عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ علمائے کرام

۲۷

- سونا چاندی کی تجارت سے متعلق بعض اہم مسائل
- زمین وجائیداد کی خرید وفروخت سے متعلق چند اہم مسائل
- سرکاری اسکیموں سے استفادہ/ شرعی نقطہ نظر سے

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا



زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارالاشاعت

اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ

جدید فقہی مباحث

مع تقاریظ عُلمائے کرام

جلد 27

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق بعض اہم مسائل
زمین وجائیداد کی خرید وفروخت سے متعلق اہم مسائل
سرکاری اسکیموں سے استفادہ/ شرعی نقطہ نظر سے

تحقیقات اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی
حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

تاثرات
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی
مفتی اعظم پاکستان جناب مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الاسلام جناب حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم

دارُالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

ہمارے اس ایڈیشن میں 80 میں سے تقریباً 58 مباحث پہلی مرتبہ صرف پاکستان میں طبع ہوئے ہیں۔ ہم اسلامی فقہ اکیڈمی کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے تمام مسودات وکمپوزنگ بذریعہ ای میل مرحمت فرمائے ۔جزاك اللّٰہ

باہتمام: خلیل اشرف عثمانی

طبع اول: نومبر 2017ء

تعداد: 500

طباعت: عابد پرنٹنگ پریس غریب آباد کراچی

﴿........ملنے کے پتے........﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن جامعہ دارالعلوم کراچی

بیت القرآن اردو بازار کراچی

بیت القلم اردو بازار کراچی

مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔فیصل آباد

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔انارکلی لاہور و اردو بازار کراچی

مسٹر بکس جناح سپر مارکیٹ اسلام آباد

دارالاخلاص صدف پلازہ محلہ جنگی پشاور

مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور

کتب خانہ رشیدیہ۔مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین سلسلہ جدید فقہی مباحث

تیسرا باب مختصر تحریریں ۳۴۹

چوتھا باب اختتامی امور ۳۹۶

☆☆☆

ملتت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عرض ناشر

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے دارالاشاعت کراچی کو پاکستان میں 1949ء سے تمام موضوعات پر اسلامی کتب کی طباعت اور اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل، تمام بزرگوں کی دعاؤں اور اکابر کی خدمات کا ثمرہ ہے، اسی محنت ولگن اور جذبے سے یہ خدمت تیسری نسل یعنی موجودہ ذمہ داران بھی کررہی ہے اور اب چوتھی نسل کے نمائندے بھی ماشاءاللہ اس کام میں شریک ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو مکمل اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں شرقبولیت عطا فرمائے جو کمی کوتاہی اس میں رہ جاتی ہے اس پر معاف فرمائے۔ (آمین)

تمام قارئین جو ماشاء اللہ ذی علم حضرات ہیں ان کے تعاون اور دعاؤں سے ہی یہ کام انجام پاسکا ان سب حضرات سے بھی دونوں جہاں میں کامیابی کی دعا کی درخواست ہے۔

زیر نظر مجموعہ ''سلسلہ جدید فقہی مباحث'' کا موجودہ ایڈیشن جو بڑے سائز کی 26 جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس میں تقریباً 70 مختلف مستقل موضوعات پر کتب جو ہندوستان میں قائم ادارہ ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' کی طویل کوششوں سے وجود میں آئیں، فقہ اکیڈمی کے سرپرست حضرات مدظلہم کی بصیرت اور کوششوں سے بڑے بڑے نامور اکابر علماء کے مقالے ان جدید فقہی موضوعات پر جمع ہوکر علمی تحقیقات کرنے والوں کے لیے بڑا زبردست ذخیرہ جمع کردیا ہے، جسے نامور اکابر ملت نے بڑی خدمت قرار دیا ہے، آئندہ صفحات میں ان بزرگوں کی تقاریظ شامل ہیں۔

ہمارے اس ایڈیشن سے قبل اس کتاب کا تقریباً چوتھائی سے بھی کم حصہ طبع ہوا تھا، جس کا معیار بھی مناسب نہ تھا اور اس کی دستیابی بھی مستقل نہ ہونے کی وجہ سے اہل علم پریشان رہتے تھے، ضرورت تھی کہ نہ صرف معیار بہتر ہو اور مستقل فراہمی بھی رہے۔ ''منتظمین اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی انڈیا'' کی خواہش تھی کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ ہو جو ان کے مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو اور مکمل اشاعت بھی کرسکتا ہو، تاکہ اس علمی ذخیرہ کی پاکستان میں اشاعت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

اس مقصد کے لیے تقریباً اب سے سات سال قبل انہوں نے دارالاشاعت کراچی کو تحریری اجازت مرحمت فرمادی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے اس میں تساہل یا کوتاہی کی گئی تو وہ کسی اور ناشر کو خدمات سونپ دیں گے۔ ارادے کے باوجود بعض مصالح اور حکمتوں کے سبب اسلامی فقہ اکیڈمی سے اپنے عذر کو واضح کردیا گیا اور اس کی اشاعت کا ارادہ ترک کردیا گیا۔

2015ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا کے سابقہ داعیہ کے ایک صاحب علم نے پیغام دیا کہ پاکستان میں اس کتاب کی مکمل اور مستقل اشاعت نہ ہونے کے سبب وہ پھر چاہتے ہیں کہ اس کا کوئی مستقل انتظام ان کے مطلوبہ معیار و مقاصد کے مطابق ہوجائے بہرحال! پھر دوبارہ ایک مفصل تحریری اجازت نامہ ان حضرات نے پاکستان کے لیے ہمیں جاری فرمایا اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کمپیوٹر کمپوزنگ یا جس شکل میں بھی یہ ذخیرہ تھا انہوں نے مذکورہ صاحب علم صاحب کے ذریعے ہمیں فراہم کیا، ان دو سالوں میں طویل محنت واخراجات کرکے اب اسے طبع کرنے کے لیے تیار کرلیا گیا ہے۔ اب پاکستان میں اس ذخیرہ کی اشاعت کے حقوق

قانونی طور پر بھی دارالاشاعت کراچی ہی کے پاس ہیں، تقریباً 22 کتب اس میں سے پہلے شائع ہوئی تھیں، ان کے علاوہ تمام ذخیرہ پہلی مرتبہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ذخیرہ پہلے انڈیا میں شائع نہیں ہوا تھا۔

ہم نے اپنے اس جدید ایڈیشن میں ترتیب یا جن دیگر خصوصیات سے اسے مزین کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱..... اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے پرانے شائع شدہ نسخوں میں کسی بھی بحث کے نتیجے میں جمع ہونے والے مقالے شائع کردیے جاتے تھے، پھر بعد میں ان میں یہ اضافہ کیا گیا کافی جگہ اکیڈمی نے ان بحثوں کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا اس کا اضافہ اس موجودہ نسخے میں شامل ہے۔

۲..... پورے علمی ذخیرے کو از سرِ نو بڑے سائز میں کمپوز و سیٹنگ سے آراستہ کیا گیا ہے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے بات ادھوری رہ گئی ہے تو قدیم نسخوں اور اصل مسودے میں بھی اسی طرح نامکمل ہے۔

۳..... پورے علمی ذخیرے کی نئی ترتیب یا جلد بندی اس طریقہ پر کی گئی ہے کہ ممکنہ طور پر ایک جیسے موضوعات پر مباحث ایک جلد میں آجائیں، پہلے طبع شدہ نسخے میں یہ صورت نہ تھی۔ مثلاً اسلامی بینکنگ کے عنوان سے ایک موضوع چوتھی جلد میں ہے تو اسی عنوان سے دوسرا موضوع ۱۳ رنمبر جلد میں ہے، اب یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک جیسے موضوع ایک ہی جلد میں آجائیں۔

۴..... ممکن ہے کہ استفادہ کرنے والے حضرات کو ایسا محسوس ہو کہ کمپوزنگ بہت جلی نہیں ہے اسے ذرا بڑا بھی رکھا جاسکتا تھا لیکن اس سے مجموعہ کے صفحات اور جلدوں میں بہت اضافہ ہو رہا تھا اور اس کی قیمت بھی قارئین پر ایک بوجھ ہوتی۔ مزید یہ کہ گزشتہ طبع شدہ نسخوں کا قلم بھی تقریباً اس جیسا ہی تھا۔

۵..... بحمد للہ! اب "سلسلۂ جدید فقہی مباحث" کا سائز بھی دیگر فقہی کتب کی طرز پر ہو گیا، کاغذ، طباعت اور جلد سازی کا معیار بھی بہت نمایاں اور بہتر ہو گیا۔

۶..... اس ذخیرہ کی قیمت بھی بازار میں دستیاب کتب کے مقابلے میں معیار وغیرہ کو دیکھتے ہوئے بہت مناسب رکھی گئی ہے۔

امید ہے کہ اہلِ علم حضرات، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، اس علمی ذخیرے کی پذیرائی کریں گی اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ درخواست اور دعا ہے کہ ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں اور دنیا و آخرت دونوں کے لیے نافع بنادیں (آمین)

والسلام

خلیل اشرف عثمانی

مدیر کتب خانہ دارالاشاعت

اردو بازار کراچی

8/7/2017

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی ہند

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ العالی

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

"اسلامک فقہ اکیڈمی ہند" ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت و فکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری و فکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ و صحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ العالی

صدر دار العلوم کراچی پاکستان

"مجھے بے انتہا مسرت بھی اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علمائے کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم کو اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانے پر یہ کام شروع نہ کر سکے۔......فقہ اکیڈمی نے بڑا اہل قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا۔

تقدیم

شیخ الاسلام جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

نائب رئیس مجمع الفقہ الاسلامی جدہ

بمناسبت خطبہ صدارت چوتھے فقہی سیمینار منعقدہ ۱۹۹۲ء حیدرآباد (دکن)

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى: اما بعد!

میرے لیے یہ بات بہت بڑے اعزاز اور خوشی ومسرت اور یادگار کی حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ جل جلالہ کے فضل وکرم سے مجھے اس عظیم الشان علمی ادارے کے چوتھے فقہی مذاکرہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنے محترم بزرگ جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم کا اور اس اسلامک فقہ اکیڈمی کے تمام منتظمین کا تہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس محفل میں شرکت کا موقع عنایت فرمایا اور نہ صرف ایک سامع اور شریک کی حیثیت میں بلکہ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری بھی مجھ ناچیز کو سونپی۔ اس سے پہلے اگرچہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال مجھے دعوت موصول ہوتی رہی لیکن میں اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہوسکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر، مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے۔ آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم وفضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کر کے اس بات کا اندازہ ہورہا ہے کہ انہوں نے اس اکیڈمی کو قائم کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان کے اس کارنامے کو قبول فرمائے اور اس کے اغراض ومقاصد کو اپنی رضا کے مطابق پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس موقع پر اس اکیڈمی کے اغراض ومقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہورہا ہے کہ اس اکیڈمی کا قیام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی تعمیل ہے۔ وہ ارشاد معجم طبرانی میں ایک روایت میں ہے جسے علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ!

"اذا جاء نا أمر ليس فيه أمر و لا نهي فما ذا تأمرنا فيه".

یارسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا سوال آجائے، ایسا قضیہ سامنے آجائے جس کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو تو اس صورت حال میں آپ ہمیں کس بات کا حکم دیتے ہیں، ایسے موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ حضرت نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه براى خاص"

کہ ایسے موقع پر فقہاء عابدین سے مشورہ کرو اور اس میں انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو، محض انفرادی فتویٰ کو، محض انفادی رائے کو لوگوں پر مسلط کرنے کی بجائے فقہاء عابدین سے مشورہ کرو، اور اس مشورہ کے نتیجہ میں جس مقام پر پہنچو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھو۔

یہ ہے وہ ارشاد جس کے ذریعہ نبی کریم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام قیامت تک پیدا ہونے والے تمام نت نئے مسائل کا حل ہمارے لیے تجویز فرمایا اور وہ یہ کہ آخری وقت میں جب کہ اجتہاد مطلق کا تصور تقریباً مفقود ہوگیا ہے، اس دور میں نئے مسائل کو حل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ فقہاء عابدین

کو جمع کیا جائے۔ مگر اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صفتیں بیان فرمائی: ایک یہ کہ جن لوگوں کو جمع کیا جائے وہ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہوں، دین کی صحیح سمجھ رکھنے والے ہوں۔ دین کے مزاج و مذاق کو اچھی طرح ملحوظ کرنے والے ہوں، اور دوسری قید یہ لگا دی کہ وہ فقہاء محض فلسفی قسم کے نہ ہوں، جو نظریاتی طور پر فقیہ ہوں، نظریاتی طور پر اسلام کے احکام کو جانتے ہوں، جو محض علم رکھتے ہوں، لیکن اس علم پر خود عمل پیرا نہ ہوں۔ اس علم کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہ ہوں، اور اس علم کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود نہ بنایا ہو، تو ایسے فقہاء سے مشورہ کرنے کا کوئی حاصل نہیں، اس لیے کہ دین یہ محض ایک نظریہ اور فلسفہ نہیں کہ ایک شخص محض فلسفہ کے طور پر اس کو اپنالے، اس کے حکم بیان کردے اور پھر بھی اس کا ماہر چلا جائے، بلکہ یہ ایک عمل ہے۔ ایک پیغام ہے، ایک دعوت ہے۔ جب تک اس پر عمل صحیح طور پر نہیں ہوگا، اس وقت تک دین کی صحیح تعبیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ یہ بات فرمایا کرتے تھے:

"کہ اگر میرا علم بمعنی جان لینا کوئی کمال کی بات ہوتی تو شاید ابلیس سے بڑا صاحب کمال اس کائنات میں کوئی نہ ہوتا۔"

اس لیے کہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے صرف جان لینے کا، علم حاصل کر لینے کا، تو ابلیس کو علم بہت بڑا حاصل تھا، بہت پختہ علم اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اور عقل کے اعتبار سے بھی آپ دیکھیں تو عقل، خالص عقل، جو وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو، اس عقل کے اعتبار سے اس نے جو دلیل پیش کی، سجدہ نہ کرنے کی، کہ اے اللہ! تو نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھ کو آگ سے پیدا کیا، تو میں افضل ہوں، اس لیے کہ آگ افضل ہے مٹی سے مقابلے میں، تو اگر عقل کو وحی کی رہنمائی سے آزاد کر دیا جائے تو خالص عقل کی بنیاد پر اس کی دلیل کا توڑ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس سارے عقل اور اس سارے علم کے باوجود وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، اس لیے کہ وہ علم نرا علم تھا، دانستن کے معنی میں اس پر عمل نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی میں اپنائے ہوئے نہیں تھا، آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے اس دور میں جتنے مستشرقین ہیں، اگر آپ ان کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں تو ان میں اسلامی کتابوں کے ڈھیر ملیں گے۔ اتنی کتابوں کے حوالے ملیں گے کہ بسا اوقات ہمارے عالم دین اتنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ لیکن سارا علم اور ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس علم کا اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے کہ ایمان کی دولت حاصل کر لیتے۔ یہودی کے یہودی، عیسائی کے عیسائی رہے۔ تو معلوم ہوا کہ صرف فقہ کا عالم ہو جانا کافی نہیں، اور صرف فقہ کے عالم ہو جانے سے وہ مقام حاصل نہیں ہوجاتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجویز فرمایا بلکہ قید لگا دی کہ فقہاء کے ساتھ عابدین ہونے چاہیے، عبادت گزار ہونے چاہیے۔ یہ حدیث میں نے اس وجہ سے سنائی کہ آج کثرت سے یہ آواز بلند ہوتا رہتا ہے، مختلف حلقوں کی طرف سے کہ صاحب دین کی تفہیم اور دین کی تعبیر کا حق صرف علماء ہی کو کیوں حاصل ہے۔ ہر مسلمان بہ حیثیت ایک مسلمان وہ دین کی تفہیم و تشریح کیوں نہیں کر سکتا۔ ہر آدمی کھڑا ہو کر یہ آواز بلند کرتا ہے کہ میں قرآن کریم سے احکام شرعیہ کا استنباط کر سکتا ہوں۔ یہ دین کی تفہیم و تعبیر کا سارا حق اٹھا کر علماء کی جھولی میں کیوں ڈال دیا گیا۔ علماء کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی۔

تو جواب دیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ یہ تشریح و تعبیر کا حق صرف فقہاء عابدین کو حاصل ہے، صرف فقہاء کو بھی نہیں بلکہ فقہاء عابدین کو، اس کے سوا کوئی قرآن و سنت کے احکام کی صحیح تفسیر و تشریح نہیں کر سکتا۔

یہ عجیب واقعہ ہے کہ دنیا کے ہر علم و فن میں کوئی ذمہ دارانہ بات کہنے کے لیے ساری دنیا میں یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ اس فن کا اس نے علم حاصل کیا ہو، اس کی ڈگری حاصل کی ہو، کوئی شخص آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا جو کہتا ہو کہ انگریزی جانتا ہوں، میڈیکل سائنس کی کتابیں مطالعہ کر کے میں علاج کر سکتا ہوں، اگر میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر، محض مطالعہ کر کے ڈکشنریوں کے ذریعہ اس کے ترجمے دیکھ کر آدمی علاج کرنا شروع کر دے تو سوائے قبرستان آباد کرنے کے اور کوئی خدمت انسانیت کی وہ انجام نہیں دے سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر بھی یہ راستہ رکھا ہے کہ جب کتاب بھیجی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ بھیجا تاکہ آپ اس کی تعلیم دیں، اس کی تربیت دیں، اس کے معانی سکھائیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے سالہا سال کی محنت کر کے قرآن کریم کی ایک سورۃ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھی۔ اس لیے یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ ہر شخص قرآن و سنت کے بارے میں جو چاہے کہہ سکتا ہے اس کا جواب اس مکمل حدیث کے اندر موجود ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مجمع الفقہ الاسلامی اسی حدیث کی

تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حدیث پر عمل کرنے کا صحیح نور، اس کی صحیح برکت اور اس کا صحیح فائدہ مجمع کو عطا فرمائے۔

جیسا کہ مجھ سے پہلے کئی حضرات اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ اس مجمع (اکیڈمی) کے قیام کا اصل مقصد ان نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو اس امت مسلمہ کو درپیش ہیں اور کوئی شک نہیں کہ علماء کے نقطۂ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے کہ علماء باہم سر جوڑ کر ان مسائل کا حل امت مسلمہ کے سامنے پیش کریں جو آج امت مسلمہ کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وقت کا بہت بڑا تقاضہ ہے کہ علماء یہ کام کریں تو مجھے چند وہ جملے بھی یاد آتے ہیں جو بسا اوقات مختلف حلقوں کی طرف سے بار بار اٹھائے جاتے ہیں کہ علماء کو وقت کے تقاضے کے پیچھے چلنا چاہیے۔ علماء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا چاہیے۔ یہ جملہ جس اجمال کے ساتھ بولا جاتا ہے اس کا صحیح مطلب بھی ہو سکتا ہے اور غلط مطلب بھی ہو سکتا ہے وقت کے تقاضہ کا مفہوم بسا اوقات لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب میں جو ہوا چل کر آوے، مغرب سے جو فکر، جو فلسفہ جو نظریہ، جو طرز عمل ہمارے ملکوں میں درآمد ہو گیا، بجائے اس کے کہ اس کو بدلا جائے، اس کے بجائے اسلام کو بدل کر اس کے مطابق کیا جائے، اسے وقت کا تقاضہ قرار دیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ سود، ربوا کا چلن ہوا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان سود کو جوں کا توں قبول کر لیں...... ایک زمانہ آیا کہ اشتراکیت اور سوشلزم کا ڈنکا بجا، اور انہوں نے دنیا کے اندر اپنے نظریات کو پھیلانا شروع کیا، دنیا کے مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں ان کا نظام رائج ہوا۔ اس کا شور شرابہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ سوشلزم کو، اشتراکیت کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا جائے وقت کا تقاضہ یہ ہے۔ غرض جو نئی وبا مغرب سے درآمد ہوا اسلام کو اس کے مطابق بنانے اور اس کو اسلام کے اندر داخل کرنے کے لیے وقت کے تقاضہ کا عنوان استعمال کر لیا جاتا ہے۔

لیکن یہ مجمع الفقہ الاسلامی درحقیقت ایسے وقت کے نام نہاد تقاضوں کے پیچھے نہ ہے اور نہ ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ... یہاں وقت کے تقاضوں سے مراد یہ ہے کہ بے شمار مسائل آپ کی زندگی کے اندر سے پیش آ گئے ہیں کہ ہمیں ان کا صریح حکم کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں یا فقہاء کرام کے کلام میں نہیں ملتا، جسے آپ اصلاحی اعتبار سے اجتہاد فی المسائل کہہ سکتے ہیں۔ تو اجتہاد فی المسائل کے ذریعہ ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور وسعت نظر کے ساتھ کیا جائے۔ پورے اسلامی مزاج کے ساتھ کیا جائے، اس کے اندر کسی اجنبی نظریہ اور فلسفہ سے مرعوب ہو کر نہیں، بلکہ حقیقی اسلامی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حل اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہ کر تلاش کیا جائے اس سے باہر نہ جایا جائے، یہ ہے اس مجمع (اکیڈمی) کا اصل مقصد اور اسی لیے اس میں الحمد للہ مختلف الخیال، مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں اور پچھلے دنوں جو تحقیقات سامنے آئی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے ان میں ان بنیادی اصولوں کا لحاظ نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ یہ اکیڈمی ان راستوں پر چلے گی، تو انشاء اللہ اس امت کے لیے بہترین مسائل کا حل پیش کرے گی...... لیکن میں آخر میں اس سلسلہ کے ایک اہم نکتہ کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، بلکہ توجہ دلانا تو بے ادبی کی بات ہوگی۔ سارے حضرات اکابر علماء ہیں۔ محض تذکیر اور تکرار کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ چوں کہ ہم ایک ایسے معاشرہ میں جی رہے ہیں جس میں مغرب کا سیاسی اور فکری تسلط قائم ہے۔ سیاسی اور فکری سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کے اوپر مغرب مسلط ہے۔ فکری اعتبار سے بھی مغرب کے افکار اور ان کے نظریات و فلسفے مسلط ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس کے پاس ہتھیار، جس کے پاس قوت ہو تو لوگوں کو بات بھی اسی کی سمجھ میں آتی ہے اور جلدی سے سینے میں اتر جاتی ہے۔ تو اس واسطے مغرب نے جو افکار ہمارے یہاں پھیلا دیئے اور صدیوں کی محنت کے بعد پھیلائے۔ ہمارے نظام تعلیم کے اندر وہ افکار پھیلا دیئے۔ ان کی موجودگی میں اس بات کا بڑا قوی اندیشہ ہے کہ کہیں ایسی چیزوں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جائے جو درحقیقت وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مغرب کے پروپیگنڈہ نے اسے وقت کی ضرورت قرار دے دیا۔ یہ وقت کی ضرورت ایک ایسا مجمل لفظ ہے جس کے اندر بہت کچھ سما سکتا ہے اس لیے وقت کی ضرورت کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہوئے ان کی دو دھاریں اپنے ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ یہ دو دھاریں ہتھیار ہیں، اس سے امت مسلمہ کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں اور اس سے امت مسلمہ کا کام

بھی تمام ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہم جب وقت کی ضرورت کا لفظ استعمال کریں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہونی چاہیے کہ مختلف پروپیگنڈوں کے شور و شغب سے مرعوب ہو کر ہم یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے اپنے اصول، ہمارے اپنے قواعد کے لحاظ سے یہ ضرورت ہے یا نہیں؟

اسی ضمن میں یہ سوال بہ کثرت اٹھتا ہے کہ کیا ان مسائل کو طے کرتے وقت کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کرنی چاہیے یا مختلف فقہی مذاہب کو سامنے رکھ کر اور اس میں جو ضرورت کے مطابق معلوم ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔

میں خاص طور پر آپ حضرات سے باادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خاص طور پر اس دور میں معاملات کے شعبہ میں چوں کہ معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، بے شمار مسائل سامنے آگئے ہیں، لہٰذا اگر یہ شخص حنفی مذہب کا پیروکار ہے اور وہ کسی ضرورت کی وجہ سے، عموم بلوی کی خاطر، وہ مسائل وقت کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کسی امام کے قول کو اختیار کرلے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ جائز ہے اور نہ صرف جائز ہے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو باضابطہ یہ وصیت فرمائی تھی کہ اس دور میں جب کہ معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں، اگر آئمہ اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی بھی فقہی مذہب میں کوئی گنجائش مل جائے تو اس دور کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنی چاہیے۔

لیکن اس میں ادق ترین جو نکتہ ہے جو بسا اوقات افراط و تفریط کا شکار ہو کر فراموش ہو جاتا ہے وہ یہ کہ مختلف مذاہب میں سے عموم بلویٰ کی خاطر کوئی قول اختیار کر لینا اور بات ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کی خاطر مذاہب کو گڈمڈ کرنا بالکل جدا شئے ہے یعنی اگر کوئی شخص محض اس بنیاد پر کہ میری خواہش نفسانی میرے مفاد ایک مذہب سے پورے ہو رہے ہیں دوسرے سے پورے نہیں ہو رہے ہیں تو اس بنیاد پر اگر وہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تو اس کی کسی کے نزدیک اجازت نہیں، یہ اتباع ہویٰ ہے۔ یہ خواہشات نفسانی کی اتباع ہے۔ اس کو تشہی کہا گیا ہے، یہ شہوت پرستی ہے، یہ خواہش پرستی ہے، محض اپنے ذاتی فائدہ یا ذاتی سہولت کی خاطر ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے اس کی مثال آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

آج جب کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یہ عام رجحان پیدا ہوا۔ پورے عالم اسلام میں خاص طور پر عرب ممالک میں یہ رجحان بہت پیدا ہوا کہ ان معاملات کو حل کرنے کے لیے مختلف مذاہب سے رہنمائی حاصل کی جائے اور کسی ایک مذہب کی اتباع نہ کی جائے۔ جب یہ لے آگے بڑھی تو اس نے بعض اوقات یہ صورت اختیار کر لی کہ محض ضرورت کی خاطر نہیں، بلکہ محض ذاتی مفاد، ذاتی سہولت کی خاطر "جمع بین المذاہب" اور "تلفیق بین المذاہب" کا راستہ اختیار کر لیا...... اتباع ہویٰ کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ فتاویٰ کے اندر لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص ذاتی خواہش کی خاطر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔"

حالانکہ علامہ ابن تیمیہ تقلید کے سخت مخالف ہیں۔ اتباع ہویٰ کو وہ بھی حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک صاحب سے میری ایک بار ملاقات ہوئی میں اور وہ دونوں سفر پر تھے اور دونوں سفر کے عالم میں مقیم تھے۔ ہفتہ دس دن ایک جگہ ٹھہرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ "جمع بین الصلوٰتین" کر رہے ہیں۔ دو نمازوں کو جمع کر رہے ہیں۔ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جمع حقیقی جائز نہیں ہے۔ جمع صوری کو جائز کہتے ہیں۔ تو وہ جمع کر رہے تھے، انہوں نے امام شافعیؒ کے قول پر عمل کیا ہوگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ ہفتہ بھر مقیم رہے اور جمع بین الصلوٰتین کرتے رہے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے شافعی مسلک کو لے لیا تاکہ دو نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش مل جائے؟ میں نے عرض کیا کہ شافعی مسلک یہ بھی ہے کہ چار دن سے زیادہ ان کے یہاں قصر نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک مدتِ قصر صرف چار دن ہے۔ تو چار دن سے زیادہ مدتِ سفر نہیں ہوتی اور آپ تو ہفتہ بھر سے مقیم ہیں۔ تو کہنے لگے کہ میں نے اس معاملہ میں حنفی مسلک کو لے لیا۔ تو میں نے پوچھا کہ کیا آپ دلائل کے نقطۂ نظر سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے اور اس معاملہ میں شافعیہ کا مسلک زیادہ قوی ہے۔ کہنے لگے کہ دلیل کے اعتبار سے تو میں نہیں سمجھتا لیکن میں نے دیکھا کہ یہ

میرے لیے زیادہ سوٹ کرتا ہے تو اس واسطے میں نے اس میں حنفی کا مسلک لے لیا اور اس میں شافعی کا مسلک لے لیا..... تو میری گزارش یہ ہے کہ محض ذاتی سہولت اور ذاتی مفاد، ذاتی راحت کے پیش نظر ایک مسئلہ میں ایک قول کو لے لینا اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے قول کو لے لینا، یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے دین کا حلیہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اس واسطے کہ ہر مذہب میں جو قول اختیار کیا گیا اس کے پیچھے شرائط ہیں اس کے کچھ حدود ہیں۔ آپ نے ان شرائط کو مدنظر نہیں رکھا چھوڑ دیا اور ان شرائط کو مدنظر رکھے بغیر اور اس طرح سے "تلفیق بین المذاهب" کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ سوائے اتباع ہوی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ بے شک دوسرے مذاہب خاص طور پر معاملات کے اندر دوسرے مذاہب سے لے لینے کی گنجائش ہے لیکن یہ اس وقت جب کہ واقعی کوئی ضرورت داعی ہو اور واقعتاً اس سے مسلمانوں کے کسی اجتماعی مسئلہ کا حل نکالنا مقصود ہو اور اس کا مقصد اتباع ہوی، تشہی اور ذاتی منفعت کو حاصل کرنا نہ ہو، اس صورت میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ علماء کا مجمع ہے، ان کے سامنے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہ اس لیے میں نے تذکیر اور تکرار اعرض کر دی کہ جب ہم کسی ایک جانب جھکیں تو ایسا نہ ہو کہ دوسری جانب کا خیال ہمارے دل سے اوجھل ہو..... یہ کام بڑا نازک ہے، یہ پل صراط ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں اس کا خیال رکھنا ہے کہ وقت کی ضروریات پوری ہوں، مسلمانوں کے مسائل حل ہوں اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ آپ مغرب کے اس جھوٹے پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوں جو ہر تتی و با کو وقت کی ضرورت کہہ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس واسطے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام دیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس شریعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ یہ آنے والے ہر بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل رکھتی ہے اور جب یہ تصور آپ کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیں گے تو ان شاء اللہ امت کے مسائل حل ہوں گے ...... جیسا کہ مجھ سے پہلے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہم نے فرمایا کہ عالم کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ حرام ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اگر کسی چیز کو حرام کہا ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے تو اس کا متبادل طریقہ بھی بتائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جب حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی کہ بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ:

"انی اری سبع بقرات سمان یاکلھن سبع عجاف"

جب یہ پوچھا تو یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے بچنے کا راستہ پہلے بتا دیا:

"تزرعون سبع سنین دابا فما حصدتم فذروہ فی سنبلہ"

تعبیر تو بعد میں بتائی کہ قحط آنے والا ہے اور پہلے قحط سے بچنے کا یہ راستہ بتایا کہ سات سال تک خوب جم کر زراعت کرو، اور خوشہ کے اندر گیہوں کو چھوڑ دو۔ تو بچنے کا طریقہ پہلے بتا دیا اور خواب کی تعبیر بعد میں بتائی..... تو عالم کا کام محض حرام قرار دے کر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ متبادل راستہ بتانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ اکیڈمی درحقیقت اسی لیے قائم کی گئی ہے۔ اس کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے علوم وفنون کے ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی۔ متبادل طریقوں کے سمجھنے اور اس کے تعین کے لیے وہ طریقے تجویز کیے جا سکیں جو قابل عمل ہیں۔

الحمدللہ! دیکھتا ہوں کہ مجمع الفقہ الاسلامی نے اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگر علوم وفنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے اس اکیڈمی کو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیابی عطا فرمائے، قدم قدم پر اس کی نصرت ودستگیری فرمائے، اس کے راستے کی دشواریوں کو دور فرمائے اور دین کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں اخیر میں ایک بار پھر اس کانفرنس کے منتظمین کا اور تمام حاضرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گزارشات کو غور و توجہ سے سماعت فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق بعض مسائل

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے 26 ویں فقہی سمینار مؤرخہ 4 تا 6/ مارچ 2017ء منعقدہ اجین (مدھیہ پردیش) میں پیش کیے جانے والے علمی و تحقیقی مقالات اور مباحثات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ٥ ایم اے جناح روڈ ٥ کراچی پاکستان

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے کائنات میں بے شمار چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں بیشتر وہ ہیں جن سے براہ راست انسانی ضرورت پوری ہوتی ہے، جیسے غذائی اشیاء، جنھیں انسان کھاتا ہے، تعمیر میں کام آنے والی چیزیں، جن سے مکانات بنتے ہیں، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر ہوتی ہے، جانور جو انسان کی سواری یا غذا کے کام آتا ہے، اسی طرح لوہا، تانبا، پیتل جن کا استعمال برتنوں، مشینوں اور مختلف کاموں میں ہوا کرتا ہے، ان سب کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی ایک اہم نعمت سونا اور چاندی ہے، جس سے اگرچہ براہ راست انسان کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی، انسان زیادہ سے زیادہ اسے زیب وزینت کے لئے استعمال کرتا ہے؛ لیکن یہ بالواسطہ انسان کو سب سے بڑھ کر فائدہ پہنچاتا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں اس دھات کی ایسی وقعت پیدا کردی ہے کہ ہزاروں سال سے یہ اشیاء کے لئے ذریعہ تبادلہ بن رہا ہے، نہ اس کو کھایا جاسکتا ہے، نہ اس کو بطور لباس پہنا جاسکتا ہے اور نہ یہ سواری کے کام آتا ہے؛ لیکن اس کے ذریعہ تمام اشیاء ضرورت حاصل کی جاسکتی ہیں۔

اسی لئے سونا چاندی کی خرید وفروخت سے متعلق شریعت میں خصوصی احکام دیئے گئے ہیں، بعض ایسے امور جن کی دیگر اشیاء کی خرید وفروخت میں اجازت ہے، سونے چاندی کے تبادلہ میں اجازت نہیں ہے، نیز سونے چاندی کی خرید وفروخت میں بعض ایسی صورتیں بھی پیدا ہوگئی ہیں، جن کا ماضی میں کوئی تصور نہیں تھا، اکیڈمی کے چھبیسویں فقہی سمینار کی پیش کش برادران وطن کے مشہور مذہبی شہر 'اجین' کے احباب نے کی اور یہاں کے علماء اور دولت مند مسلمانوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس کا انعقاد عمل میں لایا، جس میں محترم مولانا مفتی محمد جنید فلاحی، مجلس اتحاد امت، اس کے صدر مولانا محمد طیب ندوی اور دوسرے رفقاء نیز مجلس کے دیگر ذمہ داران بے حد شکریہ کے مستحق ہیں، اس سمینار کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا گیا، ان میں ایک سونا چاندی کی تجارت بھی ہے؛ چنانچہ اس شعبہ کے تاجروں اور کاریگروں کے ساتھ گفتگو کر کے قابل غور نکات متعین کئے گئے، اور ان کو سامنے رکھتے ہوئے سوالنامہ مرتب کیا گیا، اللہ تعالیٰ جزاء خیر دے کہ ملک و بیرون ملک کے اہل علم نے اس موضوع پر توجہ دی، اور انہوں نے اپنے تفصیلی مقالات اکیڈمی کو بھیجے، جن کی تعداد ۵۰ ہے، پھر سمینار کے دوران بھی اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث ہوئی اور باتفاق رائے تجاویز منظور کی گئیں۔

چنانچہ مقالات، مناقشات، سوالنامہ اور تجاویز پر مشتمل اس مجموعہ کی ترتیب کی ذمہ داری عزیز مکرم مفتی سعید الرحمن قاسمی (مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ) کو سونپی گئی، اللہ تعالیٰ انہیں جزاء خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے بہت توجہ اور ذمہ داری کے ساتھ اسے انجام دیا، اس کی فائنل ریڈنگ (آخری نظر ثانی) کا کام عزیزی مفتی امتیاز احمد قاسمی صاحب نے بڑے اہتمام کے ساتھ مکمل کیا، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ دیگر مجلات کی طرح اس کو بھی قبولیت عطا فرمائے اور فکر ونظر کا یہ کارواں آگے بڑھتا رہے۔ واللہ ھو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

16/ ذوقعدہ 1438ھ/ مطابق 9/ اگست 2017

پہلا باب: تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق مسائل

آج مورخہ ۶ / مارچ ۲۰۱۷ء کو سونا چاندی کی تجارت سے متعلق چند مسائل کے سلسلہ میں تجویز ساز کمیٹی نے درج ذیل تجاویز پر اتفاق کیا:

۱- کرنسی سے سونا چاندی خریدا جائے تو یہ بیع صرف نہیں ہے، اس لئے بدلین میں سے کسی ایک کا ادھار ہونا درست ہے۔

۲- سونے چاندی کی مقررہ نرخ سے زیادہ یا کم قیمت پر خرید وفروخت درست ہے۔

۳- سونے چاندی کی زیور سازی میں نکلنے والے ذرات کو اجرت بنانا درست ہے، جبکہ مقدار میں ایسی جہالت نہ ہو جو نزاع کا سبب بنے، البتہ بہتر ہے کہ الگ سے اجرت متعین کی جائے۔

۴- سونے چاندی کے پرانے زیورات کا نئے زیورات سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز نہیں ہے، اگر تبادلہ کرنا ہی ہے تو پرانے کو قیمتاً بیچ دے اور پھر اس قیمت سے نیا زیور خرید لے۔

۵- کموڈٹیز ایکسچینج میں سونے چاندی کی اس طرح خرید وفروخت درست نہیں ہے کہ مبیع اور ثمن پر قبضہ ہی نہ ہو اور صرف خریداری اور ادائیگی کے وقت نرخ میں جو کمی بیشی آتی ہے، اس کا لین دین کرلیا جائے۔

۶- گراں فروشی کی نیت سے سونے کی ذخیرہ اندوزی احتکار کے دائرہ میں داخل نہیں ہے، البتہ اس کو روک کر رکھنے کی صورت میں دوسری ضروری اشیاء کی قیمتیں متاثر ہوتی ہوں تو اس سے بچنا چاہئے۔

۷- اسمگلنگ غیر قانونی عمل ہے، لہذا اس طریقہ پر سونے کی خرید وفروخت سے بچنا چاہئے، لیکن اس راہ سے کسی نے سونا خرید لیا ہے تو وہ اس کا مالک ہے۔

۸- پلاٹینیم سونا نہیں ہے، لہذا عقود، نیز زکاۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

سوال نامہ:

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق چند مسائل

اللہ تعالی کی طرف سے جو قدرتی وسائل زمین میں چھپا کر رکھے گئے ہیں، ان میں سونا اور چاندی بھی ہے، یہ نہایت قیمتی دھات ہے، جہاں اس کا استعمال زیبائش وآرائش کے لئے ہوتا رہا ہے اور خواتین اس کے زیورات پہنتی رہی ہیں، وہیں یہ دولت اور قدر کو ناپنے کا ایک پیمانہ بھی ہے، اسی لئے قدیم زمانہ سے افراد ہوں یا حکومتیں، انہوں نے دولت کے ایک محفوظ ذخیرہ کے طور پر سونے کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے بہت ہی قدیم زمانہ سے کرنسی کی حیثیت سے اس کا استعمال کیا گیا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت روم میں سونے کی اور ایران میں چاندی کی کرنسی کا رواج تھا اور یہی اس وقت دنیا کی دو سب سے بڑی معاشی اور فوجی طاقتیں تھیں، عرب ان دونوں کرنسیوں کو استعمال کرتے تھے، سونے کی کرنسی دینار اور چاندی کی درہم کہلاتی تھی، اسلام نے اس کو اسی طرح باقی رکھا، البتہ درہم و دینار کے مختلف سکوں کے وزن میں جو فرق ہو جاتا تھا، اس خامی کو دور کیا اور اس میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی، حضرت عمرؓ نے جہاں اور بہت سی اصلاحات فرمائیں، ان میں ایک یہ بھی ہے۔

اگرچہ اب سونے اور چاندی کی وہ حیثیت نہیں رہی، چاندی کی حیثیت تو اب ایک عام دھات کی سی ہو گئی اور کرنسی کی قدر میں سونے کی اہمیت بھی کم ہو کر رہ گئی، اور بظاہر بے قیمت نظر آنے والے کاغذی نوٹوں نے اس کی جگہ لے لی، لیکن پھر بھی سونے کی اپنی ایک اہمیت ہے، اس کی طلب ہے، افراد ہی نہیں حکومتیں بھی چاہتی ہیں کہ ان کے پاس سونے کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ ہو، آج بھی کسی ملک یا شخص کی دولت کو تولنے کے معیارات میں ایک سونا بھی ہے؛ اسی لئے بمقابلہ تمام دھاتوں کے اور خاص کر کاغذی نوٹوں کے سونے کی قیمت میں استحکام ہے؛ بلکہ صورتحال یہ ہے کہ کاغذی کرنسی کی قیمت تیزی سے گرتی جارہی ہے اور سونے کی قیمت گھٹتی کم اور بڑھتی زیادہ ہے۔

دنیا کے معاشی نظام میں جو تبدیلیاں آتی رہی ہیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے فقہاء نے بھی ثمن کے سلسلہ میں ایک نئی اصطلاح قائم کرتے ہوئے اس کی دو قسمیں کی ہیں، ایک: ثمن حقیقی، دوسری: ثمن اصطلاحی، ثمن حقیقی سے مراد سونا اور چاندی ہے، اور ثمن اصطلاحی سے مراد وہ شئ ہے جو لوگوں کے عرف اور اتفاق کی وجہ سے ثمن کے درجہ میں آ گئی ہو، جیسے: سکے اور کاغذی نوٹ، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب ثمن کا ثمن سے تبادلہ ہو تو اس بیع کے خصوصی احکام ہیں، جن کو فقہاء نے بیع صرف سے تعبیر کیا ہے اور جس میں بے احتیاطی عقد کو ربا کے دائرہ میں لے آتی ہے۔

کاروباری نقطہ نظر سے سونے چاندی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور بالخصوص ابلاغ کے جدید ذرائع کی پیدائش، نیز ٹیلی فون اور ای میل کے ذریعہ بین ملکی تجارت نے شرعی اعتبار سے بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے ہیں، جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اس پس منظر میں درج ذیل سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں، امید کہ آپ قرآن وحدیث، نیز سلف صالحین کے اجتہادات سے استفادہ کرتے ہوئے جواب دینے کی زحمت فرمائیں گے۔

۱- اگر روپئے سے سونا خرید کیا جائے تو اس میں روپیہ کی کیا حیثیت ہوگی، کیا اس بیع کو بیع صرف تصور کیا جائے گا؟ اس پس منظر میں:

الف: کیا یہ بات درست ہوگی کہ سونا چاندی اور روپئے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار؟

ب: کیا یہ بات درست ہوگی کہ سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر کومیکس گولڈ مارکیٹ یا ہندوستان کی سطح پر یہاں کی مارکیٹ MC نے طے کیا ہو، اس سے زیادہ یا کم قیمت میں خرید وفروخت کی جائے، اور کیا اس صورت پر ربا تفاضل کا اطلاق ہوگا؟

۲- زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ وزن میں سونا لیتے ہیں اور چند دنوں میں اس کے بدلے سونے سے بنائے ہوئے زیورات انہیں واپس کرتے ہیں، انہیں الگ سے کوئی اجرت نہیں دی جاتی؛ بلکہ زیورات کی شکل میں سونے کی اتنی ہی مقدار انہیں واپس کرنی ہوتی ہے، جتنی انہوں نے لی تھی؛ البتہ سونے کا زیور بنانے میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، اس آمیزش کے بقدر سونا ان کو بچ جاتا ہے اور زیور بنانے میں سونے کے کچھ ذرات نکل آتے ہیں، یہی ان کی اجرت ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ:

الف: سونے کے لین دین میں مقدار کا جو یہ فرق ہو رہا ہے، اسے بیع تصور کیا جائے گا یا اجارہ؟

ب: کیا اجرت کی یہ شکل درست ہوگی کہ زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جائیں، وہی اجرت قرار پائے؟

۳- عام طور پر سونے کے تاجر حضرات پرانے زیور کی قیمت کم متعین کرتے ہیں، مثلاً: دس گرام سونے کو آٹھ گرام کے درجہ میں رکھتے ہیں، تو اگر سونے کے پرانے زیور کا سونے کے نئے زیور سے تبادلہ ہو اور اس کی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سونے کا پرانا زیور زیادہ وزن کا لیا جائے اور سونے کا نیا زیور کم وزن میں اس کے بدلہ ادا کیا جائے تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

۴- آج کل کیموڈیٹیز ایکسچینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے، جس میں خریدار آرڈر دیتا ہے اور جو چھ اس نے آرڈر دیا ہے، اس کے آرڈر کے بقدر وہ شئی اس کے نام سے محفوظ کر دی جاتی ہے، اس سلسلہ میں چند باتیں قابل غور ہیں:

الف: اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس مثلاً ایک کلو سونا ہو اور وہ دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے جاتے ہوں تو کیا اس کو خریدار کا قبضہ سمجھا جائے گا؟

ب: اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کر دیا گیا ہو تو کیا اس اندراج کو قبضہ کے لئے کافی تصور کیا جائے گا؟

۵- ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی ایک اور صورت جو آج کل رائج ہے، یہ ہے کہ مثلاً ایک مہینے کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے ۱۰۰ تولے سونے کا سودا کر لیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا، جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ لیا جاتا ہے، خرید کے دن اور ادائیگی کے دن سونے کے نرخوں میں جو فرق ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کر دی جاتی ہے، مثلاً خریدنے کے دن سونے کا نرخ پانچ ہزار روپے فی تولہ تھا، ادائیگی کے دن پانچ ہزار ایک سو روپے تولہ ہو گیا تو خریدار بائع کو ایک سو روپے دے گا، اور اگر اس دن چار ہزار نو سو تھی تو بائع خریدار کو ایک سو روپے ادا کرے گا، نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے اور نہ بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے، بس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے، اس کا لین دین کر لیتے ہیں، اس صورت کا کیا حکم ہے؟

۶- بہت سی دفعہ سونے کی قیمت میں متوقع اضافہ کا سونے چاندی کے تاجروں کو علم ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں وہ سونے کو روک لیتے ہیں؛ تاکہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کریں، سونا اس پہلو سے اشیاء ضروریہ میں شامل ہے کہ ثمن خلقی ہونے کے لحاظ سے وہ ذریعہ تبادلہ ہے، اس کو روک لینے کی وجہ سے سونے کی قیمت تو بڑھتی ہی ہے، اس گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہے، تو کیا سونے کی ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے لئے اس کو روک کر رکھنا احتکار کے دائرہ میں آئے گا؟

۷- ملک میں جو سونا آتا ہے، اس میں بڑا حصہ تو قانونی طریقہ پر آتا ہے، اور سونا لانے والا اس سے متعلق واجبات کو ادا کرتا ہے، دوسرا راستہ اسمگلنگ کا ہے، یہ طریقہ غیر قانونی ہے، اس میں سونا لانے والا ان واجبات کو ادا نہیں کرتا، جو حکومت نے سونے کی درآمد سے متعلق مقرر کئے ہیں، کیا یہ اسمگلنگ کا عمل جائز ہوگا، کیا اس طریقہ پر آنے والے سونے کا خریدنا اور پھر اس کو فروخت کرنا درست ہوگا؟

۸- آج کل 'پلاٹینم' کو سفید سونا کہا جاتا ہے، اب اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے، اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، تو کیا لوگوں کے عرف کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقی سونے کے حکم میں ہوگا اور عقود، نیز زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق ہوں گے؟

☆☆☆

تلخیص مقالات:

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق چند مسائل

مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی [1]

اسلامک فقہ اکیڈمی کا چھبیسواں فقہی سمینار شہر اجین، مدھیہ پردیش میں مورخہ ۴/ تا ۶/ مارچ ۲۰۱۷ء کو منعقد ہو رہا ہے، اکیڈمی نے اس سمینار کے لئے چار اہم موضوعات کا انتخاب کیا ہے، جن میں سے ایک اہم موضوع "سونے چاندی کی تجارت سے متعلق چند مسائل" بھی ہے، اس موضوع پر اکیڈمی کو ۴۳/ مقالات موصول ہوئے جن کی تلخیص ذیل میں پیش کی جارہی ہے؛ تاکہ ہر ایک کی آراء سے استفادہ آسان ہو سکے، جن حضرات کے مقالے اکیڈمی کو موصول ہوئے ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا اشتیاق احمد اعظمی مئو، قاضی عبد الجلیل قاسمی پٹنہ، مولانا خورشید انور اعظمی بنارس، مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی کھگڑیا، مولانا اختر امام عادل سمستی پور، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی مئو، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کیرالا، مولانا انور علی اعظمی مئو، مولانا خورشید احمد اعظمی مئو، مولانا ظفر عالم ندوی لکھنو، مولانا محمد شاہجہاں ندوی کیرالا، مولانا محمد اشرف قاسمی گونڈوی، مفتی عبد اللہ خالد لوناواڑہ، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا روح الامین گجرات، مولانا عبد الباسط پٹن، مولانا عمران بن دین محمد، مولانا نثار احمد گودھرا، مولانا عبد الحئی مفتاحی، مولانا محمد سلطان قاسمی، مولانا ابو المکارم معروفی گورینی جونپور، مولانا ابو محمد محمد سعد نور القاسمی، مولانا عمر امین الہی کشمیر، مولانا ذکاء اللہ شبلی اندور، مولانا عبد الرحیم قاسمی بھوپال، مولانا عبد المنان نوگاؤں آسام، مولانا عبد الحمید قاسمی اتر دیناجپور، مولانا محمد روح اللہ قاسمی مدھوبنی، مولانا محمد عثمان بستوی گورینی، مفتی محمد شاہد حسین قاسمی مدھوبنی، مولانا ظہیر احمد کانپور، مولانا فیاض احمد کرناٹک، مولانا کلیم اللہ عمری ندوی عمر آباد، مولانا شاکر نثار اعظمی مدنی، اعظم گڑھ، مولانا محی الدین غازی، مولانا عبد الجبار طیب ندوی، مولانا مقصود علی فرقانی رامپور، مولانا نعمان انور مئو، مفتی سلمان پالنپوری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، میرٹھ، مفتی سعید اسعد قاسمی، آسنسول، وراقم (مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی پٹنہ)۔

اکیڈمی نے اس موضوع سے متعلق ۸/ سوالات علماء کرام کی خدمت میں ارسال کئے تھے جن میں سے پہلا سوال تھا:

اگر روپے سے سونا خرید کیا جائے تو اس میں روپیہ کی کیا حیثیت ہوگی، کیا اس بیع کو بیع صرف تصور کیا جائے گا؟ اس پس منظر میں:

(الف) کیا یہ بات درست ہوگی کہ سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاروں کے دو نقطہائے نظر ہیں:

پہلا نقطۂ نظر:

روپے سے سونا خرید کیا جائے تو اس میں روپے کی حیثیت ثمن عرفی یا اصطلاحی کی ہوگی اور یہ بیع، بیع صرف متصور نہیں ہوگی، کیونکہ اس پر بیع صرف کی تعریف صادق نہیں آتی ہے، لہذا سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار تو یہ بیع جائز و درست ہوگی، بشرطیکہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ مجلس عقد میں ہو جائے۔

اور یہ نقطۂ نظر پینتیس مقالہ نگاروں کا ہے، جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا محمد شاہجہاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد اشرف قاسمی، مفتی عبد اللہ خالد، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی جنید محمد، مفتی

---

[1] مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

سلمان، مولانا روح الامین، مولانا عبدالباسط قاسمی، مولانا محمد سلطان قاسمی، مولانا ابوالمکارم معروفی، مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی، مولانا عمر امین الہی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا ذکاء اللہ شبلی، مولانا عبدالرحیم قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا عبدالمنان، مولانا عبدالحمید قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا روح اللہ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد عثمان، مولانا نعمان انور، مولانا شاکر نثار احمد اعظمی، مولانا فیاض احمد، مفتی محمد شاہد حسین، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ظہیر احمد اور راقم الحروف (مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

ان حضرات کے مستدلات:

بیع صرف کی تعریف

''الصرف هو البيع إذا كان واحد من عوضيه من جنس الأثمان'' (لسان العرب ۳/ ۲۴-۲۵)

(مقالہ مولانا عمر امین الہی)۔

''الصرف في متعارف الشرع اسم لبيع الأثمان المطلقة بعضها ببعض وهو بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة أو أحد الجنسين بالآخر'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۵۳) (مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا روح اللہ قاسمی، مولانا عمر امین الہی، مفتی عبداللہ خالد)۔

''وهو بيع النقد بالنقد جنسا بجنس أو بغير جنس أي بيع الذهب بالذهب أو الفضة بالفضة أو الذهب بالفضة مصوغاً أو نقدا'' (الفقه الاسلامي وادلته ج۵/ ۳۶۵۹- فتح القدير ۵/ ۲۸۸) (مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عبدالحئی مفتاحی)۔

''بيع الثمن بالثمن أي ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنسا بجنس أو بغير جنس'' (الدر المختار على الرد ۷/ ۵۲۰)

(مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا روح اللہ قاسمی، مولانا عمر امین الہی، مولانا روح الامین، مفتی نثار احمد، مفتی عبداللہ خالد)۔

''الصرف بيع النقد بالنقد'' (مجلة الاحكام العدلية: ماده: ۱۲۱) (مقالہ: مولانا روح اللہ قاسمی)۔

''الصرف اسم لعقود ثلاثه: بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة وأحدهما بالآخر'' (الجوهرة النيرة ۱/ ۲۶۱ كتاب البيوع باب الصرف. كتاب الفقه على مذاهب الاربعة ۲/ ۲۷. المختصر القدوري / ۸۵)

(مقالہ مولانا روح اللہ قاسمی، مولانا عمر امین، مولانا عبدالباسط قاسمی)۔

''وفي الاصطلاح عرفه جمهور الفقهاء بأنه بيع الثمن بالثمن جنسا بجنس أو بغير جنس فيشمل بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة كما يشمل بيع الذهب بالفضة والمراد بالثمن ما خلق للثمنية فيدخل في بيع المصوغ بالمصوغ أو بالنقد'' (الموسوعة الفقهيه؟) (مقالہ: مولانا روح اللہ قاسمی)۔

''النقد بالنقد والمراد به الذهب والفضة مضروبا كان أو غير مضروب'' (مغنى المحتاج ۲/ ۳۶۹) (مقالہ: روح الامین)۔

مولانا عمر امین الہی، مولانا ابومحمد محمد سعد نور القاسمی، مولانا روح الامین، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے بیع صرف کی چار شرطوں کا بھی ذکر کیا ہے: عدم تاجیل۔ عدم خیار شرط، وزن کے لحاظ سے تماثل و تساوی، مجلس عقد میں تقابض۔

''والشرط عدم التأجيل والخيار والتماثل إلى التساوي وزنا والتقابض بالبراجم. لا بالتخلية قبل الافتراق'' (الدر المختار مع رد المحتار ۴/ ۲۶۱)۔

''وشرائطه إجمالا التقابض قبل افتراق المتعاقدين والتماثل أي التساوي وأن لا يكون فيه خيار ولا تأجيل'' (الفقه الاسلامي وادلته ۵/ ۳۶۶۰) (مقالہ: مولانا عبدالحئی مفتاحی)۔

بیشتر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ روپیے ثمن خلقی نہیں بلکہ ثمن عرفی یا اصطلاحی ہیں اور یہ فلوس کے حکم میں ہیں۔

''أن صفة الثمنية في الفلوس عارضة باصطلاح الناس فأما الذهب والفضة فثمن بأصل الخلقة'' (المبسوط

۱۲/۱۳۷) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

مولانا ابوالمکارم معروفی و مولانا روح الامین نوٹ کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں چار نظریات ہیں:

(۱) دین کی سند ہے: گزشتہ صدی کے بیشتر علماء ہند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا مفتی شفیع عثمانی صاحبؒ وغیرہ کا موقف یہی ہے۔

(۲) مال اور سامان: علماء رامپور اور جناب مولانا احمد رضا خان بریلوی کی یہی رائے رہی ہے، اس موضوع پر ان کا ایک رسالہ کفل الفقیہ فی أحکام القرطاس والدراھم نام سے ہے، انہوں نے ثابت کیا ہے کہ نوٹ مال اور سامان ہے، سند دین یا خود ثمن نہیں۔

(۳) سونے و چاندی کے قائم مقام ہے:

نہ محض سند دین اور نہ عروض سامان ہے، بلکہ بذات خود ثمن ہے، عرف ورواج کی بنا پر اصل ثمن کے قائم مقام ہے اور اس کا بدل ہے لہذا جو احکام اصل اور مبدل کے ہیں وہی احکام نوٹ میں جاری ہوں گے، اکثر علماء عرب اسی کے قائل ہیں، اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ نے یہی تجویز منظور کی ہے، یہی مولانا فتح محمد لکھنوی صاحب عطر الہدایہ اور مولانا عبدالحئیؒ لکھنویؒ کی رائے ہے۔

(۴) بذات خود ثمن عرفی ہے:

سونے چاندی کا بدل نہیں بلکہ ثمن ہے، اور فلوس کی طرح ثمن عرفی ہے، لہذا جو احکام فلوس پر جاری ہوتے ہیں وہی اس پر بھی منطبق ہوں گے، اکثر علماء اسی نظریے کے قائل ہیں، سعودیہ عربیہ کے علماء کبار کی مجلس نے اکثریت کے ساتھ یہی قرارداد منظور کی، یہی آخری نظریہ راجح معلوم ہوتا ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فقہ البیوع، فقہی مقالات، اسلام اور جدید معیشت وتجارت، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فیصلے، جدید فقہی تحقیقات)۔

''اندفعوا إلى الاصطلاح على جوهر معدنية تبقى زمنا طويلا أن تكون المعاملة بها أمرا مسلما عندهم وكان الأليق من بينها الذهب والفضة لصغر حجمهما وتماثل أفرادهما وعظم نفعهما في بدن الإنسان ولتاتي التجمل بهما فكانا نقدين بالطبع وكان غيرهما نقدا بالاصطلاح'' (حجة الله البالغة ۱/ ۹۰) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

مفتی روح اللہ قاسمی لکھتے ہیں کہ اب کاغذی نوٹوں کی شرعی حیثیت پر تقریباً علماء کرام کا اتفاق ہو چکا ہے کہ وہ اصطلاحی ثمن ہے، بطور وثیقہ وسند اب کسی ثمن کی نمائندگی نہیں کرتا اور اس کی پشت پر کوئی سونا وغیرہ نہیں ہے، بلکہ وہ خود اصلی حیثیت کا مالک ہے، اسے زر قانونی کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے (مقالہ: مولانا روح اللہ قاسمی)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں کہ کاغذی نوٹ کو مکمل طور پر زر خلقی یعنی سونا چاندی کے حکم میں قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ سونا چاندی کی اپنی قیمت ہے، خواہ وہ ثمن ہوں یا نہ ہوں جبکہ کاغذی نوٹ کو اگر کوئی حکومت ثمن کی حیثیت نہ دے تو کاغذ کے ٹکڑے کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے (مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

بدلین میں سے ایک پر قبضہ کافی ہے:

''وإن اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس في فص بكذا فلسا وليست الفلوس عنده فهو جائز تقابضا قبل التفرق أم لم يتقابضا لأن هذا بيع ليس بصرف'' (الفتاوى الهنديه، المبسوط للسرخسي ۱۴/ ۲۵)

(مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا شاکر نثار اعظمی مدنی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی، مولانا ابوالمکارم معروفی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا عمر امین الہی، مولانا سلمان، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مفتی شاہد حسین، مفتی عبداللہ خالد، مفتی جنید محمد پالنپوری، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين'' (ردالمحتار ۷/ ۴۱۴)

(مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا شاکر نثار اعظمی ندوی، ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا عمر امین الہی، مولانا روح الامین، مولانا سلمان، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مفتی محمد شاہد حسین، مفتی جنید محمد، مولانا عبدالباسط قاسمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''وقیدبالذهب والفضة لأنه لوباع فضة بفلوس أو ذهب بفلوس فإنه يشترط قبض أحدالبدلين قبل الافتراق لا قبضهما'' (البحرالرائق۔کتاب الصرف۶/ ۲۱۱، ردالمحتار۵/ ۲۵۹)

(مقالہ: مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا ابو محمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا سلمان، مولانا خورشید اعظمی مدنی)۔

''واذااشترى الرجل فلوسا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عندالبائع فالبيع جاز لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود وقد بينا أن حكم العقد في الثمن وجوبها وجودها معا ولايشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لايشترط ذالك في الدراهم والدنانير'' (المبسوط للسرخسی ۱۴/ ۲۴)

(مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی محمد سلطان قاسمی، مولانا روح الامین)۔

''وروى الحسن عن أبي حنيفة إذا اشترى فلوسا بدراهم وليس هذا فلوس ولاعندالآخر دراهم ثم إن أحدهما دفع وتفرقا جاز وإن لم ينقد واحد منهما حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط'' (الفتاوی الهندیه۳/ ۲۲۴)

(مقالہ: مولانا عمران بن دین محمد، ابو محمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا عمر امین الہی)۔

''غالب الغش ليس في حكم الدراهم والدنانير فيصح بيعها بجنسها متفاضلا والتبايع والاستقراض بما يروج عددا أو وزنا أو بهما ولايتعين بالتعيين لكونها أثمانا'' (کنزالدقائق مع البحر۶/ ۲۳۵) (مقالہ: مفتی محمد سلطان قاسمی)۔

''وكذا إذا تبايعافلسا بعينه بفلس بعينه فالفلسان لايعينان وإن عينا الا أن القبض في المجلس شرط حتى يبطل بترك التقابض في المجلس لكونه أفتراقا عن دين بدين ولو قبض أحد البدلين في المجلس فافترقا قبل قبض الأخر ذكر الكرخي أنه لايبطل العقد لأن اشتراط القبض من الجانبين من خصائص الصرف وهذا ليس بصرف فيكتفى فيه بالقبض من أحدالجانبين لأن به يخرج عن كونه افتراقا عن دين بدين وذكر في بعض شروح المختصرالطحاوي أنه يبطل لا لكونه صرف بل لتمكن ربا النساء فيه لوجود أحد وصفي علة ربا الفضل وهو الجنس......وهو الصحيح'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۸۷۔۴۸۸)۔

''منها ما يشترط فيه التقابض وهو القبض من الجانبين وهو الصرف......ومنها ما يشترط فيه القبض من أحد الجانبين كبيع الدراهم بالفلوس'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۸۸) (مقالہ: مولانا محمد عثمان، مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا روح الامین)۔

''ثم فرق بين بيع الدراهم بالدراهم وبين بيع الفلوس بالدراهم أوالدنانيرحيث لم يشترط في بيع الفلوس بالدراهم أوالدنانير قبض البدلين قبل الافتراق ويكتفى قبض أحدالبدلين''(الفتاوی الهندیه باب الصرف) (مقالہ: مفتی محمد روح اللہ القاسمی، مولانا عمر امین الہی)۔

مولانا محمد اشرف قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا سلمان لکھتے ہیں کہ اختلاف جنس وقدر کی وجہ سے سونا و چاندی کی خرید وفروخت روپے سے ادھار جائز ہے۔

''إذااختلف النوعان فبيعوا كيف شئتم قال المحشي حفظه الله وروى مسلم عن عبادة بن الصامت أن رسول الله ﷺ قال......إذااختلف هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم'' (الصحیح لمسلم کتاب المساقات باب الصرف)۔

''عن أنس بن مالك عن النبي ﷺ أنه قال....فإذا اختلف النوعان فلابأس به'' (الدارقطنی کتاب البیوع ۲/ ۱۸، مختارات النوازل ۳/ ۳۲۸) (مقالہ: مولانا محمد اشرف علی قاسمی)۔

''إذاعدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم إليه حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والأصل فيه الإباحة وإذا وجد أحدهما وعدم الأخرحل التفاضل وحرم النساء'' (بدایه باب الربا۳/ ۷۹) (مقالہ: مولانا سلمان)۔

''اشترى فلوسابدرهم ونقدالدرهم ولم تكن الفلوس حاضرة جاز'' (الفتاوى البزازية على بامش الفتاوى

الهندیه ۵/ ۵) (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

مولانا روح الامین لکھتے ہیں کہ عام بیوع میں قبضہ کے تحقق کے لئے تخلیہ کافی ہے لیکن بیع صرف میں قبضہ کے لئے بالاجماع تخلیہ کافی نہیں ہے بلکہ عملاً اور حقیقتہً قبضہ ضروری ہے۔

''والتقابض بالبراجم لا بالتخليه'' (الدر المختار)۔

''قوله لا بالتخليه أشار إلى أن التقييد بالبراجم للاحتراز عن التخليه واشتراط القبض بالفعل لا خصوص البراجم حتى لو وضعه له في كفه أو في جيبه صار قابضًا'' (ردالمحتار باب الصرف ۵/ ۲۵۱) (مقالہ: مولانا روح الامین)۔

روپے کے ذریعہ سونا چاندی کی خرید و فروخت میں بدلین میں سے ایک پر قبضہ مجلس عقد ضروری ہے تا کہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے جو حدیث کی رو سے ممنوع ہے (مقالہ: مولانا عمران بن دین محمد، مفتی سلمان، مفتی عبداللہ خالد، مولانا عبدالباسط قاسمی، مفتی محمد سلطان قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، مولانا روح الامین)۔

تائیدات:

پہلے نقطۂ نظر کی تائید اکابر علماء کرام کے فتاویٰ سے بھی ہوتی ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے: فقہ البیوع ۲/ ۷۲۰، اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۷۴، فقہی مقالات/ص ۱۳۰۔ ۱۴، قاموس الفقہ ۴/ ۲۲۶، فتاوی عثمانی ۳/ ۱۴۳، فتاویٰ محمودیہ ۲۳/ ۵۳۹، فتاویٰ احیاء العلوم ۱/ ۲۵۰، احسن الفتاویٰ ۶/ ۵۱۸، فتاویٰ دارالعلوم زکریا ۵/ ۳۴۸، جدید معاملات کے شرعی احکام ۱/ ۱۲۸) (مقالہ: مولانا روح الامین، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا ابو محمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد روح اللہ قاسمی، مفتی عبداللہ خالد، مفتی محمد شاہد حسین قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور، مولانا عبدالحمید قاسمی، مفتی نعمت اللہ قاسمی، وراقم (مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

دوسرا نقطۂ نظر:

روپے سے سونے چاندی کی خرید و فروخت بیع صرف کے حکم میں ہے، اس میں بدلین پر مجلس عقد میں قبضہ ضروری ہے، ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار تو یہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ روپے سونے چاندی کی طرح مستقل ثمن ہیں۔

یہ آٹھ مقالہ نگاروں کا نقطۂ نظر ہے، ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا اختر امام عادل، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محی الدین غازی، مفتی مقصود علی فرقانی، مولانا کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا عبدالجبار طیب ندوی و مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی۔

ان حضرات کے مستدلات:

''عن عبادة بن صامت قال: قال رسول الله ﷺ الذهب بالذهب والفضة بالفضة مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد... فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كانت يدا بيد'' (الصحیح لمسلم ۲/ ۲۵)

(مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبدالجبار طیب ندوی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

''فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لايجوز إلا مثلا بمثل إلى قوله ولا بد من قبض العوضين قبل الافتراق'' (ہدایہ باب الصرف ۳/ ۱۰۴)۔

''فلو تجانسا شرط التماثل والتقابض اى النقدان بأن يبيع أحدهما بجنس الآخر فلا بد لصحته من التساوى وزنا ومن قبض البدلين قبل الافتراق'' (البحر الرائق کتاب الصرف ۶/ ۱۹۴) (مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

''لايجوز فلس بفلس ولا يجوز الفلوس بالذهب والفضة ولا بالدنانير'' (المدونة الکبریٰ ۳/ ۳۹۵، ۳۹۶)۔

''ویشترط عدم التأجیل والخیار (والتماثل) أی التساوی وزنا (والتقابض) بالبراجم لا بالتخلیة (قبل الافتراق)'' (الدر المختار)۔

''أی افتراق المتعاقدین بأبدانهما والتقیید بالعاقدین یعم المالکین والنائبین وتقیید الفرقة بالأبدان بقید عموم اعتبار المجلس ومن ثم قال انه لایبطل بما یدل علی الإعراض ولوسار فرسخا ولم یفترقا صح وقد اعتبروا المجلس فی مسئلة هی مالو قال الأب أشهدوا إلی اشتریت هذا لدینار من ابن الصغیر بعشرة دراهم ثم قال قبل ان یزن العشرة فهو باطل کذا عن محمد لانه لایمکن اعتبار التفرق بالأبدان'' (حاشیة ردالمحتار علی الدر المختار ۵/۲۵۱)۔

مولانا اختر امام عادل امام مالک کا قول نقل کرتے ہیں کہ اگر سونا چاندی کے بجائے جانور کی کھال ذریعہ تبادلہ بن جائے اور اس کی کرنسی اور سکے تیار ہو جائیں (جیسا کہ حضرت عمر الخطابؓ نے اپنے دور میں ارادہ فرمایا تھا) تو میرے نزدیک سونا چاندی کے بالعوض اس کی بیع پر بھی بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے، اور ادھار کی گنجائش نہ ہوگی۔

''ولوأن الناس أجازوبینهم الجلود حتی یکون لها سکة وعین لکرهتها أن تباع بالذهب والورق'' (المدونة الکبریٰ کتاب الصرف)۔

مولانا اختر امام عادل مزید لکھتے ہیں کہ آج حکومتوں کی جانب سے روپے کی حیثیت مسلمہ ثمن کی ہے، اس کی ثمنیت ساقط کرنے کا اختیار صرف حکومت کو ہے باہم اس کو محض کاغذ فرض کر لینے سے ان کی ثمنیت ساقط نہیں ہوگی، میرا احساس یہ ہے کہ خود شیخین بھی کرنسی کی موجودہ صورت حال کو ملاحظہ فرماتے تو ان کو فلوس کے بجائے درہم ودینار کا متبادل قرار دیتے۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی تو ایک طرف اس کو بیع صرف قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف سونے یا چاندی کی روپئے سے خریداری ادھار جائز لکھتے ہیں (دیکھئے: مقالہ مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

تائیدات:

مولانا اختر امام عادل نے اس نقطہ نظر کی تائید میں حیئۃ کبار العلماء سعودعرب اور مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ کا فیصلہ پیش کیا ہے:

''فإن مجلس المجمع الفقهی الاسلامی یقرر أن العملة الورقیة نقد قائم بذاته له حکم النقدین من الذهب والفضة فتجب الزکاة فیها، ویجری الربا علیها بنوعیه، فضلا ونسیا. کما یجری ذلك فی النقدین من الذهب والفضة تماما باعتبار الثمنیة فی العملة الورقیة قیاسا علیهما، وبذلك تأخذ العملة الورقیة أحکام النقود فی کل الالتزامات التی تفرضها الشریعة فیها۔

ثانیا: یعتبر الورق النقدی نقدًا قائما بذاته کقیام النقدیة فی الذهب والفضة وغیرهما من الأثمان. کما یعتبر الورق النقدی أجناسا مختلفة، تتعدد بتعدد جهات الاصدار فی البلدان المختلفة. بمعنی أن الورق النقدی السعودی جنس. وأن الورق النقدی الأمریکی جنس، وهکذا کل عملة ورقیة جنس مستقل بذاته. وبذلك یجری فیها الربا بنوعیه فضلا ونسیًا. کما یجری الربا بنوعیه فی النقدین الذهب والفضة وفی غیرها من الأثمان۔ وحیث ان الثمنیة متحققة بوضوح فی الأوراق النقدیة، لذلك کله فإن هیئة کبار العلماء تقرر باکثریتها: (مجله مجمع الفقه الاسلامی التابع لمنظمة المؤتمر الاسلامی بجدة ۳/ ۹۵۱)۔

أن الورق النقدی یعتبر نقدا قائما بذاته کقیام النقدیة فی الذهب والفضة وغیرهما من الأثمان. وأنه أجناس تتعدد بتعدد جهات الأصدار، بمعنی: أن الورق النقدی السعودی جنس. وأن الورق النقدی الأمریکی جنس، وهکذا کل عملة ورقیة جنس مستقل بذاته، وأنه یترتب علی ذالك الأحکام الشرعیة الآتیة:

أولا: جريان الربا بنوعيه فيها، كما يجري الربا بنوعيه في النقدين الذهب والفضة وفي غيرهما من الأثمان كالفلوس، وهذا يقتضي ما يلي:

(ا) لايجوز بيع بعضه ببعض أو بغيره من الأجناس النقدية الأخرى من ذهب أو فضة أو غيرهما نسيئة مطلقا فلايجوز مثلا بيع الدولار الأمريكي بخمسة أريلة سعودية أو أقل أو اكثر نسيئة۔

(ب) لايجوز بيع الجنس الواحد منه بعضه ببعض متفاضلا، سواء كان ذالك نسيئة أو يدا بيد، فلايجوز مثلا بيع عشرة أريلة سعودية ورق بأحد عشر ريالا سعوديا ورقا۔

(ج) يجوز بيع بعضه ببعض من غير جنسه مطلقا، إذاكان ذالك يدا بيد، فيجوز بيع الليرة السورية أو اللبنانية بريال سعودي، ورقاكان أو فضة، أو أقل من ذلك أو أكثر. وبيع الدولار الأمريكي بثلاثة أريلة سعودية أوأقل أو اكثر إذا كان ذلك يدا بيد، ومثل ذلك في الجواز بيع الريال السعودي الفضه بثلاثة أريلة سعودية ورق أو أقل أوأكثر يدا بيد، لأن ذلك يعتبر بيع جنس بغير جنسه ولا أثرلمجرد الاشتراك في الاسم مع الاختلاف في الحقيقة'' (إبحاث هيئة كبار العلماء ۱/ ۹۳) (دیکھئے مقالہ: مولانا اختر امام عادل)۔

سوال نمبر ۱:

ب: کیا یہ بات درست ہوگی کہ سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر میکس گولڈ مارکیٹ یا ہندوستان کی سطح پر یہاں کی مارکیٹ MC نے طے کیا ہو، اس سے زیادہ یا کم قیمت میں خرید وفروخت کی جائے اور کیا اس صورت پر ربا تفاضل کا اطلاق ہوگا؟

اس کے جواب میں مقالہ نگاروں کی تین آراء ہیں:

پہلی رائے:

اکیس مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر میکس گولڈ مارکیٹ، یا ہندوستانی سطح پر ایم سی نے طے کیا ہو اس سے زیادہ یا کم قیمت پر خرید وفروخت کر سکتے ہیں، شرعاً جائز ودرست ہے، اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ روپے اور سونا چاندی دو مختلف جنس ہیں اور مختلف جنس کی چیزوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔

مستدلات:

''قال رسول الله ﷺ لاتبيعوا الذهب بالذهب إلاسواء بسواء والفضة بالفضة إلا سواء وبيعوا الذهب بالفضة والفضة بالذهب كيف شئتم'' (صحیح بخاری حدیث: ۲۱۷۵) (مقالہ: مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا محمد عثمان)۔

''وان باع الذهب بالفضة جاز التفاضل لعدم المجانسة'' (ہدایہ ۳/ ۱۰۵)

(مقالہ: مولانا اختر امام عادل وراقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''وعلته أي علة تحريم الزيادة القدر المعهود بكيل أو وزن مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل أي الزيادة۔۔۔وإن وجد أحدهما أي القدر وحدة أو الجنس حل الفضل'' (الدرالمختار کتاب البیوع باب الربا ۷/ ۴۰۳، ۴۰۴) (مقالہ: راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''فليس الزرع والعدد بربا'' (الدر المختار ۴/ ۱۷۷)۔

''واذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموماليه حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والأصل فيه الإباحة وإذا وجد أحدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء'' (ہدایہ ۳/ ۷۹ باب الربوا) (مقالہ: مفتی سلمان قاسمی)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے کسی سامان کا نرخ طے کرنا پسندیدہ عمل نہیں ہے، بلکہ یہ مصلحت عامہ کے خلاف ہے، اسی لئے فقہاء نے اس کو مکروہ لکھا ہے۔

''عن أنس قال الناس: یا رسول اللہ علا السعر فسعرلنا فقال رسول اللہ ﷺ إن اللہ ھو المسعر القبض الباسط الرازق وإنی لأرجو أن ألقی اللہ ولیس أحد منکم یطالبنی بمظلمة فی دم ومال'' (السنن لأبی داؤد ۲/ ۲۷۲ کتاب البیوع) (مقالہ: ومولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا عبد الحمید قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی عبد الجبار طیب ندوی)۔

''ولا یسعر حاکم أی یکرہ ذلک کما فی الملتقی وغیرہ إلا إذا تعدی الأرباب عن القیمة تعدیا فاحشا بینه الزیلعی وغیرہ بالبیع بضعف القیمة'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۹/ ۵۷۳)۔

''ویکرہ التسعیر ولأن الثمن حق العاقد فلا ینبغی له أن یعترض لحقه'' (مجمع الانہر ۴/ ۲۱۵)۔

''فإن سعر فباع الخباز بأکثر مما سعر جاز بیعه کذا فی فتاوی قاضی خاں'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۲۱۴)

(مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی محمد شاہد حسین قاسمی)۔

مولانا نعمان انور اعظمی و مولانا انور علی اعظمی لکھتے ہیں کہ بیع کی تعریف ہے مال کا مال سے رضامندی کے ساتھ تبادلہ کرنا، لہذا بائع اور مشتری جب ایک بھاؤ پر آپس میں رضامند ہیں تو بیع بالکل درست ہوگی خواہ ان کے درمیان طے شدہ نرخ انٹرنیشنل مارکیٹ یا MC کے بھاؤ سے کم وبیش ہو (مقالہ مولانا نعمان انور اعظمی و مولانا انور علی اعظمی)۔

دوسری رائے:

ملکی یا بین الاقوامی سطح پر سونے چاندی کی جو قیمت مقرر ہے اس سے کم یا زیادہ میں اس کی خرید وفروخت جائز ہے، اس پر ربا الفضل کا اطلاق نہیں ہوگا، البتہ چونکہ یہ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی ہے اور پکڑے جانے پر ہتک عزت کا اندیشہ ہے، اس لئے اس طرح کے معاملہ کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

یہ رائے بھی انیس مقالہ نگاروں کی ہے۔

ان حضرات کا استدلال:

''لاتلقوا بأیدیکم إلی التہلکة'' (سورۂ بقرہ: ۱۹۵) (مقالہ: مفتی روح اللہ قاسمی)۔

''قال رسول اللہ ﷺ: لاینبغی للمومن أن یذل نفسه'' (السنن للترمذی ۲/ ۵۰)

(مقالہ: مولانا عبد الغنی مفتاحی، ومولانا ابو المکارم معروفی)۔

''المالك ھو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء'' (بیضاوی شریف جلد اول. ص۷. سورۂ فاتحہ)

(مقالہ: مولانا عبد الغنی مفتاحی)۔

''فإذا فعل ذلك وتعدی رجل عن ذلك وباع بأکثر منه أجازہ القاضی وھذا ظاھر عند أبی حنیفة رحمه اللہ تعالی لأنه لایری الحجر علی الحر وکذا عندھما'' (ہدایہ مع تکملہ ۸/ ۴۹۲)۔

''وظاھرہ أنه لو باعه بأکثر یحل وینفذ البیع'' (شامی ۹/ ۵۷۴) (مقالہ: عمر امین الہی)۔

''فان سعر فباع الخباز بأکثر مما سعر جاز بیعه'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۰۴) (مقالہ: مولانا عمر امین الہی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

''ذھب الحنفیة والحنابلة والشافعیة فی الأصح الی أن من خالف التسعیر صح بیعه'' (موسوعہ فقہیہ ۱۱/ ۳۱۰)

(مقالہ: مولانا عمر امین الہی)۔

مولانا ابو محمد محمد سعد نور لکھتے ہیں اس زمانہ میں حکومت یا اس طرح کے اداروں کا قیمت متعین کرنا بہت ضروری ہے اور لوگوں پر اس کی پابندی واجب ہے (مقالہ: مولانا ابو محمد محمد سعد نور قاسمی)۔

مولانا محمد ظفر عالم ندوی لکھتے ہیں کہ شہری اور ملکی قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے گناہ ہوگا (مقالہ: مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

مولانا محمد شاکر نثار اعظمی، مولانا محمد عثمان و مولانا عبد الجبار طیب ندوی لکھتے ہیں کہ سرکاری ریٹ میں کم و زیادہ پر بیچنا تو تسعیر کی خلاف ورزی ہوگی اور اولی الامر کے حکم کے بھی خلاف ہوگا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے۔

"اطیعوا اللہ واطیعو الرسول وأولی الأمر منکم" (سورۂ نساء:۵۹) (مقالہ: مولانا محمد شاکر نثار اعظمی، مولانا محمد عثمان و مولانا عبد الجبار طیب ندوی)۔

مولانا عبد الباسط قاسمی لکھتے ہیں کہ یہ معاملہ اس قانون کی خلاف ورزی ہے جو مفاد عامہ کے لئے حکومت نے نافذ کیا ہے اس لئے اس خارجی سبب کی بنا پر اس طرح کے معاملات کی اجازت نہ ہونی چاہئے کیوں فقہ اسلامی کا قاعدہ ہے کہ جائز و مباح امور میں قوانین حکومت کی پابندی واجب ہے۔

"اذا کان فعل الإمام مبنیا علی المصلحة فیما یتعلق بالأمور العامة لم ینفذ أمره شرعًا إلا إذا وافقه فإن خالفه لم ینفذ" (الأشباه والنظائر / ص۴۱۲) (مقالہ: مولانا عبد الباسط قاسمی)۔

"وفی أحکام القرآن للمحدث العلامة ظفر احمد العثمانی رحمه الله (ج۲ ص۲۹۱) وهذا الحکم ای وجوب طاعة الأمر یختص بها إذا لم یخالف أمره الشرع یدل علیه سیاق الأیة فإن الله تعالیٰ أمر الناس بطاعة أولی الأمر بعدما أمرهم بالعدل فی الحکم تنبیهًا علی أن طاعتهم واجبة ماداموا علی العمل وکذا تفسیر مظهری (ج۲ ص ۱۵۲ والجامع لاحکام القرآن ج۵ ص۲۵۹)۔

"تجب طاعة الإمام فیما لیس بمعصیة" (الدر المختار ۲ / ۱۷۲) (مقالہ: مفتی جنید محمد)۔

تائیدات:

اس رائے کی تائید اکابر علماء کرام کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے (اوراق احکام النقود والمعاملات ۲ / ۱۹۰۸، القضایا الفقهیة المعاصرة / ص ۸، اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲ / ۵۲، تکملہ فتح الملہم ۷ / ۵۵، انعام الباری ۶ / ۳۱۱، فقہی مقالات ۱ / ۴۰) (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا شاکر نثار اعظمی، مولانا محمد عثمانی، مفتی عبد اللہ خالد)۔

تیسری رائے:

چار مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ حکومت کے مقرر نرخ سے کم یا زیادہ میں خرید و فروخت کیا جائے تو ربا تفاضل کا اطلاق ہوگا، ان حضرات نے اس کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی ہے۔

سوال نمبر ۲:

زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ وزن میں سونا لیتے ہیں اور چند دنوں میں ان کے بدلے سونے سے بنائے ہوئے زیورات انہیں واپس کرتے ہیں، انہیں الگ سے کوئی اجرت نہیں دی جاتی، بلکہ زیورات کی شکل میں سونے کی اتنی مقدار انہیں واپس کرنی ہوتی ہے، جتنی انہوں نے لی تھی، البتہ سونے کا زیور بنانے میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، اس آمیزش کے بقدر سونا ان کو بچ جاتا ہے اور زیور بنانے میں سونے کے کچھ ذرات نکل آتے ہیں، یہی ان کی اجرت ہوتی ہے، سوال یہ ہے کہ:

الف: سونے کے لین دین میں مقدار کا جو یہ فرق ہو رہا ہے، اسے بیع تصور کیا جائے یا اجارہ؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاروں کے تین رجحانات ہیں۔

پہلا رجحان:

بیشتر مقالہ نگاروں کا رجحان یہ ہے کہ یہ اجارہ کی صورت ہے بیع نہیں ہے، اس لئے کہ اس پر اجارہ کی تعریف صادق آتی ہے، بیع کی نہیں، اس لئے کہ اجارہ کسی عوض مالی پر منفعت کا مالک بنانا ہے۔

دلائل و وجوہ:

''الإجارة عقد على المنافع بعوض'' (ہدایہ ۳/ ۲۳۰)

(مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا عبدالباسط قاسمی، مولانا عمران بن دین محمد، مفتی عبداللہ خالد)۔

''إلاجارة عقد على المنافع بعوض مالي يتجدد انعقاده بحسب حدوث المنافع ساعة فساعة'' (الجوهرة النيره ۱/ ۲۵۹) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

''تمليك المنفعة بعوض'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۰۱) (مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عبداللہ خالد، مفتی شاہد حسین قاسمی)۔

''فإن القياس لايجوز استئجار الصباغ لصبغ الثوب لأن الاجارة عقد على المنافع لا الأعيان وفيه عقد على العين وهو الصبغ لا الصبغ وحده لكن جوز للتعامل جواز الاستصناع'' (العنايه مع فتح القدير ۶/ ۱۵) (مقالہ مفتی محمد سلمان)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ بیع متصور نہیں ہوگا اس لئے کہ اس معاملہ کے وقت کاریگر کے پاس سونا نہیں ہوتا اور صحت بیع کے شرائط میں مذکور ہے، ''ومنها وهوشرط انعقاد البيع للبائع أن يكون مملوكا للبائع عندالبيع فان لم يكن لاينعقد واما ملكه بعد ذلك بوجه من الوجوه إلا السلم خاصة'' (بدائع الصنائع۴/ ۲۴۰)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''لايحل سلف وبيع ولاشرطان في بيع ولا ربح مالم تضمن ولا بيع ماليس عندك'' (السنن ابی داؤد ۲/ ۲۸۳، کتاب البیوع)۔

اور اگر اس کے پاس دوسرا سونا موجود ہو بھی تو اس لئے درست نہیں کہ بدلین پر مجلس میں تقابض نہیں ہوتا (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

مولانا انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور لکھتے ہیں اس معاملہ کو بیع ماننا تین وجوہ سے صحیح نہیں۔

(الف) یہاں دونوں طرف سونا ہے اور سونے کا لین دین سونے سے ہو رہا ہے، اور یہ معاملہ بیع صرف ہے، اور اس میں مثلاً مثل کے ساتھ یداً بید بھی شرط ہے، یہاں معاملہ چند دنوں کے بعد ہو رہا ہے، اس لئے اس کو بیع ماننے کی گنجائش نہیں ہے۔

''نهى رسول الله ﷺ عن بيع الورق بالذهب دينا'' (صحیح مسلم ۲/ ۲۵)۔

(ب) دوسرے یہ کہ سونے کا تاجر اپنا مال دے کر زیور کی شکل میں واپس لے رہا ہے تو اسے بیع ماننے کی صورت میں سونا دینے والے تاجر کو ہی بائع اور مشتری دونوں ماننا لازم آئے گا۔

(ج) تیسرے یہ کہ بیع اپنی ملک کی ہوتی ہے اگر اس کو بیع مانا جائے تو زیور بنانے والے کاریگر کو زیور کا مالک ماننا ہوگا اور پھر اسے اس بات کا پابند نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سونے کا بنایا ہوا زیور اسی تاجر کے ہاتھ بیچے۔ لہذا یہ معاملہ بیع کے بجائے اجارہ کا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور)۔

بیع اور اجارہ کے درمیان فرق کو مفتی محمد شاہد حسین قاسمی یوں بیان کرتے ہیں:

اجارہ کا عقد بھی بیع کی طرح ہے البتہ درج ذیل امور میں فرق پایا جاتا ہے۔

۱- اجارہ میں چیز کے بجائے کسی منفعت پر عقد کیا جاتا ہے۔

۲- بیع میں بائع ایک مرتبہ مبیع کو دے کر فراغت پالیتا ہے لیکن اجارہ میں منفعت مستقل طور پر وجود میں آتی رہتی ہے۔

۳- بیع میں مبیع پر قبضہ کے بعد خیار شرط نہیں رہتا جبکہ اجارہ میں عیب کے وقت کرایہ کا عقد ختم کیا جاسکتا ہے۔

۴- بیع میں مبیع کی ملکیت خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، اجارہ میں مستاجر ذات کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعض منافع کا مالک ہوتا ہے (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد شاہد حسین قاسمی)۔

مولانا محمد عثمان لکھتے ہیں کہ اس شکل کا اجارہ پر محمول ہونا بے غبار ہے، کیوں کہ استصناع میں جب میٹریل اور مواد مستصنع کی طرف سے ہوں تو اس کو استصناع (بیع) پر محمول نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کو اجارہ پر محمول کیا جائے گا، کیوں کہ استصناع کے لئے شرط یہ ہے کہ مواد اور میٹریل صانع کا اپنا ذاتی ہو اور مذکورہ شکل میں اصلی مواد مستصنع کا ہے، صانع کا نہیں، اب ملائی جانے والی دھات بھی اگر مستصنع کی ہو تو اس کا اجارہ پر محمول کرنا متعین ہے اور اگر میٹریل میں ملائی جانے والی دھات صانع کی ہے تو اس کو عمل کے تابع مان کر اجارہ پر محمول ہونا ظاہر ہے، جیسے خیاط، رنگریز، نجار وغیرہ۔

''ویشترط فی الاستصناع أن یکون العمل والعین کلاهما من الصانع وعلیه فلو کانت العین من المستصنع کان العقد إجارة'' (فتاوی ہندیہ ۴/ ۵۱۷) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد عثمان بستوی)۔

مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی لکھتے ہیں کہ کاریگر جو دھات معدنی اشیاء اس صنعت میں لگا رہا ہے وہ عرف وعادت کے مطابق لگا رہا ہے اجارہ کے باب میں عرف وعادت کا اعتبار کیا گیا ہے۔

''والأصل فیه أن الاجارة اذا وقعت علی عمل وکل ماکان من توابع ذلك العمل ولم یشترط فی الاجارة ذلك علی الأجیر فالمرجع العرف'' (تاتارخانیہ ۱۵/ ۱۵۳ کتاب الاجارہ)۔

اسی بنیاد پر درزی سے جب کپڑا سلوایا جاتا ہے تو دھاگہ وبٹن وغیرہ خیاط کے ذمہ ہوتے ہیں،

''وفی غزل الخیاط اذا لم یکن فیه عادة فهو علی صاحب الثوب وهو کالصباغ یکون الصبغ علیه فإن لم یکن فیه عادة فعلی صاحب الثوب'' (تاتارخانیہ ۱۵/ ۱۵۳) اس لئے بیع کے بجائے اجارہ ماننا چاہئے (دیکھئے مقالہ: مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی)۔

دوسرا رجحان:

اس معاملہ کو بیع کہیں گے اور بیع مؤجل، اس لئے کہ یہاں تاجر کے زیورات بنانے میں سونے کے ذرات ایک طرف ہیں اور دوسری طرف کاریگر کے دھات جسے وہ سونے کے زیور بنانے میں استعمال کرتا ہے، پھر زیور تیار ہوتا ہے۔ کاریگر کے دھات کو ثمن مان لیں تو بیع مؤجل کی صورت ہوجائے گی، کیوں کہ بیع مؤجل کہتے ہیں ایسی بیع کو جس میں مبیع نقد ہو اور ثمن ادھار (تفصیل کے لئے دیکھئے رد المحتار ۴/ ۳)۔

یہ رجحان صرف مولانا عبد الجبار طیب ندوی صاحب کا ہے۔

تیسرا رجحان:

سات مقالہ نگاروں کا رجحان یہ ہے کہ بیع ہے یا اجارہ، کہ اگر اسے بیع کہا جائے تو یہ بیع صرف ہے اس لئے یہ درست نہیں اور اگر اجارہ کہا جائے تو چونکہ اجرت مجہول ہے اس لئے یہ صحیح نہیں (دیکھئے مقالہ: مولانا عمر امین الہی، مولانا عبد الحئی مفتاحی، مولانا شاکر نثار اعظمی، مفتی سلطان قاسمی، مولانا ظہیر احمد، مولانا روح الامین، مفتی روح اللہ قاسمی)۔

مولانا روح الامین لکھتے ہیں کہ اس معاملہ کی تین صورتیں ہیں:

(۱) یہ معاملہ بیع نہیں بلکہ اجارہ ہے کیوں کہ بیع میں معقود علیہ عین ہوتا ہے اور اجارہ میں معقود علیہ منفعت یا عمل ہوتا ہے اور یہاں معقود علیہ عمل ہے۔

(۲)۔ کاریگر اپنے سونے سے زیور بنا کر تاجر کے ہاتھ فروخت کرے خواہ تاجر نے آڈر دیا ہو یا نہ دیا ہو بہر حال یہ بیع کا معاملہ ہے۔ لہذا بیع کی شرائط کا لحاظ ضروری ہے۔

(۳) تاجر نے کاریگر کو زیور بنانے کے لئے سونا دیا لیکن کاریگر نے اپنے سونے ہی سے زیور بنایا چونکہ یہ صورت رائج ہے اس لئے عرف کی بنا پر یہ

سمجھا جائے گا کہ تاجر نے اپنا سونا کاریگر کو قرض دیا ہے اور بنے ہوئے زیور کو قرض میں سے وصول کیا، اس کے بعد یہ صورت بھی پہلی صورت کی طرح ہو جائے گی یعنی کاریگر متعین اجرت کا حق دار ہوگا (دیکھئے مقالہ: مولانا روح الامین)۔

سوال نمبر ۲ (ب):

کیا اجرت کی یہ شکل درست ہوگی کہ زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جائیں وہی اجرت قرار پائے؟

جن مقالہ نگار حضرات نے اس معاملہ کو اجارہ قرار دیا ہے ان کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ اجارہ درست ہے یا نہیں؟

مقالہ نگار کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ اجارہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ اجارہ کے لئے اس کا معلوم و متعین ہونا ضروری ہے، نیز اجرت عامل کے عمل سے قرار نہ پائے، اور مذکورہ صورت میں اجرت متعین نہیں ہے اور اجرت عامل کے عمل سے قرار پا رہی ہے۔

دلائل:

''عن أبي سعيد الخدري قال نهى عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان''(السنن الكبرىٰ للبيهقي ۵/ ۳۳۹، نيل الاوطار ۵/ ۲۹۲) (مقالہ: مولانا عمران بن دین محمد، مولانا ظفر عالم ندوی)۔

''ان رسول اللهﷺ نهى عن استئجار الأجير حتى يتبين له أجره''(مراسل ابوداؤد: ۱۰)

(مقالہ: مفتی عبداللہ خالد، مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا نعمان انور، مولانا انور علی اعظمی)۔

''شرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين لأن جهالتهما تفتضي إلى المنازعة''(الدر المختار ۹/ ۷)۔

''أن لايكون الأجرة منفعة وهي من جنس المعقود عليه كإجارة السكنى بالسكنى والخدمة بالخدمة والركوب بالركوب، والزراعة بالزراعة حتى لايجوز شئى من ذلك عندنا''(بدائع الصنائع ۴/ ۱۹۴)

(مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

''أن تكون الأجرة معلومة ''(فتاوى ہندیہ ۴/ ۴۱۱)۔

''ولو دفع غزلا لآخر ينسجه له بنصفه أي بنصف الغزل أواستأجر بغلا يحمل طعامه ببعضه أوثورا ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت في الكل لانه استاجره بجزء من عمله والأصل في ذلك نهى ﷺ عن قفيز الطحان''(الدر المختار ۹/ ۷۹-۷۸)۔

''كون الأجرة جزئً من المعقود عليه قال الجمهور تفسد الاجارة ولواستأجر السلاخ بالجلد والطحان بالنخالة أو بصاع من الرقيق لأنه لايعلم هل يخرج الجلد سليما أو لا وهل هو ثخين أو رقيق وما مقدار الطحين فقد تكون الحبوب مسوسة فلاتصح الاجارة لجهالة العوض''(الفقه الاسلامي وأدلته ۵/ ۳۸۲۴) (مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی)۔

مولانا عمران لکھتے ہیں: جائز اور شرعی متبادل یہ ہے کہ کاریگر کا سونا اجرت کے طور پر طے کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ رقم طے کی جائے اور اگر کاریگر چاہے تو اسی رقم کے بدلہ زیورات کے تاجروں سے نقدی سونا خرید لے (مقالہ: مولانا عمران بن دین محمد)۔

قاضی عبدالجلیل قاسمی لکھتے ہیں: یہ اجارہ، فاسد ہے، اس لئے کہ اجرت مجہول ہے، نیز نزاع کا سبب ہے اس لئے کہ کاریگر دوسری دھات زیادہ ملانے کی کوشش کرے گا تاکہ اس کو زیادہ سے زیادہ سونا اجرت میں ملے اور اس سے جھگڑا پیدا ہوگا (مقالہ: قاضی عبدالجلیل قاسمی)۔

مولانا محی الدین غازی لکھتے ہیں کہ اب میری معلومات کی حد تک اجرت کی، سوال میں مذکور صورت رائج نہیں ہے، زیورات بنانے کا سارا کام متعین اجرت کی بنا پر ہوتا ہے (مقالہ: مولانا محی الدین غازی)۔

دوسری جماعت کی رائے یہ ہے کہ عرف و عادت کی وجہ سے اس طرح اجرت جائز و درست ہے، بظاہر اس میں دو اشکال ہے، ایک جہالت اجرت، دوسرا اجرت عامل کے عمل سے قرار پاتی ہے، اور جہاں تک اجرت مجہول ہونے کی بات ہے تو اس میں ایسی جہالت نہیں ہے جو جھگڑے

کا سبب ہو نیز یہ جہالت جہالت یسیر ہے اور جہالت یسیر سے فقہاء کی صراحت کے مطابق اجارہ فاسد نہیں ہوتا ہے۔

راقم (مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی) لکھتا ہے، علامہ کاسانی نے تحریر فرمایا ہے کہ ایسی جہالت جو جھگڑے کا سبب نہ ہو وہ صحت اجارہ کے لئے مانع نہیں کہ اس صورت میں اجرت کی حوالگی جو اجارہ کا مقصد ہے ممکن ہے۔

''منها أن يكون المعقود عليه والمنفعة معلوما علما يمنع من المنازعة فان كان مجهولا ينظر ان كانت تلك الجهالة مفضية الى المنازعة تمنع صحة العقد والا لا لأن الجهالة المفضية الى المنازعة تمنع من التسليم والتسليم فلايحصل المقصود من العقد فكان العقد عبثالخلوه عن العاقبة الحميدة واذا لم تكن المنازعة يوجد التسليم والتسليم فيحصل المقصود'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۵، ۲۴) (مقالہ: مفتی محمد شاہد حسین، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی لکھتے ہیں کہ اجارہ کی صحت کے لئے اجرت کا معلوم ہونا شرط ہے، اور یہاں اجرت بظاہر مجہول محسوس ہوتی ہے، اگر جہالت مفضی الی النزاع ہو تو اجارہ فاسد ہونا چاہئے لیکن کاریگروں اور تاجران ذہب وفضہ کے یہاں یہ تعامل چلا آرہا ہے، اور ان میں اس کی وجہ سے کوئی نزاع بھی نہیں ہوتی، نزاع نہ ہونے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کتنے وزن کے سونے کا زیور بنانے میں کتنی مقدار میں اس کے اندر دوسری دھاتیں ملانی پڑتی ہیں یہ ان کے یہاں متعارف ہوا کرتا ہے، اس لئے مذکورہ بالا صورت میں اجرت بالکلیہ مجہول نہیں بلکہ معلوم ومتعارف ہے، اور اگر جہالت ہے بھی تو معمولی جہالت اور جہالت یسیرہ عقد اجارہ کے لئے موجب فساد نہیں ہوا کرتی (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''قيدنا بالفاحشة لأن الجهالة اليسيرة تصح أي غير مفسدة'' (شامی ۴/ ۴۹) (مقالہ مولانا محمد عثمان)۔

اور جہاں تک قفیز طحان والی روایت کا تعلق ہے تو اس کے کئی جوابات ہیں:

(۱) قفیز طحان والی روایت معلول اور متکلم فیہ ہے۔

(۲) قفیز طحان والی روایت کی اس طرح تاویل ممکن ہے کہ اس کو اس صورت پر محمول کیا جائے جبکہ مقدار مقرر نہ کی گئی ہو۔

(۳) اگر تاویل نہ کی جائے اور سمجھا جائے کہ عامل کے جزء عمل کو اجرت نہ بنایا جائے تو ایسے تمام جزئیات پر اس حکم کا انطباق قیاس کے قبیل سے ہوگا۔

(۴) قیاس کے ذریعہ جو احکامات ثابت ہوں اور عرف ورواج اس کے خلاف ہو تو مروج ومعروف جائز قرار دیا جاتا ہے اور قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(۵) ہمارے زمانہ میں کاروبار ومعاملات کے مختلف ایسے طریقے مروج ہیں جن میں عامل کے جزء عمل کو اجرت بنایا جاتا ہے۔

(۶) ایسی صورت میں گو قطعی مقدار متعین نہیں کی جاتی لیکن ایسا تناسب مقرر کیا جاتا ہے جو اجرت کی مقدار مآلاً متعین کر دیتا ہے اور نزاع پیدا نہیں ہوتا اور کسی معاملہ میں ایسی جہالت اور عدم تعیین جو نزاع کا سبب نہ ہو مضر نہیں ہے۔

(۷) شریعت میں زراعت، مساقات اور مضاربت کی صورت میں ایسی نظیریں موجود ہیں اور صحت وصراحت کے ساتھ ثابت ہے جو عامل کے جزء عمل کو اجرت مقرر کرنے کو درست قرار دیتی ہیں، پس ہمارے زمانہ میں کاروبار اور معاملات میں ایسی صورت میں جو قفیز طحان کی قبیل سے ہیں اور کثرت سے مروج ومعمول بھی ہیں جائز ہونی چاہئیں (جدید فقہی مسائل ۴/ ۳۳۴)۔

(مقالہ مولانا عبد الباسط قاسمی، مولانا ابو محمد محمد سعد نور، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

مولانا ابو محمد محمد سعد نور قاسمی لکھتے ہیں کہ قفیز طحان والی حدیث کے سلسلہ میں ابن قدامہ نے ابن عقیل سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی ہے۔

''وهذا الحديث لانعرفه ولايثبت عندنا حجة'' (المغنی ۵/ ۸)۔

مزید لکھتے ہیں اور ایسی حدیث کی سند کے اندر بھی محدثین نے کافی کلام کیا ہے حتی کہ سند کے محدثین کے نزدیک متکلم فیہ ہونے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہونا بھی مشکوک ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے (تدریب الراوی ۱/ ۲۱۱) (مقالہ: مولانا ابو محمد محمد سعد نور قاسمی)۔

''وفی السراجیه وبه أفتی الشیخ الامام السرخسی ومشائخ بلخ کنصر بن یحیی ومحمد بن سلمه وغیرهما کانوا یفتون بجواز هذه الاجارة فی الثیاب لتعامل أهل بلدهم فی الثیاب التعامل حجة یترك به القیاس ویخص به الأثر وفی الظهیریة وبه أخذ الفقیه أبواللیث وشمس الائمه الحلوانی والقاضی الامام أبوعلی النسفی ''(تاتارخانیه ۱۵/ ۱۱۵، شامی ۹/ ۸۰، فتاوی قاضیخاں ۲/ ۲۲) (مقالہ: مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، مولانا جنید محمد، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

''قال أبوحنیفة المزارعة بالثلث والربع باطلة......وقالا جائزة...أن الفتوی علی قولهما لحاجة الناس إلیها لظهور تعامل الأمة لها والقیاس یترك بالتعامل'' (ہدایہ کتاب المزارعة ۴/ ۲۲۵-۲۲۴، فتاوی ہندیہ ۴/ ۴۴۵)
(مقالہ: مولانا عبدالباسط قاسمی، مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی وراقم الحروف مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں کہ البتہ کاریگر سے اتنی بات طے کرنا بہر حال ضروری ہے کہ دھات کی کتنی مقدار کی آمیزش کرے گا تاکہ اس کے بقدر سونے کے ذرات معین ہوسکیں اور اجرت کی جہالت کی وجہ سے اجارہ متأثر نہ ہوسکے (مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

تائیدات:

اس رائے کی تائید اکابر علماء کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۳، جدید فقہی مسائل ۴/ ۳۳۴، فیض الباری ۳/ ۲۵۸، احسن الفتاوی ۷/ ۳۱۳-۳۱۲، انعام الباری ۶/ ۵۶۳، اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۲۴۲)۔

مقالہ نگاروں کی تیسری جماعت کی رائے یہ ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اجرت الگ سے طے کر کے دی جائے۔

یہ مندرجہ ذیل حضرات کی رائے ہے:

مولانا عبدالحمید قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی مقصود فرقانی، مولانا ابوسفیان مفتاحی۔

سوال نمبر ۳:

عام طور پر سونے کے تاجر حضرات پرانے زیور کی قیمت کم متعین کرتے ہیں، مثلاً: دس گرام سونے کو آٹھ گرام کے درجہ میں رکھتے ہیں، تو اگر سونے کے پرانے زیور کا سونے کے نئے زیور سے تبادلہ ہو اور اس کی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سونے کا پرانا زیور زیادہ وزن کا لیا جائے اور سونے کا نیا زیور کم وزن میں اس کے بدلہ ادا کیا جائے تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار متفق ہیں کہ سونا چاندی کے پرانے زیورات کا نئے زیورات سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز نہیں ہے، یہ سود ہے، نیا اور پرانا ہونا وصف ہے اور وصف میں تفاوت کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور یہ بیع صرف ہے۔

مستدلات:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل یدا بید فمن زاد أو استزاد فقد أربی الأخذ والمعطی فیه سواء'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۵۸۷، صحیح بخاری حدیث نمبر: ۲۱۷۴) (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد، مولانا انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور، مولانا عمران بن دین محمد، مولانا عبدالباسط قاسمی)۔

''لا تبیعوا الذهب بالذهب إلا مثلا بمثل ولا تشفوا بعضها علی بعض ولا تبیعوا الورق بالورق إلا مثلا بمثل ولا تشفوا بعضها علی بعض ولا تبیعوا منها غائبا بناجز'' (صحیح بخاری حدیث: ۲۱۷۷، الصحیح لمسلم ۲/ ۲۴)
(مقالہ: مفتی عبداللہ خالد، مولانا محمد عثمان، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی فیاض احمد محمود، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد شاہ جہاں ندوی)۔

حضرت فضالہ بن عبیدؓ فرماتے ہیں کہ: ''أتی رسول الله ﷺ وهو بخیبر بقلادة فیها خرز وذهب وهی من المغانم تباع فأمر رسول ﷺ بالذهب الذی فی القلادة فنزع وحده ثم قال یعم رسول ﷺ الذهب بالذهب وزنا بوزن'' (الصحیح

لمسلم حدیث: ۴۰۴۶) (مقالہ: مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی)۔

"قوله عليه الصلاة والسلام لاتبيعوا الذهب بالذهب والورق بالورق إلا سواء بسواء قال العلماء هذا يتناول جميع أنواع الذهب والورق من جيد وردى وصحيح ومكسور وحلى وتبر وغير ذلك سواء الخاص والمخلوط بغيره بذا كله مجمع عليه" (شرع الامام النووى لصحيح لمسلم ۱/ ۱۲) (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی فیاض احمد محمود)۔

"وجمهور الفقهاء على أنه لااعتبار فى الصياغة والصناعة أيضا فيدخل فى إطلاق المساوات المصوغ والتبر بالآنية فعين الذهب والفضة وتبرهما ومضروبها وغير المضروب منهما والصحيح منهما والمكسور كلها سواء فى جواز بيعها مع التماثل فى المقدار وتحريمه مع التفاضل" (موسوعه فقهيه ۲۶/ ۳۵۶، المغنى ۸/ ۴) (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

"جيدها ورديئها سواء" (العنايه على هامش الهدايه ۶ / ۲۶۰) (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد، مفتی سلمان)۔

"فان باع فضة بفضة وذهبا بذهب لايجوز إلا مثلا بمثل وان اختلف فى الجودة والصياغة" (ہدایہ ۳ / ۱۰۴)
(مقالہ: مولانا اختر امام عادل، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی جنید محمد، مولانا عمران بن دین محمد، مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مولانا محمد شاکر نثار اعظمی، قاضی عبدالجبار طیب قاسمی)۔

"ويشترط التماثل إلى التساوى وزنا والتقابض بالبراجم لا بالتخلية قبل الافتراق وهو شرط بقائه صحيحا على الصحيح ان اتحدا جنسا وإن وصلية اختلفا جودة وصياغة" (تنوير الابصار مع الدر ۷/ ۵۲۲، ۵۲۱)

(مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی)۔

"وإذا كان الغالب على الدراهم الفضة فهى فضة وان الغالب على الدنانير الذهب فهى ذهب ويعتبر فيهما من تحريم التفاضل مايعتبر فى الجياد حتى لايجوز بيع الخالصة بها ولابيع بعضها ببعض إلا متساويا فى الوزن" (فتاوى هنديه كتاب الصرف ۳/ ۲۱۹) (مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

"ولااعتبار للجودة والصنعة فى الفضة والذهب فى حق الصرف والتبر المضروب والمصوغ وغيره سواء لاطلاق النص وفى الحاشية قال أبوبكر قال رسول الله ﷺ لاتبيعوا الذهب بالذهب إلاسواء بسواء والفضة بالفضة إلاسواء بسواء" (مختارات النوازل ۳/ ۳۲۵)۔

"رجل له عشرة دراهم صحاح فاراد أن يشترى بها اثناعشر مكسرة لايجوز لانه ربا" (مختارات النوازل ۳/ ۳۲۷) (مقالہ: مفتی محمد اشرف قاسمی)۔

"وجيدمال الربوا ورديئه سواء" (الدر المختار ۴ / ۱۸۳)۔

"لايجوز بيع الجيد بالردى فيما فيه الربو إلامثلا بمثل لاهدار التفاوت فى الوصف" (شامى ۶/ ۲۱۳)
(مقالہ: ابوالمکارم معروفی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

جواز کی صورت:

چند مقالہ نگار حضرات نے اس کے جواز کی صورت یہ لکھی ہے کہ پرانے زیور کو روپے سے فروخت کر کے اس کی قیمت وصول کر لی جائے، پھر اس روپے سے نیا زیور خریدا جائے اور یہ دونوں معاملے الگ الگ کئے جائیں تو یہ صورت جائز و درست ہوگی۔

دلائل:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے: "أن رسول الله ﷺ استعمل رجلا على خيبر فجاءه بتمر جنيب فقال رسول الله ﷺ أكل تمر خيبر هكذا قال لا والله يارسول الله انا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعين والصاعين بالثلاثة فقال رسول الله ﷺ لاتفعل بع الجميع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيبا" (الصحيح البخارى مع فتح البارى ۴ / ۳۹۹)

(مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا شاکر نثار اعظمی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا محمد عثمان)۔

دوسری رائے:

صرف مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی ومولانا ذکاء اللہ شبلی اس کے جواز کے قائل ہیں۔

مولانا ذکاء اللہ شبلی لکھتے ہیں کہ دونوں قسم کے سونے میں اگر حقیقی فرق ہو تو جائز ہے (مقالہ: مولانا ذکاء اللہ شبلی)۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی لکھتے ہیں:

اب صراف پرانے زیور کی واپسی پر دس گرام والے زیور کو آٹھ گرام مان کر زیور کا تبادلہ کرتا ہے، یا آٹھ گرام کی قیمت دیتا ہے تو یہ کمی بیشی اصل سونے کے وزن میں نہیں بلکہ زیور میں جو دھات کی آمیزش ہوتی ہے یا جو دھات کا ٹانکا لگا ہے، (جس کے بغیر کوئی زیور بن ہی نہیں سکتا) یہ فرق اس کے اعتبار سے ہے، صراف نے زیور کی فروختگی کے وقت جو دس گرام سونے کی قیمت وصول کی تھی وہ سونا اور دھات کی آمیزش اور کاریگر کی اجرت کی مجموعی قیمت لگا کر دس گرام کی تھی اب اس زیور کو وہ آٹھ گرام کے بدلہ واپس لے رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس زیور کو کسی اور ڈیزائن میں بنوائے گا، اس کی پالش کرائے گا تو اس میں دھات کی آمیزش اور کاریگر کی مزدوری بھی شامل ہوگی تو گویا دو گرام سونا نئی شکل میں ڈھالنے کے عوض ہے، اصل وزن سونے کا آٹھ گرام بالکل برابر سرابر ہے، اس لئے یہ صورت جائز ہے، اس کو سود قرار دیا نہیں جاسکتا ہے، کیوں کہ خریدار سے دو گرام کی کمی پر واپسی ڈھلائی اور کاریگر کی مزدوری کے عوض ہے، اصل سونے کے وزن میں کوئی اضافہ نہیں مجھے معتبر مسلم صراف سے یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں، اس لئے ان پر اعتماد کیا جانا چاہئے اور اس کے جواز کا فیصلہ درست ہونا چاہئے (مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

البتہ ان دونوں حضرات نے جواز کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی ہے۔

سوال نمبر ۴:

آج کل کیموڈیٹیز ایکسچینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، جس میں خریدار آرڈر دیتا ہے اور جو کچھ اس نے آرڈر دیا ہے، اس کے آرڈر کے بقدر وہ شئی اس کے نام سے محفوظ کردی جاتی ہے، اس سلسلہ میں چند باتیں قابل غور ہیں:

الف: اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس مثلاً ایک کلو سونا ہو اور وہ دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے جاتے ہوں تو کیا اس کو خریدار کا قبضہ سمجھا جائے گا؟

اس کے جواب میں مقالہ نگاروں کا دو موقف ہے۔

پہلا موقف:

جبکہ تمام خریدار کا خریدا ہوا سونا اینٹ کی شکل میں ہے تو اس کو خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، اس لئے کہ مبیع ممیز وممتاز نہیں، بلکہ مبیع شائع غیر مقدور التسلیم ہے، خریدار اپنے حصہ کے بقدر مبیع کے قبضہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔

یہ مندرجہ ذیل حضرات کا موقف ہے:

مفتی عبد اللہ خالد، مولانا اختر امام عادل، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی شاہد حسین قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی سلمان، مولانا ابو محمد سعد نور قاسمی، مولانا شاکر نثار اعظمی، مولانا عمران بن دین محمد، مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا ابو المکارم معروفی، قاضی عبد الجبار طیب ندوی، مولانا محمد اشتیاق احمد اعظمی قاسمی، مولانا عمر امین الہی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی فیاض احمد محمود، مولانا ابو سفیان مفتاحی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا عبد الباسط قاسمی، مولانا نعمت اللہ قاسمی، مولانا محمد عثمان، مولانا روح الامین، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی نثار احمد، مفتی عبد المنان، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مفتی جنید محمد، مولانا عبد الحئی مفتاحی، مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی۔

دلائل:

''أما تفسير التسليم والقبض: فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشتري قابضا له'' (بدائع الصنائع ۵ / ۲۴۴) (مقالہ: مولانا نعمان انور، مولانا انور علی اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''ويعتبر في التسليم أن يكون المبيع مفرزا غير مشغول بحق غيره، هكذا في الوجيز لكردري وأجمعوا على أن التخلية في البيع جائز تكون قبضا'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۶)

(مقالہ: مولانا نعمان انور، مولانا انور علی اعظمی، مولانا محمد عثمان، مولانا عمر امین الہی، مفتی عبداللہ خالد)۔

''معنى القبض هو التمكن والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۸)

(مقالہ: مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا روح الامین، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''أن التخلية قبض حكما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك تختلف بحسب حال المبيع'' (ردالمحتار ۴ / ۵۶۲)

(مقالہ: روح الامین)۔

''وقد روى أبو الخطاب عن أحمد رواية أخرى أن القبض في كل شئي بالتخلية مع التميز لأنه خلى بينه وبين المبيع من غير حائل فكان مقبضا له كالعقار'' (المغنی ۴/ ۸۵) (مقالہ: مولانا روح الامین)۔

''وحاصله أن التخلية قبض حكما لو مع القدرعليه بلاكلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلا فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلاكلفة قبض وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض أي بأن يكون في البلد فيما يظهر وفي نحو بقر في مرعى فكونه بحيث يرى ويشار اليه قبض وفي نحو ثوب فكونه بحيث لو مدّ يديه تصل إليه، قبض نحو فرس أو طير في بيت إمكان أخذه منه بلا معين قبض'' (ردالمختار مطلب في شروط التخلیہ ۷/ ۹۷)

(مقالہ: مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''تم التسليم يكون بالتخلية على وجه بتمكن من القبض بلا مانع وحائل'' (الدر المختار ۷/ ۹۴)

(مقالہ: مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی محمد شاہد حسین قاسمی، مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''ان الدراهم والدنانير وإن كانت لاتتعين بالعقد ولكنها تتعين بالقبض وقبضها واجب'' (بدائع الصنائع ۶/ ۳۵۷)

(مقالہ: مولانا ابوالکارم معروفی)۔

''الشرط الرابع أن يكون المقبوض غير مشغول بحق غيره ...۔ فلو كان المبيع دارا مشغولة بمتاع البائع فلا يصح القبض حتى يسلمها فارغة''۔

''الشرط الخامس أن يكون المقبوض منفصلا تميزا هذا الشرط قال به الحنيفة وهو أن يكون المقبوض منفصلا متميزا عن حق الغير فان كان متصلا به اتصال اجزاء فلايصح القبض... وسبب اشراطهم هذا الشرط إن اتصال الشئي بحق الغير يمنع من التمكن منه وحول دونه ومن أجل ذلك لايصح قبضه وهو بهذا الحال''۔

''الشرط السادس أن يكون المقبوض حصة شائعة... القول الثاني للحنفية وهو أنه يشترط في صحة القبض أن لايكون المقبوض حصة شائعة وذلك لأن معنى القبض اثبات اليد والتمكن من التصرف في الشئي المقبوض وتحقق ذلك في الجزاء الشائع وحده، لايتصور'' (موسوعہ فقہیہ رقم ۲۸ الی ۳۰) (مقالہ: مفتی روح اللہ قاسمی)۔

''المقبوض يختلف في الاشياء حسب اختلافها في انفساها فمنها مايكون بأن يوضع المبيع في يد صاحبه

ومنها ما يكون بالتخلية بينه وبين المشترى ومنها مايكون بالنقل من موضعه، ومنها بأن يكتال وذلك في مابيع في المكيل كيلا'' (بذل المجهود ۴/ ۲۸۴، المغنی ۸/ ۲۰۰) (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد، مولانا محمد شاکر نثار اعظمی)۔

مفتی محمد شاہد حسین قاسمی تخلیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تخلیہ مبیع کی حالت وکیفیت کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، مثلاً:

۱- کیلی اشیاء مثلاً دودھ، تیل، گھی، مکھن وغیرہ کیل کر کے الگ کر دینے سے مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا۔

۲- وزنی اشیاء مثلاً سونا چاندی، دھات، پیتل، دال چاول وغیرہ وزن کر کے الگ کر دینے سے مشتری کا قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

۳- زرعی زمین اور پیمائشی اشیاء مثلاً کپڑا وغیرہ جو پیمائش سے فروخت کیا جاتا ہے، پیمائش کر کے الگ کر دینے سے مشتری کا قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

۴- عددی اشیاء مثلاً انڈا، جانور، گاڑی وغیرہ شمار کر کے الگ کر دینے سے مشتری کا قبضہ ثابت ہو جائے گا (ردالمحتار ۷/ ۹۶۔ بدائع الصنائع ۴/ ۳۴۲) (مقالہ: مفتی شاہد حسین)۔

مولانا روح الامین تخلیہ کے شرائط کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فقہاء نے تخلیہ متحقق ہونے کے لئے درج ذیل شرائط کو ضروری قرار دیا ہے:

(۱) بائع کی طرف سے مبیع پر قبضہ کرنے کی اجازت ہو اور یہ اجازت دینا مختلف طریقوں سے ہو سکتا ہے، مثلاً زبان سے کہہ دے یا لکھ کر اجازت دے دے یا خریدار کے آگے رکھ دے وغیرہ، یعنی عرف میں جس کو اجازت سمجھا جاتا ہے وہ معتبر ہے۔

(۲) مبیع خریدار کے سامنے ایسی جگہ ہو کہ وہ کسی مانع کے بغیر اسے حاصل کر سکے، امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر مبیع کچھ دور بھی ہو لیکن وہ اسے بآسانی حاصل کر سکے تو بھی تخلیہ پایا جائے گا۔

(۳) مبیع کسی دوسرے کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو، ورنہ تخلیہ متحقق نہ ہوگا، جیسے گندم بائع کی بوریوں میں ہے، تو تخلیہ معتبر نہیں، کیوں کہ یہ بائع کی چیز کے ساتھ مشغول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قبضہ کی دو صورتیں ہیں: (۱) قبضۂ حقیقی، یعنی حسی طور پر شئ کو اپنی تحویل میں لے لینا، (۲) قبضۂ حکمی، یعنی تخلیہ اور اس پر دو حکم متفرع ہوتے ہیں:

۱- ضمان کا منتقل ہونا۔

۲- تصرف میں آزادی اور اس کا شرعاً صحیح و معتبر ہونا، لہذا جب یہ دو حکم عرفاً و شرعاً متفرع نہ ہوں قبضہ شمار نہ ہوگا، اس لحاظ سے مسئولہ دونوں صورتوں کا حکم اس طرح ہوگا۔

(الف) اس صورت میں خریدار کا قبضہ متحقق نہیں ہوگا، اس لئے کہ تخلیہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مبیع غیر مبیع سے ممتاز ہو اور یہاں بظاہر ایسا نہیں ہے، نیز ضمان قبضہ کے تابع ہوتا ہے، اور مذکورہ صورت میں اگر کوئی حادثہ ہوتا ہے تو مشتری نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوتا ہے۔

(ب) نقط اندراج قبضہ کے وجود کے لئے کافی نہیں، اس لئے کہ حکمی قبضہ تخلیہ سے ہوتا ہے، جس میں خریدار کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ جب چاہے اپنی خرید کردہ چیز کو لے جائے، یہاں بظاہر یہ آزادی نہیں ہوتی، نیز مبیع کا متعین ہونا بھی ضروری ہے، اور مذکورہ صورت میں خرید کردہ مقدار کا سکہ اگر چہ موجود ہے، تاہم متعدد سکوں کے درمیان اس کا سکہ متعین نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر بعض سکے ضائع ہو جاتے ہیں تب بھی بائع مکلف ہے کہ مشتری کو سکے فراہم کرے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ضمان ابھی منتقل نہیں ہوا (مقالہ: مولانا روح الامین)۔

دوسرا موقف:

مذکورہ صورت میں خریدار کا قبضہ سمجھا جائے گا، اس لئے کہ حنفیہ کے لئے قبضہ کے تحقق کے لئے حسی قبضہ ضروری نہیں ہے، بلکہ تخلیہ یعنی معنوی قبضہ

کافی ہے، اور وہ یہاں پایا جارہا ہے، اس رائے کے قائلین مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا ظہیر احمد، مفتی محمد سلطان، مولانا محی الدین غازی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ذکاء اللہ شبلی۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی لکھتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک حسی قبضہ ضروری نہیں ہے بلکہ معنوی اور حکمی قبضہ کافی ہے، یعنی مبیع اور خریدار کے درمیان کوئی مانع اور رکاوٹ موجود نہ ہو اور مبیع خریدار کے ضمان میں آجائے، اور نفع ونقصان کی ذمہ داری اس کی طرف منتقل ہوجائے۔

''باب شرئ الدواب والحمير وإذا اشترى دابة أو جملا وهو عليه هل يكون ذلك قبضا قبل أن ينزل وقال ابن عمر قال النبي ﷺ لعمر بعينه يعني جملا صعبا'' (صحیح بخاری ۱/ ۲۸۲) (مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

مولانا ظفر عالم ندوی لکھتے ہیں کہ خرید وفروخت میں قبضہ اصالۃً بھی درست ہے اور وکالۃً بھی، اور سوالنامہ میں جو صورت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے سونا خرید وفروخت کرنے والے ادارہ کی حیثیت وکیل کی ہوتی ہے، اور وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ مانا جاتا ہے، اس لئے بذریعہ وکالت کاروبار میں کوئی حرج نہیں۔

مزید لکھتے ہیں، ایکسچینج آفس میں جو اندراج ہوا کرتا ہے وہ عرف عام میں ضمان وقبضہ کے درجہ میں ہوا کرتا ہے، لہذا تاجروں کے عرف میں چونکہ یہ ضمان ہے، اور قبضہ بھی تو اسے قبضہ مانا جائے گا۔

''لأن الوكيل يملك التصرف من جهة المؤكل فلا بد أن يكون المؤكل مالكا يملكه من غيره'' (ہدایہ ۳/ ۷۷)

''كل عقد أن يعقده الانسان بنفسه جاز أن يؤكل به غيره لأن الانسان قد يعجز عن المباشرة بنفسه على اعتبار بعض الاحوال فيحتاج إلى ان يؤكل غيره فيكون بسبيل منه دفعا للحاجة وقد صح أن النبي ﷺ وكل بالشراء حكيم بن حزام'' (ہدایہ ۳/ ۷۲) (مقالہ: مولانا محمد ظفر عالم ندوی)۔

مولانا محمد کلیم اللہ عمری لکھتے ہیں کہ خریداری کے وقت جو رسید دی جاتی ہے اس کو قبضہ شمار کیا جائے گا (مقالہ: حافظ کلیم اللہ عمری)۔

مولانا محی الدین غازی لکھتے ہیں کہ قبضہ اس وقت تصور کیا جاسکتا ہے جبکہ ایسا سوق منظم میں ہو، سوق منظم سے مراد ایسی مارکیٹ ہے کہ جہاں بیچنے والے کا قانونی تصرف اس پر سے ختم ہوجائے اور وہ چاہ کر بھی کسی اور کو نہیں بیچ سکے اور خریدار کا تصرف قائم ہوجائے اور وہ اپنا حصہ جب چاہے جس کو چاہے فروخت کرسکے، اسٹاک ایکسچینج اور بینک وغیرہ اس کی مثال ہیں (مقالہ مولانا محی الدین غازی)۔

سوال نمبر ۴ (ب):

اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کردیا گیا ہو تو کیا اس اندراج کو قبضہ کے لئے کافی تصور کیا جائے گا؟

اس سلسلہ میں بھی مقالہ نگاروں کے دو نظریے ہیں:

پہلا نظریہ:

کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اندراج قبضہ کے لئے کافی نہیں ہے۔

یہ بعض مقالہ نگاروں کا نظریہ ہے۔

ان حضرات کے دلائل وہی ہیں جو جواب الف کے تحت قبضہ کے متحقق نہ ہونے کے ذیل میں لکھے گئے ہیں۔

مفتی نثار احمد، مولانا نعمان انور، مولانا انور علی اعظمی ومفتی جنید محمد لکھتے ہیں: سونا چاندی اور دیگر اجناس کی تعیین میں فرق ہے کہ دوسری اجناس اشارے یا علامتوں سے متعین ہوسکتی ہیں لیکن سونا چاندی اس وقت تک متعین نہیں ہوتی جب تک اس پر کوئی شخص خود یا اپنے کسی نمائندہ کے ذریعہ

قبضہ نہ کرے، اس لئے سونے چاندی پر قبضہ کے لئے ضروری ہے اس پر خود قبضہ کرے یا اس کا کوئی وکیل اس کی طرف سے اپنی تحویل میں اس طرح لے کہ وہ متعینہ سونا چاندی چوری ہوجائے تو نقصان خریدار کے ذمہ سمجھا جائے۔

''ان الدراهم والدنانير وإن كانت لاتتعين بالعقد ولكنها تتعين بالقبض وقبضها واجب'' (بدائع الصنائع ۲۱۸/۵) (مقالہ: مفتی نثار احمد، مولانا نعمان انور، مولانا انور علی اعظمی و مفتی جنید محمد)۔

مولانا اختر امام عادل لکھتے ہیں کہ سونا چاندی کلی طور پر مشتری کے لئے فارغ ہو، نیز بائع کے ضمان سے مشتری کے ضمان میں منتقل ہوجائے (مقالہ: مولانا اختر امام عادل)۔

مولانا خورشید انور اعظمی لکھتے ہیں کہ صرف رجسٹر میں اندراج کو قبضہ نہیں کہا جاسکتا، یہ تو صرف بکنگ ہے، جس پر ابھی بائع کا پورے طور پر قبضہ ہے اور بیع کے تام ہونے سے پہلے بہت سے امکانات درآنے کا اندیشہ ہے (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

دوسرا نظریہ:

ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے اندراج قبضہ تصور کیا جائے گا۔ اکثر مقالہ نگاروں کی یہی رائے ہے۔

''وأما تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشتري قابضا له وكذا تسليم الثمن من المشتري إلى البائع'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۴)۔

''ولايشترط القبض بالبراجم لأن معنى القبض هوالتمكن والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة'' (بدائع الصنائع ۵/ ۴۰) (مقالہ: مولانا عبدالباسط قاسمی، مفتی سلمان، مفتی سعید اسعد، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''ولكن الواقع أن التخلية إنما تعتبر قبضا حكميا إذا كان المبيع متعينا متميزا عن غير المبيع أما التخلية بدون التعيين فانه ليس تخلية فى الواقع وإنما هو حق للأخذ بعد التعيين'' (فقه البيوع ۱/ ۴۱۱)۔

''ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع وحائل'' (الدر المختار على رد المحتار ۷/ ۴۹) (مقالہ: مفتی محمد شاہد حسین قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

مولانا عبدالجبار طیب ندوی لکھتے ہیں کہ قبضہ کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے، اور یہ ہر دور کے عرف اور ہر عہد کے رواج اور طور طریقوں سے متعین ہوسکتی ہے، لہذا آج قبضہ کا عرف اگر یہی ہے اور عوام میں اسے رواج ملا ہوا ہے تو پھر کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام درج کردیا جانا ہی قبضہ تصور کیا جائے گا، اس طرح خریدار کا سامان پر قبضہ متصور ہوگا (مقالہ: مولانا عبدالجبار ندوی، و مفتی سلمان)۔

راقم (مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی) نے لکھا ہے کہ جب کہ ہر خریدار کے لئے سونے کا سکہ علحدہ رکھا ہوا ہے اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام پر درج کردیا گیا اور قبضہ سے کوئی چیز مانع ورکاوٹ نہیں ہے مشتری جب چاہے اس پر قبضہ کرسکتا ہے، تو اس کو مشتری کا قبضہ تصور کیا جائے گا (مقالہ: راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

مولانا اشتیاق احمد اعظمی لکھتے ہیں کہ بعد اندراج اس کی رسید یا سرٹیفکٹ مشتری کو دیدی جائے تو یہ شکل اس کے قبضہ کی مانی جاسکتی ہے، کیوں کہ مشتری کا گوکہ مبیع پر حسًا قبضہ نہیں ہے تاہم تخلیہ اور موانع عن التصرف کا ارتفاع پایا جارہا ہے اور قبضہ سے مقصود درحقیقت رفع موانع ہی ہوا کرتا ہے (مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی)۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی لکھتے ہیں: اندراج کو قبضہ کے لئے کافی اس شرط کے ساتھ تصور کیا جائے گا جبکہ خریدار کا اس کو اپنے تصرف میں لے کر خود ہی کمپیوٹر میں یا ریکارڈ رجسٹر میں اپنے نام سے درج کردے اور اس پر دستخط بھی کردے (مقالہ: مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں: کہ اگر کمپیوٹر کے ذریعہ یا رجسٹر وغیرہ میں نام ونمبر کے ساتھ ایسا اندراج کیا گیا کہ پھر دوسرے کے نام وہ نہیں ہوسکتا ہے تو گویا کہ خریدار کے لئے جو موانع تھے وہ باقی نہیں رہے، اس لئے قبضہ کا تصور ہو جائے گا (مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

سوال نمبر ۵:

ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی ایک اور صورت جو آج کل رائج ہے، یہ ہے کہ مثلاً ایک مہینے کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے ۱۰ تولے سونے کا سودا کرلیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا، جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ لیا جاتا ہے، خرید کے دن اور ادائیگی کے دن سونے کے نرخوں میں جو فرق ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کردی جاتی ہے، مثلاً خرید نے کے دن سونے کا نرخ پانچ ہزار روپئے فی تولہ تھا، ادائیگی کے دن پانچ ہزار ایک سو روپئے تولہ ہو گیا تو خریدار بائع کو ایک سو روپئے دے گا، اور اگر اس دن چار ہزار نو سو تھی تو بائع خریدار کو ایک سو روپئے ادا کرے گا، نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے اور نہ بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے، بس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے، اس کا لین دین کر لیتے ہیں اس صورت کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات متفق ہیں کہ یہ معاملہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ادھار کی بیع ادھار کے ذریعہ ہے، جو حدیث کی رو سے ممنوع ہے، نیز اس میں قمار اور جوا بھی ہے۔

دلائل:

"یأیها الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون" (سورۂ مائدہ: ۹۰)
(مقالہ: مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی اشرف علی قاسمی، مولانا شاکر نثار اعظمی، مولانا عبد الباسط قاسمی، مولانا عمران بن دین محمد)۔

"عن ابن عمر أن النبی ﷺ نهی عن بیع الکالی بالکالی" (الدار قطنی ۳/ ۶۰) (مقالہ: مولانا عبد الحی مفتاحی، مفتی شاہد حسین قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا نعمان انور، مولانا انور علی اعظمی، مفتی نثار احمد، مولانا عبد الباسط قاسمی، مولانا عمران بن دین محمد، راقم، مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)

"حدیث رسول ﷺ: لایحل سلف وبیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح ما لم یضمن ولا بیع ما لیس عندك" (سنن ترمذی ۱/ ۲۲۳) (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد عثمان، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی)۔

"عن حکیم بن حزام قال أتیت رسول ﷺ فقلت یاتینی الرجل یسألنی من البیع ما لیس عندی ابتاع له فی السوق ثم ابیعه قال لاتبع ما لیس عندك" (سنن ترمذی ۲/ ۵۲۶)
(مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا عثمان، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا ابو محمد محمد سعد نور قاسمی، مفتی عبد اللہ خالد)۔

"الدراهم والدنانیر لایتعینان فی العقود فیکون هذا بیع الدین بالدین وذلك لایجوز لنهی رسول اللہ ﷺ عن بیع الکالی بالکالی یعنی النسئة بالنسیئة" (مبسوط للسرخسی ۱۲/ ۱۱۰) (مقالہ: مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا ابو محمد محمد سعد نور قاسمی)۔

"لو باع فلوسا بمثلها أو بدراهم أو بدنانیر فإن نقد أحدهما جاز وإن تفرقا بلا قبض أحدهما لم یجز" (الدر المختار مع رد المحتار ۷/ ۴۱۴) (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

"الشراء علی السعر المفتوح لایجوز أصلا لأن هذا البیع فیه غرر بجهالة الثمن عند العقد فإن المراد من السعر لیس سعر یوم العقد وإنما المراد السعر الذی تنتهی إلیه السوق بعد العقد إلی مدة مجهولة فلا شك فی ان هذه الجهالة مفسدة للعقد ولایجوز البیع بهذا الطریق" (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۲) (مقالہ: مفتی عبد الرحیم قاسمی)۔

"هو من أکل المال بالباطل لأن المقر یقول لصاحبه إن کان کذا فلی کذا وإن لم یکن فلك کذا" (شرح البخاری لابن بطال ۶/ ۱۹۶) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

"وقبض المنقول من حیوان أو غیره تحویله لما روی الشیخان عن ابن عمر کنا نشتری الطعام جزافا فنهانا

رسول الله ﷺ أن نبيعه حتى ننقله من مكانه... ويكفي في قبض الثوب ونحوه مما يتناول باليد التناول'' (مغني المحتاج ۲/ ۷۲) (مقالہ: مفتی فیاض احمد)۔

''واعلم أن من البيوع ما يجرى فيه معنى الميسر وكان أهل الجاهلية يتعاملون بها فيما بينهم فنهى عنها النبي ﷺ'' (رحمة الله الواسعه ۴/ ۵۶۰) (مقالہ: مولانا محمد شاکر نثار اعظمی، مولانا عبدالباسط قاسمی، مولانا عمران بن دین محمد)۔

''وأما المعدوم فلا يحتمل العقد أصلا لأنه ليس بشئی'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۶۴) (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد)۔

صرف مولانا ظہیر احمد لکھتے ہیں کہ اس کا حکم بھی جواز کا ہوگا۔لیکن جواز کی انہوں نے کوئی دلیل ذکر نہیں کی ہے۔

سوال نمبر ۶:

بہت سی دفعہ سونے کی قیمت میں متوقع اضافہ کا سونے چاندی کے تاجروں کو علم ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں وہ سونے کو روک لیتے ہیں، تاکہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کریں، سونا اس پہلو سے اشیاء ضروریہ میں شامل ہے کہ ثمن خلقہ ہونے کے لحاظ سے وہ ذریعہ تبادلہ ہے، اس کو روک لینے کی وجہ سے سونے کی قیمت تو بڑھتی ہی ہے، اس گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی ہوتا ہے، تو کیا سونے کی ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے لئے اس کو روک کر رکھنا احتکار کے دائرہ میں آئے گا؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرات کے دو اقوال ہیں:

پہلا قول:

سونے چاندی کو گراں فروشی کے لئے روک کر رکھنا احتکار کے دائرہ میں نہیں آئے گا، اس لئے کہ احتکار صرف انسانی یا حیوانی غذائی اشیاء میں ممنوع ہے۔

دلائل وجوہ:

احتکار کی تعریف: ''الاحتكار لغة حبس الطعام إرادة الغلاء أما في الشرع فقد عرّفه الحنفية بأنه اشتراء الطعام ونحوه وحبسه إلى الغلاء'' (موسوعه فقهيه ۲/ ۹۰)۔

احتکار کے ممنوع ہونے کی روایات:

''قال رسول الله ﷺ من احتكر فهو خاطئ'' (صحيح مسلم باب تحريم الاحتكار في الأقوات ۲/ ۳۱)
(مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبدالحئی مفتاحی)۔

''عن عمر عن النبي ﷺ قال: الجالب مرزوق والمحتكر ملعون'' (صحيح مسلم ۲/ ۳۱)
(مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور)۔

''عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول ﷺ يتول من احتكر على المسلمين طعامهم ضربة الله بالجذام والافلاس'' (سنن ابن ماجه)۔

''عن أبي أمامة ان رسول الله ﷺ قال من احتكر طعاماً أربعين يوما يريد به الغلاء فقد برئ الله وبرئ الله منه. رواه رزين'' (مشكوة المصابيح: ۲۵۱) (مقالہ: مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

کن اشیاء میں احتکار ممنوع ہے:

اس سلسلہ میں تین اقوال ہیں: پہلا قول امام ابوحنیفہ، امام محمد، شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک یہ ہے کہ صرف غذائی اشیاء میں احتکار ممنوع ہے۔
دوسرا قول مالکیہ وامام ابویوسف کا ہے، احتکار ان تمام چیزوں میں ہوسکتا ہے، جو انسانی زندگی کیلئے ضروری ہو اور جن کے روکنے میں عوام الناس

کو ضرر لاحق ہو۔ تیسرا قول امام محمد بن حسن کا ہے، کہ احتکار صرف غذائی اشیاء اور کپڑوں میں ممنوع ہے۔

(مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور)۔

''هناك ثلاثة اتجاهات الأولى: ماذهب إليه أبوحنيفة ومحمد والشافعية والحنابلة أنه لااحتكار إلا في القوت خاصة۔ والاتجاه الثاني: ان الاحتكار يجري في كل مايحتاجه الناس ويتضررون من حبسه من قوت وادام ولباس وغير ذلك وهذا ما ذهب إليه المالكية وأبويوسف من الحنفية والاتجاه الثالث انه لا احتكار إلا في القوت والثياب خاصة وهذا قول لمحمد بن حسن'' (موسوعه فقهيه ۲/ ۹۲) (مقالہ: مولانا سعید اسعد قاسمی، مولانا عبداللہ خالد، قاضی عبدالجلیل قاسمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

روایت دونوں طرح کی وارد ہوئیں ہیں ایک عام اور دوسری خاص، تو عام کو خاص پر محمول کیا جائے گا، گویا جن احادیث میں مطلق احتکار کی ممانعت وارد ہوئی ہے وہ بھی غذائی اجناس پر ہی محمول ہیں:

''وإذا اجتمعت النصوص عامة واخرى خاصة في مسألة واحدة حمل العام على الخاص، والمطلق على المقيد'' (موسوعه فقهيه ۲ / ۹۲) (مقالہ: مولانا عبدالحئی مفتاحی، مفتی سعید اسعد قاسمی، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''قال أصحابنا الاحتكار المحرم هو الاحتكار في القوت خاصة يدخره ليغلو ثمنه فأما اذا جاء عن قرية أو اشتراه في وقت الرخص وأدخره او ابتاعه في وقت الغلاء لحاجته إلى أكله أو ابتاعه ليبيعه في وقته فليس باحتكار والاتحريم فيه وأما غير الأقوات فلا يحرم الاحتكار فيه بكل حال'' (شرح نووی ۲ / ۳۱) (مولانا شاہین جمالی، مولانا فیاض احمد محمود، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

''كره احتكار قوت البشر كتبن وعنب ولوز والبهائم كتبن وقوت في بلد يضر بأهله'' (الدر المختار) ''والتقييد بقوت البشر قول ابي حنيفة ومحمد وعليه الفتوى'' (ردالمحتار ۶/ ۳۸۶)

(مقالہ: مولانا ابوالمکارم معروفی، مولانا محمد عثمان، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی نثار احمد)۔

''ذهب أكثر الفقهاء إلى أن حرمة الاحتكار مختصة بالأقوات فلا يحرم الاحتكار في غيرها وهو قول أبي حنيفة والشافعي ومالك وأحمد رحمهم الله'' (تکمله فتح الملهم ۱/ ۶۰۲) (مقالہ: مولانا محمد عثمان)۔

''لان حرمة الاحتكار بحبس المشتري في المصر لتعلق حق العامة به فيصير ظالما بمنع حقهم على ماذكر ولم يوجد ذلك في المشتري خارج المصر من مكان بعيد لأنه متى اشتراه ولم يتعلق به حق أهل المصر فلا يتحقق الظلم ولكن مع هذا الأفضل له أن لا يفعل ويبيع لأن في الحبس ضررا للمسلمين وكذلك ماحصل له من ضياعه بأن زرع أرضه فأمسك طعامه فليس ذلك باحتكار لأنه لم يتعلق به حق أهل المصر لكن الأفضل أن لا يفعل ويبيع لما قلنا ثم الاحتكار يجري في كل مايضر بالعامة عند أبي يوسف رحمه الله قوتا كان أو لا وعند محمد رحمه الله لا يجري الاحتكار إلا في قوت الناس وعلف الدواب من الحنطة والشعير والتبن والقت'' (بدائع الصنائع ۱۱/ ۲۷۷)۔

مولانا اختر امام عادل لکھتے ہیں کہ انسانی یا حیوانی غذائی اشیاء کا احتکار ممنوع ہے، یعنی ایسی چیزیں جو براہ راست انسان یا جانوروں کے نظام تغذیہ کو متاثر کرے بالواسطہ یا سبب بعید کے طور پر متاثر کرنے والی ذخیرہ اندوزی احتکار ممنوع میں شامل نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ خلاف اولی یا خلاف افضل کہا جاسکتا ہے (مقالہ: مولانا اختر امام عادل)۔

مولانا خورشید انور اعظمی لکھتے ہیں کہ سونا، چاندی میں ذخیرہ اندوزی جائز ہے، البتہ آج کی موجودہ صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے امام ابو یوسف کے قول کے مطابق فتوی دینے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے۔

مولانا محمد عثمان لکھتے ہیں کہ غلہ کی ذخیرہ اندوزی سے بچنے والے ضرر ونقصان کی طرح اگر کسی دوسری چیز کی ذخیرہ اندوزی سے نقصان پہنچے تو حاکم وقت کو حضرت امام ابو یوسف کے قول کی بنا پر اس پر پابندی لگانے اور ممانعت کا اختیار ہوگا اور اگر اس طرح کا ضرر نہ پہنچے تو پابندی نہ لگائی جائے گی (مقالہ: مولانا محمد عثمان بستوی)۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی لکھتے ہیں کہ سونا اور چاندی اول تو قوت اور طعام نہیں ہیں، دوسرے ان کی ذخیرہ اندوزی کے اثرات براہ راست ضرر عامۃ الناس تک نہیں پہنچتے ہیں کیوں کہ یہ سامان زینت ہیں، ثمن ضرورت نہیں کیوں کہ عوامی ضرورت کے سامان میں ذریعہ تبادلہ نہیں ہیں، البتہ جہاں سونے اور چاندی کے سکے چلتے ہوں وہاں ان کا ذخیرہ ممنوع ہوگا (مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی جائز ہے اللجنۃ الدائمۃ کا فتویٰ ہے۔

''ویجوز شراء الذهب بعملة أخرى غير الذهب يدا بيد وادخاره وبيعه بعد بأقل او اكثر من سعره الماضي ولا يعتبر ذلك كنزا منهيا عنه'' (فتاوى اللجنة الدائمة ۱۳/ ۴۸۳) (مقالہ: مولانا حافظ کلیم اللہ عمری)۔

دوسرا قول:

اگر سونے چاندی کی گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہو تو گراں فروشی کے ارادہ سے سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی احتکار کے دائرے میں داخل ہے۔

دلائل وجوہ:

''قال رسول الله ﷺ من احتكر فهو خاطئ'' (صحيح مسلم ۲/ ۳۱)

(مقالہ: مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا عمران بن دین محمد، مولانا عبدالباسط قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

''الضرر يزال'' (الاشباه والنظائر / ۳۰۵) (مقالہ: مولانا عمران بن دین محمد، مولانا عبدالباسط قاسمی)۔

''كل ما يضر بالعامة فهو احتكار بالأقوات كان أو ثيابا أو دراهم أو دنانير اعتبار لحقيقة الضرر لأنه هو المؤثر في الكراهة'' (البحر الرائق ۸/ ۲۲۹)۔

''ويحرم الأحتكار ايضا عند المالكية وأبي يوسف في غير الطعام في وقت الضرورة'' (الفقة الاسلامي وادلته ۳/ ۵۸۸)۔

''وقال في الهداية اعتبر أبو حنيفة الضرر المعهود المتعارف وهو ضعيف لأنه لا عهد ولا تعارف خلفنا بالأقوات بل هو معهود ومتعارف في كل شئي كما لا يخفى'' (اعلاء السنن ۱۲/ ۴۲۰)۔

''وهذا القول يبدو راجحا لعموم النهي ولأن علته الإضرار بأهل البلد فيشمل كل مايحتاجون إليه'' (فقه البيوع ۲/ ۹۹۹) (مقالہ: مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی)۔

''وأبي يوسف كل ما أضر العامة حبسه فهو احتكار'' (ردالمحتار ۹/ ۵۷۱) (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد)۔

مفتی عبداللہ خالد لکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں سونے کے احتکار کا اثر انسانوں کی خوراک اور دوسری تمام ضروری اشیاء پر پڑتا ہے، اس لئے سونے کی ذخیرہ اندوزی اور احتکار ناجائز وحرام ہوگا، اس لئے کہ شریعت کا احتکار سے روکنے کا مقصد انسانوں اور جانوروں سے مضرت اور تکلیف کو دور کرنا ہے (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد)۔

مولانا عبدالحمید قاسمی لکھتے ہیں کہ حدیث کے اطلاق ممانعت احتکار کی وجوہات اور پھر امام ابویوسف کے قول کو سامنے رکھا جائے تو یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ سونا کی ذخیرہ اندوزی بھی احتکار کے دائرہ میں آئے، خصوصا موجودہ حالت میں جبکہ کاغذی نوٹوں پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے، اور سونا جو ثمن خلقی ہے، معیشت میں فیصلہ کن مقام حاصل کرتا جارہا ہے، اس کی قیمتوں میں کمی بیشی کا اثر دیگر تمام اشیاء پر ظاہر ہوتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام یوسف کے قول پر فتوی دیتے ہوئے سونے کو بھی احتکار کے دائرے میں لایا جائے (مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

مولانا عبدالباسط قاسمی لکھتے ہیں کہ احتکار میں امام یوسف کی رائے زیادہ قرین قیاس ہے، سونے کا احتکار نہ کر کے اس کو بازار میں لایا جائے اور احتکار سے بچا جائے تاکہ لوگوں کی پریشانی کا ازالہ ہو سکے (مقالہ: مولانا عبدالباسط قاسمی)۔

تائیدات:

اس قول کی تائید اکابر علماء کرام کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۰۵۵، آپ کے مسائل اور ان کا

حل ۷/۱۱۱، فقہ البیوع ۲/۹۹۹، قاموس الفقہ ۱/۳۹) (مقالہ: مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مفتی عبداللہ خالد)۔

سوال نمبر ۷:

ملک میں جو سونا آتا ہے، اس میں بڑا حصہ تو قانونی طریقہ پر آتا ہے، اور سونا لانے والا اس سے متعلق واجبات کو ادا کرتا ہے، دوسرا راستہ اسمگلنگ کا ہے، یہ طریقہ غیر قانونی ہے، اس میں سونا لانے والا ان واجبات کو ادا نہیں کرتا، جو حکومت نے سونے کی درآمد سے متعلق مقرر کئے ہیں، کیا یہ اسمگلنگ کا عمل جائز ہوگا، کیا اس طریقہ پر آنے والے سونے خریدنا اور پھر اس کو فروخت کرنا درست ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار متفق ہیں کہ اسمگلنگ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ قانونی جرم ہے اور ملکی جائز قانون کی پابندی لازم وضروری ہے، نیز ہتک عزت کا بھی اندیشہ ہے اور اپنے آپ کو ذلیل کرنا شرعاً ممنوع ہے تاہم اگر کوئی اس طرح سونا کی خرید وفروخت کرلے تو یہ جائز ہے اور آمدنی حلال وطیب ہوگی، جبکہ اس نے کسی محظور شرعی کا ارتکاب نہ کیا ہو۔

دلائل:

آیات:

"یأیہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الأمر منکم" (سورۂ نساء: ۵۹)

(مقالہ: مولانا محمد شاکر نثار اعظمی، مولانا عبدالجبار طیب ندوی)۔

"یأیہا الذین امنوا أوفوا بالعقود" (سورۂ مائدہ: ۱) "واوفوا بالعہد إن العہد کان مسئولا" (سورۂ اسراء: ۳۴) (مقالہ: عبدالجبار طیب ندوی)۔

"ولا تلقوا بأیدیکم إلی التہلکۃ" (سورۂ بقرہ: ۱۹۵) (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی سلمان)۔

احادیث:

''لاینبغی للمسلم أن یذل نفسہ قیل وکیف یذل نفسہ قال یتعرض من البلاء لما لایطیق'' (مسند احمد حدیث: ۲۳۴۴۴) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا عبدالحئی مفتاحی، مولانا محمد عثمان، مولانا ابوالمکارم معروفی)۔

''عن أبي ہریرۃ قال نہی رسول اللہ ﷺ أن یتلقی الجلب وفی حدیث عنہ لایبیع حاضر لباد'' (صحیح مسلم، سنن الترمذی ۲/ ۵۰) (مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

''المسلمون عند شروطہم فیما وافق الحق'' (سنن کبری ۷/ ۲۴۹) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل)۔

''لاتلقوا الرکبان'' (صحیح مسلم حدیث: ۱۵۱۵) (مقالہ: مفتی شاہجہاں ندوی)۔

''من غش فلیس منا'' (صحیح مسلم ۱۰۱) (مقالہ: مفتی فیاض احمد محمود)۔

''من أطاعنی فقد أطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن یطع الأمیر فقد أطاعنی ومن یعص الأمیر فقد عصانی'' (صحیح بخاری حدیث: ۲۹۵۷، صحیح مسلم حدیث: ۱۸۳۵) (مقالہ: مولانا عبدالجبار طیب ندوی)۔

عبارات:

''وہذا الحکم أی وجوب طاعۃ الأمیر یختص بما اذا لم یخالف أمرہ الشرع یدل علیہ الآیۃ فإن اللہ تعالی أمر الناس بطاعۃ أولی الأمر بعد ما أمرہم بالعدل فی الحکم تنبیہا علی أن طاعتہم واجبۃ ما داموا علی العمل انتہی وکذا فی التفسیر المظہری'' (احکام القرآن ۲/ ۱۵۲) (مقالہ: مولانا شاکر نثار اعظمی، مولانا جنید محمد)۔

''تجب طاعۃ الإمام فیما لیس بمعصیۃ'' (الدر المختار ۲/ ۱۷۲)

(مقالہ: مولانا شاکر نثار اعظمی، مولانا عبدالحمید قاسمی، مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی)۔

''کل من یسکن دولة فإنه یلتزم قولا أو فعلا بأنه یتبع قوانینها وحینئذ یجب علیه اتباع أحکامها''(فی بحوث القضایا الفقهیة المعاصرہ ص:۶۱) (مقالہ: مفتی محمد شاہد حسین قاسمی، مولانا ابوالکارم معروفی، مولانا محمد شاکر نثار احمد اعظمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا عبدالحمید قاسمی، مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا جنید محمد، راقم مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

''لأن طاعة الإمام فیما لیس بمعصیة فرض''(الدر المختار ۶/۴۱۶ باب البغاة)

(مقالہ: مولانا عمران بن دین محمد، مولانا شاکر نثار اعظمی، مفتی محمد شاد جہاں ندوی، مولانا ابوالکارم معروفی)۔

''أمر السلطان إنما ینفذ إذا وافق الشرع وإلا فلا''(الدر المختار ۶/۴۱۶) (مقالہ: مولانا عمران بن دین محمد)۔

''کل یتصرف فی ملکه کیف شاء''(شرح المجلة ۳/ ۱۳۲ رقم المادة ۱۱۹۲)

(مقالہ: مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی، مولانا جنید محمد، مولانا محمد عثمان)۔

''المالك هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء''(بیضاوی شریف ۱/۷، سورہ فاتحہ) (مقالہ: مولانا عبدالحی مفتاحی)۔

''ولا یمنع أحد من التصرف فی ملکه أبدا إلا إذا کان ضرره لغیره''(شرح المجله للأتاسی ۴/ ۱۴۰)

(مقالہ: مولانا جنید محمد، مولانا محمد عثمان)۔

''وحرمة الفعل لا تنافی ترتب الأحکام کطلاق الحائض والوضوء بمیاه المغصوبة والاصطیاد بقوس المغصوبة والذبح بسکین مغصوبة والصلوٰة علی الأرض المغصوبة والبیع فی وقت النداء فإنه یترتب الحکم علی هذه التصرفات مع اشتماله علی الحرمة''(اصول الشاشی: ۷۸) (مقالہ: مولانا حفظ الرحمن شاہین جمالی)۔

''تجب اطاعته فیما أباحه الشرع وهو ما یعود نفعه علی العامة''(شامی ۱۰/ ۴۴)۔

''انه قال لا یبیع حاضر لباد دعوا الناس یرزق الله بعضهم من بعض ولو باع جاز البیع لأن النهی لمعنی فی غیر البیع وهو الإضرار بأهل المصر فلا یوجب فساد البیع کالبیع وقت النداء''(بدائع الصنائع ۴/ ۲۸۰)۔

مولانا اختر امام عادل لکھتے ہیں کہ مسلمان کی عزت وحرمت کی حفاظت مقاصد دین بلکہ ضروریات ستہ (حفاظت دین، حفاظت جان، حفاظت مال، حفاظت عقل اور حفاظت آبرو یا نسب) میں شامل ہے، ملکی قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کی عزت وآبرو خطرہ میں پڑ سکتی ہے، اس لئے بلا کسی عذر شرعی کے اس کو خطرہ میں ڈالنا درست نہیں (مقالہ: مولانا اختر امام عادل)۔

''ومن المنهی عنه ما لا یبطل لرجوعه یعود إلی النهی لدلالة المنهی علیه إلی معنی یقترن به لا إلی ذاته لأن النهی لیس للبیع بخصوصه بل لأمر آخر..فجمیع ما فیه من الصور یصح فیها البیع ویحرم...کبیع حاضر لباد....وتلقی الرکبان''(منهاج مع المغنی المحتاج ۲/ ۳۶)۔

''ومن باع منهم بما قدره الإمام صح لأنه غیر مکره علی البیع قالوا فیمن صادره السلطان بمال ولم یتعین بیع ماله فصار یبیع أملاکه بنفسه ینفذ بیعه لأنه غیر مکره علی البیع''(شامی ۹/ ۴۸۹)(مقالہ: مولانا ابوالمکارم معروفی)۔

مولانا ابوالمکارم معروفی لکھتے ہیں کہ اسمگلنگ کا یہ غیر قانونی عمل دو وجہ سے درست نہیں ہے۔

۱- ایک تو اس لئے کہ فقہ کا قاعدہ ہے جو کام معصیت اور گناہ نہ ہو اس میں حکومت کی اطاعت واجب ہے۔

۲- جو شخص جس ملک میں قیام پذیر ہوتا ہے وہ قولاً یا عملاً اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جب تک ملک کے قوانین کسی گناہ کے کرنے پر مجبور نہیں کریں گے وہ قوانین کی ضرور پابندی کرے (مقالہ: مولانا ابوالمکارم معروفی)۔

مولانا روح الامین لکھتے ہیں کہ قانونی طریقہ کے خلاف مال درآمد کرنا اور اسمگلنگ کرنا درست نہیں یہ بہت سے منکرات کو مستلزم ہے۔

(۱) قانون کی خلاف ورزی حالانکہ جو امر معصیت کے قبیل سے نہ ہو اس میں حکومت کے خلاف قانون کی خلاف ورزی نہ کرنی چاہئے۔

(۲) نقض عہد کیوں کہ ملک کے ہر باشندہ نے قانون کی پاسداری کا قولا یا عملاً عہد لیا ہے۔
(۳) عموماً ایسے عمل کے لئے جھوٹ کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔
(۴) جان ومال یا عزت کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے (مقالہ: مولانا روح الامین)۔
مولانا عبد الباسط قاسمی جدید فقہی مسائل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ اسمگلنگ کا طریقہ بہ چند وجوہ ناجائز ہے۔
الف۔ ایک تو اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہے جو اس ملک کا شہری ہونے کے لحاظ سے اس کے قانون کے احترام کے سلسلہ میں ضروری ہے۔
ب۔ دوسرے اس طرح پوری قوم اور باشندگان ملک کو اپنی حرکت کے ذریعہ نقصان پہنچاتا ہے اور زیر بار کرتا ہے جو غیر اسلامی ہونے کے علاوہ غیر انسانی بھی ہے (مقالہ: مولانا عبد الباسط قاسمی)۔

تائیدات:

اکابر علماء کرام کی تحریروں سے بھی اس جواب کی تائید ہوتی ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۲۸، فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۷۸، فتاوی عثمانی ۳/ ۹۰، جدید معاملات کے شرعی احکام ۱/ ۱۰۵، جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۷۸)۔

سوال نمبر ۸:

آج کل ’پلاٹین‘ کو سفید سونا کہا جاتا ہے، اب اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے، اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، تو کیا لوگوں کے عرف کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقی سونے کے حکم میں ہوگا اور عقود، نیز زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرات کی تین رائیں ہیں:

پہلی رائے:

پلاٹین کا شمار اگرچہ مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے لیکن یہ حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوگا، نیز عقود اور زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام جاری نہیں ہوں گے، اکثر مقالہ نگاروں کی یہی رائے ہے۔

دلائل ووجوہ:

اللہ تعالیٰ نے ثمنیت کے لئے صرف سونا اور چاندی کو پیدا کیا ہے، لہذا دوسری دھاتیں کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہوں وہ حقیقی سونا کے حکم میں نہیں ہوسکتی ہیں۔

”والصرف فی متعارف الشرع اسم لبیع الأثمان المطلقة بعضها ببعض وهو بیع الذهب بالذهب والفضة بالفضة“ (بدائع الصنائع ۵/ ۲۱۵)۔

”ولهما أن الثمنية فی حقهما ثابت باصطلاحهما إذ لاولاية للغير عليهما فتبطل باصطلاحهما“ (ہدایہ ۳/ ۸۱) (مقالہ: مفتی عبد اللہ خالد)۔

شریعت اسلامیہ نے وجوب زکوۃ کے لئے صرف سونا و چاندی کو مال نامی قرار دیا ہے، ان کے علاوہ دوسری دھاتوں کے لئے تجارت کی نیت ہونا شرط ہے، حضرت سعید بن جبیرؓ سے مروی ہے۔

” لیس فی حجر زکوة إلا ماکان لتجارة من جوهر ولایاقوت ولالؤلؤ ولاغیره إلاالذهب والفضة“ (السنن الکبری للبیہقی / ۷۵۹۲) (مقالہ: مفتی عبد اللہ خالد، مولانا ظفر عالم ندوی)۔

” عن ابن جریج قال قال لی عطا لاصدقة فی اللؤلؤ ولا زبرجد ولا یاقوت ولا فصوص ولا عرض ولا شئ لایدار و

إن كان شئ من ذلك يدار ففيه الصدقة في ثمنه حين يباع'' (المصنف لابن أبي شيبه ۱۰۱۷۰) (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد)۔

''عن عكرمة قال ليس في حجر اللؤلؤ ولا حجر الزمرد زكوة إلا أن يكون لتجارة فإن كان لتجارة ففيها زكوة'' (تاتارخانیہ ۲/ ۱۷۳) (مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی)۔

مولانا ظفر عالم ندوی لکھتے ہیں کہ سونا و چاندی ان دونوں دھاتوں کو ثمن خلقی کے طور پر شمار کیا گیا ہے، احادیث نبویہ میں ان دونوں پر زکوۃ کی صراحت موجود ہے، اور ان کا علحدہ علحدہ نصاب بھی مقرر ہے جو منصوص ہے، لیکن جواہرات، یاقوت اور موتیاں اگرچہ کافی قیمتی اشیاء ہیں لیکن ان پر زکوۃ نہیں (مقالہ: مولانا ظفر عالم ندوی)۔

'' ولا زكوة في سائر الجواهر كاللؤلؤ والياقوت لعدم ورودها في ذلك ولأنها معدة للاستعمال كالماشية العاملة'' (تحفة المحتاج ۱/ ۴۷۰، المجموع ۶/ ۵) (مقالہ: مفتی فیاض احمد محمود)۔

'' لا زكوة في اللآلى والجواهر وإن ساوت ألفا اتفاقًا إلا أن تكون للتجارة والأصل أن ما عدا الحجرين والسوائم إنما يزكى بنية التجارة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۱۹۴)

(مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی محمد شاہد حسین، مفتی سعید اسعد قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی عبدالرحیم، راقم مفتی سعید الرحمن قاسمی)۔

'' اموال الزكوة أنواع ثلاثة أحدها: الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة ''۔ ''والثاني: أموال التجارة وهي العروض المعدة للتجارة ''۔ ''والثالث: السوائم'' (مقالہ: مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی)۔

''وذهب الحنفية وهو قول عند المالكية إلى أن الفلوس الرائجة تجب فيه الزكوة مطلقا كالذهب والفضة لأنهما أثمان مطلقة فإذا كسدت عدت عروضا فلم تجب فيها الزكوة إلا عرضت للتجارة'' (موسوعہ الفقہیہ فلوس رقم ۴)

(مقالہ: مفتی روح اللہ قاسمی)۔

مولانا محمد عثمان لکھتے ہیں کہ سونے چاندی کے خصوصی حکم کا سبب ثمنیت کا ہونا متعین ہے، لہذا پلاٹین جس کو سفید سونا کہا جاتا ہے، ثمنیت خلقیہ عرفیہ و اصطلاحیہ کے فوت ہونے کی وجہ سے اس پر سونے چاندی کے احکام جاری نہیں ہوں گے (مقالہ: مولانا محمد عثمان بستوی)۔

مفتی شاہ جہاں ندوی لکھتے ہیں کہ کسی چیز کا محض قیمتی ہونا اسے سونا چاندی کے حکم میں داخل نہیں کر دیتا ہے، چنانچہ ہیرے اور دیگر جواہرات پر ہر دور میں انتہائی قیمتی پتھر تھے اور یہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں بھی موجود تھے، لیکن آپ ﷺ نے اس پر زکوۃ واجب نہیں کی (مقالہ: مفتی محمد شاہ جہاں ندوی)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں کہ شرعی لحاظ سے ثمن خلقی و حقیقی کے احکام صرف سونے چاندی میں جاری ہوتے ہیں حتی کہ اگر سونے و چاندی کسی دوسری دھات میں مخلوط ہو کر مغلوب ہو جائیں تو اپنا حکم کھو بیٹھتے ہیں۔

'' والغالب عليه الغش منهما في حكم العروض اعتبار اللغالب فصح بيعه بالخالص إن كان الخالص أكثر من المغشوش وبجنسه متفاضلا'' (الدر المختار ۴/ ۲۶۷، كتاب الصرف)۔

مزید لکھتے ہیں کہ اگر سونا و چاندی کے علاوہ کوئی قیمتی دھات و معدن ہو تو اس کا حکم سونا و چاندی کا نہیں ہوتا ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا روح الامین)۔

''لا زكوة في ما سوى الذهب والفضة من الجواهر كالياقوت والفيروزج واللؤلؤ والمرجان والزمرد والزبرجد والحديد... فإن حسنت صنعتها وكثرت قيمتها'' (المجموع ۲/ ۱۲۷۰) (مقالہ: مولانا روح الامین)۔

مولانا روح الامین لکھتے ہیں کہ سونے اور چاندی کے علاوہ مال میں زکوۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب کہ وہ مال تجارت ہو، محض قیمتی اور گراں ہونے کی بنا پر کسی چیز پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی، لہذا پلاٹین زکوۃ کے باب میں حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوگا (مقالہ مولانا روح الامین)۔

مولانا انور علی اعظمی اور مولانا نعمان انور لکھتے ہیں کہ ہیرے جواہرات جو سونے چاندی سے زیادہ قیمتی ہیں انہیں استعمال کرنے میں اور مسئلہ

زکوۃ میں سونے چاندی کے حکم میں نہیں رکھا گیا ہے، سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال شریعت میں جائز نہیں ہے جبکہ قیمتی پتھروں کے برتن کے استعمال کی اجازت ہے، ہدایہ میں ہے: "ولا بأس باستعمال آنیۃ الرصاص والزجاج والبلور والعقیق" (ہدایہ ۴/۴۳۴)۔

اسی طرح مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں ہے لیکن انگوٹھی میں ہیرے کا قیمتی پتھر کا استعمال بطور نگ کے جائز ہے، حالانکہ بہت سے پتھر سونے سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں (مقالہ: مولانا انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور)۔

مولانا عبدالجبار طیب ندوی لکھتے ہیں کہ لوگوں کے عرف کی وجہ سے پلاٹین حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوسکتا کیوں کہ یہ عرف اب صرف پلاٹین کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے بلکہ دوسری دیگر اشیاء کو بھی عرف میں سونا کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر قطن یعنی کارٹن کو عوام نے اس کے قیمتی ہونے کی وجہ سے سفید سونا کہنا شروع کردیا ہے، اسی طرح عوام نے پٹرول کو بھی کالا سونا کہنا شروع کردیا ہے، پس اس عرف کی بنیاد پر پلاٹین کو حقیقی سونا تصور کرلیا گیا تو پھر قطن اور پٹرول کو بھی حقیقی سونے کے حکم میں ماننا پڑے گا (مقالہ: مولانا عبدالجبار طیب ندوی)۔

تائیدات:

اس رائے کی تائید اکابر علماء کرام کے فتاوی سے بھی ہوتی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۳۱۳، فقہی مقالات ۲/ ۱۴۸، احسن الفتاوی ۱۰/۴۴۱) (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد، مولانا انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور، مولانا محمد عثمان، مولانا ظفر عالم ندوی)۔

دوسری رائے:

مولانا عبدالباسط قاسمی، مولانا عمران بن دین محمد، مفتی جنید محمد، کی ہے کہ پلاٹین (وائٹ گولڈ) حقیقی سونا ہے، سونے کے تمام احکام اس میں جاری ہوں گے۔

"یتحقق الجمیع علی أن یسمی بالذهب الأبیض وهو ذهب حقیقی" (الذهب الأبیض حقیقة: ۱۹)۔

"والخلاصة ان الذهب فی أصله أصفر اللون ولا یوجد ذهب أبیض فی أصله لکن قد یضاف إلیه مواد تغیرلون الذهب الأصفر فیکون أبیض أو أحمر أو غیرذلك تجب المادة یخلط... اما مایوجد فی الأسواق الآن ویسمی بالذهب الأبیض فهو ذهب اصفر حقیقی خلط ببعض المواد" (الذهب الأبیض حقیقة: ۲۲)۔

(مقالہ: مولانا عبدالباسط قاسمی، مولانا عمران بن دین محمد)۔

تیسری رائے:

چار مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ پلاٹین عقود میں سونے کے حکم میں نہیں ہے، البتہ وجوب زکوۃ کے سلسلہ میں سونے چاندی کے حکم میں ہے، یہ مندرجہ ذیل حضرات کی رائے ہے (مولانا محی الدین غازی، مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی، مولانا محمد شاکر نثار قاسمی، مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی)۔

مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی لکھتے ہیں کہ پلاٹینیم ہیرے جواہرات کی طرح ایک قیمتی دھات ہے اور اس کے بھی زیورات بنائے جاتے ہیں اور اس کو بھی بطور ذخیرہ خرید کر لوگ محفوظ کرتے ہیں تو اس کا حکم بھی ہیرے جواہرات کی طرح ہونا چاہئے اور اس کے اندر بھی سونا چاندی کی طرح جمع کرنے کی صورت میں زکوۃ واجب ہونی چاہئے (مقالہ: مولانا ابومحمد محمد سعد نور قاسمی)۔

مولانا محمد شاکر نثار قاسمی لکھتے ہیں کہ پلاٹین کا شمار قیمتی اشیاء میں ہورہا ہے اور مال و دولت کے طور پر رکھا جاتا ہے، اس لئے روپے پیسے کی طرح اگر اس کی قیمت بھی سونے چاندی میں سے کسی ایک کے نصاب تک پہنچ جائے تو حولان حول کے بعد زکوۃ واجب ہوگی (مقالہ: مولانا محمد شاکر نثار قاسمی)۔

مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی لکھتے ہیں کہ اگر پلاٹین کا چلن سونے کی طرح ہوگیا ہے اور لوگ کاروبار میں اس کو ثمن کی جگہ قبول کرنے لگے ہیں تو پھر اس کو فلوس نافقہ کے درجہ میں تسلیم کیا جانا چاہئے، اور جس طرح فلوس نافقہ کی قیمت لگا کر زکوۃ نکالی جاتی ہے، اسی طرح پلاٹین کی بھی سونے سے قیمت لگا کر زکوۃ نکالی جانی چاہئے (مقالہ: مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی)۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

سونے چاندی کی تجارت سے متعلق بعض مسائل

سوال نمبر(۱-۵)

مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے چھبیسویں فقہی سمینار منعقدہ ۴/۵/۶/مارچ ۲۰۱۷ء اجین (ایم پی) کا ایک اہم موضوع ''سونے چاندی کی تجارت سے متعلق بعض مسائل'' پر موصولہ مقالات کے جوابات نمبر ۱/سے ۵/کا عرض مسئلہ لکھنے کے لیے بندہ کو حکم دیا گیا ہے، اس موضوع پر ناچیز کو ۴۱/مقالے موصول ہوئے، مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی (۲) مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی (۳) ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (۴) مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی (۵) مفتی عبداللہ خالد (۶) مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی (۷) مولانا ابوسفیان مفتاحی (۸) مفتی جنید بن محمد پالنپوری (۹) مفتی سلمان پالنپوری (۱۰) مولانا روح الامین سعادتی (۱۱) مولانا محمد شاکر نثار اعظمی مدنی قاسمی (۱۲) مفتی عبدالباسط پالنپوری (۱۳) مفتی عمران بن دین محمد (۱۴) مفتی نثار احمد گودھروی (۱۵) مولانا عبدالحیی مفتاحی (۱۶) مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی (۱۷) مفتی محمد سلطان قاسمی (۱۸) مولانا ابوالمکارم معروفی (۱۹) ڈاکٹر محی الدین غازی (۲۰) مفتی محمد عثمانی صاحب بستوی (۲۱) قاضی عبدالجبار طیب ندوی (۲۲) مولانا اختر امام عادل (۲۳) مفتی محمد مقصود فرقانی (۲۴) مولانا محمد سعد نور قاسمی (۲۵) مولانا عمر امین الہی (۲۶) قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی (۲۷) مفتی عبدالرحیم قاسمی (۲۸) قاضی عبدالجلیل قاسمی (۲۹) مفتی انور علی اعظمی (۳۰) مفتی عبدالمنان (۳۱) مفتی سعید الرحمن قاسمی (۳۲) مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری (۳۳) مولانا ظفر عالم ندوی (۳۴) مولانا نعمان انور (۳۵) مفتی محمد روح اللہ قاسمی (۳۶) مولانا خورشید احمد اعظمی (۳۷) مفتی محمد شاہد حسین (۳۸) مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی (۳۹) مولانا خورشید انور اعظمی بنارس (۴۰) مفتی محمد سعید اسعد قاسمی (۴۱) مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی۔

سوال نمبر ۱: اگر روپے سے سونا خرید کیا جائے تو اس میں روپیہ کی کیا حیثیت ہوگی، کیا اس کو بیع صرف تصور کیا جائے گا؟ اس پس منظر میں: الف: کیا یہ درست بات ہوگی کہ سونا و چاندی اور روپے میں ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار؟

زیر مطالعہ بحث سے متعلق سوال نمبر ایک کے جزء الف میں مجموعی طور پر چار آراء ہیں:

پہلا موقف: اکثر مقالہ نگاروں کا خیال یہ ہے کہ یہ عقد صرف نہیں ہے، اس لیے بیان کردہ صورت مسئلہ جائز ہے، اس کے قائلین کے کچھ اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی عبداللہ خالد، مولانا فروغ احمد قاسمی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مفتی محمد سلمان پالنپوری، مولانا روح الامین، مولانا شاکر نثار اعظمی مدنی، مفتی عبدالباسط قاسمی پالنپوری، مولانا عمران بن دین محمد پالنپوری، مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا عبدالحیی مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی، مفتی سلطان قاسمی کشمیر، مولانا ابوالمکارم معروفی گورینی، مفتی محمد عثمان بستوی گورینی، مولانا محمد سعد نور قاسمی، مولانا عمر امین الہی، مفتی ذکاء اللہ شبلی قاسمی اندور، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی عبدالمنان، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا نعمان انور، مفتی محمد روح اللہ قاسمی، مولانا خورشید اعظمی مدنی، مفتی محمد شاہد حسین، مولانا خورشید انور اعظمی بنارس، ۔مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، بندہ محمد اشرف قاسمی گونڈوی، باقی اسماء، مستدل عبارات کے ساتھ ذیل میں نقل کی گئی ہیں:

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی تحقیقات کی بنیاد پر فرماتے ہیں: ''کرنسی ثمن خلقی نہیں، ثمن اصطلاحی یا عرفی ہے، البتہ ثمن خلقی کی طرح تداول ہوگیا ہے، لہذا روپے سے سونے چاندی خریدنا بیع صرف نہیں، کیوں کہ بیع صرف کے احکام صرف خلقی ثمن میں جاری ہوتے ہیں'' (فقہی مقالات ۱/۴۰/۴۱، اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/۲۷) (مولانا انور علی الاعظمی)۔

---

[1] مفتی دار الافتاء شہر مہدپور، ضلع اجین (ایم پی)۔

قائلین جواز کے دلائل:

فقہاء احناف کی تصریحات درج ذیل ہیں: ''الصرف هو البيع إذا كان كل واحد من عوضيه من جنس الأثمان'' ہدایہ ۳/ ۱۰۴) (مقالہ: مولانا عمران دین محمد پالنپوری)۔

'' وشرعا بيع الثمن بالثمن أي ماخلق للثمنية ومنه المصوغ جنسا'' (درمختار ۲/ ۴۵۵)

(مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا عبدالحیی مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی، مفتی محمد سلطان القاسمی کشمیر، مولانا ابوالمکارم معروفی گورینی، مولانا عمر امین الہی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی محمد روح اللہ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی مئو)۔

''وإنما يجب التقابض في الصرف بمقتضى اسم العقد وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف'' (المبسوط ۱۴/ ۲۴) (مقالہ: مفتی محمد سلمان پالنپوری)۔

احد العوضین پر قبضہ کے ضروری ہونے کے سلسلے میں بیع الکالی بالکالی کو مستدل اکثر مقالہ نگار نے بنایا ہے اور بعض لوگوں نے روایت حدیث نقل کی ہے: ''عن ابن عمر أن النبي ﷺ نهى عن بيع الكالي بالكالي'' رواه دار قطني (مشکوۃ ۱/ ۲۴۸) (مقالہ: مولانا محمد سعد نور قاسمی)۔

''سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قُبِضَ أحدُ البدلين لما في بزازية لو اشترى مأة فَلْسٍ بدرهم يكفي التقابض من أحد الجانبين قال ومثلُه لو باع فضة أو ذهبا بفلوس'' كما في البحر عن المحيط (شامی ۵/ ۱۸۰) (مولانا روح الامین، مفتی عبدالباسط قاسمی پالنپوری، مولانا شاکر اعظمی مدنی، مولانا ابوالمکارم معروفی گورینی، مولانا محمد سعد نور قاسمی، مولانا امین الہی، مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی محمد شاہد حسین)۔

''لو باع فضة بفلوس فإنه يُشْتَرَطُ قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما كما في البحر عن الذخيرة'' (الدر مع الرد ۷/ ۵۲۲. مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی، مفتی محمد سلطان القاسمی کشمیر، مولانا محمد سعد نور قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی مئو)۔

''وفي الهندية: قال إذا اشترى فلوسا بدراهم وليس عند هذا فلوس ولا عند الآخر دراهم. ثم إن احدهما دفع وتفرقا جاز وإن لم ينقد واحد منهما حتى تفرقا لم يجز. كذا في المحيط'' (ہندیہ ۳/ ۲۲۴. الفصل الثاني في بيوع الفلوس) (مفتی شاہد حسین، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی مئو)۔

''لم يُشْتَرَط في بيع الفلوس بالدراهم أو الدنانير قبضُ البدلين قبل الافتراق ويكتفي بقبض احد البدلين'' (ہندیہ ۳/ ۲۰۹. البحر الرائق ۶/ ۱۹۴) (مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی محمد روح اللہ قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی)، مفتی روح اللہ صاحب نے عقد صرف کے ارکان وشرائط اور علت ربا اور ثمن خلقی وعرفی پر تفصیلی اور تحقیقی کلام کے ساتھ اس معاملہ کو جائز قرار دیا ہے۔

مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری نے اس معاملہ کو بیع صرف سے خارج مانتے ہوئے تکملہ فتح الملہم کی عبارت نقل کی ہے: ''وہ فلوس جن میں سونے یا چاندی کی مقدار کم ہو اور کھوٹ زیادہ ہو تو ان کو عروض کے درجے میں رکھا جائے گا اور اس میں بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے حالانکہ ان میں سونا یا چاندی کی ایک مقدار ہوتی ہے، پھر کاغذی نوٹ جن پر سونے چاندی کا ایک حبہ بھی نہیں ہوتا کس طرح بیع صرف کے احکام لے سکتے ہیں'' (تکملہ فتح الملہم ۱/ ۵۸) (مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی)۔

مولانا عبدالحیی مفتاحی نے کاغذی کرنسی کے ثمن غیر حقیقی ہونے پر مجلہ فقہ اسلامی اکیڈمی جدہ کے حوالے سے ایک اقتباس نقل کیا ہے:

''إن الأوراق النقدية ثمن عرفي، ليست ثمنا حقيقتا. والربا تجرى في الثمن الخلقي الذاتي'' (التبيان في زكوة الأثمان بحواله مجله فقه اكيڈمی جده ۴/ ۵۹، مطبوعه اسلامك فقه اكيڈمی، انديا)۔

مفتی عبداللہ خالد نے صورت مسئلہ کو عقد صرف سے خارج قرار دیتے ہوئے بوقت عقد، احد البدلین پر قبضہ کی صورت میں جواز کا حکم بیان کرنے کے لیے (بدائع ۵/ ۲۱۵، ردالمحتار ۵/ ۲۵۷، ہدایہ ۳/ ۱۰۴، المبسوط ۱۴/ ۲۴، ہندیہ ۴/ ۲۲۵) کی عبارتیں پیش کی ہیں۔

مفتی جنید بن محمد پالنپوری نے اس معاملے کو دو وجہوں سے عقد صرف سے خارج مان کر جائز قرار دیا ہے۔

ایک یہ کہ کرنسی فلوس کی طرح غیر خلقی ثمن ہے دوسرے یہ کہ سونے چاندی کے علاوہ میں عقد صرف ماننے کی صورت میں نص پر زیادتی لازم آئے گی (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۴۲ تا ۱۴۵، المبسوط للسرخسی ۱۴/ ۲۴، شامی ۴/ ۲۰۵) کی عبارات کو اپنا مستدل بنایا ہے۔

مولانا نعمان انور اور مفتی عبدالمنان صاحب سونے چاندی کے علاوہ چیزوں میں خلقی ثمنیت کا انکار کرتے ہوئے اس معاملہ کو جائز قرار دیا ہے۔

مولانا خورشید انور اعظمی بنارس نے ثمن کی حقیقت اور فقہی تعریفات کو (حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۹۰، المبسوط ۱۲/ ۷/ ۱۳، بدائع ۵/ ۲۳۴) وغیرہ کتب سے بیان کرنے کے بعد (فتاوی احیاء العلوم ۱/ ۲۵۰) سے ایک فتوی نقل کیا ہے:

''چونکہ آج کل روپیہ میں چاندی بالکل نہیں ہوتی ہے، لہذا اس سے تمام اشیاء مذکورہ کو ادھار خرید اجا سکتا ہے''۔

مفتی محمد عثمان بستوی گورینی نے موجودہ کرنسی کی شرعی حیثیت کو فلوس نافقہ کے طور پر متعین کرنے کے بعد لکھا کہ ''جس طرح فلوس نافقہ کے ذریعہ سونے کی خریداری کی صورت میں بیع صرف کے احکام نافذ نہیں ہوتے ہیں اسی طرح روپیہ کے ذریعہ سونا خریدنے پر بھی بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔'' موصوف نے فلوس سے سونا چاندی کی ادھار بیع کے جواز پر متعدد فقہی نظائر پیش کی ہیں۔

☆ **دوسرا موقف:** عقد صرف ہے۔ اس پر پانچ مقالہ نگار متفق ہیں، یہ معاملہ عقد صرف ہے اس لیے مجلس عقد میں ہی عوضین پر قبضہ ضروری ہے۔ اس لیے ڈاکٹر محی الدین غازی مختصر جملوں میں سیدھے طور پر کہتے ہیں ''یہ صورت درست نہیں ہے''، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی فرماتے ہیں: ''یہ بات جائز نہیں کہ سونا چاندی اور روپے میں ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار، اس لیے کہ بیع صرف میں ادھار جائز نہیں بلکہ فوراً فوراً ادا کرنا ضروری ہے''، قاضی عبدالجلیل قاسمی صاحب نے بھی دوٹوک انداز میں اس معاملے کو ناجائز کہا ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی نے اختلاف جنس کی صورت میں کمی زیادتی کی اجازت کے ساتھ عوضین پر مجلس عقد میں قبضہ کے سلسلے میں (مسلم ۲/ ۲۵) کی روایت نقل کی ہے: ''فإذا اختلف هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد'' (تکملۃ فتح الملہم ۱/ ۵۹۴)، اسی طرح (ہدایہ ۳/ ۱۰۴)'' ولا بد من قبض العوضين قبل الافتراق'' اور (البحر الرائق کتاب الصرف ۶/ ۱۹۲) سے عبارت نقل کی ہے کہ: ''فلو تجانسا شرط التماثل والتقابض أي بأن يبيع أحدهما بجنس الآخر فلا بد لصحته من التساوي وزنا ومن قبض البدلين قبل الافتراق''۔

ہدایہ اور بحر کی عبارت اتحاد جنس کی صورت میں قبض البدلین فی المجلس کے لزوم کو بتاتی ہیں۔ اس لیے یہ عبارات بطور دلیل نقل کرنے میں مقالہ نگار موصوف سے تسامح ہوا ہے، البتہ (ہدایہ ۳/ ۱۰۴)''بأن باع الذهب بالفضة جاز'' اور (ہندیہ ۳/ ۲۱۸) کی عبارات: ''وإن لم يكونا من جنس واحد بان باع الذهب بالفضة يشترط التقابض فيه ولا يشترط التساوي كذا في التبيين''، اختلاف جنس کی صورت میں قبض البدلین فی المجلس پر صریح ہیں۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اولاً کاغذی کرنسی کی ثمنی حیثیت پر بحث کی ہے اور اس سلسلے میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی تحقیقات (اسلام اور جدید معیشت و تجارت ص ۹۵/ تا ۱۰۴) کو سامنے رکھا ہے، نیز متعدد بڑی اور مصدری کتب کی عبارات فقہیہ سے اپنے موقف کو مبرہن کرتے ہوئے فلوس کے سلسلے میں شیخینؒ اور امام محمدؒ کے اختلاف کو بیان کر کے امام محمدؒ کے قول کو راجح قرار دیا، موصوف کا کہنا ہے کہ روپیہ یا کاغذی کرنسی ثمن ہے اگر چہ وہ عرف کی بنیاد پر ثمن بن گیا ہے، اس لیے ثمن کا جب ثمن سے تبادلہ ہوگا تو عقد صرف ہی ہوگا جس میں عوضین میں کمی زیادتی تو درست ہے لیکن ادھار ممنوع ہے، جہاں تک ثمن خلقی اور غیر خلقی کی بات ہے تو اس سے بیع الثمن بالثمن کی بنا پر عقد صرف کے اطلاق میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔ اس تعلق سے علماء عرب کا موقف بیان کرتے ہوئے کہا کہ: ''سونا چاندی کے ثمن خلقی ہونے پر کوئی دلیل شرعی موجود نہیں، یہ ایک بات ہے جو صدیوں سے مشہور چلی آرہی ہے، ورنہ سونا چاندی کی ثمنیت بھی عرف و اعتبار ہی پر مبنی ہے، ان کی ذاتی قیمت ملحوظ نہیں ہے''۔

پھر امام مالکؒ کا قول نقل کیا: '' ولو ان الناس اجازوا بينهم الجلود حتى يكون لها سكة وعين لكرهتها ان تباع بالذهب والورق نظرة'' (المدونۃ الکبری کتاب الصرف ۳/ ۵)۔

ثمن کے سلسلے میں (مجموع الفتاوی ۲۹ / ۲۵۱) سے علامہ ابن تیمیہؒ کا بھی یہی خیال نقل کیا، نیز قرار ھیئۃ کبار العلماء، مکہ مکرمہ (رقم ۱۰ وتا ریخ ۱۷ / ۸ / ۱۳۹۳ھ) اور اسی طرح مجلس مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ کی قرارداد کو نقل کیا۔

''فان مجلس المجمع الفقهی الاسلامی، یقرر ان العملة الورقية نقد قائم بذاته، له حكم النقدين من الذهب والفضة، فتجب الزكوة فيها ويجرى الربا عليها بنوعيه، فضلًا ونسيًا كما يجرى ذالك فی النقدين من الذهب والفضة تماما، باعتبار الثمنية فی العملية الورقية قياسا عليهما... الخ'' (مجلة مجمع الفقه الاسلامی التابع المنظمة المؤتمر الاسلامی بجدة ۳/ ۹۵۱/ المؤلف تصدر عن منظمة المؤتمر الاسلامی بجدة)۔

پہلے موقف کے قائلین نے بھی روپیہ کو فلوس پر قیاس کیا ہے لیکن ان سب نے شیخینؒ کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے صورت مسئلہ کو عقد صرف سے خارج مانا ہے۔ موصوف نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے کہا کہ: ''اگر شیخینؒ کا قول اختیار کیا جائے تو ایک ہی ملک کی کرنسیوں کی باہم خرید وفروخت کو کمی بیشی کے ساتھ جائز کہنا پڑے گا، اور ربا کا دروازہ کھل جائے گا'' (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

☆ **تیسرا موقف:** عقد صرف نہیں ہے اور عوضین ادھار ہوں تو بھی معاملہ درست ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد نے مختلف مذاہب کی کتب (بدائع ۴/ ۴۵۳ کتاب الصرف، ردالمحتار ۴/ ۲۶۱، المدونۃ الکبری ۳/ ۳۳۳، التاخیر فی الفلوس، تحفۃ المحتاج ۴/ ۳۰۴، المغنی لابن قدامہ ۴/ ۱۴۲، موسوعہ ۳۲/ ۲۰۶، مادہ: فلس) کے حوالے سے علت ربا اور کرنسی کی حیثیت پر تفصیلی اور تحقیقی کلام کرتے ہوئے حنفیہ اور شوافع وحنابلہ کے مسلک کے پیش نظر کہا کہ ''موجودہ کرنسیاں ثمن ضرور ہیں مگر خلقی نہیں بلکہ عرفی واصطلاحی ہیں اس لیے ان کا شمار اموال ربویہ میں نہیں ہوگا''، اس کے بعد امام محمدؒ اور امام مالکؒ کے موقف کو نقل کر کے مشائخ ماوراء النہر کے فتوی کو بیان کیا۔

''لم يُفْتَوْا بجواز ذالك، أی: بيعها بجنسها متفاضلا فی العدالی والغطارفة مع أن الغش فيها أكثر من الفضة: لأنها أعز الأموال فی ديارنا فلو ابيح التفاضل فمنها يفتح باب الربا الصريح فإن الناس حينئذ يعتادون فی الأموال النفيسة فَيَتَدَرَّجُونَ ذالك فی النقود الخالصة فمنع حسبا لمادة الفساد'' (ردالمحتار علی الدر ۴/ ۲۶۷)۔

اس اقتباس کے ساتھ امام محمدؒ کے فیصلے کو مزاج شریعت سے ہم آہنگ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں ''اگر ایک ملک کی کرنسی کا آپس میں تبادلہ ہو تو نفیس ہونے کی وجہ سے تفاضل کی گنجائش نہیں دینی چاہئے''، یعنی موصوف شیخینؒ کے مسلک کے مطابق مسئلے کو فلوس پر قیاس کرتے ہوئے سونے چاندی کو روپیوں سے خرید وفروخت کو عقد صرف نہیں مانتے ہیں، لیکن ربا کا دروازہ نہ کھل جائے اس لیے روپیوں کے باہم تبادلے کے وقت، فلوس کے سلسلے میں امام محمدؒ کے قول کو اختیار کرتے ہیں۔

مولانا روح الامین نے مختلف ناحیے سے ثمن کی قدیم وجدید کیفیات وشکلوں کو بسط وتفصیل سے بیان کیا، اور معاملے کو عقد صرف سے خارج قرار دے کر احد البدلین پر قبضہ کو ضروری قرار دینے کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا کہ اگر متعین زیور خریدنا ہو تو ایسی صورت میں احد العوضین پر بھی قبضہ ضروری نہیں ہے، اس سلسلے میں علامہ سرخسیؒ کا درج ذیل قول نقل کیا:

''وإن اشتری خاتم فضة أو خاتم ذهب، فيه فَصٌّ أو ليس فيه فص بكذا فلوسا وليست الفلوس عنده فهو جائز إن تقابضا قبل الإفتراق أو لم يتقابضا، لأن هذا بيع، وليس بصرف فانما افترقا عن عين بدين، لأن الخاتم يتعين بالتعيين بخلاف ما سبق، فإن الدراهم والدنانير لاتتعين، فلها شُرِطَ هنالك قبضُ أحدِ البدلين'' (المبسوط للسرخسی باب البيع بالفلوس ۱۴/ ۲۵) (مقالہ: مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

☆ **چوتھا موقف:** عقد صرف ہے، لیکن معاملہ درست ہے۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی صاحب معاملے کو عقد صرف مانتے ہیں، ''... فانَّ المُصَوَّغ بسبب ما اتصل به من الصَّنْعَةِ لم يبقَ ثمنا صريحا ولهذا يتعين فی العقد ومع ذالك بيعه صرف'' (البحرالرائق ۶/ ۲۲۱)۔

لیکن ادھار خرید وفروخت کو درست مانتے ہیں '' بخلاف غیرهما فإن الوزن فيه بالتعارف فيخرج عن كونه موزونا بتعارف عدديته إذا صيغ وصنع كذا في فتح القدير'' (البحر الرائق ۶/ ۲۲۳). ''فالصواب إسقاط قوله: ''وزنا'' والاقتصار على قوله '' فإنه يجوز'' (منحة الخالق على البحر الرائق ۶/ ۲۲۳)۔

لکھتے ہیں: ''کرنسی نوٹ سونے کا وثیقہ یا رسید اور علامتی ثمن بھی نہیں ہے، بلکہ تمام تر علیحدہ حیثیت کا حامل مستقل ثمن ہے، جس کو زر قانونی اور فلوس نافقہ اور دھات کے سکے کے درجے میں رکھا گیا ہے، لہذا سونے یا چاندی کی روپے سے خریداری نسیئۃ یعنی ادھار بھی جائز ہے، اس اعتبار سے یہ 'بیع سلم' سے قریب تر حکم میں ہے''، موصوف کے موقف پر اشکال ہوتا ہے کہ 'الاثمان المصوغ'' پر قیاس کر کے معاملے کو عقد صرف مانا اور پھر موجودہ کرنسی کو، ادھار خرید وفروخت کے معاملے میں کرنسی کی حیثیت ''الاثمان المصوغ'' سے مختلف قرار دیا، اس دوسری صورت میں یہ عقد صرف کیسے ہو گیا؟

٭ چار مقالہ نگاروں نے اپنا کوئی واضح موقف نہیں بیان کیا۔

مفتی فیض احمد محمود برمارے حسینی لکھتے ہیں: ''اگر.....روپیوں اور کرنسی کی حیثیت سونے اور چاندی کی ہی ہوگی جیسا کہ زکوۃ کے باب میں روپیوں کو سونے چاندی کے قائم مقام مان کر روپیوں پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، تو پھر عوضین میں سے کسی ایک کا ادھار رکھنا درست نہیں''، اس کے بعد روپیوں کی دوسری جہت کو سامنے رکھتے ہوئے کہتے ہیں: ''اگر روپئے اور کرنسی کو سونے چاندی کے طور پر تسلیم نہ کیا جائے تو روپئے کے عوض سونے چاندی کی بیع پر نہ بیع صرف کا اطلاق ہوگا اور نہ اس میں بیع صرف کی شرائط کی رعایت ضروری ہوگی...... اس اعتبار سے اگر کوئی روپئے کے بدلے سونا خریدتا اور قیمت ادھار رکھتا ہے تو اس کی گنجائش ہے''۔

قاضی عبد الجبار طیب ندوی نے سود کی حرمت پر آیات قرآنیہ نقل کرنے کے بعد عوضین پر مجلس عقد پر قبضہ کو ضروری قرار دیا اور احد العوضین کے ادھار ہونے کی صورت میں کہا ''سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد اور دوسرا ادھار ہو یہ جائز نہیں کیوں کہ سونے کو سونے سے اور چاندی کو چاندی سے یا اس کے قائم مقام دوسرے کسی اور ثمن سے خرید وفروخت جائز ہونے کے لیے فریقین کی طرف سے اپنے عوض پر الگ ہونے سے پہلے قبضہ حاصل کرنا ضروری ہے''، پھر مسلم کی روایت نقل کی: ''فإذا اختلف هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد'' (مسلم: ۱۵۸۷، نصب الرایة ۴/۴۳، ۴۴) اور پھر (فتاوی اللجنة الدائمة ۱۳/ ۴۶۶) کی ایک عبارت نقل ہے:

'' إذا كان الثمن الذي اشتراه به مصاغ الذهب ذهبا أو فضة أو يقوم مقامهما من الأوراق النقدية أو مستندا ائتمانيا لم يجز. بل هو حرام لما فيه من ربا النسيئة''۔

اس اقتباس سے متصل اپنی ابتدائی تحریر کے برعکس کہتے ہیں: ''لہذا سونا چاندی اور کرنسی مختلف الاجناس ہوئے، جب جنس مختلف ہو تو اس وقت مجلس میں کم سے کم ایک طرف سے قبضہ ضروری ہوتا ہے'' (مقالہ: قاضی عبد الجبار طیب ندوی)۔

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی اپنے تفصیلی مقالے میں روپے کو ثمن عرفی مانتے ہوئے اس طرح کے عقد کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں (البحر الرائق ۶/ ۲۱۱، رد المحتار ۵/ ۲۵۹، بدائع الصنائع ۵/ ۲۳۷) وغیرہ سے عبارتیں نقل کی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی امام مالکؒ کے مسلک (المدونة الکبری ۳/ ۵) کو سامنے رکھتے ہوئے کہتے ہیں: ''اس لیے بہتر یہ ہے کہ روپے کے ذریعہ سونا چاندی نقد خریدے'' (مقالہ: مفتی محمد شاہجہاں ندوی)۔

مفتی عبد الرحیم قاسمی نے اپنا کوئی واضح موقف ظاہر کرنے کے بجائے کچھ فقہی عبارات کے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے، البتہ موصوف کے ذریعہ نقل کی گئی عبارات فقہیہ سے ان کا رجحان معاملے کو عقد صرف کے دائرے سے خارج ہونا معلوم ہوتا ہے، نیز مبسوط کی عبارت ذیل نقل کرنے کے بعد فقہ البیوع کی جو عبارت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر زیور متعین اور متشخص ہو تو عوضین میں سے کسی پر بھی قبضہ کرنا ضروری نہیں۔

'' على مذهب الإمام محمد فإنه يجوز شراء حلي الذهب والفضة بالنقود الورقية نسيئة بشرط أن يكون بسعر يوم العقد ولا يشترط فيه التقابض بل لا يشترط قبض الحلي الحقيقي وإنما يكفي تعيين الحلي لأن النقود الورقية في حكم الفلوس في أحكام الصرف فقط وشراء الحلي بالفلوس لا يشترط فيه التقابض'' (فقه البيوع ۲/ ۷۶۳)۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ: پہلا موقف بغیر کسی شرعی قباحت کے درست ہے۔

سوال نمبر (۱) جزء ب: کیا یہ بات درست ہوگی کہ سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر کومیکس کولڈ مارکیٹ یا ہندوستان کی سطح پر یہاں کی مارکیٹ MC نے طے کیا ہو، اس سے زیادہ یا کم قیمت میں خرید وفروخت کی جائے، اور کیا اس صورت پر ربا تفاضل کا اطلاق ہوگا؟ اس سلسلے میں واضح طور پر تین موقف ہیں۔

☆ **پہلا موقف**: ربا تفاضل ہے، مولانا ابوسفیان مفتاحی کا خیال ہے کہ "صورت مسئولہ میں درست نہیں اور اس صورت پر ربا تفاضل کا اطلاق ہوگا"، اپنے اس موقف پر کوئی دلیل نہیں بیان کی ہے، جب کہ اختلاف جنس کی صورت میں اثمان کی کمی زیادتی کے ساتھ باہم بیع وشراء پر عوضین پر قبضہ فی المجلس کی متعدد دلیلیں پیش کی ہیں۔

☆ **دوسرا موقف**: تسعیر کے سلسلے میں اولی الامر سے متعلق شرعی ہدایات کو بیان کرتے ہوئے قانونی دائرے میں کاروبار کو انجام دینا بہتر قرار دیا گیا ہے، ساتھ ہی مارکیٹ ریٹ یا حکومتوں کے ذریعہ مقررہ قیمتوں میں کمی بیشی سے عقد میں ربا تفاضل کے عدم تحقق کی بنا پر صحت عقد میں تمام مقالہ نگار متفق ہیں۔

"عن انس قال الناس: یا رسول اللہﷺ غلا السعر فسعر لنا. فقال رسول اللہﷺ: إن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق وانی أرجوأن القى الله وليس أحد منكم يطالبني بمظلمة في دم ولا مال" (سنن ابی داؤد برقم الحدیث: ۳۴۵۶، ترمذی: ۱۳۱۴، ابن ماجہ: ۲۲۰۰) (قاضی عبدالجبار طیب ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا نعمان انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی، مولانا عمر امین الہی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا محمد سعد نور القاسمی، ناچیز محمد اشرف قاسمی گونڈوی)۔

"إلا أن تكون تجارة عن تراضٍ منكم" (سورۂ نساء: ۲۹) (مقالہ: قاضی عبدالجبار طیب ندوی)۔

"ولا ينبغي للسلطان ان يسعر على الناس" (حاشیہ ہدایہ ۳/ ۴۵۵)
(مفتی انور علی الاعظمی، مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری) (بحوالہ بدائع ۵/ ۱۶۸، مولانا نعمان انور اعظمی، مولانا محمد سعد نور القاسمی بحوالہ تکملہ ۸/ ۴۹۲)

"المالك هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء" (بیضاوی شریف ۱/ ۷، فاتحہ) "لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه" (ترمذی شریف ۲/ ۵۰) (مولانا ابوالمکارم معروفی گورینی، مولانا عبدالحی مفتاحی)۔

"قال رسول الله ﷺ لايبيع حاضر لباد دعوا الناس يرزق الله بعضهم من بعض" (ترمذی: باب ماجاء لايبيع حاضر لباد برقم الحديث: ۱۳۱۴) (مقالہ: مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی)۔

"إذاكان فعل الإمام مبنيا على المصلحة فيما يتعلق بالأمور العامة لم ينفذ أمره شرعا إلا إذا وافقه فإن خالفه لم ينفذ" (الاشباہ النظائر / ص ۳۱۲) (مفتی عبدالباسط پالنپوری)۔

"إذا تعدى أرباب الطعام في القيمة تعديا فاحشا فلا بأس به أي بالتسعير" (مجمع الأنہر ۲/ ۵۴۸)
(قاضی عبدالجبار طیب ندوی، مولانا سعد نور قاسمی (بحوالہ درمختار علی الرد ۵/ ۲۵۶) مفتی محمد شاہد حسین، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی)۔

"ولا يسعر بالإجماع إلا إذا كان أرباب الطعام يتحملون و يتعدون من القيمة وعجز القاضي عن صيانة حقوق المسلمين إلا بالتسعير فلا بأس به بمشورة أهل الرای و البصر هو المختار وبه يفتي" (فتاوی ہندیہ ۳/ ۲۲۰.۵/ ۲۷) (مولانا عمر امین الہی، مولانا محمد سعد نور القاسمی (بحوالہ ہدایہ مع التکملۃ ۸/ ۴۹۲، شامی ۹/ ۵۳۷ زکریا)۔

"إن كل من أضر بالعامة حبسه فهو احتكار ولو ذهبا أوفضة أو ثوبا" (شامی ۹/ ۵۷۳)۔

مولانا عمر امین الہی نے مختلف اشیاء کے احتکار کے سلسلے میں فقہاء کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے امام محمدؒ کے قول کے مطابق، سونا چاندی کی ذخیرہ اندوزی پر روک لگانے کے لیے حکومتوں کی طرف سے مقررہ قیمتوں کی پابندی کا رجحان ظاہر کیا ہے (مقالہ: مولانا عمران الہی)۔

"فإن سعر قباء الخباز بأكثر مما سعر جاز بيعه كذا في فتاوى قاضي خان ومن باع منهم بما قدر الإمام من الثمن جاز بيعه كذا في التاتارخانية" (فتاوی ہندیہ ۳/ ۲۱۴)

(مولانا فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد سعد نور قاسمی، مفتی محمد شاہد حسین، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی)۔

'' فإذا فعل ذالك رجل عن ذالك وباع بأكثر منه أجا زه القاضيٰ وهذا ظاهر عندا بي حنيفة لأنه لايرِ الحجْرَ على اخر وكذا عندهما '' (بدایہ ۴/ ۲۷۲) (مقالہ: مفتی خورشید انور اعظمی بنارس)۔

'' ذهب الحنفية والحنا بلة والشا فعية الأصح إلى أن من خا لف التسعير صح بيعه '' (مو سوعہ فقهيه ۱۱/ ۳۱۰) (مقالہ: مولانا عمر امین الہی)۔

''وان باع الذهب با لفضة جاز التفا ضل لعدم المُجا نَسَةِ'' (ہدایہ کتاب الصرف ۳/ ۱۰۴) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی)۔

''وللبائع أن يبيع بِضَاعَتَهٗ بما شاء من ثمن ولا يجب عليه أن يبيعه بسعرالسوق دائما وللتجار ملاحظة مختلفة في تعيين الا ثمان وتقديرها'' (القضاياالفقهيه المعا صرة / ص۸، كراتشي) (مقالہ: مولانا عمران بن دین محمد پالنپوری، مفتی عبدالباسط پالنپوری)۔

مفتی ذکاء اللہ شبلی صاحب حکومت یا مارکیٹ کی طرف سے طے کردہ قیمت میں کمی وبیشی سے خرید وفروخت کو جائز کہنے کے ساتھ ہی ضرورت مند کو کسی کی مقررہ داموں کی پابندی سے آزاد ہو کر اپنی مرضی وسہولت کے مطابق عقد کرنے کو''ایسر علی الناس'' قرار دیتے ہیں۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مفتی عبدالمنان، قاضی عبدالجلیل قاسمی، ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مفتی فیاض احمد محمود برمارے (شافعی)۔

☆ **تیسرا موقف:** ربا تفاضل نہیں ہوگا لیکن تسعیر کی مخالفت کی وجہ سے اس طرح معاملہ کرنا ناجائز ہے۔

مفتی عبداللہ خالد صاحب نے صحت عقد کے ساتھ ہی اطاعت امیر کے سلسلے میں بین القوسین جملوں کا اضافہ کرتے ہوئے، حضرت مفتی محمد تقی عثمانی کی ایک تحریر پیش کی ہے:

''لہذا اس کے لیے حکومت کے اس حکم کی مخالفت کرنا تو جائز نہیں (بشرطیکہ اسلامی حکومت ہو اور اسلامی اصول کی پابند ہو آج کل کی حکومتوں کی طرح نہ ہو) لیکن دوسری طرف اس زیادتی کو سود کہہ کر حرام کہنا بھی درست نہیں'' (فقہی مقالات ۱/ ۴۰)، مفتی نثار احمد گودھروی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی روح اللہ قاسمی (بحوالہ فتاوی عثمانی ۳/ ۱۴۸)، مولانا محمد سعد نور القاسمی، مولانا روح الامین مقالہ صفحہ ۲۰ (بحوالہ فقہ البیوع ۲/ ۷۳۸)، مولانا محمد شاکر اعظمی مدنی (بحوالہ اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۵۲)، مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی (بحوالہ اوراق احکام النقود والمعاملات ۲/ ۱۹۰۸)، مفتی محمد عثمان بستوی گورینی (بحوالہ انعام الباری ۶/ ۳۴۱)، موصوف کے نزدیک ''سرکاری ریٹ سے کم وزیادہ بیچنا ربو تو نہیں لیکن تسعیر کی خلاف ورزی ہے، حتی الوسع تسعیر کی پابندی کرنی چاہئے''، اسی کے قائل قاضی عبدالجبار طیب ندوی ہیں، مفتی محمد شاہد حسین نے صحت عقد کے ساتھ امیر کی عدول حکمی کی وجہ سے قابل تعزیر بتلایا (بحوالہ درمختار/ص ۵۷۴)۔

مفتی جنید بن محمد پالنپوری، اطاعت امیر کے سلسلے میں (احکام القرآن للعلامۃ ظفر احمد العثمانی ۲/ ۲۹۱، تفسیر مظہری ۲/ ۱۵۲، الجامع لاحکام القرآن ۵/ ۲۵۹) سے تصریحات نقل کرنے کے ساتھ ہی الدر المختار کی درج ذیل عبارت بھی پیش کی ہے:

''تجب طاعة الا مير فيما ليس بمعصية'' (الد رالمختا ر ۲/ ۱۷۲)۔

اور لکھا کہ ''جن ملکوں میں سرکاری طور پر مقررہ نرخ کی مخالفت قانونا جائز نہیں ہے تو وہاں اس نرخ سے کمی بیشی کرنا سود تو نہیں ہوگا، لیکن ملکی قوانین کی مخالفت اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنے کی وجہ سے جائز نہیں ہوگا'' (مقالہ: مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی عبدالباسط پالنپوری مولانا سعد انور قاسمی (بحوالہ شامی ۵/ ۱۹۶)۔

☆ **چوتھا کوئی واضح موقف نہیں ہے۔** مفتی عبدالرحیم قاسمی صاحب نے صورت مسئولہ پر اپنی رائے کا اظہار کرنے کے بجائے، روپیوں سے سونے چاندی کے ادھار معاملے میں، صحت عقد کے لیے مارکیٹ ریٹ کی قیمتوں پر معاملے کو طے کرنا ''شرط'' قرار دینے والی عبارتیں (کتاب فقہ البیوع ۱/ ۴۳۰، اور ۲/ ۷۴۸) سے نقل کی ہیں، دوسری عبارت یہ ہے:

'' واماما يخشى من الاحتيال على الربا في جواز النسئية فقد يُنْسَدُّ بَابُهُ با شتراط سعر المثل يوم العقد كما بينا''
(فقه البیوع ۲/ ۷۴۸)

سوال یہ ہے کہ اگر نقد معاملہ ہو تو مارکیٹ ریٹ یا حکومت کے ذریعہ مقرر کردہ قیمتوں میں کمی زیادتی پر ربا تفاضل کا اطلاق ہوگا کہ نہیں؟ جہاں تک بازاری قیمتوں کے معتبر ہونے کی بات ہے تو ثمن مثل کی اصطلاح پہلے سے موجود ہے۔ ثمن مثل کے خلاف عاقدین کوئی معاملہ کریں تو بھی معاملہ درست ہو جاتا ہے، زیر بحث مسئلے میں بازاری ریٹ سے مراد ثمن مثل نہیں ہے بلکہ حکومتوں یا سرمایہ داروں کی طرف سے عام کاروباریوں کی رضا کو سلب کرنا پایا جاتا ہے، یہ آزاد بازار کی ریٹ نہیں ہے، جسے تنازع ختم کرنے یا ربا کا دروازہ بند کرنے کے لیے ضروری قرار دیا جائے۔

بندہ کا خیال ہے کہ دوسرا موقف درست ہے۔ کیوں کہ اختلاف جنس کی وجہ سے اس عقد میں ربا تفاضل کا تصور بھی نہیں پایا جاتا، عام حالات میں حکومتیں لوگوں کو لازمی طور پر نرخ کی پابند نہیں بناتیں ہیں، بلکہ حکومتیں مخصوص قیمت پر اشیاء کی خرید کرتی ہیں جس سے بازار میں ان اشیا کا تقریبی ریٹ جاری ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ ایم پی اسٹیٹ گورنمنٹ، مختلف فصلوں (گیہوں سویابین) کی خاص قیمت میں خریداری کرتی ہے، اور اپنی خریدی ریٹ پر عام کاروباریوں کو عام لوگوں سے بیچنے اور خریدنے کا پابند نہیں کرتی ہے، پھر وہی قیمت بازار میں چل پڑتی ہے جس سے کسان نقصان سے بچ جاتے ہیں اور ساتھ ہی عام افراد غبن فاحش کا شکار نہیں ہوتے، اس میں اطاعت امیر کی مخالفت بھی نہیں پائی جاتی ہے، نیز اس سلسلے میں راقم الحروف نے (سوال نمبر ۷) کے جواب میں الاشباہ والنظائر سے ایک اقتباس نقل کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: امیر کی اطاعت کے لازم ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں:

۱- اس قانون سے عوام کو فائدہ ہو، نقصان نہ ہو۔

۲- تاجر کے کاروبار میں حکومت کی طرف سے مادی و قانونی امداد و تحفظ فراہم ہو۔

ان دو شرطوں کے پائے جانے کی صورت میں تسعیر کی مخالفت پر گناہ ہوگا لیکن پھر بھی عقد جائز و نافذ ہو جائے گا۔

سوال نمبر (۲)- زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ وزن میں سونا لیتے ہیں اور چند دنوں میں اس کے بدلے سونے سے بنائے ہوئے زیورات انہیں واپس کرتے ہیں، انہیں الگ سے کوئی اجرت نہیں دی جاتی؛ بلکہ زیورات کی شکل میں سونے کی اتنی ہی مقدار انہیں واپس کرنی ہوتی ہے، جتنی انہوں نے لی تھی؛ البتہ سونے کا زیور بنانے میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، اس آمیزش کے بقدر سونا ان کو بچ جاتا ہے اور زیور بنانے میں سونے کے کچھ ذرات نکل آتے ہیں، یہی ان کی اجرت ہوتی ہے، سوال یہ کہ:

الف: سونے کے لین دین میں مقدار کا جو یہ فرق ہو رہا ہے، اسے بیع تصور کیا جائے یا اجارہ؟

ب: کیا اجرت کی یہ شکل درست ہوگی کہ زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جائیں، وہی اجرت قرار پائے؟

جواب۔ اس سلسلے میں مجموعی لحاظ سے نو آراء ہیں۔

☆ **پہلا موقف:** بیع ہے اور جائز ہے، قاضی عبدالجبار صاحب طیب ندوی کے نزدیک (الف) بیع ہے۔ اور (ب) '' تاجر کی طرف سے سونے کو ثمن اور دھات کو بیع (مبیع، اشرف) مان لیا جائے تو معاملہ درست ہو جائے گا؛ لیکن کاریگر کی جو محنت ہے اس محنت کو یہاں کاریگر کی طرف سے تاجر کے لیے پیشکش (آفر) ماننا پڑے گا، اس لئے کاریگر سونے کے ذرات کو لے سکتا ہے''، مقالہ ص ۵/ نقل کردہ موصوف کی تحریر میں '' پیشکش (آفر)'' الفاظ، نیز '' اجرت'' توضیح طلب ہیں؟

☆ **دوسرا موقف:** بیع ہے اور عقد ناجائز ہے۔ مولانا شاکر نثار اعظمی قاسمی (الف) بیع تصور کرتے ہوئے معاملے کے عدم جواز پر کہتے ہیں '' مذکورہ بالا صورت میں ایک طرف زیادہ سونا اور دوسری طرف کم سونا ہے جو شریعت اسلامیہ کی رو سے سراسر ناجائز ہے، بلکہ عین ربا ہے''، اتحاد جنس کی صورت میں ردی و جید سونے کے باہم تبادلے پر مساوی الوزن مقدار میں قبضہ فی المجلس سے متعلق عبارتیں نقل کی ہیں:

'' وماغلب فضته وذهبه فضةٌ وذهبٌ حكما. فلا يصح بيع الخالص به ولا بيع بعضه ببعض إلا متساويا'' (ردالمحتار ۷/ ۵۲۱،۵۲۲)

☆ **تیسرا موقف:** بیع ما نہیں یا اجارہ، معاملہ بہر صورت ناجائز ہے۔ مفتی روح اللہ قاسمی نے اپنے مقالہ میں لکھا: '' یا پھر تماثل و تقابض فی المجلس ہو، ورنہ

بیع مانیں یا اجارہ بہر صورت یہ ناجائز ہیں"، عدم جواز پر درج ذیل فقہی تصریحات نقل کی ہیں:

"وجمهور الفقها على أنه لا اعتبار بالصياغة والصناعة أيضا فيدخل في إطلاق المساوات المصوغ بالمصوغ التبر بالآنية. فعين الذهب والفضة وتبرهما ومضروبهما وغير المضروب منهما والصحيح منهما والمكسور كلها سواء في جواز بيعها مع التماثل في المقدار وتحريمه مع التفاضل" (موسوعة: الصرف، شروط الصرف. انواع الصرف. رقم: ۲۲) (مقالہ: مولانا روح الامین بحوالہ المغنی لابن قدامہ/ص ۶۰)۔

موصوف نے علامہ کاسانی کی درج ذیل تصریح بھی نقل کی ہے:"فإن كانت الفضة فيها هي الغالبة:... فحكمها حكم الفضة الخالصة. لايجوز بيعها بالفضة الخالصة إلا سواء بسواء" (بدائع الصنائع ۶/ ۴۲۳)۔

مفتی عبدالحی مفتاحی، جزو (الف) پر خاموش ہیں۔اور (ب) سے متعلق لکھتے ہیں:

"اگر سونا اور آمیزش کی جانے والی دھات دونوں ہی چیزیں تاجر کی ہیں تو اس صورت میں سونے کے بچے ہوئے ذرات کو اجرت قرار دینا درست نہیں ہے، کیوں کہ یہ قفیز طحان کی صورت ہے،......اور اگر آمیزش کی جانے والی دھات زیورات بنانے والے کاریگروں کی طرف سے ہے تو یہ ایک قسم کی بیع ہے گویا کہ دھات کے بدلے میں سونے کے ذرات ہیں اور یہ صورت جائز ہونی چاہئے" (مقالہ: مفتی عبدالحی مفتاحی)۔

ڈاکٹر محی الدین نے بیع یا اجارہ کی وضاحت کرنے کے بجائے معاملے کے (ب) عدم جواز کی وجہ بتایا کہ "غرر کثیر ہے"۔

☆ **چوتھا موقف:** (الف)- عقدِ صرف ہے، "اس لیے تقابض فی المجلس ضروری ہے" (مولانا نثار احمد گودھروی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا عمر امین الہی، مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

☆ **پانچواں موقف:** اجارہ ہے، صحت عقد چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔

مفتی محمد سلمان پالنپوری نے معاملے کو اصالۃ اجارہ اور تبعاً بیع قرار دیا ہے، صورتِ مسئولہ میں صفقۃ فی صفقۃ والی نص کو "عام مخصوص منہ البعض" قرار دے کر اپنے خیال کے مطابق معاملے کو عقد اجارہ پر قیاس کرتے ہوئے دو شرطوں کے ساتھ جائز بتلایا

۱- اس کا عرف عام اور تعامل ہو۔

۲- آمیزکی جانے والی دھات کی مقدار متعین ہو اور ذرات کی مقدار طے ہو کر اجرت معلوم ہو (مفتی عبدالباسط پالنپوری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

"البحرالرائق" کی درج ذیل عبارت سے مبرہن کیا ہے:

"والجهالة إنما تمنع إذا أفضت الى المُنَازَعَةِ" (البحرالرائق ۸/ ۲۲)۔

☆ **چھٹا موقف:** اجارہ فاسد ہے، مولانا ابوسفیان مفتاحی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی عبدالمنان صاحب کے نزدیک (ب) اجرت مجہول ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

"وتفسد (الإجارة) بجهالة المسمى كله أو بعضه، كتسمية ثوب أو مائة درهم على أن يرمها المستأجر لصيرورة المرمة من الإجارة. فيصير الأجر مجهولا. وتفسد بعدم التسمية أصلا.... فإن فسدت بالأخيرين بجهالة المسمى وعدم التسمية وجب أجر المثل" (الدر مع الرد الاجارة الفاسدة ۹/ ۶۶)

(مولانا شاکر نثار اعظمی قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری)۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی کے نزدیک "ذرات کو واپس کرنا لازم ہے۔اب اس کی اجرت الگ سے دی جائے"، یہی رائے مفتی مقصود علی فرقانی اور مفتی انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور کی بھی ہے۔مولانا محمد ظفر عالم ندوی کے نزدیک "اجرت مثل واجب ہوگی"۔

☆ **ساتواں موقف:** حیلۂ جواز- مولانا اختر امام عادل قاسمی نے جواز کی صورت یہ بیان کی ہے کہ: "یہ صورت ممکن ہے کہ قبل سے تیار شدہ زیورات سونا تاجروں کے پاس لے جائیں اور ان کے وزن کے مطابق ان کے بدلے سونا لے لیں"۔

مفتی جنید بن محمد پالنپوری (الف) معاملے کو بیع کے دائرے سے خارج مانتے ہوئے اجارہ فاسدہ قرار دیتے ہیں، ساتھ ہی (ب) معاملے کے درست ہونے کے لیے درج ذیل صورت بتلائی۔

''کاریگر سے یہ کہا جائے کہ ملائی جانے والی دھات کی نرخ کی بہ قدر (جو کہ معلوم و متعین ہوتی ہے) سونا آپ کو اجرت میں دیا جائے گا، بچی ہوئے سونے سے دیا جائے گا یہ شرط نہ ہو تو جائز ہو جائیگا'' (یہی صورت جواز مفتی عبداللہ خالد نے بھی بیان کی ہے)۔ اس پر فتاویٰ کی عبارت سے درج ذیل عبارت نقل کی ہے:

''وسئلت في مَنِ اسْتَأجر أرضا بيضاء للزراعة بكذا وكذا قفيزًا من الغلة هل يجوز ذالك؟ فأجيب: أنه يجوز اذا كانت الغلة مشارا إليها أو موصوفة في الذمة، ولا تكون من الغلة التي تخرج من زرع الأرض لسنة جرة'' (الفتاوى الكاملية، كتاب الاجارة / ص١٩١، بحواله فتاوى محموديه جديد ٢٢/ ٢٥٩)۔

مفتی محمد عثمان بستوی صاحب گورینی: نے صورت مسئلہ سے متعلق (الف) اجارہ، بیع مطلق، بیع صرف، تعاطی، سلم، استصناع، صفقتین فی صفقۃ، شرط مالا یقتضیہ العقد، قفیز طحان وغیرہ مختلف پہلوؤں پر نظر رکھ کر عقد میں بیع یا اجارہ ہر دو صورتوں میں پائی جانے والی محظورات سے بچنے کا راستہ بیان کرتے ہوئے آخر میں درج ذیل حیلۂ جواز بیان کیا ہے۔

''تاجر اپنے سونے کو کاریگر سے فروخت کر کے اپنا سونا حوالے کرے اور قیمت کو بقایا چھوڑ دے اور کاریگر جب اپنا زیور حوالے کرے تو اسی بقایا رقم کے عوض اس کا زیور اس سے خرید لے اس حیلہ کے اختیار کرنے میں شرعا کوئی گناہ بھی نہیں ہے''۔

''وذهب علمائنا أن كل حيلة يحتال بها الرجلُ لا بطال حق الغير فهي مكروهة وكل حيلة يحتال بها الرجلُ يتخلص بها عن الحرام أو ليتوصل بها إلى الحلال فهي حسنة'' (المحيط البرهاني ٢١/ ٦٧)۔

مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی شافعی، مفتی روح اللہ قاسمی نے بھی یہی حیلہ جواز بیان کیا ہے۔

مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی نے اجارہ قرار دیا لیکن چونکہ اجرت مجہول ہے تو اس کا حل یہ پیش کیا کہ: ''اجارہ صحیح ہونے کی صورت یہ ہے کہ زیور بنوانے کی اجرت الگ سے روپے میں طے کی جائے اور کاریگر بچا ہوا سونا تاجر یا اس کے مالک کو واپس کر دے، یا اگر سونے کی شکل میں اجرت لینا ہے تو اسے طے ہونا چاہئے کہ اجرت میں اتنا گرام سونا بنوائی لیں گے'' (مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مولانا عمران بن دین محمد پالنپوری)۔

مفتی عبداللہ خالد نے بھی (ب) محظورات سے بچنے کا طریقہ بتلایا ہے۔

(ب) ''اجرت پہلے سے طے کرلی جائے پھر بچے ہوئے ذرات کو محسوب کرلیا جائے، تو جائز ہے'' (مولانا عمر امین الہی، مولانا خورشید انور اعظمی مدنی)۔

☆ **آٹھواں موقف:** اجارہ قرار دے کر عرف عام و اجرت معلوم کی شرط کے ساتھ صحت کا موقف درج ذیل افراد نے اختیار کیا ہے:

مفتی عبدالرحیم، مفتی ذکاء اللہ شبلی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، بندہ محمد اشرف قاسمی گونڈوی، مولانا اشتیاق اعظمی قاسمی، کہتے ہیں: ''مذکورہ بالا صورت میں اجرت بالکلیہ مجہول نہیں بلکہ معلوم و متعارف ہے، اور جہالت یسیرہ، عقد اجارہ کے لیے موجب فساد نہیں ہوا کرتی'' (مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی، مفتی محمد شاہد حسین، مفتی عبدالباسط پالنپوری بحوالہ قدوری ص١٠٠/ ''اجارہ منافع بالعمل ہے'')، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی نے (الف) اجارہ مانا ہے، نیز اجرت معلوم ہونے کی وجہ سے متعدد کتب و فتاویٰ کے حوالے سے اس عقد کو درست ثابت کیا ہے۔

مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، اجارہ مانتے ہوئے اجرت معلوم میں جہالت یسیرہ کی وجہ سے، صحتِ عقد پر بدائع وغیرہ کی عبارتیں پیش کی ہیں:

''ومنها أن يكون المعقود عليه والمنفعة معلوما علمًا يمنع من المنازعة فإن كان مجهولا ينظر إن كانت الجهالة مفضية إلى المنازعة تمنع صحة العقد وإلا لا...'' (بدائع ٤/ ٤٢)۔

مولانا سعد نور قاسمی نے معاملہ کو (الف) بیع ماننے کی صورت میں پانچ خرابیاں ذکر کرکے اجارہ قرار دیا۔ اور (ب) مساقات مضاربت، مزارعت

استصناع پر قیاس کرتے ہوئے سونے کے ذرات کو بطور اجرت لینا جائز بتلایا ہے (مفتی عبدالباسط بحوالہ جدید فقہی مسائل ۴/۳۳۴ مفتی محمد شاہد حسین)۔

مولانا ظفر الاسلام صدیقی۔ (الف) اجارہ کا رجحان ظاہر کیا ہے۔ (ب) اپنا واضح موقف "جو ذرات بچ جائیں وہ سونار کی اجرت ہوں گی" بیان کر کے، مسئلے پر قفیز طحان والی روایت سے وارد ہونے والے اشکال وجواب کو مختلف کتب فقہیہ سے نقل کیا ہے۔

☆ **نواں موقف:** جنس بدل کر اجرت دینا بہتر ہے۔ ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی۔ (الف) اجارہ قرار دیتے ہیں۔ "تمليك المنفعة بعوض" (بدائع الصنائع ۴/۲۰۱) (مولانا خورشید انور اعظمی بحوالہ ہدایہ ۳/۲۳۰)، (ب) ساتھ ہی ذرات کی مقدار متعین ہونے کی صورت میں جواز اور مجہول کی صورت میں عدم جواز کے قائل ہیں، نیز ذرات کی مقدار معلوم ہونے کی صورت میں امام شافعیؒ کا مسلک بیان کیا کہ "زیور بنوانے والے کو جنس بدل کر اجرت دینی چاہئے"، اس پر مغنی کی درج ذیل اقتباس کو نقل کیا:

"ولا خير أن يصارف الرجلُ الصائغ الفضة بالحلي الفضة المعمولة، ويعطيه باجارته. لأن هذا الورق بالورق متفاضلا" (الأم ۳/۳۵، نووی المجموع ۱۰/۸۳)۔

☆ **دسواں موقف** واضح نہیں ہے، مفتی سلطان القاسمی نے (الف) اجارہ اور بیع دونوں احتمال ذکر کرتے ہوئے الگ الگ حکم بیان کیا (ب) (۱) دیئے گئے متعینہ سونے سے زیور بنائے تو اجارہ۔ لیکن ذرات کی مقدار مجہول ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہے، (مولانا روح الامین کے نزدیک تین صورتوں میں سے پہلی صورت ہے۔ متعین اجرت صنعت کا، کاری گر حق دار ہوگا)، (۲) اگر اپنے سونے کا زیور بنائے تو بیع ہے، اس میں تقابض (فی المجلس) اور تماثل واجب ہے۔

مولانا ابوالکارم معروفی صاحب بھی بیع اور اجارہ کی دونوں جہتوں کو اسی طور پر بیان کرتے ہیں۔ لیکن اجارہ کی صورت میں اجرت کی جہالت چوں کہ مفضی الی النزاع نہیں ہے اس لیے ان کے نزدیک معاملہ درست ہے۔ دوسری صورت میں بیع کی تعریف صادق آتی ہے، تاجر کی طرف سے دیئے گئے سونے پر بوقت قبضہ وعدۂ بیع کیا جائے اور زیور تیار ہوجانے کے وقت عقد بیع کیا جائے اور تقابض فی المجلس ہو، اس معاملے کو بیع الزیتون بالزیت اور بیع السمسم بالسرج کے مطابق قرار دینے کی کوشش کی ہے، لیکن چونکہ کاریگر کا قبضہ، قبضہ امانت ہے جو کہ قبضہ ضمان یعنی بیع کے لیے کافی نہیں ہے۔ اسی طرح اس کو عقد سلم کے مماثل قرار دے کر بھی دائرہ جواز میں نہیں لایا جاسکتا، کیونکہ اثمان میں سلم صحیح نہیں ہے (شامی ۷/۳۱۵)۔

مولانا روح الامین کے نزدیک تین صورتوں میں پہلی صورت جس میں سونا تاجر کا ہوتا ہے وہ اجارہ ہے، کاری گر متعین اجرت کا حقدار ہوگا، دوسری صورت یہ ہے کہ کاری گر تاجر کے بجائے اپنے سونے سے زیور بنائے تو دونوں کی طرف سونا ہوا، ایسی صورت میں تاجر سے لیا گیا سونا قرض ہوگا اور یہ بنا ہوا زیور کاریگر سے تاجر اپنے دیئے ہوئے سونے کے بدلے میں وصول کرے گا، "یہ صورت بھی پہلی صورت کی طرح ہوجائے گی، یعنی کاریگر متعین اجرت کا حق دار ہوگا"۔

دوسری صورت میں کاریگر اپنے سونے سے زیور تیار کرتا ہے اور اس کی قیمت روپیوں کی صورت میں وصول کرتا ہے تو یہ بیع ہے، اور عقد صرف سے خارج ہے، اور اگر سونے وغیرہ کی صورت میں وصول کرتا ہے تو تیار زیور کے ذرات یا اور کسی قسم کی مزدوری وغیرہ کو لینے کا حقدار نہیں ہوگا جتنا زیور دے رہا ہے اتنا ہی وزن سونا لینا جائز ہوگا، ہاں اگر زیور میں نگینہ وغیرہ جڑا ہوا ہے تو پھر زائد وزن پر بھی فروخت کیا جاسکتا ہے۔

مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی شافعی نے سوال نمبر ۲ جزء الف میں تو (صحیح غیر صحیح سے تعارض کئے بغیر) اجارہ کو ثابت کیا ہے، لیکن یہاں (جزء ب) کے بارے میں ساکت ہیں، شاید انہوں نے ماقبل میں آرڈر کے ذریعہ زیور بنوانے اور ادھار خرید وفروخت کی مروج سودی شکلوں میں سوال نمبر (۱) کے تحت اپنے حیلۂ جواز کے بیان پر اعتماد کرلیا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ عقد اجارہ ہے اور چوں کہ مذکورہ بالا صورت میں اجرت بالکلیہ مجہول نہیں بلکہ معلوم ومتعارف ہے، نیز سونے سے نکلنے والے ذرات، قفیز طحان کی طرح صانع کی محنت کا اثر نہیں ہیں بلکہ صنعت کے لیے لازمی طور پر نکلتے ہیں، اس لیے انہیں بطور اجرت صانع کو لینا جائز ہے، جیسا کہ آٹھواں موقف ہے۔

سوال نمبر ۳- عام طور پر سونے کے تاجر حضرات پرانے زیور کی قیمت کم متعین کرتے ہیں، مثلاً دس گرام سونے کو آٹھ گرام کے درجے میں رکھتے ہیں،

تو اگر سونے کے پرانے زیور کا نئے زیور سے تبادلہ ہو اور اس کی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سونے کا پرانا زیور زیادہ وزن کا لیا جائے اور سونے کا نیا زیور کم وزن میں اس کے بدلہ میں ادا کیا جائے تو کیا یہ صورت جائز ہے؟

جواب: اس سلسلے میں صاف طور پر چار خیالات ہیں:

☆ **پہلا موقف:** ربا تفاضل کی وجہ سے عقد نا جائز ہے۔ اکثر مقالہ نگاروں نے صورت مسئلہ میں ربا تفاضل ور بانسیئہ پائے جانے کی وجہ سے عدم جواز کا موقف اختیار کیا ہے۔ دلائل درج ذیل ہیں۔ مولانا محمد سعد نور قاسمی اور مفتی محمد سلطان القاسمی نے عدم جواز پر ''اعلاء السنن'' سے صورت مسئلہ سے مماثل، حضرت ابو رافعؓ کی روایات کو نقل کیا ہے:

''عن أبي رافع قال مر بي عمر بن الخطاب ومعه ورق فقال: اصنع لنا أوضاحا لصبي لنا. قلت يا أمير المؤمنين عندي أوضاح معمولة فإن شئت أخذتُ الورق وأخذتَ الأوضاح فقال عمر مثلا بمثل فقلتُ نعم فوضع الورق في كفة الميزان والا وضاح في كفة الأخرى فلما استوى الميزان أخذ بأحدى يديه أعطي با لأخرى'' (اعلاء السنن ۱۴/ ۲۸۸)۔

مفتی محمد سلطان القاسمی نے اعلاء السنن سے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت ابو رافعؓ کا واقعہ اردو میں نقل کیا ہے:

''حضرت ابو رافعؓ نے چاندی کے پازیب بیچے اور حضرت ابو بکرؓ نے بدلہ میں چاندی دی اور جب ترازو میں تولا تو پازیب کا وزن زیادہ تھا، حضرت ابو بکرؓ نے پازیب سے زائد وزن کو الگ کیا، تو حضرت ابو رافع نے کہا: اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! یہ آپ کے لیے حلال ہے، تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: اے ابو رافع اگر تم اس کو حلال کر دو تو اللہ اس کو حلال نہیں کرتا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ سونے کو سونے کے بدلے اور چاندی کو چاندی کے بدلے ہم وزن بیچو، زائد دینے اور زائد لینے والا دونوں جہنم میں ہوں گے''، عدم جواز پر یہ واقعہ قوی دلیل ہے۔ موصوف اگر واقعہ کو عربی میں نقل کرتے تو شاید یہ دلیل، مزید طاقتور بن جاتی۔

''أتي رسول الله ﷺ هو بخيبر بقلادة فيها خرز وذهب ومن المغانم تُباع. فأمر رسول الله ﷺ بالذهب الذي في القلادة فنزع وحده ثم قال لهم رسول الله ﷺ الذهب بالذهب وزنا بوزن'' (مسلم برقم الحديث: ۴۰۲۶)

(مولانا سعد نور القاسمی، مفتی ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مفتی انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور)۔

''وإن اختلفا جَوْدةً وصيا غة لقوله عليه السلام الذهب با لذ هب والفضة با لفضة ۔۔۔ إلى أن قال: مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيدٍ فإذا اختلف هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد رواه مسلم ۔'' (البحر الرائق ۶/ ۲۱۰)

(مولانا محمد شاکر نثار اعظمی مدنی، مولانا ابوالمکارم معروفی، مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

''ولا يجوز بيع الجيد با لردي مما فيه الربا وإلا مِثلا بمثل لإهدا ر التفاوت في الوصف'' (ہدایہ ۳/ ۶۱)

(مفتی سلمان پالنپوری، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مفتی محمد شاہد حسین مولانا خورشید اعظمی مدنی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی)۔

''والجيد والردي والتبر المضروب والصحيح والمكسور سواء في جواز البيع مع التما ثل وتحريمه مع التفا ضل وهذا قول أكثر أهل العلم'' (المغنی ۸/ ۴) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

''فإن باع فضة بفضة وذهبا بذهب لايجوز إلا مثلا بمثلٍ وإن اختلف في الجودة والصيا غة'' (ہدایہ ۳/ ۸۱)

(قاضی عبدالجبار طیب ندوی، مولانا عبدالحی مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مفتی عبدالباسط پالنپوری بحوالہ قدوری/ص ۷۵، مولانا عبدالحی مفتاحی)۔

''ويشترط التما ثل أي التساوي وزنا والتقابض با لبرا جم.... إن اتحد جنسا وإن اختلفا جو دة وصيا نة'' (تنویر الابصار مع الرد/ ۷/ ۵۲۱،۵۲۲) (مولانا ابوالمکارم معروفی)۔

''لاتبيعوا الذهب بالذهب إلا مثلاً بمثل'' (مسلم ۲/ ۲۴) (مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی عبدالباسط قاسمی پالنپوری مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی، مولانا عبداللہ خالد بحوالہ بخاری برقم الحدیث: ۲۱۷۶، مولانا ابوسفیان مفتاحی بحوالہ تکملۃ فتح الملھم ۱/ ۵۹۷)۔

قاضی عبدالجلیل قاسمی لکھتے ہیں: ''اگر نئے پرانے دونوں قسم کے زیورات میں کوئی دوسری دھات شامل ہے تو دھات کو منہا کر کے دونوں میں برابری ضروری ہوگی، .... کم وبیش میں ربا تفاضل ہوگا''۔

☆ **دوسرا موقف:** چند شرائط کے ساتھ معاملہ جائز ہے، مولانا محمد سعد نور القاسمی مولانا روح الامین نے جواز کی دو شکلیں بیان کی ہیں:

۱- اگر زیور سادہ ہو تو اس کے ساتھ کوئی اور چیز جیسے (Immitetion) زیور میں شامل کر لے۔

۲- اگر زیور نگینہ یا کسی اور طرح کا جڑاؤ والا ہے تو بھی وزن میں کمی بیشی کے ساتھ معاملہ درست ہوگا۔ بشرطیکہ مرکب زیور میں شامل سونا مفرد سونے سے کم یا زیادہ ہو مساوی یا زائد نہ ہو (بحوالہ بہشتی زیور ۵/ ۲۷و۲۸)، مولانا سعد نور نے مزید شکلیں بیان کی ہیں (بحوالہ زر کا تحقیقی مطالعہ/ص ۱۸۰)، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (بحوالہ انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے فقہی فیصلے/ص ۲۶۵ و اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۶۶)، نیز شرح فتح القدیر کی درج ذیل عبارت نقل کی ہے:

''ولو قال اعطني نصف درهم فلوسا ونصف إلا حبة جاز لأنه قابل الدرهم بما يباع من الفلوس بنصف درهم وبنصف درهم إلا حبة فيكون نصف درهم إلا حبة بمثله وما وراءه بإزاء الفلوس'' (شرح فتح القدير ۵/ ۳۸۸)۔

☆ **تیسرا موقف:** عموماً قیمتوں سے قدیم اور جدید سونے وزیورات کے معاملے ہوتے ہیں جو کہ جائز ہے، قیمتوں سے عقد کی صحت پر ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں پوری کہتے ہیں: ''تاجر حضرات پرانے زیور کو کم قیمت میں روپے سے خریدتے ہیں اور پھر نئے زیور روپیوں میں بیچتے ہیں، لہذا جنس مختلف ہونے کی وجہ سے ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا''، یہی خیال مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی اور مفتی نثار احمد گودھروی کا بھی ہے (بحوالہ زر کا تحقیقی مطالعہ ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ کراچی)، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی اور مفتی محمد عثمان بستوی نے بھی ظاہر کیا ہے، لکھتے ہیں: ''یہ وہی طریقہ ہے جس کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی'' خیبر کے موقع پر تمر جنیب کے واقعہ سے استدلال کیا، روایت حدیث کا آخری حصہ یہ ہے:

''... والله يا رسول الله إنا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعين والصاعين بالثلاث فقال رسول الله ﷺ لا تفعل! بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيبا'' (بخاری برقم الحدیث: ۲۲۰۱)

(مقالہ: مولانا انور علی الاعظمی، مولانا نعمان انور، بندہ محمد اشرف قاسمی گونڈوی)۔

مفتی عبداللہ خالد نے ''المبسوط'' کی درج ذیل عبارت پیش کی ہے:

''ولا بأس ببيع الفضة جزافا بالذهب أو بالفلوس أو بالعروض لانعدام الربا بسبب اختلاف الجنس'' (المبسوط ۱۴/ ۶۹)

☆ **چوتھا موقف:** اکثر مقالہ نگاروں نے عدم جواز کے ساتھ ہی حیلۂ جواز بھی بیان کیا ہے۔ مفتی مقصود علی فرقانی لکھتے ہیں: ''جواز کی شکل یہ ہے کہ پرانا زیور فروخت کیا جائے اور اس کی قیمت سے دوسرا زیور خرید لیا جائے'' (مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی محمد سلطان القاسمی، مولانا عمرامین الہی، مفتی محمد روح اللہ قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا نعمان انور، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مولانا انور علی اعظمی، مولانا ابوالمکارم معروفی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا عمران بن دین محمد پالنپوری)۔

مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی نے دو حیلہ جواز بیان کیا: ایک تو روپیوں سے خرید وفروخت کا دوسرا یہ کہ: ہر ایک اپنا سونا اپنے ساتھی کو قرض دے پھر اس سے بری کردے یا پھر زیادتی کو ہبہ کردے اور یہ درست ہے، بعدہ درج ذیل فقہی اقتباسات نقل کیا ہے:

''والحيلة في تمليك الرِّبَوِيِّ بجنسه متفاضلا كبيع ذهب بذهب متفاضلا أن يبيعه من صاحبه بدراهم أو عرض ويشتري منه بها أو به الذهب بعد التقابض يجوز وإن لم يتفرقا ولم يتخايرا التضمن البيع الثاني. اجازه الأول بخلاف مع الأجنبي أو يقرض كل صاحبه ويبرئه أو يواهبا الفاضل لصاحبه وهذا جائز'' (مغنی المحتاج ۲/ ۳۸۷؛ اعانة الطالبين ۳/ ۳۵، حاشية قليوبي مع كنز الراغبين ۲/ ۱۴۶۶)۔

مفتی عبدالباسط قاسمی پالنپوری کہتے ہیں: ''البتہ اگر دونوں عقد الگ الگ ہوں کہ پرانا زیور کم قیمت میں خریدا جائے اور نئے زیور زیادہ قیمت میں فروخت کیا جائے تو جائز ہے، بشرطیکہ عاقدین رضامند ہوں''۔

☆ آخری غیر واضح موقف ہے، ڈاکٹر محی الدین غازی نے اپنا موقف واضح طور پر بیان کرنے کے بجائے کہا: ''جن لوگوں کے نزدیک ربا تفاضل جائز نہیں ہے ان کے نزدیک یہ صورت بھی جائز نہیں ہے''، سوال یہ ہے کہ کیا کسی کے نزدیک ربا تفاضل جائز ہے؟

مفتی محمد ذکاء اللہ شبلی نے کہا: ''دونوں قسم کے سونے میں اگر حقیقی فرق ہو تو جائز ہے۔''، ''حقیقی فرق'' توضیح طلب ہے؟

· مفتی عبدالمنان صاحب کے مقالہ میں ص نمبر دو بندہ کو دستیاب نہیں ہوسکا، صفحہ ایک کے بعد ص ۳ / پر جواب نمبر ۶ / شروع ہوتا ہے، اس لیے موصوف کے جوابات ۳ / ۴ / ۵ کے دلائل پر غور نہیں کیا جاسکا، البتہ مقالہ میں آخری صفحہ پر خلاصہ سے ان کے خیالات نقل کیے گئے ہیں۔

مولانا ناظفر عالم ندوی نے سوال نمبر (۳) سے کوئی بحث نہیں کی ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ قدیم و جدید سونے کی خریداری اصالۃً روپیوں سے ہوتی ہے، جیسا کہ تیسرا موقف ہے، اس لیے اس معاملے میں ربا تفاضل اور ربا نسیئہ نہیں پایا جاتا، بریں بنا روپیوں سے قدیم زیور کی قیمت طے کی جائے اور جدید کی زیادہ، تو جائز ہے، مخصوص حالات میں، چوتھے موقف میں بیان کردہ حیلہ جواز، اور دوسرے موقف میں مذکورہ شرائط بھی اسی جہت جواز کو ظاہر کرتے ہیں۔

سوال نمبر ۴: آج کل کموڈیٹر ایکس چینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، جس میں خریدار آرڈر دیتا ہے اور جو کچھ اس نے آرڈر دیا ہے، اس کے آرڈر کے بقدر وہ شیٔ اس کے نام سے محفوظ کردی جاتی ہے، اس سلسلے میں چند باتیں قابل غور ہیں:

الف: اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس مثلاً ایک کلو سونا ہو اور وہ دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے جاتے ہوں تو کیا اس کو خریدار کا قبضہ سمجھا جائے گا؟

ب: اگر ہر خریدار کے لیے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کردیا گیا ہو تو کیا اس اندراج کو قبضہ کے لیے کافی تصور کیا جائے گا؟

اس سلسلے میں سات آراء ہیں:

☆ پہلا موقف: (الف) قبضہ درست ہے، (ب) اور اس کی بیع جائز ہے، مفتی محمد عثمان بستوی نے سوال میں غیر جامعیت کی طرف اشارہ کیا کہ:

''انسب یہ تھا کہ قبضہ سے پہلے اس میں تصرف کے جائز ہونے نہ ہونے کا سوال کیا گیا ہوتا، نہ کہ صرف قبضہ کا، کیوں کہ صرف قبضہ کے تحقق یا عدم تحقق کا سوال، بذات خود اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہے''۔

پھر مسئلہ سے متعلق پانچ نکات کی نشاندہی کی، اور مسئولہ دونوں جہتوں کے تعلق سے سیر حاصل بحث کے بعد کہا کہ ''سونے چاندی کے سکے یا اینٹ کی متعینہ مقدار خریدنے کی صورت میں کمپیوٹر اور ریکارڈ رجسٹر میں اندراج ...... تعیین کے لیے کافی معلوم ہوتا ہے، سونے چاندی کی خرید وفروخت کا یہ طریقہ شرعاً جائز ہے بشرطیکہ ایک عوض پر قبضہ پالیا جائے، کیونکہ سونے چاندی ثمن ہیں اور ثمن میں تصرف کے لیے قبضہ لازم نہیں بلکہ تعیین وبیان کافی ہے''۔

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی: ''(الف) خریداری کے وقت رسید دی جاتی ہے اس کو قبضہ شمار کیا جائے گا، (ب) اندراج کو قبضہ کے لیے کافی تصور کیا جائے گا''، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (بحوالہ فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے/ص ۳۲۶)۔

مفتی ذکاء اللہ شبلی: ''(الف) (ب) چوں کہ وعدہ کے تحت اس کا اس قدر حصہ طے ہے اس لیے جائز ہوگا''۔

مولانا ناظفر عالم ندوی: (الف) قبضہ اصالۃً بھی درست ہے اور وکالۃً بھی، (ب) مبیع کا مشتری کے ضمان میں آنا شرط ہے، ایکسچینج آفس کا اندراج عرف عام میں ضمان وقبضہ کے درجہ میں ہوتا ہے، یہ کاروبار بذریعہ وکالت ہے جس میں کوئی حرج نہیں، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی کے نزدیک پہلی صورت شرکت (مشاع) ہے، اور دوسری صورت میں قبضہ مزید واضح ہے۔

''وقد احتج به أي بحديث عمر في قصة البعير الصعب المالكية والحنفية أن القبض في جميع الأشياء بالتخلية

والیہ مال البخاری'' (فیض الباری شرح البخاری ۳/ ۲۰۶) حسی قبضہ سے قبل، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کو ہبہ فرمایا۔

'' وکل عقد أن یعقده الإنسان بنفسه جاز أن یُوَکِّلَ بِهِ غیرہ لأن الإنسان قد یعجز عن المُبَاشَرَةِ بنفسه علی أعلی اعتبار بعض الأحوال فیحتاج إلی أن یُوَکِّلَ غیرہ فیکون بسبیل منه دفعا للحاجة وقد صح أن النبی ﷺ وکل بالشراء حکیمَ ابنِ حزامٍ'' (ہدایہ ۳/ ۷۲)۔

☆**دوسرا موقف:** شرکت مشاع - ایک اینٹ کے تمام شرکاء پوری قیمت ادا کریں، مفتی محمد سلطان قاسمی کے نزدیک پہلی صورت میں سونے کی (ایک) اینٹ مشترکہ طور پر (شرکاء کی) ملکیت ہوگی، البتہ اس صورت میں مکمل قیمت کو ادا کرنا ضروری ہے، ورنہ بیع الکالی بالکالی ہو جائے گی جو کہ حرام ہے، دوسری صورت (ب) کمپنی اس کا وکیل ہے، اس لیے کمپنی کی طرف سے اس کا رجسٹریشن قبضہ مانا جائے گا۔

☆**تیسرا موقف:** (الف) و(ب) بہر صورت قبضہ نہیں مانا جائے گا (مفتی محمود احمد بر مارے حسینی)۔

'' ولا یصح بیع المبیع قبل قبضه'' (منهاج الطالبین مع مغنی المحتاج ۲/ ۶۸)، نیز '' المبیع قبل قبضه من ضمان البائع بمعنی انفساخ البیع بتلفه وثبوت الخیار بتعیبه، وبا تلافه لأجنبی له لبقاء سلطنته علیه'' (منهاج المغنی ۲/ ۶۵)

ڈاکٹر شاہجہاں ندوی (الف) ''ولا تبیعوا منها غائبا بناجز'' (صحیح بخاری برقم الحدیث: ۲۱۷۷۔ مسلم برقم الحدیث: ۱۵۸۴) ''قال النبی ﷺ: ماکان یدا بیدٍ فلا بأس به'' (البخاری برقم الحدیث ۲۰۶۰، مسلم ۱۵۸۹) ''المراد بالقبض هنا القبض بالبراجم لا بالتخلیة'' (البحرالرائق ۶/ ۲۰۱)۔

مولانا روح الامین صاحب کہتے ہیں کہ'' دونوں صورتوں میں چوں کہ قبضہ ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوتا ہے اس لیے یہ قبضہ غیر متحقق ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی، مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا مقصود علی فرقانی کے نزدیک محض کمپیوٹر میں اندراج سے خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

مفتی جنید بن محمد پالنپوری: '' إن الدراهم والدنانیر لاتتعین بالتعیین وإنما تتعین بالعقد فشرطنا التقابض للتعیین لا للقبض'' (بدائع ۵/ ۲۹۱) '' فإن الدراهم والدنانیر لاتتعین بالعقد إلا بالقبض'' (فتح القدیر ۶/ ۱۶۰)

(مفتی انور علی اعظمی، مولانا نعمان انور اعظمی)۔

مولانا عبدالحی مفتاحی کے نزدیک چونکہ بائع کی طرف سے محض اندراج کردینے سے، مشتری مبیع میں اپنی حسب خواہش کوئی تصرف نہیں کرسکتا ہے، اس لیے یہ قبضہ حساً اور حکماً غیر معتبر ہے (مستفاد از اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۹۸، ۹۹)۔

مفتی نثار احمد گودھروی کے نزدیک پہلی صورت میں بیع الدین بالدین ہے اور دوسری صورت میں بھی مبیع خریدار یا اس کے وکیل کے قبضہ میں نہیں آتی ہے، اس لیے کمپوٹرائزڈ اندراج قبضہ نہیں متصور ہوگا (بحوالہ فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۷)۔

مفتی محمد روح اللہ قاسمی حسی اور حکمی قبضے کے تعلق سے (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۷) کا اقتباس نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

''اگر اسے قبضہ تصور کرلیا جائے تو ان اداروں میں غیر معمولی شرعی بے احتیاطیوں کے پیش نظر عین ممکن ہے کہ اس تقسیم واندراج کے بغیر کبھی مبیع کو آگے فروخت کردیا جائے ...... اس لیے اس صورت کو بھی قبضہ ماننا بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے''۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی کے نزدیک، صورت مسئولہ میں چوں کہ مشتری کے لیے مبیع فارغ نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے ضمان میں آتی ہے، اس لیے بسکٹ یا اینٹ بہر دو صورت قبضہ، غیر متحقق ہے، لیکن ساتھ ہی حنابلہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''البتہ حنابلہ کے یہاں توسع اور حق غیر میں مشغول اور غیر ممیز ہونے کے باوجود قبضہ مکمل ہوجاتا ہے'' (المغنی ۴/ ۳۳۳، کشاف القناع ۳/ ۲۰۲)۔

☆**چوتھا موقف:** (الف) قبضہ نہیں مانا جائے گا (ب) قبضہ مانا جائے گا (مقالہ: قاضی عبدالجبار طیب ندوی)۔

'' ویعتبر فی التسلیم أن یکون المبیع مفرَّزًا غیرَ مشغول بحق غیرہ هکذا فی الوجیز لکردری، وأجمعوا علی

أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضا" (فتاوى ہندیہ ۳/ ۱۶)
(مفتی سعید الرحمن قاسمی، مولانا نعمان انور، مفتی سلمان پالنپوری مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی عبدالمنان، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی) (بحوالہ رد المحتار مع الدر ۴/ ۴۴)۔

" فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية، والتخلي هو أن يتخلى البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشتري قابضا له" (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۴)
(مفتی انور علی اعظمی، مفتی شاہد حسین، مفتی عبداللہ خالد ندوی)

[ب] سامان متعین ہو موجود ہو حقیقی طور پر مبیع پر قبضہ کی صورتیں متحقق ہوں (مولانا محمد سعد نورالقاسمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی)۔

مفتی شاہد حسین دوسری صورت (ب) میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ "خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو جس پر مشتری اپنی مرضی اور سہولت سے بلا رکاوٹ قبضہ کرسکتا ہو تو اس اندراج کو قبضہ کے لیے کافی سمجھا جائے گا"۔

" وضابط القبض هو العرف على الصحيح فقد يكون بكيله وقد يكون بالايواء.... وكذا القيد في دفاتر المصرف" (مجلة مجمع الفقه الاسلامي ۱۰/ ۲۱۲) (مولانا شاکر نثار اعظمی مدنی)۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی نے پہلی صورت میں قبضہ کو نہیں تسلیم کیا اور دوسری صورت میں انکار ہی کا رخ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"خریدار خود ہی اپنے تصرف میں لے کر کمپیوٹر میں یا ریکارڈ رجسٹر میں اندراج کردے"۔

☆ **پانچواں موقف:** چند شرائط کے ساتھ قبضہ مانا جائے گا (مفتی عبدالباسط پالنپوری)،

(الف) "لا يُشْتَرَطُ القَبْضُ بالبراجم لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة" (بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۸) تین شرطوں کے ساتھ یہ معاملہ درست ہوگا۔

۱- قیمت فوری طور پر ادا کردی جائے۔ ۲- مبیع بائع کی ملک میں ہو۔ ۳- مبیع متعین وممتاز ہو (جدید مالیاتی ادارے/ص ۹۰)۔

(ب) خریدی ہوئی مقدار الگ ہو تو رجسٹر میں مشتری کے نام کا اندراج قبضہ ہوگا، اور مبیع بائع کے پاس بطور امانت ہوگی نہ ضمانت۔ (الف وب)، یہی رائے مولانا عمران بن دین محمد کی ہے۔

☆ **چھٹا موقف:** محض آرڈر سے بہر دو صورت قبضہ متحقق نہ ہوگا، البتہ دوسری صورت (ب) میں درج ذیل تین شرطوں کے ساتھ جائز ہے
(مفتی عبدالرحیم قاسمی اور مولانا ابوالمکارم معروفی)۔

۱ "أن يقع البيع باتا ويكون الثمن متعينا غير مذبذب"۔

۲ "أن يخلي البائع بين الذهب المشتري بحيث يمكن للمشتري أن يقبض الذهب المبيع متى شاء"۔

۳ "أن يكون الذهب المبيع مفصولا عن غير المبيع ويكون في ضمان المشتري بحيث إن هلك أو سرق فإنه يهلك من مال المشتري وليس من مال البائع" (فتاوى عثمانی ۳/ ۵۴)۔

مولانا عمر امین الہی ان شرطوں کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ: "لیکن یہ جواز کی امکانی صورتیں ہیں کیوں کہ احقر کی معلومات کے مطابق جیسا کہ اس نے ماہرین سے اس سلسلے میں گفتگو کی، ان کے یہاں یہ ساری حدود وقیود نہیں ہیں، نہ ہی شرطیں پائی جاتی ہیں، بلکہ ان کا بھی یہی ماننا تھا کہ کوڈیکس ایکس چینج میں خرید وفروخت مقصود ہی نہیں ہوتی صرف بھاؤ کی کمی بیشی سے فائدہ اٹھانا مقصود ہوتا ہے" (بحوالہ فقہ البیوع ۱/ ۴۱۴)۔

☆ **ساتواں موقف:** سوق منظم کمپیوٹرائز رجسٹریشن قبضہ ہے، غیر سوق منظم قبضہ نہیں ہے، ڈاکٹر محی الدین غازی، (الف) سکہ اینٹ میں ہو یا الگ بہر صورت رجسٹر میں اندراج قبضہ ہوگا، شرط یہ ہے کہ اس سکہ یا اینٹ میں تصرف کا اختیار بائع کو نہ ہو، جیسے سوق منظم اسٹاک اکسچینج اور بینک وغیرہ میں ہوتا ہے۔ (ب) چونکہ "سونے کا کاروبار سوق منظم کے تحت نہیں ہے، اس لیے معدوم اشیاء کی بیع کا قوی امکان ہے"۔

مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری نے سوال نمبر (۴، ۵) سے کوئی تعارض نہیں کیا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ: پہلی صورت (الف) میں جب کہ صاف صاف طور یہ بتایا جائے کہ اینٹ میں اس کا حصہ (یونٹ) ہے، تو بیع تو منعقد ہو جائے گی اور مشتری اپنی یونٹ کا قانونی طور پر حق دار ہوگا، لیکن اینٹ مشاع پر کمپوٹرائز اندراج قبضہ نہیں ہوگا۔

دوسری صورت (ب) میں قبضہ مانا جائے گا، کمپوٹرائز اندراج کے سلسلے میں ناچیز نے اپنے مقالے میں آن لائن اندراج کو کافی قرار دیا ہے، لیکن جملہ مقالوں کے مطالعہ کے بعد ساتویں موقف کی منطقی افادیت کو دیکھتے ہوئے اُسی کمپوٹرائز اندراج کی صورت کو قبضہ ماننا درست سمجھتا ہے جو کہ سوق منظم کے تحت ہو، یعنی کامل طور پر حکومتی نگرانی میں ہو۔ جیسے بینک اور اسٹاک ایکسچینج میں ہوتا ہے۔ اگر اس طرح کمپوٹرائز سونے کی تجارت پر حکومت کی قانونی بندشیں نہ ہوں تو پھر دوسری صورت (سکہ الگ ہو) بھی قبضہ کے لیے کافی نہیں ہے، نیز ایسی بیع وشراء سے خدع وفریب کا دروازہ بھی کھلنے کا قوی امکان ہے۔ اس لیے سوق غیر منظم کے کاروبار سے بچنا ضروری ہے۔

سوال نمبر ۵- ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی ایک اور صورت جو آج کل رائج ہے، یہ ہے کہ مثلا ایک مہینے کے لیے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے ۱۰/ تولے سونے کا سودا کرلیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا، جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ لیا جاتا ہے، خرید کے دن اور ادائیگی کے دن سونے کے نرخوں میں جو فرق ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کردی جاتی ہے، مثلا خریدنے کے دن سونے کا نرخ پانچ ہزار روپے فی تولہ تھا، ادائیگی کے دن پانچ ہزار ایک سو روپے تولہ ہوگیا تو خریدار بائع کو ایک سو روپے دے گا، اور اگر اس دن چار ہزار نو سو تھی تو بائع خریدار کو ایک سو روپے ادا کرے گا، نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے اور نہ ہی بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے، بس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے، اس کا لین دین کر لیتے ہیں، اس صورت کا کیا حکم ہے؟

☆ مفتی ذکاء اللہ شبلی صاحب کی تحریر میں نمبر (۵) کے تحت ''کافی سمجھا جائے گا'' لکھا ہوا ہے۔ یہ جملہ غالبا سوال نمبر (۴) کے جزو (ب) کمپوٹر اندراج کو قبضہ کے بارے میں ہے، اور سوال (۵) کا جواب، نمبر (۶) کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ''بیع کی یہ صورت جائز نہیں''۔

☆ باقی تمام مقالہ نگار اس عقد کے عدم جواز پر متفق ہیں، البتہ کچھ لوگوں نے جواز کی شکلیں بیان کی ہے: اولاً مطلقاً عدم جواز کے قائلین کے اسماء اور دلائل ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں، اکثر تحقیق کاروں نے فسادِ عقد کے بنیادی عوامل میں قمار اور بیع الکالی بالکالی کو شمار کیا ہے۔

''نهى رسول الله ﷺ من بيع الكالي با لكالي'' (السراج المنير للعزيزي ۴/ ۲۷۲)

''یہ مقصد بیع سے زیادہ قمار سے مشابہ کردیتا ہے'' (فقہی مقالات ۲/ ۲۱۳) (مقالہ مفتی انور علی اعظمی)، (یہی دلائل درج ذیل لوگوں کے بھی ہیں: مولانا نعمان انور اعظمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا عمر امین الہی، مفتی عبدالرحیم قاسمی (بحوالہ فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۳، بحوالہ اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/ ۲۴) مولانا ابوالکارم معروفی، مفتی محمد شاہد حسین، مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا عبدالحیی مفتاحی، مولانا محمد سعد نور القاسمی، مولانا روح الامین (بحوالہ فقہی مقالات ۵/ ۵۱، فقہ البیوع ۱/ ۴۱۴)، مفتی عبدالباسط پالنپوری (بحوالہ مشکوۃ ۲۲۸)، مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی (بحوالہ اسلام اور جدید معیشت وتجارت/ص ۹۱، سٹہ کا بیان/ ص ۵۷)، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مولانا عمر امین الہی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مفتی محمد روح اللہ قاسمی، مولانا اختر امام عادل، مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی سلمان پالنپوری، عمران بن دین محمد پالنپوری، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

''قال رسول الله ﷺ لا يحل سلف وبيع ولا شرط في بيع ولا ربح ما لم يضمن ولا بيع ما ليس عندك'' (ترمذی ۱/ ۲۲۲ ابواب البیوع) (مولانا فروغ احمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی)۔

''هو من أكل المال با لبا طل لأن المقا مر يقول لصا حبه إن كان كذا فلي كذا وإن لم يكن كذا فلك كذا'' (شرح صحيح بخاري لابن بطال ۶/ ۱۹۶) (مولانا خورشید انور اعظمی)۔

''لأن القمار من القمر الذي يزداد تا رة فينقص أخرى. وسمي القمار قمارا. لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز أن يستفيد ما ل صا حبه وهو حرام با لنص'' (ردالمحتار ۹/ ۵۷۷)
(مفتی جنید بن محمد، مولانا محمد شاکر نثار احمد اعظمی مدنی بحوالہ بحر ۷/ ۹۱)۔

''قبل القبض فروختگی کی وجہ سے ناجائز ہے'' (مفتی عبدالمنان صاحب، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی، مفتی مقصود علی فرقانی، قاضی عبدالجبار طیب ندوی)۔

☆ قاضی عبدالجلیل قاسمی نے کہا کہ ''یہ صورت اقالہ ہے، اس لیے ناجائز ہے۔ نیز سود کا دروازہ بھی کھل جانے کا اندیشہ ہے''، نیز ''بیع موقت ہے، اس لیے ناجائز ہے، ''أن لا یکون مؤقتا فإن أقته لم یصح'' (ہندیہ ۳/۳)، یہی رائے ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی کی ہے)۔

☆ مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی عقد صرف کے اصولوں کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناجائز مانتے ہیں۔

مفتی فیاض احمد برمارے حسینی کہتے ہیں: خیار شرط کی مدت تین دن کے بعد، نرخ میں کمی زیادتی جائز نہیں ہے، اس لیے معاملہ ناجائز ہے۔

''فنهانا رسول الله ﷺ أن نبيعه حتى ننقله من مكانه'' (مغني المحتاج ۲/ ۷۲). '' يثبت خيار المجلس في أنواع البيوع وينقطع بالتخاير بأن يختار لزومه... وبالتفرق ببدنهما ولأحدهما شرط الخيار في أنواع البيع وإنما يجوز في مدة معلومة لاتزيد على ثلاثة أيام تحتسب من العقد'' (منهاج مع مغني المحتاج ۲/ ۴۸، ۴۳)۔

مفتی محمد عثمان بستوی لکھتے ہیں: ''اصل جوہر مبیع، قبضہ میں نہیں آتا ہے اس لیے عقد ناجائز ہے، فقہاء نے بھی ربح مالم یضمن، بیع قبل القبض، اور مسلم فیہ کے بدلے میں کوئی اور چیز وصول کرنے کی ممانعت کی تصریح فرمائی ہے۔

''وبيع المسلم فيه عن بائعه أو من غيره قبل قبضه فاسدٌ'' (المغنی ۴/ ۲۲۱)۔

☆ دوسرا موقف بھی عدم جواز ہی کا ہے لیکن کچھ قیودات کے ساتھ جواز کی شکلیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ مفتی سلطان قاسمی لکھتے ہیں: ''یہ صورت حرام ہے کیوں کہ یہ بیع الکالی بالکالی ہے، البتہ باضابطہ قیمت ادا کر کے سونا خریدے، پھر اس کو تجارت کے لیے دے تو اس صورت میں یہ معاملہ درست ہو جائے گا''۔

مولانا سعد نور القاسمی صورت مسئولہ سے متعلق عدم جواز کے ساتھ ہی لکھتے ہیں: ''البتہ یہ شرط ہے کہ ایک جانب سے مال پر قبضہ جدا ہونے سے پہلے کر لیا جائے۔ ''لكن يجب أن يكون تقابض أحد البدلين في المجلس إذا كان ذهبا خالصا وأن يُعْرَف الأجل عند العقد'' (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۹)، مولانا ظفر عالم ندوی کی بھی یہی رائے ہے۔

مفتی عبداللہ خالد معاملے کو ناجائز ثابت کرنے کے بعد مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی تحریر کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

''کسی شخص سے سونا خرید کیا اور سونا اپنی تحویل میں لے لیا یا اپنی تحویل میں نہیں لیا، لیکن آپ کے نام کا وہ سونا الگ کر دیا گیا تو اب آپ کے لیے بعد میں اس کو فروخت کرنا اور بڑھی ہوئی قیمت سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، اور اگر آپ کے حصے کا سونا الگ نہیں کیا گیا تو اس کا قبضہ متحقق نہیں ہوا، لہٰذا آپ کے لیے اس کو بیچنا اور اس پر نفع اٹھانا ناجائز ہوگا'' (کتاب الفتاوی ۹/ ۴۴۹)۔

راقم الحروف کا بھی خیال ہے کہ یہ معاملہ قمار اور صفقۃ فی صفقۃ اور بیع قبل القبض وغیرہ قباحتوں کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔ لیکن یہ کاروبار، سوال میں ذکر کردہ اتنی مختصر باتوں پر نہیں ہوتا ہوگا اگر اس کی پوری تفصیلات اور شرطیں معلوم کی جائیں تو ممکن ہے کہ محصولات و مالیات کی قوت کو باقی رکھنے اور انہیں مستحکم بنانے کے لیے عقد مقایضۃ، بیع تلجئۃ، بیع الوفاء، بیع العینۃ، جیسی مختلف جائز و ناجائز بیوع کی مماثلت کے ساتھ کچھ ایسی جائز شکلیں دستیاب ہو جائیں جو جدید کاروباری دنیا میں قمار اور ربوا وغیرہ حرام کاروبار سے حفاظت کا ذریعہ ثابت ہوں، جیسا کہ دوسرے موقف میں کچھ قیودات کے ساتھ جواز کی شکلیں بتائیں گئیں ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ اس کاروبار کی پوری تفصیل حاصل کی جائے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی، اسمگلنگ اور پلاٹین کا حکم

(سوال نمبر ۶-۸)

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی[1]

الحمد لله رب العلمين

والصلاة والسلام على سيد الأنبياء وإمام المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے چھبیسویں فقہی سمینار کا ایک اہم موضوع ''سونا چاندی کی تجارت سے متعلق بعض مسائل'' تھے، اکیڈمی نے اس موضوع کے سوال نمبر ۶ تا ۸ پر عرض مسئلہ کی ذمہ داری راقم پر ڈالی ہے، چنانچہ اکیڈمی کے توسط سے اس موضوع پر احقر کو کل ۴۱ مقالات دستیاب ہوئے، مقالہ نویس حضرات کے اسماء گرامی طوالت کی وجہ سے ترک کر رہا ہوں۔

اس موضوع کا چھٹا سوال یہ ہے کہ بہت سی دفعہ سونے کی قیمت میں متوقع اضافہ کا سونے چاندی کے تاجروں کو علم ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں وہ سونے کو روک لیتے ہیں تا کہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فرخت کریں، سونا اس پہلو سے اشیاء ضروریہ میں شامل ہے کہ ثمن خلقی ہونے کے لحاظ سے وہ ذریعہ تبادلہ ہے، اس کو روک لینے کی وجہ سے سونے کی قیمت تو بڑھتی ہی ہے، اس گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہے، تو کیا سونے کی ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے لئے اس کو روک کر رکھنا احتکار کے دائرہ میں آئے گا؟

اس سوال کے جواب میں دو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

پہلا نقطہ نظر:

پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ سونے کی ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے لئے اس کو روک کر رکھنا احتکار کے دائرہ میں داخل نہیں ہے۔

اس نقطہ نظر کے حاملین ہیں: مولانا مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی، مفتی محمد شاہد حسین، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، محی الدین غازی فلاحی، مولانا ابوالمکارم معروفی، مولانا عبدالحی مفتاحی، مفتی نثار احمد، مفتی سلمان پالنپوری، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی اور راقم الحروف محمد شاہ جہاں ندوی۔

اس نقطہ نظر کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- حضرت معمر بن ابی معمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''من احتکر طعاما فهو خاطئ'' (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۶۰۵) جو غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرے وہ گنہگار ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس احتکار کی ممانعت ہے اس کا تعلق انسان کی بقا کے لئے ضروری اشیاء خوردنی سے ہے، نہ کہ ہر چیز سے (مقالہ: راقم الحروف)۔

۲- ایک مسئلہ میں نصوص مختلف ہوں، ایک عام اور دوسرا خاص، تو ایسی صورت میں عام کو خاص پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ اہل اصول نے اس کی

[1] عمید کلیۃ الحدیث جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، مالاپورم، کیرالہ، الہند۔

صراحت کی ہے۔(موسوعہ فقہیہ، ۲/ ۹۳)۔

تو گویا جن احادیث میں مطلق احتکار کی ممانعت وارد ہوئی ہے وہ بھی غذائی اجناس پر ہی محمول ہے (مقالہ: مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی)۔

۳- موجودہ مارکیٹوں کے حالات کے پیش نظر سونے کی قیمت بڑھنے سے اس کی گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر پڑنا یقینی نہیں ہے، لہذا ایسی چیزیں جو براہ راست انسان یا جانوروں کے نظام تغذیہ کو متاثر کرے ان کا احتکار ممنوع ہے، بالواسطہ یا سبب بعید کے طور پر متاثر کرنے والی ذخیرہ اندوزی احتکار ممنوع میں شامل نہیں ہے (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی سلمان پالنپوری)۔

۴- سونا نہ بیچنا گرانی کا سبب ہوسکتا ہے، لیکن خود سونا انسانی ضروریات کا حصہ نہیں ہے، لہذا اس کا احتکار ممنوع نہیں ہے (مقالہ: مفتی محبوب فروغ قاسمی)۔

۵- قیمت میں متوقع اضافہ کی امید میں سونا کو روک لینا ممنوعہ ذخیرہ اندوزی میں داخل نہیں ہے، اس لئے کہ وہ احتکار ممنوع ہے جو گرانی کے وقت ہو اور اشیاء کو گراں تر کردے، لیکن فطری اسباب کی بناء پر قیمت میں اضافہ ہونے میں سونے چاندی کے تاجروں کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۶- اشیاء ضروریہ کی قیمت میں اضافہ محض سونے کی گرانی کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کے بہت سے معاشی اور سیاسی اسباب ہیں اور عام طور سے یہ اضافہ فرضی اسباب کی بنیاد پر، یا حکومت کی غلط پالیسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر حکومت بہتر نظام اور پالیسی پر عمل پیرا رہے تو اشیاء ضروریہ کی قیمت متوازن رہے، لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت غلط پالیسی سے دور رہے اور اپنے نظام کو صاف وشفاف رکھے، نہ یہ کہ ہر چیز کی ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیا جائے (مقالہ: راقم الحروف)۔

۷- سونا اور چاندی طعام نہیں ہے اور ان کی ذخیرہ اندوزی کے مضر اثرات براہ راست عامۃ الناس تک نہیں پہنچتے ہیں (مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

دوسرا نقطہ نظر:

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ احتکار کو طعام میں محصور نہ کیا جائے بلکہ عام رکھا جائے اور دیگر اشیاء میں احتکار کا فیصلہ حاکم کو سونپ دیا جائے کہ اگر وہ ان اشیاء میں بھی غذائی اشیاء کی طرح ضرر شدید محسوس کرے تو احتکار سے روک دے ورنہ اجازت دے دے۔ اس نقطہ نظر کے حاملین ہیں: مولانا قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی عبداللہ خالد، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی جنید پالنپوری، مولانا روح الامین، مولانا محمد شاکر نثار اعظمی قاسمی مدنی، مولانا عبدالباسط قاسمی، مفتی عمران، مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی، مفتی محمد سلطان قاسمی، مولانا محمد عثمان بستوی، مولانا محمد سعد نور قاسمی، مولانا عمر ۔ن الہی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی عبدالمنان، مولانا عبدالحمید قاسمی، مفتی محمد ظفر عالم ندوی، مولانا نعمان انور اعظمی، مفتی محمد روح اللہ قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی، قاضی عبدالجبار طیب ندوی اور مولانا عبدالحمید قاسمی دیناجپوری۔

اس نقطہ نظر کے حاملین کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- موجودہ زمانے میں سونے کے احتکار کا اثر انسانوں کی خوراک اور دوسری تمام ضروری اشیاء پر پڑتا ہے، اس لئے سونے کی ذخیرہ اندوزی اور احتکار ناجائز اور حرام ہوگا، اس لئے کہ شریعت کا احتکار سے روکنے کا مقصد انسانوں اور جانوروں سے مضرت اور تکلیف کو دور کرنا ہے (مقالہ: مفتی عبداللہ خالد)۔

۲- احتکار کی شرعی ممانعت عام ہے (مقالہ: مولانا روح الامین)۔

۳- موجودہ زمانے میں ضرر عام صرف انسانوں اور جانوروں کی غذا کے احتکار سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ سونے وغیرہ نیز دیگر بہت ساری چیزوں کے احتکار سے بھی ہوتا ہے، لہذا شرعی قاعدہ {الضرر یزال} کے تحت سونے کی ذخیرہ اندوزی بھی احتکار کے دائرہ میں داخل ہونا چاہئے۔

۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب فرماتے ہیں: غیر معمولی حالات میں امام مالک کے نزدیک تمام ہی اشیاء ضروریہ میں احتکار حرام ہے، اور

یہی رائے امام ابو یوسف کی ہے، غالباً یہ رائے زیادہ قرین صواب ہے (جدید فقہی مسائل: ۱/ ۷۷ ۳، مقالہ: مفتی عبداللہ خالد)۔

۵- شریعت کی روح اور مقاصد سے یہ امر ہم آہنگ ہے کہ جو چیز ضرر عام کا باعث بنے، وہ احتکار میں داخل ہو (مقالہ: مولانا محمد سعد نور قاسمی)۔

۶- منع احتکار کا مقصود عام لوگوں کو ضرر سے بچانا ہے اور ضرر کے جملہ اقسام جو عوام سے متعلق ہوں، سب شامل ہیں، لہٰذا فی زمانناامام ابو یوسف کا قول اختیار کرنا مقاصد شرع اور مصالح ناس سے زیادہ قریب ہے (مقالہ: مفتی محمد ظفر عالم ندوی)۔

ترجیح:

پہلا نقطہ نظر راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ سونا انسانی ضروریات کا حصہ نہیں ہے اور انسانی یا حیوانی غذائی اشیاء کا احتکار اس لئے ممنوع ہے کہ اس کی وجہ سے انسانی زندگی کی بقا خطرہ سے دو چار ہوتی ہے جبکہ سونے کی ذخیرہ اندوزی اس درجہ کی نہیں ہے کہ اس کی خرید وفروخت نہ ہونے سے انسان کی زندگی کی بقا کا مسئلہ پیدا ہو جائے کیونکہ حقیقی احتکار تو یہ ہے کہ لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو اور بازار میں اس کی قلت ہو اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے اس کو فروخت کرنے کے لئے نہ نکالیں۔

اس موضوع سے متعلق ساتواں سوال یہ ہے کہ (ملک میں جو سونا آتا ہے، اس میں بڑا حصہ تو قانونی طریقہ پر آتا ہے اور سونا لانے والا اس سے متعلق واجبات کو ادا کرتا ہے، دوسرا راستہ اسمگلنگ کا ہے، یہ طریقہ غیر قانونی ہے، اس میں سونا لانے والا ان واجبات کو ادا نہیں کرتا جو حکومت نے سونے کی درآمد سے متعلق مقرر کئے ہیں، کیا یہ اسمگلنگ کا عمل جائز ہوگا، اور کیا اس طریقے پر آنے والے سونے کا خریدنا اور پھر اس کو فروخت کرنا درست ہوگا؟)

اس سوال کی دو شقیں ہیں:

پہلی شق یہ ہے کہ اسمگلنگ کا عمل جائز ہے یا نہیں؟

اس شق کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ اگر چہ شرعی اعتبار سے ہر ایک آدمی کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مال کے ذریعہ اپنی ضرورت یا پسند کی اشیاء جہاں سے چاہے خریدے اور اپنا مال جہاں چاہے فروخت کرے، اس کے باوجود اسمگلنگ (smuggling) یعنی ملکی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بیرون ممالک سے مال لانا یا وہاں مال بھیجنا ناجائز ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- شریعت کی نگاہ میں حکومت کے جائز ضوابط کی رعایت لازم ہے اس کی تکمیل نہ کرنا گناہ ہے، اس لئے کہ یہ ملک کے معاہدۂ شہریت کے خلاف ہے، چنانچہ مسلمان ہر حال میں اپنے عہد کا پابند ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "المسلمون عند شروطهم فيما وافق الحق" (البيهقى، السنن الكبرى، رقم الحديث/ ۱۴۸۲۱) (موافق حق معاملات میں مسلمان شرائط کا پابند ہوتا ہے)، لہٰذا مصلحت پر مبنی شریعت سے غیر متصادم قانونِ ملکی کی پابندی ضروری ہے (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۲- اسمگلنگ کی وجہ سے حکومت، ملک کے باشندگان اور ملکی قانون کی پابندی کرنے والے تاجر حضرات سب کو ضرر میں مبتلا کیا جاتا ہے، جبکہ لوگوں کو ضرر میں ڈالنا حرام ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لا ضرر ولا ضرار" (مسند احمد، رقم الحدیث ۲۸۶۵، اور یہ حدیث حسن درجہ کی ہے) (خود ضرر اٹھانا اور نہ دوسروں کو ضرر پہنچانا جائز ہے)۔

لہٰذا ملک و اہل ملک کو ضرر پہنچانے والے طریقے سے اجتناب لازم ہے (مقالہ: راقم الحروف)

۳- جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، جبکہ عزت و حرمت کی حفاظت مقاصد شریعت میں شامل ہے۔ (مقالہ: روح الامین) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تلقوا بايديكم إلى التهلكة (سورۂ بقرہ: ۱۹۵) (اور خود کو ہلاکت کے سپرد مت کرو) جبکہ اسمگلنگ میں خود کو ضرر میں مبتلا کرنا بھی پایا جاتا ہے کیونکہ پکڑے جانے پر قید و بند کی صعوبت جھیلنی پڑتی ہے اور آدمی بے آبرو ہو جاتا ہے، جبکہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه، قالوا: كيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من

البلاء لما لا یطیق" (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۲۵۴، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (مؤمن کے لئے مناسب نہیں کہ خود کو ذلیل کرے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ کوئی خود کو کیسے ذلیل کرے گا؟ تو رسول ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: خود کو ذلیل کرنا یہ ہے کہ نا قابل برداشت مصیبت کی زد میں خود کو لے آئے)۔

۴- اسلامی نقطۂ نظر سے کسی کو ضرر پہونچانا جائز نہیں ہے، نیز اہل بازار کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص تجارتی قافلے کے شہر میں آنے سے پہلے ہی باہر جا کر ان سے سامان خرید لے اور بازار میں آکر گراں قیمت میں فروخت کرے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لا تلقوا الرکبان" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۱۵۰، ۲۱۶۲) (تجارتی قافلے کی شہر آمد سے پہلے باہر جا کر ان سے غلے مت خریدو)۔ تو جب ضرر خاص ممنوع ہے تو پھر ضرر عام کی وجہ سے اسمگلنگ بدرجہ اولی ممنوع ہوگی۔

۵- اسمگلنگ میں بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور رشوت دینی پڑتی ہے (مولانا محمد شاکر نثار اعظمی قاسمی وغیرہ)۔

اس سوال کی دوسری شق یہ ہے کہ اسمگلنگ کے ذریعہ آنے والے سونے کا خریدنا اور پھر اس کو فروخت کرنا کیا درست ہے؟

اس شق کے جواب میں بیشتر مقالہ نویس حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی نے بچ بچا کر اسمگلنگ کے ذریعہ سونا حاصل کر ہی لیا تو حاصل شدہ مال حلال وطیب ہے اور خرید وفروخت کا معاملہ درست ہے بشرطیکہ بیع وشراء کے کسی بنیادی اصول کی خلاف ورزی نہیں کی گئی ہو۔

ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- اسمگلنگ کی ممانعت قبح لغیرہ کی بنیاد پر ہے، لہذا ممانعت کے باوجود بیع جائز رہے گی (مقالہ: مفتی محبوب فروغ قاسمی) جیسا کہ تلقی جلب وغیرہ میں ممانعت کے باوجود فقہاء نے بیع ہوجانے کے بعد بیع کی صحت کا فتوی دیا ہے۔ جیسا کہ بدائع میں ہے:

"ولو باع جاز البیع، لأن النھی لمعنی فی غیر البیع" (بدائع: ۴/ ۴۸۰)، اور اگر اس طرح بیع کرلی تو جائز ہوجائے گی، اس لئے کہ نہی لغیرہ ہے، خلاصہ یہ کہ نفس شیء میں کوئی معصیت نہیں ہے، لہذا خرید وفروخت درست ہے۔

۲- اسمگلنگ کا عمل فی نفسہ ناجائز نہیں ہے، لہذا اس طریقہ سے درآمد کیے ہوئے سونے کا خریدنا، بیچنا شرعاً جائز ہے اور اس سے حاصل شدہ آمدنی حلال ہے، جیسا کہ فقہاء کی تصریحات سے واضح ہے: "إذا سعر وخاف البائع ضرب الإمام لو نقص، لا یحل للمشتری (لعدم رضی البائع) وحیلته أن یقول له: بعنی بما تحب. فحینئذ بأی شیئ باعه یحل، لأنه قد أخذه بطیب نفسه ورضاه" (الدر المختار مع رد المحتار ۹/ ۵۷۴) (مقالہ: مولانا محمد عثمان بستوی)۔

۳- حنفیہ کے اصول کے مطابق عملی فساد کا تعلق گناہ وثواب سے ہے نہ کہ معاملات کی صحت وفساد سے، جیسا کہ عام طور سے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ "حرمة الفعل لا تنافی ترتب الأحکام" (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

دوسری رائے:

دوسری رائے یہ ہے کہ اسمگلنگ شدہ سونے کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، اس رائے کے حاملین ہیں: مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی اور مولانا کلیم اللہ عمری۔

ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- حکومت کی ممانعت کے باوجود خلاف قانون سونے کی خرید وفروخت میں حکومت اور اس کے واسطے سے عام لوگوں کو نقصان پہنچانا ہے۔

۲- اس طرح کے معاملے میں اولیاء الامور کی مخالفت لازم آتی ہے، کیونکہ جن امور سے انہوں نے روک رکھا ہے، ان کا ارتکاب لازم آتا ہے، جبکہ غیر معصیت میں ان کی اطاعت واجب ہے۔

۳- خلاف قانون حاصل کردہ سونے کی خرید وفروخت میں گناہ پر تعاون ہے جو بنص قرآنی ممنوع ہے۔

جبکہ مفتی محمد ظفر عالم ندوی کی رائے ہے کہ اگر اس عمل سے برآمد سونے کی اطلاع ہوتو علم کے باوجود اس کی خرید وفروخت کراہت سے خالی نہیں، راقم الحروف کے نزدیک یہ رائے راجح معلوم ہوتی ہے، جبکہ درآمد (Import) اور برآمد (Export) کا نظام مفاد عام کے پیش نظر بنایا گیا ہو، لیکن اگر حکمراں طبقہ اور سرمایہ دار لوگوں کی رعایت پر مبنی نظام ہوتو پھر اسمگلنگ کے ذریعہ لائے ہوئے سونے کی خرید وفروخت مباح کے دائرہ میں رہے گی۔

اس سلسلہ کا آخری سوال یہ ہے کہ: آج کل پلاٹین کو سفید سونا کہا جاتا ہے، اب اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، تو کیا لوگوں کے عرف کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقی سونے کے حکم میں ہوگا اور عقود نیز زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ پلاٹین حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہے، اور نہ ہی عقود، زکوۃ اور دیگر معاملات میں اس پر سونے کے احکام منطبق کئے جاسکتے ہیں۔

ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- پلاٹین اگر چہ ایک قیمتی دھات ہے لیکن اس کی ماہیت وحقیقت سونے چاندی سے الگ ہے (مقالہ: راقم الحروف)۔

۲- لغت، حقائق اور دیگر قرائن وامارات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سونا سے الگ ایک قسم کی دھات ہے جو بہت سخت ہوتی ہے، لہذا وہ حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہے (مقالہ: مفتی سلمان پالنپوری)۔

۳- پلاٹین بہ طور ثمن تبادلہ کا ذریعہ نہیں ہے، اس لئے محض عرف میں سونا کہے جانے کی وجہ سے حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوگا۔

(مقالہ: مولانا ابوالکارم معروفی)۔

۴- پلاٹین کا ثمن خلقی ہونا ممکن ہی نہیں، اسی طرح جب تک یہ وسیلۂ تبادلہ اور معیار ثمن کی حیثیت سے لوگوں میں متعارف نہ ہوجائے اور حکومتیں اسے تسلیم نہ کرلیں اس کو ثمن اعتباری بھی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے (مقالہ: مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۴- سونے چاندی کے خصوصی احکام نہ تو اس کی دھات کی گرانی کی وجہ سے ہیں اور نہ ہی زینت کے لئے استعمال ہونے کی وجہ سے، لہذا پلاٹین سونے کے حکم میں نہیں (مفتی محمد عثمان بستوی)۔

۵- کسی چیز کا محض قیمتی ہونا اسے سونا چاندی کے حکم میں داخل نہیں کردیتا ہے، چنانچہ ہیرے (diamond) اور دیگر جواہرات ہر دور میں انتہائی قیمتی پتھر تھے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی موجود تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر زکوۃ واجب نہیں کی، اس سے معلوم ہوا کہ محض قیمتی ہونے سے کوئی چیز سونے چاندی کے حکم میں داخل نہیں ہوجاتی ہے (مقالہ: راقم الحروف)۔

۶- فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ محض قیمتی ہونے سے کوئی چیز سونے چاندی کے حکم میں داخل نہیں ہوجاتی ہے۔

چنانچہ محمد عبدالقادر رازی حنفیؒ (و:۶۶۶ھ) لکھتے ہیں:

''ولا شیء فی الفیروزج والیاقوت واللؤلؤ والعنبر وفی الزئبق الخمس'' (رازی، تحفة الملوك: ص/۱۲۸)

(فیروزہ، یاقوت، موتی اور عنبر میں کچھ واجب نہیں ہے اور پارہ میں پانچواں حصہ واجب ہے)

اور علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''لازكاة فی اللآلی والجواهر، وإن ساوت ألفا، الا أن تكون للتجارة، والأصل أن ماعدا الحجرين، وهذا علم بالغلبة على الذهب والفضة، والسوائم إنما يزكى بنية التجارة'' (الدر مع الرد: ۲/۱۵)

(موتی اور جواہر میں زکوۃ واجب نہیں ہے، اگر چہ ہزار کے برابر ہوں، مگر یہ کہ تجارت کے لئے ہو، اصل یہ ہے کہ سونے و چاندی کے علاوہ، اور غلبہ کی وجہ سے سونے چاندی کا علم "المجرین" ہو گیا ہے، اور چرنے والے جانوروں کے علاوہ میں زکوۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جبکہ تجارت کی نیت ہو)۔

اور امام نووی شافعیؒ لکھتے ہیں:

"لازکوة فيما سوى الذهب والفضة من الجواهر" (نووی، المجموع۶/ ۲)

(سونے چاندی کے علاوہ دیگر جواہرات میں زکوۃ واجب نہیں ہے)۔

۷- کسی چیز کو سونا کہہ دینے سے حقیقت کے اعتبار سے وہ سونا نہیں ہو جاتا ہے مثلاً پیٹرول (petrol) کو سیاہ سونا اور روئی (cotton) کو سفید سونا کہا جاتا ہے، لیکن محض نام کی وجہ سے وہ سونے کے حکم میں نہیں ہو جائیں گے (مقالہ: راقم الحروف و قاضی عبد الجبار طیب ندوی)۔

دوسری رائے:

مولانا محمد سعد نور قاسمی کی رائے ہے کہ پلاٹینم ہیرے جواہرات کی طرح ایک قیمتی دھات ہے، اور اس کو بطور ذخیرہ خرید کر لوگ محفوظ کرتے ہیں، لہذا اس پر زکوۃ واجب ہونی چاہئے کیونکہ یہ سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ایک ذریعہ ہے، چونکہ قدیم فقہاء کے دور میں ہیرے جواہرات اور دیگر قیمتی دھاتوں کو ذخیرہ کرنے اور ان کے ساتھ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کا رواج نہیں تھا، خال خال کچھ لوگ دو چار موتی زمرد و یاقوت وغیرہ کے نگینے اپنی انگوٹھی وغیرہ میں لگوا لیتے تھے، اس لئے انہوں نے عدم وجوب زکوۃ کا فیصلہ فرمایا۔

اور یہی رائے محی الدین غازی فلاحی کی ہے کہ تمام مہنگی دھاتوں کو زکوۃ کے حوالے سے سونے کے حکم میں ہونا چاہئے، لیکن انہوں نے اس کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔

دراصل یہ نکتہ ڈاکٹر محمد یوسف قرضاوی اور دیگر معاصر اہل علم نے اٹھایا ہے اور اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام کا بھی یہی میلان تھا کہ ہیرے جواہرات ضروریات زندگی میں داخل نہیں اور ارباب سرمایہ اپنے خاص مصالح کے لئے اپنے روپیوں کو جن کی مقدار غیر معمولی حد تک زائد ہوتی ہے، ہیروں اور جواہرات کی صورت میں محفوظ کر کے مختلف فوائد بھی حاصل کرتے ہیں اور انہیں اس طرح اس کا اطمینان بھی رہتا ہے کہ ان ہیروں اور جواہرات کی صورت میں گویا (زر نقد) ہر دم ان کے پاس محفوظ ہے اور اس کے نتیجے میں فقراء کو شدید نقصان ہوتا ہے، لہذا ذخیرہ کئے ہوئے ہیرے جواہرات کو حکماً مال تجارت تسلیم کر کے اس پر زکوۃ واجب قرار دینی چاہئے۔

اسی رائے سے استئناس کرتے ہوئے مولانا محمد سعد نور قاسمی کی رائے ہے کہ پلاٹینم بھی سرمایہ محفوظ کرنے کا ذریعہ ہے، لہذا اس پر بھی زکوۃ واجب ہونی چاہئے۔

ترجیح:

جمہور اہل علم وفقہ کی رائے راجح معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ پلاٹین نہ ثمن خلقی ہے اور نہ ہی ثمن اعتباری، اور اسے حکماً مال تجارت تسلیم کرنے کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب تفصیلی مقالات

سونا چاندی کی تجارت - چند نئے مسائل

مولانا اختر امام عادل قاسمی[1]

۱- کاغذی کرنسی کی ثمنی حیثیت اور اس سے خرید وفروخت:

کاغذی کرنسی ثمن اعتباری اور ثمن عرفی ہے، اور ساری دنیا میں بحیثیت ذریعۂ تبادلہ کثرت استعمال کی بنا پر اس کو ثمن مان لیا گیا ہے، ورنہ فی الواقع اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، عرف اور اعتبار ساقط ہوجائے تو یہ محض کاغذ کا بے قیمت ٹکڑا ہے، آج عملاً اسی سے سارا کاروبار جاری ہے، لیکن کیا اس تعامل کی بنیاد پر اس کو ثمن حقیقی کا درجہ دیا جاسکتا ہے؟ عصر جدید کا یہ ایک اہم ترین سوال ہے، اس سلسلے میں برصغیر کے اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ ثمن حقیقی یعنی سونا اور چاندی کے مثل نہیں ہے، اس لئے کہ سونا اور چاندی میں ثمنیت لوگوں کے اعتبار وعرف کی بنا پر بھی ہے اور ان کی ذاتی قیمت یا خلقی حیثیت کی بنا پر بھی، اگر ان کا ذریعہ تبادلہ ہونے کا عرف ختم بھی ہوجائے، جب بھی ان کی ذاتی ثمنیت باقی رہے گی، کیونکہ زیورات اور آرائش کے لئے قدرتی ذخائر میں اس سے بہتر چیز موجود نہیں ہے، یہی وجہ ہے نقود اور فلوس زمانے کی تبدیلی سے بدلتے رہے ہیں، لیکن صدیاں گذر گئیں سونا اور چاندی کی ثمنی اہمیت، اور معیار قیمت ہونے کی حیثیت میں فرق نہیں آیا، آج کے نئے نظام زر میں کرنسیوں کو معیار قیمت اور ذریعہ تبادلہ مان لیا گیا ہے، اور اس کی پشت پر سونا کی کوئی مقدار موجود نہیں ہے، لیکن اب سے کچھ عرصہ قبل تک دنیا کے تمام ملکوں کی کرنسیاں ڈالر سے اور ڈالر سونے سے وابستہ تھا یعنی امریکہ اس کا پابند عہد تھا کہ وہ ڈالر کے بدلے سونا دے گا، دوسرے ملکوں نے سونا دینے سے انکار کردیا تھا تو امریکہ کے ڈالر کو معیار بنایا گیا اس لئے کہ وہ سونا سے وابستہ تھا، لیکن عملاً امریکہ نے سونا کبھی نہیں دیا اور نہ اس سے کسی ملک نے سونا کا مطالبہ کیا، لیکن جب فرانس نے امریکہ سے سونا کے مطالبہ پر اصرار کیا تو دونوں ملکوں کے تعلقات بھی خراب ہوئے، اور ۱۹۷۱ء میں امریکہ نے سونا دینے سے انکار بھی کردیا، پھر ایک نئے نظام کا آغاز ہوا جس میں ہر ملک کی مجموعی پیداوار اور قوت خرید کو معیار بنا کر کرنسیوں کی قیمت طے کی گئی (یہ معلومات مولانا تقی عثمانی صاحب کی تحقیقات پر مبنی ہیں، دیکھئے: اسلام اور جدید معیشت وتجارت/ص ۹۵ تا ۱۰۴)۔ سونا دینے سے انکار کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کی نگاہ میں سونا کی کتنی اہمیت ہے، اور ملکوں کے اقتصادی ڈھانچہ کے تحفظ کے لئے یہ کیسی شاہ کلید ہے کہ ہر ملک اپنے ذخیرہ میں سونا کا زیادہ سے زیادہ تحفظ چاہتا ہے، اس سے سونا کے عالمی اور حقیقی معیار ہونے کا ثبوت ملتا ہے، اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ثمنیت صرف عرف واعتبار پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس میں اس کی شخصی حیثیت کا بھی دخل ہے۔

کرنسی نوٹ کا مسئلہ فلوس کے مسئلہ پر مبنی ہے:

دراصل کرنسی کے بارے میں اس تصور کی بنیاد فلوس کے مسئلے پر ہے، فلوس عہد قدیم میں تانبا یا لوہا سے تیار ہونے والے سکوں کو کہتے تھے، فلوس میں ثمنیت بھی ہے اور عددیت بھی، حنفیہ کے یہاں ربا کی بنیاد قدر وجنس پر ہے، اور قدر کیلی یا وزنی چیز کو کہتے ہیں، معدودات اس دائرے سے خارج ہیں، اس اصول کی بنیاد پر فلوس فی نفسہ عددی بنیادوں پر فروخت ہوتے ہیں، لیکن ذریعہ تبادلہ اور معیار ثمن ہونے کی بنا پر ان میں ثمنیت بھی ہے، ثمنیت تعیین کے منافی ہے، جبکہ عددیت میں تعیین ہوتی ہے، اگر فلوس کی بیع فلوس کے ذریعہ کی جائے [illegible] اس میں تفاضل یا ادھار کی گنجائش ہے؟ یہ

[1] جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور بہار۔

مسئلہ قدیم میں فقہاء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے:

فلوس کے ذریعہ سونا چاندی کی خرید وفروخت:

حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا مشہور مسلک یہ ہے کہ فلوس میں ربا نہیں ہے، اس لئے کہ وہ عدد کے ذریعہ بیچے اور خریدے جاتے ہیں، ان میں قدر (کیل ووزن) موجود نہیں ہے، خواہ وہ کتنا ہی رائج الوقت ہو، جوہری ثمنیت ان میں مفقود ہے، ان کی ثمنیت محض اعتباری ہے. شافعیہ ان کو عروض میں شمار کرتے ہیں (شرح منتهى الإرادات ۲/ ۱۹۴، کشاف القناع ۳/ ۲۵۲)۔

اور حنفیہ اس میں کیل ووزن کو مفقود پاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ثمنیت ان میں اصالۃً نہیں ہے، بلکہ عاقدین کے باہمی اتفاق پر مبنی ہے، اس کی کے باہمی اتفاق سے شئی کی اصلیت باطل نہیں ہوتی، اس لئے کمی بیشی کے ساتھ ان کی خرید وفروخت جائز ہے (بدائع الصنائع ۵/ ۱۸۵)۔

''وعلى ذلك فيجوز بيع الفلوس بعضها ببعض متفاضلا، كما يجوز بيع بيضة ببيضتين، وجوزة بجوزتين. وسكين بسكينين، ونحو ذلك إذا كان يدا بيد'' (الهدايه مع الفتح ۶/ ۱۶۲)۔

اور اسی تصور کی بنیاد پر ہماری تمام کتب فقہ میں بیع فلوس بالفلوس کو (شیخین کے قول کے مطابق) بیع صرف ماننے سے انکار کیا گیا ہے:

''سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين لما في البزازية لو اشترى مائة فلس بدرهم يكفي التقابض من أحد الجانبين قال ومثله ما لو باع فضة أو ذهبا بفلوس كما في البحر عن المحيط'' (ردالمحتار ۷/ ۴۱۴)۔

''وإن اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلسًا وليست الفلوس عنده فهو جائز تقابضا قبل التفرق أو لم يتقابضا لأن هذا بيع وليس بصرف'' (الفتاوى الهنديه ۳/ ۲۲۴)۔

فلوس میں اختلاف فقہاء کی بنیاد:

حنفیہ کے یہاں یہ حکم اس صورت میں ہے جب دونوں جانب فلوس متعین ہوں، اگر دونوں میں سے کسی جانب بھی تعیین مفقود ہو تو عدم جواز پر حنفیہ کا اتفاق ہے، البتہ حضرت امام محمدؒ دونوں جانب تعیین کی صورت میں بھی جواز کے قائل نہیں ہیں، جبکہ شیخین جائز قرار دیتے ہیں، اور اس کی بنیاد بیع الاثمان بالاثمان کے وجود پر ہے، شیخین کے نزدیک فلوس کی ثمنیت سونا چاندی کی طرح اصلی اور حقیقی نہیں ہے کہ کبھی بھی ساقط نہ ہو بلکہ اعتباری ہے، جس کو عاقدین باہم ساقط کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اور معاملات میں کسی کو ان پر ولایت حاصل نہیں ہے اس لئے تعیین کی صورت میں وہ صرف ایک عددی چیز کے طور پر باقی رہیں گے اور اموال ربویہ کے دائرہ سے خارج ہو جائیں گے۔

جبکہ حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ فلوس کی ثمنیت عرف عام اور تداول عام پر مبنی ہے نہ کہ محض اتفاق باہم یا عرف خاص پر، اس لئے باہمی تعیین سے ان کی ثمنیت باطل نہ ہوگی، کیونکہ نقود واثمان تعیین سے متعین نہیں ہوتے، اس لئے سکہ رائجہ ہونے کی صورت میں ان کی ذاتی حیثیت (عددیت) مغلوب ہو جائے گی اور ذریعہ تبادلہ ہونے کی بنا پر ان کو معیار ثمن قرار دیا جائے گا، اور ان پر بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے:

''وقال محمد: لايجوز لأن الفلوس الرائجة أثمان والثمن لايتعين بالتعيين ولهذا إذا قابل الفلوس بخلاف جنسها لايتعين كالدراهم والدنانير حتى كان له أن يعطي غيرها ولا يفسد البيع بهلاكها وهذا؛ لأن ثمنيتها تثبت باصطلاح الكل فلا تبطل باصطلاحهما كالدراهم والدنانير فإذا لم يتعين يؤدي إلى الربا أو يحتمله ولهما أن الفلوس ليست بأثمان خلقة وإنما كان ثمنا بالاصطلاح وقد اصطلحا بإبطال الثمنية فتبطل وإن كانت ثمنا عند غيرهما من الناس لبقاء اصطلاحهم على ثمنيتها وهذا؛ لأنه لا ولاية للغير عليهما فلا يلزمهما اصطلاحهم بخلاف الدراهم والدنانير؛ لأن ثمنيتها بأصل الخلقة فلا تبطل بالاصطلاح فإذا بطلت الثمنية تتعين بالتعيين فلا يؤدي إلى الربا'' (تبيين الحقائق ۴/ ۹۱)۔

☆ مالکیہ کا نقطہ نظر بھی حضرت امام محمدؒ کے مطابق ہے، حضرت امام مالکؒ نے ''مدونہ'' میں تصریح کی ہے:

''لا یجوز فلس بفلسین ولا تجوز الفلوس بالذهب والفضة ولا بالدنانیر نظرة'' (المدونة الكبرى ۳/۳۹۶، ۳۹۵)۔
اور حنابلہ کی ایک روایت بھی یہی ہے (کشاف القناع ۳/ ۲۵۲، الفروع و تصحیحہا ۴ /۷ ۱۴، ۱۵۱)۔

آج کے دور میں امام محمدؒ کا قول قابل ترجیح ہے:

☆ آج کی بدلی ہوئی صورت حال میں کاغذی کرنسی کے حق میں امام محمدؒ کا قول زیادہ قابل ترجیح محسوس ہوتا ہے، اور اس کی کئی وجوہ ہیں:

☆ عہد قدیم میں فلوس مستقل ثمن کی حیثیت سے جاری نہیں تھے، بلکہ سونا چاندی کے تابع ثمن کی حیثیت سے ان کا چلن تھا، درہم و دینار ہی اصل ثمن مانے جاتے تھے، اور فلوس کو ان کی ریزگاری کے طور پر متصور کیا جاتا تھا، جب کہ آج کے دور میں سونا چاندی کے سکوں کا رواج ساری دنیا سے بالکل ختم ہو چکا ہے، اب ان کرنسیوں نے ہی پوری طرح ان کی جگہ سنبھال لی ہے، آج یہ اثمان تابعہ نہیں بلکہ اثمان اصلیہ کی طرح رائج ہیں۔

☆ دوسری بات یہ ہے کہ شیخین کے تصور کی بنیاد یہ ہے کہ ساری دنیا درہم و دینار کو ثمن مانتی ہے جبکہ فلوس اصلاً لوہا اور تانبے کی دھات ہے، جو سکہ بن جانے کے بعد اشیاء عددیہ کی طرح فروخت ہوتے ہیں، اور مخصوص اتفاقات یا مجبوریوں کی بنیاد پر لوگ ان کے ذریعہ معاملات بھی کرتے ہیں، مگر یہ ثمن مسلمہ نہیں ہیں، جس کو توڑا نہ جاسکے اور ان کی اصلیت کی طرف موڑا نہ جاسکے، علاوہ عاقدین کسی کی ولایت میں نہیں ہیں، آج روپے کی صورت حال یہ نہیں ہے، حکومتوں کی جانب سے ان کی حیثیت مسلمہ ثمن کی ہے، اس کی ثمنیت ساقط کرنے کا اختیار صرف حکومت کو ہے، باہم اس کو محض کاغذ فرض کر لینے سے ان کی ثمنیت ساقط نہیں ہوگی، ملک کے تمام شہری حکومت کی ولایت میں ہیں، اس لئے نقود اور روپے پیسے کی ثمنیت کو ختم کرنا عام انسانوں کے لئے ممکن نہیں۔

میرا احساس یہ ہے کہ خود شیخین بھی کرنسی کی موجودہ صورت حال کو ملاحظہ فرماتے تو ان کو فلوس کے بجائے درہم و دینار کا متبادل قرار دیتے، بلکہ ممکن ہے کہ امام محمدؒ نے مارکیٹ کی وہ صورت حال دیکھی ہو جو اکابر شیخین کے مشاہدہ میں نہ آسکی ہو۔

موجودہ دور کے روپے کا آغاز گوکہ سونا چاندی کے تابع کی حیثیت سے ہوا تھا لیکن آج جب سونا چاندی کے سکے مارکیٹ سے ختم ہو چکے ہیں ان کی حیثیت خود مستقل بن چکی ہے، زیادہ تر ماہرین معاشیات یہ کہتے ہیں کہ نوٹ کے پیچھے سونا اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ بحیثیت ذریعہ تبادلہ پہلے سے متعارف تھا، لیکن اب جب بغیر سونے کا واسطہ بنائے ہی کرنسی نوٹ کو ثمنیت اور ذریعہ تبادلہ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے تو اس کو سونا کا بدل ماننے کی ضرورت نہیں ہے، یہ بذات خود ایک ثمن ہے (اسلام و جدید معیشت/ ۱۰۴)۔

☆ اور ایک اہم ترین بات یہ ہے کہ اگر شیخین کا قول اختیار کیا جائے تو ایک ہی ملک کی کرنسیوں کی باہم خرید و فروخت کو کمی بیشی کے ساتھ جائز کہنا پڑے گا اور ربا کا دروازہ کھل جائے گا، جب کہ تمام دنیا کے علماء نے روپے پیسے کے باہمی تبادلہ میں کمی بیشی کو ناجائز قرار دیا ہے، الا یہ کہ الگ الگ ملکوں کی کرنسیاں ہوں، اور اسی احتیاط کی بنیاد پر عہد قدیم میں بھی فقہاء ماوراء النہر (سمرقند و بخارا) نے عدالی اور غطارفہ میں تفاضل کی حرمت کا فتویٰ دیا تھا، جب کہ ان میں کھوٹ کا غلبہ ہوتا تھا، اور اس کی بنیاد یہی بتائی گئی تھی کہ ہمارے دیار میں ان کی بڑی اہمیت ہے اگر ثمنیت کو مغلوب سمجھ کر تفاضل کو جائز قرار دیا جائے تو ربا کا دروازہ کھل جائے گا (البحر الرائق ۶ /۲۱۸)، آج کے حالات میں ہمیں اس سے رہنمائی ملتی ہے۔

روپے سے سونا چاندی کی خرید و فروخت بیع صرف ہے:

اسی بنا پر آج اکثر علماء عرب کی رائے یہ ہے کہ کرنسی سونا اور چاندی کی طرح ایک مستقل ثمن ہے، بینکوں اور نوٹ کے چھاپہ خانوں نے اس کے استقلال پر مہر لگادی ہے، اس لئے روپے کے عوض سونا چاندی کی خرید تبادلہ ثمن بالثمن ہے، اور اسی کو بیع صرف کہتے ہیں، اس لئے مجلس عقد میں بدلین پر قبضہ ضروری ہے، ایک بدل پر قبضہ کافی نہیں ہے۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ سونا چاندی کے ثمن خلقی ہونے پر کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے، یہ ایک بات ہے جو صدیوں سے مشہور چلی آرہی ہے، ورنہ سونا چاندی کی ثمنیت بھی عرف و اعتبار ہی پر مبنی ہے، ان کی ذاتی قیمت ملحوظ نہیں ہے، اس تناظر میں حضرت امام مالکؒ کا یہ قول بہت بامعنی ہے کہ:

اگر سونا چاندی کے بجائے جانور کی کھال ذریعۂ تبادلہ بن جائے، اور اسی کی کرنسی اور سکے تیار ہو جائیں (جیسا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے دور میں ارادہ فرمایا تھا) تو میرے نزدیک سونا چاندی کے بالعوض اس کی بیع پر بھی بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے اور ادھار کی گنجائش نہ ہوگی۔

''ولو أن الناس أجازوا بينهم الجلود حتى يكون لها سكة وعين لكرهتها أن تباع بالذهب والورق نظرة'' (المدونة الكبرى ۳/ ۵)۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ:

"درہم و دینار (یعنی موجودہ ثمن) کی کوئی طبعی یا شرعی حقیقت نہیں ہے، ان کی بنیاد خالص عرف پر ہے، یہ بذات خود مقصود نہیں ہیں، بلکہ مقصد کسی معیار تعامل اور ذریعۂ تبادلہ کا وجود ہے، اور یہی ان کے ثمن ہونے کی بنیاد ہے، جو چیزیں وسائل کا درجہ رکھتی ہیں ان کی نہ صورت مطلوب ہوتی ہے اور نہ مادہ، مقصد کی تکمیل سے زیادہ کچھ مطلوب نہیں ہوتا، (یعنی اگر یہ مقصد کسی اور چیز سے حاصل ہونے لگے تو اس کا حکم بھی یہی ہوگا)''۔

''وأما الدرهم والدينار فما يعرف له حد طبعي ولا شرعي. بل مرجعه إلى العادة والاصطلاح؛ وذلك لأنه في الأصل لايتعلق المقصود به، بل الغرض أن يكون معيارا لما يتعاملون به، والدراهم والدنانير لاتقصد لنفسها. بل هي وسيلة إلى التعامل بها؛ ولهذا كانت أثمانا . . . إلى أن قال: والوسيلة المحضة التي لايتعلق بها غرض. لا بمادتها ولا بصورتها يحصل بها المقصود كيفما كانت'' (مجموعہ فتاوى ابن تيميہ ۲۹/ ۲۵۱)۔

ہیئۃ کبار العلماء کا فیصلہ:

چنانچہ سعودیہ عرب کے موقر علمی ادارہ "ہیئۃ کبار العلماء" نے کرنسی کے مسئلے پر معاصر علماء و فقہاء سے مذاکرات و مناقشات کے بعد اکثریت کی رائے کے مطابق یہ فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ کرنسی خواہ کسی ملک کی ہو وہ عین ثمن کے قائم مقام ہے اور سونا اور چاندی کی ثمنیت کے ہم پلہ ہے، اور اس کی پشت پر سونا ہونے کی بات محض رسمی ہے، خارجی دنیا میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اس لئے موجودہ کرنسی کے ذریعہ سونا اور چاندی کی خرید و فروخت بیع صرف کے زمرہ میں داخل ہے، اور مجلس عقد میں تقابض بدلین ضروری ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: قرار ہیئۃ کبار العلماء رقم (10 و تاریخ 1393 \ 8 \ 17ھ)۔

مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ کا فیصلہ:

مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ نے بھی اپنے فیصلوں میں کرنسی کو ثمنیت کے معاملے میں سونا چاندی کے مثل قرار دیا ہے، اور تمام مسائل میں اس پر سونا اور چاندی کے احکام جاری کئے ہیں:

''فإن مجلس المجمع الفقهي الإسلامي. يقرر أن العملة الورقية نقد قائم بذاته. له حكم النقدين من الذهب والفضة. فتجب الزكاة فيها، ويجرى الربا عليها بنوعيه. فضلًا ونسيًا. كما يجرى ذلك في النقدين من الذهب والفضة تمامًا؛ باعتبار الثمنية في العملة الورقية قياسا عليهما. وبذلك تأخذ العملة الورقية أحكام النقود في كل الالتزامات التي تفرضها الشريعة فيها.

ثانيا: يعتبر الورق النقدى نقدًا قائمًا بذاته كقيام النقدية في الذهب والفضة وغيرهما من الأثمان. كما يعتبر الورق النقدى أجناسًا مختلفة، تتعدد بتعدد جهات الإصدار في البلدان المختلفة. بمعنى أن الورق النقدى السعودى جنس. وأن الورق النقدى الأمريكي جنس. وهكذا كل عملة ورقية جنس مستقل بذاته. وبذلك يجرى فيها الربا بنوعيه فضلًا ونسيًا، كما يجرى الربا بنوعيه في النقدين الذهب والفضة وفي غيرها من الأثمان'' (فقه الاسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي جدہ ۳/ ۹۵۱)۔

۱- اس تفصیل کی روشنی میں روپئے سے سونا چاندی کی خرید و فروخت بیع صرف کے حکم میں ہے۔

(الف) اس میں مجلس عقد میں تقابض بدلین ضروری ہے، ایک نقد اور دوسرا ادھار درست نہیں (حاشیہ رد المحتار ۵/ ۲۵۸)۔

(ب) سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت یا اس کی مارکیٹ نے طے کیا ہے اس سے زیادہ یا کم قیمت میں روپے سے خرید وفروخت کرنا جائز ہے، اس لئے کہ روپیہ کی جنس ثمنیت سونا چاندی سے مختلف ہے اور مختلف الجنس میں تفاضل کی اجازت ہے۔

''وإن باع الذهب بالفضة جاز التفاضل لعدم المجانسة'' (ہدایہ۳/ ۱۰۴)۔

۲- زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ وزن میں سونا لیتے ہیں اور چند دنوں میں اس کے بدلے سونے سے بنائے ہوئے زیورات انہیں واپس کرتے ہیں، انہیں الگ سے کوئی اجرت نہیں دی جاتی بلکہ زیورات کی شکل میں سونے کی اتنی ہی مقدار انہیں واپس کرنی ہوتی ہے جتنی انہوں نے لی تھی، البتہ سونے کا زیور بنانے میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، اس آمیزش کے بقدر سونا ان کو بچ جاتا ہے اور زیور بنانے میں سونے کے کچھ ذرات نکل آتے ہیں، یہی ان کی اجرت ہوتی ہے:

(الف) اگر یہ واقعی اجرت ہے جیسا کہ ان کے پیشے کا تقاضہ ہے کہ وہ سونا کے کاریگر ہیں تاجر نہیں، تو اجرت متعین ہونی ضروری ہے، سونے کے ذرات کتنی مقدار میں نکلیں گے یہ پہلے سے معلوم نہیں ہے تو یہ اجارۂ مجہولہ ہے اور درست نہیں، نیز یہ جنس عمل سے اجرت ہے جو بعض فقہاء کے نزدیک ناجائز ہے (ہدایہ ۳/ ۲۴۲، الفتاوی الهندیہ ۴/ ۴۴۴، شرح الصغیر ۴/ ۱۸، بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۴۶)۔

(ب) اور اگر بیع ہے تو بیع صرف میں تماثل کے ساتھ مجلس عقد میں تقابض بدلین بھی ضروری ہے، جو یہاں موجود نہیں، اس لئے بیع بھی جائز نہیں ہے۔

سونا کے تاجروں اور کاریگروں کو چاہئے کہ معاملہ کی صورت پہلے سے طے کر کے کاروبار کریں، ورنہ شرعی قباحت سے چارہ نہیں، مثلاً یہ صورت ممکن ہے کہ قبل سے تیار شدہ زیورات سونا کے تاجروں کے پاس لے جائیں اور ان کے وزن کے مطابق ان کے بدلے سونا لے لیں۔

۳- سونا چاندی کے پرانے زیورات کو نئے زیورات سے کمی بیشی کے ساتھ تبدیل کرنا جائز نہیں ہے، سونا چاندی میں نئے اور پرانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تماثل اور تقابض ہر حال میں ضروری ہے۔

''فإن باع فضة بفضة وذهبًا بذهب لايجوز إلا مثلًا بمثل وإن اختلفت في الجودة والصياغة'' (ہدایہ کتاب الصرف ۳/ ۱۰۴)۔

۴- آج کل کموڈیٹر ایکسچینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے جس میں خریدار آرڈر دیتا اور جو کچھ اس نے آرڈر دیا ہے اس کے آرڈر کے بقدر وہ شئی اس کے نام سے محفوظ کر دی جاتی ہے:

الف: مثلاً دوسو (۲۰۰) افراد نے پچاس پچاس گرام سونے کا آرڈر دیا، اور ایکسچینج میں ان سب کے نام سے پچاس پچاس گرام سونا محفوظ کر دیا گیا، اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں درج بھی کر دیا گیا، لیکن محض اس اندراج سے خریداروں کا قبضہ متحقق نہ ہوگا خواہ وہ ایک کلو سونا مشترک طور پر اینٹ کی شکل میں ہو یا الگ الگ بسکٹ اور سکوں کی شکل میں، اس لئے کہ فقہاء حنفیہ کے نزدیک قبضہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ مبیع سے بائع یا کسی دوسرے کا حق متعلق نہ ہو، اور وہ کلی طور پر مشتری کے لئے فارغ ہو، نیز بائع کے ضمان سے مشتری کے ضمان میں منتقل ہو جائے (ہندیہ ۳/ ۱۷، ردالمحتار ۴/ ۵۶۲)، البتہ حنابلہ کے یہاں توسع ہے اور حق غیر میں مشغول اور غیر متمیز ہونے کے باوجود قبضہ مکمل ہو جاتا ہے۔

۵- ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی ایک اور صورت جو آج کل رائج ہے، یہ ہے کہ مثلاً ایک مہینے کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے ۱۰ تولے سونے کا سودا کر لیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا، جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ لیا جاتا ہے، خرید کے دن اور ادائیگی کے دن سونے کے نرخوں میں جو فرق ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کر دی جاتی ہے، مثلاً خریدنے کے دن سونے کا نرخ تیس ہزار روپے فی تولہ تھا، اور ادائیگی کے دن اکتیس ہزار ہو گیا تو خریدار بائع کو ایک ہزار روپے ادا کرے گا، اور اگر ادائیگی کے دن انتیس ہزار روپے ہو گیا تو بائع خریدار کو ایک ہزار روپے ادا کرے گا، نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے اور نہ بائع قیمت پر، بس قیمتوں کے فرق کا کاروبار ہوتا ہے، میرے نزدیک یہ قمار کی ایک صورت ہے اور بالکل ناجائز ہے۔

۶-سونا چاندی کی ذخیرہ اندوزی:

حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام محمدؒ کے اصول پر یہ احتکار ممنوع کے دائرے میں داخل نہیں ہے، ان بزرگوں کے نزدیک صرف انسانی یا حیوانی غذائی اشیاء کا احتکار ممنوع ہے، یعنی ایسی چیزیں جو براہ راست انسان یا جانوروں کے نظام تغذیہ کو متاثر کرے، بالواسطہ یا سبب بعید کے طور پر متاثر کرنے والی ذخیرہ اندوزی احتکار ممنوع میں شامل نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اس کو خلاف اولی یا خلاف افضل کہا جاسکتا ہے، اور وہ بھی اس بنا پر کہ حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک احتکار کا دائرہ دیگر ائمہ کی طرح وسیع ہے، ان کے نزدیک عام لوگوں کو نقصان پہونچانے والا ہر احتکار درجہ بدرجہ ممنوع ہے (بدائع الصنائع ۱۱/۷۷ ۳)۔

۷-سونا چاندی کی اسمگلنگ:

ملک میں جو سونا آتا ہے اس میں بڑا حصہ تو قانونی طریقہ پر آتا ہے اور سونا لانے والا اس سے متعلق واجبات کو ادا کرتا ہے، دوسرا راستہ اسمگلنگ کا ہے، یہ طریقہ غیر قانونی ہے، اس میں سونا لانے والا ان واجبات کو ادا نہیں کرتا، جو حکومت نے سونے کی درآمد سے متعلق مقرر کئے ہیں، اس کو آج کی اصطلاح میں اسمگلنگ کہتے ہیں، قانون کی نگاہ میں یہ جرم ہے اور اس کے ذریعہ حاصل شدہ مال ضبط ہوسکتا ہے، شریعت کی نگاہ میں حکومت کے جائز ضوابط کی رعایت لازم ہے، اس کی تکمیل نہ کرنا گناہ ہے، اس لئے کہ یہ ملک کے معاہدۂ شہریت کے خلاف ہے، مسلمان ہر حال میں اپنے عہد کا پابند ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"المسلمون عند شروطهم فيما وافق الحق" (السنن الکبری ۷/۲۴۹) (موافق حق معاملات میں مسلمان شرائط کا پابند ہوتا ہے)۔
فقہاء نے قومی اور بین الاقوامی بے شمار مسائل میں اس حدیث کو بنیاد بنایا ہے (بدائع الصنائع ۴/۱۹۰)۔

علاوہ ازیں مسلمان کی عزت وحرمت کی حفاظت مقاصد دین بلکہ ضروریات ستہ (حفاظت دین، حفاظت جان، حفاظت مال، حفاظت عقل، اور حفاظت آبرو یا نسب) میں شامل ہے (شرح مختصر الروضۃ ۳/۲۰۹، تیسیر الاصول الی قواعد الاصول ومعاقد الفصول ۱/۲۷۳)، ملکی قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کی عزت وآبرو خطرہ میں پڑسکتی ہے، اس لئے بلا کسی عذر شرعی کے اس کو خطرہ میں ڈالنا درست نہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر خلاف قانون اسمگلنگ کرنا جرم ہے، لیکن اگر کوئی بچ بچا کر سونا لے آیا تو حاصل شدہ مال حلال وطیب ہے، بشرطیکہ بیع وشرا کے کسی بنیادی اصول کی خلاف ورزی نہ کی گئی ہو، اس لئے کہ حنفیہ کے اصول کے مطابق عملی فساد کا تعلق گناہ وثواب سے ہے نہ کہ مال کی حلت وحرمت سے۔

۸- آج کل "پلاٹین" کو سفید سونا کہا جاتا ہے، اب اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے، اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود زکوۃ یا عقود ومعاملات میں اس پر حقیقی سونا کے احکام جاری نہیں ہوں گے، اس لئے کہ سونا چاندی میں ثمنیت یا تو خلقی طور پر ہے جیسا کہ مشہور ہے، یا اعتباری طور پر، پلاٹین کو ان دونوں میں سے کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے، اس کا ثمن خلقی ہونا تو ممکن ہی نہیں، اسی طرح جب تک کہ یہ وسیلہ تبادلہ اور معیار ثمن کی حیثیت سے لوگوں میں متعارف نہ ہوجائے اور حکومتیں اسے تسلیم نہ کرلیں اس کو ثمن اعتباری بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، موجودہ حالات میں یہ صرف عروض کے درجہ میں ہے۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت کے جدید مسائل اور ان کا حل

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی[1]

تمہید:

انسانی زندگی کے لئے مال کی حیثیت شہ رگ کی ہے، چنانچہ ایک متوازن، پرامن اور پرسکون زندگی کا اس کے بغیر تصور نہیں کیا جاسکتا ہے، اسی لئے ہر انسان کی فطری خواہش زیادہ سے زیادہ مال کی حولیابی ہوتی ہے، قرآن کریم میں اسی کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

"زين للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والأنعام والحرث ذلك متاع الحياة الدنيا، والله عنده حسن المآب" (سورۂ آل عمران:۱۴) (لوگوں کی نگاہوں میں مرغوبات دنیا: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی خوشنما کردی گئی ہیں، یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں، اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے)۔

مال کی یہ ظاہری کشش انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے، اور اسے اس میں تسکین ملتی ہے، وہ اسے سماج میں اپنے وقار کا ذریعہ بناتا ہے، اور اپنی تمام مشکلات کے حل کا اسے وسیلہ قرار دیتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ بہ ظاہر اس کے سب کام بنتے چلے جاتے ہیں۔

اگرچہ مال میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، لیکن سونا چاندی ان میں سے اہم عنصر ہیں، اس لئے آدمی نے ان کو ہر دور میں اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اور اپنی دلچسپیاں اور سرگرمیاں سمیٹ کر ان کے گرد جمع کی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے مال سونا چاندی سمیت آدمی کی ایک ضرورت ہے، ہدف نہیں ہے، لہذا مال کی رغبت اچھی چیز ہے، اس لئے کہ وہ دنیا میں اس کی بقا کے لوازم میں سے ہے، لیکن آدمی کا اصل ہدف آخرت کی زندگی ہے، لہذا اسلام چاہتا ہے کہ وہ مال وجائداد کی ظاہری کشش سے متاثر ہو کر اسی میں نہ کھو جائے، بلکہ اس سے اوپر اٹھ کر آخرت کی ان دیکھی چیزوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے، اور دنیوی زندگی کی بے اعتدالیوں میں مبتلا ہو کر فطرت سلیمہ اور شریعت کے جادہ مستقیم سے نہ ہٹے، اور آخرت کی تیاری سے غفلت نہ برتے، اور دنیا میں اتنا مشغول نہ ہو کہ دنیا سے ماورا مستقبل کی تعمیر کی فکر ہی چھوڑ دے، اور جنت کے گھر کی آبادی کی یاد ہی اسے نہ رہے۔

موجودہ دور میں اگرچہ کاغذی نوٹ (Paper Currencies) رواج پذیر ہیں، پھر بھی سونا چاندی اور خاص طور سے سونے کی اہمیت برقرار ہے، اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- الف: روپیہ ثمن اصطلاحی ہے، ثمن حقیقی نہیں ہے، لہذا روپے سے سونا خریدا جائے تو اس میں روپے کی حیثیت ثمن کی ہے، لیکن یہ بیع صرف بھی نہیں ہے، اس لئے کہ روپے ناپی یا تولی جانے والی چیز نہیں، اور اس کی ثمنیت اصطلاحی ہے، لہذا یہ بات درست ہے کہ سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو، اور دوسرا ادھار، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

"وقيد بالذهب والفضة؛ لأنه لو باع فضة بفلوس، أو ذهب بفلوس؛ فإنه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق، لا قبضهما" (ابن نجيم، البحر الرائق، كتاب الصرف ٦/ ٢١١، بيروت، دار المعرفة)

(اور مؤلف نے باہمی قبضہ کو سونا چاندی کے ساتھ مقید کیا ہے: اس لئے کہ چاندی کو اگر فلوس (دھات کے ڈھلے ہوئے سکے) کے بدلے بیچے، یا سونے کو فلوس کے بدلہ بیچے، تو جدا ہونے سے پہلے بدلین میں سے ایک پر قبضہ شرط ہے، دونوں پر قبضہ شرط نہیں ہے)۔

---

[1] عمید کلیۃ الحدیث، جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، پٹیکاڈ، مالاپورم، کیرالا۔

اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: ''وقید بالنقدین؛لأنه لو باع فضة بفلوس؛فإنه یشترط قبض أحد البدلین قبل الافتراق. لا قبضهما'' (ابن عابدین، ردالمحتار، باب الصرف ۵/ ۲۵۹، بیروت، دار الفکر ۱۴۲۱ھ) (اور مصنف نے سونا چاندی کے ساتھ باہمی قبضہ کو مقید کیا ہے؛ اس لئے کہ اگر چاندی کو فلوس کے بدلے بیچے، تو جدا ہونے سے پہلے بدلین میں سے ایک پر قبضہ شرط ہے، دونوں پر قبضہ شرط نہیں ہے)۔

اور علامہ تمرتاشی اور حصکفیؒ لکھتے ہیں: ''باع فلوسا بمثلها أو بدراهم أو بدنانیر، فإن نقد أحدهما جاز. وإن تفرقا بلا قبض أحدهما لم یجز'' (تمرتاشی، تنویر الأبصار مع الدر المختار باب الربا ۵/ ۱۶۹، بیروت، دار الفکر ۱۳۸۶ھ، ۶۰۶: ۶)

(اگر فلوس کو فلوس سے یا دراہم یا دنانیر سے بیچے، سو اگر ان میں سے ایک نقد (ہاتھ کے ہاتھ) دے تو جائز ہے، اور اگر دونوں میں سے ایک کو بھی قبضہ کئے بغیر عاقدین جدا ہو جائیں، تو جائز نہیں ہے)۔

اور علامہ ابن عابدینؒ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''سئل الحانوتي عن بیع الذهب بالفلوس نسیئة. فأجاب بأنه یجوز إذا قبض أحد البدلین. لما في ''البزازیة'': لو اشتری مائة فلس بدرهم، یکفي التقابض من أحد الجانبین. قال: ومثله: ما لو باع فضة أو ذهبا بفلوس'' (ابن عابدین، ردالمحتار ۵/ ۱۸۰)

(علامہ حانوتی سے سونے کو فلوس کے بدلے ادھار بیچنے کے بارہ میں پوچھا گیا، تو جواب دیا کہ یہ جائز ہے، جبکہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ کر لیا جائے، کیونکہ ''بزازیہ'' نامی کتاب میں ہے: اگر سو فلس ایک درہم کے بدلہ خریدے، تو جانبین میں سے ایک کی طرف سے باہمی قبضہ کافی ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ اسی کی مانند حکم اس صورت میں ہے جبکہ چاندی یا سونے کو فلوس کے بدلے بیچے)، البتہ امام محمد نے ''الاصل'' (المبسوط) میں اس مسئلہ کو جس طرح ذکر کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانب سے قبضہ شرط ہے، اور ''الجامع الصغیر'' کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ باہمی قبضہ شرط ہے، اور ''الجامع الصغیر'' کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ باہمی قبضہ شرط ہے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: (ایک فلس کو دو متعین فلس کے ذریعہ بیچنے کے مسئلہ کو امام محمد نے ''الاصل'' یعنی ''المبسوط'' کے ''باب الصرف'' میں ذکر کیا ہے، اور دونوں جانب سے باہمی قبضہ کی شرط نہیں لگائی ہے، اور ''الجامع الصغیر'' میں ایسی عبارت ذکر کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جانبین سے باہمی قبضہ شرط ہے، چنانچہ بعض فقہاء نے دوسرے قول کو صحیح نہیں قرار دیا ہے، اس لئے کہ بدلین کی تعیین کے ساتھ باہمی قبضہ ''صرف'' میں شرط ہے، اور یہ ''بیع صرف'' نہیں ہے، اور بعض فقہاء نے دوسرے قول کو صحیح قرار دیا ہے، اس لئے کہ ایک اعتبار سے فلوس کے لئے سامان کا حکم ہے، اور ایک اعتبار سے ثمن کا حکم ہے، لہذا پہلے اعتبار کی وجہ سے زیادتی جائز ہے، اور دوسرے پہلو کی وجہ سے باہمی قبضہ شرط ہے) (ردالمحتار ۵/ ۱۸۰)۔

اور ''الجامع الصغیر'' میں مذکور قول پر اعتماد کرتے ہوئے ''قاری الہدایۃ'' کے فتاوی میں یہ مذکور ہے کہ فلوس کو سونا یا چاندی کے بدلہ بیچا جائے تو جانبین سے قبضہ شرط ہے (ابن عابدین، مرجع سابق ۵/ ۱۸۰)۔

لیکن صحیح قول یہی ہے کہ فلوس کو سونا یا چاندی کے بدلہ ادھار بیچنا درست ہے، اس لئے کہ وہ حقیقی ثمن نہیں ہے، لہذا یہ بیع صرف نہیں ہے، اور ایک طرف سے قبضہ کی شرط اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ ''بیع صرف'' ہے، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ سکے متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے ہیں، اور سکے کی تعیین بغیر قبضے کے نہیں ہو سکتی ہے، اس لئے اگر بغیر قبضہ کے عاقدین جدا ہو گئے، تو ان کی جدائی اس حالت میں ہوگی کہ ہر فریق کے ذمہ دوسرے کا دین ہونا، اور دین کو دین کے بدلہ بیچنا جائز نہیں ہے (کاسانی، بدائع الصنائع ۵/ ۲۳۷)۔

اشکال:

اگر یہ اشکال کیا جائے کہ کاغذی نوٹ (Paper Money) کو فلوس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ فلوس یعنی دھات کے ڈھلے ہوئے سکے دو حیثیت رکھتے ہیں: ۱- وہ سامان کے درجہ میں ہیں، ۲- وہ اصطلاحی ثمن ہیں، جبکہ کاغذی نوٹ ہر اعتبار سے اصطلاحی ثمن ہیں، اسی وجہ سے ایک ملک کے کاغذی نوٹ کو کمی وبیشی کے ساتھ بیچنا سود ہے، اور ایسا تبادلہ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار، تو جب کاغذی نوٹ ہر پہلو سے ثمن اصطلاحی ہیں، اور ان میں سامان ہونے کا کوئی شائبہ نہیں ہے، تو اسے فلوس پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ اور جب ثمن کا ہم جنس ثمن سے تبادلہ ہو تو کمی وبیشی اور ادھار دونوں ناجائز ہیں، اور اگر ثمن کا غیر جنس سے تبادلہ ہو تو ادھار ناجائز ہے، تو پھر جب کاغذی نوٹ ثمن اصطلاحی ہیں، اور سونا چاندی بھی ثمن خلقی ہیں،

تو یہ دونوں دو اجناس ہیں، لہذا ان کا تبادلہ ادھار کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب:

کاغذی نوٹ کو مکمل طور پر زر خلقی یعنی سونا چاندی کے حکم میں نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ سونا چاندی کی اپنی قیمت ہے، خواہ وہ ثمن ہوں یا نہ ہوں، جبکہ کاغذی نوٹ کو اگر کوئی حکومت ثمن کی حیثیت نہ دے تو کاغذ کے ٹکڑے کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، لہذا کاغذی نوٹ کو بالکل ثمن حقیقی یعنی سونا چاندی کے ہم معنی قرار دینا درست نہیں ہے، یہیں سے اس حدیث کا جواب بھی معلوم ہوگیا جو حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''لا تبیعوا الذهب بالذهب إلا مثلا بمثل، ولا تشفوا بعضها علی بعض، ولا تبیعوا الورق بالورق إلا مثلا بمثل، ولا تشفوا بعضها علی بعض ولا تبیعوا منها غائبا بناجز'' (صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۱۷۷، صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۵۸۴) (سونا کو سونے کے بدلہ برابر برابر بیچو، اور ایک دوسرے پر مت بڑھاؤ، اور چاندی کو چاندی کے بدلے برابر برابر بیچو، اور ایک کو دوسرے پر مت بڑھاؤ، اور ان میں سے غیر موجود کو موجود کے بدلے مت بیچو)۔

چنانچہ حدیث شریف میں حقیقی ثمنیت مراد ہے، کیونکہ سونا چاندی کی اپنی ایک قیمت ہے، لہذا اصطلاحی ثمن کو ہر پہلو سے سونا چاندی کا درجہ دینا مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ سونا چاندی اگر ثمن نہ بھی ہوں تو ان کی اپنی مالیت ہے، جبکہ کاغذی نوٹ اگر ثمن باقی نہ رہ جائیں، تو ان کی کوئی مالیت نہیں ہے۔

البتہ چونکہ بعض فقہاء ثمن اصطلاحی کو مکمل طور پر ثمن خلقی یعنی سونا چاندی کے درجہ میں رکھتے ہیں، جیسا کہ امام مالکؒ کا مذہب ہے، چنانچہ ''المدونۃ'' میں ہے: (میں نے پوچھا: آپ کی کیا رائے ہے اگر میں دراہم کے بدلے فلوس خریدوں، پھر باہمی قبضہ سے پہلے ہم عاقدین جدا ہوجائیں، تو کیا حکم ہے؟ جواب دیا: امام مالک کے قول کے مطابق یہ درست نہیں ہے، اور یہ عقد فاسد ہے، امام مالک نے مجھ سے فلوس کے سلسلہ میں فرمایا: سونا اور چاندی کے بدلہ ان کو ادھار بیچنے میں کوئی خیر نہیں ہے، اور اگر لوگ آپس میں باہم چمڑے کے سکے اور ثمن نافذ کرلیں، تو میں ان کو سونا اور چاندی کے بدلے ادھار بیچنے کو مکروہ قرار دوں۔ میں نے پوچھا: آپ کی کیا رائے ہے اگر میں چاندی یا سونے کی انگوٹھی یا سونے کا ڈلا خریدوں اور باہمی قبضہ سے پہلے جدا ہوجاؤں، تو کیا یہ امام مالک کے قول کے مطابق جائز ہے؟ تو فرمایا: یہ امام مالک کے قول کے مطابق جائز نہیں ہے، اس لئے کہ امام مالک نے فرمایا کہ: ایک فلس کو دو فلس کے بدلے بیچنا جائز نہیں، اور فلوس کو سونا چاندی یا دینار کے بدلے ادھار بیچنا جائز نہیں) (المدونۃ الکبری ۳/۵، بیروت، العلمیۃ)، اس لئے بہتر یہ ہے کہ روپئے کے ذریعہ سونا چاندی نقد خریدے۔

ب-سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل (International) سطح پر کومیکس گولڈ مارکیٹ (Comex Gold Market) یا ہندوستان کی سطح پر یہاں کی مارکیٹ MCX (Multi Commodity Exchange) نے طے کیا ہو، اس سے زیادہ یا کم قیمت میں خرید وفروخت جائز ہے، اور اس صورت پر ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ کرنسی نوٹ (Currency Paper) خلقی ثمن نہیں ہیں، بلکہ یہ ثمن اصطلاحی ہیں، اور بیع صرف کے احکام صرف خلقی اثمان یعنی سونا چاندی میں جاری ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''لا تبیعوا الذهب بالذهب إلا سواء بسواء، والفضة بالفضة إلا سواء بسواء، وبیعوا الذهب بالفضة، والفضة بالذهب کیف شئتم'' (صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۱۷۵) (سونا کو سونے کے بدلے برابر برابر بیچو، اور چاندی کو چاندی کے بدلے برابر برابر بیچو، اور سونا کو چاندی کے بدلے اور چاندی کو سونے کے بدلے، جس طرح چاہو بیچو)۔

اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''الذهب بالذهب ربا إلا هاء وهاء، والورق بالذهب ربا إلا هاء وهاء'' (صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۱۳۴، صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۵۸۶)

(سونا سونے کے بدلہ سود ہے، مگر یہ کہ برابر ہو، اور چاندی سونے کے بدلہ سود ہے مگر یہ کہ باہمی قبضہ ہوجائے) اس حدیث سے واضح ہے کہ بیع صرف کے احکام صرف خلقی اثمان یعنی سونا چاندی میں جاری ہوتے ہیں، اگر چہ ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹوں کے درمیان تبادلے کے وقت کی زیادتی جائز نہیں، لیکن وہ ثمن اصطلاحی ہیں جو ہر اعتبار سے سونے چاندی کے حکم میں نہیں ہیں، علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

''وفي الفلوس لا یبطل العقد وإن تفرقا قبل قبض ما اشتری؛ لأن في بیع الفلوس بالدراهم یکتفی بقبض

أحد البدلين حقيقة.''(ابن نجيم، البحر الرائق، كتاب البيع ۵/۳۰۶)(اور فلوس کے اندر عقد باطل نہ ہوگا، اگر چہ خرید کردہ شے پر قبضہ سے پہلے دونوں جدا ہو جائیں، اس لئے کہ فلوس کو درہم کے بدلے بیچنے کی حالت میں حقیقت کے اعتبار سے دو بدل میں سے ایک پر قبضہ کافی ہے)۔

ثمن خلقی اور ثمن اصطلاحی میں فرق کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ درہم اور دینار میں سلم جائز نہیں جبکہ تعداد کے اعتبار سے فلوس میں بیع سلم شیخین کے نزدیک جائز ہے، اور یہی صحیح قول ہے،''ہندیہ'' میں ہے:''ويجوز السلم في الفلوس عددا في ظاهر الرواية''(ہندیہ ۳/ ۱۸۳) (تعداد کے لحاظ سے فلوس میں بیع سلم ظاہر الروایۃ کے مطابق جائز ہے)۔

اور علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:''وأما السلم في الفلوس عددا فجائز عند أبي حنيفة وأبي يوسف . . . لأن ثمنيتها ليست بلازمة''(کاسانی، بدائع الصنائع ۵/ ۲۰۸)(تعداد کے اعتبار سے فلوس میں شیخین کے نزدیک بیع سلم جائز ہے اس لئے کہ اس کی ثمنیت لازم نہیں ہے)، ان فقہی اقتباسات سے واضح ہے کہ ثمن اصطلاحی ہر اعتبار سے ثمن خلقی یعنی سونے چاندی کے درجہ میں نہیں ہیں، نیز اس جگہ باتفاضل کا مسئلہ بھی نہیں بنتا ہے، اس لئے کہ کاغذی نوٹ الگ جنس ہیں، اور چاندی الگ جنس ہے، اور سونا الگ جنس ہے، اور جب جنس مختلف ہو تو زیادتی جائز ہے، اور موجودہ دور میں کاغذی نوٹوں کی پشت پر سونے نہیں رہے، چنانچہ جیوفرے گراؤتھر (Geoffrey Growther) لکھتا ہے:

{{The Promise to pay, which appears on their face in now utterly meaningless}}(Geoffrey Growther An out line of Money,p.16)

(حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرنے کا وعدہ ہے، اب اس عبارت کا جو نوٹ کے اوپر ظاہر ہوتی ہے بالکل ہی کوئی مطلب باقی نہیں رہا)، لہذا حکومت یا سونے کی مارکیٹ کی طے کردہ قیمت سے کم یا زیادہ فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲- الف: زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے زیور سازی کے سلسلہ میں جو معاملہ کرتے ہیں وہ اجارہ ہے، اس لئے کہ اسی کی تعریف اس پر صادق آرہی ہے، کیونکہ اجارہ کی تعریف ہے:''تمليك نفع مقصود من العين بعوض''(حصکفی، الدر المختار ۶/ ۴) (اجارہ: کسی چیز سے مقصود نفع کا عوض لے کر مالک بنانا ہے)، اور دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اجارہ''تمليك المنفعة بعوض'' (کاسانی، بدائع الصنائع ۴/۲۰۱)(عوض لے کر منفعت کا مالک بنانے کا نام ہے)۔

چنانچہ اجارہ میں کام والے کی طرف سے مادہ یعنی میٹیریل (Material) ہوتا ہے، اور کاریگر اس پر اپنی محنت صرف کرتا ہے۔ اور اس جگہ یہی صورت ہے کہ زیورات کے تاجر ایک متعینہ وزن میں زیور بنانے والے کاریگر کو سونا دیتے ہیں، اور کاریگر حضرات زیور بنا کر اتنی ہی مقدار میں واپس کرتے ہیں، اور ایسا اس وجہ سے ممکن ہوتا ہے کہ اس میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ہوتی ہے، کیونکہ سونے کا زیور بنانے میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، لہذا ایسی آمیزش میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ''ہندیہ'' میں ہے:

''وأما لو صاغ الفضة لأهلها، ويلقي فيها النحاس فلا بأس به''(ہندیہ ۳/ ۲۱۵)
(بہرحال اگر چاندی کے مالک کے لئے چاندی کو ڈھالے، اور اس میں تانبا ملادے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

اور فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ سونا یا چاندی کا زیور بنانے کے لئے سونا یا چاندی حوالہ کرے، اور سونا یا چاندی کی ایک مقدار اجرت میں متعین کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:''وإنما بذل صاحب القلب للصائغ درهما لصياغته اثني عشر درهما''(کاسانی، بدائع الصنائع ۴/ ۲۲۱)(کنگن والے نے سنار کو ایک درہم (اجرت کے طور پر) بارہ درہم ڈھالنے کے لئے دیا)۔

اور ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:''إن قال لصائغ: صغ لي خاتما وزنه درهم. وأعطيك مثل وزنه. وأجرتك درهما، فليس ذلك ببيع درهم بدرهمين، وقال أصحابنا: للصائغ أخذ الدرهمين، أحدهما: في مقابلة الخاتم. والثاني: أجرة له''(ابن قدامه، المغني ۴/ ۱۴۱، طبع اول بيروت، دار الفكر)(اگر سنار سے کہے میرے لئے انگوٹھی بنادو جس کا وزن ایک درہم ہو، اور میں تجھے اسی کے برابر ایک درہم دوں گا، اور ایک درہم میں نے تجھے اجرت میں دی، تو یہ ایک درہم کو دو درہم کے بدلہ بیچنا نہیں ہے، اور ہمارے علماء حنابلہ کہتے ہیں کہ سنار کے لئے جائز ہے کہ دو درہم لے، ایک انگوٹھی کے مقابلہ میں، اور دوسرا درہم اپنی اجرت میں)۔

البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک سونے یا چاندی میں سے اجرت دینا مکروہ ہے، زیور بنوانے والے کو جنس بدل کر اجرت دینی چاہئے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ولا خير أن يصارف الرجل الصائغ الفضة بالحلي الفضة المعمولة. ويعطيه إجارته؛ لأن هذا الورق بالورق متفاضلا'' (شافعي. الأم ۳/ ۳۵. بيروت. دار المعرفة ۱۳۹۳ھ. نیز دیکھئے: نووي. المجموع ۱۰/ ۸۳. طبع یعسوب)

(اس میں کوئی بہتری نہیں ہے کہ آدمی سنار سے زیور کے بدلے یعنی کاریگری کی ہوئی چاندی کے بدلہ چاندی کے لین دین کا معاملہ کرے اور اسی میں سے اسے اس کی اجرت دے، اس لئے کہ اس معاملہ میں چاندی کے بدلہ چاندی اضافہ کے ساتھ ہے)۔

ب- اجارہ کی صحت کی شرطوں میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ اجرت معلوم ومتعین ہو، جیسا کہ ''ہندیہ'' میں ہے:

''أن تكون الأجرة معلومة'' (ہندیہ. الباب الأول في تفسير الإجارة ۴/ ۴۱۱)

(اجارہ کی صحت کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اجرت معلوم ہو)، خود نبی کریم ﷺ نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ کاریگر کی اجرت عقد کے وقت ہی واضح طریقہ پر متعین کردی جائے، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ''نهى عن استئجار الأجير حتى يبين له أجره'' (مسند احمد حدیث نمبر ۱۱۵۶۵، اور اس کی سند میں کلام ہے) (مزدور کو مزدور پر رکھنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ اس کے لئے اجرت واضح کردی جائے)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''إذا استأجر أحدكم أجيرا فليعلمه أجره'' (دیلمی، الفردوس، حدیث نمبر ۱۲۱۴، اور اس کی سند میں کلام ہے) (جب تم میں سے کوئی کسی کو مزدور رکھے تو اسے اس کی اجرت بتادے)۔

اور حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعید خدریؓ یا دونوں میں سے ایک سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''من استأجر أجيرا فليسم له إجارته'' (مصنف عبدالرزاق حدیث نمبر ۱۵۰۲۳، اور بعض ناقدین نے اس کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے) (جو مزدور رکھے وہ اسے اس کی اجرت بتادے)، چنانچہ ان احادیث پاک کی روشنی میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اجارہ کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ اجرت کی مقدار اور نوعیت معلوم ہونی چاہئے، جیسا کہ فقیہ علی حیدرؒ لکھتے ہیں:

''يشترط لصحة الإجارة أي عدم فسادها: أن تكون الأجرة معلومة تماما قدر أو نوعا. أي لايكون شيء منها مجهولا كلا أو بعضا؛ لأن جهل الأجرة يفضي إلى المنازعة'' (علی حیدر. درر الحکام ۱/ ۴۲۶)

(اجارہ کے صحیح ہونے یعنی اس کے فاسد نہ ہونے کی شرط یہ ہے کہ اجرت مقدار اور نوعیت کے اعتبار سے مکمل طور سے معلوم ہو، یعنی اس میں سے کچھ کلی یا جزوی طور پر مجہول نہ ہو؛ اس لئے کہ اجرت کا مجہول ہونا باعث نزاع ہے)۔

لہٰذا اس تفصیل کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جاتے ہیں، اگر وہ متعین ہیں، مثلاً پانچ سو گرام میں دو گرام تو اجرت کی یہ تعیین کافی ہے، اور اگر متعین نہ ہوں مثال کے طور پر پانچ سو گرام میں نکلنے والے ذرات دو یا تین گرام ہو سکتے ہیں، تو اجارہ فاسد ہے، اور اجرت مثل واجب ہے، فقیہ علی حیدر ''ہندیہ'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں: (جب کوئی شخص دوکان کرایہ پر لے اس شرط کے ساتھ کہ اس کی اجرت دیگر دوکانوں کی اجرت کی طرح ہوگی، جنہیں دوکانداروں نے کرایہ پر لیا ہے، اور وہ اجرت معلوم اور متعین نہ ہو بلکہ اس میں باہم فرق ہو تو اجارہ فاسد ہوگا، اور اگر متعین ہو اور اس میں اختلاف نہ ہو تو اجارہ جائز ہے، اور اسے اسی جیسی اجرت دینے کا پابند بنایا جائے گا) (علی حیدر، درر الحکام ۱/ ۴۲۷)۔

۳- جو صورت معاشرہ میں رائج ہے وہ یہ ہے کہ سونے کے تاجر حضرات پرانے زیور کو کم قیمت میں روپئے سے خریدتے ہیں اور پھر نئے زیور روپیوں میں بیچتے ہیں، لہٰذا جنس مختلف ہونے کی وجہ سے ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوتا ہے، علامہ مرغینانیؒ لکھتے ہیں:

''الربا محرم في كل مكيل أو موزون، إذا بيع بجنسه متفاضلا. فالعلة عندنا الكيل مع الجنس. أو الوزن مع الجنس'' (مرغيناني، ہدايه ۳/ ۶۱. المكتبة الإسلامية) (سود ہر اس چیز میں حرام ہے جو ناپ یا تول کر بیچی جاتی ہو، جبکہ اسے اس کی جنس کے ساتھ زیادتی کی صورت میں بیچا جارہا ہو، چنانچہ ہم حنفیہ کے نزدیک ربا تفاضل کی حرمت کی علت ہم جنس ہونے کے ساتھ کیلی یا وزنی ہونا ہے)۔

اور ''ہندیہ'' میں ہے: ''وهو في الشرع عبارة عن فضل مال لايقابله عوض في معاوضة مال بمال'' (ہندیہ ۳/ ۱۱۷)

(سود شریعت میں مال کا مال سے تبادلہ ہونے کی صورت میں مال کے اس اضافہ کو کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہ ہو)۔

اور حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير، والتمر بالتمر، والملح بالملح، مثلا بمثل سواء بسواء، يدا بيد، فإذا اختلفت هذه الأصناف،فبيعوا كيف شئتم، إذا كان يدا بيد'' (صحيح مسلم حديث نمبر ۱۵۸۷)

(سونا سونے کے بدلہ، چاندی چاندی کے بدلہ، گیہوں گیہوں کے بدلہ، جو جو کے بدلہ، کھجور کھجور کے بدلہ، اور نمک نمک کے بدلہ برابر برابر باہمی قبضہ کے ساتھ بیچو، پھر جب یہ اجناس مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو، جبکہ باہمی قبضہ ہو جائے)۔

اور ایک ملک کی کرنسی اگر چہ عددی متقارب یعنی ایسی چیز ہے جو شمار کی جاتی ہے، اور ایک طرح کے نوٹ میں باہم کوئی تفاوت بھی نہیں ہوتا ہے، لہذا اگر تھوڑی دیر کے لئے کاغذی نوٹوں کو خلقی اثمان یعنی سونے چاندی کے درجہ میں ہر اعتبار سے مان بھی لیا جائے تو بھی کاغذی نوٹوں کی جنس الگ ہے، اور سونے چاندی کی جنس الگ ہے۔

اصل صورت کی تفصیل کے بعد ہم سوال میں مذکورہ صورت کا حکم بیان کرتے ہیں کہ اگر کہیں یہ صورت رائج ہو کہ سونے کے پرانے زیور کا نئے زیور سے تبادلہ ہو تو ایسی حالت میں پرانے زیور کے بدلہ نیا زیور کم وزن میں ادا کرنا جائز نہیں ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وأحل الله البيع وحرم الربا" (بقرہ: ۲۷۵) (حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال ٹھہرایا ہے، اور سود کو حرام کیا ہے)، اس آیت سے پتہ چلا کہ سود حرام ہے، اور جن اموال میں سود جاری ہوتا ہے، ان کے تبادلہ میں برابری ضروری ہے، اور وہ برابری شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں ہوگی، اور قیمت میں برابری کا اعتبار نہیں ہے۔

۲- حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعير بالشعير والتمر بالتمر، والملح بالملح، مثلا بمثل، يدا بيد، فمن زاد أو استزاد، فقد أربى، الآخذ والمعطي فيه سواء'' (صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۵۸۴، مسند احمد حدیث نمبر ۱۱۹۲۸) (سونا سونے کے بدلہ، چاندی چاندی کے بدلہ، گیہوں گیہوں کے بدلہ، جو جو کے بدلہ، کھجور کھجور کے بدلہ اور نمک نمک کے بدلہ برابر برابر باہمی قبضہ کے ساتھ بیچو، سو جو زیادہ دے، یا زیادہ طلب کرے، اس نے سودی معاملہ کیا، اس معاملہ میں لینے اور دینے والے برابر ہیں)، اس سے معلوم ہوا کہ اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا ہونے کا وصف غیر معتبر ہے، لہذا سونا کے سونے سے تبادلہ کے وقت اوصاف کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، بلکہ صرف مقدار کا اعتبار ہوگا، اس لئے مقدار کی زیادتی کو سنے پن کے وصف کے مقابل نہیں رکھا جا سکتا ہے، تو جب زیادہ مقدار کے مقابل کوئی عوض موجود نہیں ہے تو یہ سود ہے۔

۳- حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: ''اشتريت يوم خيبر قلادة باثني عشر دينارا، فيها ذهب وخرز، ففصلتها، فوجدت فيها أكثر من اثني عشر دينارا، فذكرت ذلك للنبي ﷺ فقال: "لا تباع حتى تفصل" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۵۹۱) (میں نے خیبر کے دن ایسا ہار خریدا، جس میں سونے اور مہرے تھے، سو میں نے اسے الگ کیا، تو اس میں بارہ دینار سے زیادہ پایا، تو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الگ کر کے ہی بیچا جائے'')۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اموال ربویہ میں مقدار اور وزن میں برابری ضروری ہے۔

۴- سونے کو سونے کے بدلہ وزن میں برابری کے ساتھ بیچنے پر اجماع ہے، چنانچہ ابن ہبیرہ لکھتے ہیں:

''أجمع المسلمون على أنه لا يجوز بيع الذهب بالذهب منفردا، والورق بالورق منفردا، تبرها ومضروبها وحليها إلا مثلا بمثل، وزنا بوزن، يدا بيد، وأنه لا يباع شيء منها غائب بناجز'' (ابن ہبیرہ، الإفصاح ۱/ ۲۱۲)

(مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تنہا سونے کو سونے کے بدلہ، اور تنہا چاندی کو چاندی کے بدلہ، خواہ ڈلا ہو یا ڈھالا ہوا ہو، یا زیور ہو، وزن میں برابری اور باہمی قبضہ کے ساتھ ہی بیچا جائے اور ان میں سے کسی غیر موجود کو موجود کے بدلہ نہ بیچا جائے)۔

۵- علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں: (اور اس حدیث کے اندر اس بات کی دلیل ہے کہ سونا چاندی کے اندر کاریگری کی کوئی قیمت نہیں ہے جبکہ اس کی جنس

سے تبادلہ ہو......اور اس حدیث میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ سونا چاندی کاریگری کی وجہ سے وزنی ہونے سے باہر نہیں ہوتے ہیں، اگرچہ بے وزن ان کو بیچنے کی لوگوں کو عادت ہوگئی ہو، دیگر وزنی اشیاء کے برخلاف، اس لئے کہ کاریگری کے بعد بھی وزن کیا جانا ان کے اندر نص سے ثابت ہے، لہذا عرف کی وجہ سے اس میں تبدیلی نہیں آئے گی، دیگر اشیاء کے برخلاف) (سرخسی، المبسوط، کتاب الصرف ۱۴/د)۔

البتہ حضرت معاویہؓ، حسن بصری، ابراہیم نخعی اور امام شعبیؒ کا قول ہے کہ سونے چاندی کے زیور کو اس کی جنس کے بدلہ زیادتی کے ساتھ بیچ سکتے ہیں، اور حنابلہ کی ایک بڑی تعداد نے اسی کو اختیار کیا ہے (ابن قدامہ، المغنی ۴/۲۹)، اور مرداوی حنبلیؒ نے اسی پر عمل قرار دیا ہے (مرداوی، الإ نصاف ۱۴/۵)، اور اسی کو ابن تیمیہؒ نے اختیار کیا ہے (بعلی، الاختیارات الفقہیہ/ص ۱۱۲)، اور ابن القیمؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے (ابن القیم، اعلام الموقعین ۱۴۱/۲)۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ کاریگری کے بعد زیورات سامان کے درجہ میں ہو گئے ہیں، لیکن زیور کا زیور کے بدلہ برابری کے ساتھ تبادلہ ہونا چاہئے، اس پر سب کا اتفاق ہے، امام نووی شافعیؒ لکھتے ہیں:

''ویذهب إلى أن الربا لایکون في التفاضل إلا في التبر بالتبر. وفي المصوغ بالمصوغ. وفي العين بالعين كذلك'' (نووی شافعی، المجموع ۱۰/ ۸۳. طبع یعسوب) (اور حضرت معاویہؓ کا مسلک یہ ہے کہ زیادتی کی صورت میں سود اسی وقت ہوگا جبکہ ڈلے کے بدلے ڈلے کا، اور زیور کے بدلہ زیور کا، اور ایسے ہی ثمن کے بدلہ ثمن کا تبادلہ ہو)۔

۴- الف: اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس ایک کیلو سونا ہو، اور وہ دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے جاتے ہوں، بلکہ ان کے آرڈر کے بقدر سونا ان کے نام سے محفوظ کر دیا جاتا ہو، تو اس کو خریداروں کا قبضہ نہیں قرار دیا جائے گا، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- حضرت عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''الذهب بالورق ربا إلا هاء وهاء'' (سنن نسائی حدیث نمبر ۴۵۷۵، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے، طبع مکنز) (سونے کو چاندی کے بدلہ بیچنا سود ہے، مگر یہ کہ باہمی قبضہ ہو جائے)۔

۲- ان ہی سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''الذهب بالذهب ربا إلا هاء وهاء'' (صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۱۳۴، ۲۱۷۴) (سونا کو سونے کے بدلہ بیچنا سود ہے، مگر یہ کہ باہمی قبضہ ہو جائے)۔

۳- ان ہی سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''الورق بالذهب ربا إلا هاء وهاء'' (صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۵۸۶) (چاندی کو سونے کے بدلہ بیچنا سود ہے، مگر یہ کہ باہمی قبضہ ہو جائے)۔

۴- حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''الذهب بالذهب، والفضة بالفضة مثلا بمثل، سواء بسواء، یدا بید'' (صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۵۸۷) (سونا کو سونے کے بدلہ، اور چاندی کو چاندی کے بدلہ برابر برابر اور باہمی قبضہ کے ساتھ بیچو)۔

۵- حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''ولا تبیعوا منها غائبا بناجز'' (صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۱۷۷، صحیح مسلم ۱۵۸۴) (سونا چاندی میں سے غیر موجود کو موجود کے بدلہ مت بیچو)، ان تمام احادیث پاک سے واضح ہے کہ سونا چاندی کے تبادلہ میں جو قبضہ مراد ہے وہ ہاتھ سے لینا یعنی عملی قبضہ مراد ہے، اس جگہ قبضہ محض تخلیہ یا خریدار کے ایسے استیلاء کا نام نہیں ہے کہ مبیع (فروخت کردہ سامان) پر اس کے تصرف میں کوئی مانع باقی نہ رہے۔

۶- فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ سونا چاندی پر ہاتھ سے یعنی عملی قبضہ ہونا چاہئے، چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں:

''المراد بالقبض هنا القبض بالبراجم، لا بالتخلية، یرید بالید'' (ابن ہمام، فتح القدیر ۷/ ۱۳۵، بیروت، دار الفکر) (اس جگہ قبضہ سے مراد انگلی کے جوڑوں سے قبضہ کرنا ہے، صرف خالی کرنے یعنی سامان اور خریدار کو اکٹھے چھوڑ دینے سے قبضہ نہ ہوگا، اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہاتھ سے قبضہ ہو یعنی عملی قبضہ ہو)۔

اور علامہ حصکفی لکھتے ہیں: ''والتقابض بالبراجم لا بالتخلیة'' (حصکفی، الدر المختار، باب الصرف ۵/ ۲۵۸) (سونے چاندی کی خرید و فروخت میں

ہاتھ سے باہمی قبضہ یعنی عملی قبضہ شرط ہے، صرف خالی کرنے سے قبضہ نہ ہوگا)۔

اگر چہ کاغذی نوٹوں سے سونا چاندی خریدنا بیع صرف نہیں ہے، لیکن اگر ثمن ادھار ہے تو پھر سونے چاندی پر قبضہ ضروری ہے تا کہ دین کو دین کے بدلہ بیچنا لازم نہ آئے، جو نا جائز ہے، اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے، جیسا کہ پہلے گذرا۔

خلاصہ یہ کہ سونا چاندی پر قبضہ اسی وقت سمجھا جائے گا، جبکہ اسے اپنے ہاتھ میں اس طرح لے لے کہ اس میں ہر طرح کا تصرف کرنے پر قادر ہوجائے، یعنی عملی طور پر قابض ہوجائے۔

ب- اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو، اور اس کو کمپیوٹر (Computer) یا ریکارڈ رجسٹر (Record Register) میں اس کے نام سے درج کردیا گیا ہو، تو یہ اندراج قبضہ کے لئے کافی نہیں ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما كان يدا بيد، فلا بأس به" (صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۰۶۰، ۲۰۶۱، ۲۴۹۷، ۲۴۹۸، صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۵۸۹) (سونا چاندی کی فروخت ہاتھ در ہاتھ ہو، تو کوئی حرج نہیں ہے)۔

اس حدیث پاک سے ظاہر ہے کہ سونا چاندی پر قبضہ ہاتھ میں لینے یعنی عملی قبضہ سے ہوگا۔

۲- علامہ ابن نجیم مصری حنفیؒ لکھتے ہیں: "المراد بالقبض هنا القبض بالبراجم، لا بالتخلية، يريد باليد" (ابن نجیم، البحر الرائق، کتاب الصرف ۶/ ۲۱۰) (اس جگہ قبضہ سے مراد انگلیوں کے جوڑوں سے قبضہ کرنا ہے، نہ کہ استیلاء اور تخلیہ کے ذریعہ قبضہ مراد ہے (بلکہ) مراد یہ ہے کہ ہاتھ سے قبضہ ہو یعنی عملی قبضہ ہو۔

۳- "ہندیہ" میں ہے: "المراد بالقبض هنا القبض بالبراجم" (ہندیہ، کتاب الصرف، الباب الأول ۳/ ۲۱۷) (قبضہ سے اس جگہ ہاتھ سے قبضہ کرنا یعنی عملی قبضہ مراد ہے)۔

۴- علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں: "التقييد بالبراجم للاحتراز عن التخلية، واشتراط القبض بالفعل، لا خصوص البراجم، حتى لو وضعه له في كفه، أو في جيبه، صار قابضا" (ابن عابدین، ردالمحتار، باب الصرف ۵/ ۲۵۸) (انگلیوں کے جوڑوں سے مقید کرنا "تخلیہ" سے احتراز کے لئے ہے، اور شرط عملی قبضہ ہے، خاص انگلیوں کی پوروں سے ہونا کوئی ضروری نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر فروخت کرنے والا اسے اس کی ہتھیلی میں رکھ دے، یا جیب میں ڈال دے، تو قبضہ کرنے والا ہوجائے گا)۔

ان فقہی اقتباسات سے واضح ہے کہ سونے چاندی پر قبضہ کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں درج کرنے سے نہیں ہوگا، بلکہ عملی طور سے اپنے قبضہ میں لینا ضروری ہے۔

۵- ایکسچینج (Exchange) کے ذریعہ کاروبار کی جو صورت رائج ہے کہ مثلاً ایک مہینے کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے ۱۰/ تولے سونے کا سودا کرلیا، خریدار نے سونے پر قبضہ نہیں کیا، اور ادائیگی کی تاریخ پر سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ کر حساب چکایا جائے، تو یہ معاملہ ناجائز ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "نهى عن بيع الكالئي بالكالئي" (حاکم، المستدرک حدیث نمبر ۲۳۴۲، ۲۳۴۳، سنن دارقطنی، حدیث نمبر ۳۱۵۰ (نسخہ مکنز)، اور اس کی سند میں کلام ہے) (ادھار شئ کو ادھار شئ سے بیچنے سے منع فرمایا)۔

اور سوال میں ذکر کردہ صورت میں مبیع (فروخت کردہ سامان) اور ثمن (قیمت) دونوں ادھار ہیں، لہذا حدیث کی رو سے یہ معاملہ ناجائز ہے۔

۲- جب فروخت کرنے والے نے قیمت پر قبضہ نہیں کیا، اور سکے متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے ہیں، اور تعیین قبضہ کے بغیر نہیں ہوسکتی ہے، تو قبضہ کے بغیر عاقدین کی جدائی اس حالت میں ہوئی کہ ہر فریق کے ذمہ دوسرے کا دین ہے، اور دین کو دین کے بدلہ بیچنا لازم آیا، جو ناجائز ہے، امام کاسانیؒ لکھتے ہیں: "وأما الفلوس الرائجة فإن قوبلت بخلاف جنسها فهي أثمان" (کاسانی، بدائع الصنائع ۵/ ۲۳۴) (اگر رائج فلوس کا تبادلہ خلاف جنس سے ہو تو یہ اثمان ہیں)، اور علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں: "أما ماعداه، فإنما يشترط فيه التعيين دون التقابض" (ابن

عابدین، ردالمحتار ۵ / ۱۷۲) (بیع صرف کے علاوہ میں متعین کرنا شرط ہے نہ کہ باہمی قبضہ)۔

البتہ سکے کی تعیین قبضے کے بغیر نہیں ہوسکتی ہے، لہذا قبضہ کرنا شرط ہے، لیکن سوال میں ذکر کردہ صورت میں نہ مشتری نے سونے پر قبضہ کیا، اور نہ ہی بائع نے قیمت پر قبضہ کیا، لہذا متعاقدین قبضہ کے بغیر جدا ہوگئے، اس لئے ہر فریق کے ذمہ دوسرے کا دین رہا، سو یہ بیع باطل ہے، امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

''الدراهم والدنانير لا يتعينان في العقود. فيكون هذا بيع الدين بالدين، وذلك لا يجوز لأنه رسول الله ﷺ عن بيع الكالئ بالكالئ يعني النسيئة بالنسيئة'' (سرخسی، المبسوط ۱۲/ ۱۱۰) (درہم اور دینار عقد میں متعین نہیں ہوتے ہیں، تو اس میں دین کو دین سے بیچنا لازم آئے گا، اور یہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ نے ادھار کو ادھار کے بدلہ بیچنے سے منع فرمایا ہے)۔

اور علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں: (ایسے ہی اگر متعین درہم یا متعین دینار کو متعین فلوس کے بدلے خرید وفروخت کرے، تو بھی فلوس متعین نہیں ہوں گے، جس طرح درہم و دینار متعین نہیں ہوتے ہیں، مگر اس جگہ عقد کے صحت پر باقی رہنے کی شرط مجلس میں قبضہ کرنا ہے، یہاں تک کہ عاقدین اگر باہمی قبضہ کے بغیر جدا ہوگئے، تو عقد باطل ہو جائے گا، اس لئے کہ دین کو دین کے بدلہ بیچنے کی حالت میں جدائی ہوئی) (کاسانی، بدائع الصنائع ۶ / ۲۳۶-۲۳۷)۔

۳- سوال میں ذکر کردہ صورت میں خرید وفروخت مقصود نہیں ہے، بلکہ غیر یقینی چڑھتی گھٹتی قیمت سے فائدہ اٹھانا ہے، لہذا یہ قمار (جوا) ہے، کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے جو غیر یقینی نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہے، اور جوا شریعت میں حرام ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون" (مائدہ: ۹۰) (اے ایمان والو! شراب اور جوا اور تھان پانسے کے تیر بالکل گندے شیطانی کاموں میں سے ہیں تو ان سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ)۔

۴- سوال میں ذکر کردہ صورت میں ثمن بھی مجہول ہے یعنی عقد کے وقت ثمن متعین نہیں ہے، بلکہ ادائیگی کے وقت کے ثمن کا اعتبار کیا گیا ہے، چنانچہ خریدنے کے دن سونے کا نرخ پانچ ہزار روپے فی تولہ تھا، اور ادائیگی کے دن سونے کے نرخوں میں جو فرق پایا گیا، اس کی ادائیگی کردی جاتی ہے، لہذا اگر سونا ادائیگی کے دن پانچ ہزار ایک سو روپے فی تولہ ہوگیا تو خریدار بائع کو ایک سو روپے دیتا ہے، اور اگر ادائیگی کے دن سونا چار ہزار نو سو روپے ہوگیا، تو بائع خریدار کو ایک سو روپے دیتا ہے، جبکہ عقد کی صحت کے لئے ثمن کا معلوم و متعین ہونا ضروری ہے، ''ہندیہ'' میں ہے: ''ومنها أن يكون المبيع معلوما، والثمن معلوما علما يمنع من المنازعة'' (ہندیہ، کتاب البیع ۳ / ۳) (اور بیع کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مبیع (فروخت کردہ سامان) اور ثمن (قیمت) اس طرح معلوم ہو کہ نزاع سے روکے)۔

۵- سوال میں ذکر کردہ صورت میں خرید وفروخت وقتی ہے، حالانکہ خرید وفروخت کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ ''أن لا يكون مؤقتا، فإن أقته لم يصح'' (ہندیہ ۳ / ۳) (بیع وقتی نہ ہو، سو اگر وقتی ہو تو صحیح نہیں ہے)۔

۶- سونے کی ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے لئے اس کو روک رکھنا احتکار کے دائرہ میں داخل نہیں ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله. فبشرهم بعذاب أليم. يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جباههم وجنوبهم وظهورهم. هذا ما كنزتم لأنفسكم. فذوقوا ما كنتم تكنزون'' (سورۂ توبہ: ۳۴-۳۵) (اور جو لوگ سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں (جمع کر کے رکھتے ہیں)، اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنادو، اس دن جس دن اس مال پر آگ دہکائی جائے گی، پھر اس سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لئے ذخیرہ کیا، تو اب چکھو جو تم جمع کرتے رہے ہو)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ذخیرہ اندوزی وہ ہے جس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے، اور مال کے حق کو ادا نہ کیا جائے۔

۲- حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں: ''كنت ألبس أوضاحا من ذهب، فقلت يا رسول الله، أكنز هو، فقال: ما بلغ أن تؤدي زكاته فزكي، فليس بكنز'' (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۱۵۶۴، مستخرج الطوسی علی جامع الترمذی حدیث نمبر ۵۸۸، طبرانی، مسند الشامیین حدیث نمبر ۲۲۸۷، المعجم الکبیر / ج ۲۳، حدیث نمبر ۶۱۳، حاکم، المستدرک حدیث نمبر ۱۴۳۸، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (میں سونے کے پازیب پہنتی تھی، تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، کیا یہ کنز میں شامل ہے، تو آپ ﷺ نے جواب دیا، جو زکوۃ کی ادائیگی کے نصاب کو پہنچ جائے، اور اس کی زکوۃ ادا کردی جائے، تو

وہ کنز میں شامل نہیں ہے)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سونے کی ذخیرہ اندوزی میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ اس کی زکوۃ ادا کی جاتی رہے۔

۳- اللہ تعالیٰ کے فرمان: "والذین یکنزون الذهب والفضة ولا ینفقونها في سبیل اللہ" (اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے) کے بارے میں ایک اعرابی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا، آپؓ نے جواب میں ارشاد فرمایا: "من كنزها فلم يؤد زكاتها فويل له، إنما كان هذا قبل أن تنزل الزكاة، فلما أنزلت جعلها الله طهرا للأموال" (صحیح البخاری حدیث نمبر ۱۴۰۴، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۱۷۸۷) (جس نے سونا چاندی ذخیرہ کیا، اور ان کی زکوۃ ادا نہیں کی، تو اس کے لئے تباہی ہے، یہ حکم زکوۃ کی آیت نازل ہونے سے پہلے تھا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کی یہ آیت نازل فرمائی، تو زکوۃ کو مال کی پاکی کا ذریعہ قرار دیا)۔

۴- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إذا أديت زكاة مالك، فقد قضيت ما عليك فيه، ومن جمع مالا حراما، ثم تصدق به، لم يكن له فيه أجر، وكان إصره عليه" (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر ۳۲۱۶، سنن ترمذی حدیث نمبر ۶۱۸، حاکم، المستدرک حدیث نمبر ۱۴۴۰، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (جب تم نے اپنے مال کی زکوۃ ادا کر دی، تو اس سلسلہ میں اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داری پوری کر دی، اور جو حرام مال جمع کرے، پھر اسے صدقہ کر دے، تو اس کے لئے اس میں کوئی اجر نہ ہوگا، اور حرام مال جمع کرنے کا بوجھ (گناہ) اسی پر ہوگا)۔

۵- حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "كل مال وإن كان تحت سبع أرضين يؤدى زكاته، فليس بكنز، وكل مال لا يؤدى زكاته، وإن كان ظاهرا، فهو كنز" (طبرانی، المعجم الأوسط حدیث نمبر ۸۲۷۹، دیلمی، الفردوس، حدیث نمبر ۴۷۴۲، بیہقی، السنن الکبریٰ حدیث نمبر ۷۰۲۵، اور اس کے مرفوع ہونے میں کلام ہے، لیکن موقوف بھی مرفوع ہی کے درجہ میں ہے) (ہر وہ مال جس کی زکوۃ ادا کی جائے وہ ذخیرہ اندوزی نہیں، اگرچہ وہ سات زمین کے تحت میں ہو، اور ہر وہ مال جس کی زکوۃ ادا نہ کی جائے، وہ کنز ہے، اگرچہ وہ ظاہر ہو)۔

۶- حضرت معمر بن ابی معمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من احتكر طعاما فهو خاطئ" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۶۰۵، سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۳۴۴۷، ترمذی حدیث نمبر ۱۲۶۷، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۱۵۴، سنن دارمی حدیث نمبر ۲۵۴۶) (جو غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرے، وہ گنہگار ہے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس "احتکار" (گراں بیچنے کے لئے سامان روکنا) کی ممانعت ہے، اس کا تعلق انسان کی بقا کے لئے ضروری اشیاء خوردنی سے ہے، نہ کہ ہر چیز سے۔

۷- حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من احتكر طعاما أربعين ليلة، فقد برئ من الله تعالى، وبرئ الله تعالى منه، وأيما أهل عرصة أصبح فيهم امرؤ جائع، فقد برئت منهم ذمة الله تعالى" (مسند احمد حدیث نمبر ۴۸۸۰، مسند ابی یعلی حدیث نمبر ۵۷۴۶، مسند بزار حدیث نمبر ۱۳۱۱، حاکم، المستدرک حدیث نمبر ۲۱۶۵، یہ حسن درجہ کی حدیث ہے، اگرچہ بعض نے اس کی سند میں کلام کیا ہے) (جو چالیس دن تک غلہ کو گراں بیچنے کے لئے روکے رکھے، وہ اللہ تعالیٰ سے بری ہو گیا، اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہو گیا، اور جس آبادی میں کوئی شخص بھوکے ہونے کی حالت میں صبح کرے تو وہاں کے باشندگان سے اللہ تعالیٰ کا ذمہ بری ہے)۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہے کہ احتکار کا تعلق اشیاء خوردنی سے ہے۔

۸- حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من احتكر على المسلمين طعامهم، ضربه الله بالإفلاس أو بجذام" (مسند احمد حدیث نمبر ۱۳۵، مسند طیالسی حدیث نمبر ۵۵، مسند عبد بن حمید حدیث نمبر ۱۷، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۱۵۵، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے، اگرچہ بعض نے اس کی سند میں کلام کیا ہے) (جو مسلمانوں پر ان کے غلہ کو گراں بیچنے کے لئے روک لے، تو اللہ تعالیٰ اسے افلاس اور جذام (کوڑھ) میں مبتلا کرے گا)۔

اس حدیث سے بھی واضح ہے کہ "احتکار" کا تعلق اشیاء خوراک سے ہے۔

۹- فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ احتکار کا تعلق اشیاء خوردنی سے ہے، "ہندیہ" میں ہے:

''الاحتکار مکروہ، وذلك أن يشتري طعاما في مصر، ويمتنع من بيعه، وذلك يضر بالناس'' (ہندیہ ۲/ ۲۱۳)
(گراں فروخت کرنے کے لئے روکنا مکروہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ شہر (یا شہر سے قریب سے) غلہ خرید ے، اور اسے بیچنے سے باز رہے، اور ایسا کرنا لوگوں کو ضرر میں مبتلا کرے)، اور علامہ تمرتاشی لکھتے ہیں:

''وكره احتكار قوت البشر والبهائم في بلد يضر بأهله'' (تمرتاشی، تنویر الأبصار مع الدر المختار ۶/ ۳۹۸)
(اور انسان اور چوپائے کی خوراک کو گرانی کے انتظار میں روکنا ایسے شہر میں مکروہ تحریمی ہے، جہاں ایسا کرنا باشندگان شہر کو ضرر میں ڈال دے)۔

اور علامہ شامی لکھتے ہیں: (''احتکار'' لغت میں کسی چیز کو اس کے گراں ہونے کے انتظار میں روکنے کا نام ہے، اور اسم کو ''حکرۃ'' (ذخیرہ اندوزی) کہتے ہیں، اور شریعت کی اصطلاح میں غلہ وغیرہ کو خرید کر چالیس دن تک گراں ہونے کے لئے روکنا ہے...... اور چالیس دن کی یہ تحدید دنیا میں جبرا فروخت کرنے اور تعزیری سزا وغیرہ دینے کے لئے ہے، گناہ کے لئے نہیں ہے، اس لئے کہ ذخیرہ اندوزی پر گناہ ہوگا خواہ مدت تھوڑی ہو۔

اور انسان کی خوراک کی چیزوں کے ساتھ مقید کرنا طرفین کا قول ہے، اور اسی پر فتوی ہے، اور امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ جس چیز کا روکنا بھی عام لوگوں کو ضرر میں مبتلا کردے، وہ احتکار ہے) (ابن عابدین، رد المحتار ۶/ ۳۹۸)۔

اور امام نووی شافعیؒ لکھتے ہیں: ''وهذا الحديث صريح في تحريم الاحتكار، قال أصحابنا: الاحتكار المحرم هو الاحتكار في الأقوات خاصة، وهو أن يشتري الطعام في وقت الغلاء للتجارة، ولا يبيعه في الحال، بل يدخره ليغلو ثمنه'' (نووی، شرح النووی علی مسلم ۱۱/ ۴۳ طبع دوم، بیروت، دار الاحیاء، ۱۳۹۲ھ) (اور یہ حدیث ذخیرہ اندوزی کی حرمت کے سلسلہ میں صریح ہے اور ہمارے علماء شوافع کا کہنا ہے کہ حرام ذخیرہ اندوزی خاص اشیاء خوردنی کی ذخیرہ اندوزی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تجارت کے لئے گرانی کے وقت غلہ خرید ے، اور فورا نہ بیچے، بلکہ اس کا ذخیرہ کرے تا کہ اس کی قیمت مزید گراں ہوجائے)۔

اور ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں: ''والاحتكار حرام... وأن يكون المشترى قوتا... وأن يضيق على الناس بشرائه'' (ابن قدامہ، المغنی ۴/ ۳۰۵، طبع اول، بیروت، دار الفکر)
(اور ذخیرہ اندوزی حرام ہے...... جبکہ خرید کردہ چیز اشیاء خوردنی میں سے ہو، اور اپنے خرید نے کے ذریعہ لوگوں کو تنگی میں مبتلا کرے)۔

جبکہ مالکیہ کے نزدیک امام ابو یوسف کی رائے کی طرح ضرورت کے وقت ہر چیز کی ذخیرہ اندوزی حرام ہے، ابن رشد قرطبی (جد) لکھتے ہیں:

''لا اختلاف في أنه لا يجوز احتكار شي من الطعام ولا غيره في وقت يضر احتكاره بالناس. ويغليه عليهم''
(ابن رشد، البیان والتحصیل ۷/ ۳۶۰، طبع دوم، بیروت، دار الغرب، ۱۴۰۸ھ، ۱۹۸۸ء)

(اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ غلہ اور غیر غلہ میں سے کسی چیز کی ذخیرہ اندوزی ایسے وقت میں جائز نہیں، جس میں اس کی ذخیرہ اندوزی لوگوں کو ضرر میں ڈال دے، اور اس چیز کو لوگوں پر گراں کردے)۔

لیکن جمہور کا مسلک راجح معلوم ہوتا ہے کہ احتکار انسان اور جانور کی خوراک کی ذخیرہ اندوزی کے ساتھ خاص ہے، اس لئے کہ حرمت کی حکمت لوگوں سے ضرر دور کرنا ہے، اور عام طور سے لوگ انسانی یا حیوانی اشیاء خوردنی کی قلت کی وجہ سے ہی ضرر میں مبتلا ہوتے ہیں۔

۱۰- قیمت میں متوقع اضافہ کی امید میں سونا کو روک لینا ممنوعہ ذخیرہ اندوزی میں داخل نہیں ہے، اس لئے کہ وہ احتکار ممنوع ہے جو گرانی کے وقت ہو اور اشیاء کو گراں تر کردے، لیکن فطری اسباب کی بنا پر قیمت میں اضافہ ہونے میں سونے چاندی کے تاجروں کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۱- اشیاء ضروریہ کی قیمت میں اضافہ محض سونے کی گرانی کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کے بہت سے معاشی اور سیاسی اسباب ہیں، اور عام طور سے یہ اضافہ فرض اسباب کی بنیاد پر ہوتا ہے، یا حکومت کی غلط پالیسی کی وجہ سے ہوتا ہے، اگر حکومت بہتر نظام اور پالیسی پر عمل پیرا رہے، تو اشیاء ضروریہ کی قیمت متوازن رہے، لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت کا نظام صاف شفاف ہو، اور اس کی غلط پالیسی پر لگام کسی جائے۔

۷- اسمگلنگ (Smuggling) کا عمل ناجائز ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- حکومت نے اپنے ملک کے معاشی مصالح کے مدنظر دوسرے ملکوں کی برآمدات پر پابندی کا جو قانون بنایا ہے اس پر چلنا واجب ہے، اس لئے کہ غیر معصیت میں حکومت وقت کے قوانین کا التزام لازم ہے، چنانچہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

''طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض، فكيف فيما هو طاعة''(ابن نجيم، البحر الرائق ۵/ ۱۵۲)
(غیر معصیت میں امام کی اطاعت فرض ہے، تو طاعت پر مبنی امور میں کس درجہ فرض ہوگی)۔

۲- اسمگلنگ کے ملکی مصنوعات پر زبردست اضرار مرتب ہوتے ہیں، چنانچہ ان کی خرید وفروخت متاثر ہوتی ہے۔

۳- جو تاجر حضرات قانونی واجبات ادا کر کے اشیاء درآمد کرتے ہیں، ان کو اسمگلنگ کی وجہ سے زبردست نقصان لاحق ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ اسمگلنگ کے ذریعہ لائے ہوئے سامان کی قیمت کا مقابلہ نہیں کر پاتے ہیں۔

۴- ملکی مصنوعات اسمگلنگ کی وجہ سے کساد بازاری کا شکار ہو جاتی ہیں، اور دیسی کارخانے بند ہونے کے کگار پر پہنچ جاتے ہیں جس کی وجہ سے بے کاری اور بے روزگاری بڑھتی چلی جاتی ہے۔

۵- اسمگلنگ کی وجہ سے حکومت، ملک کے باشندگان اور ملکی قانون کی پابندی کرنے والے تاجر حضرات سب کو ضرر میں مبتلا کیا جاتا ہے، جبکہ لوگوں کو ضرر میں ڈالنا حرام ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا ضرر ولا ضرار''(مسند احمد حدیث نمبر ۲۸۶۵، طبرانی حدیث نمبر ۱۱۸۰۶، ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۳۴۱، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے)(خود ضرر اٹھانا اور نہ دوسروں کو ضرر پہنچانا جائز ہے)۔

اور حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ ''أن رسول اللہ ﷺ قضى أن لا ضرر ولا ضرار''(سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۳۴۰، مسند احمد حدیث نمبر ۲۲۷۷۸، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے)(رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ خود نقصان اٹھانا اور نہ دوسروں کو نقصان پہنچانا جائز ہے)۔

۶- اسلامی نقطہ نظر سے کسی کو ضرر پہنچانا جائز نہیں ہے جیسا کہ گزرا، نیز اہل بازار کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص تجارتی قافلہ کے شہر میں آنے سے پہلے ہی باہر جا کر ان سے سامان خرید لے اور بازار میں آکر گراں قیمت میں فروخت کرے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''لا تلقوا الركبان''(صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۱۵۰، ۲۱۶۲، صحیح مسلم ۱۵۱۵)(تجارتی قافلے کی شہر آمد سے پہلے باہر جا کر ان سے غلہ مت خریدو) تو جب ضرر خاص ممنوع ہے تو پھر ضرر عام کی وجہ سے اسمگلنگ بدرجہ اولی ممنوع ہوگی۔

۷- شرعی نقطہ نظر سے خود کو ضرر پہنچانا بھی درست نہیں ہے، جبکہ اسمگلنگ میں خود کو ضرر میں مبتلا کرنا بھی پایا جاتا ہے، کیونکہ پکڑے جانے پر قید و بند کی صعوبت جھیلنی پڑتی ہے، اور مال کو ضبط کر لیا جاتا ہے اور جرمانے عائد کئے جاتے ہیں، لہذا اس لحاظ سے بھی اسمگلنگ ناجائز ہے۔

۸- انسان کی قیمت اس کی عزت وآبرو سے ظاہر ہوتی ہے، جبکہ اسمگلنگ میں پکڑے جانے پر آدمی بے عزت ہو جاتا ہے، اور یہ امر مخفی نہیں ہے کہ اپنی عزت کو داغدار کرنا شرعی نقطہ سے درست نہیں ہے، کیونکہ جان و مال اور عزت وآبرو کا تحفظ شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

اور جب اسمگلنگ ناجائز ہے تو پھر اس طریقہ پر آنے والے سونے کا خریدنا اور اس کو فروخت کرنا بھی درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے اندر حکومت، ملک کی صنعت اور معاشیات سب کو نقصان پہنچانا لازم آتا ہے، اور جائز اور مبنی بر مصلحت امور میں حکومت وقت کی مخالفت ہے، اور معصیت پر تعاون بھی ہے، جبکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان''(مائدہ: ۲)(اور تم باہم نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ اور ظلم وزیادتی میں تعاون نہ کرو)۔

البتہ اگر درآمد (Import) اور برآمد (Export) کا نظام مفاد عام کے پیش نظر نہیں بنایا گیا ہو، بلکہ حکمراں طبقہ اور سرمایہ دار لوگوں کی رعایت پر مبنی ہو، تو ایسی حالت میں اسمگلنگ کے ذریعہ لائے ہوئے سونے کو خریدنا مباح ہے۔

۸- موجودہ وقت میں پلاٹین (Platinum)(ایک قیمتی چاندی سے مشابہ سفید دھات) کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسے سفید

سونا کہا جاتا ہے، اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود "پلاٹین" کو حقیقی سونے کے حکم میں نہیں رکھا جا سکتا ہے، اور نہ ہی عقود، زکوۃ اور دیگر معاملات میں اس پر سونے کے احکام منطبق کئے جا سکتے ہیں، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- "پلاٹین" اشیاء کی قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے ثمن کے درجہ میں نہیں ہے، لہذا اس پر سونے چاندی کے احکام منطبق نہیں ہوتے ہیں۔

۲- "پلاٹین" اگر چہ ایک قیمتی دھات ہے، لیکن اس کی ماہیت وحقیقت سونے چاندی سے الگ ہے، لہذا سونے چاندی کے احکام اس پر منطبق نہیں ہوں گے۔

۳- "پلاٹین" اگر چہ ایک نفیس دھات ہے، لیکن سونے چاندی سے الگ ہے، لہذا روپے کے ذریعہ اس کی ادھار خرید وفروخت بھی جائز ہے، اور مجلس عقد میں اس پر باہمی قبضہ بھی شرط نہیں ہے، اور اگر وہ تجارت کے لئے نہ ہو تو اس پر زکوۃ بھی واجب نہیں ہے، البتہ اس پر سونے چاندی کے علاوہ دیگر معادن کے احکام جاری ہوں گے، یعنی اس میں خمس یعنی پانچواں حصہ واجب ہوگا، اور باقی چار حصے مالک زمین کے ہوں گے، اگر وہ مملوکہ زمین میں پایا گیا، اور اگر غیر مملوکہ زمین جیسے صحراوغیرہ میں پایا گیا تو باقی چار حصے پانے والے کے ہوں گے، امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"المستخرج من المعادن أنواع ثلاثة: منها جامد يذوب وينطبع كالذهب والفضة والحديد والرصاص والنحاس... فأما الجامد الذي يذوب بالذوب ففيه الخمس عندنا" (سرخسی. المبسوط. کتاب الزکاۃ. باب المعادن ۲/ ۲۱۱ ۲۱۲. بیروت، دار المعرفة ۱۴۱۴ھ ۱۹۹۳ء)

(کان سے نکالی جانے والی اشیاء کی تین قسمیں ہیں، ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ وہ ٹھوس ہو جو پگھلتا اور ڈھلتا ہو، جیسے سونا، چاندی، لوہا، سیسہ اور تانبا...... سو رہے وہ ٹھوس مادے جو پگھلانے سے پگھلتے ہیں تو ہم حنفیہ کے نزدیک اس میں خمس (پانچواں حصہ) واجب ہے)۔

۴- "پلاٹین" نہ سونے چاندی کی طرح خلقتاً نامی ہے، اور نہ ہی عرفاً نامی ہے، لہذا اگر تجارت کے لئے نہ ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے۔

۵- کسی چیز کو سونا کہہ دینے سے حقیقت کے اعتبار سے وہ سونا نہیں ہو جاتا ہے، مثلاً پیٹرول کو سیاہ سونا اور روئی (Cotton) کو سفید سونا کہا جاتا ہے، لیکن محض نام کی وجہ سے وہ سونے کے حکم میں نہیں ہو جائیں گے۔

۶- کسی چیز کا محض قیمتی ہونا اسے سونا چاندی کے حکم میں داخل نہیں کر دیتا ہے، چنانچہ ہیرے (Diamond) اور دیگر جواہرات ہر دور میں انتہائی قیمتی پتھر رہے ہیں، اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی موجود تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر زکوۃ واجب نہیں کی، اس سے معلوم ہوا کہ محض قیمتی ہونے سے کوئی چیز سونے چاندی کے حکم میں داخل نہیں ہو جاتی ہے۔

۷- فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ محض قیمتی ہونے سے کوئی چیز سونے چاندی کے حکم میں داخل نہیں ہو جاتی ہے، چنانچہ محمد عبد القادر رازی حنفیؒ (و: ۶۶۶ھ) لکھتے ہیں: "ولا شي في الفيروزج والياقوت واللؤلؤ والعنبر. في الزئبق الخمس" (رازی، تحفۃ الملوک/ص ۱۲۸، بیروت، دار البشائر، ۱۴۱۷ھ) (فیروزہ (نیلے رنگ کا قیمتی پتھر)، یاقوت (ایک قیمتی پتھر جو سرخ نیلا، زرد اور سفید رنگ کا ہوتا ہے)، موتی اور عنبر (ایک ٹھوس مادہ جو باریک پیسنے کے بعد مہکتا ہے، یا آگ پر ڈالنے سے خوشبو نکلتی ہے، اور وہ سمندری جانور کے پیٹ سے بطور فضلہ خارج ہوتا ہے) میں کچھ واجب نہیں ہے، اور پارہ (ایک رقیق دھات جو سفید اور بھاری ہوتی ہے، تھرکتی رہتی ہے) میں پانچواں حصہ واجب ہے)۔

اور مالکیہ کے نزدیک بھی: "ليس في الجواهر واللؤلؤ والعنبر زكاة" (جوہر (ایک قیمتی پتھر)، موتی اور عنبر میں زکوۃ نہیں)۔

(دیکھئے: مالک بن انس، المدونة ۱/ ۳۴۰، بیروت، العلمية، نیز: دسوق مالکی، حاشية الدسوقي ۱/ ۴۶۱، بیروت، دار الفکر، قرطبی مالکی، الاستذکار ۳/ ۱۵۴، بیروت العلمية ۲۰۰۰ء)

اور امام نووی شافعیؒ لکھتے ہیں: "لا زكاة فيما سوى الذهب والفضة من الجواهر، كالياقوت، والفيروزج، واللؤلؤ، والمرجان، والزمرد، والزبرجد، والحديد، والصفر، وسائر النحاس، والزجاج، وإن حسنت صنعتها، وكثرت قيمتها، ولا زكاة أيضا في المسك والعنبر" (نووی، المجموع ۶/ ۳، بیروت، دار الفکر ۱۹۹۷ء)

(سونے چاندی کے علاوہ دیگر جواہرات میں زکوۃ واجب نہیں ہے، جیسے یاقوت، فیروزہ، موتی، مونگا (چھوٹا موتی)، زمرد (سبز رنگ کا ایک قیمتی

پتھر) زبرجد (زمرد کے مشابہ ایک قیمتی پتھر جو ہرے اور زرد وغیرہ رنگ کا ہوتا ہے)، لوہا، پیتل، اور تمام قسم کے تانبے، اور شیشہ، اگر چہ ان کے اندر عمدہ طریقہ سے کاریگری کی گئی ہو، اور ان کی قیمت بہت ہو، اور ایسے ہی مشک اور عنبر میں زکوۃ نہیں ہے)۔

فقہاء کی ان تصریحات سے بھی واضح ہے کہ محض قیمتی ہونے سے کوئی چیز سونے چاندی کے حکم میں داخل نہیں ہو جاتی ہے۔

خلاصہ بحث:

۱- روپے سے سونا خریدا جائے تو اس میں روپیہ کی حیثیت ثمن کی ہے، لیکن یہ بیع صرف بھی نہیں ہے۔ لہذا یہ بات درست ہے کہ سونا چاندی اور روپئے میں سے ایک نقد ہو، اور دوسرا ادھار۔

البتہ بہتر یہ ہے کہ روپے کے ذریعہ سونا چاندی نقد خریدے۔

۲- حکومت یا سونے کی مارکیٹ کی طے کردہ قیمت سے کم یا زیادہ میں سونا چاندی فروخت کرنا جائز ہے۔ اور اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

۳- زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے زیور سازی کے سلسلہ میں جو معاملہ کرتے ہیں اور وہ اجارہ ہے۔

۴- زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جاتے ہیں، اگر وہ متعین ہیں، مثلاً پانچ سو گرام میں دو گرام، تو اجرت کی یہ تعیین کافی ہے، اور اگر متعین نہ ہوں، مثال کے طور پر پانچ سو گرام میں نکلنے والے ذرات دو یا تین گرام ہو سکتے ہیں، تو اجارہ فاسد ہے، اور اجرت مثل واجب ہے۔

۵- جو صورت معاشرہ میں رائج ہے وہ یہ ہے کہ سونے کے تاجر حضرات پرانے زیور کو کم قیمت میں روپے سے خریدتے ہیں، اور پھر نئے زیور روپیوں میں بیچتے ہیں، لہذا جنس مختلف ہونے کی وجہ سے ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوتا ہے، البتہ اگر کہیں یہ صورت رائج ہو کہ سونے کے پرانے زیور کا نئے زیور سے تبادلہ ہو، تو ایسی حالت میں پرانے زیور کے بدلے نیا زیور کم وزن سونے میں ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

۶- اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس ایک کیلو سونا ہو، اور وہ دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے گئے ہوں، بلکہ ان کے آرڈر (Order) کے بقدر سونا ان کے نام محفوظ کر دیا گیا ہو، تو اس کو خریداروں کا قبضہ نہیں قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ سونا چاندی پر قبضہ سے مراد عملی قبضہ ہے۔

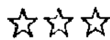
۷- اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو، اور اس کو کمپیوٹر (Computer) یا ریکارڈ رجسٹر (Record Register) میں اس کے نام سے درج کر دیا گیا ہو، تو یہ اندراج قبضہ کے لئے کافی نہیں ہے، اس لئے کہ سونا چاندی پر قبضہ سے مراد عملی قبضہ ہے۔

۸- ایکسچینج (Exchange) کے ذریعہ کاروبار کی جو صورت رائج ہے کہ مثلاً ایک مہینے کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے ۱۰ [illegible] سونے [illegible] کر لیا، خریدار نے سونے پر قبضہ نہیں کیا، اور ادائیگی کی تاریخ پر سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ کر حساب چکا یا جائے تو یہ معاملہ [illegible] ہے۔

۹- سونے کی ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے لئے اس کو روک کر رکھنا "احتکار" کے دائرہ میں داخل نہیں ہے۔

۱۰- اسمگلنگ (Smuggling) کا عمل ناجائز ہے، اور اس طریقہ پر آنے والے سونے کا خریدنا اور اس کو فروخت کرنا بھی درست نہیں ہے، البتہ اگر درآمد اور برآمد کا نظام مفاد عام کے پیش نظر نہیں بنایا گیا ہو، بلکہ حکمراں طبقہ اور سرمایہ دار لوگوں کی رعایت پر مبنی ہو، تو ایسی حالت میں اسمگلنگ کے ذریعہ لائے ہوئے سونے کو خریدنا مباح ہے۔

۱۱- "پلاٹینم"، حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہے، اور نہ ہی عقود، زکوۃ اور دیگر معاملات میں اس پر سونے کے احکام منطبق ہوتے ہیں۔



سونا چاندی کی تجارت۔ شرعی نقطۂ نظر

مفتی انور علی اعظمی[1]

۱- (الف): اگر روپے سے سونا چاندی خریدا جائے تو اس کو بیع صرف نہیں کہیں گے اور یہ بیع درست ہوگی؛ بشرطیکہ سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار۔

نوٹ کی فقہی حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ماضی قریب میں علماء ہندوستان میں اکثر کی رائے یہ رہی کہ نوٹ خود مال نہیں ہے بلکہ دین کی رسید ہے کسی کو نوٹ دینا دین کا حوالہ ہے، اور اس پر کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں: مثلاً نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی جب تک کہ ایک فقیر اس سے کوئی چیز خرید نہ لے، نوٹوں سے سونے چاندی کی خریداری درست نہیں ہوگی، اس لئے کہ نوٹ بھی سونے کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا یہ بیع صرف ہوئی اور جس نے نوٹ لئے اس نے سونے پر قبضہ نہیں کیا، لہٰذا تقابض فی المجلس نہ ہوا جو بیع صرف کے جواز کی شرط ہے؛ بلکہ اس رائے کے مطابق دو نوٹوں کا آپس میں تبادلہ بھی جائز نہیں، اس لئے کہ یہ بیع الدین بالدین (بیع الکالی بالکالی) ہے جو ناجائز ہے۔

یہ نقطۂ نظر کسی زمانہ میں درست تھا مگر اب بوجوہ درست نہیں رہا، اس لئے کہ اب نوٹوں کے پیچھے سونا نہیں ہوتا؛ بلکہ خود انھیں کو ثمن قرار دے دیا گیا ہے۔

☆ اکثر علماء عرب کی رائے یہ ہے کہ نوٹ ذہب اور فضہ کے قائم مقام ہیں، جو احکام سونے کے ہیں وہی نوٹوں کے بھی ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ سونا چاندی تو آلۂ تبادلہ نہیں رہے، سونے چاندی کی جگہ اب نوٹوں نے لے لی ہے، لہٰذا زکوٰۃ، بیع صرف اور ربوا وغیرہ تمام مسائل میں نوٹوں کا حکم سونے چاندی والا ہوگا۔

یہ نقطۂ نظر بھی درست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ سونے چاندی اور نوٹوں میں فرق ہے؛ کیونکہ سونے چاندی کو شریعت نے ثمن حقیقی قرار دیا ہے جب کہ نوٹ اعتباری ثمن ہیں، لہٰذا نوٹوں کو سونے چاندی کے قائم مقام قرار دینا اور یہ کہنا کہ سونے چاندی کی ثمنیت ختم ہو چکی ہے درست نہیں ہے۔

صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوٹ رسید نہیں ہے، بلکہ خود مال ہے، سونے چاندی کی طرح ثمن حقیقی نہیں، بلکہ ثمن عرفی ہے، ان کا حکم وہی ہوگا جو فلوس کا ہوتا ہے، لہٰذا اگر نوٹ کے ذریعہ سونا خریدا جائے تو یہ بیع صرف نہیں ہے، اس لئے تقابل فی المجلس ضروری نہیں ہے، البتہ بدلین میں سے ایک پر مجلس میں قبضہ ضروری ہے تا کہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے، لہٰذا یہ بات درست ہوگی کہ سونا چاندی اور روپیہ میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار۔

اس دور کے اکثر علماء کی یہی رائے ہے کہ روپے سے سونا اور چاندی ادھار خریدا جا سکتا ہے بشرطیکہ ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار۔

(اسلام اور جدید معاشی مسائل ۷/ ۳۴-۲۳۳)۔

(ب): انٹرنیٹ اور موبائل کی سہولیات نے پوری دنیا کو ایک شہر میں تبدیل کر دیا ہے دنیا کے مغرب میں کیا ہوتا ہے مشرق کو اس کی خبر سکنڈوں میں پہنچ جاتی ہے تمام ملکوں کی منڈیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں انٹرنیشنل مارکیٹ میں اشیاء کا جو نرخ ہوتا ہے وہ چھوٹے شہروں اور دیہات تک اسی وقت پہنچ جاتا ہے اس میں تاخیر نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی کوئی یہ چاہے کہ ساری دنیا میں کسی سامان کا ایک ہی نرخ ہو یہ ممکن نہیں اور شریعت بھی بیچنے اور خریدنے والے کو اس پر مجبور نہیں کرتی۔ خود ہمارے ملک میں سونے اور چاندی کا جو بھاؤ اخبار میں آتا رہتا ہے وہ ایک نہیں

[1] مفتی دار العلوم ...

ہوتا، ہندوستان کے چار بڑے شہر ممبئی، کلکتہ، دلی اور چینئی ان چار شہروں کے سونے اور چاندی کے بھاؤ اخبارات میں روزانہ شائع ہوتے ہیں اوران میں تفاوت رہتا ہے پھران شہروں کے قریب جوشہر ہیں ان کے بھاؤ میں بھی تفاوت ہوتا ہے بلکہ ایک شہر میں اگر سونے کے سو دوکاندار ہیں توان سب کا بھاؤ بھی بالکل برابر نہیں رہتا، کم وبیش ہوتا ہے، لہٰذا انٹرنیشنل مارکیٹ میں جو بھاؤ ہے یا ہندوستان کی سطح پر یہاں کی مارکیٹ نے جو بھاؤ طے کیا ہے اس سے زیادہ یا کم قیمت میں خرید وفروخت کرنا جائز ہوگا اور اس پر ربوا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ شریعت میں بیع کی تعریف ہے: "مبادلة المال بالمال مع التراضی"، لہٰذا جب دونوں فریق ایک بھاؤ پر لین دین کرنے کے لئے راضی ہو گئے تو یہ بیع جائز ہے چاہے وہ انٹرنیشنل بھاؤ یا M.C کے طے شدہ بھاؤ سے کچھ کم وبیش کیوں نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ تسعیر یعنی چیزوں کا بھاؤ متعین کرنا شریعت کے مزاج کے خلاف ہے اس لئے انٹرنیشنل مارکیٹ یا اندرون ملک کی مارکیٹ کے متعین کئے ہوئے بھاؤ کو ایسی حیثیت حاصل نہیں ہے کہ بائع یا مشتری کو اس کا پابند کیا جائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف روایت موجود ہے آپ کے زمانہ میں کسی چیز کا بھاؤ زیادہ ہوگیا تو لوگوں نے کہا یارسول اللہ ایک بھاؤ طے کر دیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ان الله هو المسعر القابض الباسط الرازق وإنی لأرجو أن ألقى الله تعالى وليس أحدمنكم يطالبنی بمظلمة من دم ولا مال وصححه الترمذی وابن حبان" (حاشیہ ہدایہ: ۴/ ۴۵۵)۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ بھاؤ طے کرنے والا ہے وہی تنگی اور کشادگی پیدا کرنے والا ہے روزی دینے والا ہے میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ تم میں کا کوئی شخص مجھ سے خون یا مال میں ظلم وزیادتی کا مطالبہ نہ کرے)۔

بہت مجبوری کے حالات میں عوام کو ظلم وزیادتی سے بچانے کے لئے تسعیر کی گنجائش ہے جیسا کہ ہدایہ اور فقہ کی دوسری کتابوں میں اس کی صراحت ہے۔ عام حالات میں تسعیر فقہاء کے یہاں مکروہ ہے، ہدایہ میں مذکور ہے: "ولا ینبغی للسلطان یسعر علی الناس" (حوالہ بالا)۔

بادشاہ کو نہیں چاہئے کہ وہ لوگوں پر بھاؤ طے کرے، اسلام آزادانہ تجارت کو پسند کرتا ہے اور مشتری اور بائع کو آپسی رضامندی کے ساتھ خرید وفروخت کی تعلیم دیتا ہے۔

۲- (الف): سونے کے لین دین میں مقدار کا جو یہ فرق ہورہا ہے اسے بیع نہیں کہا جا سکتا، بیع قرار دینے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ یہاں دونوں طرف سونا ہے سونے کا لین دین سونے سے ہورہا ہے، لہٰذا شرعی نقطۂ نظر سے یہ معاملہ بیع صرف ہے اور اس بیع میں مثلاً بمثلٍ کے ساتھ یداً بید بھی شرط ہے، یہاں معاملہ چند دنوں کے بعد ہورہا ہے اس لئے اس کو بیع ماننے کی گنجائش نہیں ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"حدثنا عبدالرحمن بن ابی بکرة عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثلا سواء بسواء يدًا بيدٍ۔ عن عمروٍ عن ابی المنهال قال باع شريك لی ورقًا بنسيئة إلى الموسم أو الحج فجاء الی فأخبرنی فقلت ہذا امر لا يصلح قال قد بعته فی السوق فلم ينكر ذلك علی أحد فأتيت البراء بن عازب فقال قدم النبی صلى الله عليه وسلم المدينة ونحن نبيع هٰذا البيع فقال ما كان يدا بيدٍ فلا باس به وما كان نسيئة فهو ربوٰا"۔

دوسری حدیث میں زید بن ارقم اور براء بن عازب دونوں حضرات سے مروی ہے:

"نهی رسول الله ﷺ عن بيع الورق بالذهب دينًا" (صحيح مسلم: ۲/ ۲۵، بخاری شریف: ۱/ ۲۹۱)۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی شریف اور صحاح کی تمام کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے اس لئے سونے کے تاجر اور زیور بنانے والے کاریگر کے درمیان جس معاملہ کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے اس کو بیع بنانا جائز اور درست نہیں ہوسکتا۔

دوسرے یہ کہ سونے کا تاجر اپنا مال دے کر زیور کی شکل میں واپس لے رہا ہے تو اسے بیع ماننے کی صورت میں سونا دینے والے تاجر ہی کو بائع اور مشتری دونوں ماننا لازم آئے گا۔

تیسرے یہ کہ بیع اپنی ملک کی ہوتی ہے اگر اس کو بیع مانا جائے تو زیور بنانے والے کاریگر کو زیور کا مالک ماننا ہوگا اور پھر اسے اس بات کا پابند نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سونے کا بنایا ہوا زیور اسی تاجر کے ہاتھ بیچے، مالک ہونے کی صورت میں کسی اور کے ساتھ بھی بیع کرنے کا اس کو اختیار ہوگا، حالانکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔لہٰذا یہ معاملہ بیع کے بجائے اجارہ ہے۔

(ب): فقہاء کے یہاں عقد اجارہ درست ہونے کے لئے اجرت کا متعین ہونا ضروری ہے۔ہدایہ میں مذکور ہے:

''ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة'' (ہدایہ: ۲۷۷/۳، کتاب الاجارۃ)۔

(اور عقد اجارہ صحیح نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ منافع معلوم ہوں اور اجرت معلوم ہو)۔

صاحب ہدایہ نے اس کی ایک دلیل یہ ذکر کی ہے کہ معقود علیہ کی جہالت اور اس کے بدل یعنی اجرت کی جہالت منازعت کا سبب ہے جیسے بیع میں ثمن اور مبیع کی جہالت اور اسی کے ساتھ انھوں نے کتاب الآثار کی ایک حدیث نقل کی ہے:

''من استاجر أجيرا فليعلمه أجره۔ قال المحشي رواه محمد بن الحسن في كتاب الآثار''

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مزدور کو اجرت پر رکھے تو چاہئے کہ اس کو اس کی اجرت بتادے)۔

اس لئے فقہاء کے یہاں عقد اجارہ کی درستگی کے لئے اجرت کی تعیین ایک بنیادی چیز ہے مسئلہ مذکورہ میں زیورات بنانے میں جو ذرات بچ جائیں اگر انہیں کو اجرت قرار دیا جائے تو یہ ایک غیر متعین چیز ہے زیور بنانے والا کاریگر دوسری دھات زیادہ ملا کر سونے کے ذرات زیادہ مقدار میں بچا سکتا ہے، ایسا کرنا چوری اور خیانت کا دروازہ کھولنا ہوگا۔اس لئے زیورات بنانے کی مزدوری الگ سے طے کرنا ضروری ہے اور جو دھات کاریگر اس میں ملا رہا ہے تاجر کی طرف سے اس دھات کو فراہم کرنا یا اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے، سونے کے بچے ہوئے ذرات تاجر کی ملک ہیں انہیں تاجر کے پاس واپس آنا چاہئے تاجر اپنی مرضی سے اس میں تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۳- سونا اموال ربویہ میں سے ہے اور وزنی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی وزن سے بکتا تھا اور آج بھی وزن سے بکتا ہے اور اموال ربویہ میں جب ثمن اور مبیع کی جنس ایک ہو تو ربوا تفاضل اور ربوا نسیئہ دونوں قسم حرام ہے چاہے ایک طرف جید مال ہو اور دوسری طرف ردی مال ہو۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''الذهب بالذهب مثلا بمثل وزنًا بوزنٍ والفضل ربوٰ''۔

اسی طرح سے آپ کا ارشاد ہے: ''جيدها ورديها سواء'' (نصب الرایہ ۳۷/۴، درایہ علی حاشیۃ الہدایہ ۸۸/۳)۔

اس مفہوم کی احادیث صحاح ستہ میں متعدد جگہ موجود ہے (صحیح مسلم: جلد ۲ کتاب البیوع، سنن ترمذی باب ماجاء فی الصرف ۱۴۹/۱)۔

لہٰذا براہ راست سونے کے پرانے زیور کو سونے کے نئے زیور کے ساتھ کمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیچنا جائز نہیں ہوگا اس کے سود ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔کیونکہ اموال ربویہ میں اچھا اور خراب بیع کے معاملہ میں یکساں مانا جاتا ہے اس کی بہت واضح دلیل بخاری شریف کی یہ روایت ہے جو ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنایا وہ آپ کے پاس جنیب کھجور لایا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں تو اس نے کہا نہیں اللہ کی قسم ہم دو صاع کھجوریں دے کر ایک صاع کھجور لیتے ہیں یا تین صاع کھجور کے بدلے دو صاع لیتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ایسا نہ کرو، اور ارشاد فرمایا کہ اپنی کھجوروں کو پہلے دراہم کے ذریعہ بیچو اور پھر دراہم سے جنیب کھجور خریدو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کے تبادلہ میں کمی بیشی کو منع کیا اور سود کا دروازہ بند کرنے کے لئے آپ نے جائز اور حلال طریقے پر رہنمائی فرمائی ہے (بخاری شریف: ۲۰۹/۲)۔

۴- (الف): فتاویٰ ہندیہ ج ۳ ص ۱۶ پر مذکور ہے کہ مبیع کو تسلیم کرنے میں اس بات کا اعتبار ہے کہ اس کو الگ کردیا جائے دوسرے کا حق اس میں شامل نہ ہو اور فقہاء نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ جائز بیع میں یہی تخلیہ قبضہ ہوتا ہے۔

''ويعتبر في السلم أن يكون المبيع مفرزًا غير مشغول بحق غيره هكذا في الوجيز لكردري، وأجمعوا على

أن التخلية فى البيع الجائز تكون قبضًا''۔

بدائع ۵ / ۲۴۴ پر مذکور ہے: ''فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشتري قابضا له''۔

یعنی تسلیم اور قبضہ کی حقیقت ہمارے نزدیک تخلیہ اور تخلی ہے اور اس کی شکل یہ ہے کہ بائع مشتری اور مبیع کے درمیان ہر طرح کی رکاوٹ کو دور کردے اور مشتری مبیع کے اندر تصرف کرنے پر قادر ہو جس کا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوگا کہ بائع مشتری کو مبیع حوالہ کرے اور اس پر قابض بنائے۔

سوال میں جو صورت حال بیان کی گئی ہے اس میں مشتری کا قبضہ ثابت نہیں ہوگا، اس لئے کہ مشتری کا خریدا ہوا پچاس گرام سونا اینٹ میں شامل ہے اس کو مجموعہ سے الگ نہیں کیا گیا ہے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بائع اگر فوری طور پر اس پر قبضہ کرنا چاہے تو قبضہ کرسکے یا اس میں کوئی تصرف کرنا چاہے تو تصرف کرسکے۔

بدائع میں آگے یہ بھی تحریر ہے کہ دراہم ودنانیر عقد سے متعین نہیں ہوتے بلکہ قبضہ سے متعین ہوتے ہیں سونا بھی دراہم ودنانیر کی قبیل سے ہے، فتح القدیر سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

محیط برہانی میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ دراہم اور دنانیر عقد معاوضات میں قبضہ کے وقت متعین ہوتے ہیں۔ لہٰذا متعاقدین کے درمیان عقد اسی وقت مفید ملک ہوگا جب قبضہ کے ذریعہ اس کی تعیین ہوجائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فقہاء کی عبارتیں اس بارے میں بہت واضح ہیں کہ سوال میں پوچھی ہوئی صورت حال میں پچاس گرام سونے کو اینٹ سے الگ کئے جانے سے پہلے خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا۔

(ب): دراہم ودینار اور دوسری اجناس کی تعیین میں یہ فرق ہے کہ دوسری اجناس اشارے یا علامتوں سے متعین ہوسکتی ہیں لیکن دراہم ودینار اس وقت متعین نہیں ہوسکتے جب تک اس پر کوئی شخص خود یا اپنے کسی نمائندے کے ذریعہ قبضہ نہ کرے۔ مذکورہ صورت میں صرف کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں خریدار کے نام سے پچاس گرام سونا یا خریدی ہوئی مقدار کا سکہ درج کیا گیا ہے اسی اندراج کو قبضہ کے لئے کافی تصور نہیں کیا جائے گا۔

بدائع ج ۵ ص ۲۱۸ پر مذکور ہے:

''إن الدراهم والدنانير وإن كانت لا تتعين بالعقد ولكنها تتعين بالقبض وقبضها واجب''۔

اسی کے آگے ص ۲۱۹ پر مذکور ہے: ''إن الدراهم والدنانير لا تتعين بالتعيين وإنما تتعين بالقبض فشرطنا التقابض للتعيين لا للقبض'' (بدائع ۵/ ۲۱۸،۱۹ طبع سعید)۔

دونوں عبارتوں سے اس بات کی پورے طور پر وضاحت ہوتی ہے کہ محض بسکٹ الگ ہونے سے یا خریدار کے نام کا اندراج کردینے سے سونے پر قبضہ متحقق نہیں ہوگا، کیونکہ اتنے سے دراہم ودنانیر متعین نہیں ہوتے، تعیین کے لئے خریدار یا اس کے نائب کا قبضہ ضروری ہے بدائع کی دوسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ دراہم ودنانیر میں تقابض کی شرط دراصل تعیین کے لئے ہے۔

فتح القدیر ۶ / ۱۶۰ پر مذکور ہے: ''فإن الدراهم والدنانير لا تتعين مملوكة بالعقد إلا بالقبض'' (طبع رشیدیہ کوئٹہ)

محیط برہانی میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ دراہم ودنانیر عقد معاوضات میں قبضہ کے وقت متعین ہوتے ہیں، لہٰذا متعاقدین کے درمیان عقد اسی وقت مفید ملک ہوگا جب قبضہ کے ذریعہ اس کی تعیین ہوجائے (محیط برہانی ۸ / ۶، ۷، ۵، ۷ طبع رشیدیہ کوئٹہ)۔

۵- ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی جس صورت کا سوال میں تذکرہ کیا گیا ہے بیع کی یہ شکل متعدد وجوہ سے ناجائز ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں ثمن اور مبیع دونوں ادھار ہیں، مشتری نے دس تولہ سونے کا ادھار سودا کرلیا اور اس پر قبضہ نہیں کیا، ادائیگی کی تاریخ آنے پر صرف قیمت کے تفاوت کا لین دین کرلیا اگر سونے کا بھاؤ پانچ ہزار ایک سو روپئے تولہ ہوگیا تو بائع خریدار کو ایک سو روپیہ فی تولہ دے دیتا ہے اور اگر

اس دن چار ہزار نوسو روپئے بھاؤ ہوگیا تو خریدار بائع کو ایک سو روپئے فی تولہ ادا کردیتا ہے۔ ناجائز ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہاں ثمن اور مبیع دونوں ادھار ہیں اور یہ حدیث شریف کی رو سے جائز نہیں ہے جیسا کہ حاکم اور بیہقی رحمہما اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے:

''نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الكالي بالكالي'' (السراج المنير للعزيزی ۴/ ۳۸۲)۔

(حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادھار کو ادھار کے بدلہ بیچنے سے منع کیا ہے)۔

مولانا تقی عثمانی اپنے مقالہ (مستقبل کی تاریخ پر خرید وفروخت) میں تحریر فرماتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ فیوچر مارکیٹ میں جو معاملات ہوتے ہیں ان سے تجارت مقصود نہیں ہوتی بلکہ نفع کی امید پر اپنا روپیہ داؤ پر لگانا مقصود ہوتا ہے اور یہ مقصد اس عقد کو بیع کے بجائے قمار (جوا) سے زیادہ مشابہ کردیتا ہے'' (فقہی مقالات ۲/ ۲۱۳)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب کی یہ بات حقیقت پر مبنی ہے اس لئے کہ اگر تجارت مقصود ہوتی تو مشتری سامان پر قبضہ کرتا اور وقت پر اس کی قیمت ادا کرتا یا بائع وقت پورا ہونے پر کہتا اپنا سامان لے جاؤ ہمارا پیسہ ادا کرو۔ لیکن دونوں طرف سے مبیع اور ثمن کے لین دین کا تقاضہ نہیں ہوتا صرف خرید اور ادائیگی کے دن کی قیمت کے تفاوت پر دونوں کی توجہ مرکوز ہوتی ہے۔

اس طرح کی فرضی خرید وفروخت کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ چیزوں کا دام چڑھتا ہے اور بازار میں گرانی پیدا ہوتی ہے اور اس کا ضرر عوام الناس کو اٹھانا پڑتا ہے۔

۶- امام ابوحنیفہ کے نزدیک احتکار آدمی اور جانوروں کی غذاؤں میں مکروہ ہے بشرطیکہ احتکار کا عمل ایسے شہر میں کیا جائے جہاں احتکار کی وجہ سے شہر والوں کو ضرر لاحق ہو۔ امام ابویوسف کے نزدیک احتکار غذاؤں کے ساتھ خاص نہیں ہے، ہر وہ چیز جس کا روکنا عامۃ الناس کے لئے ضرر کا باعث ہو وہ احتکار ہے چاہے وہ سونا چاندی ہو یا کپڑا، امام محمدؒ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ کپڑوں میں احتکار نہیں ہے ائمہ ثلاثہ کی ان آراء کو سامنے رکھئے تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک جو چیز کراہت میں موثر ہے وہ حقیقت ضرر ہے اس لئے انھوں نے احتکار کو غذاؤں کے ساتھ مخصوص نہیں کیا۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزیک ضرر معہود معتبر ہے اور اس کا تعلق کھانے پینے کے سامانوں سے ہے۔

''ويكره الإحتكار في أقوات الأدميين والبهائم اذاكان ذلك في بلد يضر الإحتكار بأهله وكذلك التلق فأما إذاكان لايضر فلا باس به وقال أبويوسف كل ماأضر بالعامة حبسه فهو احتكار وإن كان ذهبا وفضة أو ثوبا وعن محمد أنه قال لاإحتكار في الثياب فأبويوسف اعتبر حقيقة الضرإذ هوالمؤثر في الكلامة وأبوحنيفة اعتبر الضرر المعهود المتعارف'' (ہدایہ اخیرین، کتاب الكراهية ۴/ ۴۵۳)۔

الموسوعۃ الفقہیہ میں شوافع اور حنابلہ کا قول وہی نقل کیا گیا ہے جو امام ابوحنیفہ کا ہے ''لا إحتكار الا في القوت خاصة'' اور الموسوعۃ الفقہیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالکیہ کے نزدیک بھی ان تمام چیزوں میں احتکار مکروہ ہے جس سے عام لوگوں کو ضرر لاحق ہو احتکار صرف غذا کے ساتھ خاص نہیں ہے گویا مالکیہ کا قول امام ابویوسف کے قریب ہے (الموسوعۃ الفقہیۃ ۲/ ۹۲)۔

حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''الجالب مرزوق والمحتكر ملعون ابن ماجه، حاكم'' (دارمی الدرايه على حاشية الهداية ۴/ ۴۵۴)۔

حدیث کے الفاظ اشیاء ضروریہ میں احتکار کی ممانعت پر دلالت کرتے ہیں آج کے دور میں تاجروں کا ایک طبقہ غلہ کے علاوہ مختلف چیزوں میں ذخیرہ اندوزی کرکے عام انسانوں کا استحصال کرتا ہے، ذخیرہ اندوزی پیاز کی کرتے ہیں، کبھی دال کی اور کبھی گھی تیل کی، اس لئے سرکار نے دوکانداروں کے لئے اسٹاک کی ایک حد متعین کردی ہے، سارے دوکانداروں کو علی العموم اور مسلمان دوکانداروں کو بالخصوص اس حد کا لحاظ کرنا چاہئے، صاحب ہدایہ نے احتکار کی بحث میں حدیث کی مذکورہ لعنت سے بچنے کے لئے یہ کہا ہے:

''والحاصل أن التجارة في الطعام غير محمودة''

یعنی شریعت کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اور حدیث کی بددعا سے بچنے کے لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ غلہ کی تجارت نہ کرے، غلوں کی تجارت ناپسندیدہ ہے لیکن ہندوستان جیسے ملک میں ہم مسلمان تاجروں کو غلہ کی تجارت کرنے سے نہیں روک سکتے ہیں، اس لئے کہ فساد زدہ علاقوں میں اگر مسلمانوں کے پاس غلہ کی دوکانیں نہ ہوں تو غیر دوکانداروں کے لئے مسلمانوں کو ستانے کا ایک بڑا موقع ہاتھ آجائے گا بہرحال ذخیرہ اندوزی آج کے اس دور میں غلوں کے ساتھ ساتھ تمام اشیاء ضروریہ سے متعلق ہے یہاں تک کہ اس کا گہرا تعلق دواؤں سے بھی ہے۔ اس لئے اگر سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی اس حد تک ہونے لگے کہ اس کا اثر دوسری اشیاء کی گرانی پر پڑے تو لوگوں کو اس سے روکا جائے گا ابھی نوٹ بندی کے زمانہ میں سرکار نے سب کے لئے سونا رکھنے کی ایک حد متعین کردی ہے اس حد کی رعایت کرنا اور اس مقدار کے اندر سونا رکھنا احتکار کے دائرے کے باہر ہے۔ اور اگر سونے کی اس سے زیادہ مقدار ملکی معیشت کے لئے ضرر رساں ہو اور دوسری چیزوں کو متاثر کر رہی ہو تو یقیناً یہ فعل ناپسندیدہ ہوگا۔

۷- آج دنیا کے حالات پچھلے زمانہ سے مختلف ہیں، پہلے ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لئے ویزا پاسپورٹ کی پابندیاں نہیں تھیں، بیسویں صدی میں دنیا کے حالات دھیرے دھیرے بدلتے گئے اور تقریباً ہر ملک نے اس طرح کی پابندیاں عائد کردی، اسی طرح سے پچھلے زمانہ میں ساری دنیا میں تاجروں کے لئے اپنا مال دوسرے ملک میں لے جا کر بیچنے کی اور وہاں سے مال خریدنے کی کھلی چھوٹ تھی، پوری دنیا تاجروں اور سوداگروں کے لئے ایک آزاد منڈی تھی، لیکن بیسویں صدی میں دنیا کے معاشی حالات بدل گئے اور خرید و فروخت میں طرح طرح کی پابندیاں لاگو کردی گئیں۔ آج بھی بعض ملکوں میں آزاد منڈی ہے اور باہر سے جانے والے تاجروں اور بیرون ملک سے درآمد کئے جانے والے مال پر کوئی محصول نہیں ہے، بعض عرب ملکوں میں اب بھی یہ سہولت موجود ہے لیکن اکثر ملکوں میں ایکسپورٹ اور امپورٹ پر طرح طرح کی پابندیاں ہیں اور ان کا الگ قانون ہے ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کے قوانین کے پابند ہیں خاص طور پر وہ قانون جو شریعت سے متصادم نہیں ہیں اس کی رعایت کرنا ہمارے لئے ضروری ہے اس لئے باہر سے سونا یا دوسرے سامان لانے کا جو قانون ہمارے ملک میں جاری ہے ہمیں اس کا پابند رہنا چاہئے اس کی خلاف ورزی کرنے میں بہت سے منکرات لازم آتے ہیں جن سے ہمیں منع کیا گیا ہے مثلا اسمگلنگ کے ذریعہ مال لانے میں جھوٹ بولنا پڑتا ہے، جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے اور ملک کے جن قوانین کی پابندی کا ہم نے وعدہ کیا ہے ان کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہوتا ہے شریعت میں عہد و پیمان کی رعایت کا حکم بہت تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے ان منکرات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس عمل سے اجتناب کریں ورنہ اصولی طور پر باہر کے ملک سے مال لانا اور یہاں سے لے جا کر دوسرے ملک میں بیچنا شرعی اعتبار سے بالکل جائز ہے لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں بہت سارے مفاسد پائے جاتے ہیں اس لئے علماء کرام اس سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں۔

مولانا تقی عثمانی نے فتاویٰ عثمانی جلد سوم اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے جدید فقہی مسائل میں اس مسئلے سے مدلل بحث کی ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں کہ اسمگلنگ کرنے والا پوری قوم اور باشندگان ملک کو اپنی حرکت کے ذریعہ نقصان پہنچاتا اور زیر بار کرتا ہے جو غیر اسلامی ہونے کے علاوہ غیر انسانی حرکت بھی ہے۔ معاشی مصالح کے پیش نظر اس قسم کی پابندیوں کی گنجائش ہے، اس کی نظیر تلقی جلب ہے جس کو مکروہ قرار دیا گیا ہے تلقی جلب سے مراد یہ ہے کہ باہر سے آنے والے تجارتی قافلے کے شہر میں آنے سے پہلے ہی کوئی شخص جا کر ان سے غلہ خرید لے اور شہر میں آ کر اس سے زیادہ میں فروخت کردے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے گرانی بڑھتی ہے اور شہر کے باشندوں کو زک پہنچتی ہے، یہی صورت اسمگلنگ سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ غیر ملکی مصنوعات کی آمد کی وجہ سے اس ملک کی صنعت اور یہاں کا معاشی توازن بگڑتا اور متاثر ہوتا ہے (جدید فقہی مسائل ۱/ ۲۴۹)۔

۸- سونا چاندی ثمن خلقی ہیں اور ان کو پیدائشی طور پر نامی تسلیم کیا گیا ہے، ہیرے جواہرات جو سونے چاندی سے زیادہ قیمتی ہیں انہیں استعمال کرنے میں اور مسئلہ زکوٰۃ میں سونے چاندی کے حکم میں نہیں رکھا گیا ہے۔ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال شریعت میں جائز نہیں ہے، جبکہ قیمتی

پتھروں کے برتن کے استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ ہدایہ میں مذکور ہے: "لا بأس باستعمال آنية الرصاص والزجاج والبلور والعقيق"

(ہدایہ ۴/۴۳۴، فتاوی تاتار خانیہ ۱۸/۱۲۵، مجموعة الفتاوى الشرعية كويت ۲/۲۶۵)۔

(اور کوئی حرج نہیں رصاص، شیشہ، بلور اور عقیق کے برتنوں کے استعمال میں) اسی طرح سے مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں ہے لیکن انگوٹھی میں ہیرے کا اور قیمتی پتھر کا استعمال بطور نگ کے جائز ہے حالانکہ بہت سے پتھر سونے سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں:

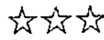
"والتختم بالذهب على الرجال حرام والحلقة هي المعتبرة لأن قوام الخاتم بها فلا معتبر بالفص حتى يجوز أن يكون من حجر"۔

(مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے اور انگوٹھی کے باب میں حلقہ کا اعتبار ہے، اس لئے کہ انگوٹھی کا وجود حلقے ہی سے ہے اور نگ کا اعتبار نہیں ہے وہ پتھر کا بھی ہوسکتا ہے)۔

لہٰذا صرف عرف کو دیکھتے ہوئے پلاٹین پر سونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا اور عقود اور زکوٰۃ کے باب میں اس پر سونے کے احکام منطبق نہیں ہوں گے آج کے زمانہ میں زمین اور فلیٹ وغیرہ غیر معمولی قیمتوں پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی پانچویں فقہی سمینار میں یہ بات طے ہوچکی ہے کہ جو ہیرے جواہرات زیورات کے لئے خریدے گئے ہوں ان کی زکوٰۃ مالک پر واجب نہیں البتہ جو ہیرے جواہرات تجارت کی نیت سے خریدے گئے ہوں ان کی زکوٰۃ مالک پر واجب ہوگی، یہی حکم پلاٹین کا بھی ہوگا اب اگر کوئی شخص زکوٰۃ سے فرار کے لئے بڑی رقم پلاٹین میں پھنساتا ہے تو وہ اپنی نیت کے حساب سے عنداللہ جواب دہ ہوگا۔

مولانا تقی عثمانی فقہی مقالات میں لکھتے ہیں:

"اموال زکوٰۃ کون کون سے ہیں"، استعمالی زیور پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، البتہ صرف سونے اور چاندی کے زیور پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن اگر سونے اور چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کا زیور ہے چاہے پلاٹینم ہی کیوں نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں جب تک کہ تجارت کے لئے نہ ہو بلکہ ذاتی استعمال کے لئے ہو (فقہی مقالات ۲/۱۴۸)۔



سونا اور چاندی کی تجارت کے مسائل اور ان کا حل

مفتی جنید عالم ندوی قاسمی[1]

۱-الف: روپئے پیسے سے سونا، چاندی کی ادھار بیع کا حکم:

روپئے پیسے ثمن اصطلاحی یا عرفی ہیں، سونا اور چاندی کی طرح ثمن خلقی نہیں ہیں، لہذا روپئے پیسے تمام احکام میں سونا اور چاندی کی طرح نہیں ہوں گے، اوران کی باہمی خرید وفروخت کو "بیع صرف" تصور نہیں کیا جائے گا اور روپئے پیسے کے ذریعہ سونا اور چاندی کو ادھار خریدنا شرعا جائز و درست ہوگا، بشرطیکہ مجلس بیع میں بدلین میں سے کسی ایک پر قبضہ ہوجائے، مجلس بیع میں مبیع اور ثمن دونوں پر قبضہ ضروری نہیں ہوگا، علامہ ابن عابدین شامی "ردالمحتار" میں لکھتے ہیں:

"سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس نسیئة فأجاب: بأنه یجوز إذا قبض أحد البدلین لما فی البزازیة لو اشتری مائة فلس بدرهم یکفی التقابض من أحد الجانبین. قال ومثله ما لو باع فضة أو ذهبا بفلوس كما فی البحر"

(ردالمحتار مطلب فی استقراض الدراهم عددا ۷/۳۱۲)۔

(حانوتی سے پوچھا گیا کہ پیسے سے سونا کی ادھار بیع جائز ہے یا نہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جائز ہے جبکہ بدلین میں سے کسی ایک پر قبضہ ہوجائے، جیسا کہ بزازیہ میں ہے: اگر کوئی شخص ایک درہم کے بدلہ سو پیسے خریدے تو بدلین میں سے کسی ایک پر قبضہ کافی ہوگا، اور اسی طرح اگر سونا اور چاندی کو پیسے کے عوض فروخت کرے (تو بدلین میں سے کسی ایک پر قبضہ کافی ہوگا))۔

ب- سرکار کی طرف سے مقرر کردہ قیمت سے کم یا زیادہ میں سونا، چاندی کی خرید وفروخت:

روپئے پیسے اور سونا چاندی الگ الگ جنس ہیں اور جب بدلین الگ الگ جنس ہوں تو کمی بیشی کے ساتھ بیع جائز ہے، اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا، البتہ اگر جنس اور قدر دونوں علتیں پائی جائیں تو ادھار بھی حرام ہے اور تفاضل بھی حرام ہے، اور اگر ان دونوں علتوں میں سے کوئی ایک مفقود ہو تو ادھار حرام ہے اور تفاضل جائز ہے، ہدایہ میں ہے:

"وإذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المفهوم إليه حل التفاضل والنسأ لعدم العلة المحرمة والأصل فيه الإباحة وإذا وجدا حرم التفاضل والنسأ لوجود العلة وإذا وجد أحدهما وعدم الاخر حل التفاضل وحرم النسأ"

(ھدایہ باب الربو ۳/۶۳)۔

کتب فقہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ سونا کو چاندی سے اندازہ کرکے یا کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے:

"ویجوز بیع الذهب بالفضة مجازفة ومفاضلة" (الفتاوی الهندیه کتاب الصرف ۳/ ۲۰۴)۔

علامہ کاسانی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب بدائع الصنائع میں مزید وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ: گیہوں کو جو کے بدلہ یا سونا کو چاندی کے بدلہ اندازہ سے یا کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے کہ جب جنس کی بیع خلاف جنس سے ہو تو مساوات شرط نہیں ہے۔

"ولو تبایعا حنطة بشعیر أو ذهبا بفضة مجازفة جاز لأن المماثلة فی بیع الجنس بخلاف الجنس غیر مشروطة

[1] ناظم وبانی دارالعلوم الاسلامیہ مفتی نگر مجھولیا، مغربی چمپارن۔

ولهذا جازت المفاضلة فيه فالمجازفة أولى'' (بدائع الصنائع ۴/۷۳)۔

لہذا مذکورہ صورت میں حکومت یا مارکیٹ کی طرف سے سونا اور چاندی کی جو قیمت متعین ہو اس میں کمی یا زیادتی کے ساتھ خرید وفروخت شرعا جائز ودرست ہے، اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۲،الف- زیور بنانے کی اجرت بچے ہوئے ذرات سے لینا بیع ہے یا اجارہ؟

زیور بنانے والے کاریگر کا زیورات کے تاجروں سے متعین مقدار میں سونا لینا اور زیور بنا کران کے حوالہ کرنا اور اجرت میں دوسری دھاتوں کی آمیزش کے بقدر بچے ہوئے سونا اور زیور بناتے وقت بچے ہوئے ذرات کا لینا یہ بیع نہیں ہے بلکہ اجارہ ہے، اس لئے کہ بیع کی تعریف ''مبادلة المال بالمال بالتراضی'' سے کی جاتی ہے، یعنی باہمی رضامندی سے کسی مال کا تبادلہ کسی دوسرے مال سے بیع ہے، اور اجارہ کی تعریف ''تمليك المنافع بعوض'' سے کی جاتی ہے، کسی چیز کے بدلہ منافع کا مالک بنانا اجارہ کہلاتا ہے، اور ظاہری بات ہے کہ مذکورہ صورت میں مال کا تبادلہ مال سے نہیں ہے، بلکہ کاریگر سونے کا زیور بنا کر اس کی اجرت لیتا ہے۔

ب- زیور بنانے کی اجرت بچے ہوئے ذرات سے لینے کا حکم:

جہاں تک زیورات کے بنانے میں بچے ہوئے ذرات کے لینے کی بات ہے کہ یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ تو چونکہ مذکورہ صورت میں اجرت بھی مجہول ہے اور مدت بھی مجہول، نیز عامل کی اجرت اس کے عمل سے قرار پاتی ہے اور یہ تینوں چیزیں مفسدہ اجارہ ہیں، اس لئے حنفیہ کے اصول کے مطابق یہ صورت جائز نہیں ہونی چاہئے، لیکن یہ صورت بالکل عام ہے، اس کا عرف بن چکا ہے اور عرف وعادت وہ اصول ہیں جن پر بے شمار مسائل کی بنیاد ہے، جن کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے کہ اجرت بھی مجہول ہے اور مدت بھی مجہول اور عامل کی اجرت اس کے عمل سے قرار پاتی ہے پھر بھی عرف عام کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا گیا ہے، جیسے مزارعت، مساقات اور جانور بٹائی پر دینا وغیرہ، مدت اور اجرت مجہول ہوں تو اس وقت مفسدہ اجارہ ہیں جبکہ جہالت آپسی نزاع کا سبب بن جائے اور جس وقت جہالت مفضی الی النزاع نہ ہو تو وہ جہالت صحت اجارہ سے مانع نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو جہالت نزاع کا سبب بن جائے وہ مبیع اور ثمن پر قبضہ سے مانع ہوگی اور عقد کا مقصد پورا نہیں ہوگا اور جو جہالت نزاع کا سبب نہ ہو وہ قبضہ سے مانع نہیں ہوگی اور عقد کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

علامہ کاسانی صحت بیع کی شرطوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ومنها: أن يكون المبيع معلوما وثمنه معلوما علما يمنع من المنازعة فإن كان أحدهما مجهولا جهالة مفضية إلى المنازعة كانت مانعة من التسليم والتسلم فلا يحصل مقصود البيع. وإذا لم تكن مفضية إلى المنازعة لاتمنع من ذلك فيحصل المقصود'' (بدائع الصنائع كتاب البيوع ۶/ ۵۲۹)۔

مذکورہ صورت میں اگر تھوڑی سی جہالت بھی ہے تو وہ نزاع کا سبب نہیں ہے، اس لئے کہ سونے کے تاجروں اور زیورات بنانے والے کاریگروں کے درمیان یہ معاملہ عام ہے، لڑائی جھگڑے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے، جہاں تک یہ معاملہ کہ عامل کی اجرت اس کے عمل سے قرار پاتی ہے، لہذا قفیز طحان والی روایت کے پیش نظر اجارہ کی یہ صورت ناجائز ہونی چاہئے، تو اس کا بہترین جواب علامہ ابن عابدین نے ''شرح عقود رسم المفتی'' میں تفصیل سے لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عرف عام کی وجہ سے کسی نص کا ترک جائز نہیں ہے، لیکن کسی نص کی تخصیص جائز ہے، اگر قفیز طحان ہی پر عرف بن جائے اور عرف کی وجہ سے اس پر عمل کر لیا جائے تو یہ نص کا ترک ہوگا؛ لیکن اگر اس علت کی بنیاد پر کوئی دوسری صورت ناجائز بن رہی ہو اور عرف عام کی وجہ سے اس صورت کو جائز قرار دیا جائے تو یہ نص کی تخصیص ہوگی نہ کہ نص کا ترک، مذکورہ صورت کو عرف عام کی وجہ سے اگر جائز قرار دیا جائے تو یہ نص کی تخصیص ہوگی جو درست ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اجارہ کی مذکورہ صورت شرعاً جائز و درست ہے اور کاریگر اجرت میں ملے ہوئے سونا اور سونے کے ذرات کو استعمال کرسکتا ہے۔

۳- پرانے سونے کا تبادلہ نئے سونے سے کمی بیشی کے ساتھ:

سونا اموال ربویہ میں سے ہے اور اموال ربویہ میں عمدہ کی بیع ردی سے کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے، بلکہ برابری ضروری ہے، نیا اور پرانا ہونا یہ وصف ہے اور وصف میں تفاوت کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لہذا سونا کے پرانے زیور کا تبادلہ سونے کے نئے زیور سے کمی بیشی کے ساتھ شرعاً حرام ہے، ان دونوں میں برابری ضروری ہے، جو لوگ کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں وہ غلط کرتے ہیں، عند اللہ سخت پکڑ ہوگی، ان پر اس سے احتراز لازم ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی ردالمحتار میں لکھتے ہیں:

''قوله(وجيد مال الربوا ورديئه سواء) أى فلا يجوز بيع الجيد بالردى مما فيه الربا إلا مثلا بمثل لإهدار التفاوت فى الوصف'' (ردالمحتار کتاب البیوع باب الربوا ۷/۴۱۳)۔

۴- الف، ب: ان دونوں سوالوں کے جوابات سے قبل قبضہ کی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ کیا قبضہ کے لئے اپنی مٹھی میں لینا ضروری ہے یا قبضہ پر قدرت بھی کافی ہے؟ کتب فقہ کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قبضہ کے لئے اپنی مٹھی میں لینا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ کسی شئی پر قبضہ کی قدرت کافی ہے، یعنی ایسا تخلیہ کہ بغیر کسی کلفت ومشقت کے اور بغیر کسی کی مدد کے اس شئی کو اپنے استعمال میں لا سکے، درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو جو قبضہ کے لئے رکاوٹ بن سکے۔

صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانی لکھتے ہیں کہ قبضہ کے لئے انگلیوں سے پکڑنا شرط نہیں ہے، بلکہ قبضہ کی حقیقت یہ ہے کہ قبضہ پر قدرت ہو، مبیع اور مشتری کے درمیان تخلیہ ہو اور عرفاً، عادۃً اور حقیقۃً کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

''ولا يشترط القبض بالبراجم لأن معنى القبض هو التمكين والتخلى وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة''

(بدائع الصنائع ۴/۳۴۲)۔

علامہ علاء الدین الحصکفی اپنی شہرہ آفاق کتاب درمختار میں قبضہ سے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ: مشتری اور مبیع کے درمیان ایسا تخلیہ کہ جس سے قبضہ پر قدرت ہو جائے اور درمیان میں کوئی چیز حائل اور رکاوٹ نہ بنے قبضہ سمجھا جائے گا۔

''ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل''۔

(الدر المختار علی ہامش رد المحتار کتاب البیوع ۷/۹۴ تا ۹۷)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے ''على وجه يتمكن من القبض'' کے تحت چند جزئیات بیان کئے ہیں جن سے قبضہ کی صحیح حقیقت سمجھ میں آتی ہے، مثلاً:

اگر کوئی شخص گیہوں خریدے جو کسی گھر میں ہو اور فروخت کرنے والا چابی خریدار کے حوالہ کر کے یہ کہے کہ میں نے تمہارے اور گیہوں کے درمیان راستہ خالی کردیا ہے تو یہ قبضہ سمجھا جائے گا اور اگر چابی دے کر کچھ بھی نہ کہے تو یہ قبضہ نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی مکان فروخت کرے جو سامنے نہ ہو بلکہ اس سے دور ہو اور فروخت کرنے والا یہ کہے کہ میں نے مکان تمہارے حوالہ کیا اور خریدار کہے کہ میں نے قبضہ کرلیا تو یہ قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، اس لئے کہ فی الحال قبضہ پر قدرت نہیں ہوگی اور اگر مکان قریب ہو تو قبضہ سمجھا جائے گا، قریب وبعید کی پہچان یہ ہے کہ اگر فی الحال مکان کے بند کرنے پر قدرت ہو تو قریب ہے اور اگر فی الحال بند کرنے پر قدرت نہ ہو تو بعید ہے (ردالمحتار مطلب فیما یکون قبضاً للمبیع کتاب البیوع ۷/ ۹۴ تا ۹۶)۔

علامہ شامی ایک صفحہ کے بعد لکھتے ہیں کہ اگر مکان قریب ہوگا تو فی الحال حقیقی قبضہ متصور ہوگا، لہذا تخلیہ کو قبضہ کے قائم مقام قرار دیا جائے گا اور اگر مکان دور ہو تو فی الحال حقیقی قبضہ متصور نہیں ہوگا، لہذا تخلیہ کو قبضہ کے قائم مقام نہیں قرار دیا جائے گا۔

''لأنه إذا كان قريبا يتصور فيه القبض الحقيقى فى الحال فتقام التخلية مقام القبض أما إذا كان بعيدا لا يتصور القبض فى الحال فلا تقام التخلية مقام القبض'' (ردالمحتار مطلب فیما یکون قبضا للمبیع کتاب البیوع ۷/۹۷)۔

علامہ شامی یہ اور اس طرح کے دیگر جزئیات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''وحاصله: أن التخلية قبض حكما مع القدرة عليه بلا كلفة'' (حوالہ مذکور ۷/۹۶)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یا تو حقیقی قبضہ ہو یا ایسا تخلیہ ہو کہ فی الحال حقیقی قبضہ متصور ہو یعنی خریدار اور مبیع کے درمیان ایسا تخلیہ ہو کہ بغیر کسی مشقت و پریشانی کے فی الحال اس پر قبضہ ممکن ہو اور درمیان میں کوئی چیز حائل اور رکاوٹ نہ ہو۔

مذکورہ دونوں صورتوں میں خواہ خریدار کے حصہ کے بقدر سونا، سونے کی اینٹ میں محفوظ ہو یا اس کے سونے کا سکہ الگ کردیا جائے قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، پہلی صورت میں جبکہ خریدار کا سونا، سونے کی اینٹ میں محفوظ ہو تو اس کو فی الحال خریدار کے حوالہ کرنا ممکن نہیں ہے، اس کے ساتھ غیر کا حق متعلق ہے۔

علامہ شامی قولہ ''بلا مانع'' کے تحت لکھتے ہیں:

''بأن يكون مفرزا غير مشغول بحق غيره'' (حوالہ مذکور ۷/۹۶)، یعنی مبیع علاحدہ ہو اور کسی غیر کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو۔
علامہ شامی ''ملتقط'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مکان فروخت کرے اور اس کو مشتری کے حوالہ کردے لیکن اس مکان میں فروخت کرنے والے کا کچھ سامان بھی ہو خواہ وہ کم ہو یا زیادہ تو یہ حوالہ کرنا نہیں ہوگا اور قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، یہاں تک کہ اپنا سامان نکال کر مکان خریدار کے حوالہ کردے۔

''وفي الملتقط: ولو باع دارا وسلمها إلى المشتري وله فيها متاع قليل أو كثير لايكون تسليما حتى يسلمها فارغة'' (حوالہ مذکور ۷/۹۶)۔

دوسری صورت میں اگرچہ خریدار کے سونے کا سکہ الگ کردیا گیا لیکن فی الحال بغیر کسی مشقت وکلفت اور بغیر کسی حیلولت کے اس پر قبضہ کرنا اور اس کو اپنے استعمال میں لانا ممکن نہیں، اس لئے اس صورت میں بھی تخلیہ قبضہ کے قائم مقام نہیں ہوگا اور اس تخلیہ کو قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، جیسا کہ ردالمحتار کے حوالہ سے قریب وبعید مکان کی خریداری کا حکم مذکور ہوا اور مزید دوسرے جزئیات ردالمحتار میں مذکور ہیں جن سے اس مسئلہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔

۵- مبیع اور ثمن پر قبضہ کئے بغیر بیع وشراء کا معاملہ:

خریدار نے اپنے ادھار خریدے ہوئے سونا پر اور فروخت کرنے والے نے ثمن پر قبضہ نہیں کیا اور سونا خریدگی کے وقت اس کی جو قیمت تھی اور ثمن کی ادائیگی کے وقت جو قیمت ہوئی ان دونوں کے درمیان جو کمی بیشی کا فرق ہوا اس کا لین دین کرلیا تو اس طرح کاروبار کرنا شرعا جائز ودرست نہیں ہے، اس سے احتراز لازم ہے، اس لئے کہ مبیع اور ثمن پر قبضہ کئے بغیر بیع وشراء کا معاملہ خلاف شرع ہے، مبیع خریدار کے اور ثمن فروخت کرنے والے کے حوالہ کرنا ضروری ہے، اس کے بعد ہی آگے کا معاملہ کیا جاسکتا ہے۔

۶- سونے کی ذخیرہ اندوزی احتکار ممنوع کے دائرہ میں داخل ہے یا نہیں:

اس کے جواب سے قبل یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جمہور فقہاء خصوصا امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک صرف غذائی اشیاء میں احتکار کا تحقق ہوگا، غذائی اشیاء کے علاوہ دیگر ضروری اجناس میں احتکار کا تحقق نہیں ہوگا اور یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ جن احادیث مبارکہ میں احتکار کی ممانعت اور اس پر وعید آئی ہے ان میں غلہ کی صراحت موجود ہے اور ان حضرات نے جن روایات میں مطلق احتکار کی ممانعت آئی ہے ان کو غلہ کے ساتھ مقید کیا ہے، اس لئے کہ جب کسی ایک مسئلہ میں خاص وعام دونوں طرح کی نصوص ہوں تو عام کو خاص پر محمول کیا جاتا ہے۔

''وإذا اجتمعت نصوص عامة وأخرى خاصة في مسئلة واحدة عمل العام على الخاص، والمطلق على المقيد''
(الموسوعة الفقهية ۲/۹۳)۔

غذائی اشیاء میں بھی احتکار کی ممانعت اس وقت ہے جبکہ غلہ خرید کر رکھا گیا ہو اور بازار میں غلہ کی کمی کی وجہ سے لوگ پریشان ہوں، اور اگر اپنے کھیت کا غلہ ہو تو اس کی ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کی نیت سے اس کو روک کر رکھنا احتکار میں داخل نہیں ہے۔

''(ولا يكون محتكرا بحبس غلة أرضه) بلاخلاف'' (درمختار)۔

''قوله (ولا يكون محتكر ...الخ) لأنه خالص حقه لم يتعلق به حق العامه، ألاترى أن له أن لايزرع فكذا له أن لايبيع'' (ردالمحتار كتاب الحظر والاباحة باب الاستبراء وغيره ۹/ ۵۷۲)۔

چونکہ سونا غذائی، اشیاء میں سے نہیں ہے اس لئے سونے کی ذخیرہ اندوزی اور اس کو گراں فروشی کی نیت سے روک کر رکھنا احتکار ممنوع کے دائرہ میں نہیں آئے گا اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا گنہگار نہیں ہوگا گرچہ اس کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہو۔

۷- اسمگلنگ کے راستہ سے سونا کی خرید وفروخت کا حکم:

چونکہ اسمگلنگ کا راستہ غیر قانونی ہے، پکڑے جانے کی صورت میں عزت پر دھبہ آئے گا، نیز ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس سے ایک طرح کا ہمارا معاہدہ ہے کہ ہم اس کے قوانین کی پابندی کریں گے جب تک کہ وہ ہماری شریعت کے خلاف نہ ہوں، اس لئے اسمگلنگ کے راستہ سے سونے کی خرید وفروخت نہیں کرنی چاہئے، اس سے احتراز کرنا چاہئے، لیکن اگر کسی شخص نے اس راستہ سے سونا خرید لیا ہے تو وہ شرعا اس کا مالک ہے، اس کو وہ کسی دوسرے سے فروخت کرسکتا ہے اور دوسرا شخص اس سے خرید سکتا ہے، شرعا اس کی گنجائش ہوگی۔

۸- پلاٹین کا حکم:

پلاٹین خواہ جتنے قیمتی ہوں اور ان سے زیورات بھی بنائے جاتے ہوں پھر بھی وہ دھات ہیں، وہ حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوں گے اور عقود نیز زکوۃ وغیرہ میں ان پر سونے کے احکام منطبق نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت کے شرعی احکام

مولانا محمد ظفر عالم ندوی[1]

روپئے یا کاغذی نوٹ جن کو موجودہ دور میں کرنسی سے تعبیر کرتے ہیں وہ ثمن اصطلاحی ہیں ثمن اصطلاحی جو ثمن اعتباری بھی کہلاتے ہیں اس کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہوتی، لیکن دنیا کی حکومتیں قانونی اعتبار سے اسے ظاہری قیمت کا درجہ دیتی ہیں، اور یہ مختلف حالات، زمانے اور تغیرات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، اوران کی حیثیت بھی انقلاب زمانہ اور تغیرات سے متاثر ہوتی رہتی ہے، اس لئے کرنسیوں اور کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی قیمت نہیں ہوتی بلکہ حکومت کے اعلان کے بعد یہ قیمتی بن جاتے ہیں، اوران میں ثمنیت آجاتی ہے، اگر چہ یہ ثمن خلقی نہیں بلکہ اعتباری یا اصطلاحی ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر حکومت ان کاغذی نوٹوں کی ثمنیت ختم ہونے کا اعلان کردے تو ان کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی، کاغذی نوٹوں کی اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے فقہی اور شرعی اعتبار سے اگر ہم اس کا جائزلیں تو یہ فلوس نافقہ کے دائرہ میں آتے ہیں جس طرح فلوس فلوس نافقہ (مروجہ سکوں) کی ظاہری قیمت ہوا کرتی ہے اور کرنسیاں بھی لین دین کا ذریعہ ہیں، یہ اگر چہ ثمن کے قائم مقام ہیں اور ایک ہی ملک کے نوٹوں کے درمیان تبادلہ کے وقت بطور کمی بیشی جائز نہیں پھر بھی یہ بیع صرف کے دائرہ میں نہیں آتے ہیں، کیونکہ کاغذی نوٹ یا کرنسیاں خلقتاً ثمن نہیں ہیں بلکہ یہ ثمن عرفی اور اصطلاحی، ہیں اور بیع صرف کے احکام صرف خلقی اثمان (سونے اور چاندی) میں جاری ہوتے ہیں، اس بنیادی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے سوال نامہ کے جوابات ذیل میں درج کئے جارہے ہیں:

۱- (الف): اگر روپئے سے سونا خرید کیا جائے تو اس بیع کو بیع صرف نہیں کہا جائے گا۔

اگر کاغذی نوٹ اور کرنسیوں کے ذریعہ سونا چاندی خریدا جائے تو یہ بیع صرف نہیں ہوگی بلکہ عام بیع کے دائرہ میں آئیگی اور اس میں ایک عوض نقد اور دوسرا ادھار ہو تو بیع درست ہوگی۔

بیع صرف کے لئے ضروری ہے کہ عوضین اثمان ہوں اور اثمان سے مراد اثمان خلقیہ ہیں، روپے و کرنسیاں وغیرہ اگر چہ ثمن ہیں لیکن ثمن عرفی ہیں، اس لئے ایک طرف اگر سونا ہو اور دوسری طرف کرنسی یا کاغذی نوٹ تو یہ بیع صرف تصور نہیں کی جائے گی، شیخ وہبہ الزحیلی بیع صرف کی تعریف وتشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''وهو بيع النقد بالنقد جنسا بجنس أو بغير جنس: اى بيع الذهب بالذهب أو الفضة بالفضة أو الذهب بالفضة، مصوغًا أو نقدًا'' (الفقه الاسلامي وادلته ۵/ ۳۶۵۹)۔

علامہ کاسانی بدائع الصنائع میں بیع صرف کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''الصرف فی متعارف الشرع اسم لبيع الأثمان المطلقة بعضها ببعض وهو بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة أو أحد الجنسين بالآخر'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۵۳)۔

علامہ حصکفیؒ نے وضاحت کی ہے کہ بیع صرف میں جو ثمن ہوا کرتا ہے وہ ثمن خلقی ہوتا ہے، موصوف لکھتے ہیں:

''بيع الثمن بالثمن (أى ما خلق للثمنية، ومنه المصوغ) جنسا بجنس أو بغير جنس'' (الدر المختار على الرد ۷/ ۵۲۰)

مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ سوال میں درج صورت بیع صرف کی نہیں ہے لہذا اگر ایک عوض نقد ہو اور دوسرا ادھار تو یہ درست ہے۔

---

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

فتاویٰ ہندیہ میں ایک جزئیہ موجود ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ اگر چاندی یا سونے کی انگوٹھی پیسے سے خریدی جائے اور پیسے پاس نہ ہوں تب بھی بیع جائز ہے کیونکہ یہ عام بیع ہے، بیع صرف نہیں ہے۔ ہندیہ کی عبارت اس طرح ہے:

''وان اشترىٰ خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلسا وليست الفلوس عنده فهو جائز تقابضا قبل التفرق أو لم يتقابضا لأن هذا بيع وليس بصرف'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۲۲۴)۔

مذکورہ عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فلوس اگرچہ ثمن ہیں لیکن عرفی ہیں نہ کہ خلقی، یہی وجہ ہے کہ ایک عوض ادھار ہو تو بیع جائز ہوگی۔

اس مسئلہ میں فقہاء کے مختلف نقطہائے نظر ہیں، امام ابوحنیفہؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اثمان کی بیع میں عندالعقد ثمن کا عقد کرنے والے کی ملک میں ہونا شرط نہیں ہے، لہذا جب جنس مختلف ہوں تو ادھار معاملہ کرنا درست ہے۔

شمس الأئمہ سرخسی لکھتے ہیں:

''واذا اشترى الرجل فلوسًا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز. لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود وقد بينا أن حكم العقد في الثمن وجو بها ووجودها معًا. ولا يشرط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشترط ذلك في الدراهم والدنا نير'' (المبسوط للسرخسی ۱۴/ ۲۴)۔

اگر کسی شخص نے دراہم کے بدلے فلوس خریدے، اور اس نے دراہم بائع کو دیئے لیکن بائع کے پاس اس وقت فلوس موجود نہیں تھے تو یہ بیع درست ہوجائیگی۔ اسلئے کہ مروجہ سکے ثمن کے حکم میں ہوتے ہیں اور ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ ثمن پر عقد کرنے کا حکم یہ ہیکہ وہ ثمن (مشتری کے ذمہ) واجب بھی ہوجائے اور موجود بھی ہو لیکن ثمن کا بائع کی ملکیت میں ہونا شرط نہیں، جس طرح دراہم اور دنانیر کی بیع کے وقت ان کا ملک میں ہونا ضروری نہیں۔

علامہ ابن نجیم مصری نے البحر الرائق میں لکھا ہے:

''وقيد بالذهب والفضة لأنه لو باع فضة بفلوس أو ذهبًا بفلوس فانه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما كذا في الزخيره'' (البحر الرائق ۶/ ۱۹۴)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ وضاحت فرماتے ہیں:

''لو باع فضة بفلوس فانه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما'' (ردالمحتار: ۷/۵۲۲)

علامہ شامیؒ نے حانوتی کا ایک فتویٰ بھی نقل کیا ہے: ''سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئةً فاجابه بأنه يجوز اذا قبض أحد البدلين'' (ردالمحتار ۵/ ۱۸۰)، فتاوی ہندیہ میں ہے: ''لم يشترط في بيع الفلوس بالدراهم اوالدنا نير قبض البدلين قبل الافتراق ويكتفى بقبض أحد البدلين'' (الفتاوی ہندیہ ۳/ ۲۲۴)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جو "احكام الأوراق النقديه" سے مشہور ہے اس میں آپ نے موضوع سے متعلق تمام گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور زیر بحث مسئلہ سے متعلق بھی صراحت کی ہے کہ یہ بیع صرف نہیں ہے اسلئے ایک عوض ادھار ہو تو جائز ہے، ایک سوال کے جواب میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے سوالنامہ میں درج مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے موصوف فرماتے ہیں:

''جعلوها في حكم الذهب سواء بسواء ولكن خالفتهم في رسالتي ''احكام الأوراق النقدية وزكرت أنها ليست قائمة مقام الذهب في جميع الأمور فلا تجرى فيها أحكا الصرف ولذلك يجوز عندى أن يشترى الذهب أو الفضة بالنقد ويجوز ايضا أن يشترى الذهب نسيئةً بالأوراق النقدية'' (فتاویٰ عثمانی ۳/ ۱۵۹)۔

موصوف ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''فانه يجوز شراء حلي الذهب والفضة بالنقود الورقية نسيئةً بشرط أن يكون بسعر يوم العقد ولا يشترط فيه التقابض'' (فقه البيوع ۲/ ۷۶۳).

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر سونے کی خرید روپے سے ہو تو ادھار بھی جائز ہے۔

(ب): اسلام کا جو نظام معیشت ہے وہ اشترا کی اور سرمایہ دارنہ نظام سے جداگانہ ہے، اسلام کے نظام معیشت میں بنیادی طور پر یہ بات پائی جاتی ہے کہ فرد کی ملکیت کو تسلیم کیا جائے اور خرید وفروخت کے بازار میں عام لوگوں کو اخلاقی حدود وقیود کی رعایت کے ساتھ آزادانہ طور پر کاروبار کا موقع دیا جائے اور کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا کی جائے۔ اور نہ تسعیر (بھاؤ مقرر) کیا جائے، ترمذی میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے:

''قال رسول الله ﷺ لا يبيع حاضر لباد، دعوا الناس يرزق الله بعضهم من بعض'' (باب ماجاء لا يبيع حاضر لباد)۔

اس روایت میں رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو اللہ تعالیٰ بعض کو بعض سے رزق دیتا ہے۔

سنن ابوداؤد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے تسعیر کی تجویز کو رد کرتے ہوئے فرمایا:

''إن الله هو المسعِّر القابض الباسط الرازق'' (ابوداؤد باب في التسعير)۔

ابن ماجہ کی روایت ہے: ''عن أنس بن مالك غلا السعر فسعر لنا فقال إن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق إني لأرجو أن ألقى ربي وليس أحد يطلبني بمظلمة بمظلبة في دم ولا مال'' (ابن ماجه حديث: ۲۲۰۰)۔

اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نرخ طے نہ کیا جائے بلکہ متعاقدین کو آزادانہ طور پر معاملہ کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے؛ البتہ اگر اس آزادی سے لوگ غلط فائدہ اٹھائیں اور عام لوگوں کا استحصال کریں تو پھر حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ عوام الناس کو ضرر سے بچانے کی خاطر اشیاء کا بھاؤ مقرر کردے۔

علامہ ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں صراحت کی ہے:

''ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس إلا إذا تعلق دفع ضرر العامة'' (فتح القدير على الهدايه ۱۰/ ۵۹)۔

فقہی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفاد عامہ کے تحفظ کی خاطر حکومت اگر اشیاء کی قیمتیں مقرر کردے تو ہمیں ایک وفادار شہری کی حیثیت سے قبول کرنا چاہئے اور پابند عہد ہو کر اس پر عمل کرنا چاہئے اور گورنمنٹ کے مقرر کردہ نرخ پر خرید وفروخت کرنی چاہئے، اگر کوئی اس کی پرواہ کئے بغیر خرید وفروخت کرے تو اگر چہ یہ بیع شرعاً درست ہوگا، لیکن حکومت کے نرخ کی پرواہ نہ کرنے کی وجہ سے وعدہ خلافی ہوگی اور گناہ ہوگا۔

مذکورہ اصولی گفتگو کے پیش نظر سوال (ا) کی شق (ب) کے بارے میں ناچیز کی رائے یہ ہے کہ سونا یا چاندی کا نرخ حکومت یا سونے کے مارکٹ نے جو طے کیا ہے اس کے خلاف کم یا زیادہ میں خرید وفروخت کرنے سے شرعاً اگر چہ ربا تفاضل نہیں ہوگا، لیکن شہری اور ملکی قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے گناہ ہوگا۔

۴- (الف): کاریگر سونے کے زیورات سے بطور اجرت بچے ہوئے جو ذرات لیتے ہیں یہ اجارہ میں داخل ہے۔

اگر چہ کاریگران زیورات میں دوسرے دھات شامل کرتے ہیں، اس میں کاریگر کی حیثیت اجیر مشترک کی ہوتی ہے، جیسے درزی کپڑے سلنے میں دھاگے اور بٹن وغیرہ شامل کرتے ہیں۔

(ب) البتہ دیئے ہوئے سونے ہی میں سے سونے کے ذرات اجرت ہوتے ہیں، اس لئے علماء احناف کے بیان کردہ اصول وقواعد کے مطابق یہ اجرت درست نہیں ہوگی؛ بلکہ مثل اجرت واجب ہوگی۔

فقہاء نے قفیز طحان والی روایت سامنے رکھ کر اس طرح کی اجرت کو فاسد قرار دیا ہے امام بیہقی اور امام دارقطنی نے یہ روایت حضرت ابو سعید خدریؓ کے واسطہ سے نقل کی ہے:

''نهى رسول الله ﷺ عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان'' (نيل الاوطار ۵/ ۲۹۲)۔

بعض علماء نے قفیز طحان کی تشریح یہ کی ہے کہ غلہ کو پیسا جائے اور اس پسے ہوئے غلہ میں سے ایک مقدار اجرت دی جائے علامہ حصکفیؒ الدر المختار میں اس مسئلہ سے متعلق بعض جزئیات نقل فرماتے ہیں جن کو ہم نظیر بنا سکتے ہیں۔ (دیکھئے: الدر المختار علی رد المحتار ۹/ ۷۹، ۷۸)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس مسئلہ کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ اس صورت میں مثل اجرت واجب ہوگی جو مسمی سے تجاوز نہ کرے۔

''(فسدت في الكل) ويجب أجر المثل لايجاوز به المسمى۔ بجزء من عمله '' کی شرح میں لکھا ہے: ''ببعض مايخرج من عمله، والقدرة على التسليم شرط وهو لايقدر بنفسه''۔

اجارہ فاسد ہونے کی دو وجہیں بیان کی ہیں ایک یہ ہے کہ جس چیز پر عمل کیا ہے اسی کے بعض حصہ کو اجرت بنانا دوسری وجہ یہ ہے کہ معاملہ کرتے وقت مستاجر کا اجرت دینے اور حوالہ کرنے پر قدرت نہ ہونا حالانکہ صحت اجارہ کے لئے قدرت علی التسلیم واجب ہے۔

شیخ وہبہ الزحیلیؒ نے تقریباً یہی بات لکھی ہے، موصوف فرماتے ہیں:

''وقدروى أن رسول الله ﷺ نهى عن قفيز الطحان''وهو أن يعطى الرجل أقفزة معلومة يطحنها بقفيز دقيق منها وهذا هو رأى الشافعيه أيضا عملًا بالنهى في هذا الحديث، ''ولأن فيه نقضًا لشرط من شرائط الإجارة وهو القدرة على تسليم الأجر وقت التعاقد''(الفقه الاسلامى وأدلته٥/ ٣٨٢١)۔

فقہاء احناف کے یہاں ایک قاعدہ شرعی بھی ہے:

''تعيين الأجر ممايعمل فيه الأجير مفسد للعقد''۔

اس معاملہ میں مزید خرابی یہ ہے کہ سونے کے ذرات کتنے ہوں گے یا نہیں؟ یہ ایک مجہول اجرت ہے، معلوم نہیں ہے، حالانکہ اجارہ میں اجرت کا معلوم ہونا شرط ہے، اس مسئلہ میں مزید وضاحت شیخ وہبہ الزحیلیؒ کے یہاں ملتی ہے موصوف فرماتے ہیں:

''كون الأجرة جزءاً من المعقود عليه: قال الجمهور: تفسد الاجارة ولو استأجر السلاخ بالجلد، والطحان بالنخالة أو بصاع من الرقيق، لأنه لايعلم هل يخرج الجلد سليمًا أو لا؟ وهل هو ثخين أو رقيق؟ وما مقدار الطحين؟ فقد تكون الحبوب مسوسة، فلا تصح الاجارة لجهالة العوض''(الفقه الاسلامي وأدلته ٥/ ٣٨٢٢)۔

شیخ کی وضاحت سے معلوم ہوا کہ اجارہ فاسدہ کی وجہ عوض کا مجہول ہونا ہے اور زیورات بنانے میں سونے کے جو ذرات ہوں گے وہ بھی مجہول ہوں گے جو عقد کو فاسد کرنے والی چیز ہے۔

اس لئے ناچیز اسی نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ زیورات بنانے والے تاجر کو دئے ہوئے سونے چاندی کے ذرات سے اجرت دینا درست نہیں ہے۔

۴- (الف): خرید وفروخت میں قبضہ اصالۃً بھی درست ہے اور وکالۃً بھی۔

(ب): سوالنامہ میں جو صورت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سونا خرید وفروخت کرنے والے ادارہ کی حیثیت وکیل کی ہوتی ہے اور وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ مانا جائے گا، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

''لأن الوكيل يملك التصرف من جهة المؤكل فلا بد أن يكون المؤكل مالكًا يملكه من غيره''(ہدایہ٣/ --)

''كل عقد أن يعقده الانسان بنفسه جاز أن يؤكل به غيره، لأن الانسان قد يعجز عن المباشرة بنفسه على اعلى اعتبار بعض الأحوال فيحتاج الى أن يؤكل غيره فيكون بسبيل منه دفعا للحاجة وقد صح أن النبى صلى الله عليه وسلم وكل بالشراء حكيم بن حزام''(ہدایہ٣/ ٧٢)۔

فقہا نے اس کی صراحت کردی ہے کہ بسا اوقات بذریعہ وکالت خرید وفروخت کی ضرورت پڑ جاتی ہے خود نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت بھی ہے۔ موجودہ مشغول متحرک اور الیکٹرانک دنیا میں اسکی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے، اس لئے اس میں بذریعہ وکالت کاروبار میں کوئی حرج نہیں ہے، مضاربت اور مشارکت تو اسی باہمی تعاون پر مبنی ہے۔ اس بنیادی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اسکی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ سونے چاندی کی خرید فروخت جب کموڈیٹیز ایکسچینج کے ذریعہ ہو تو خریدار کبھی خریدار ہوتا ہے اور کبھی فروخت کنندہ اور دونوں صورتوں میں اسے ادارہ کو اپنا وکیل بنانا پڑتا ہے، اس لئے خرید کی شکل ہو یا فروخت کی ہر دو صورت میں وکالت درست ہے، چونکہ مبیع اینٹ کی شکل میں ہے اسلئے مختلف شرکاء کی شرکت مقصود ہوگی، اور اس شرکت میں موجودہ دور کے رواج کے مطابق کوئی نزاع نہیں ہوا کرتا ہے اس لئے یہ طریقہ خرید وفروخت سونے چاندی کی تجارت میں بھی درست ہے، ایک

فریق جب کاغذی نوٹ یا کرنسی سپرد کرتا ہے اور دوسرا سونا چاندی تو یہ بیع صرف کے دائرہ میں بھی نہیں ہے کہ تقابض فی المجلس شرط ہو بلکہ بیع کا ضمان میں آجانا کافی ہے، کیونکہ نقصان کے خطرہ کو قبول کرلینا ہی ضمان ہے، اکسچینج آفس میں جو اندراج ہوا کرتا ہے وہ عرف عام میں ضمان وقبضہ کے درجہ میں ہوا کرتا ہے لہٰذا تاجروں کے عرف میں چونکہ یہ ضمان ہے اور قبضہ بھی تو اسے قبضہ مانا جائے گا۔ اسکی نظیر فقہاء کے یہاں ملتی ہے ہدایہ میں ایک جزئیہ ہے:

''ومن اشتریٰ جارية ولم يقبضها حتى يزوجها فوطيها فالنكاح جائز'' (ہدایہ ۳/۸۶)۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں کہ قبضہ کے لئے کسی چیز کو ہاتھ میں لینا شرط نہیں بلکہ قبضہ کے معنی قدرت دینا اور عرف وعادت کے اعتبار سے ایسے موانع کو ہٹا دینا ہے جو اسکے استعمال میں حارج ہوسکتا ہے:

''هو التمكن بالتخلي وارتفاع الموانع عرفًا وعادةً وحقيقةً'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۴)۔

موجودہ دور کے عرف میں جب کمپیوٹر یا رجسٹر میں اندراج معاملہ کی تکمیل کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے اور عملاً ایسا ہو رہا ہے اس لئے شرعاً یہ اندراج قبضہ مانا جائے گا۔

اس مسئلہ میں امام احمد اور امام اسحاقؒ کے مسلک کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک بیع قبل القبض کی نہی والی روایت کا تعلق صرف طعام سے ہے جیسا کہ اس روایت میں صراحت ہے:

''نهى رسول الله ﷺ عن بيع الطعام حتى يستوفيه'' (صحيح البخاري باب بيع الطعام قبل أن يقبض)۔

۵ - احناف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ثمن عرفی میں تقابض فی المجلس شرط نہیں ہے لیکن عوضین میں سے ایک پر مجلس میں قبضہ ضروری ہے یعنی ایک فریق مجلس کے اندر قبضہ ضرور کرلے خواہ دوسرا فریق نہ کرے اس لئے اگر ایک فریق بھی مجلس میں احد العوضین پر قبضہ نہ کرے تو اس صورت میں دونوں طرف سے بدلیں متعین نہ ہوئے اور جب متعین نہ ہوئے تو ایک دوسرے کے ذمہ دین ہوگئے تو یہ بیع الدین بالدین ہوگئی جس کو بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں، جسکی حدیث میں ممانعت آئی ہے، اس لئے سوال میں بذریعہ ایکسچینج سونے چاندی کے کاروبار کی جو ادھار صورت بیان کی گئی ہے وہ بیع الکالی بالکالی کے زمرہ میں آتی ہے جو جائز نہیں ہے۔ اس صورت میں جس دن روپے خریدار کی طرف سے دیئے جائیں اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا اور اسی دن کا معاملہ متصور ہوگا، پچھلے دن کے معاملہ کا شرعاً اعتبار نہ ہوگا۔

۶ - اس سوال کے جواب سے قبل یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ احتکار کا اطلاق کن اشیاء پر ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احتکار کا تعلق اشیاء خوردنی سے ہے اور یہ اس وقت ممنوع جبکہ ان اشیاء کی قلت ہو اور احتکار کی وجہ سے عوام الناس کو ضرر لاحق ہو رہا ہو، علامہ ابن ہمامؒ اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تخصيص الاحتكار بالأقوات كالحنطة والشعير والتين والقت على قول أبي حنيفة'' (فتح القدير ۱۰/ ۶۹)۔

''ويكره الاحتكار في أقوات الآدميين والبهائم ثم اذا كان في بلد يضر الاحتكام بأهله وكذلك التلقي فاما اذا كان لايضر فلا بأس'' (فتح القدير ۱۰/۶۹)۔

معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک احتکار کا تعلق اشیاء خوردنی سے ہے اور اس میں انسان اور جانور دونوں کی خوراک شامل ہیں، لیکن یہ ممنوع اس صورت میں ہے جبکہ احتکار سے ضرر عام ہو۔ اگر ضرر نہ ہو تو احتکار ممنوع نہیں۔

امام ابویوسفؒ احتکار کو صرف اشیاء خوردنی کے ساتھ خاص نہیں کرتے بلکہ ہر اس چیز کی ذخیرہ اندوزی کو احتکار میں شامل کرتے ہیں جس سے عام لوگوں کو ضرر لاحق ہو رہا ہو، علامہ ابن ہمامؒ امام ابویوسفؒ کے نقطہ نظر کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''وقال أبو يوسف: كل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتكار وان كان ذهبًا أو فضة أو ثوبًا'' (فتح القدير ۱۰/ ۶۹)۔

امام محمدؒ احتکار سے کپڑے کو خارج کرتے ہیں، ان کے نزدیک کپڑوں کا اسٹاک ممنوع نہیں ہے۔

''وعن محمد رحمه الله أنه قال: لا احتكار في الثياب'' (فتح القدير ۱۰/ ۶۹)۔

غرض کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مخصوص قسم کا ضرر احتکار کے دائرہ میں آئے گا، یہاں تک کہ مختصر مدت کی ذخیرہ اندوزی ہو تو یہ بھی ممنوع احتکار میں نہیں ہے:

''اعتبر أبو حنيفة الضرر المعهود المتعارف ثم المدة إذا قصرت لايكون احتكارًا لعدم الضرر''(فتح القدير ۱۰/ ۶۹)، امام ابویوسفؒ کے نزدیک ممانعت میں نفس ضرر موثر ہے۔

''فأبو يوسف رحمه الله اعتبر حقيقة الضرر اذ هو المؤثر في الكراهية''(حواله سابق)

فقہاء کی مذکورہ تصریحات کی روشنی میں ناچیز کا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ آج کل کی دنیا میں اشیاء خوردنی کے علاوہ بہت سی چیزیں ناگزیر ضرورتوں میں شامل ہوگئی ہیں، اور سونے کی قیمت کے اتار چڑھاؤ کا اثر بہت سی بنیادی چیزوں پر پڑتا ہے، اسلئے ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے احتکار سے متعلق روایات واحادیث نبوی پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ منع احتکار کا مقصود عام لوگوں کو ضرر سے بچانا ہے، اور ضرر کے جملہ اقسام جو عوام سے متعلق ہوں سب شامل ہیں، لہذا فی زمانہ امام ابویوسفؒ کا قول اختیار کرنا مقاصد شرع اور مصالح ناس سے زیادہ قریب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سونے کو روک رکھنے کی وجہ سے جب مہنگائی بڑھ جائے تو اسے احتکار کے زمرہ شامل سمجھا جائے گا اور ضرر عام کی وجہ سے ممنوع قرار پائے گا۔

۷- اسلامی شرع کے نقطہ نظر سے اگرچہ اشیاء کی آمدات پر پابندی نہیں ہے اور نہ ان پر کوئی واجبات اور ٹیکس ہیں۔

''كل يتصرف في ملكه كيف شاء''(شرح المجلة للأتاسي ۲/ ۱۳۲). ''لا يمنع أحد من التصرف في ملكه أبدًا الا اذا كان ضرر لغيره''(شرح المجلہ ۲/ ۱۴۰)، البتہ ہم جس ملک میں ہیں وہاں کے قوانین کی پاسداری ہمارا ایک ملکی فریضہ ہے جسے ادا کرنا چاہئے'' كل من يسكن دولة فإنه يلتزم قولًا أو عملًا بانه يتبع قوانينه. وحينئذٍ يجب عليه اتباع أحكامها'' (بحوث فقہیا معاصرہ / ص۱۶۶)۔

اس کے پیش نظر اسمگلنگ کا عمل درست نہیں ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ غیر قانونی عمل ہونے کی وجہ سے اس پر سزا ہوسکتی ہے جو ہتک عزت ہے، اور ہتک عزت سے بچنا بھی ضروری ہے، اس لئے ملکی قانون کی رعایت اور اپنے کو ہتک عزت سے بچانے کے پیش نظر اسمگلنگ کا عمل درست نہیں ہے اور اس عمل سے برآمدات سونے کی اگر اطلاع ہو تو علم کے باوجود اسکی خرید وفروخت کراہت سے خالی نہیں، البتہ اگر علم ہی نہ ہو تو کراہت کی کوئی وجہ نہیں۔

۸- پلاٹینیم سے متعلق جو تحقیق آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینی دھاتوں میں سے ہے، سونا چاندی بھی دھاتوں کی مرغوب قسموں میں ہیں، تاریخ کے ہر دور میں سونا چاندی ان دونوں دھاتوں کو ثمن خلقی کے طور پر شمار کیا گیا ہے، احادیث نبویہ میں ان دونوں پر زکوۃ کی صراحت موجود ہے اور ان کا علحدہ علحدہ نصاب بھی مقرر ہے جو منصوص ہے؛ لیکن جواہرات، یاقوت اور موتیاں اگرچہ کافی قیمتی اشیاء ہیں لیکن ان پر زکوۃ نہیں ہے جیسا کہ روایتوں میں صراحت ہے:

''عن سعيد بن جبير رضى الله عنه قال: ليس في حجر زكوة إلا ماكان لتجارة من جو هرولا يا قوت ولا لؤلؤ ولا غيره الا الذهب والفضة''(السنن الكبرى للبيهقي ۴/ ۲۴۶)۔

''عن الحكم عن عليرضي الله تعالى عنه قال: ليس في جو هر زكوة''۔

''عن عكرمة قال: ليس في حجراللولؤ ولا حجرالزمرد زكوة الا أن يكون لتجارة فان كان لتجارة ففيهازكوة''(تاتارخانيه ۲/ ۱۷۳)۔

اس قسم کی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء نے سونے اور چاندی کے علاوہ دھاتوں پر زکوۃ کو واجب نہیں قرار دیا ہے، البتہ اگر یہ چیزیں برائے تجارت ہوں تو اموال تجارت میں شامل ہوجائیں گی اور ان پر زکوۃ واجب ہوگی۔

صاحب الدر المختار صراحت کرتے ہیں:

''لا زكوة في اللئالى والجواهر إلا أن يكون للتجارة''(الدر المختار على رد المحتار ۲/ ۱۹۴)۔

''فتاوی ہندیہ'' میں زمین سے نکلنے والے رقیق وغیر رقیق دھاتوں اور اشیاء کے بارے میں صراحت ہے کہ زکوۃ نہیں ہے:

''أما المائع کالقیر والنفط والملح وما لیس بمنطبع ولا مائع کالنورۃ والجص والجواهر والیواقیت فلا شئ فیها الخ (فتاوی ہندیہ ۱/ ۱۸۰)۔

اس سلسلہ میں غور کیا جائے کہ کن اموال میں زکوۃ ہے؟ تو بنیادی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ تین قسم کے اموال ہیں جن پر زکوۃ واجب ہوتی ہے:

(۱) اثمان مطلقہ: سونا چاندی۔

(۲) اموال تجارت: وہ سامان جو بغرض تجارت حاصل ہوں۔

(۳) اموال ظاہرہ: وہ جانور جو سائمہ ہوں اور سال کے زیادہ تر حصہ میں سرکاری چراہگاہ میں چرتے ہوں۔

صاحب بدائع الصنائع لکھتے ہیں:

''أموال الزکاۃ أنواع ثلاثة:

أحدها: الأثمان المطلقة وهي الذهب والفضة

والثاني: أموال التجارة: وهی العروض المعدة للتجارة

والثالث: السوائم''

ان بنیادی احکام پر غور کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ پلاٹینیم اگر چہ ایک قیمتی دھات ہے لیکن اگر بغرض تجارت حاصل نہ ہو بلکہ استعمال کے لئے ہو تو اس کا شمار سونے چاندی میں نہیں ہوگا اور نہ اس پر زکوۃ واجب ہوگی، مولانا تقی عثمانی صاحب کی تحریر میں مجھے یہ صراحت ملی کہ اس پر زکوۃ نہیں انہی کی عبارت پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں:

''اگر سونے چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کا زیور ہے چاہے پلاٹینیم ہی کیوں نہ ہو اس پر زکوۃ واجب نہیں'' (فقہی مقالات ۳/ ۱۴۹ از مولانا محمد تقی عثمانی)۔

خلاصہ یہ کہ پلاٹینیم اگر چہ مثل سونا ایک قیمتی دھات ہے لیکن اگر وہ بغرض استعمال ہو برائے تجارت نہ ہو تو اس میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

☆☆☆

سونے چاندی کی تجارت سے متعلق چند مسائل

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی ؒ

۱- اگر سونے کی خریداری روپے سے کی جائے تو اس میں روپیہ کی حیثیت ثمن اعتباری، اصطلاحی، قانونی، غیر خلقی، غیر حقیقی، غیر صریحی کی ہوگی اور اس بیع کو "بیع صرف" تصور کیا جائے گا، کیونکہ عقد کی دونوں جانب "ثمن" ہونا ثمن خلقی، صریحی وغیرہ، اور ثمن اصطلاحی، غیر صریحی وغیرہ دونوں حالتوں میں موجود ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ نے "بیع صرف" کی تعریف میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے:

"أی بیع ما من جنس الأثمان بعضها ببعض۔ وإنما فسرناه به ولم نبقه علی ظاهره لیدخل فیه بیع المصوغ بالمصوغ أو بالنقد۔ فإن المصوغ بسبب ما اتصل به من الصنعة لم یبق ثمنا صریحا ولهذا یتعین فی العقد ومع ذالک بیعه صرف" (البحر الرائق ۶/ ۳۲۱، زکریا دیوبند)۔

جو چیز بھی ثمن کی جنس سے ہو اس کو دوسرے ثمن سے بیچنا "بیع صرف" ہے، اور ہم نے اس کی تعریف ظاہر عبارت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس لئے کی ہے، تاکہ اس میں زیور کی بیع زیور کے ساتھ یا سونے چاندی کے ساتھ تعریف میں داخل رہے، بایں وجہ کہ زیور میں کاریگر کی کاریگری شامل ہونے کے سبب زیور ثمنِ صریح نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ وہ عقد میں متعین کر دینے سے متعین ہو جاتا ہے، اس کے باوجود یہ خرید وفروخت "بیع صرف" ہے۔

الف- خریداری میں سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا اُدھار ہو تو یہ شرعاً درست ہے، اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی میں جن چھ اشیاء کی خرید وفروخت میں حرمتِ ربا کا ذکر ہے ان میں جواز بیع کے لئے تماثل اور تقابض اتحادِ جنس کے ساتھ شرط ہے، الفاظِ حدیث یہ ہیں:

"عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح۔ مثلا بمثل سواء بسواء یدا بید فإذا اختلف هذه الأصناف فبیعوا کیف شئتم إذا کان یدا بید" (صحیح مسلم ۲/ ۲۵، اصح المطابع دہلی، ورواه البخاری باب ۸/ ۸۱/ ۸۳/ وابوداؤد کتاب البیوع باب ۱۲/ ۱۸/ والترمذی کتاب البیوع باب ۴۲/ ۴۴/ ۴۹/ واحمد فی مسنده ۱/ ۲۰۱، ۳۰۰)۔

سونے کے بدلے سونا، چاندی کے بدلے چاندی، گیہوں کے بدلے گیہوں، جو کے بدلے جو، کھجور کے بدلے کھجور، نمک کے بدلے نمک، بالکل ہم وزن، برابر سرابر، ہاتھوں ہاتھ (نقد) خرید وفروخت کر سکتے ہو۔ اگر ان سب قسموں کا آپس میں اختلاف ہو تو پھر جس طرح چاہو (کمی بیشی کے ساتھ بھی) خرید وفروخت کر سکتے ہو بشرطیکہ نقد معاملہ ہو، ادھار نہ ہو۔

صراحتِ حدیث کے مطابق اختلافِ جنس کی صورت میں ادھار خرید وفروخت کی ممانعت صرف انھیں چھ چیزوں کے ساتھ منصوص ہے، ان کے علاوہ اشیاء میں یہ حکم نہیں ہوگا، بالفاظ دیگر ثمن خلقی اور ثمن اصطلاحی کے درمیان کچھ احکام میں یکسانیت اور کچھ میں فرق ملحوظ ہوگا، مثال کے طور پر نقدین سونا چاندی میں صفتِ وزن بحکم شریعت میں منصوص ہے، اس میں کسی صنعت اور کاریگری سے اس کی موزونی صفت کو بدل کر عددی نہیں بنایا جا سکتا عرف نے اس کو عددی بنا دیا ہو تب بھی یہ بحکم نص شریعت موزون ہی رہیں گے، ان کی خرید وفروخت اتحادِ جنس کی صورت میں مساواتِ

ؒ

وزن کے ساتھ ہی درست ہوگی اور اختلاف جنس کی صورت میں تقابض اور نقد خرید وفروخت جائز ہوگی اُدھار جائز نہیں ہوگی۔

لیکن ان اشیاء کے علاوہ چیزوں میں مذکورہ حکم نہیں ہوگا۔ روپئے یا نوٹ کرنسی قدیم فقہاء کے دور میں جاری نہیں ہوئے تھے ان کے زمانہ میں فلوسِ نافقہ، یعنی ڈھلے ہوئے سکوں کا چلن تھا، اس لئے فقہی احکام کا تعلق انھیں سے وابستہ تھا، موجودہ زمانہ میں کرنسی نوٹ کو فلوس نافقہ کی نظیر مانا جاتا ہے، اور انھیں پر قیاس کرتے ہوئے کاغذی نوٹوں کے حکم میں فرق رکھا گیا ہے، علامہ ابن نجیم تحریر فرماتے ہیں:

اثمان خلقیہ (مثلاً سونا، چاندی) میں صفقہ کے ساقط (غیر معتبر) ہونے کی قید ملحوظ ہے، اسی واسطے اگر کوئی شخص پیتل کے برتن کو دوسرے پیتل کے برتن سے خرید وفروخت کرے جس میں سے ایک دوسرے سے بھاری ہو تو ان کی خرید وفروخت کی بیشی کے ساتھ وزن اور تول کے ذریعہ درست ہوگی، باوجویکہ پیتل وغیرہ دھات موزون اور اموال ربویہ (سودی مالی جنس) بھی ہے، پھر بھی جواز کی وجہ یہ ہے کہ سونا چاندی میں صفقہ وزن کا اعتبار شریعت میں منصوص ہے؛ لہٰذا کسی صنعت اور کاریگری کا ان سے اتصال اس کے حکم میں تغیر پیدا نہیں کرسکتا اور نہ عرف عام میں ان کے عددی قرار دیے جانے کے باوجود اس کی موزونیت ختم ہوگی، لیکن سونے چاندی کے علاوہ چیزوں میں اگر ڈھلائی اور کاریگری کی صنعت شامل ہوجائے اور عرف عام میں انھیں عددی قرار دے دیا گیا ہو تو اس کی موزونیت ختم ہوجائے گی (البحر الرائق ۶/ ۲۲۳، زکریا دیوبند)، اور کمی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت جائز ہوگی، بلکہ زیادہ درست بات یہ ہے کہ وزن کا اعتبار ہی ساقط ہوجائے گا۔

علامہ شامی نے اس پر اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ:

''فالصواب اسقاط قوله ''وزنًا'' والاقتصار علی قوله ''فإنه یجوز'' (منحة الخالق علی البحر الرائق ۶/ ۲۲۳)۔

(درست بات یہی ہے کہ سونے چاندی کے علاوہ اشیاء میں وزن کا قول ساقط ہی کیا جائے گا اور صرف کمی بیشی کے جائز ہونے کے قول پر حکم کا دارومدار رکھا جائے گا)۔

یہیں سے یہ حکم بھی مستنبط ہوتا ہے کہ چونکہ شریعت نے ادھار خرید وفروخت کے عدم جواز کو صرف اشیاء ستہ میں منحصر رکھا ہے، اور روپیہ یا کرنسی نوٹ ان کے علاوہ ثمن ہے وہ ثمنِ خلقی کے قائم مقام بھی نہیں ہے اور ان کی مالیت کا تقابل سونے سے پوری دنیا کے عرف عام میں بھی نہیں پایا جاتا، اسی طرح کرنسی نوٹ سونے کا وثیقہ یا رسید اور علامتی ثمن بھی نہیں ہے، بلکہ تمام تر علیحدہ حیثیت کا حامل مستقل ثمن ہے جس کو زرِ قانونی اور فلوس نافقہ اور دھات کے سکے کے درجہ میں رکھا گیا ہے، لہٰذا سونے یا چاندی کی روپئے سے خریداری نسیئۃً یعنی ادھار بھی جائز ہے اور اس اعتبار سے یہ ''بیع سلم'' سے قریب تر حکم ہے۔

ب— اس کا جواب یہ ہے کہ سونے اور چاندی کا نرخ بین الاقوامی سطح پر گولڈ مارکیٹ یا ہندوستان لیبل پر MC مارکیٹ طے کرتی ہے یہ کوئی چھپا ہوا سودا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اظہار واعلان انٹرنیشنل مارکیٹ اور انڈیا مارکیٹ تمام ذرائع ابلاغ پر کرتی رہتی ہے اور سونے چاندی کے جلد جلد اترتے چڑھتے ریٹ کا علم بھی ٹی وی اور اخبار کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے تاہم گورنمنٹ سے اس کی تھوک خریداری براہ راست نہیں ہوتی بلکہ دلال کے ذریعہ ہوتی ہے اور اس کی اجرت بھی خریدار کو ادا کرنی پڑتی ہے اور اس خریداری پر گورنمنٹ کو ۱۲ فیصد ٹیکس بھی بھرنا پڑتا ہے، پھر اس سونے کو گلا گلا کر صاف کرنا ہوتا ہے جس کی مزدوری خریدار ہی دیتا ہے، اس طرح انٹرنیشنل یا MC مارکیٹ کے مقرر کردہ نرخ سے زائد مصارف خریدار کو اٹھانے پڑتے ہیں، ایسی صورت میں وہ مقررہ نرخ پر مال فروخت کرے گا تو اسے اس کاروبار سے کیا حاصل ہوگا، کاروبار تو حصول نفع کے لئے ہی ہوا کرتا ہے، لہٰذا مارکیٹ کے طے کردہ ریٹ سے زیادہ یا کم میں بیچنا اس کا کاروباری حق ہے، اس پر ربا اور سود کا اطلاق نہیں ہوگا، پھر یہ خریداری چونکہ کرنسی سے ہو رہی ہے، لہٰذا ایک ہی جنس کے ثمن پر تفاضل بھی نہیں پایا گیا۔ اور چونکہ گورنمنٹ سے خریدار تک کے درمیان کے معاملات بالکل کھلے ہوتے ہیں، لہٰذا گورنمنٹ سے کوئی چوری بھی نہیں ہوتی، خریدار اپنی لاگت کے تناسب سے کم وبیش نفع حاصل کرنے کا حق دار ہوتا ہی ہے اور اس میں نہ غبن ہے نہ نجش یعنی کوئی شرعی قباحت ہے نہ دھوکا دھڑی۔

۲- (الف) شریعتِ اسلامیہ میں ''بیع'' کی تعریف عند الاحناف:

''مبادلة المال بالمال بالتراضی'' (کنز الدقائق/ ص۲۲۷، دیوبند. کشاف اصطلاح الفنون ۱/ ۱۳۷)۔

عندالشوافع: ''مقابلة مال بمال تمليكًا'' (الامام النووی، مغنی المحتاج ۲/ ۲)۔

عندالحنابلہ: ''مبادلة المال بالمال تمليكًا'' (ابن قدامه، المغنی ۴/ ۲، کتاب البیوع)۔

عندالمالکیة: ''عقدمعاوضه على غيرمنافع ومتعة لذةٍ'' (الموسوعة الفقهيه الكويتيه ۹/ ۵، بحواله الحطاب ۴/ ۲۵۵)۔

قلیوبیؒ نے سب سے زیادہ جامع مانع تعریف کی ہے:

''عقدمعاوضةٍ ماليةٍ تفيدملك عينٍ أومنفعةٍ على التابيدلاعلى وجه القربة ثم قال۔ وخرج بالمعاوضةٍ نحوالهدية۔ وبالمالية نحوالنكاح وبإفادة ملك العين أو المنفعة الإجارة وبالتابيد الإجاره أيضًاوبغيروجه القربة القرض'' (الموسوعة الفقهيه ۹/ ۵)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کے نزدیک ''بیع'' بائع اور مشتری دونوں کی جانب سے آپس میں مالکانہ مالی تبادلہ ومعاوضہ ہوتا ہے کسی ایک جانب سے مال اور دوسری جانب سے منفعت کا تبادلہ نہیں ہوتا جیسا کہ عقدِ اجارہ میں ہوتا ہے، امام قدوری نے اجارہ کی تعریف کی ہے:

''الإجارة عقدعلى المنافع بعوض'' (المختصرالقدوری ص۱۰۰/ یاسرندیم کمپنی دیوبند)۔

اجارہ نفع کے تبادلے پر معاملہ کرنے کا نام ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ سوال میں مذکورہ صورتِ مسئلہ بیع نہیں خالص عقدِ اجارہ ہے؛ کیونکہ اس میں ایک طرف مال اور دوسری طرف محنت اور صناعت ہے جس پر حصول منفعت مقصود ہے اور اسی کا نام اصطلاح فقہاء میں اجارہ ہے۔

۲- زیورات کے بنانے میں صراف کاریگر کو جو متعین مقدار میں سونا دیتا ہے، اس میں دھات کی آمیزش کی مقدار بھی متعین ہوتی ہے، اور یہ دھات مثلاً پیتل کاریگر خود اپنی طرف سے ملاتا ہے اور سونے کو پگھلانے اور اس کی صفائی کرنے کے عمل میں کس مقدار میں سونا جھڑتا ہے وہ بھی کاریگر اور صراف کو معلوم ہوتا ہے، مثال کے طور پر صراف ۱۰۰ گرام سونے کا زیور بنوانا چاہتا ہے اور ۸۵ گرام پکا سونا کاریگر کے حوالے کرتا ہے، اس میں آپس میں طے ہوتا ہے کہ ۵ فیصد کاریگر کی مزدوری اور ۱۰ فیصد صراف کے لیبر اور دکان کی کرایہ داری اور دکان سے متعلق اخراجات کے ہوں گے۔ اس طرح ۸۵ فیصد سونے کا زیور جب کاریگر مالک کو تیار کر کے دیتا ہے تو صراف یہ سارے خرچ سونے میں جوڑ کر ۱۰۰ گرام سونے کی قیمت زیور خریدنے والے سے وصول کرتا ہے، یہ بات صراف بکری کے پرچے پر بھی لکھ کر دیتا ہے، اور زیور میں اصل سونا ۸۵ گرام ہونے کی گارنٹی گورنمنٹ کی مہر سے دی جاتی ہے جسے مشین سے چیک کر کے گاہک اطمینان حاصل کر سکتا ہے، اس سونے کے جو ۵ فیصد ذرات مزدور کے حصے میں آتے ہیں وہ سونے کے مالک صراف کی طرف سے کاریگر کی طے شدہ مزدوری ہوتی ہے جو فی گرام کی معمولی مقدار تک بھی مجہول نہیں ہوتی؛ بلکہ مشین کے ذریعہ معلوم المقدار ہوتی اور متعین ہوتی ہے۔

زیورسازی کی اجرت شرعی نقطۂ نظر سے:

اس مسئلہ کے حل کے لئے چند فقہی جزئیات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو زیورسازی کی اجرت کی نظیر بن سکتے ہیں جنہیں فقہاء نے ذکر کیا ہے۔ شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن مرغینانی متوفی ۵۹۳ھ اور امام الفقہ علامہ زین الدین ابن نجیم مصری متوفی ۹۷۰ھ لکھتے ہیں:

''ومن دفع إلى حائك غزلا ينسجه بالنصف فله أجرمثله۔ وكذا إذا استاجرحمارًا يحمل عليه طعامًا بقفيز منه فالإجارة فاسدة۔ لأنه جعل الأجربعض مايخرج من عمله فيصيرفي معنى قفيزالطحان وقد نهى النبي عليه السلام عنه۔ وهو أن يستاجر ثورًا ليطحن له حنطة بقفيز من دقيقه۔ وهذا أصل كبيريعرف به فساد كثير من الإجارات لاسيمافي ديارنا. والمعنى فيه أن المستاجرعاجزعن تسليم الآجروهوبعض المنسوج أو المحمول وحصوله بفعل الأجير لايعد هو قادرًابقدرة غيره'' (ہدایہ ۳/ ۲۸۹، اشرفیہ دیوبند، البحر الرائق ۸/ ۳۱، زکریا دیوبند)۔

(اگر کوئی شخص کسی بنکر کو دھاگہ دے کر کہے کہ تم اس سے کپڑا بن کر کپڑے کی نصف مزدوری پر مجھے دیدو تو اس کو بُنائی کی مروّج مزدوری

دی جائے گی، اسی طرح اگر کسی گدھے والے کو کھانے والی چیز لادنے کی اجرت اسی خوراکی سامان میں سے ایک خاص پیمانے سے ادا کرنے کے معاملہ پر دے تو اجارہ فاسد ہے، اس اجرت کے فاسد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس نے ایسی چیز کو اجرت قرار دیا ہے جو خود اجیر کے عمل کے ذریعہ بعد میں وجود میں آنے والی ہے، یعنی یہ مزدوری خود اجیر کے عمل کا ایک جزء اور حصہ ہے، اس طرح یہ اجرت قفیز طحان کے ہم معنی معاملہ ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے)۔

''عن أبي سعيد قال نهى عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان'' (الدراية في تخريج احاديث الهدايه ۳/ ۲۸۹)۔

قفیز طحان کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص بیل کرائے پر لے، تاکہ وہ اس کے گیہوں کا آٹا بنا کر اسی گیہوں کے آٹے کے ایک پیمانے کی مزدوری پر پیس کراسے دیدے، یہ بہت بڑی اصل ہے جس سے فساد اجارہ کی بہت ساری صورتوں کا حکم معلوم ہوجاتا ہے جو ہمارے علاقے میں رائج ہے۔

یہاں اجارہ کے فاسد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اجرت پر کام کرانے والا شخص اجرت کو اجیر کے حوالے کرنے سے عاجز ہے کیونکہ اجرت مذکورہ دونوں مسئلوں میں بنے ہوئے کپڑے اور خوراکی سامان جس کو اٹھانے پر اجرت طے ہوئی ہے، اجرت خود اسی سامان کا کچھ حصہ ہے، اور اس اجرت کا حصول اجیر کے عمل اور فعل پر موقوف ہے جس کو اجیر کے حوالے کرنے پر مستاجر کو کوئی کنٹرول حاصل نہیں ہے، کیونکہ کسی دوسرے کے فعل سے حاصل ہونے والی چیز پر اس کو قادر نہیں کہا جاسکتا (یعنی اجرت تو ایسی چیز ہونی چاہئے جس کو مستاجر جب چاہے اجیر کے حوالے کر سکے اور یہاں ایسا نہیں ہے)۔

عدم جواز کی بنیاد:

یہاں مسئلے کی دونوں صورتوں میں فساد اجارہ یا عقد اجارہ کے عدم جواز کی دو بنیادیں بتائی گئیں ہیں:

(۱) حدیث قفیز طحان۔ (۲) اجرت کی سپردگی پر عدم قدرت۔

اسی مسئلہ کی ایک اور نظیر صاحب ہدایہ ہی کے ہم عصر، ہم عمر بلکہ ہم وطن فقیہ امام فخر الدین حسن بن منصور اوز جندی فرغانی متوفی ۵۹۲ھ جو قاضی خاں کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، لکھتے ہیں:

''ایک شخص نے کسی آدمی کو مزدوری پر لیا، تاکہ وہ اس شخص کے لئے بانسوں کے جھنڈ میں سے بانس کاٹ دے اس شرط پر کہ وہ مزدوری میں پانچ کھوکھلے بانس دے گا، تو یہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ اگر وہ شخص کسی آٹا پیسنے والے کو مزدوری پر لے تاکہ وہ اس کے لئے گیہوں پیس دے اور اسی گیہوں کے آٹے سے ایک پیمانہ مزدوری میں اس کو دے گا تو یہ بھی جائز نہیں۔

اور اگر بانسوں میں سے پانچ کھوکھلے بانس متعین کر کے کہیں کہ ان پانچ بانسوں کی اجرت پر تجھے مقرر کرتا ہوں؛ تاکہ تو بانس کے اس جھنڈ کو کاٹ دے، تو یہ جائز ہے، لیکن اگر اسی صورت مسئلہ میں کہے کہ تجھے بانسوں کے اس جھنڈ کو کاٹنے کے لئے پانچ کھوکھلے بانسوں کی اجرت پر مقرر کرتا ہوں تو یہ اجارہ جائز نہیں ہوگا، ان کھوکھلے بانسوں کے غیر معلوم اور مجہول ہونے کی وجہ سے۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے آٹا پیسنے والے کو گیہوں پیسنے کے لئے مطلقاً ایک پیمانہ آٹا کی اجرت پر مقرر کیا، اور یہ نہیں کہا کہ اسی گیہوں کے آٹے کا ایک پیمانہ، تو یہ اجرت جائز ہے؛ کیونکہ مستاجر نے اسی گیہوں کے آٹے سے ایک پیمانہ کی اجرت پر اجیر نہیں رکھا اور یہاں یہ ایک پیمانہ کسی بھی آٹے کا معلوم ہے مجہول نہیں ہے، برخلاف مذکورہ غیر متعین مجہول کھوکھلے پانچ بانسوں کے'' (فتاوی قاضی خاں ۳/ ۲۲، مصطفائی دہلی ۱۳۱۰ھ)۔

ہم قاضی خاں صاحبؒ کے نقل کردہ جزئیہ سے اس مسئلہ میں اجرت کے عدم جواز کی تیسری بنیاد کو واضح کرنا چاہتے ہیں جس کا ماحصل تقریباً وہی ہے جس کو امام طحاویؒ نے قفیز طحان والی حدیث سے استنباط کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مستاجر نے آٹا کو اجرت قرار دیا ہے جو فی الحال اس کے پاس موجود نہیں ہے بلکہ اس گیہوں کو پیسنے کے بعد ہی اس کا وجود ہو سکے گا، لہٰذا یہ اجرت ایک غیر موجود اور معدوم و مجہول چیز ہے جس پر مستاجر کو سپردگی کی قدرت حاصل نہیں ہے، اس لئے یہ عقد اجارہ ناجائز ہے (مشکل الآثار لامام الطحاوی ۱/ ۳۰۷)۔

زیر بحث مسئلہ میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ تینوں بنیادیں بالآخر ایک ہی بنیاد میں سمٹ جاتی ہیں، اور وہ ہے اجرت کا بوقت اجارہ غیر موجود، غیر متعین اور غیر معلوم ہونا، جس کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے ''مجہول'' ہونا، حدیث قفیز طحان کے متکلم فیہ، مختلف فیہ اور صحت

دستقم سے قطع نظر (جس کی تفصیل مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے اپنی کتاب ''جدید فقہی مسائل'' کی جلد چہارم میں ''قفیز طحان والی روایت اور اس سے مستنبط احکام'' کے عنوان سے پورے سولہ صفحات میں ذکر کی ہے) اس میں ممانعتِ اجارہ کی جو علت بتائی گئی وہ بھی ''جہالت اجرت'' ہے اور صاحب ہدایہ اور صاحب البحرالرائق نے جو ''جعل الأجرة بعض مایخرج من عمله'' کو عدم جواز کی وجہ قرار دیا ہے جس کا نتیجہ اجرت کی سپردگی پر قادر نہ ہونا ہے تو اس کا ماحصل بھی یہی ''جہالت اجرت'' ہی ہے، اس طرح حکم ممانعت کا دارومدار صرف جہالت اجرت قرار پاتا ہے جس کو قاضی خانؒ نے کئی جزئیات کے حوالے سے بیان کیا ہے اور اسی بنیاد پر ائمہ ثلاثہ نے عدمِ جواز کا حکم لگایا ہے، صحیح بخاری کے حاشیہ میں لکھا ہے:

''قال ابن بطال منع ذالك مالك وأبوحنيفه والشافعي لأنها عندهم إجارة بثمن مجهول لايعرف''۔
(حاشیہ صحیح بخاری ۱/ ۲۱۳، نعیمیہ دیوبند)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ وتابعینؒ کا تعامل:

لیکن غور کیا جائے تو ''قفیز طحان'' والی حدیث کے برخلاف دوسری صحیح حدیث موجود ہے جس میں مذکورہ بالا ''جہالت اجرت'' کی صورتِ حال موجود ہونے کے باوجود خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ سے جوازِ اجارہ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، امام بخاری نے ''باب معاملة النبی صلی اللہ علیہ وسلم اہل خیبر'' کے تحت حدیث نقل کی ہے:

''عن عبدالله قال أعطى النبي ﷺ خيبر اليهود أن يعملوها ويزرعوها ولهم شطر ما يخرج منها''
(صحیح بخاری ۲/ ۶۱۰، مکتبہ نعیمیہ دیوبند)۔

(جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر یہود سے اس شرط پر معاملہ کیا کہ وہ خیبر کی زمین کے درختوں کی آبیاری کریں، اس میں کاشت کریں اور اس سے جو پیداوار حاصل ہو اس میں سے نصف ان کا ہوگا)۔

صحیح بخاری میں دوسری جگہ امام بخاری نے ایک مفصل باب قائم کیا ہے:

''نصف یا کم وبیش کی شرط پر کھیتی کرنے کا بیان، اور قیس بن مسلم نے ابوجعفر سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: مدینہ میں مہاجرین صحابہ کا کوئی ایسا گھرانہ نہیں تھا جو تہائی یا چوتھائی پیداوار پر بٹائی نہ کرتے ہوں، اور علی وسعد بن مالک وعبداللہ بن مسعود وعمر بن عبدالعزیز وقاسم وعروہ اور ابوبکر اور عمر اور علی کے خاندان والے اور ابن سیرین سب بٹائی پر کاشتکاری کرتے تھے، اور عبدالرحمن بن الاسود کہتے تھے کہ میں کاشتکاری میں عبدالرحمن بن یزید کا شریک تھا، اور عمرؓ نے لوگوں سے اس شرط پر کاشتکاری کا معاملہ کیا تھا کہ اگر عمرؓ اپنی جانب سے بیج فراہم کریں تو ان کو پیداوار کا آدھا ملے گا، اور اگر لوگ بیج لائیں تو ان کو اتنی مقدار ملے گی اور حسن بصری کہتے ہیں کہ زمین کسی ایک شخص کی اور دونوں اس میں خرچ کریں اور جو پیداوار ہو اس میں آدھا آدھا بانٹ لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہی رائے زہری کی بھی ہے، اور حسن بصری یہ بھی کہتے تھے کہ اس میں کوئی برائی نہیں کہ کپاس چننے میں آدھوں آدھ پر معاملہ ٹھہرالیں، اور ابراہیم نخعی اور ابن سیرین اور عطاء اور حکم اور زہری اور قتادہ نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ کپڑا بننے والے کو اسی کے بنے ہوئے کپڑے میں سے تہائی یا چوتھائی بطور مزدوری لینے پر معاملہ طے کرلے، اور معمر نے کہا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں اگر معین مدت کے لئے جانور کو تہائی یا چوتھائی کرایہ داری پر دیا جائے'' (صحیح بخاری ۱/ ۳۱۳، مکتبہ نعیمیہ دیوبند)۔

قائلین جواز:

زمین کی پیداوار میں آدھوں آدھ یا تہائی اور چوتھائی بٹائی پر کاشتکاری جو دراصل اجرت مجہولہ کی شکل ہے کے مجوزین کی فہرست اور بھی طویل ہے اور اس میں حنفیہ میں سے امام ابویوسف اور امام محمد بھی شامل ہیں۔ علامہ ابن بطال شافعی فرماتے ہیں:

''اختلف العلماء فی كراء الأرض بالشطر والثلث والربع فأجاز ذالك علي وابن مسعود وسعد والزبير وأسامه وابن عمر ومعاذ وخباب وهو قول ابن المسيب و طاؤس وابن أبي ليلى والأوزاعي والثوري وأبي يوسف ومحمد وأحمد وهولاء اجازوا المزارعة والمساقاة'' (حاشیہ صحیح بخاری ۱/ ۳۱۲، مکتبہ نعیمیہ دیوبند)۔

شاید اسی کثرت تعامل کو دیکھتے ہوئے علامہ بدرالدین عینی نے بھی لکھ دیا:

''هذا الحديث عمدة من أجاز المزارعة'' (حوالۂ بالا)۔

امام احمد اور مجوزینِ اجرت مجہولہ نے جو دلیل بیان کی ہے وہ بھی بہت جاندار ہے:

''روئی (کپاس) اور زعفران اور زیتون کے پودوں سے گھٹیا پھلوں اور پھولوں کو علیحدہ کر کے بڑھیا چننے اور کھیتی کاٹنے کی فیصد اجرت سب غیر معلوم (مجہول) ہے پھر بھی تابعین کی ایک جماعت نے اس کو جائز رکھا ہے اور یہی قول ہے امام احمد بن حنبل کا، ان حضرات نے اس معاملے کو ''مضاربت'' پر قیاس کیا ہے؛ کیونکہ اس میں بھی ایک شخص مال کے ذریعہ اسی مال کے ایک معلوم حصہ اجرت پر محنت کرتا ہے؛ اگرچہ منفعت اور محنتانہ کس مقدار میں حاصل کر سکے گا وہ یہ نہیں جانتا'' (عمدۃ القاری ۹/ ۲۰)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ سب صورتوں میں اجیر کو اس کا جزءِ عمل ہی اجرت میں حاصل ہوتا ہے۔ اور خاص طور پر عقد مضاربت میں تو اس کے جواز پر فقہاء کا اتفاق ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۷ ۸۳)۔

دلیلِ تعامل الناس:

اس کے علاوہ جواز اجرت مجہولہ کی ایک دلیل عرف عام اور تعامل الناس کو بھی کچھ مشائخ نے معتبر تسلیم کیا ہے، امام فخر الدین قاضی خاں نے لکھا ہے:

''ومشائخ بلخ رحمهم الله جوزوا ذالك لمكان التعامل وبه أخذ الفقيه أبو الليث وشمس الأئمة الحلواني والقاضي الإمام أبو علي النسفي رحمهم الله'' (فتاویٰ قاضی خاں ۳/ ۲۲، مصطفائی دہلی)۔

(مشائخ بلخ نے تعامل کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے اور فقیہ ابو اللیث اور شمس الائمہ حلوائی اور قاضی امام ابو علی نسفی رحمہم اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے)۔

مزارعت کے معاملہ میں خود ''صاحب ہدایہ'' نے امام اعظم ابوحنیفہ کے قول عدم جواز کو نقل کرنے کے بعد امام ابو یوسف اور امام محمد کے قولِ جواز کو اسی تعامل نبوی و تعامل صحابہ و تابعین کی دلیل سے مؤید کیا ہے:

''زمین کی پیداوار کے تہائی یا چوتھائی حصے پر بٹائی کا معاملہ کرنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک فاسد (ناجائز) ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد نے کہا کہ یہ جائز ہے؛ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل خیبر سے زمین کی پیداوار پھل اور غلہ میں سے آدھوں آدھ پر معاملہ کیا، اور دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ یہ مال اور عمل کے درمیان شرکت کا معاملہ ہے، لہٰذا ''مضاربت'' (جس میں ایک شخص کا مال اور دوسرے شخص کے عمل کی اجرت پر دونوں میں عقد شرکت ہوتا ہے) کا اعتبار کرتے ہوئے یہ مزارعت جائز ہے، اور دونوں معاملہ میں اصلِ جامع ایک دوسرے کی حاجت روائی ہے؛ کیونکہ کبھی مال والا عمل میں راہ یاب نہیں ہوتا اور کبھی عمل میں قوی شخص مال نہیں پاتا، اس لئے انسانی ضرورت کی تکمیل کے لئے آپس میں اس طرح کے عقد کی حاجت لاحق ہوئی'' (ہدایہ ۳/ ۴۰۸-۴۰۹، اشرفیہ دیوبند)۔

امام ابوالحسن مرغینانی ''صاحب ہدایہ'' نے آگے صاحبین ہی کے قول پر احناف کا فتویٰ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''إلا أن الفتوى على قولهما لحاجة الناس إليها ولظهور تعامل الأمة بها والقياس يترك بالتعامل كما في الاستصناع'' (ہدایہ ۳/ ۴۰۹)۔

مگر فتویٰ امام ابو یوسف اور امام محمد ہی کے قول پر (جواز کا) ہے، (۱) بٹائی اور مزارعت کی طرف لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر۔ (۲) اور اس طرح کے معاملات میں امت کے تعامل کے ظاہر ہونے کی دلیل کی وجہ سے اور تعامل امت (اتنی قوی دلیل ہے کہ) اس سے قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے جیسا کہ عقدِ استصناع (جس میں ایک شخص آرڈر دے کر دوسرے شخص سے مطلوبہ چیز تیار کراتا ہے، حالانکہ مطلوبہ چیز بوقت عقد موجود نہیں ابھی مجہول ہے۔ گویا مبیع نامعلوم پر معاملہ ہو رہا ہے اور اگر پہلے شخص نے خام مال دے کر اسی مال کے ایک حصہ کو اجرت قرار دیا ہے مثلاً فلاں سائز کے پانچ جوڑے جوتوں میں سے ایک جوڑا دوسرے شخص (تیار کنندہ Manufacturer) کا ہوگا، تو یہ عقد اجرتِ مجہولہ ہے) کے معاملے میں ہوتا ہے، اور اس کے جواز پر تعاملِ عام کی وجہ سے فقہاء کا اتفاق ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی کہ قفیز طحان اور اس جیسی تمام جزئیات کے جواز کا تعلق کسی خاص علاقے کے تعامل سے نہیں؛ بلکہ بقول صاحب ہدایہ تعامل امت سے ہے، لہٰذا مشائخ بلخ و نسفی کے فتویٰ جواز کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا:

''ومشائخنا رحمهم الله لم يجوزوا ذالك وقالوا هذا التخصيص أهل بلدة واحده ولا يخص الأثر''
(البحر الرائق ۸ / ۴۱، زکریا دیوبند)۔

(اور ہمارے مشائخ رحمہم اللہ نے اس کو جائز قرار نہیں دیا اور فرمایا کہ یہ کسی خاص ایک شہر کے رہنے والوں کی خصوصیت تعامل کی بنا پر ہے اور اس طرح کی تخصیص سے حدیث کو خاص نہیں کیا جاسکتا)۔

حقیقت یہ ہے کہ کھیتی کی بٹائی یعنی مزارعت کے مسئلہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تابعین اور امت کا تعامل اس جیسے تمام مسائل جن میں اجرت مجہولہ یا اجیر کے جزء عمل کو اجرت بنایا گیا ہو، مضاربت، استصناع، قفیز طحان، اجتناء قطن، حصاد وغیرہ وغیرہ میں جواز اجارہ کی ایسی مضبوط دلیل ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

تعاملِ نبوی کی تاویل؟:

اور خیبر کی زمین میں یہودیوں سے تعاملِ نبوی کو خراجِ مقاسمہ قرار دینا جیسا کہ امام سرخسی نے ''المبسوط'' میں اور علامہ برہان الدین نے ''الھدایہ'' میں امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف سے نقل کیا ہے وزن دار جواب نہیں ہے؛ کیونکہ خیبر کی اراضی فتح کے بعد غانمین کی ملکیت میں آگئی تھیں اور ان میں خراجِ مقاسمہ کا حکم جاری نہیں ہوسکتا تھا؛ کیونکہ یہ یہودیوں کی ملک نہیں رہ گئی تھیں، یہ مزارعت کا مسئلہ ہے، اسی واسطے اس کے کچھ حصوں سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کا سالانہ نفقہ دیا کرتے تھے اور یہودیوں کی جلاوطنی کے بعد اسے غانمین میں تقسیم کردیا گیا۔

(اس کی تفصیل خود صحیح بخاری ۱ / ۲۱۳ میں موجود ہے، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ''العرف الشذی بذیل جامع الترمذی ۱ / ۲۵۷، اشرفیہ دیوبند)۔

امام احمد کے قول پر فتویٰ:

یہ بات حد درجہ قابل لحاظ ہے کہ موجودہ دور کاروبار کی ایسی ترقی کا دور ہے جس میں تجارت کی نت نئی شکلیں وجود میں آگئی ہیں۔ اگر شریعت کے دائرہ سے ان کو باہر کردیا جائے تو امت کو سخت تنگی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''مثال کے طور پر ڈرائی کلینگ کا کاروبار ہے، اگر کوئی شخص دوسرے کو کام پر لگاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ مشنری لگادی ہے تم اس میں کام کرو اور جو کچھ نفع ہوگا ہم دونوں آدھا آدھا تقسیم کرلیں گے، اسی طرح بس سروس قائم کرکے چالیس، پچاس بسیں دوسرے کو دے دیں کہ تم ان کو چلاؤ جو کرایہ ہوگا ہم تقسیم کرلیں گے (یہ سب مسئلہ کی وہی صورتیں جن کا اوپر ذکر ہوا)، آج کل پتہ نہیں خدمات کی کتنی بے شمار قسمیں ہیں جو اس طریقے سے خدمات انجام دیتی ہیں، ان میں کوئی چیز بیچی نہیں جاتی، تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ان کو مضاربت پر لگانا ممکن نہیں ہے، لہٰذا اگر ان تمام کاروباروں میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے مضاربت کو بالکل خارج کردیا جائے تو موجودہ کاروبار میں سخت تنگی اور حرج پیش آئے گا اور کوئی نص ایسی نہیں ہے جو ان چیزوں میں کاروبار کو ناجائز قرار دیتی ہو، لہٰذا اس مسئلہ میں امام احمد بن حنبل کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے'' (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲ / ۲۴۴ فیصل دیوبند)۔

آخری فیصلہ:

مذکورۂ بالا تمام تحقیقات کو ایک مرتبہ پھر پیش نگاہ رکھ کر غور کیا جائے تو سونے کی زیور سازی کے کاروبار میں سونے کے اجزاء سے اجرت کا جواز واضح ہوجائے گا۔ کیونکہ زیور ساز سونے کے ذرات سے جو اجرت حاصل کرتا ہے وہ فیصد کے حساب سے سراف اور اجیر کے درمیان طے شدہ مقدار ہوتی ہے۔ جس کا دونوں کو پیشگی علم ہوتا ہے۔ اور اجرت اس میں اگرچہ اجیر کے عمل کا جزء ہوتا ہے مگر یہ جزء معلوم ہوتا ہے مجہول نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے بوقت معاملہ وہ حصہ سامنے موجود نہیں ہوتا۔ لیکن دونوں چاہیں تو سونے کو پگھلا کر اتنا حصہ الگ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ بھی قابل تسلیم نہ ہو تو زیور سازی کے کام میں جو تعامل الناس ہے وہ خود جوازِ اجرت کی دلیل ہے۔ اگر اس کو جائز نہ کہا جائے تو دنیا سے زیور کا وجود ہی عنقا ہو جائے گا۔ اور عورتوں کو سخت تنگی لاحق ہوگی حالانکہ شریعت میں حرج مدفوع ہے۔

۳- یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ سونے کے ہر زیور پر سونے کے اصل وزن کی سرکاری مہر لگی ہوتی ہے کوئی بھی زیور مقدار کے اعتبار سے یکساں ہوتا ہے نئے اور پرانے زیور میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ صراف خریدار کو خریداری کی جو سلپ دیتا ہے اس میں بھی کیرٹ کی تعیین ہوتی ہے۔ مثلاً ۲۲ کیرٹ یا

۲۴ کیرٹ سونا ہونے کی گارنٹی دی جاتی ہے استعمال کے بعد زیور کی ظاہری چمک دمک میں کمی یا دھندلا پن کا نام ''پرانا'' ہونا ہے ورنہ اصل سونا وزن میں جوں کا توں ہے۔

اب صراف پرانے زیور کی واپسی پر دس گرام والے زیور کو آٹھ گرام مان کر زیور کا تبادلہ کرتا ہے یا آٹھ گرام کی قیمت دیتا ہے تو یہ کمی بیشی اصل سونے کے وزن میں نہیں بلکہ زیور میں جو دھات کی آمیزش ہوتی ہے یا جو دھات کا ٹانکا لگا ہے (جس کے بغیر کوئی زیور بن ہی نہیں سکتا) یہ فرق اس کے اعتبار سے ہے۔ صراف نے زیور کی فروختگی کے وقت جو دس گرام سونے کی قیمت وصول کی تھی وہ سونا اور دھات کی آمیزش اور کاریگر کی اجرت کی مجموعی قیمت لگا کر دس گرام کی تھی۔ اب اسی زیور کو وہ آٹھ گرام کے بدلے واپس لے رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس زیور کو کسی اور ڈیزائن میں بنوائے گا یا اس کی پالش کرائے گا۔ تو اس میں دھات کی آمیزش اور کاریگر کی مزدوری بھی شامل ہوگی۔ تو گویا دو گرام سونا نئی شکل میں ڈھالنے کے عوض ہے اصل وزن سونے کا آٹھ گرام بالکل برابر سرابر ہے۔ اس لئے یہ صورت شرعاً جائز ہے اس کو سود قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ خریدار سے ۲/گرام کی کمی پر واپسی ڈھلائی اور کاریگر کی مزدوری کے عوض ہے۔ اصل سونے کے وزن پر کوئی اضافہ نہیں۔

مجھے معتبر مسلم صراف سے یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس لئے ان پر اعتماد کیا جانا چاہئے۔ اور اس کے جواز کا فیصلہ درست ہونا چاہئے۔

۴- (الف): اگر ادارے کے پاس سونا موجود ہے اور وہ غیر مقسوم شکل میں حصص متعین کر کے خریداروں کو فروخت کرتا ہے تو اسلامی اصول بیع و شراء کے مطابق یہ معاملہ درست ہے۔ سونے کی ایک اینٹ میں پچاس پچاس گرام فی حصہ دو سو آدمیوں کے درمیان معاملہ شرکتہ ''مشاع'' ہے۔ اب اگر ادارے نے تمام شرکاء کو سیل سرٹیفکٹ جاری کر دیا ہو یا ان کے حق میں محفوظ کر دینے کی گارنٹی فراہم کر دی ہو تو یہی مبیع پر قبضہ کے ہم معنی ہوگا۔

حنفیہ کے نزدیک مبیع پر قبضہ کے معتبر ہونے کے لئے ''حسی قبضہ'' ضروری نہیں بلکہ معنوی اور حکمی قبضہ بھی کافی ہوتا ہے، اس کو فقہاء کی اصطلاح میں ''تخلیہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مبیع اور خریدار کے درمیان کوئی مانع اور رکاوٹ موجود نہ ہو اور مبیع خریدار کے ضمان میں آجائے، اور نفع اور نقصان کی ذمہ داری اس کی طرف منتقل ہو جائے، بالفاظ دیگر مبیع اس پوزیشن میں ہو کہ خریدار جب چاہے قبضہ و تصرف کر سکتا ہو، اس کی دلیل جناب رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث ہے جو صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے اور امام بخاری نے مختلف احکام کے ذیل میں بیس مقامات پر اس کو نقل کیا ہے، ایک جگہ:

''باب شراء الدّواب والحمير وإذا اشترى دابة أوجملا وهوعليه هل يكون ذالك قبضًا قبل أن ينزل وقال ابن عمر قال النبي ﷺ لعمر بعينه يعني جملاصعبًا'' (صحیح بخاری ۱/ ۲۴۲)

کے تحت پوری مفصل حدیث نقل کی ہے جس میں سفر اور سواری اور خانگی حالات سے متعلق باتیں سوال وجواب کے پیرائے میں مذکور ہیں اور ترجمۃ الباب سے متعلق ''أتبيع جملك قلت نعم فاشتراه مني بأوقية'' اور آگے مدینہ واپسی اور اونٹ سے متعلق معاملہ کا ذکر ہے۔

اور ترجمۃ الباب کے مضمون کو ثابت کرنے کے لئے امام بخاری نے اسی حدیث میں راویوں سے مروی الفاظ کو دوسری جگہ ''إذا اشترط البائع ظهر الدابة إلى مكان مسمى جاز'' (صحیح بخاری ۱/ ۳۷۵) کے تحت ذکر کیا ہے، ان میں سے چند الفاظ یہ ہیں:

(۱) ''وقال شعبة عن مغيرة عن عامر عن جابر افقرني رسول الله ﷺ ظهره إلى المدينة''۔

(شعبہ نے مغیرہ سے انہوں نے عامر شعبی سے انہوں نے جابر سے یوں روایت کیا ہے: ''آنحضرت ﷺ نے مدینہ تک اس اونٹ پر چڑھنے کی مجھ کو اجازت دی)۔

(۲) ''وقال عطاوغيره ولك ظهره إلى المدينة''۔

(عطا ابن ابی رباح وغیرہ نے جابرؓ سے یوں نقل کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تو مدینہ تک اس کی پیٹھ پر چڑھ سکتا ہے (سوار رہ سکتا ہے))۔

(۳) ''وقال زيدبن أسلم عن جابر رضى اله عنه ولك ظهره حتى ترجع''

(اور زید بن اسلم نے جابرؓ سے یوں روایت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مدینہ لوٹنے تک اس کی پیٹھ پر سوار رہ سکتا ہے)۔

(۴) ''وقال أبوالزبیر عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ أفقرناك ظهرہ إلی المدینة''۔

(اور ابوالزبیر نے جابرؓ سے یوں نقل کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے مدینہ تک اس کی پشت (پیٹھ یا کمر) تجھے دے دی)۔

(۵) ''وقال الأعمش عن سالم عن جابر رضی اللہ عنہ تبلغ علیہ إلی أهلك''۔

(اور اعمش نے سالم سے انہوں نے جابرؓ سے نقل کیا، اس کی پیٹھ پر سوار رہتے ہوئے مدینہ تک پہنچ جا)۔

اس کے علاوہ امام بخاری نے ترجمۃ الباب کے دوسرے جزء ''وقال ابن عمر قال النبی ﷺ لعمر بعنیہ یعنی حملا صعبا'' سے بھی اسی معنوی قبضہ کو ثابت کیا اور تفصیلی روایت دوسری جگہ ذکر کی ہے جس میں سفر کے دوران اسی انداز کی بات خریداری اور قبضہ کے سلسلے میں ہوئی ہے جیسی حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر اپنے والد حضرت عمرؓ کی ایک اڑیل اونٹ پر سوار تھے وہ کبھی لوگوں کے سامنے سے آگے بڑھ جاتا۔ حضرت عمرؓ ڈانٹ ڈپٹ کر اسے پیچھے لوٹاتے اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر سے کہا: ''بعنیہ''۔ یہ اونٹ مجھ سے بیچ لو۔ عمرؓ نے کہا: ''ھو لک یا رسول اللہ!'' حضور آپ کے لئے ہدیہ ہے، آپ نے کہا: نہیں۔ ''بعنیہ'' مجھ سے بیچ لو۔

''فباعہ من رسول اللہ ﷺ'' (حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اونٹ فروخت کردیا)، خریداری کے بعد ''فقال النبی ﷺ: ھو لك یاعبداللہ بن عمر تصنع بہ ماشئت'' (صحیح بخاری ۱/ ۲۸۴، باب اذا اشتری شیأ فوھب فی ساعتہ الخ)

(محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہارے لئے ہبہ ہے، اے عبداللہ بن عمر، اس میں تمہیں اختیار ہے جو چاہے کرو)۔

ان سب صورتوں میں اونٹ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معنوی قبضہ متحقق ہوگیا، کیونکہ خریدے ہوئے اونٹ پر حضرت جابر، اور دوسرے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عمر سوار تو ہیں، لیکن پوزیشن یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو خود سوار ہو سکتے تھے، اور حسی قبضہ لے سکتے تھے؛ مگر جب خود آپ نے خریداری کے بعد مبیع میں تصرف کرلیا، حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عمرؓ کو ہبہ کردیا تو یہ قبضہ کے ہم معنی ہوگیا اور بیع درست ہوگئی؛ کیونکہ ہبہ کا تصرف قبضہ کے بعد ہی معتبر ہوتا ہے، محدث کبیر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

''وقد احتج بہ أی بحدیث ابن عمر فی قصة البعیر الصعب المالکیہ والحنفیہ أن القبض فی جمیع الأشیاء بالتخلیہ وإلیہ مال البخاری'' (فیض الباری علی شرح البخاری ۳/ ۲۰۶)۔

(ابن عمر کی حدیث سے مالکیہ اور حنفیہ نے حجت لی ہے کہ تمام چیزوں پر قبضہ تخلیہ سے معتبر ہو جاتا ہے)۔

اس روشنی میں زیر بحث مسئلہ کو دیکھا جائے تو ادارے کے سونے کی اینٹ فی پچاس گرام دو سو شرکاء کو فروخت کردینے اور قبضے میں رکاوٹ نہ ڈالنے کی وجہ سے خریدار کا مبیع پر معنوی قبضہ ہوگیا، اب اگر ان میں سے کوئی اپنے مشترکہ حصے کو دوسرے کو ہبہ، بیع، عطیہ، صدقہ وغیرہ کرنا چاہے اور اس میں ادارہ مانع نہ ہو تو یہی تصرف قبضہ کی دلیل بن جائے گی اور بیع درست ہوگی، فی الحال ہر حصے کی بسکٹ کی شکل میں علیحدہ تقسیم جواز بیع کے لئے ضروری نہیں ہے، کیونکہ ادارہ اگر تقسیم میں مانع بھی ہو تب بھی عدالتی چارہ جوئی کر کے یہ حق وصول کیا جا سکتا ہے۔

ب- اوپر ذکر کردہ تفصیلات سے اس سوال کے شق (ب) کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک قبضہ کے لئے حقیقی، حسی قبضہ ضروری نہیں ہے؛ بلکہ معنوی اور حکمی قبضہ بھی معتبر ہوتا ہے، چنانچہ ہر خریدار کے لئے اس کے حصہ کی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کے نام سے کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اندراج خریدار کے نام سے کردیا گیا ہو تو یہ بھی معنوی قبضہ کی ایک صورت ہے، اس صورت میں خریدار کو چاہئے کہ اس کی نقل بھی اپنے پاس رکھے، تاکہ عند النزاع عدالتی چارہ جوئی ممکن ہو۔

۵- اوپر بیان کردہ صورت مسئلہ، سٹہ بازی ہے جو شریعت میں حرام ہے، سٹے بازی کا یہی کھیل شیئر مارکیٹ کی اکثر خریداریوں میں ہوتا ہے جو سراسر حرام ہے۔

مفتی محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

سٹہ کیا ہوتا ہے؟

بیع قبل القبض کی ممانعت ایک ایسا حکم ہے جس نے بہت سے مفاسد کا سد باب کیا ہے اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں بہت سی خرابیاں اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ انہوں نے بیع قبل القبض کو جائز قرار دیا ہوا ہے، سٹے کی تمام شکلیں تقریباً وہ اسی بیع قبل القبض پر مبنی ہیں۔

سٹہ کی حقیقت یہ ہے کہ اندازہ لگانا، تخمینہ لگانا، اس لئے کہ سٹہ کے اندر یہ ہوتا ہے کہ اس کا آغاز ہوا ہے اسٹاک ایکسچینج (Stock Exchange) سے، کمپنیوں کے شیئرز، ان کے حصص بازار میں فروخت ہوتے ہیں، جس بازار میں کمپنیوں کے حصص فروخت ہوتے ہیں اس کو اسٹاک ایکسچینج کہتے ہیں، اور یہ عجیب وغریب قسم کا بازار ہوتا ہے، اس میں کوئی سامان تجارت نہیں ہوتا، لیکن کروڑوں کے روزانہ سودے ہوتے ہیں، مختلف قسم کی کمپنیوں کے حصص اس بازار میں فروخت ہوتے ہیں، اس اسٹاک ایکسچینج میں یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان حصص کو خریدتے اور بیچتے رہتے ہیں اور اس کا اندازہ کرتے ہیں کہ کونسی کمپنی زیادہ منافع میں جارہی ہے، جو کمپنی زیادہ منافع میں جارہی ہوتی ہے اس کے شیئرز کو خرید لیتے ہیں، تاکہ آگے چل کر اس کے دام بڑھیں گے تو اس وقت منافع ہوگا، مثلاً ایک کمپنی کا حصہ پچاس روپے میں بک رہا ہے اور آگے جا کر اس کا حصہ ساٹھ ستر روپے کا ہوجائے گا تو اس وقت بیچ دیں گے، تو اصل کاروبار اسٹاک ایکسچینج میں حصص کا ہے، اس میں اگر کوئی آدمی حصہ لے اور اس پر قبضہ کرلے اور قبضہ کرکے اس کو آگے فروخت کرے تو اس میں کوئی خرابی نہیں، لیکن اس میں سٹہ اس طرح ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنا اندازہ لگاتا ہے کہ کونسی کمپنی کے حصص اس وقت سستے ہیں اور کس کے مہنگے ہونے کا امکان ہے، تو اس کو لے کر خریدے گا اور اسے آگے بیچے گا لیکن ہوتے ہوتے یہ معاملہ اس طرح ہونے لگے گا کہ ایک شخص نے جس کے پاس بالکل کوئی شیئرز نہیں ہیں یعنی کوئی حصہ نہ اس کی ملک میں ہے اور نہ قبضے میں ہے، آخر میں جا کر آپس کا فرق (ڈیفرنس Difference) برابر کرلے گا اور جہاں یہ صورت ہو کہ قبضہ بالکل مقصود نہ ہو اور شیئر کا نہ لینا مقصود ہو نہ دینا مقصود ہو؛ بلکہ اصل مقصد یہ ہو کہ اس طرح سٹہ بازی کرکے آپس کے ڈیفرنس کو برابر کرلیا جائے تو یہ صورت بالکل حرام ہے، اور شریعت میں اس کی اجازت نہیں (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/۱۸۸، ۳/۲۴)۔

حدیث کے مطابق یہی صورت ''بیع مالیس عندہ'' کی ہے جو ممنوع ہے۔

''عن حکیم بن حزام قال سألت رسول اللہ ﷺ فقلت یأتینی أرجل فیسألنی من البیع مالیس عندی۔ ابتاع لہ من السوق ثم ابیعہ قال لاتبیع مالیس عندك'' (جامع ترمذی باب فی کراھیتہ مالیس عندہ ۱/ ۲۳۳ اشرفیہ دیوبند)۔

(حکیم بن حزامؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے پوچھا بعض اوقات میرے پاس کوئی شخص آتا ہے اور مجھ سے ایسی چیز کی بیع کا سوال کرتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی تو میں ایسا کرتا ہوں کہ وہ چیز بازار سے خرید کر اس کو فروخت کردیتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو چیز تیرے پاس موجود نہ ہو اس کو فروخت مت کر)۔

سٹے کے اندر یہی ہوتا ہے کہ ایک انسان کے ہاتھ میں اور اس کی ملکیت میں ایک پیسے کا بھی مال نہیں ہے اور وہ کروڑوں روپے کا کاروبار کرتا ہے، یہ تماشا دیکھنا ہو تو اسٹاک ایکسچینج میں جا کر دیکھ لو۔

۶- جن چیزوں کی ذخیرہ اندوزی سے براہ راست عام انسان کو ضرر شدید لاحق ہو ان کا احتکار وذخیرہ کرنا اسلامی شریعت میں حرام ہے، حدیث میں ہے:

''لایحتکر إلا خاطی'' (صحیح مسلم ۲/۳۱، اشرفیہ دیوبند) (صرف گنہگار شخص ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے)۔

امام نووی فرماتے ہیں: ''ھذا الحدیث صریح فی تحریم الاحتکار'' (یہ حدیث احتکار کی حرمت میں بہت واضح ہے)۔

اس دوسری روایت میں ہے: ''الجالب مرزوق والمحتکر ملعون'' (الفتاوی الھندیہ ۳/ ۱۰۳، فصل فی الاحتکار)

(باہر سے سامان لاکر مناسب دام پر بیچنے والا من جانب اللہ روزی پانے والا ہوتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے)۔

لیکن ذخیرہ اندوزی کا تعلق کن چیزوں سے ہے، تو اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ براہ راست عام انسانوں کی خوراک کی ضرورت سے وابستہ اشیاء کا ذخیرہ کرنا، گودام میں چھپا کر رکھنا؛ تاکہ قیمت کے خوب چڑھ جانے اور مہنگائی بڑھ جانے کے وقت بیچا جائے، یہ حرام ہے۔

امام مالک اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ احتکار کا تعلق خورد ونوش کی اشیاء اور اس کے علاوہ سامانوں سے بھی ہے، ان کے نزدیک درہم و دینار (چاندی سونے کے سکوں) میں بھی احتکار ممنوع ہے، لیکن جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ احتکار صرف خوراکی اجناس میں ممنوع ہے دوسری چیزوں میں نہیں۔

''والجمهور على أن الاحتكار خص بالاقوات'' (حاشیہ موطا امام مالك / ص ۲۷۰ .سعد بکڈپو دیو بند)۔

کچھ حضرات فقہاء ذخیرہ اندوزی کی حرمت کے لئے مدت کا بھی تعین کرتے ہیں:

''ثم إن حبس القوت إنما يكون احتكارًا إذا طالت المدة لا فيما قصرت وحد الطول أربعون يومًا وعن أحمد عن ابن عمر من احتكر الطعام أربعين يومًا فقد برئ من الله، و برئ الله منه'' (حاشیہ موطا امام مالك / ص ۲۰۰)

امام محی الدین النووی اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے اصحاب (شوافع) کہتے ہیں کہ حرام ذخیرہ اندوزی خاص طور پر صرف غذائی اجناس اور خوراک کی اشیاء میں ہے، ذخیرہ اندوزی اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص مہنگائی کے زمانہ میں تجارت کے لئے غلہ خرید لے اور اس کو فی الحال نہ بیچے بلکہ اسٹاک کر کے ذخیرہ کر لے دام چڑھنے کے وقت فروخت کرے۔

لیکن یہ صورت ذخیرہ اندوزی کی نہیں ہے کہ کسی شخص کے پاس گاؤں سے غلہ آجائے، یا اس کو سستے ریٹ کے وقت خرید لے اور ذخیرہ کر لے، یا مہنگائی کے وقت خود اپنی خوراکی کی ضرورت کے لئے خریدے، یا اسی مہنگائی کے وقت خریدے تاکہ اسی مہنگائی میں بیچ دے تو اس کو ذخیرہ اندوزی نہیں کہیں گے اور اس صورت میں حرمت نہیں ہے، رہ گئیں خوراکی اجناس اور غذائی غلہ جات کے علاوہ اشیاء تو ان کا ذخیرہ کرنا کسی بھی حال میں حرام نہیں ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ ذخیرہ اندوزی کی حرمت کی حکمت ہے عام لوگوں کو غذائی قلت اور ضرر سے بچانا۔ اسی وجہ سے علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کسی کے پاس کھانے کا سامان ہے اور لوگ اس کے شدید حاجتمند ہیں اور اس کے لئے مجبور ہیں اور دوسری خوراکی اشیاء اس کے علاوہ نہ پا رہے ہوں تو اس شخص کو بیچنے پر مجبور کیا جائے گا تاکہ لوگوں کی سخت تکلیف کو دور کیا جاسکے''۔

خلاصۂ بحث:

اوپر کی تفصیلات کو سامنے رکھنے سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:

(۱) ذخیرہ اندوزی ہر حال میں حرام نہیں ہے، بلکہ غذائی قلت کے زمانے میں حرام ہے۔

(۲) ذخیرہ اندوزی کی حرمت کا تعلق صرف غذائی اجناس اور خوراکی غلہ جات سے ہے، بالخصوص ان خوارکی غلہ جات سے جو براہ راست خوراک کی ضرورت سے متعلق ہوں، اور ذخیرہ کرنے کی وجہ سے اس کے اثرات عوامی ضررِ شدید پر پڑتے ہوں، لیکن جن غذائی اجناس کے ذخیرہ کر لینے سے عام حاجاتِ انسانی متاثر نہ ہوں تو اس کے ذخیرہ میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ ''صحیح مسلم'' میں حضرت سعید بن مسیب اور معمر جو حدیثِ احتکار کی حرمت کے راوی ہیں بقول عبداللہ ابن عمر خود کشمش کا ذخیرہ کرتے تھے، صحیح مسلم کے ''حاشیہ علامہ سندھی'' میں ہے کہ اس بارے میں حضرت سعید سے پوچھا گیا کہ آپ احتکار کیوں کرتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ معمر راوی حدیث خود بھی تو احتکار کرتے ہیں، اگر کشمش میں احتکار ممنوع ہوتا تو وہ حدیثِ نبوی کے خلاف ہرگز نہیں کر سکتے تھے، پتہ چلا کہ کشمش (زبیب) کا ذخیرہ احتکار حرام میں داخل نہیں ہے، اور وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس کا تعلق براہ راست ضروری خوراک سے نہیں ہے، کشمش اگرچہ طعام ہے لیکن وہ قوت (خوراک) نہیں ہے جس کے بغیر گزارہ نہ ہو سکے۔

(۳) درہم اور دینار کو امام مالک اور امام ابو یوسف نے اگرچہ ''احتکار ممنوع'' میں شامل رکھا ہے، لیکن اس کی وجہ بھی یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں نقود چاندی، سونے کے سکوں کی شکل میں فلوس نافقہ اور روپئے پیسے کی طرح ان کے دور میں ذریعۂ تبادلہ تھے، اور ان کے ذخیرہ کر لینے سے لوگوں کو شدید ضرر کا سامنا ہوتا کیونکہ ان کے بغیر غلہ اور خوراک کے سامان خریدنے میں لوگ دقت اور قلت میں مبتلا ہو جاتے، جیسا کہ موجودہ نوٹ بندی میں ہوا، چونکہ درہم و دینار براہ راست ناگزیر ضرورتِ انسانی سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے اثرات ضرر عامۃ الناس تک پہنچنے والے

تھے،اس لئے ان کو حرمت احتکار میں شامل رکھا۔

یہیں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ سونا اور چاندی اول تو قوت اور طعام نہیں ہیں، دوسرے ان کی ذخیرہ اندوزی کے اثرات براہ راست ضرر عامۃ الناس تک نہیں پہنچتے؛ کیونکہ یہ سامان زینت ہیں ثمن ضرورت نہیں، کیونکہ عوامی ضرورت کے سامان میں ذریعۂ تبادلہ نہیں ہیں، البتہ جہاں سونے چاندی کے سکے چلتے ہوں وہاں ان کا ذخیرہ ممنوع ہوگا، دوسری جگہوں پر ان کی ذخیرہ اندوزی کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا؛ جیسا کہ کشمش کے ذخیرہ کے سلسلے میں حضرت سعید بن مسیب اور معمر راوی حدیثِ احتکار کا معمول تھا۔

۷- انگریزی ڈکشنریوں میں اسمگلنگ کے معنی ہیں ''خلاف قانون سامان کی درآمد و برآمد کرنا''، یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں اور ان کے حکم میں دو علیحدہ نوعیتیں ہیں: ایک ہے اسمگلنگ کا عمل، اس کا حکم یہ ہے کہ یہ ملکی قانون کے خلاف عمل ہے اور ملک کا ہر شہری چونکہ ملکی قانون کی پابندی کا ذمہ دار ہے، اس اعتبار سے یہ عمل درست نہیں ہے۔

دوسری چیز ہے، اس عمل کے ذریعہ حاصل شدہ بیرونِ ملک کے مال کی خرید وفروخت، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اپنی ذاتی حیثیت سے اس مال کی خرید وفروخت درست ہوگی، کیونکہ یہ اقسام بیع میں سے ''بیع بماقام علیه بفضل'' میں داخل ہے جو بیع مرابحہ کے ہم معنی ہے، اور کسی فعل کے حرام وناجائز ہونے کے باوجود اصل حکم میں حلت وجواز ہوسکتا ہے۔

''وحرمة الفعل لاتنافی ترتب الأحكام كطلاقِ الحائض والوضوبمياه مغصوبة۔ والاصطياد بقوس مغصوبه والذبح بسكين مغصوبة والصلوٰة على الأرض الغصوبة۔ والبيع فی وقت النداء فإنه يترتب الحكم على هذه التصرفات مع اشتماله على الحرمة'' (اصول الشاشی/ ص۷۸، مکتبہ بلال دیوبند)۔

(اور کسی فعل کی حرمت، احکام کے مرتب (صحیح ہوجانے) کے منافی نہیں ہے، جیسے حیض کی حالت میں طلاق اور غصب کردہ پانی سے وضو کرنا اور غصب کئے ہوئے تیر وکمان سے شکار کرنا اور غصب کردہ چھری سے ذبح کرنا اور غصب کردہ زمین پر نماز پڑھنا اور اذان جمعہ کے وقت خرید وفروخت کرنا، ان سب صورتوں میں سارے تصرفات پر حکم مرتب ہوجاتا ہے باوجودیکہ وہ حرمت پر مشتمل ہے)۔

یہاں ایک اور وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ مذکورہ مسئلہ کو درجِ ذیل حدیث میں لایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

''عن أبی هريرة قال نهی رسول اللهﷺ أن يتلقى الجلب وفی حديث عنه لايبيع حاضر لباد''

(صحیح مسلم ۲ / ۴، اصح المطابع دہلی)۔

(حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے غلہ والوں کے قافلے سے ملاقات کرکے بیع کرنے کو منع فرمایا ہے اور شہری دیہاتی سے باہر ملاقات کرکے خریداری نہ کرے)۔

یہ دو مختلف صورت بیع ہے جس کا مطلب ہے کہ دیہات کے کاشتکار زمین کی پیداوار اونٹوں پر لاد کر قافلے کی شکل میں شہر کی طرف آتے تھے؛ تاکہ وہ اپنا سامان شہر میں آکر فروخت کریں تو بعض سیانے قسم کے لوگ جو شہر کے رہنے والے تھے، شہر سے باہر آکر ان کا استقبال کرتے اور ان کی چاپلوسی کرتے، آپ کہاں بازار جانے کی زحمت کریں گے، ہم یہیں آپ کا سارا سامان خرید لیتے ہیں، اس طرح سستے داموں خرید لیتے اور بازار میں آکر اس کی من مانی قیمتیں وصول کرلیتے، اسی کو تلقی الرکبان، تلقی البیوع اور تلقی جلب کہتے ہیں۔

''بیع حاضر لباد'' میں بھی یہی صورت ہوتی تھی کہ چالاک شہری پیداوار لانے والے دیہاتی کو راستہ میں بہکا پھسلا کر کہتا کہ بھائی تم شہر کے بازاری حالات اور داموں کے اتار چڑھاؤ سے واقف نہیں ہو، مجھے اپنا وکیل یا دلال بنالو میں تمہارا سامان بیچ دوں گا، اس طرح وہ شہر کے بازار میں لاکر مہنگے داموں پر بیچتا اور دیہاتی سے دلالی کی اجرت لیتا اور شہر والوں کو ضرر اور پریشانی میں مبتلا کردیتا، اس لئے جناب رسول اللہ ﷺ نے ان

دونوں قسم کی بیع سے منع فرمایا، اوراسی کے ساتھ یہ ہدایت بھی دی:

''دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم من بعض'' (صحیح مسلم ۲/۴)۔

(لوگوں کو آزاد چھوڑ دو تاکہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ رزق عطا کرے)۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اسمگلنگ والی صورت اس میں شامل نہیں، اس لئے کہ یہاں دونوں صورت بیع میں ممانعت کا تعلق عام حاجت انسانی کے سامان سے ہے؛ جبکہ سونے کی اسمگلنگ کا تعلق سامان زینت وزیبائش سے ہے، لہٰذا دونوں کا حکم یکساں نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے مطابق یہاں بھی ممانعت کے باوجود اصل بیع درست تسلیم کی گئی ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اس میں اختلاف ہوا ہے کہ کوئی شخص تلقی جلب ناجائز طریقہ سے کرے، مثلاً دھوکہ دیا یا قافلہ والوں کو غلط بھاؤ بتائے تو آیا یہ بیع منعقد ہوئی یا نہیں، علامہ ابن حزم اور ظاہریہ کہتے ہیں کہ ایسی بیع ہوئی ہی نہیں، دوسرے فقہاء شافعیہ وغیرہ (مالکیہ، حنابلہ) کہتے ہیں کہ بیع ہوگئی، لیکن صاحب سلعہ کو خیار مغبون حاصل ہوگا، امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ بیع ہوگئی، لیکن بائع کو خیار فسخ حاصل نہیں ہوگا''۔

(اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/۱۵۱ فیصل دیوبند)۔

۸- مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں: ''سونے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ وہ بالکل برابر سرابر کر کے خریدنا اور فروخت کرنا ضروری ہے، لیکن یہ حکم موتیوں کے بارے میں نہیں ہے، اس لئے دس موتی کے بدلے بارہ موتی لینا جائز ہے، لہٰذا اگر ایک ہار خریدنا ہو جو سونے اور موتی سے مرکب ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس ہار میں جتنا سونا ہے اس سے تھوڑا سا زیادہ سونا دے کر اس کو خریدنا درست ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ اس ہار میں ایک تولہ سونا ہے اور کچھ موتی لگے ہوئے ہیں، اب اگر کوئی شخص اس ہار کو ایک تولہ اور ایک رتی سونے کے عوض خریدنا چاہے تو اس کے لئے خریدنا جائز ہے، اس لئے کہ یہ کہا جائے گا کہ ایک تولہ سونا تو ایک تولہ سونا کے عوض میں آ گیا اور ایک رتی سونا موتیوں کے مقابلے میں آ گیا، اس طرح معاملہ درست ہوگیا'' (اسلام اور معاشی مسائل ۳/۱۹، فیصل دیوبند)۔

موتی سمندری دھات ہے اور پلاٹین زمینی دھات ہے:

اس تحریر سے واضح ہوا کہ پلاٹین اور سونا دونوں الگ الگ دھات ہیں اور دونوں کے احکام جداگانہ ہیں، عقود اور زکوٰۃ کے مسئلہ میں پلاٹین کو سونے کے حکم میں شامل نہیں کیا جائے گا، پلاٹین اور اس سے بنے زیور میں زکوٰۃ نہیں، مگر تجارت کے لئے ہو تو زکوٰۃ واجب ہے، سونے میں بہرحال زکوٰۃ ہے۔

ایک سوال کہ:

''قیمتی پتھر یعنی فیروزہ، یاقوت وغیرہ اگر زیور میں جڑے ہوئے ہیں تو ان کی زکوٰۃ کس اصول کے تحت ادا کرنا چاہئے اور کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے؟''

اس کے جواب میں حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ لکھتے ہیں:

''ایسے پتھروں پر زکوٰۃ واجب نہیں، ان کے وزن کو محسوب کر کے سونے چاندی کے زیور کی زکوٰۃ ادا کی جائے''۔

''أما الیواقیت واللآلی والجواھر فلا زکوٰۃ فیھا وإن کانت حلیًا إلا أن تکون للتجارۃ''

(الفتاویٰ العالمگیریہ ۱/۱۸۰، رشیدیہ پاکستان، کذافی الدر المختار ۲/۲۷۳، سعید کمپنی کراچی، کذافی التاتارخانیہ ۲/۲۴۵، ادارہ القرآن کراچی، فتاویٰ محمودیہ ۹/۳۷۰، مکتبہ شیخ الاسلام دیوبند)۔

تلخیص:

۱- سونا ثمن خلقی ہے اور روپیہ ثمن اعتباری یا زرقانونی ہے، عقد کے دونوں جانب ثمن ہے، اس لئے یہ ''بیع صرف'' ہے جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصری کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

(الف) سونا، چاندی کی روپئے سے خرید وفروخت میں ادھار جائز ہے، کیونکہ روپیہ فلوس نافقہ کے درجہ میں ہے، اور اس کی جنس الگ ہے اور سونا، چاندی الگ جنس ہے، حدیث میں چھ اشیاء کی خرید وفروخت میں ادھار کا عدم جواز انہیں چھ کے ساتھ مخصوص ہے، ان کے علاوہ میں جواز ہے۔

(ب) انٹرنیشنل یا ہندوستانی گولڈ مارکیٹ کے طے کردہ ریٹ سے کم وبیش قیمت پر خرید وفروخت جائز ہے۔ کیونکہ یہ خریداری دلال کی اجرت اور سونے کی ڈھلائی وصفائی کی اجرت کے ساتھ ہے، اس لئے اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا، زیادہ قیمت کے مقابلہ میں مذکورہ اخراجات ہوں گے۔

۲- (الف) یہ خالص عقد اجارہ ہے؛ کیونکہ یہ عقد علی منفعۃ مالیۃ ہے، ایک طرف مال اور دوسری طرف عمل صنعت کی منفعت ہے۔

(ب) کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ یہاں اجرت خود اجیر کے عمل کا ایک جزء اور حصہ ہے، جو غیر معلوم اور مجہول ہے، پھر بھی یہ عقد درست ہے، کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین اور امت کے تعامل سے اس قسم کے عقد ومعاملہ کا جواز ثابت ہے۔ احادیث صحیحہ اور آثار مرویہ اور تصریحات فقہیہ اس کی دلیلیں ہیں، عقد مزارعت، عقد مضاربت، عقد استصناع وغیرہ اس کی فقہی نظائر ہیں۔ امام احمد بن حنبل، امام ابو یوسف وامام محمد رحمہم اللہ بھی جواز کے قائل ہیں، صاحب ہدایہ نے صاحبین (امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ) کے قول پر فتوی نقل کیا ہے۔

۳- سونے کے نئے اور پرانے زیور کے وزن میں کوئی فرق نہیں، صراف جو دس گرام کا پرانا زیور آٹھ گرام کے زیور کے بدلے لین دین کرتا ہے اس کی وجہ پرانے زیور پر آنے والے خرچ، ڈھلائی، نئی ڈیزائننگ یا پالش میں جو سونا کی کٹوتی اور مزدوری وغیرہ کو وصول کرتا ہے، لہذا یہ تبادلہ جائز ہے۔

۴- قبضہ دو قسم کا ہوتا ہے: ایک حسی قبضہ، دوسرا معنوی قبضہ، معنوی قبضہ یہ ہے کہ مبیع اور خریدار کے درمیان قبضہ میں کوئی چیز مانع یا رکاوٹ باقی نہ رہ جائے، اس کو ”تخلیہ“ کہتے ہیں، یہاں خریدار کا معنوی قبضہ سمجھا جائے گا، اور یہ شرعاً معتبر ہے جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت جابرؓ اور حضرت عمرؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اونٹ خریدنا اور معنوی قبضہ کے ذریعہ دونوں کو اونٹ کی سواری ہبہ کردینا قبضہ کے معتبر ہونے کی دلیل ہے۔

۵- یہ صورت سٹہ بازی کی ہے جو شریعت میں حرام ہے، اسٹاک ایکسچینج میں زیادہ تر یہی کاروبار ہوتا ہے، اس کی ممانعت کا حکم بیع ما لیس عندہ (ترمذی) والی حدیث سے ثابت ہے۔

۶- سونے کا ذخیرہ کرنا احتکار کے حکم میں داخل نہیں ہے، احتکار ممنوع غذائی اجناس اور خوراکی اشیاء کے ساتھ مخصوص ہے، ممانعت بھی اس صورت میں ہے جبکہ براہ راست لوگوں کو ضرر لاحق ہو، سونا چاندی سامان زینت ہے، سامانِ ضرورت نہیں، اس لئے ان کا ذخیرہ ممنوع نہیں ہے۔

۷- اسمگلنگ، خلاف قانون کسی سامان کی برآمد اور درآمد کا نام ہے، ہر ملک کا شہری اپنے ملک کے قانون کی پابندی کرنے کا ذمہ دار ہے، اس لئے اسمگلنگ کا عمل ناجائز ہے، لیکن اس ذریعہ سے حاصل شدہ سونے کی خرید وفروخت جائز ہے، کیونکہ بہت سے افعال حرام ہونے کے باوجود ترتب حکم میں مانع نہیں ہوتے، مثلاً غصب کردہ چھری سے جانور ذبح کرنا حرام ہے، لیکن ذبیحہ حرام نہیں بلکہ حلال ہے۔

۸- ”سونا“ اور ”پلاٹنم“ دونوں زمینی دھات ہیں اور دونوں کی الگ الگ قسم ہے، لہذا عقود اور زکوۃ کے مسئلہ میں بھی دونوں کے احکام الگ الگ ہیں، زیور میں پلاٹنم جڑا ہو تو کمی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت جائز ہے، سونے میں زکوۃ فرض ہے جبکہ پلاٹنم میں زکوۃ نہیں ہے، الا یہ کہ تجارت کے لئے ہو۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق چند مسائل

مولانا خورشید انور اعظمی[1]

دنیا میں پائی جانے والی تمام معدنیات میں سونے چاندی کو قدیم زمانے سے سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی انسانی معاشرے میں ان کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، بلکہ ان کی طرف میلان میں کچھ اضافہ ہی نظر آرہا ہے، اسی وجہ سے ہر زمانے میں متفقہ طور پر ان کی ثمنیت کو تسلیم کیا گیا ہے، انہیں خلقی اور حقیقی ثمن قرار دیا گیا ہے اور ان کے علاوہ دیگر اثمان کو اصطلاحی اور عرفی، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''اندفعوا إلى الاصطلاح على جوهر معدنية تبقى زمنا طويلا أن تكون المعاملة بها أمرا مسلما عندهم. وكان الأليق من بينها الذهب والفضة. لصغر حجمهما وتماثل أفرادهما وعظم نفعهما في بدن الإنسان ولتاتى التجمل بهما فكانا نقدين بالطبع وكان غيرهما نقدا بالاصطلاح'' (حجة الله البالغه ۱/ ۹۰)۔

(لوگوں کا خیال ہوا کہ طویل عرصے تک باقی رہنے والے ایسے جواہر معدنیہ پر اتفاق کیا جائے جن سے ان کے یہاں معاملہ کرنا متفق علیہ ہو، تو ان میں سونا چاندی، اپنے صغر حجم، تماثل افراد، بدن انسانی میں نفع عظیم اور ان سے حصول زینت کے سبب سب سے زیادہ مناسب نظر آئے، اس لئے یہ دونوں طبعی نقد ہوئے اور ان کے علاوہ اصطلاحی)۔

علامہ سرخسی نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ سونا چاندی خلقۃً ثمن ہیں اور ان کے علاوہ دیگر اثمان، عرفی اور اصطلاحی ہیں، مبسوط میں ہے:

''إن صفة الثمنية في الفلوس عارضة باصطلاح الناس فأما الذهب والفضة فثمن بأصل الخلقة''

(المبسوط ۱۲/ ۱۳۷)۔

(فلوس میں ثمنیت، لوگوں کی اصطلاح کے سبب عارضی ہے، اور سونا چاندی، اصل خلقت کے اعتبار سے ثمن ہیں)۔

۱- اس صورت حال میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر روپے سے سونا خریدا جائے تو روپے کی حیثیت مبیع کی ہوگی، اس وجہ سے کہ سونے چاندی کی تخلیق ہی ثمنیت کے لئے ہوئی ہے، لہذا اس کے مقابل میں ثمن عرفی کے ہونے کے باوجود اس کی ثمنیت برقرار رہے گی۔

علامہ کاسانی نے لکھا ہے: ''ثم الدراهم والدنانير عندنا أثمان على كل حال أي شيء كان في مقابلتها سواء دخله حرف الباء فيهما أو فيما يقابلهما، لأنهما لا تتعين بالتعيين بحال فكانت أثمانا على كل حال'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۳۴)۔

(پھر دراہم و دنانیر ہمارے نزدیک بہر حال ثمن ہیں، ان کے مقابل میں جو بھی ہو، خواہ حرف باء ان پر داخل ہوا ہو یا ان کے مقابل پر، اس لئے کہ یہ کسی بھی حالت میں متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے، لہذا یہ بہر حال ثمن ہوں گے)۔

پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ سونے سے روپیہ خریدنے کی صورت میں بظاہر ثمن سے ثمن کی بیع ہو رہی ہے، لہذا اسے بیع صرف ہونا چاہئے، لیکن بیع صرف کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ثمن خلقی سے ثمن خلقی کی بیع مراد ہے، نہ کہ دوسرے اصطلاحی اثمان، یہی وجہ ہے کہ

[1] صدر مدرس جامعہ [illegible]

فقہاء کرام نے اس کی تعریف میں ''ثمن مطلق'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے اس بات کی جانب واضح اشارہ ملتا ہے کہ اس سے ثمن کا فرد کامل ہی مراد ہے اور وہ ثمن خلقی ہے، چنانچہ علامہ کاسانی بیع صرف کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسم لبیع الأثمان المطلقة بعضها ببعض وهو بیع الذهب بالذهب والفضة بالفضة وأحد الجنسین بالآخر'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۱۵)۔

(بیع صرف، نام ہے اثمان مطلقہ کے بعض کا بعض سے فروخت کرنے کا، اور وہ سونے کا سونے سے، چاندی کا چاندی سے اور دو جنسوں میں سے ایک کا دوسرے سے فروخت کرنا ہے)۔

اسی طرح بنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

''و بیع الثمن المطلق بالثمن المطلق کبیع الدراهم والدنانیر بالدراهم والدنانیر وهو بیع الصرف'' (البنایہ ۸/ ۳)

(وہ ثمن مطلق کا ثمن مطلق سے بیع کرنا ہے جیسے دراہم و دنانیر سے دراہم و دنانیر کی بیع، اور یہ بیع صرف ہے)۔

علامہ حصکفی نے درمختار میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ بیع صرف میں اثمان سے مراد خلقی ہیں نہ کہ اصطلاحی، جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں:

''ہو بیع الثمن بالثمن أی ما خلق للثمنیة ومنه المصوغ جنسا بجنس أو بغیر جنس کذهب بفضة''

(الدرالمختار ۵/ ۲۵۷)

(وہ ثمن کی ثمن یعنی ایسی چیز سے بیع کرنا ہے جس کی خلقت ثمنیت کے لئے ہوئی ہے اور اس میں ڈھلا ہوا سونا بھی شامل ہے، ایک جنس کی اسی جنس سے یا دوسری جنس سے جیسے سونے کی چاندی سے)۔

زیر بحث مسئلے میں مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سونے سے روپیہ خریدنے کی صورت پر بیع صرف کا اطلاق نہیں ہوگا، علامہ سرخسی نے اس مسئلے کی بہت صاف لفظوں میں وضاحت فرمائی ہے، مبسوط میں ہے:

''وبیع الفلوس بالدراهم لیس بصرف'' (المبسوط ۱۴/ ۲۴) (فلوس کی دراہم سے بیع، صرف نہیں ہے)۔

(الف) جب یہ بات طے ہوگئی کہ مذکورہ صورت پر بیع صرف کا اطلاق نہیں ہوگا تو اسی کے ساتھ یہ بھی طے ہوگیا کہ اس پر بیع صرف کے احکام و شرائط کا بھی انطباق نہیں ہوگا، لہذا اگر سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد اور دوسرا ادھار ہو تو یہ بیع درست ہوگی، ماضی قریب کے جید عالم دین حضرت مفتی محمد یسین صاحب مبارکپوریؒ سے استفتاء کیا گیا کہ ''نمک، سونا، چاندی، لوہا، جو، گیہوں ان اشیاء کو روپے سے ادھار خریدنا کیسا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: چونکہ آج کل روپیہ میں چاندی بالکل نہیں ہے، لہذا اس سے تمام اشیاء مذکورہ کو ادھار خریدنا درست ہے'' (فتاوی احیاء العلوم ۱/ ۲۵۰)۔

(ب) حکومت یا کسی ادارے کے لئے کسی سامان کا نرخ طے کرنا شرعاً درست نہیں ہے، الا یہ کہ گراں فروشی بہت زیادہ ہو جائے تو حکومت مفاد عامہ کے پیش نظر سامانوں کا نرخ طے کرسکتی ہے، تاہم اگر کوئی شخص، حکومت یا کسی ادارے کی جانب سے سونے چاندی کی مقررہ قیمت سے کم وبیش پر خرید وفروخت کرتا ہے تو درست ہے، ہدایہ میں ہے:

''فإذا فعل ذلك وتعدی رجل عن ذلك وباع بأكثر منه أجازه القاضی وهذا ظاهر عند أبی حنیفة لأنه لا یری الحجر علی الحر وكذا عندهما'' (ہدایہ ۴/ ۴۷۲)۔

(جب قاضی نرخ طے کردے اور کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس سے زیادہ قیمت پر فروخت کردے تو قاضی اس کو جائز قرار دے گا، یہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ظاہر ہے اس وجہ سے کہ وہ آزاد آدمی کو تصرف سے روکنے کو صحیح نہیں سمجھتے، اسی طرح صاحبین کے یہاں بھی یہی ظاہر ہے)۔

اور نہ اس صورت پر ربا تفاضل کا اطلاق ہوگا حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ نے اس طرح کے سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

''رائج نوٹ اور اس کے سکے سونے چاندی کے حکم میں نہیں ہیں نہ ہی سونے یا چاندی کی رسید ہیں، لہذا ان سے بیع ذهب وفضہ بہر کیف جائز

ہے، تفاضل ونسیہ بھی جائز ہے'' (احسن الفتاوی ۶/ ۵۱۸)۔

۲- الف: زیور بنانے والے کاریگرز زیور بنانے کے عوض کوئی الگ سے اجرت نہیں لیتے بلکہ زیور بنانے میں سونے کے جو ذرات نکلتے ہیں وہ لے لیتے ہیں نیز زیور بنانے میں جو دوسری دھات کی آمیزش ہوتی ہے اس کے بقدر جو سونا ان کو بچ جاتا ہے، یہی ان کی اجرت ہوجاتی ہے، لین دین کی اس صورت کو اجارہ کہا جائے گا، اس وجہ سے کہ اجارہ میں کسی عوض مالی پر منفعت کا مالک بنانا ہوتا ہے قدوری میں اجارہ کی تعریف ہے:

''الإجارة عقد علی المنافع بعوض'' (ہدایہ ۳/ ۲۳۰) (اجارہ نام ہے منافع پر بعوض عقد کرنے کا)۔

''الجوہرۃ النیرہ'' میں ہے:

'الإجارة عقد علی المنافع بعوض مالی یتجدد انعقاده بحسب حدوث المنافع ساعة فساعة'' (الجوہرۃ النیرۃ ا/ ۲۵۹)

(اجارہ نام ہے منافع پر ایسے مالی عوض کے ذریعہ عقد کرنے کا جو حدوث منافع کے مطابق لحہ بہ لحہ منعقد ہوتا رہتا ہے)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ کو اجارہ تصور کیا جائے گا اس وجہ سے کہ زیور بنانے کا ریگر بنوانے والے کو مال کے عوض پر اپنے عمل کا نفع دے رہا ہے۔

ب: اجارہ میں اجرت ومنفعت معلوم ہونی چاہئے تا کہ باہم نزاعی صورت نہ پیدا ہونے پائے جیسا کہ درمختار میں ہے:

''شرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة'' (الدر المختار ۹/ ۷)۔

(اجارہ کی شرط یہ ہے کہ اجرت ومنفعت معلوم ہوں اس وجہ سے کہ ان کی جہالت سے نزاع پیدا ہوتا ہے)۔

مذکورہ مسئلے میں اجرت واضح نہیں ہے کہ کاریگر کو کتنے ذرات ہاتھ لگیں گے اور کتنی دھات کی آمیزش کے بقدر سونا مل پائے گا جس سے زیور بنوانے والے کو یہ شکایت ہوسکتی ہے کہ سونے کی زیادہ گھسائی کی وجہ سے ذرات زیادہ نکل گئے اور دھات کی مقدار ضرورت سے زیادہ ملادی گئی، کاریگر اس کے برخلاف کہے گا، اور جب کاریگر کو اسی سے اپنی اجرت نکالنی ہے تو جہاں طبیعت میں امانت داری کا ذرا سا بھی فقدان ہوگا وہاں کاریگر کا تجاوز کر جانا مستبعد نہیں ہے جس سے نزاع کا پیدا ہونا عین ممکن ہے اس لئے یہ اجارہ فاسدہ کے قبیل سے ہوگا۔

نیز دوسری بات یہ بھی ہے کہ اجارہ میں اجرت معقود علیہ کے جنس سے نہیں ہونا چاہئے جبکہ یہاں اسی کی جنس سے ہے جو درست نہیں ہے، علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

''أن لاتكون الأجرة منفعة وهي من جنس المعقود عليه كاجارة السكنى بالسكنى والخدمة بالخدمة والركوب بالركوب والزراعة بالزراعة حتى لايجوز شيء من ذلك عندنا'' (بدائع الصنائع ۴/ ۱۹۴)۔

(اجرت معقود علیہ کی جنس سے نہ ہو جیسے سکنی کا اجارہ سکنی سے، خدمت کا خدمت سے، سواری کا سواری سے، زراعت کا زراعت سے، یہاں تک کہ ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی بھی جائز نہیں ہے)۔

اس طرح لین دین کی یہ صورت درست نہیں ہے اور یہ اجارہ فاسدہ ہے، جس سے نزاعی صورت پیدا ہوتی ہے، فقہاء کرام نے رفع نزاع کے لئے اس صورت حال میں اجرت مثل طے کیا ہے، ہدایہ میں ہے:

''الواجب في الإجارة الفاسدة أجر المثل لايجاوز به المسمى'' (ہدایہ ۳/ ۲۲۷)۔

(اس لئے اس صورت میں زیور کے کاریگر کی اجرت، سونے کے ذرات کے علاوہ اجرت مثل ہوگی)۔

۳- اگر سونے کا تاجر پرانے زیور کی قیمت کم متعین کرے اور اس پرانے زیور کا نئے زیور سے تبادلہ ہو اور اس کمی کا لحاظ کرتے ہوئے پرانا زیور زیادہ وزن کا لیا جائے اور نیا زیور کم وزن میں اس کے بدلہ دیا جائے تو یہ صورت درست نہیں ہوگی اس لئے کہ سونا جس حالت میں ہو

سب کا حکم یکساں ہوتا ہے چنانچہ علامہ نوویؒ بیع صرف کے تعلق سے ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''قال العلماء هذا يتناول جميع أنواع الذهب والورق من جيد وردى وصحيح ومكسور وحلى وتبر وغير ذلك وسواء الخالص والمخلوط بغيره وهذا مجمع عليه''(شرح النووى ۱۱/ ۱۰)۔

''المغنی'' میں ہے:'' والجيد والردى والتبر والمضروب والصحيح والمكسور سواء فى جواز البيع مع التماثل وتحريمه مع التفاضل وهذا قول أكثر اهل العلم'' (المغنی ۸/ ۴)۔

۴- الف: اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس ایک کلو سونا ہو اور وہ دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے، لیکن ان سب کا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے جاتے ہوں اسے قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، اس وجہ سے کہ قبضہ میں ایسا ہونا چاہئے کہ مشتری، اپنے خریدے ہوئے مال پر پورے طور پر تصرف کر سکتا ہو، بدائع میں ہے:

''القبض عندنا التخلية والتخلى وهو ان يخلى البائع بين المبيع وبين المشترى برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشترى من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشرى قابضا له'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۴)۔

موقع ومحل کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، مگر درہم ودینار پر قبضہ، ہاتھ سے ہوتا ہے، جیسا کہ صاحب بدائع نے اس کی صراحت کی ہے:

''اما فى الدراهم والدنانير فتناولهما بالبراجم'' (بدائع ۵/ ۲۴۴)۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صورت کو قبضہ نہیں سمجھا جائے گا۔

ب: اور اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ ہو اور اس کو کمپیوٹر یا رجسٹر میں اس کے نام سے درج کر دیا گیا ہو تب بھی اس اندراج رجسٹر کو قبضہ کے لئے کافی نہیں سمجھا جائے گا جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیل سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ صرف رجسٹر میں اندراج کو قبضہ نہیں کہا جا سکتا یہ تو صرف بکنگ ہے، جس پر ابھی بائع کا پورے طور پر قبضہ ہے اور بیع کے تام ہونے سے پہلے بہت سے امکانات کے در آنے کا اندیشہ ہے، پھر اس صورت کو قبضہ قرار دینا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

۵- ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی اس صورت میں کہ ایک مخصوص مقدار میں سونے کا صرف سودا کر لیا جائے اس پر قبضہ نہ ہو اور جب ادائیگی کی تاریخ آئے تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھا جائے اور خریدنے اور ادائیگی کے دن کے نرخوں میں جو فرق ہو اس کی ادائیگی کر دی جائے نہ مشتری کا قبضہ سونے پر ہو اور نہ بائع کا قیمت پر، صرف نرخ میں جو کمی بیشی سے فرق آیا ہے اسی کا لین دین کر لیا جائے، نرخ میں اضافہ ہونے کی صورت میں خریدار دیدے اور کمی ہونے کی صورت میں بائع دیدے تو یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ یہ قمار ہے، علامہ ابن بطال نے قمار کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''هو من أكل المال بالباطل لأن المقامر يقول لصاحبه: إن كان كذا فلى كذا وان لم يكن فلك كذا'' (شرح صحيح البخارى لابن بطال ۶/ ۱۹۶)۔

(قمار مال کو باطل طریقے پر کھانے کو کہتے ہیں اس وجہ سے کہ قمار باز اپنے ساتھی سے کہتا ہے: اگر ایسا ہوگا تو میرا اتنا ہوگا اور اگر نہیں ہوگا تو تمہارا اتنا ہوگا)۔

شریعت اسلامی میں قمار حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

انما الخمر والميسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشيطان (سورۂ مائدہ: ۹۰)۔

نیز زیر بحث صورت مسئلہ میں بیع قبل القبض ہے جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے:

''عن حكيم بن حزام قال أتيت رسول الله ﷺ فقلت: ياتينى الرجل يسألنى من البيع ما ليس عندى، أبتاع له

من السوق ثم ابیعه؟ قال: لا تبع مالیس عندك'' (سنن ترمذی ۳/۵۲۶)۔

(حکیم بن حزام کا بیان ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے کہا کہ آدمی میرے پاس آ کر مجھ سے ایسی چیز کے بیچنے کی درخواست کرتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے تو کیا میں اس کے لئے بازار سے خریدوں اور اس کے ہاتھ فروخت کردوں؟ آپ نے فرمایا: ایسی چیز نہ فروخت کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے)۔

۶- اگر سونے چاندی کا تاجر، گراں فروشی کی غرض سے قیمت بڑھنے کے انتظار میں ان کو روک لے تو یہ احتکار نہیں ہوگا اس لئے کہ سونا چاندی غذائی اشیاء میں سے نہیں ہیں اور جو ذخیرہ اندوزی حرام ہے وہ صرف کھانے کی چیزوں میں ہے۔

علامہ نوویؒ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی: من احتکر فهو خاطئ کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''وهذا الحديث صريح في تحريم الاحتكار قال أصحابنا الاحتكار المحرم والاحتكار في الأقوات خاصة'' (شرح النووی علی صحیح مسلم ۱۱/ ۴۳)۔

(یہ حدیث احتکار کی حرمت کے سلسلے میں صریح ہے، ہمارے اصحاب نے کہا حرام احتکار سے مراد، خاص طور پر غذائی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی ہے)۔

اور اس کے آگے لکھتے ہیں:

''وأما غير الأقوات فلايحرم الاحتكار فيه بكل حال'' (شرح النووی علی صحیح مسلم ۱۱/ ۴۳)۔

(رہیں غیر غذائی اشیاء، تو ان میں کسی بھی حالت میں ذخیرہ اندوزی حرام نہیں ہے)۔

امام صاحبؒ کا یہی قول ہے، ہدایہ میں ہے:

''وتخصيص الاحتكار بالأقوات كالحنطة والشعير والتبن والقت قول أبي حنيفة'' (ہدایہ ۴/ ۴۷۰)۔

(ذخیرہ اندوزی کو غذائی اشیاء مثلاً گیہوں، جو، گھاس اور بھوسہ کے ساتھ خاص کرنا امام ابوحنیفہ کا قول ہے)۔

یہی قول امام محمد کا بھی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، رد المحتار میں کافی کے حوالے سے مذکور ہے:

''التقييد بقوت البشر قول أبي حنيفة ومحمد وعليه الفتوى'' (ردالمحتار ۶/ ۳۹۸)۔

(ذخیرہ اندوزی کے سلسلے میں انسانی غذا کی قید لگانا امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ سونا چاندی میں ذخیرہ اندوزی جائز ہے، البتہ آج کی موجودہ صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق فتویٰ دینے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے جس میں انہوں نے گراں فروشی کے لئے ہر اس چیز کے روکنے کو ذخیرہ اندوزی میں شمار کیا ہے جو عوام کے لئے ضرر رساں ہو، ''العنایہ'' میں ہے:

''قال أبو يوسف كل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتكار وإن كان ذهبا أو فضة أو ثوبا'' (العنایہ ۱۰/ ۵۸)۔

۷- اگر کوئی شخص کسی ملک میں جائز طریقے سے سونا خریدتا ہے اور اس کے واجبات ادا کئے بغیر، غیر قانونی طور پر اپنے ملک میں درآمد کرتا ہے تو اس کی خرید و فروخت شرعاً درست ہے اس لئے کہ وہ اپنے حلال و مملوکہ مال کی خرید و فروخت کر رہا ہے جو جائز ہے لیکن اس میں ملکی قانون کی خلاف ورزی ہے جس کی وجہ سے کسی بھی وقت کسی بھی پریشانی میں مبتلا ہونے کا شدید اندیشہ ہے اس لئے دائرہ شریعت میں رہتے ہوئے ہر ایسے عمل سے اجتناب کرنا چاہئے جس میں ملکی قانون کی خلاف ورزی لازم آئے اور اس کی وجہ سے دنیا کے سامنے بے عزت ہونا پڑے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے امور کے اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے جن سے آدمی کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا ينبغي للمسلم أن يذل نفسه، قيل: وكيف يذل نفسه، قال: يتعرض من البلاء لما لا يطيق''

(مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۳۴۴۴)۔

(کسی مسلمان کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے، پوچھا گیا کہ کوئی اپنے آپ کو کیسے ذلیل کرے گا، آپ نے فرمایا کہ وہ ایسی بلا سے تعرض نہ کرے جس کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو)۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ نے اس طرح کے سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

''اگر وہ مال نجس، ممنوع الاستعمال اور ممنوع البیع نہ ہو اور مالک سے خریدا ہوا ہو تو اس کی تجارت فی نفسہ حلال ہے لیکن حکومت کے قانون کے خلاف ہے اور مجرم سزا کا مستحق اور ذلیل ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے اس لئے ایسا معاملہ اختیار نہ کیا جائے'' (فتاوی رحیمیہ ۶/۲۷۸)۔

۸- یہ صحیح ہے کہ 'پلاٹین' ایک مہنگی دھات ہے اور آج کل اسے سفید سونا کہا جاتا ہے نیز اس سے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں لیکن لوگوں کے اس عرف کی وجہ سے یہ حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوگا اور نہ اس پر سونے کے احکام مرتب ہوں گے اس لئے کہ وہ حقیقت میں سونا نہیں ہے اور کسی دھات کو صرف سونا کہہ دینے سے اس پر حقیقی سونے کا حکم لگانا درست نہیں ہوگا، فقہ کا معروف قاعدہ ہے:

''ان العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی لا للألفاظ والمبانی'' (قواعد الفقہ۱/ ۱۸۰. غمز عیون البصائر فی شرح الاشباہ والنظائر ۲/ ۲۶۸) (عقود میں مقاصد ومعانی کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ الفاظ وحروف کا)۔

نیز پلاٹین کو سفید سونا کہنا مجازاً ہے نہ کہ حقیقتاً، اور کتب اصول فقہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ جب لفظ حقیقت ومجاز کے درمیان دائر ہو تو اسے حقیقت پر محمول کیا جاتا ہے نہ کہ مجاز پر الا یہ کہ کوئی قرینہ ہو جیسا کہ امام غزالی نے لکھا ہے:

''إذا دار اللفظ بين الحقيقة والمجاز فاللفظ للحقيقة إلى أن يدل الدليل أنه أراد المجاز ولا يكون مجملا كقوله: رأيت اليوم حمارا واستقبلني في الطريق أسد فلا يحمل على البليد والشجاع إلا بقرينة زائدة فإن لم تظهر فاللفظ للبهيمة والسبع'' (المستصفی ۱/ ۱۹۰)۔

(جب لفظ حقیقت ومجاز کے درمیان دائر ہو تو لفظ حقیقت کے لئے ہوتا ہے یہاں تک کہ دلیل سے معلوم ہو جائے کہ اس سے مجاز مراد لیا گیا ہے یہ مجمل نہیں ہوگا جیسے کسی نے کہا میں نے آج ایک گدھا دیکھا، اور راستے میں میرے سامنے ایک شیر آیا، تو اسے بیوقوف اور بہادر پر محمول نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ الگ سے کوئی قرینہ ہو اور اگر نہ ہو تو لفظ جانور اور درندے کے لئے ہوگا)۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مطلق سونے کی بات کرتا ہے تو کسی کا ذہن اس ''سفید سونے'' کی طرف نہیں جاتا بلکہ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ یہ گفتگو حقیقی سونے کے بارے میں ہو رہی ہے، اس لئے اس مجاز کو حقیقت کا درجہ حاصل نہیں ہوگا اور نہ 'پلاٹین' پر حقیقی سونے کا حکم مرتب ہوگا۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت کے جدید مسائل

مولانا بدر احمد مجیبی ندوی[1]

۱- موجودہ کرنسی نوٹ روپئے وغیرہ کے ذریعہ سونا یا چاندی خریدنا بیع صرف نہیں ہے، کیونکہ کرنسی نوٹ روپئے وغیرہ ثمن خلقی نہیں ہیں، یہ ثمن اصطلاحی ہیں اور بیع صرف ثمن خلقی میں ہوتی ہے، اس لئے یہ عام بیع ہے، اس کی وہی حیثیت ہے جو ثمن اصطلاحی فلوس کے ذریعہ سونا چاندی خریدنے کی ہے۔

بیع صرف کی تعریف ''الدر المختار'' میں یہ ہے: ''هو بيع الثمن بالثمن أى ماخلق للثمنية'' (الدر المختار)۔

کرنسی نوٹ روپئے وغیرہ خلقی ثمن نہیں ہیں، ان کی حیثیت فلوس کی ہے، جس طرح فلوس اصطلاحی اور عرفی ثمن ہیں، اسی طرح اس زمانے میں روپئے بھی اصطلاحی اور عرفی ثمن ہیں۔ فقہاء کرام نے صراحت فرمائی ہے کہ فلوس کی درہم و دینار (سونا چاندی) سے خرید و فروخت بیع صرف نہیں ہے، اس میں تقابض یعنی مجلس میں بدلین پر قبضہ ضروری نہیں ہے، ایک پر قبضہ کافی ہے۔

''لو باع الفلوس بالفلوس أو بالدراهم أو بالدنانير فنقد أحدهما دون الآخر جاز''۔
(البحر الرائق ۶/ ۱۳۲، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: المحیط البرہانی ۷/ ۲۷۱)۔

روپئے میں اور سونا، چاندی میں دو اعتبار سے فرق ہے: سونا چاندی خلقی ثمن ہیں اور روپیہ اصطلاحی ثمن ہے، سونا اور چاندی موزونی چیز ہے اور روپیہ عددی چیز ہے، اس لئے دونوں میں جنس کا بھی فرق ہے اور قدر کا بھی فرق ہے، جس طرح فلوس اور سونا چاندی میں جنس اور قدر دونوں کا فرق ہے، جب جنس اور قدر دونوں میں اتحاد نہیں ہے تو مجلس میں دونوں پر قبضہ بھی ضروری نہیں ہے۔ ''وعلته القدر مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل والنساء، وإن عدما حلا، وإن وجد أحدهما حل الفضل وحرم النساء'' (تنویر الابصار)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس بیع کے بیع صرف نہ ہونے کے درج ذیل دلائل دیئے ہیں:

۱- کرنسی نوٹوں کا ثمن ہونا تو اب واضح ہو چکا ہے، لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ ان کو ثمن خلقی کہا جائے گا یا ثمن اعتباری اور ثمن عرفی؟

ظاہر ہے کہ انہیں ثمن خلقی قرار دینے کا کوئی راستہ نہیں، لازماً انہیں ثمن اعتباری یا ثمن عرفی ہی کہا جا سکتا ہے، لہٰذا ان کا حکم فلوس جیسا ہوگا، کیونکہ وہ بھی ثمن اعتباری ہیں۔ بلکہ نوٹوں کا ثمن اعتباری ہونا زیادہ واضح ہے، کیونکہ ان کی ذاتی قدر و قیمت فلوس سے بھی کم ہوتی ہے، انہیں ثمن بنانے والی چیز اعتبار اور اصطلاح کے سوا کچھ نہیں۔ فلوس کے بارے میں فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ ان کا باہم تبادلہ صرف نہیں، نہ اس میں تقابض فی المجلس ضروری ہے۔

۲- اگر کرنسی نوٹوں کے باہم تبادلہ کو صرف کہا جائے تو لازم آئے گا کہ جن اشیاء میں صرف جاری ہوتا ہے ان میں ایک چیز کا اضافہ ہو گیا۔ یعنی نصوص سے صرف سونے چاندی میں صرف جاری ہونا ثابت ہے، اب لازم آئے گا کہ کرنسی نوٹ میں بھی سونے چاندی کے علاوہ صرف جاری ہو، ''مایجری فیه الصرف'' میں اس اضافے کی کوئی بنیاد نصوص یا کلام فقہاء میں نہیں ملتی۔

۳- نوٹوں کی پشت پر اب نہ کوئی سونا ہے، نہ چاندی ہے۔ لہٰذا ان کو سونے چاندی کا نمائندہ قرار دے کر بھی ان پر صرف کے احکام جاری کرنا مشکل ہے۔

۴- اگر ان میں صرف جاری کیا جائے اور ساتھ ہی سونے چاندی میں بھی صرف کو بدستور جاری سمجھا جائے تو سوال یہ ہے کہ کرنسی نوٹ سے سونا چاندی خریدنے کو صرف کہا جائے گا یا نہیں؟ اگر کہا جائے گا تو عجیب بات یہ ہے کہ غالب الغش سکوں سے سونے یا چاندی کے تبادلہ کو کلی طور پر صرف نہ کہا جائے جبکہ غالب الغش سکوں میں کچھ نہ کچھ سونا یا چاندی ہوتا ہے اور صرف ان ہی کے وزن کی حد تک ان میں تقابض شرط ہوتا ہے، زیادہ

---

[1] صدر مدرس المعہد العالی امارت شرعیہ، پھلواری شریف۔

میں نہیں۔ اور کرنسی نوٹ کے تبادلہ کو کلی طور پر صرف کہا جائے جبکہ ان میں سونا چاندی بالکل موجود نہیں ہے (فتاوی عثمانی ۳/۱۴۳)۔

''فتاوی محمودیہ'' میں ہے: ''آج کل روپئے (نوٹ) یا سکہ رائج الوقت سے چاندی سونا اگر خرید اجائے تو یہ بیع صرف نہیں، جس میں برابری اور تقابض فی المجلس (ہاتھ در ہاتھ) ہونا ضروری ہو'' (فتاوی محمودیہ ۲۳/۵۳۹)۔

اس لئے کرنسی نوٹ روپئے وغیرہ سے سونا چاندی خریدنا بیع صرف نہیں ہے اور اس میں مجلس عقد میں بدلین پر قبضہ ضروری نہیں ہے۔

الف- جب یہ بیع صرف نہیں ہے تو یہ صورت درست ہے کہ روپئے کے ذریعہ سونا چاندی کی خرید وفروخت میں بدلین میں سے کوئی ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار ہو۔

ب- سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر کومیکس گولڈ مارکیٹ یا ہندوستان کی سطح پر یہاں کی مارکیٹ MC نے طے کیا ہو اس سے زیادہ یا کم قیمت میں خرید وفروخت کرنا جائز ہے۔ کیونکہ مبیع کی قیمت متعین کرنے کا بائع اور مشتری کو اختیار ہوتا ہے۔ وہ جس قیمت کو طے کر کے اس پر بیع کرتے ہیں بیع درست ہوجاتی ہے۔

البتہ اگر غبن فاحش پایا جائے اور مشتری کو اس میں بائع کی طرف سے دھوکہ دیا گیا ہو تو مشتری کو خیار حاصل ہوگا۔ مثلاً بائع کہہ رہا ہے کہ سونے کی قیمت بازار میں ساڑھے تین ہزار روپئے فی گرام ہے، مشتری نے اس پر اعتبار کرتے ہوئے اس قیمت پر سونا خرید لیا اور بعد میں مشتری کو معلوم ہوا کہ مارکیٹ میں سونے کی قیمت تین ہزار روپئے فی گرام ہے اور بائع نے اس کو دھوکہ دے کر زیادہ قیمت بتادی تھی تو اس صورت میں مشتری کو لوٹانے کا خیار ہوگا (دیکھئے: تبیین الحقائق ۴/۴۳۴)۔

''إذا غرّ البائع المشتري وقال له: قيمةُ متاعي كذا فاشتره، فاشتراه بناءً على قوله ثم ظهر فيه غبن فاحش فإنه يردّه وبه يفتي'' (الاشباہ والنظائر/ ص ۲۱۵)۔

۲- الف: یہ اجارہ کی صورت ہے۔ کیونکہ زیورات کا تاجر زیور بنانے والے سے کام لے رہا ہے اور زیور بنوا رہا ہے۔ لہذا یہ اجارہ ہے۔

ب- اگر اس کا عرف ورواج ہو کہ زیور بنانے والا علیحدہ سے اجرت نہیں لیتا، صرف بچے ہوئے سونے کے ذرات لیتا ہے تو اسی کو اجرت قرار دیا جائے گا۔ اگر یہ متعین ہو کہ دوسری دھات کی آمیزش کتنی ہوگی جس کے بقدر سونے کے ذرات (بطور اجرت) زیور بنانے والے کو ملیں گے تو اجرت مجہول نہیں رہے گی اور یہ بیع درست ہوگی۔ اگر یہ متعین نہیں ہو بلکہ زیور بنانے والے کو اختیار ہو کہ وہ جتنی چاہے دھات کی آمیزش کرے تو اس صورت میں اجرت مجہول ہوگی اور اجارہ فاسد ہوگا۔ اس میں نزاع کا بھی اندیشہ ہے۔

۳- سونے کے نئے زیور اور پرانے زیور کے ایک دوسرے سے خرید وفروخت میں سونا وزن میں برابر ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ سونے کی سونے سے بیع ہے جو بیع صرف ہے اور اس میں جنس اور قدر کا اتحاد ہے جس میں تفاضل حرام ہوتا ہے۔ اس لئے جو صورت بیان کی گئی ہے کہ زیادہ وزن کے سونے کے پرانے زیور سے کم وزن کے سونے کے نئے زیور سے تبادلہ کیا جائے یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ بدلین میں سے ایک میں زیادتی پائی جارہی ہے جو ربا الفضل ہے۔

۴- اس صورت میں سونے پر خریدار کا قبضہ نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ مختلف افراد کا خرید کردہ سونا سب ایک ہی سونے کی اینٹ میں یکجا دوسرے لوگوں کے سونے کے ساتھ ملا ہوا ہے، علیحدہ نہیں ہے، اس پر قبضہ کی کوئی شکل نہیں پائی جارہی ہے کیونکہ وہ حق غیر میں مشغول ہے، اس لئے یہ خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا ہے۔

''ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل'' (الدر المختار)۔

''قوله بلا مانع - بأن يكون مفرزًا غير مشغول بحق غيره - وفي الملتقط: ولو باع دارًا وسلمها إلى المشتري وله فيها متاع قليل أو كثير لا يكون تسليمًا حتى يسلمها فارغة وكذا لو باع أرضًا وفيها زرع'' (رد المحتار للشامی ۷/۸۳)۔

ب- خریدار کے خرید کردہ سونے کے مقدار کا سکہ علیحدہ موجود ہے اور اس کو رجسٹر یا کمپیوٹر پر اس کے نام سے اندراج کرلیا جائے تو بھی قبضہ

متحقق نہیں ہوگا۔ کیونکہ قبضہ کی حقیقت یہ ہے۔

''ولا یشترط القبض بالبراجم، لأن معنی القبض هو التمکین والتخلی وارتفاع الموانع عرفًا وعادةً حقیقةً'' (بدائع ۴/۲۴۴)۔

''التسلیم والقبض عندنا هو التخلیة والتخلی، وهو أن یخلی البائع بین المبیع وبین المشتری برفع الحائل بینهما علی وجه یتمکن المشتری من التصرف فیه، فیجعل البائع مسلمًا للمبیع والمشتری قابضًا له وکذا تسلیم الثمن من المشتری إلی البائع'' (بدائع، فصل فی حکم البیع)۔

صرف کمپنی کے رجسٹر میں یا کمپیوٹر میں خریدار کے نام پر اس کے اندراج سے اس سونے پر خریدار کا قبضہ کیسے متحقق ہوگا۔ کیونکہ تخلیہ، تمکین اور ارتفاع موانع نہیں پائے گئے۔

۵- بیان کردہ صورت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس میں سونے کی خرید وفروخت عاقدین کا مقصد ہی نہیں ہے۔ صرف ظاہری طور پر بیع کے الفاظ ادا کئے جاتے ہیں۔ نہ بائع (کمپنی) کا مقصد سونا بیچنا ہوتا ہے اور نہ خریدار کا مقصد سونا خریدنا ہوتا ہے۔ نہ مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے اور نہ بائع قیمت پر۔ اس لئے یہ بیع تلجیہ کی طرح ہے جس میں ظاہری طور سے بیع کی جاتی ہے جبکہ حقیقت میں عاقدین کا بیع کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا ہے۔ ائمہ احناف کے نزدیک بیع تلجیہ درست نہیں ہوتی اس لئے یہ بیع بھی درست نہیں ہوگی۔ بیع تلجیہ کی تفسیر اور اس کا حکم بدائع میں اس طرح بیان کیا گیا ہے (تفصیل کے دیکھئے: بدائع الصنائع، الدر المختار)۔

جب صورت مذکورہ میں بیع ہی منعقد نہیں ہوئی تو اس پر جو نفع دکھایا جا رہا ہے وہ کیسے درست ہوگا؟ نفع کے نام پر اس طریقہ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے اور یہ طریقہ شرعاً درست نہیں ہے۔

۶- احتکار کی تعریف صاحب بدائع اس طرح کرتے ہیں۔

''فهو أن یشتری طعامًا فی مصر ویمتنع عن بیعه وذلك یضر بالناس'' (بدائع)۔

حدیث نبوی سے احتکار کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔

''لایحتکر إلا خاطئ'' (مسلم، باب تحریم الاحتکار)۔

''الجالب مرزوق والمحتکر ملعون'' (ابن ماجه، باب الحکرة والجلب)۔

کن چیزوں میں احتکار کی حرمت ہے؟ اس میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک احتکار صرف ''اقوات'' میں ہے، یعنی غلہ کی چیزوں میں احتکار حرام ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جن چیزوں کے روک لینے سے لوگوں کو نقصان پہنچے اس میں احتکار حرام ہے، خواہ وہ کپڑا ہو یا دراہم، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک بھی احتکار کی حرمت غلہ کی چیزوں کے ساتھ خاص ہے (تبیین الحقائق، الانصاف للمرداوی ۴/۲۴۴)۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ احتکار کی حرمت کا تعلق غلہ کی چیزوں سے ہے۔ سونا سے نہیں ہے۔ اس لئے قیمت میں اضافہ کے پیش نظر سونے کو روک لینا اور مارکیٹ میں فروخت نہیں کرنا احتکار میں شامل نہیں ہے اور یہ حرام نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سونا ایسی ضروری چیز نہیں ہے جس کے روک لئے جانے سے عوام الناس شدید ضرر میں مبتلا ہو جائیں۔

۷- شرعی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس کی خرید وفروخت جائز ہے، کیونکہ مشتری نے اس کو خریدا ہے اور خرید کر فروخت کر رہا ہے، مگر ایسے سونے کی درآمدگی میں چونکہ حکومت کے واجبات ادا نہیں کئے جاتے ہیں اور حکومت کی طرف سے اس پر پابندی بھی ہوتی ہے اس لئے اس سے بچنا ضروری ہے۔ کیونکہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں وہاں کے قوانین کا احترام اور اس کی پابندی بھی ضروری ہے۔

۸- سونا اور چاندی ایسی چیزیں ہیں جو خلقۃً ثمن ہیں۔ دوسری چیزیں اس وصف میں اس کے برابر نہیں ہوسکتی ہیں۔ ان پر سونے کا حکم نہیں لگ سکتا ہے، اس لئے ''پلاٹین'' یا کوئی دوسری دھات ہو خواہ وہ کتنی ہی بیش قیمت ہو جائیں ان پر سونے کے احکام ثابت نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

سونے چاندی کی تجارت کی جدید شکلیں اور ان کے شرعی احکام

مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی [1]

۱- الف: روپے کے ذریعہ سونے، چاندی کی خرید وفروخت بیع صرف میں داخل نہیں ہے، لہذا بدلین پر مجلس واحد میں قبضہ ضروری نہیں ہے بلکہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ کافی ہے اس لئے کہ شریعت اسلامیہ میں روپے کی حیثیت ثمن اصطلاحی کی ہے اور فقہاء کرام نے ثمن خلقی اور ثمن اصطلاحی میں اس مسئلہ میں فرق کیا ہے یعنی سونا، چاندی کی خرید وفروخت ایک دوسرے کے بدلہ کی جائے تو ایک ہی مجلس میں بدلین پر قبضہ ضروری ہے جبکہ سونا یا چاندی کو فلوس نافقہ کے ذریعہ خریدا یا بیچا جائے تو بدلین پر ایک مجلس میں قبضہ ضروری نہیں ہے جیسا کہ ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ہے:

''وإن اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلسًا وليست الفلوس عنده فهو جائز تقابضا قبل التفرق أم لم يتقابضا لأن هذا بيع ليس بصرف'' (فتاویٰ ہندیہ ۳/ ۲۲۴)۔

(اور اگر چاندی یا سونے کی انگوٹھی جس میں نگینہ ہو یا نہ ہو، ایک متعینہ فلوس کے ذریعہ خریدی اور فلوس اس شخص کے پاس موجود نہ ہو تو بیع جائز ہے جدا ہونے سے قبل دونوں نے قبضہ کیا ہو یا نہ کیا ہو اس لئے کہ یہ بیع صرف نہیں ہے)۔

علامہ شامی نے حانوتی سے اس کے جواز کا قول نقل کیا ہے:

''سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين'' (رد المحتار ۷/ ۴۱۴)۔

(حانوتی سے سوال کیا گیا سونے کی بیع فلوس کے ذریعہ ادھار کے سلسلہ میں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ جائز ہے بشرطیکہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ ہو جائے)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب کا فتویٰ بھی جواز ہی کا ہے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''وذكرت أنها ليست قائمة مقام الذهب في جميع الأمور فلا تجري فيها أحكام الصرف ولذالك يجوز عندي أن يشترى الذهب أو الفضة بالنقود ويجوز أيضا أن يشترى الذهب نسئية الأوراق النقدية ولكن يجب أن يكون تقابض أحد البدلين في المجلس'' (فتاویٰ عثمانی ۳/ ۱۵۹)۔

(اور میں نے (اپنے رسالہ میں) ذکر کیا ہے کہ روپے تمام احکام میں سونا کے قائم مقام نہیں ہیں، بس اس میں صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے اور اسی وجہ سے میرے نزدیک سونا روپے کے بدلہ ادھار خریدنا جائز ہے، لیکن بدلین میں سے ایک پر قبضہ مجلس میں ضروری ہے)۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ کا رجحان بھی جواز ہی کا ہے، چنانچہ وہ ایک استفتاء کے جواب میں رقمطراز ہیں: رائج نوٹ اور سکے سونے، چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے یا چاندی کی رسید ہیں، لہذا ان سے بیع ذہب وفضہ بہر کیف جائز ہے تفاضل ونسیہ بھی جائز ہے (احسن الفتاویٰ ۶/ ۵۱۸)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ راقم الحروف کے نزدیک روپے کے ذریعہ سونا وچاندی کی خرید وفروخت ادھار شرعا جائز درست ہونی چاہیے اور یہ بیع صرف نہیں ہے۔

(ب) فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ سونا اور چاندی کی خرید وفروخت ایک دوسرے سے کمی بیشی کے ساتھ جائز ودرست ہے اس لئے کہ دونوں کی جنس مختلف ہے۔

''وإن باع الذهب بالفضة جاز التفاضل لعدم المجانسة'' (ہدایہ ۳/ ۱۰۵)۔

---

[1] مفتی امارت شرعیہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

(اور اگر سونے کو چاندی کے بدلہ فروخت کیا جائے تو زیادتی جائز ہے جنس ایک نہ ہونے کی وجہ سے)۔

اور روپیہ اور سونا یا چاندی یہ دونوں ہم جنس نہیں ہیں بلکہ دونوں مختلف جنس ہیں۔ لہذا سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر میکس گولڈ مارکیٹ یا ہندوستانی سطح پر ایم سی نے طے کیا ہو اس سے زیادہ یا کم قیمت پر خرید و فروخت کر سکتے ہیں، شرعاً جائز و درست ہے، اس پر ربا الفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا، اس لئے کہ تفاضل ربا میں اس وقت داخل ہے جبکہ دونوں کا قدر و جنس ایک ہو لیکن اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک مفقود ہو یعنی قدر ایک ہو، جنس ایک نہ ہو، یا جنس ایک ہو، قدر ایک نہ ہو، تو اس صورت میں تفاضل ربا نہیں ہے، بلکہ جائز و حلال ہے۔

''وعلته أي علة تحريم الزيادة القدر المعهود بكيل أو وزن مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل أي الزيادة ... وإن وجد أحدهما أي القدر وحدة أو الجنس حل الفضل'' (الدر المختار کتاب البیوع باب الربا ۷/ ۴۰۳، ۴۰۴)۔

(اور زیادتی کی حرمت کی علت قدر یعنی کیلی یا وزنی جنس کے ساتھ ہو تو جب دونوں پایا جائے تو فضل یعنی زیادتی حرام ہے اور اگر دونوں میں سے ایک یعنی صرف قدر یا صرف جنس پایا جائے تو زیادتی حلال ہے)۔

۲- الف: تاجر کا زیور بنانے کے لئے سونا کاریگر کو دینا اور کاریگر کا زیور بنا کر واپس کرنا اور آمیزش کے بقدر بچے ہوئے سونے کے ذرات کو اپنے پاس رکھ لینا یہ بیع نہیں ہے بلکہ یہ اجارہ ہے، اس لئے کہ بیع کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی ہے، بیع کی تعریف ہے:

''مبادلة المال بالمال بالتراضي'' (فتاویٰ ہندیہ ۲/ ۲)۔

(آپسی رضامندی سے مال کا تبادلہ مال کے ذریعہ) اور یہاں مال کا تبادلہ مال کے ذریعہ نہیں ہو رہا ہے۔

ب- رہا یہ سوال کہ زیورات بنانے میں جو ذرات بچ جائیں وہی اجرت قرار پائے اس طرح کی اجرت جائز ہے یا نہیں؟ جب مذکورہ صورت پر ہم غور کرتے ہیں تو بظاہر دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں:

۱۔ اجرت مجہول ہے۔ ۲۔ اجرت عامل کے عمل (جزء عمل) سے قرار پائی ہے۔ اور اصولاً یہ دونوں چیزیں مفسد اجارہ ہیں۔

لیکن جہاں تک اجرت کے مجہول ہونے کی بات ہے تو میری سمجھ کی حد تک یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ تاجر اور کاریگر دونوں اپنے اپنے مشاہدے و تجربے کی وجہ سے جانتے ہیں کہ زیور بنانے کی صورت میں کتنی مقدار میں سونے کے ذرات بچ جائیں گے، تو گویا دونوں کے نزدیک وہ ذرات معلوم و متعین ہیں، اور اگر اجرت کے مجہول ہونے کی بات تسلیم کر لی جائے تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اجرت کے مجہول ہونے کی صورت میں مفسد اجارہ ہونے کی علت فقہاء نے مفضی إلی النزاع لکھی ہے، یعنی جب اجرت متعین نہ ہوگی مجہول ہوگی تو جھگڑا پیدا ہوگا۔

''وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة'' (الدر المختار علی صدر رد المحتار ۹/۷)۔

(اجرت کی شرط یہ ہے کہ اجرت اور منفعت معلوم ہو اس لئے کہ ان دونوں کی جہالت جھگڑے کا سبب ہے)۔

علامہ علاء الدین کاسانی نے اجرت کی جہالت کے سلسلہ میں بڑی ہی اہم اور قیمتی بات تحریر فرمائی ہے کہ ایسی جہالت جو جھگڑے کا سبب نہ ہو وہ صحت اجارہ کیلئے مانع نہیں ہے اس لئے کہ اس صورت میں اجرت کی حوالگی جو اجارہ کا مقصد ہے ممکن ہے۔

''منها أن يكون المعقود عليه والمنفعة معلومًا علمًا يمنع من المنازعة فإن كان مجهولًا ينظر إن كانت تلك الجهالة مفضية إلى المنازعة تمنع صحة العقد وإلا لا۔ لأن الجهالة المفضية إلى المنازعة تمنع من التسليم والتسليم فلا يحصل المقصود من العقد فكان العقد عبثًا لخلوه عن العاقبة الحميدة وإذا لم تكن إلى المنازعة يوجد التسليم والتسليم فيحصل المقصود'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۴، ۲۵)۔

(اس میں (صحت اجارہ کے شرائط) سے یہ ہے کہ معقود علیہ یعنی منفعت ایسا معلوم و متعین ہو کہ جھگڑے کو روک دے، پس اگر مجہول ہو تو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ جہالت مفضی إلی النزاع ہے تو عقد کی صحت کے لئے مانع ہوگا ورنہ نہیں، اس لئے کہ جو جہالت مفضی إلی النزاع ہو وہ تسلیم کو روک دے گی اور اس صورت میں عقد کا مقصد حاصل نہ ہوگا، لہذا اچھے انجام سے خالی ہونے کی وجہ سے عقد لغو ہوگا اور جب (جہالت) منازعت کا سبب نہ ہو تو تسلیم پایا جائے گا، اور جب تسلیم پایا جائے گا تو مقصود حاصل ہو جائے گا)۔

مذکورہ صورت میں چونکہ تاجر اور کاریگر کے درمیان کوئی نزاع پیدا نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ جہالت صحت اجارہ کے لئے مانع نہیں ہونا چاہئے۔

رہی بات اجرت عامل کے عمل سے قرار پائی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرف وعادت وہ اصول ہیں جن پر بے شمار احکام کی بنیاد ہے، اسی میں سے مزارعت کا مسئلہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مزارعت جائز نہیں ہے، البتہ عرف ورواج کو دیکھتے ہوئے احناف نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا حالانکہ کھیتی بٹائی پر کرنے کی صورت میں بٹائی کرنے والے کو پیداوار کا ایک حصہ ہی بطور اجرت ملتا ہے، جو عامل کے جزعملی کو اجرت بنانے کی واضح نظیر ہے۔

''قال أبو حنيفة المزارعة بالثلث والربع باطلة ... وقالا جائزة ... أن الفتوىٰ على قولهما لحاجة الناس إليها ولظهور تعامل الأمة لها والقياس يترك بالتعامل'' (ہدایہ کتاب المزارعۃ ۴/ ۴۲۵، ۴۲۴)۔

اسی طرح فقہاء نے پھلوں میں بٹائی داری کو جائز قرار دیا ہے، جبکہ یہاں بھی صراحۃً عامل کے عمل سے اجرت قرار پائی ہے۔

اسی سے جڑا ہوا مسئلہ جانور بٹائی پر دینے کا بھی ہے، اس سلسلہ میں ہمارے اکابر حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا رجحان عموم بلوی کی وجہ سے جواز کا معلوم ہوتا ہے۔

''لیکن بنا بر نقل بعض اصحاب امام احمد کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے، پس تحرز احوط ہے اور جہاں ابتلاء شدید ہو، توسع کیا جاسکتا ہے'' (امداد الفتاویٰ ۳/ ۳۴۳)۔

اور بعض مستند اداروں سے بھی جانور بٹائی پر دینے کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔ الحاصل راقم الحروف کی رائے میں یہ عرف ورواج ہے کہ زیور بنانے کے بعد جو ذرات بچ جاتے ہیں وہی کاریگر کی اجرت ہوتی ہے تو اس کو جائز ہونا چاہئے۔

۳- سونا، سونا ہے خواہ نیا ہو یا پرانا، پرانا یا نیا ہونے سے سونے کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، کیونکہ نیا اور پرانا ہونا وصف ہے اور وصف میں فرق کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس لئے نئے سونے کے زیور کا تبادلہ پرانے سونے کے زیور سے کمی بیشی کے ساتھ شرعاً ناجائز وحرام ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ عمدہ سونے کی خرید وفروخت رڈی سونے کے ذریعہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ عمدہ اور رڈی وصف ہے اور وصف میں تفاوت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

''لا يجوز بيع الجيد بالردى مما فيه الربوٰ إلا مثلًا بمثلٍ لاهدار التفاوت فى الوصف'' (ہدایہ کتاب البیوع باب الربا ۳/ ۷۹)۔

(عمدہ کی بیع رڈی کے ذریعہ ان اشیاء میں جو اموال ربویہ میں سے ہیں جائز نہیں ہے، الّا یہ کہ برابر سرابر ہو، وصف میں تفاوت کے باطل ہونے کی وجہ سے)۔

علامہ علاء الدین حصکفی نے یہ صراحت کی ہے کہ اموال ربویہ میں جید اور ردی برابر ہے:

''وجيد مال الربوا .... ورديئه سواء'' (الدر المختار علی صدر المحتار ۷/۴۱۲؛ کتاب البیوع باب الربا)۔

علامہ شامی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ جید کی بیع ردی کے ذریعہ ان چیزوں میں جن میں ربا ہے جائز نہیں ہے مگر یہ کہ برابر سرابر ہو۔

''قوله (وجيد مال الربا ورديئه سواء) أى فلا يجوز بيع الجيد بالردئ مما فيه الربا إلا مثلا بمثل'' (۷/۴۱۲)۔

۴- اس سوال کے جواب سے قبل قبضہ کی حقیقت شریعت کی نگاہ میں کیا ہے؟ اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اس لئے جواب سے قبل قبضہ کی حقیقت لکھی جارہی ہے۔

کتاب وسنت میں قبضہ کی کوئی خاص صورت ونوعیت متعین نہیں ہے اور اصول یہ ہے کہ جن چیزوں کی شریعت اسلامیہ اور لغت میں کوئی تحدید نہ ہو وہ چیزیں عرف وعادت پر محمول ہوں گی۔ ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے:

''كل ما ورد به الشرع مطلقًا ولا ضابط له فيه ہولا فى اللغة يرجع فيه إلى العرف ومثلوه بالحرز فى السرقة والتفرق فى البيع والقبض'' (الأشباه والنظائر للسيوطى :۱۹۶)۔

(شریعت میں جو لفظ مطلق وارد ہوا ہو اور اس کی بابت نہ تو شریعت میں کوئی ضابطہ مقرر ہو اور نہ ہی لغت میں، تو اس میں عرف کی طرف لوٹایا جائے گا اور فقہاء نے اس کی مثال چوری کے مسئلہ میں حرز (حفاظت) بیع میں تفرق اور قبضہ سے دی ہے)۔

اور صاحب درمختار قبضہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ بائع اور مشتری کے درمیان ایسا تخلیہ جس سے قبضہ پر قدرت ہو جائے اور کوئی چیز رکاوٹ اور حائل نہ ہو یہ تخلیہ قبضہ سمجھا جائے گا۔

''ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع وحائل'' (الدر المختار على صدر رد المحتار ۹۲/۴)۔

اور تخلیہ مبیع کی حالت وکیفیت کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، چنانچہ علامہ محمد بن عابدین شامیؒ ''على وجه يتمكن من القبض'' کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں، تخلیہ بھی حکماً قبضہ ہے اور ہر چیز کا قبضہ اسی کے حساب سے ہے، مثلاً اگر کسی گھر میں گیہوں وغیرہ ہے تو اس کا تخلیہ یہ ہے کہ کنجی مشتری کے حوالہ کردی جائے اور وہ بغیر تکلف وپریشانی کے مکان کھولنے پر قادر ہو اور اگر مکان ہے تو اس کا تخلیہ یہ ہے کہ اس کے بند کرنے پر مشتری قادر ہو اور جانوروں میں اس کا تخلیہ یہ ہے کہ چراگاہ میں جانور دکھلا دیا جائے اور اس کی جانب اشارہ کردیا جائے اور کپڑا ہے تو اتنا قریب ہو کہ مشتری جب ہاتھ اس کی جانب بڑھائے تو ہاتھ کپڑے تک پہونچ جائے۔ کسی مکان میں بند گھوڑے اور پرندے پر قبضہ اس وقت متصور ہوگا جبکہ مشتری بغیر کسی کی مدد کے ان کو پکڑ سکے وغیرہ۔

''وحاصله أن التخلية قبض حكما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلا فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض أي بأن تكون في البلد فيما يظهر وفي نحو بقر في مرعى فكونه بحيث يرى ويشار إليه قبض وفي نحو ثوب فكونه بحيث لو مد يده تصل إليه قبض وفي نحو فرس أو طير في بيت إمكان أخذه منه بلا معين قبض'' (رد المحتار مطلب في شروط التخلية ۹۲/۴)۔

علامہ کاسانیؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب بدائع الصنائع میں قبضہ کی حقیقت ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

''لا يشترط بالبراجم لأن من القبض هو التمكين والتخلية وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة''
(بدائع الصنائع ۴/ ۲۴۴)۔

(انگلیوں سے قبضہ شرط نہیں ہے اس لئے کہ قبضہ کا مطلب تمکین تخلیہ اور عرف وعادت وحقیقت کے اعتبار سے رکاوٹ کا ختم ہو جانا ہے)۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ مبیع اور مشتری کے درمیان ایسا تخلیہ جس سے قبضہ پر قدرت ہو جائے اور کوئی چیز رکاوٹ اور حائل نہ ہو قبضہ سمجھا جائے گا، لہٰذا مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں راقم الحروف کے نزدیک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پہلی صورت جب تمام خریدار کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ کی شکل میں ہے تو اس کو خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، اس لئے کہ مبیع ممیز وممتاز نہیں ہے، جس کی وجہ کر تمام خریدار اپنے اپنے حصے بقدر مبیع کے قبضہ کرنے پر قادر نہیں ہیں، البتہ دوسری صورت میں جبکہ ہر خریدار کے لئے سونے کا سکہ علاحدہ علاحدہ رکھا ہوا ہے اور اس کو کمپنی کے ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام پر درج کردیا گیا اور قبضہ سے کوئی چیز مانع ورکاوٹ نہیں ہے مشتری جب چاہے اس پر قبضہ کرسکتا ہے تو اس کو مشتری کا قبضہ تصور کیا جائے گا، اس لئے کہ اس پر قبضہ کی تعریف صادق آتی ہے۔

۵- مذکورہ صورت میں جبکہ معاملہ آپس کے قبضہ کے بغیر طے ہوتا ہے کہ نہ تو خریدار مبیع پر قبضہ کرتا ہے اور نہ ہی بیچنے والا ثمن (قیمت) پر قبضہ کرتا ہے، یعنی مبیع بائع کے پاس اور ثمن مشتری کے پاس رہتا ہے گویا مبیع اور ثمن دونوں ادھار ہیں، اور جب مبیع اور ثمن دونوں ادھار ہوں تو حدیث شریف میں ایسے بیع کی ممانعت آئی ہے۔

''عن ابن عمر أن النبي ﷺ نهى عن بيع الكالي بالكالي'' (الدارقطني ۳/ ۷۰ كتاب البيوع)۔

(حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھار کی بیع ادھار کے ذریعہ سے منع فرمایا ہے)۔

لہٰذا مذکورہ طریقہ پر کاروبار شرعاً جائز نہیں ہے۔

۶- احتکار کی لغوی تعریف: لغت میں گراں فروشی کی نیت سے غلہ کی ذخیرہ اندوزی احتکار ہے۔

''الاحتكار لغة حبس الطعام إرادة الغلاء'' (الموسوعة الفقهية ۲/ ۹۰)۔

(غلہ اور اس جیسی ضروریات زندگی خرید کر گرانی کے زمانہ تک روکے رہنے کو احتکار کہتے ہیں)۔

''أما فى الشرع فقد عرفه الحنفية بأنه اشتراء الطعام ونحوه وحبسه إلى الغلاء'' (حوالہ سابق)۔

کن اشیاء کا احتکار ممنوع ہے اس سلسلہ میں فقہاء کرام کے تین اقوال ہیں۔

پہلا قول امام ابوحنیفہ، امام محمد، شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک یہ ہے کہ صرف غذائی اشیاء میں احتکار کا تحقق ہوگا۔

دوسرا قول مالکیہ اور حنفیہ میں سے امام ابو یوسف کا ہے احتکار ان تمام چیزوں میں ہوسکتا ہے جو انسانی زندگی کے لئے ضروری ہو، اور جن کے روکنے سے عوام الناس کو ضرر لاحق ہو مثلاً غلہ، سالن، لباس وغیرہ۔

تیسرا قول:۔ امام محمد بن حسن کا ہے کہ احتکار کا ثبوت صرف غذائی اشیاء اور کپڑوں میں ہوتا ہے۔

''هناك ثلاثة اتجاهات: الأول ما ذهب إليه أبو حنيفة ومحمد والشافعية والحنابلة أنه لا احتكار إلا فى القوت خاصة والاتجاه الثانى: أن الاحتكار يجرى فى كل ما يحتاجه الناس ويتضررون من حبسه من قوت وإدام ولباس وغير ذلك وهذا ما ذهب إليه المالكية وأبويوسف من الحنفية. والاتجاه الثالث: أنه لا احتكار إلا فى القوت والثياب خاصة وهذا قول لمحمد بن الحسن'' (الموسوعة الفقهية ۲/ ۹۲)۔

جمہور فقہاء کی دلیل وہ احادیث ہیں، جن میں ذخیرہ اندوزی کے ممنوع ہونے کے سلسلہ میں غلہ کی صراحت موجود ہے۔ ابن ماجہ میں ہے۔

''عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من احتكر على المسلمين طعامهم ضربة الله بالجذام والإفلاس'' (السنن لابن ماجه)۔

(حضرت عمرؓ سے مروی ہے انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جو شخص مسلمانوں سے ان کا غلہ روک دے اللہ تعالیٰ اسے جذام اور تنگی میں مبتلا کرے گا)۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے:

''عن أبى أمامة أن رسول الله ﷺ قال من احتكر طعاما أربعين يومًا يريد به الغلا فقد برئ من الله وبرئ الله منه رواه رزين'' (مشكوٰة المصابيح: ۲۵۱)۔

(حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے چالیس دنوں تک غلہ کو گراں فروشی کے ارادہ سے روک کے رکھا اس کا رشتہ اللہ سے ٹوٹ گیا، اور اللہ تعالیٰ اس سے بیزار ہوا)۔

مالکیہ اور امام ابو یوسفؒ کا استدلال ان روایات سے ہے جن میں مطلق احتکار سے منع کیا گیا ہے اور احتکار کرنے والے کو خاطی وملعون قرار دیا گیا ہے، حدیث شریف میں ہے:

''قال رسول الله ﷺ: من احتكر فهو خاطئ'' (الصحيح لمسلم باب تحريم الاحتكار فى الأقوات ۲/ ۳۱)۔

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے احتکار کیا وہ گنہگار ہے)۔

دوسری روایت میں ہے:

''عن عمر عن النبى ﷺ قال الجالب مرزوق والمحتكر ملعون'' (الصحيح لمسلم باب تحريم الاحتكار فى الأقوات ۲/ ۳۱)

(حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تاجر کو رزق دیا جاتا ہے اور احتکار کرنے والا ملعون ہے)۔

امام محمد بن الحسن نے کپڑوں کو غذائیات پر محمول کیا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں انسان کے حوائج ضروریہ میں سے ہیں:

''فإنه حمل الثياب على القوت باعتبار أن كلامنهما من الحاجات الضرورية'' (الموسوعة الفقهية ۲/ ۹۳)۔

راجح قول:

جمہور فقہاء کا قول راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ جب ایک مسئلہ میں نصوص مختلف ہوں ایک عام اور دوسرا خاص تو ایسی صورت میں عام کو خاص

پر محمول کیا جائے گا۔ تو گویا جن احادیث میں مطلق احتکار کی ممانعت وارد ہوئی ہے، وہ بھی غذائی اجناس پر ہی محمول ہے۔

"وإذا اجتمعت نصوص عامة وأخرى خاصة في مسألة واحدة حمل العام على الخاص والمطلق على المقيد" (حوالہ سابق)

علامہ نووی نے مسلم شریف کی شرح نووی میں یہ صراحت کی ہے کہ احتکار کی ممانعت صرف غذائی اجناس ہی میں خاص ہے، اس کے علاوہ دیگر چیزوں میں احتکار ممنوع نہیں ہے۔

"قال أصحابنا الاحتكار المحرم هو الاحتكار في الأقوات خاصة وهو ان يشتري الطعام في وقت الغلاء للتجارة ولا يبيعه في الحال بل يدخره ليغلو ثمنه . . . وأما غير الأقوات فلا يحرم الاحتكار فيه بكل حال" (نووی مسلم شریف ۲/۳۱)

الغرض احتکار صرف غذائی اجناس میں ممنوع ہے اس کے علاوہ میں نہیں، لہٰذا احقر کی رائے میں گراں فروشی کی نیت سے سونے کی ذخیرہ اندوزی ممنوع نہیں ہونا چاہیے اور یہ احتکار کے دائرہ میں نہیں آئے گا۔ گرچہ اس کی وجہ سے گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہو، اس لئے کہ فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ غلہ جس میں احتکار ممنوع ہے اگر کوئی شخص اپنی زمین کے غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرے اور اس کی وجہ سے لوگوں کو نقصان ہو تو بھی یہ ذخیرہ اندوزی ممنوع نہیں ہے، بلکہ جائز ہے۔

"ولا يكون محتكرا بحبس غلة أرضه بلا خلاف" (الدر المختار على صدر رد المحتار ۹/ ۵۷۲)۔

غلہ جس کی ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے جب اپنی زمین کے غلہ کے ذخیرہ اندوزی کی اجازت ہے گرچہ اس کی کی وجہ سے لوگ پریشانی میں مبتلا ہوں اور غلہ گراں ہو جائے تو اگر جس کی ذخیرہ اندوزی ممنوع نہیں ہے، مثلاً سونے کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے دوسری اشیاء کی قیمت گراں ہو جائے تو بھی اس کے جواز میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟

۷- اسمگلنگ فی نفسہ جائز وحلال ہونی چاہیے اور اس طریقہ سے آنے والے سونے کی خرید وفروخت بھی شرعاً جائز ودرست ہونی چاہیے، اس لئے کہ ہر شخص کو اپنے روپے سے اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق سامان خریدنے کا حق حاصل ہے۔

"لا يمنع أحد من التصرف في ملكه أبدا" (رد المحتار ۵/ ۴۴۸)۔

البتہ چونکہ یہ حکومت کے قانون کے خلاف ہے، پکڑے جانے پر ہتک عزت کا اندیشہ ہے نیز جس ملک میں ہم رہتے ہیں قولاً یا عملاً ہمارا یہ معاہدہ ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کریں گے تو اس قانون کی پابندی ہم پر لازم ہے۔

"كل من يسكن دولة فإنه يلتزم قولا أو عملا بأنه يتبع قوانيها وحينئذ يجب عليه اتباع أحكامها"۔

(في بحوث قضايا فقهية معاصرة/ص ۱۶۶)۔

لہٰذا اسمگلنگ کا کاروبار نہ کیا جائے، یہی رائے حضرت مولانا مفتی نظام الدینؒ، حضرت مولانا عبد الرحیم لاجپوریؒ اور مفتی تقی عثمانی صاحب کی ہے

(ملاحظہ ہو: منتخبات نظام الفتاویٰ ۳/ ۲۸، فتاویٰ رحیمیہ ۶/ ۲۷۸، فتاویٰ عثمانی ۳/ ۹۰)۔

۸- اصول یہ ہے کہ سونا اور چاندی یا مختلف کرنسیاں جو ثمن کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، اور سائمہ جانوروں کے علاوہ کسی بھی مال میں خواہ وہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، جب تک اس میں تجارت کی نیت نہ کی جائے، زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

"لا زكوة في اللآلي والجواهر وإن ساوت ألفا إلا أن تكون للتجارة" (الدر المختار على صدر رد المحتار قبيل باب السائمة ۳/ ۱۹۴)۔

لہٰذا پلاٹینیم کا شمار اگرچہ مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہو پھر بھی اس پر عقود اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں سونے کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

سونے چاندی کی تجارت

مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی [1]

اشیاء کی خرید وفروخت اور تجارت، انسانی معاشرت کی ضروریات سے ہے، انسان کو ایسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے پاس نہیں ہے، دوسرے کے پاس وہ موجود ہے، جس کو حاصل کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ اپنی کسی چیز کے عوض میں باہمی رضامندی سے حاصل کرے، اس طرح باہمی رضامندی سے ایک مال کا دوسرے مال کے عوض میں لینے کو خرید اور دینے کو فروخت سے تعبیر کرتے ہیں۔

''أما ركن البيع فهو مبادلة شئ مرغوب بشئ مرغوب'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۱۸)

اور اسی خرید وفروخت کا نام تجارت ہے، ''التاجر: الذی یبیع و یشتری'' (القاموس المحیط: ت ج ر)۔

جس چیز کو خریدا یا بیچا جاتا ہے، اس کو مبیع کہتے ہیں، اور جس چیز کے بدلے میں خریدا یا بیچا جاتا ہے اس کو ثمن کہتے ہیں، ثمن کی نوعیت اختلاف ادوار کے ساتھ بدلتی رہی ہے، زمانۂ قدیم میں عموماً کسی سامان کے بدلے میں ہی دوسرا سامان خریدا جاتا تھا، مثلاً: کپڑے کے بدلہ میں غلہ، یا غلہ کے بدلہ میں جانور وغیرہ۔

اس کے بعد کے دور میں مختلف مقامات پر بطور ثمن کچھ متعین اشیاء کا رواج رہا، مثلاً: چاقو، ہاتھی دانت، زعفران وغیرہ، اس کے بعد بطور ثمن، چاندی اور سونے کا رواج ہوا، اور پھر اسی چاندی اور سونے کے متعین اوزان کے سکے ڈھالے گئے، سونے کے سکہ کو دینار واشرفی اور چاندی کے سکہ کو درہم اور روپیہ سے تعبیر کیا گیا، اس کے علاوہ دوسری دھاتوں کے سکے بھی رواج میں آئے جو فلوس اور پیسے کہلائے، عصر حاضر میں سونے اور چاندی یا ان کے سکوں کے بجائے کاغذی نوٹ اور کرنسی عام ہوگیا ہے، جو ظاہر ہے کہ ایک طرح کا دھوکہ ہے، اس لئے کہ سونے اور چاندی یا ان سے ڈھالے گئے سکوں کی فی نفسہ مالیت ہے، وہ اگر ٹوٹ کر ٹکڑے اور ریزے بھی ہوجائیں تو ان کی مالیت برقرار رہتی ہے، برخلاف کاغذی کرنسی کے، کہ اگر یہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے یا کٹ پھٹ جائے تو اس کی مالیت ختم ہوجاتی ہے، اس لئے کہ ان کی ثمنیت محض قانونی ہے، عوام کو قانونی طور پر پابند کیا گیا ہے کہ وہ ان کاغذی کرنسیوں کو بطور ثمن قبول کریں، اور اپنی خرید وفروخت میں اس کا استعمال کریں، اور ان کے قبول نہ کرنے پر مجرم قرار دیئے جائیں گے، اور ان کاغذی کرنسیوں کے آغاز میں ان کے چلن کو عام کرنے کے لئے عوام کو یہ باور کرایا گیا کہ ان کاغذی نوٹوں کی پشت پر ان کے سونے محفوظ ہیں جو ایک چال اور دھوکہ سے ان سے سمیٹ لئے گئے، اور عوام نے سہولت پسندی کے تحت کہ سونے اور چاندی کے وزنی سکوں کی جگہ ان کاغذی ہلکے نوٹوں کا استعمال اور ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا آسان ہے، ان کو قبول کیا اور ان کے چلن کو رواج دیا، اور دھیرے دھیرے اپنے سونے چاندی کی مالیت سے بے ہاتھ ہوگئے، اور اب ایک نئی صورت حال درپیش ہے کہ یہ کاغذی نوٹ بھی عوام کے ہاتھ میں نہ رہے۔ اور یہ اپنا کاروبار اور لین دین مشین کے ذریعہ کریں، اس تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ کاغذی کرنسی اور نوٹ فی نفسہ ثمن نہیں ہیں، ان کی مالیت اور ثمنیت محض قانونی اور اصطلاحی ہے، حکومت جب چاہے ان کی قانونی حیثیت کو کالعدم کردے، اور اس کی جگہ کسی اور سکہ اور کرنسی کو رواج دے، لہذا ان کا حکم سونے اور چاندی کے مثل نہیں ہوگا، جن کی ثمنیت ہر حال میں باقی رہتی ہے؛ خواہ وہ خام شکل میں ہوں یا ڈھلے ہوئے سکے، زیورات اور عروض وسامان کی شکل میں۔

۱- اس لئے اگر کاغذی نوٹ سے سونا یا چاندی کی خرید وفروخت کی جائے، تو اس میں روپیہ (کاغذی کرنسی) کی حیثیت مبیع کی ہوگی، اور سونا یا چاندی خلقۃً ثمن ہونے کی وجہ سے ثمن ہی قرار پائیں گے، اموال کی کی تین قسمیں کی گئی ہیں:

---

[1] جامعہ عربیہ تعلیم الدین، مئو، یوپی۔

''و الأموال أنواع ثلاثة، نوع منها في العقد ثمن على كل حال وهو الدراهم و الدنانير و نوع منها ما هو مبيع على كل حال و هو ما ليس من ذوات الأمثال من العروض، كالثياب و الدواب، و نوع هو ثمن من وجه و مبيع من وجه، كالمكيل والموزون، فإنها إذا كانت معينة في العقد تكون مبيعة، وإن لم تكن مبيعة فإن صحبها حرف الباء و قابلها مبيع فهو ثمن، وإن لم يصحبها حرف الباء وقابلها ثمن فهي مبيعة، و هذا لأن الثمن ما يثبت دينًا في الذمة'' (المبسوط للسرخسی ۲ / ۱۴ کتاب البیع، بیع الصرف)۔

اور چونکہ کاغذی کرنسی بھی اصطلاحاً ثمن ہے اور اس کا چلن اور رواج بھی ثمن کی حیثیت سے ہی معروف ہے، لہذا ثمن کی بیع ثمن سے ہونے کی بنا پر اس کے بیع صرف ہونے کا وہم ہوتا ہے، اس لئے کہ بیع صرف: ''اسم لنوع بيع. و هو مبادلة الأثمان بعضها ببعض'' (المبسوط للسرخسی ۲ / ۱۴ کتاب البیع. بیع الصرف)۔ مگر درمختار کی عبارت سے یہ وہم دور ہوجاتا ہے ''هو لغةً الزيادة وشرعًا بيع الثمن بالثمن أي ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنسًا بجنس أو بغير جنس كذهب بفضة'' (الدر المختار ۷ / ۵۲۰)۔ اس میں مذکور ''ما خلق للثمنية'' کی قید سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ کاغذی کرنسی یا سکوں کے ذریعہ سونے یا چاندی کی خرید وفروخت پر بیع صرف کا اطلاق نہیں ہوگا، کیونکہ بیع صرف کی تعریف میں مذکور ثمن سے مراد ثمن خلقی سونا یا چاندی ہے، اور کاغذی کرنسی حقیقۃً ثمن مطلق نہیں ہے؛ بلکہ عارضی و اصطلاحی ثمن ہے۔

بیع صرف کی تعریف:

لغت میں صرف کا معنی، تبدیل کرنا، پھیرنا، منتقل کرنا، زیادہ کرنا وغیرہ مذکور ہے، فقہ کی اصطلاح میں بیع صرف سے مراد، ثمن کی ثمن سے خرید و فروخت ہے، جیسا کہ درمختار کی مذکورہ عبارت سے واضح ہے، نیز ''بنایہ'' میں ہے: ''هو بيع الثمن المطلق بالثمن المطلق. كبيع الدراهم و الدنانير بالدراهم و الدنانير، وهو بيع الصرف'' (البنایہ ۸ / ۳)۔ وہ ثمن مطلق کی بیع ثمن مطلق سے ہے، جیسے دراہم ودنانیر کی بیع دراہم ودنانیر سے، اوری یہ بیع صرف ہے۔

الکنایہ میں ہے: ''سمي به لأنه يحتاج إلى نقل بدليه من يد إلى يد. والصرف هو الرد و النقل'' (الكفاية مع فتح القدير ۶ / ۲۵۸)، ''إنه يسمى صرفًا لما فيه من صرف ما في يد كل واحد منهما إلى يد صاحبه'' (المبسوط للسرخسی ۱۴ / ۲) (اس کا نام ''صرف'' اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں عاقدین میں سے ہر ایک کی ملک میں جو ہوتا ہے اسے دوسرے کے حوالہ کرنا ہوتا ہے)۔

بیع صرف کی خصوصیات:

بیع صرف کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ اگر مبیع وثمن دونوں ایک ہی جنس کے ہوں تو ان میں تفاضل اور ادھار نہیں ہونا چاہئے، یعنی دونوں کی کمیت میں تماثل اور مساوات ہو، اور مجلس میں ہی بدلین پر قبضہ بھی ہو،

''والحكم الذي يختص به الصرف من بين سائر البيوع وجوب قبض البدلين في المجلس و أنه لايكون فيه شرط خيار و لا أجل'' (المبسوط للسرخسی ۱۴ / ۳)، ''وإنما يجب التقابض في الصرف بمقتضى اسم العقد'' (ایضاً ص ۲۲)

''فلو تجانسا شرط التماثل و التقابض، أي النقدان. بأن بيع أحدهما بجنس الآخر فلا بد لصحته من التساوي وزنًا ومن قبض البدلين قبل الافتراق وإن اختلفا جودة و صياغة'' (البحر الرائق: ۶ / ۲۲۲، کتاب الصرف)۔

اور اگر مبیع وثمن دونوں ایک جنس کے نہ ہوں، تو تفاضل جائز ہوتا ہے، ادھار جائز نہیں، بدلین پر مجلس میں ہی قبضہ ہونا لازم ہے۔

''وإلا شرط التقابض، أي وإن لم يتجانسا يشترط التقابض قبل الافتراق دون التماثل، لما رويناه من الحديث'' (ایضاً / ص ۲۲۴)۔

سیدنا ابوسعید خدریؓ سے مروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لا تبيعوا الذهب بالذهب إلا مثلا بمثل ولا تشفوا بعضها على بعض، ولا تبيعوا الورق بالورق إلا مثلا بمثل ولا تشفوا بعضها على بعض، ولا تبيعوا منها غائبا بناجز" (صحیح مسلم مع شرح الامام النووی ۱۱/ ۹)

(سونے کو سونے سے مت فروخت کرو مگر برابر برابر، اور ان میں سے بعض کو بعض سے کم وبیش نہ کرو، اور چاندی کو چاندی سے نہ فروخت کرو مگر برابر برابر، اور ان میں سے بعض کو بعض سے کم وبیش نہ کرو، اور ان میں سے کسی ادھار کو نقد سے نہ فروخت کرو)۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی حدیث میں ہے:

"الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد فإذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد" (صحیح مسلم مع شرح الامام النووی ۱۱/ ۱۴)

ان احادیث اور ان کی روشنی میں فقہاء کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ بیع صرف کا اطلاق اس بیع پر ہوتا ہے جس میں ثمن حقیقی یعنی سونے چاندی کی بیع ثمن حقیقی سے ہو، اور اس کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے بدلین پر قبضہ مجلس بیع میں ہی تام ہو، اور بدلین کی جنس ایک ہو تو ان کے وزن مساوی ہوں کم وبیش نہ ہوں، خواہ وہ کسی شکل میں ہوں۔

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ کاغذی کرنسی کے ذریعہ سونے یا چاندی کی خرید، بیع صرف متصور نہیں ہوگی، اس پر بیع صرف کی تعریف صادق نہیں آتی، فلوس کے ذریعہ سونے چاندی کی بیع کے بارے میں بیع صرف نہ ہونے کی صراحت فقہاء سے منقول ہے

"وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف" (المبسوط للسرخسی ۱۴/ ۲۴) (اور فلوس کی بیع دراہم سے بیع صرف نہیں ہے)۔

"وإن اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب، فيه فص أو ليس فيه فص، بكذا فلسا، و ليست الفلوس عنده، فهو جائز إن تقابضا قبل التفرق أو لم يتقابضا، لأن هذا بيع و ليس بصرف" (المبسوط للسرخسی ۱۴/ ۲۴)، لہذا:

الف- جب روپئے سے سونا یا چاندی خرید اجائے تو اس صورت میں بدلین پر مجلس میں قبضہ لازم نہیں، بلکہ اس صورت میں یہ جائز ہوگا کہ ان میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار ہو، اس لئے کہ کاغذی روپئے میں سونے یا چاندی کا جزء نہیں پایا جاتا، نیز یہ موزون ومکیل کی قبیل سے بھی نہیں ہے، لہذا اس کی حیثیت سونے وچاندی کے ماسوا دھاتوں سے ڈھالے گئے فلوس اور پیسوں کی ہوگی، کاغذی کرنسی کے بارے میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب "تکملہ فتح الملہم" میں لکھتے ہیں:

"أن المختار عندنا قول من يجعلها أثمانًا اصطلاحية، و حينئذ يجرى عليها أحكام الفلوس النافقة، سواء بسواء" (تکملة فتح الملهم ۱/ ۵۸۹، كتاب المساقاة والزراعة، حكم الا وراق النقدية، المحيط البرهاني، ۶/ ۲۲۲، فتاوى البزازيه على هامش عالمگيريه ۵/ ۵، رد المحتار على الدر المختار ۷/ ۵۲۲)۔

ب- حکومت کی طرف سے کسی سامان کا ریٹ اور نرخ طے کرنا شریعت میں مرغوب اور پسندیدہ عمل نہیں ہے، حضرت انسؓ سے منقول ہے:

"قال الناس: يا رسول الله، غلا السعر فسعر لنا، فقال رسول الله ﷺ إن الله هو المسعر القبض الباسط الرازق، وإني لأرجو أن ألقى الله وليس أحد منكم يطالبني بمظلمة في دم و لا مال" (سنن ابی داؤد: ۳/ ۲۷۲، كتاب البيوع، باب في التسعير، ۳۴۵۱، سنن الترمذى: ۳/ ۵۹۶، كتاب البيوع، باب ماجاء في التسعير، ۱۳۱۴، وقال هذا حديث حسن صحيح)۔

اور غالبا اسی مصلحت سے بیع میں تلقی جلب اور بیع حاضر لباد سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"لا يبيع حاضر لباد، دعوا الناس يرزق الله بعضهم من بعض"۔

چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں: "إن الشرع ينظر في مثل هذه المسائل الى مصلحة الناس، و المصلحة تقتضي أن ينظر للجماعة على الواحد" (صحيح مسلم مع شرح الامام النووی ۱۰/ ۱۶۵، ۱۶۳)۔

نرخ کا طے کرنا، مصلحت عامہ کے خلاف ہے، اسی لئے فقہاء نے تسعیر یعنی نرخ طے کرنے کو مکروہ لکھا ہے

(رد المحتار علی الدر المختار ۹/۵۷۳، مجمع الانہر ۴/۲۱۵، الکراہیۃ المحیط البرہانی ۸/۲۶۸، فصل ۲۵، بیاعات مکروہۃ، فتاوی ہندیہ ۳/۲۱۴)۔

لہٰذا سونے یا چاندی کو عالمی یا ملکی مقررہ نرخ سے کم یا زیادہ قیمت میں خرید وفروخت کرنا درست ہوگا، اور اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۲- زیورات بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ وزن میں سونا لیتے ہیں اور چند دنوں میں اس کے بدلے سونے سے بنائے ہوئے اتنے ہی وزن کے زیورات انہیں واپس کرتے ہیں، جبکہ زیور بنانے میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، کیونکہ سونا سونے سے براہ راست نہیں جڑتا، لہٰذا جتنے وزن کا خالص سونا لیا جاتا ہے اتنا خالص واپس نہیں ہوتا، بلکہ آمیزش کے ساتھ اتنا وزن ہوتا ہے، اور زیور تیار کرنے میں جو کٹنگ اور ذرات اس آمیزش کے بقدر نکلتے ہیں وہی ان کی اجرت ہوتی ہے۔

الف- تاجر اور کاریگر کے مابین یہ معاملہ بیع متصور نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس معاملہ کے وقت کاریگر کے پاس سونا نہیں ہوتا، صحت بیع کی شرائط میں مذکور ہے: ''و منها: وهو شرط انعقاد البيع للبائع أن يكون مملوكا للبائع عند البيع. فإن لم يكن لاينعقد وإن ملكه بعد ذلك بوجه من الوجوه إلا السلم خاصة'' (بدائع الصنائع: ۴/۳۴۰)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: '' لايحل سلف و بيع، ولا شرطان في بيع، ولا ربح ما لم تضمن ولا بيع ما ليس عندك'' (سنن ابي داؤد ۲/ ۲۸۳، كتاب البيوع، باب في الرجل يبيع ما ليس عنده، ح ۳۵۰۴ ۳۵۰۳)

اور اگر اس کی ملکیت میں دوسرا سونا موجود ہو بھی تو اس لئے درست نہیں کہ بدلین پر مجلس میں تقابض نہیں ہوتا، اور اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ سونے کی بیع سونے سے ہو تو وزن کے برابر ہونے کے ساتھ مجلس عقد میں بدلین پر قبضہ بھی شرط ہے، لہٰذا یہ صورت اجارہ قرار پائے گی، بیع کی صورت نہیں بنتی۔

ب- البتہ زیورات کو بنانے کی اجرت میں تاجر یا بنوانے والے کی طرف سے دیئے گئے سونے میں سے جوڑائی کے لئے دوسری دھاتوں کی آمیزش، کٹنگ اور چھلائی کے نتیجہ میں نکلے ہوئے سونے کے ذرات اور ٹکڑوں کو اجرت قرار دینا درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ مبہم ہیں ان کی مقدار غیر معلوم، مفضی إلی النزاع اور خداع کو مشتمل ہے، کاریگر اپنے نفع کے لئے چاہے گا کہ زیادہ سے زیادہ دوسری دھات کی آمیزش اور کٹنگ کرے، اس میں تاجر کا نقصان تو نہیں ہوتا، کیونکہ جتنا وزن سونا وہ دیتا ہے اتنے وزن کا اس کو زیور مل جاتا ہے اور وہ اتنے وزن سونے کی قیمت میں اس کو فروخت کرتا ہے، نقصان عام آدمی کا ہوتا ہے جو اس کو خریدتا ہے، یا جو عام آدمی اپنا سونا دے کر بنواتا ہے۔

صحت اجارہ کے لئے اجرت کا معلوم و متعین ہونا شرط ہے، اجارہ کی تعریف ہے:

''هي بيع منفعة معلومة بأجرة معلومة'' (كنز الدقائق مع البحر الرائق ۸/۵، نیز دیکھئے: رد المحتار على الدر المحتار ۹/۷، كتاب الاجارة)

مذکورہ مسئلہ میں اجارہ کے صحیح ہونے کی یہ صورت ہے کہ زیور کے بنوانے کی اجرت الگ سے روپئے میں طے کی جائے، اور کاریگر بچا ہوا سونا تاجر یا اس کے مالک کو واپس کردے، یا اگر سونے کی شکل میں اجرت لینا ہے تو اسے طے ہونا چاہئے کہ اجرت میں اتنا گرام سونا بنوائی لیں گے، اور تاجر یا بنوانے والا اتنے گرام سونا اس کو اجرت میں ادا کرے۔

۳- سونے کے پرانے زیور کا سونے کے نئے زیور سے تبادلہ وزن میں کم وبیش کے ساتھ جائز نہیں، کیونکہ یہ حقیقۃً سونے کی بیع سونے سے ہے جو بیع صرف کی ایک شکل ہے (فتح القدیر مع الہدایہ ۶/ ۲۵۸) جس میں تفاضل اور کم وبیش سے منع کیا گیا ہے۔

''فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لايجوز إلا مثلا بمثل و إن اختلفا في الجودة و الصياغة'' (ہدایہ مع فتح القدیر ۶/ ۲۵۹)۔

اس کے جواز کی یہ صورت ہے کہ پرانے زیور کو روپئے سے خریدا جائے، چاہے جس بھاؤ میں باہم رضامندی سے طے ہو جائے، پھر نئے زیور کی روپئے سے فروخت کا الگ معاملہ کیا جائے، اور اس کا ریٹ الگ کچھ زائد طے کیا جائے، اس طرح یہ دونوں معاملے الگ ہونگے، جس میں سونے

کی بیع سونے سے تفاضل کے ساتھ ہونا لازم نہیں آئے گا، ابو ہریرہؓ سے روایت ہے:

''إن رسول الله ﷺ استعمل رجلا على خيبر، فجاء بتمر جنيب، فقال رسول الله ﷺ: أكل تمر خيبر هكذا؟ قال: لا والله يا رسول الله، إنا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعين والصاعين بالثلاثة. فقال رسول الله ﷺ: لا تفعل، بع الجمع بالدراهم، ثم ابتع بالدراهم جنيبًا'' (صحيح بخاری مع فتح الباری ۴/ ۳۹۹، نیز دیکھئے: شرح صحيح مسلم للامام النووی ۱۱/ ۲۱، كتاب المساقاة، باب الربا)۔

۴- کموڈیٹیز ایکسچینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے جس میں خریدار آرڈر دیتا ہے، اور جو کچھ اس نے آرڈر دیا ہے اس کے آرڈر کے بقدر وہ شئی اس کے نام سے محفوظ کردی جاتی ہے۔

الف: اگر اس طور پر سونے کی خرید کی گئی، اور سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس مثلاً ایک کلو سونا ہے اور اس نے دوسو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کیا لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا، سونے کی اینٹ میں شامل ہے، یا

ب: ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ یا بسکٹ الگ سے موجود ہے، اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں خریدار کے نام سے درج کر دیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں خریدار کے نام صرف اندراج سے شرعی طور سے اس کا سونے پر قبضہ متصور نہیں ہوگا، اس لئے کہ شرعی طور پر قبضہ سے مراد یہ ہے کہ اپنی ملکیت سے دستبردار ہو کر صاحب معاملہ کے حوالہ اس طرح کردی جائے کہ اس کے لئے اس میں تصرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہو (بدائع الصنائع ۴/ ۴۹۸)۔

۵- کاروبار کی یہ صورت کہ مثلاً ایک مہینہ کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے دس تولے سونے کا سودا کرلیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا، جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے، تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ کر خرید کے دن اور ادائیگی کے دن سونے کے نرخوں میں جو فرق ہے اس کی ادائیگی کردی جاتی ہے، مثلاً خریدنے کے دن سونے کا نرخ پانچ ہزار روپے فی تولہ تھا، اور ادائیگی کے دن پانچ ہزار ایک سو روپے ہوگیا تو خریدار بائع کو ایک سو روپے دے گا، اور اگر اس دن چار ہزار نو سو تھی تو بائع خریدار کو ایک سو روپے ادا کرے گا، نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے، اور نہ بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے، بس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے اس کا لین دین کر لیتے ہیں۔

خرید وفروخت کی یہ صورت درست نہیں ہے، اس صورت میں قیمت بھی ادھار ہے اور مبیع بھی ادھار ہے، جبکہ فلوس کے بدلہ سونا یا چاندی کی خرید وفروخت میں یہ شرط ہے کہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ ضروری ہے۔

''لو باع فلوسا بمثلها أو بدراهم أو بدنانير فإن نقد أحدهما جاز وإن تفرقا بلا قبض أحدهما لم يجز''

(الدر المختار مع رد المحتار ۷/ ۴۱۲، رد المحتار علی الدر المختار ۷/ ۵۲۲، فتاوی البزازیہ علی ہامش عالمگیریہ ۵/ ۵)

اور دین کی بیع دین سے ممنوع ہے، نیز یہ صورت ''ربح مالم یضمن'' کو بھی مشتمل ہے، جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے:

''لا يحل سلف و بيع، ولا شرطان في بيع، ولا ربح مالم يضمن ولا بيع ما ليس عندك''

(سنن الترمذی ۳/ ۵۲۷، کتاب البیوع، باب ما جاء فی کراهية بيع ما ليس عندك)۔

۶- بہت سی دفعہ سونے کی قیمت میں متوقع اضافہ کا سونے چاندی کے تاجروں کو علم ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں وہ سونے کو روک لیتے ہیں تاکہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کریں، سونا اس پہلو سے اشیائے ضروریہ میں شامل ہے کہ ثمن خلقی ہونے کے لحاظ سے وہ ذریعہ تبادلہ ہے، اس کو روک لینے کی وجہ سے سونے کی قیمت تو بڑھتی ہی ہے، اس گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہے۔

اس مقصد سے کسی سامان کو روکے رکھنا کہ قیمت میں اضافہ ہونے پر اسے فروخت کرے گا، احتکار کہلاتا ہے، احتکار کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے: ''من احتكر فهو خاطئ'' (جس نے احتکار کیا وہ گنہگار ہے) اور ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں:

''لایحتکر الا خاطئ'' (صحیح مسلم ۱۱ / ۴۳، باب السلم، تحریم الاحتکار فی الاقوات)

اور ایک ان الفاظ میں منقول ہے: '' المحتکر ملعون، والجالب مرزوق'' (مصنف عبدالرزاق ۸ / ۲۰۴، باب الحکرة)

اس حدیث کے مدنظر فقہاء نے احتکار کو مکروہ کہا ہے: '' آدمی اور چوپائے کی غذا کا احتکار مکروہ ہے، جبکہ ایسے شہر میں ہو جہاں کے لوگوں کو ان اشیاء کا روکے رکھنا مضر ہو اور یہی حکم تلقی رکبان کا بھی ہے، اور اگر اس سے ان کو ضرر لاحق نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، اور غذاؤں کے ساتھ احتکار کے مکروہ ہونے کی تخصیص، امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے، اور امام ابو یوسفؒ کا قول یہ ہے کہ جن اشیاء کا روکے رکھنا عوام کے لئے مضر ہو اس کا روکنا احتکار (مکروہ) ہوگا، اگر چہ وہ سونا یا چاندی یا کپڑا ہو'' (ہدایہ ۴ / ۴۵۴، کتاب الکراہیۃ)، ایسی حالت میں جبکہ سونے کے احتکار کی وجہ سے دوسری اشیاء کی قیمتیں بھی متاثر ہوتی ہیں جن میں غذائی اشیاء بھی شامل ہیں سونے کا احتکار بھی مکروہ ہوگا، امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کے نزدیک تو واضح ہے، امام ابوحنیفہؒ کے قول پر بھی مکروہ ہوگا، اس لئے کہ اس کا اثر غذائی اشیاء کی قیمتوں پر بھی پڑتا ہے۔

۷- ملک میں سونے کا بڑا حصہ تو قانونی طور پر آتا ہے، اور سونا لانے والا اس سے متعلق واجبات کو ادا کرتا ہے، دوسرا راستہ اسمگلنگ کا ہے، یہ طریقہ غیر قانونی ہے، اس میں سونا لانے والا ان واجبات کو ادا نہیں کرتا جو حکومت نے سونے کی درآمد سے متعلق مقرر کئے ہیں، ہر دو طریقے سے آنے والے سونے کا خریدنا اور پھر اس کو فروخت کرنا جائز ہے، ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ملکیت میں جیسے چاہے تصرف کرے، اپنے مال سے جہاں سے جو سامان چاہے خریدے، اور جہاں چاہے اسے فروخت کرے، تجارت کرنا حلال اور جائز ہے '' کل یتصرف فی ملکه کیف شاء'' (ہر شخص اپنی ملکیت میں جیسے چاہے تصرف کرے گا) (شرح المجلة المادة: ۱۹۲) '' کسی شخص کو اپنی ملکیت میں تصرف سے روکا نہیں جائے گا، مگر یہ کہ اس کا تصرف کسی غیر کے لئے کھلے طور پر نقصان پہنچائے'' (ایضا، المادة: ۱۱۹۷)، لہذا اس کا لایا ہوا سونا دونوں صورتوں میں اس کی ملکیت ہوگا، اور اس میں تصرف کا حق اسے حاصل ہوگا۔

البتہ اسمگلنگ کے غیر قانونی ہونے کی وجہ سے اس کے ذریعہ اپنے آپ کو پریشانی میں ڈالنا ہے، اس لئے اس سے بچنا بھی لازم ہے، ''لا تلقوا بأیدیکم الی التهلکة'' (سورۂ بقرہ: ۱۹۵) (اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)، اور کسی ملک کا شہری ہونا اس کے قوانین کا پابند ہونے کے مرادف ہے، اور حاکم کی اطاعت لازم ہے جبتک وہ کسی شرعی حکم کے مرادف نہ ہو، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں: '' لیکن (امیر کی) اس طاعت کے لئے جیسا کہ یہ شرط ہے کہ امیر کا حکم معصیت کی قبیل سے نہ ہو، اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ وہ حکم مصلحت عوام کے لئے صادر ہوا ہو، نہ کہ خواہش نفس اور ظلم کے طور پر، اس لئے کہ حاکم کی اطاعت محض اس کی ذات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس حیثیت سے وہ واجب الاطاعت ہے کہ وہ عامة الناس کی مصلحتوں کا ذمہ دار ہے'' (تکملة فتح الملهم ۳ / ۳۲۳)، اس لئے اپنے کو ہلاکت، اور قانونی گرفت میں آنے سے بچانا بھی لازم ہے، یہ طریقہ مستحسن نہیں ہوگا، مگر اسمگلنگ غیر قانونی ہونے کے باوجود اس کے ذریعہ لایا ہوا سونا کسب خبیث نہیں کہا جائے گا۔

۸- پلاٹین جسے سفید سونا کہا جاتا ہے اور اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے، اس سے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس پر سونے کے احکام منطبق نہیں ہونگے، اس کا حکم عروض اور سامان کا ہی ہوگا، تجارت کے لئے ہونے کی صورت میں زکاۃ کی شرائط پائے جانے پر اس میں زکاۃ فرض ہوگی، اس کے زیورات پر زکاۃ نہیں ہوگی۔

''لا زكاة في اللآلي و الجواهر و إن ساوت ألفا اتفاقا، إلا أن تكون للتجارة والأصل أن ما عدا الحجرين والسوائم إنما يزكى بنية التجارة'' (الدر المختار مع رد المحتار ۳ / ۱۹۴)

(موتی و جواہرات میں بالاتفاق زکاۃ نہیں ہے اگر چہ وہ ہزاروں کے مساوی ہوں، مگر یہ کہ تجارت کی نیت سے ہوں، سونا چاندی اور سوائم کے علاوہ میں زکاۃ کے لئے اصل یہ ہے کہ تجارت کی نیت سے ہوں)، سونے چاندی کی طرح اسے ثمن کی حیثیت بھی نہیں ہوگی، لہذا اس کے باہم تبادلہ یا سونے چاندی کے ساتھ اس کے تبادلہ پر بیع صرف کا اطلاق بھی نہیں ہوگا اور نہ اس کے احکام اس پر منطبق ہوں گے۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت اور کرنسی نوٹ کے مسائل

مولانا محمد ابوبکر قاسمی [1]

اللہ تعالی نے بیع وشراء اور خرید وفروخت کو "احل اللہ البیع" فرما کر حلال ومشروع قرار دیا ہے اور "حرم الربوا" فرما کر سود وربا کو ناجائز وحرام قرار دیا ہے، پس ربا کیا ہے، اس کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشیاء ستہ سونا چاندی، گیہوں، جو، نمک اور کھجور کا ذکر فرما کر "مثلاً بمثل سواء بسواء یدا بید" کی قید لگا کر دست بدست، برابر سرابر خرید وفروخت کرنے کو جائز قرار دیا لیکن کمی وزیادتی اور نقد ادھار فروخت کرنے سے منع فرمایا، ہاں اختلاف جنس کی صورت میں دست بدست کمی زیادتی کے ساتھ خرید وفروخت کو درست قرار دیا، اسی طرح صراحت کے ساتھ ایک صاع کھجور دو صاع کھجور دے کر خریدنے کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور اسے سراسر سود قرار دیا، ہاں کھجور کو دراہم سے فروخت کرکے پھر اس سے کمی زیادتی کے ساتھ دوسری کھجور خریدنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، صاحب مشکوۃ نے باب الربوا میں اس سلسلہ کی احادیث کو تفصیل سے ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو: مشکوۃ/ص ۲۴۴، ۲۴۵)۔

مذکورہ احادیث کو ملحوظ رکھ کر حضرات مجتہدین نے سود وربا کی حرمت کی علت کا استنباط کیا ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ اور مشہور قول کے مطابق امام احمدؒ کے نزدیک ربا کی علت قدر وجنس کا اتحاد ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک طعم وثمنیت ہے اور امام مالک کے نزدیک طعم وادخار ہے (حاشیہ مشکوۃ ۱/ ۲۴۴)

"قوله الذهب بالذهب هذا الحديث هو الأصل فى باب الربوا فإنه ذكر الأشياء الستة وترك ما سواها على القياس فقاس المجتهدون واستنبطوا العلة فعند ابى حنيفة القدروالجنس وكذا القول الأشهر عن أحمد وعند الشافعى الطعم والثمنية وعند مالك الطعم والادخار" (لمعات حاشیہ مشکوۃ ۱/ ۲۴۴)۔

احادیث نبویہ میں مذکور اشیاء ستہ میں مکیلی وموزونی چیزوں کا ذکر ہے، لہذا عددی چیزوں کو کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ عوضین میں سے ایک پر قبضہ ہوجائے، حیوان کو حیوان کے بدلے ادھار فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، البتہ ایک اونٹ کو دو اونٹ کے بدلہ خریدنا خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے (مشکوۃ شریف ۱/ ۲۴۵)

اس سے پتہ چلا کہ اگر دونوں جانب مبیع وثمن ادھار ہو تو ممنوع ہے اور اگر ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار تو درست ہے، اور اگر جنس وقدر دونوں میں اختلاف ہو تو حضرات فقہاء نے نقد وادھار ہر طرح خرید وفروخت کرنے کو جائز قرار دیا ہے، اور اگر قدر میں اتحاد ہو اور جنس میں اختلاف ہو تو دست بدست نقد کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا درست ہے لیکن ادھار خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے مالابد منہ کے کتاب التقوی میں سود کی اقسام وعلل کو تفصیل سے ذکر کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

اگر ہر دو چیز (اتحاد جنس، اتحاد قدر) نیافتہ شود ہم فضل حلال باشد وہم نسیہ مثلاً گندم را عوض زر یا آہن فروختہ شود فضل ونسیہ ہر دو جائز است کہ این جا نہ اتحاد جنس است ونہ اتحاد قدر کہ گندم کیلی است وزر وآہن وزنی اور ہمچنیں اگر زر را عوض آہن فروختہ شود ہم ہر دو چیز منتفی است نہ اتحاد جنس است ونہ اتحاد قدر کہ میزان وسنجات زر دیگر است ومیزان وسنجات آہن دیگر وہمچنیں اگر گندم را عوض آہک فروختہ شود کہ کیلی گندم دیگر است وکیل آہک دیگر (ملاحظہ ہو مالابد منہ/ص ۱۰۹، ۱۱۰ مطبوعہ سبز رنگ کتاب گھر دہلی)۔

[1] مفتی ومدرس مدرسہ اسلامیہ شکر پور، بھروارہ دربھنگہ (بہار)۔

اموال ربویہ میں حرمت سود کی مذکورہ فقہی علتوں کو ملحوظ رکھ کر فقہ اکیڈمی کے سوالنامہ کا جواب لکھا جاتا ہے:

۱-سونا چاندی کو باہم صرف نقد فروخت کرنا:

سونا کو سونا کے بدلے یا چاندی کو چاندی کے بدلہ بیع کیا جائے تو بیع صرف کا تحقق ہوگا اور اس صورت میں نقد اور دست بدست عوضین پر قبضہ بھی ضروری ہے اور وزن میں برابری بھی ضروری ہے، اور سونا کو چاندی کے بدلے یا چاندی کو سونا کے بدلہ فروخت کرنے میں برابری تو ضروری نہیں ہے، البتہ عوضین پر مجلس عقد میں قبضہ ضروری ہے۔

''عن عبادة بن الصامت أن رسول الله ﷺ قال: لا تبیعوا الذهب بالذهب ولا الورق بالورق ولا البر بالبر ولا الشعیر بالشعیر ولا التمر بالتمر ولا الملح بالملح إلا سواء بسواء عینا بعین یدا بید ولکن بیعوا الذهب بالورق والورق بالذهب والبر بالشعیر والشعیر بالبر والتمر بالملح والملح بالتمر یدا بید کیف شئتم'' رواه الشافعی (مشکوٰۃ/۲۴۵)۔

گویا سونا چاندی کو کمی بیشی کے ساتھ نقد بیچنا تو جائز ہے لیکن ادھار بیچنا جائز نہیں ہے۔

الف-سونا چاندی کو روپئے یا نوٹ کے عوض فروخت کرنا:

البتہ سونا چاندی کو نوٹ یا روپئے کے عوض فروخت کرنا شرعاً بیع صرف نہیں ہے، کیونکہ سونا چاندی وزنی چیز ہے وزن سے فروخت کیا جاتا ہے، اور روپئے یا نوٹ کا شمار عددی چیزوں میں ہوتا ہے، لہذا مروجہ نوٹ اور اس کے کے عوض سونا اور چاندی کی خرید وفروخت شرعاً ہر طرح جائز ہے، اور اگر روپئے یا نوٹ کو وزنی مانا جائے تب بھی اتحاد قدر نہیں ہے کیونکہ سونے چاندی کا ترازو اور باٹ الگ ہے اور لوہے گلٹ وغیرہ کا ترازو اور باٹ الگ ہے، اس لئے دونوں میں نہ اتحاد جنس ہے اور نہ ہی اتحاد قدر ہے، اس لئے تفاضل ونسیئہ دونوں طرح ان کی خرید وفروخت مروج سکے اور نوٹ سے جائز ہے، یاد رہے کہ سونا چاندی کا شمار ثمن خلقی میں ہوتا ہے اور مروجہ نوٹ وسکہ کا شمار ثمن عرفی واصطلاحی میں ہوتا ہے، اور گلٹ کے سکے کی تو خود مالیت ہوتی ہے، لیکن مروجہ نوٹ کی تو خود مالیت نہیں ہوتی، لیکن سرکار کے اسے شائع کرنے اور اس کے او پر مثلاً ''میں دھارک کو سو روپئے ادا کرنے کا وچن دیتا ہوں'' لکھوا دینے کے سبب اس کی حیثیت جتنے عدد کا وہ نوٹ ہے اتنے سکے کے ہم وزن اسے مانا گیا ہے، لہذا باہم سکوں اور نوٹوں کو کمی بیشی کے ساتھ یا ادھار بیچنا جائز نہیں ہے، بلکہ ان کا باہم تبادلہ سکے کے عوض یا نوٹ کے عوض فقط برابر سرابر ہی جائز ہے، لیکن ہماری موجودہ حکومت کی نوٹ بندی نے بتا دیا کہ ثمن عرفی کو ثمن خلقی کے درجہ میں قرار سلسلہ سے خالی نہیں ہے، اس لئے میرے نزدیک موجودہ نوٹ درحقیقت مروجہ سکہ کا عوض ہے اور عددی ہے، اس لئے کمی بیشی کے ساتھ اس کا تبادلہ جائز ہے، جیسا کہ غیر ملکی کرنسیوں کے ساتھ ہوتا ہے، حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے ''نظام الفتاوی'' میں نوٹ تبدیل کرنے کو جائز لکھا ہے، حضرت مفتی صاحب موصوف کی تحریر ملاحظہ ہو:

الجواب بالله التوفیق:

''نوٹ (کاغذی نوٹ) نہ کیلی ہے اور نہ وزنی، بلکہ عددی ہے، اس لئے کمی بیشی کے ساتھ بدلنا جائز ہے'' فقط واللہ تعالیٰ اعلم (نظام الفتاوی)۔

حضرت مفتی رشید احمد لدھیانویؒ نے ''احسن الفتاوی'' جلد ششم ''کتاب البیوع'' کے تحت نوٹ سے سونے اور چاندی کی بیع کے جواز کے سلسلہ میں ایک فتوی لکھا ہے جو مع سوال وجواب حسب ذیل ہے:

سوال: آج کل کے مروجہ نوٹ اور سکے جو حکومت کی طرف سے رائج ہیں جن کے ساتھ لوگ بیع وشرا اور لین دین کرتے ہیں کیا یہ سونے چاندی یا صرف سونے یا صرف چاندی کے حکم میں ہیں کیا ان کے ساتھ سونے اور چاندی کی بیع بالفضل بالنسیئۃ یا صرف بالفضل یا صرف بالنسیئہ یا صرف بالنسیئۃ جائز ہے یا نہیں ہے؟

جواب: رائج نوٹ اور اس کے سکے سونے اور چاندی کے حکم میں نہیں نہ ہی سونے چاندی کی رسید ہیں، لہذا ان سے بیع ذھب وفضہ بہر کیف جائز ہے،

تفاضل ونسیئہ بھی جائز ہے، البتہ حرمت ربوابصورت تبادل بالجنس واقع ہوگی اور فرضیت زکوۃ میں یہ سکہ بحکم فضہ ہے،

کما قالوا فی الفلوس الرائجة، واللہ تعالی اعلم (احسن الفتاوی ۶/ ۵۱۸)۔

ب-سونے چاندی کوحکومت کے مقرر کردہ نرخ سے زیادہ یا کم قیمت پر فروخت کرنا:

سونے چاندی کوحکومت یا انٹرنیشنل مارکیٹ یا ملکی مارکیٹ کے طے شدہ نرخ سے زیادہ یا کم قیمت پر خرید وفروخت کرنا شرعا ہر طرح جائز ہے، نسیئہ یعنی ادھار بھی اور تفاضل کے ساتھ یدا بید ابھی، کیونکہ یہاں ربا کی علت اتحاد قدر اتحاد جنس دونوں مفقود ہے، یادر ہے کہ مبیع وثمن میں سے ایک ادھار ہو ورنہ دونوں کے ادھار ہونے کی صورت میں بیع الکالی بالکالی ہونے کی وجہ سے بیع جائز نہ ہوگی، فقط واللہ تعالی۔

۲- الف-زیورات بنانے والے کاریگر تاجروں سے متعینہ وزن میں سونا لے کر چند دنوں کے بعد اس میں دوسری دھات آمیزش کر کے زیور تیار کرنا اور اس کی اجرت میں آمیزش کی ہوئی دھات کے ہموزن سونا وضع کر لینا شرعا بیع نہیں بلکہ اجارہ ہے، اور بظاہر یہ اجارہ قفیز طحان والی صورت کے مماثل ہے، لیکن مفضی الی النزاع نہ ہونے اور اس کا عرف وتعامل ہونے کے سبب ایسا اجارہ شرعا جائز ہے۔

"قال اللہ تعالی وأمر بالعرف واعرض عن الجاھلین" (اعراف:۱۹۹)۔

"یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (بقرہ:۱۸۵)،"یرید اللہ أن یخفف عنکم" (نساء:۲۸)۔

ب- سونے کے زیورات تیار کرنے میں دیگر دھات کی آمیزش کے سبب اس کے ہم وزن جو سونے کے ذرات فاضل بچتے ہیں اسے اجرت قرار دینا شرعا درست ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

۳-سونے کے پرانے زیورات کا نئے زیورات سے تبادلہ کمی زیادتی کے ساتھ کرنا:

سونے کے پرانے زیورات کے تبادلہ میں نیا زیور کمی زیادتی کے ساتھ لینا دینا شرعا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہاں اتحاد جنس اور اتحاد قدر دونوں موجود ہے، لہذا کمی زیادتی کے ساتھ نقد ادھار دونوں طرح معاملہ کرنا شرعا جائز نہیں ہے، حدیث نبوی میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت موجود ہے۔

"عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ لاتبیعوا الذھب بالذھب إلا مثلا بمثل وفی روایة فمن زاد واستزاد فقد أربی الآخذ والمعطی فیہ سواء" (رواہ مسلم، مشکوۃ/ ۲۴۴)۔

اگر کسی کو پرانی زیورات کے بدلہ نیا زیور لینا ہو تو پہلے اسے روپے سے فروخت کردے پھر جو روپے حاصل ہوں ان سے نیا زیور خریدے تو ایسا کرنا شرعا جائز ہے، جیسا کہ جید وردی کھجور کی باہم خرید وفروخت کو کمی زیادتی کے ساتھ کرنے کو حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا لیکن کھجور کو دراہم سے فروخت کر کے پھر دراہم سے دوسری کھجور کے خریدنے کو آپ ﷺ نے درست قرار دیا۔

"عن أبی سعید وأبی ھریرة أن رسول اللہ ﷺ استعمل رجلا علی خیبر فجاء بتمر جنیب فقال أکل تمر خیبر ھکذا قال لا واللہ یا رسول اللہ إنا لنأخذ الصاع من ھذا بالصاعین والصاعین بالثلاث فقال لاتفعل بع الجمع بالدراھم ثم ابتع بالدراھم جنیبا وقال فی المیزان مثل ذلک متفق علیہ. وعن أبی سعید قال جاء بلال إلی النبی ﷺ بتمر برنی فقال لہ النبی ﷺ من أین ھذا قال کان عندنا تمر ردی فبعت منہ صاعین بصاع فقال أوہ عین الربوا عین الربوا لاتفعل ولکن إذا اردت أن تشتری فبع التمر ببیع آخر ثم اشتریہ متفق علیہ" (مشکوۃ/ ۲۴۵)۔

۴-آرڈر دے کر سونا خریدنا کیسا ہے؟

آرڈر دے کر سونا خرید کر اپنے ریکارڈ رجسٹر میں محفوظ کر لینے سے بھی شرعا قبضہ کا تحقق ہو جائے گا، بشرطیکہ کرنسی یا نوٹ کے عوض خریداری کا معاملہ طے ہوا ہو، اور فروخت شدہ مقدار کو سونے کی اینٹ سے علاحدہ کر کے رکھ دیا گیا ہو۔

"قال الله تعالى إذا تداينتم بدين إلى اجل مسمى فاكتبوه" (بقرة: ۲۸۲)

اور اگر فروخت شدہ سونے کی مقدار کو اس کی اینٹ یا سونے کے بسکٹ سے علاحدہ نہیں کیا گیا تو ایسی صورت میں فقط ریکارڈ رجسٹر میں لکھ دینے سے بیع کی تکمیل نہ ہوگی، کیونکہ مبیع وثمن دونوں کے ادھار والی بیع سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے حدیث پاک میں اس قسم کی بیع کا نام بیع الکالی بالکالی ہے،

"عن ابن عمر أن النبي ﷺ نهى عن بيع الكالي بالكالئي" رواه الدار القطني (مشكوة/ ۲۴۸)۔

۵- بغیر قبضہ کے فریقین کا سونے یا چاندی یا کسی اور چیز کو ادھار فروخت کرنا اور مبیع یا ثمن میں سے کسی ایک پر قبضہ کا نہ ہونا شرعا ممنوع ہے، اور فقہاء نے اسے بیع الکالئی بالکالئی قرار دے کر اسے ممنوع قرار دیا ہے اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس قسم کی بیع کی صراحت کے ساتھ ممانعت کی ہے

"عن ابن عمر ان النبي ﷺ نهى عن بيع الكالئي بالكالئي" رواه الدار قطني (مشكوة/ ۲۴۸).

ہاں قیمت ادا کر کے بائع کو اپنا مبیع علاحدہ کر کے رکھنے کو کہہ دے اور بائع اس پر عمل کرے تو شرعاوہ بیع درست ہوگی۔

۶- قیمت میں متوقع اضافہ کے سبب سونے چاندی کا احتکار:

اشیائے خوردنی میں احتکار شرعا ممنوع ہے، اگر اشیائے خوردنی کے علاوہ دیگر اشیاء میں احتکار کیا جائے اور قیمت میں متوقع اضافہ کے سبب اس کی سپلائی روک دی جائے تو شرعا ایسا احتکار ممنوع نہیں ہے، چنانچہ احتکار کی ممانعت والی احادیث کے تحت مشکوۃ کے حاشیہ میں مذکور ہے،

"قوله من احتكر الاحتكار المجرم هو فى الأقوات خاصة بأن يشترى الطعام فى وقت الغلاء ولا يبيعه فى الحال بل يدخره ليغلو فاما إذا جاء من قريته أو اشتراه فى وقت الرخص وادخره وباعه فى وقت الغلاء فليس باحتكار وأما غير الأقوات فلا يحرم الاحتكار فيه بكل حال، طيبى" (حاشيه مشكوة/ ۲۵۰)۔

۷- اسمگلنگ کے ذریعہ سونے چاندی کی خرید وفروخت:

جواز بیع کے لئے مبیع وثمن کا شرعا مال متقوم ہونا ضروری ہے اگر کوئی فریقین کی باہمی رضامندی اور بیع کی ضروری شرطوں کا لحاظ رکھ کر کیا جائے تو شرعاوہ جائز ہے، اسمگلنگ کا کاروبار ملکی قانون کی رو سے ممنوع ہے، اس کی خلاف ورزی عام لوگوں کی نگاہ میں عین ہتک حرمت کا سبب ہے جس سے بچنا چاہئے لیکن اگر کسی نے اس قسم کا سامان خرید لیا تو مال حرام کی خریداری کے تحت وہ نہیں آئے گا۔ اسمگلنگ والی بیع تقوی کے خلاف ہے، فتوی کے خلاف نہیں ہے۔

۸- پلاٹین کا حکم:

پلاٹین کو اگر ثمن عرفی کی جگہ اشیاء کے تبادلہ کے لئے اور ذخیرہ اندوزی کے لئے رکھا جاتا ہو تو مال تجارت کے حکم میں مان کر اس میں زکوۃ کا وجوب ہوگا اور حقیقی سونے کے حکم میں ہوگا، البتہ عقود کے سلسلہ میں اتحاد قدر وجنس کی صورت میں ربوا کا تحقق ہوگا اور اختلاف کی صورت میں نقد و ادھار بیچنا جائز ہوگا۔



سونے چاندی کی تجارت

مولانا مفتی محمد عثمان بستوی [1]

سونے چاندی کی تجارت سے متعلق جو سوالات قائم کئے گئے ہیں ان میں پہلا سوال مروجہ کرنسی کے عوض سونے چاندی کی خرید وفروخت سے متعلق ہے کہ مروجہ کرنسی سے سونے کی تجارت بیع صرف میں داخل ہوگی یا نہیں؟ اس حکم کے متعین کرنے کے لئے مروجہ کرنسی کی شرعی حیثیت متعین کرنا لازم ہے، اس کے بغیر بیع صرف ہونے اور نہ ہونے کا حکم متعین نہیں ہوسکتا ہے، لہذا اولا مروجہ کرنسی کی شرعی حیثیت بیان کی جاتی ہے:

مروجہ کرنسی کا شرعی حکم:

مروجہ کرنسی کے حکم پر کئی دور گذرے ہیں، کسی زمانے میں مروجہ کرنسی کو ثمن خلقی کی رسید مان کر حکم لگایا گیا تھا کہ جب تک کرنسی سے کوئی مال یا سونا چاندی حاصل نہ کرلیا جاتا اس وقت تک زکوۃ کی ادائیگی کو صحیح نہیں مانتے تھے اور اس کرنسی سے سونے چاندی کی خریداری کو ناجائز کہتے تھے، پھر دوسرا دور یہ آیا کہ اس کو ثمن خلقی کے حکم میں رکھا گیا اور اس کے ذریعہ سے سونے چاندی کی خریداری پر بیع صرف کے احکام جاری کئے گئے چنانچہ عطر ہدایہ کے ضمیمہ میں مولانا سعید احمد لکھنوی بہت سے اقوال اور فتاوی وغیرہ اس سلسلے میں نقل کرتے ہیں، چنانچہ اپنے ایک فتوے میں وہ فرماتے ہیں کہ قول بسندیت حوالہ کا مقتضی یہ ہے کہ کسی صورت سے جائز نہ ہو، لیکن قول بمسکوکیت پر چونکہ عرفا وقانونا نوٹ ثمن خلقی اور بعینہ روپیہ اور جمیع احکام میں مثل روپیہ کے ہے، اس لئے مثل روپیہ سے اس کی خرید وفروخت برابری وکمی بیشی تینوں صورتوں سے جائز ہے، جبکہ عوضین مجلس عقد میں مقبوض ہوجائیں۔

(تطہیر الاموال فی تحقیق الحلال والحرام/ص ۲۲۵)۔

زمانہ حال میں کرنسی کا حکم:

زمانہ حال میں کرنسی کو ثمن اصطلاحی اور عرفی مان کر فلوس نافقہ کے حکم میں رکھا گیا ہے اور جو احکام فلوس نافقہ کے ہیں وہی احکام کرنسی کے بھی ہوں گے (فقہی مقالات ۱/ ۳۷، انعام الباری ۶/ ۳۳۵)، لہذا زمانہ موجودہ میں رائج کرنسی پر درج ذیل احکام نافذ ہوں گے:

۱- رائج کرنسی متعین کرنے سے متعین نہ ہوگی یعنی اگر متعین نوٹوں کے عوض معاملہ کیا جائے تو بھی نوٹوں کے بدلنے کا اختیار رہے گا۔

"أما الفلوس فإن رائجة فكثمن والثمن من حكمه يصح التصرف به قبل قبضه في غير الصرف والسلم لأن الاستبدال يصح في بدل الصرف لأنه لايتعين بالتعيين" (الدر مع الرد ملخصا ۷/ ۳۵۱، بدائع ۴/ ۴۰۴، ۴۸۷)۔

۲- موجودہ کرنسی کے عوض اگر کوئی معاملہ کیا گیا ہو اور کرنسی پر قبضہ نہ کیا گیا ہو تو اب کرنسی کے بدلے میں متعاقدین اگر کوئی دوسری چیز لینا دینا چاہیں تو اس کی اجازت ہوگی کیونکہ یہ ثمن خلقی کی طرح ثمن اصطلاحی ہے اور ثمن میں تصرف قبل القبض جائز ہے۔

"جاز التصرف في الثمن أو بيع قبل قبضه" (الدر المختار ۷/ ۳۷۵ ۷۶)۔

۳- مروج کرنسی اگر کسی کے ذمہ دین ہو تو جس کے ذمہ دین ہے اس سے کرنسی کے علاوہ کوئی دوسری چیز لینا جائز ہے لیکن مدیون کے علاوہ کسی دوسرے سے ذمہ میں واجب کرنسی کو فروخت کرنا جائز نہیں، البتہ تین صورتیں مستثنی ہیں۔ اول: دوسرے کو کرنسی پر قبضہ کرنے کا اپنی طرف سے وکیل بنائے تو اس صورت میں جس کو وکیل بنایا ہے اس سے کرنسی کو فروخت کرسکتا ہے، وکیل اولا قبضہ دائن (مؤکل) کی طرف سے کرے گا، دوم: اپنی طرف سے حوالہ کی شکل اختیار کی جائے یعنی دائن کسی سے کوئی سامان ادھار خریدے پھر ثمن کی وصولیابی اور ادائیگی کے لئے حوالہ

[1] ریاض العلوم گورینی، جونپور (یوپی)۔

ڈال دے یعنی اپنے مدیون سے کہہ دے کہ مجھے ادا نہ کر کے فلاں کو ادا کر دو اور اپنے دائن سے کہہ دے کہ میرے فلاں مدیون سے وصول کرلو، سوم: دائن اپنے دین کی وصیت مدیون کے علاوہ کسی تیسرے کے لئے کر دے تو یہ بھی درست ہے، حاصل یہ کہ صرف تین شکلوں میں دائن مدیون کے علاوہ کسی دوسرے کو دین کا مالک بنا سکتا ہے اور ان تین شکلوں میں اگر غور کیا جائے تو حقیقتہ صرف ایک شکل توکیل کی بنتی ہے کہ دائن مدیون کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا دین وصول کرنے کا وکیل بنا دے تمام شکلوں میں یہی حقیقت مضمر ہے۔

''لا يجوز تمليك الدين من غير من عليه الدين، إلا إذا سلطه عليه. واستثنى في الأشباه من ذلك ثلث صور. الأولى: إذا سلطه على قبضه فيكون وكيلا قابض اللموكل ثم لنفسه. الثانية: الحوالة. الثالثة: الوصية'' (الدر مع الرد۷/۴۶۶)

۴- مروج کرنسی فلوس نافقہ کے حکم میں ہے، لہذا جس طرح فلوس نافقہ کے ذریعہ سونے و چاندی کی خریداری کے لئے دونوں عوض پر قبضہ مجلس میں شرط نہیں ہے اسی طرح رائج کرنسی سے اگر سونے چاندی کی خریداری ہو تو عوضین پر قبضہ شرط نہیں ہوگا بلکہ عوضین میں سے کسی ایک پر قبضہ کر لینا صحت جواز کے لئے کافی ہے، لیکن اگر مجلس میں کسی ایک عوض پر بھی قبضہ نہیں پایا گیا تو یہ شکل بیع الکالی بالکالی میں داخل ہو کر شرعا حرام و ناجائز ہوگی۔

''باع فلوسا بمثلها أو بدراهم أو بدنانير. فإن نقد أحدهما جاز، وإن تفرقا بلا قبض أحدهما لم يجز'' (الدر المختار والتفصيل في الرد۷/ ۴۱۴)۔

فلوس نافقہ اور مروجہ کرنسی کا حکم متعین کرنے کے بعد مناسب ہے کہ اس سے متعلقہ سوال کا جواب عرض کیا جائے:

الف- اگر روپئے سے سونا خریدا جائے تو روپیہ کی حیثیت فلوس نافقہ کی طرح ہوگی، جس طرح فلوس نافقہ کے ذریعہ سونے کی خریداری کی صورت میں بیع صرف کے احکام نافذ نہیں ہوتے ہیں اسی طرح روپیہ کے ذریعہ سونا خریدنے پر بھی بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے، لہذا اگر روپیہ کے ذریعہ سونا یا چاندی کی خریداری ہو تو دونوں عوض (روپیہ اور سونا چاندی) میں سے کسی ایک پر قبضہ کر لینا صحت بیع کے لئے کافی ہے، دونوں عوض پر مجلس میں قبضہ کا پایا جانا ضروری نہیں، البتہ علماء عرب کی ایک بڑی تعداد روپئے کو بعینہ سونے چاندی کے حکم میں رکھتی ہے مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: ''اب میری ذاتی رائے یہ ہے کہ نوٹ خود فلوس کا حکم اختیار کر گئے ہیں۔

عرب کے علماء کی ایک بڑی تعداد تو یہ کہتی ہے کہ یہ اب سونا چاندی کے قائم مقام ہو گئے ہیں، یعنی جو احکام سونا چاندی کے ہیں وہ اب ان پر بھی جاری ہوں گے، لہذا ربوا، صرف اور زکوۃ کے معاملات میں ان پر سارے احکام سونا چاندی والے جاری ہوں گے، البتہ میری رائے جس کی برصغیر کے بیشتر مفتی حضرات نے تائید کی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا حکم فلوس جیسا ہے۔

(انعام الباری ۶/ ۳۳۵، تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع ۴/ ۴۸۷، مبسوط ۱۴/ ۲۴، التفصیل فی فقہ البیوع ۲/ ۶۲۷)۔

ب- حکومتوں نے سونے چاندی کا عالمی یا ملکی جو ریٹ متعین کیا ہے اسی ریٹ پر فروخت کرنا لازم نہیں، بلکہ روپیہ سے خرید و فروخت کرنے کی صورت میں جنس مختلف ہو جانے کی وجہ سے عاقدین کو اختیار ہوگا جتنی قیمت پر چاہیں فروخت کریں، کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت شرعا ربوا میں داخل نہ ہوگی، البتہ حکومتوں کی طرف سے متعین کی گئی قیمت تسعیر میں داخل ہے، لہذا اس کی پابندی ملکی قوانین کی پابندی اور اولوا الامر کی اطاعت میں داخل ہونے کی وجہ سے ہوگی،

اس سلسلے میں مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: میرے نزدیک یہ بات درست نہیں، کیونکہ سرکاری طور پر نرخ مقرر کرنے سے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ایک ڈالر بالکل پچاس روپئے کے نوٹ جیسا ہو گیا بلکہ جب جنس مختلف ہے تو جنس مختلف ہونے کی صورت میں شریعت نے تفاضل کو جائز قرار دیا ہے، اب اس میں فریقین آپس میں جو بھی نرخ مقرر کر لیں شریعت نے اس کی اجازت دی ہے اس کو ربوا قرار نہیں دیا، لہذا یہ ربوا تو ہے ہی نہیں، البتہ اگر سرکار کی طرف سے اشیاء کا کوئی نرخ مقرر ہے تو اس کا وہی حکم ہوگا جو تسعیر کا ہوتا ہے۔

تسعیر کا مطلب ہے حکومت کی طرف سے اشیاء کا کوئی نرخ مقرر کر دینا جیسے گندم کا نرخ مقرر کر دیا کہ سو روپئے بوری سے زیادہ میں فروخت نہیں کر سکتے، تو یہ کرنسی کی تسعیر ہے کہ ڈالر کا نرخ مقرر کر دیا کہ پچاس روپئے ہوگا، اب سرکاری ریٹ سے کم و زیادہ بیچنا یہ تو ربوا نہیں ہے لیکن تسعیر کی خلاف ورزی ہے کیونکہ یہ حکم ہے "أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم" لہذا حتی الوسع تسعیر کی پابندی کرنی چاہئے، اس سے کم و زیادہ

میں بیچنا اولی الامر کے خلاف ہوگا، لیکن یہ ربوا نہیں ہے، سود نہیں ہے (انعام الباری ۶/۳۴۱)۔

''ذکر فی الهداية، قال النبی ﷺ إذا اختلف النوعان فبيعوا كيف شئتم'' (ہدایة مع فتح القدیر ۷/ ۲۹)۔

''وقال النبی ﷺ بيعوا الذهب بالفضة والفضة بالذهب كيف شئتم'' (بخاری شریف حدیث ۲۱۷۵)۔

الجواب الثانی:

زیورات کے تاجر کاریگروں کو متعینہ وزن میں سونا دے کر زیور میں ملاوٹ کی مقدار متعین کر کے زیور بنانے کا جو معاملہ کرتے ہیں اس میں جتنی مقدار میں دوسری دھات کی جو ملاوٹ ہوتی ہے اتنی مقدار سونا کاریگر کے پاس بچتا ہے اب اس بچے ہوئے سونے کو زیور بنانے کی اجرت پر محمول کیا جائے یا ملائی ہوئی دھات کے عوض پر محمول کیا جائے یہ تین احتمال نکلتے ہیں:

احتمال ۱:

ملاوٹ کی جانے والی دھات اگر کاریگر کی ملک ہو، تاجر کی ملک نہ ہو تو اس کو بیع پر محمول کرنا ممکن ہے گویا کہ تاجر نے کاریگر کو ملاوٹ کے بقدر سونے کا فی الحال مالک بنایا اور کاریگر سے اس سونے کے بدلے میں دھات کو ادھار خرید لیا ہے اور چونکہ دھات اور سونے دونوں کی جنس مختلف ہے اسلئے یہ بیع الدین بالعین کی قبیل سے ہے اس صورت میں تاجر کا زائد سونا ثمن بنے گا اور کاریگر کی ملاوٹ والی دھات مبیع بنے گی اور اس کو بیع سلم پر محمول کیا جا سکتا ہے کیونکہ دھات کا ثمن کاریگر کو پیشگی وصول ہو گیا ہے اور کاریگر کی طرف سے دھات کی ادائیگی بعد میں کی جائے گی اور نیز اس کو بیع تعاطی پر محمول کر کے جواز کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے کہ بائع کی طرف سے ثمن کی پیشگی ادائیگی ہوتی ہے اور کاریگر کی طرف سے دھات کی ادائیگی بعد میں ہوگی لیکن اس کی جنس مقدار متعین ہوتی ہے اور اس معاملے میں ایجاب وقبول لفظاً مفقود ہوتا ہے، لیکن معنی اور عملاً موجود ہوتا ہے (ردالمحتار ۷/ ۲۸)۔

اشکال:

کاریگر کی طرف سے ملائے جانے والی دھات کو مبیع اور تاجر کی طرف سے دیئے جانے والے سونے میں سے بقدر ملاوٹ سونے کو ثمن پر محمول کرنے کی صورت میں درج ذیل چند اشکالات پیدا ہو رہے ہیں:

۱- اگر اس کو بیع سلم پر محمول کیا جائے تو اس کی شرائط کا پایا جانا لازم ہے، اور شرائط میں سے ایک شرط اجل (مدت) بھی ہے، جس کی مقدار کم از کم ایک مہینہ متعین کی گئی ہے، لہٰذا اگر اس میں مدت ایک مہینہ سے کم متعین کی جائے تو معاملہ فاسد ہو جاتا ہے۔

۲- اس شکل کو بیع سلم پر محمول کریں یا بیع تعاطی پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جب کاریگر کے ذمہ زیور کی صنعت کی شرط لگ گئی تو یہ بیع بشرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لاحد المتعاقدين کی شکل بن رہی ہے جو عقد کے لئے مفسد ہے، اور دوسری خرابی صفقة فی صفقة کی معلوم ہو رہی ہے کیونکہ بچے ہوئے سونے میں سے اگر کچھ حصہ کو دھات کا عوض اور کچھ حصہ کو صناعی کی اجرت قرار دیا جائے تو یہ صفقة فی صفقة کی شکل بن رہی ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔

جواب:

سلم کی مدت والے خلجان کو اس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے کہ اجل کی مقدار میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام محمدؒ نے کم از کم ایک مہینہ مانا ہے اور اسی کو علماء نے اختیار کیا ہے اور امام کرخی کے یہاں اجل کی کوئی تحدید نہیں ہے، بلکہ اس کی صرف اتنی مدت متعین ہونی چاہئے جتنی مدت میں عام طور سے مسلم فیہ کی حصولیابی ممکن ہو جاتی ہے، اور بعض مشائخ کے یہاں تو صرف تین دن کی مدت ہے اور بعض کے یہاں نصف یوم کی، اور امام شافعیؒ کے یہاں تو کوئی مدت ہے ہی نہیں، اس لئے جب اس میں کوئی نص موجود نہیں ہے صرف اتنی مدت کا ذکر ہو جس میں مسلم فیہ کی حوالگی ممکن ہو اور وہ مدت متعین ہو جس سے نزاع وغیرہ نہ پیدا ہو، عقد سلم کی صحت کے لئے اتنا کافی ہے، ایک مہینے کی تحدید لازم نہیں ہے، حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدت متعین ہو خواہ کم ہو یا زیادہ (ملاحظہ ہو فقہ البیوع ۱/ ۵۷۷، ۵۷۸)۔

اور دوسرے اشکال یعنی شرط مفسد کے لگائے جانے کا جواب یہ ہوگا کہ اس وقت یہ شرط معروف ہو چکی ہے اور جس وقت شرط فاسدہ کا عرف

ہوجائے تو وہ شرط فاسد جس کا عرف بن جائے مفسد نہیں رہتی ہے۔

''ولا بيع بشرط لايقتضيه العقد وفيه نفع لأحدهما ولم يجر العرف به ولم يرد الشرع بجوازه أما لو جرى العرف به كبيع نعل مع شرط تشريكه أو ورد الشرع به كخيار شرط فلا فساد'' (الدر المختار مع الرد/ ۷، ۲۸۳، ۸۳)۔

اور تیسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس کو صرف ایک عقد خواہ بیع پر محمول کیا جائے یا اجارہ پر، بیع پر محمول کر کے صنعت کو شرط زائد قرار دیا جائے اور عرف کی وجہ سے اس شرط کو صحیح قرار دے کر عقد کو لازم کیا جائے، یا اجارہ پر محمول کر کے بچے ہوئے سونے کو اجرت قرار دیا جائے اور صنعت کو کاریگر کا عمل، اور اس کی طرف سے ملائی جانے والی دھات کو عمل کے تابع مانا جائے۔

''واختلف العلماء في المعقود عليه، فقيل هو المنافع وهي خدمتها للصبي والقيام به اللبن تبع كالصبغ في الثوب وهو اختيار صاحب الذخيرة والايضاح والمصنف، وقيل هو اللبن والخدمة تابعة، وهو اختيار شمس الأئمة السرخسي حيث قال في المبسوط: والأصح أن العقد يرد على اللبن لأنه هو المقصود'' (عنايه على هامش تكملة الفتح ۹/ ۱۰۲)۔

دوسرا احتمال اوپر عرض کی گئی تفصیل کاریگر کی ملاوٹ کو مبیع اور تاجر کے بچے ہوئے سونے کو ثمن پر محمول کرنے سے متعلق تھی اور اس پر ذکر کئے گئے اشکالات اور جواب سے بہر حال یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیع پر محمول کرنا شبہات سے خالی نہیں، لہٰذا دوسرا احتمال جو اجارہ کا ہے وہ بہتر اور اعتراض سے خالی ہے کیونکہ اجارہ پر محمول کرنے کی صورت میں کاریگر کو اجیر اور اس کے عمل صنعت کو معقود علیہ اور تاجر کی طرف سے دیئے گئے سونے میں سے بچے ہوئے حصے کو اجرت قرار دیا جائے، اس صورت میں کاریگر کی طرف سے ملائی جانے والی دھات کو اس کے عمل کے تابع قرار دیا جائے، جیسے کہ خیاط کے دھاگے کو، رنگریز کے رنگ کو اور نجار کے کیل کانٹے کو اس کے عمل کے تابع کر کے معاملہ کو صحیح قرار دیا جاتا ہے، تطہیر الاموال میں ہے: باعتبار معقود علیہ کے اجارے کی پندرہ قسمیں ہوجاتی ہیں اس لئے کہ معقود علیہ ۱- خواہ عمل محض ہے، جیسے نوکری، ۲- یا نفع محض ہے جیسے رکوب ولباس وسکنی، ۳- یا عمل اصل ہے اور مال تابع ہے جیسے سلائی، رنگائی جس میں تاگا درزی کا اور رنگ رنگریز کا ہوتا ہے۔

''ثم قيل: إن العقد يقع على المنافع وهي خدمة الصبي والقيام به واللبن يستحق على طريق التبع بمنزلة الصبغ في الثوب، وقيل إن العقد يقع على اللبن والخدمة تابعة'' (بدايه مع تكمله فتح القدير ۹/ ۱۰۲)۔

اور اس شکل کا اجارہ پر محمول ہونا بے غبار ہے کیونکہ استصناع میں جب میٹریل اور مواد مستصنع کی طرف سے ہوں تو اس کو استصناع (بیع) پر محمول نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کو اجارہ پر محمول کیا جائے گا کیونکہ استصناع کے لئے یہ شرط ہے کہ مواد اور میٹریل صانع کا اپنا ذاتی ہو اور مذکورہ شکل میں اصلی مواد مستصنع کا ہے صانع کا نہیں اب ملائی جانے والی دھات بھی اگر مستصنع کی ہو تو اس کا اجارہ پر محمول ہونا متعین ہے اور اگر میٹریل میں سے ملائی جانے والی دھات صانع کی ہو تو اس کو عمل کے تابع مان کر اجارہ پر محمول ہونا ظاہر ہے جیسے کہ خیاط، رنگریز اور نجار وغیرہ کے معاملات میں عمل اصل اور عین تابع ہے۔

''ويشترط في الاستصناع أن يكون العمل والعين كلاهما من الصانع فلو كانت العين من المستصنع كان العقد إجارة'' (هكذا في الهندية ۴/ ۵۱۷)، ''وإذا دفع الرجل جلدا إلى الإسكاف واستاجره بأجر مسمى على أن يخرز له خفين وسمى له المقدار والصفة على أن يبطله الاسكاف ويبطنه من عنده ووصف له البطانه والنعل فهو جائز استحسانا'' (سنديه ۴/ ۵۱۹)، ''ولو شرط على الخياط لأن يكون كم القميص من عنده كان فاسدا الانعدام العرف فيه'' (سنديه ۵۲۱)

احتمال اجارہ پر ایک اشکال:

تاجر کاریگر کو جو سونا دیتا ہے اسی سونے میں کاریگر کی اجرت بھی موجود ہوتی ہے جو اس کی صناعی کے عمل سے صناعت کے وقت علاحدہ ہوتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجرت قفیز طحان کی قبیل سے ہے جو شرعاً جائز نہیں جیسا کہ حضرت فقہاء کی یہ عبارت اس پر دلالت کرتی ہے۔

''ولو دفع غزلا لآخر لينسجه له بنصفه أو استاجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه أو ثورا ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت في الكل لأنه استأجره بجزء من عمله، والأصل في ذلك نهيه ﷺ عن قفيز الطحان'' (الدر المختار ۹/ ۱۰۰)۔

جواب: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کے قفیز طحان میں داخل ہونے کا صرف شبہ ہے، حقیقۃً یہ قفیز طحان میں داخل نہیں، کیونکہ تاجر کی

طرف سے دی جانے والی اجرت کاریگر کے عمل کی پیداوار نہیں بلکہ وہ اجرت بعینہٖ تاجر کی طرف سے دی گئی ہے، البتہ کاریگر کی طرف سے اس کا افراز پایا گیا ہے اور عمل افراز یہ موجب فساد نہیں کیونکہ مثلیات میں اگر اجرت کا حصہ ملا کر دیا گیا ہو اور اجرت کو الگ کرنے کی اجازت دے دی گئی ہو اور اجرت معلوم ہو تو یہ جائز ہے، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

''والحيلة أن يفرز الأجر أولا، أو يسمى قفيزا بلا تعيين. ثم يعطيه قفيزا منه فيجوز'' (شامی ۹/ ۷۹)۔

صنائع کے عمل سے حاصل ہونے والے ذرات کو اجرت میں دینا:

کاریگر کو اگر اپنی اجرت کے عوض صرف وہ ذرات ملتے ہوں جو اس کی صنعت کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں تو یہ بھی ذرات اس عین کا جز ہیں جو تاجر کی طرف سے دیا گیا تھا، یہ ذرات بھی افراز میں داخل ہو سکتے ہیں، البتہ اس کی جہالت یہ موجب فساد ہو سکتی ہے لیکن چونکہ یہ جہالت فاحشہ نہیں بلکہ یسیرہ ہے جس کا اندازہ کاریگر کو پہلے سے ہوتا ہے اس لئے یہ فساد کا سبب بنے گی اور اجارہ جائز ہوگا۔

''قيدنا بالفاحشة لأن الجهالة اليسيرة تصح أي غير مفسدة'' (شامی ملخصاً ۷/ ۴۹)۔

اس کی تائید ''احسن الفتاوی'' میں درج ایک فتوی سے ہوتی ہے، سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے:

سوال: پنجاب میں یہ رواج ہے کہ دانے بھنوانے کے لئے دیتے ہیں تو بھٹی والا اجرت میں ان میں سے کچھ دانے ہی بھوننے کی اجرت میں رکھ لیتا ہے، نیز روٹیاں تنور پر لگوانے جائیں تو بجائے پیسے دینے کے ایک آدھ آٹے کا پیڑا یا کچھ آٹا ہی رکھ لیتا ہے تو کیا یہ صورت جائز ہے؟ اگر جائز نہ ہو تو اس گناہ سے کیسے بچا جائے۔

الجواب: یہ معاملہ جائز ہے، بظاہر اس میں دو اشکال ہیں: ۱- اجرت عمل سے ہے، ۲- اجرت مجہول ہے۔

اشکال اول کا جواب یہ ہے کہ دانے کچے لینے میں اور آٹا لینے میں تو اجرت عمل سے نہیں، ہاں روٹی اور بھنے ہوئے دانے لینے میں اجرت عمل سے ہے مگر چونکہ یہ شرط نہیں کہ اجرت انہیں سے ہوگی اگر ان کی بجائے دوسرے دانے اور آٹا دے دے تو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا، اجرت من العمل اس وقت ناجائز ہے جبکہ وہ مشروط ہو یہاں مشروط نہیں اس لئے جائز ہے۔

دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ جہالت اجرت جب مفضیۃ إلی النزاع نہ ہو تو مفسد اجارہ نہیں (احسن الفتاوی ۷/ ۱۲، ۳۱۳، ۳۱۳)۔

قفیز طحان کے مسئلہ میں مذاہب ائمہ:

علامہ عینی کے مطابق احناف، مالکیہ وشافعیہ کے نزدیک قفیز طحان جائز نہیں، البتہ امام احمد کے نزدیک جائز ہے (انعام الباری ۶/ ۵۶۳، بحوالۃ عمدۃ القاری ۹/ ۲۰)، البتہ اگر عرف عام ہو جائے تو مشائخ بلخ کے نزدیک قفیز طحان جائز ہے اور یہی حسن بصریؒ اور امام احمدؒ کا بھی قول ہے، یعنی یہ تمام بزرگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی نساج یا غزال کو کپڑا دے کہ اس کو بنو اور اس میں سے ایک تہائی تمہارا یا ایک چوتھائی تمہارا ہوگا تو یہ سب لوگ اس کو جائز کہتے ہیں (انعام الباری ۶/ ۵۶۴)۔

''ومشائخ بلخ والنسفي يجيزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسج الثوب ببعض النسخ لتعامل أهل بلادهم'' (شامی ۹/ ۸۰)۔

احتمال ۳: مذکورہ شکل میں ایک احتمال یہ نکلتا ہے کہ تاجر کاریگر کو جو سونا حوالے کرتا ہے اس کا مقصود اسی سونے سے زیور بنوانا نہیں ہوتا بلکہ زیور کے تمام اوصاف ملاوٹ کی مقدار وغیرہ متعین کر کے تاجر کاریگر سے زیور لیتا ہے اور کاریگر تاجر سے غیر ڈھلا ہوا سونا لیتا ہے، تو اس صورت میں تاجر کا دیا ہوا سونا اور کاریگر کی طرف سے دیا گیا زیور دونوں کا تبادلہ ہوگا یہ شکل بیع صرف کی بن رہی ہے جس میں تقابض فی المجلس اور عوضین میں مساوات شرط ہے اور مذکورہ شکل میں اگر دونوں شرطیں موجود ہوں تو معاملہ صحیح ہو سکتا ہے، فساد وعدم جواز کی کوئی وجہ نہیں، البتہ اگر تاجر کی طرف سے سونا پہلے دے دیا جائے اور کاریگر کی طرف سے زیور بعد میں دیا جائے تو یہ شکل ربوٰ نسیہ کی وجہ سے شرعاً حرام ہوگی، لیکن اگر معاملہ نقد کیا جائے یعنی تاجر کی طرف سے خالص سونے کی حوالگی اور کاریگر کی طرف سے مغلوب ملاوٹ والے زیور کی سپردگی ایک مجلس میں ہو اور ملاوٹ والا زیور خالص سونے کے

مساوی ہو تو یہ شکل شرعاً جائز ہے، کیونکہ مساوات اور تقابض فی المجلس دونوں شرطیں موجود ہیں اور زیور میں ملاوٹ کے مغلوب ہونے کی وجہ سے وہ معدوم ہے اور یہ زیور خالص سونے کے حکم میں ہوگا اس لئے مساوات بھی موجود ہے۔

''وعلته القدر مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل والنساء'' (الدر المختار ۷/ ۴۰۲)

''وقال النبی ﷺ: لا تبیعوا الذهب بالذهب إلا مثلا بمثل، ولا تشفو بعضها علی بعض. ولا تبیعوا الورق بالورق إلا مثلا بمثل، ولا تشفوا بعضها علی بعض ولا تبیعوا منها غائبا بناجز'' (بخاری شریف، حدیث نمبر ۲۱۷۷)۔

کاریگر کے زیورات اور تاجر کے سونے کے مبادلہ کی مزید صورت:

تاجر کی طرف سے دئے جانے والے سونا اور کاریگر کی طرف سے دئے جانے والے زیور کو بیع پر محمول کیا جائے یا اجارہ پر، بیع پر محمول کیا جائے تو کل کی بیع پر یا بعض کی، اس کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے، بیع پر محمول کرنے کی چند شکلیں مزید نکلتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱- تاجر کے سونے کو قرض پر محمول کیا جائے اور کاریگر کی طرف سے ادا کئے جانے والے زیور کو اس قرض کی ادائیگی، چنانچہ کمپنی کے شیئر جس میں عروض کے ساتھ نقود بھی ہوں اور نقود کے عوض خریداری ہو تو اس صورت میں جو عروض کے بدل میں ہے اس میں تقابض فی المجلس شرط نہیں، لیکن جو نقود کا عوض ہو تو اتنے حصے میں تقابض فی المجلس شرط ہے اور مجلس میں تقابض مفقود ہوتا ہے تو جس طرح سے تاجر اور کاریگر کے درمیان ہونے والے معاملہ میں مجلس کے ایک عوض پر قبضہ ہوتا ہے دوسرے پر نہیں، اسی طرح اس میں بھی ایک عوض پر قبضہ ہوتا ہے اور ایک پر نہیں تو اس کی توجیہ حضرت تھانویؒ نے یہی بیان کی ہے کہ شیئر کے مالک کو دیا ہوا روپیہ جو نقود کے مقابل میں ہو اس کو قرض پر محمول کیا جائے پھر شیئر کا مالک کمپنی پر حوالہ ڈال دے، کہ اس کی طرف سے قرض ادا کر دیا جائے۔

''وأشرط التقابض فی بیع الدولار بالدولار. فیتحقق من البائع فعلا، بأنه یقبض الدولار الذی ہو ثمن الدولار الذی یمثله السهم أما قبض المشتری للدولار الذی ہو مبیع فوجهه الإمام أشرف علی التهانوی رحمه الله تعالی بأن ما یدفعه المشتری إلی البائع یعتبر قرضا. ثم یحیله البائع لی الشرکة تسلم هذا القرض منها'' (فقه البیوع ۲/ ۶۹۴)۔

۲- ان کے درمیان ہونے والے معاملہ کو اس پر محمول کیا جائے کہ تاجر کی طرف سے جو سونا دیا گیا ہے اس کو بیع پر اولاً محمول نہ کیا جائے بلکہ مساومہ پر محمول کر کے سونے کی ادائیگی ہو جیسے کہ بہت سے فقہاء کتب فقہیہ کے اس مسئلہ ''من أعطی صیرفیا درهما کبیرا فقال أعطنی به نصف درهم فلوسا، ونصفا من الفضة صغیرا إلا حبة صح. ویکون النصف إلا حبة بمثله ومابقی بالفلوس'' (الدر المختار ۷/ ۵۳۹)، میں اقتضاء بیع والی توجیہ کی ہے، اور پھر اس کے لئے تقابض وغیرہ کی شرط لگائی ہے، بہت سے فقہاء نے اس کو بیع نہیں مانا ہے، بلکہ مساومہ مانا ہے کیونکہ ایجاب وقبول مستقبل کے صیغے سے نہیں ہو سکتا، اور أعطنی اور بعنی وغیرہ کے الفاظ مستقبل کے لئے موضوع ہیں، اس لئے اس کو مساومہ پر محمول کیا جائے اور جب لین دین ہو تو اس کو بیع تعاطی پر محمول کیا جائے۔

''أن الکلام فیما إذا دفع إلیه المخاطب قبل الافتراق فإنه یجعل بیعا فی النصفین بالمعاطاة فیهما'' (فتح القدیر)۔

حیلہ جواز:

تاجر کے دیئے گئے سونے اور کاریگر کی طرف سے دیئے گئے زیورات کے سلسلے میں بیع یا اجارہ وغیرہ ہونے کی جو شکلیں محتمل تھیں وہ عرض کر دی گئیں اگر کسی کو اطمینان ہو مزید احتیاط کا پہلو اختیار کرنا چاہے تو یہ حیلہ اختیار کرے کہ تاجر اپنے سونے کو کاریگر سے فروخت کر کے اپنا سونا حوالے کر دے اور قیمت کو بقایا چھوڑ دے اور کاریگر جب اپنا زیور حوالے کرے تو اسی بقایا رقم کے عوض اس کا زیور اس سے خرید لے اس حیلہ کے اختیار کرنے میں شرعاً کوئی گناہ بھی نہیں اور نہ کسی کی حق تلفی یہ حیلہ جواز کے حصول اور حرام سے اجتناب کا ایک طریقہ ہے اور بس جیسے کہ آپ ﷺ نے تمر خیبر کے بارے میں خود اس کی تعلیم فرمائی:

''مذهب علمائنا أن کل حیلة یحتال بها الرجل لإبطال حق الغیر فهی مکروهة. وکل حیلة یحتال بها الرجل لیتخلص بها عن الحرام أو لیتوصل بها إلی الحلال فهی حسنة'' (المحیط البرهانی ۲۱/ ۶۷)۔

۳- نئے زیور کو پرانے زیور سے بدلنے کی صورت میں نیا زیور مقدار میں کم دینا اور پرانا زیور زیادہ لینا، جبکہ دونوں میں سے کسی میں ملاوٹ غالب نہ ہو بلکہ مغلوب ہو تو ایسی صورت میں کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا شرعاً حرام و ناجائز ہے یہ ربوا میں داخل ہے، صرف نئے پرانے ہونے کی وجہ سے کمی بیشی کی اجازت نہیں ہو سکتی، کیونکہ سونے چاندی خواہ زیورات کی شکل میں ہوں یا ڈلے کی شکل میں، اگر ان کا تبادلہ آپس میں کیا جائے تو زیادتی کی حرمت منصوص ہے اور اس میں صفت جودت ورداءت کا کوئی اعتبار نہیں ہے، یہی جمہور علماء کا مسلک ہے اس میں کوئی اختلاف بھی نہیں سوائے علامہ ابن قیم کے، البتہ اگر ان میں سے کسی میں ملاوٹ غالب ہو تو کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ہو سکتا ہے یعنی خالص والا سونا ملاوٹ میں موجود سونے سے زیادہ ہو تاکہ خالص والا سونا ملاوٹ میں موجود سونے کے برابر ہو جائے اور مابقیہ ملاوٹ کے عوض میں ہو جائے اور اگر دونوں میں ملاوٹ غالب ہو تو کمی بیشی کے ساتھ مطلقاً خرید وفروخت جائز ہے البتہ قبضہ بہر حال شرط ہوگا۔

''أما إذا كان الذهب والفضة مصوغين، مثل الحلي والأواني المصوغة من الذهب والفضة. فالجمهور على أنه صرف، وهو في حكم التبر والمسوك سواء بسواء، فيجب التماثل والتقابض إذا بيع حلي الذهب بتبره. أو بالدينار الذهبي أو بحلي آخر. ويجب التقابض إذا بيع بخلاف جنسه وهو المختار في المذاهب الأربعة وجماهير العلماء'' (فقه البيوع ۲/ ۷۰۸)، ''...فهذه الأحاديث والآثار أدلة ناطقة بأن المصوغ وغير المصوغ سواء في وجوب التماثل والتقابض'' (فقه البيوع ۲/ ۷۱۲)۔

جواز کا حیلہ:

غیر غالب الغش سونے چاندی کے نئے پرانے زیورات کے تبادلہ میں کمی بیشی کے جائز ہونے کا حیلہ یہ ہے کہ نئے زیور کا مالک پرانے زیور کے مالک سے اپنا زیور زیادہ قیمت میں فروخت کردے اور پرانے زیور والے سے اس کا پرانا زیور اس کی موجودہ مالیت کے اعتبار سے خرید لے یا پرانے زیور کے مالک سے اس کا پرانا زیور موجودہ مالیت کے اعتبار سے خرید لے اور اپنا نیا زیور اس کی موجودہ مالیت کے اعتبار سے اس سے فروخت کردے اس طرح کرنے سے معاملہ جائز ہو جائے گا اور نئے زیور کے بدلے میں پرانا زیور زیادہ مقدار میں حاصل ہو جائے گا، مثلاً سو گرام کا نیا زیور اس کو پرانے زیور کے مالک سے ڈھائی لاکھ میں فروخت کرے گا اور پھر ڈھائی لاکھ کے بدلے میں پرانے زیور کے مالک سے پرانا زیور ۱۲۰/گرام کا خرید ے گا تو یہ معاملہ شریعت کے اعتبار سے جائز بھی ہوگا اور نئے زیور کے بدلے میں پرانا زیور زیادہ مقدار میں حاصل بھی ہو جائے گا۔

اس طرح کا حیلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشیاء ربویہ کو اس کی صفت جودت کی وجہ سے کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنے کے لئے بیان فرمایا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خیبر کی عمدہ کھجوریں پیش کی گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''أکل تمر خیبر ھکذا'' (کیا ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟) تو عرض کیا گیا نہیں، بلکہ ان کھجوروں کو دو صاع کے بدلے میں ایک صاع کے اعتبار سے حاصل کیا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس طرح نہ کیا کرو بلکہ ادنیٰ درجے کی دو صاع کھجوریں دراہم کے عوض بیچ دو، پھر ان دراہم سے اچھی کھجوریں خرید لو۔

''عن أبي هريرة أن رسول الله ﷺ استعمل رجلا على خيبر فجاءه بتمر جنيب. فقال رسول الله ﷺ: أكل تمر خيبر هكذا؟ قال: لا. والله يا رسول الله إن لنأخذ الصاع من هذا بالصاعين والصاعين بالثلاث. فقال رسول الله ﷺ: لا تفعل. بع الجمع بالدراهم. ثم ابتع بالدراهم جنيبا'' (بخاری حدیث: ۲۲۰۱)۔

حیلے کا شرعی حکم:

جو حیلے شریعت کے مقاصد کے ابطال کا سبب نہ ہوتے ہوں بلکہ حیلوں کے ذریعہ شریعت کے مقصد کی تکمیل ہو یا کسی امر حرام سے احتراز مقصود ہو یا حیلہ کے ذریعہ سے کسی حلال مقصد تک رسائی ہو تو اس طرح کے حیلے شرعاً جائز ہیں، البتہ جن حیلوں سے شریعت کے مقاصد کا ابطال ہو، یا کسی دوسرے کے حق کی تفویت ہو، یا دھوکا دھڑی مقصود ہو تو اس وقت اس طرح کے حیلے اختیار کرنا شرعاً جائز نہیں۔

''مذهب علمائنا أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير. أو لإدخال شبهة فيه. أو لتمويه باطل. فهي مكروهة. وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن الحرام. أو ليتوصل بها إلى الحلال فهي حسنة'' (المحیط البرہانی ۲۱/ ۲۰)۔

ہمارے علاقے میں صراف کا طریقہ کار:

بندہ کے اپنے علم کے مطابق صراف نئے زیورات کو پرانے زیورات سے براہ راست تبادلہ نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ اولا پرانے زیورات کی موجودہ مالیت لگاتے ہیں اور اس کی مالیت کے اعتبار سے پرانا زیور خرید لیتے ہیں پھر پرانے زیور والے کو اگر زیور درکار ہوتا ہے تو نئے زیور کی مالیت لگا کر اس کو زیور دے دیتے ہیں، اگر پرانے زیور کی قیمت زیادہ ہوئی تھی تو زائد رقم واپس کرتے ہیں اور اگر نئے زیور کی قیمت پرانے زیور سے زیادہ ہوئی تو پرانے زیور والے سے زائد رقم وصول کر لیتے ہیں، حاصل یہ کہ صراف مقاصہ کے طریقہ پر عمل کرتے ہیں جو شرعا جائز ہے اور یہ وہی طریقہ ہے جس کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

سوال میں درج صورت ۳ کا حکم:

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے نئے پرانے زیورات کا جس میں ملاوٹ غالب نہ ہو براہ راست کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ شرعا جائز نہیں ہے، البتہ اگر مقاصہ کا طریقہ اختیار کیا جائے یعنی ہر ایک کی مالیت لگا کر اس کی مالیت سے خرید وفروخت ہو اور پھر جو کمی بیشی ہو اس کو لے دے کر کے حساب برابر کر لیا جاتا ہو تو اس طرح معاملہ کرنا شرعا جائز ہے، اور اس کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے، شاید کہ صراف کے یہاں نئے پرانے زیورات کی خرید وفروخت کا یہی طریقہ رائج ہے، پرانے زیور کو اس کی قیمت کے اعتبار سے خریدتے ہیں اور نئے زیور کو اس کی قیمت کے اعتبار سے بیچتے ہیں پھر دونوں کی قیمتوں میں جو تفاوت ہوتا ہے اس کو روپے کے ذریعہ سے برابر کرتے ہیں، غالبا براہ راست زیور سے زیور کے تبادلے کا طریقہ رائج نہیں ہے۔

۴- سونے چاندی کی خرید وفروخت کے رائج طریقوں کے ذریعہ خرید وفروخت سے قبضہ کا تحقق ہوگا یا نہیں؟ اس کو معلوم کرنے سے پہلے قبضے کی حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے، اختصار کے ساتھ ذیل میں قبضہ کی وضاحت کی جاتی ہے۔

قبضہ کی حقیقت:

کسی چیز پر ہر طرح سے تصرف کے اختیار کا حاصل ہو جانا اور تمام قسم کے موانع خواہ عرفی ہوں یا عادی یا حقیقی سب کے مرتفع اور ختم ہو جانے کا نام قبضہ ہے، لہذا کمپنیوں اور فیکٹریوں میں سامان کا کارٹونوں میں پیک ہو جانا اور ہر کارٹون پر اس کے مالک کا پتہ وغیرہ لکھ دیا جانا، اس کے بل اور واؤچرس کا اس کے مالک کے سپرد ہو جانا اور ان کارٹونوں کی نقل وحمل پر پورے اختیار کامل کا پایا جانا اور ان کارٹونوں کا دوسرے کارٹونوں سے ممتاز ہو جانا کہ ان میں سے بعض کے ضائع ہونے کی صورت میں امتیاز کا ممکن ہونا، قبضہ کے تحقق کے لئے کافی ہے۔

''وقال الكاساني رحمه الله تعالى: معنى القبض، هو التمكن والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة. وقال العز بن عبدالسلام رحمه الله تعالى: قولهم ''قبضت الدار والأرض، والعبد، والبعير. يريدون بذلك الاستيلاء والتمكن من التصرف'' (موسوعه فقهيه ۳۲/ ۲۵۷، فقه البيوع ۱/ ۳۹۷، فقه البيوع ۱/ ۴۱۱)۔

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ اگر خریدی ہوئی پیکٹ دوسری پیکٹوں سے ممتاز ہو جائے اور خریدی ہوئی پیکٹ کا نفع نقصان خریدنے والے سے متعلق ہو جائے تو اس کو قبضہ کا حکم دیا جائے گا۔

''لك الواقع أن التخلية إنما تعتبر قبضا حكما إذا كان المبيع متعينا متميزا عن غير المبيع'' (فقه البيوع ۱/ ۴۱۱)

سونے چاندی میں قبضہ:

۱- اگر سونے چاندی کی خرید وفروخت سونے چاندی کے ذریعہ ہو تو یہ حقیقۃ بیع صرف ہے، اس میں قبضہ کے تحقق کے لئے عوضین پر حسی قبضے کا پایا جانا لازم ہے، خواہ وہ سونے چاندی زیورات وغیرہ کی شکل میں ڈھلے ہوئے ہوں یا وہ ڈھلے ہوئے نہ ہوں، بہر صورت جب بیع صرف ہوگی تو اس میں قبضہ کے لئے تعیین وتخلیہ کافی نہ ہوگا بلکہ قبضہ حسی کا پایا جانا لازم ہے

''الصرف هو لغة بيع الثمن بالثمن أي ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنسا بجنس أو بغير جنس كذهب وفضة

ویشترط التماثل والتقابض بالبراجم لا بالتخلیة'' (الدر المختار/ ۷، ۵۲۰، ۲۱)۔

۲- البتہ اگر سونے چاندی کی خرید وفروخت سونے چاندی کے عوض نہ ہو بلکہ روپیہ پیسہ یا کسی اور چیز کے عوض میں ہو اور سونے چاندی اس شکل میں ہوں کہ وہ متعین کرنے سے متعین ہو سکتے ہوں تو ایسی صورت میں قبضہ کے تحقق کے لئے حسی قبضہ کا پایا جانا لازم نہیں بلکہ تعیین اور تخلیہ قبضہ کے لئے کافی ہے، کیونکہ ایسی صورت میں سونے چاندی متعین کرنے سے متعین ہو جاتے ہیں، چنانچہ حضرات فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر فلوس اور روپے پیسے کے ذریعہ سونے چاندی کی انگوٹھی خریدی جائے اور انگوٹھی متعین کردی جائے تو اس صورت میں اگر کسی پر بھی قبضہ حسی نہیں پایا گیا تو بھی بیع صحیح ہے کیونکہ انگوٹھی متعین کرنے سے متعین ہوگئی جو قبضہ کے لئے کافی ہے۔

''وإن اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلوسا وليست الفلوس عنده فهو جائز إن تقابضا قبل التفرق أو لم يتقابضا لأن هذا بيع وليس بصرف فإنما افترقا عن عين بدين لأن الخاتم يتعين بالتعيين بخلاف ما سبق فإن الدراهم والدنانير لاتتعين بالتعيين فلهذا شرط هنالك قبض أحد البدلين في المجلس ولم يشترط هنا'' (المبسوط ۱۴/ ۲۵)، ''فإن المصوغ بسبب ما اتصل به من الصنعة لم يبق ثمنا صريحا ولهذا يتعين في العقد'' (الدر المختار/ ۷/ ۵۲۱)۔

عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ اگر بیع صرف نہ ہو تو سونا چاندی بھی متعین کرنے سے متعین ہو سکتے ہیں، البتہ دراہم ودنانیر جب جودت ورداء ت وزن سب میں مساوی ہوں تو پھر تعیین کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، لیکن اگر امتیاز اور تعیین کا کوئی طریقہ اختیار کیا جائے پھر اس کے متعین نہ ہونے کا کوئی مطلب نہیں بلکہ امتیاز وتعیین کا کوئی طریقہ اختیار کرنے سے متعین ہو سکتے ہیں۔

سونے چاندی کے بسکٹ کا قبضہ:

بسکٹ کی خریداری کی صورت میں خریدی ہوئی مقدار کے بسکٹ کا کمپیوٹر میں یا ریکارڈ رجسٹر میں خریدنے والے کے نام صرف اندارج کردینا قبضہ کے لئے کافی نہیں ہے، البتہ اگر خریدے ہوئے بسکٹ کی نمبرنگ اور پیکنگ وغیرہ کر کے کمپیوٹر ریکارڈ رجسٹر میں خریدنے والے کے نام اس طرح اندراج کردینا کہ اس کے نفع نقصان، ہلاکت وغیرہ کی ذمہ داری خریدنے والے سے متعلق ہو جائے اس طریقے سے خریدے ہوئے بسکٹ پر خریدنے والے کے قبضہ کا تحقق ہو سکتا ہے، فتاوی عثمانی کے فتوی سے کچھ تائیدی اقتباس نقل کئے جاتے ہیں۔

''پرچی کے ذریعہ خرید وفروخت کے مروج طریقے میں دو خرابیاں ہیں، ایک مبیع کا غیر متعین ہونا، دوسرے بیع قبل القبض، لہذا یہ طریقہ جائز نہیں ہے، البتہ مذکورہ کاروبار کی جائز صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ بوروں پر نمبر ڈال کر خریداری کے وقت نمبروں کے ذریعہ ان کا تعین کرلیا جائے اور پرچی پر وہ نمبر درج ہوں، نیز بائع اپنی طرف سے تخلیہ کردے یعنی یہ کہہ دے کہ یہ بورے اب آپ کے ہیں، جب چاہیں اٹھا کرلے جائیں، اب میں ان بوروں کا ضامن نہیں ہوں، جب تک میرے گودام میں رہیں گے آپ کی امانت کے طور پر رہیں گے، میں ان کے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں گا، یہ بات پرچی پر بھی لکھ دی جائے، اس صورت میں چونکہ مبیع متعین بھی ہو جائے گی، اور ضمان بھی بائع کے تخلیہ کے ذریعہ مشتری کی طرف منتقل ہو جائے گا اس لئے خریدار کے لئے آگے فروخت کرنا جائز ہوگا (فتاوی عثمانی ۳/ ۹۷، ۹۸)۔

''رجل باع خلافي دن في بيته، فخلى بينه وبين المشتري فختم المشتري على الدن وتركه في بيت البائع فهلك بعد ذلك فإنه يهلك من مال المشتري في قول محمد، وعليه الفتوى هكذا في الصغرى'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۶)۔

عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ اگر مبیع مثلی ہو اور نمبرنگ وغیرہ کے ذریعہ اس کی تعیین کردی جائے اور مبیع غیر مبیع سے ممتاز ہو جائے اور مشتری کو تصرف کا اختیار حاصل ہو جائے تو اسے مشتری کا قبضہ مان لیا جائے گا اگر چہ وہ چیز بائع کے زیر حفاظت وانتظام ہو۔

سونے چاندی کی اینٹ پر قبضہ:

سونے چاندی کو فروخت کرنے والے ادارے کے پاس موجود سلاڈ میں سے بعض متعین مقدار کو فروخت کردینا اور فروخت کی ہوئی مقدار کو اس سے الگ نہ کرنا بلکہ ہر ایک کے خریدے ہوئے حصے کو ایک ساتھ اینٹ وغیرہ کی شکل میں محفوظ رکھنا، اس طریقہ سے خریدنے والے کا اپنے خریدے

ہوئے حصہ پر قبضہ ثابت نہ ہوگا کیونکہ قبضہ کے لئے ہر ایک کے خریدے ہوئے حصہ کا دوسرے کے خریدے ہوئے حصے سے ممتاز وعلاحدہ ہونا قبضہ کے لئے شرط ہے، لہذا مجموعی طور پر ایک بڑے ڈلے کی شکل میں سب کے حصے کو محفوظ رکھنے سے قبضہ کا تحقق نہ ہوگا۔

''وتسليم المبيع هو أن يخلى بين المبيع وبين المشترى على وجه يتمكن المشترى من قبضه بغير حائل. ويعتبر فى التسليم أن يكون المبيع مفرزا غير مشغول بحق غيره. هكذا فى الوجيز لكردرى'' (فتاوى ہنديہ ۳/ ۱۶).

وفيه: وأجمعوا على أن التخلية فى البيع الجائز تكون قبضا... الخ''.

نیز ہر ایک کی مبیع دوسرے کی مبیع سے بھی ممتاز اور علاحدہ نہ ہوگی، اگر خدانخواستہ کسی اینٹ کا کچھ حصہ ٹوٹ کر کے ضائع ہو جائے تو اس کا معلوم کرنا کہ کس کا ضائع ہو ممکن نہ رہے گا تو جب ہلاک ہونے کی صورت میں یہ امتیاز نہ ہو سکے کہ کس کا حصہ ضائع ہوا تو یہ دلیل ہے کہ تخلیہ کے نہ پائے جانے کی اور بغیر تخلیہ کے قبضہ کا تحقق نہیں ہو سکتا (فقہ البیوع ۱/ ۴۱۱)۔

سونے کی اینٹ کی خریدی ہوئی مقدار معلومہ کو قبل القبض فروخت کرنا:

سونے کی اینٹ میں سے بعض مقدار معلومہ کو خریدنے کے بعد قبضہ سے قبل فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس حکم کو سمجھنے سے پہلے چند اصولی مسئلے لکھے جاتے ہیں:

۱- مبیع میں قبل القبض تصرف جائز نہیں لیکن ثمن میں قبل القبض تصرف جائز ہے کیونکہ ثمن متعین نہیں ہوتا ہے، لہذا غرر انفساخ عقد کا خطرہ نہیں ہوتا اس لئے ثمن میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز ہے

''وجاز التصرف فى الثمن قبل قبضه سواء تعين بالتعيين كمكيل أولا كنقود... الحاصل: جواز التصرف فى الأثمان والديون كلها قبل قبضها سوى صرف وسلم'' (درمختار ۷/ ۲۷۵ تا ۲۷۷)۔

۲- سونے چاندی کو اگر سونے چاندی سے یا مروجہ سکوں سے (فلوس نافقہ) یا مروجہ کرنسی سے فروخت کیا جائے تو سونا چاندی پر ثمن کے احکام نافذ ہوں گے، کیونکہ سونے چاندی ہر حال میں ثمن ہی ہوتے ہیں۔

''وبما تقرر ظهر أن الأموال ثلاثة: الأول ثمن بكل حال وهو النقدان صحبته الباء أولا، قوبل بجنسه أولا. والثانى مبيع بكل حال كالثياب والدواب، والثالث ثمن من وجه مبيع من وجه كالمثليات. فإن اتصل بها الباء فثمن وإلا فمبيع. وأما الفلوس فإن رائجة فكثمن'' (الدر المختار ۷/ ۵۴۰)۔

۳- اگر ثمن متعین ہو جیسے اشیاء کیلیہ اور نقود معینہ تو بائع اس پر قبضہ کرنے سے پہلے ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے خواہ مشتری سے معاملہ کرے یا مشتری کے علاوہ کسی دوسرے سے جس طرح قبل القبض تصرف کا اختیار ہے اسی طرح بعد القبض تصرف کا اختیار ہوگا۔

''إذا كان ثمن المبيع عينا كالمكيلات والنقود المعينة فللبائع أن يبيعها أو يهبها أو يوصى بها للمشترى وغيره'' (شرح المجلہ ۱/ ۲۰۰) جاز التصرف فى الثمن بهبة أو بيع أو غيرهما لو عينا أى مشارا إليه'' (الدر المختار ۷/ ۲۷۵، ۲۷۶)

آمدم برسر مطلب:

سونے کی بسکٹ یا اس کی اینٹ کی متعینہ مقدار خریدنے کی صورت میں قبضہ کا تحقق ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلے میں وضاحت کے بعد بندہ نے اس کی فروخت سے متعلق حکم متعین کرنے کے لئے چند ضابطے مرتب کئے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ خریدے ہوئے بسکٹ یا اینٹ کی خریدی ہوئی مقدار متعین کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو ذکر کردہ اصول سے یہ معلوم ہوا کہ خریدے ہوئے بسکٹ اور اینٹ کی خریدی ہوئی مقدار متعین پر اگر قبضہ نہ بھی پایا جائے لیکن اس کی تعیین اشارہ وغیرہ سے ہو جائے تو قبضہ سے پہلے اس میں ہر قسم کا تصرف جائز ہے خواہ وہ تصرف خود بائع اور مشتری کے درمیان ہو یا کسی اور کے ساتھ ہو کیونکہ یہ ثمن ہیں اور ثمن میں تصرف قبل القبض جائز ہے، لیکن اگر خریدے ہوئے بسکٹ یا مقدار متعین اشارہ وغیرہ سے متعین نہ ہوں تو اس میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز تو ہے لیکن یہ تصرف صرف بائع اور مشتری کے درمیان ہوگا، اور چند صورتیں غیر کے حق میں بھی تصرف کے جائز ہونے کی ہیں جس کو بیان کیا جا چکا ہے، اور یہ خلاصہ ہے اس تفصیل کا جو شامی اور شرح المجلہ لعلی حیدر میں ہے اس لئے سوال میں

انسب یہ تھا کہ قبضہ سے پہلے اس میں تصرف کے جائز ہونے نہ ہونے کا سوال کیا گیا ہوتا نہ کہ صرف قبضہ کا کیونکہ صرف قبضہ کے تحقق یا عدم تحقق کا سوال بذات خود اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہے اب رہی بات یہ کہ خریدے ہوئے بسکٹ اور اینٹ کی خریدی ہوئی مقدار متعین کیسے ہوسکتی ہے تعیین کے لئے صرف قبضہ ہی ہے یا کوئی اور طریقہ؟ تو حضرات فقہاء نے اس کی صراحت فرمائی ہے کہ نقود یعنی دراہم ودنانیر بھی اشارہ سے متعین ہوجاتے ہیں لیکن استحقاقا تعیین نہیں ہوتی ہے، یعنی اگر اس کے علاوہ دوسرے دیئے جائیں تو اس کے رد کرنے کا اختیار نہیں ہوگا البتہ علم ومعرفت کے حق میں اشارہ سے تعیین ہوجاتی ہے حاصل یہ کہ نقود کی تعیین بطور استحقاق کے نہیں ہوسکتی، لیکن بطور علم ومعرفت کے ہوسکتی ہے۔

''إذا کان الثمن حاجرا، فالعلم به يحصل بمشاهدته والإشارة إليه، وإذا کان غائبا يحصل ببيان مقداره ووصفه'' (شرح المجلہ لعلی حیدر ۱،۳/ ۱۸۶، المادہ ۲۳۹، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شرح المجلہ ۱،۳/ ۱۹۰)

''والحاصل أن الثمن لايتعين استحقاقا إذا کان من النقود الرائجة'' (شرح المجلہ ۱،۳/ ۱۹۱)۔

اور ثمن ونقود رائجہ جب اشارہ سے متعین ہوجاتے ہیں تو غائبانہ خرید وفروخت کی صورت میں بیان مقدار اور بیان وصف وغیرہ سے بھی تعیین ہوجائے گی اور تعیین کے بعد نقود وثمن رائجہ میں تصرف قبضہ سے ہر طرح سے جائز ہے خواہ مشتری سے معاملہ ہو یا غیر مشتری سے اور سونے کی بسکٹ کی خریداری کی صورت میں اسی طرح سونے کی اینٹ کی متعینہ مقدار خریدنے کی صورت میں کمپیوٹر اور ریکارڈ رجسٹر میں اندراج یہ گرچہ قبضہ کے لئے کافی نہیں لیکن تعیین کے لئے بہر حال کافی ہے، لہذا مشتری کے لئے اس پر قبضہ کرنے سے پہلے بھی اس کو فروخت کردینے کی شرعا اجازت ہے کیونکہ یہ نہ بیع صرف ہے کہ صحت کے لئے عوضین پر قبضہ شرط ہو اور نہ بیع مقایضہ ہے کہ تصرف کے لئے قبضہ لازم ہو بلکہ یہ بیع ثمن بثمن ہے جس میں ایک عوض رائج کرنسی ہے اور دوسرا عوض سونے اور چاندی ہیں، سونے چاندی ثمن خلقی ہیں، ثمنیت سے اس کو نکالا نہیں جاسکتا، لہذا جب بیع صرف اور سلم نہ ہو تو اس میں تصرف کے لئے قبضہ لازم نہ ہوگا، تصرف عمومی کے لئے صرف تعیین کافی ہوگی اور تعیین کے لئے اندراج وغیرہ کافی ہے، نیز حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ اگر کسی چیز کے اندر ثمن اور مبیع دونوں ہونے کا احتمال ہو تو اس کو ثمنیت پر محمول کیا جائے گا۔ ''إذا کان الثمن من الأموال''۔

۴- اگر ثمن غیر متعین ہو جیسے دراہم غیر متعینہ یا اشیاء کیلیہ وزنیہ غیر متعینہ تو ان کو اصطلاح میں دین کہتے ہیں اس کا حکم یہ ہے کہ قبل القبض مشتری سے بیع کا معاملہ کرنا جائز ہے اور کسی دوسرے کے لئے وصیت کرنا بھی جائز ہے اور بطریق حوالہ بھی اس میں تصرف جائز ہے۔

''إذا کان الثمن دينا کنقود غير معينة أو مکيلات أو موزونات أن يملکه المشتري بعوض أو بغير عوض'' (شرح المجلہ ۱/ ۲۰۰) ''ولو دينا فالتصرف فيه تمليك ممن عليه الدين ولو بعوض ولا يجوز من غيره قبل قبضه، أی لايجوز تمليك الدين من غير من عليه الدين، إلا إذا سلطه عليه، واستثنى في الأشباه من ذلك ثلث صور، الأولى: إذا سلطه على قبضه، فيکون وکيلا قابضا للموکل ثم لنفسه، الثانية: الحوالة، الثالثة: الوصية'' (الدر المختار مع رد المحتار ۷/ ۳۷۶)

غیر صرف میں اثمان خلقیہ اشارہ سے متعین ہوجاتے ہیں:

جب سونے چاندی کی خرید وفروخت مروجہ کرنسی کے ذریعہ ہو تو سونے چاندی کی حیثیت ثمن کی ہوگی کیونکہ یہ اثمان خلقیہ ہیں ہر حال میں ثمن ہی بنتے ہیں اور ثمن کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ متعین ہوں یعنی اس کی طرف اشارہ وغیرہ کردیا گیا ہو تو اس میں سونے چاندی میں تصرف کرنا ہر طرح سے جائز ہوگا خواہ اس سے معاملہ کرے جس سے خریدا ہے یا کسی دوسرے سے اس لئے کہ اثمان متعینہ مشار الیہ میں ہر طرح تصرف جائز ہے، البتہ اگر ثمن متعین مشار الیہ نہ ہو تو قبل القبض اس میں معاملہ کرنا صرف اس شخص سے جائز ہے جس کے ذمہ دین لازم ہے، اسی طرح اگر کسی دوسرے کو قبضہ کرنے کا وکیل بنادے یا دوسرے کے لئے وصیت کردے یا کسی دوسرے کے لئے حوالہ ڈال دے تو اس کی بھی اجازت ہے (رد المحتار ۷/ ۳۷۶)۔

''التي تتعين بالتعيين کالمکيلات والموزونات والعدديات المتقاربة، فلأن هذه مبيع من وجه وثمن من وجه اخر، رجحت جهة الثمن في التصرف تيسيرا وتسهيلا'' (شرح المجلہ لعلی حیدر ۱، ۳/ ۲۰۰)۔

خلاصہ:

سوال نمبر ۴ کے لئے درج ذیل چیزوں کے الگ الگ جوابات معلوم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ مسئلہ بالکل بے غبار ہوجائے۔

۱- مروجہ کرنسی سے سونے یا چاندی کی بیع بیع صرف ہے یا نہیں؟ -اس کا جواب معلوم ہو چکا ہے کہ یہ بیع صرف نہیں لہذا عوضین پر قبضہ صحت عقد کے لئے شرط نہیں ہے۔

۲- مروجہ کرنسی سے سونے چاندی کی خرید وفروخت کی صورت میں سونا چاندی ثمن ہوگا یا مبیع ؟اس کا جواب بھی اس تفصیل کے تحت دیا جاچکا ہے کہ یہ ثمن ہی ہوگا مبیع نہیں۔

۳- ثمن میں تصرف کے لئے قبضہ لازم ہے یا نہیں؟اس کا جواب بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ ثمن میں تصرف کے لئے قبضہ شرط نہیں۔

۴- ثمن میں قبل القبض تصرف صرف متعاقدین کے درمیان ہوسکتا ہے یا عمومی تصرف کا اختیار ہے؟اس کا بھی جواب عرض کیا جاچکا ہے کہ اگر ثمن متعین ہوخواہ تعیین اشارہ سے ہو یا کسی دوسرے مفید تعیین طریقہ سے تو عمومی تصرف کا اختیار ہے البتہ اگر تعیین نہ ہوتو صرف متعاقدین کے درمیان تصرف ہوسکتا ہے۔

۵- سونے چاندی کے سکے یا اینٹ کی متعینہ مقدار خریدنے کی صورت میں کمپیوٹر اور ریکارڈ رجسٹر میں اندراج تعیین کے لئے کافی ہے یا نہیں؟اس کا بھی جواب عرض کردیا گیا ہے کہ تعیین کے لئے یہ کافی معلوم ہوتا ہے۔

نتیجہ: مذکورہ بالا سوال وجوابات پر نظر ڈالنے سے اور اس کی تحقیق کے نتیجہ میں بندہ کی رائے یہ ہے کہ سونے چاندی کی خرید وفروخت کا یہ طریقہ شرعا جائز ہے بشرطیکہ ایک عوض پر قبضہ پالیا جائے کیونکہ سونے چاندی ثمن ہیں اور ثمن میں تصرف کے لئے قبضہ لازم نہیں بلکہ تعیین وبیان کافی ہے۔

ادھار سونے چاندی کی خرید وفروخت:

جب مروج کرنسی کے ذریعہ سونے چاندی کی خرید وفروخت ہو اور کرنسی یا سونے چاندی میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہوجائے تو یہ بیع شرعا جائز ہے اور اس طرح سے خریدے ہوئے سونے چاندی کو قبضہ سے قبل فروخت کرنا بھی شرعا جائز ہے، اس لئے کہ سونا چاندی اس صورت میں ثمن کی حیثیت رکھے گا خواہ زیورات کی شکل میں ہو یا نقود کی شکل میں اور ثمن میں قبل القبض تصرف کی شرعا اجازت ہے لیکن اگر سونے چاندی اور مروج کرنسی میں سے کسی پر بھی قبضہ نہیں پایا گیا تو اس طرح خرید وفروخت شرعا جائز نہیں، یہ بیع الکالی بالکالی ہے اگر اس طرح خرید وفروخت ہوتو اس کے لئے کچھ شرائط ہیں، جن کو مفتی تقی عثمانی صاحب نے ایک عربی فتوے میں نقل کیا ہے (ملاحظہ ہو: فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۳)۔

فتوی کی وضاحت اور اس کا مقصد:

مفتی تقی صاحب نے جب سونے کے کاروبار میں پوری قیمت ادا نہ کی گئی ہو اور سونے کو بھی عملی طور سے حاصل نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں سونے کے جتنے حصے کی قیمت ادا کی گئی ہے اس میں کوئی مسئلہ نہیں، بیع جائز اور درست ہے البتہ جتنے حصے کی قیمت ادا نہیں کی گئی ہے اتنے حصے میں بیع الکالی بالکالی لازم آرہی ہے، اس لئے معاملہ کے جائز ہونے کے لئے مفتی صاحب نے چند شرطیں لگائیں، ان شرائط کا مقصد یہ ہے کہ جتنے حصے کی قیمت ادا نہیں کی گئی ہے، اتنے حصے میں کم از کم خریدار کا قبضہ ثابت ہوجائے تا کہ یہ معاملہ بیع الکالی بالکالی ہونے سے نکل جائے، پھر اس کے بعد مفتی صاحب نے خریدے ہوئے سونے کو آگے فروخت کرنے کے لئے توکیل کی صورت ذکر کی ہے کہ خریدار بائع ہی کو اپنا خریدا ہوا سونا فروخت کرنے کے لئے وکیل بنادے اور اس وکالہ کے صحیح ہونے کے لئے سونے کا خریدار کے قبضہ میں ہونا شرط نہیں کیونکہ یہ سونا حقیقت کے اعتبار سے ثمن ہے، اور ثمن میں تصرف کے لئے قبضہ کا ہونا یا بائع کی ملکیت میں ہونا شرط نہیں، بلکہ بغیر قبضہ کے بھی ثمن میں تصرف بائع کے لئے جائز ہے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

مفتی صاحب کا عربی فتوی اور اس کی وضاحت اس لئے کی گئی ہے تا کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ مفتی صاحب نے سونا خریدنے کی صورت میں اس میں تصرف کے لئے قبضہ کی شرط لگائی ہے اور مقالہ میں تفصیل سے بغیر قبضہ کے بھی تصرف کے جواز کو ثابت کیا گیا ہے تو اب فرق یہ واضح ہوگیا کہ اگر سونے کی قیمت ادا کردی جائے تو سونے میں تصرف کے لئے قبضہ لازم نہیں اور اگر سونے کی قیمت مجلس عقد میں ادا نہ کی جائے تو معاملہ کے جواز کے لئے سونے پر قبضہ لازم ہوگا، تحقق قبضہ کے لئے مفتی صاحب نے درج ذیل شرطیں لگائی ہیں:

۱- بائع کی طرف سے مشتری کو سونا لے جانے کا پورا اختیار ہوجائے۔

۲- یہ کہ فروخت شدہ سونا غیر فروخت شدہ سے ممتاز اور علاحدہ ہو۔

۳- اور خریدار کے ضمان میں وہ منتقل ہو گیا ہو کہ اگر ضائع ہو تو خریدار کا ضائع مانا جائے۔

۵- خرید و فروخت کا مقصود جوا کھیلنا نہیں بلکہ بیع کا مقصود کسی چیز کو اپنے ضمان میں لے کر پھر فروخت کر کے نفع کمانا ہوتا ہے یا اس کو باقی رکھ کر اس سے انتفاع مقصود ہوتا ہے، یعنی بیع میں اصل جو ہر مبیع کا ضمان میں آجانا ہے، اسی لئے شریعت میں کسی چیز کے ضمان میں آنے سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا گیا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا یحل سلف وبیع لا شرطان فی بیع ولا ربح مالم تضمن'' (ترمذی، ابوداؤد)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے قبضہ میں آنے سے پہلے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے،

''نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع مالم یقبض'' (مصنف عبدالرزاق، حدیث نمبر:۱۴۲۱۱، مسند احمد) ۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کی ملکیت میں آنے سے پہلے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے:

''نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع مالیس عند الإنسان'' (ترمذی، نسائی)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی خرید و فروخت سے بھی منع فرمایا ہے جس میں نہ تو ثمن پر قبضہ پایا جائے اور نہ مبیع پر۔

''نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع الکالی بالکالی'' (السراج المنیر ۴/ ۳۷۲، بحوالہ فقہی مقالات)۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو ادھار خریدا ہو اس کے بدلے میں کوئی دوسری چیز لینے سے منع فرمایا ہے، یا تو معاملہ ختم کر کے اپنا پیسہ لینے کا حق ہے، یا خریدی ہوئی چیز لینے کا اختیار ہے۔

''روی أبو سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی علیہ الصلاۃ والسلام أنہ قال لرب السلم: لاتأخذ إلا سلمك أو رأس مالك، وفی روایۃ: خذ سلمك أو رأس مالك'' (بدائع عن البخاری و ابی داؤد)۔

اور حضرات فقہاء نے بھی ربح مالم یضمن، بیع قبل القبض اور مسلم فیہ کے بدلے میں کوئی اور چیز وصول کرنے کی ممانعت کی تصریح فرمائی ہے،

''وبیع السلم فیہ عن بائعہ أو من غیرہ قبل قبضہ فاسد'' (المغنی ۴/ ۳۴۱)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ خرید و فروخت کا وہ طریقہ جس میں نہ تو ثمن پر سپردگی ہو اور نہ مبیع پر قبضہ شرعاً ناجائز و حرام ہے، اسی طرح جو چیزیں خریدی گئی ہوں ان پر قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کر دینے کی ممانعت منصوص ہے، نیز کسی چیز کے ضمان میں آنے سے پہلے نفع حاصل کرنے کی ممانعت صراحۃ روایت میں موجود ہے اور کاروبار کے اس طریقے میں جس میں سونا ادھار خریدا جاتا ہے اور پھر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو فروخت کیا جاتا ہے اور خریدنے اور فروخت کرنے کی قیمت میں جو کمی بیشی ہوتی ہے اس کا لین دین کر لیا جاتا ہے، یہ طریقہ نصوص صریحہ کثیرہ کے خلاف ہے اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں اس طرح معاملہ کرنا شرعاً حرام و ناجائز ہے، چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: لیکن اس خرید و فروخت کو درست کہنے کی دشواری اس سٹہ بازی کے وقت پیش آتی ہے جو اسٹاک ایکسچینج کا بہت بڑا اور اہم حصہ ہے جس میں بسا اوقات شیئرز کا لین دین بالکل مقصود نہیں ہوتا، بلکہ آخر میں جا کر آپس کا فرق (ڈیفرنس) برابر کر لیا جاتا ہے اور شیئرز پر نہ تو قبضہ ہوتا ہے اور نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے، لہذا جہاں یہ صورت ہو کہ قبضہ بالکل نہ ہو اور شیئرز کا نہ لینا مقصود ہو اور نہ دینا، بلکہ اصل مقصد یہ ہو کہ اس طرح سٹہ بازی کر کے آپس میں ڈیفرنس کو برابر کر لیا جائے تو یہ صورت بالکل حرام ہے اور شریعت میں اس کی اجازت نہیں (فقہی مقالات ۱/ ۱۵۲)۔

اور مفتی صاحب نے سٹے کو بڑی تفصیل سے انعام الباری ۶/ ۲۵۱-۲۵۴ میں بیان فرمایا ہے، طوالت کے خوف کی وجہ سے صرف حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۶- تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ نفع نقصان برابر کرنے کے لئے سونے کے کاروبار کا جو طریقہ رائج ہے جس میں نہ تو ثمن کی ادائیگی ہوتی ہے اور نہ ہی سونے پر قبضہ مقصود ہوتا ہے بلکہ خرید و فروخت کی تاریخوں میں قیمت کا جو تفاوت ہوتا ہے صرف اسی کو لینا دینا مقصود ہوتا ہے اس صورت

میں فروخت کرنے والے کونہ تو ثمن مطلوب ہوتا ہے اور خریدنے والے کو نہ مبیع مطلوب ہوتی ہے یہ مغرب کا رائج کیا ہوا طریقہ ہے جو سود و قمار پر مشتمل ہے، نفع حاصل ہوا تو بلا کسی عوض کے بہت کچھ حاصل ہو گیا اور گھاٹا ہوا تو گھر سے چلا گیا تو اس میں ضرر محض کا یا نفع محض کا احتمال ہوتا ہے، لہذا یہ طریقہ شرعاً ناجائز و حرام ہے اور اس طریقہ سے حاصل کیا ہوا نفع واجب التصدق ہے۔

۷- سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے لئے روک کر رکھنا احتکار میں داخل ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ و جمہور کا مسلک:

جمہور کے نزدیک احتکار خاص ہے طعام اور اقوات بہائم کے ساتھ اور حنابلہ کے نزدیک صرف انسان کی غذا کے ساتھ احتکار کی ممانعت خاص ہے، لہذا جمہور کے نزدیک غذائی اشیاء میں ان کے علاوہ دوسری چیزوں میں احتکار اور ذخیرہ اندوزی ناجائز نہ ہوگی۔

''ثم ذهب أكثر الفقهاء إلى أن حرمة الاحتكار مختصة بالأقوات فلا يحرم الاحتكار في غير. وهو قول أبي حنيفة والشافعي و مالك وأحمد رحمهم الله'' (تكمله فتح الملهم ۱/ ۶۰۶).

کیونکہ احتکار لغت میں غلہ کو قیمت بڑھنے کے انتظار کے لئے روکنے کو کہتے ہیں اور احتکار والی روایت کے راوی حضرت معمر غلہ کے علاوہ دوسری چیزوں میں احتکار کیا کرتے ہیں۔

''ولعل الجمهور قصروا حرمة الاحتكار إلى الطعام نظر إلى معنى كلمة الاحتكار في اللغة... ولأن معمرا كان يحتكر في غير الأقوات وهو راوي هذا الحديث'' (تكمله فتح الملهم ۱/ ۶۰۷). وفي الدر المختار: كره احتكار قوت البشر والبهائم في بلد يضر بأهله، لحديث: ''الجالب مرزوق والمحتكر معلون'' وقوله عليه والسلام الصلاة من احتكر على المسلمين أربعين يوما ضربه الله بالجذام والإفلاس. وفي رواية: فقد برئ من الله وبرئ الله منه. وفي رواية: فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين. لايقبل الله منه صرفا ولا عدلا'' (شامی ۹/ ۵۷۱)۔

حضرت امام ابویوسفؒ کا مسلک:

امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو لوگوں کی ضرورت کی ہو، چاہے کھانے پینے سے متعلق ہو، چاہے پہننے سے متعلق ہو، یا کسی بھی شئ سے متعلق ہو ہر چیز پر احتکار ہو سکتا ہے، لیکن اس کی ممانعت انہی حالات پر ہوگی جب اس کو روکے رکھنے سے عامۃ الناس کو ضرر پہنچے، اگر ضرر نہ ہو تو احتکار ممنوع نہیں، جب ضرر لاحق ہو تو اس وقت ممانعت ہوگی، حاصل یہ کہ جس چیز کے روکنے سے عامۃ الناس کو ضرر ہوتا ہو خواہ وہ سونا چاندی ہو یا کپڑا یا کوئی اور چیز ان سب کو حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک روکنا منع ہوگا:

''أن كل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتكار. ولو ذهبا أو فضة أو ثوبا'' (شامی ۹/ ۵۷۴)۔

فتوی:

عام حالات میں تو فتوی امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہے: ''التقييد بقوت البشر قول أبي حنيفة ومحمد وعليه الفتوى'' (شامی ۹/ ۵۷۱)

البتہ غلے کے علاوہ دوسری چیزوں کی ذخیرہ اندوزی سے لوگوں کو ضرر شدید و حرج شدید ہو تو ارباب حکومت و انتظام کو لوگوں کو ضرر و حرج سے بچانے کے لئے کسی بھی چیز کی ذخیرہ اندوزی سے روکنے کا اختیار ہے، جیسے کہ لوگوں کو ضرر سے بچانے کے لئے حاکم کو مصلحۃ للناس اشیاء کی قیمت و نرخ متعین کرنے کا اختیار ہے:

''إذا تعدى أرباب غير القوتين وظلموا على العامة فيسعر عليهم الحاكم بناء على ما قال أبو يوسف... ينبغي أن يجوز، فإن أبا يوسف يعتبر حقيقة الضرر كما تقرر، فتدبر'' (الدر المختار ۹/ ۵۷۴. تكمله فتح الملهم ۱/ ۶۰۷)۔

حاصل یہ کہ غلے کی ذخیرہ اندوزی سے پہنچنے والے ضرر و نقصان کی طرح اگر کسی دوسری چیز کی ذخیرہ اندوزی سے نقصان پہنچے تو حاکم کو حضرت امام ابویوسفؒ کے قول کی بنا پر پابندی لگانے اور ممانعت کا اختیار ہوگا، اور اگر اس طرح کا ضرر نہ پہنچے تو پابندی نہ لگائی جائے۔

۷- کسی حلال اور جائز چیزوں کی اسمگلنگ یعنی ملک سے برآمد اور ملک میں درآمد کرنا فی نفسہ اس کے ناجائز ہونے کی وجہ نہیں، کیونکہ ہر شخص اپنی ضرورت اور پسند کا جو مال جہاں چاہے خرید سکتا ہے اور جہاں چاہے فروخت کرسکتا ہے، شرعا اس سلسلے میں اس پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے، لہذا کسی بیرون ملک سے مال خرید کر اپنے ملک میں لانا اور اپنے ملک سے مال لے جاکر دوسرے ملک میں بیچنا دونوں شرعا بلا کراہت جائز ہیں، ان کے جواز میں کوئی شبہ نہیں چاہے وہ سونے کی خرید وفروخت ہو یا کسی اور چیز کی، شرعا ہر طرح کی پوری آزادی ہے اس میں کوئی پابندی نہیں۔

''في الدر المختار، لايمنع الشخص من تصرفه في ملكه إلا إذا كان الضرر بجاره ضررا بينا'' (۸/ ۱۵۲، زکریا)

''كل يتصرف في ملكه كيف شاء لكن إذ تعلق به حق الغير'' (شرح المجله لرستم باز/ ص ۶۵۴. ماده ۱۱۹۲)۔

البتہ عوامی مصلحت کے تقاضے سے اگر کسی چیز کے باہر سے خرید وفروخت پر پابندی عائد کردی جائے یا کسی چیز کی درآمد پر پابندی لگادی جائے تو ایسے قوانین کی پابندی درج ذیل شرائط کے ساتھ واجب ہے۔

۱- یہ پابندی دائمی نہ ہو کہ اس کی وجہ سے اللہ کی حلال کردہ کوئی چیز حرام ہوجائے۔

"يا يها النبي لم تحرم ما أحل الله لك" (التحريم: ۱) (اور کسی مباح چیز پر دائمی پابندی یقینا تحریم حلال کے مترادف ہے)۔

۲- یہ پابندی عادل حکمراں کی طرف سے عائد کی گئی ہو۔

''أقول: وظاهر عبادة خزانة الفتاوى لزوم إطاعة من استوفى شروط الإمامة، وشروط الإمامة: أن يكون عدلا بالغا أمينا ورعا ذكرا موثوقا به في الدماء والفروج والأموال. زاهدا متوضعا مسايسا في موضع السياسة'' (شامی ۱۰/ ۴۳،۴۲)۔

۳- اگر ٹیکس حاصل کرنے کے لئے یہ پابندی لگائی گئی ہو تو اس کی پابندی اس وقت واجب ہوتی ہے جبکہ ٹیکس لگانے میں ان امور کا خیال کیا جائے، ۱- اسلام مخالف مصارف میں صرف نہ کیا جائے، ۲- منکرات، فواحش، عریانی، لہو ولعب، اسراف وفضول خرچی سے احتراز کیا جائے، ۳- حکومتی اخراجات میں اعتدال اختیار کیا جائے، ۴- ٹیکس میں آمد اور مصارف کا لحاظ بھی کیا جائے یعنی جس پر ٹیکس لگایا جائے اس کی آمدنی اور اس کے اخراجات ملحوظ رکھ کر لگایا جائے، اگر ان امور مذکورہ کو ٹیکس وصول کرنے میں ملحوظ رکھا جاتا ہے تو ٹیکس کے قانون کی پابندی واجب ہے ورنہ نہیں (التفصیل فی احسن الفتاوی ۸/ ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۲)۔

۴- حکومتی قانون عوامی مصالح کے موافق ہو اس کے معارض نہ ہو "تجب إطاعته فيما أباحه الشرع وهو ما يعود نفعه على العامة" (شامی ۱۰/ ۴۴)

اگر مذکورہ بالا شرائط کو ملحوظ رکھ کر حکومت کی طرف سے کوئی قانون بنایا جائے تو اس کی پابندی اولو الامر کی اطاعت میں داخل ہونے کی وجہ سے واجب ہے، اور اگر مسلم ملک کا باشندہ ہو تو اس کے قوانین قولی یا عملی معاہدہ میں داخل ہونے کی وجہ سے واجب العمل ہوتے ہیں، بشرطیکہ یہ قوانین شریعت کے مخالف نہ ہوں۔

''كل من يسكن دولة فإنه يلتزم قولا أو عملا بأنه يتبع قوانينها وحينئذ يجب عليه اتباع أحكامها ما دامت تلك القوانين لا تجبرها على معسية دينية'' (أحكام القرآن للتهانوى ۵/ ۴۳)۔

اور اسمگلنگ میں حکومت کے قانون کی مخالفت بہر حال لازم آتی ہے، لہذا اگر یہ قوانین عوامی مصالح کے مطابق ہوں تو پابندی واجب ہوگی لیکن عموما اس طرح کے قانون حق پر مبنی نہیں ہوتے ہیں بلکہ ظلم پر مبنی ہوتے ہیں اور لوگوں کو مال بلا رضا کے لینا شرعا ناجائز وحرام ہے، لہذا اس اسمگلنگ والے قانون کی فی نفسہ پابندی واجب نہیں ہوگی۔

''ماليس بحق كالجبايات الموظفة على الناس في زماننا ببلادفارس على الخياط والصباغ وغيرهم للسلطان في كل يوم أو شهر فإنها ظلم'' (شامی ۷/ ۶۲۰)، ''ودفع النائبة والظلم عن نفسه أولى. فإن أكثر النوائب في زماننا بطريق الظلم، فمن تمكن من دفع الظلم عن نفسه فذلك خير له'' (الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۲۸۰، ۲۷۹)۔

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ اسمگلنگ کا عمل فی نفسہ ناجائز وحرام نہیں ہے، لہذا اس طریقے سے درآمد کئے ہوئے سونے کا خریدنا بیچنا شرعاً جائز ہے، اوراس سے حاصل شدہ آمدنی حلال ہے (الدر المختار مع رد المحتار ۵۷۳/۹، مع تقریرات الرافعی ۳۱۰/۱ ملحق برد المحتار)۔

اسمگلنگ کرنے کا حکم:

تفصیل مذکور اسمگلنگ کے نفس حکم اوراس کے ذریعہ حاصل کئے گئے مال کی خرید وفروخت کے حکم کو بیان کردیا گیا ہے، لیکن اسمگلنگ کرنے میں عزت نفس، اضاعت مال، کذب بیانی کا خطرہ لگا رہتا ہے، اس لئے فی نفسہ جائز ہونے کے باوجود جان ومال عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے اس کی ممانعت ہوگی، کیونکہ کسی مسلمان کے لئے اپنی آبرو جان ومال کو خطرے میں لگانا شرعاً جائز نہیں، لہذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔

''عن حذیفة قال رسول اللہ ﷺ لاینبغی (أی لایجوز) للمؤمن أن یذل نفسه (أی باختیاره) قالوا کیف یذل نفسه؟ قال: یتعرض من البلاء لما لایطیق'' (مشکاۃ مع مرقاۃ ۲۱۷/۵ آخر ابواب الدعاء)۔

سوال ۷ میں درج صورت کا حکم:

ٹیکس سے بچنے کے لئے غیر قانونی طور پر سونا وغیرہ اسمگلنگ کرکے لانا ذلت نفس، اضاعت مال وغیرہ کی وجہ سے ناجائز لغیرہ ہے، ورنہ اس کے جواز فی نفسہ میں کوئی شبہ نہیں، لہذا اس طرح سے درآمد کئے گئے سونے وغیرہ کو خریدنا بیچنا نفع حاصل کرنا سب جائز ہے، بشرطیکہ جان ومال آبرو سب محفوظ ہو، لیکن اگر اس کی خرید وفروخت میں عزت وآبرو پر بٹہ لگنے کا خطرہ ہو تو اس طرح کے کام سے بچنا لازم ہے (التفصیل فی فتاوی عثمانی ۳/۹۰-۹۱)۔

۸- سونے چاندی کے خصوصی احکام یعنی وجوب زکوۃ کے لئے نیت تجارت وغیرہ کا ضروری نہ ہونا اور آپس میں ان کے تبادلہ کے وقت قبضہ حسی کا لازم ہونا وغیرہ، اس کی ثمنیت (ذریعہ خرید وفروخت) ہونے کی وجہ سے ہے اور ثمنیت کا تحقق یا تو خلقی سے ہوگا جیسے سونا اور چاندی کہ اللہ رب العزت نے اس کو ثمنیت (ذریعہ خرید وفروخت) کے لئے پیدا کیا ہے اسی لئے ان کو اثمان خلقیہ کہا جاتا ہے، یا تو پھر ثمنیت کا تحقق عرف و اصطلاح سے ہوگا جیسے فلوس نافقہ اور مروجہ کرنسی وغیرہ، سونے چاندی کے خصوصی احکام نہ تو اس کی دھات کی گرانی کی وجہ سے ہیں اور نہ ہی زینت کے لئے استعمال ہونے کی وجہ سے کیونکہ اگر گرانی اور زینت کے لئے استعمال کرنا اس کے خصوصی احکام کا سبب ہوتے تو ہیرے جواہرات بھی سونے چاندی کے حکم میں ہوتے کیونکہ یہ بھی زینت کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور گراں بھی ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس پر خصوصی احکام کا مرتب نہ ہونا دلیل ہے کہ سونے چاندی کے خصوصی احکام کا سبب گرانی اور زینت کے لئے استعمال ہونا نہیں، بلکہ اس کے خصوصی حکم کا سبب ثمنیت کا ہونا متعین ہے، لہذا پلاٹین جس کو سفید سونا کہا جاتا ہے، ثمنیت خلقیہ وعرفیہ واصطلاحیہ کے فوت ہونے کی وجہ سے اس پر سونے چاندی کے خصوصی احکام نافذ نہ ہوں گے، چنانچہ صاحب احسن الفتاوی فرماتے ہیں: پلاٹینم و پلاٹین دو الگ الگ دھاتیں ہیں ان میں سے کوئی بھی سونا نہیں، لہذا ان پر زکوۃ نہیں ''إلا أن یکون للتجارة'' سفید سونا پلاٹینم کے ملانے سے بنتا ہے اس پر زکوۃ کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر سونا غالب ہو تو زکوۃ فرض ہے، اگر پلاٹینم غالب ہو تو زکوۃ فرض نہیں (احسن الفتاوی ۴۴۱/۱۰)۔

حاصل یہ کہ سونے کا خصوصی حکم نہ تو اس کے دھات ہونے کی وجہ سے ہے ورنہ تو تانبا پیتل بھی سونے کے حکم میں ہوتے اور نہ ہی اس کے گراں اور زینت کے لئے استعمال ہونے کی وجہ سے ہے ورنہ ہیرے جواہرات سونے کے حکم میں ہوتے، جب سونے کا حکم ان اسباب کی وجہ سے نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی چیز کے دھات یا گراں ہونے یا زینت کے لئے استعمال ہونے کی وجہ سے اس پر سونے کے احکام نافذ نہ ہوں گے، اس لئے پلاٹین بھی سونے کے حکم میں نہ ہوگا چاہے جتنا گراں اور مہنگا ہو۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت کا شرعی حکم

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی[1]

انسانوں کی ضروریات مختلف ہیں، ہر شخص ضروریات کی تمام اشیاء بیک وقت مہیا نہیں رکھ سکتا، کیونکہ جہاں اس کے لئے خطیر رقم کی ضرورت ہوتی ہے، حفاظت کے لئے افراد و مکان کی بھی حاجت ہوتی ہے، رفتہ رفتہ ہی ضرورت کی تکمیل ہوسکتی ہے جس کا آسان ذریعہ تجارت ہے، یعنی خرید وفروخت ہے، نیز جب سے انسان آباد کیا گیا اس وقت سے یہ سلسلہ چل رہا ہے اور ہر دور میں خرید وفروخت کو انسانی آبادی کی بنیادی ضرورت کے طور پر تسلیم کیا گیا، اسلام سے قبل اہل مکہ خاص طور پر تجارت کے لئے مشہور سمجھے جاتے تھے، اس وقت کی عالمی منڈی یمن وشام کا سفر اہل مکہ کی سرشت میں ایسا پیوست تھا کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر بطور امتنان واحسان کیا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعثت سے قبل بغرض تجارت اسفار کئے ہیں، البتہ اسلامی تجارت وجاہلی تجارت میں فرق یہ ہے کہ جاہلی تجارت کا مطمح نظر زیادہ سے زیادہ حصول مال ہوا کرتا تھا، خواہ جائز طریقے سے ہو یا ناجائز طریقے سے، خواہ افراد واشخاص انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کتنا کچھ مجروح ہوجائیں اگر تحصیل مال کا ذریعہ یہی ہو تو بھی گوارہ کرلیا جاتا، مگر اسلامی نظام تجارت میں ظلم وجور سے پاک وصاف ایک مکمل ومستحکم سسٹم پیش کیا گیا ہے، تجارت کی مختلف انواع کو مختلف قیود وشروط کے بندحسن کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

تجارت کی تو مختلف قسمیں ہیں مگر ان میں سے ایک قسم ''بیع صرف'' کہلاتی ہے، جس کی تشریح علامہ کاسانی کی زبان میں اس طرح ہے:

''فالصرف في متعارف الشرع اسم لبيع الأثمان المطلقة بعضها ببعض وهو بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة وأحد الجنسين بالآخر'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۵۳ کتاب الصرف، بيان شرائط طبع زكريا)

(صرف عرف شرع میں نام ہے اثمان مطلقہ میں سے بعض کی بعض سے بیع کا، وہ سونے کو سونے سے، چاندی کو چاندی سے، اور ایک جنس کو دوسری جنس سے بیع کرنا ہے)۔

اثمان مطلقہ سے مراد مبادلہ کا وہ ذریعہ ہے جس اللہ نے ثمنیت کے ساتھ روز اول سے متصف کردیا ہے اس کو ثمن خلقی کہا جاتا ہے اور وہ سونا و چاندی ہے، ثمن کے طور پر دوسری اشیاء بھی رائج رہی ہیں مگر ان کو اصطلاحی وعرفی ثمن کی حیثیت حاصل رہی، رفتہ رفتہ خلقی ثمن کا رواج وچلن کم ہوتا گیا اور مختلف ادوار سے گزر کر اب اصطلاحی وعرفی ثمن کو زر قانونی کی حیثیت سے مان لیا گیا ہے جو ہر ملک کی کرنسی کہلاتی ہے، جو باہم مختلف ہونے کے باوجود ثمنیت عرفیہ کی شان کے ساتھ متصف ہیں، نیز ان کرنسیوں کی یہی ثمنیت ان کی عزت ہے، اگر ثمنیت ختم کردی جائے تو محض کاغذ کے پرزے ہیں جو بے وقعت و بے اہمیت ہیں۔

بیع صرف چونکہ ثمن کا ثمن سے تبادلہ کا نام ہے، اس میں تھوڑی سی بھی بے احتیاطی سے ربا کا باب کھل سکتا تھا اس لئے اس کے صحیح ہونے کے لئے بنیادی طور پر چار شرطیں لگائی گئیں۔

''ويشترط عدم التاجيل والخيار؛ والتماثل أي: التساوي وزنا والتقابض'' (ردالمحتار ۴/ ۲۶۱ باب الصرف طبع رشیدیہ پاکستان)

(صرف کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے: عدم تاجیل، وعدم خیار شرط نیز وزن کے لحاظ سے تماثل وتساوی، اور مجلس عقد میں تقابض)۔

تماثل وتساوی کی شرط اس وقت ہے جبکہ ہم جنس کا باہم تبادلہ ہو، اگر جنس مختلف ہوجائیں تو پھر اس شرط کی حاجت نہیں، البتہ تقابض فی المجلس کی

---

[1] مدرسہ حسینیہ کائیم کلم کیرالا۔

شرط اساسی ہے، خواہ ایک ہی جنس سے تبادلہ ہو یا مختلف جنس سے بہرصورت شرط تقابض کا کلیدی کردار رہتا ہے، اسی بنیاد پر بعض معاملات حلت سے نکل کر حرمت کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ یہ شرطیں بالخصوص تقابض کی شرط ان کرنسیوں میں بھی جاری ہوں گی جنہوں نے آج پوری دنیا میں ''ثمن'' و قیمت کی حیثیت اختیار کرلی ہے، کیونکہ شریعت نے تقابض کی شرط محض حرمت ربا سے بچنے کے لئے لگائی ہے تو کیا ان کرنسیوں کو بھی اموال ربویہ میں داخل کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

فقہاء کے کلام سے ایسا لگتا ہے کہ امام مالک کے نزدیک تو اموال ربویہ میں شمار ہوں گے، دیگر فقہاء کے یہاں ان کا شمار اموال ربویہ میں مشکل ہے، اس لئے کہ فقہاء نے جس علت کی بنا پر کسی بھی مال کو سودی مال قرار دیا ہے، وہ علت صرف امام مالکؒ کے مسلک میں ان کرنسیوں میں پائی جارہی ہے، امام مالک کے نزدیک علت ربا ثمنیت ہے خواہ وہ ثمنیت خلقی ہو یا عرفی واصطلاحی، اسی لئے ''المدونۃ الکبریٰ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''ولو أن الناس أجازوا بينهم الجلود حتى تكون لها سكة وعين لكرهتها أن تباع بالذهب والورق نظرة لأن مالكا قال: لايجوز فلس بفلسين ولا تجوز الفلوس بالذهب ولا بالدنانير نظرة''

(المدونۃ الکبری ۳۳۳/۳، التاخیر فی صرف الفلوس طبع احیاء التراث العربی)

(اگر لوگوں کے مابین چمڑے کے ذریعہ خرید و فروخت کا رواج ہو جائے کہ وہ چمڑا ثمن اور سکہ کی حیثیت اختیار کر جائے تو اس صورت میں میرے نزدیک سونے چاندی کے ذریعہ اس چمڑے کو ادھار فروخت کرنا جائز نہیں ہے...... چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں: ایک فلس کی دو فلسوں کے ساتھ بیع جائز نہیں، اسی طرح سونا چاندی اور درہم اور دینار کے ذریعہ بھی فلوس کی ادھار بیع جائز نہیں)۔

امام شافعی کے نزدیک بھی اثمان میں علت ربا ''ثمنیت'' ہی ہے مگر وہ اس کو مقید کرتے ہیں، ثمن خلقی کے ساتھ:

''وعلة الربا فيه جوهرية الثمن فلا ربا في الفلوس وإن راجت'' (تحفۃ المحتاج ۲۷۰/۴ باب الربا، طبع دار الفکر)

(اس میں علت ربا اصلی ثمن ہونا ہے، لہذا فلوس میں چاہے رائج ہوں، ربا نہیں ہے)۔

موجودہ کرنسیاں ثمن ضرور ہیں مگر خلقی نہیں بلکہ عرفی واصطلاحی ہیں، اس لئے ان کا شمار اموال ربویہ میں نہیں ہوگا۔

امام احمد کے نزدیک تو علت ربا ظاہر قول میں وزن ہے، لہذا جن اشیاء کو وزن کر کے بیچا جاتا ہے انہی میں ربا کا تحقق ہوگا۔

(المغنی لابن قدامہ ۱۴۲/۴ دار الفکر)۔

کرنسیاں عددی ہیں وزنی نہیں:

حنفیہ کے یہاں علت ربا قدر مع الجنس ہے، یعنی کیلی و وزنی ہونا ہے کرنسیوں کے عددی ہونے کی وجہ سے ان کو اموال ربویہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، غنی و مالداری کا معیار اب یہی کرنسی ہے، انسان کی دنیاوی عزت و جاہ میں اضافہ ان کرنسیوں سے بھی وابستہ ہے، ان کا چلن سونا چاندی کے چلن کے ہو بہو ہے، فرق بس اتنا ہے کہ سونا چاندی کا رواج اگر بند ہو جائے تب بھی وہ مال نفیس ہے، کرنسیاں اگر ثمن کی حیثیت کو کھو دیں تو فالتو و بیکار کاغذ کے پرزے ہیں، قبل ازیں بھی اس کی نظیر ملتی ہے کہ سونا و چاندی کے علاوہ بھی بعض اشیاء سے ثمن کا کام لیا گیا ہے اور وہ مختلف ادوار میں مختلف اشیاء رہی ہیں، ایک زمانہ میں ''فلوس'' جو دراصل دھات کی قبیل سے ہیں ان کا چلن سونا چاندی کی طرح ہوا تھا، تو فقہاء نے اس کی بابت توضیح وتشریح کی، اس سے ہمیں مدد مل سکتی ہے، فلوس رائج کے سلسلہ میں جامعین موسوعہ نے فقہاء کے کلام کا خلاصہ اس طرح لکھا ہے:

''شافعیہ کا صحیح مسلک اور حنابلہ کا صحیح قول، نیز یہی حنفیہ میں سے شیخین کا قول اور مالکیہ کا ایک قول ہے کہ ثمن نہیں بلکہ عروض وسامان کی طرح ہیں۔

دوسرا نقطہ نظر امام محمد، ایک قول مالکیہ کا، شافعیہ کے یہاں اصح کے بالمقابل قول، حنابلہ کے یہاں صحیح کے بالمقابل قول یہ ہے کہ اموال ربویہ ہیں اور دراہم ودنانیر کی طرح ہیں۔

تیسرا نقطہ نظر مالکیہ کا قول ہے کہ یہ عروض ونقود کے بین بین ہیں، پس یہ صرف وربا کے باب میں نقد کی طرح ہیں اور دیگر ابواب میں سامان کی طرح بہر حال فلوس اگر رائج نہ ہوں تو عروض ہیں بالاتفاق'' (موسوعہ فقہیہ ۳۲/۲۰۶، مادہ: فلس)۔

دوسری جانب احناف کے یہاں اگر کسی مال کی ذاتی حیثیت ہو اور وہ قیمتی تصور کئے جاتے ہوں تو باہم تبادلہ میں تفاضل کو جائز نہیں سمجھا ہے گویا کہ ان نفیس اشیاء میں بھی ربا کا تحقق ہوسکتا ہے، اس سلسلہ میں مشائخ ماوراء النہر کا مندرجہ ذیل فتوی بہت اہم ہے:

''صاحب ہدایہ نے فرمایا: ہمارے مشائخ بخارا وسمرقند نے عدالی وغطارفہ (کھوٹے دراہم) میں جبکہ باہم بیع ہو تو تفاضل کی اجازت کا فتوی نہیں دیا، حالانکہ ان میں چاندی سے زیادہ کھوٹ ودوسری دھات ہوتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے دیار میں یہ نفیس مال سمجھے جاتے ہیں، پس اگر تفاضل ان میں جائز کردیا جائے تو سود کا باب کھل جائے گا اس لئے کہ لوگ اس وقت اموال نفیسہ میں عادی ہوں تو خالص دراہم ودنانیر میں بھی کرنے لگیں گے، لہذا مادہ فساد کو ختم کرنے کے لئے منع کیا گیا'' (ردالمحتار علی الدر ۴/۲۶۷، کتاب الصرف، مطلب: مسائل فی المقاصۃ)۔

اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر ایک کرنسی کا آپس میں تبادلہ ہو تو نفیس ہونے کی وجہ سے تفاضل کی گنجائش نہیں دینی چاہئے، اور اس بابت امام محمد کا فلوس نافقہ کے سلسلہ میں فیصلہ بہت حد تک مزاج شریعت سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے۔

۱-الف: سونا چاندی کی ادھار خرید وفروخت روپئے سے:

فلوس نافقہ کی بیع وشراء دوسری جنس مثلاً دراہم ودنانیر سے ہو تو اس وقت اس پر صرف کے احکام کے بجائے بیع مطلق کے احکام جاری ہوتے ہیں، نیز اس وقت ایک جانب سے قبضہ ہوجانے کو بیع کے صحیح ہونے کے لئے کافی سمجھا گیا ہے۔

''لم یشترط في بیع الفلوس بالدراهم أو بالدنانیر قبض البدلین قبل الافتراق ویکتفی بقبض أحد البدلین کذا فی المحیط'' (ہندیہ ۳/۲۱۷ کتاب الصرف، الباب الأول)

(فلوس کی بیع دراہم ودنانیر سے ہو تو مجلس بدلنے سے پہلے بدلین پر قبضہ شرط نہیں ہے، بدلین میں سے ایک پر قبضہ کافی ہوگا)۔

''ولو باع فضة لفلوس فإنه یشترط قبض أحد البدلین قبل الافتراق لا قبضهما کما في العبرعن الذخیرة'' (ردالمحتار ۴/۲۶۲ باب الصرف، طبع رشیدیہ پاکستان)

(اگر چاندی کو فلوس سے بیع کیا تو بدلین میں سے ایک پر قبضہ شرط ہے تفرق سے پہلے، دونوں پر قبضہ شرط نہیں ہے)۔

ایک جانب سے قبضہ اس لئے ضروری ہے کہ حدیثوں میں دین کی دین سے (یعنی بیع الکالی بالکالی) بیع کی بابت ممانعت وارد ہے، چونکہ فلوس ثمن کے طور پر رائج ہیں اس لحاظ سے متعین نہیں ہوں گے، اب اگر ایک پر بھی قبضہ نہ ہو تو بیع الکالئی بالکالئی ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگا۔

اسی پر موجودہ کرنسیوں کے عوض سونا، چاندی کی خرید وفروخت کو قیاس کیا جاسکتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ دونوں میں سے ایک پر قبضہ تحقق ہوجائے گا تو جائز ہوگا ورنہ نہیں، کیونکہ اثمان میں تعیین قبضہ کے بغیر نہیں ہوتی ہے، الا یہ کہ تعیین عاقدین اپنے طور پر کرلیں تو شیخین کے مسلک کے مطابق تعیین ہوجاتی ہے لیکن امام محمد کے نزدیک پھر بھی تعیین نہیں ہوتی ہے جیسا کہ ایک فلس کی بیع دو فلس کے مسئلہ میں ان بزرگوں کا اختلاف مشہور ومعروف ہے، امام محمد کا نظریہ یہی راجح ہے کیونکہ جس چیز کی ثمنیت کو عرف عام نے قبول کیا ہے اس کو دو آدمی کیسے ختم کرسکتے ہیں، ان دونوں کا ختم کرنا بھی خوامخواہ کا ایک ظاہری حیلہ ہوگا اور زبانی دعوی ہوگا، قلب وذہن میں اس کی ثمنیت پھر بھی برقرار رہے گی، اس لئے ثمن ہونے کا تقاضا ہے کہ بغیر قبضہ متعین نہ ہو، لہذا ایک جانب کے قبضے سے اس محظور سے بچا جاسکتا ہے۔

ب-حکومت کی جانب سے یا کومیکس گولڈ مارکیٹ یا ایم سی مارکیٹ کی جانب سے نرخ کے تعین کے باوجود تفاضل:

اگر گورنمنٹ نے یا انٹرنیشنل مارکیٹ کومیکس گولڈ، اور ہندستانی مارکیٹ ایم سی نے کرنسی کی قیمت مقرر کردی ہو، لین دین میں اس قیمت کو ملحوظ نہ رکھا جائے بلکہ اس سے زیادہ یا کم بھاؤ پر سونے وچاندی کی خرید، یا دوسری کرنسی ڈالر وغیرہ کا تبادلہ کیا جائے تو تفاضل ہونے کی بنا پر حرام ہوگا یا نہیں؟

پیچھے کے سطور میں اس امر کو واضح کردیا گیا ہے کہ نسیاں خواہ ثمن کی پوزیشن میں کیوں نہ ہوں ان کی حیثیت فلوس نافقہ کی ہے جس کو عرفی ثمن

کہا جاتا ہے، امام مالک کے علاوہ دیگر ائمہ کے یہاں تو یہ اموال ربویہ میں سے ہیں ہی نہیں، اگر دراہم کی بیع دنانیر سے ہو جو کہ حقیقی اور خلقی ثمن ہیں ان میں کتنا بھی تفاضل ہو ربا کا تحقق نہیں ہوتا، تو ثمن عرفی کرنسی وغیرہ میں مقررہ نرخ سے کمی وزیادتی کی صورت میں تفاضل ہی ثابت ہو پائے گا تو یہ حرام کیوں کر ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ حکومت کی مخالفت لازم آئے گی، جبکہ عام حالات میں حکومت کی مخالفت جائز نہیں ہے، بالخصوص جبکہ اسلامی احکام سے تصادم نہ ہوتا ہو، کیونکہ خواہ حکومت غیر مسلم کی ہو مگر مسلمانوں نے عملاً اس بات کا اقرار کرلیا ہے کہ ملکی قوانین کی پابندی کریں گے، اس کی خلاف ورزی کا جو وبال ہوسکتا ہے وہ ہوگا مگر فی نفسہ تفاضل کی صورت میں سود و ربا کا لزوم نہیں ہوگا۔

اس کو تسعیر الامام کے مسئلہ پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، جن حضرات نے امام المسلمین کو اختیار دیا ہے کہ توازن کو برقرار رکھنے کے لئے اشیاء کی قیمتیں مقرر کرسکتے ہیں، ان کے یہاں بھی اس مقرر قیمت کی مخالفت سے بیع وشراء کی حلت پر فرق نہیں پڑتا ہے۔

’’فإن سعر فباع الخباز بأكثرمما سعر جاز بيعه كذا في فتاوى قاضي خاں ومن باع منهم بما قدر الإمام من الثمن جاز بيعه كذا فى التاتار خانية‘‘(ہندیہ۳/ ۲۱۴ باب الاحتكار طبع احياء التراث العربي بيروت)

(اگر قیمت مقرر کردی پھر خباز نے مقررہ قیمت سے زائد میں بیع کی تو جائز ہے، فتاوی قاضی خاں، اور جس نے امام کی مقررہ قیمت میں بیع کی تو اس کی بیع جائز ہے، تاتارخانیہ)۔

۲-الف: کاریگروں سے زیورات بنوانے میں معاملہ کی شکل بیع ہے یا اجارہ؟

کاریگروں کو سونا یا چاندی دیکر زیورات بنوائے جاتے ہیں، اس کی شکل عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ سونا یا چاندی ابھی دیا گیا کچھ دنوں کے بعد کاریگر زیور کی شکل میں سونے یا چاندی کی وہی مقدار وزن کر کے واپس کرتا ہے، جتنا اس نے مالک سے وصول کیا تھا، چونکہ زیورات بغیر دوسری دھات ملائے ہوئے بن نہیں سکتے، اس لئے بطور اجرت کاریگر سونے یا چاندی کے فاضل ذرات کو رکھ لیتے ہیں، تو یہ معاملہ اس لحاظ سے کہ مالک نے سونا دیا ہے، اس کے عوض میں کاریگر نے دھات دی ہے، ظاہر میں مبادلۃ المال بالمال ہے اور بیع کی شکل ہے، البتہ اس دھات کو سونے کے ساتھ پیوست کر کے دینا چونکہ عرف عام ہے، عرف عام قاضی ہوا کرتا ہے، اس لئے ایسی متعارف شرط کی گنجائش فقہاء احناف کے یہاں ہے اس لئے جائز ہے، البتہ اس پر شبہ ہوسکتا ہے کہ مبیع وثمن ہر دو مجہول ہیں جو کہ صحت بیع کے لئے مضر ہے۔

’’جهالة المبيع أو الثمن تمنع جواز البيع إذا كان يتعذر معها التسليم، وإن كان لايتعذر لم يفسد العقد‘‘(ہندیہ۳/ ۱۲۲ كتاب البيوع، الفصل الثامن فى جهالة المبيع والثمن)

(مبیع یا ثمن کی جہالت جواز بیع کے لئے مانع ہے جبکہ اس جہالت کے ساتھ تسلیم متعذر رہو، اگر متعذر نہ ہو تو عقد فاسد نہیں ہے)۔

اس لئے اگر متعارف ہو کہ اتنے گرام کا زیور ڈھالنے میں اس مقدار دھات کی آمیزش ہوتی ہے تب تو متعارف ہونے کی وجہ سے جہالت ختم ہوگئی، اگر دھات میں کمی وبیشی ہوتی ہے جیسا کہ عام طور پر رواج بھی ہے تو ایسی صورت میں معاملہ اس وقت درست ہوگا جبکہ سونا دیتے وقت دھات کی مقدار مقرر کرلی جائے تاکہ اس کے بقدر سونے کی مقدار بھی مقرر ہوجائے۔

ہاں ایک شبہ پھر بھی باقی رہتا ہے کہ بیع ماننے کی صورت میں دو موزونی شئ کی بیع ہورہی ہے، ایک طرف سے قبضہ تو ہورہا ہے مگر دوسری جانب سے قبضہ نہیں پایا جارہا ہے گویا کہ گندم کی بیع جو سے ہورہی ہے اور جانبین سے تقابض نہیں ہورہا ہے، معاملہ جس کی وجہ سے فاسد ہوجاتا ہے، بعینہ یہی صورت زیورات بنوانے کے مسئلہ میں بھی پیش آرہی ہے اس لئے مناسب ہے کہ بیع کے بجائے اجارہ کا معاملہ قرار دیا جائے۔

کاریگر جو دھات معتی اشیاء اس صنعت میں لگارہا ہے وہ عرف وعادت کے مطابق لگارہا ہے، اجارہ کے باب میں عرف وعادت کا اعتبار کیا گیا ہے۔

’’والأصل فيه أن الإجارة إذا وقعت على عمل وكل ماكان من توابع ذلك العمل ولم يشترط في الإجارة ذلك على الأجير فالمرجع العرف‘‘(تاتارخانیہ۱۵/ ۱۵۳ كتاب الإجارة، الفصل۱۶ مسئلہ ۲۲۵۳۸)

(اصل یہ ہے کہ اجارہ جب ایک عمل پر ہو اس عمل کے توابع جو بھی ہیں اگر اجیر پر شرط نہیں ہیں تو ان میں عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا)۔

اسی بنیاد پر درزی سے جب کپڑا سلوایا جاتا ہے تو دھاگا و بٹن وغیرہ خیاط کے ذمہ ہوتے ہیں:

’’وفي غزل الخياط إذا لم يكن فيه عادة فهو على صاحب الثوب وهو كالصباغ يكون الصبغ عليه. فإن لم يكن فيه عادة فعلى صاحب الثوب‘‘ (تاتارخانيه ۱۵/ ۱۵۳، كتاب الإجاره، الفصل ۱۶، مسئله: ۲۲۵۴۰)

(درزی کے سوت کے سلسلہ میں یہ ہے کہ جب عرف نہ ہو تو کپڑا کے مالک پر واجب ہوگا یہ رنگریز کی طرح ہے کہ رنگ اس پر ہوتا ہے، اگر عرف نہ ہو تو کپڑے کی مالک پر ہوتا ہے)، اس لئے بیع کے بجائے اجارہ ماننا چاہئے۔

ب-زیورساز کے اجرت کی تعیین معروف طریقے سے درست ہے:

یہ مسئلہ بھی حل طلب ہے کہ کاریگر نے جس سونے یا چاندی کو لیا ہے اس نے اپنی مزدوری اسی سے لے لی ہے، گویا کہ جنس عمل سے مزدوری متعین کی ہے جو کہ قفیز طحان کے زمرے میں آتا ہے، ایک حدیث میں اللہ کے رسول نے قفیز طحان سے منع فرمایا ہے، اسی وجہ سے ائمہ ثلاثہ اس کی ممانعت کے قائل ہیں، البتہ امام احمد اور حسن بصری وغیرہ بزرگان جواز کی طرف میلان رکھتے ہیں، غالباً یہ نظریہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ حدیث کے سلسلہ میں ایک گروہ کی رائے ہے کہ یہ مرفوع کے بجائے حضرت ابوسعید خدری کا قول ہے، ہر چند کہ امام طحاوی اس نظریہ سے متفق نظر نہیں آتے ہیں، اگر اس کا مرفوع ہونا تسلیم بھی ہو تو غالباً اس صورت پر محمول ہے، جبکہ یہ شرط ہو کہ اجرت اس عمل پر حاصل ہونے والے اجزا سے ہی ہوگی، البتہ اگر اس طرح کی تعیین و تشخیص نہ ہو بلکہ صرف اجرت متعین ہو کہاں سے دے گا ہو سکتا ہے اپنے پاس سے دے دے تو اس حدیث کا محمل نہیں ہوگا۔

جبکہ اس کے برخلاف مشائخ بلخ کا نظریہ یہ ہے کہ اگر کسی چیز کا تعامل ہو جائے تو اس کی وجہ سے نص کی بھی تخصیص ہو سکتی ہے اس لئے خواہ شرط ہو کہ اسی عمل سے حاصل ہونے والی شئ اجرت ہوگی پھر بھی جائز ہوگا۔

(سراجیہ میں ہے: امام سرخسی نے اسی پر فتوی دیا ہے، مشائخ بلخ جیسے نصر بن یحیی، محمد بن سلمہ وغیرہ کپڑے میں اس اجارہ کے جواز کا فتوی دیتے تھے کپڑے میں اہل بلد کے تعامل کی وجہ سے، تعامل حجت ہے اس کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا جا سکتا ہے اور اثر کی تخصیص کی جا سکتی ہے، ظہیریہ میں ہے: اسی کو فقیہ ابواللیث شمس الائمہ حلوانی اور قاضی ابوعلی نسفی نے اختیار کیا ہے) (تاتارخانیہ ۱۵ /۱۱۱۵الفصل ۱۵، مسئلہ: ۲۲۳۷۲)۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن چیزوں میں تعامل اس کے خلاف ہو جائے تو تعامل کو قاضی بنا کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے، مزارعت و مساقات کو اس کی نظیر کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان میں بھی جزء ہی کو اجرت بنایا جاتا ہے، حضرت امام ابوحنیفہ کے اصل مسئلہ میں عدم جواز کے باوجود حنفیہ کے یہاں جواز کا فتوی ہے۔

البتہ کاریگر سے اتنی بات طے کرنا بہر حال ضروری ہے کہ دھات کی کتنی مقدار کی آمیزش کرے گا تا کہ اسی کے بقدر سونے کے ذرات معین ہو سکیں اور اجرت کی جہالت کی وجہ سے اجارہ متاثر نہ ہو سکے۔

۳-سونے کے پرانے زیور کے عوض نئے زیور کی خریداری:

یہ بھی مارکیٹ میں رائج ایک معاملہ ہے، ایک شخص پرانے زیور کو دیتا ہے اور اس کے عوض نیا اسی نوع کا یا دوسری نوع کا زیور لیتا ہے، اس لین دین میں دکاندار پرانے زیور، نئے زیور کی بنسبت زیادہ مقدار میں لیتا ہے، سونے چاندی کی خرید و فروخت کا عام اصول یہ ہے کہ اگر دونوں کی جنس متحد ہوں تو ادھار کے ساتھ کمی و بیشی بھی جائز نہیں ہے، جودت ورداءت سونے چاندی کے باب میں غیر معتبر ہے، لہذا مذکورہ بالا معاملہ جائز نہیں ہے۔

’’وإذا كان الغالب على الدراهم الفضة فهي فضة وإن كان الغالب على الدنانير الذهب فهي ذهب. ويعتبر فيهما من تحريم التفاضل ما يعتبر في الجياد حتى لايجوز بيع الخالصة بها ولا بيع بعضها ببعض إلا متساويا في الوزن‘‘ (هنديه ۳/ ۲۱۹ كتاب الصرف، الفصل الأول في بيع الذهب والفضة)

(جب دراہم پر غالب چاندی ہو تو وہ چاندی ہیں، اور اگر دینار پر غالب سونا ہے تو وہ سونا ہے، ان میں تفاضل کے سلسلہ میں وہی معتبر ہوگا جو جید و نفیس میں ہوتا ہے، حتی کہ خالص دراہم کی بیع ایسے مخلوط دراہم کے عوض یا بعض کا بعض کے عوض جائز نہیں ہے الا یہ کہ وزن میں مساوی ہو)۔

(اگر ایک پیتل کا برتن اسی جیسے پیتل کے برتن سے بیع کیا ان میں ایک دوسرے سے وزنی ہے تو جائز ہے، حالانکہ پیتل وغیرہ ان اموال ربویہ میں سے ہے جو موزون ہیں، اس لئے کہ سونے چاندی میں وزن کی صفت منصوص ہے تو صنعت کی وجہ سے تغیر نہیں ہوگا، اور موزون ہونے سے نہیں نکلے گا اس کے عددی ہونے کے تعارف کی وجہ سے برخلاف دوسری موزونی اشیاء کے کہ ان میں وزن عرف کی بنا پر ہے، لہذا عددی ہونے کا عرف ہونے کی وجہ سے موزون ہونے سے نکل جائے گا جبکہ صنعت وکاریگری اس میں کی گئی ہو) (ردالمحتار ۴/ ۲۶۲، باب الصرف، رشیدیہ پاکستان)۔

اس کے جواز کی شکل یہ ہے کہ پہلے اپنے پرانے زیور کو روپیوں کے عوض بیع کردے، پھر ان ہی روپیوں سے نئے زیور خرید لیا جائے تو جائز ہو جائے گا۔

۴- الف: سونا کی ایک مخصوص مقدار کی فروختگی کا معاملہ اگر مختلف حضرات کے مابین آرڈر کے مطابق ہو؟

بعض ادارے ایسے ہیں جو سونا کی بیع وشراء کرتے ہیں، اس کا طریقہ یوں ہوتا ہے کہ آرڈر کے مطابق گاہکوں سے معاملہ کرتے ہیں چنانچہ ایک ادارے کے پاس ایک کلو سونا ہے، دو گاہکوں نے آرڈر کیا آرڈر کے مطابق ہر ایک کے لئے سو سو گرام یا حسب آرڈر فکس کردیا، مگر ایسا نہیں ہے کہ سب کے حصے کو الگ الگ کر کے ممتاز و متشخص کردیا گیا ہو، بلکہ سونا اینٹ وڈلا کی شکل میں ہے یعنی مشاع ہے۔

چونکہ نقود کی بیع ہے جس میں قبضہ صلب عقد میں داخل ہوتا ہے، قبضہ بھی حقیقی وحسی، صرف حکمی قبضہ کافی نہیں ہوا کرتا ہے جس کو تخلیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہاں تو ایسا قبضہ مشروط ہے جس میں مبیع ایسا قابل تصرف ہو کہ تصرف کا مکان نہ رہ جائے مثلاً اپنے ہاتھوں میں لے لیا، خریدار کے اکاؤنٹ میں جمع کردیا جائے کہ اس کے علاوہ دوسرا اس کو نکال ہی نہیں سکتا ہے، اثمان کی بیع میں اس قسم کے قبضہ کی ضرورت ہوتی ہے، بیع صرف کی شرائط بیان کرتے ہوئے تقابض کی جب شرط بیان کی جاتی ہے تو اس طرح کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

"التقابض بالبراجم لا بالتخلية أشار إلى أن التقييد بالبراجم للاحتراز عن التخلية" (ردالمحتار علی الدر ۴/ ۲۶۱ باب الصرف، رشیدیہ پاکستان) (ہاتھوں سے تقابض ضروری ہے نہ کہ تخلیہ، براجم کے ساتھ تقیید سے اشارہ ہے تخلیہ سے احتراز کی جانب)۔

قبضہ فی معنی تخلیہ کے لئے بھی ضروری ہے کہ دوسرے کے حق میں مشغول نہ ہو۔

"التخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع بأن يكون مفرزا غير مشغول بحق غيره ولا حائل بأن يكون في حضرته" (ردالمحتار مع الدر المختار ۴/ ۴۸ باب البیع، شروط التخلیہ، رشیدیہ پاکستان)

- (تخلیہ اس طور پر ہو کہ قبضے پر قادر ہو کوئی مانع نہ ہو بایں طور کہ خریدا ہوا مال الگ ہو دوسرے کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو، اور نہ کوئی چیز حائل ہو بایں طور کہ اس کے پاس میں ہو)۔

مذکورہ بالا خرید کی صورت میں ہر چند کہ عام کرنسی سے بیع ہو رہی ہے، جب عام کرنسی سے بیع ہو تو احد البدلین پر قبضہ کافی ہے، جانبین سے قبضہ اس لئے ضروری نہیں ہے اصل مقصود بیع الکالی بالکالی یا بیع الدین بالدین کے محظور سے بچانا ہے، اس کی تفصیل پچھلے سطور میں آچکی ہے، ایک جانب سے قبضہ اس محظور سے بچنے کے لئے کافی ہے، مگر یہاں چونکہ آرڈر ہی ہے ثمن کا پیمنٹ نہیں ہوا ہے جبکہ دوسری جانب جو سونا خریدا جارہا ہے اس پر بھی قبضہ کا تحقق نہیں ہو پارہا ہے کیونکہ خریدار کے نام ابھی تک الارٹ نہیں ہوا ہے، نیز حق غیر کے ساتھ مشغول بھی ہے اس لئے یہ بیع ہی تحقق نہیں ہوئی۔

البتہ ثمن کو پیمنٹ کردیا گیا خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو جس کی وجہ سے بائع کا قبضہ ہوگیا تو بیع منعقد ہو جائے گی مگر مبیع پر قبضہ ابھی تصور نہیں کیا جائے گا، جب تک سونے کا کاروباری ادارہ ہر خریدار کو الگ الگ حصہ کر کے نہ دے دے۔

ب- ہر خریدار کے نام کے ساتھ الگ الگ سونا کا حصہ کردیا جائے اور تصرف کا مالک بنادیا جائے:

اگر سونے کی اینٹ کے بجائے اس کے الگ الگ ٹکڑے ہوں اور ہر خریدار کے نام ایک ایک ٹکڑا اس طرح کردیا جائے کہ جب چاہے خریدار تصرف کرلے کوئی دوسرا اس میں تصرف نہیں کرسکتا ہو تو خریدار کا قبضہ تصور کیا جائے گا، سونے چاندی کے ڈھلے ہوئے دراہم ودنانیر سے اس کے ڈلے کا حکم مختلف ہوا کرتا ہے، دراہم ودنانیر میں ہاتھ میں لئے بغیر قبضہ کا تصور ہی نہیں ہوسکتا ہے، لیکن ڈلے سے پہلے ایک طرح کی تعیین ہو جاتی ہے اسی وجہ سے بیع سلم کی بابت اختلاف ہو گیا کہ بلا ڈلے سونے میں جائز ہے یا نہیں، کیونکہ مسلم فیہ کا ایسی شئ ہونا ضروری ہے جو متعین کرنے سے متعین نہیں

ہوجائے، تبر یعنی بلاڈلے سونے کے بارے میں دورائے پائی جاتی ہے۔

''أن يكون المسلم فيه شيئا يتعين بالتعيين حتى لايجوز السلم في الأثمان نحو الدراهم المجروبة والدنانير المضروبة، وهل يجوز السلم في التبر؟على رواية كتابة الصرف لايجوز، وعلى رواية كتاب الشركة يجوز''
(تاتار خانیہ ۹/۲۳۵ الفصل ۲۳، السلم وشرائط السلم، ۱۳۵۲۰)

(مسلم فیہ یعنی مبیع کے لئے ضروری ہے کہ ایسی شئ ہو جو متعین کرنے سے متعین ہوجائے یہاں تک کہ مسلم ڈھلے ہوئے دراہم ودنانیر میں جائز نہیں ہے، کیا بلاڈلے ڈلے میں جائز ہے؟ کتاب الصرف کی روایت کے مطابق جائز نہیں ہے، اور کتاب الشرکۃ کے مطابق جائز ہے)۔

اس سے اتنی بات تو سمجھی جاسکتی ہے کہ سونے کے بسکٹ نما سکے کی شان دراہم ودنانیر کی طرح نہیں ہے، دراہم ودنانیر میں تو قبضہ اس وقت متحقق ہوہی نہیں سکتا ہے جب تک کہ ہاتھوں میں لے کر قبضہ نہ کرلے، مگر بسکٹ نما سونے میں یک گونہ توبیع اختیار کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کمپیوٹر کے ذریعہ یا رجسٹر وغیرہ میں نام ونمبر کے ساتھ ایسا اندارج کیا گیا کہ پھر دوسرے کے نام وہ نہیں ہوسکتا ہے تو گویا کہ خریدار کے لئے جو موانع تھے وہ باقی نہیں رہے اس لئے قبضہ کا تصور ہوجائے گا۔

۵- نرخ میں کمی وبیشی کا لین دین:

اسلام نے بیع وشراء کے سلسلے میں بہت سے ایسے رہنما اصول بیان کئے ہیں جن سے سودی نظام کے مفاسد کا سد باب ہوتا ہے، اور اس سے بازار کے عدم استحکام پر قابو پایا جاسکتا ہے، ان اصول میں سے ایک بنیادی ضابطہ یہ ہے کہ جب خریدار کے ضمان میں مبیع نہ آوے اس وقت تک وہ نفع ونقصان کا ذمہ دار نہیں ہے، کسی کے ضمان میں اشیاء اس وقت آتی ہیں جبکہ اس کے قبضہ وتصرف میں ہوں اسی لئے حدیثوں میں بیع قبل القبض سے منع فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

''إن رسول الله ﷺ قال: لايحل سلف وبيع، ولا شرطان في بيع ولا ربح مالم يضمن ولا بيع ما ليس عندك'' (ترمذی ۱/ ۲۳۳، ابواب البیو، باب ما جاء فی کراهیة ما لیس عنده) (اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جائز نہیں ہے قرض وبیع، اور نہ بیع میں دو شرط، اور نہ جو ضمان میں نہیں ہے اس کا نفع حلال ہے، اور نہ اس کی بیع جو تمہارے پاس نہیں ہے)۔

ایک آدمی سونا ادھار خریدتا ہے، فی الحال وہ ایکسچینج ہی میں ہے جو ادائیگی کی مدت ہے اس مدت میں سونے کی قیمت میں کمی وبیشی کے حساب سے لین دین ہوجاتا ہے، مثال سونے کی قیمت میں اچھال آگیا ہے تو خریدار کے ذمہ لازم کیا جاتا ہے کہ زائد قیمت ادا کردے، اگر نرخ میں کمی آتی ہے تو خریدار اس کمی کا بھگتان کرتا ہے۔

اس معاملہ کو کیا کہا جائے گا، ظاہر میں سلم کا معاملہ تھا، مگر سلم کے لئے ضروری ہے کہ رأس المال پر قبضہ مجلس عقد میں ہو جس سے یہ معاملہ عاری ہے، نیز اس کی شرائط میں سے ہے کہ معاملہ قطعی ہر اس میں کسی کو خیار نہ ہو۔

''والثامن أن يكون العقد باتا لا خيار فيه لالهما ولا لأحدهما'' (تاتارخانیہ ۹/ ۲۴۱، الفصل: ۲۳، باب شرائط المسلم ۱۳۵۲۳) (آٹھویں شرط یہ ہے کہ عقد لازم ہو، نہ تو دونوں کو اور نہ ہی کسی ایک کو اس میں خیار ہو)۔

کمی وبیشی کے لین دین سے محسوس ہوتا ہے کہ شروع سے ہی معاملہ کو لازم نہیں کیا ہے، اس لئے بیع سلم نہیں ہوئی۔ پھر خریدار نرخ میں کمی کی شکل میں نفع لے رہا ہے وہ کس ضمان کا ہے، جبکہ ابھی تک اس پر قبضہ نہیں کیا ہے، اگر یوں کہا جائے کہ اس نے بائع کے ہاتھ فروخت کردیا اور چونکہ سامان کی قیمت زیادہ تھی اسکو قیمت ملی ہے اسی لئے وہ کمی کی تلافی اس بائع سے لے کر کررہا ہے تو بھی معاملہ ناجائز ہوگا کیونکہ قبضہ سے پہلے بیع کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

(قبضہ سے پہلے بیع صحیح نہیں ہے اس لئے کہ مروی ہے کہ اللہ کے رسول نے قبضہ سے قبل بیع سے منع فرمایا ہے، نہی منہی کے فساد کو ثابت کرتی ہے، اور اس لئے کہ معقود علیہ کے ہلاک ہونے سے فسخ ہونے کا غرر پایا جارہا ہے...... خواہ دوسرے سے بیع کی ہو یا بائع سے بیع کی ہو، اس لئے کہ نہی مطلق

ہے جو غیر بائع و بائع کے مابین فصل نہیں کر رہی ہے اسی طرح معنی غرر دونوں کے مابین فصل نہیں کر رہا ہے)۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع ۴/ ۳۹۴ کتاب البیوع)۔

بلکہ یہ معاملہ سٹہ ہے جو معیشت کے نظام کو درہم برہم کر رہا ہے۔

۶- سونے کا احتکار:

شہر یا ایسی جگہ جہاں سے شہر میں غلہ آتا ہے وہاں سے غلہ خرید کر اپنے پاس روک لینا تاکہ مہنگا ہونے پر بیچ کرے گا اور نفع زیادہ کمائے گا، فقہ کی اصطلاح میں احتکار کہلاتا ہے، اللہ کے رسول نے مختلف ارشادات میں اس فعل پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے، ایک حدیث میں ہے:

''الجالب مرزوق والمحتكر ملعون'' (ابن ماجه ۱/ ۱۵۶ التجارات، باب الحكرة والجلب)

(باہر سے سامان لاکر شہر میں سپلائی کرنے والا رزق دیا جائے گا، اور سامان روک کر رکھنے والا ملعون ہے)۔

احتکار کی ممانعت اس وقت ہے جبکہ اہل شہر اور باشندگان کو ضرر ہو، اگر ایسا نہیں ہے، یا ایسا سامان ہے جو اس نے خود تیار کیا ہے مثلاً کاشتکاری کے ذریعہ حاصل کی ہے اگر اس کو روک کر رکھتا ہے تو اس وعید کا مصداق نہیں ہوگا۔

احتکار کا کن اشیاء میں تحقق ہوتا ہے اس بابت اختلاف ہے، امام محمد کے نزدیک انسان و جانوروں کی غذائی اشیاء کا اسٹاک کر لینا اور نہ بیچنا احتکار کہلاتا ہے اس کے علاوہ جس سے ہلاکت کا اندیشہ نہیں ہو تو اس میں احتکار ممنوع نہیں ہے۔

جبکہ امام ابو یوسف کے نزدیک انسان کی ضرورت کی ہر شئی میں احتکار ممنوع ہے جبکہ عام انسانوں کو ضرر کا سامنا ہو جیسے ملبوسات ومفروشات وغیرہ (تاتارخانیہ ۹/ ۴۱۵، کتاب البیوع، الفصل ۲۷، مسئلہ: ۱۳۷۵۳)۔

دوکاندار کا سونے کو روک لینا کیا یہ بھی ممنوع احتکار کا حصہ ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نہ بیچنے سے گرانی کا سبب تو ہو سکتا ہے، لیکن خود سونا انسانی ضروریات کا حصہ نہیں ہے، اگر لوگ نہیں خریدیں گے تو کیا نقصان ہو جائے گا، اس لئے ایسی قیمتی اشیاء جن کی ضرورت زندگی گزارنے کے لئے نہیں ہوتی ہے ان کا احتکار ممنوع نہیں ہونا چاہئے۔

۷- اسمگلنگ کے ذریعہ سونے کی حصولیابی:

اسمگلنگ کا مطلب ہے غیر قانونی طور پر بیرون ممالک سے مال کی حصول یابی اور سپلائی، انسان اپنے مال کا مالک ہوتا ہے، اس میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے، حتی کہ مسلم حکمرانوں کو بھی یہ اختیار نہیں کہ سامان کا نرخ متعین کرے، اس لئے اصل کے اعتبار سے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے مگر انسان جس ملک میں رہتا ہے اس سے عملاً عہد ہوتا ہے کہ اس کے قوانین کی پاسداری کرے گا، نیز اسمگلنگ سے معاشی توازن میں عدم استحکام آتا ہے، خاص طور پر ملکی مصنوعات کا بڑا نقصان ہوتا ہے، اس لئے قبیح لغیرہ ہو کر ناجائز ہوگا۔

تاہم اگر کسی نے اس ناجائز طریقے سے سونا چاندی کو حاصل کر لیا اور کاروبار میں لگا دیا تو جائز بھی ہو جائے گا، کیونکہ قبیح لغیرہ اصل کے لحاظ سے جائز ہی ہوتی ہے، اس کی نظیر میں تلقی جلب، بیع الحاضر للبادی کو پیش کیا جا سکتا ہے، اس قسم کے بیوع کی ممانعت وارد ہے، لیکن بیع ہو جانے کے بعد جواز کا فتوی دیا جاتا ہے۔

''أنه قال: لايبيع حاضر لباد دعوا الناس يرزق الله بعضهم من بعض، ولو باع جاز البيع. لأن النهي لمعنى في غير البيع وهو الإضرار بأهل المصر فلا يوجب فساد البيع كالبيع وقت النداء'' (بدائع ۴/ ۴۸۰ طبع زكريا)

(اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شہری دیہاتی کے لئے بیع نہ کرے، لوگوں کو چھوڑ دو اللہ بعض کو بعض کے ذریعہ سے رزق دیتا ہے، اور اگر اس طرح بیع کر لی تو جائز ہو جائے گی، اس لئے کہ نہی لغیرہ ہے اور وہ اہل شہر کو ضرر پہنچانا ہے، پس یہ فساد بیع کو ثابت نہیں کرے گا، جیسے اذان جمعہ کے وقت بیع کرنا)۔

۸- پلاٹینم کا حکم:

آج کل بعض معدنیات کی اہمیت بہت ہوگئی ہے، ان ہی میں سے پلاٹین بھی ہے، جس کو سفید سونا کہا جاتا ہے، شرعی لحاظ سے ثمن خلقی وحقیقی کے احکام صرف سونے چاندی میں جاری ہوتے ہیں، حتی کہ اگر سونے و چاندی کسی دوسری دھات میں مخلوط ہوکر مغلوب ہوجائے تو اپنا حکم کھو بیٹھتے ہیں۔

''والغالب عليه الغش منهما في حكم عروض اعتبارا للغالب فصح بيعه بالخالص إن كان الخالص أكثر من المغشوش وبجنسه متفاضلا'' (الدر المختار ۴/ ۲۶۷ کتاب الصرف، طبع رشیدیه)

(سونے و چاندی پر اگر غالب غش ہو تو وہ عروض کے حکم میں ہیں غالب کا اعتبار کرتے ہوئے، لہذا خالص سونے و چاندی سے بیع جائز ہے اگر خالص غش والے سے زیادہ ہو اور اسی جنس والے سے متفاضلا بھی جائز ہے)۔

اگر سونا و چاندی کے علاوہ کوئی قیمتی دھات ومعدن ہو تو اس کا حکم سونا و چاندی کا نہیں ہوتا ہے۔

''لا زكاة في اللآلي والجواهر وإن ساوت ألفا، إلا أن تكون للتجارة والأصل أن ماعدا الحجرين وهذا علم بالغلبة على الذهب والفضة والسوائم إنما يزكى بنية التجارة'' (الدر مع الرد ۲/ ۱۵ کتاب الزکاة)

(موتی و جواہر میں زکاۃ نہیں ہے، اگرچہ ہزار کے برابر ہو، الا یہ کہ تجارت کے لئے ہو، اصل یہ ہے کہ سونے و چاندی کے علاوہ اس کا علم غلبہ سے ہوگا، اور چرنے والے جانوروں کے علاوہ میں زکاۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جبکہ تجارت کی نیت ہو)۔

اس لئے پلاٹین کا حکم سونے کا تو نہیں ہوگا، اب اگر وہ ذریعہ تبادلہ بھی ہے تو فلوس رائج کے قائم مقام ہوکر صرف وزکاۃ میں فلوس کا حکم حاصل کرے گا۔

''أما الفلوس فإن رائجة فكثمن وإلا فكسلع'' (درمختار ۴/ ۲۷۱ کتاب الصرف طبع رشیدیه)

(بہرحال فلوس تو اگر رائج ہوں تو ثمن کی طرح ہیں ورنہ سامان کی طرح)۔

لہذا پلاٹین کا چلن ثمن کے طور پر ہوجائے تو ثمن کا حکم ہوگا، پھر اگر وہ وزنی ہے تو گویا سونے کی قدر میں بھی شریک ہے اور مجلس میں تقابض ضروری ہوجائے گا، جنس کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے تفاضل جائز ہوگا۔

اگر عدد ہے تو پھر ایک جانب سے تقابض کافی ہوگا، تاکہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے فلوس رائج میں جانبین سے تقابض ضروری نہیں قرار دیا جاتا، اس کی وجہ یہی ہے کہ علت ربا قدر وجنس نہیں ہے، اگر پلاٹین وسونے کے قدر میں اتحاد ہوجائے تو علت ربا کا تحقق ہوجائے گا اور ربا کے احکام نافذ ہوں گے، نیز بیع صرف کی وجہ سے تقابض مجلس میں ضروری ہوگا۔

خلاصہ جواب:

۱- بیع صرف، ثمن کا ثمن سے تبادلہ کا نام ہے۔

۲- ثمن کی دو قسمیں ہیں: خلقی واصطلاحی، خلقی ثمن سونا و چاندی ہیں، جبکہ اصطلاحی ثمن ہر وہ شئی ہے جس کا چلن ورواج ثمن کی طرح ہوجائے۔

۳- ثمن خلقی کے احکام میں ہے مجلس میں بدلین پر قبضہ ہے خواہ باہم مختلف جنس سے ہو رہا ہو یا ایک ہی جنس سے۔

۴- ثمن اصطلاحی میں اگر علت ربا پائی جارہی ہے تو وہ بھی خرید وفروخت میں ثمن خلقی کی طرح ہے۔

۵- علت ربا امام مالک کے نزدیک اثمان میں مطلق ثمنیت ہے، خواہ خلقی ہو یا عرفی، امام شافعی کے نزدیک صرف ثمن خلقی ہے، امام احمد کے نزدیک ظاہر قول میں وزنی ہونا ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک قدر مع الجنس ہے۔

۶- امام مالک کے نزدیک موجودہ زمانے کی کرنسیاں اموال ربویہ میں سے ہیں، جبکہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ کرنسیاں اموال ربویہ میں سے نہیں

ہیں، کیونکہ یہ یا تو ثمن اصطلاحی ہیں یا عددی ہیں، خلقی ثمن، اور وزنی نہیں ہیں۔

۷- لیکن کرنسیاں نفیس اشیاء سمجھی جاتی ہیں، حنفیہ کے یہاں اگر بدلین کی جنس متحد ہوں تو نفیس اموال میں بھی تفاضل ممنوع ہے، اس لئے کرنسیوں کے آپس میں تبادلہ میں تفاضل سے منع کیا جائے گا۔

۸- اگر سونے کو موجودہ کرنسی سے خریدا جائے تو بدلین میں سے ایک پر قبضہ ضروری ہے تا کہ بیع الکالی بالکالی کی ممانعت سے بچا جا سکے۔

۹- حکومت کی جانب سے سونے کا نرخ متعین ہونے کے باوجود اس سے زیادہ قیمت میں خریدنا جائز ہے، اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ تفاضل لازم آئے گا، اور تفاضل مختلف الاجناس میں ممنوع نہیں ہے۔

۱۰- اگر زیورات بنانے کے لئے کاریگر کے حوالہ سونا کیا جائے، چونکہ زیورات بغیر دوسری دھات کی آمیزش کے بنتے نہیں ہیں، اس لئے کاریگر نے زیور بنانے کی اجرت متعین نہ کی اور دھات کی آمیزش کے بقدر سونے کے فاضل ذرات کو اپنے پاس رکھ لیا، اور زیور دیئے گئے سونے کے وزن کے برابر واپس کر دیا تو یہ معاملہ اجارہ کا ہوگا۔

۱۱- اجارہ میں اجرت کی تعیین بھی ضروری ہے، اس لئے اگر کاریگر، سونے کے ذرات کو ہی بطور اجرت رکھتا ہے تو تعامل کی وجہ سے جائز تو ہوگا مگر اس کا متعین ہونا ضروری ہوگا، لہذا سونا حوالہ کرتے وقت ہی طے کر لی جائے کہ کتنی مقدار کی آمیزش ہوگی تا کہ اجرت متعین ہو سکے۔

۱۲- پرانے زیور کے بدلے نئے زیور کی خریداری میں دونوں ہم جنس ہیں تو تفاضل جائز نہیں ہوگا، پرانے زیور کو روپے سے بیع کر کے، ان روپیوں سے نئے زیور خرید لئے جائیں۔

۱۳- اگر سونے کی خرید کے لئے آرڈر بک کیا گیا، سونا اینٹ اور ڈلے کی شکل میں ہے جو کہ بائع کے پاس ہے، اس کو مشتری کے لئے دوسرے کے حصے سے الگ نہیں کیا گیا، اور نہ ہی ثمن پر قبضہ کیا گیا یہ بیع صحیح نہیں ہوگی کیونکہ یہ بیع کالی بالکالی ہے جو کہ ممنوع ہے۔

۱۴- اگر سونے کی خرید کے لئے آرڈر بک کیا گیا، ثمن پر قبضہ نہیں ہوا، مگر سونا بسکٹ نما سکے کی شکل میں الگ الگ ہے، اس پر نمبر کے ذریعہ مشتری کے حصہ کو الگ کیا جا سکتا ہے اور الگ کیا گیا کہ تصرف جب چاہے کر سکتا ہے تو بیع صحیح ہو جائے گی، ایک طرف سے قبضہ تصور کیا جائے گا جو کہ کرنسیوں سے بیع کے لئے کافی ہے۔

۱۵- صرف نرخ میں کمی وبیشی کا لین دین جو آج کل رائج ہے، یہ قمار کی ایک شکل ہے جو کہ جائز نہیں۔

۱۶- سونے کا احتکار جائز ہے۔

۱۷- اسمگلنگ شرعاً ممنوع، البتہ اس کے ذریعہ سونے کو حاصل کیا گیا تو اسکی حلت میں فرق نہیں پڑے گا۔

۱۸- پلاٹین کا حکم سونے کا نہیں ہے، البتہ اس کا رواج ثمن کے طور پر ہو تو ثمن عرفی کے احکام اس پر بھی جاری ہوں گے۔



سونا چاندی کی تجارت شریعت کی نگاہ میں

مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی (دار العلوم، مئو (یوپی)

بیع صرف کی تعریف:

''هو لغةً: الزيادة وشرعًا: بيع الثمن بالثمن أي ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنسًا بجنس أو بغير جنس كذهب وفضة'' (تنوير الأبصار مع الدر المختار و رد المحتار ۷/ ۵۱۰: زكريا)۔

(لغۃً ''صرف'' کے معنی: زیادتی کے ہیں، اور شرعاً ''صرف'' نام ہے: ثمن کو ثمن کے بدلے بیچنے کا (ثمن سے مراد: وہ چیز ہے جو خلقۃً ثمن بننے ہی کے لئے منجانب اللہ پیدا کی گئی ہو اور ثمن ہی کی قبیل سے سونے چاندی کے بنے ہوئے زیورات بھی ہیں۔ ثمن کو ثمن کے بدلے، جنس کو جنس کے ساتھ یا غیر جنس کے ساتھ بیچنے کا نام ''صرف'' ہے، ثمن کی مثال میں سونا اور چاندی ہیں (جنہیں اللہ تعالیٰ نے خلقۃً ثمن ہی بننے کے لئے بنایا ہے) سونے اور چاندی کا اگر زیور بنالیا جائے تو وہ بھی ثمن خلقی ہی ہوگا، جب ثمن کو ثمن کے بدلہ خریدا اور بیچا جائے گا تو دو امر ضروری ہونگے، (۱) تماثل (وزن میں مساوات) (۲) تقابض (بائع و مشتری کا جدا ہونے سے پہلے پہلے ثمن اور مبیع پر قبضہ کرلینا)

''ويشترط عدم التأجيل و الخيار والتماثل أي التساوي وزنًا و التقابض بالبراجم لا بالتخلية قبل الإفتراق'' (حوالہ بالا)

۱- سکے اور کاغذی نوٹ، چونکہ ثمن خلقی نہیں ہیں؛ بلکہ ثمن اصطلاحی اور عرفی ہیں؛ اس لئے کاغذی نوٹوں اور سکوں کے عوض سونا یا چاندی کی خرید و فروخت کو ''بیع صرف'' نہیں کہا جاسکتا؛ کیونکہ بیع صرف کے اندر مبیع اور ثمن دونوں ہی ثمن خلقی ہوا کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر ''تنویر الابصار'' کی عبارت گذر چکی ہے: ''هو (الصرف) بيع الثمن بالثمن''،

صاحب درمختار نے اس کی وضاحت میں یہ اضافہ فرمایا: ''أي ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنسا بجنس أو بغير جنس'' (۷/ ۵۲۰)، چونکہ نوٹ اور سکے ثمن خلقی نہیں ہیں؛ بلکہ ثمن اصطلاحی اور عرفی ہیں، اس لئے اس بیع کو بیع صرف نہیں کہہ سکتے۔

الف- جب مذکورہ بالا صورت میں بیع صرف کا تصور ممکن نہیں، تو ''صرف'' کی شرائط کا نفاذ بھی ضروری نہیں ہوگا؛ کونکہ ثمن حقیقی کے بدلے میں ثمن حقیقی کی خرید و فروخت میں نہ تو تفاضل جائز ہے اور نہ ہی ادھار درست ہے۔ ''درمختار'' کی اس عبارت میں اس مسئلہ کی صورت موجود ہے:

''لو باع فضةً بفلوس فإنه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما كما في البحر عن الذخيرة'' (الدر مع الرد ۷/ ۵۲۲) (اگر چاندی کو فلوس (سکوں) کے عوض فروخت کیا تو اس صورت میں بدلین (مبیع وثمن) میں صرف ایک پر قبضہ کرنا ضروری ہوگا افتراق سے پہلے پہلے، نہ کہ دونوں پر)۔

ب- سونا اور چاندی کا جو نرخ، حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ نے طے کردیا ہو، اس سے زیادہ یا کم قیمت کے عوض، سونے اور چاندی کی خرید و فروخت کو ربا الفضل (سود) نہیں قرار دیا جاسکتا؛ کیونکہ کاغذی نوٹ اور سونا چاندی، دونوں الگ الگ اجناس ہیں، اس لئے کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت پر ربا الفضل کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ہاں! حکومت کے طے کردہ نرخ کے خلاف خرید و فروخت کی صورت میں امام وقت کی مخالفت کی بنیاد پر گنہگار ہوسکتا ہے۔ علامہ تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ولا ينبغي مخالفة هذا السعر إما لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجب وإما لأن كل من سكن دولة فإنه يلتزم قولاً أو عملًا بأنه يتبع قوانينها وحينئذ يجب عليه إتباع أحكامها'' (أوراق أحكام النقود و العملات ۲/ ۱۹۰۸)

(حکومت کے طے کردہ نرخ کی مخالفت مناسب نہیں؛ کیونکہ امام وقت کی اطاعت ان امور میں واجب ہوا کرتی ہے، جو معصیت کے قبیل کے نہیں ہوا کرتے، اور یا تو اس وجہ سے کہ جو آدمی کسی بھی ملک میں سکونت پذیر ہوا کرتا ہے تو وہ وہاں کے جملہ قوانین کی عملاً یا قولاً پابندی کرنے کا التزام کئے ہوتا ہے، اس لئے اس پر حکومت کے احکام وقوانین کی اتباع لازم ہوا کرتی ہے)۔

۲- زیور بنانے والے کاریگر، زیورات کے تاجروں سے ایک معتد بہ وزن میں سونا لیتے ہیں، اور چند دنوں میں اس کے بدلے، سونے سے بنے ہوئے زیورات انہیں واپس کرتے ہیں، انہیں الگ سے کوئی اجرت نہیں دی جاتی؛ بلکہ زیورات کی شکل میں سونے کی اتنی ہی مقدار انہیں واپس کرنی ہوتی ہے، جتنی انہوں نے لی تھی؛ البتہ سونے کا زیور بنانے میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، اس آمیزش کے بقدر سونا ان کو بچ جاتا ہے اور زیور بنانے میں سونے کے کچھ ذرات نکل آتے ہیں، یہی ان کی اجرت ہوتی ہے۔

مذکورہ صورت میں سونے کے لین دین میں مقدار کا جو فرق ہو رہا ہے، اسے بیع نہیں تصور کیا جا سکتا؛ کیونکہ یہاں معاملہ، کاریگر سے تاجر کا زیور بنوانے کا ہے، نہ کہ خرید وفروخت کا، تو یہ اجارہ ہی کی صورت بنے گی۔ ہاں، اجارہ میں صحت اجارہ کے لئے، اجرت معلومہ کا ہونا شرط ہے، اور یہاں بظاہر اجرت، مجہول محسوس ہو رہی ہے، اگر یہ جہالت، مفضی الی النزاع ہو تو اجارہ، فاسد ہونا چاہئے؛ لیکن کاریگروں اور تاجرانِ ذہب وفضہ کے یہاں یہ تعامل چلا آ رہا ہے، اور ان میں اس کی وجہ سے نزاع بھی نہیں ہوتی، نزاع نہ ہونے کی وجہ، یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کتنے وزن کے سونے کا زیور بنانے میں کتنی مقدار میں اس کے اندر، دوسری دھاتیں ملائی پڑتی ہیں، یہ ان کے یہاں متعارف ہوا کرتا ہے؛ کیونکہ ٹانکہ (کھونٹ) معلوم کرنے کے لئے ان کے پاس کسوٹی (خاص پتھر) ہوا کرتا ہے، اس پر گھس کر، اس کے اندر موجود کھونٹ کی مقدار کو وہ معلوم کر لیا کرتے ہیں، اس لئے کاریگر اور تاجران کے مابین وہ ایک طرح سے معلوم کے درجہ میں ہوا کرتا ہے؛ اس لئے مذکورہ بالا صورت میں اجرت بالکلیہ مجہول نہیں ہے؛ بلکہ معلوم اور متعارف ہے اور اگر جہالت ہے بھی، تو معمولی جہالت ہے، اور جہالتِ یسیرہ، عقدِ اجارہ کے لئے موجب فساد نہیں ہوا کرتی۔

۳- عام طور پر سونے کے تاجر حضرات، پرانے زیور کی قیمت کم متعین کرتے ہیں؛ مثلاً دس گرام سونے کو آٹھ گرام کے درجہ میں رکھتے ہیں، تو اگر سونے کے پرانے زیورات کا سونے کے نئے زیورات سے تبادلہ ہو اور اس کمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سونے کا پرانا زیور، زیادہ وزن کا لیا جائے اور سونے کا نیا زیور کم وزن میں اس کے بدلے ادا کیا جائے تو یہ صورت جائز نہیں ہو سکتی؛ کیونکہ جنس کا جنس سے جب تبادلہ ہو تو تفاضل (کمی بیشی) جائز نہیں ہوا کرتی ہے؛ خواہ نئے پرانے، اور عمدہ اور گھٹیا کا فرق کیوں نہ ہو، مثلاً ۱۸/ کیرٹ کا سونا دس گرام دے کر، اگر کوئی ۲۴/ کیرٹ کا سونا آٹھ گرام لیتا ہے، تو یہ بیع جائز نہیں ہو سکتی۔ ''تنویر الابصار'' میں لکھا ہے کہ: بیع صرف میں دو چیزوں کی شرط ہے: ایک تماثل کی، دوسرے تقابض قبل الافتراق کی۔ عبارت یوں ہے:

''ویشترط التماثل أی التساوی وزناً والتقابض بالبراجم لا بالتخلیة قبل الافتراق وهو شرط بقائه صحیحًا علی الصحیح إن اتحدا جنسًا وإن وصلیة اختلفا جودةً وصیاغةً'' (تنویر الأبصار مع الدر/ ۵۲۱،۵۲۲)

اور ہدایہ ''کتاب الصرف'' میں تحریر ہے: ''فإن باع فضةً بفضة وذهبًا بذهب لا یجوز إلا مثلًا بمثل وإن اختلفت فی الجودة والصیاغة'' (ہدایہ ۳/ ۱۰۴)۔

۴- آج کل کموڈٹیز ایکسچینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، جس میں خریدار آرڈر دیتا ہے اور جو کچھ اس نے آرڈر دیا ہے، اس کے آرڈر کے بقدر وہ شئی، اس کے نام سے محفوظ کر دی جاتی ہے:

الف- تو اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس مثلاً ایک کلو سونا ہو اور وہ دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے؛ لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا، سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے گئے ہوں، تو اس صورت میں فقط خریدار کے نام سے اس کی خریدی ہوئی مقدار کے محفوظ کر دئے جانے کو خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جا سکتا؛ کیونکہ مبیع کو مقدور التسلیم ہونا بھی ضروری ہے اور یہاں تمام خریداروں کا سونا، اینٹ کی شکل میں اکٹھا موجود ہے، سونے پر کسی خریدار کا قبضہ کیونکر متصور ہو سکتا ہے؛ جبکہ مبیع مشاع غیر مقدور التسلیم ہے۔

ب- اور اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کر دیا گیا

ہو؛ نیز اس کی رسید یا سرٹیفیکٹ مشتری کو دیدی جائے تو یہ شکل اس کے قبضے کی مانی جاسکتی ہے، کیونکہ مشتری کا گوکہ مبیع پر حسًا قبضہ نہیں ہے ؛ تاہم تخلیہ اور موانع عن التصرف کا ارتفاع پایا جارہا ہے، اور قبضہ سے مقصود در حقیقت رفع موانع ہی ہوا کرتا ہے۔

۵- ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی ایک اور صورت جو آجکل رائج ہے، یہ ہے کہ مثلاً ایک مہینہ کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے ۱۰/تولہ سونے کا سودا کرلیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا، جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ لیا جاتا ہے، خریداری کے دن اور ادائیگی کے دن، سونے کے نرخوں میں جو فرق ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کردی جاتی ہے، مثلاً خریدنے کے دن سونے کا نرخ پانچ ہزار روپئے فی تولہ تھا، ادائیگی کے دن پانچ ہزار ایک سو روپئے تولہ ہوگیا تو خریدار بائع کو ایک سو روپئے دے گا اور اگر اس دن قیمت چار ہزار نو سو روپئے تھی، تو بائع خریدار کو ایک سو روپئے ادا کرے گا، نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے اور نہ بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے، بس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے، اس کا لین دین کرتے ہیں۔

مذکورہ صورت، لین دین کی جائز نہیں ہے؛ کیونکہ یہ تو مکمل سٹہ بازی ہے، اور سٹہ بازی (Speculation) میں بھی مقررہ تاریخ پر سامان اور جنس کی لین دین کے بجائے قیمتوں کا فرق برابر کرکے نفع کمایا جاتا ہے اور سٹہ (Speculation) فیوچر سیل (Future Seles) کی ایک قسم ہے، جسے علامہ تقی عثمانی صاحب نے شرعاً ناجائز لکھا ہے (دیکھئے: اسلام اور جدید معیشت وتجارت/ص۹۱، اور دیکھئے: صفحہ ۷۵ پر سٹہ کا بیان)۔

۶- بہت سی دفعہ سونے کی قیمت میں متوقع اضافہ کا سونے اور چاندی کے تاجروں کو علم ہوجاتا ہے ایسی صورت میں وہ سونے کو روک لیتے ہیں؛ تاکہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کریں گے، سونا اس پہلو سے اشیاء ضروریہ میں شامل ہے کہ وہ ثمن خلقی ہونے کے لحاظ سے ذریعہ تبادلہ ہے، اس کو روک لینے کی وجہ سے سونے کی قیمت تو بڑھتی ہی ہے، اس گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہے؛ اس لئے سونے کی ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے لئے اسے روک کر رکھنا، احتکار کے دائرہ میں آئے گا، اور احتکار منہی عنہ اور حرام ہے۔

احتکار کے بارے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف رائے ہے کہ احتکار کا تعلق صرف کھانے پینے کی اشیاء سے متعلق ہوا کرتا ہے، یا اس کا تعلق سبھی اشیائے ضروریہ سے ہوا کرتا ہے، اختلاف فقہاء کو ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

۱- احناف: اشیاء خورد و نوش کا ایک شہر سے دوسرے شہر میں لانا اور اسے اس نیت سے روک کر رکھنا کہ جب ان کی قیمت بڑھے گی، تب فروخت کروں گا، یہ احتکار میں داخل ہے، بشرطیکہ جس شہر میں غلہ روکا گیا ہے، وہاں کے لوگوں کو اس عمل سے نقصان کا اندیشہ ہو؛ کیونکہ اس شہر میں غلہ کی آمد کے بعد اس غلے سے شہر کے لوگوں کا حق متعلق ہوجایا کرتا ہے، اور اسے روک کر رکھنے میں لوگوں کے ساتھ ظلم ہے۔ علامہ کاسانیؒ نے فرمایا:

''لأن الاحتكار من باب الظلم، لأن ما يبيع في المصر فقد يتعلق به حق العامة فإذا امتنع المشتري عن بيعه عند شدة حاجتهم إليه فقد منعهم حقهم ومنع الحق عن المستحق ظلم وأنه حرام'' (بدائع الصنائع۵/ ۱۲۹)

(کیونکہ احتکار من باب الظلم ہے، اس لئے کہ جو چیز شہر میں بکتی ہے، اس سے شہر کے لوگوں کا حق متعلق ہوجایا کرتا ہے، تو جب مشتری، خریدی ہوئی شئی کو بیچنے سے رک جائے گا؛ جبکہ اہل شہر کو اس کی شدید ضرورت ہے تو دریں صورت اہل شہر کے حق کو روک کر رکھنا ہوا، اور مستحق کو اس کے حق سے روکنا، ظلم ہے، اور ظلم حرام ہے)۔

فقہاء احناف میں امام ابویوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ: احتکار کا تعلق صرف اشیائے خورد و نوش ہی سے نہیں ہے؛ بلکہ اس کا تعلق ہر اس چیز سے ہے، جس کی لوگوں کو ضرورت ہوا کرتی ہے؛ خواہ وہ ماکولات و مشروبات ہوں یا ملبوسات اور سونے چاندی ہی کیوں نہ ہوں۔

۲- امام مالکؒ: ''يمنع من يحتكر إذا كان فعله يضر بالسوق'' (المدونۃ ۳/ ۲۹۰) (احتکار کرنے والے کو احتکار سے روکا جائے گا، بشرطیکہ اس کے اس فعل سے بازار اور بازار والوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو) الغرض امام مالکؒ کے نزدیک بھی احتکار میں عموم ہے، خواہ وہ کسی چیز سے متعلق ہو، اگر لوگوں کو اس کی حاجت ہو اور کچھ لوگ اسے قیمت بڑھنے کی نیت سے روکیں تو وہ احتکار کرنے والے شمار ہوں گے۔

۳- امام شافعیؒ: ان کے نزدیک اقوات (اشیاء خورد و نوش) میں احتکار حرام ہے؛ لیکن اصحاب امام شافعیؒ نے احتکار کو حرام نہیں بلکہ صرف مکروہ قرار

دیا ہے (المجموع شرح المہذب للنووی ۱۳/ ۴۴ تا ۴۹)۔

۴- امام احمد بن حنبلؒ: امام احمدؒ نے احتکار کو حرام قرار دیا ہے، بدلیل حدیث رسول اللہ ﷺ:

"من احتکر فهو خاطئ" (مسلم فی کتاب المساقاۃ و المزارعۃ)۔

امام احمدؒ کے نزدیک احتکار تین شرطوں کے ساتھ حرام ہے:

۱- احتکار کرنے والا سامان خرید کر لائے یعنی مشتری ہو نہ کہ باہر سے لانے والا ہو، یا اپنے غلہ میں کچھ ملا کر اسے ذخیرہ کرنے والا ہو تو احتکار نہیں ہوگا۔

۲- اشیاء خورد و نوش (قوت) کا خرید کر روکنے والا ہو، لہذا حلوا، شہد، تیل اور جانوروں کے چارہ میں احتکار نہیں ہوگا۔

۳- ان اشیاء خورد و نوش کے خریدنے کی بنا پر لوگوں کو تنگی میں پڑنے کا سبب بنے تو احتکار ہوگا، ورنہ نہیں (المغنی)۔

بعض معاصر عرب مصنفین نے امام مالکؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے کو ترجیح دیا ہے؛ کیونکہ ضرورت کی کسی بھی چیز کا احتکار کرنے پر لوگوں کو تنگی اور پریشانی میں مبتلا کرنا ہوگا، اس لئے احتکار عمومی طور پر منہی عنہ اور حرام ہونا چاہئے۔

بناءً علیہ سونے کو بھی اس نیت سے روک کر رکھنا کہ جب اس کی قیمت بڑھے گی، تب فروخت کرونگا، یہ بھی احتکار میں داخل ہوگا۔

۷- ملک میں جو سونا آتا ہے، اس میں بڑا حصہ تو قانونی طریقہ پر آتا ہے اور سونا لانے والا اس کے واجبات کو ادا کرتا ہے، دوسرا طریقہ اسمگلنگ کا ہے، یہ طریقہ غیر قانونی ہے، اس میں سونا لانے والا ان واجبات کو ادا نہیں کرتا، جو حکومت نے سونے کی درآمد سے متعلق مقرر کئے ہیں۔

اسمگلنگ کا عمل جائز نہیں ہے، لہذا اسمگلنگ شدہ سونے کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں ہوگی۔

"فلا یجوز التهریب الذی یخالف ما نصت علیه الدولة ویسبب وقوع المشاکل بین الشعب والدولة ویوقع فی الحرام أیضًا فالواجب علی الشعب أن یمتثل وأن یساعد الدولة فی منع ما ینبغی منعه وفی بقاء ما ینبغی بقاؤه لأن ذلك فیه التعاون علی ما فیه مصلحة الجمیع" (من النیت)

(سو اسمگلنگ کا عمل جائز نہیں ہو سکتا؛ جس میں حکومت کے فرمان کی مخالفت لازم آتی ہے اور جو عوام اور حکومت کے مابین مشکلات پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے، نیز یہ عمل حرام میں مبتلا کرتا ہے، بناءً علیہ عوام الناس پر واجب ہے کہ حکومت کے احکام کی اطاعت کریں اور حکومت کے ممنوعات سے بچیں اور جن چیزوں کی حکومت کی طرف سے اجازت ہو، وہیں تک اپنے کو محدود رکھیں، اسی میں سارے لوگوں کی مصلحت مضمر ہے)

سعودی عربیہ کے "اللجنة الدائمة" کے فتوی (رقم: ۶۲۴۰) میں کہا گیا ہے: "وبناءً علی حرمة التهریب یکون شراء البضائع المهربة محرمًا لما فیه من الإضرار بالدولة ومخالفة ما یراه أولیاء الأمور فیها من مصلحة منعه ولما فیه أیضًا من الإعانة علی الإثم وقد قال تعالی: وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم و العدوان" (سورۂ مائدہ: ۲)

(چونکہ اسمگلنگ کا عمل حرام ہے، اس لئے اسمگلنگ شدہ تمام سامانوں کی خرید و فروخت بھی حرام ہوگی؛ کیونکہ اس میں حکومت کو نقصان پہنچانا ہے اور اولیاء الامور کی مخالفت بھی لازم آتی ہے؛ کیونکہ جن امور سے انہوں نے روک رکھا ہے، اس کا ارتکاب لازم آتا ہے، نیز اس میں تعاون علی الاثم بھی ہے، جو بنص قرآنی ممنوع و محرم ہے)۔

۸- آجکل پلاٹین کو سفید سونا کہا جاتا ہے، اب اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے، اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، تو چونکہ سونے چاندی کو شریعت میں اثمان خلقی تسلیم کیا گیا ہے، اب اس کے ساتھ کوئی دوسری دھات خواہ وہ کتنی ہی مہنگی کیوں نہ ہو اور خواہ لوگوں میں اس کے زیورات بنانے اور دیگر امور میں اس کا چلن کتنا ہی عام کیوں نہ ہو گیا ہو، وہ دھات سونے اور چاندی کا مقام نہیں لے سکتی، نہ اس کے اندر بیع و شراء کے وہ احکام منطبق ہونگے، جو سونے چاندے کے سلسلے میں ہوتے ہیں۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق اہم متعلق مسائل

مولانا محمد اقبال قاسمی[1]

۱، ۲- پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر روپئے سے سونا یا چاندی خریدا جائے تو روپے کی حیثیت ثمن کی ہوگی اور اس بیع کو بیع صرف نہیں کہا جائے گا، چونکہ بیع صرف کی تعریف فقہاء نے یہ کی ہے کہ ثمن کو ثمن کے بدلہ بیچا جائے خواہ اس کی جنس سے یا غیر جنس سے، اور ثمن سے مراد وہ چیزیں ہیں جو خلقی اعتبار سے ثمن ہوں خواہ وہ زیورات کی شکل میں ہوں یا خالص سونے چاندی کی شکل میں یا دراہم ودنانیر کی شکل میں، موسوعہ میں بیع صرف کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"هو بيع الثمن بالثمن جنسا بجنس أو بغير جنس، فيشمل بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة كما يشمل بيع الذهب بالفضة والمراد بالثمن ما خلق للثمنية فيدخل فيه المصوغ بالمصوغ أو بالنقد" (موسوعہ فقیہ ۲۶/ ۳۴۸)

لہذا سونے کو سونے کے بدلہ یا سونے کو چاندی کے بدلے بیچنے کو بیع صرف کہیں گے، اور "الفقہ الاسلامی" میں بیع صرف کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"هو بيع النقد بالنقد جنسا بجنس أو بغير جنس" أي بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة أو الذهب بالفضة مصوغا أو نقدا" (الفقه الاسلامي وادلته ۴/ ۴۰۴) (نقد کو نقد کے بدلہ بیچنا، ایک جنس کو اسی کی جنس کے عوض یا غیر جنس کے عوض یعنی سونے کو سونے کے بدلے یا چاندی کو چاندی کے بدلے یا سونے کو چاندی کے بدلہ خواہ وہ ڈھالا ہوا ہو یا نقدی ہو)۔

اور نقدی میں سونا، چاندی دونوں آتے ہیں اور یہ سب ثمن کہلاتے ہیں اور یہ خلقی ثمن ہیں، اللہ نے ان دونوں کو فطری اعتبار سے ثمن بنایا ہے، یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا ان کو ثمن مانتی ہے اور تمام ہی ممالک میں ان کو اصل سرمایہ اور پونجی تصور کیا جاتا ہے، ان کی ثمنیت کسی کے ماننے پر موقوف نہیں ہے، دنیا کے کسی بھی ملک اور خطے میں سونا اور چاندی لے کر آپ چلے جائیں ان کے بدلہ میں وہاں کی کرنسی آرام سے مل جائے گی اور روپئے یا کرنسی کی حیثیت ثمن اصطلاحی کی ہے، یعنی ہر ملک کی حکومت نے اپنے یہاں کے رائج سکوں کو ثمن کی حیثیت دے رہی ہے اور وہ ملک والے اسی سے خرید وفروخت کرتے ہیں، جب تک وہاں کی حکومت اس کو ثمن مانے گی، اس وقت تک اس کی حیثیت ثمن کی ہوگی اور جب اس پر پابندی لگا دے گی جیسا کہ آج کل پانچ سو اور ہزار روپئے کے نوٹ پر پابندی لگ گئی ہے تو اس کی ثمنیت باطل ہو جائے گی یہی وجہ ہے کہ ایک ملک کی کرنسی براہ راست دوسرے ملک میں نہیں چلتی لیکن سونا اور چاندی ہر ملک میں رائج ہے اور ہر جگہ اس کی حیثیت مسلم ہے، خلاصہ یہ ہے کہ سونا چاندی دونوں ثمن ہیں اور دونوں کی جنس الگ الگ ہے، فقہاء لکھتے ہیں:

"والذهب والفضة أثمان بالخلقة سواء كانا مضروبين نقودا أو غير مضروبين" (موسوعہ فقہیہ ۹/ ۲۷)۔

الف- سونا چاندی اور روپئے میں سے ایک نقد اور دوسرا ادھار:

یہ بات درست ہے کہ سونا، چاندی اور روپئے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار ہو کیونکہ یہ بیع صرف نہیں ہے چونکہ بیع صرف میں جانبین سے ثمن خلقی کا ہونا ضروری ہے، اور روپئے سے سونا چاندی خریدنے کو بیع صرف نہیں کہتے۔

"شامی" میں ہے، علامہ حانوتی سے سونے کو روپئے کے بدلے ادھار بیچنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جائز ہے جبکہ

[1] قاضی شریعت واستاذ مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھروارہ دربھنگہ۔

کسی ایک پر قبضہ ہوجائے۔

''وفی ردالمحتار سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس نسیئة فأجاب بأنه یجوز إذا قبض أحد البدلین''
(ردالمحتار ۱۸۰/۵، مکتبہ سعیدیہ، المبسوط سرخسی ۲۴/۱۴)۔

اور''فتاوی دار العلوم زکریا'' میں جدید معاملات کے شرعی احکام کے حوالہ سے لکھا ہے: ''سونا چاندی اس طرح فروخت کرنا کہ مثلاً سونے کے زیورات خریدے اور رقم کچھ ابھی دے دے اور کچھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا یا کل رقم ادھار ہے شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ کاغذی نوٹ کے ذریعہ سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے، اس لئے ادھار خرید وفروخت جائز ہے شرط یہ ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہوجائے تا کہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے (فتاوی دار العلوم زکریا ۳۴۹/۵)۔

ب- سونے چاندی کو سرکاری ریٹ یا سونے کی مارکیٹ کی ریٹ سے کمی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت کرنا، ہاں یہ درست ہے کہ سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ نے طے کیا ہو اس سے زیادہ یا کم قیمت میں سونے چاندی کی خرید وفروخت کی جائے اور اس صورت میں ربا الفضل کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ سونے کی جنس الگ ہے، چاندی کی جنس الگ اور کرنسی کی جنس الگ ہے اور جب سونے کو چاندی یا کرنسی سے خریدا جائے یا کرنسی سے بیچا جائے تو دونوں کے مختلف الجنس ہونے کی وجہ سے کمی بیشی جائز ہوگی کیونکہ جب جنس مختلف ہو اور دونوں ثمن کی قبیل سے ہو تو کمی بیشی جائز ہے، اور ادھار حرام ہے، ہاں اگر ایک طرف سے کرنسی ہو تو وہ جائز۔

''لأن النبی ﷺ أجاز بیع الأموال الربویة بعضها ببعض عند اتحاد الجنس مع المماثلة أو عند اختلاف الجنس ولو مع التفاضل'' (الفقه الإسلامی وأدلته ۴/ ۴)۔ (نبی اکرم ﷺ نے اموال ربویہ میں سے ایک کی بیع دوسرے سے جائز قرار دیا ہے، جنس ایک ہونے کے وقت برابری کے ساتھ یا جنس کے بدلنے کے وقت کمی بیشی کے ساتھ بشرطیکہ ہاتھ در ہاتھ ہو)۔

دوسری جگہ ہے: ''إن تبادل الأموال الربویة یجب فیه التساوی فی الکمیات المبادلة من الجنس الواحد'' (الفقه الاسلامی وأدلته ۴/ ۴۳۸) (یقیناً اموال ربویہ کے تبادلہ میں تساوی ضروری ہے ان مقداری چیزوں میں جن کا تبادلہ جنس واحد میں ہو)۔

اور جب جنس مختلف ہے ایک سونا ہے اور ایک کرنسی ہے تو کمی بیشی یقیناً جائز ہے، باقی سرکاری یا سونے کی مارکیٹ کی ریٹ سے کمی بیشی کے ساتھ خریدنا اس لئے جائز ہے کہ بائع اور مشتری دونوں اس ریٹ پر متفق ہیں، اور بائع اور مشتری جس ریٹ پر متفق ہوجائیں یقیناً وہ بیع درست ہوتی ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں اس کو ثمن کہتے ہیں اور شریعت نے اس سلسلہ میں لوگوں کو آزادی دی ہے چاہے لوگ بازاری ریٹ پر خرید وفروخت کریں جس کو فقہ کی اصطلاح میں قیمت کہا جاتا ہے اور چاہے آپسی رضامندی سے قیمت طے کرلیا کریں خواہ وہ بازاری ریٹ سے کم ہو یا زیادہ جس کو ثمن کہا جاتا ہے، فقہاء لکھتے ہیں:

''والثمن غیر القیمة لأن القیمة هی مایساویه الشئ من تقویم المقومین'' (موسوعه فقهیه:۹)
(ثمن قیمت کا غیر ہوتا ہے اس لئے کہ قیمت وہ ہے جو کسی چیز کے مساوی اور برابر ہو قیمت لگانے والوں کی نگاہ میں)۔

اور ثمن وہ ہے جس پر بائع اور مشتری دونوں راضی ہوجائیں چاہے وہ قیمت سے زیادہ ہو یا کم ہو یا مساوی ہو، ''الفقہ الاسلامی'' میں ہے:

''الثمن لایتحقق إلا فی العقد فهو ما یتراضی علیه المتبایعان سواء کان أکثر من القیمة أم اقل أم مساویا والثمر هو ما تراضی علیه المتبایعان مقابلا للمبیع'' (الفقه الاسلامی وأدلته ۴/ ۱۶۶)
(ثمن کا تحقق صرف عقد میں ہوتا ہے، اور ثمن وہ ہے جس پر بائع اور مشتری دونوں راضی ہوجائیں، چاہے قیمت سے زیادہ یا کم یا مساوی اور ثمن وہ ہے جس پر بائع اور مشتری دونوں راضی ہوجائیں اور وہ مبیع کے مقابل ہو)۔

البتہ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ نے جو قیمت طے کی ہے اس کی پابندی شرعاً لازم نہیں ہے، البتہ اگر حکومت کے طے شدہ نرخ کی خلاف ورزی سے عزت نفس کا خطرہ ہو تو پھر احتیاط کرنا چاہئے، فتاوی دار العلوم زکریا جلد پنجم میں حکومت کے طے شدہ قیمت کے خلاف کرنسی فروخت کرنے

سے متعلق ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے: بصورت مسئولہ نفس جواز میں تو کوئی کلام نہیں اس لئے کہ خلاف جنس کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے، البتہ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی لازم آئے گی اور عزت نفس ضروری ہے، اگر عزت کا خطرہ ہو تو ایسا کام نہیں کرنا چاہئے اور چند کوڑیوں کے لئے عزت نفس کو خطرہ میں ڈالنا کوئی عقل مندی کی بات نہیں (فتاوی دار العلوم زکریا ۵/ ۳۵۴)۔

۲ - الف: زیورات کے تاجر کا کاریگر کو متعینہ وزن سونا دینا پھر اتنے ہی وزن کا زیور لینا:

اگر زیورات کے تاجر زیور بنانے والے کاریگر کو متعینہ وزن میں سونا دے اور چند دنوں میں اتنے ہی وزن کا زیور لے اور زیور بنانے میں دھات کی آمیزش سے جو سونا بچا ہے اس کی اجرت قرار دے اور الگ سے زیور کا تاجر کاریگر کو کچھ نہ دے تو سونے کے لین دین میں مقدار کے اس فرق کو اجارہ تصور کیا جائے گا، چونکہ تاجر نے کاریگر کو سونا دیا ہے اور اسی سونے کا زیور کاریگر اس کو دے رہا ہے، اور کاریگری کی مزدوری اس سے سونے کے بچے ہوئے مقدار کی شکل میں مل رہا ہے۔

اجارہ کی تعریف احناف کے نزدیک "ھو عقد علی المنافع بعوض" (الفقہ الاسلامی ۴/ ۵۲۵) ہے، (یعنی منافع پر کوئی عقد کرنا ہے کسی عوض کے بدلہ) اور اس میں کاریگر کی کاریگری پر عقد ہو رہا ہے اور اس کا عوض سونے کے بچے ہوئے ذرات ہیں چونکہ زیور بنانے والے کاریگر سونے کو مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں اور ڈھالنے کے لئے دوسری دھاتوں کی آمیزش ضروری ہے جس کی حیثیت تابع کی ہے ان دھاتوں کو مستقل مبیع قرار نہیں دیا جا سکتا چونکہ وہ تابع ہیں، اور فقہاء نے اصول بیان کیا ہے "التابع تابع لا یفرد بالحکم" (تابع تابع ہوتا ہے اس کو مستقل بالحکم قرار نہیں دیا جا سکتا)، لہذا اصل مال سونا ہے جو سونے کے تاجر کے کاریگر کے حوالہ کیا ہے اور زیور بنانے والے کاریگر اپنی کاریگری اور محنت کے ذریعہ اس کو مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں اور خالص سونے اور چاندی کو بغیر دوسری دھات کے آمیزش کے نہیں ڈھالا جا سکتا اس لئے دھات ملایا گیا لہذا زیور بنانے والے کاریگر کی حیثیت اجیر (مزدور) کی ہوگی اور سونے کے مالک کی حیثیت مستاجر (مزدور رکھنے والے) کی ہوگی، اس کی مثال بالکل رنگریز کی ہوگی، جیسے کوئی آدمی کسی رنگریز کو کوئی کپڑا رنگنے کے لئے دے اور وہ رنگریز کپڑے کو رنگ کر مالک کے حوالہ کر دے، رنگریز رنگ خود اپنی ڈالتا ہے، وہ رنگ کپڑے والے سے نہیں مانگتا، اس کی محنت اور رنگ کی قیمت کو اجرت کہا جاتا ہے جو کپڑے رنگریز کو دیتا ہے، اس کو بیع قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ بیع کے لئے مبادلۃ المال بالمال بالتراضی ضروری ہے، اور صورت مسئولہ میں تبادلہ ہے ہی نہیں، صرف کاریگر کی محنت ہے اور بقدر ضرورت دھات کی آمیزش ہے اس محنت اور دھات کی آمیزش کو مال قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ب- زیورات کے بنانے میں بچے ہوئے سونے کے ذرات کو اجرت قرار دینا:

جب یہ بات متعین ہوگئی کہ سونے کے مالک کا کاریگر کو سونا دے کر ان سے زیورات بنانا عقد اجارہ ہے اور مالک کی حیثیت مستاجر کی ہے اور کاریگر کی حیثیت اجیر کی ہے تو اب یہ سوال ہے کہ زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جائیں وہ اجرت قرار دیا جائے کیا یہ درست ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کا عقد کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس دھات کی مقدار متعین ہو جس کی آمیزش زیور بنانے میں ہوگی تاکہ آپس میں کوئی نزاع نہ ہو اور کاریگر کو اپنی کاریگری کی اجرت کی مقدار معلوم ہو جائے، فقہاء نے صحت اجارہ کی شرائط میں اس کو ذکر کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"أن یکون المعقود علیہ وھو المنفعۃ معلوما علما یمنع من المنازعۃ فإن کان مجھولا جھالۃ مفضیۃ إلی المنازعۃ لا یصح العقد" (الفقہ الاسلامی ۴/ ۵۳۰)

مثلاً ایک سو گرام سونے کے زیور بنانے میں اگر دھات کی آمیزش دس فیصد ہو تو اس سے اس کی مزدوری بھی متعین ہوگئی کہ دھات اور میری محنت کی مزدوری دس گرام سونا اور مالک بھی گومگو کا شکار نہیں رہے گا کہ نہیں معلوم کتنی دھات ملائے گا، اگر اس طرح دھات کی مقدار اور اس کی کاریگری کی مکمل وضاحت ہو جائے جس سے بعد میں کوئی نزاع نہ ہو تو پھر سونے کے اس بچے ہوئے ذرات کو اجرت قرار دینے میں کوئی حرج نہیں، چونکہ اجرت بھی متعین ہے، اور محنت بھی متعین ہے، گویا مالک اس بات پر راضی ہے کہ کاریگر دس فیصد سونا لے لے اور باقی کا زیور بنا کر میرے حوالہ کرے، بظاہر ہر تو سو گرام سونے کے بدلہ سو گرام کا زیور دے رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ نوے گرام سونے کا زیور دے رہا ہے اور دس فیصد اس کی مزدوری ہوئی ہے، اور اگر دھات کی مقدار اور کاریگری کی تفصیلات واضح نہ ہو تو پھر یہ اجارہ درست نہیں چونکہ اجرت بھی مجہول ہے اور معقود علیہ بھی مجہول ہے، جیسا کہ "فإن کان

مجهولا جهالة مفضية إلى المنازعة لا يصح العقد" (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۴ / ۵۳۰) کی عبارت سے واضح ہے۔

۳- سونے کے پرانے زیور کو نئے زیور سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کا حکم:

سونے یا چاندی کے پرانے زیور کو عموماً تاجر کم قیمت میں خریدتے ہیں اور نئے زیور کو زیادہ قیمت میں بیچتے ہیں، تو اگر سونے یا چاندی کو بیچ کر روپے لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے چاہے اس کی قیمت سے کم ہو یا زیادہ، چونکہ روپے کی جنس الگ ہے اور سونے چاندی کی جنس الگ ہے اور مختلف الجنس کو کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز ہے، اور اگر پرانے زیور کو اسی کی جنس نئے زیور کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ بیچا جائے تو جائز نہیں چونکہ یہ ربا اور سود ہے، اور حدیث پاک میں ہے:

"لا تبيعوا الذهب بالذهب والورق بالورق إلا سواء بسواء. قال العلماء بذا يتناول جميع أنواع الذهب والورق من جيد ورديئ وصحيح ومكسور، وحلي وتبر وغير ذلك وسواء الخالص والمخلوط بغيره وهذا كله مجمع عليه" (شرح الامام النووی لصحیح مسلم ۱۱/ ۱۲ مطبوعہ بیروت)

(تم سونے کو سونے کے بدلے چاندی کو چاندی کے بدلے مت بیچو مگر برابر سرابر، علماء فرماتے ہیں کہ یہ سونے اور چاندی کے تمام اقسام کو شامل ہے خواہ جید ہو یا ردی سالم ہو یا ٹوٹے ہوئے، زیور ہو یا اس کے علاوہ خالص ہو، یا مخلوط، یہ سب بالا جماع ہیں)۔

ایک حدیث میں مزید اضافہ ہے کہ جنس ایک ہونے کی صورت میں زیادہ دینا یا زیادہ کا مطالبہ کرنا سود ہے جس میں دینے والا لینے والا دونوں برابر ہے، نصب الرایہ میں اشیاء ستہ والی حدیث کے آخر میں ہے:

"فمن زاد أو استزاد فقد أربى، الآخذ والمعطي فيه سواء" (نصب الرایہ ۴/ ۳۶)

(جو شخص زیادہ دے یا زیادہ لے اس نے سودی کاروبار کیا اور اس میں لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہے)۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ سونے اور چاندی میں جنس ایک ہونے کی صورت میں وزن میں برابری ضروری ہے، اور نئے پرانے، جید اور ردی اور بناوٹ کا کوئی اعتبار نہیں، وزن میں دونوں میں برابری ضروری ہے اور اس کے علاوہ کرنا صراحتاً سود ہے، لیکن زیورات کے تاجر اس طرح اگر برابری کے ساتھ بیچیں تو انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس لئے وہ عام طور پر پرانے زیورات کے بدلے نئے زیورات کم دیں گے، اس کا مناسب اور جائز حل یہی ہے کہ پرانے زیور کو کرنسی کے عوض بیچ دے پھر اس کرنسی سے نئے زیورات خرید لے اور کرنسی اور زیور کی جنس الگ الگ ہے، اس لئے اس میں وزن دیکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، اور یہ بیع بالاتفاق جائز ہے۔ "ويجوز التفاضل بين مختلفي الجنس عند الحنفية" (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۴ / ۴۴۹)، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو یہی ترکیب بتائی تھی جب وہ عمدہ کھجور کو ردی کھجور کے بدلے کمی بیشی کے ساتھ خریدنا چاہتا تھا جیسا کہ مسلم شریف جلد ثانی میں ہے۔

۴- الف: مختلف سونا خریدنے والوں کا سونا اگر اینٹ کی شکل میں ہو تو کیا اس کو قبضہ سمجھا جائے گا؟

اگر سونا فروخت کرنے والے کے پاس مثلاً ایک کلو سونا اور وہ دو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے اور ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے جاتے ہوں تو اسکو خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا چونکہ جب تک سونا اینٹ کی شکل میں ہے اس میں دوسرے افراد کا حق ہے، ہر مشتری کا حق الگ الگ نہیں ہے اور قبضہ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہ ہو اور خریدار جب چاہے خود سے یا نائب کے ذریعہ اس میں تصرف کر سکے، اور دوسروں کے ہاتھ اس کو فروخت کر سکے یا خود اپنے استعمال میں لا سکے، اس کے لئے اس میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہ ہو قبضہ کی تعریف الفقہ "الفقہ الاسلامی وأدلتہ" میں درج ذیل الفاظ میں مذکور ہے:

"التسليم أو القبض معناه عند الحنفية هو التخلية أو التخلي، وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشترى برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشترى من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشترى قابضا له" (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۴/ ۱۸۰)

(تسلیم یا قبضہ کا مفہوم احناف کے نزدیک تخلیہ ہے، وہ یہ ہے کہ بائع مشتری اور مبیع کے درمیان تخلیہ کردے اور ان دونوں کے درمیان رکاوٹ

کو ہٹا کر اس طرح کہ خریدار اس میں تصرف کرنے پر قادر ہوسکے)۔

اور تخلیہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ''التخلية هي أن يتمكن المشتري من المبيع بلا مانع ولا حائل مع الإذن بالقبض''

(تخلیہ یہ ہے کہ مشتری مبیع پر بغیر مانع اور حائل کے قدرت رکھے قبضہ کی اس کو اجازت کے ساتھ)۔

ب-خریدار کے نام سے کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اندراج کیا قبضہ تصور کیا جائے گا؟

اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کر دیا گیا ہو تو اس اندراج کو قبضہ نہیں کہا جاسکتا، جب تک اس کے حوالہ نہ کیا جائے چونکہ تخلیہ نہیں پایا گیا، چونکہ خریدار اگر اس کو لینا چاہے اور اس میں تصرف کرنا چاہے تو بغیر بائع کی اجازت کے اس کو لینے کا اختیار نہیں، اور جب مبیع کو لینے اور تصرف کرنے میں بائع کی اجازت کی ضرورت پڑے تو یہ صریح دلیل ہے کہ مبیع ابھی بائع کے قبضہ میں ہے کیونکہ قبضہ اور تخلیہ کی حقیقت یہ ہے کہ خریدار خریدی ہوئی چیز پر بغیر کسی رکاوٹ کے تصرف پر قادر ہو اور بائع کی طرف سے اس کو قبضہ کی مکمل اجازت ہو، ''الفقہ الاسلامی وأدلتہ'' میں ہے:

''التخلية هي أن يتمكن المشتري من المبيع بلا مانع ولا حائل مع الإذن له بالقبض'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۴/۱۶۱)

(تخلیہ یہ ہے کہ مشتری مبیع پر قدرت رکھے مانع اور رکاوٹ کے اور قبضہ کی اس کو مکمل اجازت ہو)۔

اور صورت مسئولہ میں کوئی بھی خریدار بغیر بائع کی اجازت کے اپنے خریدے ہوئے سکے میں تصرف کی قدرت نہیں رکھتا فقہاء نے لکھا ہے کہ:

اگر کسی شخص نے گھر میں رکھے ہوئے گندم کو کسی کے ہاتھ فروخت کیا اور مشتری کو اس گھر کی چابی دے دی اور کہہ دیا کہ میری طرف سے تم کو غلہ لینے کی اجازت ہے تو یہ قبضہ ہے اور اگر چابی دی اور کچھ نہیں بولا تو یہ قبضہ نہیں ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ)۔

۵-نرخ میں کمی بیشی کا لین دین کرنا:

ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی جو ایک صورت آج کل رائج ہے کہ ایک مہینہ کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار مثلاً دس تولے سونے کا سودا کر لیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا، جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ لیا جاتا ہے، خرید کے دن اور ادائیگی کے دن سونے کے نرخوں میں جو فرق ہوتا ہے اس کی ادائیگی کردی جاتی ہے، مثلاً خریدنے کے دن سونے کا نرخ اگر پانچ ہزار روپئے فی تولہ تھا، ادائیگی کے دن پانچ ہزار ایک سو قیمت پر، پس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے اس کا لین دین کرتے ہیں، اس صورت کا حکم یہ ہے کہ یہ جائز نہیں کیونکہ یہ بیع ہے ہی نہیں چونکہ بیع نام ہے، ''مبادلة المال بالمال بالتراضی'' کا اور اس میں تبادلہ ہے ہی نہیں، نہ تو بائع مشتری کو سونا دیتا ہے اور نہ مشتری بائع کو ثمن دیتا ہے، مشتری سونے پر قبضہ نہیں کرتا اور بائع ثمن پر قبضہ نہیں کرتا اور جب مبادلة المال بالمال نہیں ہے تو یہ بیع ہے ہی نہیں، ہاں بیع کا نام ہے اور مبیع اور ثمن فرضی ہے اور نفع نقصان میں غرر ہے، قطعی طور پر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ سونے کی قیمت آگے چل کر بڑھے گی یا گھٹے گی، اگر بڑھ گئی تو بائع کا فائدہ ہوا اور اس نے بغیر سونا دیئے ہوئے قیمت کی زیادتی کا فائدہ حاصل کرلیا اور اگر سونے کی قیمت کم ہوگئی تو مشتری کو فائدہ حاصل ہوگیا کہ مفت میں اس کو روپئے حاصل ہو گئے یہ قمار اور جوا ہے، چونکہ نہ اس میں نفع یقینی ہے اور نہ نقصان یقینی ہے، اور ہر وہ معاملہ جو نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہو قمار اور جوا کہلاتا ہے ''المخاطرة من المقامرہ''

نیز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمایا اور فقہاء نے بیع معلق اور بیع مضاف کو فاسد قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ عقد بیع تملیک فی الحال کا تقاضہ کرتا ہے اور وہ مستقبل کی طرف نسبت کو قبول نہیں کرتا ہے، جس طرح بیع کو شرط سے کوئی تعلق نہیں ہے، چونکہ اس میں قمار ہے اور وہ امر مترقب پر معلق ہے، ''الفقہ الاسلامی وأدلتہ'' میں بیع معلق اور بیع مضاف کے فساد کی علت کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''يظهر فيما ذكر أن علة فساد هذين النوعين من البيوع هو ما تشتمل عليه من الغرر إذ لا يدري العاقد ان في البيع المعلق هل يحصل الامر المعلق عليه أو لا يحصل كما لا يدري متى يحصل في البيع المضاف لا يدري العاقد ان كيف يكون المبيع في المستقبل وكيف يكون رضاهما بالعقد ومصلحتهما فيه عند ترتب أثر البيع عليه''

(مذکورہ تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیع کی ان دونوں قسموں کی فساد کی علت وہ غرر ہے جس پر وہ مشتمل ہے اس لئے کہ بیع معلق میں عاقدین کو اس

کا علم نہیں ہوتا کہ مستقبل میں مبیع کس طرح ہوگی اور ان دونوں کے عقد سے رضامندی کی کیفیت کیا ہوگی اور بیع کے اثر مرتب ہونے کے وقت ان دونوں کے فائدے اور مصالح کس طرح کے ہوں گے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ حقیقت میں بیع نہیں ہے، بیع کا صرف نام ہے کیونکہ اس مبیع پر کس کی ملکیت ہے جو خریدار نے بائع سے خریدا ہے اور مشتری اگر اس کو اپنے قبضہ میں لینا چاہے تو کیا بائع کی طرف سے اس کو قبضہ کی اجازت دی جائے گی؟ نہیں، بالکل نہیں، مبیع فرض کر کے اس پر بیع کا حکم نافذ کر رہا ہے، نہیں معلوم کہ بائع کے پاس مبیع ہے بھی یا نہیں، اگر نہ ہو تو بھی زبانی اس طرح بیع کر کے انسان روپئے کمار ہا ہے۔

۶-سونے کی ذخیرہ اندوزی گراں فروشی کی نیت سے احتکار ہے یا نہیں؟

بہت سی دفعہ سونے کی قیمت میں متوقع اضافہ کا سونے چاندی کے تاجروں کو علم ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں وہ سونا روک لیتے ہیں تاکہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کریں، سونا اس پہلو سے اگرچہ اشیاء ضروریہ میں شامل ہے کہ ثمن خلقی ہونے کے لحاظ سے وہ ذریعہ تبادل ہے، اس کو روک لینے کی وجہ سے سونے کی قیمت تو بڑھتی ہے اور اس گرانے کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہے، لیکن اس کے باوجود سونے کی ذخیرہ اندوزی گراں بیچنے کی نیت سے احتکار کے دائرہ میں نہیں آتا، احتکار کے دائرہ میں صرف اشیاء خوردنی آتے ہیں جن کو روک لینے سے عام آدمی مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، اس لئے اگر کسی تاجر نے غلہ روک کر رکھا تاکہ جب بازار میں بھاؤ بڑھے تو اس وقت زیادہ قیمت میں فروخت کرے گا اور اس کے غلہ روک لینے سے عام آدمی کو کوئی فرق نہ پڑتا ہو تو اسے احتکار نہیں کہتے اور اس طرح غلہ اندوزی میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں، قباحت تو اس وقت ہے جبکہ سارے ہی تاجر غلے کو روک لیں اور عام لوگوں کے پاس اشیاء خوردنی نہ ہو اور اس کی وجہ سے مشقت میں پڑ جائیں، اس طرح کے روکے لینے کو احتکار کہتے ہیں، احتکار کی تعریف میں کھانے پینے کی چیزوں کو روک کر رکھنا آتا ہے،

''موسوعۃ الفقہیہ'' میں ہے:

''الاحتكار ہو شراء الطعام ونحوه وحبسه الخلاء وفس الحديث: من احتكر طعاما أربعه ليلة فقد برى من الله وبرى الله منه ولأنه ظلم لأن ما يباع فى المصر فقد تعلق به حق العامة ومنع الحق عن المستحق ظلم وحرام''

(احتکار وہ غلہ اور اس جیسی دوسری چیز کو خرید کر قیمت بڑھنے تک روکنے کا نام ہے، حدیث پاک میں ہے، جو شخص چالیس روز غلہ روکتا ہے وہ اللہ سے اور اللہ اس سے بری ہے اور اس لئے کہ یہ ظلم ہے چونکہ شہر میں جو چیز بیچی جاتی ہے اس سے عام لوگوں کا حق وابستہ ہوتا ہے، اور حق کو مستحق سے روکنا ظلم اور حرام ہے)۔

پھر علماء اور فقہاء نے بحث کی ہے کہ احتکار کے دائرہ میں کیا کیا چیزیں آتی ہیں تو اس بارے میں عموماً تین طرح کے اقوال ملتے ہیں:

۱- احتکار اشیاء خوردنی کے ساتھ خاص ہے، لہذا کھانے پینے کی چیزوں کو روکنا احتکار کہلائے گا یہ امام ابوحنیفہؒ، امام محمد، شوافع اور حنابلہ کا مذہب ہے۔

۲- احتکار کھانے پینے اور پہننے اور ان تمام چیزوں میں متحقق ہوتا ہے جن کی ضرورت عام لوگوں کو پڑتی ہے اور اس کو روک لینے سے وہ مشقت میں پڑ جاتے ہیں یہ مالکیہ اور امام ابو یوسف کا مسلک ہے۔

۳- احتکار کھانے پینے اور کپڑوں کے ساتھ خاص ہے یہ امام محمد کا قول ہے۔

''موسوعہ فقہیہ'' میں ''مایجری فیہ الاحتکار'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

''هنالك ثلث اتجاهات: الأول: ما ذهب إليه أبوحنيفة ومحمد والشافعية والحنابلة أنه لا احتكار إلا القوت خاصة۔ الثاني: أن الاحتكار يرجى فى كل ما يحتاجه الناس يتضررون من حبسه من قوت وإدام ولباس و غيرذلك وهذا مذهب المالكية وأبويوسف من الحنفية۔ الثالث: أنه لا احتكار إلا فى القوت والثياب خاصة ہذا قول محمد بن الحسن'' (موسوعه فقهيه ۲/ ۹۱)۔

اور فقہاء احناف نے احتکار کو اسی وقت مکروہ قرار دیا ہے جبکہ غلہ کے روکنے سے عام لوگوں کو نقصان ہوتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''لكن أكثر فقهاء الحنفية وبعض الشافعية عبروا عنه بالكراهة إذا كان يضر بالناس'' (موسوعه فقهيه ۲/ ۹۱)۔

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات متحقق ہوگئی کہ احتکار کے دائرہ میں کھانے، پینے یا زیادہ سے زیادہ پہننے کی چیزیں آتی ہیں، اور وہ بھی اس وقت جبکہ روک لینے سے عام لوگوں کو مشقت لاحق ہوتا ہو، سونے، چاندی کو گراں فروشی کے ارادہ سے روک لینے کو کسی بھی امام نے احتکار میں داخل نہیں مانا ہے کیونکہ سونا چاندی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو روک لینے سے عام لوگوں کو نقصان لاحق ہوتا ہے، اس لئے کہ سونا چاندی کا تعلق مردوں سے ہے ہی نہیں صرف عورتوں سے ہے اور وہ زینت میں اس کو استعمال کرتی ہیں، باقی سونے کی ذخیرہ اندوزی سے عام استعمال کی چیزیں مہنگی ہوجاتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق ارباب حکومت سے ہے، عام لوگوں سے نہیں، عام استعمال کی چیزیں کس وجہ سے مہنگی ہوتی ہیں اور کسی وجہ سے سستی ہوتی اس کا علم حکومت اور کمپنیوں کو ہے، کیا دلیل ہے کہ چیزوں کے سستا اور مہنگا ہونے کا تعلق صرف سونے کو روک لینے کی وجہ سے ہو کسی اور وجہ سے نہیں۔

یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ پیٹرول، ڈیزل اور اشیاء کی درآمد اور برآمد کی کمی بیشی پر ہو، اس لئے سونے کو گراں فروشی کے ارادے سے روک لینے کو احتکار نہیں کہیں گے، اور وہ احتکار کے دائرہ میں نہیں آتا ہے۔

۷- دوسرے ملک سے غیر قانونی طریقہ پر سونے کی تجارت کرنا کیا اسمگلنگ ہے؟

سونا لانے والا جب دوسرے ملک سے اپنی جائز کمائی سے جائز طریقہ پر سونا خریدتا ہے اور اپنے ملک میں لاکر بیچتا ہے تو شرعاً یہ اسمگلنگ نہیں ہے بلکہ بیع ہے جو درست ہے، سونا لانے والے تاجر کا اس سونے کو بیچنا اور لوگوں کے لئے اس کا خریدنا جائز ہے، خریدار کو یہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سونا لانے والے نے ان واجبات کو ادا کیا ہے جو حکومت نے اس سے متعلق مقرر کر رکھا ہے، یا ادا نہیں کیا ہے، چونکہ حکومت نے سونے کے کاروبار کرنے والے پر اتنے ٹیکس اور شرائط لازم کر رکھے ہیں کہ اگر تاجر ان تمام شرائط کو پوری کرے اور ٹیکسوں کو ادا کرے تو سوائے نقصان کے نفع کا سوال ہی نہیں، اور پھر کوئی بھی سونے کی تجارت نہیں کر سکے گا، اس کو اسمگلنگ کہنا ملکی قانون کے اعتبار سے تو درست ہوسکتا ہے چونکہ یہ ٹیکس وغیرہ کی چوری ہے لیکن شرعاً یہ اسمگلنگ نہیں ہے، جس طرح لوگ اپنے ملک میں سونے، چاندی اور دیگر چیزوں کی تجارت کرتے ہیں اور سرکار سے اپنی کل آمدنی اور کل سرمایہ چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ انکم ٹیکس سے بچ جائیں اور حکومت کی نظروں میں نہ آجائیں صرف بعض سرمایہ اور انکم کی اطلاع حکومت کو دیتے ہیں اور ان کا ٹیکس ادا کرتے ہیں، لہٰذا انکم ٹیکس نہ دینے سے اور سرکار کو اپنی کل آمدنی نہ بتانے سے لوگوں کی تجارت کو ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا اور ان کے سامان کو خریدنے یا ان کے ہاتھ بیچنے کو شرعاً غلط نہیں کہا جاسکتا، چونکہ انسان جب اپنی کمائی سے جائز طریقہ سے تجارت کرتا ہے اور نفع کماتا ہے تو اس تجارت کو اور آمدنی کو ناجائز کیسے قرار دیا جائے گا، ہاں بہتر یہ ہے کہ ملکی قانون کو سامنے رکھ کر اور ان کے واجبات کو ادا کر کے لوگ کاروبار کریں خواہ سونے کی تجارت ہو یا کسی اور چیز کی، تاکہ ملک کو نقصان نہ ہو اور ملک ترقی کرسکے اور امیروں کی کمائی میں غریب بھی شریک ہوسکے اور ملکی قانون کا لحاظ بھی اس وقت ہوگا جبکہ وہ خدائی قانون سے متصادم نہ ہو۔ "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"۔

۸- پلاٹین حقیقی سونے کے حکم میں نہیں:

پلاٹین حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوگا اور عقود نیز زکوۃ میں اس پر سونے کے احکام منطبق نہیں ہوں گے چونکہ سونا خلقی ثمن ہے اور اس کی ثمنیت پر لوگ متفق ہیں بلکہ ثمن عرفی اور اصطلاحی کا مدار بھی سونے ہی پر ہے، بغیر سونے کے کرنسی کی کوئی حیثیت نہیں، سونے کو تمام ہی دنیا اصل ثمن مانتی ہے، دنیا کے کسی بھی ملک اور خطے میں آدمی سونا لے کر چلا جائے اسے وہاں کی کرنسی ہاتھوں ہاتھ مل جائے گی، لیکن پلاٹین کو وہ حیثیت حاصل نہیں اور اگر ہو بھی تو وہ عارضی ہے کیونکہ کب اس کی حیثیت ختم ہوجائے گی کچھ کہنا مشکل ہے، جس طرح ہیرے جواہرات اگرچہ سونا سے زیادہ قیمتی دھات ہیں لیکن اس کے باوجود سے حقیقی سونے کے حکم میں نہیں لیا جاتا، اور زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق نہیں ہوتے، لہٰذا پلاٹین کے بنے ہوئے زیورات سونے کے حکم میں نہیں ہوں گے، اور اس کے بنے ہوئے زیورات پر جبکہ پہننے کے لئے ہوں زکوۃ واجب نہیں ہوگی، ہاں اگر تجارت کے لئے ہو تو پھر مال تجارت کا حکم ہوگا، اگر اس کی مالیت نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے تو زکوۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں اور پلاٹین کو پلاٹین کے عوض بیچنے کی صورت میں کمی بیشی اور ادھار جائز ہوگا۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت شریعت اسلامی کی روشنی میں

مفتی روح الامین سعادتی[1]

اللہ حکیم وعلیم نے ایک طرف انسان کو اس کی دنیوی زندگی میں کائنات کی بہت سی چیزوں کا محتاج بنایا تو دوسری طرف اسے ہر چیز کا مالک بھی نہیں بنایا، چنانچہ بہت سی مرتبہ انسان ایک چیز کا مالک ہوتا ہے، لیکن وہ اس سے مستغنی ہوتا ہے، اور کبھی اپنی ضرورت کے خاطر ایک چیز کا محتاج ہوتا ہے لیکن وہ اس کی ملکیت میں نہیں ہوتی ہے، یہ صورت حال اس کو اشیاء کے درمیان باہمی تبادلہ پر مجبور کرتی ہے، اور تبادلہ کے لیے باہمی تناسب ضروری ہے، مگر بہت سی مرتبہ صورۃً یا وزناً اشیاء کے مابین کوئی تناسب نہیں ہوتا، لہذا ضروری تھا کہ ایسی اشیاء کے درمیان کوئی چیز ثالثی اور حَکَم کا کردار ادا کر سکے اور وہ ان کے لیے پیمانہ قدر بن سکے، اس مقصد کی تحصیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے نقود یعنی زر (Money) کی تخلیق فرمائی۔

- پروفیسر کراؤتھر (Prof.Crowther) زر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''زر سے مراد وہ شئی ہے جو آلۂ مبادلہ کی حیثیت سے مقبول عام ہو اور ساتھ ہی معیار قدر اور ذخیرۂ قدر کا فرض بھی سرانجام دے'' (زر کا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر عصمت اللہ کراچی، بحوالہ تعارف زر بنکاری از شیخ مبارک علی / ص ۲۶)۔

مذکورہ تعریف سے معلوم ہوا کہ نقود تین اہم خصوصیات کے حامل ہیں:

(۱) آلہ مبادلہ (Medium of Exchang) کے طور مقبول عام ہونا:

ہر چیز کو آلۂ مبادلہ نہیں بنایا جا سکتا، اولاً تو اس لیے کہ کچھ چیزوں کی انسان کو ہر وقت ضرورت پڑتی ہے، لہذا وہ اسے تبادلہ کے طور پر دینے میں راضی نہ ہوگا، دوسرے اس لیے کہ فریق آخر ضروری نہیں کہ اس کو قبول کرنے پر آمادہ ہو، لہذا ضروری ہے کہ کوئی ایسی چیز آلۂ مبادلہ ہو جس کی ہر کوئی رغبت رکھتا ہو، اور اس کی دلچسپی اس کو طبعی طور پر قبول کرنے کے لیے کسی حیل و حجت کے بغیر مجبور کردے۔

(۲) پیمانۂ قدر (Standard of Value) ہونا:

یہ اس پر مبنی ہے کہ وہ مقصود بالذات نہ ہو کہ براہ راست انسانی حاجت کو پورا کر سکے، ورنہ جس کے مطلب کی وہ چیز ہوگی اسی کے حق میں اس کو ترجیح حاصل ہوگی، ہر کوئی اسے قبول کرنے پر مجبور نہ ہوگا، نیز وہ بظاہر خود کچھ نہ ہو لیکن اپنی روح کے لحاظ سے سب کچھ ہو، اس کی کوئی مخصوص شکل نہیں، لیکن دوسری اشیاء کی نسبت سے مختلف شکلوں کی حامل ہو، جیسے آئینہ جس کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا، لیکن وہ ہر رنگ کی عکاسی کرتا ہے، ورنہ وہ ہر چیز کے لیے معیار قدر کیسے بن سکتا ہے (مستفاد از سود پر تاریخی فیصلہ از جسٹس تقی عثمانی بحوالہ احیاء العلوم غزالی / ص ۱۰۱)۔

(۳) مالیت محفوظ رکھنے (Store of Value) کا ذریعہ ہونا:

یعنی عموماً اشیاء کی قیمت کم وبیش ہوتی رہتی ہے، اس لیے اس کی مالیت بکمل طور پر محفوظ نہیں، اس کے برخلاف زر کی خصوصیت یہ ہے کہ غیر معمولی حالات سے قطع نظر اس کے ذاتی قیمت یکساں رہتی ہے اور مالیت محفوظ رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سونا جو زر تخلیقی ہے ہر دور میں اسے محفوظ مال ہونے کی اہمیت حاصل رہی ہے۔

نقود وزر کی حقیقت:

[1] استاذ جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، بھروچ، گجرات۔

مذکورہ گفتگو سے یہ ثابت ہو گیا کہ نقود ذریعہ مبادلہ ہیں، نہ وسائل پیداوار اور نہ اشیائے صرف، اسی لیے ماہرین اقتصادیات نے اشیاء کی تقسیم کو ثنائی نہیں بلکہ ثلاثی قرار دیا ہے۔

(۱) وسائل پیداوار (Production Goods):

جو محل تجارت ہو، اس کی خرید وفروخت ہو، اس کو اجارہ (Leasing) اور کرایہ پر دیا جائے اور اس سے منافع (Profit) حاصل ہو، جیسے زمین، مشینری، خام مال وغیرہ۔

(۲) اشیائے صرف (Consumer Goods):

جسے براہ راست صرف کر کے انسانی حاجت پوری کی جاسکے، مثلاً اس کو کھایا جائے، پیا جائے یا پہنا جائے وغیرہ۔

(۳) ذریعہ مبادلہ (Exchange Goods):

جس سے براہ راست انسانی ضرورت پوری نہیں ہوتی اور نہ وہ منافع حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، بلکہ اس کا وظیفہ دونوں سے مختلف ہے، وہ صرف شئ مبادلہ ہے۔

سود کے لیے جو جواز پیش کیا جاتا ہے، اس کی ایک بنیاد یہ بھی ہے کہ نقود وزر سرمایہ پیداوار ہے، اسی لیے وہ اشیاء کی تقسیم ثنائی کرتے ہیں، لیکن یہ نظریہ فقط شرعی نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ اقتصادیات کے ماہرین کی نظر میں بھی باطل ہے، کیوں کہ زر کی جن خصوصیات اور اس کے جس مقصد تخلیق کا تذکرہ اوپر کیا گیا اس اعتبار سے یہ سرمایہ پیداوار سے بالکل مختلف چیز ہے۔

چنانچہ نقود اور سامان کے درمیان مندرجہ ذیل بنیادی فرق ہے:

(۱) نقود کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں کہ انسانی ضرورت میں بلاواسطہ استعمال ہو سکے، اس کے برعکس سامان کی اپنی افادیت ہوتی ہے، اسے ذریعہ مبادلہ بنائے بغیر بھی استعمال کر کے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

(۲) سامان مختلف اوصاف کے حامل ہو سکتے ہیں، اور اسی لحاظ سے اس کی مالیت مختلف ہو سکتی ہے، جب کہ نقود میں وصف کا کوئی اعتبار نہیں، جیسے نیا نوٹ اور پرانا نوٹ ایک ہی مالیت رکھتا ہے۔

(۳) سامان متعین ہو سکتا ہے، جب کہ نقود متعین نہیں، جیسے کوئی شخص ایک چیز مخصوص نوٹ دکھا کر خریدے تو ادائیگی کے وقت اسے اختیار ہے کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا اس مالیت کا نوٹ دے دے (سود پر تاریخی فیصلہ/ص ۹۸)۔

اسی لیے امام غزالیؒ فرماتے ہیں: ''إذ طلب النقد لغير ما وضع له ظلم''۔

(نقود کو ایسے مقصد کے لیے لینا جس کے لیے وہ بنایا نہیں گیا ظلم ہے) (زر کا تحقیقی مطالعہ شرعی نقطۂ نظر سے،/ص ۳۸)۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''والدراهم والدنانير لا تقصد لنفسها، بل هي وسيلة إلى التعامل بها، ولهذا كانت أثمانا. بخلاف سائر الأموال فإن المقصود الانتفاع بها بنفسها''۔

(دراہم اور دنانیر مقصود بالذات نہیں، بلکہ یہ باہمی معاملات کا ایک ذریعہ ہیں، اسی وجہ سے یہ اثمان شمار ہو گئے، بخلاف دیگر اشیاء کے کہ وہ بذات خود مقصود ہیں) (مجموعۃ الفتاوی ۱۹/ ۲۵۲)۔

علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں: ''الأثمان لا تقصد لأعيانها، بل يقصد بها التوسل إلى السلع. فإذا صارت من نفسها سلعا تقصد لأعيانها فسد أمر الناس''۔

(زر مقصود بالذات نہیں، بلکہ اس سے مقصود سامان کے حصول کا ذریعہ بنانا ہے، اگر یہ سامان میں شمار ہونے لگے تو لوگوں کے معاملات فاسد ہو جائیں گے) (اعلام الموقعین ۲/ ۱۰۵)۔

نقود کی مذکورہ خصوصیت کی وجہ سے شریعت نے اس کے لین دین سے متعلق مخصوص احکام دیئے ہیں، آئندہ ان میں سے کچھ احکام کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

۱- اصل جواب سے پہلے دو باتوں کا ذکر ضروری ہے:

(۱) بیع صرف کی حقیقت کیا ہے؟ (۲) روپئے (نوٹ) کی فقہی حیثیت کیا ہے؟

صرف کی حقیقت:

ثمن کے مقابلہ میں ثمن کی خرید وفروخت بیع صرف کہلاتی ہے، خواہ دونوں کی جنس ایک ہو یا مختلف ہو، یہ فقہائے حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی اصطلاح ہے۔

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں: ''وشرعا بيع الثمن بالثمن أي ما خلق للثمنية، ومنه المصوغ جنسا بجنس أو بغير جنس''

(الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۵۵)۔

(اور شریعت میں بیع صرف یہ ہے کہ ثمن کی بیع ثمن کے عوض ہو یعنی وہ خلقی طور پر ثمن ہو اور اسی سے بنی ہوئی کوئی چیز ہو، خواہ جنس کا مقابلہ جنس کے ساتھ ہو یا خلاف جنس کے ساتھ ہو)۔

کشاف القناع میں ہے: ''فصل في المصارفة: وهي بيع نقد بنقد، اتحد الجنس أو اختلف'' (کشاف القناء ۲/ ۲۶۶)۔

(مصارفہ زر کے مقابلہ میں زر کی خرید وفروخت کو کہتے ہیں، خواہ جنس ایک ہو یا مختلف ہو)۔

مغنی المحتاج کی عبارت ہے: ''النقد بالنقد والمراد به الذهب والفضة مضروبا كان أو غير مضروب''۔

(نقد کے مقابلہ نقد کی خرید وفروخت کرنا اور اس سے مراد سونا و چاندی ہے، خواہ سکہ کی شکل میں ہو یا نہ ہو)۔

اسی میں مزید ہے: ''تنبيه: بيع النقد بالنقد من جنسه وغيره يسمى صرفا'' (مغنی المحتاج ۲/ ۲۶۹)۔

(نقد کے مقابلہ میں نقد کی بیع کو صرف کہتے ہیں، خواہ جنس ایک ہو یا جنس مختلف ہو)۔

مالکیہ کے یہاں تین اصطلاحات رائج ہیں: مراطلہ، مبادلہ، صرف۔

ان کے نزدیک ''صرف'' کی اصطلاح اس صورت کے ساتھ خاص ہے جہاں نقود کی بیع خلاف جنس سے ہو، جیسے دینار کے مقابلہ میں درہم، اور اگر ہم جنس میں باہمی تبادلہ وزن کے اعتبار سے ہو تو اس کو مراطلۃ کہتے ہیں، اور اگر عدد کے اعتبار سے ہو تو اسے مبادلہ کہتے ہیں (دیکھئے: حاشیۃ الدسوقی ۳/ ۲)۔

بیع صرف کا حکم:

اس کی صحت کے لیے دو بنیادی شرط ہیں:

(۱) تقابض: عاقدین میں سے ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ عوض پر مجلس عقد ہی میں قبضہ کرلے، لہذا صرف میں خیار کی شرط اور تاجیل جائز نہیں، یہ شرط عام ہے، بہر صورت اس کا لحاظ ضروری ہے۔

(۲) تماثل: جب عوضین ہم جنس ہوں، جیسے دینار کے مقابلہ میں دینار یا درہم کے مقابلہ میں درہم کی بیع ہو رہی ہو تو اس صورت میں کسی ایک جانب کسی قسم کی کوئی زیادتی جائز نہیں، البتہ اگر عوضین ہم جنس نہ ہوں تو اس صورت میں تماثل ضروری نہیں، لہذا پہلی صورت میں مجازفہ جائز نہیں، البتہ دوسری صورت میں اس کی اجازت ہوگی۔

عام بیوع میں قبضہ کے تحقق کے لیے تخلیہ کافی ہوتا ہے، لیکن صرف میں بالاجماع تخلیہ کافی نہیں، بلکہ عملا اور حقیقۃً قبضہ ضروری ہے، درمختار میں ہے:

''والتقابض بالبراجم لا بالتخلية'' (ہاتھوں سے قبضہ میں لینا نہ کہ تخلیہ کرنا)۔

اس کے تحت ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

”قوله: لا بالتخلية، أشار إلى أن التقييد بالبراجم للاحتراز عن التخلية، واشتراط القبض بالفعل، لا خصوص البراجم، حتى لو وضعه له في كفه أو في جيبه صار قابضا“ (رد المحتار، باب الصرف ۵/۲۵۸)۔

”لا بالتخلیۃ“ سے اشارہ ہے کہ براجم کی قید تخلیہ اور بالفعل قبضہ سے احتراز کے لیے ہے، خاص ہاتھ میں پکڑنا شرط نہیں، چنانچہ اگر ہتھیلی میں رکھ دیا یا اس کے جیب میں ڈال دیا تو بھی قبضہ کرنا شمار ہوگا۔

پھر نقود اگر سونے یا چاندی سے ہوں جیسے دراہم ودنانیر، تب تو بالاجماع صرف کے احکام جاری ہوں گے، لیکن اگر سونے یا چاندی کے علاوہ کسی اور چیز کے ڈھلے ہوئے سکے ہوں، جیسے فلوس جو ثمن عرفی واصطلاحی ہیں، تو اس بابت فقہائے کرام کے درمیان اختلاف ہے، ذیل میں اس کی وضاحت کی جارہی ہے۔

فلوس کے احکام:

اس سلسلہ میں فقہاء کے مسالک مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) امام مالکؒ کے نزدیک فلوس ثمن خلقی دراہم ودنانیر ہی کے حکم میں ہیں، لہذا جب ہم جنس کا باہمی تبادلہ ہو تو تماثل اور مجلس ہی میں تقابض ضروری ہے، اور غیر جنس سے تبادلہ ہو تو فقط تقابض ضروری ہے، المدونۃ الکبری میں ہے:

”لا يجوز فلس بلفسين، ولا تجوز الفلوس بالذهب والفضة ولا بالدنانير نظرة“

(المدونۃ الکبری، کتاب الصرف، باب التاخیر فی صرف الفلوس ۳/۵-۶)۔

(ایک فلس دو فلوس کے بدلہ میں جائز نہیں ہے، اور فلوس کو سونے چاندی کے بدلہ اور نہ دینار کے بدلہ مہلت کے ساتھ بیچنا جائز ہے)

(۲) شافعیہ کے نزدیک سونے چاندی میں ربا الفضل اور ربا النسیئۃ کے حرام ہونے کی علت ثمنیت خلقیہ ہے، لہذا فلوس مال ربوی نہیں، کیوں کہ یہ ثمن عرفی اور اصطلاحی ہے، اس لیے فلوس کی بیع میں تفاضل اور اُدھار دونوں جائز ہے، زاد المحتاج میں ہے:

”وعلة الربا في الذهب والفضة الثمنية وهي منتفية عن العروض والفلوس“ (زاد المحتاج شرح المنهاج ۲/۲۴)۔

(ربا کی علت سونے وچاندی میں ثمنیت ہے، اور یہ عروض وفلوس میں نہیں پائی جاتی)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: ”إذا راجت الفلوس رواج النقود لم يحرم الربا فيها، هذا هو الصحيح المنصوص وبه قطع المصنف والجمهور“ (المجموع شرح المهذب ۹/۳۹۵)۔

(جب فلوس میں ایسا تعامل جاری ہوجائے جیسا کہ نقود میں ہے تو بھی ربا ان میں حرام نہیں ہوگا، یہی صحیح اور مصرح ہے، اسی کو مصنفؒ نے جزم کے ساتھ بیان کیا ہے اور جمہور کا یہی موقف ہے)۔

حواشی شروانی میں ہے: ”وعلة الربا فيه جوهرية الثمن فلا ربا في الفلوس وإن راجت“ الخ (حواشی الشروانی ۴/۲۷۹)

(اور ربا کی علت اس میں ثمن کی جوہریت ہے، لہذا فلوس میں ربا نہیں اگر چہ رائج ہوں)۔

(۳) امام احمدؒ سے اس سلسلہ میں دو روایت منقول ہیں:

۱- فلوس میں ربا نہیں اس لیے کہ علت ربا وزن ہے اور فلوس عددی ہیں، ابن قدامہؒ نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔

۲- فلوس میں ربا اور صرف جاری ہوگا، اس لیے فلوس کی اصل تانبا یا پیتل یا لوہا ہے، یعنی انہی دھاتوں سے بنائے جاتے ہیں، اور یہ سب وزنی ہیں (دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۴/۸)۔

(۴) حنفیہ کے نزدیک حرمت ربا کی علت وزن ہے، ثمنیت نہیں، اس کا تقاضہ ہے کہ فلوس میں ربا جاری نہ ہو، اس لیے کہ یہ عددی ہیں، لیکن ایک دوسری علت کی وجہ سے تفاضل جائز نہیں ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ ثمن ہونے کی وجہ سے متعین نہیں ہوتے اور یہ امثال متساویہ ہیں، یعنی مثلاً ایک

روپیہ کا سکہ دوسرے ایک روپیہ کے سکہ کے بالکل مساوی ہے، اب اگر کسی جانب زیادتی ہوتو یہ زیادتی خالی عن العوض ہوگی اور اسی کا نام ربا ہے، اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے علامہ بابرتیؒ فرماتے ہیں:

''اگر زید نے ایک فلس دو فلس کے عوض عمرو کو فروخت کیا، اور فلوس متعین نہیں ہیں، تو زید کے لیے گنجائش ہے کہ وہ عمرو سے کہے کہ تجھ پر میرے دو فلوس ہیں، اور میرے ذمہ تیرا ایک فلس ہے، لہٰذا اس فلس کا جو میرے ذمہ ہے اس فلس کے بدلہ مقاصہ کرتا ہوں جو تیرے ذمہ ہے، چنانچہ میں تجھ کو ایک فلس دے رہا ہوں اور تیرے ذمہ میرا ایک فلس باقی ہے، لہٰذا وہ فلس مجھ کو دے دے، اس طرح زید بغیر کسی عوض کے عمرو کے ایک فلس کا مستحق ہوجائے گا، اور اس کا بطلان ظاہر ہے'' (عنایہ علی ہامش فتح القدیر ۶/ ۱۶۲)۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ فلوس متعین نہ ہوں، اور اگر متعین کر کے ایک فلس کو دو کے بدلہ بیچے، تو ائمہ حنفیہ کے مابین اختلاف ہے:

حضرات شیخین فرماتے ہیں کہ یہ تفاضل جائز ہے، کیوں کہ متعین ہونے کی صورت میں ان کی حیثیت عام سامان کی سی ہوگئی، لہٰذا تفاضل کے ساتھ معاملہ جائز ہوگا۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ''أن الثمنية في حقهما تثبت باصطلاحهما، إذلا ولاية للغير عليهما. فتبطل باصطلاحهما. وإذا بطلت الثمنية تتعين بالتعيين، ولا يعود وزنيا لبقاء الاصطلاح على العد'' (الهدايه مع فتح القدير ۶/ ۱۶۲)

(ثمنیت ان (متعاقدین) کے حق میں ان کے اتفاق کی وجہ سے ثابت ہوئی، اس لیے کہ ان پر دوسروں کو ولایت حاصل نہیں، لہٰذا ان کے اتفاق کی وجہ سے ثمنیت ختم ہوجائے گی، اور جب ثمنیت باقی نہ رہی تو تعیین سے فلوس متعین ہوں گے، اور دوبارہ وزنی بھی نہ ہوں گے، اس لیے کہ عددی ہونے پر ان کا اتفاق باقی ہے)۔

امام محمدؒ کے نزدیک فلوس میں تفاضل جائز نہیں، کیوں کہ ان کی ثمنیت تمام لوگوں کے تعامل سے ثابت ہے، لہٰذا ان دو کے اتفاق سے ثمنیت ختم نہ ہوگی، اور جب ثمنیت باقی ہے، تو تعیین سے متعین نہ ہوں گے اور دراہم و دنانیر کی طرح تفاضل جائز نہ ہوگا (حوالہ بالا)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام مالکؒ کے نزدیک فلوس کی بیع فلوس کے عوض بیع صرف ہے، جب کہ شافعیہ اور حنابلہ کے اصح قول کے مطابق صرف نہیں، اور حنفیہ کے مابین اگرچہ تفاضل کے جواز میں اختلاف ہے، تاہم ان کے نزدیک بھی صرف نہیں۔

جن کے نزدیک صرف نہیں ان کے نزدیک مجلس میں عوضین پر قبضہ بھی ضروری نہیں، یہی حنفیہ کے مذہب کا تقاضہ ہے، چنانچہ ''تنویر الابصار''، ''درمختار'' اور ''ردالمحتار'' میں یہی مذکور ہے (دیکھئے: ردالمحتار، باب الربا ۵/ ۱۷۹)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ تقابض میں مشائخ کی عبارتیں مختلف ہیں، جیسا کہ ابن عابدینؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فلوس کی بیع کی دو صورت ہیں:

۱- تماثل کے ساتھ بیع ہو:

اس صورت میں شیخین کے نزدیک بھی فلوس متعین کرنے سے متعین نہیں ہوں گے، اور عبارتوں کا اختلاف اسی صورت سے متعلق ہے، چنانچہ بعض نے ذکر کیا کہ مجلس میں قبضہ کرنا شرط ہے، اس لیے کہ جب فلوس متعین نہیں تو وہ دین ہیں، اب اگر کسی ایک جانب سے بھی قبضہ نہ ہوا تو یہ بیع الدین بالدین ہے، لہٰذا فاسد ہے، اور اگر ایک جانب سے قبضہ ہوگیا تو وہ فلس عین ہوگیا، لہٰذا اب بیع الدین بالدین لازم نہیں آئے گا۔

اور بعض مشائخ نے ذکر کیا ہے کہ اس صورت میں بھی تقابض فی المجلس شرط ہے، اس لیے نہیں کہ یہ صرف ہے، بلکہ اس لیے کہ بدلین ہم جنس ہیں اور اتحاد جنس تنہا حرمت نسیئہ کی علت ہے۔

۲- تفاضل کے ساتھ بیع ہو:

یہ صورت شیخین کے مسلک پر اسی وقت متصور ہے جب کہ فلوس دونوں جانب سے متعین ہوں، اور یہ تعین ان کے نزدیک معتبر بھی ہے، لہٰذا اس

صورت میں تقابض فی المجلس شرط نہ ہونا چاہئے، نہ دونوں جانب سے اور نہ کسی ایک جانب سے، کیوں کہ یہ بیع العین بالعین ہے، لیکن اُدھار (نسیئۃ) معاملہ کرنا پھر بھی درست نہیں ہوگا، اس لیے نہیں کہ یہ صرف ہے، بلکہ اس لیے کہ بدلین متحد الجنس ہیں اور یہ حرمت نسیئہ کی علت ہے۔

فائدہ: عدم تقابض بظاہر نسیئۃ کو مستلزم ہے، اس لیے دونوں کے درمیان فرق کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہ کہ نسیئۃ میں اجل عقد میں مشروط ہوتی ہے، اور اگر بدلین متعین ہوں، اس کے بعد بغیر شرط کے قبضہ مؤخر کردیا جائے تو اسے اصطلاح میں نسیئۃ نہیں کہا جاتا ہے (پوری تفصیل کے لیے دیکھئے فقہ البیوع ۲/۷۲۰)۔

نوٹوں کی فقہی اور شرعی حیثیت:

اصل تو زر تخلیقی سونا و چاندی ہے، اور دراہم ودنانیر ہیں، لیکن مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد آج اس کی جگہ کاغذی زر (Paper Money) نے لے لی ہے، جسے نوٹ اور عربی میں "الأوراق النقدية يا النقود الورقية يا الأنواط" کہا جاتا ہے، فقہی احکام کے لحاظ میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس بابت مختلف نظریات رہے ہیں، دلائل اور تفریعات سے تعرض کئے بغیر اجمالا چار نظریات کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

(۱) دین کی سند ہے۔

گزشتہ صدی کے بیشتر علمائے ہند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مفتی شفیع عثمانیؒ وغیرہ کا یہی موقف رہا ہے۔

(۲) مال اور سامان (Goods) ہے۔

علماء رام پور اور جناب احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی یہی رائے رہی ہے، اس موضوع پر ان کا ایک رسالہ "كفل الفقيه في أحكام القرطاس والدراهم" نام سے ہے، اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ نوٹ مال اور سامان ہے، سند دین یا خود ثمن نہیں۔

(۳) سونے و چاندی کے قائم مقام ہے۔

نہ محض سند دین اور نہ عروض وسامان ہے، بلکہ بذات خود ثمن ہے، عرف ورواج کی بناء پر اصل ثمن کے قائم مقام ہے اور اس کا بدل ہے، لہذا جو احکام اصل اور مبدل کے ہیں وہی احکام نوٹ میں جاری ہوں گے، اکثر علماء عرب اسی کے قائل ہیں، اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے یہی تجویز منظور کی (دیکھئے: فقہ البیوع ۲/۷۳۰)، یہی مولانا فتح محمد لکھنوی صاحب عطر الهدایہ اور مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی رائے ہے (دیکھئے: بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ/ص ۱۵۰)۔

۴- بذات خود ثمن عرفی ہے:

نے چاندی کا بدل نہیں بلکہ خود ثمن ہے، اور فلوس کی طرح ثمن عرفی ہے، لہذا جو احکام فلوس پر جاری ہوتے ہیں وہی اس پر منطبق ہوں گے، اکثر علماء اسی نظریے کے قائل ہیں، سعودیہ عربیہ کے علماء کبار کی مجلس نے اکثریت کے ساتھ یہی قرارداد منظور کی۔

یہی آخری نظریہ راجح ہے، اول نظریہ سے اختلاف، زمانے کے اختلاف کی وجہ سے ہے، کیوں کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں چاندی کا سکہ رائج تھا اور کاغذی نوٹ اس کی سند اور دستاویز کے طور پر ہی استعمال ہوتا تھا، لیکن اب اس کی یہ حیثیت باقی نہیں رہی، دوسرا نظریہ انتہائی ضعیف بلکہ باطل ہے، اس سے ربا کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا، بلکہ ربا کا تصور ہی ختم ہوجائے گا، تیسرے نظریہ میں عملی اعتبار سے بہت سی مشکلات ہیں، چوتھا نظریہ جہاں دلیل کے اعتبار سے قوی ہے، وہیں عملی لحاظ سے اس میں دشواریاں نہیں، لہذا فلوس کی طرح نوٹ ثمن عرفی اور اصطلاحی ہے، اس پر فلوس کے احکام منطبق ہوں گے۔

۱- (الف): روپئے کے سلسلہ میں ماقبل میں علماء کے چار موقف ذکر کئے گئے: ان میں سے پہلے اور تیسرے موقف کے اعتبار سے سونے اور چاندی کی روپئے کے عوض اُدھار خرید وفروخت جائز نہیں، کیوں کہ یہ عقد صرف ہے، اور مجلس عقد ہی میں بدلین پر قبضہ ضروری ہے، البتہ دوسرے اور چوتھے موقف کے اعتبار سے یہ معاملہ اُدھار جائز ہے، دوسرے موقف کے لحاظ سے تو واضح ہے (اگرچہ یہ موقف فی نفسہ باطل ہے)، اور چوتھے موقف کے لحاظ سے چوں کہ روپئے فلوس کے حکم میں ہے، اور وہ جمہور کے نزدیک عقد صرف میں داخل نہیں، لہذا مجلس میں

بدلین پر قبضہ ضروری نہیں ہوگا، بلکہ کسی ایک پر قبضہ کر لینا کافی ہوگا۔

صاحب بدائع "بيع الدرهم أو الدينار بالفلوس" کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"ولو لم يوجد القبض إلا من أحد الجانبين دون الآخر، فافترقا، مضى العقد على الصحة. لأن المقبوض صار عينا بالقبض، فكان افتراقا عن عين بدين" (بدائع الصنائع ۵/ ۲۳۷)۔

(اگر کسی جانب سے قبضہ ہو، دوسری جانب سے نہ ہو، اور دونوں جدا ہو جائیں تو عقد صحیح ہوگا، اس لیے کہ قبضہ کردہ چیز قبضہ کی وجہ سے عین ہو گئی، لہذا یہ "افتراق عن عین بدین" ہے)۔

مزید فرماتے ہیں: "قبضہ کے حق میں متعین اصول یہ ہے کہ عقد کے چند مراتب ہیں:

۱۔ وہ عقد جس میں تقابض شرط ہے یعنی جانبین سے قبضہ ہونا اور وہ عقد صرف ہے۔ ۲۔ جس میں قبضہ بالکل شرط نہیں، جیسے بیع العین بالعین جب کہ سونے چاندی کے علاوہ ہو۔ ۳۔ بیع العین بالدین جب کہ ربا النسیئہ کو متضمن نہ ہو، جیسے گیہوں وغیرہ کی بیع دراہم کے عوض ہو۔ ۴۔ وہ عقد جس میں کسی ایک جانب سے قبضہ شرط ہے، جیسے دراہم کی بیع فلوس کے عوض ہو" (بدائع الصنائع ۵/ ۲۳۷)۔

فتح القدیر میں ہے: "وفي شرح الطحاوي: لو اشترى مائة فلس بدرهم وقبض الفلوس أو الدراهم ثم افترقا جاز البيع لأنهما افترقا عن عين بدين" (فتح القدير ۶/ ۲۷۸)۔

(شرح طحاوی میں ہے کہ اگر کسی نے ایک درہم کے بدلہ سو فلوس خریدے اور فلوس یا درہم پر قبضہ کر لیا اور پھر دونوں جدا ہو گئے، تو یہ بیع جائز ہے، کیوں کہ وہ دین کے بدلے میں عین کا سودا کر کے جدا ہوئے ہیں)۔

"سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين لما في البزازية" الخ (الدر المختار ۵/ ۱۸۰)۔

(علامہ حانوتیؒ سے پوچھا گیا کہ فلوس کے بدلے سونے کو اُدھار فروخت کرنے کا کیا حکم ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ جائز ہے، بشرطیکہ ایک بدل پر قبضہ ہو جائے، جیسا کہ بزازیہ میں مذکور ہے)۔

علامہ سرخسیؒ کا رجحان بھی یہی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"جب ایک آدمی دراہم کے بدلہ فلوس خریدے اور ثمن (درہم) ادا کر دے اور فلوس بائع کے پاس نہ ہوں تو یہ جائز ہے، اس لیے کہ رائج فلوس نقود کی طرح ثمن ہیں اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ ثمن میں عقد کا حکم صرف اس کے وجود اور وجوب کا ہے، اور ثمن کا بوقت حکم بائع کی ملکیت میں ہونا صحت عقد کے لیے ضروری نہیں، جیسا کہ دراہم اور دنانیر میں یہ شرط نہیں" (المبسوط للسرخسی ۴/ ۲۴)۔

چونکہ راجح یہی ہے کہ روپئے فلوس کے حکم میں ہیں، لہذا مندرجۂ بالا عبارات کی روشنی میں سونے چاندی کی خرید و فروخت روپے کے عوض اُدھار جائز ہے، یعنی عوضین میں سے کسی ایک پر قبضہ کرنے سے عقد صحیح ہو جائے گا، ہاں دونوں جانب سے اُدھار درست نہیں، کیوں کہ وہ بیع الکالی بالکالی کے حکم میں ہے، جس کی ممانعت حدیث میں مصرح ہے۔

نیز اگر سونے یا چاندی کے زیور خریدے جا رہے ہوں تو مجلس میں قبضہ بھی ضروری نہیں، بلکہ اس کی تعیین کافی ہے، علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"اگر چاندی یا سونے کی انگوٹھی جس میں نگینہ ہو یا نہ ہو متعین فلوس کے بدلے میں خریدی اور فلوس پاس میں نہیں ہے، تو جائز ہے، خواہ جدائیگی سے پہلے قبضہ کر لیں یا نہ کریں، اس لیے کہ یہ (عام) بیع ہے، صرف نہیں ہے، وہ دین کے بدلے عین کا سودا کر کے جدا ہو رہے ہیں، کیوں کہ انگوٹھی تعیین سے متعین ہو جاتی ہے، بخلاف گزشتہ صورت کے، اس لیے کہ دراہم اور دنانیر تعیین سے متعین نہیں ہوتے، اسی لیے وہاں شرط لگائی کہ عوضین میں سے کسی ایک پر قبضہ ضروری ہے" (المبسوط للسرخسی، باب البیع بالفلوس ۱۴/ ۲۵)۔

(ب) جب نقود ورقیہ نہ کیلی ہیں اور نہ وزنی، بلکہ عددی ہیں، اور اس کی قیمت اسمیہ (Face Value) کا اعتبار ہے، تو یہاں ربا تفاضل کا

کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس کی قیمت اسمیہ ہی کے اعتبار سے سونے چاندی کی قیمت متعین کی جائے گی، نیز اختلاف جنس کی صورت میں تو تفاضل کا جواز منصوص ہے، رہی یہ بات کہ حکومت کی طرف سے جو قیمت طے شدہ ہے، اس سے کم وبیش قیمت میں باہمی رضامندی سے خرید وفروخت کرنا اگر چہ فی نفسہ جائز ہے، اور یہ ربوی معاملہ نہیں ہے، لیکن ہاں قانون کی مخالفت درست نہیں، ایک تو اس بناء پر کہ جو امر معصیت کے قبیل سے نہ ہو اس میں امام کی طاعت واجب ہے، دوسرے اس اعتبار سے کہ ہر ملک کا باشندہ قولاً یا عملاً اس ملک کے قانون کی پاسداری کا التزام کرتا ہے، اس لیے اس کی خلاف ورزی درست نہیں (فقہ البیوع ۲ / ۷۳۸)۔

۲- مذکورہ مسئلہ کی تین صورتیں ہیں:

(۱) تاجر کاریگر کو سونا دے یا کاریگر تاجر سے سونا لے اور اسی سونے سے زیور تیار کرے، تو یہ معاملہ بیع نہیں بلکہ اجارہ ہے، کیوں کہ بیع میں معقود علیہ عین ہوتی ہے اور اجارہ میں معقود علیہ منفعت یا عمل ہوتا ہے، اور یہاں معقود علیہ عمل ہے، جیسے کپڑے رنگریز کو رنگنے کے لیے یا درزی کو سینے کے لیے یا دھوبی کو دھونے کے لیے دینا، یہ عقد اجارہ ہی کی صورت ہے، بیع نہیں ہے۔

ابن قدامہ صورت اجارہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''هذه المسألة تدل على أحكام ستة أحدها أن المعقود عليه المنافع، وهذا قول أكثر أهل العلم منهم مالك وأبوحنيفة وأكثر أصحاب الشافعي وذكر بعضهم أن المعقود عليه العين، لأنها الموجودة والعقد يضاف إليها، فيقول: أجرتك داري كما يقول بعتكها '' (المغنی لابن قدامہ ۵/ ۳۲۲)۔

(یہ مسئلہ چھ احکام پر دال ہے، ان میں سے ایک ہے کہ معقود علیہ منافع ہیں اور یہ اکثر اہل علم کا قول ہے، جیسے مالک، ابوحنیفہ اور اکثر شافعیہ، اور بعض نے ذکر کیا ہے کہ محل عقد عین ہے اس لیے کہ وہی موجود ہے اور عقد اسی کی طرف مضاف ہوتا ہے، کہتے ہیں: أجرتک داري، جیسے کہتے ہیں: بعت داري)۔

حکم:

یہ اجارہ کا معاملہ درست ہے، لیکن ضروری ہے کہ کاریگر کے عمل کی اجرت متعین ہو، البتہ ان ذرّات ہی کو کل اجرت یا اجرت کا جزء بنانا درست نہیں، کیوں کہ یہ ذرّات کم وبیش ہو سکتے ہیں، اگر چہ لوگ اس کی شرح مقرر کر دیتے ہیں، مثلاً ایک تولے کے زیور پر ایک ماشہ ذرات کا اعتبار کرتے ہیں، لیکن اس کی مقدار کبھی مذکورہ شرح سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کچھ کم ہوتی ہے، لہٰذا اس مجہول مقدار کو اجرت قرار دینا درست نہیں، ہاں ان ذرات کا لحاظ کرتے ہوئے اجرت متعین کر دے اور پھر تاجر کاریگر کو وہ ذرات ہبہ کر دے۔

''اجرت کے معلوم ہونے کے باب میں اصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس کسی نے کسی اجیر سے اجارہ کا معاملہ کیا تو اس کو اس کی اجرت بتا دے''، اور اجرت کا علم اشارہ، تعیین یا بیان سے صحیح ہے، ...... اگر کسی انسان کو معلوم اجرت اور کھانے کے عوض اجرت پر لیا تو اجارہ صحیح نہیں ہوگا اس لیے کہ کھانا یا جانور کا چارہ اجرت میں شامل ہے اور وہ غیر معلوم مقدار ہے، لہٰذا اجرت مجہول ہوگئی'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۵ / ۳۸۲۳)۔

(۲) کاریگر اپنے سونے سے زیور بنا کر تاجر کے ہاتھ فروخت کرے، خواہ تاجر نے آڈر دیا ہو یعنی استصناع کی صورت ہو، یا آڈر نہ دیا ہو، بہر حال یہ بیع کا معاملہ ہے، لہٰذا بیع کی شرائط کا لحاظ ضروری ہے، پھر فروخت کی دو صورت ہوسکتی ہیں، روپئے کے عوض فروخت کرنا یا سونے کے عوض فروخت کرنا۔

روپئے کے عوض فروخت کرنا:

اس صورت میں زیور کے وزن، محنت ومزدوری وغیرہ کا لحاظ کرتے ہوئے باہمی رضامندی سے جو قیمت طے کرلیں، معاملہ جائز ہوگا، کیوں کہ گزر چکا کہ یہ عقد صرف نہیں ہے، لہٰذا امانت ودیانت کے ساتھ عام بیوع کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاملہ درست ہے۔

سونے کے عوض فروخت کرنا:

یعنی کاریگر تاجر کو زیور دے کر اس کے عوض خالص سونا وصول کرے، تو یہ بیع صرف ہے، لہٰذا دونوں طرف سونا وزن کے لحاظ سے برابر ہو اور لین دین دونوں طرف ہاتھ در ہاتھ ہو، نہ اُدھار ہو اور نہ چھیجت (Wastage) یا مزدوری وغیرہ کے نام پر زائد سونا ہو، جیسا کہ صرف کا اصول ہے۔

المغنی لابن قدامہ میں ہے:

''عمدہ، گھٹیا، ڈھلا ہوا اور بلا ڈھلا ہوا، صحیح اور ٹوٹا ہوا، تمام کا حکم یکساں ہے، تماثل کے ساتھ جائز ہے، اور تفاضل کے ساتھ حرام ہے، یہ اکثر اہل علم کا قول ہے جیسے ابوحنیفہؒ، شافعیؒ اور مالکؒ سے منقول ہے کہ مضروب کو اس کی قیمت کے اعتبار سے ہم جنس کے عوض فروخت کرنا جائز ہے، اور اصحاب مالک نے اس کا انکار کیا ہے اور اس قول کی مالک سے نفی کی ہے، اور بعض حنابلہ نے احمد سے ایک روایت نقل کی ہے کہ صحیح کو ٹوٹے ہوئے کے عوض فروخت کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ کاریگری کی بھی قیمت ہوتی ہے، اتلاف کی صورت میں (اس کا لحاظ کرنا) اس پر دلیل ہے، لہٰذا یہ ایسا ہوگا گویا کہ کاریگری کی قیمت کو سونے کے ساتھ شامل کرلیا، اور ہماری دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''سونا سونے کے عوض (خواہ) پترا ہو یا کوئی بنی ہوئی چیز، چاندی چاندی کے عوض، پترا ہو یا عین، یعنی برابر سرابر بیچو'' (سنن أبي داؤد، باب في الصرف من كتاب البيوع ۲/ ۲۲۲، ۲۳۲، المغنی لابن قدامۃ/ص ۶۰، دار عالم الکتب)۔

اس سلسلہ میں حضرت عبادہؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کے صریح آثار منقول ہیں (حوالہ بالا)۔

ہاں اگر زیور جڑا ہوا ہو، جیسے نگینہ وغیرہ شامل ہو تو زائد وزن پر بھی فروخت کیا جاسکتا ہے، اس صورت میں سونا سونے کے عوض اور زائد نگینہ وغیرہ کے عوض ہو جائے گا، البتہ زیور میں جتنا سونا ہے اس کے بقدر عوض کے سونے پر مجلس ہی میں قبضہ کرلینا ضروری ہے، یعنی یہاں مسئلہ مدعجوۃ والی صورت جاری ہوگی۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ تاجر نے کاریگر کو زیور بنانے کے لیے سونا دیا، لیکن کاریگر نے اپنے سونے ہی سے زیور بنایا، چوں کہ یہ صورت بھی رائج ہے، اس لیے عرف کی بنا پر یہ سمجھا جائے گا کہ تاجر نے اپنا سونا کاریگر کو قرض دیا ہے، اور بنے ہوئے زیور کو قرض میں سے وصول کیا ہے، اس کے بعد یہ صورت بھی پہلی صورت کی طرح ہو جائے گی، یعنی کاریگر متعین اجرت کا حقدار ہوگا۔

۳- اموال ربویہ میں چوں کہ وصف قدر ہے، نیا اور پرانا، جید اور ردی کا ایک ہی حکم ہے، اس لیے مذکورہ صورت جائز نہیں، البتہ اس کی متبادل صورت ہے:

(۱) دو معاملے علیحدہ علیحدہ کرلئے جائیں، اولا پرانا زیور روپے کے بدلے تاجر کو فروخت کردے، اور اس کی قیمت وصول کرلے، پھر نیا زیور خریدنے کے لیے مستقل دوسرا معاملہ کرلے۔

(۲) اگر زیور کا زیور سے تبادلہ کرنا ہو تو چند اصول ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

(الف)۔ اگر زیور سادہ ہو تو اس کے ساتھ کوئی اور چیز جیسے (Immitetion) زیور شامل کرلے تو پھر کمی بیشی کے ساتھ معاملہ درست ہو جائے گا۔

(ب)۔ اگر زیور نگینہ یا کسی اور طرح کا جڑاؤ والا ہے، تو بھی وزن کے اعتبار سے کمی بیشی کے ساتھ معاملہ درست ہو جائے گا، جب کہ مرکب زیور میں شامل سونا مفرز سونے سے کم ہو، مساوی یا زائد نہ ہو (ماخوذ از بہشتی زیور ۵/ ۲۷، ۲۸)۔

حاصل یہ ہے کہ مسئلہ مدعجوہ والی شکل اختیار کرلی جائے اور معاملہ اس طرح کرلیا جائے کہ سونا سونے کے بدلہ میں برابر سرابر ہو جائے، اور زائد مقدار اس دوسری دھات کے بدلہ میں ہو جائے، تو ربا لازم نہیں آئے گا اور شرعا معاملہ صحیح ہو جائے گا۔

۴- اصل جواب سے پہلے قبضہ کی حقیقت فقہاء کے کلام سے ذکر کی جاتی ہے۔

قبضہ کی حقیقت:

علامہ کاسانیؒ کہتے ہیں:

''معنی القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۸)۔

(قبض کا معنی ہے قدرت دے دینا، تخلیہ کر دینا اور عرف وعادت کے اعتبار سے تمام رکاوٹیں ختم کر دینا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ قبضہ کے تحقق کے لیے بنیادی طور پر دو باتیں ضروری ہیں:

(۱) بائع مبیع اور خریدار کے درمیان ہر قسم کی رکاوٹ ختم کر دے۔

(۲) خریدار کو اس مبیع پر تصرف کرنے کا پورا اختیار حاصل ہو۔

البتہ مختلف اشیاء میں قبضہ کے متحقق ہونے کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں، اسی لیے فقہائے کرام نے یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے:

''قبض كل شيئ بحسبه'' (المغنی ۴/ ۸۵)۔ (ہر چیز کا قبضہ اس کی حقیقت کے اعتبار سے ہوتا ہے)۔

زمین اور غیر منقول اشیاء میں قبضہ بالاتفاق تخلیہ کے ذریعہ متحقق ہوجاتا ہے، البتہ منقولات کے اندر قبضہ متحقق ہونے میں فقہائے کرام کے درمیان اختلاف ہے، جس کی قدرے تفصیل درج ذیل ہے۔

حنفیہ کا مسلک: حنفیہ کے یہاں منقولات کے اندر بھی تخلیہ سے قبضہ متحقق ہوجاتا ہے، بشرطیکہ بلا تکلف اس کے استعمال پر قدرت حاصل ہو، البتہ تخلیہ کی کیفیت مختلف اشیاء میں مختلف ہوسکتی ہے۔

ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

''أن التخلية قبض حكما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع'' الخ (رد المحتار ۴/ ۵۶۲)

(تخلیہ قبضہ کے حکم میں ہے بشرطیکہ خریدار کو بلا تکلف اس کے استعمال پر قدرت حاصل ہو اور اس کی صورت اشیاء کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے)۔

امام احمدؒ کی بھی ایک روایت یہی ہے کہ جب کسی چیز کو ممتاز کر کے اس کا تخلیہ کر دیا جائے تو اس پر قبضہ ہوجاتا ہے، ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

''وقد روى أبو الخطاب عن أحمد رواية أخرى أن القبض في كل شيئ بالتخلية مع التمييز لأنه خلى بينه وبين المبيع من غير حائل فكان قبضا له كالعقار'' (المغنی ۴/ ۸۵)۔

(ابو الخطاب امام احمدؒ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ ہر چیز پر قبضہ اس وقت متحقق ہوجاتا ہے جب اسے ممتاز کر کے اس کا تخلیہ کر دیا جائے، کیوں کہ اس صورت میں بائع نے مبیع اور خریدار کے درمیان کسی حائل کے بغیر تخلیہ کر دیا تو یہی اس چیز کا قبضہ ہے، جیسے زمین کا قبضہ)۔

مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا مسلک:

ان حضرات کے یہاں غیر منقول اشیاء کا قبضہ عرف پر مبنی ہے، عرف میں جس عمل کو قبضہ سمجھا جاتا ہو، اسی کو شرعاً قبضہ تصور کیا جائے گا۔

علامہ دردیر مالکیؒ لکھتے ہیں: ''والقبض في غير العقار من حيوان وعرض يكون بالعرف'' (الشرح الصغیر ۳/ ۲۰۰)

(زمین کے علاوہ دیگر اشیاء جیسے حیوان، سامان وغیرہ کا قبضہ عرف کے تابع ہے)۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

''ہمارے اصحاب کا کہنا ہے کہ قبضہ کے سلسلہ میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا، اور وہ تین طرح کا ہے، (۱) زمین اور درخت پر لگے ہوئے پھل پر قبضہ تخلیہ سے ہوجائے گا، (۲) جن چیزوں کو عادۃً منتقل کیا جاتا ہے جیسے لکڑی، دانے، بیج، مچھلیاں وغیرہ، تو انہیں منتقل کرنے سے قبضہ متحقق ہوجائے گا اور اگر مبیع ایسی جگہ ہے جو بائع کے ساتھ خاص نہیں ہے جیسے افتادہ زمین، مسجد، سڑک وغیرہ، یا ایسی جگہ ہے جو خریدار کے ساتھ خاص ہے، تو اس

صورت میں خریدار کی جگہ منتقل کرنا کافی ہے، (۳) جن چیزوں کو ہاتھ میں دیا جاتا ہے تو ہاتھ میں دینے سے ان پر قبضہ سمجھا جائے گا جیسے دراہم، دنانیر، رومال، کپڑے، چھوٹے برتن وغیرہ" (المجموع شرح المہذب ۹/۲۷۶)۔

موفق ابن قدامہ فرماتے ہیں:

"وقبض كل شيئ بحسبه، فإن كان مكيلا أوموزونا بيع كيلا أو وزنا فقبضه بكيله ووزنه... وإن كان المبيع دراهم أو دنانير، فقبضها باليد، وإن كان ثيابا، فقبضها نقلها، وإن كان حيوانا، فقبضه لمشيته من مكانه، وإن كان مما لاينقل ويحول، فقبضه التخلية بينه وبين مشتريه لا حائل دونه ... لأن القبض مطلق في الشرع فيجب الرجوع فيه إلى العرف كالإحراز والتفرق والعادة في قبض هذه الأشياء ما ذكرنا"۔

(ہر چیز پر قبضہ اس کے لحاظ سے ہوگا، اگر وہ کیلی ووزنی ہے اور کیل ووزن کے لحاظ سے بیچی گئی تو اس پر قبضہ کیل ووزن کرنے سے ہوگا،......اور اگر درہم ودینار ہیں تو اس پر قبضہ ہاتھ سے، اور اگر کپڑا ہے تو اس پر قبضہ منتقل کرنے سے، اور اگر حیوان ہے تو اس پر قبضہ اس کو اس کی جگہ سے چلا دینے سے ہوگا، اور اگر وہ چیز اس قبیل سے ہے کہ اس کو منتقل نہیں کیا جاسکتا تو اس پر قبضہ اس وقت سمجھا جائے گا جب کہ مبیع اور خریدار کے درمیان اس طرح تخلیہ ہوجائے کہ کوئی مانع نہ رہے)۔

تخلیہ کی شرائط:

فقہاء نے تخلیہ متحقق ہونے کے لیے درج ذیل شرائط کو ضروری قرار دیا ہے:

(۱) بائع کی طرف سے مبیع پر قبضہ کرنے کی اجازت ہو اور یہ اجازت دینا مختلف طریقوں سے ہوسکتا ہے، مثلاً زبان سے کہہ دے یا لکھ کر اجازت دے دے یا خریدار کے آگے رکھ دے وغیرہ، یعنی عرف میں جس کو اجازت سمجھا جاتا ہے وہ معتبر ہے۔

(۲) مبیع خریدار کے سامنے ایسی جگہ ہو کہ وہ کسی مانع کے بغیر اسے حاصل کرسکے، امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر مبیع کچھ دور بھی ہو، لیکن وہ اسے بآسانی حاصل کرسکے تو بھی تخلیہ پایا جائے گا۔

(۳) مبیع کسی دوسرے کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو، ورنہ تخلیہ متحقق نہ ہوگا، جیسے گندم بائع کی بوریوں میں ہے، تو تخلیہ معتبر نہیں، کیوں کہ یہ بائع کی چیز کے ساتھ مشغول ہے (دیکھئے: فتاوی قاضی خان علی ہامش الفتاوی الھندیۃ ۲/ ۲۵۸، رد المحتار ۴/ ۵۶۲)۔

خلاصہ یہ ہے کہ قبضہ کی دو صورتیں ہیں: (۱) قبضہ حقیقی، یعنی حسی طور پر شئ کو اپنی تحویل میں لے لینا، (۲) قبضہ حکمی، یعنی تخلیہ۔

اور اس پر دو حکم متفرع ہوتے ہیں:

۱- ضمان کا منتقل ہونا۔

۲- تصرف میں آزادی اور اس کا شرعاً صحیح ومعتبر ہونا، لہذا جب یہ دو حکم عرفاً وشرعاً متفرع نہ ہوں قبضہ شمار نہ ہوگا، اس لحاظ سے مسئولہ دونوں صورتوں کا حکم اس طرح ہوگا۔

(الف)۔اس صورت میں خریدار کا قبضہ متحقق نہیں ہوگا، اس لیے کہ تخلیہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مبیع غیر مبیع سے ممتاز ہو اور یہاں بظاہر ایسا نہیں ہے، نیز ضمان قبضہ کے تابع ہوتا ہے، اور مذکورہ صورت میں اگر کوئی حادثہ ہوتا ہے تو مشتری نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوتا ہے۔

(ب)۔فقط اندراج قبضہ کے وجود کے لیے کافی نہیں، اس لیے کہ حکمی قبضہ تخلیہ سے ہوتا ہے، جس میں خریدار کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ جب چاہے اپنی خرید کردہ چیز کو لے جائے، یہاں بظاہر یہ آزادی نہیں ہوتی، نیز مبیع کا متعین ہونا بھی ضروری ہے، اور مذکورہ صورت میں خرید کردہ مقدار کا سکہ اگرچہ موجود ہے، تاہم متعدد سکوں کے درمیان اس کا سکہ متعین نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر بعض سکے ضائع ہوجاتے ہیں تب بھی بائع مکلف ہے کہ مشتری کو سکے فراہم کرے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ضمان ابھی منتقل نہیں ہوا۔

۵- Exchange کے ذریعہ جو کاروبار ہوتا ہے عموماً وہاں حقیقی خرید وفروخت مقصود نہیں ہوتی، اسی لیے نہ مبیع کی سپردگی ہوتی ہے اور نہ اس کا مطالبہ، بلکہ بازاری قیمتوں میں ہونے والی تبدیلی کے ذریعہ نفع حاصل کرنے کی کوشش ہوتی ہے، ساری دلچسپی قیمت کے اتار چڑھاؤ میں ہوتی ہے، اور پے در پے چند سودے کرنے کے بعد ان کا کام صرف فرق ادا کرنا یا وصول کرنا ہوتا ہے، اس لیے یہ معاملات قمار کے مشابہ ہیں، جس کو Speculation اور ہندی میں ''سٹہ'' کہا جاتا ہے، معاشی اصطلاح کے مطابق اس کی تعریف ہے:

''بازاری قیمت میں تبدیلیوں سے نفع حاصل کرنے کی کوشش، جس کے نتیجہ میں سرمائے میں متوقع اضافہ کی خاطر موجودہ آمدنی کو چھوڑ دیا جائے'' (دیکھئے: فقہی مقالات از تقی عثمانی ۵/۵۱، فقہ البیوع ۱/۴۱۴)۔

الغرض مذکورہ صورت ہرگز جائز نہیں، اور ماہرین کے نزدیک یہ معاشی بحران کی ایک بڑی وجہ ہے۔

۶- اشیائے حاجت کو مہنگا ہونے کے انتظار میں روک رکھنا ''احتکار'' کہلاتا ہے، چوں کہ اس کے نتیجہ میں عام لوگ ضرر و تنگی کا شکار ہوجاتے ہیں، اس لیے شرعاً یہ عمل ممنوع ہے، حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''من احتكر فهو خاطئ'' (مسلم شريف: ۴۰۹۲) (جس نے احتکار کیا وہ خطاء کار ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں وعید ہے:

''من احتكر على المسلمين طعامهم ضربه الله بالجذام والإفلاس'' (ابن ماجه: ۲۱۵۵)

''وقال البوصيري: إسناده صحيح رجاله موثقون''۔

(جس نے مسلمانوں پر ان کے کھانے کی چیزوں کو روکے رکھا، اللہ تعالیٰ اس کو جذام اور إفلاس میں مبتلا کردیں گے)۔

اسی لیے علامہ کاسانیؒ نے اس کو ظلم اور حرام قرار دیا (بدائع الصنائع ۵/۱۲۹)

اور ابن حجر ہیثمیؒ نے اسے کبائر میں شمار کیا (نہایۃ المحتاج ۳/ ۴)۔

البتہ اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ احتکار کن اشیاء میں ممنوع ہے، اس سلسلہ میں تین رائے ہیں:

(۱) ابوحنیفہ، محمد، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک غذائی اشیاء میں احتکار کی ممانعت ہے۔

(۲) امام محمدؒ کے نزدیک کپڑوں میں بھی ممنوع ہے۔

(۳) امام ابو یوسفؒ اور مالکیہ فرماتے ہیں کہ بلا کسی تخصیص وہ تمام اشیاء اس میں داخل ہیں جن کے روک رکھنے سے لوگ ضرر اور تنگی میں مبتلا ہوجائیں (الموسوعۃ الفقہیۃ ۲/۹۲)۔

پھر جمہور فقہاء کے نزدیک اس ممانعت کی شرط یہ ہے کہ شہر کے بازار سے خرید کر ذخیرہ کیا ہو، لہٰذا اپنی زمین کی پیداوار، یا شہر کے بازار کے علاوہ کسی ایسے مقام سے جہاں سے عادۃً وہ مال برآمد نہیں ہوتا ہے، خرید کر ذخیرہ کیا تو ممنوع نہیں ہے، لیکن امام ابو یوسفؒ اور بعض مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ مدار ضرر اور تنگی پر ہے، خواہ اس نے خریدا ہو یا باہر سے برآمد کیا ہو، یا اس کی زمین ہی کی پیداوار ہے اور اپنی واپنے اہل وعیال کی ضرورت سے زائد ذخیرہ کر رکھا ہو، چنانچہ ابن رشدؒ فرماتے ہیں:

''إذا وقعت الشدة أمر أهل الطعام بإخراجه مطلقا ولو كان جالبا له أو كان من زراعته'' (حوالہ بالا)۔

(جب تنگی ہوجائے، تو بہرحال جس کے پاس غلہ ہے نکالنے کا حکم دیا جائے گا، خواہ انہوں نے برآمد کیا ہو یا ان کی کاشت سے حاصل ہوا ہو)۔

حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے: ''من كان له فضل من زاد فليعد به على من لا زاد له'' (مسلم)۔

(جس کے پاس زائد کھانے پینے کا سامان ہو، وہ اس کو دے دے جس کے پاس کچھ نہیں)۔

حدیث میں نہی عام ہے، اس کا تقاضہ یہی ہے، نیز علت ضرر ہے، لہذا یہ حکم ہر ضرورت کی چیز کو شامل ہوگا۔

اس لحاظ سے سونے کی ذخیرہ اندوزی اگر واقعی عام لوگوں کی زندگی کو تنگی میں ڈالتی ہو اور معیشت پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہو تو یہ بھی احتکار میں شامل ہوگا۔

۷- اصل یہ ہے کہ شرعاً ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مال سے اپنی ضرورت، یا اپنی پسند یا اپنے کاروبار کے لیے جہاں سے چاہے کوئی بھی چیز خریدے، لہذا بیرونی ملک سے کوئی بھی چیز درآمد یا برآمد کرنا شرعاً مباح ہے، لیکن معاشی اور عوامی مصالح کے پیش نظر حکومت اس کے لیے اس کے لیے قانون بناتی ہے، اور پابندی عائد کرتی ہے، شرعی لحاظ سے بھی اس کی گنجائش ہے، چنانچہ احادیث میں اس قسم کی کم از کم تین نظیریں ملتی ہیں:

(۱) بیع الحاضر للبادی، (۲) تلقی جلب، (۳) احتکار۔

ان تینوں کو اسی مصلحت کے خاطر ممنوع قرار دیا ہے، حالاں کہ شریعت چاہتی ہے کہ بازار اپنی فطری طریقے سے چلتا رہے، اور اس کی آزادی کو سلب نہ کیا جائے، اسی مقصد کے خاطر آپ نے تسعیر (قیمت کی تعیین) سے منع کر دیا، نیز فرمایا: "دعوا الناس یرزق الله بعضهم بعضا" (مسلم)، لوگوں کو (آزاد) چھوڑو! اللہ تعالی ایک کو دوسرے کے ذریعہ رزق پہنچائے گا۔

اس لیے قانونی طریقے کے خلاف مال درآمد کرنا اور اسمگلنگ کرنا درست نہیں، یہ بہت سے منکرات کو مستلزم ہے۔

(۱) قانون کی خلاف ورزی، حالاں کہ جو امر معصیت کی قبیل سے نہ ہو، اس میں حکومت کے قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہئے۔

(۲) نقض عہد، کیوں کہ ملک کے ہر باشندہ نے قانون کی پاسداری کا قولاً یا عملاً عہد لیا ہے۔

(۳) عموماً ایسے عمل کے لیے جھوٹ کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

(۴) جان و مال یا عزت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے۔

تاہم فی نفسہ کمائی حلال ہے، اور اس کی خرید و فروخت حرام نہیں کہلائے گی۔

۸- سفید سونے کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے:

(۱) حقیقی سونا جس میں رنگت کی تبدیلی اور تزیین کے لیے ایک مخصوص مقدار میں دوسری دھات شامل کی جاتی ہے۔

یہ حقیقی سونے ہی کے حکم میں ہے، لہذا اپنے شرائط کے ساتھ زکاۃ واجب ہوگی، اور عقود میں صرف کے احکام جاری ہوں گے، البتہ اس میں دوسری دھات بھی شامل ہوتی ہے، اس لیے یہ خالص ذہب کے حکم میں نہیں بلکہ دنانیر و دراہم مغشوشہ کے حکم میں ہے، جن میں حنفیہ کے نزدیک غالب کا اعتبار ہوتا ہے، اگر غش (کھوٹ) مغلوب ہے تو وہ خالص سونے ہی کے حکم میں ہے، ورنہ وہ عام عروض کے حکم میں ہوگا۔

"وما غلب فضته وذهبه فضة وذهب حكما ... والغالب عليه الغش منهما في حكم عروض اعتبارًا للغالب فصح بيعه بالخالص إن كان الخالص أكثر من المغشوش ليكون قدره بمثله والزائد بالغش" الخ (درمع رد المحتار، ۲۶۶)۔

(جس میں چاندی اور سونا غالب ہو وہ حکم کے اعتبار سے سونا اور چاندی ہی ہے، ...... اور جس میں غش غالب ہو وہ سامان کے حکم میں ہے، کہ غالب ہی کا اعتبار ہے، لہذا خالص کے بدلہ اس کی بیع صحیح ہوگی، بشرطیکہ خالص مغشوش سے زائد ہوتا کہ خالص کی مقدار اپنے مثل کے عوض میں ہو جائے، اور زائد مقدار کھوٹ کے بدلہ میں ہو جائے)۔

(۲) پلاٹینم: اسے بھی سفید سونا کہا جاتا ہے، لیکن درحقیقت یہ سونا نہیں بلکہ ایک علیحدہ قسم کی دھات ہے، جس کو زنگ نہیں لگتا اور نہ مرور زمان سے اس کی چمک میں کوئی فرق آتا ہے، یہ انتہائی مہنگی دھات ہے، قیمت میں تقریباً سونے کے مساوی ہوتی ہے۔

اب حکم شرعی کے لحاظ سے دو امر قابل تحقیق ہیں: (۱) پلاٹینم میں زکاۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ (۲) عقود میں صرف کے احکام اس پر منطبق ہوں گے یا نہیں؟ ذیل میں انہی دو لحاظ سے بحث کی جارہی ہے۔

پلاٹینم میں زکاۃ:

پلاٹینم معدنی اشیاء میں سے ہے، اور معدنی اشیاء میں سونا اور چاندی بالاجماع اموال زکاۃ میں شامل ہیں، لیکن ان دو کے علاوہ کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔

حنفیہ کا مسلک: حنفیہ کے نزدیک صرف سونے اور چاندی میں زکاۃ واجب ہوتی ہے، اس کے علاوہ کسی دھات میں زکاۃ واجب نہیں، ہاں اگر جامد و منطبع ہو جیسے لوہا، تانبا، پیتل وغیرہ، تو اس میں اپنے شرائط کے ساتھ خمس واجب ہوتا ہے۔

''والمعادن ثلاثة أنواع: جامد يذوب وينطبع بالنار كالنقدين الذهب والفضة والحديد والنحاس والرصاص. هذا هو الذي يجب فيه الزكاة وهي الخمس وإن لم يبلغ نصابا'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۲/ ۱۸۵۵)۔

مالکیہ اور شافعیہ کا مسلک: معدن میں زکاۃ (ربع عشر) واجب ہوتی ہے جب کہ وہ سونا و چاندی ہو، ان کے علاوہ میں کچھ واجب نہیں، ہاں جب وہ مال تجارت بن جائے تو پھر اپنے شرائط کے ساتھ زکاۃ واجب ہوگی (مغنی المحتاج ۱/ ۳۹۴، بدایۃ المجتہد ۱/ ۲۵۰، الفقہ الاسلامی ۳/ ۱۸۵۷ - ۱۸۶۰)۔

حنابلہ کا مسلک: معدن سے نکلنے والی تمام چیزوں میں زکاۃ (ربع عشر) واجب ہے (المغنی لابن قدامۃ ۳/ ۵۲، ۵۳)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ پلاٹینم میں حنابلہ کے نزدیک زکاۃ واجب ہوگی، شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک کچھ بھی واجب نہیں، اور حنفیہ کے نزدیک خمس واجب ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہوگا جب کہ کوئی شخص براہ راست کان سے پلاٹینم حاصل کرے۔

اگر کوئی شخص کسی اور ذریعہ سے اس کا مالک بنتا ہے تو اس کی دو صورت ہیں:

(۱) مال تجارت کی حیثیت سے اس کی ملکیت میں ہے۔

اس صورت میں بالاتفاق زکاۃ واجب ہوگی، فتح القدیر میں ہے:

''عروض التجارة... هي في اصطلاح الفقهاء كل ما أعد للتجارة كائنة ما كانت سواء من جنس تجب فيه زكاة العين كالإبل والغنم والبقر، أو لا كالثياب والحمير والبغال''۔

(سامان تجارت فقہاء کی اصطلاح میں وہ ہے جو تجارت کے لیے مہیا کیا گیا ہو، خواہ وہ اس مال کی جنس سے ہو، جس میں زکاۃ العین واجب ہوتی ہے، جیسے اونٹ، بکری، گائے، یا اس قبیل سے نہ ہو جیسے کپڑے، گدھے اور خچر) (فتح القدیر ۱/ ۵۲۶)۔

''قال ابن المنذر: أجمع أهل العلم على أن في العروض التي يراد بها التجارة الزكاة، إذا حال عليها الحول''۔

ابن المنذر نے کہا کہ اس پر اہل علم کا اجماع ہے کہ جن سامان سے تجارت مقصود ہو، ان میں زکاۃ واجب ہوگی، بشرطیکہ حولان حول ہو جائے (المغنی لابن قدامۃ ۳/ ۵۸)۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ تجارت مقصود نہ ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ زکاۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ وجوب زکاۃ کے لیے مال نامی ہونا شرط ہے، اس میں نمو نہ خلقۃ ہے اور نہ کسبا، جیسا کہ سونے اور چاندی میں خلقۃ نمو ہے اور مال تجارت میں کسبا نمو ہے۔

ابن رشد فرماتے ہیں:

''أن الزكاة سميت بذلك لأنه لاتوخذ إلا من الأموال التي يبتغي بها النماء لا من العروض المقتناة'' (المقدمات ۱/ ص ۲۸۱)

(زکاۃ اس نام سے اس لیے موسوم ہے کہ وہ ایسے ہی مال سے لی جائے گی جس میں نمو ہو، اس مال سے نہیں جو گزارے کے لیے ذخیرہ کیا گیا ہو)۔

بدائع میں ہے: ''إن معنى الزكاة وهو النماء لايحصل إلا من المال النامي ولسنا نعني به حقيقة النماء. لأن ذلك غير معتبر، وإنما نعني به كون المال معدا للاستنماء بالتجارة أو بالأسامة. لأن الأسامة سبب حصول الدر والنسل والسمن والتجارة سبب لحصول الربح'' (بدائع ۲/ ۱۱)۔

(زکاۃ کا معنی نمو ہے جو مال نامی ہی سے حاصل ہوتا ہے اور ہماری مراد حقیقی نمو نہیں ہے، اس لیے کہ وہ معتبر نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ مال تجارت کے ذریعہ یا اسامۃ کے ذریعہ زیادتی حاصل کرنے کے لیے مہیا کیا گیا ہو، کیوں کہ اسامۃ (مباح چراگاہ میں جانور کا چرنا) دودھ، نسل اور گھی کے حصول کا ذریعہ ہے اور تجارت نفع کے حصول کا سبب ہے)۔

حدیث میں ہے: ''ليس على المسلم في فرسه و لا عبده صدقة'' (مسلمان پر اس کے گھوڑے اور غلام میں صدقہ نہیں ہے)۔

نوویؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

''هٰذا الحديث أصل في الأموال القنية لا زكاة فيها'' (نووی مع مسلم ۶/ ۲۱۶)

(یہ حدیث اصل ہے اس پر کہ جن اموال کا ضرورت کے لیے ذخیرہ کیا گیا ہو ان میں زکاۃ نہیں ہے)۔

الفروق میں ہے: ''الزكاة تجب في الدراهم والدنانير. ينوي بها التجارة أو لم ينو، ولا تجب الزكاة في العروض إلا بنية التجارة'' (الفروق للكرابيسى ۱/ ۷۵)۔

(درہم و دینار میں زکاۃ واجب ہوگی، تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو، اور سامان میں زکاۃ اسی وقت واجب ہوگی جب کہ تجارت کی نیت ہو)۔

مجموع شرح مہذب میں ہے: ''لا زكاة في ما سوى الذهب والفضة من الجواهر كالياقوت والفيروزج واللؤلؤ والمرجان والزمرد والزبرجد والحديد... وإن حسنت صنعتها وكثرت قيمتها'' (المجموع ۲/ ۱۲۵، بيت الافكار الدولية)

(سونے اور چاندی کے علاوہ میں زکاۃ نہیں ہے، جیسے یاقوت، فیروزہ، موتی، مونگا، زمرد، زبرجد اور لوہا، اگرچہ اس کی بناوٹ عمدہ ہو اور قیمت زیادہ ہو)۔

مذکورہ تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ سونے اور چاندی کے علاوہ مال میں زکاۃ اس وقت واجب ہوتی ہے، جب کہ وہ مال تجارت ہو، محض قیمتی اور گراں ہونے کی بناء پر کسی چیز میں زکاۃ واجب نہیں ہوتی، لہذا پلاٹین زکاۃ کے باب میں حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوگا۔

پلاٹین عقود کے باب میں:

عقود کے باب میں تمام اشیاء کے درمیان احکام مشترک ہیں، صرف ''بیع صرف'' اور اموال ربویہ کے سلسلہ میں کچھ مخصوص احکام ہیں، لہذا یہاں قابل لحاظ یہی امر ہے کہ علت ربا پلاٹین میں موجود ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں اجمالاً ائمہ کے مسلک مندرجہ ذیل ہیں:

''حنفیہ کے نزدیک قدر مع الجنس علت ہے، یہی امام احمدؒ کی ایک روایت ہے، شافعیہ کے نزدیک ثمنیت اور طعم مع الجنس علت ہے، یہی امام احمدؒ کی دوسری روایت ہے، مالکیہ کے نزدیک ذہب وفضہ میں ثمنیت علت ہے، اور مابقیہ میں نسیئہ کی حرمت کے لیے محض مطعومیت اور تفاضل کی حرمت کے لیے اقتیات وادخار علت ہے'' (فقہ البیوع ۲/ ۶۶۳)۔

اس اعتبار سے حنفیہ کے نزدیک پلاٹینم اموال ربویہ میں سے ہے، اس لیے کہ وزنی ہیں، دیگر فقہاء کے نزدیک اموال ربویہ میں سے نہیں، اس لیے صرف کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے، اور عقود میں یہ سونے کے حکم میں نہیں ہے، اور حنفیہ کے نزدیک پلاٹین کا پلاٹین سے تبادلہ ہو تو سونے کی طرح ربا کے احکام جاری ہوں گے، لہذا تفاضل کے ساتھ اور اُدھار فروخت کرنا جائز نہ ہوگا، اس لیے اس حد تک پلاٹین عقود میں سونے کے حکم میں ہے۔

بحث کے نتائج

نقود وزر کی حقیقت:

نقود ذریعۂ مبادلہ ہیں، نہ وسائل پیداوار ہیں، اور نہ اشیاء صرف ہیں، لہذا عام اشیاء کی طرح ان کا لین دین درست نہیں۔

روپے سے سونا خریدنا:

(الف)۔ روپئے راجح قول کے مطابق فلوس کے حکم میں ہیں اس لیے ان کے ذریعہ سونے و چاندی کی اُدھار خرید و فروخت جائز ہے۔

(ب)۔ سونے اور چاندی کا جو نرخ حکومت نے طے کیا ہو، اس سے کم وبیش قیمت میں خرید و فروخت فی نفسہ جائز ہے، ربا الفضل میں شامل نہیں، ہاں

قانون کی مخالفت بھی درست نہیں۔

کاریگر کا سونے و چاندی کے زیورات بنانا:

(الف)۔اس کی ایک صورت یہ ہے کہ تاجر کاریگر کو سونا دے اور کاریگر اسی سونے سے زیور بنا کر تاجر کو دے، تو یہ اجارہ کا معاملہ ہے، بیع وشراء کا معاملہ نہیں، کیوں کہ یہاں معقود علیہ کاریگر کی خدمت اور اس کا عمل ہے، جب کہ بیع میں معقود علیہ عین ہوتی ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ یہ اجارہ صحیح ہے، لیکن اجرت میں ذرات کو متعین کرنا درست نہیں، کیوں کہ یہ مجہول ہیں، ہاں مستقل اجرت کی تعیین میں ان ذرات کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے۔

(ب)۔کاریگر اپنے سونے سے زیور بنا کر تاجر کو دے، تو یہ بیع کا معاملہ ہے، پھر اگر روپے کے ذریعہ خرید وفروخت ہو تو یہ عام بیع ہے، اور اگر سونے ہی کے عوض ہو تو عقد صرف ہے۔

(ج)۔تیسری صورت یہ ہے کہ تاجر نے کاریگر کو سونا تو دیا، لیکن اس نے اپنے ہی سونے سے زیور بنا کر دیا، اس صورت میں صورت اولیٰ ہی کا حکم ہوگا۔

نئے اور پرانے زیور کا تبادلہ:

(الف)۔نئے اور پرانے زیور کی خرید وفروخت کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں، اس لیے کہ اموال ربویہ میں وصف ہدر ہے۔

(ب)۔دو عقد کر لئے جائیں، ایک پرانے کو روپے کے عوض فروخت کرنے کے لیے اور دوسرا عقد ان روپیوں کے عوض نیا زیور خریدنے کے لیے تو یہ جائز ہے۔

(ج)۔زیور کے ساتھ کوئی غیر ربوی چیز شامل کر کے مدعجوہ والی شکل اختیار کر لی جائے تو بھی جائز ہے۔

ایکسچینج میں سونے کی خرید وفروخت:

(الف) خریدا ہوا سونا ممتاز و مفرز نہ ہو تو خریدار کا قبضہ شمار نہیں ہوگا۔

(ب) تسلیم کے بغیر محض اندراج بھی شرعی قبضہ کے لیے کافی نہیں۔

Exchange میں کاروبار کی رائج صورت:

عموماً یہ کاروبار معدوم کی بیع، بیع قبل القبض، غرر وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے، یہ ایک قسم کا سٹہ ہے، شرعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

سونے کا احتکار:

اگر یہ ذخیرہ اندوزی واقعی عام لوگوں کے لیے تنگی کا باعث ہو، اور معیشت کو متاثر کرتی ہو تو یہ احتکار ممنوع میں شامل ہے۔

اسمگلنگ کا حکم:

قانون عموماً معاشی اور عوامی مصالح کے پیش نظر بنائے جاتے ہیں، لہذا اس کی خلاف ورزی جائز نہیں، تاہم شرعاً اس خرید وفروخت کو حرام نہیں کہا جائے گا، اور کمائی فی نفسہ حلال تصور کی جائے گی۔

پلاٹینم اور سفید سونا:

(الف) اصل سونے کی تزیین کے لیے چاندی یا دوسری دھات شامل کی جاتی ہے، اسے بھی سفید سونا کہا جاتا ہے، یہ احکام شرعیہ زکاۃ وعقود وغیرہ میں دنانیر مغشوشہ کے حکم میں ہے۔

(ب) پلاٹینم جو ایک مستقل دھات ہے، شرعاً حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہے۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت اور اس سے مربوط مسائل

مفتی عبداللہ خالد لوناواڑہ[1]

اللہ تعالی کی طرف سے جو قدرتی وسائل زمین میں چھپا کر رکھے گئے ہیں، ان میں سونا اور چاندی بھی ہے، یہ نہایت قیمتی دھات ہے، جہاں اس کا استعمال زیبائش و آرائش کے لئے ہوتا رہا ہے اور خواتین اس کے زیورات پہنتی رہی ہیں، اور یہ دولت وقدر کو ناپنے کا ایک پیمانہ بھی ہے، اسی لئے قدیم زمانہ سے افراد ہو یا حکومتیں، انہوں نے دولت کے ایک محفوظ ذخیرہ کے طور پر سونے کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے بہت ہی قدیم زمانہ سے کرنسی کی حیثیت سے اس کا استعمال کیا گیا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس وقت روم میں سونا اور ایران میں چاندی کی کرنسی کا رواج تھا، اور یہی اس وقت دنیا کی دو بڑی معاشی اور فوجی طاقتیں تھیں، عرب ان دونوں کرنسیوں کو استعمال کرتے تھے، سونے کی کرنسی دینار اور چاندی کی درہم کہلاتی تھی، اسلام نے اس کو اسی طرح باقی رکھا، البتہ درہم اور دینار کے مختلف سکوں کے وزن میں جو فرق ہو جاتا تھا، اس خامی کو دور کیا اور اس میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی، حضرت عمرؓ نے جہاں اور بہت سی اصلاحات فرمائیں، ان میں ایک یہ بھی ہے۔

اگر چہ اب سونے اور چاندی کی وہ حیثیت نہیں رہی، چاندی کی حیثیت تو اب ایک عام دھات کی سی ہوگئی، اور کرنسی کی قدر میں سونے کی اہمیت بھی کم ہو کر رہ گئی، اور بظاہر بے قیمت نظر آنیوالے کاغذی نوٹوں نے اس کی جگہ لے لی، لیکن پھر بھی سونے کی اپنی ایک قیمت ہے، اس کی طلب ہے، افراد ہی نہیں حکومتیں بھی چاہتی ہیں کہ ان کے پاس سونے کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ ہو، آج بھی کسی ملک یا شخص کی دولت کو تولنے کے معیارات میں ایک سونا بھی ہے، اسی لئے بمقابلہ تمام دھاتوں کے اور خاص کر کاغذی نوٹوں کے سونے کی قیمت میں استحکام ہیں، بلکہ صورت حال یہ ہیں کہ کاغذی کرنسی کی قیمت تیزی سے گرتی جارہی ہے، اور سونے کی قیمت گھٹتی کم اور بڑھتی زیادہ ہے۔

دنیا کے معاشی نظام میں جو تبدیلیاں آتی رہی ہیں، ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے فقہاء نے بھی ثمن کے سلسلہ میں ایک نئی اصطلاح قائم کرتے ہوئے اس کی دو قسمیں کی ہیں؛ ایک: ثمن حقیقی، دوسری: ثمن اصطلاحی۔ ثمن حقیقی سے مراد سونا اور چاندی ہے، اور ثمن اصطلاحی سے مراد وہ شئی ہے جو لوگوں کے عرف اور اتفاق کی وجہ سے ثمن کے درجہ میں آگئی ہو؛ جیسے سکے اور کاغذی نوٹ، دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب ثمن کا ثمن سے تبادلہ ہو تو اس بیع کے خصوصی احکام ہیں، جن کو فقہاء نے بیع صرف سے تعبیر کیا ہے اور جس میں بے احتیاطی عقد کو ربا میں لے آتی ہے۔

کاروباری نقطہ نظر سے سونے چاندی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور بالخصوص ابلاغ کے جدید ذرائع کی پیدائش، نیز فون اور ای میل کے ذریعہ بین ملکی تجارت نے شرعی اعتبار سے بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے ہیں، جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱- **الف:** فقہاء کی عبارات سے پتہ چلتا ہے کہ بیع صرف کا اطلاق اس بیع پر ہوگا جہاں دونوں طرف ثمن خلقی سونا یا چاندی ہو، خواہ فی الوقت ثمن کی صورت میں ہو، مثلاً دراہم ودنانیر، یا فی الوقت ثمن کی صورت میں نہ ہو، مثلاً سونا چاندی کے برتن اور زیورات وغیرہ۔

مطلب یہ ہے کہ سونے کی بیع سونے کے ساتھ، چاندی کی بیع چاندی کے ساتھ، یا سونا اور چاندی کی بیع ایک دوسرے کے ساتھ بیع صرف ہے، سونا اور چاندی خواہ جس شکل میں بھی ہو۔

علامہ کاسانیؒ بیع صرف کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''فالصرف في متعارف الشرع اسم لبيع الأثمان المطلقة بعضها ببعض، وهو بيع الذهب بالذهب والفضة

[1] استاذ دار العلوم لوناواڑہ، گجرات۔

بالفضة" (بدائع الصنائع ۵/ ۲۱۵)۔

اسی طرح صاحب درمختار فرماتے ہیں:

"عقد الصرف بیع الثمن بالثمن أی ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنسًا بجنسٍ أو بغير جنسٍ" (ردالمحتار ۵/ ۲۵۷)۔

اسی طرح صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

"الصرف هو البيع إذا كان واحد من عوضيه من جنس الأثمان" (ھدایہ ۳/ ۱۰۴)۔

اور اگر عوضین "ثمن خلقی" نہ ہو تو اگر چہ ان میں سے ایک ثمن خلقی ہی سہی بیع صرف نہیں، اور بیع صرف کے احکام بھی اس پر لاگو نہیں ہوں گے۔

چنانچہ علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"إذا اشترى الرجل فلوسًا بدراهم و نقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود ۔ وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرفٍ" (المبسوط ۱۴/ ۲۴، رد المحتار ۴/ ۲۳۵)۔

مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ نقدین کے سوا دوسرے اثمان رائجہ کی بیع بیع صرف نہیں، لہذا اس میں عوضین پر مجلس میں قبضہ کرنا، دست بدست ہونا بھی شرط نہیں۔

اسی تفصیل کی بنا پر چونکہ مروجہ کرنسی ثمن حقیقی نہیں ہے بلکہ ثمن عرفی ہے، لہذا اس کی تجارت سونے کے ساتھ بیع صرف نہیں ہے اور اس پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے، بنابریں ادھار خرید و فروخت جائز ہوگی، ہاں عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس میں قبضہ کرنا ضروری ہوگا، تاکہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے۔

اس سلسلہ میں سب سے چشم کشاں تحریر حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب کی ہے (ملاحظہ فرمائیں: فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۹)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

"اگر کرنسی کا تبادلہ سونے چاندی سے ہو، تو کرنسی کی حیثیت سامان کی ہوجائیگی اور سونا چاندی اصل زر متصور ہوگا، کیونکہ خلقی ثمن میں ثمنیت اور زر بننے کی صلاحیت زیادہ ہے اور اصطلاحی اور رواجی ثمن اس سے کم درجہ کی حامل ہے، لہذا کرنسی اور سونے چاندی کی تبادلہ کی صورت نہ مجلس میں قبضہ ضروری ہوگا نہ مقدار میں مماثلت، نقد، ادھار خرید و فروخت بھی جائز ہوگی" (قاموس الفقہ ۴/ ۲۲۶)۔

ب- صورت مسئولہ میں نفس جواز میں تو کوئی کلام نہیں ہے، اس لئے کہ خلاف جنس کی بیع کی بیشی کے ساتھ جائز ہے، اس کی زیادتی کی شرعاً کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، اس لئے صرف حکومت کے بھاؤ طے کرنے سے دوسری طرف زیادتی کو سود کہنا درست نہیں ہوگا۔

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب فقہی مقالات میں تحریر فرماتے ہیں؛

حکومت کے مقرر کردہ بھاؤ کی مخالفت کرتے ہوئے کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کرنے میں سود لازم نہیں آئیگا، اس لئے کہ دونوں کرنسیاں جنس کے اعتبار سے مختلف ہیں اور مختلف الاجناس کے تبادلہ میں کمی زیادتی جائز ہے اور اس کی زیادتی کی شرعاً کوئی حد مقرر نہیں بلکہ یہ فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، البتہ اس پر تسعیر کے احکام جاری ہوں گے، لہذا جن فقہاء کے نزدیک اشیاء میں حکومت کی طرف سے تسعیر جائز ہے کرنسی میں بھی جائز ہوگی۔ لہذا اس کے لئے تو حکومت کے اس حکم کی مخالفت کرنا تو جائز نہیں (بشرطیکہ اسلامی حکومت ہو اور اسلامی اصول کی پابند ہو آج کل کی حکومتوں کی طرح نہ ہو) لیکن دوسری طرف اس زیادتی کو سود کہہ کر حرام کہنا بھی درست نہیں (فقہی مقالات ۱/ ۴۰)۔

۲- الف: اس شکل کو اجارہ مانا جائے گا، اس لئے کہ اس میں تاجر حضرات سونا دے کر زیور بنانے والے سے اس سونے کا زیور بناتے ہیں اور اجارہ نام ہے کسی معلوم منفعت کے مقابلہ میں کسی متعین عوض کا معاملہ کرنا۔

چنانچہ "ہدایہ" میں ہے: "الاجارة عقد يرد على المنافع بعوض" (ہدایہ ۳/ ۲۹۳)۔

اسی طرح ''فتاوی شامی'' میں ہے: ''تمليك المنفعة بعوض'' (الدر المختار ۶/ ۴)۔

اسی طرح ''المبسوط'' میں ہے: ''اعلم أن الاجارة عقدٌ على المنفعة بعوض هو مال'' (المبسوط للسرخسی ۸/ ۸۳)۔

ب- شریعت میں اجارہ صحیح ہونے کے لئے اجرت کا متعین ہونا ضروری ہے، حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے:

''ان رسول الله ﷺ نهى عن استأجر الأجير حتى يبين له أجره'' (مراسل ابی داؤد: ۱۰)۔

اسی طرح ''ہدایہ'' میں ہے: ''لا يصح حتى تكون المنافع معلومة لما روينا. لأن الجهالة في المعقود عليه و في بدله تفضي إلى المنازعة'' (ہدایہ ۳/ ۲۹۳)۔

اسی طرح ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''ومنها أن يكون المعقود عليه، وهو المنفعة معلومًا علمًا يمنع المنازعة'' (فتاوی ہندیہ ۴/ ۴۱۱)۔

اس صورت میں سونے کو زیور بنانے کے لئے جو دیا جاتا ہے اس سے جو ذرات نکلتے ہیں وہ معلوم ہو کہ کتنی مقدار میں نکلتے ہیں تو معاملہ کرنے سے پہلے ہی اتنا سونا اجرت میں متعین کر دیا جائے اور یہ نہ کہا جائے اسی سونے میں سے دیا جائیگا تو یہ شکل جائز ہوگی کیونکہ جس طرح اجارہ صحیح ہونے کے لئے اجرت کا متعین ہونا ضروری ہے اسی طرح قفیز طحان والی صورت سے بچنا بھی ضروری ہے اس لئے کہ احادیث میں قفیز طحان سے منع کیا گیا ہے، قفیز طحان یہ ہے کہ کسی کو گندم پیسنے کے لئے دے جائیں اور اجرت یہ طے کی جائے کہ اس گندم کے آٹے میں سے ایک قفیز آٹا تم کو ملے گا، اور فقہاء نے قفیز طحان سے بچنے کے لئے یہ طریقہ بتایا ہے کہ مطلق اجرت متعین کی جائے۔

چنانچہ ''فتاوی شامی'' میں ہے: ''والحيلة أن يفرز الأجر أولًا أو يسمى قفيزًا بلا تعيين ثم يعطيه قفيزًا منه فيجوز (الدر المختار) أي و يسلمه إلى الأجير فلو خلطه بعد وطحن الكل ثم أفرز الأجرة و رد الباقي جاز - ولا يكون في معنى قفيز الطحان'' (الدر المختار مع الشامی ۶/ ۵۷، هكذا في الهنديه ۴/ ۴۴۴)۔

اسی طرح حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

اجارہ صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اجرت متعین ہو مجہول نہ ہو، اور ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عندالعقد مستاجر اجرت کی ادائیگی پر قادر ہو، اسی بنا پر حدیث میں قفیز طحان سے منع کیا گیا ہے، لہذا صورت مسئولہ میں اجارہ صحیح نہ ہوگا، صحیح ہونے کی صورت یہ ہے کہ اجرت میں روپیہ متعین کرے اور اگر سونا ہی متعین کرنا ہو تو مطلقاً سونا متعین کرے اور جتنا متعین کیا ہے وہ پورا ادا کیا جائے (فتاوی رحیمیہ ۵/ ۶)۔

۳- یہ معاملہ سودی ہے اور ناجائز ہے، اس لئے کہ سونے کو سونے کے بدلہ میں کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز نہیں، چاہے خالص سونے کو ملاوٹ والے سونے کے بدلہ میں بیچا جائے یا پرانے زیور کو نئے زیور کے بدلہ میں بیچا جائے، اس لئے کہ حدیث شریف میں اس سے منع فرمایا گیا ہے، حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلًا بمثلٍ يدًا بيدٍ فمن زاد او استزاد فقد أربى الآخذ والمعطى فيه سواءٌ'' (مسلم شریف: ۱۵۸۷، بخاری شریف: ۲۱۷۶)۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''لا تبيعوا الذهب بالذهب الا مثلًا بمثلٍ ولا تشفوا بعضها على بعض، ولا تبيعوا الورق بالورق إلا مثلًا بمثلٍ ولا تشفوا بعضها على بعض، ولا تبيعوا منها غائبًا بناجزٍ'' (بخاری شریف: ۲۱۷۷)۔

اور ایک ضعیف حدیث میں صاف وضاحت ہے کہ عمدہ اور گھٹیا دونوں کا حکم یکساں ہے۔

''جيدها ورديئها سواءٌ'' (العناية على هامش الهداية ۶/ ۲۶۰)۔

اور جمہور فقہاء کرام کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ اس میں صیاغت اور صناعت کا بھی اعتبار نہیں ہوگا، جیسا کہ ''الموسوعہ الفقہیہ'' میں ہے

(موسوعہ فقہیہ ۲۶/ ۳۵۶، شرح الامام النووی لصحیح مسلم ۱۱/ ۱۲، بیروت)۔

اسی طرح مولانا تقی عثمانی صاحب اپنی کتاب ''فقہ البیوع'' میں رقم طراز ہیں:

''إن كان البدلان في الصرف من جنس واحد مثل بيع الذهب بالذهب، أو الفضة بالفضة، فيجب أن يكونا متساويين في الوزن، ولو اختلفا جودة وصناعة وذالك مصرح في حديث أبي سعيد الخدري الذي مرنصه، ومن أجل هذا الشرط اجمع الفقهاء على أن المجازفة في الصرف لا تجوز'' (فقه البيوع ٢/ ٧٠٧)۔

لیکن اس کی متبادل شکل یہ ہے کہ گاہک اپنا پرانا زیور پچاس ہزار میں مثلاً فروخت کردے اور ترپین ہزار سے نئے ڈیزائن کا زیور خریدلے تو یہ معاملہ جائز اور درست ہوگا، اسکی نظیر فقہاء کے یہاں ملتی ہے، چنانچہ ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''وإذا أشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلسا وليست الفلوس عنده فهو جائز تقابضا قبل التفرق أو لم يتقابضا لأن هذا بيع وليس بصرف'' (فتاوى هنديه ٣/ ٢٢٤، المبسوط للسرخسي ١٤/ ٦٩)۔

۴- شریعت مطہرہ میں قبضہ سے پہلے خرید وفروخت کرنے سے منع فرمایا ہے، اس کے متعلق بہت ساری احادیث مبارکہ وارد ہوئی ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں ہے: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من ابتاع طعامًا فلا يبعه حتى يستوفيه قال ابن عباس وأحسب كل شئي مثله'' (مسلم ٢/ ٥، باب بطلان بيع مبيع قبل القبض)۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں حضرت حکیم بن حزامؓ سے منقول ہے:

قلت يا رسول الله انى اشتريت بيوعا فما يحل لى منها وما يحرم على؟قال فإذا اشتريت فلا تبعه حتى تقبضه''

(مسند احمد ٣/ ٤٠٢)۔

ایک اور حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من اشترى طعاما بكيل أو وزن فلا يبعه حتى يقبضه'' (مسند احمد ٢/ ١١١)۔

ان احادیث کی روشنی میں فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کی خرید وفروخت کرنا ناجائز ہے۔

احناف کے نزدیک قبضہ کی نوعیت کیا ہوگی؟

احادیث میں قبضہ کا کوئی متعین ومحدود مصداق بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ خود احادیث میں قبضہ کی مختلف کیفیت کی طرف اشارہ موجود ہے، اسی لئے فقہاء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قبضہ کا مصداق لغت اور چیزوں کی نوعیت کے لحاظ سے ہوگا، امام نوویؒ لکھتے ہیں:

''لأن القبض ورد به لشرع وأطلقه فحمل على العرف، والعرف فيما ينقل النقل وفي ما لا ينقل التخلية''

(شرح المهذب ٩/ ٢٧٥)۔

اسی طرح ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:

''لأن القبض مطلق في الشرع فيجب الرجوع فيه إلى عرف كالإحراز والتفرق'' (المغني ٤/ ٩٠)۔

اس سلسلہ میں علامہ خطابیؒ کی تحریر ملاحظہ فرمائیں (بذل المجہود ۴/ ۲۸۴)۔

اسی لئے قبضہ کے سلسلہ میں یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ قبضہ دراصل ''تخلیہ'' یعنی مالک اور اس چیز کے درمیان مانع تصرف امر کو باقی نہ رکھنے کا نام ہے اور یہ عرف اور زمانے کے رواج وطور وطریق ہی سے معلوم ہوسکتا ہے، جیسے قبضہ میں ہر عہد کے عرف کا اعتبار ہے اسی طرح ہر چیز کا قبضہ اسی کے لحاظ سے ہوگا۔

''فتاوی شامی'' میں ہے: ''یختلف بحسب المبیع'' (رد المحتار ۴/ ۸۴)۔

اسی طرح ''فتاوی قاضی خان'' میں ہے:

''أجمعوا علی أن التخلیة فی البیع جائز تکون قبضًا'' (فتاوی قاضی خان ۲/ ۲۷۴)۔

اسی طرح علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: ''ولا یشترط القبض بالبراجم، لأن بمعنی القبض ھو التمکن والتخلی وارتفاع الموانع عرفًا وعادةً حقیقةً'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۴)۔

انہیں تفصیلات کی روشنی میں پہلی شق جس میں اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس اگر مثلا ایک کلو سونا ہو اور وہ دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرنے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہ بنائے جاتے ہوں تو کیا اس کو خریدار کا قبضہ سمجھا جائیگا یا نہیں، اس لئے کہ یہاں بہت سارے افراد کا سونا ایک ہی اینٹ ہونے کی وجہ سے خریدار اور مبیع کے درمیان تخلیہ نہیں پایا جاتا۔

حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب تخلیہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ولکن الواقع أن التخلیة إنما تعتبر قبضًا حکمیًا إذا کان المبیع متعینًا متمیزًا عن غیر المبیع. أما التخلیة بدون التعیین فإنه لیس تخلیة فی الواقع إنما ہو حق للأخذ بعد التعیین'' (فقه البیوع ۱/ ۴۱۱)۔

☆ اس سوال کی دوسری شق جس میں اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کر دیا گیا ہو، تو اس اندراج کو قبضہ کے لئے کافی سمجھا جائے گا، اس لئے کہ یہاں خریدار اور مبیع کے درمیان کسی قسم کی کوئی رکاوٹ اور خریدار کے لئے کوئی مانع تصرف باقی نہیں رہا اور تخلیہ اسی کا نام ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

اگر آپ نے بینک سے کیموڈٹی ایکسچینج سے یا سونے کا کاروبار کرنے والے کسی شخص سے سونا خرید کیا اور سونا اپنی تحویل میں لے لیا یا اپنی تحویل میں نہیں لیا، اسی کے پاس محفوظ کر دیا، لیکن آپ کے نام کا وہ سونا الگ کر دیا گیا تو اب آپ کے لئے بعد میں اس کو فروخت کرنا اور بڑھی ہوئی قیمت سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا (کتاب الفتاوی ۹/ ۴۴۹)۔

۵- یہ صورت بالکل جائز نہیں ہے اس لئے کہ شریعت میں کسی بھی چیز کو قبضہ سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ اوپر کے سوالات کے جوابات میں تفصیل سے گزرا، دوسری وجہ یہ ہے کہ اصل مبیع کا دور دور تک کہیں پتا نہیں، اور نہ ہی مشتری اصل مبیع کا مالک ہوتا ہے، یہ صورت محض جوا اور سٹہ پر مشتمل ہے، اس لئے بالکل حرام ہے، حضرت حکیم بن حزام سے مروی ہے:

''سألت رسول الله ﷺ فقلت یأتینی الرجل فیسألنی من البیع ما لیس عندی فأبتاع له من السوق ثم أبیعه. قال لاتبع ما لیس عندك'' (سنن الترمذی ۱/ ۲۳۳، مزید دیکھئے: البحر الرائق ۵/ ۲۵۹، بدائع الصنائع ۶/ ۳۶۴)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اگر آپ نے بینک سے کیموڈیٹیز ایکسچینج سے یا سونے کا کاروبار کرنے والے کسی شخص سے سونا خرید کیا اور سونا اپنی تحویل میں لے لیا، یا اپنی تحویل میں نہیں لیا، اسی کو اپنے پاس محفوظ کر لیا، لیکن آپ کے نام کا وہ سونا الگ کر دیا گیا تو اب آپ کے لئے بعد میں اس کو فروخت کرنا اور بڑھی ہوئی قیمت سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، لیکن اگر صرف حساب میں آپ کا نام شامل ہو گیا، آپ کے حصہ کا سونا الگ نہیں کیا گیا تو اس سونے پر آپ کا قبضہ متحقق نہیں ہوا، لہذا آپ کے لئے اس کو بیچنا اور اس پر نفع اٹھانا جائز نہیں ہوگا (کتاب الفتاوی ۹/ ۴۴۹)۔

۶- اسلام ایک دین رحمت ہے، اس نے انسانوں کے لئے وہی احکام نازل کئے ہیں جو انسانوں کے لئے مفید ہو، اور ہر اس چیز سے روکا ہے جو انسانوں کے لئے مضرت رساں اور نقصان دہ ہو، انہیں میں سے ایک چیز جو انسانوں کے لئے نقصان دہ ہے وہ ذخیرہ اندوزی یعنی احتکار ہے، احتکار اشیاء ضروریہ کو خرید کر اس طرح روکے رکھنے کا نام ہے جس سے اہل شہر کو مشقت ہو، حدیث شریف میں اسکو سختی سے منع کیا گیا ہے، حضرت عمرؓ سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔

''الجالب مرزوق، والمحتكر ملعون'' (ابن ماجه: ۲۱۵۳)،

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''من احتكر فهو خاطئی'' (مسلم: ۴۰۹۲) (یعنی احتکار کرنے والا گنہگار ہے)۔

ایک اور حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''من احتكر على المسلمين طعامهم ضربه الله بالجذام والإفلاس'' (ابن ماجه: ۲۱۵۵)۔

احتکار کب متحقق ہوگا؟

امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک احتکار اور ذخیرہ اندوزی صرف انسانوں اور جانوروں کی غذائی اشیاء اور حیوانات کے چارے میں ممنوع ہے، لیکن امام ابو یوسف اور امام مالک کی رائے یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی تمام ضروری اشیاء میں ممنوع ہے چاہے انسانی غذا ہو یا اور کچھ۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: موسوعہ فقہیہ ۲/۹۲، الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۳/۵۸۵، ردالمحتار ۹/۵۷۱)۔

مسئولہ صورت کا حکم:

موجودہ زمانے میں سونے کے احتکار کا اثر انسانوں کی خوراک اور دوسری تمام ضروری اشیاء پر پڑتا ہے اس لئے سونے کی ذخیرہ اندوزی اور احتکار ناجائز اور حرام ہوگا، اس لئے کہ شریعت کا احتکار سے روکنے کا مقصد انسانوں اور جانوروں سے مضرت اور تکلیف کو دور کرنا ہے۔

اور علامہ کاسانیؒ نے طرفین کی صرف انسانوں اور جانوروں کی غذا میں احتکار کو خاص کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ ضرر عام طور پر انسانوں اور جانوروں کی غذا روکنے سے ہوتا ہے۔

''وجه قول محمد: أن الضرر فی الأعم الأغلب إنما يلحق العامة بحبس القوت والعلف فلا يتحقق الاحتكار إلا به'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۰۹)۔

لیکن موجودہ زمانے میں ضرر عام صرف انسانوں اور جانوروں کی غذا کے احتکار سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ سونے وغیرہ اور بہت ساری چیزوں کے احتکار سے بھی ہوتا ہے، اس لئے کہ آج کل مارکیٹ میں ایک چیز کی تنگی کا اثر دوسری چیز پر ضرور پڑتا ہے، اس لئے موجودہ زمانے میں امام ابو یوسف اور امام مالک کی رائے پر عمل کیا جانا چاہئے۔ اس لئے کہ شریعت کا ایک اہم قاعدہ ہے، ''الضرر یزال''

اسی طرح کی رائے موجودہ زمانے کے محققین علماء کی ہے چنانچہ مفتی مولانا تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''وهذا القول يبدو راجحًا لعموم النهي ولأن علته الإضرار بأهل البلد فيشمل كل ما يحتاجون إليه'' (فقہ البیوع ۲/۹۹۹)

اسی طرح مولانا خالد سیف اللہ صاحب فرماتے ہیں: غیر معمولی حالات میں امام مالک اور امام احمد کے نزدیک تمام ہی اشیاء ضروریہ میں احتکار حرام ہے اور یہی رائے امام ابو یوسف کی ہے غالباً یہ رائے زیادہ قرین صواب ہے (جدید فقہی مسائل ۱/۳۷۷)۔

اسی طرح حضرت مولانا یوسف لدھیانوی صاحبؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

چوتھی صورت یہ ہے کہ انسانوں یا چوپایوں کی خوراک کی ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا، اسکے علاوہ دیگر چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے جس سے لوگوں کو تنگی لاحق ہو جاتی ہے یہ بھی ناجائز ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷/۱۱۱)۔

علامہ نوویؒ احتکار کی حرمت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''والحكمة فی الاحتكار رفع الضرر عن عامة الناس، كما أجمع العلماء على انه لو كان عند إنسان واضطر الناس إليه ولم يجدوا غيره أجبر على بيعه دفعًا للضرر عن الناس'' (شرح النووی على صحيح مسلم، باب تحريم الاحتكار فی الأقوات ۱۱/ ۴۳)

۷- شریعت نے ہر شخص کو یہ حق دیا ہے کہ اپنے مملوکہ روپیوں سے اپنی ضرورت یا پسند کا جو مال جہاں سے چاہے خرید سکتا ہے، اسی طرح باہر ممالک سے مال لے کر آنا یا باہر ممالک مال لیکر جانا حلال مال ہو اور حلال طریقہ سے ہو تو جائز ہے، اس لئے اسمگلنگ کے طریقے سے سونا خریدنا اور فروخت کرنا درست ہوگا، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں بہت سے گناہوں کا ارتکاب

کرنا پڑتا ہے، مثلاً جھوٹ بولنا پڑتا ہے، رشوت دینی پڑتی ہے، جان مال یا عزت آبرو کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے اور اس کی حفاظت کا شریعت میں بڑا خیال رکھا گیا ہے، اس لئے حکومت کے قانون کی پابندی کرنی چاہئے اور اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

چنانچہ حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحبؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: اگر وہ مال نجس، ممنوع الاستعمال اور ممنوع البیع نہ ہو اور وہ مالک سے خرید ہوا ہو تو اس کی تجارت فی نفسہ حلال ہے، لیکن چونکہ حکومت کے قانون کے خلاف ہے اور مجرم سزا کا مستحق اور ذلیل ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے ایسا معاملہ اختیار نہ کیا جائے (فتاوی رحیمیہ ۵/ ۲۵۸)۔

اسی طرح ''فتاوی محمودیہ'' میں ہے: جو شخص جو سامان خریدے اس کا مالک ہو جاتا ہے اس کو اپنے سامان کا حق ہو جاتا ہے کہ خود استعمال کرے یا کسی کو ہبہ کرے یا فروخت کرے، اور پھر اس سے خریدنے والے کو اس کا استعمال جائز ہوتا ہے، کیونکہ وہ مالک ہو گیا لیکن آدمی جب کسی حکومت کے ماتحت رہتا ہے تو اس کے قانون کی پابندی قانوناً لازم ہوتی ہے، اس کے خلاف کرنا قانونی چوری ہے جس سے عزت و مال دونوں کا خطرہ ہوتی ہے، اپنے عزت و مال کو خطرہ میں ڈالنا دانشمندی نہیں ہے (فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۱۴۸)۔

۸- شریعت میں سونا چاندی کی ایک خاص اہمیت ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی نے ثمنیت کے لئے صرف سونا چاندی کو پیدا فرمایا ہے، اور ان کی قدیم زمانہ سے ایک اہمیت رہی ہے، اسی لئے شریعت میں ان کے مخصوص احکام ہیں، اسی لئے دوسری کوئی دھات اس کی جگہ نہیں لے سکتی، اس لئے اگر چہ پلاٹین کا مہنگی دھاتوں میں شمار ہے اور عرف میں اس کو سفید سونا کہا جاتا ہو اس کے باوجود وہ حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوگا۔ اسی لئے شریعت نے زکوۃ کے وجوب کے لئے صرف سونا چاندی کو ہی خلقۃً مال نامی شمار کیا ہے، ان کے علاوہ دوسری دھاتوں کے لئے تجارت کی نیت ہونا شرط ہے۔

حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے: ''ليس في حجر زكوة إلا ماكان لتجارة من جوهر ولا ياقوت ولا لؤلؤ ولا غيره إلا الذهب و الفضة'' (السنن الکبری للبیہقی: ۴/ ۱۵۹)۔

اسی طرح حضرت عطاء سے مروی ہے:

''عن ابن جريج قال: قال لي عطاء: لا صدقة في اللؤلؤ ولا زبرجد ولا ياقوت ولا فصوص ولا عرض ولا شئي لايدار. وإن كان شئي من ذالك يدار ففيه الصدقة في ثمنه حين يباع'' (المصنف لابن ابی شیبہ/ ۱۰۱۷۰)۔

اسی طرح عقود میں بھی سونے چاندی کے خاص احکام ہیں جیسا کہ اوپر تفصیل سے گزرا، کہ بیع صرف نام ہی ہے سونا کو سونا کے بدلے یا چاندی کو چاندی کے بدلے یا ان دونوں کو ایک دوسرے کے بدلہ میں بیچنے کا۔

''فالصرف في متعارف الشرع اسم لبيع الأثمان المطلقة بعضها ببعض. وهو بيع الذهب بالذهب والفضة بالفضة'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۱۵)۔ اور ثمنیت کے اعتبار سے بھی اس کے خاص احکام ہیں کہ ثمن خلقی صرف دو ہی ہیں، سونا اور چاندی۔

صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

''ولهما أن الثمنيه في حقهما تثبت باصطلاحهما إذ لا ولاية للغير عليهما. فتبطل باصطلاحهما'' (ہدایہ ۳/ ۸۱)

اسی طرح حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالی نے ثمنیت کے لئے صرف سونا چاندی پیدا فرمایا ہے، اس لئے ثمن خلقی محض سونا اور چاندی ہوتے ہیں اور تمام عالم نے اسی ذہب وفضہ کو ثمن خلقی واصلی کے لئے تسلیم کر لیا ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۲۱۳)۔



سونا چاندی کی تجارت فقہ اسلامی کی روشنی میں

مولانا محمد شاکر نثار اعظمی مدنی[1]

۱- الف: اسلامی شریعت نے ثمن حقیقی صرف سونا اور چاندی کو قرار دیا ہے؛ لیکن چوں کہ اس وقت حکومتوں نے کرنسی نوٹوں کو ان کا بدل قرار دے دیا ہے، اور سارے کاروبار کرنسی نوٹوں کے ذریعہ ہی طے پاتے ہیں؛ اس لیے فقہائے امت رواج کی وجہ سے اس کے ثمن ہونے پر متفق ہوگئے ہیں، جیسا کہ ''الاختیار لتعلیل المختار'' میں ہے:

''وأما الفلوس فلأنها إذا راجت التحقت بالأثمان'' (کتاب الشرکۃ ۳/۱۵، طبع بیروت)۔

لیکن کرنسی نوٹ کو سونے چاندی کی طرح ثمن حقیقی اور ثمن خلقی قرار دیا جائے، یا ثمن اعتباری اور اصطلاحی؟ اس مسئلہ میں فقہائے کرام میں اختلاف رہا ہے، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ کرنسی نوٹ نے ثمنِ خلقی کا درجہ اختیار کرلیا ہے؛ لہذا اگر نوٹوں کے ذریعہ سونا چاندی خریدا جائے، تو یہ معاملہ بیع صرف کہلائے گا؛ لہذا بدلین میں سے کسی ایک کا ادھار ہونا جائز نہیں ہے، چنانچہ حضرت مولانا محمد یوسف شہید لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' (۷/۵۷) میں تحریر کرتے ہیں کہ سونے چاندی کو ادھار خریدنا جائز نہیں ہے۔

اسی طرح ''فقہ المعاملات'' (۲/۲۰۸) میں ہے: ''أما مبادلة الذهب بالورق النقدي. فهي تعتبر في المصطلح الفقهي صرفا. وهي مثلها مثل مبادلة الأوراق النقدية المختلفة بعضها ببعض. ولا يشترط فيها التماثل. فيصح بأي سعر يتم الاتفاق عليه بين الطرفين. ولكن تشترط الفورية في التقابض. فلا يجوز التأخير في تسليم واستلام البدلين''۔

جب کہ اس وقت کے اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ کرنسی نوٹ ثمن اصطلاحی یا ثمن اعتباری کا درجہ رکھتے ہیں، اور یہی رائے دلیل کی رو سے زیادہ مضبوط ہے؛ کیوں کہ نوٹوں کی حیثیت فلوس سے بھی کم ہے، اور فلوس کو فقہائے احناف کے راجح قول کے مطابق ثمن خلقی قرار نہیں دیا گیا ہے؛ لہذا نوٹوں کا ثمن اعتباری ہونا ہی زیادہ واضح ہے، اور فقہاء کی تصریح کے مطابق فلوس کا باہم تبادلہ صَرف نہیں ہے، نہ ہی اس میں تقابض فی المجلس ضروری ہے۔

(دیکھئے: فتاوی عثمانی ۳/۱۴۱-۱۴۵)۔

لہذا جب روپے پیسے فلوس کی طرح ثمن عرفی ہیں، ثمن حقیقی نہیں، تو روپے پیسے کے ذریعہ سونے چاندی کی خرید وفروخت نہ بیع صَرف ہے اور نہ ہی بدلین کا نقد ہونا شرط ہے؛ لہذا کرنسی نوٹوں کے عوض سے سونے چاندی کو ادھار خریدنا شرعاً جائز ہے۔

المبسوط للسرخسی (۱۴/۲۵) میں ہے:

''وإن اشترى خاتم فضة، أو خاتم ذهب، فيه فص، أو ليس فيه فص بكذا فلسًا. وليست الفلوس عنده. فهو جائز. تقابضا قبل التفرق، أو لم يتقابضا. لأن هذا بيع. وليس بصرف'' وکذا فی الفتاوی الهندیه (۳/۲۲۴). وفي ردالمحتار (۷/ ۴۱۴، طبع زکریا دیوبند): ''سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة. فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين''

(ب) سونے چاندی کا جو نرخ جو حکومت نے، یا سونے کی مارکیٹ، جیسے انٹرنیشنل سطح پر کومیکس گولڈ مارکیٹ (Comex Gold Market)، یا ہندوستانی سطح پر یہاں کی مارکیٹ (Multy Commodity Exchange.M.C) نے طے کیا ہو، جس کو فقہاء کی اصطلاح میں تسعیر کہا جاتا ہے، اس سے زیادہ یا کم قیمت میں خرید وفروخت شرعاً جائز ہے؛ کیوں کہ شریعت نے بائع کو اختیار دیا ہے کہ اپنے

[1] استاذ مدرسہ اسلامیہ عربیہ بیت العلوم سرائے میر، اعظم گڑھ۔

سامان کو مشتری کی رضامندی سے جتنی قیمت میں چاہے فروخت کرے۔

''وللبائع أن يبيع بضاعته بما شاء من ثمن، ولا يجب عليه أن يبيعه بسعر السوق دائمًا، وللتجار ملاحظة مختلفة في تعيين الأثمان وتقديرها'' (القضايا الفقهية المعاصرة / ص۸، كراتشي)۔

''وفي الهداية (۴/۲۷۲): ولا ينبغي للسلطان أن يسعر للناس، لقوله عليه السلام: لاتسعروا، فإن الله هو المسعر، القابض الباسط الرازق، ولأن الثمن حق العاقد، فعليه تقديره. فلا ينبغي للإمام أن يتعرض لحقه، إلا إذا تعلق به دفع ضرر العامة''۔

لیکن فقہائے کرام نے تسعیر کی خلاف ورزی کرنے سے احتیاطاً منع فرمایا ہے؛ کیوں کہ اس میں حکومت کی خلاف ورزی ہے، اور اگر اسلامی حکومت ہو، تو اس میں اولی الامر کی مخالفت لازم آئے گی، حالانکہ قرآن کریم نے اولی الأمر کی اطاعت کا حکم دیا ہے، فرمان خداوندی ہے:

''یأیہا الذین آمنوا أطیعوا اللہ وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم'' (سورۂ نساء: ۵۹)۔

اور اگر حکومت اسلامی نہ ہو، تب بھی خلافِ قانون کام کرنے کی صورت میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا ہے؛ اس لیے حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قیمت کی مخالفت نہ کرنا ہی بہتر ہے؛ لیکن اگر کوئی خلاف ورزی کرلے، تو اس کو ربا اور سود نہیں کہہ سکتے۔

(دیکھئے: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/۵۲)۔

''قال الشيخ محمد تقي العثماني أطال الله بقائه: ثم إن العملات المختلفة لها قيمة معهودة في البنوك والدوائر الحكومية، فهل تجوز المبادلة بأكثر أو أقل من هذه القيمة المعهودة، كما يفعل ذلك في السوق السوداء؟ والجواب: أننا لما اعتبرنا العملة الأجنبية جنسًا آخر، فالأصل أن التفاضل في مثله جائز شرعًا بالغًا ما بلغ. فلا تكون المبادلة على خلاف سعرها الحكومي ربًا، ولكن يمنع من ذلك لكونه مخالفةً لأولي الأمر إذا كانت الحكومة إسلامية، ولكونه عرضًا للنفس لعقوبات قانونية، إذا كانت الحكومة غير إسلامية'' (تكملة فتح الملهم ۱/۵۵۰، ديوبند)۔

۲- (الف): زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ مقدار میں سونا لیتے ہیں اور چند دنوں میں اس کے بدلے سونے سے بنے ہوئے زیورات انہیں واپس کرتے ہیں، لیکن ان کو الگ سے کوئی اجرت نہیں دی جاتی؛ بلکہ زیورات کی شکل میں سونے کی اتنی ہی مقدار واپس کرتے ہیں جتنی انہوں نے لی تھی؛ البتہ سونے کا زیور بنانے میں دیگر دھاتوں کی ملاوٹ کی وجہ سے سونے کی جو مقدار بچ جاتی ہے وہی ان کی اجرت ہوتی ہے۔ واضح ہونا چاہئے کہ اس طرح کا معاملہ شرعاً درست نہیں ہے؛ کیونکہ اگر صورت مذکورہ کو بیع تصور کیا جائے تو یہ سونے کی بیع سونے کے عوض ہے گرچہ ایک خالص اور دوسرے میں ملاوٹ ہے؛ لیکن قاعدہ ہے کہ جب تک ملاوٹ غالب نہ ہو وہ اصلی سونے کے حکم میں ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں ایک طرف زیادہ سونا اور دوسری طرف کم سونا ہے جو شریعت اسلامیہ کی رو سے سراسر ناجائز ہے، بلکہ عین ربوا ہے

(دیکھئے: الدر المختار مع رد المحتار كتاب البيوع باب الصرف ۷/۵۳۲، ۵۳۱)۔

(ب) اور اگر صورت مذکورہ میں بچی ہوئی مقدار کو کاریگر کی اجرت مانا جائے، تو یہ صورت اجارہ فاسدہ کی ہے؛ کیونکہ اجرت کی مقدار مجہول ہے، لہٰذا کاریگر اجرت مثل کا مستحق ہوگا۔ (الدر مع الرد باب الإجارة الفاسدة ۹/۶۶، طبع زكريا ديوبند، درر الحكام شرح غرر الأحكام، كتاب الإجارة، باب ما يفسد الإجارة ۷/۷۵)۔

۳- عام طور پر سونے کے تاجر پرانے زیورات کی قیمت نئے زیورات کے مقابلے میں کم رکھتے ہیں، مثلاً دس گرام کے پرانے زیور کو آٹھ گرام کے نئے زیور کے درجہ میں رکھتے ہیں، لہٰذا اگر پرانے زیور کا نئے زیور سے تبادلہ ہو اور کمی بیشی کو ملحوظ رکھا جائے، مثلاً دس گرام سونے کے پرانے زیور کا آٹھ گرام سونے کے نئے زیور سے تبادلہ کیا جائے، تو یہ بھی ناجائز ہے، البتہ اگر پرانے زیور کو فروخت کرکے اس کی قیمت وصول کرلی جائے پھر اسی سے نیا زیور خریدا جائے جو کہ وزن میں کم ہو تو کوئی حرج نہیں۔

(ملاحظہ ہو البحر الرائق ۶/۲۱۰، طبع بیروت، ہدایہ ۳/۶۱ طبع بیروت، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق)۔

۴- آج کل کموڈیٹیز ایکسچینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، جس میں خریدار جو آرڈر دیتا ہے وہ شئی اس کے نام محفوظ کردی جاتی ہے، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف): اگر بائع خریدار کے آرڈر کے مطابق مبیع کو اس کے نام محفوظ تو کردے؛ لیکن اس مبیع میں دوسرے آرڈر دینے والوں کا بھی حق ہو اور ہر ایک کے حصے کو الگ نہ کیا گیا ہو، مثلاً سونا فروخت کرنے والے ادارہ کا پاس ایک کلو سونے کی اینٹ ہو اور وہ پچاس پچاس گرام سونا نیں لوگوں کو فروخت کرے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا اینٹ میں شامل ہو اور الگ الگ ان کے نام کے بسکٹ نہ بنائے گئے ہوں تو صرف کمپیوٹر میں ریکارڈ کردینے سے قبضہ مکمل نہیں ہوگا؛ کیونکہ بائع نے تخلیہ نہیں کیا اور مشتری کی ملکیت دوسرے کی ملکیت سے مشغول بھی ہے، نیز صورت مذکورہ میں بائع مشتری کا وکیل بن کر بھی قبضہ نہیں کرسکتا، کیونکہ بائع مشتری کا وکیل نہیں بن سکتا، لہذا یہ صورت بھی ناجائز ہوگی۔

''كما في البدائع الصنائع (الطلاق/شرائط ركن الطلاق ۲۱۶/۷ ط بيروت): الواحد لايتولى عقد المعاوضة من الجانبين كالبيع''۔

''وفي المبسوط للسرخسي (۲۸/۳۱ ط بيروت): لأن الواحد لايتولى طرفي العقد من الجانبين في البيع والشراء كالوكيل. وهذا لأنه يؤدي إلى تضاد الأحكام؛ لأنه يكون مستزيدا ومستنقصا. مُسْلِما ومستسلما. طالبا ومطالَبا في حق نفسه وهو متهم''۔

''وفي كتاب الفقه على المذاهب الأربعة (۲/ ۲۲۴) الحنفية قالوا: من البيع الفاسد بيع الأعيان المنقولة قبل قبضها. سواء باعها لمن اشتراها منه أو لغيره''۔

(ب) اور اگر مذکورہ بالا صورت میں الگ الگ بسکٹ بنا کر خریدار کے نام کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں درج کردیئے جائیں، تو یہ اندراج قبضہ سمجھا جائے گا کیونکہ اب اس بسکٹ میں مشتری کی اجازت کے بغیر کوئی تصرف نہیں کرسکتا، لہذا اس طرح سونا کا خریدنا درست ہوگا۔

(مجلہ مجمع الفقہ الاسلامی ۳۱۲/۱۰، بحوث لبعض النوازل الفقہیہ المعاصرۃ ۱۱/۴، طبع مکتبہ شاملہ، المغنی ۲۰۰/۸)۔

۵- ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی ایک صورت آج کل یہ بھی رائج ہے کہ ایک متعینہ مدت تک کے لئے کسی سامان کا ادھار سودا کرلیا جاتا ہے مشتری نہ تو اس پر قبضہ کرتا ہے اور نہ ہی مشتری کا خریدنے کا ارادہ ہوتا ہے بلکہ متعینہ مدت آنے کے بعد اس مدت میں قیمت میں جو فرق ہوتا ہے صرف اس کی ادائیگی ہوتی ہے، یعنی اگر قیمت میں اضافہ ہوگیا تو مشتری اتنی مقدار بائع کو ادا کرتا ہے اور اگر قیمت میں کمی ہوگئی تو اتنی مقدار بائع سے واپس لے لیتا ہے، مثلاً مشتری دس گرام سونا ایک مہینہ کے لئے پانچ ہزار روپے میں ادھار خریدا اور سونے پر قبضہ نہیں کیا، جب مہینہ پورا ہوا تو دس گرام سونے کی قیمت پانچ ہزار ایک سو روپے ہوگئی، تو مشتری بائع کو صرف سو روپے ادا کرے گا اور سونا بائع کے پاس ہی رہے گا، اسی طرح اگر مہینہ مکمل ہونے پر قیمت چار ہزار نو سو روپے ہوگئی تو مشتری بائع سے سو روپے لے گا اور سونا بائع کے پاس رہے گا۔

واضح ہونا چاہئے کہ مذکورہ بالا صورت سٹہ بازی اور قمار کی ہے جو شرعاً ممنوع ہے؛ کیونکہ اس میں یہ معلوم نہیں کہ کس کا فائدہ ہوگا اور کس کا نقصان، اور اسی کا نام قمار ہے۔

قال الله تعالى: يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجسٌ من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون" (سورۂ مائدہ: ۹۰)۔

''وفي تفسير ابن كثير: وقال الضحاك عن ابن عباس قال: الميسر هو القمار، كانوا يتقامرون في الجاهلية إلى مجيء الإسلام، فنهاهم الله عن هذه الأخلاق القبيحة'' (سورۂ مائدہ: ۹۰)۔

''وفي رد المحتار: وحاصله (القمار) أنه تمليك على سبيل المخاطرة'' (۵/ ۲۵۷، طبع بيروت)۔

''وذكر النووي أنه مأخوذ من القمر؛ لأن ماله تارة يزداد إذا غُلب وينتقص إذا غَلب كالقمر يزيد

وينقص'' (البحر الرائق ۷/ ۹۱، طبع بيروت)۔

''وقال في حجة الله البالغة واعلم أن من البيوع ما يجري فيه معنى الميسر. وكان أهل الجاهلية يتعاملون بها فيما بينهم، فنهى عنها النبي ﷺ'' (۲/ ۱۰۸، طبع رشيده دہلی)۔

۶- اگر تاجروں کو آئندہ سونے کی قیمت میں اضافہ کا علم ہو جائے اور وہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے سونے کو روک لیں، اور ان کے روکنے کی وجہ سے دوسری اشیاء کی قیمتوں پر اثر پڑے؛ کیوں کہ سونا ثمن خلقی ہونے کے لحاظ سے ذریعہ تبادلہ ہے، جس کے روکنے کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں پر لازماً اثر پڑتا ہے، تو ان کا یہ عمل احتکار کے دائرے میں آئے گا، جس سے شریعت نے منع کیا ہے، احتکار اور حکرہ کے لغوی معنی ذخیرہ اندوزی کے ہیں، اور فقہی اصطلاح میں کسی سامان کو لوگوں کی ضرورت کے وقت فروخت نہ کرنا، تاکہ مارکیٹ میں اس سامان کے نہ ہونے سے قیمت میں اضافہ ہو جائے۔

''الاحتكار: جمع الطعام ونحوه مما يؤكل واحتباسه انتظار وقت الغلاء به'' (لسان العرب، مادة: ح ك ر)۔

''وقال في معجم لغة الفقهاء: الاحتكار جمع السلعة، وحبسها إلى الغلاء، والاسم منه حُكرة: حبس ما يضر بالناس حبسه، بقصد إغلاء السعر'' (مادة: ح ك ر)۔

جس سامان کا احتکار کیا ہے، اگر وہ مارکیٹ میں بالکل موجود نہیں ہے، یا موجود تو ہے؛ لیکن اس کے احتکار کی وجہ سے عام لوگ پریشانی میں مبتلا ہو جائیں، تو یہ احتکار ناجائز ہے۔ اور اگر اس کے احتکار کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو ضرر نہ ہو، تو یہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔

(الجوہرة النيرة كتاب الحظر والإباحة، الاحتكار في أقوات الآدميين والبهائم ۲/ ۲۶۸، طبع ديوبند، بدائع الصنائع كتاب الاستحسان ۱۱/ ۲۲)۔

۷- غیر قانونی طور پر اپنے سونے کو دوسرے ملک میں لے جا کر فروخت کرنا، یا وہاں سے خرید کر اپنے یہاں لانا اور حکومت نے کسی سامان کی برآمد یا درآمد پر جو واجبات یعنی ٹیکس مقرر کیے ہیں، ان کو ادا نہ کرنا، جس کو عرف عام میں اسمگلنگ کہا جاتا ہے، اس کا شرعی حکم جاننے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت اسلامیہ نے خرید و فروخت کے حلال ہونے کے لیے جن شرائط کا ذکر کیا ہے، یعنی بائع و مشتری کا رضامندی کے ساتھ اپنے مال کو دوسرے کے مال سے بدلنا، یہ تمام شرطیں اسمگلنگ میں بھی پائی جاتی ہیں، اس لیے اس طریقے میں شرعاً فی نفسہ کوئی قباحت نہیں ہے؛ لیکن اگر حکومت اسلامی ہو، اور عام مسلمانوں کے مفاد کی خاطر کسی مباح چیز پر پابندی عائد کردے، تو عوام کے لیے اس کا پابند رہنا شرعاً ضروری ہو جاتا ہے، اور اگر اسلامی حکومت نہ ہو، تب بھی ہر ملک کا باشندہ اپنے ملک کے قوانین پر قولاً یا فعلاً عمل کا عہد کرتا ہے، اور اس عہد کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو، اس کی پابندی کرنی چاہیے، چونکہ اسمگلنگ حکومت کی طرف سے ممنوع ہے؛ اس لیے اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، نیز جان و مال اور عزت و آبرو کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے؛ اس لیے حکومت کے جائز قوانین کی پابندی کرنی چاہیے۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی اسمگلنگ کیے ہوئے سونے کی خرید و فروخت کرے، تو شرعاً جائز ہے۔

وقال تعالى: "يأيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم" (سورۂ نساء: ۵۹)۔

''وفي أحكام القرآن للعلامة ظفر أحمد العثماني رحمه الله (۲/۲۵۱): وهذا الحكم أي: وجوب طاعة الأمير يختص بما إذا لم يخالف أمره الشرع، يدل عليه الآية؛ فإن الله تعالى أمر الناس بطاعة أولي الأمر بعد ما أمرهم بالعدل في الحكم؛ تنبيهًا على أن طاعتهم واجبة ما داموا على العمل، انتهى. (وكذا في التفسير المظهري ۲/ ۱۵۲، والجامع لأحكام القرآن ۵/ ۲۵۹، الدر المختار ۴/ ۲۶۴، كوئٹه، تكملة فتح الملهم ۹/ ۲۶۸، ديوبند، الأشباه والنظائر ۱/ ۱۵۷، بحوث القضايا الفقهية المعاصرة/ ص: ۷۱)۔

۸- آج کل پلاٹین کو سفید سونا کہا جاتا ہے اور اس سے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں اور قیمت بھی بہت گراں ہوتی ہے، تو کیا لوگوں کے عرف کی وجہ سے سفید سونے پر اصلی سونے کے شرعی احکام جاری ہوں گے یا نہیں؟ مثلاً زکوۃ کا نصاب بننا، اصلی سونے سے تبادلہ میں کمی زیادتی کا حرام

ہونا وغیرہ۔

اس لئے ذیل میں سفید سونا کی اقسام اور شرعی احکام کو درج کیا جاتا ہے:

۱- خالص سونا جس پر صرف پلاٹین کا رنگ چڑھایا جاتا ہے یعنی اوپر سے سفید ہوتا ہے؛ لیکن اندر سے خالص سونا ہی ہوتا ہے، اس کا شرعی حکم خالص سونے ہی کی طرح ہے، یعنی یہ سونا اگر ساڑھے سات تولہ سال بھر رہے تو اس کی زکوۃ واجب ہوگی، دوسرے سونے سے کمی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت ناجائز ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔

کما فی فتاوی اللجنة الدائمة (۶۰/۲۴): ''الذهب إذا خلط بغيره لايخرج عن أحكامه من تحريم التفاضل إذا بيع بجنسه، ووجوب التقابض في المجلس، سواء بيع بجنسه أو بيع بفضة، أو نقود ورقية. وتحريم لبسه على الرجال. وتحريم اتخاذ الأواني منه، وتسميته ذهبًا أبيض لايخرجه عن تلك الأحكام''۔

۲- خالص سفید سونا: اس سونے کے بارے میں ماہرین کی رائے یہ ہے کہ یہ خالص سونا ہی ہوتا ہے، صرف اس میں چاندی، رانگا اور نکل وغیرہ دیگر معدنیات کو ملا کر اس کا رنگ بدل دیا جاتا ہے، چنانچہ ۲۴ کیریٹ ۸۷۵ گرام خالص سونے میں ۱۲۵ گرام دیگر معدنیات کو ملانے سے ایک کلو ۲۱ کیریٹ کا سونا تیار ہوتا ہے۔ اور ۲۴ کیریٹ ۷۵۰ گرام خالص سونے میں ۲۵۰ گرام دیگر معدنیات کو ملانے سے ۱۸ کیریٹ کا ایک کلو سونا تیار ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس سونے میں ملاوٹ معمولی درجہ ہے، اس لیے اس کا حکم بھی خالص سونے کا ہوگا، جو کہ نمبر ایک کے تحت اوپر گزر چکا۔

۳- پلاٹینم سفید سونا، حقیقت میں یہ سونے کی قبیل سے نہیں ہے، صرف قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اس کا نام سونا رکھ دیا ہے، اس لیے معلوم ہونا چاہیے کہ صرف نام رکھنے سے اصلی سونے کا حکم نہیں ہوگا؛ لہذا اس طرح کے سفید سونے (پلاٹینم) سے بنے ہوئے برتن میں کھانا پینا اور مردوں کے لیے اس کا استعمال جائز ہوگا۔ البتہ احتیاط استعمال نہ کرنے میں ہے؛ اس لیے کہ جن لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ یہ سونا ہے، یا پلاٹینم، وہ اسے خالص سونا سمجھ کر استعمال کرنے والے کے بارے میں غلط گمان رکھیں گے، یا اس کو دلیل بنا کر خود خالص سونا ہی استعمال کرنے لگیں گے، اسی طرح اس سونے کی کمی بیشی کے ساتھ اور ادھار خرید وفروخت سب جائز ہے؛ لیکن چوں کہ اس کا شمار قیمتی اشیاء میں ہو رہا ہے، اور مال ودولت کے طور پر رکھا جا رہا ہے؛ اس لیے روپے پیسے کی طرح اگر اس کی قیمت بھی سونے چاندی میں سے کسی ایک کے نصاب تک پہنچ جائے، تو حولان حول کے بعد زکوۃ واجب ہوگی۔

''قال الله تعالى: وفي أموالهم حق للسائل والمحروم'' (سورۂ ذاریات:۱۹)۔

''وفي فتاوى اللجنة الدائمة (۷۶/۲۴): لبس الألماس لانعلم فيه بأسًا إذا كان خالصًا. ليس معه ذهب ولا فضة''

(دیکھئے: المجموع ۴/ ۳۲۷، الإنصاف ۱/ ۸۱)۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت کے اہم مسائل

مفتی محمد ابوالمکارم قاسمی [1]

۱- الف-روپئے پیسے یا کسی کرنسی کے ذریعہ سونے، چاندی کی خرید وفروخت، بیع صرف نہیں ہے، اس لئے اس طرح کی بیع میں مجلس عقد میں صرف احد البدلین پر قبضہ کافی ہے، ایک نقد ہو دوسرا ادھار ہو تو بیع درست ہو جائے گی، روپئے فلوس کے درجے میں ہیں، فلوس کی بیع ادھار درست ہے، لہٰذا روپیوں کی بیع بھی ادھار درست ہوگی۔

''باع فلوسا بمثلها أو بدراهم أو بدنانير فإن نقد أحدهما جاز-وفي ردالمحتار: لأن الفلوس لها حكم العروض من وجه، وحكم الثمن من وجه، فجاز التفاضل للأول واشترط التقابض للثاني''(ردالمحتار على در المختار ۷/ ۴۱۴ طبع ديوبند زكريا)۔

''والمراد بالتقابض القبض من أحد الجانبين لما في البزازية: ولو اشترى مائة. فلوس بدرهم. يكفي التقابض من أحد الجانبين''(فتاوى بزازيه ۲/ ۶ طبع زكريا ديوبند)۔

''سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب: بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين''(ردالمحتار ۷/ ۴۱۴، نیزالبحر الرائق طبع ديوبند زكريا، ہنديه ۳/ ۲۰۳ ديوبند زكريا)۔

ب- سونے چاندی کو اگر روپیوں پیسوں کے عوض خریدا یا بیچا جائے تو یہ تبادلہ مالی بیع صرف نہیں ہے، البتہ ان میں ثمنیت عرفیہ بھی ہے، اس لئے بیع صرف کے دو بنیادی رکنوں "سواء بسواء یدا بید" میں سے ایک یعنی ید ابید کو لازم قرار دیا جائے گا، جیسے سونے کی بیع سونے کے عوض ہو تو تفاضل اور نسیئہ دونوں ناجائز ہیں اور سونے کی بیع چاندی کے عوض ہو تو تفاضل جائز ہے، ادھار جائز نہیں ہے، اور روپیوں پیسوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کہ ان میں خلقی ثمنیت نہیں ہے، لہٰذا احد المتعاقدین کا احد العوضین پر قبضہ ہو جائے تو یہ بیع درست اور صحیح ہو جائے گی۔

اور کمی بیشی سے چونکہ اس بیع پر اثر نہیں پڑتا؛ اس لئے کہ یہ بیع صرف نہیں ہے، تو حکومت یا کسی گولڈ مارکیٹ کے نرخ سے زیادہ میں بھی فروخت کیا جائے تو اس کو ناجائز نہیں کہیں گے، اور اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا، نیز نوٹ نہ کیلی ہے نہ وزنی، بلکہ عددی ہے، اس لئے کمی بیشی کے ساتھ بدلنا جائز ہے (کتاب المعاملات ۱/ ۲۹۹ نظام الفتاوی)۔

ہاں البتہ اس پر تسعیر کے احکام جاری ہوں گے، اس میں حکومت کے اس حکم کی مخالف کرنا تو جائز نہیں، لیکن دوسری طرف اس زیادتی کو سود کہہ کر حرام کہنا بھی درست نہیں ہے (فتاوی دار العلوم زکریا، فقہی مقالات ۱/ ۴۰، فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۱۴۸، کفایۃ المفتی ۷/ ۳۵۶، رحیمیہ ۹/ ۲۲۲)۔

۲- صورت مسئولہ میں اجرت من جنس العمل ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز قرار دیا جائے گا، اور اس کی نظیر ''قفیز طحان'' والا مسئلہ ہے، جو کتب فقہ متداولہ میں مذکور ہے، نیز اس مسئلہ میں متعاقدین کے درمیان اجرت مجہول ہونے کی وجہ سے بھی یہ صورت ممنوع ہے، زیورات کا کاریگر تو جانتا ہے کہ میں کتنی دھات الگ سے ملاؤں گا، اور سونے کے کس قدر ذرات مجھے بچ جائیں گے، مگر سونے کے مالک کو معلوم نہیں ہوتا اور متعاقدین باہم اس دھات کو اور سونے کے ذرات کو متعین بھی نہیں کرتے اس لئے اس صورت کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

[1] مفتی شہر بھوپال (مدھیہ پردیش)۔

''ولا یصح حتی تکون المنافع معلومة، والأجرة معلومة'' (الهدایہ مع الدرایة، کتاب الاجارات ۲/ ۲۹۶ دیوبند دار العلم)۔

''وكذا إذا استأجر حمارا يحمل عليه طعاما بقفيز منه فالإجارة فاسدة؛ لأنه جعل الأجر بعض ما يخرج من عمله فيصير في معنى ''قفيز الطحان'' وقد نهى النبي عليه السلام عنه وهو أن يستأجر ثور اليطحن له حنطة بقفيز من دقيقه'' (المصدر السابق ۳/ ۳۰۸)۔

۳- اشیائے ربویہ خصوصا سونے چاندی کی بیع وشرا میں شریعت نے وصف جودت اور رداءت کو ہدر قرار دیا ہے اور اس کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ نفس سونا چاندی کا اعتبار کیا ہے، اس اعتبار سے عمدہ اور نیا زیور پرانے زیور کے بدلے فروخت کیا جائے تب بھی کمی زیادتی درست نہیں، بلکہ برابری ضروری ہے، جیسے: جید کو جید کے بدلے بیچا جائے تو کمی زیادتی درست نہیں ہے، لہذا سوال میں مذکور صورت کا جائز ہونا بالکل واضح ہے، جیسا کہ کتب فقہ کی صریح عبارات اس پر دال ہیں:

''فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لايجوز إلا مثلا بمثل، وإن اختلفت في الجودة والصياغة''
(الهداية مع الدراية، كتاب الصرف ۲/ ۱۱۱، طبع دیوبند دار العلم)۔

''ولا يجوز بيع الجيد بالردي مما فيه الربا إلا مثلا بمثل، لإهدار التفاوت في الوصف'' (المصدر السابق، باب الربا ۲/ ۸۳)۔

''عن أبي سعيد الخدري أن رسول الله ﷺ قال لا تبيعوا الذهب بالذهب إلا مثلا بمثل''۔
(الصحیح لسلم المساقاة ۳/ ۲۴، الهند، دیوبند مکتبة اشرفی)۔

۴- انسان زندگی میں کئی چیزوں کا محتاج ہوتا ہے جس کی اس کو ضرورت ہوتی ہے، اور بعض چیزیں انسان کے پاس زائد ہوتی ہیں جن کو بیچ کر انسان اپنی ضرورت کی چیزیں خرید تا ہے اس مصلحت کے لئے اللہ تعالی نے بیع وشراء کو جائز قرار دیا اور انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس کو مشروع قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: "أحل الله البيع وحرم الربوا" (بقرہ: ۲۷۵)۔

لیکن ہر چیز کے کچھ ارکان اور شرائط ہوتے ہیں: جن پر اس شئ کے جواز اور عدم جواز کا مدار ہوتا ہے، چنانچہ بیع وشرا یعنی خرید وفروخت کے بھی چند بنیادی ارکان ہیں جن کے بغیر خرید وفروخت درست نہیں بنیادی ارکان میں ایجاب وقبول ہے جس کے بغیر بیع کا تحقق ہی نہیں ہوتا۔

''البيع ينعقد بالإيجاب والقبول إذا كانا بلفظ الماضي'' (قدوری/ ص ۷۱)۔

اس کے بعد یہ سمجھنا چاہئے کہ انسان جس چیز کو فروخت کرتا ہے اس پر اس کا مکمل قبضہ اور تصرف ہونا چاہئے، تا کہ اس کو بیچنا اور دوسروں کے لئے اس کو خریدنا آسان ہو جائے نیز یہ بھی شرط ہے کہ مبیع موجود ہو معدوم نہ ہو، تا کہ موجود شئ پر مشتری یا تو خود قبضہ کر سکے یا اس کا وکیل اس خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کرے اس کے بغیر اگر کوئی خرید وفروخت کرتا ہے تو یہ ممنوع ہوگا۔

''وأما شرائط الا نعقاد فأنواع: منها: في المبيع وهو أن يكون موجودا، فلا ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم''

''ومنها: القبض في بيع المشترى المنقول وفي الدين، فبيع الدين قبل قبضه فاسد'' (ہندیہ ۳/ ۶)۔

صورت مذکورہ کی پہلی شکل میں خریداروں کا مبیع پر قبضہ نہیں ہوتا، کیونکہ قبضہ کی حقیقت شریعت میں تمکین تخلیہ اور رفع موانع ہے یعنی مشتری کو مبیع میں ہر قسم کے تصرف پر قدرت حاصل ہو جائے، مبیع حق غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو اور وہ غیر مبیع سے علاحدہ ہو اور ہر قسم کے موانع ختم ہو جائیں۔

''وقال الكاساني: معنى القبض وهو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة''
(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۴/ ۳۴۲، دیوبند، المكتبة النعیمیة، فقه البیوع ۱/ ۳۹۷)۔

یہاں مبیع پر خریداروں کا قبضہ ہوتا ہے نہ تصرف پر قدرت حاصل ہوتی ہے، اور اگر وہ اس سے استفادہ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے نہ اس کو دوسرے کے ہاتھوں بیچنے پر قادر ہیں تو گویا مبیع پر قبضہ ہی نہیں ہوا، اور بیع قبل القبض بیع فاسد ہے، نیز اس میں مبیع حقیقت میں معدوم ہوتی ہے، ہاتھی کے دانت کھانے کے کچھ اور دکھانے کے کچھ اور، دکھایا یہ جاتا ہے کہ ایک کلو سونا ہے جس کے مثلا پچاس آدمی، مالک بن گئے مگر ہوتا کچھ نہیں ہے، جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ

معاملہ بالکل فرضی ہے، حقیقت میں یہاں نہ کوئی مال ہوتا ہے نہ مبیع، لہذا ایسی بیع جس میں اس قدر خرابیاں ہوں اس کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اور یہ کہنا کہ رجسٹری کردی جاتی ہے اور ہر ایک کے نام پر پچاس پچاس گرام سونے کی اندراج کردیا جاتا ہے، تو یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ محض رجسٹری خواہ اشیائے منقولہ میں ہو یا غیر منقولہ میں قبضے کے لئے کافی نہیں ہے، اس سے قبضے کا تحقق نہیں ہوتا، چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے تحت ہونے والے فقہی سمینار میں بھی دلائل کی روشنی میں یہی فیصلہ ہوا کہ محض رجسٹری قبضہ شرعی نہیں ہے، لہذا صورت مسئولہ کی دوسری شکل میں جو رجسٹری ہوتی ہے اس کو قبضہ نہیں کہا جائے گا، اور یہ بیع قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے فاسد ہوگی، جس کی ممانعت شریعت میں وارد ہوئی ہے۔

۵- عین شئ کی بیع وشراء درست اور صحیح ہے مگر کسی شئ کے منافع اور مارجن کی بیع وشرا شرعا ممنوع ہے صورت مسئولہ میں ایکسچینج کی جو صورت رائج ہے، اس میں حقیقت میں کوئی بیع وشرا نہیں ہے، بلکہ یہ محض فرضی معاملہ ہے، نیز سٹہ کی شکل بھی ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے، اس کا حکم تقریبا وہی ہے جو فاریکس ٹریڈنگ کا ہے علت میں اشتراک کی وجہ سے، لہذا اس قسم کے لین دین سے مکمل اجتناب کی ضرورت ہے۔

''عن ابن عمر عن النبي ﷺ أنه نهى عن بيع الكالي بالكالي'' (المستدرك على الصحيحين، رقم الحديث ۲۳۴۲)۔

۶- احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی مکروہ ہے، اشیائے خورد ونوش میں احتکار باتفاق ائمہ احناف مکروہ اور ممنوع ہے، پھر امام محمدؒ نے دائرہ احتکار کو وسیع کرتے ہوئے فرمایا کہ احتکار ہر اس چیز میں ہے جو انسانوں اور چوپایوں کی غذا بنتی ہے، اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ہر اس چیز کا احتکار ممنوع ہے جس سے عوام کو ضرر پہنچے خواہ سونا چاندی ہی ہو''ہندیہ'' میں اس کی تصریح ہے۔

پس صورت مسئولہ میں سونے چاندی کا احتکار بہ چند وجوہ ممنوع ہے:

۱- اس میں عوام کو ضرر اور مشقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ۲- نقدین کے احتکار اور پھر گراں فروشی کا اثر دیگر اشیاء پر پڑ رہا ہے۔

۳- سونے چاندی کے احتکار سے اس کا ضرر لازم نہ رہ کر متعدی ہوگیا ہے۔

نیز باب احتکار کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد یہ نکتہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ احتکار کی ممانعت کی بنیادی علت ''ضرر'' ہے، لہذا جہاں عوام ضرر اور تنگی میں مبتلا ہیں ان کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑے تو ایسا احتکار ممنوع ہوگا۔

سونے چاندی میں اگر یہ علت پائی جارہی ہے تو اس کے احتکار کو بھی ممنوع قرار دیا جائے گا، جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کا قول، کتب فقہ کی عبارات اور عمومی روایات اس پر دال ہیں اور اس قول کی مؤید ہیں۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہر اس چیز میں احتکار ممنوع ہے جس سے عوام کو ضرر ہو اور اگر ضرر نہ ہو تو پھر احتکار اور ادخار ممنوع نہیں ہوگا جیسا کہ ''درمختار'' میں اس کی صراحت ہے:

''فإن لم يضر لم يكره'' (ردالمحتار على الدر المختار، كتاب الحظرة والإ باحة، فصل في البيع ۹/۶۵۷ ديوبند الفيصل)۔

مگر موجودہ زمانے میں اہالیان اسلام کو سونے چاندی وغیرہ کے احتکار سے منع کرنے میں مسلمانوں کا نقصان ہے فائدہ نہیں ہے، مسلمان اس سے رک جائیں گے اور باز تو آجائیں گے، مگر اس سے مسئلہ قابو میں نہیں آئے گا۔

ایک بات تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ نیشنل اور قومی نہیں ہے، بلکہ انٹرنیشنل اور بین الاقوامی ہے، اس لئے اس کے احتکار سے امت کو جو حرج عظیم لاحق ہورہا ہے، اور امت جس پریشانی کا سامنا کررہی ہے، اس کو چند مسلمان ختم نہیں کرسکتے اور شرذمہ قلیلہ کے احتکار سے رک جانے سے حرج عام دفع نہیں ہوگا۔

نیز ہمارے براہ راست مخاطبین برادران وطن ہیں جو سونے کا بڑا کاروبار کرتے ہیں ان کا شرع اور احکام شرعی سے کوئی واسطہ نہیں، لہذا وہ تو باز آنے سے رہے اب مسلمانوں کو اس سے روکنا اور منع کرنا مسلمانوں کو حرج میں مبتلا کرنا ہے، اور اس سے بچانا بھی ارباب حل وعقد کا فریضہ ہے۔

لہذا سونے کے احتکار کی ممانعت کا حکم نہیں لگائیں گے اور احتکار کی ممانعت کو اشیائے خورد ونوش میں منحصر رکھیں گے جیسا کہ یہ منصوص ہے اور احناف کا مفتی بہ قول ہے۔ فقہی عبارات وروایات واخبار برممانعت احتکار وادخار سے واضح ہے۔

(ملاحظہ ہو: مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر، كتاب الكراهية، فصل في البيع ۲۱۳/۴، ديوبند، فقيه الأمة، الهدايه مع الدراية، كتاب الكراهية ۲/

۴۷۴،الهندیه، کتاب البیوع، فصل فی الاحتکار ۲۰۰/۳، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، کتاب الاستحسان ۳۰۹/۴، شامی ۶۵۷/۹)۔

۷- قانون شریعت کی پابندی ہر مسلم حکومت کے لئے ضروری ہے، مگر قانون حکومت کی شریعت میں کس حد تک پابندی ضروری ہے یہ مسئلہ اہم ہے، کیونکہ اس کے متعدد پہلو ہیں اور سب کا حکم جداگانہ ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

۱- حکومت خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم یا ظالم اس کے ان تمام قوانین کی مخالفت لازم اور ضروری ہے جو شریعت اسلامیہ کے قوانین سے متصادم ہیں، یعنی خلاف شریعت قانون کی مخالفت ضروری ہے۔

۲- وہ تمام قوانین جو ایک ملک یا حکومت نے اپنے باشندوں پر عائد کئے ہیں، جو مفاد عامہ کے لئے ہیں، مصالح بلاد سے متعلق ہیں، مباح امور میں ہیں شریعت سے متصادم نہیں ہیں اور کسی خاص جماعت خصوصا جماعت المسلمین کو ضرر و نقصان پہنچانے کے لئے نہ ہوں تو ایسے قوانین کی عزت کرنا اور پابندی ہم سب پر لازم اور ضروری ہے اس کی خلاف ورزی شرعا محمود اور پسندیدہ نہیں ہے، بلکہ شریعت اس کی پابندی کا حکم دیتی ہے۔

لہذا جب تک وہ قانون ہمیں کسی گناہ پر مجبور نہ کرے اس وقت تک اس پر عمل کرنا واجب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کوئی شخص جس ملک کا باشندہ ہوتا ہے اور اس کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ عملا اس بات کا عہد کرتا ہے کہ میں اس ملک کے قانون کی پابندی کا عہد کرتا ہوں۔

اور عہد کی خلاف ورزی شریعت میں ممنوع ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "والذین هم لأماناتهم وعهدهم راعون" (مومنون: ۸)۔

صورت مسئولہ میں سونے چاندی کی اسمگلنگ جو ایک خطرناک چیز ہے اس سے اسلام کے ماننے والوں کو منع کیا جائے گا اور مسلمانوں کو اس سے روکا جائے گا اور اس عمل اور طریقے کو چند وجوہ کی بنا پر ممنوع قرار دیا جائے گا۔

۱- اسمگلنگ سے حکومت نے منع کیا ہے اور اسمگلنگ کرنا حکومت کے قانون کو توڑنا ہے، اس لئے کہ حکومت نے اس عمل سے اس لئے منع کیا ہے تاکہ ملک میں فساد نہ پھیلے اور صحیح طریقے سے تجارت کرنے والوں کو نقصان نہ پہنچے، اس لئے اسمگلنگ کی راہ سے آنے والی اشیاء پر ٹیکس وغیرہ نہ ہونے کی بنا پر وہ چیزیں ارزاں داموں پر فروخت کی جاتی ہیں بہ نسبت ان اشیاء کے جو صحیح راہ سے آنے والی ہیں، جس سے نظام تجارت پر کافی اثر پڑتا ہے جس سے روکنا بھی ضروری ہے۔

نیز اس عمل میں عزت اور جان کا بھی خطرہ ہوتا ہے، کیونکہ اسمگلر بڑے بڑے خطرات مول لیتے ہیں اور حکومت کی پرواہ نہیں کرتے پھر جب پکڑے جاتے ہیں تو بری طرح ذلیل و خوار ہوتے ہیں، نیز قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کثیر مقدار میں مالی تاوان بھی بھرنا پڑتا ہے۔

اور اپنی عزت و حیثیت کا خیال رکھنا، اپنی جان کی حفاظت کرنا اور اپنے مال و جائداد کو ضائع ہونے سے بچانا انسان کی ذمہ داری ہے اور شریعت مطہرہ نے ان تمام چیزوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے جیسا کہ قرآن و حدیث اس پر شاہد عدل ہیں، البتہ اسمگلنگ کرنے والوں سے سونا خریدنے اور پھر اس کو فروخت کرنے کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ انسان اپنی ملکیت کا مالک ہوتا ہے وہ اگر اس کو فروخت کرے تو اس کا خریدنا اور پھر بیچنا درست ہے اس میں شرعا قباحت نہیں ہے۔

اب آگے دلائل ذکر کئے جاتے ہیں:

"إذا كان فعل الإمام مبنيا على المصلحة فيما يتعلق بالأمور العامة لم ينفذ أمره شرعا إلا إذا وافقه، فإن خالفه لم ينفذ" (شرح الحموی علی الأشباه والنظائر ۳۲۱/۱، دیوبند مکتبہ الفیصل)۔

"أمر السلطان إنما ينفذ أي يتبع ولا تجوز مخالفته إذا وافق الشرع، وإلا فلا" (شامی، کتاب القضاء ۱۱۶/۸)۔

"ولا يمنع الشخص من تصرفه في ملكه إلا إذا كان الضرر بجاره ضررا بينا فيمنع من ذلك وعليه الفتوى بزازيه" (المصدر السابق ۱۵۲/۸)۔

۸- اللہ تعالی نے سونے کو جو اہمیت اور فضیلت دی ہے وہ فضیلت کسی اور دھات کو حاصل نہیں ہوسکتی خواہ اس کی قیمت آسمان کو چھولے، اور یہ اہمیت و فضیلت منصوص ہے کہ اللہ تعالی نے سونے اور چاندی میں خلقی ثمنیت رکھی ہے، یعنی اس کی خلقت ہی ثمن بننے کے لئے ہوئی ہے۔

پلاٹین اور دیگر دھاتیں خواہ کتنی ہی مہنگی ہو جائیں ان میں خلقی ثمنیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ سونے کے مساوی نہیں ہوسکتیں نہ ہی ان پر سونے

چاندی کے احکام جاری ہوں گے، یہاں چند اہم امور قابل لحاظ ہیں، جن کے پس منظر میں یہ جواب مرتب کیا گیا ہے:

۱- نام رکھنے یا بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی؛ پلاٹین کو اگر چہ سفید سونا کہا جاتا ہے، مگر وہ ''گولڈن سونے'' کے مساوی نہیں ہوسکتا، کیونکہ سونے میں خلقی ثمنیت ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اس کی اہمیت اور فضیلت کسی زمانے میں کم نہیں ہوئی، جب کہ پلاٹین وغیرہ میں ثمنیت نام کو بھی نہیں۔

''وثمنية المال كالدراهم والدنانير لتعينهما للتجارة بأصل الخلقة فتلزم الزكاة كيف ما أمسكها و لو للنفقة'' (ردالمحتار، کتاب الزکاۃ ۱۸۶/۳)۔

''قوله: بأصل الخلقة أي أن الله خلقها أي الدراهم والدنانير أثمانا''

(حاشية الطحطاوی علی الدر المختار، الزکاۃ ۳۹۳/۱، دیوبند، مکتبۃ الاتحاد)۔

''وأما اليواقيت واللآلیء والجواهر، فلا زكاة فيها وإن كانت حليا إلا أن تكون للتجارة. كذا في الجوهر النيرة'' (فتاوی ہندیہ، باب ثالث: فی زكاة الذهب والفضة والعروض. فصل: في العروض ۲۴۱/۱. وفی الجوهرة النيرة علی مختصر القدوری کتاب الزکاۃ، باب زكاة الذهب ۱۳۹/۱ دیوبند، دار الکتاب)۔

''وفي حاشية الطحطاوی لأنها غير معدة للثمنية خلقة'' (حاشية الطحطاوی علی الدر ۳۹۶/۱)۔

۲- نیز اس کے گراں قیمت ہونے کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے، اس لئے کہ معدنیات میں گرانی اور ارزانی قیمت کے اعتبار سے ہوتی رہتی ہے تو اس کے بیش قیمت ہونے کی وجہ سے اس کو حقیقی سونے کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اس کی نظیر کتب مقتدمین میں ہیرے جواہرات، فیروزہ اور موگی مونگے سے دی جاسکتی ہے، چنانچہ علامہ شامی نے ''درمختار'' کے حاشیہ میں یہ بات کہی ہے کہ جواہر ولآلی میں زکاۃ نہیں ہے، اگر چہ ہزاروں دراہم ودنانیر کے مساوی ہوجائے بس معلوم ہوا کہ پلاٹین کی قیمت خواہ کتنی ہی بڑھ جائے اس کو سونے کے درجے میں نہیں رکھا جاسکتا۔

''لا زكاة في الجواهر واللآلی وإن ساوت ألفا وفي نسخة ألوفا'' (ردالمحتار ۱۸۲/۳)۔

۳- اور سوال میں یہ بات جو مذکور ہے کہ عرف کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو سونے کا حکم دیا جاسکتا ہے کیا؟ تو یہاں یہ بات ملحوظ رہنا چاہئے کہ عرف مسائل غیر منصوصہ میں تو معتبر ہے، مگر منصوص علیہ مسائل میں عرف کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہیرے جواہرات جو بیش قیمت ہوتے ہیں اور پلاٹین جو کہ بیش قیمت دھات ہے اور دھات ہونے کی حیثیت سے دونوں کو ایک درجے اور حکم میں رکھا گیا ہے، تو جو حکم جواہر کا ہے وہی حکم پلاٹینم کا ہوگا۔

اور ہیرے جواہرات عروض کے درجے میں ہیں اور ان کی زکاۃ کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ تجارت کی غرض سے کسی کے پاس ہیں تو اس میں بھی زکاۃ واجب ہے اور اگر بغرض تجارت نہیں، بلکہ اپنے استعمال کے لئے ہیں تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے زکاۃ وصول نہیں کی ہے، اس لئے فقہاء نے بھی اس میں عدم وجوب کا قول نقل کیا ہے، رہا سونا چاندی یعنی نقود تو اس میں استعمالی اور تجارتی میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃ وصول کرنے کا حکم دیا ہے، نیز یہ مال نامی بھی نہیں ہے اور وجوب زکاۃ کے لئے ہے مال نامی ہونا بھی شرط ہے، آگے کتب حدیث اور کتب فقہ سے دلائل پیش کئے جاتے ہیں:

''العرف غير معتبر في المنصوص عليه'' (قواعد الفقه، رقم القاعدة: ۱۸۵، رقم الصفحة ۸۲، دیوبند مکتبة الإتحاد)۔

''ولا زكوة في الجواهر واللآلی إلا أن يتملكها بنية التجارة كسائر العروض''۔

(حاشية الطحطاوی علی المراقی، کتاب الزکاۃ ۷۱۸ دیوبند، دار الکتاب)۔

''وليس في عين القيرة والنقط والملح شئ، وكذا في الجص والنورة والياقوت الزمرد. واللؤلؤوالفيروزج. والزيبق'' (الفتاوی السراجیہ، کتاب الزکاۃ، باب المعدن والرکاز ۱۵۲ دیوبند، مکتبہ تھانوی)۔

''وكذا الكتب وإن لم تكن لأهلها إذا لم تنوللتجارة، غير أن الأصل له أخذ الزكاة. وإن ساوت نصبا'' (ردالمحتار ۱۸۲/۳)۔

☆☆☆

سونے چاندی کی تجارت سے متعلق احکام شریعت

مفتی محمد شاہد حسین قاسمی[1]

۱- الف: روپے اور سکے وثیقہ کا حکم رکھتے ہیں، بعینہ ثمن نہیں ہیں، فقہ کی اصطلاح میں وثیقہ کو حوالہ کہتے ہیں تو گویا روپے ادا کرنے والا محیل، وصول کرنے محتال اور بنک محتال علیہ ہے، جس نے اس کی ادائیگی کا ذمہ لیا ہے۔

''یمکن اعتباره کسند عند الدائن کدین له علی البنك'' (تکمله فتح الملهم ۱/ ۵۱۹)۔

تو نوٹوں کی فقہی تخریج یہ کی گئی کہ بذات خود مال نہیں بلکہ مال کی رسید ہے، اور جب کوئی اپنا دین ادا کرنے کے لئے کسی کو نوٹ دیتا ہے تو وہ دین اس کے حوالہ کرتا ہے جو بنک کے پاس ہے، تو روپئے کی حیثیت ثمن اصطلاحی کی ہوئی، جس کے ذریعہ سونا، چاندی کی خریداری بایں طور کی جائے کہ کچھ رقم ابھی دے دی اور کچھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا یا کل رقم ادھار ہے تو شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ روپے کے ذریعہ سے سونا چاندی کا لین دین بیع صرف میں داخل نہیں ہے اس لئے ادھار خرید و فروخت جائز ہے، بشرطیکہ عوض میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے۔

''بما قال العلامه ابن عابدين سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين'' (رد المحتار ۷/ ۴۱۴)۔

(یعنی حانوتی سے سوال کیا گیا سونے کی بیع فلوس کے ذریعہ ادھار کے سلسلہ میں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ جائز ہے بشرطیکہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ ہو جائے)۔

''وفي الهندية: قال إذا اشترى فلوسا بدراهم وليس عنده فلوس ولا عند الآخر دراهم، ثم إن أحدهما دفع وتفرقا جاز وإن لم ينقد واحد منهما حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط'' (۳/ ۲۲۴ الفصل الثاني: في بيع الفلوس)۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ کا رجحان بھی جواز ہی کا ہے، ایک استفتاء کا جواب بایں طور تحریر فرماتے ہیں: ''چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے یا چاندی کی رسید ہیں، لہذا ان سے بیع ذہب وفضہ بہر کیف جائز ہے تفاضل اور نسیئہ بھی جائز ہے'' (احسن الفتاویٰ ۶/ ۵۱۸)۔

خلاصہ کلام سونا چاندی اور روپئے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار تو اس طرح کی بیع جائز و درست ہے۔

(ب) انٹرنیشنل سطح پر کومکس گولڈ مارکیٹ یا M.C مارکیٹ سے کم یا زیادہ نرخ میں سونا چاندی بیچنا مارکیٹ میں اشیاء ضروریہ کی خریداری کو سہل بنانے اور قیمت پر کنٹرولنگ کے لئے منجانب حکومت بعض مرتبہ اشیاء کا نرخ طے کر دی جاتی ہے اور دوکاندار اسی قیمت پر سامان بیچنے کا پابند ہوتا ہے، حکومت کے اس طرح کے اقدام و فیصلہ کو خاص خاص حالت میں جائز قرار دیا ہے، چنانچہ حصکفیؒ رقم طراز ہیں:

''ولا يشعر كم حاكم إلا إذا تعدى الأرباب عن القيمة نقديا فاحشا'' (در مختار علی ہامش رد المحتار ۹/ ۵۷۳)۔

(حاکم اشیاء کا نرخ متعین نہیں کرے گا الا یہ کہ تاجر حضرات قیمت میں حد سے زیادہ اضافہ کر دیں)، تاجروں کے لئے اس صیغہ نرخ کی پابندی لازم ہے اور طے شدہ نرخ سے زیادہ لینا مکروہ ہے، درمختار ۴/ ۵۷ فقہاء نے عدول حکمی کرنے والوں کو سرزنش اور قید کی اجازت دی ہے، تاہم طے شدہ

---

[1] مدرسہ چشمۂ رحمت، ضلع مدھوبنی، بہار۔

نرخ سے زیادہ قیمت میں فروخت کیا تو یہ رقم اس کے لئے حلال وطیب ہوگی، ربا تفاضل کا اطلاق نہ ہوگا۔

''فإن سعر فباع الخباز بأكثر ما سعر جاز'' (فتاوی قاضی خان ۲/ ۳۱۴)

(اگر نرخ متعین ہوا ور نان بائی متعین سے زیادہ قیمت میں بیچ دے تو اس کا بیچنا جائز ہے)۔

۲- اجارہ کسی چیز کو کرایہ پر دینا ہے اسی طرح کوئی شخص اپنی خدمات کسی کو مزدوری لے کر مہیا کرے تو اسے اجارہ کہتے ہیں، نیز کسی چیز کو اجرت پر دینے کو فقہی اصطلاح میں اجارۃ الاعیان (کرایہ داری) کہتے ہیں، جبکہ خدمات فروخت کرنے کو فقہی اصطلاح میں اجارۃ الاشخاص (ملازمت، مزدوری) کہا جاتا ہے، معقود علیہ وہ منافع یا خدمات جن پر اجارہ کا عقد کیا جائے، مثلاً کرایہ والے گھر کی رہائش یا مزدور یا ملازم کا کام:

''فإجارة بيع المنفعة لغة ولهذا سماها أهل المدينة بيعا وأرادوا به بيع المنفعة ولهذا سمى البدل فى هذا العقد أجرة'' (بدائع الصنائع ۴/ ۱۶)۔

اجارہ کا عقد بھی بیع کی طرح ہے البتہ درج ذیل امور میں فرق پایا جاتا ہے۔

۱- اجارہ میں چیز کے بجائے کسی منفعت پر عقد کیا جاتا ہے، لہذا اجارہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ منفعت عقد کے وقت موجود ہو۔

۲- بیع میں بائع ایک مرتبہ مبیع کو دے کر فراغت پالیتا ہے، لیکن اجارہ میں منفعت مستقل طور پر وجود میں آتی رہتی ہے۔

۳- بیع میں مبیع پر قبضہ کے بعد خیار شرط نہیں رہتا جبکہ اجارہ میں عیب کے وقت کرایہ کا عقد ختم کیا جا سکتا ہے۔

۴- بیع میں مبیع کی ملکیت خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اجارہ میں مستاجر کی ذات کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعض منافع کا مالک ہوتا ہے۔

زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ وزن سونا لیتے ہیں اور چند دنوں بعد دوسرے دھاتوں کی آمیزش کے بقدر سونا ان کو بیچ جاتا ہے اور زیور بنانے میں سونے کے کچھ ذرات نکل آتے ہیں جو اپنے پاس کاریگر رکھ لیتا ہے تو اسے اجارہ کہیں گے، بیع نہیں کہیں گے، جہاں تک زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جائیں اسے اجرت قرار دینے کی صورت میں یہ اشکال یہ کہ اجرت مجہول ہے اور اجرت عامل کے جزء عمل سے قرار پائی ہے جو کہ مفسد اجارہ ہے تو اس سلسلہ میں محل غور یہ ہے کہ احکام شریعت دو طرح کے ہیں عبادات، عادات عبادات سے متعلق احکام اصلاً حکم خداوندی پر مبنی ہے انہیں فقہاء تعبدی احکام کہتے ہیں اور اجرت مجہول کے مفسد ہونے کی علت فقہاء کرام نے مفضی الی النزاع لکھی ہے۔

''وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة'' (الدر المختار ۹/ ۷)۔

اس سلسلہ میں علامہ علاء الدین کاسانی کی بھی رائے یہ ہے کہ اس طرح کا اجارہ درست ہے۔

''منها أن يكون المعقود عليه والمنفعة معلوما علما يمنع من المنازعة فإن كان مجهولا ينظر إن كانت تلك الجهالة مفضية إلى المنازعة تمنع صحة العقد وإلا لا لأن الجهالة المفضية إلى المنازعة تمنع من التسليم والتسلم فلا يحصل المقصود من العقد فكان العقد عبثا لخلوه عن العاقبة الحميدة وإذا لم تكن إلى المنازعة يوجد التسليم والتسلم فيحصل المقصود'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۴، ۲۵)۔

اب رہا معاملہ اجرت جزء عامل کا تو ایسے عادات نہیں ہیں جن سے ظلم و ناانصافی ہوتی ہو، بلکہ استحسان بالضرورۃ ہے، اور جس طرح کھیتی کی بٹائی کی صورت میں بٹائی دار کو پیداوار کا ایک حصہ ہی بطور اجرت ملتا ہے جو عامل کے جزء عمل کو اجرت بنانے کی صریح نظیر ہے۔

لہذا ہماری رائے یہ ہے کہ سونے کے لین دین میں مقدار کا یہ فرق اجارہ ہے اور زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جائیں وہی اجرت قرار پائے گی۔

۳- فقہاء کرام نے صراحتاً فرمایا ہے کہ عمدہ سونا کی خرید و فروخت ردی سونے کے ذریعہ کمی بیشی کے ساتھ ناجائز ہے، اس میں ربا پایا جاتا ہے جو کہ

حرام ہے، نیز وصف کے تفاوت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

''لا یجوز بیع الجید بالردی فیما فیہ الربوا إلا مثلا بمثل لاہدار التفاوت فی الوصف'' (ہدایہ کتاب البیوع باب الربوا ۳/ ۷۹)۔

(عمدہ کی بیع ردی کے ذریعہ جائز نہیں ہے، اموال ربویہ میں مگر یہ کہ برابر سرابر ہو وصف میں فرق کے باطل ہونے کی وجہ سے) یہی رائی علامہ علاء الدین حصکفی کی ہے۔

''وجید مال الربو وردیئہ سواء'' (الدر المختار ۴/ ۱۸۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ سونا کا پرانا زیور زیادہ وزن کا لیا جائے اور سونے کا نیا زیور کم وزن میں بدلہ کیا جائے تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

۴-قبضہ کی حقیقت:

قبضہ کا مفہوم یہ ہے کہ بائع شئی مبیع کو اپنے مال سے اس طرح الگ کر کے رکھ دے کہ خریدار جب چاہے اپنی چیز اپنی مرضی سے اٹھا کر لے جانے میں اس پر کوئی پابندی یا رکاوٹ درپیش نہ ہو۔

''ولا یشترط بالبراجم لأن معنی القبض ھو التمکین والتخلی وارتفاع الموانع عرفا وعادۃ حقیقۃ'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۴۲)۔

اور صاحب درمختار قبضہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ مبیع اور مشتری کے درمیان ایسا تخلیہ جس سے قبضہ پر قدرت ہو جائے اور کوئی چیز رکاوٹ نہ ہو تو یہ تخلیہ قبضہ متصور ہوگا۔

'' ثم التسلیم یکون بالتخلیۃ علی وجہ یتمکن من القبض بلا مانع وحائل'' (الدر المختار علی صدر ردالمحتار ۷/ ۹۴)۔

پھر یہ تخلیہ مبیع کی حالت وکیفیت کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے جو درج ذیل ہے۔

۱- کیلی اشیاء، مثلاً دودھ، تیل، گھی، مکھن وغیرہ کیل کر کے الگ کردینے سے مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا۔

۲- وزنی اشیاء مثلاً سونا، چاندی، دھات، پیتل، دال، چاول وغیرہ وزن کر کے الگ کردینے سے مشتری کا قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

۳- زرعی زمین اور پیمائشی اشیاء مثلاً کپڑا وغیرہ جو پیمائش سے فروخت کیا جاتا ہے پیمائش کر کے الگ کردینے سے مشتری کا قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

۴- عددی اشیاء: مثلاً انڈا، جانور، گاڑی وغیرہ شمار کر کے الگ کردینے سے مشتری کا قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

(ردالمحتار ۷/ ۹۶ وبدائع الصنائع ۴/ ۳۴۲)۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ مبیع اور مشتری کے درمیان ایسا تخلیہ جس سے قبضہ پر قدرت ہو جائے اور کوئی چیز حائل نہ ہو تو ایسا تخلیہ قبضہ سمجھا جائے گا نیز کتاب وسنت میں قبضہ کی کوئی خاص صورت ونوعیت متعین نہیں ہے اور اصول یہ ہے کہ جن چیزوں کی شریعت اور لغت میں مخصوص تحدید نہ ہو وہ عرف و عادت پر محمول ہوگی۔ ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے:

'' کل ما ورد بہ الشرع مطلقا ولا ضابط لہ منہ ولا فی اللغۃ یرجع فیہ إلی العرف ومثلوہ بالحرز فی السرقۃ والتفرق فی البیع والقبض'' (ص: ۱۹۶)۔

لہٰذا اتمام خریدار کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہے تو اس کو خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا اسی طرح ہر خریدار کا سکہ الگ سے کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام اندراج کرنے سے قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، ہاں البتہ اگر خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو جس پر مشتری اپنی

مرضی اور سہولت سے بلا رکاوٹ قبضہ کرسکتا ہو تو اس اندراج کو قبضہ کے لئے کافی سمجھا جائے گا۔

۵-ادھار کی بیع ادھار سے جائز نہیں ہے۔

''عن ابن عمر أن النبی ﷺ نهی عن بیع الکالی بالکالی'' (مشکوٰۃ ۲۴۸ باب المنهی عنها وهکذا مظاهر حق جدید ۲/ ۵۰۴)۔

(حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ادھار کو ادھار کے ساتھ بیچنے سے منع فرمایا ہے)، آج سرمایہ دارانہ نظام کے اندر جو مفاسد پائے جاتے ہیں، وہ بیع قبل القبض کی دین ہے۔

لہٰذا ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی مروج ایسی صورت جس میں نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے اور نہ بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے، بس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے اس کا لین دین کر لیتے ہیں، جس میں نہ تو خریدار مبیع پر قبضہ کرتا ہے اور نہ ہی بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے، گویا مبیع وثمن دونوں ادھار ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔

۶- احتکار لغت میں غلہ کو گراں فروشی کے ارادہ سے روکے رکھنا ہے، اس کا اسم حکرہ ہے (موسوعہ فقہیہ ۲/ ۹۴)۔

ائمہ کرام نے بایں طور اس کی تعریف کی ہے:

۱- حنفیہ نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ غلہ اور اس جیسی ضروریات زندگی خرید کر گراں فروشی کے زمانہ تک روکے رکھنا ہے۔

۲- مالکیہ نے احتکار کی یہ تعریف کی ہے کہ مارکیٹ میں قیمتوں کے بڑھنے کے انتظار میں روکے رکھنا۔

۳- شافعیہ نے احتکار کی یہ تعریف کی ہے کہ گرانی کے زمانہ میں غذائیں خریدنا اور اسے روکے رکھنا قیمت کے بڑھنے پر بیچنا۔

جمہور فقہاء نے ذخیرہ اندوزی کے سلسلہ میں غلہ کی صراحت کی ہے، اس کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جس میں احتکار کی ممانعت غلہ کے ساتھ صراحتاً ہے۔

ابن ماجہ میں: ''عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ یقول: ''من احتکر علی المسلمین طعامهم ضرب الله بالجذام والإفلاس'' (ابن ماجه وفی القدیر ۶/ ۳۵)۔

(حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص مسلمانوں سے اس کا غلہ اسٹاک کرے اللہ تعالیٰ اسے جذام اور تنگی وافلاس میں مبتلا کرے گا)، اس طرح کی بہت ساری حدیثیں ممانعت کی موجود ہیں۔

مالکیہ اور امام ابو یوسفؒ کا استدلال ان روایات سے ہے جس میں مطلقاً احتکار کی ممانعت ہے اور احتکار کرنے والوں کو ملعون اور خاطی کہا گیا ہے۔

''قال رسول الله ﷺ من احتکر فهو خاطی'' (صحیح مسلم ۲/ ۳۱)۔

جمہور فقہاء کرام کا قول راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے جب کسی مسئلہ نصوص مختلف ہوں ایک خاص اور دوسرا عام تو ایسی صورت میں عام کو خاص پر محمول کیا جائے گا۔ اور مطلق کو مقید پر، ''موسوعہ فقہیہ'' میں ہے:

''وإذا اجتمعت نصوص عامة وأخری خاصة فی مسألة واحدة حمل العام علی الخاص والمطلق علی المقید''

(الموسوعة الفقهیة)۔

مسلم شریف کی شرح نووی میں بالتصریح ہے کہ ذخیرہ اندوزی صرف غذائی اجناس کے ساتھ مخصوص ہے اس کے علاوہ دیگر چیزوں میں ممنوع نہیں ہے۔

''قال أصحابنا الاحتکار المحرم هو الاحتکار فی الأقوات خاصة وهو أن یشتری الطعام فی وقت الغلاء للتجارة ولا یبیعه فی الحال بل یدخره لیغلو ثمنه ... وأما غیر الأقوات فلا یحرم الاحتکار فیه لکل حال'' (نووی، شرح مسلم شریف ۲/ ۳۱)۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے پتہ چلا کہ گراں فروشی کی نیت سے سونے کی ذخیرہ اندوزی عند الشرع جائز ہے، یہ احتکار کے دائرہ سے خارج ہے، گرچہ گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی واقع ہوتا ہو، جیسا کہ شامی میں ہے:

''ولا يكون محتكرا بحبس غلة أرضه بلا خلاف'' (الدر المختار على صدر رد المحتار ۹/ ۵۷)۔

۷- ہر شخص کو حلال وطیب روپے سے ضرورت کی چیزیں خریدنے کا شریعت نے اختیار دیا ہے، ردالمحتار میں ہے:

''لا يمنع أحد من التصرف في ملكه أبدا'' (۵/ ۴۴۸)۔

لہذا اسمگلنگ شرعا جائز ودرست ہے البتہ چونکہ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی ہے اور جب تک حکومت معصیت کا قانون عائد نہ کرے اس کی پابندی ضروری ہے، تاکہ ہتک عزت کے مرتکب نہ ہو بنا بریں اسمگلنگ نہ کرنا بہتر ہے۔

''كل من يسكن دولته فإنه يلتزم قولا أو عملا بانه يتبع قوانينها وحينئذ يجب عليه اتباع أحكامها''

(في بحوث قضايا فقهية معاصرة/ ص ۱۴۶)۔

۸- سونا اور چاندی کو اللہ نے ثمن بننے ہی کے لئے پیدا کیا ہے جبکہ اس کے علاوہ دھات مثلا پلاٹین، جیسے سفید سونا کہا جاتا ہو تو اسے ثمنیت اعتباریہ مانتے ہوئے سونے کے احکام جاری ہوں گے یعنی تفاضل حرام ہوگا، اور نسیہ بھی حرام ہوگا، چنانچہ ''الثابت بالعرف كالثابت بالنص، العادة محكمة'' اصول کے تحت حقیقی سونے کے حکم میں نہ ہو کر ثمنیت اعتباریہ سمجھا جائے گا اور ہیرے جواہرات کی طرح اس پر بھی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

''لا زكوة في اللآلي والجواهر'' (رد المحتار قبيل باب السائمة ۲/ ۱۴)۔



سونا چاندی کی تجارت کے جدید مسائل

مفتی محمد روح اللہ قاسمی [1]

یہاں بنیادی طور پر یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ربا کا حکم اشیاء ستہ کے ساتھ خاص ہے یا اس کے علاوہ میں بھی متعدی ہے؟ اس سلسلے میں علماء کی دو جماعتیں ہیں: ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ حکم اشیاء ستہ کے ساتھ خاص ہے، لہذا اس کے علاوہ چیزوں میں ربا جاری نہیں ہوگا، مفتی تقی عثانی صاحب نے ''المغنی لابن قدامہ'' اور ''عمدۃ القاری'' وغیرہ کے حوالہ سے طاؤس، قتادہ، داؤد ظاہری، مسروق اور عثمان بتی وغیرہم کا یہی موقف ذکر کیا ہے۔

(دیکھئے: تکملہ فتح الملہم، المساقاۃ ۵۳۹/۱)۔

جبکہ جمہور کا کہنا ہے کہ یہ حکم حدیث پاک میں ذکر ان اشیاء کے ساتھ خاص نہیں؛ بلکہ اس کے علاوہ دیگر اشیاء کی طرف بھی متعدی ہے، چنانچہ احناف نے اس کی علت کے بارے میں غور کیا کہ ایک تو جنس کا جنس سے تبادلہ ہے اور دوسرے دو طرح کی چیزوں کا اس میں تذکرہ ہے، سونا چاندی موزونی اشیاء کے قبیل سے ہے، بقیہ چار اشیاء مکیلی ہیں؛ اس لئے احناف کے نزدیک ربا کی علت سونا چاندی میں وزن مع الجنس اور اشیاء اربعہ میں کیل مع الجنس قرار پائی اور طے پایا کہ ہر مکیلی یا موزونی چیز (جسے اصطلاح میں قدر سے تعبیر کیا جاتا ہے) اموال ربویہ میں داخل ہے، اگر اس میں جنس کا جنس سے تبادلہ ہو تو زیادتی اور ادھار دونوں حرام ہے اور اگر دونوں میں سے ایک علت پائی جائے تو زیادتی جائز ہے اور ادھار حرام، اس طرح اس مسئلہ کی چار شکلیں بنتی ہیں:

الف- جنس وقدر دونوں کا اتحاد ہو، مثلاً سونے کا سونے سے تبادلہ، اس صورت میں زیادتی اور ادھار دونوں حرام ہوگا۔

ب- اتحاد قدر ہو، اتحاد جنس نہ ہو، مثلاً گیہوں کا تبادلہ جَو سے ہو، اس صورت میں زیادتی جائز ہے؛ مگر نسیئۃ حرام ہے۔

ج- اتحاد جنس ہو، اتحاد قدر نہ ہو، جیسے حیوان کا تبادلہ حیوان سے ہو، اس صورت میں بھی زیادتی جائز ہے؛ مگر ادھار حرام ہے، مثلاً ایک بکری کی بیع دو بکری سے نقد کی شرط کے ساتھ جائز ہے۔

د- جنس وقدر دونوں معدوم ہوں، مثلاً دو سیب کا تبادلہ ایک انڈے سے ہو یا اس کے برعکس، اس صورت میں زیادتی اور ادھار دونوں جائز ہے۔

۱- کاغذی روپیوں سے سونا چاندی کی خریداری بیع صرف نہیں ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ ربا کی علت احناف کے یہاں جنس وقدر کا اتحاد ہے اور جب کسی چیز کی بیع میں یہ دونوں علت پائی جائے تو مساوات کے ساتھ نقد معاملہ کرنا ضروری ہوگا۔ سونا چاندی کے آپس میں لین دین میں ربا کی دونوں علت یا ایک کا وجود ہوتا ہے؛ اس لئے اس تبادلہ میں اس معاملہ کی نزاکت کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اگر سونا کا سونے سے یا چاندی کا چاندی سے تبادلہ ہو تو جنس وقدر دونوں کے پائے جانے کی وجہ سے مساوات اور نقد معاملہ ضروری ہوتا ہے۔ اور اگر خلاف جنس معاملہ ہو تو ایک علت کے پائے جانے کی وجہ سے تفاضل جائز اور ادھار حرام ہوتا ہے۔ اس معاملہ کو ''بیع صرف'' کہتے ہیں۔ البتہ جب نوٹ سے سونا چاندی کا تبادلہ ہو رہا ہو تو یہ نزاکت موجود ہوگی یا نہیں؟ اس کے لئے پہلے خود بیع صرف اور نوٹ کی حقیقت کا واضح ہونا ضروری ہے۔

بیع صرف کی تعریف میں فقہاء کے یہاں جو تعبیرات ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف خلقی ثمن یعنی سونا چاندی کا آپس میں لین دین ''بیع

---

[1] مدرسہ فلاح المسلمین، مدھوبنی، بہار۔

صرف'' کہلاتا ہے۔ چنانچہ علامہ کاسانی نے بیع صرف کی یہ تعریف کی ہے:

''اسم لبیع الأثمان المطلقة بعضها من بعض وهو بیع الذهب بالذهب والفضة بالفضة وأحد الجنسین بالآخر'' (بدائع، کتاب البیوع، الصرف وتفسیرہ ۴/ ۴۵۳)۔

''مجلة الاحکام العدلیة'' میں ہے: ''الصرف بیع النقد بالنقد'' (مادہ ۱۲۱)۔ اور اس کی شرح ''درر الحکام'' میں ہے: ''یعنی ان بیع الصرف ہو بیع الذهب المسکوك أو غیر المسکوك بذهب أو فضة والفضة بذهب أو مثلها فضة'' (الشاملة، درر)۔

''الجوہرة النیرة'' میں ہے: '' الصرف اسم لعقود ثلاثة بیع الذهب بالذهب والفضة بالفضة وأحدهما بالآخر'' (کتاب البیوع، باب الصرف ۱/ ۲۶۹)۔

''شامی'' کی عبارت ہے: ''(بیع الثمن بالثمن) أی ما خلق للثمنیة'' (ردالمحتار، البیوع، الصرف ۴/ ۲۲۴ نعمانی، مزید دیکھئے: موسوعہ فقهیه کویت، مادہ: صرف، رقم: ۱)۔

ان تمام عبارتوں کا حاصل یہی ہے کہ ''بیع صرف'' خلقی ثمن یعنی سونا چاندی کے آپس کے تبادلہ کا نام ہے، یعنی یا تو سونے کا سونے سے تبادلہ ہو یا چاندی کا چاندی سے یا سونے کا چاندی سے، خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو۔ کیونکہ ان تعبیرات میں فقہاء نے جہاں یہ لکھا ہے کہ نقد و ثمنیت سے مراد وہ ہے جو خلقی طور پر ثمنیت کے لئے ہے، وہیں اس کے تبادلہ کی محض تین شکلیں بتائیں ہیں، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ''بیع صرف'' ثمن خلقی کے آپس میں تبادلہ کا نام ہے، چنانچہ فلوس کے آپس میں تبادلہ کو بیع صرف نہیں مانا جاتا جبکہ یہ بھی باتفاق ثمن ہے گو اصطلاحی ہی سہی۔ اسی طرح غالب الغش سکوں سے سونے چاندی کی خریداری صرف نہیں کہلاتی جبکہ اس میں کچھ نہ کچھ سونا یا چاندی موجود ہوتا ہے۔

اس مسئلہ میں اگرچہ عرب علماء کا اختلاف ہے۔ ان کے یہاں ثمن خلقی کا رواج ختم ہوجانے کے بعد ثمن اصطلاحی نے اس کی جگہ لے لی ہے، لہٰذا ثمن خلقی کے تمام احکام اس پر منطبق ہوں گے، چنانچہ اس میں زکوۃ کا وجوب ہوگا، اس کے ذریعہ زکوۃ کی ادائیگی ہوگی، ربا کا اس میں تحقق ہوگا اور بیع صرف کے احکام بھی اس پر جاری ہوں گے۔ پس اگر نوٹ کا تبادلہ نوٹ سے ہوتا ہے تو یداً بید اور سواء بسواء ضروری ہوگا، تفاضل و نسیئۃ دونوں حرام ہوں گے۔ چنانچہ ''مجمع الفقہ الاسلامی جدہ'' نے اپنے تیسرے اور پانچویں سیمینار کے فیصلے میں اسی کو منظور کیا ہے کہ ''کاغذی نوٹ اعتباری نوٹ ہیں اور مکمل طور ثمن کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا اسود، سلم، زکاۃ اور دیگر تمام احکام کے سلسلہ میں سونے چاندی ہی کے سارے احکام ان پر بھی جاری ہوں گے'' (فقہ اکیڈمی جدہ کے فیصلے/ص ۱۰۸)۔

لیکن عام طور سے برصغیر ہند و پاک میں ثمن اصطلاحی کے باہم تبادلہ کو بیع صرف نہیں کہا جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ ایک ملک کی کرنسی کے باہم تبادلہ میں امام محمدؒ کا قول اختیار کرتے ہوئے تفاضل و نسیئۃ دونوں حرام ہوتا ہے جیسا کہ فلوس میں یہ حکم ہے کہ امام محمدؒ کے نزدیک فلوس کے آپس میں تبادلہ کے وقت تفاضل و نسیئۃ جائز نہیں ہوتا ہے چاہے وہ متعین ہوں یا غیر متعین۔ اس اختلاف کا ثمرہ یہاں ظاہر ہوگا کہ دو الگ ملکوں کی کرنسی کے تبادلہ کے وقت پہلے قول کے مطابق نسیئۃ جائز نہیں ہوگا جبکہ اس قول کے مطابق جائز ہوگا جبکہ احد البدلین پر قبضہ ہوجائے تاکہ افتراق عن دین بدین لازم نہیں آئے۔ (فقہ البیوع ۲/ ۷۳۹)۔

دوسری طرف نوٹ اور کاغذی روپیوں کی صورتحال یہ ہے کہ اس پر مختلف ادوار گذرے ہیں۔ کبھی اس کی حیثیت ثمن کی نہیں تھی، بلکہ ثمن کے لئے اسے وثیقہ اور سند مانا جاتا تھا اور اس وقت یہ اس خلقی ثمن کی نمائندگی کرتا تھا جس کی مقدار اس نوٹ پر درج ہوتی تھی۔ اس لئے اس وقت فقہاء نوٹ سے سونے چاندی کے تبادلہ میں کمی بیشی کو ناجائز کہتے تھے اور اس معاملہ کو بیع صرف مانا جاتا تھا؛ کیونکہ ایک طرف خلقی ثمن ہوتا اور دوسری طرف اس کی سند ہوا کرتی تھی۔ مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے: ''نوٹ کا چاندی کے روپیے سے تبادلہ کرنے میں کمی بیشی کرنا ناجائز ہے'' (کفایت المفتی ۸/ ۱۱۱)۔

ظاہر ہے کہ یہ اس وقت کی بات تھی جب نوٹ کی حیثیت وثیقہ کی تھی۔ لیکن اب کاغذی نوٹوں کی شرعی حیثیت پر تقریباً علماء کرام کا اتفاق ہوچکا ہے کہ وہ اصطلاحی ثمن ہے، بطور وثیقہ و سند اب کسی ثمن کی نمائندگی نہیں کرتا اور اس کے پشت پر کوئی سونا وغیرہ نہیں ہے؛ بلکہ وہ خود اصلی حیثیت کا مالک ہے، اسے زر قانونی کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے، یعنی قانونی طور پر اسے لینے پر مجبور کیا جائیگا یہ اور بات ہے کہ اس کا اختیار حکومت وقت کو ہے کہ جب

چاہے اس کی اس حیثیت عرفی کے خاتمہ کا اعلان کردے۔ اس تعلق سے خود فقہ اکیڈمی کے دوسرے سیمینار میں کرنسی نوٹ کے متعلق فیصلہ میں موجود ہے کہ "کرنسی نوٹ سند وحوالہ نہیں بلکہ ثمن ہے اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی کی حیثیت زر اصطلاحی وقانونی کی ہے"۔

زر قانونی کی حیثیت پالینے کے بعد کیا اس سے سونے چاندی کا تبادلہ بیع صرف کہلائیگا یا نہیں؟ اور اگر یہ معاملہ بیع صرف نہیں بھی کہلائے تو کیا نوٹ کی حیثیت ثمن خلقی کی ہوگی اور اس کے سونے چاندی سے تبادلہ کے وقت تماثل ضروری ہوگا یا دونوں دو الگ الگ جنس ہونگے اور اس پر فلوس کے احکام جاری ہوکر تفاضل ونسیئہ کی اجازت ہوگی؟۔

جہاں تک بیع صرف کا معاملہ ہے تو یہ بات آچکی ہے کہ بیع صرف کا اطلاق صرف اس بیع پر ہوتا ہے جس میں دونوں طرف سے ثمن خلقی ہو۔ اگر ثمن اصطلاحی کا آپس میں تبادلہ ہو یا کسی ایک طرف ثمن خلقی نہ ہو تو اسے بیع صرف نہیں کہیں گے، لہذا نوٹ سے سونے چاندی کے تبادلہ پر یہ تعریف صادق نہیں آتی ہے اس لئے اسے بیع صرف نہیں کہا جائے گا۔

نیز جیسا کہ گذرا کہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ غالب الغش سکوں سے سونے چاندی کی خریداری صرف نہیں کہلاتی جبکہ اس میں کچھ نہ کچھ سونا یا چاندی موجود ہوتا ہے اس لئے صرف اسی کے وزن کی حد تک اس میں قبضہ ضروری ہوتا ہے تو پھر کرنسی نوٹوں کے تبادلہ کو کلی طور پر صرف کیسے کہا جائے گا جبکہ اس میں سونا چاندی بالکل بھی موجود نہیں ہے (دیکھئے: فتاوی عثمانی ۳/۱۴۳)۔

اس کے علاوہ نوٹ ثمن اعتباری ہے، ثمن خلقی نہیں جو بنسبت سونا چاندی کے فلوس نافقہ سے زیادہ مشابہ ہے کیونکہ یہ بھی ثمن اعتباری واصطلاحی ہے لہذا اسے فلوس نافقہ پر قیاس کیا جائے گا اور فلوس سے سونا چاندی کی بیع "بیع صرف" نہیں کہلاتی ہے۔

فلوس کا حکم:۔ فلوس سونا چاندی کے علاوہ دوسری دھات مثلاً لوہا پیتل وغیرہ سے بنائے گئے سکوں کو کہا جاتا ہے۔ احناف کے نزدیک اگر فلوس کا فلوس سے تبادلہ ہو اور وہ غیر متعین ہو خواہ دونوں یا کوئی ایک تو یہ صورت جائز نہیں ہے؛ علامہ کاسانیؒ اس کی علت بیان کرتے ہیں:

"لأن الفلس في هذه الحالة لا يخلو من أن يكون من العروض أو من الأثمان فإن كان من العروض فالتعيين في العروض شرط الجواز ولم يوجد وإن كان من الأثمان فالمساواة فيها شرط الجواز ولم يوجد" (بدائع ۴/۴۸۸ زکریا)

(یعنی اس صورت میں فلوس یا تو عروض کی قبیل سے مانے جائیں گے یا اثمان کی قبیل سے، اگر عروض کی قبیل سے ہے تو عروض کی تعیین عقد کے جواز کی شرط ہے اور اگر اثمان کی قبیل سے ہے تو اس میں مساوات شرط ہے اور یہ دونوں ندارد ہیں)۔

اور اگر فلوس متعین ہوں تو اس صورت میں حضرات شیخین اور امام محمدؒ کا اختلاف بہت مشہور ہے۔ حضرات شیخین کے نزدیک اگر فلوس کا فلوس سے تبادلہ ہو اور وہ متعین ہوں تو یہ معاملہ تفاضل کے ساتھ بھی جائز ہے، البتہ ادھار حرام ہوگا۔ ادھار کے حرام ہونے کی وجہ تو اتحاد جنس ہے، اور تفاضل کے جائز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ فلوس کا ثمن ہونا اصطلاح ناس کی بنیاد پر ہوا ہے۔ عرف عام نے اسے بطور ثمن کے قبول کرلیا ورنہ اس کی ذاتی کوئی خاص حیثیت نہیں؛ لہذا اگر عاقدین اس کی ثمنیت کے ختم کرنے پر اتفاق کرلیتے ہیں تو انہیں اس کا اختیار ہوگا۔ پھر ثمنیت ختم ہوجانے کے بعد اس کی سابقہ قدری حیثیت عود نہیں کرتی کہ جس دھات سے وہ بنی ہے اس کا اعتبار کرکے اسے کیلی یا وزنی مانا جائے؛ کیونکہ سونا چاندی کے علاوہ کسی بھی چیز کے کیلی یا وزنی ہونے میں اس کے مادہ اور جوہر کا اعتبار نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ خود اس کی خرید وفروخت کس حیثیت سے ہے، اگر اس کا لین دین عدد کے حساب سے ہے تو وہ عددی ہے چاہے اس کی اصل کیلی یا وزنی ہو۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں: " بيع الأواني الصفرية وأحدا باثنين كبيع قمقمة بقمقمتين ونحو ذلك فإن كان مما يباع عددا يجوز ... وإن كان مما لا يباع وزنا لا يجوز" (البيوع ۴/۴۰۴، زکریا)

(کہ پیتل کے برتنوں کی ایک کے بدلے دو کی بیع جیسے ایک لوٹا کی بیع دو لوٹا کے بدلے، اگر یہ عدد سے بیچے جاتے ہیں تو جائز ہے اور اگر وزن سے بیچے جاتے ہیں تو جائز نہیں)۔

اس قاعدہ سے سونا چاندی مستثنیٰ ہے، کیونکہ ان دونوں کا موزونی ہونا منصوص علیہ ہے؛ لہذا کسی عرف وعادت کی بنیاد پر اس کی وزنی حیثیت ختم نہیں ہوسکتی؛ کیونکہ عرف نص کا مقابل نہیں ہوسکتا ہے۔

''لو باع إناء فضة بإناء فضة لا يجوز متفاضلا بخلاف ما إذا باع إناء مصوغا من نحاس بإناء من نحاس حيث يجوز متفاضلا مع أن النحاس بالنحاس متفاضلا لا يجوز؛ لأن الوزن منصوص عليه في الذهب و الفضة فلا يتغير فيه بالصناعة ولا يخرج عن أن يكون موزونا بالعادة لأن العادة لا تعارض النص'' (الجوہرۃ النیرۃ، باب الصرف: ۱/ ۲۶۹)

(اگر چاندی کے برتن کو چاندی کے برتن سے بیچے تو کمی زیادتی کے ساتھ جائز نہیں ہے، برخلاف اس کے کہ جب پیتل سے بنے برتن کو پیتل کے برتن سے بیچے تو تفاضل جائز ہے باوجودیکہ پیتل کا پیتل سے تبادلہ کمی زیادتی کے ساتھ جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ سونا چاندی میں وزن منصوص ہے، لہذا کاریگری کی وجہ سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور وہ عرف کی بنیاد پر وزنی ہونے سے خارج نہیں ہوگا، کیونکہ عرف نص کا مقابل نہیں ہوسکتا ہے)۔

پس اگر فلوس کی ثمنیت ختم کرلینے پر عاقدین کا اتفاق ہو بھی جاتا ہے تو اس کی عددی ہونے کا عرف باقی ہے۔ ''ولا يعود وزنيا لبقاء الاصطلاح على العدد'' (ہدایہ، البیوع، الربا، قولہ: يجوز بيع الفلس بالفلسين باعيانهما، نیز دیکھئے: موسوعہ فقہیہ اردو کویت ۲۶ / ۳۹۳)۔
لہذا جب عاقدین نے فلوس کی ثمنیت ختم کرلینے پر اتفاق کرلیا تو اب اس میں صرف ایک علت باقی رہ گئی یعنی جنس کا اتحاد؛ اس لئے تفاضل جائز ہوگا۔

امام محمدؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی تفاضل جائز نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اتفاق عام کی بنیاد پر فلوس کی ثمنیت ثابت ہوئی ہے؛ لہذا محض عاقدین کے اتفاق کرلینے کی سے عام اتفاق ختم نہیں ہوگا اور اس کی ثمنیت باقی رہے گی۔

اس اختلاف کے باوجود اس پر سب کا اتفاق ہے کہ فلوس کا آپس میں تبادلہ بیع صرف نہیں ہے، لہذا اس پر صرف کے احکام جاری نہیں ہونگے، البتہ علامہ کاسانیؒ کی صراحت کے مطابق فلوس کے آپس میں تبادلہ کے وقت تقابض ضروری ہے اور اس کے بغیر یہ معاملہ باطل ہے۔ ایسا اس لئے نہیں کہ یہ بیع صرف ہے؛ بلکہ اس لئے کہ اتحاد جنس کی وجہ سے نسیئہ حرام ہوتا ہے۔

''اگر فلوس متعینہ کا باہم تبادلہ ہو تو یہ متعین کرنے کے باوجود متعین نہیں ہونگے، البتہ مجلس میں قبضہ ضروری ہوگا اور بغیر قبضہ کے افتراق عین بالدین ہونے کی وجہ سے عقد باطل ہوگی۔ اور اگر احد البدلین پر قبضہ ہوجائے اور دوسرے پر قبضہ کے بغیر دونوں علیحدہ ہوجائیں تو امام کرخی کے بیان کے مطابق معاملہ باطل نہیں ہوگا؛ کیونکہ جانبین سے قبضہ کی شرط بیع صرف کی خصوصیت ہے اور یہ معاملہ صرف نہیں ہے، پس ایک جانب سے قبضہ کافی ہوگا؛ اس لئے کہ اس کی وجہ سے یہ افتراق دین بالدین سے نکل جاتا ہے۔ اور مختصر الطحاوی کی بعض شروح کے مطابق یہ معاملہ باطل ہے، اس وجہ سے نہیں کہ یہ بیع صرف ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ربا کی ایک علت یعنی جنس کا تحقق ہونے کی وجہ سے ادھار حرام ہے اور یہی صحیح ہے'' (بدائع ۴/ ۴۸۷، ۴۸۸)۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب فلوس کا فلوس سے تبادلہ ہو لیکن جب فلوس کا درہم یا دینار سے تبادلہ ہو تو احد بدلین پر قبضہ کافی ہوگا۔

''ولو لم يوجد القبض إلا من أحد الجانبين دون الأخر فافترقا مضى العقد على الصحة لأن المقبوض صار عينا بالقبض فكان افتراقا عن عين بدين'' (بدائع ۴/ ۴۸۷)۔

اسی طرح بدائع میں ہے: ''منها ما يشترط فيه التقابض وهو القبض من الجانبين وهو الصرف ... ومنها ما يشترط فيه القبض من أحد الجانبين كبيع الدراهم بالفلوس'' (بدائع ۴/ ۴۸۸)۔

الغرض جب فلوس کی صورتحال یہ ہے کہ بالاتفاق اس میں بیع صرف جاری نہیں ہوتی ہے، نہ آپس میں تبادلہ کے وقت، نہ ہی سونا چاندی سے تبادلہ کے وقت، تو یہی حکم کرنسی نوٹوں کا بھی ہوگا کہ سونا چاندی سے اس کا تبادلہ بیع صرف نہیں کہلائے گا، کیونکہ کرنسی نوٹ سونا چاندی کے مقابلہ میں فلوس سے زیادہ مشابہ ہیں اس لئے کہ یہ دونوں ثمن اعتباری ہیں۔ مفتی محمود صاحب گنگوہی تحریر فرماتے ہیں: آج کل روپئے (نوٹ) یا سکہ رائج الوقت سے چاندی سونا اگر خریدا جائے تو یہ بیع صرف نہیں جس میں برابری اور تقابض فی المجلس (ہاتھ در ہاتھ ہونا) ضروری ہو (فتاویٰ محمودیہ ۲۳/ ۵۳۹)۔

روپئے سے سونا چاندی کے تبادلہ کے وقت روپے کی حیثیت:

البتہ یہ اہم مسئلہ ہے کہ جب نوٹوں سے سونا چاندی کا تبادلہ بیع صرف نہیں ہے تو یہ معاملہ فقہاء کے یہاں بیان کردہ بیع کی اقسام اربعہ میں سے کس زمرہ میں آئے گا۔ فقہاء نے بدلین کے اعتبار سے بیع کی چار قسمیں بتائی ہیں۔ علامہ کاسائی فرماتے ہیں: (بدلین کے اعتبار سے بیع چار قسم ہے۔ بیع العین بالعین یعنی سامان سے سامان کی بیع، اور اسے بیع مقایضہ کہتے ہیں۔ بیع الدین بالعین اور یہ ثمن مطلق یعنی سونا چاندی سے یا رائج سکوں سے یا ذمہ میں واجب مکیلی یا موزونی یا عددی متقارب اشیاء سے سامانوں کی بیع۔ بیع الدین بالعین اور یہ بیع سلم ہے، اور بیع الدین بالدین اور یہ بیع صرف ہے)(بدائع الصنائع ۴/۳۲۰)۔

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ اول الذکر اور ثالث ورابع قسم میں سے نہیں ہوسکتا ہے۔ بیع العین بالعین اور بیع الدین بالدین میں اس کا نہ ہونا واضح ہے، بیع الدین بالعین میں بھی نہیں ہے کیونکہ یہ معاملہ "سلم" کہلاتا ہے جس میں مسلم فیہ یعنی مبیع دین ہوا کرتی ہے اور رأس المال یعنی ثمن عین ہوتا ہے۔

"فان المسلم فيه مبيع وهو دين ورأس المال قد يكون عينا وقد يكون دينا ولكن قبضه شرط قبل افتراق العاقدين بانفسهما فيصير عينا" (الشاملة/ تحفة الفقهاء/ البيوع/ السلم)۔

لامحالہ یہ معاملہ بیع العین بالدین کے قبیل سے ہی مانا جائے گا جس میں بیع مقایضہ، سلم اور صرف کے علاوہ دیگر معاملات داخل ہوتے ہیں اور ماننا پڑیگا کہ ان میں کوئی ایک مبیع اور دوسرا ثمن ہے۔

ثمنیت کی شان نوٹ کے مقابلہ میں سونا چاندی میں زیادہ قوی ہے؛ کیونکہ وہ خلقی طور پر ثمنیت کا حامل ہے اور اس کی ثمنیت باطل نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ بحیثیت ثمن حنفیہ کے نزدیک مال کی چار قسمیں ہیں۔ پہلا وہ مال جو ہر حال میں ثمن ہو اور وہ خلقی نقود یعنی سونے و چاندی ہیں خواہ اس پر حرف با داخل ہو یا نہ ہو خواہ اس کا تبادلہ ہم جنس سے ہو یا غیر جنس سے (موسوعہ اردو ۱۵/۵۶)۔

"ثم الدراهم والدنانير عندنا أثمان على كل حال أي شئ كان في مقابلتها وسواء دخله حرف الباء فيهما أو فيما يقابلهما لأنهما لاتتعين بالتعيين بحال فكانت أثمانا على كل حال" (بدائع/ البيوع۴/ ۴۸۳)۔

(پھر دنانیر ودراہم ہمارے نزدیک ہر حال میں ثمن ہے خواہ جو بھی اس کے مقابلہ میں ہو خواہ حرف با اس پر داخل ہو یا اس کے مقابل پر؛ اس لئے کہ یہ دونوں کسی حال میں متعین نہیں ہوتے پس ہر حال میں ثمن ہی رہیں گے۔

جبکہ نوٹ اصطلاح وعرف کی بناء پر ثمن بنا ہے، اگر عرف ختم ہوجائے تو اس کی ذاتی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے جیسا کہ ابھی اپنے ملک میں ہوا کہ حکومت وقت نے پانچ سو اور ایک ہزار روپیہ کی ثمنیت کے خاتمہ کا اعلان کردیا، اب اس کی حیثیت صرف کاغذ کے ایک ٹکڑے کی ہے، جب صورتحال یہ ہے کہ سونا چاندی کی ثمنیت اصلی اور خلقی ہے، کسی کے ختم کرنے سے اس کی ثمنیت باطل نہیں ہوسکتی ہے جبکہ نوٹوں کی ثمنیت غیر اصلی ہے تو اس عقد میں جبکہ کاغذی نوٹوں سے سونے یا چاندی کا تبادلہ ہو، سونے چاندی کو ثمن اور کاغذی نوٹ کو مبیع مانا جائیگا۔ اس کی تصریح مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے قاموس الفقہ میں کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں: اگر کرنسی کا تبادلہ سونے چاندی سے ہو تو کرنسی کی حیثیت سامان کی ہوجائیگی اور سونا چاندی اصل زر متصور ہوگا کیونکہ خلقی ثمن میں ثمنیت اور زر بننے کی صلاحیت زیادہ ہے اور اصطلاحی اور رواجی ثمن اس سے کمتر درجہ کی حامل ہے۔ (قاموس الفقہ ۴/۲۲۶)۔ الغرض کاغذی نوٹ سے سونا چاندی کا تبادلہ بیع صرف کی قبیل سے نہیں ہے، نیز اس تبادلہ میں سونا چاندی کی حیثیت ثمن کی اور کاغذی نوٹ کی حیثیت مبیع کی ہوگی۔

(الف)۔ کیا یہ بات درست ہے کہ سونا چاندی اور نوٹ میں ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار؟ اس کے لئے اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ دونوں کی جنس ایک ہے یا الگ الگ؟۔ ظاہر ہے کہ ثمنیت میں دونوں کے اشتراک کے باوجود اس معنی کر دونوں الگ الگ ہیں کہ ایک کی ثمنیت خلقی ہے اور دوسرے کی اعتباری واصطلاحی۔ لیکن کیا اس کی وجہ دونوں دو الگ الگ جنس شمار کئے جائیں گے؟ اس کیلئے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کا جنس کا اختلاف کن باتوں سے متحقق ہوتا ہے؟۔

جنس کا اختلاف درج ذیل امور سے متحقق ہوجاتا ہے۔

دونوں نام اور حقیقت و ماہیت میں الگ الگ ہو اگر چہ دونوں کا مقصود ایک ہو، جیسے گیہوں اور جو۔

دونوں کی اصل الگ الگ ہو اگر چہ دونوں ایک نام سے جانے جاتے ہوں، جیسے انگور اور کھجور کا سرکہ کہ دونوں ہم نام ہے؛ مگر دونوں کی اصل الگ الگ ہے۔

دونوں میں مقاصد کا اختلاف ہو، جیسے شعر معز اور صوف ضان میں، کہ معز وضان کے گوشت اگر چہ جنس واحد شمار ہوتے ہیں؛ مگر دونوں کے بال کے مقاصد الگ الگ ہیں، اسی طرح لحم وشحم دو جنس ہے۔

''فصار ما یوجب اختلاف الامور المتفرعة ثلاثة اشیاء۔ اختلاف الاصول واختلاف المقاصد وزیادة الصنعة'' (فتح القدیر، البیوع، باب الربا/۷/۳۵)۔

اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے نوٹ اور سونے چاندی میں جنس کا اختلاف واضح ہوجاتا ہے، کیونکہ دونوں کی اصل اور ماہیت الگ ہے ہی، مقصود بھی الگ ہے، سونا چاندی کا مقصود جہاں زرمبادلہ وہیں تزین اور زینت بھی ہے جبکہ نوٹ میں یہ بات نہیں ہے۔

جب صورتحال یہ ہے کہ دونوں دو مختلف جنس ہیں تو اگر روپیوں سے سونا چاندی خریدا جائے تو ربا کی کوئی علت نہ پاجانے کی وجہ سے تفاضل ونسیئہ دونوں جائز ہوگا۔ یعنی اس تبادلہ میں باہمی رضامندی سے جس مقدار پر عاقدین راضی ہوجائیں، جائز ہوگا؛ کیونکہ دونوں الگ الگ جنس ہیں اور قدر کا اتحاد بھی نہیں ہے، کہ ایک وزنی ہے اور دوسرا عددی تو نسیئہ بھی جائز ہوگا (دیکھئے: فتاویٰ محمودیہ ۲۳/۵۳۹)

البتہ یہ ضروری ہے کہ احد البدلین پر قبضہ ہوجائے تاکہ افتراق عن دین بدین لازم نہ آئے۔ نیز نوٹ فلوس کے زیادہ مشابہ ہے اور فلوس سے سونا چاندی کے تبادلہ میں نقد وادھار دونوں جائز ہے، لہذا اس پر قیاس کرتے ہوئے اس صورت میں بھی نقد ادھار جائز ہوگا۔ علامہ کاسانی یہ مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہ اگر متعین درہم یا دینار سے متعین فلوس کا تبادلہ کرے تو یہ دراہم ودنانیر اور فلوس متعین نہیں ہوتے، البتہ عقد کے صحیح ہونے کے لئے مجلس میں قبضہ ضروری ہے، فرماتے ہیں:

''ولو لم یوجد القبض إلا من أحد الجانبین دون الاخر فافترقا مضی العقد علی الصحة لأن المقبوض صار عینا بالقبض فکان افتراقا عن عین بدین وانه جائز إذا لم یتضمن ربا النساء ولم یتضمن ھھنا لانعدام القدر المتفق والجنس'' (بدائع۴۶/ ۴۸۷)۔

(اور اگر صرف ایک جانب سے قبضہ ہوجائے تو عقد صحیح ہوجائے گا اس لئے کہ مقبوض قبضہ کی وجہ سے عین بن چکا پس یہ افتراق عین بالدین ہوا اور جب ربا نسیئہ نہ ہو تو یہ جائز ہے اور یہاں ربا نسیئہ موجود نہیں ہے کیونکہ قدر وجنس مفقود ہے)۔

''ثم فرق بین بیع الدراھم بالدراھم وبین بیع الفلوس بالدراھم أو الدنانیر حیث لم یشترط فی بیع الفلوس بالدراھم أو الدنانیر قبض البدلین قبل الإفتراق ویکتفی قبض أحد البدلین'' (ہندیہ، الصرف، الباب الاول قبیل الفصل الاول)۔

(پھر دراہم کے دراہم سے تبادلہ میں اور فلوس کے دراہم دنانیر سے تبادلہ میں فرق ہے کہ دوسری شکل میں افتراق سے پہلے بدلین پر قبضہ ضروری نہیں، احد البدلین پر قبضہ کافی ہے)۔

(ب) جب یہ بات طے ہوگئی کہ روپیوں سے سونا چاندی کی خرید وفروخت میں تفاضل نسیئہ دونوں جائز ہے اور اس سلسلے میں عاقدین جس ثمن پر راضی ہوجائیں معاملہ صحیح ہوگا تو حکومت کے متعین کردہ نرخ سے کمی زیادتی کرنے میں مسئلہ کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑیگا اور نرخ متعین کی مخالفت کرنے کے باوجود یہ عقد صحیح ہوگا اور زیادتی حلال ہوگی۔ مثلاً مارکیٹ میں دس گرام سونا کا دام دس ہزار طے ہے؛ لیکن عاقدین دس گرام سونا کو پانچ ہزار یا پندرہ ہزار میں خرید وفروخت پر راضی ہوجاتے ہیں تو اسے ربا نہیں کہیں گے اور یہ زیادتی اس کے لئے جائز ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت کے متعین کردہ قیمت کی خلاف ورزی میں اگر قانون شکنی کا خطرہ ہے تو ایسا کرنا ممنوع ہے۔

درحقیقت اس مسئلہ کا تعلق تسعیر سے ہے۔ تسعیر کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ یا اس کا نائب یا بازار کے ذمہ داران سامانوں کی متعینہ قیمت طے کردیں اور بازار والوں کو یہ ہدایت جاری کردیں کہ مقررہ قیمت سے زائد قیمت پر سامان فروخت نہ کریں۔ کمی بیشی پر بالکل پابندی لگادی جائے الا یہ کہ کوئی مصلحت سامنے آجائے۔

تسعیر بالاتفاق حرام ہے کیونکہ لوگوں کو اپنے اموال میں تصرف کرنے کے سلسلے میں شرعاً جو آزادی ہے، تسعیر کے ذریعہ اس کی آزادی ختم کرکے اس پر پابندی عائد کردی جاتی ہے، اس طرح جہاں معاملات کرنے میں عاقدین کی رضامندی ختم ہوجاتی ہے، وہیں تسعیر کے ذریعہ ایک فریق ظلم کا شکار ہوجاتا ہے، البتہ بعض مخصوص شرائط کے ساتھ اس کی اجازت بھی ہے۔

اس سے قطع نظر کہ کن حالات میں اور کن شرطوں کے ساتھ تسعیر کی اجازت ہے اور اس کے دائرے میں کیا کیا چیزیں آتی ہیں، اگر حکومت سامانوں کے دام طے کردے اور لوگوں کو اسی متعینہ قیمت میں بیع وشراء کا پابند بنادے تو بھی حنفیہ، حنابلہ اور شافعیہ کا اصح قول یہی ہے کہ جو شخص تسعیر کی مخالفت کرتے ہوئے عقد بیع کرے تو اس کی بیع درست ہے۔ اور اس کا یہ معاملہ سود کے زمرے میں نہیں آئیگا؛ اس لئے کہ کسی کو اپنی مملوکہ چیز کسی معین قیمت پر فروخت کرنے کا پابند بنانا مشروع نہیں ہے، البتہ قانون کی مخالفت کرکے اپنی جان وعزت کو خطرے میں ڈالنا شرعاً ممنوع ہے۔

"ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" (تفصیل دیکھئے: موسوعۃ فقہیہ کویت اردو/تسعیر)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب اسی طرح کے ایک مسئلہ کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: اگر اس (سرکاری طور پر مقرر کردہ) نرخ سے کم وبیش مقرر کیا جائے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ملک ایسا ہے جہاں سرکاری طور پر مقرر کردہ نرخ کی مخالفت قانوناً جائز نہیں ہے تو وہاں اس نرخ سے کمی بیشی کرنا سود تو نہیں ہوگا لیکن ملکی قوانین کی مخالفت اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنے کی بناء پر جائز نہیں ہوگا۔ (فتاوی عثمانی ۳/۱۴۸)

۲- سونا دیکر زیور بنانے کا معاملہ:

(الف)۔ جب زیور بنانے والے کاریگر نے زیور کے تاجروں سے ایک متعینہ مقدار میں سونا لیا اور کچھ دنوں میں زیور بنا کر اسی مقدار میں اسے واپس کیا ہے جتنی مقدار اس نے سونا لیا تھا تو اس معاملہ کو بیع تصور کیا جائے یا اجارہ بہرصورت یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہوگا۔

اگر اسے بیع تصور کرتے ہیں تو یہ سونے کا سونے سے تبادلہ ہے جس میں برابری اور نقد معاملہ ضروری ہوگا نیز زیور میں کاریگری کی بنیاد پر تفاضل کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں جمہور فقہاء کی رائے یہ موسوعہ میں یہ ہے:

"وجمهور الفقهاء على أنه لا اعتبار بالصياغة والصناعة أيضا فيدخل في إطلاق المساوات المصوغ بالمصوغ والتبر بالآنية۔ فعين الذهب والفضة وتبرهما ومضروبهما وغير المضروب منهما والصحيح منهما والمكسور كلها سواء في جواز بيعهما مع التماثل في المقدار وتحريمه مع التفاضل" (موسوعۃ/الصرف/شروط الصرف/انواع الصرف/رقم ۲۳)

(کہ مساوات میں ڈھلائی اور کاریگری کا بھی اعتبار نہیں، لہذا مطلق مساوات میں ڈھلے ہوئے کو ڈھلے ہوئے کے عوض اور تبر (جو ڈھلا ہوا نہ ہو) کو برتن کے عوض فروخت کرنا داخل ہے، لہذا بعینہ سونا چاندی، ان کے ڈلے، ڈھالے ہوئے اور بغیر ڈھلے ہوئے ان دونوں میں صحیح سالم اور ٹوٹے ہوئے مقدار میں برابری کے ساتھ ان کی بیع جائز ہونے اور کمی بیشی کے ساتھ حرام ہونے میں سب برابر ہے، حتی کہ اگر چاندی کے برتن کو چاندی کے عوض یا سونے کے برتن کو سونے کے عوض فروخت کرے جن میں سے ایک کا وزن دوسرے سے زیادہ ہو تو ناجائز ہے)۔

جہاں تک زیور میں دوسرے دھاتوں کی آمیزش کی وجہ سے وزن کی کمی کا تعلق ہے تو یہ درحقیقت خالص سونے کے اعتبار سے وزن کی کمی ہے لیکن تاجر کی طرف سے دیئے گئے سونا اور کاریگر کی طرف سے دیئے گئے زیور کا وزن برابر ہے اس طرح خالص سونے میں کمی کے باوجود یہاں مساوات موجود ہے، البتہ زیور میں دوسری دھات کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ یہ زیور مغلوب الغش سونے کے دائرہ میں آئے گا جو خالص سونا کے حکم میں ہوتا ہے، نیز تھوڑے بہت ملاوٹ سے کوئی زیور خالی نہیں ہوتا؛ کیونکہ زیور بنانے کے لئے اس کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، لہذا وہ معدوم کے درجہ میں ہوگا۔ علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''فإن كانت الفضة فيها هي الغالبة... فحكمها حكم الفضة الخالصة لا يجوز بيعها بالفضة الخالصة الا سواء بسواء ... لأن اعتبار الغالب والحاق المغلوب بالعدم هو الأصل في أحكام الشرع ولأن الدراهم الجياد لا تخلو عن قليل غش لأن الفضة لا تنطبع بدونه على ماقيل فكان قليل الغش مما لا يمكن التحرز عنه فكانت العبرة للغلبة'' (بدائع ۶/ ۴/ ۴۲۳، وكذا في الموسوعة، الصرف، انواع الصرف، النوع السادس، رقم: ۴۱)۔

(اگر زیور میں چاندی ہی غالب ہو......تو اس کا حکم خالص چاندی کا ہوگا کہ اس کی بیع خالص چاندی سے برابری کے علاوہ جائز نہیں ہوگی...... کیونکہ شریعت میں غالب کا اعتبار کرنا اور مغلوب کو معدوم ماننا ہی اصل ہے، نیز خالص اور عمدہ درہم بھی تھوڑے کھوٹ سے خالی نہیں ہوتے، کیونکہ اس کے بغیر وہ ڈھل نہیں سکتے، پس تھوڑے کھوٹ سے بچنا ممکن نہیں ہے، لہذا اعتبار غلبہ کا ہوگا)۔

الغرض جب زیور بنانے والے کاریگر اور زیور تاجر کے درمیان ہونے والے اس معاملہ کو بیع تصور کیا جائے تو یہ معاملہ بیع صرف کا ہوتا ہے جس میں مساوات اور نقد معاملہ ہونا ضروری ہے۔ یہاں کاریگر نے چونکہ اتنی مقدار کا زیور تاجر کے حوالہ کر دیا ہے جتنا اس نے لیا تھا اس طرح مساوات اور وزن میں برابری کا تحقق ہو گیا، لیکن ید ابید نہیں ہوسکا اور عاقدین کا ایک ہی مجلس میں قبضہ نہیں ہوا اس لئے یہ شکل ناجائز ہوگی۔

اور اگر اسے عقد اجارہ پر محمول کیا جائے اور زیور بنانے میں سونے کے جو ذرات بچے ہیں اسے کاریگر کی اجرت مان لی جائے تب بھی یہ معاملہ جائز نہیں ہوتا ہے؛ کیونکہ عقد اجارہ میں ضروری ہے کہ اجیر کی اجرت متعین ہو، اور عند العقد مستاجر اس کی ادئیگی پر قادر ہو، نیز اجرت اجیر کے عمل سے حاصل نہ ہوئی ہو۔ اور یہاں یہ باتیں موجود نہیں ہیں، کیونکہ اگر اس بچے ہوئے ذرات کو اجرت مانا جائے تو اس کی مقدار کا علم نہیں ہے کہ کیا ہوگا؟۔ کبھی ذرات زیادہ نکلیں گے اور کبھی کم، کہ زیور بنانے میں کسی خاص متعین مقدار سے ذرات نکالنا ممکن نہیں ہے، نیز یہ ذرات وقت عقد موجود نہیں ہیں اور اجیر کے عمل کے نتیجے میں حاصل ہو رہے ہیں پس یہ قفیز طحان کی شکل ہوگی اس لئے اجارہ فاسد ہوگا۔ قفیز طحان یہ ہے کہ کسی کو گندم پیسنے کے لئے دی جائے اور اسی گیہوں کے آٹا سے ایک کیلو یا کوئی متعین مقدار اجرت طے ہو۔ اس کی ممانعت ہے۔

''استأجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه او ثورا ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت في الكل لانه استأجره بجزء من عمله ـ والأصل في ذلك نهيه ﷺ عن قفيز الطحان ـ قوله بجزء من عمله: اى ببعض ما يخرج من عمله والقدرة على التسليم شرط وهو لا يقدر بنفسه'' (در مع الشامی، کتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة ۵/ ۳۶ نعمانی)۔

(ب) جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اسے عقد اجارہ مان کر بچے ہوئے ذرات کو اجرت نہیں مان سکتے کیونکہ یہ قفیز طحان کی شکل ہوتی ہے، البتہ اس بچے ہوئے ذرات کی مقدار کو عند العقد مطلقاً اجرت مقرر کرلیا جائے تو اسے اجرت بنانا درست ہوگا۔ جس کی شکل یہ ہے کہ سونا تاجروں کاریگروں کو اپنے تجربات کی روشنی میں اتنا اندازہ ہوگا کہ اس سونا کو زیور بنانے سے کتنی مقدار ذرات کے بچیں گے، لہذا اجرت میں سونے کی کوئی متعین مقدار طے کرلی جائے کہ مثلاً دوگرام یا تین گرام اس کی اجرت ہوگی پھر اگر سونے کی وہ مقدار اس بچے ہوئے ذرات سے پورے ہو جائیں تو فبہا ورنہ تاجر اتنی مقدار مکمل کرے۔

''فلو استأجر طحانا ليطحن له هذه الحنطة بقفيز من الدقيق ولم يقل بقفيز من ذلك الدقيق جاز له، لأنه لم يجعل الأجر من دقيق هذه الحنطة والقفيز معلوم'' (الشاملة، فتاوى قاضي خان)۔

یا یہ کہ یہ معاملہ دست بدست کرے اس طور پر کہ اگر کاریگر کے پاس پہلے سے تیار شدہ مطلوبہ معیار کے مطابق زیور موجود ہو تو اس سے تبادلہ کرلے یا پھر تاجر اس کاریگر کو پیشگی اپنے بیع کی اطلاع دیدیا کرے کہ وہ فلاں شکل وصورت اور وزن کا سامان اس سے خریدنا چاہتا ہے اور کاریگر اس کے موافق اپنے پاس وہ زیور مہیا کرلے پھر وہ معاملہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے تاجر اس کاریگر سے سونا کسی متعینہ رقم کے بدلے ادھار فروخت کرے اور سونا اس کے حوالہ کردے تاکہ احد البدلین پر قبضہ ہوکر یہ معاملہ درست ہوجائے (کمامر) پھر زیور کی تیاری کے بعد از سر نو معاملہ کرکے تاجر اس کاریگر سے اس رقم کے بدلے جو اس ذمہ میں ہے زیور خرید لے۔

۳- نئے پرانے زیور کا آپس میں کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ:

درحقیقت اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آیا پرانے زیور کا کم دام لگنا محض اس بنیاد پر ہے کہ وہ پرانا ہے، باقی وہ نئے زیور کے مماثل ہے؟ تو ظاہر ہے کہ نقدین کے باہم جنس تبادلہ میں عمدگی وغیر عمدگی کا اعتبار نہیں ہوتا ہے۔ جیدھا و ردیئھا سواء۔ اور اگر یہ فرق اس لئے ہے کہ پرانے زیور میں دوسرے دھات کی آمیزش زیادہ ہے تو اگر یہ آمیزش مغلوب اور نقد غالب ہے تو اس کا حکم بھی خالص سونا کا ہے جیسا کہ اس سے قبل گذرا اور اس صورت میں بھی نئے اور پرانے زیور کا کمی زیادتی کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہیں ہوگا، اور اگر اس پرانے زیور میں کھوٹ غالب ہے تو اس صورت میں غالب کا اعتبار کر کے وہ زیور عروض کے حکم میں ہوگا، لہذا اس کو خالص کے عوض فروخت کرنا جائز ہوگا بشرطیکہ خالص اس سونا سے زیادہ ہو جو کھوٹ والے زیور میں موجود ہے تاکہ کھوٹ والے میں موجود سونا کی مقدار کے مثل خالص میں سے ہو جائے اور زائد کھوٹ کے عوض ہو جائے، اور اگر خالص سونا کھوٹ زیور میں ملے سونا کا برابر یا کم ہو یا برابری کا علم نہیں ہو تو یہ بیع درست نہیں ہوگی؛ کیونکہ پہلی اور دوسری صورت میں سود ہوگا اور تیسری صورت میں سود کا احتمال ہوگا اور باب ربا میں شبہ کو حقیقت کا حکم ہوتا ہے (دیکھئے: موسوعہ فقہیہ کویت اردو ۲۶ / ۳۸۹)۔

جواز کی شکل: یہاں بھی اگر براہ راست زیورات کا آپس میں معاملہ کرنے کے بجائے متعین رقم سے تبادلہ ہو تو آسانی کے ساتھ یہ معاملہ درست ہو جائے گا۔

۴- کموڈیٹیز ایکسچینج سے سونا چاندی کی خریداری:

کموڈیٹیز ایکسچینج جہاں سونا چاندی پیتل اور دیگر دھاتوں کی خرید فروخت آن لائن ہوتی ہے یا اس طرح کے آن لائن تجارتی ادارے عام طور سے شرعی جواز کے دائرے میں نہیں آتے؛ کیونکہ اس میں عقود کے شرعی شرائط کا کوئی لحاظ نہیں ہو پاتا ہے، یہ ادارے خرید فروخت اور سرمایہ کاری کے لئے کم اور نفع نقصان کو برابر کرنے کے لئے زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔

کموڈیٹیز ایکسچینج سے اگر سونا محض خریدا جائے اور اسے آگے فروخت کرنے کا ارادہ نہیں ہو تو ظاہر ہے کہ روپے سے سونا چاندی ادھار خریدنا جائز ہے، لہذا اگر روپے کی ادائیگی نقد کر دی گئی۔ ہے تو بغیر قبضہ کے بھی بیع صحیح ہوگی کیونکہ قبضہ بیع کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں کچھ دشواری ہوتی ہے۔

۱- اگر مشتری سونا حاصل کرنا چاہے تو کیا یہ ادارہ اسے سونا فراہم کرائے گا؟۔

۲- اگر مشتری اس مبیع پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہے اور آگے اسے فروخت کرنا نہیں چاہے تو کیا اسے اس کی اجازت ہوگی؟، یعنی یہ عقد دائمی ہوگا یا مؤقت؟۔

۳- کیا مشتری اس خریداری میں پوری قیمت یکمشت ادا کر دیتا ہے یا محض کچھ رقم بطور پیشگی ادا کرتا ہے۔ اگر پوری رقم کی ادائیگی یکمشت نہیں ہوتی تو کیا سونا پر فی الفور معاملہ کرتے وقت قبضہ دلا دیا جاتا ہے یا اس میں تاخیر ہوتی ہے؟۔

ان اداروں کی صورتحال یہ ہے کہ اگر مشتری نے ایک متعینہ مدت تک اس سامان کو آگے فروخت نہیں کیا تو دلال کی طرف سے اس پر ہرجانہ عائد ہو سکتا ہے یا پھر اسے اپنی مدت بڑھانے کے لئے دلال سے ازسرنو معاملہ کرنے کی نوبت آئیگی اور اس صورت میں نفع ونقصان کا معاملہ برابر کرنا پڑے گا، اگر اس وقت اس کی قیمت بڑھ گئی ہے تو اسے وہ زیادتی مل جائیگی اور اگر کم ہوگئی ہے تو نقصان ادا کرنا پڑیگا۔ یعنی شروع سے یہ بات طے ہوتی ہے کہ اس مبیع کو ہمیشہ کیلئے آپ نہیں رکھ سکیں گے اور ایک خاص مدت کے بعد اسے کسی دوسرے بائع سے فروخت کرنا ہوگا۔ یہ شرط فاسد ہے جس کی وجہ سے بیع کی صحت پر اثر پڑتا ہے کیونکہ بیع میں ثمن تو مبیع کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور شرط لگانے کی وجہ سے احد المتعاقدین کا فائدہ ہوتا ہے جو من غیر عوض ہے جو ربا کے حکم میں ہوگا۔ "لأن الشرط الفاسد إنما يؤثر في البيع لأنه يمكن الربا فيه" (بدائع ۴ / ۵۹۴ زکریا)

نیز اس سے مشتری خود مختاری متاثر ہوتی ہے اور مبیع پر اس کی ملکیت ثابت ہو جانے کے بعد بھی اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر مشتری مبیع کا خواہاں ہو جائے تو شاید و باید اسے مبیع مل سکے۔ پس اگر یہ محض الفاظ کی بیع ہو اور حقیقی مبیع کا کوئی پتہ نہیں ہو، مبیع کے نام پر محض چند کوڈ مل جائے یا مشتری با اختیار نہیں ہو سکے تو ظاہر ہے یہ معاملہ محض ہوائی ہوگا اور گویا نفع نقصان کے برابر کر لینے والا معاملہ ہوگا جو کہ قمار

پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہوگا۔

الغرض اگر اس معاملہ میں بیع کی صحت ونفاذ کو متاثر کرنے والی کوئی بات نہیں پائی جاتی جو تقاضائے عقد کے خلاف ہو اور کئی سونا خریداروں کا حصہ سونے کی اینٹ میں موجود ہے، ہر ایک کا حصہ الگ نہیں ہوا تو اسے قبضہ مانا جائے یا نہیں؟۔

قبضہ کی حقیقت جیسا کہ کتب فقہ سے واضح ہے اور خود اکیڈمی کے نویں سمینار کے فیصلہ میں موجود ہے کہ ''قبضہ اصل میں مبیع پر خریدار کے استیلاء کا نام ہے کہ مبیع پر اس کے تصرف میں کوئی مانع باقی نہ رہے''۔ اسی لئے فقہاء کرام کے یہاں قبضہ کے صحیح ہونے کی شرطیں ہیں، احناف کے یہاں ایک شرط یہ ہے کہ شئ مقبوض حق غیر کے ساتھ مشغول نہیں ہو مثلاً مکان پر مشتری کو قبضہ دلاتا ہے اور اس میں بائع کا سامان موجود ہے تو جب تک وہ سامان نکال نہیں لیتا قبضہ صحیح نہیں ہوگا۔

ایک شرط یہ ہے کہ شئ مقبوض حق غیر سے منفصل اور ممتاز ہو مثلاً درخت پر قبضہ اس کے پھل کے بغیر یا پھل پر قبضہ درخت کے بغیر صحیح نہیں ہوگا۔

اسی طرح قبضہ کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ شئ مقبوض حصہ شائع نہیں ہو کیونکہ قبضہ کا اصل مقصد اس شئ میں تصرف کرنا ہے اور جزو شائع میں دوسرے کا حق متعلق ہونے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہوگا (الموسوعة الفقهية، القبض، شروط صحة القبض، رقم:۲۸ الی ۳۰)۔

یہ بھی امر واقعہ ہے کہ قبضہ کی شرعاً کوئی متعین شکل نہیں ہے ہر چیز کا قبضہ اس کے حساب سے ہوگا، چنانچہ اکیڈمی کے نویں سمینار میں یہ بھی فیصلہ ہے کہ ''کتاب وسنت میں قبضہ کی حقیقت اور اس کی کوئی خاص صورت مقرر نہیں کی گئی ہے، گویا شریعت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کے عرف کو اصل قرار دیا ہے، لہذا ہر عہد کے مروجہ طریقوں اور اشیاء کی مختلف انواع کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت متعین ہوگی''۔

اس تفصیل کی روشنی میں:

(الف)۔ اگر مشتری سے سونا خریدنے والے ادارے سے سونا خرید تو لیا مگر اس کا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہے اور اسے الگ نہیں کیا گیا ہے تو اس پر خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائیگا کیونکہ مبیع ممتاز اور فارغ عن حق الغیر نہیں ہے بلکہ جزو شائع کی شکل میں ہے جس سے انتفاع بحالت موجودہ ممکن نہیں۔

(ب)۔ اور اگر خریدی ہوئی مقدار کا سونا الگ موجود ہے اس طرح کہ اگر خریدار اس مبیع کو حاصل کرنا چاہے تو اسے فراہم کیا جا سکے، محض کاغذی خانہ پری نہیں ہو رہی ہے، نیز مبیع کے تعلق سے تمام حقوق اور ذمہ داریاں مشتری کی طرف منتقل ہو جائیں، پھر بیع کو متاثر کرنے والی کوئی دوسری بات موجود نہیں ہوا اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں خریدار کے نام سے درج کر لیا گیا تو اس اندراج کو قبضہ کے لئے کافی تصور ہونا چاہئے؛ کیونکہ جیسا کہ گذرا کہ ہر عہد کے مروجہ طریقوں اور اشیاء کی مختلف انواع کے اعتبار سے قبضہ کی نوعیت ہوتی ہے اور اس طرح کے تجارتی اداروں میں قبضہ کی نوعیت تقریباً یہی ہوتی ہے کہ تمام ریکارڈ مشتری کے نام کر دیا جائے اور ساری ذمہ داری اس کی طرف منتقل کر دی جائے۔ لیکن دوسری طرف صورتحال یہ ہے کہ یہاں قبضہ حسی ممکن ہے۔ جب اس کے حصہ کی مبیع کو بسکٹ سے الگ کر کے اس کی مقدار بنائی جا سکتی ہے تو اس پر حسی طور پر قبضہ بھی آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اگر قبضہ حسی ممکن نہیں ہوتا تو اس شکل کو قبضہ کے لئے کافی ہونے کی گنجائش ہو سکتی تھی جیسا کہ حاضر سودے میں شیئرز کی خریداری کے وقت حسی قبضہ ناممکن ہونے کی وجہ سے اس کی سرٹیفکٹ پر قبضہ کو کافی تصور کیا جاتا ہے (دیکھئے: نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے/ص ۱۲۵)۔ یہاں تو حسی قبضہ ممکن ہے، علاوہ ازیں شیئرز کے قبضہ میں کم از کم سرٹیفکٹ پر مشتری کا قبضہ ہو جاتا ہے جبکہ قبضہ کے نام پر ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہوئی، اس کے علاوہ اگر حکمی قبضہ کو ہی کافی مانا جائے تو بقول مفتی تقی عثمانی صاحب ''کرنسی کے حکمی قبضے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ کرنسی کی قیمت بڑھنے یا گھٹنے کا نقصان متعلقہ شخص کے ذمے ہو جائے بلکہ قبضہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ خریدی ہوئی کرنسی غیر خرید شدہ کرنسی سے بالکل ممتاز کر کے الگ کر لی جائے، اور خریدار یا تو خود قبضہ کرے یا اس کا کوئی وکیل اس کی طرف سے اسے اپنی تحویل میں اس طرح لے لے کہ وہ متعینہ کرنسی جل جائے یا چوری ہو جائے تو نقصان خریدار کے ذمے سمجھا جائے ...... (کیونکہ) شرعی اعتبار سے کرنسی اور دوسری اجناس کی تعیین میں یہ فرق ہے کہ دوسری اجناس اشارے یا علامتوں سے متعین ہو سکتی ہیں؛ لیکن کرنسی اس وقت تک متعین نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر کوئی شخص خود یا اپنے نمائندے کے ذریعے قبضہ نہ کر لے'' (فتاویٰ عثمانی ۳/۱۵۷)۔

پھر یہ کہ اگر اسے قبضہ تصور کرلیا جائے تو ان اداروں میں غیر معمولی شرعی بے احتیاطیوں کے پیش نظر عین ممکن ہے کہ اس تقسیم واندراج کے بغیر کبھی مبیع کو آگے فروخت کردیا جائے جس سے قمار کا دروازہ کھلنے کا غالب امکان ہے، اس لئے اس صورت کو بھی قبضہ ماننا بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

۵-نفع نقصان برابر کرنے کا معاملہ:

وہ کاروبار جس میں جنس لینے دینے کے بجائے قیمتوں کا فرق کرکے نفع کمایا جاتا ہو محض قمار اور جوئے کی شکل ہے جو کہ حرام ہے، سونے کی صورتحال بھی یہی ہوگی کہ اگر سونا مستقبل کی کسی تاریخ پر ادھار خریدا جائے اور اس تاریخ کے آنے کے بعد مبیع کو حوالہ کرنے اور اس پر قبضہ کرنے کے بجائے قیمتوں کا فرق دیکھ کر نفع نقصان کو برابر کرلیا جائے کہ اگر اس متعینہ تاریخ میں سونا کی قیمت بڑھ گئی ہے تو بائع سونا دینے کے بجائے مشتری کو متعینہ قیمت سے بڑھی ہوئی رقم حوالہ کردے یا اگر قیمت کم ہوگئی ہے تو اس نقصان کو حاصل کرلے اور اس طرح نفع نقصان کو برابر کرکے معاملہ کو ختم کرلیا جائے، یہ شکل جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ کھلا ہوا جوا ہے۔

۶-سونا تاجر اگر قیمت میں متوقع اضافہ کے پیش نظر سونا روک لے:

شرعاً اس طرح کے معاملات کو احتکار کہا جاتا ہے۔ احتکار غلہ اور اس جیسی ضروریات زندگی خرید کر گرانی کے زمانے تک روکے رکھنے کا نام ہے۔ اور اس کا تحقق امام ابوحنیفہ، امام محمد، فقہاء شافعیہ اور فقہاء حنابلہ کے نزدیک صرف غذائی اجناس اور جانوروں کے چارے میں ہوتا ہے (موسوعۃ فقہیہ اردو، احتکار)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ نے لکھا ہے: ''والخلاصة أن جمهور الفقهاء خصوا الاحتكار بالقوتين (قوت الناس وقوت البهائم) نظرا للحكمة المناسبة للتحريم وهي دفع الضرر عن الناس والأغلب في ذلك إنما يكون في القوتين''

(الشاملة، الفقه الاسلامي وادلته، الجزء الرابع، المبحث الخامس، سابعا الاحتكار)

(خلاصہ یہ ہے کہ جمہور فقہاء نے تحریم کی حکمت یعنی ضرر سے لوگوں کو بچانے کے پیش نظر احتکار کو انسانوں اور چوپایوں کے غذائی اشیاء کے ساتھ خاص کیا ہے، کیونکہ عام طور سے غذائی اشیاء میں ہی ضرر کا تحقق ہوتا ہے)۔

احناف میں حضرت امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کا موقف بھی یہی ہے اور فتوی انہی کے قول پر ہے۔ ''والتقييد بقوت البشر قول أبي حنيفة ومحمد وعليه الفتوى كذا في الكافي'' (شامي، كتاب الحظر والاباحة، فصل في البيع ۵/ ۲۵۵)۔

البتہ امام محمد سے ایک روایت کپڑوں میں احتکار کا بھی ہے۔ ''وعن محمد الاحتكار في الثياب'' (شامي / ايضًا)۔

نوٹ: امام محمد کا کپڑوں میں احتکار کا قول موسوعہ فقہیہ کویت عربی میں موجود ہے۔ عبارت یہ ہے:

''الاتجاه الثالث أنه لا احتكار إلا في القوت والثياب حاصة وهذا قول لمحمد بن الحسن'' (احتكار. مايجري فيه الاحتكار، رقم: ۷)، اسی طرح اردو ترجمہ میں (۲/ ۱۶۴) پر یہی درج ہے، نیز شامی نے بھی ابن کمال (احمد بن سلیمان بن کمال پاشا) کے حوالہ سے یہی لکھا ہے (کما مر)، جبکہ ہدایہ، عنایہ، فتح القدیر، الجوہرۃ النیرۃ وغیرہ کتابوں میں امام محمد کی روایت ''لا احتكار في الثياب'' کا ہے نہ کہ ''الاحتكار في الثياب'' کا۔

امام ابو یوسفؒ کا اس سلسلہ میں قول یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کی کمی انسانی مضرت کا باعث ہو اس کی ذخیرہ اندوزی احتکار میں شامل ہے، خواہ اس کا تعلق غذائی اجناس سے ہو، کپڑے سے ہو یا درا ہم ودنانیر سے؛ کیونکہ کراہت کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

''وتخصيص الاحتكار بالأقوات قول الإمام والثالث وقال أبويوسف: كل ما يضر العامة فهو احتكار بالأقوات كان أو ثيابا او دراهم أو دنانير اعتبارا لحقيقة الضرر لأنه هو المؤثر في الكراهة'' (البحر. الكراهية. فصل في البيع ۸/ ۳۷۰)

صاحب ہدایہ نے ان دونوں قولوں کی بڑی اچھی توجیہ کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''فأبو يوسف رحمه الله اعتبر حقيقة الضرر اذ هو المؤثر في الكراهة وأبوحنيفة رحمه الله اعتبر الضرر المعهود

المتعارف'' (ہدایہ علی الفتح، الکراہیۃ، فصل فی البیع ۱۰/ ۶۹)

(امام ابو یوسفؒ نے حقیقت ضرر کا اعتبار کیا ہے جبکہ امام صاحبؒ نے عام طور سے پیش آنے والے ضرر کا اعتبار کیا ہے)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی ملکیت میں تصرف کرنے اور انہیں روکے رکھنے کا پورا حق ہے؛ لیکن جن چیزوں کے روکے رکھنے سے ضرر عام کا اندیشہ ہو اس کا روکنا مخصوص شرائط کے ساتھ احتکار میں داخل ہے اور اس کی بنیادی علت ضرر عام سے لوگوں کو بچانا ہے۔ نصوص میں احتکار کے باب میں جو کچھ وارد ہے یا تو وہ عام ہیں یا اس میں غذائی اجناس کا تذکرہ موجود ہے۔ جمہور فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ جب ایک مسئلہ میں بعض نصوص عام اور بعض خاص ہوں تو عام کو خاص پر محمول کرلیا جاتا ہے، اس لئے گویا احتکار کے باب میں وارد ہونے والی تمام نصوص کا تعلق غذائی اجناس سے ہوگا؛ کیونکہ ضرر عام اسی سے زیادہ لاحق ہوتا ہے۔ جبکہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے عموم والی نصوص سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ انسانی ضرورتوں میں داخل کسی بھی اشیاء سے ضرر لاحق ہوسکتا ہے اور جو نصوص خاص وارد ہیں ان میں مفہوم مخالف معتبر نہیں ہیں کہ ان میں ذکر اشیاء کے علاوہ احتکار نہیں ہو؛ لہذا ہر وہ چیز جو انسانی مضرت کا باعث ہو اس کی ذخیرہ اندوزی احتکار میں داخل ہے۔ اور صاحب ہدایہ کی ماقبل میں ذکر کردہ توجیہ کے مطابق امام ابو یوسفؒ نے حقیقتِ ضرر کا اعتبار کیا ہے، کیونکہ احتکار کی تحریم کی اصل علت ضرر ناس ہی ہے؛ لہذا جہاں یہ علت پائی جائے وہاں حکم موجود ہوگا، جبکہ حضرات طرفین نے غذائی اجناس میں جو احتکار کو منحصر کیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ عام طور سے ضرر عام اسی میں معہود و معروف ہے جس سے یہ واضح ہے کہ اگر اس کے علاوہ اشیاء میں بھی ایسا ہونے لگے تو حضرات طرفین کے اصول کے مطابق اسے بھی احتکار کے دائرہ میں داخل ہونا چاہئے، چنانچہ خود امام محمد کی ایک روایت کپڑوں میں احتکار کے تعلق سے موجود ہے۔ اس تفصیل کو سامنے رکھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر واقعی سونا کی ذخیرہ اندوزی سے دوسری اشیاء کی گرانی اور ضرر عام ہونے لگے تو امام ابو یوسفؒ کے قول کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

۷- سونا اسمگلنگ کا مسئلہ:

غیر قانونی طریقہ پر اموال کو درآمد و برآمد کرنے کا نام اسمگلنگ ہے جو قانون کی نگاہ میں خلاف قانون اور جرم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ شریعت میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک اشیاء و اموال میں اپنی ضرورت یا پسند کے مطابق ہر جائز تصرف کرے، جو مال جہاں سے چاہے خریدے اور جہاں چاہے اسے فروخت کرے۔ ''لا یمنع أحد من التصرف فی ملکہ أبدا الا إذا أضر بغیرہ ضررا فاحشا'' (شرح المجلۃ لسلیم رستم باز رقم المادۃ ۱۱۹۷ از حاشیہ فتاویٰ محمودیہ ۲۳/ ۴۸۷)۔ اسلامی اصول کے مطابق اس سلسلے میں مالکان اشیاء کو اس کا پابند نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ اپنا مال فلاں متعین مقامات پر ہی خرید و فروخت کرسکتا ہے اور دوسرے مقام پر نہیں کرسکتا۔ اس میں اپنے ملک اور دوسرے ملک کی کوئی قید نہیں ہے۔ درحقیقت اسلام کا مزاج اس معاملہ میں آزاد تجارت کا ہے کہ اپنی سہولت کے اعتبار سے جو جہاں چاہے بیع و شراء کا معاملہ انجام دے۔ بلکہ بقول مفتی تقی عثمانی صاحب ''بعض احادیث ایسی ہیں جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر ملکی تجارت کو پابند بنانے کے بجائے آزاد چھوڑنے کو پسند فرمایا ہے، امام دارقطنی بیہقی اور یعلی اور طبرانی نے حضرت عائشہؓ سے اور ابن عساکر نے حضرت عبد اللہ بن عیاش بن ربیعہؓ سے یہ مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ ''اطلبوا الرزق فی خبایا الارض'' (رزق کو زمین کے تمام گوشوں میں تلاش کرو)۔ ''من تعذرت علیہ التجارۃ فعلیہ بعمان'' (جس کے لئے تجارت مشکل ہوجائے اسے چاہئے کہ عمان چلا جائے)، اور ایک روایت اسی طرح مصر جانے کا عمومی مشورہ موجود ہے (کنز العمال حدیث ۴۱۷۴)، یہ تجارتی سفر درآمد و برآمد دونوں کے لئے ہوسکتا ہے۔ اس وقت کے تجار عموماً بیک وقت دونوں مقاصد کے لئے سفر کیا کرتے تھے۔ غرض عہد رسالت یا عہد صحابہ میں تو کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں درآمد و برآمد پر باقاعدہ پابندی عائد کی گئی ہو بلکہ اس کے خلاف صراحتیں ملتی ہیں'' (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۷/ ۱۲۸، ۱۲۹)۔

یہ صورتحال اس وقت تھی جب دوسرے ملکوں میں جانے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن جب سے آمد و رفت کی دشواریوں کی وجہ سے قانونی پیچیدگیاں پیدا ہونے لگی تو اس وقت آزادانہ طور پر تجارت کی یہ شکل نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ اس کی وجہ سے درآمد و برآمد میں ملکی معیشت کو خطرہ کا اندیشہ تھا اس لئے ملکوں میں اس تعلق سے قانون بنائے گئے اور اس پر عمل اس کے شہریوں کے لئے ضروری قرار دیا جانے لگا۔

پس اگر اس سے ملکی معیشت کا نظام غیر متوازن ہوجائے اور کوئی حکومت درآمد و برآمد پر پابندی لگائے اور شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی

نہیں کی گئی ہو تو اولو الامر کی اطاعت کے پیش نظر اس قانون کی پابندی وہاں کے رعایا پر لازم ہوگی۔لیکن ظاہر ہے کہ جو صحیح اسلامی حکومت کے اختیارات ہیں وہ ان حکومتوں کو نہیں حاصل ہو سکتے جو اسلامی اصول پر گامزن نہیں ہو لیکن اس کے باوجود اگر اس کی اطاعت میں کسی امر محظور کا ارتکاب لازم نہیں آتا تو ایک شہری ہونے کے ناطے وہ اس قانون کا پابند ہوگا؛ کیونکہ شریعت میں یہ اجازت ہے کہ انتظامی طور پر حکومت عوام پر ایسی پابندی یا پالیسی لگائے جو مفاد عامہ میں ہو اور اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف نہیں ہو، البتہ قانون بناتے ہوئے اس میں اعتدال رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے؛ لیکن کون فیصلہ ظالمانہ ہے اور کون نہیں، اگر اسے لوگوں کے صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو صحیح وغلط فیصلہ کا کوئی معیار باقی نہیں رہیگا۔ مولانا خالد سیف اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''معاشی مصالح کے پیش نظر اس قسم کی پابندیوں کی گنجائش ہے۔اس کی نظیر تلقی جلب اور بیع حاضر للبادی ہے جس کو مکروہ قرار دیا گیا ہے''۔

ان دونوں فقہی اصطلاح کی وضاحت کے بعد آگے تحریر فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے گرانی بڑھتی ہے اور اس شہر کے باشندوں کو زک پہونچتی ہے۔یہی مضرت اسمگلنگ میں سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ غیر ملکی مصنوعات کی آمد کی وجہ سے اس ملک کی صنعت اور یہاں کا معاشی توازن بگڑتا اور متأثر ہوتا ہے'' (جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۵۲)۔

اسمگلنگ میں قانون کی خلاف ورزی کے علاوہ اور بھی دیگر ممنوع کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔اگر سب پر نظر رکھی جائے تو اس کا عدم جواز اور بھی واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ان کے احکام کی خلاف ورزی میں چونکہ بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، نیز جان ومال یا عزت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، لہذا ان کے جائز قوانین کی پابندی کرنی چاہئے اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ قولا یا عملا یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کا پابند رہیگا اس معاہدے کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کی جائے، اسمگلنگ کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اصلا باہر کے ملک سے مال لیکر آنا یا یہاں سے باہر لے جانا شرعی اعتبار سے جائز ہے، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں مذکورہ مفاسد پائے جاتے ہیں اس لئے علماء نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے (فتاوی عثمانی ۳/ ۹۰،۹۱)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: اسمگلنگ کا کاروبار درست نہیں ہے اس لئے کہ ایک تو یہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہے جو اس ملک کا شہری ہونے کے لحاظ سے اس کے قانون کے احترام کے سلسلہ میں ضروری ہے دوسرے اس طرح وہ پوری قوم اور باشندگان ملک کو اپنی حرکت کے ذریعہ نقصان پہنچاتا اور زیر بار کرتا ہے جو غیر اسلامی ہونے کے علاوہ غیر انسانی حرکت بھی ہے (جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۵۲)۔

مفتی رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں: اسمگلنگ میں حکومت کے قانون کی خلاف ورزی، ملک کا نقصان اور عزت کا خطرہ ہے اس لئے ناجائز ہے۔ ایسے مال کی خرید وفروخت اور اس میں تعاون کرنا بھی ناجائز ہے؛ مگر اس کے منافع حرام نہیں (احسن الفتاوی ۸/ ۹۵، کذا فی فتاوی محمودیہ ۲۳/ ۴۸۷،۴۸۸)۔

نیز اپنی ملکیت میں ایسا تصرف کرنے سے روکا جائے گا جس سے دوسرے کا نقصان ہو۔

''درء المفاسد أولی من جلب المنافع۔ ومما یتفرع من هذا القاعدة أن الرجل یمنع من التصرف فی ملکه إذا کان تصرفه یضر بجاره ضررا فاحشا لأن درء المفاسد عن جاره أولی من جلب المنافع لنفسه'' (شرح المجلة رقم المادة: ۳۰)۔

الغرض مختلف محظورات وممنوعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ طریقہ شرعا ناجائز ہوگا اور اس کے ذریعہ خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی۔ تاہم اگر کوئی یہ معاملہ کرتا ہے تو صلاۃ فی الارض المغصوبہ جیسی نظائر پر قیاس کرتے ہوئے اس سے حاصل ہونے والی آمدنی اور منافع حرام نہیں ہونگے۔

۸- پلاٹین کا حکم:

پلاٹین ایک قسم کی دھات ہے جس سے زیورات بنائے جاتے ہیں اور یہ قیمت میں کم وبیش سونا کی طرح مہنگا ہوتا ہے۔ اسے عرف میں سفید سونا بھی کہتے ہیں مگر اس عرف کی بنیاد پر یہ سونے کی قسم میں داخل نہیں ہوگا، محض قیمتی اور منافع بخش ہونے یا باعث تزین ہونے میں اسے سونے سے تشبیہ دیکر سفید سونا کہتے ہیں جیسے پٹرول کو کالا سونا کہا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ پٹرول سونے کی کوئی قسم ہے؛ کیونکہ سونے میں نہ سیاہی

ہوتی ہے نہ سفیدی، بلکہ وہ مخصوص لال رنگ کی ایک دھات ہے جو مشہور ومعروف ہے۔

جب پلاٹین سونا سے الگ مستقل ایک دھات ہے تو اسے باعث تزین ہونے، یا مہنگا ہونے یا قابل ذخیرہ ہونے کی بناء پر سونا کے احکام اس پر منطبق ہونگے یا نہیں؟۔

یہاں دیکھنا یہ ہے کہ سونے کے احکام اس پر منطبق ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمام حکم جو سونا سے متعلق ہے اس سے بھی متعلق ہوجائے، مثلاً زیورات بنائے جانے اور نہ بنائے جانے کا مسئلہ، مردوں کے لئے اس کے استعمال کا مسئلہ، پلاٹین سے بنائے گئے کھانے پینے کے برتن کے استعمال کا مسئلہ، یا اس کے علاوہ دوسرے مختلف طریقوں سے استعمال کے مسئلوں میں جو حکم سونا کا ہے وہی حکم اس کا بھی ہو؛ بلکہ مقصود یہ ہے کہ سونے کو جن بعض احکام میں خاص انفرادیت حاصل ہے وہ پلاٹین کو حاصل ہوگا یا نہیں؟۔ اور یہ تین مسئلے ہیں۔ سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ سونے کی طرح پلاٹین پر صرف کے احکام نافذ ہونگے یا نہیں، یعنی اگر پلاٹین کا آپس میں تبادلہ ہو تو یدا بید اور سواء بسواء ضروری ہوگا یا کمی زیادتی اور نقد وادھار کی اجازت ہوگی۔ اسی طرح خیار شرط اور میعاد کی شرط سے خالی ہونا ضروری ہوگا یا نہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسے ثمن کا درجہ حاصل ہوگا یا نہیں؟ اور تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ اموال زکاۃ میں شامل ہوگا یا نہیں؟ یعنی اگر کسی کے پاس نصاب کی مقدار میں پلاٹین موجود ہو تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

جہاں تک عقد صرف کے احکام اس سے متعلق ہونے کی بات ہے تو وضاحت کے ساتھ آچکا ہے کہ عقد صرف کا اطلاق صرف نقدین یعنی سونا چاندی کے آپسی تبادلہ والی بیع کا نام ہے۔ اس کے علاوہ چیزوں کے تبادلہ کو ''صرف'' نہیں کہیں گے چاہے وہ ثمن اصطلاحی ہی کیوں نہ ہو جو بہت سارے احکام میں ثمن خلقی کے مشابہ ہوتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اسے ثمنیت کا درجہ حاصل ہوگا یا نہیں؟۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسے سونا چاندی یا دیگر اثمان عرفی کی طرح خرید وفروحت میں ثمن خلقی یا ثمن رواجی کی جگہ میں اسے ادا کیا جائے تو بائع کو لینے پر مجبور کیا جائیگا یا نہیں؛ کیونکہ اگر عاقدین اسے ثمن بنانے پر راضی ہوں تو محض مبیع کے مقابلہ میں ثمن بننے کی صلاحیت تو ان تمام چیزوں میں ہے جس میں مبیع بننے کی صلاحیت ہے اور اس میں کسی کی کوئی تخصیص نہیں۔

کسی بھی چیز کے باضابطہ ثمن بننے کی دو شکل ہے۔ یا تو وہ خلقی طور پر اس کے لئے بنایا گیا ہو یا اس کی ثمنیت پر اتفاق ہو چکا ہو اور پلاٹین میں یہ دونوں باتیں موجود نہیں ہیں۔ لہذا اسے ثمنیت کا درجہ حاصل نہیں ہوگا اور تبادلہ میں بطور ثمن اسے لینے پر قانونا مجبور نہیں کیا جائے گا، نہ ہی ثمن کے دوسرے احکام اس پر نافذ ہونگے۔

تیسرا مسئلہ وجوب زکوۃ کا ہے۔ کن مالوں میں زکوۃ واجب ہے؟ علامہ کاسانیؒ اس تعلق سے فرماتے ہیں:

''أموال الزكاة أنواع ثلاثة أحدها الأثمان المطلقة وهى الذهب والفضة والثانى أموال التجارة وهي العروض المعدة للتجارة والثالث السوائم'' (بدائع/ الزكاة، ۲/ ۱۰۰ زکریا) (تین طرح کے مال اموال زکوۃ میں سے ہیں۔ ایک ثمن مطلق یعنی سونا چاندی، دوسرا وہ سامان جو تجارت کے لئے ہوں، اور تیسرا سائمہ جانور)۔

یہ تین اموال ہیں جو اموال زکوۃ کہلاتے ہیں، البتہ یہاں ثمن مطلق یعنی سونا چاندی میں فقہاء نے ثمن اصطلاحی کو بھی شامل کیا ہے کہ ثمن مطلق کا رواج ختم ہونے کے بعد ثمن اصطلاحی فلوس اور اس کے بعد کاغذی نوٹ اموال زکوۃ میں شمار ہونگے اور مقدار نصاب کی صورت میں اس پر زکوۃ کا وجوب ہوگا۔

''وذهب الحنفية وهو قول عند المالكية إلى أن الفلوس الرائجة تجب فيه الزكاة مطلقا كالذهب والفضة لأنهما أثمان مطلقة فإذا كسدت عدت عروضا فلم تجب فيها الزكاة الا إذا عرضت للتجارة'' (موسوعة، فلوس، رقم: ۴)۔

پلاٹین یہاں بھی اس معیار پر نہیں اترتا ہے۔ کیونکہ ثمن خلقی اور سوائم جانوروں کے علاوہ جو بھی ہے وہ عروض میں داخل ہے اور عروض میں بغیر نیت تجارت کے زکاۃ نہیں ہے۔

"فصل في العروض: العروض جمع عرض بفتحتين حطام الدنيا كذا في المغرب والصحاح۔ والعرض بسكون الراء المتاع وكل شئ فهو عرض سوى الدراهم والدنانير" (شرح فتح القدير، كتاب الزكاة، فصل في العروض ۲/ ۲۲۵)۔

"وتشترط نية التجارة لانه لما لم تكن للتجارة خلقة فلايصير لها الا بقصدها فيه وذلك هو نية التجارة" (ایضًا/ ۲/ ۲۲۶)

(اس لئے اگر پلاٹین بطور تجارت کے نہیں ہے تو اس پر زکوۃ فرض نہیں ہوگی۔ اگر تجارت کیلئے ہو تو اموال تجارت میں شامل ہوکر وجوب زکوۃ کا مسئلہ دیگر ہے)۔

خلاصہ بحث

۱- کاغذی روپیوں سے سونا چاندی کی خریداری بیع صرف نہیں ہے اور اس معاملہ میں یعنی روپیے سے سونا چاندی کے تبادلہ کے وقت سونا چاندی کی حیثیت ثمن کی اور روپیہ کی حیثیت مبیع کی ہوگی۔

(الف)- یہ بات درست ہے کہ سونا چاندی اور نوٹ میں ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار؛ کیونکہ دونوں کی جنس الگ ہے اور قدر کا اتحاد بھی نہیں ہے لہذا تفاضل ونسیئۃ دونوں جائز ہوگا۔

(ب)- حکومت کے متعین نرخ سے زیادہ میں سونا چاندی کی خرید وفروخت میں قانون شکنی کا خطرہ اور دیگر ممنوعات موجود ہیں اس لئے ایسا کرنا ناجائز اور ممنوع ہوگا، تاہم اگر کوئی اس کے باوجود ایسا کرلے تو زیادتی جائز ہوگی اور اس پر ربا کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۲- (الف)- جب زیور بنانے والے کاریگر نے زیور کے تاجروں سے ایک متعینہ مقدار میں سونا لیا اور کچھ دنوں میں زیور بنا کر اسی مقدار میں اسے واپس کیا ہے جتنی مقدار اس نے سونا لیا تھا تو اس معاملہ کو بیع تصور کیا جائے یا اجارہ، بہرصورت یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہوگا۔

(ب)- اس معاملہ میں بچے ہوئے ذرات کو اجرت نہیں مان سکتے؛ کیونکہ یہ قفیز طحان کی شکل ہوتی ہے۔ البتہ اس بچے ہوئے ذرات کی مقدار کو عند العقد مطلقاً اجرت مقرر کرلیا جائے تو اسے اجرت بنانا درست ہوگا۔ یا یہ کہ یہ معاملہ دست بدست کرے یا تاجر اس کاریگر سے سونا کسی متعینہ رقم کے بدلے ادھار فروخت کرے اور سونا اس کے حوالہ کردے تاکہ احد البدلین پر قبضہ ہوکر یہ معاملہ درست ہوجائے پھر زیور کی تیاری کے بعد از سرنو معاملہ کرکے تاجر اس کاریگر سے اس رقم کے بدلے جو اس کے ذمہ میں ہے زیور خرید لے۔

۳- نئے پرانے زیور کا آپس میں کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ میں اگر یہ فرق محض عمدگی وغیر عمدگی کا ہے تو جائز نہیں ہے۔ اور اگر یہ فرق اس لئے ہے کہ پرانے زیور میں دوسرے دھات کی آمیزش زیادہ ہے تو اس کا حکم کھوٹے سونے کا ہوگا۔ نیز براہ راست زیورات کا آپس میں معاملہ کرنے کے بجائے متعین رقم سے تبادلہ ہو تو جائز ہے۔

۴- (الف) کموڈیٹیز ایکسچینج سے اگر مشتری نے سونا خرید تو لیا مگر اس کا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہے اور اسے الگ نہیں کیا گیا ہے تو اس پر خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائیگا کیونکہ مبیع ممتاز اور فارغ عن حق الغیر نہیں ہے بلکہ جزو شائع کی شکل میں ہے جس سے انتفاع بحالت موجودہ ممکن نہیں۔

(ب)- اور اگر خریدی ہوئی مقدار کا سونا الگ موجود ہے اور ریکارڈ کو بھی مشتری کے نام کردیا گیا ہے جب بھی اس معاملہ میں قبضہ کا تصور دشوار ہے۔

۵- سونا کی ایسی تجارت جس میں جنس لینے دینے کے بجائے قیمتوں کا فرق کرکے نفع کمایا جاتا ہو محض قمار اور جوئے کی شکل ہے جو کہ حرام ہے۔

۶- سونا تاجر اگر قیمت میں متوقع اضافہ کے پیش نظر سونا روک لے اور سونا کی ذخیرہ اندوزی سے واقعی دوسری اشیاء کی گرانی اور ضرر عام ہونے لگے تو امام ابو یوسفؒ کے قول کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

۷- سونا اسمگلنگ اور پھر اس کی خرید وفروخت مختلف محظورات وممنوعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً ناجائز ہوگا۔ تاہم اگر کوئی یہ معاملہ کرتا ہے تو "صلاۃ فی الارض المغصوبہ" جیسی نظائر پر قیاس کرتے ہوئے اس سے حاصل ہونے والی آمدنی جائز ہوگی۔

۸- پلاٹین سونا جیسا نہیں ہے اور اس پر سونا کے احکام منطبق نہیں ہونگے۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت کے احکام

مولانا ابوالمکارم معروفی [1]

کاغذی نوٹ سے سونے کی بیع، بیع صرف ہے یا نہیں؟ اس کا مدار اس پر ہے کہ کاغذی نوٹ کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ آیا اس کی حیثیت قرض کی دستاویز کی ہے یا فلوس نافقہ یا سونے اور چاندی کی؟ اس لئے پہلے اس کی فقہی حیثیت ذکر کی جاتی ہے:

نوٹ کی فقہی حیثیت:

کاغذی نوٹ کی فقہی حیثیت کے بارے میں اہل علم کے مختلف نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں: ''أحكام الاوراق النقدية والتجارية في الفقه الاسلامی'' میں اس پر دلائل کے ساتھ مفصل کلام کیا گیا ہے، ان میں سے تین نقطہ نظر زیادہ مشہور ہیں:

۱- نوٹ خود مال نہیں ہے بلکہ دین کی رسید ہے، ماضی قریب میں علماء ہند میں سے اکثر کی یہ رائے رہی ہے۔

۲- نوٹ سونے چاندی کے قائم مقام ہے، جو احکام سونے چاندی کے ہیں وہی کاغذی نوٹ کے ہیں، بیشتر علماء عرب کا یہی نظریہ ہے۔

۳- کاغذی نوٹ دین کی رسید نہیں ہے اور نہ سونے چاندی کی طرح ثمن حقیقی ہے بلکہ ثمن عرفی ہے کاغذی نوٹ کا وہی حکم ہے جو فلوس کا ہے۔

ان میں سے تیسرا نظریہ راجح اور صحیح ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (فقہ البیوع، فقہی مقالات، اسلام اور جدید معیشت وتجارت)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے دوسرے سمینار کے فیصلہ میں اسی تیسرے نظریہ کو اختیار کیا گیا ہے، تجویز کے الفاظ یہ ہیں: ''کرنسی نوٹ سند و حوالہ نہیں ہے بلکہ ثمن ہے اور اسلامی شریعت کی نظر میں اس کی حیثیت زر قانونی اور اصطلاحی کی ہے'' (جدید فقہی تحقیقات ۲/ ۵۱)۔

کیا روپے سے سونا چاندی کی خرید وفروخت بیع صرف ہے؟

روپے سے سونے کی بیع میں روپے کی حیثیت ثمن کی ہے مگر چونکہ رائج الوقت کاغذی نوٹ اور سکے خلقۃ ثمن نہیں ہیں بلکہ یہ ثمن عرفی یا اصطلاحی ہیں اور بیع صرف خلقی اثمان میں منحصر ہے اس لئے روپیوں سے سونے کی خرید وفروخت کو بیع صرف نہیں کیا جائے گا۔

''وإن اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلوسا وليست الفلوس عنده فهو جائز إن تقابضا قبل التفرقه أو لم يتقابضا لأن هذا بيع وليس بصرف'' (مبسوط السرخسی ۱۴/ ۲۵ دار المعرفه)۔

''وهو (الصرف) بيع الثمن بالثمن أي ما خلقه للثمنية ومنه المصوغ جنسا بجنس أو بغير جنس'' (درمختار ۷/ ۲۰۲ دار الکتاب)

الف- روپئے سے سونا چاندی ادھار خریدنے کا حکم:

چونکہ یہ بیع صرف نہیں ہے اس لئے اس طرح ادھار خرید وفروخت کرنا کہ رقم کچھ بوقت عقد دے دی جائے اور کچھ کے بعد میں دینے کا وعدہ کرلیا جائے یا کل رقم ادھار رہے جائز ہے، شرط یہ ہے کہ احد العوضین پر مجلس عقد میں قبضہ ہوجائے تا کہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے، جس طرح فلوس سے سونے کی بیع ادھار درست ہے۔

''تنبيه: سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة، فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين لما في البزازية: لو

---

[1] مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور، یوپی۔

اشتری مائة فلس بدرهم یکفی التقابض من أحد الجانبین'' (شامی ۷/ ۲۱۴ دار الکتاب دیوبند)۔

''روی الحسن عن أبي حنیفة: إذا اشتری فلوسا بدراہم ولیس عند ہذا فلوس ولا عند الأخر دراہم ثم إن أحد ہما دفع وتفرقا جاز وإن لم ینقد واحد منہما حتی تفرقا'' (فتاوی عالمگیری ۳/ ۲۲۳ دار الکتاب دیوبند)۔

ب-حکومت کے طے کردہ نرخ سے زیادہ یا کم میں فروخت:

سونے چاندی کا جو نرخ حکومت یا سونے کی مارکیٹ (کومکیس گولڈ مارکیٹ یا ایم سی) نے طے کیا ہے یہ تسعیر ہے اس نرخ سے زیادہ یا کم قیمت میں، خرید وفروخت کرنا تسعیر اور قانون کی خلاف ورزی ہے، حکومت کی اطاعت جائز امور میں ضروری ہے اور مخالفت کرنے والا مجرم مستحق سزا اور ذلیل ہوتا ہے اور اپنے کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے حتی الوسع یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

''قال رسول اللہ ﷺ لاینبغی المؤمن أن یذل نفسه قالوا وکیف یذل نفسه قال یتعرض مفسد البلاء لما لایطیقه'' (سنن ترمذی ۲/ ۵۱ مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

لیکن دوسری طرف اس کمی بیشی کو ربوالفضل بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ روپے سے سونے کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے اور مالک کو شرعاً اختیار ہے کہ اپنی مملوکہ چیز جس قیمت پر چاہے فروخت کردے۔

''لأن الثمن حق العاقد فإلیه تقدیره فلا ینبغي للإمام أن یتعرض لحقه إلا إذا تعلق به دفع ضرر العامة... کل یتصرف فی ملکه کیف شاء'' (ہدایہ ۴/ ۴۷۱ یاسر ندیم اینڈ کمپنی دیوبند)۔

۲-کاریگر کا تاجر سے متعینہ مقدار میں سونا لے کر زیور سازی کا معاملہ بیع ہے یا اجارہ؟

سوال ۲ میں ذکر کی ہوئی تفصیل کے مطابق زیور بنانے والے کاریگر اور زیورات کے تاجر کے درمیان ہونے والے معاملہ کی دو شکل ہے:

۱- کاریگر تاجر کے سونے سے زیور تیار کر کے چند دن بعد واپس کرے، اس صورت کا حکم یہ ہے کہ یہ معاملہ عقد اجارہ ہے اور درست ہے اور اجرت دوسری دھات کی آمیزش کے بقدر سونے کے بچے ہوئے ذرات ہیں جس کی مقدار کاریگر اور تاجر دونوں کو معلوم ہوتی ہے، یا بعد میں معلوم ہوجاتی ہے اس طرح کی جہالت مفضی إلی النزاع نہ ہونے کی وجہ سے مانع جواز نہیں ہے۔

۲- کاریگر، تاجر کے سونے سے زیور تیار نہ کرے بلکہ اپنے سونے سے زیور تیار کر کے چند دن بعد واپس کرے۔ اس پر بیع کی تعریف صادق آتی ہے اور کاریگر کے سونے پر قبضہ کرتے وقت کے معاملہ کو وعدہ بیع کہا جائے اور بیع کا انعقاد اس وقت ہو جب کاریگر تیار شدہ زیور تاجر کو حوالہ کرے اور مجلس عقد میں عوضین پر قبضہ اس طرح متحقق ہے کہ تاجر کا سونا کاریگر کے قبضہ میں پہلے سے موجود ہے اور تاجر کا قبضہ تیار شدہ زیور کی سپردگی کے وقت پایا جاتا ہے تو عوضین میں سے کسی کا ادھار ہونا لازم نہیں آتا ہے، بیع الزیتون بالزیت اور بیع السمسم بالشیرج کی طرح یہ بیع درست ہونی چاہئے کہ تاجر کا سونا مثلاً ایک ہزار گرام ہے اور کاریگر کے تیار کردہ زیور میں سونا نوسو گرام ہے تو نوسو گرام کے عوض میں اور سو گرام دوسری دھات کے عوض میں ہوگا، لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ کاریگر کا قبضہ قبضہ امانت ہے جس کا حکم یہ ہے کہ وہ قبضہ ضمان (یعنی بیع کے قبضہ) کے لئے کافی نہیں ہوتا بلکہ تجدید قبضہ ضروری ہے جو یہاں مفقود ہے اس لئے ناجائز ہے۔

''وإن کانت ید المشتری یداً مانة کیدالودیعة والعاریة لایصر قابضا'' (بدائع)۔

اور اگر کاریگر اور تاجر کے مابین ہونے والے معاملہ کو عقد سلم اور تاجر کے سونے کو رأس المال اور کاریگر کے تیار کردہ زیور کو مسلم فیہ قرار دیا جائے تب بھی یہ معاملہ جائز نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ بتصریح فقہاء بیع سلم اثمان میں صحیح نہیں ہے: ''لایصح السلم فی الأثمان'' (شامی ۷/ ۳۱۵)۔

حاصل یہ ہے کہ اگر کاریگر اپنے سونے سے تیار کر کے چند دن بعد واپس کرتا ہے تو اسے اجارہ نہیں کہا جاسکتا بلکہ بیع ہے اور ناجائز ہے اس لئے ضروری ہے کہ کاریگر تاجر کے سونے سے زیور تیار کرے تاکہ یہ معاملہ اجارہ کے دائرے میں داخل ہو کر درست ہو۔

سونے کے پرانے زیور کا تبادلہ نئے زیور سے:

سونے کے پرانے زیور کا نئے زیور سے اس طرح تبادلہ کیا جائے کہ پرانے زیور کی قیمت میں جو کمی ہے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے پرانا زیور وزن میں زیادہ لیا جائے اور اس کے بدلے نیا زیور وزن میں کم ادا کیا جائے یہ جائز نہیں ہے کیونکہ اموال ربویہ میں جو تماثل اور برابری مطلوب ہے وہ مقدار میں برابری ہے قیمت میں برابری اور تماثل مطلوب نہیں ہے بلکہ اموال ربویہ میں قیمت اور وصف کے تفاوت کا بالکل اعتبار نہیں ہے۔

''قوله جيد مال الربوا ورديئه سواء-أی فلا يجوز بيع الجيد بالردی مما فيه الربوا إلا مثلا بمثل لإهدار التفاوت فی الوصف''(شامی۷/ ۳۱۳)،''ويشترط التماثل أی التساوی وزنا والتقابض بالبراجم لا بالتخلية''(درمختار۷/ ۴۰۳ دارالکتاب دیوبند)۔

''فلوتجانسا شرط التماثل والتقابض أی النقد ان بأن بيع أحدهما بجنس الأخر فلا بدلصحته من التساوی وزنا... الخ''(البحر الرائق ۶/ ۲۲۲ زکریا بکڈپو)۔

حیلہ جواز:

جواز کا حیلہ یہ ہے کہ سونے کا پرانا زیور جس کی مقدار مثلاً ۱۰۰ گرام ہے اور قیمت ایک لاکھ ہے دوسرے نئے سونے سے جس کی مقدار مثلاً ۹۰ گرام ہے اور قیمت ایک لاکھ ہے تبادلہ نہ کرے، بلکہ پرانا سونا ایک لاکھ میں فروخت کردے پھر نیا سونا اس ایک لاکھ روپئے سے خرید لے، اس طرح کا حیلہ آپ ﷺ سے منقول ہے، صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنا کر بھیجا وہ عامل جب واپس آئے تو حضور ﷺ کی خدمت میں جنیب (عمدہ قسم کی کھجور) پیش کیں، حضور ﷺ نے سوال کیا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہم اس (عمدہ کھجور) کے ایک صاع کو (گھٹیا کھجور کے) دو صاع کے بدلے میں اور دو صاع کھجور کو تین صاع کے بدلے میں تبدیل کر لیتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا ایسا مت کرو بلکہ جمع کھجور (مختلف قسم کی ملی جلی کھجوریں) کو پہلے دراہم کے عوض فروخت کردو پھر ان دراہم سے جنیب کھجور خرید لیا کرو (صحیح البخاری ۱/ ۲۹۳، صحیح مسلم ۲/ ۲۶۰ مکتبہ بلال دیوبند)۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اموال ربویہ میں جو برابری مطلوب ہے وہ مقدار میں برابری ہے، قیمت میں برابری مطلوب نہیں ہے اس لئے کہ جنیب کھجور جمع کھجور کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کی قیمتی اور عمدہ تھی لیکن حضور پاک ﷺ نے کھجور کی ایک قسم کو دوسری قسم سے تبدیل کرنے کی صورت میں عمدہ اور گھٹیا ہونے کا بالکل اعتبار نہیں کیا بلکہ وزن میں برابری کو ضروری قرار دیا۔

خریدار کے آرڈر کے بقدر سونا اس کے نام سے محفوظ کرنے کا حکم:

نقدین محض متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے جب تک کہ اس پر خود یا اپنے وکیل کے ہاتھ سے قبضہ نہ کر لیا جائے صرف تخلیہ کافی نہیں ہے اس لئے محض خریدار کے آرڈر کے بقدر سونا اس کے نام سے محفوظ کردینے سے قبضہ کا تحقق نہیں ہوگا۔

الف-خواہ اس کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو یا

(ب)-اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ یا بسکٹ الگ سے موجود ہو اور کمپیوٹر اور ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کردیا گیا ہو۔

''إن الدراهم والدنانير وإن كانت لاتتعين بالعقد ولكنها تتعين بالقبض وقبضها واجب''(بدائع الصنائع۴/ ۳۵۷)

''إن الدراهم والدنانير لا تتعين بالتعيين وإنما تتعين بالقبض فشرطنا التقابض للتعيين لا للقبض'' (ایضا/ ص۴۵۹)

''ويشترط التماثل أى التساوى وزنا والتقابض بالبراجم لا بالتخلية. قوله لا بالتخلية أشار إلى أن التقييد بالبراجم للإحتراز عن التخلية وإشتراط القبض بالفعل'' (شامی ۷/ ۴۰۳ دار الکتاب دیوبند)۔

البتہ اگر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو جیسا کہ سوال کے جزء (ب) میں اس کا ذکر ہے تو معاملہ درج ذیل شرطوں کے ساتھ حد جواز میں داخل ہوسکتا ہے۔

۱- بیع بات (یقینی) ہو صرف آرڈر نہ ہو۔

۲- مشتری اپنی خریدی ہوئی مقدار کے سکہ پر قبضہ کرنے کا خود بائع کو وکیل بنادے اور بائع نیابۃ اس کی طرف سے قبضہ کرلے۔

۳- خریدی ہوئی مقدار کا سونا مبیع سے الگ ہونے کے ساتھ ساتھ مشتری کے ضمان میں اس طرح آجائے کہ اگر وہ متعینہ سونا ہلاک ہوجائے تو نقصان مشتری کے ذمہ سمجھا جائے (مستفاد از فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۳ نعیمیہ دیوبند)۔

سونے پر قبضہ نہ کرکے صرف ڈیفرنس برابر کرنے کا حکم:

اس کاروبار میں خریدار اپنے خریدے ہوئے سونے پر قبضہ نہیں کرتا ہے بلکہ ادائیگی کی تاریخ پر سونے کا نرخ دیکھ کر اگر نفع ہوا تو خریدار بائع کو صرف نفع ادا کرتا ہے اور اگر نقصان ہوا تو خریدار بائع سے صرف نقصان واپس لے لیتا ہے نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے اور نہ بائع ثمن پر بلکہ صرف کاغذی طور پر کارروائی ہوتی ہے اور آخر میں نرخ کی کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے اس کا لین دین کرکے نفع نقصان کا تناسب برابر کرلیا جاتا ہے نہ تو عوضین پر قبضہ ہوتا ہے اور نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے کاروبار کی اس صورت پر بیع کی تعریف صادق نہیں آتی کیونکہ بیع کا مقصد تسلیم وتسلم ہے وہ یہاں مفقود ہے اصل مقصود تو ڈیفرنس برابر کرنا ہے صرف بیع کا نام رکھ دینے سے شرعا اس کو بیع نہیں کہا جاسکتا یہ سٹہ بازی ہے جو بالکل حرام ہے شریعت میں اس کی اجازت نہیں ہے (مستفاد از فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۳)۔

''العبرة للمعانى'' (شامی ۹/ ۱۱۰ دار الکتاب دیوبند)۔

''العقد إذا خلا عن مقصوده لا يكون منعقدا أصلا'' (مبسوط/ ص۱۱۵)۔

''إن السبب إنما يلغو إذا خلا عن الحكم شرعا'' (مبسوط ۱۲/ ۱۵۵ دار المعرفہ)۔

کیا گرانی کے انتظار میں سونا روکنا احتکار ہے؟

مفتی بہ قول کے مطابق احتکار کی ممانعت انسان اور حیوان کی غذائی چیزوں سے متعلق ہے، ہر قسم کی اشیاء ضروریہ کو گرانی کے انتظار میں روکے رکھنا احتکار نہیں ہے اس لئے سونا گو خلقۃ ذریعہ تبادلہ ہونے کی وجہ سے اشیاء ضروریہ میں شامل ہے لیکن اس کو ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی کے لئے روکنا احتکار میں شامل نہیں ہے۔

''فى الدر المختار: وكره إحتكار قوت البشر كتبن وعنب ولوز والبهائم كتبن وقت فى بلد يضر بأهله''۔

''وفى ردالمحتار: التقييد بقوت البشر قول أبي حنيفة ومحمد عليه الفتوى كذا فى الكافى وعن أبي يوسف كل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتكار'' (شامی ۹/ ۴۸۶ دار الکتاب دیوبند)۔

سونے چاندی کی اسمگلنگ کا حکم:

اسمگلنگ کا یہ غیر قانونی عمل دو وجہ سے درست نہیں ہے:

۱- ایک تو اس لئے کہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ جو کام معصیت اور گناہ نہ ہو اس میں حکومت کی اطاعت واجب ہے۔

۲- دوسرے اس لئے کہ جو شخص جس ملک میں قیام پذیر ہوتا ہے وہ قولا یا عملا اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جب تک ملک کے قوانین کسی گناہ کے کرنے پر مجبور نہیں کریں گے وہ قوانین کی ضرور پابندی کرے گا، اور مخالفت کرنے والا مستحق سزا اور ذلیل ہوتا ہے اور اپنے کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے اس لئے ان قواعد کے پیش نظر اسمگلنگ کا غیر قانونی طریقہ درست نہیں ہوگا، اس لئے حتی الوسع اس سے احتراز نہ کیا جائے۔

''طاعة الإمام فيما ليس بمعاصية واجبة'' (شامی ۳/ ۵۰)۔

''كل من يسكن دولة فإنه يلتزم قولا أو عملا أنه يتبع قوانينها وحيئنذ يجب عليه إتباع أحكامها ما دامت تلك القوانين لاتجبره على معسية دينية'' (فقه البيوع ۲/ ۷۳۸)۔

''قال رسول الله ﷺ لاينبغي للمؤمن أن يذل نفسه قالوا وكيف يذل نفسه قال يتعرض من البلاء لما لايطيقه'' (ترمذی ۲/ ۵۱)۔

لیکن دوسری طرف اس طریقے پر آنے والے سونے کی خریداری اور اس کے منافع کو حرام بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ مالک اپنا مال رضامندی کے ساتھ بیچ رہا ہے اور وہ اس میں مکرہ کے درجہ میں بھی نہیں ہے جس طرح تسعیر کی خلاف ورزی کی صورت میں بیع درست ہوتی ہے جیسا کہ ذیل کی عبارت کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے۔

''ومن باع منهم بماقدره الإمام صح لأنه غير مكره على البيع۔ قالوا فيمن صادره السلطان بمال ولم يعين بيع ماله فصار يبيع أملاكه بنفسه ينفذ بيعه لانه غير مكره على البيع'' (شامی ۹/ ۴۸۹ دار الکتاب)۔

عقود وزکوۃ میں پلاٹین کا حکم:

پلاٹین خلقۃ سونا نہیں ہے اور نہ بطور ثمن کے تبادلہ کا ذریعہ ہے اس لئے محض عرف میں سونا کہے جانے کی وجہ سے اس پر زکوۃ اور عقود وغیرہ میں سونے کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

''وهو (الصرف) بيع الثمن بالثمن أى ماخلق للثمنية ومنه المصوغ جنسا بجنس أو بغير جنس'' (درمختار ۷/ ۴۰۲)

''لا زكوة فى الآلى والجواهر وإن سادت الفا إتفاقا إلا أن يكون للتجارة والأصل أن ماعد الحجرين والسوائم إنما يزكى بنية التجارة'' (درمختار مع الشامی ۳/ ۱۸۰ دار الکتاب)۔

☆☆☆

سونے چاندی کی تجارت کی شرعی حیثیت

مولانا محمد اشرف قاسمی گونڈوی[1]

۱-سونے چاندی کی، روپیوں سے ادھار خرید وفروخت:

۱- اشیاء ستہ ربویہ کیلی اور وزنی ہیں، اسی لیے تحقق ربا کے لیے علت ''جنس'' کے ساتھ علت ''قدر'' کا پایا نا بھی ضروری ہے، مختلف فقہی مجالس اور علماء کی تحقیقات کے مطابق ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک کی کرنسی سے الگ جنس ہے، روپے قدر میں بھی مکیلی اور موزونی نہیں بلکہ عددی ہیں، البتہ مکیلی اوموزونی نہ ہونے کے باوجود عرف میں وہ ثمن ہیں، اس لیے ربا کے سلسلے میں ایک ہی ملک کی کرنسی کا باہم تبادلہ کی زیادتی کے ساتھ ربا کی تعریف میں آئے گی؛ لیکن دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلے میں کمی زیادتی ربا کی تعریف میں نہیں آئے گی، کیوں کہ:

''الصرف... فی الشرع: ھو بیع الأثمان بجنسها'' (مختارات النوازل ۲/ ۲۲۳)۔

بنابریں اختلاف جنس وقدر کی وجہ سے، اگر روپے سے سونا چاندی خریدا جائے تو یہ صرف نہیں ہے؛ اس لیے:

الف: یہ بات درست ہے کہ سونا، چاندی اور روپے میں ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار۔

''إذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم'' قال المحشی حفظه الله، وروی مسلم عن عبادة بن الصامت أن رسول الله ﷺ قال: ''... إذا اختلف ھذه الأصناف فبیعوا کیف شئتم'' (کتاب المساقات باب الصرف و بیع الذھب بالورق نقدا)، والدار القطنی عنه و عن انس بن مالك عن النبی ﷺ أنه قال"... فإذا اختلف النوعان فلا بأس به"(البیوع۲۶/ ۱۸، مختارات النوازل ۲/ ۲۲۸/ ایضا)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں: ''لہذا کرنسی اور سونے چاندی کے تبادلہ کی صورت میں نہ مجلس میں قبضہ ضروری ہوگا اور نہ مقدار میں مماثلت، نقد ادھار خرید وفروخت بھی جائز ہوگی'' (قاموس الفقہ جلد ۴/ ۲۲۶)۔

قیمتوں کی تسعیر وتقدیر:

ب۔ اشیاء، خاص طور پر ماکولات کی قیمتوں کی تقدیر وتعیین کرنا منع ہے؛ حتی کہ قحط کے دنوں میں بھی حکومت کو قیمتوں کی تعیین سے منع کیا گیا ہے، صاحب مال جو کہ اپنے مال کا مالک ہے وہ اور خریدار دونوں اپنی رضا اور خوشی سے قیمتیں طے کر کے خرید وفروخت کرنے میں پوری طرح آزاد ہیں۔ حکام کی طرف سے قیمتوں کی تعیین میں بائع ومشتری کو بیع بالتراضی (جو اللہ نے انہیں دی ہے) سے محروم کرنا ہے۔

"یاأیها الذین آمنوا لاتأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم" (سورۂ نساء:۲۹)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

''عن أبی حرة الرقاشی عن عمه قال قال رسول الله ﷺ ألا لاتظلموا ألا لایحل مال امرئٍ إلا بطیب نفس منه'' رواہ البیھقی فی شعب الإیمان والدار قطنی فی المجتبی (مشکوۃ، حدیث نمبر:۲۹۴۶/ ص۲۵۵)۔

ایک دوسری روایت میں قیمتوں کی تسعیر سے صاف صاف منع فرمایا، روایت اس طرح ہے:

---

[1] مفتی دار الافتاء شہر مہد پور، ضلع اجین، مدھیہ پردیش۔

"إنه سعر فی المدینة فطلبوا التسعیر من رسول الله ﷺ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: إن الله تبارك وتعالی هو المسعر القابض الباسط" (بدائع الصنائع ۵/ ۱۳۰/ بیروت)۔

حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ رعیت کی جان، مال، عزت، مذہب، ذریعہ معاش کو پورا تحفظ فراہم کرے، رعایا کسی بھی مذہب یا قوم سے تعلق رکھتی ہو۔ اسلام میں اس کو یہ پانچوں حقوق حاصل ہوتے ہیں، اشیاء کی گرانی سے اگر عوام کی ان پانچوں میں سے کوئی ایک بھی متاثر ہونے لگے تو پھر حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کی حفاظت کا بندوبست کرے، خاص طور پر لازمی اور ضروری اشیاء کی قیمتوں کی تقدیر وتسعیر سے ممانعت کی وجہ یہی ہے کہ مالی معاملات میں لوگوں کی آزادی سلب نہ ہونے پائے؛ اسی لیے جب اس قسم کی اشیاء گراں فروخت کی جانے لگیں اور لوگوں کو مشکلات یعنی جان ومال عزت وغیرہ کو نقصان در پیش ہو، تو ایسی صورت میں حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ایسی لازمی وبنیادی چیزوں کی قیمتیں مقرر کردے۔

ایک مستند طبیب اور میڈکوز ہونے کی حیثیت سے راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ: ادویہ میں بے شمار دوائیں انتہائی رخیص اور سستی ہوتی ہیں، مثلاً سپر وفلاکساسین ۵۰۰ ایم جی کی قیمت، ڈاکٹر تک پہنچتے پہنچتے زیادہ سے زیادہ ۱۲ / یا پندرہ روپیہ کی دس گولیاں ہو جاتی ہیں، لیکن مریض سے ان دس گولیوں کی قیمتیں، پرنٹ کے لحاظ سے ۸۰ / یا ۱۲۰ / روپے کی شکل میں وصولی جاتی ہیں، ایسی بے جوڑ، قیمتوں اور گران فروشی پر روک لگا کر غریبوں کو زندگی کا سامان کرنا سرکار کی ذمہ داری ہے، یہی مثال ماکولات کی بھی ہے، اگر بے جوڑ اور غبن فاحش کے ساتھ اشیاء کی فروخت ہونے لگے تو پھر حکومت ایسے موقعوں پر قیمتوں کی تعیین وتقدیر کا حق رکھتی ہے۔

"ولا یسعر السلطان إلا أن یتعدی أرباب الطعام عن القیمة تعدیا فا حشا" (کنز الدقائق / ص۴۲۷)۔

"وفی الحاشیة برقم ۴/ قوله: إلا أن یتعدی....الخ أی لایسعر السلطان إلا إذا تعدی أرباب الطعام بالتحکیم علی المسلمین تعدیا فاحشا وعجز السلطان عن صیانة حقهم إلا بالتسعیر فلا بأس به حینئذٍ بمشورة أهل الرائی والنظر. ولا یسعر إلا إذا أبوا أن یبیعوا إلا بغبن فاحش ضعف القیمة" (الحاشیة برقم ۴/ علی کنز الدقائق / ص۴۲۷)۔

سونے کی گرانی اور ارزانی سے عوام کے پانچوں بنیادی حقوق پر کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکتا ہے، اس لیے ان کی قیمتوں کی تعیین وتقدیر میں حکومت کو دخیل بن کر تاجروں وخریداروں کی آزادی پر ضرب نہیں پہنچانی چاہئے، البتہ سونے چاندی کی درآمدات سے بالواسطہ طور پر ملک کی معیشت کے ساتھ ہی خارجہ پالیسیاں بھی مستحکم ہوتی ہیں۔ جس کا فائدہ ملک کی عوام کو بھی پہونچتا ہے، اس لیے حکومت کی طرف سے ان کی قیمتوں کو متعین کرنے سے ایک گونہ ملکی مفادات حاصل ہوتی ہیں۔ اس تعیین سے ایک سرسری قیمت عام لوگوں میں چل پڑتی ہے۔ جس کے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس لیے شرعی طور پر ایسی تعیین وتقدیر درست ہے۔ جیسا کہ ایم پی حکومت کسانوں کو نقصان سے بچانے کے لیے گیہوں وغیرہ فصلوں کو خریدتی ہے، جس دام میں سرکار، پیداوار کو لیتی ہے عموماً بازار میں وہی بھاؤ جاری ہو جاتا ہے۔ حکومت کے اس عمل سے نہ کسانوں کا نقصان ہوتا ہے اور نہ عوام کو غبن فاحش کا شکار ہونا پڑتا ہے، اس کے باوجود اشیاء کی خرید وفروخت کے لیے عوام پر سرکار کی طرف سے طے کردہ قیمت لازم نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح سونے چاندی کی خرید وفروخت کے تعلق سے حکومت کا عمل ہونا چاہئے، ممکن ہے یہ جذبات سرکار کے ہوں۔ ایسی صورت میں سرکار کا عمل، استحباب وجواز کے دائرے میں آتا ہے۔ لیکن سونے چاندی کی گرانی اور ارزانی سے عام لوگوں کے لیے بنیادی پانچوں حقوق متاثر نہیں ہوتے، اس لیے حکومت کے ذریعہ مقررہ قیمتوں پر بیچنا اور خریدنا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ حکومت کی طے کردہ قیمتوں کے علاوہ قیمتوں سے بھی خرید وفروخت جائز ہے، اس صورت میں ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوسکتا ہے۔

نوٹ: زیر بحث مسئلہ کے "جزء ب" سے متعلق کچھ فقہی اقتباسات جواب نمبر ۷ / کے ذیل میں آئیں گے۔

۲- سونے سے نکلنے والے ذرات صانع کی اجرت:

۲- "قال شیخ الإسلام برهان الدین المرغینانی: ولا تصح الإجارة حتی تکون المنافع معلومة والأجرة معلومة، لان الجهالة فیها تفضی إلی المنازعة کجهالة الثمن والمثمن فی عقد البیع وبیان جنس العمل وبیان للمدة کالخیاط" (مختارات النوازل جلد ۳ / ۳۵۵)۔

مذکورہ بالا تصریحات میں عقد اجارہ کی جائز شکل وطریقے کا بیان ہوا ہے، ساتھ ہی اجرتِ خدمت کے استحقاق کے بارے میں ائمہ کا اختلاف بھی بتلایا گیا ہے، لیکن صورت مسئلہ پر اس اختلاف سے جواز اور عدم جواز کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، تاجر نے کاریگر کو مخصوص مقدار میں سونا دیا، اور اجرتِ صنعت کے بارے میں دونوں کو معلوم ہے کہ ''زیوارات بناتے وقت اس مقدار سونا میں لازمی طور پر کسی دوسری دھات کی آمیزش ہوتی ہے، اس دھات کی مقدار وزن سے، دیے گئے سونے میں کمی ہوتی ہے''، اور جانبین کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے: ''دھات کی آمیزش اور سونے کی کمی میں غبن نہیں ہوگا''۔

خاص طور پر تاجر بہر حال اس پر نظر رکھتا ہے کہ ''کاری گر زیادہ سونا نہ نکال لے''، اس لحاظ سے تاجر کی طرف سے کاریگر کو دیے گئے سونے کی مقدار کے ساتھ ہی، کاری گر کی مزدوری طے ہو جاتی ہے۔ جس میں کوئی ابہام اور غرر نہیں ہوتا ہے، اور اس میں قفیز طحان کی شکل نہیں پائی جاتی ہے؛ کیوں کہ مخصوص مقدار میں سونے کے جو ذرات حاصل ہوئے ہیں وہ دھات کی لازمی آمیزش کے کی وجہ سے لازمی طور پر نکلے ہیں، وہ ذرات، کاری گر کی محنت کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ وہ مستقل مالیت ہیں اور کاری گر کی محنت وہ ہے جو اس نے دھات کی آمیزش سے زیور بنانے میں صرف کی ہے، اس لیے متعین مقدار میں ذرات کو بطور اجرت ٹھہرانا اور لینا، اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے۔ بنا بریں

الف۔ سونے کی لین دین میں مقدار کا جو یہ فرق ہو رہا ہے وہ اجارہ ہوگا۔

ب۔ سونے کے وزن کے تناسب سے اس میں آمیزش کی جانے والی دھاتوں کی مقدار لازمی طور پر طے کی جائے اور اسی تناسب سے دھاتوں کی آمیزش کی جائے، اس طرح صاف طور پر ذرات کی مقدار یعنی کاری گر کی اجرت بھی معلوم ہو جائے، تو اُسے بطور اجرت، کاری گر کو دینا اور لینا جائز ہے۔

۳- قدیم وجدید سونے کا باہم تبادلہ:

۲ قال شیخ الاسلام برهان الدین المرغیناني: ''[۴۱۹]... ولا اعتبار للجودة والصنعة في الفضة والذهب في حق الصرف، والتبر المضروب والمصوغ وغیره سواءٌ لإ طلا ق النص. وفي الحا شیة: ''قال أبو بکر: قال رسول الله ﷺ: لاتبیعوا الذهب با لذ هب إلا سواء بسواء، والفضة با لفضة إلا سواء بسواءٍ'' (البخا ری، باب بیع الذهب ا/ ۲۹۰، مختا رات النوازل جلد۲/ ص۲۲۵/ ایفا)۔

''[۴۲۵] رجل له عشرة دراهم صحاح، فأراد أن یشتري بها إثنا عشر مکسرة لایجوز لأنه ربا. فالحیلة فیه أن یقرض صاحب الدراهم المکسرة دراهم المکسرة، ثم یقبض من صاحب الصحاح عشرة صحیحة. و یبرأ عن درهمین'' (مختا رات النوازل جلد۲/ ص۲۲۷، طبع اسلامك فقه اکیڈمی، انڈیا)۔

سونے کا سونے سے تبادلہ ہو یا چاندی کا چاندی سے تبادلہ ہو، قدامت اور جودۃ کا اعتبار کرتے ہوئے وزن میں کمی زیادتی جائز نہیں ہے، کمی زیادتی سود ہے، اس لیے حرام ہے، ایسی صورت میں جواز کا راستہ یہ ہے کہ پرانا زیور جس وزن میں ہو، پہلے اس کی قیمت طے کی جائے، اور پھر روپے سے دوسرا نیا زیور لینے کا عقد کیا جائے، اس طرح پرانا زیور جو بیچا گیا، اس پُرانے زیور کے بدلے میں حاصل ہونے والے روپے سے نیا زیور خریدنا جائز ہوگا، یہ حیلہ جواز خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا ہے۔

في حا شیة مختارات النوا زل: '' عن أبي سعید الخدري من عدة طرق. فأخرجه عنه أحمد في مسنده أنه قال: جاء (ﷺ) صا حب تمرة بتمرة طیب، وکان تمر النبي (ﷺ) یقال له اللون. قال: فقال له رسول الله ﷺ: من أین لك هذا التمر الطیب؟ قال ذهبتُ بصا عین من تمرنا. واشتریتُ صاعا من هذا. قال، فقال: رسول الله ﷺ أربیت!(۳/ ۱۰، دیکھئے:۳/ ۴۵،۶۰،۶۲،۶۷)، وأخرج البیهقي عنه قال: قال رسول الله ﷺ اربیت، إذا أردتَ ذالك فبع تمرك بسلعة. ثم اشتر بسلعتك أي تمر شئتَ!(السنن الکبری، باب من قال بجریان الربا في کل ما یکال و یوزن،۵/ ۲۸۶، حا شیة علی مختا رات النوازل ۲/ ۲۲۲، طبع ایفا)۔

لہذا براہ راست ردی سونے کا تبادلہ جید سونے سے وزن میں کمی بیشی کے ساتھ قطعی جائز نہیں، البتہ ردی سونے کی قیمت طے کی جائے اور اس قیمت کے بدلے میں جید سونے کی قیمت طے کی جائے تو یہ صورت جائز ہے۔

۴- سافٹ ویئر قبضہ:

کمپیوٹرائز ایکسچینج میں قابل غور اصل نکتہ ''قبضہ'' ہے، قبضہ جب بولا جاتا ہے تو ایسا ذہن میں آتا ہے کہ مشتری کے ہاتھ میں مبیع آجائے، یا مشتری اس پر کامل طور پر متصرف ہوجائے، قبضہ کی یہی تعریف یہ عام حالات میں تسلیم کی جاتی ہے، عقار جیسی غیر منقولہ مبیعات میں قبض بالبراجم کے بجائے، بائع کی طرف سے مشتری کو اس میں اختیارات تصرف حاصل ہوجانا، قبضہ مانا جاتا ہے، وہاں قبض بالبراجم ضروری نہیں ہے، یعنی اشیاء اور حالات کے اختلاف سے مبیع پر قبضے کی تعریف بدلتی رہتی ہے۔

قال العلامة الكاساني: ''قبضه: هو التمكين بالتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة وحقيقة۔'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۴. مزید دیکھئے: ردالمحتار ۷/ ۹۵، ۹۴)۔

قبضہ کی مختلف صورتیں یہ ہیں:

۱- فروخت شدہ گیہوں، بائع کے گھر میں ہے اور بائع نے مشتری کو گھر کی چابی دے دی، گھر کھولنے بند کرنے میں مشتری کے لیے کوئی مانع نہیں رہا تو غلہ پر مشتری کا قبضہ ہوگیا۔

۲- مبیع اثمار، بائع کے اشجار پر ہیں، توڑنے اور کاٹنے سے بائع کی طرف سے آزادی دے دی گئی ہے، تو اثمار علی اشجار البائع ہونے کی باجود، اس پر مشتری کا قبضہ مانا گیا ہے۔

۳- مشتری نے بائع کی اجازت کے بغیر، ثمن (Cost) ادا کرنے سے پہلے ہی مبیع کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد، ثمن پر بائع سے قبضے کا مطالبہ کیا اور اس نے ثمن پر قبضہ کے لیے موانع ہٹالیا اور تو جب تک ہاتھ سے بائع قبضہ نہ کرلے، قبضہ نہیں ہوگا۔

۴- بائع کو ابھی ثمن نہیں ملا۔ پھر بھی اس نے مشتری اور مبیع کے درمیان قبضہ کے لیے تخلیہ کر دیا ہے، تو یہی تخلیہ قبضہ مانا جائے گا۔

کمپیوٹر میں مشتری کے نام سے کسی شیٔ کا اندراج اس طور پر ہو کہ اس سے متعلق تاجر کے جملہ شعبہ جات، حکومت کے متعلقہ محکموں اور خود بائع کی سائٹ کے ساتھ، مشتری کی سائٹ، ای میل یا موبائل پر اطلاعات آجائیں، اس طرح آن لائن اندراج کے بعد بائع قانونی طور پر اس شیٔ کے تعلق سے مالکانہ حق سے دست بردار ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد بائع سامان کی حوالگی سے انکار نہیں کرسکتا ہے، اس شیٔ پر مشتری کو تصرف کا پورا اختیار حاصل ہوجاتا ہے، اس لیے ''إثمار علی الأشجار، حنطة فی بیت البائع'' کی طرح وہ سامان بائع کے پاس رہتے ہوئے بھی مشتری کی ملکیت میں آجاتا ہے، اس لیے کمپیوٹر میں اس طرح مشتری کے نام سے مبیع کا اندراج ہی اس پر مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا، چونکہ یہاں بائع کی طرف سے مشتری کو قبضہ دلایا جاتا ہے، اس لیے اگر مشتری نے ثمن نہ ادا نہ کیا ہو تو بھی شرعی قبضہ پالیا جائے گا، اگرچہ وہ چیز ہاتھ میں نہ آئی ہو، جیسے

''اثمار علی الاشجار، حنطة فی البیت، متصلة بملك البائع'' وغیرہ۔

سونے کی اینٹ میں شامل مثلاً ۵۰ /گرام سونا خریدنا:

الف: فی الرد المحتار: بخلاف بیع قن ضم إلی مدبره أو نحوه فإنه یصح۔ وفی الدر المختار: علم من هذا ما یقع کثیرا وهو أن أحد الشریکین فی دارٍ ونحوها یشتری من شریکه جمیع الدار بثمن معلوم فإنه یصح علی الأصح بحصة شریکه من الثمن'' (الدر المختار ۷/ ۲۴۳، طبع زکریا)۔

''وأیضا فی رد المحتار: استحق بعض المبیع فإن کان استحقاقه قبل القبض للکل خیر فی الکل لتفرق الصفقة وإن بعده خیر فی القیمی لا فی غیره لأن تبعیض القیمی عیب لا المثلی ۔ وفی الدر المختار: حاصل ما ذکره المصنف۔۔۔لو استحق بعض المبیع قبل قبضه بطل البیع فی قدر المستحق، ویخیر المشتری فی الباقی سواء اورث الاستحقاق عیبا فی الباقی اولا، لتفرق الصفقة قبل التمام، وکذا لو استحق بعد قبض بعضه، سواء استحق المقبوض أو غیره، یخیر لما مر من التفرق۔ ولو قبض کله فاستحق ولو لم یورث عیبا فیه کثوبین أوقنین استحق أحدهما أوکیلی أو

وزنی استحق بعضه ولا يضر تبعيضه فالمشتري يأخذ الباقي بلا خيار'' (الدر المختار ۷/ ۲۰۶، طبع زکریا)۔

بائع جب ایک کلوسونے کو دوسوحصوں میں پچاس پچاس گرام کی اکائیاں بنا کر فروخت کرتا ہے۔ تو ظاہری بات ہے کہ کسی مشتری نے ایک یونٹ یا دو یا جتنی بھی یونٹ خریدی تو اس میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ اور آن لائن کمپیوٹرائزڈ اندراج کے بعد اپنی مطلوبہ یونٹ کا مستحق ہوجاتا ہے۔ اس لیے بائع کے پاس ایک کلوسونے کی اینٹ میں اس کی یونٹ شامل ہے یا بسکٹ اور سکوں کی صورت میں، اس سے صحت عقد پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی یونٹ، اینٹ میں شامل ہے تو بھی مشتری اُتنی مقدار سونے کا مستحق ہوتا ہے اور خاص طور پر اس معاملہ کے کمپیوٹرائز اندراج کی وجہ سے بائع قانونی طور پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ متعینہ مقدار میں مشتری کو سونا دے، لہٰذا مذکورہ بالا طریقے سے اندراج کے بعد، ۵۰ /گرام سونے کی ایک یا زیادہ یونٹ خریدنے والا اپنی یونٹ پر قابض مانا جائے گا۔

البتہ اگر قبل العقد با قاعدہ بائع کی طرف سے بتایا جائے کہ مشتری کا حصہ اینٹ میں شامل ہے، تو مشتری کے نام کا، مذکورہ بالا طریق پر اندراج، قبضہ نہیں ہوگا، کیوں کہ ایسی صورت میں اس کا حصہ پورے اینٹ میں شائع ہوگا، اور اس مشائعت کی وجہ اس کے حصے (یونٹ) میں بائع اور دوسرے مشتری کے حصے بھی شائع ہوں گے، بائع اور دوسرے مشتری کے حصوں کے شیوع کی وجہ سے اس پر مشتری کا قبضہ نہیں مانا جاسکتا ہے، البتہ ایسی صورت میں بھی بیع درست ہوجائے گی، اور مشتری اپنے حصے کو لے سکتا ہے۔

اس عقد کی صحت کے سلسلے میں، استحقاق مبیع کی مختلف صوتوں کی صحت اور عدم صحت کے سلسلے میں نقل کردہ فقہی عبارات کے علاوہ بیع قوائم الشجر، بیع الصوف علی الغنم کی عدم صحت پر جو دلیل دی جاتی ہے وہی یہاں اس عقد کی صحت کی دلیل ہے۔

''[۶۸۰] ويجوز بيع قوائم الشجر عليه وبيع الصفوف على الغنم عند أبي يوسف'' وفي الحاشية: ''والمتون على خلافه بأن الصوف على ظهر الغنم لا يجوز بيعه.... ولأنه قبل الجز ليس بمال متقوم في نفسه لأنه بمنزلة وصف الحيوان... ولأنه يزيد من أسفل فيختلط المبيع بغيره'' (التبیین ۴/ ۴۶، مختارات النوازل ۳/ ۲۲۵، طبع ایفا انڈیا)۔

سونا مال متقوم ہے، اپنی ذات میں اس کے تمام اجزاء مستقل ہیں، اور اس کی ذات میں اضافہ نہیں ہوتا ہے، اس لیے اینٹ میں شامل ہونے کے باوجود اس کی بیع جائز و نافذ ہے۔

نیز مبیع پر قبضہ نہ ہونے کے باوجود، سونا چوں کہ ثمن خلقی اور سلعہ مثلی ہے، اس لیے مشتری کسی دوسرے سے اپنی یونٹ فروخت کرسکتا ہے۔

''[۶۷۹] والتصرف في الثمن قبل القبض جائز، لأنه ليس فيه غرر انفساخ العقد بالهلاك لعدم تعينها بالتعيين، بخلاف المبيع.'' (مختارات النوازل ۳/ ۲۰۲، طبع ایفا انڈیا)۔

''[۶۸۶] .....وهلاك العقار نادر فيجوز بيعه قبل القبض عند أبي حنيفه وأبي يوسف رحمهما الله.۳ كالصرف في الثمن لأن الثمن في الذمة فلا يتصور الهلاك'' وفي الحاشية'' ۴ اى التصرف في الثمن قبل القبض يجوز (فتح القدير ۶/ ۴۷۵، دار الكتاب العلمية بيروت لبنان، مختارات النوازل ۳/ ۳۰۰، ایفا انڈیا)۔

ب۔ آن لائن اندراج کے بعد، قانونی طور پر بائع، اس شیء کے تعلق سے مالکانہ حق سے دست بردار ہوجاتا ہے، اس طرح اندراج کے بعد بائع سامان کی حوالگی سے انکار نہیں کرسکتا ہے، مشتری کو اس شی میں تصرف کا پورا اختیار حاصل ہوجاتا ہے، اس لیے اس قسم کا اندراج ہی مشتری کا قبضہ ہے۔

اگر اس طرح اندراج نہ ہو بلکہ صرف رجسٹر میں مشتری کا نام لکھا دیا جائے تو وہ مشتری کا قبضہ نہیں ہوگا، کیوں کہ ایسی صورت میں بائع پر قانونی گرفت بہت ڈھیلی رہتی ہے، وہ مال کی حوالگی میں ٹال مٹول کرسکتا ہے، اور ممکن ہے کہ کاغذی دستاویز کو ضائع کردے، جس سے مشتری کے لیے مبیع کا حصول مشکل ہوجائے، اس لیے غیر کمپیوٹرائزڈ اور غیر آن لائن اندراج کو قبضہ نہیں مانا جاسکتا ہے۔

۵۔ سونے کی مخصوص مقدار پر فرضی خرید و فروخت:

۵۔ بیان کردہ صورت مسئلہ میں درحقیقت بیع ہوتی ہی نہیں ہے، بلکہ قمار اور صفقة في صفقة پایا جاتا ہے، اس لیے یہ صورت ناجائز ہے۔

"یاأیها الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر الأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوه لعلکم تفلحون" (مائدہ:۹۰)

لیکن لین دین کا یہ معاملہ اتنی مختصر باتوں پر نہیں قائم ہوتا ہوگا، بلکہ اس کی کاروباری شکلوں کی تفصیل ضرور ہوگی، جس کی پوری صورتیں اور شرطیں معلوم ہونے کے بعد ممکن ہے کہ: محصولات و مالیات کی قوت کو باقی رکھنے اور انہیں مستحکم بنانے کے لیے عقد مقائضة، بیع التلجئة، بیع الوفاء، بیع العینه، وغیرہ کی مختلف جائز و ناجائز صورتوں کی مماثلت کے ساتھ کچھ ایسی جائز شکلیں دستیاب ہو جائیں جو جدید کاروباری دنیا میں قمار اور ربوا وغیرہ حرام کاروبار سے حفاظت کا ذریعہ ثابت ہوں، اس لیے اس کاروبار کی پوری تفصیل حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔

۶-سونے اور چاندی کا احتکار:

احتکار کی تفصیل (بدائع الصنائع ۵/۱۲۹ میں مذکور ہے) اس کو جاننے کے بعد، دیکھیں کہ کن چیزوں کے احتکار سے عام لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے، غلوں کو روک لیا جائے اور پہاڑ کی طرح سونے کا ڈھیر بازاروں میں لگا دیا جائے، بھوکے لوگ سونے کے ڈھیر سے زندہ نہیں بچ سکتے ہیں، اس کے برخلاف، تمام لوگوں سے سونے چاندی لے کر جمع کر دیا جائے اور ان کو خوراک ملتی رہے، تو زندگی کی گاڑی چلتی رہے گی، آدی واسی اور بے شمار غریب قومیں سونا چاندی سے سالوں سال محروم رہتی ہیں لیکن ان کے شب و روز کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، معلوم ہوا کہ سونا چاندی کے احتکار سے عام لوگوں کو تکلیف نہیں ہوتی ہے، سونا چاندی ثمن خلقی ہونے کے باوجود اس وقت ذریعہ تبادلہ کے طور پر رائج نہیں ہیں، اس لیے بھی ان کے احتکار سے اشیاء کی قیمتوں پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا ہے، سونے چاندی کے احتکار سے اشیاء کی گرانی نہیں ہوتی ہے، بلکہ اشیاء اور ماکولات کے احتکار سے ان کی قیمتیں گراں ہوتی ہیں، اس لیے سونے چاندی کا کاروبار کرنے والے اگر سونے چاندی کا احتکار کریں تو جائز ہے، وہ گنہگار نہیں ہوں گے۔

۷-غیر قانونی طور پر دوسرے ممالک سے درآمد و برآمد شدہ سونے چاندی کی خرید و فروخت:

۷- سوال (۱) کے جزء (ب) اور زیر ملاحظہ سوال (۷) کے تعلق سے ذیل میں اولاً کچھ فقہی اقتباسات نقل کی جاتی ہیں:

"إذا کان فعل الإمام مبنیا علی المصلحة فیما یتعلق بالأمور العامة لم ینفذ أمرہ شرعا إلا وافقه. فإن خالفه لم ینفذ. لهذا قال الإمام أبو یوسف فی: کتاب الخراج: من باب إحیاء الموات. لیس للإمام أن یخرج شیئا من ید أحد الا بحق ثابت معروف"۔

وقال قاضی خان فی فتاواہ من کتاب الوقف: ولو أن سلطانا اذن لقوم ان یجعلوا ارضا من أراضی البلدة حوانیت موقوفة علی المسجد أوأمرهم أن یزیدوا فی مسجدهم قالوا: إن کانت البلدة فتحت عنوة و ذالك لایضر بالمار والناس. ینفذ امر السلطان فیها. وإن کانت البلدة فتحت صلحا تبقی علی الملك ملاکها. فلا ینفذ امر السلطان فیها" (الاشباہ والنظائر مع شرحها نور البصائر ا/ ۵۲۳، ناشر بزم نصر المؤمنین بڑودہ گجرات)۔

مذکورہ بالا فقہی تصریح میں مالیات کے باب میں عوام کے اموال کے تعلق سے امیر اور حاکم کے حکم کے نفاذ کی شکلیں بیان ہوئیں ہیں، نفاذ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان حکموں کی خلاف ورزی کرے تو وہ عند اللہ گنہگار ہوگا، اور عدم نفاذ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس حکم کے خلاف کوئی عمل کرے تو عند اللہ وہ شخص مجرم نہیں ہوگا اور شرعی نقطہ نظر سے اس کا عمل قابل مواخذہ نہیں ہوگا، بلکہ اس سلسلے میں اس کا عمل اور معاملہ، حاکم وقت کی ہدایت کے خلاف ہونے کے باوجود درست ہوگا۔

ایک ملک سے دوسرے ملک میں اشیاء کی درآمدگی اور برآمدگی میں حکومت کے قوانین سے صارفین کو عموماً کافی تحفظ فراہم ہوتا ہے، اور اس حفاظتی بندوبست میں جو اخراجات آتے ہیں وہ بہرحال انہیں لوگوں پر ڈالنا چاہئے۔ جو اس سرکاری حفاظت کا فائدہ اٹھاتے ہیں، چونکہ سرکار ملکی اور عوامی مفادات کے تحت دوسرے ممالک سے کاروبار کرنے والوں سے واجبات وصول کرتی ہے، اس لیے اس کو ادا کر کے سرکاری حفاظت میں اپنے کاروبار کو انجام دینا پسندیدہ، اور ایک حد تک ضروری بھی ہے، اوپر نقل ہوئی فقہی عبارات کی روشنی میں سرکار کے واجبات کی ادائیگی کے ساتھ کاروبار کرنے کے لیے لازمی طور پر پابند ہونے کی شرط اور تفصیل یہ ہے کہ:

۱- اس قانون میں عوام کا فائدہ ہو، عوام کا نقصان نہ ہو۔ ۲- تاجر کے کاروبار میں حکومت کا مادی سہارا شامل ہو۔

یہ دونوں شرطیں ''مختارات النوازل'' کی خط کشیدہ عبارت سے معلوم ہوتی ہیں۔

درآمدات اور برآمدات کے سلسلے میں زیر بحث معاملے میں دوسری شرط، حکومت کی طرف سے صارفین کو مادی اور قانونی تحفظ فراہم ہوتا ہے۔ لیکن بعض عقود میں پہلی شرط مفقود ہوتی ہے۔ مثلاً سونے کے کاروبار میں تاجر جو واجبات ادا کرتا ہے وہ اپنے اگلے مشتری سے وصول کرتا ہے۔

اس طرح آخری گاہک کو وہ مال کافی مہنگا ملتا ہے، جس سے بالعموم عام لوگوں کے مفادات کو فائدہ کے بجائے نقصان پہونچتا ہے، بنابریں غیر قانونی راستے سے سونے چاندی کی درآمدگی اور برآمدگی کے سلسلے میں شرعی طور پر عام حالات میں امیر کی اطاعت ضروری نہیں ہے، اس لیے امیر کے ذریعہ جاری ہدایات کے خلاف، سونے چاندی کا کاروبار کرنا جائز ہے، اسی کے ساتھ ہی اس کاروبار سے جڑے لوگوں کی دینی ذمہ داری ہے کہ ارکان حکومت اور سرکاری انتظامیہ سے ملکی اور عوامی مفادات کے لیے سرکاری واجبات میں تخفیف اور سہولیات فراہم کرنے کا اصولی اور منطقی مطالبہ کرتے رہیں۔

۸- پلاٹین اور جواہرات میں زکوۃ:

فرضیت زکوۃ کے لیے سونا اور چاندی کے ساتھ سوائم کا نصاب منصوص اور متعین ہے اس لیے ان کے نصاب کی تکمیل اور شرائط کی موجودگی میں، ان پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، لیکن ان کے علاوہ اشیاء میں جب تک تجارت کی نیت نہ کی جائے، اس وقت تک ان پر زکوۃ نہیں آتی ہے۔ اور نیتِ تجارت کا اعتبار اشیاء کی ملکیت حاصل ہوتے وقت ہی مانا جائے گا۔ اسی لیے اگر کوئی کسی چیز کا مالک بذریعہ میراث بنتا ہے تو فرضیت زکوۃ کے سلسلے میں اس پر نیتِ تجارت کا حکم نہیں جاری ہوگا، کیونکہ میت کے انتقال کے ساتھ اپنی وراثت میں نیت کرنا دشوار ہے، اس کے علاوہ مثلاً کوئی مال خرید رہا ہے اور اس وقت اس نے حاصل ہونے والی مبیع کے بارے میں تجارت کی نیت کرلی تو اس پر زکوۃ کا حکم جاری ہوگا۔ اسی طرح مزدوری کر کے کچھ مال حاصل کرتا ہے اور مال حاصل ہوتے وقت اس کو فروخت کی نیت کرتا ہے تو اس پر بھی زکوۃ کا حکم جاری ہوگا، نیز کسی سے کوئی سامان فروخت کرنے کی نیت سے قرض حاصل کرتا ہے، تو وہ سامان مالِ تجارت ہوگا۔ نصاب کی تکمیل اور شرائط زکوۃ کی موجودگی میں اس پر بھی زکوۃ آئے گی، اس مال کو حاصل کرتے یا حاصل ہوتے وقت اس میں تجارت کی نیت نہیں کی گئی تو پھر اس پر زکوۃ نہیں آئے گی۔ خواہ وہ مال کتنی ہی زیادہ مالیت کا ہو، پلاٹین اگر میراث میں حاصل ہوتی ہے، یا خریداری یا اجاری یا استقراض کے ذریعہ اس کو حاصل کرتا ہے اور اس کو بطور زیب وزینت کے استعمال کرنے کا ارادہ ہے، تو اس پر بھی زکوۃ نہیں آئے گی، جیسا کہ ہیرا موتی اور دوسرے جواہرات پر زکوۃ نہیں آتی ہے۔

''ولا زكوة فى اللآلى والجواهر وإن ساوت ألفا اتفاقًا إلا أن تكون للتجارة والأصل ان ما عدا الحجرين والسوائم إنما يزكى بنية التجارة بشرط عدم المانع المودى إلى الثنى۔ شرط مقارنتها بعقد التجارة وهو كسب المال بالمال بشراء أو اجارة أو استقراض۔ وفى الدرالمختار قوله الجواهر: فاللؤلؤ والياقوت والزمرد وأمثالها، درر عن الكافى۔ قوله وإن ساوت ألفا: فى نسخة" الوفا" (الدرالمختار مع الردالمحتار ۲/ ۱۹۲، طبع زكريا)۔

اس وقت جو پلاٹین یا دوسرے جواہرات خریدے جاتے ہیں، اس کی خریداری کے وقت اگر یہ نیت رہی ہو کہ چونکہ اس کی قیمت بڑھتی رہتی ہے، اس لیے روپیوں کی گرتی ہوئی حیثیت کے پیش نظر پلاٹین کی شکل میں اپنی مالیت کو محفوظ کرلیا جائے تو یہ نیت تجارت ہی ہے۔

کیونکہ روپیوں کی گرتی حیثیت کو اس جوہر کی قیمت سے پورا کیا جارہا ہے۔ جو کہ مال میں نمو ہے، نیز اس ارادے میں اس کو فروختگی کی نیت صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے، اگر زیب وزینت اور ضروریات آرائش کے لیے نہیں خریدا ہے تو اپنا روپیہ اس میں مصروف کرنا ہی قرینہ ہے اس میں نیت تجارت کا، اس لیے ایسی صورت میں وہ مال تجارت ہوگا، اور اس میں زکوۃ کے احکام جاری ہوں گے۔

''وفارغ عن حاجته الأصلية تام لو تقديرًا بالقدرة على الاستنماء ولو بنائبه۔ وفى الدر: قوله تام لو تقديرًا: النما فى اللغة بالمد: الزيادة...... التقديرى تمكنه من الزيادة يكون فى يده أو يد نائبه'' بحر قوله الاستنماء أى طلب النمو'' (الدر المختار مع الرد المحتار ۲/ ۱۷۹، طبع زكريا)۔

اس کی خریداری پر صراحۃً نیت تجارت نہ ہو بلکہ دلالۃً ہو، تو بھی اس پر احکام زکوۃ جاری ہوں گے، لیکن سونے چاندی سے مختلف ہونے کی وجہ سے اس پر سونے چاندی کے دوسرے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

خلاصہ جوابات:

۱- اگر روپے سے سونے چاندی کی خرید وفروخت ہو تو یہ ''عقدِ صرف'' نہیں ہے۔

الف-سونا چاندی اور روپیوں میں سے ایک نقد اور دوسرا ادھار ہو تو یہ جائز ہے۔

ب- حکومت کی طرف مقررہ قیمتیں بہت سے فوائد کی حامل ہیں، لیکن عام حالات میں بائع ومشتری اپنا سامان بیچنے اور خریدنے کے لیے، قیمتوں کی تعیین میں شرعی طور پر آزاد ہیں، حکومتوں کی طرف سے مقررہ قیمتوں سے کم یا زیادہ میں خرید وفروخت پر ربا فضل کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۲- الف-سونے کی لین دین میں مقدار کا جو یہ فرق ہو رہا ہے وہ اجارہ ہوگا۔

ب- سونے کے وزن کے تناسب سے اس میں آمیزش کی جانے والی دھاتوں کی مقدار لازمی طور پر طے کی جائے اور اسی تناسب سے دھاتوں کی آمیزش کی جائے، اس طرح صاف طور پر ذرات کی مقدار یعنی کاری گر کی اجرت بھی معلوم ہو جائے، تو اُسے بطور اجرت، کاری گر کو دینا اور لینا جائز ہے۔

۳- سونے کا سونے سے تبادلہ ہو یا چاندی کا چاندی سے، تو قدامت اور جودۃ کا اعتبار کرتے ہوئے وزن میں کمی زیادتی جائز نہیں ہے، کمی زیادتی سود ہے اس لیے حرام ہے، البتہ ردی سونے کی قیمت طے کی جائے اور اس قیمت کے بدلے میں جید سونے کی قیمت طے کی جائے تو یہ صورت جائز ہے۔

۴- الف: بائع ایک کلو سونے کو دو سو حصوں میں پچاس پچاس گرام کی اکائیاں بنا کر فروخت کرتا ہے، لہذا مذکورہ بالا طریقے سے اندراج کے بعد، ۵۰/گرام سونے کی ایک یا زیادہ یونٹ خریدنے والا اپنی یونٹ پر قابض مانا جائے گا۔

البتہ اگر قبل العقد با قاعدہ بائع کی طرف سے بتایا جائے کہ مشتری کا حصہ اینٹ میں شامل ہے، تو مشتری کے نام کا، مذکورہ بالا طریق پر اندراج، قبضہ نہیں ہوگا، البتہ ایسی صورت میں بھی بیع درست ہو جائے گی، اور مشتری اپنے حصے کو لے سکتا ہے۔

ب- آن لائن اندراج کے بعد بائع قانونی طور پر اس شی ء کے تعلق سے مالکانہ حق سے دست بردار ہو جاتا ہے، اس لیے اس قسم کا اندراج ہی مشتری کا قبضہ ہے، اگر اس طرح اندراج نہ ہو بلکہ صرف رجسٹر میں مشتری کا نام لکھا دیا جائے تو وہ مشتری کا قبضہ نہیں ہوگا۔

۵- بیان کردہ صورت مسئلہ میں درحقیقت بیع ہوتی ہی نہیں ہے۔ بلکہ قمار اور صفقة فی صفقة پا جاتا ہے اس لیے یہ صورت ناجائز ہے۔

۶- سونے چاندی کے احتکار سے اشیاء کی گرانی نہیں ہوتی ہے، بلکہ اشیاء اور ماکولات کے احتکار سے اِن کی قیمتیں گراں ہوتی ہیں، اس لیے سونے چاندی کا کاروبار کرنے والے اگر سونے چاندی کا احتکار کریں تو جائز ہے، وہ گنہگار نہیں ہوں گے۔

۷- سونے چاندی کی درآمدگی اور برآمدگی کے سلسلے میں شرعی طور پر عام حالات میں امیر کی اطاعت ضروری نہیں ہے، اس لیے امیر کے ذریعہ جاری ہدایات کے خلاف، سونے چاندی کا کاروبار کرنا جائز ہے۔

۸- (الف): فرضیت زکوۃ کے لیے سونا اور چاندی کے ساتھ سوائم کا نصاب منصوص اور متعین ہے اس لیے ان کے نصاب کی تکمیل اور شرائط کی موجودگی میں، ان پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، لیکن ان کے علاوہ اشیاء میں جب تک تجارت کی نیت نہ کی جائے، اس وقت تک ان پر زکوۃ نہیں آتی ہے۔

(ب) نیتِ تجارت کا اعتبار اشیاء کی ملکیت حاصل ہوتے وقت ہی مانا جائے گا۔ اس کی خریداری پر صراحۃً نیت تجارت نہ ہو بلکہ دلالۃً ہو، تو بھی اس پر احکام زکوۃ جاری ہوں گے۔

(ج) لیکن سونے چاندی سے مختلف ہونے کی وجہ سے ان پر سونے چاندی کے دوسرے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت اسلامی تناظر میں

مولانا ابو محمد، محمد سعد نور القاسمی [1]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ پر گفتگو سے پہلے بیع صرف اور کرنسی سے متعلق کچھ گفتگو ہو جائے، چنانچہ بیع صرف کے متعلق مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب ''قاموس الفقہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

صرف: ثمن کا ثمن سے تبادلہ:

صرف کے معنی لغت میں زیادتی اور اضافہ کے ہیں اس لئے ایک حدیث میں نفل عبادت کو صرف سے تعبیر کیا گیا ہے، کہ نفل کی حیثیت بمقابلہ فرائض کے اضافی ہے، اور چونکہ تجار کو سونے چاندی میں رغبت اسی لئے ہوتی ہے کہ اس سے مال میں اضافہ کیا جائے، ورنہ تو خود سونا چاندی انسان کی کسی بنیادی ضرورت کو پورا نہیں کرتا، اسی لئے اس معاملہ کو صرف کہتے ہیں (ہدایہ مع الفتح ۷/ ۱۳۳)، صرف کے معنی کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے بھی ہیں چونکہ زر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور اس کی گردش جاری رہتی ہے۔ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی چیزوں کی طرح استعمال میں نہیں آتی اور انکی گردش کا سلسلہ کہیں تھمتا نہیں ہے، شاید اس لئے بھی نقد کی خرید و فروخت کو صرف کہا جاتا ہے (حوالہ سابق)۔

فقہ کی اصطلاح میں ''صرف'' سونے چاندی کی ایک دوسرے سے خرید و فروخت کا نام ہے۔

''الصرف هو البيع إذا كان كل واحد من عوضيه من جنس الأثمان'' (ہدایہ ۳/ ۱۰۴ کتاب الصرف)۔

درست ہونے کی شرطیں:

صرف کے درست ہونے کے لئے مجموعی طور پر چار شرطیں ہیں۔

۱- فریقین کی طرف سے اپنے عوض پر الگ ہونے سے پہلے قبضہ حاصل کر لینا۔

۲- اگر دونوں طرف سے ایک ہی جنس کی شئے ہو تو دونوں کا برابر ہونا۔

۳- فریقین یا ان میں سے ایک کا اپنے لئے غور و فکر کی مہلت حاصل نہ کرنا۔

۴- فریقین میں سے کسی کی جانب سے معاوضہ کی ادائیگی کے لئے کوئی خاص مدت مقرر نہ کرنا۔

اب ان شرائط کو کسی قدر وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے:

مجلس میں قبضہ:

سونا سونے چاندی چاندی یا سونے چاندی میں سے ایک دوسرے کے بدلہ فروخت کیا جائے تو ضرور ہے کہ دست بدست لین دین ہو یعنی جس مجلس میں معاملہ طے ہوا اسی مجلس میں دونوں فریق اپنی مطلوبہ چیز پر قبضہ کر لیں، اگر قبضہ سے پہلے مجلس ختم ہو گئی یعنی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تو یہ خرید و فروخت فاسد ہو جائے گی (فتاوی قاضی خاں ۲/ ۲۵۲)۔

مقدار میں برابری:

---

[1] مدرس و مفتی مدرسہ مظہر العلوم مسجد نکھو شاہ، بیکن گنج، کانپور (یوپی)۔

اگر سونا سونے کے بدلہ اور چاندی چاندی ہی کے بدلہ فروخت کی جائے تو یہ بھی ضروری ہے کہ مقدار کے اعتبار سے برابر ہو، گو عمدگی اور ساخت کے اعتبار سے دونوں میں تفاوت پایا جاتا ہے پھر بھی کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔

خیار شرط نہ ہونا چاہئے:

چونکہ صرف میں فریقین کا ایک دوسرے کو مالک بنا دینا ضروری ہے اس لئے فریقین میں سے کوئی اپنے لئے ایسا اختیار حاصل نہیں کر سکتا جس کے تحت دوسرا پوری ملکیت سے محروم ہو جائے۔ مثلاً اپنے لئے دو تین دن غور کرنے کی مہلت حاصل کر لے، (جس کو فقہ کی اصطلاح میں خیار شرط کہتے ہیں) ہاں اگر سامان مین کوئی عیب نظر آئے جس کی معاملہ کے وقت وضاحت نہیں ہوئی تھی تو اسکو واپس کرنے کا حق حاصل ہوگا (یہ خیار عیب کہلاتا ہے)، اسی طرح قبضہ کرتے ہوئے سامان دیکھ نہ پایا تھا تو قبضہ کرنے کے بعد اس سامان کو واپس کرنے کی گنجائش ہوگی (یہ صورت خیار رویت کہلاتی ہے)، کیونکہ ان صورتوں میں مجلس کے اندر قبضہ ثابت ہو جاتا ہے (فتح القدیر ۷/۱۳۷)۔

فریقین کی طرف سے عوض کی حوالگی میں مہلت دینے اور لینے کا حکم:

مجلس کے اندر دونوں طرف سے قبضہ کے ضروری ہونے کی وجہ سے اس معاملہ میں فریقین یا ان میں سے کسی ایک کی طرف سے عوض حوالہ کرنے کے لئے مہلت دینا یا مہلت حاصل کرنا درست نہیں ہے (حوالہ سابق)، ہاں اگر مجلس ختم ہونے سے پہلے مہلت ختم کر دی جائے اور فریقین قبضہ حاصل کر لیں تو یہ معاملہ درست ہو جائے گا (قاموس الفقہ ۴/۲۲۴،۲۲۵)۔

دوسرا مسئلہ/کرنسی نوٹوں کا حکم:

کرنسی نوٹ کے متعلق فقہاء کرام کی قدیم تحقیق یہ تھی کہ براہ راست ثمن نہیں؛ بلکہ اسکی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سونا اور چاندی جو ثمن خلقی ہیں یہ نوٹ اسکی دستاویز سند کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، لیکن موجودہ زمانہ میں کرنسی نوٹ کے متعلق جو تحقیق سامنے آئی ہے اس کی رو سے یہ کرنسی نوٹ ثمن ہی ہیں، البتہ ان کو ثمن عرفی کہا جاتا ہے، کیونکہ موجودہ زمانہ میں ان کی ماہیت اور حقیقت یکسر تبدیل ہوگئی ہے، اور سونا چاندی کے ساتھ کرنسی نوٹ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا، اسی طرح ان نوٹوں نے پوری طرح سونے اور چاندی کی جگہ لے لی ہے، یعنی اب یہ نوٹ سونے چاندی کی دستاویز کے طور پر استعمال نہیں ہوتے بلکہ فرضی قوت خرید کی نمائندگی کر رہے حکومت کی طرف سے ہر شخص مجبور ہے کہ انکو عوض کے طور پر قبول کرے لہذا یہ کرنسی نوٹ عرفاً قانوناً ثمن ہی متصور ہوتے ہیں۔

اور یہی رائے اس زمانہ کے فقہائے کرام کی ہے چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنی عربی مقالہ ''احکام الاوراق النقدیہ'' میں جس کا اردو ترجمہ مختلف کتابوں میں شائع ہو چکا ہے، نیز یہ مقالہ صاحب احسن الفتاوی نے بھی اپنی کتاب (احسن الفتاوی ۷/۵۱) میں نقل کیا ہے اسی قول کو ترجیح دیا ہے، یہی رائے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی بھی ہے (دیکھئے: قاموس الفقہ ۴/۲۲۵، مزید تفصیل کے لئے عصر حاضر کے فقہاء کے فتاوی ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں)۔

اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ نوٹ اور سکے ثمن اصطلاحی ہیں یعنی لوگوں کے تعامل اور رواج کی وجہ سے ثمن کے درجہ میں آگئے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کرنسی کے تبادلہ کے مسئلہ پر بھی غور کر لیا جائے۔

کرنسی کے تبادلہ کی تین صورتیں ہیں:

(۱) ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے۔

(۲) ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسری ملک کے کرنسی سے۔

(۳) کرنسی کا تبادلہ سونے چاندی سے (جو کہ ہمارا اصل مسئلہ ہے)

☆ ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے ہو تو برابری بھی ضروری ہوگی۔ اور ایک ہی مجلس میں قبضہ بھی لہذا آج کل خراب نوٹ زیادہ

مقدار میں لے کر اچھے نوٹ کم مقدار میں دینا اور کسی قدر زیادہ پیسہ لے کر روپیہ بھنانے کا جورواج ہے وہ جائز نہیں، اور سود میں داخل ہے۔

(دیکھئے: قاموس الفقہ ۴/ ۲۲۶)۔

☆ نیز مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ''فتاوی عثمانی'' میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

جواب: سوروپئے کے نوٹ کو چالیس یا پچاس روپئے میں خریدنا جائز نہیں، کیونکہ آج کل یہ نوٹ فلوس کے حکم میں آگئے ہیں، اور بیع الفلس بالفلس امام محمدؒ کے قول پر مطلقاً اور شیخینؒ کے قول پر غیر معین ہونے کی صورت میں ناجائز ہے۔ اور فتوی امام محمدؒ کے قول پر ہے، لہذا نوٹوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں، اور جو حضرات نوٹوں کو فلوس کے بجائے دین کی رسید قرار دیتے ہیں ان کے قول پر بھی یہ بیع الکالی بالکالی ہونے کی بنیاد پر ناجائز ہوگی (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۴۸)۔

۲- کرنسی کے تبادلہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ کسی دوسرے ملک کی کرنسی سے ہو تو اس سلسلے میں ہمارے زمانے کے اہل علم حضرات نے مختلف ملکوں کی کرنسیوں کو علیحدہ جنس کا درجہ دیا ہے اس لئے انکے تبادلہ میں کمی کی جائے تو کوئی حرج نہیں، یہی رائے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی ہے (قاموس الفقہ ۴/ ۲۲۶)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

جواب: مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے۔ بشرطیکہ کم از کم ایک فریق اپنے روپیہ پر قبضہ کرلے۔

''لئلا یکون افتراقا عن دین بدین''۔ فی المستدرك للحاکم ج ۲ ص: ۶۵-۶۶ (بیروت)

عن ابن عمر أن النبی ﷺ نهی عن بیع الكالی بالكالی رقم ۲۳۴۲۔ عن ابن عمر عن النبی ﷺ انه نهی عن بیع الكالی بالكالی هو النسيئة بالنسيئة۔ رقم ۲۳۴۳۔ والله اعلم (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۴۸)۔

۳- کرنسی کا تبادلہ سونے چاندی سے جو ہمارا اصل مسئلہ ہے اور جس کے جواب کے لئے یہ گفتگو چل رہی ہے، اگر کرنسی کا تبادلہ سونے چاندی سے ہو تو کرنسی کی حیثیت سامان کی ہوجائے گی اور سونا چاندی اصل زر متصور ہوگا۔ کیونکہ خلقی ثمن میں ثمنیت اور زر بننے کی صلاحیت زیادہ ہے اور اصطلاحی اور رواجی ثمن اس سے کم تر درجہ کی حامل ہے، لہذا کرنسی اور سونے چاندی کے تبادلہ کی صورت یہ بیع صرف نہیں ہوگی کیونکہ صرف کہتے ہیں سونے چاندی کی ایک دوسرے سے خرید وفروخت کو، یہاں سامان کا سونے چاندی سے تبادلہ ہو رہا ہے۔ اور جب یہ بیع صرف نہیں ہے تو پھر جانبین سے مجلس میں قبضہ بھی ضروری نہیں ہوگا۔ اور نہ مقدار میں مماثلت لازم ہوگی، بلکہ ایک کو نقد اور دوسرے کو ادھار کرکے نقد ادھار ہر طرح خرید وفروخت جائز ہوگی۔

چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت سے متعلق اپنی رائے اور نوٹ کے بدلے سونے چاندی کی نقد اور ادھار خرید وفروخت کا حکم تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

جواب: الی الأخ العزیز الأستاذ خیر الدین شاہین

السلام علیکم و رحمة الله و بركاته

اما الذهب سواء كان تبرا أو مصوغًا فقد أجمع الأئمة الأربعة على انه لايُعامل معاملة البضائع، وإنما يعمل أحكام النقود فی جمیع الأمور، لكن '' الأوراق النقدية'' وقع فیه خلاف بین العلماء المعاصرین، و إن كثيرًا من علماء البلاد العربية جعلوها فی حكم الذهب سواء بسواء. ولكن خالفتهم فی رسالتی '' أحكام الأوراق النقدية'' وذكرت أنها ليست قائمة مقام الذهب فی جميع الأمور، فلاتجری فیها أحكام الصرف، ولذلك يجوز عندی أن يشتری الذهب أو الفضة بالنقود، ويجوز أيضا أن يشتری الذهب نسيئة بالأوراق النقدية (١) ولكن يجب أن يكون تقابض أحد البدلين فی المجلس إذا كان ذهبا خالصًا وان يعرف الأجل عند العقد وقد قبل هذا الموقف

معظم علماء الهند و كثير من باكستان، والتفصيل في رسالتي "أحكام الأوراق النقدية" أما كون الذهب والفضة فقد اصفة النقدية، فهذا غير مسلم حتى الآن

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته، محمد تقي العثماني بقلم: عبدالله ميمن

۱۴۲۱/۹/۲۴ھ (فتوی نمبر ۴۸/۴۵۹) (فتاوی عثمانی ۱۵۹/۳، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: المبسوط للسرخسی ۲۵/۱۴، ہدایہ ۲۲۴/۳، ردالمحتار ۴۱۴/۷، البحر الرائق ۱۹۴/۶، الفتاوی الهندیہ ۲۲۴/۳)۔

اسی طرح جیولری کے کاروبار اور سونے کی خرید وفروخت کے بارے میں اہم نوعیت کے مختلف سوالات کے جوابات تحریر کئے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاوی عثمانی ۱۵۴/۳)۔

صاحب احسن الفتاوی تحریر فرماتے ہیں:

سوال: آج کل کے مروجہ نوٹ اور سکے جو حکومت کی طرف سے رائج ہیں جن کے ساتھ لوگ بیع وشراء اور لین دین کرتے ہیں کیا یہ سونے اور چاندی دونوں یا صرف سونے یا صرف چاندی کے حکم میں ہے؟ کیا ان کے ساتھ سونے اور چاندی کی بیع بالفضل والنسیئۃ یا صرف بالفضل یا صرف بالنسیئۃ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب:

رائج نوٹ اور سکے سونے چاندی کے حکم میں نہیں نہ ہی سونے چاندی کی رسید ہیں لہذا ان سے بیع ذھب وفضۃ بہر کیف جائز ہے تفاضل ونسیئہ بھی جائز ہے البتہ حرمت ربو بصورت تبادل بالجنس واقع ہوگی اور فرضیت زکوٰۃ میں یہ سکہ بحکم فضہ ہے، "کما قالوا فی الفلوس الرائجة" (أحسن الفتاوی ۵۱۸/۶)۔

نیز اسلامی فقہ اکیڈمی کے چوتھے سمینار میں جو کہ حیدرآباد میں ۲۷-۳۰/محرم ۱۴۱۲ھ مطابق ۹-۱۲/اگست ۱۹۹۱ء بعنوان "دوملکوں کی کرنسی کا تبادلہ" منعقد ہوا تھا یہ تجویز پاس ہوئی تھی۔

چوتھے سمینار میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ دوملکوں کی کرنسیوں کے تبادلہ میں عوضین پر فوری قبضہ مجلس عقد میں ضروری ہے یا نہیں۔ شریک علماء کے دو رجحانات سامنے آئے۔ ایک رائے یہ ہے کہ مجلس عقد میں ہر دوعوض پر فوری قبضہ ضروری نہیں ایک عوض پر قبضہ کافی ہے کیونکہ نوٹوں کی حیثیت کلی طور پر سونے چاندی جیسی نہیں کہ یہ اعتباری اور اصطلاحی اثمان ہیں۔

علماء کی ایک جماعت اسے خلقی اثمان (سونے چاندی) کی طرح تصور کرتی ہے اس لئے بدلین پر قبضہ کو مجلس عقد میں ضروری قرار دیتی ہے البتہ یہ حضرات عام طور پر قبضہ کی تعریف کو وسیع کرتے ہوئے ڈرافٹ اور چیک کے حصول کو اصل بدل پر قبضہ کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ اجلاس ہر دو مؤثر آراء کو سامنے رکھتے ہوئے طے کرتا ہے کہ دوملکوں کی کرنسیوں کے ادھار تبادلہ میں بہر حال احتیاط برتی جائے۔ لیکن واقعی حاجت وضرورت کی صورت میں اول الذکر رائے پر عمل کیا جاسکتا ہے (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے/ص ۱۶۷)۔

یہ قرارداد آج سے ۲۶ سال پرانی ہے ظاہر ہے اب علمائے کرام کی آراء بدل چکی ہے اور اب مفتیان عظام پہلی رائے کو ہی ترجیح دیتے ہیں جیسا کہ مولانا خالد سیف اللہ صاحب نے (قاموس الفقہ ۲۲۶/۴) میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۵) مفتی احسان اللہ شائق صاحب پاکستان لکھتے ہیں:

رائج الوقت کاغذی نوٹ اور سکے سونے چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے اور چاندی کی رسید ہیں، لہذا ان کے ذریعہ سونا اور چاندی خریدنا جائز ہے چاہے زیورات خریدیں یا اشرفی یا دراہم ان پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گی (جدید معاملات کے شرعی احکام ۱۲۸/۱)۔

نیز مفتی احسان اللہ شائق صاحب سونے چاندی کی ادھار خرید وفروخت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: سونا چاندی اس طرح ادھار پر فروخت کرنا کہ مثلاً سونے کے زیورات خرید لے اور رقم کچھ ابھی دیدی اور کچھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا یا کل رقم ادھار ہے شرعاً اسکا حکم یہ ہے کہ چونکہ کاغذی نوٹ

کے ذریعہ سے سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے۔ اس لئے ادھار خرید وفروخت جائز ہے۔ شرط یہ ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہوجائے تاکہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

''لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله (تنبيه) سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بانه يجوز إذا قبض أحد البدلين'' (در المختار ۴/ ۲۰۵ باب الربوٰ کتاب البیوع)۔

وفي الهندية قال وروى الحسن عن أبي حنيفة إذا اشترى فلوسًا بدراہم وليس عندهذا فلوس ولا عند الاخر دراہم ثم إن احدهما دفع وتفرق جازو إن لم ينقدوا حدمنهما حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط (عالمگیریہ ۳/ ۱۲۴ الفصل الثالث في بيع الفلوس) (جدید معاملات کے شرعی احکام ۱/ ۱۲۸)۔

مذکورہ بالا تحریرات کی روشنی میں سوال کی شق الف کا جواب واضح ہوگیا کہ جیسا کہ کرنسی کے ذریعہ سونے چاندی کی خرید وفروخت بیع صرف نہیں تو پھر سونے چاندی اور کرنسی میں سے ایک کو نقد اور دوسرے کو ادھار کرکے خرید وفروخت بھی بلا تکلف جائز ہوگی، بس شرط یہ ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہوجائے تاکہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

اب رہا مسئلہ سوال کی شق ثانی کا تو اس پر گفتگو سے پہلے ایک اور مسئلہ پر گفتگو ہونی چاہئے کہ حکومتوں یا جمعیتوں اور تنظیموں کا اشیاء کی قیمت متعین کرنا اور دوکاندار کو اسی متعینہ قیمت پر خرید وفروخت کا پابند بنانا کیسا ہے؟

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ شریعت الٰہیہ کی حکمت میں اصل یہ ہے کہ بیچنے والے اور خریدنے والے کے درمیان باہمی رضامندی والی تجارت میں کوئی بھی مداخلت نہ کرے اور بازار میں ریٹ کا معاملہ طرفین کے درمیان پوری آزادی سے طے ہو اور اس میں کسی طرح کی مداخلت اور دخل اندازی نہ ہو جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان دعوالناس یرزق اللہ بعضھم من بعض مشیر ہے یعنی لوگوں کو آزاد چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ نے بعض کی بعض سے روزی طے کردی ہے اسی وجہ سے تسعیر یعنی نرخ متعین سے حدیث پاک میں ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے:

''غلاالسعر على عهد رسول الله ﷺفقالوا: يا رسول الله ! سعّر لنا. فقال ﷺ:إن الله هو المسعر القابض الباسط الرزاق وإن لأرجوأن ألقى ربي وليس أحدمنكم يطلبني بمظلمة في دم و لامال'' (أخرجه الترمذي باب ما جاء في التسعير ۱۳۱۴)

(یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قیمتوں میں گرانی ہوگئی تو آپ سے عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول ہمارے لئے نرخ متعین فرمادیجئے! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی قیمت متعین کرنے والا، رزق تنگ کرنے والا، روزی کشادہ کرنے والا اور روزی دینے والا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اپنے رب سے اس طرح ملوں کہ تم میں سے کوئی بھی مجھ سے کسی طرح کے جانی یا مالی ظلم کا مطالبہ نہ کرے)۔

اس حدیث پاک کی بنیاد پر جمہور فقہاء نے حکام کو قیمت متعین کرنے سے منع کیا ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''ولاينبغي للسلطان أن يسعر على الناس لقوله عليه السلام لاتسعروا فإن الله هو المسعر القابض الباسط الرزاق'' (الهدايه مع التكمله ۸/ ۴۹۲)

لیکن یہ اور اس طرح کی عبارتوں میں بیان کردہ حکم اُن حالات میں ہے جبکہ اس کی ضرورت نہ ہو یا اس سے لوگوں کو ضرر ہو، البتہ اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ تاجروں کی طرف سے زیادہ قیمت بڑھادی جائے کہ جس سے لوگوں کو کھانے، پینے اور پہننے کی ضروری چیزوں میں ضرر اور پریشانی لاحق ہونے لگے۔ اور تجار بار بار تنبیہ اور سرزنش کے بعد بھی اپنی منمانی اور شرارت سے باز نہ آئیں اور حکام کے پاس قیمت متعین کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ ہو تو پھر قاضی یا حکام اُصحاب الرائے اور اہل بصیرت حضرات کے مشورے سے قیمت متعین کردیں تاکہ لوگ اسی متعینہ قیمت کے مطابق خرید وفروخت کریں۔

جیسا کہ صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں: ''فإن كان ارباب الطعام يتحكمون و يتعدون عن القيمة تعديا فاحشاوعجز القاضي عن صيانة حقوق المسلمين إلا بالتسعير فحينئذلابأس به بمشورةمن أهل الرأى والبصيرة'' (الهدايه مع التكملة ۸/ ۴۹۲، شامی، ۹/ ۵۷۳، زكريا ديوبند)۔

ہدایہ کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ واضح ہوگیا کہ ارباب طعام کے تعدی فاحش کی صورت میں قاضی اہل رائی اور بصیرت حضرات کے مشورے سے قیمت متعین کردے گا۔ اور اس تعدی فاحش کا اندازہ امام زیلعیؒ کے نزدیک قیمت کا دوگنا ہونا ہے۔

چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب ''فقہ البیوع'' میں فرماتے ہیں:

''وقدر الزيلعي التعدى الفاحش بضعف القيمة'' (تبيين الحقائق ٦/ ٢٨ بحواله فقه البيوع ٢/ ١٠٠١)۔

پتہ چلا کہ شریعت الٰہیہ نے عام حالات میں قیمت متعین کرنے کے عمل کو اچھا نہیں سمجھا ہے البتہ خاص حالات میں اس کی گنجائش ہے اب یہاں پر ایک مسئلہ یہ ہے کہ جب حکومت نے قیمت متعین کردی تو اس کی پابندی کا کیا حکم ہے، نیز اگر کوئی مخالفت کرے تو اسکی بیع نافذ ہوگی یا نہیں اور یہ رقم اس کے لئے جائز اور حلال ہوگی یا نہیں؟

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ حکومت کے نرخ اور بھاؤ متعین کرنے کے بعد اسکی پابندی واجب اور ضروری ہے اور اس سے زیادہ قیمت لینا مکروہ ہے۔ حتی کہ فقہا نے حکم عدولی کرنے والوں کی سرزنش اور قید وغیرہ کی اجازت دی ہے (دیکھئے: شامی ۵/ ۱۹۶)۔

تاہم اگر کسی نے اس سے زیادہ قیمت پر بیچ دیا تو اس کی بیع صحیح ہوگی اور زائد قیمت اس کے لئے جائز اور حلال ہوگی۔

چنانچہ صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں: ''فإذا فعل ذلك وتعدى رجل عن ذلك و باع بأكثر منه أجازه القاضي و بذا ظاهر عند أبي حنيفة رحمه الله لانه لايرى الحجر على الحر و كذا عندهما'' (الهداية مع التكملة ٨/ ٤٩٢)۔

شامی میں ہے: '' و ظاهره انه لو باعه بأكثر يحل وينفذ البيع '' (شامی ۹/ ۵۷۴ زکریا دیو بند)۔

عالمگیری میں ہے: '' فإن سعّر قباء الخباز باكثر مما سعّر جاز بيعه '' (ہندیہ ۳/ ۱۰۳)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

اشیاء ضروریہ کا نرخ مقرر کرنا اور اس سے زیادہ میں فروخت کرنا مارکیٹ میں اشیاء ضروریہ کی خرید کو آسان بنانے اور قیمت پر کنٹرول قائم رکھنے کے لئے حکومت کی جانب سے بعض اوقات اشیاء کا نرخ متعین کردیا جاتا ہے اور دوکاندار اسی قیمت پر سامان فروخت کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔ حکومت کے اس طرح کے اقدام کو فقہاء نے خصوصی حالات میں جائز قرار دیا ہے، چنانچہ حصکفیؒ کا بیان ہے:

''ولا يسعر الحاكم إلا إذا تعدى الأرباب عن القيمة تعديا فاحشا'' (درمختار على هامش الرد ٥/ ٢٥٦)۔

حاکم اشیاء کا نرخ متعین نہیں کرے گا سوائے اس کے کہ تاجر حضرات قیمت میں غیر معمولی اضافہ کردیں۔

تاجروں کے لئے اس متعینہ نرخ کی پابندی واجب ہے اور اس سے زیادہ قیمت لینا مکروہ ہے۔ اسی لئے فقہا نے عدول حکمی کرنے والوں کی سرزنش اور قید وغیرہ کی اجازت دی ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۴/ ۱۹۶)، تاہم اگر اس نے زیادہ قیمت میں سامان فروخت کیا تو یہ رقم اس کے لئے جائز و حلال ہوگی۔ عالمگیری میں ہے: ''فان سعر قباع الخباز باكثر مما سعر، جاز بيعه'' (ہندیہ ۳/ ۱۰۳)۔

(پس اگر حکومت کی طرف سے متعینہ نرخ سے بڑھ کر نان بائی نے قیمت لے لی تو بھی خرید و فروخت جائز ہوگی) (جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۵۱، ۳۵۲)

مذکورہ بالا گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مخصوص حالات میں حکومتوں اور مختلف اہم اداروں کے لئے قیمت متعین کرنے کی گنجائش ہے، البتہ قیمت متعین ہوجانے کے بعد پھر اس کی پابندی ضروری ہے تاہم اگر اس کے خلاف زیادہ یا کم قیمت پر بیچ دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

اب ہمارے اس زمانے میں لوگوں میں امانت و دیانت مفقود ہو چکی ہے۔ حرص لالچ، جھوٹ، عیاری، چالاکی کا دور دورہ ہے ایسی صورت میں اگر ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو پتہ نہیں بیچاری عوام کا کیا حال ہوگا۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے میں حکومت یا اس طرح کے اداروں کا قیمت متعین کرنا بہت ضروری ہے۔ اور لوگوں پر اس کی پابندی واجب ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص سونے چاندی کی متعینہ قیمت سے کم یا زیادہ قیمت پر خرید و فروخت کرے تو یہ بھی جائز ہے۔ بلاشبہ اس کی آمدنی حلال ہوگی۔ اور چونکہ کرنسی اور سونا چاندی باہم جنس نہیں ہیں اس لئے قیمت کی کمی زیادتی کے

ساتھ خرید وفروخت بلاتکلف درست ہوگی اور اس کی زیادتی پر ربا کا اطلاق نہیں ہوگا۔ کیونکہ ربا تفاضل کا اطلاق وہاں پر ہوتا ہے جہاں پر دونوں چیزیں ایک ہی جنس کی ہوں اور یہاں دونوں الگ الگ جنس ہیں جیسا کہ تفصیل سے اس مسئلہ پر کلام ہو چکا ہے تو پھر ان میں کمی بیشی بھی حلال ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب

۲- سوال نمبر ۲ کے اندر جو صورت ذکر کی گئی ہے اگر اس میں سونے اور زیورات کے لین دین کے فرق کو بیع مانا جائے تو اس میں کئی قباحتیں لازم آتی ہیں۔

ا- ایک تو یہ کہ سونے اور سونے کے زیورات کے اندر جو بیع ہو رہی ہے یہ بیع صرف ہے اور بیع صرف کے جواز کی مجموعی طور پر چار شرطیں ہیں:

(۱) اگر جنس واحد ہو تو برابر ہونا ضروری ہے کمی زیادتی جائز نہیں۔ (۲) مجلس عقد میں عوضین پر قبضہ ہو جائے۔ (۳) فریقین یا ان میں سے ایک کا اپنے لئے غور وفکر کی مہلت حاصل نہ کرنا۔ (۴) فریقین میں سے کسی کی جانب سے معاوضہ کی ادائیگی کیلئے کوئی خاص مدت مقرر نہ کرنا، چنانچہ ہدایہ میں ہے:

"الصرف هو البيع إذا كان كل واحد من عوضيه من جنس الأثمان. فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لايجوز إلا مثلابمثل۔ ولابد من قبض العوضين قبل الافتراق۔ ... ولهذا لايصح شرط الخيار فيه ولاالأجل"

(ہدایہ ۱۰۴/۳ کتاب الصرف کتاب البیوع)۔

اور یہاں پر اکثر شرطیں مفقود ہیں:

(۱) جنس واحد ہونے کے باوجود برابری اور مساوات مفقود ہے۔ (۲) مجلس عقد میں عوضین پر قبضہ بھی نہیں ہے۔ (۳) معاوضہ ایک جانب سے ادھار ہے اگر سونے کو بیع مانا جائے تو ثمن ادھار ہے۔ اور اگر ثمن مانا جائے تو مبیع غیر معدوم ادھار ہے۔ اس لئے یہ صورت بیع ماننے کی صورت میں ناجائز ہوگی۔

(۲) دوسری خرابی یہ لازم آرہی ہے کہ عام بیوعات کے اندر بھی مبیع کی موجودگی ضروری ہے حالانکہ یہاں پر اگر زیورات کو مبیع مانا جائے تو مبیع معدوم ہے اور معدوم چیز کی بیع باطل ہے مثلاً درخت میں پھل لگنے سے پہلے فروخت کر دینا یا کھیتی ظاہر ہونے سے پہلے کھیتی فروخت کرنا یا فلیٹ کی تعمیر سے پہلے اسکو فروخت کرنا یا گاڑی بک کروانے کے بعد تیار ہو کر قبضہ میں آنے سے پہلے آگے فروخت کر دینا وغیرہ۔

(۳) تیسری خرابی یہ لازم آرہی ہے کہ زیورات مبیع مقدور التسلیم نہیں ہے حالانکہ بیع کے صحیح ہونے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مبیع مقدور التسلیم ہو یعنی ایسا مال ہو کہ بائع اسکو خریدار کے حوالہ کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ جن صورتوں میں بائع مال خریدار کے حوالہ کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو مثلاً کوئی جانور بھاگا ہوا ہو جب تک قبضہ میں نہ آجائے یا مچھلی شکار کرنے سے پہلے فروخت کرنا وغیرہ ناجائز وحرام ہے۔

(۴) چوتھی خرابی یہ لازم آرہی ہے کہ زیورات مبیع کی مقدار معلوم نہیں حالانکہ بیع کے صحیح ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ مقدار مبیع معلوم ہو کیونکہ اگر مبیع کی مقدار معلوم نہ ہوگی تو عقد بیع میں نافذ نہ ہوگا۔ بلکہ جہالت کی وجہ سے فاسد ہوگا۔ مثلاً تقسیم سے قبل ایک وارث اپنے غیر معینہ حصہ کو فروخت کردے۔

چنانچہ ہدایہ میں ہے: "ولايجوز بيع السمك قبل أن يصطاد لأنه باع مالا يملكه ولافي حظيرة إذا كان لايؤخذ إلا بصيد لأنه غير مقدور التسليم" (ہدایہ ۵۱/۳ کتاب البیوع)۔

(۵) پانچویں خرابی یہ ہے کہ اگر زیورات کو ثمن مانا جائے تو ثمن مجہول ہے۔ اور ثمن کی یہ جہالت مفضی إلی المنازعۃ ہو سکتی ہے، لہذا یہ بھی فساد سے خالی نہیں ہدایہ میں ہے: "والأثمان المطلقة لاتصح إلا أن تكون معروفة القدر والصفة لأن التسليم والتسلم واجب بالعقد وهذه الجهالة مفضية إلى المنازعة فيمتنع التسليم والتسلم وكل جهالة هذه صفتها تمنع الجواز هذا هو الأصل" (ہدایہ ۲۰/۳، ۲۱)۔

اس لئے مذکورہ بالا خرابیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسکو بیع قرار دینا درست نہیں ہے۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ اسکو اجارہ مانا جائے۔ اور اجارہ ماننے کی صورت میں بھی ایک خرابی لازم آرہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں کاریگر کو سونے کے بچے ہوئے ذرات اجرت میں ملتے ہیں جو کہ اجرت العامل من جزء العمل کی قبیل سے ہے، اور یہ قفیز طحان والی روایت کی وجہ سے ناجائز اور ممنوع ہے، لیکن اس کا ایک حل موجود ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس حل کو پیش کرنے سے پہلے قفیز طحان کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

اجرت کی تعیین میں جن صورتوں کو ناکافی یا نادرست سمجھا گیا ہے ان میں ایک صورت یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کو اجرت بنایا جائے جو خود اجیر اور عامل کے عمل کے ذریعہ بعد کو وجود میں آنے والی ہے فقہاء کی زبان اور تعبیر میں خود اجیر کے جزء عمل کو اجرت بنایا جائے، اس کے درست ہونے اور نہ ہونے پر بہت سی صورتوں کا حکم موقوف ہے، اسی لئے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے:

''هذا أصل كبير يعرف به فساد كثير من الإجارات لا سيما في زماننا'' (ہدایہ ۳/ ۲۸۹)۔

لیکن یہ مسئلہ متفق علیہ نہیں بلکہ اس میں اختلاف ہے۔ کہ اس طرح اجرت کی تعیین درست ہوگی یا نہیں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، ابوثور، ابن منذر، حسن، اور ابراہیم نخعیؒ نے اسکو منع کیا ہے، امام احمدؒ، امام اوزاعیؒ ابن سیرین، عطاء، حکم، زہریؒ، قتادہؒ، معمرؒ اور ان کے علاوہ مشہور تابعی محدث اور فقیہ سعید بن المسیب کی بھی یہی رائے ہے اسی کے قائل ابن ابی لیلیٰ، اوزاعیؒ اور لیثؒ بھی ہیں شوافع میں امام مزنیؒ بھی جائز قرار دیتے ہیں امام مالکؒ سے اکثر اہل علم نے اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ کی موافقت نقل کی ہے کہ وہ اسکو ناجائز قرار دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے مالکیہ کا مسلک بھی اس کے جائز ہونے کی بابت نقل کیا ہے (دیکھئے الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۴/ ۱۷۵)۔

مانعین کی دلیل یہ حدیث ہے: ''عن أبي سعيد خدري رضي الله تعالىٰ عنه قال: نهى عن عسب الفحل و عن قفيز الطحان'' (الدرايه في تخريج أحاديث الهداية ۳/ ۲۸۹)۔

(حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ اونٹ کی جفتی کی اجرت اور قفیز طحان سے آپ نے منع فرمایا ہے، قفیز طحان سے مراد یہ کہ کسی کو گیہوں وغیرہ پیسنے کو دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ پسے ہوئے آٹے میں سے اتنی مقدار میں پیمائی کی اجرت کے بطور اس کو دیا جائے گا۔ اس حدیث کے سند و متن پر محدثین نے کلام کیا ہے، چنانچہ حدیث پاک کے جزء ثانی کے بارے میں حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ دار قطنی ابویعلی اور بیہقی میں مذکور ہے اور ضعیف ہے (الدرایہ فی تخریج أحادیث الھدایۃ ۳/ ۲۸۹)۔

علامہ ابن قدامہ مقدسی نے ابن عقیل سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی ہے۔

''وهذا الحديث لانعرفه ولايثبت عندنا حجة'' (المغنی ۵/ ۸)۔

اور اس حدیث کی سند کے اندر بھی محدثین نے کافی کلام کیا ہے حتی کہ سند کے محدثین کے نزدیک متکلم فیہ ہونے کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا بھی مشکوک ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: تدریب الراوی ۱/ ۲۱۱)۔

دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ حدیث میں اس صورت کی ممانعت مقصود ہو جب کہ مقدار اور تعداد مقرر نہ کی جائے آٹا پیسنے والے (طحان) کو کتنے قفیز اجرت کے طور پر دیئے جائیں گے۔ اس صورت میں اجرت کے غیر متعین ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ درست نہ ہوگا۔ اور اگر مقدار متعین کر دی جائے اور اجرت واضح ہو جائے تو اب یہ معاملہ درست ہو جائے گا تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ حدیث ایسے مروج معاملات کو شامل نہ ہوگی جن میں اجیر کے عمل کے اس جزء کو پوری طرح متعین اور واضح کر لیا گیا ہو۔ جس کی حیثیت اجرت کی ہے۔

تیسرے ہم کو اس امر پر بھی غور کرنا چاہئے کہ احناف نے قفیز طحان والی حدیث میں ممانعت کے لئے کسی سبب اور علت کا استخراج کیا ہے امام طحاوی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس نے آٹا کو اجرت بنایا ہے جو فی الحال اس کے پاس موجود نہیں ہے بلکہ اسکے پیسنے کے بعد ہی اسکا وجود ہو سکے گا۔ پس ایک معدوم اور غیر موجود شئے کو اس نے اجرت بنایا ہے اور یہ درست نہیں ہے۔ اسی لئے اس معاملہ سے منع کیا گیا ہے جیسا کہ ایسی چیزوں کے بیچنے سے منع فرمایا گیا ہے جو بیچنے والے کے پاس معاملہ کرتے وقت موجود نہ ہوں (دیکھئے: مشکل الآثار ۱/ ۳۰۷)۔

اب اس خاص معاملہ کے علاوہ جہاں کہیں بھی علت پائی جاتی ہے اور غیر موجود شئے کو اجرت بنایا جاتا ہے وہ تمام چیزیں ناجائز قرار پائیں گی۔

اسی کا نام قیاس ہے اور جو احکام قیاس کے ذریعہ ثابت ہوں اگر عرف و عادت اسکے خلاف ہو تو قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے اور عرف کی بنا پر ایسے مروج عمل کو درست قرار دیا جاتا ہے، جیسا کہ فقہاء نے کاریگروں کے معاملے میں کیا ہے کہ جوتا ساز کو جوتا کا آرڈر دیا جائے اور خرید کا معاملہ طے کر لیا جائے یہ درست ہے، حالانکہ یہاں بھی بیچنے والا جن جوتوں یا سامانوں کو فروخت کرتا ہے وہ ابھی موجود نہیں ہوتا، لیکن لوگوں کے تعامل عرف اور رواج کی رعایت کرتے ہوئے فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اسی کو کتب فقہ میں استصناع سے تعبیر کیا گیا ہے (دیکھئے: ہدایہ ۳/ ۴۵)۔

اور فقہ کی کتابوں میں اس کے حسب ذیل نظائر موجود ہیں:

۱- حدیث سے مزارعت کا جواز معلوم ہوتا ہے: فقہاء کے درمیان گو اس میں اختلاف ہے اور امام ابوحنیفہؒ مزارعت کو درست نہیں کہتے ہیں؛ لیکن تعامل اور رواج کو دیکھتے ہوئے احناف نے بھی اسکے جواز ہی کا فتوی دیا ہے (ہدایہ ۴/۴۰۹)۔

مزارعت میں مزارع کو پیداوار کا ایک حصہ ہی اجرت کے طور پر ملتا ہے جو صریحا عامل کے جزء عمل کو اجرت بنانے کی نظیر ہے۔

۲- فقہاء نے کھیتی ہی کی طرح پھلوں میں بھی بٹائی داری کی اجازت دی ہے، جس کو فقہ کی زبان میں ،، مساقاۃ ،، کہا جاتا ہے یہاں بھی صراحۃ عامل کے جزء عمل کو ہی اجرت بنایا جارہا ہے۔

۳- اس کی تیسری نظیر ،، مضاربت ،، ہے، مضاربت یہ ہے کہ ایک فریق کی طرف سے سرمایہ ہو اور دوسرے کی طرف سے محنت، اور اس سے جو نفع حاصل ہو وہ ایک خاص تناسب کے ساتھ دونوں میں تقسیم ہو جائے، یہاں بھی تاجر و مضارب کو اس کا جزء عمل ہی اجرت کے طور پر ملتا ہے حالانکہ اس کے جواز پر فقہاء کا اتفاق ہے انہیں نظائر کو اسی نوعیت کے ایک مسئلہ میں علامہ مقدسی نے اس طرح ذکر کیا ہے:

"وإنما عين ينتمى بالعمل عليها فصح العقد عليها ببعض نمائها كالدراهم والدنانير كالشجر فى المساقاة والأرض فى المزارعة (المغنى ۵/۷)۔

۴- ہمارے اس زمانے میں زکوۃ اور چندوں کے وصول کرنے پر کچھ فیصد کمیشن مقرر کرنا بھی اسی باب کا مسئلہ ہے اور یہ صرف ایک زکوۃ پر موقوف نہیں بلکہ آج کی کاروباری دنیا میں مختلف معاملات میں کمیشن ایجنٹ کی صورت رواج پذیر ہوگئی ہے، ایجنٹ ادارہ یا کاروبار کو جتنی رقم کا ممبر فراہم کرتا ہے اسی تناسب سے اس کو اجرت دی جاتی ہے، عجیب اتفاق ہے کہ یہ مختلف صورتیں کثرت سے رائج ہیں، اور عرف کا درجہ حاصل کر چکی ہیں، دوسری طرف اوپر یہ بات گذر چکی ہیں کہ قفیز طحان سے متعلق مسائل قیاس پر مبنی ہیں اور قیاسی مسائل میں عرف کو راجح قرار دیا جاتا ہے۔

چندوں کے وصول کرنے میں سفراء اور محصلین و عاملین کے لئے کمیشن کی ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ ایسے مدارس اور ادارے جنکی پشت پر تاریخی عظمت نہ ہو، اور جو عام مسلمانوں کے چار آٹھ آنے کے ذریعہ اپنی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں، سفراء کے لئے یہ صورت زبردست ترغیب کا باعث بن جاتی ہے، اور وہ زیادہ سے زیادہ محنت اور لگن کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتے ہیں، اگر تنخواہیں مقرر ہیں تو بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی وصولی اور سفر کے اخراجات نیز تنخواہ برابر ہو جاتی ہے، اور ادارہ کو ان سے خاطر خواہ نفع نہیں پہونچتا۔

قفیز طحان والی روایت کے علاوہ اس طرح کے معاملات کو نہ درست قرار دیئے جانے کی دوسری وجہ یہ ذکر کی جاتی ہے کہ ان صورتوں میں اجرت کی مقدار پوری طرح متعین نہیں ہوتی۔ اور اجرت کا غیر متعین (مجہول) ہونا من جملہ ان اسباب کے ہیں جن کی وجہ سے اجارہ کا معاملہ درست نہیں ہوتا۔ یہ شبہ درست نہیں اس سلسلہ میں عاملین زکوۃ کے لئے کمیشن کے مسئلہ پر راقم سطور نے اپنی تالیف قاموس الفقہ میں جو کچھ لکھا ہے اسکا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

رہ گئی بات یہ کہ اس میں اجرت متعین نہیں ہوتی اور اجارہ کے منعقد ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اجرت معلوم ہو جائے ہم عرض کریں گے کہ اجرت کا اس طرح غیر متعین اور نامعلوم ہونا اجارہ کے درست ہونے کے لئے رکاوٹ ہے۔ جو آئندہ چل کر نزاع اور باہمی اختلاف کا سبب بن سکتا ہے یہاں ایسی بات نہیں بلکہ یہ متعین ہے کہ وہ جس قدر چندہ وصول کرے گا اس تناسب سے اجرت کا مستحق ہوگا اس لئے بعد میں نزاع پیدا ہونے کا امکان نہیں اور تعامل و تجربات اس پر شاہد ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے خرید و فروخت کے ایسے معاملات کو دیانتا درست قرار دیا ہے جس میں گو کہ قیمت یا سودا پوری طرح متعین نہ ہو مگر آئندہ نزاع یا اختلاف پیدا ہونے امکان نہ ہو۔

"إن من البيوع الفاسدة مالواتى بها أحد جازت ديانة وإن كانت فاسدة قضاءً أو ذلك لأن الفساد قد يكون لحق الشرع بأن اشتمل العقد على مأثم فلايجوز بحال وقد يكون الفساد لمخافة التنازع ولايكون فيه

شیء آخر یوجب الاثم ۔ فذلك ان لم یقع فیه التنازع جاز عندی دیانة وإن بقی فاسدًا قضاءًا لارتفاع علة الفساد وهو المنازعة" (فیض الباری ۳/۲۵۸ کتاب البیوع)۔

(بعض بیوع فاسدہ ایسی ہیں اگر کوئی شخص ان کا معاملہ کرلے تو دیانۃً جائز ہیں گو قضاءًا فاسد ہیں ایسا اس لئے کہ فساد کبھی حق شرع کی بنا پر ہوتا ہے کہ وہ معاملہ کسی گناہ پر مشتمل ہو یہ معاملہ کسی صورت میں جائز نہیں ہوگا اور کبھی فساد نزع کے اندیشہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس میں اور کوئی باعث گناہ نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں اگر نزاع نہیں پیدا ہو تو میرے نزدیک دیانۃً جائز ہوگا چونکہ فساد ختم ہو چکا ہے گو وہ قضاءً فاسد باقی رہے گی) (ماخوذ ملخصًا از جدید فقہی مسائل ۴/۳۱۹۔ ۳۳۳)۔

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

۱- قفیز طحان والی روایت کی سند محدثین کے نزدیک متکلم فیہ ہے۔

۲- اس کا متن بھی محدثین کے نزدیک مشکوک ہے۔

۳- اس میں یہ تاویل ممکن ہے کہ یہ اس صورت پر محمول ہے جس میں مقدار مقرر نہ کی گئی ہو۔

۴- اگر تاویل نہ ہو اور یہ سمجھا جائے کہ عامل کے جس عمل کو اجرت نہ بنایا جائے تو ایسی تمام جزئیات پر اسکا انطباق قیاس کے قبیل سے ہوگا۔

۵- اور قاعدہ ہے کہ قیاس کے ذریعہ ثابت شدہ احکام کا اگر عرف ورواج کے مطابق ثابت شدہ احکام سے تعارض ہو تو قیاس کو چھوڑ کر مروج اور معروف عمل کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔

۶- اور اسی وجہ سے ہمارے زمانے میں تجارت کے اندر بہت سے ایسے طریقے رائج ہیں جن میں عامل کے جس عمل کو اجرت قرار دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے معاملات میں اگرچہ قطعی مقدار مقرر نہیں کی جاتی لیکن ایسا تناسب طے کر دیا جاتا ہے جو اجرت کی مقدار مآلًا متعین کر دیتا ہے اور نزاع پیدا نہیں ہوتا اور کسی معاملہ میں ایسی جہالت اور عدم تعین جو نزاع کا باعث نہ ہو مضر نہیں۔

۷- اور شریعت الہیہ میں مزارعت مساقات اور مضاربت کی شکل میں اسکے نظائر موجود ہیں۔ اور صحت وصراحت کے ساتھ ثابت ہے جو عامل کے جزء عمل کو اجرت قرار دینے کو درست قرار دیتی ہیں اس لئے ہمارے زمانے میں تجارت اور معاملات کے اندر ایسی صورتیں جو قفیز طحان کے قبیل سے ہیں اور کثرت سے رائج ہیں جائز ہونی چاہئے لہذا سونے کے زیورات کی شکل میں جو ذرات اجرت بن رہے ہیں وہ اجرت من جزء العمل ہیں۔ اور قفیز طحان کے قبیل سے ہونے کی وجہ سے ناجائز ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ یہ مسئلہ قیاسی ہے، اور عرف ورواج اسکے برخلاف جواز کا فتویٰ دیتا ہے۔ اور قیاس وعرف ورواج میں تعارض کی شکل میں عرف ورواج کو ہی ترجیح ہوتی ہے۔ اس لئے یہ سونے کی ذرات کے اجرت عرف ورواج کے مطابق جائز ہونی چاہئے۔ یہی رائے خاتم المحدثین حضرت علامہ انور شاہؒ کی بھی ہے۔ جیسا کہ پیچھے (فیض الباری ۳/ ۲۵۸) کے حوالہ سے اقتباس گذر چکا ہے اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی بھی ہے (دیکھئے: جدید فقہی مسائل ۴/۳۲۸۔۳۳۲)۔

اور اب یہی رائے اس زمانہ کے اکثر اہل علم اور ارباب افتاء کی ہے۔

۳- سونا چاندی اگر ڈلے یا سکے کی شکل میں ہو تو باتفاق فقہاء انکا تبادلہ صرف ہوگا۔ اسی طرح فقہاء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ سونا چاندی اگر ڈھلا ہوا ہو زیورات اور سونے چاندے کے برتنوں وغیرہ کی شکل میں تو انکا تبادلہ بھی صرف ہی ہوگا۔ اور وہ بھی بے ڈھلے سونے چاندی کے حکم میں ہوگا۔ لہذا اگر سونے کے زیورات کو سونے کے ڈلے، یا دینار یا کسی دوسرے زیور کے بدلے میں بیچا جائے تو اس میں تماثل اور تقابض ضروری ہوگا۔ اور اگر خلاف جنس کے ساتھ بیچا جائے تو تقابض ضروری ہوگا۔ یہی ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کا پسندیدہ مذہب ہے (فقہ البیوع ۲/ ۷۰۸)، اگرچہ ابن قیمؒ نے جمہور کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈھلے ہوئے سونے چاندی کی بیع دینار یا بے ڈھلے سونے چاندی کے ساتھ تفاضل یعنی کمی زیادتی کے ساتھ بھی جائز ہے اور اس میں تقابض بھی شرط نہیں۔ گویا کہ انہوں نے اسکو صرف نہیں مانا بلکہ عمل صناعت کی وجہ سے وہ سونے چاندی کے حکم سے نکل کر دیگر مال کی طرح ہوگیا (اعلام الموقعین ۲/ ۱۰۴)، لیکن یہ قول شاذ ہے۔ روایت درایت دونوں

کے خلاف ہے (فقہ البیوع ۲ /۷۰۹، تفصیل کے لئے دیکھئے: إعلام الموقعین ۲ / ۱۰۴، نیز فقہ البیوع للشیخ عثمانی ۲ /۷۰۹)۔

اس لئے صورت مسئولہ میں جبکہ گاہک پرانا مال لاتا ہے جس کا کل وزن ۱۰ گرام ہوتا ہے اور قیمت مثلاً پندرہ ہزار طے ہوتی ہے اور نئے مال کا وزن ۸ گرام ہوتا ہے اور قیمت پندرہ ہزار طے ہوتی ہے یعنی صرف مال کا تبادلہ ہوتا ہے نقد روپیوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا یہ طریقہ ناجائز اور حرام ہوگا۔ اس لئے کہ سونے چاندی کے زیورات بھی سونا چاندی کے حکم میں ہے لہذا کمی زیادتی کے ساتھ انکی خرید وفروخت درست نہیں ہے ربا اور سود میں داخل ہے۔ چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے، حضرت فضالہ بن عبیدؓ فرماتے ہیں:

''أتی رسول الله ﷺ وهو بخیبر بقلادة فیها خرز و ذهب وهی من المغانم تُباع۔ فأمر رسول الله ﷺ بالذهب الذی فی القلادة، فنزع وحده ثم قال لهم رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب وزنًا بوزنٍ'' (صحیح مسلم باب بیع القلادة فیها خرز وذهب، حدیث:۴۰۴۶)۔

(کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں خیبر میں ایک ہار پیش کیا گیا جس میں موتی اور سونا تھا اور اسکو مال غنیمت کے بدلے میں فروخت کیا جارہا تھا تو آپ ﷺ نے ہار کے سونے کے بارے میں حکم دیا تو وہ ہار سے الگ کردیا گیا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ سونے کو سونے کے بدلے برابر برابر وزن میں خرید وفروخت کی جائے۔ دیکھئے اس روایت میں بظاہر یہ معلوم ہورہا ہے کہ وہ ہار ڈھال کر کے تیار کیا ہوا تھا تو اگر ڈھالے ہوئے زیور کی بیع بے ڈھلے سونے کے ساتھ حرام نہ ہوتی تو سونا الگ کرنے کا حکم نہ دیا جاتا تھا۔ اور اگر یہ ڈھلا ہوا سونا سامان کے حکم میں ہوتا جیسا کہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں تو پھر چونکہ اس ہار میں موتی شامل تھا اور اس کے ساتھ بنا ہوا تھا تو یقیناً اس ہار کو سامان کی حیثیت دیا جانا زیادہ درست اور لائق ہوتا۔ لیکن اس ہار کو سامان کی حیثیت نہ دینا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ڈھلے ہوئے سونے کو سامان نہیں بلکہ سونے کے حکم میں ہی رکھا ہے۔ اسی طرح ایک اور روایت ہے۔

(ابورافع کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ میرے پاس آئے، آپ کے پاس چاندی تھی، اور کہا کہ ہماری ایک بچی کے لئے پازیب بنادو، میں نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! میرے پاس بنے ہوئے پازیب رکھے ہیں، آپ چاہیں تو چاندی میں لے لیتا ہوں، اور آپ پازیب لے لیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا برابر وزن دینے کو تیار ہو، میں نے کہا کہ جی ہاں، تو حضرت عمرؓ نے چاندی ترازو کے ایک پلڑے میں رکھی اور پازیب دوسرے میں جب ترازو سیدھی ہوگئی تو آپ نے ایک ہاتھ سے پازیب لیا اور دوسرے ہاتھ سے چاندی پکڑائی (معانی الآثار بحوالہ إعلاء السنن ۱۴/۲۸۸)۔

موضوع سے متعلق اور بھی روایتیں ہیں لیکن اختصاراً انہیں پر اکتفا کرتا ہوں ان روایتوں وآثار سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ سونے چاندی کے تیار شدہ زیورات بھی سونے اور چاندی کے ہی حکم میں ہے اس لئے جیسے سونے کے تیار زیور کو زائد سونے کے عوض اور چاندی کے تیار زیور کو زائد چاندی کے عوض میں فروخت کرنا جائز نہیں اسی طرح سونے چاندی کے زیورات کا آپس میں کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ بھی ناجائز اور حرام ہوگا اس لئے سوال میں ذکر کردہ طریقہ بھی ناجائز اور حرام ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مذکورہ صورت ناجائز ہوگئی تو پرانے زیور کے نئے زیور سے تبادلہ کی جائز صورت کیا ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جو عام فہم اور آسان طریقہ ہے وہ یہ کہ دوکاندار گاہک سے روپئے میں اسکا پرانا زیور خریدے اور گاہک کو روپیہ ادا کردے اسکے بعد گاہک جو نیا زیور خریدے اس کی قیمت اس سے وصول کرلے۔ اسکے لئے دوکاندار کو صرف اتنا اہتمام کرنا پڑے گا کہ اپنے پاس نقدی کی ایک مقدار حاضر رکھنی پڑے گی۔ لیکن یہ کوئی مشکل بات نہیں اور اس تھوڑے سے اہتمام کی برکت سے وہ بڑے گناہ سے بچ جائے گا۔

زیور کے زیور سے تبادلہ کے چند اصول:

اگر زیور کا زیور سے تبادلہ کرنا ہو تو مندرجہ ذیل چند اصول کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

الف: اگر دونوں زیور سادہ ہو اور دوکاندار کا زیور گاہک کے زیور کے وزن کے مساوی ہو یا اس سے وزن میں کم ہو اور دوکاندار مزید گاہک سے کچھ لینا چاہتا ہو تو اپنے زیور کے ساتھ (Immitation) کی مثلاً بالیاں ساتھ کردے۔

اور اگر دوکاندار کا زیور گاہک کے زیور سے زیادہ وزن کا ہے تو دوکاندار گاہک سے زائد روپئے بھی لے سکتا ہے۔

ب: اگر زیور جڑاؤ ہو تو ہر طرح سے زیور کا زیور کے بدلے تبادلہ جائز ہوگا۔ اس وقت ایک طرف کا زائد سونا بمعہ روپئے کے (اگر ہو) دوسرے کے نگینوں کی قیمت ہوجائے گی، ایسا دونوں طرف سے سمجھا جائے گا۔

ج: اگر ایک طرف سادا زیور ہو اور دوسری طرف جڑاؤ اور دوکاندار گاہک سے مزید لینا چاہتا ہو۔

۱۔ اگر جڑاؤ زیور دوکاندار کا ہو اور سادا زیور گاہک کا ہو تو خواہ گاہک کے زیور کا سونا دوکاندار کے زیور میں موجود سونے سے کم ہو یا زیادہ ہو یا اسکے برابر ہو، ہر صورت میں زائد روپئے لینا جائز ہے۔

۲۔ اگر سادہ زیور دوکاندار کا ہو، اور جڑاؤ گاہک کا ہو تو اگر گاہک کے زیور میں سونا دوکاندار کے سونے سے کم ہو تو دوکاندار گاہک سے روپیہ لے سکتا ہے۔ اور اسکے زیور میں موجود مساوی سونا ہو یا زائد ہو تو دوکاندار گاہک سے مزید روپئے نہیں لے سکتا (ماخوذ: زر کا تحقیقی مطالعہ ص: ۱۹۰)۔

۴۔ الف- احناف کے یہاں تمام اموال میں تسلیم وقبضہ کی حقیقت ایک ہی ہے یعنی تخلیہ وتخلی، چنانچہ علامہ کاسانی ''بدائع الصنائع'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''ثم لا خلاف بین أصحابنا أن أصل القبض یحصل بالتخلیة فی سائر الأموال'' (بدائع ۲۴۴/۵)۔

تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ بائع، مبیع اور مشتری کے درمیان تمام موانع اور رکاوٹوں کو اس طور پر ختم کردے کہ مشتری بیع کے اندر ہر طرح کے تصرف پر پوری طرح قادر ہوجائے، علامہ کاسانی نے تسلیم اور قبضہ کے مفہوم کی وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے۔

''أما تفسیر التسلیم والقبض عندنا هو التخلیة والتخلی وهو أن یخلی البائع بین المبیع و بین المشتری برفع الحائل بینهما علی وجه یتمکن المشتری من التصرف فیه فیجعل البائع مسلما للمبیع والمشتری قابضًا له'' (بدائع ۲۴۴/۵)

صاحب بدائع کی اس عبارت سے یہ واضح ہوگیا کہ احناف کے نزدیک اصل حوالگی مبیع بائع کی طرف سے تخلیہ اور مشتری کی طرف سے تخلی ہے۔ ہاں تخلیہ کی نوعیت میں اختلاف ہوسکتا ہے جبکہ مبیع کے انواع میں اختلاف ہو اور تخلیہ کی نوعیت میں تبدیلی کا دارو مدار عرف وعادت پر محمول ہوگا چنانچہ جس مقام پر جس طرح کے استیلاء کو وہاں کے عرف میں قبضہ سمجھا جاتا ہوگا، اسی کو اس معاملہ میں شرعاً قبضہ مانا جائے گا۔

علامہ شامیؒ بحر کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں: ''حاصله أن التخلیة قبض حکمًا لو مع القدرة علیه بلا کلفة لکن ذلك یختلف بحسب حال المبیع'' (شامی ۹۶/۷، زکریا، دیوبند)۔

اور بدائع میں ہے: ''لأن معنی القبض هو التمکین والتخلی وارتفاع الموانع عرفا و عادةً حقیقةً'' (بدائع ۱۴۸/۵)

درمختار میں ہے: ''ثم التسلیم یکون بالتخلیة علی وجه یتمکن من القبض بلا مانع ولا حائل''

(الدر المختار مع الشامی ۹۷/۷، ۹۴، زکریا دیوبند)۔

درمختار کی مذکورہ عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ بیع کی تسلیم وسپردگی تخلیہ کی صورت میں اس وقت مکمل مانی جائے گی جبکہ مشتری مبیع پر بلا کسی مانع اور حائل کے تصرف پر قادر ہوجائے۔

تخلیہ کے اندر بلا مانع اور بلا حائل کی شرط کا مفہوم یہ ہے کہ مبیع بالکل علاحدہ الگ تھلگ اس انداز سے ہو کہ اس سے غیر کا حق متعلق نہ ہو

''بأن یکون مفرزًا غیر مشغول بحق غیره'' (شامی ۹۶/۷، زکریا، دیوبند)۔

چنانچہ اگر کسی نے گھر بیچا اور مشتری کے حوالہ بھی کردیا۔ لیکن اس مکان کے اندر تھوڑا یا زیادہ بائع کا سامان موجود ہے تو اس صورت میں مبیع کی حوالگی اور تسلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک بائع اس مکان کو مکمل خالی نہ کردے۔

''ولو باع دارًا وسلمها إلی المشتری وله فیها متاع قلیل أو کثیر لا یکون تسلیمًا حتی یسلمها فارغة''

(شامی ۹۶/۷، زکریا دیوبند)۔

الغرض شریعت نے قبضہ کی اصل اور حقیقت تخلیہ کی شکل میں متعین کردی ہے۔ لیکن اس کی نوعیت میں مکان اور مبیع کے اختلاف کے باعث اختلاف ہوسکتا ہے، ''لکن ذلک یختلف بحسب حال المبیع'' اور اس کا تعلق ہر زمانہ میں اس زمانہ کے عرف وعادت سے ہوگا۔ اس کی مختلف

صورتوں کا ذکر علامہ شامی نے ان لفظوں میں فرمایا ہے:

"ففی نحو حنطة فی بیت مثلًا فدفع المفتاح إذا أمکنه الفتح بلا کلفة قبض وفی نحو دار فالقدرة علی إغلاقها قبض و نحو بقر فی مرعی فکونه بحیث یری ویشار إلیه قبض وفی نحو ثوب فکونه بحیث لو مدیده تصل إلیه قبض... إلی غیرذلك" (شامی ۷/ ۹۶ زکریا دیوبند)۔

مثلاً کسی مکان کے اندر موجود گیہوں خرید اتو بائع کا مشتری کو اس مکان کی کنجی اس طور پر حوالہ کر دینا کہ وہ اس کو بلا کسی تردد کے کھول سکے مشتری کے حق میں قبضہ مانا جائے گا۔ اور اگر کسی نے گھر خرید ااور بائع اس کی کنجی مشتری کو دیدے کہ وہ اس گھر کو بند کر سکے تو اس صورت میں مشتری کا کنجی پالینا ہی قبضہ ہوگا بشرطیکہ وہ گھر اس شہر میں ہو۔

وفی نحو دار فالقدرة علی إغلاقها قبض أی بأن تکون فی البلد فیما یظهر (شامی ۷/ ۹۶ زکریا دیوبند)

ہمارے موجودہ زمانے میں اس کی مثال وہ صورت ہے جس میں بین الاقوامی تجارت میں شپنگ (جہاز پر مال چڑھانے) کے بعد اصل بائع کا ذمہ فارغ ہو جاتا ہے اور اگر مشتری تک مال پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں پر بائع کی طرف حوالگی مبیع اور تخلیہ پایا گیا اور وہ یہاں پر مال کی شپنگ ہے۔ اس لئے اس صورت میں بائع کا فارغ الذمہ ہونا ہی قرین قیاس ہے اور یہ بیع بھی درست ہے کیونکہ بائع کی طرف سے مبیع کی تسلیم بصورت شپنگ موجود ہے اب اگر یہ مشتری اس مال کو اپنے ضمان میں لے لیتا ہے۔ اور پھر کسی کے ہاتھ اُسے فروخت کرتا ہے تو یہ بیع بھی درست مانی جائے گی۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہو گیا کہ بائع کی طرف سے حوالگی کی ایسی صورت سامنے آجائے جس کے بعد مشتری مبیع پر قابض ومتصرف ہو سکے تو اس کی طرف سے تسلیم کی یہ صورت تخلیہ ہوگی۔ اور مشتری کے حق میں تخلی یعنی قبضہ ہوگا خواہ مبیع منقول ہو یا غیر منقولہ جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہو گیا۔ البتہ تخلیہ کی صورتیں مبیع کی مختلف نوعیتوں کی بناء پر مختلف ہوں گی۔ جو ہر زمانے کے عرف وعادت پر محمول ہوگی۔ اور اس کا فیصلہ ہر زمانے کے علماء اس زمانے کے عرف وعادت اور مزاج ومذاق کو سامنے رکھ کر کریں گے۔

اور انٹرنیٹ کی موجودہ صورت میں غالباً تخلیہ کی شکل یہ ہوگی کہ بیع الگ کر کے مشتری کے نام رجسٹرڈ کر کے کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر وغیرہ میں درج کی جائے۔ تاکہ وہ اس مبیع کا ذمہ دار ہو جائے اور مبیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں وہ اسکا ضامن ہوگا۔ جیسا کہ ابھی شامی کے حوالے سے گذرا ہے کہ "بأن یکون مفرزًا غیر مشغول بحق غیره" (شامی ۷/ ۹۶)، یعنی مبیع اس انداز سے الگ تھلگ ہو کہ اس سے غیر کا حق متعلق نہ ہو اور سوال میں مذکور صورت پر غور کیا جائے تو اولاً مبیع معدوم ہے۔ کیونکہ ایک کلوگرام اگر ۵۰۔۵۰ گرام کر کے فروخت کیا جائے تو صرف بیس افراد پر تقسیم ہو سکے گا حالانکہ یہاں پر ۲۰۰ افراد کو بیچا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکے علاوہ کے حق میں مبیع غیر موجود یعنی معدوم ہے۔ اور معدوم کی بیع باطل ہوتی ہے۔ جیسا کہ قدوری، ہدایہ وغیرہ میں ہے۔ چنانچہ شامی میں ہے:

"وکل ما أورث خللًا فی رکن البیع فهو مبطل وماأورثه فی غیره فمفسد۔ (درمختار) قوله فی رکن البیع هوالإیجاب والقبول۔ أو فی محله أعنی المبیع فإن الخلل فیه مبطل۔ (شامی۔ ۴/۱۰۰)

لہذا پہلے کے بیس کے حق میں مبیع موجود ہوگی۔ اور ۲۱ سے لیکر دوسو کے حق میں معدوم ہوگی۔ اس لئے ۲۱ سے دوسو تک بیع باطل ہوگی۔

چنانچہ مفتی سلمان منصور پوری صاحب انٹرنیٹ پر خرید وفروخت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب وباللّٰه التوفیق:

سوال میں انٹرنیٹ پر بیٹھے بیٹھے جس خرید وفروخت کا ذکر ہے، وہ شرعاً حرام ہے اور اس سے حاصل شدہ نفع بھی ہرگز حلال نہیں ہے، اس لئے کہ شریعت میں کسی بھی چیز کو قبضہ سے قبل بیچنا جائز نہیں ہوتا۔ اور یہاں ساری خرید وفروخت محض ہوا میں ہوتی ہے۔ اصل مبیع کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی مشتری اصل مبیع کا مالک ہوتا ہے لہذا کاروبار کی یہ تمام صورتیں محض جوئے اور سٹے پر مشتمل ہونے کی وجہ سے قطعاً حرام ہے کسی مسلمان کے لئے ایسے کاروبار میں شرکت کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

قال الله تعالى:

"یایها الذین اٰمنو انما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون" (سورۂ مائدہ ۹۰)

"عن ابن عباس رضی الله تعالىٰ عنهما قال: قال رسول الله ﷺ من ابتاع طعاما فلا يبيعه حتى يستوفيه قال ابن عباس وأحسب كل شئى مثله" (صحیح مسلم ۲/ ۵)۔

"عن عمر قال: قال ﷺ: نهى عن بيع الطعام حتى يقبض" (المعجم الاوسط للطبرانی ۷/ ۲۶۸، رقم: ۷۴۱۴)۔

"عن حكيم بن حزام رضى الله عنه قال: يارسول الله! يأتينى الرجل فيريد منى البيع ليس عندى. أفأبتاعه له من السوق؟ فقال: لاتبع ماليس عندك" أخرجه أبو داؤد وسكت عنه" (سنن ابو داؤد رقم: ۳،۳۵۰، سنن الترمذی ۱۲۳۲، سنن ابن ماجۃ رقم ۲۱۸۷، سنن الدار قطنی ۹/۳، إعلاء السنن، باب بیع مالیس عندہ ۱۴/ ۱۸۰ رقم: ۴۶۶۸، دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔

"لايصح اتفاقًا بيع منقول قبل قبضه ولو من بائعه" (در مختار مع الشامی ۷/۳۶۹، زکریا دیوبند، کتاب النوازل ۱۱/ ۱۰۸)۔

اب رہا مسئلہ ا-۲۰ تک تو یہاں پر اگر چہ مبیع موجود ہے لیکن ظاہر ہے وہ الگ الگ متعین نہیں کی گئی ہے بلکہ غیر متعین ہے اور مبیع غیر متعین ہونے کی وجہ سے قبضہ کا بھی تحقق نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ ابھی پتہ چلا کہ قبضہ کے تحقق کے لئے ضروری ہے مبیع کو مشتری کے لئے بالکل الگ تھلگ کر دیا جائے اور یہاں پر ایسا نہیں ہے لہذا مبیع کے غیر متعین ہونے کی وجہ سے یہ صورت بعض مواقع میں مفضی الی المنازعۃ ہوگی اور بیع فاسد ہوگی۔ مثلاً اگر سونے کا پچاس گرام کا ایک حصہ ضائع ہو جائے یا کم نکلے تو پھر نزاع ہوگا۔ کہ یہ نقصان کس کا مانا جائے یا سب پر تقسیم کیا جائے۔ اسی نزاع کی وجہ سے یہ بیع فاسد کہلائے گی۔

(ب) اسی سوال کی شق الف کے جواب میں قبضہ کے سلسلے میں بھی بات آئی تھی جس کے بارے میں عرض کیا گیا تھا کہ احناف کے یہاں قبضہ کی حقیقت ہے تخلیہ وتخلی البتہ مبیع کے انواع میں اختلاف سے تخلیہ کی نوعیت میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ اور تخلیہ کی نوعیت میں تبدیلی کا دارومدار عرف وعادت پر محمول ہوگا چنانچہ جس مقام پر جس طرح کے استیلاء کو وہاں کے عرف میں قبضہ سمجھا جائے گا اسی کو اس معاملے میں شرعاً قبضہ مانا جائے گا۔ اور اسکی مثال موجودہ زمانہ کے لحاظ سے وہ صورت ہے جس میں بین الاقوامی تجارت میں شپنگ (جہاز پر مال چڑھانے) کے بعد اصل بائع کا ذمہ دار فارغ ہو جاتا ہے اور مشتری کے ضمان اور رسک میں آجاتا ہے، لہذا اگر وہ مال مشتری تک پہنچنے سے پہلے ضائع ہو جائے تو وہ اسکا ضامن نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہاں پر بائع کی طرف سے حوالگی مبیع اور تخلیہ پایا گیا اور وہ یہاں پر مال کی شپنگ ہے تو یہاں پر جہاز پر مال کے چڑھا دینے سے ہی مشتری کے ضمان میں آگیا اور اس کو تخلیہ مان کر قبضہ کو ثابت مان لیا گیا حالانکہ مال پہ مشتری کا حقیقی قبضہ نہیں ہوا۔

اسی طرح صورت مسئولہ میں اگر خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہے اور اسکو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اسکے نام درج کر دیا گیا تو اگر چہ یہاں پر حقیقتاً مشتری کا قبضہ نہیں ہوا لیکن مال حکماً مشتری کے قبضہ میں آگیا مشتری کے ضمان اور رسک میں آجانے کی وجہ سے، اس لئے یہاں پر بھی قبضہ متحقق اور ثابت ہوگا اور اندراج کے لئے قبضہ کو کافی مان کر مشتری کے لئے مشتری آخر کے ساتھ بیچنا درست ہوگا۔

چنانچہ مفتی سلمان صاحب انٹرنیٹ کے ذریعہ خرید وفروخت کے متعلق ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب و بالله التوفيق:

آج کل انٹرنیٹ پر خرید وفروخت کا جو سلسلہ جاری ہے وہ محض جوا اور سٹہ ہے، اور مختلف وجوہات کی وجہ سے حرام ہے، کیونکہ اس میں مبیع معدوم ہوتی ہے، نیز قبضہ کے بغیر بیع در بیع ہوتی ہے، دراصل یہ بیع نہیں، بلکہ بیع کا مذاق ہے، البتہ اگر باقاعدہ تجارت متعین اور موجود ہو اور حقیقی طور پر مبیع پر قبضہ کی صورتیں متحقق ہوں اور انٹرنیٹ کو صرف آپسی معاملات اور رابطہ کا ذریعہ بنایا جائے، جیسا کہ بڑی بڑی فرموں اور کمپنیوں کا طریقہ ہے، تو اس مقصد کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال اسی طرح جائز ہے جیسے فیکس اور خط وکتابت جائز ہے۔

"عن حكيم بن حزام رضى الله عنه قال سألت رسول الله ﷺ فقلت يأتينى الرجل فيسألنى من البيع ماليس عندى فأبتاع له من السوق ثم أبيعه، قال لاتبع ما ليس عندك" (سنن الترمذی ۱/ ۲۳۳)۔

"وأن يكون مقدور التسليم فلم ينعقد بيع المعدوم" (البحر الرائق ۵/ ۲۵۹ کوئٹہ. كذا فى بدائع الصنائع /

من شروط البیع کونه مقدور التسلیم ۴/ ۳۷۳ زکریا)۔

''وأما المعدوم فلایحتمل العقد أصلًا، لأنه لیس بشئ'' (بدائع الصنائع/ بیع الموزونات ۲۶۴/۴زکریا، کتاب النوازل ۱۱/ ۱۰۹)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

۵- سوال میں ذکر کردہ تفصیل کے مطابق یہ صورت ناجائز اور حرام ہے جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اگرچہ سونا چاندی کی روپیوں کے عوض ادھار خرید وفروخت جائز ہے لیکن سودے کے وقت ایک جانب سے قبضہ ضروری ہے اور یہاں پر جانبین سے قبضہ مفقود ہے جس کی بنا پر یہ صورت درست نہیں ہے۔

''فی شرح الطحاوی: لو اشتری مائة فلس بدرهم و قبض الفلوس أو الدراهم ثم افترقا جاز البیع لانهما افترقا عن عین بدین'' (فتح القدیر ۶/ ۲۷۸)۔

اور شرح طحاوی میں ہے کہ اگر کسی نے ایک درہم کے بدلے سو فلس خریدیں اور فلوس یا درہم پر قبضہ کرلیا اور پھر دونوں الگ الگ ہوگئے تو یہ بیع جائز ہے کیونکہ اس میں دین کے بدلے میں عین کا سودا کر کے جدا ہوگئے۔

''سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس نسیئة فأجاب بأنه یجوز إذا قبض أحد البدلین لما فی البزازیه لواشتری مائة فلس بدرهم یکفی التقابض من أحد الجانبین قال و مثله مالو باع فضة أو ذهبا بفلوس کما فی البحر عن المحیط'' (شامی ۷/ ۴۱۴)

(علامہ حانوتی سے فلوس کے بدلے سونے کو ادھار فروخت کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جائز ہے بشرطیکہ ایک بدل پر قبضہ ہو کیونکہ بزازیہ میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص سو فلس ایک درہم کے بدلے خریدے تو ایک جانب سے قبضہ کافی ہے فرمایا اسی طرح اگر فلوس کے بدلے چاندی یا سونے کو بیچا)۔

نیز علامہ سرخسیؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے (المبسوط للسرخسی ۱۴/ ۲۴)۔

چونکہ روپئے بھی فلوس کے حکم میں ہے، لہٰذا مندرجہ بالا عبارات کی روشنی میں سونے چاندی کی خرید وفروخت روپے کے عوض میں جائز ہے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ ایک جانب سے مال پر قبضہ جدا ہونے سے پہلے کرلیا جائے، دونوں اُدھار ہو، تو یہ جائز نہیں خواہ کتنی ہی تھوڑی مدت کے لئے ہو، کیونکہ اس صورت میں یہ بیع الکالی بالکالی کے حکم میں ہوگا اور اس سے احادیث میں ممانعت آئی ہے۔

''عن ابی عمر رضی الله عنهم نبی ﷺ نهی عن بیع الکالی بالکالی''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُدھار کی اُدھار کے عوض بیع سے منع فرمایا:

چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب نوٹ کے بدلے سونے چاندی کی نقد اور ادھار خرید وفروخت کے متعلق عربی میں ایک سوال ہے، جس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: ''ویجوز عندی أن یشتری الذهب أوالفضة بالنقود، یجوز أیضًا أن یشتری الذهب نسیئة بالأوراق النقدیة ولکن یجب أن یکون تقابض أحد البدلین فی المجلس إذا کان ذہبًا خالصًا و أن یعرف الأجل عند العقد و قد قبل هذا الموقف معظم علماء الهند وکثیر من باکستان'' (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۹)۔

(۲) جہاں تک معلوم ہوا اس طرح کے کاروبار میں جب کوئی چیز سونا وغیرہ خریدا جاتا ہے تو وہ خریدار کو متعین اور الگ کر کے حوالے نہیں کی جاتی بلکہ اس کے اکاؤنٹ میں تحریر کردی جاتی ہے پھر جب وہ خریدار اُسے آگے کسی شخص کو فروخت کرتا ہے تو اس وقت اگر اس کو نفع ہو تو صرف نفع واپس کردیا جاتا ہے اور اگر نقصان ہو تو اس سے نقصان طلب کرلیا جاتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ پوری خریدی ہوئی چیز اس کے حوالے نہیں کی جاتی بلکہ کاغذی طور پر اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کردی جاتی ہے۔ اور نفع اور نقصان کا فرق برابر کرلیا جاتا ہے جوئے کی ایک قسم ہے۔

''وفی البدائع: فالتسلیم والقبض عندنا هو التخلیة والتخلی وهو أن یخلی البائع بین المبیع وبین المشتری برفع الحائل بینهما علی وجه یتمکن المشتری من التصرف فیه فیجعل البائع مسلمًا للمبیع والمشتری قابضًا له'' ۵/ ۲۴۴)

''ويعتبر في التسليم أن يكون المبيع مفرزًا غير مشغول بحق غيره هكذ في الوجيز للكردري وأجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضًا''۔۔۔۔ الخ (ہندیہ ۳/ ۱۶)۔

لہٰذا مذکورہ بالا مفاسد کی وجہ سے یہ صورت ناجائز اور حرام ہوگی۔

۶- اصل مسئلہ پر گفتگو سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احتکار کی تعریف اور اس کے سلسلے میں حضرات فقہائے کرام کی آراء نقل کر دی جائیں تا کہ متعلقہ مسئلہ کا حل آسان ہو جائے۔

احتکار لغت میں کہتے ہیں غلہ کو اس نیت سے ذخیرہ کر لینا کہ جب مہنگا ہو جائے گا تو فروخت کروں گا اور شرعاً احتکار کا معنی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان یا حیوان کی غذا ہو اسکو ایسے وقت روک لینا جب شہر والوں کو اس کی ضرورت ہو، مقصد یہ ہے کہ بعد میں خوب زیادہ قیمت لے کر فروخت کروں گا چونکہ اس سے لوگوں اور حیوانات کو تکلیف پہنچتی ہے (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وأدلتہ للزحیلی ۳/ ۵۸۶، فقہ البیوع ۲/ ۹۹۶، قاموس الفقہ ۲/ ۳۹)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑے سخت الفاظ میں اس طرز عمل کی مذمت فرمائی ہے آپ نے فرمایا جس شخص نے احتکار کیا وہ گنہگار ہے۔

''من احتكر فهو خاطى'' (أخرجه مسلم في باب تحريم الاحتكار ۲/ ۳۱)۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل شہر کے مشقت اور نظم مملکت کے لئے فساد اور بگاڑ کا باعث ہے (حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۱۰۲، بحوالہ قاموس الفقہ ۲/ ۳۹)، فقہاء کرام نے اسے مکروہ بلکہ حرام قرار دیا ہے اس لئے کہ اسکی وجہ سے بازار گراں ہوتا ہے۔ اور عام لوگوں کے لئے ضروریات زندگی کا حصول دشوار ہوتا ہے۔

حضرات شیخین حضرت امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اور دیگر فقہاء کے یہاں احتکار اور ذخیرہ اندوزی صرف غذائی اشیاء میں ممنوع ہے۔ لیکن حضرت امام ابویوسفؒ نے فرمایا کہ ''كل مايضر بالعامة فهو احتكار بالأقوات كان أوثيابًا أو دراهم أو دنانير اعتبارًا لحقيقة الضرر لأنه هوالموثر في الكراهة'' (البحر الرائق ج ۸/ ۲۲۹ فصل في البيع)۔

یعنی ہر وہ ضروریات زندگی کی چیز جس کی ذخیرہ اندوزی سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو وہ احتکار میں داخل ہے چاہے اسکا تعلق غذا سے ہو یا کپڑوں سے یا دراہم اور دنانیر سے۔ حقیقت ضرر کا اعتبار کرتے ہوئے کیونکہ وہی کراہت میں موثر ہوتی ہے۔ یہی رائے امام مالکؒ کی بھی ہے چنانچہ دکتور وہبہ زحیلی فرماتے ہیں:

''ويحرم الاحتكار أيضا عند المالكية و أبي يوسف في غير الطعام في وقت الضرورة'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۳/ ۵۸۸)۔

علامہ صابونیؒ حضرت امام ابویوسف اور امام مالکؒ کے قول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہی قول مزاج شریعت کے زیادہ موافق معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی انسان کو کسی بھی طریقہ سے تکلیف پہنچانا یہ انسانیت کے خلاف ہے (فقہ المعاملات للصابونی، بحوالہ جدید معاملات کے شرعی احکام ۱/ ۹۳)۔

علامہ ظفر احمد تھانویؒ اقوال فقہاء کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''وقال في الهدايه: اعتبر ابوحنيفة الضرر المعهود المتعارف وهو ضعيف لأنه لاعهد ولاتعارف خلفنا بالأقوات، بل هو معهود و متعارف في كل شئي كما لايخفى'' (اعلاء السنن ۱۷/ ۴۳۰)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ''فقہ البیوع'' میں حضرت امام ابویوسفؒ کا قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''وهذ القول يبدو راجحًا لعموم النهي ولأن علته الإضرارُ بأهل البلد فيشمل كل مايحتاجون إليه'' (فقہ البیوع ۲/ ۹۹۹)۔

نیز مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب فرماتے ہیں: غیر معمولی حالات میں امام مالک اور امام احمد کے نزدیک تمام ہی اشیاء ضروریہ میں احتکار حرام ہے اور یہی رائے امام ابویوسفؒ کی ہے غالباً یہ رائے زیادہ قرین صواب ہے (جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۵۵)۔

نیز آپ کے مسائل اور انکا حل میں مولانا یوسف صاحب لدھیانویؒ فرماتے ہیں: چوتھی صورت یہ ہے کہ انسانوں یا چوپایوں کی خوراک کی ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا اس کے علاوہ دیگر چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے جس سے لوگوں کو تنگی لاحق ہو جاتی ہے یہ بھی ناجائز ہے (آپ کے مسائل

اور انکا حل ۷/۱۱۱)۔

حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ اور عصر حاضر کے دیگر فقہائے کرام کی مذکورہ آراء کی روشنی میں احقر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ سوال میں ذکر کردہ صورت احتکار کے دائرہ میں داخل ہوگی کیونکہ اس میں بھی سونے کو روک لینے کی صورت میں سونے کی قیمت تو بڑھتی ہی ہے اس گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہے، جس کا ضرر ہر خاص وعام کو لاحق ہوتا ہے، جو یقیناً انسانیت سے گرا ہوا اور ایک ناجائز فعل ہے، جس سے نمٹنے کے لئے حکومت اور انتظامیہ کو اس بات کا حق گردانا ہے کہ وہ ضروری سمجھے تو ایسے ذخیرہ اندوز اور خودغرض تاجروں کے خلاف اقدام کرتے ہوئے انکو اپنا مال بازار میں لانے پر مجبور کرے، اور اگر وہ اشیاء بہت قیمت پر فروخت کریں تو قیمتوں کا یہ تعین اصحاب رائے کے مشورہ کے بعد کردے اور انکو اسی قیمت پر بیچنے پر مجبور کرے اس لئے کہ شریعت کا اہم قاعدہ ہے، الضرر یزال یعنی نقصان اور دشواری کا ازالہ کیا جائے گا، بلکہ اسلامی تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ معاشرہ کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے حکومت ارباب دولت اور سرمایہ داروں کو بلا قیمت بھی اپنے سامان نکالنے پر مجبور کرسکتی ہے، چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من کان له فضل من زاد فلیعد به علی من لا زاد له" (مسلم ۸۱/۲)۔

(کہ جس شخص کے پاس سامان خورد ونوش ضرورت سے زیادہ ہو وہ اسے دے دے جو اس سے محروم ہے)۔

اس قسم کی مختلف روایات اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم سے استدلال کرتے ہوئے علامہ ابن حزم اندلسی نے جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر بستی کے دولتمندوں کا فریضہ ہے کہ وہ فقراء اور محتاجوں کی معیشت کے ذمہ دار ہوں اور امیر المسلمین ان کو اس کے لئے مجبور کرسکتا ہے، اور ان کی بنیادی ضروریات میں حاجت کے مطابق روٹی، موسم کے لحاظ سے سردی اور گرمی کپڑے اور رہائش کے لئے ایک ایسے مکان کی فراہمی ہے جو گرمی، دھوپ، بارش اور سیلاب سے محفوظ رہ سکے (المحلی ۱۵۶/۲)۔

ابن حزم ظاہری گو اپنے تشدد اور ظاہریت میں مشہور ہیں اور ان کی مایہ ناز تصنیف المحلی اسکا واضح ثبوت ہے، مگر یہاں انہوں نے جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ شرع اسلامی کے مجموعی مزاج اور اس کی روح کے عین مطابق ہے (ماخوذ قاموس الفقہ ۴۰/۲)۔

قیمت متعین کرنے والے تاجروں کی جمعیتیں:

مذکورہ بالا گفتگو سے اس صورت کا حکم بھی واضح ہوگیا کہ جو آج کل ہر صنعت وتجارت والے اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ مل کر جمعیتیں اور تنظیمیں بناتے ہیں جس کا مقصد چیزوں کی قیمت اور ریٹ متعین کرنا ہوتا ہے اور لوگوں کو اس پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس متعینہ قیمت کی پابندی کریں اور جو لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں انکے خلاف باقاعدہ کارروائی کی جاتی ہے اور سخت سزائیں طے کی جاتی ہیں تاکہ آئندہ کوئی اس کی خلاف ورزی نہ کرسکے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی احتکار میں داخل ہے، کیونکہ اس میں لوگوں کا اختیار ختم ہوجاتا ہے اور لوگ اسی مہنگی قیمت پر خریدنے پر مجبور ہوتے ہیں جس پر جمعیت کے لوگوں نے اتفاق کیا ہے، جس کی وجہ سے بازار گراں ہوتا ہے اور عام لوگوں کے لئے ضروریات زندگی کا حصول دشوار ہوجاتا ہے، لہٰذا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس طرح کی جمعیتوں اور تنظیموں کو ختم کردیں یا اس کا پابند کریں کہ وہ مناسب ریٹ متعین کریں اور وقتاً فوقتاً انکی نگرانی بھی کرتی رہے۔ اس کی نظیر باب القسمۃ کی یہ عبارت ہے:

"ولا یترك القسام یشترکون کی لا تصیر الأجرة غالیة بتواکلهم و عند عدم الشرکة یتبادر کل منهم إلیه خیفة الفوت فیرخص الأجر" (ہدایہ مع الفتح ۸/۳۵۱، کتاب القسمة)۔

قُسام سے مراد وہ لوگ ہیں جو چند شریکوں کے درمیان مشترک زمینوں کو اجرت لیکر تقسیم کرنے کا عمل انجام دیتے ہیں لہٰذا حکومت وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے تقسیم کرنے والوں کو اکٹھا نہ ہونے دے تاکہ آپس میں مل کر کسی ایک ریٹ پر اتفاق نہ کرلیں اور پھر عوام الناس ضرر میں مبتلا ہوجائے۔ اور ظاہر ہے کہ کھانے پینے اور غذائی اشیاء میں گراں فروشی زیادہ مضر ہے بنسبت تقسیم وغیرہ کی اجرتوں میں گرانی سے تو جب تقسیم جیسے چھوٹے مسئلے میں اسکو برداشت نہیں کیا گیا کہ وہ لوگ اکٹھے ہوکر کوئی قیمت متعین کرلیں تو اس سے زیادہ اہم مسئلہ یعنی خوراک کے مسئلہ میں اسکو کیسے

برداشت کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی تنظیم بنا کر گراں فروشی کا ارتکاب کرے جس سے لوگوں کو ضرر لاحق ہو اسی لئے اس طرح کی جمعیتیں اور تنظیمیں جو تجارت پیشہ حضرات بناتے ہیں ہرگز درست نہ ہوگی اور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ اس طرح کی تنظیمیں بننے نہ دیں اور اگر بنی ہوئی ہو تو پھر انکو ختم کر کے قیمت کو آزاد رکھے۔ تاکہ عوام کو کسی بھی طرح کے ضرر کا سامنا نہ ہو (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فقہ البیوع للشیخ العثمانی ۲/ ۹۹۹، ۱۰۰۰)

واللہ اعلم بالصواب

۷- اسمگلنگ جس کو بلیک مارکیٹ اور دو نمبر کا دھندہ بھی کہتے ہیں کی حقیقت یہ ہے کہ حکومت کی نگاہوں سے چھپا کر اور اسکے واجبات ادا نہ کر کے باہر ممالک سے مال لانا یا باہر ممالک لے جانا اور اسکا حکم یہ ہے کہ یہ مال اگر نجس، ممنوع الاستعمال اور ممنوع البیع نہ ہو اور مالک سے ہی مال خریدا جائے تو شرعاً یہ بیع وشراء درست اور جائز ہے، کیونکہ اصلاً ہر شخص کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک روپئے سے اپنی ضرورت اور پسند کا جو مال جہاں سے چاہے خرید سکتا ہے "کل یتصرف فی ملکہ کیف شاء" (شرح المجلۃ للأتاسی ۳/ ۱۳۲ رقم المادۃ ۱۱۹۲)۔

لہذا بیرونی ممالک سے بھی مال خریدنا اور وہاں لے جا کر بیچنا شرعاً مباح ہے۔ لیکن چونکہ جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ قولاً یا عملاً یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کا پابند رہے گا۔

"کل من یسکن دولۃ فإنہ یلتزم قولًا او عملًا بأنہ یتبع قوانینہا وحینئذ یجب علیہ اتباع أحکامہ الخ" (بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ، / ص ۱۶۶)۔

اس معاہدے کا تقاضہ یہ ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اسکی پابندی کی جائے۔

"تجب طاعۃ الإمام فیما لیس بمعصیۃ" (درمختار ۲/ ۱۷۲)۔

اور اپنے ملک کی مصنوعات اور نکاسی کو نقصان سے بچانے کے لئے دوسرے ممالک کی برآمدات پر پابندی لگانے کی بھی گنجائش ہے۔ اسکی نظیر تلقی جلب اور بیع حاضر للبادی ہے جس کو مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ تلقی جلب سے مراد یہ ہے کہ باہر سے آنے والے تجارتی قافلہ کے شہروں میں آنے سے پہلے ہی کوئی شخص جا کر ان سے غلہ خرید لے اور شہر میں آکر اس سے زیادہ میں فروخت کردے اور بیع حاضر للبادی یہ ہے کہ شہر کا تجربہ کار تاجر دیہات کے تاجر سے کہے کہ میں شہر کے بھاؤ سے واقف ہوں میں تمہارے لئے فروخت کرادوں گا کیونکہ اس سے گرانی بڑھتی ہے اور اس شہر کے باشندوں کو زک پہنچتی ہے۔ اور یہی مضرت اسمگلنگ سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ غیر ملکی مصنوعات کی آمد کی وجہ سے اس ملک کی صنعت اور یہاں کا معاشی توازن بگڑتا ہے اور متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے قانون ملک کی بے احترامی کرنا نیز اپنی اس غیر اسلامی بلکہ غیر انسانی حرکت سے ذریعہ ملک کے تمام باشندوں کو نقصان پہونچانا ہرگز درست نہ ہوگا، لہذا اسمگلنگ کا غیر قانونی عمل درست نہیں ہوگا۔

پھر اگر غور کیا جائے تو اس پابندی کی خلاف ورزی میں بہت سے گناہوں کا ارتکاب بھی کرنا پڑتا ہے مثلاً اکثر جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔ رشوت دینی پڑتی ہے۔ جان، مال یا عزت وآبرو کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے جس کی حفاظت کا شریعت میں بڑا خیال رکھا ہے اور بسا اوقات جسمانی تکلیف اور قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس عمل میں اتنے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور اتنے مفاسد کو جو متضمن ہوگا اسکے عدم جواز میں کیا شبہ ہوسکتا ہے اس لئے حکومت کے قانون کی پابندی کرنی چاہئے۔ اور ایسے کاروبار سے اجتناب کرنا چاہئے۔ تاہم اسمگل ہو کر آنے والی حلال ومباح چیزوں کی خرید وفروخت جائز ہے اور انکو اپنے استعمال میں لانا بھی درست ہے، اور آمدنی میں بھی حلال ہے۔

چنانچہ صاحب فتاوی رحیمیہ فرماتے ہیں:

(۱) بلیک مارکیٹ کرنا کیسا ہے۔

(**سوال**۔ ۲۶۴) حکومت سے چوری چھپے بیرون ممالک کا سامان بیچنا جس کو ہمارے یہاں بلیک مارکیٹ اور دو نمبر کا دھندہ کہتے ہیں یہ تجارت جائز ہے یا نہیں۔؟...... **جواب**: اگر وہ مال نجس ممنوع الاستعمال اور ممنوع البیع نہ ہو اور مالک سے خریدا ہوا ہو تو اسکی تجارت فی نفسہ حلال ہے لیکن

چونکہ حکومت کے قانون کے خلاف ہے اور مجرم سزا کا مستحق اور ذلیل ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ذلیل کرنا جائز نہیں، اس لئے ایسا معاملہ اختیار نہ کیا جائے، فقط واللہ اعلم بالصواب (فتاوی رحیمیہ ۹ / ۲۲۲)۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب اس طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہیں

اسمگلنگ کی شرعی حیثیت:

سوال: (۱) اسمگلنگ جائز ہے یا ناجائز؟ بعض حضرات اسکو جائز کہتے ہیں جبکہ حکومت کی طرف سے یہ کاروبار بند ہے اور عزت کا بھی خطرہ ہے

(۲) اگر ملک کے اندر یہ چیزیں پہنچ جائیں تو بعد میں ملک کے اندر علی الاعلان اسکی تجارت کی جاتی ہے کیا ایسا سامان خرید نا جائز یا ناجائز۔

(۳) بعض لوگ ملک کی سرحدوں پر رہتے ہیں مثلاً ایران کی سرحد پر تو یہ لوگ اپنی ضروریات پاکستان اور ایران دونوں جگہ سے پوری کرتے ہیں اسکے جواز کی صورت ہے؟

(۴) اگر کوئی شخص خود ایران نہ جائے بلکہ اپنے ایرانی دوست کو لکھ کر اپنے لئے سامان منگوائے اور وہ خرید کے روانہ کردے، مثلاً ایران سے آج کل موٹر سائیکلیں مکران کے راستے بہت آرہی ہیں لوگ ادھر خرید کر مجبوراً کراچی میں اسکے کاغذات بنواتے ہیں چونکہ بغیر کاغذات کے چلانا منع ہے۔ کراچی میں نمبر حاصل کرنے کے لئے ہزار ڈیڑھ ہزار خرچ ہوتا ہے عوام وخواص سب اس میں مبتلا ہیں۔ کیا یہ جائز ہے۔

جواب: ا تا ۴۔ اصل یہ ہے کہ شرعاً ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک روپے سے اپنی ضروریات یا پسند کا جو مال جہاں سے جو چاہے خرید سکتا ہے، لہذا کسی بیرونی ملک سے مال خریدنا یا وہاں سے لے جا کر بیچنا شرعاً مباح ہے، لیکن ایک صحیح اسلامی حکومت اگر مسلمانوں کے مفاد کی خاطر کسی مباح چیز پر پابندی عائد کرے تو اس کی پابندی کرنا شرعاً بھی ضروری ہوجاتا ہے، اب موجودہ مسلمان حکومتوں نے چونکہ اسلامی قوانین کو ترک کر کے غیر اسلامی قوانین نافذ کر رکھے ہیں، لہذا انکو وہ اختیارات نہیں دیئے جاسکتے جو صحیح اسلامی حکومت کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن ان کے احکام کی خلاف ورزی میں چونکہ بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، نیز جان و مال یا عزت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، لہذا ان کے جائز قوانین کی پابندی کرنی چاہئے، اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ قولاً یا عملاً معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کا پابند رہے گا، اس معاہدہ کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کی جائے، اسمگلنگ کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اصلاً باہر کے ملک سے مال لے کر آنا یا یہاں سے باہر لے جانا شرعی اعتبار سے جائز ہے، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں مذکورہ مفاسد پائے جاتے ہیں اس لئے علماء نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے، واللہ سبحانہ وتعالی اعلم (فتوی نمبر ۷۷۸ / ۲۸، فتاوی عثمانی ۳ / ۸۹- ۹۱)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب علیہ الرحمہ سونے چاندی ہی کے اسمگلنگ سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

جائز ہے، مگر عزت بچانے کے لئے اسکا بھی وہی حکم ہے جو جواب نمبر ایک کا ہے، یعنی اگر قانوناً جرم ہو تو چونکہ عزت کا بچانا واجب ہے اپنی عزت بچانے کے لئے قانون کی خلاف ورزی کی بھی اجازت نہ ہوگی (منتخبات نظام الفتاوی ۳ / ۲۸)۔

اسمگلنگ کی شرعی حیثیت:

(۴) آپ کے مسائل اور انکے حل میں مولانا یوسف صاحب لدھیانوی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

شرعاً تو کاروبار اور خرید وفروخت جائز ہے لیکن جو چیزیں حکومت کے قانون کی رو سے ممنوع ہے، وہ صحیح نہیں۔

دوسرا جواب: اس کاروبار میں جو رشوت وغیرہ دینا پڑے گی وہ گناہ ہے، اور مشہور حدیث ہے کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دوزخ میں ہیں، "الراشی المرتشی فی النار" (کنز العمال ج۔ ۶: ۱۱۳۔ حدیث نمبر ۱۵۰۷۷، آپ کے مسائل اور انکا حل محقق ۸ / ۲۳۶)۔

نیز "فتاوی احیاء العلوم" میں ہے:

(۵) باعزت طریقہ سے غیر ملک سے مال لانا:

سوال: دوسرے ملک سے اپنے ملک میں باعزت طریقہ سے مال لانا کیسا ہے۔؟ جواب: خطرہ سے محفوظ رہنے کا یقین ہو تو یہ فی نفسہ جائز ہے، ورنہ قانون کے خلاف کر کے قانون کی زد میں آنے کی صورت میں حکومت کی مخالفت خطرناک ہے، پتہ لگنے پر مال وعزت دونوں کا خطرہ ہے، پس ایسا خطرہ مول لینے سے بچنا چاہئے (فتاوی احیاء العلوم ۱/۲۷۲، بحوالہ جامع الفتاوی ۴/۴، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: فتاوی عثمانی ۳/۸۸، احسن الفتاوی ۸/۹۵، ۹۴، کفایت المفتی ۷/۳۹۴ محمودیہ، ۲۳/۴۸۶-۴۸۸ ڈابھیل، جدید فقہی مسائل ۱/۳۵۵ وغیرہ)۔

۸- سونے کو پلاٹینم کے ساتھ ایک مخصوص مقدار میں ملا کر سفید سونا یا وہائٹ گولڈ کا نام دیا جاتا ہے، دنیا کے کچھ ممالک میں وہائٹ گولڈ کے زیورات کا رواج ہے، پلاٹینم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سونے سے بھی زیادہ ایک قیمتی دھات ہوتی ہے جو حقیقتاً سونا نہیں ہوتی، بلکہ سفید سونا بنانے کے لئے سونے میں اسکی آمیزش کی جاتی ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کے اس کو حقیقی سونے کے حکم میں ہوگا یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں احقر کی رائے یہ ہے کہ یہ جب حقیقتاً سونا نہیں تو محض سونے جیسا قیمتی ہونے کی وجہ سے اسکو حقیقی سونے کے حکم میں نہیں رکھا جاسکتا ہے، اور جب یہ سونا نہیں ہے تو دوسرے عقود اور زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق بھی نہیں ہوں گے، کیونکہ سونے چاندی کے علاوہ دوسرے جواہرات جیسے یاقوت، فیروز، موتی اور مہرجان وغیرہ میں زکوۃ واجب نہیں، چنانچہ درمختار میں ہے: "ولا تجب فیما سواہما من الجواہر أو کالیاقوت والفیروز واللؤلوء ومہرجان" (درمختار ۲/۳۴)۔

ہاں البتہ جو ہیرے جواہرات وغیرہ تجارت کی نیت سے خریدے گئے ہوں انکی زکوۃ واجب ہوگی اور چونکہ پلاٹینم بھی ہیرے جواہرت کی طرح ایک قیمتی دھات ہے اور اسکے بھی زیورات وغیرہ بعض ممالک میں رائج ہیں اس لئے احقر پلاٹینم کو ہیرے جواہرات پر قیاس کر کے کہتا ہے کہ پلاٹینم اور اسکے زیورات جو تجارت کے لئے خریدے گئے ہوں ان پر زکوۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، لیکن یہاں ایک اور رجحان پایا جاتا ہے کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں ہیرے جواہرات وغیرہ کی خرید پر صرف کرتے ہیں اور اپنی نقد رقوم کو ہیرے جواہرات میں بدل کر مختلف مصالح کے تحت محفوظ کر لیتے ہیں۔

نومبر ۱۹۹۲ میں اعظم گڑھ میں منعقد ہونے والے مجمع الفقہ الاسلامی کے سمینار میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس صورت میں لاکھوں لاکھ نقد رقم ہیرے جواہرات کی صورت میں انکے پاس محفوظ ہو جاتی ہے جو کسی بھی وقت نقد کی صورت میں منتقل ہوسکتی ہے، بحث کی روشنی میں بات سامنے آئی کہ اس مسئلہ میں ایک جہت تو یہ ہے کہ ہیرے جواہرات سونا چاندی نہیں ہیں جو خلقۃ نامی تسلیم کئے گئے ہیں اور اس شخص کا کام ہیرے جواہرات کی تجارت بھی نہیں ہے۔ اور نہ فوری طور پر خریدتے وقت باضابطہ تجارت کی نیت کی گئی ہے، تاکہ بہ سبب مال تجارت ہونے کے اُسے نامی قرار دیا جائے۔ اس لئے اس جہت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس پر زکوۃ واجب نہ ہو۔

دوسری جہت یہ ہے کہ ہیرے جواہرات ضروریات زندگی میں داخل نہیں اور اصحاب سرمایہ اپنے خاص مصالح کے لئے اپنے روپیوں کو جنکی مقدار غیر معمولی حد تک زائد ہوتی ہے ہیرے اور جواہرات کی صورت میں محفوظ کر کے مختلف فوائد بھی حاصل کرتے ہیں اور انہیں اس طرح کا اطمینان بھی رہتا ہے کہ ان ہیرے اور جواہرات کی صورت میں گویا زرنقد ہر دم انکے پاس محفوظ رہتا ہے اور اسکے نتیجہ میں فقراء کو شدید نقصان ہوتا ہے۔ کہ نقد رقوم میں زکوۃ واجب ہوتی ہے جو عام حالات میں ہیرے جواہرات کی صورت میں عام اصول کے پیش نظر واجب نہیں ہوتی۔

سمینار میں شریک علماء واصحاب افتاء میں ایک خاصی تعداد نے پہلی جہت کو شامل رکھتے ہوئے یہ رائے دی کہ اس خاص صورت میں محفوظ ہیرے جواہرات کی مالیت پر زکوۃ واجب نہیں۔ جن میں سرفہرست مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا خالد سیف اللہ صاحب وغیرہ تھے۔ جب کہ دوسری بڑی تعداد ان علماء اور اصحاب افتاء کی تھی جنہوں نے دوسری جہت کو سامنے رکھتے ہوئے اس خاص صورت میں ذخیرہ کئے ہوئے ہیرے، جواہرات کو حکماً مال تجارت تسلیم کیا۔ اور اس پر زکوۃ واجب قرار دیا۔ جن میں سرفہرست اکیڈمی کے باوقار صدر مشہور فقیہ اور معتبر عالم دین مولانا قاضی

مجاہد الاسلام قاسمیؒ تھے (ماخوذ جدید فقہی تحقیقات/ص: ۲۸، ۲۹، مع حذف واضافہ)۔

مذکورہ بالا بحث اگر چہ ہیرے جواہرات سے متعلق ہے لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ پلاٹینم ہیرے جواہرات کی طرح ایک قیمتی دھات ہے اور اسکے بھی زیورات بنائے جاتے ہیں اور اسکو بھی بطور ذخیرہ خرید کر لوگ محفوظ کرتے ہیں تو اسکا حکم بھی ہیرے جوہرات کی طرح ہونا چاہئے۔ اور اسکے اندر بھی سونا چاندی کی طرح جمع کرنے کی صورت میں زکوۃ واجب ہونی چاہیے۔

کیونکہ اگر یہ غور کیا جائے کہ جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین سے نیز شرعی وجوب زکوۃ سے بچنے کے لئے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے بجائے پلاٹینم یا اسکی مصنوعات لاکھوں روپے کی خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں یہ نیت کس زمرے میں آئے گی۔ احقر کا خیال ہے کہ یہ نیت درحقیقت تجارت ہی کی نیت ہے کہ ضرورت کے موقع پر اُسے فروخت کر کے پھر اسے روپیہ بنالیں گے اور نفع بھی ہاتھ آئے گا۔ اسی لئے ایسے قیمتی اور اعلیٰ قسم کی دھات پلاٹینم پر بھی زکوۃ واجب ہوگی۔

نیز اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں: مناسب ہے کہ یہی حکم موتیوں یاقوت الماس اور تمام نفیس پتھروں اور قیمتی جواہر کا ہو کہ ان میں جو بطور زینت یا زیور استعمال کئے جائیں اور جو حد اسراف میں داخل نہ ہوں ان پر زکوۃ نہیں ہوگی۔ اور جو کھلم کھلا عادت کے طور پر استعمال ہونے والی مقدار سے زائد ہوں تو وہ اسراف اور حرام ہے اور اسکو زکوۃ سے چھوٹ دینا درست نہ ہوگا۔ اسی طرح جو کنز کے طور پر رکھے گئے ہوں ان پر بھی زکوۃ عائد ہوگی اس لئے کہ یہ صورت مال پر عائد ہونے والے حق معلوم سے بچنے کی ایک صورت بن جائے گی۔ (فقہ الزکاۃ ۱/۴۱۱)

اور ظاہر ہے کہ صورت مسئولہ میں ہیرے جواہرات اور پلاٹینم وغیرہ بطور کنز جمع کئے گئے ہیں لہذا ان پر زکوۃ واجب ہونا چاہئے۔

نیز مولانا عمر عثمانی تحریر فرماتے ہیں: ہمارے نزدیک امام ابویوسفؒ اور امام عنبری کا قول زیادہ صحیح ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام جواہرات یا تو معدنیات سے تعلق رکھتے ہیں، یا سمندری برآمدات سے، معدنیات کے متعلق تمام صحیح روایات میں خمس کے وجوب کا حکم آیا ہے سمندری برآمدات مثلاً مروارید، مونگا وغیرہ بھی معدنیات ہی کے مثل ہیں۔ لہذا ان میں خمس واجب ہونا چاہئے لیکن یہ خمس ان لوگوں پر واجب ہوتا ہے جو ان چیزوں کو زمین سے یا سمندر سے برآمد کرتے ہیں جو ان کو خرید کر اپنے پاس ذخیرہ کرتے ہیں یا بہ طور زیورات کے انہیں استعمال کرتے ہیں ان پر زکوۃ واجب ہونی چاہئے کیونکہ یہ مال متقوم ہیں اور سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ایک ذریعہ ہیں ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارے فقہاء کرام نے یہ فیصلہ فرماتے وقت کہ جواہرات وغیرہ میں زکوٰۃ نہیں ہوتی اس نکتہ کو کیوں نظرانداز فرما دیا۔ کہ یہ بھی سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ہی ایک ذریعہ ہے جہاں تک ہمارا خیال ہے فقہاء کے دور میں ان چیزوں کو ذخیرہ کرنے اور انکے ساتھ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ خال خال کچھ لوگ دو چار موتی زمرد و یاقوت وغیرہ کے نگینے اپنی انگوٹھی وغیرہ میں لگوا لیتے تھے اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ فرمایا ورنہ ظاہر ہے کہ ہمیں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی کہ آدمی اپنے سرمایہ کو سونے اور چاندی کی شکل میں جمع کرے تو اس پر زکوۃ واجب ہو جاتی ہے اور اگر اسی سرمایہ کو جواہرات کی شکل میں محفوظ کرے تو اسے زکوۃ سے چھٹکارا مل جاتا ہے حالانکہ سرمایہ دونوں جگہ موجود ہے۔ محض اسکے حفاظت کے طریقے مختلف ہیں اس طرح تو ہم سرمایہ دار طبقے کو زکوۃ سے بچنے کے طریقے بتلاتے ہیں؛ پھر وہ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے لئے سونے چاندی کو ذخیرہ نہ کریں بلکہ جواہرات کو ذخیرہ کریں اسکا ثبوت کہ فقہاء کے عہد میں جوہرات کی صورت میں سرمایہ کو ذخیرہ کرنے کا عام رواج نہ ہوا تھا یہ ہے۔

قرآن کریم کی آیت: "والذین یکنزون الذھب والفضة ولاینفقونھافی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم" (سورۂ توبہ ۳۴)
(یقیناً جو لوگ سونے چاندی کے خزانہ جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ اے پیغمبر علیہ السلام آپ انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیجئے) اس آیت میں سونے اور چاندی کے ذخیرہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے جس سے صاف نظر آتا ہے کہ عہد قدیم میں جواہرات کو ذخیرہ کرنے اور سرمایہ کو اس شکل میں محفوظ کرنے کا طریقہ رائج نہیں تھا اس لئے اگر فقہاء کرام کے عہد تک بھی یہی صورتحال تھی تو بڑی حد تک انہیں معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن آج وہ صورتحال باقی نہیں رہی ہے اس لئے ان ارشادات کو حرف آخر قرار دے کر سرمایہ دار طبقہ کو زکوۃ سے بچنے کے لئے اس طریقہ کو اپنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی (فقہ القرآن ۲۶۴ بحوالہ جدید فقہی تحقیقات ۶/۵۳۰۔۵۳۱)۔

مذکورہ بالا تحریرات کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ علماء کی ایک جماعت کی رائے ہیرے جواہرات پر زکوۃ کے وجوب کی رائے ہے ایسے ہی اگر پلاٹینم کے سلسلے میں اس زمانے کے لوگوں کے خیانتوں کو دیکھتے ہوئے تغیر زمان کی بنا پر وجوب زکوۃ کے قول کو اختیار کیا جائے تو شاید بہتر ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

خلاصۂ جوابات:

۱- اگر روپیہ سے سونا چاندی خریدا جائے تو یہ بیع صرف نہیں ہوگی اس لئے!

الف: یہ بات درست ہوگی کہ سونا چاندی اور روپیہ میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار۔

ب: اور یہ بات بھی شرعاً درست ہوگی کہ سونے چاندی کی متعینہ قیمت سے کم یا زیادہ قیمت پر خرید وفروخت کرے اگر چہ مخصوص حالات میں حکومتوں کی طرف سے متعین کردہ قیمت کی پابندی ضروری ہوجاتی ہے۔ تاہم سونا چاندی اور روپئے کے ایک جنس نہ ہونے کی وجہ سے اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہ ہوگا۔

۲- الف: سونے کے ذرات کے عوض زیورات بنانے کی شکل میں سونے کے لین دین میں مقدار کے فرق پر بیع کا اطلاق مختلف مفاسد کی وجہ سے درست نہ ہوگا بلکہ اسے اجارہ تصور کیا جائے گا۔ سونے کے ذرات کو اجرت ماننے کی صورت میں اجرت العامل من جزء العمل ہونا لازم آئے گا جو قیاس پر عرف ورواج کی ترجیح نیز مختلف نظائر کے جائز ہونے کی وجہ سے جائز ہوگا۔

۳- پرانے سونے کے زیورات کا سونے کے نئے زیورات سے تبادلہ بیع صرف ہے اور بیع صرف میں کمی زیادتی سود میں داخل ہے اس لئے صورت ناجائز ہوگی۔

۴- کموڈیٹیز ایکسچینج کے ذریعہ سونے چاندی کے خرید وفروخت کی شکل میں آرڈر کردہ شئے اس کے نام سے محفوظ کردی جاتی ہے اس کی دو شکلیں ہیں:

الف: اس صورت میں ایک کلوگرام سونا دوسو افراد کو فروخت کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پہلے ۲۰ کے لئے مبیع اگر چہ مبیع موجود ہے لیکن مفرز اور الگ تھلگ نہیں جس کی وجہ سے بعض مواقع میں یہ صورت مفضی الی المنازعہ ہوکر بیع فاسد ہوگی۔ اور ۲۱ سے دوسو تک کے لئے مبیع کے معدوم ہونے کی وجہ سے بیع باطل ہوگی۔

(ب) اس صورت میں اگر خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہے اور اسکو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام درج کردیا گیا تو مشتری کے ضمان اور رسک میں آجانے کی وجہ سے مال حکماً مشتری کے قبضہ میں مان کر قبضہ کے متحقق ہوجانے کی بناء یہ بیع جائز ہوگی۔

۵- روپئے کے عوض اگر چہ سونا چاندی کی خرید وفروخت جائز ہے لیکن شرط ہے کہ ایک جانب سے قبضہ پایا جائے جو یہاں مفقود ہے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر مفاسد کی بنا پر یہ صورت ناجائز اور حرام ہوگی۔

۶- سوال میں ذکر کردہ صورت احتکار میں داخل ہوکر ناجائز ہوگی (کیونکہ سونے کو روکنے کی صورت میں سونے کی قیمت بڑھتی ہے اور اس گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہے۔ جس کا ضرر ہر خاص وعام کو لاحق ہوتا ہے)

۷- اسمگلنگ یعنی باہر کے ملک سے مال لانا یا یہاں سے باہر لے جانا اگر چہ شرعاً جائز ہے ہے لیکن ملکی قانون کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے مختلف مفاسد کو مشتمل ہونے کی بنا پر اجتناب اور احتیاط ضروری ہے۔

۸- پلاٹینم حقیقتاً سونا نہ ہونے کی وجہ سے سونے کے حکم سے خارج ہے۔ البتہ ایک قیمتی دھات ہونے کی وجہ سے کثرت سے ذخیرہ اندوزی کی صورت میں اس پر ہیرے جواہرات کی طرح زکوۃ واجب ہونی چاہئے۔

☆☆☆

سونے چاندی کی تجارت کی موجودہ شکلیں اور ان کے شرعی احکام

(مفتی) محمد سعید اسعد قاسمی[1]

۱- الف: روپے کے ذریعہ سونے، چاندی کی خرید وفروخت بیع صرف میں داخل نہیں ہے، لہذا بدلین پر مجلس واحد میں قبضہ ضروری نہیں ہے بلکہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ کافی ہے اس لئے کہ شریعت اسلامیہ میں روپے کی حیثیت ثمن اصطلاحی کی ہے اور فقہاء کرام نے ثمن خلقی اور ثمن اصطلاحی میں اس مسئلہ میں فرق کیا ہے یعنی سونا، چاندی کی خرید وفروخت ایک دوسرے کے بدلہ کی جائے تو ایک ہی مجلس میں بدلین پر قبضہ ضروری ہے جبکہ سونا یا چاندی کو فلوس نافقہ کے ذریعہ خریدا یا بیچا جائے تو بدلین پر ایک مجلس میں قبضہ ضروری نہیں ہے جیسا کہ ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ہے:

''وإن اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلسًا وليست الفلوس عنده فهو جائز تقابضا قبل التفرق أم لم يتقابضا لأن هذا بيع ليس بصرف'' (فتاوىٰ ہندیہ ۳/ ۲۲۴)۔

(اور اگر چاندی یا سونے کی انگوٹھی جس میں نگینہ ہو یا نہ ہو، ایک متعینہ فلوس کے ذریعہ خریدی اور فلوس اس شخص کے پاس موجود نہ ہو تو بیع جائز ہے جدا ہونے سے قبل دونوں نے قبضہ کیا ہو یا نہ کیا ہو اس لئے کہ یہ بیع صرف نہیں ہے)۔

علامہ شامی نے حانوتی سے اس کے جواز کا قول نقل کیا ہے:

''سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين'' (رد المحتار ۷/ ۴۱۴)۔

(حانوتی سے سوال کیا گیا سونے کی بیع فلوس کے ذریعہ ادھار کے سلسلہ میں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ جائز ہے بشرطیکہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ ہو جائے)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب کا فتویٰ بھی جواز ہی کا ہے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''وذكرت أنها ليست قائمة مقام الذهب في جميع الأمور فلا تجري فيها أحكام الصرف ولذالك يجوز عندي أن يشتري الذهب أو الفضة بالنقود ويجوز أيضا أن يشتري الذهب نسئية الأوراق النقدية ولكن يجب أن يكون تقابض أحد البدلين في المجلس'' (فتاویٰ عثمانی ۳/ ۱۵۹)۔

(اور میں نے (اپنے رسالہ میں) ذکر کیا ہے کہ روپے تمام احکام میں سونا کے قائم مقام نہیں ہیں، بس اس میں صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے اور اسی وجہ سے میرے نزدیک سونا روپے کے بدلہ ادھار خریدنا جائز ہے، لیکن بدلین میں سے ایک پر قبضہ مجلس میں ضروری ہے)۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب کا رجحان بھی جواز ہی کا ہے، چنانچہ وہ ایک استفتاء کے جواب میں رقمطراز ہیں۔

رائج نوٹ اور سکے سونے، چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے یا چاندی کی رسید ہیں، لہذا ان سے بیع ذھب وفضۃ بہرکیف جائز ہے تفاضل ونسیہ بھی جائز ہے (احسن الفتاویٰ ۶/ ۵۱۸)۔

لہذا اس سلسلہ میں میرا نظریہ ہے کہ روپے کے ذریعہ سونا وچاندی کی خرید وفروخت ادھار شرعا جائز درست ہونی چاہیے اور یہ بیع صرف نہیں ہے۔

(ب) فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ سونا اور چاندی کی خرید وفروخت ایک دوسرے سے کمی بیشی کے ساتھ جائز ودرست ہے اس لئے کہ دونوں

[1] دار القضاء امارت شرعیہ، آسنسول۔

کی جنس مختلف ہے۔

"وإن باع الذهب بالفضة جاز التفاضل لعدم المجانسة" (ہدایہ ۳/ ۱۰۵)۔

(اور اگر سونے کو چاندی کے بدلہ فروخت کیا جائے تو زیادتی جائز ہے جنس ایک نہ ہونے کی وجہ سے)۔

اور روپیہ اور سونا یا چاندی یہ دونوں ہم جنس نہیں ہیں بلکہ دونوں مختلف جنس ہیں۔

لہٰذا سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر میکس گولڈ مارکیٹ یا ہندوستانی سطح پر ایم سی نے طے کیا ہو اس سے زیادہ یا کم قیمت پر خرید وفروخت کر سکتے ہیں، شرعاً جائز و درست ہے، اس پر ربا الفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا، اس لئے کہ تفاضل ربا میں اس وقت داخل ہے جبکہ دونوں کا قدر و جنس ایک ہو لیکن اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک مفقود ہو یعنی قدر ایک ہو، جنس ایک نہ ہو، یا جنس ایک ہو، قدر ایک نہ ہو، تو اس صورت میں تفاضل ربا نہیں ہے، بلکہ جائز وحلال ہے۔

"وعلته أي علة تحريم الزيادة القدر المعهود بكيل أو وزن مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل أي الزيادة ... وإن وجد أحدهما أي القدر وحدة أو الجنس حل الفضل" (الدر المختار كتاب البيوع باب الربا ۷/ ۴۰۳، ۴۰۴)۔

(اور زیادتی کی حرمت کی علت قدر یعنی کیلی یا وزنی جنس کے ساتھ ہو تو جب دونوں پایا جائے تو فضل یعنی زیادتی حرام ہے اور اگر دونوں میں سے ایک یعنی صرف قدر یا صرف جنس پایا جائے تو زیادتی حلال ہے)۔

۲- الف: تاجر کا زیور بنانے کے لئے سونا کاریگر کو دینا اور کاریگر کا زیور بنا کر واپس کرنا اور آمیزش کے بقدر بچے ہوئے سونے کے ذرات کو اپنے پاس رکھ لینا یہ بیع نہیں ہے بلکہ یہ اجارہ ہے، اس لئے کہ بیع کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی ہے۔

بیع کی تعریف ہے، "مبادلة المال بالمال بالتراضي" (فتاوی ہندیہ ۲/ ۳)۔

(باہمی رضامندی سے مال کا تبادلہ مال کے ذریعہ) اور یہاں مال کا تبادلہ مال کے ذریعہ نہیں ہو رہا ہے۔

ب- رہا یہ سوال کہ زیورات بنانے میں جو ذرات بچ جائیں وہی اجرت قرار پائے اس طرح کی اجرت جائز ہے یا نہیں؟ جب مذکورہ صورت پر ہم غور کرتے ہیں تو بظاہر دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں:

۱۔ اجرت مجہول ہے۔ ۲۔ اجرت عامل کے عمل (جزء عمل) سے قرار پائی ہے۔

اور اصولاً یہ دونوں چیزیں مفسد اجارہ ہیں۔

لیکن جہاں تک اجرت کے مجہول ہونے کی بات ہے تو میری سمجھ کی حد تک یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ تاجر اور کاریگر دونوں اپنے اپنے مشاہدے و تجربے کی وجہ سے جانتے ہیں کہ زیور بنانے کی صورت میں کتنی مقدار میں سونے کے ذرات بچ جائیں گے، تو گویا دونوں کے نزدیک وہ ذرات معلوم و متعین ہیں، اور اگر اجرت کے مجہول ہونے کی بات تسلیم کر لی جائے تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اجرت کے مجہول ہونے کی صورت میں مفسد اجارہ ہونے کی علت فقہاء نے مفضی إلی النزاع لکھی ہے، یعنی جب اجرت متعین نہ ہوگی مجہول ہوگی تو جھگڑا پیدا ہوگا۔

"وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة" (الدر المختار علی صدر رد المحتار ۷/ ۹)۔

(اجرت کی شرط یہ ہے کہ اجرت اور منفعت معلوم ہو اس لئے کہ ان دونوں کی جہالت جھگڑے کا سبب ہے)۔

علامہ علاء الدین کاسانی نے اجرت کی جہالت کے سلسلہ میں بڑی ہی اہم اور قیمتی بات تحریر فرمائی ہے کہ ایسی جہالت جو جھگڑے کا سبب نہ ہو وہ صحت اجارہ کیلئے مانع نہیں ہے اس لئے کہ اس صورت میں اجرت کی حوالگی جو اجارہ کا مقصد ہے ممکن ہے۔

"منها أن يكون المعقود عليه والمنفعة معلومًا علمًا يمنع من المنازعة فإن كان مجهولًا ينظر إن كانت تلك الجهالة مفضية إلى المنازعة تمنع صحة العقد وإلا لا- لأن الجهالة المفضية إلى المنازعة تمنع من

التسليم والتسليم فلا يحصل المقصود من العقد فكان العقد عبثًا لخلوه عن العاقبة الحميدة وإذا لم تكن إلى المنازعة يوجد التسليم والتسليم فيحصل المقصود'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۵،۲۴)۔

(اس میں (صحت اجارہ کے شرائط) سے یہ ہے کہ معقود علیہ یعنی منفعت ایسا معلوم ومتعین ہو کہ جھگڑے کو روک دے، پس اگر مجہول ہو تو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ جہالت مفضی إلی النزاع ہے تو عقد کی صحت کے لئے مانع ہوگا ورنہ نہیں، اس لئے کہ جو جہالت مفضی إلی النزاع ہو وہ تسلیم کو روک دے گی اور اس صورت میں عقد کا مقصد حاصل نہ ہوگا، لہذا اچھے انجام سے خالی ہونے کی وجہ سے عقد لغو ہوگا اور جب (جہالت) منازعت کا سبب نہ ہو تو تسلیم پایا جائے گا، اور جب تسلیم پایا جائے گا تو مقصود حاصل ہو جائے گا)۔

مذکورہ صورت میں چونکہ تاجر اور کاریگر کے درمیان کوئی نزاع پیدا نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ جہالت صحت اجارہ کے لئے مانع نہیں ہونا چاہئے۔

رہی بات اجرت عامل کے عمل سے قرار پائی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرف وعادت وہ اصول ہیں جن پر بے شمار احکام کی بنیاد ہے، اسی میں سے مزارعت کا مسئلہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مزارعت جائز نہیں ہے، البتہ عرف ورواج کو دیکھتے ہوئے احناف نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا حالانکہ کھیتی بٹائی پر کرنے کی صورت میں بٹائی کرنے والے کو پیداوار کا ایک حصہ ہی بطور اجرت ملتا ہے، جو عامل کے جزء عمل کو اجرت بنانے کی واضح نظیر ہے۔

''قال أبو حنيفة المزارعة بالثلث والربع باطلة ... وقالا جائزة ... أن الفتوى على قولهما لحاجة الناس إليها ولظهور تعامل الأمة لها والقياس يترك بالتعامل'' (ہدایہ کتاب المزارعۃ ۴/ ۴۲۵، ۴۲۴)۔

اسی طرح فقہاء نے پھلوں میں بٹائی داری کو جائز قرار دیا ہے، جبکہ یہاں بھی صراحۃ عامل کے عمل سے اجرت قرار پائی ہے۔

اسی سے جڑا ہوا مسئلہ جانور بٹائی پر دینے کا بھی ہے، اس سلسلہ میں ہمارے اکابر حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا رجحان عموم بلوی کی وجہ سے جواز کا معلوم ہوتا ہے۔ ''لیکن بنا بر نقل بعض اصحاب امام احمد کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے، پس تحرز احوط ہے اور جہاں ابتلاء شدید ہو، توسع کیا جا سکتا ہے'' (امداد الفتاویٰ ۳/ ۳۴۳)۔

اور بعض مستند اداروں سے بھی جانور بٹائی پر دینے کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔ لہذا مذکورہ دلائل کی بنیاد پر بندہ کی رائے میں یہ عرف ورواج ہے کہ زیور بنانے کے بعد جو ذرات بچ جاتے ہیں وہی کاریگر کی اجرت ہوتی ہے تو اس کو جائز ہونا چاہئے۔

۳- سونا، سونا ہے خواہ نیا ہو یا پرانا، پرانا یا نیا ہونے سے سونے کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، کیونکہ نیا اور پرانا ہونا وصف ہے اور وصف میں فرق کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس لئے نئے سونے کے زیور کا تبادلہ پرانے سونے کے زیور سے کمی بیشی کے ساتھ شرعاً ناجائز وحرام ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ عمدہ سونے کی خرید وفروخت رڈی سونے کے ذریعہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ عمدہ اور رڈی وصف ہے اور وصف میں تفاوت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

''لا يجوز بيع الجيد بالردي مما فيه الربو إلا مثلًا بمثلٍ لانهدار التفاوت في الوصف'' (ہدایہ کتاب البیوع باب الربا ۳/ ۷۹)۔

(جید کی بیع رڈی کے ذریعہ ان اشیاء میں جو اموال ربویہ میں سے ہیں جائز نہیں ہے، الا یہ کہ برابر سرابر ہو، وصف میں تفاوت کے باطل ہونے کی وجہ سے)

علامہ علاء الدین حصکفی نے یہ صراحت کی ہے کہ اموال ربویہ میں جید اور ردی برابر ہے۔

''وجيد مال الربوا ...... ورديئه سواء'' (الدر المختار علی صدر المحتار ۷/ ۴۱۲؛ کتاب البیوع باب الربا)۔

علامہ شامی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ جید کی بیع ردی کے ذریعہ ان چیزوں میں جن میں ربا ہے جائز نہیں ہے مگر یہ کہ برابر سرابر ہو۔

''قوله (وجيد مال الربا ورديئه سواء) أي فلا يجوز بيع الجيد بالردئ مما فيه الربا إلا مثلا بمثل'' (۷/ ۴۱۲)۔

۴- اس سوال کے جواب سے قبل قبضہ کی حقیقت شریعت کی نگاہ میں کیا ہے؟ اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اس لئے جواب سے قبل قبضہ کی حقیقت لکھی جا رہی ہے۔

کتاب وسنت میں قبضہ کی کوئی خاص صورت ونوعیت متعین نہیں ہے اور اصول یہ ہے کہ جن چیزوں کی شریعت اسلامیہ اور لغت میں کوئی تحدید نہ ہو وہ چیزیں عرف وعادت پر محمول ہوں گی۔ "الأشباہ والنظائر" میں ہے:

"کل ما ورد به الشرع مطلقًا ولا ضابط له فيه ولا في اللغة يرجع فيه إلى العرف ومثلوه بالحرز في السرقة والتفرق في البيع والقبض" (الأشباه والنظائر للسيوطي: ۱۹۶)۔

(شریعت میں جو لفظ مطلق وارد ہوا ہو اور اس کی بابت نہ تو شریعت میں کوئی ضابطہ مقرر ہو اور نہ ہی لغت میں، تو اس میں عرف کی طرف لوٹایا جائے گا اور فقہاء نے اس کی مثال چوری کے مسئلہ میں حرز (حفاظت) بیع میں تفرق اور قبضہ سے دی ہے)۔

اور صاحب درمختار قبضہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ بائع اور مشتری کے درمیان ایسا تخلیہ جس سے قبضہ پر قدرت ہو جائے اور کوئی چیز رکاوٹ اور حائل نہ ہو یہ تخلیہ قبضہ سمجھا جائے گا۔

"ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع وحائل" (الدر المختار علی صدر رد المحتار ۷/ ۹۴)

اور تخلیہ مبیع کی حالت وکیفیت کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، چنانچہ علامہ محمد بن عابدین شامیؒ "على وجه يتمكن من القبض" کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں، تخلیہ بھی حکماً قبضہ ہے اور ہر چیز کا قبضہ اسی کے حساب سے ہے، مثلاً اگر کسی گھر میں گیہوں وغیرہ ہے تو اس کا تخلیہ یہ ہے کہ کنجی مشتری کے حوالہ کردی جائے اور وہ بغیر تکلف وپریشانی کے مکان کھولنے پر قادر ہو اور اگر مکان ہے تو اس کا تخلیہ یہ ہے کہ اس کے بند کرنے پر مشتری قادر ہو اور جانوروں میں اس کا تخلیہ یہ ہے کہ چراگاہ میں جانور دکھلا دیا جائے اور اس کی جانب اشارہ کردیا جائے اور کپڑا ہے تو اتنا قریب ہو کہ مشتری جب ہاتھ اس کی جانب بڑھائے تو ہاتھ اس تک پہنچ جائے، کسی مکان میں بند گھوڑے اور پرندے پر قبضہ اس وقت متصور ہوگا جبکہ مشتری بغیر کسی کی مدد کے ان کو پکڑ سکے وغیرہ (ردالمحتار مطلب فی شروط التخلیۃ ۷/ ۹۶)۔

علامہ کاسانیؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب بدائع الصنائع میں قبضہ کی حقیقت ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

"لا يشترط بالبراجم لأن من القبض هو التمكين والتخلية وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة" (بدائع الصنائع ۴/ ۲۴۴)

(انگلیوں سے قبضہ شرط نہیں ہے اس لئے کہ قبضہ کا مطلب تمکین تخلیہ اور عرف وعادت وحقیقت کے اعتبار سے رکاوٹ کا ختم ہو جانا ہے)۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ مبیع اور مشتری کے درمیان ایسا تخلیہ جس سے قبضہ پر قدرت ہو جائے اور کوئی چیز رکاوٹ اور حائل نہ ہو قبضہ سمجھا جائے گا، لہٰذا مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں راقم الحروف کے نزدیک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پہلی صورت جب تمام خریدار کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ کی شکل میں ہے تو اس کو خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، اس لئے کہ مبیع ممیز وممتاز نہیں ہے، جس کی وجہ کر تمام خریدار اپنے اپنے حصہ کے بقدر مبیع کے قبضہ کرنے پر قادر نہیں ہیں، البتہ دوسری صورت میں جبکہ ہر خریدار کے لئے سونے کا سکہ علاحدہ علاحدہ رکھا ہوا ہے اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام پر درج کردیا گیا اور قبضہ سے کوئی چیز مانع ورکاوٹ نہیں ہے مشتری جب چاہے اس پر قبضہ کرسکتا ہے تو اس کو مشتری کا قبضہ تصور کیا جائے گا، اس لئے کہ اس پر قبضہ کی تعریف صادق آتی ہے۔

۵- مذکورہ صورت میں جبکہ معاملہ آپس کے قبضہ کے بغیر طے ہوتا ہے کہ نہ تو خریدار مبیع پر قبضہ کرتا ہے اور نہ ہی بیچنے والا ثمن (قیمت) پر قبضہ کرتا ہے، یعنی مبیع بائع کے پاس اور ثمن مشتری کے پاس رہتا ہے گویا مبیع اور ثمن دونوں ادھار ہیں، اور جب مبیع اور ثمن دونوں ادھار ہوں تو حدیث شریف میں ایسے بیع کی ممانعت آئی ہے۔

"عن ابن عمر أن النبي ﷺ نهى عن بيع الكالي بالكالي" (الدارقطني ۳/ ۶۰ كتاب البيوع)۔

(حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھار کی بیع ادھار کے ذریعہ سے منع فرمایا ہے)۔

لہٰذا مذکورہ طریقہ پر کاروبار شرعاً جائز نہیں ہے۔

۶- احتکار کی لغوی تعریف: لغت میں گراں فروشی کی نیت سے غلّہ کی ذخیرہ اندوزی احتکار ہے۔

''الاحتكار لغة حبس الطعام إرادة الغلاء'' (الموسوعة الفقهية ۲/ ۹۰)۔

(غلہ اور اس جیسی ضروریات زندگی خرید کر گرانی کے زمانہ تک روکے رہنے کو احتکار کہتے ہیں)۔

''أما في الشرع فقد عرفه الحنفية بأنه اشتراء الطعام ونحوه وحبسه إلى الغلاء'' (حوالہ سابق)۔

کن اشیاء کا احتکار ممنوع ہے اس سلسلہ میں فقہاء کرام کے تین اقوال ہیں۔

پہلا قول امام ابوحنیفہ، امام محمد، شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک یہ ہے کہ صرف غذائی اشیاء میں احتکار کا تحقق ہوگا۔

دوسرا قول مالکیہ اور حنفیہ میں سے امام ابویوسف کا ہے احتکار ان تمام چیزوں میں ہوسکتا ہے جو انسانی زندگی کے لئے ضروری ہو، اور جن کے روکنے سے عوام الناس کو ضرر لاحق ہو مثلاً غلہ، سالن، لباس وغیرہ۔

تیسرا قول: امام محمد بن حسن کا ہے کہ احتکار کا ثبوت صرف غذائی اشیاء اور کپڑوں میں ہوتا ہے (دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیہ ۲/ ۹۲)۔

جمہور فقہاء کی دلیل وہ احادیث ہیں، جن میں ذخیرہ اندوزی کے ممنوع ہونے کے سلسلہ میں غلہ کی صراحت موجود ہے۔ ابن ماجہ میں ہے۔

''عن عمر بن الخطاب رضي الله تعالىٰ عنه قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من احتكر على المسلمين طعامهم ضربة الله بالجذام والإفلاس'' (السنن لابن ماجه)۔

(حضرت عمرؓ سے مروی ہے انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا جو شخص مسلمانوں سے ان کا غلہ روک دے اللہ تعالیٰ اسے جذام اور تنگی میں مبتلا کرے گا)۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے: ''عن أبي أمامة أن رسول الله ﷺ قال من احتكر طعاما أربعين يومًا يريد به الغلا فقد برئ من الله وبرئ الله منه رواه رزين'' (مشكوٰة المصابيح: ۲۵۱)۔

(حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے چالیس دنوں تک غلہ کو گراں فروشی کے ارادہ سے روکے رکھا اس کا رشتہ اللہ سے ٹوٹ گیا، اور اللہ تعالیٰ اس سے بیزار ہوا)۔

مالکیہ اور امام ابویوسفؒ کا استدلال ان روایات سے ہے جن میں مطلق احتکار سے منع کیا گیا ہے اور احتکار کرنے والے کو خاطی وملعون قرار دیا گیا ہے، حدیث شریف میں ہے:

''قال رسول الله ﷺ: من احتكر فهو خاطئ'' (الصحيح لمسلم باب تحريم الاحتكار في الأقوات ۲/ ۳۱)۔

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے احتکار کیا وہ گنہگار ہے)۔

دوسری روایت میں ہے:

''عن عمر عن النبي ﷺ قال الجالب مرزوق والمحتكر ملعون'' (الصحيح لمسلم باب تحريم الاحتكار في الاقوات ۲/ ۳۱)

(حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تاجر کو رزق دیا جاتا ہے اور احتکار کرنے والا ملعون ہے)۔

امام محمد بن الحسن نے کپڑوں کو غذائیات پر محمول کیا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں انسان کے حوائج ضروریہ میں سے ہیں:

''فإنه حمل الثياب على القوت باعتبار أن كلامنهما من الحاجات الضرورية'' (الموسوعة الفقهية ۲/ ۹۳)۔

راجح قول:

جمہور فقہاء کا قول راجح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ جب ایک مسئلہ میں نصوص مختلف ہوں ایک عام اور دوسرا خاص تو ایسی صورت میں عام کو خاص پر محمول کیا جائے گا۔ تو گویا جن احادیث میں مطلق احتکار کی ممانعت وارد ہوئی ہے، وہ بھی غذائی اجناس پر ہی محمول ہے۔

''وإذا اجتمعت نصوص عامة وأخرى خاصة في مسألة واحدة حمل العام على الخاص والمطلق على المقيد'' (حوالہ سابق)

علامہ نووی نے مسلم شریف کی شرح نووی میں یہ صراحت کی ہے کہ احتکار کی ممانعت صرف غذائی اجناس ہی میں خاص ہے، اس کے علاوہ دیگر چیزوں میں احتکار ممنوع نہیں ہے۔

''قال أصحابنا الاحتكار المحرم هو الاحتكار في الأقوات خاصة وهو ان يشترى الطعام في وقت الغلاء للتجارة ولا يبيعه في الحال بل يدخره ليغلو ثمنه ... وأما غير الأقوات فلا يحرم الاحتكار فيه بكل حال'' (نووی مسلم شریف ۲/ ۳۱)

الغرض احتکار صرف غذائی اجناس میں ممنوع ہے اس کے علاوہ میں نہیں، لہذا احقر کی رائے میں گراں فروشی کی نیت سے سونے کی ذخیرہ اندوزی ممنوع نہیں ہونا چاہیے اور یہ احتکار کے دائرہ میں نہیں آئے گا۔ گرچہ اس کی وجہ سے گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہو، اس لئے کہ فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ غلہ جس میں احتکار ممنوع ہے اگر کوئی شخص اپنی زمین کے غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرے اور اس کی وجہ سے لوگوں کو نقصان ہو تو بھی یہ ذخیرہ اندوزی ممنوع نہیں ہے، بلکہ جائز ہے۔

''ولا يكون محتكرا بحبس غلة أرضه بلا خلاف'' (الدر المختار على صدر رد المحتار ۹/ ۵۷۲)۔

غلہ جس کی ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے جب اپنی زمین کے غلہ کے ذخیرہ اندوزی کی اجازت ہے گرچہ اس کی کی وجہ سے لوگ پریشانی میں مبتلا ہوں اور غلہ گراں ہو جائے تو اگر جس کی ذخیرہ اندوزی ممنوع نہیں ہے، مثلاً سونے کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے دوسری اشیاء کی قیمت گراں ہو جائے تو بھی اس کے جواز میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟

۷- اسمگلنگ فی نفسہ جائز وحلال ہونی چاہیے اور اس طریقہ سے آنے والے سونے کی خرید وفروخت بھی شرعاً جائز و درست ہونی چاہیے، اس لئے کہ ہر شخص کو اپنے روپے سے اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق سامان خریدنے کا حق حاصل ہے۔

''لا يمنع أحد من التصرف في ملكه أبدا'' (رد المحتار ۵/ ۴۴۸)۔

البتہ چونکہ یہ حکومت کے قانون کے خلاف ہے، پکڑے جانے پر ہتک عزت کا اندیشہ ہے نیز جس ملک میں ہم رہتے ہیں قولاً یا عملاً ہمارا یہ معاہدہ ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کریں گے تو اس قانون کی پابندی ہم پر لازم ہے۔

''كل من يسكن دولة فإنه يلتزم قولا أو عملا بأنه يتبع قوانيها وحينئذ يجب عليه اتباع أحكامها'' (في بحوث قضايا فقهية معاصرة/ ص ۱۶۶)۔

لہذا اسمگلنگ کا کاروبار نہ کیا جائے، یہی رائے حضرت مولانا مفتی نظام الدین، حضرت مولانا عبد الرحیم لاجپوری اور مفتی تقی عثمانی صاحب کی ہے (ملاحظہ ہو: منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۲۸، فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۷۸، فتاوی عثمانی ۳/ ۹۰)۔

۸- اصول یہ ہے کہ سونا اور چاندی یا مختلف کرنسیاں جو ثمن کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، اور سائمہ جانوروں کے علاوہ کسی بھی مال میں خواہ وہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، جب تک اس میں تجارت کی نیت نہ کی جائے، زکوۃ واجب نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ فقہاء کرام نے یہ صراحت کی ہے کہ ہیرے اور جواہرات پر زکوۃ واجب نہیں ہے۔

''لا زكوة في اللآلي والجواهر وإن ساوت ألفا إلا أن تكون للتجارة''

(الدر المختار على صدر رد المحتار قبيل باب السائمة ۳/ ۱۹۴)۔

لہذا پلاٹینیم کا شمار اگرچہ قیمتی دھاتوں میں ہوتا ہے پھر بھی اس پر عقود اور زکوۃ کے سلسلہ میں سونے کے احکام جاری نہیں ہونگے۔



سونا چاندی کی تجارت سے متعلق مسائل موجودہ تناظر میں

مفتی عمران بن دین محمد فلاحی، پالنپوری[1]

۱- الف: رائج الوقت کاغذی نوٹ، سکے اور روپے سونے چاندی کے حکم میں نہیں ہے، بلکہ ان کی حیثیت ثمن اصطلاحی کی ہے، اور ثمن اصطلاحی سے مراد وہ شئ ہے جو لوگوں کے عرف اور اتفاق کی وجہ سے ثمن کے درجہ میں آ گئی ہو، جبکہ سونا کی حیثیت ثمن حقیقی کی ہے جیسا کہ دوسرے فقہی سیمینار کی تجاویز سے معلوم ہوتا ہے، نیز دونوں کی اجناس بھی مختلف ہیں، لہذا ان کے ذریعہ سونا چاندی خریدنا جائز ہے، چاہے زیورات خریدیں یا اشرفی یا دراہم، ان پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے، کیونکہ بیع صرف کی تعریف امام قدوریؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:

"الصرف هو البيع إذا كان كل واحد من عوضيه من جنس الأثمان... فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لم يجز الخ" (المختصر القدوری/ ۸۵)۔

بیع صرف وہ بیع ہے: جس میں ثمن اور مبیع دونوں سونا چاندی کی جنس سے ہوں، نیز یہ بات بھی درست ہوگی کہ سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار اس لئے کہ روپئے سے سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے، اس لئے ادھار خرید و فروخت جائز ہے بشرطیکہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے، تاکہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

"لما قال العلامة ابن عابدين الشامي: (تنبيه) يجوز إذا قبض أحد البدلين" (ردالمحتار ۴/ ۲۰۵، باب الربوا، کتاب البیوع)۔

"وفي الهندية: قال: وروى الحسن عن أبي حنيفة إذا اشترى فلوسا بدراهم وليس بهذا فلوس ولا عند الآخر دراهم ثم إن أحدهما دفع وتفرقا جاز وإن لم ينقد واحد منهما حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط" (الفتاوى الهنديه ۳/ ۲۲۴، الفصل الثالث في بيع الفلوس)۔

ب- گولڈ مارکیٹ یا حکومتی نرخ سے کم وبیش میں سونے چاندی کی خرید وفروخت:

آج کل سونا اور چاندی کا کاروبار بہت ہی عروج پر ہے، اس کے لئے با قاعدہ مارکیٹ وجود میں آ گئی ہے، اب اس میں حکوت یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر "کومیکس گولڈ مارکیٹ" یا ہندوستان کی طرح پر یہاں کی مارکیٹ MC نے اس کا نرخ طے کیا ہے، لیکن لوگ بلیک مارکیٹ میں یا نجی معاملات میں حکومتی ریٹ کے بجائے اپنی مرضی سے ریٹ لگا کر خرید و فروخت کرتے ہیں جو حکومت کے ریٹ سے کم وبیش ہوتا ہے، اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ جب یہ عقد فریقین (بائع ومشتری) کے مابین باہمی رضامندی سے طے پائے تو جائز ہے بشرطیکہ دھوکہ اور فریب نہ ہو۔

"من منابع الشريعة العامة في الصفقات التجارية، وكافة العقود والاتفاقات أن لايتم ابرام العهود إلا بمرضاة الطرفين وأن يكون لهما التحرر والاختيار حتى لايتضرر به الآخر" (فقه الحلال والحرام ۲۲۲)۔

"والبائع أن يبيع بضاعته بما شاء من ثمن ولا يجب عليه أن يبيعه بسعر السرق دائما. وللتجار ملاحظة مختلفة في تعيين الأثمان وتقديرها... الخ" (قضايا فقهيه معاصره:۸)۔

لیکن اس طرح کا معاملہ کرنا چونکہ اس قانون کی خلاف ورزی ہے جو اجتماعی مفاد کے لئے حکومت کی طرف سے نافذ ہے، اس لئے اس خارجی سبب کی وجہ سے اس طرح کے معاملات کی اجازت نہ ہوگی، کیونکہ فقہ اسلامی کا قاعدہ ہے کہ جائز امور میں حکومتی قوانین کی پابندی واجب ہے، چنانچہ

---

[1] استاذ مدرسہ کنز مرغوب، فیض صفا، پٹن، شمالی گجرات۔

''الاشباہ والنظائر'' میں ہے:

''إذا كان فعل الإمام مبنيا على المصلحة فيما يتعلق بالأمور العامه لم ينفذ أمره شرعا إلا إذا وافقه فإن خالفه لم ينفذ'' (الأشباه والنظائر ۲۱۲، تحت القاعده الخامسه)۔

البتہ اس آمدنی کو حرام نہیں کہا جائے گا، بایں وجہ کہ نفس عقد میں کوئی قباحت نہیں پائی جاتی۔

''وعرف بهذا أنه لايكره بيع مالم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب ممن يتخذ منه المعازف'' (شامی ۶/ ۴۲۱ باب البغاة)۔

واضح رہے کہ یہ اضافہ ربا تفاضل کی فہرست میں نہیں آئے گا، کیونکہ عام طور پر فقہاء نے ربا تفاضل کی جو تعریف کی ہے وہ یہ ہے:

''وفي الشرع عبارة عن فضل مالايقابله عوض في معاوضة مال بمال'' (عنایہ علی ہامش الفتح ۶/ ۱۴۷ طبع احیاء التراث)۔

ایسا اضافہ جس کے عوض معاملہ کے دوسرے فریق کی طرف سے کچھ نہ ہو، اس تعریف پر غور کرنے سے معلوم ہو رہا ہے کہ جب عاقدین باہمی رضامندی سے عقد کر رہے ہیں نیز دونوں کی جنس بھی مختلف ہے، لہذا اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۲-الف: زیور بنانے والے کاریگر کا متعینہ وزن میں لینا، شرعی نقطہ نظر:

زیور بنانے والے کاریگر کے زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ وزن میں سونا لینے کی جو صورت سوال نامہ میں درج ہے وہ اجارہ تصور کی جائے گی، کیونکہ اجارہ کی تعریف اس پر منطبق ہوتی ہے، چنانچہ ابوالحسین احمد بن ابوبکر بغدادی القدوزی تحریر فرماتے ہیں:

''الإجارة عقد على المنافع بعوض'' (قدوری، / ص ۱۰۰)۔

اجارہ اس معاملہ کو کہا جاتا ہے جس میں ایک فریق کی طرف سے منفعت کی پیش کش ہو اور دوسرے کی طرف سے معاوضہ اور اجرت کی۔

نیز اجارہ کی مزید تفصیلات کو ذکر کرتے ہوئے امام قدوری لکھتے ہیں: ''وتارة تصير المنافع معلومة بالمدة... وتارة تصير معلومة بالعمل والتسمية كمن السأجر رجلا على صبغ ثوب أو خياطة ثوب الخ'' (حوالہ سابق)۔

منافع کی تعیین اور وضاحت کبھی مدت کے ذریعہ ہوگی اور کبھی وقت، جگہ، مسافت یا کام اور صنعت کے ذریعہ، اس عبارت کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مذکورہ صورت اجارہ منافع بالعمل کی ہے۔

ب-عامل ہی کے عمل کے ایک جز کو اجرت بنانا:

اجرت کے سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو ہدایات دی ہیں ان میں ایک ایسا جامع اصول بھی بیان کیا ہے جو حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی جفتی کی اجرت اور قفیز طحان سے منع فرمایا ہے، چنانچہ سنن کبری میں ہے:

''عن أبي سعيد الخدري: قال: نهى عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان'' (السنن الكبرى للبيهقي ۵/ ۳۳۹ طبع دار المعرفة)۔

قفیز طحان سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت یہ ہے کہ قفیز ایک پیمانہ تھا جس سے چیزوں کی مقدار متعین کی جاتی تھی اور طحان کے معنی ہے آٹا پیسنے والا، رواج یہ تھا کہ لوگ آٹا پیسنے والے کو گندم وغیرہ دیتے اور کہتے کہ اسی میں سے اتنے قفیز تمہاری اجرت ہوگی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت کو منع فرمایا۔

فقہاء نے اسی حدیث کی روشنی میں جزئیات کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ عامل ہی کے عمل کے ایک جز کو اجرت بنانا قفیز طحان کے دائرہ میں آتا ہے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعی اور بعض فقہاء اس کی ممانعت کے قائل ہیں (اعلاء السنن ۱۶/ ۱۸۳)۔

البتہ عرف کی رعایت کرتے ہوئے مشائخ بلخ نے اس طرح کی صورت میں اس کی اجازت دی ہے، چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

''ومشائخ بلخ جوز واهذه الإجارة لمكان الضرورة والتعامل'' (الفتاوى الهنديه ۴/ ۵۰۳، باب بيان ما يجوز عن الإجارة)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا قول بھی جواز ہی کا معلوم ہو رہا ہے، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں: ''ہندو پاک کے علاقہ میں جانوروں کے

معاملہ میں جس طرح یہ طریقہ مروج ہے، اس کے تحت عرف کی رعایت کرتے ہوئے اس کی اجازت ہونی چاہئے (جدید فقہی مسائل ۴/۱۹۶)۔

نیز مولانا رحمانی صاحب حدیث قفیز طحان کی حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: قفیز طحان والی روایت معلول اور متکلم فیہ ہے، قفیز طحان والی روایت کی تاویل اس طرح ممکن ہے کہ اس کو اس صورت پر محمول کیا جائے جبکہ مقدار مقرر نہ کی گئی ہو...... شریعت میں مزارعت، مساقات اور مضاربت کی صورت میں ایسی نظیریں موجود ہیں اور صحت اور صراحت کے ساتھ ثابت ہیں جو عامل کے جز عمل کو اجرت مقرر کرنے کو درست قرار دیتی ہیں، پس ہمارے زمانہ میں کاروبار اور معاملات میں ایسی صورتیں جو قفیز طحان کی قبیل سے ہیں اور کثرت سے مروج و معمول ہیں جائز ہونی چاہئیں (حوالہ سابق ۴/۱۹۸، طبع زمزم)۔

تاہم ''فتاوی ہندیہ'' میں جمہور فقہاء ہی کے قول کے معتبر و صحیح قرار دیا گیا ہے:

''والصحیح جواب الکتاب لأنه فی معنی قفیز الطحان'' (الفتاوی الهندیه ۴/ ۵۰۳، باب بیان ما یجوز من الإجارة)۔

چنانچہ جمہور ہی کے قول کا اعتبار کرتے ہوئے سوال نامہ میں دو صورت (سونا متعین وزن میں اجرت کے طور پر دینا اور لینا) قفیز طحان کی رو سے ناجائز ہوگی۔

جائز شرعی متبادل:

مذکورہ حدیث کے اختلافات سے بچتے ہوئے کاریگر کا سونا اجرت کے طور پر طے کرنے کے بجائے بہتر اور افضل یہ ہے کہ رقم طے کی جائے، اور اگر کاریگر چاہے تو اسی رقم کے بدلے ان لوگوں (زیورات کے تاجروں) سے بعد میں سونا خرید لے۔

۳- نیا زیور نئی خرابی:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت ربا کا ایک جامع اصول بیان فرمایا ہے، چنانچہ بخاری، مسلم میں یہ حدیث موجود ہے:

''الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والتمر بالتمر والشعیر بالشعیر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء یدا بید فمن زاد أو استزاد فقد أربی أی دخل فی الربا المحرم، الآخذ والمعطی فیه سواء'' (اخرجه البخاری: رقم: ۲۱۷۴، مسلم: رقم: ۱۵۸۴ والترمذی: ۱۲۴۰، وقال: حسن صحیح)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ سونے کو سونے کے عوض میں یا چاندی کو چاندی کے عوض میں، گندم کو گندم کے عوض میں، کھجور کو کھجور کے عوض میں، جو کو جو کے عوض میں، نمک کو نمک کے عوض میں فروخت کرنا ہو تو اس کے جواز کے لئے دو شرطیں ہیں:

۱- برابر وزن میں فروخت کیا جائے، کسی طرف سے کمی زیادتی نہ ہو۔

۲- نقد فروخت کیا جائے، ایک طرف یا دونوں طرف سے ادھار نہ ہو، اس میں جس نے زیادہ کیا یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو وہ سود خوری کے حرام طریقہ کا اختیار کرنے والا ہوگا، اس میں سود دینے والا اور لینے والا دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔

فقہاء کرام نے بھی اسی اصول حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی تصانیف میں بیع تصرف کے احکام کو زیر قرطاس کیا ہے، چنانچہ امام قدوریؒ لکھتے ہیں:

''فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لم یجز إلا مثل بمثل وإن اختلفا فی الجودة والصیاغة ولا بد من قبض العوضین قبل الإفتراق'' (المختصر القدوری/ ص۸۵ باب الصرف)۔

خلاصہ کلام یہ کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے تجارت میں سود ثابت ہونے کے لئے دو چیزوں کو علت قرار دیا ہے: ۱- جنس، ۲- قدر، اب ایک چیز کو دوسری چیز کے عوض فروخت کرنے میں اگر دونوں وصف پائے جائیں تو عوضین کا مساوی ہونا اور نقد ہونا ضروری ہے، خواہ دونوں کے مابین جودت اور زرگری میں تفاوت کیوں نہ ہو، اب اگر کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرے یا ادھار فروخت کرے تو دونوں صورتوں میں سود لازم آنے کی وجہ سے حرام ہے۔

اصول پر غور وخوض کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سوال نمبر ۳ میں تحریر کردہ صورت بھی بیع صرف کی قبیل سے ہے، اور بیع صرف کے جواز کی بنیادی شرائط جنس اور قدر میں سے یہاں قدر مفقود ہے، لہذا تاجر حضرات کا سونے کا پرانا زیور زیادہ وزن کا لینا اور سونے کا نیا زیور کم وزن میں اس کے بدلہ ادا کرنا شرعا درست نہیں ہے، جبکہ ایک ہی عقد میں یہ تبادلہ ہو، ہاں اگر دونوں عقد الگ الگ ہو مثلاً سونا کم قیمت میں خریدنا اور دوسرے سے زیادہ قیمت میں فروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ باہمی رضامندی سے یہ عقد طے پایا ہو۔

۴-الف: مشترک چیز میں خریدار کا قبضہ:

احناف کے یہاں قبضہ کا مفہوم وسیع ہے، کیونکہ عند الاحناف قبضہ کا حاصل صرف تخلیہ ہے اور تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ مبیع اور مشتری کے درمیان باعتبار حقیقت یا باعتبار عرف وعادت ایسا کوئی مانع اور حائل نہ ہو جو مشتری کو عرفی قبضہ کرنے سے اور اس میں تصرف کرنے سے روک سکے، بلکہ مبیع اس حال میں ہو کہ مشتری اگر اس میں تصرف کرنا چاہے تو آزادی کے ساتھ اس میں تصرف کر سکے، اگر چہ مبیع ابھی بائع کے پاس ہی موجود ہو، چنانچہ علامہ کاسائیؒ رقم طراز ہیں:

"وأما تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي و هو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشترى برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشترى من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشترى قابضا له" (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۴)۔

نیز دوسری جگہ یہ عبارت مسطور ہے:

"ولا يشترط القبض بالبراجم لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة" (حوالہ سابق ۵/ ۱۴۸)۔

حاصل یہ کہ کتاب وسنت نے قبضہ کی کوئی خاص صورت تو متعین نہیں کی ہے، لیکن ایسے اصول وقواعد اور اس کی مثالیں ضرور بیان کردی ہیں، جن سے ہر زمانہ میں اس کی تعیین کر سکتے ہیں، اور اس کا زیادہ تر مدار عرف وعادت پر ہے، لیکن اس میں عرف کی حیثیت شرعیہ ملحوظ رکھتے ہوئے اعتبار ہوگا، مطلقا عرف کا اعتبار نہیں ہوگا۔

آج کل کموڈیٹیز ایکسچینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، تو اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس مثلاً ایک کلو سونا ہو اور وہ دوسو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کردے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے جاتے ہوں، اس طرح کی صورت حال میں عقد اگر مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ ہو تو درست ہے، اور قبضہ متحقق ہوگا۔

۱- فوری طور پر قیمت ادا کی جاتی ہو اور مبیع (سونے) کے حقوق خریدار سے متعلق ہو جاتے ہوں، کیونکہ کموڈیٹیز ایکسچینج میں عام طور پر بعض انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے مبیع کی حوالگی میں تاخیر ہو جاتی ہے، تو اس عقد کی بیع کالی بالکالی سے بچانے کے لئے فوری قیمت ادا کرنا ضروری ہے، اور مبیع (سونا) کے حقوق خریدار سے متعلق ہونا اس لئے ضروری ہے تا کہ قبضہ کا تحقق ہو سکے۔

۲- مبیع موجود ہو اور بیچنے والے کی ملکیت میں ہو، جو چیز اپنی ملکیت میں نہ ہو اس کی بیع درست نہیں چنانچہ "قدوری" میں ہے:

"ولا يجوز بيع السمك في الماء قبل أن يصطاده، ولا بيع الطائر في الهواء" (المختصر القدوری/ ص۷۸)۔

۳- مبیع اس طرح متعین ہو کہ وہ دوسرے کی ملکیت سے ممتاز ہو خواہ اس طور پر کہ اسے الگ کر دیا گیا ہو یا نمبر کے ذریعہ اس کو ممتاز کر دیا گیا ہو۔
(جدید مالیاتی ادارے: /ص ۹۰)۔

ب-کمپیوٹر یا ریکارڈر جسٹر میں خریدار کے نام کا اندراج قبضہ متصور ہوگا:

اس سلسلہ میں حضرات فقہاء نے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ بائع مبیع کو اپنے مال سے الگ کر کے اس طرح رکھ دے کہ خریدار اپنے سامان کو اپنے اختیار سے جب لے جانا چاہے یا اس میں تصرف کرنا چاہے تو بائع کی طرف سے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے (بدائع ۵ / ۱۴۸)۔

فقہاء کی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے یہی بات قرین انصاف معلوم ہوتی ہے کہ اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈر جسٹر میں اس کے نام سے درج کر دیا گیا ہو تو قبضہ کے ثبوت کے لئے قبضہ بالید کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اسی اندراج کو قبضہ شمار کیا جائے گا، اس بات کی تصدیق میں رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم ''المجمع الفقہی الاسلامی'' مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے کی ایک قرارداد بھی مؤید ہوسکتی ہے، جس کا اقتباس یہاں نقل کیا جارہا ہے:

''بینک کے رجسٹر میں اندراج اس شخص کے حق میں قبضہ کے لئے معتبر ہوگا جو ایک کرنسی کو دوسری کرنسی میں تبدیل کرانا چاہتا ہو''۔
(المجمع الفقہی الاسلامی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے: ص ۳۲۶)۔

۵-عقد مستقبلیات:

سوال نمبر ۵ میں ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی جو نئی صورت درج ہے اسے انگریزی میں Future Sale اور عربی میں ''مستقبلیات'' کہا جاتا ہے، یہ صورت قطعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ اس معاملہ کی صورت میں نہ تو بائع کی طرف سے مال دینا پایا جاتا ہے، اور نہ اس کے مقابلہ میں مشتری کی طرف سے ثمن، بلکہ مقررہ تاریخ پر بڑھتے ہوئے دام کی صورت میں منافع اور گھٹتے ہوئے دام کی صورت میں خسارہ ادا کیا جاتا ہے، گویا دونوں طرف سے ادھار ہے، اور آپ ﷺ نے ایسی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے، چنانچہ صاحب مشکوۃ المصابیح نے ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی ہے:

''عن ابن عمر أن النبي ﷺ نهى عن بيع الكالي بالكالي'' (مشكوة المصابيح/ ص ۲۴۸)۔

نیز اس میں قمار اور جوا بھی ہے کہ حقیقت میں خرید وفروخت مفقود ہے، اور محض ایک کاغذی کاروائی کی بنیاد پر نفع یا نقصان ہوتا ہے، اس لئے یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہے، بلکہ اس سے احتراز لازم ہے، کیونکہ اس کی حرمت نص قرآنی اور احادیث نبویہ وفقہاء کی آراء سے معلوم ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

"یا ایها الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه" (المائدة: ۹۰)۔

احادیث کے ذخیرہ پر سرسری نظر دوڑانے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے زمانہ جاہلیت کے جو قمار آمیز معاملات تھے مثلاً بیع ملامسہ، بیع منابذہ، بیع حصاۃ، بیع عربان وغیرہ ان پر پابندی لگاتے ہوئے اسلامی نظام معیشت کو پیش کیا۔

ہمارے سلف المحدثین شاہ ولی اللہؒ نے خرید وفروخت کی ان صورتوں کا اصولی وتفصیلی تجزیہ کیا ہے جن کو آپ ﷺ نے منع فرمایا تھا اور بتایا ہے کہ اسباب ممانعت میں سے ایک وہ ہے جس میں قمار کی کیفیت پائی جاتی ہو۔

''واعلم أن من البيوع ما يجري فيه معنى الميسر، وكان أهل الجاهلية يتعاملون بها فيما بينهم فنهى عنها النبي ﷺ'' (رحمة الله الواسعة شرح حجة الله البالغة: كتاب البيوع: ۴/ ۵۶۰)۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان مندرجہ بالا اصولی وتفصیلی باتوں سے ایکسچینج کی اس نئی صورت کا ممنوع ہونا بالکل واضح ہے۔

۶-سونا اور احتکار-شرعی نقطۂ نظر:

ذخیرہ اندوزی کو عربی زبان میں احتکار کہا جاتا ہے، لغوی معنی: غلہ کو اس نیت سے ذخیرہ کر لینا کہ جب مہنگا ہو جائے گا، فروخت کروں گا، اور شرعاً اشیاء ضروریہ کو خرید کر اس طرح روک رکھنا جس سے اہل شہر کو مشقت لاحق ہو، چنانچہ ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''وذلك أن يشتري طعاما في مصر ويمتنع من بيعه وذلك يضر بالناس'' (الفتاوى الهنديه ۳/ ۲۱۳)۔

(یہ گرانی اگر اس لئے کہ مارکیٹ گراں ہوگا تب فروخت کریں گے تو بھی گناہ ہے اور اگر اس لئے کہ قحط پڑنے کے بعد مال بازار میں لائیں گے تب تو سنگین گناہ ہے) (حوالہ سابق ۳/ ۲۱۴)۔

حاصل یہ کہ جب ضرورت پڑنے لگے اور روکنے سے ضرر ہونے لگے، احتکار ہوجاتا ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۱۹)۔

امام محمدؒ کے نزدیک احتکار صرف غذائی اشیاء میں ممنوع ہے، لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تمام اشیاء مایحتاج اس میں داخل ہیں، امام مالکؒ کی یہی رائے ہے، چنانچہ ''ہندیہ'' میں ہے:

''والاحتكار في كل يضر بالعامة في قول أبي يوسف وقال محمد: الاحتكار ب ما يتقوت به الناس والبهائم كذا في الحاوى'' (ہندیہ ۳/ ۲۱۳)۔

''والاحتكار يحرم في غير الطعام أيضا عند الضرورة عن المالكية وأبي يوسف من الحنفية''

(الفقه الاسلامى وادلته ۲/ ۵۸۶)۔

احتکار کی مذمت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سخت الفاظ میں اس طرز عمل کی مذمت فرمائی ہے، چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے: ''من احتكر فهو خاطى'' (مسلم: باب تحریم الاحتکار ۱۲۲۸) (جس نے ذخیرہ اندوزی کی وہ گنہگار ہے)، ایک روایت میں آپ نے محتکر کو ملعون قرار دیا ہے (ابن ماجہ ا/ ۱۵۶)۔

فقہاء نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ ایسے ذخیرہ اندوز اور خودغرض تاجروں کے خلاف اقدام کرتے ہوئے ان کو اپنا مال بازار میں لانے کے لئے مجبور کرے، چنانچہ ''ہندیہ'' میں ہے:

''قال محمد: للإمام أن يجبر المحتكر على البيع إذا خاف الهلاك على أهل المصر ويقول للمحتكر بع بما يبيع الناس'' (ہندیہ ۳/ ۲۱۴)۔

اور اگر وہ اشیاء بہت گراں قیمت پر فروخت کریں تو قیمتوں کا تعین اصحاب رائے سے مشورہ کے بعد کردے اور ان کو اسی قیمت پر بیچنے پر مجبور کرے، چنانچہ ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے:

''ومنها بيع طعام المحتكر جبرا عليه عند الحاجة وامتناعه من البيع دفعا للضرر العام'' (الأشباه والنظائر ۲۱۳)۔

فتاوی محمودیہ میں ایک سوال کے جواب میں درج ہے:

''اگر اس کے خریدنے سے بستی والوں کو ضرر ہوتا ہے کہ وہ چیز نایاب ہوجاتی ہے یا گراں ہوجاتی ہے تو یہ احتکار میں داخل ہوکر ممنوع ہے، اگر ضرر نہیں ہوتا تو ممنوع نہیں ہوتا'' (فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۲۳۵ فصل فی الاحتکار)۔

تاہم احادیث اور فقہاء کی تصریحات سے یہی بات سمجھ میں آرہی ہے کہ سونے کے تاجروں کا سونا روک لینا تا کہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کریں، یہ احتکار میں داخل ہے، کیونکہ سونا تو ثمن خلقی ہونے کی وجہ سے اس کو روک لینے کی صورت میں سونے کی قیمت تو بڑھتی ہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہے، جس کی بنا پر اہل شہر اور پبلک مشقت کا شکار ہوتی ہیں، جبکہ شریعت اسلامی کا ایک اہم قاعدہ ہے: ''الضرر یزال'' (فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۲۳۵ فصل فی الاحتکار)، نقصان اور دشواری کا ازالہ کیا جائے گا۔

لہذا اسی اصول کے پیش نظر، نیز امام ابو یوسف اور مالکیہ کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کی پریشانی کا ازالہ بایں معنی ہو کہ احتکار نہ کرکے اسے مارکیٹ میں لاکر لوگوں کی حاجت روائی کی جائے۔

۷-اسمگلنگ کے راستے سے آنے والا سونا اور خرید وفروخت:

ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک روپئے سے اپنی ضروریات یا پسند کا جو مال جہاں سے چاہے خریدے، لہذا کسی بیرونی ملک سے مال خریدنا یا وہاں لے جا کر بیچنا شرعا مباح ہے۔

''وللبائع أن يبيع بضاعته بما شاء من ثمن ولا يجب عليه أن يبيعه بسعر السوق دائما. وللتجار ملاحظة مختلفة في تعيين الأثمان وتقديرها...'' (قضايا فقهيه معاصره:۸)۔

لیکن مختلف ممالک اپنے ملک کی معاشی مصالح کے پیش نظر دوسرے ملکوں کی برآمدات پر پابندی لگاتے ہیں، تاکہ ملکی معاشی نظام توازن کے ساتھ چلتا رہے، کیونکہ ان کے آنے کی وجہ سے ملکی مصنوعات کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اور Value ڈاؤن ہوسکتی ہے۔

اب بیرونی سامان معیشت کو ملک میں آنے کے دو ہی راستے ہیں:

۱-یا تو قانونی طریقہ اور اس سے متعلق واجبات (ٹیکس) ادا کر کے لانا، ۲-دوسرا طریقہ اسمگلنگ کا ہے، یہ طریقہ غیر قانونی ہے، اس میں سونا وغیرہ لانے والا ان واجبات کو ادا نہیں کرتا جو حکومت نے سونے کی درآمد سے متعلق مقرر کئے ہیں، بچند وجوہ یہ اسمگلنگ کا عمل جائز نہیں ہے۔

۱- اس لئے کہ اس میں ایک تو اس معاہدہ کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جو اس ملک کا شہری ہونے کے لحاظ سے اس کے قانون کا پالن کرنا ضروری ہے۔

''لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض'' (الدر مع ردالمحتار ۶/ ۴۱۶ باب البغاة)۔

''أمر السلطان إنما ينفذ إذا وافق الشرع وإلا فلا'' (حواله سابق ۸/ ۱۱۷ كتاب الفقهاء)۔

۲- دوسرے اس طرح وہ پوری قوم اور ملک کے افراد انسانی کو اپنی حرکت کے ذریعہ نقصان پہنچاتا ہے جو کہ ایک غیر اسلامی عمل ہونے کے ساتھ ساتھ غیر انسانی حرکت بھی ہے۔

۳- بعض دفعہ بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، نیز جان و مال یا عزت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، لہذا حکومت کے جائز قوانین کی پابندی میں ہی بھلائی ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی رائے بھی یہی ہے کہ یہ طریقہ درست نہیں ہے، بلکہ اس سے اجتناب لازم ہے (فتاوی عثمانی ۳/ ۸۸، جدید فقہی مسائل ۱/ ۳۷۸)۔

معاشی مصالح کے پیش نظر اس قسم کی ملکی پابندیوں کی گنجائش ہے، اس کی نظیر کتب فقہ میں ''تلقی جلب'' اور بیع حاضر للبادی ہے جسے مکروہ قرار دیا ہے۔

تاہم اسمگلنگ کے طریقہ سے حاصل شدہ سونے کی خرید وفروخت میں اگر جھوٹ بولنا یا کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی، چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: اگر اسمگلنگ کی گھڑیوں کی خرید میں جھوٹ بولنا یا کسی اور گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو خریدنا جائز ہے (حوالہ سابق)۔

۸-سفید سونا حقیقت کے آئینہ میں:

حقیقت میں سونا زرد رنگ کا ہوتا ہے، اسی طرح غالبا اس میں تانبا ملانے کے سبب سے اسے سرخ کا وصف بھی دیا جاتا ہے، لوگوں کے ہاں سونے کے بارے میں تو یہی معروف ہے، اور لغت، کتب احادیث و معدنیات اور فقہاء کے اقوال وغیرہ سے یہی معلوم ہو رہا ہے، چنانچہ ''المعجم الوسیط'' میں درج ہے:

''الذهب: عنصر فلزي أصفر اللون'' (المعجم الوسيط/ ص۳۱۷)۔

''وفي لسان العرب: والأصفران: الذهب والزعفران'' (لسانالعرب ۴/ ۴۶۰ ماده: ص،ف،ر)۔

''قال فی دائرة المعارف من القرن العشرين: الذهب جسم لماع نحو لونه أصفر'' (دائرة المعارف القرن العشرين: لمحمد فريد وجدی ۴/ ۱۳۵)۔

''وفی الحديث ان النبی ﷺ صالح أهل خيبر علی الصفراء والبيضاء والحاقة. الصفراء: الذهب لو البيضاء: الفضة و الحلقة: الدروع'' (ابوداؤد: كتاب الخراج والإمارة: باب ما جاء فی حكم ارض خيبر)۔

''وروی الطحاوی من طريق طعمة بن عمرو قال: رأيت صفرة الذهب بين ثنايا أو قال بين ثنيتی موسی بن طلحة'' (شرح معانی الآثار۴/ ۲۵۸)... ''وقال الشيخ عبدالله بن سليمان المنيع: ولا يعرف للذهب لون غير الصفرة'' (مجموع فتاوی و بحوث الشيخ عبدالله المنيع۱۶/ ۳۱۶)۔

زیورات بنانے اور سونا ڈھالنے والے تجربہ کار افراد سے سوال کرنے کے بعدان کا یہ کہنا ہے کہ'' وائٹ گولڈ کا اطلاق کئی ایک اشیاء پر ہوتا ہے''۔

اول: پلاٹین کی دھات پر وائٹ گولڈ کا اطلاق ہوتا ہے۔

''هنالك معدن نفيس هو البلاتين تصنع منه أنواع من الحلی، قد يطلق عليه بعض الناس من غير الصاغة'' (الذهب الأبيض: عبدالرحمن بن فهد الودعان/ ص۲۳)۔

دوم: White Gold کا اطلاق معروف زرد رنگ کے سونے پر ہوتا ہے، لیکن اس کے اوپر پلاٹین کی پالش چڑھی ہوتی ہے، چنانچہ شیخ عبدالرحمن الودعان لکھتے ہیں:

''الذهب الأبيض منه ما ہو ذهب أصفر خلط ببعض المواد بنسب قليلة الكسبته اللون الأبيض... ومنه ما ہو ذهب اصفر طلبی بمادة جعلت ظاہره باللون الأبيض'' (حوالہ سابق)۔

سوم: White Gold کا اطلاق معروف زرد سونے پر ہوتا ہے لیکن ایک معین تناسب کے ساتھ اس میں پلاڈیم یا کوئی اور مادہ ملایا جاتا ہے، یہ کیرٹ کے حساب سے کم وبیش ہوتا ہے، جتنے کیرٹ کا مطلوب ہوگا اسی حساب سے اسے شامل کیا جائے گا، اور سونے کی دوکانوں میں یہی اطلاق مشہور ہے، چنانچہ شیخ الذہب العالم یوسف العطیر لکھتے ہیں:

''ان الذهب الأبيض هو الذهب المعروف الأصفر، وما يجعله أبيض ہی مادة تضاف عليه عند السبك من البلاد يوم ومعدن آخر'' (حواله سابق)۔

ماہرین معدنیات اور زیور بنانے والے تجربہ کار افراد کے اقوال کا جائزہ لینے کے بعد اگر ہم اطلاق اول (پلاٹین کی دھات پر وائٹ گولڈ کا اطلاق) کا اعتبار کریں جیسا کہ سیمینار کے سوال سے بھی یہی واضح ہو رہا ہے تو اس صورت میں اس پر سونے کا حکم مرتب نہیں ہوگا، نیز عقود زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق نہیں ہوں گے، کیونکہ یہ مستقل ایک الگ دھات ہے، اور اسے White Gold کہنا صرف ایک اعتباری اصطلاح ہے، اور حقیقت میں یہ سونا نہیں، جس طرح پیٹرول کو BlackGold (سیاہ سونا) کا نام دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ سونا نہیں، بلکہ قیمتی ہونے میں مشابہت ہے (الذهب الابيض حقيقة/ص ۲۷)۔

یہی رائے شیخ عبداللہ بن سلیمان المنیع اور شیخ محمد ناصر الدین البانی کی ہے، چنانچہ شیخ عبداللہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''...ولا يعرف للذهب لون غير الصفرة، فإذا كان هنالك معدن يسمی اصطلاحا: الذهب الأبيض؛ كالبلاتين ونحوہا؛ فلا يظهر لی الحاق هذا النوع بالذهب المحرم علی الرجال التحلی به، ولو ترك الرجل التحلی بهذا النوع اتقا للشبهة؛ لكان فی ذلك استبراء للدين والعرض'' (حواله سابق/ ص۳۰)۔

علامہ البانی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''الذهب الأبيض نوعان: النوع الأول: هو البلاتين فهذا لا شئ فيه؛ لأنه لم يات نص فی الشرع يحرم

المعادن الثمينة غير الذهب والفضة، فالبلاتين يدخل تحت قاعدہ: الأصل فى الأشياء الإباحة'' (حوالہ سابق/ص ۳۰)

پلاٹین میں وجوب زکوۃ کا مسئلہ:

اللہ تعالی نے معدنی اشیاء میں سے صرف سونا چاندی پر زکوۃ کو واجب کیا ہے، حالانکہ ان کے علاوہ دوسری معدنی اشیاء کئی ساری ہیں، ان میں زکوۃ واجب نہیں ہے تو من جملہ ان کے ایک پلاٹین بھی ہے، اس میں بھی زکوۃ واجب نہیں ہوگی، الا یہ کہ وہ تجارت کے لئے ہو تو اس میں مال تجارت ہونے کی بنا پر زکوۃ واجب ہوگی، چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

''ولا شئ فی البغال والحمیر۔۔إ لاأن یکون للتجارۃ، لأن الزکوۃ حینئذ تتعلق بالمالیۃ کسائر أموال التجارۃ''

(ہدایہ ۱۹۱/۱ کتاب الزکوۃ)۔

البتہ سعودی اور ہمارے صوبہ گجرات کے مشہور شہر ''پٹن'' کے بعض زیور بنانے والے تجربہ کار افراد کا کہنا ہے: اصل میں سونا تو زرد رنگ ہی کا ہوتا ہے، اور اصلا وائٹ گولڈ کا کوئی وجود ہی نہیں، لیکن س میں کچھ مواد شامل کر کے اسے سفید رنگ میں تبدیل کیا جاتا ہے، چنانچہ وائٹ گولڈ تو زرد سونا ہی ہے، لیکن اس میں چاندی اور تانبے کے بجائے پلاڈیم شامل کرنے سے وائٹ گولڈ بن جاتا ہے، اسی لئے سونے کی دوکانوں پر زرد سونے کی طرح وائٹ گولڈ بھی کئی کیرٹ کا پایا جاتا ہے، اور یہ تو معلوم ہے کہ سونے میں چاندی یا تانبا ملانے سے وہ سونے سے خارج نہیں ہوجاتا، کیونکہ معمولی غش تو ہوتا ہی ہے تب جا کر زیور تیار ہوتا ہے، چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''لأن الدرهم لاتخلو عن قليل غش، لأنها لاتنطبع إلا به'' (ہدایہ ۱/ ۱۹۵)۔

اس سے معلوم ہوا کہ وائٹ گولڈ تو حقیقی سونا ہے، اسی بنا پر وائٹ گولڈ مردوں کے لئے پہننا حرام ہے کیونکہ یہ حقیقتا یہ زرد سونا ہی ہے، لیکن اس میں ایسا مادہ ملایا گیا ہے جو اس کے رنگ کو تبدیل کر کے سفید کر دیتا ہے، شیخ عبد الرحمن الودعان نے بھی اس سلسلہ میں کچھ تفصیلات ذکر کی ہیں

(دیکھئے: الذهب الأبيض حقيقته/ص ۲۲)۔

سعودی کی فتوی کمیٹی سے وائٹ گولڈ کی حقیقت کے متعلق دریافت کیا گیا تو کمیٹی کا یہ جواب تھا:

''اگر واقعی ایسا ہی ہے جیسا سوال میں بیان کیا گیا ہے تو پھر سونے کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملانے سے، سونے کی جنس سے ہی اسے فروخت کرنے میں کم اور زیادہ کے ساتھ فروخت کرنے کی حرمت کے احکام سے خارج نہیں ہوجاتا، اور مجلس عقد میں اپنے قبضہ میں کرنے کے وجوب، میں فرق نہیں آتا، چاہے وہ اسی جنس سے فروخت کیا گیا ہو یا پھر چاندی یا نقدی روپیوں میں، اور مردوں کے لئے پہننے کی حرمت سے بھی خارج نہیں ہوتا، اور اسی طرح اس کے برتن بنانے بھی حرام ہی رہیں گے۔ (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والإ فتا ۲۴/ ۶۰)۔

اور اسے وائٹ گولڈ کا نام دے دینا اسے ان احکام سے خارج نہیں کرے گا۔

☆☆☆

سونا اور چاندی کی تجارت سے متعلق مسائل

مفتی سلمان پالنپوری[1]

۱- بیع صرف کی تعریف اور ثمن کی قسمیں:

بیع صرف اگرچہ ثمن کی بیع کا نام ہے، لیکن ہر قسم کے ثمن کی بیع، بیع صرف نہیں کہلاتی، ثمن کی دو قسمیں ہیں ۱- ثمن خلقی (حقیقی)، ۲- ثمن اصطلاحی (عرفی واعتباری) ثمن خلقی جسے نقدین سے تعبیر کیا جاتا ہے، صرف دو ہیں: سونا اور چاندی۔ ثمن اصطلاحی: نقدین کے علاوہ کوئی بھی چیز جسے ثمن کی حیثیت دے دی گئی ہو۔

عبارات فقہیہ سے پتہ چلتا ہے کہ بیع صرف کا اطلاق صرف اس بیع پر ہوگا جہاں دونوں طرف ثمن خلقی سونا چاندی ہو، خواہ وہ فی الوقت ثمن کی صورت میں ہو مثلاً دراہم یا دنانیر یا فی الوقت ثمن کی صورت میں نہ ہو، مثلاً سونا اور چاندی کے برتن، زیورات وغیرہ، گویا سونے کی بیع سونے کے ساتھ، چاندی کی بیع چاندی کے ساتھ یا سونا اور چاندی کی بیع ایک دوسرے کے ساتھ بیع صرف ہے، یہ سونا اور چاندی خواہ جس شکل میں بھی ہوں، درہم و دینار کی صورت میں یا ظروف وزیورات کی صورت میں۔

صاحب ہدایہ نے ''صرف'' کی تعریف یوں کی ہے:

''الصرف هو البيع إذا كان كل واحد من عوضيه من جنس الأثمان'' (ہدایہ ۳/ ۱۰۴)

(صرف وہ بیع ہے جس میں عوضین (ثمن و مبیع) میں سے ہر ایک اثمان کی جنس سے ہوں) اس کی شرح میں امام ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

''وإنما قال من جنس الأثمان ولم يقتصر على قوله بيع ثمن بثمن ليدخل بيع المصوغ بالمصوغ أو بالنقد. فإن المصوغ بسبب ما اتصل من الصنعة به لم يبق ثمنا صريحا. ولهذا يتعين في العقد ومع ذلك بيعه صرف'' (فتح القدیر ۷/ ۱۳۶)

(ماتنؒ نے جنس اثمان کہا، اس پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ ثمن کی ثمن سے بیع ہے، تاکہ اس صورت کو بھی صرف میں داخل کردیں، جب (سونے اور چاندی کی) ڈھلی ہوئی اشیاء کی بیع ڈھلی ہوئی اشیاء یا نقود (بے ڈھلے سونا یا چاندی) سے ہو، اس لئے کہ ڈھلی ہوئی اشیاء صنعت متصل ہوجانے کی وجہ سے اگرچہ صراحۃ ثمن باقی نہیں رہیں، اسی لئے وہ عقد بیع میں متعین بھی ہوجاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی بیع بھی بیع صرف ہے)۔

''شرعا بيع الثمن بالثمن أي ما خلق للثمنية ومنه المصوغ جنسا'' (درمختار ۲/ ۵۵)۔

صاحب درمختار نے بیع صرف کی تعریف میں ثمن کو ما خلق للثمنیۃ (جو خلقۃً ثمن ہوں) کہہ کر بات اس قدر واضح کردی کہ کسی قسم کا ابہام اور الجھاؤ باقی نہیں رہا۔

اب وہ عبارتیں ملاحظہ کیجئے کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اگر عوضین ثمن خلقی نہ ہوں تو اگرچہ ان میں سے ایک ثمن خلقی ہی سہی بیع صرف نہیں اور بیع صرف کے احکام بھی اس پر لاگو نہیں۔

شمس الائمہ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

جب کوئی آدمی فلوس کو دراہم سے خریدے اور ثمن کو نقد سے دے، لیکن فلوس بائع کے پاس نہ ہوں تو بیع جائز ہے، اس لئے کہ فلوس رائجہ نقود کی طرح

[1] مفتی مدرسہ جامعہ خلیلیہ ماہی، پالنپور، گجرات۔

ثمن ہیں اور ہم بتا چکے ہیں کہ ثمن میں عقد بیع کا حکم ایک ساتھ اس کا وجوب وجود ہے، لیکن عقد بیع کے صحیح ہونے کے لئے اس کا بائع کی ملکیت میں قائم ہونا شرط نہیں، صرف میں دونوں طرف سے قبضہ اس لئے شرط ہوتا ہے کہ اس کے نام کا مقتضی ہی یہی ہے، لیکن فلوس کی بیع دراہم سے صرف نہیں ہے)۔

''وإنما يجب التقابض في الصرف بمقتضى اسم العقد وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف'' (المبسوط ۱۴/ ۲۴)۔

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

''وإذا كان الخيار مشروطا لأحدهما فتفرقا بعد التقابض جائز. لأن التسليم يتم ممن لم يشترط الخيار في البدل الذي من جانبه وقبض أحد البدلين هنا يكفي بخلاف الصرف'' (حوالہ سابق)۔

(فلوس و دراہم کی بیع میں) جب خیار شرط بائع اور مشتری میں سے کسی ایک کے لئے ہو اور قبضہ کے بعد دونوں الگ الگ ہو گئے ہوں تو بیع جائز ہے، کیونکہ بدل کی حوالگی اس کی طرف سے مکمل ہو جائے گی، جس نے اپنے لئے اختیار نہیں رکھا ہے اور بدلین میں سے ایک پر قبضہ یہاں کافی ہے، لیکن صرف میں کافی نہیں)۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

''لو باع فضة بفلوس، فإنه يشترط قبض أحد البدلين قبل الافتراق لا قبضهما كما في البحر عن الذخيرة''

(شامی مع الدر ۴/ ۲۲۵)۔

علامہ شامیؒ دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فإجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين. لما في البزازية لو اشترى مأة فلس بدرهم يكفي التقابض من أحد الجانبين، قال ومثله لو باع فضة أو ذهبا بفلوس كما في البحر عن المحيط'' (شامی ۴/ ۱۸۴)۔

(سونے کی بیع فلوس سے ادھار کے متعلق حانوتیؒ سے سوال کیا گیا، انہوں نے جواب دیا کہ اگر بدلین میں سے کسی ایک پر قبضہ ہو جائے تو جائز ہے، اس لئے کہ بزازیہ میں ہے کہ اگر سو فلوس کو ایک درہم میں خریدے تو دونوں جانب میں سے ایک طرف سے قبضہ کافی ہے اور اسی کے مثل یہ صورت بھی ہے کہ اگر چاندی یا سونے کو فلوس سے بیچا جائے جیسا کہ بحر میں محیط سے منقول ہے)۔

مذکورہ بالا عبارات فقہیہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نقدین کے سوا دوسرے اثمان رائجہ کی بیع سونا اور چاندی سے بیع صرف نہیں، لہذا سونا یا چاندی اور روپئے میں ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار ہو، تو بیع جائز ہے، دونوں کا دست بدست ہونا ضروری نہیں، لیکن دونوں ادھار نہ ہوں، ایک کا نقد ہونا ضروری ہے جیسا کہ عبارات فقہیہ گزریں، مزید یہ روایت بھی:

''عن ابن عمر أن النبي ﷺ نهى عن بيع الكالي بالكالي'' (رواه دارقطني مشكوة شريف ۱/ ۲۴۸)۔

سونا چاندی اور روپئے میں ربا کا تحقق؟

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک علت، ربا قدر مع الجنس ہے یعنی کیلی یا وزنی ہونا اور ہم جنس ہونا یہ دو وصف مل کر ربا کی علت ہے، پہلا وصف قدر موجود نہیں ہے، کیونکہ سونا چاندی موزونی ہے اور روپئے عددی ہیں۔

''فليس الزرع والعد بربا'' (درمختار ۴/ ۱۷۷) (پیمائش اور عدد علت ربا نہیں)۔

''ہدایہ'' میں ہے: ''وإذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم إليه حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة. والأصل فيه الإباحة وإذا وجد أحدهما وعدم الآخر حل التفاضل وحرم النساء'' (ہدایہ ۳/ ۷۹ باب الربا)

(اگر جنس اور قدر دونوں معدوم ہوں تو زیادتی بھی جائز ہے اور ادھار بھی، کیونکہ علت محرمہ موجود نہیں اور اصل اس میں اباحت ہے، جب دونوں اوصاف پائے گئے تو تفاضل اور ادھار دونوں حرام ہیں، علت کے پائے جانے کی وجہ سے اور جب دونوں میں سے ایک پایا جائے اور دوسرا

معدوم ہو تو تفاضل حلال ہے، ادھار حرام ہے)۔

اور سونا چاندی اور روپئے اگر چہ ثمن ہیں، لیکن وصف ثمنیت میں من کل وجہ متفق نہیں، گویا کہ ایک وصف بھی من کل وجہ موجود نہیں ہے۔

حاصل یہ کہ سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت یا سونے کے مارکیٹ نے طے کیا ہے اس سے زیادہ یا کم قیمت میں خرید و فروخت کی جائے تو یہ جائز ہے اس پر ربا الفضل کا اطلاق نہیں ہوگا، کیونکہ سونا چاندی اور روپئے قدر میں متحد نہیں اور جب سود کی علت کے دو وصفوں میں سے ایک وصف فوت ہو جائے تو تبادلہ میں کمی زیادتی جائز ہے۔

۲- زیورات بنانے کی اجرت میں بچا ہوا سونا لینا:

الف- درحقیقت یہ معاملہ صفقۃ فی صفقۃ ہے، کیونکہ اس میں زیور بنانے کے اجارہ کے ساتھ دوسری دھات جس کی آمیزش کی جاتی ہے اس کی بیع بھی ہے، لیکن اجارہ اصالۃ ہے اور بیع تبعا ہے، اس لئے اس کو اجارہ ہی تصور کیا جائے گا، چنانچہ فقہاء کرام نے اپنے زمانہ میں رائج اس قسم کے کئی معاملات کا ذکر کیا ہے، مثلاً صباغ کو کپڑا رنگنے کے لئے اجرت پر دینا، اس میں رنگ کی بیع ہے اور رنگنے کا اجارہ ہے، خیاط کو کپڑا سینے کے لئے دینا، اس میں دھاگے اور اس کے متعلقات کی بیع ہے اور سینے کا اجارہ ہے، سقہ سے پانی منگوانا، اس میں پانی کی بیع ہے اور پانی لانے کا اجارہ ہے، ان سب صورتوں میں صفقۃ فی صفقۃ ہے اور سقہ سے پانی لینے کی صورت میں بیع ما لیس عندہ بھی ہے، فقہاء نے تعامل اور عرف کی وجہ سے ان سب معاملات کو جائز قرار دیا ہے، اور صفقۃ فی صفقۃ والی نص کو عام مخصوص منہ البعض قرار دیا ہے، اور چونکہ یہ سب معاملات اصالۃ اجارہ ہی ہے، اسی لئے فقہاء نے ان کی اصلی حیثیت کا ہی اعتبار کر کے ان کا حکم شرعی بیان کیا ہے اور ان کا ذکر کتاب الاجارۃ میں فرمایا ہے، اور عرف میں بھی ان کو اجارہ ہی سمجھا جاتا ہے، یہ بیع مقصود ہوتی ہے اور نہ ان کو کوئی بیع سمجھتا ہے، جیسا کہ ابن نجیمؒ نے فرمایا۔ (ملاحظہ ہو: البحر الرائق ۸/ ۲۱ کتاب الاجارۃ)۔

عنایہ شرح ہدایہ میں ہے:

"فإن القياس لايجوس استيجار الصباغ لصبغ الثوب لأن الجارة عقد على المنافع لا الأعيان وفيه عقد على العين وهو الصبغ لا الصبغ وحده لكن جوز التعامل جواز الاستصناع" (لعناية مع فتح القدير ۶/ ۸۵)۔

حاصل یہ کہ ہمارے مسئلہ میں سونے کے لین دین میں مقدار کا جو فرق ہو رہا ہے، اس کو بیع نہیں، بلکہ اجارہ تصور کیا جائے گا، اور زیورات بنانے میں دوسری دھات کی جو آمیزش ہوتی ہے، اس کی بیع اس اجارہ میں تبعا ہے اور تابع کو اصل کا درجہ دے کر اس معاملہ کو بیع نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ب- جب یہ صورت اجارہ کی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا اجرت کی یہ شکل درست ہوگی کہ زیورات کے بنانے میں سونے کے جو ذرات بچ جائیں، وہی اجرت قرار پائے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجارہ میں تین خرابیاں ہیں:

۱- یہ معاملہ صفقۃ فی صفقۃ ہے، کما مر، ۲- اجرت جزء عمل سے ہے جو قفیز الطحان کی ممانعت میں داخل ہے، ۳- اگر آمیزش کی جانے والی دھات کی مقدار متعین نہ ہو تو اجرت بھی مجہول ہے، کیونکہ آمیزش کی جانے والی دھات کی کمی بیشی سے سونے کے بچے ہوئے ذرات میں کمی بیشی ہوگی، جسے اجرت ٹھہرایا گیا ہے۔

کتب فقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء نے عرف و تعامل کی وجہ سے "نهى عن صفقة فى صفقة" والی نص عام میں تخصیص کر کے کئی معاملات کو جائز قرار دیا ہے، جن کی مثالیں ماقبل میں گزر چکی ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کپڑے بننے والے کو روئی دے کر، بننے کی اجرت اسی سے طے کرے تو یہ بھی قفیز طحان کی نظیر ہونے کی بنا پر ممنوع ہونا چاہئے، مگر مشائخ بلخ نے ان کے عرف و تعامل کی بنیاد پر اس کو جائز قرار دیا ہے، مگر اس سے نص عام کا ترک نہیں، بلکہ صرف تخصیص ہوئی ہے، علامہ شامیؒ نے "الذخيرة البرهانية" سے نقل کیا ہے:

(مشائخ بلخ جیسے نصیر بن یحیی اور محمد بن مسلمہ وغیرہ کپڑوں میں اس طرح کے اجرت کے معاملہ کو ان کے اہل شہر کے تعامل کی بنا پر جائز قرار دیتے تھے اور تعامل ایسی حجت ہے جس کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا جاتا ہے اور حدیث کی تخصیص کی جاتی ہے اور اس اجرت کے معاملہ کو تعامل کی بنا پر جائز

قرار دینا اس نص کی تخصیص کے معنی میں ہے جو قفیز طحان کے بارے میں وارد ہوئی ہے، اس لئے کہ نص تو قفیز طحان کے بارے میں ہے نہ کہ کپڑا بننے والے کے بارے میں، ہاں کپڑا بننے والا اس کی نظیر ہے، لہذا یہ نص باعتبار دلالت کے اس کے بارے میں وارد ہوئی ہے، پس جب ہم اس نص کی دلالت پر عمل کر کے کپڑا بننے والے کے بارے میں ترک کردیں اور قفیز طحان کے بارے میں اس نص پر عمل کرلیں تو یہ تخصیص ہوئی نہ کہ بالکلیہ اس کا ترک) (رسائل شامی ۲/۱۱۶)۔

پس معلوم ہوا کہ عرف عام وتعامل اس معنی کر معتبر ہے کہ وہ نص عام کی تخصیص کرسکتا ہے اور اجارہ میں اگر اجرت مجہول ہو، لیکن اجرت کی جہالت عرف وتعامل کی وجہ سے باعث نزاع نہ ہو، تو اس کو بھی امام اعظمؒ نے جائز قرار دیا ہے، جیسے دودھ پلانے والی عورت کو کھانے اور کپڑوں کے عوض دودھ پلانے کے لئے اجرت پر رکھنا، علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

''وبطعامها وكسوتها وهذا عند الإمام وقالا لا يجوز وهو القياس... والجهالة لا تفضي إلى المنازعة لأن العادة جرت بالتوسعة عليها شفقة على الأولاد بل يعطيها ما طلبت ويوافقها على مرادها والجهالة انما تمنع اذا افضت الى المنازعة'' (البحر الرائق ۸/ ۲۲)۔

لیکن ہمارے زیر بحث مسئلہ میں اجرت کا مجہول ہونا باعث ہے یا ہوسکتا ہے، حاصل یہ کہ یہ اجارہ دو شرطوں کے ساتھ درست ہے:

۱- اس کا عرف عام اور تعامل ہو۔

۲- آمیزش کی جانے والی دھات کی مقدار متعین ہو، تا کہ اس کے مقابلہ میں سونے کے بچ جانے والے ذرات کی مقدار طے ہو کر اجرت معلوم ہو جائے۔

۳-سونے کے پرانے زیورات کا نئے زیورات سے تبادلہ:

ربا کی حرمت کے بارے میں جو مشہور حدیث ہے اس میں ہے: ''جیدھا وردیھا سواء'' سونا چاندی میں کبھی پیدائشی کھوٹ ملی ہوئی ہوتی ہے جس کو گھٹیا سونا چاندی کہا جاتا ہے اور جس میں کھوٹ ملی ہوئی نہ ہو وہ عمدہ سونا چاندی کہا جاتا ہے، حدیث شریف میں سونے کی سونے کے عوض بیع میں مماثلت کو لازم قرار دیا ہے اور کمی بیشی کو ربا قرار دیا ہے اگر چہ ان میں سے ایک عمدہ اور دوسرا گھٹیا ہو، اسی طرح فقہاء کرام نے کھوٹ ملے ہوئے دنانیر (جس میں کھوٹ کم اور سونا زیادہ ہو) کو خالص سونے کے دنانیر کے حکم میں قرار دیا ہے اور ان کھوٹ ملے ہوئی دنانیر کی خالص دنانیر کے عوض بیع میں مماثلت کو شرط قرار دیا ہے اور کمی بیشی کو ناجائز کہا ہے۔

''ہدایہ'' میں ہے: ''لقوله عليه السلام جيدها ورديها سواء'' (ہدایہ ۳/ ۶۱)، ''وإذا كان الغالب على الدنانير الذهب فهي ذهب ويعتبر فيهما من تحريم التفاضل ما يعتبر في الجياد حتى لا يجوز بيع الخالصة بها ولا بيع بعضها ببعض إلا متساويا في الوزن'' (ہدایہ ۳/ ۹۲)۔

عام طور پر سونے کے تاجر حضرات پرانے زیور کی قیمت کم متعین کرتے ہیں، تو اگر سونے کے پرانے زیور کا سونے کے نئے زیور سے تبادلہ ہو اور اس کمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سونے کا پرانا زیور زیادہ وزن کا لیا جائے اور سونے کا نیا زیور کم وزن میں اس کے بدلہ ادا کیا جائے تو یہ صورت ناجائز اور ربا میں داخل ہے۔

جواز کی یہ صورت سونے کا پرانا زیور قیمت سے خریدا جائے اور سونے کا نیا زیور قیمت سے دیا جائے۔

۴-سونا فروخت کرنے والے ادارہ سے سونا خریدنا:

حقیقت یہ ہے کہ قبضہ کا مصداق نہ کتاب وسنت میں متعین ہے اور نہ فقہاء نے اس کا کوئی قطعی مفہوم مقرر کیا ہے، بلکہ یہ ہر دور کے عرف اور خرید کی ہوئی اشیاء کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوسکتا ہے، البتہ کتب فقہ کے مطالعہ سے اتنی بات تو وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ قبضہ کے تحقق کے لئے تخلیہ حقیقی یا حکمی کا پایا جانا ضروری ہے، علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''ولا يشترط القبض بالبراجم لأن معنى القبض هو التمكن والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة''

(بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۴)

(انگلیوں سے قبضہ شرط نہیں، اس لئے کہ قبضہ کے معنی تمکن وتخلی اور عرف وعادت اور حقیقت کے اعتبار سے موانع کا ختم ہوجانے کے ہیں)۔

اور جس طرح قبضہ میں ہر عہد کے عرف کا اعتبار ہے، اسی طرح ہر شئی کا قبضہ اسی کے لحاظ سے ہوگا، علامہ شامیؒ کے الفاظ میں "یختلف بحسب المبیع" (ردالمحتار ۴/ ۴۸)۔

"أجمعوا علی أن التخلیة فی البیع الجائز تکون قبضا" (فتاوی قاضی خاں ۲/ ۲۷۴)۔

خلاصہ الفتاوی میں ہے کہ اگر مبیع دوری پر بھی واقع ہو پھر بھی تخلیہ قبضہ کے لئے کافی ہوگا۔

"إن بالتخلیة یقع القبض وإن کان المعقود علیه یبعد عنه" (خلاصة الفتاوی ۳/ ۸۹)۔

معاییر شرعیہ نامی کتاب جس کو ستائیس محققین ارباب فتوی نے مرتب کیا ہے اس میں مرقوم ہے:

"یتحقق القبض بحصوله حقیقة أو حکما وتختلف کیفیة قبض الأشیاء بحسب حالها واختلاف الأعراف وبما یکون قبضا لها. إذا أودع فی حساب العمیل مبلغ من المال مباشرة أو بحوالة مصرفیة الی آخرما قال" (معاییر شرعیة / ص ۱۲۲)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کسی کے کھاتے میں رقم کا اس طرح منتقل کردینا کہ وہ اس میں تجارت کرسکتا ہو قبضہ حکم ہے۔

شرح عنایہ میں ہے: "إن الفائدة المطلوبة بالعقد إنما هی التمکن من التصرف وذلك یترتب علی التعیین فلایحتاج الی قبض" (شرح العنایة علی هامش فتح القدیر ۷/ ۱۸)۔

عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل میں مرقوم ہے:

بینک کے رجسٹر میں اندراج اس شخص کے حق میں قبضہ کے حکم کے لئے معتبر ہوگا جو ایک کرنسی کو دوسری کرنسی میں تبدیل کرنا چاہتا ہو، خواہ یہ تبدیلی اس کرنسی میں مطلوب ہو جسے وہ شخص بینک کو دے رہا ہے یا بینک میں جمع کرنسی میں ہو (عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کا شرعی حل/ص ۲۳۲)۔

عطر ہدایہ میں ہے:

پھر اس امر میں کہ قبضہ معتبر کس طور کا قبضہ ہے، فقہاء کے اقوال مختلف ہیں جن سب کا مرجع عرف پر ہے اور ہے بھی یہ بات کہ قبضہ کوئی شرعی ایجاد نہیں جسے لوگ قبضہ سمجھتے آئے وہی شرع میں بھی قبضہ سمجھا گیا ہے، خصوصا اس زمانہ میں اعتبار قبضہ کو وسعت دینے کی سخت ضرورت ہے مثلاً چھکڑے بالوں سے بھرے آتے ہیں اور کھڑے کھڑے کئی کئی بار بک کر آخر کار مال اتارا جاتا ہے تو ہر بار کسی قسم کے نقل وحرکت میں غالبا مصارف اصل کے قریب یا زیادہ بڑھ جائیں گے، پس ضرور ہے ۱- بلٹی، ۲- قول قبضہ سمجھ لیا جائے، مثلاً مال کی بلٹی دستخط کرکے حوالے کردے یا پیچ کر کہہ دیا کہ تم لے لو یہ قبضہ ہے، کیونکہ عرف موجودہ میں یہ تمام امور قبضہ جائز متصور ہوتے ہیں اور ان سے مشتری کو باقاعدہ تصرف کا اختیار ہوجاتا ہے اور ظرف یعنی جہاز، کشتی، چھکڑا وغیرہ اگر ملک بائع ہے یا بائع اس کا کرایہ ادا کرچکا ہے تو مشتری نے گویا ایک وقت تک کے لئے جو صراحۃ یا عرفا یا ضرورۃ مذکور سمجھا جائے مستعار لیا (عطر ہدایہ/ص ۴۸)۔

بدائع الصنائع میں ہے:

"وأما تفسیر التسلیم والقبض فالتسلیم والقبض عندنا هو التخلیة والتخلی وهو أن یخلی البائع بین المبیع وبین المشتری برفع الحائل بینهما علی وجه یتمکن المشتری من التصرف فیجعل البائع مسلما للمبیع والمشتری قابضا له وکذا تسلیم الثمن من المشتری الی البائع" (۵/ ۲۴۴ فی حکم البیع)۔

ردالمحتار میں ہے: "إن التخلیة قبض حکما لو مع القدرة بلا کلفة... وفی نحو بقر فی مرعی فکونه بحیث یری ویشار الیه قبض" (ردالمحتار ۴/ ۵۶۲)۔

وفي الدر المختار: ''والتمكن من القبض كالقبض'' (۵/ ۶۹۰)۔

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ حسی قبضہ ضروری نہیں، بلکہ تخلیہ کافی ہے، تخلیہ کے معنی ہیں کہ مشتری کو اس بات پر قدرت دے دی جائے کہ وہ جب چاہے آ کر مبیع پر قبضہ کر لے جب قبضہ کرنے میں مانع باقی نہ رہے تو سمجھیں گے کہ تخلیہ ہو گیا۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں زیر بحث جزئیات کا جواب اس طرح ہے:

الف-اگر سونا فروخت کرنے والا ادارہ ایک کلو سونا دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے جاتے ہوں، تو اس کو خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ اس صورت میں ہر خریدار کے خریدے ہوئے سونے کی تمیز و تعیین نہیں پائی جاتی ہے، اس لئے تخلیہ متحقق نہیں ہو سکتا جو حکمی قبضہ کے مترادف ہے۔

ب-اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں سونا خریدار کے نام سے درج کر دیا گیا ہو اور اس اندراج کا مقصد یہ ہو کہ خریدار کو اتنی مقدار متعین سونا دیا جا رہا ہے وہ جب چاہے آ کر اس پر قبضہ کر لے اور وہ اس میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے، اب یہ سونا مکمل اس کی ملکیت و اختیار میں ہے، تو یہ اندراج عصر حاضر کے عرف کے اعتبار سے تخلیہ حکمی کے مترادف ہے، لہذا اس کو قبضہ کے لئے کافی تصور کیا جانا چاہئے، فقہاء کرام نے التمکن من القبض کو کالقبض قرار دیا ہے، چراگاہ میں چرنے والی گائے دور سے بائع نے مشتری کو بتا دی تو اس کو بھی قبضہ شمار کیا ہے، نیز عرف عام میں کسی کے کھاتے میں رقم کا منتقل کر دینا قبضہ حکمی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ہمارے مسئلہ میں ریکارڈ رجسٹر میں اندراج کے بعد ادارہ کی طرف سے مشتری کو اس کے خریدے ہوئے سونے میں تصرف کی قدرت دے دی جاتی ہے اور مشتری بھی اپنے آپ کو تصرف کرنے پر قادر سمجھتا ہے اور عرف عام میں بھی اسکو تسلیم و تسلم شمار کیا جاتا ہے۔

۵-ڈیفرنس برابر کرنا سٹہ بازی ہے:

ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی ایک اور صورت جو آجکل رائج ہے، یہ ہے کہ مثلاً ایک مہینہ کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے دس تولے سونے کا سودا کر لیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا، جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ لیا جاتا ہے، خرید کے دن اور ادائیگی کے دن سونے کے نرخوں میں جو فرق ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کر دی جاتی ہے اس صورت میں سونے کا لین دین بالکل مقصود نہیں ہوتا، بلکہ آخر میں جا کر آپس کا فرق (ڈیفرنس) برابر کر لیا جاتا ہے اور سونے پر نہ تو قبضہ ہوتا ہے اور نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے، لہذا جہاں یہ صورت ہو کہ قبضہ بالکل نہ ہو اور سونے کا نہ لینا مقصود ہو اور نہ دینا مقصود ہو، بلکہ اصل مقصد یہ ہو کہ اس طرح سٹہ بازی کر کے آپس کا فرق برابر کر لینا مقصود ہو، تو یہ صورت بالکل حرام ہے اور شریعت میں اس کی اجازت نہیں۔

۶-متوقع اضافہ کی وجہ سے سونے کو روک لینا:

احتکار کے معنی ہیں کسی چیز کی ذخیرہ اندوزی اس نیت سے کرنا کہ میں اس وقت نکالوں گا جب بازار میں اس کی قلت بہت ہو جائے گی اور اس کی وجہ سے لوگوں سے زیادہ قیمت وصول کر سکوں گا، اس کو احتکار اور ذخیرہ اندوزی کہتے ہیں، یہ ذخیرہ اندوزی انسان کی ضرورت کی اشیاء میں بھی ہوتی ہے، اور جانوروں کے کھانے کی اشیاء میں بھی ہوتی ہے، ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ اندوزی کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے، چنانچہ فرمایا: ''المحتکر ملعون''۔

کن اشیاء کا احتکار جائز نہیں؟

کھانے پینے کی اشیاء میں تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان میں احتکار جائز نہیں، لیکن ان کے علاوہ دوسری اشیاء میں احتکار جائز ہے یا

نہیں؟اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک غذائی اجناس کے علاوہ دوسری اشیاء میں احتکار جائز ہے، امام ابویوسف کے نزدیک احتکار ہر ضرورت کی چیز میں ناجائز ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ احتکار کی ممانعت اسی وقت ہے جبکہ ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے عوام کو ضرر پہنچے، عوام کو اس چیز کی ضرورت ہو اور یہ شخص اس کو فروخت کرنے کے لئے نہ نکالے، لیکن اگر اس شخص کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے عوام کو ضرر نہیں پہنچ رہا ہے، بلکہ بازار میں اس چیز کی فراوانی ہے تو اس صورت میں ذخیرہ اندوزی کرنے کی ممانعت نہیں، گناہ اس وقت ہے کہ جب لوگ ضرورت مند ہوں اور یہ شخص گرانی پیدا کرنے کے لئے ذخیرہ اندوزی کر رہا ہو۔

''والاحتكار في كل ما يضر بالعامة في قول أبي يوسف و قال محمد الاحتكار بما يتقوت به الناس والبهائم كذا في الحاوي'' (الفتاوی الهندیه ۳/ ۲۱۴)۔

بہت سی دفعہ سونے کی قیمت میں متوقع اضافہ کا سونے اور چاندی کے تاجروں کو علم ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں وہ سونے کو روک لیتے ہیں، تا کہ قیمت بڑھنے کے بعد سے فروخت کریں، تو یہ صورت احتکار کے دائرہ میں مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر داخل نہیں۔

۱- تاجروں نے قیمت میں متوقع اضافہ کی وجہ سے سونا روکا ہے، گرانی پیدا کرنے کے لئے سونا نہیں روکا ہے، اور نہ سونا روکنے کی وجہ سے قیمت میں اضافہ ہوا ہے، بلکہ وہ تو ہونے والا تھا، یہی وجہ ہے کہ اگر تاجر سونا نہ روکیں تو بھی کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ متوقع اضافہ ہو کر رہتا ہے۔

۲- موجودہ مارکیٹوں کے حالات کے پیش نظر سونے کی قیمت بڑھنے سے اس کی گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر پڑنا بھی یقینی نہیں رہا، کیونکہ بسا اوقات سونے کی قیمت جوں کی توں ہوتی ہے اور دیگر کئی اشیاء کے نرخ آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے، اور کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مارکیٹ میں سونے کی فراوانی ہوتی ہے جتنا سونا خریدنا چاہیں مارکیٹ میں بہ آسانی دستیاب ہوتا ہے، لیکن سونے کی قیمت اور دیگر اشیاء کے نرخ غیر معمولی زیادہ ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ سونے کی قلت یا ذخیرہ اندوزی پر نرخ بڑھنے اور گرانی کا انحصار نہیں، بلکہ اب تو سونے اور اشیاء کی فراوانی کے باوجود مصنوعی گرانیاں پیدا کی جا رہی ہیں، حالانکہ حقیقی احتکار تو اس کو کہتے ہیں کہ لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو اور بازار میں اس کی قلت ہو اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے اس کو فروخت کرنے کے لئے نہ نکالیں، جس کی وجہ سے گرانی پیدا ہو رہی ہو، لہذا مذکورہ صورت احتکار میں داخل نہیں۔

۳- سونے کی مارکیٹ میں ملکی و عالمی پیمانہ پر غیر مسلموں کی اکثریت ہے، بلکہ مارکیٹ ہی ان کے قبضہ میں ہے اور اس مارکیٹ میں مسلم تاجروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور سونے کی تجارت میں ملکی و عالمی پیمانہ پر ذخیرہ اندوزی اور سٹہ بازی عام ہے، ایسے میں اگر اس صورت کو احتکار کے دائرہ میں داخل کر کے مسلم تاجروں کو اس سے روکا جائے تو سوائے مسلم تاجروں کے نقصان کے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا، کیونکہ اکثریت یعنی غیر مسلم تاجروں کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے اشیاء کی گرانی جوں کی توں رہے گی، چند فیصد مسلم تاجروں کے ذخیرہ اندوزی سے باز رہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایسے حالات میں احتکار کے بارے میں طرفینؒ کے قول کو ترجیح دینا مناسب ہے۔

۷- اسمگلنگ کا حکم:

اصل یہ ہے کہ شرعاً ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک روپے سے اپنی ضرورت یا پسند کا جو مال جہاں سے چاہے خرید سکتا ہے، لہذا کسی بیرونی ملک سے مال خریدنا یا وہاں لے جا کر بیچنا شرعاً مباح ہے، بشرطیکہ معاملہ شریعت کے دائرہ میں ہو، بریں بنا از روئے شرع اسمگلنگ کی آمدنی بھی حلال ہے، لیکن چونکہ اس کام میں حکومتی سخت قوانین اور گرفت کی بنا پر بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، ہلاکت جان و مال کا قوی اندیشہ رہتا ہے اور عزت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، اس لئے اس طرح کے کاموں سے احتراز لازم ہے۔

ارشاد ربانی ہے: "ولا تلقوا بأيديكم إلى التهلكة" (سورۂ بقرہ: ۱۹۵)۔

اسمگلنگ کے طریقہ پر آنے والے سونا کا خریدنا اور پھر اس کو فروخت کرنا فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ خریدنے اور فروخت کرنے میں کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، اگر اس میں بھی بے عزتی کا خطرہ ہوتو اس سے بھی احتراز لازم ہے۔

فتاوی رحیمیہ میں ہے:

اگر وہ مال نجس، ممنوع الاستعمال، اور ممنوع البیع نہ ہو اور مالک سے خریدا ہو تو اس کی تجارت فی نفسہ حلال ہے، لیکن چونکہ حکومت کے قانون کے خلاف ہے، اور مجرم سزا کا مستحق اور ذلیل ہوتا ہے، اور اپنے آپ کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے ایسا معاملہ اختیار نہ کیا جائے۔

(فتاوی رحیمیہ ۹/۲۲۲)۔

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

اسمگلنگ کے معاملہ کی حقیقت یہی ہے کہ باہر ممالک سے مال لے کر آنا یا باہر ممالک مال لے کر جانا حلال مال ہو شرعی اعتبار سے جائز ہے، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے، اس پابندی کی خلاف ورزی میں بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، رشوت دینی پڑتی ہے، جان مال یا عزت وآبرو کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، جس کی حفاظت کا شریعت میں بڑا خیال رکھا گیا ہے اور بسا اوقات جسمانی تکلیف اور قید و بند کی صعوبت برداشت کرنی پڑتی ہے، اس لئے حکومت کے قانون کی پابندی کرنی چاہئے اور ایسے کاروبار سے اجتناب کرنا چاہئے، تاہم اسمگل ہو کر آنے والی حلال ومباح چیزوں کی خرید وفروخت جائز ہے اور ان کو اپنے استعمال میں لانا درست ہے اور آمدنی بھی حلال ہے۔

(جدید معاملات کے شرعی احکام ۱/۱۰۵)۔

۸- کیا پلاٹین سونے کے حکم میں ہے؟

پلاٹین لوہے کی ایک قیمتی قسم ہے اور دوسری دھاتوں سے زیادہ سخت ہے جلد پگھلنے والی نہیں ہے، اس کا رنگ سفید چاندی کی طرح چمکدار ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسے سفید سونا بھی کہا جاتا ہے، اب اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے اور اس کے زیورات بنائے جاتے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود لغت، حقائق اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سونا سے الگ ایک قسم کی دھات ہے جو بہت سخت ہوتی ہے اور سونا تو بالکل نرم ہوتا ہے، اسی لئے زیورات بناتے وقت دوسری دھات کی آمیزش کی جاتی ہے، تاکہ کچھ سختی آجائے، لہذا اگرچہ عرف میں اس کو سفید سونا کہا جاتا ہے، لیکن جب تک محقق طور پر اس کا سونا ہونا ثابت نہ ہو جائے تب تک وہ حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوگا، اور عقود، زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق نہیں ہوں گے۔

''وكل شئ فهو عرض سوى الدراهم والدنانير'' (فتح القدير ۲/۲۱۷)۔



سونا چاندی کی تجارت سے متعلق شرعی احکام

مولانا نعمان انور اعظمی، مئو

۱- الف: سونا چاندی اور روپے میں سے ایک ادھار ہو اور دوسرا نقد ہو تو یہ بیع درست ہے؛ لیکن اصطلاح شرع میں اس خرید و فروخت کو بیع صرف نہیں کہا جا سکتا۔

نوٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں علماء کرام کی مختلف رائیں ہیں:

ماضی قریب کے علمائے ہند میں اکثر کی رائے یہ ہے کہ نوٹ خود مال نہیں ہے بلکہ دین کی رسید ہے کسی کو نوٹ دینا دین کا حوالہ ہے اور اس پر کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں مثلاً نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی جب تک ایک فقیر اس سے کوئی چیز نہ خرید لے، نوٹوں سے سونا چاندی کی خریداری درست نہیں ہوگی، اس لئے کہ نوٹ بھی سونے کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا یہ بیع صرف ہوئی، جس نے نوٹ لئے اس نے سونے پر قبضہ نہیں کیا لہٰذا تقابض فی المجلس نہیں ہوا جو بیع صرف کے جواز کی شرط ہے؛ بلکہ اس رائے کے مطابق دو نوٹوں کا آپس میں تبادلہ بھی جائز نہیں اس لئے یہ بیع الدین بالدین ہے (بیع الکالی بالکالی ہے) جو ناجائز ہے، یہ نقطۂ نظر کسی زمانے میں درست تھا، مگر اب بہ چند وجوہ درست نہیں رہا؛ اس لئے کہ اب نوٹ کے پیچھے سونا نہیں ہوتا؛ بلکہ خود انھیں کو ثمن قرار دے دیا گیا ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ج ۷ ص ۳۴-۲۳۳)۔

اکثر علماء عرب کی رائے یہ ہے کہ نوٹ ذھب اور فضہ کے قائم مقام ہیں، جو احکام سونے کے ہیں وہی نوٹوں کے بھی ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ سونا چاندی تو آلۂ تبادلہ نہیں رہے، سونا چاندی کی جگہ اب نوٹوں نے لے لی ہے، لہٰذا زکوٰۃ، بیع صرف اور ربوا وغیرہ تمام مسائل میں نوٹوں کا حکم سونے چاندی والا ہوگا۔

علامہ ساعاتی فرماتے ہیں:

''فالذی أراہ حقا وأدین اللہ علیہ أن حکم الورق المالی کحکم النقدین'' (شرح الفتح الربانی للساعاتی آخر باب زکوٰۃ الذھب والفضۃ ۸/ ۲۵۱)۔

(میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ جس پر میں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں کہ زکوٰۃ کے وجوب اور اس کے ادائیگی کے مسئلے میں ان کاغذی نوٹوں کا حکم بھی بعینہٖ سونے چاندی کے حکم کی طرح ہے)۔

مولانا تقی عثمانی کے نزدیک بہ چند وجوب یہ موقف درست نہیں (فتاویٰ عثمانی ۳/ ۱۴۳)۔

۱- کرنسی نوٹوں کا ثمن ہونا تو اب واضح ہو چکا ہے لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ ان کو ثمن خلقی کہا جائے گا یا ثمن اعتباری اور ثمن عرفی، ظاہر ہے کہ انھیں ثمن خلقی قرار دینے کا کوئی راستہ نہیں، لازماً انھیں ثمن اعتباری یا ثمن عرفی کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان کا حکم فلوس جیسا ہوگا کیونکہ وہ بھی ثمن اعتباری ہے۔

۲- اگر کرنسی نوٹوں کے باہم تبادلے کو بیع صرف کہا جائے تو لازم آئے گا کہ جن اشیاء میں صرف جاری ہوتا ہے ان میں ایک چیز کا اضافہ ہو گیا، حالانکہ یہ نصوص کے خلاف ہے۔

۳- اگر ان میں صرف جاری کیا جائے اور ساتھ ہی سونے چاندی میں بھی صرف کو بدستور جاری سمجھا جائے تو سوال یہ ہے کہ کرنسی نوٹ سے سونا چاندی خریدنے کو صرف کہا جائے گا یا نہیں؟ اگر کہا جائے گا تو عجیب بات یہ ہے کہ غالب الغش سکوں سے سونے یا چاندی کے تبادلے کو کلی طور

پر صرف کہا جائے جب کہ غالب الغش سکوں میں کچھ نہ کچھ سونا یا چاندی ہوتا ہے اور صرف انھیں کی حد تک ان میں تقابض شرط ہے، زیادہ میں نہیں اور کرنسی نوٹوں کے تبادلے کو صرف کہا جائے جب کہ ان میں سونا چاندی بالکل موجود نہیں ہے (الدر المختار ۵/۱۷۹، تکملہ فتح الملہم ۱/۵۸۷)۔

صحیح نقطہ نظر یہ ہے کہ نوٹ رسید نہیں ہے بلکہ خود مال ہے، سونے چاندی کی طرح ثمن حقیقی نہیں بلکہ ثمن عرفی ہے، ان کا حکم وہی ہوگا جو فلوس کا ہوتا ہے لہٰذا اگر نوٹ کے ذریعہ سونا خریدا جائے تو یہ بیع صرف نہیں اس لئے تقابض فی المجلس ضروری نہیں، البتہ بدلین میں سے ایک پر قبضہ مجلس میں ضروری ہے تاکہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے لہٰذا یہ بات درست ہوگی کہ سونا چاندی اور روپئے میں سے ایک نقد اور دوسرا ادھا۔

اس دور کے اکثر علماء کی یہی رائے ہے کہ روپئے سے سونا اور چاندی ادھا خریدا جاسکتا ہے بشرطیکہ ایک نقد اور دوسرا ادھار ہو۔

(ب): جدید سائنسی ایجادات نے پوری دنیا میں انقلاب برپا کردیا ہے اور پوری دنیا کو ایک گاؤں کی شکل میں تبدیل کردیا ہے۔ مشرق و مغرب ہر وقت باہم رابطے میں رہتے ہیں اور پل پل کی خبریں پوری دنیا بیک وقت موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعہ معلوم کرتی ہے جس کے نتیجے میں ایک جگہ سے حالات کا دوسری جگہ پر پڑنا لازمی ہے۔ اور پوری دنیا تجارتی منڈی کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہے، تمام ملکوں کی منڈیاں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، انٹرنیشنل مارکیٹ میں اشیاء کا جو نرخ ہوتا ہے وہ چھوٹے شہروں اور دیہاتوں تک اسی وقت تک پہنچ جاتا ہے، اس کے باوجود پوری دنیا میں کسی سامان کا نرخ ایک ہی رہے یہ ناممکن ہے۔

شریعت بھی بیچنے اور خریدنے والے کو اس کا مکلف نہیں بناتی، خود ہمارے ملک میں سونے چاندی کا بھاؤ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مختلف رہتا ہے، روزانہ اخباروں میں جو نرخ شائع ہوتا ہے اس میں ہر شہر کا بھاؤ الگ ہوتا ہے، اسی طرح ہندوستان کے دوسرے چھوٹے بڑے شہروں کی مختلف بازاروں کے نرخ میں قدرے اختلاف رہتا ہے۔

لہٰذا انٹرنیشنل مارکیٹ ہو یا ہندوستان کے سطح کی مارکیٹ، ان بازاروں میں جو بھاؤ طے کئے گئے ہیں ان سے اختلاف کرنے میں کوئی حرج نہیں، اور اسے ربوا تفاضل قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ شریعت میں بیع کی تعریف ہے "مبادلۃ المال بالمال بالتراضی" یعنی مال کا مال سے رضامندی کے ساتھ تبادلہ کرنا، لہٰذا بائع اور مشتری جب ایک بھاؤ پر آپس میں رضامند ہیں تو بیع بالکل درست ہوگی خواہ ان کے درمیان طے شدہ نرخ انٹرنیشنل مارکیٹ یا MCL کے بھاؤ سے کم وبیش ہو۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق وإني لأرجوا أن ألقى الله تعالى وليس أحد منكم يطالبني بمظلمة من دم ولا مال وصحح الترمذي وابن حبان"

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ ہی تعالیٰ بھاؤ طے کرنے والا ہے اور رزق میں تنگی اور فراخی دینے والا ہے، میں امید کرتا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ تم میں سے کوئی شخص مجھ سے خون یا مال کے سلسلے میں ظلم وزیادتی کا مطالبہ نہ کرے)۔

اس لئے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چیزوں کا بھاؤ متعین کرنا شریعت کے مزاج کے خلاف ہے، اور لوگ اپنے سامانوں کے مالک ہیں اور انھیں اپنے مملوکہ اشیاء میں بھاؤ طے کرنے کا اختیار ہے، شریعت اس میں کوئی دخل اندازی نہیں دیتی۔

اس لئے انٹرنیشنل مارکیٹ یا اندرون ملک کسی بھی سامان کا بھاؤ متعین کرنا خلاف شرع ہے، کسی مارکیٹ کے متعین کئے ہوئے بھاؤ کو ایسی حیثیت حاصل نہیں ہے کہ بائع اور مشتری کو اس کا پابند بنایا جائے بہت مجبوری کے حالات میں عوام کو ظلم وزیادتی سے بچانے کے لئے تسعیر کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ ہدایہ اور فقہ کی دوسری کتابوں میں اس کی صراحت ہے، عام حالات میں تسعیر فقہاء کے یہاں مکروہ ہے۔

"ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس" (حاشیہ ہدایہ ۴/۴۵۵) (بادشاہ کے لئے لوگوں پر بھاؤ طے کرنا مناسب نہیں)۔

اسلام آزادانہ تجارت کا قائل ہے اور مشتری اور بائع کی آپسی رضامندی کے ساتھ خرید وفروخت کی تعلیم دیتا ہے۔

۲- الف: سونے کے لین دین میں مقدار کا جو فرق ہو رہا ہے اسے بیع نہیں کہا جاسکتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بیع صرف میں سونے کا لین دین

سونے سے ہوتا ہے جس کے اندر کمی زیادتی کے فرق کے ساتھ بیع ناجائز ہے اور مثلا بمثل یدا بید کی شرط مختلف احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''عن عبادة بن الصامت قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسوا يدا بيد عن عمرو عن أبي المنهال قال: باع شريك لي ورقا بنسيئة إلى الموسم أو الحج فجاء إلى فأخبرني فقلت هذا أمر لا يصلح قال قد بعته في السوق فلم ينكر ذلك على أحد فأتيت البراء بن عازب فقال قدم النبي ﷺ المدينة ونحن نبيع هذا البيع فقال ماكان يدا بيد فلا باس به وماكان نسيئة فهو ربوا''۔

دوسری حدیث میں زید بن ارقم اور براء ابن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

''نهى رسول الله ﷺ عن بيع الورق بالذهب دينا'' (صحیح مسلم ۲/ ۲۵، بخاری شریف ۱/ ۲۹۱)۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں یہ حدیث مروی ہے۔ اس لئے سونے کے تاجر اور زیور بنانے والے کاریگر کے درمیان جس معاملے کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے اس کو بیع بنانا جائز اور درست نہیں ہوسکتا۔

دوسرے یہ کہ سونے کا تاجر اپنا مال دے کر زیور کی شکل میں واپس لے رہا ہے اس صورت میں سونا دینے والے تاجر ہی کو بائع اور مشتری دونوں ماننا لازم آئے گا۔

تیسرے یہ کہ بیع اپنی ملک کی ہوتی ہے اگر اس کو بیع مانا جائے تو زیور بنانے والے کاریگر کو زیور کا مالک ماننا ہوگا اور پھر اسے اس بات کا پابند نہیں بنایا جاسکتا کہ اسی تاجر کے ہاتھ بیچے، مالک ہونے کی صورت میں کسی اور کے ساتھ بھی بیع کرنے کا اس کو اختیار ہوگا، حالانکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا یہ معاملہ بیع کے بجائے اجارہ ہے۔

(ب): عقد اجارہ کے صحیح ہونے کے لئے فقہاء کے یہاں مختلف شرائط ہیں، انھیں میں ایک اجرت کا متعین ہونا ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من استاجر أجيرا فليعلمه أجره۔ قال المحشي رواه محمد بن الحسن في كتاب الآثار'' (ہدایہ ۳/ ۲۷۷، کتاب الاجارہ)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مزدور کو اجرت پر رکھے تو چاہئے کہ اس کو اس کی اجرت بتادے)۔

ہدایہ میں مذکور ہے: ''ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة'' (ہدایہ ۳/ ۲۷۷، کتاب الاجارہ)۔

(اور عقد اجارہ صحیح نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ منافع معلوم ہوں اور اجرت معلوم ہو)۔

صاحب ہدایہ نے اس کی ایک دلیل یہ ذکر کی ہے کہ معقود علیہ کی جہالت اور اس کے بدل یعنی اجرت کی جہالت مفضی الی النزاع ہے جس طرح عقد بیع کے اندر ثمن اور مبیع کی جہالت کی وجہ سے بیع فاسد ہوجاتی ہے، اسی طرح عقد اجارہ میں اجرت کی جہالت کی وجہ سے عقد اجارہ فاسد ہوجائے گا۔

ہدایہ میں مذکور ہے: ''ولأن الإجارة في المعقود عليه في البدله تفضي إلى المنازعة كجهالة الثمن'' (حوالہ مذکورہ)

(اور اس لئے کہ معقود علیہ اور اس کے بدل میں جہالت مفضی الی المنازعہ ہے جیسے کہ عقد بیع میں ثمن کی جہالت)۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کے یہاں عقد اجارہ کے صحیح ہونے کے لئے اجرت کی تعیین ضروری ہے۔ مسئلہ مذکورہ میں سونے کے بچے ہوئے ذرات کو اجرت قرار دینا ایک غیر متعین چیز ہے، زیور بنانے والے کاریگر دوسری دھاتوں کی آمیزش کرنے کے بعد سونے کے ذرات کو زیادہ مقدار میں بچا کر موقع کا ناجائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ظاہر ہے ایسا کرنا چوری اور خیانت کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہوگا، اس لئے زیورات بنانے کی مزدوری الگ سے طے ہونا ضروری ہے، جس دھات کی آمیزش اس میں ہو رہی ہے تاجر کی طرف سے اس دھات کو فراہم کرنا یا اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے۔ سونے کے بچے ہوئے ذرات کا مالک تاجر ہی ہے، اور اس میں تصرف کرنے کا حقدار ہے۔

۳- سونے کی خرید وفروخت جب اسی کی جنس سے کیا جائے ایسی صورت میں کمی زیادتی کے ساتھ خریدنا اور بیچنا جائز اور درست نہیں ہے:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''الذهب بالذهب مثلا بمثل وزنًا بوزنٍ والفضل ربو''۔

سونا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں وزن سے بکتا تھا اور آج بھی وزن ہی سے بکتا ہے، پس سونے کی خرید وفروخت کرنا سونے کے ساتھ اس صورت میں ربوا تفاضل اور ربوا نسیہ ناجائز ہے، اگر چہ ایک طرف جید مال ہو اور دوسری طرف ردی مال ہو۔

''جيدها ورديها سواء'' (نصب الرايه ۴/ ۳۷، درايه على حاشية الهداية ۳/ ۸۸)۔

اس مفہوم کی احادیث صحاح ستہ میں متعدد جگہ موجود ہیں (صحیح مسلم ۲، کتاب البیوع۔ سنن ترمذی باب ماجاء فی الصرف ۱/ ۱۴۹)۔

لہٰذا براہ راست سونے کے پرانے زیورات کو نئے زیورات سے کمی بیشی کے ساتھ خریدنا اور بیچنا جائز نہیں، کیونکہ مذکورہ حدیث میں اموال ربویہ کو کمی بیشی کے ساتھ بیچنے سے منع فرمایا ہے، چاہے ایک طرف جید مال ہو اور دوسری طرف ردی مال ہو۔

اموال ربویہ میں اچھا اور خراب بیع کے معاملہ میں یکساں مانا جاتا ہے اس کی بہت واضح دلیل بخاری شریف کی یہ روایت ہے جو ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنایا وہ آپ کے پاس جنیب کھجور لایا اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں تو اس نے کہا نہیں اللہ کی قسم ہم دو صاع کھجوریں دے کر ایک صاع کھجور لیتے ہیں یا تین صاع کھجور کے بدلے دو صاع لیتے ہیں، تو آپ ﷺ نے کہا ایسا نہ کرو، اور ارشاد فرمایا کہ اپنی کھجوروں کو پہلے دراہم کے ذریعہ بیچو اور پھر دراہم سے جنیب کھجور خریدو اللہ کے رسول ﷺ نے کھجوروں کے تبادلہ میں کمی بیشی کو منع کیا اور سود کا دروازہ بند کرنے کے لئے آپ نے جائز اور حلال طریقے پر رہنمائی فرمائی ہے (بخاری شریف ۲/ ۶۰۹)۔

۴- الف: فتاویٰ ہندیہ ۳/ ۱۶ پر مذکور ہے کہ مبیع کو تسلیم کرنے میں اس بات کا اعتبار ہے کہ اس کو الگ کر دیا جائے دوسرے کا حق اس میں شامل نہ ہو اور فقہاء نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ جائز بیع میں یہی تخلیہ قبضہ ہوتا ہے۔

''ويعتبر في السلم أن يكون المبيع مفرزًا غير مشغول بحق غيره هكذا في الوجيز لكردري، وأجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضًا.

بدائع ۵/ ۲۴۴ پر مذکور ہے: ''فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشتري قابضا له''۔

یعنی تسلیم اور قبضہ کی حقیقت ہمارے نزدیک تخلیہ اور تخلی ہے اور اس کی شکل یہ ہے کہ بائع مشتری اور مبیع کے درمیان ہر طرح کی رکاوٹ کو دور کر دے اور مشتری مبیع کے اندر تصرف کرنے پر قادر ہو جس کا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہوگا کہ بائع مشتری کو مبیع حوالہ کرے اور اس پر قابض بنائے۔

سوال میں جو صورت حال بیان کی گئی ہے اس میں مشتری کا قبضہ ثابت نہیں ہوگا، اس لئے کہ مشتری کا خریدا ہوا پچاس گرام سونا اینٹ میں شامل ہے اس کو مجموعہ سے الگ نہیں کیا گیا ہے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ بائع اگر فوری طور پر اس پر قبضہ کرنا چاہے تو قبضہ کر سکے یا اس میں کوئی تصرف کرنا چاہے تو تصرف کر سکے۔

بدائع میں آگے یہ بھی تحریر ہے کہ دراہم و دنانیر عقد سے متعین نہیں ہوتے بلکہ قبضہ سے متعین ہوتے ہیں سونا بھی دراہم و دنانیر کی قبیل سے ہے۔ فتح القدیر سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

محیط برہانی میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ دراہم اور دنانیر عقد معاوضات میں قبضہ کے وقت متعین ہوتے ہیں۔ لہٰذا متعاقدین کے درمیان عقد اسی وقت مفید ملک ہوگا جب قبضہ کے ذریعہ اس کی تعیین ہو جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فقہاء کی عبارتیں اس بارے میں بہت واضح ہیں کہ سوال میں پوچھی ہوئی صورت حال میں پچاس گرام سونے کو اینٹ سے الگ کئے جانے سے پہلے خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا۔

(ب): دراہم ودینار اور دوسری اجناس کی تعیین میں یہ فرق ہے کہ دوسری اجناس اشارے یا علامتوں سے متعین ہوسکتی ہیں لیکن دراہم ودینار اس وقت متعین نہیں ہوسکتے جب تک اس پر کوئی شخص خود یا اپنے کسی نمائندے کے ذریعہ قبضہ نہ کرے۔ مذکورہ صورت میں صرف کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں خریدار کے نام سے پچاس گرام سونا یا خریدی ہوئی مقدار کا سکہ درج کیا گیا ہے اسی اندراج کو قبضہ کے لئے کافی تصور نہیں کیا جائے گا۔

بدائع ۵/ ۲۱۸ پر مذکور ہے: ''إن الدراهم والدنانير وإن كانت لاتتعين بالعقد ولكنها تتعين بالقبض وقبضها واجب''

اسی کے آگے ص ۲۱۹ پر مذکور ہے: ''إن الدراهم والدنانير لاتتعين بالتعيين وإنما تتعين بالقبض فشرطنا التقابض للتعيين لا للقبض'' (بدائع ۵/ ۲۱۸، ۱۹ طبع سعید)۔

دونوں عبارتوں سے اس بات کی پورے طور پر وضاحت ہوتی ہے کہ محض بسکٹ الگ ہونے سے یا خریدار کے نام کا اندراج کردینے سے سونے پر قبضہ متحقق نہیں ہوگا، کیونکہ اتنے سے دراہم ودنانیر متعین نہیں ہوتے، تعیین کے لئے خریدار یا اس کے نائب کا قبضہ ضروری ہے بدائع کی دوسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ دراہم ودنانیر میں تقابض کی شرط دراصل تعیین کے لئے ہے۔

فتح القدیر ۶/ ۱۶۰ پر مذکور ہے: ''فإن الدراهم والدنانير لاتتعين مملوكة بالعقد إلا بالقبض'' (طبع رشیدیہ کوئٹہ)

محیط برہانی میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ دراہم ودنانیر عقد معاوضات میں قبضہ کے وقت متعین ہوتے ہیں۔ لہٰذا متعاقدین کے درمیان عقد اسی وقت مفید ملک ہوگا جب قبضہ کے ذریعہ اس کی تعیین ہوجائے۔

۵- ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی جس صورت کا سوال میں تذکرہ کیا گیا ہے بیع کی یہ شکل متعدد وجوہ سے ناجائز ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں ثمن اور مبیع دونوں ادھار ہیں، مشتری نے دس تولہ سونے کا ادھار سودا کرلیا اور اس پر قبضہ نہیں کیا، ادائیگی کی تاریخ آنے پر صرف قیمت کے تفاوت کا لین دین کرلیا اگر سونے کا بھاؤ پانچ ہزار ایک سو روپے تولہ ہوگیا تو بائع خریدار کو ایک سو روپیہ فی تولہ دے دیتا ہے اور اگر اس دن چار ہزار نوسو روپے بھاؤ ہوگیا تو خریدار بائع کو ایک سو روپے فی تولہ ادا کردیتا ہے، ناجائز ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہاں ثمن اور مبیع دونوں ادھار ہیں اور یہ حدیث شریف کی رو سے جائز نہیں ہے جیسا کہ حاکم اور بیہقی رحمہما اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

''نهى رسول الله ﷺ من بيع الكالي بالكالي'' (السراج المنير للعزيزى ۴/ ۳۷۲)۔

(حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادھار کو ادھار کے بدلہ بیچنے سے منع کیا ہے)۔

مولانا تقی عثمانی اپنے مقالہ (مستقبل کی تاریخ پر خرید وفروخت) میں تحریر فرماتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ فیوچر مارکیٹ میں جو معاملات ہوتے ہیں ان سے تجارت مقصود نہیں ہوتی بلکہ نفع کی امید پر اپنا روپیہ داؤ پر لگانا مقصود ہوتا ہے اور یہ مقصد اس عقد کو بیع کے بجائے قمار (جوا) سے زیادہ مشابہ کردیتا ہے'' (فقہی مقالات ۲/ ۲۱۳)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب کی یہ بات حقیقت پر مبنی ہے اس لئے کہ اگر تجارت مقصود ہوتی تو مشتری سامان پر قبضہ کرتا اور وقت پر اس کی قیمت ادا کرتا یا بائع وقت پورا ہونے پر کہتا اپنا سامان لے جاؤ ہمارا پیسہ ادا کرو۔ لیکن دونوں طرف سے مبیع اور ثمن کے لین دین کا تقاضہ نہیں ہوتا صرف خرید اور ادائیگی کے دن کی قیمت کے تفاوت پر دونوں کی توجہ مرکوز ہوتی ہے۔

اس طرح کی فرضی خرید وفروخت کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ چیزوں کا دام چڑھتا ہے اور بازار میں گرانی پیدا ہوتی ہے اور اس کا ضرر عوام الناس کو اٹھانا پڑتا ہے۔

۶- امام ابوحنیفہ کے نزدیک احتکار آدمی اور جانوروں کی غذاؤں میں مکروہ ہے بشرطیکہ احتکار کا عمل ایسے شہر میں کیا جائے جہاں احتکار کی وجہ سے شہر والوں کو ضرر لاحق ہو۔ امام ابویوسف کے نزدیک احتکار غذاؤں کے ساتھ خاص نہیں ہے، ہر وہ چیز جس کا روکنا عامۃ الناس کے لئے ضرر کا باعث ہو وہ احتکار ہے چاہے وہ سونا چاندی ہو یا کپڑا ہو۔ امام محمدؒ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ کپڑوں میں احتکار نہیں ہے ائمہ ثلاثہ کی ان آراء کو سامنے رکھئے تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک جو چیز کراہت میں موثر ہے وہ حقیقت ضرر ہے اس لئے انھوں نے احتکار کو

غذاؤں کے ساتھ مخصوص نہیں کیا۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ضرر معہود معتبر ہے اور اس کا تعلق کھانے پینے کے سامانوں سے ہے۔
(دیکھئے: ہدایہ، کتاب الکراہیۃ ۴/ ۴۵۳)۔

الموسوعۃ الفقہیہ میں شوافع اور حنابلہ کا قول وہی نقل کیا گیا ہے جو امام ابوحنیفہ کا ہے لا إحتكار إلا في القوت خاصة اور الموسوعة الفقهية سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالکیہ کے نزدیک بھی ان تمام چیزوں میں احتکار مکروہ ہے جس سے عام لوگوں کو ضرر لاحق ہو احتکار صرف غذا کے ساتھ خاص نہیں ہے گویا مالکیہ کا قول امام ابویوسف کے قریب ہے (الموسوعۃ الفقہیۃ ۲/ ۹۲)۔

حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''الجالب مرزوق والمحتكر ملعون. ابن ماجه، حاكم، دارمي'' (الدرايه على حاشية الهداية ۴/ ۴۵۴)۔

حدیث کے الفاظ اشیاء ضروریہ میں احتکار کی ممانعت پر دلالت کرتے ہیں آج کے دور میں تاجروں کا ایک طبقہ غلہ کے علاوہ مختلف چیزوں میں ذخیرہ اندوزی کر کے عام انسانوں کا استحصال کرتا ہے، ذخیرہ اندوزی پیاز کی کرتے ہیں، کبھی دال کی اور کبھی گھی تیل کی، اس لئے سرکار نے دوکانداروں کے لئے اسٹاک کی ایک حد متعین کردی ہے، سارے دوکانداروں کو علی العموم اور مسلمان دوکانداروں کو بالخصوص اس حد کا لحاظ کرنا چاہئے۔ صاحب ہدایہ نے احتکار کی بحث میں حدیث کی مذکورہ لعنت سے بچنے کے لئے یہ کہا ہے: والحاصل ان التجارة فى الطعام غير محمودة۔ یعنی شریعت کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اور حدیث کی بد دعا سے بچنے کے لئے آدمی کو چاہئے کہ وہ غلہ کی تجارت نہ کرے، غلوں کی تجارت ناپسندیدہ ہے لیکن ہندوستان جیسے ملک میں ہم مسلمان تاجروں کو غلہ کی تجارت کرنے سے نہیں روک سکتے ہیں، اس لئے کہ فساد زدہ علاقوں میں اگر مسلمانوں کے پاس غلہ کی دوکانیں نہ ہوں تو غیر دوکانداروں کے لئے مسلمانوں کو ستانے کا ایک بڑا موقع ہاتھ آجائے گا بہرحال ذخیرہ اندوزی آج کے اس دور میں غلوں کے ساتھ ساتھ تمام اشیاء ضروریہ سے متعلق ہے یہاں تک کہ اس کا گہرا تعلق دواؤں سے بھی ہے۔ اس لئے اگر سونے چاندی کی ذخیرہ اندوزی اس حد تک ہونے لگے کہ اس کا اثر دوسری اشیاء کی گرانی پر پڑے تو لوگوں کو اس سے روکا جائے گا ابھی نوٹ بندی کے زمانہ میں سرکار نے سب کے لئے سونا رکھنے کی ایک حد متعین کردی ہے اس حد کی رعایت کرنا اور اس مقدار کے اندر سونا رکھنا احتکار کے دائرے کے باہر ہے۔ اور اگر سونے کی اس سے زیادہ مقدار ملکی معیشت کے لئے ضرر رساں ہو اور دوسری چیزوں کو متاثر کررہی ہو تو یقیناً یہ فعل ناپسندیدہ ہوگا۔

۷- بیع کے صحیح ہونے کے لئے عاقد اور محل بیع یعنی مبیع کے اندر بیع کے قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہونا لازمی ہے۔

آدمی اپنے مملوک روپیوں سے جہاں سے چاہے اپنی پسند کی چیزیں خرید سکتا ہے، لہٰذا کسی بیرونی ملک سے خریدنا اور وہاں مال لے جاکر بیچنا شرعاً مباح ہے۔

''لا يمنع احدا من التصرف فى ملكه أبدا إلا إذا كان ضرره لغيره'' (وفي الشرح المجلى للاتاسى رقم الماده: ۱۱۹۲، ۲/ ۱۳۲، شرح رد المحتار ۵/ ۴۴۸، طبع سعيد، بدايه ۴/ ۴۷۲، بدائع الصنائع للكاسانى ۵/ ۱۲۹)۔

آج دنیا کے حالات پچھلے زمانہ سے مختلف ہیں، پہلے ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لئے ویزا یا پاسپورٹ کی پابندیاں نہیں تھیں، بیسویں صدی میں دنیا کے حالات دھیرے دھیرے بدلتے گئے اور تقریباً ہر ملک نے اس طرح کی پابندیاں عائد کردی، اسی طرح سے پچھلے زمانہ میں ساری دنیا میں تاجروں کے لئے اپنا مال دوسرے ملک میں لے جاکر بیچنے کی اور وہاں سے مال خریدنے کی کھلی چھوٹ تھی، پوری دنیا تاجروں اور سوداگروں کے لئے ایک آزاد منڈی تھی، لیکن بیسویں صدی میں دنیا کے معاشی حالات بدل گئے اور خرید وفروخت میں طرح طرح کی پابندیاں لاگو کردی گئیں۔ آج بھی بعض ملکوں میں آزاد منڈی ہے اور باہر سے جانے والے تاجروں اور بیرون ملک سے درآمد کئے جانے والے مال پر کوئی محصول نہیں ہے، بعض عرب ملکوں میں اب بھی یہ سہولت موجود ہے لیکن اکثر ملکوں میں ایکسپورٹ اور امپورٹ پر طرح طرح پابندیاں ہیں اور ان کا الگ قانون ہے ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کے قوانین کے پابند ہیں خاص طور پر وہ قانون جو شریعت سے متصادم نہیں ہیں اس کی رعایت کرنا ہمارے لئے ضروری ہے اس لئے باہر سے سونا یا دوسرے سامان لانے کا جو قانون ہمارے ملک میں جاری ہے ہمیں اس کا پابند رہنا چاہئے اس کی خلاف ورزی کرنے میں بہت سے منکرات لازم آتے ہیں جن سے ہمیں منع کیا گیا ہے مثلاً اسمگلنگ کے ذریعہ مال لانے میں جھوٹ بولنا پڑتا ہے،

جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے اور ملک کے جن قوانین کی پابندی کا ہم نے وعدہ کیا ہے ان کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہوتا ہے شریعت میں عہد و پیمان کی رعایت کا حکم بہت تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے ان منکرات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس عمل سے اجتناب کریں ورنہ اصولی طور پر باہر کے ملک سے مال لانا اور یہاں سے لے جا کر دوسرے ملک میں بیچنا شرعی اعتبار سے بالکل جائز ہے لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں بہت سارے مفاسد پائے جاتے ہیں اس لئے علماء کرام اس سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں۔

مولانا تقی عثمانی صاحب نے فتاویٰ عثمانی جلد سوم اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے جدید فقہی مسائل میں اس مسئلے سے مدلل بحث کی ہے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں کہ اسمگلنگ کرنے والا پوری قوم اور باشندگان ملک کو اپنی حرکت کے ذریعہ نقصان پہنچاتا اور زیر بار کرتا ہے جو غیر اسلامی ہونے کے علاوہ غیر انسانی حرکت بھی ہے۔ معاشی مصالح کے پیش نظر اس قسم کی پابندیوں کی گنجائش ہے، اس کی نظیر تلقی جلب ہے جس کو مکروہ قرار دیا گیا ہے تلقی جلب سے مراد یہ ہے کہ باہر سے آنے والے تجارتی قافلے کے شہر میں آنے سے پہلے ہی کوئی شخص جا کر ان سے غلہ خرید لے اور شہر میں آ کر اس سے زیادہ میں فروخت کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے گرانی بڑھتی ہے اور شہر کے باشندوں کو زک پہنچتی ہے، یہی صورت اسمگلنگ سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ غیر ملکی مصنوعات کی آمد کی وجہ سے اس ملک کی صنعت اور یہاں کا معاشی توازن بگڑتا اور متاثر ہوتا ہے (جدید فقہی مسائل ۱/ ۲۴۹)۔

۸- سونا چاندی ثمن خلقی ہیں اور ان کو پیدائشی طور پر نامی تسلیم کیا گیا ہے، ہیرے جواہرات جو سونے چاندی سے زیادہ قیمتی ہیں انہیں استعمال کرنے میں اور مسئلہ زکوٰۃ میں سونے چاندی کے حکم میں نہیں رکھا گیا ہے۔ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال شریعت میں جائز نہیں ہے، جبکہ قیمتی پتھروں کے برتن کے استعمال کی اجازت ہے۔ ہدایہ میں مذکور ہے:

''ولا بأس بإستعمال آنية الرصاص والزجاج والبلور والعقيق'' (هدايه ۴/ ۴۴۴، فتاوى تاتارخانيه ۱۸/ ۱۲۵، مجموعة الفتاوىٰ الشرعية كويت ۲/ ۲۶۵)۔

(اور کوئی حرج نہیں رصاص، شیشہ، بلور اور عقیق کے برتنوں کے استعمال میں) اسی طرح سے مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں ہے لیکن انگوٹھی میں ہیرے کا اور قیمتی پتھر کا استعمال بطور نگ کے جائز ہے حالانکہ بہت سے پتھر سونے سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

''والتختم بالذهب على الرجال حرام والحلقة هي المعتبرة لأن قوام الخاتم بها فلا معتبر بالفص حتى يجوز أن يكون من حجر''۔

(مردوں کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے اور انگوٹھی کے باب میں حلقہ کا اعتبار ہے، اس لئے کہ انگوٹھی کا وجود حلقے ہی سے ہے اور نگ کا اعتبار نہیں ہے وہ پتھر کا بھی ہو سکتا ہے)۔

لہٰذا صرف عرف کو دیکھتے ہوئے پلاٹین پر سونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا اور عقود اور زکوٰۃ کے باب میں اس پر سونے کے احکام منطبق نہیں ہوں گے آج کے زمانہ میں زمین اور فلیٹ وغیرہ غیر معمولی قیمتوں پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی پانچویں فقہی سمینار میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جو ہیرے جواہرات زیورات کے لئے خریدے گئے ہوں ان کی زکوٰۃ مالک پر واجب نہیں البتہ جو ہیرے جواہرات تجارت کی نیت سے خریدے گئے ہوں ان کی زکوٰۃ مالک پر واجب ہوگی، یہی حکم پلاٹین کا بھی ہوگا اب اگر کوئی شخص زکوٰۃ سے فرار کے لئے بڑی رقم پلاٹین میں پھنساتا ہے تو وہ اپنی نیت کے حساب سے عنداللہ جواب دہ ہوگا۔

مولانا تقی عثمانی فقہی مقالات میں لکھتے ہیں: ''اموال زکوٰۃ کون کون سے ہیں'' ......

استعمالی زیور پر بھی زکوٰۃ واجب ہے البتہ صرف سونے اور چاندی کے زیور پر زکوٰۃ واجب ہے، لیکن اگر سونے اور چاندی کے علاوہ کسی اور دھات کا زیور ہے چاہے پلاٹینم ہی کیوں نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں جب کہ تجارت کے لئے نہ ہو بلکہ ذاتی استعمال کے لئے ہو (فقہی مقالات ۲/ ۱۴۸)۔

☆☆☆

سونے چاندی کی تجارت - فقہی نقطۂ نظر

مفتی عمر امین الہی[1]

سوالوں کے جوابات عرض کرنے سے پہلے چند چیزیں بطور تمہید ذکر کی جاتی ہیں:

بیع صرف کسے کہتے ہیں:

صرف کے لغوی معنی: زیادتی اور اضافہ کے ہیں، نیز کسی چیز کو پھیرنے یا تبدیل کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

(دیکھئے: لسان العرب ۳/۲۴۳۵، المصباح المنیر، المعجم الوسیط ۱/۵۱۳، بحوالہ حاشیہ شامی ۷/۵۲۰)۔

چونکہ لوگوں کو سونے چاندی میں رغبت اسی لیے ہوتی ہے کہ اس سے مال میں زیادتی و اضافہ ہوتا ہے، اس لیے اس معاملہ کو صرف کہا جاتا ہے۔ (الکفایۃ مع الفتح ۷/۳۶)۔

یا بیع صرف میں متعاقدین اثمان کو تبدیل کرتے ہیں، اس لیے اسے بیع صرف کہا جاتا ہے (المقدمات الممہدات ۴/۱۳۵)۔

صرف کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

''الصرف هو البيع إذا كان واحد من عوضيه من جنس الأثمان'' (ہدایہ ۳/۱۰۴)۔

(صرف وہ بیع ہے جس میں عوضین (ثمن ومبیع) میں سے ہر ایک اثمان کی جنس سے ہوں)۔

اس کی شرح میں علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

''وإنما قال من الأثمان ولم يقتصر على قوله بيع ثمن بثمن ليدخل بيع المصوغ بالمصوغ أو بالنقد فإن المصوغ بسبب ما اتصل من الصنعة به لم يبق ثمنا صريحا ولهذا يتعين في العقد و مع ذلك بيعه صرف'' (فتح القدیر ۷/۱۲۶)۔

(صاحب ہدایہ نے جنس اثمان کہا، اس پر اکتفاء نہیں کیا کہ وہ ثمن کی ثمن سے بیع ہے، تا کہ اس صورت کو بھی صرف میں داخل کریں، جب (سونے اور چاندی کی) ڈھلی ہوئی اشیاء کی بیع ڈھلی ہوئی اشیاء یا نقود (بے ڈھلے سونا چاندی) سے ہو، اس لیے کہ ڈھلی ہوئی اشیاء صنعت سے متصل ہوجانے کی وجہ سے اگرچہ صراحتاً ثمن باقی نہیں رہیں، اسی لیے وہ عقد بیع میں متعین بھی ہوجاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی بیع بھی بیع صرف ہے)۔

درمختار میں بیع صرف کی تعریف اس طرح ہے:

''بيع الثمن بالثمن اي ماخلق للثمنية و منه المصوغ جنسا'' (الدر المختار مع الشامی ۷/۵۲۰)۔

صرف شرعاً ثمن سے ثمن کی بیع ہے یعنی وہ ثمن جو خلقۃً ثمن ہوں، انہیں میں ڈھلی ہوئی اشیاء ہیں جنس کے اعتبار سے۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

''الصرف في متعارف الشرع اسم لبيع الأثمان المطلقة بعضها ببعض وهو بيع الذهب بالذهب و الفضة بالفضة و احد الجنسين بالآخر'' (بدائع الصنائع ۴/۴۵۳)۔

---

[1] دار العلوم الہیہ شاہ فیصل کالونی صورہ سری نگر کشمیر۔

(شرع میں بیع صرف مطلق اثمان کی آپس میں بیع کا نام ہے یعنی سونے کی سونے سے اور چاندی کی چاندی سے اور ایک کی دوسری جنس سے)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''ھو تبایع ذھب أو فضة'' (لغۃ الفقہ/ ۱۷۵) (یہ سونے یا چاندی کی آپس میں بیع ہے)۔

علامہ زرکشیؒ فرماتے ہیں:

''بیع الأثمان بعضھا ببعض'' (شرح الزرکشی علی مختصر الخرقی ۲/ ۴۷۲) (اثمان کی آپس میں بیع صرف کہلاتی ہے)۔

مالکیہ کی مشہور کتاب ''الفواکہ الدانی'' میں ہے:

''بیع الذھب بالفضة أو الفضة بالذھب أو أحدھما بالفلوس'' (۲/ ۷۹)

(سونے کی چاندی یا چاندی کی سونے سے یا ان دونوں کی فلوس سے بیع کا نام صرف ہے)۔

علامہ عبدالرحمن جزیریؒ فرماتے ہیں:

''الصرف ہو بیع الذھب بالذھب و الفضة بالفضة أو بیع أحدھما بالآخر'' (کتاب الفقہ علی المذاھب الأربعة ۲/ ۲۷۰)

(صرف وہ سونے سے سونے اور چاندی سے چاندی کی بیع یا ان دونوں میں سے ایک کی دوسرے کے ساتھ بیع ہے)۔

معلوم ہوا کہ بیع صرف ایسی بیع کو کہا جائے گا جس میں دونوں جانب سے ثمن ہو اور درمختار کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ثمن خلقتاً ثمن ہو جس کی وضاحت علامہ کاسانیؒ اور علامہ جزیریؒ کی عبارات میں آگئی کہ بیع صرف کی تین صورتیں ہیں:

(۱) سونے کی بیع سونے سے، (۲) چاندی کی بیع چاندی سے (۳) اور ان دونوں میں سے ایک کی دوسرے کے ساتھ۔

علامہ ابن ہمامؒ کے کلام سے یہ بھی واضح ہوا کہ سونا اور چاندی میں بیع صرف کے لیے سونا چاندی کا ڈھلا اور بے ڈھلا ہونا برابر ہے، یعنی دونوں صورتوں میں اسے بیع صرف کہا جائے گا، دیگر فقہاء کے ہاں بھی اس میں کوئی فرق نہیں کہ سونا اور چاندی ڈھلے ہوئے ہوں یا بغیر ڈھلے دونوں صورتوں میں اگر ان کا تبادلہ ہو رہا ہے تو اسے بیع صرف کہا جائے گا، چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''أجمع الفقھاء أن الذھب و الفضة إن کانا فی صورة التبر أو کانا مسکوکین فی صورة الدینار و الدرھم فان تبادلھما صرف سواء وقع التبادل بجنسھا مثل الدینار بالدینار و تبر الذھب بتبر الذھب أو بخلاف جنسھا مثل الدینار بالدرھم و تبر الذھب بتبر الفضةاما اذا کان الذھب و الفضة مصوغین مثل الحلی و الاوانی المصوغة من الذھب و الفضة فالجمھور علی انه صرف وھو فی حکم التبر و المسکوك سواء بسواء ... وھو المختار فی المذاھب الأربعة و جماھیر العلماء'' (فقہ البیوع ۲/ ۷۰۸)۔

(فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ سونا چاندی اگر ڈھیلے کی شکل میں ہوں یا دینار و درہم کی صورت میں نوٹ بنائے گئے ہوں تو ان کا آپسی تبادلہ بیع صرف ہے، یہ تبادلہ اسی جنس کے ساتھ ہو جیسے دینار کو دینار اور سونے کے ڈھیلے کو سونے کے ڈھیلے کے ساتھ یا خلاف جنس کے ساتھ جیسے دینار کو درہم اور سونے کے ڈھیلے کو چاندی کے ڈھیلے کے ساتھ بہرحال جب سونا اور چاندی ڈھلے ہوئے ہوں جیسے سونے چاندی کے زیورات یا برتن تو جمہور کے ہاں یہ صرف ہے، یہ ڈھیلے اور بنے ہوئے کے حکم میں ہیں برابر برابر ہونے میں...... مذاہب اربعہ اور جمہور علماء کے ہاں یہی مختار و پسندیدہ ہے)۔

نوٹ: لیکن مالکیہ کی کتاب الفواکہ الدانی کی عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر سونا چاندی کی بیع فلوس سے ہو تو وہ بھی صرف ہے لیکن مالکیہ کے مشہور محققین علامہ دسوقی مالکیؒ اور ابن جزیریؒ نے بیع صرف کی تعریف میں فلوس کا اضافہ نہیں کیا ہے۔

(دیکھئے: حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۳/ ۴۱، القوانین الفقہیۃ/ ۱۶۵)۔

بیع صرف کی شرائط:

بیع صرف بھی دیگر بیوعات کی طرح ہے، لہٰذا اس میں بھی وہی شرائط و قیود ہیں جو دیگر بیوعات میں ہیں، لیکن چوں کہ یہ ایک خاص قسم کی بیع ہے، اس لئے اس میں کچھ مزید شرطیں بھی ہیں، چنانچہ ''درمختار'' میں ہے:

''ویشترط عدم التاجیل و الخیار و التماثل ای التساوی وزنا و التقابض بالبراجم لا بالتخلیة قبل الافتراق'' (الدر المختار ۷/ ۵۲۱)۔

(بیع صرف میں تاجیل اور خیار کا نہ ہونا اور تماثل یعنی وزن میں برابری اور جدائیگی سے پہلے تقابض بالفعل شرط ہے نہ کہ محض تخلیہ)۔

''ہندیہ'' میں ہے:

''و اما شرائطه فمنها: قبض البدلین قبل الافتراق ... و منها: ان لایکون فی هذا العقد خیار الشرط لاحدهما و منها: ان لایکون فی هذا العقد اجل'' (الفتاوی الهندیه ۳/ ۲۰۲)۔

(اور بیع صرف کی شرطیں، تو ان میں سے جدائیگی سے پہلے عوضین پر قبضہ کرنا ہے، اور یہ کہ اس عقد میں خیار شرط نہ ہو، اور یہ کہ اس عقد میں تاجیل نہ ہو)۔

علامہ حصکفیؒ نے چار شرطیں ذکر فرمائی ہیں یعنی تقابض، تماثل، عدم خیار شرط اور عدم تاجیل، لیکن بعض حضرات نے تین شرطیں جبکہ دیگر کچھ حضرات نے زائد شرطیں ذکر فرمائی ہیں، ہم ان شرطوں کی مختصر وضاحت کرتے ہیں۔

پہلی شرط: متعاقدین کا عوضین پر مجلس عقد میں قبضہ کرنا:

بیع صرف کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے کہ متعاقدین مجلس عقد میں ہی اپنے عوض پر قبضہ کریں، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''الذهب بالذهب ربا الا هاء وهاء'' (بخاری کتاب البیوع حدیث: ۲۱۷۴، عمر بن الخطاب)

(سونا سونے کے بدلہ میں اگر نقد نہ ہو تو سود ہے)۔

''لا تبیعوا الذهب بالذهب الا مثلا بمثل و لاتشفوا بعضها علی بعض و لاتبیعوا الورق بالورق الا مثلا بمثل و لاتشفوا بعضها علی بعض و لاتبیعوا غائبا بناجز'' (بخاری کتاب البیوع، عن ابی سعید، حدیث نمبر: ۲۱۷۷)۔

(سونے کو سونے کے بدلے اس وقت تک نہ بیچو جب تک دونوں طرف سے برابر برابر نہ ہو اور ان میں کمی زیادتی نہ کرو اور چاندی کو چاندی کے بدلے اس وقت تک نہ بیچو جب تک دونوں طرف سے برابر برابر نہ ہو اور ان میں کمی زیادتی نہ کرو اور نقد کو ادھار کے بدلے نہ بیچو)۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

''ولابدّ من قبض العوضین قبل الافتراق باجماع الفقهاء'' (فتح القدیر ۷/ ۱۲۹، ومثله فی البیانة للعینی ۷/ ۵۰۲)۔

(جدائیگی سے پہلے عوضین پر قبضہ کرنا فقہاء کے اجماع کی وجہ سے ضروری ہے)۔

علامہ باجیؒ فرماتے ہیں:

''فاما التفرق قبل القبض فلا خلاف فیه بین الفقهاء نعلمه فی انه یفسد العقد'' (المنتقی ۴/ ۲۷۱)۔

(قبضہ سے پہلے متعاقدین کا جدا ہو جانا عقد کو فاسد کر دے گا اس میں فقہاء کے کسی بھی اختلاف کا علم ہمیں نہیں ہے)۔

معلوم ہوا کہ بیع صرف کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ متعاقدین مجلس عقد میں ہی عوضین پر قبضہ کریں، اس شرط کے ضمن میں دو باتیں قابل غور ہیں۔

۱- متعاقدین کا ایک ہی مجلس عقد میں ہونا ضروری ہے، اگر متعاقدین میں سے کوئی دوسری جگہ ہو جیسے آج کل کے زمانے میں فون کے ذریعے، فیکس یا انٹرنیٹ کے ذریعہ تو اسے ایک ہی مجلس تصور نہیں کیا جائے گا، چنانچہ علامہ کاسانیؒ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

''ولو نادیٰ احدهما صاحبه من وراء جدار او ناداه من بعید لم یجز الصرف لانهما مفترقان بابدانهما عند

العقد'' (بدائع الصنائع۶/ ۴۵۴، ۴۵۳)۔
(اگر متعاقدین میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو دیوار کے پیچھے سے آواز دی یا دور سے آواز دی تو بیع صرف جائز نہیں کیوں کہ متعاقدین عقد کے وقت اپنے جسم کے اعتبار سے جدا ہیں)۔

''ہندیہ'' میں ہے: ''وکذلك لو تصارفا بالرسالة لانهما متفرقان بابدانهما کذا فی محیط السرخسی'' (۳/ ۲۰۳)۔
(اسی طرح اگر متعاقدین نے خط وکتابت کے ذریعے بیع صرف کی تو جائز نہیں کیوں کہ متعاقدین آپس میں جدا ہیں)۔
معلوم ہوا کہ یہاں اتحاد مجلس سے اتحاد ابدان مراد ہے، اگر اتحاد مجلس نہیں ہے یا متعاقدین میں سے کوئی ایک اٹھ کر چلا گیا تو بیع باطل ہوگی، علامہ جزیریؒ فرماتے ہیں:

''فان افترقا بابدانهما قبل القبض فقد بطل العقد'' (کتاب الفقه علی المذاهب الأربعة۲/ ۲۷۱)۔
(اگر متعاقدین قبضہ سے پہلے جدا ہوگئے تو عقد باطل ہوگا)۔

۲- درمختار کی عبارت میں ''التقابض بالبراجم'' کی عبارت لاکر ''تقابض في المجلس'' کو مزید مؤکد کردیا کیوں کہ احناف کے ہاں بلکہ تمام حضرات فقہاء کے ہاں تخلیہ کافی ہے، حالانکہ تخلیہ میں حقیقی قبضہ ضروری نہیں، لیکن بیع صرف میں بالفعل تقابض کو شرط قرار دیا گیا ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

''قوله: لا بالتخلیة اشار الی ان التقیید بالبراجم للاحتراز عن التخلیة و اشتراط القبض بالفعل لا خصوص البراجم حتی لو وضعه فی کفه او فی جیبه صار قابضا'' (شامی۷/ ۵۲۱)۔
(ماتن کا یہ کہنا کہ محض تخلیہ سے قبضہ نہیں ہوگا، یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ہاتھوں سے قبضہ کی قید تخلیہ سے احتراز کے لیے ہے اور بالفعل قبضہ شرط ہے نہ کہ ہاتھوں (کی انگلیوں کے جوڑ) سے، یہاں تک کہ اگر اس کی ہتھیلی میں رکھا یا جیب میں تو یہ بھی قبضہ ہے)۔

علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ فرماتے ہیں:

''اذا کان المبیع دراهم او دنانیر فقبضها بالید'' (الشرح الکبیر علی المقنع مع المغنی۴/ ۱۳)۔
(جب مبیع دراہم یا دنانیر ہو تو ان کا قبضہ بالید ہوگا)۔
معلوم ہوا کہ بیع صرف میں قبضہ بالفعل یعنی حقیقی قبضہ شرط ہے صرف تخلیہ معتبر نہیں، حالاں کہ دیگر بیوعات میں تخلیہ بھی کافی ہوجاتا ہے۔

تقابض صحت عقد کی شرط یا بقاء عقد کی:

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بیع صرف میں متعاقدین کا مجلس عقد میں عوضین پر قبضہ کرنا شرط ہے، لیکن یہ صحت عقد کی شرط ہے یا بقاء عقد کی؟ اس میں اختلاف ہے، جمہور علماء اسے بقاء عقد کی شرط قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ صحت عقد کی شرط ہے۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

''وشرط القبض هنا هو شرط بقائه علی الصحة'' (بدائع الصنائع۵/ ۲۱۹)۔
(قبضہ کی شرط یہاں بقاء عقد کے صحیح ہونے کی شرط ہے)۔

علامہ رملیؒ فرماتے ہیں:

''التقابض شرط لدوام العقد'' (نهایة المحتاج۳/ ۴۲۵) (تقابض دوام عقد کی شرط ہے)۔
اس اختلاف کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اگر ہم اسے صحت عقد کی شرط قرار دیں تو عقد کے فوراً بعد قبضہ شرط ہوگا اور اگر کچھ دیر بعد قبضہ کیا گیا تو وہ صحیح نہیں ہوگا اس لیے ہمیں یہاں قبل الافتراق کی قید کا اضافہ کرنا پڑتا ہے، تاکہ متعاقدین کے لیے آسانی ہو ورنہ حرج لاحق ہوگا۔ اور اگر ہم اسے بقاء عقد کی شرط

قرار دیتے ہیں تو پھر اس قید کا اضافہ نہیں کرنا پڑے گا (تبیین الحقائق ۴ / ۲۳۵)۔

دوسری شرط: مقدار میں برابری:

بیع صرف میں دوسری شرط یہ ہے کہ اگر سونے کو سونے اور چاندی کو چاندی کے بدلے بیچا جا رہا ہے تو مقدار میں برابری ہو، اگر وزن میں برابری نہیں تو عقد صحیح نہیں ہوگا، ہاں اگر عمدگی اور ساخت میں کمی بیشی ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں اس کی صراحت گزر چکی ہے۔

نیز حضرت ابورافعؓ کی روایت ہے:

''عن ابی رافع قال: خرجت بخلخال فضة لامرأتی ابیعه فلقینی ابوبکر رضی الله عنه فاشتراه منی. فوضعته فی کفة المیزان و وضع ابوبکر دراہمه فی کفة المیزان و کان الخلخال اثقل منها قلیلا. فدعا بمقراض لیقطعه فقلت: یا خلیفة رسول الله ﷺ هو لك، فقال: یا ابا رافع! انی سمعت رسول الله ﷺ قال: الذهب بالذهب وزنا بوزن و الزائد و المستزید فی النار'' (مصنف عبدالرزاق ۳/ ۱۲۴، مصنف ابن ابی شیبه۸/ ۲۹۹)۔

(میں اپنی بیوی کا چاندی والا پازیب بیچنے نکلا، مجھے حضرت ابوبکرؓ مل گئے تو انہوں نے وہ مجھ سے خرید اتو میں نے اسے ترازو کے ایک پلڑے میں اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دراہم دوسرے پلڑے میں رکھے، پازیب دراہم سے تھوڑا وزن میں زیادہ تھا، تو حضرت ابوبکرؓ نے اسے کاٹنے کے لیے ایک قینچی منگائی، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ کے خلیفہ! یہ آپ لے لیں تو انہوں نے فرمایا: اے ابورافعؓ! میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: سونا سونے کے بدلے برابر وزن میں بیچا جائے، زائد اور زیادتی طلب کرنے والا دوزخ میں ہوں گے)۔

علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں:

''فان باع فضة بفضة او ذهبا بذهب لایجوز الا مثلا بمثل و ان اختلفا فی الجودة و الصیاغة'' (ہدایہ۳/ ۱۰۴)۔

(پس اگر چاندی کو چاندی یا سونے کو سونے کے بدلے بیچا تو جائز ہے، مگر برابر برابر اگرچہ عمدگی اور ساخت میں مختلف ہوں)۔

علامہ ابن عبدالبر مالکیؒ فرماتے ہیں:

''واجمع العلماء علی ان الذهب تبره و عینه سواء لایجوز التفاضل فی شیء منه و کذلك الفضة تبرها و عینها و مصنوع ذلك کله و مضروبه لایحل التفاضل فی شیء منه'' (الاستذکار۱۹/ ۱۹۳)۔

(تمام علماء کا اجماع ہے کہ سونا ڈھیلا ہو یا عین دونوں برابر ہیں، ان میں سے کسی میں تفاضل جائز نہیں، اسی طرح چاندی ڈھیلے یا عین اور ڈھلا ہوا اسی طرح سکہ ان تمام میں کمی بیشی حلال نہیں)۔

معلوم ہوا کہ سونا یا چاندی، ڈھیلے کی شکل میں ہوں یا زیورات و کرنسی کی شکل میں تمام صورتوں میں مقدار کی برابری شرط ہے، اگر عمدگی اور ساخت میں اختلاف ہو تو کوئی حرج نہیں۔

تیسری شرط: خیار شرط کا نہ ہونا:

بیع صرف کی ایک شرط خیار شرط کا نہ ہونا بھی ہے کیوں کہ اس عقد میں مجلس میں قبضہ کرنا شرط ہے اور خیار شرط کی صورت میں قبضہ مکمل نہیں ہوتا اور جب قبضہ نہیں پایا گیا تو عقد ہی فاسد ہو گیا، ہاں البتہ خیار عیب اس میں مخل نہیں اس لیے عقد صرف میں اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں:

''ولا یجوز فی شیء من الصرف تاخیر ساعة فما فوقها، و لا ان یتوارى احدهما عن صاحبه قبل التقابض ولا تجوز فیه حوالة ولا ضمان و لا خیار و لا عدة و لا شیء من النظرة ولا یجوز الا هاء وهاء و یتقابضان فی مجلس واحد و وقت واحد'' (الکافی فی فقه أهل المدینة/ ۳۰۳)۔

(صرف میں ایک گھڑی کی تاخیر یا اس سے زیادہ جائز نہیں اور نہ ہی یہ کہ تقابض سے پہلے متعاقدین میں سے کوئی اپنے ساتھی سے چھپا ہو، اور بیع صرف میں حوالہ، ضمان، خیار اور وعدہ اور کسی بھی قسم کی مہلت جائز نہیں، اور بیع صرف جائز نہیں مگر نقد اور متعاقدین ایک ہی وقت میں مجلس عقد میں عوضین پر قبضہ کریں)۔

معلوم ہوا کہ عقد صرف میں عدم خیار شرط بھی ضروری ہے، نیز بعض علماء نے عدم تاجیل کا اضافہ بھی بطور شرط فرمایا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اصل حقیقی شرطیں دو ہی ہیں یعنی تقابض فی المجلس اور تماثل کیوں کہ خیار اور تاجیل عدم تقابض کی وجہ سے ہی جائز نہیں، جب خیار شرط ہوگا یا تاجیل تو تقابض فی المجلس حقیقتاً مفقود ہوگا۔

بیع صرف میں وکالت:

احناف، شوافع اور حنابلہ کے یہاں بیع صرف میں قبضے اور ادائیگی کے لیے توکیل جائز ہے، کیوں کہ یہ بھی دیگر بیوعات کی طرح ہے، نیز احادیث میں بھی اس کی صراحت ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے بیع صرف میں دوسرے شخص کو وکیل بنایا ہے، نیز بیع صرف میں توکیل کے جواز پر امت کا اجماع بھی ہے (فتح الباری ۴/ ۴۸۱)۔

بیع صرف میں توکیل کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ مجلس عقد مکمل ہونے کے بعد متعاقدین قبضہ کے لیے کسی کو وکیل بنائیں اور خود جدا ہو جائیں اور یہ وکیل ان کی جدائیگی کے بعد قبضہ کرے یہ صورت جائز نہیں کیوں کہ یہ پہلی شرط کے منافی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مجلس عقد میں ہی متعاقدین کی موجودگی میں وکیل قبضہ کرے یہ درست ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: المبسوط للسرخسی ۴/ ۶۰، روضۃ الطالبین ۳/ ۳۸۱، کشاف القناع ۳/ ۲۶۶)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر دو شخص انٹرنیٹ یا فون کے ذریعہ عقد کر رہے ہوں اور عقد کے دوران ہی ان کے وکیل بدلین پر قبضہ کریں تو یہ جائز ہے۔

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت:

چونکہ سونے اور چاندی کے کچھ مسائل کرنسی نوٹ سے جڑے ہوئے ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ کرنسی نوٹ کی حقیقت وحیثیت مختصراً بیان کردی جائے، نیز کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت جاننے کے لیے اس کا تاریخی پس منظر سامنے رکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔

جن حضرات نے نوٹ کی تاریخی حیثیت سے اس پر حکم لگایا تو انہوں نے کرنسی نوٹ کو ''حوالہ کا وثیقہ وسند'' قرار دیا، جن میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ (امداد الفتاوی ۲/ ۵)، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ (آلات جدیدہ/ ص ۲۰۰)، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ (قاموس الفقہ ۳/ ۵۸)، اور علامہ سید احمد بیگ حسینیؒ وغیرہ ہیں (فقہ البیوع ۲/ ۷۲۵)۔

اور جن حضرات نے اس حیثیت سے اس پر غور کیا کہ کرنسی نوٹ پہلے سند اور وثیقہ تھے لیکن اب عرف وقانون کی بنا پر یہ خود ثمن کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، تو انہوں نے کرنسی نوٹ کو ''ثمن اصطلاحی'' قرار دیا، ان حضرات میں علامہ فتح محمد صاحب لکھنویؒ اور ان کے فرزند مفتی سعید احمد لکھنویؒ ہیں اور علامہ فتح محمد صاحبؒ نے اپنے استاذ حضرت علامہ عبدالحیی لکھنویؒ کی طرف بھی یہ منسوب کیا ہے، جس کی تائید ان کے فتاوی سے بھی ہوتی ہے (دیکھئے: الناس إلی رفع الحوائج بسکۃ القرطاس مطبوعہ مع عطر ہدایہ/ ص ۲۱۷ تا ۲۲۳، بحوالہ فقہ البیوع ۲/ ۷۲۶)۔

اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے یہ دونوں اقوال درست ہیں، کیوں کہ شروع میں یہ نوٹ بطور وثیقہ اور رسید دئے جاتے تھے، لیکن پھر جب سرمایہ داروں نے دیکھا کہ اب لوگ ہماری رسیدوں سے ہی خرید وفروخت کرتے ہیں تو انہوں نے رسیدیں بکثرت دیدیں یہاں تک کہ حکومتوں کو اسے اپنے اختیار میں لینا پڑا اور بطور ثمن عرفی اس کو رائج کرنا پڑا، پہلے پہل تو لوگوں نے اور پھر حکومتوں نے اسے باضابطہ ثمن قرار دیا، اور اسے قبول کرنا عوام پر لازم کردیا گیا، تو جن حضرات نے اس کی پہلی حیثیت کی بنا پر اپنے زمانہ میں ان کے وثیقہ ہونے کا فتوی دیا وہ بھی صحیح تھے اور جنہوں نے اس کے آخری دور کے اعتبار سے فتوی دیا وہ بھی درست ہیں، چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''والظاهر ان كلا القولين مصيب بالنظر الى ازمنة مختلفة فلا شك ان هذه الاوراق كانت سندات دين فى مبدأ الامر و لم تاخذ صفة الاثمان قانونا و حينئذ كان القول الاول هو المتعين اما بعد ما اكتسبت هذه الاوراق صفة قانونية بحيث يُجبر الناس على قبولها فى افتقاء حقوقهم المالية فالقول الثانى هو الراجح'' (فقه البيوع ۲/ ۴۲۶،۴۲۷)۔

(ظاہر بات یہ ہے کہ دونوں قول مختلف زمانوں کے اعتبار سے درست ہیں، کیوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع میں یہ نوٹ دین کی رسیدیں تھیں اور قانونی حیثیت اختیار نہیں کی تھی تو اس وقت پہلا ہی قول متعین تھا، لیکن جب نوٹوں نے قانونی حیثیت اختیار کی کہ لوگوں کو اپنے مالی حقوق کے حصول کے لیے ان کے لینے پر مجبور کیا گیا تو دوسرا قول راجح ہو گیا)۔

ثمن کی قسمیں:

ثمن کی دو قسمیں: (۱) ثمن حقیقی (خلقی) (۲) ثمن اصطلاحی۔

ثمن خلقی وہ ثمن جس کی پیدائش ہی بطور ثمن ہو یہ سونا اور چاندی ہیں، اور ثمن اصطلاحی کا مطلب یہ ہے کہ سونا چاندی کے علاوہ کسی زمانے میں لوگ کسی چیز کو ثمن قرار دینے پر متفق ہو جائیں یا کوئی حکومت کسی چیز کو ثمن قرار دے جیسے فلوس (دیکھئے: قاموس الفقہ ۳/ ۵۹)۔

کرنسی نوٹ ثمن حقیقی ہیں یا اصطلاحی؟

اس وقت تقریباً تمام علماء عرب وعجم کا اتفاق ہے کہ نوٹ ثمن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، لیکن یہ ثمن کی کون سی قسم ہے، اس میں اختلاف ہے۔

پہلا قول:

بعض علماء فرماتے ہیں: چوں کہ آج پورا کاروبار صرف نوٹ ہی کے ذریعے ہوتا ہے، لہٰذا کرنسی نوٹ نے آج کے زمانے میں سونا چاندی کی حیثیت اختیار کی ہے، اسی لیے ان میں زکوۃ واجب بھی ہوتی ہے اور ادا بھی، بیع سلم میں راس المال بھی بن سکتے ہیں اور اس میں بیع صرف کے احکام بھی جاری ہوں گے، یعنی ان حضرات کے یہاں کرنسی نوٹ ثمن حقیقی کی ایک مستقل قسم کی حیثیت رکھتے ہیں، اب یہ سونا اور چاندی کے علاوہ تیسرا ثمن حقیقی ہے، چنانچہ مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ نے اپنے پانچویں اجلاس کی قرارداد میں تحریر کیا ہے:

''ان مجلس الفقه الاسلامى يقرر ان العملة الورقية نقد قائم بذاته له حكم النقدين من الذهب و الفضة فتجب الزكوة فيها و يجرى الربا عليها بنوعيه فضلا و نسيئا كما يجرى ذلك فى النقدين من الذهب و الفضة تماما باعتبار الثمنية فى العملة الورقية قياسا عليها و بذلك تاخذ العملة الورقية احكام النقود فى كل الالتزامات التى تفرضها الشريعة فيها'' (قرارات مجمع الفقه الاسلامى الدورة الخامسة القرار السادس/ ص ۱۰۱،۱۰۰)۔

(اسلامی فقہ اکیڈمی طے کرتی ہے کہ کرنسی نوٹ بذات خود نقد ہے اور اس پر سونے چاندی کا حکم جاری ہوگا، چنانچہ اس پر زکوۃ واجب ہوگی اور اس میں زیادتی اور ادھار دونوں قسم کے سود جاری ہوں گے، جیسے کہ یہ سب ہی کچھ نقدین سونے اور چاندی میں جاری ہوتے ہیں، کرنسی نوٹ کو اس کے وصف ثمنیت کا اعتبار کرتے ہوئے اسی نقدین پر قیاس کریں گے اور اسی وصف ثمنیت کی وجہ سے کرنسی نوٹ سونے چاندی کے وہ سارے احکام لے لے گا جو اس سلسلے میں شریعت ضروری قرار دیتی ہے)۔

دوسرا قول:

علماء کی ایک جماعت بلکہ برصغیر کے جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ نوٹ ثمن عرفی و اصطلاحی ہیں۔

چونکہ ثمن عرفی کے سلسلے میں متقدمین کا مشہور اختلاف ہے، جس میں ایک طرف جمہور شوافع، حنابلہ اور شیخین ہیں اور دوسری طرف امام محمدؒ ہیں۔ جمہور فلوس کی آپسی بیع میں تفاضل کو جائز قرار دیتے ہیں، جبکہ امام محمدؒ عدم جواز کے قائل ہیں، اس لیے ہمارے زمانہ کے علماء میں بھی اس سلسلے میں اختلاف ہوا، کچھ حضرات جمہور کی روایت کے مطابق فلوس کے احکام کرنسی نوٹ پر جاری کرتے ہیں جبکہ دیگر حضرات امام محمدؒ کی روایت کے مطابق۔

اس اختلاف کا ثمرہ یہ ہوگا کہ جمہور والے قول کے قائلین کے ہاں کرنسی نوٹوں کی آپسی بیع میں تفاضل جائز ہوگا اور امام محمدؒ کی روایت کے مطابق ناجائز۔

کیا کرنسی نوٹ پر بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے؟

کرنسی نوٹ پر صرف کے احکام جاری ہوں گے یا نہیں؟ اس سلسلے میں وہ حضرات جو نوٹ کو حقیقی ثمن قرار دیتے ہیں، ان کے ہاں اس پر بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے۔ لہٰذا ان کے ہاں کرنسی نوٹ کی آپسی بیع میں تقابض فی المجلس اور تماثل بھی ضروری ہوگا اور اختلاف جنس کے وقت مثلاً ایک ملک کی کرنسی کا اگر دوسرے ملک کی کرنسی سے یا سونے چاندی سے تبادلہ ہو تو تقابض شرط ہوگا البتہ کمی بیشی جائز ہوگی، چنانچہ ''مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ'' نے اپنے پانچویں اجلاس کی قرارداد میں تحریر فرمایا:

''لا یجوز بیع الورق النقدی بعضہ ببعض أو بغیرہ من الاجناس النقدیۃ الاخری من ذھب أو فضۃ أو غیرھما نسیئۃ مطلقا'' (قرارات المجمع الفقہ الاسلامی الدورۃ الخامسۃ القرار السادس / ص۱۰۱)۔

(کرنسی نوٹ کا باہمی تبادلہ یا دوسری جنس کے نقود جیسے سونے چاندی کے ساتھ ادھار تبادلہ قطعاً جائز نہیں)۔

اور اگر کرنسی کو ثمن اصطلاحی قرار دیا جائے اور اس پر فلوس کے احکام جاری کئے جائیں تو شوافع، حنابلہ اور شیخین کی روایت کے مطابق اس میں بیع صرف کے احکام جاری نہ ہوں گے نہ ہی تقابض وتماثل کی شرط ہوگی نہ ہی عدم خیار شرط اور عدم تاجیل ضروری۔

اور امام محمدؒ کی روایت کے مطابق بھی بیع صرف کے احکام جاری نہ ہوں گے البتہ اگر اسے اپنی جنس کے ساتھ بیچا جائے تو تماثل وتقابض ضروری ہوگا، اس لیے نہیں کہ یہ بیع صرف ہے بلکہ اتحاد جنس کی وجہ سے کیوں کہ احناف کے ہاں اتحاد جنس علت ربا ہے، اور اگر اپنی جنس کے علاوہ دوسرے ملک کی کرنسی کے ساتھ بیچا جائے تو نہ تو تماثل ضروری ہے نہ ہی تقابض البتہ احد العوضین پر قبضہ لازم ہوگا، چنانچہ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

''و لو لم یوجد القبض الا من احد الجانبین دون الآخر فافترقا مضی العقد علی الصحۃ لان المقبوض صار عینا بالقبض فکان افتراقا عن عین بدین'' (بدائع الصنائع ۶/ ۴۸۷)۔

(اگر قبضہ صرف ایک جانب سے پایا گیا پھر متعاقدین جدا ہو گئے تو عقد صحیح ہوگا کیوں کہ مقبوض قبضہ کی وجہ سے متعین ہو گیا اور یہ جدائیگی ادھار لے بدلے نقد والی ہوگی)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''فالحاصل ان بیعت الفلوس بجنسھا یشترط التقابض لا لکونہ صرفا بل لوجود احد علتی الربا وھو الجنس. اما اذا بیعت بخلاف جنسھا جاز بقبض احد البدلین فی المجلس و لم یجز بدون ذلک'' (فقہ البیوع ۲/ ۷۲۱،۷۲۲)۔

(حاصل بحث یہ ہے کہ اگر فلوس کا تبادلہ اپنی جنس کے ساتھ ہو تو تقابض شرط ہوگا، اس لیے نہیں کہ صرف ہے بلکہ ربا کی دو علتوں میں سے ایک کے پائے جانے کی وجہ سے اور وہ جنسیت ہے، بہر حال جب خلاف جنس کے ساتھ تبادلہ ہو تو احد البدلین پر مجلس میں قبضہ کر کے جائز ہوگا اس کے بغیر جائز نہیں)۔

اگر پہلے موقف کو اختیار کیا جائے تو اس میں کئی مشکلات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نوٹ کے ذریعہ سونا چاندی خریدنے کی صورت میں تقابض فی المجلس شرط ہوگا، لہٰذا نوٹ کے ذریعہ سونا چاندی کی بیع ادھار جائز نہیں ہوگی، نیز اس کے علاوہ لوگوں کو اس میں بہت سی مشکلات بھی پیش آتی ہیں، لیکن اس موقف کے قائلین نے اس کو جائز قرار دینے کے لیے دور کی تاویلات کا سہارا لیا ہے۔

دوسرے موقف میں اگر جمہور کی رائے کو اختیار کیا جائے تو اس میں ربا کا چور دروازہ کھل جائے گا، کیوں کہ ان کے زمانے میں تو فلوس کے ذریعہ تجارت بہت ہی محدود تھی اور ہمارے زمانے میں کرنسی نوٹ ہی ذریعہ تجارت ہیں، لہٰذا آج کے زمانے کے لحاظ سے اس میں بڑی مشکلات ہیں چنانچہ ماضی میں بھی علماء ماوراء النہر جمہور کے قول کو چھوڑ کر حرمت تفاضل کے قائل ہو گئے ہیں، ان کے زمانہ میں عدالی اور غطارفہ کی مثال ہمارے لیے کافی ہے، یہ وہ سکے تھے جن میں کھوٹ زیادہ تھا تو اس میں تفاضل اس طور پر درست تھا کہ اسے خلاف جنس کی طرف پھیرا جائے لیکن علماء ماوراء النہر نے اس کے عدم جواز کا فتوی دیدیا اور دلیل دی۔

''انما اعز الاموال فی دیارنا فلو ابیح التفاضل فیه یفتح باب الزبا''۔

(یہ ہمارے یہاں عزیز ترین اموال میں سے ہیں تو اگر اس میں تفاضل مباح قرار دیا جائے تو سود کا دروازہ کھل جائے گا)۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

''فان الناس حینئذ یعتادون التفاضل فی الاموال النفیسة فیتدرجون الی ذلك النقود الخالصة فمنع ذلك حسما لمادة الفساد'' (فتح القدیر ۶/ ۲۷۵)۔

کیونکہ لوگ تب اموال نفیسہ میں کمی بیشی کے عادی ہوں گے اور پھر اس میں خالص نقود کو بھی داخل کریں گے تو مادہ فساد کو ختم کرنے کے لیے اس کو ممنوع قرار دیا گیا۔

لہٰذا آج کے زمانہ کے لحاظ سے امام محمدؒ ہی کا قول راجح معلوم ہوتا ہے، نیز اس کے اختیار کرنے میں یہ پیچیدگیاں بھی نہیں ہیں، لہٰذا اگر کرنسی نوٹ کے ذریعہ سونا چاندی خریدا جائے تو ایک طرف فلوس ہونے کی وجہ سے اس پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے، چنانچہ امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

''وان اشتری خاتم فضة او خاتم ذهب فیه فص او لیس فیه فص بکذا فلوسا. ولیست الفلوس عنده فهو جائز ان تقابضا قبل التفرق او لم یتقابضا. لان هذا بیع و لیس بصرف فانما افترقا عن عین بدین لان الخاتم یتعین بالتعیین بخلاف ما سبق فان الدراهم و الدنانیر لا تتعین بالتعیین فلهذا شرط ہناك قبض احد البدلین''

(المبسوط باب البیع بالفلوس ۱۴/ ۲۵)۔

(اگر کچھ فلوس میں چاندی یا سونے کی انگوٹھی خریدی اس میں نگینہ ہو یا نہ ہو، اور اس کے پاس فلوس نہ ہوں تو جدا ہونے سے پہلے دونوں قبضہ کریں یا نہ کریں دونوں صورتوں میں جائز ہے، کیوں کہ یہ (عام) بیع ہے، صرف نہیں ہے، کیوں کہ وہ عین و دین کے ساتھ جدا ہو گئے، کیوں کہ انگوٹھی تعیین سے متعین ہوتی ہے، برخلاف گزشتہ صورت کے کیوں کہ دراہم اور دنانیر تعیین سے متعین نہیں ہوتے ہیں اسی وجہ سے یہاں احد البدلین کے قبضہ کی شرط ہے)۔

چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے بھی امام محمد کے قول کو ترجیح دی ہے۔

سونا چاندی ادھار خریدنے کا حکم:

جیسا کہ اوپر واضح ہوا کہ کرنسی نوٹ نہ تو ثمن حقیقی ہیں نہ ہی رسیدیں بلکہ یہ ثمن اصطلاحی ہیں، لہٰذا اگر نوٹ کے ذریعے سونا چاندی ادھار خریدا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن عوضین میں سے ایک پر قبضہ کرنا ضروری ہوگا تا کہ بیع الکالی بالکالی کے زمرہ میں نہ آئے، شامی میں ہے:

تنبیه: ''سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس فاجاب بانه یجوز اذا قبض احد البدلین'' (ردالمحتار ۷/ ۴۱۴)۔

(علامہ حانوتیؒ سے فلوس کے ذریعہ سونے کی بیع کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ جائز ہے جب بدلین میں سے ایک پر قبضہ کرے)

''ہندیہ'' میں ہے:

''روی الحسن عن ابی حنیفة اذا اشتری فلوسا بدراہم و لیس عند ہذا فلوس و لا عند الآخر دراہم ثم ان احدهما دفع و تفرقا جاز. وان لم ینقد واحد منها حتی تفرقا لم یجز کذا فی المحیط'' (الفتاوی الهندیه ۳/ ۲۲۴)۔

(امام حسنؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے روایت کیا ہے کہ جب دراہم سے فلوس خریدے اور اس کے پاس فلوس نہ ہوں اور نہ ہی دوسرے کے پاس دراہم لیکن ان میں سے ایک نے مجلس میں عوض دیدیا اور جدا ہو گئے تو جائز ہے اور اگر ایک عوض نقد نہ دیں یہاں تک کہ جدا ہو جائیں تو جائز نہیں ہے)۔

''لم یشترط فی بیع الفلوس بالدراهم او الدنانیر قبض البدلین قبل الافتراق و یکتفی بقبض احد البدلین''
(الفتاوی الهندیه ۳/ ۲۰۹)۔

(فلوس کی دراہم و دنانیر سے تبادلہ میں بدلین پر قبضہ کرنا شرط نہیں ہے اس میں ایک بدل پر قبضہ کرنا کافی ہے)۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ کرنسی نوٹ اور سونے چاندی کی خرید وفروخت میں احد العوضین پر قبضہ ضروری ہے اگر ایک چیز پر قبضہ نہ کیا تو پھر یہ بیع جائز نہیں نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ وقت عقد کی قیمت متعین اور طے ہونی چاہئے تا کہ اس کے ذریعہ ربا کا اندیشہ نہ رہے)۔

سونا چاندی کی مقررہ نرخ سے کم یا زیادہ خرید وفروخت:

اگر نوٹ کے ذریعہ سونا یا چاندی خریدا جائے اور اس میں مقامی یا بین الاقوامی یا حکومتی نرخ سے کمی یا زیادتی کے ساتھ خرید وفروخت کی جائے تو یہ سود شمار ہوگا یا نہیں؟

اس سلسلے میں شریعت کے حکم تسعیر کو سمجھنا ہوگا، تسعیر یعنی حکومت کی طرف سے نرخ مقرر کرنا۔

تسعیر کے بارے میں اصلاً تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ جائز نہیں، کیوں کہ یہ ایسا عمل ہے جسے حضور پاک ﷺ نے مطالبہ کے باوجود نہیں کیا، چنانچہ علامہ کاسانیؒ نے تین دلائل سے تسعیر کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے۔

۱- ارشاد باری تعالی ہے:

"یاایھا الذین امنوا لاتأکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم" (سورۂ نساء:۲۹)۔

(اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ الا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو (تو وہ جائز ہے))۔

۲- حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے:

''لا یحل ما امرء مسلم الا بطیب نفس منه'' (أخرجه احمد۵/ ۷۲) (کسی مسلمان کا مال اس کی خوشی کے بغیر حلال نہیں)۔

۳- حضرت انسؓ کی روایت ہے:

''غلا السعر فی المدینة علی عهد رسول الله ﷺ فقال الناس: یا رسول الله! غلا السعر فسعر لنا. فقال رسول الله ﷺ: ان الله هو المسعر القابض الباسط الرازق وانی لارجو ان القی الله و لیس احد منکم یطالبنی بمظلمة فی دم ولا مال'' (أخرجه أبوداؤد کتاب البیوع باب فی التسعیر حدیث:۳۴۵۳، الترمذی کتاب البیوع باب ما جاء فی التسعیر حدیث:۱۳۱۴)۔

(حضور پاک ﷺ کے زمانے میں مدینہ منورہ میں بھاؤ بڑھ گیا تو لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! بھاؤ بڑھ گیا ہے، آپ ﷺ ہمارے لئے بھاؤ متعین کردیں، تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا: بھاؤ متعین کرنے والا، روکنے والا، کھولنے والا اور رزق دینے والا اللہ تعالی ہے، اور میں اللہ تعالی سے اس طرح ملنا نہیں چاہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی مجھ سے خون یا مال کے ظلم کے بارے میں مطالبہ کرنے والا ہو)۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے

''ولا یسعر بالاجماع الا اذا کان ارباب الطعام یتحملون و یتعدون عن القیمة و عجز القاضی عن صیانة حقوق المسلمین الا بالتسعیر فلا بأس به بمشورة اہل الرأی و البصر هو المختار و به یفتی'' (۳/۲۰۰)۔

(تسعیر بالاجماع جائز نہیں، مگر جب غلے والے قیمت میں زیادتی کریں اور قاضی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت سے بغیر تسعیر عاجز ہو تو اہل رای ودانش کے مشورہ سے تسعیر میں کوئی حرج نہیں، یہ پسندیدہ اور مفتی بہ ہے)۔

موسوعہ فقہیہ کویتیہ میں ہے:

''اختلف الفقهاء فی التسعیر فذهب الحنفیة و المالکیة الی ان لولی الامر ذلك اذاکان الباعة یتعدون القیمة و عجز القاضی عن صیانة حقوق المسلمین الا بالتسعیر بمشوة اہل الرای و البصروذلك لفعل عمر حین مر بحاطب فی السوق فقال له: اما ان ترفع السعر واما ان تدخل بیتك فتبیع کیف شئت'' (موسوعه فقهیه۹/ ۲۷)۔

(تسعیر کے سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے، احناف اور مالکیہ اس طرف گئے ہیں کہ اولی الامر کو اس کا اختیار ہے، جب کہ تجار قیمت میں زیادتی

کرتے ہوں اور قاضی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت سے بغیر تسعیر کے عاجز ہو تو اہل رای و دانش سے مشورہ کر بھاؤ متعین کرے گا، اور اس کی وجہ حضرت عمرؓ کا عمل ہے، جب وہ حضرت حاطبؓ کے پاس سے بازار میں گزرے (اور وہ چیزیں سستی بیچ رہے تھے) تو حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا: یا تو قیمت بڑھاو یا اپنے گھر میں داخل ہو کر جیسے چاہو بیچو)۔

تسعیر کی اجازت کے بعد احناف میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا تسعیر ہر چیز میں جائز ہے یا کھانے کی اشیاء کے ساتھ خاص ہے، علامہ حصکفیؒ نے علامہ عتابیؒ سے نقل فرمایا ہے کہ صرف طعام اور جانوروں کے چارہ میں تسعیر ہوگی، دیگر اشیاء میں اس کی اجازت نہیں، لیکن پھر علامہ قہستانی سے نقل فرمایا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق دیگر اشیاء میں بھی اس کی اجازت ہونی چاہئے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''قلت: وافاد ان التسعیر فی القوتین لا غیر وبه صرح العتابی وغیره لکنه اذا تعدی ارباب غیر القوتین وظلموا علی العامة فیسعر علیهم الحاکم بناء علی ما قال ابو یوسف ینبغی ان یجوز ذکره القهستانی''۔

(میں کہتا ہوں: اس سے بطور فائدہ یہ بھی معلوم ہوا کہ تسعیر قوتین میں ہی ہوگا نہ کہ ان کے علاوہ میں، علامہ عتابیؒ وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے، لیکن جب تجار قوتین کے علاوہ (دیگر چیزوں میں) عام لوگوں پر تعدی و ظلم کریں تو حاکم امام ابو یوسفؒ کے قول کی بناء پر تسعیر کرے گا، اس کا جواز (اس صورت میں) مناسب ہے، اسے علامہ قہستانیؒ نے ذکر فرمایا ہے)۔

علامہ شامیؒ اس کے تحت فرماتے ہیں:

(میں کہتا ہوں: ہاں! لیکن یہ مسئلہ قیاس و استنباط کے ذریعے ان سے مفہوماً ماخوذ ہے، یہی وجہ ہے کہ ماتنؒ نے بناء علی ما قال ابو یوسفؒ فرمایا اور اسے امام ابو یوسفؒ کا قول نہیں بنایا، پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ جب ضرر عام ہو تو امام صاحبؒ حجر کے قائل ہیں، جیسے مفتی ماجن، مکاری مفلس اور طبیب جاہل کے سلسلے میں، یہ تو عام تضیہ ہے، ہمارا یہ مسئلہ بھی اس میں داخل ہوگا کیوں کہ تسعیر بھی معنوی طور پر حجر ہی ہے کیوں کہ یہ زیادت فاحشہ کے ساتھ بیع کو روکنا ہے تو اس بناء پر یہ مسئلہ صرف امام ابو یوسفؒ کے قول پر مبنی نہ ہوگا) (بلکہ جمہور احناف کا ہوگا)۔

معلوم ہوا کہ امام ابو یوسف کی احتکار والی روایت پر قیاس کر کے اور ضرر عام کی عمومی علت کی بناء پر قوتین کے علاوہ میں بھی تسعیر جائز ہے، لہٰذا سونے چاندی میں بھی اگر حکومت تسعیر چاہے تو کر سکتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص حکومت کے مقررہ نرخ کی خلاف ورزی کرے اور کمی بیشی کے ساتھ اشیاء کی خرید و فرخت کرے تو یہ بھی جائز ہے، شامی میں ہے:

''وظاہرہ انه لو باعه باکثر یحل و ینفذ البیع و لاینافی ذلك ماذکره الزیلعی وغیره من انه لو تعدی رجل وباع باکثر اجازه القاضی لان المراد ان القاضی یمضیه و لایفسخه'' (ردالمحتار ۹/ ۵۷۴)۔

اور اس سے ظاہر ہے کہ اگر اس نے زیادہ کر کے بیچا تو حلال بھی ہے اور بیع نافذ بھی ہوگی، یہ اس بات کے منافی نہیں جس کا تذکرہ امام زیلعیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص نے تعدی و ظلم کر کے زیادہ میں کوئی چیز بیچی تو قاضی اسے نافذ کر دے گا، کیوں کہ یہاں (نفاذ قاضی سے) مراد یہ ہے کہ قاضی اسے برقرار رکھے گا اور فسخ نہیں کرے گا۔

موسوعہ فقہیہ میں ہے:

''ذهب الحنفية والحنابلة و الشافعية فی الاصح الی ان من خالف التسعیر صح بیعه'' (۱۱/ ۳۱۰)۔

(احناف، حنابلہ اور شوافع صحیح قول کے مطابق اس جانب گئے ہیں کہ جس نے تسعیر کی مخالفت کی تو اس کی بیع صحیح ہوگی)۔

معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص مقررہ نرخ سے کمی یا زیادتی کر کے کسی چیز کی خرید و فروخت کرے تو بیع بالکل درست ہے، البتہ ملکی قانون اور عوامی مفاد کی بنا پر اسے سزا دی جا سکتی ہے، لیکن اس کی بیع صحیح ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص سونے چاندی کی خرید و فروخت مقررہ نرخ سے کمی بیشی کے ساتھ کرے تو یہ بھی جائز ہے، لہٰذا یہ سود نہیں ہوگا۔

احتکار کا حکم:

اشیاء ضروریہ کو خرید کر اس طرح روکے رکھنا کہ اس سے اہل شہر کو مشقت ہو اسے احتکار کہتے ہیں، احتکار کے سلسلے میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ مکروہ ہے، بعض نے حرام جب کہ بعض حضرات نے گناہ کبیرہ بھی قرار دیا ہے، علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

''یتعلق بالاحتکار احکام (منھا) الحرمة لما روی عن رسول اللہ ﷺ انه قال المحتکر ملعون و الجالب مرزوق و لایلحق اللعن الا بمباشرة المحرم، وروی عنه علیه الصلاة والسلام انه قال من احتکر طعاما اربعین لیلة فقد بریء من اللہ و بریء اللہ منه و مثل ھذا الوعید لایلحق الا بارتکاب الحرام ولان الاحتکار من باب الظلم لان ما بیع فی المصر فقد تعلق به حق العامة فاذا امتنع المشتری عن بیعه عند شدة حاجتھم الیه فقد منعھم حقھم و منع الحق عن المستحق ظلم و انه حرام'' (بدائع الصنائع۵/ ۱۲۹)۔

(احتکار سے چند احکام متعلق ہیں: ان میں سے احتکار کا حرام ہونا ہے کیوں کہ حضور پاک ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: غلہ روکنے والا ملعون ہے اور لانے والا مرزوق، اور لعنت حرام کام کے ساتھ لاحق ہوتی ہے، اور آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے چالیس روز غلہ روکا تو وہ اللہ سے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہے، اور اس جیسی وعید حرام کے ارتکاب پر ہوتی ہے، اور اس لیے بھی کہ احتکار ظلم کے قبیل سے ہے، کیوں کہ جو چیز شہر میں بیچی جاتی ہے اس سے عام لوگوں کا حق متعلق ہوتا ہے تو جب لوگوں کی سخت حاجت کے وقت اس کے بیچنے سے مشتری رکا رہا تو گویا اس نے ان کا حق روک لیا اور مستحق سے حق کا روک لینا ظلم بھی ہے اور حرام بھی)۔

معلوم ہوا کہ احتکار ممنوع، قابل لعنت اور گناہ کبیرہ ہے، احتکار کا اطلاق کن چیزوں کے روکنے پر ہوگا؟ اس سلسلے میں احناف سے تین روایتیں ہیں:

۱- صرف انسانوں کے طعام اور جانوروں کے چارہ پر۔

۲- قوتین کے علاوہ کپڑوں پر بھی۔

۳- ہر اس چیز کا روکنا احتکار کے دائرہ میں آئے گا جس سے لوگوں کو ضرر ہو۔

پہلا قول طرفین کا ہے، دوسرا امام محمدؒ کی ایک روایت ہے اور تیسرا امام ابو یوسفؒ کا ہے، ''ہندیہ'' میں ہے:

''والاحتکار فی کل مایضر بالعامة فی قول ابی یوسف و قال محمد الاحتکار بما یتقوت به الناس و البھائم کذا فی الحاوی'' (ھندیہ۳/ ۲۰۰)۔

(اور امام ابو یوسفؒ کے قول میں احتکار ہر اس چیز میں ہوگا جس سے عام لوگوں کو ضرر ہو اور امام محمدؒ فرماتے ہیں: احتکار لوگوں کے طعام اور چوپایوں کے چارہ میں ہوگا)۔

''بدائع'' میں ہے:

''الاحتکار یجری فی کل ما یضر بالعامة عند ابی یوسف قوتا کان اولا و عند محمد لایجری الاحتکار الا فی قوت الناس و علف الدواب من الحنطة و الشعیر و التبن و القت (وجه) قول محمد ان الضرر فی الاعم الاغلب انما یلحق العامة بحبس القوت و العلف لایتحقق الاحتکار الا به (وجه) قول ابی یوسف ان الکراھة لمکان الاضرار بالعامة وھذا لایختص بالقوت و العلف'' (بدائع ۵/ ۱۲۹)۔

(امام ابو یوسفؒ کے نزدیک احتکار ہر اس چیز میں ہوگا جس سے عام لوگوں کو ضرر ہو وہ قوت ہو یا نہ ہو اور امام محمدؒ کے نزدیک احتکار صرف لوگوں کے قوت اور چاپایوں کے چارہ میں جاری ہوگا یعنی گیہوں، جو، بھوسہ اور خشک یا تر گھاس، امام محمدؒ کے قول کی وجہ ہے کہ عمومی اور غالب طور پر عوام کو قوت اور جانوروں کے چارہ کے روکنے کی وجہ سے ضرر ہوتا ہے، لہٰذا احتکار اسی کے ساتھ متحقق ہوگا، امام ابو یوسفؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ کراہت عام لوگوں کو ضرر لاحق ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ ضرر قوت و چارہ کے ساتھ خاص نہیں)۔

امام ابو یوسفؒ کی دلیل بظاہر قوی ہے کیوں کہ احتکار کی علت لوگوں کو ضرر لاحق ہونا اور اس کی ممانعت کی حکمت لوگوں سے ضرر کو دور کرنا ہے، اور یہ قوتین کے علاوہ دیگر اشیاء ضروریہ میں بھی ہو سکتا ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''والحکمة فی تحریم الاحتکار رفع الضرر عن عامة الناس'' (شرح النووی علی مسلم ۱۱/ ۴۳ باب تحریم الاحتکار فی الأقوات)۔
(احتکار کو حرام قرار دینے کی حکمت عام لوگوں سے ضرر کو دور کرنا ہے)۔

معلوم ہوا کہ اس کی حکمت عام لوگوں سے ضرر کو دور کرنا ہے لہٰذا جن اشیاء میں روک کی وجہ سے لوگوں کو ضرر لاحق ہوتا ہو ان تمام کا روکنا احتکار کے دائرہ میں آئے گا، اسی وجہ سے امام محمدؒ کی ایک روایت کپڑوں میں احتکار کی ممانعت والی بھی ہے، لیکن علامہ شامیؒ نے کافی سے طرفین کے قول پر فتوی نقل فرمایا ہے، تحریر کرتے ہیں:

''والتقیید بقوت البشر قول ابی حنیفة ومحمد وعلیه الفتوی کذا فی الکافی و عن ابی یوسف کل ما اضر بالعامة حبسه فهو احتکار وعن محمد الاحتکار فی الثیاب ابن کمال'' (۹/ ۵۷۱)۔

(قوت بشر کے ساتھ مقید کرنا طرفین کا قول ہے اور اسی پر فتوی ہے، ایسا کافی (نامی کتاب) میں ہے اور امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ جس کا روکنا عام لوگوں کو ضرر دے تو وہ احتکار (کے دائرہ میں) ہے اور امام محمدؒ سے (ایک روایت میں) مروی ہے کہ احتکار کپڑوں میں بھی ہوگا)۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ سونا چاندی میں ذخیرہ اندوزی اور اس کو بازار میں نہ لانا احتکار میں داخل نہ ہوگا، لیکن چوں کہ اس کی ذخیرہ اندوزی کی بنا پر خود اس کی قیمت نیز دیگر اشیاء کی قیمت بھی بڑھتی ہے، جس سے عوام کو ضرر لاحق ہوتا ہے اور احتکار کی اصل علت بھی ضرر ہی ہے اور قاعدہ کلیہ ہے الضرر یزال اس لیے احقر کی رائے میں اگر امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتوی دیا جائے تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے، نیز قضاء بیوعات وغیرہ میں عام طور پر امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتوی دیا جاتا ہے۔

علامہ شامیؒ امام ابو یوسفؒ کے قول کی وضاحت فرماتے ہیں:

''ان کل من اضر بالعامة حبسه فهو احتکار ولو ذهبا او فضة او ثوبا'' (۹/ ۵۷۴)۔
(جس کا روکنا عام لوگوں کو ضرر دے تو وہ احتکار (کے دائرہ میں) ہے، اگرچہ سونا چاندی یا کپڑے ہوں)۔

نیز امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے کہ ہر وہ چیز جس کے روکنے سے عوام الناس کو ضرر لاحق ہو وہ احتکار میں داخل ہے، علامہ حطابؒ امام مالکؒ سے نقل فرماتے ہیں:

''والحکرة فی کل شیء ... فما کان احتکاره یضر بالناس منع محتکره من الحکرة'' (مواهب الجلیل ۴/ ۲۲۷)۔
(اور احتکار ہر چیز میں ہے،...... جس چیز کے روکنے سے لوگوں کو ضرر ہو تو اس کے روکنے والے کو احتکار سے روکا جائے گا)۔

سوالوں کے جوابات اب اخیر میں سوالوں کے جوابات ترتیب وار ذکر کئے جاتے ہیں:

۱- اگر روپئے یا کسی بھی کرنسی نوٹ سے سونا خریدا جائے تو کرنسی نوٹ فلوس کے حکم میں امام محمدؒ کی روایت کے مطابق ثمن عرفی و اصطلاحی ہوگا، لہٰذا کرنسی نوٹ کی سونے یا چاندی سے خرید و فروخت کو بیع صرف نہیں کہا جائے گا۔

الف: اگر کرنسی نوٹ سے سونا یا چاندی خریدا جائے تو اس میں تفاضل بھی جائز ہوگا اور ادھار بھی، البتہ احد البدلین پر قبضہ ضروری ہوگا تا کہ یہ بیع ادھار در ادھار نہ ہو۔

ب: اگر سونے یا چاندی کو حکومتی یا بین الاقوامی مقررہ نرخ سے کم یا زیادہ کر کے خریدا یا بیچا جائے تو یہ بھی درست ہے اور اس پر سود کا اطلاق نہیں ہوگا، لیکن ملکی یا بین ملکی قانون کی پاسداری اور مفاد عامہ کی بنا پر اس سے احتراز ہی کرنا چاہئے۔

۲- زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ وزن میں سونا لیتے ہیں اور چند دنوں میں اس کے بدلے سونے سے بنائے ہوئے

زیورات انہیں واپس کرتے ہیں، انہیں الگ سے کوئی اجرت نہیں دی جاتی بلکہ زیورات کی شکل میں سونے کی اتنی ہی مقدار انہیں واپس کرنی ہوتی ہے، جتنی انہوں نے لی تھی، البتہ سونے کا زیور بنانے میں دوسری دھاتوں کی آمیزش ضروری ہوتی ہے، اس آمیزش کے بقدر سونا ان کو بچ جاتا ہے اور زیور بنانے میں سونے کے کچھ ذرات نکل آتے ہیں، یہی ان کی اجرت ہوتی ہے، یہ جائز نہیں، کیوں کہ اگر اسے بیع کہا جائے تو بیع صرف ہے اور بیع صرف میں عوضین کے متحد الجنس ہونے کے وقت تقابض وتماثل شرط ہے، یہاں نہ تو تقابض پایا گیا نہ ہی تماثل، اس لیے یہ درست نہیں۔

اور اگر اسے اجارہ کہا جائے تو اس اعتبار سے بھی یہ عقد جائز نہیں کیوں کہ یہاں جو چیز اجرت قرار دی جا رہی ہے وہ مجہول ہے اور اس میں ایسی جہالت ہے جو مفضی الی المنزاع ہے، کیوں کہ کاریگر تو یہ چاہے گا کہ دوسری دھات کا استعمال زیادہ کرے تاکہ سونے کے ذرات زیادہ مقدار میں بچ جائیں اور تاجر چاہے گا کہ کم دھات استعمال کرے تاکہ سونے کے ذرات کم رہیں اور زیورات میں زیادہ سونا استعمال ہو، اور جو جہالت مفضی الی النزاع ہو وہ مفسد عقد ہوتی ہے، البتہ اگر سونے یا روپے کی کوئی متعین مقدار بطور اجرت پہلے ہی طے کردی جائے اور پھر زیورات بنانے کے بعد بچے ہوئے ذرات کی مقدار فریقین کی رضامندی سے اس میں محسوب کرلی جائے تو جائز ہے۔

۳- سونے کے تجار اگر بیع کے وقت پرانا سونا لیں اور اس کے عوض نیا سونا دیں تو یہ بیع صرف ہے لہٰذا تماثل بھی ضروری ہوگا اور تقابض بھی، اس میں کمی بیشی جائز نہیں، البتہ اس کی جائز صورت یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے تاجر پرانا سونا خریدے اور اس کی قیمت کچھ کم طے کرکے سونے پر قبضہ کرے اور پھر نئے سونے کی قیمت نئے عقد کے ساتھ کچھ زیادہ کرکے بیچے، تو یہ صورت جائز ہے کیوں کہ روپے کی بیع سونے سے ہورہی ہے تو تفاضل بھی جائز ہے اور ادھار بھی، لہٰذا پہلی صورت میں تاجر پرانے سونے پر قبضہ کرے اور پیسے ادھار رکھے اور دوسری بیع میں نیا سونا پیشگی قیمت پر دیدے۔

۴- کیموڈیٹی ایکسچینج کے ذریعے جو سونا چاندی یا دیگر اشیاء کی خرید وفروخت ہوتی ہے، اس کی عمومی صورت یہ ہوتی ہے کوئی انسان اس مارکٹ میں اپنا ایک اکاؤنٹ کھولتا ہے اور اس کے کچھ روپے اسے ادا کرنے پڑتے ہیں، اس کے بعد اسے کیموڈیٹی ایکسچینج میں خرید وفروخت کی اجازت ہوتی ہے، اگر کوئی اکاؤنٹ نہ کھولے تو اسے بغیر دلال کے خرید وفروخت کی اجازت نہیں ہوتی، اس کے بعد کوئی شخص مستقبل میں وجود میں آنے والے سامان کو بیچنا چاہتا ہے، اور دوسرا شخص اسے خرید لیتا ہے، لیکن اسے پوری قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی بلکہ ثمن کا ایک حصہ سات یا دس فیصد دینا پڑتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان یہ معاہدہ تحریرًا بھی ہوجاتا ہے، اس کے بعد یہ دوسرا شخص اس مبیع کو فروخت کرنا چاہتا ہے، تو اس سے تیسرا شخص خرید لیتا ہے، اور اس سے چوتھا اور یہ سلسلہ برابر اس تاریخ تک چلتا رہتا ہے جو پہلے بائع نے مبیع سپرد کرنے کے لیے طے کی تھی، اس متعین تاریخ کے آنے تک اس کی خرید وفروخت کئی بار ہوچکی ہوتی ہے، اب جب متعین تاریخ آجاتی ہے تو اب پہلا بائع مبیع سپرد کرنا چاہتا ہے، لہٰذا اس وقت جو اس مبیع کا آخری مشتری ہوگا اسے مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ اس چیز پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں یا آگے فروخت کرنا چاہتے ہیں، اگر یہ قبضہ کرنا چاہے تو اس کی بھی متعین صورت ہوتی ہے اور اگر یہ فروخت کرنا چاہے تو اسے بائع اول کو فروخت کرنا پڑتا ہے، اور پھر اس کا تصفیہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ بائع اول کے فروخت کرنے کے وقت کی قیمت اور وقت سپردگی کی قیمت کے درمیان جو فرق ہوگا، اس کی ادائیگی کردی جاتی ہے۔

اس پورے کھیل میں کچھ ماہرین معاشیات آنے والے دنوں میں اس چیز کے بھاؤ کی پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں، جس کی بنیاد پر ہر خریدنے والا اسے فروخت کرنا چاہتا ہے، اور پورا سلسلہ اسی مدار میں گھومتا رہتا ہے، ظاہری بات ہے کہ یہ بیع ہی نہیں بلکہ یہ سٹہ کی ایک قسم ہے، کیوں کہ نہ تو اس میں مبیع موجود ہوتی ہے، اور نہ ہی مشتری کا مقصدا سے خریدنا ہوتا ہے، اور کسی چیز کی بیع کے لیے مبیع کا ملکیت میں ہونا ضروری ہے، کیوں کہ بیع مالا یملکہ الانسان جائز نہیں۔

اب اگر کسی چیز کا وجود حقیقتًا ہوتا ہے، لیکن جب اسے مشتری اول خریدتا ہے تو وہ چیز اس کے لیے متعین اور الگ نہیں کی جاتی بلکہ صرف اس کے اکاؤنٹ میں تحریر کردی جاتی ہے، حالاں کہ مبیع کے لئے شرط ہے کہ وہ فارغ ہو کسی کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو، ''ہندیہ'' میں ہے:

''ویشیر فی التسلیم ان یکون المبیع مفرزا غیر مشغول بحق غیرہ ھکذا فی الوجیز للکردی'' (۱۹/۳)

(اور تسلیم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مبیع الگ ہو کسی غیر کے حق کے ساتھ مشغول نہ ہو)۔

لیکن اگر کوئی شخص واقعی کوئی چیز خریدنا چاہتا ہو اس کا ارادہ سٹہ بازی یا قمار بازی نہ ہو یعنی صرف بھاؤ کے اتار چڑھاؤ پر بیع نہ ہو مبیع موجود ہو اور مشتری کے لیے اس کی مبیع رجسٹر میں لکھ لی گئی اور اس کے نام سے الگ محفوظ کردی گئی اور اس نے اس کی قیمت ادا کردی تو یہ صورت جائز ہے، کیوں کہ مبیع کا موجود ہونا، مشتری کے لیے مبیع کا الگ، غیر کے حق سے جدا ہونا اور احد البدلین پر قبضہ کرنا یہ ساری چیزیں ضروری تھیں اور یہ پائی گئیں، لیکن پھر بھی یہ مشتری اس مبیع کو آگے تب تک نہیں بیچ سکتا جب تک کہ قبضہ نہ کرے یا تخلیہ ہی پایا جائے کیوں کہ تخلیہ بھی معتبر ہے، ''ہندیہ'' میں ہے:

''و اجمعوا علی ان التخلیة فی البیع الجائز تکون قبضا'' (۳/ ۱۹) (اور فقہاء کا اجماع ہے کہ بیع جائز میں تخلیہ قبضہ شمار ہوگا)۔

لیکن تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ مبیع پر خریدار کا ایسا استیلاء ہو کہ اس کے مبیع پر تصرف کرنے میں کوئی مانع نہ ہو اور ضمان بھی مشتری کی طرف لوٹے، چنانچہ ''ہندیہ'' میں ہے:

''وتسلیم المبیع هو ان یخلی بین المبیع و بین المشتری علی وجه یتمکن المشتری من قبضه بغیر حائل وکذا التسلیم فی جانب الثمن کذا فی الذخیرة'' (۳/ ۱۹)۔

(اور مبیع کا سپرد کرنا وہ یہ ہے کہ مبیع اور مشتری کے درمیان سے اس طرح الگ ہو جائے کہ مشتری بغیر کسی حائل کے قبضہ پر قادر ہو اسی طرح ثمن کی جانب میں سپردگی شرط ہے)۔

حالانکہ کموڈیٹی ایکسچینج اور دیگر عالمی مالیاتی اداروں میں ایسا نہیں ہوتا، کیوں کہ مشتری تو اسے آگے فروخت کرسکتا ہے، لیکن اگر اس کے قبضہ سے پہلے ہی وہ چیز ہلاک ہوگئی تو وہ بائع کے ضمان سے ہلاک ہوتی ہے حالاں کہ اس میں تو مشتری کی طرف ضمان آنا چاہئے تھا (کچھ کمپنیوں نے اب ضمان کو مشتری کی طرف بھی عائد کیا ہے، لیکن اس کے مال کو ہلاکت کی صورت میں بچانے کے لئے انہوں نے انشورنس کی شرط لگا رکھی ہے، یعنی ان کو مارکٹوں میں جب بھی کوئی شخص خرید وفروخت کرے گا تو اسے اپنی بیع کا انشورنس کرانا پڑتا ہے، جو بذات خود نا جائز ہے)، اور یہ ربح مالم یضمن کے قبیل سے ہے کیوں کہ وہ آگے تو بیچ سکتا ہے لیکن ضمان اس کی طرف عائد نہیں، لہٰذا ان مارکٹوں کی چیزیں خرید تو سکتے ہیں لیکن قبضہ حقیقی یا حسی سے پہلے اسے آگے نہیں بیچ سکتے، خلاصہ یہ ہے کہ اگر کموڈیٹی مارکٹ سے سونا یا چاندی خریدا جائے تو اس کے جواز کی کچھ شرطیں ہیں:

۱- متعاقدین بیع کرنا چاہتے ہوں سٹہ اور قمار بازی مقصود نہ ہو۔

۲- مبیع حقیقتاً موجود ہو۔

۳- احد البدلین پر مجلس میں قبضہ ہو تا کہ بیع ادھار در ادھار نہ ہو

۴- مبیع اس کے نام سے رجسٹر پر دیگر ذخیرے سے الگ کر کے محفوظ کردی جائے۔

۵- مبیع کی ہلاکت کی صورت میں ضمان مشتری کی طرف لوٹے۔

۶- اگر چوتھی شرط نہ پائی جائے تو مشتری قبضہ سے پہلے آگے نہیں بیچ سکتا کیوں کہ یہ ربح مالم یضمن کے قبیل سے ہے۔

الحاصل! اگر یہ شرطیں پائی جائیں تو اس کی خرید وفروخت کی اجازت ہوگی، لیکن یہ جواز کی امکانی صورتیں ہیں، کیوں کہ احقر کی معلومات کے مطابق جیسا کہ احقر نے ماہرین سے اس سلسلے میں گفتگو کی، ان کے ہاں یہ ساری حدود وقیود نہیں ہیں، نہ ہی یہ شرطیں پائی جاتی ہیں، بلکہ ان کا بھی یہی ماننا تھا کہ کموڈیٹی ایکس چینج میں خرید وفروخت مقصود ہی نہیں ہوتی صرف بھاؤ کی کمی بیشی سے فائدہ اٹھانا مقصود ہوتا ہے۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس جیسے ایک مسئلہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''وکذلك حکم شراء السلع المخزونة بواسطة البورصات العالمیة و کثیر من بیاعات بوصات السلع لایقصد

منها التسليم و التسلم و انما يقصد بها المضاربات من خلال تذبذب اسعارها، و ان هذه العمليات بالمقامرة اشبه منها بالبيوع الحقيقة، ولا شك فى حرمتها و لكن قد يقصد بها البيوع و حينئذ لابدّ من توافر الشروط الشرعية فى ذلك'' (فقه البيوع ۱۶/ ۴۱۴)۔

۵- اگر کوئی شخص کسی تاجر سے سونے یا چاندی کی کسی مقدار پر ادھار بیع کرلے اور پھر چند دن بعد جب ادائیگی کی تاریخ آئے تو اس وقت بیع کے وقت اور موجودہ نرخ میں تفاوت کے اعتبار سے اتنے روپئے لے یا تاجر کو دے یہ جائز نہیں کیوں کہ سونے چاندی کی روپے سے بیع کے وقت احدالعوضین پر قبضہ بھی شرط ہے اور یوم عقد کی قیمت بھی متعین اور یہ دونوں مفقود ہیں، لہٰذا یہ درست نہیں یہ تو صرف نرخ کی کمی بیشی کی بیع ہے، جو کہ سٹہ اور قمار کی ایک قسم ہے۔

۶- اگر کوئی شخص یا تاجر سونے یا چاندی کو اسی نیت سے ذخیرہ کرکے رکھے کہ اس کی قیمت بڑھے گی تو پھر مارکیٹ میں لے آئے گا تو یہ احتکار کی ممانعت میں داخل ہوگا، ہاں اگر کوئی شخص بغیر اس نیت کے سونا یا چاندی ذخیرہ کرکے رکھے تاکہ کبھی حاجت کی بنا پر اسے فروخت کرے تو یہ احتکار کے دائرہ میں نہیں آئے گا۔

۷- ہر کسی انسان کو چاہئے کہ جس ملک میں رہائش اختیار کر رہا ہے وہاں کے قوانین (جب کہ شریعت سے متصادم نہ ہوں) کی پاسداری کرے تاکہ نہ اس کی وجہ سے کسی فرد یا ادارہ کو تکلیف پہنچے اور نہ ہی اسے، اسمگلنگ غیر قانونی ہے، نیز اس میں دیگر غیر شرعی امور بھی داخل ہوجاتے ہیں، جیسے دھوکہ، جھوٹ، اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈالنا وغیرہ، اس لیے یہ مناسب نہیں بلکہ کچھ علماء کرام اسے ناجائز بھی فرماتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص کوئی حلال چیز غیر قانونی طور پر درآمد کرتا ہے تو اس کی خرید و فروخت پر اس کا اثر نہیں پڑے گا اس کی خرید و فروخت درست ہے اور اس کی کمائی حلال ہے۔



سونا چاندی کی تجارت سے متعلق جدید مسائل

قاضی عبدالجبار طیب ندوی[۱]

اللہ رب العزت نے بندوں کے آپسی تصرفات ولین دین کے احکامات کو کافی شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا ہے، عدل وانصاف پر مبنی ایسا کامل ومکمل نظام عطا کیا ہے جس کا کوئی مساوی نظام دنیا میں نہیں ہے، لہذا اس نظام میں عدول وانصاف کے دامن چھوڑنے کی ممانعت اور مفاد کے پیش نظر معاملات میں کمی وزیادتی کو ربوا اور سود کہہ کر مسلمانوں کو اس سے بچنے اور دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے؛ چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ" (البقرة: ۲۷۸)۔

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو)۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً" (آل عمران: ۱۳۰)۔

(اے ایمان والو! کئی گنا بڑھا کر سود مت کھاؤ)۔

"الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ" (البقرة: ۲۷۵)۔

(جو لوگ سود کھاتے ہیں کھڑے نہیں ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنا دے لپٹ کر)۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی ہے؛ چنانچہ ترمذی شریف میں ہے:

"عن ابن مسعود قال: لعن رسول الله ﷺ اكل الربوا وموكله، وشاهديه وكاتبه" (ترمذی: باب ماجاء فی أكل الربوا: ۱۲۰۶)

(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے اور اس کے گواہ بننے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے)۔

سونا اور چاندی کی تجارت میں چونکہ سود اور ربوا کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے اس باب میں احتیاط کو ملحوظ رکھنا اور شریعت کی پابندی کرنا ضروری ہے، سود کا حکم واضح ہوجانے کے بعد اب میں ان سوالات کے جوابات اللہ کی مدد اور اس کی توفیق سے لکھنا شروع کرتا ہوں، جو اسلامک فقہ اکیڈمی کے چوبیسواں سالانہ سیمینار کیلئے منتخب کردہ چار عنوانوں میں سے ایک ہے۔

۱- الف: کیا یہ بات درست ہوگی کہ سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار ہو؟

سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد اور دوسرا ادھار ہو یہ جائز نہیں کہ کیوں کہ سونے کو سونے سے اور چاندی کو چاندی سے یا اس کے قائم مقام دوسرے کسی اور ثمن سے خرید وفروخت جائز ہونے کے لئے فریقین کی طرف سے اپنے عوض پر الگ ہونے سے پہلے قبضہ حاصل کرنا ضروری ہے؛ چنانچہ مسلم شریف ہے:

"عن عبادة بن صامت رضى الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب والفضة بالفضة مثلًا بمثلٍ، سواءً بسواءٍ يدًا بيدٍ ... فإذا اختلفت هٰذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم إذا كانت يدًا بيدٍ" (مسلم: ۱۵۸۷، نصب الرایہ ۴/ ۴۳)

---

[۱] قاضی دارالقضاء، آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ، کڑپہ زیر انتظام: کڑپہ اسلامک ویلفیر سوسائٹی، کڑپہ۔

(حضرت عبادہ ابن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سونا، سونے سے اور چاندی، چاندی سے یا ایک ہی صنف کی چیز دونوں طرف سے ہو تو ان کا برابر ہونا ضروری ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں طرف سے نقد معاملہ ہو اور صنفین مختلف اور الگ ہوں تو تب بھی نقد ہونا ضروری ہے)۔

مذکورہ بالا حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سونا چاندی کے علاوہ دوسرا کوئی ثمن ہو تو تب بھی خرید وفروخت کے جائز ہونے کے لئے مجلس میں نقد معاملہ کرنا ضروری ہے، اس طرح کی بیع میں ادھار جائز اور درست نہیں ہوگا، جبکہ آج ورقی نوٹوں اور کرنسیوں (جس کے پیچھے اب نہ تو کوئی سونا چاندی ہے اور نہ یہ ان کی نمائندگی کرتے ہیں) کو ثمن عرفی مان لیا گیا ہے، گویا اس کا حکم ثمن حقیقی کے حکم کی طرح ہی ہے؛ لہذا ''فتاوی اللجنۃ الدائمۃ'' میں اس طرح کی بیع کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

''إذا كان الثمن الذی اشتری به مصاغ الذهب ذهبًا أو فضة أو ما يقوم مقامهما من الأوراق النقدية أو مستنداتها لم يجز، بل هو حرام، لما فيه من ربا النسيئة'' (فتاوی اللجنة ۱۳/ ۴۶۶)۔

لہذا سونا چاندی اور کرنسی مختلف الاجناس ہوئے، جب جنس مختلف ہو تو اس وقت مجلس میں کم سے کم ایک طرف سے قبضہ ضروری ہوتا ہے، اس لئے اس طرح کی بیع جائز نہیں ہوگی، تاہم خرید وفروخت میں عوض اگر کوئی عروض/ اشیاء ہو تو ثمن کو ادھار رکھنا جائز اور درست ہوگا۔

ب: سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر کومیکس گولڈ مارکیٹ یا ہندوستان کی سطح پر یہاں کی مارکیٹ ایم سی وغیرہ نے طے کیا ہو اس سے زیادہ یا کم قیمت میں خرید وفروخت بھی کرنا جائز نہیں ہوگا اور اس صورت میں میرے نزدیک کوئی ربوا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا، کیوں کہ سرکار کی طرف سے سونا چاندی کی قیمت متعین کرنے سے یہ سونا چاندی اور کرنسی نوٹ ہم جنس نہیں ہو جاتے ہیں، بلکہ جنس مختلف ہی رہتی ہے، اور جب جنس مختلف اور الگ ہو تو شریعت نے تفاضل کو جائز قرار دیا ہے، لہذا اب فریقین آپس میں جو بھی نرخ متعین کرلیں، شریعت نے اس کی اجازت دی ہے اس کو ربوا قرار نہیں دیا ہے، البتہ اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ثمنین میں سے کم از کم ایک پر بالفعل مجلس عقد میں قبضہ کرلے؛ کیوں کہ اگر مجلس میں کسی بھی ایک ثمن پر قبضہ نہیں کیا تو دونوں ادھار ہو جائیں گے، اور ادھار کی بیع ادھار سے لازم آئے گی جو شریعت مطہرہ میں ممنوع وحرام ہے، اسی کو فقہ کی اصطلاح میں بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں، صاحب تحفۃ الاحوذی رقمطراز ہیں:

''وإذا كانت النسيئة من الطرفين فهی من بيع الكالی بالكالی، وهو لا يصح عند الجمع'' (تحفة الاحوذی ۴/ ۳۶۶)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کی طرف سے مقرر کردہ نرخ سے کم یا زیادہ قیمت میں سونا چاندی کی خرید وفروخت میں ربوا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

اب بات رہ جاتی ہے کہ حکومت کے مقرر کردہ نرخ کے خلاف خرید وفروخت کرنے پر بیع کا کیا حکم ہوگا، یعنی بیع کی شرعی حیثیت کیا ہوگی۔

حکومت کا اشیاء کی قیمت (نرخ) متعین کرنا:

حکومت کی طرف سے کسی بھی شیٔ کی قیمت کے متعین کرنے کو عربی میں ''تسعیر'' کہتے ہیں؛ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت انسؓ کی ایک مرفوع حدیث نقل کی جاتی ہے:

''عن أنس قال الناس: يا رسول الله! غلا السعر فسعر لنا. فقال رسول الله ﷺ: إن الله هو المسعر القابض، الباسط، الرازق وإنی لأرجو أن ألقى الله وليس أحد منكم يطالبنی بمظلمة فی دم ولا مال'' (سنن أبی داؤد: ۳۴۵۶، ترمذی: ۱۳۱۴)۔

(حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قیمتیں بڑھ گئیں ہیں، آپ ہمارے لئے قیمتوں کو متعین کردیجئے، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیمت متعین کرنے والا صرف اللہ ہے اور وہی قیمتوں کو گھٹانے اور بڑھانے والا اور رزق عطاء کرنے والا ہے، میری خواہش ہے کہ میں اللہ رب العزت سے اس حال میں ملاقات کروں کہ تم میں سے کوئی بھی مجھ سے ظلم کی بنیاد پر کسی مال اور خون کے بارے میں مطالبہ نہ کرے)۔

مذکورہ حدیث سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اگر بازار میں قیمتیں بڑھ جائیں تو قیمتوں کو متعین کرنا ظلم ہے، اور ظلم حرام ہے، تسعیر قرآن کے حکم کے خلاف بھی معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ قرآن نے خریدنے اور بیچنے والے کو اپنے مال اور قیمتوں پر مکمل حق تصرف دیا ہے، اب وہ دونوں جس قیمت

میں چاہیں خریدیں اور جیسے چاہیں بیچیں، اگر حکومت تسعیر کا کام کرتی ہے تو گویا بائع ومشتری کے حق تصرف کو چھیننے کا کام کر رہی ہے، ایسی خرید وفروخت پر مجبور کر رہی ہے جس سے وہ راضی نہیں؛ چنانچہ حکومت کا یہ اقدام قرآن کریم کے اصول کے خلاف ہوگا، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

"إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" (النساء:۲۹) (لین دین آپسی رضامندی سے ہو)۔

احناف فقہاء کرام نے تسعیر کو مکروہ (تحریمی) قرار دیا ہے؛ چنانچہ علامہ آفندیؒ لکھتے ہیں:

''ويكره التسعير لقوله عليه السلام: لا تسعروا فإن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق'' (مجمع الانہر ۲/ ۵۴۸)

(نرخ متعین کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: قیمتیں متعین مت کرو، اللہ رب العزت ہی قیمت متعین کرنے والا ہے، وہی قیمتوں کو گھٹانے اور بڑھانے والا اور رزق عطاء کرنے والا ہے)۔

لیکن بازار کی قیمتیں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہوں، اور ارباب اشیاء جان بوجھ کر قیمتیں زیادہ وصول کر رہے ہوں تو اس وقت اس ظلم وتعدی کو روکنے کے لئے حکومت کو تسعیر کی اجازت ہے اور اسی میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت بھی ہے؛ چنانچہ علامہ آفندیؒ نے لکھا ہے:

''إذا تعدى أرباب الطعام في القيمة تعديًا فاحشًا فلا بأس به أي بالتسعير'' (مجمع الانہر ۲/ ۵۴۸)۔

(جب صاحب سامان قیمتوں میں کھلی زیادتی کر رہا ہو، (سامان کو ذخیرہ بنا کر رکھ رہا ہو) تو پھر نرخ متعین کرنے میں کوئی حرج نہیں)۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ اگر حکومت کی طرف سے اشیاء کا کوئی نرخ متعین کر دیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ میں فروخت نہیں کر سکتے تو یہ کرنسی کی تسعیر ہوئی، نہ کہ سرکاری ریٹ سے کم وزیادہ میں بیچنا رہا ہوا، ہاں اگر کوئی شخص سرکاری ریٹ سے کم وزیادہ پر بیچتا ہے تو تسعیر کی خلاف ورزی ہوگی، اور اولی الامر کے حکم کے خلاف ہوگا جبکہ اللہ نے ان کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے:

"أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم" (النساء:۵۹)۔

(اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہیں)۔

حتی الوسع تسعیر کی پابندی کرنی چاہئے اس سے کم وزیادہ پر بیچنا مناسب نہیں ہوگا تاہم معاملہ اگر وجود میں آ گیا ہے تو معاملہ کے منعقد ہونے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔

۲- الف: اس طرح کی خرید وفروخت کو بیع ہی کہیں گے، اجارہ نہیں، بیع میں بھی بیع مؤجل ہوگی؛ کیوں کہ یہاں تاجر کے زیورات بنانے میں سونے کے ذرات ایک طرف ہیں اور دوسری طرف کاریگر کے دھات جسے وہ سونے کے زیور بنانے میں استعمال کرتا ہے، اور پھر زیور تیار ہوتا ہے، کاریگر کے دھات کو ثمن مان لیں تو بیع مؤجل کی صورت ہو جائے گی؛ کیوں کہ بیع مؤجل کہتے ہی ہیں ایسی بیع کو جس میں مبیع نقد ہو اور ثمن ادھار ہو (تفصیلات کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۴/ ۳)۔

اجارہ نہیں کہہ سکتے ہیں، اجارہ میں ضروری ہوتا ہے کہ ایک طرف مال اور دوسری طرف نفع ہو یعنی کوئی مادی شئ نہ ہو، جیسے تعلیم پر اجرت کہ اس میں معلم کی طرف سے منفعت ہوتی ہے مال نہیں ہوتا ہے، مذکورہ سوال میں ہی اگر زیور بنانے والا کاریگر اپنی طرف سے کوئی دھات نہ ملاتا اور اس کے عوض اپنے پاس سونے کے ذرات نہ رکھتا؛ بلکہ وہ صرف اپنی طرف سے منفعت (نفع) دیتا تو پھر یہ صورت اجارہ کی ہو سکتی تھی؛ لیکن ظاہر ہے کہ کاریگر کی طرف سے دھات ہوتے ہیں اور اسی کے بقدر اسے سونا کے ذرات ملتے ہیں؛ اس لئے یہ بیع کی صورت ہوگئی، بیع میں بھی بیع مؤجل کی صورت ہوگئی۔

الغرض میرے نزدیک سونے کے لین دین میں مقدار کا جو یہ فرق ہے وہ بیع ہے نہ کہ اجارہ۔

ب: اس مسئلہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اجرت کے طور پر سونا (سونے کے ذرات) ہی ادا کیا جا رہا ہے، جو کہ صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ تاجر زیور کے لئے سونا دیتا ہے اور کاریگر اس کو زیور بنا کر دیتا ہے جس میں کاریگر کو دوسرے کچھ دھات ملانا پڑتا ہے، اس دھات کے بقدر سونا وہ رکھ لیتا ہے

اور وہی اس کی اجرت ہوتی ہے، اس کے علاوہ اسے کچھ بھی نہیں دیا جاتا ہے، غور کرنے والی بات یہ ہے کہ اس میں کاریگر کو دھات کا عوض ملتا ہے، گویا تاجر کاریگر کو سونا دیتا ہے اور کاریگر بدلہ میں تاجر کو دھات دیتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ایک بیع کی شکل ہوگئی، تاجر کی طرف سے سونے کو ثمن اور دھات کو بیع مان لیا تو معاملہ درست ہوجائے گا؛ لیکن کاریگر کی جو محنت ہے اس محنت کو یہاں کاریگر کی طرف سے تاجر کے لئے پیشکش (آفر) ماننا پڑے گا، اس لئے کاریگر سونے کے ذرات کو لے سکتا ہے اور اس میں اس کے لئے کوئی حرج نہیں ہے۔

۳- سونے کے پرانے زیور کا سونے کے نئے زیور سے اگر تبادلہ ہو تو اس میں بھی برابری ضروری ہے، سونے کا پرانا زیور زیادہ وزن کا لینا اور اس کے بدلہ میں سونے کا نیا زیور کم وزن میں دینا جائز نہیں ہوگا، گو یا کہ عمدگی اور ساخت میں فرق ہی کیوں نہ ہو، فقہاء کرام نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی حدیث سے یہ بات مستنبط کی ہے کہ سونے کا سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اگر تبادلہ ہو تو برابری ضروری ہے اور یہ برابری، عمدگی اور بناوٹ میں بھی ضروری ہے، عمدگی اور بناوٹ کے فرق سے لین دین میں تفاضل کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا ہے؛ چنانچہ علامہ مرغینانیؒ رقمطراز ہیں:

''فإن باع فضة بفضة أو ذهبًا بذهبٍ لايجوز إلا مثلًا بمثلٍ وإن اختلفا في الجودة والصياغة'' (ہدایہ ۲/ ۸۱)۔
(چاندی کو چاندی سے اور سونے کو سونے سے بیچنا جائز نہیں مگر برابر سرابر، اگرچہ کہ عمدگی اور بناوٹ میں فرق ہو)۔

۴- اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس مثلاً ایک کیلو سونا ہو اور وہ دو سو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے جاتے ہوں تو اس کو خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا؛ کیوں کہ سوال میں سونا سونے کی اینٹ کی شکل میں ہے، اور پھر خریدار کی خریدی ہوئی مقدار کے مطابق سونے کو سونے کی اینٹ سے الگ بھی نہیں کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ خریدار کو اس کا خریدا ہوا اگر سونا چاہئے تو اسے الگ کر کے نہیں دیا جائے گا، ایسی صورت میں اس کو قبضہ نہیں کہہ سکتے ہیں، قبضہ دراصل کہتے ہیں تخلیہ کو یعنی مالک اور شئ کے درمیان کوئی مانع تصرف امر باقی نہ رہے، جب چاہے مالک شئ کو استعمال میں لاسکتا ہے اور جب چاہے اسے فروخت کرسکتا ہے، یہ صورت اس مسئلہ میں نہیں ہے؛ لہٰذا اس کو خریدار کا قبضہ تصور نہیں کیا جائے گا، ہاں اگر خریدار کو اس کا خریدا ہوا سونا دیدیا جائے تو اس صورت میں اس کو قبضہ تصور کیا جائے گا۔

ب: جیسا کہ جز ب میں ہے کہ اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کردیا گیا ہو اور اسے مکمل حق تصرف بھی حاصل ہو تو اسے قبضہ تصور کیا جائے گا؛ کیوں کہ قبضہ کے لئے کسی بھی شئ کو ہاتھ میں لینا ضروری نہیں ہے بلکہ قبضہ کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے، اور یہ ہر دور کے عرف اور ہر عہد کے رواج اور طور طریقوں سے متعین ہوسکتی ہے؛ لہٰذا آج قبضہ کا عرف اگر یہی ہے اور عوام میں اسے رواج ملا ہوا ہے تو پھر کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کردیا جانا ہی قبضہ تصور کیا جائے گا، اس طرح خریدار کا سامان پر قبضہ متصور ہوگا۔

۵- سوالنامہ میں ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی جو صورت بتائی گئی ہے کہ ایک مہینہ کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے: ایک تولہ سونے کا سودا کرلیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا ہے اور نہ بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے، بس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے اس کا لین دین کرلیتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ صورت ناجائز اور حرام ہے اور شریعت کی روح کے بالکل مغایر ہے، اس طرح کی خرید و فروخت کے لئے حضور اکرم ﷺ نے جو اصول مقرر فرمایا ہے اس اصول کے خلاف ہے وہ اصول یہ ہے:

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے چند اشیاء کا نام لیا جن میں سونا اور چاندی بھی شامل ہے اور فرمایا کہ اگر ایک ہی صنف کی چیز دونوں طرف سے ہو تو ان کا برابر بھی ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں طرف سے نقد معاملہ ہو اور صنفین الگ ہوں تو تب بھی نقد ہونا ضروری ہے (دیکھئے، مسلم: ۱۵۸۷)۔

اس حدیث سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ:

۱۔ اگر دونوں طرف سے ایک جنس کی شئ ہوتو دونوں کا برابر ہونا ضروری ہے۔

۲۔ فریقین کی طرف سے اپنے عوض پر الگ ہونے سے پہلے قبضہ حاصل کرنا۔

۳۔ اگر صنفین الگ ہوتب بھی نقد ہونا ضروری ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنس الگ بھی ہوتب بھی ثمنین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں ہی قبضہ ضروری ہے، اور یہاں وہ شکل مفقود ہے؛ لہذا اس طرح کی بیع جائز نہیں ہوگی۔

۷- اس سوال میں دوشقوں پر بات کی جائے گی (۱) سونے کی درآمد کے لئے اسمگلنگ کا عمل جائز ہے یا نہیں، (۲) اسمگلنگ کے ذریعہ درآمد کیا ہوا سونے کو خریدنا اور اس کو بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

دوسری شق کا پہلے جواب تحریر کرتا ہوں کہ اس طرح کے درآمد کئے ہوئے سونے کا خریدنا و بیچنا دونوں جائز ہے؛ کیوں کہ یہاں نفس شئ میں کوئی معصیت نہیں ہے، ہاں اگر نفس شئ میں ہی معصیت ہوتو پھر اس کی خرید وفروخت مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''لا یکرہ مالم تقم المعصیة به'' (رد المحتار مع الدر ۴/ ۲۶۸)۔

البتہ مشتری کو چاہئے کہ وہ اس طرح کے سونے کی خرید وفروخت نہ کرے، کیوں کہ اس کے ساتھ خرید کا معاملہ کرنا اس کی معصیت میں تعاون کرنا ہے، اور اللہ رب العزت نے معصیت کے کاموں میں تعاون کرنے سے منع کیا ہے؛ چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (المائدۃ: ۲)۔

دوسری شق کا جواب یہ ہے کہ اسمگلنگ کا یہ عمل جائز نہیں ہے، کیوں کہ حکومت کی طرف سے سونے کے درآمد پر جو بھی واجبات تھے اس کی ادائیگی اس کے لئے ضروری تھی، اس نے وہ ادا نہیں کیا، اس نے حکومت کی خلاف ورزی کی اور یہ اس کے لئے جائز نہیں کیوں کہ اللہ رب العزت نے اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ قرآن میں ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ" (النساء: ۵۹)۔

اور حضور اکرم ﷺ نے امیر کی اطاعت کو اپنی اطاعت بتایا ہے؛ چنانچہ بخاری شریف میں ہے:

''من أطاعني فقد أطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله ومن يطع الأمير فقد أطاعني ومن يعص الأمير فقد عصاني''

(بخاری: ۲۹۵۷، مسلم: ۱۸۳۵)۔

ہندوستان یا اس جیسے ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے بھی اس ملک کے قانون کا ادب واحترام کرنا اور اس کی پیروی کرنا ضروری ہے، (اگر شریعت اسلامیہ سے متصادم نہ ہو) کیوں کہ اس ملک میں مسلمان عہد و پیمان کے ساتھ رہتے ہیں؛ اور عہد و پیمان پورا کرنا ہمارے لئے ضروری ہے؛ کیوں کہ اللہ رب العزت اسے پورا کرنے کا حکم فرماتا ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ" (المائدۃ: ۱)، "وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" (الاسراء: ۳۴)

نیز جو لوگ اسمگلنگ کا عمل کرتے ہیں وہ پوری قوم اور باشندگان ملک کو اپنی اس حرکت کے ذریعہ نقصان پہونچاتے ہیں اور زیر بار کرتے ہیں، جو غیر اسلامی ہونے کے علاوہ غیر انسانی حرکت بھی ہے؛ لہذا اسگلنگ کے عمل کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح اس کے ذریعہ درآمد کئے ہوئے سونے چاندی کی خرید وفروخت بھی ممنوع ہوگی تاہم اگر خرید وفروخت کا معاملہ کرہی لیتا ہے تو معاملہ درست ہوگا۔

۸- اس سوال کا جواب تحریر کرنے سے پہلے ایک ہلکی نظر اس کی تاریخ پر ڈالتے چلیں:

پلاٹین اسپینی زبان کا ایک لفظ ہے، اس کا معنی ہے چھوٹا سونا، اور یہ ایک قیمتی معدنیات میں سے ہے، اس کا رنگ سفیدی مائل ہوتا ہے، اس میں سونے کی طرح لچک ہوتی ہے۔

۱۷۵۵ء میں پہلی مرتبہ ایٹالین سائنسدان نے اس کا پتالگایا اور اس نے دنیا کے سامنے انکشاف کیا، شروع میں قیمت بہت معمولی تھی، اس وقت دنیا کو اس کی قیمت کا انکشاف نہیں ہوا تھا، جب سے اس کی خوبیوں کو دنیا نے پایا اور اس کے استعمال کرنے والوں کی طرف سے اس کی طلب میں اضافہ ہوا اس وقت سے اس کی قیمت مزید بڑھتی ہی رہی۔

زیورات میں اس کا استعمال اس کی صلابت اور قوت کی وجہ سے شروع ہوا، اور اب دانتوں اور عمل جراحی کے سامانوں کی تیاری میں بھی اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ (مراجعت کے لئے: mawdoo3.com)۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس کی قیمت سونے سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور عالمی پیمانے پر اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے، پلاٹین کو اسی وجہ سے لوگوں نے سفید سونا کہنا شروع کر دیا، سوال یہ ہے کہ کیا یہ حقیقی سونے کے حکم میں ہوگا، نیز عقود اور زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق ہوں گے؟

پلاٹین کا عرف اور رواج ایک سونے کی حیثیت سے ہی ہے، لوگوں کا پلاٹین کو سفید سونا کہنا اس بات کی دلیل ہے، لیکن اس کے باوجود پلاٹین کو حقیقی سونا نہیں کہا جا سکتا ہے، نیز عقود اور زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق نہیں ہو سکتے ہیں، دلیل یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے یہ حکم قرآن میں ذکر نہیں کیا ہے، اس کی حیثیت بس ایک مباح شئ کی ہے، جس کا استعمال صنف کی تقسیم کئے بغیر مرد وعورت دونوں کے لئے جائز ہے۔

نیز لوگوں کے عرف کی وجہ سے بھی پلاٹین حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہو سکتا، کیوں کہ یہ عرف اب صرف پلاٹین کے ساتھ ہی خاص نہیں رہا؛ بلکہ دوسری دیگر اشیاء کو بھی عرف میں سونا کہا جاتا ہے، مثال کے طور پر قطن یعنی کارٹن کو عوام نے اس کے قیمتی ہونے کی وجہ سے سفید سونا کہنا شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح پٹرول کی دولت آج کی حکومتوں کے لئے ایک بڑی دولت ہوتی ہے، ملک کی معیشت کا براہ راست اس سے تعلق ہوتا ہے، عوام نے پٹرول کو بھی کالا سونا کہنا شروع کر دیا ہے، پس اگر اس عرف کی بنیاد پر پلاٹین کو حقیقی سونا تصور کر لیا گیا تو پھر قطن اور پٹرول کو بھی حقیقی سونے کے حکم میں ماننا پڑے گا؛ لہذا میرے نزدیک عرف کی بنیاد پلاٹین سونے کے حکم میں نہیں ہوگا، نیز عقود اور زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام بھی منطبق نہیں ہوں گے۔

چوں کہ اس کے زیورات دو طرح سے بنائے جاتے ہیں:

۱- خالص پلاٹین سے۔

۲- سونے چاندی اور دیگر معدنیات کے ساتھ ملا کر۔

لہذا خالص پلاٹین کا بنا زیور کا استعمال مرد وعورت دونوں کے جائز ہوگا اور عقود وزکوۃ وغیرہ میں حقیقی سونے کے احکام منطبق نہیں ہوں گے، اگر سونا چاندی کے ساتھ بنایا گیا ہو تو پھر اس کا استعمال عورتوں کے لئے تو جائز ہوگا مردوں کے جائز نہیں ہوگا، نیز اس زیور کی خرید و فروخت یا استعمال میں وہی سارے احکام نافذ ہوں گے جو سونا چاندی کے ہیں۔

☆☆☆

سونا چاندی کی خرید وفروخت اور جدید مسائل

مفتی عبد الباسط قاسمی پالنپوری[1]

۱- روپیہ کی شرعی حیثیت:

(الف) موجودہ کرنسی (کاغذی نوٹ، سکے) سونے چاندی کے حکم میں نہیں ہے، بلکہ ان کی حیثیت ثمن اصطلاحی وعرفی ہے، اور ثمن اصطلاحی سے مراد وہ شیء ہے جو لوگوں کے عرف واتفاق کی وجہ سے ثمن کے درجہ میں آ گئی ہو، جب کہ سونا چاندی کی حیثیت ثمن حقیقی کی ہے، نیز دونوں کی اجناس مختلف ہیں، لہذا موجودہ کرنسی کے ذریعہ سونا چاندی کی خرید جائز ہے، چاہے زیورات خریدیں یا بسکٹ یا دراہم وغیرہ، لیکن ذریعۂ تبادلہ کی صورت میں کرنسی نوٹ احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے، لہذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار، البتہ دو ملکوں کی کرنسیاں دو اجناس ہیں، اس لئے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ حسب رضائے فریقین جائز ہے، روپے سے سونا چاندی خریدنے کی صورت میں ایسی بیع کو بیع صرف تصور نہ کیا جائے گا، ان پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے، کیوں کہ بیع صرف کی تعریف امام قدوریؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:

”الصرف هو البيع إذا كان كل واحد من عوضيه من جنس الأثمان فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لم يجز... الخ“ (المختصر القدوری: ۸۵)۔

بیع صرف وہ بیع ہے: جس میں ثمن اور مبیع دونوں سونا چاندی کے جنس سے ہوں، سونا چاندی اور روپے میں ایک نقد اور دوسرا ادھار ہونے کی صورت میں بھی بیع درست ہوگی، اس لئے کہ روپے سے سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے، بشرطیکہ عوضین میں سے کسی کا ایک مجلسِ عقد میں قبضہ ہو جائے تا کہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

”لما قال العلامة ابن عابدين الشامي (تنبيه) سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحد البدلين“ (رد المحتار ۴/ ۲۰۵ باب الربوٰا)۔....... ”وفي الهندية: قال: و روى الحسن عن أبي حنيفة إذا اشترى فلوسا بدراهم و ليس هذا فلوس و لا عند الآخر دراهم ثم إن أحدهما دفع و تفرقا جاز و إن لم ينقد واحد منهما حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط“ (الفتاویٰ الهنديه ۳/ ۲۲۴ في بيع الفلوس)۔

(ب): کومیکس گولڈ مارکیٹ یا حکومت کے مقرر کردہ نرخ پر سونے چاندی کی خرید وفروخت میں کمی بیشی اختیار کرنا:

آج کل سونا اور چاندی کی تجارت بہت ہی عروج پر ہے، اس کے لئے با قاعدہ مارکیٹ کا وجود ہے، اب اس میں حکومت یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر کومیکس گولڈ مارکیٹ یا ہندوستانی مارکیٹ Mc نے اس کا نرخ طے کیا ہے، لیکن لوگ بلیک مارکیٹ میں یا ذاتی معاملات میں حکومت کے مقرر کردہ ریٹ کے بجائے اپنی مرضی سے ریٹ لگا کر خرید وفروخت کرتے ہیں، جو حکومت کے مقرر کردہ بھاؤ سے کم وبیش ہوتا ہے، اس بارے میں حکم شرع یہ ہے کہ جب بائع ومشتری باہمی رضامندی سے یہ عقد کرے تو جائز ہے، بشرطیکہ یہ عقد دھوکہ اور فریب سے خالی ہو۔

”من مناهج الشريعة العامة الصفقات التجارية و كافة العقود و الاتفاقات ان لايتم ابرام العهود الا بمرضاة الطرفين و أن يكون لهما التحرر و الاختيار حتى لايتضرر به الآخر“ (فقه الحلال و الحرام: ۲۳۲)۔

---

[1] مفتی واستاذ مدرسہ کنز مرغوب، پٹن۔

''وللبائع أن يبيع بضاعته بما شاء من ثمن و لا يجب عليه أن يبيعه بسعر السوق دائما، و للتجار ملاحظة مختلفة فی تعيين الاثمان و تقريرها الخ'' (قضايا فقهية معاصرة: ۸)۔

لیکن یہ معاملہ اس قانون کی خلاف ورزی ہے جو مفاد عامہ کے لئے حکومت نے نافذ کیا ہے، اس لئے اس خارجی سبب کی بنا پر اس طرح کے معاملات کی اجازت نہ ہونی چاہئے، کیوں کہ فقہ اسلامی کا قاعدہ ہے کہ جائز و مباح امور میں قوانینِ حکومت کی پابندی واجب ہے۔

جیسا کہ ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے: ''إذا كان فعل الإمام مبنيا على المصلحة فيما يتعلق بالأمور العامة لم ينفذ أمره شرعا إلا إذا وافقه فإن خالفه لم ينفذ'' (الاشباه و النظائر: ۲۱۲)۔

البتہ اس آمدنی کو حرام نہ کہا جائے گا، کیوں کہ نفسِ عقد میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جیسا کہ شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس عقد میں معصیت نہ ہو وہ مکروہ نہیں ہے۔

''و عرف بهذا أنه لا يكره بيع ما لم يقم المعصية به كبيع الجارية المغنية و الكبش النطوح و الحمامة الطيارة و العصير و الخشب ممن يتخذ منه المعازف'' (شامی ۶/ ۴۲۱ باب البغاة)۔

حکومت کے مقرر کردہ نرخ کی خلاف ورزی میں ربا تفاضل کا اطلاق نہ ہوگا، کیوں کہ عموماً فقہاء نے ربا تفاضل کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ کے الفاظ ہیں:

''فالظاهر من كلام المصنف تعريف ربا الفضل، لأنه هو المتبادر عند الإطلاق و لذا قال فی البحر فضل أحد المتجانسين، نعم هذا يناسب تعريف الكنز بقوله فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال'' (ردالمحتار ۷/ ۳۹۹ باب الربوا زکریا)

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جب عاقدین باہمی رضامندی سے معاملہ کر رہے ہیں، نیز دونوں کی جنس بھی مختلف ہے، لہٰذا یہ اضافہ ربا تفاضل کی فہرست میں نہیں آئے گا۔

۲-الف: سونار کا متعینہ وزن میں بعوض مزدوری سونا لینا، شرعی نقطۂ نظر:

زیور بنانے والے کاریگر کے زیورات کے تاجروں سے ایک متعینہ وزن میں سونے لینے کی جو صورت سوال نامہ میں درج ہے وہ اجارہ تصور کی جائے گی، کیوں کہ اس پر اجارہ کی تعریف کا اطلاق ہوتا ہے، اور اجارہ منافع بالعمل کی صورت ہے، مندرجہ ذیل قدوری کی عبارت سے اجارہ کی تعریف و تفصیلات معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ ابوالحسن القدوریؒ تحریر فرماتے ہیں:

''الإجارة عقد على المنافع بعوض''۔۔۔۔۔۔ ''و تارة تصير المنافع معلومة بالمدة و تارة تصير معلومة بالعمل و التسمية كمن استاجر رجلا على صبغ ثوب أو خياطة ثوب الخ'' (قدوری: ۱۰۰)۔

مذکورہ عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ سوال میں مذکور صورت اجارہ منافع بالعمل ہے۔

(ب) عامل کے جزء عمل ہی کو اجرت بنانا:

عامل کے جزء عمل کو اجرت بنانا قفیز طحان کے دائرہ میں آتا ہے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے، جیسا کہ سنن کبریٰ کی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی جفتی کی اجرت اور قفیز طحان سے منع فرمایا ہے:

''عن أبي سعيد الخدری قال نهی عن عسب النحل و عن قفيز الطحان'' (السنن الكبریٰ للبيهقی ۵/ ۳۳۹)۔

یہ مسئلہ متفق علیہ نہیں ہے، بلکہ فقہاء کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ اس طرح اجرت کی تعیین درست ہوگی یا نہیں؟

جمہور فقہاء نے اس کو منع کیا ہے، اور بعض مالکیہ اور امام مزنیؒ جائز قرار دیتے ہیں، جیسا کہ الفقہ الاسلامی کی عبارت ہے۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: الفقہ الاسلامی وأدلتہ ۴/ ۵۴۳، الہدی دیو بند)۔

البتہ ضرورت وتعامل ناس کی بنا پر مشائخ بلخ نے اس طرح کی صورت کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ ''الفتاوی الھندیہ'' میں مذکور ہے:

''و مشائخ بلخ جوزوا هذه الإجارة لمكان الضرورة و التعامل'' (فتاوی ھندیہ۴/ ۴۴۵)۔

نیز مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے جدید فقہی مسائل میں قفیز طحان کے مسئلہ میں تفصیلی کلام کیا ہے، جس کو خلاصہ کے طور پر یہاں پیش کیا جارہا ہے:

اس سلسلہ میں مختلف نظائر پیش کئے ہیں، مثلاً:

۱- مزارعت، اس میں مزارع کو پیداوار کا ایک حصہ ہی اجرت پر دیا جاتا ہے، جو صریحاً عامل کے جزء عمل کو اجرت بنانے کی نظیر ہے۔

۲- مساقاۃ کا مسئلہ ہے، جس میں بھی کھیتی کی طرح پھلوں میں بھی بٹائی داری کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔

۳- مضاربت ہے، اس میں جو بھی نفع حاصل ہوتا ہے وہ ایک خاص تناسب کے ساتھ دونوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، یہاں بھی تاجر و مضارب کو اس کا جزء عمل ہی اجرت کے طور پر ملتا ہے، حالاں کہ اس کے جواز پر فقہاء کا اتفاق ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے پوری تفصیلی بحث کے بعد خلاصۂ بحث کو ذکر کیا ہے، اور قیمتی نکات کو بیان کیا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

پس اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ

۱- قفیز طحان والی روایت معلول اور متکلم فیہ ہے۔

۲- قفیز طحان والی روایت کی اس طرح تاویل ممکن ہے کہ اس کو اس صورت پر محمول کیا جائے جب کہ مقدار مقرر نہ کی گئی ہو۔

۳- اگر تاویل نہ کی جائے اور سمجھا جائے کہ عامل کے جزء عمل کو اجرت نہ بنایا جائے تو ایسے تمام جزئیات پر اس حکم کا انطباق قیاس کی قبیل سے ہوگا۔

۴- قیاس کے ذریعہ جو احکام ثابت ہوں، اور عرف ورواج اس کے خلاف ہو تو مروج ومعروف عمل جائز قرار دیا جاتا ہے، اور قیاس چھوڑ دیا جاتا ہے۔

۵- ہمارے زمانہ میں کاروبار اور معاملات کے مختلف ایسے طریقے مروج ہیں جن میں عامل کے جزء عمل کو ہی اجرت بنایا جاتا ہے۔

۶- ایسی صورتوں میں گو قطعی مقدار مقرر نہیں کی جاتی لیکن ایسا تناسب مقرر کیا جاتا ہے جو اجرت کی مقدار مآلاً متعین کر دیتا ہے اور نزاع پیدا نہیں ہوتا، اور کسی معاملہ میں ایسی جہالت اور عدم تعیین جو نزاع کا باعث نہ ہو مضر نہیں ہے۔

۷- شریعت میں مزارعت، مساقات اور مضاربت کی صورت میں ایسی نظیریں موجود ہیں اور صحت اور صراحت کے ساتھ ثابت ہے جو عامل کے جزء عمل کو اجرت مقرر کرنے کو درست قرار دیتی ہیں، پس ہمارے زمانہ میں کاروبار اور معاملات میں ایسی صورتیں جو قفیز طحان کی قبیل سے ہیں اور کثرت سے مروج ومعمول ہیں جائز ہونی چاہئیں (جدید فقہی مسائل ۴/ ۳۳۴)۔

مذکورہ کتاب کی عبارت اور مشائخ بلخ کے مذہب کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ سوال (۲) میں مذکور صورت میں ضرورت اور تعامل ناس اور عرف ورواج کی بناء پر جواز کا حکم ہوگا۔

۳- سونے کا پرانہ زیور زیادہ وزن کا لے کر سونے کا نیا زیور کم وزن والا دینا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت ربا کا ایک جامع اصول بیان فرمایا ہے، چنانچہ جامع بخاری ومسلم کی روایت ہے:

''الذهب بالذهب و الفضة بالفضة و البر بالبر و التمر بالتمر و الشعير بالشعير و الملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ يداً بيد، فمن زاد أو استزاد فقد أربى أى دخل فى الربا المحرم، الآخذ و المعطى فيه سواءٌ'' (البخاری: رقم ۱۲۴۳ و مسلم: رقم ۱۵۸۴)

حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشیاء ستہ میں کسی کو اسی جنس کے عوض فروخت کرنا ہو تو اس کے جواز کے لئے دو شرطیں بیان فرمائی ہیں:

۱- برابر وزن میں فروخت کیا جائے، کسی طرف کمی بیشی نہ ہو۔

۲- نقد فروخت کیا جائے، ایک طرف یا دونوں طرف سے ادھار نہ ہو۔

اس میں زیادتی کرنے والا اور زیادتی کا مطالبہ کرنے والا سود خوری کے حرام طریقہ کو اپنانے والا ہوگا، اس میں لینے والے اور دینے والے دونوں گناہ میں برابر شریک ہوں گے۔

فقہاء کرام نے حدیث میں بیان کردہ اصول کو سامنے رکھتے ہوئے بیع صرف کے احکام تحریر فرمائے ہیں، چنانچہ امام قدوری تحریر فرماتے ہیں:

''فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لم يجز إلا مثلا بمثل وإن اختلفا في الجودة و الصياغة و لابد من قبض العوضين قبل الافتراق'' (قدوری: ۸۵) (تفصیل کے لئے دیکھئے: الفقه الاسلامي وأدلته ۴/ ۴۳۶،۴۷۷)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فقہاء نے تجارت میں سود ثابت ہونے کے لئے دو چیزوں کو علت قرار دیا ہے، ۱-جنس ۲-قدر اب ایک چیز کو دوسری چیز کے عوض فروخت کرنے میں اگر دونوں وصف پائے جائیں تو عوضین کا مساوی ہونا اور نقد ہونا ضروری ہے، خواہ دونوں کے درمیان جودت اور زرگری میں تفاوت کیوں نہ ہوں، اب اگر کمی بیشی کے ساتھ یا ادھار فروخت کرے تو دونوں صورتوں میں سود لازم آنے کی وجہ سے حرام ہے۔

اوپر بیان کردہ اصول سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سوال نمبر (۳) میں تحریر کردہ صورت بھی بیع صرف کی قبیل سے ہے، اور بیع صرف کے جواز کی بنیادی شرطیں جنس اور قدر ہیں، یہاں قدر مفقود ہے، لہٰذا تاجروں کا سونے کے پرانے زیور زیادہ وزن کے لینا اور سونے کے نئے زیور کم وزن والے دینار باتفاضل کے پائے جانے کی وجہ سے شرعاً جائز نہیں ہے۔ جب کہ ایک ہی عقد میں یہ تبادلہ ہو، البتہ اگر دونوں عقد الگ الگ ہوں کہ پرانا زیور کم قیمت میں خریدا جائے اور نیا زیور زیادہ قیمت میں فروخت کیا جائے تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ عاقدین رضامند ہوں۔

۴-مشترک چیز میں خریدار کا قبضہ:

الف-احناف کے یہاں قبضہ کا مفہوم وسیع ہے، عندالاحناف قبضہ کا حاصل صرف تخلیہ ہے، اور احناف نے تخلیہ کے مفہوم میں وسعت پیدا کی ہے، اور تخلیہ حقیقی و حکمی کی دو صورتیں کر کے استیلاء کی تمام صورتوں کو سمیٹ لیا ہے، اور تخلیہ کا مطلب ہے کہ مبیع اور مشتری کے درمیان باعتبار حقیقت یا باعتبار عرف و عادت ایسا کوئی مانع اور حائل نہ ہو جو مشتری کو عرفی قبضہ کرنے سے اور اس میں تصرف کرنے سے روک سکے خواہ اموال منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، بلکہ مبیع اس حال میں ہو کہ مشتری اگر اس میں تصرف کرنا چاہے تو آزادی کے ساتھ تصرف کر سکے، اگرچہ مبیع ابھی بائع کے پاس ہی موجود ہو، چنانچہ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''و أما تفسير التسليم و القبض فالتسليم و القبض عندنا هو التخلية و التخلي و هو أن يخلي البائع بين المبيع و بين المشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع و المشتري قابضا له'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۴)۔

نیز ایک دوسرے مقام میں تحریر فرماتے ہیں: ''ولا يشترط القبض بالبراجم لأن معنى القبض هو التمكين و التخلي و ارتفاع الموانع عرفا و عادة حقيقة'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۸)۔

نیز مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے بیع قبل القبض کی بحث کرتے ہوئے قبضہ کے متعلق تفصیل تحریر فرمائی ہے، اس کو جدید فقہی مسائل میں دیکھا جا سکتا ہے (جدید فقہی مسائل ۴/ ۲۱۴)۔

حاصل یہ ہے کہ قبضہ کا مصداق نہ کتاب و سنت میں متعین ہے اور نہ فقہاء نے اس کا کوئی قطعی مفہوم مقرر کیا ہے، بلکہ یہ ہر دور کے عرف و رواج اور خرید کی گئی اشیاء کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہو سکتا ہے۔

آج کل کموڈیٹیز ایکسچینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اور سوال میں مذکور جو صورت بیان کی گئی ہے، اگر مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ ہے تو معاملہ درست ہوگا، اور قبضہ ثابت ہوگا۔

۱- فوری طور پر قیمت ادا کی جاتی ہو اور سونے کے حقوق خریدار کے متعلق ہو جاتے ہوں، کیوں کہ کموڈیٹیز ایکسچینج میں عام طور پر بعض انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے مبیع کی حوالگی میں تاخیر ہو جاتی ہے، تو اس عقد کو بیع کالی بالکالی سے بچانے کے لئے فوری طور پر قیمت ادا کرنا ضروری ہے، اور مبیع (سونا چاندی) کے حقوق خریدار سے متعلق ہونا اس لئے ضروری ہے تا کہ قبضہ محقق ہو سکے۔

۲- مبیع موجود ہو اور بائع کی ملکیت میں ہو، جو چیز اپنی ملکیت میں نہ ہو اس کی بیع درست نہیں، چنانچہ قدوری میں ہے:

''ولا یجوز بیع السمك فی الماء قبل ان یصطاده ولا بیع الطائر فی الهواء'' (۴۸)۔

۳- مبیع اس طرح متعین ہو کہ وہ دوسرے کی ملکیت سے ممتاز ہو، خواہ اس طرح اسے الگ کر دیا گیا ہو یا نمبر کے ذریعہ اس کو الگ کر دیا گیا ہو۔

(جدید مالیاتی ادارے: ۹۰)۔

ب- کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں مشتری کا نام درج کرنا قبضہ کے لئے کافی تصور کیا جائے گا:

اس سلسلہ میں حضرات فقہاء کی تحریر کا حاصل یہ ہے کہ بائع مبیع کو اپنے مال سے الگ کر کے اس طرح رکھ دے کہ مشتری اپنے سامان کو اپنے اختیار سے جب لے جانا چاہے، یا اس میں اپنے اختیار سے تصرف کرنا چاہے تو بائع کی طرف سے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

''ولا یشترط القبض بالبراجم لأن معنی القبض هو التمکین و التخلی و ارتفاع الموانع عرفا و عادة حقیقة''

(بدائع الصنائع ۵/ ۱۴۸)۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اصل چیز ضمان میں آ جانا ہے، اس ضمان میں آ جانے کے لئے حسی قبضہ کوئی ضروری نہیں بلکہ اگر اس نے حساً قبضہ نہیں کیا لیکن بائع نے تخلیہ کر دیا تو تخلیہ کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بھائی میں نے تمہیں قدرت دے دی ہے جب چاہو اس پر قبضہ کر لینا، پھر بھی اگر وہ میرے پاس ہی رہی تو بطور امانت ہوگی نہ کہ بطور ضمان، کیوں کہ اب ضمان بائع سے مشتری کی طرف منتقل ہو گیا ہے، تو اب قبضہ کا حکم بھی متحقق ہو گیا۔

(اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۱۰۰)۔

فقہاء کرام کی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اگر ہر مشتری کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو، اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کیا گیا ہو تو اس اندراج کو قبضہ کے لئے کافی تصور کیا جائے گا۔

جیسا کہ رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم "المجمع الفقهی الاسلامی" مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے میں ایک کرنسی کو دوسری کرنسی میں تبدیل کرنے کی صورت میں قرارداد تحریر کی ہے:

بینک کے رجسٹر میں اندراج اس شخص کے حق میں قبضہ کے لئے معتبر ہوگا (ص: ۳۲۶)

۵- مستقبل کی تاریخ پر خرید وفروخت:

آج کل بازار میں تجارت کی ایک خاص قسم رائج ہے، جس کو عربی میں المستقبلیات (Futures) کہا جاتا ہے۔

مستقبلیات وہ عقد تجارت ہے، جس کا مقصد کسی چیز کی معین مقدار کو مستقبل کی کسی معین تاریخ میں بیچنا یا خریدنا ہوتا ہے، عام طور پر جو لوگ اس قسم کے معاملات میں حصہ لیتے ہیں، وہ دو قسم کے ہوتے ہیں، ان دونوں کے اغراض الگ الگ ہوتے ہیں، بعض لوگ وہ ہوتے ہیں جو نفع کی امید پر اپنا روپیہ داؤ پر لگاتے ہیں، جن کو اصطلاح میں مخاطر (Speculator) کہا جاتا ہے، ان لوگوں کا مقصد اس معاملہ کے ذریعہ نہ بیچنا ہوتا ہے، نہ خریدنا، نہ مبیع مقصود ہوتی ہے اور نہ ہی ثمن، بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ قیمتِ خرید اور قیمتِ فروخت کے درمیان جو فرق ہے اس کو بطور نفع کے وصول کریں، چنانچہ یہ لوگ عام طور پر قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے ماہرین کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے مستقبل کا معاملہ اس امید پر کر لیتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد جب دام بڑھے گا اس وقت اس کو زیادہ قیمت پر فروخت کر لیں گے۔ اور اس عقد کے نتیجہ میں ان کو مبیع پر قبضہ اور اس کی سپردگی کی تکلیف میں پڑے بغیر ہی خالص نفع حاصل ہو جائے گا، اب بعض اوقات ان کی یہ امیدیں کامیاب ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات ناکام ہو جاتی ہیں۔

اور بعض لوگوں کا اس عقد کے ذریعہ یہ مقصد ہوتا ہے کہ وہ جو عقد فی الحال کر رہے ہیں، آئندہ زمانہ مستقبل میں اس کے نفع کی حفاظت کر لی

جائے، تاکہ آئندہ نقصان سے بچ جائیں، جس کو اصطلاح میں تامین الربح (Hedging) کہا جاتا ہے، یہ فیوچر ٹریڈنگ کا مختصر خلاصہ ہے۔
(اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۳/۲۵۵ تا ۲۶۰)۔

سوال (۵) میں مذکور صورت پہلی قسم کی قبیل سے ہے، اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ شرعاً حرام اور ناجائز ہے اور شریعت کے بہت سے احکام سے متصادم ہے، نیز اس میں قمار اور جوا بھی ہے، حقیقت میں خرید وفروخت مقصود نہیں ہے، محض نفع نقصان مدنظر ہوتا ہے، دونوں طرف سے عوضین ادھار ہے، اور یہ بیع الکالی بالکالی کی قبیل سے ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ نے ابن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے:

''عن ابن عمر أن النبی ﷺ نهى عن بیع الکالی بالکالی'' (مشکوٰۃ: ۲۴۸)۔

نیز قمار، جوا کا حرام ہونا نص قطعی سے ثابت ہے۔

"یأیها الذین اٰمنوا انما الخمر و المیسر و الانصاب و الازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ" (المائدۃ: ۹۰)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ جاہلیت کے جو قمار آمیز معاملات تھے، مثلاً بیع ملامسہ، بیع منابذہ، بیع حصاۃ، بیع عربان وغیرہ سے منع فرمایا ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممنوع کردہ صورتوں کا اصولی وتفصیلی تجزیہ کیا ہے، اور واضح کیا ہے کہ اسباب ممانعت میں سے ایک وہ ہے جس میں قمار کی کیفیت پائی جاتی ہو۔

''واعلم أن من البیوع ما یجری فیه معنی المیسر، و کان أهل الجاهلیة یتعاملون بها فیما بینهم فنهی عنها النبی ﷺ'' (رحمة الله الواسعه ۲/ ۵۶۰)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سوال (۵) میں مذکور صورت کسی بھی صورت میں جائز نہ ہوگی، کیوں کہ وہ قمار جوا ہے، حقیقت میں خرید وفروخت مفقود ہے، اور محض ایک کاغذی کارروائی ہے، اسی کی بنیاد پر نفع یا نقصان ہوتا ہے، اس سے احتراز لازم ہے۔

۶- سونا چاندی کا احتکار اور اس کا شرعی حکم:

احتکار کا لغوی معنی ذخیرہ اندوزی یعنی غلہ کو اس نیت سے ذخیرہ کرلینا کہ جب ریٹ بھاؤ بڑھے گا تو فروخت کروں گا، اور شریعت کی اصطلاح میں اشیاء ضروریہ کو خرید کر اس طرح روک لینا جس سے اہل شہر کو مشقت لاحق ہو۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''وذلك أن یشتری طعاما فی مصر و یمتنع من بیعه و ذلك یضر بالناس'' (۴/ ۲۱۳)۔

احتکار کے معاملہ میں ائمہ فقہاء کی آراء مختلف ہیں، امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک صرف غذائی اشیاء میں ممنوع ہے، چاہے وہ انسانی غذائی اشیاء ہوں یا جانوروں کی، اور امام محمدؒ کے نزدیک ہر اس چیز میں جو عوام الناس کو نقصان پہنچائے، چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''و تخصیص الاحتکار بالأقوات کالحنطة و الشعیر و التبن و القت قول أبی حنیفة و قال أبو یوسف کل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتکار و إن کان ذهبا أو فضة أو ثوبا'' (ہدایہ ۴/ ۴۷۰)۔

امام مالکؒ کی بھی رائے امام ابو یوسفؒ کی طرح ہے، چنانچہ ''فتاویٰ ہندیہ'' میں مذکور ہے:

''و الاحتکار فی کل ما یضر بالعامة فی قول أبی یوسف و قال محمد: الاحتکار بما یتقوت به الناس و البهائم کذا فی الحاوی'' (الهندیه ۳/ ۲۱۳)۔

اور جب ضرورت لاحق ہو، اور روکنے سے ضرر ہونے لگے تو کراہیت کا حکم ہوگا، چنانچہ الفقہ الاسلامی میں مذکور ہے:

''إنهم اتفقوا علی أن الاحتکار یکون فی حال الضیق و الضرورة لا فی وقت السعة.... و یحرم الاحتکار أیضا عند المالکیة و أبی یوسف فی غیر الطعام فی وقت الضرورة، لا فی وقت السعة، فلا یجوز عندهم الاحتکار فی الطعام

وغیرہ من الکتان و القطن و جمیع ما یحتاج الیہ الإنسان أو کل ما أضر بالناس حبسہ قوتا کان أو لا و لو ثیابا أو دراھم'' (الفقہ الاسلامی و ادلتہ ۳/ ۵۸۸)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے سخت الفاظ میں محتکر کی مذمت فرمائی ہے، چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے: ''من احتکر فھو خاطی'' (رقم: ۱۲۲۸)۔

نیز ایک دوسری روایت میں ہے:

''الجالب مرزوق و المحتکر ملعون'' (نصب الرایہ ۴/ ۲۶۱، البنایہ ۱۱/ ۲۲۸)۔

فقہاء کرام نے حکومت اور انتظامیہ کو اس بات کا حقدار گردانا ہے کہ وہ ضروری سمجھے تو بالجبر ایسا مال نکال کر فروخت کرادے، چنانچہ ''فتاوی ہندیہ'' میں لکھا ہے:

''قال محمد: للإمام أن یجبر المحتکر علی البیع إذا خاف الھلاک علی أھل المصر و یقول للمحتکر بع بما یبیع الناس'' (الھندیہ ۳/ ۲۱۴)۔

''ومنھا بیع طعام المحتکر جبرًا علیہ عند الحاجۃ و امتناعہ من البیع رفعا للضرر و العام'' (الأشباہ و النظائر: ۲۱۳)

احادیث نبویہ اور فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ سونے کے تاجروں کا سونا روک لینا تاکہ ریٹ بڑھنے کے بعد اس کو فروخت کریں گے، یہ احتکار میں داخل ہے، کیوں کہ سونا ثمن خلقی ہونے کی وجہ سے اس کو روک لینے کی صورت میں سونے کی قیمت تو گراں ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس گرانی کا اثر دوسری چیزوں پر بھی پڑتا ہے، جس کی وجہ سے عوام الناس مشقت کے شکار ہوتے ہیں، جب کہ فقہ اسلامی کا ایک قاعدہ ہے: ''الضرر یزال''۔

لہذا احتکار میں امام ابو یوسفؒ کی رائے زیادہ قرین قیاس ہے، سونے کا احتکار نہ کرکے اس کو بازار میں لایا جائے اور احتکار سے بچا جائے تاکہ لوگوں کی پریشانی کا ازالہ ہوسکے، اور لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔

۷- اسمگلنگ کے راستہ سے آنے والا سونا، اور اس کی خرید وفروخت:

ہر آدمی کو اپنے روپیوں پیسوں کے ذریعے اپنی ضرورت یا پسند کی اشیاء جو بھی ہو، اور جہاں سے چاہے خریدنے کا حق حاصل ہے، لہذا بیرونی ممالک سے مال خریدنا یا وہاں فروخت کرنا شرعاً مباح اور درست ہے۔

''و للبائع أن یبیع بضاعہ بما شاء من ثمن و لایجب علیہ أن یبیعہ بسعر السوق دائمًا و للتجار ملاحظۃ مختلفۃ فی تعیین الأثمان و تقدیرھا'' الخ (قضایا فقھیۃ معاصرۃ/ ص۸)۔

لیکن مختلف ممالک اپنے ملک کی معاشی مصالح کے پیش نظر دوسرے ملکوں کی برآمدات پر پابندی عائد کردیتے ہیں کہ ان کے آنے کی وجہ سے ملکی مصنوعات اور ان کی نکاسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اور ملک کا معاشی نظام عدم توازن کا شکار ہوسکتا ہے۔

بیرونی ممالک سے اشیاء کے آمد کے دو راستے ہیں:

۱- ملک کے قانون کے مطابق ان اشیاء سے متعلق واجبات (ٹیکس وغیرہ) ادا کرکے لانا۔ ۲- دوسرا طریقہ اسمگلنگ کا ہے، یہ طریقہ غیر قانونی ہے۔

سوال (۷) میں مذکور طریقہ یہ دوسرا اسمگلنگ کا طریقہ ہے، یہ چند وجوہ سے ناجائز ہے، چنانچہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے جدید فقہی مسائل میں وضاحت کی ہے،

۱- ایک تو اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہے جو اس ملک کا شہری ہونے کے لحاظ سے اس کے قانون کے احترام کے سلسلہ میں ضروری ہے۔

۲- دوسرے اس طرح پوری قوم اور باشندگان ملک کو اپنی حرکت کے ذریعہ نقصان پہنچاتا ہے اور زیر بار کرتا ہے جو غیر اسلامی ہونے کے علاوہ غیر انسانی حرکت بھی ہے۔

معاشی مصالح کے پیش نظر اس قسم کی پابندیوں کی گنجائش ہے، اس کی نظیر 'تلقی جلب' اور 'بیع حاضر للبادی' ہے۔ جس کو مکروہ قرار دیا گیا ہے، وہ

کیوں کہ اس کی وجہ سے گرانی بڑھتی ہے، اور اس شہر کے باشندوں کو زک پہنچتی ہے، یہی مضرت اسمگلنگ سے بھی پیدا ہوتی ہے کہ غیر ملکی مصنوعات کی آمد کی وجہ سے اس ملک کی صنعت اور یہاں کا معاشی توازن بگڑتا اور متاثر ہوتا ہے (جدید فقہی مسائل ۱/۳۷۸)۔

تاہم اسمگلنگ کے طریقے سے حاصل شدہ سونے کی خرید وفروخت میں اگر جھوٹ بولنا نہ پڑے یا کسی گناہ کا ارتکاب لازم نہ آئے تو اس کی خرید وفروخت جائز ہونی چاہئے، چنانچہ حضرت مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا ہے، اگر (اسمگلنگ) کی گھڑیوں کی خرید میں جھوٹ بولنا یا کسی گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو خریدنا جائز ہے (فتاوی عثمانی ۳/۸۸)۔

۸-سفید سونا کی حقیقت:

حقیقت میں سونا زرد رنگ کا ہوتا ہے، اور اس میں غالبًا تانبا ملانے کی وجہ سے سرخ نام دیا جاتا ہے، اور عوام الناس کے نزدیک یہی معروف ہے، اور لغت، کتب احادیث ومعدنیات اور فقہاء کرام کے اقوال وغیرہ سے یہی معلوم ہورہا ہے، چنانچہ ''المعجم الوسیط'' میں مذکور ہے:

''الذهب: عنصر فلزی اصفر اللون'' (ص:۳۱۷)۔

''و فی الحدیث ان النبی ﷺ صالح أهل خیبر علی الصفراء و البیضاء و الحلقة، الصفراء: الذهب، و البیضاء: الفضة، و الحلقة: الدروع'' (ابو داؤد: باب ما جاء فی حکم ارض خیبر)۔........ ''و روی الطحاوی من طریق طعمة بن عمرو قال: رأیت صفرة الذهب بین ثنایا او قال ثنیتی موسیٰ بن طلحة'' (طحاوی ۲/۲۵۸)۔

زیورات بنانے والوں کا کہنا ہے وائٹ گولڈ کا اطلاق بہت سی چیزوں پر ہوتا ہے۔

۱- پلاٹین کی دھات پر وائٹ گولڈ کا اطلاق ہوتا ہے۔

''هناك معدن نفیس هو البلاتین تصنع منه أنواع من الحلی، قد یطلق علیه بعض الناس من غیر الصاغة''

(الذهب الابیض للشیخ عبدالرحمن بن فهدالودعان: ص ۲۳)۔

۲- وائٹ گولڈ کا اطلاق معروف زرد رنگ کے سونے پر ہوتا ہے، لیکن اس کے اوپر پلاٹین دھات کی پالش چڑھی ہوتی ہے، چنانچہ شیخ عبدالرحمن بن فہدالودعان وضاحت کرتے ہیں:

''الذهب الأبیض منه ما هو ذهب أصفر خلط ببعض المواد ینسب قلیلة اکتسبته اللون الأبیض... و منه ما هو ذهب اصفر ظلی بمادة جعلت ظاهره باللون الأبیض'' (حوالہ سابق)۔

۳- وائٹ گولڈ کا اطلاق معروف زرد سونے پر ہوتا ہے، لیکن ایک معین تناسب کے ساتھ اس میں پلاٹین یا کوئی اور مادہ ملایا جاتا ہے، یہ کیرٹ کے حساب سے کم وبیش ہوتا ہے، اور سونے کی دوکانوں میں یہی اطلاق مشہور ہے، چنانچہ شیخ الذہب العالم یوسف العطیر لکھتے ہیں:

''ان الذهب الأبیض هو الذهب المعروف الأصفر، و ما یجعله أبیض هو مادة تضاف علیه عند السبك من البلاد یوم و معدن آخر'' (حوالۂ سابق)۔

ماہرین معدنیات اور زیور بنانے والے تجربہ کار افراد کے اقوال کا جائزہ لینے کے بعد اگر ہم اطلاق اول (پلاٹین کی دھات پر وائٹ گولڈ کا اطلاق) کا اعتبار کرتے ہیں تو اس پر سونے کا حکم مرتب نہ ہوگا، نیز عقود، زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکامات ثابت نہ ہوں گے، کیوں کہ یہ مستقل ایک الگ دھات ہے، اور اسے وائٹ گولڈ کہنا صرف ایک اختیاری اصطلاح ہے، اور حقیقت میں یہ سونا نہیں، جس طرح پیٹرول کو بلیک گولڈ (سیاہ سونا) کا نام دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ سونا نہیں، بلکہ قیمتی ہونے میں مشابہت ہے۔

''ذهب بعض شیوخنا وغیرهم و بعض طلبة العلم الی ان ما یسمی بالذهب الأبیض لیس ذهبا حقیقیا۔ بل هو شیء آخر لایأخذ أحکام الذهب المعروفة و قالوا: تسمیة بالذهب غیر حقیقة، بل هو کما یسمی البترول بالذهب الأسود تجوّزًا من باب التشبیه، أو کما یسمی الحریر الصناعی بالحریر و لیس کذالك، و رتبوا علی هذا انه لایأخذ

احکامہ الشرعیۃ'' (الذھب الأبیض حقیقتہ: ۲۷)۔

یہی رائے شیخ عبداللہ بن سلیمان المنیع اور شیخ محمد ناصر الدین البانی کی بھی ہے، وہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

و لایعرف للذھب لون غیر الصفرۃ، فإذا کان ھناك معدن یسمی اصطلاحا: الذھب الأبیض، کالبلاتین و نحوھا، فلا یظھر لی الحاق ھذا النوع بالذھب المحرم علی الرجال التحلی بہ، و لو ترك الرجل التحلی بھذا النوع اتقائً للتشبھۃ لکان فی ذلك استبراء للدین و العرض'' (الذھب الابیض حقیقتہ: ۳۰)۔

اور علامہ البانی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''الذھب الأبیض نوعان: النوع الأول ھو البلاتین فھذا لا شیء فیہ، لانہ لم یات نص فی الشرع یحرم المعادن الثمنیۃ غیر الذھب و الفضۃ فالبلاتین یدخل تحت قاعدۃ: الاصل فی الاشیاء الاباحۃ'' (حوالہ سابق)۔

رہا زکوۃ کا حکم تو اللہ تعالیٰ نے معدنی اشیاء میں سے صرف سونا، چاندی میں زکوۃ کو واجب کیا ہے، اس کے علاوہ دوسری معدنی چیزوں میں واجب نہیں فرمائی ہے، تو من جملہ ان کے ایک پلاٹین بھی ہے، اس میں بھی زکوۃ کا وجوب نہ ہوگا، ہاں اس کی تجارت کرنے کی صورت میں دیگر تجارتی چیزوں کی طرح اس میں بھی زکوۃ واجب ہوگی۔

البتہ بعض سعودی ماہرین معدنیات کا کہنا ہے کہ اصل میں سونا تو زرد رنگ کا ہی ہوتا ہے اور اصلاً وائٹ گولڈ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، لیکن سونے میں کچھ مواد شامل کرکے اسے سفید رنگ میں تبدیل کیا جاتا ہے، چنانچہ وائٹ گولڈ تو زرد سونا ہی ہے، لیکن اس میں چاندی اور تانبے کے بجائے پلاٹین شامل کرنے سے وائٹ گولڈ بن جاتا ہے، اسی لئے وائٹ گولڈ بھی کئی کیرٹ کا پایا جاتا ہے اور یہ بات تو معلوم ہے ہی کہ سونے میں چاندی یا تانبا وغیرہ ملانے سے وہ سونے سے خارج نہیں ہوتا کیوں کہ معمولی غش تو ہوتا ہی ہے، تب جاکر زیور تیار ہوتا ہے، جیسا کہ ''ہدایہ'' میں ہے:

''لأن الدرھم لاتخلو عن قلیل غش، لأنھا لاتنطبع الا بہ'' (ہدایہ ۱/ ۱۹۵)۔

اس سے معلوم ہوا کہ وائٹ گولڈ حقیقی سونا ہے، اسی بناء پر وائٹ گولڈ مردوں کے لئے پہننا حرام ہے، کیوں کہ حقیقتاً یہ زرد سونا ہی ہے، لیکن اس میں ایسا مادہ ملایا گیا ہے جو اس کے رنگ کو تبدیل کرکے سفید کردیتا ہے، چنانچہ شیخ عبدالرحمن الودعان تحریر فرماتے ہیں:

''یتحقق الجمیع علی أن یسمی بالذھب الأبیض ھو ذھب حقیقی'' (الذھب الابیض حقیقتہ: ۱۹)۔

آگے خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں:

''و الخلاصۃ: أن الذھب فی أصلہ أصفر اللون، و لایوجد ذھب أبیض فی أصلہ، لکن قد یضاف إلیہ مواد تغیر لون الذھب الأصفر فیکون أبیض، أو أحمر، أو غیر ذلك بحسب المادۃ یخلط... أما ما یوجد فی الأسواق الآن و یسمی بالذھب الأبیض فھو ذھب أصفر حقیقی، خلط ببعض المواد... الخ'' (الذھب الابیض حقیقتہ: ۲۲)۔

وائٹ گولڈ کی حقیقت کے متعلق دریافت کئے گئے سوال کے بارے میں سعودی کمیٹی کا جواب نقل کیا جاتا ہے، اگر واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ سوال میں بیان کیا گیا ہے تو پھر سونے کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملاتے سے سونے کی جنس سے ہی اسے فروخت کرنے میں کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنے کی حرمت کے احکام سے خارج نہیں ہوجاتا، اور مجلس عقد میں اپنے قبضہ میں کرنے کے وجوب میں فرق نہیں آتا، چاہے وہ اسی جنس سے فروخت کیا گیا ہو یا پھر چاندی یا نقدی روپیوں میں، اور مردوں کے لئے پہننے کی حرمت سے بھی خارج نہیں ہوتا، اور اسی طرح اس کے برتن بنانے بھی حرام ہی رہیں گے (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیہ والافتاء: ۲۴/ ۶۰)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ وائٹ گولڈ حقیقی سونا ہے، سونے کے تمام احکام اس میں جاری ہوں گے۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق چند اہم اور جدید مسائل

مفتی جنید محمد پالنپوری[1]

۱۔ کاغذی نوٹ اور روپے سے سونا خریدنا بیع صرف میں داخل نہیں کیونکہ یہ کرنسی اور کاغذی نوٹ ثمن خلقی نہیں بلکہ ثمن عرفی اور ثمن اعتباری ہے، لہذا ان کا حکم فلوس جیسا ہوگا کیوں کہ وہ بھی ثمن اعتباری ہے۔ دوسری وجہ: اگر کرنسی نوٹوں سے سونے، چاندی کے تبادلہ کو "صرف" کہا جائے تو لازم آئے گا کہ جن اشیاء میں "صرف" جاری ہوتا ہے، ان میں ایک چیز کا اضافہ ہوگیا، یعنی نصوص سے صرف سونے چاندی میں صرف جاری ہونا ثابت ہے، اب لازم آئے گا کہ کرنسی نوٹوں میں بھی سونے چاندی کے علاوہ صرف جاری ہو، "ما یجزی فیہ الصرف" میں اس اضافہ کی کوئی بنیاد نصوص یا کلام فقہاء میں نہیں ملتی۔ تیسری وجہ: نوٹوں کی پشت پر اب نہ کوئی سونا ہے نہ چاندی ہے، لہذا ان کو سونے چاندی کا نمائندہ قرار دے کر بھی ان پر صرف کے احکام جاری کرنا مشکل ہے۔ چوتھی وجہ: عجب بات یہ ہے کہ غالب الغش سکوں سے سونے چاندی کے تبادلہ کو کلی طور پر صرف نہ کہا جائے جبکہ غالب الغش سکوں میں کچھ نہ کچھ سونا چاندی ہوتا ہے اور صرف ان ہی کے وزن کی حد تک ان میں تقابض شرط ہوتا ہے، زیادہ میں نہیں اور کرنسی نوٹوں کے تبادلہ کو کلی طور پر صرف کہا جائے جبکہ ان میں سونا چاندی بالکل نہیں ہے (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۴۲، ۱۴۵ ملخصا)۔

الف۔ بدلین ہر مجلس عقد میں تقابض ضروری نہیں بلکہ احد البدلین پر قبضہ کافی ہے۔

"وإذا اشتری الرجل فلوسا بدراهم ونقدا لثمن ولم تكن الفلوس عندالبائع فالبيع جائز لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود قد بينا أن حكم العقد في الثمن وجوبها ووجودها معا ولا يشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لايشترط ذلك في الدراهم والدنانير" (المبسوط للسرخسی ۱۴/ ۲۴)... "قال العلامة ابن عابدين: (تنبيه) سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فأجاب بأنه يجوز إذا قبض أحدا البدلين" (شامی ۴/ ۲۰۵)۔

ب۔ سونے اور چاندی کا جو نرخ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر کومیکس گولڈ مارکیٹ یا ہندوستانی سطح پر یہاں کی مارکٹ MC نے طے کیا ہو اس سے کم یا زیادہ قیمت پر خرید وفروخت کرنا جائز ہے، البتہ جن ملکوں میں سرکاری طور پر مقرر کردہ نرخ کی مخالفت قانونا جائز نہیں ہے تو وہاں اس نرخ سے کمی بیشی کرنا سود تو نہیں ہوگا لیکن ملکی قوانین کی مخالفت اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنے کی بنا پر جائز نہ ہوگا۔

"وفي أحكام القرآن للمحدث العلامة ظفر أحمد العثماني (۲/ ۲۹۱) وهذا الحكم أي وجوب طاعة الأمير يختص بما إذا لم يخالف أمره الشرع يدل عليه سياق الأية فإن الله تعالى أمر الناس بطاعة أولي الأمر بعدما أمرهم بالعدل في الحكم تنبيها على أن طاعتهم واجبة مادامو اعلى العمل اه" (وكذا في تفسير المظهري ۲/ ۱۵۲ والجامع لأحكام القرآن ۵/ ۲۵۹)۔

"تجب طاعة الإمام فيما ليس بمعصية" (الدر المختار ۲/ ۱۷۲)۔... "وفي شرح الجواهر تجب اطاعته فيما أباحه الشرع وهو ما يعود نفعه على العامة" (أيضا، تكملة فتح الملهم ۳/ ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، مستفاد فتاوی عثمانی ۳/ ۱۴۸)۔

۲۔ الف: اس معاملہ پر بیع کی تعریف صادق نہیں آتی، لہذا اسے بیع تصور نہیں کیا جائے گا۔

"البيع: مبادلة مال بمال على سبيل التمليك عن تراض" (معجم لغة الفقهاء)۔

ب۔ صورت مسئولہ میں اس دیگر دھات کی ملاوٹ کی شرح اور ذرات کی مقدار متعین نہ ہو تو یہ اجرت مجہول ہے، لہذا اس صورت میں یہ بچا ہوا سونا اور ذرات

[1] دار الافتاء والارشاد، مجلس البرکہ ممبئی۔

زیورات کے تاجر کا ہوگا اور کاریگر کو اجرت مثل ملے گی، یہ معاملہ اجارہ فاسدہ کا ہوگا۔

''والواجب في الإجارة الفاسدة أجر المثل الخ'' (ہدایہ)۔

''وشرطها: كون الأجرة والمنفعة معلومتين؛ لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة'' (الدر المختار)۔

''تفسد الإجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد، فكل ما أفسد البيع يفسدها كجهالة ماجوز أو أجرة''

(الدر المختار ٦/ ٤٦ باب الإجارة الفاسدة)۔

البتہ آج کل مارکیٹ میں زیورات کے تاجروں کی طرف سے کاریگروں کو دیگر دھات کی ملاوٹ کی شرح بھی بتلائی جاتی ہے اور اسی دھات کے بقدر بچا ہوا سونا اس کی اجرت قرار پاتی ہے، یہ صورت قفیز الطحان کی ہوگی جو ناجائز ہوگی۔

''لأنه جعل الأجر بعض ما يخرج من عمله فيصير في معنى قفيز الطحان وقد نهى النبي ﷺ'' (الهداية ٣/ ٣٠٥)۔

البتہ مشائخ بلخ نے یہ فرمایا کہ اگر کسی چیز کے بارے میں عرف ہو جائے یعنی اس طرح اجارہ کا عام رواج ہو جائے تو عرف نص کے لئے مخصص بن سکتا ہے، چنانچہ انہوں نے ''اجارة الحائك ببعض الغزل'' کو جائز قرار دیا ہے، یعنی بنکر کو اجرت پر لے لیا کہ کپڑے کا جو حصہ تم بناؤ گے اس میں سے اتنا حصہ تمہارا ہے تو یہ جائز ہے۔ اسی طرح اجتناء القطن مثلا بالنصف کہتے ہیں تو بھی جائز ہے، کیونکہ ہمارے یہاں اس کا تعامل اور عرف ہو گیا ہے اور جب عرف ہو جائے تو وہ نص میں تخصیص پیدا کرتا ہے، تو قفیز الطحان والی نص میں تخصیص کر کے یہ چیزیں اس سے نکل جائیں گی، یعنی اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ نص قفیز ان ہی تک محدود رہیں گی، اس کو دوسری اشیاء کی طرف متعدی نہیں کیا جائے گا کیونکہ عرف جاری نہیں۔

لہذا مشائخ بلغ کے قول پر یہ جائز ہے اور جو حسن بصری اور امام محمد کا قول ہے وہی مشائخ بلخ کا بھی ہے، ''وقال إبراهيم وابن سيرين وعطاء والحكم والزهري وقتادة: لا بأس أن يعطي الثوب بالثلث أو الربع نحوه'' (اسلام اور جدید معاشی مسائل ٢/ ٢٤٢)۔

''قال الشامي: مطلب يخص القياس والأثر بالعرف العام دون الخاص، قال في التبيين: ومشائخ بلخ والنسفي يجيزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسيج الثوب ببعض كمنسوج لتعامل أهل بلادهم بذلك، ومن لم يجوزه قاسه على قفيز الطحان'' (شامی ٩/ ٨٠ مكتبه زكريا)۔

زیر بحث مسئلہ میں بھی کاریگر کے لئے زیورات بناتے وقت سونے یا چاندی کے علاوہ ملائی جانے والی دھات کی شرح کی بقدر سونا اسی ڈلے ہوئے سونے میں سے لینے کا عرف ہے، لہذا مشائخ بلخ کے قول کے مطابق جائز ہوگا، اسی میں سہولت ہے۔

البتہ امام ابوحنیفہؒ کا اصل مذہب میں ناجائز ہے، لہذا متفق علیہ طور پر جواز کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ کاریگر سے یہ کہا جائے کہ ملائی جانے والی دھات کی شرح کی بقدر (جو معلوم و متعین ہوتی ہے) سونا آپ کو اجرت میں دیا جائے گا یعنی اسی دیئے ہوئے سونے میں سے دیا جائے گا یہ شرط نہ ہو تو جائز ہو جائے گا، پھر بعد میں زیورات کا تاجر اسی شرح کی بقدر الگ سے سونا دے دے یا اسی سے دے دے تو کوئی حرج نہیں، یہ جائز ہوگا۔

'' (وسئلت) فيمن استاجر أرضا بيضا للزراعة بكذا وكذا قفيزا من الغلة هل يجوز ذلك؟ ''فالجواب'' نعم! يجوز إذا كانت الأجرة مشارا اليها، أو موصوفة في ذمته، ولا تكون من الغلة التي تخرج من زرع الأرض المستاجرة كذا في فتاوى قاري الهدايه'' (الفتاوى الكاملية، كتاب الاجارة/ ص ١٩١، مستفاد فتاوى محموديه جديد ٢٢/ ٢٥٩)۔

٣- ان زیورات میں غالب سونا ہوتا ہے، لہذا نیا زیور کم وزن کا دے کر پرانا زیور زیادہ وزن کا لینا جائز نہیں۔

''قال: فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لايجوز إلا مثلا بمثل وإن اختلفا في الجودة والصياغة لقوله عليه الصلوة والسلام: الذهب بالذهب مثلا بمثل وزنا بوزن يدا بيد والفضل ربا، الحيث: قال عليه الصلوة والسلام ''جيدها ورديئها سواء'' وقد ذكرنا في البيوع'' (الهدايه ٣/ ١٠٤ كتاب الصرف)۔

٤- الف، ب: شرعی اعتبار سے سونا چاندی اور دوسری اجناس کی تعیین میں فرق ہے کہ دوسری اجناس اشارے یا علامتوں سے متعین ہو سکتی ہے، لیکن سونا چاندی اس وقت تک متعین نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر کوئی شخص خود یا اپنے کسی نمائندہ کے ذریعہ قبضہ نہ کر لے۔

''أن الدراهم والدنانير وإن كانت لاتتعين بالعقد ولكنها تتعين بالقبض وقبضها واجب'' (بدائع ۵/۲۱۸)۔

''وفيه ايضا: أن الدراهم والدنانير لا تعين بالتعيين وإنما تعين بالعقد فشرطنا التقابض للتعيين لا للقبض'' (۵/ ۲۱۹)۔...... ''فإن الدراهم والدنانير لاتعين بالعقد إلا بالقبض'' (فتح القدير ۶/ ۱۶۰)۔

اوپر کی عبارات سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی میں قبضہ کے لئے ضروری ہے کہ خریدا ہوا سونا چاندی غیر خرید سونے چاندی سے بالکل ممتاز اور الگ کرلیا جائے اور خریدار یا تو خود قبضہ کرے یا اس کا کوئی وکیل اس کی طرف سے اپنی تحویل میں اس طرح لے لے کہ وہ متعینہ سونا چاندی چوری ہوجائے تو نقصان خریدار کے ذمے سمجھا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت قبضہ کی مذکورہ کاروبار میں نہیں ہوتی کہ سونا چاندی خریدار کے کسی نمائندہ کی تحویل میں دے دیا گیا (فتاوی عثمانی ۳/۱۵۷ ملخصا)

۵- اس طرح کے کاروبار میں جب کوئی سونا خریدتا ہے تو وہ خریدار کو متعین اور الگ کر کے حوالہ نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے اکاؤنٹ میں تحریر کردیا جاتا ہے پھر وہ خریدار اسے آگے کسی شخص کو فروخت کرتا ہے تو اس وقت اگر اسے نفع ہو تو صرف نفع واپس کردیا جاتا ہے، خلاصہ یہ کہ پوری خرید کردہ لاٹ تحویل میں نہیں دی جاتی بلکہ کاغذی طور پر اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کردی جاتی ہے اور آخیر میں نفع ونقصان کا فرق برابر کرلیا جاتا ہے جو سٹے کی ایک قسم ہے (الفتاوی الہندیہ ۳/۱۶، رد المحتار ۹/ ۵۷۷)۔

۲- عدم جواز کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کاروبار کی اس صورت میں سونے پر قبضہ نہیں ہوتا، نہ خریدار کا نہ اس کے نمائندہ کا کہ یہ خریدا ہوا سونا ہلاک ہوجائے تو ضمان خریدار پر نہیں آتا بلکہ بائع پر ہی آتا ہے، لہذا بغیر قبضہ کے آگے بیچنا ہوا جو ''ربح مالا یضمن'' کی وجہ سے سود اور ناجائز ہے۔

''أن الدراهم والدنانير وإن كانت لاتتعين بالعقد ولكنها تتعين بالقبض وقبضها واجب'' (بدائع ۵/ ۲۱۸)۔

۳- عدم جواز کی تیسری وجہ یہ ہے کہ کاروبار کے اس طریقہ میں خریدار ثمن (قیمت) کا معمولی حصہ ادا کرتا ہے، اگر چہ باقی رقم بہ طور ضمانت کمپنی جمع کراتی ہے، مگر رقم درحقیقت خریدار کے ذمے دین ہوتی ہے اور دوسری طرف سونا چاندی پر بھی شرعی طریقہ پر قبضہ نہیں ہوتا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاملہ دونوں طرف سے ادھار ہوا جو بیع الکالی بالکالی میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔

''عن ابن عمر أن النبي ﷺ نهى عن بيع الكالي بالكالي هو النسيئة بالنسية'' (مستدرك للحاكم ۲/ ۶۵، ۶۶)۔

۴- عدم جواز کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ درمیانی کمپنی جو کمیشن وصول کرتی ہے وہ یا تو ضمانت کی مد میں ہے یا اس رقم کا معاوضہ ہے جو وہ خریدار کی طرف سے بیچنے والے کو ادا کرتی ہے، پہلی صورت میں یہ ''اجرت علی الکفالۃ'' ہے اور دوسری صورت میں یہ قرض پر سود ہے اور یہ دونوں طریقے ناجائز ہیں (مستفاد فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۷، ۱۵۸)۔

حاصل یہ کہ اس طرح کا کاروبار سود، قمار، بیع الکالی بالکالی اور ربح مالا یضمن نیز اجرت علی الکفالۃ یا قرض پر سود کو متضمن ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔

۶- اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ سونے کو بڑی مقدار میں روک لینے کی وجہ سے روپئے کی قدر یقینی طور پر گھٹتی ہے اور روپئے میں گراوٹ کی وجہ سے روزہ مرہ کی ضروری اشیاء میں گرانی کا آنا یقینی ہوتا ہے کہ جو چیز پہلے سو روپئے میں آتی تھی اب وہ ایک سو بیس روپئے میں آرہی ہے۔

حاصل یہ کہ بڑی مقدار میں سونا روک لینے کی وجہ سے روپئے کی قدر گھٹتی ہے، جس سے عوام الناس کو نقصان ہوتا ہے، لہذا امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ بھی احتکار میں داخل ہے اور مکروہ ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع الصنائع وہدایہ)۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک گیہوں، جو نیز کھانے پینے کی اشیاء میں احتکار ممنوع ہے، صورت مسئولہ میں بہ نظر غائر دیکھا جائے تو سونے کی بڑی مقدار روکنے کا اثر روپئے کی قدر گھٹنے سے براہ راست کھانے پینے کی اشیاء پر پڑتا ہے کہ اشیاء خورد ونوش میں گرانی آجاتی ہے، گویا اشیاء خوردنی میں احتکار کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہی سونے کی بڑی مقدار کے روکنے سے ہوتا ہے۔ حاصل یہ کہ سونے اور اشیائے خورد ونوش میں احتکار کا نتیجہ ایک ہی ہے کہ اشیاء مہنگی ہوجاتی ہے، لہذا امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق براہ راست اور امام ابوحنیفہؒ کے قول کے بہ موجب بالواسطہ اشیاء خوردنی ہی میں احتکار

ہوا۔لہذا سونے کی بڑی مقدار روکنا کہ روپے کی قدر گھٹ کر ضروری اشیاء میں مہنگائی بڑھ جائے احتکار کے حکم میں ہوگا۔

۷- اصل یہ ہے کہ شرعا ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک روپئے سے اپنی ضروریات یا پسند کا جو مال جہاں سے چاہے خرید سکتا ہے، لہذا کسی بیرونی ملک سے مال خریدنا یا وہاں لے جا کر بیچنا شرعا مباح ہے۔

''وفی شرح المجلة للأتاسی ۳/ ۱۳۲: کل یتصرف فی ملکه کیف شاء نح وفی صفحة أخری لایمنع أحد من التصرف فی ملکه ابدا إلا اذا کان ضرره لغیره'' (۴/ ۱۴۰)۔

البتہ اسمگلنگ کا عمل حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی ہے اور حکومتی احکام کی خلاف ورزی میں چونکہ بہت سے منکرات لازم آتے ہیں، مثلا جھوٹ بولنا پڑتا ہے، نیز جان و مال یا عزت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، لہذا ان کے جائز قوانین کی پابندی کرنی چاہئے۔

اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو قولا یا عملا یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کا پابند رہے گا، اس معاہدہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کی جائے۔ اسمگلنگ پر چونکہ حکومت نے پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کے خلاف ورزی میں مذکورہ مفاسد پائے جاتے ہیں، اس لئے علماء نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔

''وهٰذا الحکم أی وجوب طاعة الأمیر یختص بما إذا لم یخالف أمره الشرع یدل علی سیاق الآیة فإن الله تالی أمر الناس بطاعة أولی الأمر بعد ما أمرهم بالعدل فی الحکم تنبیها علی أن طاعتهم واجبة ما داموا علی العمل''

(احکام القرآن للمحدث العلامة ظفر احمد عثمانی ۲/ ۲۹۱، نیز الدر المختار، ردالمحتار بحوث قضایا فقهیه معاصرة/ ص ۱۶۶)۔

۸- سوال میں پلاٹینم (Platinum) اور سفید سونا (White Gold) کو ایک ہی چیز بتائی گئی ہے، جبکہ احقر کی تحقیق کے مطابق یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

پلاٹینم یہ سونا چاندی کے علاوہ کوئی اور دھات اور کیمیکل سے بنتا ہے، جو بہت ہی مہنگا ہوتا ہے، البتہ چونکہ اس میں سونا اور چاندی نہیں ہوتا ہے اس لئے اس پر سونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، چاہے یہ سونے سے مہنگا ہی کیوں نہ ہو۔

اس پر سونے کے احکام منطبق کرنا گویا ثمن خلقی میں اضافہ کرنا ہوگا اور پھر عقود کے اعتبار سے اس میں بھی بیع کے احکام جاری ہوں گے، جبکہ ثمن خلقی میں اضافہ کی کوئی بنیاد نصوص یا کلام فقہاء میں نہیں ملتی (بدائع الصنائع)۔

سفید سونا (White Gold) یہ پیلے سونے (Yellow Gold) کے ساتھ دیگر دھات جیسے چاندی، زنک، نکل اور کوپر وغیرہ کو ملا کر بنایا جاتا ہے، جس میں مندرجہ ذیل حساب سے دیگر دھات کی آمیزش ہوتی ہے:

۱- 22 کیریٹ میں 91.6 فی صد سونا اور 8.4 فی صد دوسری دھات ہوتی ہے۔

۲- 21 کیرٹ میں 87.5 فیصد سونا اور 12.5 فی صد دوسری دھات ہوتی ہے۔

۳- 18 کیرٹ میں 75.0 فی صد سونا اور 25.0 فی صد دوسری دھات ہوتی ہے۔

۴- 12 کیرٹ میں 50 فیصد سونا اور 50 فی صد دوسری دھات ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ ۱۲ کیرٹ کو چھوڑ کر بقیہ تین میں سونا ہی غالب ہوتا ہے، لہذا سونے کے تمام احکامات (زکوۃ، صرف وغیرہ) جاری ہوں گے، اور ۱۲ کیرٹ میں چونکہ سونا اور دوسری دھات برابر سرابر ہے، لہذا اس میں سونے کے ساتھ چاندی کی آمیزش ہوگی تو صرف کے احکام یقینی طور پر جاری ہوں گے اور زکوۃ میں احتیاطا سونے کا دام پکڑا جائے گا، اور اگر سونے کے ساتھ چاندی کے علاوہ دیگر دھات مثلا زنک، نکل اور کوپر وغیرہ کی آمیزش ہے تو احتیاطا سونے ہی کے تمام احکام جاری ہوں گے (الفتاوی الهندیہ ۱/ ۱۷۹)۔

☆☆☆

سونے چاندی کے احکام

مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی[1]

۱-سونے چاندی کی روپیوں کے عوض ادھار بیع:

(الف) سونا چاندی کو اگر روپیوں کے بدلہ خریدا جارہا ہے تو روپیوں اور کرنسی کی حیثیت سونے اور چاندی کی ہی ہوگی جیسا کہ زکوۃ کے باب میں روپیوں کو سونے چاندی کے قائم مقام مان کر روپیوں پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، تو پھر سونے کو روپیوں کے عوض خریدنے کی صورت میں عوضین میں سے کسی ایک کا ادھار رکھنا درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ سونا چاندی کی جب سونے چاندی سے بیع ہو تو نقد ہونا ضروری ہے، لیکن اگر روپیوں اور کرنسی کو سونے اور چاندی کے طور پر تسلیم نہ کیا جائے تو روپیوں کے عوض سونے اور چاندی کی بیع پر نہ بیع صرف کا اطلاق ہوگا اور نہ اس میں بیع صرف کی شرائط کی رعایت ضروری ہوگی۔ چوں کہ فقہاء نے کرنسی اور اوراور روپیوں کو سونے چاندی کے طور پر تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ اصل نقدین کو ہی ربا کے باب میں معیار قرار دیا ہے، اس لئے کرنسی میں ربا کی علت پائی نہیں جاتی، اس اعتبار سے اگر کوئی روپیوں کے بدلے سونا خریدتا ہے اور قیمت ادھار رکھتا ہے تو اس کی گنجائش ہے۔

(ب) سونے اور چاندی کا نرخ اور قیمت حکومت یا انٹرنیشنل اور ملکی سطح پر قائم ادارے طے کرتے ہیں، عام طور پر وہ قیمت دکانوں اور تجارتی منڈیوں کی قیمت کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے، اگر دکانوں سے سونا خریدتے وقت حکومتی اور ملکی سطح پر متعینہ مقدار کے مقابلہ میں کچھ کمی زیادتی کے ساتھ خریدا جائے تو اس میں ربا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا اس لئے کہ جب روپیوں کو سونا چاندی کے طور پر تسلیم نہیں کیا جارہا ہے تو ظاہر ہے عوضین میں سے ایک ربوی ہے اور دوسرا غیر ربوی ہے، کیوں کہ فلوس میں علت ربا نہیں پائی جارہی ہے۔

علامہ خطیب شربینیؒ فرماتے ہیں:

''وعلة الربا فی الذهب والفضة جنسية الأثمان غالبًا كما صححه فی المجموع ويعبر عنها ايضًا بجوهرية الأثمان غالبًا، وهی منتفية عن الفلوس وغيرها من سائر العروض لأنها قيم الأشياء كما جری عليه صاحب التنبيه،لأن الأوانی والتبر والحلی تجری فيها الربا كما مر وليست مايقوم بها، واحترز ب غالبا عن الفلوس إذاراجت فإنه لاربافيها كماتقدم ولا أثر لقيمة الصنعة فی ذلك حتی لواشتری بدنانير ذهبا مصوغا قيمته أضعاف الدنانير اعتبرت المماثلة ولانظر إلی القيمة'' (مغنی المحتاج۲/۳۸۶)۔

آرڈر کے ذریعہ زیورات بنانے اور ادھار خرید وفروخت کا حکم:

آج کل اس ترقی یافتہ دور میں وقت کی ضرورت کے پیش نظر پرانے سونے چاندی کے زیورات دیکر یا روپیوں کے بدلے نئے زیورات آرڈر اور پسند کے مطابق لینے کا رواج عام ہے جس میں یہ معاملہ سونے کے بدلے سونے یا چاندی کے بدلے چاندی سے ہو تو دونوں طرف سے معاملہ میں برابری، نقد اور فوری قبضہ لازمی ہے، لیکن عام طور پر اس طرح کا معاملہ جب بھی ہوتا ہے تو نقد کے بجائے ادھار ہوتا ہے کہ مشتری اپنا پرانا سونا دیکر نئے زیورات بنانے کا آرڈر دیا جاتا ہے یا یوں ہی رقم کے بدلے زیورات خریدے جاتے ہیں اور رقم فوراً ادا نہیں کی جاتی یا رقم ادا کی جاتی ہے اور زیورات بعد میں حاصل کئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاملہ نقد اور فوری قبضہ کی شرط پائی نہیں جاتی، لاعلمی میں اس طرح معاملہ کرنے کی وجہ سے سود اور حرام کا ارتکاب لازم آتا ہے جس سے احتیاط ضروری ہے، لیکن فقہاء نے اس ضرورت کے پیش نظر اور امت کو حرام کے ارتکاب سے بچانے کیلئے

---

[1] جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور کرناٹک۔

ایک آسان ترکیب بتلائی کہ اپنا زیور فروخت کر کے اس کی قیمت لے لے پھر اس قیمت سے جو زیور چاہے آرڈر کے ذریعہ ادھار خرید لے اس لئے کہ یہاں یہ تبادلہ پیسوں کی شکل میں ہونے کی وجہ سے ربا کی فہرست میں داخل نہیں ہوگا اور اس طرح سود کی نحوست سے نجات ملے گی۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''الذهب بالذهب، والفضة بالفضة مثلًا بمثلٍ، سواء بسواء يدًا بيدٍ'' (مسلم: ۴۰۶۳)۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: ''وأجمعوا على أنه لايجوز بيع الربوى بجنسه، وأحدهما مؤجل'' (المنهاج في شرح مسلم: ۴/ ۱۹۵)

علامہ مزجدؒ فرماتے ہیں: ''الربويان إن كان بعلة واحدة: فإن اتحدا جنسا كبيع ذهب بذهب، وحنطة بحنطة. يشرط فيه: التساوى قدرًا، والحلول، والتقابض قبل التفرق'' (العباب: ۲/ ۲۲، البيان: ۵/ ۱۶۱)۔

علامہ خطیب شربینیؒ فرماتے ہیں:

''وعلة الربا في الذهب والفضة جنسية الأثمان غالبًا كما صححه في المجموع ويعبر عنها ايضًا بجوهرية الأثمان غالبًا، وهي منتفية عن الفلوس وغيرها من سائر العروض لأنها قيم الأشياء كما جرى عليه صاحب التنبيه،لان الاواني والتبر والحلي تجرى فيها الربا كما مر وليست مايقوم بها، واحترز ب غالبا عن الفلوس إذاراجت فإنه لاربافيها كماتقدم ولا أثر لقيمة الصنعة في ذلك حتى لواشترى بدنانير ذهبا مصوغا قيمته اضعاف الدنانير اعتبرت المماثلة ولانظر إلى القيمة'' (مغني المحتاج ۲/ ۳۸۶)۔

۲- حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعید فرماتے ہیں: من استاجر أجيرا فليعلمه أجره (المصنف لابن ابي شيبہ: ۲۱۵۱۳)، شریعت میں عقد اجارہ کے صحیح ہونے کے لئے بنیادی شرط اجرت کی تعیین ہے، علامہ خطیب شربینیؒ فرماتے ہیں: ''ويشترط كون الأجرة معلومة جنساوقدراوصفة'' (مغنی المحتاج: ۲/ ۴۰۴)، اس وقت مارکیٹ اور ہمارے ملک میں تاجر اور کاریگر کے درمیان پہلے ہی سے سونے کی شکل میں فی صد کے اعتبار سے اجرت طے ہوتی ہے، لہذا زیور بنانے کی مسؤلہ صورت عقد اجارہ ہی ہے، اس لئے کہ اجرت جنس، مقدار اور صفت کے اعتبار سے متعین ہے۔ چنانچہ اس وقت سونے کا تاجر کاریگر کو ۱۰۰/ گرام سونا دے کر اس کے زیورات بنانے کو کہتا ہے، البتہ زیورات کتنے کیاریڈ کے بنانے ہیں اس کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے، مثلاً ۲۲/ کیاریڈ کے زیور بنانے ہیں تو اس میں تقریبا ۹۲/ فیصد سونا استعمال ہوتا ہے اور ۸/ فیصد کسی اور دھات کی آمیزش ہوتی ہے، نیز کاریگری کی اجرت بھی اصل سونے میں ہی سے فیصد کے اعتبار سے متعین ہوجاتی ہے، اب اس صورت میں اگر ۵/ فیصد اجرت متعین ہوئی ہے تو ۸/ گرام اصل سونا اور سونے کے ذرات کل ملا کر ۹/ گرام یا ۸/ ہی گرام بچ جائے تو کاریگر ۵/ گرام اپنی اجرت رکھ کر باقی سونا تاجر کو واپس کر دیتا ہے، ایک سونے کے تاجر سے اس تفصیل کے حاصل ہونے کے بعد اس عقد کو عقد اجارہ ہی کہنا چاہئے، نہ کہ بیع، اس لئے کہ بیع کے شرائط میں سے مبیع کی رویئت شرط ہے، اور جو دھات ملائی جاتی ہے گویا وہ مبیع ہے اور اس کے بقدر سونا اس کا ثمن ہے، چونکہ مبیع کی رویئت پائی نہیں جاتی اس لئے اس کو بیع نہیں قرار نہیں دیا جاسکتا، اور اس طرح کا معاملہ کرنے میں تاجر کا بہت زیادہ نقصان ہوگا، اسی لئے مارکیٹ میں اس طرح کا معاملہ عقد اجارہ کے طور پر ہی رائج ہے۔

۳- پرانے زیورات کے بدلے نئے زیورات خریدنا:

آج کل عوام الناس میں پرانے زیورات دیکر نئے زیورات خریدنے کا رواج بالکل عام ہے، جس میں صرف پرانا سونا شمار ہوتا ہے اور نئے زیورات میں سونے کے نئے ہونے کے ساتھ کاریگر کی بناوٹ اور کاریگری کا بھی اعتبار ہوتا ہے جس کی بناء پر پرانے سونے کے مقابلہ میں نیا سونا کم ملتا ہے اس طرح کی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت ہوتی ہے جس کی شکل سود کی ہے اور یہ شرعًا حرام ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''لا تبيعوا الذهب بالذهب، ولا الورق بالورق، إلا وزنًا بوزن، مثلًا بمثلٍ، سواء بسواء'' (مسلم: ۱۵۸۴)۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

''قال العلماء هذا يتناول جميع أنواع الذهب والورق من جيد وردی وصحيح ومكسور، وحلى وتبر، وغير ذلك، وسواء الخالص والمخلوط بغيره وهذا كله مجمع عليه'' (المنهاج فی شرح مسلم: ۴/ ۱۹۵)۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

''إذا بيع الطعام بالطعام إن كانا جنسا اشترط الحول والمماثلة، والتقابض قبل التفرق ۔ ۔۔ والنقد بالنقد كطعام بطعام'' (منہاج مع السراج الوہاج: ۱۳۸، ۱۳۷)۔

علامہ عمرانیؒ فرماتے ہیں:

''إذا ثبت هذا: فسواء كانا مصوغين أو كان أحدهما مصوغا أو مضروبًا والآخر تبرًا فانه لايجوز بيع الجنس بجنسه متفاضلا'' (البیان ۵/ ۱۶۱)۔

پرانے سونے کے بدلے نیا سونا خریدنے کا جائز طریقہ:

پرانا سونا دیکر نیا سونا خریدنا وقت کی ضرورت اور انسانی حاجت وعادت بن گئی ہے، جب کہ اس طرح کی خرید وفروخت کو شریعت کی روشنی میں حرام قرار دیا گیا ہے، لیکن چوں کہ اسلام انسانی حاجات اور ضروریات کا پورا خیال رکھتا ہے اور اسلامی علوم کے ماہرین نے اسلام کی آسانی اور سہل پسندی کو اپنے اجتہادات کی روشنی میں ثابت کر دکھایا ہے۔ لہذا مذکورہ مسئلہ میں بھی فقہاء نے کچھ ایسے طریقہ نقل کئے ہیں جن پر عمل کرنے کی صورت میں پرانے سونے کو نئے سونے کے بدلے جائز طریقہ سے خریدنا آسان ہوگیا ہے۔

پہلی صورت: پرانے سونے کی قیمت لگائی جائے، سنار اور پرانے سونے کے مالک درمیان جتنی قیمت طے ہو اس قیمت کے بدلے پرانا سونا فروخت کیا جائے اس کے بعد نئے سونے کی قیمت لگائی جائے اور پرانے سونے کا مالک اتنی قیمت ادا کرکے نیا سونا خریدے۔ اس صورت میں سونے کی بیع سونے سے نہیں ہوتی بلکہ سونے کی بیع روپیوں سے ہوتی ہے اور فقہاء نے اس مسئلہ میں سونے کے قائم مقام نہیں مانا ہے اس لئے اس طرح بیع جائز ہوگی۔

دوسری صورت: یہ ہے کہ ہر ایک اپنا سونا اپنے ساتھی کو قرض دے پھر اس سے بری کردے یا پھر زیادتی کو ھبہ کردے اور یہ درست ہے۔

(مغنی المحتاج ۲/ ۳۸۷، اعانة الطالبین ۳/ ۳۵، حاشیة قلیوبی مع کنز الراغبین ۲/ ۱۳۶۶)۔

۴۔ سونے پر قبضہ کے بغیر خرید وفروخت:

(الف۔ب) کسی بھی چیز کو خریدنے کے بعد قبضہ سے پہلے مشتری کی ملکیت کمزور ہوتی ہے، اسی لئے قبضہ سے پہلے اس مبیع کو فروخت کرنا درست نہیں ہے، اور مشتری کے قبضہ سے پہلے اس پر بائع کا ہی قبضہ شمار ہوتا ہے، اسی لئے اگر وہ مبیع مشتری کے قبضہ سے پہلے تلف ہو جائے تو اس کا ضمان بائع پر ہی واجب ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں نبی کریم ے فرمایا جو شخص طعام خریدے تو اس پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو فروخت نہ کرے (مسلم: ۱۵۲۶)، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حکیم بن حزامؓ سے فرمایا تھا کہ تم کسی چیز کو قبضہ کرنے سے پہلے نہ بیچو (سنن بیہقی: ۱۹۱۸)، ان دلائل کی روشنی میں امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ

''ولايصح بيع المبيع قبل قبضه'' (منهاج الطالبين مع مغنی المحتاج ۲/ ۶۸)

نیز فرماتے ہیں:

''المبيع قبل قبضه من ضمان البائع بمعنى انفساخ البيع بتلفه وثبوت الخيار بتعيبه، وبإتلاف الأجنبى له لبقاء سلطنته عليه'' (منهاج مع مغنی المحتاج ۲/ ۶۵)،

اور سونا چونکہ اشیاء منقولہ میں سے ہے اس لئے اس پر قبضہ کی شکل یہ ہے کہ سونا بائع کی ملکیت سے منتقل ہو کر مشتری کی ملکیت میں آجائے جس

کے لئے نقل ضروری ہے۔سوال میں الف کے ضمن میں پوچھی گئی صورت میں چوں کہ تمام گاہکوں کو سونا ایک ہی اینٹ میں شامل ہے اس لئے مشتری کے لئے مبیع پر قبضہ کرنا دشوار ہے اس لئے اس صورت میں قبضہ شمار نہیں کیا جائے گا۔اور ب کے ضمن میں پوچھی گئی صورت میں جس جگہ خریدار کے نام سے کمپوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں درج کیا جار ہا ہو، چوں کہ یہاں پر حقیقی قبضہ یعنی مبیع کی منتقلی پائی نہیں جارہی ہے اس لئے مشتری کا قبضہ متصور نہیں ہوگا، بلکہ اس پر بائع ہی کا قبضہ معتبر ہوگا:

''وقبض منقول من سفينة اوحيوان بنقله إلى محل آخر مع تفريغ السفينة، ويحصل القبض ايضا بوضع البائع للمنقول بين يدى المشترى بحيث لومداليه يده لناله وإن قال لا أريده'' (فتح المعين مع اعانة الطالبين: ۲/ ۴۷)۔

۵-مبیع (سونا) پر قبضہ کئے بغیر صرف نرخ کی کمی زیادتی کا لین دین:

بیع کی تکمیل کے بعد اس کے متعلق کسی قسم کا ردوبدل یا قیمت میں کمی زیادتی کا اختیار مجلس عقد سے جدا ہونے سے پہلے یا خیار شرط کی صورت میں تین دن یا اس سے کم مدت کے اندر باقی رہتا ہے،لیکن جب یہ دونوں اختیار باقی نہ ہوں تو ایک مرتبہ عقد ہونے کے بعد ثمن کی تعیین کے بعد ادائیگی کے وقت نرخ کی کمی زیادتی کی بنا پر متعینہ قیمت میں کمی زیادتی شرعا کیسے درست ہوسکتی ہے، اس لئے مجلس عقد سے جدا ہونے کے بعد یا خیار شرط کی صورت میں تین کے بعد کسی بھی قسم کی کمی زیادتی کا امکان باقی نہیں رہتا، اس لئے یہ صورت درست نہیں ہے

(مغنی المحتاج ۲/ ۷۲،منہاج مع مغنی المحتاج ۲/ ۴۸، ۴۳)۔

۶-سونے کی متوقع زیادہ قیمت کی بنا پر ذخیرہ اندوزی:

حضرت سعید ابن مسیب حدیث بیان کرتے ہیں کہ معمر نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ذخیرہ اندوزی کی تو وہ خطا کار اور گنہگار ہے، حضرت سعیدؒ سے پوچھا گیا کہ آپ بھی تو ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں، تو حضرت سعیدؒ نے کہا: کہ معمر جو یہ حدیث بیان کرتے تھے وہ بھی ذخیرہ اندوزی کرتے تھے۔مذکورہ حدیث کے تحت شارح مسلم امام نوویؒ رقمطراز ہیں کہ حدیث میں جو خاطی آیا ہے اہل لغت نے اسکے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ مراد گنہگار ہے، اور اس حدیث میں ذخیرہ اندوزی کرنے پر صریح حرمت ہے۔ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ جو ذخیرہ اندوزی حرام ہے اس سے وہ ذخیرہ اندوزی مراد ہے جو خاص طور پر غذائی اشیاء میں ہو، اور اس سے مراد یہ ہے کہ مہنگائی کہ زمانہ میں غلہ اور کھانے کو تجارت کی غرض سے خرید لے اور اسکو فوراً نہ بیچے بلکہ اسکو ذخیرہ کرکے رکھے تا کہ اس کی قیمت میں مزید ہو جائے تو یہ صورت حرام احتکار میں داخل ہے۔اگر کوئی غلہ کو سستائی کے زمانہ میں خرید کر ذخیرہ کرے، یا مہنگائی کے وقت میں خود کے لئے خریدے یا غلہ خریدے تا کہ اس کو اس کے وقت میں بیچے تو یہ احتکار میں داخل نہیں ہے، اور نہ یہ حرمت کی صورت میں داخل ہوئی۔جہاں تک غذائی اشیاء کے علاوہ میں ذخیرہ اندوزی کا مسئلہ ہے تو اس صورت میں کسی بھی وقت ذخیرہ کرنا حرام نہیں ہے، علماء نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ عوام سے ضرر کو دور کرنا ہے، جہاں تک راوی حدیث کا احتکار کرنے کا مسئلہ ہے، تو ابن عبدالبر وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حضرات تیل کا ذخیرہ کرتے تھے اور یہ حضرات حدیث کو حاجت اور مہنگائی کے وقت غذائی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی پر محمول کرتے ہیں۔امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اور دیگر حضرات نے بھی اس کو اسی پر محمول کیا ہے، کہ حاجت اور مہنگائی کے وقت ذخیرہ کرنا مراد ہے اور یہی قول راجح ہے، مذکورہ تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر سونا چاندی کو قیمت کے اضافہ کی خاطر روکا جائے تو یہ فی نفسہ مباح اور جائز ہے، اگر چہ اس کا اثر دیگر اشیاء میں سرایت کر جائے، اس لئے کہ سونا چاندی ذخیرہ کرنے والے کا مقصود فقط سونے چاندی میں قیمت کا اضافہ ہے، نہ کہ دیگر اشیاء میں اور دیگر اشیاء میں قیمت کا اضافہ ہونا اتفاقی چیز ہے، مزید یہ کہ سونا چاندی کی ذخیرہ اندوزی غذائی اشیاء کی مہنگائی کے وقت نہیں ہے، نیز یہ کہ غذائی اشیاء کی فراہمی ہے صرف یہ کہ قیمت میں اضافہ ہوا ہے، لیکن ان سب کے باوجود مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے کوئی ایسا کام نہ کرے جس کی وجہ سے عوام الناس مشقت اور تکلیف میں مبتلا ہو جائے

(المنہاج فی شرح مسلم ۴/ ۲۲۰، ۲۱۹،اسنی المطالب ۳/ ۷۱، ۷۰، روضۃ الطالبین ۳/ ۷۸)۔

۷-غیر قانونی سونے کی آمدورفت:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں (مسلم:۱۰۱)، اس حدیث کے عموم کو دیکھتے ہوئے ہر قسم کا دھوکہ ممنوع ہے، چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی، دھوکہ کسی فرد کو دیا جائے یا جماعت کو، کسی ادارہ کو دیا جائے یا حکومت کو، جن ممالک میں ملکی معاشی مصالح کے پیش نظر دیگر ممالک سے سونا لانے کے جو اصول متعین ہیں، ان کی خلاف ورزی بھی ایک قسم کی دھوکہ دہی ہے، چونکہ غیر قانونی طور پر سونا لانے میں تمام مراحل سے دھوکہ دہی اور غرر کے ساتھ ہی گذرنا ناگزیر ہوتا ہے، نیز غیر قانونی طور پر سونا لانے والے جب پولیس اور حکومتی کارندوں کے ہاتھ پکڑے جاتے ہیں تو بھاری مقدار میں مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور ذلت و رسوائی بھی مقدر ہو جاتی ہے، اسی لئے علماء نے اس طرح کے دھوکہ دہی کے معاملات کو نادرست قرار دیا ہے، جیسا کہ شرعاً بہت سے معاملات فی نفسہ درست ہیں، لیکن غرر اور دھوکہ دہی کی بنا پر ان بیوعات کو شرعاً منع کیا گیا ہے، بیع حاضر لباد، تلقی رکبان، نجش، جیسے عقود اسی ضمن میں داخل ہیں۔

''فإذا منعت الدولة تهريب الذهب، أونحوه من الأشياء المباحة لمصالح تعودعلى البلد والناس ولمفاسد معتبرة تدفع، فيجب الالتزام بهذالقرار والكف عن التهريب'' (اسلام ویب:۲۵۴۷۸۲)۔

''ومن المنهى عنه مالايبطل لرجوعه يعود الى النهى لدلالة المنهى عليه إلى معنى يقترن به لا إلى ذاته لأن النهى ليس للبيع بخصوصه، بل لأمر آخر۔ فجميع مافيه من الصور يصح فيها البيع ويحرم۔ كبيع حاضرلباد ۔۔وتلقى الركبان ۔۔۔'' (منهاج مع المغنى المحتاج ۲/ ۳۶)۔

۸-پلاٹین پر سونے کا اطلاق اور اس پر زکوۃ کا حکم:

پلاٹینم یہ زمین سے حاصل ہونے والی ایک قیمتی دھات ہے، جس سے سونے چاندی کے زیورات کی طرح زیورات بنائے جاتے ہیں، نیز دیگر اشیاء میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، جب کہ سفید سونے کو سونے اور دوسری دھات کے ملاپ سے تیار کیا جاتا ہے، چنانچہ نیٹ پر دستیاب معلومات کے مطابق پلاٹینم اور سفید سونا دونوں الگ الگ ہیں۔

platinum.naturally.occuring.metals.

white.gold.mad.by.alloying.naturally.occuring.yellow.gold.with.other.metals.{www.diffen.com}

پلاٹینم چونکہ الگ دھات ہے، اور سونا چاندی کے قبیل سے نہیں ہے، اس لئے سونا چاندی کے احکام کا پلاٹینم پر اطلاق نہیں ہوگا، اور نہ اس پر زکوۃ واجب ہوگی، رہا مسئلہ پلاٹینم کے قیمتی ہونے کا تو زکوۃ کے وجوب میں اصل نقدین کا اعتبار ہے کہ کسی قیمتی چیز کا، یہی وجہ ہے کہ بعض ہیرے جواہرات جو سونے سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اس کے باوجود ان پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی، اس لئے پلاٹینم پر بھی زکوۃ واجب نہیں ہوگی اور نہ اس پر سونے کا اطلاق ہوگا۔

علامہ ابن حجر ہیثمیؒ فرماتے ہیں:

ولازكاة فى سائرالجواهر كاللؤلؤواليا قوت، لعدم ورودها فى ذلك، والانها معدة للاستعمال كالماشية العاملة'' (تحفة المحتاج ۱/ ۴۷۰، المجموع ۶:/ ۵، اسلامی ویب: ۴۵۱۱۳)۔

ملتت

تیسرا باب مختصر تحریریں

سونا چاندی کی تجارت - صورتیں اور احکام

قاضی عبدالجلیل قاسمی [1]

۱- اگر روپے سے سونا چاندی خریدا جائے تو اس پر بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے۔

الف- یہ بات درست نہ ہوگی کہ سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو، دوسرا ادھار ہو۔

ب- حکومت کی طرف سے سونا چاندی کی مقرر کردہ قیمت سے کم وبیش میں خریدنا، فروخت کرنا صحیح ہوگا۔

۲- الف، بیہ اجارہ ہے اور فاسد ہے، اس لیے کہ اجرت مجہول ہے، نیز نزاع کا سبب ہے، اس لیے کہ کاریگر دوسری دھات زیادہ سے زیادہ ملانے کی کوشش کرے گا تاکہ اس کو زیادہ سے زیادہ سونا (اجرت میں) حاصل ہوسکے اور اس سے جھگڑا پیدا ہوگا۔

۳- اگر نئے پرانے دونوں قسم کے زیورات میں کوئی دوسری دھات شامل ہے تو دھات کو منہا کر کے دونوں میں برابری ضروری ہوگی، مثلاً اگر پرانا زیور دس گرام کا ہے، اور اس میں سونا آٹھ گرام ہے اور دوسرا نیا زیور بھی دس گرام کا ہے اور اس میں بھی سونا آٹھ گرام ہے، باقی دوسری دھات ہے تو کمی بیشی میں میں فروخت کرنا ناجائز ہوگا، کم وبیش کرنے میں ربا الفضل ہوگا۔

۴- الف: اس صورت میں سونا پر خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا۔

ب: رجسٹر میں اندراج قبضہ کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

۵- سوال نامہ میں ذکر کردہ صورت اقالہ کی ہے اور اقالہ میں ثمن اول میں اضافہ یا کمی کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے سوال میں مذکور صورت جائز نہیں ہے۔

''الإقالة جائزة في البيع بمثل الثمن الاول... فإن شرط أكثر منه أو أقل فالشرط باطل و يرد مثل الثمن الأولى'' (ہدایہ ۳/ ۶۹)۔

(بیع میں ثمن اول کے مثل سے اقالہ جائز ہے...... اگر اس سے کم وبیش کی شرط لگائی جائے تو شرط باطل ہوگی اور ثمن اول کا مثل ہی واپس کرنا ہوگا) (یعنی اگر ثمن پر قبضہ کرلیا ہو)۔

نیز اس صورت میں سود کا دروازہ کھل جانے کا اندیشہ بھی ہے، لوگ سود پر قرض دینے کے بجائے یہ حیلہ اختیار کریں گے کہ ضرورت مند سے اس کی کوئی چیز کسی مقرر قیمت پر خرید لیں گے، ثمن ادا کردیں گے اور سامان پر قبضہ نہیں کریں گے، پھر سال بھر کے بعد وہ سامان اسی کو فروخت کر کے پہلی قیمت سے زیادہ وصول کرلیں گے، یعنی پہلے ایک ہزار میں خریدا تھا اور اب بارہ سو میں فروخت کردیں گے، بیع کا تلفظ تو ہوگا، حقیقت میں ایک ہزار روپے دے کر بارہ سو روپے وصول کرلیں گے، اس لیے بھی اس صورت کو ممنوع ہونا چاہیے۔

[1] قاضی شریعت، مرکزی دار القضاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

۶- سونا کو قیمت میں اضافہ کے لیے روک لینا احتکار میں داخل نہیں ہے، احتکار صرف کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں میں ہوتا ہے، جن کے بغیر زندگی دشوار ہے، سونا کے بغیر زندگی دشوار نہیں ہوتی ہے۔

''الاحتكار لغة: حبس الطعام إرادة الغلاء ... أما في الشرع فقد عرفه الحنفية بأنه اشتراء طعام و نحوه و حبسه إلى الغلاء و عرفه المالكية بأنه رصد الأسواق انتظار ا لارتفاء الأثمان و عرفه الشافعية بأنه اشتراء القوت وقت الغلاء و إمساكه و بيعه بأكثر من ثمنه للتضيق و عرفه الحنابلة بأنه اشتراء القوت و حبسه انتظارا للغلاء''

(الموسوعة الفقهية ۲/ ۹۰)۔

لغت میں احتکار کا معنی گرانی کی نیت سے کھانے کی چیز کو روک کر رکھنا ہے، شریعت میں حنفیہ نے یہ تعریف کی ہے، کھانے وغیرہ کو خریدنا اور گرانی تک کے لیے اس کو روک رکھنا، مالکیہ نے تعریف کی ہے، قیمتوں کے بڑھنے کے انتظار میں بازار کی نگرانی کرنا، شافعیہ نے تعریف کی ہے، مہنگائی کے زمانہ میں غلہ کو خریدنا اور اس کو روک رکھنا اور تنگی کی وجہ سے اس کی قیمت سے زیادہ میں فروخت کرنا، حنابلہ نے تعریف کی ہے، غلہ کو خریدنا اور گرانی کے انتظار میں اس کو روک رکھنا۔

الموسوعہ میں اس پر فقہاء کی بحث نقل کی گئی ہے کہ کن چیزوں میں احتکار ہوتا ہے، ان اشیاء میں سونا کا ذکر نہیں ہے۔

کن اشیاء میں احتکار ہوسکتا ہے:

''و هناك ثلاثة اتجاهات: الاول: ما ذهب إليه أبو حنيفة و محمد و الشافعية و الحنابلة أنه لا احتكار إلا في القوت خاصة و الاتجاه الثاني: ان الاحتكار يجري في كل ما يحتاجه الناس و يتضررون من حبسه من قوت و إدام و لباس و غير ذلك و هذا ما ذهب إليه المالكية و أبو يوسف من الحنفية و الاتجاه الثالث: أنه لا احتكار إلا في القوت و الثياب خاصة و هذا قول لمحمد بن الحسن'' (الموسوعة الفقهية ۲/ ۹۲)۔

یہاں تین نقطہ نظر ہیں، امام ابوحنیفہ امام محمد، شافعیہ اور حنابلہ کا مذہب یہ ہے کہ صرف غلہ میں احتکار ہوسکتا ہے، دوسرا مذہب امام مالکؒ کا ہے، ان کی رائے ہے کہ ہر اس چیز میں احتکار ہوسکتا ہے جس کے محتاج لوگ ہوں، اور اس کو روک لینے سے ان کو ضرر ہو، خواہ غلہ ہو، سالن ہو، یا لباس وغیرہ ہو، حنفیہ میں امام ابویوسف کا مذہب بھی یہی ہے، تیسرا مذہب ہے کہ صرف غلہ اور کپڑا میں احتکار ہوسکتا ہے یہ امام محمد کا ایک قول ہے۔

اس لیے گرانی کی امید میں سونا کو روک کر رکھنا ناجائز نہ ہوگا۔

۷- اس سوال کا جواب زبانی دیا جاسکتا ہے، تحریر میں لانا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔

۸- پلاٹین خواہ جتنا بھی قیمتی ہو وہ سونا چاندی کے حکم میں نہیں ہوسکتا ہے، اس کی خرید وفروخت کو صرف میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے، نہ اس پر سونا کے احکام جاری ہوں گے۔



سونا چاندی کی تجارت کے احکام

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی[1]

۱- الف- کرنسی ثمن خلقی نہیں ثمن اصطلاحی یا عرفی ہے، البتہ ثمن خلقی کی طرح تداول ہو گیا ہے، لہذا روپے سے سونا چاندی خریدنا بیع صرف نہیں کیونکہ بیع صرف کے احکام صرف خلقی ثمن میں جاری ہوتے ہیں، مجلس عقد میں دونوں طرف سے قبضہ شرط نہیں بنابریں ان میں سے ایک کا نقد ہونا اور دوسرے کا ادھار ہونا درست ہے، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''کرنسی نوٹ حقیقتاً ثمن نہیں ہیں بلکہ یہ ثمن عرفی یا ثمن اصطلاحی ہیں اور بیع صرف کے احکام صرف خلقی اثمان (سونا، چاندی) میں جاری ہوتے ہیں، معلوم ہوا کہ جب جنسیں مختلف ہوں تو ایسا کرنا درست ہے، چنانچہ شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں: ''وإذا اشتری الرجل فلوسا بدراہم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع بالبيع جائز'' (فقہی مقالات ۱/ ۴۰، ۴۱)، مفتی صاحب ایک جگہ اور لکھتے ہیں: ''صرف کے اندر ضروری ہے کہ دونوں طرف حقیقی سونا ہو یا چاندی اور نوٹ کی پشت پر سونا یا چاندی نہیں ہے، لہذا یہ بیع صرف نہ ہوگی اس لئے حقیقی تقابض فی المجلس شرط نہیں''۔

ب- ''چونکہ اتحاد جنس نہیں اس لئے متعینہ قیمت سے کم وبیش میں خریدا جاسکتا ہے اور اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہ ہوگا'' (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۶۷، نیز دیکھئے: فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۹)۔ مولانا عثمانی کہتے ہیں: ''اتحاد جنس نہیں اور اس کی کمی زیادتی کی شرعاً کوئی حد نہیں یہ فریقین کی رضامندی پر موقوف ہے'' (فقہی مقالات ۱/ ۴۳۳)۔

۲- الف: یہ معاملہ اجرت کا معلوم ہوتا ہے زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جائیں وہ سونار کی اجرت ہی ہوں گے۔

قفیز طحانی والی روایت سے یہی سمجھ میں آتا ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: ''قفیز طحانی یعنی آٹا پیسنے والے کو گیہوں وغیرہ دے اور کہے کہ اسی میں سے اتنے قفیز تمہاری اجرت ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورت کو منع فرمایا، فقہاء نے اس ممانعت کے دائرہ کو وسیع کیا اور یہ کہا کہ عامل ہی کے عمل کے ایک جزء کو اجرت بنانا درست نہیں، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور بعض فقہاء اس کی ممانعت کے قائل ہیں، امام احمدؒ، امام اوزاعیؒ اور بعض فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں، امام مالکؒ سے دونوں طرح کے اقوال نقل کئے گئے ہیں، جن حضرات نے اس روایت کو قبول نہیں کیا ہے ان کے پیش نظر یہ حدیث پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی، ابن حجرؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، اور علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے ابن عقیل سے نقل کیا ہے کہ یہ درجہ استدلال کو نہیں پہنچتی ''هذا الحديث لا نعرفه ولا يثبت عندنا حجيته... ''بعدہ مولانا رحمانی صاحب بنکر، قصاب، درزی وغیرہ کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ احناف میں سے مشائخ بلخ نے عرف کی رعایت کرتے ہوئے جواز کا قول فرمایا ہے'' (قاموس الفقہ ۱/ ۴۹۹)، اس لئے عرف کا لحاظ کرتے ہوئے ان ذرات کو بطور اجرت لیا جاسکتا ہے، ''إنما تعتبر العادة إذا طردت'' (الاشباہ والنظائر للسیوطی/ ۶۳)، ''العادة محكمة- اعلم ان اعتبار العادة والعرف راجع اليه في الفقه مسائل لا تعد كثرة'' (الاشباہ والنظائر للسیوطی/ ۶۳، نیز دیکھئے: غمز عیون البصائر شرح الاشباہ والنظائر للسید احمد بن محمد الحنفی الحموی ۱/ ۲۹۵ القاعدة السادسہ)، نیز مولانا رحمانی صاحب نے اپنی دوسری کتاب ''نوازل فقہیہ معاصرہ'' (۱/ ۴۵۳ تا ۴۶۴) پر قفیز طحان سے متعلق تفصیلی بحث فرمائی ہے، اولاً اس روایت پر محدثانہ کلام پیش فرمایا ہے، بعدہ فقہاء کے آراء مع ان کے دلائل نقل فرمائے ہیں، موصوف جواز کی رائے ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں:

''فأرى أن الجهالة التي تفضي إلى المنازعة بين المتعاقدين هي التي تمنع صحة الإجارة وأما في هذه الصور

---

[1] سابق شیخ الحدیث، دار العلوم مئو۔

المتداولة فليس كذلك، بل هنا يتعين أنهم يستحقون الاجرة بنسبة ما يجمعون الخ''

میرے خیال میں جو جہالت مفضی الی المنازعت ہو وہ صحت اجارہ سے مانع ہوگی اس لئے قفیز طحان اور اس پر قیاس کردہ دیگر مسائل ایسے نہیں جس کی جہالت اسی تک مفضی ہو، نیز مولانا موصوف تحریر فرماتے ہیں: قفیز طحان پر قیاس کردہ دیگر مسائل ثابت بالقیاس ہیں ثابت بالنص نہیں۔

''وما يثبت من الأحكام بالقياس ويخالفها العرف والعادة فيجوز العمل بالعادة دون القياس، وفي زماننا كثير من العقود والمعاملات و طرق التجارة التي يجعل فيها جزء عمل الأجير أجرة، وفي مثل هذه الصورة وإن كان لاتبعين مقدار الأجرة بجميع اعتباريها تحدد بالنسبة التي تكون كالمعلومه آلا ولا تقفى إلى النزاع فالجهالة اليسيرة التي لاتؤدي إلى النزاع لاتضر في صحة العقد''۔

شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:''جاز عندي ديانة دون بقي فاسد افضاء لارتفاع عنه الفساد وهي المنازعة''

تکملہ فتح الملہم ۱/ ۴۴۰ مکتبہ اشرفیہ دیوبند پر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی تحریر ملاحظہ ہو:''وقال شيخ مشائخنا الانور في فيض الباری۳/ ۲۹۵تحت هذا الباب ''حكم المزارعت وكراء الأرض''من صحيح البخاري''ولم أكن أفهم دهرا ما في الهدايه في أول باب المزارعة لاتجوز المزارعة والمساقاة عند أبي حنيفه، ثم أراه ... الخلاف بينه وبين صاحبه وكنت التعجب ان المزارعة إذا لم تجز عنده فمن ابن الملك التفريات والمسائل الخ''

عامل ہی کے عمل کے ایک جز کو اجرت بنانے کے جواز پر شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ میں بہت دنوں تک ہدایہ کے باب لاتجوز المزارعة والمساقاة عند ابی حنیفہ کی بابت سوچتا رہا اور پھر یہ بھی دیکھتا رہا کہ اس کے تحت فقہاء مسائل میں امام صاحب اور صاحبین کے درمیان اختلاف بھی نقل کرتے ہیں اگر یہ درست نہیں تو پھر جزئیات وتفریعات کیا معنی؟ پھر لوگوں کا یہ جواب دینا کہ عدم جواز کے باوجود اگر لوگ معاملہ کرلیں تو پھر اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس غرض سے اس کا بیان ہے لیکن مجھے اس جواب پر انشراح نہیں ہوتا تھا، پھر جب میں حاوی القدسی میں دیکھا کہ امام صاحب کے یہاں یہ مکروہ ہے تشدید فی النھی نہیں ہے تو میرا خلجان دور ہوگیا کبھی شئ باطل ہوتی ہے لیکن اس کا ارتکاب معصیت نہیں ہوتا بنا بریں احکام وتفریعات کا بیان درست ہے، نیز مزارعت کا ثبوت احادیث اور امت متواترہ کا تعامل ہے اور وہ روایتیں جن سے مزارعت کی نہی ہورہی ہے وہ دوحال سے خالی نہیں یا تو وہ مزارعت کی کوئی خاص کروہی دفع الارض بقدر بھی غیر شائع من الخارج ہے یا علی سبیل الارشاد المشورہ ہے نہ کہ علی سبیل الحرمة اور ان دونوں تاویلوں پر دلائل موجود ہیں، اس سے بھی تائید ہورہی ہے کہ بچے ہوئے ذرات کو اجرت بنایا جاسکتا ہے۔

اسی کے تحت ہدایہ علی شرح فتح القدیر ۸/ ۳۴۴ کتاب المزارعة کی تحریر پیش ہے:''إ لا أن الفتوى على قولهما لحاجة الناس اليها ولظهور تعامل الأمة بها والقياس يترك بالتعامل كما في الاستصناع''، نیز فتاوی عالمگیری ۴/ ۴۴۵ الفصل الثالث فی قفیز الطحان وما هو فی معناه کے تحت بہت ساری مثالوں کو پیش کرنے کے بعد مشائخ بلخ کے یہاں اس مسئلہ کے جواز کی علت لمکان الضرورة والتعامل نقل کی ہے، ہاں یہ بات اور ہے کہ وہ لکھتے ہیں کہ''زیادہ صحیح اس کا عدم جواز ہے''، حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں بھی جائز ہے۔

''لا بأس ان يحصد الزرع ويوم النخل بسدس ما يخرج منه وبواجب الى من المقاطعة انما جاز بهنا لانه معلوم بالمشاهدة وهو اعلى طرق العلم ومن علم شيئا علم جزاه المشاع فيكون اجراه معلوما الخ'' (المغني والشرح الكبير۶/ ۱۳ الطبعه المنار مصر)

حنابلہ کے یہاں دلیل جواز یہی ہے کہ جب اس نے یہ چیز دیکھ لیں تو مشاہدہ کے ذریعہ اس کو علم ہوگیا اور سب سے قوی ترین ذریعہ علم ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اخراج مقاسمہ کے تحت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جن روایتوں میں''بشطر ما يخرج منها'' آیا ہے جن میں نہی وارد ہوئی ہے تو وہ نہی تنزیہی ہے نہ کہ تحریمی (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۲۳۶)۔

۳- بہتر تو یہ ہے کہ اولا پرانا زیور فروخت کردیا جائے اور اس کی قیمت سے نیا زیور لے لیا جائے لیکن یہ معاملہ بایں طور درست ہوسکتا ہے کہ پرانے اور نئے دونوں زیورات کا بٹہ (ٹانکہ) چھوڑ کر آٹھ گرام کا اصل سونا پرانے زیور کے اتنے ہی سونے کے بالمقابل مانا جائے اور نئے کا ٹانکہ

پرانے کے مابقیہ کے بالمقابل مان لیا جائے، مزید وضاحت یوں ہے:

(نیا زیور) ۸/گرام سونا، ٹانکہ (پرانا زیور) ۸/گرام، ٹانکہ، مابقیہ

نئے زیور کا ٹانکہ = پرانے زیور کا مابقیہ

چنانچہ سونا سونے کے برابر ہوگیا اس میں کمی وبیشی درست نہیں۔ جید ھا ور دتیھا سواء

نئے زیور کا بٹہ دوسری طرف کے سونے وبٹہ کے برابر ہوگیا، اتحاد جنس نہیں اس لئے تفاضل درست ہوا۔ اور بٹے میں ربا ہے ہی نہیں۔

انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے فقہی فیصلے/ص ۲۶۵ پر مذکور ہے: ''خالص سونے کی فروخت ایسے سونے کے ساتھ جس کے ساتھ کوئی اور جنس ملی ہوئی ہو کمی وزیادتی کے ساتھ درست ہے اور یہ اس لئے کہ ایک جانب سونے کی زائد مقدار دوسری جانب کی دوسری جنس والی چیز کے بالمقابل سمجھی جائے گی''۔

''ولو قال اعطنى نصف درهم فلوسا ونصفا الاحبة جاز لانه قابل الدرهم بما يباع من الفلوس بنصف درهم وبنصف درهم الاحته فيكون نصف درهم الاحته بمثله وماوراه بازاء الفلوس'' (شرح فتح القدير ۲۱۱/۵ دار عالم الكتب رياض)

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ایک ہار ذہب وغیر ذہب سے مرکب ہے اور اس ہار میں پانچ تولہ سونا ہے اب اس ہار کو چھ تولہ سونے یا ساڑھے پانچ تولہ سونے کے عوض فروخت کرنا جائز ہے تاکہ پانچ تولہ سونا ۵ تولہ سونے کے مقابل ہو جائے اور ثمن میں...... اس لئے معاملہ درست ہو جائے گا (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۶۶/۲)۔

۴- الف: مذکورہ صورت سے قبضہ نہ ہوگا۔

ب- کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں خریدار کے نام کا اگر اندراج ہو جاتا ہے تو یہ قبضہ محسوب ہونا چاہئے (دیکھئے: فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے/ص ۳۲۶)۔

۵- یہ بیع الکالئی بالکالئی ہے (دوطرفہ ادھار خرید وفروخت) جو ناجائز ہے، نیز ربح مالم یضمن کی بھی صورت ہے، ساتھ ہی قمار کی بھی صورت معلوم ہو رہی ہے (یعنی تعلیق التملیک بالخطر) پے بہ پے خرابیوں کے باعث یہ معاملہ فاسد ہے۔

۶- اولاً احتکار کے تعلق سے ائمہ کے اقوال پیش ہیں، امام محمدؒ کے نزدیک احتکار اور ذخیرہ اندوزی صرف غذائی اشیاء میں ممنوع ہے (کمافی رد المحتار وتکملہ فتح الملہم ۶۵۶/۱، ۶۵۷، نیز دیکھئے: رد المحتار علی الدر ۵۷۱/۱)۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی درج ذیل تحریر سے موصوف کا عندیہ معلوم ہو رہا ہے، آپ لکھتے ہیں: ''والذى يبدو لهذا العبد الضعيف عفا الله عنه ان حرمة احتكار الطعام ثابتة بالحديث من غير شكل فكان امرا تشريعها معمر لانه الى الا بدلان حاجة الناس الى الطعام اكثر منها الى غيره واما احتكار الاشياء الاخرى فيفوض الى رأى الحاكم فان رأى فى احتكار حاضر راشديد انظر الضرر فى الطعام منعه والاجازه، والله سبحانه اعلم'' (تکملہ فتح الملہم/ ۶۵۸ مکتبہ اشرفیہ دیوبند)۔

احتکار کی حرمت تو بدون کسی شک ثابت ہے اور بطور شریعت اس پر عمل قیامت تک رہے گا کیونکہ لوگوں کی حاجت بہ نسبت دیگر اشیاء کے اس تک زیادہ ہے لیکن دیگر اشیاء میں ثبوت احتکار حاکم کی رائے کی طرف سونپ دینا چاہئے، اگر حاکم دیگر اشیاء میں بھی غذائی اشیاء کی طرح ضرر شدید محسوس کرتا ہے تو احتکار سے روک دے گا ورنہ اجازت دے گا۔

عاجز کی رائے یہی ہے کہ احتکار کو طعام میں محصور نہ کیا جائے، احتکار کو عام رکھا جائے۔

۷- حضرت مفتی نظام الدین اعظمی صاحب تحریر فرماتے ہیں: اگر قانوناً جرم ہو تو چونکہ عزت بچانا واجب ہے، اپنی عزت بچانے کے لئے قانون کی خلاف ورزی کی بھی اجازت نہ ہوگی (منتخبات نظام الفتاوی ۲۸/۳ ایفا)۔

۸- پلاٹینم کو ثمن خلقی نہیں مانا جا سکتا ہے، کیونکہ سونا چاندی ہی کو منصوص طور پر ثمن قرار دیا گیا ہے، نیز اس میں تداول بھی نہیں پایا جاتا۔

☆☆☆

سونے چاندی کی تجارت - اسلامی نقطہ نظر

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی[1]

۱- الف-فقہاء کے نزدیک ثمن کی دو قسمیں ہیں: ایک ثمن خلقی اور دوسرا ثمن اصطلاحی، ثمن خلقی اور حقیقی سے مراد سونا چاندی ہے، اس کی ثمنیت کسی حال میں ختم نہیں ہوتی، جبکہ ثمن اصطلاحی کا تعلق حکومت کے مقرر اور متعین کردہ کرنسی اور فلوس سے ہے، اور حکومت کی تعیین ہی کی وجہ سے عوام میں لین دین میں اس کا چلن ہوتا ہے، حکومت نے اپنی منظوری واپس لے لی تو اس کی کرنسی کی حیثیت کاغذ کی رہ جاتی ہے، اور بینک بھی اس کے لئے روادار نہیں ہوتا، اس کی موٹی مثال وزیر اعظم ہندوستان کے ذریعہ ایک ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کے بند کرنے کا فیصلہ ہے، اس فیصلے کے بعد ثمن اصطلاحی کی قدر و قیمت ختم ہوگئی اور کاروباری ادارے ہی نہیں عوام بھی اسے لینے سے انکار کرنے لگی! حالانکہ یہی کرنسی جب ممنوع نہیں تھی تو اس کے قبول کرنے سے انکار قانونی جرائم زمرے میں آتا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ ثمن خلقی اور ثمن اصطلاحی ایک جنس کے نہیں ہیں، بلکہ دونوں کی جنس الگ ہے، ایک کی ثمنیت کبھی ختم نہیں ہوتی اور دوسرے کی ثمنیت حکومت کی مرہون منت ہوا کرتی ہے، علامہ سرخسیؒ کا یہی موقف ہے، مبسوط میں ہے:

"إن صفة الثمنية في الفلوس عارضة باصطلاح الناس فأما الذهب والفضة فثمن بأصل الخلقة" (المبسوط ۱۲/ ۱۳۷)۔

فلوس میں ثمنیت عارضی ہے، اور سونا چاندی اصل خلقت کے اعتبار سے ثمن ہیں، اس لئے سونے چاندی کی خرید و فروخت روپے سے بیع صرف نہیں ہے، کیونکہ بیع صرف ثمن خلقی کی بیع ثمن خلقی سے ہے، نہ کہ ثمن خلقی کی بیع ثمن اصطلاحی سے، اور جب یہ بیع صرف نہیں ہے تو بدلین میں سے ایک پر قبضہ کافی ہوگا، دوسرا ادھار ہوسکتا ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے چوتھے فقہی سمینار میں بھی علماء کرام کی ایک رائے یہی تھی کہ:

"مجلس عقد میں ہر دو عوض پر فوری قبضہ ضروری نہیں، ایک عوض پر قبضہ کافی ہے، کیونکہ نوٹوں کی حیثیت کلی طور پر سونے چاندی جیسی نہیں کہ یہ اعتباری اور اصطلاحی اثمان ہیں (نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے/ص ۱۶۷)۔

اس مسئلہ پر مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۴)، حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ (فتاوی محمودیہ ۲۳/ ۵۴۰)، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (کتاب الفتاوی ۹/ ۲۴،۴۲۴، قاموس الفقہ ۳/ ۶۵)، (فتاوی حقانیہ ۶/ ۲۴، جدید معاملات کے شرعی احکام ۱/ ۱۲۹)، مولانا مفتی سلمان منصوری (کتاب النوازل ۱۱/ ۹۱)، مفتی شبیر احمد قاسمی (فتاوی قاسمیہ ۱۹/ ۱۵۷۵)، اور فتاوی دار العلوم زکریا میں بھی حضرات مفتیان کرام نے اسے بیع صرف نہیں مانا ہے۔

ب-جہاں تک حکومت کے مقرر کردہ نرخ سے کم یا زیادہ پر سونے چاندی کی خریداری کا تعلق ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اس پر ربا الفضل کا اطلاق نہیں ہوگا، "وإن باع الذهب بالفضة جاز التفاضل لعدم المجانسة" (ہدایہ کتاب الصرف ۳/ ۱۰۴)۔

۲-زیور بنانے والے کاریگر کا زیور بنانے کے بدلے دوسری دھاتوں کی آمیزش کرنے کے عوض جو سونے کے ذرات مل جائیں، اسی کو اجرت کے طور پر قبول کرنا بیع نہیں، اجرت ہے اور عرف میں ایسا ہی چلن ہے جس کی وجہ سے یہ معاملہ مفضی الی النزاع نہیں ہوتا، اس لئے اس اجرت کو اجرت مجہولہ اور عامل کے جزو عمل ہونے کی وجہ سے اسے ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اجرت مجہولہ کے ممنوع ہونے کی وجہ نزاع ہے، اور

[1] نائب ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

تعامل کی وجہ سے نزاع کی صورت باقی نہیں رہتی، ہر دو فریق کو اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے ذرات بچیں گے اور دوسری دھات کی آمیزش کس قدر ہوگی۔

۳- بازار میں پرانے زیور کی قیمت کم لگائی جاتی ہے اور نئے کی زیادہ یہ درست نہیں ہے، کیونکہ ثمن خلقی ہونے کی وجہ سے دونوں ایک جنس کے ہیں، زیادہ سے زیادہ مستعمل اور غیر مستعمل کے فرق کو اچھے اور کم تر درجہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن اس سے اصل معاملہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس معاملہ میں فقہاء کی صراحت ملتی ہے کہ وصف کا اثر اس کے معاملہ پر نہیں پڑے گا، ہدایہ میں ہے:

''فإباء فضة بفضة وذهبا بذهب لايجوز إلا مثلا بمثل وإن اختلف في الجودة والصياغة'' (۲/ ۱۰۴)۔

۴- الف- کمپیوٹر کے ذریعہ سونا کی خرید وفروخت اس طرح کرنا کہ مبیع خریدار کے پاس نہ آئے اور خریداری کو مکمل سمجھا جائے اور قیمت بڑھنے پر اسی تاجر یا ایجنسی کے ذریعہ اسے فروخت کر کے زائد قیمت اصول کر لی جائے، ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ سونے چاندی میں قبضہ بالید مطلوب ہے، علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

''المراد بالقبض هنا القبض بالبراجم، ولا بالتخلية'' (فتح القدير ۷/ ۱۳۵)

(یہاں قبضہ سے مراد ہاتھوں کے ذریعہ حقیقی قبضہ ہے صرف تخلیہ کافی نہیں ہے)۔

ب- اسی وجہ سے اگر ہر خریدار کے نام بنام خریدی ہوئی مقدار کمپیوٹر میں درج ہو اور اتنی قدر کا سکہ الگ سے موجود ہو تو بھی یہ شکل جائز نہیں ہوگی۔

۵- ایکسچینج کے ذریعہ مخصوص مقدار میں سونے کی ادھار خرید وفروخت کے بعد ادائیگی کے دن کی قیمت کی کمی وبیشی کی ادائیگی شرعاً ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ بیع کالی بالکالی ہے جو ممنوع ہے، اس کے علاوہ مقصد اس معاملہ کا بڑھتی گھٹتی قیمت سے فائدہ اٹھانا ہے، اس لئے قمار ہے، نیز اس میں سونے چاندی کی تجارت میں جو قبض بالبراجم ضروری ہے وہ بھی مفقود ہے، اس معاملہ میں ثمن مجہول اور معاملہ وقتی ہے، ان تمام وجوہات سے اس قسم کی خرید وفروخت کی شرعاً گنجائش نہیں ہے۔

۶- سونے کی ذخیرہ اندوزی شریعت کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ ذخیرہ اندوزی سے مال نامی کی گردش رک جاتی ہے، اور بازار پر اس کا اثر پڑتا ہے، اس کے باوجود اس کی ذخیرہ اندوزی احتکار ممنوع کے دائرہ میں نہیں آئے گی، کیونکہ ذخیرہ اندوزی غذائی اجناس میں ممنوع ہے، دوسری چیزوں میں نہیں، جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے، ابن رشد قرطبی لکھتے ہیں:

''لا اختلاف في أنه لايجوز احتكار شئ من الطعام ولا غيره'' (البيان والتحصيل ۷/ ۳۶۰)۔

۷- اسمگلنگ کے ذریعہ جو سونے کی تجارت کی جاتی ہے، وہ درست نہیں ہے، کیونکہ غیر اسلامی ملکوں میں بھی مسلمانوں پر ان ملکی قوانین کی پابندی ضروری ہے، جو شرعی احکام سے متصادم نہ ہوں، اسمگلنگ میں ضرر اور ضرار، دونوں ہے، اس سے ملکی معیشت کو نقصان پہنچتا ہے اور پکڑے جانے کی صورت میں مالی جرمانہ کے ساتھ قید وبند کی صعوبت اس پر مستزاد، اس لئے اسمگلنگ مطلقاً جائز نہیں ہے، خواہ وہ سونے چاندی کی ہو یا کسی اور شئ کی۔

۸- پلاٹین چاندی سے مشابہ قیمتی دھات ہے، لیکن اسے ثمن اصلی کے حکم میں نہیں رکھا جاسکتا، کیونکہ ثمن اصلی منصوص ہے اور پلاٹین اس میں شامل نہیں ہے، اس لئے عقود اور زکوۃ وغیرہ اس پر سونے کے احکام نہیں نافذ ہوں گے، کیونکہ کسی چیز کا قیمتی ہونا اسے ثمن اصلی نہیں بنا دیتا، جیسے ہیرے جواہرات وغیرہ، جو انتہائی قیمتی ہیں لیکن ان پر زکوۃ نہیں ہے، اور اس معاملہ میں احناف، شوافع اور مالکیہ کا قول یکساں ہے کہ سونے چاندی کے علاوہ دیگر جواہرات میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔

محمد عبدالقادر رازی حنفی نے تحفۃ الملوک/ص ۱۲۸، مالک بن السنن مالکی نے المدونۃ الکبری میں اور امام نووی نے شرح مسلم میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہی ہے کہ ''لا زكوة فيما سوى الذهب والفضة من الجواهر'' سونے چاندی کے علاوہ جواہرات میں زکوۃ نہیں ہے۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت شریعت کی نگاہ میں

مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی [1]

۱- الف: یہ تو طے ہو چکا ہے کہ کاغذی نوٹ قرض کے لئے سند اور دستاویز نہیں ہے بلکہ ایک مستقل زر قانونی ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ نوٹ سونا چاندی نہیں ہے اور نہ سونا چاندی کے حکم میں ہے گرچہ بہت سے عرب علماء نے کاغذی نوٹ کو سونا اور چاندی کے حکم میں قرار دیا ہے، لیکن حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس نظریہ کا رد فرمایا ہے، اور مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نوٹ فلوس نافقہ کے حکم میں ہے نہ کہ سونا چاندی کے حکم میں (دیکھا جائے: فقہ البیوع/ص ۷۱۶ تا ۷۲۴، اور فقہی مقالات/ ۱۳ تا ۱۴)۔

پس جب یہ کاغذی نوٹ سونا چاندی نہیں ہے اور نہ سونا چاندی کے حکم میں ہے تو ان نوٹوں کے ذریعہ سونے چاندی کی تجارت کو بیع صرف نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی بیع صرف کے احکام ان پر جاری ہوں گے، یعنی روپے کے ذریعہ سونے چاندی کی تجارت کے جائز و درست ہونے کے لئے مجلس عقد میں بدلین پر قبضہ ضروری نہیں ہوگا، احد البدلین پر قبضہ کافی ہوگا بلکہ یہ بھی کافی ہوگا کہ سونے چاندی کی صرف تعیین ہو جائے، خواہ اس پر قبضہ ہو یا نہ ہو، ''المبسوط للسرخسی'' میں ہے:

''وإن اشترى خاتم فضه أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلوسا وليست الفلوس عنده فهو جائز إن تقابضا قبل للتفريق أو لم يتقابضا لأن هذا بيع وليس بصرف فإنما افترقا عن عين بدين لأن الخاتم يتعين بالتعيين بخلاف ما سبق فإن الدراهم والدنانير لا تتعين بالتعيين فلهذا اشترط هنالك قبض أحد البدلين'' (المبسوط للسرخسی باب البیع بالفلوس/ ۲۵، بحواله فقه للبيوع ۲/ ۷۶۳)۔

لیکن اگر خریدا ہوا سونا چاندی غیر خریدے ہوئے سونے چاندی کے ساتھ مخلوط ہو تو پھر اس معاملہ کے جائز و درست ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ مجلس عقد میں روپے پر قبضہ ہو جائے ورنہ بیع الکالی بالکالی کی صورت ہو جائے گی جو جائز نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ مبیع مخلوط غیر متعین خواہ وہ سونا چاندی ہو یا کوئی اور شئ جب تک اس کو غیر مبیع سے ممتاز و ممیز اور علاحدہ کر کے بائع یا اس کا وکیل اپنے قبضہ میں نہ کر لے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ''فقہ البیوع'' میں چلپی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''ولكن للواقع أن التخلية إنما تعتبر قبضا حكما إذا كان المبيع متعينا متميزا عن غير المبيع أما التخلية بدون التعيين فإنه ليس تخلية فى الواقع وإنما هو حق للأخذ بعد التعيين وليس فى حكم القبض لأنه إن هلكت كمية بقدر كمية المبيع والباقى فى المخزن كمية أخرى مثلها وجب على البائع أن يعطى المشترى منها كما ذكره الشلبي عن الجامع'' (فقه البيوع ۱/ ۴۱۱ مكتبه دار المعارف ديوبند)۔

ب- ملکی یا بین الاقوامی سطح پر سونے چاندی کی جو قیمت مقرر ہے اس سے کم یا زیادہ میں اس کی خرید و فروخت جائز ہے، اس لئے کہ کاغذی کرنسی اور سونا چاندی متحد الجنس نہیں ہیں پس ربا الفضل کا اطلاق نہیں ہوگا البتہ اگر ملکی یا بین الاقوامی سطح پر مقررہ قیمت کی پابندی ضروری ہو اور اس کے خلاف کرنے میں باز پرس کی جاتی ہو تو پھر ملکی اور بین الاقوامی قوانین کی پابندی کرنی چاہئے، یہ ربا الفضل کا مسئلہ نہیں تسعیر کا مسئلہ ہوگا، اگر حکومت کسی معصیت کا حکم نہ کرے تو حکومت کے قوانین کی پابندی کرنی چاہئے۔

---

[1] جامعہ اسلامیہ دار العلوم ملیا، کھگڑیا، بہار۔

۲- الف، ب: یہ معاملہ سونے کے لین دین کا نہیں ہے، یہ اجارہ کا مسئلہ ہے اس لئے کہ زیور بنانے والا کاریگر اسی سونے کو واپس کرتا ہے جو سونا زیورات کے تاجر سے اس نے لیا تھا، البتہ پورا سونا واپس نہیں کرتا ہے بلکہ سونے کے کچھ ذرات اپنی اجرت میں اور ان دھاتوں کے بدلے رکھ لیتا ہے جو دھات اس نے زیورات میں ملائے ہیں اور اجرت میں کچھ ایسی جہالت بھی نہیں ہے جو مفضی الی المنازعۃ ہو، زیورات کے تاجر اور زیورات کے کاریگر دونوں کو ان ذرات کا اندازہ رہتا ہے، اور دونوں راضی بھی رہتے ہیں اس لئے اس معاملہ اجارہ میں شرعا کوئی قباحت نہیں ہے۔

۳- یہ صورت بالکل ناجائز ہے، صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

''فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لايجوز إلا مثلا بمثل وإن اختلفت في الجودة والصياغة لقوله عليه السلام: ''الذهب بالذهب مثلا بمثل وزنا بوزن يدا بيد والفضل ربوا '' وقال عليه السلام: ''جيدها ورديها سواء'' (ہدایہ کتاب الصرف ۳/ ۸۸)۔

ہاں اگر پرانے زیور کو پہلے روپے کے بدلے فروخت کرلیا جائے پھر روپے کے ذریعہ نیا زیور خریدا جائے تو یہ صورت جائز ہے، خواہ نیا زیور وزن میں پرانے زیور سے کم ہو یا زیادہ۔

۴- بذریعہ ایکسچینج سونے اور چاندی کے اس کاروبار میں سب سے اہم اور قابل غور دو باتیں ہیں: اول یہ کہ خریدا ہوا سونا غیر خریدے ہوئے سونے سے ممتاز و ممیز اور علاحدہ ہوکر مشتری یا مشتری کے وکیل کے قبضہ میں آتا ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ اگر مبیع غیر مبیع کے ساتھ مخلوط ہو تو تصرف کار اختیار ملنے کے باوجود شرعی قبضہ کا تحقق نہیں ہوتا ہے جیسا کہ سوال نمبر ۱ کی شق الف کے جواب میں فقہ البیوع کے حوالہ سے تحریر کیا گیا اور جب تک شرعی قبضہ کا تحقق نہ ہو مبیع کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

دوم یہ کہ مجلس عقد میں ثمن یا مبیع پر اصالۃ یا وکالۃ قبضہ ہوتا ہے یا نہیں؟

پس اگر خریدا ہوا سونا غیر خریدے ہوئے سونے سے ممتاز و ممیز ہوکر مجلس عقد کے اندر مشتری یا اس کے وکیل کے قبضہ میں آ گیا تو یہ معاملہ جائز اور درست ہے اور مبیع کو آگے فروخت کرنا بھی جائز ہے خواہ ثمن پر قبضہ ہوا یا نہ ہوا ہو اور اگر مجلس عقد کے اندر اصالۃ یا وکالۃ مبیع پر تو قبضہ نہیں ہوا لیکن ثمن پر قبضہ ہوگیا تب بھی یہ معاملہ جائز اور درست ہے لیکن اس صورت میں خریدے ہوئے سونے کو آگے فروخت کرنا اس وقت تک جائز نہیں ہوگا جب تک کہ اس کو غیر مبیع سے ممتاز و ممیز نہ کرلیا جائے اور اگر مجلس عقد کے اندر اصالۃ یا وکالۃ نہ ثمن پر قبضہ ہوا نہ مبیع پر شرعی قبضہ ہوسکا تو یہ بیع الکالی بالکالی ہے جو قطعا صحیح نہیں ہے۔

۵- جب مجلس عقد کے اندر ثمن و مبیع میں سے کسی پر قبضہ نہیں ہوا تو یہ بیع الکالی بالکالی ہے جو قطعا صحیح نہیں ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔

۶- گراں فروشی کے لئے سونے کو روکے رکھنا بھی احتکار ہے، امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ ہر وہ چیز جس کے روکنے سے لوگوں کو نقصان پہنچے وہ احتکار ہے، ''وعن أبي يوسف كل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتكار'' (رد المحتار ۹/ ۵۷۱ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اور آج کل تو پوری دنیا ایک شہر کی مانند ہے اور دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کاروبار ہوتا ہے اس لئے یہ بھی نہیں دیکھنا ہے کہ کتنی دوری سے مال لایا گیا ہے، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایسے شہر سے مال لاکر روکا گیا ہے جس شہر سے لوگ عادتا مال لایا کرتے ہیں تو یہ بھی احتکار ہے، ''وعن محمد إن كان يجلب منه عادة كره وهو المختار'' (الدر المختار مع رد المحتار ۹/ ۵۷۳)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا رجحان بھی اسی طرف ہے (فقہ البیوع ۲/ ۹۹۸)۔

۷- اس سوال کے جز ہیں: الف- اسمگلنگ اور خفیہ کاروبار کا شرعی حکم کیا ہے؟ ب- اسمگلنگ کے راستے آئے سونے کی خریداری کا کیا حکم ہے؟

جہاں تک اسمگلنگ کے راستے آئے سونے کی خریداری کا سوال ہے تو وہ سونا خریدنے والے کی ملکیت قرار پائے گا اور اس سونے کا مصرف لینا

بھی اس کے لئے جائز ہوگا۔

رہ گیا اسمگلنگ کا معاملہ تو اسمگلنگ کا معاملہ ٹیکس سے جڑا ہوا ہے، آج کل حکومتیں ملکی اخراجات اور ترقیات کے نام پر مختلف قسم کے بھاری بھر کم ٹیکس عوام پر لادتی چلی جارہی ہیں جبکہ ان ٹیکسوں سے حاصل ہونے والے سرمائے کا بیشتر حصہ ارکان حکومت کی تنخواہوں، مراعات اور رفاہی کاموں کے نام لوٹ کھسوٹ کی نظر ہو جاتا ہے، بمشکل تمام عوامی سرمائے کا ایک چوتھائی حصہ ہی عوام پر یا ترقیات ورفاہی کاموں پر خرچ ہو پاتا ہے، اگر ارکان حکومت کی شاہ خرچیاں اور رفاہی کاموں کے نام پر لوٹ کھسوٹ نہ ہو تو مختلف قسم کے بھاری بھر کم ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی، ہلکے پھلکے ٹیکس سے وہ سارے کام انجام پاجائیں گے جو بھاری بھر کم ٹیکس سے بھی انجام نہیں پاتے ہیں اور ہلکے پھلکے ٹیکس کو عوام بخوشی قبول کرنے اور ادا کرنے کو تیار ہوں گے، اور ٹیکس سے بچنے کی تدبیریں تلاش کرنے کے درپے نہ ہوں گے، گویا حکومت واجب اخراجات سے زیادہ عوام سے ٹیکس وصول کرتی ہے جو ظلم ہے اور ظلم سے بچنے کی تدبیریں کرنا ہر کسی کا حق ہے، پس اگر کچھ لوگ حکومت کی نظروں سے بچ بچا کر کاروبار کرتے ہیں تو انہوں نے کوئی خدائی حکم نہیں توڑا، البتہ ڈرتے ہوئے ظالم حکمرانوں کے حکموں کو توڑا اور اپنی روزی روٹی کا انتظام کیا یا اپنی معیشت اور ملکی معیشت کو مضبوط اور مستحکم کیا، میرے خیال سے یہ خفیہ کاروبار ملکی مفاد کے خلاف نہیں ہے، البتہ ظالم حکمرانوں کے مفاد کے خلاف ضرور ہے تاہم اس خفیہ کاروبار میں خود کی عزت داؤ پر لگی رہتی ہے بلکہ جان و مال کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے اور حدیث شریف میں آتا ہے: "علی المرأ أن لایذل نفسه" نیز حدیث شریف میں ہے کہ تمہارے اوپر تمہاری جان اور تمہارے اعضاء آنکھ وغیرہ کا بھی حق ہے اس لئے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جس سے جسم و جان کو نقصان پہنچے یا عزت و آبرو خطرے میں پڑے، یہ بھی ایک حکم شرعی ہے، پس اس نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو اسمگلنگ اور خفیہ کاروبار میں ملوث نہیں کرنا چاہئے۔

۸- ہیرے جواہرات سونے کے حکم میں ہیں یا نہیں؟

حضرت قاضی صاحب نور اللہ مرقدہ کے زمانے میں پانچویں فقہی سمینار منعقدہ اعظم گڑھ میں ہیرے جواہرات سے متعلق بحث ہو چکی ہے، کہ انہیں سونے کی طرح خلقتاً یا مال تجارت کی طرح حکماً نامی تسلیم کیا جائے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کی دو جماعت بن گئی، ایک جماعت کی رائے یہ تھی کہ انہیں خلقتاً یا حکماً مال نامی تسلیم کیا جائے اور ان پر بھی زکوۃ واجب ہو خواہ وہ تجارت کے لئے نہ ہو جبکہ دوسری جماعت کی رائے اس کے برعکس تھی اب اس سمینار میں بھی اسی قضیہ کو دوسرے عنوان سے اٹھایا گیا ہے کہ پلاٹین کو حکماً سونا تسلیم کیا جائے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ پلاٹین کے بارے میں بھی حسب سابق دو رائیں ہوں گی:

ہیرے جواہرات کو سونے کے حکم میں تسلیم کرنے والی جماعت کی رائے اگرچہ مضبوط اور عقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے لیکن وہ ذات اقدس جو خالق ارض و سموات کی نمائندہ بن کر دنیا میں آئی اور جس کے بارے میں قرآن نے کہا: "وما ینطق عن الهوى ان هو الا وحي يوحى" ﷺ اس ذات اقدس نے ہیرے، جواہرات کو معیار غنی بنانے کی طرف توجہ مبذول نہیں فرمائی جبکہ اس زمانے میں بھی ہیرے، جواہرات کا وجود تھا اور ہیرے جواہرات رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے تو اب ہم لوگوں کو بھی ہیرے جواہرات کو معیار غنی بنانے کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے، نہیں معلوم کیا مصلحت تھی کہ ہیرے جواہرات کو نظر انداز کیا گیا۔

پلاٹین کا مسئلہ- پلاٹین اور فلوس نافقہ:

تاہم پلاٹین جس کا وجود اب سامنے آیا ہے اور جس کے بارے میں سوال میں کہا گیا ہے کہ اب اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، پس اگر اس کا چلن سونے کی طرح ہو گیا ہے اور لوگ کاروبار میں اس کو ثمن کی جگہ قبول کرنے لگے ہیں تو پھر اس کو فلوس نافقہ کے درجے میں تسلیم کیا جانا چاہئے اور جس طرح فلوس نافقہ کی قیمت سونے سے لگا کر اس کی زکوۃ نکالی جاتی ہے اسی طرح پلاٹین کی بھی سونے سے قیمت لگا کر زکوۃ نکالی جانی چاہئے۔

☆☆☆

سونے اور چاندی کی تجارت اسلام کی روشنی میں

مولانا عبدالحی مفتاحی [1]

چند باتیں بطور تمہید ذکر کی جاتی ہیں:

۱- ''صرف'' کا لغوی معنی زیادتی اور اضافہ ہے، اسی لیے حدیث شریف میں نفل عبادت کو ''صرف'' سے تعبیر کیا گیا ہے:

''عن عمرو بن عوف قال قال رسول الله ﷺ من تولی غير مواليه، فعليه لعنة الله، ومن انتمی إلى غير أبيه، لايقبل الله منه صرفًا ولاعدلًا- أي لانفلًا ولافرضًا'' (الصحیح لمسلم۱/ ۴۴۲)۔

اور فقہ کی اصطلاح میں: سونے کو سونے کے بدلے، یا چاندی کو چاندی کے بدلے، یا سونے کو چاندی کے بدلے خرید وفروخت کرنے کو بیع صرف کہا جاتا ہے۔

'' وشرعًا ہو بيع النقد بالنقد جنسًا بجنس أوبغير جنس، أي بيع الذهب بالذهب، أوالفضة بالفضة، أوالذهب بالفضة، مصوغًا أونقدًا'' (فتح القدير مع العناية ۵/ ۳۶۸، ۲۸۳، رد المحتار۴/ ۲۴۴، بحواله الفقه الاسلامی وأدلته۵/ ۳۶۵۹)۔

بیع صرف کے صحیح ہونے کے لیے چار شرطیں ہیں، جن کو اجمالی طور پر تحریر کیا جاتا ہے:

(۱) فریقین کی طرف سے اپنے عوض پر الگ ہونے سے پہلے قبضہ کرلینا۔

(۲) اگر دونوں طرف سے ایک ہی جنس کی شئ ہو تو دونوں کا برابر ہونا۔

(۳) فریقین یا ان میں سے کسی ایک کا اپنے لیے غور وفکر کی مہلت حاصل نہ کرنا۔

(۴) فریقین میں سے کسی کی جانب سے معاوضہ کی ادائیگی کے لیے کوئی خاص مدت مقرر نہ کرنا، جیسا کہ الفقہ الاسلامی وادلتہ (۵/ ۳۶۶۰) پر ہے:

''وشرائطه إجمالًا التقابض قبل افتراق المتعاقدين والتماثل وأن لايكون فيه خيار ولاتأجيل''۔

۲- ثمن کی دو قسمیں ہیں: ثمن حقیقی اور ثمن عرفی یا اصطلاحی۔

ثمن حقیقی وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی ثمن بننے کے لیے کیا ہے۔ جیسے سونا اور چاندی۔

ثمن اصطلاحی وہ جو رواج اور عرف کی وجہ سے یا کسی قانون کی وجہ سے ثمن بنا دیا گیا ہو۔ جیسے: فلوس، روپئے اور کرنسی وغیرہ۔

اگر سونے کا تبادلہ سونے یا چاندی کا تبادلہ چاندی یا سونے کا تبادلہ چاندی سے ہو تو بیع صرف ہوگا، اور اس پر صرف کے احکام جاری ہوں گے اور اگر سونے چاندی کا تبادلہ روپئے اور نوٹوں سے ہو تو یہ صرف نہ ہوگا، اور نہ ہی صرف کے احکام جاری ہوں گے؛ اس لیے تقابض فی المجلس کی شرط نہیں ہوگی۔

''واعلم أن الفلوس ليست بثمن فی الأصل وإنما ضربت لتقام مقام الكسور من الفضة، لحاجة الناس إلى ذلك فی شراء المحضرات'' (الدرالمنتقی مع مجمع الأنهر جلد سوم) ''إن الاوراق النقدية ثمن عرفی، ليست ثمنا

---

[1] (ناظم اعلیٰ) مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیرآباد ضلع مئو (یوپی)۔

حقیقیًا. والرباء تجری فی الثمن الخلقی الذاتی'' (التبیان فی زکوۃ الاثمان، بحوالہ مجلہ فقہ اکیڈمی ۴/ ۵۹، مطبوعہ اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)۔

۳- قبضہ کی دو قسمیں ہیں: قبضہ حسی اور قبضہ معنوی یا قبضہ تقدیری۔

احناف کے نزدیک قبضہ کے معتبر ہونے کے لیے حسی ہونا ضروری نہیں، بلکہ تخلیہ بھی کافی ہے، تخلیہ کے معنی یہ ہیں کہ مشتری کو اس بات پر قدرت دے دی جائے کہ وہ جب چاہے آکر مبیع پر قبضہ کرلے، جب قبضہ کرنے میں کوئی مانع باقی نہ رہے تو سمجھیں گے کہ تخلیہ ہوگیا۔ مثلاً کوئی بکس ہے اس کے اندر کئی چیزیں رکھی ہوئی ہیں، اس کی چابی اس کے حوالے کردی، تو جب چابی حوالے کردی، اب چاہے وہ اٹھائے یا نہ اٹھائے قبضہ متحقق ہوگیا، تخلیہ کے کافی ہونے پر امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ مبیع پر مشتری کا قبضہ ضروری ہے، تاکہ مشتری کو اتنی قدرت حاصل ہوجائے کہ وہ اس کو آگے بیچ سکے اور جس چیز پر اس نے قبضہ ہی نہیں کیا اس کو آگے بیچ بھی نہیں سکتا، اس نہی کی علت ربح مالم یضمن ہے، یعنی اگر وہ قبضہ نہیں کرے گا تو مشتری کے ضمان میں نہیں آئے گی، نہ آنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ہلاک ہوجائے تو بائع کا نقصان سمجھا جائے گا، لیکن اگر مشتری نے قبضہ کرلیا تو اب ہلاک ہونے کی صورت میں مشتری کا نقصان ہوگا، اگر مبیع بائع کے پاس ہے اور ابھی تک مشتری کے ضمان میں نہیں آئی اب اگر مشتری اس کو بغیر قبضہ کے تیسرے شخص کو فروخت کرے اور اس پر نفع کمائے تو یہ ربح مالم یضمن ہوجائے گی، یعنی اس چیز پر نفع کمانا جو اس کے ضمان میں نہیں آئی اور یہ ناجائز ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اصل چیز ضمان میں آجانا ہے، اس ضمان میں آجانے کے لیے حسی قبضہ کوئی ضروری نہیں، بلکہ اگر اس نے حسًا قبضہ نہیں کیا لیکن بائع نے تخلیہ کردیا تو تخلیہ کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بھائی میں نے تمہیں قدرت دیدی جب چاہو اس پر قبضہ کرلینا، پھر بھی اگر وہ میرے پاس ہی رہے تو بطور امانت ہوگی نہ کہ ضمان، کیوں کہ اب ضمان بائع سے مشتری کی طرف منتقل ہوگیا ہے، تو قبضہ کا حکم بھی متحقق ہوگیا، اب اگر مشتری اسے آگے فروخت کرنا چاہے تو ربح مالم یضمن نہیں لازم آئے گا (مستفاد: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۹۹، ۱۰۰)۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ اگر روپے سے سونا اور چاندی خرید لیا جائے تو سونے چاندی کے مقابلے میں روپے کی حقیقت فلوس کی ہوگی، لہذا اس بیع کو بیع صرف تصور نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس پر صرف کے احکام لاگو ہوں گے، کیوں کہ بیع صرف میں ضروری ہوتا ہے کہ دونوں طرف نقد ہو، یعنی دونوں طرف سونا چاندی میں سے کوئی ایک ہو، اور سونا چاندی کے روپے سے بیع میں ایک طرف نقدین میں سے کوئی نہیں ہے، لہذا یہ بیع صرف نہیں ہے، جیسا کہ تمہید کے ذیل میں صرف کی تعریف گذر چکی ہے۔

الف: چنانچہ سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار تو یہ معاملہ جائز ہوگا۔

''سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس نسیئة فأجاب بأنه یجوز إذا قبض أحد البدلین. لما فی البزازیة لو اشتری مائة فلس بدرهم یکفی التقابض من أحد الجانبین'' (شامی کتاب البیوع باب الربو مطلب فی استقراض الدراهم عددًا زکریا ۷/ ۴۱۴)۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے: ''وإن اشتری خاتم فضة أو خاتم ذهب فیه فص أو لیس فیه فص بکذا فلسًا ولیست الفلوس عنده فهو جائز تقابضا قبل التفرق أولم یتقابضا لأن هذا بیع ولیس بصرف'' (عالمگیری کتاب الصرف الباب الثانی الفصل الثالث فی بیع الفلوس زکریا قدیم ۳/ ۲۲۴)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فلوس کی تشریح کے ذیل میں فرماتے ہیں: ''اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں تفاضل تو حرام ہے یعنی ایک کے بدلے مثلاً دو لینا تو حرام ہے، لیکن اگر اس کے ذریعہ سے سونے کی بیع کی جائے تو بیع صرف نہیں ہوگی، کیوں کہ بیع صرف کے اندر ضروری ہے کہ دونوں طرف حقیقی سونا ہو یا چاندی ہو اور نوٹ کی پشت پر سونا چاندی نہیں ہے، لہذا یہ بیع صرف نہیں ہوگی، اس لیے حقیقی تقابض فی المجلس شرط نہیں ہے''۔

(اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۷۸)۔

ب: حکومت یا سونے کی مارکیٹ کی طرف سے سونے چاندی کا طے شدہ نرخ سے زیادہ یا کم قیمت پر خرید وفروخت کرنا جائز ہے۔

''المالك هو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء'' (بیضاوی شریف ۱/ ۷، سورہ فاتحہ)

اس پر ربوتفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا کیوں کہ روپے کی حیثیت فلوس کی ہے، سونے چاندی کی نہیں ہے۔ اس لیے روپے کے عوض سونا چاندی کی خرید وفروخت کی جائے نرخ سے کمی زیادتی کے ساتھ تو ربوتفاضل نہیں ہوگا، ہاں اگر روپے سونا چاندی کے حکم میں ہوتے تو ربوا تفاضل کا تحقق ہوسکتا تھا، البتہ اگر حکومت نے سونا چاندی کا نرخ طے کیا ہے تو اس کے خلاف کرنا مناسب نہیں، کیوں کہ اس صورت میں اپنی عزت اور جان ومال کو خطرہ میں ڈالنا ہے، حکومت کی جانب سے سزا ہوسکتی ہے اور حکومت کے قانون کے خلاف کر کے اپنی عزت اور جان ومال کو خطرے میں ڈالنا دانشمندی نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ''لا ینبغی للمؤمن أن یذل نفسه'' (ترمذی شریف ۲/ ۵۰، مطبوعہ رشیدیہ دہلی)۔

۲- سونا چاندی کے تاجر لوگ زیورات بنانے والوں کو جو سونا دیتے ہیں اور ان کو کچھ دوسری دھات کی آمیزش کر کے زیورات تیار کر کے اتنی ہی مقدار واپس کرنی ہوتی ہے اور آمیزش کے بقدر بچے ہوئے سونے کے ذرات کو ان کی اجرت قرار دے دیا جاتا ہے تو اس کے جواز اور عدم جواز میں تفصیل یہ ہے کہ اگر سونا اور آمیزش کی جانے والی دھات دونوں ہی چیزیں تاجر کی ہیں تو اس صورت میں سونے کے بچے ہوئے ذرات کو اجرت قرار دینا درست نہیں، کیوں کہ یہ قفیز طحان کی صورت ہے جو بنص حدیث ناجائز ہے۔

''عن أبي سعید قال نهی عن عصب الفحل وعن قفیز الطحان'' راوه الدار قطنی۔

اور اگر آمیزش کی جانے والی دھات زیورات بنانے والے کاریگروں کی طرف سے ہے تو یہ ایک قسم کی بیع ہے گویا کہ دھات کے بدلے میں سونے کے ذرات ہیں اور یہ صورت جائز ہونی چاہئے۔

۳- سونا چاندی کے پرانے زیورات کے تبادلے کے وقت کمی بیشی ناجائز ہے، کیوں کہ اس صورت میں ربو متحقق ہے۔

''فإن باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لایجوز إلا مثلًا بمثل، وإن اختلفت فی الجودة والصیاغة. وإن باع الذهب بالفضة جازت التفاضل. لعدم المجانسة'' (ہدایہ کتاب الصرف اشرفی ۳/ ۱۰۴)۔

۴- قبضہ وہی معتبر ہوتا ہے جو حسًا ہو یا حکمًا جس کی وجہ سے مبیع بائع کے ضمان سے نکل کر مشتری کے ضمان میں چلی جائے یعنی مشتری کے لیے ایسا قبضہ ثابت ہوجائے کہ اگر وہ شئ ہلاک ہوجائے تو مشتری کا نقصان سمجھا جائے اور اگر وہ بائع کے پاس ہو تو ہلاک ہونے پر بائع کا نقصان سمجھا جائے، ادارے نے جو سونا چاندی چند افراد کو فروخت کیا ہے چاہے سب کا سونا سونے کی ایک اینٹ میں شامل ہوجائے چاہے بسکٹ کی شکل میں سب کا الگ الگ ہو اور کمپیوٹر یا ریکارڈ میں ان کا فارم درج ہو، چونکہ وہ سونا ابھی ادارے کے ہی ضمان میں ہے خریدنے والے حضرات اس میں کوئی تصرف نہیں کر سکتے ہیں، گو کہ وہ مالک ہیں، اس لیے اس کو قبضہ نہیں مانا جائے گا، کیوں کہ قبضہ یا حسًا ہوتا ہے یا حکمًا، حکمًا قبضہ یہ ہے کہ مشتری کا وکیل قبضہ کرے یا بائع مشتری اور مبیع کے درمیان تخلیہ کردے، تخلیہ یہ ہے کہ مشتری کو اس بات پر قدرت دے دی جائے کہ وہ جب چاہے آکر مبیع پر قبضہ کر لے، اگر اس کو بیچنا چاہے تو اس کو بیچ سکے یا اور کوئی تصرف کرنا چاہے تو کر سکے، کمپیوٹرائز اکس چینج کی طرف سے جو بیع ہورہی ہے اس میں اس طرح کا کوئی قبضہ نہیں ہورہا ہے، لہٰذا یہ قبضہ معتبر نہیں ہوگا (مستفاد: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۹۸، ۹۹)۔

۵- سوال نامہ میں ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی رائج صورت جو ذکر کی گئی ہے وہ جائز نہیں، کیوں کہ بیع الکالی بالکالی کی صورت ہے جو کہ ناجائز ہے۔ بیع الکالی بالکالی یہ ہے کہ مبیع اور ثمن دونوں ادھار ہوں اور یہاں یہی صورت ہے، اس لیے بائع جو کہ ادارہ ہے نہ وہ ثمن پر قبضہ کر رہا ہے اور نہ مشتری مبیع پر قبضہ کر رہا ہے۔

''عن ابن عمر أن النبی ﷺ نهی عن بیع الکالی بالکالی'' راوه الدار قطنی۔

۶- سونا اور چاندی کی قیمتوں میں متوقع اضافہ کا علم ہوجانے پر ان کو روک لینا اور قیمت بڑھنے کے بعد فروخت کرنا احتکار کے دائرے میں نہیں آئے گا، کیوں احتکار صرف قوت یعنی اشیاء خوردنی میں جاری ہوتا ہے، اس کے علاوہ میں نہیں، جیسا کہ یہی امام ابوحنیفہ، شوافع اور حنابلہ کا مذہب ہے، ان ائمہ نے اپنے مذہب پر استدلال یوں کیا کہ اس باب میں جو روایات آئی ہیں ان میں بعض عام ہیں اور بعض خاص، مثلاً:

''قال رسول الله ﷺ من احتکر فهو خاطئ'' (رواه مسلم وابوداؤد)۔

اسی طرح ایک دوسری روایت جس کو امام مسلم اور امام احمد نے نقل کیا ہے: "لایحتکر الا خاطئ"

اسی طرح اور دوسری روایات ہیں، یہ روایات عموم پر دلالت کرتی ہیں، یعنی احتکار ہر چیز میں جاری ہوتا ہے۔

اور جو روایات خصوص پر یعنی احتکار صرف مطعومات میں جاری ہوتا ہے دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہیں:

"من احتكر على المسلمين طعامهم ضربه الله بالجذام والإفلاس۔ أخرجه أحمد وابن ماجة والحاكم۔

من احتكر الطعام أربعين ليلة فقد برئ من الله وبرئ الله منه"۔ رواه احمد والحاكم وابن أبي شيبة

اور ضابطہ یہ ہے کہ ایک مسئلے میں عام اور خاص نصوص جمع ہو جائیں تو عام کو خاص پر اور مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے:

"وإذا اجتمعت نصوص عامة وأخرىٰ خاصة في مسئلة واحدة حمل العام على الخاص والمطلق على المقيد"

(الموسوعة الفقهيه ۲/ ۹۳)۔

۷- اسمگلنگ کے راستے سے آنے والے سونے کا خریدنا اور بیچنا جائز اور درست ہے، اس کی آمدنی حلال ہے۔

"المالك هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء" (بيضاوی شريف ۱/ ۷، سوره فاتحه)

تاہم اسمگلنگ کا عمل غیر مناسب ہے، کیوں کہ عزت اور جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا ہے، خلاف قانون ہونے کی وجہ سے حکومت کی جانب سے سزا ہو سکتی ہے اور دانشمند کا کام نہیں کہ اپنی عزت اور جان و مال کو خطرے میں ڈالے۔

حدیث شریف میں ہے: "لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه" (ترمذی شريف ۲/ ۵۰، مطبوعه رشيديه دہلی)۔

۸- پلاٹین گو کہ مہنگی دھات ہے اور اس سے زیورات بنائے جاتے ہیں پھر بھی اس پر سونے کے احکام نہیں جاری ہوں گے، چنانچہ مذکورہ دھات اگر مال تجارت ہے تو جیسے اور اموال تجارت میں زکوۃ واجب ہوتی ہے اس پر واجب ہوگی، اور اگر اس دھات سے زیورات بنالئے گئے ہیں تو جس طرح سونے چاندی کے علاوہ پیتل المونیم تانبے سے بنے ہوئے زیورات میں زکوۃ واجب نہیں ہوتی ہے ایسے ہی اس میں بھی واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح پلاٹین کا تبادلہ پلاٹین سے یا سونے چاندی کا تبادلہ پلاٹین سے ہو تو اس پر صرف کے احکام مثلاً تقابض فی المجلس جاری نہیں ہوں گے، کیوں کہ بیع صرف میں ضروری ہے کہ سونے کا سونے سے، چاندی کا تبادلہ چاندی سے یا سونے کا تبادلہ چاندی سے ہو، جیسا کہ تمہید میں یہ بات گذر چکی ہے اور یہاں یہ صورت نہیں ہے۔

☆☆☆

سونے چاندی کی تجارت کے احکام

مفتی محمد اشرف[1]

۱- روپئے یعنی موجودہ رائج کرنسی جو سونے/ چاندی سے بنی ہوئی نہیں ہے اس سے اگر سونا یا چاندی خرید ا جائے تو یہ اصطلاحی بیع صرف نہیں ہے، اس لئے کہ بیع صرف سے مراد وہ بیع ہے جو سونے چاندی کے درمیان میں ہو، بیع صرف ہونے کے لئے ثمن ہونا ضروری نہیں ہے، بیع المصوغ بالمصوغ او بالنقد بیع صرف ہے لیکن مصوغ ثمن کے حکم میں نہیں ہے اور وہ متعین ہوجاتا ہے (الدر المختار ۴/ ۲۶۱)۔

الف- سونے/ چاندی کی روپئے کے عوض ادھار بیع جائز ہے، عوضین پر قبضہ ضروری نہیں ہے۔

ب- روپیہ اور موجودہ کرنسی سونا/ چاندی نہیں ہے، لہذا روپئے کے عوض سونے/ چاندی کی فروخت مین ربا کے احکام جاری نہیں ہوں گے، سونے/ چاندی کی جو قیمت حکومت نے طے کی ہے، اس کے خلاف فروخت کرنے سے ربا الفضل ثابت نہیں ہوگا۔

۲- اس شکل کو بیع قرار دینا مشکل ہے، اس لئے کہ یہاں عوضین پر ایک مجلس میں قبضہ نہیں ہوتا بلکہ پہلے کاریگر قبضہ کرتا ہے، کچھ مدت کے بعد بنے ہوئے زیور پر تاجر قبضہ کرتا ہے، اس لئے اسے اجارہ کی تاویل کے ساتھ جائز قرار دینا آسان ہوگا۔

کاریگر دو کام کرتا ہے، سونے کو مطلوبہ شکل کے مطابق ڈھالتا اور اس مقصد کے لئے اپنی طرف سے سونے/ چاندی کے علاوہ کوئی دوسری دھات اپنی طرف سے ملاتا ہے اس عمل کے دوران کاریگر کے پاس معلوم مقدار کے ساتھ سونے کے جو ذرات رہ جاتے ہیں وہ کاریگر کے عمل کی اجرت اور اس کی طرف سے لگائی ہوئی دھات کی قیمت متصور کئے جائیں گے، جیسا کہ صباغ کے عمل کی فقہاء نے تاویل کی ہے، اس میں صفقۃ فی صفقۃ ہے لیکن تعامل کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے مزید یہ کہ بیع اس میں تبعا ہے اصل میں اجارہ ہی ہے، مرضعہ کا اجارہ بھی اسی قبیل سے ہے، منی آرڈر کو حضرت تھانویؒ نے صباغ کی تاویل سے جائز قرار دیا ہے، یہاں جہالت یسیرہ اور مغتفرہ ہے۔

(والتفصیل لصفقۃ فی صفقۃ مذکور فی فقہ البیوع للشیخ العثمانی/ ص ۵۰۶ تا ۵۱۴)۔

۳- لیکن اگر سونے کے عوض روپیہ ہو تو پھر یہ جائز ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کے تبادلے کو جائز طریقے سے کرنے کی شکل بیان کی۔

۴- کمپیوٹرائز ایکسچینج ایک ادارہ ہے، اس میں سونے چاندی کی خرید و فروخت کا عمل ایسا ہی ہے جیسے بازار حصص میں حصص کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اس مین خرید و فروخت ایجنٹ (بروکر) یعنی وکیل کے واسطے سے ہوتی ہے، ادارہ کے پاس سونا موجود ہوتا ہے اور یہ تمام سونا زیورات کی مخصوص شکل میں نہیں بلکہ بڑی اینٹ کی شکل میں ہوتا ہے گویا کہ وہ متساوی الاجزاء ہونے کی وجہ سے ذوات الامثال کے حکم میں ہے، ایک کلو سونے کی اینٹ میں مثلاً دس گرام اینٹ کے کسی بھی حصے میں ایک ہی قیمت کا ہوگا، اینٹ کے مختلف اجزاء کی قیمتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، لہذا:

الف: ایک کلو سونے کی اینٹ میں سے پچاس گرام سونا خریدنا بروکر کے واسطے سے صحیح ہے اگرچہ پچاس گرام سونے کو الگ کرکے نہ رکھا جائے، یہ پچاس گرام ایک کلو میں مشاع ہے اور یہ بیع سہم من السہام کے قبیل سے ہے، بروکر وکیل ہے لہذا اس کا قبضہ خریدار کا قبضہ کہلائے گا، قبضے سے مراد اس رسید یا ثبوت پر قبضہ جو دلالت کررہی ہے کہ اتنی مقدار کا سونا حامل رسید کی ملکیت ہے۔

چونکہ یہ بیع صرف نہیں ہے، لہذا دوسرے عوض یعنی رقم پر اسی مجلس میں قبضہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

---

[1] دار الافتاء جامعہ محمودیہ، سپرنگز ساؤتھ افریقہ۔

مزید یہ کہ آج کل رقم کی ادائیگی انٹرنیٹ کے واسطے سے ایک اکاؤنٹ میں سے دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کی جاتی ہے، محقق علماء عصر نے کسی کے اکاؤنٹ میں رقم کے آجانے کو حامل اکاؤنٹ کا قبضہ قرار دیا ہے، لہٰذا سونا خریدتے وقت جب تاجر سونے کی معین مقدار خریدنے کا آرڈر کرے گا تو اس سے رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جائے گا، جب یہ تاجر خریدار انٹرنیٹ کے ذریعہ رقم منتقل کرے گا تو دوسری جانب میں سونا فروخت کرنے والے کا رقم پر قبضہ بنک کی وکالت سے متصور ہوگا اور بروکر کے واسطے سے سونے پر خریدار کا قبضہ معتبر ہوگا، اس طرح ایک مجلس میں جانبین سے عوضین پر قبضے کی شکل بھی پائی گئی، شریعت کے مطابق بنکاری اور اقتصادی معاملات کے لئے ضوابط مقرر کرنے کی تنظیم AAOIFI نے اپنے لئے معیار نمبر ۵۷ میں اس صورت کو جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ رقم کی ادائیگی فوری کی جائے، کیونکہ یہ ان کے نزدیک بیع صرف کے حکم میں ہے۔

ب- اسے قبضہ تصور کیا جائے گا اور یہ مزید اچھی شکل ہے۔

۵- سوال میں جو صورت مذکور ہے وہ بیع مستقبل کی صورت ہے اور مستقبل کی طرف نسبت کر کے بیع کرنا صحیح نہیں ہے، لہٰذا یہ صورت جائز نہیں ہے، جو علماء روپے سے سونے کی خرید وفروخت کو بیع صرف کہتے ہیں، ان کے نزدیک بدرجہ اولی جائز نہیں ہے۔

۶- آج کل رائج کرنسی کا تعلق سونے سے نہیں ہے اور سونے کا استعمال ثمن کے اعتبار سے بھی نہیں ہے، سونے کا ذخیرہ کرنے سے اگر قیمتوں پر اثر واقع ہوتا ہے تو وہ بین الاقوامی تجارت پر واقع ہوتا ہے، اندرون ملک تیار ہونے والی چیزوں پر اثر واقع نہیں ہوتا۔

مزید یہ کہ احتکار مذموم کا تعلق کھانے پینے اور عام لوگوں کی ضروریات سے متعلق ہے بشرطیکہ ذخیرہ کرنے سے عام آدمی کو نقصان پہنچے، سونے کا ذخیرہ کرنے سے عام لوگوں کی ضروریات پر معتدبہ اثر واقع نہیں ہوتا، لہٰذا سونے کا ذخیرہ کرنا احتکار مذموم میں داخل نہیں ہے۔

۷- اسمگلنگ کے ذریعہ جو فرد سونا لاتا ہے وہ بھی حکومت کی نظر میں سونے کا مالک کہلاتا ہے، حکومت اس سے اپنے واجبات کا مطالبہ کرتی ہے، لہٰذا جو شخص سونے کے مالک سے شرعی طریقہ کے مطابق سونا خریدتا ہے تو وہ شرعاً سونے کا مالک کہلائے گا۔

اگر حکومت کے اضافی قوانین مفاد عامہ کے لئے ہیں اور اسمگلنگ کے ذریعہ خریدنے میں مفاد عامہ کا نقصان ہے تو پھر نہی عن تلقی الجلب وعن بیع الحاضر للبادی کی تفصیل کی روشنی میں مکروہ بیع ہوگی۔

مزید یہ کہ حکومت کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ضرر لاحق ہوسکتا ہے اور عاقل کی شان یہ ہے کہ وہ ایسے عمل سے بچے جس سے وہ ضرر میں مبتلا ہوسکتا ہو، حکومت کی مخالفت کرنے کے بھی درجات ہیں، اس کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

۸- پلاٹینم (Platinum) سونا نہیں ہے بلکہ یہ مستقل الگ دھات ہے، اس پر سونے کے احکام بیع صرف وزکوۃ وغیرہ جاری نہیں ہوں گے، اگرچہ عوام اسے سونا سمجھیں، زکوۃ وغیرہ کے احکام امر تعبدی ہیں، قیاس سے اس کو ثابت نہیں کر سکتے جیسا کہ ہیرے جواہرات بھی قیمتی ہیں، لیکن ان پر زکوۃ فرض نہیں ہے، گھوڑا قیمتی جانور ہے جیسا کہ بکری، گائے اور اونٹ وغیرہ لیکن گھوڑے پر زکوۃ نہیں ہے، اگر وہ مال تجارت نہ ہو۔

نوٹ: حوالہ جات منسلکہ دس صفحات میں ہیں اور ہر جواب کے لئے دلیل کا اشارہ درج ذیل ہے:

سوال نمبر ۱- اس کے جواب کا مدار اس اصول پر ہے کہ جب ثمن حقیقی یا عرفی کے مقابلے میں عروض ہوں تو ادھار جائز ہے اور فی الحال سونا چاندی ثمن کی حیثیت سے مستعمل نہیں ہے، مزید کہ ثمن عرفی (کرنسی نوٹ) اور سونا چاندی دونوں جنس وقدر میں مختلف ہیں، دلیل کے لئے ملاحظہ ہو عبارت نمبر: ۱، ۳، ۴، ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۱۔

۲- دلیل کے لئے عبارت ۱، ۹، ۱۴، ۱۵، 25

۳- دلیل کے لئے عبارت ۱، ۲

۴- دلیل کے لئے عبارت ۱۲، ۱۳ (7/2,8/2) 17,19,20,21,22,24

۵- دلیل کے لئے عبارت نمبر (۱۷ (9/2، ۱۸، 20,23

۶- دلیل کے لئے عبارت ۷، ۱۰

۷- دلیل کے لئے عبارت ۱۱

۸- دلیل کے لئے عبارت ۱۶

حوالہ جات:

۱ ''قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد فاذا اختلفت هذه الأصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدا بيد'' (رواه مسلم وفي رواية: لاتبيعوا الذهب بالذهب ولا الورق بالورق إلا وزنا بوزن، مشكوة/ ص۲۴۴ طبع قديمي)۔

۲ ''وعن ابي سعيد وابي هريرة أن رسول الله ﷺ استعمل رجلا على خيبر فجاء ه بتمر جنيب، فقال: أكل تمر خيبر هكذا؟ قال: لا والله يا رسول الله، إنا لناخذ الصاع من بذا بالصاعين والصاعين بالثلاث، فقال: لاتفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيبا وقال في الميزان مثل ذلك، متفق عليه'' (مشكوة/ ص۲۴۵)۔

۳ ''وعن ابن عمر قال كنت أبيع الإبل بالنقيع بالدنانير فاخذ مكانها الدراهم وابيع بالدراهم فاخذ مكانها الدنانير، فاتيت النبي ﷺ فذكرت ذلك له، فقال: لا بأس ان تاخذها بسعر يومها مالم تفترقا وبينكما شئ'' (رواه الترمذي وابوداؤد، مشكوة/ ص۲۴۸)۔

۴ ''فقال رسول الله ﷺ: من أسلف في شئ فليسلف في كيل معلوم ووزن معلوم الى اجل معلوم'' (متفق عليه)۔

۵ ''عن عائشة قالت اشترى رسول الله ﷺ طعاما من يهودي الى أجل ورهنه درعا له من حديد'' (متفق عليه)۔

۶ ''وفي الحديث: من احتكر على المسلمين طعامهم ضربه الله بالجذام والافلاس رواه ابن ماجه'' (الاحاديث، ماخوذة من المشكوة/ ص۲۵۱،۲۵۰)۔

۷ ''وفي الدر المختار: باب الصرف هو بيع الثمن بالثمن: أي ما خلق للثمنية ومنه المصوغ (جنسا بجنس أو بغير جنس) كذهب وفضة (قوله أي ما خلق للثمنية) ذكر نحوه في البحر ثم قال وانما فسرناه به ليدخل فيه بيع المصوغ بالمصوغ أو بالنقد فان المصوغ بسبب ما اتصل به من الصنعة لم يبق ثمنا صريحا ولهذا يتعين في العقد ومع ذلك بيعه صرف اه'' (الدر المختار ۴/ ۲۶۱ طبع كوئته)۔

۸ ''وفي الدر المختار: ويصح السلم في عددي متقارب كجوز وبيض وفلس'' (۴/۲۲۶)۔

۹ ''وفي الدر المختار: ومن اعطى صيرفيا درهما فقال اعطني به نصف درهم فلوسا ونصفا إلا حبة صح ويكون النصف إلا حبة بمثله وما بقي بالفلوس (والاموال ثلاثة، ثمن بكل حال وهو النقدان ومبيع بكل حال كالثياب والدواب وثمن من وجه ومبيع من وجه كالمثليات، فان اتصل بها الباء فثمن وإلا فمبيع وأما الفلوس فإن رائجة فكثمن وإلا فكسلع (و)الثمن (من حكمه عدم اشتراط وجوده في ملك العاق عند العقد وعدم بطلانه بهلاكه) أي الثمن۔

قوله وأما الفلوس: يستفاد من البحر أنها قسم رابع حيث قال و ثمن بالاصطلاح وهو سلعة في الأصل كالفلوس فإن كانت رائجة فهي ثمن و الا فسلعة اهط'' (الدر المختار ۴/ ۲۷۰،۲۷۱)۔

۱۰ '' (و)كره (احتكار قوت البشر) كتين وعنب ولوز (والبهائم) كتبن وقوت (في بلد يضر بابله) لحديث الجالب مرزوق والمحتكر ملعون فان لم يضر لم يكره ومثله تلقي الجلب''۔

قال العلامة الشامي: والتقييد بقوت البشر قول أبي حنيفة و محمد وعليه الفتوى كذا في الكافي وعن أبي يوسف كل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتكار وعن محمد الاحتكار في الثياب ابن كمال (قوله يضر بابله) بان كان البلد صغيرا هداية'' (الدر المختار ۵/ ۲۸۲، كتاب الكراهية)۔

۱۱- ''وفي الدر: (ولا يسعر حاكم) لقوله عليه الصلاة والسلام: لاتسعروا فإن الله هو القابض الباسط الرازق (الا إذا تعدى الارباب عن القيمة تعديا فاحشا فيسعر بمشورة أهل الرأي... وأفاد أن التسعير في القوتين الغير وبه صرح العتابي وغيره لكنه اذا تعدى ارباب غير القوتين وظلموا على العامة فيسعر عليهم الحاكم بناء على ما قال أبويوسف ينبغي أن يجوز ذكره القهستاني فان ابا يوسف يعتبر حقيقة الضرر كما تقرر فتدبر'' (الدر المختار ۵/ ۲۸۲ كتاب الكراهية)۔

۱۲- ''وفي الدر: (لا) يفسد بيع عشرة (اسهم) من مائة سهم اتفاقا لشيوع السهم (قوله لشيوع السهم) لأن السهم اسم للجزء الشائع فكان المبيع

عشرة اجزاء شائعة من مائة سهم كما في الفتح أي فهو كبيع عشرة قراريط مثلا من أربعة وعشرين فانه جزء شائع في كل جزء من اجزاء الدار (الدر المختار ۴/ ۳۵، ایضا فقه البیوع للشیخ العثمانی ۳۷۵)''۔

۱۲ ''وفي الهداية: ويجوز التوكيل بعقد الصرف والسلم لانه عقد يملكه بنفسه فيملك التوكيل به دفعا للحاجة على ما مر... فان فارقه الوكيل صاحبه قبل القبض بطل العقد ولا يعتبر مفارقة الموكل لانه ليس بعاقد والمستحق بالعقد قبض العاقد وهو الوكيل فيصح قبضه وان كان لايتعلق به الحقوق كالصبي والعبد المحجور عليه''(ہدایہ کتاب الوکالۃ ۳/ ۱۸۲)۔

۱۴ ''وفي الدر في بحث البيع بشرط: (استحسانا) للتعامل بلا نكير (قوله استحسانا للتعامل) أي يصح البيع ويلزم الشرط استحسانا للتعامل والقياس فساده لأن فيه نفعا لأحدهما وصار كصبغ الثوب مقتضى القياس منعه لأنه اجارة عقدت على استهلاك عين الصبغ مع المنفعة ولكن جوز للتعامل ومثله اجارة الظئر وللتعامل جوزنا الإستصناع مع أنه بيع المعدوم ومن انواعه شراء الصوف المنسوج على أن يجعله البائع قلنسوة أو قلنسوة على أن يجعل البائع لها بطانة من عنده وتمامه في الفتح'' (الدر المختار ۴/ ۱۳۸)۔

۱۵۔ حضرت تھانویؒ نے منی آرڈر کے بارے میں آخری فیصلہ یہ دیا کہ منی آرڈر مرکب ہے دو معاملے سے، ایک قرض جو اصل رقم سے متعلق ہے دوسرے اجارہ جو فارم کے لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دی جاتی ہے، اور دونوں معاملے جائز ہیں، پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے، اور چونکہ اس میں ابتلائے عام ہے، اس لئے یہ تاویل کر کے جواز کا فتوی مناسب ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۱۴۶)۔

۱۶۔ ''وفي الدر: (لا زكوة في اللآلي والجواهر) وان ساوت الفا اتفاقا (إلا أن تكون للتجارة) والاصل أن ماعدا الحجرين والسوائم إنمايزكى بنية التجارة... وفي الشامية: (قوله والجواهر) كاللعل والياقوت أمثالها درر (قوله وان ساوت الفا) في نسخة الوفا (قوله ماعدا الحجرين) هذا علم بالغلبة على الذهب والفضة'' (الدر المختار ۲/ ۱۵)۔

''وفي الدر: (ولا شئ في خيل) سائمة عندهما وعليه الفتوى خانية وغيرها (و) لا في (بغال وحمير ليست للتجارة

وفي الشامية: (قوله عندهما) لما في الكتب الستة من قوله عليه الصلاة والسلام: ''وليس على المسلم في عبده وفرسه صدقة (قوله وعليه الفتوى) قال الطحاوي: هذا أحب القولين الينا'' (الدر المختار ۲/ ۲۱)۔

۱۷۔ ''وفي المعايير الشرعية:

2/6 القبض في بيع العملات

2/6/3 يتحقق القبض بحصوله حقيقة أو حكما، وتختلف كيفية قبض الاشياء بحسب حالها واختلاف الأعراف فيما يكون قبضالها.

يتحقق القبض الحكمي اعتبارا وحكما بالتخلية مع التمكين من التصرف ولو لم يوجد القبض حسا، ومن صور القبض الحكمي المعتبرة شرعا وعرفا ما ياتي: القيد المصرفي لمبلغ من المال في حساب العميل في الحالات الآتية:

۱ اذا اودع في حساب العميل مبلغ من المال مباشرة أو بحوالة مصرفية

۲ اذا اقتطعت المؤسسة بأمر العميل مبلغا من حساب له لتضمه الى حساب أخر بعملة أخرى في المؤسسة نفسها أو لمستفيد أخر. وعلى المؤسسة مراعاة قواعد عقد الصرف في الشريعة الاسلامية ويغتفر تاخير القيد المصرفي بالصورة التي يتمكن المستفيد بها من التسليم الفعلي الى المدة المتعارفة عليها في اسواق التعامل۔

2/7 يجوز توكيل الغير بابرام عقد بيع عملات مع توكيله بالقبض والتسليم۔

2/8 التعاقد بوسائل الاتصال الحديثة بين طرفين في مكانين متباعدين تنشأ عنه نفس الآثار المترتبة على اجراء العقد في مكان واحد۔

2/9 تحرم المواعدة في المتاجرة في العملات اذا كانت ملزمة للطرفين ولو كان ذلك لمعالجة مخاطر هبوط العملة أما الوعد من طرف واحد فيجوز ولو كان ملزما۔

(المعايير الشرعية المرتبة من هيئة المحاسبة والمراجعة للمؤسسات المالية الاسلامية بسنة 2010م المعيار الشرعي رقم (۱) المتاجرة في العملات ص5,4

۱۸ ''وفي الدر: البيع ينعقد بالايجاب والقبول بلفظين ماضيين أو حالين وأما المتمحض للاستقبال فكالامر لايصح أصلا'' (الدر المختار ۴/ ۱۰)۔

''وفي كتاب الصرف من الهداية: ولأنه لا بد من قبض احدهما ليخرج العقد عن الكالي بالكالئ'' (ہدایہ ثالث ۳/ ۱۰۵)۔

''وفي بيع السلم: ولا يصح السلم حتى يقبض رأس المال قبل ان يفارقه فيه اما اذا كان من النقود فلانه افتراق عن دين بدين'' (ہدایہ ۳/ ۹۶۔

ـشيخ محمد تقى العثمانى)۔

، النبى ﷺ نهى عن بيع الكالئ بالكالئ'' (مشكوة / ص۲۴۸)۔

ن صبرة تعلم صيعانها للمتعاقدين، وينزل على الإشاعة فإذا علما أنها عشرة اصع، فالمبيع شرعها، فلو تلف بعضها، تلف بقدره لمنهاج للمحلى مع القيوبى و عميرة۲:۱٦۱)۔

و علمت الكمية المجموعة فى المخزن انها عشرة أطنان مثلا، وبيعت منها كمية، مثل طن واحد، فإن الكمية ، حصة مشاعة فى مجموع ما فى المخزن، ويعتبر البيع أنه بيع عشر ما فى المخزن، فلو هلك طن منه، فإنه ينقص قدر كنه مشروط بأن يعلم المتعاقدان مجموع الكمية، وأن يتحمل المشترى بلاك حصته فيها، والعادة فى أسواق السلع مية المجموعة فى المخزن، ولا يعتبر المشترى ضامنا عند بلاك بعضها بقدر حصته فيها فلا تنطبق عليه هذه الجزئية

للع المخزونة بواسطة البورصات العالمية'' (البورصة كلمة معربة من الكلمة الطالية B o u r s eومرادفها Exوقد يقال لها بالعربية ''المغابة'' أو ''الندوة المالية'' وہى عبارة عن إدارة للسماسرة تنظم عمليات التجارة فى السلع ، النقود والأوراق المالية راجع لتاريخها دائرة المعارف للبستانى ۵/ ٦٤٩)، وكثير من بياعات بورصات السلع لايقصد منها إنما يقصد بها المضاربات من خلال تذبذب أسعارہا، وإن هذه العمليات بالمقامرة أشبه منها بالبيوع الحقيقة، ولا شك كرت بعض أقسام هذه العمليات فى بحثى على ''عقود المستقبليات فى السلع'' انظر ''بحوث فى قضايا فقهية ۱:۱)ولكن قد يقصد بها البيوع الحقيقة، وحينئذ لا بد من توافر الشروط الشرعية فى ذلك ومنها أن المشترى من تلك ، أن يبيعها إلى آخر حتى يقبضها بالطريق الذى ذكرناه۔

فعية والمالكية يشترطون العد لتمام القبض (المجموع شرح المهذب ۹/ ۲۴۸، الشرح الكبير للدردير مع الدسوقى ۳/ فى المكيلات، والوزن فى الموزونات أما الحنفية فيكفى عندهم التخلية (بدائع الصنائع ۳/ ۳۹۹)، وكذلك المكيلات زفة، وهو رواية عن الإمام أحمد رحمه الله تعالى، وذكر ابن قدامة من مذهب الحنابلة أن مجرد التخلية لايعتبر قبضا ، الحكم فى ما بيع مجازفة (المغنى لابن قدامه۳/ ۲۲۰)، واستدلوا فى ذلك بما أخرجه مسلم فى صحيحه عن عبدالله بن ال: كنا نشترى الطعام من الركبان جزافا، فنهانا رسول الله ﷺ أن نبيعه حتى ننقله من كمانه (صحيح مسلم، باب بض حديث ۳۸۱۹)، ولكن المختار عند الحنابلة أن القبض فى العدديات يحصل بالعد، كما ہو مذهب الشافعية لا يشترط نقله'' (كشاف القناع۳/ ۲۴۳، شرح منتهى الإرادات۲/ ۱۹۰)، وقال فى شرح منتهى المرادات: ''ولا يعتبر نقله بما''۔

The second type: where the percentage of pure gold is 50% less, in which case it is not unless it is sold for gold, silver or currencies, in which case spot exchange of counter- values i

3/3/1/2The second type: where gold is mixed ,with a substance not intended per se; intended for the purposes of standardizing or coloring gold, etc. For example, when a substa specific proportions to render it of a certain standard (Karatage), such as 21K or 18K. In this ca to the gold are not intended per se. Therefore, the exchange of one counter value for the oth weight of pure gold in each of the two counter values must be equal.

3/3/1/3The third type: where a proportionately insignificant amount of gold, not intende

ownership of a specified ingot that is distinguishable (an allocated ingot) from others, by serial numbers or other distinct marks from other ingots, provided the certificate is issued the day the contract is concluded (Trade DAte "T+o"), by officially or customarily recognized agencies, enabling the buyer to take physical possession of the purchased ingot at his request. Hence, it is not permissible to sell an unspecified ingot (technically known in the market as unallocated ingot) without physical possession.

3/5Shariah Rulings for Joint Ownership of Gold

3/5/1It is permissible to jointly own gold where each partner owns an undivided share of a specified percentage in the pool of gold. Such ownership is subject to the rulings set out in item 3.4 above.

3/5/2The owner of the undivided share may request the segregation of his share, if possible, without prejudice to the other partners. He may sell his undivided share without segregation.

3/5/3In case of loss or damage, each co owner shall bear the losses damages pro rata.

3/5/4Ingots stored in a ware house and not distinguishable by serial numbers are considered unallocated and are thus subject to the Shariah rulings for joint ownership. However, if the ingots have distinguishing serial numbers, each owner shall own his allocated ingots and be liable for their loss, unless they allo agree that the ownership of the stored ingots shall be joint and undivided, in which case the rulings of joint ownership shall apply. In the event of loss or damage of thejointly owned ingots, each owner shall bear the loss pro rata, provided that the overall amoint in storage is specified at all times.

4.Gold in contracts of Musharakah and Modern Corporations and companies

4/1The use of gold as capital in Musharakah, Mudharabah and investment Wakalah is permissible provided that gold is valuated and its monetary value in the currency of capital is determined at the contract date by mutaual agreement of the contracting parties. This valuation is carried out for the purpose of determining the shares of the partners in Musharakah or the capital of Mudharabah and investment Wakalah. If valuation of the Gold is not possible, the use of gold as capital is not permissible.

4/2It is permissible for the parties to distribute the profit in gold provided it is at the market value of gold at the time of profit distribution.

4/3It is permissible for the parties to redeem their capital in gold, upon liquidation, provided it is at the market value of gold at the time of redemption.

4/4It is permissible to buy the shares of a company that operates in extraction of Gold provided that the relevant Shariah parameters are complied with See Shariah Standar No. (21) on Financial papers.

5.Gold in commutative contracts (Muawadhat)

5/1Gold in sale contract

5/1/1It is permissible for an institution to purchase gold from a supplier at spot, and sell it at spot by way of Murabahah or Musawamah, provided the Shariah requirements set out in items (3) and (2/2/6) in Shariah Standard No. (8) on al-Murabahah are complied with.

5/1/2 It is not permissible to purchase gold by way of documentary credit unless Shariah requirements set out in item (3) are complied with, including payment of the price of the documentary credit without deferment, See item (3/1/3) of Shariah Standard No. (14) on Documentary Credit.

5/1/3 It is permissible to appoint an agent to purchase and take possession of Gold (Wakalah). After purchase and taking possession, it is permissible for the agent to purchase from the principal the gold purchased by way of Wakalah through an exchange of Offer (Ijab) and Acceptance (Qabul). In that case, liability for the purchased gold is transferred to the agent as parchaser in the latter contract. See item (6.1.4) of Shariah Standard No (23), on "Agency and the Act of an Uncommissioned Agent (Fodooli)"; and also item (3/1) of Shariah Standard No (8) on Murabahah.

5/2Gold in the Contracts of Salam and Istisnaa

5/2/1It is permissible to use gold as capital of Salam, provided that the subject matter of Salam sale (alMuslam Fehi) is not gold, silver or currencies.

5/2/2It is permissible to purchase gold through a Salam Contract, provided the capital of Salam is not gold, silver or currencies.

5/2/3It is permissible to execute an Istisnaa contract in gold, provided-the price of Istisnaa is not gold, silver or currencies.

5/3 Gold in Ijarah (Lease and Services) Contract

5/3/1It is permissible to lease gold whether in the form of jewelry or ingots provided the corpus of the leased asset is not consumed during the lease. The rent may be payable in advance or in arrears, and whether the lease contract is for an identified asset or it is Ijarah Mawsufah Fi Zhimmah.

5/3/2it is permissible for the lessee to purchase the (leased) Gold from the lessor at a spot price agreed upon at the time of purchase.

5/3/3It is permissible to pay the rent amount (Ujrah) in gold, even if the leased asset is gold. See 5.3.1.above.

5/3/4Ijarah is permissible in gold smithery, where gold is provided by the hirer [service recipient] and work is provided byteh goldsmith [service provider]; the remuneration (Ujrah) may be in advance or in arrears. The laborer's remuneration (Ajr) can be paid out in gold.

5/4Gold in Deposit Contract (Wadiah)

5/4/1Deposits of gold shall be held in trust with the depository. It is not permissible for the depository to use or dispose of deposits of gold (gold deposited with it), or commingle them with its gold or any other gold held in its safekeeping without allocation. In case the depositor permits that his gold deposits are commingled with gold held in his depository's safekeeping, item (3.5) shall apply.

5/3/2 It is permissible for the depository to charge fees for safekeeping the gold. The fees may be charged as lump sum amount or as a percentage of the value of the deposeted gold. If the gold is deposited as collateral against a loan borrowed by the depositor.



سونا چاندی کی تجارت کے متعلق چند مسائل

مفتی محمد سلطان القاسمی [1]

۱- اگر روپے سے سونا خرید کیا جائے تو اس میں روپے کی حیثیت فلوس کی ہوگی؛ کیونکہ آجکل روپے کا چاندی یا سونے سے کوئی تعلق نہیں، لہذا:

الف- سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار تو بیع صحیح ہوگی؛ لیکن سودے کے وقت ایک جانب قبضہ ضروری ہے؛ چنانچہ فتح القدیر میں شرح الطحاوی کے حوالہ سے مرقوم ہے:

''لو اشتری مائة فلس بدرهم وقبض الفلوس أو الدراهم ثم افترقا، جاز البيع لأنهما افترقا عن عين بدين'' (فتح القدیر ۶/ ۲۷۸)۔

علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: ''وإذا اشترى الرجل فلوسًا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز. لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود، وقد بينا أن حكم العقد في الثمن وجوبها ووجودها معًا. ولا يشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشترط ذلك في الدراهم والدنانير'' (المبسوط ؛طبع بیروت، دار المعرفہ ۱۴۱۴ھ، ۴/ ۲۴)۔

البتہ دونوں طرف ادھار جائز نہیں چاہے مختصر وقت کیلئے ہی کیوں نہ ہو؛ کیونکہ یہ بیع الکالی بالکالی ہے جو کہ ممنوع ہے۔

ب- سونے اور چاندی کا جو نرخ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ جیسے کو میکس گولڈ یا میکس گولڈ نے طے کیا ہو، اس سے کم یا زیادہ قیمت میں خرید وفروخت درست ہوگی اور اس صورت پر ربا الفضل کا اطلاق نہیں ہوگا؛ کیونکہ یہاں بیع صَرف نہیں ہو رہی ہے۔ بیع صَرف اس وقت ہوتی جب سونے چاندی کا باہم تبادلہ ہوتا؛ یہاں سونے چاندی کا تبادلہ ثمن عرفی سے ہو رہا ہے اور بیع صرف کیلئے ثمن خلقی کا ہونا ضروری ہے جو کہ یہاں نہیں پایا جا رہا ہے: چنانچہ بیع صرف کی تعریف میں علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

'' وشرعًا بيع الثمن بالثمن أي ما خلق للثمنية، ومنه المصوغ جنسًا بجنسٍ أو بغير جنس'' (الدر المختار مع رد المحتار/ ۷ /۴۰۲)۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:'' قوله ولا يتعين بالتعيين لكونها أثمانًا يعني ما دامت تروج لأنها بالاصطلاح صارت. أثمانًا فما دام ذلك الاصطلاح موجودًا، لا تبطل الثمنية لقيام المقتضى '' (كنز الدقائق مع البحر، ط بيروت، ۶/ ۲۳۵)۔

''صاحب ہدایہ کی یہ بات کہ یہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے کیونکہ یہ اثمان ہیں یعنی جب تک مروج ہوں، اس لئے کہ یہ لوگوں کی اصطلاح سے اثمان بنے ہیں، سو جب تک یہ اصطلاح باقی رہے گی، اس کی یہ ثمنیت باقی رہے گی، اس کے لئے مقتضی موجود ہے''۔

اس سے یہ بات صاف ہوتی ہے کہ اس میں ثمن کا مقابلہ ثمن سے ہے لیکن چونکہ یہ خلقی نہیں ہے اسلئے اسکو بیع صرف سے نکالا اور اس میں وحدت جنس کے باوجود تفاضل کو جائز قرار دیا۔

شوافع وحنابلہ کے ہاں بھی مصارفہ سے مراد ثمن خلقی کی باہمی بیع ہے:

''فصل في المصارفة، وهي بيع نقد بنقد اتحد الجنس أو اختلف '' (کشف القناع ۳/ ۲۵۳)۔

---

[1] مفتی واستاذ سراج العلوم، سری نگر، جموں کشمیر۔

(مصارفہ زر کے مقابلہ زر کی خرید ورفروخت کو کہتے ہیں چاہے جنس ایک ہو یا مختلف)۔

"(النقد بالنقد) والمراد به الذهب والفضة مضروبًا كان أو غير مضروب"

(مغنی المحتاج للشربینی، بیروت، ط: احیاء التراث: ۲/۲۴)۔

(بیع صرف نقد کے مقابلہ نقد کی خرید وفروخت کو کہتے ہیں اور اس سے مراد سونا چاندی ہے، چاہے سکہ کی شکل میں ہو یا نہ ہو)۔

علامہ ابن تیمیہؒ امام احمدؒ کی دوسری روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"والثانية لايشترط الحلول والتقابض، فان ذلك معتبر في جنس الذهب والفضة سواء كان ثمنًا أو كان صرفًا أو كان مكسورًا بخلاف الفلوس ولأن الفلوس هي في الأصل من باب الأعراض والثمنية عارضة لها"

(مجموعة الفتاوی: ۲۹/ ۴۵۹)۔

ان عبارتوں سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک عقد صرف کیلئے ثمن کا خلقی ہونا ضروری ہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ کھوٹ کی صورت میں سونا چاندی غالب ہوں، اسلئے فلوس (موجودہ دور میں نوٹ) کی بیع صرف میں داخل نہیں بلکہ سونے یا چاندی میں اگر کھوٹ غالب ہو اور بحیثیت سکہ کے یہ سونا چاندی رائج ہوں تو بھی اسکی بیع صَرف نہیں کہلائے گی؛ چنانچہ حافظ الدین نسفیؒ "کنز الدقائق" میں رقمطراز ہیں:

"وغالب الغش ليس في حكم الدراهم والدنانير فيصح بيعها بجنسها متفاضلًا والتبايع والاستقراض بما يروج عددا أو وزنًا أوبهما ولايتعين بالتعيين لكونها أثمانًا" (كنز الدقائق مع البحر، ط بيروت: ۶/ ۳۲۵)۔

۲- زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجر سے ایک متعین وزن میں جو سونا لیتے ہیں اور چند دنوں بعد اسکے بدلے سونے سے بنائے ہوئے زیورات انہیں واپس کر دیتے ہیں، تو اس معاملہ میں زیور بنانے والے کاریگر کی حیثیت اجیر کی ہوگی اگر وہ انہی کے دئے ہوئے زیور کو کام میں لاتے ہیں۔

اور اگر وہ اپنے سونے سے زیور بنا کر انکو دیتے ہیں تو پھر یہ بیع ہے؛ دونوں صورتوں میں حکم الگ الگ ہوگا۔

اجیر ہونے کی صورت میں اجرت الگ سے طے ہونی چاہئے کیونکہ بچنے والے ذرات کی مقدار مجہول ہوتی ہے اور مجہول کا ثمن کے طور پر مقرر کرنا صحیح نہیں۔

اگر وہ اپنے سونے سے زیور بنا کر انکو دیتے ہیں اور اسکے مقابلہ میں سونا لیتے ہیں تب تو تقابض اور تماثل واجب ہے۔

۳- یہ صورت جائز نہیں ہوگی بلکہ یہ تو عین ربا ہوگا۔

اس سلسلہ میں صاحب اعلاء السنن نے کئی روایات جمع کی ہیں؛ چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت رافعؓ کے آپسی معاملہ کا تذکرہ ہے جس میں حضرت رافعؓ نے چاندی کے پازیب بیچے اور حضرت ابوبکرؓ نے بدلہ میں چاندی دی اور جب ترازو میں تولا تو پازیب کا وزن زیادہ تھا، حضرت ابوبکرؓ نے پازیب سے زائد وزن کو الگ کیا۔ ابورافعؓ نے کہا: اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! یہ آپ کے لئے حلال ہے، تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: اے ابورافع! اگر تم اس کو حلال کردو تو اللہ اسکو حلال نہیں کرتا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ سونے کو سونے کے بدلہ میں ہم وزن، اور چاندی کو چاندی کے بدلہ میں ہم وزن بیچو، زائد دینے والا اور زائد لینے والا دونوں جہنم میں ہونگے (دیکھئے اعلاء السنن: ۱۴/ ۲۸۸، ۲۸۹)۔

اس کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ پہلے پرانی چاندی کو روپے کے بدلہ بیچا جائے، پھر نئی چاندی/ زیور کو خریدا جائے۔

۴- (الف) ان سب نے مشترکہ طور پر خریدا ہے؛ لہذا سونے کی اینٹ انکی مشترکہ ملکیت ہوگی؛ البتہ اس صورت میں مکمل قیمت کو ادا کرنا ضروری ہے ورنہ بیع الکالی بالکالی ہوجائے گی جو کہ حرام ہے۔

(ب) خریدار نے جو سونا خریدا وہ جبکہ سکہ کی صورت میں موجود ہے اور اس نے کمپنی کو اپنا وکیل بنایا ہے تو کمپنی کی طرف سے اس کو کمپیوٹر یا

ب:۔ اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر پر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کر دیا گیا ہو تو اس اندراج کو قبضہ کے لئے کافی اس شرط کے ساتھ تصور کیا جائے گا جب کہ خریدار کا اس کو اپنے تصرف میں لے کر خود ہی کمپیوٹر میں یا ریکارڈ رجسٹر میں اپنے نام سے درج کر دے اور اپنا دستخط کر دے۔

۵- صورت مسئولہ میں اس صورت کا حکم درست نہ ہونا ہے۔

۶- اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ حرمت احتکار خاص ہے، اقوات یعنی غذا کی چیزوں کے ساتھ، لہذا احتکار حرام نہیں، غیر اقوات میں، ہی ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا قول ہے (دیکھئے: تکملہ فتح الملہم ۱/ ۶۵۶ تا ۶۵۹، اور اس کو دیکھئے: ردالمحتار ۵/ ۲۸۲، اور مغنی ابن قدامہ ۴/ ۲۴۴، وشرح النووی والابی تحت ھذا الحدیث)۔

علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں: احتکار وہ حرام ہے، جس میں تین شرطیں جمع ہوں:

۱- یہ کہ خرید ہے پس اگر کوئی چیز لائے یا اس کو اپنے سامان میں داخل کرے، پھر اس کی ذخیرہ اندوزی کرے تو وہ محتکر نہ ہوگا۔

۲- یہ کہ خریدی ہوئی چیز قوت وغذا پھر بہر حال سالن اور حلوا، شہد، زیتون، اور چوپایوں کے چارے میں احتکار حرام نہیں ہے۔

۳- یہ کہ لوگوں پر تنگی وحرج آجائے اس کے خریدنے سے اور حرج کا حصول دو باتوں سے ہوگا:

۱- ایسے ملک وشہر میں ہو کہ تنگی میں ڈال دے اس کے باشندوں کو احتکار جیسے حرمین اور وسیع وعریض شہر، جیسے بغداد و بصرہ اور مصر اور ہندوستان میں دلی، کولکاتا اور ممبئی وغیرہ ان میں احتکار حرام نہیں اس لئے کہ غالباً ان میں احتکار اثر نہیں ڈالتا۔

پھر فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا روک لینا جو عام لوگوں کو نقصان پہنچائے تو وہ احتکار ممنوع ہے (کما فی ردالمحتار ۵/ ۲۸۲)۔

پھر علامہ تقی عثمانی تکملہ ۱/ ۶۵۷ میں اپنی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ طعام کا حرمت احتکار حدیث سے ثابت ہے بغیر شک کے، تو طعام کا احتکار امر تشریعی معمولی ہوگا ابد تک اس لئے کہ لوگوں کا طعام کا محتاج ہونا بہت زیادہ بنسبت دوسری اشیاء کے اور طعام کے علاوہ دوسری چیزوں پر احتکار کا حکم لگانا حاکم کی رائے کے حوالہ کیا جاتا ہے، تو اگر دیکھے کہ طعام کے علاوہ دوسری چیزوں کے احتکار شدید ضرر طعام میں ضرر کی طرح ہو تو حاکم اس کو منع کر دے گا ورنہ اس کی اجازت دے دے گا۔ تو معلوم ہوا کہ اقوات وغذائی چیزوں میں حرمت احتکار ہوگی بس اور دوسری چیزوں میں احتکار حرام حاکم کی رائے کے حوالہ ہے اگر دوسری چیزوں کی ذخیرہ اندوزی میں ضرر شدید دیکھے طعام میں ضرر کی طرح تو منع کر دے گا ورنہ اجازت دے دے گا۔

اب دیکھئے: تکملہ (۱/ ۶۵۶ تا ۶۵۹) میں حدیث اور علامہ تقی عثمانی صاحب کی عبارت اور فیصلہ المحقق۔

''باب تحریم الاحتکار فی الاقوات: عن یحیی وھو ابن سعید قال: کان سعید بن المسیب یحدث ان معمر قال: قال رسول اللہ ﷺ: من احتکر فھو خاطئی'' (رواہ مسلم). علامہ تقی عثمانی صاحب تکملہ (۱/ ۴۵۶ تا ۶۵۹) میں تحریر فرماتے ہیں: ''قولہ: من احتکر: الاحتکار لغۃ: احتباس الشئ انتظارا لغلائہ'' (ردالمحتار ۵/ ۲۸۲، مغنی ابن قدامہ ۴/ ۲۴۴)۔

خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں احتکار حرام خاص ہے اقوات وغذائی اشیاء کے ساتھ اور اقوات کے علاوہ دوسری اشیاء احتکار حرام حاکم کی رائے کے حوالہ ہے اگر دوسری اشیاء کی۔

۷- ملک میں جو سونا آتا ہے اس میں بڑا حصہ قانونی طریقہ پر آتا ہے، اور سونا لانے والا اس سے متعلق واجبات کو ادا کرتا ہے، دوسرا راستہ اسمگلنگ کا ہے یہ طریقہ غیر قانونی ہے اس میں سونا لانے والا ان واجبات کو ادا نہیں کرتا جو حکومت نے سونے کی درآمد سے متعلق مقرر کئے ہیں تو یہ اسمگلنگ کا عمل جائز نہ ہوگا اس طریقہ پر آنے والے سونے کا خریدنا اور پھر اس کو فروخت کرنا درست نہ ہوگا۔

۸- پلاٹین جس کو سفید سونا بھی کہا جاتا ہے اور اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں بھی ہوتا ہے اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، تو لوگوں کے عرف کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقی سونے کے حکم میں نہ ہوگا اور عقود، نیز زکوۃ وغیرہ میں اس پر سونے کے احکام منطبق نہ ہوں گے۔

☆☆☆

سونا چاندی کی تجارت اور شرعی طریقہ کار

ڈاکٹر مولانا محی الدین غازی فلاحی [1]

تمہید:

موجودہ دور میں سوق منظم کا تصور عام ہوا ہے، اس سوق میں تداول کی خصوصیت یہ ہے کہ متداول بہ شیء کسی مخزن میں رہتی ہے اور لوگوں کے درمیان اس کا لین دین ہوتا رہتا ہے، معاصر فقہاء نے سوق منظم کے تداول کو قبض حکمی میں شمار کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سوق منظم میں لین دین گو کہ کاغذ اور کمپیوٹر پر ہوتا ہے، لیکن اس کے نتیجہ میں بائع کا حق تصرف مکمل طور سے مشتری کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ ہر چیز ریکارڈ میں ہوتی ہے، اور سارے ریکارڈ کی نگرانی حکومت کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس کا امکان نہیں کے برابر ہوتا ہے کہ بائع کسی شئے کو فروخت کرنے کے بعد بھی اس پر کسی طرح کا تصرف کرسکے۔ سوق منظم کی مثال بینک اور اسٹاک ایکسچینج ہیں۔ آن لائن رقم ٹرانسفر کردینے کے فوراً بعد اس رقم پر سے رقم کے مالک کا تصرف ختم ہوجاتا ہے، اسی طرح آن لائن شیئرز کی فروخت کے بعد فوراً ہی ان شیئرز پر سے شیئرز کے مالک کا تصرف ختم ہوجاتا ہے۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ محض بائع کے رجسٹر یا کمپیوٹر میں ریکارڈ رکھنے سے سوق منظم کے احکام لاگو نہیں ہوسکتے ہیں، کیونکہ اگر مکمل طور پر حکومتی سطح کی نگرانی نہیں ہو، تو ریکارڈ رکھنے کے باوجود، بائع فروخت شدہ شیء میں تصرف کرسکتا ہے۔ سونے چاندی اور دھاتوں کی خرید وفروخت کے بازاروں کے سلسلے میں یہ کہنا بہت مشکل اور تحقیق طلب ہے کہ ان میں سوق منظم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اور یہ کہ وہاں ہونے والا تبادل قبض حکمی کی تعریف میں شامل ہوسکتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد مذکورہ سوالوں کے جوابات پیش ہیں:

۱- الف- یہ درست نہیں ہوگا، کیونکہ ایسا کرنا بیع صرف کے ضابطے کے خلاف ہوگا۔

ب- کسی مارکیٹ میں متعین نرخ سے کم یا زیادہ قیمت پر سونا یا چاندی خریدا اور بیچا جاسکتا ہے، بلکہ مختلف جنس کی کرنسی بھی خریدی اور بیچی جاسکتی ہے، یہ معاملہ تسعیر کے باب کے تحت تو آسکتا ہے، ربا تفاضل کے باب میں نہیں آئے گا۔ ربا تفاضل تو اس وقت ہوگا جب سونے کے عوض سونا لیا جائے، لیکن سونے کو اگر کسی کرنسی کے عوض لیتے ہیں تو اس کا وہ حکم ہوگا جو سونے کو چاندی کے عوض لینے کا ہے، یعنی اس میں ربا نسیئة کی بات تو آسکتی ہے اگر مجلس میں تقابض نہ ہو، لیکن ربا تفاضل کا کوئی محل نہیں ہے۔

۲- الف، ب- اجرت کی یہ شکل درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں غرر کثیر ہے، اجرت متعین ہونا چاہئے، اس کے علاوہ دوسری دھاتوں کی آمیزش کی وجہ سے جو سونا بچ جائے وہ یا اس کی قیمت اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے۔ ہاں ذرات کے سلسلے میں رعایت کی جاسکتی ہے کہ وہ کاریگر کو عرف عام کے تحت دے دیا جائے۔ لیکن اس کی حیثیت ہبہ کی ہونا کہ اجرت کی۔

ویسے اب میری معلومات کی حد تک اجرت کی سوال میں مذکور صورت رائج نہیں ہے۔ زیورات بنانے کا سارا کام متعین اجرت کی بنا پر ہوتا ہے۔

۳- جن لوگوں کے نزدیک ربا تفاضل جائز نہیں ہے، ان کے نزدیک یہ صورت بھی جائز نہیں ہوگی۔

۴- الف، ب: اگر ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج

---

[1] ممبر مجمع فقہاء الشریعة (امریکہ)، عمید کلیة القرآن الجامعہ الاسلامیہ شانتاپرم (کیرلا)۔

کر دیا گیا ہو تو اس اندراج کو قبضہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ اگر کئی خریداروں کا سونا ایک اینٹ میں شامل ہو، اور اس اینٹ کا اندراج رجسٹر میں ہو تو وہ بھی قبضہ کے تحت مانا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لئے سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ قانونی لحاظ سے اس قدر سونے پر سے بائع کا تصرف یکسر ختم ہو جائے، اور خریدار یا اس کے وکیل کا تصرف قائم ہو جائے۔

ایسا قبضہ اسی وقت تصور کیا جا سکتا ہے جبکہ ایسا سوق منظم میں ہو۔ سوق منظم سے مراد ایسی مارکیٹ ہے کہ جہاں بیچنے والے کا قانونی تصرف اس پر سے ختم ہو جائے، اور وہ چاہ کر بھی کسی اور کو نہیں بیچ سکے۔ اور خریدار کا تصرف قائم ہو جائے، اور وہ اپنا حصہ جب جس کو چاہے فروخت کر سکے۔ اسٹاک ایکسچینج اور بینک وغیرہ ایسی سوق منظم کی مثال ہیں۔

لیکن یہ کہ سونا فروخت کرنے والا ایک ایسا ادارہ ہو جس کی ہر چیز قانون کی نگرانی میں نہیں ہو، اور وہ اپنے رجسٹر میں اندراج تو کر رہا ہو، لیکن اس اندراج کی قانونی طور پر پابندی اور نگرانی کا کوئی انتظام نہ ہو تو اس صورت میں اندراج کو قبضہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔

واضح رہنا چاہئے کہ رجسٹر اور سسٹم میں اندراج کی صورت میں قبضہ کو فقہاء کی اصطلاح میں قبض حکمی کہا جاتا ہے، اور سونے چاندی کے سلسلے میں قبض حکمی کی اجازت اسی صورت میں ہوگی جب کہ قبض حکمی میں قبض حقیقی کے بنیادی عناصر پائے جائیں، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ بائع کا حق تصرف عملاً ختم ہو جائے، اور خریدار کا حق تصرف عملاً قائم ہو جائے۔

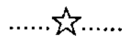
بعض رپورٹس کے مطابق دھاتوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں جو بازار ہیں، وہاں اس کا قوی امکان ہوتا ہے کہ معدوم اشیاء کی خرید و فروخت بھی ہو۔

۵- یہ دراصل قمار کی ایک شکل ہے، اس میں بیع صرف اور شرط تقابض سے جڑے مسائل تو اپنی جگہ ہیں ہی، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ساتھ ہی یہ ایک طرح کا جوا ہے، جو مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کی بنا پر کھیلا جاتا ہے۔ یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہے۔

۶- یہ امر قابل تحقیق ہے کہ سونے کے احتکار سے اشیاء ضروریہ کی قیمتوں پر ضرر کی حد تک اثر پڑتا ہے۔ میری رائے ہے کہ سونے کو ان اشیاء میں رکھنا چاہئے جن کی ذخیرہ اندوزی شرعاً ممنوع نہیں ہے۔

۷- تجارت کے غیر قانونی طریقے اختیار کرنے میں شرعی کراہیت بھی کسی درجے میں ضرور ہوتی ہے، خواہ وہ طریقہ فقہی نقطہ نظر سے درست نظر آتا ہو۔

۸- میری رائے ہے کہ تمام مہنگی دھاتوں کو زکاۃ کے حوالے سے سونے کے حکم میں ہونا چاہئے۔



سونا چاندی کی تجارت کے نئے مسائل

مفتی عبدالرحیم قاسمی[1]

۱- الف: نوٹ کے ذریعہ سونا چاندی خریدا جائے تو وہ بیع صرف نہیں ہوگی کیونکہ صرف کے اندر ضروری ہے کہ دونوں طرف حقیقی سونا ہو یا چاندی ہو اور نوٹ کی پشت پر سونا چاندی نہیں، لہذا یہ بیع صرف نہیں ہوگی اسی لئے حقیقی تقابض فی المجلس شرط نہیں (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۷۸)۔

نوٹ فلوس کے حکم میں ہیں اس کا نتیجہ ہے کہ ان میں تفاضل تو حرام ہے یعنی ایک کے بدلے دو لینا تو حرام ہے لیکن اگر اس کے ذریعہ سونے کی بیع کی جائے تو وہ بیع صرف نہیں ہوگی (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۷۹)۔

علامہ سرخسی نے فرمایا ہے: ''وان اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص أو ليس فيه فص بكذا فلوسا وليست الفلوس عنده فهو جائز أن تقابضا قبل التفرق أو لم يتقابضا لأن هذا بيع وليس بصرف فإنما افترقا عن عين بدين لأن الخاتم يتعين بالتعيين بخلاف ما سبق فان الدراهم والدنانير لا تتعين بالتعيين فلهذا اشترط هناك قبض أحد البدلين في المجلس ولم يشترط هنا''۔

(اگر چاندی یا سونے کی انگوٹھی جس میں نگینہ ہے یا نہیں ہے پیسوں کے بدلے خریدی اور اس کے پاس پیسے نہیں تو یہ معاملہ جائز ہے اور اگر وہ جدا ہونے سے پہلے قبضہ کرلیں یا قبضہ نہ کریں اس لئے کہ یہ بیع صرف نہیں تو وہ خاص چیز کی دین کے بدلے بیع کرنے سے علاحدہ ہوئے ہیں، اس لئے کہ انگوٹھی متعین کرنے سے متعین ہوجاتی ہے، بخلاف دراہم ودنانیر کہ وہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے اس لئے وہاں احد البدلین پر قبضہ کرنا شرط ہے اور یہاں نہیں) (المبسوط ۱۴/ ۲۵)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

''على مذهب الإمام محمد رحمه الله تعالى فإنه يجوز شراء حلى الذهب والفضه بالنقود الورقية نسيئة بشرط أن يكون بسعر يوم العقد ولا يشترط فيه التقابض بل لا يشترط قبض الحلى الحقيقي وانما يكفي تعيين الحلى لأن النقود الورقية في حكم الفلوس في أحكام الصرف فقط وشراء الحلى بالفلوس لا يشترط فيه التقابض''۔

(امام محمدؒ کے نزدیک سونے چاندی کے زیورات کو کاغذی نوٹوں سے ادھار میں خریدنا جائز ہے اس شرط کے ساتھ کہ عقد کے دن مارکیٹ ریٹ کے مطابق قیمت متعین کی جائے اور اس میں قبضہ کرنا شرط نہیں بلکہ زیور پر حقیقی قبضہ بھی شرط نہیں صرف زیور کو متعین کرنا کافی ہے، اس لئے کہ کاغذی نوٹ صرف بیع صرف کے احکام میں پیسوں کے درجہ میں ہیں اور پیسوں سے زیور خریدنے میں قبضہ کرنا شرط نہیں) (فقہ البیوع ۲/ ۷۶۳)۔

ب- بیچی جانے والی دوسری چیزوں کی دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جن کی اکائیاں مختلف نہیں ہوتیں اور بازار کے ریٹ ان کے درمیان مختلف نہیں ہوتے اور معلوم متعین معیار کے ساتھ وہ منضبط ہوجاتی ہیں اور معاملہ کرنے والے اس معیار کو پہچانتے ہیں اور اس کے مطابق معاملہ کرنے میں غلطی ہونے اور جھگڑا ہونے کا احتمال نہیں رہتا تو اس قسم میں بازار کے ریٹ سے بیچنا جائز ہے، اس لئے کہ اس جیسے معیار منضبط کو ذکر کرنا یا ثمن کو ذکر کرنے کے قائم مقام ہے اس میں ایسی جہالت نہیں جو جھگڑے تک پہنچادے ظاہر ہے کہ یہ قول سب سے زیادہ معتدل اور قواعد کے سب سے زیادہ موافق ہے اور یہاں دوسری چیزیں بھی ہیں جن کی قیمتیں ہر دن بلکہ بعض حالات میں ہر وقت بدلتی رہتی ہیں، جیسے سونا اور

[1] امیر مرکز دعوت وارشاد وافتاء ناظم جامعہ خیر العلوم نور محل روڈ، بھوپال۔

چاندی ہیں اور کمپنیوں کے حصص ہیں، لیکن یہ منضبط ہیں تاجروں کے بدلنے سے نہیں بدلتے اوران کی قیمت وقتوں کے مطابق لکھی ہوتی ہیں تو یہ چیزیں اگر بازار ریٹ کے مطابق بیچی جائیں توعقد کرتے وقت قیمت لگانے کے وقت کو ذکر کرنا ضروری ہے (فقہ البیوع ۱/۴۳۰)۔

سونے چاندی کونوٹوں کے بدلے ادھارخرید نے کے لئے مارکیٹ ریٹ پرخریدنا شرط ہے اس سے سود کے حیلے کا دروازہ بند ہوجائے گا۔

''وأما ما يخشى من الاحتيال على الربا في جواز النسيئة فقد ينسد بابه باشتراط سعر المثل يوم العقد كما بينا''

(فقه البيوع ۲/۷۴۸)۔

(سونا چاندی کونوٹوں کے بدلے ادھارخریدنے کے عقد کے دن مارکیٹ ریٹ کی شرط لگانے سے سود کے حیلے کے اندیشے کا دروازہ بند ہوجائے گا)۔

۲- الف-سونا ان کو نہیں بیچا ہے بلکہ زیور بنانے کے لئے دیا ہے، یہ بیع نہیں عاقدین اس اجرت پر متفق ہوں تو یہ اجارہ ہے۔

ب-زیورات کے تاجروں اور زیور بنانے والے کاریگروں کے درمیان اگر یہ عرف ہو کہ زیور بنانے میں جو ذرات بچ جائیں وہی اجرت متعین ہوں اور اس میں کوئی لڑائی جھگڑا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس طرح اجرت کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے۔

۳- سونے کو سونے کے بدلے کم یا زیادہ لینا دینا سود ہے، حدیث شریف میں ہے:

''لا تبيعوا الذهب بالذهب إلا مثلا بمثل'' (رواه مسلم ۲/۲۴)۔

اور سود کا لینا دینا حرام ہے، البتہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ سونے کے پرانے زیور کونوٹوں کے ذریعہ فروخت کردیا جائے اوران نوٹوں میں کچھ اور زیادہ نوٹوں کو شامل کر کے سونے کا نیا زیور خریدلیا جائے تو یہ صورت جائز ہوگی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو خیبر پر عامل بنایا وہ خیبر سے آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ جنیب کھجوریں لے کر آئے، جنیب کھجور اچھی قسم کی ہوتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی اچھی ہوتی ہیں، انہوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کھجوریں ایسی نہیں ہوتیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہم دوصاع کے عوض اس قسم کی ایک صاع کھجور خریدتے ہیں یعنی عام قسم کی دوصاع کھجور دے کر اعلیٰ قسم کی ایک صاع کھجوریں لیتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو (دوسری جگہ فرمایا عین الربا یعنی یہ عین ربا سود ہے) بلکہ ایسا کرو کہ ملی جلی اچھی بری کو ملا کر ان کو دراہم سے بیچو پھر دراہم سے جنیب خریدلو، یعنی پہلے طریقہ کو ناجائز قرار دیا پھر اس کا متبادل جائز طریقہ بتادیا کہ دوصاع ادنیٰ درجہ کی کھجوریں دراہم کے عوض بیچ دو پھران دراہم سے جنیب خریدلو تو یہ جائز ہے کیونکہ جب دراہم سے جنیب خریدی جائے گی تو جنس مختلف ہونے کی وجہ سے تفاضل جائز ہوگا (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴/۶۲)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيبا''

(مجموعی ملی جلی کھجوروں کو دراہم کے بدلے بیچ دو پھر دراہم سے جنیب خریدلو) (رواہ مسلم ۲/۲۶)۔

۴- الف: سونے کی اینٹ میں سے دوسو افراد کو پچاس پچاس گرام جو سونا بیچا گیا اس میں سے خریداروں کے حصے الگ الگ نہیں کئے گئے اور خریدار کے سپرد نہیں کئے گئے بلکہ اینٹ کی شکل میں یکجا ہیں اس لئے یہ بیع درست نہیں کیونکہ سونے کی خرید وفروخت کے لئے یہ شرطیں ہیں:

۱- یہ کہ بیع قطعی ہو اور ثمن متعین ہو مذبذب نہ ہو۔

۲- یہ کہ سونے اور خریدار کے درمیان بائع تخلیہ کردے کہ خریدار جب چاہے اپنے سونے پر قبضہ کرلے۔

۳- یہ کہ بیچا ہوا سونا بغیر بیچے ہوئے سے علاحدہ کردیا جائے اور وہ خریدار کے ضمان میں ہو کہ اگر ضائع ہو یا چوری ہو تو خریدار کے مال میں سے ضائع ہوگا بیچنے والے کے مال میں سے نہیں۔

''انما تجوز هذه المعاملة بشروط تاليه''۔

الف۔''أن يقع البيع باتا ويكون الثمن متعينا غير مذبذب''۔

ب۔ ''أن یخلی البائع بین الذھب والمشتری بحیث یمکن للمشتری أن یقبض الذھب المبیع متی شاء''۔

ج۔ ''أن یکون الذھب المبیع مفصولا عن غیر المبیع ویکون فی ضمان المشتری بحیث إن ھلك أو سرق فإنه یھلك من مال المشتری ولیس من مال البائع'' (فتاوی عثمانی ۳/ ۵۴)۔

ب-صرف کمپیوٹر یا رجسٹر میں خریدار کے حصہ کو متعین ومحفوظ کرنے سے اس کا قبضہ نہیں مانا جائے گا کیونکہ مجموعہ میں غیر معین سامان وصول کرنے کا اس کو حق دیا گیا ہے اور بیچا ہوا سامان بغیر بیچے ہوئے سے عملی طور پر وصول کرنے سے پہلے علاحدہ نہیں کیا جاتا ہے، تو سپرد کرنے کے حکم ڈلیوری آرڈر کو اس صورت میں قبضہ کے لئے معتبر نہیں مانا جائے گا کیونکہ یہ مخصوص بیچی ہوئی چیز کی نمائندگی نہیں کرتا ہے یہ اس وجہ سے کہ بیچی ہوئی چیز اگر مخصوص متعین نہ ہو تو صرف کاغذ سپرد کرنے سے بیچنے والے سے خریدنے والے کی طرف اس کی ذمہ داری منتقل نہیں ہوگی اگر اس مجموعہ میں سے بعض حصہ ضائع ہو جائے تو قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ ضائع شدہ حصہ خریدا ہوا تھا یا بغیر خریدا ہوا تھا اور بیچنے والے پر واجب ہوگا کہ ضائع ہونے کے بعد باقی رہنے والے سامان میں سے خریدار کو اس کا حصہ دے اور اس میں خریدار کی ذمہ داری میں نہ آنا نشاندہی کرتا ہے کہ مبیع پر قبضہ نہیں ہوا کیونکہ قبضہ کے بعد ہی ذمہ داری منتقل ہوتی ہے اگر خریدار اس حالت میں یہ اپنا خریدا ہوا حصہ دوسرے کو بیچے تو ربح مالم یضمن ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔

(دیکھئے: فقہ البیوع ۱/ ۴۱۱)۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مبیع پر مشتری کو قدرت حاصل ہو جائے کہ وہ اس کو آگے بیچ سکے اور جس چیز پر ابھی اس نے قبضہ ہی نہیں کیا اس کو آگے بیچ بھی نہیں سکتا اس نہی کی علت ربح مالم یضمن ہے یعنی اگر وہ قبضہ نہیں کرے گا تو وہ مشتری کے ضمان میں نہیں آئے گی نہ آنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ہلاک ہو جائے تو بائع کا نقصان سمجھا جائے گا لیکن اگر مشتری نے قبضہ کر لیا تو اب ہلاک ہونے کی صورت میں مشتری کا نقصان ہوگا اگر مبیع بائع کے پاس ہے اور ابھی تک مشتری کے ضمان میں نہیں آئی اور یہ ناجائز ہے، امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اصل چیز ضمان میں آجانا ہے اس ضمان میں آجانے کے لئے حسی قبضہ کوئی ضروری نہیں بلکہ اگر اس نے حسا قبضہ نہیں کیا لیکن بائع نے تخلیہ کر دیا تو تخلیہ کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خریدار کو قدرت دے دی ہے کہ جب چاہو اس پر قبضہ کر لینا پھر بھی اگر وہ میرے پاس ہی رہی تو بطور امانت ہوگی نہ کہ ضمان کے ساتھ کیونکہ اب ضمان بائع سے مشتری کی طرف منتقل ہو گیا تو قبضہ کا حکم بھی متحقق ہو گیا اب اگر مشتری اسے آگے فروخت کرنا چاہے تو ربح مالم یضمن نہیں لازم آئے گا۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۱۰۰)۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ تخلیہ بھی قبضہ کے قائم مقام ہے، صرف کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں خریدار کا نام لکھنے سے تخلیہ متحقق نہیں ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ دیگر بسکٹوں میں سے ایک بسکٹ علاحدہ کر کے اس کو پیکٹ وغیرہ میں بند کر کے اس پر خریدار کا نام لکھ کر الگ رکھ دیا جائے اور اس کو مطلع کر دیا جائے کہ اس پر جب چاہے قبضہ کر سکتا ہے اور اب یہ بسکٹ بائع کے پاس صرف بطور امانت موجود ہے اس کا ضمان بائع کو منتقل کر دیا گیا ہے اور خریدار اس کا ضمان لے تو یہ قبضہ کی شکل بن سکتی ہے (فقہ البیوع ۱/ ۴۱۱)۔

۵- اس بیع میں عقد کے دن کے بازاری ریٹ نرخ پر معاملہ نہیں کیا جاتا بلکہ ادائیگی والے دن کے ریٹ پر معاملہ کیا جاتا ہے، اس کی مدت اور وقت متعین نہیں اور اس وقت کیا قیمت ہوگی یہ بھی معلوم نہیں اور اس معاملہ میں سونا لینا دینا مقصود نہیں بلکہ ادائیگی کے وقت جو فرق ہوگا صرف اس کا لین دین مقصود ہے، لہذا شرعا یہ بیع جائز نہیں۔

''إن ھذہ الصورۃ أشد حرمة لأنه قد ازداد فیھا محظور اخر غیر الجھالة والغرر وھو أنه لیس ہناك بیع حقیقی یراد به التسلیم والتسلم وإنما المقصود دفع فروق الثمن فھو أشبه بالمضاربة القماریة الرائجه فی البرصات ولا یجوز بحال'' (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۳)۔

اسی جیسے معاملہ پر عدم جواز کا حکم لگاتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا:

''الشراء علی السعر المفتوح لایجوز أصلا لأن ھذا البیع فیه غرر بجھالة الثمن عند العقد فإن المراد من السعر لیس سعر یوم العقد وإنما المراد السعر الذی تنتھی إلیه السوق بعد العقد إلی مدۃ مجھولة فلا شك فی أن ھذہ الجھالة مفسدۃ للعقد ولا یجوز البیع بھذا الطریق'' (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۵۳)۔

جہاں یہ صورت ہو کہ قبضہ بالکل نہ ہو نہ لینا مقصود ہو نہ دینا مقصود ہو بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ اس طرح سٹہ بازی کر کے آپس کے ڈیفرنس کو برابر کر لینا مقصود ہو تو یہ صورت بالکل حرام ہے اور شریعت میں اس کی اجازت نہیں (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/ ۲۴)۔

۶- حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''لا یحتکر الا خاطئی، الجالب مرزوق والمحتکر ملعون'' (مشکوۃ).

جو سامان فروخت کرنے کے لئے بازار میں لے آئے اس کو اللہ تعالی کی طرف سے رزق دیا جاتا ہے اور جو روک کر رکھے گرانی بڑھانے کے لئے وہ ملعون ہے، یہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احتکار کو منع فرمایا اس کے معنی یہ نہیں کہ کسی بھی شخص کو کسی بھی حال میں سامان تجارت گھر میں رکھنا جائز نہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ جب عامۃ الناس کو کسی چیز کی ضرورت ہو اور وہ بازار میں نہیں مل رہی ہو ان حالات میں اگر کوئی شخص اپنے گھر میں چھپا کر رکھے تاکہ جب گرانی بڑھ جائے تو پھر بازار میں لے جا کر فروخت کرے تو وہ ملعون ہے اور یہ احتکار حرام ہے، لیکن جب عام انسان کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو تو احتکار ممنوع نہیں، امام ابوحنیفہ کا یہی مسلک ہے احتکار کے بارے میں قول فیصل بھی یہی ہے کہ اس کی ممانعت اسی صورت میں ہے کہ جب کہ اس سے عامۃ الناس کو ضرر ہو پھر اس میں کلام ہوا ہے کہ احتکار کا یہ حکم صرف کھانے پینے کی اشیاء میں ہے یا دوسری اشیاء میں بھی یہی حکم ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا مشہور مسلک یہ ہے کہ احتکار کی ممانعت طعام اور اقوات بہائم میں ہے لیکن دوسری اشیاء میں احتکار ممنوع نہیں، امام ابویوسفؒ کا ارشاد ہے کہ ہر وہ چیز جو لوگوں کی ضرورت کی ہو چاہے کھانے پینے سے متعلق ہو یا کسی بھی شئی سے متعلق ہو ہر چیز پر احتکار کے احکام عائد ہوتے ہیں، امام ابویوسف کے قول کا حاصل یہ نکلا کہ احتکار تو ہر چیز میں ہے لیکن اس کی ممانعت انہی حالات پر ہوگی جب اس کو روک کر رکھنے سے عامۃ الناس کو ضرر پہنچے اگر ضرر نہ ہو تو احتکار ممنوع نہیں جب ضرر لاحق ہو تو اس وقت منع ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴/ ۹۰)۔

لیکن میرے خیال میں کھانے پینے کی چیزوں کی کمی اور فقدان کے وقت ان چیزوں کو روک کر رکھنے سے عام لوگوں کو نقصان اور ضرر لاحق ہوتا ہے، لہذا کھانے پینے کی چیزوں کو ایسے وقت روکنا منع ہوگا اور سونے کو روکنے سے عام لوگوں کو نقصان ہے کیونکہ عام لوگ نوٹوں کے ذریعہ روزمرہ کی ضروریات کا سامان خریدتے ہیں اور وہ ان کے پاس موجود ہیں جو لوگ سونے کو روک کر رکھتے ہیں اور وہ اس کی زکوۃ بھی ادا کرتے ہیں تو سونے کو روک کر رکھنے میں عام لوگوں کو ضرر و نقصان نہیں ہے، لہذا سونے کو روک کر رکھنا منع نہیں ہوگا اور احتکار ممنوع میں داخل نہیں ہوگا۔

''الاحتکار فی کل ما یضر بالعامه فی قول أبي یوسف وقال محمد الاحتکار بما یتقوت به الناس والبهائم''
(فتاوی عالمگیری ۳/ ۲۱۴)۔

۷- اصل یہ ہے کہ شرعا ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے مملوک روپے سے اپنی ضروریات یا پسند کا جو مال جہاں سے چاہے خرید سکتا ہے۔

لہذا کسی بیرونی ممالک سے مال خریدنا یا وہاں لے جا کر بیچنا مباح ہے۔ لیکن حکومت کے احکام کی خلاف ورزی میں چونکہ بہت سے منکرات لازم آتے ہیں مثلاً اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، نیز جان و مال یا عزت کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، لہذا ان کے جائز قوانین کی پابندی کرنی چاہئے اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ قولاً یا عملاً معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کا پابند رہے گا اس معاہدہ کا تقاضہ بھی ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کی جائے، اسمگلنگ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اصلا باہر کے ملک سے مال لے کر آنا یا یہاں سے باہر لے جانا شرعی اعتبار سے جائز تو ہے لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں مذکورہ مفاسد پائے جاتے ہیں اس لئے علماء نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے (فتاوی عثمانی ۳/ ۹۰)۔

۸- جواہر اور موتیوں کے بھی زیورات بنائے جاتے ہیں اور وہ بہت قیمتی ہوتے ہیں اس کے باوجود علماء نے جواہر اور موتیوں کو سونے کے درجہ میں نہیں مانا اور ان پر زکوۃ کو فرض نہیں کیا ''لا زکوۃ فی اللآلی والجواهر وإن ساوت ألفافی نسخة الوفا إلا أن تکون للتجارة'' (درمختار علی ہامش ردمحتار ۲/ ۱۴)۔

اس لئے عقود اور زکوۃ وغیرہ میں پلاٹین کو سونے کے حکم میں نہیں مانا جا سکتا۔

☆......☆......☆

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق سوالات کے جوابات

قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی [1]

۱- الف: چاندی کے سلسلہ میں اس وقت اہل علم کا رجحان یہ ہے کہ اس کی حیثیت ایک دھات کی ہوگئی ہے (اس کی گرتی قیمت اور حکومت کی نظر میں ثمن نہ ہونے کی بنا پر) اس لئے اس میں ادھار کی بیع وشراء درست ہونی چاہئے۔

ب-ضرورت مند اپنی ضرورت کے تحت مارکیٹ MC کے طے شدہ قیمت سے کم یا زیادہ پر اگر بیچتا خریدتا ہے تو جائز ہوگا، اس لئے موجودہ حالت میں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ زیور کہاں سے آیا کیسے خریدا، آمدنی کے حساب وکتاب اور دیگر سرکاری مراحل کی الجھن سے بچنے نیز بازار جانے اور سیل ٹیکس والوں کے ناروا چنگل سے بچنے اور دیگر زحمت اور وقت کی بربادی کو ذہن میں رکھتے ہوئے کم قیمت پر صاحب مال بیچ رہا ہو تو خریدنا جائز ہوگا۔

۲- الف: اجارہ کی صورت تصور کی جائے گی۔

ب: اجرت کی یہ شکل چونکہ مروج بھی ہے، لہذا باہمی رضامندی سے یہ طے ہو تو درست ہوگا۔

۳- دونوں قسم کے سونے میں اگر حقیقی فرق ہو تو جائز ہے۔

۴- چونکہ وعدہ کے تحت اس کا اس قدر حصہ طے ہے اس لئے جائز ہوگا۔

۵- کافی سمجھا جائے گا۔

۶- بیع کی یہ صورت جائز نہیں۔

۷- احتکار کے زمرہ میں نہیں آئے گا۔

۸- شرعی اعتبار سے درست ہے، البتہ ملکی معاہدہ کے تحت مناسب نہیں۔

☆☆☆

[1] دارالقضاء، مسجد چھوٹی گوال ٹولی، اندور (ایم پی)۔

سونا چاندی کی تجارت سے متعلق اہم مسائل

مولانا عبدالحمید قاسمی دیناجپوری[1]

۱- روپے سے سونا چاندی خریدنے کو بیع صرف کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟

کافی بحث وتحقیق کے بعد اکثر مفتیان کرام کی تحقیقی رائے یہی ہے کہ روپے یا کسی بھی کرنسی کے ذریعہ سونا چاندی کے خرید وفروخت پر بیع صرف کا اطلاق نہیں ہوگا لہٰذا بیع صرف کے احکام اس پر لاگو نہیں ہوں گے۔

الف:۔ اگر روپے سے سونا یا چاندی خریدی جائے تو ایک نقد اور دوسرا ادھار درست ہے فقہ کی تمام کتابوں میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ وہ فلوس جن میں سونے یا چاندی کی مقدار کم ہو اور کھوٹ زیادہ ہو تو ان کو عروض کے درجے میں رکھا جائے گا اور اس میں بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ حالانکہ ان میں سونا یا چاندی کی ایک مقدار ہوتی ہے پھر کاغذی نوٹ جن پر سونا چاندی کا ایک حبہ بھی نہیں ہوتا کس طرح بیع صرف کے احکام لے سکتے ہیں (تکملہ فتح الملہم ۱/۵۸۶)۔

ب:۔ بائع اور مشتری باہمی رضامندی سے اصل مارکیٹ سے کم وبیش ثمن مقرر کرسکتے ہیں اس پر ربا تفاضل کا اطلاق نہ ہوگا اپنی رضامندی سے ثمن طے کرنا بائع اور مشتری کا حق ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

’’ولا ینبغی للسلطان أن یسعر علی الناس لقوله علیه السلام لاتسعروا فإن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق‘‘ (الهدایه ۴/ ۴۷۲، بدائع الصنائع / ۵/ ۱۶۸)۔

۲- زیورات بنانے کے دوران زیورات سے گرنے والے ذرات کو اجرت قرار دینا:

زیور بنانے والے کاری گر کی حیثیت اجیر کی ہے اسے زیور تیار کرنے پر جو مزدوری دی جاتی ہے اس کا متعین ہونا ضروری ہے صورت مسئولہ میں سنار کے لئے بچنے والے ذرات کی مقدار بھی متعین نہیں اس لئے یہ اجرت مجہولہ ہے دوسری بات کہ زیور بنانے میں وہ دوسری دھاتوں کی کتنی مقدار اس میں ملائے گا یہ بھی طے نہیں، ایسے میں نزاع کا اندیشہ ہے، بلکہ واقعہ بھی ہے سنار اس بات کی کوشش کرے گا کہ سونے کے زیادہ سے زیادہ ذرات گرے اور اس میں دوسری دھاتوں کی آمیزش کردی جائے بہتر ہے کہ یہ طے کردیا جائے کہ سونے کی اصل مقدار باقی رہے گی اور اس میں لگنے والے دھات اور زیور بنانے کی اجرت الگ سے طے کیا جائے گا۔

۳- سونا چاندی کے پرانے زیورات کے عوض نئے زیورات لینے میں کمی زیادتی کرنا:

خرید وفروخت یا تبادلہ کی یہ صورت قطعاً ناجائز ہے حدیث مشہور کے بموجب یہ عین ربوا ہے اتحاد جنس وقدر کی صورت میں ربوا نسیئہ اور ربوا تفاصل دونوں ہی ناجائز ہیں، لیکن موجودہ دور میں اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے لوگ پرانے زیورات کے بدلے نئے ڈیزائن کے زیورات خریدتے ہیں اس لئے اس ضرورت کے تحت جواز کی یہ صورت اپنائی جاسکتی ہے کہ، مثلاً پچاس گرام پرانے زیورات کے بدلے اگر ۴۵ گرام سونے کے نئے زیورات دئے جاتے ہیں تو اولاً پرانے زیورات کی قیمت طے کرلی جائے اور اس قیمت پر نئے زیورات لے لئے جائیں پھر روپے کے

---

[1] ادارہ فیض القرآن محمود چوک ٹھکری باڑی، ضلع اتر دیناجپور مغربی بنگال۔

بجائے سنار کو پرانے زیورات ہی دے دیے جائیں۔ اس حیلے سے مقصد بھی حاصل ہوجائے گا اور سودی لین دین سے بھی نجات مل جائے گی۔

۴-سونے کی اینٹ سے مختلف لوگوں کا ایک متعین مقدار خریدنا:

(الف) بیع کی مذکورہ صورت درست ہے مشترک مال میں کئی لوگ شریک ہوسکتے ہیں فقہاء نے عبد مشترک اور اس میں متعدد لوگوں کے حصوں کا تذکرہ کتب فقہ میں کیا ہے رہی بات قبضے کی تو اس کی کوئی متعین شکل نصوص میں موجود نہیں ہے، قبضہ کو عرف پر چھوڑ دیا گیا ہے، عرف عام میں جس کو قبضہ سمجھا جائے وہ شرعاً قبضہ کہلائے گا نیز اشیاء کے اختلاف سے قبضے کی شکلیں بھی بدل جاتی ہیں، فقہاء نے حسی قبضہ کو ضروری قرار نہیں دیا ہے بلکہ قبضے کی تعریف میں توسع سے کام لیا ہے چنانچہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے تخلیہ کو قبضہ قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بائع نے مشتری کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں رکھی ہے بلکہ اسے تصرف پر پورا اختیار دے دیا ہے بہ الفاظ دیگر مبیع مشتری کے ضمان میں داخل ہوچکی ہے کہ اب اگر وہ ضائع ہوجائے تو بائع اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ فقہائے کرام نے قبضے کے مفہوم میں اسی وسعت سے استفادہ کرتے ہوئے چند شرائط کے ساتھ کمپنی کے شیئرز خریدنے کو درست قرار دیا ہے حالانکہ وہ حصہ ایسا نہیں کہ شیئر ہولڈر کمپنی میں جاکر اپنا حصہ وصول کرلے اور اس پر قبضہ کرلے، ایسا کرنا تو ممکن ہی نہیں، لہٰذا اصل حصے کے مالک بننے کا مطلب یہ ہے کہ اس حصے کے فوائد اور نقصانات، اس حصے کی ذمہ داریاں اور اس کے منافع کا ذمہ دار بن گیا۔

قاضی خاں تحریر فرماتے ہیں: ''أجمعوا علی ان التخلیه فی البیع الجائز تکون قبضا''

خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے: ''ان بالتخلیه یقع القبض وإن کان المعقود علیه یبعد عنها''

(خلاصة الفتاوی ۳/ ۸۹، مستفاد فقهی مقالات ۱/ ۱۵۴)۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ: ''یجوز بیع العقار قبل القبض عند أبی حنیفه وأبی یوسف إلی ان قال ولا غرر فیه لأن الهلاك فی العقار نادر بخلاف المنقول والغرر المنهی عنه غرر الانفساخ والحدیث معلول ای بغرر انفساخ العقد فیما قبل القبض بهلاك المعقود علیه فیکون مخصوصًا بالمنقول'' (بدایه ۳/ ۷۴)۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث میں قبضہ سے پہلے بیع وشراء کی ممانعت فسخ کے اندیشے کی بنیاد پر ہے اور جہاں یہ احتمال نہ ہو وہاں بیع درست ہوگی۔

''وقال شیخ الإسلام العلامه تقی العثمانی'' ثم القبض عرفه الفقهاء بعبارات مختلفه فجاء فی القوانین الفقهیه لابن جزی القبض عبارة عن حیازة الشئی والتمکن منه سواء کان ممایمکن تناوله بالید أولم یکن وقال الکاسانی معنی القبض التخلی وارتفاع الموانع عرفا وعادة'' (فقه البیوع/ ص۳۹۷) وفی موضع آخر۔ قال العلامه الکاسانی أی یخلی البائع بین المبیع والمشتری برفع الحائل بینهما علی وجه یتمکن المشتری من التصرف فیه''

(فقه البیوع/ص ۳۹۸، وهکذا قال: خالد سیف الله رحمانی فی جدید فقهی مسائل ۴/ ۲۱۹)۔

لہٰذا بیع کی مذکورہ صورت درست ہے اور جب مشترک اینٹ میں ایک متعین مقدار کی بیع درست ہے تو اگر خریدار کے حصے کو سکہ یا بسکٹ کی شکل میں الگ کردیا جائے تو اس کی بیع وشراء بدرجۂ اولیٰ درست ہوگی، دراصل شریعت نے قبضے کی کوئی شکل متعین نہ کرکے بڑا احسان کیا ہے اس کا مدار عرف پر رکھنے کی وجہ سے کافی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں (جدید فقہی مسائل ۴/ ۲۱۵)۔

۵-محض نرخ کی کمی بیشی سے لین دین کرنا:

سوال نامے میں مذکورہ بیع کی صورت دراصل بیع ہی نہیں ہے نہ تو حقیقتاً یہاں مبیع ہے نہ ثمن، نہ مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے نہ بائع ثمن پر، بس بھاؤ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے اس کا سودا کرلیتے ہیں، اس فرضی معاملے میں ایک تو ثمن مجہول ہے دوسرا اس میں غرر اور خطر بھی ہے اس لئے یہ قمار کی ایک شکل ہے اس کے جواز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

۶-اشیاءِ خورد ونوش کے علاوہ کیا باقی چیزوں پر بھی احتکار کا اطلاق ہوگا:

کائنات کی ہر چیز کا اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "للہ ما فی السموات ومافی الأرض" (سورۂ بقرہ: ۲۸۴)، اس لئے اسے ہی ان چیزوں پر تصرف کا اختیار ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے عارضی طور پر انسان کو بھی مالک بنا کر انہیں تصرف کرنے کا اختیار دیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اسے مطلق آزاد نہیں چھوڑا کہ اصل مالک کو کوئی اختیار ہی نہ ہو اسی اصول کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر بعض پابندیاں عائد کی ہیں۔

احتکار کے معنی ذخیرہ اندوزی یعنی روک کر رکھ لینا ہے حدیث میں مطلقاً احتکار سے منع کیا گیا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مال بازار میں لاکر فروخت کرنے والوں کو دعا دی ہے اور روک کر رکھنے والوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ اللہ کی رحمت سے دور ہے۔ فرماتے ہیں:

"لا یحتکر الا خاطی"، نیز فرمایا: "الجالب مرزوق والمحتکر ملعون" (نصب الرایہ ۴/۲۶۱)

حدیث میں اگرچہ کسی خاص چیز کا ذکر نہیں ہے کہ اس کا احتکار منع ہے لیکن فقہاء نے انسانوں اور جانوروں کے اشیاءِ خورد ونوش پر اس کا اطلاق کیا ہے اور مخصوص حالات میں اسے ناجائز قرار دیا ہے مثلاً لوگوں کو ذخیرہ اندوزی سے سخت مشکلات کا سامنا ہو اور تاجر اپنا مال زیادہ نفع خوری کی لالچ میں بازار میں نہ لائے پھر ممانعت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مال اس کا ذاتی نہ ہو اور نہ اس نے دوسرے شہر سے برآمد کیا ہو اگر وہ اناج یا چارہ خود اس کے کھیت کا ہے یا اس نے دوسرے شہر سے اس کو برآمد کیا ہے تو پھر اس پر ممانعت کا اطلاق نہیں ہوگا امام اعظم ابوحنیفہ کا یہی قول ہے۔

لیکن احناف میں سے امام محمد، امام ابو یوسفؒ نے اس میں عموم رکھا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ احتکار صرف اشیاءِ خورد ونوش کے ساتھ خاص نہیں، ہر وہ چیز جو لوگوں کی ضرورت ہو چاہے کھانے پینے سے متعلق ہو یا کسی بھی شئی سے متعلق اس پر احتکار کے احکام عائد ہوتے ہیں، امام ابو یوسفؒ کے قول کا حاصل یہ نکلا کہ احتکار تو ہر چیز میں ہے، لیکن اس کی ممانعت انہیں حالات میں ہوگی جب اس کو روکے رکھنے سے عامۃ الناس کو ضرور پہونچے اگر ضرر نہ پہونچے تو احتکار ممنوع نہیں ہے (عمدۃ القاری ۸/۲۱۶)۔

حدیث کا اطلاق، ممانعت احتکار کی وجوہات اور پھر امام ابو یوسف کا قول سامنے رکھا جائے تو یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ سونا کی ذخیرہ اندوزی بھی احتکار کے دائرے میں آئے خصوصاً موجودہ حالت میں جبکہ کاغذی نوٹوں پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے اور سونا جو کہ ثمن خلقی ہے پھر معیشت میں فیصلہ کن مقام حاصل کرتا جا رہا ہے، اس کی قیمتوں میں کمی بیشی کا اثر دیگر تمام اشیاء پر ظاہر ہو جاتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے سونے کو بھی احتکار کے دائرے میں لایا جائے۔

۷-اسمگلنگ اور اس راہ سے آنے والی چیزوں کی خرید وفروخت کا حکم:

شریعت نے ہر شخص کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے مملوک روپے سے اپنی ضرورت اور پسند کا سامان باہمی رضامندی سے جس سے اور جس قیمت پر بھی چاہے خریدے، لہٰذا اگر جھوٹ یا کسی دوسرے گناہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو اس راہ سے آنے والی چیزوں کی بیع وشراء درست ہے کیونکہ بیع کی تعریف کی گئی ہے مبادلۃ المال بالمال بالتراضی۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

"البیع ینعقد بالایجاب والقبول إذا کانا بلفظی الماضی" (ہدایہ ۴/۱۸)۔

(ب) لیکن اس میں جان ومال اور عزت وآبرو کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، لہٰذا ملکی قوانین کی پابندی کرنی چاہئے، جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت حاصل کرتا ہے تو وہ قولاً یا عملاً یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کا پابند رہے گا، اس معاہدے کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ جب تک حکومت کا حکم گناہ پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی ضروری ہوگی۔ لہٰذا چونکہ حکومت نے اسمگلنگ پر پابندی لگا رکھی ہے اور اس پابندی کی خلاف ورزی میں بہت سے مفاسد ہیں، اس لئے علماء نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔

(فی الدر المختار تجب اطاعۃ الامیر فیما لیس بمعصیۃ ۲/۱۴۳)۔

''وقريبًا منه في ردالمحتار (۵ / ۲۵۹) وفي بحوث في قضايا فقهيه معاصرة (ص:۱۶۶) كل من يسكن دولة فانه يلتزم قولا وعملًا بانه يتبع قوانينها وحينئذ يجب عليه اتباع احكامها''۔

۸- کیا پلاٹین یا دیگر دھاتوں کو سونا کا حکم دیا جا سکتا ہے؟

سونا چاندی اثمان اصلیہ یا خلقیہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا ہی ثمن بننے کے لئے کیا ہے، ان کا ثمن بننا اور ان میں حرمت تفاضل وحرمت نسیئہ ہونا نص حدیث سے ثابت ہے:

''لاتبيعوا الذهب بالذهب إلا سواء بسواء والفضة بالفضة إلا سواء بسواء'' (صحیح بخاری حدیث:۲۱۷۵)

اگر عرف ان کی ثمیت کو ختم کرنا چاہے، تو بھی ان کی ثمیت ختم نہیں ہوگی، اس لئے فقہاء کا اتفاق ہے کہ حدیث میں مذکورہ اشیاء کی جو حیثیت متعین کردی گئی ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گی، ان کے علاوہ باقی چیزوں میں عرف کا اعتبار ہوگا مثلاً سیب بعض علاقوں میں کیلی ہے اور بعض میں عددی اس میں ان علاقوں کے عرف کا اعتبار ہوگا چنانچہ جہاں کیلی ہے وہاں ایک کیلو سیب کے بدلے دو کلو سیب خرید فروخت کرنے کی اجازت نہ ہوگی اور جہاں عددی ہے وہاں ربا کی دونوں علت قدر وجنس میں سے ایک کے نہ ہونے کی وجہ سے کمی زیادتی درست ہوگی۔

سونا چاندی کے علاوہ دوسری چیزیں جن کو رواج کی وجہ سے یا کسی قانون کے ذریعہ ثمن بنادی گئی ہیں ان کو ثمن اعتباری یا ثمن عرفی کہا جاتا ہے ان کو ثمن خلقی قرار دینے کا کوئی راستہ نہیں کیوں کہ نصوص سے صرف سونا چاندی میں بیع صرف کا اطلاق ہوتا ہے اگر دوسری چیزوں کو ثمن خلقی قرار دیا جائے تو اس میں اضافہ لازم آتا ہے۔

اس تفصیل کے بعد اب پلاٹین کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں۔

سونا چاندی کے علاوہ دوسری چیزیں مثلاً پلاٹین اگر عرف یا قانون کے ذریعہ ثمنیت کا درجہ حاصل کرلے تو اس پر ثمن عرفی یا اعتباری کا اطلاق ہوگا اور کرنسی نوٹوں کے احکام اس پر لاگو ہوں گے لیکن مکمل طور پر سونے کے احکام اس پر لاگو نہیں ہوں گے۔ مثلاً سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ ہے اور چاندی کا ساڑھے باون تولہ اگر پلاٹین کو ثمنیت کا درجہ مل جائے تو نصاب زکوۃ کے لئے ساڑھے سات تولہ یا ساڑھے باون تولہ معتبر نہ ہوگا بلکہ عروض تجارت کی طرح اس کا بھی حکم وہی ہوگا۔



سونا چاندی سے متعلق مسائل

مفتی محمد مقصود فرقانی [1]

الف- چونکہ سونا و چاندی اور نوٹ کی قیمت عرف عام میں مترادف ہے اس لئے اس بیع کو بیع صرف تصور کیا جائے گا اور اس میں ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار تو یہ بیع درست نہیں ہے، کیونکہ نوٹ ثمن کے حکم میں ہے اور ثمن پر بیع صرف کے احکام جاری ہوں گے۔

ہدایہ /ص ۸۸ پر ہے:

''الصرف هو البيع إذا كان كل واحد من عوضيه من جنس الأثمان والثمن عند الحرب ما كان دينا في الذمة''

اور /ص ۶۴ پر ہے: ''وعقد الصرف ما وقع على جنس الأثمان يعتبر فيه قبض عوضيه في المجلس''۔

ب- سونے اور چاندی کی جو قیمت سونے چاندی کی مارکیٹ نے مقرر کی ہے یا حکومت نے مقرر کی ہے اس میں کمی وزیادتی رہا ہوگی۔

۲- الف: مذکورہ صورت میں سونے کے لین دین میں مقدار کا جو فرق آرہا ہے اسے اجارہ تصور کیا جائے گا اور سونار کو الگ سے اجرت لینی چاہئے۔

ب- سونار کو زیورات کے بچے ہوئے ذرات اجرت میں نہیں لینا چاہئے، بلکہ ان ذرات کی قیمت متعین کی جائے اور وہی قیمت اجرت قرار دی جائے۔

۳- یہ صورت بھی جائز نہیں ہے بلکہ اس کے جواز کی شکل یہ ہے کہ پرانا زیور فروخت کیا جائے اور اس کی قیمت سے دوسرا زیور خرید لیا جائے۔

۴- الف، ب: یہ صورت بھی خرید وفروخت کی جائز نہیں ہے کیونکہ یہ مفضی الی المنازعۃ ہے اور جس صورت میں یہ شکل ہو وہ درست نہیں ہے اور چونکہ مذکورہ صورت قبضہ منقولہ کی ہے اور فقہاء نے منقولہ اشیاء کے لئے جو قواعد مقرر کئے ہیں وہی برقرار رہیں گے اور کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اندارج کو قبضہ نہیں سمجھا جائے گا۔

۵- یہ صورت بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس میں مشتری کا قبضہ نہیں ہے۔

۶- احتکار کا اطلاق ان چیزوں پر ہوتا ہے جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہو سونے اور چاندی پر انسانی زندگی کا انحصار نہیں ہے، اس لئے ان پر احتکار کا حکم جاری نہیں ہوگا۔

۷- قانونی طریقے سے اس سونے کا لانا درست نہیں ہے، لیکن فی نفسہ اس سونے کا لانا جائز ہے کیونکہ وہ اپنی مملوکہ چیز کو لا رہا ہے، البتہ اسے قانون پر بھی عمل کرنا چاہئے، اور حکومت کے واجبات ادا کرنے چاہئیں۔

۸- جو چیز سونے اور چاندی کی جنس سے نہیں ہے اس پر سونے چاندی کا حکم جاری نہیں ہوگا، پلاٹین ان دونوں چیزوں کی جنس سے نہیں ہے اس لئے اس پر سونے چاندی کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

الجواب صحیح:
فقط احقر محبوب علی عفی عنہ، مفتی مدرسہ ہذا

☆☆☆

[1] خادم دار الافتاء جامع العلوم فرقانیہ رامپور۔

سونا اور چاندی کی تجارت سے متعلق چند مسائل

مفتی عبدالمنان[1]

۱- روپے (کاغذی نوٹ) نے آج کل لوگوں کی اصطلاح میں ثمن کی حیثیت اختیار کرلیا ہے جس کو اصطلاحی یا عرفی ثمن کہا جاتا ہے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سونا اور چاندی ہی بطور ثمن استعمال ہوتا تھا جو درہم و دینار کی شکل میں ہوتا تھا، بعد میں درہم و دینار کا عام رواج بند ہوگیا اگرچہ بعض اسلامی ممالک میں اب بھی رائج ہے لیکن ہمارے ملک میں کاغذی نوٹ جس کو گورنر کی طرف سے تصدیق کر کے بطور ثمن قبول کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے اجبار ہے اور درہم و دینار کی جگہ آج کل کاغذی نوٹ نے لے لیا ہے، لہذا اس کو فلوس نافقہ کی طرح ثمن اصطلاحی یا عرفی کہا جائے گا، اسی وجہ سے اگر روپے سے سونا چاندی خریدا جائے تو اس کو ثمن اصطلاحی کہا جائے گا، لیکن ثمن کی بیع ثمن سے جس کو بیع صرف کہا جاتا ہے، مگر یہاں تبدیل جنس کی وجہ سے مجلس میں قبضہ ضروری نہیں اور اس میں ادھار خرید و فروخت بھی درست ہوگی۔

الف- اگر روپے سے سونا، چاندی خرید کیا جائے تو اس میں سے ایک نقد اور ایک ادھار بھی درست ہوگی۔

ب- سونا چاندی کا جو نرخ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ جیسے انٹرنیشنل سطح پر ہو کو میکس گولڈ مارکیٹ یا ہندوستان کی سطح پر یہاں کی مارکیٹ MC نے طے کیا ہو اس سے کم یا زیادہ قیمت میں خرید و فروخت بھی درست ہوگی، ربوا تفاضل کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۲- الف: دوسری دھاتوں کی آمیزش کتنی مقدار میں ہوگی یہ طے نہیں ہے، لہذا اجرت مجہول ہونے کی وجہ سے یہ اجارہ فاسدہ ہے اور اجرت کی یہ شکل درست نہیں ہے۔

۳- عام طور پر سونے کے تاجر حضرات پرانے زیور کی قیمت کم متعین کرتے ہیں، مثلاً: دس گرام سونے کو آٹھ گرام کے درجہ میں رکھتے ہیں، تو اگر سونے کے پرانے زیور کا سونے کے نئے زیور سے تبادلہ ہو اور اس کی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سونے کا پرانا زیور زیادہ وزن کا لیا جائے اور سونے کا نیا زیور کم وزن میں اس کے بدلہ ادا کیا جائے تو یہ صورت درست ہوگی۔

۴- آج کل کموڈیٹیز ایکسچینج میں دوسری اشیاء کے ساتھ سونے چاندی کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے، جس میں خریدار آرڈر دیتا ہے اور جو کچھ اس نے آرڈر دیا ہے، اس کے آرڈر کے بقدر وہ شئی اس کے نام سے محفوظ کردی جاتی ہے، اس سلسلہ میں چند باتیں قابل غور ہیں:

الف: اگر سونا فروخت کرنے والے ادارے کے پاس مثلاً ایک کلو سونا ہو اور وہ دوسو افراد کو پچاس پچاس گرام سونا فروخت کرے، لیکن ان سب کا خریدا ہوا سونا سونے کی اینٹ میں شامل ہو، ان کے الگ الگ بسکٹ یا سکے نہیں بنائے تو اس کو خریدار کا قبضہ نہیں سمجھا جائے گا۔

ب: اگر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کردیا گیا ہو تو اس اندراج کو قبضہ تصور کیا جاسکتا ہے، کیونکہ خلاصۃ الفتاوی میں ہے کہ: "ان بالتخلیۃ یقع القبض وا ن کان المعقود علیہ یبعد عنہا" (۸۸/۳)، مذکورہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو قبضہ مانا جاسکتا ہے۔

۵- ایکسچینج کے ذریعہ کاروبار کی ایک اور صورت جو آج کل رائج ہے، یہ ہے کہ مثلاً ایک مہینے کے لئے ادھار ایک مخصوص مقدار جیسے ۱۰ تولے سونے

---

[1] مفتی دارالحدیث، پرمائی، نوگاؤں، آسام۔

کا سودا کرلیا جاتا ہے، خریدار سونے پر قبضہ نہیں کرتا، جب ادائیگی کی تاریخ آتی ہے تو سونے کے اس دن کے نرخ کو دیکھ لیا جاتا ہے، خرید کے دن اور ادائیگی کے دن سونے کے نرخوں میں جو فرق ہوتا ہے، اس کی ادائیگی کردی جاتی ہے، مثلاً خریدنے کے دن سونے کا نرخ پانچ ہزار روپے فی تولہ تھا، ادائیگی کے دن پانچ ہزار ایک سو روپے تولہ ہوگیا تو خریدار بائع کو ایک سو روپے دے گا، اور اگر اس دن چار ہزار نو سو تھی تو بائع خریدار کو ایک سو روپے ادا کرے گا، نہ تو مشتری سونے پر قبضہ کرتا ہے اور نہ بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے، بس نرخ میں کمی بیشی سے جو فرق آتا ہے، اس کا لین دین کرلیتے ہیں تو اس صورت کی بیع ناجائز ہے چونکہ اس میں سود بھی ہے اور قبل القبض فروختگی بھی ہے، لہذا اس قسم کی بیع جائز نہیں ہوگی۔

٦- بہت سی دفعہ سونے کی قیمت میں متوقع اضافہ کا سونے چاندی کے تاجروں کو علم ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں وہ سونے کو روک لیتے ہیں؛ تاکہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کریں، سونا اس پہلو سے اشیاء ضروریہ میں شامل ہے کہ ثمن خلقی ہونے کے لحاظ سے وہ ذریعہ تبادلہ ہے، اس کو روک لینے کی وجہ سے سونے کی قیمت تو بڑھتی ہی ہے، اس گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر بھی پڑتا ہے، سونے کی یہ ذخیرہ اندوزی اور گرانی فروشی کے لئے روکے رکھنا جبکہ یہ اشیاء ضروریہ میں شامل ہیں اور اس کے روکنے کی وجہ سے جب دوسری اشیاء میں بھی گرانی ہوتی ہے تو یہ احتکار کے دائرہ میں آنا چاہئے۔

٧- ملک میں جو سونا آتا ہے، اس میں بڑا حصہ تو قانونی طریقہ پر آتا ہے، اور سونا لانے والا اس سے متعلق واجبات کو ادا کرتا ہے، دوسرا راستہ اسمگلنگ کا ہے، یہ طریقہ غیر قانونی ہے، اس میں سونا لانے والا ان واجبات کو ادا نہیں کرتا، جو حکومت نے سونے کی درآمد سے متعلق مقرر کئے ہیں، یہ اسمگلنگ کا عمل جائز نہیں ہوگا کیونکہ اگر پکڑا گیا تو بے عزتی ہوگی اور حدیث میں ہے کہ: "لا ینبغی للمؤمن أن یذل نفسہ" اور اس کی خرید وفروخت بھی کراہت سے خالی نہیں ہوگی۔

٨- آج کل 'پلاٹین' کو سفید سونا کہا جاتا ہے، اب اس کا شمار مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے، اور اس کے زیورات بھی بنائے جاتے ہیں، اب اس پلاٹین کو حقیقی سونا کے حکم میں لانے کی کوئی وجہ خاص نہیں نظر آتی، صرف قیمتی ہونا اور زیور بنانے اور لوگوں کا منہ بولا سونا کہنے سے وہ حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہوسکتا، نیز عقود اور زکوۃ میں اس پر سونے کے احکام بھی جاری نہیں ہوں گے۔



سونا چاندی کی تجارت سے متعلق مسائل کا شرعی حل

مفتی نثار احمد گودھروی[1]

۱- الف-حضرات حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک بیع صرف کی تعریف درج ذیل ہے۔

ثمن یا زر کے مقابلہ میں ثمن یا زر کی خرید وفروخت خواہ دونوں جنس ایک ہو یا مختلف ہو۔

لیکن باب صرف میں دونوں جانبوں میں ثمن سے مراد ثمن خلقی ہے یعنی سونا اور چاندی خواہ سونا یا چاندی کسی بھی شکل میں ہو درہم یا دینار یا سونے چاندی کا برتن یا زیور یا ڈلی ہو۔

لھذا اگر کسی ایک جانب یا دونوں جانبوں میں عوضین ثمن عرفی ہو مثلاً کرنسی نوٹ یا فلوس تو اس کو بیع صرف نہیں کہا جائے گا اور اس پر صرف کے احکام جاری نہ ہوں گے۔

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

''وشرعًا بيع الثمن بالثمن اى ماخلق للثمنية ومنه المصوغ جنسا بجنس و بغير جنس''۔

فقہائے احناف کی تصریحات سے یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ بیع صرف کے لئے ثمن کا ہونا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ ثمن خلقی ہو البتہ ثمن خلقی کسی بھی شکل میں ہوسکتا ہے، البتہ عدم تعیین کے لئے کسی ایک شئی کا صرف ثمن ہونا کافی ہے۔

''فتاوی دار العلوم'' زکریا میں ہے:

کاغذی نوٹ یعنی مروجہ کرنسی ثمن حقیقی نہیں ہے بلکہ ثمن عرفی ہے، لہذا اس کی تجارت میں بیع صرف کے احکام جاری نہ ہونگے بنا بریں اُدھار خرید وفروخت جائز ہے ہاں عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس میں قبضہ کرنا ضروری ہے تا کہ بیع الدین بالدین لازم نہ آئے (دار العلوم زکریا جلد ۵)۔

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے۔

سونے یا چاندی اس طرح فروخت کرنا کہ مثلاً سونے کے زیورات خرید لے اور رقم کچھ ابھی دے دی اور کچھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا یا کل رقم ادھار ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ کاغذی نوٹ کے ذریعہ سے سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے اس لئے ادھار خرید وفروخت جائز ہے۔ شرط یہ ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے تا کہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے (جدید معاملات کے شرعی احکام ۱/۸۲۱)۔

''احسن الفتاوی'' میں ہے:

رائج نوٹ اور سکے سونے چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے چاندی کی رسید ہے لھذا ان سے بیع ذہب وفضہ بہر کیف جائز ہے تفاضل اور نساء بھی جائز ہے (احسن الفتاوی ۶/۸۱۵، فتاوی حقانیہ ۶/۴۲۱)۔

---

[1] مفتی جامعہ رحمانیہ گودھرا، گجرات۔

مولانا تقی عثمانی صاحب ''فقہ البیوع'' میں فرماتے ہیں:

''ثم إن الدراهم المضروبة بالفضة والدنانير المضروبة بالذهب يجرى فيها الصرف بالإجماع فإن بيعت بجنسها وجب التماثل والتقابض وإن بيعت بغير جنسها لم يجب التماثل ولكن وجب التقابض۔

اما الأثمان العرفيه او الإصطلاحية المسكوكة بغير الذهب والفضة مثل الفلوس فاختلف الفقهاء فى حكمها۔ ثم إن الائمة الحنفية بالرغم من اختلافهم المذكور فى جواز التفاضل فيها كلهم متفقون على ان بيع الفلوس بالفلوس صرفًا ومن هذه الجهة أفتى بعضهم بانه لايجب فيها التقابض فى المجلس بل يشترط ان يقع بين احد البدلين فى المجلس لئلا يلزم الافتراق عن دين بدين۔

فالحاصل أنه إن بيعت الفلوس بجنسها يشترط التقابض لا لكونه صرفًا بل لوجود احد علتى الربا وهو الجنس أما إذا بيعت بخلاف جنسها جاز بقبض احد البدلين فى المجلس ولم يجز بدون ذالك'' (فقه البيوع ۲/ ۶۱۷)۔

حاصل کلام یہ نکلتا ہے کہ موجودہ کرنسی کے ذریعہ سونے اور چاندی کی خرید وفروخت بیع صرف نہیں ہے اس لئے بدلین پر قبضہ ضروری نہیں بلکہ احد البدلین پر قبضہ کافی ہے۔

ب- سونا اور چاندی کا جو نرخ حکومت نے مقرر کیا ہے اس کی مخالفت کرتے ہوئے نرخ کے ذریعہ کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس سے سود لازم نہیں آئے گا اس لئے کہ سونا اور چاندی ثمن حقیقی اور خلقی ہے جب کہ آج کی کرنسی ثمن عرفی ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ کرنسیاں جنس کے اعتبار سے مختلف ہو تو کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے اور اس کمی زیادتی کی شرعًا کوئی حد مقرر نہیں بلکہ فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے البتہ اس پر تسعیر کے احکام جاری ہوں گے نیز حکومت کے قانون کی خلاف ورزی لازم آئے گی اور عزت نفس ضروری ہے اگر عزت نفس کا خطرہ ہو تو ایسا کام نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس زیادتی کو سود کہہ کر حرام کہنا درست نہیں اور اس پر ربوا الفضل کا اطلاق نہ ہوگا (فقہی مقالات ۱/ ۴۰، فتاوی دار العلوم زکریا ۵/ ۵۴۳، زر کا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب کراچی)۔

۲- الف: زیور بنانے والے کاریگر زیورات کے تاجروں سے ایک متعین وزن میں سونا لیتے ہیں اور چند دنوں کے بعد اس کے بدلہ سونے کے زیورات واپس کرتے ہیں سوال کی عبارت سے یہ مسئلہ اجارہ کا معلوم ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ کاریگروں کو الگ سے اجرت نہیں دی جاتی۔ اس صورت میں کاریگر اجیر ہے اور اس کو اپنے کام کی اجرت ملتی ہے اس لئے زیورات بنانے میں جو ذرات (چھچھت) بچ جائے اس کا اعتبار کرتے ہوئے اجرت طے کی جاسکتی ہے۔ البتہ ذرات کو (چھچھت) اجرت کا جزؤ (حصہ) نہیں بنایا جاسکتا ہے کیونکہ ذرات میں کمی بیشی ہوتی ہے اور اجرت مجہول ہونے کی صورت میں اجارہ درست نہیں ہوتا۔

آثار وروایت سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے سونے کے تیار زیور کو زائد سونے کے عوض میں اور چاندی کے تیار زیور کو زائد چاندی کے عوض میں فروخت کرنا درست نہیں اگر چہ اس اضافے کو مزدوری کا نام دیا جائے اور مزدوری کے طور پر لیا جائے، مزدوری کی بہتر صورت یہ ہے کہ نقد رقم لے لی جائے (اعلاء السنن)۔

ب- البتہ زیور بنانے میں جو ذرات نکلتے ہیں اگر کاریگر اس کی امانت داری کے ساتھ شرح بتادے اور کاریگر سے متعین شرح کے ساتھ مثلا ایک تولہ کے زیور بنانے میں بطور اجرت ایک ماشہ ذرات سونے کے دئے جائیں گے تو پھر اس طرح جبکہ اجرت معلوم ومتعین ہو جائے یہ ذرات کا اجرت کی شکل میں لینا درست ہوگا۔ اگر کاریگر اپنے پاس سے زیور بنا کر تاجر کے پاس سے پورا سونا لیتا ہے تو اگر چہ اس میں کچھ کھوٹ ملی ہوئی ہوتی ہے لیکن مغلوب ہوتی ہے اس لئے اس کا وہی حکم ہوتا ہے جو خالص سونے کا ہوتا ہے چونکہ اس میں دونوں طرف سونا ہے لہٰذا یہ بیع صرف ہوئی تو اسمیں تقابض فی المجلس اور برابری بھی ضروری ہوگی (زر کا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب کراچی)۔

۳- سونے کا پرانا یا نیا زیور بشرطیکہ اس میں سونا غالب ہو خالص سونے کے حکم میں ہے۔ اگر اس کا آپس میں تبادلہ ہو تو کمی زیادتی کے ساتھ بیچنا درست نہیں۔ البتہ اگر پرانے زیور کی قیمت سونار اور تاجروں کے عرف وعادت اور تعامل میں کم شمار ہوتی ہو تو اس صورت میں پہلے پرانے زیور کی ان کی عرف وعادت کے اعتبار سے قیمت لگا کر اس قیمت سے نیا زیور خریدنا درست ہوگا اور لین دین میں جو قیمت کے اعتبار سے کمی زیادتی ہوگی وہ آپس میں سمجھ لی جائیگی۔

خلاصہ یہ کہ زیورات کے تاجروں کے عرف وعادت اور تعامل کے پیش نظر پرانے زیور کم قیمت میں اور نیا زیور مارکیٹ قیمت کے اعتبار سے بیچنے کا معمول ہو تو یہ صورت درست ہوگی (زرکا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب کراچی)۔

۴- الف: سونا خریدنے والا اگر کمپنی کو آڈر دیتا ہے اور ثمن کی ادائیگی نہیں کرتا تو یہ صورت بیع الدین بالدین کی بنتی ہے، لہذا یہ ناجائز ہے۔

البتہ اگر سونا ثمن کی ادائیگی کے ساتھ خریدا گیا ہے تو یہ سونا اگر مشترکہ اینٹ میں شامل ہوتا ہے اور اس کا الگ سے قبضہ نہیں پایا جاتا ہے بلکہ اس کے اکاونٹ میں تحریر کردیا جاتا ہے پھر جب وہ خریدار اُسے آگے کسی شخص کو فروخت کرتا ہے تو اس وقت اگر اسے نفع ہو تو صرف نفع واپس کیا جاتا ہو اور نقصان ہو تو اس سے وہ نقصان طلب کرلیا جاتا ہے بلکہ کاغذی طور پر اس کے اکاونٹ میں منتقل کردی جاتی ہے اور آخر میں نفع اور نقصان برابر کردیا جاتا ہے۔ تو اس طرح فقط اکاونٹ میں منتقل کرنا قبضہ شمار نہ ہوگا۔

واضح رہے شرعی اعتبار سے ثمن (سونا چاندی) اور دوسری اجناس کی تعیین میں یہ فرق ہے کہ دوسری اجناس اشارے یا علامتوں سے متعین ہوسکتی ہیں لیکن ثمن چاہے حقیقی ہو یا عرفی اس وقت تک متعین نہیں ہوتا جب کہ اس پر کوئی شخص خود یا اپنے نمائندے کے ذریعہ قبضہ نہ کرے۔

ب- اگر خریدار کے لئے خریدا ہوا سونا سکے کی شکل میں الگ سے موجود ہو اور کمپیوٹر ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کردیا گیا ہو تو فقط اندراج کرنا قبضہ کے لئے کافی نہ ہوگا بلکہ خود خریدار کا یا اس کے وکیل کا قبضہ کرنا اور انہیں تحویل میں لینا ضروری ہوگا۔ الثمن لا یتعین بالتعیین بل یتعین بالقبض۔ (فتاوی عثمانی ۳/۱۵۷، زرکا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب کراچی)۔

۵- کاروبار کا یہ طریقہ جس میں سونے پر نہ مشتری کا قبضہ ہوتا ہے اور نہ بائع قیمت پر قبضہ کرتا ہے فقط قیمت کی کمی بیشی میں جو فرق آتا ہے اس کا لین دین کرتے ہے کاروبار کی یہ شکل بالکل ناجائز اور حرام ہے کیونکہ اس صورت میں یہ بیع الکالی بالکالی لازم آرہا ہے جو احادیث کی رو سے ممنوع ہے۔

''عن ابن عمر ان النبی ﷺ نهی عن بیع الکالی بالکالی'' (زرکا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب کراچی)۔

۶- احتکار شریعت میں اشیاءِ ضروریہ کو خرید کر اس طرح روک کر رکھنے کا نام ہے جس سے اہل شہر کو مشقت ہو اور ان کے لئے باعث ضرر بنیں۔ یہ گرانی اس لئے ہو کہ مارکیٹ گراں ہوگا تب فروخت کریں گے تو یہ گناہ ہے اور اگر اس لئے ہو کہ قحط پڑنے کے بعد مال بازار میں لائیں گے تب تو یہ سنگین گناہ ہے۔

احتکار کا دائرہ:

حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ اور فقہاءِ شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں احتکار صرف غذائی اشیاء میں ہوگا۔ دوسرا رجحان یہ ہے کہ احتکار ان تمام چیزوں میں ہوگا جن کو روکنے سے عوام الناس کو ضرر لاحق ہو۔

جمہور علماء کے یہاں احتکار اور ذخیرہ اندوزی کا تعلق غذائی اشیاء کے ساتھ ہے اور وہ اس شرط کے ساتھ کہ جس سے اہل شہر کو مشقت اور ضرر لاحق ہو اور جمہور کا مذہب مفتی بہ ہے جس پر علامہ شامیؒ نے فتوی دیا ہے۔

''قال فی در المختار: وکره احتكار قوت البشر والبهائم فی بلد یضر بأهله۔ وفی الشامی والتقید بقوت البشر قول أبي حنیفة ومحمد وعلیه الفتوی'' (شامی ۹/ ۹۷۵)۔

''فقہ البیوع'' میں ہے:

"وخصّ معظم الفقهاء النهى بالأقوات وعلف الدواب إن أضر ذالك بأهل البلد" (فقه البيوع ۲/ ۸۹۹)۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے سونا اور چاندی کی ذخیرہ اندوزی احتکار کے دائرہ میں نہیں آتی۔

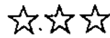
البتہ زیادہ مقدار میں احتکار کرنے سے اس کی گرانی کا اثر دوسری اشیاء پر پڑتا ہو اور اس سے عوام الناس کو حد سے زیادہ مشقت اور ضرر لاحق ہوتا ہو تو حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام مالکؒ کے قول کے مطابق وہ احتکار کے دائرہ میں آسکتا ہے۔

"وعن أبي يوسف أنه ممنوع فى كل ما أضر بالعامة وهو مذهب المالكيه" (فقه البيوع ۲/ ۸۹۹)۔

"وفى رد المحتار: وعن أبي يوسف كل ما اضر بالعامة حبسه فهو احتكار" (شامی ۹/ ۱۷۵)۔

۷- اسمگلنگ کا طریقہ غیر قانونی طریقہ ہے، اگر چہ شرعاً کسی بیرونی ملک سے مال خریدنا اور وہاں لے جا کر بیچنا مباح اور جائز ہے لیکن اس سے ملک کے احکام کی خلاف ورزی لازم آتی ہو اور بہت سے منکرات اور مفاسد مثلاً جھوٹ بولنا، جان مال اور عزت کو خطرے میں ڈالنا وغیرہ پائے جاتے ہیں۔اس لئے علماء نے اس کو منع کیا ہے۔اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ قولاً اور عملاً یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کے قوانین کی پابندی کریگا اس معاہدے کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ جب تک حکومت کا حکم معصیت پر مشتمل نہ ہو اس کی پابندی کی جائے۔اس لئے اس غیر قانونی طریقہ پر عمل کرنا بہتر معلوم نہیں ہوتا اس سے بچنا ہی اولی ہوگا (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۹)۔

۸- سونا اور چاندی یہ ثمن حقیقی ہے اور اللہ تعالی نے اس کو ثمن کا درجہ دیا ہے، پلاٹین کا شمار اگر چہ مہنگی دھاتوں میں ہوتا ہے اور اس کے بھی زیورات بنائے جاتے ہیں اور لوگ اس کو عرف میں سونے کی طرح سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود پلاٹین کو اصلی سونے کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے اور عقود اور زکوۃ وغیرہ میں سونے کے احکام اس پر منطبق نہیں ہوسکتے، البتہ اس پر عروض کا اطلاق ہوسکتا ہے۔



سونا چاندی کی تجارت شرعی تناظر میں

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی[1]

۱- الف: صورت مسؤلہ میں یہ بات جائز نہیں ہوگی کہ سونا چاندی اور روپے میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا ادھار۔ اس لئے کہ بیع صرف میں ادھار جائز نہیں ہے، بلکہ نقد ہونا فوراً ادا کرنا ضروری ہے۔

ب: صورت مسؤلہ میں ثمن میں تفاوت جائز ہے یعنی بائع اور مشتری کے مابین ثمن کے سلسلہ میں تفاوت جائز ہے۔

۲- الف: سونے کے لین دین میں مقدار کا جو یہ فرق ہو رہا ہے، اسے اجارہ ہی تصور کیا جائے گا، لیکن سونے میں دیگر دھاتوں کی آمیزش کی مقدار کا متعین ہونا بھی لازم ہے تاکہ تراشیدہ سونے کی متعین مقدار بطور اجرت طے سمجھی جائے اور جہالت باقی نہ رہے، معاملہ واضح ہونا ضروری ہے۔

ب: کہ زیورات کے بنانے میں جو ذرات بچ جائیں، اسی اجرت قرار دینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ مقدار بھی متعین ہو، جہالت نہ ہو۔

۳- مذکورہ صورت میں جو تفاوت اور تفاضل ہے جائز نہیں ہے، نیز نئے اور پرانے سونے میں بھی برابری اور فوری طور پر لین دین میں ادائیگی ضروری ہے، عام طور پر معاملات میں نئے اور پرانے سونے میں لین دین میں فرق ضرور کیا جاتا ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔

۴- الف: خریداری کے وقت جو رسید دی جاتی ہے، اس کو قبضہ شمار کیا جائے گا۔

ب: صورت مسؤلہ میں ہر خریدار کے لئے اس کی خریدی ہوئی مقدار کا سکہ الگ سے موجود ہو اور اس کو کمپیوٹر یا ریکارڈ رجسٹر میں اس کے نام سے درج کر دیا گیا ہو تو اس اندراج کو قبضہ کے لئے کافی تصور کیا جائے گا۔

۵- صورت مسؤلہ میں جو معاملہ مذکور ہے وہ بیع صرف کے خلاف ہے لہٰذا اس صورت میں ادھار کا معاملہ درست نہیں ہے، یعنی اس بیع میں سونے پر قبضہ بھی نہیں ہے، لین دین میں فوری طور پر ادائیگی بھی نظر نہیں آتی، لہٰذا یہ بیع صرف کے خلاف معاملہ ہے جو جائز نہیں ہے۔

۶- اشیاء ضروریہ کی ذخیرہ اندوزی جائز نہیں ہے لیکن سونے کی ذخیرہ اندوزی کے سلسلہ میں اہل علم کے مابین اختلاف کے باوجود مناسب قول جواز کا ہے، اس لئے کہ یہ احتکار کے باب میں داخل نہیں ہے جیسا کہ فتاوی اللجنۃ الدائمۃ میں بھی یہ فتوی ہے:

"يجوز شراء الذهب بعملة اخرى غير الذهب يدا بيد وادخاره وبيعه بعد باقل او اكثر من سعره الماضي ولا يعتبر ذلك كنزا منهيا عنه" (فتاوى اللجنة الدائمة ۱۳/ ۴۸۳)۔

۷- صورت مسؤلہ میں مذکورہ طریقہ یعنی خلاف قانون (اسمگلنگ کے راستہ سے لین دین) سونے کا لین دین جائز نہیں ہوگا، بلکہ ہر شہری کو چاہیے کہ وہ ملک کے قوانین کا پاس ولحاظ رکھے، غیر قانونی حرکات وسکنات سے اجتناب کرے۔

۸- پلاٹین حقیقی سونے کے حکم میں نہیں ہے، عام طور پر لوگ زیب وزینت یا زیبائش کے طور پر خریدتے ہیں اور اسے محفوظ کرتے ہیں، اور اس پر سونے کے احکامات (عقود، نیز زکوۃ وغیرہ میں) جاری نہیں ہوں گے بلکہ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی مال تجارت کے طور پر خریدے یا بیچے تو اس پر مال تجارت کے احکام مرتب ہوں گے، زکوۃ بھی واجب ہوگی۔

☆☆☆

[1] استاذ ومفتی جامعہ دار السلام عمر آباد۔

سونے چاندی کی تجارت سے متعلق مسائل

مفتی ظہیر احمد کانپور

۱- الف:۔ روپیہ ثمن اصطلاحی ہے اور سونا ثمن خلقی ہے دونوں الگ الگ جنس کے درجہ میں ہیں، اس لئے روپئے سے سونے کی خرید وفروخت کو بیع صرف نہیں کہا جائے گا، لہذا ایک کو نقد یا ادھار خریدا جاسکتا ہے (دیکھئے: فتاوی محمودیہ ۲۴/۲۶۱)۔

ب:۔ سونے یا چاندی کا جو نرخ حکومت نے یا سونے کی مارکیٹ وغیرہ مثلاً کو میکس گولڈ مارکیٹ یا MC وغیرہ نے طے کیا ہو اس سے کم زیادہ میں بیچنے میں بھی کوئی ربوا الفضل لازم نہیں آئے گا، اسی وجہ سے مختلف جگہوں پر مختلف ریٹ ہوتے ہیں، اسی ضابطے سے ثمن اصطلاحی کا تبادلہ ثمن خلقی سے ہورہا ہے، حتی کہ ایک ثمن اصطلاحی کا تبادلہ تفضلا دوسرے ثمن اصطلاحی سے بھی جائز ہے، جیسے روپئے کہ بیع ڈالر سے یا ریال و درہم وغیرہ (دیکھئے فتاوی محمودیہ ۲۴/۲۶۶، ۲۶۸۸)۔

۲- الف: دونوں شکلوں میں شرعا اس طرح کا معاملہ درست نہیں۔

اگر بیع بھی تصور کیا جائے تو پھر سونے کی بیع سونے سے تفضلا ناجائز ہے اگر اسمیں کوئی دوسری دھات ملائی بھی جائے گی تو وہ نصف سے کم ہی ہوگی اور وہ شرعا سونے ہی کے حکم میں ہوگی، تو دونوں طرف سونا ہوگیا اور کمی زیادتی کے ساتھ ہوگا جو جائز نہ ہوگا۔

البتہ اگر پہلے سونے کو کاریگر الگ سے خریدے اور پھر زیور بنا کر دوبارہ اتنی قیمت پر فروخت کردے تو یہ جواز کی شکل ہو جائے گی، ڈائریکٹ اس طرح کا معاملہ کرنا درست نہ ہوگا۔

ب- اجازہ کی شکل میں محمول کرنا بھی درست نہیں، قفیز طحان اور مقدار متعین نہ ہونے کی صورت میں جہالت کی وجہ سے اجرت مجہول ہوگی۔

۳- اگر نئے اور پرانے زیورات کی قیمت مستقل روپئے میں متعین کردی جائے اور پھر نئے پرانے زیورات کو خریدا، بیچا جائے تو اس کی شرعا اجازت ہوگی چونکہ پھر یہ بیع سونے کی روپئے کے ساتھ ہوگی، سونے کی بیع سونے کے ساتھ نہ ہوگی، جو ناجائز ہے، لیکن ڈائریکٹ پرانے سونے کو نئے سونے کے ساتھ کمی زیادتی کے ساتھ بیچنا جائز نہ ہوگا۔

جیسا کہ حدیث میں خراب اور اچھی کھجوروں کے تفاضلا تبادلہ سے منع فرمایا گیا لیکن خراب کھجوروں کو بیچ کر پھر اچھی کھجوروں کو خریدا جائے تو درست ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے طریقہ بتایا۔

۴- اس مسئلہ کا تعلق قبضہ سے متعلق بحث سے بظاہر بیع قبل القبض معلوم ہوتی ہے حنفیہ کے یہاں اشیاء منقولہ میں بیع قبل القبض درست نہیں، لیکن اگر قبضہ کا حکم عرف وعادت کے مطابق تسلیم کرلیا جائے اور محض کسی چیز کے نقصان وغیرہ کے ہونے پر وہ اپنے کو ضامن تسلیم کرلے یعنی کوئی شخص اگر کسی چیز کو اپنے قبضہ میں تسلیم کرکے اس کے Risk کا ذمہ دار ہوجائے تو یہی اس کا قبضہ ہے، تو پھر ایسی صورت میں ''الف'' اور ''ب'' دونوں شکلوں کے جواز میں کوئی شبہ نہ ہوگا، آج کل اسی طرح لوگ انٹرنیٹ پر سودے کرتے ہیں اور اس میں کوئی نزاع نہیں ہوتا ہے تو اس کو قبضہ مانا جانا چاہئے۔

۵- اس کا حکم بھی جواز کا ہوگا، بشرطیکہ اس میں کوئی شکل مفضی الی النزاع نہ بنے سارے قاعدے اور ضابطے بالکل واضح ہوں۔

۶- سونے کی ذخیرہ اندوزی بظاہر احتکار کے دائرہ میں نہیں آتی لیکن اس کا بیجا اثر اگر کھانے پینے کی ضروری اشیاء پر بھی پڑنے لگے تو پھر یہ احتکار کے حکم میں ہوگا۔

۷- اسمگلنگ سونے کی قانونا منع ہے، قانون میں تغیر ہوتا رہتا ہے آج منع ہے کل اجازت ہوجائے، اس کا امکان ہے، لیکن شریعت کا حکم دائمی ہے، یہ جائز ہے، بشرطیکہ اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کا خیال رکھا کرے ورنہ مال کی خاطر اپنی عزت وآبرو کو خطرہ میں ڈالنا کوئی دانشمندی نہیں، حفظ مال پر حفظ العزۃ کا مقام مقدم ہے، شرعا بھی اور عقلا بھی۔

۸- پلاٹین کو حقیقی سونے کا درجہ شرعا نہیں دیا جاسکتا ہے، اور نہ اس پر سونے کے احکام کا انطباق ہوگا، اگر اس کی قیمت چاندی کے نصاب کے بقدر ہوجائے گی تو وہ صاحب نصاب مانا جائے گا، اور سال گذرنے پر زکوۃ ادا کرنا لازم ہوجائے گا۔

☆☆☆

چوتھا باب اختتامی امور

سونے چاندی سے متعلق کاروبار کے مسائل

مولانا عتیق احمد بستوی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ میں دو باتیں مناقشے سے پہلے عرض کرنا چاہتا ہوں، کئی سوالات اس میں اٹھائے گئے ہیں اور سارے سوالات اہم ہیں، اس وقت جو کاروبار چل رہا ہے، سونے چاندی کا ان مروجہ کاروبار کے تعلق سے سوالات ہیں اور کچھ اصولی سوالات ہیں کہ کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت اصلاً کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ کرنسی نوٹ کو مکمل طور پر سونے یا چاندی کا قائم مقام قرار دینا یہ بھی ایک نقطہ نظر ہے اور کئی عرب علماء اور بعض اکیڈمیوں نے اس کا فیصلہ کیا ہے اور برصغیر کے علماء اور اصحاب افتاء کی اکثریت اب تک اسی کی قائل ہے کہ اسے مکمل طور پر سونے چاندی کا حکم نہیں دیا جائے گا، یعنی صرف کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے، یہ بڑا اہم موضوع ہے، اسی ضمن میں یہ مسئلہ بھی آتا ہے کہ یہ جو بار بار ہم تذکرہ میں لاتے ہیں اور کتابوں کے اندر بھی ہے کہ سونا اور چاندی یہ ثمن خلقی ہیں، تو کیا اس کے بارے میں کوئی نص موجود ہے، اگر مسئلہ منصوص ہے تو اس کا انکار نہیں ہوسکتا، انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور اگر مسئلہ منصوص نہیں ہے تو دو رائے ہوسکتی ہے، اور احکام پر غور کیا جاسکتا ہے، یہ نکتہ ان دونوں کا ثمن خلقی ہونا، نہ ہونا اس بارے میں نصوص میں کوئی چیز ہو صراحۃً ہو یا اشارتاً ہو، اس کو ہمیں ضرور دیکھنا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علت ربوا کے تعلق سے جو ہم گفتگو کرتے ہیں کتب فقہ میں جو ہم طلباء کو پڑھاتے ہیں تو حنفیہ کے یہاں علت ربوا کیل مع الجنس یا وزن مع الجنس یا دونوں کو جمع کر کے قدر مع الجنس ہم ذکر کرتے ہیں، فقہاء نے اس کو لکھا ہے، ثمن کے علت ربوا ہونے کی بات امام محمدؒ کے قول سے...... کے بارے میں مسئلہ آتا ہے، لیکن آج جو صورت حال ہے، علماء جس طرح مسئلہ پر غور کر رہے ہیں تو پوری دنیا میں تقریباً گویا ثمنیت کو ایک علت ربوا قرار دیا جا رہا ہے، امام شافعیؒ کے یہاں علت ربوا ثمنیت اور طعمیت ہے، ثمن کو ثمنیت کی علت ربوا قرار دیتے ہیں، تو لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ شاید ان کے یہاں بھی وہ علت ناقصہ ہے، غیر متعدیہ ہے، اس میں تعدی نہیں ہوگی، پھر آج جو صورت حال ہے، علماء جس انداز سے گفتگو کر رہے ہیں، اور مباحث فقہیہ، نیز ادارے، اکیڈمیاں سب نے گویا کرنسی کو (جو آج کاغذ کے نوٹ ہیں یا جیسے بھی نوٹ ہوں) ان کو ہم جنسی کی صورت میں تفاضل و کمی بیشی کو ربوا قرار دے رہے ہیں، اس کی ضرورت ہے کہ ہم جب فقہ پڑھائیں اپنے طلبہ کو تو نئے رجحانات، نئی چیزیں بھی طلبہ کے سامنے رکھیں، تاکہ ہمارے طلبہ بصیرت کے ساتھ ان معاملات میں تیار ہوں، تو یہ موضوع اور یہ نکتہ بہت اہم ہے۔

ایک سوال زیور سازی کے بارے میں ہے کہ سونے چاندی کے زیورات کے لئے سونا و چاندی کاریگر کے حوالے ہوجاتا ہے، اور وہ اس سے سونے و چاندی کا زیور بنا کر لاتا ہے، الگ سے کوئی اس کی اجرت طے نہیں ہوتی ہے، جو ذرات زیور سازی میں نکلتے ہوں گے اسی کو گویا اس کی اجرت مان لیا جاتا ہے، اس کو اجارہ کہیں کہ بیع کہیں، جو معاملہ چل رہا ہے وہ یہ ہے معاملہ کی صورت درست ہے یا نہیں، آپ کو طے کرنا ہے کہ جو صورت حال چل رہی ہے اور جو مروج ہے ابھی کہ الگ سے کوئی اجرت نہیں سونا اسی مقدار میں دیا گیا، لیا گیا، آپ نے سونا آدھا کلو، ایک کلو، دس کلو حوالے کیا، اور بنے ہوئے زیورات سنار سے لیا یا کاریگر سے، یہ سمجھا گیا کہ جو اس میں ذرات نکلے تو وہی ذرات اس کی اجرت ہے، محنتانہ ہے، معاملہ کی یہ صورت درست ہے کہ نہیں، اگر درست نہیں ہے، گنجائش نہیں ہے تو کیا شکل ہوسکتی ہے؟ ایسی کیا تبدیلی ہوسکتی ہے جس سے یہ معاملہ شرعاً درست ہوجائے، یہ ایک اہم سوال ہے اس کے بارے میں بھی ان شاء اللہ آپ فیصلہ کریں گے۔

پرانے زیورات کے بدلے میں نئے زیورات خریدنا یہ مسئلہ بھی آپ کے ان مسائل میں سے ہے جو زیر بحث ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا حل بھی آسان اور اس کا راستہ بتانا بھی آسان ہے، پرانے زیورات کو آپ بیچ کر نئے زیورات خرید لیجئے، سیدھا مسئلہ ہے، ڈائیریکٹ جب خریداری ہوگی تو

وہاں شرعی محظور لازم آئے گا، ممانعت کی بات پائی جائے گی، تو سارے مسائل جو زیر گفتگو ہیں ان میں کئی مسائل تجارت کے ہیں......وغیرہ کے ہیں آپ حضرات مسئلے کے ان پہلوؤں کو جواب تک سامنے نہیں آسکے ہیں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے، ایک بات میں ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو عرض پیش کیا گیا ہے یا تلخیص مقالات جو آپ کے پاس پہنچی ہے اگر اس میں کسی کی رائے غلط نقل ہوگئی ہو تو با قاعدہ اس کو لکھ کر دے دیں اس لئے کہ عرض اور یہ تلخیص مقالات مجلہ میں کتابی صورت میں شائع ہوتی ہے، اس میں بھی اس طرح کی کچھ غلطیاں ہیں، اس کی تصحیح بہت ضروری ہے آپ با قاعدہ لکھ کر کے کاغذ پر دیجئے کہ عرض میں یا تلخیص میں یہ خامی ہے، اس کی تصحیح کردی جائے، اشاعت سے پہلے پہلے۔ میں سب سے پہلے مولانا اختر امام عادل صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مناقشے کا آغاز کریں۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی صاحب:

مجھے صرف دو باتیں عرض کرنی ہے، ایک عرض کے تعلق سے اور ایک مسئلہ کے تعلق سے، عرض کے تعلق سے یہ کہنا ہے کہ تلخیص اور عرض میں تعارض ہے، سوال نمبر ۲ میں زیور بنانے کی صورت میں جو ذرات بچ جاتے ہیں وہ اس کو اجرت کہیں گے یا بیع؟ اس سلسلہ میں تلخیص میں تین رجحانات نقل کئے گئے ہیں اور عارض نے سوال ۲ میں ۹ رجحانات نقل کئے ہیں، بلکہ دس کہا جائے، دسواں رجحان یہ ہے کہ کوئی رجحان نہیں ہے، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ چوتھا رجحان بھی میرا ہے، اور ساتواں رجحان بھی میرا، عرض کے سلسلہ میں یہی بات مجھے کہنی تھی، دوسری بات ہے مسئلہ کے تعلق سے سوال نمبر ۱۱ اس زمانے کا بہت اہم ترین مسئلہ ہے، اس لئے کہ جب کرنسی نوٹوں کا رواج شروع ہوا تو یہ دنیا کے اور علماء کے سامنے ایک نیا مسئلہ تھا، مگر چونکہ اس کو وثیقہ اور دستاویز کی حیثیت دی گئی تھی اس لئے علماء کو آسان یہ معلوم ہوا کہ اس کو اثمان تابعہ سمجھ کر فلوس پر قیاس کرلیں، چونکہ فلوس بھی اثمان تابعہ ہیں اور کرنسی بھی اثمان تابعہ ہیں، لیکن ادھر بیس پچیس سالوں سے جو معاشی دنیا میں تبدیلیاں اور انقلابات آئے ہیں اور ان کی بنیادوں پر تقریباً تمام ہی ماہرین معاشیات کا بشمول مفتی تقی عثمانی صاحب کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ یہ اثمان مستقلہ ہیں، اثمان تابعہ نہیں ہیں اسی لئے ہمارے وہ قدیم فتاوی جو پہلی کتابوں میں لکھے جاتے تھے اس میں بہت سارے تبدیل ہو چکے ہیں، اس میں ایک فتوی جس میں یہ ہے کہ اگر فلوس پر یہ قیاس کیا جانا صحیح ہو تو فلوس کے بارے میں فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ ایک فلس کی بیع دو کے بدلے تفاضل کے ساتھ جائز ہے چونکہ وہ عددی ہیں اور عددی چیزیں اموال ربویہ میں داخل نہیں ہیں اس لئے ان میں تفاضل جائز ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اگر دس روپئے کو چینج کرایا جائے یعنی باہم کرنسیوں میں آپس میں تبادلہ ہو، ایکسچینج کیا جائے تو اس میں بھی کمی بیشی جائز ہونا چاہئے چونکہ فلوس پر ہم نے قیاس کیا ہے، لیکن تقریباً ہماری فقہ اکیڈمی نے بھی اس سے پہلے یہی فیصلہ کیا ہے اور دوسری جگہوں پر بھی فیصلہ ہو چکا ہے، کہ آپس میں تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے، ایک ملک کی کرنسیوں کا تبادلہ باہم تفاضل کے ساتھ جائز نہیں ہے، البتہ غیر ملکی کرنسی سے تبادلہ جائز ہے اس لئے کہ اختلاف جنس پایا جاتا ہے، تو وہاں پر ہم نے اس کو بیع صرف مان کر کے تفاضل کو ناجائز قرار دیا ہے، دوسری طرف ہم نے وہی پرانی چیز باقی رکھی ہے جب سونے چاندی کو خریدنے کے لئے ہم جاتے ہیں تو ہم اس کو فلوس مان کر کے اس کو ہم عددی چیز مان لیتے ہیں اور شیخین کا جو مشہور مسلک ہے اس کے مطابق فتوی دے دیتے ہیں کہ تفاضل جائز ہے، اور ادھار جائز ہے چونکہ یہ اموال ربویہ میں داخل نہیں ہے لیکن حضرت امام محمدؒ کے قول کو اگر سامنے رکھا جائے اور اس کے مطابق جس طرح ہم نے دوسری جگہوں پر تبدیلیاں کی ہیں اگر اس مسئلہ پر بھی ہم غور کریں تو میرے خیال سے یہ مناسب ہوگا۔

مولانا ابوالمکارم صاحب:

ابھی مولانا عتیق احمد صاحب نے پہلا نکتہ اٹھایا تھا کہ سونے یا چاندی اثمان خلقی ہیں یا نہیں؟ اس پر دلیل ہے کہ نہیں؟ اس پر یہ دلیل سمجھ میں آتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو چیزیں بحیثیت اثمان رائج تھیں، وہ ہمیشہ اثمان ہی شمار ہوں گی، اس لئے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج عرف پر حضرات فقہاء نے نص کا حکم لگایا ہے، لہذا بعض حضرات کا یہ کہنا کہ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، اس نکتہ پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

یہ مسئلہ ابھی جو آپ فرمارہے ہیں یہ دلیل نہیں ہے یعنی سونے اور چاندی کے خلقی ثمن ہونے کے تعلق سے کوئی اور واضح چیز ہوتا بتائیں، یہ تو آپ استنباط کررہے ہیں کہ ایسا لگتا ہے۔

مولانا عبدالرشید صاحب کانپور:

بات ثمن کی نہیں، کیلی اور وزنی کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو کیلی رہی وہ قیامت تک کیلی رہے گی جو وزنی رہی وہ وزنی رہے گی، مجھے اس وقت یہ کہنا ہے کہ جو عارض نے پلاٹینم یا ہیرے وجواہرات میں زکاۃ نہ ہونے کی بات کو راجح قرار دیا ہے کہ قدیم فقہاء نے اس کو نہیں شمار کیا، وہی رائے راجح ہونا چاہئے، اصل میں دقت تھوڑی سی یہ ہے کہ پہلے ان کی قیمت متعین نہیں تھی بلکہ اعتباری قیمت تھی، کوئی قیمتی ہیرا، جو ہر کوئی بھی چیز ہو تو ہوسکتا ہے کہ ایک کی نظر میں بہت قیمتی ہو، اور دوسرے کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہ ہو، ایک بادشاہ اس کو مہنگی ریٹ پر خرید لے اور دوسرے کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہ ہو، تو اس اعتبار سے آدمی جو ہیرے وجواہرات کو رکھتا ہے اس کے لئے رسک بھی تھا اور رسک یہ تھا کہ ہوسکتا ہے آج وہ ہیرے وجواہرات کو رکھے ہوئے ہے کل کو وہ مٹی کی ریٹ میں ہوجائے، لہذا ذخیرہ اندوزی بھی نہیں تھا اور فقہاء نے اس کو اموال ربویہ میں شامل نہیں کیا، آج کل جو صورت حال ہے وہ یہ کہ جو پلاٹینم ہوں یا اس طرح کی دھاتیں ہوں ان کا باقاعدہ ایک ریٹ ہوتا ہے اور جن دکانوں میں یہ چیزیں ملتی ہیں وہ رسید بنا کر دے دیتے ہیں، کہ جب آپ چاہیں اس کو ہمیں اسی ریٹ پر واپس دے سکتے ہیں یا اتنی مدت کے بعد اتنے پرسینٹ آپ کو نفع دیں گے، تو اب اگر اس میں زکوۃ واجب قرار نہ دی جائے تو کروڑوں روپے کے لوگ ہیرے جواہرات زکوۃ سے بچنے کے لئے خرید لیں گے، اور پھر جب ان کو مال بنانا ہوگا تو پھر اسی سنار کے یہاں جاکر مہنگے ریٹ میں بیچ دیں گے تو ایک امت کو زکوۃ سے بچانے کا، زکوۃ سے بچنے کا بہت بڑا حیلہ مل جائے گا، کہ وہ لمبی رقموں سے اس طرح کی دھات کو خرید کر کے اپنی رقم کو بھی سیو کرلیں گے اور زکوۃ سے بھی بچ جائیں گے، لہذا آج کے دور میں اس پر اس معنی کر زکوۃ ہونا چاہئے کہ یہ اب باقاعدہ مال بن چکا ہے اور بین الاقوامی سطح پر باقاعدہ اس کا قانون بن چکا ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہیرے جواہرات کے تعلق سے اکیڈمی میں پہلے بھی گفتگو ہوئی تھی اور اس میں دو رائے سامنے آئی تھی، اس میں ناموں کے ساتھ دونوں کا اظہار بھی کیا گیا تھا، لیکن بہر حال آپ اس پر غور کیجئے، حالانکہ یہ پہلو ہے مسئلہ کا جو حضرات بھی اس پر زکوۃ لازم ہونے کی بات فرماتے ہیں حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کا رجحان بھی یہی تھا، وہاں لوگوں کا اختلاف لکھا ہوا ہے، تو یہ ایک پوائنٹ غور کرنے کا ہے جو مولانا نے پیش کیا ہے، اب مفتی سعید الرحمن صاحب ممبئی پلاٹینم کے بارے میں کچھ فرمانا چاہتے ہیں۔

مفتی سعید الرحمن فاروقی صاحب:

اصل میں پلاٹینم کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ واقعی لوگ اس میں بڑی رقمیں روک سکتے ہیں اس لئے قاضی صاحب کی رائے بہت زیادہ مفید اور اچھی معلوم ہوتی ہے، ایسے ہی رقمیں لوگ زمینوں میں روک رہے ہیں، تجارت کی نیت سے نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ خرید لیتے ہیں زمین کو تاکہ زکوۃ نہ دینی پڑے اور ہمارے پیسے محفوظ ہوجائیں تو اس میں اور دونوں میں بڑا مسئلہ پیدا ہوگا اس لئے غور یہ کرنا چاہئے کہ یہ رقمیں یہاں پھنس جائیں اور لوگوں کو زکوۃ نہ ملے اس سے امت کو بھی نقصان ہوگا اور لوگوں کو حیلے جواز ملے گا، قاضی صاحب کی رائے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

مولانا سلطان صاحب نے یہ تحریر بھیجی ہے کہ زیر بحث مسئلہ پر اگر فقہ اکیڈمی کی طرف سے مختصر اور آسان انداز میں کوئی پمفلٹ منظر عام پر آجائے اور منظم انداز میں اسے تاجروں میں تقسیم کیا جائے تو مجھے امید ہے کہ فائدہ ہوگا، جو تجاویز آپ طے کریں گے جو فیصلے کریں گے اس کو کچھ مزید تمہید کے ساتھ کچھ اور چیزوں کے ساتھ شائع کیا جاسکتا ہے، یہ مناسب بات ہے۔

مولانا اشاعتی صاحب موجود نہیں ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ "ٹائٹینم" یہ بھی ایک طرح کی دھات ہے اس کا کیا حکم ہوگا اس لئے کہ عرض مسئلہ میں صرف پلاٹینم کا تذکرہ ہوا ہے، ٹائٹینم کا ذکر نہیں ہوا ہے، تو جو کمیٹی بنے گی اس پر غور کرے گی کہ اس میں کیا ہوسکتا ہے۔

مولانا جنید عالم ندوی قاسمی صاحب:

سوال نمبر ۲ میں دو سوال ہے: پہلا یہ کہ کاریگر حضرات جو زیورات بنا کر کے دیتے ہیں یہ بیع ہے یا اجارہ؟ اس سلسلہ میں جب بیع اور اجارہ کی

تعریف پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیع نہیں ہے اجارہ ہے، اس لئے کہ بیع کی تعریف ہے: ''مبادلۃ المال بالمال بالتراضي''، اور اجارہ کی تعریف یہ ہے: ''ہی تملیک المنافع بعوض''، یہاں پر کاریگر حضرات جو واپس کرتے ہیں تو وہ مال کے بدلے میں مال نہیں دیتے ہیں بلکہ زیورات بناتے ہیں، اور زیورات بنانے کی اجرت ان کو ملتی ہے، گرچہ اسی سے ملے الگ سے نہ ملے، تو یہ اجارہ ہے، یہ ''تملیک المنافع بعوض'' ہے، ''مبادلۃ المال بالمال بالتراضي'' نہیں ہے، جہاں تک یہ مسئلہ آیا کہ یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ یہ صورت جائز ہے، یہ بات آئی ہے کہ اجرت بھی مجہول ہے اور مدت بھی مجہول ہے اور عامل کی اجرت اس کے عمل سے قرار پاتی ہے، جیسے قفیز طحان میں ہے، تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ وہ مدت اور وہ اجرت مجہولہ وہ مفسد اجارہ ہے جو مفضی إلی النزاع ہو، یہاں پر چونکہ یہ صورت رائج ہے عام ہے، اور عرف عام ہے، بہت سارے مسائل ایسے ہیں کہ جن میں عرف عام کی وجہ سے اجرت اور مدت مجہول ہونے کے باوجود اس کو جائز قرار دیا گیا ہے اور جہاں تک یہ بات کہ عامل کی اجرت اس کے عمل سے قرار پاتی ہے تو رات بھی میں نے یہ بات بتائی تھی کہ شرح عقود رسم المفتی میں بہت تفصیل سے یہ بات آئی ہے کہ عرف عام کی وجہ نص کا ترک جائز نہیں ہے لیکن نص کی تخصیص جائز ہے، اگر اس صورت میں عمل کرتے ہیں تو نص کی تخصیص ہے، نص کا ترک نہیں ہے، اس لئے یہ صورت جائز ہونی چاہئے۔

سوال نمبر ۴ میں دو سوال ہیں: ایک تو یہ ہے کہ آرڈر دینے والے کے حصے کے بقدر اس کا سونا، سونے کی اینٹ میں محفوظ کرلیا جاتا ہے اور الگ الگ سکہ نہیں بنایا جاتا، دوسری شکل یہ ہے کہ ہر ایک کا الگ الگ سکہ بنا دیا جاتا ہے، تو ان دونوں صورتوں میں قبضہ مانا جائے گا یا نہیں، اس سلسلہ میں قبضہ کی حقیقت پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ یا تو ایک حقیقی قبضہ ہو باقاعدہ جسے قبضہ کہتے ہیں یا حقیقی قبضہ نہ ہو لیکن ایسا تخلیہ ہو جس سے قبضہ ممکن ہو، یعنی جو حقیقی قبضے کے قائم مقام ہو، یعنی خریدار اور مبیع کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہو، بلکہ خریدار بغیر کسی مشقت، کلفت اور بغیر کسی حائل کے اور بغیر کسی تعاون اور مدد کے اس پر براہ راست قبضہ کر سکے، بہت ساری شکلیں اور بہت سارے جزئیات کتب فقہ میں موجود ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی نے مکان کو بیچا، مکان اگر قریب ہے اور اس نے کہہ دیا ہے کہ مکان میں نے خالی کر دیا ہے آپ قبضہ کر لیجئے تو اس کو قبضہ کے قائم مقام قرار دیا جائے گا لیکن اگر مکان بعید ہے دور ہے تو ایسی صورت میں اس کو قبضہ کے قائم مقام قرار نہیں دیا جائے گا، اور قریب اور بعید کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ اگر اتنا قریب ہو کہ قبضہ آسانی سے کر سکے تو قریب ہے اور اگر آسانی سے قبضہ نہ کر سکے تو یہ بعید ہے، کپڑے کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ اگر اتنا قریب ہے کہ ہاتھ اس کا وہاں تک پہنچ سکے، تو قریب ہے اور اگر ہاتھ نہیں پہنچ سکے تو بعید ہے اور بھی بہت سارے جزئیات ہیں، مذکورہ صورت میں چاہے اینٹ کی شکل میں اس کا حصہ ہو یا الگ الگ سکہ بنا دیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں بغیر کسی کلفت و مشقت کے، بغیر کسی حائل کے بغیر کسی ممانعت کے، جب چاہے وہ اس کو تصرف میں لائے، استعمال میں لائے یہ ممکن نہیں ہے، اس لئے میری نزدیک دونوں صورتوں میں قبضہ کا تصور نہیں کیا جائے گا، جزاک اللہ۔

مولانا محمد عثمان بستوی صاحب:

رائج کرنسی کے بارے میں مولانا اختر امام عادل صاحب کی طرف سے جو باتیں اٹھائی جارہی ہیں کہ رائج کرنسی اثمان مستقلہ کے درجہ میں ہے، لہٰذا ان پر بیع صرف کے تمام احکام اسی طرح سے جاری ہوں گے جس طرح سے سونے چاندی پر جاری ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ بیع صرف سے متعلق جو احکام جاری ہوتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک ربوا فضل دوسرا ربوا نسا، ربوا فضل میں جو علت ہے وہ ربوا حقیقیہ کا تحقق ہے اس لئے وہ حرام ہے، اور وہ جنس بالجنس کی صورت میں ہوتی ہے اور ربوا نساء کی صورت میں یعنی جب جنس مختلف ہو اور اثمان جو ہیں کہ قبیل سے ہو تو وہاں جو حرمت کی علت ہے وہ شبہ ربوا ہے، ربوا حقیقیہ نہیں ہے، تمام فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے، اور ایک بات دوسرے فقہاء کی یہ مسلم شدہ ہے کہ شبہ کا تو اعتبار ہے شبہ الشبہ کا نہیں، اب اگر رائج کرنسیوں کو ثمن تسلیم کیا جائے تو بہر حال یہ جو ثمن تسلیم کیا جائے گا حقیقی نہیں ہوگا بلکہ یہ ایک تسلیمی ہوگا جس میں شبہ ضرور قائم رہے گا اور اس شبہ کی وجہ سے جو ربوا کا تحقق ہوگا وہ شبہۃ الشبہ ہوگا شبہ نہیں ہوسکتا، اس لئے اس سے مسئلہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اس کو چاہے ثمن مستقلہ مانیں غیر مستقلہ مانیں، بہر حال فقہاء نے صاف صاف اس کی صراحت کی ہے کہ جو سونے چاندی کے علاوہ سکے رائج ہوتے تھے وہ دھاتوں کے ہوتے تھے، سونے چاندی کی طرح سے دھات ہوتے تھے، مستقل ان کا رواج ہوتا تھا، اس طرح اس کی نظیر بھی موجود ہے، جس پر فقہاء نے کبھی بھی اثمان خلقیہ کا حکم نافذ نہیں کیا تو بلا وجہ زبردستی احکام میں تنگی پیدا کرنا، معاملات میں تنگی پیدا کرنا یہ کوئی عقل مندی کی بات معلوم نہیں ہوتی ہے، ''الدین یسر'' معاملات میں آسانی پیدا کرنا یہ شریعت کا حکم ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

بہرحال مولانا عثمان صاحب کی رائے ہے بڑی قوت کے ساتھ بیان کر رہے ہیں، اور مولانا اختر امام عادل صاحب کا جو موقف ہے اس میں بھی وہ قوی ہیں ماشاء اللہ، لیکن یہاں کوئی جواب الجواب نہیں ہونا ہے، انشاء اللہ کمیٹی میں آپ دونوں حضرات کو رکھ دیا جائے گا، پھر توازن پیدا ہو جائے گا، ایک صاحب نے ایک پرچی بھیجی ہے کہ ابھی آپ نے فرمایا کہ سونا اور چاندی کے ثمن خلقی ہونے کی کوئی دلیل نصوص میں موجود ہے اگر ہے تو کوئی کلام نہیں، مولانا عمران ندوی ہیں، تو انہوں نے آیت لکھ کر بھیجی ہے جس کو انہوں نے دلیل سمجھا ہے، "وشروہ بثمن بخس دراھم معدودۃ" درہم سے مراد چاندی کے سکے ہیں، اس آیت کو انہوں نے بھیجا ہے گویا یہ دلیل اس طرح کی ہے، میں آپ حضرات سے عرض کردوں، ایک بات یاد دلادوں کہ جہاں پر ان اشیاء ستہ کے تعلق سے ہمارے فقہاء نے بحث کی ہے اور اس تعلق سے خود حنفیہ میں دو رائے پائی جاتی ہے کہ جن چیزوں کے کیل کا رواج تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہ قیامت تک کے لئے کیلی ہیں اگرچہ لوگ کیل کرنا ترک کردیں، طرفین کا مسلک یہی ہے، امام ابوحنیفہؒ وامام محمدؒ کا اور جن چیزوں کے وزن کا رواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا جس کا ذکر احادیث میں قرآن میں آتا ہے وہ قیامت تک کے لئے وزنی ہے، لیکن امام ابویوسفؒ کا مسلک اس سے مختلف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کا جو عرف تھا چلن تھا اس کے لحاظ سے اس کا ذکر فرمایا، چونکہ اس دور میں فلاں فلاں چیزوں کو کیل کر کے بیچنے کا لین دین کا رواج تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کیل کے حساب سے کی ہے اور جن چیزوں کا لین دین تول کر ہوتا تھا تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا ہے کہ ان کا معاملہ وزن سے ہوگا، لیکن اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کے برعکس ہوتا تو اسی کا لحاظ کرتے یعنی نص میں جو ذکر ہے اس کے کیلی اور وزنی ہونے کا اس کا مبنی بھی عرف ہے، امام ابویوسفؒ نے یہ بات ذکر فرمائی ہے اور علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں سہولت ہے کہ آج آپ گیہوں کا تبادلہ گیہوں سے کریں، اب آپ چاہیں کہ صاحب کیل کر کے اس کو ہم تبادلہ کریں تو مسئلہ آسان نہیں ہے، رواج ہے تولنے کا تول کر لین دین ہوتا ہے تو اس اعتبار سے برابری ہے تو ربوا نہیں ہوگا، تو بہرحال یہ ایک علمی بات ہے جو میں یاد دلا رہا ہوں، اس مسئلہ کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اس کا بھی ہم لحاظ کریں۔

مفتی ظہیر احمد کانپوری:

یہ میرا جو مسئلہ ہے سوال نمبر ۲ سے متعلق جو عارض صاحب ہیں، ابھی مولانا اختر امام عادل صاحب نے بھی کہا تھا اس میں دوسرا جو موقف ہے کہ بیع ہے اور عقد ناجائز ہے، اور اس کے بعد چوتھا موقف ہے، عقد صرف ہے ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے بلکہ وہ جو ناجائز ہے وہ عقد صرف ہی کی وجہ سے ناجائز ہے، کیا عقد صرف بیع نہیں ہے کیا؟ عقد صرف بھی بیع ہی ہے تو اس لئے یہ موقف میں اضافہ ہے اس وجہ سے بھی ہوا ہے، اسی طرح سے ہمارا، تلخیص جنہوں نے کی ہے اس میں بھی صفحہ ۱۱۹ پر اسی مسئلہ سے متعلق وہ لکھتے ہیں: تیسرا رجحان: مذکورہ معاملہ اجارہ ہے یا بیع اس سلسلہ میں سات مقالہ نگاروں کا رجحان واضح نہیں ہے آگے پھر یہ لکھتے ہیں کہ یہ حضرات یہ لکھتے ہیں کہ اگر اسے بیع کہا جائے تو یہ بیع صرف ہے اس لئے درست نہیں، اور اگر اجارہ کہا جائے تو چونکہ اجرت مجہول ہے اس لئے یہ صحیح نہیں، تو یہ واضح نہیں ہے، مجھے خود یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کو رجحان کیوں نہیں معلوم ہوا، یہ جو حضرات ہیں یہ دونوں کی نفی کر رہے ہیں کہ یہ دونوں ناجائز ہیں، اگر آپ اس کو اجارہ مانتے ہیں تب بھی ناجائز ہے اس کی وجوہات بھی لکھی ہے اگر اس کو آپ بیع مانتے ہیں تو عقد صرف ہی کی بنیاد پر یہ بیع، اس لئے یہ جو ہمارے تلخیص کرنے والے ہیں ان کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ان کا رجحان کیا ہے، وہ دونوں چیزوں میں اس کی نفی کر رہے ہیں۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس میں اگر کچھ خامیاں ہیں تو اس کو باقاعدہ آپ لوگ لکھ کر کے یہاں جمع کردیں تاکہ اس کی اشاعت کے وقت اس کی تصحیح کردی جائے، اور ایک بات میں آپ سے عرض کردوں کہ بسا اوقات ایسے مقالے بھی آتے ہیں کہ مقالہ نگار کی رائے کیا ہے وہ ظاہر نہیں ہوتی، چند عبارتیں نقل کردی بس جواب ہوگیا، خود اس کی کیا رائے ہے مسئلہ میں، اس کا اظہار نہیں ہوتا، اسی لئے درخواست کی جاتی ہے کہ ان کا خلاصہ اخیر میں لاحق کردیں، ایک صفحہ کا کہ ان مسائل میں آپ کی رائے کیا ہے، تفصیلات کے بعد، اس سے آسانی ہوگی تلخیص کرنے والوں کو بھی اور عرض کرنے والوں کو بھی۔

مولانا جنید بن محمد پالنپوری صاحب:

سوال نمبر ۸ میں یہ جملہ آیا ہے کہ آج کل پلاٹین کو سفید سونا کہا جاتا ہے۔ تو گویا پلاٹین اور سفید سونا ایک ہی بات بتلائی گئی ہے، جبکہ میں نے اس معاملہ میں سونا کے بہت بڑے کاروبار کرنے والے سے تحقیق کی تو انہوں نے بتایا کہ پلاٹین الگ چیز ہے اور وہائٹ گولڈ (سفید سونا) الگ چیز ہے دونوں ایک ہی چیز نہیں ہے کہ پلاٹین یہ دھات سے بنتا ہے اس میں سونے چاندی کی آمیزش بالکل نہیں ہوتی ہے لیکن وہائٹ گولڈ جو ہوتا ہے وہ سونا ہی ہوتا ہے Yellow Gold ہی ہوتا ہے، اب اس Yellow Gold کے اندر زنک ہے، نیکل ہے اور کوپر کو ملا کر بنایا جاتا ہے تو یہ سونا ہی ہوتا ہے گویا کہ سونے سے الگ نہیں ہے، اب ۲۲ کیرٹ کا اگر ہوتا ہے تو ۹۱ اعشاریہ چھ فیصد سونا اور ۸ اعشاریہ ۴ فیصد اس سے زیادہ ہوتی ہے، اسی طرح ۲۱ کیرٹ میں ۸۷ اعشاریہ ۵ فیصد سونا اور ۱۲ اعشاریہ ۵ فیصد دوسری دھات ہوتی ہے، الی آخری ..... میں اس طرح ہوتا ہے تو یہ وہائٹ گولڈ کو پلاٹین نہ سمجھا جائے بلکہ یہ سونا ہی ہے، تو سوال جو قائم کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز ہے اور لوگوں نے وہی حکم لگایا تو گویا کہ وہائٹ گولڈ پر وہی حکم ہوگیا، تو مزید تحقیق کر لی جائے اور سوال کی تصحیح کر لی جائے۔

مولانا جمیل احمد نذیری:

سوال نمبر ا سے متعلق جو بات میں کہنا چاہتا تھا اس کا آغاز تو ہو چکا ہے، مولانا عتیق صاحب نے اور مولانا اختر امام عادل صاحب نے بھی اس کے متعلق کچھ بات فرمائیں، تو کچھ اشکالات ہیں اور کچھ سوالات ہیں جو میں سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ ایک تو یہی ہے کہ یہ کرنسی جو موجودہ کرنسی ہے یہ ثمن عرفی ہے ثمن اصطلاحی ہے، ثمن خلقی نہیں ہے اور میرا ابھی موقف یہی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ثمن عرفی کے ذریعہ سونا یا چاندی خریدیں تو یہ بیع صرف نہیں ہے میں بھی اسی کا قائل ہوں تو اگر ہم سو روپے کو دوسو روپے سے خریدیں تو یہ ربوا کیسے ہے جبکہ احناف کے یہاں علت ربوا کا جو تحقق ہے وہ ہے نہیں، یعنی قدر مع الجنس، یعنی دونوں کیلی ہوں یا دونوں وزنی ہوں، جنس ایک ہو، تو یہ نہ کیلی ہے نہ وزنی ہے تو کیا جبکہ ہمارا فتوی بھی یہی ہے کہ میں بھی یہی بتاتا ہوں اور عام فتوی یہی ہے کہ کرنسی کو اگر کمی بیشی کے ساتھ بیچا جائے گا تو یہ ربوا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عملاً ہم ثمنیت کو تسلیم کر چکے ہیں، علت ربوا کے طور پر جو امام شافعیؒ نے علت ربوا کہا ہے یا جو امام محمدؒ کا قول ہے، گویا ہم ثمنیت کو بھی علت ربوا مان چکے ہیں، تو اگر ثمنیت کو مان چکے ہیں تو اس کی تصحیح ہونی چاہئے اور واضح طور پر یہ بات آجانی چاہئے کہ کرنسیوں میں جو تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ہوگا یہ ربوا ہے اور فلاں علت کی بنیاد پر ربوا ہے اس کی صاف اور صریح بات آجانی چاہئے، اور یہ جو بات کہی جاتی ہے کہ یہ جو موجودہ کرنسی ہے اب اثمان مستقلہ کی حیثیت حاصل کر چکی ہے یہ ثمن عرفی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ملک خود مختار ہونا چاہئے کہ وہ اپنی کرنسی کی جو چاہے مالیت مقرر کرے اور جو قیمت چاہے مقرر کرے، مستقل کرنسی ہے اس ملک کی، جیسے ہمارے ملک ہندوستان میں جو نوٹ چل رہا ہے مستقل کرنسی ہے، ہمارے ملک کو اختیار ہونا چاہئے کہ ہم اس کی جو مالیت چاہیں مقرر کریں ہر ملک کو اختیار ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مالیت جو چاہے مقرر کریں، لیکن آپ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس معاملہ میں ممالک خود مختار نہیں ہیں کہ وہ اپنی کرنسی کی جو چاہے مالیت مقرر کریں، بلکہ کچھ بین الاقوامی معاملات ہیں ان کے تحت کرنسی کی مالیت اور قیمت مقرر ہوتی ہے اور یہ جو مالیت متعین ہوتی ہے ہم اب اس کو تسلیم بھی کرتے ہیں، جیسے اگر کوئی دینار ہو ہم اگر اس ملک میں اس کا تبادلہ کریں اس ملک کی کرنسی سے تو ہم کو سولہ سترہ دینار اگر ہو تو جیسے کویتی دینار ہے تو دوسو پچیس وغیرہ دوسو تیس اس کے لگ بھگ نکلے گا اگر درہم ہے تو ہم کو سولہ سترہ روپے ملے گا، اور جناب گویا ہماری جو کرنسی ہے وہ کم مالیت کی ہے اور دوسرے ممالک کی کرنسیاں پونڈ ہیں اور دوسری چیزیں ہیں تو ڈالر وغیرہ ہے ہمارے ملک سے اس کی کرنسی اونچی مانی جاتی ہے تو اثمان مستقلہ کی اگر حیثیت ہوتی تو ہر ملک کو اختیار ہوتا جیسے چاہتا کرنسی کی مالیت مقرر کرتا، اس میں ضرور اس کے پیچھے معاملہ ہے اور اسی لئے کسی ملک کو اپنی کرنسی جیسے چاہے مقرر کرنے کا اختیار نہیں، اور جو مالیت چاہے اس کو مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہے اس کے پیچھے زرمبادلہ ہوتا ہے اور اب زرمبادلہ کی بات اخباروں میں آتی بھی رہتی ہے، ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، ابھی مدارس میں ہم لوگ اکٹھا ہوئے تھے جو جمعیۃ علماء ہند کے ادارہ المباحث الفقہیہ کا اجتماع ہوا تھا اس میں بھی اس موضوع پر گفتگو ہوئی اور یہ واضح طور پر بات سامنے آئی کہ اثمان مستقلہ ان کو نہیں کہا جاسکتا اور ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی چیز ضرور ہے، اقتصادی حالات ہوں اور پیٹرول کی طاقت ہو، سونا چاندی ہو، کوئی نہ کوئی چیز بہر حال ہے اس کو اثمان مستقلہ نہیں ہے تو سونے چاندی کی حیثیت نہیں ہے تو پھر اس میں علت ربوا کا تحقق کیسے ہوگا، اور اگر آپ اس کو صرف کہتے ہیں تو گویا سونا چاندی مان لیتے ہیں، سونا چاندی مان لیتے ہیں تو صرف کہنا چاہئے، اور اگر اس کو ثمن عرفی کہتے ہیں تو اس پر بیع صرف کا تحقق نہیں ہوگا، بہر حال یہ اشکالات ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

جزاک اللہ، بہر حال اتنا تو مان لیا آپ نے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر امام شافعیؒ کی جو علت ربوا ہے ثمنیت اسے ہم نے قبول کرلیا ہے (ہاں یہ قبول کئے ہوئے ہیں عملاً ہم نے قبول کرلیا) ثمنیت کو گویا علت ربوا ہم مان رہے ہیں، (ہاں مگر اس کا فیصلہ ہونا چاہئے، مولانا جمیل احمد نذیری)، تو گویا آپ اعلان چاہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے اس کو قبول کرلیا ہے (جی بالکل واضح طور پر ورنہ آپ کیسے کہیں گے کہ ربوا ہے۔ جمیل احمد نذیری)، جہاں تک معاملہ ہے کہ سونے چاندی کے سارے احکامات جاری کئے جائیں نہ کئے جائیں، بیع صرف قرار دیا جائے نہ قرار دیا جائے یہ بہت ہی دوررس مسئلہ ہے اور جو کرنسی نوٹ کی صورتحال ہے ابھی ہمارا ملک ایک ایسے دور سے گزرا جس میں آپ کو نئے تجربے ہوئے ان سے بھی آپ کو روشنی ملے گی ان کرنسی نوٹوں کی حیثیت کے بارے میں......تو مسئلہ میں عرض کررہا تھا کہ موجودہ حالات پیش آئے ہمارے ملک میں اس میں عجیب پیچیدگی میں آپ پڑے کہ کرنسی پانچ سو اور ہزار کے نوٹ کینسل کردیئے گئے جو کچھ لوگوں کے پاس پیسے رکھے ہوئے تھے تھوڑے زیادہ وہ سب کینسل ہوگئے، اس زمانے میں بڑے لوگوں نے سوالات کئے، استفتاء آئے، زبانی سوالات کئے کہ بھائی ان کرنسی نوٹوں کو سستا بیچ دینا، اس کا کیا حکم ہے کہ جائز ہے یا ناجائز، اور کئی سوالات پیدا ہوئے ان کرنسی نوٹوں کی جو حیثیت ہے سونے چاندی کی حیثیت تو بالکل نہیں ہے، ظاہر ہے اور سکنڈوں منٹوں میں اس کی حیثیت کیا سے کیا ہوجاتی ہے ہم دیکھ رہے ہیں، اس فرق کو تو ملحوظ رکھنا پڑے گا، اور باقی یہ خود موضوع جو آپ فرمارہے ہیں یہ خود مستقل موضوع ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر اکیڈمی ایک ورکشاپ ایسا کرے جس میں کچھ ماہرین اقتصادیات جوزر کے خاص طور سے ماہر ہوں اور کرنسی کیسے شائع ہوتی ہے اور اس کے پیچھے کیا چیزیں ہوتی ہیں، ان پر کوئی اس طرح کا پروگرام ہو تو یہ دلچسپ بھی ہوگا اور معلومات افزاء ہوگا اور اس سے بہت سے مسائل کو حل کرنے میں آسانی ہوگی۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

مفتی جمیل احمد صاحب سے خصوصاً اور آپ سب لوگوں سے عموماً اپنی معلومات کے لئے میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں کہ یہ جو ہمارے فقہاء نے جنس اور قدر کے اتحاد کو معیار مانا ہے کیا قدر سے کسی شئ کا کیلی اور وزنی ہونا مراد ہے یا کوئی بھی ایسا پیمانہ جو کسی تفاوت کے بغیر اس شئ کی مقدار کو بتا دے وہ سب قدر میں شامل ہیں جیسے عددی متقارب ہیں ان کو آپ نے مثلی اشیاء میں مانا، چونکہ اس میں مقدار کے اعتبار سے اتنی قربت ہوتی ہے تقارب ہوتا ہے کہ وہ اختلاف کا موجب نہیں بنتا ہے تو یہ جو نوٹ ہیں یا سکے ہیں تو کیا اس پہلو سے کہ یہ ایسے عددی غیر متفاوت ہیں متقارب بھی نہیں ہیں، غیر متفاوت ہیں اور عدد ہی ان کے لئے پیمانہ ہے تو کیا نوٹ کے معاملہ میں عدد کو قدر کے درجہ میں نہیں رکھا جاسکتا ہے، نہ میں نے کہیں دیکھا نہیں ہے، لیکن یہ سوال ذہن میں آتا ہے۔

ایک آواز:

......دوسری بات یہ ہے کہ قدر مع الجنس وغیرہ ربوا البیوع اور ربوا الفضل، یہ دو قسم کی ربوا ہے تو ہم لوگ جو نقد کو نقد سے تبادلہ کرتے ہیں تو ربوا البیوع کا تحقق اس میں ہوتا ہے، یا ربوا الفضل کا تحقق ہوتا ہے ربوا الفضل کے لئے تو قدر مع الجنس شرط نہیں ہے، اس مسئلہ پر غور فرمایا جائے، اس لئے ابھی یہ جو مولانا اختر امام عادل صاحب نے فرمایا کہ فلوس کے پیچھے جو ہے سونا اور چاندی ہے تو فلوس کے پیچھے تو کبھی بھی سونا اور چاندی نہیں ہے، عرفی اور اصطلاحی ثمن ہے وہ عرف جب تک ہے اس کے ثمن ہونے کا وہ ثمن ہے ورنہ ثمن نہیں ہے، اسی طریقہ سے یہ جو روپیہ ہے یہ بھی عرفی ثمن ہے اس کے پیچھے ابھی جو کہا جارہا ہے کہ اس کے پیچھے سونا چاندی نہیں ہے اور یہ پسند نہیں ہے تو یہ پسند ہونا نہ ہونا علاحدہ بات ہے، لیکن اس کے پیچھے ابھی ابھی......کہ عرفی ثمن ہے سونا اور چاندی اس کے پیچھے نہیں ہے، تو اب اگر ایک روپیہ کا تبادلہ دو روپے سے کریں گے تو یہ بیع ہے یا یہ کہ قرض ہے اگر بیع ہے تو پھر قدر مع الجنس والی بات پیدا ہوگی، اور اگر یہ قرض ہے تو پھر ربوا الفضل کا تحقق جو ہے قدر مع الجنس کے بغیر بھی ہوگا۔

مفتی جمیل احمد نذیری:

میں یہ عرض کررہا ہوں کہ ہمارے فقہاء کرام نے اس حدیث کو جس میں اشیاء ستہ کا تذکرہ ہے ان ہی چھ چیزوں پر غور کیا، امام ابوحنیفہؒ نے غور کیا، علت ربوا کے لئے، کیونکہ یہ بات محقق ہے کہ ربوا اشیاء ستہ میں محقق نہیں، کیونکہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان سے چلے

گئے اور "لم یبین لنا أبواب الربوا" ابواب ربوا کو کھول کر نہیں بیان کیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ چھ کے علاوہ میں بھی ربوا ہے تو ہمارے فقہاء مجتہدین نے ان چھ چیزوں پر غور کرنا شروع کیا امام ابوحنیفہؒ نے غور کیا کہ یہ چھ چیزیں ہیں، گیہوں، جو، سونا چاندی، کھجور، نمک ان میں سے کچھ چیزیں وزن کر کے بکتی ہیں کچھ چیزیں کیل کر کے تو انہوں نے کہا کہ یہی علت ربوا ہے اور یہ چیز ایک ہو تو ربوا ہے تو امام ابوحنیفہؒ نے علت ربوا وزن کو اور کیل کو قرار دیا اور جنس کو گویا کہ وجہ بنایا، کہ اگر ہم باہم ایک جنس کا تبادلہ ہو تو، امام شافعیؒ نے ان ہی چھ چیزوں میں غور کیا تو انہوں نے یہ فرمایا کہ اس میں سے کچھ چیزیں تو کھانے کی ہیں طعمیت ہے اور کچھ چیزیں ثمنیت کے قبیل کی ہیں اس لئے انہوں نے علت ربوا کھانے کی چیز کو اور ثمن کو قرار دیا، امام مالکؒ نے ان ہی چھ چیزوں پر غور کیا تو انہوں نے یہ فرمایا کہ اس میں کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو ذخیرہ بنا کر رکھی جاتی ہیں کہ آدمی بوقت ضرورت کام لے گا سونا چاندی ہے، گیہوں وغیرہ ہے تو اقتیات اور ادخار کو علت ربوا قرار دیا، تو ہمارے یہاں فقہاء احناف نے جو علت ربوا قرار دیا ہے ان ہی چھ چیزوں پر غور کر کے اور یہ چھ چیزیں یا تو کیلی ہیں یا وزنی ہیں اس پر اور کوئی مثل کا معاملہ نہیں۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

ماشاء اللہ، یہاں جتنے بھی حضرات تشریف فرما ہیں، صرف ہدایہ آخرین پڑھتے پڑھاتے ہوں گے، یہ بحثیں ان کے سامنے ہیں، غور کرنے کی بات اس کے آگے کی ہے کہ مان لیجئے آپ نے کرنسی کو ثمن مان لیا تو ظاہر ہے وہاں نہ طعمیت ہے، صرف ثمنیت ہے، طعمیت، ثمنیت امام شافعیؒ جو فرماتے ہیں، ہمارے یہاں جو علت ربوا ہے بظاہر اس میں پائی نہیں جاتی، لیکن فتوی اس وقت یہی ہے کہ یہاں تبادلہ کی بیشی کے ساتھ ناجائز ہے گویا ہم نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ ثمنیت علت ربوا ہے، تو بہرحال جو مسائل ہیں اصولی، اس پر غور کریں اور ذہن میں رکھیں۔

مفتی عبدالرحیم قاسمی:

روپیوں سے سونا کی خریداری بیع صرف ہے یا نہیں؟ میں نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ وہ بیع صرف نہیں ہے، عارض صاحب نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ رائے واضح نہیں ہے، حالانکہ میں نے واضح طور سے مقالہ میں لکھا ہے کہ وہ بیع صرف نہیں ہے۔

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی:

سوال نمبر ا کے سلسلہ میں میرا جو موقف بیان کیا گیا وہ یہ ہے کہ یہ عقد صرف بھی ہے اور نسیا جائز بھی ہے، عقد صرف ہونے کی دلیل تو میں نے علامہ نجیم سے لی ہے، اور اس کی جو دوسری حیثیت ہے وہ بھی ان کی دوسری تحریر منحۃ الخالق سے لی ہے، اسی طرح ایک ہی چیز اگر ایک حیثیت سے صرف ہے اور اس پر صرف کا اطلاق نہ کرتے ہوئے دوسری حیثیت کا اطلاق کرتے ہوئے نسیئاً جائز رکھا جائے تو اس میں اشکال کیا پیش آ رہا تھا عارض کو، ایک بات۔ دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ زیور پرانا ہو یا نیا یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے اگر آپ کسی بھی مسلمان سنار سے جو بڑے کاروباری ہوں معلوم کریں کہ اس کی خرید وفروخت کا طریقہ کیا ہے، زیور جب آپ خریدتے ہیں نیا زیور تو اسمیں وہ کیرٹ کے اعتبار سے دام مقرر کرتا ہے، اور اسی دام کو پرچی پر لکھ کر بھی دیتا ہے سرکاری مہر بھی ہوتی ہے اس پر پھر اس کے بعد جب پرانے زیور لیتے ہیں تو مقرر کرتا ہے کہ وہ اتنے کیرٹ کا ہے، اب پرانے، نئے زیور کے تبادلے میں کیرٹ کا یا جو بنیادی وزن نئے زیور کا تھا وہی بنیادی وزن پرانے زیور میں موجود ہے، کوئی فرق نہیں ہے تفاضل کا ربوا کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، وہ جو پرانا زیور لے رہا ہے اس پرانے زیور کو لینے کی صورت میں وہ دو تین کام کرتا ہے، پالش کرائے گا اس میں کچھ سونے اس کے مزدور کو بھی ملیں گے، اس کی دکان کا، لیبر کا بھی خرچ ہے، پھر اس میں دھات کی آمیزش بھی ہوگی تو سونے کا وزن دونوں صورتوں میں چاہے زیور پرانا ہو یا نیا، ہر حال میں ایک ہی ہے بلا وجہ ہم لوگ خواہ مخواہ غور کرتے ہیں کہ ربوا ہو گیا اور کمی بیشی ہو گئی، کمی بیشی کچھ نہیں ہوئی نیا پرانا دونوں اپنی جگہ ہے، نئے میں بھی وہی وزن ہے سونے کا اور پرانے میں بھی وہی وزن ہے اور جو کم قیمت لے رہا ہے وہ صرف اس لئے لے رہا ہے کہ وہ دھات کی آمیزش ہے، لیبر کا خرچ ہے، دکان کا خرچ ہے، اس طرح سے وہ مقرر کر کے تھوڑا سا ریٹ لے لیتا ہے اس لئے اس میں ربوا کا کوئی تحقق نہیں۔

تیسری بات یہ جو ذات کا مسئلہ ہے جب مزدوری وہ مقرر کر کے لے رہا ہے تو یہ بات بھی جاننی چاہئے کہ سنار زیور بنوانے والے کو یہ کہتا ہے میں اتنا وزن تم سے ہر حال میں لوں گا اور تم اس زیور کو اتنے وزن کا مجھے بنا کر دو اور اتنا تم اس میں دھات ملا لو اس لئے جو ذرہ اس کا جھڑتا ہے اس کی مقدار بھی سنار کو معلوم ہوتی ہے اور جو زیور بنوا رہا ہے اس لئے اجرت مجہولہ کا بھی کوئی سوال اس میں نہیں ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ خالص عقد

اجارہ ہے کیونکہ اس کے عمل سے اس کی اجرت کا تعلق ہے تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس کو بیع قرار دیا جائے، اس صورت کے بھی ناجائز ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اس لئے ہمیں موجودہ تعامل کو دیکھتے ہوئے ورنہ کسی کو کوئی زیور دنیا میں مل ہی نہیں سکتا، اگر آپ نے اس کو حرام قرار دیا تو زیور کی خریداری ہر صورت میں حرام ہو جائے گی اور کوئی زیور دنیا میں بنانے والا اس کے بغیر بنا کر دے ہی نہیں سکتا، اس لئے ہمیں بہر حال اس سہولت کو اور عرف عام کو اور سنار کے جو اپنے معمولات ہیں اس کو نظر میں رکھتے ہوئے ہی فیصلہ کرنا چاہئے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ تلخیص میں میری طرف سے یہ ایک بات اچھی لکھی ہوئی ہے اور میرے مقالہ سے نقل کی ہوئی ہے، عارض نے اس پر نظر نہیں ڈالی وہ میں نے کئی ماہر سناروں سے ذاتی معلومات حاصل کر کے لکھی ہے، اس لئے میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس پر غور کیا جانا چاہئے۔

مولانا جعفر ملی رحمانی:

سونے چاندی کی تجارت کے تعلق سے چوتھا سوال تھا، آج کل انٹرنیٹ کے ذریعہ سونے کی جو خرید و فروخت ہوتی ہے، اس میں بائع یعنی بینک ہر خریدار کے لئے خریدی ہوئی مقدار کا سکہ یا اس کی مقدار الگ نہیں رکھتا نہ اس کو متعین کرتا ہے بلکہ لاعلی التعیین کسی بھی مقدار کی مثلاً دس گرام بارہ گرام پندرہ گرام کو بیچتا ہے اور پھر قیمت کم و بیش ہونے کی صورت میں خود ہی خریدار کی طرف سے اس کو فروخت بھی کرتا ہے اور محض کمپیوٹر پر اندراج ہوتا ہے تو محض کمپیوٹر کسی کے نام سے اندراج کرنے کی صورت میں نہ تو حقیقی قبضہ پایا جاتا ہے نہ حکمی قبضہ پایا جاتا ہے، تو انٹرنیٹ کے ذریعہ سونے کی آج کل جو خرید و فروخت ہو رہی ہے اس میں شرعی اصولوں کا پاس ولحاظ نہیں رکھا جاتا لہٰذا اکیڈمی جب بھی اس تجویز کو پاس کرے تو اس میں اس کا خیال رکھے کہ یہ صورت شرعاً جائز نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

ایک منٹ میں ایک بات میں عرض کرنا چاہ رہا ہوں، یہ جو بات ہمارے مولانا جعفر صاحب نے کہی اس پر کوئی گفتگو آج صبح سے نہیں آئی، ایک تو ہمارے یہاں اسٹاک ایکسچینج ہے جس میں شیئرز کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور ہمارے علماء نے تقریباً اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے مشروط طور پر خود حضرت تھانویؒ نے اس کو شرکت عنان کے زمرہ میں رکھا ہے لیکن اسٹاک ایکسچینج سے آپ کوئی چیز خریدتے ہیں تو آپ کو شئی کی ڈلیوری نہیں مل سکتی، اگر آپ ٹاٹا کا شیئر خریدیں اور آپ یہ کہیں کہ اس کے بدلے میں آپ اپنے کارخانے کے مصنوعات میں سے کسی چیز کی مجھے ڈلیوری دیں میرے حوالہ کریں یہ آپ کو نہیں مل سکتی، کیموڈیٹی ایکسچینج جو شروع ہوئی ہے اس میں آپ کو قبضہ مل سکتا ہے چاہے وہ اجناس آپ خریدیں چاہے آپ تانبہ خریدیں، کو پر خریدیں تو سونے کی جو کیموڈیٹی ایکسچینج کے ذریعہ خرید و فروخت ہوتی ہے اس کی مختلف صورتیں ہیں، ایک صورت تو وہ ہے کہ جس میں نفع نقصان کو برابر کرنا مقصود ہو، وہ تو بالکل جائز نہیں ہے، لیکن ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ آپ کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر آپ سونا لینا چاہیں تو سونا لے سکتے ہیں، اور اگر آپ سونا ہمارے پاس رکھنا چاہیں تو ہمارے پاس رکھ سکتے ہیں، اور جتنی مدت آپ ہمارے پاس رکھیں گے ہم اس کی حفاظت کا سروس چارج لیں گے، اور کبھی آپ مجھ کو فروخت کرنے کو کہیں گے تو ہم اس کو فروخت کر دیں گے چونکہ میں نے خود اس کو دیکھا ہے، حیدرآباد میں ممبئی کا ایک ادارہ ہے وہ اس کام کو کر رہا تھا انہوں نے مجھ سے خواہش کی کہ اس پر آپ فتویٰ دیں، تو میں نے کہا کہ جب تک میں عملاً دیکھ نہ لوں کہ کیا اس میں فیزیکل قبضہ یا نہیں مل سکتا ہے اس وقت تک میں اس بارے میں کچھ نہیں لکھ سکتا، تو ان کے گودام ہوتے ہیں، ہر جگہ ہم نے جا کر دیکھا انہوں نے مختلف مقدار کے سکے رکھے ہیں ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ آپ نے خریدا اور اس کو بعد میں برابر کر لیا عام طور پر اس میں پیسے بھی پہلے ادا نہیں کرتے ہیں، نفع ونقصان برابر کر لیتے ہیں وہ تو سٹہ ہے، لیکن یہ بھی شکل ہوتی ہے کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کو سونے کا سکہ جو آپ نے خریدا ہے وہ آپ کو اس کی ڈلیوری دے دیتے ہیں، ایک خاص مقدار کی جو کوائن ہوتی ہے ان کے یہاں، سکہ ہوتا ہے وہ اگر لیں تو فوری بھی چاہیں تو وہ آپ کو دے دیں گے، اور اگر آپ اس سے کم لینا چاہیں مثلاً آپ ایک گرام کا لینا چاہیں دو گرام کا لینا چاہیں اس میں آپ سے دو تین دنوں وقت لیتے ہیں اور یہ صرف یہاں کا مسئلہ نہیں ہے چونکہ کیموڈیٹی ایکسچینج میں سمجھتا ہوں کہ اسٹاک ایکسچینج سے اس لحاظ سے زیادہ بہتر ہے کہ یہاں آپ کو مبیع پر فزیکل قبضہ حاصل ہو سکتا ہے اور وہ ادارہ بحیثیت وکیل آپ کی طرف سے قبضہ کرتا ہے تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس کی تجویز طے کرتے ہوئے چونکہ مغائر شرعیہ کا فیصلہ بھی موجود ہے اور آپ جانتے ہیں اس کے صدر مولانا تقی عثمانی صاحب ہیں اور اس میں اس کی تمام صورتوں کو ناجائز نہیں کہا گیا ہے تو ایسی صورت جس میں حقیقی قبضہ متحقق ہوتا ہو جو شرطیں میں نے آپ سے عرض کی تو اس کے بارے میں غور کرنا چاہئے اور تمام صورتوں کو ایک زمرہ میں نہیں رکھنا چاہئے۔

ایک آواز:

یہ مبیع اگر غیر مبیع کے ساتھ مخلوط ہو تو اس میں وکیل کا قبضہ یا اصیل کا قبضہ جب ہی متحقق ہوگا جب کہ مبیع کو ممتاز کر دیا جائے غیر مبیع سے، ورنہ قبضہ کا تحقق نہیں ہوگا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

سونے کی اینٹ تو مشترک شکل ہے اس کے بارے میں، میں نہیں کہہ رہا ہوں لیکن ہر آدمی کو اس کی مقدار کے لحاظ سے جسے آپ نے پچاس گرام سونا خریدا تو ان کے پاس پچاس گرام کا سکہ ہے اس پر ایک نمبر لکھا ہوا ہے تو آپ کے نام پر وہ سکہ آجاتا ہے اگر چاہیں تو آپ اس کی ڈلیوری حاصل کرلیں اور چاہیں تو آپ ان سے کہیں کہ آپ اپنے پاس رکھیں، جب میں چاہوں گا فروخت کروں گا، یا جب میں چاہوں گا تو اس کی ڈلیوری لے لوں گا، تو اس مسئلہ کی مزید تحقیق کے بغیر بہت عجلت میں اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہئے۔

مفتی انور علی اعظمی صاحب:

سوال نمبر ۲ میں جہاں زیور بنانے کے لئے سونا دیا جارہا ہے تو اس سلسلے میں ہم لوگوں کا موقف یہی ہے، جو سوال و جواب میں لکھا بھی گیا ہے کہ یہ بیع نہیں ہے اجارہ ہے، لیکن اجارہ کی صورت میں جو ذرات لے لئے جارہے ہیں اس کی اجازت دینے میں چوری کا ایک راستہ کھلے گا، اجرت یہاں پر غیر متعین ہے اور جو زیورات بنا کر دیئے جارہے ہیں اس میں یہ طے نہیں ہے کہ سونا جتنا دیا گیا ہے وہ سارا یا پھر کتنی مقدار سونا لوٹے گا کتنی مقدار بنانے والا اپنے پاس رکھ لے گا، ہم لوگوں کے یہاں جو کپڑے کا کاروبار ہوتا ہے تو کپڑا تیار کرانے والے بھی میٹریل دے دیتے ہیں تیار کرنے والے مزدوروں کو لیکن ان کی طرف سے اگر یہ اجازت دے دی جائے کہ ہم کو صرف اتنی ساڑی چاہئے، یہ میٹریل آپ کا ہوگا تو ایسی صورت میں چوری کا ایک دروازہ کھلے گا یہاں بھی چوری کا دروازہ کھلنے کا پورا امکان ہے، اس لئے یہاں اجرت متعین ہونی چاہئے، ورنہ یہ معاملہ بہت ہی غیر واضح ہوگا، اور اجرت میں دوسرے اجارے کے معاملات میں طرح طرح کے نقصانات کا اندیشہ ہے۔

مفتی سلمان پالنپوری صاحب:

مجھے ثمن خلقی کے بارے میں ایک بات عرض کرنی ہے کہ جو بات کہی جارہی ہے کہ سونا اور چاندی ثمن خلقی نہیں ہے تو یہ بات احقر کی رائے کے مطابق درست نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تمام فقہاء آج تک اس کو ثمن خلقی لکھتے آئے ہیں اور کسی فقیہ نے اس کے خلاف اس کے ثمن عرفی کی رائے قائم نہیں کی ہے، اس لئے یہ تمام فقہاء کا جو اتفاق ہے وہ بہت بڑی دلیل ہے، اور اس کے ثمن عرفی ہونے پر کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے، دوسری بات زکوۃ واجب ہونے کے لئے نصاب کا مال نامی ہونا شرط ہے تو سونے چاندی کے جو زیورات ہیں اس میں زکوۃ جو فقہاء نے واجب کی ہے تو اس کے اندر صفت نمو کو حکما ثابت کیا ہے اور وہ خلقی ثمنیت کی وجہ سے، اگر بالفرض ہم یہ مان لیں کہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانے میں سونا اور چاندی ثمن عرفی تھا خلقی نہیں تھا تو اس زمانے میں سونا چاندی ثمن عرفی تو باقی رہا نہیں اور ثمن خلقی کی بھی ہم نفی کر رہے ہیں تو پھر سونے چاندی کے زیورات میں صفت نمو کس طرح ثابت ہوگی۔

مولانا مصطفی عبد القدوس ندوی صاحب:

بہر حال ساری باتیں آچکی ہیں اس لئے اس کا اعادہ مناسب نہیں ہے، اور جیسا کہ سوال نمبر ۲ کے (ب) کے تعلق سے اجرت یا بیع کے تعلق سے بات آچکی ہے اور یہ اجرت تعاطی کے حکم میں آسکتا ہے، اور قفیز طحان کے تعلق سے جو اختلاف پایا جاتا ہے اور اس پر بھی کلام متقدمین فقہاء سے چلا آرہا ہے لیکن جن لوگوں نے جائز قرار دیا ہے ایک تو اس حدیث پر کلام ہے کہ ثابت ہے کہ ثابت نہیں ہے اور اس کو مال...... قرار دیا ہے، یہ سب کو معلوم ہے سوال نمبر ۴ کے اندر جوائنٹ کی بات آئی تو اسکے اندر تقریبا سب کا اتفاق ہی ہے کہ ناجائز ہے اور ناجائز ہونے کی بہت ساری صورتیں اس میں موجود ہیں کہ اس میں غرر بھی پایا جارہا ہے، کہ اس کے اندر، دوسری بات ہے کہ بیع در بیع ہوتے ہوئے معاملہ آگے بڑھے گا تو دوسرے کی مملوک چیز کو بیچنا بھی لازم آئے گا، اور پھر یہ کہ آگے چل کر مسئلہ آئے گا کہ اس پر مشتری کا قبضہ بھی نہیں وہ بیچ بھی نہیں سکتا، یہی تقریبا متفق علیہ بات ہوگی، تیسری

بات کہ ابھی جو بحث سب کے درمیان چھڑی ہوئی ہے کہ کرنسی کے تعلق سے۔ اتنی بات معلوم ہے کہ سونا اور چاندی خیر وہ الگ ہے کہ بعد میں طے ہو کہ ثمن خلقی ہے یا نہیں ہے لیکن سونا اور چاندی ثمنیت کے باب میں ایک جنس ہے اور ربوا کے باب میں مختلف جنس ہے، فقہاء نے اس بات کو تسلیم کیا ہے، اسی طرح سے کرنسی کے باب کے اندر اس پر قیاس کرتے ہوئے کہ ثمنیت کے باب میں کرنسی ہو یا سونا ہو یا چاندی ہو سب ایک جنس کے ہوں گے، اور ربوا کے باب میں مختلف جنس کے ہوں گے، جب مختلف جنس کے ہوں گے تو ایسی صورت میں روپئے کے ذریعہ سے سونا چاندی کے خریدنے میں تفاوت ہو مالیت کے اعتبار سے جس کو بیع صرف نہیں کہا جاسکتا ہے چونکہ جنس بدل گئی ہے تو اس پہلو سے بھی بہر حال اس پر غور کیا جائے، اور بقیہ باتیں چونکہ آچکی ہیں اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

یہ کچھ تجویزیں اور آراء تحریری طور پر آئی ہیں، مولانا عمران ندوی، مولانا روح الامین، مولانا اشاعتی، مولانا سیف اللہ قاسمی دھنباد، مولانا علی احمد آسامی، مولانا اسماعیل مظاہری، مولانا ابوالکلام صاحب، ڈاکٹر عمران عالم قاسمی بھوپال وغیرہ، ان حضرات کی ان تجاویز کو کمیٹی کے حوالہ کردیا جائے گا، انشاء اللہ اب گویا اس موضوع پر مناقشہ ہو چکا ہے کل سے آج تک ان سے فارغ ہو چکے ہیں، ان موضوعات کے بارے میں کمیٹیاں ترتیب دے دی گئی ہیں اس کا بھی اعلان ہوگا اور صدر محترم حضرت مولانا محبوب علی وجیہی صاحب دامت برکاتہم جو اپنے بڑھاپے کے باوجود تشریف لائے ہیں اور صدارت فرما رہے ہیں ان کے صدارتی کلمات اور دعا پر انشاء اللہ یہ نشست ختم ہوگی۔

صدارتی کلمات

مفتی محبوب علی وجیہی صاحب:

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد۔

اب نہ خطاب کا وقت ہے نہ مزید گفتگو کا موقع، تو دو بج رہے ہیں، آج تو ہمارے سکریٹری صاحب نے اتنے پروگرام ہمارے ساتھ لگا دیئے کہ پورا کرنا مشکل ہو گیا، پھر مغرب کے بعد پروگرام، صوتی آلودگی فضائی آلودگی، اب تک سونے چاندی میں تھے، اب آلودگی میں جائیے، حضرات کرام علماء عظام، یہ حق تعالی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ کو ہمیں پھر ایک دینی خدمت کے لئے جمع ہونے کا موقع دیا، اور یہ سمینار اس لئے ہوتا ہے کہ ہم آپ سب جمع ہو کر دین کے جو نئے مسئلہ پیدا ہو رہے ہیں یا مسائل تو پرانے ہیں مگر غور طلب ہو گئے ہیں ان میں غور کیا جائے، اور جو نئے پیدا ہو رہے ہیں ان کے ضوابط تیار کئے جائیں، بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہر ایک آدمی کو کچھ نہ کچھ اپنے خیال کے مطابق اپنے علم کے مطابق اپنے تجربے کے مطابق کہنے کا موقع ملتا ہے اور اس میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔

تمت

☆☆☆

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے چھبیسویں فقہی سمینار منعقدہ مورخہ ۵-۷ رجمادی الاخری ۱۴۳۸ھ مطابق ۴-۶ مارچ ۲۰۱۷ء کو مجلس اتحاد امت اجین، مدھیہ پردیش میں پیش کیے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات ومناقشات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دار الاشاعت
اردو بازار ۰ ایم اے جناح روڈ ۰ کراچی پاکستان

باب اول تمہیدی امور

سوالنامہ:

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

اللہ تعالی نے انسان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں سب سے اہم زمین ہے، زمین ہی انسان کا مسکن بھی ہے اور اس کا مدفن بھی، وہی درختوں اور پودوں کے واسطہ سے رزق کی فراہمی کا ذریعہ ہے، جو جانور انسان کی غذا اور سواری وغیرہ کے کام آتے ہیں، ان کو بھی زمین ہی سے چارہ فراہم ہوتا ہے، اور ہماری سب سے بڑی ضرورت جس سے ہم دو منٹ بھی بے نیاز نہیں رہ سکتے، یعنی: آکسیجن، زمین ہی میں پیدا ہونے والے درخت ان کے حصول کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ دنیا میں کچھ تو وہ آلودگی ہے، جو خود قدرت کی طرف سے ہے، اور آلودگی کا ایک بہت بڑا حصہ وہ ہے، جو قدرتی وسائل کے استعمال میں انسان کی بے احتیاطی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، ان آلودگیوں کو تحلیل کرنے کے دو بڑے قدرتی ذرائع ہیں، ایک: سمندر، دوسرے: زمین، اسی لئے زمین انسان کی بہت محبوب شئی رہی ہے، دنیا میں اکثر جنگیں زمین ہی کے لئے ہوتی رہی ہیں؛ بلکہ خاندانی جنگیں بھی زیادہ تر زمین ہی کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔ تجارتی نقطۂ نظر سے بھی زمین کی بڑی اہمیت ہے، اور آج کل بڑے اور چھوٹے شہروں میں بڑے بڑے تاجروں نے زمین اور فلیٹس کی تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا ہے، جہاں اس سے تاجروں کو معاشی فائدہ پہنچتا ہے وہیں خریدار کو رہنے کی جگہ مل جاتی ہے اور بعض تاجر غریبوں کے لئے لائق خرید بنانے کی غرض سے اقساط کی سہولت فراہم کردیتے ہیں، اس طرح متوسط اور کم آمدنی کے حامل لوگوں کو بھی شہروں میں مکان حاصل ہوجاتا ہے۔ تجارت کے اس شعبہ میں تاجروں اور گاہکوں کو بہت سے شرعی مسائل بھی پیش آتے ہیں، ان ہی مسائل سے متعلق درج ذیل سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں:

۱۔ بعض لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر سرکاری اراضی پر قابض ہوجاتے ہیں اور انہیں فروخت کرتے ہیں، رشوت کے ذریعہ سرکاری عہدہ داروں سے وہ لے آوٹ بھی منظور کروالیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بڑے شہروں میں بہت ساری زمینیں اسی طور پر فروخت ہوتی ہیں، پھر خریدار اسے دوسرے خریدار سے بیچ دیتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ اس پر مکان تعمیر کرتے جاتے ہیں اور کچھ اسے آگے فروخت کرتے جاتے ہیں، ایسی زمینوں کا کیا براہ راست قابضین سے خریدنا یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا جائز ہوگا؟

۲۔ ایک افسوس ناک حقیقت یہ بھی ہے کہ بعض دفعہ خود مسلمان اوقاف کی زمین غصب کرلیتے ہیں، کبھی تو یہ زمین اتنی دور افتادہ ہوتی ہے کہ مقصد وقف کو اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ پاتا ہے، بعض اوقات غیر مسلم حضرات کے قابض ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے، یا وہ اس کے کچھ حصے پر قابض ہوچکے ہوتے ہیں، اور بعض دفعہ ایسی زمین بھی ہوتی ہے کہ جس کی واقعی مسجد ومدرسہ وغیرہ کو ضرورت ہوتی ہے؛ لیکن صرف اللہ سے بے خوفی اور مال کی حرص ولالچ کی وجہ سے ان پر ناجائز قبضہ ہوجاتا ہے۔ اوقاف کی ان مختلف قسم کی مغصوبہ زمینوں کو خریدنے کا کیا حکم ہے؟

۳۔ بعض زمین موروثی طور پر ملتی ہیں، لیکن جن لوگوں کو زمین حاصل ہوتی ہے، ان کے والد یا دادا کے وقت میں وراثت کی شرعی طور پر تقسیم نہیں ہوئی تھی، جیسے والد نے پھوپھیوں کو حصہ نہیں دیا تھا، یا دادا نے اپنی بہنوں کو حصہ نہیں دیا تھا، اب بیٹوں یا پوتوں سے ان کی ایسی موروثی زمین کا خرید کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

۴۔ ایک شخص کی آمدنی حرام تھی، اور اس حرام آمدنی کے ذریعہ اس نے ڈھیر ساری زمین حاصل کی، اور اب وہ اس زمین کو فروخت کرتا ہے، تو جو لوگ ان حالات سے واقف ہیں، کیا ان کے لئے اس زمین کو خرید کرنا درست ہوگا؟

۵۔ حکومت کے قانون کے مطابق جو لے آوٹ منظور ہوتا ہے، اس میں سڑکوں کی چوڑائی کا رقبہ طے شدہ ہوتا ہے، پلے گراؤنڈ بھی چھوڑنا ہوتا ہے، اگر خالص مسلمانوں کی کالونی ہو تو کالونی بنانے والا ترغیب کے لئے مسجد کی جگہ بھی مقرر کرتا ہے؛ لیکن جب کالونی میں پلاٹنگ شروع ہوجاتی ہے تو راستوں کو چھوٹا کردیتے ہیں، اور پلاٹ میں شامل کرتے ہوئے اس کی بھی قیمت وصول کرتے ہیں، پلے گراؤنڈ اور سوئمنگ پول کی جگہ بھی بیچ دیتے ہیں، یہاں تک کہ مسجد کی مقررہ جگہ بھی فروخت کردیتے ہیں، کیا بیچنے والے شخص کے لئے اس کے بنائے ہوئے نقشے میں تبدیلی کرتے ہوئے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کو فروخت کردینا اور دوسرے لوگوں کا جانتے بوجھتے اس کو خرید کرنا جائز ہوگا؟

۶۔ قانون کے لحاظ سے کالونی میں گارڈن اور پلے گراؤنڈ رکھنا ضروری ہے، حکومت لے آوٹ منظور کرنے کے لئے نقشہ میں ان چیزوں کو رکھواتی ہے اور جگہ مخصوص کرواتی ہے؛ لیکن زمین بیچنے والا مسلمانوں کو لبھانے کے لئے گارڈن کی بجائے مسجد کے لئے جگہ دے دیتا ہے، اور جو زمین قانون اور حکومت سے معاہدہ کے مطابق گارڈن کی تھی، اسی جگہ مسجد بنادی جاتی ہے، کیا ان کا اس زمین پر مسجد بنانا درست ہوگا اور وہ مسجد شرعی تصور کی جائے گی؟

۷۔ آج کل کسی زمین کو کالونی کی حیثیت سے منظور کرانے میں کئی مرحلے درپیش ہوتے ہیں، پہلے زمین کو غیر زراعتی (نان اگریکلچر) اراضی میں تبدیل کرانا ہوتا ہے، اس کے لئے کوشش بھی کرنی ہوتی ہے اور اخراجات بھی ہوتے ہیں۔ پھر قانون کے مطابق اس کا ڈیولپمنٹ کراتا ہے، جس میں ڈرینج لائن، سڑکیں، بجلی کے کھمبے شامل ہیں، اس میں بھی کافی اخراجات ہوتے ہیں، پھر زمین کے خریدنے پر بھی ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے، پلاٹس بنانے کے بعد ان کی جو قیمت طے ہو، اس پر بھی ٹیکس دینا ہوتا ہے، پھر جو پلاٹ خریدے گا، ان کو بھی ٹیکس ادا کرنا ہوگا، جو تقریباً بارہ پندرہ فیصد ہوتا ہے، یہ تو ٹیکسز ہیں، پھر ان تمام مراحل میں عہدہ داروں کو رشوت دینی ہوتی ہے، اور اگر کسی شخص کی طرف سے اعتراض کی درخواست دائر ہوگئی تو معاملہ اور زیادہ پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد زمین بہت مہنگی ہوجاتی ہے؛ اس لئے عموماً لوگ گورنمنٹ سے منظور کرائے بغیر پولیس اور متعلقہ محکمہ کو رشوت دے کر کالونی بنالیتے ہیں، اور جب اچھی خاصی آبادی ہوجاتی ہے، تو یا تو عوامی غیظ وغضب اور نقض امن کا خیال کرتے ہوئے حکومت خاموش رہتی ہے اور مقامی سیاسی لیڈروں کی کوششوں سے روڈ، بجلی وغیرہ کی سہولتیں فراہم ہوجاتی ہیں، یا خود حکومت بعد میں غیر قانونی کالونی اور مکانات کو قانونی بنانے کا موقع فراہم کرتی ہے، اور کچھ پیسے لے کر اس کو قانونی طور پر منظور کالونی کی حیثیت دے دیتی ہے، شہروں میں جو اکثر غریب آبادیاں بسائی گئی ہیں، وہ اسی طور پر بسائی گئی ہیں، تو کیا اس طرح قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر کالونیاں بنانا اور پلاٹ فروخت کرنا جائز ہوگا؟ اس کی نوبت اس لئے آتی ہے کہ اگر ان تمام مراحل کو قانون کے مطابق انجام دیا جائے تو زمین کی قیمت اتنی زیادہ ہوجائے گی کہ غریبوں کے لئے پلاٹ کی خریداری دشوار ہوجائے گی۔

۸۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد زمین کے خریدنے کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ وہائٹ منی دے، اور یہ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی مقدار میں وہائٹ منی دکھانا بہت دشوار ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ بینک سے کروڑوں روپیہ کا لون لے، تاکہ گورنمنٹ کی پکڑ سے محفوظ رہ سکے، کیا پیسے ہونے کے باوجود قانونی دشواری سے بچنے کے لئے اس طرح لون لیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا نہ ہو تو مسلمانوں کے لئے اس کاروبار میں رہنا دشوار ہوجائے گا، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شہر میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت غریب اور پسماندہ ہے، وہ آسان قسطوں پر پلاٹ حاصل کرکے مکان کے مالک بن جاتے ہیں، اور مسلمان تاجر اگر اس کاروبار سے نکل جائیں، تو انہیں بہت دشواری ہوجائے گی۔

۹۔ کالونی میں جو قطعہ زمین بیچا جاتا ہے، وہ نقشہ پر تو درج ہوتا ہے اور زمین کے ہر ٹکڑے کا ایک نمبر ہوتا ہے، لیکن زمین پر پلاٹس بنائے نہیں جاتے اور کالونی بسانے والے کے لئے اس بات کی بھی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ اس جگہ کو تبدیل کردے یا نقشہ میں جس پلاٹ کا جو نمبر بتایا گیا ہے، اس کو کسی اور جگہ ڈال دے، کیا اس طرح صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجائے گی اور خرید وفروخت کا یہ عمل درست ہوگا؟

۱۰۔ اس صورت میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمین کے جو حصے بیچے گئے ہیں، اس پر بیچنے والا کاشت بھی کرتا رہتا ہے، تو کیا اس کے باوجود خریدار اس کا مالک ہوجائے گا؟

۱۱۔ جس شخص نے پلاٹ خریدا ہے تو اس سے پہلے کہ اس کا پلاٹ متعین ہو صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر وہ اپنی زمین کسی اور سے فروخت کر دیتا ہے، کیا یہ بیع درست ہوگی؟۔ اس میں دو صورتیں ہوتی ہیں:

الف: ایک یہ کہ زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آگئی تھی اور اس نے پلاٹس فروخت کئے تھے۔

ب: دوسری صورت یہ ہے کہ زمین ابھی مالک زمین ہی کی ملکیت میں ہوتی ہے، کالونی بنانے والا اس کی اجازت سے (جو اکثر اوقات اسٹامپ پیپر پر ہوتی ہے) پلاٹنگ کرتا ہے اور اس کو بیعانہ کی ایک رقم دے دیتا ہے، اور وہ ایک مقررہ مدت میں بقیہ رقم ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے؛ لیکن اگر کسی وجہ سے قانونی رکاوٹ پیدا ہوگئی تو پھر زمین مالک زمین ہی کے پاس رہ جاتی ہے، کیا اس صورت میں پلاٹنگ کرنے والے کا پلاٹ بیچنا اور پھر اس سے پلاٹ خریدنے والے شخص کا اگلے شخص کو بیچ دینا جائز ہوگا؟

۱۲۔ ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ کالونی بنانے والا کچھ دلالوں سے بات کرتا ہے کہ آپ ہماری زمین بکوایئے، یہ دلال مارکیٹ میں آتے ہیں اور مختلف گراہکوں اور انویسٹرس سے بات کرتے ہیں کہ ہمارے پاس مال ہے، آپ پیسہ لگایئے اس کو خریدیئے، اس کی قیمتیں بڑھیں گی، جب قیمتیں بڑھیں تو آپ بیچ دینا، زمین خریدنے والے کو زمین مقصود نہیں ہوتی، اس کو صرف پیسے کمانا ہوتا ہے، وہ شخص زمین خرید لیتا ہے، خریدنے والا اصل مالکِ زمین کو جانتا تک نہیں، نہ کوئی رجسٹری ہوتی ہے نہ کوئی کاغذی تحریر ہوتی ہے، صرف دلال اور خریدنے والے کے درمیان زبانی سودا ہوتا ہے اور دلال اس کو کہہ دیتا ہے کہ اس زمین میں ایک قطعہ آپ کا ہے اور اس سے پیسے وصول کرلیے جاتے ہیں، اگر یہ شخص اپنا یہ قطعہ بیچنا چاہے تو اس کو صرف یہی دلال بیچے گا، اگر اس کو دوسرا خریدار مل بھی جائے تو بھی وہ اس کو دلال ہی سے کہے گا اور دلال ہی اس کو فروخت کرے گا اور اپنی دلالی بھی وصول کرے گا، اس طریقہ سے یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، جب کہ ابھی زمین کھیتی والے اصل مالک سے بھی ٹرانسفر نہیں ہوتی، کیا یہ شکل درست ہے؟

۱۳۔ کبھی کبھی خود کالونی بنانے والے ایسا کرتے ہیں کہ وہ پلاٹس بیچ دیتے ہیں اور قسطوں میں پیسہ بھی وصول کرلیتے ہیں، اب اگر خریدار کو بیچنا ہے تو اس کو بھی کالونی بنانے والے ہی سے رابطہ کرنا ہوگا، اگر کوئی گراہک لاتا ہے تو بھی اسی سے ملانا ہوگا، خود کالونی بنانے والا بھی نہیں چاہتا ہے کہ کوئی گراہک آئے، وہ خود ہی اس کو خرید لیتا ہے اور جو بھی قیمت میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا ہے، اس کو ادا کرتا ہے، کیا اس صورت میں پلاٹ خریدنے والے کی ملکیت زمین پر ثابت ہوگی؟

۱۴۔ ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ پلاٹ قسطوں میں بیچ دیا جاتا ہے اور خریدار اس میں سے مثلاً پانچ یا آٹھ قسطیں ادا کر پایا، باقی قسطیں ادا کرنے کی گنجائش نہیں رہی؛ تو حالانکہ سودا ہو چکا تھا، صرف بعض قسطوں کی ادائیگی باقی تھی؛ لیکن کالونی بنانے والا اپنی طرف سے اس سودے کو کینسل مانتا ہے، اب اگر بعد میں خریدار قسطیں ادا کرنا چاہے، یا اپنی زمین کا مطالبہ کرے تو اس کو کہہ دیتا ہے کہ چونکہ قسطیں وقت پر ادا نہیں ہوئیں؛ اس لئے آپ کا سودا کینسل ہوگیا، اور جتنی رقم قسطوں میں ادا کی گئی تھیں، اتنی ہی رقم اس کو واپس کر دیتا ہے؛ جبکہ اس نے جس وقت وہ زمین خریدی تھی، اس وقت اس کی قیمت بہت کم تھی اور اتنی ہی متعین ہوئی تھی، اور اب اس کی قیمت تقریباً پچاس گنا بڑھ چکی ہوتی ہے، کیا یہ درست ہے؟

۱۵۔ اسی طرح زمین کی دلالی سے متعلق کچھ مسائل ہیں:

الف: آسان شکل تو یہ ہے کہ دلال زمین کا گاہک لائے اور اپنی دلالی وصول کرلے؛ لیکن دلال زمین کی قیمت کالونی بنانے والے سے معلوم کرلیتا ہے، پھر اس کو اپنی من مانی قیمت پر بیچتا ہے، زمین والے نے جتنی قیمت بتلائی تھی، اتنی اس کو دے دیتا ہے اور باقی کو اپنے لئے جائز سمجھتا ہے، کیا یہ درست ہے؟

ب: دلال کمپنیاں جو شکل سب سے زیادہ استعمال کر رہی ہیں، وہ یہ ہے کہ زمین بیچ دیتے ہیں؛ لیکن قبضہ نہیں دیتے، اور ان کو کہہ دیتے ہیں کہ جب بھی آپ کو بیچنا ہو تو آپ یہ زمین ہمیں ہی واپس کریں گے، کسی اور کو نہیں، کیا یہ مشروط بیع جائز ہے؟



تجاویز:

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل

۱۔ شہر کی ضرورتوں سے وابستہ اراضی یا وہ اراضی جن کو حکومت نے کسی ضرورت کے لیے متعین کر رکھا ہے، پر قبضہ غصب ہے اور غاصبین سے ایسی اراضی کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، لیکن وہ اراضی جو شہروں کی ضرورتوں سے فاضل ہیں، یا حکومت نے اس کو کسی ضرورت کے لیے خاص نہیں کیا ہے ان کی خرید وفروخت کی گنجائش ہے، بشرطیکہ قانونی تقاضوں کی تکمیل کرلی جائے۔

۲۔ غیر مجاز طور پر اوقاف کی زمین کو فروخت کرنا ناجائز اور سخت گناہ ہے اور ایسے غاصبین سے اس کا خرید کرنا بھی درست نہیں ہے۔

۳۔ مورث کے انتقال کے بعد فوراً ہی ورثہ کے درمیان ترکہ کی تقسیم ہونی چاہئے؛ لیکن اگر ترکہ کی تقسیم نہیں ہوسکی اور کسی وارث نے مشترک اراضی کو فروخت کردیا تو یہ فروختگی صرف اس فروخت شدہ جائیداد میں اس کے حصہ کے بقدر محدود رہے گی اور اس کے حصہ سے زائد میں دیگر ورثہ کی اجازت کے بغیر درست نہیں ہوگی۔

۴۔ حرام مال سے جو زمین و جائیداد خریدی گئی ہے، حقیقت حال سے واقف حضرات کے لئے اس کا خریدنا جائز نہیں ہے، ہاں! لاعلمی کی صورت میں خریدنے سے خریدار کی ملکیت ثابت ہوجائے گی۔

۵۔ الف: کالونی بسانے کی خاطر جو لے آوٹ منظور کرایا جاتا ہے، اس کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، لیکن اس کی وجہ سے وہ زمین کالونی بسانے والے کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے منظور شدہ نقشہ کے برخلاف اپنے نقشہ کے مطابق بھی بیچنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ اس میں ضروری عوامی مفادات متاثر نہ ہوتے ہوں۔

ب: نقشہ کے مطابق قطعات کی فروخت ہوجانے کے بعد مفاد عامہ کے لئے متعین قطعات کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

۶۔ مسجد مسلمانوں کی اہم ترین دینی ضرورت ہے، اس لئے کالونی بننے سے پہلے اگر کالونی بنانے والا پلے گراؤنڈ وغیرہ جیسے مفاد عامہ کی زمین کو مسجد کے لئے تبدیل کردیتا ہے، نیز مسجد کے لئے مطلوبہ شرائط بھی پائی جاتی ہیں تو اس پر مسجد بنانا درست ہوگا اور وہ مسجد شرعی تصور کی جائے گی؛ البتہ کالونی بن جانے کے بعد مفاد عامہ کے قطعات سے تمام باشندگان کا حق متعلق ہوجاتا ہے؛ اس لئے باہمی رضامندی سے ہی مسجد بنائی جاسکتی ہے۔

۷۔ کالونی بسانے میں مسلمانوں کو چاہئے کہ قانونی طریقہ اختیار کریں؛ لیکن دشواریوں کے پیش نظر کالونیاں بسالی جائیں تو اس کی گنجائش ہے؛ البتہ قانونی منظوری حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھیں۔

۸۔ حتی الامکان سودی قرض سے بچنا لازم ہے؛ البتہ ضرورت کے وقت بینک سے قرض لیکر مکان خریدنے اور زمین خرید کر کالونیاں بسانے کی گنجائش ہے۔

۹۔ کالونی بنانے کے لئے نقشہ میں دکھائے گئے پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجاتی ہے اور خرید وفروخت کا یہ عمل درست ہے اور کالونی بسانے والے کیلئے اس میں کسی طرح کا تغیر وتبدل جائز نہیں ہے۔ اور اگر زمین کے بیچے گئے حصہ پر بیچنے والا خریدار کی اجازت سے کاشت بھی کرتا رہتا ہے تب بھی خریدار اس کا مالک رہے گا۔

۱۰۔ الف: زمین وجائیداد کی بیع میں قبضہ ضروری نہیں ہے صرف ملکیت میں آجانا کافی ہے؛ اس لئے زمین اگر کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آگئی ہو تو اس کو فروخت کرسکتا ہے اور خریدنے والا اس کو خرید سکتا ہے۔

ب: اگر زمین ملکیت میں نہیں آئی بلکہ ابھی صرف وعدۂ بیع ہوا ہے اور اس وعدہ کو مستحکم کرنے کے لیے بیعانہ کی رقم دی گئی ہے تو وہ اس کو آگے فروخت نہیں کرسکتا۔

ج: کالونی بسانے والا مالک زمین سے اپنی مرضی کے مطابق زمین کو فروخت کرنے اور مدت متعینہ میں قیمت ادا کرنے کا معاملہ طے کرلیتا ہے اور اس کے لیے بیعانہ کے نام پر کچھ رقم بھی ادا کردیتا ہے تو یہ معاملہ کرنا اور اس کی خرید وفروخت کرنا شرعاً جائز ہے؛ البتہ اگر فروخت کرنے کے بعد آئندہ قبضہ دلانے میں کوئی قانونی رکاوٹ پیش آتی ہے تو اس کی پوری ادا کردہ قیمت واپس کرنی لازم ہوگی۔

۱۱۔ دلال کے ذریعہ خرید وفروخت کا یہ طریقہ جس میں زمین اور مالک زمین کا کچھ پتہ نہ ہو، ناجائز نہیں ہے۔

۱۲۔ پلاٹس کے مالک کا معاملے کو اس طرح مشروط کرنا کہ جب خریدار بیچنا چاہے تو بیچنے والے سے ہی فروخت کرسکتا ہے، جائز نہیں ہے؛ البتہ بغیر کسی پیشگی شرط کے معاملہ کیا جائے پھر معاملہ کے دونوں فریق اپنی رضا ورغبت سے اپنی سہولت کے لیے اس طرح کا وعدہ کرلیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۱۳۔ قسطوں پر زمین کی خریداری کی یہ شکل کہ ''اگر متعینہ مدت تک قیمت ادا نہیں کی گئی تو معاملہ کینسل ہوجائے گا'' اگر اس کی وضاحت معاملہ کے وقت ہی کردی جائے تو اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے اور مقررہ وقت پر پوری قسطیں ادا نہ کرنے کی صورت میں اس کو صرف اپنی جمع کردہ قسطوں کی واپسی کا حق ہوگا۔

۱۴۔ دلال کی اجرت جائز ہے، مگر اجرت کا معلوم ہونا اور معاملہ کا صاف ستھرا ہونا ضروری ہے، لہٰذا زمین کی خرید وفروخت کے دلال کا ایک فریق سے قیمت کو چھپا کر زیادہ لینا یا جھوٹ بول کر زیادہ لینا جائز نہیں ہے۔

۱۵۔ دلال کا قبضہ نہ دلانا بیع کے تقاضا کے خلاف ہے اور ظلم ہے، نیز شرط لگانا کہ جب بھی بیچنا ہو ہم سے بیچنا ہوگا شرط فاسد ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔



تلخیص مقالات:

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

مفتی امتیاز احمد قاسمی [1]

''إن الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله وعلى آله وصحبه أجمعين''۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے چھبیسویں فقہی سمینار میں جن چار اہم موضوعات پر بحث وتحقیق اور مناقشہ ہونا ہے ان میں ایک موضوع ''زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل'' ہے، جس کے تحت ۱۵ رسوالات قائم کئے گئے ہیں، اور اہل علم وتحقیق سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ ان سوالات کا مفصل جواب قرآن وسنت، آثار صحابہ، اجتہادات فقہاء اور عرف وعادت کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔

چنانچہ اکیڈمی کو تلخیص کا کام شروع ہونے تک اس موضوع پر کل ۲۰ رمقالات موصول ہوئے، جس کی تلخیص کی ذمہ داری اکیڈمی نے مجھے دی ہے، تاکہ ایک دوسرے کی آراء اور دلائل سے واقف ہوا جاسکے، ان مقالات میں سے بعض بہت مفصل ہیں، جس میں موضوع کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کا احاطہ ہے، بلکہ بہت سے متعلقات بھی ذکر کئے گئے ہیں جن سے اصل مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، بعض مختصر ہیں، لیکن سوالات کے مکمل جوابات مع دلائل موجود ہیں، جبکہ بعض مقالے بہت ہی مختصر ہیں، مقالہ نگار کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی ظہیر احمد قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی، ڈاکٹر حافظ کلیم اللہ عمری، ڈاکٹر محی الدین غازی، مفتی عبد المنان آسام، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی ابصار احمد ندوی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی عبد الحمید قاسمی دیناجپوری۔

اس موضوع کا پہلا سوال یہ ہے:

سوال نمبر (۱): بعض لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر سرکاری اراضی پر قابض ہوجاتے ہیں اور انہیں فروخت کرتے ہیں، رشوت کے ذریعہ سرکاری عہدہ داروں سے وہ لے آوٹ بھی منظور کروالیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بڑے شہروں میں بہت ساری زمینیں اسی طور پر فروخت ہوتی ہیں، پھر خریدار اسے دوسرے خریدار سے بیچ دیتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ اس پر مکان تعمیر کرتے جاتے ہیں اور کچھ اسے آگے فروخت کرتے جاتے ہیں، ایسی زمینوں کا کیا براہ راست قابضین سے خریدنا یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا جائز ہوگا؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے بعض مقالہ نگار نے غصب کی تعریف، غصب کی حرمت اور غصب کرنے والوں پر وارد وعید اور گناہ کا تذکرہ کیا ہے۔

اسی طرح منقولہ وغیر منقولہ اموال میں حنفیہ اور جمہور کا اختلاف، غصب اور قبضہ میں فرق وغیرہ کو بالتفصیل ذکر کیا ہے (دیکھئے مقالہ: ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مولانا زبیر ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی وغیرہ)، جبکہ ابتداء مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی اور مولانا ابوسفیان مفتاحی وغیرہ نے اراضی کی اہمیت وافادیت، اس کی مختلف نوعیتیں مثلاً: ذاتی زمین، اراضی موقوفہ، غیر مزروعہ اور بنجر زمین اور اراضی سلطانیہ یعنی سرکاری زمینیں اور ان کے مختلف احکام کو اپنے مقالہ میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد سوال کا جواب دیتے ہوئے تقریباً تمام مقالہ نگاران نے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ ایسی زمینوں پر کسی طرح کا تصرف اور خرید وفروخت حرام اور ناجائز ہے اور خریدی ہوئی کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا بھی حرام اور ناجائز ہے (ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محی الدین غازی فلاحی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی

[1] رفیق شعبہ علمی، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

محمد مقصود فرقانی اور مولانا عبد الحمید قاسمی وغیرہ)۔

دلائل:

اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس لئے کہ ایسی زمینیں سرکاری اراضی ہوتی ہیں جو مال عام ہیں، جن پر کسی فرد کی ملکیت نہیں ہوتی، بلکہ وہ ساری قوم کی ملکیت ہوتی ہے اور جس کے تصرف کا حق مصلحت وضرورت کے مطابق حاکم وقت کو ہوتا ہے، لہذا مال عام پر ہر طرح کی دست درازی باطل طریقہ سے مال کو برتنے میں داخل ہے، جو شریعت میں ممنوع ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "یاأیھا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل" (سورہ نساء: ۲۹)

تفسیر روح المعانی میں ہے: "الباطل" الحرام کالسرقة والغصب وکل ما لم یأذن بأخذه الشرع" (روح المعانی ۲/ ۱۰۵) (ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی الیاس قاسمی، مولانا ابصار احمد ندوی وغیرہ)۔

۲۔ مال عام کو ذاتی ملکیت بنالینا گویا دوسروں کے حق کو فوت کرنا، ظلم وعدوان، اللہ کے مال میں ناجائز تصرف اور حقوق العباد کی پامالی اور خیانت ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲) (مقالہ: مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۳۔ "عن خولة الأنصارية قالت: سمعت النبی ﷺ یقول: إن رجالًا یتخوضون فی مال الله بغیر حق فلھم النار یوم القیامة" (صحیح بخاری، حدیث: ۳۱۱۸، مسند احمد حدیث: ۲۷۳۱۸) (مقالہ: مولانا ابصار احمد ندوی، مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۴۔ "عن أبی حرة الرقاشی عن عمه قال: قال رسول الله ﷺ: "ألا لا تظلموا ! ألا لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفسه" (مرقاۃ المفاتیح ۶/ ۱۳۵) (مولانا محمد عفان منصور پوری، مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۵۔ "لا یجوز لأحد أن یتصرف فی ملك الغیر بغیر إذنه" (قواعد الفقہ / ۱۱۰) (مولانا محمد عفان منصور پوری، مفتی محمد الیاس قاسمی)

۶۔ یہ ایسی چیز کی بیع ہے جو بائع کی ملکیت میں ہے ہی نہیں: "منھا أن یکون مملوکًا، لأن البیع تملیك، فلا ینعقد فیما لیس بمملوك"، ... ومنھا: ہو شرط انعقاد البیع للبائع أن یکون مملوکًا للبائع عند البیع، فإن لم یکن لا ینعقد...." (بدائع الصنائع ۴/ ۳۳۹، ۳۴۰) (مقالہ مولانا محمد عفان منصور پوری)۔

۷۔ "لا یجوز التصرف فی مال غیره بلا إذنه ولا ولایته" (الدر المختار علی رد المحتار ۹/ ۲۴۰) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۸۔ معلوم ہونے کے باوجود غیر قانونی زمین خریدنا گویا تعاون علی الاثم ہے جو کہ ایک مسلمان کے لئے کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲) (ڈاکٹر حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

اگر پلاٹس خریدنے والوں کو اس بات کا علم نہ ہو کہ آیا یہ سرکاری مقبوضہ اراضی ہیں یا غیر قانونی طور پر کالونی پاس کرائی گئی ہے تو وہ گناہ گار نہیں ہوں گے، البتہ معلوم ہونے کے بعد اصل مالک سے مصالحت واجب ہوگی؛ خواہ یہ مصالحت شئ مغصوب کو واپس لوٹانے کے ذریعہ ہو یا اس کے عوض اور معاوضہ کی ادائیگی کے ذریعہ۔

* "لو ظهر غیر حلال أی مسروقًا أو مغصوبًا یرجع علیه المشتری" (رد المحتار ۵/ ۴۲)۔
* "لو باع السارق المسروق من إنسان أو ملك منه بوجه من الوجوه فإن كان قائمًا فلصاحبه أن یأخذه لأنه عین ملکه وللمأخوذ منه أن یرجع علی السارق" (بدائع الصنائع ۷/ ۸۵)

(مولانا محمد عفان منصور پوری، مفتی عثمان بستوی، مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

* "یجب رد عین المغصوب لقوله علیه السلام: علی الید ما أخذت حتی ترد، ولقوله علیه السلام: لا یحل لأحدکم أن یأخذ مال أخیه لاعبًا ولا جادًا وإن أخذه فلیرد علیه" (رد المحتار ۹/ ۲۶۶)

(مولانا محمد زبیر ندوی، مولانا عفان منصور پوری)۔

* ''علی الغاصب رد المغصوب إلی صاحبه إذا کان المغصوب قبیل العقار من دون أن یغیره أو ینقصه لأنه إذا کان المال المغصوب موجودًا عینًا یرد إلی صاحبه'' (شرح المجله ۲/ ۵۷۱) (مولانا محمد زبیر ندوی)۔

* ''إن کان المغصوب أرضًا وهو قائم بید الغاصب، فلا یجوز للآخر أن یشتریه منه، ولو اشتری فالبیع موقوف عند الحنفیة علی إجازة المالك، فلو فسخ المالك البیع انفسخ، ووجب علی المشتری أن یرده، وعلی البائع أن یرد الثمن'' (فقه البیوع ۲/ ۱۰۰۸) (مفتی عثمان بستوی)۔

* ''...... حکمه لغیر من علم أنه مال الغیر: الرد أو الغرم فقط دون الإثم، فلا إثم لأنه خطأ وهو مرفوع بالحدیث'' (الدر المختار مع رد المحتار ۹/ ۲۶۳) (مفتی عثمان بستوی)۔

☆ مفتی محمد الیاس قاسمی اور مفتی عثمان بستوی کی رائے ہے کہ لینڈ گرابرس یا غنڈہ عناصر سے ان مقبوضہ سرکاری اراضی کی بیع حکومت کی اجازت پر موقوف ہوگی: ''من باع ملك غیره بغیر أمره فالمالك بالخیار، إن شاء أجاز البیع وإن شاء فسخ'' (ہدایہ ۳/ ۱۳۴)۔

* ''البیع الذی یتعلق به حق الغیر کبیع الفضولی وبیع المرہون ینعقد موقوفًا علی إجازة ذلك الآخر'' (مجلة الاحکام، کتاب البیوع رقم المادة: ۳۶۸)۔

پھر مفتی عثمان بستوی اور مولانا محی الدین غازی لکھتے ہیں کہ اگر سرکاری حکام ملکی قوانین اراضی کی مخالفت کرتے ہوئے کسی غیر مستحق کو زمین الارٹ کرتے ہیں خواہ رشوت لیا ہو یا نہ لیا ہو، کسی بھی صورت میں اس الاٹمنٹ کو نافذ نہیں مانا جائے گا، بلکہ یہ کالعدم ہے، اس لئے اس کا مالک علی حالہ حکومت ہوگی۔

''ارتشی ہو أو أعوانه بعلمه وحکم لا ینفذ حکمه وهو الصحیح ولو قضی لم ینفذ وبه یفتی وفی الخانیة أجمعوا علی أنه إذا ارتشی لا ینفذ قضاءه فیما ارتشی فیه'' (الدر المختار مع رد المحتار ۸/ ۳۵ ملخصا)۔

جبکہ بعض دوسرے مقالہ نگار مثلاً مفتی عبدالمنان آسام اور مولانا زبیر ندوی نے اس میں فرق کیا ہے کہ اگر مغصوبہ اراضی پر سرکاری منظوری مل گئی، اگرچہ رشوت وغیرہ کے ذریعہ سے ہی ہو تو وہ اس کا مالک ہوجائے گا اور اس کا دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا اور دوسروں کا اس سے خریدنا بھی جائز ہوگا:

''الغاصب إذا باع المغصوب من رجل ثم باعه المشتری من الآخر حتی تداولته الأیدی ثم إن المالك أجاز عقدًا من العقود جاز ذلك العقد'' (الفتاوی الهندیه ۳/ ۱۱۱) (مولانا زبیر ندوی)۔

* ''من غصب عبدًا فباعه وأعتقه المشتری ثم أجاز المولی البیع فالعتق جائز استحسانًا وهذا عند أبی حنیفة ......'' (فتاوی تاتارخانیه ۸/ ۳۴۶) (مولانا عبدالمنان آسام)۔

اسی طرح مولانا زبیر ندوی صاحب نے اس صورت میں بھی فرق کو واضح کیا ہے کہ اگر مغصوبہ اراضی کی مرمت کردی یا وہ بنجر زمین تھی اس کو آباد کردیا یا اس پر تعمیر کردی گئی جس کو فقہاء کی اصطلاح میں ''تغیر فاحش'' کہتے ہیں اور اس کی تعمیر کی لاگت زمین کی قیمت سے زیادہ ہے یا برابر ہے یا کم ہے، لیکن حکومت یا مالک اراضی کچھ قیمت لے کر راضی ہوجاتا ہے تو غاصب پر عین شئی کا لوٹانا واجب نہیں ہے، بلکہ ان پر ضمان یا قیمت ادا کرنا واجب ہے:

* ''وإنه حینئذ یتسلم الغاصب العین ویدفع قیمتها أو یدفعها ویضمن نقصانها والخیار فی ذلك للمالك'' (رد المحتار ۹/ ۲۶۶)۔

* ''إذا کان المغصوب أرضًا وکان الغاصب أنشأ علیها بناء أو غرس فیها أشجارًا یؤمر الغاصب بقلعها وإن کان القلع مضرًا بالأرض فللمغصوب منه أن یعطی قیمته مستحق القلع ویضبط الأرض ولکن لو کانت قیمة الأشجار أو البناء أزید من قیمة الأرض وکان قد أنشأ أو غرس بزعم شرعی کان حینئذ لصاحب البناء أو الأشجار أن یعطی قیمة الأرض ویتملکها'' (شرح المجله ۲/ ۵۷۳، ماده: ۹۰۶) (مولانا زبیر ندوی)۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی کی نگاہ میں براہ راست قابضین اور ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا درست ہے، وہ لکھتے ہیں: حضرت امام ابوحنیفہؒ کے یہاں غصب کرتے ہی غاصب مغصوب کا مالک سمجھا جائے گا ضمان دینے کے بعد، اگر ایسا نہ مانیں تو ایک ہی شخص بدل اور مبدل منہ دونوں کا مالک ہوجائے گا،

اس لئے مغصوب میں غاصب کا تصرف ضمان سے پہلے درست ہوجاتا ہے، اگرچہ بعض فقہاء نے قبل اداء ضمان تصرف سے منع فرمایا ہے۔

* ''لو تصرف فی المغصوب بالبیع أو الهبة أو الصدقة قبل أداء الضمان ینفذ تصرفه کما نفذ تصرفات المشتری فی المشتری شراء فاسدًا'' (الفقه الاسلامی وادلته ۵/ ۷۳۳)۔

* ''ولأبی حنیفة أن الأصل مضمون بالغصب الأول فلا یقع البیع والتسلیم غصبًا ..... ثم إذا ضمن المالك الغاصب قیمة المغصوب وقت الغصب أو وقت البیع والتسلیم جاز البیع لأنه تبین أنه باع ملك نفسه .....'' (بدائع الصنائع ۶/ ۱۳۲، ۱۳۳)۔

☆ مزید تائید اس عبارت سے ہوتی ہے: ''ألا تری أنه لو وہبه أو باعه جاز. وجه الاستحسان: قوله علیه السلام فی الشاة المذبوحة المصلیة بغیر رضا صاحبها: (أطعموہا الأساری)'' (ہدایه مع فتح القدیر ۷/ ۳۷۷)۔

سوال نمبر (۲): ایک افسوس ناک حقیقت یہ بھی ہے کہ بعض دفعہ خود مسلمان اوقاف کی زمین غصب کر لیتے ہیں، کبھی تو یہ زمین اتنی دور افتادہ ہوتی ہے کہ مقصد وقف کو اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ پاتا ہے، بعض اوقات غیر مسلم حضرات کے قابض ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے، یا وہ اس کے کچھ حصے پر قابض ہو چکے ہوتے ہیں، اور بعض دفعہ ایسی زمین بھی ہوتی ہے کہ جس کی واقعی مسجد و مدرسہ وغیرہ کو ضرورت ہوتی ہے؛ لیکن صرف اللہ سے بے خوفی اور مال کی حرص ولالچ کی وجہ سے ان پر ناجائز قبضہ ہوجاتا ہے۔ اوقاف کی ان مختلف قسم کی مغصوبہ زمینوں کو خریدنے کا کیا حکم ہے؟

چند مقالہ نگار کے علاوہ تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ چونکہ وقف مکمل ہونے کے بعد وہ انسانوں کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالی کی ملکیت میں داخل ہوجاتا ہے، اس لئے اوقاف کی مغصوبہ اراضی کو خریدنا حرام ہے اور ایسی بیع بیع باطل ہے (ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا عبدالمنان آسام، مفتی ظہیر احمد قاسمی، مولانا محی الدین غازی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی مقصود فرقانی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا ناز بیر ندوی، مولانا عبدالحمید قاسمی وغیرہ)۔

دلائل:

ان حضرات کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ ''فإذا تم ولزم لا یملك ولایملك ولا یعار ولا یرهن .... قوله (لایملك) أی لا یکون مملوکًا لصاحبه ولایملك أی لا یقبل التملیك بغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیك الخارج عن ملکه ولایعار ولا یرهن لاقتضائهما الملك'' (الدر المختار مع ردالمحتار ۶/ ۵۴۱، کتاب الوقف)

(مقالہ: مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عفان منصور پوری، مولانا عبدالحمید قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی وغیرہ)۔

۲۔ ''إذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه، قال ابن الهمام: لم یجز بیعه ولا تملیکه وهو بإجماع الفقهاء. أما انتفاء التملیك فلما بین من قوله علیه السلام: تصدق بأصلها لا یباع ولا یورث ولایوهب'' (فتح القدیر مع الهدایه ۶/ ۲۲۰)

(مقالہ مولانا عفان منصور پوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی وغیرہ)۔

۳۔ وقف کی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کو واقف کی منشا کے خلاف استعمال کرنا شرعًا درست نہیں ہے (حافظ کلیم اللہ عمری)۔

۴۔ وقف کا اصلی حکم یہ ہے کہ اس کی خرید وفروخت نہ ہو، اور اس میں وقف کی مصلحت کے مطابق تصرف کرنے کا حق صرف متولی کو ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تصدق بأصله، لا یباع ولا یوهب ولا یورث ولکن ینفق ثمره'' (صحیح بخاری حدیث: ۲۷۶۴، صحیح مسلم حدیث: ۱۶۳۲) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی)۔

۵۔ علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: ''وظاہر قولهم إن الوقف لا یملك ولا یباع یقتضی أن الوقفیة لا تبطل بالخراب ولا

تعود إلی ملك الواقف و وارثه'' (البحر الرائق ۵/ ۲۲۳، کتاب الوقف)۔
تو جب وقف ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے تو پھر اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو اپنے لئے خریدنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۶۔ جب ایک عام مسلمان کے مال کی اتنی حرمت ہوتی ہے تو پھر اوقاف کی کتنی حرمت ہوگی، جو اللہ تعالی کی ملکیت میں ہیں:

''إن دماءکم وأموالکم وأعراضکم بینکم حرام کحرمة یومکم ہذا، فی شہرکم ہذا، فی بلدکم ہذا'' (صحیح البخاری حدیث: ۶۷، ۱۰۵، صحیح مسلم حدیث: ۱۶۷۹) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

ان حضرات نے ان دلائل کے علاوہ تقریباً سب وہ دلائل پیش کئے ہیں جو جواب نمبر ایک کے ذیل میں درج ہیں، مثلاً:

۱۔ اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو اوقاف کی حد میں لوٹانا واجب ہے، اس لئے کہ دیگر غصب کردہ اموال کی طرح غصب کی ہوئی وقفی زمین کا بھی یہی حکم ہے، امام سرخسی لکھتے ہیں: ''الحکم الأصلی الثابت بالغصب وجوب رد العین علی المالك بقوله ﷺ: علی الید ما أخذت حتی ترد'' (ابوداؤد حدیث: ۳۵۶۱)، ''وقال ﷺ: لا یحل لأحد أن یأخذ متاع أخیه لاعبًا ولا جادًا، فإن أخذه فلیرد'' (ابوداؤد، حدیث: ۵۰۰۳) .... ''ومن ضرورة کونه أحق بالعین وجوب الرد علی الآخذ'' (المبسوط ۱۱/ ۴۲)
(مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ریاست علی قاسمی، مولانا ابصار ندوی)۔

۲۔ ''لم یحل للمسلم أن یشتری شیئًا یعلم أنه مغصوب أو مسروق أو مأخوذ من صاحبه بغیر حق'' (الحلال والحرام للقرضاوی/ ۲۱۶) (مولانا زبیر ندوی)۔

۳۔ ''اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ جو شخص کسی آدمی کا مال غصب کرے تو وہ اس کا ضامن قرار پائے گا، پھر اگر غصب کی ہوئی چیز موجود اور اپنی حالت پر قائم ہو تو غاصب پر اس کے عین کو واپس کرنا لازم ہوگا، بشرطیکہ اس میں ایسا عیب داخل نہ ہو جائے جو اس کی منفعت کو کم کر دے، اس لئے کہ حضرت سمرہ بن جندبؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''علی الید ما أخذت حتی تؤدی'' (موسوعہ فقہیہ ۳۶/ ۱۵۷) (مولانا ابصار احمد ندوی)۔

اوقاف کی منتقلی کی اجازت:

البتہ ایسے اوقاف جن پر قبضہ کر لینے کا غالب گمان ہو یا قابل انتفاع نہ ہو یا دور افتادہ ہو تو متولی وقف کے لئے درست ہے کہ اراضی موقوفہ کو فروخت کر کے اس کی رقم دوسرے اوقاف میں لگائی جائے جو منشاء واقف کے مطابق ہو، ایسا کرنا درست ہے (مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا عفان منصور پوری، مولانا محی الدین غازی، مفتی الیاس قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عبد المنان آسام وغیرہ)۔

دلائل:

۱۔ ''سئل الحلوانی عن أوقاف إذا تعطلت وتعذر استغلالها هل للمتولی بیعها ویشتری مکانها أخری؟ قال: نعم'' (البحر الرائق ۵/ ۳۴۵) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۲۔ ''سئل شمس الأئمة الحلوانی عن مسجد أو حوض خرب ولا یحتاج إلیه لتفرق الناس، هل للقاضی أن یصرف أوقافه إلی مسجد آخر أو حوض آخر؟ قال: نعم'' (الفتاوی التاتارخانیہ ۸/ ۱۹۶) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی)۔

۳۔ ''سئل شیخ الإسلام عن أهل قریة افترقوا وتداعی مسجد القریة إلی الخراب وبعض المتغلبة یستولون علی خشب المسجد وینتقلونها إلی دیارهم، هل لواحد من أهل القریة أن یبیع الخشب بأمر القاضی ویمسك الثمن لیصرفه إلی بعض المساجد أو إلی هذا المسجد؟ قال: نعم'' (الفتاوی التاتارخانیہ ۸/ ۱۹۷)
(مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا عبد الحمید قاسمی وغیرہ)۔

۴۔ ''فلا یجوز بیع الوقف بعد تمامه عند جمهور الفقهاء إلا أن یخرب أو تتعطل منافعه فیجوز فی هذه الأحوال بیعه

بمعرفة القاضي بثمن المثل ويشترى بثمنه وجوبًا وقف آخر يحل محله. ويجوز نقل الوقف من هذا السبيل إلى سبيل آخر إذا تعذر الانتفاء في المكان الأول وإذا لم يتعذر لم يجز'' (الفتاوى الشرعيه) (مفتی محمد مقصود فرقانی)۔

۵۔ ''قال هشام: سمعت محمدًا يقول: الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره، وليس ذلك إلا للقاضي'' (البحر الرائق ۵/ ۲۴۵) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۶۔ ''قيم خاف من السلطان أو من وارث يغلب على أرض وقف يبيعها ويتصدق بثمنها وكذا كل قيم إذا خاف شيئًا من ذلك له أن يبيع ويتصدق بثمنها'' (حوالہ سابق) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۷۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی تحریر فرماتے ہیں: ''وإذا خرب الوقف ولم يرد شيئًا بيع واشتري بثمنه ما يرد على أهل الوقف وجعل وقفًا كالأول'' (المغني ۵/ ۳۶۸) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۸۔ ''رجل وقف موضعًا في ساحة وأخرجه عن يده فاستولى عليه غاصب وحال بين الوقف وبينه. قال شيخ الإسلام أبو بكر محمد بن الفضل: يأخذه من الغاصب قيمتها ويشتري بها موضعًا آخر فيقفه على شرائط الأول'' (فتاوى قاضي خان على هامش الهنديه ۳/ ۳۱۲) (مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

۹۔ ''والثاني أن لا يشترطه، سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شيء أصلًا أو لا يفي بمؤنته فهو أيضًا جائز على الأصح'' (رد المحتار ۶/ ۵۸۳) (مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی الیاس قاسمی)۔

۱۰۔ ''ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجدًا عند الإمام والثاني أبدًا إلى يوم القيامة وبه يفتى'' (الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۵۴۸) (مفتی الیاس قاسمی)۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی صاحب حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی مفصل تحریر، حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری کا فتوی اور درمختار مع ردالمحتار کی عبارت ''فإذا تم ولزم لا يملك ولا يعار ولا يرهن....'' کے بعد لکھتے ہیں:

''احقر کے نزدیک موقوفہ کی بیع باطل ہے، الا یہ کہ اس کے دست وبرد اور ضائع ہونے کا یقین کامل ہو تو اسے بیچ کر واقف کی منشاء کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوسری جائیداد خریدی جاسکتی ہے''۔

ڈاکٹر شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں:

''عام حالتوں میں وقف کی چیز کو بیچ کر اس سے دوسری چیز خریدنا یا دوسری شئی سے وقف کردہ شئی کا تبادلہ کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اوقاف کا تبادلہ صرف مخصوص صورتوں میں جائز ہے، اور ان صورتوں میں بھی شرط یہ ہے کہ دوسرے مقامات پر اسی نوع کے متبادل اوقاف قائم کئے جائیں، جیسا کہ علامہ شامیؒ رقمطراز ہیں:

''لا يستبدل العامر إلا في أربع: الأولى: لو شرطه الواقف. الثانية: إذا غصبه غاصب وأجرى عليه الماء حتى صار بحرا، فيضمن القيمة، ويشتري المتولي بها أرضًا بدلًا. الثالثة: أن يجحده الغاصب ولا بينة، أي: وأراد دفع القيمة، فللمتولي أخذها ليشتري بها بدلا. الرابعة: أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن صقعًا. فيجوز على قول أبي يوسف. وعليه الفتوى، كما في فتاوى قارئ الهداية'' (رد المحتار ۴/ ۳۸۸، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ)

آباد زمین کا تبادلہ کرنا صرف چار ہی صورتوں میں جائز ہے، پہلی صورت یہ ہے کہ واقف نے اس کی شرط لگادی ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ غاصب نے وقف کی زمین غصب کرلی ہو اور اس پر اس طرح پانی بہادیا ہو کہ وہ تالاب بن جائے، تو اب غاصب قیمت کا ضامن ہوگا، اور متولی اس قیمت سے دوسری زمین خریدے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ غاصب اس زمین کے غصب سے انکار کرتا ہو، اور گواہان موجود نہ ہوں، اور غاصب قیمت دینے کو تیار ہو جائے، تو متولی اس زمین کے بدلہ قیمت لے سکتا ہے، تا کہ اس کے ذریعہ دوسری زمین خرید کر متبادل وقف قائم کر سکے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ اس وقف کو کوئی شخص ایسا بدل دے کر لینا چاہتا ہو جو پیداوار اور محل وقوع کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہو، تو امام ابو یوسف کے قول پر اس صورت میں تبادلہ کرنا جائز ہے، اور اسی پر فتوی ہے، جیسا کہ "قاری الہدایہ" کے فتاوی میں ہے)، تو جب اوقاف کا تبادلہ شرطوں کے ساتھ مشروط ہے تو پھر اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو اپنی ذات کے لئے خرید کر غاصبین کی حوصلہ افزائی کیونکر جائز ہوگی؟"۔

مفتی محمد الیاس قاسمی صاحب نے اوقاف کی ناقابل انتفاع اراضی کو فروخت کرنے کے لئے کچھ شرائط کو ذکر کیا ہے:

۱۔ ان اراضی کو معمولی قیمت پر نہیں، بلکہ مارکیٹ ویلو پر فروخت کیا جائے۔

۲۔ تبادلہ اوقاف کا مجاز عام متولیوں کے بجائے دیانتدار و ذمہ دار ادارہ کو بنایا جائے۔

۳۔ موقوفہ اراضی کے بدلے اراضی ہی حاصل کی جائے، نقد سے تبادلہ نہ ہو اور اگر ہو تو فوراً ہی اس سے غیر منقولہ جائیداد خرید لی جائے۔

۴۔ لیکن ذمہ دار ادارہ اس کو قاضی کی اجازت سے ہی فروخت کر سکتا ہے اور قاضی کے لئے مناسب ہے کہ اگر اس کے پاس یہ معاملہ آئے اور وہ دیکھے کہ وقف غیر منافع ہو چکا ہے اور مستحقین وقف کا مفاد اس کو بیچنے میں ہے تو بیچنے کی اجازت دے (الدر المختار علی رد المحتار ۶/ ۵۸۵-۵۸۷)۔

مفتی محمد عثمان بستوی صاحب ان شرائط میں ایک احتیاطی شرط کا اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لہذا جن ممالک میں حکومت اسلامی یا اس طرح کے قضاۃ مفقود ہوں ان جگہوں میں اوقاف کی حفاظت کے لئے فروختگی میں شرط لازمی ہے کہ فروختگی کا فیصلہ متدین اصحاب بصیرت علماء پر مشتمل کوئی جماعت کرے، ورنہ عمومی طور پر اوقاف کو خرد برد سے محفوظ رکھنا ممکن نہیں۔

سوال نمبر (۳): بعض زمین موروثی طور پر ملتی ہیں، لیکن جن لوگوں کو زمین حاصل ہوتی ہے، ان کے والد یا دادا کے وقت میں وراثت کی شرعی طور پر تقسیم نہیں ہوئی تھی، جیسے والد نے پھوپھیوں کو حصہ نہیں دیا تھا، یا دادا نے اپنی بہنوں کو حصہ نہیں دیا تھا، اب بیٹوں یا پوتوں سے ان کی ایسی موروثی زمین کا خرید کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

مکروہ ہے:

اس سوال کے جواب میں بعض مقالہ نگار کی رائے ہے کہ جو موروثی زمین فروخت ہو رہی ہے اگر اس میں تمام شرکاء زمین کی رضامندی شامل نہیں ہے اور بیٹے اور پوتے نے دوسرے شرکاء کی زمین الگ بھی نہیں کی ہے تو ایسی موروثی زمین کا خریدنا مکروہ ہوگا (مفتی عثمان بستوی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا عفان منصور پوری، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

دلائل:

۱۔ "يشترط في لزوم ونفاذ قسمة الرضا، رضاء كل واحد من المتقاسمين، بناء عليه إذا غاب أحد المتقاسمين، ولم يكن له نائب وقسم الحاضرون وأفرزوا حصة الغائب، فلا تصح قسمة الرضا، أي لا تكون لازمة"

(درر الحکام ۳/ ۱۲۷) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۲۔ مشترکہ جائیداد میں تمام شرکاء کی اجازت سے ہی تصرف کیا جا سکتا ہے: علامہ علاء الدین سمرقندی لکھتے ہیں:

"شركة الأملاك على ضربين: أحدهما: ما كان بفعلهما مثل أن يشتريا أو يوهب لهما أو يوصى لهما فيقبلا، والآخر بغير فعلهما وهو أن يرثا، والحكم في الفصلين واحد، وهو أن الملك مشترك بينهما، وكل واحد منهما في نصيب شريكه كالأجنبي، لا يجوز له التصرف فيه إلا بإذنه" (تحفة الفقهاء ۳/ ۵ طبع بيروت) (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی)

۳۔ ''لا یجوز لأحد أن یتصرف فی ملك غیره بغیر إذنه.....'' (قواعد الفقه/ ۱۱۰، فتاوی شامی ۹/ ۲۹) (مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست قاسمی)۔

۴۔ اس لئے کہ بائع کے مال میں حرام کا بھی حصہ ہے، جس کی وجہ سے معاملہ میں اشتباہ ہے اور ایسی حالت میں نبی کریم ﷺ نے صریح ممانعت کی جگہ شبہ سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے:

''فمن اتقی الشبهات استبرأ لدینه وعرضه، ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام، کالراعی یرعی حول الحمی یوشك أن یرتع فیه'' (صحیح بخاری، حدیث: ۵۲، صحیح مسلم، حدیث: ۱۵۹۹) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)

بیع موقوف ہوگی:

جبکہ بعض دوسرے مقالہ نگار کی رائے ہے کہ ایسی موروثی زمینوں کو خریدنے کی صورت میں بیع موقوف ہوگی، اس لئے کہ شرط نفاذ نہیں پائی جارہی ہے، اجازت کے بعد اس کے اپنے حصہ کی بیع درست ہوجائے گی (مقالہ: ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

دلائل:

۱۔ ''إن کان فی المبیع حق لغیر البائع کان العقد موقوفًا غیر نافذ'' (الفقه الاسلامی وادلته ۴/ ۲۴۲) (قاری ظفر الاسلام اعظمی)

۲۔ ''وکل منهما أجنبی فی نصیب الآخر حتی یجوز له التصرف فیه إلا بإذن الآخر کغیر الشریك لعدم تضمنها الوکالة'' (مجمع الانهر ۲/ ۵۴۳) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۳۔ ''أن لا یکون فی المبیع حق لغیر البائع، فإن کان لا ینفذ کالمرهون والمستأجر. واختلفت عبارات الکتب فیها، ففی بعضها أنه فاسد والصحیح أنه موقوف ویحمل الفساد علی أنه لا حکم له ظاهرًا، وهو تفسیر الموقوف عندنا'' (البحر الرائق ۵/ ۴۳۴، کتاب البیوع) (مولانا زبیر احمد ندوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی)۔

جبکہ باقی مقالہ نگار نے شرائط وقیود کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے، مثلاً:

ڈاکٹر کلیم اللہ عمری اور مولانا زبیر احمد ندوی لکھتے ہیں کہ خریدار کو اس کا علم نہ ہو کہ یہ مشترکہ موروثی زمین ہے، صرف بائع کا حصہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس کے لئے خریدنا جائز ہے، لیکن اگر معلوم ہوجانے کے بعد خریدتا ہے تو تعاون علی المعصیت کی وجہ سے جائز نہ ہوگا۔

* ''فإن اشتری وقیل وهو لا یعلم أنه لغیره وأخبره أنه له، رجوت أنه فی سعة من شراه وقبوله. والتنزه أفضل'' (المبسوط للسرخسی ۳/ ۱۲۲) (مولانا زبیر احمد ندوی)۔

☆ قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی اور مولانا عبدالحمید قاسمی کی رائے ہے کہ وارثین کے لئے اپنے حصہ کے بقدر اراضی فروخت کرنا اور دوسروں کے لئے ان کا خریدنا جائز ہوگا۔

☆ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں: البتہ شریک اپنے حصہ میں ایسا تصرف کرسکتا ہے جس سے دوسرے کی حق تلفی نہ ہوتی ہو، لہذا اس کے حصہ کے بقدر خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن دوسرے شرکاء کو حق شفعہ حاصل ہوگا، اگر وہ لوگ نہیں لیتے ہیں تو پھر خریدار ایک شریک کی مانند ہوجائے گا، لیکن اس قابض وارث سے دوسرے کے حصے کو خریدنا جائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ بیع وشراء کی صحت کے لئے بائع کا مالک ہونا شرط ہے، ورنہ بیع مالیس عندک ہوجائے گی۔

''وشرط المعقود علیه ستة: کونه موجودًا مالا متقوما مملوکا فی نفسه وکون الملك للبائع فیما یبیعه لنفسه وکونه مقدور التسلیم۔

ولا بیع ما لیس مملوکًا له، وإن ملکه بعده إلا السلم والمغصوب لو باعه الغاصب ثم ضمن قیمته، وبیع الفضولی، فإنه منعقد موقوف، وبیع الوکیل، فإنه نافذ'' (رد المحتار ۴/ ۶) (مقالہ: مولانا فروغ احمد قاسمی)۔

☆ مفتی عثمان بستوی اور مولانا محی الدین غازی لکھتے ہیں:

ہندوستان کی تمام موروثی زمینوں کا خواہ وہ زمینداری والی ہوں یا بھوم دھری ہوں یا سیر دھری کی ہوں، سب کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں اولاد مؤنث کا حصہ دیا جانا معلوم نہ ہو اور اولاد مؤنث اور ان کے ورثاء کی طرف سے کسی قسم کے مطالبہ کا بھی علم نہ ہو تو ظاہر حال کے مطابق قابض ومتصرف کو مالک مختار مجاز مان کر کے اس کا خریدنا جائز ہے، لیکن اگر خریدنے کے بعد اولاد مؤنث میں سے کوئی مطالبہ پیش کرے اور اس کا مطالبہ صحیح ودرست طریقہ سے ثابت بھی ہو جائے تو اس کے حصہ کے مطابق بیع کالعدم مانی جائے گی، اس کے حصہ کی زمین دے کر یا اس کا معاوضہ دے کر اس کو راضی کرنا لازم اور واجب ہوگا، کیوں کہ جب ان کا استحقاق ثابت ہو گیا تو پھر استحقاق کا حکم بھی عائد ہوگا۔

اور اگر موروثی زمین میں اولاد مؤنث کی طرف سے مطالبہ ہو اور مطالبے کا علم بھی ہو تو اس کو راضی کئے بغیر اس کے حصے کی زمین خریدنا شرعاً غصب ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے، اس صورت میں اگر زمین خریدی گئی تو چونکہ ان کا حق باقی اور معلوم ہے، اس لئے جس طرح بھی ممکن ہو ان کا حق ادا کرنا لازم ہوگا (مفتی عثمان بستوی، مولانا محی الدین غازی)۔

مفتی عثمان بستوی صاحب نے وراثت جاری ہونے کے بارے میں زمینداری اور دوسری زمینوں کا فرق حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ کے فتوی کی روشنی میں بیان کیا ہے جو اس طرح ہے:

''حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ کی رائے کے مطابق زمین داروں کے زمانے سے ان کی نسلوں میں زمینداری کی جو زمین باقی ہیں، ان میں وراثت جاری ہوگی، اس کے علاوہ دوسری زمینوں میں وراثت جاری نہیں ہوتی ہے، اس لئے ان کی رائے کے مطابق ہندوستانی زمینوں کی خرید وفروخت حکومتی ضابطے کے مطابق صحیح اور درست ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں، البتہ زمین داری والی زمین میں چونکہ اولاد مؤنث کا بھی حق ہوتا ہے، اس لئے اس زمین کا حکم کچھ علاحدہ ہوگا، یعنی اس کا حکم دیگر علماء جو عام زمینوں کے بارے میں فرماتے ہیں وہی حکم اس کا بھی ہوگا''۔

☆ مفتی ظہیر احمد قاسمی اور مفتی عبد المنان آسام کی رائے میں ایسی زمینیں خریدی جاسکتی ہیں، اس لئے کہ مخصوص کوئی قطعۂ اراضی متعین نہیں ہے کہ یہ قطعہ فلاں وارث کا ہی ہے۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی مقصود فرقانی اور مفتی عثمان بستوی کی تحریروں سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جب باقی شرکاء کی عدم رضامندی کی صورت میں تقسیم میراث درست نہیں ہے تو وارثین شرکا کو محروم کر کے ان کی وراثت کی خرید وفروخت کیوں کر درست ہوگی، تا آنکہ ان کے حصے الگ الگ کردیئے جائیں (رد المحتار ۹/ ۲۶۶)۔

☆ مفتی محمد الیاس قاسمی اور مولانا ابصار احمد ندوی نے اس جواب کے ذیل میں وراثت کی عدم تقسیم پر وارد وعید اور اس پر ہونے والے گناہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

سوال نمبر (۴): ایک شخص کی آمدنی حرام تھی، اور اس حرام آمدنی کے ذریعہ اس نے ڈھیر ساری زمین حاصل کی، اور اب وہ اس زمین کو فروخت کرتا ہے، تو جو لوگ ان حالات سے واقف ہیں، کیا ان کے لئے اس زمین کو خرید کرنا درست ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں آدھے مقالہ نگار کی رائے ہے کہ حرام آمدنی سے خریدی ہوئی زمین کا دوسروں کے لئے معلوم ہونے کے باوجود خریدنا ناجائز ہے۔

(ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی عثمان بستوی، مولانا زبیر ندوی، مفتی مقصود فرقانی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

دلائل:

ان حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

۱۔ ''إن علم أنه حرام فهو حرام'' (المغنی لابن قدامہ ۴/ ۳۳۳)۔

۲۔ ''الحرمة تتعدد في الأموال مع العلم بها'' (الاشباہ والنظائر ۴/ ۵۰۴) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا محمد زبیر ندوی)۔

۳۔ یہ معصیت پر تعاون ہے جو نص قطعی سے ممنوع ہے، ارشاد ربانی ہے: "ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲)

(مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۴۔ ''الحرام ينتقل حرمته وإن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاك'' (فتاوی شامی ۷/ ۳۰۱)۔

۵۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے بارے میں حرام ہونا معلوم ہو تو اس کو خریدنا جائز نہیں۔

''قال الشيخ عبدالوهاب الشعرانى فى كتاب المنن وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا يتعدى إلا ذمتين سألت عن الشهاب بن الشلبى فقال: هو محمول على ما إذا لم يعلم بذلك، أما من رأى المكاس يأخذ من أحد شيئًا من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذه من ذلك الآخر فهو حرام'' (حوالہ سابق) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۶۔ ''فإن غالب ماله الحرام لايقبلها ولا يأكل'' (مجمع الانھر ۴/ ۱۸۶) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

* ''كل عين قائمة يغلب على ظنه أنهم أخذوها من الغير بالظلم وباعوها فى السوق فإنه لا ينبغى أن يشترى ذلك وإن تداولته الأيدى'' (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۶۴) (مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۸۔ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: ''ما فى الوجود من الأموال المغصوبة والمقبوضة بعقود لا تباح بالقبض. إن عرفه المسلم اجتنبه. فمن علمت أنه سرق مالا أو خانه فى أمانته أو غصبه. فأخذه من المغصوب قهرًا بغير حق لم يجز لى أن آخذه منه، لا بطريق الهبة ولابطريق المعاوضة ولا وفاء عن أجرة. ولا ثمن مبيع. ولا وفاء عن قرض. فإن هذا عين مال ذلك المظلوم'' (فتاوی ابن تیمیہ ۲۹/ ۳۲۳)۔

۹۔ ''إن ما يشترى من السوق ويعلم قطعًا أنهم يبايعون الأتراك ومن غالب مالهم الحرام ويجرى بينهم الربا والعقود الفاسدة، كيف يكون؟ فهو على ثلاثة أوجه:

فكل عين قائمة يغلب على ظنه أنهم أخذوها من الغير بالظلم وباعوها فى السوق. فإنه لا ينبغى أن يشترى ذلك، وإن تداولتها الأيدى، والثانى: إن علم أن المال الحرام بعينه قائم إلا أنه اختلط بالغير لايمكن التمييز عنه، فإن على أصل أبى حنيفة بالخلط يدخل فى ملكه، إلاأنه لاينبغى أن يشترى منه حتى يرضى الخصم بدفع العوض، فإن اشتراه يدخل فى ملكه مع الكراهة۔

والثالث: إذا علم أنه لم تبق عين المغصوبة أو المأخوذ بالربا وغيره، وإنما باعها لغيره فإن الذى يعلم أنه لم تبق تلك العين، جاز له أن يشترى منهم، بذا كله من حيث الفتوى أما إذا أمكنه أن لا يشترى منهم شيئًا كان أولى أن لايشترى ولعل أنه يتعذر ذلك فى بلاد العجم'' (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۶۳) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے لمبی بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں لکھا ہے کہ حرام مال سے حاصل ہونے والی جائیداد بھی حرام ہے، اصل مالک کو لوٹانا اگر ممکن ہو تو اسے لوٹایا جائے گا، ورنہ صدقہ کردیا جائے گا، جب ایسی جائیداد کا وہ شخص مالک ہی نہیں، نیز خریدار کو معلوم بھی ہے تو اس کے لئے خریدنا کیسے جائز ہوگا۔

جواز کی صورتیں اور ان کا حکم:

جبکہ بعض مقالہ نگاران کی رائے ہے کہ ایسی صورت حال میں خریدنے والے کے لئے وہ زمین خریدنا جائز اور درست ہوگا (حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی عبدالمنان آسام، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا ابوبکر قاسمی)۔

اسی طرح مولانا محی الدین غازی فلاحی کا جواب ہے کہ حرام آمدنی سے کسی نے زمین خریدی ہو، اور پھر فروخت کررہا ہو تو اس سے وہ زمین خریدنا جائز ہوگا، البتہ اس زمین کے فروخت کرنے سے حاصل شدہ رقم اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، بلکہ جس طرح آمدنی حرام تھی، اس سے خریدی ہوئی زمین بھی حرام رہے گی اور پھر اسے فروخت کرکے جو قیمت کی رقم اسے ملے گی وہ بھی حرام ہی رہے گی، جس شخص نے اپنی حلال آمدنی سے اس کی زمین خریدی اس کے لئے وہ زمین حلال رہے گی۔

اسی طرح بعض مقالہ نگار مثلاً قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عثمان بستوی، مولانا عبدالحمید قاسمی کی رائے علامہ کرخی کے بیان کردہ

ضابطہ واصول کی روشنی میں یہ ہے کہ ایسی زمین کا خریدنا جائز ہے، البتہ تقوی واحتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ نہ خریدی جائے، اس مسئلہ میں امام کرخی نے پانچ صورتیں ذکر کی ہیں جن کی تفصیلات اس طرح ہیں:

۱۔ بائع کو پہلے وہ غصب کیا ہوا مال بطور قرض دے دے، تاکہ اس کے ذمہ ہو جائے، پھر اس سے کوئی شئی اسی دین کے بدلے خرید لے۔

۲۔ وہ حرام نقود جن سے خرید رہا ہے اس کی طرف اشارہ کرے، اور وہی ادا کردے۔

۳۔ ان نقود مغصوبہ کو اشارہ کر کے متعین کرے، لیکن دوسرا ثمن ادا کردے۔

۴۔ ان نقود کی طرف اشارہ تو نہ کرے مگر انہی کو ثمن کے طور پر دے دے۔

۵۔ دوسرے نقود کی طرف اشارہ کرے، لیکن بائع کو نقود مغصوبہ ہی دے۔

اگر مشتری اول نے پہلی اور دوسری صورت کے ذریعہ خریدا ہے تب تو کسی دوسرے خریدار کو وہ زمین خریدنا درست نہیں ہوگا اور نہ نفع حلال ہوگا اور بقیہ تینوں صورتوں سے خریدا ہے تو علامہ کرخی نے دفع حرج کے لئے اس سے دوسروں کے خریدنے کو جائز قرار دیا ہے (فتاوی شامی ۵/ ۲۳۵)۔

بعض مقالہ نگار نے اس اس صورت میں کہ جب اکثر مال حرام ہو یا حرام مال حلال سے مخلوط ہو، حکم میں فرق کو بیان کیا ہے، مثلاً مفتی عثمان بستوی لکھتے ہیں:

مال حرام سے خریدی ہوئی زمین کا حکم یہ ہے کہ اگر مال حرام، حلال سے مخلوط نہ ہو، بلکہ مکمل حرام ہو غصب، رشوت وغیرہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا اور اس سے کوئی زمین وغیرہ خریدی جائے، تو اگر مال حرام کا عوض ادا کردیا جائے یعنی اگر مالک معلوم ہو تو ان کو واپس لوٹا دیا گیا ہو، ورنہ صدقہ کردیا گیا ہو تو اس کے بعد اس کا خریدنا اور بیچنا دونوں جائز ہے اور اس کا نفع حلال ہے، کیونکہ مال حرام کا حکم شرعی انجام دینے کے بعد اس سے خریدا ہوا مال حلال ہو جائے گا اور اس مال میں کوئی خبث باقی نہ رہے گا، جیسا کہ مال مغصوب عوض ادا کرنے کے بعد حلال ہو جاتا ہے اور اس کی خرید وفروخت جائز ہو جاتی ہے:

''مات وكسبه حرام فالميراث حلال، ثم رمز وقال: لا نأخذ بهذه الرواية وهو حرام مطلقًا على الورثة فتنبه، الخ، ومفاده الحرمة وإن لم يعلم أربابه'' (فتاوی شامی)۔

''ما يأخذه من المال ظلمًا ويخلطه بماله وبمال مظلوم آخر يصير ملكا له وينقطع حق الأول فلا يكون أخذه عندنا حرامًا محضًا، نعم لا يباح الانتفاع به قبل أداء البدل في الصحيح من المذهب'' (فتاوی شامی ۲/ ۲۲۰)۔

یہی رائے مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی ظہیر احمد کانپوری اور مفتی ریاست علی قاسمی کی معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی کا مشورہ ہے کہ مسلمان ایسی زمینوں کو نہ خریدیں، تاکہ اس کے لئے تازیانہ عبرت ہو اور حوصلہ افزائی نہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

۱۔ مال حرام سے حاصل کردہ زمین کو خریدنے میں حرام خور کی حوصلہ افزائی ہوگی، جو نا جائز ہے۔

۲۔ اگر مسلمان ایسی زمین کو نہیں خریدیں گے تو حرام خور کے لئے تازیانہ عبرت ثابت ہوگا اور وہ دوبارہ حرام آمدنی کی طرف نہیں لوٹے گا۔

۳۔ اس سے خریدنے میں حرام پر اسے برقرار رکھنا ہے۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور مفتی عثمان بستوی نے اس پر گفتگو کی ہے کہ مال حرام سے جو شئی خریدی جاتی ہے اس پر ملکیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں، پھر علماء کے مختلف اقوال کا ذکر کیا ہے، اسی طرح مفتی محمد الیاس قاسمی نے مال حرام کی شناعت وقباحت اور اس کی حرمت پر وارد احادیث وآثار کو اپنے مقالہ میں ذکر کیا ہے۔

سوال نمبر (۵): حکومت کے قانون کے مطابق جو لے آوٹ منظور ہوتا ہے، اس میں سڑکوں کی چوڑائی کا رقبہ طے شدہ ہوتا ہے، پلے گراونڈ بھی چھوڑنا ہوتا ہے، اگر خالص مسلمانوں کی کالونی ہو تو کالونی بنانے والا ترغیب کے لئے مسجد کی جگہ بھی مقرر کرتا ہے؛ لیکن جب کالونی میں پلاننگ شروع ہو جاتی ہے تو راستوں کو چھوٹا کردیتے ہیں، اور پلاٹ میں شامل کرتے ہوئے اس کی بھی قیمت وصول کرتے ہیں، پلے گراونڈ اور سوئمنگ پول کی جگہ بھی بیچ دیتے ہیں، یہاں تک کہ مسجد کی مقررہ جگہ بھی فروخت کردیتے ہیں، کیا بیچنے والے شخص کے لئے اس کے بنائے ہوئے نقشے میں

تبدیلی کرتے ہوئے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کو فروخت کردینا اور دوسرے لوگوں کا جانتے بوجھتے اس کو خرید کرنا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں اکثر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ حکومت سے پاس کرائے گئے نقشے کو تبدیل کرکے عوامی مفاد کے لئے مختص اراضی کو فروخت کرنا ناجائز ہے (ڈاکٹر محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی عثمان بستوی، مفتی عبدالمنان آسام، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محی الدین غازی، مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی مقصود فرقانی، مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

دلائل:

ان حضرات کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ حکومت کے قانون کے مطابق جو نقشہ پاس ہوتا ہے، اس کی حیثیت حکومت سے وعدہ اور معاہدہ کی ہے، بلاٹر حکومت سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ ہم خریداروں کو اس نقشہ کے مطابق پلاٹ فراہم کریں گے اور خریداروں سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ اس نقشہ کے مطابق پلاٹ فراہم کیا جائے گا اور حکومت کا نقشہ سازی کے بعد پلاٹنگ کی اجازت دینا اور پلاٹنگ کو نقشہ کے ساتھ منظور کرنا عوامی مصالح اور فائدے کے لئے ہوتا ہے، اس لئے اس کی پابندی پلاٹر کے اوپر واجب ہوتی ہے اور اس کی خلاف ورزی شرعاً جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "أوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا" (سورہ اسراء) (مفتی عثمان بستوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی الیاس قاسمی)۔

۲۔ حکومت سے منظور شدہ نقشہ کی خلاف ورزی حکومت، انتظامیہ اور عوام کے ساتھ صریح دھوکہ ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، بلکہ اخلاقی لحاظ سے قبیح جرم ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من غشنا فليس منا" (حدیث) (مولانا عفان منصور پوری، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا محی الدین غازی، مفتی مقصود فرقانی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

☆ "الخلف في الوعد حرام" (الاشباہ والنظائر / ۱۵۹) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۳۔ اسی طرح راستہ کا معاملہ بھی ہے، راستہ تنگ کردینا یا راستہ نہ دینا درست نہیں ہے، عرف کے مطابق جتنا حق بنتا ہے، یہ کالونی کے حقوق میں سے ہے، اس لئے اس حق کو ضائع نہیں کرسکتا ہے، حدیث میں: "قضى النبي ﷺ إذا تشاجروا في الطريق بسبعة أذرع" (صحیح بخاری ۱/ ۳۳۶، کتاب المظالم) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۴۔ غیر معصیت میں حکومت وقت خواہ غیر مسلم حکومت ہو، کے قوانین کی پابندی ضروری ہے۔

"وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲)۔

اور یہ ظاہر ہے کہ سڑکوں کی چوڑائی کا رقبہ طے کرنا، کھیل کے میدان کے لئے جگہ رکھوانا، مسجد کی جگہ مقرر کرانا اور سوئمنگ پول کی جگہ چھوڑنا عام لوگوں کی صحت کی حفاظت اور ان کو ضرر سے بچانے کے نقطہ نظر سے ہے، سو یہ خیر اور بھلائی کا کام ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں حکومت کا تعاون واجب ہے، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم" (سورہ نساء: ۵۹)، اور ذمہ داران کار میں اہل علم اور حکمراں دونوں شامل ہیں، اگرچہ امام طبریؒ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ سربراہان کار سے مراد حکمراں ہیں (جامع البیان فی تاویل القرآن ۸/ ۵۰۲) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۵۔ اور عقلی دلائل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عام لوگوں کی صحت کی حفاظت کی خاطر اور ان سے ضرر کے ازالہ کے لئے حکومت کی ہدایات کی تعمیل واجب ہو، کیونکہ حکومت ضرر عام کو دور کرنے کی ذمہ دار ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں اس کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی لازم ہے (مولانا شاہجہاں ندوی)

۶۔ علامہ مبارکپوری امام عبدالرحمن طبری کے حوالہ سے لکھتے ہیں: "معناه أن يجعل قدر الطريق المشتركة سبعة أذرع. ثم يبقى بعد ذلك لكل واحد من الشركاء في الأرض قدر ما ينتفع به ولا يضر غيره" (تحفۃ الأحوذی ۴/ ۴۲۱) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۷۔ چونکہ کھیل کے میدان، سڑکوں اور دیگر چیزوں کے عوض کالونی کے پلاٹ کی قیمت میں یہ طے ہوتی ہے اور شامل ہوتی ہے، تو پھر کالونی بنانے والے کے لئے دوبارہ اس کی قیمت حاصل کرنا کیوں کر جائز ہوگا (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

☆ کیونکہ عمومی منافع کی جگہیں خریدے ہوئے پلاٹ کے تابع ہوں گے:

''اعلم أن الحق فى العادة يذكر فيها هو تبع للمبيع ولا بد له منه ولا يقصد إلا لأجله كالطريق والشرب للأرض ... وفى النهر المذكور: ودخول شرب البركة الجارى إليها وقت البيع وإن لم ينصوا على ذلك ولا سيما ماء البركة فإنه مقصود بالشراء حتى أن الدار بدونه ينقص ثمنها نقصًا كثيرًا وقد مرّ آنفًا عن الكافى أن الأحكام تبنى على العرف وأنه يعتبر فى كل أقليم وعصر عرف أهله'' (فتاوی شامی ۷/ ۴۲۴، ۴۲۷) (مفتی عثمان بستوی)۔

۸۔ نقشوں کی پابندی نہ کرنے اور راستوں کو تنگ کرنے کی وجہ سے کالونی میں بسنے والوں کی صحت، وبائی امراض اور دوسرے خطرات سے دوچار ہوتی رہتی ہے، کیونکہ تنگ راستوں کی وجہ سے زیادہ آلودگی پھیلتی ہے، فقہاء لکھتے ہیں:

''لا يمنع الشخص من تصرفه فى ملكه إلا إذا كان الضرر بجاره ضررًا بينًا فيمنع من ذلك وعليه الفتوى'' (الدر المختار مع ردالمحتار ۸/ ۱۵۲) (مفتی الیاس قاسمی، مفتی شاہجہاں ندوی، مولانا انصار احمد ندوی)۔

۹۔ ''لا يمنع أحد من التصرف فى ملكه مالم يكن ضرر فاحش للغير'' (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ۲/ ۲۱۰) (مفتی محمد الیاس قاسمی)

۱۰۔ ''وإن أراد أهل المحلة أن يدخلوا شيئًا من الطريق فى دورهم وذلك لا يضر بالطريق لا يكون لهم ذلك'' (البحر الرائق ۵/ ۴۲۸)۔

۱۱۔ راستہ عوام الناس کے لئے وقف ہوتا ہے، کسی کے لئے راستے پر قبضہ کرکے اس پر ذاتی تصرف کرنا جائز نہیں ہے، راستہ وسیع ہو اور اس پر قبضہ کی وجہ سے راہگیروں کو ضرر نہ ہو تب بھی راستے پر قبضہ کرنا جائز نہیں ہے، موسوعہ فقہیہ میں ہے:

''وإن زاد على سبعة أذرع أو عن قدر الحاجة لم يغير لأن الطريق والأفنية كالأحباس للمسلمين فلا يجوز لأحد أن يستولى على شئى منها أو يقتطع من طريق المسلمين شيئًا وإن كان الطريق واسعًا ولا يتضرر المارة بالجزء المقتطع منه، لما روى عن الحاكم بن الحارث السلمى أن النبى ﷺ قال: من أخذ من طريق المسلمين شبرًا طوقه يوم القيامة من سبع أرضين'' (الطبرانی فی الصغیر، بحوالہ موسوعہ فقہیہ ۲۴/ ۲۴۷) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۱۲۔ یہ ایک طرح عوامی مفاد کی چوری ہے، اور اس کی ملکیت میں غصب ہے اور غصب حرام ہے اور عوام الناس کی حق تلفی ہے جو بڑا جرم ہے۔ اس عمل سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسروں کو تکلیف دینا حرام ہے (مولانا انصار احمد ندوی)۔

ان حضرات کے برخلاف بعض دوسرے حضرات کی رائے ہے کہ اس طرح کے پلاٹ کی خرید وفروخت جائز ہے، مشتری اس کا بھی مالک ہو جائے گا، اگر چہ اس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور دھوکہ دھڑی کا مرتکب ہوا، جس کا گناہ اس کو ہوگا (مولانا عفان منصور پوری، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مولانا عبدالحمید قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی (لیکن کراہت سے خالی نہیں))۔

اسی طرح قاری ظفر الاسلام اعظمی کی یہی رائے ہے کہ معلوم ہونے کے بعد بھی اس کی بیع وشراء درست ہونی چاہئے، اگر چہ انہوں نے وعدہ کے خلاف کیا ہے اور وعدہ کا نقض مکروہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اگر پہلے سے ایفا کی نیت تھی اور کسی مجبوری سے بدل دیا تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر وعدہ کرتے ہی وقت ایفا کی نیت نہ تھی تو مکروہ تحریمی ہے، امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں تصریح فرمائی ہے کہ اصل چیز وعدہ میں نیت ہے، اگر فساد نیت ہے تو مذموم ہے''

(درس بخاری ضبط تحریر: مولانا عبدالوحید فتحپوری/ ۲۳۴)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور مفتی عبدالمنان آسام کی رائے میں پلاٹ کاٹنے والا عوامی مفاد کی زمینوں کا مالک ہی نہیں ہے، تو اس کا فروخت کرنا کیسے درست ہوگا، وہ لکھتے ہیں:

''اگر زمین حکومت کی ہے، حکومت نے کسی کے نام الارٹ کیا ہے تاکہ وہ کالونی بنائے، حکومت نے راستہ کی چوڑائی متعین کردی ہے، مسجد کی جگہ فکس

کردی ہے، اسی طرح دوسرے عوامی مفاد کے لئے پارک وگراؤنڈ کی تحدید کردی ہے، تو ایسی صورت میں کالونی بنانے والے کو عوامی مفادات سے وابستہ یا مسجد ومدرسہ کے لئے مختص زمین کی ملکیت حاصل ہی نہیں ہوئی، اس لئے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ سابقہ پروگرام میں ردوبدل کرے، اور نہ دوسروں کے لئے جائز ہے کہ جانتے بوجھتے ہوئے اس کو خریدے، کیونکہ کالونی بنانے والا اس کا مالک نہیں تو اس کو بیچنے کا حق بھی نہیں" (مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے اس طرح کی زمینوں میں فرق کو واضح کیا ہے کہ اگر زمین حکومت کی ہے اور حکومت نے کسی کے نام الاٹ کیا ہے تب تو وہ حکم ہے جو اوپر بیان ہوا، لیکن اگر زمین کالونی بنانے والے کی ہے، اور حکومت سے صرف کالونی بنانے کی اجازت لی ہے تو چونکہ وہ پوری زمین کا مالک ہے، اس لئے وہ عوامی مفاد کی زمینوں میں ردوبدل کرسکتا ہے اور اس کو بیچ بھی سکتا ہے، لکھتے ہیں:

"لیکن زمین کالونی بنانے والے کی ہے، گورنمنٹ سے صرف کالونی کا پرمٹ لیا ہے، حکومت نے پرمٹ کے لئے عوامی مفادات سے وابستہ قطعات کو چھوڑنے کی شرط لگائی ہے، بظاہر کالونی بنانے والے کو منظور بھی ہے، مگر دل سے شاید راضی نہیں ہے، اسی لئے بعد میں اس کو بیچ دیتا ہے، حکومت کی اس قسم کی شرط سے اس شخص کی ملکیت ختم نہیں ہوتی ہے، الا یہ کہ وہی خود برضا ورغبت ان اراضی کو مسلمانوں کے لئے وقف کردے، لیکن وہ شخص ایسا نہیں کرتا ہے تو بدستور اس کی ملکیت ہے اور وہ اس کو بیچ سکتا ہے، دوسرے لوگوں نے خرید لیا ہے تو خریدنا جائز بھی ہے، صرف اتنا ہوا کہ حکومت کے جائز قانون کی خلاف ورزی کی جس کا وبال اس کو پہنچ سکتا ہے" (مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

اسی طرح انہوں نے اس فرق کو بھی واضح کیا ہے کہ راستہ چونکہ بنیادی ضروریات میں سے ہے، اس لئے اس کے لئے کم از کم سات ہاتھ چھوڑنا لازم ہے، البتہ پارک، پلے گراؤنڈ اور سوئمنگ پول آج کی ضروریات میں شامل ہیں، مگر بنیادی ضروریات میں سے نہیں ہیں، اس لئے اگر ان کی بیع کرتا ہے تو بیع نافذ ہوگی اور خریدنے والے کے لئے خریدنا بھی جائز ہوگا۔

مولانا محمد زبیر ندوی لکھتے ہیں:

اگر حکومت کی تجویز کردہ پلے گراؤنڈ، راستے ودیگر عوامی مفاد کی اراضی ضرورت سے زائد ہوں اور اس قدر ہوں کہ ان سے کم میں بھی ضرورت کی تکمیل ہوسکتی ہو، باشندگان کا کوئی کوئی جسمانی اور مکانی نقصان نہ ہو تو مالک زمین کو زائد حصے بیچنے کا حق ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں جو بنیادی چیز مدنظر ہے وہ اہل کالونی کا اپنی ضروریات میں دقت محسوس نہ کرنا ہے۔

پلاٹنگ میں مسجد کا مسئلہ اور اس کی شرائط:

اس شق کے سلسلہ میں قاضی عبدالجلیل قاسمی اور مفتی عبدالمنان آسام کی رائے ہے کہ کالونی بنانے والے نے اگر مسجد کے لئے زمین وقف کردی تو اس کے لئے اس کو فروخت کرنا صحیح نہ ہوگا، اور اگر نہیں کیا ہے، بلکہ مسجد بنانے کا وعدہ کیا ہے تو اس کو فروخت کرسکتا ہے، البتہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

قاری ظفر الاسلام اعظمی نے قاموس الفقہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام محمدؒ کے نزدیک جب تک وقف کے لئے متولی مقرر کرکے اس کے حوالہ نہ کردے وقف مکمل نہ ہوگا، فتاویٰ سراجیہ اور خلاصۃ الفتاویٰ میں اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔

مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی اور مولانا ابصار احمد ندوی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے کہ کب وقف کی ملکیت واقف سے ختم ہوکر اللہ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے، اتمام وقف کے لئے کیا کیا شرائط ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ:

پلاٹ کاٹنے والے کا اپنے پلاٹ میں کسی جگہ کا مسجد کے لئے متعین کرنا یہ مسجد شرعی ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، نقشہ میں مسجد کا پلاٹ دکھانے اور متعین کردینے سے وہ جگہ نہ تو وقف ہوگی، نہ مسجد شرعی بنے گی، کیونکہ وقف کے لئے ضروری ہے کہ باقاعدہ کسی چیز کو وقف کیا جائے، اور یہ کیا جائے کہ یہ چیز وقف ہے، اسی طرح وقف کرنے والا اس میں نماز کی اجازت دے دے، فقہاء نے کسی جگہ کے مسجد ہونے کے لئے تین شرطیں ذکر کی ہیں:

۱۔ افراز، یعنی مکمل طور پر علاحدہ کردے۔ ۲۔ اذن صلوۃ، یعنی نماز پڑھنے کی مکمل اجازت ہو۔ ۳۔ تابید، یہ وقف ہمیشہ کے لئے ہو۔

لہذا جس جگہ پر نماز پڑھنے کی اجازت نہ دی گئی ہو اور وہ جگہ قوم ومتولی کے حوالہ نہ کی گئی ہو، صرف مجوزہ نقشہ اور ارادہ میں کسی جگہ پر مسجد بنانا ہو تو اس نقشہ اور ارادہ سے وہ جگہ شرعاً مسجد نہیں بنے گی۔

''ولو بنی مسجدًا وسلمه إلی المتولی لا یصیر مسجدًا بالتسلیم إلی المتولی وهو قول البعض واختاره شمس الأئمة السرخسی. وقال بعضهم: یصیر مسجدًا کسائر الأوقاف.... فأفاد بالاقتصار علی الشروط الثلاثة (الإفراز وإذن الصلاة والتأبید) أنه لا یحتاج فی جعله مسجدًا إلی قوله وقفته ونحوه لأن العرف جار بالإذن فی الصلاة علی وجه العموم. والتخلیة بکونه وقفًا علی هذه الجهة فکان کالتعبیر به'' (البحر الرائق ۵/ ۲۴۹)
(مفتی عثمان بستوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''وأجمعوا علی أن من جعل داره أو أرضه مسجدًا یجوز وتزول الرقبة عن ملکه لکن عزل الطریق وإفرازه والإذن للناس بالصلاة فیه، والصلاة شرط عند أبی حنیفة ومحمد رحمهما الله حتی کان له أن یرجع قبل ذلك وعند أبی یوسف تزول الرقبة عن ملکه بنفس قوله جعلته مسجدًا ولیس له أن یرجع عنه علی ما نذکره''
(بدائع الصنائع ۵/ ۳۲۶) (قاری ظفر الاسلام اعظمی)۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی اور مفتی عثمان بستوی نے اس پر حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ اور حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ کا فتوی بھی نقل کیا ہے:

''مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''غیر آباد جنگل و بیابان میں مسلم آبادی قائم کرنے اور مسلمانوں کو وہاں بسانے کی غرض سے وسیع قطعہ زمین خریدی گئی اور مسجد و مدرسہ قائم کرنے کی غرض سے جگہ بھی متعین کردی گئی..... رہائش گاہیں اور مکانات تعمیر کرنے سے قبل تبرکاً مسجد کے سنگ بنیاد کی رسم ادا کی گئی، اس کو دس سال کا عرصہ گذر جاتا ہے مگر رہائش گاہیں بنانے اور مسلمانوں کو وہاں بسانے میں کامیابی نہیں ہوئی، قرب وجوار میں نہ کوئی چھوٹی بڑی مسلم آبادی ہے اور نہ مسلمانوں کو اس کی حاجت ہے، وہاں نہ اذان ہوئی نہ نماز پڑھی گئی اور نہ مسجد بننے اور آباد ہونے کے قرائن پائے گئے تو یہ مسجد شرعی نہ ہوگی'' (فتاوی رحیمیہ ۹/ ۹۹-۱۰۰) (مقالہ: ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی)۔

''حضرت مفتی محمود صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس کی وہ زمین ہے اگر اس نے مسجد بنانے سے پہلے لوگوں کو وہاں اذان، نماز، جماعت کی اجازت دے دی اور یہ نیت کرلی کہ یہاں ہمیشہ اذان، نماز، جماعت ہوا کرے گی اور اس کو مسجد قرار دے دیا تو وہ شرعی مسجد بن گئی، اب جو چیز مسجد میں منع ہے وہاں بھی منع ہے، مسجد کا پورا احترام لازم ہے (فتاوی عالمگیری ۳/ ۳۳۸) اور اگر ایسا نہیں کیا بلکہ نیت یہ ہے کہ تعمیر مکمل ہونے کے بعد اذان، نماز، جماعت شروع کی جائے گی اور اسی وقت اس کو مسجد قرار دیا جائے گا تو اس پر مسجد کا حکم تکمیل عمارت کے بعد جاری ہوگا'' (فتاوی محمودیہ ۱۴/ ۳۸۸) (مقالہ: مفتی عثمان بستوی)۔

علامہ حصکفی لکھتے ہیں: ''الملك یزول عن الموقوف بأربعة. بإفراز مسجد...'' (الدر المختار ۴/ ۳۴۳)۔

علامہ شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ''عبر بالإفراز. لأنه لو کان مشاعًا لا یصح إجماعًا. وأفاد أنه یلزم بلا قضاء''
(ردالمحتار والدر المختار ۴/ ۳۴۳) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

سوال نمبر (۶): قانون کے لحاظ سے کالونی میں گارڈن اور پلے گراؤنڈ رکھنا ضروری ہے، حکومت لے آوٹ منظور کرنے کے لئے نقشہ میں ان چیزوں کو رکھواتی ہے اور جگہ مخصوص کرواتی ہے؛ لیکن زمین بیچنے والا مسلمانوں کو لبھانے کے لئے گارڈن کی بجائے مسجد کے لئے جگہ دے دیتا ہے، اور جو زمین قانون اور حکومت سے معاہدہ کے مطابق گارڈن کی تھی، اسی جگہ مسجد بنادی جاتی ہے، کیا ان کا اس زمین پر مسجد بنانا درست ہوگا اور وہ مسجد شرعی تصور کی جائے گی؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کے دو نقطہ نظر ہیں:

پہلے نقطہ نظر کے حاملین کی رائے ہے کہ گارڈن اور پلے گراؤنڈ کی جگہ مسجد بنانے کی صورت میں اس قانون کی خلاف ورزی ہوگی جو لے آوٹ منظور کراتے وقت حکومت کے متعلقہ شعبہ نے جاری کیا ہے، لہذا کالونی بنانے والے پر اس معاہدہ کی پاسداری اور اس قانون کی تعمیل واجب ہوگی (ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا عفان منصور پوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی الیاس قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا محی الدین غازی، مفتی عبدالمنان آسام، مفتی مقصود فرقانی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

دلائل:

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اجتماعی مصالح، مفاد عامہ کے تحفظ اور ضرر عام کے ازالہ کی خاطر حکومت کے وضع کردہ اس طرح کے قانون کی پابندی لازم ہے، اس کی خلاف ورزی ناجائز اور گناہ ہے (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۲۔ ''مسجد بنی علی سور المدينة قالوا: لايصلى فيه لأن السور حق العامة'' (فتاوی ہندیہ بحوالہ قاموس الفقہ ۵/ ۹۳) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۳۔ اگر حاکم اور ذمہ دار کسی ایسی چیز کا حکم دے جس کی تعمیل میں اللہ تعالی کی نافرمانی نہ ہوتی ہو تو اس چیز کو وجود میں لانا لازم ہے۔

''طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض، فكيف فيما هو طاعة'' (بدائع الصنائع ۷/ ۱۴۰)

(مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۴۔ ''لا طاعة لمخلوق في معصية الله، إنما الطاعة في المعروف'' (صحيح البخاری، حديث: ۷۲۴۰، صحيح مسلم حديث: ۱۸۴۰) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

مولانا محی الدین غازی لکھتے ہیں:

صحیح طریقہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی کالونی بنانے والے مسجد کے لئے بھی جگہ چھوڑیں اور گارڈن کے لئے بھی جگہ چھوڑیں، کیونکہ گارڈن جس طرح غیر مسلم کالونی میں صحت مند ماحول کے لئے مفید ہے، اسی طرح مسلم کالونی کے لئے بھی مفید اور مطلوب ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی عبدالمنان، مفتی ریاست علی قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری اور مفتی الیاس قاسمی کی رائے میں پلے گراؤنڈ اور گارڈن کی زمین پر مسجد بنانا درست نہ ہوگا اور وہ شرعی مسجد نہ ہوگی۔

قاری ظفر الاسلام اعظمی اور مفتی ظہیر احمد کانپوری کی رائے ہے کہ کالونی کی تعمیر منظور شدہ نقشہ کے مطابق ہی ہونی چاہئے۔

مسجد بنانے کی گنجائش ہے:

مفتی ریاست علی قاسمی اور مولانا عفان منصور پوری کی رائے ہے کہ اگر مسجد کے نام پر منظوری مل جاتی ہے تو مالک زمین کا گارڈن کے نام پر منظور شدہ زمین پر مسجد تعمیر کرنا معاہدہ شکنی ہوگی اور قانون کی خلاف ورزی ہوگی، جس سے بچنا چاہئے، اگرچہ مسجد بنانا شرعاً درست ہے اور وہ مسجد شرعی ہی ہوگی۔

اگر حکومت کی طرف سے کالونی کے نقشہ پر مسجد کے نام سے منظوری ملتی ہی نہ ہو اور پلاٹ خریدنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہو اور سب کو یہ معلوم ہو کہ مسجد کے نام پر منظوری نہیں مل سکتی، کسی اور نام پر زمین خالی رکھی جائے گی اور وہیں مسجد کی تعمیر ہوگی تو ایسی شکل میں گارڈن کے نام پر خالی پڑی زمین میں یا اس کے ایک حصہ میں مسجد تعمیر کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

* ''لايمنع الشخص من تصرفه في ملكه إلا إذا كان الضرر بجاره ضررًا بينًا فيمنع من ذلك وعليه الفتوى'' (فتاوی شامی ۸/ ۱۵۲)

* ''والقياس في جنس هذه المسائل أن من تصرف في خالص ملكه لايمنع ولو أضر بغيره لكن ترك القياس في محل يضر بغيره ضررًا بينًا وقيل وبه أخذ كثير من المشائخ وعليه الفتوى'' (حوالہ سابق ۷/ ۴۹۲)

(مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی)۔

☆ البتہ چونکہ مالک زمین کالونی بنانے والا اس صورت میں ایک مفاد عام کے لئے مخصوص جگہ کو دوسرے مفاد عامہ کے لئے دیتا ہے جو اگرچہ مناسب نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ غصب کا معاملہ بھی نہیں ہے، اس لئے اس جگہ پر مسجد بنانا درست ہے اور بننے والی مسجد شرعی مسجد ہوگی۔

(مولانا شاہجہاں ندوی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مفتی محمد مقصود فرقانی)۔

☆ اگر کالونی میں بسنے والے سب کے سب مسلمان ہوں اور سب متفق ہوں تو ایسی جگہ پر مسجد بنائی جاسکتی ہے، ورنہ نہیں (مولانا ابصار احمد ندوی)۔

مسجد بنانا شرعاً درست ہے:

جبکہ دوسرے نقطہ نظر کے حاملین کی رائے ہے کہ قانونی طور پر جس قطعہ ارضی کو مفاد عامہ کے لئے حکومت نے منتقل کیا ہے، اس کا مالک درحقیقت

حکومت نہیں بائع ہے، بات صرف اتنی ہے کہ حکومت نے مفاد عامہ کے لئے مختص کرنے کی شرط لگائی ہے، اگر اس شرط کی مخالفت کرتا ہے اور اس حصہ کو مسجد بنادیتا ہے تو حکومت کی مخالفت ہوگی، فی نفسہ وقف پر اثر انداز نہیں ہوگی، وقف کے لئے فقہاء نے جو شرائط ذکر کی ہیں وہ یہاں پائی جاتی ہیں۔

(مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی عثمان بستوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

دلائل:

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ''شرطه (الوقف) شرط سائر التبرعات كحرية وتكليف، أفاد أن الواقف لابد أن يكون مالكه وقت الوقف ملكًا باتًا ولو بسبب فاسد، وأن لايكون محجورًا عن التصرف، حتى لو وقف الغاصب المغصوب لم يصح وإن ملكه بعد شراء أو صلح'' (رد المحتار ۳/ ۳۹۴ كتاب الوقف) (مولانا محبوب فروغ قاسمی)۔

۲۔ بہت سے معاملات ہیں کہ جہاں حکومت کی شرط کے خلاف اگر تصرف کیا جائے تو وہ نافذ ہوجاتا ہے، انہی میں تسعیر الحاکم کا مسئلہ بھی ہے:

''فإن سعر فباع الخباز بأكثر ما سعر جاز بيعه'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۰۲) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۳۔ مسلم کالونیوں میں مسجد ایک بنیادی ضرورت ہے، اس ضرورت کو پورا کرنا مفاد عامہ سے زیادہ اہم ہے، اس لئے کالونی والوں کے مشورہ سے وہاں مسجد بنادی جائے تو جائز ہوگا اور وہ مسجد شرعی بھی ہوجائے گی۔

(مفتی عثمان بستوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا محمد زبیر ندوی)۔

۴۔ کچھ بزرگوں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، چنانچہ احسن الفتاوی میں ہے:

''حضرات فقہاء کرام نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ بوقت ضرورت اہل محلہ راستہ کو بھی مسجد بنا سکتے ہیں، بشرطیکہ گزرنے والوں کو اس سے ایذاء نہ ہو، اس لئے کہ راستہ بھی انہی لوگوں کی ضرورت کے لئے ہے، لہذا وہ اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہیں، بناء علیہ خالی پلاٹ میں جو اہل محلہ ہی کے مفاد وراحت کے لئے چھوڑا گیا ہے اہل محلہ کی اجتماعی رائے سے مسجد کی تعمیر بطریق اولی جائز ہے، مسجد مسلم آبادی کی بنیادی ضرورت ہے'' (احسن الفتاوی ۶/ ۴۴۵ کتاب الوقف)۔

۵۔ ''لأن المسجد حق الله تعالى أو حق عامة الناس'' (الفتاوى الخانية على الهنديه ۲/ ۲۹۰) (مولانا زبیر ندوی)۔

۶۔ ''رجل له ساحة لا بناء فيها أمر قومًا أن يصلوا فيها بجماعة، هذا على ثلاثة أوجه: أحدها: إما إن أمرهم بالصلاة فيها أبدًا نصًا بأن قال: صلوا فيها أبدًا، أو أمرهم بالصلاة مطلقًا ونوى الأبد، ففي هذين الوجهين صارت الساحة مسجدًا'' (فتاوى ہنديه ۲/ ۴۵۵، كتاب الوقف) (مولانا عبدالحمید قاسمی، مولانا محمد زبیر ندوی)۔

☆ البتہ حکومت سے منظور شدہ نقشہ کے مطابق تعمیر کرنے کی وجہ سے وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا (مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

☆ البتہ وہ پبلک مقامات جو حکومت کی تحویل میں ہیں یا ان کے قبضہ میں ہیں، ان مقامات پر مسجد بنانے کے لئے حکومت کی اجازت ضروری ہے:

''مسجد بني على سؤر المدينة قالوا: لايصلى فيه لأن السؤر حق العامة وينبغي أن يكون الجواب على التفصيل: إن كانت البلدة فتحت عنوة وبنى مسجد بإذن الإمام جازت الصلاة فيه لأن للإمام أن يجعل الطريق مسجدًا فهذا أولى'' (فتاوى ہنديه ۱/ ۱۱۰، كتاب الصلاة) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

☆ تاہم مناسب اور بہتر یہ ہے کہ گارڈن کی جگہ پر گارڈن ہی باقی رکھا جائے اور مسجد کے لئے کوئی الگ پلاٹ مخصوص کیا جائے اور اس کی قیمت پلاٹ خریدنے والوں کے پلاٹ کی قیمت پر کچھ اضافہ کرکے وصول کی جاسکتی ہے، اس طرح کرنے سے مسجد کی بھی ضرورت پوری ہوجائے گی اور حکومت سے کئے گئے معاہدہ کی پابندی بھی ہوجائے گی۔

''عن عطاء: لما فتح الله تعالى الأمصار على يد عمر، أمر المسلمين أن يبنوا المساجد وأن لا يتخذوا في مدينة مسجدين يضار أحدهما صاحبه'' (الكشاف ۲/ ۲۱۰، سوره توبه: ۱۰۷) (مفتی عثمان بستوی)۔

سوال نمبر (۷): آج کل کسی زمین کو کالونی کی حیثیت سے منظور کرانے میں کئی مرحلے درپیش ہوتے ہیں، پہلے زمین کو غیر زراعتی (نان اگریکلچر) اراضی میں تبدیل کرانا ہوتا ہے، اس کے لئے کوشش بھی کرنی ہوتی ہے اور اخراجات بھی ہوتے ہیں۔ پھر قانون کے مطابق اس کا ڈیولپمنٹ کراتا ہے، جس میں ڈرینج لائن، سڑکیں، بجلی کے کھمبے شامل ہیں، اس میں بھی کافی اخراجات ہوتے ہیں، پھر زمین کے خریدنے پر بھی ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے، پلاٹس بنانے کے بعد ان کی جو قیمت طے ہو، اس پر بھی ٹیکس دینا ہوتا ہے، پھر جو پلاٹ خریدے گا، اس کو بھی ٹیکس ادا کرنا ہوگا، جو تقریباً بارہ پندرہ فیصد ہوتا ہے، یہ تو ٹیکسز ہیں، پھر ان تمام مراحل میں عہدہ داروں کو رشوت دینی ہوتی ہے، اور اگر کسی شخص کی طرف سے اعتراض کی درخواست دائر ہوگئی تو معاملہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ ان تمام مرحلوں سے گزرنے کے بعد زمین بہت مہنگی ہو جاتی ہے؛ اس لئے عموماً لوگ گورنمنٹ سے منظور کرائے بغیر پولیس اور متعلقہ محکمہ کو رشوت دے کر کالونی بنا لیتے ہیں، اور جب اچھی خاصی آبادی ہو جاتی ہے، تو یا تو عوامی غیظ وغضب اور نقص امن کا خیال کرتے ہوئے حکومت خاموش رہتی ہے اور مقامی سیاسی لیڈروں کی کوششوں سے روڈ، بجلی وغیرہ کی سہولتیں فراہم ہو جاتی ہیں، یا خود حکومت بعد میں غیر قانونی کالونی اور مکانات کو قانونی بنانے کا موقع فراہم کرتی ہے، اور کچھ پیسے لے کر اس کو قانونی طور پر منظور کالونی کی حیثیت دے دیتی ہے، شہروں میں جو اکثر غریب آبادیاں بسائی گئی ہیں، وہ اسی طور پر بسائی گئی ہیں، تو کیا اس طرح قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر کالونیاں بنانا اور پلاٹ فروخت کرنا جائز ہوگا؟ اس کی نوبت اس لئے آتی ہے کہ اگر ان تمام مراحل کو قانون کے مطابق انجام دیا جائے تو زمین کی قیمت اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ غریبوں کے لئے پلاٹ کی خریداری دشوار ہو جائے گی۔

اس سوال کے جواب میں بھی مقالہ نگاران کے درمیان دو نقطہ نظر پائے جاتے ہیں:

پہلے نقطہ نظر کے حاملین کی رائے یہ ہے کہ قانونی تقاضوں کی تکمیل اور مکمل ضابطوں کی پاسداری کے بعد ہی کالونیاں بنانا اور پلاٹس فروخت کرنا مناسب ہے (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

دلائل:

ان حضرات نے حسب ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے:

۱۔ حکومت کی خیر خواہی کا تقاضہ ہے کہ عوامی بہبود کی خاطر بنائے گئے قوانین کی خلاف ورزی نہ کی جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے معاملات کے ذمہ دار حکمراں حضرات اور عوام الناس کے ساتھ خیر خواہی کو لازم قرار دیا ہے:

''الدین النصیحة، قلنا: لمن؟ قال: لله ولکتابه ولرسوله ولأئمة المسلمین وعامتهم'' (صحیح مسلم، حدیث: ۵۵)۔

۲۔ ایک دوسری حدیث میں ہے: ''وأن تناصحوا من ولاہ الله أمرکم'' (صحیح بخاری، حدیث: ۴۴۲، موطا مالک، حدیث: ۱۷۹۶) اور حکمراں کی خیر خواہی کا مطلب یہی ہے کہ مناسب قانون کے سلسلہ میں ان کا تعاون کیا جائے (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۳۔ قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر جو کالونیاں بنائی جاتی ہیں اور جو پلاٹس فروخت کئے جاتے ہیں اور جن پر بعد میں تعمیر ہوتی ہے، ان میں ڈرینج لائن وغیرہ کا مناسب انتظام نہیں ہوتا ہے، جس سے ماحولیاتی آلودگی بھی پیدا ہوتی ہے اور کالونی میں رہائش پذیر افراد کی صحت بھی مختلف وباؤں اور امراض کی زد میں رہتی ہے (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۴۔ قانون کی خلاف ورزی درست نہیں، ہمیں معروف کے ہر کام میں اولی الامر کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، خلاف قانون کالونی بنانا درست نہیں (حافظ کلیم اللہ عمری)۔

جبکہ دوسرا نقطہ نظر رکھنے والوں کی رائے یہ ہے کہ قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر کالونیاں بنانا اور پلاٹ فروخت کرنا شریعت کی خلاف ورزی نہیں ہے، اس لئے یہ عمل درست ہوگا (مولانا محبوب فروغ قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی الیاس قاسمی، مفتی مقصود فرقانی، مولانا عبدالحمید قاسمی، مولانا ابوبکر قاسمی)۔

ان حضرات نے درست ہونے کے دلائل اور وجوہات اس طرح بیان کئے ہیں:

۱۔ ان کالونیوں کے ذمہ داروں کی طرف سے اجازت نہ لینے کا اقدام اس لئے ہوتا ہے کہ اجازت کے حصول میں لمبے مراحل اور مختلف منازل سے گزرنا پڑتا ہے، ایک خطیر رقم کچھ تو فیس کے نام پر تو کچھ رشوت کے طور پر خرچ کرنی پڑتی ہے، پھر بھی ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ کب اس کے خلاف کیس درج ہو کر مزید رقموں کا بوجھ آجائے، اگر ان سب خرچوں کو زمین پر جوڑا جائے تو یقیناً زمین کی قیمت گراں سے گراں تر ہو جائے گی، لیکن اجازت کے بغیر کالونیاں بن گئیں تو حکومت چار و ناچار اجازت دے ہی دے گی، ناچیز یہ سمجھتا ہے کہ جن وجوہات کی وجہ سے حکومت کی دخل اندازی برداشت کی جاتی ہے یہاں وہ وجوہات حکومت کی دخل اندازی سے زیادہ ہو جاتی ہیں، اس لئے مالکان اراضی کا بغیر اجازت و پرمٹ کالونیاں بنانا، اور فروخت کرنا اور ان سے دوسرے حضرات کا خریدنا شریعت کی خلاف ورزی نہیں ہے، واللہ اعلم

(مقالہ: مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، نیز دیکھئے مقالہ: مولانا ابوبکر قاسمی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی مقصود فرقانی)۔

۲۔ حکومت کے جو قوانین نظم و انتظام سے متعلق ہوں حتی الامکان اس کی پابندی کرنی ضروری ہوتی ہے، تاہم اگر کوئی قانون لوگوں کی دشواری کا باعث ہو تو اس کی خلاف ورزی کی صورت میں، جان و مال آبرو وغیرہ پر حرف نہ آئے تو دشواری کی وجہ سے اس قانون کی خلاف ورزی جائز ہے، لہذا کالونی بسانے کے لئے حکومت کے جو قوانین ہیں اگر ان کو نظر انداز کر کے زمین کے مالکین پلاٹ بنا کر فروخت کر دیں اور لوگ اپنی سہولت کے مطابق خرید کر آباد ہو جائیں تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس طرح سے فروخت کرنا اور خریدنا دونوں جائز ہے، البتہ اگر عزت و آبرو کا خطرہ ہو تو احتراز ضروری ہے:

”لا يمنع الشخص من تصرفه في ملكه إلا إذا كان الضرر بجاره ضررًا بينًا“ (شامی ۸/ ۱۵۲ زکریا)

(مقالہ: مفتی عثمان بستوی، نیز دیکھئے مقالہ: مولانا محمد زبیر ندوی)۔

۳۔ فقہاء نے سیل ٹیکس، انکم ٹیکس جیسے ناروا ٹیکسیس سے اپنے آپ کو بچانے کی اجازت دی ہے، لہذا زمین کی خریداری پر واجب الاداء سیل ٹیکس سے اپنے آپ کو بچانا شرعاً جائز ہے۔

”الأفضل مشاركة أهل محلته في إعطاء النائبة لكن في زماننا أكثرها ظلم فمن تمكن من دفعه عن نفسه فحسن وإن أعطى فليعط من عجز“ (الدر المختار على رد المحتار ۹/ ۶۰۸) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۴۔ علامہ شامی مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”هذا كان في ذلك الزمن لأنه إعانة على الطاعة وأكثر النوائب في زماننا بطريق الظلم فمن تمكن من دفعه عن نفسه فهو خير له“ (حوالہ سابق) (مفتی الیاس قاسمی)۔

قاضی عبدالجلیل قاسمی اور مفتی عبدالمنان آسام کی رائے ہے کہ قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر کالونیاں بنالی جائیں اور بعد میں منظوری لے لی جائے، جس میں اخراجات بھی کم ہوتے ہیں تو کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے۔

اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا:

مفتی ریاست علی قاسمی اور مولانا عفان منصور پوری اور مفتی محمد الیاس قاسمی کی رائے ہے کہ اگر تمام مراحل کی تکمیل قانونی طور پر دشوار اور ناممکن ہو اور سرکاری اداروں کا مسلمانوں کے ساتھ تعصب کی بنیاد پر ضابطۂ کالونی کی منظوری دشوار ہو تو باضابطہ منظوری کرائے بغیر پولس اور متعلقہ محکمہ کے افسران کو رشوت دے کر کالونی بنانے کا عمل شروع کرنا اور زمین کی پلاٹنگ کرنا شرعاً درست ہوگا، کیونکہ اپنے جائز حق کو حاصل کرنا اگر بغیر رشوت دیئے ممکن نہ ہو تو فقہاء کرام نے رشوت دے کر اس حق کو حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔

”دفع المال للسلطان الجائر عن نفسه وماله لاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع“ (فتاوی شامی ۱/ ۶۰۷)۔

نیز ہمارے ملکی باشندہ ہونے کے لحاظ سے جائز حقوق کا حاصل نہ ہونا ہمارے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہے اور رفع ظلم کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، ہدایہ میں ہے: ”ودفع الرشوة لرفع الظلم أمر جائز“ (۳/ ۲۲۹ کتاب الصلح) (مفتی ریاست علی قاسمی)۔

نیز بذل المجہود میں ہے: ”فإذا أعطى ليتوسل به إلى حق أو يدفع عن نفسه ظلمًا فإنه غير داخل في هذا الوعيد“ (بذل المجهود ۶/ ۳۰۷) (مفتی الیاس قاسمی)۔

قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی لکھتے ہیں:

ذکر کردہ سارے حالات مجبوری واضطرار کے ہیں، ان حالات میں شرعی وسعت رکھی گئی ہے، اس لئے اگر آئندہ ہتک عزت کا اندیشہ نہ ہو تو اس کی گنجائش دی جاسکتی ہے: "لو اضطر إلى دفع رشوة لإحياء حقه جاز له الدفع وحرم على القابض" (الدر المختار على رد المحتار ۷/ ۲۶۵)۔

مفتی الیاس قاسمی اور مولانا عبدالحمید قاسمی لکھتے ہیں:

صورت مسئولہ میں قانونی مراحل کی تکمیل کی وجہ سے کالونی کے مکانات اور پلاٹ کی قیمت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ غریبوں کے لئے پلاٹ کی خریداری دشوار ہوجائے گی، جبکہ مکان انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے اور ذاتی مکان کے حصول کے لئے بحالت مجبوری سودی قرض لینے کی گنجائش فقہاء نے دی ہے: "يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ والنظائر ۱/ ۳۲۷)۔

مولانا ابصار احمد ندوی لکھتے ہیں:

"الغرض یہاں پر کوئی مذکورہ صورت نہیں ہے، اس لئے رشوت دینا حرام ہے، اور بغیر قانونی تقاضوں کی تکمیل کے پلاٹ خریدنا، بیچنا اور کالونی بنانا درست نہیں ہے۔

البتہ دوسری رائے رکھنے والے حضرات بھی لکھتے ہیں کہ:

☆ بہتر ہے کہ حکومتی ضابطہ کی تکمیل کرائی جائے، تاکہ ہر اعتبار سے درست ہو (قاضی ذکاء اللہ شبلی)۔

☆ حتی الامکان حکومتی قوانین کی پاسداری کرنی ضروری ہے (مفتی عثمان بستوی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی عبدالمنان آسام، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا نازبیر ندوی)۔

☆ عافیت وتحفظ بھی اسی میں ہے کہ ہمارے تمام ہی منصوبے اور پروجیکٹ اصول وقوانین کے دائرہ میں پروان چڑھیں، ورنہ کسی بھی وقت حد درجہ دشواری پیش آسکتی ہے (مفتی عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا نازبیر ندوی)۔

☆ حکومت کے قوانین وہدایات مفاد عامہ کے ساتھ مربوط ہونے چاہئے: "فعل الأمير منوط بمفاد العامة" (مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

سوال نمبر (۸): مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد زمین کے خریدنے کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ وہائٹ منی دے، اور یہ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی مقدار میں وہائٹ منی دکھانا بہت دشوار ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ بینک سے کروڑوں روپیہ کا لون لے، تاکہ گورنمنٹ کی پکڑ سے محفوظ رہ سکے، کیا پیسے ہونے کے باوجود قانونی دشواری سے بچنے کے لئے اس طرح لون لیا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا نہ ہو تو مسلمانوں کے لئے اس کاروبار میں رہنا دشوار ہوجائے گا، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شہر میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت غریب اور پسماندہ ہے، وہ آسان قسطوں پر پلاٹ حاصل کر کے مکان کے مالک بن جاتے ہیں، اور مسلمان تاجر اگر اس کاروبار سے نکل جائیں، تو انہیں بہت دشواری ہوجائے گی۔

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار کے مختلف نقطۂ نظر ہیں:

☆ قانونی گرفت سے بچنے کے لئے سرکاری سودی قرض حاصل کرنے کی شرعاً اجازت ہے، کیونکہ قانونی گرفت سے بچنا انسان کی مجبوری ہے، اور مجبوری کے وقت سودی قرض حاصل کرنے کی فقہاء نے رخصت دی ہے: "يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ والنظائر)

(مفتی عثمان بستوی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی مقصود فرقانی)۔

☆ قانونی دشواریوں سے بچنے کے لئے اگر سرکاری لون لیتا ہے، تو اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے (قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی الیاس قاسمی، مفتی عبدالمنان آسام (البتہ توبہ واستغفار کرے)۔

☆ اگر اضطراری حالت ہو اور انتہائی مجبوری ہو تو جتنی رقم سے ضرورت پوری ہوجائے بس اتنی مقدار میں سودی قرض لینا جائز ہے (مفتی عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپوری)۔

☆ حکومت جو ظالمانہ ٹیکس عائد کرتی ہے، اس کی ادائیگی واجب بھی نہیں ہے، اگر اپنے آپ کو بچاتے ہوئے ٹیکس سے چھٹکارا حاصل کرسکتا ہے تو کرنے میں گناہ بھی نہیں ہے (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

☆ علامہ ابن نجیم "حاجت" کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وأما الحاجيات: معناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسع ورفع الضيق المؤدى في الغالب إلى الحرج والمشقة بفوت المطلوب" (الاشباہ والنظائر) (مولانا محمد زبیر ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی عثمان بستوی)۔

☆ بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹے ضرر کو اختیار کیا جاسکتا ہے: "الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف. الضرورات تبيح المحظورات، الضرورات تتقدر بقدرها" (قواعد الفقه) (مفتی ظہیر احمد کانپوری، مفتی محمد مقصود فرقانی)۔

☆ "الأفضل مشاركة أهل محلته في إعطاء النائبة. لكن في زماننا أكثرها ظلم. فمن تمكن من دفعه عن نفسه فحسن وإن أعطى فليطع من عجز" (الدر المختار على رد المحتار ۹/ ۶۰۸) (مفتی الیاس قاسمی)۔

☆ بینک سے لون لینا مناسب قیمت پر غریبوں کو مکان مہیا کرانے کا وسیلہ ہے، لہٰذا بینک سے لون لینا جائز ہوگا، کیونکہ وسیلہ مقصد کے تابع ہوتا ہے:

"وسيلة المقصود تابعة للمقصود وكلاهما مقصود" (اعلام الموقعين ۳/ ۱۵۷) (مفتی الیاس قاسمی)۔

☆ جن مجبوریوں کی بنا پر سودی معاملہ کرنے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، کیا یہ صورت اس میں داخل ہے اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ یہ ٹیکس جائز اور برحق ہے یا نہیں؟ چنانچہ مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں:

"اگر یہ ٹیکس برحق ہے اور مفاد عامہ کے لئے ضروری ہے، تو پھر مفاد عامہ کے سلسلہ میں سب کو تعاون کرنا چاہئے، اور اس کو وجود میں لانے والی چیز کی ادائیگی کی پابندی کرنی چاہئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد ہے: "وتعاونوا على البر والتقوى، ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (مائدہ: ۲)۔

اور اگر یہ ٹیکس ناحق ہے مثلاً کسی خدمت کے بدلہ نہیں ہے، بلکہ حکومت ناحق ٹیکس لیتی ہے، یا ٹیکس کا استعمال ناجائز اخراجات یا دکھاوے یا خوش عیشی اور تعیش میں ہوتا ہے، تو مجبوراً لون لینے کی گنجائش ہے، سود دینے کو رشوت دینے کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے، یعنی جس طرح بدرجۂ مجبوری رشوت دے کر اپنے جائز حق کی تحصیل کی گنجائش ہے، اسی طرح سودی لون لے کر ظالمانہ ٹیکس اور دیگر قانونی دشواری سے بچنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

"لو اضطر إلى دفع الرشوة لإحياء حقه، جاز له الدفع، وحرم على القابض" (رد المحتار ۵/ ۷۲)

البتہ ملک کے ارباب علم وفکر ودانش کو ممکنہ حد تک اس بات کی عملی جدوجہد کرنی چاہئے کہ ملک میں ٹیکس (Tax) کا بہتر نظام قائم ہو، اور مال وملکیت کے سلسلہ میں ایسا قانون بنے کہ لوگ آسانی کے ساتھ اس پر عمل کرسکیں، اور قانون سے فرار کی تدبیریں نہ سوچیں" (دیکھئے: موصوف کا مقالہ)۔

☆ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں:

"اس لئے مذکورہ بالا صورت حال میں اگر لون کی ادائیگی وقت پر کردی جائے اور زمین کو اس لون سے خرید لیا جائے، تاکہ عام مسلمانوں کو سستی قیمت میں پلاٹ حاصل ہوجائے تو سرمایہ چھپانے سے جو جھوٹ لازم آرہا ہے عنداللہ اس کے وبال سے بچ سکتا ہے"۔

☆ مولانا محمد زبیر ندوی لکھتے ہیں:

"اگر کوئی شخص واقعی ضرورت مند ہو اور اس کے بغیر اس کی زندگی مشکلات سے دوچار ہو اور خود سے کوئی مناسب مکان خریدنے پر قادر نہ ہو تو لون کے ساتھ کالونی میں مکان لینے کی گنجائش ہے، ورنہ نہیں، یہی حکم تاجر کے لئے بھی ہے، فقہ کا اصول ہے:

"المشقة تجلب التيسير، الأمر إذا ضاق اتسع، الضرر يدفع بقدر الإمكان"۔

☆ مفتی عثمان بستوی لکھتے ہیں:

"رشوت کے باب میں بھی حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، لہٰذا سودی قرض میں جو سود دیا جائے اس کو رشوت کے قائم مقام مان کر کے دفع مضرت کے لئے دینے کی بدرجہ اولیٰ گنجائش ہوگی۔

''أخذ المال يستوي أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع وهو حرام على الآخذ فقط'' (فتاوی شامی ۸/ ۳۵)

حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ کے فتوی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ وہ اس مسئلہ میں کہ بعض اوقات رقم موجود ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص بڑا سرمایہ لگا کر کاروبار کرتا ہے تو حکومت کے قوانین کی وجہ سے پکڑ لیے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں مسلمان کیا کرے؟ حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں: ''مثلاً اپنے جائز روپے سے بھی بڑا کاروبار کرنے میں قانون حکومت کی وجہ سے قانونی گرفت ہوکر اپنا جائز روپیہ کالا روپیہ شمار ہوکر قابل ضبطی وغیرہ ہو رہا ہو تو قانونی رو سے اور اپنے حلال روپے کو بچانے کے لئے مجبوری میں بقدر ضرورت حکومت وقت سے قرض لے لینے کی گنجائش ہو جاتی ہے'' (منتخبات نظام الفتاوی ۱/ ۱۸۹)۔

☆ مولانا شاہجہاں ندوی صاحب نے ایک متبادل صورت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پھر بھی موجودہ صورتحال میں بہتر یہ ہے کہ زمین کی خریداری شراکت کے ساتھ ہو، یعنی تمام شرکاء سے سرمایہ اکٹھا کرنے کے بعد زمین کی خریداری ہو، اور زمین کی خریداری کے نتیجہ میں تمام شرکاء کے درمیان ''شرکت ملک'' قائم ہو جائے، در مختار میں ہے:

''شركة ملك، وهي أن يملك متعدد: إثنان فأكثر عينًا أو دينًا بإرث أو بيع أو غيرهما'' (تنویر الابصار مع الدر المختار ۴/ ۲۹۹، کتاب الشرکة)، اس طرح مختلف مالکین کی طرف سے بڑی مقدار میں وہائٹ منی دکھانے کی صورت میں قانونی دشواری حائل نہ ہوگی''

ناگزیر حالات میں گنجائش ہے:

☆ رہائشی علاقوں کی خرید کے لئے اگر ایسا اقدام کیا جائے جو سوالنامہ میں مذکور ہے تو ناگزیر حالات میں سود کے وبال کو انگیز کیا جا سکتا ہے۔

☆ بعض اوقات جھوٹ بولنا یا یوں کہہ لیا جائے تعریض یعنی جھوٹ کی شکل بنانا مباح ہو جاتا ہے:

''والكذب مباح لإحياء حقه ودفع الظلم عن الناس، والمراد: التعريض، لأن عين الكذب حرام'' (ردالمحتار ۵/ ۳۰۲) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

☆ اس قدر قرض لینا جائز ہوگا، جس کے ذریعہ تاجر اپنے آپ کو قانونی گرفت سے بچا سکے، بالخصوص اس لئے بھی کہ قومیائے ہوئے بینک سرکاری ادارے ہیں اور سرکاری قرضہ جات کے معاملہ میں علماء نے زیادہ نرمی برتی ہے (کتاب الفتاوی ۵/ ۳۱۵)۔

(قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپوری)۔

☆ انکم ٹیکس وغیرہ کے ناواجبی قانون سے بچنے کے لئے ایک قانونی ضرورت بن گئی ہو یا کاروبار کی بقا اور اس کے تحفظ بغیر لون ملے دشوار ہو جائے تو بینک سے قرض لیا جا سکتا ہے (جدید فقہی مسائل ۲/ ۲۷۵، ۲۷۶) (قاری ظفر الاسلام اعظمی)۔

درست نہیں ہے:

☆ محض سرکاری قوانین، انکم ٹیکس و دیگر سرکاری ٹیکسیز وغیرہ سے بچنے کے لئے استطاعت کے باوجود سودی قرض لے کر زمین کی خرید وفروخت کرنا درست نہیں ہے، خواہ غریب مسلمانوں کے تعاون کا جذبہ ہو۔

سود جیسے موجب لعنت اور حرمت معاملہ میں مبتلا ہو کر غیروں یا مسلم غرباء کی مدد کرنا جائز نہیں ہے: "ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" کے تحت ممنوع ہوگا (مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، حافظ کلیم اللہ عمری)۔

☆ غیر مسلموں کے ترقیات کو دیکھ کر گمراہ کن راہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "هذا صراطي مستقيمًا فاتبعوه ولا تتبعوا السبل" (سورہ انعام: ۱۵۴)، یہ دراصل شیطان کی راہ ہے۔

البتہ اگر خود کوئی پریشان حال بے مکان مسلمان مکان کا محتاج ہو اور اسے غیر سودی قرض نہ ملتا ہو تو ضرورت کی بنا پر بقدر ضرورت کے اس لئے انفرادی طور پر سودی قرض لے کر مکان یا رہائشی زمین خریدنے کی گنجائش ہوگی، جیسا کہ فقہاء نے صراحت کی ہے: "يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ/ ۱۰۰) (مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

☆ یہ ٹیکس کی چوری ہے اور ٹیکس کی چوری اور اس سے راہ فرار اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

دوسری بڑی خرابی سود جیسے گناہ کا ارتکاب بغیر کسی اضطرار کے۔

☆ الغرض پیسے ہونے کے باوجود قانونی دشواریوں سے بچنے کے لئے سودی قرض نہیں لیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی اس طرح سے زمین خریدنا درست ہے اور نہ کالونی بنانا (مولانا ابصار احمد ندوی)۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی لکھتے ہیں: شہر میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت غریب ہے، یہ خلاف حقیقت ہے۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی اور حافظ کلیم اللہ عمری نے یہ مشورہ دیا ہے: مسلمان تاجروں کے لئے لازم ہے کہ وہ جائز شرعی کاروبار کریں۔

☆ مولانا محی الدین غازی نے لکھا ہے کہ چونکہ کاروباری ضرورتوں کے لئے لون لینے کی حاجت کا تعلق صرف زمین کے کاروبار سے نہیں ہے، بلکہ ہر کاروبار سے ہے، اس لئے یہاں بھی وہی موقف اختیار کیا جانا چاہئے، جو عمومی طور پر ہر کاروباری لون کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا ہے۔

☆ اسی طرح اس سوال کے جواب میں ابتداءً ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی اور مولانا عبدالحمید قاسمی نے سودی لین دین اور سودی معاملہ کی شناعت وقباحت پر آیات واحادیث وغیرہ کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

سوال نمبر (۹) کالونی میں جو قطعہ زمین بیچا جاتا ہے، وہ نقشہ پر تو درج ہوتا ہے اور زمین کے ہر ٹکڑے کا ایک نمبر ہوتا ہے، لیکن زمین پر پلاٹس بنائے نہیں جاتے اور کالونی بسانے والے کے لئے اس بات کی بھی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ اس جگہ کو تبدیل کردے یا نقشہ میں جس پلاٹ کا جو نمبر بتایا گیا ہے، اس کو کسی اور جگہ ڈال دے، کیا اس طرح صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجائے گی اور خرید وفروخت کا یہ عمل درست ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں بھی مقالہ نگاران کے درمیان دو نقطہ نظر پائے جاتے ہیں:

نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجاتی ہے:

پہلے نقطہ نظر کے حاملین کی رائے ہے کہ صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجائے گی اور خرید وفروخت کا یہ عمل درست ہوگا (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عفان منصور پوری، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

بشرطیکہ اس کو عرفاً قبضہ سمجھا جاتا ہو (مولانا ابصار احمد ندوی)۔

زمین فروخت کرتے وقت پلاٹس کی لمبائی، چوڑائی اور اس کے راستے وغیرہ متعین کردینے سے اس طرح کی تعیین ہوجاتی ہے جو رافع نزاع ہے، لہذا اس صورت میں جو جہالت ہوتی ہے وہ جہالت یسیرہ ہے، جس کا دور کرنا ان کے اپنے اختیار میں ہے اور اس کی تعیین میں عموماً پلاٹ میں یکسانیت کی وجہ سے اختلاف بھی نہیں ہوتا ہے، لہذا اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے (مفتی عثمان بستوی، مولانا زبیر ندوی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مفتی مقصود فرقانی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ زمین کی فروختگی کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ جس جگہ کی زمین کو بیچا جارہا ہے، اس کو بتا کر اس مقدار کی تعیین کردی جائے جو بیچی جارہی ہے، مثلاً دس یا بیس گز زمین، چنانچہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

''وأما الذرعيات، فإن لم يسم جملة الذرعان، بأن قال: بعت منك هذا الثوب، أو هذه الأرض، أو هذه الخشبة، كل ذراع منها بدرهم، فالبيع فاسد فى الكل عند أبي حنيفة، إلا إذا علم المشترى جملة الذرعان فى المجلس، فله الخيار إن شاء أخذ، وإن شاء ترك، وإن لم يعلم حتى تفرقا، تقرر الفساد، وعند أبي يوسف ومحمد يجوز البيع فى الكل، ويلزمه كل ذراع منه بدرهم.... وجه قولهما فى مسائل الخلاف أن جملة البيع معلومة، وجملة الثمن ممكن الوصول إلى العلم بالكيل والوزن والعدد والذرع، فكانت هذه جهالة ممكنة الرفع والإزالة، ومثل هذه الجهالة لا تمنع صحة البيع... ولأبي حنيفة رحمة الله أن جملة الثمن

مجهولة حالة العقد جهالة مفضية إلى المنازعة. فتوجب فساد العقد.... وقولهما: يمكن رفع هذه الجهالة مسلم، لكنها ثابتة للحال إلى أن ترتفع'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۵۹) (مقالہ: مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۲۔ ''فسد بيع عشرة أذرع من مائة ذراع من دار أو حمام وصححاه وإن لم يسم جملتها على الصحيح. لأن إزالتها بيدهما، لا يفسد بيع عشرة أسهم من مائة سهم لشيوع السهم لا الذراع بقي لو تراضيا على تعيين الأذرع في مكان لم أره، وينبغي انقلابه صحيحًا لو في المجلس ولو بعده فبيع بالتعاطي (الدر) وفي الرد: ذكر في غاية البيان نقلًا عن الصدر الشهيد والإمام العتابي أن قولهما بجواز البيع إذا كانت الدار مائة ذراع. ويفهم هذا من تعليلها أيضًا حيث قال: لأن عشرة أذرع من مائة ذراع عشر الدار فأشبه عشرة أسهم من مائة سهم ... قلت وجه كون الموضع مجهولًا أنه لم يبين أنه من مقدم الدار أو من مؤخرها وجوانبها تتفاوت قيمة فكان المعقود عليه مجهولًا جهالة مفضية إلى النزاع فيفسد كبيع بيت من بيوت الدار'' (شامی ۷/ ۱۷) (مقالہ: مفتی عثمان بستوی)

۳۔ شرح مجلہ میں ہے کہ اگر کسی نے دوسرے شخص سے متعین ثمن کے ذریعہ اس چیز کو خریدا جو اس کے پاس ہے، اگرچہ متبایعین کو اس کی صحیح مقدار معلوم نہ ہو، تو یہ معاملہ درست ہے، اسی طرح اس میں ہے کہ اگر کسی نے کسی مکان میں اپنے حصہ کو بیچا ایسے شخص سے جو اس کی صرف مقدار جانتا ہو تو یہ بیع بھی درست ہے (۱/ ۱۷۸) (مولانا محمد زبیر ندوی)۔

۴۔ زمین و مکان حدود اور اوصاف سے متعین ہو سکتے ہیں اور اموال غیر منقولہ صرف جنس کے بیان سے متعین ہو سکتے ہیں (حوالہ سابق) (مولانا زبیر ندوی)

۵۔ جب نقشہ میں اشارہ موجود ہے تو مبیع متعین ہوگئی، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ''والأعواض المشار إليها لا يحتاج إلى معرفة مقدارها في جواز البيع، لأن بالإشارة كفاية في التعريف وجهالة الوصف فيه لا تفضي إلى المنازعة'' (ہدایہ ۳/ ۲۰)۔

۶۔ صاحب ہدایہ نے بیع کی مذکورہ صورت کو حضرات صاحبین کے حوالے سے جائز قرار دیا ہے:

''ومن اشترى عشرة أذرع من مائة ذراع من دار أو حمام فالبيع فاسد عند أبي حنيفة. وقالا: هو جائز وإن اشترى عشرة أسهم من مائة سهم جاز في قولهم جميعًا'' (حوالہ سابق) (مولانا عبد الحمید قاسمی)۔

۷۔ ''في تقريرات الرافعي: والظاهر اعتماد قولهما الآن لموافقة العرف حملًا لكلام العاقد على عرفه'' (تقريرات الرافعي على آخر الشامي ۷/ ۱۱۶) (مفتی عثمان بستوی، مولانا زبیر ندوی)۔

۸۔ ''اشترى أرضًا وذكر حدودها لا ذرعها طولًا وعرضًا جاز. وإن عرف المشترى الحدود لا الجيران يصح وإن لم يذكر الحدود ولم يعرفه المشترى جاز البيع إذا لم يقع بينهما تجاحد وجهل البائع بالمبيع لايمنع وجهل المشترى يمنع'' (فتاوى بزازيه على الهنديه ۴/ ۳۷۲) (مولانا ظفر عالم ندوی)۔

۹۔ اس لئے کہ بائع نے زمین کے ایک حصہ کی رجسٹری کرا کر مشتری کو کاغذی نقشہ پر اس کا مالک بنا دیا ہے اور زمین و جائیداد میں سرکاری رجسٹری کرا کر اسکے کاغذات پر قبضہ دے دینا اس زمین پر قبضہ دینے کے مانند ہے (مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی)۔

۱۰۔ ''تفسير التسليم والقبض، فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية. والتخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع والمشترى برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن للمشترى معه التصرف فيه'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۹۸)۔

۱۱۔ ''والقبض الكامل في المنقول ما يناسبه أو في العقار ماينا سبه'' (شرح المجله ۱/ ۴۶۳) (مولانا عفان منصور پوری)۔

دوسرے نقطہ نظر کے حاملین کی رائے اور دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ زمین کی خرید و فروخت کی وہ صورت جو اس وقت رائج ہے (جو سوال میں بھی مذکور ہے)، یہ قبضہ کی حقیقت کے منافی ہے، تا آنکہ پلاٹنگ کر کے مشتری کے لئے ایک حصہ فکس نہ کر دیا جائے اور یہ نہ کہہ دیا جائے کہ یہ حصہ تمہارا ہے۔

(مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبدالمنان آسام، قاضی ذکاء اللہ شبلی، حافظ کلیم اللہ عمری)۔

۲۔ صورت مسئولہ میں تخلیہ بھی نہیں پایا گیا، نیز مبیع کی جہالت بھی لازم آرہی ہے جو مفضی الی المنازعت ہوسکتی ہے، مثلاً لب روڈ یا پیچھے یا دونوں سائڈ اوپن وغیرہ۔ اور مبیع کے جواز میں کلیدی عنصر جو بنص قرآنی "إلا عن تراض" ہے، مفقود ہورہا ہے، اس لئے خرید وفروخت کا یہ عمل درست نہیں ہونا چاہئے (قاری ظفر الاسلام اعظمی)

۳۔ سوال کے سیاق سے معلوم ہورہا ہے کہ اس معاملہ میں تخلیہ نہیں ہوا اور تخلیہ ہی قبضہ ہے:

"أجمعوا على أن التخلية في البيع الجائز تكون قبضًا...." (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۶) (قاری ظفر الاسلام اعظمی)۔

۴۔ بیع کی صحت کی شرائط میں سے ایک مبیع کا معلوم ہونا ہے، چنانچہ اگر مبیع مجہول ہو تو بیع درست نہ ہوگی۔

"ومنها أن يكون المبيع معلومًا والثمن معلومًا علمًا يمنع من المنازعة فالمجهول جهالة مفضية إليها غير صحيح كشاة من هذا القطيع وبيع الشئی بقيمته وبحكم فلان" (البحر الرائق ۵/ ۴۳۶)۔

۵۔ "وفسد بيع شاة من قطيع وثوب من عدل وكذا إذا باع عدديًا متفاوتًا عددًا بثمن واحد فوجد أكثر لجهالة المبيع وكذا إذا اشترى من هذا اللحم ثلاثة أرطال بدرهم ولم يبين الموضع" (البحر الرائق ۵/ ۴۵۹) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۶۔ اگر کالونی بسانے والا صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے زمین فروخت کرے اور زمین کے محل وقوع کے بارے میں کوئی وضاحت نہ کرے یا زمین پر پلاٹس بناتے وقت اپنے متعینہ نقشے کی خلاف ورزی کرے تو اس صورت میں بائع وخریدار کے درمیان بعد میں تنازعہ پیدا ہوسکتا ہے، کیونکہ ایک بڑے رقبے کی زمین کے مختلف حدود اربعہ رکھنے والے قطعۂ زمین کی نوعیت وافادیت مختلف ہوتی ہے، خریدار نقشے میں دیئے گئے حدود اربعہ کے مطابق جس قطعۂ زمین کو پسند کرتا ہے وہ اسی کے حصول پر راضی ہوتا ہے، اگر بعد میں اسے نقشے کے مطابق حدود اربعہ کا حامل قطعۂ زمین حاصل نہ ہو تو اس کے اور کالونی بسانے والے کے درمیان تنازعہ وجھگڑا پیدا ہوسکتا ہے، لہٰذا خرید وفروخت کا یہ عمل درست نہ ہوگا، چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

"ومن اشترى عشرة أذرع من مائة ذراع من دار أو حمام فالبيع فاسد عند أبي حنيفة وقالا: هو جائز وإن اشترى عشرة أسهم من مائة سهم جاز في قولهم جميعا، لهما أن عشرة أذرع من مائة ذراع عشر الدار فأشبه عشرة أسهم وله أن الذراع اسم لما يذرع به واستعير لما يحله الذراع وهو المعين دون المشاع وذالك غير معلوم بخلاف السهم"

(ہدایہ علی فتح القدیر ۶/ ۲۵۴) (مقالہ: مولانا محمد الیاس قاسمی)۔

۷۔ بیع وشراء کی وجہ سے ایک تو ملکیت منتقل ہوتی ہے، دوسرے مبیع بائع کے ضمان سے منتقل ہوکر مشتری کے ضمان میں داخل ہوجاتی ہے، ملکیت کی منتقلی کے لئے ایجاب وقبول کافی ہے، مگر ضمان کا منتقل ہونا اس وقت ہوتا ہے جبکہ قبضہ وتسلیم پائے جائیں، قبضہ وتسلیم کی جو تفصیل فقہاء نے ذکر کی ہے اس کا خلاصہ علامہ کاسانی کے الفاظ میں اس طرح ہے:

"التسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع المبيع والمشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلمًا للمبيع والمشتري قابضًا له" (بدائع ۴/ ۴۹۸، كتاب البيوع، تفسير التسليم والقبض، ط: زكريا ديوبند) (مقالہ: مولانا فروغ احمد قاسمی)۔

۸۔ جبکہ نمبر تبدیل کرنے کی بھی گنجائش ہے اور نقشہ میں دیا ہوا پلاٹ کا نمبر بھی کسی اور جگہ ڈال دینے کی گنجائش ہونے کی وجہ سے یہ خرید وفروخت کا عمل درست نہ ہوگا (مفتی عبدالمنان آسام، مولانا محی الدین غازی)۔

۹۔ لیکن نقشہ میں دکھائے گئے پلاٹ کو بدل کر دوسرا پلاٹ دینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ نقشہ میں جو پلاٹ دکھایا گیا ہے تو پھر وہ متعین ہوگیا اور متعین شئی کو بدل دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ مبیع مجہول ہوگیا اور مجہول شئی کی بیع درست نہیں ہے، نیز ایسی صورت میں نزاع بھی ہوگا، کیونکہ قیمتیں جگہ کے اعتبار سے بدلتی ہیں، نیز اس میں مشتری کو دھوکہ دینا بھی ہے اور بیع میں دھوکہ اور غرر جائز نہیں ہے، لہٰذا بائع کو چاہئے کہ نقشہ میں جو پلاٹ جیسا دکھایا گیا ہے ویسا ہی مشتری کو حوالہ کرے، بصورت دیگر مشتری کو اختیار ہے کہ دوسرا پلاٹ قبول کرے یا نہ کرے (مولانا انصار احمد ندوی)۔

البتہ

☆ فروخت کرنے والے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ جگہ کو تبدیل کردے یا نقشہ میں جس پلاٹ کا جو نمبر بتایا گیا ہے اس کو دوسری جگہ ڈال دے، کیونکہ پلاٹ نمبر کی وجہ سے جگہ متعین ہے اور اس لئے بھی کہ سڑک کے سامنے کے پلاٹ کی قیمت پیچھے کے پلاٹ سے زیادہ ہوتی ہے (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

☆ صورت مسئولہ میں کالونی کا قطعہ زمین کا رقبہ متعین ہوتا ہے، اگر کالونی بنانے والا اس بات کی وضاحت کردے کہ خریدار جو قطعہ زمین خرید رہا ہے کالونی میں اس کا محل وقوع متعین نہیں ہے اور پوری کالونی میں مخصوص نمبر کا قطعہ کسی بھی مقام پر دیا جاسکتا ہے تو بعد میں کوئی نزاع نہیں پائی جائے گی اور پائی جانے والی جہالت جہالت یسیرہ کے قبیل سے ہوگی، اور اس طرح پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجائے گی اور خرید وفروخت کا عمل درست ہوگا۔

''معرفة الحدود تغني عن معرفة المقدار ففي البزازية: باعه أرضًا وذكر حدودها لا ذرعها طولًا وعرضًا جاز وكذا إن لم يذكر الحدود ولم يعرفه المشتري إذا لم يقع بينهما تجاحد''

(رد المحتار ۷/ ۴۸، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۵/ ۴۵۹) (مقالہ: مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

سوال نمبر (۱۰): اس صورت میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمین کے جو حصے بیچے گئے ہیں، اس پر بیچنے والا کاشت بھی کرتا رہتا ہے، تو کیا اس کے باوجود خریدار اس کا مالک ہوجائے گا؟

اس سوال کے جواب میں چند مقالہ نگار کے علاوہ تمام مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ایجاب وقبول ہوگیا تو معاملہ بیع مکمل ہوگیا اور مشتری اس شئی کا مالک بھی ہوگیا، اب اگر بائع مشتری کی اجازت سے اس زمین پر کاشت کررہا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر وہ یہ سمجھ کر کاشت کررہا ہے کہ اب بھی وہ مالک ہے تو یہ عمل جائز نہیں ہوگا، بائع کو چاہئے کہ وہ اس زمین کو مشتری کے حوالے کرے۔

دلائل:

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بیع، ایجاب وقبول سے ہی منعقد ہوجاتی ہے اور ایجاب وقبول کے بعد مشتری مبیع کا مالک ہوجاتا ہے:

''البيع ينعقد بالإيجاب والقبول إذا كانا بلفظي الماضي، مثل أن يقول أحدهما بعت والآخر اشتريت'' (ہدایہ علی فتح القدیر ۶/ ۲۳۰) (مفتی الیاس قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی عثمان بستوی، مولانا عفان منصورپوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

۲۔ ''وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد'' (ہدایہ علی فتح القدیر ۶/ ۲۳۸)

(مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۳۔ ''أما حكمه فثبوت الملك فى المبيع للمشترى وفى الثمن للبائع إذا كان البيع باتًا'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۳)

(مفتی الیاس قاسمی)۔

۴۔ ''أما حكمه فهو ثبوت الملك للمشترى فى المبيع وللبائع فى الثمن للحال'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۹۷، کتاب البیوع)

(مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی الیاس قاسمی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۵۔ ''وأما بيان صفة الحكم له صفتان: إحداهما اللزوم حتى لا ينفرد أحد المتعاقدين بالفسخ، سواء كان بعد الافتراق عن المجلس أو فيه... والثانية: الحلول: وهو ثبوت الملك فى البدين فى الحال'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۴۳)

(مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۶۔ ظاہر ہے کہ جب خریدار غیر معین ایک ایکڑ کا مالک ہے تو کالونی بنانے والا اس زمین میں کاشت کرسکتا ہے (قاضی عبدالجلیل قاسمی)۔

۷۔ لہٰذا زمین کے جو حصے فروخت کئے گئے ہیں وہ خریدار کی ملکیت میں آجائیں گے؛ اگرچہ اس پر بیچنے والا مشتری کی اجازت سے کاشت بھی کرتا رہتا ہو

(مفتی الیاس قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا عفان منصور پوری، مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی عبدالمنان آسام، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا محمد زبیر ندوی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مولانا محی الدین غازی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی مقصود فرقانی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

تو ملکیت اور قبضے میں یہ عمل مانع نہیں سمجھا جائے گا (مولانا محی الدین غازی)۔

عقد بیع کے وقت شرط:

۱۔ اگر خریداری کے وقت بیچنے والے نے یہ شرط لگائی ہو کہ وہ زمین میں کاشت کرتا رہے گا تو بیع فاسد ہوجائے گی، کیونکہ یہ شرط تقاضۂ بیع کے خلاف ہے:

''ولا بیع بشرط لا یقتضیه العقد ولا یلائمه، وفیه نفع لأحدهما، أو فیه نفع للمبیع هو من أهل الاستحقاق، ولم یجز العرف به، ولم یرد الشرع بجوازه'' (تنویر الابصار مع الدر المختار ۵/ ۸۴) (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی الیاس قاسمی)۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا یحل سلف وبیع، ولا شرطان فی بیع، ولا ربح ما لم یضمن، ولا بیع ما لیس عندك'' (سنن ترمذی، حدیث: ۱۲۳۴، ابن ماجه، حدیث: ۲۱۸۸، مسند احمد، حدیث: ۶۶۲۸) (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۳۔ ''وکل شرط لا یقتضیه العقد وفیه منفعة لأحد المتعاقدین أو للمعقود علیه وهو من أهل الاستحقاق کشرط أن لا یبیع المشتری العبد المبیع لأن فیه زیادة عاریة عن العوض فیؤدی إلی الربا أو لأنه یقع بسببه المنازعة فیعری العقد عن مقصوده إلا أن یکون متعارفًا، لأن العرف قاض علی القیاس'' (ہدایہ ۳/ ۵۹) (مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

قبضہ سے پہلے ملکیت کا ثبوت:

۱۔ ''صح بیع عقار لا یخشی هلاکه قبل قبضه من بائعه لعدم الغرر لندرة هلاك العقار....'' (فتاوی شامی ۷/ ۳۶۹)
(مفتی عثمان بستوی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی)۔

۲۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مشتری خرید شدہ زمین پر قبضہ سے قبل تصرف کرے تو یہ تصرف درست ہے:

''للمشتری أن یبیع المبیع من آخر قبل قبضه إن کان عقارا لا یخشی هلاکه وکما یجوز بیع العقار قبل قبضه یجوز أیضًا التصرف فیه بالرہن، والهبة غیر أن التصرفات المذکورة وإن کانت جائزة إلا أنها لا تکون لازمة ونافذة إلا بدفع الثمن للبائع أو إجارته لها'' (شرح مجلة الاحکام ۱/ ۱۲۸)
(مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی عفان منصور پوری، مولانا زبیر ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی)۔

۳۔ ''إذا اشتری دارًا أو عقارًا فوہبها قبل القبض من غیر البائع یجوز عند الکل، ولو باع یجوز فی قول أبی حنیفة وأبی یوسف رحمهما الله ولا یجوز فی قول محمد رحمه الله'' (فتاوی تاتارخانیه ۸/ ۲۶۶) (مولانا ظفر عالم ندوی)۔

۴۔ اس لئے اگر زمین فروخت کرنے والا فروخت شدہ زمین پر اپنی کاشت کرتا ہے تو بھی خریدنے والے کے لئے اس کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، کیوں کہ فروخت شدہ زمین پر کاشت کرنے سے مشتری کے لئے قبضہ کے تحقق اور ملکیت کے ثبوت میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔

''(ویلزم بإیجاب وقبول) وقال الشافعی لا یلزم به بل لهما خیار المجلس لقوله علیه السلام: ''المتبایعان بالخیار ما لم یتفرقا''، إذ هما متبایعان بعد البیع وقبله متساومان، ولنا أن العقد تم من الجانبین ودخل المبیع فی ملك المشتری والفسخ بعده لا یکون إلا بالتراضی، لما فیه من الإضرار بالآخر بإبطال حقه کسائر العقود'' (تبیین الحقائق ۴/ ۲۷۶-۲۷۷) (مفتی عثمان بستوی)۔

البتہ اگر زمین فروخت کرنے والا خریدار کی اجازت کے بغیر اس زمین میں کاشت کررہا ہو تو زمین کی پیداوار میں سے اس کے لئے لاگت کے بقدر پیداوار ہی حلال ہے، اس سے زائد پیداوار صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا، مجمع الانہر میں ہے:

"ويتصدق بالفضل عند الطرفين حتى إذا غصب أرضًا فزرعها فأجرجت ثمانية أكرار ولحقه من المؤونة قدر كر ونقصها قدر كر فإنه يأخذ منه أربعة أكرار ويتصدق بالباقي" (مجمع الانہر ۴/ ۸۱، کتاب الغصب)

(مولانا الیاس قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی)۔

جبکہ بعض مقالہ نگار کی آراء مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جب تک کاغذی طور پر تحصیل میں رجسٹری ہو کر نیٹ پر نام نہ آجائے وہ خریدار نہیں مانا جائے گا، چونکہ وہ زمین ابھی بائع کے پاس ہی ہے، اس لئے کاشت بھی اسی کی ہوگی اور زمین بھی اسی کی ہوگی (ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی)۔

۲۔ جس حصہ کو خریدار نے خریدا ہے، اگر بائع اس میں کاشت کر رہا ہے تو بائع کا قبضہ ہی سمجھا جائے گا، لہذا اس کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوگا، اس لئے کہ بائع ابھی تک پلاننگ سے فارغ نہیں ہوا ہے تو گویا ابھی تک مبیع متعین نہیں ہو پائی ہے، جبکہ "مبیع" کی جہالت مفسد عقد ہوا کرتی ہے:

"وأما الثالث وهو شرائط الصحة فخمسة وعشرون، منها عامة ومنها خاصة. فالعامة لكل بيع شروط الانعقاد المارة، لأن ما لا ينعقد لا يصح، وعدم التوقيت ومعلومية المبيع ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة فلايصح بيع شاة من هذا القطيع..." (رد المحتار ۴/ ۶، کتاب البیوع) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۳۔ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو ذکر کرنے کے بعد خلاصہ کے طور پر لکھا ہے:

"لہذا جو زمین بیچی گئی ہے اس کے حصے کی تعیین میں اختلاف نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ سب برابر حیثیت وقدر کے ہیں تو یہ بیع صحیح ہوگئی، لیکن ضمان منتقل نہیں ہوا، اور اگر زمین کی پوزیشن ایسی ہے کہ حصوں کی تعیین میں غیر معمولی حیثیت عرفی کے لحاظ سے فرق ہے جس کو عام طور پر گوارہ نہیں کیا جاتا ہے تو اس وقت بیع ہی منعقد نہیں ہوئی، اور جب بیع ہوئی ہی نہیں تو آگے خریدار کو بیچنے کا حق ہی نہیں ہوگا، واللہ اعلم"۔

۴۔ بائع اپنی کاشت کاٹنے کے بعد خواہ وہ کاشت کاٹنے کے وقت کو پہنچی ہو یا نہیں، اس کی اپنی کاشت کاٹنے کے بعد ہی خریدار اس زمین کا مالک ہوگا۔

(مولانا ابوسفیان مفتاحی)۔

سوال نمبر (۱۱۔الف): جس شخص نے پلاٹ خریدا ہے تو اس سے پہلے کہ اس کا پلاٹ متعین ہو صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر وہ اپنی زمین کسی اور سے فروخت کر دیتا ہے، کیا یہ بیع درست ہوگی؟ اس میں دو صورتیں ہوتی ہیں:

الف: ایک یہ کہ زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آگئی تھی اور اس نے پلاٹس فروخت کئے تھے۔

اس کے جواب میں اکثر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آگئی تھی اور اس نے پلاٹس فروخت کئے تو پلاٹ خریدنے والا پلاٹ متعین ہونے سے پہلے صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر اپنی زمین کسی دوسرے شخص سے فروخت کر سکتا ہے، بشرطیکہ خریدار کے لئے انتفاع سے کوئی قوی مانع نہ پایا جائے (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی الیاس قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مولانا انصار احمد ندوی، مولانا نازبیر ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی مقصود فرقانی، مولانا عبد الحمید قاسمی)۔

ان حضرات نے مندرجہ ذیل احادیث اور فقہی عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

۱۔ غیر منقولہ اشیاء جیسے زمین، پلاٹ، جائیداد وغیرہ کا صرف سودا کر کے معاملہ کر لینا قبضہ کے لئے کافی ہے اور اس کے لئے دوسرے کو فروخت کرنا بھی صحیح ہے:

"يجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد: لا يجوز رجوعًا إلى إطلاق الحديث واعتبارًا بالمنقول وصار كالإجارة، ولهما أن ركن البيع صدر من أهله في محله ولا غرر فيه، لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول" (ہدایہ علی فتح القدیر ۶/ ۴۷۲) (مفتی الیاس قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

۲۔ "ولو ملك غير المنقول بالوصية أو الميراث يجوز بيعه قبل القبض، كذا في المحيط: اشترى دارًا أو عقارًا فوهبها قبل القبض من غير البائع يجوز عند الكل ولو باع يجوز في قول أبي حنيفة وأبي يوسف ولايجوز في قول محمد" (فتاوی

ہندیہ ۳/ ۱۳) (مفتی الیاس قاسمی، مفتی شاہجہاں ندوی وغیرہ)۔

۳۔ ''وأما بيع الأعيان غير المنقولة قبل قبضها كبيع الأرض والضياع والنخيل والدور ونحو ذلك من الأشياء الثابتة التي لا يخشى هلاكها فإنه يصح'' (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/ ۲۳۴) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۴۔ ''مما يدل بقول أبي حنيفة ما رواه ابن أبي ملكية أن عثمان ابتاع من طلحة أرضًا بالمدينة نافلة بأرض له بالكوفة فقال عثمان بعت ماله أره. فقال طلحة: إنما النظر لي لأني ابتعت مغيبًا وأنت قد رأيت ما ابتعت فتحا كما إلى جبير بن مطعم فقضى على عثمان: أن البيع جائز وأن النظر لطلحة. لأنه ابتاع مغيبًا رواه البيهقي بإسناد حسن وتقتضي جواز بيع العقار قبل القبض فإن عثمان باع أرضًا له بالكوفة ولم يرها وهو ظاهر أنه باعها ولم يقبضها فإن القبض يستلزم الرؤية حتمًا'' (اعلاء السنن ۱۴/ ۲۳۸) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۵۔ اور عقلی اعتبار سے یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ صرف ایسی چیز کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت ہے جسے منتقل کیا جاسکے (مولانا شاہجہاں ندوی)

۶۔ بشرطیکہ پہلے ہی سے وہ خریدار کے سامنے واضح کردے کہ پوری کالونی میں اسے متعین طور پر ایک پلاٹ ملے گا، تاکہ بعد میں تنازعہ پیدا نہ ہو، علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: "فلو اتفقوا على أن مؤدى عشرة أذرع من مائة هذه الدار شائع لم يختلفوا'' (فتح القدیر ۶/ ۲۵۴) (مفتی الیاس قاسمی)۔

جبکہ مولانا ظفر عالم ندوی اور مولانا محی الدین غازی کی رائے ہے کہ جب تک پلاٹ کی تعیین نہ ہوجائے اس کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں مجھول اور مشاع شئی کی بیع ہوگی، جو فاسد ہوگی۔

اسی طرح ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی لکھتے ہیں:

کالونی بنانے کی ملکیت سے مراد اگر کالونی بنانے والے کے نام سے اس زمین کا داخل خارج ہوچکا تھا اور اس کے نام زمین نیٹ پر آگئی تھی تو بلاشبہ اس کا فروخت کرنا درست ہوگا، لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ فروختگی درست نہ ہوگی، حضرت امام شافعیؒ، امام محمدؒ اور امام زفرؒ کے یہاں کسی بھی شئی کو قبل القبض فروخت کرنا درست نہیں ہے: ''لا يجوز بيع المبيع قبل قبضه عقارًا كان أو منقولًا. لا بإذن البائع ولا بغير إذنه. لا قبل أداء الثمن ولا بعده. وقال أبوحنيفة وأبويوسف رحمهما الله: يمنع البيع قبل القبض في سائر المنقولات ويجوز في العقار الذي لا يخشى هلاكه كما في فتح القدير'' (تکملة فتح الملهم ۱/ ۳۵۰، ۳۵۱)۔

قاضی ذکاء اللہ شبلی لکھتے ہیں: مختار نامہ کے بعد بکنگ جائز ہے۔

سوال نمبر (۱۱-ب): دوسری صورت یہ ہے کہ زمین ابھی مالک زمین ہی کی ملکیت میں ہوتی ہے، کالونی بنانے والا اس کی اجازت سے (جو اکثر اوقات اسٹامپ پیپر پر ہوتی ہے) پلاٹنگ کرتا ہے اور اس کو بیعانہ کی ایک رقم دے دیتا ہے، اور وہ ایک مقررہ مدت میں بقیہ رقم ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے؛ لیکن اگر کسی وجہ سے قانونی رکاوٹ پیدا ہوگئی تو پھر زمین مالک زمین ہی کے پاس رہ جاتی ہے، کیا اس صورت میں پلاٹنگ کرنے والے کا پلاٹ بیچنا اور پھر اس سے پلاٹ خریدنے والے شخص کا اگلے شخص کو بیچ دینا جائز ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کی آراء حسب ذیل ہیں:

۱۔ لیکن دوسری صورت جس میں مالک زمین صرف پلاٹنگ کی اجازت دیتا ہے، قدرے تفصیل طلب ہے، اگر مالک زمین اور پلاٹنگ کرنے والے کے درمیان مبیع اور ثمن متعین ہوکر ایجاب وقبول بھی ہوچکا ہے تو اس کی بیع مکمل ہوچکی ہے، اس میں چونکہ ثمن ادا کرنے کی ایک مدت بھی مقرر کی گئی ہے، اس لئے اس کو بیع موجل کہیں گے، لیکن ادائیگی کا وقت متعین کرنا ضروری ہوگا۔

لیکن اگر مالک زمین اور پلاٹنگ کرنے والے کے درمیان خرید وفروخت کا معاملہ طے نہیں ہوا، بلکہ حکومتی منظوری کی توقع پر محض امکانی درجہ میں پلاٹنگ کرلی گئی، اور پھر پلاٹنگ کرنے والے نے اس کو فروخت کردیا تو یہ بیع الفضولی کہلائے گی، یعنی ایک غیر مالک شخص نے کسی کی چیز فروخت کردی، اس صورت میں اصل منظوری مالک زمین سے حاصل کرنی ہوگی، اگر اس نے اس خرید وفروخت کو منظور کرلیا تو یہ بیع درست ہوجائے گی، ورنہ کالعدم سمجھی جائے گی۔

''قال: من باع ملك غيره بغير أمره فالمالك بالخيار إن شاء أجاز البيع وإن شاء فسخ'' (ہدایہ ۳/ ۸۸)

(مولانا عبد الحمید قاسمی)۔

۲۔ زمین جبکہ مالک زمین سے ''خیار نقد'' کے ساتھ خریدی گئی ہو تو پلاٹنگ کرنے والے کا اصل مالک کی اجازت سے پلاٹنگ کرنا اور اسے بیچنا جائز ہے۔

(مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مفتی ظہیر احمد کانپوری)۔

۳۔ بیع، ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتی ہے، ایجاب وقبول کے بعد مشتری زمین کا مالک ہو جاتا ہے، اگرچہ سرکاری رجسٹر میں اس زمین پر بائع کا نام درج ہو:

''وإذا وجدا (أي الإيجاب والقبول) لزم البيع بلا خيار إلا لعيب أو رؤية'' (الدر المختار ۷/ ۴۷) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۴۔ بیعانہ کی رقم سودے طے ہونے کے بعد ہی دی جاتی ہے، اور خرید وفروخت میں متعینہ مدت کے بعد ثمن کی ادائیگی شرعاً جائز ہے۔

''ويجوز البيع بثمن حال ومؤجل إذا كان الأجل معلومًا'' (ہدایہ علی فتح القدیر ۶/ ۲۴۲)۔

''(وصح بثمن حال) وهو الأصل (ومؤجل إلى معلوم) لئلا يفضى إلى النزاع'' (الدر المختار علی رد المحتار ۷/ ۵۲)

(مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۵۔ مسئلہ مذکور میں کالونی بنانے والا سودا طے ہو جانے کے بعد زمین کا مالک ہو جاتا ہے، اور اس کے لئے جائز ہے کہ وہ پلاٹ دوسروں کو فروخت کرے، کیونکہ غیر منقولہ اشیاء کی بیع قبل القبض بھی جائز ہے، ''ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف'' (ہدایہ مع فتح القدیر ۶/ ۲۷۴)

(مفتی الیاس قاسمی)۔

۶۔ البتہ اس بات کی وضاحت کردی جائے کہ اسے غیر متعین طور پر ایک پلاٹ دیا جائے گا، اسی طرح اس بات کی بھی وضاحت کردی جائے کہ بائع قانونی طور سے زمین کا مالک نہیں ہے اور آئندہ ایسی صورت حال بھی پیش آسکتی ہے کہ قانونی دشواری کی وجہ سے بائع کو یہ معاملہ ختم کرنا پڑے، ایسی صورت میں بائع مشتری سے حاصل کردہ قیمت اسے واپس کرنے کا وعدہ کرے، فقہاء نے معاملات میں کسی بھی قسم کی فریب دہی سے منع کیا ہے چنانچہ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

''اتفق الفقهاء على أن الغش حرام سواء أكان بالقول أم بالفعل وسواء كان بكتمان العيب في المعقود عليه أو الثمن أم بالكذب والخديعة وسواء أكان في المعاملات أم في غيرها من المشورة والنصيحة'' (الموسوعة الفقهيه ۳۱/ ۲۱۹) (مقالہ: مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۷۔ دوسری صورت میں بھی جبکہ زمین ابھی مالک زمین ہی کی ملکیت میں ہو اور کالونی بنانے والا اصل مالک کی اجازت سے پلاٹنگ کررہا ہو تو بھی فروختگی جائز ہوگی، اس لئے کہ اصل مالک کی رضامندی پائی جارہی ہے ''والقبض الكامل في المنقول ماينا سبه وفي العقار ماينا سبه'' (شرح المجلہ ۱/ ۲۶۳) ''وتفسير التسليم والقبض، فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية. التخلي وهو أن يخلي البائع بين المبيع والمشتري برفع حائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلمًا للمبيع والمشتري قابضًا له'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۹۸) (مولانا عفان منصور پوری)۔

۸۔ مفتی عثمان بستوی صاحب نے مختلف فقہی عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

مذکورہ صورت خیار نقد پر زیادہ منطبق ہوتی ہے، کیونکہ جس طرح خیار نقد میں بائع اپنا سامان اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ اگر قیمت مدتِ متعینہ میں ادا نہیں ہوسکی تو یہ معاملہ فسخ ہو جائے گا، اسی طرح زمین کی خریداری میں بھی یہ شکل اپنائی جاتی ہے، کہ اگر خریدی ہوئی زمین کی قیمت متعینہ مدت میں ادا نہیں ہوئی تو یہ بیع کالعدم ہو جائے گی، تو یہ دونوں شکل تقریباً یکساں ہیں جس کو اصطلاح شریعت میں ''خیار نقد'' کہا جاتا ہے اور خیار نقد کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ متعینہ مدت تین دن کی ہو تو بالاتفاق صحیح اور درست ہے (الحاقاً بخیار الشرط)، اور اگر تین دن سے زائد ہو تو شیخینؒ کے یہاں بیع بشرط الاقالہ ہونے کی وجہ سے فاسد ہے، لیکن امام محمدؒ کے یہاں معاملہ صحیح اور درست ہے، البتہ اگر مدتِ متعینہ میں قیمت ادا نہ کی جاسکی تو یہ معاملہ شرعاً فاسد ہو جائے گا، اس لئے ہر ایک کو فسخ کرنے کا اختیار ہوگا، لیکن اگر فسخ نہ کیا گیا اور خریدار نے اسی معاملے کی بنیاد پر قبضہ کرلیا تو قبضہ سے ملکیت ثابت ہو جائے گی۔

''إن اشتری شیئًا علی أنه إن لم ینقد ثمنه إلی ثلاثة أیام فلا بیع صح استحسانًا... وإن اشتری کذلك إلی أربعة أیام لا یصح خلافًا لمحمد فإن نقد فی الثلاثة جاز اتفاقا لأن خیار النقد ملحق بخیار الشرط'' (الدر المختار ۷/ ۱۱۷)۔ .... ''إذا تبایعا علی أن یؤدی المشتری الثمن فی وقت کذا وإن لم یؤده فلا بیع بینهما صح البیع وهذا یقال له خیار النقد''۔ .... ''إذا لم یؤد المشتری الثمن فی المدة المعینة کان البیع الذی فیه خیار النقد فاسدًا'' (شرح مجله لعلی حیدر ۱/ ۲۶۱، ۲۶۲، ماده: ۳۱۳، ۳۱۴)۔

مجلہ میں خیار نقد کے لئے کسی مدت کی تحدید نہیں کی گئی ہے، بلکہ جواز کے لئے صرف تعیین مدت کافی ہے چاہے جتنی ہو۔

جب یہ بات منقح ہوگئی کہ مذکورہ صورت خیار نقد میں داخل ہے اور خریدار من لہ الخیار ہے اور من لہ الخیار کے تصرف سے معاملہ لازم ہوجاتا ہے تو مذکورہ صورت میں خریدار کا خرید وفروخت کرنا یا اپنی زمین کی خرید وفروخت ہوگی، لہذا اس کا فروخت کردینا جائز ہے، اور اس سے خریدنے والے کے لئے بھی اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا، کیونکہ جب بیع صحیح ہوگئی تو زمین میں بغیر قبضہ کے بھی آگے فروخت کرنے کی اجازت ہے، شرعی اور اصولی اعتبار سے اس معاملہ پر یہ حکم مرتب ہوتا ہے (مقالہ مفتی عثمان بستوی)۔

جبکہ اس سوال کے جواب میں بعض مقالہ نگار کی رائے ہے کہ سوال میں مذکور صورت کی بیع درست نہیں ہے (مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی عبد المنان آسام، مولانا زبیر ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محی الدین غازی اور مفتی مقصود فرقانی)۔

قاری ظفر الاسلام اعظمی لکھتے ہیں:

''اس کا عدم جواز تو سوال ہی سے ظاہر ہے، جبکہ زمین ابھی بیعانہ دینے والے کے نام نہیں ہوئی، اصل مالک ہی کے نام ہے تو پھر بیعانہ دینے والا اسے اگلے شخص کو کیسے فروخت کرسکتا ہے''۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی لکھتے ہیں:

''یہ صورت بعینہ اس عقار کی ہے جس میں اندیشہ ضیاع ہوتا ہے، جس کو غرر انفساخ سے تعبیر کیا جاتا ہے، قبل القبض بیع کی ممانعت کی علت یہی غرر انفساخ ہے، اس لئے کالونی بنانے والا ابھی نہیں فروخت کرسکتا ہے اور اس سے خریدنے والا بھی دوسرے سے نہیں بیچ سکتا ہے، علامہ ابن الہمام لکھتے ہیں:

''إلا إذا صار بحرًا ونحوه حتی قال بعض المشائخ: إن جواب أبي حنیفة فی موضع لا یخشی علیه أن تصیر بحرًا أو یغلب علیه الرمال، فأما فی موضع لا یؤمن علیه ذلك فلا یجوز'' (فتح القدیر ۶/ ۵۱۳، کتاب البیوع)۔

یہی رائے مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی عبد المنان آسام، مولانا زبیر ندوی اور مولانا ابوبکر قاسمی صاحبان کی ہے۔

سوال نمبر (۱۲): ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ کالونی بنانے والا کچھ دلالوں سے بات کرتا ہے کہ آپ ہماری زمین بکوایئے، یہ دلال مارکیٹ میں آتے ہیں اور مختلف گراہکوں اور انویسٹرس سے بات کرتے ہیں کہ ہمارے پاس مال ہے، آپ پیسہ لگایئے اس کو خریدیئے، اس کی قیمتیں بڑھیں گی، جب قیمتیں بڑھیں تو آپ بیچ دینا، زمین خریدنے والے کو زمین مقصود نہیں ہوتی، اس کو صرف پیسے کمانا ہوتا ہے، وہ شخص زمین خرید لیتا ہے، خریدنے والا اصل مالک زمین کو جانتا تک نہیں، نہ کوئی رجسٹری ہوتی ہے نہ کوئی کاغذی تحریر ہوتی ہے، صرف دلال اور خریدنے والے کے درمیان زبانی سودا ہوتا ہے اور دلال اس کو کہہ دیتا ہے کہ اس زمین میں ایک قطعہ آپ کا ہے اور اس سے پیسے وصول کرلیے جاتے ہیں، اگر یہ شخص اپنا یہ قطعہ بیچنا چاہے تو اس کو صرف یہی دلال بیچے گا، اگر اس کو دوسرا خریدار مل بھی جائے تو بھی وہ اس کو دلال ہی سے کہے گا اور دلال ہی اس کو فروخت کرے گا اور اپنی دلالی بھی وصول کرے گا، اس طریقہ سے یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، جب کہ ابھی زمین کھیتی والے اصل مالک سے بھی ٹرانسفر نہیں ہوتی، کیا یہ شکل درست ہے؟

اس سوال کے جواب میں بھی مقالہ نگاران کی دو رائیں پائی جاتی ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ کالونی بنانے والا اصل مالک زمین کا وکیل ہے، اور دلال کالونی بنانے والے کا وکیل ہے، لہذا کالونی بنانے والے کا دلال کو وکیل بنانا اور وکیل کی حیثیت سے دلال کا لوگوں سے زمین کی خرید وفروخت کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے (مفتی الیاس قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، قاضی عبد الجلیل قاسمی

مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مولانا عفان منصور پوری، مفتی عثمان بستوی وغیرہ)۔

دلائل:

ان حضرات کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ''كل عقد جاز أن يعقده الإنسان بنفسه جاز أن يؤكل به غيره ويجوز التوكيل بالخصومة في سائر الحقوق'' (قدوری مع اللباب فی شرح الکتاب/ ۶۶) (مفتی عثمان بستوی)۔

۲۔ اصل یا لک زمین کے دلال سے خریدنا اصل مالک زمین سے خریدنے کے درجہ میں ہے، کیوں کہ اس جگہ دلال زمین بیچنے کا وکیل بھی ہے اور وکیل کا تصرف مؤکل کے تصرف کے حکم میں ہے: ''تصرف الوكيل كتصرف المؤكل'' (بدائع الصنائع ۲/ ۲۳۱) (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مولانا عفان منصور پوری)۔

۳۔ ''تصح الوكالة بأجر وبغير أجر لأن النبي ﷺ كان يبعث عماله لقبض الصدقات .... ولأن الوكالة عقد جائز لا يجب على الوكيل القيام بها فيجوز أخذ الأجرة فيها'' (الفقه الاسلامی وادلته ۵/ ۴۰۵۸)

(مفتی الیاس قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی)۔

۴۔ ''الأصل في الوكالة الإباحة وقد تصح مندوبة إن كانت إعانة على مندوب وقد تصير مكروبة إن أعانت على مكروه....'' (حوالہ سابق ۵/ ۴۰۶۱)۔

۵۔ ''حكم الوكالة: الوكالة جائزة بالكتاب والسنة....'' (منهاج المسلم للشيخ ابی بكر الجزائری/ ۳۱۲)

(مقالہ مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

ملکیت محض ایجاب وقبول سے ثابت ہوجاتی ہے:

۱۔ ایجاب وقبول سے سودا مکمل ہوجاتا ہے، شرعاً انتقال ملکیت کے لئے سرکاری کاغذات میں اندراج ضروری نہیں ہے:

''البيع يلزم بإيجاب وقبول أى حكم البيع يلزم بهما'' (البحر الرائق ۵/ ۴۳۹) (مفتی الیاس قاسمی، مفتی عثمان بستوی)۔

۲۔ ''تنتقل ملكية المبيع للمشترى بمجرد الإيجاب والقبول ويصير له حق المطلق فى استعمال المبيع واستثماره والتصرف به كيفما شاء، له غنمه وعليه غرمه، أى له ثمراته وغلاته أو عوائده أيا كانت قليلة أو كثيرة فى مقابل تحمل مغارمه'' (الموسوعة الفقهيه والقضايا المعاصرة ۱۲/ ۲۸۱) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۳۔ غیر منقولہ جائیداد میں قبضہ سے پہلے بھی بیع پر کامل ملکیت حاصل ہوجاتی ہے اور جب ملکیت حاصل ہوگئی تو اس میں تصرف کا حق بھی حاصل ہوگیا۔

(مولانا شاہجہاں ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی)۔

۴۔ رجسٹری ثبوت کے لئے ہے، ملکیت کے ٹرانسفر کے لئے نہیں ہے (قاضی عبدالجلیل قاسمی)۔

۵۔ ''والنطق ليس بشرط لانعقاد البيع والشراء ولا لنفاذهما وصحتهما فيجوز بيع الأخرس وشرائه إذا كانت الإشارة مفهومة فى ذلك، لأنه إذا كانت الإشارة مفهومة فى ذلك قامت الإشارة مقام عبارته'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۲۲)

(مفتی عثمان بستوی)۔

دلالی کی اجرت:

۱۔ دلالی کی اجرت لینا شرعاً جائز ہے، خواہ اجرت مثل طے کی جائے یا بیع کی قیمت پر فیصد کے تناسب سے اجرت متعین کی جائے:

''فى الدلال والسمسار يجب أجر المثل...وفى الحاوى: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به وإن كان فى الأصل فاسدًا لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول

الحمام'' (رد المحتار ۹/ ۹۷) (مفتی الیاس قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عفان منصور پوری)۔

۲۔ ''أما الدلال فإن باع العين بنفسه بإذن ربها فأجرته على البائع وإن سعى بينهما وباع المالك بنفسه يعتبر العرف (قوله يعتبر العرف) فتجب الدلالة على البائع أو المشتري أو عليهما بحسب العرف'' (الدر المختار مع رد المحتار ۷/ ۹۳) (مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عفان منصور پوری)۔

مشاع اور مشترک شئی کی بیع:

۱۔ یہ مشترک چیز خریدنے کی صورت ہے اور تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مشترک چیز کو شریک یا اجنبی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے:

''جاز بيع المشاع وإيداعه'' (رد المحتار ۸/ ۳۸۴) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

۲۔ ''يجوز بيع المشاع للمشارك وللأجنبي، سواء أكان قابلًا للقسمة أم لم يكن'' (درر الحکام ۲/ ۳۸۱) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

البتہ دلال کا یہ شرط لگانا کہ اسے وہی بیچے گا، باطل شرط ہے، کیونکہ وہ اس کے ذریعہ سے نفع کمانا چاہتا ہے اور فروخت کرنے والے کو مارکیٹ ریٹ سے کم قیمت دینا چاہتا ہے۔ لیکن اگر یہ شرط عقد مکمل ہونے کے بعد ہے تو عقد کی صحت پر اس کا اثر نہیں پڑے گا (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ چونکہ زمین ابھی اصل مالک سے ٹرانسفر بھی نہیں ہوئی ہے، اس لئے یہ بیع نہیں، بلکہ وعدۂ بیع ہے (قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی عبدالمنان آسام، مولانا محمد زبیر ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محی الدین غازی، مفتی مقصود فرقانی)۔

ان حضرات کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''وهناك أحكام قانونية تختلف بين العقار والمنقول، منها أن انتقال ملكية العقار لا يتم إلا بالتسجيل، أما المنقول فلاحاجة نقل الملكية إلى التسجيل'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹/ ۵۶) (مولانا ابوبکر قاسمی)۔

۲۔ یہ بیع ''بیع مالا یملک'' کے قبیل سے ہے (مولانا زبیر ندوی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

۳۔ یہ شکل مفضی إلی النزاع ہے (مفتی مقصود فرقانی)۔

۴۔ سوالنامہ میں مذکور بیع کی صورت موجب غرر ہے (مولانا ابوبکر قاسمی)۔

۵۔ زمین کی تجارت کی یہ شکل درست نہیں ہے، اس صورت کے مفاسد بہت زیادہ ہیں اور اس میں نزاعات کے امکانات بہت زیادہ پائے جاتے ہیں، مثلاً: ملکیت کا منتقل نہ ہونا، قبضہ کا نہ ملنا، تصرف کا حق نہ ملنا، اصل مالک کا مجهول ہونا، اصل مبیع کا مجهول ہونا، غرض جہالت اور دیگر موانع بیع کا ایک طویل سلسلہ ہے (مولانا محی الدین غازی)۔

۶۔ یا اصل مالک زمین سے خرید وفروخت کا معاملہ تو طے ہو چکا ہے، لیکن ابھی اس پر قبضہ نہیں کر سکا ہے، یعنی مالک زمین کی طرف سے ابھی رکاوٹ دور نہیں کی گئی ہے، تو پھر کالونی بنانے والے کا ان پلاٹوں کو فروخت کرنا یا دلالوں کے ذریعہ فروخت کرنا درست نہیں ہے، یہ بیع قبل القبض کی قبیل سے ہے۔

(مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

۷۔ خلاصہ یہ کہ اس معاملہ میں گوناگوں محظور لازم آتے ہیں:

۱۔ معاملہ دلالی کا نہیں وکالت کا ہے اور وکیل قبضہ دلانے پر قادر نہیں ہے۔

۲۔ مبیع مجهول ہے، مفضی إلی النزاع بھی ہو سکتا ہے، مگر اس لئے نہیں ہو رہا ہے کہ بیع مقصود نہیں۔

۳۔ خریدار ثانی جس کی بیع کرنا چاہ رہا ہے اس کا وہ مالک ہی نہیں ہے (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

بیع میں بے جا شرط:

اس طرح کی شرط لگانا اور صاحب پلاٹ کو مجبور کرنا کہ وہ جب فروخت کرے تو مالک اول ہی کو دے، یہ دونوں ہی شرطیں شرعاً ناجائز ہیں۔

(قاضی ذکاء اللہ شبلی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی مقصود فرقانی)۔

سوال نمبر (۱۳): کبھی کبھی خود کالونی بنانے والے ایسا کرتے ہیں کہ وہ پلاٹس بیچ دیتے ہیں اور قسطوں میں پیسہ بھی وصول کر لیتے ہیں، اب اگر خریدار کو بیچنا ہے تو اس کو بھی کالونی بنانے والے ہی سے رابطہ کرنا ہوگا، اگر کوئی گراہک لاتا ہے تو بھی اسی سے ملانا ہوگا، خود کالونی بنانے والا ابھی نہیں چاہتا ہے کہ کوئی گراہک آئے، وہ خود ہی اس کو خرید لیتا ہے اور جو بھی قیمت میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا ہے، اس کو ادا کرتا ہے، کیا اس صورت میں پلاٹ خریدنے والے کی ملکیت زمین پر ثابت ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ جب کالونی بنانے والے نے خریدار کو پلاٹ بیچ دیا اور پیسے بھی ادا کر دیا تو شرعی اعتبار سے بیع وشراء کا معاملہ مکمل ہوگیا، یہ پلاٹ کالونی بنانے والے کی ملکیت سے نکل کر خریدار کی ملکیت میں آ گئی اور وہ مالک ہوگیا (مفتی الیاس قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا عفان منصور پوری، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مولانا محی الدین غازی، مفتی مقصود وغیرہ)۔

اس صورت میں ملکیت کا ثبوت ہو چکا:

۱۔ ''وحكمه ثبوت الملك أى فى البدلين لكل منهما فى بدل'' (فتاوی شامی ۷/۱۶)۔

۲۔ ''البيع النافذ يفيد الحكم فى الحال أى ثبوت الملك فى البدلين لكل منهما فى بدل وهذا هو الحكم الأصلى للبيع'' (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ۲/ ۳۷۳) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۳۔ ''حكم البيع المنعقد الملكية يعنى صيرورة المشترى مالكًا للمبيع والبائع مالكًا للثمن .... والملكية تثبت بمجرد العقد إذا استجمع البيع شرائط الانعقاد والصحة واللزوم والنفاذ'' (شرح المجله للاتاسى ۲/ ۲۵۷) (مفتی الیاس قاسمی)۔

۴۔ قسطوں میں جب پوری قیمت ادا ہو جائے تو زمین پر ملکیت ثابت ہو جائے گی، پھر انہی کے ہاتھ نفع لے کر فروخت کر دی تو یہ درست ہے:

''ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبى حنيفة وأبى يوسف... ولهما أن ركن البيع صدر من أهله فى محله ولا غير رقبة لأن الهلاك فى العقار نادر بخلاف المنقول والغرر المنهى عنه غرر انفساخ العقد. والحديث معلول به عملًا بدلائل الجواز'' (ہدایہ ۳/ ۷۳، نیز دیکھئے: تاتارخانیہ ۸/ ۲۶۲، الفقہ علی المذاہب الاربعہ ۲/ ۲۲۳) (مولانا ظفر عالم ندوی)۔

۵۔ ''تبين مما سبق بحثه فى الشروط المتقدمة أن البائع ينقطع تعلقه بالمبيع بمجرد إبرام البيع إلا إذا وجد مايجيز فسخ العقد من الخيارات كخيار الشرط أو العيب أو الرؤية وذلك بسبب انتقال الملكية الذى هو حكم العقد أو مقتضاه إلى المشترى فيكون حق التصرف المترتب على انتقال الملكية فى البيع حقا تاما يمنح المشترى بسبب الملكية التامة أن يتصرف فيما صار ملكاله كمايشاء بيعا أو هبة أو وصية أو وقفا وغير ذلك'' (الموسوعة الفقهية والقضايا المعاصره ۱۳ / ۲۰۷) (مفتی الیاس قاسمی)۔

بیع میں شرط کا اثر:

۱۔ کالونی بنانے والے کا یہ شرط لگانا کہ جب خریدار اپنا پلاٹ فروخت کرے تو صرف اسی سے فروخت کرے، یہ شرط درست نہیں ہے، بلکہ مالک پلاٹس کو اختیار ہے کہ وہ جس کو چاہے دے (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مولانا ظفر عالم ندوی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا عفان منصور پوری، مولانا محی الدین غازی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی مقصود فرقانی)۔

۲۔ ''ولو بشرط لا تقتضيه العقد وفيه نفع لأحد المتعاقدين أو لمبيع يستحق فهو فاسد'' (مجمع الانہر ۳/ ۹۰) (مولانا عفان منصور پوری)۔

۳۔ ''ولو باع عبدًا على أن يعتقه المشتري أو يدبره أو يكاتبه أو أمة على أن يستولدها فالبيع فاسد، لأن هذا بيع وشرط وقد نهى النبي ﷺ عن بيع وشرط.... '' (ہدایہ مع فتح القدیر ۶/ ۴۴۲) (مفتی عثمان بستوی)۔

۴۔ جبکہ صلب عقد میں شرط ہو کہ خریدار کالونی بنانے والے سے ہی بیع کرسکتا ہے، یہ حقیقت میں بائع کے آزادانہ تصرف پر پابندی عائد کرنا ہے جو کہ بیع وشراء کے اصول کے خلاف ہے، اس لئے پلاٹنگ کرنے والے کا اس شرط کے ساتھ بیچنا ہی صحیح نہیں ہوا تو خریدار کی ملکیت میں بھی داخل نہیں ہوگا جیسا کہ اس کے طرز عمل سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ صلب عقد میں شرط ہے (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، یہی رائے مفتی عثمان بستوی، مفتی عبدالمنان آسام، مولانا زبیر ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری کی ہے)۔

۵۔ سوال میں مذکور جملے ''اب اگر خریدار کو بیچنا ہے تو اس کو بھی کالونی بنانے والے ہی سے رابطہ کرنا ہوگا'' صلب عقد میں ہیں، تو یہ معاملہ فاسد ہوگا، اور اگر ایسا نہیں ہے تو پلاٹ خریدنے والے کی ملکیت زمین پر ثابت ہونی چاہئے (قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

۶۔ نیز اگر اس طرح کا معاملہ مبیع پر قبضہ اور ضمان میں آنے سے پہلے کا ہے تو قیمت میں یہ اضافہ مشتری کو دیدینا ''ربح مالم یضمن'' کے قبیل سے ہوگا اور مشتری اول کی ملکیت زمین پر ثابت نہ ہوگی (قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبدالمنان آسام)۔

۷۔ اگر یہ شرط عقد مکمل ہونے کے بعد ہو تو عقد کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا: ''وإن ذكر البيع بلا شرط ثم شرطاه على وجه المواعدة جاز البيع'' (البحر الرائق ۶/ ۸) (مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا شاہجہاں ندوی)۔

سوال نمبر (۱۴) ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ پلاٹ قسطوں میں بیچ دیا جاتا ہے اور خریدار اس میں سے مثلاً پانچ یا آٹھ قسطیں ادا کرپایا، باقی قسطیں ادا کرنے کی گنجائش نہیں رہی؛ تو حالانکہ سودا ہو چکا تھا، صرف بعض قسطوں کی ادائیگی باقی تھی؛ لیکن کالونی بنانے والا اپنی طرف سے اس سودے کو کینسل مانتا ہے، اب اگر بعد میں خریدار قسطیں ادا کرنا چاہے، یا اپنی زمین کا مطالبہ کرے تو اس کو کہہ دیتا ہے کہ چونکہ قسطیں وقت پر ادا نہیں ہوئیں؛ اس لئے آپ کا سودا کینسل ہوگیا، اور جتنی رقم قسطوں میں ادا کی گئی تھیں، اتنی ہی رقم اس کو واپس کردیتا ہے؛ جبکہ اس نے جس وقت وہ زمین خریدی تھی، اس وقت اس کی قیمت بہت کم تھی اور اتنی ہی متعین ہوئی تھی، اور اب اس کی قیمت تقریباً پچاس گنا بڑھ چکی ہوتی ہے، کیا یہ درست ہے؟

قسطوں پر خرید وفروخت کی صورت میں ملکیت کا ثبوت:

اس سوال کے جواب میں تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

پہلے نقطۂ نظر کے حاملین کی رائے ہے کہ قسط پر خرید وفروخت کی صورت میں معاملہ مکمل ہونے کے بعد مبیع پر خریدار کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے اور ادھار قیمت کی قسطوں میں ادائیگی اس پر لازم ہوتی ہے، چنانچہ قسط پر خرید وفروخت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مکمل قسطوں کی ادائیگی کے بعد مبیع پر ملکیت ثابت ہو، کیوں کہ یہ ادھار بیع کی ایک شکل ہے اور ادھار بیع مکمل ہوتے ہی مبیع پر ملکیت ثابت ہوجاتی ہے (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا ابصار احمد ندوی، مولانا محی الدین غازی، مولانا عبدالحمید قاسمی)۔

دلائل:

۱۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آں حضور ﷺ نے ایک یہودی کے ساتھ متعینہ مدت پر قیمت کی ادائیگی کا معاملہ فرمایا: ''اشترى طعامًا من يهودي إلى أجل ورهنه درعًا من حديد'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۰۶۸، صحیح مسلم، حدیث: ۱۶۰۳) (مولانا شاہجہاں ندوی)۔

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں:

''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ثمن کی ادائیگی کا وقت مقرر کرکے کوئی چیز خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے اور ادھار قیمت کی ادائیگی کی متعینہ مدت طے ہونے کے باوجود مبیع پر خریدار کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے اور قسط پر خرید وفروخت بھی ایسی بیع ہے، جس کی قیمت کی آئندہ ادائیگی کا وقت مقرر ہے''۔

۲۔ حضرت عائشہؓ کی ایک دوسری روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیمت چند قسطوں میں ادا کرنا درست ہے:

''جاءتني بريرة فقالت: كاتبت أهلي على تسع أواق، في كل يوم وقية'' (صحيح البخاري، حديث: ۲۱۶۸، ۲۷۲۹)
(مولانا شاہجہاں ندوی)۔

دوسرے نقطہ نظر کے حامل مولانا ابوسفیان مفتاحی کی رائے ہے کہ یہ بیع درست نہیں ہے۔

اسی طرح مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی پہلے لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا صورت بیع معلق یا مستقبل کی طرف منسوب بیع کی ہے (کہ اگر مقررہ مدت میں قیمت ادا کردی گئی تو بیع ہوگی، ورنہ نہیں)، اس سے بیع ہی منعقد نہیں ہوتی ہے، ایسی صورت میں جتنی رقم دی گئی ہے وہی مل سکتی ہے، اس سے زیادہ کا مطالبہ صحیح نہیں''، پھر اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں:

''اس کی فقہی صورت یہی زیادہ مناسب ہے کہ اس صورت کو وعدہ بیع قرار دیا جائے، تاکہ وقت مقررہ پر ادائیگی کی صورت میں بیع کی تکمیل میں کوئی محظور لازم نہ آئے کیونکہ بیع معلق باطل ہوتی ہے''۔

جبکہ تیسرے نقطہ نظر کے حاملین کی رائے ہے کہ یہ صورت ''خیار نقد'' یا ''اقالہ'' کی ہے جو درست ہے، شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔

مفتی الیاس قاسمی، مفتی عثمان بستوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی عبدالمنان آسام، مولانا نازبیر ندوی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مولانا ابوبکر قاسمی، مفتی مقصود فرقانی کے مقالات سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ:

اگر زمین و پلاٹ کے فروخت کے وقت یہ شرط لگائی جائے کہ اگر خریدار نے مقررہ مدت تک کل رقم یا مقررہ قسط ادا نہیں کی تو یہ معاملہ ختم ہوجائے گا، تو یہ صورت ''خیار نقد'' کی ہے، اور خرید وفروخت میں یہ شرط لگانا جائز ہے اور یہ شرط اپنے وقت میں مؤثر بھی ہوگی، یعنی مقررہ مدت میں کل رقم یا طے شدہ قسط ادا نہیں کی ہو تو بائع یک طرفہ طور پر بیع کو ختم کر کے خریدار سے مبیع واپس لے سکتا ہے اور ثمن کا جتنا حصہ اس نے وصول کیا ہے وہ خریدار کو واپس لوٹا دے۔

دلائل:

۱۔ ''إذا تبايعا على أن يؤدي المشتري الثمن في وقت كذا، وإن لم يؤد فلا بيع بينهما صح البيع وهذا يقال له خيار النقد'' (درر الحكام ۱/ ۳۰۹) (مفتی عثمان بستوی، مفتی الیاس قاسمی)۔

۲۔ ''إذا الحاجة مست إلى الانفساخ عند عدم النقد تحرزًا عن المماطلة في الفسخ...'' (ہدایہ ۳/ ۳۰) (مولانا ظفر عالم ندوی)

۳۔ ''عن عمرو بن عوف عن أبيه عن جده أن رسول الله ﷺ قال: المسلمون على شروطهم إلا شرطًا حرم حلالا أو أحل حرامًا'' (سنن الترمذي ۱/ ۲۵۱)۔

۴۔ ''الإقالة جائزة في البيع بمثل الثمن الأول لقوله ''من أقال نادمًا بيعه، أقال الله عثراته يوم القيامة. لأن العقد حقهما فيملكان رفعه دفعًا لحاجتهما'' (ہدایہ ۳/ ۶۹) (مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی)۔

۵۔ ''إذا لم يؤد للمشتري الثمن في المدة المعينة كان البيع الذي فيه خيار النقد فاسدًا من العاقدين فسخه إذا بقي المبيع على حاله'' (شرح المجله لسليم رستم باز/ ۱۶)۔

۶۔ ''وأما بيان ما يرفع حكم البيع فنقول وبالله التوفيق: حكم البيع نوعان: نوع يرتفع بالفسخ وهو الذي يقوم برفعه أحد المتعاقدين وهو حكم كل بيع غير لازم كالبيع الذي فيه أحد الخيارات الأربع والبيع الفاسد'' (بدائع الصنائع ۴/ ۵۹۲) (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۷۔ ائمہ ثلاثہ نے بسبب افلاس، عقد بیع کے فسخ کو درست مانا ہے اور حدیث نبوی سے استدلال کیا ہے:

''من أدرك ماله بعينه عند رجل أو إنسان قد أفلس فهو أحق به من غيره رواه الشيخان عن أبي هريرة وفي رواية: من وجد عين ماله عند رجل فهو أحق به يتبع البيع إلى البائع من باعه، رواه أحمد وأبوداؤد والنسائي عن سمرة بن جندب'' (الفقه الاسلامي وادلته)۔

البتہ حنفیہ کے یہاں خریدار کے مفلس ہونے سے بیع فسخ نہ ہوگی، ہاں اس کے تنگدست ہونے کے سبب اس کو مزید مہلت دی جائے گی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة" (سورہ بقرہ) (مقالہ مولانا ابو بکر قاسمی)۔

یکطرفہ بیع رد کرنے کا اختیار:

تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر زمین کا خریدار مزید قسطوں کی ادائیگی سے عاجز ہوجائے تو فروخت کرنے والا یک طرفہ طور پر معاملہ بیع رد نہیں کرسکتا ہے، اس کا یہ عمل درست نہیں ہوگا۔

بہتر اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ خریدار کو اختیار دیا جائے اور مزید مہلت دینی چاہئے، آخری صورت میں موجودہ وقت میں زمین کی مارکیٹ کے اندر جو قیمت ہے، اسے ادا کر کے زمین لے لے اور باقی ماندہ قسطوں سے زائد قیمت خریدار کو ادا کرے یا کسی تیسرے شخص سے بیچ کر اپنی باقی ماندہ قسطیں حاصل کرے اور زائد قیمت خریدار کے حوالہ کرے۔

"ومن اشترى عبدًا فغاب فأقام البائع البينة أنه باعها إياه. فإن كانت غيبته معروفة لم يبع في دين البائع لأنه يمكن إيصال البائع إلى حقه بدون البيع وفيه إبطال حق المشتري وإن لم يدر أين هو بيع العبد وأو في الثمن لأن ملك المشتري ظهر بإقراره فيظهر على الوجه الذي أقر به مشغولًا بحقه وإذا تعذر استيفاءه من المشتري يبيعه القاضي فيه كالراهن إذا مات والمشتري إذا مات مفلسًا والمبيع لم يقبض" (ہدایہ علی فتح القدیر ۷/ ۱۱۹، ۱۲۰) (مفتی الیاس قاسمی وغیرہ)۔

سوال نمبر (۱۵-الف): اسی طرح زمین کی دلالی سے متعلق کچھ مسائل ہیں:

الف: آسان شکل تو یہ ہے کہ دلال زمین کا گاہک لائے اور اپنی دلالی وصول کرلے؛ لیکن دلال زمین کی قیمت کالونی بنانے والے سے معلوم کرلیتا ہے، پھر اس کو اپنی من مانی قیمت پر بیچتا ہے، زمین والے نے جتنی قیمت بتلائی تھی، اتنی اس کو دے دیتا ہے اور باقی کو اپنے لئے جائز سمجھتا ہے، کیا یہ درست ہے؟

دلالی کی اجرت:

۱۔ دلالی کے عمل میں کیا جانے والا کام اور وقت مجہول ہوتا ہے، اس لئے فقہ حنفی میں اصولاً دلالی کا عمل اور اس پر اجرت کا حصول جائز نہیں تھا، لیکن فقہاء متاخرین نے ضرورت کی بنا پر اس کو جائز قرار دیا، چنانچہ علامہ سرخسی رقمطراز ہیں:

"والسمسار اسم لمن يعمل للغير بالأجر بيعا وشراء ومقصوده من إيراد الحديث بيان جواز ذلك" (المبسوط ۱۵/ ۲۰۹) (مفتی الیاس قاسمی، مفتی محمد شاجہاں ندوی)۔

۲۔ "وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار. فقال: أرجو أنه لا بأس وإن كان في الأصل فاسدًا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز. فجوزوه لحاجة الناس إليه" (رد المحتار ۶/ ۶۳)

(مولانا شاجہاں ندوی، مفتی الیاس قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا انصار احمد ندوی)۔

۳۔ اگر اجرت متعین کرکے دلالی کی جائے تو مفتی بہ قول کے مطابق جائز ہے:

"وقال في البزازية: أجرة السمسار والمنادي والحمامي والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل" (رد المحتار ۹/ ۶۴)

(مفتی الیاس قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا انصار احمد ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا نازبیر ندوی)۔

۴۔ "قال في التاتارخانية: في الدلال والسمسار يجب أجر المثل. وما تواضعوا عليه أن كل عشرة دنانير كذا فذلك حرام عليهم" (رد المحتار ۹/ ۸۷) (مفتی الیاس قاسمی)۔

دلالی کی مذکورہ صورت:

البتہ دلالی کی مذکورہ صورت جمہور علماء احناف، شوافع اور مالکیہ کے یہاں جائز نہیں ہے، امام احمد اور امام اسحاق کے نزدیک جائز ہے، کیونکہ دلال وکیل ہے اور وکیل کو مؤکل کے سامان کا جو عوض حاصل ہو اس عوض کا حقدار مؤکل ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ۔

''وقال ابن عباس: لابأس أن يقول: بع هذا لثوب فما زاد على كذاوكذا فهو لك. هذا التعليق وصله ابن أبي شيبة عن هشيم عن عمرو بن دينار عن عطاء عن ابن عباس نحوه وقال ابن سيرين إذا قال بعه بكذا فما كان من ربح فهولك أو بيني وبينك فلابأس به. وهذا التعليق أيضا وصله ابن أبي شيبة عن هشيم عن يونس عن ابن سيرين. وفي التلويح: وأما قول ابن عباس وابن سيرين فأكثر العلماء لايجيزون هذا البيع وممن كرهه: الثوري والكوفيون و قال الشافعي ومالك: لا يجوز فإن باع فله أجر مثله وأجازه أحمد و إسحاق وقالا: هومن باب القراض وقدلا يربح المقارض'' (عمدة القاري شرح صحيح البخاري ۸/ ۶۲۳) (مقالہ: مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۱۔ مولانا شاہجہاں ندوی دلالی کے جواز کی شرطیں ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اس تفصیل کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دلال کا زمین کی قیمت کالونی بنانے والے سے معلوم کرکے زمین کو اپنی من مانی قیمت پر بیچ کر مالک زمین کی بتائی ہوئی رقم سے زائد رقم خود لے لینا، ناحق طریقہ سے مال کھانا ہے جو ناجائز اور حرام ہے''۔

۲۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقًا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون'' (سورہ بقرہ: ۱۸۸)۔

۳۔ ''كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه'' (صحيح مسلم. حديث: ۲۵۶۴)۔

۴۔ ''لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه'' (مسند احمد. حديث: ۲۰۶۹۵)۔

۵۔ ''ولو وكله بأن يبيعه بألف درهم فباعه بأكثر. نفذ البيع وإن باعه بأقل لم ينفذ'' (ہندیہ ۳/ ۵۹۰)۔

اس سے پتہ چلا کہ زائد قیمت کا مالک زمین والا ہے نہ کہ دلال''۔ مفتی مقصود فرقانی کی بھی یہی رائے ہے۔

۶۔ فتاوی رحیمیہ میں ہے:

''یہ پیسہ مباح ہے اور اپنی محنت اور کام کے موافق پہلے سے مناسب اجرت طے کردی جائے تو طے کردہ اجرت لے سکتا ہے، اور اجرت ایک فریق سے بھی لے سکتا ہے اور دونوں فریق سے بھی، البتہ اجرت طے اور متعین ہونا چاہئے، معاملہ مبہم نہ رہنا چاہئے'' (۹/ ۲۹۹)۔

فتاوی دار العلوم میں ہے: ''دلال کی اجرت کام اور محنت کے موافق لینا اور دینا جائز ہے، بشرطیکہ ظاہر کرکے رضا سے لیا جائے اور جو خفیہ طرفین سے لیا جاتا ہے وہ جائز نہیں ہے'' (بحوالہ فتاوی رحیمیہ ۹/ ۲۹۹)۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ان دونوں فتاوی کے بعد لکھتے ہیں:

متاخرین فقہاء کے یہاں اسی قسم کا فتوی ہے، لہذا کذب بیانی یا اجرت کو خفیہ رکھنا اور لینا جائز نہیں۔

قاری ظفر الاسلام اعظمی صاحب کی رائے ہے کہ اگر غبن فاحش نہ پایا جائے تو درست ہے، البتہ اگر غبن فاحش کے ساتھ معاملہ ہو تو مع الکراہت درست ہوگا (الدر المختار مع الرد ۷/ ۳۶۳)۔

دلال اور مالک زمین کے درمیان پہلے سے معاملہ طے ہو:

اگر دلال اور مالک زمین اس طرح کا معاملہ کریں کہ بائع کی مطلوبہ قیمت سے زائد رقم دلال کی اجرت قرار پائے گی تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہونا چاہئے (مفتی الیاس قاسمی، مفتی عثمان بستوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا ظفر عالم ندوی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، مولانا ابوبکر قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محی الدین غازی)۔

مفتی عثمان بستوی کی رائے ہے کہ اگر وکیل (دلال) مالک سے صاف صاف یہ وضاحت کردے کہ متعینہ قیمت آپ کو ملے گی اور اس سے زائد جو حاصل ہوگا وہ میرا ہوگا، یہ وضاحت خواہ صراحۃً ہو یا عرفاً، تو زائد خود رکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ جو زائد ہے وہ اجرت ہے...... نیز اس کو ''جعالہ'' پر محمول کرکے بھی حد جواز میں داخل ہونے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

مولانا ظفر عالم ندوی، مولانا عفان منصور پوری اور مفتی ریاست علی قاسمی لکھتے ہیں:

اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ دلال نے بائع سے متعین رقم پر زمین خرید کر مشتری کے ہاتھ نفع لے کر فروخت کردیا، اس صورت میں دلال کو دلال نہیں کہا جائے گا، بلکہ تاجر کہا جائے گا، اور یہ معاملہ شرعاً درست ہوجائے گا۔

''أنه باعه مرابحة، فإن كان ما اشتراه به له مثل جاز سواء جعل الربح من جنس رأس المال الدرهم من الدراهم أو من غير الدرهم من الدنانير أو على العكس، إذا كان معلومًا ما يجوز به الشراء لأن الكل ثمن'' (عنايه على الهدايه مع فتح القدير ۶/ ۴۹۵)۔

مفتی الیاس قاسمی لکھتے ہیں:

''اجرت دلال کی مذکورہ صورت ہمارے معاشرے میں بہت معروف ہے، فقہاء نے بہت سے مسائل میں عرف وعادت کا اعتبار کیا ہے، چنانچہ کوئی چیز کیلی ہے یا وزنی، اس کے متعلق فقہاء نے لکھا ہے کہ جس چیز کا کیلی یا وزنی ہونا شریعت میں منصوص نہ ہو، اس کے کیلی یا وزنی ہونے کا فیصلہ اس علاقے کے عرف پر مبنی ہوگا (دیکھئے: اعلاء السنن ۱۴/ ۷۹/ ۴)۔

لہٰذا ہمارے معاشرے کے عرف کا اعتبار کرتے ہوئے دلالی کی یہ صورت جائز ہونا چاہئے کہ دلال بائع کی مطلوبہ قیمت سے زائد رقم دلالی کی اجرت کے طور پر لے گا، فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ''ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن'' (الاشباہ والنظائر ۱/ ۳۲۸)۔

سوال نمبر (۱۵-ب): دلال کمپنیاں جو شکل سب سے زیادہ استعمال کررہی ہیں، وہ یہ ہے کہ زمین بیچ دیتے ہیں؛ لیکن قبضہ نہیں دیتے، اور ان کو کہہ دیتے ہیں کہ جب بھی آپ کو بیچنا ہو تو آپ یہ زمین ہمیں ہی واپس کریں گے، کسی اور کو نہیں، کیا یہ مشروط بیع جائز ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام ہی مقالہ نگار کی رائے ہے کہ دلال کمپنیوں کا زمین فروخت کرکے قبضہ نہ دینا شرعاً جائز نہیں ہے اور قبضہ نہ دینے کی شرط سے بیع کی جائے تو ایسی مشروط بیع جائز نہیں ہوگی۔

دلائل:

۱۔ خرید وفروخت کے بعد مبیع کو مشتری کے حوالہ کرنا اور اس کے قبضہ وتصرف میں دینا شرعاً لازم ہے: ''وحكمه ثبوت الملك أي في البدلين لكل بدل وهذا حكمه الأصلي والتابع وجوب تسليم المبيع والثمن'' (فتاوی شامی ۷/ ۱۶)۔

۲۔ مبیع پر مشتری کا قبضہ شرعاً واجب ہے: ''أما الأحكام التي هي من التوابع للحكم الأصلي للبيع... فمنها وجوب تسليم المبيع والثمن ...'' (بدائع الصنائع ۵/ ۴۹۷) (مفتی الیاس قاسمی، مولانا ابصار احمد ندوی)۔

۳۔ ''لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع ولا ربح ما لم يضمن ولا بيع ما ليس عندك'' (سنن الترمذي، حديث: ۱۲۳۴) (مفتی الیاس قاسمی، مولانا ابصار احمد ندوی، مفتی عبد المنان آسام)۔

۴۔ خرید وفروخت میں ایسی شرط لگانا جو تقاضۂ بیع کے خلاف ہو اور وہ بیع سے مناسبت نہ رکھتی ہو، یا اس میں بائع یا مشتری میں سے کسی کا فائدہ ہو تو شرعاً جائز نہیں اور ایسی شرط سے بیع فاسد ہوجاتی ہے (مفتی الیاس قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، قاری ظفر الاسلام اعظمی، مولانا زبیر ندوی، مفتی ظہیر احمد کانپوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا عبد الحمید قاسمی)۔

۵۔ ''ولا يبيع بشرط... لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لأحدهما'' (الدر المختار على رد المحتار ۷/ ۸۲، ۸۳)۔

۶۔ ''كل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده'' (بدايه

علی فتح القدیر ۶/ ۴۰۶)۔

۷۔ ''لا يجوز للبائع اشتراط زيادة منفعة على حساب المشترى لا تتفق مع مقتضى العقد ويكون البيع فاسدًا أو باطلًا... ودليلهم ما روى عن النبي ﷺ أنه نهى عن بيع وشرط'' (الموسوعة الفقهيه والقضايا المعاصرة ۱۳/ ۲۸۲)
(مفتی الیاس قاسمی)۔

۸۔ مؤطا مالک میں حضرت عمرؓ کا فتوی بایں الفاظ وارد ہے: ''إن عبدالله بن مسعود ابتاع جارية من امرأته زينب الثقفية واشترطت عليه أنك إن بعتها فهي لي بالثمن الذى تبيعها به. فسأل عبدالله بن مسعود عن ذلك عمر بن الخطاب، فقال: لا تقربها وفيها شرط لأحد'' (مؤطا امام مالک/ ۲۵۳) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۹۔ ''فإن كان فيه منفعة لأحد المتعاقدين فالبيع فاسد لأن الشرط باطل فى نفسه والمنتفع به غير راض بدونه فتمكن المطالبة بينهما لهذا الشرط. فلهذا فسد له البيع'' (المبسوط ۱۵/ ۲۸۷) (مولانا انصار احمد ندوی، مولانا عفان منصور پوری)۔

جواز کی صورت:

البتہ مفتی عثمان بستوی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی اور مولانا محی الدین غازی نے اس مسئلہ کے جواز کی یہ صورت بیان کی ہے:

۱۔ اس کے جواز کی ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ بیع تو بلا شرط کر لی جائے، مگر بعد میں ہی ایک معاہدہ کر لیا جائے کہ آپ یہ زمین ہم کو ہی واپس کریں تو یہ بیع صحیح ہوگی۔ (فتاوی محمودیہ ۲۴/ ۱۰۱، ۱۰۲)۔

۲۔ ''وإن ذكر البيع بلا شرط ثم شرطا على وجه المواعدة جاز البيع ولزم الوفاء'' (تبيين الحقائق ۵/ ۱۸۴)
(مولانا عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی)۔

۳۔ زمین کو اس شرط کے ساتھ فروخت کرنا کہ اگر فروخت کرنا ہوگا تو بیچنے والے ہی سے فروخت کرنا پڑے گا اور اس وقت کی جو قیمت ہوگی وہ دی جائے گی تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، البتہ اگر شرط میں یہ بھی داخل ہو کہ اس کو خود اپنے استعمال میں لانے کی اجازت نہیں، بیچنا بہر حال لازم ہوگا تو یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف اور بائع کے لئے نفع بخش ہونے کی وجہ سے معاملہ کے لئے مفسد ہوگی (مفتی عثمان بستوی)۔

۱۰۔ **ڈاکٹر ظفر الاسلام اعظمی صاحب نے اس سلسلہ میں دو اقتباس نقل کیا ہے، جس سے بھی یہی واضح ہو رہا ہے:**

''اکیڈمی کے بائیسویں سمینار میں یہ موضوع زیر بحث آچکا ہے، اس کا فیصلہ نمبر ۴ اس طرح ہے: ''اگر کوئی شخص سخت ضرورت مند ہو، اس کو نہ قرض حسن ملے اور نہ ہی رہن پر قرض ملے اور وہ نقد رقم حاصل کرنے کے لئے اپنی کوئی شئی کسی کے ہاتھ فروخت کرتا ہے جبکہ اس کا ارادہ ہو کہ بعد میں اس کو دوبارہ خرید لے گا تو اس کی گنجائش ہے، البتہ واپس خریداری کا ذکر اس معاملہ کے کرنے کے درمیان نہ کیا جائے، بلکہ اس سے الگ باہمی معاہدہ ہو جائے کہ خریدار اسے اسی قیمت پر دوبارہ فروخت کر دے گا تو ایسا کرنا درست ہوگا'' (مجلہ 'واپسی کی شرط پر خرید وفروخت' (بیع وفا) / ۳۵)۔

مفتی رشید احمد صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے شرط لگائی گئی ہو یا جانبین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں تو یہ بیع فاسد ہے، اور اگر بیع کے بعد واپسی کا وعدہ کیا تو یہ بیع صحیح ہے اور اس وعدہ کا ایفا لازم ہے۔

(احسن الفتاوی ۶/ ۵۰۷، دیکھئے: الدر المختار علی الرد ۷/ ۵۴۶، نوازل فقہیہ معاصرۃ ۱/ ۲۶۸، ۲۶۹)۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

(سوال نمبر ۱-۴)

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی [1]

اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داروں کی جانب سے اس ناچیز کو ''زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل'' (سوال ۱-۴) کا عرض مسئلہ تیار کرنے کی ذمہ داری دی گئی ہے، اس لیے پیش ہے متعلقہ موضوع کے ابتدائی چار سوالوں کا عرض مسئلہ۔

اکیڈمی کی جانب سے دو مرحلوں میں کل ۱۷ مقالے موصول ہوئے بعض مقالے تفصیلی، اور بعض مختصر، بلکہ مختصر ترین بھی ہیں عرض مسئلہ کی تیاری میں تمام ہی حضرات کی قیمتی تحریروں سے استفادہ کی کوشش کی گئی ہے، جن حضرات کے مقالے موصول ہوئے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی (۲) مفتی محمد عثمان بستوی (۳) ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام صدیقی (۴) مفتی انصار احمد ندوی (۵) قاضی عبد الجلیل (پٹنہ) (۶) مفتی محمد الیاس قاسمی (پونہ) (۷) مفتی محمد عفان منصور پوری (امروہہ) (۸) ڈاکٹر محی الدین غازی (کیرالا) (۹) مولانا ابوسفیان مفتاحی (مئو) (۱۰) مفتی عبد الحمید قاسمی (دیناجپور) (۱۱) مفتی عبد المنان (آسام) (۱۲) مولانا ظفر عالم ندوی (ندوۃ العلماء) (۱۳) حافظ کلیم اللہ عمری (عمرآباد) (۱۴) مفتی مقصود علی فرقانی (رامپور) (۱۵) مفتی محمد زبیر ندوی (ممبئی) (۱۶) قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی (اندور) (۱۷) راقم الحروف محبوب فروغ احمد قاسمی (کیرالا)۔

(۱) سرکاری زمینوں پر ناجائز قبضہ کرنے والوں سے خریداری:

سوال: بعض لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران، یا غنڈہ عناصر سرکاری اراضی پر قابض ہوجاتے ہیں، اور انہیں فروخت کرتے ہیں، رشوت کے ذریعہ سرکاری عہدہ داران سے لے آوٹ منظور کروالیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بڑے شہروں میں بہت ساری زمینیں اسی طور پر فروخت ہوتی ہیں، پھر خریدار دوسرے خریدار سے بیچ دیتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ اس پر مکان تعمیر کرتے جاتے ہیں اور کچھ اسے آگے فروخت کرتے جاتے ہیں، ایسی زمینوں کا کیا براہ راست قابضین سے خریدنا یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا جائز ہوگا؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے بہت سے مقالہ نگار حضرات نے اولاً اس کو منقح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا عقار اور غیر منقول اشیاء میں غصب کا تعلق ہوسکتا ہے؟ (دیکھئے: مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد زبیر ندوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، قاری ظفر الاسلام صدیقی وغیرہ کے مقالے)۔

نیز اس پر تمام حضرات متفق ہیں کہ غیر منقولی جائیداد میں بھی غصب کا تحقق ہوتا ہے، جبکہ کچھ لوگوں نے اس سے تعرض نہیں کیا ہے، صرف سوال کے جواب پر توجہ مرکوز رکھی ہیں۔

جہاں تک سوال کے جواب کا تعلق ہے تو مفتی عبد المنان آسام و قاری ظفر الاسلام صدیقی کے علاوہ ۱۴ مقالہ نگاروں نے عدم جواز کو ترجیح دی ہے۔

البتہ مولانا محی الدین غازی سرکاری زمین پر قبضہ کے ناجائز ہونے کے قائل ہونے کے باوجود اگر قانوناً قابض کو مالک تصور کیا جاتا ہو تو براہ راست ایسے قابضین سے یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنے میں شرعی ممانعت نہیں ہوتی ہے، ہاں چونکہ تعاون علی الاثم ہے، اس لئے پرہیز اولی و بہتر ہے۔

مولانا موصوف نے مسئلہ کا مدار قانونی طور پر قبضہ و ملکیت پر رکھا ہے، خواہ شرعی نقطہ نظر میں فروخت کی جانے والی جائداد میں قابض کی ملکیت ہو یا نہ ہو، لیکن غازی صاحب نے تمہیدی کلمات میں شرعی ملکیت و قبضہ کو بھی ضروری قرار دیا ہے، اس لئے راقم یہی سمجھتا ہے کہ موصوف نے شرعی ملکیت

[1] استاذ حدیث وفقہ جامعہ حسنیہ، کیرالا۔

وقبضہ کے بعد قانونی قبضہ کو ضروری قرار دیا ہے، چونکہ مسئلہ سرکاری اراضی سے متعلق ہے، اگر حکومت نے ملکیت تسلیم کرلی ہے تب تو اس کی بیع وشراء میں کوئی شبہ رہتا ہی نہیں ہے۔

جو حضرات قابضین اور ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں ان میں سے پانچ حضرات (مولانا محمد عثمان بستوی، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، حافظ کلیم اللہ عمری اور راقم حروف محبوب فروغ احمد قاسمی) اس وقت خریداری کو ناجائز قرار دیتے ہیں، جبکہ خریدار کو اس ظالمانہ قبضہ کا علم بھی ہو۔ جبکہ بقیہ حضرات نے اس طرح کی تصریح نہیں کی ہے، مگر راقم کا خیال ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی عدم جواز اس وقت ہی ہے جب کہ علم میں ہو، کیونکہ ناواقف لوگوں کے لیے فقہاء بہت سی مرتبہ ظاہری قبضہ پر مدار رکھ کر فیصلہ کرتے ہیں، مجلہ (مادہ ۶۸) میں ہے:

''یحکم بالظاہر فیما یتعسر الإطلاع علی حقیقتہ''۔

حرمت کے قائلین کے مابین تفصیل وتوجیہ میں قدرے اختلاف بھی ہے، جس کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے:

حافظ کلیم اللہ عمری کے نزدیک ایسے قابضین سے خریدنا اس لئے ناجائز ہے کہ یہ تعاون علی الاثم ہے، مفتی محمد عفان منصور پوری لکھتے ہیں: غیر کی مملوکہ چیز پر قبضہ غصب ہے، اور شئی مغصوب کو فروخت کرنا جائز نہیں، ''لا یجوز لأحد أن یتصرف في ملک الغیر بغیر إذنہ'' (قواعد الفقہ / ۱۱۰)، لہٰذا اگر خرید بھی لیا ہے تب بھی حقیقت حال واضح ہونے پر اصل مالک کو لوٹانا واجب ہے اور اپنی ادا کردہ قیمت واپس لے لے۔

''لو ظھر غیر حلال أی مسروقًا أو مغصوبًا یرجع علیہ المشتری'' (ردالمحتار ۵/ ۴۲)۔

مفتی محمد عثمان رشوت کے ذریعہ لے آوٹ منظور کروانے کو غصب کے مرادف قرار دیتے ہوئے تفصیل کرتے ہیں:

(۱) خریدنے والے کو کچھ معلوم نہ ہو تو اس کے لئے ظاہر حال پر عمل کرتے ہوئے خریدنا شرعاً جائز ہے۔

''یحکم بالظاھر فیما یتعسر الإطلاع علی حقیقتہ'' (مادہ: ۶۱)۔

(۲) جس کو پوری حقیقت کا علم ہے اس کے لئے اس صورت میں ایسی زمین خریدنا جائز ہے جب اس پر بسنے والی کالونی کو سرکاری وشہری سہولیات دے دی گئی ہوں؛ کیونکہ یہ سہولیات اجازت کا قرینہ قویہ ہے، قرینہ اسباب حکم میں سے ایک ہے۔

(۳) جن کو حقیقت کا علم ہو، لیکن سرکاری سہولت ابھی تک مہیا نہ ہوئی ہوں تو خریدنا جائز نہیں؛ کیونکہ غصب ہے، نیز علم ہوتے ہوئے خریدنے کی اجازت نہیں ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی نے بھی ظالمانہ قبضہ کو غصب قرار دیا ہے اور مسلم شریف کی حدیث: ''من اقتطع شبرًا من الأرض ظلمًا طوقہ اللہ إیاہ یوم القیامۃ'' سے استدلال کرتے ہوئے ''تکملۃ فتح الملہم'' سے حدیث کی شرح میں لمبی عبارت نقل کی ہے۔

مولانا عبدالحمید قاسمی نے عدم جواز پر استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے: یہ عمل سراسر غصب ہے، جو نہ تو شرعاً جائز ہے نہ قانوناً، کسی چیز کی بیع وشراء کے لیے اس پر بائع کی ملکیت کا ہونا اور مقدور التسلیم ہونا ضروری ہے۔

مفتی ابصار احمد ندوی اور ڈاکٹر شاہجہاں ندوی مذکورہ بالا کچھ دلائل کے علاوہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ سرکاری جائداد ملک عام کی قبیل سے ہے جس میں سب کو تصرف کا حق رہتا ہے، مولانا ابصار احمد کے الفاظ ہیں: لہٰذا انتفاع کو اپنے لیے مخصوص کرنا گویا دوسروں کے حق کو فوت کرنا اور ظلم ہے۔

مولانا شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں: مال عام پر دست درازی باطل طریقے سے مال کو برتنے میں داخل ہے جو شریعت میں ممنوع ہے، پھر عام نصوص کو پیش کرکے مال عام میں تصرف کے عدم جواز کو ثابت کیا ہے۔

ناچیز اصل مسئلہ سے اتفاق رکھتے ہوئے اس دلیل سے اتفاق نہیں رکھتا، اس لیے کہ سرکاری زمین ملک عام نہیں، بلکہ سرکار کی ملک خاص ہے، صرف حکومت کو اختیار ہے کہ قواعد وضوابط کے لحاظ سے کسی کو بھی بخش سکتی ہے، مال عام تو وہ مال ہوتا ہے جس میں کسی کی ملکیت نہیں ہوتی ہے نہ تو عوام اور نہ ہی سرکار کی، چنانچہ علماء نے اراضی کی مختلف قسمیں کی ہیں: اراضی شخصیہ، اراضی سلطانیہ، اراضی موات، اراضی موقوفہ، اراضی مباحہ، نیز ہر ایک کے احکام جداگانہ بیان کئے گئے ہیں (دیکھئے: انعام الباری مفتی تقی عثمانی ۶ / ۵۷۸)۔

مولانا شاہجہاں ندوی نے ظالمانہ قبضہ کو غصب قرار دیتے ہوئے اس کے احکام پر بھی روشنی ڈالی ہے، غصب کا بنیادی اور اصلی حکم یہ ہے کہ اصل مالک کو لوٹا دیا جائے، بدائع میں ہے: "الحکم الأصلي للغصب هو وجوب عين المغصوب، لأن بالرد يعود عين حقه إليه، وبه يندفع الضرر عنه من كل وجه" (بدائع ۷/ ۱۵۱) لہٰذا سرکاری زمین حکومت کو لوٹائی جائے گی۔

مولانا شاہجہاں ندوی مختلف مکاتب فکر سے استفادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شافعیہ وحنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ غاصب کی بیع باطل ہے، اور حنفیہ ومالکیہ کے نزدیک بیع موقوف رہتی ہے۔

شامی میں ہے: "وقف بيع الغاصب على إجازة المالك، يعني إذا باعه لمالكه لا لنفسه"۔

اورنہ کہ خود کے لیے فروخت کرنے سے مراد یہ ہے کہ "خود فروخت" نہ کرے، جیسا کہ علامہ شامی رقمطراز ہیں:

"قول البدائع: لو باعه لنفسه لم ينعقد أصلاً معناه: لو باعه من نفسه فاللام بمعنى من" (رد المحتار ۵/ ۱۰۸)۔

غالبًا اس عبارت سے موصوف کہنا چاہتے ہیں کہ غاصب کے لیے بیع کا اقدام کرنا ہی صحیح نہیں ہے، مگر اس ناچیز کو دو وجہ سے تردد ہے: ایک تو فقہائے احناف کی تصریح کے مطابق غاصب کی بیع اجازت پر موقوف ہوتی ہے، اجازت کے بعد نافذ مانی جاتی ہے، اس سے اس کے اقدام کا من وجہ ہی سہی، مگر معتبر ہونا سمجھ میں آتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عبارت "لو باعه من نفسه" کا مفہوم اگر وہ ہوتا جو فاضل مقالہ نگار نے بیان کیا ہے تو عبارت یوں ہوتی "لو باعه نفسه" یا "لو باعه بنفسه"، "لو باعه من نفسه" کا مفہوم تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ غاصب ہی بائع ہو اور وہی مشتری، جبکہ بیع وشراء میں فرد واحد ایجاب وقبول دونوں کا متحمل نہیں ہوسکتا، شامی سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے، عبارت ہے:

"باعه من نفسه؛ لأنه يكون مشتريًا لنفسه، وقد صرحوا بأن الواحد لا يتولى الطرفين في البيع" (شامی ۴/ ۱۵۲ باب البيع الفاسد)، والله اعلم بالصواب۔

مولانا محمد زبیر ندوی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر زمین پر تعمیر وغیرہ کرلی گئی ہو تو یہ تغیر فاحش کے حکم میں ہے اور اس وقت خرید وفروخت اس وجہ سے جائز ہے کہ اب غاصب پر تاوان ہی لازم ہوگا۔

بہر حال دلائل وبراہین کے لحاظ سے یہ نظریہ راجح معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ ایسے قابضین سے خریدنے میں ان کی حوصلہ افزائی، تعاون علی الاثم، شرکت فی الغصب، نظام حکومت میں رخنہ اندازی جیسے محظورات کے علاوہ غیر مالک سے اراضی کی خریداری لازم آتی ہے، جو بہت سے فقہاء کے نزدیک سرے سے صحیح ہی نہیں، اور بعض فقہاء کے نزدیک مالک کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے۔

لیکن قاری ظفر الاسلام صدیقی ومفتی عبدالمنان آسام کے نزدیک اس خریداری میں حرج نہیں ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب کے نزدیک زمین میں غصب کا تحقق تو ہوتا ہے، مگر غاصب کو یا تو ملک مطلق حاصل ہوجاتی ہے، جیسا کہ فقیہ ابواللیث سمرقندی کا مسلک ہے، فتح القدیر میں ہے: "ووجهه ثبوت الملك المطلق للتصرف"، نیز ڈاکٹر صاحب نے ایک لمبی حدیث لکھی ہے جس کی تخریج ابوداؤد نے باب القضاء (۲/ ۵۰۹) میں کی ہے، اس میں ایک غزوہ کا قصہ ہے، ایک صحابی نے ایک شخص کی چادر لے لی تھی اور وہ ضائع ہوگئی تھی، تو اللہ کے رسول ﷺ نے لینے والے کی تلوار دلوائی تھی، مزید کچھ صاع بھی دینے کا حکم دیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غاصب کو ملک مطلق حاصل تھی۔

یا پھر غاصب کو ملک حاصل نہیں ہے تو اس کا تصرف موقوف ہے حکومت کی اجازت پر، ڈاکٹر صاحب کے الفاظ ہیں: براہ راست قابضین اور ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خرید نادرست ہوگا، سرکار تو کسی نہ کسی طرح ان سے ضمان لے ہی لے گی۔

راقم کا خیال ہے کہ شئی مغصوب میں غاصب کی ملکیت ادائے ضمان سے پہلے ائمہ اربعہ میں سے کسی کا مسلک نہیں ہے، جہاں تک حدیث کا تعلق ہے تو عرض ہے کہ اس کا تعلق ایک غزوہ سے ہے جس میں غصب نہیں بطور غنیمت مال لیا جاتا ہے، پھر مذکورہ بالا حدیث میں شئی مغصوب ضائع ہوچکی ہے، الفاظ حدیث میں: "إنما خرجت من يدي" اس لیے تاوان دلوایا گیا ہے، واپسی کی شکل تھی ہی نہیں، نیز حدیث مذکور کا معاملہ محض ان نئے مسلمانوں کی دلداری

کے لیے تھا، یہی وجہ ہے کہ آدھی غنیمت واپس کی گئی، آدھی مجاہدین کو ہی دی گئی۔

جہاں تک معاملہ حکومت کے ضمان لینے کا ہے تو اگر ضمان مثل لے لے تب ہی اس کا جواز ہوسکتا ہے، محض رشوت کی بنا پر کسی غیر مستحق کو الاٹ کر دینے سے قابضین کی ملکیت ثابت نہیں ہوسکتی؛ کیونکہ سرکاری حکام کے لئے وضع کردہ قوانین کی حیثیت، مسلمان قاضی کے لئے شرعی قوانین کی مانند ہیں، جس طرح کوئی قاضی کتاب وسنت کے خلاف فیصلہ کرتا ہے تو رد سمجھا جاتا ہے، اسی طرح سرکاری حکام اگر قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو رد سمجھا جائے گا۔

اگر ضمان مثل حکومت نے وصول کیا ہے تب تو ملکیت کے ثبوت میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا ہے، بعض مقالہ نگار نے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ جب تعمیر وغیرہ ہوگئی تو تغیر فاحش ہوگیا، اور تغیر فاحش کے بعد رد کی صورت باقی نہیں رہی، اس لئے تملک ہو جائے گا، اور خرید نا صحیح ہو جائے گا۔

(دیکھئے: مقالہ: مولانا محمد زبیر ندوی)۔

لیکن فقہاء کی عبارت اسی طرف مشیر ہے کہ اس وقت بھی تملک اس وقت ہوگا جب کہ قیمت ادا کر دے گا۔

(۲) مختلف مغصوبہ اوقاف کو خریدنے کا حکم:

سوال (۲): ایک افسوس ناک حقیقت یہ بھی ہے کہ بعض دفعہ خود مسلمان اوقاف کی زمین غصب کر لیتے ہیں، کبھی تو یہ زمین اتنی دور افتادہ ہوتی ہے کہ مقصد وقف کو اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ پاتا ہے، بعض اوقات غیر مسلم حضرات کے قابض ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، یا وہ اس کے کچھ حصہ پر قابض ہو چکے ہوتے ہیں، اور بعض دفعہ ایسی زمین ہوتی ہے کہ جس کی واقعی مسجد و مدرسہ وغیرہ کو ضرورت ہوتی ہے، لیکن صرف اللہ سے بے خوفی اور مال کی حرص ولالچ کی وجہ سے ان پر ناجائز قبضہ ہو جاتا ہے، اوقاف کی ان مختلف قسم کی مغصوبہ زمینوں کو خریدنے کا کیا حکم ہے؟

اس سوال میں تین قسموں کا حکم معلوم کیا گیا ہے: مسلمانوں کا غصب کیا ہوا وقف، کافروں کی جانب سے اندیشہ غصب کی صورت میں اوقاف کی خرید وفروخت کا حکم، اوقاف کے غیر مفید ہونے کی صورت میں خرید وفروخت کا حکم۔

اس بات پر تمام مقالہ نگار متفق ہیں کہ اراضی موقوفہ پر قبضہ سنگین جرم ہے، حتی الامکان اس قبضہ کو ختم کرنے کی سعی کی جائے گی؛ کیونکہ مکمل ہونے کے بعد انسانوں کی ملکیت سے نکل کر اللہ کی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے، اب اس میں کسی بھی قسم کا مالکانہ تصرف جائز نہیں۔

"فإذا تم ولزم لايملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن ولا يقسم" (درمختار ۳/ ۴۰۲ کتاب الوقف)۔ البتہ اگر مقصد وقف فوت ہو رہا ہو، غیروں کے قبضہ کا شدید خطرہ ہے، یا مسلمان نے اپنی قوت وطاقت کے بل بوتے قبضہ کر لیا ہو تو اس بابت تین نقطہائے نظر ہیں:

(۱) پہلا نقطہ نظر تو یہ ہے کہ وقف کا نفع باقی ہے، مگر کسی مسلمان نے قبضہ کر رکھا ہے، اور کسی بھی طرح قبضہ ہٹانے پر راضی نہیں ہے تو ان سے قیمت وصول کی جائے گی، نیز وہ قیمت دوسری متبادل زمین خریدنے میں لگائی جائے گی، یہ رائے ہے مفتی محمد عثمان بستوی کی۔

مولانا لکھتے ہیں: وقف سے مقصد وقف حاصل ہو رہا ہو، لیکن کسی مسلمان نے اس پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہو تو اس مسلمان سے ایسے وقف کی زمین خریدنا جائز نہیں۔۔۔۔ خریدنا اس لئے جائز نہیں کہ وہ مال نہیں اور عوض لینے کی اجازت مجبوری کے درجہ میں ہے، حاصل یہ کہ عوض وصول کرنا مجبوری ہے، لیکن خریدنا مجبوری نہیں، نیز فرماتے ہیں: آباد ہونے کی صورت میں مدبر کی طرح ہے، اور مدبر کی بیع باطل ہے، لہذا آباد وقف کو غاصب سے خریدنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

ناچیز یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ جب وقف بامقصد ہے تو اب بیچنے کا مسئلہ کیونکر پیش آئے گا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ غاصب ظالمانہ طور پر متولی ہو گیا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ اگر مقصد وقف مکمل نہیں ہو رہا ہے تو تکمیل مقصد کے لیے بیچنا وخریدنا یکساں رہے گا، فقہاء کی بعض عبارتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ متولی ونگراں کو اگر اندیشہ ہو تو بھی بیچ سکتا ہے، بحر کی عبارت ہے:

"قيم خاف من السلطان أو من وارث يغلب على أرض وقف، يبيعها ويتصدق بثمنها، وكذا كل قيم إذا خاف شيئًا من ذلك، له أن يبيع ويتصدق بثمنها" (البحر الرائق ۵/ ۲۲۵ زکریا)۔

نیز غاصب سے قیمت کا وصول کرنا بھی اس سے بیچنے کے ہی مرادف ہے، خواہ مجبوری ہی کی شکل میں ہو۔

(۲) دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہر صورت میں غصب ہے اور خرید وفروخت جائز نہیں ہے، اس نظریہ کے حاملین سات مقالہ نگار ہیں (مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا

ظفر عالم ندوی، مفتی ابصار احمد ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محی الدین غازی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ذکاء اللہ شبلی)۔

اکثر حضرات نے رائے لکھنے پر اکتفاء کیا ہے، ہاں بعض مقالہ نگاروں نے تفصیلی کلام کیا ہے، مولانا محی الدین غازی نے عدم جواز کو اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے: اگر کسی وقف کو غیر محفوظ اور غیر موزوں مقام سے محفوظ اور مناسب مقام پر منتقل کرنے کے نیک ارادے سے اور مسلمانوں کے اجتماعی مشورہ سے اور قابل اعتماد لوگوں کی نگرانی میں ایسی زمینوں کو فروخت کیا جاتا ہے تو انہیں خریدنے کی گنجائش سمجھ میں آتی ہے۔

مولانا شاجہاں ندوی نے متعدد دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اراضی موقوفہ کی بیع نہیں ہوسکتی ہے۔

(الف) ''لا يحل لامرئ من مال أخيه إلا ما طابت به نفسه'' وغیرہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقاف پر قبضہ بھی ناحق کسی کے مال پر تسلط جمانا ہے۔

(ب) غصب ہے، اور مغصوب کو لوٹانا واجب ہوتا ہے۔

(ج) وقف کا اصلی حکم خرید وفروخت کی ممانعت ہے، جیسا کہ حدیث عمر: ''تصدق بأصله لا يباع ولا يوهب'' سے معلوم ہوتا ہے۔

(د) استبدال بھی مخصوص حالتوں کے علاوہ میں جائز نہیں، نیز اس کے لیے شرط ہے کہ دوسرے مقام پر اسی نوع کے متبادل اوقاف قائم کئے جائیں تو جب اوقاف کا تبادلہ شرطوں کے ساتھ مشروط ہے تو پھر اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو اپنی ذات کے لیے خرید کرنا اور غاصبین کی حوصلہ افزائی کیونکر جائز ہوگی۔

ان میں سے بعض دلیلوں کا ذکر مفتی ابصار احمد ندوی نے بھی کیا ہے۔

(۳) تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر اوقاف غاصبانہ قبضے کی وجہ سے کارآمد باقی نہیں رہے ہوں، یا غیر مسلموں کے قبضہ میں جانے کا قوی اندیشہ ہو تو دین دار حضرات، یا قاضی، یا محکمہ اوقاف کی اجازت ومشورہ سے بیچنا جائز ہے، اس نقطہ نظر کے حاملین آٹھ یا نو مقالہ نگار ہیں (مفتی محمد الیاس قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی عبدالحمید قاسمی، مفتی عبدالمنان آسام، مفتی مقصود علی فرقانی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد زبیر ندوی، اور راقم محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

مولانا محمد زبیر ندوی کی رائے خلاصۂ جواب میں یہی ہے، جبکہ اصل مقالہ میں بالکل عدم جواز کے قائل معلوم ہوتے ہیں، خلاصہ میں لکھتے ہیں: اگر قابضین اپنی قوت کے بل پر موقوفہ زمین چھوڑنے کو تیار نہ ہوں تو ان سے قیمت کا مطالبہ کیا جائے گا، اگر دے دیں تو پھر یہ زمین ان کی ملکیت ہو جائے گی اور اس کی بیع وشراء بھی درست ہوگی ورنہ نہیں۔ جبکہ اصل مقالہ میں رقمطراز ہیں: لہٰذا نہ اس کا بیچنا درست ہوگا اور نہ ہی کسی کے لیے اس کا خریدنا جائز ہوگا، بلکہ قبضہ کرنے والوں کو اس زمین سے دستبردار ہونا لازم ہوگا۔

اسی طرح ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب اپنا عندیہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں: احقر کے نزدیک موقوف کی بیع باطل ہے، بلکہ قبضہ کرنے والوں کو اس زمین کے بارے میں دست وبرد اور ضائع ہونے کا یقین کامل ہو تو اسے بیچ کر واقف کی منشا کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوسری جائداد خریدی جاسکتی ہے۔

اس نظریہ کے حاملین کے پیش نظر مختلف دلائل ہیں:

(الف) البحر الرائق (۵/ ۲۴۵ زکریا) میں ہے: ''الوقف إذا صار بحيث لا ينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره. وليس ذلك إلا للقاضي'' (مقالہ: مفتی محمد الیاس، محبوب فروغ احمد، مفتی محمد عثمان)۔

(ب) ''ولو صارت الأرض بحال لا ينتفع بها والمعتمد أنه بلا شرط يجوز للقاضي بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلية'' (مفتی محمد الیاس، مفتی عثمان، محبوب احمد احمد)۔

(ج) فتح القدير (۶/ ۱۲ زکریا) میں ہے: ''لكن لا يبيعها إلا بإذن الحاكم، وينبغي للحاكم إذا رفع إليه ولا منفعة في الوقف أن يأذن في بيعها إذا رآه أنظر لأهل الوقف''۔

مفتی محمد عثمان نے غیر مفید کی مختلف شکلوں کی نشاندہی کرنے کے بعد لکھا ہے: اگر وقف معطل ہو جائے، یعنی اس وقف سے کوئی نفع نہ ہو، خواہ دور

ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے، یا اس پر غیروں کے قبضہ کا اس وقف سے کوئی نفع نہ ہو، خواہ دور ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے، یا اس پر غیروں کے قبضہ کا شدید خطرہ ہو تو ایسے وقف کو خریدنا جائز ہے، کیونکہ وقف کے معطل ہوجانے کی صورت میں وقفیت ختم ہوجاتی ہے۔

اس نقطۂ نظر کے قائلین نے خرید وفروخت کے لیے قاضی، محکمہ اوقاف، یا متدین اصحاب بصیرت حضرات کے مشورے کو لازم قرار دیا ہے، یہی رائے ناچیز کے نزدیک راجح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جن اوقاف پر ناجائز قبضہ لوگوں نے رکھا ہے، یا قوی اندیشہ ہے کہ غیر مسلم ان پر قابض ہوجائیں گے تو اس وقت اوقاف کارآمد باقی نہیں رہتے ہیں، فقہاء نے ایسے اوقاف کو بیچنے کی اجازت دی ہے، اگر خریدنے کی اجازت نہ ہو تو فروختگی کا معاملہ کیسے تمام ہوگا، حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے شامی و بحر کی مختلف عبارتوں کو نقل کرکے لکھا ہے: ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ وقف تام اور مکمل ہوجانے کے بعد اس کا بیچنا، خریدنا، ہبہ کرنا، رہن رکھنا وغیرہ کچھ بھی جائز نہیں ہوتا، ہاں اگر ضائع ہوجانے کا ظن غالب ہوجائے، یا بالکل ہی ناقابل انتفاع ہوجائے تو اس کو فروخت کرکے اس کے بدلے میں اسی موقوفہ کے متوازی و مماثل دوسری چیزیں خرید کر وقف کردی جائے۔

آگے تحریر کرتے ہیں: لہذا اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اس موقوفہ کے ضیاع کا قوی خطرہ ہوچکا تھا، ایسی حالت میں اس زمین کا وقف کی حفاظت کی خاطر فروخت کردینا درست تھا، اور جب خریدار اول کے لیے اس کا خریدنا ان مذکورہ بالا عبارتوں کے ذریعہ درست تھا، تو خریدار اول تو بطور خود مالک ہوجانے کے بعد خریدار ثانی کے ہاتھ فروخت کرنا بھی درست و جائز ہوگا (منتخبات نظام الفتاوی ۲ / ۲۷۶)۔

(۳) قدیم موروثی زمین کی خریداری:

سوال (۳) بعض زمین موروثی طور پر ملتی ہے لیکن جن لوگوں کو زمین حاصل ہوتی ہے ان کے والد یا دادا کے وقت میں وراثت کی شرعی طور پر تقسیم نہیں ہوئی تھی، جیسے والد نے پھوپھیوں کو حصہ نہیں دیا تھا یا دادا نے اپنی بہنوں کو حصہ نہیں دیا تھا، اب بیٹوں یا پوتوں سے ان کی ایسی موروثی زمین کا خریدکرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

□ اس بابت مقالہ نگاروں کی مختلف آراء پائی جاتی ہیں، بیشتر حضرات کی رائے میں ایسی اراضی کی خریداری ان ورثہ کی اجازت پر موقوف ہوگی جن کا حصہ ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی مقصود فرقانی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، اور مفتی محمد الیاس صاحبان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص سے خریداری ہو رہی ہے صرف اسی کے حصہ کی خریداری صحیح ہے، باقی لوگوں کے حصوں کی خریداری جائز نہیں ہے۔

مولانا ابوسفیان مفتاحی لکھتے ہیں: ایسی موروثی زمین کا خریدنا جائز نہیں ہے، اس کے جواز کے لیے ان کا نقشہ بنا کر ارباب افتاء سے اپنے حصہ کی تعیین کے لیے رجوع کریں۔

مفتی مقصود کہتے ہیں: وہ کل زمین کا مالک نہیں ہے، اور غیر مالک بجز مالک کی اجازت نہ فروخت کرنا جائز ہے اور نہ خریدنا۔

مفتی محمد الیاس کے نزدیک تین صورتوں میں ہی خریدنا جائز ہے: (۱) دوسرے ورثہ قیمت لے کر دستبردار ہوجائیں، (۲) تقسیم وقبضہ کے بعد ہبہ کردیا ہو، (۳) قابض نے کوئی ایسا تصرف کیا جس کی وجہ سے اس کی قیمت دین ہوگئی، پھر ورثہ نے معاف کردیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکہ کی ساری چیزوں میں ورثہ کی شرکت، شرکتِ ملک ہوتی ہے، جس میں دوسرے ورثہ کی اجازت صحیحہ کے بغیر تصرف نہیں ہوسکتا،

''لا یجوز التصرف فیہ بغیر إذن صاحبہ'' اجازت صحیحہ کی یہی تین شکلیں ہیں، اس لیے ان ہی صورتوں میں جواز دائر رہے گا۔

اس بابت مفتی عبدالمنان خرید وفروخت کے جواز کی رائے رکھتے ہیں، جبکہ ڈاکٹر شاہجہاں ندوی مکروہ تنزیہی اور مفتی ابصار احمد ندوی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر زیادہ تر حصہ شرعی طور پر منقسم ہے تو اس کا خریدنا جائز ہے، اگر غیر شرعی طور پر منقسم ہے تو خریدنا مکروہ اور اشتباہ ہے تو خلاف اولی۔

مفتی عبدالمنان نے حرام طریقے سے حاصل ہونے والی آمدنیوں کے حکم والی عبارتوں کو پیش کرکے جواز کا قول اختیار کیا ہے۔

مفتی شاہجہاں لکھتے ہیں: شرعی ورثہ اس کے مشترکہ طور پر مالک بن جاتے ہیں اور جب تک باہمی رضامندی یا عدالت کے ذریعہ تقسیم نہ ہوجائے انفرادی ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے، اس میں یہ بھی شرط ہے کہ تمام شرکاء یا ان کے وکیل موجود ہوں، اگر زمینیں ابھی تقسیم نہیں ہوئیں تو زیادہ سے زیادہ مشتبہ مال ہوا جس کا خریدنا مکروہ ہوگا، فاضل مقالہ نگار کی تحریروں سے یہ معلوم ہورہا ہے، موصوف نے نعمان بن بشیر کی مشہور حدیث: "ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام" اور قرآن کی آیت: "سماعون للكذب أكالون للسحت" نیز اس معنی کی اور بھی نصوص پیش کر کے تائید حاصل کی ہے۔

ان ۷ مقالہ نگاروں کے علاوہ ۱۰ مقالہ نگاروں کی رائے میں اگر خریدار کو معلوم ہے کہ اس زمین میں وراثت جاری نہیں ہوئی ہے تو اس کو خریدنا روا نہیں ہے، کیونکہ مال غصب ہے جس کا قابض مالک نہیں، اگر خرید بھی لی ہے تو بیع موقوف رہے گی، اور شریک ورثہ کی جانب سے اجازت ملنے پر خریداری صحیح ہوجائے گی، کیونکہ موروثی زمین میں شرکاء کی شرکت، شرکت ملک کہلاتی ہے، شرکت ملک کی بابت فقہاء نے تصریح کی ہے:

''کل من شرکاء الملك اجنبی فی مال صاحبه فصح له بیع حصته، ولو من غیر شریکه بلا إذن، إلا فی صورة الخلط'' (الدر المختار ۳/ ۳۶۵ کتاب الشرکہ)۔...... ''ہدایہ'' میں ہے: ''یجوز بیع أحدهما نصیبه من شریکه فی جمیع الصور. ومن غیر شریکه بغیر إذنه، إلا فی صورة الخلط'' (ہدایہ ۲/ ۶۲۴ کتاب الشرکۃ)۔

بیع موقوف اس لیے ہے کہ شرط نفاذ نہیں ہے، اس لیے کہ صحت بیع کے لیے معقود علیہ کا مملوک ہونا ضروری ہے جو صورت مذکورہ میں مفقود ہے۔

(۴) حرام مال سے حاصل ہونے والی جائداد کی خریداری:

سوال (۴) ایک شخص کی آمدنی حرام تھی، اور اس حرام آمدنی کے ذریعہ اس نے ڈھیر ساری زمینیں حاصل کی اور اب وہ اس زمین کو فروخت کرتا ہے، تو جو لوگ ان حالات سے واقف ہیں کہ ان کے لیے اس زمین کو خریدنا درست ہوگا؟

حرام مال سے جو زمین خریدی گئی ہے ایسی زمین کی خریداری کی بابت مقالہ نگاروں کے تین نقاط نظر ہیں:

(۱) پہلا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسی زمین کی خریداری جائز ہے، اس کے قائل ہیں:

مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی عبد المنان، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محی الدین غازی اور مولانا ذکاء اللہ شبلی۔

مفتی محمد عفان لکھتے ہیں: لیکن اس کے باوجود اس کو فروخت کرنا اور حالات سے واقف لوگوں کے لیے اس کو خریدنا جائز ہے، البتہ جو مال حرام اس نے زمین کی خریداری میں لگایا ہے اس کو صاحب حق تک پہنچانا ضروری ہے، لیکن اگر صاحب حق تک پہنچانا متعذر ہوجائے تو پھر اس مال کو صدقہ کرنا لازم وضروری ہے۔ ان حضرات نے دلیل سے تعرض نہیں کیا ہے۔

(۲) دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسی جائداد کو خریدنا حرام ہے، اس رائے کے حاملین ہیں: مولانا محمد زبیر ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی مقصود فرقانی، مفتی ابصار احمد ندوی اور محبوب فروغ احمد قاسمی راقم الحروف۔

قاضی عبد الجلیل صاحب نے ایک صورت کو مستثنی کیا ہے: اگر قابض اصل مالک تک اس کی رقم پہنچانا چاہتا ہے یا حقدار معلوم نہ ہونے کی صورت میں تصدق کرنا چاہتا ہے تو حق اسی کے لیے جائز ہے۔

اس نقطۂ نظر کے دلائل یہ ہیں:

(۱) الحرمة تتعدی فی الأموال مع العلم بها (الاشباہ)، (۲) یہ معصیت پر تعاون ہے (۳) اگر مسلمان نہیں خریدیں گے تو تازیانۂ عبرت ثابت ہوگا، (۴) ابن قدامہ لکھتے ہیں: "إن علم أنه حرام فهو حرام" (مغنی ۴/ ۲۲۳)، (۵) عالمگیری میں ہے (۵/ ۲۶۴):

''کل عین قائمة یغلب علی ظنه أنهم أخذوها من الغیر بالظلم وباعوها فی السوق. فإنه لا ینبغی أن یشتری ذلك. وإن تداولته الأیدی''، (۶) شامی میں ہے: ''الحرام ینتقل أی: تنتقل حرمته وإن تداولته الأیدی وتبدلت الأملاك''۔

(۷) ابن رشد (فتاوی ابن رشد/ ۷ ۶۴) کے بیان کے مطابق شافعیہ وحنابلہ کے راجح قول کے مطابق حرام مال سے خریدنے کی صورت میں

بیع کا انعقاد ہی نہیں ہوتا ہے، احناف کے یہاں تفصیل ہے، علامہ کاسانی وغیرہ نے عدم جواز کو ترجیح دی ہے۔

(۳) تیسرا نقطہ نظر مولانا محمد عثمان، قاری ظفر الاسلام صدیقی، مولانا ظفر عالم ندوی اور مولانا عبدالحمید قاسمی صاحبان کا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مال حرام سے جو زمین خریدی گئی ہے اس میں خبث صرف سبب میں ہے، لہٰذا وہ تفصیل زیادہ انسب ہے جو امام کرخی نے بیان کی ہے، جو تاتارخانیہ (۸/۳۴۶)

اور ہندیہ (۳/۲۵ باب الاحتکار، باب الغصب ۵/۲۴۱) وغیرہ کتب فقہ میں مذکور ہے، امام کرخی نے مسئلہ کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں:

(۱) بائع کو پہلے مال حرام بطور قرض دے دے، زمین وغیرہ اسی کے عوض خرید لی، (۲) حرام مال کی طرف اشارہ کر کے زمین خریدی اور بعینہ وہی مال ادا کیا گیا، (۳) حرام مال کی طرف اشارہ کر کے زمین خریدی گئی لیکن دوسرا مال دیا گیا، (۴) حرام مال کی طرف اشارہ تو نہیں کیا، بلکہ بیع مطلق ہوئی، مگر حرام مال ہی دیا گیا، (۵) حلال مال کی طرف اشارہ کیا گیا، لیکن حرام مال دیا گیا۔

ان صورتوں میں سے پہلی و دوسری صورت (جس میں بائع نے حرام رقم پہلے دی، یا حرام رقم کی طرف اشارہ کر کے بعینہ دے دیا) میں زمین میں ملکیت نہیں آئے گی، تو دوسرے سے بیع کرنا بھی جائز نہ ہوگا، البتہ بقیہ تینوں صورتوں میں حرام مال سے خریدنے والا مالک ہو جائے گا اور خرید وفروخت جائز ہوگی۔

مولانا محمد عثمان بستوی لکھتے ہیں: جس نے حرام آمدنی سے کوئی زمین بنائی ہو تو اس زمین کا خریدنا خلاف احتیاط تو ہے، لیکن شرعاً جائز ہے، اور تفصیل کرتے ہوئے علامہ کرخی کی تفصیل ذکر کی ہے۔

قاری ظفر الاسلام صاحب نے حضرت مفتی نظام الدین صاحب کا فتوی نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: کرخی کے قول کے مطابق ان کے لیے زمین خریدنا درست ہے۔

علامہ کاسانی نے بعض مشائخ کا فتوی بھی اسی کے مطابق نقل کیا ہے، فتاوی دار العلوم میں بھی مفتی عزیز الرحمن کا فتوی انہی کے مطابق ہے، اس ناچیز نے بھی اپنے مقالہ میں علامہ کرخی کی تفصیل ذکر کی ہے، نیز لکھا ہے کہ علامہ کاسانی نے اس بابت اختلاف نقل کیا ہے، ابوبکر اسکاف نے تمام صورتوں کو حرمت کے دائرے میں رکھا ہے، کاسانی کا رجحان اسی طرف ہے، اس ناچیز نے اس پر یہ نوٹ چڑھایا ہے۔

علامہ کاسانی کی تصحیح بہت حد تک کتاب وسنت کے مزاج سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے، علامہ کرخی کے قول میں احتمال ہے کہ ان کے پیش نظر وہ نفع ہو جو ادائے ضمان سے پہلے حاصل ہوا ہو، مگر ضمان ادا کر دینے کے بعد اس کا کیا حکم ہوگا، مثلاً ایک شخص نے ایک شئی حرام مال سے خریدی ہے، اس کی قیمت دس ہزار روپے تھی، پھر اس کو پندرہ ہزار میں بیچ دیا، بعدہ وہ حرام مال کے بقدر یا تو مالک کو لوٹا دیا، یا پھر صدقہ کر دیا، پانچ ہزار کا جو نفع ہے یہ اس کے لیے حلال ہے یا نہیں؟ طرفین کے نزدیک یہ نفع حلال نہیں، امام کرخی کے نزدیک ادائے ضمان کی وجہ سے حلال ہو گئے، اگر ضمان ادا نہیں کیا گیا، یا اصل حرام مال کو صدقہ نہیں کیا گیا تو وہ حلال وطیب ہوگا یا نہیں اس سے اس نظریہ میں بحث ہی نہیں کی گئی ہے، نیز کتاب وسنت کا لب لباب بتاتا ہے کہ ابوبکر اسکاف وکاسانی کا قول راجح ہے، اس لیے کہ قرآن میں آیت ربا: "لا تأكلوا الربا أضعافًا مضاعفة" (سورہ آل عمران: ۱۳۰) میں ربا القرض ہے، اس کے کھانے کا تصور بالخصوص اضعافاً مضاعفة کی شکل میں اسی وقت ہوگا جب کہ اس سے غذائی وخوردنی اشیاء خرید کر کھائی جائے یا لباس وپوشاک کی ضرورت پوری کی جائے، اسی کو وعید شدید کا مصداق بنایا گیا۔

اس لیے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ حرام مال سے خریدی ہوئی زمین کا خریدار مالک ہی نہیں ہوتا ہے، جو خریدار کے لیے کلیدی شرط ہے، البتہ بعض بزرگوں کا فتوی علامہ کرخی کے مطابق ہے تو ضرورت کے وقت، یا ناواقفیت میں خرید لینے کے وقت جواز کا قول اختیار کیا جائے تو مناسب ہے۔

***

عرض مسئلہ:

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

(سوال نمبر ۵-۹)

مولانا محمد عثمان بستوی[1]

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين. أما بعد!

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق سوال ۵ تا ۹ کے جوابات پر عرض مسئلہ کی ذمہ داری اس ناچیز کے سپرد کی گئی، اس موضوع سے متعلق اکیڈمی کے توسط سے احقر کو کل سولہ ۱۶ / مفتیان کرام وعلماء عظام کے مقالات موصول ہوئے جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی ابصار احمد قاسمی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی محمد الیاس قاسمی، قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی عبدالمنان آسامی، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری صاحبان اور احقر محمد عثمان بستوی۔

موصولہ مقالات میں سے بعض میں متعلقہ سوالات کے جوابات بڑی تفصیل سے لکھے گئے ہیں، اور بعض میں خیر الکلام ما قل ودل کا نمونہ پیش کیا گیا ہے اور بعض میں انتہائی ابہام واجمال سے کام لیا گیا ہے، بہر حال اگر سوال نمبر ۵ سے متعلق جواب کا تجزیہ کیا جائے تو کل چار امور زیر بحث لائے گئے ہیں: (۱) منظور شدہ نقشہ میں عمومی منافع سے متعلق جگہوں کی نفس خرید وفروخت کا حکم، (۲) خرید وفروخت کے ذریعہ ثبوت ملکیت، (۳) بلڈر کی طرف سے مسجد کے لیے متعین کی گئی جگہ کا وقف ہونا، (۴) اس کو فروخت کرنا۔

عمومی منافع سے متعلق جگہوں کی نفس خرید وفروخت کا حکم:

منظور شدہ نقشہ میں عمومی منافع سے متعلق جگہوں کی خرید وفروخت کی ممانعت پر (خریدار کے لیے ثبوت ملکیت سے قطع نظر) تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے، البتہ تعبیرات میں فرق ہے، اکثر حضرات نے معاہدہ کی خلاف ورزی، بدعہدی، دھوکا، اضرار وغیرہ کی وجہ سے خرید وفروخت کو ناجائز کہا ہے، لیکن ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب نے مکروہ لکھا ہے جس کی تفصیل اس طرح کی ہے: اگر پہلے سے ایفاء عہد کی نیت تھی، لیکن کسی مجبوری سے بدل جائے تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر وعدہ کرتے ہی ایفاء کی نیت نہ تھی تو مکروہ تحریمی ہے، اور مولانا فروغ احمد صاحب نے فرمایا کہ اگر یہ جگہیں کالونی بنانے والے کی ملک ہیں، تو خرید وفروخت جائز ہے، لیکن حکومت کے جائز قوانین کی خلاف ورزی کا وبال اس کو پہنچ سکتا ہے۔

عدم جواز کے قائلین کے اسماء اور ان کے دلائل:

(۱) "تعاونوا على البر والتقوىٰ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" (سورہ مائدہ)۔

(۲) "يأيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولى الأمر منكم" (نساء)۔

(۳) "اسمعوا وأطيعوا وإن استعمل عليكم عبد حبشي كان رأسه زبيبة" (بخاری شریف: رقم الحدیث: ۷۱۴۲)

(۴) "طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة" (شامی ۲/ ۱۷۲) (ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی)۔

"الحرج مدفوع، لاضرر ولا ضرار في الإسلام" (الاشباہ) (زبیر احمد ندوی)۔

---

[1] مدرسہ ریاض العلوم گوریتی، جونپور، یوپی۔

''من آذی جارہ فقد آذانی ومن آذانی فقد آذاہ اللہ''(کنز العمال: رقم الحدیث: ۲۴۹۲۷)

(مفتی ابصار احمد مفتی)۔

''اجعلوا الطریق سبعة أذرع''(مسند احمد: رقم الحدیث: ۹۵۳۷) (مفتی ابصار، ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی)۔

''أوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا''(اسراء)، ''من غشنا فليس منا'' (ترمذی ۱/ ۲۴۵)

(مفتی الیاس، مفتی عفان منصور پوری، مفتی عبدالحمید قاسمی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مفتی مقصود علی فرقانی، محمد عثمان غنی عنہ)۔

نوٹ:......حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی عبدالمنان اور مفتی ابوسفیان مفتاحی صاحبان نے عدم جواز کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی ہے۔

۲......عمومی منافع سے متعلق جگہوں کی خریداری اور ملکیت کا ثبوت:

عمومی منافع سے متعلق جگہوں کو خریدنے کے بعد ملکیت کے ثابت ہونے نہ ہونے کے بارے میں مقالہ نگار حضرات کا اختلاف ہے، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی عبدالحمید، مفتی فروغ احمد، قاضی عبدالجلیل قاسمی صاحبان نے ان جگہوں کی خریداری کی صورت میں خریدار کی ملکیت کو ثابت مانا ہے، لیکن مفتی عبدالمنان، مفتی محمد الیاس قاسمی، ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مولانا زبیر احمد ندوی، مفتی ابصار ندوی، مفتی ابوسفیان مفتاحی، مفتی مقصود علی فرقانی صاحبان نے خرید وفروخت کو ناجائز تو کہا ہے، لیکن ملکیت کے ثبوت وعدم ثبوت سے بحث نہیں کی ہے۔

۳......خریداروں کی ترغیب کے لیے مسجد کے نام سے متعینہ جگہ کا حکم:

پلاٹر کی طرف سے ترغیب کے لیے نقشہ میں مسجد کے نام سے متعین کی جانے والی جگہ کے وقف ہونے نہ ہونے میں مقالہ نگار حضرات کی آراء میں اختلاف ہے، مفتی فروغ احمد قاسمی، مفتی عبدالمنان صاحبان نے اس جگہ کو وقف مانا ہے، چنانچہ مفتی فروغ احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اگر زمین پر نشان ڈال دیا گیا، یا لوگوں کی ترغیب کے لیے زبانی ہی اس کا ذکر کیا گیا تو وہ جگہ وقف ہوگئی۔

''ولا يشترط أيضا وجود الموقوف عليه حين الوقف حتى لو وقف على مسجد بيأ مكانه قبل أن يبنيه فالصحيح الجواز''(شامی: ۴/ ۳۹۵، کتاب الوقف)۔

مفتی عبدالمنان صاحب لکھتے ہیں کہ کالونی بنانے والے اپنی طرف سے مسجد کی جگہ متعین کرتے ہیں، تو یہ ان کی طرف سے وقف ہو جائے گا۔

اور اس کے برعکس ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی ابصار ندوی صاحبان، اور بندہ محمد عثمان غنی عنہ نے وقف نہ ہونے کی صراحت کی ہے، اور مفتی عفان منصور پوری، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی عبدالحمید قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مفتی مقصود علی فرقانی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا زبیر احمد ندوی صاحبان نے اس جگہ کے وقف ہونے نہ ہونے کی کوئی صراحت نہیں کی ہے۔

وقف نہ ہونے کے دلائل:

''وأجمعوا على من جعل داره أو أرضه مسجدا لا يجوز وتزول الرقبة عن ملكه لكن عزل الطريق وإفرازه والإذن للناس بالصلاة فيه. والصلاة شرط عند أبي حنيفة ومحمد حتى كان له أن يرجع قبل ذلك وعند أبي يوسف تزول الرقبة عن ملكه بنفس قوله جعلته مسجدًا وليس له أن يرجع عنه على ما نذكره'' (بدائع ۵/ ۲۲۶)

(ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب صدیقی)۔

اور اسی طرح کی عبارت ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مفتی ابصار صاحبان نے درمختار سے اور بندہ محمد عثمان عفی عنہ نے البحر الرائق سے نقل کی ہے۔

نقشہ میں مسجد کے لیے مختص جگہ کی خرید وفروخت کا حکم:

جن حضرات نے اس کے وقف ہونے کا حکم لگایا ہے، ان کے نزدیک خرید وفروخت کا ناجائز ہونا ظاہر ہے، اسی طرح وقف کی صراحت نہ

کرنے والے حضرات نے اس مسئلہ میں مطلقاً خرید وفروخت کو ناجائز کہا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی اس جگہ کی خرید وفروخت جائز نہیں، البتہ ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی ابصار ندوی وغیرہم کے نزدیک یہ جگہ وقف نہیں اور اس کی خرید وفروخت شرعاً صحیح اور درست ہے۔

احقر کی رائے:

بندہ کے خیال میں کالونی بنانے والا راستے کی چوڑائی وغیرہ کے سلسلے میں اپنی رضا اور خوشی سے معاہدہ نہیں کرتا ہے، بلکہ قانونی مجبوری اور دباؤ کی وجہ سے اس پر آمادہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کا حکم یہ ہوگا کہ اگر اس کو اپنی آبرو وغیرہ کا کوئی خطرہ نہ ہو، تو اس معاہدہ کا شرعاً وہ پابند نہ ہوگا، اس لیے منظور شدہ نقشہ میں تبدیلی اور عمومی منافع سے متعلق جگہوں میں کمی بیشی اگر پلاٹ کی فروختگی سے قبل عمل میں آئے تو یہ شرعاً جائز ہے۔

"إذاسعرو خاف البائع ضرب الإمام لو نقص لا يحل للمشتري (لعدم رضا البائع)... وظاهره لو باعه بأكثر يحل وينفذ البيع ولو باعه بقليل يحل أيضا" (شامی: ص/ ۵۷۳-۵۷۴ مع تقریرات الرافعی/ ۲۱۰)۔

(۲) اور پلاٹر نے پلاٹ فروخت کرتے وقت خریداروں سے جن سہولیات کو فراہم کرنے کا معاہدہ کیا ہو، ان چیزوں کی خرید وفروخت جائز نہ ہوگی اور خریدنے سے ملکیت بھی ثابت نہ ہوگی؛ کیونکہ صراحت کی صورت میں وہ چیزیں مبیع میں داخل سمجھی جائیں گی۔

"لو قال البائع بعتك هذا الدار بجميع حقوقها دخل في المبيع حق المرور و حق الشرب وحق المسيل" (شرح المجلة لعلي حيدر ۱/ ۱۸۳، الماده: ۲۳۵)۔

(۳) اور اگر خریدنے والوں سے صراحتاً کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو تو عرف کے مطابق عمل ہوگا، جو چیزیں عرفاً پلاٹ کا لازمی حصہ سمجھی جاتی ہیں (راستہ، نالی وغیرہ) ان کی خرید وفروخت باطل ہوگی اور جو چیزیں عرفاً پلاٹ کا لازمی حصہ نہیں سمجھی جاتی ہیں (گارڈن، کھیل میدان وغیرہ) تو وہ بغیر صراحت کے پلاٹ کا حصہ شمار نہ ہوں گی، لہٰذا اس کی خرید وفروخت درست ہوگی۔

"مالايكون من مشتملات المبيع ولا هو من توابعه المتصلة المستقرة أو لم يكن في حكم جزء من المبيع أو لم تجر العادة والعرف بيعه لا يدخل في البيع مالم يذكر وقت البيع اما ماجرت عادة البلد والعرف بيعه تبعا للمبيع فيدخل في البيع من غير ذكر" (شرح المجلة لعلي حيدر الماده: ۲۳۲)۔

"أن الأحكام تبتني على العرف وأنه يعتبر في كل أقليم وعصر عرف أهله" (شامی ۷/ ۴۲۷)۔

(۴) کالونی آباد ہونے کے بعد عمومی منافع سے متعلق جگہیں وقف کے درجہ میں ہو جائیں گی اور ان کی خرید وفروخت شرعاً درست نہ ہوگی۔

"ولا يجوز إحياء ما عرب من العامر بل يترك مرعى لهم ومطرحا لحصائدهم لتعلق حقهم به" (الدر المختار ۱۰/ ۶)

(۵) کسی جگہ کے وقف ہونے کے لیے صراحۃً وقف کرنا ضروری ہے، اور مسجد ہونے کے لیے قولاً یا فعلاً فی الحال مسجد بنادیے جانے کی صراحت ضروری ہے، صرف آئندہ مسجد بنائے جانے کے ارادہ اور اس کے اظہار سے مسجدیت کا تحقق نہ ہوگا

(فتاویٰ دارالعلوم ۱۳/ ۲۷۵، امداد المفتیین ۲/ ۶۳۵)۔

وعن أبي يوسف تزول بمجرد القول مطلقًا... ويزول بالفعل أيضًا بلا خلاف... هو وعلمت أرجحيته قول أبي يوسف في الوقف والقضاء" (طحطاوی علی الدر مخلصه: ۵۳۶) "وركنه الألفاظ الخاصة كأرضي هذه صدقة ونحوه من الألفاظ" (شامی ۶/ ۵۲۲-۵۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ خریداروں کی رغبت کے لیے پلاٹ میں کوئی جگہ مسجد کے لیے متعین کرنے سے مسجد پر وقف نہ ہوگی، اور نہ ہی شرعاً وہ مسجد کے حکم میں ہوگی، اس لیے خریدنے سے ملکیت ثابت ہو جائے گی، لیکن اس کی خرید وفروخت بہر حال اتہام سے خالی نہیں، اس لیے اجتناب لازم و ضروری ہے۔

حاصل:

حاصل یہ ہے کہ سوال نمبر ۵ سے متعلق جوابات کی تحقیق و تنقیح کے لیے درج ذیل نکات پر توجہ دینا لازم ہے:

(۱) نقشہ کی منظوری حاصل کرنے کے لیے راستہ کی چوڑائی، کھیل کے میدان، پارک وغیرہ کے سلسلے میں کالونی بنانے والا جو وعدہ کرتا ہے، یہ وعدہ دلی خوشی اور رضامندی سے ہوتا ہے، یا صرف قانونی جبر و دباؤ کی بناء پر۔

(۲) پلاٹ فروخت کرنے کے بعد عرف میں کون سی چیزیں پلاٹ کے لیے لازم اور ضروری سمجھی جاتی ہیں، کہ جس کا بغیر صراحت کے بھی فراہم کرنا پلاٹر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

(۳) فروخت کرنے کے بعد کونسی ایسی چیزیں ہیں، جو پلاٹ کے لیے عرف میں لازم و ضروری نہیں خیال کی جاتیں، بلکہ وہ چیزیں پلاٹ کی حسن و خوبی کے لیے ہوتی ہیں۔

(۴) پلاٹ بک کرانے والوں سے پلاٹر کے معاہدہ کا حکم کیا ہوگا۔

(۵) کسی جگہ کے وقف یا مسجد بننے کے لیے شرائط کیا ہیں۔

کھیل کے میدان اور پارک کی جگہ پر مسجد بنانے کا حکم:

سوال (۶):۔ یعنی کھیل کے میدان اور پارک کی جگہ پر مسجد بنانے سے متعلق جوابات میں دو مختلف آراء ذکر کی گئی ہیں:

(۱) مولانا کلیم اللہ صاحب عمری، مفتی ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد الیاس صاحب قاسمی، ڈاکٹر محی الدین صاحب غازی، مفتی عبدالمنان صاحب آسامی، مفتی ابصار ندوی صاحبان نے کھیل کے میدان اور پارک وغیرہ کی جگہ پر مسجد بنانے کو ناجائز لکھا ہے، البتہ ڈاکٹر محی الدین غازی نے یہ تفصیل کی ہے کہ اگر حکومت کی نگاہ میں وہ جگہ مسجد تسلیم کرلی جائے اور خریداروں کو معاملہ کے وقت یہ مسجد دکھائی گئی ہو تو مضائقہ نہیں، ورنہ درست نہیں، اور مفتی ابصار صاحب نے یہ فرمایا کہ اگر تعمیر مسجد باتفاق اہلیان کالونی ہو تو درست ہے، ورنہ نہیں؛ کیونکہ زمین مشترک ہے، ان حضرات نے دلائل میں درج ذیل عبارات پیش کی ہیں:

(۱) ''المسجد لغة محل السجود وشرعًا المحل الموقوف للصلوة فيه'' (مرقاۃ شرح مشکوۃ: ۲/ ۴۴۴) (مفتی ابوسفیان مفتاحی)۔

(۲) ''وفي الهندية: مسجد بني على سور المدينة قالوا: لا يصير مسجدا فيه لأن السور حق العامة'' (بحوالہ قاموس الفقہ ۵/ ۹۳) (مفتی الیاس صاحب قاسمی)۔

نوٹ:۔ مولانا کلیم اللہ عمری ڈاکٹر محی الدین غازی مفتی عبدالمنان وغیرہم نے کوئی دلیل ذکر نہیں ہے۔

(۲) اس کے برعکس مولانا زبیر احمد صاحب ندوی، مولانا مقصود علی صاحب فرقانی، مفتی عبدالحمید صاحب قاسمی، مفتی عفان صاحب منصور پوری، قاضی ذکاء اللہ صاحب شبلی، قاضی عبدالجلیل صاحب قاسمی، ڈاکٹر شاہ جہاں صاحب ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام، مفتی فروغ احمد قاسمی صاحبان نے کھیل کے میدان اور پارک کی جگہ پر مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی ہے اور اس پر بنائی جانے والی مسجد کو مسجد شرعی تسلیم کیا ہے۔

دلائل: ان حضرات نے درج ذیل ذکر کئے ہیں:

(۱) ''مسجد بني على سور المدينة قالوا: لا يصلى فيه لأن السور حق العامة وينبغي أن يكون الجواب على التفصيل إن كانت البلد فتحت عنوة وبني مسجد بإذن الإمام جاز الصلوة فيه لأن للإمام أن يجعل الطريق مسجدًا وهذا أولى'' (ہندیۃ ۱/ ۱۱۰، كتاب الصلوة) (مفتی فروغ احمد قاسمی)۔

(۲) ''لأن المسجد حق الله تعالى أو حق عامة المسلمين'' (الخانية على الهنديه ۲/ ۲۹۰) (مولانا زبیر احمد ندوی)۔

(۳) ''ولا يمنع الشخص من تصرفه في ملكه إلا إذا كان الضرر بجاره ضررا بينا فيمنع من ذلك فعليه الفتوى'' (شامی: ۸/ ۱۵۲)۔

(۴) ''المالك ہو المتصرف فی الأعیان المملوكة كیف شاء'' (بیضاوی۱/ ۷) (مفتی عفان منصور پوری)۔

احقر عارض کی رائے:

احقر اس سلسلے میں درج ذیل تفصیل مناسب خیال کرتا ہے:

(۱) پلاٹ فروخت کرنے سے قبل پلاٹر پارک یا کھیل میدان کی متعینہ جگہ کو مسجد بنانے کے لیے مختص کردے، یا پلاٹ فروخت کرنے کے وقت خریداروں سے ان جگہوں پر مسجد بنانے کا ارادہ ظاہر کردے اور اس پر مسجد بنائی جائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں؛ کیونکہ یہ زمین اس کی ملک ہے اور مالک کو من چاہا تصرف کا اختیار ہے۔

اسی طرح پلاٹ فروخت کرنے کے وقت کھیل میدان اور پارک وغیرہ کی جگہ کے بارے میں پلاٹر نے پلاٹ خریدنے والوں سے کھیل میدان وغیرہ دینے کا کوئی وعدہ نہ کیا ہو تو بھی اس پر مسجد بنانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں؛ کیونکہ یہ جگہیں پلاٹر کی ملک ہیں اور بغیر صراحت کے پلاٹ کے تابع نہ ہوگی۔

''لا یمنع أحد من التصرف فی ملکه أبدا وإلا إذا أضره بغیره ضررا فاحشا'' (شرح المجلة المادة: ۱۱۹۷)۔

" ما لایکون من مشتملات المبیع ولا ہو من توابعه المتصلة المستقرة أو لم یکن فی حکم جزء من المبیع أو لم تجر العادة والعرف بیعه لا یدخل فی البیع مالم یذکر وقت البیع أما ماجرت عادة البلد والعرف بیعه تبعا للمبیع فیدخل فی البیع من غیر ذکر'' (شرح المجلة لعلی حیدر المادہ: ۲۳۲)۔

(۲) پلاٹ فروخت کرنے والے نے کھیل میدان، پارک وغیرہ دینے کا وعدہ کیا ہو یا وعدہ نہ کیا ہو، لیکن کھیل میدان وغیرہ کے نام سے یہ جگہیں چھوڑ دی گئی ہوں اور کالونی آباد ہو چکی ہو تو اس صورت میں یہ جگہیں اہلیان کالونی کے لیے بمنزلہ وقف کے ہیں، لہٰذا اگر مسجد کی ضرورت ہو اور اہلیان کالونی مسجد کی تعمیر پر راضی ہوں، خواہ صراحتاً خواہ دلالۃً تو اس پر مسجد بنانا شرعاً جائز ہے اور اگر اہلیان کالونی میں اختلاف ہو تو اکثریت کی رائے کے مطابق عمل کرنا لازم ہے۔

''وفي كتاب الكراہیة من الخلاصة عن الفقیه أبي جعفر عن ہشام عن محمد أنه یجوز أن یجعل شئ من الطریق مسجدًا... ولو اختلفوا ینظر أیہم أكثر ولایة، له ذلك'' (تبیین الحقائق۴/ ۲۷۴) ''وفی الشامیة: إذا اجتمع أكثرہم لیس للأقل منعہم'' (شامي:۶/ ۵۷۶)۔

قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بغیر پلاٹ فروخت کرنے اور کالونی بسانے کا حکم:

سوال (۷): یعنی قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بغیر پلاٹ فروخت کرنے اور کالونی بسانے سے متعلق جوابات میں اکثر حضرات نے جواز کا رجحان ظاہر کیا ہے، البتہ مفتی ابصار ندوی، مولانا کلیم اللہ ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحبان قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بغیر کالونی بسانے اور پلاٹ فروخت کرنے کو جائز نہیں سمجھتے ہیں، اور ڈاکٹر محی الدین غازی نے کوئی حکم نہ لگانے کا مشورہ دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ بسنا بسانا ایک اضطراری عمل ہے، جس پر کوئی حکم جاری کرنا مناسب نہیں۔

عدم جواز کی دلیل میں ''أن تناصحوا من ولاہ اللہ أمركم'' (مسند احمد عن ابی ہریرۃ رقم الحدیث: ۹۰۲۲) وغیرہ کو ذکر کیا ہے۔ (مفتی ابصار ندی)۔

اور جائز کہنے والوں کے دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) ''لا یمنع أحد من التصرف فی ملکه أبدا إلا إذا أضره بغیره ضررا فاحشا'' (شرح المجلة المادة: ۱۱۹۷)۔

(۲) ''یتحمل الضرر الخاص بدفع ضرر عام'' (شرح المجلة المادة: ۲۶)۔

(۳) إذا تعارضا مفسدتان روعی أعظمهما بارتكاب أخفهما'' (شرح المجلة المادة: ۲۶) (مولانا نذیر احمد صاحب ندوی)

(۴) "الحاجة العامة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم ا/ ۲۱۶)
(مفتی الیاس قاسمی، مفتی عفان منصور پوری)۔

احقر کی رائے:

احقر پہلی رائے کو راجح اور صحیح سمجھتا ہے؛ کیونکہ ہر آزاد عاقل بالغ انسان کو اپنی منشاء کے مطابق اپنا مال فروخت کرنے کا شرعاً حق ہے اور جب تک اس کے کسی تصرف سے ضرر عام لاحق نہ ہو کسی کو روکنے کا اختیار نہیں اور اس کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روکنا شرعاً اکراہ اور ظلم ہے جو ناجائز ہے، اس لیے اس طرح کے قوانین کی وجہ سے حکم شرعی متاثر نہ ہونا چاہئے، البتہ اگر قانونی خلاف ورزی کی وجہ سے آبرو وغیرہ پامال ہونے کا اندیشہ ہو تو اس سے بچنے کا مشورہ ضرور دیا جاسکتا ہے، لیکن ناجائز ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

خلاصہ یہ کہ اس طرح کے قانون سے اگر کچھ لوگوں کا نفع ہے تو دوسرے بہت سے لوگوں کا نقصان بھی ہوتا ہے، اور زمین چونکہ فروخت کرنے والے کی ملک ہے، اس لیے شرعاً قانونی پابندی لازم نہیں اور خرید نا بیچنا جائز ہے، البتہ قانونی مواخذہ کا اندیشہ ہو تو احتراز ضروری ہے، واللہ اعلم۔

"إذا سعر وخالف البائع ضرب الإمام لو نقص لا يحل للمشتري (لعدم رضا البائع) وظاهره لو باعه بأكثر يحل وينفذ البيع ولو باعه بقليل يحل أيضا" (شامی: ۵۷۴،۵۷۳) "مقتضاه أن أمراء زماننا لا يفيد أمرهم الوجوب الخ" (شامی ۱۰/ ۴۳،۴۲)۔

قانونی مجبوری اور انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لیے سودی قرض لینے کا حکم:

سوال (۸): یعنی قانونی مجبوری اور انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لیے سودی قرض لینے سے متعلق جوابات میں بھی مقالہ نگار حضرات کے درمیان اختلاف آراء موجود ہے: (۱) چنانچہ مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی فروغ احمد قاسمی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی عبد المنان آسامی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحبان نے قانونی مجبوری وغیرہ کی صورت میں بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت کا رجحان ظاہر کیا ہے اور درج ذیل عبارات فقہاء سے استدلال کیا ہے:

"يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (بحر الرائق: ۶/ ۲۱۱) "قال ابن نجيم أما الحاجات معناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسع ورفع الضيق المودي في الغالب إلى الحرج والمشقة لفوت المطلوب" (الاشباہ والنظائر) (مولانا زبیر احمد ندوی)

"الضرورات تبيح المحظورات" (مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی عبد المنان، ڈاکٹر ظفر الاسلام، قاضی عبد الجلیل، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی عفان منصور پوری)۔

"الكذب مباح لإحياء حقه ودفع الظلم عن النفس والمراد التعريض لأن عين الكذب حرام" (الدر المختار: ۵/ ۳۰۴) (مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

(۲) اور ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مفتی انصار ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا عبد الحمید قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری صاحبان نے قانونی مجبوری اور ٹیکس وغیرہ کی ضرورت سے بچنے کے لیے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی فرماتے ہیں کہ سودی قرض لینا اس وقت جائز ہوسکتا ہے کہ جب کہ ضیاع جان کا اندیشہ ہو، اور مولانا عبد الحمید قاسمی کفایۃ المفتی کے حوالے سے فرماتے ہیں: البتہ سخت مجبوری اور اضطرار کی حالت میں جب کہ نوبت ہلاکت نفس یا عزت و آبرو تک پہنچ جائے تو بقدر حاجت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے۔

دلائل:

"فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه". "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (شاہ جہاں ندوی)۔

إن المقترض بالربوا لابد ان يكون الدافع لفعله المحرم هذا هو الضرورة وليست الحاجة التي يمكنه التخلي عنها وعدم فعلها"۔

"والضرورة تتعلق بضرر يقع على دينه أو بدنه أو عقله أو عرضه أو ماله وهو ما يسمى الضرورات الخمس وليست هي المشقة التي يمكن تحملها بل هي الضرورة التي قد تسبب له هلاكا أو تلفا ببعض أعضائه أو سجنا طويلا أو مرضا مزمنا (موقع الاسلام سوال وجواب ۵/ ۵۲۲۵) (مفتی انصار ندوی)۔

احقر عارض کی رائے:

احقر قانونی گرفت سے بچنے کے لیے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش سمجھتا ہے، جس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

(۱) محتاج کے لیے سودی قرض لینے کی حضرات فقہاء نے صراحت فرمائی ہے: ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' اور حاجت سے مراد وہ تنگی اور مشقت ہے جو مطلوب اور مقصود کے فوت ہونے سے پیش آئے اور محنت کی کمائی کا ایک اچھا حصہ ضبط ہوجانے یا قانونی مقدمہ میں ماخوذ ہونے سے مشقت کا لاحق ہونا ظاہر، لہٰذا مال کی حفاظت کے لیے اور قانونی مواخذہ سے بچنے کے لیے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی۔

''وأما الحاجيات فمعناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسعة ورفع الضيق المؤدیٔ فی الغالب إلی الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب'' (الموافقات للشاطبی ۲/ ۱۰)۔

(۲) حضرات فقہاء نے دفع ضرر یا جلب منفعت کے لیے رشوت دینے کی اجازت دی ہے، جب کہ رشوت دینا بھی سود دینے کی طرح سے حرام ہے، تو جس طرح دفعِ مضرت وغیرہ کے لیے رشوت کی اجازت ہے، اسی طرح بقدر ضرورت سود دینے کی بھی اجازت ہوگی۔

''أخذ المال ليسوی أمره عند السلطان دفعا للضرر وجلبا للنفع وهو حرام علی الآخذ فقط'' (شامی ۸/ ۳۵)۔

(۳) اکابر مفتیان کرام نے بھی قانونی مواخذہ یا انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لیے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

(منتخبات نظام الفتاویٰ ۱/ ۱۸۹)۔

خیار تبدیل کی صورت میں مبیع کی جہالت اور بیع کی صحت:

سوال (۹): یعنی پلاٹ کو فروخت شدہ پلاٹ میں تغیر وتبدل کا اختیار حاصل ہونے کی صورت میں خریدا ہوا پلاٹ متعین ہوگا یا نہیں اور اس کی خرید وفروخت درست ہوگی یا نہیں؟ اس سے متعلق جوابات میں بھی مقالہ نگار حضرات کی آراء میں اختلاف موجود ہے، کل تین آراء مذکور ہیں:

(۱) ڈاکٹر ظفر الاسلام، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مولانا کلیم اللہ عمری صاحبان نے مبیع کو غیر متعین اور مجہول مان کر بیع کی عدم صحت کا حکم لگایا ہے۔

ان حضرات کے دلائل یہ ہیں:

''التسليم أو القبض معناه عند الحنفية هو التخلية أو التخلی وهو أن يخلی البائع بين المبيع وبين المشتری برفع الحائل بينهما علی وجه يتمكن المشتری من التصرف فيه فيجعله البائع مسلما للمبيع والمشتری قابضا له. التخلية وهی أن يتمكن المشتری من المبيع بلا مانع (أی أن يكون مفرزا) و لا حائل (أی فی حضرة البائع) مع الإذن له بالقبض'' (الفقه الاسلامی ۴/ ۲۱۸) (ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب)۔

(۲) مفتی ابصار احمد ندوی، ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی الیاس قاسمی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی زبیر احمد ندوی، مفتی عبدالمنان صاحبان نے مبیع کو متعین مان کر بیع کو جائز قرار دیا ہے۔

دلائل:

''وإذا قال الرجل للرجل بعتك هذه الدار كل ذراع بدرهم علی أنها ألف ذراع فهو جائز لأن بيان جملة الذرعان يصير جملة الثمن معلوما ولأنه سمی بمقابلة كل ذراع درهما'' (مبسوط سرخسی، کتاب الشروط: ۲۲/ ۲۲۴)

(مفتی محمد ابصار صاحب، ڈاکٹر مفتی شاہ جہاں ندوی صاحب)۔

''بعت الأرض المحدودة بكذا وكذا أو بعت الأرض فی الموقع الفلانی والتی هی عبارة عن كذا ذراعا بيان مقدار المبيع فيكون المبيع معلوما والبيع صحيحا ذاتًا ووصفًا'' (مجلة الاحكام ۱/ ۱۵۳، المادة: ۲۰۱)

(مولانا زبیر احمد صاحب، مفتی الیاس صاحب قاسمی)۔

''القبض عندنا ہو التخلية والتخلی وهو أن ينحلى البائع بين المبيع والمشترى برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن للمشترى معه التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشترى قابضًا له'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۹۸، زکریا)

(مفتی محمد عفان صاحب)۔

(۳) قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی فروغ احمد قاسمی، مفتی عبدالحمید قاسمی صاحبان نے مذکورہ صورت میں مبیع کو تو متعین نہیں مانا ہے، لیکن بیع کو صحیح قرار دیا ہے، ان کے دلائل درج ذیل ہیں۔

''ومن اشترى عشرة أذرع من مائة ذراع من دار أو حمام فالبيع فاسد عند ابی حنيفة وقالا هو جائز وإن اشترى عشرة أسهم من مائة سهم جاز فی قولهم جميعا ولهما أن عشرة أذرع من مائة ذراع عشر الدار فأشبه عشرة أسهم'' (ہدایہ مع فتح القدیر ۶/ ۲۵۴) ''الظاهر اعتماد قولهما الآن لموافقته العرف حملًا لكلام العاقد على عرفه'' (تقریرات رافعی: ۱۱۶، کتاب البیوع)۔

احقر کی رائے:

احقر کے نزدیک آخر الذکر حضرات کی آراء صحیح اور راجح معلوم ہوتی ہیں؛ کیونکہ جب پلاٹر کو پلاٹ بدلنے کا اختیار حاصل ہے تو یہ شکل خیار تعیین للبائع کی قبیل سے ہوگی، اور خیار تعیین جس طرح مشتری کے لیے صحیح اور درست ہے، اسی طرح سے بائع کے لیے بھی درست ہوگی اور خیار تعیین میں مبیع کے غیر متعین ہونے کے باوجود بھی بیع صحیح ہوتی ہے:

''وصح خيار التعيين للبائع فی الأصح'' (شامی ۷/ ۱۴۰)

''يكون المبيع بخيار التعيين غير معين، فعلى هٰذا الوجه يكون المبيع مجهولا فمقتضى القياس فساده إلا أنه يجوز استحسانا'' (شرح المجلۃ ا۔ ۳/ ۲۶۳)۔

٭٭٭

عرض مسئلہ:

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

(سوال نمبر ۱۰ تا ۱۵)

مفتی ابصار احمد ندوی (جھارکھنڈ)

اسلامک فقہ اکیڈمی کے چھبیسویں فقہی سمینار کا ایک اہم موضوع ''زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل'' ہے، اکیڈمی کی جانب سے راقم الحروف کو سوال نمبر ۱۰ تا ۱۵ پر عرض مسئلہ کے لئے کل بیس (۲۰) مقالہ نگاروں کے مقالات موصول ہوئے، جن میں سے کچھ طویل ہیں، کچھ مختصر تو کچھ انتہائی مختصر، مقالہ نگاروں کے نام حسب ذیل ہیں:

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی ابصار احمد ندوی، محی الدین غازی فلاحی، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی عبدالمنان، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا ظہیر احمد قاسمی، مفتی ظفر عالم ندوی، مولانا محمد ابوبکر قاسمی۔

اس موضوع کا دسواں سوال یہ ہے کہ: اس صورت میں (یعنی صرف نقشہ پر پلاٹ کی تعیین کی صورت میں) ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمین کے جو حصے بیچے گئے ہیں، اس پر بیچنے والا کاشت بھی کرتا رہتا ہے، تو کیا اس کے باوجود خریدار اس کا مالک ہوجائے گا؟

اس سلسلہ میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

پہلا نقطہ نظر:

صورت مذکورہ میں بائع کے کاشت کرنے کے باوجود خریدار اس زمین کا مالک ہوجائے گا، اس نقطہ نظر کے حاملین بیشتر مقالہ نگار ہیں (دیکھئے مقالہ ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی عبدالمنان، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مولانا ظہیر احمد قاسمی، مولانا محمد ابوبکر قاسمی وغیرہ)۔

اس ذیل میں بائع کے کاشت کرنے کے تعلق سے اکثر مقالہ نگار کی رائے یہ ہے کہ اگر مشتری کی اجازت کے بعد وہ ایسا کرتا ہے، تو یہ اس کی جانب سے تبرع ہے اور وہ کاشت کرسکتا ہے، لیکن اگر بائع کاشت کی شرط لگاتا ہے، تو یہ شرط فاسد ہے، اور اس سے بیع فاسد ہوجائے گی۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ خیار سے خالی بیع صحیح کا حکم اصلی یہی ہے کہ مبیع میں خریدار کے لئے اور ثمن میں بائع کے لئے فوراً ملکیت ثابت ہوجاتی ہے۔

''أما الأول فهو ثبوت الملك للمشتري في المبيع وللبائع في الثمن للحال'' (بدائع الصنائع للكاساني ۵/ ۲۳۳)

(مقالہ ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

۲۔ جب ایجاب وقبول ہوگیا، مبیع اور ثمن کی تعیین بھی ہوگئی تو اس پر مشتری کی ملکیت فوراً ثابت ہوجائے گی، بیع صحیح میں ملکیت کے لئے قبضہ بھی شرط نہیں ہے، مبیع میں مشتری کی ملکیت محض بیع صحیح کر لینے سے ہوجاتی ہے۔

(دیکھیے مقالہ مفتی عبدالحمید قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی محمد عفان منصور پوری اور راقم الحروف)۔

۳۔ عقد کے بعد خریدار کی اجازت سے بائع کاشت کرسکتا ہے، اور یہ اس کی طرف سے تبرع ہے، لیکن کاشت کی شرط لگانا شرط فاسد ہے، اس سے عقد فاسد ہوجائے گا۔ (دیکھیے مقالہ ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مقالہ مفتی عبدالحمید قاسمی اور راقم الحروف بہ حوالہ موسوعۃ فقہیۃ اردو ۲ / ۷۰)۔

۴۔ ایسی شرط جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو، اس سے بیع فاسد ہوجاتی ہے (مقالہ ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی بہ حوالہ تنویر الابصار، مفتی محمد الیاس قاسمی بہ حوالہ در مختار)۔

۵۔ اگر زمین میں کھیتی لگی ہوئی ہو تو بائع کو اس کھیتی کے کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا۔ (مفتی محمد زبیر ندوی بہ حوالہ شرح مجلۃ الاحکام)۔

۶۔ مشتری کی اجازت کے بغیر اگر بائع کاشت کررہا ہو تو لاگت سے زائد پیداوار صدقہ کرنا اس پر لازم ہے (مفتی محمد الیاس قاسمی بہ حوالہ مجمع الانہر)۔

۷۔ مشتری بائع کو کاشت سے روک سکتا ہے، یا اس کی اجرت بھی متعین کرسکتا ہے، کیوں کہ وہ اس زمین کا مالک بن چکا ہے۔
(مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی)۔

۸۔ بائع خریدار کی اجازت سے بطور مزارع یا بطور اجیر کاشت کرسکتا ہے، ورنہ نہیں، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:
''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه'' (مولانا محمد ابوبکر قاسمی)۔

دوسرا نقطہ نظر:

اس سلسلہ میں دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ زمین کے معاملات میں دھوکہ دہی کی کثرت کی وجہ سے جب تک رجسٹری ہوکر نیٹ پر نام نہ آجائے وہ خریدار مانا ہی نہیں جائے گا، اس لئے وہ زمین بائع کی ہی ہے اور کاشت بھی اسی کی ہوگی، اس کی دلیل کورٹ اور عدلیہ میں اس طرح کے بیشتر مقدمات کا ہونا ہے، اس نقطہ نظر کے حامل ہیں ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی۔

ترجیح ووجہ ترجیح:

عارض سمجھتا ہے کہ صورت مسئولہ کے اعتبار سے پہلا نقطہ نظر راجح ہے، کیونکہ جب نقشہ بن چکا، اور نقشہ میں پلاٹ نمبر کی تعیین بھی کردی گئی، تو مبیع مجہول اور غیر معین کہاں رہی؟ مبیع تو معلوم اور متعین ہے، لہذا یہ بیع صحیح ہے، مشتری اپنی زمین کا مالک ہے، بائع مشتری کی اجازت کے بغیر اس پر کاشت نہیں کرسکتا، اور نہ قبل العقد کاشت کی شرط لگا سکتا ہے، اگر وہ ایسا کرتا ہے، تو شرط فاسد کی وجہ سے بیع فاسد ہوجائے گی۔

جہاں تک بات رجسٹری ہوکر نیٹ پر نام آنے کی ہے، تو یہ اصل بیع نہیں بلکہ ثبوت بیع ہے۔

اس موضوع کا گیارہواں سوال یہ ہے کہ: جس شخص نے پلاٹ خریدا ہے تو اس سے پہلے کہ اس کا پلاٹ متعین ہو، صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر وہ اپنی زمین کسی اور سے فروخت کردیتا ہے، کیا یہ بیع درست ہوگی؟

اس میں دو صورتیں ہوتی ہیں:

الف: ایک یہ کہ زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آگئی تھی اور اس نے پلاٹس فروخت کئے تھے۔

(۱)۔ اس کے جواب میں زیادہ تر مقالہ نگاروں کی رائے یہ ہے کہ زمین کے مالک ہونے کے بعد بغیر قبضہ کے بھی (قبضہ کی صورت میں کوئی اختلاف نہیں) کالونی بنانے والے کا پلاٹس فروخت کرنا جائز ہے (دیکھئے مقالہ ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ابو سفیان مفتاحی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی عبدالمنان، مفتی عبدالحمید قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا محمد ابوبکر قاسمی، مولانا ظہیر احمد قاسمی)۔

کتابوں کے حوالہ کے اختلاف کے باوجود ان سب کے دلائل معنوی اعتبار سے یکساں ہیں، یعنی امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہا اللہ کے نزدیک غیر منقولات کی بیع قبل القبض جائز ہے، غرر اور ہلاکت تقریبا نہ ہونے کی وجہ سے۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

"اشترى دارًا أو عقارًا فوهبها قبل القبض من غير البائع يجوز عند الكل ولو باع يجوز في قول أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالى ولا يجوز في قول محمد رحمه الله تعالى" (الفتاوى الهنديه ۳/ ۱۳ مقالہ ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

"ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد لايجوز رجوعا إلى إطلاق الحديث واعتبارا بالمنقول وصار كالإجارة ولهما أن ركن البيع صدر من أهله في محله ولا غرر فيه لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول" (ہدایة مع فتح القدیر ۵/ ۵۱۳ مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی)۔

"للمشتري أن يبيع المبيع لآخر قبل قبضه إن كان عقارًا وإلا فلا وقد جوزه الشيخان استحسانًا .... وبما أن الهلاك نادر في العقار ولا اعتبار للنادر فليس في بيع العقار قبل القبض غرر الانفساخ كما في بيع المنقول" (شرح مجلة الأحكام: ۲۳۶/۱ مقالہ مفتی محمد زبیر ندوی)۔

(۲) دوسری رائے:

صورت مسئولہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ بغیر قبضہ کے ایسی زمین کو فروخت کرنا درست نہیں ہے، اس کے قائلین ہیں: مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مفتی ظفر عالم ندوی، راقم الحروف ابصار احمد ندوی۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

قبضہ کے بغیر بیع، اصول بیع کے خلاف ہے، لقول النبي: "لا تبع ما ليس عندك" (مقالہ مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی)۔

پلاٹ کی تعیین سے پہلے بیع، مجہول اور مشاع شئی کی بیع ہوگی، اس لئے یہ بیع فاسد ہے (مقالہ مفتی ظفر عالم ندوی)۔

حدیث میں قبضہ سے قبل کی بیع کی ممانعت عام ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر چیز اناج ہی کے مثل ہے، جیسا کہ حدیث رسول ہے: "إذا اشتريت بيعا فلا تبعه حتى تقبضه"، نیز جس طرح جائیداد غیر منقولہ میں قبضہ سے قبل اجارہ ناجائز ہے، اسی طرح بیع بھی ناجائز ہونا چاہیے، کیونکہ دونوں میں مشترک علت یہ ہے کہ دونوں میں غیر مضمون کا نفع پایا جارہا ہے، اس لئے کہ فروختگی میں مقصود نفع ہے، اور غیر مضمون کا نفع شرعاً ممنوع ہے، اور ممانعت فساد کا تقاضا کرتی ہے، لہذا قبضہ سے قبل بیع فاسد ہوگی، کیونکہ وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہی نہیں ہوئی، جیسا کہ اجارہ میں ہے، اور جیسا کہ امام محمد رحمہ اللہ اور شوافع کا مسلک ہے (مقالہ راقم الحروف بہ حوالہ موسوعۃ فقہیۃ کویتیۃ اردو ۱۴۴/ ۹)۔

ترجیح ووجہ ترجیح:

عارض سمجھتا ہے کہ صورت مسئولہ کے اعتبار سے دوسرا موقف راجح ہے، کیونکہ آج کے حالات میں جب تک زمین پر قبضہ نہ ہوجائے، یا کم ازکم کوئی ایسی صورت نہ ہو، جو قبضہ کے مثل ہو، تو پھر اکثر بایں صورت غرر اور نزاع کے واقعات پیش آتے ہیں، شریعت کا مقصد بھی یہی ہے کہ معاملہ بالکل واضح اور صاف وشفاف ہو، اور حدیث میں ممانعت کی علت بھی یہی ہے، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ فی زماننا اندیشۂ غرر یا نزاع کی صورت میں شوافع اور امام محمدؒ کے مسلک پر فیصلہ ہونا چاہیے۔

ب: (اس سوال کا دوسرا جزء) دوسری صورت یہ ہے کہ زمین ابھی مالک زمین ہی کی ملکیت میں ہوتی ہے، کالونی بنانے والا اس کی اجازت سے (جو اکثر اوقات اسٹامپ پیپر پر ہوتی ہے) پلاٹنگ کرتا ہے، اور اس کو بیعانہ کی رقم دے دیتا ہے، پھر وہ ایک مقررہ مدت میں بقیہ رقم ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے؛ لیکن اگر کسی وجہ سے قانونی رکاوٹ پیدا ہوگئی تو پھر زمین مالک زمین ہی کے پاس رہ جاتی ہے۔ کیا اس صورت میں پلاٹنگ کرنے والے کا پلاٹ بیچنا اور پھر اس سے پلاٹ خریدنے والے شخص کا اگلے شخص کو بیچ دینا جائز ہوگا؟

اس کے جواب میں پانچ طرح کے نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلا نقطہ نظر:

صورت مذکورہ ناجائز ہے، اس کے قائلین ہیں: مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، ڈاکٹر محی الدین غازی فلاحی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی

عبدالمنان، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد زبیر ندوی۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

بیع میں مبیع کو بیچنے سے قبل قبضہ شرط ہے، نبی کریم کا ارشاد ہے: "لا تبع مالیس عندک" (مقالہ مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی)۔

جب زمین ابھی بیعانہ دینے والے کے نام ہی نہیں ہے، اصل مالک ہی کے نام ہے، تو پھر بیعانہ دینے والا اسے اگلے شخص کو کیسے فروخت کرسکتا ہے، اس کا عدم جواز تو سوال ہی سے ظاہر ہے، نیز قانونی رکاوٹ کا بھی اندیشہ ہے (مقالہ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

چونکہ کالونی بنانے والا اب تک زمین کا مالک نہیں ہوا، نہ روپیہ ادا ہوئے اور نہ ہی رجسٹری ہوئی، صرف ایک وعدہ بیع ہے، لہذا کالونی بنانے والا اس کو فروخت نہیں کرسکتا، اور نہ اسے خریدنے والا آگے بیچ سکتا ہے (مفتی عبدالمنان)۔

یہ صورت بعینہ اس عقار کی سی ہے جس میں اندیشہ ضیاع ہوتا ہے، کہ بحر ہو جائے یا اس پر ریت غالب آجائے، جس کو غرر انفساخ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو صورت مذکورہ میں بھی موجود ہے، لہذا عدم اطمینان کی وجہ سے کسی کا بھی ایسی زمین بیچنا جائز نہیں ہے (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)

مفتی محمد زبیر ندوی لکھتے ہیں کہ اس میں عدم جواز کا پہلو راجح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ نہ ملکیت پائی جارہی ہے اور نہ قبضہ۔

۲۔ دوسرا نقطہ نظر:

ایسی خرید وفروخت جائز ہے، اس کے قائلین ہیں: مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا ظہیر احمد قاسمی۔

کالونی بنانے والا مالک زمین کی اجازت سے پلاٹنگ کررہا ہے، اس میں اصل مالک کی رضامندی پائی جارہی ہے۔ اس لئے یہ بیع جائز ہے (مفتی محمد عفان منصور پوری)۔

گویا یہ مالک کی رضامندی سے قسطوں میں بیع ہے (مولانا ظہیر احمد قاسمی)۔

۳۔ تیسرا نقطہ نظر:

قانونی رکاوٹ کے نتیجہ میں اگر کسی غرر کا موجب ہو تو ناجائز ہے، ورنہ جائز، اس کے قائلین ہیں: مولانا محمد ابوبکر قاسمی، مفتی مقصود علی فرقانی۔

اگر کسی قانونی رکاوٹ کی وجہ سے غرر کا موجب ہو تو معاملہ کی تکمیل سے پہلے ایسی اراضی کا بیچنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ حدیث نبوی ہے: "لا ضرر ولا ضرار" (مولانا محمد ابوبکر قاسمی، مفتی مقصود علی فرقانی)۔

۴۔ چوتھا نقطہ نظر:

یہ بیع مؤجل ہے، اور اس طرح کی بیع جائز ہے، اس کے قائلین ہیں: مفتی محمد الیاس قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی عبدالحمید قاسمی۔

بیعانہ کی رقم سودا طے ہو جانے کے بعد ہی دی جاتی ہے، یہ ادھار بیع ہے، اور اس کے لئے پلاٹ دوسروں کو فروخت کرنا جائز ہے، البتہ اس بات کی وضاحت کردی جائے کہ اسے غیر متعینہ طور پر ایک پلاٹ دیا جائے گا، اور یہ کہ وہ قانونی طور سے زمین کا مالک نہیں ہے، اور آئندہ قانونی دشواری کے نتیجہ میں یہ معاملہ ختم بھی ہوسکتا ہے، اور وہ بیعانہ کی رقم واپس کرنے کا وعدہ بھی کرے، کیونکہ معاملات میں کسی بھی طرح کی فریب دہی ممنوع ہے (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

اگر مبیع اور ثمن متعین ہو کر ایجاب وقبول ہو چکا، اور ثمن کی ادائیگی کی مدت بھی مقرر کی گئی، تو یہ بیع مؤجل ہے، لیکن اگر حکومتی منظوری کی توقع پر محض امکانی درجہ میں پلاٹنگ کرلی گئی، اور پلاٹنگ کرنے والے نے زمین فروخت کردیا، تو یہ بیع الفضولی کہلائے گی، اگر اصل مالک نے اس خرید وفروخت کو منظور کرلیا، تو یہ بیع درست ہے، ورنہ کالعدم سمجھی جائیگی (مفتی عبدالحمید قاسمی)۔

۵- پانچواں نقطہ نظر:

صورت مذکورہ ''خیار نقد'' کی صورت ہے، جس میں خرید وفروخت کا معاملہ اس طرح طے ہوتا ہے کہ متعینہ مدت کے اندر مشتری اگر ثمن ادا نہ کر سکے، تو معاملہ فسخ ہو جائے گا، اور اس خیار کے ساتھ بیع صحیح ہے، اگر اس میں مشتری کسی دوسرے شخص سے بیع کا معاملہ کرتا ہے، تو بیع لازم ہو جائے گی، اور لازما بائع اول کو ثمن دینا ہوگا، اس کے قائلین ہیں: ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد عثمان بستوی۔

واضح ہو کہ مذکورہ دونوں حضرات نے اس کے جواب میں بہت طویل، محققانہ اور بالدلائل کلام کیا ہے، ان کے دلائل کا خلاصہ اختصار کے ساتھ عرض ہے:

شریعت میں خیار نقد کے ساتھ بیع درست ہے، بیعانہ کی رقم دینا بہ طور اعتماد کے ہے، مشتری مقررہ مدت میں بقیہ رقم ادا کرنے کا پابند ہے، اگر اس میں مشتری کسی دوسرے شخص سے بیع کا معاملہ کرتا ہے، تو بیع لازم ہو جائے گی، اور لازما بائع اول کو ثمن دینا ہوگا۔

(ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی بہ حوالہ درر الحکام اور رد المحتار)۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے خیار نقد کے ساتھ بیع کو درست قرار دیا ہے (ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی بہ حوالہ المغنی لابن قدامۃ الحنبلیؒ)۔

قیاس کا تقاضا ہے کہ یہ بیع درست نہ ہو، لیکن استحسانا اس کو جائز قرار دیا گیا ہے، تاکہ خریدار کے ٹال مٹول سے بچا جا سکے۔

(ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی بہ حوالہ درر الحکام)۔

یہ شکل خیار نقد پر زیادہ منطبق ہوتی ہے، اگر اس میں من لہ الخیار یعنی مشتری مبیع میں کوئی تصرف کر دے، تو خیار ساقط ہو جاتا ہے، اور بیع لازم ہو جاتی ہے، لہذا ایسی صورت میں خریدار کا اس زمین کو دوسرے سے فروخت کرنا اپنی زمین کو فروخت کرنا ہوگا، اور مشتری ثانی کو بھی یہ حق ہوگا کہ اس زمین کو بیچ دے، کیونکہ زمین میں بغیر قبضہ کے بھی فروخت کرنا جائز ہے (مفتی محمد عثمان بستوی بہ حوالہ شرح المجلہ لعلی حیدر)۔

ترجیح ووجہ ترجیح:

عارض سمجھتا ہے کہ صورت مسئولہ کے اعتبار سے پانچواں یعنی آخری نقطہ نظر راجح ہے، کیونکہ صورت مسئولہ بالکلیہ خیار نقد پر منطبق ہوتی ہے، البتہ بیعانہ کی رقم دینا بہ طور اعتماد کے معلوم ہوتا ہے، بیع کی یہ صورت جائز ہے، لیکن اس صورت میں مشتری کا اس زمین کو بیچنے کا جواز، قبضہ نہ ہونے کے باوجود، قانونی رکاوٹ پیدا ہو جانے کے اندیشہ کے باوجود، اور معاملہ کے فسخ ہو جانے کے احتمال کے باوجود محل نظر ہے۔

اس موضوع کا بارہواں سوال یہ ہے کہ: ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ کالونی بنانے والا دلالوں سے بات کرتا ہے کہ آپ ہماری زمین بکوائیے، یہ دلال مارکیٹ میں آتے ہیں اور مختلف گراہکوں اور انویسٹرس سے بات کرتے ہیں کہ ہمارے پاس مال ہے، آپ پیسہ لگائیے اس کو خریدیئے، اس کی قیمتیں بڑھیں گی، جب قیمتیں بڑھیں تو آپ بیچ دینا، زمین خریدنے والے کو زمین مقصود نہیں ہوتی، اس کو صرف پیسہ کمانا ہوتا ہے، وہ شخص زمین خرید لیتا ہے، خریدنے والا اصل مالک زمین کو جانتا تک نہیں، نہ کوئی رجسٹری ہوتی ہے نہ کوئی کاغذی تحریر، صرف دلال اور خریدنے والے کے درمیان زبانی سودا ہوتا ہے، دلال اس کو کہہ دیتا ہے کہ اس زمین میں ایک قطعہ آپ کا ہے، اور اس سے پیسے وصول کر لیے جاتے ہیں، اگر یہ شخص اپنا یہ قطعہ بیچنا چاہے تو اس کو صرف یہی دلال بیچے گا، اگر اس کو دوسرا خریدار مل بھی جائے جب بھی وہ اس کو دلال ہی سے کہے گا، اور دلال ہی اس کو فروخت کرے گا اور اپنی دلالی بھی وصول کرے گا۔ اس طریقہ سے یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، جب کہ ابھی زمین کھیتی والے اصل مالک سے بھی ٹرانسفر نہیں ہوتی، کیا یہ شکل درست ہے؟

اس کے جواب میں دو طرح کے نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

ا- پہلا نقطہ نظر:

صورت مذکورہ ناجائز ہے، اس کے قائلین ہیں: مفتی محمد زبیر ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبد الحمید قاسمی، مفتی مقصود علی فرقانی، مولانا

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا محمد ابوبکر قاسمی، محی الدین غازی فلاحی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی عبد المنان، قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، اور راقم الحروف۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

جب دلال خود معاملہ کررہا ہے، تو وہ دلال نہیں، بلکہ بائع کا وکیل ہے، اور وہ وکیل مذکورہ شکل میں قبضہ دلانے پر قادر نہیں ہے، اور وکالت کے مجموعی احکام میں سے یہ ہے کہ وہ مبیع پر قبضہ دلا سکے، اور یہاں ایسا نہیں، اسلئے یہ صورت ناجائز ہے (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی۔ مفتی محمد زبیر ندوی)

صورت مسئولہ میں مبیع مجہول ہے، نیز یہ کہنا کہ وہی دلال بیچ سکتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر زمین خریدار کی ہوگئی، تو پھر ملکیت کیوں منتقل نہیں ہوئی، گویا یہ غیر مملوک کی بیع ہے، اور یہ شرعا درست نہیں (محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

مشتری اصل بائع کو جانتا تک نہیں، اور نہ قابض کو جانتا ہے، گویا یہ مجہول الحال شئی کی بیع ہے، اس لئے یہ خریداری درست نہیں (مفتی محمد زبیر ندوی)۔

اگر کالونی بنانے والے نے اصل مالک زمین سے خرید وفروخت کا معاملہ طے نہیں کیا ہے، صرف بھاؤ تاؤ کیا ہے، یا خرید وفروخت کا معاملہ طے ہوا، اور قبضہ نہیں ہوا، تو پھر ایسی بیع درست نہیں، یہ بیع قبل القبض کے قبیل سے ہے، ہاں اگر قبضہ کرلیا ہو، تو درست ہے (مفتی عبد الحمید قاسمی)۔

یہ صورت مفضی الی النزاع ہے، نیز خریدار کو مکمل تصرف کا حق نہیں مل رہا ہے کہ وہ بغیر دلال کے فروخت کرسکے، اس لئے یہ شکل درست نہیں (مفتی مقصود علی فرقانی)۔

کسی زمین کو دلال کے ذریعہ خرید کر بغیر رجسٹری کرائے ہوئے چھوڑ دینا، اور پھر دلال ہی کی ذریعہ زبانی اس کی بیع در بیع کرنا موجب غرر ہے، اس لئے یہ صورت ناجائز ہے، زمین کی ملکیت میں قانونًا نام کا تبادلہ لازم ہے، جیسا کہ شیخ وھبہ زحیلی نے لکھا ہے:

''وهنالك أحكام قانونية تختلف بين العقار والمنقول. منها أن انتقال ملكية العقار لا يتم إلا بالتسجيل''
(مولانا محمد ابوبکر قاسمی بحوالہ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹/ ۵۶)۔

صورت مسئولہ میں مذکورہ مبیع اسلامی اصولوں کے برخلاف ہے، یعنی مبیع کو فروخت کرنے کے باوجود سارے اختیارات بائع اول کے پاس ہی رہیں، یا دلال زمین فروخت کرنے کے باوجود ملکیت بیع وشراء اپنے پاس ہی رکھے، اور مشتری کو بیع کا اختیار نہ دے، بلکہ مشتری دلال ہی سے رجوع کرے، یہ صورت شرعا درست نہیں (مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی)۔

چونکہ زمین ابھی اصل مالک سے ٹرانسفر بھی نہیں ہوئی، اسلئے یہ بیع درست نہیں ہوئی، اگر یہ بیع درست ہوتی تو خریدار کو اسے فروخت کرنے میں دلال کی کیا ضرورت پڑتی، خریدنے والا تو خود مختار ہوتا ہے (ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

یہ بیع مالا یملک کے قبیل سے ہے، چونکہ دلال اس زمین کا مالک نہیں ہے، اس لئے وہ بیچنے کا بھی مالک نہیں، لہذا یہ بیع جائز نہیں (مفتی عبد المنان)۔

اس میں کالونی بنانے والے کا زمین پر قبضہ نہیں، نیز دلال کا شرط لگانا بھی غلط ہے کہ وہی اس کو فروخت کرے گا، اس لئے یہ بیع درست نہیں ہے (راقم الحروف)

۲۔ دوسرا نقطۂ نظر:

ایسی خرید وفروخت جائز ہے، اس کے قائلین ہیں: ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، قاضی عبد الجلیل قاسمی، مولانا ظہیر احمد قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی ظفر عالم ندوی۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

صورت مسئولہ میں دلال مجاز من المالک ہے، اس لئے اس کا ہر عمل مالک کی رضامندی سے مانا جائے گا، موجودہ دور میں اس طرح کا کاروبار عام ہے، اس طرح کے معاملات میں محض زبانی ایجاب وقبول پر ہی اکتفا ہوتا ہے، کاغذی طور پر زمین اصل مالک ہی کے نام ہوتی ہے، اپنے نام

رجسٹری کرانے کا اختیار مشتری کو ہوتا ہے، لیکن اگر وہ اسی حال میں زمین فروخت کرنا چاہے، تو لازماً دلال سے رجوع کرنا ہوگا؛ کیونکہ اصل مالک کا نمائندہ وہی ہے، اس لئے اس طرح کے معاملات شرعاً جائز ہیں (مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی)۔

جس طرح اصل مالک سے کوئی چیز خریدنا جائز ہے، اسی طرح اس کے وکیل سے بھی خریدنا جائز ہے، دلال اصل مالک کے وکیل ہوتے ہیں، اس لئے ان سے خریدنا بھی جائز ہے، نیز یہ خریدار بھی دلال کے ذریعہ فروخت کرسکتا ہے، زبانی سودا بھی درست ہے، بیع کے انعقاد کے لئے رجسٹری لازم نہیں ہے، اور صرف نفع کے حصول کے لئے ہی زمین کی خرید وفروخت جائز ہے (قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد عثمان بستوی)۔

اس قسم کی خرید وفروخت میں دلالی کے بغیر معاملہ مشکل ہے، موجودہ دور میں اس کا رواج بھی ہوگیا ہے، زمین پر قبضہ نہ بھی ہو، تو قیمت ادا کر دینے سے ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، اس لیے یہ بیع در بیع بغیر قبضہ کے بھی بذریعہ دلال درست ہے (مفتی ظفر عالم ندوی)۔

ترجیح ووجہ ترجیح:

عارض سمجھتا ہے کہ صورت مسئولہ کے اعتبار سے پہلا نقطہ نظر راجح ہے، کیونکہ صورت مسئولہ بیع مالم یقبض کی ہے، نیز صورت مسئولہ گویا معقود بالشرط ہے، کہ دلال ہی اس کو بیچے گا، اور ایسی شرط جو تقاضائے بیع کے خلاف ہو، شرط فاسد ہے، اس سے بیع بھی فاسد ہوجاتی ہے۔

اس موضوع کا تیرہواں سوال یہ ہے کہ: کبھی کبھی خود کالونی بنانے والے ایسا کرتے ہیں کہ وہ پلاٹس بیچ دیتے ہیں، اور قسطوں میں پیسہ بھی وصول کرلیتے ہیں، اب اگر خریدار کو بیچنا ہے تو اس کو بھی کالونی بنانے والے ہی سے رابطہ کرنا ہوگا، اگر کوئی گراہک لاتا ہے تو بھی اسی سے ملانا ہوگا، خود کالونی بنانے والا بھی نہیں چاہتا ہے کہ گراہک آئے، وہ خود ہی اس کو خرید لیتا ہے، اور جو بھی قیمت میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا ہے اس کو ادا کرتا ہے۔ کیا اس صورت میں پلاٹ خریدنے والے کی ملکیت زمین پر ثابت ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

ا۔ پہلا نقطہ نظر:

بائع یعنی کالونی بنانے والا اگر صلب عقد میں اور بیع سے پہلے یہ شرط لگاتا ہے تو یہ مقتضائے بیع کے خلاف ہے، اس سے بیع فاسد ہوجائے گی، اور خریدار کی ملکیت اس زمین پر ثابت نہ ہوگی، لیکن اگر یہ شرط عقد کے بعد ہو تو اس سے عقد کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوگا، اور خریدار کی ملکیت اس زمین پر ثابت ہوجائے گی، اس کے قائلین ہیں: مفتی محمد عثمان بستوی، ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی عبدالحمید قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، اور راقم الحروف۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

''تنتقل ملكية المبيع للمشتري بمجرد الإيجاب و القبول ويصير له الحق المطلق في استعمال المبيع و استثماره و التصرف به كيفما يشاء'' (مفتی محمد زبیر ندوی بہ حوالہ قضايا الفقه و الفكر المعاصر ص ۲۱۵)۔

''ولو اشترى شيئًا ليبيعه من البائع فالبيع فاسد'' (مفتی محمد زبیر ندوی بہ حوالہ الفتاوی الهندیہ ۳/ ۱۳۴)۔

''ولو باع عبدا على أن يعتقه المشتري أو يدبره أو يكاتبه أو أمة على أن يستولدها فالبيع فاسد لأن هذا بيع وشرط وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع وشرط ثم جملة المذهب فيه أن يقال كل شرط يقتضيه العقد كشرط الملك للمشتري لا يفسد العقد لثبوته بدون الشرط وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده كشرط أن لا يبيع المشتري العبدالمبيع''
(مفتی محمد عثمان بستوی بہ حوالہ ہدایہ مع فتح القدیر ۶/ ۴۴۲)۔

صلب عقد میں مذکورہ شرط لگانے سے عام طور سے مالک کا استحصال مقصود ہوتا ہے، اس لئے اس شرط کے ساتھ بیع درست نہیں (ڈاکٹر مفتی

محمد شاہجہاں ندوی)۔

صلب عقد میں شرط مشتری کے آزادانہ تصرف پر پابندی عائد کرنا ہے، جو بیع وشراء کے اصول کے خلاف ہے، اس لئے اس طرح کی بیع درست نہیں۔ (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۲۔ دوسرا نقطہ نظر:

بیع کی یہ صورت جائز ہے، اور پلاٹ خرید نے والا زمین کا مالک ہو جائے گا، اس کے قائلین ہیں:

مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مفتی محمد الیاس قاسمی، محی الدین غازی، مفتی ظفر عالم ندوی، مفتی مقصود علی فرقانی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا ظہیر احمد قاسمی۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

ایجاب وقبول، ثمن کی وصولی اور مبیع کی حوالگی کے بعد بیع کی تمامیت میں کوئی شبہ نہیں، مذکورہ شرط کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، مشتری جس کو چاہے پلاٹ فروخت کرسکتا ہے، کالونی بنانے والے کی طرف سے بہ طور وعدہ کے یہ بات آئی ہو کہ اگر فروخت کا ارادہ ہو، تو ہم سے رابطہ کرلیا جائے، اور مشتری اس کا وعدہ کرے، تو اس میں کوئی حرج نہیں: ''وإن ذكر البيع بلا شرط ثم شرطاه على وجه المواعدة جاز البيع'' (مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی بہ حوالہ البحر الرائق ۸/۶)۔

اس صورت میں پلاٹ خرید نے والے کی ملکیت زمین پر ثابت ہوگی اور کالونی بنانے والے کا مذکورہ طریقہ غیر اسلامی تصور کیا جائے گا (مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی)۔

ملکیت محض عقد سے ہی ثابت ہو جاتی ہے، جبکہ بیع میں انعقاد، صحت، لزوم اور نفاذ کی تمام شرطیں جمع ہو جائیں، لہذا مشتری اس میں جو تصرف چاہے کرسکتا ہے، اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ زمین کالونی بنانے والے سے ہی فروخت کرے (مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

قسطوں میں جب پوری قیمت ادا ہو جائے، تو زمین پر ملکیت ثابت ہو جائے گی، پھر انہی کے ہاتھ نفع لے کر فروخت کردی تو یہ درست ہے (مفتی ظفر عالم ندوی)۔

۳۔ تیسرا نقطہ نظر:

بیع کی یہ صورت ناجائز ہے، اور اس صورت میں پلاٹ خرید نے والے کی ملکیت زمین پر ثابت نہ ہوگی، اس کے قائلین ہیں: مفتی عبدالمنان، مولانا ابوسفیان مفتاحی۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

یہ صورت دو وجہ سے ناجائز ہے؛ ایک سود کی وجہ سے، دوسری بیع فی الشرط کی وجہ سے، یہ شرط بیع کے خلاف ہے، اس لئے یہ بیع فاسد ہے، ''نهى رسول الله عن بيع وشرط'' (مفتی عبدالمنان)۔

ترجیح ووجہ ترجیح:

راقم کا خیال یہ ہے کہ مذکورہ تینوں صورتوں میں بہت زیادہ اختلاف نہیں ہے، بس یہ کہ بعض نے شرط قبل البیع کے اعتبار سے لکھا ہے، اور بعض نے بعد البیع کے اعتبار سے، جبکہ بعض نے دونوں صورتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، گویا معنوی اعتبار سے سب متفق ہیں، یعنی کالونی بنانے والا اگر صلب عقد میں اور بیع سے پہلے یہ شرط لگاتا ہے، تو یہ مقتضائے بیع کے خلاف ہے، اس سے بیع فاسد ہو جائے گی، اور خریدار کی ملکیت اس زمین پر ثابت نہ ہوگی، لیکن اگر یہ شرط عقد کے بعد ہو تو اس سے عقد کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوگا، اور خریدار کی ملکیت اس زمین پر ثابت ہو جائے گی، مذکورہ دلائل کی روشنی میں میرے نزدیک یہی صورت راجح ہے۔

اس موضوع کا چودھواں سوال یہ ہے کہ: ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ پلاٹ قسطوں میں بیچ دیا جاتا ہے، اور خریدار اس میں سے مثلاً پانچ یا آٹھ قسطیں ادا کر پایا، باقی قسطیں ادا کرنے کی گنجائش نہیں رہی؛ تو حالانکہ سودا ہو چکا تھا، صرف بعض قسطوں کی ادائیگی باقی تھی، لیکن کالونی بنانے والا اپنی طرف سے اس سودے کو کینسل مانتا ہے، اب اگر بعد میں خریدار قسطیں ادا کرنا چاہے، یا اپنی زمین کا مطالبہ کرے تو اس سے کہہ دیتا ہے کہ چونکہ قسطیں وقت پر ادا نہیں ہوئیں، اس لئے آپ کا سودا کینسل ہو گیا، اور جتنی رقم قسطوں میں ادا کی گئی تھی، اتنی ہی رقم اس کو واپس کر دیتا ہے؛ جبکہ اس نے جس وقت وہ زمین خریدی تھی، اس وقت اس کی قیمت بہت کم تھی، اور اب اس کی قیمت تقریباً پچاس گنا بڑھ چکی ہوتی ہے، کیا یہ درست ہے؟

اس سوال کے جواب میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

۱۔ پہلا نقطہ نظر:

اگر مذکورہ باتیں بیع کے وقت طے ہوگئی تھیں، تو سودے کو کینسل ماننا درست ہے، کیونکہ یہ اقالہ کی ایک صورت ہے، شریعت نے اقالہ کی اجازت دی ہے، مشتری بس اپنی ادا کردہ رقم کا حقدار ہوگا، زائد کا نہیں، بعض مقالہ نگار نے اسے خیار نقد سے تعبیر کیا ہے، لہذا اگر متعینہ مدت پر مکمل ثمن کی ادائیگی نہیں ہوئی، تو بیع فاسد ہو جائے گی، ادا کردہ رقم مشتری کو واپس کر دی جائے گی، اس کے قائلین ہیں: مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی ظفر عالم ندوی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا ظہیر احمد قاسمی، مولانا محمد ابوبکر قاسمی، مفتی مقصود علی فرقانی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی محمد الیاس قاسمی (اخیر کے تین حضرات نے دو طرح کی آراء کا تذکرہ کیا ہے)۔

ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

''المسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما''۔

(مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی بحوالہ ترمذی)۔

''إذ الحاجة مست إلى الانفساخ عند عدم النقد تحرزا عن المماطلة في الفسخ'' (مفتی ظفر عالم ندوی، ہدایہ ۳/ ۳۰)۔

''إذا لم يؤد المشترى الثمن فى المدة المعينة كان البيع الذى فيه خيار النقد فاسدًا''۔

(مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی محمد الیاس قاسمی بحوالہ درر الحکام، المادۃ: ۳۱۴)۔

۲۔ دوسرا نقطہ نظر:

یہ ادھار بیع یا بیع بالتقسیط کی ایک شکل ہے، اس میں ثمن کے ادھار ہونے کے باوجود عند العقد مبیع پر مشتری کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، بشرطیکہ کل قیمت اور ثمن کی ادائیگی کی مدت معلوم اور متعین ہو، اس کے قائلین ہیں: ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی اور راقم الحروف ابصار احمد ندوی۔

ادھار یا قسطوں پر بیع شریعت سے ثابت ہے، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

''أن النبي ﷺ اشترى طعامًا من يهودي إلى أجلٍ ورهنه درعًا من حديد'' (وفي رواية أخرى) ''قالت: جاءتني بريرة فقالت كاتبت أهلي على تسع أواق في كل عام أوقية'' (ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی اور راقم الحروف بحوالہ بخاری)۔

اس لئے بعض قسطوں کی ادائیگی کی تاخیر کی بنا پر معاملہ کو یک طرفہ ختم کرنے کا شرعاً کوئی اختیار نہیں، اس کو ختم کر کے صرف مشتری کی ادا کردہ رقم واپس کرنا ظلم، غصب، ناجائز اور حرام ہے (مفتی محمد عثمان بستوی، ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، راقم الحروف ابصار احمد ندوی)، بلکہ مشتری کو مہلت دینا چاہیے، تاکہ وہ باقی ماندہ قسطیں ادا کر کے اپنی زمین حاصل کر لے، یا زمین بیچ کر باقی رقم ادا کرے (ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، راقم الحروف ابصار احمد ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)؛ باوجود تنبیہ کے اگر وہ ادا نہ کرے تو بائع کو چاہیے کہ مارکیٹ حساب سے وہ خود خرید لے، یا کسی تیسرے سے اسے بیچ کر اپنی باقی رقم لے لے، اور زائد رقم مشتری اول کو دے دے (ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی، راقم الحروف)۔

جب سودا مکمل ہوگیا، صرف کچھ قسطیں ادا کرنا باقی ہے، تو یہ قسطیں خریدار کے ذمہ دین اور قرض ہیں، اس پر قرض کے احکام جاری ہوں گے، یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ اس کی خریدی ہوئی زمین ہتھیالی جائے، اور وہ بھی اسوقت جبکہ پچاس، اور سوگنا اس کی قیمت میں اضافہ ہو چکا ہے، زمین خریدار کی ملکیت ہے، وہی اس کے نفع ونقصان کا مالک ہے، مشہور ضابطہ ہے: "الخراج بالضمان" (مفتی عبدالحمید قاسمی)، اگر خدانخواستہ زمین کی قیمت میں گراوٹ آجاتی، تو اس کا ذمہ دار بھی مالک زمین ہوتا، نہ کہ کالونی بنانے والا (مفتی عبدالحمید قاسمی، مفتی محمد زبیر ندوی)۔

بیع ہو جانے کے بعد ملکیت مکمل طور سے خریدار کو منتقل ہو جاتی ہے، اگر بائع نے بطور رہن وہ زمین اپنی تحویل میں لی ہے، تو پھر دین اور رہن کے احکام لاگو ہوں گے، بائع کو صرف اس کا حق ہوگا کہ اس زمین کو حسب ضابطہ رہن بیچ دیا جائے اور اپنی بقیہ قسطیں وصول کرلے، اور باقی قطعہ زمین یا باقی رقم خریدار کو لوٹا دی جائے (محی الدین غازی فلاحی)۔

ترجیح ووجہ ترجیح:

راقم کا خیال ہے کہ اسے اقالہ یا خیار نقد سے تعبیر کرنا مناسب نہیں؛ کیونکہ صورت مسئولہ (کا یہ جملہ "لیکن کالونی بنانے والا اپنی طرف سے اس سودے کو کینسل مانتا ہے، اب اگر بعد میں خریدار قسطیں ادا کرنا چاہے، یا اپنی زمین کا مطالبہ کرے") اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اس میں رکن اقالہ (صراحتاً یا دلالۃ اقالہ پر ایجاب وقبول) اور شرط اقالہ (فریقین کی رضامندی) نہیں پائی جارہی ہے؛ بلکہ یہ ادھار قسطوں کی شکل میں بیع ہے، عقد بیع کے ساتھ ہی مشتری مبیع کا مالک ہو جاتا ہے، اس لئے میرے نزدیک دوسرا نقطہ نظر راجح ہے۔

اس موضوع کا پندرہواں سوال زمین کی دلالی سے متعلق کچھ اور مسائل ہیں؛ جن کے دو اجزاء ہیں، پہلا جزء یہ ہے کہ:

الف: آسان شکل تو یہ ہے کہ دلال زمین کا گراہک لائے، اور اپنی دلالی وصول کرے؛ لیکن دلال زمین کی قیمت کالونی بنانے والے سے معلوم کرلیتا ہے، پھر اس کو من مانی قیمت پر بیچ دیتا ہے، زمین والے نے جتنی قیمت بتلائی تھی، اتنی اس کو دے دیتا ہے اور باقی کو اپنے لئے جائز سمجھتا ہے، کیا یہ درست ہے؟

اس کے جواب میں دو طرح کے موقف پائے جاتے ہیں:

پہلا موقف یہ ہے کہ مذکورہ صورت ناجائز اور حرام ہے، اور اس پر ایک دو کے علاوہ تقریباً تمام لوگوں کا اتفاق ہے، اس کے قائلین ہیں: ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی مقصود علی فرقانی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی عبدالمنان، مولانا ظہیر احمد قاسمی، مفتی ظفر عالم ندوی وغیرہ۔

ان میں سے بعض نے جواز کی کچھ شکلیں بھی پیش کی ہیں۔

ان کے دلائل اور جواز کی شکلیں درج ذیل ہیں:

یہاں دلال وکیل ہے، اور وکیل کو موکل کے سامان کا جو عوض حاصل ہو، اس عوض کا حقدار موکل ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ؛ لہذا صاحب زمین سے بغیر معاملہ کی وضاحت کیے ہوئے، زائد رقم خود رکھ لینا شرعاً جائز نہیں (دیکھیے مقالہ ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد عثمان بستوی)۔

دلال زمین کا مالک نہیں ہے، بلکہ وہ صرف وکیل بالبیع ہے، اور وکیل کے سارے تصرفات موکل کی طرف منسوب ہوتے ہیں، اور وکیل کی اجرت معلوم ومتعین ہونی چاہیے (دیکھیے مقالہ مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی محمد زبیر ندوی)۔

اجرت طے شدہ اور متعین ہونی چاہیے، معاملہ مبہم نہ رہنا چاہیے (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی بہ حوالہ فتاوی رحیمیہ)۔

یہاں دلال وکیل ہے بائع کا، اگر وہ اس کی اجازت کے ساتھ زائد رقم سے فروخت کرے تو جائز ہے، ورنہ نہیں (مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی)۔

یہ ناحق طریقہ سے اور صاحب مال کی رضامندی کے بغیر اس کا مال لینا ہے، اور قرآن کی آیت: "ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل"

اور حدیث "لا یحل مال امری، مسلم إلا بطیب نفس منه" کی رو سے یہ حرام ہے (ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی اور راقم الحروف)۔

دلالی کی یہ شکل بہ اعتبار صورت مسئولہ جمہور علماء احناف، شوافع اور مالکیہ کے نزدیک جائز نہیں، امام احمد اور امام اسحاق کے نزدیک جائز ہے۔
(مفتی محمد الیاس قاسمی)

امام بخاری نے اس کے جواز کی ایک شکل پیش کرتے ہوئے حضرت عبداللہ ابن عباس اور ابن سیرین کا قول نقل کیا ہے:

"وقال ابن عباس لا بأس أن يقول بع هذا الثوب، فما زاد على كذا وكذا فهو لك، وقال ابن سيرين: إذا قال بعه بكذا فما كان من ربح فهو لك، أو بيني وبينك، فلا بأس به، وقال النبي ﷺ: المسلمون عند شروطهم"
(بخاری باب اجر السمسرة: ۲۲۷۴)۔

لہٰذا یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے کہ دلال نے مالک زمین سے طے کرلیا کہ مقررہ قیمت سے زائد میری ہوگی، اور زمین کا مالک اس پر راضی ہو۔
(مفتی محمد الیاس قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی اور راقم الحروف)۔

البتہ مفتی زبیر ندوی نے احسن الفتاوی کا ایک فتوی ذکر کیا ہے، جس کی رو سے یہ صورت بھی ناجائز ہے، حوالہ مذکور نہیں (دیکھیے مقالہ مفتی محمد زبیر ندوی)۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ یہ صورت جائز ہے، اس کے قائلین ہیں: مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی

ان کے نزدیک صورت مسئولہ کے اعتبار سے دلال کو دلال نہیں کہا جائے گا، بلکہ تاجر کہا جائے گا۔

ترجیح ووجہ ترجیح:

دلائل کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ پہلا موقف راجح ہے، جیسا کہ بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے۔

اس سوال کا دوسرا جزء یہ ہے کہ:

ب: دلال کمپنیاں جو شکل سب سے زیادہ استعمال کر رہی ہیں، وہ یہ ہے کہ زمین بیچ دیتے ہیں، لیکن قبضہ نہیں دیتے، اور ان کو کہہ دیتے ہیں کہ جب بھی آپ کو بیچنا ہو تو آپ یہ زمین ہمیں ہی واپس کریں گے، کسی اور کو نہیں، کیا یہ مشروط بیع جائز ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ مذکورہ شکل درست نہیں، کیونکہ مبیع اور ثمن پر ایک دوسرے کو قبضہ دلانا بیع صحیح کے احکام میں سے ہے، نیز عند العقد ایسی شرط لگانا جس سے عاقدین میں سے کسی کا نفع متعلق ہو، اور جو تقاضائے بیع کے خلاف ہو، بیع کو فاسد کردیتا ہے، حدیث میں اس کی ممانعت ہے، مزید دلائل ماقبل میں بھی گزر چکے ہیں، اس لئے یہ صورت بالاتفاق درست نہیں، البتہ بعض مقالہ نگاروں نے اس کے جواز کی کچھ شکلیں بیان کی ہیں، مثلاً: بیع تو بلا شرط کرلی جائے، مگر بعد میں ایک معاہدہ کرلیا جائے کہ بعد میں آپ یہ زمین ہمیں ہی واپس کریں گے، تو یہ بیع صحیح ہوجائے گی۔
(مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی بہ حوالہ فتاوی محمودیہ)۔

"وإن ذكر البيع بلا شرط ثم شرطا على وجه المواعدة جاز البيع و لزم الوفاء"
(تبیین الحقائق ۳/ ۱۸۴ مفتی محمد عفان منصور پوری، فتاوی خانیہ ۲/ ۱۶۵ مفتی محمد الیاس قاسمی)۔

هٰذا ما تبين لي، والله أعلم بالصواب وإليه المرجع والمآب۔

***

باب دوم تفصیلی مقالات

عصر حاضر میں زمین کی خرید وفروخت سے متعلق اہم مسائل

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی[1]

اولاً غصب کی تعریف مرقوم ہے:

''الغصب شرعًا أخذ مال متقوم محترم بغير إذن المالك وعلى وجه يزول يد المالك إن كان في يده أو يقصر يده إن لم يكن في يده'' (التاتارخانیه ۱۶/ ۴۲۶، ہدایہ علی شرح فتح القدیر ۷/ ۳۶)۔

نیز آیت قرآنی وروایات پیش ہیں، کتاب اللہ میں ہے: "يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (البقرہ: ۱۸۸)۔

''عن عائشة أن النبي ﷺ قال من ظلم شبرًا من الأرض طوقه الله من سبع أرضين'' (رواه البخاری حدیث: ۲۴۵۳، مسلم: المساقاة حدیث: ۱۶۱۲)۔

''وقد روى ابن أبي شيبة بإسناد حسن من حديث أبي مالك الأشعري أعظم الغلول عند الله يوم القيامة ذراع أرض يسرقه رجل فيطوقه من سبع أرضين'' (۵/ ۷۵)۔

''وقال النبي ﷺ في خطبته يوم النحر: إن دماءكم وأموالكم حرام كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا الخ'' (اعلاء السنن ۱۶/ ۳۸۶)۔

''وقوله ﷺ: لا يحل مال امرئ مسلم إلا عن طيب نفسه'' (رواه ابن ماجه والدارقطني وكشاف القناع عن متن الاقناع ۴/ ۸۳)

ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں کہ فی الجملہ غصب کی حرمت پر اجماع ہے۔ ''رواه أبو إسحاق الجوزجاني :أجمع المسلمون على تحريم الغصب في الجملة'' (المغنی مع الشرح الکبیر ۵/ ۳۷۴ مکتبہ سلفیہ مئو، نیز دیکھئے: کشاف القناع ۴/ ۸۳)۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے یہاں عقار میں غصب نہیں اور یہی امام ابویوسفؒ کا آخری قول ہے، لیکن امام محمدؒ کے یہاں اس کی قیمت کا ضامن ہوگا۔

''وفي الكافي وعلى هذا الرأي على أن غصب العقار لا ينعقد موجبًا للضمان إذا باع دارا لرجل وأدخلها المشتري في بنائه لم يضمن البائع عند أبي حنيفة وهو قول أبي يوسف آخرًا وعند محمد يضمن قيمتها'' (التاتارخانیه ۱۶/ ۴۲۸)۔

علامہ ابن الہمام نے بھی حنفیہ کی تائید میں فتح القدیر ۷/ ۳۶۸ تا ۳۷۰ میں مفید بحث فرمائی ہے۔

مفتی ظفر احمد صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ عقار کے برباد وتلف کرنے کی بنیاد پر بالاتفاق ضمان لازم ہوگا۔

''وأما نقصه الغاصب من العقار بفعله أو سكناه ضمنه في قولهم جميعًا لأنه إتلاف والعقار يضمن بالإتلاف من غير اختلاف كما لو نقل ترابها أو هدم حيطانها أو غرقها بالماء أو ألقى الحجارة فيها أو نقصها بعرسه وبنائه فيضمنه بغير خلاف كذا في الهداية وغيرها من كتب القوم'' (اعلاء السنن ۱۶/ ۴۰۶)۔

احقر کی رائے یہ ہے کہ غیر منقولہ ومنقولہ دونوں میں غصب کو عام رکھنا چاہئے، مشہور فقیہ اور محقق حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم کی تحریر پیش ہے:

---

[1] سابق شیخ الحدیث وپرنسپل جامعہ دار العلوم مئو۔

''اس بابت انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ غیر منقولہ احوال کے بارے میں حنفیہ نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے وہ نہ نامناسب ہے اور نہ دوسرے فقہاء کی رائے سے بہت مختلف، لیکن موجودہ زمانے میں اراضی اور جائیداد پر ناجائز تسلط کا فتنہ عام ہے اور کتنے ہی مالکان ہیں جو اپنی جائیدادوں سے محروم نان جو کے محتاج ہیں، اس لئے جیسے فقہاء متاخرین نے وقف کی جائیداد وغیرہ کی بابت جمہور کی رائے پر فتوی دیا ہے، موجودہ حالات میں عام مملوکہ جائیداد پر ناجائز تسلط کی بابت بھی یہی رائے اختیار کی جائے تو شاید غلط نہ ہو (قاموس الفقہ ۴/ ۴۳۹)۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے یہاں غصب کرتے ہی غاصب مغصوب کا مالک سمجھا جائے گا ضمان دینے کے بعد، اگر ایسا نہ مانیں تو ایک ہی شخص بدل اور مبدل منہ دونوں کا مالک ہو جائے گا، اس لئے مغصوب میں غاصب کا تصرف ضمان سے پہلے درست ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''لو تصرف فی المغصوب بالبیع أو الهبة أو الصدقة قبل أداء الضمان ینفذ تصرفه کما نفذ تصرفات المشتری فی المشتری شراء فاسدا'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/ ۷۲۳، نیز دیکھئے: المبسوط ۱۱/ ۱۵، البدائع ۷/ ۱۵۲، اللباب شرح الکتاب ۲/ ۱۹۳)۔

''ولأبی حنیفة أن الأصل مضمون بالغصب الأول ولا یقع البیع والتسلیم غصبا... ثم إذا ضمن المالك الغاصب قیمة المغصوب وقت الغصب أو وقت البیع والتسلیم جاز البیع لأنه تبین أنه باع ملك نفسه... الخ'' (بدائع الصنائع ۶/ ۱۳۲-۱۳۳)۔

مزید تائید اس عبارت سے بھی ہورہی ہے:

''ألا تری أنه لو وہبه أو باعه جاز، وجه الاستحسان قوله علیه الصلوۃ والسلام: فی الشاۃ المذبوحة المصلیة بغیر رضا صاحبها ''أطعموها الأساری'' (ہدایہ مع الشرح الفتح ۷/ ۳۷۷ دار عالم الکتب ریاض)۔

بعض فقہاء نے قبل اداء ضمان تصرف سے منع فرمایا ہے: ''ولا یحل له الانتفاع بها حتی یؤدی بدلها استحسانًا والقیاس أن یکون له ذلك وهو قول الحسن وزفر وہکذا عن أبی حنیفة''۔

لیکن فقیہ ابواللیث سمرقندی فرماتے ہیں کہ غاصب کو ملک مطلق حاصل ہوگئی ہے، اس لئے تصرف کرسکتا ہے:

''وجهه ثبوت الملك المطلق للتصرف'' (ہدایہ مع الشرح الفتح ۷/ ۳۷۷)۔

اداء ضمان سے قبل تصرف کا جواز من وجہ اس حدیث سے بھی ہورہا ہے:

''عن عمارة بن حذیفة ....قال الزبیب: فدعتنی أمی، فقالت: ہذا الرجل أخذ زربیتی فانصرفت إلی النبی ﷺ یعنی فأخبرته فقال لی: ''احبسه''، فأخذت بتلبیبه وقمت معه مکاننا ثم نظر إلینا نبی الله قائمین فقال: ''ما ترید بأسیرك؟'' فأرسلته من یدی فقام نبی الله ﷺ فقال للرجل: رد علی ہذا زربیة أمه التی أخذت منها'' قال یا نبی الله: إنما خرجت من یدی قال: فاختلع نبی الله ﷺ سیف الرجل فأعطانیه فقال للرجل: ''اذهب فزده آصعًا من طعام'' قال فزادنی آصعا من شعیر'' (ابوداؤد حدیث: ۳۶۱۲ باب القضاء)۔

مذکورہ تحریروں کی روشنی میں براہ راست قابضین اور ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا درست ہوگا، سرکار تو کسی نہ کسی طرح ان سے ضمان لے ہی لے گی۔

(۲) اس کا جواب دینے سے پہلے احقر قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کی ایک تحریر جو مباحث فقہیہ / ۲۴۶-۲۴۷، نیز فتاوی قاضی / ۱۷۵-۱۷۶ پر موجود ہے، جس میں حضرت نے مرحومہ صغری بی بی ساکنہ بہار شریف ضلع پٹنہ کے وقف ۱۸۹۶، جس کی مالیت ملکۂ وکٹوریہ کے چاندی والے سکہ سے ۱۲ لاکھ تھی جو آج کے نرخ سے بارہ ارب روپے ہوئے، اس کی زبوں حالی کا خاکہ پیش فرماتے ہوئے اور ایک استفتاء ''قبرستان سے دوسرا مصرف لیا جانا'' کے تحت لکھتے ہیں:

''ایسی صورت میں جبکہ اس کا قوی امکان ہے کہ ایسی اراضی پر غاصب لوگ قبضہ کرلیں گے جس کو ہٹانا ناممکن ہے یا بے حد دشوار ہے، میری رائے

میں ایسی قبرستان کی اراضی کو کرایہ Lease پر دیا جاسکتا ہے اور یہی اقرب الی الفقہ ہے، احقر کہتا ہے کہ رد المحتار علی الدر ۶ / ۵۵۰ پر سید محمد امین ابن عابدین نے "مطلب فی نقل القاضی المسجد ونحوہ" کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسجد کی شہادت کے بعد اس کے سامان کو کسی دوسری مسجد یا دوسرے حوض میں منتقل کرنا بشرطیکہ اس مسجد یا اس حوض کو فی الحال یا فی المآل ضرورت نہ ہو تو اس کی بابت علماء کا اختلاف تھا، سید امام ابوشجاع شمس الدین حلوانی، امین الدین بن عبد العال، احمد بن یونس شلبی، زین الدین ابن نجیم، شیخ محمد وفائی جواز کے قائل تھے، شیخ امام محمد بن سراج الدین الحانوتی کا مفتی بہ قول عدم جواز کا تھا، بعض حضرات نے شرنبلالی کے قول کے مطابق عدم جواز کا قول فرمایا تھا، لیکن جب چور اچکے ڈاکو مسجد کا سامان اٹھا لے گئے تو پھر انہیں یہ فتوی بدلنا اور کہنا پڑا کہ ایک مسجد کا سامان جبکہ اس مسجد کو ضرورت نہ ہو قاضی کی اجازت سے دوسری مسجد میں استعمال ہوسکتا ہے۔

اب عرض ہے کہ موقوفہ زمین کو بیچنا جائز نہیں ہے، ایسی بیع بیع باطل ہے (فتاوی رحیمیہ ۹ / ۶۳)، علائیہ میں ہے:

"فإذا تم ولزم لا يملك ولا يعار ولا يرهن قوله لا يملك أى لا يكون مملوكا لصاحبه ولا يملك أى لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه" (رد المحتار على الدر ۶/ ۵۳۹)۔ احقر کے نزدیک موقوفہ کی بیع باطل ہے، الا یہ کہ اس کے دست و برد اور ضائع ہونے کا یقین کامل ہو تو اسے بیچ کر واقف کی منشا کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوسری جائیداد خریدی جاسکتی ہے۔

مولانا سید عبد الرحیم لاجپوریؒ لکھتے ہیں: "موقوفہ زمین اس وقت بیچی جاسکتی ہے جبکہ واقف نے اجازت دی ہو یا وقف اس حالت میں ہو کہ اس سے کوئی نفع حاصل نہ ہوسکے" (فتاوی رحیمیہ ۹ / ۴۵-۴۶)۔

(۳) "(وكل) من شركاء الملك (اجنبى) فى الامتناع عن تصرف مضر (فى مال صاحبه) لعدم تضمنها الوكالة (فصح له بيع حصته ولو من غير شريكه بلا إذن)" (الدر المختار مع الرد ۶/ ۴۶۶-۴۶۷، شرح فتح القدير ۵/ ۳)۔

دکتور وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"إن كان فى المبيع حق لغير البائع كان العقد موقوفاً غير نافذ" (الفقه الاسلامى وادلته ۴/ ۲۴۲)۔

ڈاکٹر صاحب کی دوسری تحریر یوں ہے:

"أن لا يكون فى المبيع حق لغير البائع ..... لأنه وإن كان مملوكا له ولكن للغير حق فيه" (الفقه الاسلامى وادلته ۴/ ۳۸۷)۔ صورت مذکورہ میں شرط نفاذ کے نہ پائے جانے کی وجہ سے بیع موقوف رہے گی، اجازت کے بعد اس کے اپنے حصہ کی بیع درست ہوجائے گی، بشرطیکہ کوئی اور وجہ حرمت نہ پائی جائے۔

(۴) "رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى منه شيئًا فهذا على خمسة أوجه:

(۱) إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا ثم اشترى منه بتلك الدراهم. (۲) أو اشترى قبل الدفع بتلك الدراهم ودفعها، (۳) أو اشترى قبل الدفع بتلك الدراهم ودفع غيرها، (۴) أو اشترى مطلقًا ودفع تلك الدراهم. (۵) أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم، اختلف أبو نصر وأبو بكر وأبو الحسن. قال الكرخى: قال أبو انصر: يطيب له ولا يجب عليه أن يتصدق فى الوجه الأول وإليه ذهب فقيه أبو الليث رحمه الله. لكن هذا خلاف ظاهر الرواية فإنه نص فى الجامع الصغير إذا غصب ألفًا فاشترى بها جارية وباعها بألفين يتصدق بالربح وقال أبو الحسن الكرخى فى الوجه الأول والثانى: لا يطيب ويتصدق وفى الوجه الثالث والرابع والخامس يطيب وقال أبو بكر: لا يطيب له ويجب عليه التصدق فى الوجوه كلها لكن الفتوى اليوم على قول الكرخى دفعا للحرج عن الناس" (تاتارخانيه ۸/ ۳۴۶ كتاب البيوع، رد المحتار على الدر ۷/ ۴۹۰ زکریا)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"بلکہ مفتی بہ قول کے اس جملہ "وفی الثلاث الأخيرة يطيب . . . الخ" سے مملوک حلال اور جائز الاستعمال معلوم ہوتا ہے اور جب مورث کے لئے مملوک حلال اور جائز الاستعمال ہوگا تو وارثین کے لئے بدرجۂ اولی مملوک حلال اور جائز الاستعمال ہوگا (منتخبات نظام الفتاوی ۲ / ۲۷، محمود الفتاوی ۵ /

۴۱۷ تا ۴۱۹)، کرخی کے قول کے مطابق ان کے لئے زمین خریدنا درست ہے۔

(۵) یہ اخلاف وعدہ ہے اور وعدہ کا نقض مکروہ ہے، اگر پہلے سے ایفا کی نیت تھی اور کسی مجبوری سے بدل دیا تو مکروہ تنزیہی ہے اور اگر وعدہ کرتے ہی وقت ایفا کی نیت نہ تھی تو مکروہ تحریمی ہے، امام غزالی نے احیاء العلوم میں تصریح فرمائی ہے کہ اصل چیز وعدہ میں نیت ہے، اگر فساد نیت ہے تو مذموم ہے۔ (درس بخاری ضبط وتحریر مولانا عبدالوحید فتحپوری/ ۲۳۴)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

''امام محمدؒ کے نزدیک جب تک وقف کے لئے متولی مقرر کر کے اس کے حوالہ نہ کردے وقف مکمل نہ ہوگا، سراجیہ وخلاصۃ الفتاوی میں اسی کو مفتی بہ قرار دیا گیا ہے'' (قاموس الفقہ ۵ / ۲۹۵)۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کے یہاں وقف کا تلفظ کرتے ہی وقف مکمل ہوجائے گا اور واقف کی ملکیت اس پر ختم ہوجائے گی، مشائخ بلخ، صاحب منیۃ المصلی اور ملا حدادو غیرہ نے اسی پر فتوی دیا ہے، علامہ شامی نے بھی امام ابو یوسف ہی کے قول پر فتوی نقل کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اسی میں احتیاط ہے (قاموس الفقہ ۵ / ۲۹۵)۔

علامہ کاسانی کی تحریر ملاحظہ ہو:

''وأجمعوا علی أن من جعل داره أو أرضه مسجدًا يجوز وتزول الرقبة عن ملكه لكن عزل الطريق وإفرازه والإذن للناس بالصلاة فيه والصلوة شرط عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالى، حتى كان له أن يرجع قبل ذلك وعند أبي يوسف تزول الرقبة عن ملكه بنفس قوله جعلته مسجدًا وليس له أن يرجع عنه على ما نذكره'' (بدائع الصنائع ۵ / ۳۲۶)۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

''من بنى مسجدا لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه ويأذن بالصلاة فيه'' (۳/ ۲۲۸ کتاب الوقف الباب الحادي عشر بحواله فتاوى رحيميه ۹/ ۱۰۰)۔

''وإن جعل أرضًا له مسجدا لعامة المسلمين وبناها وأذن للناس بالصلاة فيها وأبانها من ملكه وأذن فيه المؤذن وصلى الناس جماعة صلوة واحدة أو أكثر لم يكن له أن يرجع فيه وإن مات لم يكن ميراثًا''

(الكافي للحاكم شهيد على المبسوط للسرخسي ۱۲/ ۳۴ نیز دیکھئے: البحر الرائق ۵/ ۲۴۸، تاتارخانيه ۸/ ۱۵۶، كتاب الوقف، بيان الحقائق ۳/ ۳۲۶، فتاوى عثمانى ۲/ ۵۳۶، الفقه الاسلامى وادلته ۸/ ۵۳، فتاوى محموديه ۱۸/ ۱۵۷، مجمع الانهر ۱/ ۷۵۵)۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''غیر آباد جنگل وبیابان میں مسلم آبادی قائم کرنے اور مسلمانوں کو وہاں بسانے کی غرض سے وسیع قطعہ زمین خریدی گئی اور مسجد ومدرسہ قائم کرنے کی غرض سے جگہ بھی متعین کردی گئی۔ رہائش گاہیں اور مکانات تعمیر کرنے سے قبل تبرکاً مسجد کے سنگ بنیاد کی رسم ادا کی گئی، اس کو دس سال کا عرصہ گذر جاتا ہے مگر رہائش گاہیں بنانے اور مسلمانوں کو وہاں بسانے میں کامیابی نہیں ہوئی، قرب وجوار میں نہ کوئی چھوٹی بڑی مسلم آبادی ہے اور نہ مسلمانوں کو اس کی حاجت ہے، وہاں نہ اذان ہوئی نہ نماز پڑھی گئی اور نہ مسجد بننے اور آباد ہونے کے قرائن پائے گئے تو یہ مسجد شرعی نہ ہوگی'' (فتاوی رحیمیہ ۹ / ۹۹ - ۱۰۰)۔

مذکورہ تحریروں سے احقر کی یہی رائے ہے کہ معلوم ہونے کے بعد بھی اس کی بیع وشراء درست ہونی چاہئے۔

(۶) نقشہ کے مطابق ہی تعمیر کرنی چاہئے، لیکن اگر ایسا نہ کر کے مسجد کے لئے زمین دیدیتا ہے اور ملکیت سے خارج کر کے وقف کردیتا ہے اور مسجد تعمیر ہو کر مع اذان با جماعت نماز ہونے لگتی ہے تو وہ مسجد شرعی ہوجائے گی، نیز مسجد مسلمانوں کی ایک اہم ضرورت ہے، ایک مسلمان کے لئے گارڈن سے کہیں زیادہ ضروری مسجد ہے، اس لئے اسے مسجد شرعی قرار دیا جانا چاہئے، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''مسجد شرعی

کے لئے اس کا راستہ عام ہونا چاہئے'' (کفایت المفتی ۳/ ۱۶۳)۔

ہندیہ میں ہے: ''فلو جعل وسط داره مسجدًا وأذن للناس فی دخوله والصلاة فيه إن شرط معه الطريق صار مسجدًا فی قولهم وإلا فلا'' (۲/ ۴۵۴-۴۵۵)۔

مفتی رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''رفاہی پلاٹ پر مسجد بنا سکتے ہیں، مسجد مسلم آبادی کی بنیادی ضرورت ہے''

(احسن الفتاوی ۶/ ۴۴۴-۴۴۵)۔

(۷) ذکر کردہ سارے حالات مجبوری واضطرار کے ہیں، ان حالات میں شرعی وسعت رکھی گئی ہے، اس لئے اگر آئندہ ہتک عزت کا اندیشہ نہ ہو تو ان کی گنجائش دی جاسکتی ہے۔

''لو اضطر إلى دفع رشوة لإحياء حقه جازله الدفع وحرم على القابض'' (رد المحتار على الدر ۷/ ۲۶۵ زکریا)۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی لکھتے ہیں: ''اگر دفع ظلم کے لئے رشوت دی جائے تو توقع ہے کہ دینے والے پر پکڑ نہیں ہوگی، لینے والا بہر حال حرام کھائے گا'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷/ ۶۷)۔

(۸) فقیہ وقت حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

''اس قدر قرض لینا جائز ہوگا جس کے ذریعہ تاجر اپنے آپ کو قانونی گرفت سے بچا سکے، بالخصوص اس لئے بھی کہ قومیائے ہوئے بینک سرکاری ادارے ہیں اور سرکاری قرضہ جات کے معاملہ میں علماء نے زیادہ نرمی برتی ہے'' (کتاب الفتاوی ۵/ ۳۱۵)۔

حضرت ایک جگہ اور تحریر فرماتے ہیں:

''انکم ٹیکس وغیرہ کے ناواجبی قانون سے بچنے کے لئے ایک قانونی ضرورت بن گئی ہو یا کاروبار کا بقا اور اس کا تحفظ بغیر لون لئے دشوار ہو جائے تو بینک کا قرض لیا جاسکتا ہے'' (جدید فقہی مسائل ۲/ ۲۷۵-۲۷۶)۔

(۹) احقر اولاً تسلیم یا قبض کی وضاحت کر رہا ہے، ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''التسليم أو القبض معناه عندالحنفية هو التخلي أو التخلى وهو أن يخلي البائع بين المبيع وبين المشترى برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشترى من التصرف فيه فيجعله البائع مسلمًا للمبيع والمشترى قابضًا له. التخلية وهى أن يتمكن المشترى من المبيع بلا مانع أى أن يكون مفرزا ولا حائل أى فى حضرة البائع مع الإذن له بالقبض'' (الفقه الاسلامی وادلته ۴/ ۴۱۸)۔

ساتھ ہی غرر کی تعریف بھی عرض ہے:

''قال السرخسی: الغرر مايكون مستور العاقبة. وقال القرافی المالكی: أصل الغرر هو الذى لايدرى هل يحصل أم لا، كالطير فى الهواء والسمك فى الماء. وقال الشيرازی الشافعی: ما انطوى عنه أمره وخفى عليه عاقبته وقال ابن تيمية: الغرر هو المجهول العاقبة. وقال ابن حزم: ما لا يدرى المشترى ما اشترى أو البائع ما باع''

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۴۳۷)

یعنی تخلیہ کے معنی یہ ہیں کہ مشتری کو اس بات پر قدرت دے دی جائے کہ وہ جب چاہے آکر مبیع پر قبضہ کرلے، جب قبضہ کرنے میں کوئی مانع نہ رہے، صورت مسئولہ میں تخلیہ بھی نہیں پایا گیا، نیز مبیع کی جہالت بھی لازم آرہی ہے جو مفضی الی المنازعات ہوسکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ تعیین و نمبرنگ تو ہوئی تھی لب روڈ کی اور اب دیا جارہا ہے روڈ سے بہت دور، روڈ سے ہٹ کر، یہ بھی جانتے ہیں کہ لب روڈ کی کیا ویلو ہے، یا نمبرنگ تو ہوئی تھی اس زمین کی جس میں دو راستے ملتے تھے، اب ایک ہی راستہ یا سرے سے راستہ ہی نہیں، یا معاملہ جانب مشرق کا ہوا تھا اور دیا جارہا ہے مغرب کی سمت وغیرہ وغیرہ، اس لئے اس معاملہ کے مفضی الی المنازعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور بیع کے جواز کا کلیدی عنصر جو بنص قرآنی "إلا عن تراض" ہے، مفقود ہورہا ہے، اس لئے خرید وفروخت کا یہ عمل درست نہیں ہونا چاہئے، سوال کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں تخلیہ نہیں اور تخلیہ ہی قبضہ ہے،

"وأجمعوا علی أن التخلیة فی البیع الجائز تکون قبضا الخ" (عالمگیری ۱۶/۳)۔

(۱۰) اس پرفتن دور میں جبکہ مالک زمین ایک زمین کو کئی دفعہ لوگوں کو دھوکہ دے کر فروخت کرتا رہتا ہے؛ حتی کہ کئی کئی دفعہ ایک زمین کی رجسٹری بھی کردیتا ہے، اس لئے جب تک کاغذی طور پر تحصیل میں رجسٹری ہوکر نیٹ پر نام نہ آجائے وہ خریدار نہیں مانا جائے گا، چونکہ وہ زمین ابھی بائع کے پاس ہی ہے، اس لئے کاشت بھی اسی کی ہوگی اور زمین بھی اسی کی ہوگی، احقر کا مشاہدہ ہے کہ کورٹ اور عدلیہ میں اس طرح کے بیشتر مقدمات چل رہے ہیں۔

(۱۱) مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

"آج کل بعض معاملات بالخصوص زمین کے معاملات میں کاغذی اندراج اور اسکی سرکاری کارروائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، لہذا اس کو بھی تخلیہ کے لئے کافی سمجھا جائے گا" (جدید تجارتی شکلیں/ ۳۴)۔

حضرت امام شافعیؒ وامام محمدؒ وامام زفرؒ کے یہاں کسی بھی شئی کو قبل القبض فروخت کرنا درست نہیں:

"لایجوز بیع المبیع قبل قبضه عقارًا كان أو منقولًا لا بإذن البائع ولا بغير إذنه لا قبل أداء الثمن ولا بعده" (شرح المهذب)۔ .... "قال أبو حنيفة وأبو يوسف رحمهما الله يمنع البيع قبل القبض فى سائر المنقولات ويجوز فى العقار الذى لايخشى هلاكه كما فى فتح القدير (تكملة فتح الملهم ۱/ ۳۵۰-۳۵۱)۔

(۱۱-الف) کالونی بنانے کی ملکیت سے مراد اگر کالونی بنانے والے کے نام سے اس زمین کا داخل خارج ہو چکا تھا اور اس کے نام زمین نیٹ پر آگئی تھی تو بلاشبہ اس کا فروخت کرنا درست ہوگا، لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ فروختگی درست نہ ہوگی۔

(۱۱-ب) اس کا عدم جواز تو سوال میں ہے ظاہر ہے، جبکہ زمین ابھی بیعانہ دینے والے کے نام نہیں ہوئی، اصل مالک ہی کے نام ہے تو پھر بیعانہ دینے والا اسے اگلے شخص کو کیسے فروخت کرسکتا ہے، لہذا من وجہ الف وب دونوں کا ایک ہی حکم ہوگا یا الف کا اور، اور ب کا اور نیز یہ کہ قانونی رکاوٹ کا بھی اندیشہ ہے۔

(۱۲) مذکورہ صورت بیع کی نہیں بلکہ وعدۂ بیع ہے اور ان دونوں میں فرق ہے، بیع میں حق ملکیت خریدار کو منتقل کردیا جاتا ہے اور وعدۂ بیع میں ایسا نہیں، بیع میں نہ صرف ملکیت منتقل ہوتی ہے؛ بلکہ اس کا رسک (ضمان) بھی خریدار کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، وعدۂ بیع میں اگر مبیع کسی اور کے ہاتھ فروخت کردے تو کہا جائے گا کہ اخلاقاً اچھا نہیں کیا، لیکن قانونی اعتبار سے یہ بیع درست ہوجائے گی، وعدہ بیع میں اگر بائع دیوالیہ (مفلس) ہوجائے تو خریدار یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں چیز جو میں خرید چکا ہوں، لہذا یہ چیز مجھے دیدی جائے؛ بلکہ وہ چیز بدستور بائع کی ملکیت رہے گی۔

(ماخوذ از اسلام اور جدید معاشی مسائل از مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ ۳/ ۲۰۰ تا ۲۰۲)۔

چونکہ زمین ابھی اصل مالک سے ٹرانسفر بھی نہیں ہوئی، اس لئے یہ بیع نہیں ہوئی، اگر یہ بیع درست ہوجاتی تو بائع کو اسے فروخت کرنے میں دلال کی کیا ضرورت پڑتی، خریدنے والا تو خود مختار ہوتا ہے، وہ مبیع کو بیچنے میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔

(۱۳) سوال میں مذکور جملے "اب اگر خریدار کو بیچنا ہے الخ" صلب عقد میں ہیں تو یہ معاملہ فاسد ہوگا اور اگر ایسا نہیں ہے تو پلاٹ خریدنے والے کی ملکیت زمین پر ثابت ہونی چاہئے، نیز اگر اس طرح کا معاملہ مبیع پر قبضہ اور ضمان میں آنے سے پہلے کا ہے تو قیمت میں یہ اضافہ مشتری کو دیدینا ربح مالم یضمن کے قبیل سے ہوگی اور مشتری اول کی ملکیت زمین پر ثا:ت نہ ہوگی۔

(۱۴) اگر مشتری کسی مجبوری کے تحت کوئی قسط ادا نہ کرسکا تو بائع کو مہلت دینی چاہئے تھی، "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة"، لیکن اگر بلا وجہ قسط کی ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے تو معاملہ کرنے کے بعد یہ شرط لگادی جائے کہ ایسا کرنے پر کچھ اضافی رقم تبرعاً دینی پڑے گی جو تیسرے شخص کے پاس محفوظ رہے گی اور خیراتی وامدادی ضرورتوں میں کام آئے گی، اگر مجبوراً ایسا ہوا اور کالونی بنانے والے نے یکطرفہ سودا کینسل کردیا تو وہ

درست نہیں، اگر وہ اس مبیع کو کہیں اور بھی فروخت کردے گا تو وہ ثمن بھی کالونی بنانے والے کے لئے حلال نہ ہوگا۔

(دیکھئے: احسن الفتاوی ۶/ ۵۰۵۔۵۰۶، نیز اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/ ۱۳۰۔۱۳۱)۔

(۱۵۔الف) اگر غبن فاحش نہ پایا جائے تو درست ہے، علائیہ میں ہے: ''هو ما لا يدخل تحت تقويم المقومين'' یعنی غبن فاحش یہ ہے کہ قیمت لگانے والوں کی قیمت کے تحت وہ داخل نہ ہوسکے، یعنی اندازہ سے کہیں زیادہ، اس کے تحت علامہ شامی لکھتے ہیں:

''وذلك كما لو وقع البيع بعشرة مثلا ثم إن بعض المقومين يقول إنه يساوي خمسة وبعضهم ستة وبعضهم سبعة فهذا غبن فاحش لأنه لم يدخل تحت تقويم أحد'' (رد المحتار على الدر ۷/ ۲۶۳).

یعنی اگر کسی نے کوئی سامان دس میں بیچا مگر بعض اس کی قیمت پانچ بعض چھ اور بعض مقومین سات لگاتے ہیں تو دس میں بیچنا غبن فاحش ہوگا۔

احقر کے نزدیک غبن فاحش کے ساتھ معاملہ مع الکراہت درست ہوگا۔

علائیہ میں ہے: ''واعلم أنه (لا رد بغبن فاحش)........ (في ظاهر الرواية) (الدر المختار مع الرد ۷/ ۲۶۳)۔

(۱۵۔ب) اگر زمین پر قبضہ دلانے کے بعد میں واپسی کی شرط اسی قیمت پر ہوئی تو بیع وفا ہونے کے باعث درست قرار دیا جاسکتا تھا، لیکن یہاں تو سرے سے قبضہ ہی مشتری کا نہیں، علاوہ ازیں اسی مجلس عقد میں یہ شرط ہے، اس لئے شرط فاسد کے باعث یہ معاملہ فاسد ہوگا۔

اکیڈمی کے بائیسویں سمینار میں یہ موضوع زیر بحث آچکا ہے، اس کا فیصلہ ۴ اس طرح ہے: ''اگر کوئی شخص سخت ضرورت مند ہو، اس کو نہ قرض حسن ملے اور نہ ہی رہن پر قرض ملے اور وہ نقد رقم حاصل کرنے کے لئے اپنی کوئی شئی کسی کے ہاتھ فروخت کرتا ہے جبکہ اس کا ارادہ ہو کہ بعد میں اس کو دوبارہ خرید لے گا تو اس کی گنجائش ہے، البتہ واپس خریداری کا ذکر اس معاملہ کے کرنے کے درمیان نہ کیا جائے، بلکہ اس سے الگ باہمی معاہدہ ہوجائے کہ خریدار اسے اسی قیمت پر دوبارہ فروخت کردے گا تو ایسا کرنا درست ہوگا'' (مجلہ واپسی کی شرط پر خرید وفروخت (بیع وفا)/ ۳۵)۔

مفتی رشید احمد صاحبؒ لکھتے ہیں: اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے شرط لگائی گئی ہو یا جانبین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں تو یہ بیع فاسد ہے، اور اگر بیع کے بعد واپسی کا وعدہ کیا تو یہ بیع صحیح ہے اور اس وعدہ کا ایفا لازم ہے۔

''قال في العلائية وقيل بيع يفيد الانتفاع به وفي إقالة شرح مجمع عن النهاية وعليه الفتوى... الخ''

(احسن الفتاوی ۶/ ۵۰۷، دیکھئے: الدر المختار علی الرد ۷/ ۵۴۶، نوازل فقہیہ معاصرہ ۱/ ۲۶۸، ۲۶۹)۔

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی ایک تحریر عرض ہے جو بیع قبل القبض سے متعلق ہے حضرت لکھتے ہیں:

''اور آج سرمایہ دارانہ نظام کے اندر جو مفاسد پائے جاتے ہیں ان مفاسد میں اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ ان مفاسد میں کم از کم پچاس فیصد بیع قبل القبض کا ہے، یعنی آدھے مفاسد اس سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے گرانی بڑھتی ہے، اس کی وجہ سے بازار میں عدم استحکام پیدا ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے بازار میں قیمتوں میں زلزلے آتے ہیں کہ ایک دم سے چڑھ گئی، ایک دم سے نیچے اتر گئی''

(اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/ ۹۸)۔

☆☆☆

اراضی کی خرید وفروخت سے متعلق نئے مسائل

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی [1]

تمہید:

زمین اللہ تعالی کی عظیم الشان، بے بہا اور انتہائی قیمتی نعمت ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے انسانوں پر اپنے احسانات کے زمرہ میں اس کا شمار کیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "الذی جعل لکم الأرض فراشا والسماء بناء" (البقرہ: ۲۲) (اس کی بندگی کرو جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش (بچھونا) اور آسمان کو چھت بنایا) اور زمین کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالی نے اس کی قسم کھائی ہے، جیسا کہ فرمان الہی ہے: "والأرض وما طحٰها" (الشمس: ۶) (اور قسم ہے زمین کی اور جیسا کچھ اس کو بچھایا)۔

اور زمین ہی ہمارے ماحول کا وہ حصہ ہے جس پر ہم چلتے ہیں، اور یہ بھی اللہ رب العزت کا عظیم احسان ہے کہ اس نے زمین کو قابل آمد ورفت بنایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "هو الذی جعل لکم الأرض ذلولا فامشوا فی مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور" (الملک: ۱۵) (وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ہموار بنایا، تو تم اس کے شانے پر چلو پھرو، اور اس کی بخشی ہوئی روزی میں سے کھاؤ، اور اسی کے دربار میں تمہیں دوبارہ زندہ ہوکر جانا ہے)۔

اور اس کی مٹی ہی جو چٹانوں کے ٹوٹنے پھوٹنے سے وجود میں آتی ہے، نباتی بالیدگی کا ذریعہ ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

"ولقد مكنا كم فی الأرض وجعلنا لكم فيها معايش قليلا ما تشكرون" (الاعراف: ۱۰)

(اور ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا، اور تمہارے لئے اس میں سامان زیست مہیا کیا، پر تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو)

اور ارشاد ہے: "سبحان الذی خلق الأزواج كلها مما تنبت الأرض ومن أنفسهم ومما لا يعلمون" (یٰس: ۳۶) (پاک ہے وہ ذات جس نے تمام اقسام کے جوڑے پیدا کئے ان چیزوں میں سے بھی جن کو زمین اگاتی ہے اور خود ان کے اندر سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے)۔

اور اسی زمین کی منصفانہ تقسیم نہ ہونے سے انسانوں کے درمیان لڑائیاں برپا ہوتی ہیں، لہذا اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ زمین کا حصول شریعت کے مقرر کردہ اصول کی روشنی میں ہو، تاکہ انسانی سماج سے بدامنی دور رہو، اور یہ زمین امن وآشتی، اخوت ومحبت اور بھائی چارگی کا گہوارہ بنے۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

سوال نمبر ۱ کا جواب:

بعض لینڈ گرابرس (Land Grabbers) یعنی زمین غصب کرنے والے، سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر کا سرکاری اراضی پر قابض ہوکر انہیں فروخت کرنا حرام ہے خواہ رشوت کے ذریعہ سرکاری عہدہ داروں سے وہ لے آوٹ (Lay out) یعنی آبادی کا نقشہ بھی منظور کرا چکے ہوں؛ اس لئے کہ سرکاری اراضی مال عام میں سے ہیں، اور مال عام کسی کی ملک نہیں، بلکہ وہ ساری قوم کی مشترکہ دولت ہے جس میں مصلحت کے مطابق تصرف کرنے کا حق صرف حاکم وقت کو ہے، لہذا مال عام پر ہر طرح کی دست درازی حرام ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- مال عام پر دست درازی باطل طریقہ سے مال کو برتنے میں داخل ہے جو شریعت میں ممنوع ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"یا أیها الذین آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل..." (النساء: ۲۹) (اے ایمان والو! اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ)۔

---

[1] عمید کلیۃ الحدیث، جامعہ اسلامیہ، شانتاپرم، مالاپرم، کیرالہ۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے مال عام کی چوری پر سخت وعید فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: "ومن یغلل یأت بما غل یوم القیامۃ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون" (آل عمران: ۱۶۱) (اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے دن حاضر ہوگا، پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا، اور ان پر کچھ ظلم نہ ہوگا)۔

علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وھذا تھدید شدید ووعید أکید" (ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۱/ ۵۱۸، بیروت، دار الفکر، ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴ء)
(اس آیت میں مال عام کے اندر خیانت کے سلسلہ میں سخت دھمکی اور زبردست وعید ہے)۔

۳۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مال عام پر دست درازی سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، جیسا کہ جنابہ خولہ انصاریہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إن رجالا یتخوضون فی مال اللہ بغیر حق، فلھم النار یوم القیامۃ" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۳۱۱۸، ترمذی حدیث نمبر: ۲۳۷۴، مسند احمد حدیث نمبر ۲۷۰۵۴، ۲۷۳۱۸) (کچھ لوگ اللہ کے مال کو ناحق ہڑپ کرتے ہیں، سو قیامت کے دن ان کے لئے آگ ہے)۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "یا أیھا الناس! أدوا الخیاط والمخیط، فإن الغلول یکون علی أھلہ عارا وشنارا یوم القیامۃ" (موطا مالک حدیث نمبر: ۹۷۷، سنن نسائی حدیث نمبر: ۳۶۸۸، نسائی، السنن الکبری حدیث نمبر: ۶۵۱۵، اور اس کی سند حسن درجہ کی ہے) (اے لوگو! سلائی کی سوئی اور دھاگے وغیرہ بھی ادا کرو؛ کیونکہ مال غنیمت کی چوری روز قیامت چوری کرنے والے کے لئے عیب ورسوائی ہوگی)۔

۵۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیوں کی پور کے درمیان اونٹ کے بال لے کر ارشاد فرمایا: یہ بھی تمہاری غنیمت کا حصہ ہے، اور مجھے بھی اس میں سے صرف پانچواں حصہ حاصل ہے، اور وہ بھی تمہارے مصالح میں ہی خرچ کیا جائے گا:

"فأدوا الخیط والمخیط وأقل من تلک وأکثر، ولا تغلوا؛ فإن الغلول عار ونار علی أھلہ فی الدنیا والآخرۃ"
(احمد شیبانی، الآحاد والمثانی حدیث نمبر ۱۸۶۶، مسند شاشی حدیث نمبر: ۱۲۶۱، طحاوی، شرح معانی الآثار حدیث نمبر: ۲۲۷۱، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے)
(لہذا دھاگہ اور سوئی بھی ادا کرو، اور اس سے کمتر اور بڑی جو چیز ہو اسے بھی حوالہ کرو، اور مال غنیمت میں خیانت نہ کرو، کیونکہ مال غنیمت میں خیانت دنیا اور آخرت میں خیانت کرنے والے کے لئے رسوائی اور آگ میں جانے کا سبب بنے گی)۔

۶۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم اور مال غنیمت منتقل کرنے پر متعین تھا، ایک موقع سے اسے تیر لگا اور وہ مر گیا، اس پر صحابہ نے کہا، اسے شہادت مبارک ہو، یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کلا، والذی نفسی بیدہ، إن الشملۃ التی أخذ یوم خیبر من المغانم لم تصبھا المقاسم، لتشتعل علیہ نارًا" (موطأ مالک حدیث نمبر: ۹۸۰، صحیح البخاری حدیث نمبر: ۴۲۳۴، ۶۷۰۷، سنن نسائی حدیث نمبر: ۳۸۲۷، نسائی، السنن الکبری حدیث نمبر: ۴۶۸۷، سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۲۷۱۱) (ہرگز نہیں! اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، یقیناً وہ چادر جسے اس نے خیبر کے دن غنیمت کی تقسیم سے پہلے لے لی تھی، وہ اس پر آگ بن کر بھڑک رہی ہے)۔

۷۔ حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من اقتطع شبرًا من الأرض ظلمًا طوقہ اللہ إیاہ یوم القیامۃ من سبع أرضین" (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۶۱۰، مسند ابی عوانہ حدیث نمبر: ۵۵۳۱، مسند ابی یعلی حدیث نمبر: ۹۵۹) (جو ناحق بہ طور ظلم ایک بالشت کے بہ قدر بھی زمین لے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سات زمین سے اس کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دے گا)۔

۸۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن ھذا المال خضرۃ حلوۃ. فنعم صاحب المسلم ھو، ما أعطی منہ المسکین والیتیم وابن السبیل... وإنہ من یأخذہ بغیر حقہ کالذی یأکل ولا یشبع، ویکون شھیدًا علیہ یوم القیامۃ" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۱۴۶۵، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۰۵۲، مسند طیالسی حدیث نمبر: ۲۱۸۰، بیروت، دار المعرفۃ) (یہ مال سرسبز اور شیریں ہے، اور مسلمان کا بہترین ساتھی ہے، جبکہ اس میں سے مسکین، یتیم اور مسافر کو دے... اور اس کی مثال جو ناحق اس کو حاصل کرنے اس شخص جیسی ہے جو کھائے اور آسودہ نہ ہو، اور یہ ناحق مال قیامت کے روز اس کے خلاف گواہ بنے گا)۔

ان تمام ادلہ سے واضح ہے کہ مال عام پر کسی قسم کی دست درازی درست نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ، رسول اور اہل ایمان کے ساتھ سنگین خیانت اور قابل مؤاخذہ جرم ہے۔

۹۔ ہر چیز کا مالک حقیقی اللہ تعالی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "لله ملك السموات والأرض وما فيهن وهو على كل شيئ قدير" (المائدہ: ۱۲۰) (آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی ملکیت اللہ ہی کے لئے ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

لیکن شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے افراد کو اللہ تعالی نے ذاتی ملکیت کا حق بھی دیا ہے، اور انفرادی ملکیت کے اسباب جیسے میراث، ہبہ، وصیت اور تبادلہ کے عقود کے ذریعہ ملکیت حاصل کرنے کی اجازت بھی دی ہے، البتہ مال عام کا مالک حقیقی اللہ تعالی ہی ہے، اور اس سے انتفاع کا حق پوری قوم کو ہے، جیسا کہ فرمان الہی ہے: "هو الذي خلق لكم ما في الأرض جميعًا" (البقرہ: ۲۹) (وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے)۔

اور مال عام میں مصلحت کے مطابق تصرف کرنے کا حق حاکم وقت کو ہے، جیسا کہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: "تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة" (ابن نجیم، الاشباہ والنظائر/ ۱۲۳، بیروت، العلمیۃ، ۱۴۰۰ھ) (رعیت کے سلسلہ میں امام کا تصرف مصلحت کے ساتھ مربوط ہے)۔

لہذا حکومتی ضابطے کی پابندی کیے بغیر سرکاری اراضی پر قابض ہوجانا حرام ہے۔

اور جانتے بوجھتے غصب کردہ سرکاری اراضی کا قابضین یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا ناجائز ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ غصب کے تین احکام ہیں:

(الف) وہ شخص گنہگار اور مجرم ہے جس نے جانتے بوجھتے دوسرے کا مال زبردستی اس کی رضامندی کے بغیر لیا ہے، اور اس کا یہ عمل قابل مؤاخذہ ہے، وہ آخرت میں اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا ہے۔

(ب) اگر غصب کردہ شئی موجود ہے تو اسے اصل مالک کو لوٹانا واجب ہے، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں: "الحكم الأصلي للغصب هو وجوب رد عين المغصوب؛ لأن بالرد يعود عين حقه إليه، وبه يندفع الضرر عنه من كل وجه" (کاسانی، بدائع الصنائع ۷/ ۱۵۱، بیروت، دار الکتاب العربی) (غصب کا اصلی حکم یہ ہے کہ غصب کردہ شئی کو مالک کو لوٹا دیا جائے؛ اس لئے کہ لوٹانے سے ہی اس کا اصلی حق اسے ملے گا، اور اسی سے ہر اعتبار سے اس سے ضرر دور ہوگا)، اور یہی دیگر فقہاء کا بھی مسلک ہے (دیکھئے: ابن جزی مالکی، القوانین الفقہیہ/ ۳۳۰، شربینی شافعی، مغنی المحتاج ۲/ ۲۷۷، ابن قدامہ حنبلی، المغنی ۵/ ۲۵۹)۔

(ج) اگر غصب کردہ شئی ضائع ہوجائے تو اس کا تاوان دینا واجب ہے، اگر وہ مثلی ہے تو اس کا مثل لوٹانا واجب ہے، اور اگر وہ مثلی نہیں ہے تو اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہے، علامہ حصکفی حنفیؒ لکھتے ہیں: "وحكمه الإثم لمن علم أنه مال الغير، ورد العين قائمة، والغرم هالكة، ولغير من علم الأخيران. فلا إثم؛ لأنه خطأ، وهو مرفوع بالحديث" (حصکفی، الدر المختار ۶/ ۱۷۹-۱۸۰، بیروت، دار الفکر، ۱۳۸۶ھ) (اور غصب پر مرتب ہونے والا اثر و حکم یہ ہے کہ جو جانتا ہو کہ یہ دوسرے کا مال ہے وہ گنہگار ہوگا، اور اگر غصب کردہ چیز موجود ہے تو اسے مالک کو لوٹانا ہوگا، اور اگر ضائع ہوجائے، تو اس کا تاوان دینا ہوگا، اور جو نہ جانتا ہو اس کے حق میں اخیر کے دو حکم ثابت ہیں، اور نہ جاننے والے کو گناہ نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ خطا ہے جو حدیث کی روشنی میں معاف ہے)۔

لہذا سرکاری زمین پر قابضین افراد کی ذمہ داری ہے کہ وہ غصب کردہ زمین حکومت کو لوٹائیں۔

۲۔ اگر چہ شیخین یعنی امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک زمین کا غصب نہیں ہوسکتا ہے، جیسا کہ علامہ حصکفی حنفی رقمطراز ہیں: "فلا يتحقق في العقار خلافًا لمحمد" (حصکفی، الدر المختار ۶/ ۱۷۹) (غیر منقولہ جائیداد میں غصب ثابت نہیں ہوتا ہے، اس میں امام محمدؒ کا اختلاف ہے)۔

لیکن جمہور فقہاء اور امام محمد کے نزدیک غیر منقولہ جائیداد میں بھی غصب ثابت ہوتا ہے (دیکھئے: دسوقی مالکی، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۳/ ۴۴۳، ابن رشد مالکی، بدایۃ المجتہد ۲/ ۳۱۱، شربینی شافعی، مغنی المحتاج ۲/ ۲۷۵، ابن قدامہ حنبلی، المغنی ۵/ ۲۲۳، منصور بہوتی حنبلی، کشاف القناع ۴/ ۸۳)۔

لیکن شیخین کے نزدیک بھی قابضین پر لازم ہے کہ وہ مالک زمین کو زمین لوٹا دیں، جیسا کہ علامہ حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

"إنما لا يتحقق الغصب عندهما في العقار في حكم الضمان، أما فيما وراء ذلك فيتحقق. ألا ترى أنه يتحقق في

الرد'' (الحصکفی، الدر المختار، کتاب الغصب ۶/ ۱۸۶) (شیخین کے نزدیک بھی غیر منقولہ جائیداد میں غصب محض تاوان کے حکم میں ثابت نہیں ہوتا ہے، بہر حال اس کے علاوہ امور میں تو ثابت ہے، کیا تم غور نہیں کرتے کہ واپسی کے سلسلہ میں غصب ثابت ہے)۔

لہذا جب قابضین پر واپس کرنا لازم ہے تو ان سے خریدنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ اگر چہ حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک غصب کردہ شئی کو اگر غاصب بیچ دے تو اس کی فروخت مالک کی اجازت پر موقوف رہتی ہے کہ اگر وہ اجازت دے دے تو بیع نافذ ہو جائے گی، ورنہ باطل ہو جائے گی، چنانچہ علامہ حصکفی حنفی لکھتے ہیں: ''ووقف بيع الغاصب على إجازة المالك يعني إذا باعه لمالكه، لا لنفسه'' (حصکفی، الدر المختار ۵/ ۱۱۲) (اور غاصب کی بیع مالک کی اجازت پر موقوف ہے یعنی جب کہ غصب کردہ شئی کو مالک کے لئے فروخت کرے، نہ کہ خود کے لئے)۔

اور نہ کہ خود کے لئے فروخت کرے سے مراد یہ ہے کہ خود سے فروخت نہ کرے، جیسا کہ علامہ شامی رقمطراز ہیں:

''قول البدائع: لو باعه لنفسه لم ينعقد أصلًا، معناه: لو باعه من نفسه، فاللام بمعنى من'' (ابن عابدین، رد المحتار ۵/ ۱۰۸، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ) (بدائع الصنائع کی یہ تحریر کہ: اگر خود کے لئے اسے بیچے تو بالکل منعقد نہیں ہوگی، اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''اگر خود سے بیچے'' سو ''لام''''من'' کے معنی میں ہے)۔

اور مالکیہ کے مذہب کے لئے دیکھئے: (قرطبی مالکی، الکافی فی فقہ أهل المدینة ۲/ ۸۴۸، ط: ۲، ریاض، مکتبۃ الریاض، ۱۴۰۰ھ)۔

جبکہ شافعیہ اور راجح روایت کے مطابق حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ غاصب کی بیع باطل ہے، جیسا کہ رافعی شافعیؒ لکھتے ہیں: ''وكذلك بيع الغاصب'' (رافعی (و: ۶۲۳ھ)، فتح العزیز شرح الوجیز ۸/ ۱۲۱، بیروت، دار الفکر) (اور ایسے ہی غاصب کی بیع باطل ہے)۔

اور مرداوی صالحی حنبلی (و: ۸۸۵ھ) لکھتے ہیں: ''اعلم أن بيع الغاصب العين المغصوبة غير صحيح مطلقًا على المذهب'' (مرداوی حنبلی، الانصاف، باب الغصب ۶/ ۱۲۶، ط: ۱، بیروت، دار الاحیاء، ۱۴۱۹ھ) (جان لو کہ غاصب کا غصب کردہ چیز کو بیچنا مذہب میں صحیح قول کے مطابق مطلقاً درست نہیں ہے)۔

اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے؛ اس لئے کہ حقیقی رضا کے بغیر غاصب کے اثر ورسوخ کی وجہ سے مجبوری میں بھی اجازت ہو سکتی ہے، اور اسی کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت سعید بن زیدؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ليس لعرق ظالم حق'' (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۳۰۷۳، نسائی، السنن الکبری حدیث نمبر: ۵۷۶۱، سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۳۷۸، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (غاصب کا کوئی حق نہیں ہے)۔

اور حنفیہ کے مسلک کے مطابق بھی صورت مسئولہ میں بیع کو موقوف قرار دینے میں کوئی فائدہ نہیں ہے؛ اس لئے کہ حکومت سے اجازت ملنے کی امید نہیں ہے، لہذا براہ راست قابضین سے خریدنا، یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا جائز نہیں ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' (المائدہ: ۲) (اور باہم گناہ اور ظلم وزیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔

امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''ثم نهى فقال: ''ولا تعاونوا على الإثم والعدوان'' وهو الحكم اللاحق عن الجرائم، وعن العدوان وهو ظلم الناس'' (قرطبی، الجامع لاحکام القرآن ۶/ ۴۷، ریاض، دار عالم الکتب، ۱۴۲۳ھ) (پھر اللہ تعالیٰ نے گناہ اور زیادتی کے کاموں میں باہم مدد دینے سے منع فرمایا، اور یہ بعد میں آنے والا حکم جرائم اور لوگوں پر ظلم کرنے سے روکتا ہے)۔

اور یہ امر بالکل واضح ہے کہ سرکاری اراضی پر قابضین سے خریدنا یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنے میں غاصبین کی حوصلہ افزائی ہے اور گناہ اور ظلم میں تعاون ہے، اور اگر لوگ اسی طرح تعاون کرتے رہیں، تو پھر صحیح نظام کبھی قائم ہو سکتا ہے اور نہ مال عام پر دست درازی بند ہو سکتی ہے۔

۵۔ سرکاری مغصوبہ اراضی کے سلسلہ میں بھی یہی حکم ہے کہ ان کو حکومت کو لوٹانا واجب ہے، لہذا براہ راست قابضین سے خریدنا یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا جائز نہیں ہے۔

۶۔ حکومتی زمین غصب کر کے اس پر عمارت کھڑی کر دینے اور مکان تعمیر کر لینے کی حالت میں بھی یہی حکم ہے کہ اسے حکومت کو لوٹانا واجب ہے، لہذا براہ راست قابضین سے خریدنا یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا جائز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں فقہی مسالک درج ذیل ہیں:

(الف) شافعیہ اور حنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ حکومتی زمین پر غصب کر کے تعمیر کردہ عمارت ڈھادی جائے گی اور پیڑ پودے اکھاڑ دیئے جائیں گے، اور غاصب کے ذمہ منہدم کرنے کی اجرت اور زمین کے اندر ہونے والے نقصان کا معاوضہ واجب ہوگا (دیکھئے: ماوردی شافعی، الحاوی الکبیر ۷/ ۱۶۶، منصور بہوتی حنبلی، الروض المربع شرح زاد المستقنع ۱/ ۲۷۴)۔

(ب) مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ اکھڑے ہوئے پیڑ پودے اور منہدم عمارت کے ملبے کی قیمت ادا کر کے حکومت چاہے تو درخت یا عمارت سمیت زمین حاصل کرلے، یا اگر چاہے تو غاصب سے عمارت منہدم کرنے اور درخت اکھاڑنے کا مطالبہ کرے (دیکھئے: ابن جزی، القوانین الفقہیہ/ ۲۱۷)۔

(ج) حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ سرکاری اراضی پر تعمیر کردہ عمارت منہدم کردی جائے گی اور درخت اکھاڑ دیئے جائیں گے، البتہ اگر منہدم کرنے یا پیڑ پودے اکھاڑنے میں زمین کو نقصان پہنچے، یا زمین کی قیمت عمارت اور درخت کی قیمت سے کم ہو تو حاکم غاصب کو اس کی قیمت دے کر زمین درخت یا عمارت سمیت حاصل کرلے (دیکھئے: علی حیدر، درر الحکام ۲/ ۵۱۶، بیروت، دار عالم الکتب)۔

۷۔ غصب کردہ سرکاری اراضی براہ راست قابضین سے خریدنا یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا غصب کرنے میں شریک ہونا ہے، اور غصب حرام ہے۔

سوال نمبر ۲ کا جواب:

اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو خریدنا حرام ہے، اس کے دلائل درج ہیں:

۱۔ اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو اوقاف کی مد میں لوٹانا واجب ہے؛ اس لئے کہ دیگر غصب کردہ اموال کی طرح غصب کی ہوئی وقفی زمین کا بھی یہی حکم ہے کہ اسے متولی یا ان لوگوں کے حوالہ کرے جن کو اس سے انتفاع کا حق حاصل ہے، امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

''الحکم الأصلی الثابت بالغصب وجوب رد العین علی المالك بقوله ﷺ علی الید ما أخذت حتی ترد'' (ابوداؤد حدیث نمبر: ۳۵۶۱، ترمذی حدیث نمبر: ۱۲۶۶، مسند احمد حدیث نمبر: ۲۰۰۸۶، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے)، وقال ﷺ: ''لایحل لأحد أن یأخذ متاع أخیه لاعبا ولا جادًا، فإن أخذه فلیرده علیه'' (ابوداؤد حدیث نمبر: ۵۰۰۳، ترمذی حدیث نمبر: ۲۱۶۰، بخاری الادب المفرد حدیث نمبر: ۲۴۱، یہ حسن درجہ کی حدیث ہے)، وقال ﷺ: ''من وجد عین ماله فهو أحق به'' (ابوداؤد حدیث نمبر: ۳۵۳۱، نسائی حدیث نمبر: ۴۶۸۱، مسند احمد حدیث نمبر: ۲۰۱۰۹، ۲۰۱۴۶، ۲۰۱۴۶، اور یہ صحیح لغیرہ درجہ کی حدیث ہے)، ''ومن ضرورة کونه أحق بالعین وجوب الرد علی الآخذ'' (سرخسی، المبسوط ۱۱/ ۴۲، ط: ۱، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ) (غصب کی وجہ سے ثابت شدہ اصلی حکم یہ ہے کہ غصب کردہ مال کو مالک کو لوٹا دے، اس لئے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "قبضہ کرنے والے ہاتھ پر لی ہوئی شئی کی ذمہ داری ہے یہاں تک کہ اسے لوٹا دے"، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "کسی کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا سامان ہنسی مذاق یا سنجیدگی کے طور پر لے، سو اگر لے ہی لے تو اسے واپس کردے"، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جو بعینہ اپنے مال کو پالے، تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے"، اور اس کے اپنے مال کے زیادہ حقدار ہونے کا تقاضا ہے کہ لینے والے پر اس کو واپس کرنا واجب ہو)۔

۲۔ ناحق کسی کے مال پر تسلط جمانا حرام ہے، اور خاص طور سے اوقاف پر قبضہ کرنا سنگین ترین جرم ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض" (النساء: ۲۹) (اے ایمان والو! اپنے مال آپس میں باطل طریقہ سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ کوئی مال باہمی رضامندانہ تجارت کے ذریعہ سے حاصل ہوجائے)۔

اور فرمان الٰہی ہے: "إن الذین یأکلون أموال الیتامی ظلمًا إنما یأکلون فی بطونهم نارًا" (۴/ النساء: ۱۰) (جو لوگ ظلم و ناانصافی سے یتیموں کے مال ہڑپ کر رہے ہیں وہ تو بس اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں)۔

اور حضرت عمرو بن یثربیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ولا یحل لامرئ من مال أخیه إلا ما طابت به نفسه" (مسند احمد حدیث نمبر: ۱۵۴۸۸، ابن ابی عاصم، الآحاد والمثانی حدیث نمبر: ۹۷۹، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (کسی شخص کے لئے اس کے بھائی کے مال سے وہی مقدار حلال ہے جو

وہ خوشی سے دے دے)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "وحرمة ماله كحرمة دمه" (مسند احمد حدیث نمبر: ۴۲۶۲، مسند ابی یعلی حدیث نمبر: ۵۱۱۹، مسند طیالسی حدیث نمبر: ۳۰۶، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (مسلمان کے مال کی حرمت اس کی جان کی حرمت کی طرح ہے)۔

اور حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إن دماء كم وأموالكم وأعراضكم بينكم حرام كحرمة يومكم هذا، في شهركم هذا، في بلدكم هذا" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۶۷، ۱۰۵، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۶۷۹) (یقیناً تمہاری جانیں، مال اور عزت وآبرو تمہارے درمیان حرام ہیں، جس طرح تمہارے اس شہر کے اندر اور تمہارے اس ماہ میں تمہارے آج کے دن کی حرمت ہے)۔

تو جب ایک عام مسلمان کے مال کی یہ حرمت ہے تو پھر اوقاف کی کتنی حرمت ہوگی، جو اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں، لہٰذا اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو خریدنا حرام ہے، اور ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو غاصبین کے قبضہ سے نکال کر کے وقف کی مد میں بحال کریں۔

۳- وقف کا اصلی حکم یہ ہے کہ اس کی خرید وفروخت نہ ہو، اور اس میں وقف کی مصلحت کے مطابق تصرف کرنے کا حق صرف متولی کو ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تصدق بأصله، لا يباع ولا يوهب ولا يورث، ولكن ينفق ثمره" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۷۶۴، ۲۷۷۲، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۶۳۲) (اس کی اصل کو اس طرح صدقہ کردو کہ اس کی خرید وفروخت نہ ہوسکے، اور نہ اس کو ہبہ کیا جاسکے، اور نہ اس میں میراث جاری ہوسکے، لیکن اس کے پھل (آمدنی) کو خرچ کیا جائے)۔

اور ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: "وظاهر قولهم: إن الوقف لايملك ولا يباع، يقتضي أن الوقفية لا تبطل بالخراب. ولا تعود إلى ملك الواقف ووارثه" (ابن نجيم، البحر الرائق، كتاب الوقف ۵/ ۲۲۲) (فقہاء فرماتے ہیں کہ وقف میں ملکیت جاری نہیں ہوسکتی ہے، اور نہ اس کی خرید وفروخت ہوسکتی ہے، اس کا بہ ظاہر تقاضا یہ ہے کہ ویران ہونے سے وقف ہونا باطل نہیں ہوتا ہے، اور وقف کی چیز وقف کرنے والے اور اس کے ورثہ کی ملکیت میں نہیں لوٹتی ہے)، تو جب وقف ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے تو پھر اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو اپنے لئے خریدنا کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟

۴- عام حالتوں میں وقف کی چیز کو بیچ کر اس سے دوسری چیز خریدنا یا دوسری شئی سے وقف کردہ شئی کا تبادلہ کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اوقاف کا تبادلہ صرف مخصوص صورتوں میں جائز ہے، اور ان صورتوں میں بھی شرط یہ ہے کہ دوسرے مقامات پر اسی نوع کے متبادل اوقاف قائم کئے جائیں، جیسا کہ علامہ شامیؒ رقمطراز ہیں:

"لا يستبدل العامر إلا في أربع: الأولى: لو شرطه الواقف، الثانية: إذا غصبه غاصب وأجرى عليه الماء حتى صار بحرا، فيضمن القيمة، ويشتري المتولي بها أرضًا بدلًا، الثالثة: أن يجحده الغاصب ولا بينة، أي: وأراد دفع القيمة، فللمتولي أخذها ليشتري بها بدلا، الرابعة: أن يرغب إنسان فيه ببدل أكثر غلة وأحسن صقعًا، فيجوز على قول أبي يوسف، وعليه الفتوى، كما في فتاوى قارئ الهداية" (ابن عابدین، ردالمحتار ۴/ ۳۸۸، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ، ع-ا-: ۸)

(آباد زمین کا تبادلہ کرنا صرف چار ہی صورتوں میں جائز ہے، پہلی صورت یہ ہے کہ واقف نے اس کی شرط لگادی ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ غاصب نے وقف کی زمین غصب کرلی ہو اور اس پر اس طرح پانی بہادیا ہو کہ وہ تالاب بن جائے، تو اب غاصب قیمت کا ضامن ہوگا، اور متولی اس قیمت سے دوسری زمین خرید لے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ غاصب اس زمین کے غصب سے انکار کرتا ہو، اور گواہان موجود نہ ہوں، اور غاصب قیمت دینے کو تیار ہوجائے، تو متولی اس زمین کے بدلہ قیمت لے سکتا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ دوسری زمین خرید کر متبادل وقف قائم کرسکے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ اس وقف کو کوئی شخص ایسا بدل دے کر لینا چاہتا ہو جو پیداوار اور محل وقوع کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہو تو امام ابویوسف کے قول پر اس صورت میں تبادلہ کرنا جائز ہے، اور اسی پر فتوی ہے، جیسا کہ "قاریٔ الہدایہ" کے فتاوی میں ہے)، تو جب اوقاف کا تبادلہ شرطوں کے ساتھ مشروط ہے تو پھر اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو اپنی ذات کے لئے خرید کر غاصبین کی حوصلہ افزائی کیونکر جائز ہوگی؟

۵- اوقاف کی املاک سے غاصبانہ قبضہ ختم کرنا مسلمانوں کی اہم ترین ذمہ داری ہے، تو پھر اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو اپنے لئے خرید کر غصب کرنے والے کی

ہمت افزائی کیونکر درست ہوگی؟

سوال نمبر ۳ کا جواب:

اسلام کا نظام میراث انتہائی جامع اور مکمل ترین نظام ہے، جس کی نظیر انسانی تاریخ میں پہلے تھی نہ بعد میں ملے گی، چنانچہ اس نظام کی رو سے وراثت ملکیت کا غیر اختیاری سبب ہے، اور مورث کے مرنے کے بعد خود بخود اسکی چھوڑی ہوئی جائیداد اس سے متعلقہ حقوق سے فراغت کے بعد ورثاء کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے، اور سارے شرعی ورثہ اس کے مشترکہ طور پر مالک بن جاتے ہیں، اور جب تک باہمی رضامندی یا عدالت کے ذریعہ تقسیم نہ ہو جائے، انفرادی ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے، اور باہمی رضامندی سے تقسیم میں یہ بھی شرط ہے کہ تمام شرکاء یا ان کے وکیل موجود ہوں، چنانچہ فقیہ علی حیدر حنفیؒ لکھتے ہیں:

"يشترط في لزوم ونفاذ قسمة الرضا، رضاء كل واحد من المتقاسمين، بناء عليه إذا غاب أحد المتقاسمين، ولم يكن له نائب، وقسم الحاضرون، وأفرزوا حصة الغائب، فلا تصح قسمة الرضاء، أي لا تكون لازمة" (علی حیدر، درر الحکام ۳/ ۱۲۷) (باہمی رضامندی سے ہونے والی تقسیم کے نافذ اور لازم ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ تقسیم کرنے والے میں سے ہر ایک راضی ہو، لہٰذا تقسیم کرنے والے میں سے کوئی غائب ہو، اور اس کا نائب بھی موجود نہ ہو، اور جو لوگ موجود ہوں وہ تقسیم کر لیں، اور غیر موجود شخص کا حصہ علاحدہ کر دیں، تو باہمی رضامندی سے ہونے والی تقسیم صحیح نہیں ہوگی، یعنی لازم نہیں ہوگی)۔

اور مشترکہ جائیداد میں تمام شرکاء کی اجازت سے ہی تصرف کیا جا سکتا ہے، علاء الدین سمرقندیؒ لکھتے ہیں:

"شركة الأملاك على ضربين: أحدهما: ما كان بفعلهما مثل أن يشتريا، أو يوهب لهما، أو يوصى لهما فيقبلا۔ والآخر بغير فعلهما وهو أن يرثا، والحكم في الفصلين واحد، وهو أن الملك مشترك بينهما، وكل واحد منهما في نصيب شريكه كالأجنبي، لايجوز له التصرف فيه إلا بإذنه" (سمرقندی، علاء الدین، تحفۃ الفقہاء ۳/ ۵، بیروت، العلمیہ، ۱۴۰۵ھ) (شرکت املاک کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم یہ ہے کہ ملکیت میں شرکت دونوں کے عمل سے ہو، مثال کے طور پر دونوں کوئی چیز خریدیں، یا دونوں کو کوئی شئی ہبہ کیا جائے، یا دونوں کے لئے وصیت کی جائے، اور اسے دونوں قبول کر لیں۔

اور دوسری قسم یہ ہے کہ ملکیت میں شرکت ان کے عمل کے بغیر ہو، اور وہ یہ ہے کہ دونوں کسی چیز کے وارث بن جائیں، اور ان دونوں صورتوں میں حکم ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ دونوں کے درمیان ملکیت مشترک ہے، اور دونوں میں سے ہر ایک اپنے شریک کے حصہ میں اجنبی کی طرح ہے، اس کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف جائز نہیں ہے)۔

لہٰذا اگر موروثی زمین کی تقسیم نہیں ہوئی ہو، تو تمام شرعی وارثین کی باہمی رضامندی سے فروخت ہونے والی ایسی موروثی زمین کا خریدنا جائز ہے۔

لیکن اگر موروثی زمین سے پھوپھیوں یا بہنوں کو حصہ نہیں دیا گیا، تو بیٹوں یا پوتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کا حصہ اگر وہ زندہ ہیں تو ان کو دیدیں، اور اگر فوت ہو چکی ہوں تو ان کے ورثہ کو دیں، اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو ان کو غصب میں شریک سمجھا جائے گا، اور اگر وہ دینے پر صراحتاً لینے سے منع کرتی ہیں، تو یہ ان کی طرف سے ہبہ سمجھا جائے گا، لیکن اس سلسلہ میں شرماحضوری کافی نہیں ہے، چنانچہ ابن حجر ہیتمی شافعیؒ امام غزالیؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"الغصب نوعان: غصب استيلاء، وغصب استحياء، فغصب الاستيلاء: أخذ الأموال على جهة الاستيلاء والقهر والغلبة، وغصب الاستحياء هو أخذه بنوع من الحياء، وهما حرامان؛ لأنه لا فرق بين الإكراه على أخذ الأموال بالسياط الظاهرة، وبين أخذه بالسياط الباطنة" (ہیتمی، الفتاوی الفقہیہ الکبری ۴/ ۱۱۲، بیروت، دار الفکر) (غصب کی دو قسمیں ہیں: ایک: قبضہ و تسلط جمانے پر مبنی غصب، دوم: شرم وحیا پر مبنی غصب، چنانچہ قبضہ جمانے پر مبنی غصب یہ ہے کہ تسلط جما کر اور کسی کو مجبور کر کے مال لے لیا جائے۔

اور حیاء پر مبنی غصب یہ ہے کہ ایک قسم کی شرط کے ذریعہ مال لے لیا جائے، اور یہ دونوں قسمیں حرام ہیں، اس لئے کہ ظاہری کوڑے کے ذریعہ مال لینے اور باطنی کوڑے کے ذریعہ مال لینے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے)۔

البتہ اگر ایسا نہیں کیا گیا، تو بیٹوں یا پوتوں سے ان کی ایسی موروثی زمین کا خریدنا مکروہ ہے؛ اس لئے کہ اس کے مال میں حرام کا بھی حصہ ہے، جس کی وجہ سے معاملہ میں اشتباہ ہے، اور ایسی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح ممانعت کی جگہ شبہ سے بچنے کو کہا ہے، جیسا کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه، ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام، كالراعي يرعى حول الحمى يوشك أن يرتع فيه'' (صحیح البخاری حدیث نمبر:۵۲، صحیح مسلم حدیث نمبر:۱۵۹۹، مسند احمد حدیث نمبر:۱۸۳۶۸) (سو جو شبہات سے بچے اس نے اپنے دین اور عزت کو محفوظ کرلیا، اور جو شبہات میں پڑ جائے وہ حرام میں پڑ سکتا ہے، جیسے چرواہا بادشاہ کی طرف سے ممنوعہ چراگاہ کے اردگرد چرائے، تو ہوسکتا ہے کہ اس کے جانور اس چراگاہ میں چرنے لگیں)۔

اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہود کے مال میں حلال وحرام دونوں ہوتے تھے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"سماعون للكذب أكالون للسحت" (المائدہ:۴۲) (یہ جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں، حرام کے بڑے کھانے والے ہیں)۔

اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہدیہ اور دعوت قبول کرتے تھے۔

اور شاید ایسے ہی شخص کے بارے میں جس کے حلال مال کے ساتھ حرام مال مل گئے ہوں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک شخص کے سوال: ''إن لي جارا يأكل الربا، وإنه لا يزال يدعوني'' (میرا ایک پڑوسی ہے جو سود کھاتا ہے، اور مجھے برابر دعوت دیتا رہتا ہے)، کے جواب میں فرمایا: ''مهنأة لك، وإثمه عليه'' (مصنف عبدالرزاق حدیث نمبر:۱۴۶۷۵، ۸/ ۱۵۰، ط:۲، بیروت، المکتب الاسلامی، ۱۴۰۳ھ) (اس کی اچھی چیز تیرے لئے مباح ہے، اور اس کا گناہ اس کے ذمہ ہے)۔

اسی بنا پر حنفیہ اور مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ جس کا اکثر مال حلال ہو اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے، چنانچہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

''إذا كان غالب مال المهدي حلالا، فلا بأس بقبول هديته، وأكل ماله ما لم يتبين أنه من حرام، وإن كان غالب ماله الحرام لا يقبلها، ولا يأكل، إلا إذا قال: إنه حلال ورثه أو استقرضه'' (ابن نجیم، الاشباہ والنظائر/ ۱۱۲، بیروت، العلمیہ، ۱۴۰۰ھ)

(اگر ہدیہ دینے والے کا اکثر مال حلال ہو، تو اس کے ہدیہ قبول کرنے اور اس کے مال کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، جب تک کہ یہ ظاہر نہ ہوجائے کہ وہ حرام مال میں سے ہے، اور اگر اس کا اکثر مال حرام ہو تو ہدیہ قبول نہ کرے، اور نہ اس کی دعوت کھائے، مگر اس وقت جبکہ دعوت دینے والا یہ کہے کہ یہ حلال مال ہے جو اسے وراثت میں ملا ہے یا اس نے قرض لیا ہے)۔

اور مالکیہ کے مسلک کے لئے دیکھیے: ابن رشد جد مالکی، البیان والتحصیل ۱۸/ ۱۹۴۔

جبکہ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک جس کا اکثر مال حرام ہو، اس کے ساتھ تعامل کرنا محض مکروہ ہے، چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں: ''وكان في مال المشتري حلال وحرام، ولم يعلم من أين يوفيه الثمن، لم يحرم على الإنسان الموهوب له. ولكن الورع تركه، ويتأكد الورع أو يخف بحسب كثرة الحرام في يد المشتري وقلته'' (نووی، المجموع ۹/ ۳۲۵، بیروت، دار الفکر، ۱۹۹۶ء)

(خریدار کے مال میں حلال اور حرام دونوں ہوں اور فروخت کنندہ کو معلوم نہ ہو کہ وہ اسے دام کہاں سے دے رہا ہے، تو خرید کردہ سامان جسے ہبہ کیا گیا وہ اس پر حرام نہیں ہے، لیکن ورع و پارسائی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے چھوڑ دے، اور خریدار کے قبضہ میں حرام مال کی کثرت اور قلت کے اعتبار سے ورع کا تقاضا زیادہ یا کم ہوگا)۔

اور ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: ''فإن لم يعلم من أيهما هو كرهنا لاحتمال التحريم فيه، ولم يبطل البيع لإمكان الحلال، قل الحرام أو كثر، وهذا هو الشبهة'' (ابن قدامہ، المغنی ۴/ ۳۳۳، ط:۱، بیروت، دار الفکر، ۱۴۰۵ھ)

(سو اگر معلوم نہ ہو کہ فروخت کردہ سامان حلال وحرام میں سے کس میں سے ہے، تو ہم بیع کو مکروہ قرار دیں گے، اس لئے کہ اس کے مال میں حرام ہونے کا احتمال ہے، اور حلال کے امکان کی وجہ سے بیع باطل نہ ہوگی، خواہ حرام کم یا زیادہ ہو، اور یہی شبہ ہے)۔

سوال نمبر ۴ کا جواب:

جولوگ حرام خور کے حالات سے واقف ہیں، ان کے لئے حرام خور سے اس کی حرام آمدنی سے حاصل کردہ زمین کو خریدنا ناجائز ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ معصیت پر تعاون ہے جو نص قطعی سے ممنوع ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (المائدہ:۲) (اور گناہ اور ظلم وزیادتی میں تعاون نہ کرو)۔

۲۔ مال حرام کے سلسلہ میں اصلی حکم یہ ہے کہ اسے اور ضائع ہونے کی صورت میں اس کے عوض کو اصل مالک یا ان کے ورثہ کو لوٹا دیا جائے، اگر وہ موجود ہوں، اور انہوں نے اپنے مال کے ناجائز عوض سے فائدہ نہ اٹھایا ہو، جیسے زنا کی اجرت کے طور پر مال نہ دیا ہو، ورنہ بغیر ثواب کی نیت کے اسے صدقہ کردیا جائے، لہذا مال حرام سے حاصل کردہ زمین کو خریدنے میں حرام خور کی حوصلہ افزائی ہے جو ناجائز ہے۔

۳۔ اگر مسلمان ایسی زمین کو نہیں خریدیں گے تو یہ حرام خور کے لئے تازیانہ عبرت ثابت ہوگا، اور وہ دوبارہ حرام آمدنی کی طرف نہیں لوٹے گا۔

۴۔ اگر مسلمان ایسی زمین کو نہیں خریدیں گے، تو حرام آمدنی والا اسے بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کرنے پر مجبور ہوگا۔

۵۔ اس سے خریدنے میں حرام پر اسے برقرار رکھنا ہے۔

۶۔ مال حرام سے لیا ہوا بھی حرام ہی کے درجہ میں ہے، تو گویا خریدنے والا حرام مال لینے والے کے درجہ میں ہوا۔

۷۔ جو چیز حرام ہے اس کا ثمن یعنی دام لینا بھی حرام ہے۔

۸۔ فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ جس کا مال حرام ہو اس کے ساتھ معاملہ کرنا درست نہیں ہے، چنانچہ علامہ شیخی زادہ عبدالرحمن بن محمد حنفی (و: ۱۰۷۸ھ) لکھتے ہیں: ''وإن غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل'' (شیخی زادہ، مجمع الانہر ۴/۱۸۶، بیروت، العلمیۃ، ۱۴۱۹ھ۔۱۹۹۸ء) (اور اگر ہدیہ دینے والے کا زیادہ تر مال حرام ہو تو اسے قبول نہ کرے اور نہ کھائے)۔

اور ہندیہ میں ہے: ''إن ما يشترى من السوق، ويعلم قطعًا أنهم يبايعون الأتراك، ومن غالب مالهم الحرام، ويجرى بينهم الربا، والعقود الفاسدة، كيف يكون؟ فهو على ثلاثة أوجه: فكل عين قائمة يغلب على ظنه أنهم أخذوها من الغير بالظلم، وباعوها في السوق؛ فإنه لا ينبغي أن يشترى ذلك، وإن تداولتها الأيدي. والثاني: إن علم أن المال الحرام بعينه قائم، إلا أنه اختلط بالغير بحيث لا يمكن التمييز عنه؛ فإن على أصل أبي حنيفة بالخلط يدخل في ملكه، إلا أنه لا ينبغي أن يشترى منه حتى يرضى الخصم بدفع العوض، فإن اشتراه يدخل في ملكه مع الكراهة. والثالث: إذا علم أنه لم تبق العين المغصوبة، أو المأخوذ بالربا وغيره، وإنما باعها لغيره. فإن الذي يعلم أنه لم تبق تلك العين، جاز له أن يشترى منهم، هذا كله من حيث الفتوى، أما إذا أمكنه أن لا يشترى منهم شيئًا، كان أولى أن لا يشترى، ولعل أنه يتعذر ذلك في بلاد العجم'' (ہندیہ ۵/ ۳۶۴ کتاب الکراہیۃ، الباب الخامس والعشرون في البيع والاستيام) (جو چیز بازار سے خریدی جاتی ہے، اور یہ یقینی طور سے معلوم ہے کہ اہل بازار ترک قوم کے ساتھ خرید وفروخت کا معاملہ کرتے ہیں، حالانکہ ان کا زیادہ تر مال حرام ہوتا ہے، اور ان کے درمیان سودی معاملہ اور فاسد عقود ہوتے ہیں، تو اس کا حکم کیا ہوگا؟ تو اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) ہر متعین اور موجود چیز جس کے بارے میں آدمی کو گمان غالب ہو کہ انہوں نے اسے دوسرے سے ظلم کرکے لیا ہے، اور بازار میں بیچ دیا ہے، تو مناسب نہیں ہے کہ اسے خریدے، اگرچہ وہ مختلف ہاتھوں میں آیا ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معلوم ہو کہ متعین مال حرام موجود ہے، مگر وہ دوسرے مال سے اس طرح مل گیا ہے کہ اسے اس سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے، تو امام ابوحنیفہؒ کے ضابطہ کے مطابق خلط ملط ہونے سے وہ چیز اس کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے، مگر مناسب نہیں کہ اس سے خریدے، یہاں تک کہ اس مال کا دعویدار عوض کی ادائیگی پر راضی ہوجائے، سوا گر اسے خرید ہی لے تو کراہت کے ساتھ وہ چیز اس کی ملکیت میں داخل ہوجائے گی۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اسے معلوم ہوجائے کہ غصب کردہ چیز یا سود وغیرہ کے ذریعہ لیا ہوا مال باقی نہیں رہا، اس نے اسے دوسرے سے بیچ دیا، سو جسے معلوم ہو کہ وہ چیز باقی نہیں رہی تو اس کے لئے جائز ہے کہ ان سے خریدے۔

ان ساری صورتوں کا یہ حکم فتوی کے لحاظ سے ہے، البتہ اگر اس کے لئے ممکن ہو کہ ان سے کچھ نہ خریدے، تو یہ زیادہ بہتر ہے، اور یہ شاید عجمی ملکوں میں دشوار ہے۔

اور علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ رقمطراز ہیں: ''وإن علم أنه حرام فهو حرام'' (ابن قدامہ، المغنی ۴/ ۳۳۳) (اور اگر خریدار کو یقین ہو کہ فروخت کردہ سامان حرام ہے، تو اس کا خریدنا حرام ہے)۔

اور علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''کائنات کے اندر جو بھی غصب کردہ اموال ہیں، اور ایسے عقود کے ذریعہ قبضہ کردہ اموال ہیں جو قبضہ کرنے سے مباح نہیں ہوتے ہیں، اگر مسلمان اسے جان لے تو اس سے بچے، سو جس کے بارے میں مجھے معلوم ہو کہ اس نے مال چرایا ہے، یا اپنی امانت میں خیانت کی ہے، یا غصب کیا ہے، اور ناحق مجبور کر کے غصب کردہ شخص سے لیا ہے، تو میرے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مال اس سے لوں، نہ ہبہ کے طور پر، اور نہ ہی تبادلہ کے طور پر، اور نہ ہی اجرت کی ادائیگی کے طور پر، اور نہ ہی فروخت کردہ سامان کے دام کے طور پر، اور نہ ہی قرض کے بدلہ میں، کیونکہ یہ اس مظلوم کا بعینہ مال ہے'' (ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی ۲۹/ ۳۲۳، بیروت، دار الوفاء، ط: ۳، ۱۴۲۶ھ۔ ۲۰۰۵ء)۔

اور ہندیہ میں ہے: ''رجل مات وكسبه من الحرام، ينبغي للورثة أن يتعرفوا، فإن عرفوا أربابها ردوا عليهم، وإن لم يعرفوا تصدقوا به'' (ہندیہ ۲/ ۲۱۰) (ایک شخص مرگیا، اور اس کی کمائی حرام سے تھی، تو وارثین کے لئے مناسب ہے کہ اصل مالک کو جاننے کی کوشش کریں، سو اگر اصل مالکین کو جان لیں تو ان کو واپس کردیں، اور اگر جان نہ سکیں تو حرام آمدنی کو صدقہ کردیں)۔

ان تمام فقہی اقتباسات سے واضح ہے کہ حرام آمدنی کے ذریعہ حاصل کی ہوئی زمین کا خریدنا درست نہیں ہے۔

سوال نمبر ۵ کا جواب:

بیچنے والے شخص کے لئے حکومتی ادارہ سے منظور نقشے میں تبدیلی کرتے ہوئے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کو فروخت کردینا، اور دوسرے لوگوں کو جانتے بوجھتے اس کو خریدنا جائز نہیں ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ غیر معصیت میں حکومتِ وقت خواہ غیر مسلم حکومت ہو، کے قوانین کی پابندی ضروری ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (المائدہ: ۲) (اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو، اور گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں باہم ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو)۔

اور یہ ظاہر ہے کہ سڑکوں کی چوڑائی کا رقبہ طے کرنا، پلے گراؤنڈ (Playground) کے لئے جگہ رکھوانا، مسجد کی جگہ مقرر کرانا، اور سوئمنگ پول (Swimming Pool) کی جگہ چھوڑوانا عام لوگوں کی صحت کی حفاظت اور ان کو ضرر سے بچانے کے نقطۂ نظر سے ہے، سو یہ خیر اور بھلائی کا کام ہے، لہذا اس سلسلہ میں حکومت کا تعاون واجب ہے۔

نیز اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ''يا أيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم'' (النساء: ۵۹) (اے ایمان والو! اللہ، رسول اور اپنے سربراہان کار کی اطاعت کرو)۔ اور ذمہ داران کار میں اہل علم اور حکمراں دونوں شامل ہیں، اگرچہ امام طبریؒ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ سربراہان کار سے مراد حکمراں ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''وأولى الأقوال في ذلك بالصواب، قول من قال: هم الأمراء والولاة، لصحة الأخبار عن رسول الله ﷺ بالأمر بطاعة الأئمة والولاة، فيما كان لله طاعة وللمسلمين مصلحة'' (طبری، جامع البیان فی تاویل القرآن ۸/ ۵۰۲، ط: ۱، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۲۰ھ۔ ۲۰۰۰ء، تحقیق: احمد محمد شاکر، ع۔ أ۔ ۲۴) (اس سلسلہ میں زیادہ صحیح ان لوگوں کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ذمہ داران کار سے مراد حکمراں ہیں؛ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی صحیح احادیث نے یہ

بات ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالی کی طاعت اور مسلمانوں کی مصلحت کے مطابق امور میں حکمراں کی اطاعت کا حکم دیا ہے)۔

لیکن آیت کے عموم کو دیکھتے ہوئے یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ "اُولوالأمر" سے مراد امت کے سربراہان کار ہیں، لہذا اس کے مصداق کے اندر ارباب علم وبصیرت اور ارباب اقتدار وسیاست دونوں شامل ہیں، البتہ ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت کے تحت ہے، لہٰذا اللہ ورسول کے احکام کے خلاف ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

اور یہ امور پوشیدہ نہیں ہے کہ عام لوگوں کو ضرر سے بچانا شریعت کے مطابق ہے، لہذا اس سلسلہ میں حکومت کے وضع کردہ قوانین کی پابندی ضروری ہے۔

اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسمعوا وأطيعوا، وإن استعمل عليكم عبد حبشي كأن رأسه زبيبة" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۱۴۲ے، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۸۶۰) (تم پر سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے، اگر چہ کسی کالے کلوٹے غلام کو تمہارا امیر بنادیا گیا ہو، گویا کہ اس کا سر بال کے کالے پن اور گھونگھریالے پن میں کشمش کے دانے کی طرح ہو)۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جائز امور میں حکومت کے وضع کردہ قوانین کی پابندی لازم ہے۔

اور عقلی دلائل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عام لوگوں کی صحت کی حفاظت کی خاطر اور ان سے ضرر کے ازالہ کے لئے حکومت کی ہدایات کی تعمیل واجب ہو، کیونکہ حکومت ضرر عام کو دور کرنے کی ذمہ دار ہے، لہذا اس سلسلہ میں اس کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی لازم ہے۔

اور فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر حاکم اور ذمہ دار کار کسی ایسے کام کا حکم دے جس کی تعمیل میں خالق کی نافرمانی نہ ہوتی ہو تو اس کام کو انجام دینا لازم ہے، چنانچہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں: "طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة" (ابن عابدین، ردالمحتار ۲/۱۷۲، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ-۲۰۰۰ء) (امام کی اطاعت ایسے معاملات میں جو معصیت نہ ہوں، واجب ہے)۔

۲۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے راستوں کی چوڑائی کا رقبہ طے فرمایا ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اجعلوا الطريق سبع أذرع" (مسند احمد حدیث نمبر: ۷۔۹۵۳، ۱۰۰۱۲، ابوداود حدیث نمبر: ۳۶۳۳، ترمذی حدیث نمبر: ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۳۳۸، مسند طیالسی حدیث نمبر: ۲۵۵۵، طحاوی شرح مشکل الآثار حدیث نمبر: ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، اور اس کی سند صحیح ہے) (راستہ سات گز رکھو)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مفاد عام کی خاطر سڑکوں کی چوڑائی کا رقبہ طے کرنے کا حق حکومت کو ہے، اور اس کی پابندی لازم ہے، چنانچہ علامہ مبارکپوری محمد عبدالرحمن طبری کے حوالہ سے لکھتے ہیں: "معناه أن يجعل قدر الطريق المشتركة سبعة أذرع، ثم يبقى بعد ذلك لكل واحد من الشركاء في الأرض قدر ما ينتفع به ولا يضر غيره" (مبارکپوری، تحفۃ الاحوذی ۴۲۱/۳) (حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ مشترک راستہ کی مقدار (کم سے کم) سات گز مقرر کیا جائے، پھر اس کے بعد زمین میں شراکت رکھنے والے کے لئے اتنی مقدار باقی رہ جائے گی جس سے وہ فائدہ اٹھائیں اور دوسرے کو ضرر نہ پہنچائیں)۔

۳۔ سڑکوں، پلے گراؤنڈ (Playgournd) اور سوئمنگ پول (Swimming Pool)، اور کالونی بنانے والا ترغیب کے لئے مسجد کی جو جگہ مقرر کرتا ہے، عام طور سے زمین کے دیگر پلاٹ (Plat) یعنی حصے میں اس کی قیمت شامل ہوتی ہے، تو پھر کالونی (Colony) بنانے والے کے لئے دوبارہ اس کی قیمت حاصل کرنا کیونکر جائز ہوگا؟

۴۔ نقشہ کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے کالونی میں بسنے والے افراد کی صحت وبائی امراض کا شکار ہوتی رہتی ہے۔

۵۔ راستوں کو تنگ کرنے کی وجہ سے کالونی میں بسنے والے کی صحت مختلف خطرات سے دوچار ہوتی رہتی ہے، کیونکہ تنگ راستہ کی وجہ سے زیادہ آلودگی پھیلتی ہے۔

البتہ مسجد کی جگہ مقرر کرنا لے آوٹ (Lay out) یعنی آبادی کے نقشہ کی منظوری کے لئے ضروری نہیں ہے، یہ کالونی بنانے والا محض مسلمانوں کی ترغیب کے لئے نقشہ میں دکھاتا ہے؛ اس لئے اگر اس نے اس قطعۂ زمین کی قیمت دوسرے قطعۂ اراضی میں شامل نہیں کی ہے، تو اس کے لئے اسے بیچنا جائز ہے، اور دوسرے لوگوں کا جانتے بوجھتے اس کو خریدنا بھی جائز ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں: "والملك يزول عن الموقوف بأربعة

بافراز مسجد" (حصکفی، الدر المختار ۴ / ۳۴۳، بیروت، دار الفکر ۱۳۸۶ھ، ع۔ا۔: ۶) (وقف کردہ شئی سے ملکیت چار چیزوں سے زائل ہوجاتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مسجد کو علاحدہ کردے)، اور علامہ شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: "عبر بالإفراز؛ لأنه لو كان مشاعًا، لا يصح إجماعًا، وأفاد أنه يلزم بلا قضاء" (ابن عابدین، رد المحتار ۴ / ۳۴۳، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ۔۲۰۰۰ء، ع۔ا۔: ۸) (علاحدہ کرنے کی تعبیر اختیار کی، اس لئے کہ اگر مشترک ہو تو بالاتفاق صحیح نہیں ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قاضی کے فیصلے کے بغیر بھی اس کا مسجد ہونا لازم ہوجائے گا)۔

اور کوئی جگہ مسجد کے لئے وقف اس وقت ہوگی جبکہ وقف کرنے والا اس میں نماز کی اجازت دے دے، محض نیت یا نقشہ میں دکھانے سے وہ جگہ مسجد کے لئے وقف نہ ہوگی، علامہ حصکفی حنفیؒ لکھتے ہیں: "ويزول ملكه عن المسجد والمصلى بالفعل، وبقوله: "جعلته مسجدًا عند الثاني، وشرط محمد والإمام الصلاة فيه بجماعة، وقيل: يكفي واحد، وجعله في الخانية، ظاهر الرواية" (حصکفی، الدر المختار ۴/ ۳۵۶۔۳۵۷) (وقف کرنے والے کی ملکیت مسجد اور عیدگاہ سے زائل ہوجائے گی عمل یعنی اس میں نماز پڑھنے سے، اور امام ابویوسف کے نزدیک زبان سے یہ کہنے سے کہ میں نے اسے مسجد قرار دیا، اور امام محمد اور امام ابوحنیفہ نے ملکیت ختم ہونے کے لئے اس میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی شرط لگائی ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک کا نماز پڑھنا کافی ہے، اور اسی کو "فتاوی قاضی خاں" میں ظاہر الروایہ قرار دیا ہے)، البتہ اگر کالونی بنانے والا مسلمان ہے، تو اسے اپنا وعدہ پورا کرنا چاہئے کہ یہی مسلمانوں کے بلند ترین اخلاق میں سے ہے۔

سوال نمبر ۶ کا جواب:

لے آوٹ (Layout) یعنی آبادی کا نقشہ منظور کرنے کے لئے کالونی (Colony) میں گارڈن (Gardeng) اور پلے گراؤنڈ (Playground) رکھنا قانونی اعتبار سے ضروری ہے، لہذا کالونی بنانے والے پر واجب ہے کہ اس قانون کی تعمیل کرے، اور اس مخصوص جگہ کو دوسرے مقصد کے لئے نہ بیچے، یا نہ دے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ غیر معصیت میں حکومت کے حکم کی تعمیل لازم ہے، چنانچہ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لا طاعة لمخلوق في معصية الله عز وجل" (مسند احمد حدیث نمبر: ۱۰۹۵، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (اللہ تعالی کی نافرمانی کے ساتھ کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے)۔ اور حضرت علیؓ سے ہی روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لا طاعة لمخلوق في معصية الله، إنما الطاعة في المعروف" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۴۳۴۰، ۷۲۵۷، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۸۴۰، حمیدی، الجمع بین الصحیحین ۱/ ۷۹، حدیث نمبر: ۱۳۲، ط: ۲، بیروت، دار ابن حزم، ع۔ا۔: ۴) (اللہ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے، اطاعت تو بس نیکی کے کام میں جائز ہے)۔

چونکہ ملک کے دیگر باشندوں کی طرح کالونی (Colony) میں رہائش رکھنے والے کی زندگی کو خطرات سے بچانا حکومت کی ذمہ داری ہے، لہذا اجتماعی مصالح، مفاد عامہ کے تحفظ اور ضرر عام کے ازالہ کی خاطر حکومت کے وضع کردہ اس طرح کے قانون کی پابندی لازم ہے۔

۲۔ مصالح عامہ قائم کرنا اور ایسا نظام بنانا جس سے ملک کے تمام شہریوں کی صحت محفوظ رہے، حکومت کی ذمہ داری ہے، لہذا حکومت اپنے فرائض کو انجام دیتے ہوئے، اگر ایسے قوانین بناتی ہے جو کالونی میں رہائش رکھنے والوں کی صحت کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، تو ان کی تعمیل لازم ہے، اور خلاف ورزی ناجائز اور گناہ ہے۔

۳۔ فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر حاکم اور ذمہ دار کسی ایسی چیز کا حکم دے جس کی تعمیل میں اللہ تعالی کی نافرمانی نہ ہوتی ہو تو اس چیز کو وجود میں لانا لازم ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں: "طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض، فكيف فيما هو طاعة" (کاسانی، بدائع الصنائع ۷/ ۱۴۰، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۹۸۲ء) (جو چیزیں معصیت میں داخل نہیں، ان میں امام کی اطاعت فرض ہے، تو جو چیزیں طاعت ہیں ان میں کس درجہ اطاعت لازم ہوگی)۔

البتہ چونکہ مالک زمین کالونی بنانے والا اس صورت میں ایک مفاد عام کے لئے مخصوص جگہ کو دوسرے مفاد عام کے لئے دیتا ہے جو اگرچہ مناسب نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ غصب کا معاملہ بھی نہیں ہے، اس لئے اس جگہ پر مسجد بنانا درست ہے اور بننے والی مسجد شرعی مسجد ہے، اور اس میں نماز کسی کراہیت کے بغیر درست ہے۔

سوال نمبر ۷ کا جواب:

مکان انسان کی بنیادی ضرورتوں میں شامل ہے، اور یہ حکومت کی ذمہ داری میں داخل ہے کہ وہ عوام کی بنیادی ضروریات ان سے کسی نفع کے مطالبہ کیے بغیر فراہم کرے، اور اس مقصد کے لئے اپنے غیر پیداواری اسکیموں (Schemes)، منصوبوں (Plans) اور پروجیکٹوں (Projects) میں کمی کر کے بچت کرے، لیکن چونکہ حکومت کے وسائل اور ذرائع آمدنی بھی محدود ہوتے ہیں، لہٰذا ہر حکومت اس پوزیشن (Position) میں نہیں ہوتی ہے کہ وہ تمام باشندوں کے لئے رہائش فراہم کرے، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ غریبوں کے لئے کسی زمین کو کالونی (Colony) کی حیثیت سے منظور کرانے کے مراحل کو آسان بنائے، اور زمین کی خرید وفروخت پر لگنے والے ٹیکس کا نظام ایسا بنائے کہ لوگ آسانی کے ساتھ ٹیکسیز (Taxes) ادا کر سکیں، ٹیکس کا نظام ایسا نہ ہو کہ لوگ اس سے بچنے کی تدبیریں سوچیں، اس سلسلہ میں ملک میں موجود تنظیموں، جماعتوں اور سیاسی پارٹیوں کو مل کر ٹیکس کے ظالمانہ نظام کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے، اور اس میں تبدیلی لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

نیز ملک کے باشندگان کو باشعور ہونا چاہئے تاکہ وطن عزیز سے رشوت ستانی کی وبا ختم ہو۔

ملک کے موجودہ حالات میں جہاں آبادی میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے، اور مہنگائی روز بروز بڑھ رہی ہے، اور مکان کے حصول کے لئے لوگوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہے، حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ آسان قانون اور صالح نظام بنائے، تاکہ ملک کے ہر باشندہ کو مناسب مکان دستیاب ہوسکے کہ مکان ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے بغیر انسان کے لئے زندگی گزارنا ممکن ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ایک عظیم نعمت کے طور پر ذکر کیا ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا، وجعل لکم من جلود الأنعام بیوتاً تستخفونھا یوم ظعنکم ویوم إقامتکم، ومن أصوافھا وأوبارھا وأشعارھا أثاثاً ومتاعاً إلی حین" (النحل: ۸۰) (اور اللہ ہی نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو مقام سکون بنایا، اور تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر بنائے، جنہیں تم اپنے کوچ اور قیام کے دن ہلکا پھلکا پاتے ہو، اور ان کے اون اور ان کے روئیں اور ان کے بالوں سے تمہارے لئے گھر کا سامان اور ایک وقت تک فائدہ اٹھانے کی چیزیں بنائیں)۔

یہ آیت اس بات پر صریح دلیل ہے کہ مکان اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے جو انسان کے لئے وجہ سکون وراحت اور ذریعۂ حفاظت ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کشادہ مکان کو انسان کی نیک بختی کی علامتوں میں سے ایک علامت قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ثلاث من السعادۃ: المرأۃ الصالحۃ، والمسکن الواسع، والمرکب الھنئی" (مسند بزار ۴/۲۰، حدیث نمبر: ۱۱۸۰، حاکم، المستدرک علی الصحیحین حدیث نمبر: ۲۶۸۴، مسند احمد حدیث نمبر: ۱۴۴۵، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (تین چیزیں انسان کی خوش بختی کی نشانی ہیں: نیک بیوی، کشادہ مکان اور عمدہ سواری)۔

اور ایک روایت میں ہے کہ جو ان ہی سے مروی ہے: "أربع من السعادۃ: المرأۃ الصالحۃ، والمسکن الواسع، والجار الصالح، والمرکب الھنئی" (صحیح ابن حبان حدیث نمبر: ۴۰۳۲، ابونعیم، حلیۃ الاولیاء ۸/۳۸۸، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (چار چیزیں انسان کی خوش بختی کی علامت ہیں: نیک بیوی، کشادہ مکان، نیک پڑوسی، اور عمدہ سواری)۔

اور حضرت نافع بن عبدالحارث ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من سعادۃ المرء: الجار الصالح، والمرکب الھنئی، والمسکن الواسع" (مسند احمد حدیث نمبر: ۱۵۳۷۲، ابن ابی عاصم، الاحاد والمثانی حدیث نمبر: ۲۳۳۶، طحاوی، شرح مشکل الآثار حدیث نمبر: ۲۷۷۳، بخاری، الادب المفرد حدیث نمبر: ۴۵۷،۱۱۶، اور یہ صحیح لغیرہ درجہ کی حدیث ہے) (آدمی کی خوش بختی کی نشانیوں میں سے ہیں: نیک ہمسایہ، عمدہ سواری اور کشادہ مکان)۔

اور کشادہ مکان کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں کشادگی کی دعا مانگتے ہوئے کہتے تھے:

"اللھم اغفرلی ذنبی، ووسع لی فی داری، وبارک لی فیما رزقتنی" (مسند احمد حدیث نمبر: ۱۶۵۹۹، اور یہ حسن لغیرہ درجہ کی حدیث ہے)

(اے اللہ میرے گناہ بخش دے، اور میرے گھر میں کشادگی عطا فرما، اور جو روزی مجھے دی ہے اس میں برکت عطا فرما)۔

اس لئے ملک کے ارباب فکر ودانش کو چاہئے کہ ٹیکسز (Taxes) کے نظام اور دیگر نظام میں بہتری لانے کے لئے ممکنہ حد تک عملی جدوجہد کریں تاکہ

غریب افراد جن کے مالی وسائل تنگ ہیں وہ بھی مناسب مکان حاصل کرسکیں۔

البتہ جب تک بہتر نظام قائم نہیں ہوجاتا ہے اس وقت تک قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بعد ہی کالونیاں (Colonies) بنانا اور پلاٹ (Plat) فروخت کرنا مناسب ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ حکومت کی خیرخواہی کا تقاضا ہے کہ عوامی بہبود کی خاطر بنائے گئے قوانین کی خلاف ورزی نہ کی جائے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے معاملات کے ذمہ دار حکمراں حضرات اور عوام الناس کے ساتھ خیرخواہی کو لازم قرار دیا ہے جیسا کہ حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "الدين النصيحة، قلنا: لمن؟ قال: لله ولكتابه ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم" (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۵۵) (دین خیرخواہی کا نام ہے، ہم نے پوچھا کن لوگوں کی خیرخواہی کا نام ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسول، مسلمانوں کے حکمراں اور عام لوگوں کی خیرخواہی کا نام ہے)۔

نیز ایک اور حدیث میں ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"وأن تناصحوا من ولاه الله أمركم" (بخاری، الادب المفرد حدیث نمبر: ۴۴۲، مالک، موطأ، حدیث نمبر: ۱۷۹۶، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (اور اللہ تعالی نے تمہارے معاملات کا جن لوگوں کو ذمہ دار بنایا ہے، ان کی خیرخواہی کرو)۔

اور حکمراں کی خیرخواہی کا مطلب یہی ہے کہ مناسب قانون کے سلسلہ میں ان کا تعاون کیا جائے، چنانچہ امام ابوسلیمان خطابی تحریر فرماتے ہیں: "والنصيحة لأئمة المسلمين أن يطيعهم في الحق" (خطابی، معالم السنن ۴/۱۲۵، ط: ۱، حلب، المطبعۃ العلمیہ، ۱۳۵۱ھ۔ ۱۹۳۲ء) (مسلمانوں کے حکمرانوں کی خیرخواہی یہ ہے کہ حق کے سلسلہ میں ان کی اطاعت کی جائے)۔

اور امام نووی شافعیؒ لکھتے ہیں: "وأما النصيحة لأئمة المسلمين فمعاونتهم على الحق وطاعتهم فيه" (نووی، المنہاج شرح صحیح مسلم ۲/۳۸، ط: ۲، بیروت، دار الاحیاء ۱۳۹۲ھ) (رہا مسلمانوں کے حکمرانوں کی خیرخواہی تو حق کے سلسلہ میں ان کا تعاون کرنا اور اس میں ان کی اطاعت کرنا ہے)۔

لہذا حکومت کے تعاون اور جائز امور میں اس کی اطاعت کا تقاضا ہے کہ کالونی (Colony) میں رہائش رکھنے والوں کی صحت کے تحفظ اور ان کو ضرر سے بچانے کی خاطر اس کے وضع کردہ قوانین کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔

۲۔ قانونی تقاضوں کی تکمیل کیے بغیر جو کالونیاں (Colonies) بنائی جاتی ہیں اور جو پلاٹ فروخت کیے جاتے ہیں، عام طور پر ان میں ان پہلوؤں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے جو قدرتی آفات اور دیگر اضرار سے بچنے کے لئے لازم ہیں۔

۳۔ قانونی تقاضوں کی تکمیل کیے بغیر جو کالونیاں بنائی جاتی ہیں اور جو پلاٹ فروخت کیے جاتے ہیں اور جن پر بعد میں تعمیر ہوتی ہے ان میں ڈرینج لائن (Drainageline) وغیرہ کا مناسب انتظام نہیں ہوتا ہے، جس سے ماحولیاتی آلودگی (Pollution) بھی پیدا ہوتی ہے، اور کالونی میں رہائش رکھنے والے افراد کی صحت بھی مختلف وباؤں اور امراض کی زد میں رہتی ہے۔

لہذا مناسب یہی ہے کہ قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بعد ہی کالونیاں بنائیں جائیں اور پلاٹ فروخت کیے جائیں۔

سوال نمبر ۸ کا جواب:

اللہ تعالی کے نزدیک سود کا معاملہ انتہائی سنگین ہے، گویا سودی معاملہ کرنے والا اللہ تعالی کے ساتھ آمادۂ جنگ ہے، اسی لئے اسلام صرف سود ہی نہیں بلکہ اس کے سایہ سے بھی دور رہنے کو واجب قرار دیا ہے، چنانچہ کتاب وسنت میں سودخوری پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئیں ہیں، اس کی شناعت، قباحت اور برائی کو سمجھنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالی نے اس پر سودخور کو اعلان جنگ دیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "يأيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربوا إن كنتم مؤمنين، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله...." (البقرۃ: ۲۷۸۔۲۷۹) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ باقی ماندہ سود ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو، سو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہوجاؤ کہ اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے)۔

اور فرمان الہی ہے: "يأيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربا أضعافًا مضاعفة، واتقوا الله لعلكم تفلحون" (آل عمران: ۱۳۰) (اے ایمان والو! سود

نہ کھاؤ دگنا چوگنا بڑھا کر، اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاؤ)، اور ارشاد ہے: "يمحق الله الربا ويربي الصدقات" (البقرہ: ۲۷۶) (اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے)، اور سود سے باز نہ رہنے پر کافروں کی طرح دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "واتقوا النار التي أعدت للكافرين" (آل عمران: ۱۳۱) (اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کو زنا سے زیادہ سخت جرم قرار دیا ہے کہ حرام لقمہ ہی انسان کو معاصی کی طرف بڑھاتا ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "الربا سبعون حوبا، أيسرها أن ينكح الرجل أمه" (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۲۷۴، بیہقی شعب الایمان حدیث نمبر: ۵۵۲۲، مسند بزار حدیث نمبر: ۸۵۳۸، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (سود ستر قسم کے گناہ پر مشتمل ہے، اور ان سنگین گناہوں میں سے خفیف تر یہ ہے کہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سودی معاملہ میں شریک ہونے والے تمام افراد کو مجرم اور گنہگار قرار دیا ہے، جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ "لعن رسول الله ﷺ آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال هم سواء" (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۵۹۸) (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر، گواہوں پر، لکھنے والے پر، اور فرمایا: یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں)۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات سود خور کو سنگین عذاب میں مبتلا پایا، جیسا کہ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات مشاہدہ کیے ہوئے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"فانطلقنا حتى أتينا على نهر من دم، فيه رجل قائم، وعلى شطر النهر رجل بين يديه حجارة، فأقبل الرجل الذي في النهر، فإذا أراد الرجل أن يخرج، رمى الرجل بحجر في فيه، فرده حيث كان، فجعل كلما جاء ليخرج رمى في فيه بحجر، فيرجع كما كان، فقلت: ما هذا؟ فقال: الذي رأيته في النهر آكل الربا" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۱۳۸۶، ۲۰۸۵) (سو ہم چلے، یہاں تک کہ خون کی ایک نہر کے پاس آئے جس میں ایک شخص کھڑا تھا، اور نہر کے کنارہ ایک شخص تھا جس کے سامنے پتھر تھے، اور جو شخص نہر میں تھا وہ آنے لگا، اور جب نکلنا چاہا تو نہر کے کنارہ والے شخص نے اسے پتھر مار کر اس جگہ لوٹا دیا جہاں وہ تھا، تو جب بھی وہ نکلنے کے لئے آتا تو کنارہ والا شخص اس کے منہ پر پتھر مارتا جس سے وہ اپنی جگہ لوٹ جاتا، سو میں نے حضرت جبریل سے پوچھا، یہ کیا منظر ہے؟ تو جواب ملا: جس شخص کو آپ نے نہر میں پایا، وہ سود خور ہے)۔

اور حضرت عمر بن الخطابؓ نے سود کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے فرمایا: "فدعوا الربا والريبة" (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۲۷۶، اور اس کی سند صحیح ہے) (سود اور شبہ سود دونوں کو چھوڑ دو)۔

اور ایک مومن کی یہ شان ہونی چاہئے کہ وہ ہر حال میں اللہ سے ڈرے، چنانچہ ممنوعات سے ہر حال میں بچنا لازم ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "فإذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه، وإذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۷۲۸۸، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۳۳۷) (سو جب کسی چیز سے میں تمہیں منع کروں تو اس سے دور رہو، اور جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اس سے جتنا تمہارے بس میں ہو اتنا انجام دو)۔

اسی لئے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فاتقوا الله ما استطعتم واسمعوا وأطيعوا" (۶۴/ التغابن: ۱۶) تو اللہ سے ڈرتے رہو جہاں تک ہو سکے، اور سنو اور مانو۔

اسی وجہ سے سودی لون (Loan) لینا اسی وقت مباح ہے، جبکہ جان کے ضائع ہونے کا خدشہ ہو، جیسا کہ فرمان الہی ہے: "فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه، إن الله غفور رحيم" (۲/ البقرہ: ۱۷۳) (سو جو مجبور ہو جائے، اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے اور رحم کرنے والا ہے)۔

اور فقہاء نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے کہ بدرجۂ مجبوری ہی سودی لون لینے کی گنجائش ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: "يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (ابن نجیم، الاشباہ والنظائر/ ۹۲) (محتاج شخص کے لئے جائز ہے کہ سود پر قرض حاصل کرے)۔

اور اس صورت میں گناہ لینے والے پر ہوگا، کیونکہ دینے والا مجبور ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں جب ہم سوال میں ذکر کردہ صورت کو دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہائٹ منی (White Money) والا جس قانونی دشواری سے بچنا چاہتا ہے وہ اس پر عائد ہونے والے ٹیکس (Tax) سے بچنا ہے، لہٰذا یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ ٹیکس جائز اور برحق ہے یا نہیں؟ اگر یہ ٹیکس برحق ہے اور مفاد عامہ کے لئے ضروری ہے، تو پھر مفاد عامہ کے سلسلہ میں سب کو تعاون کرنا چاہئے، اور اس کو وجود میں لانے والی چیز کی ادائیگی کی پابندی کرنی چاہئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وتعاونوا على البر والتقوى، ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (مائدہ: ۲) (تم نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو، اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو)۔

اور اگر یہ ٹیکس ناحق ہے مثلاً کسی خدمت کے بدلہ نہیں ہے، بلکہ حکومت ناحق ٹیکس لیتی ہے، یا ٹیکس کا استعمال ناجائز اخراجات یا دکھاوے یا خوش عیشی اور تعیش میں ہوتا ہے، تو مجبوراً لون لینے کی گنجائش ہے، سود دینے کو رشوت دینے کے جواز پر قیاس کرتے ہوئے، یعنی جس طرح بدرجۂ مجبوری رشوت دے کر اپنے جائز حق کی تحصیل کی گنجائش ہے، اسی طرح سودی لون لے کر ظالمانہ ٹیکس اور دیگر قانونی دشواری سے بچنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

''لو اضطر إلى دفع الرشوة لإحياء حقه، جاز له الدفع، وحرم على القابض'' (رد المحتار ۵/ ۲۷)

(اگر اپنے حق کو زندہ کرنے کے لئے رشوت دینے پر مجبور ہوجائے، تو اس کے لئے دینا جائز ہے، اور لینے والے پر حرام ہے)، البتہ ملک کے ارباب علم وفکر ودانش کو ممکنہ حد تک اس بات کی عملی جدوجہد کرنی چاہئے کہ ملک میں ٹیکس (Tax) کا بہتر نظام قائم ہو، اور مال وملکیت کے سلسلہ میں ایسا قانون بنے کہ لوگ آسانی کے ساتھ اس پر عمل کرسکیں، اور قانون سے فرار کی تدبیریں نہ سوچیں۔

متبادل طریقہ (Alternative):

پھر بھی موجودہ صورتحال میں بہتر یہ ہے کہ زمین کی خریداری شراکت (Partnership) کے ساتھ ہو، یعنی تمام شرکاء سے سرمایہ اکٹھا کرنے کے بعد زمین کی خریداری ہو، اور زمین کی خریداری کے نتیجہ میں تمام شرکاء کے درمیان "شرکت ملک" قائم ہوجائے، چنانچہ علامہ تمرتاشیؒ لکھتے ہیں:

''شركة ملك، وهى أن يملك متعدد: اثنان فأكثر عينا أو دينا بإرث أو بيع أو غيرهما'' (تمرتاشی، تنویر الابصار مع الدر المختار، کتاب الشرکة ۴/ ۲۹۹-۳۰۰، بیروت، دار الفکر، ۱۳۸۶ھ) (شرکت ملک یہ ہے کہ متعدد افراد یعنی دو یا دو سے زیادہ افراد وراثت یا بیع وغیرہ کے ذریعہ کسی چیز یا دین کے مشترکہ طور پر مالک بن جائیں)۔

اس طرح مختلف مالکین کی طرف سے بڑی مقدار میں وہائٹ منی (White Money) دکھانے کی صورت میں قانونی دشواری حائل نہ ہوگی۔

سوال نمبر ۹ کا جواب:

زمین کی فروختگی کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ جس جگہ کی زمین کو بیچا جارہا ہے، اس کو بتا کر اس مقدار کی تعیین کردی جائے جو بیچی جارہی ہے، مثلاً دس یا بیس گز زمین، چنانچہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''وأما الذرعيات، فإن لم يسم جملة الذرعان، بأن قال: بعت منك هذا الثوب، أو هذه الأرض، أو هذه الخشبة، كل ذراع منها بدرهم، فالبيع فاسد فى الكل عند أبي حنيفة، إلا إذا علم المشترى جملة الذرعان فى المجلس، فله الخيار إن شاء أخذ، وإن شاء ترك، وإن لم يعلم حتى تفرقا، تقرر الفساد. وعند أبي يوسف ومحمد يجوز البيع فى الكل، ويلزمه كل ذراع منه بدرهم.... وجه قولهما فى مسائل الخلاف أن جملة البيع معلومة، وجملة الثمن ممكن الوصول إلى العلم بالكيل والوزن والعدد والذرع، فكانت هذه جهالة ممكنة الرفع والإزالة، ومثل هذه الجهالة لا تمنع صحة البيع... ولأبي حنيفة أن جملة الثمن مجهولة حالة العقد جهالة مفضية إلى المنازعة، فتوجب فساد العقد.... وقولهما: يمكن رفع هذه الجهالة مسلم، لكنها ثابتة للحال إلى أن ترتفع''

(كاسانى، بدائع الصنائع، كتاب البيوع، فصل: شرائط الصحة ۵/ ۱۵۹، بيروت، دار الكتاب العربي، ۱۹۸۲ء)

(بہر حال جو چیز گز سے بکتی ہے، سو اگر مجموعی گز کو بیان نہیں کیا، اس طرح کہ کہا: میں نے تجھ سے اس کپڑے یا اس زمین کو یا اس لکڑی کو بیچا، ان میں سے ہر گز کو ایک درہم کے بدلہ، تو تمام گزوں میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بیع فاسد ہے، مگر جبکہ خریدار کو مجلس عقد میں تمام گزوں کا علم ہوجائے، تو اسے اختیار ہوگا،

اگر چاہے تو لے اور اگر چاہے تو نہ لے، اور اگر اسے علم نہ ہو، یہاں تک کہ عاقدین جدا ہو جائیں، تو فساد مستحکم ہو جائے گا، اور امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک سارے گزوں میں بیع جائز ہے، اور خریدار کو ایک درھم کے بدلہ ہر گز لازم ہوگا... اور اختلافی مسائل کے اندر صاحبین کے قول کی دلیل یہ ہے کہ تمام گز معلوم ہیں، اور ناپ، تول، گنتی اور پیمائش کے ذریعہ مجموعی ثمن کے علم تک پہنچنا ممکن ہے، لہذا یہ جہالت ایسی ہے جسے ختم کرنا ممکن ہے، اور ایسی جہالت بیع کے صحیح ہونے سے مانع نہیں ہے... اور امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ کل ثمن عقد کے وقت اس طرح مجھول ہے جو باعث نزاع ہے، لہذا یہ عقد کے فاسد ہونے کو لازم کرے گا.... اور صاحبین کا یہ کہنا کہ اس جہالت کو ختم کرنا ممکن ہے، قابل تسلیم ہے، لیکن وہ عقد کی حالت میں ثابت ہے یہاں تک کہ ختم ہو جائے)۔

اور علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

''اور ایسے ہی اگر مکان خریدے، ہر گز ایک درہم کے بدلہ، اور مجموعی گزوں کو بیان نہ کرے، تو اس میں بھی یہی اختلاف ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تمام گزوں میں عقد فاسد ہے؛ اس لئے کہ گزوں کی قیمت گھر کے اگلے اور پچھلے حصے کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، لہذا ان میں سے کسی گز میں عقد کو صحیح قرار دینا ممکن نہیں ہے، اور ایسے ہی کپڑے اور لکڑی کی بیع کی صورت میں بھی اختلاف ہے، اور اگر اس مکان میں سے دس گزوں میں سے ایک گز خریدے، تو صاحبین کے نزدیک عقد جائز ہے؛ اس لئے کہ جو بیان کیا گیا ہے وہ گھر کے دسویں حصہ سے عبارت ہے، جیسے خریدار کہے: دس حصوں میں سے ایک حصہ، یا دس ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ گز اس متعین جگہ کا نام ہے جس پر ناپنے کا پیمانہ پڑے، اور گھر میں سے اس کی جگہ میں تفاوت ہے، برخلاف حصہ اور ٹکڑے کے'' (سرخسی، المبسوط، باب البیوع الفاسدۃ ۱۳/ ۶، بیروت، دار الفکر، ط: ۱، ۱۴۲۱ھ)۔

اور ایک جگہ لکھتے ہیں: ''وإذا قال الرجل للرجل: بعتك هٰذه الدار، كل ذراع بدرهم على أنها ألف ذراع، فهو جائز؛ لأن ببيان جملة الذرعان يصير جملة الثمن معلومًا، ولأنه سمى بمقابلة كل ذراع درهمًا، وإنما يذرع بذراع وسط ...(لأن) مطلق التسمية في العقد تنصرف إلى المتعارف، وهو الذراع الوسط'' (سرخسی، المبسوط ۳۰/ ۲۳۴)

(اور اگر ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا: اس گھر کو میں نے تجھ سے بیچا، ہر گز ایک درھم کے بدلہ، اور اس کی مجموعی تعداد ہزار گز ہے، تو یہ عقد جائز ہے؛ اس لئے کہ گزوں کی مجموعی تعداد بیان کرنے سے کل ثمن معلوم ہو جائے گا، اور اس لئے بھی کہ اس نے ہر گز کے مقابلہ میں ایک درھم کو بیان کیا ہے، اور متوسط درجہ کے گز سے ناپا جائے گا.... (اس لئے کہ) عقد میں گز کو مطلقاً ذکر کرنے سے عرف میں رائج گز مراد ہوتا ہے، اور وہ متوسط درجہ کا گز ہے)۔

ان فقہی اقتباسات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پلاٹ (Plat) نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہو جائے گی، بشرطیکہ پلاٹ کتنے گز پر مشتمل ہے، اس کی وضاحت کر کے قیمت کی بھی تعیین کر دی جائے، لہذا خرید وفروخت کا یہ عمل درست ہے، البتہ فروخت کرنے والے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ جگہ کو تبدیل کر دے، یا نقشہ میں جس پلاٹ کا جو نمبر بتایا گیا ہے، اس کو دوسری جگہ ڈال دے؛ کیونکہ پلاٹ نمبر کی وجہ سے جگہ متعین ہے، اور اس لئے بھی کہ سڑک کے سامنے (Front) کے پلاٹ کی قیمت پیچھے (Back) کے پلاٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔

نیز اس جگہ مزید کئی صورتیں ہیں، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام صورتوں کے احکام قلمبند کر دیئے جائیں، جو درج ذیل ہیں:

(الف) کالونی کی مخصوص اور معین زمین میں سے ایک ٹکڑا بیچا گیا اور فروخت کنندہ نے نقشہ پر درج اس ٹکڑے کی لمبائی چوڑائی اور قیمت خریدار کو بتائی، اور اس نے اسے قبول کر لیا، تو اس حالت میں مبیع متعین ہے، اور خرید وفروخت کا یہ عمل بھی درست ہے اور فروخت کنندہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس جگہ کو تبدیل کر دے، یا نقشہ میں جس پلاٹ (Plat) کا جو نمبر بتایا گیا ہے، اس کو کسی اور جگہ ڈال دے۔

(ب) کالونی کی مخصوص اور معین زمین میں سے مختلف قطعے بیچے گئے جو مثال کے طور پر دس دس گز کے ہیں، اور ہر قطعہ کا نقشہ پر کوئی نمبر نہیں ہے تو یہ مشترکہ خرید وفروخت ہے، لہذا کالونی کی زمین تمام مالکین کے درمیان ان کے حصے کے بقدر مشترک ہوگی، جس کی تقسیم انصاف کے ساتھ ہر ایک کے استحقاق کے مطابق ہوگی، فقیہ علی حیدر حنفیؒ لکھتے ہیں: ''يلزم أن تكون القسمة عادلة، سواء كانت القسمة رضاء أو قضاء، أو كان المقسوم مال شركة، أو مالا آخر، أي أن تعدل الحصص بحسب الاستحقاق، وأن لا يكون بإحداها نقصان فاحش'' (علی حیدر، درر الحکام ۳/ ۱۵۹، بیروت، العلمیہ) (لازم ہے کہ تقسیم انصاف کے ساتھ ہو، خواہ تقسیم باہمی رضامندی سے ہو، یا عدالت کے ذریعہ، اور خواہ تقسیم کردہ مال شرکت کا مال ہو، یا دوسرا مال ہو، یعنی استحقاق کے اعتبار سے حصے

برابر کئے جائیں گے اور اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ کسی حصہ میں کھلا ہوا نقصان نہ ہو)۔

(ج) اگر کالونی کے نقشہ پر موجود قطعے زمین فروخت کئے گئے جو ابھی عملاً موجود نہیں ہیں، تو یہ عقد استصناع کے قبیل سے ہے، لہذا عقد کے اندر فروخت کی جانے والی زمین کے اوصاف وشرائط واضح ہونے چاہئے، تاکہ کسی طرح کی نزاع پیدا نہ ہو، اور اگر چہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بنا کر یا حاصل کر کے دی جانے والی چیز کی حوالگی کی متعینہ مدت مہلت کے طور پر ذکر کرنا عقد استصناع میں درست نہیں ہے، لیکن صاحبین کے نزدیک درست ہے، علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

''وجه قولهما أن العادة جارية بضرب الأجل في الاستصناع، وإنما يقصد به تعجيل العمل لا تأخير المطالبة، فلايخرج به عن كونه استصناعا'' (كاساني، بدائع الصنائع ۵/ ۳)

(صاحبین کے قول کی دلیل یہ ہے کہ عرف میں استصناع میں بھی مدت کی تعیین کی جاتی ہے، اور اس سے مقصد کام جلد کرانا ہوتا ہے، مطالبہ مؤخر کرنا مقصود نہیں ہوتا ہے، لہذا مدت مقرر کرنے سے وہ استصناع ہونے سے باہر نہ ہوگا)، اس لئے حوالہ کرنے کا وقت بھی متعین ہونا چاہئے تاکہ بعد میں کسی طرح کا اختلاف اور جھگڑا نہ ہو۔

واضح رہے کہ بعض اہل علم اس کو عقد سلم میں سے قرار دیتے ہیں، اور مجلس عقد میں مکمل ثمن کی حوالگی شرط قرار دیتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ عقد استصناع کے قبیل سے ہے، جسے ہم ''بیع مواصفہ'' (یعنی وہ معاملہ وسودا جو کسی چیز کی صفت بیان کر کے کیا جائے، اور پھر وہ چیز حاصل کر کے دی جائے) بھی کہہ سکتے ہیں۔

اور استصناع کے معاملات میں حلت اصل ہے، لہذا یہ بیع درست ہے، اور ثمن کی ادائیگی قسط وار بھی صحیح ہے۔

سوال نمبر ۱۰ کا جواب:

زمین کے جن حصوں (Real Estate Units) کی بیع مکمل ہوگئی، اس پر اس کے شرعی آثار مرتب ہوں گے، یعنی فروخت کنندہ پر لازم ہے کہ وہ مبیع (یعنی فروخت کردہ چیز) کو خریدار کے حوالہ کرے، اور خریدار پر لازم ہے کہ اگر ثمن کی ادائیگی کا وقت مقرر نہ کیا گیا ہو، تو مکمل ثمن (دام) فروخت کنندہ کے حوالہ کرے، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں: ''أما الأول فهو ثبوت الملك للمشتري في المبيع، وللبائع في الثمن للحال'' (كاساني، بدائع الصنائع ۵/ ۲۳۳) (بہر حال خیار سے خالی بیع صحیح کا حکم اصلی تو یہ ہے کہ مبیع (فروخت کردہ سامان) میں خریدار کے لئے اور ثمن (قیمت) میں فروخت کرنے والے کے لئے فوراً ملکیت ثابت ہو جاتی ہے)۔

اور ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''وأما بيان صفة الحكم فله صفتان: إحداهما اللزوم حتى لا ينفرد أحد العاقدين بالفسخ، سواء كان بعد الافتراق عن المجلس أو قبله .... والثانية: الحلول، وهو ثبوت الملك في البدلين في الحال'' (مرجع سابق ۵/ ۲۳۳) (بہر حال حکم کے درجہ کا بیان تو اس کے دو درجے ہیں: ایک درجہ لزوم ہے، یہاں تک کہ عاقدین میں سے کوئی تنہا بیع کو ختم نہیں کر سکتا ہے، خواہ ختم کرنا مجلس عقد سے جدا ہونے کے بعد ہو، یا جدا ہونے سے پہلے ہو.... اور دوسرا درجہ فوریت ہے، اور وہ یہ ہے کہ فوراً بدلین میں ملکیت ثابت ہو جاتی ہے)۔

اور ایک جگہ لکھتے ہیں: ''وأما بيان وقت الوجوب، فالوجوب على التوسع ثبت عقيب العقد بلا فصل. وأما على التضييق، وإن تبايعا عينا بدين، يراعى فيه الترتيب عندنا، فيجب على المشتري تسليم الثمن أولاً، إذا طالبه البائع، ثم يجب على البائع تسليم المبيع إذا طالبه المشتري'' (مصدر سابق ۵/ ۲۴۳-۲۴۴)

(رہا حوالہ کرنے کے وجوب کا وقت تو وجوب وسعت وکشادگی کے ساتھ عقد کے بعد ثابت ہو چکا ہے، اور بہر حال تنگی کے ساتھ حوالہ کرنے کا وجوب تو اس میں تفصیل ہے.... سو اگر متعین چیز کو غیر متعین چیز کے بدلہ باہم خرید وفروخت کا معاملہ کرے، تو اس میں ہمارے نزدیک ترتیب کی رعایت ہے، چنانچہ پہلے خریدار پر ثمن کی حوالگی واجب ہے، جبکہ بیچنے والا اس کا مطالبہ کرے، پھر بیچنے والے شخص پر فروخت کردہ سامان کا حوالہ کرنا واجب ہے، جبکہ خریدار اس کا مطالبہ کرے)۔

ان فقہی اقتباسات کی روشنی میں یہ بالکل واضح ہے کہ زمین کے جن حصوں کی بیع مکمل ہو چکی ہے، خریدار ان کا مالک ہو چکا ہے۔

البتہ اگر ان حصوں پر بیچنے والے کا کاشت کرنا عقد کے بعد خریدار کی اجازت سے ہے تو یہ اس کی طرف سے تبرع ہے۔

اور اگر کاشت کرتے رہنے کی شرط عقد کے اندر لگائی گئی تھی تو یہ شرط فاسد ہے، جس سے عقد فاسد ہوجائے گا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لایحل سلف وبیع، ولا شرطان فی بیع، ولا ربح ما لم یضمن، ولا بیع ما لیس عندك'' (نسائی حدیث نمبر: ۴۶۱۱، ابوداود حدیث نمبر: ۳۵۰۴، ترمذی حدیث نمبر: ۱۲۳۴، ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۱۸۸، مسند احمد حدیث نمبر: ۶۶۲۸، ۶۶۷۱، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (قرض کی شرط کے ساتھ خرید وفروخت حلال نہیں، اور نہ ہی خرید وفروخت کے اندر دو شرطیں حلال ہیں، اور نہ ہی اس چیز سے نفع اٹھانا حلال ہے جو اس کی ضمانت میں نہ آئے، اور نہ ہی اس چیز کو بیچنا جائز ہے، جو اس کے پاس موجود نہ ہو)۔

اور امام خطابیؒ لکھتے ہیں: ''ولا فرق فی مثل ہذا بین شرط واحد، وبین شرطین، أو شروط ذات عدد فی مذاہب أکثر العلماء، وفرق أحمد بن حنبل بین شرط واحد وبین شرطین اثنین'' (خطابی، معالم السنن ۳/ ۱۴۱، ط: ۱، حلب، المطبعة العلمیة، ۱۳۵۱ھ) (اس طرح کی شرط لگانے میں ایک یا دو یا کئی شرطوں کے درمیان اکثر اہل علم کے مذہب میں کوئی فرق نہیں ہے، اور امام احمد نے (حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے) ایک اور دو شرط کے درمیان فرق کیا ہے)۔ اور اس طرح کی شرط کے جائز نہ ہونے کی وجہ بالکل ظاہر ہے، اور وہ یہ ہے کہ شرط کی وجہ سے ثمن مجھول ہوجائے گا، چنانچہ یہ معلوم نہ ہوگا کہ کس قدر زمین کی قیمت ہے، اور کس قدر کاشت کرنے کی اجرت ہے۔

بہرحال ایسی شرط لگانے سے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو، بیع فاسد ہوجاتی ہے، علامہ تمرتاشی لکھتے ہیں:

''ولا بیع بشرط لا یقتضیه العقد ولا یلائمه، وفیه نفع لأحدهما، أو فیه نفع لمبیع ہو من أہل الاستحقاق، ولم یجر العرف به، ولم یرد الشرع بجوازہ'' (تمرتاشی، تنویر الابصار مع الدر المختار ۵/ ۸۴) (اور ایسی شرط کے ساتھ بیع درست نہیں ہے جس کا عقد تقاضا نہ کرے، اور نہ وہ اس کے مناسب ہو، اور اس میں عاقدین میں سے ایک کا نفع ہو، یا اس میں فروخت کردہ چیز کا نفع ہو جبکہ اس میں نفع اٹھانے کی صلاحیت ہو (مثلاً: غلام ہو)، اور نہ ہی اس شرط کو لگانے کا عرف ہو، اور نہ ہی شریعت اس کے جواز کے ساتھ وارد ہو)۔

سوال نمبر ۱۱ کا جواب:

اگر زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آگئی تھی، اور اس نے پلاٹس فروخت کئے، تو پلاٹ خریدنے والا پلاٹ متعین ہونے سے پہلے صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر اپنی زمین کسی دوسرے شخص سے فروخت کرسکتا ہے؛ اس لئے کہ اموال غیر منقولہ میں قبضہ سے پہلے بیع جائز ہے، بشرطیکہ خریدار کے لئے انتفاع سے کوئی قوی مانع نہ پایا جاتا ہو۔ عالمگیری میں ہے:

اشتری دارًا أو عقارًا، فوہبہا قبل القبض من غیر البائع یجوز عند الکل، ولو باع یجوز فی قول أبی حنیفة وأبی یوسف ولایجوز فی قول محمد، ولو آجرہا قبل القبض من البائع أو غیرہ، لایجوز عند الکل. وکذا لو اشتری أرضًا فیہا زرع یزرعہا، والزرع بقل، ودفعہا إلی البائع معاملة بالنصف قبل القبض لا یجوز'' (ہندیہ ۳/ ۱۳، بیروت، دار الفکر)

(مکان یا زمین خریدے، اور اسے قبضہ سے پہلے اس شخص کو ہبہ کردے جو فروخت کنندہ کے علاوہ ہے، تو یہ سب کے نزدیک جائز ہے۔ اور اگر بیچ دے تو شیخین کے قول کے مطابق جائز ہے، اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق جائز نہیں ہے۔ اور اگر قبضہ سے پہلے فروخت کنندہ یا دوسرے شخص کو کرایہ پر دے دے، تو یہ سب کے نزدیک جائز نہیں ہے، اور اسی طرح اگر ایسی زمین خریدے جس میں کھیتی ہو جسے کاشت کررہا ہو، حالانکہ کھیتی کچی ہو، اور فروخت کنندہ کو آدھی پیداوار کے بدلہ قبضہ سے پہلے دے دے، تو یہ جائز نہیں ہے)۔

اور حدیث شریف سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''نھی أن تباع السلع حتی یحوزہا التجار إلی رحالہم'' (سنن ابی داود حدیث نمبر: ۳۴۹۹، طبرانی، المعجم الکبیر حدیث نمبر: ۴۷۸۲، مسند احمد حدیث نمبر: ۲۱۶۶۸، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (سامان کو بیچے جانے سے منع فرمایا یہاں تک کہ تاجر حضرات اسے اپنے ٹھکانے پر لے جائیں)، سو اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ایسی چیز کو قبضہ سے پہلے بیچنے کی ممانعت ہے، جسے منتقل کیا جاسکے، نیز عقلی اعتبار سے بھی یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ منتقل ہونے والی چیز جب تک خریدار اول کے ہاتھ نہ آجائے، اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ فروخت کردہ چیز اس کے قبضہ میں آہی نہ پائے، اور وہ دوسرے خریدار کو مبیع کی حوالگی پر قادر نہ ہوسکے۔

اور یہ علت اموال غیر منقولہ میں نہیں پائی جاتی ہے، البتہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ معاملہ بالکل واضح اور صاف وشفاف طریقہ سے، اور آئندہ کسی قسم کی نزاع پیدا نہ ہو، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ زمین پر پلاٹ متعین ہونے اور قبضہ کرنے کے بعد دوسرے سے فروخت کرے۔

(ب) زمین جبکہ مالک زمین سے "خیار نقد" کے ساتھ خریدی گئی ہو تو پلاٹنگ (Plating) کرنے والے کا اصل مالک کی اجازت سے پلاٹ بنانا اور اسے بیچنا جائز ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

ا۔ یہ "خیار نقد" کی صورت ہے، اور خیار نقد یہ ہے کہ خرید و فروخت کا معاملہ اس طرح طے ہو کہ اگر خریدار متعینہ مدت کے اندر ثمن ادا نہ کرے، تو فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان بیع نہیں ہوگی، فقیہ علی حیدر حنفیؒ لکھتے ہیں: "إذا تبايعا على أن يؤدي المشتري الثمن في وقت كذا، وإن لم يؤده، فلا بيع بينهما، صح البيع، وهٰذا يقال له خيار النقد" (علی حیدر، درر الحکام ۱/ ۲۶۱) (اگر عاقدین خرید و فروخت کا معاملہ اس شرط کے ساتھ طے کریں کہ خریدار متعین وقت کے اندر ثمن ادا کرے گا، اور اگر ادا نہ کر سکے تو ان دونوں کے درمیان بیع نہ ہوگی، تو اس خیار کے ساتھ بیع صحیح ہے، اور اسے خیار نقد کہا جاتا ہے)۔

اور خیار نقد کی مدت حنفیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک تین دن ہے، جبکہ امام محمدؒ کے یہاں عاقدین باہم جو مدت طے کرلیں صحیح ہے، چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں: "خلافاً لمحمد فإنه جوزه إلى ما سماه" (ابن عابدین، رد المحتار ۴/ ۵۷۱، بیروت، دار الفکر ۱۴۲۱ھ) (اس میں امام محمد کا اختلاف ہے، کیونکہ انہوں نے اس مدت کو جائز قرار دیا ہے جو عاقدین باہم طے کرلیں)۔

اور اس مسئلہ میں امام محمدؒ کا قول ہی راجح ہے، چنانچہ فقیہ علی حیدر رقمطراز ہیں: "وإنما اختير قوله في هٰذه المسألة أيضًا مراعاة لمصلحة الناس" (علی حیدر، درر الحکام ۱/ ۱۱۱) (اور مسئلہ میں بھی امام محمد کا قول اختیار کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کی مصلحت کی رعایت ہو)۔

لہٰذا سوال میں یہ کہنا کہ زمین ابھی مالک زمین ہی کی ملکیت میں رہتی ہے درست نہیں ہے، بلکہ خرید و فروخت کا معاملہ طے ہو چکا ہے، اور طے ہونے کے بعد خریدار نے بطور اعتماد ثمن کے کچھ حصہ پر فروخت کنندہ کو قبضہ دلا دیا ہے، اور مقررہ مدت میں بقیہ رقم ادا کرنے کا وہ پابند ہے، اور اس مدت میں خریدار اگر فروخت کا معاملہ کرتا ہے، تو پہلی بیع لازم ہو چکی ہے، اور اسے لازماً فروخت کنندہ کو ثمن دینا ہوگا، چنانچہ علامہ شامیؒ "النہر" کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"ثم لو باعه المشتري، ولم ينقد الثمن في الثلاث، جاز البيع، وكان عليه الثمن" (ابن عابدین، رد المحتار ۴/ ۵۷۱) (پھر اگر خریدار اسے بیچ دے، اور تین دن یعنی متعینہ مدت کے اندر ثمن ادا نہ کرے، تو اس کی بیع جائز (نافذ) ہے، اور اس پر ثمن ادا کرنا لازم ہے)۔

اور پلاٹنگ (Plating) کے سلسلہ میں اصل مالک کی اجازت بھی ضروری نہیں ہے۔

اور قانونی رکاوٹ کی وجہ سے زمین کا اصل مالک زمین کے پاس رہ جانا الگ بات ہے۔

۲۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ "خیار نقد" کے ساتھ بیع درست نہ ہو، اس لئے کہ اس میں شرط پر معلق فاسد اقالہ یعنی بیع کو توڑنا مشروط ہے، لیکن بطور استحسان اسے جائز قرار دیا گیا ہے، فقیہ علی حیدرؒ لکھتے ہیں: "ووجه الاستحسان الاحتراز من مماطلة المشتري؛ لأن المشتري إن لم يدفع الثمن، فالحاجة تمس إلى فسخ البيع" (علی حیدر، درر الحکام ۱/ ۲۶۱) (اور استحسان کی وجہ خریدار کے ٹال مٹول سے بچنا ہے؛ اس لئے کہ خریدار اگر ثمن ادا نہ کرے، تو بیع کو ختم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے)۔

۳۔ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے خیار نقد کے ساتھ بیع کو درست قرار دیا ہے، جیسا کہ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:

"إن هٰذا يروى عن عمر، ولأنه علق رفع العقد بأمر يحدث في مدة الخيار، فجاز، كما لو شرط الخيار، ولأنه نوع بيع، فجاز أن يفسخ بتأخير القبض كالصرف، ولأن هٰذا بمعنى شرط الخيار؛ لأنه كما يحتاج إلى التروي في البيع، هل يوافقه أولا، يحتاج إلى التروي في الثمن، هل يصير منقودًا أولا؟ فهما سيان في المعنى متغايران في الصورة"

(ابن قدامہ، المغنی ۴/ ۱۲۹، ط: ۱، بیروت، دار الفکر، ۱۴۰۵ھ)

(خیار نقد کے ساتھ بیع کا جواز حضرت عمرؓ سے مروی ہے، اور اس لئے بھی کہ یہ ایسی بیع ہے جس میں عقد کو ختم کرنے کو ایسی چیز پر مشروط کیا گیا ہے جو مدت

خیار میں ظاہر ہوگی، لہذا یہ بیع جائز ہے، جس طرح خیار شرط کے ساتھ بیع کرے، اور اس لئے کہ یہ ایک قسم کی بیع ہے، لہذا جائز ہے کہ ثمن پر قبضہ کی تاخیر کی وجہ سے فسخ کردی جائے، جیسے عقد صرف میں ہوتا ہے، اور اس لئے کہ یہ خیار شرط کے معنی میں ہے؛ اس وجہ سے کہ جس طرح خرید وفروخت میں غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے کہ کیا یہ اس کے موافق ہے یا نہیں؟ اسی طرح ثمن میں غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے کہ کیا وہ ادا ہوجائے گا یا نہیں، لہذا دونوں شرط حقیقت کے اعتبار سے برابر ہیں، لیکن صورت کے لحاظ سے الگ الگ ہیں)، اور جب پلاٹنگ کرنے والے کا پلاٹ بیچنا جائز ہے تو پھر اس سے خریدنے والے شخص کا اگلے شخص سے بیچ دینا بھی جائز ہے، علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"بہر حال قبضہ سے پہلے غیر منقولہ جائیداد کو بیچنا امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق جائز ہے، اور امام ابویوسف کے پہلے قول کے مطابق جائز نہیں ہے، اور یہی امام محمدؒ اور شافعیؒ کا قول ہے، اس وجہ سے کہ جس چیز پر قبضہ نہ ہو، اس کو فروخت کرنے کی ممانعت عام ہے، اور اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیز سے نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا ہے جو آدمی کی ضمانت میں نہ آئے، اور غیر منقولہ جائیداد کو قبضہ سے پہلے خرید کردہ دام سے زیادہ میں بیچنے کی صورت میں ایسی چیز سے نفع کمانا ہے جو ضمانت میں نہیں آئی ہے...... یہاں تک کہ جب اس کا کوئی حقدار نکل آئے، یا اس کی ہلاکت کا تصور ہو سکے، اور وہ ہلاک ہو جائے، تو ثمن ساقط ہو جائے گا...... اور امام ابوحنیفہؒ اور ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ قبضہ سے پہلے غیر منقولہ جائداد کو بیچنا، قبضہ کے بعد منقولہ اشیاء کو بیچنے کے حکم میں ہے، لہذا جائز ہے...... اور قبضہ سے پہلے غیر منقولہ جائیداد کو بیچنے کی حالت میں بیچنے والے کی ملکیت میں صرف استحقاق کا غرر پایا جاتا ہے؛ اس لئے کہ غیر منقولہ جائیداد کی ہلاکت، اور اس کی وجہ سے بیع کے فسخ (ختم) ہو جانے کا تصور نہیں ہو سکتا ہے، اور غرر کا اس کے سبب کے بالکل نہ ہونے کی وجہ سے نہ پایا جانا، اس کے سبب کے متصور ہونے اور عمل نہ کرنے کی حالت میں نہ پائے جانے سے زیادہ موثر ہے، اور قبضہ سے پہلے غیر منقولہ اشیاء کی بیع میں صرف استحقاق کے اعتبار سے غرر کا تصور ہو سکتا ہے، اور اس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ اور ملکیت میں قبضہ سے پہلے تصرف کے جائز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے ثمن میں تصرف کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ ملکیت میں کوئی غرر نہیں پایا جاتا ہے" (سرخسی، المبسوط ۱۳/ ۱۶-۱۷، ط: ۱، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ)۔

سوال نمبر ۱۲ کا جواب:

غیر منقولہ جائیداد میں قبضہ سے پہلے بھی مبیع (فروخت کردہ چیز) پر کامل ملکیت حاصل ہو جاتی ہے، اور جب ملکیت حاصل ہوگئی تو اس میں تصرف کا حق بھی حاصل ہو گیا، لہذا جب متعین زمین کے اندر جو ہزار گز پر مشتمل ہے، مثلاً پچاس گز کا قطعہ جہت اور سمت کی تعیین کے بغیر خرید لیا گیا، تو یہ مشترکہ طور پر خریداری ہے، اور ساری زمین تمام شرکاء کے درمیان ان کے حصے کے بقدر مشترک ہوگی، جس کی تقسیم انصاف کے ساتھ باہمی رضامندی یا عدالت کے ذریعہ ہوگی۔

اور اصل مالک زمین کے دلال سے خریدنا اصل مالک زمین سے خریدنے کے درجہ میں ہے، کیونکہ اس جگہ دلال زمین بیچنے کا وکیل بھی ہے، اور وکیل کا تصرف موکل کے تصرف کے حکم میں ہے، چنانچہ فقہ کا معروف ضابطہ ہے: "تصرف الوکیل تصرف الموکل" (کاسانی، بدائع الصنائع ۲/ ۲۳۱) (وکیل کا تصرف موکل کے تصرف کے درجہ میں ہے)۔

اور زبانی سودا بھی درست ہے، ہدایہ میں ہے: "البيع ينعقد بالإيجاب والقبول، إذا كانا بلفظي الماضي" (مرغینانی، الهدایہ ۳/ ۲۱، المکتبة الاسلامیه) (بیع ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتی ہے، جبکہ دونوں ماضی کے لفظ سے ہوں)۔

اور زمین خرید کر تجارت کرنا اور پیسے کمانا بھی جائز ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

"وأحل الله البيع وحرم الربا" (البقرۃ: ۲۷۵) (حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے، اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے)۔

اور تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مشترک چیز کو شریک یا اجنبی کے ہاتھ سے فروخت کرنا جائز ہے، چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

"جاز بيع المشاع وإيداعه" (ابن عابدین، رد المحتار ۸/ ۳۸۴) (مشترک چیز کو فروخت کرنا اور اسے امانت رکھنا جائز ہے)

اور فقیہ علی حیدر حنفیؒ لکھتے ہیں: "يجوز بيع المشاع للمشارك وللأجنبي، سواء أكان قابلًا للقسمة أم لم يكن" (علی حیدر، درر الحکام ۲/ ۳۸۸) (مشترک چیز کو شریک اور اجنبی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، خواہ وہ قابل تقسیم ہو یا نہ ہو)، اور شیخی زادہ حنفیؒ لکھتے ہیں: "بيع المشاع جائز لا رهنه" (شیخی زادہ، مجمع الأنہر ۴/ ۷۹-۲۷۰، بیروت، العلمیہ، ۱۴۱۹ھ) (مشترک چیز کو بیچنا جائز ہے، لیکن اسے رہن رکھنا جائز نہیں ہے)۔

اور علامہ عبدالرحمن شہاب الدین بغدادی مالکی لکھتے ہیں: ''ویجوز بیع المشاع'' (شھاب الدین مالکي. ارشاد السالك إلى أشرف المسالك في فقه الامام مالك/ ۱۸۳. الشركة الافريقية) (اور مشترک چیز کو فروخت کرنا جائز ہے)۔

اور امام نووی شافعیؒ لکھتے ہیں: ''یجوز بیع المشاع کنصف من عبد، أو بہیمة، أو ثوب، أو خشبة، أو أرض، أو شجرة أو غیر ذلك بلا خلاف، سواء کان مما ینقسم أم لا'' (نووی، المجموع شرح المھذب ۹/ ۲۴۴، بیروت، دار الفکر، ۱۹۹۷ء)

(مشترک چیز کو فروخت کرنا جائز ہے، جیسے آدھے غلام، یا آدھے جانور، یا آدھے کپڑے یا آدھی لکڑی، یا نصف زمین یا آدھے درخت وغیرہ کو بالاتفاق فروخت کرنا جائز ہے، خواہ وہ مشترک چیز قابل تقسیم ہو یا نہ ہو)۔

اور مرداوی حنبلی (و: ۸۸۵ھ) لکھتے ہیں: ''یجوز بیع المشاع ورھنه''(مرداوی، الانصاف ۶ /۲۶، ط:۱، بیروت، دار الاحیاء، ۱۴۱۹ھ) (مشترک چیز کو فروخت کرنا اور اسے رہن رکھنا جائز ہے)۔

ان تمام فقہی اقتباسات سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ مشترکہ طور پر قطعۂ زمین خریدنا اور اس کا بیچنا جائز ہے۔

البتہ دلال کا یہ شرط لگانا کہ اسے وہی بیچے گا، باطل شرط ہے، کیونکہ وہ اس کے ذریعہ سے نفع کمانا چاہتا ہے، اور فروخت کرنے والے کو مارکیٹ ریٹ سے کم قیمت دینا چاہتا ہے۔ لیکن اگر یہ شرط عقد مکمل ہونے کے بعد ہے تو عقد کی صحت پر اس کا اثر نہیں پڑے گا۔

سوال نمبر ۱۳ کا جواب:

کالونی بنانے والے سے قسطوں میں قیمت ادا کر کے پلاٹ خریدنا جائز ہے، اور اس طرح خریدنے سے خریدار کی ملکیت زمین پر ثابت ہو جاتی ہے، اور اگر یہ پلاٹ مشترکہ طور پر خریدا گیا ہے، تو پھر فروخت کرنے کی حالت میں اسے خریدنے کا حق تمام شرکاء کو ہے، چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے:

''قضی رسول اللہ ﷺ بالشفعة في كل شركة لم تقسم، ربعة أو حائط. لا يحل له أن يبيع حتى يؤذن شريكه. فإن شاء أخذ، وإن شاء ترك، فإذا باع ولم يؤذنه، فهو أحق به'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۶۰۸، نسائی حدیث نمبر: ۴۷۰۱، سنن ابی داود حدیث نمبر: ۳۵۱۳) (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مشترکہ جائیداد میں جو تقسیم نہ کی گئی ہو، خواہ مکان ہو یا باغ ہو، شفعہ کا فیصلہ فرمایا، اور یہ فرمایا کہ شریک کے لئے مناسب نہیں کہ شریک کو بتائے بغیر بیچے، سو اگر شریک چاہے تو لے لے، اور اگر چاہے تو چھوڑ دے، پھر اگر بیچ ہی دے اور شریک کو اطلاع نہ دے تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے)۔

لیکن شریک کا اپنے شریک کو یہ بتانا کہ وہ اپنا حصہ بیچ رہا ہے صرف مستحب ہے، ''ہندیہ'' میں ہے:

''وھو محمول عند أصحابنا على الندب، وكراهة بيعه قبل إعلامه'' (ہندیہ ۵/ ۲۶۴)
(یہ ہمارے علماء احناف کے نزدیک استحباب اور شریک کو بتانے سے پہلے فروخت کرنے کے مکروہ ہونے پر محمول ہے)۔

اور استحباب پر محمول کرنے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ''نسائی'' اور ''ابوداؤد'' کی روایت میں ہے: ''لا یصلح له'' (دیکھئے: سنن نسائی حدیث نمبر: ۴۶۴۶، سنن ابی داود حدیث نمبر: ۳۵۱۳، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (اس کے لئے مناسب نہیں)۔

اور حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ ''قضی النبي ﷺ بالشفعة في كل مال لم يقسم، فإذا وقعت الحدود، وصرفت الطرق فلا شفعة'' (صحيح البخاري حديث نمبر: ۲۲۱۴، ۲۲۵۷، ۲۴۹۵) (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس مال میں شفعہ کا فیصلہ فرمایا جس کی تقسیم نہیں ہوئی ہو، سو جب حدود متعین ہو جائیں، اور راستے الگ کر دیئے جائیں، تو شفعہ نہیں ہے)۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ شریک کو بتانا واجب نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی اطلاع کے بغیر بیچ دینے کی صورت میں حق شفعہ ثابت کیا گیا ہے، لہذا کالونی بنانے والے اصل مالک پلاٹس کا اگر وہ شریک بھی ہو، تو اس کا یہ شرط لگانا کہ خریدنے والا صرف اسی سے بیچے درست نہیں ہے، بلکہ مالکِ پلاٹ کو اختیار ہے کہ وہ جس سے چاہے بیچے۔

اور اگر کالونی بنانے والا خریدنا ہی چاہتا ہے تو اسے مارکیٹ ریٹ سے لینا ہوگا۔

بہر حال اگر یہ شرط عقد کے مکمل ہونے کے بعد ہو تو عقد کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

اور اگر پلاٹ مقدار اور محل وقوع کے اعتبار سے متعین ہے، تو پھر اول فروخت کرنے والے یا دیگر مالکین کا یہ شرط لگانا کہ پلاٹ کا مالک ان ہی سے بیچے یا فلاں سے نہ بیچے درست نہیں ہے، اس طرح کی شرط لگانے سے عام طور سے مالک کا استحصال اور مارکیٹ ریٹ سے کم پر لینا مقصود ہوتا ہے۔

البتہ اگر یہ شرط عقد مکمل ہونے کے بعد ہے تو عقد کی صحت پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

سوال نمبر ۱۴ کا جواب:

قسط پر فروخت کی صورت میں خریدار کی ملکیت مبیع (فروخت کردہ سامان) پر معاملہ مکمل ہونے کے بعد ثابت ہو جاتی ہے، اور ادھار قیمت کی قسطوں میں ادائیگی اس پر لازم ہوتی ہے، چنانچہ قسط پر خرید وفروخت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مکمل قسطوں کی ادائیگی کے بعد مبیع (فروخت کردہ چیز) پر ملکیت ثابت ہو، کیونکہ یہ ادھار بیع کی ایک شکل ہے، اور ادھار بیع مکمل ہوتے ہی مبیع پر ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، اور ادھار قیمت کی ادائیگی مقررہ مدت میں واجب ہو جاتی ہے، اور ادھار قیمت کی ادائیگی مقررہ مدت میں واجب ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیا:

''اشترى طعامًا من يهودى إلى أجل، ورهنه درعًا من حديد'' (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۰۶۸، ۲۰۹۶، ۲۲۰۰، ۲۲۵۱، ۲۲۵۲، ۲۳۸۶، ۲۵۰۹، ۲۵۱۳، صحیح مسلم: ۱۶۰۳) (ایک یہودی سے متعینہ مدت پر قیمت کی ادائیگی کی شرط کے ساتھ غلہ خریدا، اور اس کے پاس لوہے کی زرہ رہن رکھی)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ثمن کی ادائیگی کا وقت مقرر کر کے کوئی چیز خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے، اور ادھار قیمت کی ادائیگی کی متعینہ مدت طے ہونے کے باوجود مبیع (فروخت کردہ سامان) پر خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، اور قسط پر خرید وفروخت بھی ایسی بیع ہے جس کی قیمت کی آئندہ ادائیگی کا وقت مقرر ہے، اور شرعی اعتبار سے ادھار قیمت یکمشت ادا کی جائے، یا چند قسطوں میں دونوں کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں: ''جاءتني بريرة، فقالت: كاتبت أهلي على تسع أواق، في كل عام أوقية'' (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۱۶۸، ۲۷۲۹) (حضرت بریرہ میرے پاس آئیں، اور بتایا کہ میں نے اپنے مالک سے نو اوقیہ یعنی ۳۶۰ درہم پر عقد کتابت (یعنی متعینہ مال کی ادائیگی کے بعد آزاد ہونے کا معاہدہ) کیا ہے، اور ہر سال ایک اوقیہ یعنی چالیس درہم ادا کرنا ہے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیمت چند قسطوں میں ادا کرنا درست ہے۔

البتہ ادھار بیع میں ثمن (دام) کی ادائیگی کی مدت متعین اور معلوم ہونی چاہئے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصریؒ رقمطراز ہیں:

''معلومية الأجل في البيع بثمن مؤجل'' (ابن نجيم، البحر الرائق، كتاب البيع ۵/ ۲۸۱) (ادھار ثمن کے ساتھ خرید وفروخت کی حالت میں ادائیگی کی مدت معلوم ہونی چاہئے)۔

لہذا کالونی بنانے والے کا بعض قسطوں کی ادائیگی باقی رہنے کی وجہ سے سودے کو کینسل (Cancel) قرار دینا درست نہیں ہے، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ باقی قسطوں کو ادا نہ کرنے کی حالت میں خریدار کو اختیار دیا جائے کہ وہ باقی ماندہ قسطیں ادا کر کے اپنی زمین حاصل کرلے، یا زمین بیچ کر باقی ماندہ قسطیں ادا کرے، اور فروخت کرنے والے کو چاہئے کہ قسط وقت مقررہ پر نہ ادا کرنے کی بنا پر خریدار کو متنبہ کرے، اور تنبیہ کے بعد بھی وہ ادا نہ کرے، تو پھر موجودہ وقت میں زمین کی مارکیٹ کے اندر جو قیمت ہے اسے ادا کر کے زمین لے لے، اور باقی ماندہ قسطوں سے زائد قیمت خریدار کو ادا کرے، یا کسی تیسرے شخص سے بیچ کر اپنی باقی ماندہ قسطیں حاصل کرے، اور زائد قیمت خریدار کے حوالہ کرے۔

خلاصہ یہ کہ فروخت کرنے والے کا صرف قسطوں میں ادا کی ہوئی رقم واپس کرنا جبکہ زمین کی قیمت مارکیٹ میں پچاس گنا بڑھ چکی ہو، ظلم شدید ہے، اور "والله لا يحب الظالمين" (آل عمران: ۵۷) (اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا ہے)، اور حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: ''يا عبادي إني حرمت الظلم على نفسي، وجعلته بينكم محرما، فلا تظالموا'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۵۷۷، بخاری، الادب المفرد

حدیث نمبر: ۴۹۰، سنن ترمذی حدیث نمبر: ۲۴۹۵، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۴۲۵۷، مسند احمد حدیث نمبر: ۲۱۴۲۰، مسند طیالسی حدیث نمبر: ۴۶۳، مصنف عبد الرزاق: ۲۰۲۷۲) (اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم حرام ٹھہرایا ہے، اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے، لہذا آپس میں ظلم نہ کرو)۔

سوال نمبر ۱۵ کا جواب:

(الف): دلالی کی اجرت جائز ہے، علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں: ''والسمسار اسم لمن يعمل للغير بالأجر بيعًا وشراء. ومقصوده من إيراد الحديث بيان جواز ذلك'' (سرخسی، المبسوط ۱۵/ ۲۰۹) (دلال اس شخص کا نام ہے جو اجرت کے بدلہ دوسرے شخص کے لئے خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہے اور حدیث بیان کرنے سے مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اس عمل کے جواز کو بیان کیا جائے)۔

اور علامہ شامی ''حاوی'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار. فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدًا، لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه'' (ابن عابدین، ردالمحتار ۶/ ۶۳) (محمد بن سلمہ سے دلال کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ اصل کے اعتبار سے یہ فاسد ہے، اور جواز کی وجہ بہ کثرت اس کا معاملہ ہونا ہے، اور اس نوعیت کے بہت سے معاملات جائز نہیں لیکن لوگوں کی ضروریات کی وجہ سے دلال کی اجرت جائز قرار دی گئی ہے)۔

واضح رہے کہ لغت کے اعتبار سے سمسار اور دلال کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، لیکن عرف کے اعتبار سے بعض فقہاء نے دونوں کے درمیان فرق کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ''سمسار'' سامان کی جگہ اور اس کے مالک کے بتانے والے کو کہتے ہیں، اور دلال وہ ہے جو عام طور سے فروخت کرنے والے اور خریدار کے درمیان فروختگی کے عمل میں داخل ہوتا ہے (دیکھئے: ابن عابدین، ردالمحتار ۵/ ۱۳۶)۔

دلالی کے جواز کی شرطیں:

دلال کی اجرت کے جواز کی درج ذیل شرطیں ہیں:

۱۔ دلال کی اجرت معلوم ومتعین ہو۔

۲۔ جس سے اجرت لے رہا ہے، خواہ وہ فروخت کرنے والا ہو، یا خریدار اسے بتادے؛ اس لئے کہ دلالی اپنی حقیقت کے اعتبار سے کام کی انجام دہی پر اجرت لینا ہے، لہذا کام کی اجرت دینے اور لینے والے کی طرف سے ایجاب وقبول ہونا چاہئے، لہذا جس سے دلالی لے رہا ہے، اس کے علم کے بغیر لینا ناجائز ہے۔

۳۔ جس سے دلالی لے رہا ہے اس سے معاہدہ ہونا چاہئے، دوسرے فریق کو بتانا ضروری نہیں ہے۔

۴۔ دلال کو اس کی متعین اور معلوم اجرت کام کی تکمیل کے بعد ملے گی۔

۵۔ اگر فروخت کرنے والے اور خریدار دونوں سے دلالی لے رہا ہے تو دونوں کو بتانا لازم ہے۔

۶۔ اگر دلال عاقدین میں سے کسی ایک کے لئے کام کر رہا ہے، تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ دوسرے فریق کے ساتھ دام بڑھانے یا گھٹانے کا اتفاق کرلے، اس لئے کہ یہ فریب دہی اور امانت میں خیانت ہے، اور خاص طور پر اس کی شناعت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جبکہ دلال ہی عقد کو انجام دے رہا ہو، اس لئے کہ ایسی حالت میں وہ وکیل بھی ہے، اور وکیل کو قابل اعتماد ہونا چاہئے، اور اسی وجہ سے شریعت کا یہ حکم ہے کہ سپرد کردہ سامان سے اگر وکیل نے نفع حاصل کیا، تو وہ موکل کا ہے نہ کہ وکیل کا، اور اگر وہ عقد انجام نہیں دے رہا ہو، بلکہ اس کا کام محض فروخت کرنے والے یا خریدار کو بتانا ہو، اور اس سے کہا گیا ہو کہ بہتر سے بہتر دام پر خریدنے والے کو ڈھونڈو، یا کم سے کم دام پر بیچنے والے کا پتہ لگاؤ، تو ایسی حالت میں بھی دوسرے فریق کے ساتھ جس کے لئے وہ کام نہیں کر رہا ہے، اتفاق کرلینا دھوکہ اور خیانت ہے۔

۷۔ دلال کی اجرت اگر معروف کے مطابق ہو تو اسے ثمن میں شامل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ فقہاء نے بیع مرابحہ میں بھی اس کو شامل کرنے کی اجازت دی ہے، حالانکہ وہ ثمن اصلی کے بتانے کے سلسلہ میں امانت پر قائم ہوتی ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''لا بأس بأن يلحق برأس المال أجرة القصار والصباغ والغسال والفتال والخياط والسمسار.... اعتبارا للعرف؛ لأن العادة فيما بين التجار أنهم يلحقون هذه المؤن برأس المال، ويعدونها منه، وعرف المسلمين وعادتهم حجة مطلقة'' (کاسانی، بدائع الصنائع ۵/ ۲۲۳)

(کوئی حرج نہیں کہ ثمن میں کپڑے کی سفید کاری کرنے والے، رنگریز، دھوبی، رسی بٹنے والے، درزی اور دلال کی اجرت شامل ہو...عرف کا اعتبار کرتے ہوئے، اس لئے کہ سوداگروں کا عرف یہ ہے کہ وہ ان اخراجات کو ثمن میں شامل کرتے ہیں، اور اسی میں سے شمار کرتے ہیں، اور مسلمانوں کا عرف کامل درجہ کی حجت ہے)، تو جب یہ ''مرابحہ'' میں جائز ہے، تو دیگر بیوع کے اندر بدرجہ اولی جائز ہوگا۔

ہاں اہم بات یہ ہے کہ ثمن پر خریدار راضی ہو، اور اسے دھوکہ اور فریب نہ دیا گیا ہو۔

اس تفصیل کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دلال کا زمین کی قیمت کالونی بنانے والے سے معلوم کرکے زمین کو اپنی من مانی قیمت پر بیچ کر مالک زمین کی بتائی ہوئی رقم سے زائد رقم خود لے لینا ناجائز وحرام ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقًا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون" (البقرة: ۱۸۸) (اور تم آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر نہ کھاؤ، اور ان کو حاکموں تک نہ پہنچاؤ تاکہ دوسروں کے مال کا کوئی حصہ بہ طریقۂ گناہ کھا جاؤ، حالانکہ تم اس کو جانتے ہو)۔

اور دلال کا مالکِ زمین کی اجازت کے بغیر من مانی قیمت پر بیچنا، اور اس کی بتائی ہوئی قیمت کے علاوہ باقی کو خود لے لینا ناحق طریقہ سے مال کھانا ہے جو حرام ہے، اس لئے کہ اس صورت میں وہی عقد بھی انجام دے رہا ہے، لہذا وہ وکیل بھی ہے، اور وکیل کو قابل اعتماد ہونا چاہئے، لہذا زائد قیمت کا مالک، زمین کا اصل مالک ہے نہ کہ دلال۔

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۵۶۴ (ترقیم: محمد فؤاد عبدالباقی)، سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۴۸۸۲، سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۹۲۷، مسند احمد حدیث نمبر: ۷۷۲۷) (ہر مسلمان کی جان، مال اور عزت وآبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے)۔

لہذا مالک زمین کی اجازت کے بغیر زیادہ قیمت پر بیچ کر اس کی بتائی ہوئی رقم سے زائد رقم خود لے لینا حرام ہے۔

۳۔ حضرت حنیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لايحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه'' (مسند احمد حدیث نمبر: ۲۰۶۹۵، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (کسی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے)، لہذا دلال کا مالک کی اجازت کے بغیر من مانی قیمت پر بیچ کر زائد رقم خود لے لینا حرام ہے۔

۴۔ ''ہندیہ'' میں ہے: ''ولو وكله بأن يبيعه بألف درهم، فباعه بأكثر، نفذ البيع، وإن باعه بأقل لم ينفذ'' (ہندیہ ۳/ ۵۹۰) (اور اگر کسی کو وکیل بنائے کہ سامان ایک ہزار درہم میں بیچ دے، لیکن وہ اسے زیادہ میں بیچ دے، تو بیع نافذ ہوگی، اور اگر کم میں بیچے تو نافذ نہ ہوگی)۔

اس سے پتہ چلا کہ زائد قیمت کا مالک زمین والا ہے نہ کہ دلال، لہذا اس کا باقی کو اپنے لیے جائز سمجھنا درست نہیں ہے۔ البتہ بعض فقہاء کے نزدیک جواز کی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ دلال کالونی بنانے والے مالک زمین سے یہ طے کرلے کہ اس قیمت سے زائد میں اگر میں بیچوں تو زائد قیمت ہماری ہوگی، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ''لا بأس أن يقول: بع هذا الثوب، فما زاد على كذا وكذا، فهو لك'' (صحيح البخاری ۳/ ۵۵۴، ط: ۱، دار طوق النجاة، ۱۴۲۲ھ) (اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کسی سے کہے کہ اس کپڑے کو بیچ دو، سوا اتنے دام سے جو زائد رقم ہو، وہ تمہاری ہے)۔

اور محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں: ''إذا قال بعه بكذا، فما كان من ربح فهو لك، أو بيني وبينك، فلا بأس به'' (مرجع سابق ۳/ ۵۵۴) (اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ اسے اتنے میں بیچ دو، سو جو نفع ہو وہ تمہارا ہے، یا ہمارے اور تمہارے درمیان ہے، چنانچہ ایسا کرنے میں کوئی

حرج نہیں ہے)۔

البتہ اس صورت میں بھی دلال کو چاہئے کہ حد سے زیادہ قیمت نہ بڑھائے، تاکہ لوگ مشقت میں نہ پڑیں، اور یہ سوچے کہ اگر میں خریدار کی جگہ ہوتا تو کیا پسند کرتا، کہ یہی مومن کی شان ہے، جیسا کہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لا یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیه ما یحب لنفسه'' (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۱۳، صحیح مسلم حدیث نمبر: ۴۵) (تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

(ب):

دلال کمپنی کا زمین بیچ کر قبضہ نہ دلانا سراسر ظلم اور سخت گناہ ہے، اس لئے کہ جب خریداری مکمل ہوگئی تو ''مبیع'' (فروخت کردہ سامان) کو حوالہ کرنا واجب ہوگیا، ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں: ''وأما أحکامه فالأصلی له الملك فی البدلین. لکل منهما فی بدل ... والتابع وجوب تسلیم المبیع والثمن'' (ابن نجیم، البحر الرائق، کتاب البیع ۵/ ۲۸۲) (بہرحال بیع پر مرتب ہونے والے احکام تو اس کا اصلی حکم واثر بدلین میں ملکیت کا ثبوت ہے یعنی عاقدین میں سے ہر ایک کے لئے ملکیت بدل میں ثابت ہوجاتی ہے، اور ضمنی حکم مبیع (فروخت کردہ سامان) اور ثمن کی حوالگی کا وجوب ہے)۔

اور اگر زمین بیچنے والی دلال کمپنی عقد کے اندر یہ شرط لگاتی ہے کہ زمین ہم سے ہی بیچنا تو یہ شرط باطل ہے، اور اس شرط کے لگانے سے عقد فاسد ہوجائے گا، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ امام سرخسیؒ لکھتے ہیں: ''فإن کان فیه منفعة لأحد المتعاقدین، فالبیع فاسد؛ لأن الشرط باطل فی نفسه، والمنتفع به غیر راض بدونه، فتتمکن المطالبة بینهما بهذا الشرط، فلهذا فسد به البیع'' (سرخسی، المبسوط، کتاب البیوع، باب البیوع إذا کان فیها شرط ۱۳-۱۳-۱۴) (سو اگر شرط کے اندر عاقدین میں سے کسی ایک کا نفع ہو، تو بیع فاسد ہے: اس لئے کہ یہ شرط بذات خود باطل ہے، اور اس سے فائدہ اٹھانے والا اس کے بغیر راضی نہیں، لہٰذا دونوں کے درمیان اس شرط کا مطالبہ راہ پائے گا، سو اسی وجہ سے اس کے سبب بیع فاسد ہوگئی)۔

۲۔ یہ شرط عقد کے مقصود کے خلاف ہے، کیونکہ عقد کا تقاضا یہ ہے کہ فروخت کنندہ کی ملکیت ثمن میں، اور خریدار کی ملکیت مبیع (فروخت کردہ سامان) میں اس طرح ثابت ہوجائے کہ دونوں اپنی مملوکہ چیز میں آزادی کے ساتھ تصرف کرسکیں، جبکہ یہ شرط خریدار کی آزادی کو سلب کرتی ہے۔

۳۔ اس شرط کو لگا کر دلال کمپنی خریدار کا استحصال (Exploitation) کرنا چاہتی ہے تاکہ مارکیٹ ریٹ سے کم پر دوبارہ اس کی مملوکہ زمین حاصل کی جاسکے، جو ظلم ہے، اور ظلم اپنی تمام قسموں اور شکلوں کے ساتھ اسلامی شریعت میں حرام ہے۔

خلاصہ بحث:

۱۔ بعض لینڈ گرابرس (Land grabbers)، سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر کا سرکاری اراضی پر قابض ہوکر ان کو فروخت کردینا حرام ہے خواہ رشوت کے ذریعہ سرکاری عہدہ داروں سے وہ لے آوٹ (Layout) بھی منظور کراچکے ہوں، اور جانتے بوجھتے غصب کردہ سرکاری اراضی کا قابضین یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا ناجائز ہے۔

۲۔ اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کو تمام قسموں کے ساتھ اپنے لئے خریدنا حرام ہے۔

۳۔ اگر پھوپھیوں یا بہنوں کو حصہ نہیں دیا گیا تو بیٹوں یا پوتوں سے ان کی ایسی موروثی زمین کا خریدنا مکروہ تنزیہی ہے۔

۴۔ جو لوگ حرام خور کے حالات سے واقف ہیں، ان کے لئے حرام خور سے اس کی حرام آمدنی سے حاصل کردہ زمین کو خریدنا ناجائز ہے۔

۵۔ بیچنے والے شخص کے لئے حکومتی ادارہ سے منظور شدہ نقشے میں تبدیلی کرتے ہوئے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کو فروخت کردینا اور

دوسرے لوگوں کا جانتے بوجھتے اس کو خریدنا جائز نہیں ہے۔

۶۔ لے آؤٹ (Layout) یعنی آبادی کا نقشہ منظور کرنے کے لئے کالونی میں گارڈن (Garden) اور پلے گراؤنڈ (Playground) رکھنا قانونی اعتبار سے ضروری ہے، لہٰذا کالونی بنانے والے پر واجب ہے کہ اس قانون کی تعمیل کرے، اور اس مخصوص جگہ کو دوسرے مقصد کے لئے نہ بیچے، یا نہ دے۔

۷۔ ایک مفاد عام کے لئے مخصوص جگہ کو دوسرے مفاد عام کے لئے دینا مناسب نہیں ہے، البتہ یہ غصب کا معاملہ بھی نہیں ہے، اس لئے اس جگہ مسجد بنانا درست ہے، اور بننے والی مسجد شرعی مسجد ہے۔

۸۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ٹیکس کا نظام ایسا بنائے کہ لوگ اس سے بچنے کی تدبیریں نہ سوچیں۔

۹۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ آسان قانون اور صالح نظام بنائے تاکہ ملک کے ہر باشندہ کو مناسب مکان دستیاب ہو سکے۔

۱۰۔ قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بعد ہی کالونیاں بنانا اور پلاٹ فروخت کرنا مناسب ہے۔

۱۱۔ جائز ٹیکس سے بچنے کے لئے لون لینے کی گنجائش نہیں ہے، البتہ ظالمانہ ٹیکس اور غیر منصفانہ قانونی دشواری سے بچنے کے لئے لون لینے کی بدرجۂ مجبوری گنجائش ہے۔

۱۲۔ پلاٹ (Plat) نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہو جائے گی، بشرطیکہ پلاٹ کتنے گز پر مشتمل ہے اس کی وضاحت کر کے قیمت کی بھی تعیین کر دی جائے، لہٰذا خرید و فروخت کا یہ عمل درست ہے۔

البتہ فروخت کرنے والے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ جگہ کو تبدیل کر دے، یا نقشہ میں جس پلاٹ کا جو نمبر بتایا گیا ہے، اس کو دوسری جگہ ڈال دے۔

۱۳۔ زمین کے جن حصوں کی بیع مکمل ہو چکی ہے، خریداران کا مالک ہو چکا ہے، لہٰذا اگر کاشت کرنے کی شرط عقد کے اندر لگائی گئی تھی تو یہ شرط فاسد ہے، جس سے عقد فاسد ہو جائے گا۔ البتہ اگر ان حصوں پر بیچنے والے کا کاشت کرنا عقد کے بعد خریدار کی اجازت سے ہے، تو یہ اس کی طرف سے تبرع ہے۔

۱۴۔ اگر زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آ گئی تھی، اور اس نے پلاٹس فروخت کئے، تو پلاٹ خریدنے والا پلاٹ متعین ہونے سے پہلے، صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر اپنی زمین کسی دوسرے شخص سے فروخت کر سکتا ہے؛ اس لئے کہ اموال غیر منقولہ میں قبضہ سے پہلے بیع جائز ہے۔

۱۵۔ مالک زمین سے "خیار نقد" کے ساتھ جو زمین خریدی گئی، وہ مالک زمین کی ملکیت سے نکل چکی ہے، اور خرید و فروخت کا معاملہ طے ہونے کے بعد خریدار نے بہ طور اعتماد ثمن کے کچھ حصہ پر فروخت کنندہ کو قبضہ دلا دیا ہے، اور مقررہ مدت میں بقیہ رقم ادا کرنے کا وہ پابند ہے، اور اس مدت میں خریدار اگر پلاٹ (Plat) بنا کر بیچتا ہے، تو پہلی بیع لازم ہو گئی، اور اسے لازماً فروخت کنندہ کو ثمن دینا ہو گا۔

اور پلاٹنگ (Plating) کے سلسلہ میں اصل مالک کی اجازت بھی ضروری نہیں ہے۔

اور قانونی رکاوٹ کی وجہ سے زمین کا اصل مالک زمین کے پاس رہ جانا الگ بات ہے۔

اور جب پلاٹنگ کرنے والے کا پلاٹ بیچنا جائز ہے، تو پھر اس سے خریدنے والے شخص کا اگلے شخص کو بیچ دینا بھی جائز ہے۔

۱۶۔ غیر منقولہ جائیداد میں قبضہ سے پہلے بھی مبیع پر کامل ملکیت حاصل ہو جاتی ہے، اور جب ملکیت حاصل ہو گئی، تو اس میں تصرف کا حق بھی حاصل ہو گیا، لہٰذا جب متعین زمین کے اندر جو ہزار گز پر مشتمل ہے، مثلاً پچاس گز کا قطعہ جہت اور سمت کی تعیین کے بغیر خرید لیا گیا تو یہ مشترکہ طور پر خریداری ہے۔

اور اصل مالک زمین کے دلال سے خریدنا اصل مالک زمین سے خریدنے کے درجہ میں ہے۔

اور زبانی سودا بھی درست ہے۔

اور زمین خرید کر تجارت کرنے اور پیسے کمانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اور تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مشترک چیز کو شریک یا اجنبی کے ہاتھ سے فروخت کرنا جائز ہے۔

البتہ دلال کا یہ شرط لگانا کہ اسے وہی بیچے گا، باطل شرط ہے، اور اگر یہ شرط عقد مکمل ہونے کے بعد ہے، تو عقد کی صحت پر اس کا اثر نہیں پڑے گا۔

۱۷۔ کالونی بنانے والے سے قسطوں میں قیمت ادا کر کے پلاٹ خریدنا جائز ہے، اور اس طرح خریدنے سے خریدار کی ملکیت زمین پر ثابت ہوجاتی ہے، اور اگر یہ پلاٹ مشترکہ طور پر خریدا گیا ہے، تو پھر فروخت کرنے کی حالت میں اسے خریدنے کا حق تمام شرکاء کو ہے، لہذا کالونی بنانے والے اصل مالک پلاٹس کا اگر وہ شریک بھی ہو، تو اس کا یہ شرط لگانا کہ خریدنے والا صرف اسی سے بیچے درست نہیں ہے، بلکہ مالک پلاٹ کو اختیار ہے کہ وہ جس سے چاہے بیچے۔

اور اگر کالونی بنانے والا خریدنا ہی چاہتا ہے، تو اسے مارکیٹ ریٹ سے لینا ہوگا۔

لیکن اگر یہ شرط عقد کے مکمل ہونے کے بعد لگائی گئی ہو، تو عقد کی صحت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

اور اگر پلاٹ مقدار اور محل وتوع کے اعتبار سے متعین ہے، تو پھر اول فروخت کرنے والے یا دیگر مالکین کا یہ شرط لگانا کہ پلاٹ کا مالک ان ہی سے بیچے، یا فلاں سے نہ بیچے درست نہیں ہے۔

البتہ اگر یہ شرط عقد مکمل ہونے کے بعد لگائی گئی ہو، تو عقد کی صحت پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

۱۸۔ قسط پر فروخت کرنے کی صورت میں خریدار کی ملکیت مبیع پر معاملہ مکمل ہونے کے بعد فوراً ہی ثابت ہوجاتی ہے، اور ادھار قیمت کی قسطوں میں ادائیگی اس پر لازم ہوتی ہے، لہذا کالونی بنانے والے کا بعض قسطوں کی ادائیگی باقی رہنے کی وجہ سے سودے کو کینسل قرار دینا درست نہیں ہے، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ باقی قسطوں کو ادا نہ کرنے کی حالت میں خریدار کو اختیار دیا جائے کہ وہ باقی ماندہ قسطیں ادا کر کے اپنی زمین حاصل کرے، یا زمین بیچ کر باقی ماندہ قسطیں ادا کرے۔ لہذا فروخت کرنے والے کا صرف قسطوں میں ادا کی ہوئی رقم واپس کرنا جبکہ زمین کی قیمت مارکیٹ میں پچاس گنا بڑھ چکی ہو، سراسر ظلم ہے۔

۱۹۔ دلال کی زمین کی قیمت کالونی بنانے والے سے معلوم کر کے زمین کو اپنی من مانی قیمت پر بیچ کر مالک زمین کی بتائی ہوئی رقم سے زائد رقم خود لے لینا جرم ہے۔ البتہ بعض فقہاء کے نزدیک جواز کی شکل یہ ہوسکتی ہے کہ دلال کالونی بنانے والے مالک زمین سے یہ طے کر لے کہ اس قیمت سے زائد میں اگر میں بیچوں تو زائد قیمت میری ہوگی۔

۲۰۔ دلال کمپنی کا زمین بیچ کر قبضہ نہ دلانا سراسر ظلم اور سخت گناہ ہے۔

۲۱۔ زمین بیچنے والی دلال کمپنی عقد کے اندر یہ شرط لگاتی ہے کہ زمین ہم سے ہی بیچنا، تو یہ شرط باطل ہے، اور اس شرط کے لگانے سے عقد فاسد ہوجائے گا۔

ھذا ما ظھر لی واللہ أعلم بالصواب۔

☆☆☆

زمین کی بیع وشراء سے متعلق چند جدید مسائل

مولانا محمد ظفر عالم ندوی[1]

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق جو سوالات اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے آئے ہیں ان کے جوابات ترتیب وار شرع اسلامی کی روشنی میں ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

جواب نمبر (۱): بعض لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر سرکاری اراضی پر قابض ہوجائیں تو بلاشبہ یہ از روئے شرع اسلامی غصب ہے، غصب کردہ زمین کے بارے میں جب علم ہواوراس کے مالک کے بارے میں واقفیت ہوتو ایسی صورت میں غاصبین یا غاصبین نے جن کے ہاتھ فروخت کیا ہے ان سے زمین خریدنا شرعاً جائز نہیں ہے، اس بارے میں درج ذیل فقہی نصوص سے رہنمائی ملتی ہے۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

''لایجوز لأحد من المسلمین أخذ مال بغیر سبب شرعی'' (البحر الرائق ۵/ ۴۱، کتاب الحدود فی التعزیر)۔

علامہ ابن عابدین شامی اور ابن نجیم مصری دونوں فرماتے ہیں:

''أما شرائط المعقود علیه.... أن یکون ملك البائع فیما یبیعه لنفسه'' (رد المحتار ۴/۵۰۵، البحر الرائق ۵/۲۵۹)۔

غصب کردہ زمین خواہ مختلف ہاتھوں بکتی اور منتقل ہوتی رہے، وہ مال حرام ہی رہے گا اور حرمت منتقل ہوتی رہے گی۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

'' الحرام ینتقل أی ینتقل حرمته وإن تداولته الأیدی وتبدلت الأملاك'' (رد المحتار ۷/ ۳۰۰)۔

علامہ سیوطی الاشباہ والنظائر میں صراحت فرماتے ہیں:'' الحرمة تتعدی فی الأموال'' (ص- ۱۵۹)۔

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:''الحرمة تتعدی مع العلم بها إلا فی حق الوارث وقیده فی الظهریة بأن لا یعلم أرباب الأموال'' (الدر المختار علی رد المحتار ۷ / ۳۰۱)۔

فقہاء نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ غیر کے مال میں بغیر مالک کی اجازت کے تصرف جائز نہیں ہے، اس صورت میں اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں ہوگی۔

علامہ حصکفی لکھتے ہیں:''لایجوز التصرف فی مال غیره بلا إذنه و لا ولایته.'' (الدر المختار علی رد المحتار ۶/۲۰۰)۔

'' ولا یجوز التصرف بمال الغیر بدون إذن صریح''(الأشباه والنظائر / ۱۵۷)۔

فقہا کی مذکورہ تصریحات سے معلوم ہوا کہ مذکورہ قسم کی اراضی خریدنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

جواب نمبر (۲): موقوفہ غصب کردہ زمین کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، جن لوگوں نے اوقاف کی زمینوں پر قبضہ کرلیا، انھوں نے بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے، ایسے لوگوں سے جس طرح ممکن ہو وقف کی زمینیں آزاد کرانا متولیان اور ذمہ داران وقف پر ضروری ہے، غصب کردہ زمین خواہ وقف کی ہو یا کسی اور کی ان کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے، اگر کسی مسلمان نے موقوفہ زمین پر علم کے باوجود غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے تو ان پر لازم ہے کہ وہ موقوفہ زمین کو واپس کردے، ورنہ وہ عنداللہ وعند الناس مجرم قرار پائیں گے، احادیث میں اس سے متعلق سخت وعیدیں آئی ہیں

---

[1] مفتی واستاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

اور فقہاء نے اس بارے میں صراحت فرمائی ہے۔

"وأما حكمه فالإثم والمغرم عندالعلم وإن كان بدون العلم بأن ظن أن الماخوذ ماله أو اشترى عينا ثم ظهر استحقاقه فالمغرم ويجب على الغاصب رد عينه على المالك وإن عجز عن رد عينه بهلاكه فى يده بفعله أو بغير فعله فعليه مثله إن كان مثليا فإن لم يقدر على مثله بالإنقطاع عن أيدى الناس فعليه قيمته يوم الخصومة عندأبى حنيفة وقال أبو يوسف رحمه الله يوم الغصب وقال محمد رحمه الله يوم الإنقطاع" (فتاوى هنديه ۵/ ۱۹)۔

غاصب چاہے کسی وجہ سے بھی غصب کردہ زمین کا مالک ہو اور اسے بیع کردے تو یہ بیع باطل ہوگی۔

"ولوملك الغاصب المغصوب من جهة المغصوب منه ببيع أوبهبة أو وارث بعد ما باعه من غيره بطل البيع" (فتاوى هنديه ۵ / ۱۳۰)۔

اس مسئلہ میں دراصل بنیادی چیز یہ ہے کہ موقوفہ جائداد کی نہ خرید وفروخت ہوسکتی ہے اور نہ ہبہ اور نہ یہ وراثت میں منتقل ہوگی جیسا کہ روایات میں صراحتاً موجود ہے، اسی طرح اس کو رہن رکھنا اور اس پر ناجائز قبضہ کرنا وغیرہ ناجائز ہے، لہٰذا اس کی خریدگی بھی جائز نہیں ہوگی، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

"وإذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه أما إمتناع التمليك فلما بينا ماروى من حديث تصدق بأصلها : لا يباع ولا يوهب" (هدايه، كتاب الوقف)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں: "فاذا تم ولزم لا يملك ولا يملك ولايعار ولا يرهن أى لا يكون مملوكا لصاحبه ولا يقبل التمليك لغيره با لبيع ونحوه لإستحالة تمليك الخارج عن مالكه" (رد المحتار ۳/ ۵۰۷)۔

ان کے علاوہ دیگر کتب فقہ میں یہ تفصیلات موجود ہیں، موقوفہ جائداد کی خرید وفروخت ممکن نہیں ہے۔

جواب نمبر (۳): موروثی زمین جو تقسیم نہ ہوئی ہو بعد کے ورثاء اگر اپنے حصے کے بقدر کسی کے ہاتھ فروخت کردیں تو اس زمین کو خریدنا جائز ہے، کیونکہ بطور وراثت اس زمین کے وہ مالک ہیں اور مالک کو اپنی زمین فروخت کرنے کا حق حاصل ہے اور کسی کے لیے اس کے خریدنے کی اجازت ہے، فقہاء کے یہاں اس کی تصریحات موجود ہیں۔

حرام مال سے خرید کردہ اراضی خریدنے کا حکم؟

جواب نمبر (۴) اگر مشتری کو معلوم ہے کہ بائع کے پاس جتنی زمینیں ہیں وہ سب مال حرام سے خرید کردہ ہیں تو تعین کے ساتھ علم رکھنے والے حضرات کے لیے ان زمینوں کا خریدنا جائز نہیں ہے ہاں! اگر متعین طور پر معلوم نہ ہو کہ یہ زمین مال حلال سے خریدی گئی ہے یا حرام سے، حالانکہ بائع کے پاس دونوں طرح کے اموال ہیں تو اس صورت میں امام کرخیؒ کا قول یہ ہے کہ اس کی خریداری درست ہوگی، علامہ ابن عابدینؒ شامیؒ نے صراحت کی ہے کہ فتویٰ امام کرخیؒ کے قول پر ہے۔

"رجل اكتسب مالا من حرام، ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أو لا، ثم اشترى منه بها أو اشترى مطلقا و دفع تلك الدراهم أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها او اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها، أو اشترى مطلقا ودفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم أخر، ودفع تلك الدراهم- إلى قوله، وقال الكرخى رحمه الله فى الوجه الأول والثانى لا يطيب، وفى الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبو بكر رحمه الله لا يطيب فى الكل، لكن الفتوى الآن على قول الكرخى رحمه الله دفعا للحرج عن الناس" (رد المحتار ۷ / ۴۹۰ زكريا، كتاب البيوع، مطلب إذا اكتسب حراما)۔

فتاویٰ ہندیہ میں تقریباً یہی صراحت موجود ہے (فتاویٰ ہندیہ ۳ / ۲۱۵ دار الکتاب دیوبند)۔

قانونی طور پر منظور شدہ نقشہ کے خلاف خرید وفروخت کرنا کیسا ہے؟

جواب نمبر (۵): حکومت کے قانون کے مطابق جو لے آؤٹ منظور کرایا گیا ہے اور خریدار کو نقشہ کے مطابق معاملہ بتایا گیا، پھر اس میں تبدیلی کردی گئی، مثلاً راستہ کم کردیا گیا یا اس کی بھی قیمت خریداروں سے لی گئی تو یہ از روئے شرع غش میں داخل ہے، لیکن اس غش سے خریدار واقف ہوتے ہیں اور اس کے باوجود خریدتے ہیں تو اگرچہ شرعاً یہ بیع ہوجائے گی، لیکن قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی، اور حکومت کی طرف سے کارروائی ہوسکتی ہے اور بڑا نقصان بھی ہوسکتا ہے، اس لیے اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے اس قسم کی خریداری کراہت سے خالی نہیں ہوگی۔ ہاں! اگر مکان بنانے کی سخت ضرورت ہو اور کوئی فریش کالونی اور زمین نہ مل پارہی ہو تو بربنائے ضرورت خریدنے میں کراہت نہیں ہوگی۔

گارڈن کے لئے تجویز شدہ جگہ پر مسجد بنوانا:

جواب نمبر (۶): گارڈن یا پلے گراؤنڈ نقشہ میں جہاں ہو اگر اس جگہ مالک زمین کی طرف سے مسجد بنادی گئی تو مسجد درست ہوگی اور مسجد شرعی کہلائے گی، البتہ حکومت سے منظور شدہ نقشہ کے مطابق تعمیر نہ کرنے کی وجہ سے وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

مجبوری اور زیادہ اخراجات کے پیش نظر غیر قانونی کالونی بسانا:

جواب نمبر (۷): اس مسئلہ میں شرعی نقطہ نظر سے اگر غور کیا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اراضی ہو تو اس پر کالونی بسانے کے لیے نقشہ کی منظوری یا خرید وفروخت سے متعلق ٹیکسیز شرعاً نہیں ہیں، لیکن ملکی اور شہری قانون کا لحاظ کرنا ایک اچھے شہری کے لیے ضروری ہے، اگر قانون کا لحاظ نہ ہو تو غیر قانونی کالونی بسانے والے خلاف معاہدہ کام کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوں گے اور خلاف قانون کام کرنے کی وجہ سے گرفت میں آنے پر بے عزتی اور تذلیل ہوگی اور اپنے کو ذلت سے بچانا شرعاً ضروری ہے، ترمذی کی روایت ہے:

''عن حذيفة قال قال رسول الله ﷺ: لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه قالوا كيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لا يطيق'' (ترمذی وابن ماجہ)۔

انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری ٹیکسیز سے بچنے کے لیے سودی قرض لے کر زمین کی خرید وفروخت کرنا:

جواب نمبر (۸): محض سرکاری قوانین، انکم ٹیکس و دیگر سرکاری ٹیکسیز وغیرہ سے بچنے کے لیے استطاعت کے باوجود سودی قرض لے کر زمین خرید و فروخت کرنا درست نہیں ہے، خواہ غریب مسلمانوں کے تعاون کا جذبہ ہو، سود جیسے موجب لعنت اور حرمت معاملہ میں مبتلا ہو کر غیروں یا مسلم غرباء کی مدد کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ "ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" آیت کے تحت ممنوع ہوگا، غیر مسلموں کی ترقیات کو دیکھ کر گمراہ کن راہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل" (سورہ انعام: ۱۵۴)۔ یہ راہ دراصل شیطان کی راہ ہے، "ولا تتبعوا خطوات الشيطان" (بقرہ: ۱۶۸)، بلکہ غیروں کی چمک دمک کی طرف نظر اٹھانے سے منع کیا گیا ہے "ولا تمدن عينيك إلى ما متعنا به أزواجا منهم زهرة الحياة الدنيا" (سورہ طہ: ۱۳۱)۔

البتہ اگر خود کوئی پریشان حال بے مکان مسلمان مکان کا محتاج ہو اور اسے غیر سودی قرض نہ ملتا ہو تو ضرورت کی بنا پر بقدر ضرورت اس کے لیے انفرادی طور پر سودی قرض لے کر مکان یا رہائشی زمین خریدنے کی گنجائش ہوگی، جیسا کہ فقہاء نے صراحت کی ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں:

''يجوز للمحتاج الإستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر لابن نجیم / ۱۰۰)۔

قطعہ زمین کے نمبر جو نقشہ میں ہوتے ہیں ان کے بجائے پلاٹس نمبر کے اعتبار سے فروختگی کا حکم:

جواب نمبر (۹): اس بارے میں اصل یہ ہے کہ خرید وفروخت میں مبیع کا تعین ہو، مبیع مجہول نہ ہو، اگر پلاٹس نمبر کی تعیین سے مبیع کی تعیین ہوجائے اور

جہالت باقی نہ رہے تو اس طرح خرید وفروخت کا معاملہ شرعاً درست ہوگا، فتاویٰ بزازیہ میں ایک جزئیہ موجود ہے:

''اشتریٰ أرضا و ذکر حدودها لا ذرعها طولا و عرضا جاز، وإذا عرف المشتری الحدود لا الجیران یصح وإن لم یذکر الحدود ولم یعرفه المشتری جاز البیع إذا لم یقع بینهما تجاحد، وجهل البائع بالمبیع لا یمنع وجهل المشتری یمنع'' (فتاویٰ بزازیه علی الهندیة ۴/۳۷۲)۔

اوپر کی عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ مشتری کو اگر پلاٹ معلوم ہوجائے تو بیع درست ہوجائے گی، ورنہ جہالت کی وجہ سے بیع درست نہیں ہوگی۔

زمین پر بائع ہی کا قبضہ ہو، لیکن مشتری نے ثمن ادا کردیا ہو تو کیا مشتری کی ملک ہوگی؟

جواب نمبر (۱۰): اس بارے میں فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مشتری نے زمین کی خریدگی کا معاملہ کرکے بائع کو ثمن ادا کردیا تو زمین پر مشتری کی ملکیت ہوجائے گی، اگرچہ بائع نے قبضہ نہ دیا ہو، بائع اگر فروخت شدہ زمین پر کھیتی کرے تو یہ ان کی طرف سے زیادتی ہے، بائع پر واجب ہے کہ وہ جلد از جلد زمین مشتری کے لیے خالی کردے، یہی وجہ ہے کہ اگر مشتری خرید شدہ زمین پر قبضہ سے قبل تصرف کرلے تو یہ تصرف درست ہوگی۔

شرح المجلہ کی عبارت ہے: ''للمشتری أن یبیع المبیع من آخر قبل قبضه إن کان عقارا لا یخشی بلاکه وکما یجوز بیع العقار قبل قبضه یجوز أیضا التصرف فیه بالرہن، والهبة، غیر أن التصرفات المذکورة وإن کانت جائزة إلا أنها لا تکون لازمة ونافذة إلا بدفع الثمن للبائع أو إجارته لها'' (شرح المجلة ۱/۱۲۸ رقم: ۲۵۳)۔

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے: ''إذا اشتریٰ دارا أو عقارا فوبها قبل القبض من غیر البائع یجوز عند الکل ولو باع یجوز فی قول أبی حنیفة وأبی یوسف رحمهما الله ولا یجوز فی قول محمد رحمه الله'' (فتاوی تاتارخانیة ۸/۲۶۱)۔

علامہ ابن عابد شامیؒ لکھتے ہیں: ''لو اشتریٰ عقارا فوہبه قبل القبض من غیر بائع یجوز عند الکل کما فی البحر عن الخانیة'' (رد المحتار ۷/ ۳۶۹ دار الکتب بیروت)۔

ان کے علاوہ اور فقہاء نے بھی یہی نقطہ نظر پیش فرمایا ہے کہ عقار میں جب مشتری نے ثمن ادا کردیا تو مشتری کی ملک ہوجاتی ہے اور قبضہ کے بغیر بھی اس کے لیے تصرف درست ہوجاتا ہے۔

پلاٹ متعین ہونے سے قبل کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردینا:

جواب نمبر (۱۱) (الف): زمین اگرچہ کالونی بنانے والی کی ملک میں آگئی ہو اور اس نے پلاٹ خریدنے والے کے ہاتھ فروخت کردیا جب تک پلاٹ کی تعیین نہ ہوجائے، اس کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں مجھول اور مشاع شئ کی بیع ہوگی جو فاسد ہوگی، البتہ اس صورت میں پلاٹ متعین ہونے کے بعد بائع کی اجازت سے مشتری اس پلاٹ پر قبضہ کرلے تو بائع کی ملکیت ثابت ہوجائے گی، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ بیع فاسد میں بائع کی اجازت سے مشتری جب بیع پر قبضہ کرے تو مشتری مبیع کا مالک ہوجائے گا، ہدایہ اور دیگر کتب فقہ میں صراحت موجود ہے:

'' فإن باعه المشتری بالشراء الفاسد نفذ بیعه، لأنه ملکه فملك التصرف فیه وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثانی ونقض الأول لحق الشرع و حق العبد مقدم لحاجته'' (ہدایہ ۳ / ۶۵)۔

علامہ ابن ہمامؒ اس پر لکھتے ہیں:

''فان باعه أی باع المشتری ما اشتراہ شراء فاسدا بیعا صحیحا نفذ بیعه لأنه ملکه فملك التصرف فیه وسقط حق البائع الأول فی الاسترداد'' (فتح القدیر ۶/۴۲۷)۔

(ب): دوسری صورت جس میں کہ کالونی بنانے والے کا ابھی قبضہ نہیں ہوا ہے اور کاشتکار کھیتی کر رہا ہے اس صورت کا بھی وہی حکم ہوگا جو پہلی صورت کا ہے، کیونکہ املاک غیر منقولہ کا ثمن سودا کے بعد اگر ادا کر دیا جائے تو مشتری کی ملک بغیر قبضہ کے بھی ہو جاتی ہے، جیسے پیچھے فقہاء کی تصریحات درج کی جاچکی ہیں۔

بذریعہ دلال زمین کی خرید وفروخت جب کہ زمین پر قبضہ بھی نہ ہو:

جواب نمبر (۱۲): غیر منقولہ اشیاء مثلاً زمین ومکان وغیرہ جب موجود اور مقدور التسلیم ہوں تو اس کی خرید وفروخت جائز ہے، چونکہ اس قسم کی خرید وفروخت میں دلالی کے بغیر معاملہ مشکل ہے اور موجود دور میں اس کا رواج بھی ہو گیا ہے، اس لیے اس میں دلالی کی بھی گنجائش ہے اور اس کی اجرت بھی جائز ہے، زمین پر اگر چہ قبضہ نہ ہو، لیکن قیمت ادا کر دینے کی وجہ سے ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، اس لیے آگے دوسروں کے ہاتھ بغیر قبضہ کے بھی اس کی خرید وفروخت بذریعہ دلال درست ہے جیسا کہ بذریعہ وکالت اس کی اجازت ہوتی ہے، دلائل اوپر کے مسائل میں درج ہو چکے ہیں۔

قسطوں پر پلاٹ بذریعہ دلال خریدنا اور فروخت کرنا ہے۔

جواب (۱۳): قسطوں میں جب پوری قیمت ادا ہو جائے تو زمین پر ملکیت ثابت ہو جائے گی، پھر انہی کے ہاتھ نفع لے کر فروخت کر دی تو یہ درست ہے۔

''ویجوز بیع العقار قبل القبض عند أبي حنیفة وأبي یوسف رحمهما الله، ولهما أن رکن البیع صدر من أهله فی محله ولا غیر رقبة لأن الهلاك فی العقار نادر بخلاف المنقول. والغرر المنهی عنه غرر انفساخ العقد والحدیث معلول به عملا بدلائل الجواز'' (ہدایہ ۲/ ۷۳)۔

'' إذا اشتریٰ دارا أو عقارا فوہبها قبل القبض من غیر البائع یجوز عندالکل. ولو باع یجوز فی قول أبي حنیفة وأبي یوسف رحمهما الله'' (تاتارخانیة ۸/۲۶۶)۔

الفقه علی المذاهب الأربعة ۲ / ۳۳۴ میں بھی یہی صراحت ہے۔

پوری قسطیں ادا نہ ہونے کی صورت میں معاملہ کو کینسل کرنا اور ادا شدہ رقم واپس کرنا اور خریدار کا بوقت واپسی رقم زمین کا مطالبہ کرنا:

جواب نمبر (۱۴): خریدار جب وقت مقررہ پر پوری قیمت ادا نہ کر پائے تو بائع کو معاملہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، بلکہ رقم پوری ادا کرنے کی صورت میں بھی اقالہ کا حق ہوتا ہے، اس صورت میں مشتری دوبارہ بقیہ رقم ادا کرنے کی بات کرے تو یہ بائع کے اختیار میں ہے، چاہے تو قبول کرے یا فسخ کردے اور ادا شدہ قیمت واپس کردے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

'''إذا الحاجة مست إلی الإنفساخ عند عدم النقد تحرزا عن المماطلة فی الفسخ ....'' (ہدایہ ۳/۳۰)۔

''فإذا عزم البائع علی ترك الخصومة، تم الفسخ. وبمجرد العزم وإن كان لا يثبت الفسخ فقد اقترن بالفعل وهو إمساك الجارية و نقلها وما يضاهيه ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشترى فات رضاء البائع فيستبد بفسخه'' (ہدایہ ۳/ ۱۳۱۔ باب التحکیم۔ مسائل شتیٰ)۔

ہدایہ کے علاوہ دیگر کتب فقہ میں یہ بات ملتی ہے کہ اگر مشتری معاہدہ کے مطابق ثمن ادا نہ کر پائے تو بائع کو معاملہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے، اور جب فسخ ہو جائے تو مشتری صرف اتنی ہی رقم کا حقدار ہوگا جو انھوں نے بائع کو سپرد کیا ہے، اس سے زائد نہیں۔

شیخ سہارنپوریؒ صراحت فرماتے ہیں:

''ویرد العربان إذا ترك العقد علی كل حال بالإتفاق'' (بذل المجهود ۴/ ۲۸۷)۔

دلال کا مشتری سے من مانی قیمت لے کر زمین فروخت کرنا:

جواب نمبر (۱۵): جو قیمت بائع سے طے ہوئی ہو اسی پر دلالی کرے اور اپنی اجرت طے کرے تو یہ صورت درست ہے۔

''وسئل محمد بن مسلمة عن أجرة السمسار فقال أرجو أنه يجوز وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه'' (رد المحتار ۶/ ۶۳)۔

علامہ شامی مزید تحریر فرماتے ہیں:

''إجارة السمسار والمنادی والحمامی والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة'' (رد المحتار ۶/۴۷)۔

لیکن بائع سے کچھ طے کیا جائے اور مشتری کچھ لے تو یہ صورت درست نہیں ہے، ہاں اگر یہ صورت ہو کہ دلال کالونی فروخت کرنے والوں سے یہ طے کرلے کہ میں آپ کو ایک متعین قیمت دوں گا، مثلاً ایک ہزار روپے اسکوائر فٹ دوں گا اور مشتری سے جو کچھ زیادہ ملے وہ میں لوں گا پھر دلال مشتری سے زمین کی قیمت طے کر کے معاملہ کرے اور اس میں جو زائد رقم حاصل کرے وہ اس کی اجرت ہوگی اور درست کہلائے گی، اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ دلال نے بائع سے متعین رقم پر زمین خرید کر مشتری کے ہاتھ نفع لے کر فروخت کر دیا، شرعاً اس کی گنجائش ہوگی، ہدایہ کی شرح عنایۃ میں ایک جزئیہ ہے:

''أنه باعه مرابحة، فإن كان كل ما اشتراه به له مثل جاز سواء جعل الربح من جنس رأس المال الدرهم من الدراهم أو من غير الدرهم من الدنانير أو على العكس، إذا كان معلومًا ما يجوز به الشراء لأن الكل ثمن'' (عناية على الهداية ۶/ ۴۹۵)۔

مذکورہ جزئیہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ دلال اگر کالونی والے سے زمین خرید کر بطور مرابحہ خریدار کے ہاتھ فروخت کرے تو اس کی گنجائش ہے جبکہ قیمت طے ہو۔

مختلف النوع اراضی کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی[1]

زمین بیش بہا نعمت خداداد ہے، انسان کی بنیادی ضروریات زمین سے ہی وابستہ ہیں، یہی مدفن ومسکن ہے، خوراک وپوشاک اسی کی رہین منت ہیں، ظاہر میں پیروں تلے روندی جانے والی حقیر شئی ہے، مگر ذرا قدموں تلے سے کھسک جائے تو انسان کا سارا زور چکنا چور ہوجائے، اللہ نے بار بار جن نعمتوں کا تذکرہ کرکے بندوں کی تذکیر کی ہے ان میں بہت اہمیت کے ساتھ زمین کا تذکرہ کیا گیا ہے، چونکہ انسانی دسترس سے ماوراء بھی نہیں اس لئے ظلم وزیادتی کی شکار بھی خوب رہتی ہے جس کی پاداش میں بہت سے مظلوم انسان پس جاتے ہیں، اس لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی واضح انداز میں متنبہ کردیا ہے کہ جس نے تھوڑی زمین کا حصہ ہڑپ کیا وہ قیامت کے دن ساتوں تہوں کو طوق بنائے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہوگا۔

''عن سعید بن زید قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: من ظلم من الأرض شيئًا طوّقه من سبع أرضين'' (بخاری ۱/ ۳۳۲ کتاب المظالم، باب اثم من ظلم شيئًا من الأرض) (حضرت سعید فرماتے ہیں: میں نے اللہ کے رسول کو فرماتے ہوئے سنا: جس نے تھوڑی زمین بھی غصب کیا تو ساتوں زمین کا طوق بنایا جائے گا)۔

دنیا کے پرستاروں نے اسی کے حصول کے لئے حرب وجنگ کے بہت سے میدانوں کو خون آلود کیا اور یہ سلسلہ نسل در نسل دراز سے دراز ہوتا گیا جس کی وجہ سے دنیا جور وزیادتی کی آماجگاہ بن گئی، لوگوں کی ستم ظریفی کیا کیا ہوتی ہے اور اس بے زبان زمین کے ساتھ کیسا برتاؤ ہوتا ہے، خواہ ان ظالموں کا فائدہ ہو یا نہ ہو، اس پر بسنے والے آہ وبکا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، خواہ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری نہ ہو، مگر دل میں جو گھاؤ پڑ جاتا ہے بڑی مشکل سے بھر پاتا ہے، فقہ اسلامی سے اس بابت کیا رہنمائی ملتی ہے مندرجہ ذیل سطور میں پیش کیا جارہا ہے:

(۱) سرکاری زمینوں کے قابضین سے خرید وفروخت:

اراضی مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں:

(۱) ذاتی زمین: جو افراد واشخاص کی زیر ملکیت ہوتی ہے، (۲) اراضی موقوفہ: جو کار خیر میں اللہ کے لئے وقف ہوتی ہے، (۳) غیر آباد وبنجر زمین یہ جس سے آبادی کا مفاد وابستہ نہ ہو، (۴) اراضی سلطانیہ یعنی سرکاری زمین جو گورنمنٹ کے قبضہ میں ہو؛ خواہ اسی کی ملکیت ہو یا اصل مالک کے نہ ہونے کی وجہ سے حکومت کی تحویل میں ہو۔

ہر زمین کے احکام الگ الگ ہیں، سرکاری جائیداد جس پر گورنمنٹ کو مالکانہ تصرف کا حق ہے، چونکہ وہ زمینیں سرکاری حکام کی ملکیت نہیں ہیں، بلکہ صرف تصرف کے مجاز ہیں، کس قسم کا تصرف یہ کرسکتے ہیں وہ سرکاری کاغذات میں فکس ہیں، کس کو زمین بطور ہبہ الارٹ کیا جاسکتا ہے یہ بھی متعین ہے، اگر سرکاری حکام اپنے حدود اور دائرہ کار میں رہتے ہوئے انجام دیتے ہیں تو اس تصرف کو سراہا جائے گا، اگر اپنے دائرہ کار سے متجاوز ہوتے ہیں تو اسے خرد برد کہا جائے گا، زمینی حقیقت میں اس کی حیثیت نہ ہوگی، عدالت آج نہیں تو کل اس کو کالعدم کردے گی، سرکاری حکام کے لئے وضع کردہ قوانین انتظامی امور کو درست رکھنے کے لئے ایک مسلمان قاضی کے قوانین کے مانند ہیں، اگر کوئی قاضی وسربراہ کتاب وسنت کے خلاف کوئی فیصلہ کرتا ہے تو وہ فیصلہ نافذ نہیں سمجھا جاتا ہے:

''أو خالف کتابًا أو سنة مشهورة أو إجماعًا لا ينفذ في الكل'' (الدر المختار ۴/ ۳۶۷ کتاب القضاء مطلب فی الحکم بما خالف الکتاب الخ) (قاضی کتاب اللہ، یا سنت مشہورہ، یا اجماع کی خلاف ورزی کرے تو کوئی فیصلہ نافذ نہیں ہوگا)۔

---

[1] استاذ حدیث وفقہ جامعہ حسنیہ کایم کلم، کیرالا۔

اسی طرح سرکاری حکام ملکی قوانین اراضی کی مخالفت کرتے ہوئے کسی غیر مستحق کو زمین الارٹ کرتے ہیں، خواہ رشوت لیا ہو یا نہ لیا ہو، کسی بھی صورت میں اس الارٹمنٹ کو نافذ نہیں مانا جاسکتا، اور اس کا مالک علی حالہ حکومت وقت ہوگی، اسی کو بیچنے کا اختیار ہوگا، دوسرے کی بیع بیع فضولی کہلائے گی، جو مالکیہ وحنفیہ کے نزدیک مالک کی اجازت پر موقوف رہتی ہے؛ جبکہ شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک بیع ہوتی ہی نہیں ہے؛ خواہ مالک اجازت ہی کیوں نہ دے دے۔

''الأول للحنفية والمالكية وأحمد فى رواية عنه: هو أن بيع الفضولى ينعقد موقوفًا على إجازة المالك؛ فإن أجازه نفذ وإن رده بطل. والثانى للحنابلة والشافعية فى المعتمد: وهو أن بيع الفضولى باطل فلا ينقلب صحيحًا ولو أجازه المالك بعد'' (الموسوعة الفقهيه الكويتيه ۳۲/ ۱۴۲ ماده: فضل)۔

(بیع فضولی کے سلسلہ میں پہلا نقطۂ نظر حنفیہ ومالکیہ کا ہے اور ایک روایت امام احمد کی ہے کہ اس کی بیع مالک کی اجازت پر موقوف ہوکر منعقد ہوتی ہے، اگر اجازت دے دے تو نافذ اور اگر رد کردے تو باطل۔

دوسرا نظریہ حنابلہ اور شافعیہ کا ہے کہ فضولی کی بیع باطل ہے، پس صحیح نہیں ہوسکتی ہے چاہے بعد میں مالک اجازت ہی دے دے)۔

البتہ سرکاری حکام نے ایسے لوگوں کے نام الارٹ کیا ہے جس کو قانوناً الارٹ کیا جاسکتا ہے تو خواہ رشوت ہی لے کر کیا گیا ہو جس کے نام الارٹ ہوا ہے وہ مالک ہوجائے گا اور اس کے لئے بیچنا بھی جائز ہوگا۔

لہٰذا جن غنڈہ عناصر نے سرکاری زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے، ان کا یہ قبضہ غاصبانہ سمجھا جائے گا، شئ مغصوب جب تک باقی ہے بعینہ اس شئ کو واپس کرنا ضروری ہے، واپس کردینے سے بری الذمہ ہوجائے گا؛ خواہ دوسرے معلوم ہو یا نہ ہو۔

''يجب رد عين المغصوب ما لم يتغير تغيرًا فاحشًا ويبرأ بردها ولو بغير علم. وفى البزازية: ولو سلمه إليه بجهة أخرى كهبة أو إيداع أو شراء'' (الدر المختار ۵/ ۱۲۸ كتاب الغصب، رشيديه پاكستان)۔

(عین مغصوب کو لوٹانا ضروری ہے جب تک تغیر فاحش نہ ہو، اور اس کو لوٹانے سے بری الذمہ ہوجائے گا خواہ مغصوب منہ کو معلوم نہ ہو، بزازیہ میں ہے: اسی طرح اگر اس کو دوسرے طریقے ہبہ، ودیعت یا شراء کے طریقے سے دے تو بری ہوجائے گا)۔

لہٰذا جانتے ہوئے ایسی زمینوں کو خریدنے کا اقدام کرنا جائز نہیں ہے، نیز ان قابضین سے خریدنے کی وجہ سے خریدار کو مالکانہ تصرف کا حق بھی نہیں ہوگا۔

(۲) اوقاف کی اراضی مغصوبہ کی خرید وفروخت:

وقف مکمل ہوجانے کے بعد وہ انسانوں کی ملکیت سے نکل کر اللہ کی ملکیت میں داخل ہوجاتا ہے، اب خرید وفروخت بلکہ کسی بھی قسم کا مالکانہ تصرف کے لائق نہیں رہتا ہے۔

''فإذا تم ولزم لا يملك ولا يُملك ولا يعار ولا يرهن ولا يقسم'' (الدر المختار ۳/ ۴۰۲ كتاب الوقف. ط: رشيديه پاكستان) (جب وقف مکمل ولازم ہوجائے تو نہ کوئی مالک ہوسکتا ہے اور نہ کسی کو مالک بنایا جاسکتا ہے، نہ عاریت پر دیا جاسکتا ہے، نہ رہن کے طور پر رکھا جاسکتا ہے، اور نہ ہی ملکیت والی تقسیم کی جاسکتی ہے)۔

اگر لوگوں کے دوسری جگہ منتقل ہونے کی وجہ سے دور افتادہ ہوجائے، یا کسی وجہ سے مستحقین کے لئے نفع بخش باقی نہ رہ پائے تو ایسے موقع پر فقہاء نے اجازت دی ہے کہ اس کی بیع کردی جائے اور اس کی قیمت دوسرے اوقاف میں خرچ کردی جائے۔

''سئل شمس الأئمة الحلوانى عن مسجد أو حوض خرب ولا يحتاج إليه لتفرق الناس هل للقاضى أن يصرف أوقافه إلى مسجد آخر أو حوض آخر؟ قال: نعم'' (الفتاوى التاتارخانية ۸/ ۱۹۶، الفصل: ۲۴ صرف الغلة على وجوه، مسئله: ۱۱۶۲۴)۔

(علامہ حلوانی سے سوال کیا گیا ایک ایسی مسجد یا حوض کے بارے میں جو ویران ہے اس کی ضرورت باقی نہیں، اس لئے کہ لوگ وہاں پر نہیں ہیں، تو قاضی اس کے اوقاف کو دوسری مسجد یا دوسرے حوض میں صرف کرسکتا ہے، انہوں نے کہا: ہاں)۔

لہٰذا ایسے اوقاف جن پر مسلمانوں نے یا غیر مسلموں نے ناجائز قبضہ کرلیا ہے یا قبضہ کرنے کا ایسا قوی اندیشہ ہے کہ مقصدِ وقف پامال ہوسکتا ہے، آئندہ

بھی اس کا ناجائز قبضہ کو ختم کرنے کی قدرت نہ ہونے کا ظن غالب ہے تو ناچیز یہ خیال کرتا ہے کہ اس قسم کے اوقاف کارآمد باقی نہیں رہتے، اس لئے اس کو بیچ دینے میں یا ایسے شخص کو خرید لینے میں حرج نہیں ہے جن کو اتنی استطاعت ہو کہ قبضہ کر سکے گا اور اس میں مالکانہ تصرف کر پائے گا، پھر اس سے حاصل ہونے والی رقم کو کسی دوسرے اوقاف میں لگا دیا جائے یا اس سے کسی دوسری زمین وغیرہ خرید کر وقف کر دیا جائے، اس سلسلہ میں اس جزئیہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے:

''سئل شيخ الإسلام عن أهل قرية افترقوا وتداعى مسجدا لقربة إلى الخراب، وبعض المتغلبة يستولون على خشب المسجد وينقلونها إلى ديارهم هل لواحد من أهل القرية أن يبيع الخشب بأمر القاضي ويمسك الثمن ليصرفه إلى بعض المساجد أو إلى هذا المسجد؟ قال: نعم'' (الفتاوى التاتارخانية ۸/ ۱۹۷ الفصل: ۲۴ صرف الغلة على وجوه: ۱۱۶۲۶)۔

(شیخ الاسلام سے سوال کیا گیا: اہل قریہ ادھر ادھر چلے گئے، قریہ کی مسجد ویران ہونے لگی، بعض غاصبین مسجد کی لکڑی وغیرہ پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اپنے گھر لے جاتے ہیں تو کسی کے لئے جائز ہے کہ قاضی کی اجازت سے لکڑی بیچ دے اور ثمن کو باقی رکھے تا کہ دوسری مسجد یا اسی مسجد میں صرف کرے؟ تو کہا: ہاں، جائز ہے)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند شامی اور بحر کی مختلف عبارتوں کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

''ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ وقف تام اور مکمل ہو جانے کے بعد اس کا بیچنا، خریدنا، ہبہ کرنا، رہن رکھنا وغیرہ کچھ بھی جائز نہیں ہوتا، ہاں اگر ضائع ہو جانے کا ظن غالب ہو جائے یا بالکل ہی ناقابل انتفاع ہو جائے تو اس کو فروخت کر کے اس کے بدلے میں اسی موقوفہ کے متوازی ومماثل دوسری چیزیں خرید کر وقف کر دی جائیں''۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں:

''لہذا اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس موقوفہ کے ضیاع کا قوی خطرہ ہو چکا تھا، ایسی حالت میں اس زمین کا وقف کی حفاظت کی خاطر فروخت کر دینا درست تھا، اور جب خریدار اول کے لئے اس کا خریدنا ان مذکورہ بالا عبارتوں کے ذریعہ درست تھا تو خریدار اول کو بطور خود مالک ہو جانے کے بعد خریدار ثانی کے ہاتھ فروخت کرنا بھی درست وجائز ہو گیا، اور خریدار ثانی کو بھی جائز ہو گیا کہ وہ اب جس طرح جائز کاموں میں چاہے استعمال کرے'' (منتخبات نظام الفتاوی ۲/ ۲۷۶ کتاب الوقف، مطبوعہ ایفا)۔

عام اوقاف کا حکم یہی ہے، اسی طرح مسجد کے مصالح کے لئے جو وقف کیا جاتا ہے اس کا حکم بھی یہی ہے، لیکن جو جگہ مسجد ہو گئی تو پھر وہ تا قیامت تحت الثری سے ثریا تک مسجد ہی رہتی ہے۔

''ولو خرب ما حوله واستغنى عنه يبقى مسجدًا عند الإمام والثاني أبدًا إلى قيام الساعة وبه يفتى'' (الدر المختار ۲/ ۴۰۶ کتاب الوقف، مطلب فيما لو خرب المسجد أو غير، ط: رشيديه) (اگر مسجد کے اردگرد ویران ہو جائے، مسجد کی ضرورت باقی نہ رہے تو شیخین کے نزدیک مسجد ہی باقی رہے گی ہمیشہ قیامت تک، یہی مفتی بہ ہے)۔

(۳) قدیم موروثی زمین کو خریدنے کا حکم:

وہ موروثی زمین جو عرصۂ دراز سے وارثوں کے مابین تقسیم نہیں ہوئی، ایسی زمین ہر وارث کی بقدر حصہ ملکیت سمجھی جائے گی، ہندیہ میں ہے:

''الشركة نوعان: شركة ملك وهي أن يتملك رجلان شيئًا من غير عقد الشركة بينهما، وشركة عقد وهي أن يقول أحدهما: شاركتك في كذا ويقول الآخر: قبلت'' (ہندیہ ۲/ ۳۰۱ کتاب الشركة، ط: بيروت)۔

(شرکت کی دو قسمیں ہیں: شرکت ملک اور وہ یہ ہے کہ دو آدمی کسی شئی کے مالک ہوں بغیر عقد شرکت کے، اور شرکت عقد یہ ہے کہ ایک کہے میں نے تم کو اس طرح شریک کیا، دوسرا کہے: میں نے قبول کیا)۔

شرکتِ ملک میں ہر شریک دوسرے کے حق میں اجنبی ہوتا ہے، دوسرے کی اجازت کے بغیر اس کے حصے میں تصرف کا حق نہیں رکھتا ہے۔

''وكل منهما أجنبي في نصيب الآخر حتى لا يجوز له التصرف فيه إلا بإذن الآخر كغير الشريك لعدم تضمنها

الوکالۃ'' (مجمع الانہر ۲/ ۵۴۳ کتاب الشرکۃ، ط: دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔
(ہر شریک دوسرے کے حصے میں اجنبی ہوتا ہے، اس حصہ میں اجازت کے بغیر تصرف جائز نہیں ہے، جیسے کہ غیر شریک کے لئے، اس لئے کہ اس میں وکالت نہیں ہوتی ہے)۔

البتہ شرک اپنے حصہ میں ایسا تصرف کرسکتا ہے جس سے دوسرے کی حق تلفی نہ ہوتی ہو، لہذا اس کے حصہ کے بقدر خریدنے میں حرج نہیں ہوگا، لیکن بعدہ دوسرے شرکاء کو حق شفعہ حاصل ہوگا، اگر وہ لوگ نہیں لیتے ہیں تو پھر خریدار ایک شریک کی مانند ہوجائے گا، لیکن اس پر قابض وارث سے دوسرے کے حصے کو خریدنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ بیع وشراء کی صحت کے لئے بائع کا مالک ہونا شرط ہے، ورنہ تو بیع مالیس عندک ہوجائے گی۔

''وشرط المعقود علیه ستة: کونه موجودًا مالًا متقومًا مملوکًا فی نفسه، وکون الملك للبائع فیما یبیعه لنفسه وکونه مقدور التسلیم۔
ولا بیع ما لیس مملوکا له وإن ملکه بعده إلا السلم والمغصوب لو باعه الغاصب ثم ضمن قیمته؛ وبیع الفضولی؛ فإنه منعقد موقوف، وبیع الوکیل؛ فإنه نافذ'' (الرد المحتار ۴/ ۶ کتاب البیوع ط: رشیدیہ پاکستان)۔
(معقود علیہ کی شرط چھ ہیں: وہ موجود ہو، مال متقوم ہو، فی نفسہ مملوک ہو، بائع جس چیز کو بیع کررہا ہے اس کا مالک ہو، مقدور التسلیم ہو۔
ایسی شئی کی بیع صحیح نہیں ہے جو مملوک نہ ہو، اگر چہ اس کے بعد مالک ہوجائے، سوائے سلم اور مغصوب کے، اگر غاصب نے بیع کی پھر اس کی قیمت کا ضامن ہوگیا، اور فضولی کی بیع، کیوں کہ وہ موقوف ہو کر منعقد ہوتی ہے، نیز وکیل کی بیع کہ وہ نافذ ہوتی ہے)۔

(۴) حرام آمدنی سے خریدی ہوئی زمین کو علم کے باوجود خریدنا:

مال حرام سے جو شئی خریدی جاتی ہے اس میں ملکیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں علماء کے اقوال مختلف ہیں، ابن رشد کے بیان کے مطابق شافعیہ کے یہاں بیع کا انعقاد ہی نہیں ہوتا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ بیع منعقد ہوجاتی ہے (فتاوی ابن رشد/ ۴۶۷)۔

حنابلہ کے یہاں بھی اقوال مختلف ہیں، ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''وإذا غصب أثمانًا فاتجر بها، أو عروضًا فباعها واتجر بثمنها قال أصحابنا: الربح للمالك والسلع المشتراة له. وقال الشریف أبو جعفر وأبو الخطاب: إن کان الشراء بعین المال فالربح للمالك. وقال الشریف: وعن أحمد أنه یتصدق به، وإن اشتری فی ذمته ثم نقد الأثمان فقال أبو الخطاب: یحتمل أن الربح للغاصب وهو قول أبی حنیفة والشافعی فی أحد قولیه؛ لأنه اشتری لنفسه فی ذمته فکان الشراء له والربح له وعلیه بدل المغصوب وهذا قیاس قول الخرق، ویحتمل أن یکون الربح للمغصوب منه؛ لأنه نماء ملکه فکان له کما لو اشتری بعین المال وهذا ظاهر المذهب'' (المغنی ۵/ ۲۱۶ کتاب الغصب، مسئلہ: ۳۹۷۷)۔
(جب ثمن غصب کیا پھر اس سے تجارت کی، یا سامان غصب کرے پھر اس کو بیچ دیا اور اس کے ثمن سے تجارت کی تو ہمارے اصحاب (حنابلہ) نے کہا: نفع مالک کا ہوگا، اور خریدی ہوئی اشیاء غاصب کی، شریف ابوجعفر اور ابوالخطاب کہتے ہیں: اگر خریداری عین مال سے ہوئی ہے تو نفع مالک کا ہے، شریف نے امام احمد سے نقل کیا ہے کہ اس کو صدقہ کردے، اور اگر خرید کیا اس طرح کہ ثمن کو اپنے ذمہ میں رکھا پھر وہی ثمن دے دیا تو ابوالخطاب نے کہا: احتمال ہے کہ نفع غاصب کا ہو، یہی قول امام ابوحنیفہ کا ہے اور ایک قول امام شافعی کا ہے؛ اس لئے کہ اس نے اپنے لئے خریدا جو اس کے ذمہ میں ہے تو شراء و نفع اسی کے لئے ہوا، البتہ اس پر مغصوب کا بدل واجب ہے، یہی خرقی کے قول کا قیاس ہے، نیز یہ بھی احتمال ہے کہ نفع مغصوب منہ کا ہو، اس لئے کہ اس کے ملک کا نما ہے تو اس کے لئے ہوا جیسا کہ عین مال سے خریدتا، یہی ظاہر مذہب ہے)۔

احناف کے یہاں تھوڑی تفصیل ہے جس کا حاصل یہ ہے:

(۱) پہلے بائع کو وہ غصب کیا ہوا مال بطور قرض دے دے تاکہ اس کے ذمہ ہوجائے پھر اس سے کوئی شئی اسی دین کے بدلے خرید لے۔

(۲) وہ حرام نقود جن سے خرید رہا ہے اس کی طرف اشارہ کرے اور وہی ادا کردے۔

(۳) نقود مغصوبہ کو اشارہ کر کے متعین کرے، لیکن دوسرا ثمن ادا کردے۔

(۴) ان نقود کی طرف اشارہ تو نہ کرے، مگر انہی کو ثمن کے طور پر دے دے۔

(۵) دوسرے نقود کی طرف اشارہ کرے، لیکن بائع کو نقود مغصوبہ ہی دے۔

خلاصہ ان پانچ صورتوں کا یہ ہوا کہ یا تو نقود مغصوبہ یا یوں کہہ لیں وہ مال جو کہ حرام طریقے سے کمایا گیا ہے اور جو واجب الرد یا واجب التصدق ہے ان ہی سے خرید اجارہا ہے یا ان کی طرف اشارہ کر کے ثمن بنایا جارہا ہے؛ خواہ دینے کے وقت دوسرے مال سے ادا کررہا ہے۔

علامہ کرخیؒ پہلی دونوں صورتوں میں (یعنی پہلے نقود بائع کو بطور قرض دیا پھر ان سے ہی خرید لیا، یا واجب التصدق وواجب الرد رقوم کی طرف اشارہ کیا اور انہی کو ادا کیا) نہ تو نفع ہی اس کے لئے حلال ہے اور نہ ہی خریدی ہوئی شئی کا مالک ہے، البتہ بقیہ تینوں صورتوں میں جن میں اشارہ وادا جمع نہیں ہورہے ہیں حلال ہیں، علامہ کاسانی نے پہلی صورت کے ماسوا چار صورتوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ کرخی کا مسلک لکھا ہے:

''ولو اشترى بالدراهم المغصوبة شيئًا هل يحل له الانتفاع به أو يلزمه التصدق؟ ذكر الكرخي وجعل ذلك على أربعة أوجه: إما أن يشير إليها وينقد منها، وإما أن يشير إليها وينقد من غيرها، وإما أن يشير إلى غيرها وينقد منها؛ وإما أن يطلق إطلاقًا وينقد منها، وإذا ثبت الطيب في الوجوه كلها إلا في وجه واحد وأن يجمع بين الإشارة إليها والنقد منها'' (بدائع ۶/ ۱۵۰ كتاب الغصب، ط: زكريا ديوبند)۔

(اگر دراہم مغصوبہ سے کوئی چیز خریدی تو کیا اس سے انتفاع حلال ہے؟ یا واجب التصدق ہے، کرخی نے اس کی چار صورتیں ذکر کی ہیں: یا تو اس کی طرف اشارہ کیا اور اسی کو ادا کردیا، یا اس کی طرف اشارہ کیا اور دوسرا ثمن دے دیا، یا دوسرے مال کی طرف اشارہ کیا اور دراہم مغصوبہ سے ادا کردیا، یا مطلق رکھا اور دراہم مغصوبہ سے ادا کردیا، تمام صورتوں میں حلت آئے گی، صرف پہلی صورت جس میں اشارہ وادا جمع ہوئے ہیں نہیں آئے گی)۔

علامہ کاسانی کہتے ہیں: بعض مشائخ نے فتوی اسی پر دیا ہے۔

''ومن مشايخنا من اختار الفتوى في زماننا بقول الكرخي تيسرًا للأمر على الناس لازدحام الحرام'' (بدائع ۶/ ۱۵۰ كتاب الغصب، ط: زكريا ديوبند)۔

(بعض مشائخ نے ہمارے زمانے میں کرخی کے قول پر فتوی دیا ہے لوگوں کی آسانی کے لئے؛ کیوں کہ حرام کی کثرت ہوگئی ہے)۔

ابونصر صفار اور فقیہ ابواللیث نے ہر صورت کو حلال کیا ہے جبکہ ابوبکر اسکاف نے تمام صورتوں کو حرمت کے دائرے میں رکھا ہے، علامہ کاسانی کا رجحان ابوبکر اسکاف کے قول یعنی تمام صورتوں میں حرمت کی طرف ہے (بدائع ۶/ ۱۵۰ از کریا دیوبند)۔

علامہ کاسانی نے اسکاف کے قول کی تصحیح پر دلیل بھی پیش کی ہے کہ یا تو حقیقتاً حرام مال کے ذریعہ ایک شئی کو حاصل کیا گیا ہے یا کم از کم شبہ حرمت ضرور پایا جاتا ہے، اس لئے احتیاط کا تقاضا ہے کہ ابوبکر اسکاف کی تصحیح کی جائے۔

علامہ کاسانی کی تصحیح بہت حد تک کتاب وسنت کے مزاج سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے، امام کرخی کے قول میں احتمال ہے کہ ان کے پیش نظر وہ نفع ہو جو ادائے ضمان سے پہلے حاصل ہوا ہو، مگر ضمان ادا کردینے کے بعد اس کا حکم کیا ہوگا؟ مثلاً ایک شخص نے ایک شئی حرام مال سے خریدی، اس کی قیمت دس ہزار روپے تھی، پھر اس کو پندرہ ہزار روپے میں بیچ دیا، بعدہ وہ حرام مال کے بقدر یا تو مالک کو لوٹا دیا یا پھر صدقہ کردیا، پانچ ہزار کا جو نفع ہے یہ اس کے لئے حلال ہے یا نہیں، طرفین کے نزدیک یہ نفع حلال نہیں ہے، امام کرخی کے نزدیک ادائے ضمان کی وجہ سے حلال ہوگیا۔

اگر ضمان ادا نہیں کیا گیا یا اصل حرام مال کو صدقہ نہیں کیا گیا تو وہ حلال وطیب ہوگا یا نہیں اس سے اس نظریہ میں بحث ہی نہیں کی گئی ہے۔

نیز کتاب وسنت کا لب لباب بتاتا ہے کہ ابوبکر اسکاف کا قول راجح ہے؛ اس لئے کہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

"الذين يأكلون الربا لا يقومون إلا كما يقوم الذي يتخبطه الشيطان من المس" (بقرہ: ۲۷۵)۔

"يأيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربا أضعافًا مضاعفة واتقوا الله لعلكم تفلحون" (آل عمران: ۱۳۰)۔

یہ ربا القرض ہے، اس کے کھانے کا تصور بالخصوص اضعافًا مضاعفہ کی شکل میں اسی وقت ہوگا جب کہ اس سے غذائی وخوردنی اشیاء خرید کر کھائی جائے یا لباس و پوشاک کی ضرورت پوری کی جائے، اسی کو وعید شدید کا مصداق بنایا گیا ہے۔

اسی طرح حدیث میں ہے:

"إنه لا يدخل الجنة لحم نبت من سحت، النار أولى به" (مسند احمد ۳/ ۳۲۱ حدیث: ۱۴۴۸۱، رجالہ ثقات)۔
(ایسا شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا جس کی نشوونما حرام مال سے ہوئی ہے، جہنم ہی اس کے لئے مناسب ہے)۔

خلاصہ یہ کہ حرام مال سے حاصل ہونے والی جائیداد بھی حرام ہے، اصل مالک کو لوٹانا اگر ممکن ہو تو اسے لوٹایا جائے گا، ورنہ صدقہ کردیا جائے گا۔

جب ایسی جائداد کا وہ شخص مالک ہی نہیں، نیز خریدار کو معلوم بھی ہے تو اس کے لئے خریدنا کیسے جائز ہوگا، لیکن بعض فقہاء نے کرخی کے قول کو اختیار کیا ہے، اس لئے اگر حاجت ہو، یا معلوم رہتے ہوئے خرید لیا ہو تو امام کرخی کے قول کے مطابق حکم لگانے میں حرج بھی نہیں معلوم ہوتا ہے، اسی بنا پر حضرت مفتی عزیز الرحمن اول مفتی دار العلوم دیوبند کے مختلف فتاویٰ میں اسی کے مطابق فتویٰ بھی دیا گیا ہے، وقف کے مسئلہ کو دیکھتے ہوئے ایک فتویٰ اس طرح دیتے ہیں:

"اگر ناجائز آمدنی سے زمین اور جائیداد خریدی تو وہ خریدنے والا اس زمین وجائداد کا مالک ہوگیا، اگرچہ ملک خبیث ہوگی پس وقف کرنا اس جائداد کا صحیح ونافذ ہے، یعنی وہ جائیداد وقف ہو جائے گی" (فتاوی دار العلوم جدید ۱۳/ ۱۴۰ کتاب الوقف)۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"یہ جو امام کرخی سے روایت ہے اس میں وسعت ہے، اور اس زمانہ میں بوجہ غلبہ حرام اور عدم امکان احتراز اسی روایت کے موافق عمل ہو جانا غنیمت ہے ....اور فتاوی رشیدیہ میں اس مال کی نسبت حکم لکھا ہے جو بعینہ مال حرام موجود ہو اور ظاہر ہے کہ مبادلہ کے بعد کچھ خفت آجاتی ہے، مثلاً ایک صورت تو یہی ہے کہ بعینہ مال رشوت یا سود کسی کو دیا جائے اور ایک یہ کہ مال سود سے کوئی زمین خرید لے اور پھر وہ زمین مزارعت پر دی جائے ان دونوں میں فرق ہو جاتا ہے، اور پھر امام کرخی کی روایت کے بہ موجب اس زمین خرید شدہ میں حلت کی شکل نکل سکتی ہے؛ جب کہ ثمن سامنے کرکے زمین نہ خریدی جائے الخ" (فتاوی دار العلوم جدید ۱۴/ ۳۹۲ کتاب البیوع)۔

(۵) پلاٹنگ سے پہلے نقشے میں موجود عوامی مفاد کی جائیداد: مسجد، سڑک وغیرہ کا حکم:

اگر زمین حکومت کی ہے، حکومت نے کسی کے نام الارٹ کیا ہے تا کہ وہ کالونی بنائے، حکومت نے راستہ کی چوڑائی متعین کردی ہے، مسجد کی جگہ فکس کردی ہے، اسی طرح دوسرے عوامی مفاد کے لئے پارک وگراؤنڈ کی تحدید کردی ہے، تو ایسی صورت میں کالونی بنانے والے کو عوامی مفادات سے وابستہ یا مسجد ومدرسہ کے لئے مختص زمین کی ملکیت حاصل ہی نہیں ہوئی، اس لئے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ سابقہ پروگرام میں رد وبدل کرے، اور نہ دوسروں کے لئے جائز ہے کہ جانتے بوجھتے ہوئے اس کو خریدے، کیونکہ کالونی بنانے والا اس کا مالک نہیں تو اس کو بیچنے کا حق بھی نہیں۔

لیکن زمین کالونی بنانے والے کی ہے، گورنمنٹ سے صرف کالونی کا پرمٹ لیا ہے، حکومت نے پرمٹ کے لئے عوامی مفادات سے وابستہ قطعات کو چھوڑنے کی شرط لگائی ہے، بظاہر کالونی بنانے والے کو منظور بھی ہے، مگر دل سے شاید راضی نہیں ہے، اسی لئے بعد میں اس کو بیچ دیتا ہے، حکومت کی اس قسم کی شرط سے اس شخص کی ملکیت ختم نہیں ہوتی ہے، الا یہ کہ وہ ہی خود برضا ورغبت ان اراضی کو مسلمانوں کے لئے وقف کردے، لیکن وہ شخص ایسا نہیں کرتا ہے تو بدستور اس کی ملکیت ہے اور وہ اس کو بیچ سکتا ہے، دوسرے لوگوں نے خرید لیا ہے تو خریدنا جائز بھی ہے، صرف اتنا ہوا کہ حکومت کے جائز قانون کی خلاف ورزی کی جس کا وبال اس کو پہنچ سکتا ہے۔

یہ بھی اس وقت ہے جب کہ صرف نقشہ پر ہے، اگر زمین پر نشان ڈال دیا کہ یہ مسجد ومدرسہ کی جگہ ہے، یا لوگوں کی ترغیب کے لیے ہی سہی اس کا ذکر کیا ہے تو گویا کہ وہ اپنی زبان سے وقف کرچکا ہے، اب اس کو اپنے قول سے رجوع کرنے کا حق بھی نہیں ہے، نیز مسلک مفتی بہ کے مطابق صرف زبان سے کہہ دینا ہی ملکیت سے نکلنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے، اس لئے اب اس میں رد وبدل کرنا جائز نہیں اور نہ خریدنے سے بیع وشراء کا حکم جاری ہوگا۔

''ولا يشترط أيضًا وجود الموقوف عليه حين الوقف حتى لو وقف على مسجد يأ مكانه قبل أن يبنيه فالصحيح الجواز'' (رد المحتار ۳/ ۳۹۵ کتاب الوقف، رشیدیہ پاکستان)۔

(موقوف علیہ کا وقف کے وقت موجود ہونا ضروری نہیں ہے؛ حتی کہ اگر مسجد پر وقف کیا، اس کی جگہ کو تیار کردیا بنایا نہیں ہے تو بھی صحیح یہ ہے کہ جائز ہے)۔

اسی طرح معاملہ راستہ کا بھی ہے، راستہ کو تنگ کرنا یا راستہ نہ دینا نادرست ہے، عرف کے مطابق جتنا بھی حق بنتا ہے یہ کالونی کے حقوق میں سے ہے، اس لئے اس حق کو ضائع نہیں کرسکتا، حدیث ہے:

''قضی النبی ﷺ إذا تشاجروا فی الطریق بسبعة أذرع'' (بخاری ۱/ ۳۳۶ کتاب المظالم. باب: إذا اختلفوا فی الطریق) (جب راستہ کے سلسلہ میں اختلاف ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ نے سات ذراع کا فیصلہ کیا)۔

اس کا اصل محمل تو اخلاف ہے، مگر لوگوں پر تنگی کرنا اس سے زیادہ شنیع ہے، اس لئے ایسے موقع پر اس سے بھی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، اور کم از کم سات ہاتھ راستہ چھوڑنا لازمی ہوگا، اس کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں مجبور کی طرح ہوگا، راستہ کالونی کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔

البتہ پارک، پلے گراؤنڈ وغیرہ بھی آج کل ضروریات میں شامل ہیں، مگر بنیادی ضروریات میں سے نہیں ہیں، اس لئے اگر ان کو بیع کرتا تو چونکہ وہ اس کا مالک ہے، اس لئے بیع نافذ ہوگی، خریدنے والے کے لئے خریدنا بھی جائز ہوگا، واللہ اعلم۔

(۶) قانونی طور پر جو جگہ مفاد عامہ کے لئے تھی اس پر مسجد بنادی گئی:

مسجد بننے کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ جگہ اللہ کے لئے وقف ہے، جس کی منفعت اللہ کے بندوں کے لئے مختص ہے اور واقف و بانی اس موقوف کا وقف کرتے وقت مالک ومختار بھی ہے۔

''شرطه (الوقف) شرط سائر التبرعات كحرية وتكليف. أفاد أن الواقف لابد أن يكون مالكه وقت الوقف ملكًا باتًا ولو بسبب فاسد وأن لا يكون محجورًا عن التصرف حتى لو وقف الغاصب المغصوب لم يصح وإن ملكه بعد بشراء أو صلح'' (رد المحتار ۳/ ۳۹۴ کتاب الوقف، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

(وقف کی شرط وہی ہے جو دوسرے تبرعات کی ہے، جیسے واقف کا آزاد و مکلف ہونا، اس سے یہ بات معلوم ہورہی ہے کہ واقف کے لئے ضروری ہے کہ اس وقف کا مالک ہو، خواہ سبب فاسد کے ذریعہ ہی ہو، اور یہ کہ محجور عن التصرف نہ ہو؛ حتی کہ اگر غاصب مغصوب کو وقف کرے تو صحیح نہیں، خواہ اس کے بعد شراء یا صلح کے ذریعہ مالک ہوجائے)۔

قانونی طور پر جس قطعۂ ارض کو مفاد عامہ کے لئے حکومت نے مختص کیا ہے اس کا مالک درحقیقت حکومت نہیں بائع ہے، بات صرف اتنی ہے کہ حکومت نے مفاد عامہ کے لئے مختص کرنے کی شرط لگائی ہے، اگر اس شرط کی مخالفت کرتا ہے اور اس حصہ کو مسجد بنادیتا ہے تو حکومت کی مخالفت ہوگی، فی نفسہ وقف پر اثر انداز نہیں ہوگی، بہت سے معاملات میں جو حکومت کی شرط کے خلاف اگر تصرف کیا جائے تو وہ نافذ ہوجاتے ہیں، انہی میں سے تسعیر الحاکم کا مسئلہ بھی ہے۔

''فإن سعر فباع الخباز بأكثر ما سعر جاز بيعه'' (ہندیہ ۳/ ۱۰۲) (اگر خباز نے زیادہ قیمت میں بیع کی تو بیع جائز ہوگی)۔

مسلم کالونی میں مسجد ایک بنیادی ضرورت ہے، اس ضرورت کو پورا کرنا مفاد عامہ سے زیادہ اہم ہے، اس لئے وہ مسجد شرعی بھی ہوجائے گی، کچھ بزرگوں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، احسن الفتاوی میں ہے:

''حضرات فقہاء کرام نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ بوقت ضرورت اہل محلہ راستہ کو بھی مسجد بناسکتے ہیں، بشرطیکہ گزرنے والوں کو اس سے ایذاء نہ ہو، اس لئے کہ راستہ بھی انہی لوگوں کی ضرورت کے لئے ہے، لہذا وہ اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہیں، بناء علیہ خالی پلاٹ میں جو اہل محلہ ہی کے مفاد وراحت کے لئے چھوڑا گیا ہے، اہل محلہ کی اجتماعی رائے سے مسجد کی تعمیر بطریق اولی جائز ہے، مسجد مسلم آبادی کی بنیادی ضرورت ہے'' (احسن الفتاوی ۶/ ۴۴۵ کتاب الوقف)۔

ہاں وہ پبلک مقامات جو حکومت کی تحویل میں ہیں یا تو اس کے قبضہ میں ہیں یا اس کی ملکیت ہیں، ان مقامات پر مسجد بنانے کے لئے حکومت کی اجازت

ضروری ہے۔

''مسجد بني على سؤر المدينة قالوا:لايصلى فيه لأن السؤر حق العامة وينبغي أن يكون الجواب على التفصيل:إن كانت البلدة فتحت عنوة وبنى مسجد بإذن الإمام جازت الصلاة فيه لأن للإمام أن يجعل الطريق مسجداً فهذا أولى'' (ہندیہ ۱/ ۱۱۰ کتاب الصلاۃ، الباب السابع، الفصل الثانی، ط: بیروت)۔

(کوئی مسجد سؤر البلد پر بنائی گئی تو فقہاء نے کہا کہ اس میں نماز نہیں پڑھی جائے گی، اس لئے کہ یہ عامۃ الناس کا حق ہے۔

مناسب ہے کہ جواب اس تفصیل سے ہو: اگر شہر عنوۃ فتح ہوا ہے اور مسجد حاکم کی اجازت سے بنائی گئی ہے تو اس میں نماز جائز ہے، اس لئے کہ امام کو حق ہے کہ راستہ کو مسجد بنادے، یہ تو بطریقہ اولی ہوگا)۔

(۷) غیر قانونی کالونیاں:

اسلام کا نظام معیشت دیگر نظامہائے معیشت سے بالکل جدا ہے، ایک طویل عرصہ تک سرمایہ دارانہ نظام و اشتراکی نظام کی یکے بعد دیگرے اجارہ داری رہی، دونوں ہی نظام معیشت کے توازن کو برقرار رکھنے میں ناکام ہو گئے، عالمی منڈی کا رخ بتا رہا ہے کہ قوم ان دونوں نظاموں سے اکتا چکی ہے، کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں جس طرح کی کھلی چھوٹ دی گئی کہ ہر شخص خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہے، مقصود سرمایہ کو بڑھانا اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا ہے، چونکہ کسی فرد یا جماعت حتی کہ حکومت تک کو اس کی اجازت نہیں کہ دوسرے کے معاملات میں دخیل ہوں جس کا نتیجہ قمار وسٹہ، رشوت وسود کی کالا بازاری نکلا، پھر مکر وفریب، خیانت ودغا کا پرکشش جال تان دیا گیا کہ کسی کا کسی پر اعتماد باقی نہ رہا، اس کے بالمقابل اشتراکی نظام نے لوگوں کی ساری دولت اور ہر فرد کا پائی پائی چھین کر حکومت کی جھولی میں ڈال دیا، اب ملک کی ساری معیشت کا ٹھیکیدار حاکم وقت اور سربراہ مملکت ٹھہرا، حکومت نے لوگوں پر ڈیوٹیاں مسلط کردی، لوگ ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں، ملک کا کتنا نفع ہوگا، معیشت پر اس کا اثر کیسا مرتب ہوگا اس سے کسی کو مطلب نہیں، اس نظام نے تو معیشت کی چولیں ہلا دیں، بالآخر لوگوں نے اس نظام کو نکار دیا۔

لیکن اسلامی نظام معیشت میں ہر شخص کی حریت وآزادی باقی رکھی گئی، مالک ہونے کی حیثیت تسلیم کر کے مذکورہ نظامہائے معیشت میں جو بے راہ روی وافراط وتفریط در آئے تھے ان پر لگام کس دیا گیا، چنانچہ کچھ پابندیاں الٰہی فرمان وشرعی قانون کے طور پر عائد کی گئیں، سود، قمار، رشوت جیسے لعنتی معاملات کا قلعہ ہی قمع نہیں کیا گیا؛ بلکہ ان کے ذرائع کا بھی سدباب کردیا گیا، جھوٹ، خیانت، دھوکہ وغرر وغیرہ چور دروازوں پر مضبوط پہرا بیٹھا دیا گیا، انسانوں کی بالادستی کو تسلیم کرنے کے ساتھ حکومتی پابندی کا بھی ایک حد تک پاس ولحاظ رکھا گیا؛ حتی کہ حکومت کو یہ حق دیا گیا کہ اگر ظلم وزیادتی یا ناقابل برداشت نقصان محسوس ہو تو مناسب پابندی لگا سکتی ہے، اس کی رعایت کرنا ہر شخص پر ضروری ولازم ہوگا، لیکن حکومت کی پابندی بھی اسی وقت تک قابل لحاظ ہے جب اصحاب ثروت کی جانب سے حدود کو برقرار رکھنے میں کوتاہی ولا پرواہی ہو رہی ہو، اگر سرمایہ داروں نے توازن کو برقرار رکھنے میں خود ہی بھرپور کوشش کر رکھی ہے تو حکومت کو دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے، معیشت کا یہ اسلامی نظام ہے جو فقہی ابواب میں پورے شرح وبسط کے ساتھ موجود ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے ان کالونیوں جن کو دنیا کے قانون میں غیر قانونی سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ گورنمنٹ کی اجازت کے بغیر وجود میں آئی ہیں، ان کے سلسلہ میں ایک نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

ان کالونیوں کے ذمہ داروں کی طرف سے اجازت نہ لینے کا اقدام اس لئے ہوتا ہے کہ اجازت کے حصول میں لمبے مراحل اور مختلف منازل سے گزرنا پڑتا ہے، ایک خطیر رقم کچھ تو فیس کے نام پر تو کچھ رشوت کے طور پر خرچ کرنی پڑتی ہے، پھر بھی ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ کب اس کے خلاف کیس درج ہو کر مزید رقموں کا بوجھ آجائے، اگر ان سب خرچوں کو زمین پر جوڑا جائے تو یقیناً زمین کی قیمت گراں سے گراں تر ہو جائے گی، لیکن اجازت کے بغیر کالونیاں بن گئیں تو حکومت چاروناچار اجازت دے ہی دے گی، ناچیز یہ سمجھتا ہے کہ جن وجوہات کی وجہ سے حکومت کی دخل اندازی برداشت کی جاتی ہے، یہاں وہ وجوہات حکومت کی دخل اندازی سے زیادہ ہو جاتی ہیں، اس لئے مالکان اراضی کا بغیر اجازت وپرمٹ کالونیاں بنانا، اور فروخت کرنا اور ان سے دوسرے حضرات کا خریدنا شریعت کی خلاف ورزی نہیں ہے، واللہ اعلم۔

(۸) گورنمنٹ کی پکڑ سے محفوظ رہنے کے لئے لون لینا اور زمین خریدنا:

بعض اوقات زمین خریدنا آسان نہیں ہوتا ہے، قانونی دشواریاں بھی ہوتی ہیں، اگر یک مشت قیمت ادا کی گئی تو حکومت کی گرفت میں بھی آسکتا ہے، مختلف قسم کے ٹیکس کا بوجھ الگ برداشت کرنا پڑسکتا ہے، اس کے لئے آسان شکل یہ ہوتی ہے کہ انسان بینک سے قرض لے لے اور اس سے زمین خرید لے اس میں شرعی نقطہ نظر سے دو پریشانیاں ہیں:

(۱) بینک سے قرض لینا جس پر سود دینا ناگزیر ہے، عام حالات میں سودی قرض لینا و دینا جائز نہیں ہے۔

(۲) ایک انسان روپیہ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو غریب وفقیر ظاہر کر رہا ہے جو بظاہر جھوٹ ہے، کیا کسی مسلمان کے لئے جھوٹ کے ساتھ اس قسم کے اقدام کی گنجائش ہے؟

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عام مسلمانوں کو زمین کی حصولیابی بلا اس حیلہ کے آسان بھی نہیں ہوگی، آبادی کی کثرت کے تناسب میں رہائشی علاقوں کی جس قدر قلت ہو رہی ہے کہ روز بروز قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں مگر اس سے مفر بھی نہیں ہے، اس لئے رہائشی علاقوں کی خرید کے لئے اگر ایسا اقدام کیا جائے تو ناگزیر حالات میں سود کے وبال کو انگیز کیا جاسکتا ہے۔

اب رہا مسئلہ جھوٹ کا تو بعض اوقات جھوٹ بولنا یا یوں کہہ لیا جائے تعریض یعنی جھوٹ کی شکل بنانا مباح بھی ہو جاتا ہے۔

”والكذب مباح لإحياء حقه ودفع الظلم عن النفس والمراد: التعريض؛ لأن عين الكذب حرام“ (ردالمحتار ۵/ ۲۰۳ كتاب الحظر والاباحه، فروع، ط: رشيديه)۔

(کذب اپنے حق کو پانے اور نفس سے ظلم کو دور کرنے کے لئے مباح ہے، مراد تعریض ہے، اس لئے کہ خالص کذب تو حرام ہے)۔

اس کے تحت علامہ شامی تشریح فرماتے ہیں:

”أن كل مقصود محمود يمكن التوصل إليه بالصدق والكذب جميعًا فالكذب فيه حرام، وإن أمكن التوصل إليه بالكذب وحده فمباح إن أبيح تحصيل ذلك المقصود، وواجب إن وجب تحصيله كما لو رأى معصومًا اختفى من ظالم يريد قتله أو إيذاءه فالكذب هنا واجب، وكذا لو سأله عن وديعة يريد أخذها يجب إنكارها، ومهما كان لا يتم مقصود حرب أو إصلاح ذات البين أو استمالة قلب المجني عليه إلا بالكذب فيباح“ (رد المحتار ۵/ ۲۰۳ كتاب الحظر والاباحه، ط: رشيديه پاكستان)۔

(ہر وہ نیک مقصد جس تک صدق وکذب دونوں کے ذریعہ رسائی ممکن ہو تو کذب وہاں حرام ہے، اور اگر صرف کذب کے ذریعہ رسائی ممکن ہے، پس اگر اس کی تحصیل مباح ہو تو کذب مباح ہے، اور اگر اس کی تحصیل واجب ہے تو واجب ہے، جیسا کہ ایک شخص نے کسی بری شخص کو دیکھا کہ ظالم سے چھپ گیا ہے جو کہ اس کو قتل کرنا چاہتا ہے یا تکلیف پہنچانا چاہتا ہے تو کذب یہاں واجب ہے، اسی طرح اگر کسی امانت کے بارے میں کوئی ظالم پوچھتا ہے جو اس کو چھیننا چاہتا ہے تو انکار واجب ہے، اور جب تک جنگ یا دو شخصوں کے مابین صلح، یا مجنی علیہ کے قلب کو مائل کرنا کذب کے بغیر ممکن نہ ہو تو مباح ہے)۔

نیز حکومت جو ظالمانہ ٹیکس عائد کرتی ہے اس کی ادائیگی واجب بھی نہیں ہے، اگر اپنے آپ کو بچاتے ہوئے ٹیکس سے چھٹکارا حاصل کرسکتا ہے تو کرنے میں گناہ بھی نہیں ہے، حضرت تھانویؒ کے مختلف فتاوی میں اس طرح کی تصریح موجود ہے۔

(دیکھئے ایک فتوی بابت: ٹیکس تشخیص کرنے والے سے اپنا مال چھپانا، امداد الفتاوی ۴/ ۱۵۲ کتاب الحظر والاباحہ)۔

اس لئے مذکورہ بالا صورت حال میں اگر لون کی ادائیگی وقت پر کردی جائے اور زمین کو اس لون سے خرید لیا جائے تا کہ عام مسلمانوں کو سستی قیمت میں پلاٹ حاصل ہو جائے تو سرمایہ چھپانے سے جو جھوٹ لازم آرہا ہے عند اللہ اس کے وبال سے بچ سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۹) صرف پلاٹ نمبر سے قبضہ کا تحقق؟

بیع وشراء کی وجہ سے ایک تو ملکیت منتقل ہوتی ہے، دوسرے مبیع بائع کے ضمان سے منتقل ہو کر مشتری کے ضمان میں داخل ہو جاتی ہے، ملکیت کی منتقلی کے

لئے ایجاب وقبول کافی ہے، مگر ضمان کا منتقل ہونا اس وقت ہوتا ہے جبکہ قبضہ وتسلیم پائے جائیں، قبضہ وتسلیم کی جو تفصیل فقہاء نے ذکر کی ہے اس کا خلاصہ علامہ کاسانی کے الفاظ میں اس طرح ہے:

''التسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلي البائع المبيع والمشتري برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشتري من التصرف فيه فيجعل البائع مسلمًا للمبيع والمشتري قابضًا له'' (بدائع ۴/ ۴۹۸، کتاب البیوع، تفسیر التسلیم والقبض، ط: زکریا دیوبند)۔

(ہمارے نزدیک قبضہ وتسلیم کی حقیقت تخلیہ ہے، نیز تخلیہ یہ ہے کہ بائع مبیع ومشتری کے مابین حائل موانع کو ختم کر کے چھوڑ دے، اس طور پر کہ مشتری کو اس میں تصرف پر قدرت ہو، تو بائع کو حوالہ کرنے والا اور مشتری کو اس پر قبضہ کرنے والا سمجھا جائے گا)۔

اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر گھر کی بیع ہوئی تو چابی دے دینے سے قبضہ سمجھا جائے گا، لہٰذا زمین خرید وفروخت کی وہ صورت جو رائج ہے کہ پلاٹ کا خاکہ کاغذ پر بنا کر اس پر نمبر ڈال دیا، ہر خریدار کا حصہ اس نمبر سے متعین کیا، لیکن بائع جب پلاٹنگ کرتا ہے تو اس نقشہ کا پابند نہیں رہتا، نمبر میں ردوبدل کر دیتا ہے، یہ قبضہ کی حقیقت کے منافی ہے، تا آں کہ پلاٹنگ کر کے مشتری کے لئے ایک حصہ فکس نہ کر دیا جائے اور یہ نہ کہہ دیا جائے کہ یہ حصہ تمہارا ہے۔

شیخ مصطفی الزرقاء نے اس بابت کچھ اختلاف کیا ہے، انہوں نے عرف کو مدار بناتے ہوئے محض تسجیل کو بھی قبضہ کے حکم میں رکھا ہے

(دیکھئے: المدخل الفقہی العام ۲/ ۹۵۴ الباب التاسع، نظریۃ العرف)۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب بائع کو تصرف کا اختیار ہے تو تخلیہ کہاں پایا گیا جو کہ قبضہ کے لئے لازمی واساسی شرط ہے، یہ مسئلہ الگ ہے کہ بیع وشراء کے لئے قبضہ ضروری نہیں ہے، بیع وشراء کا تحقق ہو چکا ہے، لیکن تصرف کرنے کے لئے اس خریدار کو پہلے قبضہ کرنا چاہئے، ویسے زمین وجائیداد کے باب میں قبضہ سے پہلے بھی بیع کرنے میں فقہاء احناف نے حرج نہیں سمجھا ہے، کیونکہ اس کے ہلاک ہونے کا خطرہ نہیں ہے، ہاں جہاں ہلاک ہونے کا خطرہ ہو بایں طور کہ بائع کبھی بھی اس معاملہ خرید وفروخت کو ختم کر سکتا ہے، جیسا کہ بعض شکلوں میں ہوتا ہے تو پھر آگے فروخت کرنے کے لئے بھی قبضہ ضروری ہوگا، ابن الہمام نے اس کی تصریح کی ہے (دیکھئے: فتح القدیر ۶/ ۵۱۳، کتاب البیوع، ط: مصر)۔

(۱۰) اگر بائع کاشت بھی کرتا رہے:

جس حصہ کو خریدار نے خریدا ہے اگر بائع اس میں کاشت کر رہا ہے تو بائع کا قبضہ ہی سمجھا جائے گا، لہٰذا اس کا ضمان مشتری کی طرف منتقل نہیں ہوگا، لیکن اس طرح سے اگر بیع ہوئی ہے تو خریدار اس کا مالک ہوگا یا نہیں؟ یہ مسئلہ اس لئے پیدا ہو رہا ہے کہ بائع جب پلاٹنگ سے فارغ نہیں ہوا ہے تو گویا ابھی تک مبیع متعین نہیں ہو پائی ہے، بیع کی جہالت مفسد عقد ہوا کرتی ہے:

''وأما الثالث وهو شرائط الصحة فخمسة وعشرون منها عامة ومنها خاصة فالعامة لكل بيع شروط الانعقاد المارة؛ لأن ما لا ينعقد لا يصح؛ وعدم التوقيت، ومعلومية المبيع، ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة فلا يصح بيع شاة من هذا القطيع الخ'' (رد المحتار ۴/ ۶ کتاب البیوع، ط: رشیدیہ پاکستان)۔

(شرط کی تیسری قسم تو وہ شرائط صحت ہیں، اور وہ پچیس ہیں بعض عام ہیں، اور بعض خاص، ہر بیع کے لئے عام شرطیں وہی شرائط انعقاد ہیں جن کا ذکر سابق میں ہوا، اس لئے کہ جو منعقد نہیں ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

اور توقیت کا نہ ہونا مبیع کا معلوم ہونا، ثمن کا معلوم ہونا جس سے نزاع ختم ہو جائے، لہٰذا اس ریوڑ سے ایک بکری کی بیع صحیح نہیں ہے الخ)۔

صاحب ہدایہ نے جہالت مبیع کی مختلف صورتیں ذکر کی ہیں، جس صورت میں مبیع کی تعیین عند العقد ہو جائے اس کو امام صاحب کے نزدیک جائز ونافذ قرار دیا ہے، اور جس صورت میں تعیین بروقت نہیں ہو خواہ مجلس عقد میں تعیین ہو جا رہی ہو اس کو نافذ نہیں کیا ہے، جبکہ صاحبین دونوں ہی صورتوں کو نافذ مانتے ہیں؛ خواہ متفاوت العدد والقدر ہو یا متساوی العدد والقدر۔

فقیہ ابو اللیث نے صاحبین کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے:

''ثم قال الفقيه: والفتوى على قولهما تيسيرا للأمر على الناس'' (فتح القدير ٦/ ٢٧١ كتاب البيوع)۔
(فقیہ ابواللیث نے فرمایا: فتوی صاحبین کے قول پر ہے لوگوں کی آسانی کے لئے)۔

لیکن یہ اسی صورت میں ہے جبکہ جہالت کی وجہ سے نزاع پیدا نہ ہو، اگر مستقبل میں نزاع کا خطرہ ہے تو بیع کسی کے نزدیک نافذ نہیں ہوگی، اسی بنیاد پر ایک گھر کا ہر حصہ قدر و قیمت میں دوسرے سے متفاوت ہے، اگر اس سے قدر معین کی بیع ہوئی یعنی قدر شائع نہیں، تو بیع جائز نہیں ہے، کیونکہ نزاع ہونا یقینی ہے۔

''من اشترى عشرة أذرع من مائة ذراع من دار أو حمام فالبيع فاسد عند أبي حنيفة وقالا: هو جائز، وإن اشترى عشرة أسهم من مائة سهم جاز في قولهم جميعًا۔
ومبنى الخلاف على أن المؤدى من عشرة أذرع من مائة ذراع معين أو شائع، فعندهما شائع كأنه باع عشر مائة وبيع الشائع جائز اتفاقا كما في بيع عشرة أسهم من مائة سهم، وعنده مؤداه قدر معين، والجوانب مختلفة الجودة فتقع المنازعة في تعيين مكان العشرة ففسد البيع، فلو اتفقوا على أن مؤدى عشرة أذرع من مائة من هذه الدار شائع لم يختلفوا، ولو اتفقوا على أنه متعين لم يختلفوا'' (فتح القدير مع الهدايه ٦/ ٢٧٥ كتاب البيوع)۔
(جس نے سو ذراع والے دار یا حمام میں سے دس ذراع خریدا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بیع فاسد ہے، صاحبین کے نزدیک جائز ہے، اور اگر سو حصے میں سے دس حصوں کو خریدا تو سب کے نزدیک جائز ہے۔

اختلاف کی بنیاد اس بات پر ہے کہ دس ذراع جو ادا کیا جائے گا یہ معین ہے یا شائع؟ صاحبین کے نزدیک شائع ہے، تو گویا کہ اس نے سو کا دسواں حصہ بیچا (جو کہ بیع المشاع ہے) اور شائع کی بیع جائز ہے بالاتفاق جیسا کہ سو سہم میں سے دس سہم کی بیع، امام ابوحنیفہ کے نزدیک جو ادا کیا جائے گا وہ متعین ہے، حالانکہ گھر کا ہر جانب صفت جودت میں مختلف ہے، تو دس ذراع کی تعیین میں جھگڑا ہوگا، اس لئے بیع فاسد ہوگی، اگر سب متفق ہوں کہ ادا کیا جانے والا حصہ شائع ہے تو اختلاف نہیں ہوگا، اسی طرح اگر متعین ہے تو اختلاف نہیں ہوگا)۔

لہذا جو زمین بیچی گئی ہے اس کے حصہ کی تعیین میں اختلاف نہیں ہوتا ہے، اس لیے کہ سب برابر حیثیت وقدر کے ہیں، تو یہ بیع صحیح ہوگئی، لیکن ضمان منتقل نہیں ہوا، اور اگر زمین کی پوزیشن ایسی ہے کہ حصوں کی تعیین میں غیر معمولی حیثیت عرفی کے لحاظ سے فرق ہے جس کو عام طور پر گوارہ نہیں کیا جاتا ہے تو اس وقت بیع ہی منعقد نہیں ہوئی، اور جب بیع ہوئی ہی نہیں تو آگے خریدار کو بیچنے کا حق ہی نہیں ہوگا، واللہ اعلم۔

(۱۱) (الف) کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آنے کے بعد پلاٹس فروخت کیا تو خریدار دوسرے سے بیع کر سکتا ہے:

کالونی بنانے والے نے زمین خرید لی اور اپنے قبضہ میں کرلیا ہے، لیکن پلاٹنگ کرنے سے پہلے وہ دوسرے سے زمین کا ایک حصہ فروخت کرتا ہے اور قبضہ نہیں دلاتا تو خریدار اپنے اس حصہ کو بیچ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر معاملہ منقولات کا ہوتا تو احناف متفق ہوتے کہ قبضہ سے پہلے اس کی بیع جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ ربح مالم یضمن ہے جس کی حدیثوں میں ممانعت آئی ہے، کیا جائیداد اور غیر منقولی اشیاء میں بھی یہی حکم جاری ہوگا اور خریدار دوسرے سے فروخت کرنے کا مجاز نہیں ہوگا؟

اس بابت حنفیہ میں سے امام محمدؒ منقول پر قیاس کرتے ہوئے ناجائز کہتے ہیں، جبکہ شیخین کے نزدیک جائز ہے؛ کیونکہ ربح مالم یضمن کی حرمت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے مبیع ہلاک ہوجائے تو معاملہ ہی اصل سے ختم ہوجائے، لیکن جو غیر منقولی ہے اس میں ضیاع کا خطرہ موہوم ہے؛ اس لئے جائز ہے۔

''يجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف، وقال محمد: لا يجوز رجوعًا إلى إطلاق الحديث واعتبارًا بالمنقول وصار كالإجارة، ولهما أن ركن البيع صدر من أهله في محله ولا غرر فيه؛ لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول'' (هدايه على فتح القدير ٦/ ٥١٢ كتاب البيوع، ط: مصر)۔
(زمین جائیداد کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے شیخین کے نزدیک، امام محمد نے کہا: جائز نہیں، کیونکہ حدیث مطلق ہے، نیز منقول پر قیاس کا مقتضی یہی ہے تو یہ اجارہ کی طرح ہوگئی۔

شیخین کی دلیل یہ ہے کہ رکن بیع، بیع کے اہل سے اس کے محل میں صادر ہوا ہے، نیز اس میں غرر نہیں ہے؛ اس لئے کہ عقار میں ہلاکت نادر ہے برخلاف

منقول کے)۔

اجارہ میں اصل چونکہ منافع ہیں اور منافع منقول کی طرح ہوا کرتے ہیں، اس لئے اجارہ بالاتفاق جائز نہیں ہے۔

لہذا شیخین کی رائے کے مطابق ایسے پلاٹ کی بیع جو مجھول نہ ہو، یا پھر مشاع ہو قبل القبض بھی جائز ہے، واللہ اعلم۔

(ب) کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آنے سے پہلے پلاٹ کی بیع ہوئی تو خریدار بیچ سکتا ہے یا نہیں؟

جہاں تک اس صورت کا حکم ہے کہ کالونی بنانے والے نے ابھی زمین خریدنے کا محض وعدہ کیا ہے خریدا نہیں ہے، اور بیعانہ کے طور پر کچھ رقم ادا کردی ہے، کوئی ضروری نہیں ہے کہ وقت مقررہ پر ادا کر سکے، اگر وقت مقرر پر ادا نہیں کر سکا تو معاملہ ختم بھی ہو سکتا ہے، یہ صورت بعینہ اس عقار کی ہے جس میں اندیشہ ضیاع ہوتا ہے، جس کو غرر انفساخ سے تعبیر کیا جاتا ہے، قبل القبض بیع کی ممانعت کی علت یہی غرر انفساخ ہے جو اس صورت میں موجود ہے، اس لئے کالونی بنانے والا بھی نہیں فروخت کر سکتا اور اس سے خریدنے والا بھی دوسرے سے نہیں بیچ سکتا ہے۔

علامہ ابن الہمام لکھتے ہیں:

"إلا إذا صار بحرًا ونحوه حتى قال بعض المشايخ: إن جواب أبي حنيفة في موضع لا يخشى عليه أن تصير بحرًا أو يغلب عليه الرمال، فأما في موضع لا يؤمن عليه ذلك فلا يجوز" (فتح القدير ۶/ ۵۱۳ كتاب البيوع. ط: مصر)۔

(مگر یہ کہ بحر وغیرہ ہو جائے حتی کہ بعض مشائخ نے کہا: امام ابوحنیفہ کا جواب ایسی زمین کے بارے میں ہے جس کے تئیں یہ خدشہ نہیں ہے کہ بحر ہو جائے گی یا اس پر ریت غالب آجائے، بہر حال ایسی جگہ جہاں اس کا اطمینان نہ ہو تو جائز نہیں ہے)۔

(۱۲) دلالوں کے ذریعہ زمینوں کی خرید وفروخت:

زمین کی خرید وفروخت کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ سارا معاملہ دلال وایجنٹ کے ذریعہ طے ہوتے ہیں، زمین کس کی ہے، خریدار کو اس کا علم تک نہیں ہوتا، خریدار اور دلال کے مابین صرف زبانی سودا ہو جاتا ہے، کوئی رجسٹری یا قبضہ وغیرہ نہیں ہوتا ہے، ہاں اتنا ہوتا ہے کہ دلال کہہ دیتا ہے کہ ایک حصہ آپ کا ہے، پھر یہ خریدار اگر اس کو بیچنا چاہے تو اسی دلال کے ذریعہ بیچوائے گا، دلال اب اس سے بھی اپنا کمیشن وصول کرے گا۔

یہ پیسہ کمانے کا ایک دھندا ہے، نہ زمین مقصود ہے، نہ اس کی خرید وفروخت، جب دلال خود معاملہ کر رہا ہے تو وہ دلال نہیں بلکہ بائع کا وکیل ہے جو کہ بائع کا قائم مقام ہے، لیکن اس وکیل کے پاس وہ زمین نہیں ہے جس پر قبضہ دلا سکے، وکالت کے مجموعی احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ وکیل کو اس شئی پر قدرت حاصل ہو، لیکن زمین کی خرید وفروخت کی مذکورہ بالا شکل میں ایسا نہیں ہے۔

نیز خریدار نے جس حصۂ ارض کو خریدا ہے وہ معلوم ومتعین نہیں، جس سے مبیع مجھول ہو جا رہی ہے، جس کی وجہ سے بیع ہی صحیح نہیں تو آگے فروخت کرنا بھی صحیح نہیں ہوگا، یہاں یہ بھی ہے کہ وہی دلال بیچ سکتا ہے، اگر زمین خریدار کی ہو گئی تو ملکیت کیوں منتقل نہیں ہوئی، معلوم ہوا کہ مالک بننے سے پہلے یہ بیع ہو رہی ہے جو غیر مملوک کی بیع ہے، غیر مملوک کی بیع صحیح نہیں ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس معاملہ میں گوناگوں محظور لازم آتے ہیں:

(۱) معاملہ دلال کا نہیں وکالت کا ہے، اور وکیل قبضہ دلانے پر قادر نہیں ہے۔

(۲) مبیع مجھول ہے، مفضی الی النزاع بھی ہو سکتا ہے، مگر اس لئے نہیں ہو رہا ہے کہ بیع مقصود نہیں۔

(۳) خریدار ثانی جس کی بیع کرنا چاہ رہا ہے اس کا وہ مالک ہی نہیں ہے۔

(۱۳) کالونی بنانے والا صرف قسط وصول کرتا ہے تو خریدار کی ملکیت ثابت ہوگی؟

اگر کالونی بنانے والا پلاٹ کو بیچتا ہے اور خریدار سے قسطوار قیمت بھی وصول کر لیتا ہے، نیز زمین کی وہ مقدار جو اس نے بیچی ہے متعین ہے، یعنی اس نے کتنا اسکوائر فٹ فروخت کی ہے اور وہ مشاع ہے، کوئی جانب فکس نہیں ہے کہ غیر مشاع ہو کر مجھول ہو جائے تو ایسی صورت میں خریدار اس کا

مالک ہو چکا ہے، اور کالونی بنانے والے کا شریک سمجھا جائے گا، الا یہ کہ زمین کی جانب متعین ہو اور مبیع کو مجہول رکھا گیا ہو تو بیع ہی فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ تفصیل سے سطور سابقہ میں گزرا ہے۔

اور جب کالونی بنانے والا شریک فی المبیع ہو گیا تو اگر وہی خریدنا چاہتا ہے تو بحق شفعہ اس کو خریدنے کا حق بھی ہے، دوسرے گاہکوں کو اگر الگ رکھنا چاہتا ہے تو رکھ سکتا ہے، ہاں الجھن اس وقت پیدا ہوگی، جبکہ صلب عقد میں شرط ہو کہ خریدار کالونی بنانے والے سے ہی بیع کر سکتا ہے، یہ حقیقت میں بائع کے آزادانہ تصرف پر پابندی عائد کرنا ہے جو کہ بیع وشراء کے اصول کے خلاف ہے، اس لئے پلاٹنگ کرنے والے کا اس شرط کے ساتھ بیچنا ہی صحیح نہیں ہوا تو خریدار کی ملکیت میں بھی داخل نہیں ہوگا جیسا کہ اس کے طرز عمل سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ صلب عقد میں شرط ہے، نیز اس میں یہ خرابی لازم آئے گی کہ خریدار نے جس قدر سے ادا کیا ہے اب اس کو اس کے عوض میں زیادہ پیسے کالونی والے سے ملیں گے جو سود نہ بھی ہو تو شبہ سود سے پاک نہیں ہے، اس لئے ایسے حضرات سے معاملہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۱۴) قسط وار ادا کرنے کی صورت میں تمام قسطوں کے ادا کرنے سے پہلے دست برداری:

پلاٹ کو قسطوں پر خریدنے کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر خریدار نے مقررہ مدت میں قسطوں کو ادا نہیں کیا تو معاملہ کینسل سمجھا جاتا ہے، پلاٹنگ کرنے والا جو رقم لیتا ہے اسے واپس کر دیتا ہے، بعض اوقات خریدار کو اس معنی کر نقصان ہوتا ہے کہ زمین کی قیمت اس مدت میں دوچند ہو جاتی ہے، جبکہ قسطوں پر دیئے گئے پیسے پرانی قیمت کے حساب سے واپس ملتے ہیں۔

بیع وشراء کی صحت کے لئے جہاں بہت سی شرائط ہیں وہاں یہ بھی شرط ہے کہ بیع منجز ہو، اور مستقبل پر معلق نہ ہو، مذکورہ بالا صورت بیع معلق یا مستقبل کی طرف منسوب بیع کی ہے، کہ اگر مقررہ مدت میں قیمت ادا کر دی گئی تو بیع ہوگی ورنہ نہیں، اس سے بیع ہی منعقد نہیں ہوتی ہے، ایسی صورت میں جتنی رقم دی گئی ہے وہی مل سکتی ہے، اس سے زیادہ کا مطالبہ صحیح ہی نہیں ہے۔

یا اس کو یوں کہا جائے کہ پلاٹنگ کرنے والے نے بیع کا وعدہ کیا ہے حقیقتاً بیع اس وقت ہوگی جب مکمل قیمت ادا کر دی جائے گی خواہ وہ تعاطی کے ذریعہ ہو یا باقاعدہ ایجاب وقبول کے ذریعہ، جب خریدار نے وعدہ کا ایفاء نہیں کیا تو پلاٹ کے مالک پر وعدہ کا ایفاء کیوں کر واجب ہوگا، زیادہ سے زیادہ اس سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ جتنے روپے تم نے لئے ہیں اس کو واپس کر دو اور وہ اسی قدر واپس کرے گا جتنا لیا ہے، راقم کا خیال ہے کہ اس کی فقہی صورت یہی زیادہ مناسب ہے کہ وعدۂ بیع قرار دیا جائے، تاکہ وقت مقرر پر ادائیگی کی صورت میں بیع کی تکمیل میں کوئی محظور لازم نہ آئے، کیونکہ بیع معلق باطل ہوتی ہے، لہذا اس کو ختم کرنا ہی ضروری ہوگا اور نفاذ کی شکل نہیں بن سکے گی۔

(۱۵) (الف) دلال کا، زمین کی خرید وفروخت میں کذب بیانی سے کام لینا:

دلال کی اجرت عرف کے مطابق تعامل کی وجہ سے جائز ہے، لہذا دلال چاہے تو بائع ومشتری دونوں سے اجرت لے سکتا ہے، اگر اس کا عرف ہو، لیکن اس میں کذب بیانی کرنا، معاملہ چھپانا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری کے فتاوی میں ہے:

”یہ پیشہ مباح ہے اور اپنی محنت اور کام کے موافق پہلے سے مناسب اجرت طے کر دی جائے تو طے کردہ اجرت لے سکتا ہے اور اجرت ایک فریق سے بھی لے سکتا ہے اور دونوں فریق سے بھی، البتہ اجرت طے اور متعین ہونا چاہئے، معاملہ مبہم نہ رہنا چاہئے۔

فتاوی دار العلوم قدیم میں ہے: دلال کی اجرت کام اور محنت کے موافق لینا اور دینا جائز ہے، بشرطیکہ ظاہر کر کے رضاء سے لیا جائے، اور جو خفیہ طرفین سے لیا جاتا ہے وہ جائز نہیں ہے“ (فتاوی رحیمیہ ۹/۲۹۹ کتاب الاجارہ دلال کی اجرت)۔

متاخرین فقہاء کے یہاں اسی قسم کا فتوی ہے، لہذا کذب بیانی، یا اجرت کو خفیہ رکھنا اور لینا جائز نہیں۔

(ب) دلال کمپنیوں کا یہ کہنا کہ جب بیچنا ہو ہمیں دینا اور قبضہ نہیں دلانا، کیا یہ روا ہے؟

قبضہ دلانا بیع کے مقتضیات میں سے ہے، لہذا قبضہ نہ دلانا جائز نہیں ہے، نیز یہ شرط لگانا کہ جب آپ کو بیچنا ہو ہم سے معاملہ کرو، یہ شرط فاسد ہے جس

میں ایک عاقد یعنی دلال کا فائدہ ہے، شرط فاسد سے معاملہ فاسد ہوجاتا ہے، موطا امام مالک میں حضرت عمرؓ کا فتوی بایں الفاظ وارد ہے:

''إن عبدالله بن مسعود ابتاع جارية من امرأته زينب الثقفية واشترطت عليه أنك إن بعتها فهي لي بالثمن الذي تبيعها به. فسأل عبدالله بن مسعود عن ذلك عمر بن الخطاب فقال: لا تقربها وفيها شرط لأحد'' (موطا امام مالك/ ۲۵۳ کتاب البيوع، باب ما يفعل في الوليدة إذا بيعت)۔

(حضرت ابن مسعودؓ نے اپنی بیوی زینب ثقفیہ سے ایک جاریہ خریدا، زینب نے یہ شرط لگائی کہ اگر آپ اس کو بیچیں تو میں اسی قیمت میں لے لوں گی جس قیمت پر آپ بیچیں گے، عبداللہ بن مسعودؓ نے اس بابت حضرت عمرؓ سے پوچھا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس کے قریب مت جانا، اس میں ایک کے لئے شرط لگی ہوئی ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی شرط لگانا جائز نہیں ہے، واللہ اعلم۔

خلاصۂ جوابات:

(۱) سرکاری زمینیں جن غنڈہ عناصر کے قبضہ میں ہیں ان کا قبضہ غاصبانہ ہے، وہ ان اراضی کے مالک نہیں ہیں، لہذا ان کو بیچنے کا حق بھی نہیں ہے، جانتے ہوئے ایسی اراضی کو خریدنا بھی جائز نہیں، نیز ایسی زمینیں حکومت کی املاک ہیں، قانون اراضی کے مطابق جس کو چاہے وہ دے سکتی ہے۔

(۲) وقف کے مکمل ہونے کے بعد بیع وشراء جائز نہیں، لیکن وقف کا مقصد فوت ہوجائے اور وہ مسجد نہ ہو تو بیچ کر دوسرے وقف میں خرچ کرنے کی اجازت ہے، یا اس سے کوئی زمین وغیرہ خرید کر وقف کردینے کی ہدایت ہے، چنانچہ اوقاف کی جائیداد جن پر دوسروں نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے، ایسی جائیداد سے چونکہ مقصد وقف مکمل نہیں ہو پاتا ہے، لہذا اس کو بیچنا جائز ہے، اس کی رقم سے دوسری جائیداد خرید کر وقف کردی جائے، یا دوسرے وقف کی ضروریات میں خرچ کردیا جائے۔

(۳) قدیم موروثی زمین تمام ورثہ کے مابین مشترک ہوگی، کوئی خریدار بعض وارث سے اس کے حصہ کے بقدر خرید سکتا ہے، قدر حصہ سے زیادہ خریدنے سے اس پر ملکیت اس وقت ہوگی جبکہ جن کا حصہ ہے وہ اس کی اجازت دے دیں۔

(۴) حرام مال کا اگر انسان مالک بھی ہوجائے تو ملک خبیث ہے جس کو مالک تک پہنچانا ضروری ہے یا صدقہ کرنا لازم ہے، اگر اس حرام مال سے کوئی جائیداد خریدی جائے تو حنفیہ میں سے امام کرخی نے اس کا مالک قرار دیا ہے، الا یہ کہ بعینہ حرام مال کو ثمن کے لئے اشارہ کرکے متعین کیا ہو پھر اسی کو ادا کردیا ہو۔

(ب) فقہاء احناف میں اکثر حضرات کی رائے میں کسی بھی صورت میں خریدار اس جائداد کا مالک نہیں ہوگا، فقہاء شافعیہ کے یہاں بھی بیع صحیح نہیں ہوتی ہے، قرآن وحدیث سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے، لہذا ایسی جائداد خریدار کی ملکیت میں نہیں ہے، کوئی دوسرا شخص خریدتا ہے تو غیر مالک سے خریدنے کی وجہ سے مالک نہیں ہوگا۔

(ج) بہت سے حضرات نے علامہ کرخی کے قول کو اختیار کیا ہے، یعنی خریدار مالک ہوجائے گا، اور اس سے کسی اور کا خریدنا بھی جائز ہوگا، چنانچہ حاجت کے وقت، یا ایک شخص نے ناواقفیت میں خرید لیا ہے تو جواز کا قول اختیار کرنا مناسب ہوگا۔

(۵) اگر زمین سرکاری ہے، حکومت نے کسی کو دیتے وقت یا بیچتے وقت راستہ، مسجد وغیرہ کے لئے زمین کو مستثنی کردیا ہے، بایں طور کہ اس کی تحدید وتعیین کردی ہے تو خریدنے والے کی ملک میں وہ حصہ نہیں آئے گا، لہذا کسی کا اس خریدار سے خریدنا بھی جائز نہیں ہوگا۔

(ب) اگر زمین کالونی بنانے والے کی ہے، سرکار سے پرمٹ کے وقت عوامی مفادات سے وابستہ قطعات کو چھوڑنے کی شرط لگی تھی تو وہ حصے بدستور زمین والے کی ملک میں ہوں گے اور وہ اپنی اس ملک کو بیچ سکتا ہے، دوسرے حضرات خرید سکتے ہیں۔

(ج) البتہ اس نے مدرسہ ومسجد کے لئے زمین کے وقف کا زبانی اقرار کرلیا ہے تو قول مفتی بہ کے مطابق اس حصہ کو نہیں بیچ سکتا ہے۔

(د) نیز راستہ کو بھی تنگ نہیں کرسکتا ہے، اس کی چوڑائی کم از کم سات ہاتھ ہوگی۔

(ہ) البتہ دوسرے مفاد عامہ سے وابستہ، پارک وغیرہ چونکہ بنیادی ضرورتیں نہیں ہیں، اس لئے ان کو بیچنے اور خریدنے میں حرج نہیں ہے۔

(۶) جو جگہ مفاد عامہ کے لئے ہے، اس کا مالک حقیقت میں وہ شخص ہے جس کا پورا پلاٹ ہے، چوں کہ مسجد مسلم آبادی کی بنیادی ضرورت ہے، اس لئے ایسی جگہ کو مسجد بنانا جائز ہے، اور اس کا حکم مسجد شرعی کا ہوگا۔

(ب) البتہ پبلک مقام پر جو حکومت کی تحویل میں ہے اس پر مسجد بنانے کے لئے حکومت سے اجازت ضروری ہے۔

(۷) جو کالونیاں حکومت کی اجازت کے بغیر بنی ہیں، جن کو غیر قانونی باور کیا جاتا ہے، اسلامی نقطہ نظر میں حکومت کی اجازت کی اہمیت ہے، مگر وہاں جہاں توازن بگڑتا نظر آئے، کالونیوں کی بابت اجازت کی جو لمبی دوڑ ہے اس سے توازن ٹھیک ہونے کے بجائے مزید بگڑنے کا خطرہ ہے، اس لئے بغیر اجازت کالونیاں بنانا جائز ہیں، ان کو فروخت کرنا اور خریدنا بھی جائز ہے۔

(۸) حکومت کی گرفت سے بچنے کے لئے بینک سے قرض لے کر زمین خریدنا اور کالونیاں بسانا جائز ہے۔

(۹) قبضہ کے لئے ضروری ہے کہ مشتری کو اس مبیع میں تصرف کرنے کا پورا اختیار ہو، اگر بائع نے زمین بیچی، مگر قبضہ کی یہ صورت اختیار کی ہے کہ ایک کاغذ پر محض نمبر ڈال دیا، جب پلاٹنگ کا وقت آئے گا وہ نمبر زمین کے کسی بھی حصہ پر ڈالا جا سکتا ہے، اس طرح قبضہ کا تحقق نہیں ہوتا ہے۔

(۱۰) اگر بائع بیچی ہوئی زمین میں کاشت کر رہا ہے تو قبضہ کا تحقق نہیں ہوگا، بیع ہوئی یا نہیں یہ اس بات پر موقوف ہے کہ بیچا ہوا حصہ شائع ہے یا غیر شائع، اگر شائع ہے تو بیع ہوگئی، اور اگر شائع نہیں ہے اور سب حصے آپس میں متفاوت ہیں جو جھگڑا کا باعث ہے تو مبیع مجہول ہونے کی وجہ سے بیع منعقد نہیں ہوئی۔

(۱۱) زمین جائیداد کی بیع قبل القبض بھی جائز ہے، صرف مبیع کی اتنی تعیین ضروری ہے کہ نزاع نہ ہو، یا پھر حصہ شائع ہو۔

(ب) زمین جائیداد کی بیع قبل القبض اس وقت فاسد ہو جاتی ہے جبکہ زمین کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، لہذا صرف مشتری کی جانب سے خریدنے کا وعدہ کرنے کی وجہ سے خریدنا متحقق نہیں ہوا، ہوسکتا ہے وہ پیسے ادا نہ کر سکے اور مبیع اس کی نہ ہو سکے، اس لئے ایسی زمین کو دوسرے خریدار کے لئے خریدنا جائز نہیں ہے۔

(۱۲) بعض اوقات دلالوں کے ذریعہ خرید وفروخت ہوتی ہے، مگر زمین زمین والے کے قبضہ میں ہی رہتی ہے، دلال دونوں ہی جانب سے معاملات کرتا ہے، بلکہ خریدار کو بیچنے کی ضرورت ہو تو وہی دلال معاملہ کر سکتا ہے، اس قسم کے معاملات میں گونا گوں خرابیاں لازم آتی ہیں، اس لئے ایسے دلالوں سے خریدنا جائز نہیں ہے۔

(۱۳) کالونی بنانے والے نے قسط وصول کر لیا ہے تو خریدار اس حصہ ارض کا مالک ہو گیا، لیکن کالونی بنانے والے نے اگر شرط لگائی ہے کہ اگر خریدار کو بیچنا ہو تو اسی سے بیچے گا، یہ شرط فاسد ہے جو کہ مفسد عقد ہے۔

(۱۴) مقررہ مدت میں قسط وار ادا نہ کرنے کی صورت میں اگر معاملہ کینسل کر دیا جاتا ہو اور جتنی رقم اس نے ادا کی ہے واپس مل جاتی ہو تو یہ بیع معلق ہے یا بیع مضاف الی المستقبل ہے جو کہ باطل ہے، یا یوں کہا جائے کہ یہ صرف وعدۂ بیع ہے جس سے ملکیت کا ثبوت نہیں ہوتا ہے۔

(۱۵) دلال کا کذب بیانی سے کام لینا، یا خفیہ طور پر اجرت وصول کرنا جائز نہیں ہے۔

(ب) دلال کمپنیوں کی یہ شرط کہ جب بھی بیچنا ہو کمپنی سے ہی رابطہ کرنا ہوگا، نیز یہ کہہ کر قبضہ دلانے سے گریز کرنا قانون بیع وشراء کی خلاف ورزی ہے، اور شرط فاسد ہونے کی وجہ سے مفسد عقد ہے۔

☆☆☆

پلاٹ وزمین کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل

مفتی محمد عثمان بستوی [1]

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، ومن تبعه بإحسان إلى يوم الدين أما بعد!

قال الله تبارك وتعالى: "يأيها الذين آمنوا لاتأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم".

وقال النبي ﷺ: ''إنما أنا بشر، إنكم تختصمون إلي ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض فأقضي له على نحو ما أسمع منه، فمن قضيت له بشيئ من حق أخيه فلا يأخذنه، فإنما أقطع له قطعة من النار'' (مشكوة/ ۳۲۶)۔

مذکورہ بالا آیت وروایت اس باب میں صریح ہیں کہ دوسرے کا مال بغیر رضا کے حلال نہیں ہوتا خواہ وہ زمین کی قبیل سے ہو یا کسی اور جنس سے، جب تک صاحب حق کی طرف سے رضا نہ پائی جائے اس کی حرمت باقی رہتی ہے، اور جب صاحب حق کی طرف سے رضا پائی جائے خواہ معاوضہ ادا کر کے یا صاحب حق کی طرف سے ایثار واحسان کے ذریعہ، رضا خواہ کسی بھی طرح سے پائی جائے جب رضا کا تحقق ہو جائے گا مال حلال ہو جائے گا اور اگر رضا کا تحقق نہ ہو تو مال کی حرمت باقی رہے گی، نیز اگر کوئی کسی صاحب حق کا حق قانونی غلبہ یا کسی اور طریقہ سے لے لے لیکن صاحب حق اس پر راضی نہ ہو تو قانون وغیرہ سے اباحت اور حلت ثابت نہیں ہو سکتی جیسا کہ نبی پاک ﷺ نے ایک روایت میں ارشاد فرمایا کہ میں جس کے لئے اس کے بھائی کے کسی حق کا فیصلہ کر دوں تو میں اس کو آگ کا ایک ٹکڑا ہی دے رہا ہوں اس پر مقدمہ لانے والے حضرات میں سے ہر ایک نے عرض کیا کہ میرا حق میرے فریق کے لئے ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح نہیں بلکہ جاؤ تقسیم کرو اور تقسیم میں یسر وسہولت سے کام لو پھر قرعہ اندازی کرو اس کے بعد ہر ایک دوسرے کے لئے مباح کر دے (مشکوۃ)، اس روایت میں صاف وضاحت ہے کہ کسی جبر دباؤ خواہ قانون کا ہو یا کسی اور طرح کا اس سے مال کی حلت ثابت نہیں ہوگی، بلکہ حرمت علی حالہ باقی رہے گی، حلت کے تحقق کے لئے رضا لازم ہے چاہے جس طرح سے بھی حاصل ہو۔

سوال نمبر ۱ کا جواب:

رشوت کے ذریعہ سرکاری زمین کا لے آوٹ (نقشہ) منظور کروانا یہ حقیقت میں غصب ہے اور اس پر غصب کے احکام نافذ ہوں گے، کیونکہ رشوت کے ذریعہ جو فیصلہ کیا جاتا ہے وہ کالعدم ہے، اس لئے شرعاً یہ منظوری اور اجازت معدوم ہوگی اور بلا اجازت کسی کی زمین پر قابض ہو جانا یہ غصب میں داخل ہے۔

''ارتشی ہو أو أعوانه بعلمه وحكم لا ينفذ حكمه وهو الصحيح ولو قضى لم ينفذ وبه يفتى وفي الخانية أجمعوا أنه إذا ارتشى لا ينفذ قضاءه فيما ارتشى فيه'' (الدر المختار مع رد المحتار ملخصا ۸/ ۳۵)۔

اور غصب کی ہوئی چیز کی خرید وفروخت شرعاً باطل ہے، البتہ اگر مغصوب منہ کی طرف سے اجازت پائی جائے تو اجازت کے بعد یہ خرید وفروخت شرعاً صحیح ہو جاتی ہے، لہذا کسی دوسرے کے لئے غاصب سے اس کے غصب کو جانتے ہوئے خریدنا شرعاً جائز نہیں ہے، لیکن اگر کسی کو غصب کا علم نہ ہو تو خریدنے پر کوئی گناہ نہیں اور علم ہونے پر اصل مالک سے مصالحت شرعاً واجب ہوگی، خواہ یہ مصالحت شئ مغصوب کو واپس لوٹانے کے ذریعہ ہو یا اس کے عوض اور معاوضہ کی ادائیگی کے ذریعہ ہو۔

''إن كان المغصوب عرضًا، و ہو قائم بيد الغاصب، فلايجوز لآخر أن يشتريه منه، ولو اشترى فالبيع موقوف عند الحنفية على إجازة المالك، فلو فسخ المالك البيع انفسخ، ووجب على المشتري أن يرده، وعلى البائع أن يردّ الثمن'' (فقه البيوع ۲/ ۱۰۰۸)۔

---

[1] مدرسہ ریاض العلوم گورینی، جونپور، یوپی۔

''وحکمه (أی الغصب) الإثم لمن علم أنه مال الغیر وردّ العین قائمة والغرم بالکة، ولغیر من علم الأخیر ان أی وحکمه لغیر من علم أنه مال الغیر الرد أو الغرم فقط دون الإثم، فلا إثم لأنه خطأ وهو مرفوع بالحدیث، وهو قوله علیه الصلاة والسلام: ''رفع عن أمتی الخطأ والنسیان'' (الدر المختار مع رد المحتار ۹/ ۲۶۳)۔

''وقف بیع مال الغیر ولو الغیر بالغًا عاقلًا وهٰذا إن باعه علی أنه لمالکه. أما لو باعه علی أنه لنفسه أو باعه من نفسه فالبیع باطل... لو باعه لنفسه، فاللام بمعنی من ..... وقد صرحوا بأن الواحد لا یتولی الطرفین فی البیع'' (شامی ۷/ ۳۱۴)۔

سوال میں درج صورت کا حکم:

سوال میں دو چیزیں اہم ہیں: (۱) ایک تو رشوت دے کر لے آوٹ منظور کروا کر فروخت کرنا۔ (۲) دوسرے خریداروں کا ان سے خریدنا، پہلی صورت شرعاً غصب ہے، جس کے ناجائز وحرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، جیسا کہ تفصیل مذکور سے معلوم ہو چکا ہے، اور دوسری صورت شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اور جن کو حقیقت کا پورا علم نہیں ہے کہ اجازت نامہ وغیرہ رشوت دے کر کے حاصل کیا گیا ہے تو ان کے لئے خریدنا جائز ہے، کیونکہ جب حقیقت کا علم نہیں اور اجازت پر مشتمل سرکاری کاغذات ودستاویزات کا موجود ہونا ظاہری طور پر اس کی خرید وفروخت کی اجازت اور اباحت کو ثابت کرتا ہے، لہذا ظاہر کو دیکھتے ہوئے ناواقف کے لئے خریداری کی اجازت ہوگی؛ کیونکہ حضرات فقہاء نے ایسی صورت میں ظاہر پر مدار رکھ کر خرید وفروخت کی اجازت دی ہے۔

''لا یعمل بالخط والخاتم فقط، أما إذا کان سالمًا من شبهة التزویر والتصنیع فیکون محمولًا به أی یکون مدارًا للحکم، ولا یحتاج للإثبات بوجه آخر'' (شرح المجله لعلی حیدر ۱۲-۱۶/ ۴۲۶، الماده: ۱۷۳۶)۔

''فإن وضع الید حجة قاطعة، وأما قولهم وضع یده کان بطریق المصادقة وقد مات المصادقون فبطلت المصادقة الخ'' (تنقیح الفتاوی الحامدیه ۱/ ۱۲۱)۔

اسی طرح اگر کسی کو حقیقت کا پورا علم ہو، لیکن اس خرید وفروخت کو بعد میں قانونی منظوری حاصل ہو گئی ہو یعنی آبادی سے متعلق شہری سہولیات، جو حکومتوں کی طرف سے مہیا کرائی جاتی ہیں وہ فراہم کرادی گئی ہوں تو اس صورت میں سرکاری سہولیات واسکیموں کا فراہم کردینا یہ حکومت کی طرف سے اجازت کے درجہ میں ہوگا، لہذا اس کے بعد جس کو حقیقت کا علم ہو اس کے لئے بھی خریدنا جائز ہوگا، کیونکہ اصل مالک کی طرف سے اجازت ہونے کے قرائن قویہ موجود ہیں۔

''قال فی الفتاوی الخیریة: والقول قوله بیمینه فی ما تحت یده لأن أقصی ما یستدل به علی الملك وضع الید'' (الفتاوی الخیریة علی تنقیح الحامدیه ۲/ ۹۶)۔ ''دلیل الشئی فی الأمور الباطنة یقوم مقامه. یعنی أنه یحکم بالظاہر فیما یتعسر الاطلاع علی حقیقته'' (الماده: ۶۸)، القرینة القاطعة أحد أسباب الحکم أیضًا. أسباب الحکم سبعة: (۱) القرینة (۲) الشهادة (۳) الإقرار (۴) الیمین (۵) النکول عن الیمین (۶) القسامة (۷) علم القاضی علی قول (المادة: ۱۷۴۰)۔ إذا باع أحد مالًا علی أنه ملکه فی حضور شخص آخر لشخص وسلمه ثم ادعی الحاضر بأنه ملکه مستقلًا. أو أن لا حصه فیه مع أنه کان حاضرًا فی مجلس البیع ورأی ذلك وسکت بلا عذر ینظر فإذا کان الحاضر من أقارب البائع أو زوجها أو زوجته فلا تسمع دعواه هٰذه مطلقًا وإذا کان من الأجانب فلا یکون حضوره وسکوته فی مجلس البیع مانعًا لاستماع دعواه علی هٰذا الوجه، أما إذا کان حاضرًا مجلس البیع ورأی أن المشتری یتصرف فی ذلك الملك تصرف المالك مدة بإنشائه أبنیة فیه أو بهدمه أو غرسه أشجارًا وسکت بلا عذر، ثم ادعی بعد ذلك علی الوجه المبین أعلاه بأن الملك ملکه أو أن له حصة فیه فلا تسمع دعواه'' (الماده: ۱۶۵۹)۔

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ قرائن اور ظاہر پر عمل کرنا شرعاً جائز ہے، لہذا رشوت دے کر سرکاری زمین کا لے آوٹ منظور کروانے کے بعد فروخت کرنے والوں سے خریدنے کا حکم یہ ہوگا: (۱) خریدنے والے کو کچھ معلوم نہ ہو تو اس کے لئے ظاہر حال پر عمل کرتے ہوئے خریدنا شرعاً جائز ہے، (۲) جس کو پوری حقیقت کا علم ہے اس کے لئے اس صورت میں ایسی زمین خریدنا جائز ہے جب اس پر بسنے والی کالونی کو سرکاری وشہری سہولیات دے دی گئی ہوں، کیونکہ سرکاری سہولیات کے ملنے کے بعد ظاہر یہی ہے کہ حکومت کی طرف سے اجازت دی گئی ہے، کیونکہ سرکاری سہولیات کو اجازت کا قرینہ قویہ مانا جا سکتا ہے، (۳) جس کو

پوری حقیقت کا علم ہو اور سرکاری سہولیات نہ دی گئی ہوں تو اس کے لئے خرید نا جائز نہیں، کیونکہ یہ غصب ہے اور مال مغصوب کو علم ہوتے ہوئے اپنے لئے خریدنے کی اجازت نہیں۔

سوال نمبر ۲ کا جواب:

اوقاف کی خرید وفروخت کی صورتیں اور اس کے احکام:

(۱) وقف سے آمدنی ہو رہی ہو اور واقف کا مقصد پورا ہو رہا ہو اور واقف نے وقف کرتے وقت اس کے فروخت کرنے کی اجازت صراحۃ نہ دی ہو تو ایسی صورت میں وقف کی خرید وفروخت شرعاً باطل ہے اور یہ وقف ایک آزاد یا مدبر انسان کے حکم میں ہے، اس کو فروخت کر کے عوض حاصل کرنا شرعاً حرام ہے۔

''الحاصل أن ہہنا مسئلتين: الأولى: بيع الوقف باطل، ولو غير مسجد، خلافًا لما أفتى بفساده، لكن المسجد العامر كالحر وغيره كالمدبر، وحاصله أن المسجد قبل خرابه كالحريس بمال من كل وجه، بخلافه بعد خرابه لجواز بيعه إذا خرب في أحد القولين فصار مجتهدًا فيه كالمدبر، فيصح بيع ما ضم إليه، ومثله سائر الأوقاف ولو عامرة فإنه يجوز بيعها عند الحنابلة يشتري بثمنها ما هو خير منها''۔

یعنی مسجد جو آباد ہوں وہ ایک آزاد انسان کے حکم میں ہے اس کی بیع شرعاً باطل ہے، اور مسجد جب ویران ہو جائے یا مسجد کے علاوہ دوسرے اوقاف چاہے وہ مسجد ہی کے نفع کے لئے وقف ہوں، اگرچہ وہ آباد ہوں، مدبر کے حکم میں ہیں یعنی جس طرح مدبر کے بارے میں اختلاف ہے اسی طرح ویران مسجد اور دوسرے اوقاف کی خرید وفروخت کے بارے میں اختلاف ہے، احناف کے نزدیک ویران مسجد ہو یا آباد اوقاف دونوں کی بیع باطل ہے، لہٰذا اوقاف کے متولی یا کسی دوسرے کے لئے آباد وقف کو فروخت کرنا اور اس کی قیمت وصول کرنا حرام ہے اور وصول کی ہوئی قیمت پر ملکیت کا تحقق نہیں ہوگا، اسی طرح خریدنے والے کی بھی وقف پر ملکیت ثابت نہ ہوگی۔

(۲) وقف آباد ہو لیکن واقف نے وقف کرتے وقت اس کی خرید وفروخت کی اجازت دی ہو اور یہ اجازت وغیرہ وقف نامہ میں تحریر ہو تو واقف کی شرائط کے مطابق اس کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے: ''اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه: الأول: أن يشرطه الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه وغيره، فالاستبدال فيه جائز على الصحيح وقيل اتفاقًا'' (شامی ۶/ ۵۸۳)۔

(۳) غاصب وقف کو غصب کر لے اور اس کے منافع کو بالکل معطل کر دے تو ایسی صورت میں متولی کے لئے اس کو فروخت کر کے اس کے بدلے میں دوسرا وقف قائم کرنا جائز ہے اگر یہ ممکن ہو۔

''الثانية: إذا غصبه غاصب وأجرى عليه الماء حتى صار بحرًا فيضمن القيمة ويشتري المتولي بها أرضًا بدلًا'' (شامی ۶/ ۵۸۸)۔

(۴) غاصب نے غصب کیا اور وقف کے منافع غصب کے بعد بھی باقی ہوں، لیکن غاصب سے واپس لینا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی اس کا عوض اگر ممکن ہو حاصل کر لینا جائز ہے۔

''الثالثة: أن يجحده الغاصب ولا بينة وأراد دفع القيمة فللمتولي أخذها ليشتري بها بدلًا'' (شامی ۶/ ۵۸۸)۔

(۵) وقف اس طرح سے معطل ہو جائے کہ اس سے کوئی آمدنی نہ ہو اور وقف پر آنے والے اخراجات اس کی آمدنی سے بھی پورے نہ ہو سکیں اور مصلحت اس کے خرید وفروخت کر دینے میں ہو تو اس کا فروخت کر دینا جائز ہے۔

''أن لا يشرطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شئى أصلًا أو لا يفي بمؤنة فهو أيضًا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضي ورأى المصلحة فيه'' (شامی ۶/ ۵۸۳-۵۸۴)۔

(۶) وقف سے آمدنی ہو رہی ہو، لیکن قلیل ہو اور اس کو فروخت کر کے اس کے بدلے میں اسی مقصد کے لئے اس سے بہتر وقف کا قیام ممکن ہو تو اس کی فروختگی

کے جواز وعدم جواز میں اختلاف ہے، حضرت امام ابویوسف کے نزدیک جائز ہے اور فتویٰ بھی اس قول پر دیا گیا ہے، لیکن وقف کی ضیاع اور اوقاف کے محافظین کی بد دیانتی کی وجہ سے اس صورت میں ترجیح عدم جواز والے قول کو دی گئی ہو۔

''والحاصل أن الاستبدال إما عن شرط الاستبدال أو لا عن شرطه، فإن كان لخروج الوقف عن انتفاع الوقوف عليهم فينبغي أن لا يختلف فيه، وإن كان لا لذلك بل اتفق أنه أمكن أن يؤخذ بثمنه ما هو خير منه مع كونه منتفعًا به، فينبغي أن لا يجوز، لأن الواجب إبقاء الوقف على ما كان عليه دون زيادة، ولأنه لا موجب لتجويزه. لأن الموجب في الأول الشرط وفي الثاني الضرورة ولا ضرورة في هذا إذ لاتجب الزيادة بل نبقيه كما كان'' (شامی ۶/ ۵۸۹)۔

وقف سے خرید وفروخت سے متعلق کل چھ شکلیں ذکر کی گئی ہیں جن میں سے ایک بالاتفاق عدم جواز کی ہے اور چار شکلیں جواز کی ہیں اور ایک شکل مختلف فیہ ہے جس میں ترجیح عدم جواز کی ہے، لیکن ضرورت کے وقت جواز والے قول کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔

وقف کے فروخت کرنے کی ایک احتیاطی شرط:

جن صورتوں میں وقف کو فروخت کرنے کی اجازت ہے وہ اجازت مشروط ہے کہ فروختگی کا فیصلہ ایسے قاضی نے کیا ہو جو احکام شریعت سے واقف، دین دار اور عمل کا پابند بھی ہو، لہٰذا جن ممالک میں حکومت اسلامیہ یا اس طرح کے قضاۃ مفقود ہوں ان جگہوں میں اوقاف کی حفاظت کے لئے فروختگی میں یہ شرط لازمی ہے کہ فروختگی کا فیصلہ متدین اصحاب بصیرت علماء پر مشتمل کوئی جماعت کرے، ورنہ عمومی طور پر اوقاف کو خرد برد سے محفوظ رکھنا ممکن نہیں۔

موقوفہ زمین کو خریدنا:

اوقاف کی زمین فروخت کرنے سے متعلق حضرات فقہاء کی ذکر کردہ تفصیلات کی روشنی میں اس کی تمام شکلوں کو جمع کر دیا گیا ہے تاکہ خریدنے کا حکم بآسانی معلوم ہوسکے، ذیل میں خریدنے سے متعلق حکم عرض کیا جاتا ہے، سوال میں درج شکلوں کا حکم سوال کی ترتیب کے مطابق ملاحظہ ہو:

(۱) وقف کی زمین اتنی دور افتادہ ہو کہ جس سے مقصد وقف کو کوئی نفع نہ پہنچ رہا ہو، نیز ساتھ ساتھ غیر مسلم حضرات کے قابض ہوجانے کا ظن غالب ہو یا قبضہ ہو چکا ہو خواہ کل پر ہوا ہو یا بعض پر تو ایسی صورت میں اس وقف پر اوقاف معطل کے احکام نافذ ہوں گے اور اوقاف معطل کو خریدنا اور بیچنا دونوں جائز ہے، لہٰذا ایسے وقف کو خرید لینا جائز ہے بشرطیکہ اہل بصیرت متدین علماء کی جماعت نے اس کی فروختگی کا فیصلہ کر دیا ہو۔

''سئل شيخ الإسلام عن أهل قرية رحلوا وتداعى مسجدها إلى الخراب، وبعض المتغلبة يستولون على خشبة. وينقلونه إلى دورهم هل لواحد لأهل المحلة أن يبيع الخشب بأمر القاضي، ويمسك الثمن ليصرفه إلى بعض المساجد أو إلى هذا المسجد؟ قال نعم'' (شامی ۶/ ۵۵۰)، ''الوقف صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شئى أصلًا أو لا يفي بمؤونته فهو أيضًا جائز على الأصح إذا كان بإذن القاضي ورأى المصلحة فيه'' (شامی ۶/ ۵۸۴، طحطاوی علی الدر ۲/ ۵۴۵)۔

(۲) وقف سے مقصد وقف حاصل ہو رہا ہو، یعنی وقف آباد ہو لیکن کسی مسلمان نے اس پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہو تو اس مسلمان سے ایسے وقف کی زمین خریدنا جائز نہیں اگرچہ متولی کے لئے غاصب سے اگر ممکن ہو تو اس کا عوض حاصل کر لینا جائز ہے، خریدنا اس لئے جائز نہیں کہ وہ مال نہیں، اور عوض لینے کی اجازت مجبوری کے درجہ میں ہے، حاصل یہ کہ عوض وصول کرنا مجبوری ہے، لیکن خریدنا کوئی مجبوری نہیں ہے جیسے کہ خنزیر کے بال سے نفع اٹھانے کی اجازت ہے اور مفت حاصل نہ ہونے کی صورت میں مجبوراً خریدنے کی اجازت ہے، اسی طرح جب آباد وقف پر کسی مسلمان کا قبضہ ہوجائے اور وہ اس کا کچھ عوض ادا کرے تو مجبوراً عوض لینے کی تو گنجائش ہے لیکن غاصب سے خریدنے میں کوئی مجبوری نہیں، خریدنا یہ ضرورت سے زائد ہے، نیز اس کے فعل غصب کی تائید بھی ہے، مزید یہ کہ وقف مال نہیں، آباد ہونے کی صورت میں مدبر کی طرح ہے اور مدبر کی بیع باطل ہے، لہٰذا آباد وقف کو غاصب سے خریدنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس دوسری شکل کے علاوہ جتنی بھی شکلوں میں وقف کو فروخت کرنے کی اجازت ہے ان سب شکلوں میں خریدنے کی بھی شرعاً اجازت ہوگی، کیونکہ بیع وشراء لازم وملزوم ہے، کیونکہ اگر فروخت کرنے کی اجازت ہو اور خریدنے کی اجازت نہ ہو تو فروخت کرنے کی اجازت بے معنی اور لغو ہو جائے گی۔

سوال نمبر ۳ کا جواب/ موروثی زمین کی خرید وفروخت:

ایسی موروثی زمین جس میں اولاد مؤنث کو ان کا حصہ نہ دیے جانے کا تحقیقی علم ہو اور اولاد اناث کی طرف سے مطالبہ باقی ہو اور خریدنے والے کو اس کا علم بھی ہو تو ایسی صورت میں موروثی زمین کا خریدنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ جب اس زمین میں دوسرے کا استحقاق معلوم ہو تو ایسی صورت میں بغیر اس کے رضا کے خریدنے کی صورت میں اس کے حصہ کا غصب ہے، اس لئے اس کا خریدنا جائز نہیں ہوگا، اگر خرید لیا تو اس کے حصہ کے بقدر بیع موقوف ہوگی، اگر اس کی طرف سے رضا اور اجازت پائی جائے گی تو مکمل طور پر نافذ ہو جائے گی اور اگر اس کی طرف سے رضا اور اجازت نہ پائی گئی تو اولاد اناث کا حصہ باقی رہے گا جس میں تصرف اس کے لئے جائز نہ ہوگا اور اولاد اناث اپنے حصہ کے بقدر اس میں شریک اور حصہ دار ہو جائے گی۔

''بخلاف بيع قن ضم إلى مدبر فإنه يصح أي فيصح في قن بحصته، لأن المدبر محل للبيع عند البعض فيدخل في العقد ثم يخرج فيكون البيع بالحصة في البقاء دون الابتداء .....إذا ضم البائع إليه مال نفسه وباعهما له صفقة واحدة يجوز البيع في المضموم على الأصح'' (شامی ۷/ ۲۴۳)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ کی رائے:

لیکن حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ کے نزدیک چونکہ ہندوستانی زمینوں پر قبضہ، قبضۂ مالکانہ نہیں ہے، بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ ہندوستانی زمینوں پر قبضہ، قبضۂ انتظامی ہے اور یہ زمینیں قابضین کے قبضہ میں حکومت کی طرف سے بطور عاریت ہیں، لہذا ہندوستانی زمینوں میں حکومت کے قوانین کے مطابق عمل ہوگا، ملکیت کے احکام شرعیہ یعنی عشر وخراج وراثت وغیرہ ہندوستانی زمینوں پر مرتب نہ ہوں گے، حضرت مفتی صاحب کے فتاوی ملاحظہ کئے جائیں (فتاوی نظامیہ اور ندویہ ۱/ ۱۳۹، ۲۱۷)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب کی یہ رائے دیگر علماء محققین کے موافق نہیں ہے، ان سے پہلے اور ان کے بعد کے بھی علماء کرام نے ہندوستانی زمینوں میں قابضین کو مالک ہونے کا ہی حکم لگایا ہے اور ان کی زمینوں پر عشر وخراج، بیع، ہبہ، وراثت وغیرہ کے احکام نافذ فرمائے ہیں، بندہ کو حضرت مفتی صاحبؒ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں اختلاف کا علم نہیں، تمام اکابر مفتیان کرام نے موروثی زمینوں پر قبضہ مالکانہ ہی مانا ہے، اور اس کے احکام ذکر فرمائے ہیں۔

ہندوستان میں موروثی زمین کو خریدنا:

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ کی رائے کے مطابق زمین داروں کے زمانوں سے ان کی نسلوں میں زمینداری کی جو زمین باقی ہیں ان میں وراثت جاری ہوگی، اس کے علاوہ دوسری زمینوں میں وراثت جاری نہیں ہوتی ہے، اس لئے ان کی رائے کے مطابق ہندوستانی زمینوں کی خرید وفروخت حکومتی ضابطے کے مطابق صحیح اور درست ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں، البتہ زمینداری والی زمین میں چونکہ اولاد مؤنث کا بھی حق ہوتا ہے، اس لئے اس زمین کا حکم کچھ علاحدہ ہوگا، یعنی اس کا حکم دیگر علماء جو عام زمینوں کے بارے میں فرماتے ہیں وہی حکم اس کا بھی ہوگا۔

البتہ حضرت مفتی نظام الدین صاحب کی رائے کے برعکس ہندوستان کی تمام موروثی زمینوں کا خواہ وہ زمینداری والی ہوں یا بھوم دھری ہوں یا سیر دھری کی ہوں سب کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں اولاد مؤنث کا حصہ دیا جانا معلوم نہ ہو اور اولاد مؤنث اور ان کے ورثاء کی طرف سے کسی قسم کے مطالبے کا بھی علم نہ ہو تو ظاہر حال کے مطابق قابض ومتصرف کو مالک مختار مجاز مان کر کے اس کا خریدنا جائز ہے، لیکن اگر خریدنے کے بعد اولاد مؤنث میں سے کوئی مطالبہ پیش کرے اور اس کا مطالبہ صحیح ودرست طریقے سے ثابت بھی ہو جائے تو اس کے حصے کے مطابق بیع کالعدم مانی جائے گی، اس کے حصے کی زمین دے کر یا اس کا معاوضہ دے کر اس کو راضی کرنا لازم اور واجب ہوگا، کیونکہ جب ان کا استحقاق ثابت ہو گیا تو پھر استحقاق کا حکم بھی عائد ہوگا اور اگر موروثی زمین میں اولاد مؤنث کی طرف سے مطالبہ ہو اور مطالبے کا علم بھی ہو تو اس کو راضی کئے بغیر اس کے حصے کی زمین خریدنا شرعاً غصب ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے، اس صورت میں اگر زمین خریدی گئی تو چونکہ ان کا حق باقی اور معلوم ہے تو جس طرح بھی ممکن ہو ان کا حق ادا کرنا لازم ہوگا۔ هذا ما عندي و لعل عند غيري أحسن منه۔

سوال نمبر ۴ کا جواب: مال حرام سے خریدی ہوئی زمینوں کی خرید وفروخت:

مال حرام سے خریدی ہوئی زمین کا حکم یہ ہے کہ اگر مال حرام، حلال سے مخلوط نہ ہو بلکہ مکمل حرام ہو، غصب، رشوت وغیرہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہو اور اس سے کوئی زمین وغیرہ خریدی جائے تو اگر مال حرام کا عوض ادا کردیا جائے، یعنی اگر مالک معلوم ہو تو ان کو واپس لوٹا دیا گیا ہو ورنہ صدقہ کردیا گیا ہو تو اس کے بعد اس کا خریدنا اور بیچنا دونوں جائز ہے اور اس کا نفع حلال ہے، کیونکہ مال حرام کا حکم شرعی انجام دینے کے بعد اس سے خریدا ہوا مال حلال ہوجائے گا اور اس مال میں کوئی خبث باقی نہ رہے گا جیسے کہ مال مغصوب عوض ادا کرنے کے بعد حلال ہوجاتا ہے اور اس کی خرید وفروخت جائز ہوجاتی ہے۔

''مات وكسبه حرام فالميراث حلال، ثم رمز وقال: لا نأخذ بهٰذه الرواية. وهو حرام مطلقًا على الورثة فتنبه اهـ. ومفاده الحرمة وإن لم يعلم أربابه'' (شامی ۷/ ۳۰۲)۔

''مايأخذه من المال ظلمًا ويخلطه بماله وبمال مظلوم آخر يصير ملكًا له وينقطع حق الأول فلا يكون أخذه عندنا حرامًا محضا، نعم لا يباح الانتفاع به قبل أداء البدل في الصحيح من المذهب''۔

اور اگر مال حرام کے حکم شرعی پر عمل نہ کیا گیا ہو، اس صورت میں اس سے خریدی ہوئی زمین کو خریدنا جمہور کے مطابق جائز نہیں، کیونکہ ملکیت میں خبث ہے، البتہ امام کرخی کے قول کے مطابق اگر زمین کی خریداری میں مال حرام پہلے دے کر پھر اسی کے عوض خریداری نہ ہوئی ہو اور مال حرام کی طرف اشارہ کرکے اس کو نہ دیا گیا ہو تو ایسی صورت میں مال حرام سے خریدی ہوئی زمین امام کرخی کے قول مطابق حلال ہے، اس میں کوئی خبث نہیں، خبث صرف سبب میں ہے، عین مال میں نہیں اور مال حرام کا تعلق اس کے ذمہ سے ہے نہ کہ زمین کے عین سے، اس لئے امام کرخی کے نزدیک وہ زمین حلال ہے، لہذا اس کی خرید وفروخت بھی شرعاً جائز ہے اور اس کا نفع بھی طیب ہے اور اس زمانے میں مشائخ نے مال حرام کے غلبہ کی وجہ سے یسر وسہولت کے لئے امام کرخیؒ کے قول پر فتوی دیا ہے، لہذا مال حرام سے خریدی ہوئی زمین کو خریدنے کی گنجائش ہے، البتہ احتیاط کرنا بہتر ہے (الھندیہ ۳/ ۲۱۵ باب الاحتکار، نیز دیکھئے: ہندیہ باب الغصب ۵/ ۲۴۱)۔

مال حرام سے خریدا ہوا مال عین حرام کے حکم میں ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، راجح اور احوط یہی ہے کہ وہ عین حرام کے حکم میں ہے، لہذا اس کو خریدنا جائز نہیں، لیکن علامہ کرخی وغیرہ کے نزدیک عین حرام کے حکم میں نہیں ہے، اس لئے اس کا خریدنا جائز ہے اور مال حرام کی کثرت کے زمانہ میں یہی لائق عمل ہے جیسا کہ مشائخ نے اس پر فتوی بھی دیا ہے اور یہ اوسع ہے، مال حرام سے خریدے ہوئے مال کے سبب میں خبث ہے، عین میں نہیں لہذا خریدنا مکروہ ہے۔

''إن لم يردّه يكره للمسلمين شراءه منه لأنه ملك خبيث بمنزلة المشترى فاسدًا إذا أراد بيع المشترى بعد القبض يكره شراءه منه وإن نفذ فيه بيعه وعتقه لأنه ملك حصل له بسبب حرام شرعًا'' (شامی ۷/ ۳۰۱)۔

سوال نمبر ۵ کا جواب:

حکومت کے قانون کے مطابق جو نقشہ منظور ہوتا ہے اس کی حیثیت حکومت سے وعدہ اور معاہدہ کی ہے کہ پلاٹر حکومت سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ ہم خریداروں کو اس نقشہ کے مطابق پلاٹ فراہم کریں گے، اور خریداروں سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ اس نقشے کے مطابق پلاٹ فراہم کیا جائے گا اور حکومت کا نقشہ سازی کے بعد پلاننگ کی اجازت دینا اور پلاننگ کو نقشہ کے ساتھ منظور کرنا عوامی مصالح اور فائدے کے لئے ہوتا ہے، اس لئے اس کی پابندی پلاٹر کے ذمہ واجب ہوتی ہے اور اس کی خلاف ورزی شرعاً جائز نہیں ہے، اسی طرح دوطرفہ عہد ومعاہدہ کی پابندی بھی واجب ہے معاہدہ کی خلاف ورزی حرام ہے۔ "وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا" کا حکم ہے، اس لئے منظور شدہ نقشہ کے خلاف فروخت کرنا شرعاً معاہدے کی خلاف ورزی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً ناجائز ہے، چنانچہ ایفاء عہد پر تفصیلی گفتگو کے بعد محقق عصر حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی ''نتائج بحث'' کے عنوان سے خلاصہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نتائج بحث''

وعدہ اور معاہدہ کی مذکورہ بالا بحث سے جو صورت حال واضح ہوتی ہے وہ درج ذیل ہیں: (۱) وعدہ کا ایفاء عام حالات میں صرف دیانۃً واجب ہوتا ہے قضاءً نہیں، اگر کوئی شخص بغیر کسی عذر کے وعدہ خلافی کرے تو گنہ گار ہے، اور اگر وعدہ کرتے ہوئے ہی نیت وعدہ خلافی کی ہو تو اسے حدیث میں نفاق کہا گیا ہے، (۲) دوطرفہ وعدہ جسے معاہدہ کہا گیا ہے، اس کو بعض فقہاء عصر نے وعدہ سے ممتاز کرکے لازم قرار دیا ہے یعنی یک طرفہ وعدے کو قضاءً لازم نہیں کہا، لیکن دوطرفہ وعدے کو

قضاءً بھی لازم قرار دیا ہے، (۳) بعض معاملات میں حاجت کی وجہ سے یک طرفہ وعدے کو قضاءً بھی لازم کیا جاسکتا ہے، (۴) اگر کسی خلاف شرع بات کا کوئی وعدہ کیا گیا ہو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں، مثلاً ایک شریک دوسرے شریک سے یہ وعدہ کرے کہ اگر کاروبار میں کوئی نقصان ہوگا تو میں اس کی تلافی کر کے تمہیں دوں گا تو یہ وعدہ بھی چونکہ سارا نقصان ایک فریق پر ڈالنے کا موجب ہے جو شرعاً جائز نہیں اس لئے یہ وعدہ بھی جائز نہیں، (۵) تجارتی معاملات میں وعدے کے قضاءً لازم ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کے قضاءً لازم ہونے پر فریقین وعدے کے وقت ہی متفق ہو جائیں۔

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ منظور شدہ نقشہ کے خلاف خرید وفروخت معاہدہ کی خلاف ورزی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، لہذا جب بلاٹر منظور شدہ نقشہ میں تبدیلی کر کے دی گئی سہولیات کو ختم کردے اور سہولیات کے لئے جو جگہیں متعین کی گئی تھیں ان کو جان بوجھ کر خریدنا شرعاً منع ہوگا، کیونکہ علم کے باوجود اس جگہ کا خریدنا تعاون علی الاثم میں داخل ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے، لیکن چونکہ زمین بلاٹر کی ملک ہے، راستہ یا عمومی مفاد کی جگہ ابھی اس کے لئے خاص نہیں ہوئی ہے؛ بلکہ منصوبہ میں داخل ہے اور صرف منصوبہ سے وہ جگہ راستہ وغیرہ نہیں بنے گی، لہذا جب ملکیت بلاٹر کی باقی ہے تو خریدنے والے کی ملکیت ثابت ہو جائے گی، لیکن معاہدے کی خلاف ورزی میں معین ہونے کی وجہ سے علم کے ہوتے ہوئے خریدنا منع ہوگا، البتہ نقشہ دکھلا کر پلاٹوں کو فروخت کردینے کے بعد عمومی منافع کی جگہوں کو فروخت کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ عمومی منافع کی جگہیں خریدے ہوئے پلاٹ کے تابع ہوں گے۔

”اعلم أن الحق في العادة يذكر فيما هو تبع للمبيع ولابد له منه ولايقصد إلا لأجله كالطريق والشرب للأرض.... وفي النهر المذكور: ودخول شرب البركة الجاري إليها وقت البيع وإن لم ينصوا على ذلك ولا سيما ماء البركة فإنه مقصود بالشراء حتى إن الدار بدونه ينقص ثمنها نقصًا كثيرًا وقد مر آنفًا عن الكافي أن الأحكام تبتني على العرف وأنه يعتبر في كل إقليم وعصر عرف أهله“ (شامی ۷/ ۴۲۴، ۴۲۷)۔

کسی جگہ کو مسجد کے لئے مقرر کرنا:

بلاٹر کا اپنے پلاٹ میں کسی جگہ کا مسجد کے لئے متعین کرنا یہ مسجد شرعی ہونے کے لئے کافی نہیں، نقشہ میں مسجد کا پلاٹ متعین کردینے سے وہ جگہ نہ تو وقف ہوگی نہ مسجد شرعی بنے گی، کیونکہ وقف کے لئے ضروری ہے کہ باقاعدہ کسی چیز کو وقف کیا جائے، صرف نیت اور ارادہ کر لینے سے کوئی چیز وقف نہیں بنتی جب تک یہ نہ کہہ دیا جائے کہ یہ چیز وقف ہے، اس وقت تک وقف نہیں بنے گی (انعام الباری ۶/ ۱۰۳۵)، اور کسی جگہ کے مسجد ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں: (۱) افراز (۲) اذن صلاۃ (۳) تابید۔ یعنی مسجد کی جگہ کو علیحدہ کر کے ہمیشہ کے لئے اذان ونماز کی اجازت کے ساتھ وہ جگہ نماز پڑھنے کے لئے حوالہ کردی جائے، لہذا جس جگہ پر نماز پڑھنے کی اجازت نہ دی گئی ہو اور وہ جگہ قوم ومتولی کے حوالہ بھی نہ کی گئی ہو، صرف مجوزہ نقشہ اور ارادہ میں کسی جگہ پر مسجد بنانا ہو تو اس نقشہ اور ارادہ سے وہ جگہ شرعاً مسجد نہیں بنے گی۔

”لو بنى مسجدًا وسلمه إلى المتولي لايصير مسجدًا بالتسليم إلى المتولي وهو قول البعض واختاره شمس الأئمة السرخسي....وقال بعضهم يصير مسجدًا كسائر الأوقاف كذا في الخانية وفي فتح القدير والوجه الصحة لأن بالتسليم إلى المتولي أيضًا يحصل تمام التسليم إلى تعالى لرفع يده عنه فكأنه لم يطلع على تصحيح وفي الاختيار والتصحيح أنه يصير مسجدًا. فأفاد بالاقتصار على الشروط الثلاثة (الإفراز، إذن الصلاة، التابيد) أنه لا يحتاج في جعله مسجدًا إلى قوله وقفته ونحوه لأن العرف جار بالإذن في الصلاة على وجه العموم، والتخلية بكونه وقفًا على هذه الجهة فكان كالتعبير به“ (البحر الرائق ۵/ ۲۴۹)۔

تائید کے لئے چند فتاوی:

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحبؒ اپنے ایک فتوی میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے بسانے کی غرض سے وسیع قطعہ زمین خریدی گئی اور مسجد، مدرسہ قائم کرنے کی غرض سے جگہ بھی تعیین بھی کردی گئی..... صرف سنگ بنیاد رکھنے پر جبکہ نہ وہاں اذان ہوئی، اور نہ نماز پڑھی گئی..... شرعی مسجد کے احکام جاری نہ ہوں گے (فتاوی رحیمیہ ۹/ ۱۰۰)۔

اسی طرح حضرت مفتی صاحب کے ایک دوسرے فتوی سے بھی صرف نقشہ سے مسجدیت کے تحقق کا نہ ہونا معلوم ہوتا ہے (رحیمیہ جدید ۹/ ۹۷)۔

منظور شدہ نقشے کے خلاف فروخت کرنا اور اس کا خریدنا:

منظور شدہ نقشے کے خلاف خرید وفروخت کے کل تین مراحل ہوتے ہیں:

(۱) نقشہ کے منظور ہونے کے بعد ہی لوگوں سے کسی قسم کا معاملہ کرنے سے پہلے ہی نقشہ میں تبدیلی کردے، راستوں کو چھوٹا کردینا وغیرہ ابتداء ہی سے ہو، چونکہ یہ حکومت سے کئے گئے اس معاہدے کے خلاف ہے جس میں لوگوں کا نفع ہے اس لئے اس معاہدہ کی خلاف ورزی شرعاً منع ہے، لیکن چونکہ زمین اس کی مملوک ہے اس لئے صاحب زمین کو اس میں اپنے من چاہے تصرف کا حق حاصل ہے اور اس میں کسی کا اضرار اور نقصان بھی نہیں اور نہ ہی کسی صاحب حق کے حق کا ضیاع ہے، اس لئے خریدنے والے کے لئے خریدنا جائز ہے، خریدنے میں کوئی گناہ نہیں، جیسے کہ حکومت کے طرف سے متعینہ نرخ سے زائد میں خریدنا شرعاً جائز ہے۔

(۲) نقشہ منظور شدہ کے مطابق پلاٹ کو فروخت کیا جاچکا ہو اس کے بعد اس میں سہولیات کے لئے جو جگہیں مقرر تھیں مثلاً پلے گراؤنڈ، سوئمنگ پل وغیرہ کو بیچنا پلاٹ خریدنے والوں سے معاہدے کی خلاف ورزی اور ان کی حقوق تلفی کی وجہ سے شرعاً جائز نہیں اور نہ ہی جان بوجھ کر کے اس کو خریدنا جائز ہوگا، کیونکہ خریدنے کی صورت میں تعاون علی الاثم بہرحال پایا جائے گا، لیکن اگر خریدے گا تو مالک ہوجائے گا، کیونکہ یہ جگہیں کالونی آباد ہونے سے پہلے پہلے بیچنے والے کی ملکیت ہیں۔

(۳) کالونی آباد ہونے کے بعد اس کی سہولیات کی جگہوں کا فروخت کرنا جائز نہیں اور نہ ہی اس کو خریدنا جائز ہے، کیونکہ آباد ہونے کے بعد ان جگہوں سے لوگوں کے حقوق متعلق اور وابستہ ہوگئے ہیں اور جن جگہوں سے عوامی حقوق وابستہ ہوں اس کا خریدنا بیچنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ وقف کے درجہ میں ہیں:

''ولا یجوز إحیاء ما قرب من العامر بل یترك مرعی لهم و مطرحًا لحصائدهم لتعلق حقهم به'' (شامی ۱۰/ ۶)۔

سوال نمبر ۶ کا جواب/ منظور شدہ نقشے میں گارڈن کی جگہ پر مسجد بنانا:

نقشے میں جو جگہ گارڈن کی حیثیت سے متعین ہے، اس جگہ پر مسجد بنادینا شرعاً جائز ہے، کیونکہ گارڈن ہو یا مسجد دونوں سے عمومی حق ونفع متعلق ہے، لیکن گارڈن کے مقابلہ میں مسجد کی اہمیت بڑھی ہوئی ہے، اس لئے گارڈن کے بجائے مسجد بنانے کی اجازت ہے اور وہ جگہ چونکہ پلاٹر کی ملکیت ہوتی ہے، اس لئے اس پر بنائی گئی مسجد مسجد شرعی بن جائے گی، تاہم مناسب اور بہتر یہ ہے کہ گارڈن کی جگہ پر گارڈن ہی باقی رکھا جائے اور مسجد کے لئے کوئی الگ پلاٹ مخصوص کیا جائے اور اس کی قیمت پلاٹ خریدنے والوں کے پلاٹ کی قیمت پر کچھ اضافہ کرکے وصول کی جاسکتی ہے، اس طرح کرنے سے مسجد کی بھی ضرورت پوری ہوجائے گی اور حکومت سے کئے گئے معاہدہ کی بھی پابندی بھی ہوجائے گی۔

''عن عطاء: لما فتح الله تعالی الأمصار علی ید عمر أمر المسلمین أن یبنوا المساجد وأن لا یتخذوا فی مدینة مسجدین یضار أحدهما صاحبه'' (الکشاف ۲/ ۳۱۰، سورۃ التوبة: ۱۰۷، دار الکتاب العربی بیروت)۔

''جعل شئی من الطریق مسجدًا لضیقه ولم یضر بالمارین جاز لأنهما للمسلمین کعکسه کما جاز جعل الإمام الطریق مسجدًا لا عکسه لجواز الصلاة فی الطریق لا المرور فی المسجد تؤخذ أرض بجنب مسجد ضاق علی الناس بالقیمة کرها'' (الدر المختار ملخصاً ۶/ ۵۷۶ تا ۵۷۷)۔

سوال نمبر ۷ کا جواب:

حکومت کے جو قوانین نظم وانتظام سے متعلق ہوں حتی الامکان اس کی پابندی کرنی ضروری ہوتی ہے، تاہم اگر کوئی قانون لوگوں کی دشواری کا باعث ہو تو اس کی خلاف ورزی کی صورت میں جان ومال آبرو وغیرہ پر حرف نہ آئے تو دشواری کی وجہ سے اس قانون کی خلاف ورزی جائز ہے، لہذا کالونی بسانے کے لئے حکومت کے جو قوانین ہیں اگر ان کو نظر انداز کرکے زمین کے مالکین پلاٹ بناکر فروخت کردیں اور لوگ اپنی سہولت کے مطابق خرید کر آباد ہوجائیں تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، اس طرح سے فروخت کرنا اور خریدنا دونوں جائز ہے، البتہ اگر عزت وآبرو کا خطرہ ہو تو احتراز ضروری ہے:

''لا یمنع الشخص من تصرفه فی ملکه إلا إذا کان الضرر بجاره ضررًا بینًا'' (شامی ۸/ ۱۵۲، زکریا)۔

''إذا سعّر وخاف البائع ضرب الإمام لو نقص لا يحل للمشتری (لعدم رضا البائع) وحيلته أن يقول له: بعني بما تحب، فحينئذ بأی شئی باعه يحل، لأنه قد أخذه بطيب نفسه ورضاه، وظاهره لو باعه بأكثر يحل، ولو باعه بقليل يحل أيضًا بشرط أن يخشى البائع بلوغ الخبر للسلطان وانتقامه منه'' (الدر مع الرد مع تقريرات الرافعي ۹/ ۵۷۳۔ ۵۷۴)۔

''إن أكثر النوائب في زماننا بطريق الظلم، فمن تمكن من دفع الظلم عن نفسه فذلك خير له'' (الدر مع الرد ۳/ ۲۷۹۔ ۲۸۰)۔

''عن حذيفة قال قال رسول اللهﷺ لا ينبغي (أی لا يجوز) للمؤمن أن يذل نفسه (أی باختياره) قالوا كيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لا يطيق'' (مشكاة مع مرقاة آخر ابواب الدعاء ۵/ ۲۱۴)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے قانون سے اگر کچھ لوگوں کا نفع ہے، تو دوسرے بہت سے لوگوں کا اس طرح کے قانون سے نقصان بھی ہوتا ہے، زمین فروخت کرنے والے کی ملک ہے اس لئے قانونی پابندی لازم نہیں اور خرید نا و بیچنا جائز ہے، واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۸ کا جواب:

قانونی گرفت سے بچنے کے لئے سرکاری سودی قرضے حاصل کرنے کی شرعاً اجازت ہے، کیونکہ قانونی گرفت سے بچنا انسان کی مجبوری ہے اور مجبوری کے وقت سودی قرض حاصل کرنے کی فقہاء نے رخصت واجازت دی ہے، چنانچہ انکم ٹیکس کی گرفت سے محفوظ رہنے کے لئے حکومتی قرض لینے کی حضرات مفتیان کرام نے اجازت مرحمت فرمائی ہے، نیز ''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' کی کتب فقہیہ میں صراحت بھی موجود ہے، یعنی حاجت مند شخص کے لئے سودی قرض لینا جائز ہے اور حاجت سے مراد وہ تنگی اور مشقت ہے جو مطلوب ومقصود کے فوت ہونے سے پیش آتی ہے اور محنت کی کمائی کا ایک اچھا حصہ ضبط ہو جانے سے یا قانون اور مقدمہ میں ماخوذ ہونے سے مشقت کا لاحق ہونا ظاہر ہے، لہذا مال کی حفاظت کے لئے، اسی طرح قانونی مواخذہ سے بچنے کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی۔

''وأما الحاجيات فمعناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسعة ورفع الضيق المؤدی في الغالب إلى الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب'' (الموافقات للشاطبی)۔

نیز رشوت کے باب میں بھی حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، لہذا سودی قرض میں جو سود دیا جائے اسکو رشوت کے قائم مقام مان کر کے دفع مضرت کے لئے دینے کی بدرجہ اولی گنجائش ہوگی:

''أخذ المال ليسوّی أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع وهو حرام على الآخذ فقط'' (شامی ۸/ ۳۵)۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحب کے فتوی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ وہ اس مسئلہ میں کہ بعض اوقات رقم موجود ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص بڑا سرمایہ لگا کر کاروبار کرتا ہے تو حکومت کے قوانین کی وجہ سے پکڑ کا اندیشہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں مسلمان کیا کرے؟ حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں: مثلاً اپنے جائز روپے سے بھی بڑا کاروبار کرنے میں قانون حکومت کی وجہ سے قانونی گرفت ہو کر اپنا جائز روپیہ کالا روپیہ شمار ہو کر قابل ضبطی وغیرہ ہو رہا ہو تو قانونی رو سے اور اپنے حلال روپے کو بچانے کے لئے مجبوری میں بقدر ضرورت حکومت وقت سے قرض لے لینے کی گنجائش ہو جاتی ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۱/ ۱۸۹)۔

سوال نمبر ۹ کا جواب:

زمین فروخت کرنے کے وقت پلاٹ کی لمبائی چوڑائی اس کے راستے وغیرہ متعین کر دینے سے اس طرح کی تعیین ہو جاتی ہے جو رافع نزاع ہو، لہذا اس صورت میں جو جہالت ہوتی ہے وہ جہالت یسیرہ ہے جس کا دور کرنا ان کے اپنے اختیار میں ہے اور اس کی تعیین میں عموماً پلاٹ میں یکسانیت کی وجہ سے اختلاف بھی نہیں ہوتا ہے، لہذا اس طرح سے معاملہ کرنا جائز ہے اور اس کی نظیر غلے کے ڈھیر میں سے چند صاع غلہ فروخت کر دینا یا ایسی زمین جس کی چہار سمت یکساں ہو، کا کچھ گز بغیر تعیین کے فروخت کر دیا جانے والا مسئلہ ہے جس میں حضرت امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے، حضرت امام صاحب کے نزدیک مبیع کی جہالت کی وجہ سے یہ بیع جائز نہیں اور صاحبین کے نزدیک جائز ہے اور امام صاحب کے نزدیک بھی اگر حوالگی اور تعیین مجلس عقد میں پائی جائے تو بیع صحیح ہو جاتی ہے اور فتوی صاحبین کے قول پر ہے کہ بیع صحیح اور درست ہے، کیونکہ جہالت یسیرہ ہے جس کا دور کرنا دونوں کے اختیار میں ہے:

''فسد بيع عشرة أذرع من مائة ذراع من دار أو حمام وصححاه وإن لم يسم جملتها على الصحيح. لأن إزالتها بيدهما، لا يفسد بيع عشرة أسهم من مائة سهم لشيوع السهم لا الذراع بقي لو تراضيا على تعيين الأذرع في مكان لم أره. وينبغي انقلابه صحيحًا لو في المجلس ولو بعده فبيع بالتعاطي (الدر) وفي الرد: ذكر في غاية البيان نقلًا عن الصدر الشهيد والإمام العتابي أن قولهما بجواز البيع إذا كانت الدار مائة ذراع، ويفهم هذا من تعليلها أيضًا حيث قال: لأن عشرة أذرع من مائة ذراع عشر الدار فأشبه عشرة أسهم من مائة سهم .... قلت وجه كون الموضع مجهولًا أنه لم يبين أنه من مقدم الدار أو من مؤخرها وجوانبها تتفاوت قيمة فكان المعقود عليه مجهولًا جهالة مفضية إلى النزاع فيفسد كبيع بيت من بيوت الدار'' (شامی ۷/ ۷۱)۔

''وفي تقريرات الرافعي: والظاهر اعتماد قولهما الآن لموافقة العرف حملًا كلام العاقد على عرفه'' (تقريرات الرافعي على احر الشامي ۷/ ۱۱۶)۔

سوال نمبر ۱۰ کا جواب:

زمین کی خرید وفروخت کے جائز ہونے کے لئے قبضہ شرط نہیں ہے، بغیر قبضہ کے بھی زمین کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے، لہذا زمین کے کسی حصہ کو خریدنے والے کے لئے قبضہ سے پہلے فروخت کردینا شرعاً جائز ہے، جب پلاٹر نے پلاٹ کی نوعیت تو متعین کی ہے، لیکن جگہ کی تعیین نہیں کی تو یہ حصۂ شائعہ کی بیع ہوگی اور حصۂ شائعہ کی خرید وفروخت کی صورت میں خریدار اپنے حصہ کے بقدر زمین میں مالک اور شریک ہوجائے گا اور خریدار کے لئے اپنے اس حصۂ شائعہ کو فروخت کرنے کی اجازت ہوگی، گرچہ اس پر قبضہ کا تحقق نہ ہو، اس لئے اگر زمین فروخت کرنے والا فروخت کی ہوئی زمین پر اپنی کاشت کرتا ہے تو بھی خریدنے والے کے لئے اس کو فروخت کرنا جائز ہے، کیونکہ فروخت شدہ زمین پر کاشت کرنے سے قبضہ کا تحقق نہیں ہوگا، لیکن ملکیت تو بہرحال ثابت ہوجائے گی۔

''(ويلزم بإيجاب وقبول) وقال الشافعي: لا يلزم به بل لهما خيار المجلس لقوله عليه السلام: ''المتبايعان بالخيار ما لم يتفرقا'' إذهما متبايعان بعد البيع وقبله متساويان، ولنا أن العقد تم من الجانبين ودخل المبيع في ملك المشتري والفسخ بعده لا يكون إلا بالتراضي لما فيه من الإضرار بالآخر بإبطال حقه لسائر العقود'' (تبيين الحقائق ۴/ ۲۷۶-۲۷۷)۔

''صح بيع عقار لا يخشى هلاكه قبل قبضه من بائعه لعدم الغرر لندرة هلاك العقار. قوله (صح بيع عقار الخ) أي عندهما وقال محمد لا يجوز وعبر بالصحة دون النفاذ واللزوم لأنهما موقوفان على نقد الثمن أو رضا البائع وإلا فللبائع إبطاله أي إبطال بيع المشتري وكذا كل تصرف يقبل النقض إذا فعل المشتري قبل القبض أو بعده بغير إذن البائع فللبائع إبطاله أي بعد القبض الواقع بلا إذنه لأن قبض المبيع قبل نقد الثمن بلا إذن البائع غير معتبر لأن له استرداده وحبسه إلى قبض الثمن'' (شامی ۷/ ۳۶۹)۔

حاصل یہ کہ زمین میں قبضہ سے پہلے تصرف جائز ہے، لیکن بائع کو اگر ثمن حاصل نہ ہو تو اسکے لئے مشتری کے کئے ہوئے تصرفات کو ختم کرنے کا حق ہے، البتہ جو تصرفات فسخ کو قبول نہیں کرتے ہیں ان میں بائع کو فسخ کا اختیار نہ ہوگا (نیز دیکھئے: تبیین الحقائق ۴/ ۲۸۶ م زکریا)۔

''وبيع قفيز من صبرة يجوز لعدم التفاوت فلا تفضي الجهالة إلى المنازعة .... ومن اشترى عشرة أذرع من مائة ذراع من دار أو حمام فالبيع فاسد عند أبي حنيفة، وقالا: هو جائز .... وعلى قول آخرين يجوز لأنها جهالة بيدهما إزالتها فيذرع الكل فيعرف نسبة العشرة وصحح هذا بناء على ما تقدم لهما من بيع صبرة لجواز أن يكون العاقد يرى الرأي الأول.... والصحيح أنه يجوز لأنها جهالة بأيديهما إزالتها بأن تقاس كلها فيعرف نسبة الذراع أو العشرة منها فيعلم قدر المبيع'' (ہدایہ مع فتح القدير ملخصًا ۶/ ۲۷۱، ۲۷۸، ۲۷۶، ہکذا فی البدائع ۴/ ۳۵۹، ۳۶۰)۔

حاصل یہ ہے کہ اس صورت میں حصۂ شائعہ کی بیع ہوتی ہے اور خریدنے والا جب حصۂ شائعہ کا مالک ہوگیا تو اس کے لئے بھی فروخت کرنا

شرعاً جائز ہوگا، چاہے اس پر قابض ہو یا قابض نہ ہو، قبضہ سے یا عدم قبضہ سے حکم میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔

''فتحرر أن بيع الشائع جائز من الشريك ومن الأجنبي إلا في الحصة الشائعة من الغراس والزرع وقال العلامة قاسم في رسالته في مسائل الشيوع سئلت عن بيع حصة شائعة من عقار فأجبت بالجواز، ثم أخبرت عن بعض من يزعم العلم بالفقه أن ذلك غير جائز فقلت لا أعلم خلافًا في المذهب فيما ذكروا إنما اختلف في بيع الحصة الشائعة من العمارة والصحيح الجواز'' (تنقيح الفتاوى الحامديه ۱/ ۲۲۵)۔

سوال نمبر ۱۱ کا جواب:

(الف) کالونی بنانے والے کی ملکیت میں زمین آ گئی ہو اور اس سے کسی خریدار نے کاغذی نقشے کی بنیاد پر زمین خرید لی ہو اور پلاٹ کی لمبائی چوڑائی، جہت، راستہ وغیرہ ہر چیز متعین کردی گئی ہو تو ایسی صورت میں اس کی خرید و فروخت شرعاً صحیح اور درست ہے، اس لئے خریدنے والے کی ملکیت بغیر قبضہ کے بھی ثابت ہوجائے گی، ثبوت ملکیت کے بعد اس کو فروخت کرنا بھی جائز ہوگا جس کی توجیہ سوال ۱۰ کے تحت کی جاچکی ہے اور ملکیت ثابت ہونے کے بعد قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز ہے، حاصل یہ کہ جب بیع صحیح ہو فاسد نہ ہو تو قبضہ میں آنے سے پہلے اس کو دوسرے کو فروخت کردینا بھی شرعاً جائز ہے۔

''ويلزم بإيجاب وقبول، وقال الشافعي: لا يلزم به بل لهما خيار المجلس لقوله عليه السلام: ''المتبايعان بالخيار ما لم يتفرقا'' إذ هما متبايعان بعد البيع وقبله متساويان، ولنا أن العقد تم من الجانبين ودخل المبيع في ملك المشتري والفسخ بعده لا يكون إلا بالتراضي لما فيه من الإضرار بإبطال حقه كسائر العقود'' (تبيين الحقائق ۴/ ۲۷۶-۲۷۷، نیز دیکھئے: حوالہ سابق ۴/ ۲۸۶، ہدایہ مع فتح القدیر ۶/ ۵۱۳)۔

(ب): سوال کی دوسری شکل جس میں مالک زمین اور کالونی بنانے والے کے درمیان معاہدہ ہوتا ہے کہ اتنی مدت متعینہ میں زمین کی قیمت ادا کردی جائے تو ٹھیک، جس کے لئے خریدار بیعانہ کے نام سے کچھ پیشگی رقم بھی دیدیتا ہے اور اگر اس متعینہ مدت میں قیمت ادا نہ کی جاسکی تو معاملہ ختم، کاروبار کا یہ طریقہ کثرت سے رائج ہے، اس شکل کو کتب فقہیہ میں درج صورتوں میں سے کس صورت پر منطبق کیا جائے اس میں مختلف احتمالات ہیں، لہذا ان احتمالات مختلفہ کو ذکر کر کے شکل اور اس کے حکم کے انطباق کی کوشش کی جاتی ہے، واللہ المؤید والمیسر۔

احتمال (۱) یہ شکل خیار نقد پر زیادہ منطبق ہوتی ہے، کیونکہ جس طرح خیارِ نقد میں بائع اپنا سامان اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ اگر قیمت مدتِ متعینہ میں ادا نہیں ہوسکی تو یہ معاملہ فسخ ہوجائے گا، اسی طرح زمین کی خریداری میں بھی یہ شکل اپنائی جاتی ہے، کہ اگر خریدی ہوئی زمین کی قیمت متعینہ مدت میں ادا نہیں ہوئی تو یہ بیع کالعدم ہوجائے گی، تو یہ دونوں شکل تقریباً یکساں ہیں جس کو اصطلاح شریعت میں خیار نقد کہا جاتا ہے اور خیار نقد کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ متعینہ مدت تین دن کی ہو تو بالاتفاق صحیح اور درست ہے (الحاقاً بخیار الشرط)، اور اگر تین دن سے زائد ہو تو شیخینؒ کے یہاں بیع بشرط الاقالہ ہونے کی وجہ سے فاسد ہے، لیکن امام محمدؒ کے یہاں معاملہ صحیح اور درست ہے، البتہ اگر مدتِ متعینہ میں قیمت ادا نہ کی جاسکی تو یہ معاملہ شرعاً فاسد ہوجائے گا، اس لئے ہر ایک کو فسخ کرنے کا اختیار ہوگا، لیکن اگر فسخ نہ کیا گیا اور خریدار نے اسی معاملے کی بنیاد پر قبضہ کرلیا تو قبضہ سے ملکیت ثابت ہوجائے گی۔

''إن اشترى شيئًا على أنه إن لم ينقد ثمنه إلى ثلاثة أيام فلا بيع صح استحسانًا... وإن اشترى كذلك إلى أربعة أيام لا يصح خلافًا لمحمد فإن نقد في الثلاثة جاز اتفاقا لأن خيار النقد ملحق بخيار الشرط'' (الدر المختار ۷/ ۱۱۷)۔

''إذا تبايعا على أن يؤدي المشتري الثمن في وقت كذا وإن لم يؤده فلا بيع بينهما صح البيع وهذا يقال له خيار النقد'' (المادة: ۳۱۳)، ''إذا لم يؤد المشتري الثمن في المدة المعينة كان البيع الذي فيه خيار النقد فاسدًا'' (شرح مجله لعلی حیدر ۱/ ۲۶۱، ۲۶۲، المادہ: ۳۱۴)۔

مجلہ میں خیار نقد کے لئے کسی مدت کی تحدید نہیں کی گئی ہے، بلکہ جواز کے لئے صرف تعیین مدت کافی ہے چاہے جتنی ہو۔

خیارِ نقد پر مرتب ہونے والے چند احکام:

(۱) خیارِ نقد میں من لہ الخیار خریدار ہوتا ہے، فروخت کرنے والا نہیں، گرچہ یہ شرط فروخت کرنے والے کی طرف سے اپنے نفع کے لئے لگائی جاتی ہے، لیکن اس شرط کو پوری کرنے اور نہ کرنے کا اختیار مشتری کو ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو متعینہ مدت میں قیمت ادا کرکے بیع کو لازم کردے اور اگر چاہے تو قیمت ادا نہ کرکے معاملہ کو فسخ یا فاسد کردے تو جب معاملہ کی تکمیل کا اختیار مشتری کو ہے بائع کو نہیں تو من لہ الخیار مشتری ہوگا بائع نہیں۔

’’ومقتضى هذه المادة أنه إذا عقد البيع بخيار النقد فللمشتري دفع الثمن وإمضاء البيع وفسخ البيع وعدم دفع الثمن فيكون الخيار ثابتًا للمشتري مع أن الغريب في ذلك أن الذي ينتفع من الخيار إنما هو البائع۔ إيضاح شرط. البائع. إذا أسلم المشتري ثمن المبيع إلى البائع واشترط البائع أنه إذا رد الثمن إلى المشتري إلى أجل معين فلا يكون بينهما بيع فالبيع صحيح ويكون المشتري ضامنًا للمبيع بقيمته وإذا قبض المبيع وعقد البيع على هذا الوجه فالبائع هو صاحب الخيار وهو قادر على فسخ البيع الخ‘‘ (شرح المجلة لعلي حيدر ۱/ ۱۱۱)۔

(۲) اگر من لہ الخیار (مشتری) مبیع میں کوئی تصرف کردے تو خیار ساقط ہوجاتا ہے اور بیع لازم ہوجاتی ہے۔

’’لو باعه المشتري ولم ينقد الثمن في الثلاث جاز البيع وكان عليه الثمن وتصرف فيه المشتري في المدة المعينة قبل نقد الثمن أو تلف في يده أو استهلكه فالبيع يصير لازمًا‘‘ (شامی ۷/ ۱۱۷)۔

’’ولا يبقى حق الفسخ فلذلك يجب على المشتري أن يؤدي ثمن المبيع لأن البيع بخيار النقد بمنزلة البيع بخيار الشرط‘‘ (شرح المجلة لعلي حيدر ۱/ ۲۶۲)۔

سوال میں درج صورت پر مرتب ہونے والا حکم:

جب یہ بات منقح ہوگئی کہ مذکورہ صورت خیار نقد میں داخل ہے اور خریدار من لہ الخیار ہے اور من لہ الخیار کے تصرف سے معاملہ لازم ہوجاتا ہے تو مذکورہ صورت میں خریدار کا خرید وفروخت کرنا یہ اپنی زمین کی خرید وفروخت ہوگی، لہذا اس کا فروخت کردینا جائز ہے، اور اس سے خریدنے والے کے لئے بھی اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا، کیونکہ جب بیع صحیح ہوگئی تو زمین میں بغیر قبضہ کے بھی آگے فروخت کرنے کی اجازت ہے، شرعی اور اصولی اعتبار سے اس معاملہ پر یہ حکم مرتب ہوتا ہے، لیکن اس میں ایک احتمال معاملہ کے ختم ہونے کا بھی رہتا ہے، اس لئے خریدار کا اپنے آگے کیا ہوا معاملہ اور اس کے بعد کیے جانے والے معاملات کے فسخ ہونے کا احتمال رہتا ہے، اس لیے خریدار سے آگے کئے جانے والے معاملات غرر انفساخ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز معلوم ہوتے ہیں۔

اشکال وجواب: جب خریدار اور اس سے آگے کئے جانے والے معاملات میں غرر انفساخ موجود ہے تو پھر یہ معاملات جواز کے دائرے میں کس طرح آسکتے ہیں؟

جواب:......اس اشکال کا حل دو طرح سے ممکن ہے: (۱) جب خیارِ نقد میں من لہ الخیار آگے فروخت کردے تو یہ معاملہ لازم ہوگیا اور قانونی بنیاد پر اس کو فسخ کرنے کا جو احتمال ہے وہ عموماً پایا نہیں جاتا ہے، خریدار عام طور پر معاملے کی تکمیل کر ہی لیتا ہے فسخ کی نوبت کم ہی آتی ہے اور جو احتمالات نادر ہوں وہ معتبر نہیں ہوا کرتے جیسے کہ مبیع میں ملکیت غیر کا احتمال باقی رہتا ہے، لیکن اس احتمال کو نادر مان کر اس پر کوئی حکم مرتب نہیں ہوتا، اسی طرح یہاں بھی اس احتمال کو نادر مان کر کالعدم قرار دیا جائے، دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ معاملات کی تکمیل سے پہلے خریدار نے اور اس سے معاملہ کرنے والوں نے جو آگے معاملات کئے ہیں ان کو بیع پر نہ محمول کرکے صرف معاہدے پر محمول کیا جائے کہ ہر ایک نے بیع نہیں کیا ہے بلکہ معاہدۂ معلق کیا ہے کہ اگر فلاں زمین ہمارے قبضہ اور ملکیت میں آگئی تو ہم آپ سے اس کو فروخت کریں گے تو اس کو ایک معاہدہ مانا جائے پھر جب رکاوٹ دور ہوجائے تو ہر ایک معاملہ تعاطی کے طور پر خود بخود انجام پاجائے، اور جب یہ معاہدہ اس وضاحت کے ساتھ ہوگا کہ اس کی تکمیل قانونی رکاوٹ کے دور ہونے کی صورت میں کی جائے گی، تو جب قانونی رکاوٹ دور نہ ہو اور معاہدے کی تکمیل ممکن نہ ہوسکے تو شرط کے مطابق معاہدے کی ایفاء سے معذوری ظاہر کردی جائے گی اور اس میں کوئی گناہ بھی نہیں، حاصل یہ کہ اس کو حد جواز میں داخل کرنے کی ایک شکل یہ ہے کہ خریدار اور اس سے آگے کئے جانے والے معاملات کو معاہدۂ معلقہ میں داخل مانا جائے اور پوری صورتحال کو واضح کردیا جائے تو یہ معاملہ حد جواز میں آسکتا ہے، لیکن معاملہ کرنے والوں کا خداع، دھوکا، فریب، جھوٹ وغیرہ سے کام لے کر اس طرح معاملات کرنا کہ صورتحال کا کچھ علم نہ ہو شرعاً جائز نہیں، بلکہ یہ کذب

وفریب میں داخل ہونے کی وجہ سے شرعاً حرام وناجائز ہے۔

معاہدے والی توجیہ: مولانا فتح محمد صاحب لکھنویؒ کے اس بیان سے سمجھ میں آتی ہے۔

بیع کا معاہدہ کرنا: یعنی بیچا نہیں، مگر بیچنے کا اقرار کرلیا اور خریدا نہیں مگر خریدنے کا اقرار کرلیا اور دونوں اپنے اپنے قول وقرار کے پابند ہو گئے، نہ اس میں بیع ختم کی جاتی ہے کہ مبیع کا موجود ومقدار کا معلوم ہونا لازم ہو اور ایجاب وقبول قطعی ہو جائے، آئندہ پر اٹھا نہ رہے اور نہ محض وعدہ ہے کہ دونوں مختار ہیں اور ضرورتیں اس کی اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ تجارتی کام ہوں یا ذاتی سلطنت کا انتظام ہو یا امر رفاہ عام، غرض کوئی کام بھی بدون ایسے معاہدوں کے انجام نہیں پا سکتا مثلاً زید کو کسی محکمے یا کارخانے یا فوج کے لئے ایسی اشیاء کی ضرورت ہے کہ جو نہ عام طور پر کارآمد ہیں کہ بازاروں میں موجود رہیں نہ بدون فرمائش واطمینان کوئی اسے تیار ومجتمع کرتا ہے، جیسے گودڑ، روئی، ہڈیاں وغیرہ، اور بہت چیزیں ایسی ہیں کہ سوائے فصل کے، وہ بھی بعض مقامات پر دستیاب نہیں ہوتیں یا گراں ہو جاتی ہیں، پس اگر ایسے معاہدہ نہ کئے جائے تو نہ ہر وقت اور ہر جگہ یہ چیزیں کافی طور پر ملیں گی اور اتنے دام ایک وقت میں دیے جا سکتے ہیں اور نہ اس کی فراہمی اور نگرانی کا اہتمام آسان ہے، پس ایسی سخت ضرورتیں یوں ہی پوری ہو سکتی ہیں کہ زید وبکر میں معاہدہ ہو جائے کہ ہم نے اتنا مال اس قسم وصفت کا اس قیمت پر ان قسطوں سے ان ان مقاموں پر بیچنے اور خریدنے کا معاہدہ کیا، اس میں شرط ہے کہ تمام امور کی تصریح ہو جائے مثلاً فلاں شئی، فلاں صفت اور قسم کی، اس قدر ان قسطوں سے، ان وقتوں اور مقاموں پر اس نرخ سے بیچیں اور خریدیں گے، اولی یہ ہے کہ ایسی شروط وغیرہ قلم بند ہو جایا کریں جیسا کہ باب سلم میں تحریر مناسب ہے، پھر عقد بیع اور عہد میں فرق ہے، بیع میں مبیع مشتری کی ملک میں آجاتا ہے قبضہ ہو یا نہ۔ (۲) مشتری جب چاہے قبضہ کرنے اور نفع اٹھانے کا مستحق ہے، بائع حاضر ہو یا غائب، زندہ ہو یا میت، راضی ہو یا ناخوش۔ (۳) وہ تمام حقوق جو کسی وجہ سے بائع کی ذات یا مال پر عائد ہو مبیع سے متعلق نہیں ہوتے۔ (۴) مشتری کی ذمہ داریوں کا اثر مبیع پر پہنچتا ہے مقبوض ہو یا نہ۔ (۵) بائع کو مبیع کا روک رکھنا اور اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں، لیکن عہد بیع میں نہ مبیع خریدار کی ملک ہوتا ہے، نہ اسے انتفاع اور قبضے کا حق ہے، نہ ورثاء بائع ومشتری پر دعوی، نہ ان ذمہ داریوں سے مستثنی ہیں جو بائع کی ذات یا مال سے متعلق ہوں، البتہ بائع کو مجبور کیا جائے گا کہ بحکم عہد وہ اشیاء اپنی شروط واوقات پر موجود کردے اور اس موجود کرنے میں اس کے نقصان اور معذوری پر توجہ نہ کی جائے گی، اور ایسے ہی مشتری لینے اور دام دینے پر مجبور ہوگا، ضرورت رہے یا نہ اور وہی رضاء سابق بحکم عہد رضاء حال سمجھ لی جائے گی، پس ظاہر ہو گیا فرق درمیان وقوع اور اقتضاء وقوع کے (عطر ہدایہ/ ۱۱۰۔۱۱۱)۔

حاصل یہ کہ خریدار نے اپنے آگے جو معاملات کئے ہیں اس کو معاہدۂ معلقہ پر محمول کیا جائے اور جب وہ خریدار کے قبضے میں آجائے تو بیع تعاطی کے ذریعہ جس سے معاہدہ کیا گیا ہے اس کی ملکیت بن جائے گی، چنانچہ مفتی سعید صاحب لکھنوی فرماتے ہیں:

''یہ دونوں معاہدے شرعاً جائز اور فریقین پر (دیانۃً وقضاءً) پابندی اس کی واجب ہے حتی کہ اگر وقت معہود آنے پر بجبر اور بطور تعاطی بھی بیع منعقد ہو جائے گی تو صحیح ہو جائے گی (عطر ہدایہ/ ۱۱۰)۔

احتمال (۲) کالونی بنانے والا، صاحب زمین سے جو معاملہ کرتا ہے اگر اس کو خیار نقد پر نہ محمول کیا جائے، بلکہ اس کو صرف ایک معاہدہ مانا جائے تو اس صورت میں کالونی بنانے والے کا زمین کا پلاٹ دوسرے سے فروخت کرنے کی صورت میں ''بیع مالیس عند الانسان'' کا حکم صادق آئے گا اور یہ بیع شرعاً باطل ہوگی، لہذا کالونی بنانے والوں کا یا اس سے خریدنے والوں کا کیا ہوا معاملہ شرعاً باطل وکالعدم ہوگا، اس لئے کہ یہ ''مال غیر'' اور ''بیع ما لیس عند الانسان'' ہے جو شرعاً باطل ہے۔

''بطل بيع ما ليس في ملكه لبطلان بيع المعدوم وماله خطر العدم لا بطريق السلم فإنه صحيح لأنه عليه الصلاة والسلام نهى عن بيع ما ليس عند الإنسان ورخص في السلم'' (الدر المختار ۷/ ۲۴۶)۔

جواز کی توجیہ:

کالونی بسانے والے کا صاحب زمین سے جو معاملہ ہے اگر اس کو خیار نقد میں داخل نہ مانا جائے تو اس کے کئے ہوئے معاملات اور اس کے بعد کے معاملات کے جواز کی توجیہ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اس کو خرید وفروخت پر محمول نہ کیا جائے، بلکہ جتنے بھی معاملات ہوئے ہیں سب کو معاہدہ معلقہ میں داخل مانا جائے اور صاحب زمین اور پلاٹر کے درمیان جب معاہدے کی تکمیل ہو جائے تو اس کے بعد کئے جانے والے معاملات کو تعاطی کے طور پر انجام پانے پر محمول کر دیا جائے، یہ گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ ہر ایک سے معاملے کی نوعیت اچھی طرح واضح

کردی جائے، کسی قسم کا دھوکا، فریب، کذب بیانی سے احتراز کیا جائے، لیکن اگر معاملہ کی نوعیت واضح نہ کی جائے بلکہ سامنے والے کو دھوکا دے کر مال حاصل کرنے کے ایک طریقہ اور بہانہ کے طور پر اختیار کیا جائے تو یہ شرعاً حرام اور ناجائز ہے اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب لکھنوی معاہدہ بیع کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ دونوں معاہدے شرعاً جائز اور فریقین پر (دیانۃً وقضاءً) پابندی اس کی واجب ہے، حتی کہ اگر وقت معہودہ آنے پر بجبر اور بطور تعاطی بھی بیع منعقد کی جائے گی تو صحیح ہو جائے گی، بعذر خواہ بلا عذر (قولاً وفعلاً) کسی طرح سے انعقاد صحیح نہ ہوگا، خرید کرنے والے کی رقم جو اس نے پیشگی بغرض استحکام معاہدہ بیع دی تھی واپس کرنا واجب ہوگا، چونکہ حسب تصریح مشائخ ''بمجرد النیۃ لاینعقد البیع'' محض نیت سے بدون طریقے اربعہ قولیہ، تحریریہ، ضمنیہ، فعلیہ بیع منعقد نہیں ہوتی ہے الخ (عطر ہدایہ/ ۲۴۳-۲۴۴)۔

سوال نمبر ۱۲ کا جواب:

زمین کی خرید وفروخت میں زمین فروخت کرنے کے لئے جو دلال ہوتا ہے وہ اصولی اعتبار سے مالک زمین کا وکیل ہوتا ہے، لہذا اس کے کیے ہوئے معاملات خود مالک زمین کے کئے ہوئے معاملات کے حکم میں ہوں گے اور زمین یا کسی چیز کی خرید وفروخت میں رجسٹری یا کاغذی تحریر شرعاً لازم وضروری نہیں، بغیر تحریر اور رجسٹری کے صرف زبانی کئے ہوئے معاملات اگر اصول وضابطے کے مطابق ہوں تو شرعاً ان کا اعتبار ہے اور زمین کی خرید وفروخت میں معاملہ کے صحیح ہونے کے لئے قبضہ کا پایا جانا ضروری نہیں، زمین کی بیع بغیر قبضہ کے بھی صحیح ودرست ہے، لہذا جب خریدار نے دلال کے واسطے سے زمین خرید لیا تو خریدار اپنی خریدی ہوئی زمین کا مالک ہو گیا اور اس کا نفع ونقصان خریدنے والے سے متعلق ہو گیا، لہذا خریدنے والے کو شرعاً رجسٹری سے قبل اپنی خریدی ہوئی زمین کو فروخت کر کے نفع نقصان کا حاصل کرنا شرعاً جائز ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں، چاہے وہ معاملہ خود کرے یا دلال کے واسطے سے کرے شرعی مالک کو پورا اختیار ہے۔

''كل عقد جاز أن يعقده الإنسان بنفسه جاز أن يوكّل به غيره، ويجوز التوكيل بالخصومة في سائر الحقوق'' (قدوری/ ۶۶ مع اللباب في شرح الكتاب)۔

''يلزم بإيجاب وقبول .... ودخل المبيع في ملك المشتري والفسخ بعده لايكون إلا بالتراضي لما فيه من الإضرار بالآخر بإبطال حقه كسائر العقود'' (تبيين الحقائق ۴/ ۲۷۶-۲۷۷)۔

''النطق ليس بشرط لانعقاد البيع والشراء ولا لنفاذهما وصحتهما فيجوز بيع الأخرس وشراءه إذا كانت الإشارة مفهومة في ذلك، لأنه إذا كانت الإشارة مفهومة في ذلك قامت الإشارة مقام عبارته'' (بدائع الصنائع ۴/ ۲۲۲)۔

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ بیع کے انعقاد اور ثبوت ملکیت کے لئے رجسٹری وغیرہ کرانا شرعاً لازم نہیں ہے، بلکہ صرف ایجاب وقبول کے پالیے جانے سے ملکیت ثابت ہو جائے گی اور ملکیت کے احکام اس پر مرتب ہوں گے، ایجاب وقبول خواہ لفظاً پائے جائیں یا عملاً پائے جائیں یا اشارہ پائے جائیں، ثبوت ملکیت کے لئے ایجاب وقبول کافی ہے، رجسٹری وغیرہ ضروری نہیں۔

سوال نمبر ۱۳ کا جواب:

جب پلاٹس فروخت کر دیئے گئے اور خریدنے والوں نے پیسے ادا کر دیئے تو ان کی ملکیت کے ثبوت میں کوئی شبہ نہیں، ایجاب وقبول سے ملکیت کا تحقق ظاہر ہے، لہذا کالونی بنانے والے جب اپنے پلاٹس بیچ کر پیسے وصول کر لیں تو اب بیچنے والوں کا اس پلاٹ سے کوئی حق وابستہ نہیں رہ جاتا ہے، خریدار کو اس پر پورا اختیار حاصل ہو جاتا ہے، چاہے وہ خود فروخت کرے یا فروخت کرنے میں کسی سے مدد حاصل کرے، چاہے کسی اجنبی سے فروخت کرے یا جس سے خریدا ہے اسی کو فروخت کرے، لہذا فروخت کرنے والے کی طرف سے اگر خود اسی سے فروخت کرنے کی شرط لگائی جاتی ہے تو یہ شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے مفسد ہوگی اور اس شرط کے ساتھ معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، لیکن اگر معاملہ میں کوئی شرط نہ ہو اور خریدار خود اپنی آسانی کے لئے فروخت کرنے والے سے خواہ خریدار کی پیشکش کے ذریعہ یا بغیر پیشکش کے فروخت کر دیتا ہے تو شرعاً یہ جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر معاملہ میں اسی سے فروخت کرنے کی شرط لگ جائے تو معاملہ ناجائز ہوگا۔

''ولو باع عبدًا على أن يعتقه المشتري أو يدبره أو يكاتبه أو أمة على أن يستولدها فالبيع فاسد لأن هذا بيع

وشرط وقد نهى النبي ﷺ عن بيع وشرط ثم جملة المذهب فيه أن يقال: كل شرط يقتضيه العقد كشرط الملك للمشترى لا يفسد العقد لثبوته بدون الشرط وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسد كشرط أن لا يبيع المشترى العبدالمبيع لأنه فيه زيادة عارية عن العوض فيؤدى إلى الربا أو لأنه يقع بسببه المنازعة فيعرى العقد عن مقصوده إلا أن يكون تعارفًا لأن العرف قاض على القياس ولو كان لا يقتضيه العقد ولا منفعة فيه لأحد لا يفسده'' (ہدایہ مع فتح القدیر ۶/ ۴۴۲)۔

نوٹ:......اگر ایسی شرط لگائی گئی جس سے مشتری کا تو نقصان ہو لیکن اس میں کسی کا فائدہ نہ ہو تو اس کے مفسد ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف ہے، طرفین کے یہاں مفسد نہیں، امام ابو یوسفؒ کے یہاں مفسد ہے۔

''ومثّل في البحر لما فيه مضرة بما إذا اشترى ثوبًا على أن لا يبيعه ولا يهبه. والبيع في مثله جائز عندهما خلافًا لأبي يوسف'' (شامی ۷/ ۲۸۴)۔

سوال نمبر ۱۴ کا جواب:

قسطوں پر خرید وفروخت کی شکل میں بعض قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر کی بنا پر فروخت کرنے والے کو معاملہ کو یک طرفہ ختم کرنے کا شرعًا کوئی اختیار نہیں، اس کا ختم کر کے صرف اس کی رقم کا واپس کرنا شرعًا ظلم، غصب ناجائز اور حرام ہے، البتہ اگر معاملے میں قسط کی ادائیگی وقت پر نہ ہونے کی صورت میں معاملہ کو ختم کرنے کی شرط لگی ہو تو اس کو خیار نقد میں داخل مان کر کے جواز کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، نیز اگر اس کو بیع پر محمول نہ کیا جائے، بلکہ معاملہ پر محمول کیا جائے کہ بائع اور مشتری کے درمیان یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اگر خریدار کی طرف سے تمام قسطیں اپنے وقت مقررہ پر ادا کردی گئیں تو معاہدہ کی بنا پر وہ زمین خریدار کی ملکیت قرار پائے گی اور اگر وقت مقررہ پر قسط کی ادائیگی نہ ہوسکی تو از روئے معاہدہ زمین خریدار کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوگی، بلکہ مالک کی ملکیت میں باقی رہے گی تو اس توجیہ سے بھی گنجائش نکل سکتی ہے، حاصل یہ کہ خیار نقد یا معاہدے پر محمول کر کے جواز کے دائرے میں لانے کی گنجائش ہے۔

''إذا تبايعا على أن يؤدى المشترى الثمن في وقت كذا. وإن لم يؤده فلا بيع بينهما صح البيع وهذا يقال له خيار النقد'' (المادة: ۳۱۳)۔

''إذا لم يؤد المشترى الثمن في المدة المعينة كان البيع الذى فيه خيار النقد فاسدًا'' (المادة: ۳۱۴)۔

سوال نمبر ۱۵ کا جواب:

(الف):

دلال کا زمین کے مالک سے اس کی قیمت معلوم کر کے مالک زمین کی طرف سے بتلائی ہوئی قیمت سے زائد میں فروخت کرنا، زائد خود رکھ لینا اور بتلائی ہوئی قیمت مالک کو واپس کردینا شرعًا جائز نہیں، کیونکہ دلال وکیل ہے اور وکیل کو موکل کے سامان کا جو عوض حاصل ہوا اس عوض کا حقدار موکل ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ، لہذا صاحب زمین سے بغیر معاملہ کی وضاحت کئے ہوئے زائد کو خود رکھ لینا شرعًا جائز نہیں، البتہ اگر وکیل مالک سے صاف صاف یہ وضاحت کردے کہ آپ کی متعینہ قیمت آپ کو ملے گی اور اس سے زائد جو حاصل ہوگا وہ میرا ہوگا یہ وضاحت خواہ صراحۃً ہو یا عرفًا تو زائد خود رکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جو زائد ہے وہ اجرت ہے، البتہ حاصل ہونے والی زیادتی کی مقدار مجھول ہونے کی وجہ سے عدم جواز کا شبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر اس جہالت کو فیصد میں پائی جانے والی جہالت کی طرح مانا جائے تو پھر عدم جواز کا شبہ ختم ہوسکتا ہے، نیز جعالہ پر محمول کر کے بھی حد جواز میں داخل ہونے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

''وصح الزيادة فيه. لو ندم بعدما زاد أجبر. والحط منه والزيادة يلتحقان بأصل العقد'' (الدر المختار ۷/ ۳۴۸-۳۴۹)

''لو أمر رجلاً أن يشترى له جارية بألف فاشتراها ثم ان البائع وهب الألف من الوكيل فللوكيل أن يرجع على الآمر. ولو وهب منه خمس مائة لم يكن له أن يرجع على الآمر إلا بخمس مائة الأخرى لأن الأول حط والثاني هبة'' (البحر الرائق ۷/ ۱۵۵)۔

''والجعالة تختلف عن الإجارة: الأول صحة الجعالة على عمل مجهول والثانى صحة الجعالة مع عامل غير معين والثالث كون العامل لايستحق الجعل إلا بعد تمام العمل، الرابع: لايشترط فى الجعالة تلفظ العامل بالقبول، الخامس جهالة العوض فى الجعالة فى بعض الأحوال، السادس: يشترط فى الجعالة عدم التوقيت لمدة العمل، السابع: الجعالة عقد غير لازم، الثامن: سقوط كل العوض بفسخ العامل تمام العمل المجاعل عليه'' (الموسوعة الفقهيه ۱۵/ ۲۰۹-۲۱۰)۔

(ب): فروخت کرنے والے کا اپنے سے فروخت کرنے کی شرط لگانا:

بیچنے والا اگر خریدنے والے سے یہ شرط لگائے کہ اگر اس زمین کو بیچنا ہو تو مجھ سے بیچنا پڑے گا، کسی دوسرے سے بیچنے کا اختیار نہیں ہوگا یہ مفسد بنے گی یا نہیں، اس کو سمجھنے سے پہلے اس چیز پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ شرط عاقدین یا ثالث کے لئے مفید ہے یا مضر اگر مفید ہوگی تو مفسد اور اگر مضر ہوگی تو مفسد نہیں، غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرط خریدنے والے کے حق میں مضر ہے، کیونکہ اس کا اختیار سلب ہو رہا ہے جو مقتضاء عقد کے خلاف ہے اور بائع یا اس کے وکیل کے لئے یہ مفید ہے یا نہیں یہ چیز محل غور ہے؟ اگر بائع یا اس کا وکیل اس کی پوری قیمت جو رائج ہے ادا کرتا ہے تو پھر اس کے حق میں یہ مفید نہیں، لہٰذا اگر بائع یا اس کا وکیل خریدنے کی صورت میں پوری قیمت ادا کرنے کی شرط لگاتا ہے تو اس سے معاملے میں فساد نہیں آئے گا۔

''فيصح بشرط لايقتضيه ولا نفع فيه لأحد، وشمل مافيه مضرة لأحدهما، قال فى النهر: كان ثوبًا على أن يخرقه أو جارية على أن يطأها أو دارًا على أن يهدمها فعند محمد: البيع جائز والشرط باطل، وقال أبويوسف: البيع فاسد كذا فى الجوهرة، ومثّل فى البحر لما فيه مضرة بما إذا اشترى ثوبًا على أن لا يبيعه ولا يهبه، والبيع فى مثله جائز عندهما خلافًا لأبي يوسف'' (شامی ۷/ ۲۸۴)۔

نیز اگر یہ شرط مفید بھی ہو تو بھی مفسد نہیں، کیونکہ یہ شرط معلق ہے مبرم نہیں، بیچنا اس کی مرضی پر موقوف ہو، بہر حال نہیں، البتہ اگر اس سے فروخت کرنے کی صورت میں مروجہ قیمت نہ دی جائے تو پھر یہ ظلم پر مبنی ہونے کی وجہ سے شرعاً جائز نہیں۔ فقط واللہ اعلم۔

خلاصہ جواب:

(۱) رشوت دے کر سرکاری زمین کا لے آوٹ منظور کروانا اور اس کو فروخت کرنا اور علم کے ہوتے ہوئے اس کو خریدنا شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر علم نہ ہو یا علم ہو لیکن اس زمین پر کالونی کی تمام سہولیات دے دی گئی ہوں تو ان کو اجازت کے درجہ میں مان کر خریدنا جائز ہوگا۔

(۲) جو وقف آباد ہو، مقصد وقف حاصل ہو اس وقف کا خریدنا بیچنا شرعاً جائز نہیں، اگر کسی غاصب نے ایسے وقف کو غصب کرلیا ہو تو کسی دوسرے کے لئے اس کا خریدنا بھی جائز نہیں، البتہ متولی کے لئے اگر غاصب سے اس کا معاوضہ حاصل کرنا ممکن ہو تو معاوضہ کا حاصل کرنا جائز ہے اور اگر وقف معطل ہو جائے یعنی اس وقف سے کوئی نفع نہ ہو خواہ دور ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے یا اس پر غیروں کے قبضہ کا شدید خطرہ ہو تو ایسے وقف کو خریدنا جائز ہے، کیونکہ وقف کے معطل ہو جانے کی صورت میں وقفیت ختم ہو جاتی ہے۔

(۳) موروثی زمین جس میں اولاد مؤنث کو حصہ دیے جانے اور نہ دیے جانے کسی کا علم نہ ہو اور کسی کی طرف اس زمین پر دعوی اور مطالبہ بھی نہ ہو تو ایسی زمین کو خریدنا جائز ہے، البتہ اگر کوئی اس کا مستحق اپنے استحقاق کو ثابت کر کے دعوی کرے تو اس کا حصہ دینا پڑے گا، اور اپنے پیسے کے مطالبہ کا حق بائع سے ہوگا اور اگر موروثی زمین میں اولاد مؤنث کا حصہ نہ دیا جانا معلوم ہو اور ان کی طرف سے اس کا مطالبہ بھی باقی ہو تو پھر علم ہوتے ہوئے اس کا خریدنا جائز نہیں، اگر خریدے گا تو بغیر اس کو راضی کئے اس کے حصے میں تصرف حرام ہوگا، اس کا حصہ دینا بہر حال ضروری ہوگا۔

(۴) جس نے حرام آمدنی سے کوئی زمین بنائی ہو تو اس زمین کا خریدنا خلاف احتیاط تو ہے لیکن شرعاً جائز ہے۔

(۵) حکومت سے منظور شدہ نقشے میں تصرف کر دینا، راستوں وغیرہ کو چھوٹا یا کم کر دینا یا بعض سہولیات کو ختم کر دینا حکومت سے کئے گئے معاہدے کی

خلاف ورزی پر مبنی ہونے کی وجہ سے منع ہے۔ اور کالونی بن جانے کے بعد راستے، پارک، مسجد کے لئے متعین جگہ کو فروخت کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ ان چیزوں سے کالونی کے لوگوں کا حق متعلق ہے اور پلاٹ خریدنے میں ان سہولیات کا بھی دخل ہے، لہذا یہ اس کے حقوق او رمرافق کی قبیل سے ہیں ان کو بیچنا خریدنا شرعاً جائز نہیں۔

(۶) نقشے میں گارڈن کی جگہ پر مسجد بنا دینے کی شرعاً اجازت ہے، البتہ گارڈن کو باقی رکھتے ہوئے دوسری مسجد کا انتظام کرنا یہ افضل اور بہتر ہوگا۔

(۷) کالونی سے متعلق حکومت کے پیچیدہ اور مشکل قوانین کو نظر انداز کر کے پلاٹ کی خرید وفروخت جائز ہے، البتہ اگر عزت آبرو وغیرہ کا خطرہ ہو تو احتراز لازم ہے۔

(۸) قانونی مجبوری کی وجہ سے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے۔

(۹) نقشے پر درج پلاٹ کو غیر متعین طور پر خرید لینا جائز ہے بشرطیکہ پلاٹ کی اس طرح سے تعیین ہو جائے کہ اس کی تعیین میں نزاع کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

(۱۰) زمین خریدنے والا خریدتے ہی اس کا مالک ہو جائے گا اگرچہ اس پر قبضہ بیچنے والا ہی کا باقی رہے۔

(۱۱) (الف) خریدے ہوئے غیر متعین پلاٹ کو فروخت کر دینا بھی جائز ہے، کیونکہ یہ حصہ شائعہ کی بیع کے حکم میں ہے۔

(ب) بظاہر یہ خیار نقد کی شکل ہے، لہذا اس طرح سے خریدنا اور خریدنے کے بعد دوسرے سے فروخت کر دینا بھی جائز ہے، نیز اس کو معاہدۂ معلقہ پر محمول کر کے معاملہ کو حد جواز میں لانے کی گنجائش ہے۔

(۱۲) دلال کے ذریعہ سے زمین فروخت کرنا اور اس کو خریدنا جائز ہے، خواہ اصل مالک کو معلوم ہو یا معلوم نہ ہو بشرطیکہ دلال کو زمین فروخت کرنے کا مالک کی طرف سے اختیار حاصل ہو، زمین کی خرید وفروخت کے لئے رجسٹری کا ہونا لازم اور ضروری نہیں۔

(۱۳) جب معاملہ کے ساتھ زمین فروخت کر دی گئی اور اس کی قیمت وصول کر لی گئی تو ثبوت ملکیت سے کوئی چیز مانع نہیں اور جب ملکیت ثابت ہوگئی تو اس کو فروخت کرنا بھی جائز ہے خواہ صاحب زمین سے فروخت کرے یا کسی اور سے۔

(۱۴) زمین کے مالک کا کسی قسط کے مؤخر ہونے کی صورت میں معاملہ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دینا شرعاً جائز نہیں، یہ طریقہ ظلم وغصب پر مبنی ہے، البتہ اگر معاملے میں کسی قسط کی عدم ادائیگی پر معاملہ کو ختم کرنے کی شرط ہو تو گنجائش ہے۔

(۱۵) (الف) مالک کی طرف سے متعینہ قیمت سے زائد قیمت میں فروخت کر کے زائد کو خود رکھ لینا اور مالک کی طرف سے متعینہ قیمت کو حوالہ کر دینے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ کذب، خداع وغیرہ سے معاملہ بالکل صاف و پاک ہو۔

(ب) زمین کو اس شرط کے ساتھ فروخت کرنا کہ اگر فروخت کرنا ہوگا تو بیچنے والے ہی سے فروخت کرنا پڑے گا اور اس وقت کی جو قیمت ہوگی وہ دی جائے گی تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، البتہ اگر شرط میں یہ بھی داخل ہو کہ اس کو خود اپنے استعمال میں لانے کی اجازت نہیں بیچنا بہر حال لازم ہوگا، تو یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف اور بائع کے لئے نفع بخش ہونے کی وجہ سے معاملے کے لئے مفسد ہوگی۔ فقط واللہ اعلم۔

☆☆☆

زمین کی بیع وشراء سے متعلق چند غور طلب مسائل

مولانا ریاست علی قاسمی رامپوری[1]

الحمد للہ علی إحسانه، أما بعد:

شریعت اسلامیہ کا ماخذ قرآن وحدیث اور اجماع امت ہے، قرآن وحدیث میں دو قسم کے حقوق ''حقوق اللہ، حقوق العباد'' کی تعلیم دی گئی ہے اور حقوق العباد کے دائرہ میں بیع وشراء، شفعہ، کفالہ، حوالہ، وقف، ہبہ، عاریت، ودیعت، رہن، اجارہ، مضاربت، وکالت وغیرہ بے شمار ابواب آتے ہیں جن میں بیع وشراء اور خرید وفروخت کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ اس کا وقوع کثرت سے ہے، اسی وجہ سے کتب فقہ میں بیع وشراء کو بہت زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، پیش نظر تحریر میں اسلامی فقہ اکیڈمی کی جانب سے آئے ہوئے ایک سوالنامہ کی روشنی میں خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل کی تنقیح اور ان سے متعلق حکم شرعی کی وضاحت پیش کرنا مقصود ہے۔

سیاسی لیڈران اور دبنگ عناصر کے سرکاری اراضی کو قبضہ کر کے فروخت کرنے کا حکم:

سیاسی لیڈران، دبنگ عناصر، لینڈ مافیا افراد کا سرکاری اراضی پر قبضہ کرنا اور پھر اس کو فروخت کرنا یا سرکاری اراضی پر قبضہ کرنا اور پھر اس کو فروخت کرنا یا سرکاری عہدیداران اور افسران کو رشوت دے کر لے آوٹ منظور کرالینا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اس لئے کہ یہ زمین سرکاری ملکیت ہے، سرکار کے قبضہ میں ہے اور غیر کی مملوکہ چیز پر قبضہ کرنا غصب ہے اور شئی مغصوب کو فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے، خریداران اس زمین کو خرید کر مالک نہیں قرار دیئے جائیں گے، بلکہ خریداران کے ذمہ اگر علم ہو تو ان اراضی کو واپس کرنا ضروری ہوگا، دوسرے لوگوں کے ہاتھ اس کو فروخت کرنا درست نہ ہوگا۔

''عن سعید بن زید قال قال رسول اللہ ﷺ: من أخذ شبرًا من الأرض ظلمًا فإنه یطوقه یوم القیامة من سبع أرضین'' (متفق علیه، مشکوۃ ۱/ ۲۵۴)۔

''عن أبي حرة الرقاشي عن عمه قال قال رسول اللہ ﷺ: ألا لا تظلموا ألا لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفس منه'' (رواہ البیهقي، مشکوۃ ۱/ ۲۵۵)۔

''عن سالم عن أبیه قال قال رسول اللہ ﷺ: من أخذ من الأرض شیئًا بغیر حقه خسف به یوم القیامة إلی سبع أرضین'' (رواہ البخاری ۱/ ۲۵۶)۔

وفي الدر المختار علی رد المحتار: ''وبیع ما لیس في ملکه لبطلان بیع المعدوم وما له خطر العدم، لأنه علیه السلام نهی عن بیع ما لیس عند الإنسان'' (۷/ ۲۴۶ زکریا)۔

وفي رد المحتار: '' شرط المعقود علیه أن یکون موجودًا مالًا متقومًا مملوکًا في نفسه وأن یکون ملك البائع فیما یبیعه لنفسه وأن یکون مقدور التسلیم'' (۷/ ۲۴۶ زکریا)۔

''لا یجوز لأحد أن یتصرف في ملك الغیر بغیر إذنه'' (قواعد الفقه/ ۱۱۰)۔

ارض مغصوبہ کو خرید کر فروخت کرنے کا حکم:

اگر کوئی شخص عدم جواز کے باوجود اراضی مغصوبہ کو خرید لے تو دیکھا جائے گا کہ مشتری کو اس اراضی کے مغصوبہ ہونے کا علم ہے یا نہیں، اگر مشتری

[1] مفتی واستاذ حدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ، یوپی۔

کو اس اراضی کے مغصوبہ ہونے کا علم نہیں ہے تو وہ خریدار شخص گنہگار نہ ہوگا، اور خریدی ہوئی زمین کا مالک ہو جائے گا اور اس کا دوسرے شخص کو فروخت کرنا اور دوسرے شخص کا اس زمین کو خریدنا بھی جائز ہوگا، لیکن اگر مشتری کو اس کا یقین یا ظن غالب ہے کہ فروخت ہونے والی زمین چوری یا غصب شدہ ہے تو مشتری کے لئے نہ اس کا خریدنا جائز ہے اور نہ خرید کر دوسرے کو فروخت کرنا ہی جائز ہے، ایسی صورت میں اگر ممکن ہو تو اصل مالک تک واپس کرنا ضروری ہے، ورنہ فقراء اور مساکین پر صدقہ کرنا ضروری ہے، اور اگر غلط فہمی میں زمین خرید لی ہے تو صورت حال واضح ہونے کے بعد اس زمین کو اصل مالک تک واپس لوٹا دے اور اپنی ادا کردہ ثمن کو واپس لے لے۔

وفی رد المحتار: ''والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له'' (۷/ ۳۰۱ زکریا)۔

''ويجب رد عين المغصوب لقوله عليه السلام على اليد ما أخذت حتى ترد ولقوله عليه السلام: لا يحل لأحدكم أن يأخذ مال أخيه لاعبًا ولا جادًا وإن أخذه فليرده عليه وظاهره أن رد العين هو الواجب الأصلي'' (/ ۲۶۶ زکریا)۔

وفی الهداية: ''وعلى الغاصب رد العين المغصوبة معناه ما دام قائمًا'' (۳/ ۳۵۷)۔

وقف کی تعریف اور اس کی خرید وفروخت کا حکم:

اصطلاح فقہ میں وقف نام ہے کہ چیز کو اپنی ملکیت سے نکال کر رب العالمین کی ملکیت میں دیدینا اور اس کی منفعت کو رب ذو الجلال کی رضا اور خوشنودی کی خاطر دائمی طور سے کار خیر کے لئے خاص کر دینا، اس کے بعد شئی موقوفہ میں کسی بھی شخص کو کسی بھی طرح کا مالکانہ تصرف بیع وشراء، ہبہ، عاریت وغیرہ کی شرعاً اجازت نہیں ہے، اس لئے وہ شئی موقوفہ واقف کی ملکیت سے خارج ہوگئی اور دوسرے کسی شخص کی ملکیت ثابت نہیں ہے۔

وفی الهداية: ''وإذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه'' (۲/ ۶۴۰)۔

وفی الدر المختار على هامش رد المحتار: ''فإذا تم ولزم لا يملك ولا يعار ولا يرهن''۔

وفی فتح القدير: ''وإذا صح الوقف خرج عن ملك الواقف لم يجز بيعه ولا تمليكه هو بإجماع الفقهاء، وأما امتناع التمليك فلما بينا من قوله عليه السلام تصدق بأصلها لا يباع ولا يورث ولا يوهب ومن المعنى وهو أن الحاجة ماسة إلى آخره ولأنه باللزوم خرج عن ملك الواقف وبلا ملك لا يتمكن من البيع'' (۶/ ۲۰۳، اشرفیہ دیوبند)

مدرسہ یا مسجد کی موقوفہ زمین اگر ناقابل انتفاع ہو جائے:

اگر کسی وجہ سے مسجد یا مدرسہ کی وقف شدہ زمین کلی طور پر ناقابل انتفاع ہو جائے اور مقاصد وقف میں اس کا استعمال ناممکن یا دشوار ہو جائے یا اس وقف شدہ زمین سے منفعت کم ہو اور اس کے بدلہ میں دوسری زمین زیادہ منفعت والی حاصل ہو رہی ہو تو اس زمین کو فروخت کر کے دوسری زمین خرید لی جائے یا اس موقوفہ زمین کی قیمت کو مسجد یا مدرسہ کے دیگر تعمیراتی امور میں صرف کر دیا جائے تو شرعاً یہ عمل درست ہے، نیز اگر واقف نے وقف کرتے وقت اس زمین کو دوسرے زمین سے تبادلہ کرنے یا اس موقوفہ زمین کو فروخت کر کے اس کی قیمت کو مسجد یا مدرسہ کے دوسرے امور میں صرف کرنے کی اجازت دیدی ہو تو اس صورت میں بھی موقوفہ زمین کو فروخت کرنا اور اس کی ثمن کو حسب شرائط واقف صرف کرنا درست ہوگا۔

وفی الدر المختار على رد المحتار: ''اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه: الأول أن يشترطه الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه وغيره فالاستبدال فيه جائز على الصحيح وقيل اتفاقًا. والثاني أن لا يشرطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شئ أصلًا أو لا يفي بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح'' (۶/ ۵۸۳، ۵۸۴ زکریا)۔

موروثی زمین کو تقسیم سے پہلے خریدنے کا حکم:

اگر وہ ورثہ جن کو حق وراثت نہیں دیا گیا ہے اس زمین کی خرید وفروخت کے وقت موجود ہوں اور اس وقت وہ صراحۃً بیع وشراء کی اجازت دیدیں یا خاموش رہیں تو ان کی خاموشی کو دلیل اجازت قرار دیا جائے گا اور ایسی موروثی زمین کی خرید وفروخت شرعاً درست ہوگی اور اگر ورثا اپنے حق شرعی کا

مطالبہ کریں تو ایسی موروثی زمین کا فروخت کرنا درست نہ ہوگا۔

وفی الهداية: ''وكل ما جاز بإجازة الوارث يتملكه المجاز له'' (۴/ ۶۳۹ كتاب الوصايا)۔

وفی الدر المختار علی رد المحتار: ''لا يجوز التصرف في مال غيره بلا إذنه ولا ولايته'' (۹/ ۲۹۱ كتاب الغصب)۔

''بخلاف الأجنبي فإن سكوته ولو جارا لا يكون رضا إلا إذا سكت الجار وقت البيع والتسليم وتصرف المشتري منه زرعًا وبناء فحينئذ لا تسمع دعواه على ما عليه الفتوى قطعا للأطماع الفاسدة'' (الدر المختار على رد المحتار ۱۰/ ۴۶۹-۴۵۰ زکریا)۔

حرام مال سے خرید کردہ زمین کا حکم:

اگر کسی شخص کے پاس حرام مال اور حرام آمدنی تھی، بعد میں اس شخص نے اس حرام آمدنی سے کچھ زمین خرید لی تو اگر چہ یہ زمین حرام ذریعہ آمدنی سے خریدی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود دوسرے لوگوں کے لئے اس مالک زمین سے خریدنا شرعاً درست ہے، البتہ جو مال حرام اس نے زمین کی خریداری پر لگایا ہے اس کو اصل مالک اور صاحب حق تک پہنچانا شرعاً ضروری ہے، لیکن اگر صاحب حق تک پہنچانا متعذر ہے تو مال حرام کی مقدار کو صدقہ کرنا واجب ہے۔

وفی رد المحتار: ''ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه'' (۹/ ۵۵۳ زکریا)۔

منظور شدہ لے آوٹ کی خلاف ورزی کا حکم:

اگر کوئی مالک زمین شخص حکومت سے ایک کالونی کا نقشہ منظور کرائے پھر اسی نقشہ کے مطابق عوام میں تشہیر کرے کہ ہم کالونی میں رہنے والوں کو اتنی چوڑی سڑک دیں گے جس کو لے آوٹ کہتے ہیں اور ایسا پلے گراونڈ دیں گے، اتنے فاصلہ پر مسجد دیں گے، ہسپتال اور اسکول دیں گے، پھر ان اعلانات اور سہولتوں پر اعتماد کرتے ہوئے لوگوں نے پلاٹ خریدے، لیکن بعد میں مالک زمین کی نیت میں خرابی آگئی، اس نے منظور شدہ نقشہ کے مطابق راستوں کی چوڑائی بھی کم کردی، سوئمنگ پول، پلے گراونڈ، مسجد، اسکول اور ہسپتال کو بھی نقشہ سے ہٹا دیا تو اس کا یہ عمل سرکاری معاہدہ کے خلاف ورزی بھی ہے، اور خریداران کے ساتھ صریح دھوکہ دھڑی اور غداری بھی ہے، جس کی شریعت مطہرہ میں قطعاً گنجائش نہیں ہے، ارشاد نبوی ہے:

''من غش فليس منا'' (ترمذی ۱/ ۲۴۵)۔

''عن أبي بكر الصديق قال قال رسول اللهﷺ ملعون من ضار مؤمنًا أو مكر به'' (ترمذی ۲/ ۱۵)۔

معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے زمینوں کو فروخت کرنے کا حکم:

منظور شدہ لے آوٹ کی خلاف ورزی، نقشہ میں تبدیلی اور عوام الناس کے ساتھ واضح غداری اور دھوکہ دھڑی کے باوجود اگر اس زمین کے مالکان اپنی زمین کو فروخت کردیں تو یہ خرید وفروخت کا عمل شرعاً درست ہے، کیونکہ مالک اپنی ملکیت میں تصرف کررہا ہے، لہذا اس مالک زمین کا زمین کو فروخت کرنا اور دوسرے لوگوں کا اس سے خریدنا بھی درست ہوگا، اگر چہ معاہدہ کی خلاف ورزی اور دھوکہ دھڑی کا گناہ اس کے ذمہ عائد ہوگا۔

وفی رد المحتار: ''وشرط المعقود عليه ستة: كونه موجودًا مالًا متقومًا مملوكًا في نفسه وكون الملك للبائع فيما يبيعه لنفسه'' (۷/ ۱۵ زکریا)۔

گارڈن کی جگہ پر مسجد بنانا:

اگر کالونی کے نقشہ مسجد کو حکومت آسانی سے منظور کرلیتی ہے اور اس میں کوئی دقت اور دشواری نہیں ہے تو مالک کا گارڈن کے نام منظور شدہ زمین پر مسجد تعمیر کرنا شرعاً درست نہیں ہے، بلکہ یہ معاہدہ شکنی ہوگی اور قانون کی خلاف ورزی قرار دی جائے گی اور معاہدہ شکنی اور قانونی مخالفت سے بچنا چاہئے اور اس معاہدہ شکنی کی وجہ سے وہ قانون کی زد میں کسی بھی وقت آسکتا ہے اور اس کی گرفت ہوسکتی ہے، اگر چہ مسجد بنانا شرعاً درست ہوگا اور وہ

مسجد شرعی تصور کی جائے گی، کیونکہ یہ مالک کا اپنی ملکیت میں تصرف ہے جس میں وہ مختار ہے اور اگر کالونی کے نقشہ پر مسجد کے نام سے حکومت کی طرف سے منظوری نہ ملتی ہو، بلکہ وہ کالونی کا نقشہ ہی رد ہوجاتا ہو اور پلاٹ خریدنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مسجد کے نام پر منظوری حاصل نہیں ہوسکتی کسی اور نام سے زمین خالی رکھی جائے گی اور اسی جگہ پر مسجد تعمیر ہوگی تو ایسی صورت میں گارڈن کے نام سے خالی شدہ زمین یا اس کے کسی حصہ پر مسجد تعمیر کرنے کی گنجائش ہوگی۔

''المالك ہو المتصرف فی الأعیان المملوکة کیف شاء'' (بیضاوی/ ۷)۔

وفی الدرالمختار علی رد المحتار: ''ولا یمنع الشخص من تصرفه فی ملکه إلا إذا کان الضرر بجاره ضررًا بینا فیمنع من ذلك وعلیه الفتوی واختاره فی العمادیة'' (۸/ ۱۵۲ زکریا)۔

وفی رد المحتار: ''القیاس فی جنس هٰذه المسائل أن من تصرف فی خالص ملکه لا یمنع ولو أضر بغیره لکن ترك القیاس فی محل یضر بغیره ضررًا بینًا وقیل بالمنع وبه أخذ کثیر من مشائخنا وعلیه الفتوی'' (۸/ ۱۵۳ زکریا)۔

قانونی مراحل کی تکمیل کے بغیر رشوت دے کر پلاٹنگ شروع کرنا:

ہر مسلمان بلکہ ہر ملکی باشندہ کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ تمام مراحل قانونی اعتبار سے انجام پذیر ہوں، کیونکہ ملک کا شہری ہونے کے ناطے تمام ہی ملکی قوانین کا پاس ولحاظ ہماری ذمہ داری ہے اور عافیت اور تحفظ بھی اسی میں ہے کہ ہمارے تمام ہی منصوبے اور پروجیکٹ اصول وقوانین کے دائرہ میں پروان چڑھیں، ورنہ کسی بھی وقت حد درجہ دشواری پیش آسکتی ہے؛ لیکن اگر تمام مراحل کی تکمیل قانونی طور سے دشوار اور ناممکن ہو اور سرکاری اداروں کے مسلمانوں کے ساتھ تعصب کی بنیاد پر باضابطہ کالونی کی منظوری دشوار ہو تو باضابطہ منظور کرائے بغیر پولیس اور متعلقہ محکمہ کے افسران کو رشوت دے کر کالونی بنانے کا عمل شروع کرنا اور زمین کی پلاٹنگ کرنا شرعاً درست ہوگا، کیونکہ اپنے جائز حق کو حاصل کرنا اگر بغیر رشوت دیئے ممکن نہ ہو تو فقہاء کرام نے رشوت دے کر اس حق کو حاصل کرنے کی اجازت دی ہے، نیز ہمارے ملکی باشندہ ہونے کے لحاظ سے جائز حقوق کا حاصل نہ ہونا ہمارے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہے اور رفع ظلم کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے۔

وفی الهدایة: ''ودفع الرشوة لدفع الظلم أمر جائز'' (۳/ ۲۲۹ کتاب الصلح)۔

وفی رد المحتار: ''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة یعنی فی حق الدافع'' (۹/ ۶۰۷ زکریا)۔

''ما یدفع لدفع الخوف من المدفوع إلیه علی نفسه أو ماله حلال للدافع حرام علی الآخذ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب ولایجوز أخذ المال لیفعل الواجب'' (۸/ ۳۵ زکریا)۔

مجبوری اور اضطرار کی حالت میں سرکاری بینک سے سودی قرض لینا:

بینک سے سودی لین دین کرنا اور سودی معاملات طے کرنا ناجائز اور حرام ہے، لیکن اگر اضطراری حالات ہوں اور انتہائی درجہ کی مجبوری ہو، مثلاً اگر وائٹ منی دے کر زمین خریدے گا تو حکومت کی نگاہ میں وہ شخص آجائے گا اور حکومت اس سے محاسبہ اور پوچھ گچھ کرے گی اور پھر اس رقم پر اس شخص کو ٹیکس بھی دینا پڑے گا جو ناقابل برداشت ہوگا اور سرکاری بینک سے اگر سودی قرض نہ لے تو مسلمان کا اس کاروبار میں رہنا دشوار ہوجائے گا، اس لئے اس طرح کی سخت مجبوری اور اضطرار کی حالت میں جتنی مقدار سے ضرورت پوری ہوجائے اس مقدار میں سودی قرض لینا شرعاً درست ہوگا، اس سے زیادہ مقدار میں لینا درست نہ ہوگا۔

''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباه والنظائر القاعدة الخامسة)۔

پلاٹ نمبر کی تعیین کے ساتھ مبیع کا تعین اور اس کی بیع وشراء کا حکم:

اگر کسی قطعۂ زمین سے متعلق کالونی کا مجوزہ نقشہ موجود ہو اور اس میں پلاٹ کے نمبرات متعین ہوں اور پلاٹ نمبر کی تعیین کے ساتھ کسی شخص کے

ہاتھ اس کو فروخت کیا جائے، تو اگر چہ زمین پر پلاٹ موجود نہ ہوں اور کالونی بسانے والوں کے لئے اس میں تبدیلی کی بھی گنجائش ہو اور کاغذی نقشہ کے خلاف اس پلاٹ کو کسی دوسری جگہ ڈالنے کا بھی امکان ہو، پھر اس کو فروخت کرنا درست ہے، اس لئے کہ بائع نے زمین کے ایک حصہ کی رجسٹری کرا کر مشتری کو کاغذی نقشہ پر اس کا مالک بنا دیا اور زمین وجائیداد سرکاری رجسٹری کر کے اس کے کاغذات پر قبضہ دیدینا زمین پر قبضہ دینے کے مانند ہے، اس لئے صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہو جائے گی اور خرید وفروخت کا یہ عمل درست ہوگا۔

وفی الدر المختار علی رد المحتار: ''ثم التسليم يكون بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل'' (۷/ ۹۴ زکریا)۔

وفی البدائع: ''وأما تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشترى من التصرف فيه فيجعل البائع مسلمًا للمبيع والمشترى قابضًا له وكذا تسليم الثمن من المشترى إلى البائع'' (۴/ ۴۹۸ زکریا)۔

فروخت شدہ زمین پر بائع کا کاشت کرنا:

اگر فروخت شدہ قطعۂ اراضی اور پلاٹ پر بائع کاشت کرے تب بھی مشتری سرکاری رجسٹری ہونے کے بعد اس کا مالک تصور کیا جائے گا، کیونکہ ایجاب وقبول کے بعد بیع مکمل ہوگئی اور وہ مشتری ہر وقت اس پر قبضہ کرنے پر قادر ہے اور بائع کا کاشت کرنا اگر مشتری کی صراحت اجازت سے ہے یا مشتری کاشت کا علم ہونے کے باوجود خاموش ہے اور اس کی دلالۃ اجازت موجود ہے تو ایسی صوت میں بائع کے لئے اس قطعہ اراضی پر کاشت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر مشتری بائع کو کاشت کرنے سے منع کرے یا اس کی اجرت متعین کرے تو مشتری کے لئے ایسا کرنا درست ہے، کیونکہ مشتری اس قطعۂ زمین کا کلی طور سے مالک ہو چکا ہے۔

وفی الهداية: ''وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما إلا من عيب أو عدم رؤية'' (۳/ ۴)۔

وفی الدر المختار علی رد المحتار: ''وإذا وجد لزم البيع بلا خيار إلا لعيب أو رؤية'' (۷/ ۴۷ زکریا)۔

''صح بيع عقار لا يخشى هلاكه قبل قبضه من بائعه لعدم الغرر لندرة هلاك العقار'' (ایضاً ۷/ ۳۶۹ زکریا)۔

وفی الهداية: ''ويجوز بيع العقار قبل القبض'' (۳/ ۵۸)۔

خریدار شخص کا خرید شدہ پلاٹ کو صرف نقشہ کی بنیاد پر دوسرے کو فروخت کرنا:

پلاٹ خریدنے والے صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر رجسٹری کے ذریعہ پلاٹ کا مالک ہو جاتا ہے، اب اس خریدار شخص کے لئے اس پلاٹ اور قطعۂ زمین کو دوسرے شخص کو فروخت کرنا درست ہے، خواہ زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں ہو یا زمین کا مالک کوئی دوسرا شخص ہو اور کالونی بنانے والے شخص مالک زمین کی اجازت سے پلاٹ فروخت کئے ہوں، دونوں صورتوں میں پلاٹ خرید کر دوسرے شخص کو فروخت کرنا درست ہے، کیونکہ اصل مالک کی رضامندی پائی گئی۔

وفی البدائع: ''أما تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلي وهو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشترى برفع حائل بينهما على وجه يتمكن المشترى من التصرف فيه فيجعل البائع مسلمًا للمبيع والمشترى قابضًا له'' (۴/ ۴۹۸ زکریا)۔

دلال کے واسطہ سے زمین اور پلاٹ کی خرید وفروخت کی صورتیں:

زمینوں کی خرید وفروخت میں ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ کالونی بنانے والا کچھ دلالوں سے گفتگو کرتا ہے کہ ہماری زمین بکوائے، یہ دلال مارکیٹ میں خریدار اور گراہک تیار کرتے ہیں کہ آپ ہم سے زمین خریدیئے اور جب اس کی قیمتیں بڑھ جائیں گی تو فروخت کر دینا، زمین خریدنے والوں کو زمین مقصود نہیں ہوتی، بلکہ صرف نفع کا حصول مقصود ہوتا ہے، وہ خریدار شخص اصل مالک زمین کو جانتا بھی نہیں ہے، نہ رجسٹری ہوتی ہے، نہ کوئی

کاغذی تحریر ہوتی ہے، بلکہ صرف دلال اور خریدار کے درمیان زبانی سودا ہوتا ہے اور دلال اس زمین کا ایک قطعہ اور پلاٹ اس شخص کو رقم وصول کر کے فروخت کر دیتا ہے، اب اگر یہ شخص اپنے پلاٹ کو فروخت کرنا چاہے تو اس دلال کے ذریعہ فروخت کرے گا اور وہ دوسرا خریدار بھی تیسرے شخص کو اسی دلال کے ذریعہ فروخت کرے گا اور اس طرح سلسلہ چلتا رہے گا اور دلال ہر مرتبہ میں اپنی دلالی وصول کرے گا، تو اس صورت کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ دلال اصل مالک کی جانب سے مجاز اور اجازت یافتہ ہے، لہذا اس کا ہر عمل مالک کی اجازت ہی سے مانا جائے گا، موجودہ دور اس طرح کا کاروبار عام ہے، اور چونکہ اس طرح کے معاملات میں تحریر کا سہارا نہیں لیا جاتا ہے اور محض زبانی ایجاب وقبول پر اکتفا ہوتا ہے اور کاغذی اعتبار سے زمین اصل مالک کے نام ہوتی ہے، اس لئے مشتری اگر اس زمین کو اپنے نام رجسٹری کرانا چاہے تو اس کو اختیار ہے، لیکن اگر اسی حالت میں فروخت کرنا چاہے، تو دلال سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، اگر اگلا خریدار اس زمین کو اپنے نام کرانا چاہے تو ظاہر ہے کہ مشتری اول اس میں اس کی مدد نہیں کرے گا، کیونکہ زمین اس کے نام نہیں ہے، لامحالہ دلال کا سہارا لینا پڑے گا، کیونکہ اصل مالک کا نمائندہ وہی ہے، اور اس کا مالک سے رابطہ ہے، بہر حال اس طرح معاملات شرعاً درست ہیں۔

وفی رد المحتار: ''وفی الدلال والسمسار یجب أجر المثل. وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال أرجو أنه لا بأس به'' (۹/ ۸۷ زکریا)۔

وفی الدر المختار علی ہامش ر دالمحتار: ''وأما الدلال فإن باع العین بنفسه بإذن ربها فأجرته علی البائع وإن سعی بینهما وباع المالك بنفسه یعتبر العرف''۔

وفی رد المحتار: ''قوله یعتبر العرف فتجب الدلالة علی البائع أو المشتری أو علیهما بحسب العرف'' (۷/ ۹۳ زکریا)۔

خریدار شخص کا اپنے پلاٹ کو فروخت کرنے کے لئے کالونی بنانے والوں سے رابطہ کرنا:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کالونی بنانے والے پلاٹ فروخت کر کے قسطوں پر رقم وصول کر لیتے ہیں، اب خریدار اپنے پلاٹ کو فروخت کرنا چاہے، تو کالونی والوں ہی سے رابطہ کرتے ہیں، اگر کوئی خریدار علیحدہ سے لاتا ہے تو بھی کالونی بنانے والوں سے ہی ملانا ہوتا ہے، خود کالونی بنانے والے دوسرے گراہک کا آنا پسند نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ خود ہی اس کو خرید لیتے ہیں، تو اس صورت میں شرعی حکم یہ ہے کہ جب ایجاب وقبول ہو گیا اور رقم وصول ہو گئی اور مبیع مشتری کے حوالہ ہو گئی تو اب بیع کے مکمل ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا، تو اب مشتری کے لئے اس پلاٹ کو کسی بھی شخص کے ہاتھ فروخت کرنا درست ہے، کالونی والوں کا مشتری پر یہ دباؤ بنانا کہ پلاٹ کے خریدار ہم ہی رہیں گے اور ہمارے ہاتھ ہی پلاٹ فروخت کرنا ہوگا درست نہیں ہے، بلکہ اگر یہ مشتری سے شرط کے درجہ میں ہے تو یہ شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہے، اس کا اعتبار نہ ہوگا؛ لیکن اگر مشتری سے بائع کی جانب سے کوئی دباؤ اور شرط نہ ہو، بلکہ بیع کے بلاشرط مکمل ہونے کے بعد کالونی والوں کی جانب سے مشتری کے پاس یہ بات آئی ہو کہ اگر فروخت کرنا ہو تو ہم سے رابطہ کر لیا جائے اور مشتری اس کا وعدہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

وفی البحر الرائق: ''وإن ذکر البیع بلا شرط ثم شرطاه علی وجه المواعدة جاز البیع'' (۶/ ۸)۔

پلاٹ قسطوں پر خریدنے کے بعد قسطوں کا ٹوٹ جانا:

کسی شخص نے پلاٹ خریدا اور خریدار نے آٹھ دس قسطیں اس پلاٹ کی قیمت کی ادا کر دیں، باقی قسطیں ادا کرنے سے عاجز ہو گیا اور اس کی گنجائش باقی نہ رہی تو اب سودا مکمل ہونے کے باوجود صرف بعض قسطوں کے ادا نہ ہونے کی وجہ سے کالونی والوں نے سودا کینسل کر دیا، اب اگر بعد میں وہ خریدار قسطیں ادا کرنا چاہے، یا اپنی زمین کا مطالبہ کرے تو مالک بجائے قسطیں وصول کرنے اور خریدار کو زمین حوالہ کرنے کے صرف وصول شدہ قسطوں کی رقم واپس کرتا ہے، تو اس کا اس طرح معاملہ کو فسخ کرنا شرعاً درست ہے، کیونکہ یہ اقالہ کی ایک صورت ہے اور اقالہ کی شریعت نے اجازت دی ہے، اس صورت میں بائع نے مشتری کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ اس کی رضامندی سے کیا ہے، اس لئے اس صورت کے جواز میں کوئی تردد نہ ہونا چاہئے۔

وفی الهدایة: ''الإقالة جائزة فی البیع بمثل الثمن الأول لقوله علیه السلام: ''من أقال نادمًا بیعته أقال الله

عشراته يوم القيامة" "لأن العقد حقهما فيملكان رفعه دفعًا لحاجتهما" (۳/ ۵۲)۔

دلال کا زمین کو مشتری کے ہاتھ اپنی من مانی قیمت پر فروخت کرنا:

اگر دلال گراہک اور خریدار کو مالک زمین کے پاس لاکر سودا کرادے اور اپنی دلالی وصول کرے تو اس صورت کے جواز میں تو کوئی تردد ہی نہیں ہے، لیکن اگر دلال کالونی بسانے والے یا مالک زمین سے زمین کے ریٹ معلوم کرے، پھر خریدار کو اپنی من مانی قیمت پر فروخت کرے، اس کے بعد زمین والے کو اس کے بتلائے ہوئے ریٹ کے مطابق قیمت ادا کردے اور باقی قیمت کو اپنے پاس رکھ لے تو دلال کے لئے ایسا کرنا بھی درست ہے، اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ دلال نے بائع سے یہ زمین مثلاً ایک لاکھ میں خریدی ہے اور پھر مشتری کو ایک لاکھ دس ہزار میں فروخت کردی، لہذا اس صورت میں یہ شخص دلال نہیں ہوگا، بلکہ تاجر کہلائے گا، اور یہ معاملہ شرعاً درست ہوگا۔

"وفي العناية في الإيضاح والمحيط أنه باعه مرابحة فإن كان ما اشتراه به له مثل جاز سواء جعل الربح من جنس رأس المال الدراهم من الدراهم أو من غير الدراهم من الدنانير أو على العكس إذا كان معلومًا يجوز به الشراء لأن الكل ثمن" (عنایہ مع فتح القدیر ۶/ ۴۵۶ زکریا)۔

• دلال کمپنیوں کا زمین فروخت کر کے قبضہ نہ دینا:

اگر دلال کمپنیاں زمین فروخت کر کے خریداران کو زمین پر قبضہ نہیں دیتی ہیں، بلکہ خریداران سے یہ کہہ دیتی ہیں کہ جب آپ کا زمین فروخت کرنے کا ارادہ ہو تو آپ یہ زمین ہم کو واپس کریں گے، کسی دوسرے کو فروخت نہ کرو گے، تو اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ بیع بالشرط میں داخل ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں مبیع کو واپس کرنے کی شرط لگائی ہے اور یہ شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہے، اس لئے یہ بیع درست نہ ہوگی، جواز کا حیلہ یہ ہے کہ دلال کمپنی خریدار سے بیع تو بلا شرط کرے پھر بعد میں علاحدہ سے زمین کو واپس کرنے کا معاہدہ کرلیں تو شرعاً یہ بیع درست ہوگی۔

وفي الهدايه: "وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده" (۳/۴۳)۔

وفي الدر المختار على رد المحتار: "الأصل الجامع في فساد العقد بسبب شرط لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لأحدهما أو فيه نفع لمبيع هو من أهل الاستحقاق للنفع" (۷/ ۲۸۲ زکریا)۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔



موجودہ دور میں زمین کی خرید وفروخت سے متعلق اہم مسائل

مفتی محمد عفان منصور پوری[1]

جواب(۱): سیاسی لیڈران اور لینڈ مافیا کا سرکاری زمینوں پر قبضہ کر کے فروخت کرنا یا سرکاری عہدہ داروں کو رشوت دے کر لے آؤٹ منظور کرالینا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ زمین سرکار کے قبضہ اور اس کی ملکیت میں ہے اور غیر کی مملوکہ چیز پر قبضہ غصب ہے اور شئی مغصوب کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه قال: قال رسول لله ﷺ ''ألا لا تظلموا! ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفسه'' (مرقاة المفاتيح مكتبه اشرفيه ديوبند ۶/ ۱۳۵)۔

''لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه'' (قواعد الفقه/ ۱۱۰)۔

''و منها أن يكون مملوكا؛ لأن البيع تمليك فلا ينعقد فيما ليس بمملوك'' (بدائع الصنائع زكريا ۴/ ۳۳۹)۔

''ومنها: ہو شرط انعقاد البيع للبائع أن يكون مملوكًا للبائع عند البيع؛ فإن لم يكن لا ينعقد. وإن ملكه بعد ذالك بوجه من الوجوه إلا السلم خاصة، و ہذا بيع ما ليس عنده'' (بدائع الصنائع زكريا ۴/ ۳۴۰)۔

عدم جواز کے باوجود اگر اراضی مغصوبہ کو فروخت کیا گیا تو دیکھا جائے گا کہ مشتری کو اس شئی کے مغصوب ہونے کا علم ہے یا نہیں؟ اگر علم نہیں ہے تب تو وہ گنہ گار نہیں ہوگا اور خریدی ہوئی چیز کا مالک بن جائے گا اور اس سے دوسرے کا خریدنا بھی جائز ہوگا؛ لیکن مشتری کو اگر اس بات کا یقین یا ظن غالب ہے کہ بیچی جانے والی چیز مسروقہ یا مغصوبہ ہے تو نا اس کا خریدنا جائز ہے اور نہ ہی خرید کر دوسرے کو فروخت کرنا جائز ہوگا، ایسی صورت میں اگر ممکن ہو تو مال کا اصل مالک کی طرف لوٹانا ضروری ہے، ورنہ صدقہ کرنا لازم ہوگا، اگر کسی شخص نے غلط فہمی میں مال خرید لیا تو حقیقت واضح ہونے کے بعد وہ مال اصل مالک کو لوٹا دے اور ادا کردہ قیمت بائع سے واپس لے۔

''قال في ردالمحتار لو ظهر غير حلال أي مسروقا أو مغصوبا يرجع عليه المشتري'' (ردالمحتار ۵/ ۴۲سعيد)۔

بدائع میں ہے: ''ولو باع السارق المسروق من إنسان أو ملك منه بوجه من الوجوه فإن كان قائما فلصاحبه أن يأخذه لأنه عين ملكه و للماخوذ منه أن يرجع على السارق'' (بدائع ۷/ ۸۵)۔

جواب(۲): وقف کہتے ہیں کسی چیز کو اپنی ملک سے نکال کر اللہ کی ملک میں دے دینا اور اس کی منفعت کو رضاء الٰہی کی خاطر دائمی طور پر کار خیر کے لیے مخصوص کر دینا، جو چیز وقف کردی گئی اس میں کسی کو مالکانہ تصرف یعنی بیع، شراء، ہبہ عاریت وغیرہ میں سے کسی کی اجازت نہ ہوگی اور اگر کسی نے ایسا کیا تو باطل ہوگا، اس لیے کہ شئی موقوفہ واقف کی ملکیت سے نکل گئی اور کسی دوسرے کی ملکیت بھی ہونا ثابت نہیں ہے۔

درمختار میں ہے: ''فإذا تم و لزم لا يملك ولا يملك ولا يعار ولا يرہن. و في الشامية: قوله لا يملك أي لا يكون مملوكا لصاحبه ولا يملك أي لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه لاستحالة تمليك الخارج عن ملكه'' (درمختار مع ردالمحتار ۴/ ۳۵۲)۔...... قال في الهدايه: و إذا صح الوقف لم يجز بيعه ولا تمليكه: قال ابن الهمام لم يجز بيعه ولا تمليكه وهو بإجماع الفقهاء أما انتفاء التمليك فلما بينا من قوله عليه السلام: ''تصدق بأصلها لا يباع ولا يورث ولا يوهب'' (فتح القدير مع الهداية ۶/ ۲۲۰)۔

ہاں! البتہ اگر مسجد یا مدرسے کے لیے وقف شدہ زمین بالکل نا قابل انتفاع ہو جائے اور مقصد وقف کو اس زمین سے کوئی نفع نہ پہنچ رہا ہو تو اس کو بیچ کر یا تو

---

[1] استاذ حدیث وفقہ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ۔

دوسری جگہ خرید لی جائے یا پھر اس زمین سے حاصل شدہ رقم کو مدرسے یا مسجد کے دیگر کاموں میں صرف کردیا جائے۔

''والثاني أن لا يشترطه، سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شيئ أصلا أو لا يفي بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح'' (شامی زکریا ۶/ ۵۸۳)۔

جواب (۳): اگر وہ ورثاء جن کو حق وراثت نہیں دیا گیا ہے بوقت بیع وشراء موجود ہوں اور اس وقت یا تو وہ خاموش رہیں یا صراحتاً بیع کی اجازت دے دیں تو ایسی موروثی زمین کی خرید وفروخت میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ اگر وہ صراحتاً اجازت دے دیں تو پھر تو کوئی بات ہی نہیں ہے اور اگر وہ خاموش رہیں تو ان کی خاموشی کو ہبہ سکوتی بالقرائن کی دلیل قرار دے دیا جائے گا؛ لیکن اگر وہ ورثاء اپنے حق کا مطالبہ کریں تو پھر ایسی موروثی زمین کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

''الأجنبي سكوته ولو جارًا لا يكون رضاء إلا اذا سكت الجار وقت البيع والتسليم و تصرف المشتری فيه زرعًا و بناءً فحينئذ لا تسمع دعواه على ماعليه الفتوى قطعا للأطماع الفاسدة'' (شامی ۱۰/ ۳۶۹)۔

''وكل ماجاز باجازة الوارث يتملكه المجاز له'' (ہدایہ کتاب الوصایا مکتبہ اشرفی دیوبند ۴/ ۴۵۶ بحوالہ فتاویٰ قاسمیہ ۲۵/ ۵۴۶)۔

جواب (۴): اگر کسی شخص کے پاس حرام آمدنی تھی، بعد میں اس نے اس حرام آمدنی کے ذریعے کچھ زمین خرید لی تو اگر چہ یہ زمین حرام آمدنی کے ذریعے خریدی گئی ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس کو فروخت کرنا اور حالات سے واقف لوگوں کے لیے اس کو خریدنا جائز ہے، البتہ جو مال حرام اس نے زمین کی خریداری میں لگایا ہے اس کو صاحب حق تک پہنچانا ضروری ہے؛ لیکن اگر صاحب حق تک پہنچانا متعذر ہو جائے تو پھر اس مال کو صدقہ کرنا لازم اور ضروری ہے (مستفاد فتاویٰ قاسمیہ ۲۵/ ۲۵۶)۔

''صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإمّا أن يكون كسبه بعقد فاسد، كالبيوع الفاسدة والاستئجار على المعاصي والطاعات أو بغير عقد، كالسرقة والغصب والخيانة والغلول ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام'' (بذل المجهود قديم ۱/ ۳۷/ باب فرض الضوء)۔

''ويردونه على أربابه إن عرفوالهم، وإلايتصد قوا به، لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد'' (تكملة البحر الرائق زکریا ۹/ ۳۶۹، ہندیۃ زکریا ۵/ ۳۴۹)۔

جواب (۵): اس سوال کے دو جز ہیں: (۱) منظور شدہ لے آؤٹ کی خلاف ورزی کرنا، (۲) نقشہ میں تبدیلی کر کے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کی بیع وشراء۔

پہلے جزء کے بارے میں یہ عرض ہے کہ جب مالک نے کالونی کا ایک نقشہ منظور کرایا پھر اسی کے مطابق عوام میں تشہیر کی کہ ہم کالونی میں رہنے والوں کو اتنی چوڑی سڑک دیں گے، ایسا پلے گراؤنڈ دیں گے، اتنے رقبہ پر مشتمل مسجد دیں گے، پھر ان سہولیات اور اعلانات پر اعتماد کرتے ہوئے لوگوں نے پلاٹ خریدے؛ لیکن بعد میں مالک کی نیت بدلنے لگی، اس نے سڑک کی چوڑائی بھی کم کرنے کا ارادہ کیا، سوئمنگ پول، پلے گراؤنڈ اور مسجد کو بھی نقشے سے ہٹا دیا تو اس کا یہ عمل حکومتی معاہدہ کی خلاف ورزی کے ساتھ ساتھ عوام کے ساتھ صریح دھوکہ دھڑی ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، ارشاد نبوی ہے: ''من غشنا فليس منا'' (جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔

رہا دوسرا جزء یعنی نقشہ میں تبدیلی کر کے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کو بیچنا اور اس کا خریدنا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ معاہدہ کی خلاف ورزی اور دھوکہ دھڑی کا گناہ اپنی جگہ؛ لیکن مالک اگر ایسا کر رہا ہے تو وہ اپنی ملکیت میں تصرف کر رہا ہے؛ اس لیے اس کا بیچنا بھی جائز ہوگا اور خریدنا بھی درست ہوگا۔

جواب (۶): صورت مسئولہ میں دیکھا جائے گا کہ حکومت کالونی کے نقشہ میں مسجد کو بآسانی منظوری دیتی ہے یا نہیں؟ اگر مسجد کے نام پر منظوری مل جاتی ہے تو مالک کا گارڈن کے نام پر منظور شدہ زمین میں مسجد تعمیر کرنا معاہدہ شکنی ہوگی اور قانون کے خلاف ورزی ہوگی جس سے بچنا چاہیے، اگر چہ مسجد بنانا شرعاً درست ہوگا اور وہ مسجد شرعی ہی تصور کی جائے گی، کیوں کہ یہ مالک کا اپنی ملکیت میں تصرف ہے، جس میں وہ مختار ہے؛ البتہ معاہدہ شکنی کی وجہ سے وہ قانون کی زد میں بھی آ سکتا ہے۔

اور اگر حکومت کی طرف سے کالونی کے نقشہ پر مسجد کے نام سے منظوری ملتی ہی نہ ہو اور پلاٹ خریدنے والوں کی اکثریت مسلمانوں کی ہو اور سب کو یہ معلوم ہو کہ مسجد کے نام پر منظوری نہیں مل سکتی، کسی اور نام پر زمین خالی رکھی جائے گی اور وہیں مسجد کی تعمیر ہوگی تو ایسی شکل میں گارڈن کے نام پر خالی پڑی زمین میں یا اس کے ایک حصہ میں مسجد تعمیر کرنے کی گنجائش ہونی چاہیے۔

''ولا یمنع الشخص من تصرفه فی ملکه إلا إذا کان الضرر بجاره ضررًا بینا فیمنع من ذالك و علیه الفتوی'' (شامی زکریا ۸/ ۱۵۲)۔

''القیاس فی جنس هٰذه المسائل أن من تصرف فی خالص ملکه لایمنع ولو أضر بغیره لکن ترك القیاس فی محل یضر بغیره ضررًا بینًا و قیل وبه أخذ کثیر من المشایخ و علیه الفتوی'' (شامی زکریا ۷/ ۴۹۲)۔

جواب (۷): اولاً تو بھرپور کوشش اسی بات کی ہونی چاہیے کہ تمام مراحل قانونی اعتبار سے انجام پائیں، اس لیے کہ ملک کے باشندے ہونے کے ناطے ان قوانین کا پاس ولحاظ ہماری ذمہ داری ہے اور عافیت وتحفظ بھی اسی میں ہے کہ ہمارے پروجیکٹ ملکی اصول وقانون کے دائرے میں آگے بڑھ رہے ہوں، ورنہ آگے چل کر کبھی بھی بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اور اس وقت پانی کی طرح پیسا بہانے کے باوجود بھی کام نہیں بن پاتا؛ لیکن موجودہ ملکی حالات کو دیکھتے ہوئے جبکہ ہر سطح پر مسلمانوں کو تعصب کا نشانہ بنایا جارہا ہے اور مسلمانوں سے جڑے ہوئے منصوبوں کو منظوری دلانا جوئے شیر لانے کے مرادف ہورہا ہے، اگر کاغذی ودستاویزی اور قانونی طور پر مضبوط ہونے کے باوجود حکومتی ادارے محض تعصب کی بناء پر کسی زمین کو کالونی کی حیثیت سے منظور کرنے میں آنا کانی کررہے ہیں اور ٹال مٹول کا رویہ اپنا کر معاملہ کو طول دینے کی اور ٹھنڈے بستے میں ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں، تاکہ پیروکار بھی تھک ہار کر اپنے گھر بیٹھ جائے، تو اس طریقے کو اپنایا جاسکتا ہے جس کا ذکر سوالنامہ میں موجود ہے، یعنی گورنمنٹ سے منظور کرائے بغیر پولیس اور متعلقہ محکمہ کو رشوت دے کر کالونی بنانے کا عمل شروع کرنا، اس لیے کہ اپنے جائز حق کو حاصل کرنا بھی اگر رشوت دیئے بغیر ممکن نہ ہو تو فقہاء نے اس کی گنجائش دی ہے۔

''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة یعنی فی حق الدافع'' (شامی زکریا ۹/ ۶۰۷)۔

''ومنها إذا دفع الرشوة خوفا علی نفسه أو ماله فهو حرام علی الأخذ غیر حرام علی الدافع'' (البحرالرائق زکریا ۶/ ۴۴۱)

جواب (۸): بینک سے سودی معاملات کرنا درست نہیں ہے؛ لیکن اگر اضطراری اور انتہائی درجے کی مجبوری ہو تو جتنی رقم سے ضرورت پوری ہوجائے بس اتنی مقدار میں سودی قرض لینا جائز ہے، اس سے زیادہ سود لینا درست نہیں ہے اور مذکورہ سوال میں بھی ایک طرح کی مجبوری ہے، کیونکہ اگر وائٹ منی دے کر زمین خریدے گا تو حکومت اس سے پوچھ گچھ کرے گی اور پھر اس رقم پر حکومت کو ٹیکس دینا پڑے گا اور اگر بینک سے سود نہ لیں تو مسلمان اس کاروبار میں نہیں رہ پائیں گے، اس لیے اس مجبوری کی وجہ سے دشواری سے بچنے کے لیے بینک سے لون لیا جاسکتا ہے (مستفاد فتاویٰ رحیمیہ ۹/ ۲۳۷)۔

''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح و ذالك نحو أن یقترض عشرة دنانیر مثلا و یجعل لربها شیئا معلومًا فی کل یوم ربحا'' (حاشیه الأشباه والنظائر مکتبه فقیه الأمة ۱/ ۲۲۷، بحرالرائق کوئٹه ۶/ ۱۲۶)۔

جواب (۹): سوال میں جو صورت بیان کی گئی ہے کہ کالونی میں زمین کا جو حصہ فروخت کیا جاتا ہے وہ نقشہ پر تو درج ہوتا ہے اور زمین کے ہر ٹکڑے کا ایک نمبر بھی ہوتا ہے؛ لیکن زمین پر پلاٹس نہیں بنائے جاتے ہیں، اسی طرح کالونی بسانے والوں کے لیے اس بات کی بھی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ اس جگہ کو تبدیل کر دیں یا نقشہ میں جس پلاٹ کا جو نمبر بتایا گیا ہے اس کو کسی اور جگہ ڈال دیں، ان سب باتوں کے باوجود صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجائے گی اور خرید وفروخت کا یہ عمل بھی درست ہوگا، اس لیے کہ بائع نے زمین کے ایک حصہ کی رجسٹری کرا کر مشتری کو کاغذی نقشہ پر اس کا مالک بنادیا اور زمین جائیداد میں سرکاری رجسٹری کرا کر اس کے کاغذات پر قبضہ دے دینا یہ زمین پر قبضہ دینے کے مانند ہے، اس لیے صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع بھی متعین ہوجائے گی اور خرید وفروخت کا یہ عمل بھی درست ہوگا۔

''وتفسیر التسلیم والقبض، فالتسلیم والقبض عندنا هو التخلیة، والتخلی وهو أن یخلی البائع بین المبیع والمشتری برفع الحائل بینهما علی وجه یتمکن للمشتری معه التصرف فیه۔

فیجعل البائع مسلما للمبیع والمشتری قابضًا له'' (بدائع الصنائع زکریا ۴/ ۴۹۸)۔

''والقبض الكامل في المنقول مایناسبه أوفي العقار مایناسبه'' (شرح المجلة مكتبه اتحاد ۱/ ۲۶۳ بحواله فتاوىٰ قاسمیه ۲۱/ ۲۲۷)۔

''وإذا وجدالزم البیع بلاخیار إلا لعیب أورؤیة'' (شامی زکریا ۷/ ۴۷)۔

جواب (۱۰): صورت مسئولہ میں اگر فروخت شدہ قطعہ اراضی پر بائع کاشت کرتا ہے تب بھی مشتری اس کا مالک ہوجائے گا؛ کیوں کہ بیع مکمل ہوچکی ہے اور وہ جب چاہے اس پر قبضہ کرسکتا ہے، رہا بائع کا کاشت کرنا تو اگر مشتری بائع کے اس عمل کو دیکھ کر خاموش ہے یا صراحتاً اجازت دے رہا ہے تو کاشت کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن اگر وہ بائع کو اس عمل سے روکے یا کوئی اجرت متعین کرے تو مشتری کو اس کا حق ہے، کیوں کہ وہ اس زمین کا مالک بن چکا ہے۔

''وإذا وجدا (أي الإیجاب والقبول) لزم البیع بلا خیار إلا لعیب أو رؤیة'' (شامی زکریا ۷/ ۴۷، البحر الرائق کوئٹه ۵/ ۲۶۳)

''صح بیع عقار لایخشی هلاكه قبل قبضه من بائعه لعدم الغرر لندرة هلاك العقار'' (شامی زکریا ۷/ ۳۶۹)۔

''وأما بیع المشتری العقار قبل القبض فجائز عند أبي حنیفة'' (بدائع الصنائع ۴/ ۳۹۶)۔

جواب (۱۱): اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پلاٹ خریدنے والا صرف کاغذی نقشہ کی بناء پر زمین کا مالک ہوجاتا ہے، چنانچہ اب اگر یہ شخص اس پلاٹ کو کسی دوسرے کو فروخت کردے تو یہ درست ہے، کیونکہ زمین وجائیداد میں کاغذاتی نقشہ پر قبضہ دے دینا قبضہ کے درجے میں ہوتا ہے، اس لیے یہ بیع درست ہوجائے گی۔

(الف) پہلی صورت میں تو مسئلہ واضح ہے جبکہ زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آگئی اور اسی نے پلاٹس فروخت کئے ہوں۔

(ب) اور دوسری صورت میں جبکہ زمین ابھی مالک زمین ہی کی ملکیت میں ہو اور کالونی بنانے والا اصل مالک کی اجازت سے پلاٹنگ کررہا ہو تو بھی فروختگی جائز ہوگی، اس لیے کہ اصلی مالک کی رضامندی پائی جارہی ہے۔

''والقبض الكامل في المنقول مایناسبه وفي العقار مایناسبه'' (شرح المجلة مكتبه اتحاد ۱/ ۲۶۳)۔

''وتفسیر التسلیم والقبض فالتسلیم والقبض عندنا هو التخلیة، والتخلي وهو أن یخلي البائع بین المبیع والمشتري برفع حائل بینهما علی وجه یتمكن المشتري من التصرف فیه فیجعل البائع مسلما للمبیع والمشتري قابضاله'' (بدائع الصنائع ۴/ ۴۹۸)۔

جواب (۱۲): صورت مسئولہ میں دلال مجاز من المالک ہے؛ اس لیے اس کا ہر عمل مالک کی رضامندی سے مانا جائے گا، موجودہ دور میں اس طرح کا کاروبار عام ہے اور چوں کہ ان معاملات میں تحریر کا سہارا نہیں لیا جاتا محض زبانی ایجاب وقبول پر اکتفا ہوتا ہے اور کاغذی طور پر زمین اصل مالک ہی کے نام پر چڑھی ہوتی ہے، اس لیے اگر مشتری اس کو اپنے نام پر چڑھانا چاہتا ہے تو الگ بات ہے؛ لیکن اگر اسی حال میں فروخت کرنا چاہتا ہے تو دلال سے رجوع کرنا ہوگا؛ کیوں کہ اصل مالک کا نمائندہ وہی ہے اگر اگلا خریدار زمین کو کاغذی طور پر اپنے نام اتارنا چاہے گا تو ظاہری بات ہے مشتری اول اس سلسلہ میں اس کی مدد نہیں کرپائے گا۔ کیوں کہ خود اس کے نام زمین چڑھی ہوئی نہیں ہے، لامحالہ دلال کا سہارا لینا ہوگا جس کا رابطہ مالک سے ہے، بہر حال اس طرح کے معاملات شرعاً جائز ہیں۔

''وفي الدلال والسمسار یجب أجر المثل'' (شامی زکریا: ۹/ ۸۷، ہندیة زکریا قدیم ۴/ ۴۵۰)۔

''سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به'' (شامی زکریا ۹/ ۸۷، تاتارخانیه زکریا ۱۵/ ۱۳۷)

جواب (۱۳): صورت مسئولہ میں جب ایجاب وقبول ہوگیا اور پیسے بھی وصول کرلیے گئے مبیع بھی مشتری کے حوالہ کردی گئی تو بیع کی تمامیت میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ گیا، اب کالونی بنانے والے کا مشتری سے یہ کہنا کہ ہم نے اس شرط پر تم سے معاملہ کیا ہے کہ اگر تم اس جگہ کو بیچو گے تو ہم ہی خریدار ہوں گے، یہ شرط مقتضاء کے عقد کے خلاف ہے، اس کا اعتبار نہیں ہوگا اور مشتری جس کو چاہے فروخت کرسکتا ہے؛ لیکن اگر شرط کے طور پر نہیں، بلکہ بہ طور وعدہ کالونی بنانے والے کی طرف سے یہ بات آئی ہو کہ اگر بیچنے کا ارادہ ہو تو ہم سے ہی رابطہ کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

''وإن ذكرالبيع بلاشرط ثم شرطاه على وجه المواعدة جازالبيع'' (بحرالرائق کوئٹہ ۸/۶)۔

''ولو بشرط لايقتضيه العقد وفيه نفع لأحد المتعاقدين أو لمبيع يستحق فهو فاسد'' (مجمع الانہر ۳/ ۹۰، فقیہ الأمۃ)

''ولا بيع بشرط لا يقتضيه العقد ولا يلائمه و فيه نفع لأحدهما'' (شامی زکریا ۷/ ۲۸۱/ ۲۸۲)۔

جواب(۱۴): سوال میں خرید وفروخت سے متعلق جو معاملہ لکھا گیا ہے، مثلاً زید نے بکر سے کوئی پلاٹ خریدا اور بکر نے یہ کہا کہ آپ دس قسطوں میں ۲۰۱۶ء تک میرے روپے ادا کردینا، چنانچہ دونوں اس معاملہ پر راضی ہوگئے، اس کے بعد زید نے پانچ یا آٹھ قسطیں ادا کردیں، بقیہ قسطیں ادا کرنے سے زید عاجز و قاصر ہوگیا، اسی حال میں وقت نکل گیا، چنانچہ اب بکر یہ کہتا ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان جو معاملہ ہوا تھا وہ کینسل ہوگیا، اب اگر بعد میں خریدار بقیہ قسطیں ادا کرنا چاہے یا اپنی زمین کا مطالبہ کرے تو اس کو کہہ دینا ہے کہ آپ نے چونکہ میرا روپیہ وقت پر ادا نہیں کیا، اس لیے وہ سودا کینسل ہوگیا اور جتنی رقم قسطوں میں ادا کی گئی تھی اتنی رقم بکر کو واپس کردیتا ہے تو اس کا اس طرح معاملہ کو فسخ کرنا درست ہے، اس لیے کہ یہ اقالہ کی ایک صورت ہے اور اقالہ کرنا درست ہے، شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، اس لیے صورت مسئولہ میں جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ بالکل درست ہے۔

''عن عمروبن عوف عن أبيه عن جده أن رسول الله ﷺ قال: والمسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حرامًا'' (سنن الترمذی أبواب الأحكام باب ماذكر عن رسول الله فى السلم بين الناس (النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱)۔

''الاقالة جائزة فى البيع بمثل الثمن الأول لقوله ''من أقال نادما بيعته، أقال الله عثراته يوم القيامة'. لأن العقد حقهما فيملكان رفعه دفعا لحاجتهما'' (هداية ۳/ ۶۹)۔

جواب(۱۵) (الف): سوال میں جو تفصیل بیان کی گئی ہے کہ دلال زمین کی قیمت کالونی بنانے والے سے معلوم کرلیتا ہے، پھر اس زمین کو اپنی من مانی قیمت پر فروخت کردیتا ہے، اس کے بعد زمین والے کو اس کی بتائی ہوئی قیمت کے برابر قیمت دے دیتا ہے، یہ شکل بالکل درست ہے اور اس کے لیے باقی قیمت کو اپنے پاس رکھ لینا بھی درست ہے، اس لیے کہ اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ دلال نے بائع سے یہ زمین مثلاً: پچاس ہزار روپے میں خریدی ہے اور پھر مشتری کو ساٹھ ہزار روپے میں فروخت کردی ہے، لہٰذا اس صورت میں دلال کو دلال نہیں کہا جائے گا، بلکہ تاجر کہا جائے گا اور یہ معاملہ شرعاً درست ہوجائے گا (مستفاد فتاویٰ قاسمیہ ۲۱ / ۶۵۸)۔

''أنه باعه مرابحة. فإن كان ماشتراه به له مثل جاز سواء جعل الربح من جنس رأس المال الدرهم من الدراهم أو من غير الدراهم من الدنانير، أو على العكس إذا كان معلومًا يجوز به الشراء؛ لأن الكل ثمن...'' (فتح القدير زكريا ۶/ ۴۵۶)۔ ... ''وفي الدلال والسمسار يجب أجرالمثل'' (ہندیہ زکریا قدیم ۴/ ۴۵۰، جدید ۴/ ۴۸۷)۔

سوال نمبر ۱۵ کے دوسرے جز میں یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ دلال کمپنیاں زمین کو بیچ دیتی ہیں؛ لیکن قبضہ نہیں دیتے اور ان کو کہہ دیتے ہیں کہ جب بھی آپ کو بیچنا ہو تو آپ یہ زمین ہم کو ہی واپس کریں گے، کسی اور کو نہیں...... اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بیع مشروط جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں بیع کو واپس کرنے کی شرط لگادی ہے اور یہ شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہے، اس لیے یہ بیع درست نہیں ہوگی۔

ہاں! البتہ اس کے جواز کی ایک شکل یہ ہوسکتی ہے کہ بیع تو بلاشرط کرلی جائے، مگر بعد میں ایک معاہدہ کرلیا جائے کہ آپ یہ زمین ہم کو ہی واپس کریں تو یہ بیع صحیح ہوجائے گی (فتاویٰ محمودیہ ۲۴ /۱۰۱/ ۱۰۲)۔

''وإن ذكرالبيع بلاشرط ثم شرطا على وجه المواعدة جازالبيع ولزم الوفاء'' (تبيين الحقائق ۵/ ۱۸۴، كتاب الاكراه، شامی کراچی ۵/ ۲۷۷ بحوالہ فتاویٰ محمودیہ ۲۴/ ۱۰۱/ ۱۰۲، البحر الرائق کوئٹہ ۶/ ۸)۔

''ولا بيع بشرط لايقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لأحدهما'' (شامی زکریا ۷/ ۲۸۱/ ۲۸۲)۔

''ولو بشرط لا يقتضيه العقد و فيه نفع لأحد المتعاقدين أو لمبيع يستحق فهو فاسد'' (مجمع الأنهر ۳/ ۹۰، مکتبہ فقیہ الأمة)۔ فقط واللہ اعلم

☆☆☆

موجودہ اراضی کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل کے جوابات

مفتی ابصار احمد ندوی[1]

تمہید:

زمین اللہ تعالی کی ایک عظیم نعمت ہے، جو انسانوں کا مسلک ومدفن اور رزق کی فراہمی کا ذریعہ ہے، جس کی عظمت کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ قرآن میں تقریباً دوسو (۲۰۰) مقامات پر زمین کا ذکر ہے، اللہ تعالی نے انسانوں پر اپنے انعامات واحسانات کے ذیل میں اس کا ذکر کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ولقد مکناکم فی الأرض وجعلنا لکم فیہا معایش قلیلاً ما تشکرون" (سورہ اعراف: ۱۰)۔

(ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور اس میں تمہارے لئے سامان زیست فراہم کیا، لیکن تم کم ہی شکریہ ادا کرتے ہو)۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس زمین کے ناجائز حصول کے لئے اسی زمین پر سیکڑوں تنازعات نے جنم لیا ہے، آپسی خوریزی ہوئی ہے، اور مختلف مسائل سے لوگوں کو گذرنا پڑا ہے، مگر جب تک لوگ شریعت سے دور رہ کر اپنے مسائل کو حل کریں گے، وہ مسائل مسائل ہی بنے رہیں گے اور تاقیامت حل نہیں ہوں گے، اس لئے ان مسائل میں شرعی رہنمائی اور ان پر عمل درآمد ضروری ہے، تاکہ لوگ اپنے مسائل حل کرسکیں اور پرامن زندگی گزار سکیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

سوال نمبر (۱) کا جواب/ سرکاری اراضی پر قابض ہونا اور ان کی خرید وفروخت کا حکم:

لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران، غنڈہ عناصر یا کسی کا بھی سرکاری اراضی پر قابض ہونا، انہیں فروخت کرنا، رشوت کے ذریعہ سرکاری عہدہ داروں سے لے آوٹ کروالینا، یہ تمام چیزیں ناجائز اور حرام ہیں، کیونکہ سرکاری اراضی مال عام کا ایک جز ہیں، اور ان میں تمام لوگوں کو برابر انتفاع کا حق ہے، مال عام کسی خاص کا ملک نہیں ہوتا، بلکہ سارے لوگوں کی وہ مشترکہ دولت ہوتا ہے۔

زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے اور اس نے بغیر کسی تمیز اور تخصیص کے زمین اور زمین کی چیزوں کو انتفاع کے لئے پیدا کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ھو الذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعًا" (سورہ بقرۃ: ۲۹)۔ (زمین میں جو کچھ ہے اس نے تمہارے فائدہ کے لئے پیدا کیا ہے)۔

اور "وللہ ملک السموات والأرض وما بینہما وإلیہ المصیر" (سورہ مائدۃ: ۱۸)۔

(آسمانوں وزمین کی ملکیت اللہ ہی کی ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اور اسی کی طرف (تم کو) لوٹ کر جانا ہے)۔

لہذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زمین اور زمین کی فطری چیزوں کا حقیقی مالک اللہ تعالی ہے، اور انتفاع کا حق عامۃ الناس کو ہے، ہاں مصالح کے پیش نظر حاکم وقت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رعیت کے سلسلہ میں مال عام پر تصرف کرے، جیسا کہ علامہ ابن نجیمؒ رقمطراز ہیں:

"تصرف الإمام علی الرعیة منوط بالمصلحة" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم/ ۱۲۳)۔
یعنی رعیت کے امور میں مال عام میں امام مصلحت کے مطابق تصرف کرسکتا ہے۔

یا جائز انفرادی حق کے ذریعہ اس کو حاصل کیا ہو جیسے میراث، ہبہ، وصیت، تبادلہ کے عقود وغیرہ۔

ان جائز صورتوں کے علاوہ مال عام کو ذاتی ملکیت بنالینا ظلم وعدوان، اللہ کے مال میں ناجائز تصرف، حقوق العباد کی پامالی اور خیانت ہے،

[1] چترپور، رام گڑھ، جھارکھنڈ۔

دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ سرکاری اراضی مال عام میں سے ہیں، اور ان میں انتفاع کا حق ہر ایک کو یکساں ہے، لہذا انتفاع کو اپنے لئے مخصوص کرنا گویا دوسروں کے حق کو فوت کرنا اور ظلم ہے، کیونکہ اس میں دوسروں کا حق مارا جاتا ہے اور دوسروں کا حق مارنا گناہ اور عدوان میں تعاون کرنے کے مترادف ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قول ہے: "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲) (گناہ اور ظلم وزیادتی کے کام میں تعاون نہ کرو)۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل...." (سورہ بقرہ: ۱۸۸) (اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناروا طریقہ سے نہ کھاؤ)۔

قرآن کی اس آیت میں واضح دلیل موجود ہے کہ لوگوں کے مال کو باطل طریقہ سے کھانا جائز نہیں ہے، ناحق طریقہ سے کھانا ناجائز اور حرام ہے، اور چونکہ سرکاری اراضی میں عوام الناس کو انتفاع کا حق حاصل ہے، اس انتفاع کے حق کو چھین لینا اور اپنے لئے خاص کر لینا باطل طریقہ پر لوگوں کا مال کھانا ہے، اس لئے بھی ایسا طریقہ حرام ہے۔

(۳) امام بخاریؒ کی روایت ہے: ''عن خولة الأنصارية قالت سمعت النبي ﷺ يقول: إن رجالًا يتخوضون في مال الله بغير حق فلهم النار يوم القيامة'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۳۱۱۸، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۳۱۸)۔

(حضرت خولہ انصاریہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ کچھ لوگ اللہ کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے قیامت کے دن جہنم کی آگ ہے)۔

چونکہ سرکاری زمین کا مالک اصلاً اللہ ہے، انتفاع کا حق عوام الناس کو ہے، اب اسے اپنے لئے خاص کر لینا ناحق حاصل کرنا ہے اور یہ اللہ کے مال میں ناجائز تصرف ہوگا، ایسے لوگوں کے لئے جہنم کی وعید ہے، اس لئے بھی سرکاری زمین پر قابض ہونا اور اس کی خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے۔

(۴) مال غنیمت مال عام میں سے ہوتا ہے، جس کی شرعی تقسیم عمل میں لائی جاتی ہے، کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس مال عام میں سے ذرہ برابر بھی از خود لے لے، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو مال عام میں خیانت کرتا ہے اور ایسے شخص کے لئے جہنم کی وعید ہے، چنانچہ قرآن واحادیث میں اس تعلق سے سخت وعیدیں ہیں، اور مال غنیمت کو اپنے طور پر لے لینا مال عام ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔

سرکاری زمین بھی مال عام کی ایک صنف ہے، اور اسے اپنے طور پر لے لینا مال عام میں خیانت کرنا ہے، ایسے شخص کے لئے وہی وعیدیں ہیں جو اوپر گزریں، اس لئے بھی سرکاری اراضی پر قابض ہونا اور ان کی خرید وفروخت حرام ہے۔

سوال نمبر (۲) کا جواب/ اوقاف کی زمین غصب کرنا اور اس سے متعلق احکام:

اوقاف کی زمین غصب کرنا حرام ہے، کیونکہ موقوفہ چیزیں کسی انسان کی ملکیت نہیں ہوتیں، بلکہ وہ انسان کی عارضی ملکیت سے بھی نکل کر اللہ کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ درمختار میں ہے:

''فإذا تم ولزم لا يُملك ولا يملك ولا يعار ولا يرهن'' (الدر المختار ۴/ ۳۵۱)۔

''لا يملك أن لا يكون مملوكًا لصاحبه ولا يملّك أي لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه'' (رد المحتار ۷/ ۲۰۹)۔

یعنی وقف جب مکمل ہو جائے تو پھر واقف اس کا مالک ہو سکتا ہے، نہ دوسرے کو بیع وغیرہ کے ذریعہ سے ملکیت حاصل ہو سکتی ہے۔

اور ظاہر ہے انسان جب عارضی طور پر کسی چیز کا مالک ہوتا ہے (حقیقی مالک اللہ ہے) تو ایسی صورت میں غصب کرنا جائز نہیں تو پھر جو چیز انسان کی ملکیت ہی میں نہیں اس کا غصب کرنا کس قدر جرم ہوگا، یہی وجہ ہے کہ موقوفہ چیز کو بیچنا، ہبہ وغیرہ کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

''تصدق بأصله لا يباع ولا يوهب ولا يورث ولكن ينفق ثمره'' (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۲۶۱۳-۲۷۶۴)۔

یعنی حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اس کی اصل کو صدقہ کر دو (یہ کنایہ ہے وقف سے)، اس کی نہ تو خرید وفروخت ہو سکتی ہے، نہ اسے ہبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہو سکتی ہے، ہاں اس کے پھل (آمدنی) کو خرچ کیا جائے گا۔

باوجود اس کے اگر کوئی شخص غصب کرتا ہے تو اسے موقوفہ زمین کو لوٹانا واجب ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

"علی الید ما أخذت حتی تؤدی" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۳۵۶۳، مسند احمد: ۲۰۶۶۴، سنن الترمذی: ۱۲۶۶)۔

(ایسے ہاتھ پر واجب ولازم ہے جس نے ناجائز کوئی چیز لی ہو، وہ اسے لوٹا دے)۔

اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، جیسا کہ موسوعہ فقہیہ کویتیہ (اردو) میں ہے:

"چہارم: غصب اور ضمان

اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ جو شخص کسی آدمی کا مال غصب کرلے تو وہ اس کا ضامن قرار پائے گا، پھر اگر غصب کی ہوئی چیز موجود اور اپنی حالت پر قائم ہو تو غاصب پر اس کے عین کو واپس کرنا لازم ہوگا، بشرطیکہ اس میں ایسا عیب داخل نہ ہو جائے جو اس کی منفعت کو کم کردے، اس لئے کہ حضرت سمرہ بن جندب ؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "علی الید ما أخذت حتی تؤدی" (انسان پر وہ واجب ہے جو وہ لے، یہاں تک کہ اسے ادا کردے)" (الموسوعۃ الفقہیہ (اردو) باب مثلیات ۳۶/۱۵۷)۔

لہذا اوقاف کی زمینوں کو غصب کرنا بہت بڑا جرم ہے اور ان کو لوٹانا واجب ولازم ہے۔

اب اگر کوئی شخص موقوفہ زمین کو لوٹاتا نہیں ہے، تو وہ عند اللہ بڑا مجرم ہوگا، اور ایسے شخص سے اس زمین کو خریدنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ موقوفہ زمین بغیر کسی مصلحت حقیقی کے نہ تو بیچی جاسکتی ہے اور نہ ہی خریدی جاسکتی ہے، اور ایسی صورت تو اور سنگین ہوجاتی ہے جب کہ موقوفہ زمین کو غصب کرلیا گیا ہو اور پھر اسے بیچا یا خریدا جاتا ہو، خریدنے والا اگر یہ جانتے ہوئے خرید رہا ہے کہ یہ موقوفہ اور مغصوبہ زمین ہے تو وہ بھی اس جرم میں برابر شریک ہوگا اور ایسی بیع باطل ہوگی۔

سوال نمبر (۳) کا جواب:

وراثت کی شرعی تقسیم ایک دینی فریضہ ہے، جس طرح نماز، روزہ، زکوۃ وغیرہ فرض ہیں اسی طرح وراثت کی شرعی تقسیم بھی فرض ہے۔

جو شخص مستحق وارث کو میراث نہیں دیتا وہ عند اللہ مبغوض ہے اور ایسے شخص کے لئے رسوا کن عذاب ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے:

"عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله ﷺ من فرّ من ميراث وارثه. قطع الله ميراثه من الجنة يوم القيامة" (سنن ابن ماجه، كتاب الوصايا رقم الحديث: ۲۷۰۲)۔

(حضرت انس ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو اپنے وارث کی میراث سے راہ فرار اختیار کرے گا، اللہ تعالی قیامت کے دن جنت کی میراث سے اس کو محروم کردے گا)۔

یہ انتہائی سخت وعید ہے، اس لئے تمام لوگوں کے لئے لازم ہے کہ میراث کی تقسیم شرعی طور پر عمل میں لائیں، بسا اوقات میراث میں عورتوں کو ان کا حصہ نہیں دیا جاتا اور یہ متصور کیا جاتا ہے کہ وہ لینا نہیں چاہتیں، اس تعلق سے صرف تصور کرلینا یا کسی طرح کے دوسرے بہانے کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ کوئی عورت صراحتاً لینے سے انکار کردے تو پھر اس کو ہبہ تصور کیا جائے گا، لیکن اگر وہ کچھ عوارض کی بنا پر کچھ نہیں کہتی، تو دوسرے وارثین رجال پر لازم ہے کہ اس کی رائے واضح طور پر معلوم کرے، نیز بوقت تقسیم تمام شرکاء یا ان کے وکیل کا ہونا لازم ہے، ورنہ کسی ایک کی بھی عدم موجودگی میں تقسیم صحیح نہیں ہوگی، جیسا کہ درر الحکام میں ہے:

"يشترط في لزوم ونفاذ قسمة الرضاء رضاء كل واحد من المتقاسمين. بناء عليه إذا غاب أحد المتقاسمين ولم يكن له نائب وقسّم الحاضرون وأفرزوا حصة الغائب فلاتصح قسمة الرضاء أي لا تكون لازمة" (درر الحکام ۳/۱۲۷، فتاوی الشبکۃ الاسلامیہ ۱۴/۱)۔

(رضامندی کے ساتھ ہونے والی تقسیم کے نافذ اور لازم ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ تقسیم کرنے والے میں سے ہر ایک راضی ہو، اس بنا پر یہ کہا جائے گا کہ اگر ان میں سے کوئی غائب ہو اور اس کا کوئی نائب وکیل بھی موجود نہ ہو، ایسی صورت میں حاضرین تقسیم کرلیں اور غائب کا حصہ بھی الگ کردیں تو رضامندی کی یہ تقسیم درست نہیں ہوگی، یعنی لازم نہیں ہوگی (ہاں اگر غائب اس تقسیم پر راضی ہوجائے تو لازم ہوجائے گی)۔

الغرض تمام وارثین کا یا ان کے وکلاء کا تقسیم کے وقت موجود ہونا لازم ہے، خواہ وارثین میں سے کوئی عورت ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ نہیں لینا چاہتی تو اسکی صراحت لازم ہے، بصورت دیگر اس کو غصب تصور کیا جائے گا، اس تعلق سے فتاوی شبکۃ اسلامیہ میں ہے:

"إن الغصب نوعان: غصب استيلاء وغصب استحياء، فغصب الاستيلاء أخذ الأموال على جهة القهر والغلبة، وغصب الاستحياء هو أخذه بنوع من الحياء، وبما حرامان، لأنه لافرق بين الإكراه على أخذ الأموا ل بالسياط الظاهرة وبين أخذه بالسياط الباطنة" (فتاوى الشبكة الاسلاميه، حرمة غصب الاستحياء ۱۲/ ۸۱۲۸)۔

(یعنی غصب کی دو قسمیں ہیں: (۱) بہ طور جبر وتسلط غصب، (۲) بہ طور شرم وحیاء غصب، بہ طور جبر وتسلط غصب یہ ہے کہ کسی کا مال اس کو دبا کر اور اس پر غالب ہو کر لے لیا جائے، اور بہ طور شرم وحیاء غصب یہ ہے کہ کسی کا مال اس کی حیاء کی وجہ سے لے لیا جائے، اور یہ دونوں حرام ہیں، کیونکہ ظاہری کوڑے (یعنی دبا کر) کے ذریعہ مال لینے اور باطنی کوڑے (یعنی شرم کی وجہ سے) کے ذریعہ مال لینے میں کوئی فرق نہیں ہے)۔

غصب کی مذکورہ دونوں صورتوں میں لازم ہے کہ حق دار وارث کو اس کا پورا پورا حق دیا جائے، کیونکہ غصب کا لوٹانا واجب ہے، حق دار وارث اگر مر چکا ہو تو اس کے وارثین کو حق دینا ہوگا، لہذا اگر بالفرض باپ نے اپنی بہنوں (پھوپھیوں) یا دادا نے اپنی بہنوں کو حصہ نہیں دیا تھا تو مورث کے بیٹوں اور پوتوں پر لازم ہے کہ اگر ان کی پھوپھیاں یا دادا کی بہنیں موجود ہوں تو ان کو ان کا حق دے دیں، تا کہ عند اللہ گناہ میں تعاون کرنا لازم نہ آئے، اور اگر وہ مر گئی ہوں تو ان کے وارثین کو دے دیں۔

لیکن اگر بیٹا یا پوتا حق داروں کو حق نہیں دیتا ہے تو وہ بھی گناہ میں شریک ہے، لہذا صورت مسئولہ میں بیٹوں یا پوتوں سے ان کی ایسی زمینوں کو نہ خریدنا اولی ہے، کیونکہ اس کے مال میں اشتباہ ہے کہ آیا زیادہ حصہ حلال کا ہے یا حرام کا، اور اشتباہ کے کام سے بچنا ہی چاہئے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

"عن النعمان بن بشير قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: إن الحلال بين وان الحرام بين وبينهما مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام كالراعي يرعى حول الحمى يوشك أن يرتع فيه" (صحيح مسلم، رقم الحديث: ۴۱۷۸، مسند احمد، رقم الحديث: ۱۸۳۷۴)۔

(حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جن کو بہت سارے لوگ نہیں جانتے ہیں، لہذا جو مشتبہ چیزوں سے بچے گا گویا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا، لیکن جو مشتبہ چیزوں میں پڑ جائے وہ حرام میں پڑ سکتا ہے، جیسے چرواہا ممنوعہ چراگاہ کے ارد گرد (اپنے جانوروں کو) چرائے، تو ہو سکتا ہے کہ اس کے جانور اس چراگاہ میں چرنے لگیں)۔

نیز اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کا اکثر حصہ حلال ہے، تو ایسی موروثی زمین کا خریدنا حلال اور جائز ہوگا، اور اگر یہ پتہ چل جائے کہ اس کا اکثر حصہ حرام ہے تو اس کا خریدنا مکروہ تحریمی ہوگا، اور اگر اس میں اشتباہ ہو تو نہ خریدنا اولی ہے، حنفیہ کا مسلک ہدیہ کے مال کے سلسلہ میں یہی ہے (الفتاوی الهندیہ، باب فی الہدایا والضیافات ۵/ ۳۴۲)۔

سوال نمبر (۴) کا جواب/حرام آمدنی کے ذریعہ خریدی ہوئی زمین کا خریدنا اور اس کا حکم:

حرام آمدنی کے ذریعہ خریدی ہوئی زمین کو اگر کوئی شخص باوجود علم کے خریدتا ہے تو وہ گناہ گار ہے، اور ایسی زمین کا خریدنا (اس کی حالت کے معلوم ہوتے ہوئے) ناجائز اور حرام ہے، دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ یہ گناہ کے کام میں تعاون ہے اور گناہ کے کام میں تعاون کرنا حرام ہے، جیسا کہ قرآن کی آیت ہے: "ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲) (گناہ اور ظلم وزیادتی کے کام میں تعاون نہ کرو)۔

۲۔ حرام آمدنی کے ذریعہ خریدی ہوئی زمین کو خریدنے کی صورت میں حرام کمائی والے کی حوصلہ افزائی ہوگی، اس لئے اس سے بچنا لازم ہے۔

۳۔ جو چیز حرام ہے اس کی قیمت لینا بھی حرام ہے، صورت مسئولہ میں حرام کمائی کی زمین حرام ہے، اس لئے اس کی قیمت لینا بھی حرام ہوگا۔

لہٰذا اگر مال مبیع (زمین) کا حرام مال سے خریدنا معلوم ہو تو اس کا دوسرے کے لئے خریدنا بھی حرام ہوگا، لیکن اگر شک ہو تو مکروہ تنزیہی ہے اور نہ خریدنا افضل ہے، جیسا کہ حنابلہ کا مسلک ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ فرماتے ہیں:

''فإن علم أن المبيع من حلال ماله فهو حلال وإن علم أنه حرام فهو حرام، لأن الظاهر أن ما في يد الإنسان ملكه، فإن لم يعلم من أيهما هو، كرهناه لاحتمال التحريم فيه، ولم يبطل البيع لإمكان الحلال قل الحرام أو كثر'' (الموسوعة الفقهيه الكويتيه باب معاملة من غالب ماله حرام ۳۱/ ۱۲۹، المغني لابن قدامه ۴/ ۳۳۳)۔

(اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مبیع اس کے حلال مال سے ہے تو وہ حلال ہے، اور اگر یہ معلوم ہو کہ وہ حرام ہے تو وہ حرام ہوگا، اس لئے کہ ظاہراً جو انسان کے قبضہ میں ہو وہ اس کی ملکیت ہوتی ہے، اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ مبیع حلال وحرام میں سے کس میں سے ہے تو اس میں تحریم کے احتمال کی وجہ سے ہم نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، اور بیع باطل نہ ہوگی، اس لئے کہ حلال کا بھی امکان ہے، خواہ حرام کم ہو یا زیادہ)۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

''ایسے شخص کے ساتھ معاملہ کرنے کا مسئلہ جس کا اکثر مال حرام ہو، اگر عین حرام معلوم نہ ہو تو اصح قول کی رو سے اس کے ساتھ معاملہ کرنا حرام نہ ہوگا لیکن مکروہ ہوگا، اور یہی حکم بادشاہ کے عطایا لینے کا ہے، جبکہ اس کے قبضہ میں زیادہ حرام مال ہو۔ جیسا کہ شرح مہذب میں ہے کہ اس سلسلہ میں مشہور مکروہ ہونا ہے، نہ کہ تحریم برخلاف امام غزالی کے'' (الاشباہ والنظائر للسیوطی ۱/ ۱۰۷)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر مبیع کو بائع نے مکمل حرام مال سے خریدا ہے تو پھر اس کا خریدنا حرام ہوگا لیکن اگر اس میں حلال وحرام دونوں کا امکان ہو تو اس مبیع کا خریدنا مکروہ ہے، لیکن ایسے مال کا نہ خریدنا اولیٰ ہے۔

سوال نمبر (۵) کا جواب / پلے گراؤنڈ، سوئمنگ پل وغیرہ کی زمین بیچنے اور خریدنے کا حکم:

حکومت کے قانون کے مطابق جو لے آوٹ منظور ہوتا ہے اس کی پابندی لازم ہے، حکومت کے قانون کے برخلاف راستوں کی چوڑائی کم کرکے بیچ دینا، پلے گراؤنڈ اور سوئمنگ پل وغیرہ کی جگہ بیچ دینا ناجائز ہے، اور ایسا کرنے والا سخت گناہ گار ہے۔

اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ حکومت کے قانون کے مطابق راستوں وغیرہ کے تعلق سے جو لے آوٹ منظور ہوتا ہے وہ عوامی مفادات کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے، اور عوامی مفادات کی بحالی لازم ہے، اور یہ بھی بھلائی کے کام میں تعاون ہے، اس میں خالق کی معصیت نہیں، بلکہ انسانوں کے مفادات مضمر ہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی مفادات کے پیش نظر راستوں کی چوڑائی سات گز مقرر کی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

''عن أبي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: اجعلوا الطريق سبعة أذرع'' (سنن الترمذی حدیث نمبر: ۱۳۵۵، مسند احمد حدیث نمبر: ۱۰۲۷۳) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راستوں کی چوڑائی سات گز رکھو)۔

لہٰذا یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مصلحت عامہ کے پیش نظر سڑکوں وغیرہ کی چوڑائی طے کرے اور اس میں حکومت کی اطاعت لازم ہے۔

۲۔ یہ ایک طرح سے عوامی مفادات کی چوری ہے، کیونکہ اس میں عوام کا مفاد مضمر ہے، یہ کسی ایک کی جاگیر نہیں ہوئی، بلکہ وہاں لینے والے تمام لوگوں کا اس میں حق ہوتا ہے، اور اس کا ناجائز استعمال کرنا اور بیچ دینا گویا عوام الناس کی حق تلفی ہے، اور حقوق العباد میں کوتاہی بلکہ حق تلفی بڑا جرم ہے جس میں معافی کی امید نہیں، جیسا کہ مفتی تقی عثمانی صاحب نے اپنے ایک مضمون ''سڑکوں کا ناجائز استعمال'' میں لکھا ہے کہ ''جو چیزیں سرکاری املاک کہلاتی ہیں، ان کے بارے میں واقعی ''مال مفت دل بے رحم'' کی مثل صادق آتی ہے، ان پر قبضہ کر لینا، ان کو خلاف قانون استعمال کرنا یا بے دردی سے استعمال کرنا، ایسی عام بات ہوگئی ہے جس پر ہر کوئی چشم پوشی کرتا ہے، حالانکہ سرکاری اشیاء برسر اقتدار افراد کی نہیں، پوری قوم کی ملکیت ہوتی ہیں اور ان کا ناجائز استعمال صرف کسی ایک شخص کی نہیں سارے عوام کی حق تلفی ہے، اور یہ حقوق العباد کا اس قدر نفی ہے کہ اس میں اگر کوئی حق تلفی ہو جائے تو اس گناہ کی معافی انتہائی مشکل ہے''۔
اس لئے ہم کہیں گے کہ بیچنے والا کسی ایک کا حق نہیں مارتا، بلکہ دسیوں اور سیکڑوں لوگوں کے حقوق کو مارتا ہے، اور یہ بڑا جرم ہے۔

۳۔ یہ عوام الناس کی ملکیت کا غصب بھی ہے اور غصب حرام ہے، مال عام اور غصب کے تعلق سے دلائل ماقبل میں گذر چکے ہیں، اس لئے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کو فروخت کرنے والا غاصب اور ان زمینوں کو خریدنے والے غصب میں شریک ہیں۔

۴۔ اس عمل سے دوسروں کو تکلیف دینا لازم آتا ہے اور دوسروں کو تکلیف دینا حرام ہے، اللہ کو ایسے لوگ محبوب ہیں جو اللہ کی مخلوق کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، چنانچہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''الخلق عيال الله فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله'' (شعب الايمان للبيهقي حديث نمبر: ۷۴۴۸، كنز العمال حديث نمبر: ۱۶۱۷۱)۔

(مخلوق اللہ کی عیال ہے، لوگوں میں اللہ کا سب سے محبوب اور پسندیدہ وہ ہے جو اس کے عیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے)۔

اسلام میں راستوں سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا صدقہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے بارے میں خبر دی ہے جس نے راستہ سے کانٹے دار ٹہنی ہٹادی تھی تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو تو اللہ تعالی نے اس کے گناہوں کو معاف کردیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''بينما رجل يمشي بطريق وجد غصن شوك على الطريق فأخره، فشكر الله له، فغفر له'' (صحيح البخاري، حديث نمبر: ۶۵۲، صحيح مسلم، حديث نمبر: ۶۸۳۵)۔

(ایک شخص راستہ پر چلا جارہا تھا، اسے راستہ میں ایک کانٹے دار ٹہنی ملی، اس نے اس کو ہٹادیا، اللہ نے اس کے اس عمل کو قبول کیا اور اس کی مغفرت فرمادی)۔

۵۔ جو لوگ ایسی زمینوں کو خریدتے ہیں، ان کی صحت متاثر رہتی ہے، اور دیکھا جاتا ہے کہ آئے دن ان میں جھگڑے ہوتے ہیں، ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو تکلیف دیتا ہے، پڑوسی کو تکلیف دینا اللہ کو تکلیف دینا ہے، جیسا کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''من اذى جاره فقد اذاني ومن اذاني فقد اذى الله'' (كنز العمال، في حق الجار، حديث نمبر: ۲۴۹۲۷)۔

(جس نے اپنے پڑوسی کو تکلیف دی، اس نے مجھے تکلیف دی، اور جس نے مجھے تکلیف دی گویا اس نے اللہ کو تکلیف دی)۔

۶۔ بالعموم پلاٹ کی قیمت کے ساتھ راستہ، پلے گراؤنڈ، سوئمنگ پل وغیرہ کی قیمت شامل ہوتی ہے، پھر بیچنے والے کے لئے دوبارہ اس کی قیمت لینا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ خلاصہ یہ ہے کہ ایسی زمینوں کو فروخت کرنا اور دوسرے لوگوں کا جانتے ہوئے انہیں خریدنا جائز نہیں ہوگا۔

البتہ مسجد کے تعلق سے تھوڑی تفصیل ہے:

اگر سرکاری اور قانونی طور پر مسجد کی تعمیر لازمی ہو تو مسجد تعمیر کرنا لازمی ہے، لیکن اگر کالونی بنانے والا محض ترغیب کے لئے مسجد کی جگہ مقرر کرتا ہے، حالانکہ اس زمین کی قیمت دوسرے پلاٹ میں شامل نہیں کی ہے، اور اسے فروخت کرتا ہے تو اسے فروخت کرنا جائز ہے اور دوسرے لوگوں کا اسے خریدنا بھی جائز ہے، کیونکہ محض قول وقرار یا نقشہ میں مسجد دکھانے سے کوئی زمین مسجد نہیں ہوجاتی، جب تک کہ اس کو وقف نہ کردیا جائے اور اس میں نماز کی اجازت نہ دے دی جائے، جیسا کہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں: ''ويزول ملكه عن المسجد والمصلى بالفعل وبقوله جعلته مسجدًا، وشرط محمد الصلاة فيه بجماعة وقيل: يكفي واحد وجعله في الخانية ظاهر الرواية'' (الدر المختار ۴/ ۳۵۵)۔

(وقف کرنے والے کی ملکیت مسجد اور مصلی سے ختم ہوجائے گی جب کہ اس میں عملاً نماز ہو (امام یوسفؒ کے) نزدیک یہ کہنا کافی ہے کہ) میں نے اسے مسجد قرار دیا، امام محمدؒ اس میں جماعت کے ساتھ نماز کی شرط لگاتے ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک شخص کا نماز پڑھنا کافی ہے، اور اسی آخری قول کو فتاوی خانیہ میں ظاہر الروایہ قرار دیا گیا ہے)۔

اس لئے عملاً اس میں کم از کم ایک آدمی کا نماز پڑھنا لازم ہے، ورنہ وہ مسجد تصور نہیں کی جائے گی۔

سوال نمبر (۶) کا جواب / کالونی میں گارڈن کی جگہ مسجد تعمیر کرنے کا حکم:

قانونی اعتبار سے کالونی میں گارڈن اور پلے گراؤنڈ رکھنا ضروری ہے، اس لئے کالونی بنانے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ اس قانون کو روبہ عمل لائے، یہ قانون وہاں رہنے والوں کی صحت اور دیگر سہولیات کا خیال رکھ کر بنایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ایک اچھا کام ہے اور اچھے کام میں حتی الامکان تعاون کرنا چاہئے، اس

لئے کالونی بنانے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ حکومت کے اس قانون کو عملی جامہ پہنائے، یہ بھلائی کے کام میں تعاون بھی ہوگا۔

زمین بیچنے والے یا کالونی بنانے والے کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ گارڈن یا پلے گراونڈ کی زمین کو مسجد کے لئے دے دے، پھر بھی وہ اگر ایسا کرتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ کیا کالونی میں بسنے والے سب کے سب مسلمان ہیں، اگر سب مسلمان ہوں اور سب بالاتفاق مسجد بنانے کے لئے راضی ہوں تو مسجد بنائی جاسکتی ہے جبکہ صحت کے اعتبار سے کوئی خلل نہ ہو، اور اگر کالونی میں مسلمان کے علاوہ غیر مسلم افراد بھی ہوں اور وہ راضی نہ ہوں تو پھر مسجد بنانا درست نہیں، اور ایسی مسجد شرعی تصور نہیں کی جائے گی، کیونکہ یہ مشترکہ زمین ہے اور مشترکہ زمین میں ہر ایک کی اجازت لازم ہے، ہاں ہر ایک شخص اجازت دے دے اور اپنا حصہ مسجد کے لئے وقف کردے تو مسجد بنانا درست ہے، جیسا کہ ملک مشاع کے وقف کا مسئلہ ہے۔

سوال نمبر (۷) کا جواب/ملکی قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر کالونیاں بنانے اور پلاٹ فروخت کرنے کا حکم:

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں قانونی تقاضوں سے گزر کر کالونیاں بنانا اور غریبوں کے لئے ان میں پلاٹ خریدنا انتہائی دشوار ترین مرحلہ ہے، کیوں کہ جگہ جگہ یہاں رشوت ستانی کا بازار گرم رہتا ہے، اس پر مزید ٹیکسز ادا کرنا توستم بالائے ستم ہے، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ وہ غریبوں کو مدنظر رکھ کر ایسے قوانین لائے جن سے غریبوں کو مکان میسر ہوسکے، ٹیکسوں کا ظالمانہ نظام ختم ہو، رشوت لینے والوں اور دینے والوں پر قانونی کارروائی ہو، کیونکہ یہ سب حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، غریبوں کو مکان فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے، تاکہ غریب ذمہ دار شہری کی طرح زندگی گزار سکے اور عزت کے ساتھ اپنے گھر میں رہ سکے۔ لیکن جہاں تک قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بعد کالونیاں بنانے اور پلاٹ فروخت کرنے کا مسئلہ ہے تو اس میں حکومت کے ذریعہ بنائے گئے قوانین کی اطاعت کرنی چاہئے، کیونکہ یہ دنیاوی امور ہیں اور دنیاوی امور میں غیر مسلم حاکم کی اطاعت درست ہے، بلکہ ملکی قوانین کی اطاعت لازمی ہے جب تک کہ کوئی معصیت نہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

''وأن تناصحوا من ولّاه الله أمركم'' (مسند احمد عن أبي هريرة حديث نمبر: ۹۰۳۴، موطأ مالك حديث نمبر: ۱۸۳۲)۔

(اللہ نے جن کو تمہارے معاملات کا حاکم بنایا ہے ان کے ساتھ خیرخواہی کرو)۔

اور ظاہر ہے کہ قانونی تقاضوں کی تکمیل حکام کے ساتھ خیرخواہی ہے، اس لئے ایک مسلمان کو تو ضرور اس کی پاسداری کرنی چاہئے، جہاں تک قانونی تقاضوں کی تکمیل میں عہدہ داروں کو رشوت دینے کی بات ہے، تو اس کے خلاف پُرزور اور پرقوت آواز اٹھانی چاہئے اور ایسے عہدہ داروں کے خلاف قانونی کارروائی بھی کرنی چاہئے۔

قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر کالونیوں کی تعمیر میں بالعموم پولیس اور متعلقہ محکمہ کو رشوت دینا پڑتا ہے، اور ایسی صورت میں رشوت دینا حرام ہے، کیونکہ اس میں پلاٹ خریدنے والے یا کالونی میں مکان لینے والے کا کوئی حق متعلق نہیں ہوتا ہے، کالونی ہی میں سکونت اختیار کرنا ضروری نہیں ہے، جہاں آدمی حلال طریقہ پر رہ سکتا ہے وہیں سکونت اختیار کرنی چاہئے، ہاں اگر حق متعلق ہو تو جمہور کے نزدیک رشوت دے سکتے ہیں، جیسا کہ الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ (اردو) میں ہے کہ ''جمہور کے نزدیک آدمی کسی حق کی حصولیابی یا ظلم یا نقصان کے ازالہ کے لئے رشوت دے سکتا ہے، اس کا گناہ رشوت لینے والے پر ہوگا، دینے والے پر نہیں'' (الموسوعۃ الفقہیہ (اردو) ۲۲/ ۲۶۴)۔

الغرض یہاں پر کوئی مذکورہ صورت نہیں ہے، اس لئے رشوت دینا حرام ہے، اور بغیر قانونی تقاضوں کی تکمیل کے پلاٹ خریدنا اور بیچنا اور کالونی بنانا درست نہیں ہے۔

سوال نمبر (۸) کا جواب:

زیادہ سے زیادہ کمانے کی ہوس انسان کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے اور ایسا شخص نہ دنیا کا رہتا ہے اور نہ دین کا۔

سوال یہ ہے کہ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد پلاٹ خریدنے کے لئے وہائٹ منی (White Money) دکھانا کیوں دشوار ہے؟ اپنی مکمل آمدنی کا ٹیکس ادا کرنے کے بعد وہائٹ منی دکھانے میں دشوری سمجھ سے بالاتر ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ آدمی اپنی کل آمدنی ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور ٹیکس سے بچنا چاہتا ہے، یہ ٹیکس کی چوری ہے، اور ٹیکس کی چوری اور اس سے راہ فرار اختیار کرنا جائز نہیں، کیونکہ ٹیکس مفاد عامہ، دفاع اور دیگر امور سلطنت کے اخراجات کے لئے ادا کرنا

ہوتا ہے، اور اس میں حکومت کی مدد کرنی چاہئے، جیسا کہ حدیث ماقبل میں گزری، اس لئے اس کا تقاضا ہے کہ پورا پورا ٹیکس ادا کیا جائے۔

ہاں اگر ٹیکس ظالمانہ ہو، تو اس کے خلاف مؤثر آواز اٹھانی چاہئے۔

الغرض پیسے ہونے کے باوجود قانونی دشواریوں سے بچنے کے لئے سودی قرض (Loan) نہیں لیا جاسکتا ہے، اور نہ ہی اس طرح سے زمین خریدنا درست ہے اور نہ کالونی بنانا، کیونکہ اس میں دو بڑی خرابیاں ہیں: ایک سود جیسے گناہ کا ارتکاب بغیر کسی اضطرار کے، دوسری ٹیکس سے راہ فرار اختیار کرنا۔

سوال نمبر (۹) کا جواب/ پلاٹس کا نقشہ بننے اور حدود اربعہ کی تعیین کے بعد زمین کی خرید وفروخت کا حکم:

صورت مسئولہ میں صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجائے گی، اور خرید وفروخت کا عمل درست ہوگا، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ مبیع کی مقدار مثلاً گز وغیرہ، اور قیمت متعین کردی جائے۔ البتہ فروخت کرنے والے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس جگہ کو تبدیل کردے یا نقشہ میں پلاٹ کا جو نمبر دکھایا گیا ہے، اس کو کسی اور جگہ ڈال دے، اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) مبسوط میں علامہ سرخسی رقمطراز ہیں: ''وإذا قال الرجل للرجل بعتك هذه الدار، كل ذراع بدرهم على أنها ألف ذراع، فهو جائز، لأن ببيان جملة الذرعان يصر جملة الثمن معلومًا، ولأنه سمى بمقابلة كل ذراع درهمًا'' (المبسوط للسرخسی، کتاب الشروط ۲۳/ ۴۲۴)۔

(اگر ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا: میں نے اس گھر کو تجھ سے بیچا، ہر گز ایک درہم کے بدلہ، اور اس کی مکمل پیمائش ایک ہزار گز ہے تو یہ بیع جائز ہے، کیونکہ گز کی مکمل تعداد بیان کرنے کے ساتھ کل قیمت بھی معلوم ہوجائے گی، اور اس وجہ سے بھی کہ اس نے ہر گز کے مقابلہ میں ایک درہم کا ذکر بھی کردیا ہے)۔

(۲) زمین جائیداد وغیرہ میں اگر نقشہ تیار ہوگیا ہو، مبیع کے حدود اربعہ بھی متعین ہوں، کسی طرح ضرر یا دھوکہ کا اندیشہ نہ ہو تو پھر خرید وفروخت کا عمل درست ہے، شرط یہ ہے کہ اس کو عرفاً قبضہ سمجھا جاتا ہو، چنانچہ دار العلوم دیوبند سے اسی طرح کے ایک مسئلہ میں فتویٰ دیا گیا ہے:

''عقار (جائیداد) میں منقولات کی طرح قبضے کی شرط نہیں ہے، بلکہ جائیداد میں اگر عرفاً نقشہ تیار ہونے اور مبیع کے حدود اربعہ کے متعین ہونے کے بعد بایں طور کہ اس میں ضرر یا غرر کا اندیشہ نہ ہو، بائع کی جانب سے قبضہ دلانا سمجھا جاتا ہو تو مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا''۔

(دیکھئے دیوبند فتویٰ آن لائن، سوال وجواب نمبر: ۱۴۵۸۳۸)۔

الغرض پلاٹ کا نقش تیار ہو، حدود اربعہ کی تعیین بھی ہو، زمین کے ہر ایک ٹکڑے کا نمبر بھی ہو، اور اس کو عرف عام میں قبضہ بھی سمجھا جاتا ہو تو اس کی خرید وفروخت درست ہے۔

لیکن نقشہ میں دکھائے گئے پلاٹ کو بدل کر دوسرا پلاٹ دینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ نقشہ میں جو پلاٹ دکھایا گیا تو پھر وہ متعین ہوگیا، اور متعین شئی کو بدل دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ مبیع مجہول ہوگیا، اور مجہول شئی کی بیع درست نہیں ہے، نیز ایسی صورت میں نزاع بھی ہوگا، کیونکہ قیمتیں جگہ کے اعتبار سے بدلتی ہیں، نیز اس میں مشتری کو دھوکہ دینا بھی ہے اور بیع میں دھوکہ اور غرر جائز نہیں ہے، لہذا بائع کو چاہئے کہ نقشہ میں جو پلاٹ جیسا دکھایا گیا ہے ویسا ہی مشتری کو حوالہ کرے، بصورت دیگر مشتری کو اختیار ہے کہ دوسرا قبول کرے یا نہ کرے۔

سوال نمبر (۱۰) کا جواب:

جب بائع اور مشتری کے درمیان ایجاب اور قبول ہوجائے تو بیع متحقق ہوجاتی ہے، جیسا کہ فقہ کی تمام کتابوں میں ہے، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

''وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع...'' (الفتاوى الهنديه ۱۹/ ۳۸۷)۔

یعنی جب ایجاب وقبول ہوجائے تو بیع لازم ہوجاتی ہے۔

اب بائع پر لازم ہے کہ وہ مبیع مشتری کے حوالہ کردے، اور مشتری ثمن کو بائع کے سپرد کردے، جیسا کہ موسوعہ فقہیہ (اردو) میں ہے: ''مبیع کو سپرد کرنا وہ اہم نتیجہ ہے جس کا عقد بیع میں بائع پابند ہوتا ہے اور یہ نتیجہ نقد ثمن کے سپرد کرنے کے وقت ثابت ہوتا ہے'' (موسوعہ فقہیہ (اردو) ۹/ ۶۱)۔

نیز عقار (زمین یا جائیداد) میں قبضہ تخلیہ سے ہوتا ہے، جیسا کہ موسوعہ فقہیہ میں ہے: ''چنانچہ عقار پر قبضہ کے لئے تخلیہ کافی ہے'' (موسوعہ فقہیہ (اردو) ۹/۶۱)۔

یعنی اگر زمین ہو تو اس پر قبضہ اس کو چھوڑ دینے سے ہوگا۔

جہاں تک ملکیت کی بات ہے تو مبیع میں مشتری کی ملکیت اسی وقت ثابت ہو جاتی ہے جبکہ ایجاب وقبول ہوا اور بیع لازم ہوگئی، چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

''مشتری مبیع کا مالک اور بائع ثمن کا مالک ہوگا، مبیع میں مشتری کی ملکیت محض بیع صحیح کر لینے سے ہو جاتی ہے، آپسی قبضہ ہونے پر موقوف نہیں، اگر قبضہ کا ضمان میں اثر ہے'' (موسوعہ فقہیہ کویتیہ (اردو) ۹/۵۶)۔

الغرض صورت مسئولہ میں خریدار بیع کے انعقاد کے ساتھ ہی اس زمین کا مالک ہوگیا۔

جہاں تک بات بیچنے والے کے کاشت کرنے کی ہے، تو یہ خریدار کی اجازت پر موقوف ہے، اگر خریدار اجازت دیتا ہے، تو فبہا ونعمت، اور ایسی صورت میں اس کی طرف سے تبرع سمجھا جائے گا۔

لیکن بیچنے والا کاشت کی شرط نہیں لگا سکتا، کیونکہ یہ شرط فاسد ہے اور اس سے عقد فاسد ہو جائے گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

''لا یحل سلف وبیع، ولا شرطان فی بیع، ولا ربح ما لم یضمن، ولا بیع ما لیس عندک''

(سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۵۰۶، مسند احمد: ۶۶۷۱، نسائی، حدیث نمبر: ۴۶۳۰)۔

(قرض کی شرط کے ساتھ بیع جائز نہیں، اور نہ ہی بیع میں دو شرطیں جائز ہیں، اور نہ ہی اس چیز سے نفع اٹھانا درست ہے جو اس کی ضمانت میں نہ آئے، اور نہ اس چیز کی بیع درست ہے جو آپ کے پاس نہ ہو)۔

اس لئے عند الاحناف اور عند الشوافع (راجح قول کے مطابق) سامان کی حوالگی کو موخر کرنے کی شرط درست نہیں ہے، چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

''حنفیہ کا مسلک اور شافعیہ کا راجح قول یہ ہے کہ سامان کی حوالگی کو موخر کرنے کی شرط صحیح نہیں ہے، ان حضرات کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ ''نہی عن بیع وشرط'' (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع اور شرط یعنی مشروط بیع سے منع فرمایا)، ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اپنی بیوی زینب ثقفیہ سے ایک باندی خریدی، ان کی بیوی نے بیچتے وقت یہ شرط لگائی کہ اگر آپ اسے فروخت کریں تو میرے ہاتھ اسی قیمت پر فروخت کریں، عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس معاملہ کے بارے میں حضرت عمرؓ سے استفتاء کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''لا تقربہا وفیہا شرط لأحد'' (اس باندی کے قریب نہ ہو جاؤ جب کہ اس میں کسی کے لئے کوئی شرط لگی ہو)'' (موسوعہ فقہیہ (اردو) ۲/۷۰)۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمین بیچنے والا مشتری کی جانب سے تبرعاً اجازت دیئے جانے کی وجہ سے کاشت کر رہا ہے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اگر کاشت کی شرط لگا کر بیع کرتا ہے تو یہ نقلاً اور عقلاً درست نہیں ہے۔

سوال نمبر (۱۱) کا جواب:

(الف) زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں اسی وقت آگئی تھی جب اس نے پلاٹ خریدا تھا، کیونکہ ایجاب وقبول کے ساتھ ہی بیع لازم ہو جاتی ہے اور مشتری مبیع کا مالک ہو جاتا ہے، جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا کہ ''مشتری مبیع کا مالک اور بائع ثمن کا مالک ہوگا، مبیع میں مشتری کی ملکیت محض بیع صحیح کر لینے سے ہو جاتی ہے، آپسی قبضہ ہونے پر موقوف نہیں'' (موسوعہ فقہیہ (اردو) ۹/۵۶)۔

الغرض ملکیت اور چیز ہے اور قبضہ ایک دوسری چیز، سوال نمبر گیارہ کے پہلے جزو (الف) میں وضاحت نہیں ہے کہ زمین قبضہ میں آئی تھی کہ نہیں۔ اگر زمین قبضہ میں آگئی تھی تو پھر اس کو فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کا مالک بھی تھا اور اس کے قبضہ میں بھی تھی، لیکن اگر زمین اس کے قبضہ میں نہیں تھی تو اس میں اختلاف ہے، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید دوسرا جز (ب) اس سے متعلق ہے۔

جواب (ب):

زمین مالک زمین (بائع) کی ملکیت میں ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ بیع کے ساتھ ہی اس کی ملکیت ختم ہوگئی، جیسا کہ دلیل اوپر گزری، ہاں بائع کے قبضہ میں

ہوسکتی ہے، ایسی صورت میں اختلاف ہے۔شافعیہ، حنابلہ اور امام محمد کے نزدیک غیر منقولہ چیز کو بھی قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست نہیں، لیکن امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک غیر منقولہ چیز کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا درست ہے۔

دلائل کی روشنی میں شوافع، حنابلہ اور امام محمد کا مسلک راجح معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ موسوعہ فقہیہ میں مذکور ہے:

''بیع مالم یقبض''

۱۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من ابتاع طعاما فلا یبعه حتی یقبضه'' (جو اناج خریدے، قبضہ کرنے سے قبل اس کو فروخت نہ کرے)، ایک روایت میں ہے: ''حتی یکتاله'' (یہاں تک کہ اس کو ناپ لے)، ایک اور روایت میں ہے: ''حتی یستوفیه'' (یہاں تک کہ اس کو وصول کرلے)، راوی حدیث حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: میں یہی سمجھتا ہوں کہ ہر چیز اناج ہی کے مثل ہے، ایک اور روایت میں ہے: ''إذا اشتریت بیعًا فلا تبعه حتی تقبضه'' (جب تم کوئی چیز خریدو تو قبضہ کرنے سے قبل اس کو فروخت نہ کرو)۔

قبضہ سے قبل مبیع کو فروخت کرنے کے بارے میں فقہاء کے چند مذاہب ہیں:

۲۔ شافعیہ کا مذہب، امام ابو یوسف کا قول اول، امام محمد کا قول اور امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ قبضہ سے قبل مبیع کو فروخت کرنا صحیح نہیں، خواہ منقول ہو یا جائیداد غیر منقولہ، گو کہ بائع اجازت دے دے اور ثمن پر قبضہ کر چکا ہو، اس کی دلیل حکیم بن حزامؓ کی یہ روایت ہے: ''میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ چیزیں خریدتا ہوں، ان میں سے میرے لئے کیا حلال اور کیا حرام ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إذا اشتریت بیعًا فلا تبعه حتی تقبضه''، اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لا یحل سلف وبیع، ولا شرطان فی بیع، ولا ربح مالم یضمن، ولا بیع مالیس عندک'' (ایک ساتھ قرض اور بیع حلال نہیں، اور نہ بیع میں دو شرطیں حلال ہیں، نہ اس چیز کا نفع حلال ہے، جو آدمی کے ذمہ نہ ہو، اور نہ اس چیز کی بیع حلال ہے، جو آپ کے پاس نہ ہو)۔

''غیر مضمون کے نفع'' سے مراد قبضہ سے قبل فروخت کی گئی چیز کا نفع ہے، مثلاً کوئی سامان خریدے اور بائع کی طرف سے اس پر قبضہ ملنے سے قبل دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے، تو یہ بیع باطل ہے اور اس کا نفع ناجائز ہے، اس لئے کہ مبیع بائع اول کے ضمان میں ہے، اس سے خریدنے والے کے ذمہ میں نہیں، اس لئے کہ قبضہ نہیں ہے۔

نیز زید بن ثابتؓ کی حدیث میں ہے: ''أن النبی ﷺ نهی أن تباع السلع حیث تبتاع، حتی یحوزها التجار إلی رحالهم'' (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ سامانوں کو اس جگہ فروخت کیا جائے، جہاں خریدے گئے ہیں، یہاں تک کہ تاجر اس کو اپنے قبضہ میں کرلیں)، اور تاجر کے محفوظ کرنے سے مراد قبضہ کا پایا جانا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے والی حدیث میں ہے۔

نیز اس لئے کہ قبضہ سے قبل ملکیت کمزور ہے، کیونکہ مبیع کے تلف ہونے سے عقد فسخ ہوجاتا ہے، شافعیہ نے قبضہ سے قبل بیع کی ممانعت کی علت یہی بتائی ہے۔

حنفیہ میں شیخین (امام ابوحنیفہ وابو یوسف) جائیداد غیر منقولہ کی بیع قبضہ سے قبل استحسانًا جائز قرار دیتے ہیں، ان کا استدلال جواز بیع کے عمومی دلائل سے ہے، جن میں کوئی تخصیص نہیں، اور کتاب اللہ کے عموم کی تخصیص خبر واحد سے ناجائز ہے، نیز اس لئے کہ جائیداد غیر منقولہ میں ہلاکت کے ذریعہ عقد کے فسخ ہونے کا وہم نہیں ہوتا، برخلاف اموال منقولہ کے، نیز اس لئے کہ جائیداد غیر منقولہ کو حوالہ کرنے پر قدرت حاصل ہے، اور پانی اور ریت کے بھر جانے سے اس کی تباہی شاذ و نادر ہی ہوتی ہے اور نادر کا اعتبار نہیں، اس کی ایک دلیل قبضہ سے قبل ثمن میں تصرف پر قیاس کرنا بھی ہے، اس لئے کہ وہ جائز ہے، کیونکہ اس میں کوئی غرر نہیں، جیسا کہ مہر، بدل خلع، بدل عتق اور بدل صلح عن دم العمد (عمداً خون کرنے کے سلسلہ میں صلح کا بدل) میں تصرف کرنا، اس لئے کہ تصرف کی اجازت دینے والی چیز ملکیت ہے اور وہ پائی گئی، لیکن حتی الامکان غرر سے احتراز واجب ہے، اور یہ اس صورت میں ہے جس میں غرر کا تصور ہو، اور وہ منقول مبیع ہے، غیر منقولہ جائیداد نہیں۔

امام محمدؒ کا اس میں اختلاف ہے، انہوں نے غیر منقولہ جائیداد میں بھی قبضہ سے قبل بیع کی اجازت نہیں دی، اور یہی امام ابو یوسفؒ کا پہلا قول ہے، اور امام شافعیؒ کا بھی قول ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، اس کی دلیل حدیث کا مطلق ہونا اور اموال منقولہ پر قیاس ہے۔

نیز ایک دلیل اجارہ پر بھی قیاس ہے، کیونکہ اجارہ جائیداد غیر منقولہ میں قبضہ سے قبل ناجائز ہے، اور دونوں میں مشترک علت یہ ہے کہ دونوں میں غیر مضمون

کا نفع پایا جارہا ہے، اس لئے کہ فروختگی میں مقصود نفع ہے، اور غیر مضمون کا نفع شرعاً ممنوع ہے، اور ممانعت فساد کا تقاضا کرتی ہے، لہذا قبضہ سے قبل بیع فاسد ہوگی، کیونکہ وہ خریدار کے ضمان میں داخل نہیں ہوئی۔ جیسا کہ اجارہ میں ہے (موسوعہ فقہیہ (اردو) ۹/ ۱۴۴۔۱۴۷)۔

الغرض مذکورہ دلائل کی روشنی میں شوافع، حنابلہ اور امام محمدؒ کا مسلک راجح معلوم ہوتا ہے کہ قبضہ سے پہلے غیر منقولہ جائیداد کو بھی بیچنا درست نہیں ہے۔

سوال نمبر (۱۲) کا جواب:

مسئولہ شکل درست نہیں ہے، کیونکہ کالونی بنانے والے کا زمین پر قبضہ نہیں ہے اور قبضہ سے پہلے دلائل کی روشنی میں غیر منقولہ جائیداد کا بھی بیچنا درست نہیں ہے، جیسا کہ دلائل اوپر گذرے، نیز اس میں دلال کا شرط لگانا بھی غلط ہے کہ وہی اس کو فروخت کرے گا، کیونکہ بیچنے کا اصل اختیار اس کو ہے جس کی چیز ہوتی ہے ہاں اس کی اجازت سے دلال فروخت کرسکتا ہے، لیکن چونکہ صورت مسئولہ میں بائع کا قبضہ زمین پر نہیں ہے، اس لئے اس کی بیع درست نہیں ہے۔

سوال نمبر (۱۳) کا جواب:

کالونی بنانے والے کا اگر پلاٹس پر قبضہ تھا تو وہ اپنے پلاٹس کو جس سے چاہے بیچ سکتا ہے اور قبضہ سے مراد اس طور پر استیلاء اور عمل دخل ہو کہ اس میں کوئی چیز مانع نہ ہو، ہر طرح کے تصرف کا وہ مجاز ہو، اور عرف میں اس کی شکلیں بدل سکتی ہیں۔

الغرض کالونی بنانے والے کا قبضہ حسی یا معنوی ہو اور وہ پلاٹ کسی کے ہاتھوں بیچتا ہے تو پلاٹ خریدنے والے کی اس میں ملکیت ثابت ہوجائے گی، کیونکہ ایجاب وقبول کے ساتھ ہی بیع کا انعقاد ہوگا اور اسی وقت کالونی بنانے والے سے زمین خریدنے والا مالک ہوگیا، جیسا کہ اس کی دلیل گزر چکی ہے۔

لیکن کالونی بنانے والے کا یہ شرط لگانا کہ جب بھی وہ زمین فروخت کرے تو اسی سے فروخت کرے یا پھر دوسرے خریدار کو اس سے ملانا ہوگا یہ شرط فاسد ہے اور حدیث میں اس کی ممانعت ہے، جیسا کہ اس کی دلیل بھی ماقبل میں گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروط بیع سے منع فرمایا ہے۔

لہذا کالونی بنانے والے نے جس وقت زمین بیچا تھا، اسی وقت خریدنے والا اس کا مالک ہوگیا تھا، اب اگر اس خریدنے والے کا اس زمین پر قبضہ ہو چکا تھا تو وہ جس سے چاہے فروخت کرسکتا ہے، اور خود کالونی بنانے والا بھی اس سے خرید سکتا ہے۔

سوال نمبر (۱۴) کا جواب:

ادھار یا قسطوں میں بیع جائز ہے، بشرطیکہ کل قیمت، ماہانہ قسطیں اور مدت، بیع کے وقت طے کرلی جائیں، جیسا کہ بخاری کی حدیث ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

''جاءتني بريرة فقالت: كاتبت أهلي على تسع أواق في كل عام أوقية'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۰۶۰، ۲۵۶۹)۔

(میرے پاس بریرہ آئیں اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے نو اوقیہ میں عقد کتابت کیا ہے، ہر سال ایک اوقیہ ادا کرنا ہے)۔

مدت کے تعلق سے علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

''فمنها معلومية الأجل في البيع بثمن مؤجل ففسد إن كان مجهولا'' (البحر الرائق ۱۵/ ۴۲)۔

(ادھار خرید وفروخت کی صورت میں ادائیگی کی مدت معلوم ہونی چاہئے، مدت اگر مجہول ہو تو بیع فاسد ہے)۔

الغرض قسطوں میں بیع درست ہے، اور بیع کے وقت ہی خریدار مبیع کا مالک ہوجاتا ہے، بائع کو چاہئے کہ اسی وقت مشتری کو مالکانہ قبضہ دے، تاکہ مشتری کو اپنی ملکیت کی چیز میں تصرف کا مکمل اختیار ہو۔

اب اگر کسی وجہ سے خریدنے والا وقت پر باقی قسطیں ادا نہیں کر پا رہا ہے، تو اسے مہلت دینی چاہئے، جیسا کہ حدیث میں تنگدست مقروض کو مہلت دینے کی فضیلت آئی ہے، یہاں بھی اس کو مہلت دینا مثل قرض کے انشاء اللہ باعث ثواب ہوگا۔

اس کے بعد بھی خریدنے والا باقی قسطیں ادا نہیں کررہا ہے تو بائع کو چاہئے کہ مشتری کے سامنے اور کچھ لوگوں کی موجودگی میں اس کی زمین فروخت کرو

ادے، اور اپنی باقی ماندہ رقم لے لے، اپنی رقم سے زائد لینا ظلم اور سود کے مشابہ ہے، اسی طرح سودے کو کینسل ماننا بھی ظلم ہے اور اللہ تعالی ظالمین کو پسند نہیں کرتا۔

سوال نمبر (۱۵) کا جواب:

(الف) شریعت میں دلالی، دلال کی اجرت جائز ہے، دلال اس کو کہا جاتا ہے جو بائع اور مشتری کے درمیان واسطے کا کام کرتا ہے۔ چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

''والسمسار ہو الذی یدخل بین البائع والمشتری متوسطًا لإمضاء البیع، وهو المسمی الدلال، لأنه یدل المشتری علی السلع، ویدل البائع علی الأثمان'' (الموسوعۃ الفقهیه الکویتیه (عربی) ۱۰/ ۱۵۲)۔

(سمسار وہ شخص ہے جو بائع اور مشتری کے درمیان بیع کو نافذ کرانے کے لئے بطور واسطے کے کام کرتا ہے، اس کو دلال بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ سامان کی خریداری میں مشتری کی رہنمائی کرتا ہے، اسی طرح (سامان فروخت کرواکے) قیمت (ثمن) کی طرف بائع کی رہنمائی کرتا ہے)۔

بعض معاملات میں لوگوں کو دلالی کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے کہ ہر شخص خرید وفروخت کی مہارت نہیں رکھتا، اسی لئے شریعت نے دلالی اور اس کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ ردالمحتار میں ہے: ''سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال أرجو أنه لا بأس'' (ردالمحتار ۲۴/ ۳۱۸)۔

(محمد بن سلمہ سے دلال کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے)۔

اس لئے جمہور فقہاء نے دلالی کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے، اور وہ اجرت پہلے سے طے شدہ ہونی چاہئے۔

صورت مسئولہ کے اعتبار سے دلال کا کالونی بنانے والے کی زمین اپنی من مانی بیچنا اور زائد رقم اپنے پاس رکھ لینا ناجائز اور حرام ہے، دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل'' (سورہ بقرہ: ۱۸۸) (آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ)۔

(۲) حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفس منه'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۰۶۹۵، ۲۱۲۳۷) (کسی شخص کا مال اس کی رضامندی اور خوشی کے بغیر لینا جائز نہیں ہے)۔

(۳) یہ ایک طرح کی چوری اور جھوٹ ہے، اور یہ دونوں حرام ہیں، ہاں، اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کالونی بنانے والا اس کو اجازت دے کہ اس متعینہ قیمت سے زائد میں اگر تو بیچے گا، تو زائد قیمت تیری ہوگی، یا پھر دلال کالونی بنانے والے سے پہلے طے کر لے کہ اگر اس سے زائد قیمت پر بیچا تو اس کا مالک میں ہوں گا، تو پھر اس صورت میں اس کا زائد قیمت اپنے پاس رکھنا جائز ہے جیسا کہ بخاری کی حدیث ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

''لا بأس أن یقول: بع هذا الثوب، فما زاد علی کذا وکذا فهو لك. وقال ابن سیرین: إذا قال بعه بکذا فما کان من ربح فهو لك، أو بینی وبینك، فلا بأس به'' (صحیح البخاری، باب أجر السمسرة، حدیث نمبر: ۲۲۷۴)۔

(اس میں کوئی حرج نہیں کہ (مالک سامان) دلال سے کہے کہ آپ یہ کپڑا فروخت کریں، جو اس قیمت سے زائد ہوگی، وہ تیری ہے، ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ اگر بائع دلال سے کہے کہ اس سامان کو اتنا میں فروخت کرو، اس سے زائد جو فائدہ ہو وہ تمہارا ہے، یا میرے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں)۔

لیکن دلال کا من مانی قیمت پر بیچنا جائز نہیں ہے، اور اگر بیچ دیا تو پورا پیسہ کالونی بنانے والے کو لوٹانا واجب ہے، باقی رقم اپنے پاس رکھ لینا ناجائز، حرام، چوری اور دوسرے کو دھوکہ دینا ہے۔

(ب) جب بیع مکمل ہو جائے تو مبیع خریدار کے حوالے اور ثمن بائع کے حوالہ کرنا لازم ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم، علامہ ابن عابدین اور تقریباً تمام فقہاء لکھتے ہیں، چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

''وحکمه ثبوت الملك أی فی البدلین، لکل منهما فی بدل. وهذا حکمه الأصلی. والتابع وجوب تسلیم المبیع والثمن'' (رد المحتار، کتاب البیوع ۱۸/ ۲۰۵)۔

(بیع کا حکم اصلی یہ ہے کہ بدلین میں ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، عاقدین میں سے ہر ایک کی ملکیت بدل میں ثابت ہو جاتی ہے، اور اس کا ضمنی حکم یہ ہے کہ

مبیع اور ثمن ایک دوسرے کے حوالہ کرنا لازم ہے)۔

جہاں تک بات دلال کمپنی کا یہ شرط لگا کر بیچنا کہ جب بھی آپ کو بیچنا ہو تو ہمارے پاس بیچنا، شرط باطل ہے اور اس سے عقد فاسد ہو جائے گا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

''لا یحل سلف وبیع، ولا شرطان فی بیع، ولا ربح ما لم یضمن ولا بیع ما لیس عندك'' (سنن ابی داود، حدیث نمبر: ۳۵۰۶، مسند احمد، حدیث نمبر: ۶۶۷۱)۔

(قرض کی شرط کے ساتھ بیع جائز نہیں، اور نہ ہی بیع میں دو شرطیں جائز ہیں، اور نہ ہی اس چیز سے نفع اٹھانا درست ہے جو اس کی ضمانت میں نہ آئے، اور نہ اس چیز کی بیع درست ہے جو آپ کے پاس نہ ہو)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے: ''.... أن عبدالله بن مسعود ابتاع جارية من امرأته زينب الثقفية. واشترطت عليه أنك إن بعتها فهي لي بالثمن الذي تبيعها به. فسأل عبدالله بن مسعود عن ذلك عمر بن الخطاب فقال عمر بن الخطاب: لا تقربها وفيها شرط لأحد'' (موطأ مالك، حديث نمبر: ۱۲۹۷، ۲۲۸۰)۔

(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنی بیوی زینت ثقفیہ سے ایک باندی خریدی، ان کی بیوی نے بیچتے وقت یہ شرط لگائی کہ اگر آپ اسے فروخت کریں تو میرے ہی ہاتھ اسی قیمت پر فروخت کریں، عبداللہ ابن مسعودؓ نے اس معاملہ کے بارے میں حضرت عمرؓ سے دریافت کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: اس کے قریب نہ جاؤ جب کہ اس میں کسی کے لئے کوئی شرط لگی ہو)۔

اس تعلق سے امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

''بیع میں ایسی شرط ہو جس سے عاقدین میں سے کسی ایک کا نفع متعلق ہو، تو ایسی بیع فاسد ہے، اس لئے کہ یہ شرط فی نفسہ باطل ہے، اور اس سے فائدہ اٹھانے والا اس کے بغیر راضی بھی نہیں، اور اس شرط سے دونوں کے درمیان مطالبہ راہ پا رہا ہے، اس لئے بیع فاسد ہے''۔

(المبسوط للسرخسی، باب البیوع إذا کان فیہا شرط ۱۵/۱۷۸)۔

الغرض اس طرح کی مشروط بیع جائز نہیں ہے۔

خلاصہ بحث:

۱۔ کسی کا بھی سرکاری اراضی پر قابض ہونا، ان کی خرید وفروخت کرنا، رشوت کے ذریعہ لے آؤٹ کروانا، ان پر مکان تعمیر کرنا ناجائز اور حرام ہے، ایسا کرنے والا گناہ گار، ظالم، خائن اور غاصب ہے۔

۲۔ اوقاف کی زمینوں کا غصب کرنا حرام اور جرم عظیم ہے، اور جانتے بوجھتے ایسی مغصوبہ زمینوں کا خریدنے والا بھی اس جرم میں برابر کا شریک ہے۔

۳۔ میراث کی شرعی تقسیم لازم ہے، اگر مستحق وارث کو وراثت نہیں ملی تھی اور وہ زندہ ہو تو اس کو وراثت دینا لازم ہے، اور اگر وہ مر چکا ہو تو اس کے وارثین کو ان کا حق دینا لازم ہے، کوئی اگر نہیں دیتا ہے تو ایسی موروثی زمین جس کا زیادہ تر حصہ شرعی طور پر منقسم ہو، اس کا خریدنا جائز اور درست ہوگا، لیکن اگر اس کا زیادہ حصہ غیر شرعی طور پر منقسم ہو اور غیر مستحق اس پر قابض ہوں تو اس کا خریدنا مکروہ ہے، اور اگر اس میں اشتباہ ہو تو نہ خریدنا اولی ہے۔

۴۔ اگر کسی کی آمدنی مکمل حرام تھی اور اس حرام مال سے اس نے زمین خریدی، تو دوسروں کا جانتے بوجھتے اس کی زمین خریدنا ناجائز اور حرام ہے، لیکن اگر اس میں حلال وحرام دونوں کا امکان ہو تو اس زمین کا خریدنا مکروہ ہے، اور شک کی بنیاد پر نہ خریدنا افضل ہے۔

۵۔ حکومت کے قانون کے مطابق جو لے آؤٹ منظور ہوتا ہے، اس کی پابندی لازم ہے، اس کے برخلاف راستوں کی چوڑائی کم کر دینا اور اسے بیچنا، اسی طرح پلے گراؤنڈ اور سوئمنگ پل وغیرہ کی جگہ بیچ دینا ناجائز ہے، ایسا کرنے والا سخت گناہ گار ہے، جانتے بوجھتے ایسی زمینوں کا خریدنا جائز نہیں ہے، صرف ترغیب کے لئے مسجد کی جگہ مقرر کرنے سے وہ مسجد نہیں ہوئی، جب تک کہ اسے عملاً وقف نہ کیا جائے اور اس میں کم از کم ایک آدمی نماز نہ پڑھ لے۔

۶۔ قانونی اعتبار سے کالونی میں گارڈن اور پلے گراؤنڈ رکھنا ضروری ہو تو کالونی بنانے والے پر لازم ہے کہ وہ اس قانون کو عملی جامہ پہنائے، زمین بیچنے والے

یا کالونی بنانے والے کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ گارڈن یا پلے گراؤنڈ کی زمین مسجد کو دے دے، کیونکہ یہ مفاد عامہ کے لئے مشترکہ زمین ہے، ہاں اگر وہاں بسنے والے تمام مالکان زمین اس کی اجازت دے دیں تو پھر وہ شرعی مسجد تصور کی جائے گی، جیسا کہ ملک مشاع کے وقف کا مسئلہ ہے۔

۷۔ قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر پلاٹ خریدنا اور بیچنا اور کالونی بنانا درست نہیں ہے، اور بغیر منظوری کے کالونی بنانے کے لئے پولیس اور متعلقہ محکمہ کو رشوت دینا ناجائز اور حرام ہے۔

۸۔ ٹیکس سے راہ فرار اختیار کرنا اور وہائٹ منی (White Money) نہ دکھانا مناسب نہیں ہے، قانونی دشواری سے بچنے کے لئے اور زمینوں کے کاروبار میں رہنے کے لئے لون لینا ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ اس میں اضطرار نہیں پایا جاتا، ایسا کرنے والے کے لئے خدا کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

۹۔ پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہو جائے گی بشرطیکہ مبیع کی مقدار اور قیمت وغیرہ متعین کردی جائے، اور اس طرح خرید وفروخت کا عمل درست ہے، فروخت کرنے والے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ نقشہ میں پلاٹ کا جو نمبر دکھایا گیا ہے، اس کو کسی اور جگہ ڈال دے۔

۱۰۔ بیع کے انعقاد یعنی ایجاب وقبول کے ساتھ ہی خریدار مبیع کا مالک ہو جاتا ہے، خواہ اس پر فی الفور قبضہ ہو یا نہ ہو، بیچنے والا کاشت کی شرط نہیں لگا سکتا، اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس سے عقد فاسد ہو جائے گا۔

۱۱۔ زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں اسی وقت آ گئی تھی جب اس نے پلاٹ خریدا تھا، کیونکہ انعقاد بیع کے ساتھ ہی خریدار مبیع کا مالک ہو جاتا ہے، اگر عرف عام کے اعتبار سے مشتری کا زمین پر قبضہ تھا تو پھر اس کا بیچنا جائز ہے، لیکن اگر قبضہ نہیں تھا تو دلائل کی روشنی میں غیر منقولہ مال کو بھی بیچنا درست نہیں ہے۔

۱۲۔ زمین پر بغیر قبضہ کے فروخت کرنا دلائل کی روشنی میں جائز نہیں ہے، ہاں عرف عام میں جس کو قبضہ سمجھا جاتا ہو اس کے بعد فروخت کرنا جائز ہے، دلال کا مشتری کو یہ شرط لگانا کہ جب بھی وہ زمین فروخت کرے تو وہی دلال بیچے گا جائز نہیں ہے، اس طرح کی شرط بیع کو فاسد کردے گی۔

۱۳۔ کالونی بنانے والے کا اگر پلاٹس پر قبضہ تھا تو وہ جس سے چاہے پلاٹس فروخت کرسکتا ہے، اور اسی وقت مشتری کی ملکیت اس میں ثابت ہو جائے گی، لیکن کالونی بنانے والے کا یہ شرط لگانا کہ جب بھی وہ زمین فروخت کرے تو اسی سے فروخت کرے یا پھر دوسرے خریدار کو اس سے ملانا ہوگا، یہ شرط فاسد ہے، عقد سے پہلے ایسی شرط ہو تو بیع فاسد ہو جائے گی، عقد کے بعد اگر ایسی شرط ہو تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔

۱۴۔ ادھار یا قسطوں میں بیع جائز ہے، بیع کے وقت ہی خریدار مبیع کا مالک ہو جاتا ہے، قسطیں وقت پر ادا نہ کرنے کی صورت میں بیع کو کینسل ماننا جائز نہیں ہے، بلکہ مہلت دینی چاہئے، باوجود مہلت کے اگر مشتری باقی قسطیں ادا نہیں کر رہا ہے تو اس کی زمین فروخت کرا کر صرف اپنی رقم لینا جائز ہے، زائد رقم لینا مشتری پر ظلم ہے۔

۱۵۔ شریعت میں دلالی اور اس کی اجرت جائز ہے، لیکن دلال کا اپنی من مانی زمین بیچنا اور زائد رقم اپنے پاس رکھ لینا ناجائز اور حرام ہے، زائد رقم مالک زمین کی اجازت پر موقوف ہے۔

جب بیع مکمل ہو جائے تو مبیع اور ثمن کا آپسی تبادلہ لازم ہے، مبیع پر قبضہ نہ دلانا ظلم ہے، دلال کمپنی کا یہ شرط لگانا کہ جب بھی آپ کو زمین بیچنا ہو ہم سے ہی بیچیں فی نفسہ باطل ہے اور ایسی شرط سے بیع فاسد ہو جائے گی۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

☆☆☆

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل

مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری[1]

سرکاری اراضی پر غیر قانونی قبضہ اوران کی بیع وشراء کا حکم:

جواب نمبر ۱: لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر یا کسی بھی شخص کا سرکاری یا غیر سرکاری زمینوں پر غیر قانونی اور ناجائز طریقے سے قبضہ کرلینا جائز نہیں، رشوت یا سیاسی اثر ورسوخ کے ذریعہ اگر ''لے آوٹ'' حاصل بھی کرلیا جاتا ہے تو اس سے قابض کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی، اصل مالکین کی ہی ملکیت رہے گی، لہذا قابض کا ان زمینوں کو بیچنا، ہبہ کرنا یا ان سے خریدنا وغیرہ سب ناجائز اور حرام ہوگا، یہ عمل سراسر غصب ہے جو نہ تو شرعاً جائز ہے، نہ ہی قانوناً، کسی چیز کی بیع وشراء کے لئے اس پر بائع کی ملکیت کا ہونا اور مقدور التسلیم ہونا ضروری ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''ولا یجوز بیع السمك قبل أن یصطاد، لأنه باع ما لا یملکه'' (ہدایہ ۴/ ۵۱)۔

موقوفہ اراضی کی خرید وفروخت:

جواب نمبر ۲: موقوفہ زمین اللہ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے، خود واقف بھی وقف مکمل ہوجانے کے بعد ان کی بیع وشراء کا مجاز نہیں ہے، اس لئے ان کی خرید وفروخت درست نہیں، اگر غنڈہ عناصر یا خدا کے خوف سے بے پرواہ لوگ ان اراضی پر کسی طرح قبضہ بھی کرلیتے ہیں، تو ان پر ان کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی، لہذا ان کی بیع وشراء کے درست ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ''لا بیع فیما لا یملک ابن آدم''۔

البتہ اگر موقوفہ زمین سے مقصد وقف کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے، یا اس کی حفاظت کا مسئلہ پیش آگیا ہے تو اس کی آمدنی سے اس کی حفاظت کا سامان کیا جاسکتا ہے، نیز اگر شر پسند عناصر کے ہاتھوں پہنچ جانے کا قوی اندیشہ ہے تو متولی اس کو فروخت کرکے اس کا متبادل خرید سکتا ہے، فتاوی شامی میں ہے:

''فإذا تم ولزم لا یملك ولا یملك ولا یعار ولا یرهن، لا یکون ملکوکا لصاحبه، ولا یملك أی لا یقبل التملیك لغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیك الخارج عن ملك'' (شامی کتاب الوقف ۶/ ۵۳۹، ہدایہ ۲/ ۶۳۷)۔

بصورت مجبوری وخطرہ، استبدال وقف کے جواز پر مندرجہ ذیل عبارت سے روشنی ملتی ہے:

''سئل شیخ الإسلام عن أهل قریة رحلوا وتداعی مسجدها إلی الخراب وبعض المتغلبة یستولون علی خشبه وینقلونه إلی دورهم هل لواحد لأهل المحلة أن یبیع الخشب بأمر القاضی ویمسك الثمن لیصرفه إلی بعض المساجد أو إلی هذا المسجد قال نعم'' (ردالمحتار، کتاب الوقف ۴/ ۳۶۰)۔

موروثی زمین کی شرعی تقسیم کے بغیر خرید وفروخت:

جواب نمبر ۳: ایسی زمین جس پر شرعی تقسیم جاری نہیں ہوئی مثلاً والد نے پھوپھیوں کو یا دادا نے اپنی بہنوں کو حصہ نہیں دیا تھا، اب بیٹے یا پوتے ان پر قابض ہیں اور فروخت کرنا چاہتے ہیں تو جتنا حصہ ان کا ہے اس میں بیع درست ہوجائے گی اور اگر انھوں نے اپنی پھوپھیوں یا دادا کی بہنوں کا حصہ بھی فروخت کردیا ہے تو ان کے حصوں کی بیع موقوف رہے گی، اگر انہوں نے اجازت دے دی تو وہ بیع نافذ ہوجائے گی اور اگر اجازت

[1] ادارہ فیض القرآن محمود چوک ٹھکری باڑی، ضلع اتر دیناجپور مغربی بنگال۔

نہیں دی تو رد ہو جائے گی۔

''لا بیع فیما لا یملك ابن آدم''۔

حرام آمدنی کے ذریعہ اکٹھی کی گئی زمین کا خریدنا:

جواب نمبر ۴: حرام آمدنی سے زمین خریدنے کی کئی صورتیں فقہاء کرام نے لکھی ہیں: (۱) خریدنے والے نے بعینہ حرام مال اولاً بیچنے والے کے حوالے کیا، پھر اسی مال حرام سے زمین خریدا، (۲) اولاً زمین خرید لی پھر وہی مال حرام اس کے حوالے کر دیا، (۳) اولاً زمین خریدی پھر اس مال حرام کے بجائے دوسرا مال دیا، (۴) مطلقاً کوئی زمین خریدی لیکن پھر وہی مال حرام بائع کے حوالے کر دیا، (۵) زمین خریدی حرام کے علاوہ دوسرے روپے پیسے کے عوض لیکن پھر وہی مال حرام حوالے کر دیا۔

اگر مشتری اول نے پہلی اور دوسری صورت کے ذریعہ خریدا ہے تب تو کسی دوسرے خریدار کو وہ زمین خریدنا درست نہیں اور بقیہ صورتوں سے خریدا ہے تو علامہ کرخی نے دفع حرج کے لئے اس سے دوسرے کے خریدنے کو جائز قرار دیا ہے، فتاویٰ شامی میں ہے:

''قوله اكتسب حرامًا توضيح المسئلة مافي التتارخانية حيث قال رجل اكتسب مالًا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولًا ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها أواشترى مطلقًا ودفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم قال الكرخي في الوجه الأول والثاني لايطيب والثلاث الآخرة يطيب وقال أبو بكر لا يطيب في الكل لكن الفتوى الآن على قول الكرخي رفعا للحرج عن الناس'' (الدر المختار كتاب البيوع باب المتفرقات مطلب اذا اكتسب حرامًا مع رد المحتار ۵/ ۲۳۵)۔

لیکن احتیاط وتقویٰ کا تقاضہ ہے کہ ایسی زمین نہ خریدی جائے۔

کالونی بنانے والے کا سوئمنگ پول، گارڈن یا مسجد کے لئے مقرر کی گئی زمین کا فروخت کر دینا:

جواب نمبر ۵: لے آؤٹ کی منظوری کے لئے حکومت نے جو قانون بنایا ہے، سڑک، پلے گراؤنڈ وغیرہ کے لئے جو اصول مقرر کیا ہے کالونی بنانے والے نے ان کی پابندی کا عہد کیا ہے، اسے پورا کرنا چاہئے، لوگوں کو پلاٹ خریدنے کی ترغیب دینے کے لئے نقشہ میں یہ چیزیں رکھنا اور پھر پلاننگ شروع ہونے کے بعد خریداروں کے ازدحام کو دیکھ کر مفاد عامہ کے لئے مقرر کی گئی زمینوں کو بھی فروخت کر دینا دھوکہ ہے جو ناجائز ہے، دھوکہ دہی کے ذریعہ گاہکوں کو اپنی طرف مائل کرنا ایک مسلمان کے لئے انتہائی نامناسب ہے، تاہم زمین چونکہ کالونی بنانے کی ملکیت ہے، ''لے آؤٹ'' کے حصول کے باوجود اس کی زمین اسی کی ملکیت میں ہے، اس لئے شرعاً ایسے پلاٹوں کی بیع وشراء درست ہوگی، لیکن قرآن وحدیث میں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ عہد وپیمان کو پورا کریں، لہٰذا مسلمانوں کو نفع خوری کی لالچ میں اس طرح کی حرکتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

معاہدے کے مطابق گارڈن کے لئے طے شدہ زمین پر بنائی گئی مسجد کا حکم:

جواب نمبر ۶: معاہدے کی خلاف ورزی درست نہیں، تاہم کالونی بنانے والے نے اگر اپنی مملوکہ زمین پر مسجد بنائی ہے، اس پر سے اپنا قبضہ بھی اٹھا لیا ہے اور اس میں نماز شروع ہوگئی تو وہ مسجد شرعی کے حکم میں ہے:

''رجل له ساحة لابناء فيها آمر قوما أن يصلوا فيها بجماعة إلى قوله أحدها إن أمرهم بالصلوٰة فيها أبدًا نصا بأن قال صلوا فيها أبدًا أو أمرهم بالصلوٰة مطلقًا ونوى الأبد ففي هذين الوجهين صارت الساحة مسجدًا لومات لايورث عنه'' (الفتاوىٰ الهنديه ۲/ ۴۰۹)۔

لہٰذا مذکورہ مسجد شرعی مسجد کہلائے گی اگر بالفرض مسجد کی عمارت کھڑی بھی نہ ہوئی اور مالک زمین محض مسجد کے لئے مختص زمین پر نماز کی اجازت دیتا اور اس میں نماز شروع ہو جاتی، تو بھی وہ زمین مسجد شرعی بن جاتی، البتہ شرط یہ ہے کہ مالک زمین کی اجازت سے نماز ہوئی ہو اور باجماعت ہوئی ہو،

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "التسليم في المسجد أن تصلي فيه جماعة بإذنه (هنديه ۲/۴۵۵)۔

قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر کالونیاں بنانا اور پلاٹ فروخت کرنا

سوال نمبر ۷: حکومت کے قوانین وہدایات مفادِ عامہ کے ساتھ مربوط ہونے چاہئے: "وفعل الأمير منوط بمفاد العامة" کالونی اور پلاننگ کے سلسلے میں حکومتی قوانین میں بے پناہ دشواریاں ہیں، ان تقاضوں کی تکمیل کے بعد قیمتیں آسمان کو چھونے لگتی ہیں اور غریب اپنے بنیادی حق مکان سے محروم رہتے ہیں، پھر حکومت نے ان قوانین میں لچک پیدا کر رکھی ہے کہ غیر قانونی کالونیوں کو قانونی بنانے کا موقع فراہم کرتی ہے، جب حکومت خود چشم پوشی سے کام لیتی ہے اور پھر اکثر غریب آبادیاں اسی طرح بسائی گئی ہیں تو اس نرم رویہ کو دیکھتے ہوئے اس طرح کی کالونیاں بنانے اور پلاٹ فروخت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، کسی بھی حکومت کے لئے یہ درست نہیں کہ خواہش نفس، ظلم وزیادتی پر مبنی مفادِ عامہ کے خلاف کوئی فرمان صادر کرے۔

"وهذه الطاعة كما أنها مشروطة بكون أمر الحاكم غير معصية فإنها مشروطة أيضا بكون الأمر صادرًا عن مصلحة لا عن هوىً أو ظلم لأن الحاكم لا يطاع لذاته وإنما يطاع من حيث أنه متول لمصالح العامة" (تكمله فتح الملهم ۳/۳۲۳)۔

مالی حیثیت ہوتے ہوئے محض قانونی دشواری سے بچنے کے لئے سودی قرض لینے کا حکم:

جواب نمبر ۸: سود کی حرمت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، سود چاہے بنیادی ضروریات کے لئے ہو یا پھر معاشی خوشحالی کے لئے یا اپنی تجارت کو فروغ دینے کیلئے، بہرصورت سود ہے اور خود آں حضرت ﷺ کے عہد مبارک میں بھی ہر طرح کے سودی قرض کا رواج تھا اور یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ نزول قرآن کے وقت مسلمانوں کی جو معاشی بدحالی تھی بعد کے دور میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے، اس وقت بھی یہودی معیشت پر حاوی تھے اور مسلمان معاشی اعتبار سے ان سے کافی پیچھے بلکہ ان کے تنخواہ دار بھی۔

سود کی تباہ کاری:

آج دنیا میں جتنی تباہ کاریاں آئی ہیں وہ اسی سودی نظام کے تحت آئی ہے جس میں امیر امیر ترین بنتے جارہے ہیں اور غریب کا چولھا بجھ رہا ہے، سود کی اسی لعنت کی بناء پر اسلام نے اسے قطعی حرام قرار دیا ہے اور دوسرے محرمات کی طرح اسی وقت اس کی اجازت دی ہے جب آدمی کے لئے اس کے بغیر اپنی جان اور عزت وآبرو کو محفوظ رکھنا مشکل ہو جائے۔ "إلا ما اضطررتم إليه"۔ پھر اس میں بھی یہ قید لگادی کہ طالب لذت نہ ہو، نہ ہی حد سے تجاوز کرے، یعنی جس مقدار میں یہ خطرہ ٹل جائے اسی پر اکتفا کرنا ضروری ہے، اگر ضرورت کو عرفی معنی پر محمول کیا جائے تو سود کا وسیع دروازہ کھل جائے گا، لہذا صرف ضرورت بمعنی اضطرار کے وقت ہی شرعی قیود کے ساتھ اس کا جواز ہوسکتا ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری اپنی شہرۂ آفاق کتاب الاشباہ والنظائر میں تحریر فرماتے ہیں:

"يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباه والنظائر، العادة محلة / ۲۶۷)۔

اہل ایمان کی مادی ترقی کا مدار:

صدیوں کے تجربات ومشاہدات اس بات پر شاہد ہیں کہ مسلمانوں کی مادی ترقی کا معیار بھی غیروں سے الگ ہے، خود نصوص بھی اس طرف رہنمائی کرتی ہیں، اگر مسلمان شریعت کی پابندی کریں اور شرعی حدود میں رہ کر تجارت کریں تو اللہ کی مدد ضرور شامل حال ہوگی، شوشلزم اور کمیونزم یا سرمایہ دارانہ نظام کی عمریں زیادہ نہیں ہیں، صدیوں تک اسلام نے کامیاب نظام معیشت پیش کیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ دوسری اقوام بھی اس کے انوار وبرکات سے بہرہ ور ہوئے ہیں اور جوں جوں شریعت کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی اور خلاف شرع نظام پر اعتماد کیا جانے لگا، اللہ کی مدد ہٹتی گئی اور مسلمان قعر مذلت میں گرتے چلے گئے، یہ ہرگز ممکن نہیں کہ مسلمان سودی قرض کے ذریعہ مادی ترقی کرلیں، کیوں کہ آقا ﷺ نے یہ پہلے ہی واضح کردیا ہے: "إن الربوا وإن كثر فإن عاقبته تصير إلى قل" (مشکوۃ) (سود خواہ کس قدر زیادہ ہوجائے انجام کار وہ قلت کی طرف لے جائے گی)،

اس کے بالمقابل اگر معاصی سے تائب ہوکر اپنے کو ہر معاملے میں شریعت کے تابع بنادیا جائے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اُخروی نجات کے ساتھ ساتھ سارے دنیوی مسائل بھی حل فرمادیں گے۔

قرآن کا صاف اعلان ہے: "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا" کہ جو شخص اللہ سے ڈرے گا، تقویٰ و پرہیز گاری اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ دے دے گا، ان واضح ارشادات کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو دنیا کے سودی نظام سے واسطہ نہیں رکھنا چاہئے، وہ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے تجارت کریں، شریعت کے اصول اور تجارت کے شرعی مسائل سے واقفیت حاصل کریں، شروع میں دشواریاں پیش آئے گی، لیکن اللہ تعالیٰ راہیں نکال دیں گے، ایک کریم آقا اپنے مخلص نوکر کو فراموش نہیں کرتا، برکت اور کثرت کے لئے خطیر رقم ہی سے تجارت کرنا ضروری نہیں، اللہ تعالیٰ چھوٹی رقم اور چھوٹی تجارت میں بھی برکت دے گا، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اس کی بہترین مثال ہیں، مدینہ ہجرت کرنے کے بعد خالی ہاتھ تجارت شروع کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دولت کے انبار لگ گئے۔

زمین کی خرید وفروخت میں کیا پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجائے گی:

جواب نمبر ۹: زمین کی خرید وفروخت کی یہ صورت، کہ کالونی میں جو قطعہ زمین بیچا جاتا ہے وہ نقشہ پر تو درج ہوتا ہے اور زمین کے ہر ٹکڑے کا ایک نمبر ہوتا ہے، لیکن زمین پر پلاٹس بنائے نہیں جاتے اور کالونی بسانے والے کے لئے اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ اس جگہ کو تبدیل کرنے یا نقشہ میں جس پلاٹ کا جو نمبر دیا گیا ہے اس کو کسی اور جگہ ڈال دے الخ۔ از روئے شرع درست ہے، کیوں کہ مبیع اور ثمن میں کوئی جہالت نہیں ہے، صرف پلاٹ نمبر کے آگے پیچھے ہونے کا احتمال رہتا ہے اور اس جہالت یسیرہ کو مشتری گوارہ کر لیتا ہے اور اس سے باہمی نزاع پیدا نہیں ہوتا، اشیاء منقولہ وغیر منقولہ کی تعیین ایک ہی طرح سے نہیں ہوتی، ان کے قبضہ میں بھی فرق ہوتا ہے، جب نقشہ میں اشارہ موجود ہے تو مبیع متعین ہوگئی صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

"والأعواض المشار إليها لايحتاج إلى معرفة مقدارها في جواز البيع لأن بالإشارة كفاية في التعريف وجهالة الوصف فيه لا تفضي إلى المنازعة" (ہدایہ ۳/ ۲۰)۔

صاحب ہدایہ نے بیع کی مذکورہ صورت کو حضرات صاحبین کے حوالے سے جائز قرار دیا ہے: "ومن اشترى عشرة أذرع من مأة ذراع من دار أوحمام فالبيع فاسد عند أبي حنيفة وقالا: هو جائز وإن اشترى عشرة أسهم من مأة سهم جاز في قولهم جميعًا"۔

دراصل حضرات صاحبین ہوں یا امام صاحب کے دیگر تلامذہ، انہوں نے اپنا کوئی قول اختیار نہیں کیا ہے، ان کی طرف منسوب اقوال بھی دراصل امام صاحب ہی کے اقوال ہوتے ہیں، دلائل کی روشنی میں جب کسی مسئلے میں مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور دلائل میں موجود گنجائش کی بنا پر امام صاحب کے قول میں تعدد ہوجاتا ہے، پھر احوال زمانہ اور تبدیلی عرف کی بنا پر جب امام صاحب کے تلامذہ ان ہی کے بیان فرمودہ کسی قول پر فتویٰ دیتے ہیں تو یہ قول ان کی طرف منسوب ہوجاتا ہے، علامہ شامیؒ نے شرح عقود رسم المفتی میں اس بات کی صراحت فرمائی ہے، امام صاحب کے تلامذہ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ ہمارے اقوال دراصل امام صاحب ہی کے اقوال ہیں اور اگر امام صاحب ہوتے تو موجودہ صورت حال کو دیکھ کر وہ بھی یہی فتویٰ دیتے (شرح عقود رسم المفتی/ ۱۰۱)۔

لہٰذا عرف اور عدم نزاع کے یقین کی صورت میں بیع کی مذکورہ صورت جائز ہونی چاہئے، بشرطیکہ اس میں بیع کی دیگر ضروری شرطیں پائی جاتی ہوں۔

بیچی ہوئی زمین پر بیچنے والے کا کاشت کرنا:

سوال نمبر ۱۰: جب ایجاب وقبول مکمل ہوگیا، مبیع اور ثمن کی تعیین بھی ہوگئی تو اب بائع کے لئے جبراً اسے اپنے قبضہ میں رکھنا جائز نہیں، اس پر فوراً مشتری کی ملکیت ثابت ہوگئی، بیع صحیح میں ملکیت کے لئے قبضہ بھی شرط نہیں ہے، ہاں بیع فاسد میں مبیع پر مشتری کی ملکیت اس وقت ثابت ہوگی جب وہ اس پر قبضہ کرلے گا۔

"وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما" (ہدایہ ۳/ ۲۰)۔

لہذا صورت مسئولہ میں بائع کے لئے اپنی بیچی ہوئی زمین پر کاشت کرنا جائز نہیں، وہ مشتری کی ملکیت ہے، الا یہ کہ مشتری نے کھیتی کرنے کی اجازت دے دی ہو، نیز یہ پہلو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اگر زمین بیچنے والے نے اپنے لئے کچھ مدت کے لئے کاشت کرنے کی شرط لگا دی ہے تو پھر یہ بیع درست ہی نہ ہوگی اور مشتری اس کا مالک نہ ہوگا:

''وكل شرط لايقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق كشرط أن لايبيع المشترى العبد المبيع لأن فيه زيادة عارية عن العوض فيودى إلى الربوا أو لأنه يقع بسببه المنازعة فيعرى العقد عن مقصوده إلا أن يكون متعارفا لأن العرف قاض على القياس'' (ہدایہ ۳/ ۵۹)۔

خریدے ہوئے پلاٹ کو متعین ہونے سے پہلے محض کاغذی نقشہ کی بنیاد پر فروخت کرنا:

جواب نمبر ۱۱: اس کی دو صورتیں ہیں:

(الف) اگر زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آگئی تھی اور پھر اس نے پلاٹ بنا کر اس کو فروخت کیا تو یہ صورت جائز ہے، کیوں کہ کالونی بنانے والا اس کا مالک مختار ہے، اس میں جو بھی تصرف کرنا چاہے شرعاً قانوناً عقلاً ہر اعتبار سے جائز ہے۔

(ب) لیکن دوسری صورت جس میں مالک زمین صرف پلاٹنگ کی اجازت دیتا ہے، قدرے تفصیل طلب ہے، اگر مالک زمین اور پلاٹنگ کرنے والے کے درمیان مبیع اور ثمن متعین ہو کر ایجاب وقبول بھی ہو چکا ہے تو اس کی بیع مکمل ہو چکی ہے، اس میں چونکہ ثمن ادا کرنے کی ایک مدت بھی مقرر کی گئی ہے، اس لئے اس کو بیع مؤجل کہیں گے، اس میں ادائیگی کا وقت متعین کرنا ضروری ہوگا۔

لیکن اگر مالک زمین اور پلاٹنگ کرنے والے کے درمیان خرید وفروخت کا معاملہ طے نہیں ہوا، بلکہ حکومتی منظوری کی توقع پر محض امکانی درجے میں پلاٹنگ کر لی گئی اور پھر پلاٹنگ کرنے والے نے اس کو فروخت کر دیا تو یہ بیع الفضولی کہلائے گی، یعنی ایک غیر مالک شخص نے کسی کی چیز فروخت کر دی، اس صورت میں اصل منظوری مالک زمین سے حاصل کرنی ہوگی، اگر اس نے اس خرید وفروخت کو منظور کر لیا تو یہ بیع درست ہو جائے گی، ورنہ کالعدم سمجھی جائیگی۔

''قال ومن باع ملك غيره بغير أمره فالمالك بالخيار إن شاء أجاز البيع وإن شاء فسخ'' (ہدایہ ۳/ ۸۸)۔

کالونی بنانے والے کا دلالوں کے ذریعہ اپنے پلاٹس فروخت کرنا:

جواب نمبر ۱۲: سوال نمبر ۱۱ کی طرح اس میں بھی تفصیل ہے، اگر کالونی بنانے والے نے مالک زمین سے خرید وفروخت کا معاملہ طے کر لیا ہے اور اس پر قبضہ بھی کر لیا ہے (اگر چہ اس نے مالک زمین کو کاشت کرنے کی اجازت دے رکھی ہے) تو وہ اپنے پلاٹس خود بھی فروخت کر سکتا ہے اور وکیلوں کے ذریعہ بھی، جنہیں آجکل دلال کہا جاتا ہے، لیکن اگر اس نے زمین والے سے خرید وفروخت کا معاملہ طے نہیں کیا ہے ابھی معاملہ بھاؤ تاؤ تک ہی محدود ہے یا خرید وفروخت کا معاملہ تو طے ہو چکا ہے، لیکن ابھی اس پر قبضہ نہیں کر سکا ہے یعنی مالک زمین کی طرف سے ابھی تک رکاوٹ دور نہیں کی گئی ہے تو پھر کالونی بنانے والے کا ان پلاٹوں کو خود فروخت کرنا یا دلالوں کے ذریعہ فروخت کرنا درست نہیں ہے، یہ بیع قبل القبض کی قبیل سے ہے، ہر وہ معاملہ جو انسان خود انجام دے سکتا ہے اسے وکیل کے ذریعہ بھی انجام دے سکتا ہے انسان بسا اوقات بعض حالات کی بنا پر کوئی کام خود انجام نہیں دے سکتا ہے، اور اسے اپنی حاجت کے لئے دوسرے کی مدد لینی پڑتی ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حکیم بن حزام کو قربانی کا جانور خریدنے کیلئے اور حضرت عمر بن ام سلمہ کو نکاح کے لئے وکیل بنایا۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ''قال وكل عقد جاز أن يعقده الإنسان بنفسه جاز أن يؤكل به غيره، لأن الإنسان قد يعجز عن المباشرة بنفسه على اعتبار بعض الأحوال فيحتاج إلى أن يوكل به غيره فيكون بسبيل منه دفعا للحاجة وقد صح أن النبى ﷺ وكل بالشراء حكيم بن حزام وبالتزوج عمر بن أم سلمة'' (ہدایہ ۳/ ۱۷۷)۔

کالونی بنانے والے کا اپنے بیچے ہوئے پلاٹس خود ہی خریدنے کی شرط لگانا:

جواب نمبر ۱۳: خریدار جب تک واجب الاداء قسطیں کالونی والے کو ادا نہ کردے اس وقت تک کالونی والے کو اپنے پلاٹس روک کر رکھنے کا اختیار رہتا ہے، فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے: "ویجوز للبائع أن لا یسلم المبیع إلی المشتری حتی یستوفی الثمن"، لیکن جب خریدار نے طے شدہ ثمن ادا کردیا تو اب مبیع پر بائع کا کوئی اختیار نہیں رہتا ہے، اس لئے بیع کی اس صورت میں یہ تفصیل ملحوظ رکھنی پڑے گی کہ اگر بائع نے ابتداء ہی میں شرط لگادی کہ اگر پلاٹس بیچنے کی نوبت آئے تو آپ (مشتری) دوسروں کے ہاتھ فروخت نہیں کرسکتے، ہمیں ہی فروخت کرنا ہوگا تو بیع مشروط ہے اور یہ ایسی شرط ہے جس کا نہ عقد تقاضا کرتا ہے، نہ ہی اس کا عرف عام میں چلن ہے، اس لئے یہ بیع فاسد ہوگی، خریدار کی ملکیت ہی اس پر ثابت نہیں ہوگی۔

اور اگر دوسری صورت ہے کہ ابتداء میں تو اس کی کوئی قید نہیں تھی، بیع مطلق ہوئی تھی، مگر بعد میں کالونی بنانے والے نے شرط لگادی تو یہ اس کی طرف سے زیادتی وظلم ہے، اسے اس کا اختیار نہیں ہے، اس پر ظلم وزیادتی کا گناہ ہوگا۔

خرید وفروخت مکمل ہوجانے کے بعد محض بعض قسطوں کی ادائیگی نہ ہونے پر بائع کا سودا کینسل کرنا:

جواب نمبر ۱۴: ایجاب وقبول مکمل ہوجانے کے بعد بائع یا مشتری میں سے کسی کو بھی اس کے فسخ کرنے کا اختیار نہیں رہتا، ہاں دونوں کی رضامندی ہوتو دوسری بات ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

"وإذا حصل الإیجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منهما إلا من عیب أو عدم رویة" (ہدایہ ۳/۲)۔

یعنی جب ایجاب وقبول ہوگیا تو معاملہ پختہ ہوگیا، اب تنہا کسی ایک کو اس معاملے کو کینسل کرنے کا اختیار نہیں، رہی یہ بات کہ اس کی قسطیں وقت پر ادا نہیں ہوئی یا اب وہ ان قسطوں کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہے، تو اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ خریدار کے ذمہ باقی قسطیں دین اور قرض ہیں، وہ کالونی بنانے والے کا مقروض ہے اور اس پر قرض کے احکام جاری ہوں گے، یہ ہرگز درست نہیں ہے کہ اس کی خریدی ہوئی زمین ہتھیالی جائے اور وہ بھی اس وقت جبکہ سوگنا اس کی قیمت میں اضافہ ہوچکا ہے، زمین خریدار کی ملکیت ہے، وہی اس کے نفع نقصان کا مالک ہے، مشہور ضابطہ ہے: "الخراج بالضمان" اگر خریدار ماقبی قسطیں ادا کرنے سے قاصر ہے تو اس کی زمین فروخت ہوگی اور اس وقت اس کی جو قیمت ہوگی اس پر معاملہ کرنا ضروری ہوگا، خریدار کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ خود کالونی بنانے والے کو اپنا پلاٹ فروخت کرکے اپنی قسطیں ادا کرے یا دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنے اور اس کی قسطیں ادا کرے، زمین اس کی ہے، اس لئے اگر خوانخواستہ زمین کی قیمتوں میں گراوٹ آجاتی تو اس کا ذمہ دار بھی مالک زمین ہوتا نہ کہ کالونی بنانے والا، مبیع کے نفع ونقصان کا مالک وہی ہوتا ہے جس کی ملکیت مبیع پر ہوتی ہے، حضور پاک ﷺ نے معاملہ کے کینسل ہونے کی صورت میں مبیع سے ہونے والے منافع کا فیصلہ مشتری ہی کے حق میں فرمایا ہے، چنانچہ مشکوۃ شریف کی روایت ہے:

"عن مخلد بن خفاف قال ابتعت غلاما فاستغللته ثم ظهرت منه علی عیب فخاصمت فیه إلی عمر بن عبدالعزیز فقضی لی رده وقضی علّی برد غلته فأتیت عروة فأخبرته فقال أروح إلیه العشیة فأخبره أن عائشه أخبرتنی أن رسول اللہ ﷺ قضی فی مثل ہذا أن الخراج بالضمان فراح إلیه عروة فقضی لی أن أخذ الخراج من الذی قضیٰ به علی" (رواہ فی شرح السنة، مشکوۃ / ۲۴۹)۔

(حضرت مخلد بن خفاف فرماتے ہیں کہ میں نے ایک غلام خریدا اور پھر اس کی کمائی حاصل کی، پھر میں اس کے عیب پر مطلع ہوا تو (خیار عیب سے استفادہ کرتے ہوئے اس معاملے کو کینسل کرنے کے لئے) اس معاملے کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے پیش کیا، آپ نے غلام کو واپس کردینے اور اس سے کمائی ہوئی رقم بائع کو لوٹا دینے کا فیصلہ صادر فرمایا، میں حضرت عروہؓ کے پاس گیا اور ان کو اس فیصلے کی اطلاع دیا، تو آپ نے فرمایا کہ میں شام کو ان کے پاس جاؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ حضرت عائشہؓ نے مجھے بتایا کہ رسول ﷺ نے اسطرح کے معاملوں میں الخراج بالضمان کے

مطابق فیصلہ فرمایا، چنانچہ حضرت عروہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے پاس تشریف لے گئے، تو پھر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس آمدنی کو مجھے واپس لے لینے کا فیصلہ صادر فرمایا جو میرے ذمہ لازم کیا تھا)۔

لہٰذا لوگوں سے اس طرح قسطیں وصول کرنا، پھر ان کے ذریعہ دولت بٹورنا اور پھر اس کی قیمت بڑھنے پر اس کو از خود کینسل کر دینا ہرگز جائز نہیں ہے، کسی کا مال اس طرح ہڑپ کر لینا درست نہیں ہے، ہاں خریدار خود اس معاملے کا اقالہ کرنا چاہے اور بائع بھی رضامند ہو تو اس کی گنجائش نکلتی ہے۔

''الإقالة جائزة في البيع بمثل الثمن الأول لقوله عليه السلام من أقال نادمًا بيعته أقال الله عثراته يوم القيمة'' (ہدایہ ۳/ ۶۹. والحديث رواه ابوداؤد وابن ماجه وابن حبان)۔

زمین کی دلالی سے متعلق مسائل:

جواب نمبر ۱۵: دلالی کی یہ شکل تو بلا کراہت درست ہے کہ دلال اپنی دلالی اور محنت کا معاوضہ اپنے مؤکل سے وصول کرلے، لیکن:

(الف) دلالی کی یہ شکل کہ اصل مالک سے قیمت معلوم کر کے پھر جتنے میں سودا طے کر سکے طے کر لے اور اصل قیمت مالک کے حوالے کر کے باقی رقم خود رکھ لے درست نہیں ہے، دلال زمین کا مالک نہیں ہے، وہ صرف وکیل بالبیع ہے اور وکیل کے سارے تصرفات مؤکل کی طرف منسوب ہوتے ہیں، وکیل ثمن کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھ کر ما بقی واپس کر دے یہ، درست نہیں ہے، یہ اجارہ ہے اور اجارہ میں اجرت کا مقرر ہونا ضروری ہے:

''ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة'' (ہدایہ ۳/ ۲۹۳)۔

کمپنی والے کا زمین بیچ کر پھر خود ہی خریدنے کیلئے قبضہ نہ دلانا:

(ب) اس طرح کی مشروط بیع کہ مبیع پر قبضہ بھی نہ دلایا جائے درست نہیں ہے، مبیع کے سلسلے میں ہر طرح کے تصرف کا حق مالک ہی کو ہوگا، کمپنی نے جب وہ پلاٹ کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا تو پھر اس پر اس کا کوئی حق نہیں رہ جاتا۔

''وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما إلا من عيب أو عدم رؤية'' (ہدایہ ۳/ ۲۰)۔

☆☆☆

مختلف النوع زمینوں کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

مفتی محمد الیاس قاسمی[1]

معاملات اسلام کا ایک اہم شعبہ ہے جس سے عموماً ہمارے معاشرے میں غفلت عام ہے اور ہم نے عملاً اسے دین سے خارج کر رکھا ہے، مسلمان نماز، روزہ، زکوۃ وحج کا اہتمام کرتے ہیں اوراد ووظائف کی پابندی بھی کر لیتے ہیں، لیکن معاملات کے باب میں اسلامی احکامات پر عمل پیرا نہیں ہوتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دین کے تمام شعبوں میں احکام شریعت پر کاربند رہنے کی تاکید فرمائی ہے، ارشاد باری ہے:

"یأیھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ" (البقرۃ: ۲۰۸)۔ (اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ)

خرید وفروخت اور لین دین کے بارے میں اپنے آپ کو حرام اور ناجائز ذرائع آمدنی سے بچائے رکھنا ہی اصل پرہیزگاری ہے، معاملات صاف نہ ہونے اور حرام وحلال کی تمیز نہ کرنے سے انسان کی نمازیں ودعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔

جواب: ۱

لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر کا سرکاری اراضی پر قبضہ کرنا غصب کے حکم میں ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے زمین غصب کرنے کی شدید الفاظ میں مذمت بیان فرمائی ہے: "عن سعید بن زید قال: قال رسول اللہ ﷺ: من أخذ شبرا من الأرض ظلما فإنہ یطوقہ یوم القیامۃ من سبعین أرضین" (صحیح البخاری ۱/ ۵۷۱، کتاب بدء الخلق باب ماجاء فی سبع أرضین ط: بیروت)۔

(حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو کوئی ظالمانہ طور سے بالشت بھر زمین پر بھی قبضہ کرے گا تو اُسے قیامت کے روز ستر زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا)۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:

"قال الخطابی: قولہ (طوقہ) لہ وجہان: أحدھما: أن معناہ أنہ یکلف نقل ماظلم منھا فی القیامۃ إلی المحشر ... الثانی: معناہ: أنہ یعاقب بالخسف الی سبعین أرضا وتکون کل أرض فی تلک الحالۃ طوقا فی عنقہ ... وفی الحدیث تحریم الظلم وتغلیظ عقوبتہ وإمکان غصب الأرض وأنہ من الکبائر. قالہ القرطبی" (فتح الباری ۵/ ۱۳۰)۔

(علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: آپ ﷺ کا ارشاد ہے "اس کو طوق پہنایا جائے گا" اس کی دو صورتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے جو زمین ظلماً حاصل کی ہے اُسے قیامت کے دن محشر کی طرف منتقل کرنے پر مجبور کیا جائے گا...... دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو ستر زمینوں تک دھنسانے کی سزا دی جائے گی، یعنی اس حالت میں ہر زمین اس کے گلے میں طوق ہوگی...... حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ظلم حرام ہے اور اس کی سزا بہت سخت ہے اور زمین کو غصب کرنا ممکن ہے اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یأیھا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل" (البقرۃ: ۱۸۸)۔

(اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ)۔

تفسیر روح المعانی میں ہے:

[1] دارالافتاء مدرسہ بیت العلوم پونہ۔

''(الباطل) ''الحرام کالسرقة والغصب وکل مالم یأذن بأخذہ الشرع'' (روح المعانی ۲/ ۱۰۵)۔
(باطل سے مراد حرام ہے؛ جیسے چوری، غصب اور ہر وہ طریقہ جس کو اختیار کرنے کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو)۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اتفق العلماء من أهل السنة علی أن من أخذ ما وقع علیه اسم مال قل أو کثر أنه یفسق بذلك وأنه محرم علیه أخذہ'' (الجامع لأحکام القرآن القرطبی ۲/ ۳۴)۔
(اہل سنت کے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو کوئی اس قدر چیز لے گا جس پر اسم مال کا اطلاق ہو خواہ وہ کم ہو یا زیادہ تو وہ اس کی وجہ سے فاسق ہو جائے گا، اس کا لینا اس پر حرام ہے)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه'' (سنن الدارقطنی ۳/ ۲۲، کتاب البیوع، رقم الحدیث: ۲۸۶۲)۔
(کسی مسلمان شخص کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں)

فقہاء کرام لکھتے ہیں:

''لا یجوز التصرف فی مال غیرہ بلا إذنه ولا ولایته'' (الدر المختار علی رد المحتار ۹/ ۲۴۰، کتاب الغصب)۔
(غیر کے مال میں تصرف اس کی اجازت اور ولایت کے بغیر جائز نہیں)۔

فقہی قاعدہ ہے: ''لا یجوز لأحد أن یتصرف فی ملك الغیر بلا إذنه'' (درر الحکام شرح مجلة الأحکام ۱/ ۹۸، المادہ: ۹۸)۔

قاعدہ فقہیہ ہے:

''لا یجوز لأحد أن یأخذ مال أحد بلا سبب شرعی'' (درر الحکام شرح مجلة الأحکام ۱/۹۸، المادہ ۹۸)۔
(کسی کے لئے جائز نہیں کہ کسی کے مال کو بغیر شرعی سبب کے حاصل کرے)۔

قدقیدت هذہ المادة: بلاسبب شرعی ''لأنه بالأسباب الشرعیة کالبیع والإجارة والهبة والکفالة والحوالة یحق أخذ مال الغیر'' (درر الحکام شرح مجلة الأحکام ۱/۹۸، ۹۶، المادہ: ۹۸، ۹۶)۔
(اس مادہ میں بلا سبب شرعی کی قید لگائی گئی ہے، اس لیے کہ شرعی اسباب جیسے بیع، اجارہ، ہبہ، کفالہ اور حوالہ سے دوسرے کا مال لینا جائز ہو جاتا ہے)۔

لہٰذا لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران اور غنڈہ عناصر کی مقبوضہ سرکاری اراضی کو براہ راست، قابضین یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا جائز نہیں۔

لینڈ گرابرس یا غنڈہ عناصر سے ان مقبوضہ سرکاری اراضی کی بیع حکومت کی اجازت پر موقوف ہوگی، چنانچہ ہدایہ میں ہے:

''من باع ملك غیرہ بغیر أمرہ فالمالك بالخیار إن شاء أجاز البیع وإن شاء فسخ'' (ہدایہ ۳/ ۱۳۴)۔
(جو کوئی دوسرے کی ملکیت کو اسکی اجازت کے بغیر فروخت کر دے تو مالک کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو بیع کی اجازت دے دے اور چاہے تو فسخ کر دے)

مجلۃ الاحکام میں ہے: ''البیع الذی یتعلق به حق الغیر کبیع الفضولی وبیع المرهون ینعقد موقوفا علی إجازة ذلك الآخر'' (مجلة الأحکام کتاب البیوع، رقم المادہ: ۳۶۸)۔
(وہ بیع جس سے غیر کا حق متعلق ہو جیسے فضولی اور مرہونہ چیز کی بیع اس دوسرے شخص کی اجازت پر موقوف ہوگی)

اگر براہ راست قابضین یا ان لوگوں سے خریدے ہوئے حضرات سے ایسی زمینوں کی خریداری کر لی جائے اور خریداری کے وقت مشتری کو معلوم نہ ہو کہ یہ سرکاری مقبوضہ اراضی ہے تو بائع کو ان زمینوں کی قیمت حکومت کو ادا کرنا ہوگی اور اگر خریداری کے وقت مشتری کو معلوم رہا ہو کہ یہ مقبوضہ اراضی ہے اس کے باوجود اس نے ان اراضی کو قابضین سے خریدا ہو تو مشتری پر لازم ہوگا کہ وہ ان اراضی کی قیمت حکومت کو ادا کرے۔

اگر قابض حضرات حکومت سے صلح کر کے ان مقبوضہ اراضی کی قیمت ادا کر دیں تو پھر براہ راست قابضین یا ان قابضین سے خریداری کرنے والے حضرات سے ان اراضی کی خریداری شرعاً جائز ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "والصلح خیر" (النساء: ۱۲۸) (اور صلح بہتر ہے)۔

جواب نمبر ۲:

عام حالات میں وقف کی زمین کو دوسری زمین سے تبدیل کرنا یا اسے فروخت کرنا جائز نہیں، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

"فإذا تم ولزم لایملك ولایملك ولایعار ولا یرهن" ...قوله (لایملك) أی لایکون مملوکا لصاحب ولایملك أی لایقبل التملیك بغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیك الخارج عن ملکه ولایعار ولایرهن لاقتضائهم الملك" (الدر المختار ۶/۴۲۱، کتاب الوقف)۔

البتہ اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ اوقاف کی زمین سے مقصد وقف کو کوئی نفع نہیں پہنچ رہا ہو یا اس پر غیر مسلم حضرات کے قابض ہوجانے کا اندیشہ ہو یا عملاً وہ اس کے کچھ حصے پر قابض ہو چکے ہوں تو ان صورتوں میں دیندار مسلمانوں کے مشورہ سے اوقاف کی زمین کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے متبادل زمین خریدنا جائز ہے، چنانچہ ہشامؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر وقف کی صورتحال ایسی ہوجائے کہ وہ مساکین کے لئے نا قابل انتفاع ہوجائے تو قاضی کے لیے گنجائش ہے کہ اسے فروخت کردے اور اس کی قیمت سے دوسری جائداد خرید کردے، البتہ یہ حق صرف قاضی ہی کو ہے:

قال هشام: سمعت محمدا یقول: الوقف إذا صار بحیث لاینتفع به المساکین فللقاضی أن یبیعه ویشتری بثمنه غیره ولیس ذلك إلا للقاضی" (البحر الرائق ۵/ ۲۲۵، ط: زکریا)۔

شمس الائمہ علامہ حلوانیؒ سے ان اوقاف کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ اگر وہ معطل ہوجائیں اور ان کو آباد کرنا دشوار ہوجائے تو کیا متولی اسے فروخت کرسکتا ہے اور اس کی جگہ دوسری جائیداد خرید سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں!

"سئل الحلوانی عن أوقاف إذا تعطلت وتعذر استغلالها هل للمتولی بیعها ویشتری مکانها أخریٰ؟ قال نعم" (البحر الرائق ۵/۲۲۵)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر وقف کے نگراں کو بادشاہ یا وارث کی جانب سے وقف کی زمین پر غاصبانہ قبضے کا اندیشہ ہو تو وہ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت صدقہ کرسکتا ہے، ہر وقف کے نگراں جس کو اس کا خوف ہو اس کے لئے یہی حکم ہے:

"قیم خاف من السلطان أو من وارث یغلب علی أرض وقف یبیعها ویتصدق بثمنها وکذا کل قیم إذا خاف شیئا من ذلك له أن یبیع ویتصدق بثمنها" (البحر الرائق ۵/۲۲۵، ط: زکریا)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی تحریر فرماتے ہیں کہ اگر وقف ویران ہوجائے اور اس سے کوئی فائدہ نہ ہو تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کے عوض ایسی جائیداد خریدی جائے گی جو مستحقین وقف کو فائدہ پہنچا سکے اور پہلی ہی جائیداد کی طرح اس کو وقف رکھا جائے گا:

"وإذا خرب الوقف ولم یرد شیئا بیع واشتری بثمنه مایرد علی أهل الوقف وجعل وقفا کالأول" (المغنی لابن قدامه ۵/۳۶۸)۔

علامہ ابن الہمام تحریر فرماتے ہیں: "لکن لا یبیعها إلا باذن الحاکم وینبغی للحاکم إذا رفع إلیه ولا منفعة فی الوقف أن یأذن فی بیعها إذا رآه أنظر لأهل الوقف" (فتح القدیر ۶/۱۲-۲۱۱ط: زکریا)۔

اوقاف کی نا قابل انتفاع اراضی کو فروخت کرنے کے لئے کچھ شرائط ہیں:

(۱) ان اراضی کو معمولی قیمت پر نہیں بلکہ مارکیٹ ویلو پر فروخت کی جائے۔

(۲) تبادلہ اوقاف کا مجاز عام متولیوں کے بجائے دیانتدار وذمہ دار ادارہ کو بنایا جائے۔

(۳) موقوفہ اراضی کے بدلے اراضی ہی حاصل کی جائے، روپیہ پیسے سے تبادلہ نہ ہو اور اگر ہو تو فوراً ہی اس سے غیر منقولہ جائیداد خرید لی جائے، لیکن ذمہ دار ادارہ اس کو قاضی کی اجازت ہی سے فروخت کرسکتا ہے اور قاضی کے لیے مناسب ہے کہ اگر اس کے پاس یہ معاملہ آئے اور وہ دیکھے کہ وقف غیر نافع ہو چکا ہے اور مستحقین وقف کا مفاد اس کو بیچنے میں ہے تو بیچنے کی اجازت دے دے (الدر المختار علی رد المحتار ۶/ ۸۷-۵۸۵)۔

لہذا اوقاف کی ایسی دور افتادہ زمین جس سے مقصد وقف کو کوئی نفع نہیں پہنچ پاتا ہو یا جس پر غیر مسلم حضرات کے قابض ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہو اسے فروخت کر کے اسکے عوض متبادل وقف قائم کیا جاسکتا ہے، اوقاف کی ایسی زمینوں کو خریدنا شرعاً جائز ہے، اوقاف کی ایسی زمین کہ جس کی واقعی مسجد ومدرسہ کو ضرورت ہوتی ہے، لیکن صرف اللہ سے بے خوفی اور مال کی حرص ولالچ کی وجہ سے ان پر ناجائز قبضہ ہو جاتا ہے، اس پر سے غیروں کے قبضہ کو ختم کرنے اور انہیں بازیاب کرانے کی پوری کوشش کی جائے، لیکن اگر ان کو بازیاب کرانا عملاً ممکن نہ ہو اور غاصب حضرات قیمت دینے کو تیار ہو جائیں تو متولی اس زمین کے بدلہ قیمت لے سکتا ہے؛ تا کہ اس کے ذریعہ دوسری زمین خرید کر متبادل وقف قائم کر سکے، چنانچہ علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''لایجوز استبدال العامر إلا فی أربع'' (الدر المختار علی رد المحتار ۶/ ۵۸۹)۔
(آباد زمین کا استبدال چار ہی صورتوں میں جائز ہے)

علامہ شامیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''الأولی: لوشرطه الواقف ... الثالثة: أن یجحده الغاصب ولا بینة أی وأراد دفع القیمة فللمتولی أخذها لیشتری بها بدلا'' (شامی ۶/ ۵۸۸)۔

(پہلی صورت یہ ہے کہ واقف نے اس کی شرط لگادی ہو...... تیسری صورت یہ ہے کہ غاصب اس زمین سے انکار کرتا ہو اور گواہان موجود نہ ہوں اور غاصب قیمت دینے کو تیار ہو جائے تو متولی اس زمین کے بدلے قیمت لے سکتا ہے، تا کہ اس کے ذریعہ دوسری زمین خرید کر متبادل وقف قائم کر سکے)، اوقاف کی ایسی زمینوں کو بھی خریدنا مسلمانوں کے لیے جائز ہے، البتہ اصل مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہے اس کو فروخت کرنا یا اس کا تبادلہ قطعاً جائز نہیں، علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''ولوخرب ماحوله واستغنی عنه یبقی مسجدا عند الإمام والثانی أبدا إلی یوم الساعة وبه یفتی'' (الدر المختار علی رد المحتار ۶/۵۴۸)۔

(اگر مسجد کا گردوپیش ویران اور مسجد سے مستغنی ہو جائے تب بھی وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسف کے نزدیک قیامت تک مسجد ہی رہے گی اور اسی پر فتویٰ ہے۔)

جواب نمبر ۳: اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں تمام وارثوں کو ان کا حصہ دینے کی تاکید فرمائی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یوصیکم الله فی أولادکم للذکر مثل حظ الأنثیین" (النساء: ۱۱)۔

اللہ تعالیٰ نے تمام وارثوں کے حصے تفصیل سے بیان فرمانے کے بعد ان احکام پر عمل کرنے والوں کے لیے عظیم بشارت بیان فرمائی ہے، جبکہ ان احکام سے روگردانی کرنے والوں کے لئے سخت وعید بیان فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"تلك حدود الله ومن یطع الله ورسوله یدخله جنت تجری من تحتها الأنهر خلدین فیها وذلك الفوز العظیم ۝ ومن یعص الله ورسوله ویتعد حدوده یدخله نارا خالدا فیها وله عذاب مهین" (النساء: ۱۳ و ۱۴)۔

(یہ حدیں اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ تعالیٰ جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقررہ حدوں سے آگے نکلے گا اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، ایسوں ہی کے لئے رسوا کن عذاب ہے)۔

حق وراثت انسان کا اپنا دیا ہوا حق نہیں ہے کہ معاف کر دینے سے یا ختم کرانے سے ختم یا معاف ہو جائے، بلکہ یہ حق وراثت اللہ کا دیا ہوا حق ہے جس کے اندر کسی تبدیلی وترمیم کا کسی کو حق نہیں، علامہ حصکفیؒ رقم طراز ہیں:

''والثالث إمّا اختیاری وهوا لوصیة أو اضطراری وهو المیراث'' (الدر المختار علی رد المحتار ۱۰/ ۴۹۲)۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں کہ اگر وارث کہہ دے کہ میں نے اپنا حق چھوڑ دیا تب بھی اس کا حق ترکہ میں سے باطل نہیں ہوگا، اس لیے کہ ملکیت چھوڑ دینے سے باطل نہیں ہوتی:

''ولو قال الوارث ترکت حقی لم یبطل حقه إذ الملك لایبطل بالترك'' (الأشباه والنظائر مع شرحه للحموی ص ۱۶۴ الفن الثالث: ما یقبل الاسقاط من الحقوق وما لا یقبله ط: اشاعت الاسلام دہلی)۔

علامہ حمویؒ اس کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اعلم أن للإعراض عن الملك ضابطة أنه إن كان ملكا لازما لم يبطل بذالك كما لو مات عن ابنين فقال أحد هما تركت نصيبي عن الميراث لم يبطل لأنه لازم لايترك بالترك بل إن كان عينا فلا بد من التمليك وان كان دينا فلا بد من الإبراء'' (شرح حموی علی الأشباه والنظائر ص ۱۴۲، الفن الثالث)۔

(جان لو کہ ملکیت سے اعراض کا ایک ضابطہ یہ ہے کہ اگر یہ لازمی ملکیت ہو تو اعراض سے باطل نہیں ہوگی جیسا کہ اگر مورث دو بیٹوں کو چھوڑ کر انتقال کر جائے اور ان میں سے ایک کہے کہ میراث میں سے میں نے اپنا حصہ چھوڑ دیا تو اس کا حصہ باطل نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ لازمی ہے چھوڑ دینے سے یہ متروک نہیں ہوتا، بلکہ اگر یہ عین ہو تو تملیک ضروری ہے اور اگر یہ دین ہو تو ابراء ضروری ہے)۔

مرنے والا جتنی چیزیں اپنی ملکیت میں چھوڑتا ہے وہ سب اس کا ترکہ شمار ہوتا ہے؛ خواہ وہ زمین و مکان ہو، نقد ہو یا اور کوئی سامان و چیز (البحر الرائق ۹/۳۶۵)۔

لہٰذا اگر پھوپھیاں یا دادا کی بہنیں ترکے میں سے اپنا حصہ معاف کردیں تو بھی اس سے ان کا حصہ معاف نہیں ہوگا، کیونکہ عفو وابراء دَین سے ہوتا ہے، عین سے عفو وابراء صحیح نہیں، البتہ اگر بھائیوں نے ترکے میں کوئی ایسا تصرف کرلیا جس سے بہن کا حق عین سے منتقل ہوکر بھائیوں کے ذمہ دَین بن گیا تو عفو وابراء صحیح ہے، بہن کے معاف کرنے سے معاف ہوجائے گا، ورثہ کے تصرف سے قبل اگر بہن ھبہ کردے تو یہ ھبۃ المشاع ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں)۔

علامہ زیلعیؒ رقم طراز ہیں:

''اگر ورثاء اپنے میں سے کسی ایک کو سامان یا زمین میں سے مال کے عوض یا چاندی کے عوض سونے یا اس کے برعکس یعنی سونے کے عوض چاندی سے خارج کردیں تو یہ صحیح ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ، یعنی انہوں نے جو دیا ہے وہ کم ہو یا زیادہ، اس لیے کہ اسے مبادلہ پر محمول کیا جائے گا اس لیے کہ یہ عین سے صلح ہے اور اسے ابراء پر محمول کرنا ممکن نہیں اس لیے کہ ان پر دین نہیں ہے اور عین سے ابراء کا تصور نہیں کیا جاسکتا'' (تبیین الحقائق ۵/۵۰)۔

علامہ چلپیؒ اس کی توضیح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: ''(قوله ولا يتصور الإبراء) أي لأن الإبراء عن الأعيان غير المضمونة لايصح'' (حاشية الشلبي على هامش تبيين الحقائق ۵/۵۰)۔

ترکہ کی سب چیزیں تمام ورثاء میں شرکت املاک سے مشترک ہوتی ہیں اور اس کا حکم یہ ہے کہ کوئی وارث دوسرے ورثاء کی اجازت صحیحہ کے بغیر کوئی تصرف کسی چیز میں نہیں کرسکتا، ورنہ عند اللہ وہ غاصب شمار ہوگا، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''وهي (الشركة) ضربان: شركة ملك وهي أن يملك متعدد إثنان فأكثر عينا... أو دينا... بارث أو بيع أو غير هما بأي سبب كان جبريا أو اختيار يا ... وكل من شركاء الملك أجنبي في الامتناع عن تصرف مضر في مال صاحبه'' (الدر المختار علی رد المحتار ۶/۴۶۷-۴۶۶)۔

(شرکت کی دو قسمیں ہیں: شرکت ملک اور وہ یہ ہے کہ متعدد لوگ دو یا اس سے زائد کسی عین...... یا دین...... میں وراثت یا بیع یا ان کے علاوہ کسی بھی سبب کے ذریعے خواہ وہ جبری ہو یا اختیاری شریک ہوں...... اور ملکیت کے شرکاء میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے مال میں نقصان دہ تصرف سے باز رہنے کے سلسلے میں اجنبی ہے)۔

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''رہی شرکت املاک تو دونوں قسموں میں اس کا حکم ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ دونوں شریکوں میں سے ہر ایک اپنے شریک کے حصے میں اجنبی کی طرح ہے، اس کے لیے اس میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف جائز نہیں'' (بدائع الصنائع ۵/۸۷، ط: زکریا دیوبند)۔

ایسی زمین جس میں والد نے پھوپھیوں کو یا دادا نے بہنوں کو حصہ نہ دیا ہو اس میں تین صورتیں ایسی ہیں جن میں بیٹوں یا پوتوں سے ایسی موروثی زمین کا خریدنا جائز ہے:

(۱) پھوپھیاں یا دادا کی بہنیں قیمت لے کر اپنے حصے سے دستبردار ہو جائیں۔

(۲) تقسیم وقبضہ کے بعد پھوپھیاں یا دادا کی بہنیں اپنی رضامندی سے اپنا حصہ ہبہ کردیں:

''وتتم الهبة بالقبض الكامل'' (الدر المختار على رد المحتار ۸/۴۹۳)۔

(۳) والد نے یا دادا نے زمین میں کوئی ایسا تصرف کرلیا ہو جس سے بہن کا حصہ والد یا دادا کے ذمہ دین بن گیا ہو اور اس کے بعد پھوپھیوں نے یا دادا کی بہنوں نے اپنا حصہ خوش دلی سے معاف کردیا ہو۔

اگر ان صورتوں میں سے کوئی صورت نہ پائی جائے تو بیٹوں یا پوتوں سے ایسی موروثی زمین کا خریدنا جائز نہیں، کیونکہ یہ غصب کے حکم میں ہے اور غصب کردہ چیز باقی ہو تو اصل چیز کا لوٹانا واجب ہے اور اگر وہ ضائع ہوگئی ہو تو اس کی قیمت مالک کو دینا لازم ہے:

''ويجب ردّ عينه في مكان غصبه أو مثله إن هلك وهو مثلي أو إن انصرم المثلي فقيمته يوم الخصومة'' (كنز الدقائق على البحر الرائق ۹/۹۹-۱۹۸)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل'' (البقرہ: ۱۸۸)۔ (اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو)

تفسیر روح المعانی میں ہے: ''والمراد من الأكل مايعم الأخذ والاستيلاء وعبر به لأنه أهم الحوائج وبه يحصل اتلاف المال غالبا'' (روح المعانی ۲/۶۳۲)۔

(اور کھانے سے مراد وہ ہے جو لینے یا بزور قوت قبضہ کرنے کو شامل ہے اور کھانے سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ یہ سب سے اہم حاجت ہے اور عموماً مال کا اتلاف اسی سے ہوتا ہے)۔

''(الباطل) الحرام كالسرقة والغصب وكل مالم يأذن بأخذه الشرع'' (روح المعانی ۲/۱۰۵)۔

(باطل حرام کو کہتے ہیں، جیسے چوری، غصب اور ہر وہ طریقہ جس کو اختیار کرنے کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی مسلمان کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں:

''لايحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه'' (مشكوة المصابيح ص ۲۵۵، باب الغصب والعارية)۔

لہٰذا بیٹوں یا پوتوں سے ایسی موروثی زمین کا خریدنا جائز نہیں جس میں جواز کی تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہ پائی جائے۔

جواب نمبر ۴: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف احادیث میں حرام چیزوں سے دور رہنے کی تاکید فرمائی ہے، مشکوۃ شریف میں ہے:

''عن الحسن بن علي قال: حفظت من رسول الله صلى الله عليه وسلم: دع ما يريبك إلى مالا يريبك'' (مشكوة المصابيح ۲۴۲، كتاب البيوع، باب الكسب وطلب الحلال)۔

(جس چیز کے متعلق تمہارے دل میں شک وشبہ ہو اس کو چھوڑ کر ایسی چیز کو اختیار کرو جس کے متعلق شک وشبہ نہ ہو)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دس درہم کے عوض کوئی کپڑا خریدے جس میں ایک درہم حرام ہو تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں فرمائیں گے۔

''عن ابن عمر رضي الله عنهما أن رسول الله ﷺ قال: من اشترى ثوبا بعشرة دراهم وفيه درهم حرام لم يقبل الله تعالى له صلاة مادام عليه'' (مسند احمد بن حنبل ۵/۱۹-۲۱۸، حديث: ۵۷۳۲- ط: قاهرة)۔

ایک دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو بھی بندہ حرام مال کماتا ہے اور اسے خرچ کرتا ہے اس میں اس کے لیے برکت نہیں دی جاتی اور وہ اسے صدقہ کرتا ہے تو اسے قبول نہیں کیا جاتا اور جو حرام مال وہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ بنے گا۔

''عن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه عن رسول الله ﷺ قال: لايكسب عبدمالا من حرام فينفق فيه فيبارك

له فيه ولا يتصدق به فيتقبل منه و لا يترك خلف ظهره إلا كان زاده إلى النار'' (مسند احمد بن حنبل ۲/۵۳۹، حدیث نمبر ۳۶۷۲)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی سامان کے متعلق معلوم ہوجائے کہ وہ کسی شخص سے ظلماً لے کر لوگوں نے بازار میں فروخت کردیا ہے تو اسے خریدنا جائز نہیں، اگر چہ کئی لوگوں نے اس کا لین دین کیا ہو (عالمگیری ۵ / ۳۶۴، کتاب الکراھیۃ)۔

حرام ایک شخص سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتا ہے، چنانچہ علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص امان لے کر دارالحرب میں جائے اور حربی کی رضامندی کے بغیر اس کا مال حاصل کرکے ہمارے پاس لے کر آئے تو وہ اس کا مالک ہوگا اور اس کی بیع بھی درست ہوگی، لیکن اس کے لیے اور مشتری کے لیے وہ حلال نہ ہوگا، لہٰذا اس کو خریدنے سے وہ گنہگار ہوگا، کیونکہ وہ حرام کمائی سے اس کا مالک ہوا ہے (الدر المختار علی رد المحتار ۷ / ۳۰۰)۔

علامہ شامی اس کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حرام منتقل ہوتا ہے یعنی اس کی حرمت منتقل ہوتی ہے اگر چہ کئی لوگوں نے لین دین کیا ہو اور ملکیتیں تبدیل ہوگئی ہوں'' (شامی ۷ / ۳۰)۔

فقہاء کرام تحریر فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے بارے میں حرام ہونا معلوم ہو تو اس کو خریدنا جائز نہیں چنانچہ علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ عبدالوہاب شعرانی کتاب المنن میں کہتے ہیں اور بعض احناف سے جو منقول ہے کہ حرام دو ذموں تک منتقل نہیں ہوتا تو اس کے بارے میں میں شہاب ابن شلبی سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ اس پر محمول ہے جبکہ دوسرے شخص کو یہ معلوم نہ ہو، رہی یہ صورت کہ جو شخص ٹیکس وصول کرنے والے کو دیکھے کہ وہ کسی شخص سے کوئی ٹیکس وصول کر رہا ہے پھر وہ اسے دوسرے کو دے رہا ہے پھر وہ شخص اس دوسرے شخص سے لے لے تو یہ حرام ہے'' (شامی ۷ / ۳۰۱ ط: زکریا)۔

لہٰذا جو زمین خالص حرام آمدنی سے خریدی گئی ہو اسے ان لوگوں کے لیے خریدنا جائز نہیں جو جانتے ہیں کہ یہ زمین حرام مال سے خریدی گئی ہے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ اگر حرام مال کے مالک معلوم ہوں تو اسے انہیں لوٹانا واجب ہے اور اگر مالک معلوم نہ ہوں تو اسے صدقہ کرنا واجب ہے۔

''والحاصل أنه ان علم أرباب الأموال وجب ردّه عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه'' (شامی ۷/۳۰۱، کتاب البیوع)۔

مال حرام کے مصرف کے بارے میں علامہ خلیل احمد سہارنپوری تحریر فرماتے ہیں:

''وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فأما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له لغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء'' (بذل المجهود ۱/۳۵۹، کتاب الطهارة)۔

(اور اگر کسی شخص کے پاس حرام مال ہو اور وہ عقد فاسد کے ذریعے اس کا مالک ہوا ہو یا اسے وہ مال بغیر عقد کے حاصل ہوا ہو اور اس کے لیے ممکن نہ ہو کہ وہ اسے اس کے مالک کو لوٹائے اور وہ چاہتا ہو کہ اپنے آپ سے ظلم کو دور کردے تو اس کے لیے اس کے علاوہ کوئی حیلہ نہیں ہے کہ وہ اسے فقراء کو دے دے)۔

البتہ اگر ایسا شخص اپنے کل مال حرام اور اس کے ذریعے نفع حاصل کردہ منافع کی قیمت کا تخمینہ کرکے اتنے روپئے آہستہ آہستہ صدقہ کردے تو اس نے مال حرام سے جو زمین خریدی ہے وہ حلال ہوجائے گی، صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی تحریر فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے کسی کے مثلاً ہزار روپئے غصب کرلیے اور ان ہزار روپیوں سے کوئی سامان تجارت خرید لیا اور اسے فروخت کرکے دو ہزار بنا لیے پھر اور مال خریدا اور اس سے مزید نفع کمایا تو اصل مالک کو اسے ضمان دینی ہوگی، ساتھ ہی ساتھ یہ پورا نفع بھی اسے صدقہ کردینا ہوگا، یہ مسلک امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک صدقہ کرنا واجب نہیں، بلکہ ضمان ادا کرنے کے بعد یہ منافع اس کے لیے حلال ہوجائیں گے، مشائخ علماء احناف کا کہنا یہ ہے کہ ضمان ادا کرنے کے پہلے بھی اور ضمان ادا کرنے کے بعد بھی یہ منافع اس کے لیے پاک نہیں ہوں گے اور یہی قول مختار ہے (ہدایہ علی فتح القدیر ۹ / ۳۳۶، مستفاد: بحث ونظر پٹنہ شمارہ نمبر ۴۴ ص ۱۴۔ ۱۱۲)۔

لہٰذا اگر کسی شخص کے متعلق معلوم ہوجائے کہ اس نے اس شرعی حیلہ سے اپنی حرام کمائی سے خرید کردہ زمین کو حلال کرلیا ہے تو اس شخص سے زمین خریدنا شرعاً جائز ہے۔

جواب نمبر ۵: کالونی بنانے والا حکومت کی جانب سے لے آوٹ منظور کرانے کے لیے پلے گراؤنڈ اور مسجد کی جگہ مقرر کرتا ہے، مخصوص چوڑائی کی سڑکوں، پلے

گراؤنڈ اور سوئمنگ پول کے لیے جگہ چھوڑتا ہے، اسی طرح وہ اپنے گاہکوں کے سامنے بھی ان چیزوں کو ظاہر کرتا ہے، لیکن بعد میں وہ سڑکوں کو چھوٹا کر دیتا ہے، پلے گراؤنڈ، سوئمنگ پول اور مسجد کی جگہ کو فروخت کر دیتا ہے، کالونی بنانے والے بلڈر کا یہ طرز عمل شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ حکومت سے لے آؤٹ منظور کراتے وقت بلڈر کالونی سے متعلق حکومت کے قوانین پر عمل کرنے کا عہد کرتا ہے، اسی طرح وہ لوگوں سے بھی کالونی میں حکومتی معیار کی سہولیات مہیا کرانے کا وعدہ کر کے اسے پورا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے وعدہ پورا کرنے کی تاکید فرمائی ہے:

"وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا" (الاسراء: ۳۴)۔ (اور وعدے پورے کرو، کیونکہ قول وقرار کی باز پرس ہونے والی ہے)۔

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے صاحب روح المعانی رقم طراز ہیں:

"وأوفوا بالعهد" أي ما عاهدتم الله عليه من التزام تكاليفه وعاهد تم عليه غيركم من العباد ويدخل في ذالك العقود" (روح المعاني ۱۵/۱۰۲)۔

(اور وعدے پورے کرو یعنی جو معاہدہ تم نے اللہ سے کیا ہے یعنی اس کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کا اور جو معاہدہ تم نے اپنے علاوہ دوسرے بندوں سے کیا ہے اور اس میں معاملات داخل ہیں)۔

"پھر وفاء عہد کو ترک کر دینا جیسا کہ صحیح احادیث تقاضا کرتی ہیں، کہا گیا ہے کہ گناہ کبیرہ ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آپ نے عقد یعنی معاہدے توڑ دینے کو کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے، بلکہ شیخ الاسلام علائیؒ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وارد ہوا ہے کہ آپ نے اسے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے"۔ (روح المعانی ۱۵/ ۱۰۲، تحت قولہ وأوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا)۔

فقہاء لکھتے ہیں کہ وعدہ خلافی حرام ہے: "الخلف في الوعد حرام" (الأشباه والنظائر مع حاشية الرافعي ص ۱۵۹، الفن الثاني)۔

کالونی بسانے والا بلڈرز زمین میں ناجائز تصرفات کے ذریعے حکومت اور اپنے گاہکوں کو دھوکہ دیتا ہے، جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکہ دینے کی مذمت بیان فرمائی ہے:

"من غش فليس منا" (جامع الترمذي ۱/۲۴۵، أبواب البيوع) (جو (شخص) دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں)۔

تجارت میں فریب دہی اور خیانت کی مذمت بیان فرماتے ہوئے ڈاکٹر وھبہ زحیلی رقم طراز ہیں:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے ہیں "جو ہم کو دھوکہ دے تو وہ ہم میں سے نہیں"، یعنی ان لوگوں میں سے نہیں جو میری سیرت پر چلتے ہیں اور میرے علم، عمل اور میرے اچھے طریقے کی اقتداء کرتے ہیں، امانت داری اور حلال کا التزام اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ چوری کردہ، غصب کردہ، باصرار اور شر ما شری میں لی ہوئی چیز کو نہ خریدا جائے، عمدہ چیز پیش کی جائے، خراب چیز کو ترک کر دیا جائے اور حیلہ اور فریب سے دور رہا جائے ...... تاجر پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اور سب سے پہلے اپنے شریک کے ساتھ امانت داری کا التزام کرے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے فرماتے ہیں: "میں دو شریکوں کا تیسرا شریک ہوں جب تک کہ ان میں سے کوئی خیانت نہ کرے، پس اگر ان میں سے کوئی خیانت کرے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں"۔

(الموسوعة الفقهيه والقضايا المعاصره ۱۱/۱۴۰)۔

کالونی میں راستے چھوٹے کر دینا، پلے گراؤنڈ اور سوئمنگ پول کی جگہ فروخت کر دینا ضرر عام کا باعث ہے، جبکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ انسان کا ایسا طرز عمل جس سے ضرر عام لاحق ہو جائز نہیں۔

"لا يمنع الشخص من تصرفه في ملكه إلا إذا كان الضرر بجاره ضررا بينا فيمنع من ذالك وعليه الفتوى" (الدر المختار على رد المحتار ۸/۱۵۲، كتاب القضاء)۔

(کسی شخص کو اس کی ملکیت میں تصرف سے نہیں روکا جائے گا، مگر جب کہ اس کے پڑوسی کو واضح ضرر ہو تو اسے اس سے روکا جائے گا اور اسی پر فتویٰ ہے)۔

درر الحکام شرح مجلۃ الأحکام میں ہے: "کسی شخص کو اس کی ملکیت میں تصرف سے نہیں روکا جائے گا؛ جب تک کہ دوسرے کو ضرر فاحش نہ ہو"

(درر الحكام شرح مجلة الأحكام ۳/۲۱۰، رقم المادة: ۱۱۹۷)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لاضرر ولاضرار'' (سنن ابن ماجہ ص ۱۶۹)۔

(نہ ابتداء نقصان پہنچایا جائے اور نہ جوابًا نقصان پہنچایا جائے)

لہٰذا بیچنے والے شخص کے لیے نقشے میں تبدیلی کرتے ہوئے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کو فروخت کر دینا جائز نہیں۔

جو لوگ جانتے ہوں کہ مالک زمین، عوامی مفادات سے وابستہ زمین فروخت کر رہا ہے، ان کے لیے جانتے بوجھتے ایسی زمینوں کی خریداری جائز نہیں، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر اہل محلہ راستے کے بعض حصے کو اپنے گھروں میں شامل کرلیں تو ان کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں، اگرچہ اس کی وجہ سے راستے کو کوئی نقصان نہ پہنچ رہا ہو، البحر الرائق میں ہے:

''وإن أراد أهل المحلة أن يدخلوا شيئا من الطريق في دورهم وذلك لايضر بالطريق لايكون لهم ذلك'' (البحر الرائق ۵/۴۲۸)۔

راستہ بھی عوام الناس کیلئے وقف ہوتا ہے، کسی کے لیے راستے پر قبضہ کر کے اس پر ذاتی تصرف کرنا جائز نہیں، راستہ وسیع ہو اور اس پر قبضہ کی وجہ سے راہگیروں کو ضرر نہ ہو تب بھی راستے پر قبضہ کرنا جائز نہیں ہے۔

موسوعہ فقہیہ میں ہے: ''اور اگر وہ (امام) راستہ سات ہاتھ یا بقدر حاجت سے زیادہ طے کردے تو اس میں تبدیلی نہ کی جائیگی، اس لئے کہ راستے اور میدان مسلمانوں کے لئے وقف شدہ چیزوں کی طرح ہیں، لہٰذا کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ مسلمانوں کے راستے کے کسی حصے پر قبضہ کرے یا اس میں سے کچھ خود کیلئے لے لے، اگرچہ راستہ وسیع ہو اور مقبوضہ حصے کے سبب راہ گیروں کو ضرر نہ ہو، چنانچہ حضرت حاکم بن حارث سلمی سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو مسلمانوں کے راستے کے ایک بالشت حصے پر بھی قبضہ کرے گا تو قیامت کے دن اس کو سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا''۔

(الطبرانی فی الصغیر) (الموسوعة الفقهية ۲۴/۳۴۷)۔

لہٰذا جب راستے پر قبضہ کر کے مکان بنانا جائز نہیں تو راستے، پلے گراؤنڈ اور گارڈن کی حیثیت سے متعینہ مقامات کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ نے گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون کرنے سے منع فرمایا ہے۔

"وتعاونوا على البر والتقوى ولاتعاونوا على الأثم والعدوان" (المائدہ: ۲)۔

جواب نمبر: ۶/ اسلام دین فطرت ہے، اس کے نزدیک ایک حد تک جسمانی ورزش اور تفریح بھی مستحسن و مطلوب ہے، ورزش و تفریح کے ذریعے جسم کی سستی دور ہوجاتی ہے اور طبیعت میں نشاط، چستی، حوصلہ و ہمت پیدا ہوتی ہے، ان چیزوں کے حصول کے لیے گارڈن اور پلے گراؤنڈ ضروری ہے۔

لہٰذا اسلام میں پلے گراؤنڈ اور گارڈن کی اہمیت و افادیت مسلم ہے اور بیچنے والے شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ مسلمانوں کو لبھانے کے لیے گارڈن کی جگہ مسجد بنائے، کیوں کہ یہ حکومت سے کیے ہوئے معاہدے کے خلاف ہے اور گاہکوں سے بھی فریب دہی ہے، گارڈن کی جگہ بنائی گئی مسجد، مسجد شرعی نہیں ہوگی، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مسجد پوری کی پوری راستے پر تعمیر کی گئی ہو تو وہ مسجد شرعی نہیں ہوگی، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''جعل الباني شيئا من الطريق مسجدا لضيقه ولم يضر بالمارين جاز. لأنهما للمسلمين'' (الدر المختار علی رد المحتار ۶/۵۴۷)۔

(مسجد بنانے والے نے مسجد کی تنگی کی وجہ سے راستے کے بعض حصے کو مسجد بنادیا، درآنحالیکہ راستے سے گزرنے والوں کو تکلیف نہ ہو تو جائز ہے، کیوں کہ یہ سب مسلمانوں کے فائدہ کے لیے ہیں)۔

علامہ شامیؒ عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''قوله (جاز) ظاهره أنه يصير له حكم المسجد وقد قال في جامع الفصولين المسجد الذي يتخذ من جانب الطريق لايكون له حكم المسجد بل هو طريق بدليل أنه لو رفع حوائطه عاد طريقا كما كان قبله.

قلت: الظاهر أن هذا في مسجد جعل كله من الطريق''

(ماتن کا قول (جائز ہے) اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم مسجد کا ہوگا، جامع الفصولین میں فرماتے ہیں: وہ مسجد جو راستے کے کنارے پر بنائی

جاتی ہے، اس کا حکم مسجد کا نہیں ہوگا، بلکہ یہ راستے کے حکم میں ہوگا، اس دلیل کی بناء پر کہ اگر اس کی دیوار ہٹادی جائیں تو وہ دوبارہ راستہ بن جائے گا، جیسا اس سے پہلے تھا، میں کہتا ہوں: بظاہر یہ اس مسجد کے بارے میں ہے جو پوری کی پوری راستے پر بنائی گئی ہو)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ مسجد اور راستہ دونوں عام لوگوں کے فائدے کے لیے ہوتے ہیں، اسی طرح گارڈن بھی عوام الناس کے فائدے کے لیے ہوتا ہے اور ایسی مسجد جو مکمل طور پر گارڈن کی جگہ پر بنی ہو وہ شرعی مسجد نہیں کہلائے گی، چنانچہ فقہاء نے اس مسجد میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی ہے جو شہر کی فصیل پر بنائی گئی ہو، کیونکہ فصیل شہر پر عوام الناس کا حق ہے۔

''مسجد بني على سور المدينة قالوا لايصلى فيه لأن السور حق العامة'' (فتاوی عالمگیری بحوالہ قاموس الفقہ ۵/۹۳)۔

جواب نمبر ۷/ فقہاء کرام نے سیل ٹیکس، انکم ٹیکس جیسے ناروا ٹیکسیس سے اپنے آپ کو بچانے کی اجازت دی ہے، لہٰذا زمین کی خریداری پر واجب الادا سیل ٹیکس سے اپنے آپ کو بچانا شرعاً جائز ہے، علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''الأفضل مشاركة أهل محلته في إعطاء النائبة لكن في زماننا أكثرها ظلم فمن تمكن من دفعه عن نفسه فحسن وإن أعطى فليطع من عجز'' (الدر المختار على رد المحتار ۹/ ۶۰۸)۔

(اہل محلہ کا ٹیکس دینے میں شریک ہونا افضل ہے، لیکن ہمارے زمانے میں اکثر ٹیکس ظلم ہیں، پس جو شخص اپنے آپ کو ٹیکس سے بچالے تو یہ اچھا ہے اور اگر دیتا ہے تو وہ شخص دے جو اپنے آپ کو ٹیکس سے بچانے سے عاجز ہو جائے)۔

علامہ شامیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''هذا كان في ذلك الزمن لأنه إعانة على الطاعة وأكثر النوائب في زماننا بطريق الظلم فمن تمكن من دفعه عن نفسه فهو خير له'' (شامی ۹/ ۶۰۵)۔

(یہ (ٹیکس کی ادائیگی) اس زمانے میں افضل تھا، کیونکہ یہ نیک کام میں اعانت کے قبیل سے تھا، جبکہ ہمارے زمانے میں اکثر ٹیکس ظلم کے قبیل سے ہیں، پس جو شخص اپنے آپ کو اس سے بچالے تو اس کے لئے بہتر ہے)۔

فقہاء کرام نے اپنے جائز حق کے حصول اور ظلم و ناانصافی سے بچنے کے لیے رشوت دینا جائز قرار دیا ہے۔

''دفع المال للسلطان الجائر عن نفسه و ماله لاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع'' (شامی ۶۰۷/۱)۔

''مايدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ: لأن دفع الضرر عن المسلم واجب ولا يجوز أخذ المال ليفعل'' (ردالمحتار ۸/۳۵)۔

بذل المجہود میں ہے:

''فإذا أعطى ليتوسل به إلى حق أو يدفع عن نفسه ظلما فإنه غير داخل في هذا الوعيد'' (بذل المجهود ۶/۳۰۷)۔

(پس اگر رشوت اس لیے دے: تاکہ اس کے ذریعے اپنا جائز حق حاصل کرے یا اپنے آپ سے ظلم کو دفع کرے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے)۔

صورت مسئولہ میں قانونی مراحل کی تکمیل کی وجہ سے کالونی کے مکانات اور پلاٹ کی قیمت اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ غریبوں کے لیے پلاٹ کی خریداری دشوار ہو جائیگی جبکہ مکان انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے اور ذاتی گھر کے حصول کے لیے بحالت مجبوری سودی قرض کے حصول کی بھی گنجائش ہے، علامہ ابن نجیم تحریر فرماتے ہیں:

''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الأشباه والنظائر ۳۲۷/۱، الفن الأول القاعدة الخامسة)۔

علامہ ابن نجیم نے حاجت کی بناء پر سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے، اور اصطلاح میں حاجت ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے کسی مقصد کا وجود موقوف نہ ہو، لیکن اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو مشقت اور حرج پیدا نہ ہو جائے۔

''وأما الحاجيات معناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسع ورفع الضيق المؤدي في الغالب إلى الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب'' (الموافقات ۳/۵)۔

فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ''الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة '' (الأشباه والنظائر لابن نجيم ۱/۳۱۶)۔
(حاجت ضرورت کا درجہ اختیار کرتی ہے خواہ وہ عام ہو یا خاص)۔

لہٰذا قانونی مراحل کی تکمیل کے بغیر ہی کالونی بنانا اور پلاٹ فروخت کرنا شرعاً جائز ہوگا، کیونکہ یہ ایک جائز کام کا ذریعہ ووسیلہ ہے، جبکہ وسیلہ اپنے مقصد کے تابع ہوتا ہے۔فقہ کا قاعدہ ہے:

'' ان الوسيلة أو الذريعة تكون محرمة إذا كان المقصد محرما وتكون واجبة إذا كان المقصد واجبا'' (المقاصد الشرعيه للخادمی ص ۴۶)۔

''وسيلة المقصود تابعة للمقصود وكلاهما مقصود '' (اعلام الموقعين ۳/۱۷۵)۔
(مقصد کا وسیلہ مقصد کے تابع ہوتا ہے اور وہ دونوں مقصود ہوتے ہیں)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں کہ شریعت اسلامی ایک دائمی شریعت ہے جس کا مطلوب یہ ہے کہ لوگ دنیا وآخرت میں خوشحالی سے ہمکنار ہوں اور ان سے ضرر اور مشقت دور ہو:

''شریعت اسلامی عام ودائمی شریعت ہے جس کا مقصود لوگوں کے مفادات کی تکمیل، ان کی نجات اور دنیا وآخرت میں ان کو کامیاب بنانا ہے اور اس کا تقاضہ یہ ہے کہ شریعت مطہرہ کے تمام احکامات کی بنیاد اور ان کا مقصد لوگوں کے فوری یا بعد کے مفادات کی حفاظت ہے یا تو ان کے لیے نفع کے حصول کے ذریعے یا ان سے ضرر وفساد کے دفعیہ کے ذریعے احکام شریعت میں آسانی اور فراخدلی کی بنیاد کی رعایت کی جائے، اس لئے کہ شریعت کی خصوصیات میں سے ہیکہ حرج یا مشقت کو دور کیا جائے اور مختلف قسم کے احکامات کی تحقیق وجائزے کی رہنمائی میں اور ان کی مراد کو سمجھتے ہوئے ان کے مقصود وفائدہ کو اخذ کرتے ہوئے احکامات کو زندگی کے حالات اور نئے واقعات سے ہم آہنگ کیا جائے، اس کی جانب قرآن کی آیتیں رہنمائی کرتی ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''رسولوں (کو بھیجے) بشارت دینے کیلئے اور ڈرانے کے لئے، تاکہ رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی الزام وحجت نہ رہ جائے'' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر لوگوں کیلئے رحمت بنا کر'' (الموسوعة الفقهيه والقضايا المعاصره ۱۲ / ۱۹۴)۔

جواب نمبر: ۸ / فقہاء کرام نے ضرورت اور مجبوری کے وقت سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے۔

''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح '' (الأشباه والنظائر لابن نجيم ص ۱/۳۱۷)۔

مسئلہ مذکورہ میں بھی انکم ٹیکس سے تحفظ کے لیے بینک سے کروڑوں کا لون لینا جائز ہے، کیونکہ اگر لون نہ لیں گے تو انسان انکم ٹیکس کی زد میں آجائے گا، جبکہ فقہاء کرام نے ناروا ٹیکس کی عدم ادائیگی کو جائز قرار دیا ہے۔علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں:

''الأفضل مشاركة أهل محلته فى إعطاء النائبة لكن فى زماننا أكثرها ظلم فمن تمكن من دفعه عن نفسه فحسن وإن أعطى فليطعم من عجز'' (الدر المختار على رد المحتار ۹/ ۶۰۸)۔

صورت مسئولہ میں بینک سے لون لینا مناسب قیمت میں غریبوں کو مہیا کرانے کا وسیلہ ہے، لہٰذا بینک سے لون لینا جائز ہوگا، کیونکہ وسیلہ مقصد کے تابع ہوتا ہے: '' وسيلة المقصود تابعة للمقصود وكلاهما مقصود'' (اعلام الموقعين ۳/۱۵۷)۔

صاحب ثروت مسلمان تاجرین پر واجب ہے کہ وہ رہائشی مکان وزمین کے حصول میں اپنے غریب بھائیوں کی مدد کریں، فقہ کا قاعدہ ہے:

''إن مالايتم الواجب إلا به فهوواجب'' (فقه النوازل ۳/۲۲۵)۔ (جس چیز کے بغیر واجب تام نہ ہو وہ بھی واجب ہوتی ہے)

''ماكان وسيلة الواجب فهوواجب'' (موسوعة القواعد الفقهية ۹/۲۰۵)۔
(جو چیز واجب کا ذریعہ ہو وہ بھی واجب ہوتی ہے)

لہٰذا مسلم تاجرین کے لیے انکم ٹیکس سے تحفظ کی خاطر بینک سے لون لینا جائز ہے۔

شریعت اسلامی ایسے تمام اسباب اختیار کرنے سے منع کرتی ہے جس سے اشیاء کی قیمتوں میں بلاوجہ اضافہ ہوجائے، چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

تجارتی قافلوں سے شہر سے باہر خریداری کرنے سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ دیہاتی کے لیے شہری بیع نہ کرے، راوی حضرت عبداللہ بن عباس سے دریافت کرتے ہیں کہ شہری دیہاتی کے لیے بیع نہ کرے، اس کا کیا مطلب ہے تو فرمایا کہ وہ اس کے لیے دلال نہ بنے۔

عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال: نھی رسول اللہ ﷺ أن یتلقی الرکبان ولا یبیع حاضر لباد "قلت یاابن عباس! ماقولہ: لایبیع حاضر لباد؟ قال لا یکون لہ سمسارا" (صحیح البخاری علی عمدۃ القاری ۸/۶۲۴)۔

دیہاتی کے لیے شہری بیع نہ کرے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ خلیل احمد سہارنپوری تحریر فرماتے ہیں:

"ومعنی ھذا أن یتربص لہ بسلعۃ لأن یبیعہ بسعر الیوم وذلك أن البدوی إذا جلب سلعۃ إلی السوق وھو غریب غیر مقیم باعھا بسعر یومہ فیأخذ الناس فیھا رفقا ونفعۃ فإذا جاء ہ الحضری وقال: أنا أتربص لك وأبیعھا حرم الناس ذالك النفع وفاتھم ذالك الرفق" (بذل المجھود ۱۱/۱۴۵)۔

(اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گرانی کا انتظار کرے گا اور آج کے نرخ پر فروخت نہیں کرے گا اور وہ اس طرح ہے کہ جب دیہاتی بازار میں سامان لے کر آئے گا، درآنحالیکہ وہ اجنبی وغیر مقیم ہے تو وہ اسے آج کے نرخ پر فروخت کرے گا، تو لوگ اس میں فائدہ اور نفع حاصل کریں گے، جبکہ اگر شہری اس کے پاس آکر کہے کہ میں تیرے فائدہ کیلئے گرانی کا انتظار کرکے فروخت کروں گا تو لوگ اس نفع سے محروم ہوجائیں گے اور وہ نفع انہیں حاصل نہیں ہوگا)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نجش سے منع فرمایا ہے:

"عن ابن عمر قال: نھی النبی ﷺ عن النجش" (صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب النجش حدیث نمبر ۲۱۴۲)۔

علامہ ابن الہمامؒ نجش کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "النجش أن یزید فی الثمن ولا یرید الشراء لیرغب غیرہ إذا بلغت السلعۃ قیمتھا فإنہ تغریر للمسلم ظلما" (فتح القدیر ۶/۴۳۶ فصل فیما یکرہ)۔

(نجش دوسرے کو رغبت دلانے کے لیے ثمن میں بڑھا کر بولی لگانا ہے، حالانکہ خریدنے کا ارادہ نہ ہو، جب خریدار سامان کی مناسب قیمت لگا چکا ہو تو یہ عمل مسلمان کو دھوکہ دینا ہے جو کہ ظلم ہے)۔

نجش کے بارے میں علامہ ابن حزم ظاہری رقم طراز ہیں: "مسألۃ: ولایحل النجش وھو أن یزید البیع فینتدب إنسانا للزیادۃ فی البیع وھو لا یرید الشراء ولکن لیغتر غیرہ، فیزید بزیادتہ" (المحلی ۸/۴۴۸)۔

(مسالہ: نجش درست نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ بائع سامان کو زیادہ میں بیچنا چاہے، چنانچہ وہ کسی کو بلائے جو خریدار سے زیادہ قیمت لگائے، حالانکہ اس کا ارادہ خریدنے کا نہ ہو، بلکہ اس سے خریدار کو دھوکہ دینا ہو کہ خریدار بھی اس کے اضافہ کی وجہ سے ثمن میں اضافہ کردے)

صورت مسئولہ میں مسلم تاجرین کا وہائٹ منی سے زمین خریدنا پلاٹ کی قیمت میں اضافے کا باعث ہوگا، جبکہ قیمت میں اضافہ شرعاً غیر مطلوب ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ ناجائز کام کا وسیلہ اور ذریعہ بھی ناجائز ہوتا ہے۔

"الوسیلۃ إلی الحرام حرام" (بدائع الصنائع ۶/۴۸۸. کتاب الاستحسان)۔

لہٰذا مسلم تاجران کے لیے پیسہ ہونے کے باوجود گورنمنٹ کی پکڑ سے بچنے کے لیے بینک سے لون لینا جائز ہے۔

جواب نمبر ۹: بیع کی صحت کی شرائط میں سے ایک شرط مبیع کا معلوم ہونا ہے، چنانچہ اگر مبیع مجہول ہو تو بیع درست نہ ہوگی، علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

"ومنھا أن یکون المبیع معلوما والثمن معلوما علما یمنع من المنازعۃ فالمجھول جھالۃ مفضیۃ إلیھا غیر صحیح کشاۃ من ھذا القطیع وبیع الشئی بقیمتہ وبحکم فلان" (البحر الرائق ۵/۴۳۶)۔

(بیع کی صحت کی شرائط میں سے مبیع اور ثمن کا اس طرح معلوم ہونا ہے جو جھگڑا وتنازعہ پیدا ہونے سے روک دے، پس مبیع کا اس طرح مجہول ہونا جو جھگڑے تک پہنچادے صحیح نہیں ہے، جیسے اس ریوڑ میں سے ایک بکری کی بیع، کسی چیز کی بیع اس قیمت کے عوض اور فلاں کے حکم سے بیع)۔

"وفسد بیع شاۃ من قطیع وثوب من عدل وکذا إذا باع عددا متفاوتا عددا بثمن واحد فوجد أکثر لجھالۃ المبیع وکذا إذا اشتری من ھذا اللحم ثلاثۃ أرطال بدرھم ولم یبین الموضع" (البحر الرائق ۵/۴۵۹)۔

(ریوڑ میں سے ایک بکری کی بیع اور گٹھر میں سے ایک کپڑے کی بیع فاسد ہے اور اگر اسی طرح عددی متفاوت کو ایک ہی قیمت میں گن کر فروخت کرے اور وہ اسے زیادہ پائے تو مبیع کے مجہول ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہے اور اسی طرح اگر وہ اس گوشت میں سے تین رطل ایک درہم کے عوض فروخت کرے اور گوشت کے مقام کو واضح نہ کرے)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر مبیع میں جہالت فاحشہ پائی تو اس کی بیع درست نہ ہوگی اور اگر اس میں معمولی جہالت ہو تو اس کی بیع درست ہوگی، چنانچہ علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

"وشرط الصحة معرفة قدر مبيع وثمن" (الدرالمختار علی ردالمحتار ۴۸/۷)۔
(اس کی صحت کے لیے مبیع اور ثمن کی مقدار معلوم ہونا شرط ہے)

علامہ شامیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "پس اس سے یہ مسئلہ خارج ہوگیا جبکہ مبیع کی مقدار میں جہالت فاحشہ پائی جائے تو یہ صحیح نہیں ہے اور ہم نے فاحشہ کی قید لگائی، اس لیے کہ فقہاء نے کہا ہے کہ اگر وہ مشتری کو جو کچھ گاؤں میں ہے یا جو کچھ اس بڑے مکان میں ہے اسے فروخت کردے، حالانکہ خریدار کو اس میں کیا ہے معلوم نہ ہو تو جہالت کے واضح ہونے کی وجہ سے یہ بیع صحیح نہیں ہے، رہی یہ صورت جبکہ وہ اس گھر میں، اس صندوق میں یا اس تھیلے میں جو کچھ ہے اسے خریدار کو فروخت کرے تو یہ صحیح ہے، اس لیے کہ جہالت معمولی ہے" (الدرالمختار علی ردالمختار ۷ / ۴۸)۔

صورت مسئولہ میں کالونی کے قطعۂ زمین کا رقبہ متعین ہوتا ہے، اگر کالونی بنانے والا اس بات کی وضاحت کردے کہ خریدار جو قطعۂ زمین خرید رہا ہے کالونی میں اس کا محل وقوع متعین نہیں ہے اور پوری کالونی میں مخصوص نمبر کا قطعہ کسی بھی مقام پر دیا جاسکتا ہے تو بعد میں کوئی نزاع نہ پیدا ہوگا اور اس میں پائی جانے والی جہالت جہالت یسیرہ کے قبیل سے ہوگی اور اس طرح صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجائے گی اور خرید وفروخت کا عمل درست ہوگا، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ کوئی شخص زمین اس طرح فروخت کرے کہ اس کی حدود اربعہ بیان کردے اور اس زمین کی لمبائی و چوڑائی کی وضاحت نہ کرے یا زمین کی حدود اربعہ بھی بیان نہ کرے اور خریدار اسے جانتا بھی نہ ہو، لیکن ان کے درمیان بیع کے بعد تنازعہ پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کی خرید وفروخت درست ہوگی، علامہ شامیؒ رقم طراز ہیں:

"ومعرفة الحدود تغني عن معرفة المقدار ففي البزازية: باعه أرضا وذكر حدودها لا ذرعها طولا وعرضا جاز وكذا إن لم يذكر الحدود ولم يعرفه المشتري إذا لم يقع بينهما تجاحد" (شامی ۴۸/۷)۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

"باع المشتري أرضا وذكر حدودها لا ذرعها طولا وعرضا جاز وإذا عرف المشتري الحدود لا الجيران يصح وإن لم يذكر الحدود ولم يعرفه المشتري جاز البيع إذا لم يقع بينهما تجاحد" (البحر الرائق ۵/ ۴۵۹)۔

(خریدار کو زمین فروخت کرے اور اس کی حدود اربعہ کا ذکر کردے، لیکن اس کی لمبائی وچوڑائی کی پیمائش کا ذکر نہ کرے تو بیع جائز ہے، اگر خریدار کو حدود اربعہ معلوم ہو، لیکن پڑوسی معلوم نہ ہوں تو خرید وفروخت صحیح ہے، اور اگر وہ زمین کی حدود اربعہ کا ذکر نہ کرے اور خریدار اسے نہ جانتا ہو تو بھی بیع جائز ہے، جبکہ ان کے درمیان تنازعہ پیدا نہ ہو)۔

اگر کالونی بسانے والا صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے زمین فروخت کرے اور زمین کے محل وقوع کے بارے میں کوئی وضاحت نہ کرے یا زمین پر پلاٹس بناتے وقت اپنے متعینہ نقشے کی خلاف ورزی کرے تو اس صورت میں بائع وخریدار کے درمیان بعد میں تنازعہ پیدا ہوسکتا ہے، کیونکہ ایک بڑے رقبے کی زمین کے مختلف حدود اربعہ رکھنے والے قطعۂ زمین کی نوعیت وافادیت مختلف ہوتی ہے، خریدار نقشے میں دیئے گئے حدود اربعہ کے مطابق جس قطعۂ زمین کو پسند کرتا ہے وہ اسی کے حصول پر راضی ہوتا ہے، اگر بعد میں اسے نقشے کے مطابق حدود اربعہ کا حامل قطعۂ زمین حاصل نہ ہو تو اس کے اور کالونی بسانے والے کے درمیان تنازعہ وجھگڑا پیدا ہوسکتا ہے، لہٰذا خرید وفروخت کا یہ عمل درست نہ ہوگا، چنانچہ صاحب ھدایہ لکھتے ہیں:

"جو شخص سو گز کے مکان یا حمام میں سے دس گز خریدے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بیع فاسد ہے اور صاحبین کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے اور اگر وہ سو حصوں میں سے دس حصے خریدے تو بالاتفاق جائز ہے، صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ سو گز میں سے دس گز مکان کا دسواں حصہ ہے، اس لیے یہ دس حصوں کے مشابہ ہے، امام

صاحب کی دلیل یہ ہے کہ گز اس چیز کا نام ہے جس سے پیمائش کی جاتی ہے اور یہ لفظ جس مقام کی پیمائش کی جاتی ہے اس کے لیے مستعار لیا گیا ہے اور یہ متعین ہے، غیر متعین نہیں ہے اور حصے کے برخلاف غیر معلوم ہے" (ہدایہ علی فتح القدیر ۶/ ۲۵۴)۔

علامہ ابن ہمامؒ اس عبارت کی وضاحت فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اختلاف کی بنیاد اس بات پر ہے کہ سو گز میں سے دیا جانے والا دس گز متعین ہے یا غیر متعین ہے، صاحبین کے نزدیک یہ غیر متعین ہے، گویا اس نے سو گز کا دسواں حصہ فروخت کیا ہے اور غیر متعین کی بیع بالاتفاق جائز ہے، جیسا کہ سو حصوں میں سے دس حصے کی بیع کے جواز پر اتفاق ہے، امام صاحب کے نزدیک دیئے جانے والے دس گز کی مقدار متعین ہے درآنحالیکہ گوشے عمدگی کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا دس گز کی مقدار کی تعیین میں تنازعہ پیدا ہو جائے گا، لہٰذا بیع فاسد ہوگی، پس اگر ان کا اس بات پر اتفاق ہو جائے کہ اس مکان میں سے دیا جانے والا دس گز غیر متعین ہوگا تو ان میں اختلاف پیدا نہیں ہوگا، اسی طرح اگر ان میں اس بات پر اتفاق ہو جائے کہ یہ دس گز متعین ہوگا تو بھی ان میں اختلاف پیدا نہیں ہوگا" (فتح القدیر ۶/ ۲۵۴)۔

صاحب عنایہ اس عبارت کی توضیح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ دس گز یہاں متعین نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ معلوم نہیں ہے کہ دس گز گھر کے کس جانب سے دیئے جائیں گے، لہٰذا اس میں ایسی جہالت پائی جاتی ہے جس میں تنازعہ کا اندیشہ ہے، اس لیے کہ دس حصوں والا نوے حصوں والے کے ساتھ پورے مکان میں شریک ہوگا اور زیادہ حصوں والے شریک کیلئے جائز نہیں کہ وہ کم حصوں والے شخص کو اسکے حصوں کے بقدر جگہ کسی بھی مقام سے دے دے (عنایہ علی فتح القدیر ۶/ ۲۵۵)۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

"عشرة أذرع من دار لا أسهم و هذا عند أبي حنيفة و قالا هو جائز كما لو باع عشرة أسهم من دار و مبنى الخلاف في مؤدى التركيب فعندهما شائع كأنه باع عشر مائة و بيع الشائع جائز اتفاقا وعنده مؤداه قدر معين والجوانب مختلفة الجودة فتقع المنازعة في تعيين مكان العشرة فيفسد البيع فلو اتفقوا على مؤداه لم يختلفوا" (البحر الرائق ۵/ ۲۸۷)۔

جواب نمبر ۱۰: بیع ایجاب وقبول سے ہی منعقد ہو جاتی ہے اور ایجاب وقبول کے بعد مشتری مبیع کا مالک ہو جاتا ہے، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

"البيع ينعقد بالإيجاب والقبول إذا كانا بلفظي الماضي مثل أن يقول أحدهما بعت والآخر اشتريت" (ہدایہ علی فتح القدير ۶/۲۳۰)۔

"وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد" (ہدایہ علی فتح القدير ۶/۲۳۸)۔

"وأما حكمه فثبوت الملك في المبيع للمشتري وفي الثمن للبائع إذا كان البيع باتا" (عالمگیری ۳/ ۳)۔

(اور رہا اس کا حکم تو یہ مبیع میں مشتری کی اور ثمن میں بائع کی ملکیت کا ثابت ہونا ہے جبکہ بیع قطعی ہو)۔

"أما حكمه فهو ثبوت الملك للمشتري في المبيع وللبائع في الثمن للحال" (بدائع الصنائع ۴/۴۹۷، کتاب البیوع فصل وأما حكم البيع) (رہا اس کا حکم تو یہ مبیع میں مشتری کی اور ثمن میں بائع کی ملکیت کا فوراً ثابت ہونا ہے)۔

لہٰذا زمین کے جو حصے بیچے گئے ہیں وہ خریدار کی ملکیت میں آجائیں گے، اگر چہ اس پر بیچنے والا کاشت بھی کرتا رہتا ہو، اگر خریداری کے وقت بیچنے والے نے یہ شرط لگادی ہو کہ وہ زمین میں کاشت کرتا رہے گا تو بیع فاسد ہو جائے گی، کیونکہ یہ شرط تقاضہ بیع کے خلاف ہے، علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں:

"ولا يبيع بشرط ... لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لأحدهما" (الدر المختار على رد المحتار ۷/۲۸۲)۔

علامہ شامیؒ اس کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ومنه لو شرط البائع أن يهبه المشتري شيئا أو يقرضه أو يسكن الدار" (شامی ۷/۲۸۳)۔

اگر زمین فروخت کرنے والا خریدار کی اجازت کے بغیر اس زمین میں کاشت کر رہا ہو تو زمین کی پیداوار میں سے اس کے لیے لاگت کے بقدر پیداوار ہی حلال ہے، اس سے زائد پیداوار صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا، چنانچہ مجمع الأنہر میں ہے:

"ويتصدق بالفضل عند الطرفين حتى اذا غصب أرضا فزرعها كرين فأخرجت ثمانية أكرار ولحقه من المؤنة

قدر كرو نقصها قدر كر فإنه يأخذ منه أربعة أكرار ويتصدق بالباقي'' (مجمع الأنهر ۴/۸۱، كتاب الغصب)۔

(طرفین کے نزدیک زائد پیداوار صدقہ کرے گا، چنانچہ اگر کوئی زمین غصب کرے اور اس میں دو کر اناج بوئے اور اس سے آٹھ کر پیدا ہوا اور ایک کر کے بقدر اخراجات لاحق ہوئے ہوں اور ایک کر کے بقدر نقصان ہوگیا ہو تو وہ اس میں سے صرف چار کر لے سکتا ہے اور باقی صدقہ کرے گا)۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر تعمیر کرے یا درخت لگائے تو اسے اکھاڑنے اور واپس کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

''من بنى أو غرس في أرض غيره بغير إذنه أمر بالقلع والرد'' (الدر المختار على رد المحتار ۹/۲۸۳، كتاب الغصب)۔

زمین فروخت کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ کھیتی کو ختم کرکے زمین اس کے مالک کے حوالے کرے، چنانچہ مجلۃ الأحکام میں ہے:

''إن كان المغصوب أرضا فبنى الغاصب فيها بناء... أو غرس فيها أشجار، فإنه يؤمر بقلعها ورد الأرض وإن كانت قيمة البناء والغرس أكثر من قيمة الأرض'' (مجلة الأحكام ص ۵۰۲، رقم الماده: ۹۰۶)۔

(اگر غصب کی گئی شئے زمین ہو، پھر غاصب نے اس پر عمارت تعمیر کرلی ہو...... یا اس میں درخت لگادیئے ہوں تو اسے ان کو ختم کرنے اور زمین واپس کرنے کا حکم دیا جائے گا، اگرچہ عمارت اور درختوں کی قیمت زمین کی قیمت سے زیادہ ہو)۔

جواب نمبر ۱۱: (الف) / غیر منقولہ اشیاء جیسے زمین، پلاٹ، جائیداد وغیرہ کا صرف سودا کرکے معاملہ کرلینا قبضہ کے لیے کافی ہے اور اس کے لیے اسے دوسرے کو فروخت کرنا بھی صحیح ہے، ہدایہ میں ہے:

''ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالىٰ'' (هدايه على فتح القدير ۶/۴۷۲)۔

(امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک جائیداد کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

''ولو ملك المنقول بالوصية أو الميراث يجوز بيعه قبل القبض كذا في المحيط، اشترى دارا أو عقارا فوهبها قبل القبض من غير البائع يجوز عند الكل ولو باع يجوز في قول أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالىٰ ولا يجوز في قول محمد رحمه الله تعالىٰ'' (فتاویٰ عالمگیری ۳/۱۳)۔

(اگر منقولہ جائیداد کا وصیت یا میراث کے ذریعے مالک ہوا ہو تو اس کی خرید وفروخت قبضہ سے پہلے جائز ہے، محیط میں اسی طرح ہے، کسی نے مکان یا جائیداد خریدا، پھر اسے قبضہ سے پہلے بائع کے علاوہ کسی کو ہبہ کردیا، تو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسف رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں)

علماء لکھتے ہیں:

''وأما بيع الأعيان غير المنقولة قبل قبضها كبيع الأرض والضياع والنخيل والدور ونحو ذلك من الأشياء الثابتة التي لا يخشى هلاكها فإنه يصح'' (كتاب الفقه على المذاهب الأربعه ۲/۲۲۴)۔

(رہی قبضہ سے پہلے اشیاء غیر منقولہ جیسے زمین، جائیداد، کھجور کے درخت اور مکانات اور ان جیسی قائم رہنے والی اشیاء جن کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو ان کی بیع درست ہے)۔

زمین کی خریداری کے بعد انسان بغیر قبضہ کے ہی اس کا مالک ہوجاتا ہے اور وہ اس میں جو تصرف چاہے کرسکتا ہے، چنانچہ حضرت عثمان کا واقعہ منقول ہے کہ انہوں نے اپنی کوفہ کی زمین کے عوض حضرت طلحہؓ سے مدینہ کی زمین خریدی تھی، پھر عثمانؓ نے حضرت طلحہؓ سے کہا کہ میں نے تمہیں ایسی زمین فروخت کی جسے میں نے نہیں دیکھا تھا اور طلحہؓ نے کہا کہ اختیار مجھے حاصل ہوگا، اس لیے کہ میں نے زمین کو بغیر دیکھے خریدا ہے اور تم نے جو زمین خریدی ہے اسے تم نے دیکھا ہے چنانچہ دونوں حضرات اپنا معاملہ جبیر بن مطعمؓ کے پاس لے گئے تو انہوں نے عثمانؓ کے خلاف فیصلہ کیا کہ بیع جائز ہے اور طلحہ کو اختیار حاصل ہوگا، کیونکہ انہوں نے بغیر دیکھے خریدا ہے، اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جائیداد کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے، اس لیے کہ حضرت عثمان نے اپنی کوفہ کی زمین فروخت کردی

درآنحالیکہ آپ نے اسے دیکھا نہیں تھا(اعلاء السنن ۱۴/ ۲۳۸)۔

لہٰذا ایسے پلاٹس جو کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آ گئے تھے اور اس نے اسے خریدار کو فروخت کر دیئے تھے تو اس خریدار کے لیے بھی پلاٹ متعین ہونے سے پہلے صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر اپنی زمین کسی اور سے فروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ پہلے ہی سے وہ خریدار کے سامنے واضح کر دے کہ اس پوری کالونی میں اسے متعین طور پر ایک پلاٹ ملے گا، تاکہ بعد میں تنازعہ پیدا نہ ہو، چنانچہ علامہ ابن الھمام تحریر فرماتے ہیں:

''فلو اتفقوا على أن مؤدى عشرة أذرع من مائة هذه الدار شائع لم يختلفوا ''(فتح القدير ۶/۲۵۴)۔

اگر خریداری کے وقت خریدار کو یہ نہ بتایا گیا ہو کہ اسے غیر متعین طور پر کالونی میں سے ایک قطعہ زمین دی جائے گی تو معاملہ فاسد ہوگا، چنانچہ صاحب عنایہ لکھتے ہیں:

''(وذلك) أي العشرة الأذرع غير معلوم هنا إذ لم يعلم أن العشرة من أي جانب من الدار فيكون مجهولا جهالة تفضي إلى المنازعة ''(عنايه على فتح القدير ۶/۲۵۵)۔

(اور یہ یعنی دس گز یہاں معلوم نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ معلوم نہیں ہے کہ دس گز گھر کے کس جانب سے دیئے جائیں گے، لہٰذا اس میں ایسی جہالت پائی جاتی ہے جو معاملہ تنازعہ تک پہنچا سکتی ہے)۔

جواب نمبر ۱۱ (ب): بیع ایجاب وقبول سے منعقد ہو جاتی ہے، ایجاب وقبول کے بعد مشتری زمین کا مالک ہو جاتا ہے، اگرچہ حکومت کے رجسٹر میں اس زمین پر بائع کا نام درج ہو، علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

''وإذا وجدا (أي الايجاب والقبول) لزم البيع بلا خيار إلا لعيب أو رؤية '' (الدر المختار على رد المحتار ۷/۴۷)۔

''وحكمه ثبوت الملك''(الدر المختار على رد المحتار ۷/۱۶)۔

بیعانہ کی رقم سودا طے ہو جانے کے بعد ہی دی جاتی ہے اور خرید وفروخت میں متعینہ مدت کے بعد ثمن کی ادائیگی شرعاً جائز ہے۔

'' ويجوز البيع بثمن حال ومؤجل إذا كان الأجل معلوما'' (هدايه على فتح القدير ۶/۲۴۲)۔

(خرید وفروخت نقد قیمت اور مؤجل قیمت دونوں سے درست ہے جبکہ مدت معلوم ہو)۔

(وصح بثمن حال) وهو الأصل (ومؤجل إلى معلوم) لئلا يفضي إلى النزاع ''(درمختار على ردالمحتار ۷/۵۲)۔

لہٰذا مسئلہ مذکورہ مین کالونی بنانے والا سودا طے ہو جانے کے بعد زمین کا مالک ہو جاتا ہے اور اس کے لیے جائز ہے کہ وہ پلاٹ دوسروں کو فروخت کرے، کیونکہ غیر منقولہ اشیاء کی بیع قبل القبض بھی جائز ہے۔

''ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالىٰ'' (هدايه على فتح القدير ۶/۲۷۲)۔

(امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک جائیداد کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے)

لہٰذا مسئلہ مذکورہ میں پلاٹنگ کرنے والے یا خریدار کے لیے پلاٹ فروخت کرنا شرعاً جائز ہے، البتہ اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ اسے غیر متعین طور پر ایک پلاٹ دیا جائے گا، اسی طرح اس بات کی بھی وضاحیت کر دی جائے کہ بائع قانونی طور سے زمین کا مالک نہیں ہے اور آئندہ ایسی صورت حال بھی پیش آ سکتی ہے کہ قانونی دشواری کی وجہ سے بائع کو یہ معاملہ ختم کرنا پڑے، ایسی صورت میں بائع مشتری سے حاصل کردہ قیمت اسے واپس کرنے کا وعدہ کرے، فقہاء نے معاملات میں کسی بھی قسم کی فریب دہی سے منع کیا ہے، چنانچہ الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:

''اتفق الفقهاء على أن الغش حرام سواء أكان بالقول أم بالفعل وسواء كان بكتمان العيب في المعقود عليه أو الثمن أم بالكذب والخديعة وسواء أكان في المعاملات أم في غيرها من المشورة والنصيحة'' (الموسوعة الفقهيه ۳۱/۲۱۹)۔

(فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فریب دہی حرام ہے؛ خواہ قول سے ہو یا فعل سے، خواہ مبیع یا ثمن میں عیب چھپا کر ہو یا جھوٹ یا فریب کے ذریعے ہو،

خواہ معاملات میں ہو یا معاملات کے علاوہ مشورہ ونصیحت میں ہو)

جواب نمبر ۱۲: صورت مسئولہ میں کالونی بنانے والا دلال کو اپنا وکیل بناتا ہے اور دلال مالک زمین کے وکیل کی حیثیت سے خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہے تو یہ شرعاً جائز ہے، چنانچہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''تصح الوکالة بأجر وبغیر أجر لأن النبی ﷺ کان یبعث عماله لقبض الصدقات ... ولأن الوکالة عقد جائز لا یجب علی الوکیل القیام بها فیجوز أخذ الأجرة فیها'' (الفقه الاسلامی وأدلته ۵/۴۰۵۸، الفصل التاسع الوکالة، المبحث الاول کالة بأجر)۔

(وکالت اجرت کے ساتھ اور بغیر اجرت کے دونوں صورتوں میں صحیح ہے، اس لیے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عاملوں کو زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجتے تھے...... اور اس لیے کہ وکالت ایک جائز معاملہ ہے، وکیل پر اس کام کو انجام دینا واجب نہیں ہے، لہٰذا اس پر اجرت لینا جائز ہے)

''الأصل فی الوکالة الإباحة وقد تصح مندوبة إن کانت إعانة علی مندوب وقد تصیر مکروهة إن أعانت علی مکروه وقد تکون حراما إن أعانت علی حرام وقد تکون واجبة إن ضررت عن المؤکل'' (الفقه الاسلامی وأدلته ۵/۴۰۶۱، الفصل التاسع الوکالة المبحث الاوّل)۔

(وکالت میں اصل جواز ہے، وکالت کبھی کبھی مستحب ہوتی ہے جبکہ اس میں مستحب عمل پر اعانت ہو، کبھی کبھی وکالت مکروہ ہوتی ہے جبکہ اس میں مکروہ عمل پر اعانت ہو، بسا اوقات حرام ہوتی ہے جبکہ اس میں حرام عمل پر اعانت ہو اور کبھی کبھی واجب ہوتی ہے جبکہ اس کے ذریعے مؤکل سے ضرر وتکلیف کا ازالہ ہو)۔

شیخ ابو بکر جابر الجزائری تحریر فرماتے ہیں:

''وکالت کا حکم: وکالت کتاب وسنت کی رو سے جائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور صدقہ وصول کرنے پر متعین کارکنوں کے لیے'' (سورۂ توبہ:۶۰)، یہ لوگ زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے امام کے وکیل ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اب اپنے میں سے کسی کو یہ روپئے لے کر شہر بھیجو، وہ تحقیق کرنے کہ کون سا کھانا صاف ستھرا ہے؟ پھر وہ اس میں سے تمہارے پاس کچھ کھانا لے کر آئے'' (سورہ کہف:۱۹)، پس ان لوگوں (اصحاب کہف) نے اپنے لیے کھانا خریدنے کی خاطر اپنے میں سے ایک کو وکیل بنایا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انیسؓ سے کہا: ''انیس اس عورت کے پاس جاؤ، پس اگر وہ (زنا کا) اعتراف کرے تو اسے رجم کردو''، پس اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حد نافذ کرنے کے لیے دعویٰ کی تحقیق کی خاطر انیس کو وکیل بنایا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کی زکوٰۃ (صدقۂ فطر) کی حفاظت کے لیے مجھے وکیل بنایا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جابرؓ سے فرمایا: ''جب تو میرے وکیل کے پاس آئے تو اس سے پندرہ وسق لے لے اور اگر وہ تجھ سے علامت طلب کرے تو اپنا ہاتھ اپنے گلے پر رکھ دینا'' (منهاج المسلم للشیخ أبی بکر الجزائری ص ۳۱۲، الباب الخامس فی المعاملات، الفصل الرابع)۔

دلالی کی اجرت لینا شرعاً جائز ہے، خواہ اجرت مثل طے کی جائے یا بیع کی قیمت پر فیصد کے تناسب سے اجرت متعین کی جائے، چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

''فی الدلال والسمسار یجب أجر المثل ... وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به وإن کان فی الأصل فاسدا لکثرة التعامل وکثیر من هذا غیر جائز. فجوزوه لحاجة الناس إلیه کدخول الحمام'' (ردا لمحتار ۹/۸۷)۔

(دلال کے لیے اجرت مثل واجب ہوگی، حاوی میں ہے: محمد بن سلمہ سے دلال کی اجرت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا: مجھے امید ہے کہ کثرت تعامل کے سبب اس میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ اصلاً یہ فاسد ہے، اس طرح کے بہت سے معاملات ناجائز ہیں، لیکن لوگوں کو اس کی حاجت کے سبب فقہاء نے جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ (اجرت پر) حمام میں داخل ہونا جائز ہے)

خرید وفروخت کے معاملہ میں ایجاب وقبول کے بعد ہی سودا مکمل ہوجاتا ہے اور مبیع پر مشتری کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، شرعاً انتقال ملکیت کے لیے سرکاری کاغذات میں اندراج ضروری نہیں، علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

''البیع یلزم بإیجاب وقبول أی حکم البیع یلزم بهما'' (البحر الرائق ۵/۴۳۹)۔

(بیع ایجاب وقبول سے لازم ہوجاتی ہے یعنی بیع کا حکم ان دونوں سے لازم ہوجاتا ہے)، علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''أما حكمه فهو ثبوت الملك للمشتري في المبيع وللبائع في الثمن للحال'' (بدائع الصنائع ۴/۴۹۷، كتاب البيوع)
(رہا اس کا حکم تو یہ مبیع میں مشتری کی اور ثمن میں بائع کی ملکیت کا فوراً ثابت ہونا ہے)۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''محض ایجاب وقبول سے ہی مبیع کی ملکیت مشتری کی جانب منتقل ہوجاتی ہے اور اسے مبیع کے استعمال کرنے، اس میں سرمایہ کاری کرنے اور اس میں حسب منشا تصرف کرنے کا مطلق حق حاصل ہوجاتا ہے، اس کے نفع کا مستحق وہی ہوتا ہے اور اس کا تاوان بھی اس پر ہی واجب ہوتا ہے یعنی اس کا تاوان برداشت کرنے کے عوض اس کے ثمرات اور اس کی پیداوار یا اس کے منافع کا حقدار وہی ہوتا ہے، خواہ یہ کم ہوں یا زیادہ'' (الموسوعۃ الفقہیۃ والقضایا المعاصرہ ۱۳/۲۸۱)۔

لہٰذا زمین کے اصل مالک سے نام کے انتقال سے پہلے دلال کا لوگوں کو زمین فروخت کرنا شرعاً جائز ہے، اسی طرح جو لوگ دلال سے خریدیں ان کے لیے بھی دوسروں کو فروخت کرنا جائز ہے۔

جواب نمبر ۱۳: بیع میں ایجاب وقبول کے بعد سودا مکمل ہوجاتا ہے اور مبیع پر مشتری کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''وحكمه ثبوت الملك أي في البدلين لكل منهما في بدل'' (شامی ۷/۱۶)۔
(اس کا حکم بدلین یعنی مبیع وثمن میں سے ہر ایک چیز میں بائع وخریدار ان میں سے ہر ایک کے لیے ملکیت کا ثبوت ہے)۔

درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام میں ہے: ''البيع النافذ يفيد الحكم في الحال أي ثبوت الملك في البدلين لكل منهما في بدل وهذا هو الحكم الأصلي للبيع'' (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ۲/۳۷۳)۔
(بیع نافذ فوراً حکم یعنی بدلین (مبیع وثمن) میں سے ہر ایک چیز میں بائع وخریدار ان میں سے ہر ایک کے لیے ملکیت کے ثبوت کا فائدہ دیتی ہے اور یہ بیع کا اصلی حکم ہے)۔

علامہ اتاسی کی شرح مجلۃ الأحکام میں ہے:

''حكم البيع المنعقد الملكية يعني صيرورة المشتري مالكا للمبيع والبائع مالكا للثمن ... الملكية تثبت بمجرد العقد إذا استجمع البيع شرائط الانعقاد والصحة واللزوم والنفاذ'' (شرح المجلة للأتاسي ۲/۳۵۷، رقم المادة: ۳۶۹ ط: كوئٹه)۔

(بیع منعقد کا حکم ملکیت ہے، یعنی خریدار کے لئے مبیع کا اور فروخت کرنے والے کے لئے ثمن کا مالک ہونا ہے..... ملکیت محض عقد سے ہی ثابت ہوجاتی ہے جبکہ بیع میں انعقاد، صحت، لزوم اور نفاذ کی تمام شرطیں جمع ہوجائیں)۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں کہ ایجاب وقبول اور سودا مکمل ہوجانے کے بعد مبیع سے بائع کا حق ملکیت ختم ہوجائیگا اور مشتری مکمل طور پر اس کا مالک ہوجائے گا۔

''سابقہ شرطوں میں جو بحث گزر چکی ہے، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ فروخت کرنے والے کا مبیع سے تعلق محض سودا کے پختہ ہوجانے سے ہی ختم ہو جاتا ہے، مگر جبکہ ایسے اختیارات پائے جائیں جو عقد کو فسخ کردیتے ہیں، جیسے خیار شرط، خیار عیب یا خیار رؤیت اور یہ خریدار کی جانب ملکیت کے منتقل ہوجانے کی وجہ سے ہوتا ہے جو کہ عقد کا حکم یا اس کا تقاضہ ہے، لہٰذا تصرف کا حق جو کہ بیع میں ملکیت کے انتقال پر مرتب ہوتا ہے، ایک کامل حق ہوگا، جو ملکیت کاملہ کے سبب مشتری کو عطا کیا جائے گا کہ جو چیز اس کی ملکیت ہوگئی اس میں حسب منشا جو تصرف چاہے کرے، خواہ بیع کی صورت میں ہو، ھبہ کی شکل میں ہو، وصیت کی صورت میں یا وقف کی شکل میں ہو'' (الموسوعۃ الفقہیۃ والقضایا المعاصرہ ۱۳/۳۰۷)۔

لہٰذا مسئلہ مذکورہ میں پلاٹ خریدنے والے کی ملکیت زمین پر ثابت ہوجائے گی اور وہ اس میں جو تصرف چاہے کرسکتا ہے، اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ زمین کالونی بنانے والے کو ہی فروخت کرے۔

جواب نمبر ۱۴: جب ایک بار بیع ہوجائے تو بائع اور مشتری دونوں میں سے کسی کو بھی یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

علامہ مرغینانیؒ رقم طراز ہیں:

''إذا قال لغيره اشتريت وأنكر الآخر له أن يصدقه لأن أحد المتعاقدين لايتفرد بالفسخ كما لا يتفرد بالعقد'' (هدايه على فتح القدير ۷/۳۱۳، كتاب ادب القاضي)۔

(جب کسی دوسرے سے کہے کہ تو نے خریدا ہے اور دوسرا انکار کردے تو اسے اس کی تصدیق کرنے کا اختیار حاصل ہے، اس لیے کہ متعاقدین میں سے کوئی ایک یک طرفہ طور پر بیع کو فسخ نہیں کرسکتا، جس طرح ان دونوں میں سے کوئی ایک یک طرفہ طور پر عقد نہیں کرسکتا)۔

لہٰذا اگر مشتری بعض قسطیں ادا کرنے سے عاجز ہوجائے تو کالونی کے بلڈر کے لیے یک طرفہ طور پر سودا کینسل کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ مذکورہ میں اگر زمین کی فروخت کے وقت یہ شرط لگائی جائے کہ اگر خریدار نے مقررہ مدت تک کل رقم یا مقررہ قسط ادا نہیں کی تو یہ سودا ختم ہوجائے گا تو یہ صورت ''خیار نقد'' کی ہے اور خرید وفروخت میں یہ شرط لگانا جائز ہے اور یہ شرط اپنے وقت پر مؤثر بھی ہوگی، یعنی مقررہ مدت میں کل رقم یا طے شدہ قسط ادا نہیں کی تو بائع یک طرفہ طور پر بیع کو ختم کرکے خریدار سے مبیع واپس لے سکتا ہے اور ثمن کا جتنا حصہ اس نے وصول کیا ہے وہ خریدار کو واپس لوٹا دے۔

درر الحکام مجلۃ الأحکام میں ہے:

''جب بائع اور مشتری اس شرط کے ساتھ بیع کریں کہ خریدار فلاں وقت پر ثمن ادا کرے گا اور اگر وہ ثمن ادا نہیں کرے گا تو ان کے درمیان بیع نہ ہوگی تو بیع درست ہوجائے گی اور اسے خیار نقد کہتے ہیں...... اگر وہ تین دن سے زائد مدت بیان کرے تو امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ بیع فاسد ہوگی، امام محمدؒ کہتے ہیں کہ بیع جائز ہے، البحر الرائق میں غایت البیان سے نقل کیا گیا ہے کہ امام ابو یوسفؒ اپنے پہلے قول کے مطابق امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہیں، اور جس قول کی طرف انہوں نے رجوع کرلیا تھا وہ یہ ہے کہ وہ امام محمدؒ کے ساتھ ہیں، اس زمانے میں لوگوں کی مصلحت کا لحاظ کرتے ہوئے مجلہ کی جمعیت نے امام محمدؒ کے قول کو اختیار کیا ہے جیسا کہ صدر اعظم مرحوم علی پاشا کی مجلہ کی سابقہ رپورٹ میں اس کی صراحت کی گئی ہے'' (درر الحکام شرح مجلۃ الأحکام ۱/۳۰۹، رقم المادۃ: ۳۱۳)۔

علامہ سلیم رستم باز مجلۃ الأحکام کی اپنی شرح میں لکھتے ہیں:

''إذا لم يؤد المشترى الثمن فى المدة المعينة كان البيع الذى فيه خيار النقد فاسدا ولكل من العاقدين فسخه إذا بقى المبيع على حاله'' (شرح المجلة لسليم رستم باز ص ۱۶، رقم المادة: ۳۱۴)۔

(جب خریدار متعینہ مدت میں ثمن ادا نہ کرے تو وہ بیع جس میں خیار نقد ہو فاسد ہوجائے گی اور عاقدین میں سے ہر ایک کو اسے فسخ کرنے کا اختیار ہوگا جبکہ مبیع اپنی حالت پر باقی ہو)

علامہ کاسانیؒ بیع غیر لازم کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''وأما بيان مايرفع حكم البيع فنقول وبالله التوفيق: حكم البيع نوعان: نوع يرتفع بالفسخ وهو الذى يقوم برفعه أحد المتعاقدين وهو حكم كل بيع غير لازم كالبيع الذى فيه أحد الخيارات الأربع والبيع الفاسد'' (بدائع الصنائع ۴/۵۹۲، كتاب البيوع، فصل فى بيان "مايرفع حكم البيع")۔

(رہی وہ چیزیں جو بیع کے حکم کو ختم کردیتی ہیں تو ہم کہتے ہیں درآنحالیکہ توفیق اللہ سے ہی حاصل ہوتی ہے: بیع کے حکم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ قسم جو فسخ سے ختم ہوجاتا ہے اور یہ وہ قسم ہے جس کو ختم کرنے کا کام بیع کا معاملہ کرنے والے دونوں لوگوں میں سے کوئی ایک انجام دیتا ہے اور یہ ہر بیع غیر لازم کا حکم ہے جیسے وہ بیع جس میں چاروں اختیارات میں سے کوئی ایک اختیار ہو اور بیع فاسد)۔

اگر زمین کا خریدار مزید قسطوں کی ادائیگی سے عاجز ہوجائے تو فروخت کرنے والا یک طرفہ طور پر سودا کینسل نہیں کرسکتا، بلکہ اسے چاہیے کہ خریدار کی رضامندی سے وہ موجودہ قیمت کے حساب سے اسے خود خرید لے یا کسی دوسرے شخص کو فروخت کردے اور جو نفع حاصل ہو وہ خریدار کو لوٹا دے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو بائع شرعی دار القضاء سے رجوع ہوکر اپنا معاملہ پیش کرسکتا ہے، قاضی تحقیق کے بعد زمین کو موجودہ قیمت کے حساب سے فروخت کرنے کا حکم دے سکتا ہے، صاحب ہدایہ علامہ مرغینانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص غلام خریدے، اس کے بعد وہ غائب ہوجائے درآنحالیکہ غلام بائع کے قبضہ میں ہو تو قاضی تحقیق کے بعد

مناسب سمجھے تو غلام کو فروخت کر کے اس کی قیمت بائع کے حوالے کر سکتا ہے:

"ومن اشترى عبدًا فغاب فأقام البائع البينة أنه باعها اياه فإن كانت غيبته معروفة لم يبع فى دين البائع لأنه يمكن إيصال البائع إلى حقه بدون البيع وفيه إبطال حق المشترى وإن لم يدر أين هو بيع العبد وأوفى الثمن لأن ملك المشترى ظهر بإقراره فيظهر على الوجه الذى أقربه مشغولا بحقه وإذا تعذر استيفاءه من المشترى يبيعه القاضى فيه كالراهن إذا مات والمشترى إذا مات مفلسا والمبيع لم يقبض" (هدايه على فتح القدير ۷/ ۱۲۰۔ ۱۱۹)۔

(جو شخص کوئی غلام خریدے پھر وہ غائب ہوجائے پھر بائع اس بات پر بینہ قائم کردے کہ اس نے اسے مشتری کو فروخت کیا ہے، پس اگر اس کا غائب ہونا معروف ہو تو اسے بائع کے دین کے وصولی کے لیے فروخت نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ بیع کے بغیر بھی بائع کو اس کا حق پہنچانا ممکن ہے اور بیع میں خریدار کے حق کا ابطال ہے اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ خریدار کہاں ہے تو غلام کو فروخت کر کے قیمت وصول کی جائے گی، اس لیے کہ خریدار کی ملکیت اس کے اقرار سے ظاہر ہوئی ہے، پس وہ اسی طرح سے ظاہر ہوگی جیسا کہ اس نے اقرار کیا ہے کہ وہ اس کے حق میں مشغول ہے اور جب خریدار سے قیمت کی وصولی دشوار ہوجائے تو قیمت کی وصولی کے لیے قاضی اسے فروخت کردے گا جیسا کہ راھن جبکہ اس کی موت ہوجائے اور خریدار جبکہ وہ دیوالیہ ہوکر مرجائے درآنحالیکہ مبیع پر قبضہ نہ کیا گیا ہو)۔

صاحب عنایہ لکھتے ہیں:

"كالراهن إذا مات فإن المرتهن أحق بالمرهون يباع فى دينه إن تعذر الاستيفاء والمشترى إذا مات قبل قبض المبيع مفلسا فإن المبيع يباع فى ثمنه" (عنايه على فتح القدير ۷/۱۲۰)۔

(جیسے راہن جبکہ وہ مرجائے تو رہن رکھنے والا مرہونہ چیز کا زیادہ حقدار ہوگا، اگر دین کی وصولی دشوار ہوجائے تو دین کی وصولی کے لیے اسے فروخت کردیا جائے گا اور جب خریدار مبیع پر قبضہ سے پہلے دیوالیہ ہوکر مرجائے تو اس کی ثمن کی وصولی کے لیے مبیع کو فروخت کردیا جائے گا)۔

جواب نمبر ۱۵: (الف): دلالی کے عمل میں کیا جانے والا کام اور وقت مجھول ہوتا ہے، اس لیے فقہ حنفی میں اصولاً دلالی کا عمل اور اس پر اجرت کا حصول جائز نہیں تھا لیکن متاخرین فقہاء نے ضرورت کی بناء پر اس کو جائز قرار دیا ہے، اگر اجرت متعین کر کے دلالی کی جائے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق جائز ہے، چنانچہ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

"قال فى البزازية: أجرة السمسار والمنادى والحمامى والصكاك ومالا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل" (شامى ۹/۶۳، كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة)۔

(فتاویٰ بزازیہ میں فرماتے ہیں: دلال، حمام والے، نیلام میں بولی لگانے والے، چیک لکھنے والے اور وہ کام جس میں وقت اور کام متعین نہیں ہوتا کی اجرت جائز ہے، اس لیے کہ لوگوں کو اس کی حاجت ہوتی ہے اور حاصل کی گئی اجرت اگر بقدر اجرت مثل ہو تو حلال ہے)۔

دلالی کی یہ صورت کہ دلال زمین کی قیمت کالونی بنانے والے سے معلوم کرلے پھر اس کو من مانی قیمت پر بیچ کر زمین کے مالک کو اس کی مطلوبہ قیمت دے دے اور باقی خود رکھ لے، جمہور علماء احناف، شوافع اور مالکیہ کے نزدیک جائز نہیں، امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، اس کے جواز کے سلسلے میں امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن سیرینؒ کا قول نقل کیا ہے، ابن أبی شیبہؒ نے مصنف ابن شیبہ میں ان دونوں اقوال کو موصولا روایت کیا ہے۔ شارح صحیح بخاری علامہ عینی تحریر فرماتے ہیں:

"وقال ابن عباس: لابأس أن يقول: بع هذا الثوب فما زاد على كذا وكذا فهو لك. هذا التعليق وصله ابن أبي شيبة عن هشيم عن عمرو بن دينار عن عطاء عن ابن عباس نحوه وقال ابن سيرين إذا قال بعه بكذا فما كان من ربح فهو لك أو بيني وبينك فلابأس به، وهذا التعليق أيضا وصله ابن أبي شيبة عن هشيم عن يونس عن ابن سيرين وفى التلويح: وأما قول ابن عباس وابن سيرين فأكثر العلماء لايجيزون هذا البيع وممن كرهه: الثورى والكوفيون وقال الشافعي ومالك: لا يجوز فإن باع فله أجر مثله وأجازه أحمد وإسحاق وقالا: هو من باب القراض وقد لا يربح المقارض" (عمدة القارى شرح صحيح البخارى ۸/۶۲۲)۔

(عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ کہے: "اس کپڑے کو بیچ دے اور اس رقم سے زیادہ جو بھی حاصل ہو وہ تیرا ہے، اس تعلیق کو ابن أبی شیبہؒ نے ھشیم عن عمرو بن دینار عن عطاء اس سند سے عبداللہ بن عباسؓ سے موصولاً روایت کیا ہے، ابن سیرینؒ فرماتے ہیں: اگر کہے کہ اسے اتنے میں بیچ دے اور جو بھی نفع حاصل ہو تو وہ تیرا ہوگا یا میرے اور تیرے درمیان ہوگا تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس تعلیق کو بھی ابن أبی شیبہؒ نے ہشیم عن یونس عن ابی سیرین اس سند سے موصولاً روایت کیا ہے، تلویح میں ہے: رہا ابن عباس اور ابن سیرین کا قول تو اکثر علماء اس بیع کو جائز قرار نہیں دیتے اور جن حضرات نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، ان میں امام ثوری اور کوفی فقہاء ہیں، امام شافعی اور امام مالک کہتے ہیں: یہ جائز نہیں، لہٰذا اگر بیچے گا تو اس کو اجرت مثل ملے گی اور اسے امام احمد اور اسحاقؒ نے جائز قرار دیا ہے اور یہ دونوں حضرات کہتے ہیں کہ یہ مضاربت کے قبیل سے ہے اور بسا اوقات مضارب کو نفع حاصل نہیں ہوتا)۔

بائع کی مطلوبہ قیمت سے زائد قیمت دلال کے لیے حلال ہے، اس سے متعلق امام بخاریؒ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "مومنین اپنی شرطوں کے پابند ہوتے ہیں" اس کو بھی نقل کیا ہے، لہٰذا اگر دلال کوئی متعین شرط لگائیں تو سامان کے مالک اور دلال کو اپنی شرط کا پابند رہتے ہوئے اس کے مطابق عمل کرنا چاہئے، چنانچہ علامہ عینیؒ رقم طراز ہیں:

"وقال النبي ﷺ: المؤمنون عندشروطهم ... مطابقته للترجمة من حيث أن السمسرة إذا شرطت بشئى معين ينبغي أن يكون السمسار وصاحب المتاع ثابتين على شرطهما لقوله صلى الله عليه وسلم: "المؤمنون عند شروطهم" وهٰذا التعليق وصله أبوداؤد في القضاء من حديث الوليد بن رباح بالباء الموحدة عن أبي هريرة و روى ابن أبي شيبة من طريق عطاء: بلغنا أن النبي ﷺ قال: المؤمنون عند شروطهم وروى الدار قطني والحاكم من حديث عائشة رضي الله تعالىٰ عنها مثله وزاد ما وافق الحق" (عمدة القاري شرح صحيح البخاري ۸/۶۲۴)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیہاتی کے لیے شہری کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ شہری دیہاتی کا دلال نہ بنے، علامہ ابن بطالؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کا دلال اس لیے نہ بنے کہ اس سے لوگوں کو ضرر لاحق ہوتا ہے، دلال کی اجرت کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیہاتی کے لیے شہری کی بیع سے منع نہیں فرمایا، لہٰذا صاحب سامان اور دلال اگر اجرت پر معاملہ کرتے ہیں تو یہ جائز ہوگا:

"عن ابن عباس رضي الله عنه عنهما قال: نهى رسول الله ﷺ أن يتلقى الركبان ولايبيع حاضر لباد قلت يابن عباس ما قول: لايبيع حاضر لباد؟ قال لايكون له سمسارا ... قال ابن بطال: لايكون له سمسارا يعني من أجل المضرة الداخلة على الناس لامن أجل أجرته" (عمدة القاري ۸/۶۲۴)۔

ان احادیث وروایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر دلال اور مالک زمین اس طرح کا معاملہ کریں کہ بائع کی مطلوبہ قیمت سے زائد رقم دلال کی اجرت قرار پائے تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہونا چاہئے، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے معاملات کو صحت ودرستگی پر محمول کرنا چاہئے۔

"لأن أمور المسلمين محمولة على الصحة والسداد ماأمكن" (بدائع الصنائع ۵/۲۱۷)۔

اسی طرح جہاں تک ممکن ہو مسلمان کے فعل کو بہتر سے بہتر صورت پر محمول کرنا واجب ہے:

"لأن فعل المسلم يجب حمله على أحسن الوجوه ماأمكن" (اعلاء السنن ۱۴/۳۳۸)۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر وھبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

"يلزم مراعاة الشرط بقدر الامكان" (مجلة الأحكام: المادة: ۸۳)۔

اجرت دلال کی مذکورہ صورت ہمارے معاشرے میں بہت معروف ہے، فقہاء نے بہت سے مسائل میں عرف وعادت کا اعتبار کیا ہے، چنانچہ کوئی چیز کیلی ہے یا وزنی، اس کے متعلق فقہاء نے لکھا ہے کہ جس چیز کا کیلی یا وزنی ہونا شریعت میں منصوص نہ ہو، اس کے کیلی یا وزنی ہونے کا فیصلہ اس علاقے کے عرف پر مبنی ہوگا، چنانچہ علامہ ظفر احمد تھانویؒ رقم طراز ہیں:

"كل شئى لم ينص عليه الشارع أنه كيلي أو وزني يعمل في ذالك على ما يتعارفه أهل تلك البلدة. مثلا الأرز فإنه

لم يأت فيه نص من الشارع أنه كيلي أو وزني فتعتبر في عادة أهل كل بلدة على ما بينهم من العرف فيه فإنه في البلاد المصرية يكال وفي البلاد الشامية يوزن ونحو ذلك من الأشياء لأن الرجوع إلى العرف جملة من القواعد الفقهية'' (اعلاء السنن ۱۴ /۴۷۹، باب اعتبار العرف في البيوع و الاجارات ونحوها)۔

لہٰذا ہمارے معاشرے کے عرف کا اعتبار کرتے ہوئے دلالی کی یہ صورت جائز ہونا چاہیے، کہ دلال بائع کی مطلوبہ قیمت سے زائد رقم دلالی کی اجرت کے طور پر لے گا، فقہ کا مشہور قاعدہ ہے:

''ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن'' (الأشباه والنظائر ص ۱ /۳۲۸)۔

(جس چیز کو مسلمان اچھا خیال کریں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھی ہے)۔

جواب نمبر ۱۵ (ب):

خرید وفروخت کے بعد مبیع کو مشتری کے حوالے کرنا اور اس کے قبضے وتصرف میں دینا شرعاً لازم ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''وحكمه ثبوت الملك أي في البدلين لكل منهما في بدل وهذا حكمه الأصلي والتابع وجوب تسليم المبيع والثمن'' (شامی ۱۶/۷)۔

(اس کا حکم بدلین یعنی مبیع وثمن میں سے ہر ایک چیز میں بائع وخریداران میں سے ہر ایک کیلئے ملکیت کا ثابت ہونا ہے اور یہ اس کا اصلی حکم ہے اور اس کا تابع حکم مبیع اور ثمن کی حوالگی ہے)۔

مبیع پر مشتری کا قبضہ دینا شرعاً واجب ہے، اس سے متعلق علامہ کاسانیؒ رقم طراز ہیں:

''وأما الأحكام التي هي من التوابع للحكم الأصلي للبيع ...... فمنها وجوب تسليم المبيع والثمن ...... أما الأول فتسليم البدلين واجب على العاقدين لأن العقد أوجب الملك في البدلين ومعلوم أن الملك ما ثبت لعينه وإنما ثبت وسيلة إلى الانتفاع بالمملوك ولا يتهيأ للانتفاع به إلا بالتسليم فكان إيجاب الملك في البدلين شرعا إيجابا تسلمها ضرورة ولأن معنى البيع لا يحصل إلا بالتسليم والقبض لأنه عقد مبادلة وهو مبادلة شيئ مرغوب بشئ مرغوب وحقيقة المبادلة في التسليم والقبض لأنها بدل وإعطاء بدل'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۹۷)۔

(رہے وہ احکام جو بیع کے حکم اصلی کے توابع میں سے ہیں...... تو ان میں سے مبیع اور ثمن کی حوالگی کا واجب ہونا ہے...... رہا پہلا تابع حکم تو بدلین (مبیع وثمن) کی حوالگی عاقدین پر واجب ہے، اس لیے کہ عقد بیع نے بدلین یعنی مبیع وثمن میں ملکیت کو واجب قرار دیا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ ملکیت لعینہ ثابت نہیں ہوئی، بلکہ یہ مملوکہ چیز سے فائدہ اٹھانے کے وسیلہ کے طور پر ثابت ہوئی ہے اور یہ اس سے حصول نفع کے لیے حوالگی کے ذریعے ہی مہیا ہوگی، لہٰذا شرعاً بدلین میں ملکیت کو واجب قرار دینا ضرورۃ اس کی حوالگی کو واجب قرار دینا ہے اور اس لیے کہ بیع کا مفہوم حوالگی اور قبضے ہی سے حاصل ہوگا، اس لیے کہ یہ باہم تبادلہ کا معاملہ ہے اور یہ مرغوب چیز کے عوض مرغوب چیز کا تبادلہ ہے اور باہم تبادلہ کی حقیقت حوالگی اور قبضہ دینے میں ہے، اس لئے کہ یہ بدل لینے اور بدل دینے کا نام ہے)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع میں شرط لگانے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن العاصؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرض اور بیع حلال نہیں ہے اور نہ ایک بیع میں دو شرطیں حلال ہیں اور نہ ہی ایسا نفع حلال ہے جس کا ضامن نہ ہوا گیا ہو...... اور نہ ہی اس چیز کی بیع حلال ہے جو تیرے پاس نہ ہو:

''عن عبدالله بن العاص قال قال رسول الله ﷺ '' لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع ولا ربح ما لم يضمن ولا بيع ما ليس عندك'' (سنن الترمذي أبواب البيوع حديث: ۱۲۳۴)۔

خرید وفروخت میں ایسی شرط لگانا جو تقاضۂ بیع کے خلاف ہو اور وہ بیع سے مناسبت نہ رکھتی ہو یا اس میں بائع یا مشتری میں سے کسی کا فائدہ ہو شرعاً جائز نہیں اور ایسی شرط سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، لہٰذا زمین کی خرید وفروخت میں قبضہ نہ دینے اور آئندہ فروخت کرتے وقت بائع سے ہی فروخت

کرنے کی شرط سے خرید وفروخت کا یہ معاملہ فاسد ہو جائے گا، چنانچہ علامہ حصکفی تحریر فرماتے ہیں:

''ولا يبيع بشرط ... لايقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لأحدهما'' (الدر المختار على رد المحتار ۷/ ۸۲- ۸۳)۔

(اور ایسی شرط لگا کر فروخت نہیں کرسکتا جس کا عقد تقاضہ نہ کرتا ہو اور جو اس سے مناسبت نہ رکھتی ہو اور اس میں ان دونوں (بائع ومشتری) میں سے کسی کا نفع ہو)۔

ہدایہ میں ہے:'' كل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده '' (هدايه على فتح القدير ۶/۴۰۶)۔

(ہر وہ شرط جس کا عقد تقاضہ نہ کرے اور اس میں معاملہ کرنے والے دونوں لوگوں میں سے کسی کا فائدہ ہو یا مبیع کا فائدہ ہو درآنحالیکہ وہ اہل استحقاق میں سے ہو یہ بیع کو فاسد کردے گی)۔

خرید وفروخت میں ایسی شرط جو تقاضہ عقد کے خلاف ہو یا اس میں بائع کا نفع ہو، اس پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر وھبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''بائع کے لیے جائز نہیں کہ وہ خریدار کے حساب میں ایسی شرط لگائے جو عقد کے تقاضہ سے موافقت نہ رکھتی ہو اور بیع فاسد ہوگی یا باطل ہوگی جیسے فروخت کرنے والا خریدار پر یہ شرط رکھے کہ وہ مبیع کو فروخت نہیں کرے گا یا اسے ہبہ نہیں کرے گا، یا مبیع کا کچھ حصہ وہ اسے فروخت کرے گا یا وہ اس قدر مال اسے قرض دے گا یا ایک مدت تک گھر میں رہے یا خریدار فروخت کرنے والے پر یہ شرط رکھے کہ اس نے اس سے جو کپڑا خریدا ہے وہ اس کا لباس سل کر دے یا جو کھیتی اس نے اس سے خریدی ہے اس کو کاٹے یا جو چمڑا اس نے اس سے خریدا ہے وہ اس کا جوتا بنا کردے اور ان کی دلیل وہ روایت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے'' (الموسوعة الفقهية، القضايا المعاصرة ۱۳/ ۲۸۲)۔

اس معاملے میں اگر بائع خریداری کے وقت یہ شرط نہ لگائے کہ آئندہ فروخت کرنا ہو تو اس سے ہی فروخت کرے بلکہ وہ بیع مکمل ہونے کے بعد خریدار سے یہ شرط بطور وعدہ کے بیان کردے تو بیع درست ہو جائے گی اور خریدار پر اس کے مطابق عمل کرنا لازم ہوگا، چنانچہ متاخرین احناف نے بھی چند مسائل میں ''وعدہ'' کو قضاءً لازم قرار دیا ہے، قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ ''بیع بالوفاء'' کے مسئلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس''

(فتاوى خانيه على الفتاوى الهنديه ۲/۱۶۵، كتاب البيوع، فصل في الشروط المفسدة)۔

(اگر بیع بغیر شرط کے کی جائے اور اس کے بعد شرط کو بطور وعدہ کے بیان کر دیا جائے تو بیع جائز ہو جائے گی اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا، اس لیے کہ باہمی وعدہ کبھی لازم بھی ہوتا ہے، لہٰذا اس وعدہ کو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم قرار دیا جائے گا)۔

علامہ ابن عابدین شامی تحریر فرماتے ہیں:

''وفي جامع الفصولين أيضا: لو ذكرا البيع بلا شرط ثم ذكرا الشرط على وجه العدة جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد إذا المواعيد قد تكون لازمة فيجعل لازما لحاجة الناس'' (رد المحتار ۷/۲۸۱، باب البيع الفاسد مطلب في البيع بشرط فاسد)۔

(جامع الفصولین میں بھی یہ عبارت موجود ہے کہ اگر بائع اور مشتری بلا کسی شرط کے بیع کریں اور پھر شرط کو بطور وعدہ کے ذکر کریں تو بیع جائز ہوگی اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا، اس لیے کہ آپس کے باہمی وعدے بعض اوقات لازم ہو جاتے ہیں، لہٰذا یہاں بھی لوگوں کی ضرورت کی بناء پر لازم قرار دیا جائے گا)۔

☆☆☆

زمین کی پلاٹنگ اور اس کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل

مولانا محمد زبیر ندوی [1]

۱۔ الجواب وباللہ التوفیق:

اراضی اور غیر منقولہ جائیداد کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان میں غصب کا تحقق ممکن ہے یا نہیں؟ اور اس سلسلہ میں ائمہ اور فقہاء کی آراء کیا ہیں؟ متعدد کتب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک غیر منقولہ جائیداد میں غصب کا تحقق نہیں ہوتا ہے، کیونکہ غصب کے تحقق کے لئے جائیداد کا اصل مالک کے قبضہ سے نکل کر دوسرے کی ملکیت میں اس طور پر منتقل ہونا ضروری ہے کہ اصل مالک اس سے بالکلیہ محروم ہوجائے، اور یہ بات اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب اسے ہٹا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردیا جائے، اور چونکہ غیر منقولہ اشیاء میں یہ ممکن نہیں لہذا ان میں غصب کا تحقق بھی ممکن نہیں۔

ائمہ ثلاثہ اور احناف میں سے امام محمدؒ اور امام زفرؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غصب کے سلسلہ میں منقولہ اور غیر منقولہ سب برابر ہے، اور ہر دو طرح میں غصب کا تحقق ہوجاتا ہے، اور اس پر وہی احکام نافذ ہوں گے جو مال مغصوب کے ہیں، علماء احناف نے گو شیخین ہی کے مذہب کو قبول کیا ہے، لیکن اپنے زمانہ اور حالات کے پس منظر میں متاخرین احناف نے بھی اوقاف اور یتیموں کے غیر منقولہ جائیدادوں میں غصب کو قبول کیا ہے، غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ کے حالات پہلے سے کہیں زیادہ ابتر ہیں، خصوصاً زمین وجائیداد کے سلسلہ میں جس قسم کے ناجائز اور ظالمانہ قبضے ہر خطۂ زمین میں ہورہے ہیں اہل نظر سے مخفی نہیں، شاید ہی کوئی علاقہ ہو جہاں زمینوں کے غاصب اور جائیداد کے لالچی لوگ نہ ہوں، لہذا جس طرح متاخرین احناف نے اوقاف اور یتامی کے جائیداد کو اور ائمہ ثلاثہ نے ہر طرح کے مال کو قابل غصب قرار دیا ہے اگر موجودہ زمانے میں اسی پر عمل کیا جائے اور ہر طرح کی منقولہ اور غیر منقولہ اشیاء کو قابل غصب قرار دیا جائے اور ان پر ناجائز قبضہ کی صورت میں غصب کے احکامات لگائے جائیں، تو حالات حاضرہ کے پس منظر میں زیادہ بہتر ہوگا۔

لہذا وہ زمین یا جائیداد جسے لوگ غصب کرلیں اور ناجائز طور پر بنا کسی کے حق پر قابض ہوجائیں ایسی زمینوں کو اصل مالکین کو لوٹانا واجب ہے، چنانچہ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

''ويجب رد عين المغصوب لقوله عليه السلام على اليد ما أخذت حتى ترد، ولقوله عليه السلام: لا يحل لأحدكم أن يأخذ مال أخيه لاعبًا ولا جادًا، وإن أخذه فليرده عليه'' (رد المحتار ۹/ ۲۶۶، کتاب الغصب)۔

نیز شرح المجلہ میں اس کی صراحت ان الفاظ میں ہے:

''على الغاصب رد المغصوب إلى صاحبه إذا كان المغصوب قبيل العقار من دون أن يغيره أو ينقصه لأنه إذا كان المال المغصوب موجودًا عينًا يرد إلى صاحبه'' (شرح المجلہ ۲/ ۵۷۱، المادۃ: ۹۰۵)۔

لیکن اگر غاصب نے اراضی پر قبضہ کرنے کے بعد ان کی مرمت کردی اور مکانات تعمیر کردیئے اور اگر ان کی قیمت زمین کی قیمت سے زیادہ ہے یا برابر ہے یا کم ہے لیکن حکومت یا مالک اراضی کچھ قیمت لے کر راضی ہوجاتے ہیں، یعنی فقہاء کی اصطلاح میں تغیر فاحش ہوجاتا ہے تو غاصب پر عین شئی کا لوٹانا واجب نہیں ہے، بلکہ ان پر ضمان یا قیمت ادا کرنا واجب ہوگا اور پھر وہ اس کا مالک ہوجائے گا۔

''وأنه حينئذ يتسلم الغاصب العين ويدفع قيمتها أو يدفعها ويضمن نقصانها، والخيار في ذلك للمالك'' (ردالمحتار ۹/ ۲۶۶ کتاب الغصب)۔

---

[1] دار العلوم الاسلامیہ اوشیوری، جوگیشوری، ممبئی۔

اور جب غاصب قیمت ادا کر کے شئی مغصوب کا مالک ہو گیا تو اس کو بیچنے کا بھی حقدار ہوگا، لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر اگر غاصبین نے سرکاری اراضی کو غصب کیا اور اس پر قبضہ کرلیا اور وہ زمین غیر آباد اور بنجر تھی اور حکومت نے اس کو آباد کرنے کا بھی حکم دیدیا تو اس کی بھی بیع وشراء جائز ہے، اور اگر حکومت نے اجازت نہیں دی، بلکہ قانونی اعتبار سے وہ مغصوبہ ہے تو نہ اس کی بیع وشراء جائز ہے اور نہ ہی اس پر تعمیر شدہ مکانات کی بالمشافہ یا یکے بعد دیگرے خرید وفروخت جائز ہے، کیونکہ مالک اراضی کی اجازت شامل نہیں ہے، فتاویٰ خانیہ میں ہے:

''يجوز بيع الأرض المحياة بإذن الإمام، فإن أحياها بغير إذن الإمام وباعها لا يجوز عند أبي حنيفة وقال صاحباه: يجوز'' (الفتاوى الخانيه على هامش الهنديه ۲/ ۲۸۳)۔

نیز فتاویٰ ہندیہ میں منقول ہے: ''الغاصب إذا باع المغصوب من رجل ثم باعه المشتري من الآخر حتى تداولته الأيدي، ثم إن المالك أجاز عقدًا من العقود جاز ذلك العقد'' (الفتاوى الهنديه ۳/ ۱۱۱)۔

اور مجلۃ الاحکام میں اس مسئلہ میں یوں صراحت مذکور ہے:

''إذا كان المغصوب أرضًا وكان الغاصب أنشأ عليها بناء أو غرس فيها أشجارًا يؤمر الغاصب بقلعها وإن كان القلع مضرًا بالأرض فللمغصوب منه أن يعطي قيمته مستحق القلع ويضبط الأرض، ولكن لو كانت قيمة الأشجار أو البناء أزيد من قيمة الأرض وكان قد أنشأها أو غرس بزعم شرعي كان حينئذ لصاحب البناء أو الأشجار أن يعطي قيمة الأرض ويتملكها'' (شرح المجله ۲/ ۵۷۳، ماده: ۹۰۶)۔

۲۔ الجواب باسم ملهم الصواب:

موقوفہ اراضی خواہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہوں یا غیر مسلموں کے اور خواہ مدرسہ ومسجد اور وقف کو ان کی ضرورت ہو یا نہ ہو کسی بھی طرح وہ وقف ہی سمجھی جائے گی اور یہ قبضہ غاصبانہ قبضہ تصور کیا جائے گا، غصب کرنے یا ناجائز قبضہ کرنے سے غاصب وقابض نہ اس کا مالک ہوگا اور نہ ہی اس پر اس کا حق ثابت ہوگا، لہذا نہ اس کا بیچنا درست ہوگا اور نہ ہی کسی کے لئے اس کا خریدنا جائز ہوگا، بلکہ قبضہ کرنے والوں کو اس زمین سے دستبردار ہونا لازم ہوگا، چنانچہ شرح المجلہ میں قہستانی کے حوالہ سے بصراحت مرقوم ہے:

''ومفاده أن غصب العقار موجب للرد والإعادة بالاتفاق'' (شرح المجله ۲/ ۵۶۹ الفصل الثاني)۔

اور علامہ شامی نے تحریر فرمایا ہے:

''والحاصل: إن علم أرباب الأموال وجب ردهم عليه'' (رد المحتار، مطلب فيمن ورث مالا حراما)۔

علامہ شامی ہی کا بیان ایک اور مقام پر ہے کہ اگر کسی نے کوئی گھر خریدا، اور اس میں رہنا شروع کر دیا اور اس کی واپسی کرنا ممکن نہ ہو تو اس کی قیمت ادا کرنا ضروری ہوگا، تاکہ وقف کے مال کو نقصان نہ ہو (ردالمحتار ۹/ ۲۷۲)۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہؒ کی یہ عبارت کس قدر بے غبار ہے:

''فمن علمت أنه سرق مالا أو خانه في أمانته أو غصبه فأخذه من المغصوب قهرًا بغير حق لم يجز لي أن آخذه منه لا بطريق الهبة ولا بطريق العوض ولا وفاء عن أجرة ولا ثمن بيع'' (مجموعة الفتاوى لابن تيميه ۲۹/ ۳۲۲)۔

اس قسم کی ناجائز اشیاء کی خرید وفروخت کے بارے میں علامہ یوسف قرضاوی اس طرح رقم طراز ہیں:

''لم يحل للمسلم أن يشتري شيئًا يعلم أنه مغصوب أو مسروق أو مأخوذ من صاحبه بغير حق'' (الحلال والحرام للقرضاوي/ ۲۱۶ الفصل الرابع)۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے بھی ایک فتویٰ میں اس قسم کی بیوع کو ناجائز قرار دیا ہے:

سوال: جس موقوفہ زمین کو متولی نے بیع کردیا اور عرصۂ دراز سے مشتری کے قبضہ میں ہو، اس زمین کو مشتری سے خریدنا اور اپنا ملک تصور کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جب پہلی ہی بیع باطل ہے تو دوسری بیع جو اس پر مبنی ہے نیز باطل ہوگی (امداد الفتاوی ۲/۶۰۸ کتاب الوقف)۔

ان تمام علماء وفقہاء اور ان کی آراء کے تتبع سے واضح ہوجاتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں ایسی زمینوں کی خریداری اور قبضہ درست نہیں ہے جو وقف سے تعلق رکھتی ہوں۔

۳۔ الجواب وباللہ الصواب:

جو زمین موروثی طور پر ملی ہو اور مالک زمین اس کو اپنی ملکیت بتا کر بیچے اور یہ کہے کہ اس میں کسی کا حق نہیں ہے، تو ایسی زمین خریدنے میں مضائقہ نہیں ہے، امام محمدؒ المبسوط میں لکھتے ہیں:

''فإن اشترى وقبل وهو لا يعلم أنه لغيره وأخبره أنه له، رجوت أنه فى سعة من شراه وقبوله، والتنزه أفضل'' (المبسوط للامام محمد ۳/ ۱۲۲)۔

اسی طرح اگر اس زمین کو بیچنے والا اس کے بارے میں مشتری کو کچھ نہیں بتاتا ہے، اور نہ ہی مشتری اس کے بارے میں کچھ دریافت کرتا ہے کہ آیا یہ اسی کی ملکیت ہے یا کسی اور کی، اور یہ مال صرف اسی کا ہے یا کسی اور کا بھی حصہ اس میں ہے، بلکہ مطلقاً بیع وشراء ہوجائے تو بھی اس زمین کا خریدنا درست ہے، امام محمدؒ لکھتے ہیں:

''وإن كان لم يخبره أن ذلك الشئى لغيره فلا بأس بشراء ذلك منه، وإن كان غير ثقة وقبوله منه ما لم يعلم الذى اشتراه'' (المبسوط للامام محمد ۳/ ۱۲۱)۔

لیکن اگر وہ موروثی زمین اس طور پر ہو کہ اس میں دوسروں کا حصہ بھی ہو، یعنی وارث کے باپ یا دادا نے مستحقین کو ان کا حصہ نہ دیا ہو اور بائع اسی کا اقرار کرتا ہو، اور مشتری کو بھی یہ معلوم ہو چکا ہو تو اس زمین کا خریدنا درست نہیں ہے، کیونکہ بائع کی ملکیت میں وہ مبیع مکمل طور پر نہیں ہے، بلکہ دوسروں کا بھی حق اس میں باقی ہے، اور فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ بیع کا دوسروں کے حق سے آزاد ہونا بیع کے نفاذ کے لئے ضروری ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ نفاذ بیع کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''أن لا يكون فى المبيع حق لغير البائع'' (البحر الرائق، كتاب البيوع ۵/ ۴۴۴)۔

لیکن اس کے باوجود اگر کسی نے بیع وشراء کرلیا تو صحیح قول کے مطابق یہ بیع بیع موقوف ہوگی، یعنی دوسرے مستحقین کی اجازت اگر ہوگی تو بیع نافذ ہوجائے گی اور مشتری کا خریدنا درست ہوگا، ورنہ نہیں، علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

''أن لا يكون فى المبيع حق لغير البائع، فإن كان، لا ينفذ كالمرهون والمستأجر، واختلفت عبارات الكتب فيها، ففى بعضها أنه فاسد، والصحيح أنه موقوف ويحمل الفساد على أنه لا حكم له ظاهرًا، وهو تفسير الموقوف عندنا'' (البحر الرائق ۵/ ۴۴۴ كتاب البيوع)۔

۴۔ الجواب وباللہ التوفیق:

جو زمین مال حرام سے خریدی گئی ہو اور بائع کہہ رہا ہو کہ اس نے یہ زمین ناجائز پیسے سے خریدی ہے یا معتبر ذرائع سے اس کا علم ہو تو واقف کاروں کو اس زمین کا خریدنا حرام ہے، کیونکہ مال کی حرمت زمین میں بھی داخل ہوگئی، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ تحریر فرماتے ہیں:

''الحرمة تتعدد فى الأموال مع العلم بها'' (الاشباه مع غمز عيون البصائر ۲/ ۵۰۴)۔

البتہ فتاوی قاضی خاں میں اس بارے میں یہ تفصیل ہے کہ فتوی اس پر ہے کہ اگر کسی کے پاس حرام مال ہو اور اس نے یہ حرام مال بائع وغیرہ کو پیشگی دے دیا، اور پھر یہ کہہ کر خریدا کہ اس مال کے بدلہ میں یہ زمین یا ملبہ خریدتا ہوں، یا پیشگی نہ دیا مگر خاص اس مال کی طرف اشارہ یا نسبت کرکے یوں کہا کہ اس روپیہ کے عوض یہ زمین یا ملبہ خریدتا ہوں تب تو یہ زمین اور ملبہ بھی اس مال حرام کے حکم میں ہوگیا، لیکن اگر ایسا نہیں بلکہ بغیر پیشگی دیئے اور بغیر نسبت واشارہ کے مطلقاً خرید لیا جیسا کہ عام طور پر یہی دستور ہے تو یہ زمین اور ملبہ اس مال حرام کے حکم میں نہیں ہوگا، بلکہ پاک اور حلال ہے (الفتاوی الخانیۃ علی الھندیہ ۲/۲۸۷)۔

لہذا وہ زمین اگر مال حرام سے خریدی گئی اور حرام رقم ہی اس کی خریداری میں ثمن کے طور پر دی گئی اور اب خریدنے والے کو بھی اس کا پورا پورا علم ہے تو ایسی زمین کا خریدنا درست نہیں ہے، ہاں اگر واقفیت نہیں ہے یا مالک زمین نے خود حرام مال سے نہیں خریدا تھا تو خریدنا درست ہوگا۔

۵۔ الجواب باسم ملهم الصواب:

حکومت نے جو لے آؤٹ پاس کیا ہے اور اس میں جو راستے یا پلے گراؤنڈ یا دیگر چیزیں جو عوامی مفادات سے وابستہ ہوں اگر ضرورت سے زائد ہوں اور اس قدر ہوں کہ ان سے کم میں ضرورت کی تکمیل ہو سکتی ہو اور باشندگان کالونی کو کوئی جسمانی اور مکانی نقصان نہ ہو تو مالک زمین کو زائد حصہ بیچنے کا حق ہے، کیونکہ اس سلسلہ میں جو بنیادی چیز مدنظر ہے وہ اہل کالونی کا اپنی ضروریات میں دقت محسوس نہ کرنا ہے، اگر منظور شدہ زمینوں سے کم میں یہ ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں اور حکومت نے زیادہ تجویز کر دی ہیں تو گویا یہ مالک زمین کے ساتھ ناانصافی ہے، اور اس ناانصافی کو وہ ختم کرنے پر قادر ہے تو کر سکتا ہے، لیکن اگر حکومت کی تجویز کردہ شاہراہ یا دیگر مصالح عامہ کی زمینیں بقدر حاجت وضرورت ہیں اور اس سے کم میں لوگوں کو نقصان ہے تو مالک کا نہ بیچنا جائز ہے اور نہ ہی جانتے بوجھتے کسی کا خریدنا درست ہے، کیونکہ ایسی زمینوں کے بیچنے کی شرط یہ ہے کہ عوام کا حق باطل نہ ہو، شامی کا بیان ہے:

''..... لا يفضى إلى إبطال حق العامة'' (رد المحتار ۷/ ۲۷۳)۔

فتاوی ہندیہ میں طریق عام کی بیع سے متعلق یہ تفصیل لکھی ہے کہ اگر کوئی شخص مملوکہ زمین کے ساتھ طریق عام کو بھی بیچ دے تو مملوکہ زمین کی بیع ہو جائے گی، البتہ طریق کا شمار عیب کے طور ہوگا، گویا طریق کی بیع درست نہ ہوگی۔

''ولو اشترى ملكًا وفيه طريق العامة لا يفسد البيع والطريق عيب'' (الفتاوى الهنديه ۳/ ۱۱۳)۔

لہذا اگر بقدر ضرورت جگہ چھوڑی گئی تھی تو اس کا بیچنا اور خریدنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں اہالیان کو ضرر اور حرج لاحق ہے، اور ضرر اور حرج کو شریعت میں دور کیا گیا ہے۔

''الحرج مدفوع''، اور ''لا ضرر ولا ضرار''۔

۶۔ الجواب وبالله التوفيق:

حکومت کی جانب سے جو لے آؤٹ منظور ہوتا ہے اور اس کے نقشہ میں جو پلے گراؤنڈ اور گارڈن وغیرہ ہوتے ہیں ان کا تعلق درحقیقت عوام کے روزمرہ کے مفادات سے ہے، اور مسلمانوں کے لئے جس طرح دنیوی صحت وراحت کے لئے اس طرح کی چیزوں کی ضرورت ہے اس سے کہیں بڑھ کر ان کی اخروی زندگی کے لئے مسجد کی ضرورت ہے، علماء نے اپنی کتابوں میں مسجد کو اللہ کا حق یا بندوں کا حق قرار دیا ہے:

''لأن المسجد حق الله تعالى أو حق عامة المسلمين'' (الفتاوى الخانية على الهنديه ۳/ ۲۹۰)۔

لہذا کالونی بنانے والے کو خود اس کے لئے زمین متعین کرنا چاہئے، خصوصاً جبکہ صرف مسلمانوں پر مشتمل کالونی ہو، لیکن اگر اس نے مسجد کے لئے خود سے کالونی میں الگ سے جگہ نہیں چھوڑی تو اگر ساری آبادی صرف مسلمانوں پر مشتمل ہو اور قانونی اعتبار سے حکومتی سطح پر کسی بڑی مزاحمت اور کارروائی کا اندیشہ نہ ہو تو مسجد بنانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مسلمانوں کے لئے گارڈن اور پلے گراؤنڈ سے کہیں زیادہ مسجد کی ضرورت ہے، اور یہ بھی ان کے مفادات ہی کی چیز ہے، لیکن اہالیان کالونی راضی نہ ہوں یا حکومت کی قانون شکنی کی وجہ سے عزت ووقار کو سخت اندیشہ ہو تو ایسی زمین کو بیچنا درست نہ ہوگا، نیز فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جائز چیزوں میں حکومت اور امیر کی بات ماننا واجب ہے:

''لأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض'' (الدر المختار مع الرد ۶/ ۴۱۶)۔

البتہ پہلی صورت میں کیا یہ مسجد ''مسجد شرعی'' تصور کی جائے گی یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اگر یہ زمین ہمیشہ کے لئے مسجد ہی کے واسطے دے دی گئی اور مالک اپنی ملکیت سے دستبردار ہو گیا اور اس میں تعمیر کے بعد نماز، اذان واقامت کے ساتھ ادا کی جانے لگی تو یہ مسجد شرعی کے حکم میں ہو جائے گا، چنانچہ فتاوی عالمگیری میں اس بابت منقول ہے:

''رجل له ساحة لا بناء فيها، أمر قومًا أن يصلوا فيها بجماعة، هٰذا على ثلاثة أوجه: أحدها: إما إن أمرهم

بالصلاة فيها أبدًا نصًا بأن قال: صلوا فيها أبدًا، أو أمرهم بالصلاة مطلقًا، ونوى الأبد، ففي هذين الوجهين صارت الساحة مسجدًا'' (الفتاوى الهنديه ۲/ ۴۵۵، كتاب الوقف)۔

لیکن اگر ہمیشہ کے لئے زمین نہیں دی نہ صراحۃً اور نہ نیۃً تو یہ مسجد شرعی نہیں سمجھی جائے گی، قاضی خاں لکھتے ہیں:

''وإن أمرهم بالصلاة شهرًا أو سنة، ثم مات يكون ميراثًا عنه، لأنه لابد من التأبيد، والتوقيت ينافي التأبيد'' (قاضيخان على الهنديه ۳/ ۲۹۰، كتاب الوقف)۔

نیز فتاوی ہندیہ میں ہے:

''أما إن وقت الأمر باليوم أو الشهر أو السنة ففي هذا الوجه لا تصير الساحة مسجدًا'' (الهنديه ۲/ ۴۵۵، كتاب الوقف)

۷- الجواب باسم ملهم الصواب:

اصولی اعتبار سے مالک زمین اپنی زمین جب اور جس سے چاہے بیچ سکتا ہے، کیونکہ وہ اس کی ملکیت اور قبضہ میں ہے، لہذا اس طرح کا تصرف جائز ہے، چاہے تو فروخت کرے یا پلاٹنگ کرے یا کھیتی باڑی کرے، شرح المجلہ میں ہے:

''لا يمنع أحد من التصرف في ملكه أبدًا، إلا إذا أضره بغيره ضررًا فاحشًا'' (شرح المجله، ماده: ۱۱۹۷)۔

لیکن انسان جس ملک میں رہتا ہے اس کے قوانین کی پابندی بھی ضروری ہے، خصوصاً جبکہ وہ قوانین جواز کے دائرہ میں ہوں، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''إن طاعة الأمير فيما ليس بمعصية فرض'' (الدر مع الرد كتاب الجهاد ۶/ ۴۱۶)۔

پھر چونکہ حکومتی قوانین پر عمل نہ کرنے سے مختلف قسم کے خدشات اور اندیشے ہوتے ہیں، مثلاً انسان کا جانی یا مالی نقصان، یا عزت ووجاہت کی پامالی وغیرہ، چنانچہ بعض علماء نے ان اموال کو شرعاً جن کی بیع وشراء درست ہو، لیکن ملکی قوانین کی رو سے اس کی خرید وفروخت درست نہ ہو تو ایسا معاملہ کرنا اچھا نہیں سمجھا ہے، اور اس کا سبب وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ حکومت سے چوری چھپے بیرونِ ملک کا مال بیچنے کے سلسلہ میں لکھتے ہوئے مولانا عبدالرحیم لاجپوریؒ فرماتے ہیں:

''اگر وہ مال نجس، ممنوع الاستعمال اور ممنوع البیع نہ ہو اور مالک سے خریدا ہو تو اس کی تجارت فی نفسہ حلال ہے، لیکن چونکہ حکومت کے قانون کے خلاف ہے، اور مجرم سزا کا مستحق اور ذلیل ہوتا ہے، اور اپنے آپ کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے ایسا معاملہ اختیار نہ کیا جائے''۔

(فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۷۸ کتاب الحظر والاباحۃ)۔

اس اعتبار سے بغیر ملکی قانون کی اجازت اور تکمیلِ کارروائی کے کالونی بنانا اور اس کی بیع وشراء درست معلوم نہیں ہوتی، پھر چونکہ اس میں رشوت دینا بھی پڑتا ہے، اس لئے رشوت دے کر پولس اور افسروں کو رشوت خور بنانا اور اس کا خوگر بنانا بھی لازم آتا ہے جو درست نہیں ہے، چنانچہ مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ ایک جگہ میونسپلٹی کے ٹیکس کو بچا کر افسروں اور پولس والوں کو رشوت دینے کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میونسپلٹی کا ٹیکس بچا کر پولس والوں اور افسروں کو دینا اور رشوت کا انہیں عادی بنانا کوئی اچھا کام نہیں ہے، اس سے بہتر تو یہی ہے کہ ٹیکس پورا دیدیا جائے، نہ دینے میں کبھی ذلیل اور بے عزت ہونے کا موقع آجاتا ہے، اور خود کو ذلیل کرنا شرعاً جائز نہیں'' (فتاوی رحیمیہ ۶/ ۲۵۶ کتاب الحظر والاباحۃ)۔

لیکن اس مسئلہ کا دوسرا رخ بھی ہے، جیسا کہ سوال میں ظاہر ہے کہ مالک زمین یا کالونی بنانے والا اگر حکومت کی قانونی کارروائی پوری کرے تو مختلف مسائل اور ناجائز امور سے گزرنا پڑتا ہے، خصوصاً ٹیکس کے دوہرے تیہرے ظالمانہ نظام اور رشوت کی آفت سے تو چارۂ کار نہیں، اور پھر اس کے نتیجہ میں زمین اور کالونی کا اس قدر گراں اور بیش قیمت ہوجانا کہ عام انسانوں کے لئے خریدنا اور اس میں حصہ لینا نہایت دشوار ہوجاتا ہے، انصاف کی رو سے حکومت اور اس کے کارندوں کا عمل اور ٹیکس ورشوت کسی ظلم سے کم نہیں ہے، اور خصوصاً جبکہ اس میں رعایا کا استحصال ہو، اور انہیں صحیح محفوظ پناہ گاہ ملنا دشوار ہو۔

لہذا اس پہلو اور ماسبق نقطۂ نظر میں یہ معاملہ پیچیدہ ہوجاتا ہے، ایک طرف حکومت کی قانون شکنی اور دوسری طرف حکومت کی ناانصافی اور زمین کی گرانی، دونوں پہلو اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں، لہذا اس سلسلہ میں اگر دوسرے پہلو کو ترجیح دی جائے اس شرط پر کہ اگر عموماً اس قسم کے معاملات میں تجرباتی طور پر کوئی

وقوع جانی و مالی اور عزت کی پامالی کا اندیشہ نہ ہو اور جیسا کہ سوال میں مذکور ہے کہ اکثر کالونیاں بغیر اجازت اور بنا قانونی منظوری کے بنتی ہیں، نیز عموماً اس سے حکومت راضی ہو جاتی ہے، تو ایسی کالونی بنانا درست ہے، اور اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہوگی۔

اس صورت میں عوام اور غریب طبقہ بھی سر چھپانے کی جگہ پالیتا ہے، اور حکومت کے بیجا ظلم اور ٹیکس کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ فقہاء کا اصول ہے کہ اگر ایک طرف ضرر خاص ہو اور دوسری طرف عام ضرر ہو تو خاص ضرر کو برداشت کیا جائے گا اور ضرر عام کو دور رکھا جائے گا، شرح المجلہ میں ہے:

''یتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام'' (شرح المجلہ ۱/ ۴۰، مادہ: ۲۶)۔

نیز اسی کتاب میں ہے کہ شدید ترین ضرر کو خفیف ضرر کے ذریعہ ختم کیا جائے گا، اور بہت سے قواعد فقہیہ سے اس مسئلہ میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

''الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف، يعني أن الضرر تجوز إزالته بضرر يكون أخف منه، ولا يجوز أن يزال بمثله أو أشد منه''۔

''إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما بارتكاب أخفهما'' (شرح المجلہ ۱/ ۴۰-۴۱، مادہ: ۲۷)۔

۸- الجواب وباللہ التوفیق:

موجودہ زمانہ میں مختلف ممالک میں بہت سے قوانین غیر منصفانہ اور نہایت بیجا ہیں، لیکن رعایا حکومتی دباؤ سے ان پر عمل کرنے پر مجبور ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر ممالک کی رعایا اپنے حکام سے ناراض ہوتی ہیں اور لوگ عموماً قانون شکنی کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں، انہیں میں یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کسی زمین یا مکان یا دیگر قیمتی چیز خریدنے کی وسعت ہو اور وہ اس کی قیمت ادا کرنے پر بغیر سود و رشوت کے قادر ہو، لیکن حکومت کی سختی سے وہ مجبور ہوتا ہے، حکومت اس کے اموال کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتی ہے، بلکہ مختلف بہانوں سے ایسے شخص کو پھنسا کر قانون کے شکنجہ میں لا کھڑا کرتی ہے، اور اس میں بھی اس کے پیش نظر اس سے سود کا پیسہ جھپٹنا اور ظالمانہ ٹیکس لگانا ہوتا ہے جس کی بنا پر رعایا اپنا مال چھپا کر حکومت سے سودی قرض لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

یہ صورتحال خصوصاً مسلمانوں کے لئے بڑی تکلیف دہ ہو جاتی ہے، کیونکہ اسلام میں سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، اور نہایت خطرناک وعیدیں اس بارے میں وارد ہوئی ہیں، فقہاء کرام اور علماء امت کے تصریحات اور بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ کسی بھی مسلمان کے لئے بغیر کسی شدید مجبوری کے سودی قرض لینا درست نہیں ہے، خصوصاً ہندوستانی علماء اس سلسلہ میں نہایت محتاط واقع ہوئے ہیں، فتاوی محمودیہ جلد ۱۶ اور فتاوی رحیمیہ جلد ۶ اس کی واضح مثال ہیں۔

فقہاء میں سے علامہ ابن نجیم مصریؒ نے محتاج کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش کی صراحت کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (البحر الرائق ۶/ ۲۱۱، بیوع)۔

نیز ایک مقام پر ابن نجیمؒ ''حاجت'' کی تعریف کرتے ہوئے: ''وأما الحاجيات: معناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسع ورفع الضيق المؤدي في الغالب إلى الحرج والمشقة لفوت المطلوب'' (الاشباہ والنظائر)۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ زیر بحث مسئلہ حاجت میں آتا ہے یا نہیں اور یہ معاملہ درست ہوسکتا ہے یا نہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ دو اعتبار سے یہ معاملہ درست معلوم نہیں ہوتا: ایک یہ کہ سود کی حرمت اور شدت کے پیش نظر کہ جس قدر سودی معاملات کرنے والوں کے لئے تہدیدات اور وعیدیں کتب حدیث اور قرآن مجید میں موجود ہیں، بظاہر اس کے مقابلہ میں ایمانی تقاضا یہی ہے کہ اس حقیر چند روزہ دنیا کو ٹھکرا کر انسان آخرت کی فکر کرے۔ دوسرے یہ کہ جب آدمی کے پاس اتنا پیسہ موجود ہے کہ وہ کالونی کی اس گراں زمین یا مکان خرید سکتا ہے، اور صرف حکومت کا قانون مانع ہے، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسے حاجت میں شمار کر کے کالونی ہی میں زمین لینے پر مجبور کیا جائے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں اور اس سے کم تخمینہ میں جہاں حکومتی ممانعت یا قانون نہ ہو وہاں بھی لے سکتا ہے اور اس طرح وہ سود کی لعنت سے بھی محفوظ ہو جائے اور مکان بھی حاصل ہو جائے، اور جہاں تک مسلمان تاجروں کا معاملہ ہے تو انہیں خود اس لعنت سے دور رہنے کی فکر کرنی چاہئے کہ چند دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس معاملہ کو حاجت میں شمار کیا جائے اور اس کی چند وجوہات ہوسکتی ہیں:

۱- اصولیین کے مطابق حاجت ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے کسی مقصد کا وجود موقوف نہ ہو، لیکن اگر اس کی اجازت نہ دی

جائے تو مشقت اور حرج پیدا ہوجائے، اور انسان اپنی مطلوبہ چیز کو حاصل نہ کرسکے، اب اس مسئلہ میں دیکھئے کہ انسان کے پاس پیسے موجود ہیں اور وہ اپنی مطلوبہ چیز کو حاصل بھی کرسکتا ہے، لیکن حکومتی حرج اور قانون کی تنگی کی وجہ سے نہیں حاصل کر پا رہا ہے، لہذا اسے اصولیین کی اصطلاحی تعریف کی وجہ سے حاجت کی فہرست میں آنا چاہئے۔

دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بعض مرتبہ غریب اور پسماندہ لوگوں کے پاس یکمشت اس قدر موجود نہیں ہوتی ہے کہ وہ رہائش اور بود وباش کے لئے معقول انتظام کرسکیں لیکن جیسا کہ سوال میں مذکور ہے کہ اس طرح وہ آسان قسطیں ادا کرکے مکان کے مالک بن جاتے ہیں اور ان کی رہائش کا معقول انتظام ہوجاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ہندوستان جیسا ملک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور انہیں ملک میں اس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے گویا وہ کرائے کے آدمی ہیں، اور یہ ان کا وطن نہیں ہے بلکہ ہر اعتبار سے انہیں مفلس اور تنگ حال کرنے اور ان کی معاش و معیشت کو کمزور بنانے کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں، اگر انہیں اس قسم کی مراعات نہ دی جائیں اور مسلمان تاجروں کو اس تجارت سے اور مسلمان عوام کو اس قسم کی خریداری سے روک دیا جائے تو بلاشبہ زبردست مشقت کا سامنا کرنا ہوگا، جبکہ فقہ کا اصول ہے کہ مشقت آسانی پیدا کرتی ہے۔

''المشقة تجلب التيسير، الأمر إذا ضاق اتسع، الضرر يدفع بقدر الإمكان''۔

اور اس قسم کی دیگر باتوں اور اصولوں کے پیش نظر اجازت ہونی چاہئے، دونوں قسم کی وجوہات کو سامنے رکھتے ہوئے خاکسار راقم کے نزدیک اگر کوئی شخص واقعی ضرورت مند ہو اور اسکے بغیر اس کی زندگی مشکلات سے دوچار ہو اور خود سے کوئی مناسب مکان خریدنے پر قادر نہ ہو تو لون کے ساتھ کالونی میں مکان لینے کی گنجائش ہے، لیکن اگر کوئی با استطاعت ہو اور صرف عیش و مستی اور ضرورت سے زائد خریدنا چاہتا ہو تو اس کے لئے سودی معاملہ پر لون لے کر اس قسم کی کالونیوں میں جگہ لینا مناسب نہیں اور تاجرین کو بھی اگر بلا مشقت دوسرا کام ملے تو اسے ترجیح دینا چاہئے۔

۹۔ الجواب ومنه الصدق والصواب:

اسلامی مالی معاملات کے مطابق فقہاء کرام کا بیان ہے کہ بیع و شراء کے معاملہ میں بیع کا معلوم اور متعین ہونا ضروری ہے، چنانچہ شرح المجلہ میں ہے:

''يلزم أن يكون المبيع معلومًا عند المشتري'' (شرح المجله ۱/ ۱۷۷، ماده: ۲۰۰)۔

نیز فقہاء کا بیان ہے کہ بیع کا متعین اور معلوم ہونا اس وقت ضروری ہے جب کہ تسلیم اور تسلم ضروری ہو اور اگر تسلیم و تسلم ضروری نہ ہو، یا تسلیم میں کوئی عذر ایسا نہ ہو کہ مفضی الی النزاع ہو تو بھی معاملہ درست ہوگا، چنانچہ شرح المجلہ میں ہے کہ اگر کسی نے دوسرے شخص سے متعین ثمن کے ذریعہ اس چیز کو خریدا جو اس کے پاس ہے اگر چہ متبایعین کو اس کی صحیح مقدار معلوم نہ ہو تو یہ معاملہ درست ہے، اسی طرح اس میں ہے کہ اگر کسی نے کسی مکان میں اپنے حصہ کو بیچا ایسے شخص سے جو اس کی صرف مقدار جانتا ہو تو یہ بیع بھی درست ہے (شرح مجلۃ الاحکام ۱/ ۱۷۸)۔

اسی سلسلہ میں فتاوی ہندیہ میں نقل کیا گیا ہے:

''جهالة المبيع أو الثمن مانعة جواز البيع إذا كان يتعذر معها التسليم'' (الفتاوى الهنديه)۔

البتہ بیع کی تعیین کی شکل کیا ہوگی؟ تو اس بارے میں علماء کی وضاحت ہے کہ بیع کے احوال اور صفات اس طرح بیان کردیئے جائیں کہ وہ چیز دوسری چیزوں سے متمیز ہوجائے، مثلاً زمین اگر بیچی جارہی ہے تو اس کے حدود کے بیان سے بیع متعین ہوجائے گی، البتہ مختلف اشیاء کے تعیین کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً کیلی اور وزنی چیزیں اشارہ سے بھی متعین ہوسکتی ہیں، زمین اور مکانات حدود اور اوصاف سے متعین ہوسکتے ہیں اور اموال غیر منقولہ صرف جنس کے بیان سے بھی متعین ہوسکتے ہیں، مجلہ میں مذکور ہے:

''يصير المبيع معلومًا ببيان أحواله وصفاته التي تميزه عن غيره، مثلًا لو باعه كذا مدًا من الحنطة الحمراء أو باعه أرضًا مع بيان حدودها صار المبيع معلومًا وصح البيع''۔

''إن طرق العلم بالمبيع تختلف باختلاف المبيع، ومن طرق العلم به أولا بالإشارة، ثانيًا بالخواص..... ثالثًا

مکانه الخاص'' (شرح مجلة الاحکام ۱/ ۱۷۸)۔

خصوصًا زمین اور مکانات کے سلسلہ میں اصحاب مجلہ کا یہ بیان کس قدر واضح اور بے غبار ہے، کہ اگر کسی نے کہا کہ میں نے یہ زمین بیچی جس کی حد فلاں فلاں ہے، یا میں نے زمین بیچی جو فلاں جگہ میں واقع ہے، اور اس کی لمبائی چوڑائی اتنی اتنی گز ہے اور بیع کی مقدار یہ ہے تو یہ بیع معلوم اور متعین شمار ہوگی اور بیع ہر دو اعتبار ذات اور وصف سے صحیح مانی جائے گی (مجلۃ الاحکام ۱/ ۱۷۸)۔

لہٰذا مذکورہ بالا فقہی عبارات اور توضیحات سے واضح ہوتا ہے کہ اگر زمین کی مقدار معلوم ہو اور پلاٹ نمبر میں اس بات کی وضاحت ہو کہ کتنی فٹ ہے اور کتنی زمین ہے اور بائع مشتری کے مطالبہ پر اتنی ہی زمین اسے دینے پر قادر ہو اور اس طرح کی چیز مفضی إلی النزاع نہ ہو تو یہ معاملہ درست ہوگا، اور پلاٹ نمبر سے بھی مبیع متعین ہوسکتی ہے، جیسا کہ شرح المجلہ کی عبارات سے واضح ہے، اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ معاشرہ میں اس قسم کی بیوع کا اس قدر عرف اور رواج ہوگیا ہے کہ عموماً اس طرح کی بیع مفضی إلی النزاع نہیں ہوتی ہے اور مشتری کا مقصود غالبًا متعینہ مقدار میں زمین مطلوب ہوتی ہے، بعینہ کوئی خاص جگہ نہیں اور عرفًا ومجازًا مالک زمین پلاٹ نمبر تبدیل کرنے کا حق بھی رکھتا ہے، اس لئے عرفی اعتبار سے بھی یہ معاملہ درست ہونا چاہئے، واللہ اعلم بالصواب۔

۱۰۔ الجواب وباللہ التوفیق:

اس مسئلہ کے جواب کے لئے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ فقہاء کی اصطلاح میں ملکیت کسے کہتے ہیں؟ اور اس کے کیا اقسام ہیں، فقہاء کرام کی اس بارے میں مختلف تعریفات کو سامنے رکھتے ہوئے قدر مشترک کے طور پر شیخ مصطفی زرقاء نے اپنی کتاب میں جو تعریف لکھی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ ملکیت ایسی اختصاصی کیفیت کا نام ہے، جو صاحب شئی کے سوا دوسروں کو انتفاع اور تصرف سے روکتی ہے، اور صاحب شئی کو تصرف کا حق دیتی ہے، الا یہ کہ کوئی اضافی چیز اس کے تصرف کے لئے مانع ہو، عربی عبارت یہ ہے:

'' هو اختصاص حاجز شرعًا صاحبه التصرف إلا لمانع'' (المدخل الفقهی ۱/ ۲۴۱)۔

پھر ملک کی دو قسمیں ہیں: تام اور ناقص، ملک تام وہ ہے جس میں آدمی اصل شئی کا بھی مالک ہو اور اس کی منفعت کا بھی یعنی وہ چیز اس کے قبضہ میں بھی ہو، ملک تام کی تعریف ان الفاظ میں ہے:

''هو ما اجتمع فيه الملك واليد'' (المدخل لدراسة الشريعة الاسلامية/ ۲۲۵)۔

جبکہ ملک ناقص اسے کہتے ہیں جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک ہی پایا جائے، یعنی صرف منفعت کا مالک ہو یا صرف اصل شئی کا، جیسے مہر پر قبضہ نہ ہوا ہو، یا اجارہ پر کوئی چیز لی ہو۔

ملک کی تعریف اور اس کے اقسام کے اس پس منظر میں جب ہم زیر بحث مسئلہ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایجاب وقبول کے بعد بیع ہوگئی، اور بیع ہوجانے سے اس کی ملکیت اس زمین پر ہوگئی، البتہ اس کا قبضہ ابھی اس پر نہیں ہوا ہے، تو یہ ملک ملک ناقص ہوگی، اور زمین پر قبضہ کی صورت یہ ہوگی کہ بائع زمین کو اس طرح خالی کردے کہ وہ اس میں تصرف کرسکے، اور اگر اس میں کھیتی لگی ہوئی ہے تو بائع کو کاٹنے پر مجبور کیا جائے گا۔

''تسليم المبيع يحصل بالتخلية، وهو أن يأذن البائع للمشتری بقبض المبيع مع عدم وجود مانع من تسليم المشتری إياه'' (شرح المجله ۱/ ۲۵۱)۔

''إذا بيعت أرض مشغولة بالزرع يجبر البائع على رفع الزرع بحصاده أو رعيه، وتسليم الأرض خالية للمشتری'' (شرح مجلة الاحکام ۱/ ۲۵۳ ماده: ۲٦۷)۔

اس پوری تفصیل اور لوگوں کے عرف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عمومًا کالونی والے زمین پر ایسا قبضہ نہیں دیتے ہیں کہ بالکل خالی ہو اور وہ کسی بھی طرح تصرف کرے، لہٰذا یہ ملکیت ملک ناقص تصور کی جائے گی، اور چونکہ غیر منقولہ اشیاء میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قبل القبض بھی بیع جائز ہے اس لئے وہ اسے بیچ بھی سکتا ہے۔

''للمشتری أن يبيع المبيع لآخر قبل قبضه إن كان عقارًا، وإلا فلا. وكذلك يجوز له أن يهبه، وقد جوزه

الشیخان استحساناً'' (شرح المجلہ ۱/ ۲۳۶ مادہ: ۲۵۳)۔

۱۱۔ الجواب بتوفیق الوہاب:

جواب نمبر ۹ اور ۱۰ سے واضح ہو چکا ہے کہ پلاٹ نمبر سے بھی عدم مفضی إلی النزاع اور عرف کی بنا پر پلاٹ متعین ہو جاتا ہے اور بیع کی وجہ سے اسے ملکیت حاصل ہو جاتی ہے، گو کہ قبضہ نہیں ہوتا، اور عقار یعنی غیر منقولی اشیاء میں امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا مسلک یہی ہے کہ اسے قبل القبض بھی صرف کی وجہ سے بیچ سکتا ہے، لیکن اگر زمین مالک زمین ہی کی ملکیت میں ہو اور قبضہ بھی اسی کا ہو جیسا کہ شق باء میں مذکور ہے تو ایسی بیع درست نہ ہوگی، پھر شق باء میں غرر اور ضرر کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے کہ قانونی رکاوٹ کی وجہ سے مل بھی سکتا ہے اور نہیں بھی مل سکتا ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں شق الف کی صورت جائز معلوم ہوتی ہے، جبکہ شق باء میں عدم جواز کا پہلو راجح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ نہ ملکیت پائی جارہی ہے اور نہ ہی قبضہ، شق الف کے جواز کی تائید فقہاء کرام کے بیان کردہ اس مسئلہ سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کسی نے کہا کہ میں نے تم سے اس گھر میں جو میرا حصہ ہے وہ فروخت کیا اور مشتری اس حصہ سے واقف ہو کہ اس کا اس مکان میں کتنا حصہ ہے گرچہ بائع کو اپنا حصہ معلوم نہ ہو تو یہ معاملہ درست ہے۔

''رجل قال: بعت منك نصيبي من هذه الدار بكذا جاز، إذا علم المشتري بنصيبه من الدار وإن لم يعلم البائع'' (الفتاوى الهنديه ۳/ ۱۲۷)۔

غیر منقولہ جائیداد کی بیع کے سلسلہ میں حنفی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب مجلہ نے تحریر فرمایا ہے:

''للمشتري أن يبيع المبيع لآخر قبل قبضه إن كان عقاراً، وإلا فلا، وكذلك يجوز له أن يهبه، وقد جوزه الشيخان استحساناً... ومما أن الهلاك نادر في العقار ولا اعتبار للنادر، فليس في بيع العقار قبل القبض غرر الانفساخ كما في بيع المنقول'' (شرح المجلہ ۱/ ۲۳۶)۔

شرح المجلہ کی وضاحت سے ظاہر ہے کہ حنفیہ کے نزدیک عقار میں بلکہ دیگر بیوع کے قبضہ میں اصل چیز غرر ہے، اگر غرر پایا جائے تو قبل القبض درست نہیں ہے، اور نہ پایا جائے تو درست ہے، غرر کی بابت خلاصہ کلام کے طور پر فقیہ العصر استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت فیوضہم کی بات پیش خدمت ہے:

ایسی جہالت جو باعث نزاع نہ ہو، معمولی جہالت ہے اور عقد کی صحت میں مانع نہیں ہے، اور ایسی جہالت جو مفضی الی النزاع ہو جہل متفاحش ہے اور فساد عقد کا باعث ہے، اسی طرح جو غرر نزاع کا باعث بن جاتا ہو سمجھنا چاہئے کہ یہ غرر متفاحش ہے جو دوسرے فریق کے لئے ناقابل تحمل ہے، اور جو غرر عام طور پر باعث نزاع نہ ہو وہ غرر یسیر ہے، اور عقد کے لئے باعث فساد نہیں ہے (جدید فقہی مسائل ۴/ ۱۲۸)۔

۱۲۔ الجواب ومنه السداد والصواب:

اس سوال کے جواب میں دو باتیں قابل غور ہیں: ایک یہ کہ اس مسئلہ میں دلال کی حیثیت کیا ہے؟ یعنی وہ فقہی اصطلاح کے اعتبار سے دلال ہے یا بذات خود بائع ہے؟ دوسرے یہ کہ یہ معاملہ مالک کی ملکیت میں ہوتے ہوئے بیع کے زمرے میں آئے گا یا نہیں؟

فقہی اصطلاح میں دلال یا سمسار اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے کے لئے اجرت کے ساتھ بیع وشراء کا معاملہ کرے۔

''والسمسار اسم لمن يعمل للغير بالأجرة بيعاً وشراء'' (المبسوط للسرخسي ۵/ ۱۲۸ باب السمسار)۔

اب اگر یہ شخص مذکورہ تعریف کے مطابق صرف دلال ہے اور اجرت کے ساتھ مالک زمین اور مشتری کے درمیان معاملہ کرتا ہے اور ایجاب وقبول اور دیگر لوازم بیع اصل مالک اور مشتری انجام دیتے ہیں تو یہ معاملہ درست ہے، لیکن زیر بحث مسئلہ میں مشتری اصل بائع کو جانتا تک نہیں، بلکہ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ اصلاً یہ زمین کس کی ہے، اور کس کے قبضہ میں ہے، بلکہ دلال کی زبانی بات چیت کو کافی سمجھ کر آئندہ نفع کی امید پر بیع وشراء کا معاملہ کر رہا ہے، گویا ایک طرح سے مجهول الحال شئی کی خریداری کر رہا ہے، لہذا یہ خریداری درست نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دلال کو اگر وکیل بالبیع مانا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ اصل مالک زمین نے اس کو وکالت کے ذریعہ تمام اختیارات

دیئے ہیں، اور پھر یہ بیع وشراء کا سارا معاملہ کررہا ہے، اور وہ اس وکالت کی اجرت لے رہا ہے تو یہ معاملہ درست ہوگا، لیکن اس صورت میں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وکالت میں اس کو ایک حد تک ملکیت حاصل ہوجاتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ اس میں ہر طرح متصرف ہوسکتا ہے، جبکہ یہاں یہ چیز نہیں پائی جارہی ہے، بلکہ دلال کو عرفاً دلال ہی سمجھا جاتا ہے اور وکیل بالبیع کی کیفیت اس کے اندر نہیں ہوتی ہے، پھر اس میں ایک قباحت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ اگر دوبارہ مشتری اپنی اسی زمین یا پلاٹ کو بیچنا چاہے تو اس کو اتنا حق تصرف حاصل نہیں کہ خود بیچ سکے، بلکہ پھر اسی دلال سے رابطہ کرنا ہوگا، اور اس کو دلال کی اجرت بھی دینی ہوگی، لہذا اس صورت میں بھی یہ معاملہ جائز نہیں ہے۔

تیسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ دلال اس زمین یا پلاٹ کو خرید کر مالک ہوجاتا اور پھر آگے کے معاملات انجام دیتا، لیکن اس مسئلہ میں دلال نے اسے خود خریدا ہی نہیں ہے، اور جب خریدا نہیں اور نہ ہی اس کا مالک ہوا، تو بیچنے کے جواز کا سوال ہی نہیں، لہذا زیر بحث صورت شرعی نقطہ نظر سے جائز معلوم نہیں ہوتی، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۱۳۔ الجواب وباللہ التوفیق:

جواب نمبر ۱۰ کے ضمن میں گذر چکا ہے کہ بیع بھی ملکیت کا ایک ذریعہ ہے، اور جب مشتری نے بیع کی تمام شرائط کے مطابق اپنی تمام قسطیں ادا کردیں تو قاعدہ کی رو سے وہ اس زمین کا مالک ہوگیا، بلکہ فقہاء کرام کی عبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایجاب وقبول ہی سے ملکیت منتقل ہوجاتی ہے، اور یہاں تو قسطیں بھی ادا ہوچکی ہیں، تو وہ اس کا مالک ہوگیا۔

''وقال أصحابنا رحمهم الله: كل لفظين ينبئان عن التمليك والملك على صيغة الماضي أو الحال ينعقد بها البيع'' (الفتاوی الهنديه ۳/ ۴)۔

''تنتقل ملكية المبيع للمشتري بمجرد الإيجاب والقبول، ويصير له الحق المطلق في استعمال المبيع واستثماره والتصرف به كيفما يشاء له غنمه وعليه غرمه، أي له ثمراته وغلاته أو عوائده'' (قضايا الفقه والفكر المعاصر/ ۲۱۵)۔

اب دیکھئے کہ زیر بحث مسئلہ میں ملکیت بھی ثابت ہوچکی ہے، قسطیں بھی جمع ہوچکی ہیں، اور چونکہ بائع سے ہی بیچنے کی شرط بھی نہیں ہوتی ہے، اس لئے وہ ملکیت کے ساتھ ہر طرح کا تصرف کرسکتا ہے، ہاں اگر بائع ہی سے بیچنا شرط ہو یا ایسا عرف ہو جو شرط کے درجہ میں ہو کہ بغیر اس کے کہے بیچنا ممکن نہ ہو، یا اس زمین اور پلاٹ کا بیچنا مالک زمین کی اجازت پر یا کسی دوسرے شخص کی اجازت پر موقوف ہو تو پھر یہ معاملہ سرے سے جائز ہی نہ ہوا، چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

''ولو اشترى شيئًا ليبيعه من البائع، فالبيع فاسد'' (الفتاوی الهنديه ۳/ ۱۳۴)۔

''وإن اشترى على أن لا يبيع إلا بإذن فلان: أو اشترى دارًا على أن لا يهديها أو لا يبنيها إلا بإذن فلان فالبيع فاسد'' (الفتاوی الهنديه ۳/ ۱۳۵)۔

ان تمام نصوص فقہیہ سے ظاہر ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں اگر بیع وشراء مشروط ہو تو یہ بیع درست نہ ہوگی، اور اگر مشروط نہ ہو بلکہ عرفاً ہی ایسا ہو تو بھی درست نہیں، کیونکہ فقہاء کرام کا اصول ہے کہ جو بات عرف میں اس قدر معروف ہو کہ لوگ اسے فوراً سمجھ جاتے ہوں تو یہ شرط کے درجہ میں ہوتا ہے۔

''المعروف عرفًا كالمشروط شرعًا''۔ اور جب یہ بیع ہی صحیح نہ ہوئی تو ملکیت کجا دارد۔

۱۴۔ الجواب ومنه الصواب:

قسطوں پر معاملہ کرنا شریعت میں جائز ہے، بشرطیکہ قسطیں اور اجل متعین ہوں، اور قسطیں وقت پر ادا نہ کرسکنے کی صورت میں قیمت پر نہ اضافہ اور نہ ہی وصول شدہ رقم ضبط کی جائے۔

''البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح، ويلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتأجيل والتقسيط'' (شرح المجله: ماده: ۲۴۵)۔

''أما ما يفعله بعض الناس من تحديد ثمن البضاعة على أساس سعر النقد، وذكر القدر الزائد على أساس أنه جزء من

فوائد التأخير في الأداء، فإنه ربّما صراح'' (بحوث في قضايا فقهيه معاصره: ۱۰)۔

فقہاء کرام کی عبارتوں میں اس کا بھی ذکر ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز خریدے اور اس کے ثمن کو کچھ دیدیا اور کچھ باقی ہو تو بائع کو مبیع کے روک لینے کا حق ہے، حتی کہ تمام ثمن ادا نہ کرے۔

''ولو كان بعض الثمن حالًا وبعضه مؤجلًا فله حبسه حتى يستوفي الحال، ولو بقي من الثمن شئي قليل كان له حبس جميع المبيع'' (الفتاوى الهنديه ۳/ ۱۵)۔

مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہے کہ مبیع روکنے کا اور قبضہ نہ دینے کا حق اسی وقت تک جائز ہے تا آنکہ وہ بقیہ قسطیں جمع نہ کردے، لیکن پوری قسطیں ادا کرنے کے بعد مبیع روکنے کا حق نہیں ہے۔

لیکن اگر عقد کے وقت ہی یہ صراحت کردی گئی اور اگریمنٹ میں درج کردیا گیا کہ تاخیر کی صورت میں سودا کینسل ہوجائے گا اور جتنی رقم جمع کی گئی ہوگی اتنی ہی واپس کی جائے گی، تو اسے تاخیر کی صورت میں کینسل کا حق ہوگا، اور ادا شدہ رقم واپس کرنی ہوگی، لیکن اگر ایسا کوئی معاہدہ اگریمنٹ پیپر یا زبانی بات چیت میں نہیں تھا اور مشتری نے قسط کی ادائیگی میں تاخیر کی اور بلڈر نے خود سے سودے کو کینسل کردیا تو اس کا کینسل کرنا درست نہیں ہے، لیکن اگر اس کے باوجود کینسل کردیا تو اب اس زمین یا فلیٹ کی موجودہ قیمت کی شرط کے اعتبار سے اسے قیمت لوٹانا واجب ہوگا تاکہ نقصان سے محفوظ رہے، کیونکہ مشتری اس امید پر قسطیں جمع کرتا رہا تھا کہ اس کو فلیٹ یا زمین حاصل ہوگی اور ظاہر ہے کہ اس کو اس صورت میں صرف اپنی رقم حاصل ہورہی ہے، اور اس کا کوئی نفع نہیں مل رہا ہے، جبکہ اگر وہ زمین یا فلیٹ ضائع ہوجاتا تو اس کا نقصان اس کو بھی برداشت کرنا پڑتا، لہٰذا شریعت کے اصول کے پیش نظر حرج اور مشقت کو دور کیا جائے گا اور وہ موجودہ قیمت کی شرح کے اعتبار سے رقم لے گا۔

۱۵۔ الجواب وبالله التوفيق والسداد:

(الف):

فقہاء کرام نے دلال یا سمسار کی جو تعریف کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلال اصطلاح میں اسے کہتے ہیں جو بائع اور مشتری کے درمیان معاملہ طے کرائے اور بائع ومشتری دونوں کو ثمن معلوم ہو، اور دلال کو اس ثمن کے علاوہ اجرت ملتی ہو، یہ اجرت پانچ دس روپے کی صورت میں بھی متعین ہوسکتی ہے، اور فیصد کے اعتبار سے اس کی تعیین اس طور پر ہوسکتی ہے کہ ایک ہزار میں اتنا ہوگا، چنانچہ مبسوط سرخسی میں ہے:

''والسمسار اسم لمن يعمل للغير بالأجرة بيعًا وشراء'' (المبسوط للسرخسي ۱۵/ ۱۲۸، باب السمسار)۔

نیز مجمع الانہر کے حاشیہ پر ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے۔

''والسمسار المتوسط بين البائع والمشتري (يجبران عليه) لأنهما يعملان بأجرة عادة بلا استيجار'' (سكب الانهر على هامش مجمع الانهر ۳/ ۴۵۸)۔

مذکورہ بالا تعریف کے تناظر میں جب ہم زیر بحث مسئلہ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دلال فقہاء کی تعریف کی رو سے دلال ہے ہی نہیں، کیونکہ اس کی حیثیت تو صرف درمیانی شخص کی ہوتی ہے، اور وہ اصل بائع اور مشتری کے درمیان صرف معاملہ طے کرانے کی اجرت لیتا ہے، لیکن زیر بحث مسئلہ میں اس کی حیثیت نظر نہیں آتی، بلکہ وہ خود مالک زمین بن کر مشتری سے سارے مسائل طے کراتا ہے اور متعینہ قیمت مالک زمین کو دیدیتا ہے، جبکہ مبیع نہ ہی اس کی ملکیت ہے اور نہ ہی اس کا اس پر قبضہ ہے، اور ایسی دلالی شرعاً درست نہیں ہے، نیز اس میں دلالی کی اجرت بھی متعین نہیں ہے۔

اسی سلسلہ میں احسن الفتاوی کے ایک سوال وجواب سے بھی واضح روشنی پڑتی ہے، جس کا ذکر فائدہ سے خالی نہیں۔

سوال: زید نے بکر سے کہا کہ میں تمہاری بھینس عمر کے ہاتھ فروخت کرادیتا ہوں مگر اس شرط سے کہ مبلغ تین سو پچاس روپے تمہیں دوں گا اور اس سے زائد جتنا بھی وصول ہو وہ میں لے لوں گا، یعنی زید دلال ہے، بکر اس پر راضی ہوگیا، زید نے بکر کے سامنے ہی بھینس تین سو پچھتر روپے میں عمر کو فروخت کرکے تین سو پچاس بکر کو دیدئے اور پچیس روپے خود رکھ لیے، تو شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب باسم ملہم الصواب: یہ معاملہ ناجائز ہے، البتہ اگر دلالی کی رقم متعین ہو یا بھینس کی قیمت سے فیصد کے حساب سے دلالی متعین ہو، مثلاً بھینس جتنے بھی فروخت ہو اس سے میں سے پانچ فیصد دلال لے گا تو جائز ہے۔

(ب):

بیع وشراء کا مقصد شریعت اسلامی نے ثمن اور مبیع سے فائدہ اٹھانا بتایا ہے، اور فائدہ انسان اسی وقت اٹھا سکتا ہے جب اس کو ثمن یا مبیع میں پورا حق اور ہر طرح کا تصرف حاصل ہو، اس نقطۂ نظر سے جب ہم اس مسئلہ کو دیکھتے ہیں تو دو خرابیاں لازم آتی ہیں: ایک تو عدم قبضہ یعنی بائع مشتری کو اس کی ملکیت پر قبضہ ہی نہیں دیتا اور اس قبضہ میں قبضہ کی وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو فقہاء نے بیان کی ہیں۔

دوسری خرابی یہ لازم آتی ہے کہ مشتری جب اپنی مبیع کو کبھی بیچنا چاہے تو اسے بیچنے کا حق صرف بائع اول ہی سے ہوگا، اور یہ بات شرط کی حد تک لازم ہوتی ہے، اور جس کی بنا پر مشتری کو مکمل اور ہر طرح کا تصرف اپنی بیع میں حاصل نہیں ہوتا ہے، بایں وجوہات یہ مسئلہ شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، عدم قبضہ کی بابت شرح المجلہ میں ہے:

''إذا شرط البائع فی البیع عدم تسلیم المبیع للمشتری مدة شهر فالبیع فاسد'' (شرح مجلة الاحکام ۱/ ۱۶۳)۔

نیز مشتری بائع ہی سے مبیع بیچے گا تو یہ بیع فاسد ہوگی، اسی کے بارے میں ہندیہ میں یہ منقول ہے:

''ولو اشتری شیئًا لیبیعه من البائع، فالبیع فاسد'' (الفتاوی الهندیه ۳/ ۱۳۴)۔

اور شرح المجلہ میں ہے: ''لأن المقصود من البیع إنما هو التملیك والتملك خاصة: أی أن یكون المشتری مالكًا للمبیع والبائع مالكًا للثمن بلا مانع ولا مزاحم''۔

خلاصہ بحث:

(۱) جو زمین لینڈ گرابرس سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر قبضہ کرلیں اس زمین کا حکم غصب کی ہوئی زمین کا ہے، اسے بعینہ حکومت کو واپس کرنا ضروری ہے، لیکن اگر اس پر عمارت وغیرہ تعمیر کردی ہے، یا حکومت خود کچھ معاوضہ وغیرہ لے کر راضی ہوگئی ہے، یا قابضین نے اس کی قیمت ادا کردی ہے، تو اس صورت میں اس زمین کا بیچنا یا مکانات تعمیر کرنا، اور ایک دوسرے کا یکے بعد دیگرے بیع وشراء کا معاملہ درست ہوگا، لیکن اگر حکومت راضی نہیں ہوئی یا اس کی منظوری نہ ہوئی اور ضمان وغیرہ ادا نہ کیا تو یہ زمین مغصوبہ سمجھی جائے گی اور کسی طرح کا تصرف درست نہیں ہوگا۔

(۲) موقوفہ زمین قبضہ کرلینے سے قابض اس کا مالک نہیں ہوگا، لہذا نہ اس کی بیع وشراء درست ہے اور نہ ہی کسی اور طرح کا تصرف، لیکن اگر قابضین اپنی قوت کے بل پر موقوفہ زمین کو چھوڑنے کو تیار نہ ہوں، تو ان سے اس کی قیمت کا مطالبہ کیا جائے گا اگر دے دیں تو پھر یہ زمین ان کی ملکیت ہوجائے گی، اور پھر اسکی بیع وشراء بھی درست ہوگی، ورنہ نہیں۔

(۳) اگر کسی نے ایسی زمین خریدی جس کی تقسیم نہیں ہوئی تھی، یعنی دوسرے مستحقین کو ان کے حصہ نہیں دیئے گئے، لیکن بائع نے اپنا بتا کر بیچا، اور مشتری کو اس کا علم نہیں تھا، یا مطلقاً بیع وشراء ہوگئی اور کوئی استفسار نہ ہوا، تو یہ بیع وشراء موقوف ہوگی اور دیگر ورثاء کی رضامندی تک نفاذ کا حکم نہیں لگایا جائے گا، لیکن اگر بائع نے بتادیا کہ اس میں دوسروں کا بھی حق ہے اور مشتری کو معلوم ہوگیا تو یہ بیع وشراء درست نہیں ہوگی۔

(۴) اگر مال حرام سے خریدی گئی اور حرام مال ہی اس کی خریداری میں صرف کیا اور وہ اقرار کرتا ہے، اور مشتری کو معلوم بھی ہے تو اس زمین کا خریدنا درست نہیں، لیکن اگر بائع نے بتایا نہیں، اور مشتری کو معتبر ذرائع سے خبر بھی نہ ہوئی تو خریدنا درست ہے۔

(۵) حکومت نے جو لے آوٹ پاس کیا ہے اور اس میں پلے گراؤنڈ وغیرہ بنائے ہیں، اگر وہ ضرورت سے زائد ہیں یا ضرورت سے زائد جگہ اس میں صرف کی گئی ہے حالانکہ اس سے کم میں بھی کام چل سکتا تھا، تو بقدر ضرورت باقی رکھ کر باقی حصہ کو بیچنا جائز ہوگا، لیکن اگر بقدر حاجت ہی راستہ، پلے گراؤنڈ، سوئمنگ پول وغیرہ چھوڑا گیا ہے، تو پھر نہ ان کا بیچنا جائز ہے اور نہ ہی جان بوجھ کر خریدنا۔

(۶) مسلمانوں کے لئے مسجد کی تعمیر حاجت اور ضرورت کا درجہ رکھتی ہے، اس لئے کالونی بنانے والوں کو خود اس کے لئے زمین چھوڑنا چاہئے، لیکن اگر نہیں چھوڑا ہے اور کالونی میں صرف مسلمانوں کی ہی آبادی ہے، اور وہ مسجد کی تعمیر کے لئے راضی ہیں، تو عوامی مفادات سے متعلقہ زمین میں مسجد بنائی جاسکتی ہے، اور اگر ہمیشگی کی نیت کی گئی تو یہ مسجد شرعی ہوگی، لیکن اگر اس میں غیر مسلم باشندے بھی ہوں، یا حکومت کی جانب سے سخت کارروائی کا اندیشہ ہو کہ جان و آبرو کا خطرہ ہو تو ایسی جگہ میں مسجد کی تعمیر درست نہیں ہے۔

(۷) اس میں شک نہیں سرکاری کارروائی کرنے میں اور کالونی کے تمام قوانین کو برتنے میں بڑی مشقت اور زمین کی گرانی ہے، اور نہ کرنے میں حکومت کی قانون شکنی کا ارتکاب ہے، لہذا اگر تجرباتی طور پر حکومت غیر قانونی کالونیوں سے کم چھیڑ چھاڑ کرتی ہو اور کچھ معاوضہ لے کر راضی ہو جاتی ہو اور جانی و مالی نقصان کا قوی اندیشہ نہ ہو تو قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر کالونی بنانا اور پلاٹ فروخت کرنا درست ہوگا ورنہ نہیں۔

(۸) اگر کوئی شخص واقعی ضرورت مند ہو، اور خود سے کوئی مکان خریدنے پر قادر نہ ہو تو اس طرح کے مکانات، قسط وار خریدنے کی گنجائش ہے، لیکن صرف زندگی کو بہتر بنانے اور رہائش میں تعیش مقصود ہو تو اس طرح لون لے کر معاملہ کرنا درست نہیں ہے۔

(۹) اگر پلاٹ کی مقدار معلوم ہو اور اس بات کی وضاحت ہو کہ کتنی فٹ لمبی اور کتنی فٹ چوڑی ہے، اور بائع مشتری کے مطالبہ پر اتنی زمین دینے پر قادر ہو تو اس سے مبیع متعین ہو جائے گی، اور خرید و فروخت کا معاملہ بھی درست ہو جائے گا۔

(۱۰) اس صورت میں زمین یا پلاٹ ملکیت میں آجائے گا، البتہ قبضہ نہیں پایا جائے گا، اور غیر منقول اشیاء کی بیع قبضہ سے پہلے درست ہے، اس لئے خرید و فروخت کر سکتے ہیں۔

(۱۱) الف: اگر عرف ہو اور معاملہ مفضی الی النزاع نہ ہو تو صرف کاغذی نقشہ کی بنا پر بھی خرید و فروخت درست ہے۔

(ب) یہ صورت درست معلوم نہیں ہوتی، اور بیع و شراء کا معاملہ درست نہیں ہوگا۔

(۱۲) یہ فاصلہ کسی بھی طریقے سے درست نہیں ہے اور اس کی تمام انواع بیع و شراء غیر درست ہے۔

(۱۳) اگر اصل مالک سے خریداری کے وقت اسی سے بیچنے کی شرط ہو تو پہلی بیع ہی درست نہیں ہے اور اس طرح اس کی ملکیت ثابت نہ ہوگی، لیکن اگر شرط نہ ہو بلکہ اسے خود دوسرے سے بیچنے کا اختیار کلی ہو تو پہلی بیع درست ہوگی، اور ملکیت بھی ثابت ہوگی اور دوسروں سے بھی بیچ سکتا ہے۔

(۱۴) اگر اگریمنٹ ہوتے وقت ہی تاخیر کی صورت میں صرف اصل رقم کی ادائیگی کا وعدہ تھا تو صرف اصل رقم واپس کرے، ورنہ زمین یا بلڈنگ کی موجودہ قیمت کی شرح کے اعتبار سے رقم واپس کرے۔

(۱۵) (الف) یہ صورت درست نہیں ہے۔

(ب) یہ معاملہ بھی درست نہیں ہے۔

☆☆☆



موجودہ اراضی کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل

مفتی عباد اللہ قاسمی مظفر پوری[1]

ناجائز طور پر قبضہ کی ہوئی سرکاری اراضی کی خرید فروخت:

جواب ا: مجموعی اعتبار سے زمینیں دو طرح کی ہوتی ہیں:

(الف) اراضی مملوکہ: وہ زمینیں جو خاص افراد واشخاص کی ملکیت اور تحویل میں ہوں۔

(ب) اراضی غیر مملوکہ: وہ زمینیں جو خاص افراد واشخاص کی ملکیت اور تحویل میں نہ ہوں، جسے فقہ کی اصطلاح میں ''ارض مباحہ'' کہتے ہیں، چنانچہ علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ''فالأراضی فی الأصل نوعان: أرض مملوکة، وأرض مباحة غیر مملوکة'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۸۱)۔

پھر اراضی غیر مملوکہ کی دو قسمیں ہیں:

(الف) اراضی بلدیہ: یعنی شہر سے متصل زمینیں جو بستی کی ضرورت عامہ (گلی، کوچے، سڑک، قبرستان، عیدگاہ، چراگاہ اور میدان وغیرہ) میں استعمال ہو رہی ہوں۔

(ب) اراضی موات: یعنی شہر سے دور یا قریب کی وہ غیر آباد اور نا قابل کاشت زمینیں جو ضروریات عامہ میں استعمال نہ ہو رہی ہوں۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: ''نوع هو من مرافق البلدة محتطبا لهم و مرعی لمواشیهم، ونوع لیس من مرافقها وهو المسمی بالموات'' (بدائع الصنائع ۵/ ۲۸۱)۔

ضرورت عامہ میں مستعمل زمین پر کسی صورت میں کبھی بھی کسی کو مالکانہ قبضہ اور تصرف کا حق حاصل نہیں ہوگا، نہ حاکم وقت خود اس کا مالک بن سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو بنا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو جاگیر کے طور پر دے سکتا ہے، بلکہ وہ شہر کی ضرورت عامہ کیلئے اراضی موقوفہ کی طرح محفوظ رکھی جائے گی (بدائع الصنائع، کتاب الاراضی: ۲۸۳)۔

البتہ غیر آباد اور نا قابل کاشت زمین ''ارض موات'' پر حاکم وقت سے اجازت لینے کی صورت میں مالکانہ قبضہ اور تصرف جائز ہوگا، آباد کرنے والا خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مستحق ہو یا غیر مستحق، عدم اجازت کی صورت میں اس پر مالکانہ قبضہ اور تصرف جائز نہیں ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من أحیا أرضا میتة فهی له، ولیس لعرق ظالم'' (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۳۰۷۳)۔

اسی طریقے سے امام زہری، سالم سے اور وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں:

''کان الناس یتحجرون علی عهد عمر، فقال: من أحیٰ أرضًا فهی له'' (مصنف ابن ابی شیبہ: رقم الحدیث، ۲۲۳۴۹)۔

چنانچہ نصوص مذکورہ کی روشنی میں علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں: ''فالملك فی الموات یثبت بالإحیاء بإذن المالك عند أبی حنیفة وعند أبی یوسف ومحمد رحمهم الله یثبت بنفس إحیاء وإذن الإمام لیس بشرط'' (بدائع الصنائع، کتاب الاراضی: ۵/ ۲۸۳، ط: دارالکتاب دیوبند، قاضی خان علی ہامش الهندیہ ۲/ ۲۱۹)۔

مذکورہ نصوص سے یہ بات واضح ہوگئی کہ غیر مملوکہ اراضی کا کوئی شخص حاکم کی اجازت سے مالک بن سکتا ہے، مگر ضرورت عامہ میں استعمال کی جاری زمین کا کسی صورت میں کوئی شخص کبھی بھی مالک نہیں بن سکتا۔

---

[1] استاذ حدیث وفقہ: جامعہ ضیاء العلوم کنڈلو کرناٹکا اڈپی۔

لہٰذا اگر قبضہ ناجائز طریقہ پر ہوا ہو تو پھر اسے آگے بیچنا اور خریدنا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ زمین شرعی اعتبار سے بائع کی ملکیت میں نہیں ہوگی، اور غیر مملوکہ شئی کو بیچنا اور مشتری کیلئے بصورت علم اس کا خریدنا دونوں ہی ناجائز ہوگا، چنانچہ خرید و فروخت کے سلسلے میں حضرات فقہاء نے جو شرطیں ذکر کی ہیں، ان میں مملوکہ ہونے کی قید بالکل واضح ہے (رد المحتار علی الدر المختار: ۷/ ۴، کتاب البیع) کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے: ''لا تبع مالیس عندک'' (سنن ابوداؤد: حدیث نمبر: ۳۵۰۳، سنن نسائی: حدیث نمبر: ۴۶۱۳) (جو چیز تمہاری ملکیت میں نہ ہو اسے مت بیچو)۔

اور قبضہ قانونی اعتبار سے جائز ہو تو جہاں تک قابضین اور خریدار سے خریدنے کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ اگر زمین انہیں (قابضین) کے قبضہ میں ہے تو براہ راست انہیں سے خریدنا ضروری ہوگا؛ لیکن اگر وہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کر چکے ہوں، تو مذکورہ شرطوں کا خیال رکھتے ہوئے خریدے ہوئے شخص سے خریدنا اور فروخت کرنا ضروری ہوگا، کیوں کہ جب اس نے اسے فروخت کر دیا تو اب اس سے اس کی ملکیت بھی ختم ہو چکی، لہٰذا فی الوقت جس کے قبضہ میں ہے اب اسی کی ملکیت ہے؛ لہٰذا اسی سے اس کا خریدنا ضروری ہوگا؛ کیوں کہ اب براہ راست قابضین کی حیثیت بیچی جانے والی شئی کے ساتھ ایک اجنبی کی ہوگئی؛ اگر اس کیلئے ملکیت کو مانیں گے تو ایسی صورت میں بیک وقت ایک شئی کا دو شخص کو مالک قرار دینا لازم آئے گا جو کہ درست نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

غصب کی ہوئی زمین کی مطلقاً خرید و فروخت:

"ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل فتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون" (سورة البقرة: ۱۸۸)

(اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ، اور ان کو حکام کے پاس اس غرض سے مت لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے طریقے پر کھاؤ، جب کہ تمہیں علم بھی ہو)، لوگوں کی جائز ملکیت کے احترام کی تاکید اور اس پر دست درازی کی مذمت قرآن نے اور بھی کئی آیتوں میں فرمائی ہے، مثلاً ملاحظہ ہو، سورۃ النساء ۲۹ : ۳۰، والتوبہ : ۳۴، سورۃ الانعام: ۱۵۲، و بنی اسرئیل: ۳۴۔

''كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه'' (مسند احمد، رقم الحديث: ۲۳۶۰۶)
(مسلمان مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی)۔

''من أخذ من الأرض شيئا بغير حقه خسف به يوم القيامة إلى سبعة أرضين'' (صحيح البخاری، باب اثم من ظلم شيئا من الارض: رقم الحديث: ۲۴۵۴) (جو شخص زمین کا کوئی بھی حصہ ناحق لے لے، اسے قیامت کے دن سات زمینوں تک دھنسایا جائے گا)۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حلال و حرام (اشیاء) واضح ہیں اور ان دونوں (حلال و حرام) کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں، جن کی حقیقت سے اکثر لوگ ناواقف ہیں؛ لہٰذا جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ گیا، اس نے اپنا دین اور اپنی عزت و آبرو کو بچالیا، اور جو شخص اس میں مبتلاء ہوا وہ حرام میں مبتلاء ہو گیا''

(ترمذی، باب ماجاء فی ترک الشبہات، حدیث نمبر: ۱۲۰۵، صحیح البخاری: باب الحلال بین والحرام بین وبینہما مشبہات، حدیث نمبر: ۲۰۵۱)۔

ذکر کردہ نصوص سے خرید و فروخت کے سلسلے میں شریعت مطہرہ کا اصول معلوم ہوا کہ بیچنے والا شخص اپنی مملوکہ شئی کے فروخت کرنے کا مجاز ہے، اشیاء غیر مملوکہ کا نہیں؛ لہٰذا اس کا بیچنا اور علم کی صورت میں اس کا خریدنا بھی جائز نہیں ہوگا؛ بلکہ اسے مالک کے پاس پہنچانا ضروری ہوگا۔

اوقاف کی مغصوبہ زمینوں کی خرید و فروخت:

جواب: ۲ اشیاء موقوفہ سے واقف کا مقصد دائمی ثواب حاصل کرنا اور عمومی جہت وقف کی صورت میں عوام الناس کو دائمی فائدہ پہنچانا ہوتا ہے؛ اس لئے وقف کے بعد اگر ''واقف'' یا ''منتظم اوقاف'' ان میں سے کوئی ایسا تصرف کرنا چاہیں جس سے وقف کا یہ مقصد فوت ہو جائے تو اس کی اجازت نہیں ہوگی؛ کیوں کہ واقف اب اس کا مالک نہیں رہا، جب مالک نہیں رہا تو پھر اسے ملکیت غیر میں تصرف کا حق کیوں کر ہوگا؟

''وبيع ملك الغير لا يجوز'' (ردالمحتار، کتاب الوقف: ۶/ ۹۹۵)، اس لئے واقفین ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے وقف کی ہوئی اشیاء اپنی ملکیت میں لوٹانا چاہیں یا منتظمین اوقاف ان کی عدم موجودگی میں ان کے وارثین کی طرف لوٹانا چاہیں، یا وقف کے علاوہ کسی اور مصرف میں استعمال کرنا چاہیں جس سے وقف کی گئی زمین کا مقصد فوت ہو جائے، یا اس کی جہت تبدیل ہو جائے تو اس کی اجازت انہیں نہیں ہوگی اور یہ ایک قبیح عمل ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے؛

چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: فمن بدله بعد ما سمعه فإنما إثمه على الذين يبدلونه إن الله سميع عليم (سورہ بقرہ: ۱۸۱) (پھر کوئی شخص وصیت سننے کے بعد اس کو بدل ڈالے تو بدلنے والے کو اس کا گناہ ہوگا، بے شک اللہ تعالی سننے والے اور جاننے والے ہیں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ وقف کی ہوئی اشیاء کا بیچنا یا ہبہ کرنا جائز نہیں ہے، حضرت ابن عمر کی روایت ہے:

''عن ابن عمر قال: أصاب عمر أرضا بخيبر، فأتى النبي ﷺ يستأمره فيها، فقال يا رسول الله! إني أصبت أرضا بخيبر لم أصب مالا قط هو أنفس عندي منه فما تأمرني به قال إن شئت حبست أصلها وتصدقت بها قال فتصدق بها عمر أنه لا يباع أصلها ولا يبتاع ولا يورث ولا يوهب قال فصدق عمر في الفقراء وفي القربى وفي الرقاب وفي سبيل الله وابن السبيل والضيف لاجناح على من وليها أن ياكل منها بالمعروف أويطعم صديقا غير متمول فيه'' (صحيح المسلم، باب الوقف حديث نمبر: ۱۶۳۲)۔

مذکورہ حدیث کی تشریح میں ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: ''إن الوقف لايجوز بيعه ولاهبته ولايرث ميراثا لأنه صار لله تعالى وخرج عن ملك الواقف'' (عمدة القارى، باب الشروط فى الوقف: ۱۴/ ۲۴)۔

نیز وقف کی ہوئی اشیاء ''تملیک'' اور ''تملک'' کو قبول نہیں کرتی، یعنی واقف یا منتظم کسی کو اس کا مالک بنا سکتا ہے اور نہ ہی خود اس کا مالک بن سکتا ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ حدیث مذکورہ کے ذیل میں لکھتے ہیں: ''ثم استدل بالمعنى وهو قوله ولأن الحاجة ماسة إلى أن يصل ثوابه إليه على الدوام'' (فتح القدير، كتاب الوقف: ۶/ ۲۹۲)۔

علامہ ابن ہمامؒ نے اس پر فقہاء کا اجماع لکھا ہے:

''قوله: (إذا صح الوقف) أى لزم، وهٰذا يؤيد ما قدمناه فى قول القدورى إذا صح الوقف خرج عن ملك (الواقف) قوله: (لم يجز بيعه وتمليكه) هو بإجماع الفقهاء'' (فتح القدير ۷/ ۲۰۴، ط: دار الكتب العلمية)۔

لیکن! اگر وقف کی ہوئی اشیاء کی منفعت ختم ہو جائے یا جس مقصد کے لئے اشیاء وقف کی گئی تھی وہاں اس کی ضرورت نہ ہو تو قاضی یا ''منتظم اوقاف'' کو اس کی درستگی اور اصلاح کے پیش نظر تبدیلی کی گنجائش ہوگی؛ بشرطیکہ اسے اسی مصرف میں استعمال کیا جائے جس کیلئے واقف نے اسے وقف کیا تھا اور وقف کی جہت تبدیل نہ ہو؛ چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "فمن خاف من موص جنفا أو إثما فأصلح بينهم فلا إثم عليه إن الله غفور رحيم" (البقرہ: ۱۸۲) (البتہ جس شخص کو وصیت کرنے والے سے غلطی یا گناہ کا اندیشہ ہو اور وہ ان کے درمیان صلح کرا دے تو اس پر کچھ گناہ نہیں)..... لیکن اگر مسجد کے نام وقف کی گئی ہو تو پھر اس میں تبدیلی کی قطعی طور پر اجازت نہیں ہوگی، خواہ اس میں نماز ہوتی ہو یا نہیں، ائمہ ثلاثہ کا مسلک یہی ہے؛ چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں:

''قوله: (لوخرب ماحول المسجد واستغنى عنه) أى استغنى عن الصلاة فيه أهل تلك المحلة أوالقرية بأن كان فى قرية فخربت وحولت مزارع يبقى مسجدا على حاله عند أبي يوسف، وهو قول أبي حنيفة ومالك والشافعى'' (فتح القدير، كتاب الوقف: ۶/ ۲۱۹، ط: دار الكتب العلمية بيروت لبنان)۔

علامہ شامیؒ رقمطراز ہیں: ''لايجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أولا هو الفتوى... لأن المسجد لايخرج عن المسجد أبدا'' (ردالمحتار: ۶/ ۵۴۸، ط: دار الكتب العلمية بيروت لبنان)۔

مذکورہ نصوص اور کتب فقہ کی عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خرید وفروخت کیلئے مبیع پر بائع کی ملکیت کا ہونا ضروری ہے، ملکیت غیر کو بیچنا شرعا حرام اور ممنوع ہے، ظاہر ہے کہ جب اوقاف کی زمین کا بیچنے والا شخص مالک نہیں ہے تو پھر اس کیلئے اوقاف کی اراضی کا بیچنا اور دوسرے کے لئے بصورت علم اس کا خریدنا بھی جائز نہیں ہوگا۔

اگر کسی نے اوقاف کی زمین خرید ہی لی تو اس پر ملکیت ثابت نہیں ہوگی، کیوں کہ اوقاف کی بیع کو فقہاء نے باطل قرار دیا ہے، فاسد نہیں، لہذا اس پر قبضہ اور تصرف بھی درست نہیں ہوگا، کیوں کہ فاسد میں تو قبضے کی صورت میں خریدار کے لیے ملکیت تصرف حاصل ہو جاتی ہے، لیکن باطل میں ملکیت تصرف حاصل نہیں ہوتی؛ لہٰذا بیع کر بھی لیا ہو تو اس پر اس کا اثر شرعی مرتب نہیں ہوگا۔

"حكم الفاسد أنه لا يفيد الملك بالقبض والباطل لا يفيد أصلا" (ردالمحتار، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد: ۷/ ۲۲۳)۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شرعی تقسیم سے پہلے موروثی زمین کی خرید وفروخت:

جواب ۳: وراثت کی شرعی تقسیم عمل میں آنے سے پہلے گھر کے کسی فرد کا مورث کے چھوڑے ہوئے مال کو فروخت کرنا درست نہیں ہے، حضرت سعید ابن المسیبؒ سے روایت ہے، قبیلہ انصار کے دو بھائیوں کے درمیان میراث تھی، ان میں سے ایک نے اپنے بھائی سے وراثت کی تقسیم سے متعلق سوال (گفتگو) کیا، اس کے بھائی نے کہا: اگر تم نے اس معاملہ میں مجھ سے دوبارہ گفتگو کی تو میرا تمام مال رتاج الکعبہ کیلئے ہے، یعنی جس کا میں مالک ہوں کعبہ کی اصلاح ومرمت اور زیب وزینت کیلئے نذر مانتا ہوں، حضرت عمرؓ نے اس سے کہا: کعبہ تیرے مال سے بے نیاز ہے، اپنے قسم کا کفارہ ادا کرو اور اپنے بھائی سے بات (وراثت سے متعلق) کرو: اس لئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا ہے، تجھ پر قسم نہیں ہے، یعنی اس قسم کا پورا کرنا تم پر ضرور نہیں ہے، اور رب کی نافرمانی، قطع رحمی اور غیر کی ملکیت میں نذر نہیں ہے (ابوداؤد: باب اليمين في قطيعة الرحم، رقم الحديث: ۳۲۷۲)، اس حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وراثت کی شرعی تقسیم سے پہلے کسی بھی قسم کا تصرف کرنا صحیح نہیں ہے، خواہ وہ عبادات کے قبیل سے ہی کیوں نہ ہو؛ کیوں کہ صاحب حق کو حق عطاء کرنا فرض ہے اور فرض درجہ اور مقام میں نذر سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔

لہذا وراثت کی شرعی تقسیم سے پہلے عمل مباح (بیع) کی بھی اجازت نہیں ہوگی، اور علم کی صورت میں مشتری کا اس کا خریدنا بھی جائز نہیں ہوگا، لہٰذا مورث اعلی کے مال متروکہ میں اگر باپ یا دادا نے اپنی بہنوں کو یا ان کے علاوہ کسی بھی مستحقین وراثت کو ان کا حق نہ دیا ہو تو ان کی اولاد کو چاہئے کہ وہ مستحقین وراثت تک میراث پہنچائیں، اگر صاحب حق کا علم ہو تو ان تک یا ان کے وارثین تک پہنچادیں، علم نہ ہو یا کوئی ہو ہی نہ تو اس کو صدقہ کردیں اپنی ذات میں استعمال نہ کریں ؛ہندیہ میں ہے:

"إذا مات الرجل وكسبه خبيث فالأولى لورثته أن يردوا المال إلى أربابه فإن لم يعرفوا تصدقوا به وإن كان كسبه من حيث لا يحل، وابنه يعلم ذلك ومات الأب ولا يعلم الابن ذلك بعينه فهو حلال له في الشرع والورع أن يتصدق به بعينه خصماء أبيه كذا في الينابيع" (ہندیہ، نیز دیکھئے ردالمحتار، کتاب الحضر والاباحة، فصل فی البیع: ۹/ ۵۵۳)۔

ذکر کردہ عبارت سے یہ مسئلہ واضح ہوگیا کہ اگر کسی کے پاس خود کی محنت سے کمایا ہوا مال نہ ہو اور نہ ہی کسی جائز طریقے سے ملکیت میں آیا ہو تو شریعت مطہرہ کا اصول یہ کہ ایسے مال کو مالک کے پاس پہنچانا ضروری ہے، اس مال کو ذاتی مصرف میں استعمال کرنا حرام ہے؛ لہٰذا مالک زمین کی اجازت سے قبل معلوم ہونے کی صورت میں اس کی خرید وفروخت دونوں حرام ہوگی۔

حرام مال سے حاصل کی ہوئی زمین کی خریداری:

جواب ۴: اللہ تعالی نے انسان کو پاکیزہ اور حلال رزق کمانے اور کھانے کا حکم دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"يأيها الذين آمنوا كلوا من طيبات مارزقنا كم وماظلمونا ولكن كانوا أنفسهم يظلمون"

اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "حلال کمائی کا طلب کرنا فریضے کے بعد ایک فرض ہے" (بیہقی فی شعب الایمان: حدیث نمبر: ۱۱۶۹۵) اور دھوکہ اور فریب سے کمایا ہوا مال انسان کیلئے حلال نہیں ہے، تو اس کا کھانا یا بیچنا اس کیلئے کہاں سے جائز ہوجائے گا؟

اللہ تعالی نے جس طریقے سے پاکیزہ اور حلال رزق کمانے کا حکم دیا ہے، اسی طریقے سے حرام اور مشتبہ اشیاء سے بچنے کا بھی حکم دیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: "الحلال بين والحرام بين وبنيهما مشتبهات" یعنی حلال کو اختیار کرنا اور حرام ومشتبہ چیزوں سے بچنا ایک صاحب ایمان کیلئے ضروری ہے، حدیث میں صرف مشتبہ ہونے کی بنیاد پر بچنے کا حکم دیا ہے تو یقین کی صورت میں اس کی اجازت کہاں سے ہوگی؟ یعنی خریدار کو جب بائع کے احوال کا یقینی علم ہے کہ بیچنے والا شخص مال حرام سے زمین حاصل کئے ہوا ہے تو پھر ایسے شخص سے زمین کی یا کسی دوسری اشیاء کی خریداری سے احتیاط کرنا چاہئے؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مشتبہ میں مبتلا ہوگیا وہ حرام میں مبتلا ہوگیا، یہاں تو یقین ہے تو اس کیلئے خریدنے کی اجازت نہیں ہوگی، حرام شئ ہر جگہ حرام رہتی

ہے، انتقال ملکیت کی بنیاد پر وہ حلال نہیں ہوگی؛ بلکہ حرام رہے گی، چنانچہ علامہ علاء الدین حصکفیؒ لکھتے ہیں:

''الحرام ينتقل فلودخل بأمان وأخذ مال حربي بلارضاه وأجره إلينا ملكه. وصح بيعه لكن لايطيب له، ولا للمشترى منه، قوله:(الحرام) أي تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاك. ويأتى تمامه قريبا، قوله: (ولاللمشترى منه) فيكون بشرائه منه مسيئا؛ لأنه ملك خبيث. وفي شرائه تقرير للخبث'' (ردالمحتار على الدرالمختار شرح تنوير الابصار ۵/ ۹۸)۔

علامہ عمرانی شافعی لکھتے ہیں: ''ولايجوز مبايعة من يعلم أن جميع ماله حرام لماروى أبومسعود البدرى أن النبى ﷺ نهى عن مهرالبغي وحلوان الكاهن۔

والبغي الزانية، قال الله تعالى: يا اخت هارون ماكان أبوك امرأسوء وماكانت أمك بغيا۔

''واما حلوان الكاهن فهومايعطى الكاهن ويجعل له رشوة على كهانته يقال منه حلوت الرجل أحلوه حلوانا إذا حبوته بشي'' (البيان فى فقه الامام الشافعي، كتاب البيوع:۵/ ۱۰۹تا۱۱۰، ط:دارالكتب العلمية)۔

سرکار کی طرف منظور شدہ نقشہ میں ترمیم:

جواب ۵، ۶: عموماً بڑے بڑے شہروں میں مکانات کی تعمیرات کے موقع پر حکومت سے نقشہ منظور کرانا ضروری ہوتا ہے، اس سے قبل مکانات کی تعمیر کی اجازت نہیں ہوتی اور لوگ عموماً اس کا خیال بھی رکھتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے منظور شدہ نقشہ میں صاحب زمین کچھ ترمیم کرنا چاہیں، تو کیا انھیں اس کی اجازت ہوگی؟

صاحب زمین کی حیثیت پر غور کرنے سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں:

(الف) صاحب زمین بحیثیت مالک۔ (ب) صاحب زمین بحیثیت معاہد۔

مالکانہ حیثیت ترمیم کا تقاضا کرتی ہے، مالک زمین کو اپنی زمین میں تصرف کرنے کا کلی اختیار ہوتا ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسے حکومت سے منظور شدہ نقشہ میں تصرف کرنے کا اختیار ہونا چاہئے؛ چنانچہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''حكم الملك وولاية التصرف للمالك فى المملوك باختياره ليس لأحد ولاية الجبر عليه إلا لضرورة ولا لأحد ولاية المنع عنه وإن كان يتضرر به إلا إذا تعلق به حق الغير فيمنع عن التصرف من غير رضا صاحب الحق وغير المالك لايكون له التصرف فى ملكه من غير إذنه ورضاه إلا لضرورة وكذلك حكم الحق الثابت فى المحل'' (بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع :كتاب الدعوى:۵/ ۲۹۴، ط:دارالكتاب ديوبند)۔

معاہدانہ حیثیت عدم ترمیم کا تقاضا کرتی ہے، معاہدے کا پاس ولحاظ رکھنا ایک مسلمان کیلئے ضروری ہے، محض نفع کی زیادتی کی خاطر اپنے کئے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کرنا درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا أوفوا بالعقود" (سورہ مائدہ)، ایک جگہ ارشاد فرمایا: ''جب تم آپس میں عہد کر چکے ہو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور پختہ قسمیں کھانے کے بعد انھیں توڑ نہ ڈالو؛ حالاں کہ تم اپنے آپ پر اللہ کو گواہ بنا چکے ہو، بے شک اللہ تمہارے کاموں سے واقف ہے'' (سورہ نحل:۹۱)۔

علامہ رازیؒ رقمطراز ہیں:

''الثانية :أن المراد منه كل عهد يلتزمه الإنسان لاختياره، قال ابن عباسؓ والوعد من العهد وقال ميمون ابن مهران من عاهدته فبعهده مسلما كان أوكافرا فإنما العهد لله تعالى'' (سورة نحل : ۱۶، جلد:۲۰/ ۲۶۲)۔

غرض حکومت سے کئے معاہدے کی خلاف ورزی درست نہیں ہے؛ گو کہ وہ زمین کا مالک ہی کیوں نہ ہو، لہذا جب صاحب زمین نے حکومت سے معاہدہ کرلیا ہے، تو اب معاہدے کی تکمیل اس پر واجب ہوگی، حکومت کی طرف سے منظور شدہ نقشہ میں اسے ترمیم کی گنجائش نہیں ہوگی؛ کیوں کہ منظور شدہ نقشہ میں

ترمیم کی صورت میں خریدار کے ساتھ دھوکا اور فریب ہوگا، وہ اس طور پر کہ جس وقت خریدار نے زمین خریدی تھی نقشہ میں، پلے گراؤنڈ اور راستے کی چوڑائی، لمبائی کا ذکر تھا؛ لیکن بائع خریدار کی کثرت کو دیکھتے ہوئے محض نفع کی زیادتی کی خاطر اب ان جگہوں میں ترمیم کرنا چاہے، تو انہیں اس کی اجازت نہیں ہوگی؛ کیوں کہ زمین کی خریداری کا سبب بسا اوقات یہی چیزیں ہوتی ہیں، بصورت ترمیم صرف حکومت ہی کے ساتھ دھوکا اور فریب نہیں ہے؛ بلکہ خریدار فریق کے ساتھ بھی دھوکا اور فریب ہے، جس کی شریعت میں سخت مذمت آئی ہے۔

نقشہ میں مسجد کی جگہ مقرر نہیں تھی؛ لیکن زمین بیچنے والے نے مسلمانوں کو لبھانے کی خاطر گارڈن کی جگہ ختم کر کے مسجد کی جگہ مقرر کردی تو اس کا بھی یہی حکم ہوگا، یعنی اس پر مسجد بنانا درست نہیں ہوگا؛ اگر بنادی گئی تو اس پر مسجد شرعی کا حکم نافذ نہیں ہوگا؛ کیوں کہ قیام مسجد کیلئے ضروری ہے کہ اس کا قیام اخلاص پر ہو، عہد شکنی، وعدہ خلافی اور ضرر رسانی پر مبنی نہ ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "لا تقم فيه أبدا لمسجد أسس على التقوى من أول يوم أحق أن تقوم فيه، فيه رجال يحبون أن يتطهروا والله يحب المطهرين" (سورۂ توبہ: ۱۰۸)

حکومتی تقاضا سے پہلے کالونی بنا کر زمین فروخت کرنا:

جواب ۷: نظام حکومت کے غیر مستحکم ہونے کی وجہ سے قانونی تقاضوں کی تکمیل میں اخراجات کی اتنی طویل فہرست ہوجاتی ہے جس کی صاحب زمین اور خریدار میں برداشت کی طاقت نہیں ہوتی؛ اس لئے بسا اوقات ایسا کرنا صاحب زمین کی مجبوری ہوتی ہے؛ اگر حکومتی تقاضوں کی تکمیل کو لازم قرار دیا جائے، تو متوسط طبقہ کے لوگوں کیلئے مہنگائی کے سبب رہائشی مکانات کی تعمیر کیلئے زمین کی خریداری بہت مشکل ہوجائے گی، جبکہ کہ یہ عوام الناس کی سخت ضرورت ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس پس منظر میں اگر ہم اس مسئلہ پر غور کریں تو خیال ہوتا ہے کہ قانونی تقاضوں کی تکمیل کے بغیر انہیں زمین فروخت کرنے کی اجازت ہونی چاہئے، حسب ذیل قواعد سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

"القاعدة: الضرر الأشد يزال بالضرر الأخف، الألفاظ الأخرى يختار أهون الشرين أو أخف الضررين يدفع أعظم الضررين باحتمال أخفهما، إذا اجتمع الضرر ان أسقط الأصغر الأكبر يدفع شر الشرين" (القوعد الفقهية ۱/ ۲۱۹)

"أن من ابتلى ببليتين وهم متساويتان يأخذ بأيتهما شاء وإن اختلفتا يختار أهونهما لأن مباشرة الحرام لا تجوز إلا للضرروة ولا ضرورة في حق الزيادة" (الوجيز في ايضاح القوعد الفقه الكلية ۱/ ۲۶۰)۔

انکم ٹیکس سے بچنے کی خاطر لون لینا:

جواب ۸: حکومت مختلف چیزوں (زمین، مکان، سڑک، اور روپیہ کی خاص مقدار) پر "ٹیکس" لاگو کرتی ہے جس کا بنیادی مقصد حکومتی اخراجات کی بھرپائی ہوتی ہے، کیوں کہ حکومتی اخراجات، بہت ہی زیادہ ہوتے ہیں؛ اگر حکومت ٹیکس لینا چھوڑ دے تو پھر حکومت کی طرف سے عوام کو مختلف قسم کی جو مراعات اور سہولتیں (غریب اور مفلوک الحال کیلئے رہائشی مکانات کی تعمیر، عمر کی ایک خاص دہلیز پر پہنچنے پر وظیفہ کا انتظام، کسان اور مزدور طبقہ کے لوگوں کے لئے بیج کی معمولی قیمت میں دستیابی اور بیماروں کے لئے فری علاج و معالجہ کا انتظام وغیرہ) فراہم کی جاتی ہیں، آخر وہ کہاں سے پوری کی جائیں گی؟ دوسری بات یہ کہ ٹیکس کی رقم بالکل معمولی ہوتی ہے، جسے بسہولت ادا کیا جاسکتا ہے، غرض اس میں عوامی مفادات کا پہلو غالب ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اور بھی چیزیں ہوتی ہیں جو ضمنی طور پر عوامی مفادات سے ہی جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ سودی لین دین کی شریعت میں سخت مذمت آئی ہے؛ اس لئے بلا عذر شرعی مسلمانوں کو سودی لین دین سے اجتناب کرنا چاہئے؛ تاہم شریعت نے بوقت ضرورت ممنوعات کے استعمال کی اجازت دی ہے، جہاں تک مسلمانوں کے اس کاروبار میں موجود ہونے کا سوال ہے تو انہیں اس کاروبار میں آنا چاہئے مگر کذب بیانی اور غلط بیانی سے اجتناب ضروری ہے، لہذا تمام باشندگان ہند پر ایک ہندستانی شہری ہونے کے ناطے دستور ہند کے مطابق عمل کرنا قیام امن کی خاطر ضروری ہوگا، نیز اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں حکومت کا تعاون کرنا ہے جو شریعت میں محمود اور پسندیدہ ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "تعاونوا على البر والتقوى"، اس لئے ایک مؤمن کو جب کہ وہ اس کا متحمل ہوجائے اس کی ادائے گی میں پیش قدمی کرنا چاہئے، نہ یہ کہ ٹیکس سے بچنے کی خاطر جھوٹ اور کذب بیانی کا سہارا لے؛ اس لئے ٹیکس سے بچنے کی خاطر ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا، شریعت مطہرہ نے کسب معاش کی جائز راہوں کی نشاندہی کی ہے، انہیں اختیار کرنا چاہئے، حصول زر کی حرص و ہوس میں ایسا کرنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہے، لہذا حتی المقدور اس سے بچنا چاہئے۔

نمبر کے ذریعہ تعیین مبیع کی تفصیل:

جواب۹: صحت بیع کیلئے بیچی جانے والی چیز (مبیع) اور اس کے عوض میں دی جانے والی چیز (ثمن) کی تعیین ضروری ہے، تعیین کا مطلب یہ ہے کہ مبیع اور ثمن اس طور پر متعین ہوں کہ عاقدین کے درمیان جہالت کے سبب نزاع اور جھگڑے کا سبب نہ بنے؛ لیکن صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوگی یا نہیں ؟ تو اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ کالونی کے جس ٹکڑے کو فروخت کیا گیا ہے، اگر زمین کی فروختگی کے وقت بائع زمین کی تعیین کے ساتھ ساتھ اس کے متعینہ نمبر کی بھی وضاحت کردے اور مشتری اس کا مشاہدہ بھی کرلے، تو اس صورت میں تعیین مبیع کی بنیاد پر خرید وفروخت کا عمل درست ہوگا؛ کیوں بیع کا اصول ہے کہ جب مبیع متعین ہو اور سبب نزاع نہ ہو تو بیع منعقد ہوجاتی ہے۔

اسی طرح اگر بائع صرف نمبر کی تعیین کردے، جگہ کی تعیین نہ کرے اور مشتری کو صرف مطلوبہ نمبر کی زمین سے مطلب ہو خواہ وہ کسی جگہ ہو اور وہ اس پر راضی بھی ہو تو اس صورت میں بھی خرید وفروخت کا عمل درست ہوگا، یہ تو اصولی بات تھی، لیکن اس سلسلہ میں جس عمل کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ بہر صورت جھگڑے اور نزاع سے خالی نہیں ہے؛ کیوں کہ بائع کے جگہ اور نمبر کی تبدیلی کے اختیار کی بنیاد پر نزاع اور جھگڑے کا وقوع ہوسکتا ہے، وہ اس طور پر کہ نقشہ کے مطابق زمین بالکل سڑک کنارے تھی اب جبکہ بائع اپنے اختیار کی بنیاد پر کسی قسم کی تبدیلی (دائیں نمبر والی زمین بائیں جانب) کرے گا تو ظاہر ہے کہ یہ عاقدین کے درمیان آپسی اختلاف کا سبب بنے گا، دوسری صورت میں اگر صرف متعینہ نمبر کی زمین سے ہی مطلب ہو تو اس کی گنجائش ہوگی؛ لیکن مشتری کی نیت کب بدل جائے اس کا کوئی بھروسہ نہیں؛ اس لئے نمبر کی تعیین کے ذریعہ خرید وفروخت کا عمل درست نہیں ہونا چاہئے؛ چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

''ومعلومية المبيع، ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة فلا يصح بيع شاة من هذا القطيع'' (ردالمحتار، کتاب البیع: ۷/ ۱۵)۔

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''ومنها أن يكون المبيع معلوما والثمن معلوما علما يمنع من المنازعة فإن كان أحدهما مجهولا جهالة مفضية إلى المنازعة، فسد البيع وإن كان مجهولا جهالة لاتفضى إلى المنازعة لايفسد، لأن الجهالة إذا كانت مفضية إلى المنازعة كانت مانعة من التسليم والتسلم فلايحصل مقصود البيع، وإذا لم تكن مفضية إلى المنازعة لا تمنع من ذلك فيحصل المقصود'' (بدائع الصنائع: ۴/ ۳۵۵، البحر الرائق: ۴۲۶۵، ط: دار الکتاب دیوبند)۔

مالک زمین کے کاشت کرنے سے مشتری کی ملکیت متاثر ہوگی یا نہیں؟

جواب۱۰: بیع کا اصول یہ ہے کہ بیچنے والا جب خریدار سے سامان کی قیمت وصول کرلے، تو اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ اب وہ زمین خریدار کے سپرد کردے، فروختگی کے بعد اس کا اپنے کسی مصرف میں استعمال کرنا درست نہیں ہے؛ تاہم اس کی وجہ سے مشتری کی ملکیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، مالک زمین وہی ہے اور رہے گا؛ چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

''أن ينقد الثمن إليه؛ لأن ملك المشترى مشغول بملك البائع، فكان عليه تفريغه وتسليمه'' (البحرالرائق ۱/ ۵۰۱)

رہی بات خریدار کے مالک بننے کی تو وہی اس کا مالک ہوگا؛ کیوں بائع کے ایجاب کی بنیاد پر جب خریدار نے قیمت دے دی اور بیچنے والے نے قیمت بھی وصول کرلی، تو پھر اس پر بیع کا حکم نافذ ہوگا، چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''وقوله: (وحكمه ثبوت الملك) أى فى البدلين لكل منهما فى بدل، وهذا هو الحكم الأصلى، والتابع وجوب تسليم المبيع والثمن'' (ردالمحتار علی الدر المختار شرح تنویر الابصار ۷/ ۱۶، ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت)۔

کاغذی نقشہ کی بنیاد پر زمین کی خرید وفروخت:

جواب۱۱: خرید وفروخت کا اصول یہ ہے کہ مشتری مبیع پہلے اپنی تحویل میں لے لے، پھر فروخت کرے؛ کیوں کہ تحویل میں لینے سے پہلے فروخت کرنے کی صورت میں بسا اوقات ایسی دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں، جس کی انتہاء فسخ بیع ہوتی ہے، اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ ہر وہ معاملہ جس میں قبضہ سے پہلے عقد فسخ ہونے کا امکان ہو اس کی بیع قبضہ سے پہلے درست نہیں ہوتی ہے، نیز اس صورت میں ایک طرف مشتری کے ساتھ دھوکا اور فریب ہے، تو دوسری طرف

بائع کے لیے ذلت ورسوائی بھی؛ اس لئے اس سے بچنا از حد ضروری ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''لایحل سلف وبیع ولاشرطان فی بیع ولا ربح مالم یضمن ولابیع مالیس عندك'' (ترمذی: باب ماجاء فی کراہیة بیع مالیس عندك، حدیث نمبر: ۱۲۳۴) (قرض اور بیع جائز نہیں ہے، اور ایک بیع میں دو شرطیں جائز نہیں ہے اور جوشیٔ اپنے ضمان اور ذمہ داری میں نہیں آئی اس کا نفع اور فائدہ حلال نہیں اور جوشیٔ اپنے پاس نہیں (جس کا مالک نہیں) اس کی بیع جائز نہیں)۔

کاغذی نقشہ کی بنیاد پر خرید وفروخت کرنے کی دوصورتوں میں سے ملکیت مع القبض کی صورت میں زمین کی فروختگی درست ہوگی اور دوسری صورت میں جب کہ زمین پر ملکیت کے ساتھ ساتھ قبضہ بھی حاصل ہوجائے تو بھی فروخت کرنا درست ہوگا؛ کیوں اس صورت میں بائع سہولت کے ساتھ مبیع مشتری کے سپرد کرسکتا ہے، اور یہی چیز بیع کے اندر مقصود بھی ہوتی ہے، البتہ مستقبل میں حصول ملکیت کی بنیاد پر بیع درست نہیں ہوگی؛ کیوں کہ وقت مقررہ پر قیمت ادانہ کرنے کی صورت میں مبیع کے معدوم ہونے کے ساتھ ساتھ، قانونی رکاوٹ کے پیدا ہونے کا بھی قوی امکان ہے اور بیع کا مسلمہ اصول ہے کہ بیع خطرات پر معلق ہونے کی صورت میں منعقد نہیں ہوتی ہے؛ علاوہ ازیں بیع کی صحت کیلئے ضروری ہے کہ مبیع بوقت عقد موجود ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لا تبع مالیس عندک'' (سنن ابوداؤد: حدیث: ۳۵۰۳، سنن نسائی: حدیث نمبر: ۳۶۱۳) (جو چیز تمہاری ملکیت میں نہ ہو اسے مت بیچو)۔

خلاصہ یہ کہ مشتری زمین کا کامل مالک نہیں ہے، جس کی وجہ سے بیع کے فسخ ہونے کا قوی امکان ہے؛ اس لئے محض مستقبل میں قبضہ کے ممکن ہونے کی بنیاد پر کسی کیلئے بھی خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہوگا۔

سامان تحویل میں لینے سے قبل تصرف کرنے کے سلسلہ میں فقہائے احناف نے ایک قاعدہ تحریر کیا ہے:

''والأصل: أن كل عوض ملك بعقد ينفسخ فيه العقد بهلاكه قبل القبض، لايجوز التصرف فيه كالبيع، وَالأجُرة... وكل عوض ملك بعقد لا ينفسخ العقد بهلاكه قبل القبض يجوز فيه التصرف فيه'' (بدائع الصنائع: ۴/ ۲۹۶، ط: دارالکتاب دیوبند)۔

نیز علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

''ومنها: القبض فی بیع المشتری المنقول، فلایصح بیعه قبل القبض لما روي أن النبي ﷺ: نهی عن بیع مالم یقبض (ابوداؤد) ولنهی یوجب الفسادالمنهی، ولأنه بیع فیه غررالانفساخ بهلاك المعقود علیه، لأنه إذا هلك المعقود علیه قبل القبض یبطل البیع الأول، فینفسخ الثانی، لأنه بناه علی الأول وقد نهی رسول اللهﷺ عن بیع فیه غرر، سواء باعه من غیربائعه، أومن بائعه لأن النهی مطلق لا یوجب الفصل بین البیع من غیربائعه،وبین البیع من بائعه،وکذامعنی الغرر لایفصل بینهما،فلایصح الثانی والأول علی حاله ولایجوز إشراکه وتولیته؛ لأن کل ذلك بیع'' (بدائع الصنائع، کتاب البیوع ۴/ ۲۹۴، نیز دیکھئے: ہدایہ: آخرین/ ۵۸، باب بیع المرابحة)۔

علامہ برہان الدین لکھتے ہیں:

''وبیع المبیع قبل القبض لایجوز'' (ہدایہ آخرین، کتاب الصرف: ۸۹، ط: مکتبة الاتحاد دیوبند)۔

خرید فروخت کا غلط طریقہ:

جواب ۱۲: سوال میں بنیادی طور پر چند شقیں ہیں جن سے مسئلہ بالکل واضح ہوجاتا ہے وہ یہ ہیں:

(الف) خریداری کے وقت دلال خریدار سے صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ اس زمین میں ایک قطعہ آپ کا ہے، کون سا حصہ ہے اس کی تعیین نہیں کرتا۔

(ب) مشتری کی ملکیت پر بحیثیت دلال کوئی کاغذی وثیقہ یا دستاویز نہیں دیتا جس کی بنیاد پر یہ یقین کیا جاسکے کہ وہ اب اس زمین کا مالک ہوچکا ہے، صرف زبانی وعدہ ہوتا ہے۔

(ج) مشتری اگر اسے فروخت کرنا چاہے تو وہ ازخود فروخت نہیں کرسکتا؛ بلکہ دلال ہی فروخت کرے گا اور اپنی دلالی کی قیمت بھی وصول کرے گا۔

(د) زمین اصل مالک زمین سے ٹرانسفر تک نہیں ہوتی ہے۔

ذکر کردہ جزئیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ تمام جزئیات بیع کی روح کے بالکل خلاف ہیں: پہلی صورت اس طور پر کہ بوقت عقد مبیع کی تعیین ضروری ہے اور یہاں صرف قطعہ زمین کی طرف مبہم اشارہ ہے جو کہ مبیع کی تعیین کیلئے ناکافی ہے؛ چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

''ومعلومية المبيع، ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة فلا يصح بيع شاة من هٰذا القطيع'' (ردالمحتار، کتاب البیع ۷/۱۵)۔

دوسری صورت اس طور پر کہ ملکیت میں آنے کا انحصار عقد کے درست ہونے پر ہے جب عقد درست نہیں تو ملکیت کیوں کر ثابت ہوگی؟ دوسری اور آخری بات یہ ہے کہ دلال مبیع پر مشتری کی ملکیت پر کوئی کاغذی وثیقہ نہیں دیتا کہ بصورت اختلاف مشتری عدالت میں اس وثیقہ کی بنیاد پر مقدمہ دائر کر کے اپنا حق وصول کر سکے، مشتری کا مقصد اگرچہ زمین خریدنا نہیں ہوتا، صرف پیسہ ہی کمانا ہوتا ہے؛ لیکن اگر فرض کیجئے دلال مشتری کی دی گئی اصل رقم ہی کا انکار کر بیٹھے تو متوقع نفع کے ساتھ اصل رقم بھی جائے گی جسے ہم غرر کہہ سکتے ہیں اور شریعت مطہرہ نے غرر پر مبنی بیع سے منع کیا ہے۔

تیسری صورت اس طور پر کہ بائع مشتری کو مبیع میں تصرف سے روکے تو یہ بھی درست نہیں ہے؛ کیوں کہ عقد مبیع میں کلی تصرف کا تقاضا کرتا ہے، اور یہ مقتضائے عقد کے خلاف شرط ہے، اور مقتضائے عقد کے خلاف شرط لگانے سے بیع فاسد ہو جاتی ہے؛ لہٰذا یہ بیع فاسد ہو جائے گی، چنانچہ علامہ برہان الدین مرغینانیؒ لکھتے ہیں: ''هٰذه الشروط لا يقتضيه'' (ہدایہ، کتاب البیوع، باب بیع الفاسد ۴۳، ط: مکتبۃ الاتحاد دیوبند)۔

چوتھی صورت اس طور پر کہ بیع کا اصول ہے کہ جب مشتری سامان کی قیمت ادا کر دے تو بائع کا فریضہ ہوتا ہے کہ سامان خریدار کے حوالے کر دے؛ جبکہ یہاں ایسا نہیں کیا گیا ہے، خلاصہ یہ کہ یہ محض پیسہ کمانے کا ایک دھوکا اور غرر پر مبنی طریقہ ہے جسے بیع کا نام دے دیا گیا ہے جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں؛ اس لئے اس طرح سے خرید فروخت جائز نہیں ہوگی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غرر پر مبنی بیع سے منع فرمایا:

''نهى عن بيع الغرر'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۱۳)۔

اشیاء پر ملکیت کا دارومدار:

جواب ۱۳: اشیاء پر ملکیت کے حصول کا دارومدار بائع کے ایجاب اور قبول پر ہے، یعنی جیسے ہی بائع نے کہا میں نے اپنا یہ سامان بیچا، مشتری نے کہا میں نے اسے خریدا اور اسی کے ساتھ ساتھ اس نے معاہدے کے مطابق قیمت بھی ادا کر دی، تو فقہاء نے اس کو حصول ملکیت کے لئے کافی قرار دیا ہے؛ چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''(وحكمه ثبوت الملك) أى فى البدلين لكل منهما فى بدل، وهٰذا هو الحكم الأصلى، والتابع وجوب تسليم المبيع والثمن'' (ردالمحتار علی الدر المختار شرح تنویر الابصار ۷/۱۶، ط: دار الکتب العلمیہ، بیروت)۔

بائع کا زمین کے بیچنے کے بعد مشتری کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالنا حقیقت میں یہ بیع کی روح کے خلاف ہے؛ کیوں کہ عقد بیع ملکیت میں کلی تصرف کا تقاضا کرتا ہے، مذکور صورت میں بیع کا اپنے مقصد سے منحرف ہونا ظاہر ہے؛ لہٰذا اگر مشتری کو بیع سے کسی قسم کے ضرر کے پہنچنے کا امکان نہ ہو تو بائع کو اپنے مشتری کے ساتھ اس قسم کی زیادتی سے بچنا چاہئے، خواہ مخواہ اس کا اس سلسلہ میں آڑے بننا درست نہیں ہے۔

تاہم شئی پر ملکیت تو مشتری ہی کی ہوگی؛ لیکن از راہ ضرورت (جیسے مشتری زمین کسی ایسے شخص سے بیچ دے جو اس جگہ میں مقیم حضرات کی مصلحت کے خلاف اور اذیت وتکلیف کا باعث ہو) اسے اس کا حق ہوگا کہ وہ اسے کسی سے نہ بیچنے دے؛ بلکہ اسے خود ہی مناسب قیمت میں خرید لے یا پھر وہ جس کو مناسب سمجھے اس سے فروخت کر دے؛ تاکہ مشتری کو اپنے سامان کی مناسب قیمت مل جائے اور بائع مشتری کی بیع کے نتیجے میں ہونے والے ضرر سے محفوظ ہو جائے، شریعت نے عاقدین کو جانبین سے ضرر کے ختم کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ایک موقع سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کو ضرر پہنچانے سے سختی سے منع فرمایا ہے:

''لا يدخل الجنة من لا يأمن جاره بوائقه'' (بخاری)۔

اس حدیث کی روشنی میں علامہ کاسانی نے اس کی اجازت دی ہے:

''حكم الملك ولاية التصرف للمالك فى المملوك باختياره ليس لأحد ولاية الجبر عليه إلا لضرورة ولا لأحد

ولاية المنع عنه وإن كان يتضرر به إلا إذا تعلق به حق الغير فيمنع عن التصرف من غير رضا صاحب الحق وغير المالك لا يكون له التصرف في ملكه من غير إذنه ورضاه إلا لضرورة وكذلك حكم الحق الثابت في المحل'' (بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع :كتاب الدعوى:۵/ ۲۹۴،ط:دار الكتاب ديوبند)۔

جواب ۱۴: زمین کی قیمتیں گردوپیش کی سہولیات اور ماحول کی بنیاد پر کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہیں، مثلاً ایک جگہ جہاں قریب میں ضروریات کی ساری چیزیں فراہم ہوں، ظاہر ہے اس کی قیمت اس زمین کے مقابلے میں زیادہ ہوگی جہاں سہولیات فراہم نہ ہوں، یا کوئی آبادی نہ ہو یا آبادی تو ہو؛ لیکن مخرب اخلاق اور شر پسند لوگ ہوں؛ اس لئے کہ یہی چیزیں خریدار کے لئے خریدنے کا سبب بنتی ہیں؛ لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ جس وقت مشتری (خریدار) نے زمین خریدی تھی اس کی قیمت معمولی تھی، لیکن خریدار کے قسطیں ادا کرنے سے قاصر اور عاجز ہونے کی وجہ سے، جب مالک زمین نے عقد بیع ختم کردیا تو اس سلسلہ میں ایک تو یہ ہے کہ ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ فسخ معاملہ کی صورت میں دی گئی قسطوں کی واپسی کس اعتبار سے ہونی چاہئے؟ جبکہ زمین اب کافی قیمتی اور مہنگی ہوچکی ہے، آیا خریداری کے وقت کی قیمت یا فسخ عقد کے وقت کی قیمت؟ تو اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے:

(الف) ابتداء عقد میں یہ شرط طے پائی ہو کہ ہر ماہ قسط کی ادائے گی لازم ہوگی، عدم ادائے گی کی صورت میں معاملہ فسخ سمجھا جائے گا، تو اس صورت میں عاقدین کو آپس میں کئے گئے وعدے کے مطابق معاملہ فسخ کرنے کی گنجائش ہوگی؛ تاہم بائع پر دی گئی رقم کی واپسی ضروری ہوگی،

چنانچہ علامہ برہان الدین مرغینانیؒ لکھتے ہیں: ''ولو اشترى على إن لم ينقد الثمن إلى ثلاثة أيام فلا بيع بينهما جاز في قولهم جميعا'' (هداية آخرين، باب خيار الشرط، ص:۱۴)۔

(ب) اگر ابتدائے عقد میں اس قسم کی کوئی شرط کا تذکرہ نہ ہو؛ بلکہ مطلقاً سال دوسال میں قسط کی ادائے گی لازم ہو، اگر حسب وعدہ مشتری نصف یا نصف سے زائد قسط ادا کرنے کے بعد کسی وجہ سے ایک دو قسط وقت مقررہ پر ادا نہ کرسکے؛ تو ایسے موقع سے شرعی نقطۂ نگاہ سے بائع کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ وقت مقررہ تک انتظار کرے، اگر وقت مقررہ کے اندر اندر مشتری مابقیہ قسطیں ادا کردے تو شرعی اعتبار سے اسے معاملہ فسخ کرنے کی اجازت نہیں ہوگی؛ بلکہ وقت مقررہ تک اسے ادائے گی کیلئے مہلت دینا مندوب ہے، جیسا کہ آیت کریمہ (خیر لکم) کے مفہوم سے واضح ہوتا ہے؛ تاہم مفسرین نے واجب قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون" (البقرة:۲۸۰)۔

علامہ رازیؒ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''وهو قول مجاهد وجماعة من المفسرين :إنها عامة في كل دين واحتجوا بما ذكرنا من أنه تعالى قال (وإن كان ذو عسرة) ولم يقل: وإن كان ذو عسرة، ليكون الحكم عاما في المفسرين. وإن كان من عليه المال معسرا وجب أنظاره إلى وقت القدرة؛ لأن النظرة يراد بها التأخير. فلابد من حق تقدم حتى يلزم التأخير. بل لما ثبت وجوب الأنظار في هذا بحكم النص ثبت وجوبه في سائر الصور ضرورة الاشتراك في المعنى. وهو أن العاجز عن أداء المال لا يجوز تكليفه به. وهذا قول أكثر الفقهاء كأبي حنيفة ومالك والشافعي رحمهم الله عليهم'' (تفسير رازی ۷/ ۱۱۱)

فسخ بیع کی صورت میں رقم کی واپسی فسخ کے دن کے اعتبار سے ہوگی:

(ج) بائع اگر زیادتی زر کے حصول کی خاطر ایسا کرے تو پھر مشتری جس قدر زمین کی قیمت ادا کرچکا ہے، اسے اس زمین کا مالک سمجھا جانا چاہئے؛ تاکہ اگر بائع معاملہ فسخ بھی کرے تو مشتری کا نقصان نہ ہو؛ کیوں کہ قیمت کی ادائے گی کے بقدر ملکیت کے عدم تصور کی بنیاد پر بائع معمولی معمولی صورت میں مشتری کو زمین سے سبکدوش کرکے زیادہ قیمت میں زمین بیچنے کی تمنا اور حرص کرے گا جس سے مشتری کا نقصان اور بائع کا فائدہ بالکل واضح ہے؛ اس لئے مشتری اگر وقت متعینہ کے اندر اندر قیمت ادا کرنے کا متحمل ہوجائے، پھر بائع معاملہ فسخ کردے تو اس پر دی گئی رقم کی واپسی فسخ کے دن کے اعتبار سے سد ذریعہ کے طور پر لازم ہونی چاہئے؛ تاکہ عاقدین ایک دوسرے کی ضرر رسانی سے محفوظ رہ سکیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لا ضرر ولا ضرار في الإسلام (ابن ماجه)۔

''وهذه الآية (ياايهاالذين آمنوا أوفوا بالعقود) إشارة إلى الصبر عن شهوة كسب المال بالوجوه المنكرة اوالمحرّمة من الرشاوى وأخذ الأموال على ترك الوجبات وفعل القبائح والمحظورات. فإن كل عاقل ينفر من الحرام ولايتقبل العفيف الشريف تلويث مكاسبه بالمحرمات والشبهات'' (التفسير الوسيط ۲/ ۱۲۹۹)۔

علامہ مرغینانیؒ لکھتے ہیں:

''ومن اشترى عبدا فغاب (أي غاب المشترى قبل نقد الثمن) والعبدفي يد البائع وأقام البائع البينة أنه باعه إياه. فكانت غيبته معروفة لم يبع فى دين البائع لأنه يمكن إيصال البائع إلى حقه بدون البيع وفيه إبطال حق المشترى. وإن لم يدر أين هو بيع العبدوأوفى الثمن؛ لأن ملك المشترى ظهر بإقراره. فيظهر على وجه الذى أقر به مشغولاً بحقه وإذا تعذر استيفاءه من المشترى يبيعه القاضي فيه كالراهن وإذا مات المشترى إذا مات مفلسا والمبيع لم يقبض. بخلاف مابعد القبض لأن حقه لم يبق متعلقا به ثم إن فضل شئ يمسك المشترى؛لأنه لابدل حقه. وإن نقص يتبع هوأيضا'' (بداية آخرين. كتاب البيوع، مسائل منثورة، ص: ۸۷)۔

صاحب ہدایہ کی اس عبارت سے مذکورہ مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے، وہ اس طور پر کہ اگر کوئی شخص سامان خرید کر قیمت کی ادائے گی سے قبل غائب ہوجائے تو کیا بائع اس غلام کو جو فی الوقت اسی کے قبضہ میں ہے بیچ کر اپنی قیمت وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مشتری کی جائے پناہ معلوم ہو تو بائع پر ضروری ہوگا کہ وہ اس غلام کو اس تک پہنچا کر اپنی قیمت وصول کرلے؛ لیکن بیچنے کا حق اس کو نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس کے خود کے دعوی کرنے کی وجہ سے مشتری کا حق اس سے متعلق ہو چکا ہے، مگر علم ہی نہ ہو کہ کہاں گیا تو قاضی اسے فروخت کرے گا اور اس کی قیمت وصول کر کے بائع کو سپرد کردے گا، فروختگی کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ جس قیمت کا غلام تھا اتنا ہی میں فروخت ہوا، دوسرے یہ کہ اس سے کم میں فروخت ہوا، تیسرے یہ کہ اس سے زائد میں فروخت ہوا، دوسری صورت میں مابقیہ کی وصول یابی مشتری کے ذمہ باقی رہے گی جب کبھی اس سے ملاقات ہوگی وہ مابقیہ قیمت اس سے وصول کرلے گا اور تیسری صورت میں بائع کی قیمت ادا کرنے کے بعد باقی ماندہ رقم مشتری کیلئے محفوظ رکھ دی جائے گی؛ کیوں یہ قیمت اسی کے سامان کی ہے، مالک سامان اپنے سامان کی قیمت کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس بیع کی بنیاد پر فقہاء نے بائع کو غلام بیچ کر اپنی قیمت وصول کرنے سے منع کردیا تو اس وقت جب کہ مشتری نے بائع سے کئے ہوئے معاہدے کے مطابق بیع پختہ کرنے کیلئے خطیر رقم بھی دے دی ہو، اگر وہ کسی معقول عذر کی بنیاد پر ماہ دو ماہ کی قسط کی ادائے گی وقت مقررہ پر نہ کرسکے تو اس صورت میں بائع کو معاملہ فسخ کرنے کا حق کہاں سے ہوگا؟ دوسری بات یہ کہ جب نفس بیع کی بنیاد پر ثمن کی ادائیگی سے پہلے مبیع پر مشتری کا حق ثابت ہو چکا ہے، تو اس صورت میں بدرجہ اولی دی گئی رقم کے بقدر مشتری کی ملکیت قائم ہونی چاہیے۔ لہٰذا مشتری اگر وقت کے اندر اندر تمام قسطوں کی ادائیگی پر قادر ہو جائے تو بائع کو معاملہ فسخ کرنے کا حق نہیں ہوگا؛ بالفرض اگر کرتا ہے تو اسے دی گئی رقم کی واپسی فسخ کے دن کے اعتبار سے کرنی ہوگی؛ تاکہ عاقدین ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ رہ سکیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دلال کی تعریف:

جواب ۱۵: خریدار اور بیچنے والے کے درمیان خرید وفروخت کی اجرت کے ساتھ ذمہ داری نبھانے والے محافظ شخص کو ''بروکر'' اور ''دلال'' سے موسوم کرتے ہیں؛ چنانچہ صاحب عون المعبودؒ نہایہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

قال فى النهاية: السمسار القيم بالأمر الحافظ له وهو اسم الذى يدخل بين البائع والمشترى متوسطا لإمضاء البيع والشراء انتهى'' (عون المعبود وحاشية ابن قيم: باب التجارة)۔

علامہ کاسانیؒ نے یہ تعریف کی ہے: ''السمسار: هو الذى يبيع أويشترى لغيره بالأجرة'' (بدائع الصنائع ۴/ ۱۸۳)۔

علامہ سرخسیؒ نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے:

''والسمسار اسم لمن يعمل للغير بالأجر بيعا وشراء'' (المبسوط للسرخسي، باب السمسار: ۱۵/ ۱۱۴)۔

دسیسہ کاری سے حاصل کئے ہوئے مال کا حکم:

دلال کی حیثیت پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''دلالی'' وکیل بالاجرت کے قبیل سے ہے، وہ شرعی اعتبار سے مؤکل کی ہدایت کے مطابق کام کی انجام دہی کا پابند ہے، اس میں کمی بیشی کا حق اسے حاصل نہیں، مثلاً: کسی شخص نے کسی کو سامان بیچنے یا خریدنے کیلئے اجرت پر لیا، تو وکیل کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ مؤکل کی بتائی گئی قیمت کے مطابق سامان بیچ کر قیمت یا خرید کر سامان دے دے، اور معاہدے کے مطابق مؤکل سے ''حق الخدمت'' لیکر درمیان سے علاحدہ ہوجائے، اگر وکیل اس کو دھوکا اور فریب کے ذریعہ روپیہ بٹورنے کا ذریعہ بنائے تو اس سے حاصل شدہ رقم اس کیلئے مکروہ ہوگی؛ کیوں کہ شریعت میں اپنے نفع کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دی گئی ہے، چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''لاضرر ولاضرار في الإسلام'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۷۷۸)، نیز مؤکل کے حکم کی خلاف ورزی تو ظاہر ہے، اور خریدار کے ساتھ ظلم اس طور پر ہے کہ کم قیمت کا سامان زیادہ قیمت میں بیچ کر اس نے خریدار کے ساتھ ظلم کیا ہے؛ جس کا اسے حق نہیں دیا گیا ہے۔

{یاأیھا الذین آمنوا أوفوا بالعقود} کی تفسیر میں علی الطنطاوی لکھتے ہیں:

''وهذه الآية إشارة إلى الصبر عن شهوة كسب المال بالوجوه المنكرة أو المحرَّمة من الرشاوى وأخذ الأموال على ترك الوجبات وفعل القبائح والمحظورت فإن كل عاقل ينفر من الحرام ولايتقبل العفيف الشريف تلويث مكاسبه بالمحرمات والشبهات'' (التفسير الوسيط ۲/ ۱۲۹۹)۔

حضرت ابن عباسؓ کے اثر سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے:

''عن عبدالله ابن طاؤس عن أبيه قال: سألت ابن عباس رضى الله عنهما ما معنى قوله ؟لايبعن حاضرلباد، فقال: لايكن له سمسارا'' (صحيح البخاري، باب النهي عن تلقي الركبان، حديث نمبر: ۲۱۶۳)۔

اس اثر میں حضرت ابن عباسؓ نے شہری کو دیہاتی کا دلال بننے سے منع فرمایا۔

اثر میں وجہ ممانعت پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے شہری کو دیہاتی کا دلال بننے سے اس لئے منع فرمایا کہ اس کے دلال بننے کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں میں گرانی آئے گی جو اہل شہر کیلئے ضرر کا باعث بنے گی، خلاصہ یہ کہ اہل شہر کو ضرر کولاحق ہونے سے بچانا ہے، ظاہر ہے کہ یہ حکم ہر اس دلال کا ہوگا جس کے دلالی کے نتیجے میں اہل شہر کو ضرر لاحق ہو۔

مشروط عقد کا حکم:

جواب (ب): بوقت فروخت دلال کمپنیوں کا اپنے خریدار سے یہ شرط لگانا کہ جب کبھی زمین آپ کو بیچنا ہو تو آپ یہ زمین ہمیں ہی واپس کریں، کسی اور کو نہیں، ظاہر ہے کہ یہ شرط لگانا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ عقد تقاضا کرتا ہے مشتری کیلئے مبیع میں کلی تصرف کا، اس سے قبل بھی اس سے متعلق تفصیل آچکی ہے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی بیع سے منع فرمایا ہے:

''نهى عن بيع وشرط'' (المعجم الاوسط، حديث نمبر: ۴۳۶۱، مسند ابي حنيفة، روايته عن يحي ابن عامر الحميري الكوفي)

تاہم اگر مشتری کی بیع سے ضرر پہنچنے کا امکان ہو تو بائع کو اس کی اجازت ہوگی، بلاوجہ ایسا کرنا درست نہیں ہے، دلیل (س: ۱۳ کے جواب) کے تحت گزر چکی ہے۔

☆☆☆

باب سوم مختصر تحریریں

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق چند مسائل

قاضی عبدالجلیل قاسمی[1]

الحمد لمن هو أهله و الصلوة و السلام على من لا نبي بعده، اما بعد!

۱۔ سرکاری اراضی کو سرکاری قانون کے مطابق مجاز افسران کے ذریعہ ہی خرید وفروخت کرنا جائز ہے، غنڈہ عناصر اور سیاسی لیڈران کی طرف سے زبردستی قبضہ کر کے خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ اوقاف کی اراضی کو اوقاف کے مفاد میں قاضی کی اجازت سے فروخت کرنا جائز ہوگا، اس کے بغیر اس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

۳۔ اگر موروثی زمین میں باپ دادا نے اپنا حصہ فروخت نہیں کیا ہو، بلکہ ان کا حصہ باقی ہو تو ان کے وارثین کے لیے ان کے حصہ کے بقدر اراضی کو فروخت کرنا اور دوسروں کے لیے ان کا خریدنا جائز ہوگا۔

۴۔ جس شخص نے حرام آمدنی سے اراضی خریدی ہے، اگر وہ ان اراضی کو اس لیے فروخت کرتا ہے کہ ان کو فروخت کر کے رقم حقداروں کو واپس لوٹا دے، یا حقداروں کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں اس کو صدقہ کردے تو ایسی اراضی کا خریدنا جائز ہوگا، اس لیے کہ اس کے بغیر حق رسی ممکن نہیں ہے۔

۵۔ کالونی بنانے والے نے اگر مسجد کے لیے زمین کو وقف کر دیا ہے تو اس کے لیے اس کو فروخت کرنا صحیح نہ ہوگا، اور اگر وقف نہیں کیا ہے؛ بلکہ مسجد بنانے کا وعدہ کیا ہے تو اس کو فروخت کر سکتا ہے، البتہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

۶۔ کالونی میں پلے گراؤنڈ یا گارڈن اس کے رہنے والوں کی سہولت اور فائدے کے لیے ہے اور مسجد بھی ان ہی کی سہولت اور فائدے کے لیے ہے، اس لیے اگر ان کے مشورہ سے وہاں مسجد بنادی جائے تو اس کو جائز ہونا چاہیے اور اس کو شرعی مسجد کا حکم دیا جانا چاہیے۔

۷۔ اگر کالونی کی منظوری سرکار کی طرف سے بنانے سے پہلے لی جاتی ہے اور بعد میں بھی لی جاسکتی ہے اور بعد میں منظوری لینے میں اخراجات کم ہیں، تو بعد میں بھی منظوری لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔

۸۔ قرض لینے کے لیے فقیر وغریب ہونا ضروری نہیں ہے، مالدار آدمی بھی قرض لے سکتا ہے، اس لیے قانونی دشواریوں سے بچنے کے لیے کوئی سرکار سے لون لیتا ہے تو اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے۔

۹۔ کالونی بنانے والا جو زمین فروخت کرتا ہے، اگر خریدار کے ساتھ یہ معاہدہ ہو جائے کہ کالونی کے لیے مقررہ ایریا میں ایک ایکڑ زمین اس کو دے گا، خریدار بھی اس پر راضی ہو جائے تو زمین تو متعین نہیں ہوگی، البتہ خریدار اس ایریا میں سے ایک ایکڑ کا حق دار ہوگا اور وہ بھی اسی طرح ایک ایکڑ کو فروخت کر سکتا ہے۔

---

[1] قاضی شریعت، مرکزی دارالقضاء امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

۱۰۔ ظاہر ہے کہ جب خریدار غیر معین ایک ایکڑ کا مالک ہے تو کالونی بنانے والا اس پر کاشت کر سکتا ہے۔

۱۱۔ خریدار غیر معینہ پلاٹ کو فروخت کر سکتا ہے۔

الف۔ کالونی بنانے والا مالک ہو یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔

ب۔ یہ کہنا کہ کالونی بنانے والا مالک نہیں ہوتا ہے، نا قابل فہم ہے، اس لیے کہ اس طرح کی بیع ادھار ہوتی ہے، خریدار بیعانہ کی ایک مخصوص رقم دیتا ہے، تاکہ بائع کو اطمینان ہو کہ وہ خریداری سے فرار اختیار نہیں کرے گا، بلکہ مقررہ مدت میں ثمن پورا ادا کر دے گا، اس لیے یہ کہنا کہ ابھی وہ اصل مالک کی ملکیت میں ہے، نا قابل فہم ہے، یہ دوسری بات ہے کہ مالک زمین کی نیت خراب ہو جائے یا کوئی دوسری رکاوٹ پیدا ہو جائے اور زمین نہ مل سکے، تو اس صورت میں تمام خریداریاں رد ہو جائیں گی، ثمن اس کے حقدار کو دید یا جائے گا۔

۱۲۔ جس طرح اصل مالک سے کوئی چیز خریدنا جائز ہے، اسی طرح اس کے وکیل سے بھی خریدنا جائز ہے، دلال اصل مالک کے وکیل ہوتے ہیں، اس لیے ان سے خریدنا بھی جائز ہے، خریدنے کے بعد وہ زمین خریدار کی ملکیت میں آجاتی ہے، رجسٹری ثبوت کے لیے ہے، ملکیت کے ٹرانسفر کے لیے نہیں ہے، ایجاب وقبول سے بیع تام ہو جاتی ہے اور ملکیت ٹرانسفر ہو جاتی ہے، جس طرح اصل مالک نے دلال کے ذریعہ فروخت کیا ہے، اسی طرح یہ خریدار بھی دلال کے ذریعہ فروخت کر سکتا ہے، نفع کے حصول کے لیے زمین کی خرید وفروخت جائز ہے۔

۱۳۔ اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا ہے۔

۱۴۔ اگر بیع کے وقت یہ بات طے ہو گئی تھی، متعینہ مدت تک قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں بیع کینسل ہو جائے گی اور ادا کردہ ثمن کا حصہ واپس کر دیا جائے تو یہ صحیح ہوگا، اور یہ چونکہ اقالہ ہے، اس لیے ادا کردہ ثمن ہی واپس ہوگا، اس میں کمی بیشی کی شرط لگانا جائز نہ ہوگا۔

۱۵۔ الف۔ اگر دلال نے مالک زمین سے طے کر لیا کہ مقررہ قیمت سے زائد میں فروخت کرنے کی صورت میں زائد رقم اس کی اجرت ہوگی اور زمین کا مالک اس پر راضی ہو تو اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔

ب۔ یہ صورت جائز نہیں معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ اگر بیع میں کوئی ایسی شرط لگائی جائے جو مقتضاء بیع کے منافی ہو تو بیع فاسد ہو جاتی ہے۔



اراضی کی خرید وفروخت سے متعلق اہم مسائل

مولانا ابوسفیان مفتاحی[1]

سوال (۱) وباللہ التوفیق: بعض لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر سرکاری اراضی پر قابض ہوجاتے ہیں اور انہیں فروخت کرتے ہیں، رشوت کے ذریعہ سرکاری عہدوں سے وہ لے آوٹ بھی منظور کروالیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بڑے شہروں میں بہت ساری زمینیں اسی طور پر فروخت ہوتی ہیں، پھر خریدار سے بیچ دیتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ اس پر مکان تعمیر کرتے جاتے ہیں اور کچھ اسے آگے فروخت کرتے جاتے ہیں۔

تو ایسی زمینیں براہ راست قابضین سے خریدنا یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ یہ زمینیں غصب کردہ ہیں، اور دوسروں کی زمینیں ان کی ملک نہیں ہیں؛ بلکہ غصب کردہ ہیں اور غصب کردہ زمینوں کا فروخت کرنا اور خریدنا جائز نہیں ہے، واللہ سبحانہ اعلم۔

اس کے لئے اس حدیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے، جو صحیح مسلم مع تکملہ میں ہے:

"عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل: إن رسول الله ﷺ قال: من اقتطع شبرًا من الأرض ظلمًا طوّقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين" (رواه مسلم، تكمله صحيح مسلم ۱/ ۶۷۳، باب تحريم الظلم وغصب الأرض)۔

ودل الحديث على تحريم الظلم والغصب وتغليظ عقوبته، وعلى أن الأرض يمكن غصبها، خلافًا لمن أنكر ذلك، اور صحیح مسلم میں اور بھی احادیث ہیں جن کو دیکھا جاسکتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں حکم یہ ہے کہ ایسی زمینوں کو خریدنا جائز نہیں ہے، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر (۲) وباللہ التوفیق: ایک افسوس ناک حقیقت یہ بھی ہے کہ بعض دفعہ خود مسلمان اوقاف کی زمین غصب کر لیتے ہیں، کبھی یہ زمین اتنی دور افتادہ ہوتی ہے کہ مقصد وقف کو اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ پاتا ہے، بعض اوقات غیر مسلم حضرات کے قابض ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے، یا وہ اس کے کچھ حصے پر قابض ہو چکے ہوتے ہیں، اور بعض دفعہ ایسی زمین بھی ہوتی ہے کہ جس کی واقعی مسجد ومدرسہ وغیرہ کو ہوتی ہے، لیکن صرف اللہ سے بےخوفی اور مال کی حرص ولالچ کی وجہ سے ان پر ناجائز قبضہ ہوجاتا ہے تو اوقاف کی ان مختلف قسم کی مغصوبہ زمینوں کو خریدنا جائز نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں مغصوبہ زمینوں کو خریدنا جائز نہیں ہے، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر (۳) وباللہ التوفیق: بعض زمین موروثی طور پر ملتی ہیں، لیکن جن لوگوں کو زمین حاصل ہوتی ہے ان کے والد یا دادا کے وقت میں وراثت کی شرعی طور پر تقسیم نہیں ہوئی تھی، جیسے والد نے پھوپھیوں کو حصہ نہیں دیا تھا، یا والد نے اپنی بہنوں کو حصہ نہیں دیا تھا، تو اب بیٹوں یا پوتوں سے ان کی ایسی موروثی زمین کا خریدنا جائز نہیں ہوگا، اس کے جواز کی یہ شکل ہوسکتی ہے کہ یوں نقشہ بنا کر مفتیوں سے پوچھا جائے کہ دادا کا انتقال ہوا اس نے وارثین میں اولاد اور میت نے بہنوں کو چھوڑا اور دادا کے ترکہ سے ان بہنوں کا حصہ الگ کیا جائے اگر زندہ ہوں تو ورنہ ان کی اولاد کو اور والد کا انتقال ہوا اس نے وارثین میں اپنی اولاد کو اور والد میت نے اپنی بہنوں کو چھوڑا، تو والد میت کے ترکہ سے میت کی اولاد کے حصے الگ کئے جائیں اور بہنوں کے حصے الگ کئے جائیں، اگر بہنیں زندہ ہوں تو ورنہ ان کی اولاد کو دیا جائے تو اب ان ورثہ کے حصوں کو خریدا

---

[1] صدر مدرس جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

جاسکتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں ان کی ایسی موروثی زمین کا خریدنا جائز نہیں ہے، اس کے جواز کے لئے ان کا نقشہ بنا کر دار الافتاء سے پوچھا جائے تو مفتی حصے بتلادے تو اب ان کے ملے ہوئے حصوں کو ان سے خریدنا جائز ہوگا۔

سوال نمبر (۴) وباللہ التوفیق: ایک شخص کی آمدنی حرام تھی اور اس حرام کے ذریعہ اس نے ڈھیر ساری زمین حاصل کی، اور اب وہ اس زمین کو فرخت کرتا ہے تو جو لوگ ان حالات سے واقف ہیں، ان کے لئے ان زمین کا خریدنا درست نہیں، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر (۵) وباللہ التوفیق: حکومت کے قانون کے مطابق جو لے آوٹ منظور ہوتا ہے اس میں سڑکوں کی چوڑائی کا رقبہ طے شدہ ہوتا ہے، پلے گراؤنڈ بھی چھوڑنا ہوتا ہے، اگر خالص مسلمانوں کی کالونی ہو تو کالونی بنانے والا ترغیب کے لئے مسجد کی جگہ بھی مقرر کرتا ہے، لیکن جب کالونی میں پلاٹنگ شروع ہوجاتی ہے تو راستوں کو چھوٹا کردیتے ہیں اور پلاٹ میں شامل کرتے ہوئے اس کی بھی قیمت وصول کرتے ہیں، پلے گراؤنڈ اور سوئمنگ پل کی جگہ بیچ دیتے ہیں، یہاں تک کہ مسجد کی مقررہ جگہ بھی فروخت کردیتے ہیں، تو بیچنے والے شخص کے لئے اس کے بنائے ہوئے نقشہ میں تبدیلی کرتے ہوئے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کو فروخت کردینا، اور دوسرے لوگوں کا جانتے بوجھتے اس کو خریدنا جائز نہ ہوگا۔ خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کو فروخت کرنا اور دوسرے لوگوں کا جانتے بوجھتے اس کا خریدنا جائز نہ ہوگا، واللہ سبحانہ اعلم

سوال نمبر (۶) وباللہ التوفیق: قانون کے لحاظ سے کالونی میں گارڈن اور پلے گراؤنڈ رکھنا ضروری ہے، حکومت لے آوٹ کرنے کے لئے نقشہ میں ان چیزوں کو رکھواتی ہے اور جگہ مخصوص کرواتی ہے، لیکن زمین بیچنے والا مسلمانوں کو لبھانے کے لئے گارڈن کی بجائے مسجد کے لئے جگہ دیدیتا ہے، اور جو زمین قانون اور حکومت سے معاہدہ کے مطابق گارڈن کی تھی، اسی جگہ مسجد بنادی جاتی ہے، تو جو زمین قانون اور حکومت سے معاہدہ کے مطابق گارڈن کی تھی تو ان کا اس زمین پر مسجد بنانا درست نہ ہوگا اور وہ مسجد شرعی تصور نہیں کی جائے گی۔

چنانچہ مرقاۃ شرح مشکوۃ ۲ / ۴۴۴ میں ہے کہ مسجد باعتبار لغت محل سجود کو کہتے ہیں، اور شرعاً اس محل ومقام کو کہتے ہیں جس میں نماز کے لئے جو محل وقف کردیا جائے، چنانچہ مرقاۃ کی عبارت یہ ہے: ''والمسجد لغة محل السجود، وشرعًا المحل الموقوف للصلاة فيه''۔

خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں گارڈن والی زمین پر مسجد بنانا درست نہ ہوگا اور وہ شرعی مسجد نہیں کہی جائے گی، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر (۷) وباللہ التوفیق: خلاصۂ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں بہر کیف قانونی تقاضوں کی تکمیل کئے بغیر کالونیاں بنانا اور پلاٹ فروخت کرنا جائز نہیں ہے، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر (۸) وباللہ التوفیق: خلاصۂ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں قانونی دشواری سے بچنے کے لئے سودی قرض لینا جائز نہیں اور شہر میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت غریب ہے یہ خلاف حقیقت ہے، اور قسطوں پر پلاٹ حاصل کرنا اور مکان کے مالک بننا درست ہے اور مسلمان تاجروں کے لئے لازم ہے کہ وہ جائز شرعی کاروبار کریں، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر (۹) وباللہ التوفیق: خلاصۂ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین ہوجائے گی اور بیع وشراء کا یہ عمل درست ہوجائے گا، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر (۱۰) وباللہ التوفیق: خلاصۂ کلام: یہ کہ صورت مسئولہ میں بائع کے اپنی کاشت کے کاٹنے کے بعد خواہ وہ کاشت کاٹنے کے وقت کو پہنچی ہو یا نہ ہو، تو اس کے اپنی کاشت کاٹنے کے بعد خریدار اس کا مالک ہوجائے گا، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر(۱۱) وباللہ التوفیق: جس شخص نے پلاٹ خریدا ہے تو اس سے پہلے کہ اس کا پلاٹ متعین ہو صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر وہ اپنی زمین کسی اور سے فروخت کر دیتا ہے، تو یہ بیع درست نہ ہوگی، اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

الف: ایک یہ کہ زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آ گئی تھی اور اس نے پلاٹس فروخت کئے تھے، تو ملکیت میں آ جانے کے بعد اس کا پلاٹس کو فروخت کرنا شرعاً درست ہے۔

ب: دوسری صورت یہ کہ زمین ابھی مالک زمین کی ملکیت میں ہوتی ہے، کالونی بنانے والا اس کی اجازت سے (جو اکثر اوقات اسٹامپ پیپر ہوتی ہے) پلاننگ کرتا ہے اور اس کو بیعانہ کی ایک رقم دیدیتا ہے اور وہ ایک مقررہ مدت میں بقیہ رقم ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے قانونی رکاوٹ پیدا ہوگئی تو پھر زمین مالک زمین ہی کے پاس رہ جاتی ہے تو اس صورت میں پلاننگ کرنے والے کا پلاٹ بیچنا درست نہیں ہے، اور پھر اس سے پلاٹ خریدنے والے شخص کا اگلے شخص کو بیچ دینا جائز نہ ہوگا، واللہ سبحانہ اعلم۔

خلاصۂ کلام: یہ کہ صورت مسئولہ میں صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر پلاٹ خریدنے والا اپنی زمین کو کسی اور سے فروخت کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اور (الف) ملکیت میں آ جانے کے بعد اس کا پلاٹس کو فروخت کرنا شرعاً درست ہے، اور (ب) قانونی رکاوٹ پیدا ہونے کے بعد پلاننگ کرنے والے کا پلاٹ بیچنا درست نہیں، پھر اس سے پلاٹ خریدنے والے شخص کا اگلے شخص کو بیچ دینا جائز نہ ہوگا، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر(۱۲) وباللہ التوفیق: خلاصۂ کلام: یہ کہ صورت مسئولہ میں شرعاً یہ شکل درست نہیں، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر(۱۳) وباللہ التوفیق: اس صورت میں پلاٹ خریدنے والے کی ملکیت زمین پر ثابت نہ ہوگی، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال نمبر(۱۴) وباللہ التوفیق: خلاصۂ کلام: یہ کہ صورت مسئولہ میں شرعاً یہ درست نہیں، واللہ سبحانہ اعلم۔

سوال(۱۵) وباللہ التوفیق: الف: آسان شکل تو یہ ہے کہ دلال زمین کا گاہک لائے اور اپنی دلالی وصول کر لے، لیکن دلال زمین کی قیمت کالونی بنانے والے سے معلوم کرتا ہے پھر اس کو اپنی من مانی قیمت پر بیچتا ہے، زمین والے نے جتنی قیمت بتلائی تھی اس کو اتنی دیتا ہے اور باقی کو اپنے لئے جائز سمجھتا ہے، یہ شرعاً درست نہیں۔

ب: وباللہ التوفیق: دلال کمپنیاں جو شکل سب سے زیادہ استعمال کر رہی ہیں وہ یہ ہے کہ زمین بیچ دیتے ہیں، لیکن قبضہ نہیں دیتے اور ان کو کہہ دیتے ہیں کہ جب بھی آپ کو بیچنا ہو تو آپ یہ زمین ہمیں ہی واپس کریں گے کسی اور کو نہیں تو یہ مشروط بیع جائز نہیں شرعاً، واللہ سبحانہ اعلم۔

الف: خلاصہ کلام یہ کہ یہ شرعاً درست نہیں۔

ب: خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ مشروط بیع شرعاً جائز نہیں، واللہ سبحانہ اعلم۔

☆☆☆

زمین کی خرید وفروخت

مولانا مفتی ظہیر احمد قاسمی[1]

(۱) معلوم ہوتے ہوئے ایسی زمینوں کا خریدنا درست نہیں، اس میں تعاون علی الاثم بھی ہے، تاہم وہ ایسی صورت میں مالک ہوجائے گا۔

(۲) معلوم ہوتے ہوئے ایسی زمینوں کا خریدنا شرعاً درست نہیں، اس میں تعاون علی الاثم بھی ہے۔

(۳) مذکورہ زمینوں کو خریدا جاسکتا ہے، تاہم ان کے وارثین کو ایسا نہیں کرنا چاہئے، حقوق ادا نہ کرنے پر گناہ گار رہوں گے، اور آخرت میں وہ ان حقوق کا بدل ادا کریں گے اور سزا بھگتیں گے، وراثت کے شرعی طور پر تقسیم کرنے کی ترغیب دیتے رہنی چاہئے، خریدنے کی گنجائش اس لئے ہوگی؛ کیونکہ مخصوص کوئی قطعہ اراضی متعین نہیں کہ قطعہ فلاں وارث کا ہی ہے۔

(۴) اگر پوری آمدنی حرام نہ تھی، بلکہ کچھ حصہ حرام آمدنی کا تھا اور کچھ حلال، تو ایسی صورت میں اس سے خریداری کی جاسکتی ہے، تاہم اگر بالکل پوری حرام آمدنی ہو تو پھر اس سے خرید وفروخت کا معاملہ کرنا درست نہ ہوگا۔

(۵) جانتے بوجھتے ہوئے خریدنا درست نہیں، اس میں تعاون علی الاثم ہے، لیکن اگر علم ہونے کے باوجود وہ خرید لیتا ہے تو وہ مالک ہوجائے گا، کیونکہ اس نے اس زمین کو بالعوض وصول کیا ہے اور کونسا حصہ روڈ کا ہے اور کونسا حصہ پلے گراؤنڈ وغیرہ کا ہے متعین نہیں۔

(۶) قانون کی خلاف ورزی کرنا درست نہیں، لیکن پھر بھی اگر کسی نے وہ جگہ مسجد کے لئے وقف کردی تو وہ وقف ہوجائے گی اور مسجد شرعی شمار ہوگی، کیونکہ مذکورہ زمین اسی کی ملک ہے، اس نے ایک معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے جس کا وہ گناہ گار ہوگا۔

(۷) قانونی تقاضوں کو پورا کئے بغیر کالونیاں بنانا اور پلاٹ فروخت کرنا ٹھیک نہیں، اس کی ہمت شکنی کی جانی چاہئے، لیکن ہمارے ملک میں نظام بہت لچر ہے، غیر قانونی طور پر انجام دینا سستا ہوتا ہے اور قانون کے مطابق عمل کرنا بہت مہنگا ثابت ہوتا ہے، اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ قانون کو بنایا جائے اور اس کا نفاذ عدل وانصاف کے ساتھ ہو۔

تاہم ان حالات میں اگر کوئی خرید وفروخت کرتا ہے تو شرعاً اس کو ناجائز قرار نہیں دیا جاسکتا، اس میں اصل خرابی قانون بنانے والوں اور اس کے نفاذ کرنے والوں کی ہے۔

(۸) مجبوری اور ضرورت پر بقدر ضرورت لون لینے کی بھی گنجائش ہے، بڑے ضرر سے بچنے کے لئے چھوٹے ضرر کو اختیار کیا جاسکتا ہے:

''الضر الأشد یزال بالضرر الأخف'' (قواعد الفقه/ ۸۸)، ''الضرورات تبیح المحظورات'' (قواعد الفقه/ ۸۹)، ''الضرورات تتقدر بقدرها'' (قواعد الفقه/ ۸۹)۔

(۹) زمین کی پوری طرح تعیین ہونی چاہئے، تاکہ مفضی الی النزاع نہ ہو، لیکن اگر خریدنے والا راضی ہے کہ آپ جہاں بھی جگہ دے دیں گے ہم راضی ہیں تو اس صورت میں بیع درست ہوگی۔

---

[1] مسجد سوہن حلوہ، کانپور، یوپی۔

(۱۰) اگر خریدار کی اجازت سے کاشت کرتا ہے تو کوئی حرج نہیں۔

(۱۱، الف) اس شکل میں جبکہ وہ اس کی ملکیت میں آئی تھی بالکل درست ہے، جبکہ یہ مفضی الی النزاع نہ ہو، حنفیہ کے یہاں غیر منقولہ کا فروخت کرنا بغیر قبضہ کے بھی درست ہے۔

(ب) اس صورت میں بھی خرید وفروخت درست ہے، گویا وہ مالک زمین کی اجازت سے قسطوں میں زمین فروخت کر رہا ہے۔

(۱۲) اگر کالونی بنانے والے نے مالک زمین سے کسی معاہدہ کے تحت کسی زمین کا سودا کرلیا ہے، اگرچہ زمین ابھی پورے طور پر ٹرانسفر نہ ہوئی ہو، یعنی داخل خارج نہیں ہوا، بلکہ اسٹامپ پیپر پر یا رجسٹری ہوئی ہے، تو اس صورت میں بھی اس طرح خرید وفروخت کرنا درست ہوگا، بشرطیکہ مفضی الی النزاع نہ ہو، اس درجہ تعیین ضروری ہے، تاکہ آگے چل کر کوئی جھگڑا وغیرہ نہ ہو۔

موجودہ قانونی پیچیدگیوں اور پوری رقم کا ایک دم سے حصول ممکن نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ایسا کرتے ہیں۔

معاملات میں حتی الامکان وسعت دی جانی چاہئے۔

(۱۳) ملکیت ثابت ہوجائے گی، اگرچہ پورے طور پر زمین متعین نہیں، اجمالی طور پر تعیین کافی ہوگی اگر خریدار راضی ہے۔

(۱۴) اگر معاہدہ میں یہ سب باتیں بالکل واضح کردی گئی تھیں کہ پوری رقم ادا نہ کرنے پر اتنی اتنی مدت میں/ یا اتنی قسطیں ادا نہ کرنے پر آپ کا سودا ختم ہوجائے گا، یہ سب معاہدہ میں موجود تھا تو اس طرح کرنا اس کا درست ہوگا، ورنہ نہیں۔

(۱۵، الف) اگر دلال نے پہلے کالونی بنانے والے سے اس طرح کا کوئی معاہدہ کرلیا ہے کہ میں نے یہ پلاٹ اتنے روپے میں لیا یا اتنے روپے میں اس پلاٹ کے ادا کرلوں گا، اور پھر وہ گاہک لاکر اس سے پیسے لے کر ایسا کرتا ہے تو زائد رقم لینا اس کے لئے درست ہوگا، ورنہ محض دلال بن کر زیادہ رقم کا مطالبہ درست نہیں، خریدار کو بھی تحقیق کرلینی چاہئے۔

(ب) اس طرح کی شرط کے ساتھ بیع درست نہیں، شرط فاسد ہے۔

☆☆☆

مختلف طرح کی زمینوں کی خرید وفروخت سے متعلق نئے مسائل

مفتی عبدالمنان صاحب [1]

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں سب سے اہم زمین ہے، زمین ہی انسان کا مسکن بھی ہے اور اس کا مدفن بھی، وہی درختوں اور پودوں کے واسطہ سے رزق کی فراہمی کا ذریعہ ہے، جو جانور انسان کی غذا اور سواری وغیرہ کے کام آتے ہیں، ان کو بھی زمین ہی سے چارہ فراہم ہوتا ہے، اور ہماری سب سے بڑی ضرورت جس سے ہم دومنٹ بھی بے نیاز نہیں رہ سکتے، یعنی آکسیجن، زمین ہی میں پیدا ہونے والے درخت ان کے حصول کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، دنیا میں کچھ تو وہ آلودگی ہے، جو خود قدرت کی طرف سے ہے، اور آلودگی کا ایک بہت بڑا حصہ وہ ہے، جو قدرتی وسائل کے استعمال میں انسان کی بے احتیاطی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، ان آلودگیوں کو تحلیل کرنے کے دو بڑے قدرتی ذرائع ہیں: ایک سمندر دوسرے زمین، اسی لئے زمین انسان کی بہت محبوب شئی رہی ہے، دنیا میں اکثر جنگیں زمین کے لئے ہوتی ہیں، تجارتی نقطۂ نظر سے بھی زمین بڑی اہمیت ہے، اور آج کل بڑے اور چھوٹے شہروں میں بڑے بڑے تاجروں نے زمین اور فلیٹس کی تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا ہے، جہاں اس سے تاجروں کو معاشی فائدہ پہنچتا ہے، وہیں خریدار کو رہنے کی جگہ مل جاتی ہے، اور بعض تاجر غریبوں کے لئے لائق خرید بنانے کی غرض سے اقساط کی سہولت فراہم کردیتے ہیں، اس طرح متوسط اور کم آمدنی کے حامل لوگوں کو بھی شہروں میں مکان حاصل ہوجاتا ہے، تجارت کے اس شعبہ میں تاجروں اور گاہکوں کو بہت سے شرعی مسائل بھی پیش آتے ہیں، ان ہی مسائل سے متعلق درج ذیل سوالات وجوابات مندرج ہیں:

جواب (۱): بعض لینڈ گرابرس، سیاسی لیڈران یا غنڈہ عناصر سرکاری اراضی پر قابض ہوجاتے ہیں اور انہیں فروخت کرتے ہیں، رشوت کے ذریعہ سرکاری عہدہ داروں سے وہ لے آوٹ بھی منظور کروالیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بڑے شہروں میں بہت ساری زمینیں اسی طرح فروخت ہوتی ہیں، پھر خریدار اسے دوسرے خریدار سے بیچ دیتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ اس پر مکان تعمیر کرتے جاتے ہیں اور کچھ اسے آگے فروخت کرتے جاتے ہیں، ایسی زمینوں کو براہ راست قابضین سے خریدنا یا ان سے خریدے ہوئے لوگوں سے خریدنا جائز ہے، جیسے فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

”من غصب عبدًا فباعه واعتقه المشترى ثم أجاز المولى البيع فالعتق جائز استحسانًا وهٰذا عند أبي حنيفة وأبو يوسف وقال محمد: لايجوز“ (فتاوى تاتارخانيه ۸/ ۲۷۴)۔

یہاں غصب کردہ غلام کو فروخت کیا اور مشتری نے خرید کر آزاد کردیا، پھر مولی نے جب بیع کی اجازت دے دی تو عقد جائز ہوگیا، اسی طرح سرکاری زمین کا قبضہ غیر قانونی تھا، لیکن بعد میں متعلقہ عہدہ داروں سے لے آوٹ بھی منظور کروالیا، اگرچہ لے آوٹ کی منظوری میں رشوت دیا ہو، اس رشوت دینے کا گناہ اس کو ہوگا اور اس پر توبہ لازم ہے، لیکن سرکاری منظوری ہوگئی ہے، لہذا متعلقہ عہدہ داروں سے منظوری لینے کے بعد اس زمین کو فروخت کرنا جائز ہوگا، اور اس سے خریدنا بھی جائز ہوگا، نیز فتاوی تاتارخانیہ میں مذکور ہے: الشرا بالمال کے تحت ۱۲۱۴۵ نمبر مسئلہ میں لکھا ہے:

”رجل اكتسب مالا من حرام ثم منه شيئًا فهذا على خمسة أوجه: (۱) إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا ثم اشترى منه بتلك الدراهم، (۲) أو اشترى قبل الدفع بتلك الدراهم ودفعها، (۳) أو اشترى قبل الدفع بتلك الدراهم ودفع غيرها، (۴) أو اشترى مطلقًا ودفع تلك الدراهم، (۵) أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم. اختلف ابو نصر وابوبكر وابو الحسن، قال الكرخي: قال أبونصر يطيب له ولايجب عليه أن يتصدق في الوجه الأول، وإليه ذهب الفقيه أبوالليث لكن هذا خلاف ظاهر الرواية فإنه نص في الجامع الصغير: إذا غصب ألفًا فاشترى بها

---

[1] مفتی دارالحدیث پر مائی بھٹی، نوگاؤں، آسام۔

وباعها باليقين يتصدق بالربح وقال أبوالحسن الكرخي في الوجه الأول والثاني لا يطيب ويتصدق وفي الوجه الثالث والرابع والخامس يطيب وقال أبوبكر لا يطيب له ويجب عليه التصدق في الوجوه كلها: لكن الفتوى اليوم على قول الكرخي دفعًاللحرج عن الناس'' (فتاوی تاتارخانیہ ۸/۳۴۶)۔

امام کرخیؒ نے چوتھی اور پانچویں وجہ میں جہاں مشتری نے وہی مال حرام مبیع کے ثمن میں ادا کیا پھر بھی یطیب لہ کا حکم فرمایا، پھر مصنفؒ نے امام کرخیؒ کے قول پر فتوی ہونے کا فیصلہ فرمایا ہے لوگوں سے تنگی دور کرنے کے لئے، ویسا ہی سرکاری زمین کو پہلے اگرچہ غیر قانونی قبضہ کیا تھا، بعد میں جب متعلقہ سرکاری عہدہ داروں سے لے آوٹ کی منظوری لے لی، اب سرکاری منظوری لینے کے بعد اس زمین کو فروخت کرنا اس کے لئے جائز ہوگا، اور اسے خریدنا بھی جائز ہوگا، واللہ اعلم۔

جواب (۲): اوقاف کی غصب کردہ زمین کو خریدنا جائز نہیں ہوگا، جب بیچنا جائز نہیں تو خریدنا بھی ناجائز ہے، لیکن جبکہ مقصد وقف کو کوئی نفع نہیں پہنچتا یا غیر مسلم کے قبضہ میں ہوجاتا ہے یا بدمعاش لوگوں نے ناجائز قبضہ کرلیا ہے، اس سے خلاصی کی کوئی صورت نہیں رہتی یا ہڑپ ہونے کا غالب گمان ہے تو ایسی حالت میں قاضی شرعی کے حکم سے اس کی بیع درست ہوگی اور خریدنا بھی جائز ہوگا۔

جواب (۳): جو زمین موروثی طور پر ملتی ہے، اگر وارث کے والد یا دادا کے وقت میں وراثت کی شرعی طور پر تقسیم نہیں ہوئی تھی جیسے والد نے پھوپھیوں کو حصہ نہیں دیا تھا یا دادا نے اپنی بہنوں کو حصہ نہیں دیا تھا، اب بیٹوں سے یا پوتوں سے ان کی ایسی موروثی زمین خریدنا جائز ہوگا یا نہیں؟

اس سلسلہ میں علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے جس کا اختصار یہ ہے:

''وفي حظر لأشباه: الحرمة تتعدد مع العلم بها إلا في حق الوارث وقيده في الظهيرية بأن لا يعلم بعينه فلا شك في حرمته ووجوب رده عليه بذا مغنى قوله وقيده في الظهيريهة وفي منية المفتي: مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكتسب من حيث لا يحل ولكن لا يعلم الطالب بعينه ليرد عليه حل له الإرث؟ والأفضل أن يتورع ويتصدق بنية خصماء أبيه اهـ۔

وكذا لايحل له إذا علم عين الغصب مثلاًوإن لم يعلم مالكه كما في البزازية: أخذ مورثه رشوة أو ظلمًا إن علم ذلك بعينه لا يحل له أخذه وإلا فله أخذه حكما، أما في الديانة فيتصدق به بنية إرضاء الخصماء، والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا، فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه، وإن كان مالا مختلطًا مجتمعًا من الحرام ولا يعلم أربابه ولاشيئًا منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه عنه. وفي الذخيرة: سئل الفقيه أبو جعفر عن من أكسب ماله من أمراء السلطان ومن الغرمات المحرمات وغير ذلك هل يحل له لمن عرف ذلك أن يأكل من طعامه؟ قال أحب إليّ في دينه أن لا يأكل، وسعه حكمًا إن لم يكن ذلك الطعام غصبًا أو رشوة وفي الخانية: امرأة زوجها في أرض الجور إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذلك الطعام غصبا فهي في سعة من أكله: وكذا لو اشترى طعامًا أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من تناوله والإثم على الزوج'' (شامی ۴/۱۳۰)

نیز درمختار کی عبارت ''بخلاف البيع الفاسد فإنه لا يطيب لفساد عقده ويطيب للمشتري منه لصحة عقده'' (۴/۱۳۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی موروثی زمین خریدنا جائز ہوگا۔

جواب (۴): ایسی زمین کا خریدنا درست ہوگا، ''ويطيب للمشتري منه لصحة عقده'' (الدر المختار ۴/ ۱۳۰، فتاوی محمودیہ)۔

جواب (۵): حکومت کے قانون کے مطابق جو لے آوٹ منظور ہوتا ہے، اس میں سڑکوں کی چوڑائی کا رقبہ طے شدہ ہوتا ہے، پلے گراؤنڈ بھی چھوڑنا ہوتا ہے، اگر خالص مسلمانوں کی کالونی ہو تو کالونی بنانے والا ترغیب کے لئے مسجد کی جگہ بھی مقرر کرتا ہے، لیکن جب کالونی کی پلاننگ شروع ہوجاتی ہے تو راستوں کو چھوٹا کردیا جاتا ہے اور پلاٹ میں شامل کرتے ہوئے اس کی بھی قیمت وصول کی جاتی ہے، پلے گراؤنڈ اور سوئمنگ پول کی جگہ بھی بیچ دیتے ہیں، یہاں

مدرسہ مسجد کی جگہ بھی فروخت کردیتے ہیں، بیچنے والے شخص کے لئے اس کے بتائے ہوئے نقشے میں تبدیل کرتے ہوئے عوامی مفادات سے وابستہ زمینوں کوفروخت کردینا اور دوسرے لوگوں کا جانتے بوجھتے اسکا خریدنا جائز نہیں ہوگا، چونکہ سرکاری قانون کے مطابق جوزمین جس چیز کے لئے متعین ہے کالونی بنانے والا اس کو تبدیل کرنے کا حق نہیں رکھتا، جبکہ وہ بیچنے والا مالک ہی نہیں، جتنی جگہ پلے گراؤنڈ اور سوئمنگ کے لئے حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے اس میں تبدیلی بھی درست نہیں، اتنی زمین بیچنا اور دوسرے کو خریدنا بھی درست نہیں، کالونی بنانے والا اپنی طرف سے مسجد کی جگہ متعین کرتا ہے، تو یہ اس کی طرف سے وقف ہوجائے گا، اس کو بیچا نہیں جاسکتا ہے اور دوسرا شخص اس کو خرید بھی نہیں سکتا ہے، واللہ اعلم۔

ب: قانون کے لحاظ سے جبکہ کالونی میں گارڈن اور پلے گراؤنڈ رکھنا ضروری ہے، حکومت لے آوٹ منظور کرنے کے لئے نقشہ میں ان چیزوں کو رکھواتی ہے اور جگہ مخصوص کرواتی ہے، لیکن زمین بیچنے والا مسلمانوں کو لبھانے کے لئے گارڈن کی بجائے مسجد کے لئے جگہ دے دیتا ہے اور جوزمین قانون اور حکومت سے معاہدہ کے مطابق گارڈن کی تھی اس جگہ مسجد بنادی جاتی ہے، ان کا اس زمین پر مسجد بنانا درست نہیں ہے اور وہ مسجد شرعی متصور نہیں ہوگی، جب تک سرکار سے منظوری نہ لی جائے۔

جواب (۷): کسی زمین کو کالونی کی حیثیت سے منظور کرانے میں جتنے مراحل طے کرنے کی قانونی طور پر ضرورت ہے، چاہے کسی سیاسی لیڈر کی مدد لے کر ان مراحل کو طے کر کے سرکاری منظوری لے کر کالونی بنانا ہی بہتر ہے، عافیت واطمینان بھی اسی میں ہے، ورنہ اندیشہ رہتا ہے کہ فورس کے ذریعہ کالونی کو خالی کرالیں، جیسے اس وقت آسام میں ہورہا ہے، ورنہ متعلقہ عہدہ داروں سے حتی الامکان کوششیں کر کے لے آوٹ منظور کرالیں، بہتر شکل یہی ہے۔

اصل میں سرکار کی ذمہ داری ہے کہ پبلک کو رہنے کی جگہ ومکان کا انتظام کرے، اس بنیاد پر کالونی کے لئے جتنے مراحل قانونا طے کرنے کی ضرورت ہے، یہ سرکار کی طرف سے متعلقہ محکمہ کی ذمہ داری ہونا چاہئے جس کو اب پبلک پر بوجھ ڈالا جارہا ہے، لہذا متعلقہ محکمہ سے رابطہ قائم کر کے مقامی سیاسی لیڈر کے ذریعہ سے حکومت سے منظور کرانے کی کوششیں کرنا چاہئے یا قانونی تقاضوں کو تکمیل کئے بغیر متعلقہ محکمہ سے رابطہ قائم کر کے کالونی بنانے کے بعد حکومت کی طرف سے منظوری ہوجاتی ہے، جیسے عام طور پر کالونی بنائی جاتی ہے، تو پہلے مرحلہ اگرچہ غیر قانونی تھا لیکن منظوری کے بعد جواز کی شکل اختیار کرلے گا، جبکہ اس وقت قانون کے دائرہ میں ہے اور اس کی خرید وفروخت بھی درست ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جواب (۸): سوال میں مذکورہ مشکلات کے حل کے لئے اور قانونی دشواری سے بچنے کے لئے لون لینا درست ہوگا، مجبوری کی وجہ سے ایسا کیا گیا، لہذا تو یہ بھی کرتا رہے۔

جواب (۹): کالونی میں جو قطعہ زمین بیچا جاتا ہے وہ نقشہ پر درج ہوتا ہے اور زمین کے ہر ٹکڑے کا ایک نمبر ہوتا ہے، لیکن اس پر پلاٹس بنائے نہیں جاتے اور کالونی بنانے والے کے لئے اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ وہ اس جگہ کو بدل کر یا نقشہ میں جس پلاٹس کا جو نمبر بتایا گیا ہے اس کو کسی اور جگہ ڈال دے، یہاں پلاٹس نمبر ڈال دینے سے متعین ہونا اصولی بات ہے، لیکن جبکہ نمبر تبدیل کرنے کی بھی گنجائش ہے اور نقشہ میں دیا ہوا پلاٹ کا نمبر بھی کسی اور جگہ ڈال دینے کی گنجائش ہونے کی وجہ سے اس کے لئے خرید وفروخت کا عمل درست ہوگا۔

جواب (۱۰): زمین کا جو حصہ بیچ دیا گیا مشتری اس کا مالک بن جاتا ہے، بیچنے والے کا کاشت کرنا درست نہیں ہے، مشتری کی اجازت سے یا رضامندی سے کاشت کرنے کی اجازت ہو تو جائز ہوگا۔

جواب (۱۱، الف): جب زمین کالونی بنانے والے کی ملکیت میں آجاتی ہے تو اس کی خرید وفروخت کرنا درست ہے۔

(ب): جب زمین مالک ہی کی ملکیت میں ہوتی ہے، کالونی بنانے والا اس کی اجازت سے (جو اکثر اوقاف اسٹامپ پیپر پر ہوتی ہے) پلاننگ کرتا ہے، اور اس کو بیعانہ کی ایک رقم دے دیتا ہے اور ایک مقررہ مدت میں بقیہ رقم ادا کرنے کا پابند رہتا ہے، لیکن جب کسی وجہ سے قانونی رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے تو زمین مالک زمین ہی کے پاس رہ جاتی ہے، تو اس وقت پلاٹنگ کرنے والا کا پلاٹ بیچنا اور پھر اس سے پلاٹ خریدنے والے شخص کا اگلے شخص کو بیچنا جائز نہیں ہوگا، چونکہ کالونی بنانے والا اب تک زمین کا مالک نہیں ہوا، نہ روپے ادا ہوا اور نہ ہی رجسٹری ہوئی، صرف ایک وعدہ بیع ہے، لہذا کالونی بنانے والا اس کو فروخت نہیں کرسکتا اور نہ اسے خریدنے والا آگے بیچ سکتا۔

جواب (۱۲): یہ شکل کہ کالونی بنانے والا کچھ دلالوں کو ذمہ داری دیتا ہے کہ ہماری زمین بکوایئے، تو یہ دلال مارکیٹ میں مختلف گراہکوں سے بات کرتا ہے کہ

ہمارے پاس مال ہے آپ پیسہ لگائیے، اس کو خریدئے، اسکی قیمت بڑھے گی جب قیمت بڑھے تو آپ بیچ دینا، زمین خریدنے والے کو زمین مقصود نہیں ہوتی، اس کو صرف پیسہ کمانا مقصود ہوتا ہے، وہ شخص زمین خرید لیتا ہے، خریدنے والا اصل مالک کو جانتا تک نہیں، نہ کوئی رجسٹری ہوتی ہے اور نہ کوئی کاغذی تحریر ہوتی ہے، صرف دلال اور خریدنے والے کے درمیان صرف زبانی سودا ہوتا ہے اور دلال اس کو یہ کہہ دیتا ہے کہ اس زمین میں ایک قطعہ آپ کا ہے اور اسے پیسہ وصول کر لیتے ہیں، اگر یہ شخص اپنا قطعہ بیچنا چاہے تو صرف وہی دلال بیچے گا، اگر اس کو دوسرا خریدار مل بھی جائے تو بھی وہ اس کو دلال سے ہی کہے گا اور دلال اس کو فروخت کرے گا اور اپنی دلالی وصول کرے گا، اس طریقہ سے یہ سلسلہ چلتا رہے گا جبکہ ابھی زمین کھیتی والے اصل مالک سے بھی ٹرانسفر نہیں ہوئی تو یہ شکل بھی ناجائز ہے، یہ بیع مالا یملک کے قبیل سے ہے، چونکہ دلال اس زمین کے مالک نہیں ہے وہ بیچنے کا بھی مالک نہیں، لہذا یہ بیع جائز نہیں ہوگی۔

جواب (۱۳): کبھی خود کالونی بنانے والے ایسا کرتے ہیں کہ وہ پلاٹ بیچ دیتے ہیں اور قسطوں میں پیسہ بھی وصول کر لیتے ہیں، اب اگر خریدار کو بیچنا ہے تو اس کو بھی کالونی بنانے والے سے ہی رابطہ کرنا ہوگا، اگر کوئی گراہک لاتا ہے تو بھی اسے ملانا ہوگا، خود کالونی بنانے والا بھی نہیں چاہتا کہ گراہک آئے، وہ خود ہی اس کو خرید لیتا ہے اور جو بھی قیمت میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا ہے اس کو ادا کرتا ہے۔

صورت دو وجہ سے ناجائز ہے: (۱) سود کی وجہ سے، (۲) اور بیع فی الشرط کی وجہ سے، جبکہ وہ خود بیچ نہیں سکتا، اس بائع سے ہی بیچنا ہوگا، یہ شرط بیع کے خلاف ہے، لہذا یہ بیع فاسد ہے: "نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع وشرط"۔

جواب (۱۴): ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ پلاٹ قسطوں میں بیچ دیا جاتا ہے اور خریدار اس میں سے مثلاً پانچ یا آٹھ قسطیں ادا کر پاتا ہے، باقی قسطیں ادا کرنے کی گنجائش نہیں ہوئی، حالانکہ سودا ہو چکا ہوتا ہے، صرف قسطوں کی ادائیگی باقی تھی، لیکن کالونی بنانے والا اپنی طرف سے اس کو کینسل مانتا ہے، اب اگر بعد میں مشتری قسطیں ادا کرنا چاہے یا اپنی زمین کا مطالبہ کرے تو اس کو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ قسطیں وقت پر ادا نہیں ہوئیں، اس لئے آپ کا سودا کینسل ہو گیا، اور جتنی رقمیں قسطوں پر ادا کی گئی تھی اتنی رقم اس کو واپس کر دیا جاتا ہے، جبکہ اس نے جس وقت زمین خریدی تھی اس وقت اس کی قیمت بہت کم تھی اور اتنی ہی متعین ہوئی تھی، اب اس کی قیمت تقریباً پچاس گنا بڑھ چکی ہوتی ہے، ایسی صورت میں اگر واقعتاً وقت پر قسطیں ادا نہیں ہوئی تھی اور اس پر مشروط تھا تو بائع کو بیع کینسل کرنے کا حق ہوگا ورنہ نہیں، مذکورہ صورت میں یہ بیع درست ہے، چونکہ ایجاب وقبول سے سودا ہو چکا، صرف قسطیں ادا کرنا اور قبضہ باقی تھا، لہذا باقی قسطیں ادا کرنا ضروری ہے اور مبیع کو قانونی چارہ جوئی کر کے قبضہ میں لینا ہے، بائع اصل میں چالاک ومکار ہے اس کی پالیسی دھوکہ دینا ہے، لہذا اس کو مجبور کیا جائے گا کہ قسطیں قبول کرے اور مبیع پر قبضہ دے۔

جواب (۱۵، الف): دلال کا کالونی بنانے والے سے زمین کی قیمت معلوم کر کے پھر من مانی قیمت پر بیچ کر زائد روپے بطور دلالی لے لینا جائز نہیں ہوگا، دلال مالک سے اپنی دلالی وصول کر سکتا ہے، لیکن زمین کا وہ مالک نہیں، لہذا وہ بیچ کر زائد روپے لینے کا حق نہیں رکھتا۔

(ب): دلال کمپنیاں جو شکل سب سے زیادہ استعمال کرتی ہیں کہ وہ زمین بیچ دیتی ہیں، لیکن قبضہ نہیں دیتی ہیں اور خریدار کو کہہ دیتی ہیں کہ جب آپ کو بیچنا ہو تو آپ یہ زمین ہمیں ہی واپس کریں گے، کسی اور کو نہیں دے سکتے، یہ شکل درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہ بیع وشرط کے قبیل سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے۔

"نھی رسول اللہ ﷺ عن بیع وشرط"۔ نیز "قال فی التنویر فی بیان البیع الفاسد وبیع بشرط لا یقتضیہ العقد ولا یلائمہ وفیہ نفع لأحدھما أو لمبیع من أھل الاستحقاق ولم یجر العرف بہ ولم یرد الشرع بجوازہ کشرط أن یقطعہ ویخیطہ قباء أو یستخدمہ شھرًا أو یعتقہ الخ وفی الشامیۃ (قولہ مثال لما فیہ نفع للبائع) ومنہ ما لو شرط أن یھبہ المشتری شیئًا أو یقرضہ أو یسکن الدار الخ" (رد المحتار ۴/ ۱۳۶، احسن الفتاوی ۶/ ۴۷۸)۔

مذکورہ دلائل کی بنیاد پر یہ شکل بیع کی درست نہیں۔



مختلف اراضی کی خرید و فروخت اور اس سے متعلق جدید مسائل

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی[1]

موضوع سے متعلق درپیش سوالات اوران کے جوابات۔

جواب۔۱: قال اللہ تعالی:

"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللهَ اِنَّ اللهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" (سورۃ المائدۃ: ۲) (نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب سخت ہے)۔

صورت مسؤلہ میں مذکورہ آیت کی روشنی میں علم ہونے کے باوجود غیر قانونی زمین خریدنا گویا تعاون علی الاثم ہے جو کہ ایک مسلمان کے لئے کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

جواب۔۲: قال رسول اللہ ﷺ: "إن الحلال بين وإن الحرام بين وبينهما مشتبهات لايعلمهن كثير من الناس فمن اتقى الشبهات فقد استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام" (متفق عليه)

(یقینا حلال اور حرام واضح ہے، ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں، جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے، جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ جاتا ہے تو وہ اپنے دین اور عزت وآبرو کی حفاظت کرلیتا ہے اور جو مشتبہ چیزوں میں گھر جاتا ہے حرام میں پھنس جاتا ہے)۔

صورت مسؤلہ میں مذکورہ حدیث شریف کی روشنی میں مغصوبہ زمین کا خریدنا ناجائز ہوگا، وقف کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کو واقف کی نیت کے خلاف استعمال کرنا شرعا درست نہیں ہے۔

جواب۔۳: صورت مسؤلہ میں حق وراثت کی شرعی تقسیم نہیں کرنا ظلم وزیادتی ضرور ہے، ظلم کرنے والے عند اللہ مسؤل ہوں گے لیکن ایسی موروثی زمین جس میں ظلم ہوا ہو، حقدار کو حق نہ دیا گیا ہو اس کا خریدنا اس شخص کے لئے درست ہوگا جو حقیقت سے ناواقف ہے، ورنہ جو شخص واقف ہو پھر بھی ایسی زمین کو خریدتا ہو تو اس کے لئے جائز نہ ہوگا، بلکہ تعاون علی الاثم شمار ہوگا جو کہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللهَ اِنَّ اللهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" (سورۃ المائدۃ: ۲)۔

جواب۔۴: مذکورہ صورت میں جو لوگ ان حالات سے واقف ہوں کہ بیچنے والے کی آمدنی حرام تھی تو ایسی صورت حال میں خریدنے والے کے لئے وہ زمین خریدنا جائز ہوگا، البتہ حرام کمائی کمانے والا عند اللہ ضرور مسؤل ہوگا۔

جواب۔۵: قانون کی اطاعت واجب ہے جہاں قانون خلاف شریعت نہ ہو، چوں کہ پلاٹ بنانے کے لئے جو اصول بنائے گئے ہیں درحقیقت مفاد عامہ کی خاطر ہی بنائے گئے ہیں، جس میں سب کا فائدہ ملحوظ رکھا جاتا ہے، لہذا ایسے قوانین کی پابندی کرنا عوام پر واجب ہے۔

جواب۔۶: صورت مسؤلہ میں خلاف قانون مسجد بنانے کا یہ عمل صحیح نہیں ہے، گارڈن بنانے اور پلے گراؤنڈ بنانے کے بجائے مسجد بنانا ایک حیلہ ہے جو درست نہیں ہے، نیز اس مسجد کو شرعی مسجد کا نام نہیں دیا جاسکتا، مسجد تو وہ ہوتی ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے بنائی گئی ہو، حلال کمائی سے بنائی گئی ہو، زمین مسجد ہی کے لئے خریدی اور وقف کی گئی ہو، تاقیامت اس میں تغییر اور تبدیل یا بیچنے کی کسی کو اجازت نہ ہو، مذکورہ زمین بیچنے والا مسلمانوں کو لبھانے کے لئے گارڈن کی بجائے مسجد کے لئے جگہ دے رہا ہے درحقیقت یہ ایک دھوکہ ہے، شرعا یہ عمل جائز نہیں ہے۔

[1] استاذ ومفتی جامعہ دار السلام، عمرآباد۔

جواب۔۷: صورت مسؤلہ میں از روئے شرع قانون کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، ہمیں معروف کے ہر کام میں اولوالامر کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا، خلاف قانون کالونی بنانا درست نہیں ہے، مسلم قوم کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ مذکورہ طریقہ سے کالونی آباد کرے۔

جواب۔۸: صورت مسؤلہ میں جہاں تک ہوسکے قانون کی پاسداری کی جائے، حرام کاموں سے بچا جائے، سودی کاروبار سے یا لین دین سے بچنا اہم ضروری ہے لہٰذا غیر قانونی کاموں سے بچتے ہوئے صحیح طریقہ اپنانا ہی صحیح معلوم ہوتا ہے، خواہ بظاہر کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔

جواب۔۹: صورت مسؤلہ میں صرف پلاٹ نمبر کی تعیین سے مبیع متعین نہیں ہوجائے گی اور خرید وفروخت کا یہ عمل درست نہ ہوگا، بلکہ یہ بیع عقد مجہول شمار ہوگا، لہٰذا پلاٹ نمبر کے ساتھ ساتھ زمین کی نشاندہی بھی ضروری ہے تاکہ دھوکہ نہ ہو۔

جواب۔۱۰: صورت مسؤلہ میں از روئے شریعت زمین کے جو حصے بیچے گئے ہیں، اس پر بیچنے والا کاشت بھی کرتا رہتا ہو، تو اس کے باوجود خریدار مبیع کا مالک ہوجائے گا، کیونکہ موجودہ دور میں رجسٹریشن قبضہ کی دلیل ہے، البتہ بیچنے والے کو چاہئے کہ زمین پوری طرح خریدار کے حوالہ کردے، بیچنے کے بعد خریدار کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا تصرف نہ کرے، کیونکہ کسی کی ملکیت میں اجازت کے بغیر تصرف کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

جواب۔۱۱: صورت مسؤلہ میں پلاننگ کرنے والے کا پلاٹ بیچنا اور پھر اس سے پلاٹ خریدنے والے شخص کا اگلے شخص کو قبضہ کے بغیر بیچ دینا ناجائز ہوگا، نیز بیع کے اصول کی خلاف ورزی صحیح نہیں ہے یعنی بیع میں مبیع کو بیچنے سے قبل مبیع پر قبضہ شرط ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لا تبع مالیس عندک" (رواہ اصحاب السنن) (جو چیز تمہارے قبضہ میں نہ ہو اسے نہ بیچا کرو)، لہٰذا مذکورہ معاملہ خلاف شریعت ہے، جو جائز نہیں ہے۔

جواب۔۱۲: صورت مسؤلہ میں مذکورہ بیع اسلامی اصولوں کے برخلاف ہے، یعنی مبیع کو فروخت کرنے کے باوجود سارے اختیارات بائع اول کے پاس ہی رہیں یا دلال فروخت کرنے کے باوجود ملکیت بیع وشراء اپنے پاس ہی رکھے اور مشتری کو دوبارہ بیع کا اختیار نہ دے، بلکہ مشتری دلال سے ہی رجوع کرے، یہ صورت بیع وشراء میں شرعاً درست نہیں ہے۔

جواب۔۱۳: مذکورہ مسئلہ میں بیع کے بعد مشتری کو سارے اختیارات منتقل ہونی چاہئے، یعنی وقف، بیع اور ہبہ کرنے وغیرہ کے سارے اختیارات خریدار کو پہنچنی چاہئے، ورنہ یہ بیع فاسد ہے، اس صورت میں پلاٹ خریدنے والے کی ملکیت زمین پر ثابت ہوگی اور کالونی بنانے والے کا مذکورہ طریقہ غیر اسلامی تصور کیا جائے گا، کالونی بنانے والے کے اختیارات پلاٹس بیچ دینے کے ساتھ خریدار کے لئے منتقل ہوجائیں گے۔

جواب۔۱۴: قال اللہ تعالی: "وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (سورۃ البقرۃ: ۲۸۰)
(اور اگر قرض لینے والا تنگدست ہو تو (اُسے) وسعت (کے حاصل ہونے تک) مہلت (دو) اور اگر (زرقرض) بخش ہی دو تو تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو)۔

"عن جابر رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال رحم اللہ رجلا سمحا إذا باع وإذا اشتری وإذا اقتضی" (البخاری، حدیث نمبر: ۲۰۷۶) (اللہ تعالی اس نرم آدمی پر رحم فرمائے جب وہ بیچتا ہے اور خریدتا ہے اور جب وہ تقاضہ کرتا ہے)۔

صورت مسؤلہ میں مذکورہ بالا نصوص کی روشنی میں تنگ دست کو ضرور موقع دیا جائے، تاکہ بقیہ قسطیں ادا کرنے پر قدرت رکھ سکے، معاملات کے باب میں کچھ نہ کچھ فراخدلی اور ہمدردی کی ضرورت ہے، نیز دوسری صورت یہ بھی ہے کہ اگر خریدار نے نصف سے زائد قسطیں ادا کردیا ہو تو اسی کے حساب سے اس مقدار کا مالک بنادیا جائے اور اس حصہ کی رجسٹری ہوجائے، باقی حصہ بائع اپنے اختیار سے تصرف کرلے تو بہتر ہے۔

جواب۔۱۵، الف: دلال وکیل ہے بیچنے والے کا، اگر دلال بیچنے والے کی اجازت کے ساتھ زائد رقم سے فروخت کرے تو جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔

جواب۔ب: جب دلال کمپنیاں زمین بیچ دیتی ہیں اور قبضہ نہیں دیتی ہیں تو یہ بیع کے اصول کے خلاف ہے، اصول یہ ہے کہ بیع کے ساتھ شرط نہ ہو، بیع کے ساتھ مبیع پر قبضہ مشتری کے لئے ہو، اور مالکانہ اختیارات خریدار کے لئے مخصوص ہوں، لہٰذا ہر وہ شرط جو کتاب وسنت کے موافق نہ ہو جائز نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل وإن کان مائة شرط" (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۱۶۸) (جو شرط قرآن کریم کے موافق نہ ہو جائز نہیں ہے، خواہ وہ سو شرطیں کیوں نہ ہوں۔

ھذا ما تبین لی واللہ اعلم بالصواب

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل اور ان کے دلائل

مولانا ابوبکر قاسمی[1]

اللہ رب العزت نے انسانوں کی دنیاوی ضروریات وخواہشات کی تکمیل کے لئے زر، زن، زمین جیسی اشیاء کو پیدا فرمایا ہے، جن میں زمین انسان کا جہاں مسکن ہے وہیں مدفن بھی ہے، علاوہ ازیں یہ زمین انسان کا معمل بھی ہے، چنانچہ اس زمین پر انسان سکونت اختیار کر کے اچھا یا برا جو کام بھی کرتا ہے قیامت کے دن یہ زمین اس کی گواہی دے گی، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "یومئذ تحدث أخبارھا" (سورہ زلزال: ۴)۔

اس لئے ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالی کی پیدا کردہ اس زمین پر رہ کر نیکی کا کام کرے، برائی کے کاموں سے بچے، اب رہی زمین کی ملکیت کا مسئلہ تو قرآن کریم نے باوجود یکہ "والأرض وضعھا للأنام" فرمایا ہے، لیکن اس سے شخصی ملکیت کی نفی نہیں ہوتی، کیونکہ قرآن کی دیگر آیات میں اللہ تعالی نے اسی دنیاوی زمین میں انسانوں کی خلافت ووراثت اور زمین کی پیداوار سے انفاق کا ذکر کیا ہے جو شخصی ملکیت کی واضح دلیل ہے، نیز حدیث وفقہ کے مختلف ابواب میں مزارعت ومساقات اور ارض موات کے مسائل ذکر کئے گئے ہیں جو شخصی املاک کے واضح دلائل ہیں، خود آئین بھارت کی دفعہ ۳۰۰ میں شخصی ملکیت کی تسلیم کر کے باشندگان ہند کو اس کی خرید وفروخت کی اجازت دی گئی ہے، لہذا زمین کی خرید وفروخت سے متعلق سوالات کے جوابات کیا ہوں گے ان کا حل اصول شریعت کو ملحوظ رکھ کر کرنا زیادہ مناسب ہوگا، والحق أحق أن یتبع۔

(۱) عام اراضی پر قبضہ کر کے فروخت کرنا:

جو اراضی مساجد ومدارس یا اوقاف کی نہ ہوں، نہ کسی شخص خاص کی مملوکہ ہوں تو ایسی اراضی پر قبضہ کر کے اور اپنے نام کا پٹہ بنوا کر اس کو فروخت کرنا شرعاً درست ہے، "قال النبی ﷺ: من عمر أرضاً لیست لأحد فھو أحق بھا" (الفقہ الاسلامی ۳۳۳/۵، رواہ البخاری عن عائشہ بلفظ "من أعمر" حدیث: ۲۳۳۵، وفی حدیث آخر: "من أحیا أرضاً میتة فھی لہ"، رواہ الترمذی وصححہ وقد رواہ ثمانیة من الصحابة) (جس شخص نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی کی مملوکہ نہ ہو تو وہ آباد کرنے والا اس کا زیادہ حقدار ہے)۔

(۲) مدارس ومساجد کی موقوفہ اراضی کو فروخت کرنا:

مدارس ومساجد پر جو اراضی وقف ہوں ان کو قبضہ کر کے فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، قدوری کی کتاب الوقف میں ہے:

"وإذا صح الوقف لم یجز بیعه ولا تملیکه اھ وقال فی ہامشه لحدیث مرفوع فی الصحیحین تصدق بأصلھا لا یباع ولا یورث ولا یوھب الخ" (قدوری مطبوعہ رحیمیہ دیوبند/ ۱۴۱، وفی کتاب الوصایا للامام البخاری فی صحیحه فی حدیث صدقة عمر. قال النبی ﷺ: "تصدق بأصله لا یباع ولا یوھب ولا یورث" (حدیث: ۲۷۶۴)۔

(۳) جن اراضی کی شرعی ورثہ کے درمیان تقسیم عمل میں نہ آئی ہو ان کے بعض ورثہ سے زمین کا خرید کرنا:

جن زمینوں کو ان کے شرعی ورثہ کے درمیان تقسیم نہیں کیا گیا، اگر ان کے مستحقین ورثہ زندہ ہوں تو ایسی صورت میں ان اراضی کے جو شرعی مالک ہوں یا جو شرعی حصہ دار ہوں ان کی زندگی میں اصل مالک اور شرعی حصہ دار ہی سے خریدا جائے، لیکن ان کی وفات کے بعد جو بعض ورثہ قابض ہوں ان

---

[1] مہتمم جامعہ رحیمیہ اسلام آباد، رحمت نگر، دربھنگہ، بہار۔

کو اصل مالک تسلیم کر کے صرف قابض ورثہ سے بھی پوری زمین خریدی جاسکتی ہے، کیونکہ بعض ورثہ کی وفات کے بعد بعض زندہ ورثہ کا قبضہ ظاہراً ملکیت کی دلیل ہے،

"قال النبی ﷺ: من أحاط حائطا علی أرض فهی له" رواه أحمد وأبوداؤد عن جابر ومثله عن سمره بن جندب، عن زيد بن أسلم مرفوعًا من حاز شيئًا علی خصمی عشر سنين فهو أحق به منه، وفی رواية من سبق إلی ما لم يسبقه إليه فهو له" (الفقه الاسلامی وادلته۹/ ۷۵)۔

نیز شیخ وہبہ زحیلی نے عقد بالمعاطاۃ پر بحث کرتے ہوئے بیع اجارہ، اعارہ، ہبہ اور رجعت کو بطور معاطاۃ کے جائز قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹ /۱۰۱)۔

(۴) حرام آمدنی سے خریدی گئی زمین کو اس کے مشتری مالک سے جان بوجھ کر خریدنا:

حرام آمدنی سے خریدی گئی زمین کو جان بوجھ کر اس کے خریدار بائع سے خریدنا شرعاً جائز ہے، کیونکہ حضرات فقہاء احناف نے بیع بالثمن الحرم کو فاسد قرار دیا ہے جو بعد القبض موجب ملک ہے، لہٰذا جب بائع اس کا مالک ہے تو اس کے لئے اس کا فروخت کرنا جائز ہے، فافہم، واللہ اعظم۔

(۵) لے آوٹ منظور شدہ اراضی میں سڑک یا مسجد کی اراضی کو فروخت کرنا اور اس کے خریدنے کا حکم:

سرکاری قانون کے مطابق لے آوٹ منظور شدہ اراضی میں سڑک یا مسجد سے متعلقہ اراضی کو جان بوجھ کر فروخت کرنا اور علم رکھتے ہوئے اس کا خریدنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کی نوعیت وقف اراضی کی ہے جس کی خرید وفروخت اور ہبہ فقہاء نے ناجائز لکھا ہے، واللہ اعلم۔

شیخ وہبہ زحیلی نے لکھا ہے: "ما لا يقبل التمليك والتملك بحال وهو ما خصص للنفع کا لطرق العامة والجسور والحصون... الخ" (الفقه الاسلامی وادلته۹/ ۶۴)۔

(۶) لے آوٹ منظور شدہ اراضی میں گارڈن کی جگہ مسجد تعمیر کرنا:

سرکاری قانون کے مطابق لے آوٹ منظور شدہ اراضی میں گارڈن کی جگہ مسجد تعمیر کرنا درست ہے، کیونکہ ایک مسلمان کے نزدیک اس کے پسندیدہ مذہب کی رو سے گارڈن سے زیادہ مفید اس کے حق میں تعمیر مسجد ہے، چنانچہ سیدنا ابوبکرؓ نے ہجرت سے قبل مکہ میں رہتے ہوئے اپنی رہائش کے سامنے گھر کے صحن پر ایک مسجد تعمیر کی تھی جس میں وہ نماز پڑھا کرتے تھے، نیز قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

"عن عائشة فی حديث الهجرة ثم بدأ لأبی بكر فابتنی مسجدًا بفناء داره فكان يصلی فيه ويقرأ القرآن" (رواه البخاری کتاب الصلاة، باب المسجد يكون فی الطريق من غير ضرر بالناس، حديث: ۴۷۶ و ۲۲۹۷، ۳۹۰۵)۔

(۷) کسی زمین کو بحیثیت کالونی منظور کرانے سے قبل کالونی بنا کر پلاٹ فروخت کرنا:

کسی زمین کو بحیثیت کالونی منظور کرانے میں اگر اخراجات زیادہ آتے ہوں، اس لئے اس سے بچنے اور غریبوں کو سستی زمین مہیا کرانے کی خاطر بغیر کالونی منظور کرائے ہوئے از خود کالونی بنا کر پلاٹ فروخت کرنا شرعاً درست ہے، قال اللہ تعالیٰ: "يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (سورہ بقرہ: ۱۸۵)، فقہاء کے اصول ہیں: "المشقة تجلب التيسير" (ملاحظہ ہو: الاشباہ والنظائر، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۹ /۵۳۱)۔

(۸) نقد رقم دے کر اراضی حاصل کرنے میں دشواری کی صورت میں لون لے کر زمین خریدنا شرعاً درست ہے:

وہائٹ منی دے کر نقد خریدنے میں اگر دشواری کا سامنا ہو تو ایسی صورت میں لون لے کر آسان قسطوں پر پلاٹ حاصل کر کے مکان کا مالک بننا شرعاً درست ہے۔

(۹) زمین پر پلاٹ بنانے سے قبل مجوزہ نقشہ بنا کر زمین فروخت کرنے کی شرعی حیثیت:

زمین پر پلاٹ بنانے سے قبل اس کا مجوزہ نقشہ بنا کر زمین فروخت کرنا اور صرف پلاٹ نمبر متعین کر کے زمین بیچنا بھی شرعاً درست ہے، کیونکہ فقہاء نے زمین کی خرید وفروخت میں بیع قبل القبض کو بھی جائز لکھا ہے، واللہ اعلم۔

(۱۰) فروخت شدہ اراضی پر قدیم بائع کا کاشت کرنا نئے خریدار کی اجازت پر موقوف ہوگا:

اگر کسی فروخت شدہ زمین پر اس کا قدیم مالک نئے خریدار کی اجازت کے بغیر کاشت کرتا ہے تو یہ شرعاً درست نہیں ہے، ہاں نئے خریدار کی اجازت سے بطور مزارع کے یا بطور اجیر کے کاشت کرتا ہے تو شرعاً اس کا یہ عمل درست ہوگا ورنہ نہیں۔

''قال النبی ﷺ: لا یحل مال امرئ إلا بطیب نفس منه'' (رواه البیهقی، مشکوۃ/ ۲۵۵)۔

(۱۱) پلاٹ خریدنے والے کا صرف کاغذی نقشہ کی بنیاد پر اپنی خرید کردہ اراضی فروخت کرنا:

پلاٹ خریدنے والے نئے خریدار کا اپنی خرید کردہ اور قبضہ کردہ اراضی کو فروخت کرنا تو بلا شبہ درست ہے، رہا بائع اول سے اسٹامپ پیپر پر مدت مقرر کر کے خریداری کا بیعانہ دیدینے اور قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کرنا، اگر کسی قانونی رکاوٹ کی وجہ سے غرر کا موجب ہو تو ایسی صورت میں معاملہ کی تکمیل سے پہلے اس قسم کی اراضی کا فروخت کرنا شرعاً جائز نہ ہوگا، کیونکہ حدیث نبوی ہے:

''لا ضرر ولا ضرار'' (ابن ماجه عن ابن عباس وعبادة بن الصامت، ابو اب الاحکام باب ۱۷ حدیث: ۲۳۶۲، ۲۳۶۳)۔

ایک دوسری حدیث ہے: ''من ضارّ أضرّ الله به'' (ابن ماجه، حدیث: ۲۳۶۴)۔

(۱۲) کسی زمین یا پلاٹ کو دلال کے ذریعہ خرید کر چھوڑ دینا اور بغیر رجسٹری کرائے ہوئے زبانی بیع در بیع کرنا:

کسی زمین کے پلاٹ یا کسی کالونی میں دلال کے ذریعہ کوئی قطعہ اراضی خرید کر بغیر رجسٹری کرائے ہوئے چھوڑ دینا اور پھر دلال ہی کے ذریعہ اس کی خرید وفروخت کرتے ہوئے بیع در بیع کرنا اور اصل مالک سے زمین کے کاغذات میں نام کا تبادلہ نہ کرنا شرعاً موجب غرر ہے، اس لئے شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ شیخ وہبہ زحیلی نے الفقہ الاسلامی وادلتہ کی نویں جلد کے صفحہ ۵۶ کے حاشیہ میں لکھا ہے:

''وهنالك أحكام قانونية تختلف بين العقار والمنقول: منها أن انتقال ملكية العقار لا يتم إلا بالتسجيل. أما المنقول فلا حاجة في نقل ملكيته إلى التسجيل اه'' (حوالہ بالا)، واللہ اعلم۔

(۱۳) کالونی بنانے والے کا پلاٹس کو قسطوار فروخت کرنے کی صورت میں خریدار کی ملکیت کا ثبوت کب ہوگا:

دور حاضر میں پلاٹس کو قسطوار فروخت کرنے کی صورت میں جب تک رجسٹری کے کاغذات میں خریدار کے نام کا قیالہ نہیں ہوجاتا قانونی طور سے ایسے پلاٹس پر خریدار کی ملکیت تسلیم نہیں کی جاتی ہے، لہذا بیع عقار اگرچہ عند الشیخین قبل القبض جائز ہے، تاہم دیانت وامانت کا تقاضا یہی ہے کہ کسی کو دھوکہ دیئے بغیر جب تک اصل بائع کی رضامندی نہ ہو خریدار کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی خرید کردہ اراضی کو کسی اجنبی شخص کے ہاتھ فروخت نہ کرے (حوالہ اوپر گذر چکا ہے)، واللہ اعلم۔

(۱۴) پلاٹس کی قسطوار فروختگی کی صورت میں شرائط بیع کو پورا نہ کرنے کی صورت میں بائع کا خریدار کو اس کی ادا کردہ رقم واپس کرنا:

کسی زمین کے مالک یا دلال نے کسی پلاٹس کو قسط مقرر کر کے فروخت کیا، لیکن خریدار طے کردہ شرائط کے مطابق وقت پر مقررہ قسط ادا نہ کر سکا جس کے سبب زمین کے مالک یا دلال نے خریدار کو اس کی ادا کردہ قسط والی رقم واپس کر دیا تو شرعاً ایسا کرنا درست ہے، چنانچہ ائمہ ثلاثہ نے بہ سبب افلاس کے عقد بیع کے فسخ کو درست مانا ہے، اور اس حدیث نبوی سے استدلال کیا ہے۔

''من أدرك ماله بعينه عند رجل أو إنسان قد أفلس فهو أحق به من غيره'' (رواه الشيخان عن أبي هريرة. وفي

روایة من وجه عین ماله عند رجل فهو أحق به یتبع البیع، أی البائع من باعه. رواه احمد وابو داؤد والنسائی عن سمرة بن جندب، تفصیل کے لئے الفقہ الاسلامی وادلتہ کی نویں جلد کے نظریۃ الفسخ کا مطالعہ کیا جائے)۔

البتہ حنفیہ کے یہاں خریدار کے مفلس ہونے سے بیع فسخ نہ ہوگی، البتہ اس کے تنگدست ہونے کے سبب اس کو مزید مہلت دی جائے گی۔

"قال الله تعالى: وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة" (سورہ بقرہ)۔

(۱۵) دلال کے ذریعہ زمین کی خرید وفروخت کی مختلف صورتیں:

ایک شخص کے پاس زمین ہے جس کو وہ بیچنا چاہتا ہے، لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ اس زمین کا گاہک (خریدار) تلاش کرے اس لئے وہ اپنی اراضی کی فروختگی کے لئے دلال تلاش کرتا ہے جو بائع ومشتری کے درمیان واسطہ بن کر زمین کو فروخت کرواتا ہے اور دلال بائع سے زمین کی اصل قیمت معلوم کر کے اپنی من مانی قیمت پر خریدار کے ہاتھ فروخت کرتا ہے اور دور حاضر میں خریدار کو دلال ہی کے قول پر اعتماد بھی ہوتا ہے اور فریقین کی رضامندی ہی سے بیع وشراء کا معاملہ طے ہوتا ہے، لہذا اس طرح معاملہ کرنا شرعاً درست ہے، فقہاء نے دلالی کے معاملہ کی تعبیر فقہ کی اصطلاح میں سمسرۃ سے کیا ہے، شیخ وہبہ زحیلی نے الفقہ الاسلامی وادلتہ کی چوتھی جلد میں عقود کی بحث میں بیع السمسرۃ کا حسب ذیل عبارت میں تعارف پیش کیا ہے۔

"السمسرة هي الوساطة بين البائع والمشتري لإجراء البيع والسمسرة جائزة والآجر الذي يأخذه السمسار حلال لأنه أجر على عمل وجهد معقول" (حوالہ بالا/ ۱۳۹)۔

دلال کا زمین کو خریدار سے فروخت کر کے قیمت وصول کرنے کے باوجود زمین پر قبضہ نہ دلانا اور خریدار کے فروخت کرنے کی صورت میں دلال ہی کے ہاتھ فروخت کرنے کی شرط لگانا سراسر ظلم وعدوان ہے، حدیث نبوی ہے: "مطل الغنی ظلم" (بخاری عن ابی ہریرۃ حدیث: ۲۴۰۰)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

......☆......

پلاٹ وزمین کی بیع وشراء سے متعلق چند مسائل

ڈاکٹر محی الدین غازی[1]

تمہید:

شریعت نے خرید وفروخت کے سلسلے میں یہ ضابطہ دیا ہے کہ کوئی چیز اس وقت تک فروخت کرنے والا فروخت نہ کرے جب تک وہ چیز اس کی ملکیت اور اس کے قبضے میں نہ آجائے، اس ضابطے کے ذریعہ سب سے پہلے اس شخص کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے، جو رقم ادا کر کے خریدار بنتا ہے۔

ہندوستان میں زمین وجائیداد کی خرید وفروخت کی صورت حال کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس ضابطے کی خلاف ورزی بہت زیادہ ہے، اور اس کے برے نتائج بھی بہت زیادہ ہیں، دوسری چیزوں کے مقابلے میں زمین کی خرید وفروخت میں اس ضابطے پر زور دینا اس لئے بہت ضروری ہے کہ زمین خریدنے کے بعد اگر خریدار کو قانونی قبضہ نہیں مل سکے، تو اس کا بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے، اور اس سلسلے کے نزاعات بہت طول پکڑتے ہیں۔

زمین کی ملکیت اور قبضے کے سلسلے میں اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا محض شرعی ملکیت جو ایجاب وقبول سے حاصل ہو جاتی ہے، اور شرعی قبضہ جو محض تخلیہ سے حاصل ہو جاتا ہے، کافی ہے؟

متعدد واقعات کے جائزے کے بعد راقم کی یہ رائے بنی ہے کہ جب تک شرعی ملکیت اور شرعی قبضے کے علاوہ قانونی ملکیت اور قانونی قبضہ بھی حاصل نہ ہو جائے، اپنی خریدی ہوئی زمین کسی دوسرے کو فروخت کرنا درست نہیں ہونا چاہئے، ایسی زمین کو فروخت کرنا درست نہیں ہونا چاہئے جس پر قانونی طور سے خود بائع کو ملکیت اور قبضہ حاصل نہیں ہو، اور ایسی زمین کو بھی نہیں جو خریدار کو قانونی ملکیت اور قانونی قبضہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔

اس تمہید کے بعد سوالوں کے مختصر جوابات پیش ہیں:

جواب۔۱: سرکاری زمین پر قبضہ کرنے کا حکم تو واضح ہے کہ ایسا کرنا ناجائز ہے، اس قبضہ کو قانونی شکل دینے کے لئے رشوت وغیرہ جیسے غیر اخلاقی طریقے اختیار کرنا بھی غلط اور ناجائز ہے، لیکن اگر وہ قانونی لحاظ سے اس کے باقاعدہ مالک ہو جاتے ہیں، اور خود سرکاری قانون کی رو سے وہ قابض اور غاصب کے حکم میں نہیں ہوتے ہیں، اور ان سے زمین خریدنا خود سرکار کی نظر میں غیر قانونی عمل نہیں ہوتا ہے، تو ان سے زمین خریدنے، یا خرید چکے لوگوں سے خریدنے میں کوئی شرعی ممانعت معلوم نہیں ہوتی ہے، لیکن چونکہ تعاون علی الاثم کا عنصر اس شکل میں نظر آتا ہے، اس لئے اصل قابضین سے خریدنے کے سلسلے میں پرہیز بہتر ہے۔

جواب۔۲: زمین کے دور افتادہ ہونے یا غیر مسلموں کے قبضہ کر لینے کے اندیشے یا غیر مفید ہونے کے احساس سے اس کا جواز نہیں ملتا ہے کہ اس وقف کی زمین پر کچھ مسلمان قابض ہو جائیں، اور ایسی صورت میں جانتے بوجھتے ان سے وہ زمین خریدنا کسی کے لئے جائز نہیں ہوگا۔

البتہ اگر کسی وقف کو غیر محفوظ اور غیر موزوں مقام سے محفوظ اور مناسب مقام پر منتقل کرنے کے نیک ارادے سے اور مسلمانوں کے اجتماعی مشورے سے اور قابل اعتماد لوگوں کی نگرانی میں ایسی زمینوں کو فروخت کیا جاتا ہے، تو انہیں خریدنے کی گنجائش سمجھ میں آتی ہے۔

جواب۔۳: وراثت میں حق نہیں دینے والے پر اس ظلم کا گناہ عائد ہوگا، اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، اسے تسلیم کر لینے کے بعد یہ دیکھنا چاہئے

[1] ممبر مجمع فقہاء الشریعۃ (امریکہ)، عمید کلیۃ القرآن الجامعۃ الاسلامیہ شانتاپرم (کیرالہ)۔

کہ وراثت کے حق داروں کی طرف سے کوئی دعوی یا مقدمہ ہے یا نہیں ہے، مقدمہ یا دعوی ہونے کی صورت میں تو ایسی زمین کا خریدنا بالکل درست نہیں ہے، البتہ مقدمہ یا دعوی نہیں ہونے کی صورت میں اگر قانونی لحاظ سے زمین فروخت کرنے والا اگر اس زمین کا باقاعدہ مالک ہے، اور قانونی طور سے فروخت کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے، مطلب جن لوگوں کا حق اس میں شامل ہے، ان کی طرف سے کوئی دعوی یا مقدمہ موجود نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس سے زمین خریدنا تو شرعا جائز ہوگا، البتہ جن لوگوں کا اس زمین میں جتنا حصہ تھا، اسی تناسب سے ان کا حصہ فروخت کے ذریعہ حاصل شدہ رقم میں رہے گا، اور وہ جب تک دوسروں کا حصہ بیچ دینے والا اس رقم میں سے ان کا حصہ ادا نہیں کرتا ہے، اس کا ذمہ مشغول رہے گا، اور وہ غاصب کے حکم میں رہے گا۔

البتہ اس سلسلے میں یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اگر حق داروں کو ان کا حصہ لوٹانا ضروری ہے تو کتنی نسلوں تک کے حقوق لوٹانا ضروری ہوں گے، یعنی یہ سلسلہ والد، دادا، اور پردادا تک جائے گا یا سلسلہ نسل آگے بڑھ جانے کے بعد کسی مرحلے پر یہ وجوب ختم ہوجائے گا؟

جواب۔ ۴: حرام آمدنی سے کسی نے زمین خریدی ہو، اور پھر فروخت کررہا ہو، تو اس سے وہ زمین خریدنا جائز ہوگا، البتہ اس زمین کے فروخت کرنے سے حاصل شدہ رقم اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، بلکہ جس طرح آمدنی حرام تھی، اس سے خریدی ہوئی زمین بھی حرام رہے گی، اور پھر اسے فروخت کرکے جو قیمت کی رقم اسے ملے گی وہ بھی حرام ہی رہے گی، جس شخص نے اپنی حلال آمدنی سے اس کی زمین خریدی، اس کے لئے وہ زمین حلال رہے گی۔

جواب۔ ۵: ایسا کرنا معاہدہ شکنی، دھوکہ اور خیانت ہے، کالونی کے نقشے پر پلاٹس کے علاوہ جو جگہ بھی چھوڑی گئی ہو، اور جسے دکھا کر پلاٹوں کی مارکیٹنگ کی گئی ہو، ایسی کسی بھی جگہ کو یا اس کے کسی حصہ کو بیچ دینا شرعا ناجائز ہے، اور اخلاقی لحاظ سے نہایت قبیح جرم ہے۔

جواب۔ ۶: اس میں تحقیق کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا گارڈن کی جگہ مسجد بنادینے سے حکومت کی طرف سے عائد کردہ گارڈن کی شرط کی خود حکومت کی نگاہ میں تکمیل ہوجاتی ہے، اگر ایسا ہے اور اس نے پلاٹ خریدنے والوں کا گارڈن کے بجائے مسجد ہی دکھائی، اور حکومت نے اس مسجد کا گارڈن کے متبادل کے طور پر تسلیم بھی کرلیا تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لیکن اگر حکومت کی نگاہ میں گارڈن کی جگہ پر مسجد بنانا معاہدہ کی خلاف ورزی ہے، تو پھر وہاں مسجد بنانا درست نہیں ہوگا، صحیح طریقہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی کالونی بنانے والے مسجد کے لئے بھی جگہ چھوڑیں اور گارڈن کے لئے بھی جگہ چھوڑیں، کیونکہ گارڈن جس طرح غیر مسلم کالونی میں صحت مند ماحول کے لئے مفید ہے، اسی طرح مسلم کالونی کے لئے بھی مفید اور مطلوب ہے۔

جواب۔ ۷: راقم کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے، اس پورے عمل کے محرکات میں حالات کا جبر بھی شامل ہے، اہل حل وعقد نے تمدن اور سکونت کی صورت گری اس طرح کی ہے کہ لوگ شہروں کی طرف کوچ کرنے اور کسی بھی طرح بس جانے پر مجبور ہیں، غرض موجودہ حالات میں یہ بسنے اور بسانے کا اضطراری عمل ہے، اس لئے اس سلسلے میں کوئی فتوی جاری کرنا مناسب نہیں ہے۔

جواب۔ ۸: سوال میں مذکور یہ بات وضاحت طلب ہے کہ وہائٹ منی کو بڑی مقدار میں دکھانا دشوار ہے، کیونکہ یہ بات بلیک منی کے بارے میں تو کہی جاسکتی ہے، لیکن وہائٹ منی کے بارے میں اس لئے نہیں کہی جاسکتی کہ وہائٹ منی کہتے ہی اسے ہیں، جو حکومت کے ریکارڈ میں ہو، ہاں ٹیکس سے بچنے کے لئے کاروباری لون لینے کی ضرورت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

چونکہ کاروباری ضرورتوں کے لئے لون لینے کی حاجت کا تعلق صرف زمین کے کاروبار سے نہیں بلکہ ہر کاروبار سے ہے، اس لئے یہاں بھی وہی موقف اختیار کرنا چاہئے جو عمومی طور سے ہر کاروباری لون کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے۔

جواب۔۹: شرعاً یہ ضروری ہے کہ پلاٹ کا نقشہ بنایا جائے، ہر قطعہ کا نمبر ہو، اور بائع اس نمبر کا التزام کرے، اور اسے فروخت کرنے کے بعد اس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرے، اگر نقشہ بن جاتا ہے اور ہر قطعہ کا نمبر بھی متعین ہو جاتا ہے، اور اس کی بنیاد پر بیع ہو جاتی ہے، تو شرعاً اس کی گنجائش نہیں رہتی ہے کہ بائع اپنی طرف سے کوئی ردوبدل کرے، اس لئے بیع کو درست مانا جائے، اور بیع کے بعد بائع کے اس طرح کے تصرفات کو ناجائز قرار دیا جائے۔

جواب۔۱۰: اگر بیچنے والا خریدار کی مرضی سے کاشت کر رہا ہے، تو ملکیت اور قبضے کے عمل میں یہ عمل مانع نہیں ہوگا، البتہ اگر خریدار کی مرضی شامل نہیں ہے، تو یہ عمل قبضہ میں مانع سمجھا جائے گا۔

جواب۔۱۱۔الف: جس زمین کو خریدا اور بیچا جائے، اس کے حدود اربعہ کا تعین ضروری قرار پانا چاہئے، اس کے بغیر فروخت میں غرر کثیر لازم آتا ہے۔

جواب۔ب: اس صورت میں پلاٹنگ کرنا اور دوسروں کو بیچنا قطعاً جائز نہیں ہے، یہ صورت "بیع ما لا یملک" کی ہے، اور اس کے مفاسد اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے یہ بیع ہرگز جائز نہیں ہوسکتی ہے۔

جواب۔۱۲: زمین کی تجارت کی یہ شکل درست نہیں ہے، اس صورت کے مفاسد بہت زیادہ ہیں، اور اس میں نزاعات کے امکانات بہت زیادہ پائے جاتے ہیں، ملکیت منتقل نہ ہونا، قبضہ نہ ملنا، تصرف کا حق نہ ملنا، اصل مالک کا مجھول ہونا، اصل مبیع کا مجھول ہونا، غرض جہالت اور دیگر موانع بیع کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے۔

جواب۔۱۳: اس طرح کی پابندی حق ملکیت سے مناسبت نہیں رکھتی ہے، لیکن بہر حال یہ ایسی شرط نہیں ہے جو بیع کے موانع میں شمار ہو۔

جواب۔۱۴: بیع ہو جانے کے بعد ملکیت مکمل طور سے خریدار کے پاس منتقل ہو جاتی ہے، قطع نظر اس کے کہ قیمت کی ادائیگی کب ہوتی ہے، البتہ اگر خریدار وقت پر قیمت کی ادائیگی نہیں کرتا ہے، اور بائع نے بطور رہن وہ زمین اپنی تحویل میں لی ہوئی ہے، تو پھر دین اور رہن کے احکام لاگو ہوں گے، اور بائع کو صرف اس کا حق ہوگا کہ اس زمین کو حسب ضابطہ رہن بیچ دیا جائے، بائع اس کی قیمت سے بقیہ قسطیں وصول کر لے، اور باقی قطعہ زمین یا باقی رقم خریدار کو لوٹا دی جائے، واضح رہے کہ قیمت کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں بقیہ زمین کو بیچنے کے بارے میں بھی مال مرہون کو بیچنے کے سلسلے میں طے شدہ ضابطوں کی پابندی ضروری ہوگی۔

جواب ۱۵، الف: اگر دلالی کی اجرت یہ طے ہوئی ہو کہ متعین قیمت سے زیادہ جو بھی رقم قیمت فروخت سے بچ جائے وہ دلالی کی اجرت ہے، تو اس میں اس کے علاوہ کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اجرت قدرے مجھول ہے۔

جواب۔ب: دو صورتیں ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ قانونی طور سے زمین بیچنے والی کمپنی کے نام رہے، اور محض سکونت کا حق ملے، تب تو ایسی مشروط بیع بالکل جائز نہیں ہوگی، کیونکہ یہ شرط مقتضائے عقد بیع کے خلاف ہے، اور اس لئے ایسی مشروط بیع کو جائز نہیں ہونا چاہئے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قانونی طور سے خریدار مالک ہو جائے، اس کو قبضہ بھی مل جائے، لیکن الگ سے خریدار بائع کی اس شرط کو بھی منظور کر لے کہ وہ کسی اور کو یہ زمین فروخت نہیں کرے گا، ایسی صورت میں بھی یہ شرط مقتضائے عقد بیع کے خلاف ہی ہے، لیکن اس قدر نہیں جتنا کہ پہلی صورت میں ہے، تحقیق طلب امر یہ بھی ہے کہ دوسری صورت میں قبول کی جانے والی مذکورہ شرط قانونی طور سے کس قدر لازم اور ناقابل نقض ہوتی ہے؟ قانونی طور پر قابل نقض ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ بیع جائز ہوسکتی ہے، وہ بھی قاعدہ ضرورت کے تحت۔

☆

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق جوابات

قاضی محمد ذکاء اللہ شبلی[1]

۱۔ خریدار کے ساتھ یہ صریح دھوکہ ہے، معلوم ہونے کے باوجود خرید وفروخت درست نہیں۔

۲۔ شرعاً ناجائز وحرام ہے، البتہ اگر وقف بورڈ کا کرایہ دار بن جائے تو درست ہوگا۔

۳۔ اگر تمام وارثین اتفاق سے فروخت کریں تو درست ہوگا۔

۴۔ خریدار کے لئے سودا کرنا درست ہے۔

۵۔ لے آوٹ کے ضابطہ عمل کے وعدہ سے خلاف ورزی ہے، البتہ شرعاً اس طرح کے پلاٹ کا خرید وفروخت جائز ہے۔

۶۔ چونکہ صاحب زمین اصل مالک ہے، اس لئے اس کی اجازت سے ایسی جگہوں پر مسجد یا مدرسہ کی تعمیر درست ہے، اور وہ شرعی مسجد ہوگی۔

۷۔ ایسی اراضی کو رہائشی صورت میں بدلنے کے ضابطے حکومت نے اس قدر خرچیلے اور مشکل بنا دیئے ہیں اور قدم قدم پر رشوت خوروں کی لائن ہوتی ہے، اس لئے اگر کالونی بنانے والے ''زمین کا ڈائیورشن'' کرائے بغیر پلاٹ کاٹ کر بیچے تو شرعی اعتبار سے درست ہوگا۔

۸۔ قانونی مجبوری کے تحت اس رقم کا لون درست ہے۔

۹۔ یہ عمل قطعاً درست نہیں۔

۱۰۔ زمین دکھانے کے بعد خریدار کی اجازت سے درست ہے۔

۱۱۔ مختار نامہ کے بعد بکنگ جائز ہے۔

۱۲۔ اس طرح کی شرط اور صاحب پلاٹ کو مجبور کرنا دونوں ہی شرعاً ناجائز ہے۔

۱۳۔ یہ درست ہے۔

۱۴۔ چونکہ خریدار نے وعدہ وفا اور طے شدہ ضابطہ کے خلاف کیا، نیز اصولاً مہلت بھی نہیں لی تو کالونی بنانے والوں کو اختیار ہوگا چاہے تو اسے دے یا دوسرے کو بیچ دے۔

......☆......

[1] قاضی دارالقضاء مسلم پرسنل لاء بورڈ اندور، مدھیہ پردیش۔

موجودہ دور میں اراضی کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل

مفتی محمد مقصود فرقانی[1]

(۱) ایسی زمین جو سرکاری قبضہ میں ہے، اس کو خریدنا خصوصاً رشوت کے ذریعہ سے اور اس پر تعمیر کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ کتنی ہی مرتبہ فروخت کی جا چکی ہو۔

(۲) اوقاف کی زمین کو خریدنا اور فروخت کرنا جائز نہیں ہے اور ان پر قبضہ کرنا یا معمولی کرایہ دے کر رہنا جائز نہیں ہے، البتہ ایسی زمین جو مسلم آبادی سے دور ہو یا مسلم آبادی میں نہ ہو، اسے محکمۂ اوقاف سے اجازت لے کر فروخت کرنا جائز ہے، مگر اس کے بدلہ مفید زمین خرید کر وقف کرنا لازم ہے۔

الفتاوی الشرعیہ میں ہے:

''فلا یجوز بیع الوقف بعد تمامه عند جمهور الفقهاء إلا أن یخرب أو تتعطل منافعه فیجوز فی هٰذه الأحوال بیعه بمعرفة القاضی بثمن المثل ویشتری بثمنه وجوبًا وقف آخر یحل محله، ویجوز نقل الوقف من هٰذا السبیل إلی سبیل آخر إذا تعذر الانتفاع فی المکان الأول وإذا لم یتعذر لم یجز''۔

(۳) ایسی موروثی زمین جس میں حقداروں کو حق نہیں دیا گیا ہو، اس کا خریدنا جائز نہیں ہے، کیونکہ جو زمین فروخت کر رہا ہے وہ کل زمین کا مالک نہیں ہے اور غیر مالک کو بغیر مالک کی اجازت نہ فروخت کرنا جائز ہے اور نہ خریدنا جائز ہے۔

(۴) حرام مال سے خریدی ہوئی چیز بھی ناجائز ہے، اس لئے اسے بھی معلوم ہونے پر نہیں خریدنا چاہئے، بلکہ فروخت کرنے والے پر اس کا تصدق واجب ہے اور اگر مالک مال مل جائے تو اس حرام مال کو مالک پر واپس کرنا واجب ہے۔

کتب فقہیہ میں ہے: ''ما حصل بسبب خبیث فالسبیل رده إذا عرفوهم وإلا تصدقوا بها لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبها''۔

(۵) گورنمنٹ سے جو لے آوٹ منظور ہوا ہے کالونی بنانے والے کو اس کے مطابق کالونی بنانا چاہئے، اس میں کانٹ چھانٹ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ گورنمنٹ کو بھی دھوکہ ہے اور عوامی مفاد کو بھی، اس لئے یہ جائز نہیں ہے۔

(۶) اگر لے آوٹ اور نقشہ میں مسجد نہیں ہے یا پارک نہیں ہے اور نقشہ منظور ہو جانے کے بعد اس میں مسجد کے لئے جگہ نکالے یا راستہ میں تنگی پیدا کرے تو یہ بھی درست نہیں ہے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا ضرر عام ہے اور اس میں قانوناً مسجد بنانا درست نہیں ہے، البتہ مسجد شرعی طور پر تصور کی جائے گی۔

(۷) مذکورہ صورت میں مفاد عامہ اور غریب لوگوں کی رعایت کے لئے غیر قانونی طریقہ سے کالونی بنانا اور غریبوں کو آباد کرنا درست ہے اور چونکہ قانونی طریقہ سے بنانے میں جو اخراجات ہوتے ہیں وہ بھی اکثر غیر شرعی ہوتے ہیں، اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

---

[1] دار الافتاء جامع العلوم فرقانیہ، رامپور، یوپی۔

(۸) اس صورت میں مصلحت کے تحت لون لینا درست ہوگا، "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت۔

(۹) اس صورت میں مبیع متعین ہوگا اور مالک زمین کو اختیار ہوگا کہ وہ نمبرات میں تبدیلی کردے، مگر یہ تبدیلی خریدار کو بتلانے سے پہلے ہو، تاکہ کسی قسم کا دھوکہ نہ ہو اور اس طریقہ سے خرید وفروخت درست ہے۔

(۱۰) چونکہ اب یہ صورت عام ہوچکی ہے اور اس طرح خرید وفروخت ہوتی ہے اور بائع ومشتری میں کوئی نزاع بھی نہیں ہوتا ہے، اس لئے اس صورت میں خریدار اس کا مالک سمجھا جائے گا۔

(۱۱، الف) اگر کالونی بنانے والے کی ملکیت میں وہ زمین آگئی تھی اور اس نے پلاٹ فروخت کئے ہیں تو یہ جائز ہے۔

(ب) اس صورت میں چونکہ کل رقم ادا نہیں کی گئی ہے جس کی بنا پر وہ زمین مالک زمین کی ہے تو دوسرے شخص کو قانونی رکاوٹ کے دور ہونے تک پلاٹ بیچنا درست نہیں ہے، اسی طرح تیسرے شخص کو بھی اس کا فروخت کرنا ممنوع ہے، البتہ قانونی رکاوٹ دور ہونے کے بعد اس کا فروخت کرنا درست ہوگا۔

(۱۲) یہ شکل درست نہیں ہے، کیونکہ یہ مفضی الی النزاع ہے، دوسرے یہ کہ خریدار کو مکمل اختیارات نہیں ہیں، اگر وہ فروخت کرنا چاہے تو کسی دوسرے کو بغیر دلال کے فروخت نہیں کرسکتا، اس لئے یہ صورت ناجائز ہے۔

(۱۳) صورت مذکورہ میں خریدار کی ملکیت اس میں ثابت ہوگی، اگرچہ خریدار کو اپنی ملکیت فروخت کرنے کے لئے کالونی بنانے والے سے رابطہ کرنا ہوگا، اس سے ملکیت پر کوئی اثر واقع نہیں ہوگا۔

(۱۴) اس صورت میں کوتاہی خریدار کی طرف سے ہے، اس لئے وہ اتنی ہی رقم لینے کا حقدار ہے جتنی وہ ادا کرچکا ہے، خواہ زمین کی قیمت کم ہو یا زیادہ۔

(۱۵، الف) مذکورہ صورت درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں خریدار کے لئے دلال کی طرف سے دھوکہ ہے، دلال کو چاہئے کہ بائع ومشتری کے درمیان بیع کرادے اور اپنی محنت کا معاوضہ وصول کرلے۔

(ب) بیع مشروط درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں خریدار کو کلی اختیار نہیں ہوتا، لہذا یہ صورت بھی جائز نہیں ہے فقط واللہ اعلم بالصواب۔



باب چہارم

مناقشہ: صدارت: مولانا ومفتی احمد دیولوی صاحب

زمین کی خرید وفروخت سے متعلق مسائل

گفتگو: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

حضرات! ابھی تین عرض آپ کے سامنے پیش کئے گئے اور عارضین نے بڑی خوش اسلوبی سے تمام نقاط نظر اور ان کے دلائل کو ذکر کیا اور اہم بات یہ ہے کہ واضح طور پر اس رائے کو بتایا ہے جو ان کے نزدیک قابل ترجیح ہے اور ترجیح کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے، عارضین حضرات سے درخواست ہے کہ ایک بہت مناسب تعبیر ہم لوگوں کو متوارثا ملی ہے، اسماء واعلام میں وغیرہ اور عبارتوں میں الی آخرہ کی، تو اگر آئندہ نشستوں میں اس تعبیر کو اختیار کریں تو انشاء اللہ اس سے آپ کی بات مختصر ہوسکتی ہے۔

اب میں اصل موضوع پر آتا ہوں، اس میں پندرہ سوالات تھے اور بعض ایک سوال کئی شقوں پر مشتمل تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ تحقیق سے اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے، جہاں تحقیق نہیں ہوتی ہے وہاں اختلاف پیدا نہیں ہوتا، لیکن جب آدمی کسی موضوع پر غواصی کرتا ہے، اس کے تمام پہلوؤں کو اپنے سامنے رکھتا ہے تو اس میں اختلاف رائے بھی پیدا ہوتا ہے، اس لئے بہت سے مسائل ایسے بھی ہیں جن میں اختلاف رائے ہے، تو ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ کچھ بنیادی اصولوں پر ہم زیادہ سے زیادہ گفتگو کریں، اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ حکومت سے جو ہمارا معاہدہ ہے، ہم اس ملک کے باشندہ ہیں، ہم نے اس ملک کے قانون پر عمل کرنے کا عہد کیا ہے اور ایفاء عہد قضاءً یا دیانۃً ہم پر واجب ہے، تو اس معاہدہ کی کیا حیثیت ہے، اس کی تھوڑی سی اور تفصیل یہ ہے کہ املاک تین قسم کی ہوسکتی ہیں: ایک تو خالص سرکاری املاک، ایک عوامی املاک ہیں، گورنمنٹ ان کی نگرانی کرتی ہے، لیکن وہ عوام کے فائدہ کے لئے ہے، جیسے پارک ہے، کھیل کا میدان ہے، سڑکیں ہیں، اور ایک شخصی املاک ہیں، آپ نے کوئی چیز خرید کر لی ہے، تو حکومت سے جو ہمارا معاہدہ ہے کہ ہم اس کے قانون پر عمل کریں گے، کیا تینوں قسم کے املاک کے لئے یکساں طور پر اس کا اطلاق ہوگا؟ جیسے سرکاری املاک مثلاً ٹرین ہیں، اس کی سیٹیں ہیں، ریلوے اسٹیشن ہیں اور بھی چیزیں ہیں، ان میں سے کسی چیز میں ہم تصرف نہ کریں جو عوامی مفاد کے لئے چیزیں بنائی گئی ہیں، وہ عوامی املاک ہیں، اس میں ہم اس معاہدہ کے حد درجہ پابند رہیں، اسی طرح ہماری شخصی ملکیتیں ہیں، زمین ہم نے خریدی ہے، ہم شرعاً وقانوناً اس کے مالک ہیں اور حکومت ہمارے لئے اصول مقرر کرتی ہے کہ اتنی فیصد جگہ آپ کو چھوڑنی ہوگی، مثال کے طور پر تو کیا شخصی املاک میں بھی حکومت کے قانون کی پابندی اسی درجہ ضروری ہوگی؟ وہ وجوب کے درجہ میں ہوگی یا استحباب کے درجہ میں ہوگی؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بنیادی نقطہ ہے جس سے کئی مسئلے متعلق ہیں، اس پر ہمیں غور کرنا چاہئے، اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ حکومت سے ہم نے معاہدہ کیا ہے، لیکن معاہدہ کی جو روح ہے شریعت میں تراضی طرفین، تو کیا معاہدہ کی ان تمام صورتوں میں تراضی طرفین کا تحقق ہوتا ہے؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے جس میں ہمیں غور کرنا چاہئے۔

دوسرا سوال جو ابھر کر سامنے آیا ہے وہ انتقال حرمت کا ہے، چاہے وہ میراث کے ذریعہ املاک کی منتقلی ہو، چاہے کسی عقد کے ذریعہ ملکیت کی منتقلی ہو، تو جو حرمت پہلے سے پائی جارہی ہو اس حرمت کا انتقال کن صورتوں میں ہوتا ہے اور کن صورتوں میں نہیں ہوتا ہے، کن صورتوں میں بعد میں جن کی ملکیت اس پر قائم ہوئی ہے ان کے لئے آگے بیچنا یا ان سے لوگوں کے لئے خریدنا جائز ہوگا اور کن صورتوں میں ان کا خریدنا جائز نہیں ہوگا؟ تو یہ ایک دوسری بنیادی بات ہے اور اس سلسلہ میں امام کرخیؒ کے اقوال بھی آپ حضرات نے ذکر کیا، اس صورت میں اگر اس قول سے استفادہ کیا جائے تو کیا جاسکتا ہے؟ اس پر ہماری توجہ ہونی چاہئے۔

تیسرا مسئلہ استقراض بالربح کا ہے، اکیڈمی کے تیسرے فقہی سمینار منعقدہ بنگلور میں اس سلسلہ میں بنیادی اصول طے ہو گئے تھے، اور ہمارے ہندوستان کے اکابر علماء کے فتاوی میں اس کا ذکر موجود ہے، لیکن یہ جو فقہاء نے لکھا، "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح"، تو ایک حاجت تو جانی ہے، ایک حاجت مالی ہے اور معاصر علماء نے اس میں عرض (انسان کی عزت وآبرو) کو بھی شامل کیا ہے، تو کیا حاجت قانونی بھی حاجت میں شامل ہے یا کیا اس کو حفظ عرض میں شامل مانا جائے گا، یہ بھی کیا حاجت کے دائرے میں آئے گا، تو اس پہلو پر اس میں گفتگو کی جائے تو مناسب ہوگا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ چوں کہ اس میں رشوت کی بات بھی آئی ہے، دیکھئے: ہر بات جو ہم لوگوں کے بحث میں آئی ہو تجویز میں انہی الفاظ میں وہ آئے ضروری نہیں، لیکن مسئلہ کی تنقیح کے لئے اس کے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہمارے یہاں فقہاء نے رشوت کی جو اجازت دی ہے وہ بنیادی طور پر دفع ظلم کے لئے اجازت دی ہے، اور دفع ظلم کی دو صورت ہوتی ہے: ایک اپنی چیز پر سے دوسرے کے ناجائز قبضہ کو ہٹانا جس کو بعض فقہاء نے اس بحث میں دفع مضرت سے تعبیر کیا ہے، اور دوسرے اپنے جائز حق کو حاصل کرنا جس کو رشوت کی بحث میں بعض فقہاء نے جلب منفعت سے تعبیر کیا ہے، تو اس میں یہ بھی مسئلہ زیر غور آتا ہے؟ اور کیا یہ مسئلہ اس دائرہ میں آتا ہے جس کا فقہاء نے اس صورت میں استثناء کیا ہے؟

پانچواں اہم اور قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ جو اموال غیر منقولہ ہیں ان میں قبضہ تو ضروری نہیں ہے، آگے کی بیع کے لئے بیع قبل القبض میں ہمارے یہاں وہ شامل نہیں ہے، لیکن مملوک ہونا ضروری ہے اور ثبوت ملک کا کوئی ایک متعین طریقہ نصوص میں بیان نہیں کیا گیا ہے، تو اس پر غور کیا جائے کہ ثبوت ملکیت کا تحقق موجودہ دور میں صرف اجازت کی وجہ سے یا حوالگی کی وجہ سے یا پاور آف اٹارنی، جنرل پاور آف اٹارنی بنادینے کی وجہ سے ہو جاتا ہے یا نہیں؟ ہمارے قدیم فقہاء نے بھی اس پر بحث کی ہے، کہ ایک چیز آپ نے بیچ دی، اس میں کسی کا استحقاق نکل آیا، تب بھی وہ بیع فی نفسہ جائز ہوتی ہے، جب استحقاق نکلے گا اس وقت وہ مسئلہ پیدا ہوگا، اسی سے فقہاء متاخرین نے ضمان درک کا مسئلہ اٹھایا، تو اگر کسی چیز کی اجازت مالک کی طرف سے ہو جائے، لیکن اندیشہ ہے کہ آئندہ اس میں کوئی قانونی رکاوٹ پیدا ہو جائے، تو کیا یہ قانونی رکاوٹ ثبوت ملکیت میں مانع سمجھی جائے گی؟

یہ چار پانچ بنیادی اصول ایسے ہیں کہ اس پر ہماری توجہ زیادہ مرکوز ہونی چاہئے، دو باتوں کی اور بھی وضاحت کر دیتا ہوں: اس میں بار بار استبدال وقف کا مسئلہ بھی آیا ہے، استبدال وقف کے مسئلہ پر ممبئی کے سمینار میں اکیڈمی کی تفصیلی بحثیں ہوئی ہیں اور اس کی بہت مفصل تجویزیں منظور ہوئی ہیں، اس بحث میں اب ہم کو الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، ایک خاص صورت کہ جس میں وقف پر ناجائز قبضہ ہو گیا، اس کو آگے بیچ دیا گیا، کئی پشتوں سے وہ چیز بیچی جارہی ہے، یہ بیع قابل قبول ہوگی یا نہیں؟ یہ مسئلہ اصل میں زیر بحث ہے اور دوسرا مسئلہ مسجدیت کا بھی آگیا، مسجد شرعی، مسجدیت کا تحقق کب ہوگا، اور جب مسجدیت قائم ہو جائے گی تو اس میں ابدیت اور دوام ہوگا، یہ بات تو پہلے سے طے شدہ ہے، مسئلہ صرف یہ ہے کہ اگر یہاں کسی نے مسجد بنانے کا ارادہ کیا اس ارادہ کا اظہار کیا اور آئندہ اس نے اپنے اس ارادہ کو پورا نہ کرتے ہوئے زمین کو فروخت کر دیا جو اس کی ملکیت ہے، تو یہ بیع درست ہوگی یا نہیں؟ اخیر میں یہ بات عرض ہے کہ گفتگو ہمیں کھل کر کرنی چاہئے، فقہاء کا کمال یہی ہے کہ معاشرہ میں جو اچھی باتیں پیش آئی ہیں انہوں نے اس کو بھی زیر بحث لایا ہے اور جو بری باتیں پیش آئی ہیں، چونکہ شریعت تمام مسلمانوں کے لئے اور ہر حالت کے لئے رہنما ہے، ان پر بھی انہوں نے بحث کی ہے، لہذا جو حضرات تجویز مرتب کریں گے وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ہماری تجویز ملکی مصالح سے، ملکی قانون سے متصادم نہیں ہو، اور اس میں کوئی ایسا لفظ نہ آجائے یا ایسی تعبیر نہ آجائے جو ایک طرح سے مسلمانوں کے لئے، غیر اخلاقی طرز عمل کو جواز فراہم کرتی ہو، اب جیسا کہ فقہاء کے یہاں آپ دیکھتے ہیں کہ کہیں صاف واضح الفاظ لکھتے ہیں، کہیں لکھتے ہیں: "ینبغی" کہیں کہتے ہیں "لا أحب"، یہ فقہاء کے احتیاط ہیں کہ بعض چیزوں کو انہوں نے تعبیر کے غلاف میں ڈھک کر پیش کیا ہے جس کو بالکل کھول کر بتانا مناسب نہیں تھا، تو ہم لوگ تجویز کی ترتیب کے وقت اس بات کو پیش نظر رکھیں، ہمارے پاس بہت سارے دوستوں کے نام اس موضوع پر بحث کے لئے آئے ہیں اور کئی تحریریں بھی آئی ہیں، جو تحریریں آئی ہیں ان کو انشاء اللہ ہم تجویز کمیٹی کے حوالے کر دیں گے، لیکن اس میں ایک اہم تحریر ہے جس کو پڑھ کر سنا دیتا ہوں، یہ تحریر مولانا مفتی ثناء الہدی قاسمی کی ہے، آپ نے لکھا ہے: "سوال ۱۱ کے دوسرے جزء کے متعلق عرض کرنا ہے کہ پلاٹنگ کرنے والا اسٹام پیپر پر جو اصل مالک سے معاہدہ کرتا ہے اس کی حیثیت عموماً پاور آف اٹارنی کی ہوتی ہے اور پاور آف اٹارنی کے ذریعہ جو تصرف ہوتا ہے اس کو ہندوستان میں قانونی حیثیت حاصل ہے، اور اس کا تصرف شرعاً درست سمجھا جاتا ہے، پاور آف اٹارنی کی حیثیت وکیل کی ہوتی ہے، اس لئے پلاٹنگ کرنے والے کا تصرف درست ہونا چاہئے، کیوں کہ بظاہر اس میں نہ تو شرعاً اور نہ قانونی حیثیت سے کوئی رکاوٹ ہے، پاور آف اٹارنی کے ذریعہ کئے گئے تصرف میں غرر کی بات سمجھ میں نہیں آتی"۔

اب جن حضرات نے مناقشہ کے لئے کہا ہے میں ان کو دعوت دیتا ہوں اور سب سے پہلے اس مناقشہ کا آغاز مولانا نعمت اللہ صاحب قاسمی سے کراتا ہوں۔

مولانا نعمت اللہ قاسمی صاحب:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، پہلا سوال یہ ہے کہ بعض غنڈہ عناصر اور دوسرے افراد سرکاری زمین پر قابض ہو جاتے ہیں، اس میں زمین کی دو قسمیں ہیں، ارض موات، جس کو ارض مباحہ بھی کہتے ہیں اور ارض مملوک، یہ مسئلہ جس پر ہم لوگ بحث کر رہے ہیں، ارض مباحہ اور ارض موات کا ہے، اور مشکل یہ ہے کہ ارض مملوک سمجھ کر غصب کا حکم ہمارے فقہاء نے اس پر لگا دیا، اجلاس میں ہمارے جتنے فقہاء موجود ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ ارض مباحہ کا مسئلہ ہے، ارض مباحہ کے سلسلہ میں مسئلہ یہ ہے کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ملکیت ثابت ہونے کے لئے امیر کی اجازت یا سربراہ مملکت کی اجازت شرط ہے، لیکن حضرات صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ شرط نہیں ہے، بغیر امیر کی اجازت کے بھی اگر کسی نے قبضہ کر لیا اور اس کو آباد کر لیا تو وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی، شہر کی ضرورتوں سے جو فاضل زمین ہوتی ہے، مثلاً پارک فاضل زمین ہے، ہوائی اڈے سے فاضل زمین ہے، کھیل کے میدان سے جو فاضل زمین ہے، ان فاضل زمینوں کو ہم ارض مباحہ اور ارض موات تصور کرتے ہیں، اب اس ارض موات کے اوپر کسی نے قبضہ کر لیا، ہمارے حکام کا بھی مزاج یہی ہے کہ اگر ہم درخواست گزار نے جائیں گے کہ ہم کو مکان بنانے کی ضرورت ہے، اس میں ہم کو دو کٹھہ زمین الاٹ کر دیجئے، تو آسانی سے الاٹ کرنے والی حکومت نہیں ہے، اب اس میں جو لوگ قبضہ کر سکتے ہیں وہ قبضہ کرتے ہیں، پھر بعد میں حکومت سے اجازت لیتے ہیں، اس اجازت لینے میں بھی پیسہ کا لین دین ہوتا ہے، تو ارض موات کے سلسلہ میں ہمارے افسران و حکام اور حکومت کا جو مزاج ہے، اس مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کو سوچنا چاہئے، ایک بااثر آدمی ہے جس نے ایک علاقہ پر قبضہ کیا اور قبضہ کرنے کے بعد اندر اندر اس کی پلاننگ کی اور دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا شروع کر دیا، اس امید پر کہ ہم افسران سے اس کی اجازت لے لیں گے، جیسا کہ سوال میں اس کا تذکرہ بھی آیا ہے، تو اگر افسران سے وہ اجازت لے لیتے ہیں تو پھر یہ صحیح ہو جاتا ہے اور اگر اجازت نہیں ہوتی ہے تو پھر ہم کہتے ہیں کہ قانونی طور پر صحیح نہیں ہے، لہٰذا اس مسئلہ پر اس نقطہ نظر سے بھی غور کرنا چاہئے، سارے لوگوں نے اس مسئلہ کو غصب قرار دے دیا، میری سمجھ سے یہ بات باہر ہے، اس مسئلہ کو اس لحاظ سے سوچنا چاہئے کہ جو ضرورتیں لوگوں کی ہیں، مکان کی ضرورت ہے، زمین کی ضرورت ہے، اس کو بھی سامنے رکھنا چاہئے، یہ پہلا سوال ہے، اس لئے میں نے لکھا تھا کہ شہر کی ضرورت سے جو فاضل زمین ہے درحقیقت وہ ارض مباحہ ہے، یعنی احیاء موات کا مسئلہ ہے، البتہ یہ ہے کہ قبضہ سے لے کر خرید وفروخت تک سارا سلسلہ جو ہوتا ہے وہ حکام کی اجازت کے بغیر ہوتا ہے، تو ہوتا ہے ہوا کرے، لیکن بعد میں اجازت لے کر قانونی استحکام حاصل کر لیا جائے، تو پھر اس میں کوئی مضائقہ ہی نہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

جزاکم اللہ، مفتی صاحب نے بڑا اہم نکتہ اٹھایا ہے، اب یہ بات قابل بحث ہے کہ ارض موات کا اطلاق کس پر ہوگا؟ اگر چہ کسی زمین پر کھیتی نہ ہوتی ہو، لیکن وہ دوسرے مقاصد میں استعمال ہوتی ہو، اور مولانا نعمت اللہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ ان مقاصد سے باہر کی زمین ہے، ہوائی اڈے کی زمین نہیں ہے، پارک کی زمین نہیں ہے، اس کے علاوہ جو بنجر زمین ہوگی اس کا یہ مسئلہ ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب: اچھا ٹھیک ہے آگے چلیے۔

مولانا نعمت اللہ قاسمی صاحب:

جی آگے، نمبر ۲، اوقاف کی بیع کے سلسلہ میں بھی بات آئی ہے، تو اس میں فقہاء نے شامی کے اندر جن شرائط کا ذکر کیا ہے، ان شرائط کو سامنے رکھ کر کے اس کی اجازت ہونی چاہئے، قاضی جنہ کی بھی شرط ہے، یعنی جنت میں جانے والا قاضی ہو اور دوسری اہم شرط یہ ہے کہ اگر زمین کی فروختگی کا معاملہ ہو تو روپے سے ہو یا زمین کا تبادلہ زمین سے ہو، پہلے بدل کی زمین کا انتظام کر لیا جائے، تب جا کر کے اس زمین کو فروخت کیا جائے، اس لئے اس کی تجویز مرتب کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے۔

حرام آمدنی سے خریدی ہوئی زمین کا مسئلہ آیا ہے، حرام آمدنی سے خریدی ہوئی زمین کے سلسلہ میں امام کرخیؒ کے ایک قول کا تذکرہ بار بار آیا ہے، لیکن اس میں یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب حرام آمدنی کا مثل یا اس کا بدل ادا کردیا جائے، اگر مالک معلوم ہو اور اگر مالک معلوم نہیں ہے تو پھر اس کا صدقہ کردیا جائے تب جا کر کے وہ چیز جائز ہے اور اس کا استعمال کرنا حلال ہے، ورنہ وہ ملک خبیث ہے، ملک خبیث کو استعمال میں لانا جائز نہیں ہے۔

اس لئے تجویز مرتب ہوتے وقت یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہئے، اور کالونی کی زمین میں نقشہ کی خلاف ورزی کرنا، نقشہ میں مسجد کے لئے جو جگہ مختص کی گئی ہے اس زمین کو فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں ہے؟ تو مسئلہ یہ ہے کہ وہ کالونی والی زمین ارض مباحہ نہیں ہے، ارض مملوکہ ہے اور کالونی بسانے والے نے خریدار کی رغبت کے لئے کہیں پارک دکھلایا، کہیں مسجد دکھلایا، کہیں کچھ دکھلایا، تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جو سہولتیں دکھلائی گئی ہیں وہ مبیع کے لئے اوصاف کے درجے میں ہیں، اگر مبیع وصف کے مطابق نہیں ہوتو پھر خریدار کو اجازت ہے کہ چاہے وہ خریدے، چاہے نہیں خریدے، گویا وہ زمین پارک کی ہے، لیکن نقشہ میں مسجد کے لئے زمین ہے، اس کے اوپر بہرصورت مالک کی ملکیت ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

مفتی صاحب! میری رائے یہ تھی کہ آپ نے بڑے اہم نکات اٹھائے ہیں، اس کو لکھ دیجئے اور اس تجویز کمیٹی میں انشاء اللہ آپ شامل ہوں گے، تو آپ کو دوسروں سے کہنا نہیں پڑے گا، آپ خود انشاء اللہ اس کو بہتر طور پر مرتب فرمائیں گے۔

مولانا نعمت اللہ قاسمی صاحب:

دسواں سوال جس میں زمین کی پلاٹنگ کی خلاف ورزی اور نقشہ میں تبدیلی کردی، ایسی صورت میں مبیع مجہول ہے یا غیر مجہول ہے اس سلسلہ میں کچھ بات عرض کرنی تھی۔

فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کسی نے غلہ کے ڈھیر کو بیچا اور یہ کہا کہ ایک صاع اتنے روپے میں، تو اس میں ہمارے فقہاء تحریر فرماتے ہیں کہ بہرصورت ایک صاع کے اندر بیع درست ہوجائے گی، باقی میں بیع درست نہیں ہوگی اور اگر مجلس عقد کے اندر پورے کا پورے وزن کردیا گیا اور معلوم ہوگیا کہ اتنا کیلو ہے اور اسکی اتنی قیمت ہے، رضامندی مجلس عقد میں ہوگئی تو وہ بیع درست ہے، لیکن اگر کوئی بکریوں کے ریوڑ کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ اس میں سے ہم نے دو جانور یا ایک جانور فروخت کیا اتنے روپے میں، تو اس کو ہمارے تمام فقہاء ناجائز فرماتے ہیں، اس لئے کہ یہ ذوات القیم میں سے ہے، اس میں قیمتوں میں تفاوت ہے، تو یہ جو پلاٹنگ ہوتی ہے وہ دو قسم کی ہوتی ہے: ایک تو یہ ہے کہ جائے وقوع، یعنی ایک ہے بیچ کا راستہ، ایک ہے کنارے کا راستہ اور ایک طرف گویا کہ کچھ ایسے لوگ بسے ہوئے ہیں جہاں پر بسنا لوگ مناسب نہیں سمجھتے، دوسرے شریف لوگ بسے ہوئے ہیں، تو جائے وقوع کے لحاظ سے اور اسی طریقہ سے محل وقوع کے لحاظ سے وہ پلاٹ مختلف نوع کی چیز ہے، ذوات القیم میں سے ہے، تو اگر ایک راستے کے اندر مختلف پلاٹ ہے، اس کی قیمت بھی ایک ہے اور پڑوسیوں کے لحاظ سے بھی وہ جگہ مناسب ہے تو ایسے پلاٹوں کو ہم ذوات الامثال میں شمار کرسکتے ہیں، لیکن اگر وہ پلاٹ محل وقوع کے لحاظ سے اور دوسرے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہے تو اس کو ہم ذوات القیم میں شمار کریں گے، اگر مطلق نقشے کے اندر اس نے پلاٹنگ کی اور اس میں تبدیلی کی تو ایسی شکل میں ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ پلاٹ ذوات الامثال میں سے ہے یا ذوات القیم میں سے ہے، اگر ذوات القیم میں سے ہے تو اس میں تبدیلی کا ہم کوئی لحاظ نہیں کریں گے اور کہیں گے کہ یہ خرید وفروخت جائز ہے اور درست ہے، اور اگر ذوات القیم میں سے ہے تو وہاں غور کرنا پڑے گا اور کہنا ہوگا کہ یہ خرید وفروخت درست نہیں ہے۔

مولانا عبدالقدوس ندوی صاحب:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، یہ سوال نمبر ۳ کے اندر موروثی زمین کے تعلق سے جو بات آئی ہے، تو اس میں دو باتیں ہیں: اگر بیچنے والا صرف اپنا ہی حصہ بیچتا ہے تو اس صورت کے اندر جائز ہونی چاہئے، اور یہ بیع مشاع ہوگی، البتہ اگر اس کے حصے کو الگ کردیا جائے تو درست ہوگی اور اگر پوری مکمل زمین بیچتا ہے یعنی دوسرے کے حصے کو بھی بیچ دیتا ہے تو یہ اپنے حصے کے بقدر تو جائز ہوگی، لیکن دوسرے کے حصے کو جو بیچا ہے یہ بیع موقوف ہوگی، اگر

دوسرے حصہ دار اجازت دیتے ہیں تو بیع نافذ ہوجائے گی، اگر اجازت نہیں دیتے ہیں تو اس صورت کے اندر نافذ نہیں ہوگی۔

سوال نمبر ۴ کے اندر جو حرام آمدنی کے تعلق سے بات آئی تھی، ظاہری بات ہے کہ جو آمدنی مال حرام ہے، مال خبیث ہی ہے، اس میں کوئی تفریق کی ضرورت نہیں ہے، اس میں کہنا یہ ہے کہ حرام مال اگر اعیان ہوں تو وہ متعین ہوتے ہیں اور اس کی حرمت متعدی ہوتی ہے اور بیچیں گے تو درست وصحیح نہیں ہوگا، لیکن اگر حرام مال اعیان نہ ہوں اثمان ہوں تو اس صورت کے اندر اثمان متعین نہیں ہوتے ہیں، اسی وجہ سے امام کرخیؒ کی جو باتیں آئی ہیں اگر اس میں ایسا ہوجائے کہ مبیع پہلے خرید کرلی جائے اور بعد میں ثمن ادا کیا جائے تو بیع درست ہونی چاہئے، اس لئے کہ اثمان متعین نہیں ہوتے، مافی الذمہ اثمان لازم ہوجائیں گے، اسی طرح سے جو مواعید کی بات آئی تھی، وعدے کے تعلق سے کہ آیا اس کا پورا کرنا دیانۃً ہے یا قضاءً، تو احناف کے یہاں مشہور ہے کہ دیانۃً واجب ہے، قضاءً واجب نہیں ہے، لیکن دور حاضر کے اندر تقریباً ہمارے اہل علم جانتے ہیں کہ مالکیہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے احناف بھی مواعید کو قضاءً واجب قرار دیتے ہیں، اس اعتبار سے وہ مسائل مرتب ہوں گے اور اسی اعتبار سے مسائل مرتب ہونے چاہئیں، اسی طرح سے اس کے اندر بہت سی باتیں آئی تھیں کہ پلاٹنگ کرنے والے اگر بیچتے ہیں جب کہ اس سے پہلے وعدے وغیرہ کرچکے ہیں تو ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے، اور اگر کرتے ہیں تو اس میں دھوکہ بھی ہوگا اور غرر بھی جو مفسد عقد ہوتا ہے۔

سوال ۶ کے اندر انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے سودی قرض لینا جائز ہے، اس کے تعلق سے بات آئی تھی، ہم سب لوگ جانتے ہیں کہ انکم ٹیکس کا ایک حصہ تو درست ہوتا ہے اور بہت سے حصے درست نہیں ہوتے ہیں، اگر جائز انکم ٹیکس ہے تو اس کی خاطر سودی قرض لینا جائز نہیں ہوگا، اگر ناجائز ہے تو پھر اس کے جواز کی صورت پیدا ہونی چاہئے۔

سوال ۱۵ کے اندر جو دلال کی اجرت کی بات آئی تھی اس کے تعلق سے یہ کہنا ہے کہ جب ہم دلال کی اجرت کو ایک طرف جائز قرار دیتے ہیں، تو وہاں یہ ہے کہ اگر دلال مشتری سے بھی پیسے لے رہا ہے اور بائع سے بھی پیسے لے رہا ہے تب تو صحیح نہیں ہوگا، لیکن وہ اگر بائع سے اپنی اجرت لے رہا ہے اور یہ کام کررہا ہے تو پھر یہ درست اور صحیح ہونا چاہئے، ناجائز نہیں ہونا چاہئے۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔

مفتی جمیل احمد نذیری صاحب:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، ابھی حضرت مولانا مفتی نعمت اللہ صاحب قاسمی نے زمین کو ذوات الامثال میں سے فرمایا ہے، تو میرا یہ کہنا ہے کہ ذوات الامثال اور ذوات القیم کون چیزیں ہوتی ہیں، فقہاء نے ان کو متعین کردیا ہے، تمام مکیلات اور تمام موزونات اور عددیات متقاربہ یہ ذوات الامثال میں ہیں، عددیات متقاربہ جیسے کیلا ہے، انڈا ہے کہ جن کے آحاد میں تفاوت بہت کم ہوتا ہے اور اس سے کوئی نزاع نہیں پیدا ہوتا ہے، لیکن تمام مزروعات اور تمام عددیات متفاوتہ ان میں جانور بھی شامل ہے، وہ سب کے سب ذوات القیم میں ہے اور زمین مزروعات میں ہے، کسی قسم کی بھی زمین ہو وہ ذوات الامثال میں شامل نہیں ہوں گی، ذوات القیم میں ہوں گی، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ایک زمین کا حصہ ہے جو سامنے کا ہے اور ایک ہے اس کے پیچھے کا، تو دونوں کی قیمتوں میں فرق بہرحال رہے گا، (یہی تو ذوات القیم کی نشانی ہے)۔

شاید مولانا نعمت اللہ قاسمی صاحب: نہیں نہیں یہ ذوات الامثال ہی میں سے ہے، یہ ذوات القیم کی پہچان نہیں ہے، وہ مزروعات میں سے ہے نہ مکیلات نہ موزونات نہ عددیات متقاربہ۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

بہرحال فقہاء نے ذوات الامثال اور ذوات القیم میں عام طور پر اموال منقولہ کا ذکر کیا ہے، لیکن کیا یہ ایک تعبدی امر ہے کہ جو مثالیں دی گئی ہیں ان ہی تک ذوات الامثال وذوات القیم محدود ہوگا یا اس کا دائرہ وسیع بھی ہوسکتا ہے؟ یہ بات قابل توجہ ہے۔

مولانا محمد شاہجہاں ندوی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، مجھے دو باتیں عرض کرنی ہے: پہلی بات یہ ہے کہ پہلے عارض صاحب نے سرکاری اموال کو سرکار کی ملک خاص قرار دیا ہے، سرکاری اموال سرکار کی ملک خاص نہیں ہوتے ہیں، بلکہ وہ ملک عام ہوتے ہیں، جس میں مصلحت کے مطابق تصرف کرنے کا حق حکومت کو ہوتا

ہے یا قاعدہ قانون وضع کرنے کا حق حکومت کو ہوتا ہے، سرکار کی کوئی ملک خاص نہیں ہوتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ میں نے مقالہ میں جو بات کہی ہے کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ غاصب کے لئے بیع کا اقدام کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ علامہ شامیؒ کی توضیح پیش کی ہے کہ مغصوبہ زمین کو اگر غاصب مالک کے لئے بیچ دیتا ہے تو یہ بیع منعقد ہو جائے گی، اس لئے کہ یہ فضولی کی بیع ہے، البتہ اپنی ذات کے لئے مغصوبہ زمین کو بیچتا ہے تو بیع منعقد نہیں ہوگی، اس لئے کہ غاصب نہ مالک ہے نہ وکیل ہے اور چوں کہ وہ اپنی ذات کے لئے بیچ رہا ہے اس لئے یہ بیع، بیع فضولی بھی نہیں ہے، جزاکم اللہ۔

مولانا محمد فصیح الدین ندوی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، سوال ۵ کے تحت پلاننگ کرنے والا نقشہ میں پارک اور مسجد، اسی طرح لائبریری کے لئے جگہ بتاتا ہے، پھر وہ اس کے اندر تبدیلی کرتے ہوئے اس کو فروخت کر دیتا ہے، تو عارض محترم نے اس کی تبدیلی کی اجازت دی ہے، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کرنا کھلا دھوکہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "من غش فلیس منا"، اس لئے نقشہ میں جو چیز بتائی گئی ہے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح اگر کوئی آدمی اس طرح کرتا ہے اور نقشہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فروخت کر بھی دیتا ہے، مثلاً حیدرآباد بڑا شہر ہے، بڑے بڑے کامپلیکس ملٹی کروڑس کے بن رہے ہیں، وہاں پارکنگ کی جگہ ہوتی ہے، اس پارکنگ کی جگہ کو بلڈر شاپس (Shops) کے لئے بیچ دیتا ہے، لیکن نقشہ میں اس نے پارکنگ ہی بتائی تھی، تو پھر عدالت میں یہ مقدمہ جاتا ہے، عدالت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ پارکنگ کی جگہ چوں کہ آپ نے بتائی تھی، یہاں شاپس غیر قانونی بنائی گئی ہیں تو راتوں رات اس کو توڑ دیا جاتا ہے، اس لئے اس طرح کی چیزوں کے بارے میں عدم جواز کی رائے ہونا چاہئے، تجاویز مرتب کرنے والے اس سلسلہ کو ملحوظ رکھیں، اور اسی طرح میری گزارش ہے کہ اراضی کے سلسلہ میں ایک اور مسئلہ بھی پیش آ رہا ہے، زمین ہوتی ہے گرین زون کی، یعنی ایگریکلچر کی زمین ہوتی ہے، بیچنے والا دھوکہ دے کر بیچ دیتا ہے، مدرسوں کو بیچ رہا ہے، مسجدوں کو بیچ رہا ہے، بتاتا نہیں کہ یہاں تعمیر کی جاسکتی ہے یا نہیں کی جاسکتی ہے، ایم پی سے لگا ہوا اسٹیٹ مہاراشٹر ہے، یہاں ایسے مدرسوں کے لئے زمینیں ساتھیوں نے خریدی ہے جو گرین زون میں ہے، دس سال ہو چکے ہیں مگر اب وہاں تعمیر نہیں کر سکتے، تو یہ دھوکہ دے کر بیچنے میں آتا ہے، اس کی بھی اگر وضاحت کر دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا، اور نقشہ میں جیسا بتایا گیا، اسی طرح دینا خریدنے والوں کو یہ زیادہ بہتر ہوگا، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

ابھی مولانا نے جو ایک اور سوال اٹھایا گرین زون کی زمین کا دھوکہ دے کر فروخت کر دینا، یعنی وہ اراضی جس کو ایگریکلچر کے لئے گورنمنٹ نے مخصوص رکھا ہے، تو جو حضرات تجویز مرتب کرنے والے ہوں وہ اس سوال کو بھی اپنے ذہن میں رکھیں، یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔

مفتی رجیب قاسمی کیرالہ:

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، أما بعد! انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے جو سودی قرض لینے سے متعلق جوابات ہیں اس پر ایک بات عرض کرنی ہے کہ سودی قرض کی وجہ سے انکم ٹیکس پورا وضع نہیں کیا جاتا، بلکہ ایک سال میں سودی قرض کی وجہ سے جو پیسہ بینک میں جمع کرنا ہے صرف اسی کے بقدر انکم ٹیکس سے وضع کیا جاتا ہے، مثلاً ایک شخص کی تنخواہ ایک سال میں دس لاکھ ہو، تو ایک لاکھ اس کو انکم ٹیکس بھرنا ہے، تو اس آدمی نے پانچ سال کی مدت پر بینک سے دس لاکھ قرض لیا ہے تو یوں سمجھئے کہ ہر سال میں دو لاکھ اس کو بینک میں جمع کرنا ہے، اگر بارہ فیصد اس کا سود ہے تو دس لاکھ کا انہوں نے ایک لاکھ بیس ہزار سود کے طور پر بینک کو دے رہا ہے، تو انکم ٹیکس شعبہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کو ایک سال میں دو لاکھ بینک کو دینا ہے، اس لئے اس دو لاکھ کا ہم ٹیکس نہیں لیں گے، باقی آٹھ لاکھ کا ٹیکس لیں گے، تو نتیجہ یہ ہوا کہ جو آدمی دس لاکھ تنخواہ لینے والا ہے اس کا زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار وضع کیا جائے گا یا بیس ہزار وضع کیا جائے گا ٹیکس کی رقم سے، لیکن اس کی وجہ سے اس کو بینک کو ایک سال میں ایک لاکھ بیس ہزار دینا پڑتا ہے، اگر بارہ فیصد سود ہو تو ایک لاکھ بیس ہزار دینا پڑتا ہے، یہ تیس ہزار سے بچنے کے لئے ایک لاکھ بیس ہزار سود پر دینا پڑتا ہے، تو شاید انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے یہ سود کا قرض نہیں لے رہا ہے بلکہ انکم ٹیکس کے نام پر یہ حیلہ کر رہا ہے، ان کو سودی قرض سے نفع اٹھانا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ انکم ٹیکس دینا کچھ حرام تو نہیں ہے، علماء نے تو حرام نہیں کہا ہے، لیکن سود لینا دینا دونوں حرام ہے، تجویز کمیٹی اگر اس بات کو بھی سامنے رکھے تو انشاء اللہ بہتر ہوگا۔ والسلام علیکم

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یہ بات قابل غور ہے جو آپ نے بتائی کہ اس قرض کی وجہ سے انکم ٹیکس سے کس درجہ چھوٹ ملتی ہے، اس میں انشاء اللہ کسی واقف کار سے مزید معلومات حاصل کرنا مناسب ہوگا، اسی پروگرام کے درمیان انشاء اللہ اس کی کوشش کی جائے گی۔

مولانا جنید بن محمد صاحب پالنپوری (ممبئی):

بسم اللہ الرحمن الرحیم، پہلا سوال قانون سے متعلق ہے، ہمیں قانون جاننا چاہئے کہ قانون کیا کہتا ہے، ہر زمین پر آدمی لے آوٹ پاس نہیں کراسکتا، منظور نہیں کراسکتا، ورنہ زمین بچے گی ہی نہیں، ہر دیہات میں ہر شہر میں بعض زمین ایسی ہوتی ہے جو حکومت کی طرف سے مباح ہوتی ہے، آدمی اس پر دعوی کرتا ہے، مطالبہ کرتا ہے، مانگتا ہے تو اس کو حکومت دیتی ہے، اسی پر لے آوٹ پاس کراسکتا ہے، لے آوٹ منظور کرالیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت نے زمین اس کو دیدی، ورنہ لے آوٹ بڑے سے بڑا افسر بھی پاس نہیں کراسکتا، اس لئے اسے غصب کہنا محل نظر ہے، اب یہ غنڈہ عناصر ہوں یا معمولی انسان ہو، اس کے لئے رشوت دینا بھی ضروری ہے، اس کے بعد ہی پاس کراتا ہے، ان کے بغیر کام ہوتا ہی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں پر ایک سوال آیا تھا کہ سوئمنگ پول ہے، کھیل کا میدان ہے، پارکنگ ہے، اسے بلڈر بیچ دیتا ہے تو سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں مکان کے تابع ہیں، مبیع کے تابع ہیں، اب چاہے اوصاف سے مانی جائے یا مبیع کی ذات سے مانی جائے، جب تک بلڈران چیزوں کو دکھاتا نہیں ہے تب تک کوئی بھی چیز پاس نہیں کراسکتا، یہ اور بات ہے کہ رہائش پذیر یا جو لوگ مکان خرید رہے ہیں انہیں اصول کا پتہ نہیں ہوتا تو بلڈر اسے بیچ دیتا ہے، تو گویا کہ ان کے حق کو بیچ رہا ہے، اسے صرف اوصاف کہنا یہ محل نظر ہے، یہ ان کا حق مار رہا ہے، اسی طرح ایک بات یہ آئی تھی، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حکومت ہمارے نرخ اور داموں پر کنٹرول کرتی ہے اور اس میں عوام کی بھلائی بھی ہے، امام ابو یوسفؒ نے اس کی اجازت دی ہے کہ حکومت اور امیر نرخ پر کنٹرول کرسکتا ہے، تو یہ سوئمنگ پول ہوتا ہے، کھیل کے میدان ہوتے ہیں یا پارکنگ ہوتی ہے، یہ اسی قبیل سے ہے، کہ عوام کے فائدے کے لئے حکومت نے قانون پاس کیا ہے، گویا کہ اس کالونی میں جو رہنے والے ہیں ان کا حق ہے، اسے بلڈر نہیں بیچ سکتا، اب یہ اور بات ہے کہ سرکاری افسران آتے ہیں اور بغیر ان چیزوں کا معائنہ کئے ہوئے رشوت کھا کر اجازت دے دیتے ہیں، ورنہ NOC ان چیزوں کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

اب بعض کالونیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جس میں مسلمان بھی ہوتے ہیں اور غیر مسلم بھی ہوتے ہیں، اب وہاں پر کھیل کا جو میدان ہوتا ہے یا باغ ہوتا ہے تو اسے مسجد بنا لیتے ہیں، اس میں تمام کا حق لگا ہوا ہے، مسلم ہوں یا غیر مسلم ہوں، اس لئے باتفاق اہل کالونی ہی مسجد بنانے کی اجازت ہوگی، ورنہ یہ غصب ہوگا اور دوسروں کا حق مارنا ہوگا، اس کے علاوہ جو سودی قرض کا معاملہ آیا اس میں کوئی انکار نہیں ہے کہ بڑی مصیبتیں آتی ہیں، اب تو اور مصیبتیں ہوگئی ہیں کہ حکومت نے تین لاکھ سے زیادہ کیش پر پابندی لگادی ہے، کوئی آدمی اگر تین لاکھ سے زیادہ کیش کا کاروبار کرے گا تو وصول کرنے والے پر سو فیصد جرمانہ لگے گا، تو ممکن ہے ایک آدمی بڑے مکان کو نقد نہ لے پائے، مگر اس پر دو شرطیں جواز کی ہونی چاہئے: ایک تو یہ کہ جو تحدید وقت ہے، کم سے کم جو وقت ہے اس میں ادا کردیا جائے اور دوسری جو اہم شرط ہے وہ یہ کہ اس کے پاس واقعی نقد بھی ہونا چاہئے خریدنے کے لئے، ورنہ گویا کہ وہ مفتی کو بیوقوف بنا رہا ہے، سوالنامہ میں جو آخری سوال ہے کہ دلال جو رقم زیادہ کرکے دیتا ہے، دلال یہاں پر صرف واسطہ ہے، وکیل بالبیع نہیں ہے، یہ صرف دونوں بائع اور مشتری کو ملانے کا واسطہ ہے اور اسی کام کا وہ پیسہ لیتا ہے، لہٰذا اگر وکیل دلال زیادہ پیسہ لیتا ہے تو ممبئی کی زبان میں اور شہروں کی زبان میں اسے کھانچہ مارنا کہتے ہیں، یہ قطعاً جائز نہیں ہوگا۔ جزاکم اللہ۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

یہ بھی پہلو سامنے ہونا چاہئے کہ ایک تو یہ ہے کہ کسی فعل کا نادرست ہونا اور دوسرے اس فعل کی بنیاد پر ہونے والے تصرف کا ناقابل تنفیذ ہونا، جیسے تسعیر کا مسئلہ آپ نے بیان کیا، تو امام ابو یوسفؒ کے یہاں تسعیر کی اجازت ہے، لیکن فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ باوجود تسعیر کے اگر اس کی رعایت کئے بغیر بیچ دے تو بیع درست ہوجائے گی اور بیع نافذ ہوگی، اس پہلو کو بھی سامنے رکھا جائے۔

مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی (امارت شرعیہ پٹنہ):

بسم اللہ الرحمن الرحیم، سوال نمبر ۱۱ کے پہلے جزو سے متعلق عرض یہ ہے کہ پلاٹ خریدنے کے بعد اس پر قبضہ سے پہلے اس کی خرید وفروخت جائز ہونی چاہئے، جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کے نزدیک عقار کی بیع قبضہ سے قبل جائز ہے، چوں کہ اس صورت میں غرر اور ضیاع کا امکان نادر الوقوع ہے، البتہ اگر وہ زمین ایسی جگہ ہو جہاں اس کے ضائع ہونے کا قوی امکان ہو جیسے دریا کے کنارے وغیرہ تو پھر قبضہ سے قبل بیع جائز نہیں ہونی چاہئے، جزاکم اللہ خیر الجزاء۔

مولانا محمد ابرار خاں ندوی (جے پور):

بسم اللہ الرحمن الرحیم، بعض سوالات تو آچکے ہیں بعض ساتھیوں کی طرف سے، بس ایک چیز مجھے عرض کرنی ہے جو تیسرے سوال سے متعلق ہے اور وہ اتنی ہے کہ بعض لوگوں کی یہ رائے آئی کہ جس مال کی شرعی طور پر تقسیم نہیں ہوئی ہے یعنی پھوپھیوں کو اور بہنوں کو یعنی دادا نے اپنی بیٹیوں کو اور والد صاحب نے پھوپھیوں کو ان کا حصہ نہیں دیا ہے وہ مال بعد کے ورثاء کے لئے اس کی ملکیت میں نہیں ہے، لہذا جب ملکیت میں نہیں ہے تو اس کا بیچنا درست نہیں ہے، اس بات میں بعض دشواریاں بھی آئیں گی، اس لئے کہ اگر اس کو ملکیت ہم نہیں مانیں گے اور اس کے نتیجہ میں اس کی بیع درست نہیں مانیں گے تو پھر ایک مسئلہ آئے گا اس مال پر زکوۃ کی فرضیت کا، کہ اگر بہنوں کا حصہ الگ کردیا جائے تو اتنا کم مال بچے گا کہ اس پر زکوۃ فرض نہیں ہوگی، اس لئے کہ بہنوں کی ملکیت ہے، اس کی ملکیت نہیں ہے تو اس مال کو مدارس میں یا مساجد میں استعمال کرنا، اس مال سے حج کرنا (خالد سیف اللہ صاحب: زمین تو اموال زکوۃ میں نہیں ہے، یہ جب تک تجارت کے لئے نہ ہو)، لیکن اس کی آمدنی کا استعمال، اس زمین کی جو آمدنی ہوگی اس کا استعمال اور اس کی آمدنی پر زکوۃ اور اس کی آمدنی سے حج وغیرہ کرنا یہ تمام دینی امور کی انجام دہی وغیرہ کا مسئلہ تو آئے گا ہی، اس لئے اس کو ملکیت ماننے ہی میں فائدہ نظر آرہا ہے، جزاکم اللہ۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

یہ کئی تحریریں ہمارے پاس آئی ہیں، مولانا ومفتی عبدالحکیم صاحب، م ص ندوی صاحب، مولانا سیف اللہ صاحب دھنباد، مولانا سعید اسعد صاحب بنگال، مولانا شمس الدین قاسمی صاحب ایم پی، مولانا محمد حسن ندوی صاحب ماٹلی والا بھروچ، مولانا عمران ندوی صاحب، مولانا سلطان صاحب کشمیر، مولانا ومفتی نذیر احمد صاحب کشمیر، ان دوستوں نے بڑا اچھا کیا کہ انہوں نے اپنی رائے اور اپنی تجویز کو تحریری شکل میں دیدیا ہے، یہ ہمارے پاس امانت ہے جو تجویز کمیٹی بنے گی ان کے کنوینر کی خدمت میں انشاء اللہ ہم اسے پیش کردیں گے۔

ہم بہت شکر گزار ہیں کہ آپ حضرات نے بہت متانت اور وقار وسنجیدگی کے ساتھ عرض مسئلہ کو سنا اور ایک دوسرے کے احترام کے ساتھ اپنی باتوں کو پیش فرمایا اور بڑے اچھے نکات اٹھائے، ایسے نکات کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوا ہوگا، میں اس نشست کے اخیر میں اس اجلاس کے صدر عالی قدر حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی صاحب دامت برکاتہم مہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر و رکن عاملہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور ٹرسٹی خازن اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے صدارتی کلام سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

صدارتی خطاب

مولانا مفتی احمد دیولوی صاحب:

الحمد للّٰہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد!

اسٹیج پر تشریف فرما اساطین امت، علماء عظام اور اسلامک فقہ اکیڈمی کی دعوت پر پورے ملک اور بیرون ملک سے تشریف لائے ہوئے مفتیان عظام اور علماء دین! آج ہم نے جس موضوع کے متعلق عرض سنا اور اس کے بعد مناقشہ سنا، الحمد للہ بہت خوشی ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کی کوشش دن بہ دن بار آور ہو رہی ہے، چوں کہ احقر اسلامک فقہ اکیڈمی کے پہلے اجلاس میں شرکت نہیں کر سکا تھا، دوسرے اجلاس سے اور اس کے بعد سے شاید ہی کوئی ایک دو اجلاس ہو جس میں شرکت نہ کی ہو اور اس کے سمیناروں میں جو مقالات پیش کئے جاتے ہیں وہ بہت ہی علمی اور تحقیقی ہوا کرتے ہیں، اس وقت جو مقالے ہمارے سامنے پیش کئے گئے اس میں ہمارے مقالہ نگار حضرات نے جو تحقیق پیش کی ہے اس میں شقیں در شقیں جو بیان کی ہیں یہ آپ حضرات کی محنتیں ہیں جو قابل قدر ہیں، اللہ تعالیٰ مزید توفیق عطا فرمائے اور زمین کے بارے میں ایک تو مزروعہ زمین ہے اور دوسری غیر مزروعہ زمین ہے، کھیتی کی زمین مزروعہ زمین ہے جس کی قیمت کم ہوتی ہے اور جب مزروعہ پر پلاٹنگ کر دی جاتی ہے اور آبادی دکھادی جاتی ہے تو افسران اسے غیر مزروعہ میں شمار کر کے اس کی اجازت دے دیتے ہیں، پھر بلڈر اس کو فروخت کرتا ہے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اس لئے جو راستے وغیرہ ہیں، کامن پلاٹ ہے یا باغ وغیرہ یا تفریح وغیرہ کا جو سوئمنگ پول وغیرہ رکھا ہے تو اس کی قیمت زمین بیچنے والا وصول کر لیتا ہے، وہ اس کی طرف سے نہیں ہے، اس لئے میرا اپنا خیال ہے کہ جو باغ وغیرہ یا مسجد اور راستہ وغیرہ کو اپنا پلاٹ بتا کر فروخت کرتا ہے، تو اس کو بیچنے کی اجازت نہیں ہوگی اور اس میں کمی بیشی کرنے کی اس کو اجازت نہیں ہونی چاہئے اور اس لئے بھی کہ وہ اپنی قیمت وصول کر چکا ہے، یہ تو سرکار نے اس کو فرض لازم کیا ہے کہ وہ ان چیزوں کے لئے اتنی جگہیں چھوڑیں، اسی بناء پر غیر قانونی طور پر وہ کام کرے گا تو سرکار اس کو ضبط بھی کر لیتی ہے، اس لئے جو حضرات اس کی تجویز مرتب کریں گے وہ اس پر توجہ رکھیں گے، بہت وقت ہو چکا ہے، میں اسی پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

☆☆☆

عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام کے جدید فقہی مسائل پر مقالہ جات اور مناقشات کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ

سلسلہ
جدید فقہی مباحث

سرکاری اسکیموں سے استفادہ

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے چھبیسویں فقہی سمینار منعقدہ مورخہ ۵-۷/ جمادی الاخری ۱۴۳۸ھ مطابق ۴-۶/ مارچ ۲۰۱۷ء کو مجلس اتحاد امت اجین، مدھیہ پردیش میں پیش کئے گئے علمی، فقہی اور تحقیقی مقالات ومناقشات کا مجموعہ

تحقیقاتِ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

زیرِ سرپرستی

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی
حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالاشاعت
اردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان

مجلس ادارت

جدید فقہی تحقیقات

باب اول تمہیدی امور

سوال نامہ:

سرکاری اسکیموں سے استفادہ

ہماری حکومت عوام کی معاشی و معاشرتی ضرورتوں کی کفالت، تعلیمی ترقی، صنعتوں کے فروغ اور اقتصادی اعتبار سے محروم و پسماندہ شہریوں کو اونچا اٹھانے نیز ملک کی معیشت کی مضبوطی و ترقی کے لئے مختلف شکلوں میں رقوم دیتی ہے، جس سے چھوٹے بڑے پیمانے پر بہت سے کام انجام دیئے جاتے ہیں، اور معاشی و تعلیمی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں، نیز صحت و علاج، رہائش اور زراعت وغیرہ میں عوام کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے، اس طرح کی بعض اسکیمیں ملک کے تمام طبقات کے لئے اور بعض مسلمانوں بشمول مخصوص طبقات کے لئے ہوتی ہیں، نیز یہ بات ظاہر ہے کہ ملک کے خزانہ پر جس طرح دوسرے لوگوں کا حق ہے، اسی طرح مسلمانوں کا بھی حق ہے اور وہ بھی براہ راست یا بالواسطہ ٹیکس ادا کرتے ہیں؛ اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایسی فلاحی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں؛ لیکن چونکہ ہمارا ملک ایک سیکولر ملک ہے؛ اس لئے بہت سی اسکیموں میں اس بات کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہ وہ شرعی طور پر قباحتوں سے پاک ہوں۔

ان اسکیموں میں عوام کو جو رقوم فراہم کی جاتی ہیں، وہ بنیادی طور پر دو طرح کی ہوتی ہیں: امداد و اعانت اور قرض، امدادی رقوم زیادہ تر اسکالرشپ وغیرہ کی شکل میں دی جاتی ہیں، ان کے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی، رہا قرض تو قرضے بنیادی طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ قرض جس کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے، جس کو سبسڈی کا عنوان دیا جاتا ہے، دوسرے وہ قرضے جو پورے واپس ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ مزید کچھ ادا کرنا پڑتا ہے، کبھی اس زائد رقم کی شرح سود کی مروج شرح کے مطابق ہوتی ہے اور کبھی بہت معمولی ہوتی ہے، اس قسم کے قرضوں سے مسلمانوں کے لئے استفادہ کا کیا حکم ہے؟ - اس بابت چند سوالات پیش خدمت ہیں:

۱- وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

۲- معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

۳- اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

۴- غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو؛ لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرہ میں آئے گا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت و گنجائش ہوگی؟

۵- اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

۶- ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

۷- گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم- جس قسم کی بھی ہوں- ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

۸- بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

۹- اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

۱۰- امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

۱۱- بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

۱۲- بعض ایسی اسکیمیں بھی ہین، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر دیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے تو کیا صورت درست ہوگی؟



تجاویز:

سرکاری اسکیموں سے استفادہ

۱- وہ سرکاری قرضے جن کا کچھ حصہ معاف کردیا جاتا ہے، اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے ایسے قرضوں کا لینا جائز ہے۔

۲- وہ قرضے جن میں ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، ایسے قرضوں کا لینا بھی درست ہے۔

۳- وہ قرضے جن میں مقررہ مدت کے بعد قرض واپس کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے، ایسے قرضے بلا ضرورت شدیدہ لینا جائز نہیں ہے۔

۴- وہ قرضے جن کی واپسی پر اصل سے زائد رقم ادا کرنی پڑتی ہو وہ ناجائز ہے، البتہ اگر وہ دیندار ماہرین اور معتبر اصحاب افتاء کی رائے کے مطابق اس جیسے عمل کے لئے واقعی سروس چارج کہلانے کے لائق ہو اور کسی طرح بھی سود لینے کا حیلہ نہ ہو تو لینے کی گنجائش ہے۔

۵- قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے وہ رقم سود ہے اور عام حالات میں ایسا قرض لینا جائز نہیں ہے۔

۶- مکان یا بیت الخلاء کی تعمیر یا تعلیمی ضروریات وغیرہ کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے امداد کے طور پر جو رقم ملتی ہے اس کو حاصل کرنا اور اس کا استعمال کرنا درست ہے۔

۷- رشوت لینا اور دینا جائز نہیں ہے، البتہ گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی رقوم حاصل کرنے کا طریقہ کار سے کوئی شخص واقف نہ ہو یا کسی وجہ سے اس کو انجام دینے پر قادر نہ ہو اور وہ کسی ایسے شخص کی مدد حاصل کرے جو اس کے حصول کے لئے تگ ودو اور جدوجہد کرتا ہو اور یہ کوشش اس کی ذمہ داری میں داخل نہ ہو تو بطور محنتانہ مناسب مقررہ اجرت کا لین دین درست ہے۔

۸- امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے جو شرائط ومعیارات حکومت کی طرف سے متعین ہوں اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض حاصل کرنا درست نہیں ہے۔

۹- تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت عوام کو بینک سے قرض دلائے اور اس پر عائد ہونے والی زائد رقم خود مقروض کو ادا نہ کرنا پڑے، بلکہ خود حکومت ادا کرے تو اس طرح کا قرض لینا درست ہے۔

۱۰- جن اسکیموں میں حکومت نے محفوظ فنڈ قائم کرکے اس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا اور اس کے انٹرسٹ سے حاصل شدہ رقم کا مالک ہوکر تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کرتی ہے، ایسی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے۔

۱۱- دوسری قومی اکائیوں کی طرح مسلمانوں کا بھی سرکاری خزانہ میں حق ہے، اس لئے سرکاری اسکیموں سے مسلمانوں کو استفادہ کرنا چاہئے، بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو، جو شرعاً ممنوع ہے۔

۱۲- شرکاء سمینار مسلم دانش وروں، تنظیموں اور اداروں کے نمائندوں اور ذمہ داروں کو توجہ دلاتے ہیں کہ سرکاری جائز اسکیموں کا لوگوں میں زیادہ سے زیادہ تعارف کرائیں اور بلا معاوضہ ممکنہ تعاون کی صورت پیدا کریں۔

☆☆☆

تلخیص مقالات:

سرکاری اسکیموں سے استفادہ

مفتی احمد نادر القاسمی

"إن الحمد كله لله والصلاة والسلام على رسول الله، وعلى آله وصحبه، ومن تبعه ودعا بدعوته جميعًا"۔

دنیا کے جمہوری اور عالمی سیاسی وملکی نظام میں ہر ملک اور ریاست اپنے اپنے طور پر عوام کی ترقی اور راحت رسانی کے لئے مختلف قسم کی اسکیمیں جاری کرتی اور منصوبے بناتی ہے، ان اسکیموں میں بسا اوقات فلاحی ورفاہی امداد وتعاون بھی ہوتا ہے، اور تعلیمی قرضہ جات، رہائشی مکانات کی تعمیر کے لئے بینک اور حکومت کے ذریعہ دی جانے والی سود پر مبنی سہولیات بھی ہوتی ہیں اور کاروبار اور معاشی ترقی کے لئے فراہم کیا جانے والا سودی قرض بھی ہوتا ہے، جہاں تک حکومت سے ملنے والی امداد کا تعلق ہے تو اس میں تو کوئی دو رائے نہیں کہ اس سے استفادہ کرنا اور اسے قبول کرنا بغیر کسی تردد کے جائز ومباح ہے، حکومت، خواہ کسی بھی نظریہ کی حامل ہو اور کسی طبقہ کی ہو، حکومتی نظام اور خزانے سے استفادے میں سب برابر کے شریک ومساہم ہیں، کیونکہ ملک کی ترقی اور تعمیر میں ہر شہری کا اپنے اپنے دائرے میں تعاون شامل رہتا ہے، البتہ بعض اسکیمیں سود پر مبنی ہوتی ہیں اور ان سے استفادے کے لئے حکومت کو اس کے عوض سود دینا پڑتا ہے، ان اسکیموں سے ایک صاحب ایمان شخص کے لئے ملک اور نظام کا حصہ ہونے کے باوجود استفادہ کرنا درست ہوگا یا نہیں، یہ ایک اہم سوال ہے، اس منظر میں بہت سے اور بھی سوالات ہیں جو قابل غور بھی ہیں اور فوری حل طلب بھی، ان سوالات کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے ۲۶ ویں فقہی سمینار کا ایک موضوع "سرکاری اسکیموں سے استفادہ" بھی رکھا، اور اس بابت مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے سوالنامہ مرتب کر کے اہل علم وارباب افتاء کی خدمت میں روانہ کیا، ان سوالات کے جو جوابات اور اہل علم کی فقہی آراء نیز تحقیقی مقالات اکیڈمی کو موصول ہوئے، ان کی تلخیص، دلائل اور مقالہ نگاران کے نتائج فکر، اس مجموعہ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تلخیص کرتے وقت تک اکیڈمی کو اس بارے میں جن ۷۵ / حضرات اہل علم وفکر کی قیمتی تحریریں راقم الحروف (احمد نادر القاسمی) کو موصول ہوئیں ان کے اسماء گرامی اس طرح ہیں:

مولانا فیاض عالم قاسمی، مفتی ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی حیدر علی قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد صابر حسین ندوی، مولانا محمد ممتاز خاں ندوی، علامہ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد عرفان (آسام)، مولانا محمد اکرم بن اسلم رشید، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مولانا محمد حذیفہ داحودی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی اعجاز الحسن باندے، شیخ ڈاکٹر عبد اللہ جولم، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد فلاحی، مفتی محمد فاروق دربھنگوی، مولانا سراج الحق میواتی، مولانا عباس بن یوسف، مفتی محمد حسین قمر الدین ماہمکر فلاحی، مفتی جنید بن محمد پالنپوری، مفتی محمد اسعد پالنپوری، مولانا رحمت اللہ ندوی، دار الافتاء مدرسہ جامعہ عربیہ سلم العلوم بناس کانٹھا گجرات، مفتی محمد زبیر ندوی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا نثار عالم ندوی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی محمد ارشاد دساوا، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی محمد رمضان سعادتی، حضرت شیخ مفتی محبوب علی وجیہی، حضرت مفتی جمیل احمد نذیری، ڈاکٹر محی الدین غازی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، دار الافتاء جامعہ سلفیہ بنارس، مولانا ابوالمکارم معروفی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی عبد المنان آسام، مفتی عبد الحمید قاسمی (دیناج پور)، مفتی عبد التواب اناوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، حضرت قاضی عبد الجلیل قاسمی، مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی ملیا، مولانا ظہیر احمد قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا مصطفی عبد القدوس ندوی، مولانا عبد الباسط قاسمی۔

اکیڈمی کی طرف سے جاری کردہ سوالنامہ کل ۱۲ / سوالات پر مشتمل ہے، جس میں پہلا سوال یہ ہے:

سوال نمبر(۱): وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

مقالہ نگاران کا موقف:

حکومت کی طرف سے فراہم کیا جانے والا قرض جس میں حکومت قرض کا کچھ حصہ معاف کردیتی ہے جسے حکومت کی اصطلاح میں سبسڈی کہا جاتا ہے، اور قرض لینے والے کو لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، حکومت کی اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے اور قرض حاصل کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، جائز اور مباح ہے، اور حکومت کی طرف سے قرض کی رقم میں کمی کردینا یہ سودی معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح کا تعاون ہے، اور قرض دینے والے کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی رقم کا کچھ حصہ معاف کردے، اس پر تمام ہی مقالہ نگاران کا اتفاق ہے، اس پر حضرات مقالہ نگاران نے جو دلائل دیئے ہیں وہ اس طرح ہیں:

دلائل:

۱۔ "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة، وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون" (سورة البقرة: ۲۸۰)۔

۲۔ "يأأيها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمى فاكتبوه" (بقرہ: ۲۸۲) (دیکھئے مقالہ: اعجاز الحسن باندے)۔

۳۔ "يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (سورہ بقرہ: ۱۸۵)۔

۴۔ اس پر ربا کا تحقق نہیں ہوتا ہے، ''عن علی مرفوعًا: كل قرض جرّ منفعة فهو ربا. وكل قرض شرط فيه زيادة، فهو حرام بلا خلاف'' (اعلاء السنن للتهانوی ۱۴/ ۴۹۹) (از مقالہ: مفتی لطیف الرحمن مبیّ)۔

۵۔ ''عن كعب بن مالك عن النبى صلى الله عليه وسلم: كشف سجف حجرته ونادى كعب بن مالك، فقال: يا كعب! فقال: لبيك يا رسول الله، فأشار بيده أن ضع الشطر من دينك، قال كعب: قد فعلت يا رسول الله'' (بخاری ۱/ ۶۸ كتاب الصلاة باب رفع الصوت فى المسجد)۔

۶۔ ''عن جابر قال: أصيب عبد الله وترك عيالًا ودينًا فطلبت إلى أصحاب الدين أن يضعوا بعضًا، فأبوا فأتيت النبى صلى الله عليه وسلم فاستشفعت به عليهم فأبوا'' (بخاری: كتاب الاستقراض، باب الشفاعة فى وضع الدين ۱/ ۳۲۴)۔

۷۔ ''فأتاه عبد الله بن جعفر وكان له على الزبير أربع مائة ألف، فقال لعبد الله: إن شئتم تركتها لكم، قال عبدالله: لا'' (بخاری كتاب الجهاد، باب بركة الغازى فى ماله حيا وميتا ۱/ ۴۴۱)

(مذکورہ روایات محبوب فروغ احمد قاسمی کے مقالے سے ماخوذ ہیں (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

۸۔ ''عن كعب بن عمرو: ''من أنظر معسرًا أو وضع عنه أظله الله فى ظله'' (مسلم حديث نمبر: ۳۰۰۶)۔

۹۔ ''عن أبي هريرة: استقرض رسول الله صلى الله عليه وسلم سنا فأعطى سنا خيرا منه، وقال: خياركم أحسنكم قضاءًا'' (سنن ترمذی حديث نمبر: ۱۳۱۹)۔

۱۰۔ ''عن أبي رافع أن النبى صلى الله عليه وسلم استسلف من رجل بكرا، فقدمت على النبى إبل الصدقة، فأمر أبا رافع أن يقضى الرجل بكره فرجع إليه أبو رافع، فقال: يا رسول الله! لم أجد فيها إلا خيارًا رباعيا، فقال: أعطه، فإن خير الناس أحسنهم قضاءًا'' (مسلم حديث نمبر: ۱۶۰۰) (مولانا سراج الحق میوانی)۔

۱۱۔ ''قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من أحب أن يظله الله فى ظله فلينظر معسرًا أو يضع عنه'' (ابن ماجه، كتاب الصدقات، حديث نمبر: ۲۴۱۹)۔

۱۲۔ ''قال: من سره أن ينجيه من كرب يوم القيامة فلينفس عن معسر أو يضع عنه'' (مسلم، حديث نمبر: ۴۰۸۳)۔

۱۳۔ ''عن النبي صلى الله عليه وسلم: حوسب رجل ممن كان قبلكم، فلم يوجد له من الخير شئى إلا أنه كان يخالط الناس، وكان موسرًا، فكان يأمر غلمانه أن يتجاوزوا عن المعسر، قال: قال الله عزوجل: ''نحن أحق بذلك منه، تجاوزوا عنه'' (مسلم، حديث نمبر: ۱۵۶۱، بخاری ادب المفرد، حديث نمبر: ۲۹۳، ترمذی حدیث نمبر: ۱۳۰۷) (دیکھئے مقالہ: مفتی ڈاکٹر شاہجہاں ندوی)۔

۱۴۔ ''من أنظر معسرًا أو وضع له أظله الله يوم القيامة تحت ظل عرشه يوم لا ظل إلا ظله'' (ترمذی. حدیث نمبر: ۱۳۰۶) (دیکھئے: مفتی عارف باللہ)۔

۱۵۔ ''عن عائشة رضي الله عنها قالت: توفي رسول الله ﷺ ودرعه مرہونة عند یہودی بثلثين صاعًا من شعير، ومنها أيضًا: اشترى رسول الله ﷺ طعامًا من يهودى إلى آجل ورہنه درعًا له من حديد'' (مشکوۃ/ ۲۵۰) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد عثمان بستوی)۔

۱۶۔ ''عن حذيفة قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: مات رجل فقيل له: قال أبايع الناس فأتجاوز عن الموسر وأخفف عن المعسر فغفر له'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۳۹۱) (قاضی محمد حسن ندوی)۔

۱۷۔ ''قوله: (ففعل صح) أی أخّر رب الدين أو حط بعض الدين، بأن أبرأ المديون عن بعض الدين'' (تبيين الحقائق للزيلعی ۵/ ۴۴، ط: المطبعة الكبرى قاهره)۔

۱۸۔ ''إذا أقر له بدين أو عين فأسقط أو وہبه البعض وترك الباقی صح'' (زاد المستقنع فی اختصار المقنع ۱/ ۱۱۸، ط: دار الوطن للنشر، رياض)۔

۱۹۔ ''إذا أقر له بدين أو عين فوہب أو أسقط بعضه وطلب باقيه صح'' (الفروع ۶/ ۲۳، ط: مؤسسة الرساله)۔

۲۰۔ ''إذا أقر له بدين أو عين فوضع عنه بعضه أو وہب له بعضها ... فهو صحيح'' (الانصاف ۵/ ۲۳۵ ط: دار احياء التراث العربي)۔

۲۱۔ ''إذا أقر له بدين أو عين فأسقطه عنه من الدين بعضه... صح'' (الروض المربع ۱/ ۳۷۹، ط: الرساله)۔

۲۲۔ ''كان يقرر رشيد لآخر بدين أو عين ثم يسقط عن المقر له بعض العين أو الدين، ويأخذ الباقی فهو إبراء عن بعض الدين بلفظ الصلح'' (الفقه الميسر ۱/ ۲۵۵، ط: مجمع الملك فهد)۔

۲۳۔ ''إذا كان النفع عائدًا على المقترض، فليس حرامًا؛ لأنه تبرع من المقرض للمستقرض'' (القواعد الفقهيه ۱/ ۶۵۴، ط: دار الفكر دمشق) (مذکورہ فقہی عبارات کے لئے دیکھئے: مقالہ: محمد اکرم بن اسلم رشید)۔

۲۴۔ ''وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون'' (سورہ بقرہ: ۲۸۰) ''أی تتصدقوا على المعسر بالإبراء (من كل الدين أو بعضه)'' (جلالين ۱/ ۴۴)۔

۲۵۔ ''إذا قضى المديون أقل من حق الدائن ورضى به الدائن أو لم يؤد المديون شيئًا، ولكنه حلله عن الدائن فأحل له فهو جائز'' (فيض الباری ۳/ ۳۱۱ كتاب الاستقراض) (دیکھئے: محمد عرفان آسام)۔

۲۶۔ ''كذلك يجوز للبائع أن يزيد فی المبيع ويجوز أن يحط الثمن ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك'' (الفقه الميسر/ ۱۱۰) (دیکھئے مقالہ: محمد ممتاز خاں ندوی)۔

۲۷۔ ''ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباه مع الغمز عيون البصائر)۔

۲۸۔ ''ویکون متبرعًا علی المدعی علیه کما لو تبرع بقضاء الدین'' (ہدایہ ۳/ ۲۵۰) ''العفو إنما یسقط ماکان مستحقا للمعانی خاصة'' (قواعد الفقہ/ ۹۳)، ''وهبة الدین ممن علیه إبراء'' (ہدایہ ۳/ ۲۹۲)، ''وهبة الدین ممن علیه الدین جائز قیاسًا واستحسانًا'' (ہندیہ۴/ ۳۸۴) ''للدائن أن یحفو المدین وتبرأ بذلك ذمته من الدین'' (موسوعہ فقہیہ۳۰/ ۱۷۳)۔

۲۹۔ ''کما لا یوعظ الطالب فی نقصان ماله، إذا لو أبرأه من جمیعه لصحت برائته'' (احکام القرآن للجصاص۱/ ۵۸۹)

۳۰۔ ''اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا اور غریب رعایا کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرنا ہے، اسی لئے حکومت کچھ رقم کی چھوٹ بھی دیتی ہے، جسے سبسڈی کہا جاتا ہے، اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد سود خوری نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی شخص حکومت سے اس قسم کی اسکیم کے تحت قرض لے اور حکومت کی طرف سے اس پر کچھ رقم کی چھوٹ ملے (اور بقیہ رقم حکومت مع سود وصول کرے) اگر وہ چھوٹ سود میں ملی ہوئی رقم، یعنی سبسڈی سے ادا ہو جاتی ہو، اپنے پاس سے زائد رقم نہ دینا پڑتی ہو تو اس تاویل سے کہ حکومت نے بطور تعاون جو رقم دی تھی اس شخص نے اسی تعاون والی رقم میں سے کچھ رقم واپس کردی۔ مذکورہ اسکیم کے تحت قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر سود کی رقم چھوٹ میں ملی ہوئی رقم بھی سبسڈی سے زیادہ دینی پڑے تو پھر یہ معاملہ سودی کہلائے گا اور جائز نہ ہوگا'' (فتاوی رحیمیہ ۹/ ۲۶۵)۔

۳۱۔ ہندوستان میں محض سرکاری قرضے ایسے ہیں جن پر سرکار کی طرف سے چھوٹ دی جاتی ہے، اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی اضافی رقم چھوٹ کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں ہے'' (فقہی فیصلے/ ۱۶۲)۔

مذکورہ بالا کتاب وسنت اور عبارات فقہاء کے علاوہ بہت سے مقالہ نگاران نے اکابر علماء وفقہاء کے اردو فتاوی بھی استشہاد میں پیش کئے ہیں، تفصیل کے لئے ان کے مقالات کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے (دیکھئے مقالہ: مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا محمد حذیفہ داحودی، مفتی عبدالتواب اناوی وغیرہ)۔

متفرق نکات:

- مفتی محمد عثمان بستوی کا خیال ہے کہ اس طرح کی چھوٹ والی اسکیموں سے استفادہ میں اس بات کو بھی مصلحتاً مدنظر رکھنا چاہئے کہ بسا اوقات سیاسی جماعتیں اپنے سیاسی مقاصد کی غرض سے اس طرح کی اسکیمیں جاری کرتی ہیں اور عوام کو بعد میں دینی ودنیوی ضرر لاحق ہوتا ہے (دیکھئے: موصوف کا مقالہ)۔
- ایسی اسکیموں سے فائدہ اٹھانا درست ہے، تاہم اس کا لحاظ ضروری ہے کہ وہ دینی اور سیاسی مصلحت کے خلاف نہ ہو (مولانا ابوالمکارم معروفی)۔
- مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی جواز کی رائے کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''اگر بوقت قرض نہ تو معافی مشروط ہو اور نہ معروف ہو تو بظاہر ایسے قرضے کی حصول یابی میں کوئی حرج نہیں'' (دیکھئے: موصوف کا مقالہ)۔
- یہ صورت اس وقت جائز ہوگی جب اس میں معافی اور چھوٹ عام ہو، سب کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جارہا ہو، اگر یہ خاص طبقہ کے لئے ہو تو صرف اس طبقہ کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا، سب کے لئے نہیں، اگر قرض میں معافی کا ضابطہ تو ہو، مگر عام اعلان نہ ہو تو اس کی دو شکل ہے، اگر واقعتاً ادائیگی کی وسعت نہیں ہے تو معافی کرانا جائز ہوگا اور قرض سے نفع اٹھانے کا حکم عائد نہیں ہوگا، اور اگر کل قرض کی ادائیگی کی وسعت ہے، مگر غیر اعلان شدہ ضابطہ سے معلوم ہونے کی وجہ سے قرض کی واپسی میں معافی چاہتا ہے تو پھر اس کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا اور یہ ''کل قرض جر نفعًا فھو ربوا'' (السنن الکبری للبیھقی ۸/ ۲۷۶) کے حکم میں داخل ہوگا، اور قرض کی رقم میں کمی کی سہولت سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ استقراض بالربح مقید ہے محتاج کے ساتھ اور وہ یہاں فوت ہے (من غیر لفظہ) (دیکھئے مقالہ: مفتی عبدالتواب)۔
- مولانا رحمت اللہ ندوی کا خیال ہے کہ یہ معاملہ اصل معاملہ کے وقت سودی ہی ہوتا ہے، اس لئے ضرورت اور ناقابل برداشت مشقت کی صورت میں ہی قرض لینے کی اجازت اور گنجائش ہے، خواہ اس کا ایک حصہ معاف کردیا جائے، بلاضرورت اور وجہ مجبوری کے بینک سے سودی قرض لینا حرام ہے (دیکھئے موصوف کا مقالہ) یہی رائے دارالافتاء سلم العلوم بناس کانٹا گجرات کی بھی ہے۔

سوال نمبر (۲): معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے، جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

اس سوال کے جواب میں بھی تمام مقالہ نگاران کا اتفاق ہے کہ چونکہ تاخیر کی وجہ سے اگر چہ قرض لینے والے کو سبسڈی کا فائدہ نہیں ہوتا اور حکومت نے جو مراعات اسے دی تھی اس سے وہ محروم رہتا ہے، تاہم واپسی میں، لی ہوئی رقم سے زائد نہیں دینا پڑتا، اس لئے یہ معاملہ بھی سودی معاملہ کے دائرے میں نہیں آئے گا اور جائز رہے گا، کیونکہ اس میں نہ سود لیا جاتا ہے اور دیا جاتا ہے۔ دلائل میں ایسی نصوص پیش کئے ہیں جن میں ربا کی حرمت اور ممانعت آئی ہے، اور قرض کی واپسی میں وقت کی تعیین وتحدید کا اختیار شریعت نے قرض خواہ کو دیا ہے، اس لئے ان نصوص کو بھی پیش کیا ہے جن میں وقت کی تعیین کی طرف اشارہ ہے، مثلاً:

دلائل:

۱۔ ''وإن تبتم فلكم رؤوس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون'' (سورہ بقرہ: ۲۸۰)۔

۲۔ یہ قرض حسن ہے، جس میں کوئی سود نہیں ہے، ''من ذا الذي يقرض الله قرضًا حسنًا فيضاعفه لم أضعافًا كثيرة والله يقبض ويبسط وإليه ترجعون'' (سورہ بقرہ: ۲۴۵)۔

۳۔ ''عن أنس بن مالك: رأيت ليلة أسرى بي على باب الجنة مكتوبًا: الصدقة بعشر أمثالها والقرض بثمانية عشر. فقلت لجبريل: ما بال القرض أفضل من الصدقة؟ قال: لأن السائل يسأل وعنده؛ والمستقرض لا يستقرض إلا من حاجة'' (ابن ماجه، حديث نمبر: ۲۴۳۱)۔

۴۔ ''من كان في حاجة أخيه كان الله عزوجل في حاجته، ومن فرج عن مسلم كربة، فرج الله عزوجل عنه بها كربة من كرب يوم القيامة'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۲، ۶۹۵۱، مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۰، ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۸۹۳، ترمذی، حدیث نمبر: ۱۴۲۶، نسائی، حدیث نمبر: ۲۹۱)۔

۵۔ ''عن النبي صلى الله عليه وسلم: ما من مسلم يقرض مسلمًا قرضًا مرتين إلا كان كصدقتها مرة''۔

۶۔ ''كل قرض جر نفعًا فهو ربا'' عن فضالة بن عبيد أنه قال: ''وكل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا'' (السنن الکبری للبیہقی ۸/ ۲۷۶، حدیث نمبر: ۱۱۰۹۳)۔

۷۔ ''إذا قال: صالحتك من الألف على خمس مائة تدفعها إليّ غدًا وأنت بريئ من الفضل على أنك إن لم تدفعها إلي غدًا فالألف عليك على حاله، وجوابه إن الأمر على ما قال؛ لأنه أتى بصريح التقييد، فيفعل به'' (ہدایہ ۳/ ۲۳۶) (مولانا خورشید انور اعظمی، وایضاً: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۸۔ ''إذا كان حط الدين المؤجل مشروطًا بتعجيله فهو ممنوع، لأنه من قبيل (ضع وتعجل) وأما إذا كان من غير شرط ملفوظ ولا ملحوظ فهو جائز، فيكون حينئذ تبرعًا من الدائن للمدين، والله اعلم'' (الفتاوی الشرعیہ کویت ۶/ ۱۶۵) (ماخوذ از مقالہ محمد ابرار خاں ندوی)۔

۹۔ '' (ولو شرط) أن يرد (مكسرا عن الصحيح أو أن يقرضه) شيئًا آخر (غيره لغا الشرط) فيهما ولم يجب الوفاء به (والأصح أنه لا يفسد العقد، لأن ما جره من المنفعة ليس للمقرض، بل للمقترض والعقد عقد إرفاق، فكأنه زاد في الإرفاق ووعده وعدًا حسنًا'' (نہایۃ المحتاج مع شیئین ۴/ ۲۳۰-۲۳۱)۔

۱۰۔ ''(فسد) أي الإقراض (بشرط جر منفعة للمقرض كرد زيادة) في القدر أو الصفة كرد صحيح عن مكسر (أو شرط)

أن يرد (أنقص) قدرًا وصفة كرد مكسر عن صحيح (لغا الشرط فقط) أي لا العقد؛ لأن ماجره من المنعقة ليس للمقترض؛ بل للمقروض أو لهما والمقترض معسر والعقد عقد إرفاق، فكأنه زاد في الإرفاق ووعده وعدًا حسنًا'' (حاشية الجمل ۵/ ۵۹، تكملة المجموع ۱۳/ ۲۹۲، حاشية اعانة الطالبين ۳/ ۹۳) (دیکھئے مقالہ: محمد حسین قمر الدین)۔

۱۱۔ ''ولا يثبت الأجل في القروض عندنا'' (ہدایہ ۵/ ۳۶۸)۔

۱۲۔ ''إن هذه المعاملة فيها مصلحة للطرفين (الدائن والمديون) فالدائن يستفيد تعجيل الدين والمدين يستفيد بوضع الدين عليه، وهذا ضد الربا، فإن ذلك يتضمن الزيادة في الأجل. وذلك إضرار محض بالغريم ومسألتنا تتضمن برأة ذمة الغريم من الدين وانتفاء صاحبه بما يتعجله، وكلاهما حصل له الانتفاء من غير ضرر'' (فتاوى اللجنه ۱۴۸/ ۱۳، ۱۶۸/ ۱۳)۔

۱۳۔ ''الدين لا يسقط إلا بالقضاء'' (بدائع الصنائع ۵/ ۱۳) (دیکھئے مقالہ: قاضی محمد حسن ندوی)۔

۱۴۔ ''وكان عليه مثل ما قبض'' (تنویر الابصار ۷/ ۲۹۸)۔

۱۵۔ ''ومن كان على آخر ألف درهم، فقال: ادفع إلي غدا منها خمس مائة على أنك برئ من الفضل، ففعل فهو برئ. فإن لم يدفع إليه خمس مائة غدًا عادت الألف عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله'' (الفتاوی الهندیه باب الصلح فی الدین ۴/ ۲۳۴، العناية مع شرح فتح القدير باب الصلح في الدين ۸/ ۴۴۷) (محمد جمیل اختر جلیلی ندوی)۔

۱۶۔ ''الديون تقضى بأمثالها'' (شامی / ۶۷۵ کتاب الایمان)۔

۱۷۔ ''قال محمد رحمه الله تعالى في كتاب الصرف: إن أبا حنيفة كان يكره كل قرض جر منفعة، قال الكرخي: هذا إذا كانت المنفعة مشروطة في العقد'' (ہندیہ ۳/ ۲۰۲) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد زبیر ندوی)۔

۱۸۔ ''أد إلي غدًا خمس مائة على أنك برئ من الباقي على أنك لو لم تعطيني غدًا خمس مائة فالألف عليك على حاله. فالأمر كما قال'' (خلاصة الفتاوى ۴/ ۱۷۷)۔

۱۹۔ ''اختلف العلماء في تأخير الدين إلى أجل، فقال أبوحنيفة وأصحابه: سواء كان القرض إلى أجل أو غير آجل. له أن يأخذه متى أحب، وكذلك العارية وغيرها؛ لأن عندهم من باب العدة والهبة غير مقبوضة، وهو قول الحارث العكلي وإبراهيم النخعي'' (عمدة القاری للعینی ۶/ ۶۰)۔

۲۰۔ ''اسلامک فقہ اکیڈمی نے سود سے متعلق مسائل کے سلسلہ میں جو تجاویز اعظم گڈھ کے سمینار میں پیش کیا تھا اس میں ایک تجویز یہ تھی کہ ''ہندوستان میں بعض سرکاری قرضے ایسے ہوتے ہیں جن میں سرکار کی طرف سے چھوٹ دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر وہ سود کی رقم چھوٹ والی رقم کے مساوی یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم سود نہیں ہے (ماہنامہ الرشاد جنوری ۱۹۹۰ء)۔

۲۱۔ ''سرکاری خزانہ چونکہ عوامی ملکیت ہے، لہٰذا مقررہ ضابطے کے تحت حکومت کو قرض یا قرض کا بعض حصہ معاف کرنے کا اختیار ہے، اور قرض کے حقدار کو اس معافی سے فائدہ اٹھانے کا بھی حق ہے۔

مذکورہ عربی وفقہی عبارات اور کتاب وسنت کے نصوص کے علاوہ مقالہ نگاران نے اردو فتاوی بھی نقل کئے ہیں، استفادہ کے لئے وہاں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

متفرق وضاحت:

اس سوال کے جواب میں بعض مقالہ نگاران نے قرض میں تاجیل اور مدت متعین کئے جانے کے سلسلہ میں جوائمہ کے درمیان مشہور اختلاف ہے،

اس کا بھی ذکر کیا ہے، مثلاً مفتی عبد المنان آسام، قاضی محمد حسن ندوی ماٹلی والا بھروچ، مولانا ابوالمکارم معروفی وغیرہ، مگر چونکہ یہ مسئلہ مقالہ نگاران کے نزدیک اتفاقی ہے، اس لئے ائمہ کے اختلافات کی تفصیل یہاں طوالت کے خوف سے ذکر کرنا موزوں معلوم نہیں ہوتا۔

سوال نمبر (۳): اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

اس سوال سے متعلق مقالہ نگاران کی رائے یہ سامنے آئی کہ اگر قرض کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے قرض میں لی گئی رقم سے زیادہ ادا کرنا پڑے تو یہ سراسر سودی معاملہ ہے اور یہ زیادتی ربا جاہلیہ اور حرام ہے، یہ زیادتی پر مبنی مشروط قرض ہے، اور یہ ایسی زیادتی ہے جو کسی بھی قسم کے عوض سے خالی ہے، اس طرح قرض حاصل کرنا سود کی لعنت میں گرفتار ہونا ہے، اس لئے اس طرح کا قرض اور حکومت کی قرض والی اسکیموں سے عام حالات میں تو فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، البتہ اضطراری اور مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہے۔

اس مسئلہ پر بھی تمام مقالہ نگاران کا اتفاق ہے اور ربا کی حرمت کے دلائل بھی معلوم و معروف ہیں، مثلاً:

۱۔ "أحل الله البيع وحرم الربا" (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔

۲۔ "عن مجاهد قال: في الربا الذي نهى الله عنه كانوا في الجاهلية. يكون للرجل على الرجل الدين فيقول لك: كذا وكذا، وتوخّر عني فيوخر عنه" (جامع البيان في تفسير القرآن ۳/ ۶۷)۔

۳۔ "عن جابر رضي الله تعالىٰ عنه قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء" (صحيح مسلم، حديث نمبر: ۱۵۹۸)۔

۴۔ "أما ربا النسيئة فهو الأمر الذي كان مشهورًا متعارفًا في الجاهلية، وذلك أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا كل شهر قدرًا معينًا، ويكون رأس المال باقيًا، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال. فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به" (تفسير كبير ۷/ ۲۷۵)

۵۔ "الربا هو القرض المشروط فيه أجل وزيادة، مال على المستقرض أو منفعة ينتفع به المسلف فهي ربا" (الكافي في فقه الحديث ۲/ ۳۵۹)۔

۶۔ "لا خلاف بين الفقهاء في أن اشتراط الزيادة في بدل القرض للمقرض ...... لعقد القرض، وأن هذه الزيادة تعد من قبيل الربا" (موسوعہ ۳۳/ ۱۳۰)۔

۷۔ "قال الشامي: كل قرض جر نفعًا فهو ربا أي إذا كان مشروطًا" (شامی ۵/ ۳۵۵)۔

۸۔ "كل قرض شرط فيه أن يزيده فهو حرام بغير خلاف، قال المنذر: أجمعوا على أن المسلف إذا شرط على المتسلف زيادة أو هدية. فأسلف على أسلف، أن آخذ الزيادة على ذلك ربا. وقد روى عن أبي بن كعب، وابن عباس، وابن مسعود أنهم نهوا عن قرض جر نفعًا" (المغني ۶/ ۴۳۶)۔

۹۔ "القرض بالشرط حرام والشرط لغو" (الدر مع الرد ۷/ ۳۹۴) (مولانا ابرار خان ندوی)۔

۱۰۔ "الزيادة المشروطة نسيئة الربا؛ لأنها فضل لا يقابله عوض" (بدائع الصنائع ۷/ ۳۹۵)۔

اس کے علاوہ اکثر مقالہ نگاران نے سود کی حرمت و ممانعت اور قباحت سے متعلق اور بھی آیات واحادیث نقل کی ہیں، بخوف طوالت یہاں صرف نظر کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر (۴): غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج

کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلاسکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرہ میں آئے گا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کے دو رجحانات ہیں:

پہلا رجحان: معمولی اضافی رقم کو سروس چارج تصور کیا جائے گا:

اس پہلے رجحان کی تفصیل اس طرح ہے کہ سروس چارج لینا بینک کے لئے بہرحال درست ہے، ورنہ وہ اپنے کام کاج کیسے چلائیں گے، اب سروس چارج کی دو شکلیں ہیں ایک یہ کہ قرض کی رقم پر کوئی اضافی رقم نہ لی جائے، بلکہ علاحدہ سے کچھ رقم لے لی جائے اور قرض حاصل کرنے والے تمام ہی حضرات سے یکساں معاملہ کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ زیادہ قرض لینے والے زیادہ اور کم قرض حاصل کرنے والے سے کم لیا جائے، یہ کام کی اجرت ہے اور اجرت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ قرض کی رقم کے حساب سے فیصد میں لیا جائے اگرچہ اس کی مقدار کم ہی ہو، اگر اضافی رقم کی مقدار اتنی معمولی ہو کہ اسے سروس چارج کا نام دیا جاسکتا ہو تو پہلا رجحان یہ ہے کہ اس کی گنجائش ہے، اور اسے سود کا نام نہیں دیا جائے گا، اگرچہ سود ہی کے نام سے لیا جائے، اس کی گنجائش ہے اور اس طرح سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے لئے قرض لیا جاسکتا ہے، بعض حضرات نے اس میں بھی بدرجہ مجبوری کی قید کا اضافہ کیا ہے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مفتی لطیف الرحمن، مولانا فیاض عالم قاسمی، مفتی اسعد بن عبد الرزاق، محمد زبیر ندوی، محمد صابر حسین ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، سراج الدین میواتی، محمد فلاحی، مولانا ڈاکٹر عبد اللہ جولم، مفتی اعجاز الحسن پانڈے، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی محمد حذیفہ داحودی، محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا ابوالمکارم معروفی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محبوب علی وجیہی، محمد قمر الزماں ندوی، محمد نثار عالم ندوی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، جنید بن محمد، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپور، مفتی محمد نعمت اللہ (ملیا) قاضی عبد الجلیل قاسمی، عبد الحمید قاسمی، دار الافتاء بناس کانٹا (گجرات)، مولانا رحمت اللہ ندوی، عبد التواب اناوی، مفتی محمد اسعد فلاحی، مفتی شاہد علی قاسمی۔

مجوزین میں مولانا رحمت اللہ ندوی اور مفتی اقبال محمد ٹنکاروی کہتے ہیں کہ یہ معاملہ اس وقت درست ہوگا جب سب کے ساتھ یکساں معاملہ کیا جائے، جبکہ قاضی محمد حسن ندوی کہتے ہیں کہ اگر قرض دار اپنی صوابدید پر اضافی رقم ادا کرے تو جائز ہے، اور اگر مشروط ہو تو سود ہے اور ناجائز ہے۔

مذکورہ حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل اپنے موقف کی تائید میں دیئے ہیں:

۱۔ ''وليملل الذى عليه الحق وليتق الله ربه ولا يبخس منه شيئًا'' (سورہ بقرہ: ۲۸۲)۔

۲۔ ''وكل حيلة يحتال بها الرجل يتخلص بها عن حرام أو يتوصل بها إلى حلال فهى حسنة. والأصل فى جواز هذا النوع من الحيل قول الله عزوجل: ''وخذ بيدك ضغثًا، فاضرب به ولا تحنث'' (سورہ ص: ۴۴)۔

۳۔ ''فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه إن الله غفور رحيم'' (سورہ بقرہ: ۱۷۳)۔

۴۔ ''عن أبى سعيد الخدرى، وأبى هريرة عن رسول الله ﷺ أنه قال: ''ومن استأجر أجيرًا فليعلمه أجره. وهذا منه ﷺ تعليم شرط جواز الإجارة، وهو إعلام الأجر، فيدل على الجواز'' (بدائع الصنائع)۔

۵۔ ''اعلم أن الإجارة عقد على المنفعة بعوض هو مال'' (المبسوط ۱۵/ ۸۶)۔

۶۔ ''الضرورات تبيح المحظورات'' (الاشباہ والنظائر) (دیکھئے مقالہ: محمد نثار عالم ندوی)۔

۷۔ ''المعروف كالمشروط'' (شامی ۵/ ۲۱۰ بحوالہ امداد الفتاوی ۳/ ۳۵۴)۔

۸۔ ''يستحق القاضى الأجر على كتب الوثائق والمحاضر والسجلات قدر ما يجوز لغيره كالمفتى. فإنه يستحق أجر

المثل علی کتابة الفتوی، لأن الواجب علیه الجواب باللسان دون الکتابة بالبنان'' (درمختار ۹/۱۰۸)
(دیکھئے مقالہ: مولانا ابوالمکارم معروفی محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

۹۔ ''من أراد بالحیلة الهرب من الحرام فلا بأس'' (سراج علی الخانیہ ۴/ ۴۷۵ بحوالہ تعلیم کے قرض کا حصول/ ۱۳۰)۔

۱۰۔ ''فإن لم تکن المنفعة مشروطة فی العقد فأعطاه المستقرض أجود مما علیه فلا بأس به'' (ہندیہ ۳/ ۲۰۲)
(دیکھئے مقالہ: قاضی محمد حسن ندوی)۔

۱۱۔ ''عمت البلوی أن أهل الثروة لایقرضون أحدًا إلا بزیادة، إما من نوع المستقرض أو غیره بصیغة النذر، أو یتأجر المقرض من المقترض أرضًا بمال یسیر یستغلها مرة بقاء الدین المذکور، أو یردها علی المستقرض بأجرة تقابل تلك الزیادة، فالعقود المذکورة صحیحة إذا توفرت شروطها، لا یدخل ذلك فی أبواب الربا، إعطاء الربا عند الاقتراض ولو للضرورة بحیث إنه إن لم یعطه لم یقرضه، لا یدفع الإثم'' (فتاوی ابن زیاد مع بغیة المسترشدین/ ۲۶۹، ۲۷۰)۔

۱۲۔ ''وقال شیخنا ابن زیاد: لایندفع إثم إعطاء الربا عند الاقتراض للضرورة بحیث إنه إن لم یعط الربا لا یحصل له القرض إذ له طریق إلی إعطاء الزائد بطریق النذر أو التملیك، لا سیما إذا قلنا النذر لا یحتاج إلی قبول لفظا علی المعتمد، وقال شیخنا: یندفع الإثم للضرورة'' (فتح المعین مع حاشیة اغاثة الطالبین ۲/ ۳۵) (دیکھئے مقالہ: محمد حسین قمر الدین ماہمکر)۔

۱۳۔ ''إن لم یکن النفع مشروطًا فی القرض فعلی قول الکرخی لا بأس به'' (درمختار ۷/ ۳۹۵)۔

۱۴۔ ''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح، قال الحموی فی حاشیة: وکذلك نحوه: أن یقرض عشرة دنانیر مثلًا ویجعل یربیها شیئًا معلومًا فی کل یوم ربحًا'' (الاشباہ/ ۱۱۵)۔

۱۵۔ ''الأمور بمقاصدها، إنما الأعمال بالنیات، الحکم الذی یترتب علی أمر یکون علی مقتضی ما هو المقصود من ذلك الأمر، المشقة تجلب التیسیر، یتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام'' (شرح المجلہ ۱/ ۱۹۔ ۲۹۰)
(دیکھئے مقالہ: حافظ کلیم اللہ عمری، سراج الحق میواتی، مولانا محمد زبیر ندوی)۔

۱۶۔ پس اس معاملہ کی توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت ہے.... نیز اس طریقہ کار و محکمہ میں نفع و سہولت بھی دونوں جانب کو قریب قریب یکساں حاصل ہوئی سود تو نام ہے اس نفع و زیادتی کا جو محض ایک جانب کو حاصل ہو اور عوض سے خالی ہو (مستفاد نظام الفتاوی ۲ / ۴۴۰)۔

۱۷۔ ''قرض جاری کرنے اور اس کا حساب و کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں بینک کے لئے اپنے قرضداروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آتے ہیں، البتہ فیصلہ کے اعتبار سے وصول کئے جانے والے اخراجات کی مقدار بہت معمولی ہونی چاہئے، تاکہ واقعتًا اس کے سروس چارج ہونے میں کوئی شبہ نہ ہو، اور یہ سروس چارج اجرت مثل سے زیادہ وصول کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں'' (فقہی مقالات ۱ / ۲۷۰، ۲۷۱ مفتی تقی عثمانی)۔

۱۸۔ ''ترقیاتی قرضوں میں اصل مقصود نفع کمانا نہیں ہوتا، بلکہ عوام کے لئے بنیادی ضروریات اور روزگار کی فراہمی مقصود ہوتی ہے، اس لئے اگر اس پر لئے جانے والے قرض کو دفتری اخراجات اور ضروریات پر محمول کیا جائے تو مناسب محسوس ہوتا ہے (جدید فقہی مسائل ۴ / ۸۹، حضرت فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی) (مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی محمد حذیفہ داحودی، مفتی اعجاز الحسن پانڈے، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، محمد بن عبد الجباری فلاحی، عباس بن یوسف، مولانا محمد ممتاز خاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی عبد الرحیم قاسمی وغیرہم)۔

دوسرا رجحان: قرض پر لی جانے والی معمولی رقم کو سروس چارج کا نام نہیں دیا جاسکتا:

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کا دوسرا رجحان یہ ہے کہ سود کی شرح خواہ کم ہو یا زیادہ، سود سود ہے اس کو سروس چارج کا نام دے کر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، اور اس طرح بغیر شدید ضرورت کے جس کا فقہاء نے استثناء کیا ہے، قرض حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، یہ موقف مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا محمد اکرم بن اسلم رشید، دارالافتاء سلفیہ بنارس، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا جمیل اختر جلیلی ندوی، ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی حیدر علی قاسمی، مولانا محمد رمضان سعادتی، مولانا محمد عرفان آسام، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد ابرار خان ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عبدالمنان آسام، مولانا ابوسفیان مفتاحی۔

عدم جواز کے اس موقف کے لئے مذکورہ مقالہ نگاران نے درج ذیل دلائل نقل کئے ہیں:

۱۔ "یا أیها الذین آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربا إن کنتم مؤمنین. فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله" (سورہ بقرہ: ۲۷۸، ۲۷۹)۔

۲۔ یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا الربا أضعافًا مضاعفة واتقوا الله لعلکم تفلحون" (سورہ آل عمران: ۱۳۰)۔

۳۔ ''عن جابر بن عبد اللّٰہ: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربا ومؤکلہ وکاتبہ وشاهدیه. وقال: هم سواء'' (مسلم. حدیث نمبر: ۱۵۹۸)۔

علت: اگر یہ سروس چارج ہوتا تو اس میں سالانہ اضافہ نہیں ہوتا، جبکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے، اس پر سود ہی کی تعریف صادق آئے گی (البتہ اپنے جائز حق کو حاصل کرنے کے لئے سود دینے کی گنجائش ہے) جیسا کہ ظلم کو دفع کرنے کے لئے رشوت (دیکھئے مقالہ: شاہ جہاں ندوی)۔

۴۔ ''عن أبي هریرة رضی اللّٰہ عنہ أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: الدینار بالدینار لا فضل بینهما والدرهم بالدرهم لا فضل بینهما''۔ (متفق علیہ)

۵۔ ''من أسلف سلفًا فلا یشترط أفضل منه، وإن کانت قبضة من علف فهو ربا'' (موطا امام مالک مع شرح تنویر الحوالک ۲/ ۱۶۹)۔

۶۔ ''عن ابن مسعود رضی الله عنهما عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: بین یدی الساعة یظهر الربو والزنا والخمر'' (رواہ الطبرانی. جواہر الفتح ۲/ ۹۴)۔

۷۔ ''فمن اتقی المتشبهات استبرأ عرضه ودینه، ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام'' (ابوداؤد. حدیث نمبر: ۳۳۲۲)۔

۸۔ ''عن عبد اللّٰہ حنظلة غسیل الملائکة رضی الله عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم درهم یأکله الرجل وهو یعلم أشد من ستة وثلاثین زنیة'' (الفتح السریانی فی الترتیب مسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی ۱۵/ ۶۹)

(دیکھئے مقالہ: محمد عرفان آسام، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی)۔

۹۔ ''عن عمر رضی اللّٰہ عنہ قال: دعوا الربا والریبة'' (ابن کثیر ۱/ ۳۲۸)۔

۱۰۔ ''والتحرز عن حقیقة الربا وشبهة الربا واجب'' (الکاسانی: بدائع ۶/ ۵۱۹)۔

۱۱۔ ''إن قلیل الربا وکثیرہ حرام'' (التفسیر المنیر ۳/ ۱۸۳)۔

۱۲۔ ''کل قرض جر منفعة فهو ربا''. (السنن الکبری للبیہقی ۸/ ۲۷۶، حدیث نمبر: ۱۱۰۹۳)۔

۱۳۔ ''الربا لغة مطلق الزیادة وشرعًا فضل خال عن عوض بمعیار شرعی مشروط لأحد المتعاقدین فی المعاوضة''

(اللباب فی شرح الکتاب ۱/ ۲۲۱)۔

۱۴۔ ''قد أجمع المسلمون نقلاً عن النبی ﷺ: أن اشتراط الزیادة فی السلف ربا'' (عمدة القاری ۱۲/ ۱۳۵)

۱۵۔ ''قد أجمع المسلمون نقلاً عن نبیهم صلی الله علیه وسلم: أن اشتراط الزیادة فی السلف ربا، ولو کان قبضة من علف حبة، کما قال ابن مسعود: أو حبة واحدة'' (التمهید ۴/ ۶۸)۔

۱۶۔ ''أن الربا حرام مطلقًا ولا فرق بین قلیله وکثیره'' (تکملة فتح الملهم ۱/ ۶۷-۵۶۸)۔

۱۷۔ ''ما کان سبب حرام فهو حرام، الشبهة کالحقیقة فی باب الربو'' (دیکھئے مقالہ: حیدر علی قاسمی)۔

۱۸۔ ''الربا وهو القرض علی أن یؤدی إلیه أکثر أو أفضل مما أخذ.... وکان قلیله یدعو إلی کثیره، فوجب أن یسد بابه بالکلیة ولذلك نزل فی القرآن شأنه فأنزل'' (حجة الله البالغه ۲/ ۱۰۶)۔

۱۹۔ ''سود کی حرمت اجماعی ہے، اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں'' (مجموع الفتاوی لابن تیمیہ ۲۹/ ۳۳۳)۔

۲۰۔ ''الثابت بالعرف کالثابت بدلیل شرعی'' اور عرف میں اس کو سروس چارج نہ کہا جاتا ہے اور نہ سمجھا جاتا ہے۔

متفرق وضاحتیں:

سوال نمبر (۴) سے متعلق متفرق وضاحتیں:

مولانا رمضان سعادتی لکھتے ہیں: ''اس سود کو سروس چارج قرار دینے پر راقم السطور کو دو وجہوں سے اشکال ہے: ایک یہ کہ اس قسم کے قرضوں سے بینک کا مقصد سود حاصل کرنا ہوتا ہے فقط دفتری اخراجات کی تکمیل نہیں اور فقہ کا قاعدہ ہے: ''الأمور بمقاصدها'' (الاشباہ والنظائر ۱/ ۱۱۳)،

دوسرے یہ کہ اس سود کی وصولیابی کا طریقہ عین ربا کا طریقہ ہے، ''إما أن تقضی، وإما أن تربی'' جیسا کہ جاہلیت میں ربا کا رائج طریقہ تھا، اس لئے بندے کے نزدیک تفضّل کا طریقہ مناسب ہے وہ یہ کہ بینک اگر قرض پر فیصد کے حساب سے یا کسی اور حساب سے ایک متعین رقم عائد کرتا ہے جس کی ادائیگی کو وقت پر لازم قرار دیتا ہے اور وقت پر نہ ادا کرنے کی صورت میں سود اضافہ نہیں ہوتا تو یہ صورت جائز ہے، اور اگر مستقرض پر بینک متعین رقم عائد نہیں کرتا ہے، بلکہ اجرائے قرض سے سود کا کانٹا چلنا شروع ہوجاتا ہے اور ادائیگی پر ہی وہ سلسلہ رکتا ہے، تو یہ ''إما أن تقضی وإما أن تربی'' کی بنیاد پر ناجائز ہوگا'' (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

مولانا حفیظ الرحمن مدنی عدم جواز کا رجحان رکھنے کے باوجود کہتے ہیں کہ قاعدہ: ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے تحت ایسے مسلمان جن کے پاس کوئی معاشی ذریعہ نہ ہو توان کے لئے ایسے قرض حاصل کرنا جائز سمجھ میں آتا ہے اور معمولی شرح سود انتظامی خرچ شمار کی جائے گی، جیسا کہ حضرت مفتی نظام الدین کا رجحان ہے (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

جناب محی الدین غازی کہتے ہیں: سروس چارج کے سلسلہ میں ایک شرط تو یہ ہے کہ وہ خاص اس قرض پر ہونے والے انتظامی خرچ کے بقدر ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ وہ متعین رقم ہو، جس کا رقم اور زمانے سے تعلق نہ ہو، اور اگر اس کا تعلق قرض اور زمانے سے ہوجائے تو اس کا سود ہونا واضح ہے، اس میں یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سود کی شرح کم ہے یا زیادہ، بلکہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس میں سود والا وصف ہے یا نہیں۔

اور ایسی کسی زائد رقم کو جو دراصل سود ہی ہے اگر سروس چارج قرار دے دیا جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے حلال قرار پائے گی، پھر یہ طے کرنا بھی بہت مشکل اور ایک طرح سے اضافی ہوجاتا ہے کہ کتنی رقم کو سروس چارج کہا جائے اور لوگ بڑی بڑی زائد از قرض رقمیں دھڑلے کے ساتھ سروس چارج کے نام پر وصول کرتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں اگر سود ہی کہا جائے اور قاعدہ ضرورت کے تحت مستحق افراد کے لئے رخصت رکھی جائے تو اس کا سود ہونا بہر حال لوگوں کو محتاط رکھنے میں معاون ہوگا۔

سود کو سروس چارج کہہ کر مستقل طور پر حلال کر دینا منکرات جاریہ میں شمار ہو سکتا ہے، جس کا وبال قیامت تک ان لوگوں کے سر آئے گا جنہوں نے سود کو سروس چارج کا روپ دیا (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

سروس چارج پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

''جواب: سروس چارج کو ہم دو صورتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱- وہ سروس چارج، جو پیسے رکھنے والوں سے وصول کیا جائے۔ ۲- وہ سروس چارج، جو اپنے قرض داروں سے وصول کیا جائے۔

پہلی صورت کے جواز میں کوئی شک نہیں؛ کیونکہ بینک ایک ایسی کمپنی ہے، جس کے پاس لوگ روپے پیسے قرض کی شکل میں ودیعت رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان روپیوں کی حفاظت کے لئے افراد کی ضرورت پڑتی ہے، پھر اسی کے ساتھ ساتھ روپیوں کے حساب وکتاب کے لئے رجسٹر بھی تیار کرنا ہوتا ہے اور ان میں اخراجات ایک لازمی شئی ہے، کمپنی اپنی طرف سے روپیوں کی حفاظت پر مامور افراد اور حساب وکتاب کے لئے تیار رجسٹروں کے لئے خرچہ برداشت نہیں کر سکتی؛ اس لئے بینک ہر کھاتہ دار سے کچھ رقم سروس چارج کے نام سے لیتی ہے، جو در اصل روپیوں کی حفاظت کے لئے اور ''الأجرة إنما تکون فی مقابلة العمل'' (ردالمحتار، مطلب دعوی الأب أن الجهاز عارية ۱۵۶/۳) کے طور پر ہوتی ہے؛ چنانچہ ''الجوہرۃ النیرۃ'' میں ہے:

''... بخلاف الوديعة إذا شرط المودِع للمودَع أجرًا على حفظها، فله الأجر'' (الجوهرة النيرة، كتاب الرهن: ۲/ ۴۰۱)

ودیعت کے برخلاف، جب صاحب ودیعت ودیعت کی حفاظت کے لئے ودیعت رکھنے والے کے لئے اجرت کی شرط لگائے تو اس کے لئے اجرت ہوگی۔

ڈاکٹر احمد اسعد رقم طراز ہیں:

''والحكم الشرعي لهذه الصورة يتخلص فى أن المصرف يتقاضى أجرًا مقابل الخدمات التي يقدمها للمودع. وهذا جائز شرعًا، ولا مجال للشبهة فى اختلاط الأجر بالربا، أو المنفعة المحرمة'' (نظرية القرض فى الفقه الاسلامى، ص: ۲۳۴، بحواله: تطوير الأعمال المصرفية، ص: ۳۶۸، مشكلة الاستثمار فى البنوك الاسلامية وكيف عالجها الاسلام، ص: ۵۵۵)۔

اس صورت کے حکم شرعی کا خلاصہ یہ ہے کہ بینک اپنی ان خدمات کے لئے اجرت کا تقاضی کرتا ہے، جو وہ مودع کے لئے انجام دیتا ہے، یہ شرعاً جائز ہے اور اس میں سود اور منفعت محرمہ کے ساتھ اختلاط کا کوئی شبہ نہیں ہے۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے تو اس کی بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱- قرض کسی شخص سے لیا جائے اور وہ سروس چارج کے نام سے کچھ رقم لے۔

۲- قرض کسی ادارہ سے لیا جائے اور وہ ادارہ سروس چارج کے نام سے کچھ رقم لے۔

پہلی صورت میں سروس چارج کے نام سے قرض کے علاوہ کچھ رقم لینا عام حالت میں درست نہیں؛ کیونکہ یہاں کسی عمل کے مقابلہ میں یہ ''رقم'' نہیں ہے، لہٰذا یہ ''الأجرة إنما تکون فی مقابلة العمل'' کے دائرہ میں نہیں ہوگا؛ البتہ خاص حالت میں مثلاً: اس کے پیسے دوسرے شہر میں ہوں اور قرض لینے والے کو سخت ضرورت ہو، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پیسے لانے کے لئے دوسرے شہر جانے کا خرچ لینا درست ہوگا؛ کیونکہ یہ ''الأجرة إنما تکون فی مقابلة العمل'' کے تحت داخل ہے۔

دوسری صورت میں سروس چارج کے نام سے کچھ رقم لینا درست ہے کہ یہ ''اجرۃ العمل'' ہے؛ البتہ اس کے لئے اس بات کو لازم قرار دیا جائے کہ یہ زائد رقم قرض کا معاملہ کرتے وقت ہی لیا جائے، قرض کی واپسی کے وقت نہ لیا جائے، قرض کی واپسی کے وقت لینے میں سود کے شبہ کا امکان ہے، جس سے بچنا بھی ضروری ہے؛ کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''... فمن اتقى المشتبهات استبرأ عرضه ودينه، ومن وقع فى الشبهات وقع فى الحرام'' (ابوداود، باب فی اجتناب الشبهات، حدیث نمبر: ۳۳۲۹)

(جو شبہات سے بچا، اس نے اپنے دین وآبرو کو (طعن وتشنیع سے) بچالیا اور جو شبہات میں پڑ گیا، وہ حرام میں جا پڑا)۔

یہ تو بات اس وقت کی ہے، جب سروس چارج کے نام سے کچھ زائد رقم لی جائے؛ لیکن زائد رقم کا نام سروس چارج نہ ہو، تاہم اس کی مقدار اتنی ہی ہو، جتنی سروس چارج کی ہوتی ہے، تو کیا اسے بھی سروس چارج سمجھا جائے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں دو باتیں ہیں:

۱۔ سروس چارج کی مقدار والی رقم اگر چہ سروس چارج نہ کہلاتی ہو؛ لیکن عرف میں اسے سروس چارج ہی سمجھا جاتا ہو تو اسے سروس چارج ہی سمجھا جائے (جس کے احکام گزر چکے ہیں)؛ کیونکہ فقہی اصول ہے: ''الثابت بالعرف کالثابت بدلیل شرعی'' (عرف سے ثابت ہونے والی چیز دلیل شرعی سے ثابت شدہ حکم کی طرح ہے)، ایسی صورت میں اسے سود نہیں سمجھا جائے گا۔

۲۔ اگر عرف میں سروس چارج نہ سمجھا جاتا ہو تو اسے سروس چارج نہ سمجھا جائے اگر چہ کے مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کے برابر ہو؛ کیونکہ عرفی اور وضعی دونوں اعتبار سے اسے سروس چارج نہیں سمجھا جاتا اور جب سروس چارج نہیں سمجھا جاتا تو پھر اس کا حکم بھی ثابت نہ ہوگا؛ کیونکہ فقہ کا ایک اصول ہے: ''اختصاص العقد باسم لا ختصاصه بحکم یدل علیه معنی ذلک الاسم'' (حکم کے ساتھ مختص ہونے کے لئے عقد کا کسی نام کے ساتھ مختص ہونا اسی نام پر دلالت کرتا ہے، جس پر وہ نام دلالت کرے)، جیسے کسی شخص نے قسم کھائی کہ وہ فلاں کے گھر نہیں جائے گا؛ اس شخص کے قسم کھانے کے بعد وہ فلاں اپنے گھر کو باغ یا مسجد میں تبدیل کردے، پھر قسم کھانے والا اس باغ یا مسجد میں داخل ہو تو وہ شخص حانث نہیں ہوگا؛ کیونکہ:

''عقد الیمین باسم الدار، والبستان والمسجد والحمام غیر الدار، فإذا لم یبق ذلك الاسم لا یبق الیمین''

(الجامع الصغیر، باب الیمین فی الدخول والخروج والسکنی والرکوب: ۱/ ۲۵۹، نیز دیکھئے: المبسوط للسرخسی، باب المهایأة: ۲۰/ ۱۴۷)۔

قسم کا معاملہ گھر کے نام کے ساتھ پیش آیا، جب کہ باغ، مسجد اور حمام نام زد گھر نہیں، پس جب نام باقی نہیں رہا تو قسم بھی باقی نہیں رہی۔

لہٰذا ایسی صورت میں اسے سود سمجھا جائے گا، واللہ اعلم بالصواب''! (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

سوال نمبر (۵): اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ سود سود ہے، قرض کی نوعیت سے سود کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے، سود کی حرمت قطعی ہے اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے، البتہ قرض لینے والے افراد کی حالت کے اعتبار سے حکم میں فرق ہے کہ محتاج وضرورت مند کے لئے بحالت مجبوری ہی سودی قرض کی اجازت ہے، آسودہ حال لوگوں کے لئے نہیں ہے، یہ تمام ہی حضرات کی اتفاقی رائے ہے، اس لئے ان کے اسماء گرامی یہاں حذف کئے جاتے ہیں۔

دلائل:

۱۔ ''الضرورات تبیح المحظورات'' (الاشباہ)۔ ۲۔ ''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر/ ۲۹)

چونکہ سود کا مسئلہ متفق اور مصرح ہے اور اس کی حرمت وشناعت پر کتاب وسنت کے دلائل بھی واضح اور مصرح ہیں، اس لئے یہاں طوالت سے بچتے ہوئے صرف نظر کیا جاتا ہے، حسب ضرورت گذشتہ اوراق کی طرف رجوع مفید رہے گا۔

استثنائی وضاحت:

البتہ اس مسئلہ میں مولانا محمد فلاحی نے یہ وضاحت کی ہے کہ مکان کی تعمیر، روزگار، کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات کے لئے چیزیں حکومت فراہم کرتی ہے اور اس پر کچھ نقد بھی دیتی ہے وہ عام سودی قرضوں کے حکم میں نہیں آئے گا، اور واپسی میں جو زیادتی ہوگی اس میں دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ ہم نے

حکومت سے پیسہ لے کر چیزیں نہیں خریدیں، بلکہ حکومت نے خرید کردی ہے، اس لئے وہ زیادتی گویا سامان اور مشین کی قیمت ہے جو نفع کے ساتھ حکومت نے ہمارے ساتھ فروخت کیا ہے، جسے مرابحہ کہتے ہیں، دوسرے یہ زائد رقم انتظامی اخراجات کی فیس تصور کیا جائے گا۔

مکان، حمام، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے ملنے والی سرکاری امداد سے استفادہ:

سوال نمبر (۶): ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں تمام مقالہ نگاران کا اتفاق ہے کہ حکومت کی طرف سے ملنے والی امداد و مراعات سے استفادہ کرنا نہ صرف یہ کہ جائز و مباح ہے، بلکہ یہ ملکی اور شہری حق ہے، اس میں کسی تامل کی ضرورت نہیں ہے، البتہ بعض مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں مالدار لوگوں کے لئے حکومت کی امداد سے فائدہ اٹھانے کو ناجائز قرار دیا ہے، جبکہ اکثر حضرات نے اپنی رائے کو مالدار اور غریب کی قید سے آزاد رکھا ہے اور اس پر مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے۔ یہ موقف بھی چونکہ اتفاقی ہے، اس لئے مقالہ نگاران کے اسماء گرامی حذف کئے جاتے ہیں۔

دلائل:

۱۔ "وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲)۔

۲۔ "عن علي رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم: إن كسرى أهدى له، فقبل: وإن الملوك أهدو إليه، فقبل منهم. وعن عياض بن حماد أنه أهدى للنبي صلى الله عليه وسلم هدية له ناقة. فقال النبي صلى الله عليه وسلم أسلمت. فقال: لا، قال: فإني نهيت عن زبد المشركين" (ترمذی باب ما جاء في قبول هدايا المشركين ۵/ ۲۴۵)۔

۳۔ "عن النبي صلى الله عليه وسلم: أنا أولى المؤمنين من أنفسهم، فمن مات وعليه دين ولم يترك وفاء، فعلينا قضاءه ومن ترك مالا فلورثته" (بخاری، حدیث نمبر: ۶۷۳۱)۔

۴۔ "ألا كلكم راع، وكلكم مسئول عن رعيته، فالأمير الذي على الناس راع وهو مسئول عن رعيته" (مسلم ۲/ ۱۴۵۹)۔

۵۔ "من ترك كلا فإلي، ومن ترك مالا فلورثته، وأنا وارث من لا وارث له، أعقل له وأرثه" (ابوداؤد، رقم الحديث: ۲۸۹۹)

۶۔ "الهبة: وهي العطية الخالية عن تقدم الاستحقاق، وهي أمر مندوب وصنع محمود وقبولها سنة. فإنه صلى الله عليه وسلم قبل هدية العبد" (الاختيار لتعليل المختار ۲/ ۵۲۳)۔

۷۔ "هل كان ذلك من خصائصه صلى الله عليه وسلم أو يجب على ولاة الأمور بعده والراجح الاستمرار. لكن وجوب الوفاء إنما هو من مال المصالح" (فتح الباری ۱۲/ ۱۰)۔

۷۔ "تصرف الإمام في بيت المال مقيد بشرط النظر" (تبیین الحقائق للزیلعی ۳/ ۵۷)۔

۸۔ "تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة" (الاشباہ لابن نجیم / ۱۲۳)۔

۹۔ "الأصل في الأشياء الإباحة" (الاشباہ مع الغمز ۱/ ۹۷)۔

۱۰۔ "أخذ الجائزة من السلطان قال بعضهم: لم يعلم أنه يعطيه من حرام. قال محمد: وبه نأخذ. لم يعرف شيئا حرام بعينه، وهو قول أبي حنيفة وأصحابه أن الشيخ أبا القاسم كان يأخذ جائزة السلطان" (الفتاوى الهنديه ۵/ ۳۴۲)۔

۱۱۔ "أن يباشر بنفسه مشارفة الأمور وتصفح الأحوال لينهض بسياسة الأمة وحراسة الملة. ولا يعول عن

التفويض تشاغلا بلذة أو عبادة، فقد يخون الأمين ويغش الناصح، وقد قال الله تعالى: ''ياداؤد إنا جعلناك خليفة فى الأرض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله''۔الآية (سوره ص: ٢٦) (الاحکام السلطانیہ للماوردی ۱/ ۴۰)۔

۱۲۔ ''أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس، إلا أن يعلم أنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية'' (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۲، تاتارخانیہ ۱۸/ ۱۷۵)۔

۱۳۔ ''قال العلماء: الراعي هو الحافظ المؤتمن الملتزم صلاح ما قام عليه، وما هو تحت نظره، ففيه أن كل من تحت نظره شئي فهو مطالب بالعدل فيه، والقيام بمصالحه في دينه ودنياه ومتعلقاته'' (شرح النووی ۱۲/ ۲۱۳)۔

۱۴۔ ''قال بعض أهل العلم: يجب على الإمام أن يقضي من بيت المال دين الفقراء... كما أن على الإمام أن يسد رمقه ويراعي مصلحته الدنيوية'' (عمدۃ القاری، تحت رقم الحدیث: ۲۲۸۹)۔

۱۵۔ ''میرے نزدیک سرکاری خزانہ ایک ایسی دولت ہے جس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے، اس لئے ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، تجارت کی ترقی، اور صنعت وحرفت کی ہمت افزائی، نیز بیکاروں کو باکار بنانے کے لئے جس قدر رقم بھی حکومت اپنے بجٹ میں رکھتی ہے ان میں ایک مسلمان شہری کا بھی اسی طرح حق ہے، جس طرح دوسروں کا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا'' (مباحث فقہیہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ ۲۶۷، نیز فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۲۲۵)۔

متفرق خیالات:

حکومت کی مراعات وامداد سے فائدہ اٹھانے کے لئے مندرجہ ذیل حضرات نے کچھ شرائط کا اضافہ کیا ہے:

-مولانا محمد عرفان صاحب آسام کہتے ہیں: ''حکومت نے جو شرائط ان کے حصول کے لئے مقرر کی ہیں وہ امداد حاصل کرنے والوں میں موجود ہوں اور دھوکہ دیگر غیر مستحق نے حاصل نہ کی ہو'' (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

-دار الافتاء بناس کانٹا گجرات کی رائے یہ ہے کہ ''گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی رقوم جس میں کسی طرح کا غرر، دھوکہ، سود شامل نہ ہو صرف اعانت کے طور پر ہو تو اس کے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

-مولانا ابوالمکارم معروفی کہتے ہیں کہ ''اگر سیاسی، دینی مصلحت کے خلاف ہے تو اس طرح کی اسکیموں سے احتراز لازم ہے۔

-مفتی محمد اسعد فلاحی پالنپوری کہتے ہیں کہ تعلیمی ضروریات کے لئے اگر غیر مسلم حکومت کی طرف سے کوئی امداد پیش کی جاتی ہے تو اس کا لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ حکومت اس کی آڑ میں مسلمانوں کو اپنے احسان تلے دبا کر ان کے دینی اداروں میں مداخلت شروع کردے گی، اور نتیجۃً خالص دینی ادارہ ایک دنیوی اسکول اور کالج بن کر رہ جائے گا..... اس لئے حکومت کی جانب سے پیش کی جانے والی امداد دینی اداروں میں لینا جائز نہیں ہے، اور ان کا استعمال کرنا مفاسد سے خالی نہیں ہے، جس سے احتراز لازم ہے (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

-مفتی ارشاد دساوا کہتے ہیں کہ ''یہ رقم حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام نہ لیا جائے اور لینے والے میں شرائط پائی جاتی ہوں تو درست ہے۔

-مولانا فاروق دربھنگوی بھی کہتے ہیں کہ بشرطیکہ اس امداد کے حصول میں جھوٹ وغرر شامل نہ ہو۔

سوال نمبر (۷): گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم-جس قسم کی بھی ہوں-ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرات نے واسطہ بننے والے اشخاص کی دو حیثیت ذکر کی ہے، ایک وہ لوگ جو اسی محکمہ میں سرکاری ملازم ہیں اور سرکار ان کو خود اجرت دے رہی ہے، ان کے لئے تو محنتانہ الگ سے لینا اور امداد کے خواہاں حضرات کا ان کو کسی بھی قسم کا کوئی محنتانہ پیش کرنا یہ دونوں رشوت

کے حکم میں ہے اور اس کی اجازت نہیں ہے، نہ لینے کی نہ دینے کی، الا یہ کہ اس کے بغیر کام ہی نہ چل سکے تو صرف اپنا حق وصول کرنے کے لئے اس کی اجازت ہے، البتہ وہ لوگ جو آزادانہ طریقے پر بچولئے اور ایجنٹ کا کام کرتے ہیں، لوگوں کی ضرورت اور حاجت کے پیش نظر ان کے لئے کمیشن لینا اور دینا دونوں درست ہے، کام سے پہلے دونوں کے درمیان جو طے ہوجائے، خواہ فیصد کے حساب سے ہی کیوں نہ ہو، اس کے مطابق کام کرانا جائز ہے، اور اگر طے نہ ہو تو پھر اجرت مثل کے وجوب کی بات مقالہ نگاران نے کہی ہے۔

سمسار اور واسطہ بننے والے کے کام اور اجرت کے جواز پر چونکہ تمام مقالہ نگاران کا اتفاق ہے اس لئے ان کے اسماء گرامی کی فہرست یہاں حذف کی جاتی ہے اور صرف ان کے دلائل درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

دلائل:

۱۔ ”قالت إن أبي يدعوك ليجزيك أجر ما سقيت لنا“ (سورۃ القصص: ۲۵)۔

۲۔ ”فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن“ (سورہ طلاق: ۶)۔

۳۔ ”عن حماد: أنه كره أجر السمسار إلا بأجر معلوم“ (مصنف ابن أبي شيبة ۴/ ۴۵۷، حديث نمبر: ۲۲۰۵۷)، قلت: والحاصل أن الجهالة اليسيرة عفو فيما جرى به التعامل لكونها لا تفضى إلى النزاع عادة“ (اعلاء السنن للتهانوی ۱۶/ ۲۲۵، باب أجر السمرة)۔

۴۔ ”تصح الوكالة بأجر وبغير أجر، لأن النبي صلى الله عليه وسلم كان يبعث عماله لقبض الصدقات، ويجعل لهم عمولة، ولهذا قاله أبناء عمه: لو بعثتنا على هذه الصدقات فنؤدى ما يؤدى الناس، ونصيب ما يصيبه الناس، أى العمولة، ولأن الوكالة عقد جائز ولا يجب على الوكيل القيام بها، فيجوز أخذ الأجرة فيها بخلاف الشهادة“ (الفقه الاسلامی وادلته ۴/ ۷۴۵ بحواله فتاوی قاسميه ۲۱/ ۶۸۹)۔

۵۔ ”عن أنس قال: حجم رسول الله أبو طيبة، فأمر له رسول الله بصاع من تمر“ (رواه البخاري وغيره، اعلاء السنن باب الاجارة من غير مشارطة اعتمادًا على العرف ۱۶/ ۲۵۸-۲۵۹)۔

(مذکورہ عبارات ونصوص کے لئے دیکھئے مقالات: مفتی محمد رمضان سعادتی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی حیدر علی قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا آزاد بیگ قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا عرفان آسام)۔

۶۔ ”ولم ير محمد بن سيرين وعطاء ابن أبي رباح وإبراهيم النخعي والحسن البصري، بأجر السمسار بأسًا، وقال ابن عباس: لا بأس أن يقول: بع هذا الثوب، فما زاد على كذا وكذا فهو لك، وقال ابن سيرين: إذا قال: بعه بكذا، فما كان من ربح فهو لك، وبيني وبينك، فلا بأس به، وقال النبي صلى الله عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم“ (صحيح بخاری باب أجر السمسرة)۔

۷۔ ”اعطوا الأجير أجره قبل أن يجف عرقه“ (مجمع الزوائد ۴/ ۹۷) (دیکھئے مقالہ: قاضی محمد حسن ندوی)۔

۸۔ ”أهل بلدة ثقلت عليهم مؤنات العمل فاستأجروا رجلًا بأجرة معلومة ليذهب ويرفع أمرهم إلى السلطان الأعظم ليخفف عنهم بعض الحيف، وأخذ الأجرة من عامتهم غنيهم وفقيرهم، ذكر ههنا أنه إن كان بحال لو ذهب إلى بلد السلطان تهيأ له إصلاح الأمر يومًا أو يومين جازت الإجارة، وإن كان بحال لا يحصل ذلك إلا بمدة، فإن وقتوا للإجارة وقتًا معلومًا فالإجارة جائزة، والأجر كله له وإن لم يوقتوا فهي فاسدة، وله أجر مثله“ (الهنديه ۴/ ۵۲۶)۔

۹۔ ”إن ما يأخذه المحامي رزق حلال إن كان لرفع الحق، لأن ما يأخذه على عمل وهو ثمن لمنفعة استوفاها

المؤكل'' (مجلة لواء الاسلام، رمضان: ۱۳۶۸، ص: ۴۴) (مفتی محمد عارف بالله قاسمی)۔

۱۰۔ ''قال فی الدر المختار نقلًا عن البزازية: إجارة السمسار والمنادى والحمامى والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا مقدار العمل تجوز لما كان للناس به حاجة جاز، ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل. وفى الحاوى سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان فى الأصل فاسد لكثرة التعامل''
(شامی ۹/ ۷۷ باب الاجارة الفاسدة ۹/ ۸۷، مطلب فی أجرة الدلال)۔

۱۱۔ ''وقال مالك: ولا بأس بأجرة السمسار والحجام'' (الكافى فى فقه أهل المدينه ۲/ ۷۵۶)۔

۱۲۔ ''فتجب الدلالة على البائع أو المشترى أو عليهما بحسب العرف'' (شامی ۴/ ۴۲ بحواله کتاب الفتاوی ۵/ ۷-۲۰۸)۔

۱۳۔ ''إذا دفع الرشوة ليسوى أمره عند السلطان حل له الدفع ولا يحل للأخذ أن يأخذ. فإن أراد أن يحل للآخذ يستأجر الآخذ يوما إلى الليل بما يريد أن يدفع إليه، فإن تصح هذه الإجارة.... وإن طلب منه أن يسوى أمره ولم يذكر له الرشوة، وأعطاه بعد ما سوى اختلفوا فيه، قال بعضهم: لا يحل له أن يأخذ. وقال بعضهم: يحل وهو الصحيح، لأنه يروى مجازات الإحسان، فيجعل كما لو جعلوا للإمام والمؤذن شيئًا فأعطوه من غير شرط كان حسنا.... والحيلة أن يستأجره ثلاثة أيام ونحوه ليعمل له ثم يستعمله إن كان فعلًا يجوز الاستيجار عليه كتبليغ الرسالة ونحوه، وإن لم يبين المدة لا يجوز. وهذا إذا كان فيه شرط، أما إذا كان الإبداء من غير شرط ولكن يعلم يقينًا أنه يهدى له ليعينه عند السلطان'' (رسائل ابن نجيم ملخصًا / ۱۱۲-۱۱۳) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد عثمان بستوی)۔

۱۴۔ ''ما أبيح أخذه أبيح إعطاءه'' (الاشباہ لابن نجیم ۱/ ۱۵۵)۔

متفرق آراء:

-مولانا جنید بن محمد نے تمام تفصیلات نقل کرنے کے بعد اخیر میں یہ لکھا ہے کہ ''بہر حال اس طرح کے معاملات میں دلالی کرنے والے کے لئے دلالی مکروہ ہوگی، بلکہ غرباء کا حق مارنا کہا جائے گا تو زیادہ صحیح ہوگا، کیونکہ اگر یہ دلال درمیان سے ہٹ جائیں تو عوام کے لئے امدادی رقوم حاصل کرنا آسان ہو جائے اور مکمل رقوم ان کو وصول ہو (دیکھئے: موصوف کا مقالہ)۔

-مولانا ابوالمکارم معروفی کہتے ہیں کہ محنتانہ کے نام پر اجرت دینا اور لینا درست ہے، اگرچہ وہ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ ہے، بشرطیکہ وہ کام ان کے ذمہ واجب نہ ہو (دیکھئے: موصوف کا مقالہ)۔

-ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی نے اس مسئلہ میں عام مقالہ نگاران سے ہٹ کر دلال اور درمیان میں واسطہ بننے والے کے لئے کسی بھی طرح رقم لینے کو رشوت کے زمرے میں داخل کیا ہے اور اس سلسلہ کی وہ آیات اور روایات جن میں دوسروں کا مال غلط طریقے سے لینے کی ممانعت و مذمت آئی ہے، ان سے استدلال کیا ہے، مثلاً:

۱۔ ''ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقًا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون'' (سورہ بقرہ: ۱۸۸)۔

۲۔ ''وأخذهم الربا وقد نهوا عنه، وأكلهم أموال الناس بالباطل'' (سورہ نساء: ۱۶۱)۔

۳۔ ''إن كثيرًا من الأحبار والرهبان ليأكلون أموال الناس بالباطل'' (سورہ توبہ: ۳۴)۔

۴۔ ''لولا ينهاهم الربانيون والأحبار عن قولهم الإثم وأكلهم السحت، لبئس ما كانوا يصنعون'' (المائدۃ: ۶۳)۔

۵۔ ''أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع وهو حرام على الآخذ لا الدافع'' (فتح القدیر ۶/ ۳۵۵)۔

۶۔ "المعنى لا تصانعوا بأموالكم الحكام وترشوهم ليقضوا لكم على أكثر منها. قال ابن عطية: وهذا القول يترجح؛ لأن الحكام مظنة الرشاء إلا من عصم، وهو الأقل" (قرطبی: الجامع لأحکام القرآن ۲/ ۳۴۰) (دیکھئے: موصوف کا مقالہ)۔

البتہ موصوف کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ محنتانہ کی اس شکل کو رشوت قرار نہیں دیتے جب ایک دو روز کے لئے اجرت پر رکھ لیا جائے، اور اس پر شامی کی حیلہ والی عبارت سے استدلال کیا ہے، "أن يستأجره يوما إلى الليل أو يومين له" (تفصیل کے لئے موصوف کا مقالہ دیکھا جاسکتا ہے)۔

- مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کہتے ہیں کہ فیصد کا اعتبار عرف پر مبنی ہے، البتہ مولانا رحمت اللہ ندوی کہتے ہیں کہ فیصد کے حساب سے محنتانہ درست نہیں ہے، متعین رقم ہونا چاہئے۔
- مولانا محی الدین غازی کہتے ہیں: بشرطیکہ کسی ناجائز طریقہ کو اختیار کر کے واسطہ کا عمل انجام نہ دیں۔
- مولانا قمر الزماں ندوی کہتے ہیں کہ سودی والے معاملہ میں محنتانہ درست نہیں ہے، غیر سودی والے میں درست ہے، بشرطیکہ پہلے طے کرلیا جائے، تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو۔
- مولانا محمد فاروق دربھنگوی کہتے ہیں کہ اجرت مثل ہے تو جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔

سوال نمبر (۸): بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

اس مسئلہ میں مقالہ نگاران کے دو موقف ہیں:

پہلا موقف: (فیصد، یا جس پر فریقین رضامند ہوجائیں معاملہ کرنا جائز ہے):

اس موقف میں ۴۳ / مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ معاملہ کرتے وقت اگر طے کرلیا جائے تو چونکہ آج کل سرکاری امداد بھی حاصل کرنا اور پھر دفاتر کے چکر لگانا ہر شخص کے بس میں نہیں ہوتا اور مشقت سے خالی نہیں، اور پھر عموم بلوی بھی ہے، اس لئے جس طرح ایک طے شدہ رقم پر دلالی کا معاملہ کرنا درست ہے، اسی طرح حاصل ہونے والی آمدنی میں سے فیصد کے طور پر ایک حصہ پر معاملہ کرنا بھی جائز ہے اور اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ اجرت فیصد لینے ہی سے طے ہو، البتہ ان مجوزین میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ہر حال میں اجرت مثل ہی واجب ہوگا، جبکہ بعض حضرات اس بات کی بھی قید لگاتے ہیں کہ اس کے جواز کے لئے ضروری ہے کہ واسطہ بننے والا شخص سرکاری یا اس محکمہ کا ملازم نہ ہو، کیونکہ یہ اس کی ذمہ داری میں پہلے ہی سے شامل ہے، اگر اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا تو رشوت شمار ہوگا، اس لئے واسطہ بننے والا آزاد شخص ہونا چاہئے۔

ان حضرات نے انہیں نصوص وعبارات فقہاء کو بنیاد بنایا ہے جو اس سے پہلے سوال نمبر ۷ کے ضمن میں نقل ہوئے، اس لئے مزید یہاں بھی ان کا دہرانا بے سود ہے۔

دوسرا موقف:

دوسرا موقف یہ ہے کہ واسطہ بننے اور دلالی کے اس معاملہ میں حاصل ہونے والی رقم سے فیصد متعین کرنا جائز نہیں ہے، البتہ پہلے سے کچھ طے ہوجائے یا اجرت مثل ہو تو درست ہے، جیسا کہ دلالی کے مسئلہ میں ہے، اس موقف کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی مدنی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا فیاض عالم قاسمی، ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد فاروق دربھنگوی۔

بنیادی طور پر فیصد کے حساب سے محنتانہ کو عدم جواز کے قائلین رشوت مانتے ہیں اور رشوت مجبوری ہی میں دی جاسکتی ہے، ورنہ نہیں۔

دلائل:

۱۔ "عن أبي سعيد الخدري قال: نهي عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان" (دار قطنی ۳/ ۴۲، حدیث نمبر: ۲۹۶۶،

بیہقی ۵/ ۵۵۶، حدیث نمبر: ۱۰۸۵۴، نصب الرایہ للزیلعی ۴/ ۳۳۴)۔

۲۔ ''الراشی والمرتشی کلاھما فی النار'' (ترمذی حدیث نمبر: ۱۳۸۷)۔

۳۔ ''وأما دفع الرشوة لدفع الظلم فجائز'' (رد المحتار ۸/ ۲۲۲)۔

۴۔ ''إذا دفع الرشوة لدفع الجور عن نفسه أو أحد من أهل بيته لم يأثم'' (ابن عابدین شامی ۸/ ۵۰۹) (دیکھئے مقالہ: ڈاکٹر شاہجہاں ندوی)۔

۵۔ ''ولو دفع غزلًا لآخر لينسجه له بنصفه، أي بنصف الغزل أو استأجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه أو ثورا ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت في الكل؛ لأنه استأجره بجزء من عمله، والحاصل في ذلك نهيه صلى الله عليه وسلم عن قفيز الطحان'' (درمختار ۹/ ۷۹-۷۸، مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر ۳/ ۵۲۹ کتاب الاجارہ، تبیین الحقائق ۶/ ۲۸-۱۲۷، فتاوی ہندیہ ۴/ ۴۴۴، کتاب الاجارۃ) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی)۔

۶۔ ''وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل، وما تواضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا، فذلك حرام عليهم'' (رد المحتار ۶/ ۹۳) (دیکھئے مقالات: مولانا خورشید احمد، مولانا خورشید انور)۔

متفرق رائے:

- مولانا ڈاکٹر محی الدین غازی کہتے ہیں کہ سوال نمبر سات اور آٹھ کے سلسلہ میں بھی یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ ملک کا قانون اس طرح کے واسطے اور محنتانہ کی کس قدر اجازت دیتا ہے، خاص طور سے فتاوی جاری کرتے وقت اس باب میں احتیاط کی ضرورت ہے۔
- مولانا قمر الزماں ندوی کہتے ہیں کہ جن صورتوں میں حکومت عوام کو سودی قرض دیتی ہے اور پورا معاملہ سودی ہوتا ہے ان صورتوں میں واسطہ بننے والوں کا مطلوبہ محنتانہ لینا درست معلوم نہیں ہوتا، اور نہ ہی حاصل شدہ رقم میں سے فیصد یا حصہ طے کر کے لینا درست اور جائز معلوم ہوتا ہے (دیکھئے: موصوف کا مقالہ متعلق سوال)۔
- مولانا محمد فیاض عالم قاسمی کہتے ہیں کہ بعض حصے کو لے لینا جائز نہیں ہے، بہتر ہے کہ مسلمانوں کی تنظیمیں اس کام کو اعزازی طور پر انجام دیں۔
- مولانا محمد اکرم بن اسلم رشید کہتے ہیں جائز ہے، بشرطیکہ اجرت مناسب ہو۔
- مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کہتے ہیں کہ واسطہ بننے والے شخص کا تعلق فرائض منصبی والوں سے نہ ہو تو درست ہے۔
- مفتی عبدالتواب اناوی کی رائے ہے کہ دلالی کی اجرت عرف پر مبنی ہے، اس سے ہٹ کر غبن فاحش ہے۔
- قاضی محمد حسن ندوی کہتے ہیں کہ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ دینا عرف کی وجہ سے درست ہے، تاہم پہلے سے طے ہونا چاہئے۔
- مفتی ظہیر احمد قاسمی کانپور کہتے ہیں کہ ایک معقول اور مناسب حصہ لیتے ہیں تو جائز ہے۔
- مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی کہتے ہیں کہ صرف رقم کی ایک خاص مقدار متعین کی جائے۔

سوال نمبر (۹):

اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں تمام ہی مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ بہ حالت مجبوری، رشوت کے بغیر کام نکل آنے کی ہر ممکن کوشش کے بعد اپنا جائز حق وصول کرنے اور حکومت سے قرض حاصل کرنا بھی ہمارا ملکی اور شہری حق ہے، اس لئے وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اگر رشوت دینا ضروری ہو جائے تو رشوت دے کر اپنا حق حاصل کرنے کی گنجائش ہے، اور اس کی وجہ سے رشوت دینے والا ان شاء اللہ گناہ گار نہیں ہوگا، اس مسئلہ پر مقالہ نگاران کا اتفاق ہے کہ دفع ظلم اور حقوق واجبہ کے حصول کی خاطر جب اس کے بغیر چارہ نہ ہو رشوت دینا جائز ہے، اور دلائل بھی تقریباً یکساں ہی نقل کئے ہیں، مثلاً:

دلائل:

۱۔ "فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا إثم علیه إن الله غفور رحیم" (سورۃ بقرۃ: ۱۷۳)۔

۲۔ ''وروی أن ابن مسعود أخذ فی شیء بأرض الحبشة، فأعطی دینارین حتی خلی سبیله'' (مرقاۃ المفاتیح ۶/ ۲۴۲۷، معالم السنن، سنن أبی داؤد ۳/ ۱۴۹، ۱۵۰)۔

۳۔ ''فأما إذا أعطی المعطی لیتوصل به إلی حق، أو یدفع عن نفسه ظلمًا، فلا بأس'' (شرح السنه حدیث نمبر: ۲۴۹۳)۔

۴۔ ''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة، یعنی فی حق الدافع'' (رد المحتار ۱۰/ ۶۰۷)۔

۵۔ ''الرابع: ما یدفع لدفع الخوف من المدفوع إلیه علی نفسه وماله حلال للدافع، حرام علی الآخذ، لأن دفع الضرر عن المسلم واجب، ولا یجوز أخذ المال لیفعل الواجب'' (فتح القدیر ۷/ ۲۳۶ کتاب القضاء، فتاوی ہندیہ ۴/ ۴۰۳)۔

۶۔ ''إذا لم یستطع صاحب الحق أخذحقه إلا بدفع رشوة، فقد نص العلماء علی جواز دفعه للرشوة حینئذ، ویکون التحریم علی الآخذلا المعطی'' (فتاوی الاسلام سوال وجواب: ۷۲۲۶۸)۔

۷۔ ''فعلی هذا بذل المال للتوصل إلی الحق لایکون رشوة'' (سبل السلام ۲/ ۵۹، منتخبات نظام الفتاوی ۲/ ۲۰۷، کتاب الفتاوی لخالد سیف اللہ رحمانی ۱۰/ ۳۱۴، فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۴۵۶، محمود الفتاوی ۲/ ۳۱۳)۔

۸۔ ''إنه یجوز أن یرشی من کان یتوصل بالرشوة إلی نیل حق أو دفع بأصل'' (نیل الاوطار ۹/ ۱۷۳)۔

۹۔ ''الضرورات تبیح المحظورات'' (الاشباہ ۱/ ۱۵۵)۔

متفرق رائے:

- قاضی محمد حسن ندوی کہتے ہیں کہ سرکاری اسکیم سے امدادی رقم اور قرضوں کی تحصیل کوئی اپنا حق نہیں ہے، اس لئے اس کے لئے رشوت دینا عام حالت میں جائز نہیں، اور نہ رشوت دے کر امدادی رقم اور قرض کا حاصل کرنا درست ہے (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔
- مفتی محمد ارشاد پالنپوری کہتے ہیں کہ گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقم کے حصول کے لئے رشوت دینا جائز نہیں ہے، اب رہی یہ بات کہ جمہوری حکومت کے خزانۂ عامہ کی مالک اس ملک کے شہریوں کی مجموعی اکائی ہوتی ہے، تو ملک کے خزانے سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے تو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہونا چاہئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات ظاہر ہے کہ یہاں مالک ہونے سے شرعی ملک مراد نہیں ہے، چنانچہ مالکانہ تصرفات (مبیع، ہبہ اور وصیت وغیرہ) اس میں جاری نہیں ہوتے، لہٰذا یہ حق انتفاع دفع رشوت کے جواز کے لئے کافی نہیں ہے (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔
- مولانا عباس بن یوسف کہتے ہیں کہ اس کے لئے دو چیز شرط ہے، کسی کی حق تلفی نہ ہو، ہر ممکن کوشش کر چکا ہو (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔
- مفتی تنظیم عالم قاسمی کہتے ہیں کہ ''البتہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اپنے نظام کو رشوت سے پاک بنائے، کوشش کرے کہ مستحقین کا حق ان تک مکمل طور پر پہنچ جائے، اور بیچ میں کسی طرح کی ہیرا پھیری نہ ہو'' (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

سوال نمبر (۱۰): امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلہ میں مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ حکومت نے جو اصول ومعیار اور قوانین وضوابط بنائے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنا اور غلط بیانی کرنا اور غلط طریقے سے حکومت کی سہولت سے فائدہ اٹھانا قطعاً جائز نہیں ہے، اور غلط طریقے سے مال حاصل کرنا کذب، دھوکہ، اکل مال غیر، حق تلفی اور

خیانت ہے اور بے عزتی کا خطرہ بھی ہے، اس مسئلہ میں مقالہ نگاران کا اتفاق پایا جاتا ہے، ان کے اسماء گرامی حذف کئے جاتے ہیں:

دلائل:

۱۔ "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقًا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون" (سورہ بقرہ:۱۸۸)۔

۲۔ "يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله و كونوا مع الصادقين" (سورہ توبہ:۱۱۹)۔

۳۔ "فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور" (سورہ حج:۳۰)۔

۴۔ "يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" (سورہ نساء:۲۹)۔

۵۔ "ومن يغلل يأت بما غل يوم القيامة ثم توفى كل نفس ما كسبت وهم لا يظلمون" (آل عمران:۱۶۱)۔

۶۔ ''عن أبي هريرة كان فينا النبي صلى الله عليه وسلم فذكر الغلول فعظّمه وعظم أمره، قال: لا ألغين أحدكم يوم القيامة على رقبته شاة لها ثغاء، وعلى رقبته فرس له حمحمة، يقول: يا رسول الله! أغثني، فأقول: لا أملك لك شيئا، قد أبلغتك، وعلى رقبته بعير له رغاء، يقول: يا رسول الله! أغثني، فأقول: لا أملك لك شيئًا، قد أبلغتك، وعلى رقبته صامت، فيقول: يا رسول الله! أغثني، فأقول: لا أملك لك شيئا قد أبلغتك، أو على رقبته رقاع تخفق، فيقول: يا رسول الله! أغثني، فأقول: لا أملك لك شيئًا، قد أبلغتك'' (بخاری حدیث نمبر: ۳۰۷۴، مسلم حدیث نمبر: ۱۸۳۱، مسند احمد حدیث نمبر: ۹۵۰۳)۔

۷۔ ''عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم المكر والخديعة والخيانة في النار'' (المستدرك حدیث نمبر: ۸۷۹۵)۔

۸۔ ''عن مستورد بن شداد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من كان لنا عاملًا فليكتسب زوجة، فإن لم يكن له خادم، فليكتسب خادمًا، فإن لم يكن له مسكن فليكتسب مسكنا، من اتخذ غير ذلك فهو غال أو سارق'' (ابوداؤد حدیث نمبر: ۲۹۴۵، ابن خزیمہ حدیث نمبر: ۲۳۷۰) (مذکورہ بالا آیات واحادیث کے لئے دیکھئے مقالہ: ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی)

۹۔ ''عن أنس قال: فلما خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا قال: لا إيمان لمن لا أمانة له، ولا دين لمن لا عهد له'' (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، مشکوۃ کتاب الایمان ۱/۱۵)۔

۱۰۔ ''إنما أنا بشر وأنتم تختصمون إليّ ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض، فأقضي له على نحو ما أسمع منه، فمن قضيت له ليس في حق أخيه فلا يأخذنه، فإنما أقطع له قطعة من النار فليحملها أو يذرها'' (رواہ البخاری ومسلم حدیث نمبر: ۱۷۱۳) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد عرفان آسام)۔

۱۱۔ ''عن النبي صلى الله عليه وسلم: آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب وإذا اؤتمن خان، وإذا وعد أخلف'' (مسلم کتاب الایمان: ۱۴۳)۔

۱۲۔ ''من غش فليس منا'' (مسلم ۴/۹۷)۔

۱۳۔ ''إن الصدق يهدي إلى البر، وإن البر يهدي إلى الجنة، وإن الرجل ليصدق حتى يكتب عند الله صديقًا، وإن الكذب يهدي إلى الفجور، وإن الفجور يهدي إلى النار، وإن الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذابا'' (متفق علیہ/۲۶، حدیث نمبر: ۵۴۰ ریاض الصالحین)۔

۱۴۔ ''ولا يأكل بعضكم مال بعض بالباطل بالوجه الذي لم يبحه الله ولم يشرعه، وتدلوا بها ولا تلقوا أمرها

والحکومة فیها إلی الحکام لتأکلوا بالتحاکم فریقًا طائفة من أموال الناس بالإثم بشهادة الزور أو بالیمین الکاذبة'' (کشاف ۱/ ۳۲۳)۔

۱۵۔ ''أن کل مقصود محمود یمکن التوصل إلیه بالصدق والکذب جمیعًا فالکذب فیه حرام، وإن أمکن التوصل إلیه بالکذب وحده فمباح إن أبیح تحصیل ذلك المقصود وواجب إن وجب تحصیله'' (رد المحتار ۶/ ۲۲۷)۔

۱۶۔ ''اتفق العلماء علی أن الغش حرام سواء أکان بکتمان العیب فی المعقود علیه، أو الثمن، أم بالکذب والخدیعة، وسواء أکان فی المعاملات أم فی غیرها من المشورة والنصیحة'' (موسوعہ فقہیہ ۳۱/ ۲۱۹)۔

۱۷۔ ''من اکتسب مالا بغیر حق، فأما إذا کان عند رجل مال خبیث، فأما إن ملکه بعقد فاسد أو حصل له بغیر عقد ولا یمکنه أن یرده إلی مالکه، ویرید أن یدفع مظلمة عن نفسه، فلیس له حیلة، إلا أن یدفعه إلی الفقراء'' (بذل المجهود ۱/ ۳۵۹) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

۱۸۔ ''والکذب حرام إلا فی الحرب للخدعة، وفی الصلح بین اثنین، وفی إرضاء الأهل، وفی دفع الظالم عن الظلم'' (ملتقی الابحر ۴/ ۲۲۱)۔

متفرق رائے (گنجائش کے پہلو):

اس سوال کے جواب میں اتفاق کے باوجود ۵۷ مقالہ نگاران میں سے ۳/حضرات: عبدالباسط قاسمی، مولانا ابوالمکارم معروفی اور مولانا نثار عالم ندوی نے جمہور سے ہٹ کر اس میں گنجائش کا پہلو نکالنے کی کوشش کی ہے، اور اختلاف کیا ہے۔

- مولانا عبدالباسط قاسمی لکھتے ہیں: ''شرعی قواعد کی بنا پر ایسی امداد وقرض کو حاصل کرنے کے لئے ضرورت وحاجت کو معیار بنایا گیا ہے، اگر شرعی بنیادیں پائی جائیں اور ضرورت وحاجت کے پورا ہونے کی کوئی شکل نہ ہو اور سرکاری شرائط ومعیار موجود نہ ہو تو عزت وآبرو کے تحفظ کے ساتھ حیلہ ممکن ہو تو اختیار کرنے کی گنجائش ہوگی، جیسا کہ بہت سے معاملات میں سرکاری شرائط ومعیارات کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے، اور عزت وآبرو کے تحفظ کے ساتھ ان شرائط کے ترک کی گنجائش دی گئی ہے، حج وعمرہ میں نئی پابندیوں کے سلسلہ میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں اور ان پابندی سے متعلق قوانین کی خلاف ورزی کو گناہ نہیں قرار دیا گیا ہے'' (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

- ابوالمکارم معروفی کہتے ہیں: ''اگر کوئی شخص مطلوبہ شرائط ومعیارات کے مطابق امدادی رقم یا قرض کا واقعی مستحق ہے، لیکن کچھ ایسی دشواریاں یا الجھنیں ہیں جو رقم کے حصول میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں تو ایسی صورت میں اسکیم کو حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی اور تعریض کی گنجائش ہے'' (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

- مولانا محمد عرفان (آسام) کہتے ہیں کہ ''اگر وہ معیارات مبنی برتعصب اور خلاف شرع ہوں تو پھر اس کا ذکر کسی معتبر عالم سے کر کے ان کی ہدایت پر عمل کرے'' (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

- مولانا محمد نثار عالم ندوی لکھتے ہیں:

''اس سوال کے جواب کو بھی دو جزء میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) امدادی رقوم یا لون واسکیم سے استفادہ کرنے کے لئے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں اور حاصل کرنے والے شخص کے پاس وہ مطلوبہ شرائط ومعیارات کا غذات مکمل دستیاب نہیں ہیں، لیکن وہ شخص فی نفسہ اس امداد واسکیم کا مستحق ہے تو ایسی صورت میں غلط بیانی سے ڈپلی کیٹ (Duplicate) کاغذات کا سہارا لیتا ہے تو اس کے اس عمل کی گنجائش ہونی چاہئے کہ وہ اسکیمیں مستحق اشخاص کے لئے ہی مختص ہوتے ہیں اور مستحق اشخاص کے پاس مطلوبہ شرائط وکاغذات نہیں ہے، پس اصل کا اعتبار ہوگا نہ کہ کاغذات وشرائط کا۔

نیز کاغذات بنانے کی ذمہ داری اس شخص پر خود عائد ہوتی ہے، لیکن دوسری طرف بنانے کی ایک ذمہ داری حکومت کی بھی ہوتی ہے۔ مشاہدہ

ہے کہ بہت سارے کاغذات حکومت کے عدم توجہی سے نہیں بن پاتے ہیں اور بہت سارے، بلکہ اکثر و بیشتر کاغذات حکومت کے اہل کار کی غفلت وکاہلی، عدم توجہی یا جہالت کے سبب غلط بن جاتے ہیں، اس میں اس شخص سے زیادہ حکومت کی بے توجہی کو دخل ہے، پھر غلط کاغذات کی وجہ سے خمیازہ اس شخص کو بھگتنا پڑتا ہے۔

نیز حکومت کی طرف سے بعض اسکیم علی الاعلان ہوتے ہیں، لیکن کچھ کاغذات کی وجہ سے بہانہ بنا کر وہ رقم واپس چلی جاتی ہے، حالانکہ حکومت کے پاس ان افراد کی لسٹ ہوتی ہے وہ اس کے مطابق تقسیم کر سکتے ہیں، لیکن بعض دفعہ بیجا شرائط لگا کر اس سے محروم کر دیا جاتا ہے، گاؤں دیہات میں عام مشاہدہ ہے، پس حکومت کے اس حیلے تراشے سے بچنے کے لئے نقلی دستاویزات سے حاصل شدہ رقم کے استعمال کی گنجائش ہونی چاہئے۔

پس اگر مطلوبہ دستاویزات وکاغذات امیدوار کے پاس نہیں ہیں اور واقعۃً وہ اس اسکیم کا مستحق ہے وہ اپنے Duplicate کاغذات وغلط بیانی کے سہارے اس اسکیم سے فائدہ حاصل کرنے کا مجاز سمجھا جاسکتا ہے۔

(ب) اسکیم سے استفادہ کے کچھ شرائط ومعیارات ہیں اور امیدوار شخص اس کا مستحق بھی نہیں ہے اس کے باوجود وہ غلط بیانی سے یا Duplicate کاغذات کے سہارے سے حکومت کے مختلف امدادی اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہندوستان کی موجودہ صورتحال جس میں اسلام ومسلمان، بلکہ عامۃ الناس غریب کی بیخ کنی کی منظم سازشی پلاننگ پر درآمد جودن بدن کم تر ہونے کے بجائے فروتر ہوتا جارہا ہے جو کسی سے مخفی نہیں ہے ایسے ماحول میں، اور ایسی صورتحال میں اس کی گنجائش ہونی چاہئے بچند وجوہ:

(الف): حکومت کی طرف سے مختلف پروجیکٹ کے لئے مختلف ترجیحات کے لئے ہی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں اور لوگوں کو عدم واقفیت کی وجہ سے بہت ساری اسکیمیں رکھی رہ جاتی ہیں اور وہ واپس ہوجاتی ہیں وہ یا تو نمائندہ افراد کے جیب میں چلی جاتی ہیں، یا پھر وہ کسی سرمایہ دار کے ہاتھ میں لگ جاتے ہیں جو بالکلیہ ہی غیر مستحق ہوتے ہیں۔

(ب) مستحق شخص یا عام افراد کے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے وہ رقم نمائندہ افراد یا سرمایہ دار شخص کے پاس جانے کی صورت میں وہ مال عیش وعشرت یا اسلام دشمنی میں خرچ ہونے کا قوی امکان ہے۔

ابھی حال ہی میں بات واضح ہوئی کہ کس طرح عوام کے پیسے کو جبراً بینک میں رکھوا جارہا ہے اور رکھے ہوئے مال سے سرمایہ دار سیکٹرس افراد کو مال مال کر کے حکومت اپنی مرضی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

پس ''اہون البلیتین'' کے تحت غلط بیانی سے حاصل شدہ رقم کے جواز کی راہ نکالی جاسکتی ہے۔

(ج) ہندوستان کی موجودہ صورتحال کی وجہ سے قدیم ومعاصر فقہاء کرام نے بربنائے حاجت سود ورشوت جیسی حرام وقبیح چیز کو بعض صورتوں میں جائز قرار دیا ہے ملاحظہ ہو مسائل سود از مولانا حبیب الرحمن صاحب خیرآبادی صفحہ ۱۹۰ تا صفحہ ۲۰۰ تک۔

جب بربنائے حاجت وضرورت سود ورشوت جیسی چیز کو بعض صورتوں میں جائز قرار دیا جاسکتا ہے تو صورت مسئلہ میں بدرجہ اولی گنجائش ہونی چاہئے، ''الضرورات تبیح المحظورات'' کی بناپر۔

(د) ہندوستان کی موجودہ ناگفتہ بہ صورتحال میں جبکہ علی الاعلان حکومت کے نمائندوں کی طرف سے مسلمانوں کو دیش بدر کر دینے کی سازش اور سیاسی وسماجی علمی واقتصادی ہر اعتبار سے تہی دست کر دینے کی ایک منظم سازش وعمل ہو رہا ہے ایسی صورت حال میں اقتصادی بدحالی وزبوں حالی کو دور کرنے کے لئے اس کی اجازت دی جانی چاہئے'' (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

- اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مفتی محمد عثمان بستوی نے عدم جواز کی رائے رکھنے کے باوجود کذب بیانی سے حاصل کی گئی امداد اور اس کے ذریعہ حاصل آمدنی کے تعلق سے تفصیل سے گفتگو کیا ہے ان کے علاوہ اور بھی مقالہ نگار نے اس پر روشنی ڈالی ہے، یہاں موصوف بستوی کے مقالہ کا اقتباس نقل کیا جارہا ہے:

”کذب بیانی سے حاصل کی گئی امداد کا حکم:

کذب بیانی کے ذریعہ سے حاصل کی گئی امداد بحکم غصب ہے اور مال مغصوب سے انتفاع شرعاً جائز نہیں، بلکہ اس کے اصل مالک کو واپس لوٹانا واجب ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے مالک تک لوٹانا ممکن نہ ہو تو اس کا تصدق واجب ہے، کذب بیانی سے حاصل کی گئی امداد غصب کے حکم میں اس لئے ہے کہ یہ مال مالک کی رضا کے بغیر حاصل کیا گیا ہے، کیونکہ اس کی رضا شرائط کے ساتھ مشروط تھی اور شرائط کے فوت ہونے کی وجہ سے رضا بھی فوت ہے، لہٰذا اس کا بحکم غصب ہونا ظاہر ہے“۔

’القسم الأول ماكان محرما على المرأ لكونه ملكًا للغير. القسم الأول نعبر عن جميع العقود الباطلة فيما يأتي بالمغصوب والذى يقبض هذا المال الحرام بالغصب، وذلك لسهولة التعبير ويشمل هذا التعبير كل مالٍ حرام لايملكه المرأ فى الشرع سواء كان غصبًا أو سرقة، أو رشوة، أو ربا فى القرض، أو مأخوذًا ببيع باطل، وإنه حرام للغاصب الانتفاء به أو التصرف فيه، فيجب عليه أن يرده إلى مالكه أو إلى وارثه بعد وفاته؛ وإن لم يمكن ذلك لعدم معرفة المالك أو وارثه أو لتعذر الرد عليه لسبب من الأسباب وجب عليه التخلص منه بتصدقه عنه من غير نية ثواب الصدقة لنفسه، وهذا الحكم عام سواء كان المغصوب عرضًا أم نقدًا؛ لأن النقود تتعين فى الغصوب، حتى عند الحنفية الذين يقولون بعدم تعين النقود، كما مر تحقيقه، ثم إن كان المغصوب قائمًا عند الغاصب بعينه تتعدى حرمته إلى من يأخذه من الغاصب شراء أو هبة أو إرثًا وهو يعلم أنه مغصوب، وهذا القدر لا نعلم فيه خلافًا بين الفقهاء“ (فقه البيوع ۲/ ۱۰۰۶)۔

مذکورہ صورت کے منافع کا حکم:

دراہم مغصوبہ وغیرہ سے حاصل کے گئے منافع کے سلسلہ میں فقیہ عصر حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ نے بڑی مفصل گفتگو فرمائی ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ خریداری کی کل پانچ صورتیں ہیں: (۱) دراہم مغصوبہ بائع کو پہلے حوالے کئے جائیں پھر اس کے عوض خریداری ہو (۲) دراہم مغصوبہ کی طرف اشارہ ہو اور اس کے ذریعہ خریداری ہو پھر وہی حوالے بھی کئے جائیں (۳) دراہم مغصوبہ کی طرف اشارہ ہو اور اسی پر عقد ہو اور حوالے دوسرے دراہم کئے جائیں (۴) عقد مطلق ہو (کسی درہم کی طرف اشارہ اور تعیین نہ کی گئی ہو) لیکن دراہم مغصوبہ حوالے کئے جائیں (۵) مغصوبہ دراہم کے علاوہ دوسرے دراہم کی طرف اشارہ اور اس کے ذریعہ خریداری کی جائے لیکن حوالے دراہم مغصوبہ کئے جائیں۔

مذکورہ بالا صورتوں کا حکم:

ان صورتوں کے احکام میں مشائخ احناف کا اختلاف ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) القول الاول: مذکورہ بالا پانچوں صورتوں کا حکم یہ ہے کہ اداء ضمان سے قبل جو بھی نفع ہو وہ حلال نہیں ہے اس کو نفع کے ساتھ مالک کو لوٹا دینا واجب ہے اور نفع کو صدقہ کرنے کا بھی اختیار ہے (انعام الباری ۶/ ۴۴۹)۔ البتہ اداء ضمان کے بعد جو نفع حاصل ہوگا وہ طیب وحلال ہے یہی ظاہر الروایہ کا مقتضا ہے اور اسی کو ترجیح دیا ہے، ہدایہ، بدائع اور ہندیہ وغیرہ میں اسی کو اختیار کیا ہے ابوبکر اسکاف نے (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۱۱)۔

(۲) القول الثانی: مذکورہ بالا صورتوں میں سے پہلی صورت کے علاوہ بقیہ سب صورتوں میں نفع طیب وحلال ہے، کیونکہ مشتری کے ذمہ مطلق دراہم کی ادائیگی واجب ہوتی ہے اور دراہم مغصوبہ یہ اس دراہم مطلقہ کا بدل ہیں، لہٰذا خریدی ہوئی چیز میں کوئی خبث ظاہر نہ ہوگا اور دراہم کی طرف کئے گئے اشارہ کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں اس کے قائل ابوالنصر اور ابواللیث ہیں (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۱۱)۔

(۳) القول الثالث: تیسرا قول امام کرخیؒ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ پہلی دونوں صورتوں میں نفع طیب وحلال نہیں اور بقیہ تین صورتوں میں طیب وحلال ہے (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۱۱)۔

امام کرخیؒ ابوالنصر وغیرہ کے قول کا مطلب:...... حضرت مفتی صاحب نے ان حضرات کے اقوال کی توجیہ یہ بیان فرمائی ہے کہ نفع حاصل ہونے

کے بعد اگر ضمان ادا کر دیا جائے تو امام کرخی کے مطابق تین صورتوں میں نفع اس وقت حلال اور طیب ہو جائے گا، گرچہ اداء ضمان سے قبل ہی حاصل ہوئے ہوں "ینقلب ھذا الربح طیبا بأداء الضمان"، البتہ پہلی اور دوسری صورت میں اداء ضمان کے بعد بھی نفع حلال وطیب نہ ہوگا اور ابونصر، ابواللیث وغیرہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ پہلی صورت کے علاوہ بقیہ چار صورتوں میں اداء ضمان کے بعد نفع حلال ہوگا اور پہلی صورت میں حلال نہیں ہوگا اور اداء ضمان سے قبل کسی صورت میں بھی کسی کے نزدیک حلال نہ ہوگا۔ (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۱۳)

فتوی اور ترجیح:

حضرت مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں کہ امام کرخی کے قول کا جو مطلب ہم نے ذکر کیا ہے اگر وہ لیا جائے تو اس کا راجح ہونا مسلم ہے اور اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ دراہم مغصوبہ سے حاصل شدہ نفع حلال ہے تو اس صورت میں صاحب ہدایہ اور علامہ کاسانی کا قول (نفع کا حرام ہونا) راجح معلوم ہوتا ہے اور اسی میں احتیاط ہے، اگر چہ بہت سے فقہاء نے عموم بلوی کی وجہ امام کرخی کے قول پر فتوی بھی دیا ہے، اس لئے سخت ضرورت اور مجبوری کے وقت اس پر عمل کی گنجائش ہے، البتہ احتیاط بہتر ہے۔

"وذکر کثیر من المتأخرین أن الفتوی الآن علی قول الکرخی دفعًا للحرج عن الناس قال ابن عابدین: "وعلی ھذا مشی المصنف (یعنی صاحب الدر المختار) فی کتاب الغصب تبعًا للدرر وغیرھا. وقد أفتی بہ جماعۃ من مشایخنا۔

فلو أخذ قول الکرخی علی ما فسرناہ فرجحانہ مسلم، أما إذا أخذ مبیحا لما اشتری بالنقود المغصوبۃ وربحہ فالذی یمیل إلیہ القلب أن ما رجحہ صاحب الھدایۃ والکاسانی بناء علی قول الإمام أبي حنیفۃ ومحمد رحمھم اللہ، ھو الأولی بالترجیح وھو الاحتیاط، وإن کان کثیر من الفقھاء المتاخرین أفتوا بذلک لعموم البلوی، ولذا فمن ابتلی بمثل ھذا یرجی أن یسوغ لہ الأخذ بھذا القول عند حاجۃ شدیدۃ، والتنزہ أولی، ولم یذکر عن الکرخی حکم البائع الذی أخذ من المشتری النقود المغصوبۃ ہل یسوغ لہ استعمال تلک النقود؟ وقد أفتی کثیر من علمائنا أنہ یجوز لہ ذلک أیضًا، واللہ سبحانہ وتعالی أعلم"۔ (فقہ البیوع ۲/۱۰۱۶)

کذب بیانی سے حاصل کئے گئے قرض سے انتفاع:

کذب بیانی کرنا قرض حاصل کرنے کے لئے شرعاً جائز نہیں، لیکن حاصل کئے گئے قرض کا مالک ہو جائے گا اور اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی حلال ہوگا، کیونکہ ملکیت اور عقد میں کوئی خبث نہیں ہے، البتہ خبث سبب ملک میں ہے اور جب خبث ملکیت اور عقد میں نہ ہو تو نفع حلال ہوتا ہے، لیکن خبث فی السبب کی وجہ سے معاملہ کو ختم کر کے از سر نو کرنا واجب ہوتا ہے بشرطیکہ جس چیز میں خبث ہو اس کو باقی رکھ کر کے نفع حاصل کیا جائے۔

"إن الخبث عند الحنفیۃ علی ثلاثۃ أنواع: خبث الکسب، خبث السبب، خبث البدل.... أن المسلم إذا باع الخمر والخنزیر فی دار الحرب وأخذ ثمنھا فلیس ھناک خبث فی السبب ولا فی البدل، لکن یوجد ھناک خبث فی الکسب فالتعاطی الخمر والخنزیر حرام علی المسلم فکذلک فی مسئلتنا (النکاح الثابت بشھادۃ الزور) لأن السبب الحل ھو القضاء أي ہو سبب مشروع، لکن الخبث متمکن فی الکسب، یعنی الطریق الذی أدی إلی ذلک السبب، ولا یرتفع ذلک الخبث إلا بعقد مستأنف علی الطریق المشروع، وأضف إلی ذلک أن الخبث إن کان مستمرًا فلا یطیب للرجل الانتفاع حتی یزیل ذلک الخبث بطریق مشروع، وھو العقد المستأنف" (تکملۃ فتح الملھم ملخصًا ۸/ ۵۰۲، ۵۰۳ م الاشرفیہ دیوبند)۔

(جب کذب بیانی کے ذریعہ سے قرض حاصل کیا گیا اور اس قرض سے نفع حاصل ہوا تو اس نفع کے حصول کا سبب قرض ہے اور نفع میں خبث نہیں، لیکن کذب بیانی کی وجہ سے قرض میں خبث ہے اور جب ربح میں خبث نہیں تو اسکا تصدق بھی واجب نہیں اور قرض کی رقم کے استہلاک کے ذریعہ سے نفع

حاصل ہوتا ہے اس کو باقی رکھ کر کے نہیں، لہٰذا معاملے کا استیناف بھی واجب نہیں، اس مسئلہ سے بہت قریب جعلی سرٹیفکٹ کے ذریعہ سے ملازمت حاصل کرنے والا مسئلہ ہے، کیونکہ جس طرح کذب بیانی کے ذریعہ سے قرض حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس قرض سے نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح کذب بیانی کے ذریعہ سے ملازمت حاصل کی جاتی ہے اور اس ملازمت کے ذریعہ سے آمدنی حاصل کی جاتی ہے دونوں مسئلوں میں نفع کی جو اصل ہے اس کے حاصل کرنے کے طریقہ میں خبث ہے اور جعلی سرٹیفکٹ والے مسئلہ میں علماء نے اس کی صراحت کی ہے کہ آمدنی حلال ہے واجب التصدق نہیں)۔

چنانچہ صاحب ''احسن الفتاوی'' تحریر فرماتے ہیں: کہ یہ جھوٹ اور دھوکہ ہے، لہٰذا جائز نہیں اس کی اعانت کرنے والے گناہ گار ہوں گے، البتہ جو کام اس کے ذمہ ہے اگر وہ اسے بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو تنخواہ حلال ہے (احسن الفتاوی ۸/۱۹۸)

اور یہی حکم ''جدید فقہی مسائل'' میں بھی مذکور ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ مگر اس کی کمائی ہوئی آمدنی حلال وجائز اور یہ اس کی محنت کی اجرت ہے ایسا ممکن ہے کہ ذریعہ ناجائز ہو کمائی جائز ہو اس سلسلہ میں فقہ کا یہ جزئیہ قابل لحاظ ہے:

''ومہر البغي في الحديث هو أن يواجر أمته على الزنا وما أخذه من المهر فهو حرام عندهما وعند الإمام إن أخذه بغير عقد بأن زنى بأمته ثم أعطاها شيئًا فهو حرام لأنه أخذه بغير حق، وإن استاجرها ليزني بها ثم أعطاها مهرها أو ما شرط لها لا بأس بأخذه؛ لأنه إجارة فاسدة فيطيب له، وإن كان السبب حرامًا'' (جدید فقہی مسائل ۱/۴۱۳)۔

حاصل یہ کہ کذب بیانی کے ذریعہ سے حاصل کئے گئے قرض سے نفع اٹھانا بھی جائز ہے اور اس کا نفع بھی حلال ہے، البتہ کذب بیانی کا جو گناہ ہے وہ بہر حال ہوگا، کذب بیانی کی وجہ سے قرض اور اس کے ربح میں خبث کا تحقق نہیں ہوگا، لیکن کذب بیانی کے ذریعہ حاصل کی گئی امداد کا حکم قرض سے مختلف ہے، کیونکہ یہ امداد بحکم غصب ہے، چنانچہ ''فتاوی عثمانی'' کے ایک فتوی میں ہے کہ آپ کے لئے اپنی رہائش کا فاصلہ زیادہ لکھوا کر کرایہ سواری وصول کرنا جائز نہیں اور جب اس طرح حاصل کی ہوئی رقم ناجائز ہوئی تو اسے حکومت ہی کو واپس کرنا ضروری ہے اور اس کو صدقہ کرنا بھی درست نہیں، الا یہ کہ حکومت کو واپس کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو اس صورت میں بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے (فتاوی عثمانی ملخصا ۳/۳۹۰، ۳۹۱)۔

جس طرح سے کذب بیانی کے ذریعہ حاصل کئے گئے کرایہ کو غصب کے حکم میں رکھا گیا ہے اسی طرح کذب بیانی کے ذریعہ حاصل کی گئی امداد بھی غصب کے حکم میں ہوگا اور غصب کے حکم میں یہ بات تفصیل سے ذکر کر دی گئی ہے کہ اس کا ضمان ادا کرنے سے پہلے نہ تو اس سے انتفاع جائز ہے اور نہ ہی اس کا نفع حلال وطیب ہے اور اگر ضمان ادا کرنے سے پہلے نفع حاصل کیا گیا تو اداء ضمان کے بعد اس کا خبث زائل ہوگا یا نہیں اس میں اختلاف ہے، امام کرخی کے نزدیک اداء ضمان سے پہلے حاصل ہونے والے نفع کا خبث اداء ضمان سے زائل ہو جائے گا اور حرام کی اس کثرت کے زمانے میں یہی راجح ہے''۔

سوال نمبر (۱۱): بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے دو شق ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ قرض پر آنے والی سود کی رقم حکومت ادا کرتی ہے، یہ صورت جائز ہے۔

۲۔ قرض پر آنے والے سود کی رقم قرض دار یا قرض گرندہ خود ادا کرتا ہے تو یہ سودی معاملہ ہے اور اگر اس کی مقدار اتنی ہے کہ اسے سروس چارج پر محمول کیا جاسکتا ہے تب تو درست ہے اور اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا عام آدمی کے لئے جائز ہے، اور اگر سود کی مقدار زیادہ یا عام سودی معاملہ کی طرح ہے، تو اس اسکیم سے صرف ان حضرات کے لئے فائدہ اٹھانا جائز ہے جو غریب ومحتاج ہیں، عام آدمی کے لئے جائز نہیں ہے، یہ رجحان اکثر مقالہ نگاران کا ہے، مگر چونکہ اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کے الگ الگ چار رجحانات سامنے آئے ہیں، اس لئے ہم انہیں ترتیب وار نذر قارئین کرتے ہیں:

پہلا رجحان (اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں):

پہلا رجحان یہ ہے کہ مطلقاً ناجائز ہے، خواہ سود کی رقم حکومت ادا کرے یا قرض دار، یہ موقف مندرجہ ذیل حضرات کا ہے:

مفتی اسعد بن عبدالرزاق فلاحی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد زبیر ندوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عبدالباسط قاسمی، مفتی ارشاد پالنپوری، مولانا محمد قمر الزماں ندوی۔

ان حضرات کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ سودی معاملہ ہے اور سود کسی بھی طرح ادا کیا جائے اور کوئی بھی ادا کرے بہرحال وہ سود ہے اور وہ حرام ہے، اس لئے اس طرح کی اسکیم سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

دوسرا رجحان (سودی معاملہ ہے، مگر حکومت سود کی ادائیگی اپنے ذمہ لے تو جائز ہے):

دوسرا رجحان یہ ہے کہ سود کی رقم پوری کی پوری اگر حکومت ادا کرتی ہے تو جائز ہے یہ حکومت کی طرف سے گویا ایک امدادی اسکیم ہے اور اگر قرض دار ادا کرے تو سود کی شرح کم ہو یا زیادہ یہ سودی معاملہ ہے، یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ عام حالات میں سود دینا ممنوع اور حرام ہے، اس کی ادائیگی کو اگرچہ معمولی ہو سروس چارج پر محمول نہیں کیا جاسکتا ہے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا ابوالمکارم معروفی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی عبدالمنان آسام، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا اعجاز الحسن پانڈے، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا آزاد بیگ قاسمی، مولانا محمد عرفان آسام، مولانا محمد رمضان سعادتی، مفتی حیدر علی قاسمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد خورشید احمد اعظمی، مولانا محی الدین غازی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد حذیفہ داحودی۔

تیسرا رجحان (یہ حکومت کی امدادی اسکیم ہے):

تیسرا رجحان یہ ہے کہ یہ حکومت کا اپنا معاملہ ہے اور یہ امدادی اسکیم ہے، اگر سود کی رقم حکومت ادا کرتی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اس موقف کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مفتی ظہیر احمد قاسمی کانپور، مولانا محمد فیاض عالم قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی جمیل احمد نذیری، دارالافتاء بناس کانٹا گجرات، مولانا محمد حسین قمر الدین ہمکر، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عبدالحمید قاسمی۔

چوتھا رجحان (کم شرح سود کو سروس چارج پر محمول کرنا):

اگر قرض دار ادا کرے، اور وہ رقم معمولی ہو تو اس کو سروس چارج پر محمول کیا جائے گا، اور اس سرکاری اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد ممتاز خاں ندوی، مولانا سراج الحق میواتی، مولانا محمد نثار عالم ندوی۔

پانچواں رجحان: (اضطراری اور ضرورت شدیدہ کی حالت ہی میں اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا):

اس اسکیم سے صرف مضطر اور ضرورت مند فائدہ اٹھا سکتا ہے، کیونکہ یہ بھی سودی اسکیم ہے، واضح طور پر اس کی وضاحت مندرجہ ذیل حضرات نے کی ہے:

مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مولانا سراج الحق میواتی، مولانا محمد فلاحی، مفتی عبدالمنان آسام، مفتی محبوب علی وجیہی، ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی، مولانا جمیل اختر جلیلی۔

متفرق رجحان:

- محمد اکرم بن اسلم رشید کہتے ہیں کہ اس کا جواب سوال ۶ کے جواب کی تفصیل سے مربوط ہے۔

- مولانا عباس بن یوسف کہتے ہیں کہ اگر سود ادائیگی کی رقم سے کم ہے تو جائز ہے اور زیادہ ہے تو جائز نہیں ہے۔
- مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی کہتے ہیں کہ سود ادا کرنے کی صورت میں ضرورت مند کے لئے جائز ہے، نہ ادا کرنے کی صورت میں سب کے لئے جائز ہے۔
- مفتی لطیف الرحمن ممبئی کہتے ہیں کہ ادائیگی کی رقم لی ہوئی رقم سے تجاوز کر جاتی ہے تو چاہے حکومت ادا کرے یا مقروض بہر صورت ناجائز ہے۔
- مولانا ابوالمکارم معروفی کہتے ہیں کہ یہاں دو معاملے الگ الگ ہیں، ایک معاملہ بینک کا شہری اور مقروض سے ہوا، یعنی قرض بغیر سود کے، اور دوسرا معاملہ بنک کا حکومت سے جو ہبہ ہوا، اس تاویل سے تعلیمی ودیگر ضروریات کے لئے لون لینا جائز ہے، البتہ اس صورت میں مقروض پر لی ہوئی رقم سے کچھ زائد دینا ہوگا تو یہ سود ہی کے زمرے میں آئے گا (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔
- مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی لکھتے ہیں: ''اس سوال کو چار مختلف اجزاء میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱- تعلیم کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ خود حکومت ادا کرے۔

۲- تعلیم کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرے۔

۳- تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ خود حکومت ادا کرے۔

۴- تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرے۔

پہلی صورت (تعلیم کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ خود حکومت ادا کرے) کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا بالکل جائز ودرست ہے؛ کیونکہ حکومت جو زائد رقم ہماری طرف سے ادا کر رہی ہے، وہ ہمارے لئے اعانت ہے، جس سے فائدہ اٹھانا ایک جائز عمل ہے، جیسا کہ سوال نمبر (۶) کے جواب میں گزر چکا ہے۔

دوسری صورت (تعلیم کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرے) کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اس میں سود ادا کرنا پڑتا ہے، خواہ جس مقدار میں ہو؛ اس لئے ایسے قرض کے سلسلہ میں دو باتوں میں غور کرنے کی ضرورت ہے:

۱- جس تعلیم کے لئے قرض لیا جارہا ہے، وہ فرض کفایہ میں سے ہے اور قرض لینے والے شخص کے علاقہ میں فرض کفایہ کی ادائے گی کرنے والا کوئی نہیں۔

۲- وہ تعلیم، جس کے لئے قرض لیا جارہا ہے، وہ تو فرض کفایہ تو ہے؛ لیکن اس کی ادائیگی کرنے والے موجود ہوں۔

ان دونوں صورتوں کے احکام بیان کرنے سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ فرض کفایہ علوم کونسے ہیں؛ تاکہ حکم لگانے میں سہولت بہم ہو سکے، مشہور اسلامی فلاسفر امام غزالیؒ نے 'فرض کفایہ علوم' کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

أما فرض الكفاية، فهو علم لا يستغنى عنه في قوام أمور الدنيا كالطب، إذ هو ضروري في حاجة بقاء الأبدان، وكالحساب، فإنه ضروري في المعاملات، وقسمة الوصايا، والمواريث وغيرهما. وهذه هي العلوم التي لو خلا البلد عمن يقوم بها حرج أهل البلد، وإذا قام بها واحد كفى وسقط الفرض عن الآخرين (إحياء علوم الدين. كتاب العلم. الباب الثاني: بيان العلم الذي هو فرض كفاية ۱/ ۲۸)۔

جہاں تک فرض کفایہ کا تعلق ہے تو وہ علم ہے، جس سے دنیاوی معاملات کی درستگی میں چھٹکارہ نہیں، جیسے: ڈاکٹری کہ جسمانی بقا کی حاجت کے لئے یہ ضروری ہے، اور جیسے: حساب کہ میراث ووصیت کی تقسیم اور معاملات کے لئے ضروری ہے، اور یہ وہ علوم ہیں کہ اگر شہر ان کے جاننے والے سے خالی ہو تو اہل شہر حرج ومشقت میں پڑ جائیں اور اگر ایک شخص بھی ان امور کو انجام دینے والا ہو تو کافی ہوگا اور دوسروں سے فرض ساقط ہو جائے گا۔

امام غزالیؒ کی وضاحت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں قرض لینے کی گنجائش ہونی چاہئے، بالخصوص موجودہ زمانہ میں اور ہمارے ملک میں، جہاں فرقہ پرستی کا عفریت راج کرتا ہے، گنجائش کی یہ بات اس مسئلہ کی روشنی میں بھی کہی جاسکتی ہے، جس میں ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ ۱/ ۱۵۵) کے ذریعہ محتاج کے لئے سودی قرض لینے کی بات کہی گئی ہے، فرض کفایہ کی تعلیم، جبکہ پورا علاقہ خالی ہو، ایک

دینی اور قومی ضرورت ہے، جو ذاتی ضرورت سے کہیں بڑھا ہوا ہے؛ اس لئے اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے تو اس میں گنجائش نہیں ہونی چاہئے کہ یہاں نہ دینی ضرورت ہے اور نہ ہی قومی ضرورت، واللہ أعلم بالصواب!

تیسری صورت (تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ خود حکومت ادا کرے) کا جواب بھی اثبات میں ہے کہ یہ حکومت کی طرف سے ہماری اعانت ہے، جو حکومت پر ضروری ہے؛ اس لئے اس صورت میں حکومت کی اعانت سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

اب رہی چوتھی صورت (تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرے) کی بات، تو اس سلسلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ:

۱- اگر وہ مقصد ایک ''ضرورت'' ہے تو ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' کی روشنی میں اس طرح کے قرض سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

۲- لیکن اگر وہ مقصد ''ضرورت'' نہیں تو اس کے لئے اس طرح کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں''۔

- حکومت کی سبسڈی کے بارے میں مولانا نثار عالم ندوی لکھتے ہیں:

''بعض اسکیموں میں مثلاً تعلیم یا دیگر کسی شعبہ میں حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ یعنی سود عائد ہوتا ہے حکومت اپنی طرف سے ادا کرتی ہے اس کو اصطلاح میں سبسڈی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص مذکورہ بالا اسکیم کے تحت قرض لے اور سود کی رقم حکومت کی طرف سے ادا ہوتی ہے تو اس کو ایسے اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔ اور حکومت کی طرف سے ادا شدہ رقم اعانت سمجھی جائے گی ہولڈر کے حق میں اور بینک کے حق میں سروس چارج مانا جائے گا اور یہ عمل جائز ہوگا اور اس کے دلائل بھی وہی ہوں گے جو سروس چارج کے مسئلہ میں گزر چکے ہیں''۔

-جبکہ دارالافتاء سلفیہ بنارس، مولانا عبداللہ جولم، مولانا عبدالحمید قاسمی، مولانا ابرار خاں ندوی نے اس سوال کے جواب سے خاموشی اختیار کی ہے۔

دلائل:

پانچوں رجحانات کے حامل مقالہ نگاران کے دلائل ترتیب وار اس طرح ہیں:

(نمبر ۱) جن حضرات نے ضرورت اور بہ درجہ مجبوری اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے ان حضرات نے بالعموم مندرجہ ذیل فقہی جزئیہ کو بنیاد بنایا ہے، اکثر حضرات نے سوال نمبر ۳، ۴، ۵، ۶ میں ذکر کئے گئے دلائل کی طرف اشارہ پر اکتفا کیا ہے۔

۱- ''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ مع حموی ۱/ ۷۹)۔

۲- ''الضرورات تبیح المحظورات'' (حوالہ سابق) وغیرہ۔

(نمبر ۲) جن حضرات نے مطلقاً اس اسکیم سے استفادہ کو ممنوع قرار دیا ہے، انہوں نے اسے سودی معاملہ قرار دیا ہے، اور اس کی حرمت پر جو دلائل کتاب وسنت میں مذکور ہیں ان کو بنیاد بنایا ہے، جو ماقبل میں گذر چکے ہیں یہاں تکرار کی حاجت نہیں۔

(نمبر ۳) جن حضرات نے شرح سود کو سروس چارج قرار دیا ہے، انہوں نے مندرجہ ذیل جزئیہ سے استشہاد کیا ہے، مثلاً:

''ولا ربوا بین سیدہ وعبدہ،... ولا ربوا بین متفاوضین وشریکی العنان'' (قولہ: لا ربوا بین السید وعبدہ)، لأنہ ومافی یدہ لمولاہ، فلا یتحقق الربوا لعدم تحقق البیع'' (درمختار مع شامی ۷/ ۴۲۱)، ''إنما یرد الزائد لا للربا، بل لتعلق حق الغرماء'' (شامی مع الرد ۵/ ۱۸۵)۔

۱- عقود ومعاملات میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے

''الأمور بمقاصدها، وفیها بیان أن الشئی الواحد یتصف بالحل والحرمة باعتبار ما قصد له'' (الأشباہ ۱/ ۱۱۳)۔

۲۔ ''وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال فهي حسنة. والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله عزوجل: ''خذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث'' (الفتاوى الهنديه ۶/ ۳۹۰)۔

۳۔ یہ حکومت کی طرف سے اعانت ہے، (مولانا عارف باللہ قاسمی، مفتی ظہیر احمد کانپور، مولانا فیاض عالم قاسمی)۔

۴۔ اکیڈمی کا فیصلہ: اگر سود کے نام سے لی جانے والی رقم جھوٹ کے مساوی یا کم ہوتو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں (اہم فقہی فیصلے/۱۹)۔

۵۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت فیوضہ کا فتوی: ''سود لینا اور دینا دونوں گناہ ہے، البتہ سرکاری اور غیر سرکاری کے حکم میں ایک گونہ فرق ہے، جب ہم اس ملک کے شہری ہیں تو جیسے حکومت دوسرے شہریوں کو روزگار فراہم کرتی ہے ویسے ہی مسلمانوں کو بھی اس طرح کی سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے اور ہمارا بحیثیت ہندی اس پر حق ہے، لہٰذا جو مسلمان واقعی بے روزگار ہوں اور معاشی اعتبار سے اس سطح پر ہوں کہ اپنے پیسوں سے کوئی روزگار شروع نہیں کر سکتے ان کے لئے ایسے قرض حاصل کرنا جائز ہے، اور جو زائد رقم سود کے نام سے لی جاتی ہے اسے انتظامی اخراجات قرار دیا جاسکتا ہے، ورنہ اس کی حیثیت سود یا قرض پر رشوت دینے کی ہوگی، اور مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہے''

(کتاب الفتاوی ۵/ ۳۷۸)۔

۶۔ مفتی نظام الدین سابق مفتی دار العلوم دیوبند کا فتوی: ''اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے، بلکہ انتظامی درستگی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جاسکے گا اور یہ معاملہ جائز رہے گا'' (منتخبات نظام الفتاوی ۲/ ۴۴۴) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد ممتاز خاں ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، دار الافتاء بناس کانٹا گجرات، مفتی محمد عثمان بستوی)۔

۷۔ ''وفي شرح حيل الخصاف شمس الائمة: أن الشيخ أبا القاسم الحكيم كان يأخذ جائزة السلطان، وكان يستقرض لجميع حوائجه، ومايأخذ من الجائزة يقضي بها ديونه، والحيلة هذه المسائل أن يشتري نسيئة ثم ينقد ثمنه من أي مال شاء'' (الهنديه ۵/ ۳۹۲) (مفتی ریاست علی قاسمی)۔

۸۔ ''الأصل عند أبي حنيفة أن الإنسان يجوز أن لا يملك الشئي بنفسه قصدًا ويملكه بتفويضه إلى غيره، ويجوز أن لا يملك الشئي قصدًا، ويملكه حكما'' (تاسیس النظر للدبوسی/ ۵۵)۔

۹۔ ''فلهذا اختص جوازه بماله مثلا، فأشبه البيع'' (بدائع الصنائع ۶/ ۵۱۷)۔

۱۰۔ ''ويجوز التوكيل بالبياعات والأشربة والإجارات والنكاح والطلاق والعتاق والخلع والصلح والإعارة والاستعارة والهبة والصدقة'' (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۵۶۴) (مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

(نمبر ۴) حکومت ادا کرے تو جائز ہے خود ادا کرے تو ناجائز ہے۔

اس موقف کے حاملین نے اس بات کو بنیاد بنایا ہے کہ حکومت اور رعایا کے درمیان جو معاملہ ہے وہ اعانت و امداد کا ہے اور عوام کی ترقی و خوشحالی حکومت کی ذمہ داری ہے خود رسول اللہ ﷺ نے بہت سے محتاجوں کے قرضے بیت المال سے اور اپنے پاس سے بھی ادا کئے ہیں اور نص صریح موجود ہے۔

''تؤخذ من أغنيائهم وترد إلى فقرائهم'' (ابوداؤد) گویا یہ حکومت کی ذمہ داری ہے جسے اس نے اپنی طرف سے سود ادا کر کے پورا کیا ہے۔

(نمبر ۵) خود قرض دار کا سود ادا کرنا بہرحال یہ سودی معاملہ ہے اس کی اجازت حالت مجبوری میں ہی دی جاسکتی ہے ان حضرات نے ربا کے باب میں قلیل وکثیر کی حرمت کو بنیاد بنایا ہے، جس کی تفصیل سوال نمبر ۳، ۴، ۵، اور ۶ میں گذر چکی ہے، وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر (۱۲): بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر دیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے، تو کیا صورت درست ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں حضرات مقالہ نگاران کے تین موقف سامنے آئے ہیں:

پہلا موقف:

پہلا موقف یہ ہے کہ یہ حکومت چونکہ غیر مسلم ہے، ان کے نزدیک سود وربا کا معاملہ جائز وناجائز پر مبنی نہیں ہوتا، اس کے خزانے مشترک ہوتے ہیں جہاں ہر طرح کا مال جمع ہوتا ہے اور سارا نظام ریزرو بینک کے تحت چلتا ہے، اس لئے حکومت اگر محفوظ فنڈ کو بینک میں ڈپازٹ کرتی ہے اور اس سے سود حاصل کرتی ہے اور اس سود سے اپنے عوام جس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں ان کی رفاہی اور تعلیمی مدد کرتی ہے تو حکومت کی اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا اور اس کے تحت ملنے والی رقم کو استعمال کرنا جائز ہے، یہ سود دینے والے کے حق میں تو سود ہے، جن کو دیا جارہا ہے ان کے حق میں سود نہیں ہے، البتہ احتیاط باعث اجر وثواب ہے۔

اس موقف کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مولانا محمد اکرم بن اسلم رشید، مفتی جنید بن محمد فلاحی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محی الدین غازی، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مولانا محمد فیاض عالم قاسمی، مفتی ظہیر احمد قاسمی کانپور، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی حیدر علی قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی محبوب علی وجیہی، قاری ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد ممتاز خاں ندوی، مفتی عبدالمنان قاسمی آسام، مفتی محمد فلاحی، مفتی عبدالتواب اناوی، مفتی محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا مصطفی عبدالقدوس ندوی، مفتی محمد اسعد پالنپوری، مفتی محمد رمضان سعادتی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا ابوالمکارم معروفی، مولانا محمد فاروق در بھنگوی۔

جواز کی علت:

مذکورہ حضرات نے بنیادی طور پر سود کے ذریعہ حاصل کی گئی آمدنی کو حکومت کا اپنا ذاتی معاملہ قرار دیا ہے، جس میں مسلمانوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، اور حکومت اس بات کا مکلف نہیں ہے اور فروعات میں تو مزید یہ حکومت شرعی تکلیف کے دائرے میں نہیں آتی، اس لئے حکومت کی اس تعاونی اسکیم سے فائدہ اٹھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے، مزید مذکورہ حضرات نے مندرجہ ذیل دلائل سے اپنے موقف کو مؤکد کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً:

دلائل:

۱۔ "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (المائدہ: ۲)۔

۲۔ ''عن النبي صلى الله عليه وسلم: والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه'' (ترمذی)۔

۳۔ ''إنما الأعمال بالنيات'' (بخاری)۔

۴۔ ''عن النبي صلى الله عليه وسلم: هو لها صدقة ولنا هدية'' (بخاری ۵/ ۳۰۲، کتاب الزکوۃ حدیث نمبر: ۱۴۹۵)۔

۵۔ ''عن ابن مسعود أنه سئل عمن له جار يأكل الربا علانية، ولا يتحرج من مال خبيث يأخذه يدعوه إلى الطعام، قال: أجيبوه، فإنما الوزر عليه'' (جامع العلوم والحکم لابن رجب/ ۷۱)۔

۶۔ ''ولو أن حربيا باع من حربي درهما بدرهمين ثم خرجا إلى دار الإسلام مسلمين أو ذميين واختصما إلى القاضي فإن كان ذلك بعد التقابض فالقاضي لا يتعرض لذلك ولا يبطله'' (المحیط البرہانی ۸/ ۳۷۷)۔

۷۔ ''وقد أمرنا بتركهم وما يدينون كذا في الهداية، وقال: دل عليه قول عمر ولوهم بيعهما وخذوا العشر من أثمانهما... الخ، وأشار به إلى أن إعراضنا عنهم ليس لكونها مباحة شرعًا في حقهم، كما هو قول البعض، بل الحرمة ثابتة في حقهم في الصحيح، لأنهم مخاطبون بها، كما قلنا، لكنهم لا يمنعون من بيعها؛ لأنهم لا يعتقدون حرمتها ويتمولونها وقد أمرنا بتركهم وما يدينون كما في البحر عن البدائع'' (شامی ۷/ ۳۷۱)

(دیکھئے: ابوالمکارم معروفی)۔

۸۔ ''وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحة بيعه، بخلاف دين على المسلم لبطلانه'' (درمختار مع الرد ۹/ ۵۵۳)۔

۹۔ ''الأمور بمقاصدها'' (الاشباہ والنظائر ۱/ ۱۱۳)۔

۱۰۔ ''أهل الذمة يتركون على ما يدينون به'' (تاسیس النظر لابوزید الدبوسی)۔

۱۱۔ ''الضرورات تبيح المحظورات'' (الاشباہ ۱/ ۱۵۵)۔

۱۲۔ کفار ومشرکین اور غیر مسلم کا ہدیہ قبول کرنا اور غیر مسلم حکومت سے انعام حاصل کرنے کا جواز اکابر کے فتاویٰ میں موجود ہے۔

(دیکھئے فتاویٰ دار العلوم ۵ / ۲۱۴، منتخبات نظام الفتاوی ۱/ ۲۰۹، امداد الاحکام ۴ / ۳۹۰، امداد الفتاوی ۳/ ۱۶۴ وغیرہ)۔

۱۳۔ ''الحالة الأولى: أن يخرجه غيرهما، فيجوز للإمام أن يخرج المال من خاص نفسه ومن بيت المال لما فيه من التحريض على تعليم الفروسة'' (روضة الطالبين ۷/ ۵۳۶)۔

۱۴۔ ''وفي الهداية: فإن عقدهم على الخمر كعقد المسلم على العصير، وعقدهم على الخنزير كعقد المسلم على الشاة، لأنها أموال في اعتقادهم، ونحن أمرنا بأن نتركهم وما يعتقدون دل عليه قول عمر ولّوهم بيعهما وخذوا العشر من أثمانهما'' (۳/ ۸۶)۔

۱۵۔ ''تبدل الملك بمنزلة تبدل العين في الشريعة، كذا في الكافي وعامة الشروح'' (فتح القدیر ۹/ ۲۱۳)۔

۱۶۔ ''الأصل عند أبي حنيفة أن الإنسان يجوز أن لا يملك الشئى بنفسه قصدًا ويملكه بتفويضه إلى غيره، ويجوز أن لا يملك الشئى قصدًا ويملكه حكمًا'' (تاسیس النظر ابوزید دبوسی / ۵۵)۔

۱۷۔ ''إذا دخل المسلم دار الحرب بأمان فلا بأس بأن يأخذ منهم أموالهم بطيب أنفسهم بأي وجه كان'' (شامی ۵/ ۱۸۶)

۱۸۔ ''فيرد على أربابها، إن علموا وإلا تصدق به على الفقراء'' (فتاوی بزازیہ مع الہندیہ ۶/ ۳۵۵)۔

۱۹۔ ''وعن علي رضي الله عنه قال: للسلطان نصيب من الحلال والحرام، فإذا أعطاك شيئا فخذوه، فإن ما يعطيك حلال... الخ'' (السیر الکبیر / ۹۹)۔

۲۰۔ ''النقود لا تتعين بالتعيين'' (از مقالہ محی الدین غازی)۔

دوسرا موقف:

اس سلسلہ میں دوسرا موقف یہ ہے کہ اس اسکیم سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مجبور ومحتاج اور غربت وافلاس کی زندگی گزار رہے ہیں، مستحق ہیں، اور اپنے معاش کے لئے اس کے محتاج ہیں، عام لوگوں کے لئے اس سے استفادہ جائز نہیں ہے، اس موقف کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا محمد زبیر ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی اعجاز الحسن باندے، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد عرفان آسام، مولانا محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی محمد حذیفہ داحودی اور ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی۔

اضطراری حالت سے متعلق دلائل، مثلاً:

۱۔ ''فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه إن الله غفور رحيم'' (سورہ بقرہ: ۱۷۳)۔

۲۔ ''الضرورات تبيح المحظورات'' (الاشباہ ۱/ ۱۵۵)، وغیرہ واضح ہیں، اس لئے یہاں تکرار سے بچتے ہوئے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

تیسرا موقف:

اس سلسلہ میں تیسرا موقف یہ ہے کہ اس اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ سود کے ذریعہ حاصل کی گئی آمدنی اور اسی پر چلنے والی اسکیم ہے، اور مال خبیث ہے، اس رقم کو قبول کرنا گویا حکومت کو سودی نظام کے لئے تقویت فراہم کرنا ہے، جو تعاون علی الاثم ہے، اس موقف کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے: مفتی محمد ارشاد پالنپوری، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عباس بن یوسف، مولانا سراج الحق میواتی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد صابر حسین ندوی، مولانا عبدالحمید قاسمی، مفتی محمد حذیفہ داحودی۔

دلائل:

۱۔ "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲)۔

۲۔ "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً ویرزقہ من حیث لا یحتسب، ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ، إن اللہ بالغ أمرہ، قد جعل اللہ لکل شیء قدرًا" (سورہ طلاق: ۳)۔

۳۔ "واجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور" (سورہ حج: ۱۴)۔

۴۔ ''فمن اتقی من الشبھات فقد استبرأ لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبھات وقع فی الحرام'' (متفق علیہ)۔

۵۔ ''عن جابر بن عبد اللہ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربا ومؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ، وقال: ھم سواء'' (مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۹۸)۔

۶۔ شارع کی صریح محرمات کے دروازے پر دستک دینے سے بچا جائے (کتاب الفتاوی ۵/ ۲۳۳)۔

۷۔ ''التابع تبع'' (الاشباہ للسیوطی/ ۱۵۳)۔

۸۔ ''الأصل بقاء ما کان علی ما کان'' (الاشباہ لابن نجیم)۔

۹۔ ''الربا لا تصح إباحتہ فی الشرع تبعا'' (الموسوعۃ الفقھیہ)۔

۱۰۔ ''لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبہ'' (شامی ۹/ ۵۵۳، کتاب الحظر والاباحہ)۔

۱۱۔ ''درأ المفاسد أولی من جلب المصالح/ المنافع، فإذا تعارضت مفسدۃ ومصلحۃ قدم دفع المفسدۃ غالبًا، لأن اعتناء الشرع بالمنھیات أشد من اعتناءہ بالمامورات'' (الاشباہ ۵/ ۲۶۴)۔

۱۲۔ ''فلیس لہ حیلۃ إلا أن یدفعہ إلی الفقراء'' (بذل المجھود ۱/ ۳۵۹)۔

۱۳۔ ''والحاصل أنہ إن علم أرباب الأموال وجب ردہ علیھم'' (رد المحتار ۷/ ۳۰۱)۔

متفرق آراء:

- مفتی حذیفہ داحودی کہتے ہیں کہ اگر حکومت اپنی دوسری رقوم جو دوسری ریاستوں سے آئی ہیں اس سے اس رقم کو مخلوط کر دیتی ہے اور اس سے رفاہی اور تعلیمی اداروں کی مدد کرتی تو اس سے بھی لوگوں کے لئے استفادہ جائز ہے (دیکھئے موصوف کا مقالہ)۔

- بعض مقالہ نگاران نے اس احتیاطی پہلو کو بھی لکھا ہے کہ اگر چہ اس اسکیم سے استفادہ درست ہے، تاہم احتیاط اولی ہے (دیکھئے مقالہ: مولانا تنظیم عالم قاسمی، مفتی عبدالمنان آسام)۔

- اس سوال کے جواب سے دارالافتاء بناس کانٹا، مولانا ابرار خان ندوی، دارالافتاء سلفیہ بنارس، مولانا عبداللہ جولم نے خاموشی اختیار کی ہے۔

- اس تعلق سے ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی نے اپنی قیمتی اور تفصیلی رائے دی ہے اور اپنے موقف کو مدلل انداز سے پیش کیا ہے، ان کے مقالہ

کا اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''(الف): ضروری ہے کہ تعلیمی اور رفاہی اداروں کو پاک مال سے چلایا جائے، تاکہ پڑھنے والے طلبہ، تعلیم دینے والے اساتذہ اور کام کرنے والے عملہ کے اندر نیکی کی روح بیدار ہو، اور خیر کا جذبہ پروان چڑھے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حلال اور پاکیزہ مال کھانے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

"یا أیها الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم، واشکروا لله إن کنتم إیاه تعبدون" (۲/ البقرہ: ۱۷۲)

(اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ، اور اللہ ہی کے شکر گزار بنو، اگر تم اس کی بندگی کرتے ہو)۔

۲۔ حلال مال سے عمل صالح کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، جبکہ مال حرام سے معصیت کی روح بیدار ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو حلال و پاکیزہ اشیاء استعمال کرنے کا حکم دیا ہے، تاکہ انسانی معاشرہ میں خیر و بھلائی کی فضا قائم ہو، اور معصیت کی سرد بازاری ہو، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

"یا أیها الناس کلوا مما فی الأرض حلالا طیبًا ولا تتبعوا خطوات الشیطان إنه لکم عدو مبین" (۲/ البقرہ: ۱۶۸)

(اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال پاکیزہ ہیں ان کو کھاؤ، اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، یقیناوہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے)۔

۳۔ مسلمانوں کی شان یہ ہونی چاہئے کہ وہ تعلیم و دعوت کے مراکز پاکیزہ مال سے چلائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ و حلال اشیاء کے خرچ کرنے پر ہی اجر وثواب سے نوازتا ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"أیها الناس، إن الله طیب، لا یقبل إلا طیباً، وإن الله أمر المؤمنین بما أمر به المرسلین، فقال: "یا أیها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا إنی بما تعملون علیم" (۲۳/ المؤمنون: ۵۱)، وقال: "یا أیها الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم" (۲/ البقرہ: ۱۷۲)

ثم ذکر الرجل یطیل السفر، أشعث أغبر، یمد یدیه إلی السماء: یا رب یا رب، ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذی بالحرام، فأنی یستجاب لذلك؟''

(صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۰۱۵، سنن ترمذی حدیث نمبر: ۲۹۸۹، سنن دارمی حدیث نمبر: ۲۷۱۷، مسند احمد حدیث نمبر: ۸۳۴۸)

(اے لوگو! بے شک اللہ پاک ہے اور پاکیزہ چیز ہی کو قبول کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو وہی حکم دیا ہے جو رسولوں کو دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: (اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، جو کچھ تم کروگے میں اسے سے اچھی طرح واقف ہوں) اور فرمایا: (اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو پاکیزہ چیزیں دی ہیں ان کو کھاؤ) پھر نبی کریم ﷺ نے ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبے سفر کرتا ہے، پراگندہ بال اور گرد آلود ہوتا ہے، آسمان کی طرف اپنے ہاتھ کو دراز کر کے اے پروردگار، اے پروردگار کی آواز لگاتا ہے، حالانکہ اس کا کھانا حرام اس کا پینا حرام اور اس کی پوشاک حرام ہے، اور اس کی پرورش حرام سے ہوئی ہے، پھر اس شخص کی دعا کیوں کر قبول ہوگی؟)۔

۴۔ جنابہ خولہ انصاریہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''إن رجالا یتخوضون فی مال الله بغیر حق، فلهم النار یوم القیامة''

(صحیح بخاری حدیث نمبر: ۳۱۱۸، ترمذی حدیث نمبر: ۲۳۷۴، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۰۵۴، ۲۷۳۱۸)

(کچھ لوگ اللہ کے مال کو ناحق ہڑپ کرتے ہیں سو قیامت کے دن ان کے لئے آگ ہے)۔

یہ وعید مال عام کو ہڑپنے پر ہے، تو پھر سودی مال کی طرف لپکنے پر کتنی سخت وعید ہوگی؟

۵۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یأتی علی الناس زمان لا یبالی المرء ما أخذ منه: أمن الحلال، أم من الحرام؟'' (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۲۰۵۹، سنن نسائی حدیث نمبر: ۴۴۵۴، سنن دارمی حدیث نمبر: ۲۵۳۹)

(لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو اس کی پروا نہ ہوگی کہ اس نے حلال مال سے لیا یا حرام مال سے)۔

ان نصوص سے واضح ہے کہ تعلیمی ورفاہی ادارے اور محتاج افراد واشخاص کے تعاون کے لئے سودی فنڈ قائم کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر غیر مسلم حکومت ایسا کرتی ہے تو ایسی حالت میں اگر تعلیمی ورفاہی ادارے ضرورت مند ہیں تو بیت الخلاء (Toilet)، راستے کی تعمیر اور دیگر عمومی مصالح کے کاموں کے لئے سودی مال لے سکتے ہیں۔

(ب): یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ سودی اسکیم کا تعلق افراد واشخاص سے ہو کہ اگر وہ فقراء اور مساکین میں سے ہوں تو ان کے لئے سودی امداد سے استفادہ کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ جس مال کو اس کے مالک کو نہیں لوٹایا جاسکتا ہو، اسے بھلائی کی مدات میں صرف کیا جائے گا، اور ان مدات میں فقراء اور مساکین بھی داخل ہیں، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک انصاری صحابی کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازہ میں نکلے، سو میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر کے پاس کھودنے والے کو وصیت کرتے ہوئے پایا: ''اس کے دونوں پیر کی طرف کشادہ کھودو، اس کے سر کی طرف کشادہ کھودو'' پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ سے لوٹے، تو ایک خاتون کی طرف سے دعوت دینے والا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا:

''فجاء وجيء بالطعام، فوضع يده، ثم وضع القوم فأكلوا، فنظر آباؤنا رسول الله ﷺ يلوك لقمة في فمه، ثم قال: أجد لحم شاة أخذت بغير إذن أهلها، فأرسلت المرأة، قالت: يا رسول الله، إني أرسلت إلى البقيع يشتري لي شاة، فلم أجد، فأرسلت إلى جارك قد اشترى شاة أن أرسل إلي بها بثمنها، فلم يوجد، فأرسلت إلى امرأته، فأرسلت إليّ بها، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ''أطعميه الأسارى'' (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۳۳۳۲، طحاوی، شرح مشکل الآثار حدیث نمبر: ۳۰۰۵، ۳۰۰۶، دار قطنی، حدیث نمبر: ۴۸۲۶، مسند احمد حدیث نمبر: ۲۲۵۰۹، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)

(تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس خاتون کے گھر تشریف لائے، اور کھانا لایا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ رکھا، پھر لوگوں نے اپنے ہاتھ رکھے، اور کھانے لگے، سو ہمارے آباء واجداد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دہن مبارک میں لقمہ کو ہلکے ہلکے چباتے ہوئے دیکھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس بکری کا گوشت پارہا ہوں جسے مالک کی اجازت کے بغیر حاصل کیا گیا''، اس پر عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قاصد بھیجا اور معاملہ کو واضح کرتے ہوئے کہا، اے اللہ کے رسول، میں نے بقیع کی طرف قاصد کو بھیجا کہ وہ میرے لئے کوئی بکری خرید لائے، سو میں نے بکری کو نہیں پایا، تب میں نے اپنے اس ہمسایہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا جس نے بکری خریدی تھی کہ اس کی خرید کردہ قیمت کے بدلہ اسے میرے پاس بھیج دو، لیکن پڑوسی مل نہ سکا، سو میں نے اس کی بیوی کو پیغام بھیجا، اور اس نے میرے پاس بکری بھیج دی، تب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے قیدیوں کو کھلا دو'')۔

اس حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پکی ہوئی بکری کو صدقہ کرنے کا حکم دیا؛ اس لئے کہ وہ مالک کی اجازت کے بغیر لی گئی تھی، اور اس کی خریداری درست نہیں تھی، جیسا کہ ملا علی قاری رقمطراز ہیں:

''فظهر أن شراءها غير صحيح؛ لأن إذن جارها ورضاه غير صحيح.... وذلك أنه لما لم يوجد صاحب الشاة ليستحلوا منه، وكان الطعام في صدد الفساد، ولم يكن به من إطعام هؤلاء، فأمر بإطعامهم....وقد لزمها قيمة الشاة بإتلافها، ووقع هذا تصدقا عنها'' (علی القاری، مرقاۃ المفاتیح ۱۰/ ۲۹۷)

(سو اس سے عیاں ہے کہ اس کی خریداری درست نہیں تھی، اور قیدیوں کو (جو عام طور سے محتاج ہوتے ہیں) کھلانے کا حکم اس وجہ سے دیا کہ بکری کا مالک جب نہیں ملا تا کہ اس سے حلال ٹھہرالیں، حالانکہ کھانا خراب ہونے کے درپے تھا، اور قیدیوں کے کھلانے کے علاوہ چارہ نہیں تھا، لہٰذا ان کو کھلانے کا حکم دیا....اور بکری کو ضائع کرنے کی وجہ سے اس پر قیمت لازم ہوئی، اور کھانا اس کی طرف سے صدقہ ہوا)۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے اگر اصل مالک تک مال نہ پہنچ سکے تو محتاج افراد پر صدقہ کیا جائے گا۔

۲۔ امام قرطبی (و: ۶۷۱ھ) لکھتے ہیں:

''قال علماؤنا: إن سبيل التوبة مما بيده من الأموال الحرام، إن كانت من ربا فليردها على من أربى عليه، ويطلبه إن لم يكن حاضرًا، فإن أيس من وجوده، فليتصدق بذلك عنه، وإن أخذه بظلم، فليفعله كذلك في

أمر من ظلمه، فإن التبس عليه الأمر، ولم يدركم الحرام من الحلال مما بيده، فإنه يتحرى قدر ما بيده مما يجب عليه رده، حتى لا يشك أن ما يبقى قد خلص له'' (قرطبی، الجامع لأحکام القرآن ۳/۳۶۶)

(ہمارے مالکی علماء فرماتے ہیں کہ مال حرام سے توبہ کی راہ یہ ہے کہ اگر سود سے حاصل ہو، توجس سے سود لیا ہے اسے واپس کردے، اور اگر وہ موجود نہ ہو تو اسے تلاش کرے، سو اگر اس کو پانے سے ناامید ہوجائے، تو اس کی طرف سے اسے صدقہ کردے۔ اور اگر بہ طور ظلم اسے لیا ہو، تو جس پر ظلم کیا ہو اس کے معاملہ میں ایسا ہی کرے، سو اگر اس پر معاملہ مشتبہ ہوجائے، اور اسے معلوم نہ ہو کہ اس کے قبضہ میں جو مال ہے، اس میں کتنا حرام ہے اور کتنا حلال ہے، تو اپنے قبضہ کے مال میں سے جس مقدار کی واپسی اس پر واجب ہے اس کے سلسلہ میں تحری، یعنی بہتر مقدار کو اختیار کرے، یہاں تک کہ اسے کوئی شک نہ رہ جائے کہ باقی ماندہ اس کا خالص مال ہے)۔

۳۔　علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''المال إذا تعذر معرفة مالكه صرف في مصالح المسلمين عند جماهير العلماء كمالك وأحمد وغيرهما، فإذا كان بيد الإنسان غصوب أو عوار أو ودائع أو رهون، قد يئس من معرفة أصحابها فإنه يتصدق بها عنهم، أو يصرفها في مصالح المسلمين، أو يسلمها إلى قاسم عادل يصرفها في مصالح المسلمين المصالح الشرعية'' (ابن تيمیه، مجموع الفتاوى ۲۹/ ۳۲۱، ط:۲، دار الوفاء، ۱۴۲۶ھ-۲۰۰۵ء)

(مال کے مالک کو پانا اگر دشوار ہوجائے تو جمہور اہل علم جیسے مالک واحمد وغیرھما کے نزدیک اسے مسلمانوں کے مصالح میں صرف کیا جائے گا، سو اگر آدمی کے قبضہ میں غصب کردہ مال یا عاریتاً اور عارضی طور پر لی ہوئی چیز ہو یا امانت کے مال ہوں یا رہن ہوں، اور مالک کو پانے سے ناامید ہوجائے، تو وہ اسے ان کی طرف سے صدقہ کردے، یا مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کرے، یا منصف تقسیم کرنے والے کے حوالہ کردے جو اسے مسلمانوں کے شرعی مصالح میں صرف کرے)۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ فقراء اور مساکین مال حرام کی مدات میں سے ایک مد ہیں۔

۴۔　ابن قیم الجوزیہ (و:۷۵۱ھ) فرماتے ہیں:

''أن من قبض ما ليس له قبضه شرعًا، ثم أراد التخلص منه؛ فإن كان المقبوض قد أخذ بغير رضى صاحبه، ولا استوفى عوضه، رده عليه، فإن تعذر رده عليه، قضى به دينا يعلمه عليه، فإن تعذر ذلك، تصدق به عنه، فإن اختار صاحب الحق ثوابه يوم القيامة، كان له، وإن أبى إلا أن يأخذ من حسنات القابض، استوفى منه نظير ماله، وكان ثواب الصدقة للمتصدق بها، كما ثبتت عن الصحابة'' (ابن القیم، زاد المعاد ۵/۶۸۷، ط: ۲۷، بیروت، مؤسسة الرسالہ ۱۴۱۵ھ-۱۹۹۴ء)

(جو شخص ایسی چیز پر قبضہ کرلے جس پر شرعی اعتبار سے اس کا قبضہ کرنا درست نہیں ہے، پھر اس سے نجات حاصل کرنا چاہے، سو اگر قبضہ کردہ مال مالک کی رضامندی کے بغیر لیا گیا ہو، اور مالک نے اس کا عوض حاصل نہ کیا ہو، تو وہ اس کو مالک کو واپس کردے، سو اگر مالک کو واپس کرنا دشوار ہو، تو اس کے اس دَین کو ادا کردے جسے وہ جانتا ہو، سو اگر یہ بھی دشوار ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کردے، اب اگر مالک بہ روز قیامت اس کے ثواب کو اختیار کرے، تو اسے ایسا کرنے کا حق ہوگا، اور اگر انکار کردے اور قبضہ کرنے والے کی نیکی سے لینا چاہے، تو مال کے مثل اس سے نیکی وصول کرے، اور صدقہ کا ثواب صدقہ کرنے والے کو مل جائے گا، جیسا کہ صحابہؓ سے ثابت ہے)۔

ان فقہی نقول واقتباسات سے پوری طرح واضح ہے کہ فقراء اور مساکین مال حرام کے مصارف میں سے ایک مصرف ہیں، اور یہ کہ مال حرام غصب کرنے یا رشوت لینے یا سود حاصل کرنے والے کے حق میں خبیث اور گندہ ہے، جبکہ فقیر کے حق میں وہ حلال اور پاکیزہ مال کے درجہ میں ہے''۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

مختلف سرکاری اسکیموں سے استفادہ کرنے کا حکم

(سوال نمبر ۱-۵)

مولانا رحمت اللہ ندوی[1]

ضرورت مند کا تعاون کرنا خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، رفاہی اداروں کی شکل میں ہو یا حکومتی سطح پر، بہر صورت ایک مستحسن کام اور پسندیدہ عمل ہے، متعدد آیات اور مختلف احادیث میں جائز کاموں میں ضرورت مند افراد کے تعاون کی نہ صرف ترغیب دی گئی ہے، بلکہ تاکید کی گئی ہے۔

تعاون کی ایک شکل قرض دینا بھی ہے، اور تنگدست سے قرض کو کلی یا جزوی طور پر معاف کر دینا یا مزید مہلت دینا بھی نیکی کا کام اور فضیلت کی چیز ہے، قرض دینے والے کو اختیار ہے کہ پورا قرض یا اس کا کچھ حصہ معاف کر دے، اس کو شریعت میں "ابراء دین" کہتے ہیں، جو موجب اجر اور قابل قدر ہے، لیکن قرض کی ادائیگی پر قدرت کے باوجود تاخیر کرنا یا ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ قرض دینے سے گریز کرتے ہیں، قرض کا لفظ عام ہے، اس کے بالمقابل دَین خاص ہے، نقد یا جنس کی شکل میں جو چیز قابل واپسی ہو وہ قرض ہے اور ذمہ میں واجب اور ہر طرح کا بقایا دین ہے۔

سرکاری خزانہ میں سب کا حق ہے، سرکار اس خزانہ سے استفادہ کرنے کے لئے اسکیمیں بناتی اور مختلف شکلیں پیدا کرتی ہے، بعض اسکیمیں مخصوص ہوتی ہیں اور بعض عام۔ اسی طرح بعض اسکیموں میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہوتی اور بعض میں ہوتی ہے، حکومت کی طرف سے ملنے والی رقوم امداد اور قرض دونوں طرح کی ہوتی ہیں، قرض کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے، کہ اس کا کچھ حصہ معاف ہو جاتا ہے، جبکہ بعض قرضے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں اصل لی ہوئی رقم سے زائد کی واپسی ہوتی ہے، یہ زائد رقم کبھی معمولی ہوتی ہے اور کبھی اوسط سے زائد۔ اگر زائد رقم کی مقدار قرض کے وقت متعین ہو اور اس کا تعلق رقم کی کمی زیادتی اور وقت پر ادائیگی یا عدم ادائیگی سے نہ ہو اور اخراجات کے بقدر ہو تو اسے سروس چارج یا انتظامی خرچ کہنے کی گنجائش ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سود ہے، سود کی حرمت قطعی اور منصوص ہے، لیکن اگر سودی قرضے کی حرمت کی بنا پر ہر مسلمان کے لئے استفادہ حرام کر دیا جائے یا سود کو سروس چارج وغیرہ کا نام دے کر حلال کر دیا جائے تو یہ دونوں طریقے ہی قرآن کی تعلیم اور حکم سے میل نہیں کھاتے، اس کے بجائے اگر سودی قرض کی حرمت باقی رکھتے ہوئے صرف ضرورت مندوں کے لئے بقدر ضرورت رخصت دی جائے یا گنجائش اور وسعت رکھی جائے تو یہ طریقہ نہ صرف مناسب، بلکہ قرآنی طریقہ سے ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ قرآن نے جہاں حرام کو پوری شدت سے بیان کیا ہے وہیں اضطراری حالت میں قید و شرط کے ساتھ رخصت کا ذکر بھی کیا ہے، واضح رہے کہ سود لینے میں کوئی اضطراری حالت نہیں ہو سکتی، اس لئے قرآن مجید کی شدید وعیدوں کے مخاطب اصلاً سود لینے والے ہی ہیں، البتہ سود دینے میں اضطراری حالت ہو سکتی ہے، اس لئے اس میں نرمی کا رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور حد میں رہ کر گنجائش بھی نکالی جا سکتی ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۲۶/ ویں فقہی سمینار منعقدہ "اجین" (ایم-پی) کے زیر بحث موضوعات میں ایک موضوع "مختلف سرکاری اسکیموں سے استفادہ کرنے کا حکم" بھی ہے، اس کے ابتدائی پانچ سوالوں پر عرض مسئلہ پیش کرنے کی ذمہ داری اس ناچیز پر ڈالی گئی ہے، اکیڈمی کی طرف سے اس موضوع پر کل ۵۰/ مختصر اور طویل تحریریں اور مقالات موصول ہوئے ہیں، مقالہ نگار حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا فیاض عالم قاسمی، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی حیدر علی قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد عرفان آسام، مولانا محمد اکرم بن مولانا اسلم رشید، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مولانا حذیفہ داحودی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی اعجاز الحسن باندے قاسمی، ڈاکٹر عبداللہ جولم عمری، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد فلاحی، مفتی محمد فاروق دربھنگوی، مولانا عباس

[1]

بن یوسف، مفتی محمد حسین فلاحی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی محمد اسعد پالنپوری، مفتی محمد زبیر ندوی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی، مفتی محمد جعفرملی رحمانی، مولانا نثار عالم ندوی، مفتی محمد قمر الزماں ندوی، مفتی محمد ارشاد پالنپوری، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی محمد رمضان سعادتی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی جمیل احمد نذیری، ڈاکٹر محی الدین غازی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا ابوالکلام معروفی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی عبدالمنان آسام، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مفتی عبدالتواب اناوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، راقم اسطور رحمت اللہ ندوی، ایک فتوی از دار الافتاء جامعہ سلفیہ بنارس، اور ایک تحریر از مدرسہ جامعہ عربیہ سلم العلوم، گجرات۔

ہر سوال سے متعلق آراء پیش خدمت ہیں:

سوال (۱) جس قرض کا ایک حصہ معاف کردیا جائے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑے، اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ قرض کی یہ صورت جائز اور درست ہے، کیونکہ قرض دینے والے کو قرض کا پورا یا کچھ حصہ معاف کرنے کا اختیار ہے، شریعت کی اصطلاح میں اسے ''ابراء'' کہا جاتا ہے، حکومت کی طرف سے ملنے والی یہ سہولت سبسڈی اور تعاون ہے، البتہ مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی محمد زبیر ندوی، اور مولانا صابر حسین ندوی کا مشورہ ہے کہ بلا ضرورت استفادہ کرنے سے احتیاط برتی جائے۔

سوال (۲) اگر معافی ایک مقررہ مدت کے اندر واپسی کے ساتھ مشروط ہو، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہو، لیکن لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں دو طرح کے نقطہائے نظر سامنے آئے:

(۱) مطلق جواز (۲) جواز میں ذرا تفصیل:

☆ مفتی حیدر علی قاسمی، مفتی محمد ممتاز خان ندوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ابرار خان ندوی، ڈاکٹر محی الدین غازی، مفتی محمد رمضان سعادتی، کے نزدیک جواز میں ذرا تفصیل ہے:

☆ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کہتے ہیں: اگر ایک مخصوص مدت میں ادا کرنے پر قرض کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہو، اور اس مدت کے گزرنے کے بعد مکمل قرض کی واپسی ضروری ہو، بعد میں زائد رقم کا لزوم نہ ہوتا ہو تو اگر معاملہ مشروط نہیں ہے تو درست ہے، اور اگر مشروط ہے تو قرض لے لیا جائے، مگر ادائیگی وقت مقررہ کے بعد کی جائے، تاکہ سود لازم نہ آئے۔

☆ مولانا ابرار خاں ندوی مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں: اگرچہ حکومت کی جانب سے قرض کی معافی متعینہ مدت سے پہلے ادا کرنے پر مشروط ہے، مگر اس میں کسی طرح کا ربا (سود) نہیں پایا جارہا ہے، اس لئے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے، یہی حنابلہ اور شوافع کا بھی راجح مذہب ہے،

''ویری ابن عباس وزفر جواز ذلك، لماروا ه ابن عباس رضي الله عنهما أن النبي عليه السلام أمر باخراج بني النضير، جاء ه ناس منهم، فقالوا: يانبي الله! انك أمرت باخراجنا. ولنا على الناس ديون لم تحل. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ضعوا وتعجلوا (فقه السنة ۳/ ۱۶۷)۔

☆ ڈاکٹر محی الدین غازی کا کہنا ہے: یہ معاہدۂ قرض درست نہیں ہوگا، کیونکہ ''ضع وتعجل'' کے تحت آئے گا، جس سے جمہور فقہاء سے ممانعت منقول ہے، لیکن بہر حال اس کے جواز کی گنجائش بھی موجود ہے، اس لئے نرم رویہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

☆ مفتی محمد رمضان سعادتی نے ''ضع وتعجل'' (دائن، مدیون سے کہے: قرضے میں کمی کر اور جلدی ادا کر، یا مدیون، دائن سے کہے کہ قرضے میں کمی کر اور جلد وصول کر، پر گفتگو کرتے ہوئے ائمۂ اربعہ اور اکثر فقہاء کے نزدیک قبل از وقت ادائیگی کے لئے کمی کو شرط قرار دینے پر عدم جواز کا قول نقل کیا ہے اور

وجہ یہ ہے کہ جب دین میں تاخیر کی صورت میں زیادتی سود ہے تو دین میں تعجیل کی صورت میں دین کے اندر کمی کرنا بھی سود ہے، پھر دلائل سے مدلل کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں: کہ مسئلہ کی حرمت کی بنیاد اجل کا عوض ہے اور اجل کے مقابلہ میں ثمن کی کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، دیون مؤجلہ میں ''ضع وتعجل'' کا معاملہ حرام ہے، اور دیون حالہ اور قرض میں معاملہ جائز ہے، کیونکہ احناف کے نزدیک قرض، تاجیل قبول نہیں کرتا، لہٰذا قرض کی یہ صورت جائز ہے۔

☆ مولانا صابر حسین ندوی لکھتے ہیں: یہ صورت قمار (جوا) کی ہے جو حرام ہے، مگر یہاں یہ مفضی الی النزاع نہیں ہے، اور غرر یسیر ہے، اس لئے درست ہے۔

☆ مفتی محمد ممتاز خاں ندوی کے نزدیک اگر یہ معافی تبرعاً ہے، یعنی مقروض اور سرکاری اسکیم میں وقت سے پہلے قرض کی ادائیگی میں معافی پر مصالحت نہ ہو تو جائز ہے، اور اگر معافی پر مصالحت ہوجائے تو جائز نہیں۔

☆ مفتی حیدر علی قاسمی کی رائے ہے کہ اگرچہ قرض کی مدت لازم ہونے اور نہ ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے، تاہم مدت متعین ہونے کی صورت میں تمام فقہاء کے نزدیک ایفاء عہد واجب ہے، لیکن اگر کوئی شخص کسی وجہ سے مقررہ مدت کے اندر قرضہ ادا نہیں کر پا رہا ہے تو چونکہ سود نہیں پایا جارہا ہے، اس لئے کوئی قباحت نہیں۔

ان کے علاوہ بقیہ حضرات مطلق جواز کے قائل ہیں، کیونکہ کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مسئلہ بھی تقریباً متفق علیہ ہے، کیونکہ مذکورہ بالا حضرات کی رائے بھی کسی نہ کسی طرح جواز تک پہونچ ہی جاتی ہے۔

سوال (۳) اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کیساتھ زائد بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہے؟

اس کے جواب میں تین قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں:

(۱) زائد رقم سود، قرض سے استفادہ ناجائز۔ (۲) بصورت مشروط زائد رقم سود، ورنہ نہیں۔

(۳) زائد رقم سود، لیکن مجبور اور محتاج کے لئے استفادہ کی گنجائش۔

پہلی رائے کے حاملین: مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا حفظ الرحمن مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی بہرائچی، مفتی محمد اسعد پالنپوری، مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی محمد حسین فلاحی (ان کے نزدیک عقد قرض بھی فاسد ہے) مولانا عباس یوسف، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی اعجاز الحسن باندے، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مولانا محمد عرفان، ڈاکٹر ظفر الاسلام، مفتی محمد ممتاز ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی محمد رمضان سعادتی۔

دلائل: ان حضرات کے دلائل سود کی حرمت سے متعلق آیات واحادیث، فقہی عبارات اور اقوال ہیں مثلاً:

(۱) أحل الله البيع وحرم الربا (بقرۃ: ۲۷۵) (مولانا محمد عرفان، مفتی محمد جعفر، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

(۲) يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربا أضعافا مضاعفة (سورہ آل عمران: ۱۳۰) (مولانا خورشید احمد، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

(۳) كل قرض جر نفعا فهو ربا (حدیث) (مولانا خورشید احمد، مفتی اعجاز الحسن باندے، مولانا خورشید انور)۔

(۴) حقیقت ربا اور شبہ ربا سے احتراز والی روایات:

(۱) ''قال عمر: إن آخر ما نزل من القرآن آية الربا، وإن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها، فدعوا الربا والريبة'' (ابن ماجہ ۲۲۷۶ مسند احمد ۲۲۵ مصنف ابن شیبہ ۴/ ۴۴۸ کنز العمال ۴/ ۱۸۶)۔

(۲) کتب فقہ کی وہ عبارات جو شبہ ربا سے احتراز کو لازم قرار دیتی ہیں:

مثلاً: ''وشبهة الربا مانعة، كحقيقة الربا'' (فتح القدیر ۷/ ۱۲۶/ ۳۶۷)۔

''والاحتراز عن شبهة الربا واجب كا لإحتراز عن حقيقة الربا. لأن الشبهة في باب الحرمات ملحقة بالحقيقة (تبين الحقائق / ۸۴)

یہ دلائل مولانا محمد اکرم کے ہیں، نیز انہوں نے بیان القرآن ۱/ ۱۵۷ تفسیر منیر ۳/ ۸۴-فقہی مقالات ۱/ ۳۰۷ سے اقوال وعبارات بھی پیش کئے ہیں۔

''كان ربا الجاهلية في الديون أن يكون للرجل على الرجل. الدين، فإذا حلّ، قال له:أتقضي أم تربي. فإن قضاه أخذه وإلا زاده في الحق وزاده في الأجل'' (المدونة الكبرى ۵/ ۱۸)

مولانا ممتاز ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، نیز مجلہ بیع بالتقسیط ۳۱، اور اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ کے فقہی فیصلے/ ۳۲۷ کا حوالہ بھی ڈاکٹر صاحب نے دیا ہے۔

''كل قرض جر نفعا للمقرض إذا كان مشروطًا فهو حرام، للحديث الشريف''كل قرض جر نفعًا فهو حرام'' (الفقه الحنفي ۴/ ۲۲۰) (مفتی اسعد)۔

''والثاني: أنه معلوم أن ربا الجاهلية إنما كان قرضًا مؤجلا بزيادة مشروطة. فكانت الزيادة بدلًا من الأجل بأبطله الله وحرمه'' (احكام القرآن للجصاص ۱/ ۴۶۷ مفتی جنید)۔

''إذا حل الدين وطالبوا المديون برأس المال. فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل. فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به'' (تفسير رازی ۷/ ۴) (ڈاکٹر شاہجہاں ندوی) انھوں نے مزید دلائل بھی پیش کئے ہیں۔

دوسری رائے: اگر زائد رقم شرط کے ساتھ ہو تو سود، ورنہ نہیں، بلکہ مستحسن اور پسندیدہ کام ہے۔

اس رائے کے حامل مولانا ابوسفیان مفتاحی نے مسلم شریف کی وہ روایات پیش کی ہیں جن میں ''إن خيار الناس أحسنهم قضاءً'' کہا گیا ہے (تکملۃ فتح الملہم ۱/ ۶۴۴)۔

حضرت جابرؓ کی روایت: ''كان لي عليه دين فقضاني وزادني'' (بخاری: ۳۳۹۴)

حافظ ابن حجرؒ ایک حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: ''وفيه جواز وفاء ما هو أفضل من المثل. المقترض، إذا لم تقع شرطية ذلك في العقد. فيحرم ذلك اتفاقًا، وبه قال الجمهور'' (فتح الباری ۵/ ۵۷ منقول از فتوی جامعہ سلفیہ بنارس)۔

تیسری رائے: بوجہ مجبوری اور بحالت محتاجی اس قرض سے استفادہ کرنے کی گنجائش ہے، یہ مذکورہ حضرات کے علاوہ کی رائے ہے، البتہ مولانا عبد الحمید قاسمی، مولانا محمد فاروق، مفتی محمد ارشاد پالنپوری کا کہنا ہے کہ اگر وقت مقررہ پر ادا کر کے سود سے بچنے کا یقین یا ظن غالب ہو تو لے سکتا ہے، ورنہ نہیں، اور مفتی عبد المنان کا کہنا ہے کہ زائد رقم سود ہے، قرض لے سکتا ہے، لیکن مدت کے اندر واپس کردے تاکہ سود دینے سے بچ سکے۔

- قاضی عبد الجلیل قاسمی اور مفتی شاھد علی قاسمی کی رائے ہے کہ ضرورت ومجبوری کی وجہ سے قرض لے سکتا ہے، اگر کوشش کے باوجود معقول عذر کی وجہ سے ادا نہ کر سکا تو اضافی رقم دینے کی گنجائش ہے اور اللہ کی ذات سے امید ہے کہ معاف کردے گا۔
- مولانا محمد فیاض عالم کے نزدیک وقت کی تعیین کے ساتھ قرضہ لینا جائز، وقت مقررہ پر ادا نہ کرنے کی صورت میں زائد رقم تاوان اور چارج ہے، مولانا محمد حذیفہ داحودی، نفس قرض کا معاملہ درست، زیادتی کی شرط کو لغو قرار دیتے ہیں، زیادتی سود ہے، وقت مقررہ پر ادا کرنے کی نیت سے لے اور وقت پر ادا کردے تو گنہگار نہیں ہوگا، ورنہ سود دینے کا گناہ ہوگا۔

نوٹ: ......ڈاکٹر عبد اللہ جولم عمری نے اس سوال کا جواب نہیں دیا ہے۔

ناچیز کے نزدیک قرض کی یہ صورت درست ہے، کیونکہ زائد کا دینا اور نہ دینا موہوم ہے، اس لئے جب تک زائد رقم دینے کی نوبت نہ آئے اس وقت تک اس پر سود کی تعریف صادق نہ آئے گی، اور یہاں تو وقت مقررہ پر ادا کر کے بچنا بھی ممکن ہے، پھر حکومت کے سودی قرضوں اور عام قرضوں میں فرق بھی ہے، حکومت کی آمدنی کے ذرائع مختلف ہیں اور اس کی ترقیاتی اور اسکیمی قرضے، عام ضرورتوں کے تحت لئے جانے والے عام قرضوں سے مختلف ہیں، حکومت کا مقصود زراندوزی نہیں ہے۔ بلکہ اس شرط کا مقصد وقت پر ادائیگی کا پابند بنانا ہے، اس کے باوجود اگر سود مان بھی لیا جائے تو اختیاری اور اضطراری

حالت میں فرق ہے۔

سوال (۴): اگر زائد رقم کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو یا اپنی مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود ہوگا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں بنیادی طور پر تین رائے سامنے آئی:

(۱) زائد رقم سود ہے۔ (۲) مناسب مقدار ہو تو مطلق گنجائش ہے۔ (۳) گنجائش مشروط ہے۔

پہلی رائے: زائد رقم سود ہے، سروس چارج نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس رائے کے حاملین یہ حضرات ہیں:

مفتی حیدر علی قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد عرفان آسام، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی بہرائچی، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی محمد ارشاد پالنپوری، مولانا خورشید احمد اعظمی، اور مولانا خورشید انور اعظمی۔

ان حضرات کے مستدلات کم وبیش وہی ہیں جو سود سے متعلق سوال (۳) کے ذیل میں ذکر کئے جاچکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

دوسری رائے: اگر سروس چارج کے بقدر ہو تو سود کے زمرے میں داخل نہیں ہوگا۔

اس کے قائلین ہیں: قاضی عبدالجلیل قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد قمر الزماں ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا حذیفہ داحودی، مفتی محمد جعفر ملی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا ابوالمکارم معروفی، مولانا صابر حسین ندوی۔

دلائل:

۱۔ ''لاضرر ولاضرار۔ إذا ضاق الأمر اتسع۔ الضرر يزال۔ الضرر يدفع بقدر الإمكان'' (مولانا صابر حسین ندوی)۔

۲۔ ''يستحق القاضي على كتب الوثائق والمحاضر والسجلات قدر ما يجوز بغيره كالمفتي، فإنه يستحق أجر المثل على كتابة الفتوى، لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان. ومع هذا، الكف أولى احترازًا عن القيل والقال، وصيانة لماء الوجه عن الابتذال'' (درمختار ۵/ ۶۳، نیز منتخبات نظام الفتاوی ۲/ ۴۳۶) (مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا ابوالمکارم معروفی)۔

۳۔ ترقیاتی قرضوں میں اصل مقصود نفع کمانا نہیں ہوتا ہے، بلکہ عوام کے لئے بنیادی ضروریات اور روزگار کی فراہمی مقصود ہوتی ہے، اس لئے اگر اس پر لئے جانے والے قرضے کو دفتری اخراجات اور ضروریات پر محمول کیا جائے تو مناسب محسوس ہوتا ہے (جدید فقہی مسائل ۴/ ۸۹، اسلامک فقہ اکیڈمی کا ایک فیصلہ ص ۱۷۰/ مولانا حذیفہ داحودی/ مفتی محمد قمر الزماں ندوی، نیز مباحث فقہیہ ۴۲۲)۔

۴۔ ''اعلم أن الإجارة عقد على المنفعة بعوض هو مال'' (مبسوط السرخسی ۱۵/ ۸۶) (مفتی محمد جعفر ملی)۔

۵۔ حضرت عمرؓ کا بنی تغلب کے جزیہ کے بارے میں ارشاد: ''هذه جزيتكم فسموها جزية أو صدقة'' (تکملة عمدة الرعاية ۱/ ۲۲۸)۔

۶۔ ''العبرة للمعاني'' (شامی: ۹، نیز احسن الفتاوی ۷/ ۱۴۴، فقہی مقالات ۱/ ۷۰/ ۲/ ۷۷/ ۲۷۷) (مولانا ابوالمکارم معروفی، مفتی شاہد علی قاسمی)۔

تیسری رائے: بقیہ حضرات نے کچھ قیود وشرط کے ساتھ سروس چارج قرار دیا ہے، وہ اس طرح ہے:

☆ زائد رقم کی مقدار کا پہلے سے علم ہو۔ (مفتی محمد اسعد فلاحی) ☆ ہر قرض دار کے ساتھ زائد رقم یکساں ہو (رحمت اللہ ندوی)

☆ حکومت کا مقصد زر کشی وزراندوزی نہ ہو۔ (مفتی جنید فلاحی)

☆ انتظامی خرچ بھی قرار دیا جاسکتا ہے یا پھر مجبوری کے درجے میں رشوت کی حیثیت بھی دی جاسکتی ہے۔ (مفتی محمد عثمان، مولانا محمد فلاحی)

☆ حکومت زائد رقم کہہ کر لیتی ہو۔ (مولانا فیاض عالم قاسمی) ☆ دستاویزات پر سروس چارج کی صراحت ہو (مولانا محمد زبیر ندوی)

☆ زائد رقم انتظامی خرچ کے بقدر ہو، متعین ہو، رقم کا سقراور زمانے سے کوئی تعلق نہ ہو (ڈاکٹر محی الدین غازی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی ممتاز خاں ندوی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مفتی محمد رمضان سعادتی، مولانا محمد اکرم۔

☆ زائد رقم قرض کا معاملہ کرتے وقت لیا جائے، واپسی کے وقت نہیں، اسی طرح عرف میں وہ سروس چارج سمجھا بھی جاتا ہو (مولانا جمیل اختر جلیلی ندوی)

مطلق گنجائش یا مطلق سود قرار دینے کے مقابلہ میں مشروط گنجائش والی رائے مناسب معلوم ہوتی ہے۔

سوال (۵) اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ واضح ہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ یہ سود ہے، ناجائز ہے، البتہ بعض حضرات نے اس کے باوجود بھی اضطراری حالت میں بقدر ضرورت، مجبور و بے بس کے لئے لینے کی گنجائش رکھی ہے، جس کے پاس زندگی کی بنیادی ضروریات بھی نہ ہوں، جبکہ دیگر حضرات کسی بھی صورت اور حالت میں کوئی گنجائش نہیں دیتے۔

عدم گنجائش کے قائلین یہ حضرات ہیں:

حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا جمیل اختر ندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد اسعد، مفتی جنید محمد، ڈاکٹر شاہجہاں ندوی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا عبدالحمید قاسمی، مفتی عبدالمنان، اور دارالافتاء جامعہ سلفیہ بنارس۔

ان کے دلائل سود کی حرمت، وعید اور تشدید سے متعلق نصوص اور عبارات و اقوال ہیں جو گزر چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

ان کے علاوہ بقیہ حضرات کے نزدیک اضطراری حالت میں مضطر کے لئے بقدر ضرورت استفادہ کی گنجائش ہے۔ ان کے کچھ دلائل یوں ہیں:

۱۔ "فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه" (بقرة: ۱۷۳) (قاضي محمد حسن ندوی)۔

۲۔ "الضرورات تبيح المحظورات" (قاضی حسن ندوی، مفتی جمیل نذیری، مولانا حفیظ الرحمن اعظمی)۔

۳۔ "يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الأشباہ: ۱۴۵) تقریباً سب نے اس سے استدلال کیا ہے۔

۴۔ "وينبغي أن يستثنى الأخذ بالربا للمحتاج فإنه لا يحرم" (أشباہ مع حموی ۱۷۶) (قاضی محمد حسن ندوی، مولانا فیاض عالم قاسمی)

۵۔ "الضرورات تقدر بقدرها" (مفتی محمد ارشاد)۔

۶۔ ضرورت مند کون ہے؟ "بلوغه حدا إن لم يتناول الممنوع هلك أو قارب" (حاشية حموی ۱/ ۲۰۸)۔

۷۔ "معناه عندي أن من اضطر ولا يجد ما يحيى به نفسه والإفلا، ولا بد من التأويل، ولولم يؤول قول الأشباه لكان رأيا باطلاً خلافًا للنص" (إعلاء السنن ۱۴/ ۶۳۸) (مفتی محمد فاروق)۔

۸۔ ان دلائل کے علاوہ فقہ وفتاوی کی عبارت سے بھی بعض حضرات نے استدلال کیا ہے۔

دلائل اور حالات کا جائزہ لینے سے ان حضرات کی بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے جو اضطراری اور اختیاری حالت کا فرق کر کے ضرورت کے وقت بقدر ضرورت استفادہ کی گنجائش رکھتے ہیں۔

نوٹ:- ڈاکٹر عبداللہ جولم عمری مدنی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا ہے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ:

سرکاری اسکیموں سے استفادہ

(سوال نمبر ۶-۱۲)

مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی[1]

الحمدلله رب العالمين، والصلوٰة والسلام على رسوله الكريم أمابعد!

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے چھبیسویں سمینار منعقدہ ۴-۶ / مارچ ۲۰۱۷ء کا ایک اہم موضوع "سرکاری اسکیموں سے استفادہ" بھی ہے، جس کے سوال نمبر چھ (۶) تا بارہ (۱۲) کے عرض مسئلہ کے لئے اس حقیر کے پاس باون (۵۲) مقالات آئے، بعض مقالہ نگاروں نے تفصیلی جوابات تحریر کئے ہیں، بعض نے خیر الامور اوساطہا کو پیش نظر رکھا ہے، جب کہ بعض مقالات اختصار میں جلالین سے بھی آگے نکلے ہوئے ہیں، بعض حضرات نے بعض سوالات کے جواب پر ہی اکتفا کیا ہے، تاہم سارے مقالات ہمارے لئے قیمتی اور نہایت اہم ہیں، تمام مقالات کو بالاستیعاب پڑھ کر ان کے جوابات اور دلائل کا خلاصہ بالترتیب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ راہِ سداد کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

سوال نمبر (۶): حکومتی تعاون سے استفادہ کا کیا حکم ہے؟

جواب: گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر ملنے والی رقوم (خواہ مکان اور بیت الخلاء بنانے یا تعلیمی ضروریات کے لئے ہو) چونکہ بلاتفریق تمام شہریوں کی اعانت کے لئے ہوتی ہے؛ اس لئے تمام مقالہ نگاروں نے ان کے حصول اور استعمال دونوں کو جائز قرار دیا ہے۔

مقالہ نگاروں کے نام یہ ہیں: مولانا محمد فیاض عالم قاسمی، ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مفتی حیدر علی قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد صابر حسین ندوی، مولانا محمد ممتاز خاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مولانا محمد اکرم بن مولانا اسلم رشید، مولانا محمد عرفان، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مولانا حذیفہ داحودی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، مفتی اعجاز الحسن بانڈے قاسمی، ڈاکٹر عبداللہ جولم، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد فلاحی، مفتی محمد فاروق دربھنگوی، مولوی سراج الحق میواتی، مولانا عباس بن یوسف، مفتی محمد حسین قمر الدین ماہمکر فلاحی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی محمد اسعد پالنپوری، مولانا رحمت اللہ ندوی، مدرسہ جامعہ عربیہ سلم العلوم، مفتی محمد زبیر ندوی، مولانا آزاد بیگ قاسمی، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی محمد عارف باللہ قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا نثار عالم ندوی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی محمد ارشاد دسادا پالنپوری، مفتی محمد عثمان بستوی، مفتی محمد رمضان سعادتی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی جمیل احمد نذیری، ڈاکٹر محی الدین غازی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، دار الافتاء، بنارس، مولانا ابوالمکارم معروفی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی عبدالمنان، مفتی عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مفتی عبدالتواب اناوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد ابرار خان ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

البتہ وجہ جواز میں بعض حضرات نے "اعانت"، بعض نے "انعام وہدیہ" اور بعض نے "ہبہ" قرار دیا ہے اور اسی کے مطابق دلائل پیش کئے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱ "وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (المائدة: ۲)

(ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی حیدر علی قاسمی)۔

۲ "أنا أولى المؤمنين من أنفسهم، فمن مات، وعليه دين، ولم يترك وفاء، فعلينا قضاءه، ومن ترك مالاً فلورثته"

[1]

(بخاری، حدیث نمبر: ۶۷۳۱) (ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی)۔

۲ ''كلكم راع، وكلكم مسؤول عن رعيته، والإمام راع، ومسؤول عن رعيته'' (بخاری، حدیث نمبر: ۸۹۳) (محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۴ ''عن سماك قال: سمعت علقمة بن وائل يحدث عن أبيه أن النبي صلى الله عليه وسلم أقطع أرضًا بحضرموت. قال محمد: حدثنا النصر عن شعبة، وزادفيه: وبعث معه معاوية ليقطعها إياه'' (ترمذی. كتاب الأحكام. باب ماجاء في القطائع) (محمد ممتاز خاں ندوی)۔

۵ ''عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من نفس عن مسلم كربة من كرب الدنيا، نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة، ومن يسر على معسر في الدنيا، يسر الله عليه في الدنيا والآخرة، ومن ستر على مسلم في الدنيا، ستر الله عليه في الدنيا والآخرة، والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه'' (تحفة الألمعی: ۵/ ۲۷۱) (مفتی حیدر علی قاسمی)۔

۶ ''عن علی رضی الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم: إن كسرى أهدى له، فقبل، وإن الملوك أهدوا إليه، فقبل منهم'' (ترمذی، باب ماجاء في قبول هدايا المشركين) (مولانا محمد عثمان)

۷ ''قال ابو الليث: اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم: يجوز مالم يعلم أنه يعطيه من حرام. قال محمد: وبه نأخذ مالم نعرف شيئا حرامًا بعينه، وهو قول أبي حنيفة وأصحابه، كما في الظهيرية'' (الفتاوى الهندية، باب الكراهية، في الهدايا والضيافات: ۵/ ۳۴۲) (مفتی اقبال احمد ٹنکاروی، محمد آزاد بیگ قاسمی)

۸ ''روى محمد في السير الكبير أخبارًا متعارضة في بعضها: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل هدايا المشركين، وفي بعضها: أنه صلى الله عليه وسلم لم يقبل، فلابد من التوفيق، واختلف عبارة المشائخ في وجه التوفيق ... ومن المشائخ من وفق بوجه آخر، فقال: لم يقبل من شخص علم أنه لو قبل يقل صلابته وعزته في حقه، ويلين له بسبب قبول الهدية، وقبل من شخص علم أنه لا يقل صلابته وعزته في حقه، ولا يلين بسبب قبول الهدية، كذا في المحيط'' (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۴۷) (مولانا ابو المکارم معروفی)۔

۹ ''أهدى إلى رجل شيئا، أو أضافه: إن كان غالب ماله من الحلال، فلا بأس؛ إلا أن يعلم أنه حرام. فإن كان الغالب هو الحرام، ينبغي أن لا يقبل الهدية'' (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۴۲، الفتاوى التاتارخانية: ۱۸/ ۱۶۵) (مولانا حفیظ الرحمن اعظمی مدنی)۔

۱۰- محمد قمر الزماں ندوی، رحمت اللہ ندوی، فیاض عالم قاسمی، سراج الحق میواتی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، محمد اکرم بن مولانا ارشد سلیم، محمد فلاحی بن عبد الجبار، مولانا ناز بیر ندوی، محمد ممتاز خاں ندوی، مفتی عبد الرحیم قاسمی نے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی (مباحث فقہیہ، ص: ۴۶۷) اور حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم لاجپوریؒ کے (فتاوی رحیمیہ: ۵/ ۴۳۸، ۱/ ۲۲۵، ۶/ ۱۳۵) کی عبارتیں بھی نقل کئے ہیں۔

۱۱ ''الأصل في الأشياء الإباحة'' (الأشباه والنظائر مع غمز عيون البصائر: ۱/ ۹۷) (خورشید احمد اعظمی مدنی)۔

۱۲ ''الهبة تمليك مال لآخر بلا عوض'' (شرح المجلة، رقم المادة: ۸۳۳) (مولانا محمد زبیر ندوی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے مختلف کتابوں سے ہبہ کی عبارتیں نقل کی ہیں)

۱۳ ''فكل ما يرى ولي الأمر فعله أقرب إلى الصلاح للرعية، وأبعد عن الفساد، فله أن يفعله؛ بل قد يجب عليه، وإن لم يجئ بذلك نص خاص'' (فتاوى معاصرة للقرضاوي: ۱/ ۵۸۳) (مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

تاہم اس سلسلہ میں کچھ مقالہ نگاروں نے حدود وقیود بھی نقل کئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

☆ محمد ممتاز خاں ندوی، محمد قمر الزماں ندوی، ابوالمکارم معروفی، مولانا محمد عرفان، محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد ارشاد پالنپوری، محمد ابرار خاں ندوی اور مفتی عارف باللہ قاسمی کے نزدیک اگر اس امداد کے لئے مخصوص شرائط وحدود ہوں، مثلاً: صرف غریب ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے، تو شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے، دوسروں کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا درست نہیں۔

☆ ابوالمکارم معروفی اور مفتی حیدر علی قاسمی کی رائے یہ ہے کہ اگر دینی اور سیاسی مصلحت کے خلاف ہو، نیز ان اسکیموں سے دینی وملی صلابت اور غیرت وحمیت کو ختم کرنا مقصود ہو تو ان کے حصول کی اجازت نہیں، جبکہ محمد فاروق پالنپوری نجھوٹ اور غرر شامل نہ ہونے کی صورت میں تو اجازت ہے، ورنہ نہیں۔

سوال نمبر (۷/۸/۹): واسطہ بننے والوں کا محنتانہ لینے اور دینے، نیز ان کا حاصل شدہ رقوم سے ایک حصہ لینے اور سرکاری قرضوں کے حصول کے لئے رشوت دینے کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلہ میں مقالہ نگاروں کی چار رائیں ہیں:

پہلی رائے: واسطہ بننے والے کا محنتانہ لینا اور اس کو محنتانہ دینا دونوں جائز ہیں، اس کے قائلین درج ذیل مقالہ نگار ہیں: مفتی جمیل احمد نذیری، قاضی عبدالجلیل قاسمی، محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مفتی محمد رمضان سعادتی، قاضی محمد حسن ندوی، مدرسہ جامعہ عربیہ سلم العلوم، محمد فاروق، محمد حذیفہ داحودی، مولانا محمد عرفان، سراج الحق میواتی، مفتی محمد اسعد فلاحی، محمد اکرم بن مولانا اسلم رشید، محمد فلاحی، مولانا محمد زبیر ندوی، محمد آزاد بیگ قاسمی، حفیظ الرحمن اعظمی مدنی، خورشید احمد اعظمی مدنی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، رحمت اللہ ندوی، محمد نیاض عالم قاسمی، مفتی حیدر علی قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی محمد حسین قمر الدین فلاحی ماہمکر، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، محی الدین غازی، دارالافتاء جامعہ سلفیہ بنارس، مفتی عبدالتواب اناوی، عبدالحمید قاسمی، خورشید انور اعظمی اور مفتی تنظیم عالم قاسمی۔

البتہ وجہ جواز میں بعض حضرات نے ''دلال''، بعض نے ''اجیر'' اور بعض نے ''وکیل'' قرار دیا ہے اور اسی کے مطابق دلائل پیش کئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱ ''قالت إن ربي يدعوك ليجزيك أجر ماسقيت لنا'' (قصص: ۲۵)۔

۲ "فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن" (الطلاق: ۶) (قاضی محمد حسن ندوی)

۳ ''من صنع إليكم معروفًا فكافئوه'' (مسند احمد: ۲/ ۶۸، ابوداود، حدیث نمبر: ۶۷۲) (دارالافتاء جامعہ سلفیہ بنارس)۔

۴ ''المسلمون على شروطهم فيما يحل'' (الارواء: ۱۳۰۳) (عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، دارالافتاء جامعہ سلفیہ بنارس)۔

۵ ''اعطوا الأجير أجره قبل أن يجف عرقه'' (مجمع الزوائد: ۴/ ۹۷) (قاضی محمد حسن ندوی، محمد صابر حسین ندوی)

۶ ''مافي صحيح البخاري: باب أجرة السمسرة، ولم ير ابن سيرين وعطاء وإبراهيم والحسن بأجر السمسار بأسًا. وقال ابن عباس: لابأس أن يقول: بع هذا الثوب فمازاد على كذا وكذا فهولك، وقال ابن سيرين: إذا قال: بعه بكذا وكذ، فماكان من ربح فهولك، أوبيني وبينك، فلابأس'' (كتاب الاجارة: ۱/ ۳۰۳) (مفتی جعفر ملی رحمانی، مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

۷ ''عن ابي سعيد الخدري رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن استئجار الأجير حتى يبين له أجره'' (مسند احمد: ۱۸/ ۱۱۶) (محمد فلاحی)۔

۸ ''من استأجر أجيرًا فليعلمه أجره'' (رواه البيهقي) (محمد صابر حسین ندوی)۔

۹ ''وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار: فقال: أرجو أنه لابأس به، وإن كان في الأصل فاسدًا

لكثرة التعامل، وكثيرمن هذا غيرجائز، فجوزوه لحاجة إليه كدخول الحمام'' (حاشية ابن عابدين، باب الاجارة، مطلب في أجرة الدلال: ۹/ ۸۷) (محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، سراج الحق میواتی، محمد قمرالزماں ندوی، خورشید انور اعظمی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مفتی حید رعلی قاسمی، محمد فیاض عالم قاسمی، رحمت اللہ ندوی، محمد آزاد بیگ قاسمی، محمد فلاحی)۔

۱۰ ''سعى له عند السلطان وأتم أمره، لابأس بقبول هديته بعده وقبله بطلبه سحت، وبدونه مختلف فيه. ومشايخنا على أنه لابأس به'' (ردالمحتار: ۸/ ۳۵) (مولانا محمد عثمان)

۱۱ ''وإن سعى بينهما وباع المالك بنفسه يعتبر العرف، فتجب الدلالة على البائع، أوالمشتري، أو عليهما بحسب العرف'' (الدرالمختار مع الرد: ۴/ ۴۶) (محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی حیدرعلی قاسمی)۔

۱۲ ''إجارة السمسار والمنادي والحمامي والصكاك ومالايقدر فيه الوقت ولاالعمل تجوز لماكان للناس به حاجة ويطيب الأجرالمأخوذ لوقدر أجرالمثل'' (ردالمحتار: ۶/ ۴۷)

(محمد فیاض عالم قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، محمد آزاد بیگ قاسمی، مولانا محمد زبیر ندوی، مفتی محمد رمضان سعادتی)۔

۱۳ ''الأجراء على ضربين: مشترك وخاص، فالأول: من يعمل لالواحد كالخياطة ونحوه، أويعمل له عملاغيرموقت كأن استأجره للخياطة في بيته غيرمقيدة بمدة، كان أجيرامشتركا وإن لم يعمل لغيره، أوموقتًابلاتخصيص... ولايستحق المشترك الأجرحتى يعمل'' (الدرالمختار مع الرد: ۹/ ۸۲) (خورشید احمد اعظمی مدنی)۔

۱۴ ''ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة'' (هداية۳/ ۲۹۳، الفقه الحنفي الجديد: ۴/ ۳۴۲) (مولانا محمد عرفان، قاضی محمد حسن ندوی، مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

۱۵ ''وفي الدلال والسمسار يجب أجرالمثل'' (محمدفاروق)۔

۱۶ ''أهل بلدة ثقلت عليهم مؤنات العمل، فاستأجر رجلًا بأجرة معلومة ليذهب ويرفع أمرهم إلى السلطان الأعظم، ليخفف عنهم بعض الحيف وأخذ الأجرة من عامتهم غنيهم وفقيرهم. ذكرههنا أنه إن كان بحال لوذهب إلى بلدالسلطان تهيأ له إصلاح الأمر يومًا أويومين جازت الإجارة، وإن كان بحال لايحصل ذلك إلا بمدة، فإن وقتوا للإجارة وقتا معلوما، فالإجارة جائزة، والأجر كله له. وإن لم يوقتوا، فهي فاسدة، وله أجرالمثل'' (ہندیہ: ۴/ ۵۲۶) (مفتی محمد عارف باللہ قاسمی)۔

۱۷ ''تصح الوكالة بأجروبغيرأجر؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم كان يبعث عماله لقبض الصدقات، ويجعل لهم عمولة، ولهذا قاله أبناء عمه: لوبعثتنا على هذه الصدقات فنؤدي مايؤدي الناس ونصيب مايصيبه الناس. أي: العمولة، ولأن الوكالة عقد جائز لايجب على الوكيل القيام بها، فيجوز أخذالأجرة فيها بخلاف الشهادة'' (الفقه الاسلامي وأدلته: ۴/ ۷۵۵) (مفتی محمد رمضان سعادتی، محمد اکرم بن مولانا اسلم رشید)۔

۱۳- محمد جمیل اختر جلیلی ندوی اور محبوب فروغ احمد قاسمی نے فتاوی محمودیہ سے یہ فتوی بھی نقل کیا ہے: دلالی یہ ہے کہ بائع ومشتری کے درمیان معاملہ کرایا جائے، اس میں بائع ومشتری دونوں کو ثمن (قیمت) معلوم ہوتی ہے اور دلال کو اس ثمن کے علاوہ اجرت ملتی ہے، خواہ وہ اجرت پانچ دس روپے کی صورت میں متعین ہو، خواہ اس طرح کہ فی صد دس روپے یا فی روپیہ ایک آنہ اجرت مقرر کی جائے، وہ اجرت درست ہے، جس قدر بھی ہو، فقط، واللہ سبحانہ اعلم (فتاوی محمودیہ: ۴/ ۷۰)۔

البتہ محنتانہ وصول کرنے کی شکلوں میں مندرجہ ذیل نقاط نظر ہیں:

۱- اجرت متعین ہونی چاہئے، اس کے قائلین قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی، محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مفتی محمد رمضان سعادتی، قاضی محمد حسن

ندوی، محمد فاروق، مولانا محمد عرفان، مفتی محمد اسعد فلاحی، محمد اکرم بن مولانا اسلم رشید، محمد فلاحی، مولانا محمد زبیر ندوی، محمد آزاد بیگ قاسمی، رحمت اللہ ندوی، مفتی حیدر علی قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی محمد حسین قمر الدین فلاحی ماہمکر، مفتی لطیف الرحمن، مفتی ارشاد پالنپوری، مفتی تنظیم عالم قاسمی اور مفتی عبدالتواب اناوی وغیرہم ہیں، نیز اجرت متعین نہ ہونے کی صورت میں قاضی محمد حسن ندوی، محمد فاروق، محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی محمد حسین قمر الدین فلاحی ماہمکر اور مفتی لطیف الرحمن فلاحی نے اجرت مثل دینے کی بات کی ہے، جب کہ محمد حذیفہ داحودی، سراج الحق میواتی اور محمد فیاض عالم قاسمی نے صرف اجرت مثل ہی دینے کی بات لکھی ہے۔

۲- فیصد (جو مجہول نہ ہو، جیسے: فی صد دس روپے) کے اعتبار سے اجرت طے کرنا جائز ہے، اس کے قائلین مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، عباس بن یوسف، محمد فلاحی اور مفتی جنید محمد پالنپوری ہیں، جب کہ رحمت اللہ ندوی نے فیصد کے اعتبار سے اجرت طے کرنے کو درست نہیں سمجھا ہے۔

۳- حاصل شدہ امدادی رقوم کا ایک حصہ بطور محنتانہ لینا جائز ہے، اس کے قائلین محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مفتی حیدر علی قاسمی، محی الدین غازی، مفتی اعجاز الحسن بانڈے قاسمی، مفتی عبدالمنان، عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مفتی محمد حسین قمر الدین فلاحی ماہمکر، حفیظ الرحمن اعظمی مدنی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مفتی محمد رمضان سعادتی، محمد فلاحی، محمد فاروق، مولانا محمد عرفان اور قاضی محمد حسن ندوی ہیں، جب کہ محمد قمر الزماں ندوی، مفتی ارشاد پالنپوری، خورشید انور اعظمی، مفتی محمد اسعد فلاحی، مفتی جعفر ملی رحمانی، فیاض عالم قاسمی اور دارالافتاء جامعہ سلفیہ بنارس نے حاصل شدہ امدادی رقوم کے ایک حصہ کو بطور محنتانہ لینے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

۴- مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی تنظیم عالم قاسمی اور محمد آزاد بیگ قاسمی نے حاصل شدہ رقم میں اپنی طرف سے لینے کو نادرست قرار دیا ہے؛ البتہ معاملہ طے کر کے لینے کو درست کہا ہے۔

۵- مفتی عبدالتواب اناوی نے حاصل شدہ رقم سے غریب کو مجبور کر کے اور عرف سے بڑھ کر لینے کی صورت میں غبن فاحش کا حکم لگاتے ہوئے ناجائز قرار دیا ہے۔

۶- محمد حذیفہ داحودی اور خورشید احمد اعظمی نے حاصل شدہ رقم میں محنت یا اجرت مثل سے زائد لینے کو نادرست قرار دیا ہے۔

۷- مفتی جنید محمد پالنپوری اور مفتی تنظیم عالم قاسمی نے دلالی کی اجرت کو تو جائز قرار دیا ہے؛ البتہ حکومت کی امدادی رقوم کے حصول میں دلالوں اور حکومتی افسران کی ملی بھگت سے عوام کو درپیش پریشانیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس طرح کے معاملات میں دلالی کو مکروہ قرار دیا ہے۔

۸- مفتی اقبال احمد ٹنکاروی اور محمد نثار عالم ندوی نے بھی دلالی کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے؛ لیکن حکومت کی طرف سے امدادی رقوم کے حصول میں عموماً دلال حکومتی آدمی یا اس کا نمائندہ ہوتا ہے، جو رشوت کے معاملہ میں ماخوذ ہونے کے ڈر سے دلال کا روپ اختیار کرتا ہے؛ اس لئے ان کے محنتانہ کو رشوت قرار دیا ہے۔

☆ محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، محمد صابر حسین ندوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی حیدر علی قاسمی، محمد زبیر ندوی اور مولانا محمد عرفان وغیرہ نے تصرف قبل القبض اور جزء عمل کو اجرت بنانے پر سیر حاصل گفتگو بھی کی ہے۔

☆ محی الدین غازی صاحب نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ واسطہ بننے والا کسی ناجائز طریقہ کو اختیار کر کے واسطہ کے عمل کو انجام نہ دے۔

☆ محمد صابر حسین ندوی نے واسطہ یا سفارشی بننے والوں کی دو صورتیں کی ہیں:

(۱) ممدوح ثالث: جس کی قرآن وحدیث میں تعریف کی گئی ہے، قرآن میں ہے: "من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها" (النساء:۸۵) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اشفعوا فلتوجروا، وليقض الله على لسان نبيه ما شاء" (ابوداود، حدیث نمبر: ۱۵۱۳)

(۲) مذموم ثالث: جس کی مذمت قرآن نے کی ہے، ارشاد ہے: "من يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها" (النساء:۸۵)

اول الذکر قسم کی محنتانہ دینے یا لینے میں اس شرط کے ساتھ کہ ایک دوسرے کا استحصال نہ ہو اور مقصود حق کی حصول یابی ہو تو اجازت دی جاسکتی

ہے، ورنہ "لا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (المائدۃ: ۲) کے تحت اجازت نہ ہوگی۔

دوسری رائے: اگر واسطہ بننے والے شخص کا تعلق ان افراد میں سے ہو، جسے حکومت نے انھی امدادی رقوم کی تقسیم کے فرض منصبی پر مامور کر رکھا ہو تو ایسی صورت میں محنتانہ کے نام پر لی جانے والی رقم رشوت میں شمار ہوگی؛ لیکن اگر وہ عام آدمی ہے، سرکاری ملازم نہیں ہے تو اس کے لئے محنتانہ لینا اور محنتانہ دینا دونوں درست ہیں، اس کے قائلین مفتی شاہد علی قاسمی، عباس بن یوسف، محبوب فروغ احمد قاسمی، ابوالمکارم معروفی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی عبدالمنان، محمد عثمان اور مفتی ارشاد پالنپوری ہیں، ان حضرات کے مستدلات درج ذیل ہیں:

۱ "الراشي والمرتشي كلاهما في النار" (مسند احمد: ۶/ ۲۱۶) (محمد ممتاز خاں ندوی، مفتی ارشاد پالنپوری)۔

۲ "لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي" (ترمذی: ۳/ ۶۱۴)۔

۳ "هدايا الأمراء غلول" (مسند احمد: ۵/ ۴۲۴) (عباس بن یوسف)۔

۴ "ولا يجوز أخذ المال ليفعل الواجب" (شامی: ۸/ ۳۲) (ابوالمکارم معروفی، مفتی ارشاد پالنپوری)۔

۵ "لم يختلف العلماء في كراهية الهدية إلى السلطان الأكبر، وإلى القضاة، والعمال، وجباة الأموال. ويقصد بالكراهة الحرمة" (القرطبی: ۲/ ۳۴۰) (عباس بن یوسف)

۶ "الحاصل أن حد الرشوة هو ما يؤخذ عما وجب على الشخص سواء كان واجبًا على العين أو على الكفاية، وسواء كان واجبًا حقا للشرع أو كان عقدًا" (إعلاء السنن: ۱۵/ ۶۱) (ابوالمکارم معروفی)

البتہ ان حضرات نے دینے والے کے لئے حق کے حصول اور ظلم وضرر کو دور کرنے کی غرض سے رشوت دینے کی گنجائش رکھی ہے، جس کے مستدلات یہ ہیں:

۱ "يجوز للإنسان عند الجمهور أن يدفع رشوة للحصول على حق أو لدفع ظلم، أو ضرر. ويكون الإثم على المرتشي دون الراشي" (ابن عابدین: ۴/ ۳۰۴) (عباس بن یوسف)

۲ "الضرورات تبيح المحظورات" (الاشباہ والنظائر، ص: ۸۷) (مفتی عبدالمنان، قاضی محمد حسن ندوی)۔

تیسری رائے: سودی قرضوں کے حاصل کرنے میں واسطہ بن کر معاوضہ لینا درست نہیں، غیر سودی میں درست ہے، اس کے قائلین محمد ابرار خاں ندوی اور محمد قمر الزماں ندوی ہیں، ان حضرات نے "لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء" (مسلم) سے استدلال کیا ہے، نیز اس سلسلہ میں استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ کے ایک فتوی کو بھی نقل کیا ہے (کتاب الفتاوی: ۵/ ۷۰ ۳) (دیکھئے مقالہ: محمد قمر الزماں ندوی)۔

چوتھی رائے: واسطہ بنے والے جو رقم لیتے ہیں، وہ رشوت ہے، اس کے قائلین ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، حافظ کلیم اللہ عمر مدنی، محمد نثار عالم ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی وغیرہم ہیں، ان کے مستدلات درج ذیل ہیں:

۱ "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقًا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون" (البقرۃ: ۱۸۸)

۲ "المعنى لا تصانعوا بأموالكم الحكام وترشوهم ليقضوا لكم على أكثر منها. قال ابن عطية: وهذا القول يترجح؛ لأن الحكام مظنة الرشاء، إلا من عصم، وهو الأقل" (الجامع لأحكام القرآن للقرطبی: ۲/ ۳۴۰)۔

۳ "أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعا للضرر أو جلبا للنفع، وهو حرام على الآخذ لا الدافع" (فتح القدير: ۷/ ۲۵۵) (ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی)۔

البتہ تمام مقالہ نگاروں کے نزدیک حق کے حصول اور ظلم وضرر کو دور کرنے کی غرض سے رشوت دینے کی گنجائش ہے، جس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱ ''الرابع: مایدفع لدفع الخوف من المدفوع إلیه علی نفسه وماله حلال للدافع حرام علی الآخذ؛ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب، ولایجوز أخذالمال لیفعل الواجب '' (شرح فتح القدیر، کتاب أدب القاضی: ۷/ ۲۳۶، ردالمحتار، کتاب القضاء، مطلب فی الکلام علی الرشوة والهدیة: ۸/ ۳۴) (محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مفتی حیدر علی قاسمی)۔

۲ ''أما إذا أعطی لیتوصل به إلی الحق، أو لیدفع به عن نفسه ظلمًا، فلابأس به'' (مرقات: ۲/ ۲۴۸) (محمد نثار عالم ندوی)

۳ ''لو اضطر إلی دفع الرشوة لإحیاء حقه، جاز له الدفع، وحرم علی القابض'' (ردالمحتار: ۵/ ۷۲) (ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)

☆ ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی اور مفتی عبدالرحیم قاسمی نے رشوت کے بجائے واسطہ بننے والے کو ایک دو دن کے لئے اجرت پر رکھنے کو بہتر قرار دیا ہے اور دلیل کے طور پر علامہ شامیؒ کی یہ عبارت نقل کی ہے:

''وحیلة حلها أن یستأجره یوما إلی اللیل، أو یومین، فتصیر منافعه مملوکه، ثم یستعمله فی الذهاب إلی السلطان للأمر الفلانی'' (ردالمحتار ۵/ ۳۶۲)

بقیہ مقالہ نگاروں کے دلائل بھی الفاظ کے فرق کے ساتھ چوتھی اور دوسری رائے کے تحت مذکور عبارتیں ہیں، تاہم بہت سارے مقالہ نگاروں نے اردو فتاوے جیسے: منتخب نظام الفتاوی، فتاوی محمودیہ اور کتاب الفتاوی وغیرہ کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں۔

سوال نمبر (۱۰): امدادی رقوم یا قرض کے حصول کے لئے غلط بیانی سے کام لینے کا حکم کیا ہے؟

تمام مقالہ نگاروں نے عام حالت میں غلط بیانی سے کام لینے کو ناجائز قرار دیا ہے، جن کے نام سوال نمبر (۶) میں درج ہیں، ان حضرات کے مستدلات درج ذیل ہیں:

۱- "یاأیها الذین آمنوا اتقوا الله و کونوا مع الصادقین" (التوبة: ۱۱۹) (ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی)۔

۲- "واجتنبوا قول الزور" (الحج: ۳۰) (ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی حیدر علی قاسمی، مولانا محمد عرفان، محمد ممتاز خاں ندوی)۔

۳ "یاأیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم" (النساء: ۲۹) (ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، محمد آزاد بیگ قاسمی، سراج الحق میواتی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مفتی عبدالتواب اناوی)۔

۴ "ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل" (البقرة: ۱۸۸) (محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، محمد آزاد بیگ قاسمی، خورشید انور اعظمی، مفتی حیدر علی قاسمی)۔

۵ "لعنة الله علی الکاذبین" (آل عمران: ۶۱) (محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، حفیظ الرحمن اعظمی مدنی)۔

۶ ''من غشنا فلیس منا'' (مسلم، حدیث نمبر: ۱۰۱) (ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مفتی محمد رمضان سعادتی، محمد قمر الزماں ندوی، مولانا خورشید انور اعظمی، محمد فلاحی، مفتی محمد اسعد فلاحی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، سراج الحق میواتی، مفتی حیدر علی قاسمی، حفیظ الرحمن اعظمی مدنی، محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۷ ''المکر والخدیعة والخیانة فی النار'' (المستدرك للحاکم، حدیث نمبر: ۸۷۹۵) (ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی)۔

۸ ''کل خلة یطبع علیها المؤمن؛ إلا الخیانة والکذب'' (مسند ابی یعلی، حدیث نمبر: ۷۱۱) (محمد جمیل اختر جلیلی ندوی)

۹ ''لا إیمان لمن لا أمانة له، ولا دین لمن لا عهد له'' (مشکوة المصابیح ۱/ ۱۵) (مفتی محمد رمضان سعادتی، محمد صابر حسین ندوی)۔

۱۰ ''آیة المنافق ثلاث: زاد مسلم: وإن صام وصلی وزعم أنه مسلم، ثم اتفقا: إذا حدث کذب، وإذا وعد أخلف، وإذا ائتمن خان'' (مشکوة المصابیح: ۱/ ۱۷) (مفتی اقبال احمد ٹنکاروی، محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، حفیظ الرحمن اعظمی مدنی، محمد ممتاز خاں ندوی)

۱۱ ''إنما أنا بشر، وإنه يأتيني الخصم، فلعل بعضهم أن يكون أبلغ من بعض، فأحسب أنه صادق، فأقضي له، فمن قضيت له بحق مسلم، فإنما هي قطعة من النار، فليحملها أو يذرها'' (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۱۳) (مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد عرفان، محمد ممتاز خاں ندوی)۔

۱۲ ''كبرت خيانة أن تحدث أخاك حديثا هو لك به مصدق، وأنت به كاذب'' (مشکوۃ المصابیح ص: ۴۱۳) (محمد فاروق)۔

۱۳ ''المسلم أخو المسلم ... لا يكذبه، وفي رواية: لا يخونه'' (ترمذی ۲/ ۱۴) (مفتی حیدر علی قاسمی)

۱۴ ''أكبر الكبائر: الإشراك بالله، وعقوق الوالدين، وشهادة الزور ثلاثًا، أو قول الزور'' (بخاری ومسلم) (محمد صابر حسین ندوی، محمد فلاحی)۔

۱۵ ''لا يحل لامرء مال أخيه إلا بطيب نفسه'' (مشکوۃ) (مفتی عبد التواب اناوی، مفتی حیدر علی قاسمی)۔

۱۶ ''وإن الكذب يهدي إلى الفجور، وإن الفجور يهدي إلى النار'' (محمد ممتاز خاں ندوی، محمد فلاحی)

۱۷ علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں: ''والغلول: السرقة من الغنيمة، وهو حرام'' (المبسوط ۱۰/ ۷) (ڈاکٹر شاہجہاں ندوی)۔

۱۸ ''رجل له عطاء في الديوان، مات عن ابنين، فاصطلحا على أن يكتب في الديوان اسم أحدهما، ويأخذ العطاء، والآخر لا شيء له، ويبذل له من كان العطاء مالًا معلوما، فالصلح باطل، ويرد بدل الصلح والعطاء للذي جعل الإمام العطاء له... غير أن السلطان إن منع المستحق، فقد ظلم مرتين في قضية حرمان المستحق، وإثبات غير المستحق مقامه'' (الأشباه والنظائر، القاعدة: تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة) (مفتی شاہد علی قاسمی)۔

۱۹ ''لا يجوز التصرف في مال غيره ولا ولايته'' (الدرمختار مع الرد ۹/ ۲۹۱، الأشباه والنظائر ص: ۲۴۶) (مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مفتی حیدر علی قاسمی)۔

۲۰ ''الكذب مباح لإحياء حقه ودفع الظلم عن نفسه، والمراد التعريض؛ لأن عين الكذب حرام، قال: وهو الحق. (وفي الرد): اعلم أن الكذب قد يباح وقد يجب، والضابطة فيه: أن كل مقصود محمود يمكن التوصل إليه بالصدق والكذب جميعًا، فالكذب حرام، وإن أمكن التوصل إليه بالكذب وحده، فمباح إن أبيح تحصيل ذلك المقصود، وواجب إن وجب تحصيله... والمراد التعريض؛ لأن عين الكذب حرام، قال: وهو الحق''

(الدرمختار مع الرد ۹/ ۵۲۵، حاشية اعانة الطالبين ۳/ ۲۲۱)

(ابو المکارم معروفی، محمد فیاض عالم قاسمی، مولانا محمد عثمان، مفتی محمد رمضان سعادتی، مولانا خورشید انور اعظمی، محمد فاروق، مفتی محمد حسین قمر الدین فلاحی ماتمکر)۔

۲۱ ''والكذب حرام إلا في الحرب للخدعة، وفي الصلح بين اثنين، وفي إرضاء الأهل، وفي دفع الظالم عن الظلم'' (ملتقى الأبحر ۴/ ۲۲۱) (مفتی محمد ارشاد پالنپوری)

۲۲ ''اتفق العلماء أن الغش حرام، سواء أكان بكتمان العيب في المعقود عليه أو الثمن، أم بالكذب والخديعة، وسواء أكان في المعاملات أم في غيرها من المشورة والنصيحة'' (الموسوعة الفقهية: ۳۱/ ۲۱۹)

(محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مفتی جعفر علی رحمانی، عباس بن یوسف، محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۲۳- ابو المکارم معروفی، محمد قمر الزماں ندوی، محمد حذیفہ واحودی، محمد عثمان وغیرہم نے فتاوی عثمانی، محمود الفتاوی، جدید فقہی مسائل، کتاب الفتاوی، فتاوی دینیہ وغیرہ کے فتاوے بھی تائید میں نقل کئے ہیں۔

☆ البتہ محمد صابر حسین ندوی نے حکومت کی طرف سے امدادی رقوم یا قرض کی فراہمی کے لئے طے شدہ معیارات، طبقات اور شرائط کو بڑی حد تک

ناانصافی پر مبنی قرار دیا ہے اور ضرورت مندوں کو اپنی حاجت روائی کے لئے (نہ کہ ترقیاتی طور پر) غلط بیانی سے کام لینے کی اجازت دی ہے۔

☆ مفتی محمد حسین قمر الدین ماہمکر فلاحی نے مقصد کے حصول اور محمد جمیل اختر جلیلی ندوی نے حق کے حصول کے لئے غلط بیانی سے کام لینے کی گنجائش دی ہے۔

☆ مولانا محمد عرفان نے حکومت کی طرف سے طے شدہ شرائط و معیارات کو مبنی بر تعصب اور خلاف شرع ہونے کی صورت میں کسی معتبر عالم دین سے رجوع کرنے اور ان حکم پر عمل کرنے کا مشورہ دیا ہے، جبکہ خورشید احمد اعظمی مدنی نے ایسی صورت میں کسی بھی حیلہ سے امداد حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔

☆ مفتی عبدالتواب اناوی نے ایسے حقیقی مستحق کے لئے غلط بیانی سے کام لینے کی اجازت دی ہے، جو صرف کاغذی اعتبار سے حکومتی معیار پر نہیں اترتا، نیز ایسے غیر مستحق کے لئے بھی حکومتی رقوم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے، جس کا نام مستحقین کی فہرست میں حکومت کی طرف سے اصولوں کی تعیین میں چوک کی وجہ سے شامل ہو گیا ہے۔

☆ مولانا ابوالکارم معروفی، مولانا فیاض عالم قاسمی اور مفتی محمد عثمان نے شرائط و معیارات پر اترنے کے باوجود قانونی داؤ پیچ سے ناواقف حضرات کے لئے غلط بیانی کے بجائے توریہ وتعریض سے کام لینے کی اجازت دی ہے۔

☆ مفتی محبوب علی وجیہی اور مولانا خورشید انور اعظمی نے شرائط مکمل ہونے کے باوجود رشوت دیئے بغیر رقم نہ ملنے کی صورت میں رشوت دینے اور کسی بھی حیلۂ شرعی سے رقم حاصل کرنے کی گنجائش دی ہے۔

☆ مفتی اعجاز الحسن باندے قاسمی نے امدادی رقوم کے حصول کے لئے ایسی شرائط کی صورت میں غلط بیانی سے کام لینے کی اجازت دی ہے، جن کی وجہ سے مسلمان مستحقین کے لئے استفادہ ممکن نہ ہو۔

مولانا نثار عالم ندوی نے کاغذی اعتبار سے حقیقی مستحقین کے ساتھ ساتھ ملک کی موجودہ صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے غیر مستحقین کے لئے بھی غلط بیانی سے کام لینے کی اجازت دی ہے۔

سوال نمبر (۱۱): اگر مقروض کی طرف سے حکومت کل سود یا سود کا بڑا حصہ ادا کرے تو ایسے قرض کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے دو جزء ہیں: (۱) بینک کے قرض کا پورا انٹرسٹ حکومت ادا کرے۔ (۲) انٹرسٹ کا بڑا حصہ تو حکومت ادا کرے؛ البتہ معمولی حصہ قرض دار ادا کرے۔ ان دونوں اجزاء کے بارے میں مقالہ نگاروں کی چار رائیں ہیں:

(۱) دونوں طرح کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا مطلقاً جائز نہیں۔ اس کے قائلین محمد زبیر ندوی، مفتی محمد اسعد فلاحی، دارالافتاء جامعہ سلفیہ بنارس، محمد صابر حسین ندوی، حفیظ الرحمن اعظمی مدنی، مولانا ابوسفیان مفتاحی ہیں؛ البتہ مفتی محمد ارشاد پالنپوری اور محمد قمر الزماں ندوی نے عام حالت میں تو دونوں صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے، جب کہ ضرورت کے وقت جائز قرار دیا ہے، ان حضرات کے مستدلات درج ذیل ہیں:

۱- "وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (المائدة: ۲) (دارالافتاء جامعہ سلفیہ بنارس)۔

۲- "أحل الله البيع وحرم الربا" (البقرة: ۲۷۵) (محمد صابر حسین ندوی)۔

۳ "كل قرض جر نفعًا فهو ربا" (محمد زبیر ندوی، دارالافتاء جامعہ سلفیہ بنارس، مولانا ابوسفیان مفتاحی، حفیظ الرحمن اعظمی مدنی)۔

۴ "يأتي على الناس زمان يأكلون فيه الربا. قيل الناس كلهم يارسول الله؟ فقال عليه السلام: من لم يأكله ناله غباره" (الفتح الرباني: ۱۵/ ۶۹) (دارالافتاء جامعہ سلفیہ بنارس)۔

۵ "لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه. وقال: هم سواء" (مشكوة.ص: ۲۴۴) (مفتی محمد ارشاد پالنپوری، حفیظ الرحمن اعظمی مدنی)۔

۶ "فالربا حرام في كل صوره وأشكاله، سواء كانت الزيادة كثيرة أم قليلة، وسواء كان الاستقراض للاستثمار أم

للاستهلاك'' (الفقه الحنفي في ثوبه الجديد ۴/ ۲۲۸) (مفتي محمد اسعد فلاحی)۔

(۲) دونوں صورتوں میں اسکیم سے فائدہ اٹھانا مطلقاً جائز ہے۔اس کے قائلین حافظ کلیم اللہ عمری مدنی اور مدرسہ جامعہ عربیہ سلم العلوم ہیں۔

(۳) پہلی صورت (یعنی بینک کے قرض کا پورا انٹرسٹ حکومت ادا کرے) میں اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

اس کے قائلین قاضی عبدالجلیل قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی شاہد علی قاسمی، محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، محمد نثار عالم ندوی، محبوب فروغ احمد قاسمی، محمد ابرار خاں ندوی، مولانا محمد عثمان، ابوالمکارم معروفی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، محمد فیاض عالم قاسمی، مفتی اعجاز الحسن باندے قاسمی، سراج الحق میواتی، عبدالحمید قاسمی دیناجپوری، مفتی عبدالمنان، مفتی عارف باللہ قاسمی، رحمت اللہ ندوی، خورشید احمد اعظمی مدنی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، محمد آزاد بیگ قاسمی، خورشید انور اعظمی، مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی جنید محمد پالنپوری، محمد ممتاز خاں ندوی، عبدالتواب اناوی، مفتی حیدر علی قاسمی، مولانا محمد عرفان، محی الدین غازی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، محمد حذیفہ داحودی اور مفتی تنظیم عالم قاسمی ہیں، ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱ ''لاربوا بين سيدوعبده ولومدبرا. لامكاتبا؛إذلم يكن دينه مستغرقالرقابته وكسبه... التحقيق الإطلاق. وإنمايردالزائد لاللربا؛ بل لتعلق حق الغرماء'' (الدرالمختار مع الرد ۵/ ۱۸۵) (مفتی شاہد علی قاسمی، محمد عثمان، ابوالمکارم معروفی)

۲ ''الأصل عندأبي حنيفة أن الإنسان يجوزأن لايملك الشئ بنفسه قصدًا ويملكه بتفويضه إلى غيره ويجوز أن لايملك الشئ قصدًا ويملكه حكمًا'' (تاسيس النظر، ص: ۵۵) (مفتی تنظیم عالم قاسمی)۔

۳ ''الأمور بمقاصدها، وفيها أن الشئ الواحد يتصف بالحل والحرمة باعتبار ماقصد له'' (الأشباه والنظائر، ص: ۱۱۳) (سراج الحق میواتی، مفتی حیدر علی قاسمی)۔

۴- یہ حکومت کی طرف سے اعانت ہے، جس کے دلائل سوال نمبر (۶) کے جواب میں ذکر کردئے گئے ہیں، وہاں دیکھ لیا جائے۔

(۴) دوسری صورت (یعنی انٹرسٹ کا بڑا حصہ تو حکومت ادا کرے؛ البتہ معمولی حصہ قرض دار ادا کرے) کے سلسلہ میں مقالہ نگاروں کی کئی رائیں ہیں:

(الف) یہ صورت مطلقاً ناجائز ہے---- اس کے قائلین درج ذیل حضرات ہیں: عبدالحمید قاسمی، خورشید احمد اعظمی مدنی، محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی جعفر ملی رحمانی، آزاد بیگ قاسمی، مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی محمد رمضان سعادتی، مفتی جنید محمد پالنپوری، مولانا محمد عرفان، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، محمد حذیفہ داحودی، مفتی اعجاز الحسن باندے قاسمی، ان کے مستدلات یہ ہیں:

۱ ''والخلاصة أن القرض جائز بشرطين:أن لايجرنفعا. فإن كانت المنفعة للدافع منع اتفاقًا للنهي عنه. وخروجه عن باب المعروف. وإن كانت للقابض جاز'' (الفقه الاسلامي وأدلته: ۵/ ۳۷۹۶) (خورشید احمد اعظمی مدنی)۔

۲ ''وكل قرض شرط فيه الزيادة فهوحرام بلاخلاف'' (كتاب النوازل ۱۱/ ۳۲۳) (مفتی لطیف الرحمن فلاحی)۔

(ب) مطلق جائز ہے---اس کے قائل مفتی محمد حسین قمر الدین ماہمکر ہیں۔

(ج) عام حالت میں تو ناجائز ہے؛ البتہ ضرورتاً جائز ہے--- اس کے قائلین درج ذیل حضرات ہیں: مولانا محمد عثمان، مفتی محبوب علی وجیہی، خورشید انور اعظمی، رحمت اللہ ندوی، محمد اکرم بن مولانا اسلم رشید، قاضی عبدالجلیل قاسمی، سراج الحق میواتی، عباس بن یوسف، ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، مفتی حیدر علی قاسمی، قاضی محمد حسن ندوی، ان حضرات کے دلائل یہ ہیں:

۱ ''ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (البحر الرائق:۶/ ۱۳۷، الاشباه والنظائر) (ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، سراج الحق میواتی، خورشید انور اعظمی)۔

۲ ''الضرورات تبيح المحظورات'' (مفتی عبدالمنان)۔

☆ محمد جمیل اختر جلیلی ندوی نے ایسے فرض کفایہ علم کے حصول کے لئے اجازت دی ہے، جس کی ادائے گی کرنے والا پورے علاقہ میں کوئی نہ ہو، ورنہ

درست نہیں۔

(د) قرض کا تھوڑا سا حصہ سروس چارج کے حکم میں ہے۔ اس کے قائلین قاری ظفر الاسلام صدیقی، محمد ممتاز خاں ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی عبدالرحیم قاسمی، محمد فیاض عالم قاسمی۔

☆ مفتی شاہد علی قاسمی، ابوالمکارم معروفی، محمد فاروق، مفتی عارف باللہ قاسمی، اور عبدالتواب اناوی کی رائے یہ ہے کہ اگر سود کی مالیت اتنی کم ہو کہ سروس چارج کہا جاسکے تو جائز ہے، ورنہ سوائے بدرجۂ مجبوری کے جائز نہیں۔

سوال نمبر (۱۲): حکومت کا اپنے محفوظ سودی فنڈ سے افراد واشخاص کے تعاون کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب: اس سلسلہ میں مقالہ نگاروں کی تین رائیں ہیں:

(۱) ایسی اسکیم سے استفادہ جائز ہے۔ اس کے قائلین درج ذیل حضرات ہیں:

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مفتی حسین قمر الدین ماہمکر، مفتی محبوب علی وجیہی، محمد اکرم بن مولانا اسلم رشید، مفتی محمد رمضان سعادتی، محمد فاروق، محمد ممتاز خاں ندوی، عبدالتواب اناوی، محی الدین غازی، مفتی لطیف الرحمن فلاحی، مفتی اقبال احمد ٹنکاروی، مفتی جنید محمد پالنپوری، قاضی عبدالجلیل قاسمی، خورشید انور اعظمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی عبدالمنان، محمد فیاض عالم قاسمی، مفتی تنظیم عالم قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، محبوب فروغ احمد قاسمی، محمد نثار عالم ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، محمد عثمان، ابوالمکارم معروفی، مفتی حیدر علی قاسمی، خورشید احمد اعظمی مدنی، مفتی محمد اسعد فلاحی، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، محمد قمر الزماں ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، ان کے مستدلات درج ذیل ہیں:

۱ ''أتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلحم، فقیل: تصدق علی بریرۃ، قال: ھولھاصدقۃ، ولنا ھدیۃ'' (بخاری، حدیث نمبر: ۲۵۷۷) (خورشید احمد اعظمی مدنی، محمد فیاض عالم قاسمی، مفتی محمد اسعد فلاحی، محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مفتی اقبال احمد ٹنکاروی)۔

۲ ''عن ابن مسعود أنہ سئل عمن لہ جار، یأکل الربا علانیۃ، ولایتحرج من مال خبیث یأخذہ، یدعوہ إلی طعام. قال: أجیبوہ، فإنما المھنأ لکم، والوزر علیہ'' (جامع العلوم والحکم، ص: ۷۱) (محمد جمیل اختر جلیلی ندوی)۔

۳ ''تبدل الملك بمنزلۃ تبدل العین'' (رد المحتار: ۳/ ۲۸۷) (خورشید احمد اعظمی مدنی، محمد فیاض عالم قاسمی)۔

۴ ''ولو أن حربیًا باع من حربی درھما بدرھمین، ثم خرجا إلی دار السلام مسلمین أو ذمیین، واختصما إلی القاضی، فإن کان ذلك بعد التقابض، فالقاضی لایتعرض لذلك، ولایبطلہ'' (المحیط البرہانی: ۸/ ۳۷۷) (ابوالمکارم معروفی، محمد عثمان)۔

۵ ''وجاز أخذ دین علی کافر من ثمن خمر، بخلاف المسلم'' (درر الحکام: ۱/ ۲۱۸) (مفتی شاہد علی قاسمی، محمد اکرم بن مولانا اسلم رشید، مفتی محمد رمضان سعادتی)۔

۶ ''فإذا أخذہ برضاھم فقد أخذ مالا مباحا بلا عذر'' (تبیین الحقائق: ۴/ ۹۷) (خورشید انور اعظمی)۔

(۲) ایسی اسکیم سے استفادہ ناجائز ہے۔ اس کے قائلین مندرجہ ذیل مقالہ نگار ہیں:

عباس بن یوسف سعادتی، محمد آزاد بیگ قاسمی، سراج الحق میواتی، دار الافتاء جامعہ سلفیہ بنارس، مفتی ارشاد پالنپوری، حفیظ الرحمن اعظمی مدنی، ان کے دلائل یہ ہیں:

۱ ''ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان'' (المائدۃ: ۲) (دار الافتاء جامعہ سلفیہ بنارس)۔

۲- حرمت ربوا پر دلالت کرنے والی قرآنی آیات (دیکھئے مقالہ: حفیظ الرحمن اعظمی مدنی)۔

۳ ''درء المفاسد أولى من جلب المصالح. فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبًا'' (الاشباه.ص: ۲۶۴) (سراج الحق میواتی)۔

۴ ''الحرام ينتقل،أى تنتقل الحرمة ، وإن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاك'' (شامی: ۷/ ۳۰۰) (محمد آزاد بیگ قاسمی)۔

۵ ''فما أخذه المرابي زيادة على القرض فهو فى حكم الغصب والرشوة. ومن كان متمحضا من الربا لايجوز قبول الهدية منه ولا إجابة دعوته ولا عقد الشراء أو البيع'' (فقه البيوع: ۲/ ۱۰۵۸) (عباس بن یوسف سعادتی)۔

(۳) عام حالت میں درست نہیں، مستحقین کے لئے اور مجبوری کی حالت میں گنجائش ہے۔اس کے قائلین درج ذیل حضرات ہیں:

محمد صابر حسین ندوی، عبدالحمید قاسمی، محمد زبیر ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، محمد فلاحی، قاری ظفر الاسلام صدیقی، محمد عرفان، مفتی جعفر ملی رحمانی، رحمت اللہ ندوی، مفتی اعجاز الحسن پانڈے قاسمی، ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱ ''فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه'' (البقرة: ۱۷۳) (محمد صابر حسین ندوی)۔

۲ ''الربا لاتصح إباحته فى الشرع تبعا'' (الموسوعة الفقهية) (محمد صابر حسین ندوی)۔

☆ ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی کی رائے یہ ہے کہ اگر تعلیمی ورفاہی ادارے ضرورت مند ہیں تو بیت الخلاء، راستے اور دیگر عمومی مصالح کے لئے ایسی اسکیم سے استفادہ کی گنجائش ہے، جب کہ اشخاص وافراد میں صرف مستحقین کے لئے گنجائش ہے۔

☆ حافظ کلیم اللہ عمری مدنی اور مفتی تنظیم عالم قاسمی کی رائے میں تقوی پر عمل کرتے ہوئے اجتناب بہتر ہے۔

☆ محمد حذیفہ داحودی کی رائے یہ ہے کہ اگر حکومت اس رقم میں دوسری رقوم کو ملا دیتی ہے تو اس سے استفادہ جائز ہے، ورنہ نہیں۔

''ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه ... لأن الخلط استهلاك'' (درمختار مع الرد ۲/ ۲۱۷)۔

***

سرکاری جاری کردہ اسکیمیں ایک عمومی جائزہ

عبدالرشید اگوان[1]

کسی بھی ملک میں سرکار کا کام اپنے عوام میں نظم وضبط پیدا کرنا، ان کے بیچ انصاف قائم کرنا، ان کی ترقی کے لئے منصوبے بنانا اور فلاح عام کا نظام ہوتا ہے اور اس کے لئے وہ عوامی وسائل سے آمدنی اور ٹیکس کے ذریعہ رقومات جمع کر کے اپنی اسکیموں کو بروئے کار لاتی ہے۔ ہمارے ملک میں سرکار بجٹ اور خصوصی اہتمام کے ذریعہ عوام الناس کی بہتری کے لئے اسکیمیں بناتی ہے اور ان پر حتی الامکان عمل کرتی ہے۔ بھارت میں رہنے والے ۲۰ کروڑ کے قریب مسلمان بھی معاشرے کا ایک اہم جز ہیں اور سرکار کی مختلف اسکیموں سے استفادہ کے ذریعہ ترقی کر سکتے ہیں، اور اپنی فلاح وبہبود کے لئے اس سے مدد لے سکتے ہیں۔ مگر چونکہ سرکار کی بہت سی اسکیموں میں سود کا عنصر شامل ہے، اس لئے یہ سوال اٹھنا لازم ہے کہ مسلمانوں کو کن اسکیموں سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور کن سے گریز کرنا چاہئے۔ ذیل میں مرکزی حکومت کی ان اسکیموں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے جن کے بارے میں اس پہلو سے غور کرنا ضروری ہے کہ مسلمان ان کے بارے میں کیا رویہ اختیار کریں۔ صوبائی اسکیموں پر بھی اسی طرح قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ایک عمومی جائزہ:

مرکزی حکومت کی فلاحی اسکیموں کو اپنی نوعیت کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلی جو تمام لوگوں کے لئے ہیں، دوسری وہ جو تمام اقلیتوں کے لئے ہیں، اور تیسری وہ جو براہ راست مسلمانوں کے لئے ہوتی ہیں۔ اسی طرح وسائل کے ماخذ کے لحاظ سے بھی انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی کہ مختلف قسم کے ٹیکس سے آمد، سرکاری املاک اور اثاثہ کے فروخت یا آمدنی سے آمد اور سرکار کے بینک کھاتوں یا اسکیم کے لئے جمع (Corpus) پر سود سے آمد۔ جو فلاحی اسکیمیں سرکار چلاتی ہیں ان کے لئے وسائل کی فراہمی بھی تین طرح سے ہوتی ہے، یعنی بجٹ میں ایک رقم مختص کر کے، کسی خاص اسکیم کے لئے ایک کثیر رقم بینک میں جمع کرا کر صرف اس کے متعین سود کی آمد سے اسکیم کو چلانا اور بعض اسکیموں میں سبسڈی کے ذریعہ ضرورت مندوں کی مدد کرنا۔(۱)

عمومی فلاحی اسکیمیں:

عمومی فلاحی اسکیموں سے ملک کا ہر مستحق شہری فائدہ اٹھا سکتا ہے اور حسب ضرورت اور استحقاق مسلمان بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں یا اٹھاتے ہیں، مثلاً:

۱- تعلیم اور تعلیمی وظائف

۲- غرباء اور مساکین کے لئے راشن

۳- مستحق بزرگوں، بیواؤں اور بیواؤں کی بچیوں کے لئے پینشن، شادی میں امداد اور علاج میں سہولتیں وغیرہ

۴- نوجوانوں کی صنعتی تربیت اور کاروبار کے لئے قرض

۵- آنگن باڑی کے ذریعہ چھوٹے بچوں کی نگہداشت، تعلیم اور کھانے کا عشائیہ

---

[1]

۶-اسکولوں میں مڈڈے میل کا اہتمام

۷-بیماریوں کے خلاف ٹیکے

۸-زچگی میں سرکاری امداد

۹-ثقافتی تبادلے کے تحت دوسرے ملکوں میں تعلیم کے وظائف

۱۰-بیت الخلاء اور پینے کے پانی کا انتظام

۱۱-بی پی ایل کے تحت ملنے والے مختلف امداد

۱۲-علاج کے لئے مستحقین کے لئے بیما اسکیمیں

۱۳-سفر میں حادثات کے لئے بیما اور مالی امداد کی اسکیمیں

۱۴-کارخانوں اور فیکٹریوں میں حادثات کے لئے سرکاری یا سرکاری حکم پر امداد

۱۵-معذورین کے لئے اسکیمیں اور سہولیات

۱۶-کسانوں کے لئے قرض معافی وسبسڈی

۱۷-خواتین کو مختلف ٹیکسوں میں چھوٹ

بجٹ میں سود کا عنصر:

سرکار کے سالانہ بجٹ میں ٹیکس ودیگر آمدنیوں کے علاوہ ایک رقم سودی آمدنی کی بھی شامل ہوتی ہے۔اسی طرح سرکاری خرچوں میں ایک بڑی رقم سود اور قرض کی ادائیگی کے لئے بھی دی جاتی ہے، مثلاً ابھی حال ہی میں مرکزی حکومت کے پیش کردہ 18-2017 کے بجٹ میں 19.021 کروڑ روپئے کی آمدنی سود سے دکھائی گئی ہے، وہیں 5.23.078 کروڑ روپئے سود اور قرض واپسی کی مد میں شامل کئے گئے ہیں، اس طرح سرکار سود کی آمدنی سے کہیں زیادہ سودی رقم کی واپسی پر خرچ کرتی ہے۔(۲)

سرکاری بجٹ میں خرچ کا ایک کثیر حصہ سرکار کو بینکوں کی گارنٹی کے لئے دی گئی امداد کا بھی ہوتا ہے جو اصلاً بینکوں کو سرکاری امداد ہوتی ہے مگر بینک اس رقم کو مستحقین کو سرکار کی ضمانت پر قرض کی شکل میں دے دیتے ہیں جس پر سود لگا کر اس رقم کی واپسی کی امید کی جاتی ہے، مثلاً سال رواں کے بجٹ میں 10.000 کروڑ روپئے سرکار نے سرکاری بینکوں کو دینے کے لئے مختص کئے ہیں۔

اقلیتوں بشمول مسلمانوں کے لئے اسکیمیں:

اقلیتوں کے لئے خاص کی گئی اسکیمیں:

وزارت برائے اقلیتی امور کے تحت بہت سی اسکیمیں جاری ہیں جن سے ملک کی منظور شدہ اقلیتوں کے مستحق افراد اور ادارے فائدہ اٹھا سکتے ہیں مثلاً:

۱-وظائف:

درجہ اول سے لیکر پی ایچ ڈی تک تعلیم کے لئے سرکار ہر سال ایک متعین رقم مستحق طلبا وطالبات کو ادا کرتی ہے، اس میں صوبے اور اقلیتوں کی آبادی کے لحاظ سے کوٹا ہوتا ہے، چونکہ اقلیتوں کی کل آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 75% ہے، اس لئے وظائف کی تمام اسکیموں میں تین چوتھائی تعداد مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ان اسکیموں کے نام ہیں: پری میٹرک مائناریٹی اسکالرشپ، پوسٹ میٹرک مائناریٹی اسکالرشپ، میرٹ کم مینس

اسکالرشپ اور مولانا آزاد ریسرچ فیلوشپ۔ یہ تمام اسکیمیں مرکزی بجٹ میں ایک رقم مختص کر کے چلائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کئی صوبائی حکومتیں بھی وظائف کی اسکیمیں چلاتی ہیں۔ (۳)

۲-کوچنگ اسکیمیں:

اقلیتوں سے جڑے ہونہار طلبا کے لئے اچھے کورس میں داخلہ کے لئے اور سرکاری نوکریاں حاصل کرنے کے لئے کوچنگ فراہم کرنے کے لئے یونیورسٹیوں یا فلاحی اداروں یا ٹریننگ دینے والی کمپنیوں کو سرکار مدد فراہم کرتی ہے، یہ رقم بھی بجٹ کے ذریعہ ہی فراہم کی جاتی ہے۔

۳-ایم ایس ڈی پی: (ملٹی سیکٹرل ڈیولپمنٹ پروگرام):

اس اسکیم کے تحت جن اضلاع یا بلاک میں اقلیتی طبقوں کی آبادی ۲۰ فیصد سے زیادہ ہوتی ہے وہاں بنیادی ڈھانچوں مثلاً اسکول، اسپتال، ہاسٹل، آئی ٹی آئی، روڈ، پانی کی سہولت، وغیرہ کے لئے منظور شدہ پروجیکٹ کے مطابق ضلع کلکٹر کی معرفت رقم خرچ کی جاتی ہے، ان اسکیموں سے اقلیتی طبقے اور دوسرے طبقات بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۴-صنعتی قرض:

نیشنل مائنارٹیز ڈیولپمنٹ فائنانشیل کارپوریشن (NMDFC) اقلیتوں کو صنعتی قرض دلواتا ہے اور مسلمان بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں یا اٹھا سکتے ہیں۔ یہ ادارہ ۱۹۹۴ میں قائم کیا گیا اور ایک خاص رقم بینکوں میں Corpus رکھ کر اس کی سالانہ اضافی رقم سے قرض دیئے جاتے ہیں، فی الحال یہ (Corpus) ۱۵۰۰ کروڑ کا ہے جس کی آمدنی میں سے سالانہ ۲۰ لاکھ روپے تک کے کاروباری قرض مرد کو 8٪ کی شرح سود پر اور خواتین کو 6٪ کی شرح سود پر زرضمانت کے ذریعہ دیئے جاسکتے ہیں۔ یہ ادارہ صنعتی تربیت کے لئے مستحق طلباء کو سود پر قرض بھی دیتا ہے۔

۵-مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن:

یہ ادارہ مولانا آزاد کی سالگرہ کے موقع پر ۱۰۰ کروڑ کی رقم کے (Corpus) سے بنایا گیا تھا جس کے سود کی آمدنی سے اس کی دو اسکیمیں چلائی جاتی ہیں، پہلی اسکیم میں تعلیمی اداروں، آئی ٹی آئی، ہاسٹل وغیرہ کی تعمیر اور ان کی لیباریٹری کے لئے آلات اور مشینوں کے لئے امداد فراہم کی جاتی ہے، اور دوسری اسکیم میں اچھے نمبرات سے دسویں پاس کرنے والی لڑکیوں کو گیارہویں اور بارہویں میں تعلیم کے لئے 10,000 روپئے سالانہ کی امداد دی جاتی ہے، گوکہ اداروں اور طالبات کی امداد پر کوئی سود یا قرض واپسی کی شرط نہیں ہے، مگر فاؤنڈیشن کی آمدنی سود سے ہی ہوتی ہے۔

۶-دیگر اسکیمیں:

وزارت برائے اقلیتی امور کے تحت چند دوسری اسکیمیں ہیں، مثلاً اسکل ڈیولپمنٹ (Skill Development)، اور صنعتی تربیت کے لئے امداد، ''نئی منزل'' کے تحت خواتین میں قائدانہ صلاحیت پیدا کرنے کے لئے اور مختلف پروگرام منعقد کرنے کے لئے ''نئی روشنی'' کے تحت امداد، اسکول چھوڑ دینے والے بچوں کی تربیت اور قابلیت پیدا کرنے کے لئے ''استاد''، اور نوجوانوں میں اسکل پیدا کرنے کے لئے (MANAS)۔ ان سبھی اسکیموں کے لئے بجٹ میں رقم مختص کی جاتی ہے۔

مسلمانوں کے لئے براہ راست اسکیمیں:

سرکاری اسکیموں میں کچھ اسکیمیں ایسی ہیں جن سے مسلمان براہ راست فائدہ اٹھاتے ہیں جو کہ مدرسوں کی جدید کاری کے لئے امداد، فروغ اردو، حج سبسڈی اور مرکزی وقف کونسل کی اسکیموں کی شکل میں موجود ہیں۔ (۵)

۱-مدرسوں کی جدید کاری:

مرکزی وزارت برائے ترقی انسانی وسائل (HRD) کے تحت مدرسہ موڈرنائزیشن کے لئے منظور شدہ مدرسوں کو اپنے دینی تعلیم کے طلبا اور طالبات کو جدید مضامین، مثلاً انگریزی، ریاضی، سائنس اور ہندی پڑھانے کے لئے اساتذہ کے طے شدہ مشاہروں کے ذریعہ مدد کی جاتی ہے، فی الحال یہ اسکیم ۱۲۰ کروڑ روپئے سالانہ ہے جو کہ بجٹ میں رقم مختص کر کے فراہم کی جاتی ہے۔

۲-حج سبسڈی:

مرکزی حکومت حج سبسڈی کے تحت تقریباً ۷۰۰ کروڑ روپئے سالانہ ادا کرتی ہے جو حاجیوں کے ٹکٹ کی کل رقم میں شامل ہوتا ہے، یہ رقم بھی بجٹ میں شامل کر کے فراہم کی جاتی ہے۔

۳-مرکزی وقف کونسل:

صوبائی اوقاف سے سالانہ آمدنی اور مرکزی حکومت کی فراہم کردہ رقم سے مرکزی وقف کونسل کو امدادی رقم فراہم کی جاتی ہے، وقف کونسل کے تحت چلنے والی اسکیمیں اس طرح ہیں:

۱-آئی ٹی آئی کی تعمیر کے لئے مسلم اکثریت والے علاقوں میں ادارہ بنانے کے لئے امداد

۲-فلاحی تنظیموں اور اداروں کو امداد

۳-لائبریری اور بک بینک بنانے کے لئے اداروں کی مدد

۴-شہری اوقاف کی ترقی کا ادارہ:

نیشنل وقف ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا قیام 2015 میں ہوا جسے 1975 سے شہری وقف کی ترقی کے لئے مرکزی وقف کونسل کی سودی قرض اسکیم کی تجدید کے بعد قائم کیا گیا، اس کے ۱۰۰ ارکروڑ کے Corpus میں ۴۹ فیصد حصہ NMDFC کا، ۹ فیصد حصہ مرکزی وقف کونسل کا اور باقی اوقاف سے جڑے دیگر اداروں کا رکھا گیا ہے۔ اس کا مقصد وقف جائداد کو کارآمد بنانا ہے، تا کہ ان سے دور جدید کے مطابق مناسب آمدنی ہو جو کہ مسلمانوں اور ملک کی ترقی کے لئے استعمال ہو سکے۔ اس کے تحت کسی وقف کو بہتر اور مالی اعتبار سے مفید بنانے کے لئے طویل مدتی قرض فراہم کیا جاتا ہے۔ گو کہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ قرض بلاسودی ہے، مگر ''ایجوکیشن ڈونیشن'' کے نام پر قرض دار ادارے کو قرض کی 6٪ سالانہ رقم تب تک ادا کرنی پڑتی ہے جب تک کہ دی گئی اصل رقم کی ادائیگی نہیں ہو جاتی۔

چند سوال:

ان اسکیموں کے بارے میں چند ابھرنے والے اہم سوالات درج ذیل ہیں:

۱- مرکزی حکومت کے کل بجٹ میں سودی آمدنی اور خرچ کا ایک عنصر شامل ہے، حالانکہ سود کی آمدنی سے زیادہ سود کی ادائیگی پر خرچ ہوتا ہے۔ کیا اس سے سرکار کی تمام اسکیموں سے استفادہ میں کوئی حرج واقع ہوگا؟

۲- جس طرح سرکاری ملازمین، جن میں مسلمان بھی شامل ہیں کو تمام تنخواہیں اور پنشن کارپس (Corpus) کی رقم کے سود سے فراہم کی جاتی ہے، کیا کارپس سودی یا غیر سودی آمدنی سے چلنے والی اسکیموں کی کوئی مطابقت ہے؟

۳- حج سبسڈی کے نام پر حاجیوں سے معمول سے زیادہ کرایا وصول کر کے سرکاری ہوائی جہاز کمپنی کو مدد دی جاتی ہے، کیا اس کے خلاف آواز بلند ہونی چاہئے؟

۴- کیا سودی آمدنی والے کارپس سے امداد مثلاً مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن بھی سودی رقم والی مانی جائے گی؟ یا پھر کارپس بنانا سرکاری ذمہ داری سمجھ کر اس امداد کو سودی نہیں مانا جائے گا۔

۵- کیا ''ایجوکیشن ڈونیشن'' کے نام پر 6٪ اضافی رقم کو سود مانا جائے گا۔؟

۶- ''پڑھو پردیش'' کے نام سے وزارت کی ایک اسکیم ہے جس میں ملک سے باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو ۱۰ لاکھ روپئے تک کا قرض دیا جاتا ہے جس کی زرِ ضمانت سرکار ادا کرتی ہے، مگر یہ رقم سود کے ساتھ واپس ادا کرنے کی ذمہ داری طالب علم کی ہوتی ہے۔

۷- فروغ اردو: وزارت برائے ترقی انسانی وسائل کے تحت فروغ اردو کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو (NCPUL) کی جانب سے اردو کمپیوٹر سنٹر کھولنے، اردو اور عربی تعلیم کے لیے کورس، اردو میں کتابوں کی اشاعت، ترجمہ کے لیے رقم فراہم کی جاتی ہے۔ یہ رقم سالانہ بجٹ کا حصہ ہوتا ہے۔

۸- وزارت ترقی انسانی وسائل (HRD) کے تحت اقلیتی اسکولوں کی تعمیر کے لیے (IDMI) اسکیم چلائی جاتی ہے جو کہ اس وقت بند ہے۔ یہ اسکیم بجٹ میں رقم مختص کر کے چلتی ہے۔ کیا مسلمانوں کو اس اسکیم کو دوبارہ چلانے کی مانگ کرنی چاہئے؟

حواشی

۱- سرکاران تین طرح کی آمدنیوں کا ایک اندازہ لگالیتی ہے اور پھر بجٹ بناتی ہے، اور مختلف اسکیموں کے لئے فنڈ مختص کرتی ہے، ان آمدنیوں میں سودی اور غیر سودی دونوں شامل ہوتی ہیں، اور بجٹ بناتے وقت ان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا ہے۔

۲- یعنی سرکار کسی کمپنی، ادارہ یا کسی ملک سے سودی قرض لیتی ہے تو ادائیگی کے وقت طے شدہ سود سے زیادہ رقم سرکار کو ادا کرنی پڑتی ہے، اس طرح سود سے حاصل ہونے والی آمدنی سود میں چلی جاتی ہے۔

۳- اس میں صرف مولانا آزاد ریسرچ فیلوشپ سودی رقم سے ملتی ہے، بقیہ اسکالرشپ مرکزی بجٹ سے دیا جاتا ہے۔

۴- کارپس کا مطلب یہ ہے کہ کسی پروجیکٹ کے لئے ایک رقم مختص کر کے بینک یا کمپنی کے حوالہ کر دیا جائے اور پھر اس سے جو رقم بطور سود ملے اسے اس پروجیکٹ پر خرچ کیا جائے۔

۵- اس کے لئے حکومت فنڈ مختص کر دیتی ہے، اس میں سودی اور غیر سودی رقم کی تخصیص نہیں ہوتی ہے۔



باب اول تفصیلی مقالات

سرکاری اسکیموں سے استفادہ، احکام اور مسائل

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی[1]

تمہید:

سرکاریں عام شہریوں کے فائدے کے لئے مختلف اسکیمیں جاری کرتی ہیں، جن کا انتظام سرکاری خزانہ سے ہوتا ہے جو عوام کی ملکیت ہے، اگرچہ کوئی فرد اپنی انفرادی حیثیت سے سرکاری خزانہ کا مالک نہیں ہے، لیکن ہر فرد اپنی انفرادی حیثیت میں عوامی خزانہ سے مقررہ ضابطے کے تحت فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ چنانچہ عوامی خزانہ ایک ایسی مشترکہ دولت ہے جس سے فائدہ اٹھانے کا حق عام ہندوستانی باشندوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے، لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ سرکاری ترقیاتی اسکیموں (Scheme)، دوکان اور مکانات کی تعمیر، تجارت کی ترقی، صنعت وحرفت کی ہمت افزائی اور بیکاروں کو باکار بنانے کے لئے حکومتی پروجیکٹوں (Porojects) سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

سوال نمبر (۱) کا جواب:

ایسے حکومتی قرضے لینا جائز ہے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة. وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون" (۲/البقرہ: ۲۸۰)

(اور اگر مقروض نادار وتنگ دست ہو تو فراخی وکشادگی تک اس کو مہلت دو، اور معاف کردو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم سمجھو)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پوری اصل رقم معاف کرنے کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ یہ بہت بہتر اقدام ہے، اور اس کا اجر وثواب بے پایاں ہے، تو جب پوری اصل رقم معاف کرنے کی اجازت ہے، تو قرض کے کچھ حصہ کو معاف کرنے کی بدرجۂ اولیٰ اجازت ہوگی۔

آلوسی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: "وتصدقكم على معسري غرمائكم برؤوس أموالكم كلا أو بعضًا (خير لكم) أي أكثر ثوابًا من الإنظار" (الوسی، روح المعانی ۲/ ۵۴، بیروت، دار الاحیاء، ج۔أ: ۳۰)

(تمہارا اپنے غریب اور نادار مقروضوں کو مکمل اصل رقم یا اس کا کچھ حصہ بخش دینا تمہارے لئے مہلت دینے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے)۔

۲۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

"أنه تقاضى ابن أبي حدرد دينا كان له عليه في المسجد، فارتفعت أصواتهما، حتى سمعها رسول الله ﷺ وهو في بيته، فخرج إليهما حتى كشف سجف حجرته، فنادى يا كعب! قال: لبيك يا رسول الله! قال: ضع من دينك هذا، وأومأ إليه أي الشطر، قال: لقد فعلت يا رسول الله! قال: قم فاقضه" (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۵۵۸)

(انہوں نے ابن ابی حدرد سے مسجد کے اندر اپنے اس دین کا تقاضا کیا جو اس کے ذمہ تھا، سو دونوں کی آواز بلند ہوگئی، یہاں تک کہ رسول

---

[1] عمید کلیۃ الحدیث جامعہ اسلامیہ، شانتاپرم، مالاپرم، کیرالہ۔

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر کے اندر ہماری آواز سنی اور ہماری طرف نکلے اور اپنے حجرہ کا پردہ ہٹایا اور ندا لگائی اے کعب! انہوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول میں حاضر ہوں، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: اپنے دین میں سے اتنا، یعنی آدھا کم کردو، انہوں نے کہا، اے اللہ کے رسول میں نے ایسا کیا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن حدرد کو حکم دیا کہ اٹھو اور بقیہ دین ادا کردو)۔

۳۔ حضرت ابو مسعود بدری انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''حوسب لرجل ممن كان قبلكم، فلم يوجد له من الخير شئي، إلا أنه كان يخالط الناس، وكان موسرًا، فكان يأمر غلمانه أن يتجاوزوا عن المعسر، قال: قال الله عزوجل: نحن أحق بذلك منه، تجاوزوا عنه'' (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۵۶۱، بخاری، الادب المفرد، حدیث نمبر: ۲۹۳، سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۰۷)

(تم سے پہلی امت کے ایک شخص کا حساب لیا گیا، لیکن اس کی نیکی سے کوئی غیر معمولی چیز نہیں پائی گئی، البتہ لوگوں سے اس کا معاملہ تھا، اور وہ مالدار تھا، اور اپنے غلاموں کو حکم دیتا تھا کہ تنگ دست سے درگزر کرو اور اسے معاف کردو، سو اللہ تعالی نے فرمایا: میں اس سے زیادہ اس بات کا حقدار ہوں، اسے معاف کردو)۔

۴۔ حضرت ابوالیسر کعب بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من أنظر معسرًا أو وضع عنه، أظله الله فی ظله'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۳۰۰۶، صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۵۰۴۴، طحاوی، شرح مشکل الآثار، حدیث نمبر: ۳۸۱۷، مسند احمد حدیث نمبر: ۱۵۵۲۱) (جو تنگ دست کو مہلت دے یا اس کے دین معاف کردے، اسے اللہ تعالی اپنے سایہ میں جگہ دے گا)۔

یہ احادیث اگرچہ انفرادی معافی کی فضیلت کو اجاگر کررہی ہیں، لیکن حاکم وقت کو بھی حق ہے کہ عوامی خزانہ سے لیے گئے پورے قرض کو یا اس کے کچھ حصہ کو معاف کردے، کیونکہ سرکاری خزانہ کا ایک مصرف یہ بھی ہے کہ اس سے ناداروں اور غریبوں کی مدد کی جائے، چنانچہ علامہ کاسانی رقمطراز ہیں:

''وأما النوع الرابع فيصرف إلى دواء الفقراء والمرضى وعلاجهم ... وعلى الإمام صرف هذه الحقوق إلى مستحقيها'' (کاسانی، بدائع الصنائع ۲/۶۹، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۹۸۲ء)

(بہر حال چوتھی قسم تو اسے فقراء اور بیماروں کے علاج ومعالجہ اور ان کی دوا کی فراہمی میں خرچ کیا جائے گا... اور امام پر واجب ہے کہ ان حقوق کو ان کے حقداروں تک پہنچائے، اور صحیح مصرف میں استعمال کرے اور واقعی مد میں خرچ کرے)۔ اور یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ حاکم وقت کو ایسے قوانین بنانے کا حق ہے جو معاملات کو منظم کریں، اور ان سے لوگوں کے حق میں عمومی مصلحت حاصل ہو۔

لہذا قرض کا حقدار حکومت کی معافی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

سوال نمبر (۲) کا جواب:

قرض میں اگر سود کی شرط نہیں ہے تو وہ بہر صورت جائز ہے، خواہ اس میں یہ قید ہو کہ ایک سال کے اندر مثلاً قرض کی واپسی پر نصف قرض معاف کردیا جائے گا، اور ایک سال کے بعد ادا کرنے کی صورت میں قرض کی پوری رقم ادا کرنی ہوگی، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ یہ قرض حسن ہے جس میں کسی طرح کا کوئی سود نہیں ہے، اور اسلام کی نگاہ میں قرض حسن کی بڑی فضیلت ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"من ذا الذی يقرض الله قرضًا حسنًا فيضاعفه له أضعافًا كثيرة، والله يقبض ويبسط وإليه ترجعون" (۲/ البقرہ: ۲۴۵)

(اور کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ اللہ اس کو اس کے لئے کئی گنا بڑھائے، اللہ ہی ہے جو تنگ دستی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی دیتا ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا بھی ہے)۔ اور ایک جگہ ارشاد ہے:

"من ذا الذی يقرض الله قرضًا حسنًا فيضاعفه له وله أجر كريم" (۵۷/ الحدید: ۱۱)

(کون ہے کہ اللہ کو قرض دے اچھا قرض کہ وہ اس کو اس کے لئے بڑھائے، اور اس کے لئے باعزت صلہ ہے)۔

اگر چہ ان آیات کے اندر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے، لیکن انسانوں کو دیا جانے والا قرض حسنہ بھی اسی فضیلت میں داخل ہے۔

۲۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''رأيت ليلة أسرى بي على باب الجنة مكتوبًا: الصدقة بعشر أمثالها، والقرض بثمانية عشر. فقلت لجبريل: ما بال القرض أفضل من الصدقة؟ قال: لأن السائل يسأل وعنده. والمستقرض لا يستقرض إلا من حاجة'' (سنن ابن ماجه حدیث نمبر: ۲۴۳۱، اور اس کی سند میں کلام ہے)

(معراج کی رات میں نے جنت کے دروازہ پر یہ لکھا ہوا پایا: صدقہ کا ثواب دس گنا ملتا ہے، اور قرض کا ثواب اٹھارہ گنا ملتا ہے، سو اس پر میں نے حضرت جبریل سے پوچھا: قرض صدقہ سے کیوں افضل ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ بھکاری بھیک مانگتا ہے حالانکہ اس کے پاس کچھ مال ہوتا ہے، جبکہ قرض کا خواستگار ضرورت کی بنا پر ہی قرض طلب کرتا ہے)۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من كان فى حاجة أخيه، كان الله عزوجل فى حاجته، ومن فرج عن مسلم كربة، فرج الله عزوجل عنه بها كربة من كرب يوم القيامة'' (صحيح البخارى حديث نمبر: ۲۴۴۲، ۶۹۵۱، صحيح مسلم حديث نمبر: ۲۵۸۰، سنن ابى داؤد، حديث نمبر: ۴۸۹۳، سنن ترمذى حديث نمبر: ۱۴۲۶، نسائى، السنن الكبرى، حديث نمبر: ۷۲۹۱)

(جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا، اللہ عزوجل اس کی ضرورت پوری کرے گا، اور جو مسلمان کی پریشانی دور کرے گا، تو اللہ عزوجل قیامت کی اس کی پریشانیوں میں سے کسی پریشانی کا ازالہ فرمائے گا)۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ما من مسلم يقرض مسلمًا قرضًا مرتين إلا كان كصدقتها مرة'' (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۴۳۰، دیلمی، الفردوس، حدیث نمبر: ۶۰۶۶، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (جو مسلمان کسی مسلمان کو دو مرتبہ قرض دے گا، وہ ایک بار اس کے صدقہ دینے کے درجہ میں ہے)۔

۵۔ سرکاری خزانہ چونکہ عوامی ملکیت ہے، لہٰذا مقررہ ضابطے کے تحت حکومت کو عام لوگوں کی بھلائی کے لئے قرض کا کل یا بعض حصہ معاف کرنے کا اختیار ہے، اور قرض کے حقدار کو اس معافی سے فائدہ اٹھانے کا بھی حق ہے۔

۶۔ علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

''وأما الذى يرجع إلى نفس القرض فهو أن لا يكون فيه جر منفعة، فإن كان لم يجز'' (کاسانی، بدائع الصنائع ۷/ ۳۹۵) (بہرحال جس شرط کا تعلق نفس قرض سے ہے تو وہ یہ ہے کہ اس میں نفع کی تحصیل نہ ہو، سو اگر قرض فائدہ پر مشتمل ہو تو جائز نہیں ہے)۔

اور چونکہ معافی والا قرضہ نفع کی شرط سے خالی ہے، لہٰذا جائز ہے۔

سوال نمبر (۳) کا جواب:

مہلت اور میعاد کے بدلہ جو زیادتی طلب کی جاتی ہے وہ سود ہے، چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں سود کا یہی طریقہ زیادہ رائج تھا، جیسا کہ علامہ ابن عادل ابوحفص عمر بن علی (و: ۸۸۰ھ) رقمطراز ہیں:

''ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا فى الحق والأجل، فهذا هو الربا الذى كانوا يتعاملون به فى الجاهلية'' (ابن عادل، اللباب فى علوم الكتاب ۴/ ۴۴۸، بيروت، العلميه، ۱۴۱۹ھ-۱۹۹۸ء، ط:۱)

(پھر جب دین کی ادائیگی کا وقت آتا، تو قرض دینے والے افراد مقروض سے اصل رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتے، سو اگر اس کے لئے قرض کی رقم ادا کرنا دشوار ہوتا تو رقم اور مدت میں اضافہ کر دیتے، چنانچہ یہ سود کی وہ صورت ہے جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھی)۔

لہٰذا مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنے کی شرط سودی شرط ہے، اور جو معاملہ بھی سودی شرط پر مشتمل ہو وہ قطعی طور سے حرام ہے، اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة" (۲/البقرہ: ۲۸۰) (اور اگر مقروض نادار ہو تو ہاتھ کشادہ ہونے تک اس کو مہلت دو)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تنگ دست کو مہلت دینا واجب ہے، اور قرض کو سودی قرض میں تبدیل کر دینا حرام ہے۔ لہٰذا شروع سے ہی یہ عقد حرام ہے اگر چہ مقررہ مدت کے بعد ادائیگی نہ ہو؛ کیونکہ اصل اعتبار شرط لگانے کا ہے، اور تاخیر کی صورت میں زائد رقم کی شرط سودی اضافہ کی شرط ہے جو واضح طور سے حرام ہے، اور اس امر کا کوئی اعتبار نہیں ہے کہ شاید وقت مقررہ پر ہی ادائیگی ہو جائے، اس لئے کہ حرمت کا تعلق اصل عقد سے ہے نہ کہ ادائیگی سے۔

۲۔ اصل رقم پر اضافہ کی شرط عقد کو فاسد کرنے والی شرطوں میں سے ایک شرط ہے کیونکہ فساد کے عمومی اسباب میں سے ایک ربا ہے، چنانچہ ابن رشد حفید رقمطراز ہیں:

"وإذا اعتبرت الأسباب التي من قبلها ورد النهي الشرعي في البيوع، وهي أسباب الفساد العامة، وجدت أربعة: أحدها: تحريم عين المبيع، والثاني: الربا، والثالث: الغرر، والرابع: الشروط التي تئول إلى أحد هذين أو لمجموعهما" (ابن رشد، بداية المجتهد، كتاب البيوع، أسباب الفساد ۲/ ۱۰۳، بيروت، دار الفكر، ۱۴۱۵ھ-۱۹۹۵ء)

(اور اگر تم ان اسباب کا شمار کرو گے جن کے سلسلہ میں خرید و فروخت کے معاملہ کے اندر شرعی ممانعت وارد ہے، اور جو فساد کے عمومی اسباب میں سے ہیں، تو تم چار چیزوں کو پاؤ گے (۱) ایک عین مبیع کی حرمت، (۲) دوم: سود، (۳) سوم: غرر (انجام سے بے خبری) اور (۴) چہارم: وہ شرطیں جن کا تعلق سود یا غرر میں سے کسی ایک یا دونوں سے ہوں)۔

اور علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: "واشتراط الربا في العقد مفسد له" (کاسانی، بدائع الصنائع ۵/ ۱۹۴) (عقد کے اندر ربا کی شرط لگانا عقد کو فاسد کر دیتا ہے)۔

۳۔ ایک مسلمان پر واجب ہے کہ ہر ایسے معاملہ سے دور رہے جس میں سود یا سود کا شبہ ہو، چنانچہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"وأما الذي يرجع إلى نفس القرض فهو أن لا يكون فيه جر منفعة، فإن كان لم يجز، نحو ما إذا أقرضه دراهم غلة على أن يرد عليه صحاحًا، أو أقرضه وشرط شرطا له فيه منفعة، لما روى عن رسول الله ﷺ أنه نهى عن قرض جر نفعًا"

(مسند الحارث (زوائد الہیثمی) ۱/ ۵۰۰، حدیث نمبر: ۴۳۷، اور اس کی سند میں اگر چہ کلام ہے، لیکن اس کا مفہوم کئی صحابہ جن میں عبد اللہ بن مسعود، ابی بن کعب، عبد اللہ بن سلام، ابن عباس اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے صحیح سند سے ثابت ہے)۔

"ولأن الزيادة المشروطة تشبه الربا؛ لأنها فضل لا يقابله عوض، والتحرز عنه حقيقة الربا وعن شبهة الربا واجب" (كاساني، بدائع الصنائع، كتاب القرض، شرائط القرض ۷/ ۳۹۵)

(اور رہی وہ شرط جس کا تعلق نفس قرض سے ہے، تو وہ یہ ہے کہ اس کے اندر منفعت کی تحصیل نہ ہو، سو اگر منفعت کی تحصیل ہو تو ایسا قرض جائز نہیں، جیسے کسی کو کھوٹے درہم قرض دے اس شرط کے ساتھ کہ وہ کھرے سکے واپس کرے، یا قرض دے اور ایسی شرط لگائے جس میں قرض دینے والے کا فائدہ ہو، اس حدیث کی وجہ سے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے قرض سے منع فرمایا ہے جو نفع کی تحصیل کا ذریعہ بنے، اور اس لئے بھی کہ اضافہ کی شرط سود کے مشابہ ہے کیونکہ وہ ایسی زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہیں ہے، اور ربا کی حقیقت اور شبہ دونوں سے بچنا واجب ہے)۔

سوال نمبر (۴) کا جواب:

شرح سود کے کم یا زیادہ ہونے کا اثر سود کی حرمت پر نہیں پڑتا ہے، لہٰذا قرض کی اصل رقم پر جو اضافہ ہو، خواہ کم ہو یا زیادہ، وہ سود میں داخل ہے، اور

اسلام صرف سود ہی نہیں، بلکہ اس کے سایہ سے بھی دور بھاگنے کو لازم قرار دیتا ہے، چنانچہ کتاب وسنت میں سودخوری پر بڑی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اس کی شناعت، قباحت اور برائی کو سمجھنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالی نے اس پر سودخور کو اعلان جنگ دیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

"یا أیها الذین آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقی من الربو إن کنتم مؤمنین. فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله" (۲/ البقرہ: ۲۷۸-۲۷۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ باقی ماندہ سود ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو، سو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے)۔

اور حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے کہ "لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم آکل الربا ومؤکله وکاتبه وشاهدیه. وقال: هم سواء" (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۵۹۸) (رسول کریم ﷺ نے لعنت فرمائی سود کھانے والے پر، کھلانے والے پر، گواہوں پر، لکھنے والے پر، اور فرمایا: یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں)۔

لہٰذا کم شرح سود کو سروس چارج یا انتظامی خرچ میں شمار کرنا درست نہیں ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اس میں سالانہ اضافہ ہوتا ہے، اگر یہ سروس چارج ہوتا تو اس میں سالانہ اضافہ نہ ہوتا، اس لئے کہ اس پر سود کی تعریف صادق آرہی ہے؛ کیونکہ وہ مہلت کے بدلہ ہے اور بلاعوض زائد مال ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: "فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال" (ابن نجیم، البحر الرائق ۱۳۵/۶) (مال کا مال سے تبادلہ کے وقت بلاعوض زائد مال کو شرعی اصطلاح میں سود کہتے ہیں)۔

۲۔ واقعی اخراجات تو ہر بینک اپنے گاہک (Client) سے وصول کرتا ہی ہے، لہٰذا ایک ہی چیز کے لئے ڈبل چارج نہیں لگایا جاسکتا ہے۔

۳۔ بینک اور ماہرین اقتصادیات بھی کم شرح سود کو سود ہی تسلیم کرتے ہیں، اور سروس چارج نہیں قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قرض کی اصل رقم پر جو زائد رقم لی جاتی ہے اگر چہ کم ہو، لیکن وہ سود ہی ہے جو اسلام کی نگاہ میں سخت حرام ہے، خواہ وہ سود مفرد ہو کہ سالانہ شرح سود کی رقم کو اصل رقم کے ساتھ جوڑ کر اس پر سود نہیں لگایا جاتا ہو، بلکہ ہر سال کی شرح سود کا حساب الگ رہتا ہو، یا مرکب سود ہو کہ سالانہ شرح سود کی رقم کو اصل رقم کے ساتھ جوڑ کر ساری رقم پر سود لگایا جاتا ہو۔ البتہ ملکی اسکیم سے فائدہ اٹھانے کا حق چونکہ مسلمانوں کو بھی ہے لہٰذا اپنے جائز حق کو حاصل کرنے کے لئے سود دینے کی گنجائش ہے، اس صورت میں گناہ سودخور پر ہوگا نہ کہ سود دینے والے پر، چنانچہ فقہاء نے اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے یا ظلم وضرر کو دور کرنے کے لئے رشوت دینے کو جائز قرار دیا ہے (دیکھئے: ابن عابدین، رد المحتار ۵/ ۷۲، ۸/ ۲۲۲، ۸/ ۵۰۹، رملی، نہایۃ المحتاج ۸/ ۳۳۶)۔

سوال نمبر (۵) کا جواب:

سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو، تو اس صورت میں بھی یہ سود ہے جس کا لین دینا ناجائز ہے، اور اسلامی شریعت میں سخت حرام اور گناہ کبیرہ میں سے ہے اور اس پر کتاب وسنت میں سخت وعیدیں آئی ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وأحل الله البیع وحرم الربو" (۲/ البقرہ: ۲۷۵) (حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا اور سود کو حرام قرار دیا)۔

اور ارشاد ہے: "یمحق الله الربا ویربی الصدقات" (۲/ البقرہ: ۲۷۶) (اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے)۔

اور فرمان الٰہی ہے: "یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا الربا أضعافا مضاعفة، واتقوا الله لعلکم تفلحون" (۳/ آل عمران: ۱۳۰)

(اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ دگنا چوگنا بڑھا کر، اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاؤ)۔

اور عبد اللہ بن حنظلہ غسیل الملائکۃ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"درهم ربا یأکله الرجل وهو یعلم، أشد من ستة وثلاثین زنیة"

(مسند احمد حدیث نمبر: ۲۱۹۵۷، مسند بزار، حدیث نمبر: ۳۳۸۱، طبرانی، المعجم الاوسط حدیث نمبر: ۲۷۰۳، اور اس کی سند صحیح ہے، لیکن اس کے مرفوع ہونے میں

کلام ہے)(سود کا ایک درہم جو آدمی جانتے بوجھتے کھائے وہ چھتیس زنا سے بڑھ کر ہے)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''الربا ثلاثة وسبعون بابًا أيسرها مثل أن ينكح الرجل أمه''

(حاكم، المستدرك على الصحيحين، حديث نمبر: ٢٢٥٩، بيهقى، شعب الايمان حديث نمبر: ٥٥١٩، اوراس کی سند صحیح ہے)

(سود کی تہتر دروازے ہیں ان میں سب سے کم تر یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے)۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اجتنبوا السبع الموبقات''، قالوا: يا رسول الله، وما هن؟ قال: الشرك بالله، والسحر، وقتل النفس التى حرم الله إلا بالحق، وأكل الربا، وأكل مال اليتيم، والتولى يوم الزحف، وقذف المحصنات المؤمنات الغافلات''

(صحيح البخارى، حديث نمبر: ٢٧٦٦، ٦٨٥٧، صحيح مسلم، حديث نمبر: ٨٩)

(سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، صحابہ نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول، وہ کیا ہیں؟ جواب ملا: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ جان کو ناحق ہلاک کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن پیٹھ پھیر کر بھاگنا، اور بے خبر باایمان پاکدامن خواتین پر تہمت لگانا)۔

البتہ چونکہ ہندوستان جیسے ملک میں مسلمان سرکاری خزانہ سے انتفاع کے اپنے جائز حق کو سود دیئے بغیر حاصل نہیں کر سکتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو اولاً اس نظام کو بدلوانے کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن جب تک یہ فاسد نظام تبدیل نہ ہو جائے، اس وقت تک بدرجۂ مجبوری مسلمانوں کے لئے اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے سود دینے کی گنجائش ہوگی، چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: ''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (ابن نجیم، الاشباہ والنظائر/ ۹۲) (محتاج شخص کے لئے جائز ہے کہ سود پر قرض حاصل کرے)۔

اور اس صورت میں گناہ لینے والے پر ہوگا، کیونکہ دینے والا مجبور ہے۔

اور ضرورت میں کھانا، کپڑا اور مکان شامل ہے، اور ضرورت کی بنا پر حرام شئی مباح ہو جاتی ہے، جیسا کہ مشہور فقہی ضابطہ ہے: ''الضرورات تبيح المحظورات'' (حصکفی، الدر المختار ۳/ ۵۳۳) (ضرورتیں ممنوعات کو مباح ٹھہراتی ہیں)۔

اور علامہ شاطبیؒ نے ضرورت کی تعریف اس طرح کی ہے:

''أنها لا بد منها فى قيام مصالح الدين والدنيا، بحيث إذا فقدت لم تجر مصالح الدنيا على استقامة، بل على فساد وتهارج وفوت حياة، وفى الأخرى فوت النجاة والنعيم، والرجوع بالخسران المبين'' (شاطبى، الموافقات ۲/ ۱۷-۱۸، ط:۱، دار ابن عفان، ۱۴۱۷ھ-۱۹۹۷ء)

(دین اور دنیا کی مصلحتوں کے وجود میں آنے کے لئے جو لازم ہے، وہ ضرورت ہے، اس طرح کہ اگر وہ مفقود ہو جائے تو دنیا کی مصلحتیں درست نہ رہ سکیں، بلکہ فساد پیدا ہو جائے، ہنگامہ اور لڑائی کی نوبت آجائے، اور زندگی فوت ہو جائے، اور آخرت میں نجات نہ ملے، اخروی نعمت کا حصول نہ ہو اور کھلے ہوئے خسارہ سے انسان دوچار ہو جائے)۔ اور کھانا، کپڑا، اور مکان ایسی ہی ضرورتیں ہیں کہ وہ اگر دستیاب نہ ہوں تو انسانی زندگی فوت ہو جائے، لہٰذا اضطراری حالت میں بقدر ضرورت سود دینے کی گنجائش ہے۔

لیکن جانوروں کو پالنا، کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار حاجت کے درجہ میں ہیں کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے تقریباً بند ہیں، معاش کی تحصیل کے لئے یہ سب چیزیں ناگزیر ہیں، اور چونکہ بہت سے مواقع میں شریعت نے حاجت کو ضرورت کے درجہ میں رکھا ہے، جیسا کہ مشہور فقہی ضابطہ ہے: ''الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة'' (ابن نجیم، الاشباہ والنظائر/ ۹۱) (حاجت ضرورت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے خواہ عمومی حاجت ہو یا انفرادی)۔

لہٰذا حاجت شدیدہ کی بنا پر بھی سود دے کر قرض لینے کی گنجائش ہوگی، تاکہ ہندوستان جیسے ملک میں مسلمان بہتر روزگار اور عمدہ کاشت کے ذریعہ باعزت طریقہ پر اپنی روزی حاصل کرسکیں، خاص طور سے اس کی گنجائش اس لحاظ سے مزید مؤکد ہوجاتی ہے کہ سرکاری خزانہ سے انتفاع کا حق مسلمانوں کو بھی ہے، لہٰذا وہ اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے بدرجۂ مجبوری سود دے رہے ہیں۔

سوال نمبر (۶) کا جواب:

ملک کا ہر شہری اپنی انفرادی حیثیت میں عوامی خزانہ سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے، اور دستور ہند کی رو سے ہر شہری کو مقررہ ضابطے کے تحت سرکاری خزانہ سے نفع اٹھانے کا حق حاصل ہے لہٰذا مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کو حاصل کرنا اور استعمال کرنا جائز ہے۔ اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ حکومت ہر شہری کے تکفل کی ذمہ دار ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وتعاونوا علی البر والتقوی، ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (۵/ المائدہ: ۲) (تم نیکی اور پرہیزگاری کے کام میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو)۔

اس آیت کا خطاب تمام مسلمانوں سے ہے اور چونکہ حکومت پورے سماج کی نمائندہ ہے، لہٰذا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ معاشرے کے اندر مطلوبہ تعاون کو قائم کرے، اور اسی تعاون کی ایک صورت یہ ہے کہ سماج کی نیابت میں اس پر واجب ہونے والی امداد ضرورت مندوں کو دے۔

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"أنا أولی المؤمنين من أنفسهم، فمن مات وعليه دين ولم يترك وفاء فعلينا قضاؤه، ومن ترك مالا فلورثته" (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۶۷۳۱) (میں اہل ایمان سے ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہوں، سو جو مر جائے، اور اس کے ذمہ دین ہو اور ادائیگی کے بقدر مال نہ چھوڑے، تو اسے ادا کرنا ہماری ذمہ داری ہے، اور جو مال چھوڑے تو وہ اس کے ورثہ کے لئے ہے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مفاد عام کے لئے مخصوص مال سے ضرورتمندوں کی امداد حکومت پر واجب ہے چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: "وهل كان ذلك من خصائصه صلى الله عليه وسلم أو يجب على ولاة الأمور بعده، والراجح الاستمرار، لكن وجوب الوفاء إنما هو من مال المصالح" (ابن حجر، فتح الباری ۱۲/ ۱۰، بیروت، دار المعرفہ، ۱۳۷۹ھ)

(کیا یہ امداد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے حکمراں پر بھی واجب ہے؟ راجح یہی ہے کہ یہ امداد باقی اور برقرار رہے، لیکن ادائیگی کا وجوب عمومی مصالح کے لئے مخصوص مال سے ہے)۔

۳۔ حضرت مقدام بن معدیکربؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من ترك كلا فإلي، ومن ترك مالا فلورثته، وأنا وارث من لا وارث له، أعقل له وأرثه..." (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۲۸۹۹، سنن سعید بن منصور حدیث نمبر: ۱۷۲، نسائی، السنن الکبری حدیث نمبر: ۶۳۵۶، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۷۳۸، طحاوی، شرح معانی الآثار ۴/ ۳۹۷-۳۹۸، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) (جو محتاج اولاد چھوڑے تو اس کی کفالت میرے ذمہ ہے، اور جو مال چھوڑے تو وہ اس کے ورثہ کے لئے ہے، اور میں اس شخص کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہ ہو، اس کی طرف سے تاوان ادا کروں گا، اور اس کا وارث بنوں گا)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ضرورتمندوں کی امداد حکومت کی ذمہ داری ہے، چنانچہ علامہ عظیم آبادیؒ رقمطراز ہیں:

"من ترك كلا أي ثقلا، وهو يشمل الدين والعيال، والمعنى: إن ترك الأولاد فإلي ملجأهم وأنا كافلهم، وإن ترك الدين فعلي قضاؤه (أعقل له) أي: أودي عنه ما يلزمه بسبب الجنايات التي تتحمله العاقلة - أي عصبته - وأرثه أي: أرث من لا وارث له، قال القاضي عياض: يريد به صرف ماله إلى بيت مال المسلمين" (عظیم آبادی، محمد شمس الحق، عون المعبود ۸/ ۱۰۶، ط: ۲، مدینہ منورہ، مکتبہ سلفیہ، ۱۳۸۸ھ-۱۹۶۸ء)

(جو "ثقل" یعنی بوجھ چھوڑے اور یہ قرض اور بال بچے دونوں کو شامل ہے، اور مفہوم یہ ہے کہ اگر اولاد چھوڑے تو ان کی پناہ گاہ میری طرف ہے اور

میں ہی ان کی کفالت کرنے والا ہوں، اور میں اس کی طرف سے وہ تاوان ادا کروں گا جو اس پر اس کے جرم کے ارتکاب کی وجہ سے لازم آئے، جسے اس کے عصبہ یعنی اولاد اور اس کے باپ کی طرف کے رشتہ دار برداشت کرتے (اگر وہ ہوتے)۔ اور میں اس کا وارث ہوں گا جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ قاضی عیاضؒ کا کہنا ہے کہ اس سے مراد اس کے مال کو مسلمانوں کے بیت المال یعنی سرکاری خزانہ میں رکھنا ہے)۔

۴۔ بیت المال، یعنی مصالح عامہ کے عوامی خزانہ میں آنے والے اموال کو عدل وانصاف کے ساتھ تقسیم کرنے کی ذمہ داری حکومت کی ہے، لہٰذا مقررہ ضابطے کے مطابق ملک کا ہر شہری امدادی رقم حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۵۔ عمومی مصالح کی رعایت کرتے ہوئے مصالح عامہ کے اموال میں عدل کے ساتھ تصرف کرنے کا حق حکومت کو ہے، چنانچہ علامہ زیلعیؒ لکھتے ہیں:

''تصرف الإمام في بيت المال مقيد بشرط النظر'' (زيلعي، تبيين الحقائق ۳/۵۷)

(بیت المال کے اندر امام کا تصرف مصلحت کی رعایت کی شرط کے ساتھ مقید ہے)۔

اور علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: ''تصرف الإمام على الرعية منوط بالمصلحة'' (ابن نجيم، الاشباه والنظائر، القاعدة الخامسة، ص/۱۲۲) (رعیت کے حق میں امام کا تصرف مصلحت کے ساتھ مربوط اور وابستہ ہے)۔

لہٰذا اگر حکومت حسب ضابطہ بعض اغراض ومقاصد کے لئے امدادی رقم دیتی ہے تو اس کے اہل افراد کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔

سوال نمبر (۷) کا جواب:

واسطہ بننے والے جو رقم لیتے ہیں وہ رشوت میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقًا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون" (۲/ البقرہ: ۱۸۸)

(اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ، اور اس کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح دوسرے کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کرسکو، حالانکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو)۔

اور علامہ قرطبیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''المعنى لا تصانعوا بأموالكم الحكام وترشوهم ليقضوا لكم على أكثر منها. قال ابن عطية: وهذا القول يترجح؛ لأن الحكام مظنة الرشاء إلا من عصم، وهو الأقل'' (قرطبی، الجامع لأحکام القرآن ۲/ ۳۴۰، ریاض، دار عالم الکتب ۱۴۲۳ھ۔ ۲۰۰۳ء، تحقیق: ہشام سمیر البخاری، نیز دیکھئے: ابن عطیہ اندلسی، المحرر الوجیز ۱/ ۲۴۷، ط:۱، بیروت، العلمیۃ، ۱۴۱۳ھ۔ ۱۹۹۳ء، تحقیق: عبدالسلام، ع.أ.:۵)۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے مال حکام کو رشوت کے طور پر نہ دو کہ وہ تمہارے لئے تمہارے حق سے زیادہ کا فیصلہ کریں۔

علامہ ابن عطیہؒ فرماتے ہیں کہ یہی قول راجح ہے اس لئے کہ حکام رشوت کا محل ہیں، مگر جن کو اللہ تعالیٰ بچائے، اور وہ بہت کم ہیں)۔

اور سود کی طرح رشوت خوری بھی یہودیوں کا امتیاز ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

"وأخذهم الربو وقد نهوا عنه وأكلهم أموال الناس بالباطل" (۴/ النساء: ۱۶۱)

(اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے ہیں حالانکہ اس سے ان کو روکا گیا ہے، اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریقہ سے کھاتے ہیں)۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: "يا أيها الذين آمنوا إن كثيرًا من الأحبار والرهبان ليأكلون أموال الناس بالباطل" (۹/ التوبہ: ۳۴)

(اے ایمان والو! ان فقیہوں اور راہبوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں۔

اور اللہ عزوجل کا فرمان ہے: "لو لا ينهاهم الربانيون والأحبار عن قولهم الإثم وأكلهم السحت لبئس ما كانوا يصنعون" (۵/ المائدہ: ۶۳) (ان کے علماء اور فقہاء ان کو گناہ کی بات بکنے اور ان کو حرام خوری سے روکتے کیوں نہیں؟ کتنی بری ہے یہ حرکت جو یہ کررہے ہیں)۔

اور یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ عام طور سے واسطہ بننے والے رشوت کی رقم کا ایک حصہ حکام کو دیتے ہیں اور باقی ماندہ رقم خود رکھ لیتے ہیں، لہٰذا واسطہ بننے والے کو محنتانہ کے نام سے جو رقم دی جاتی ہے وہ رشوت میں داخل ہے، چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں:

''الثالث: أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع، وهو حرام على الآخذ لا الدافع''
(ابن ہمام، فتح القدیر ۷/ ۲۵۵، بیروت، دار الفکر)۔

(رشوت کی تیسری قسم یہ ہے کہ مال اس لئے لیا جائے کہ لینے والا ضرر کے ازالہ کی خاطر یا منفعت کی تحصیل کے لئے مال دینے والے کے معاملہ کو بادشاہ کے پاس طے کرے، اور یہ لینے والے پر حرام ہے نہ کہ دینے والے پر)۔

البتہ مطلوبہ محنتانہ کے جواز کی شکل یہ ہے کہ واسطہ بننے والے کو ایک یا دو دن کے لئے اجرت پر رکھ لے، اور جو مناسب اجرت ہو اسے طے کر لے، جیسا کہ علامہ شامی ابن ہمام کے حوالہ سے رقمطراز ہیں:

''وحيلة حلها أن يستأجره يوما إلى الليل أو يومين، فتصير منافعه مملوكة، ثم يستعمله في الذهاب إلى السلطان للأمر الفلاني'' (ابن عابدین، رد المحتار ۵/ ۳۶۲، بیروت، دار الفکر، ۱۴۲۱ھ-۲۰۰۰ء)

(اور اس کے حلال ہونے کا حیلہ یہ ہے کہ واسطہ بننے والے کو ایک دن رات تک کے لئے یا دو دن کے لئے اجرت پر لے لے، تاکہ اس کے منافع اس کی ملکیت میں آجائیں، پھر فلاں کام کے لئے بادشاہ کے پاس جانے کے لئے اسے استعمال کرے)۔

اگر یہ شکل ممکن نہ ہو اور بدرجہ مجبوری اپنے جائز حق کے حصول کے لئے رشوت دینی پڑے تو دینے والے پر گناہ نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں: ''لو اضطر إلى دفع الرشوة لإحياء حقه، جاز له الدفع وحرم على القابض'' (ابن عابدین، رد المحتار ۵/ ۷۲) (اگر اپنے حق کو زندہ کرنے کے لئے رشوت دینے پر مجبور ہو جائے، تو اس کے لیے دینا جائز ہے، اور لینے والے پر حرام ہے)۔

سوال نمبر (۸) کا جواب:

واسطہ بننے والے لوگوں کا حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لینا رشوت کے حکم میں ہے، اور رشوت کا لینا دینا اصولی طور پر حرام ہے، لیکن اگر کوئی شخص عوامی خزانہ سے اپنے جائز حق کے حصول کے لئے رشوت دینے پر مجبور ہو جائے تو اس پر گناہ نہیں، اس صورت میں گناہ لینے والے کو ہوگا، علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں: ''وأما دفع الرشوة لدفع الظلم فجائز'' (ابن عابدین، رد المحتار ۸/ ۲۲۲) (بہرحال ظلم کو دفع کرنے کے لئے رشوت دینا تو جائز ہے)

اور ایک جگہ لکھتے ہیں: ''إذا دفع الرشوة لدفع الجور عن نفسه أو أحد من أهل بيته، لم يأثم'' (ابن عابدین، رد المحتار ۸/ ۵۰۹) (اگر اپنی ذات یا اپنے گھر والوں میں سے کسی کی طرف سے ظلم کو دور کرنے کے لئے رشوت دے، تو گناہ گار نہ ہوگا)۔

سوال نمبر (۹) کا جواب:

اسلامی نقطہ نظر سے رشوت حصول مال کا جائز ذریعہ نہیں ہے، بلکہ یہ گناہ، حق تلفی اور غصب حقوق کا راستہ ہے، لہٰذا اسلامی شریعت میں اصولی طور پر رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقًا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون" (۲/ البقرہ: ۱۸۸) (اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ ہڑپ کرو، اور اس کو حکام تک پہنچنے کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح دوسرے کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے کھا سکو، حالانکہ تم اس کے گناہ ہونے کو جانتے ہو)۔

اور سود کی طرح رشوت خوری بھی یہودیوں کی شان امتیازی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"سماعون للكذب أكالون للسحت" (۵/ المائدہ: ۴۲) (یہ جھوٹ کے رسیا و خوگر ہیں اور پکے حرام خور ہیں)۔

اور حرام خوری سے مراد رشوت خوری ہے، چنانچہ علامہ طبری لکھتے ہیں:

''ویقبلون الرشی فیأکلونها علی کذبهم علی الله وفریتهم علیه'' (طبری، جامع البیان فی تأویل القرآن ۱۰/ ۲۱۸، بیروت، موسسة الرسالہ، ط:۱، ۱۴۲۰ھ-۲۰۰۰ء، تحقیق: احمد محمد شاکر، ع-أ-: ۲۴)

(اور یہ یہودی لوگ اللہ پر جھوٹ بولنے اور اس پر افترا پردازی کرنے کے سلسلہ میں رشوت قبول کرتے ہیں اور اسے کھاتے ہیں)۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ''لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم الراشی والمرتشی'' (سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۳۵۸۰، سنن ترمذی حدیث نمبر: ۱۳۳۷، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۳۱۳، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)

(رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے اور لینے والے پر لعنت فرمائی ہے)۔ اور ایک روایت میں ہے: ''والرائش'' (مسند احمد حدیث نمبر: ۲۲۳۹۹، حاکم، المستدرک: ۷۰۶۸، اور اس کی سند میں کلام ہے) (اور واسطہ بننے والے پر بھی لعنت فرمائی)۔

۳۔ شریعت کا مشہور قاعدہ ہے: ''ما حرم أخذه حرم إعطاءه'' (ابن نجیم، الاشباہ/ص: ۱۵۸) (جس کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہے)۔

چنانچہ سود، زنا کار عورت کی اجرت زنا، جوتشی، کاہن (غیب دانی کے مدعی) کا نذرانہ، نوحہ خوانی کرنے والی عورت کی اجرت اور مزامیر بجانے والے کی مزدوری کا لینا دینا دونوں حرام ہے۔ البتہ چند مسائل کا استثناء ہے، اور ان ہی میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ اپنے جان یا مال سے ضرر دور کرنے اور اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دے سکتے ہیں، علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

''الرشوة لخوف علی ماله أو نفسه، أو لیسوی أمره عند سلطان أو أمیر'' (ابن نجیم، الاشباہ، ص: ۱۵۸)

(اپنے مال یا جان کے خوف سے یا بادشاہ یا حاکم کے پاس اپنا معاملہ ٹھیک کرانے کے لئے رشوت دے سکتے ہیں)۔

لہٰذا سرکاری خزانہ سے ملنے والی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے، تو رشوت دینا مباح ہے، گناہ لینے والے کو ہوگا۔

سوال نمبر (۱۰) کا جواب:

ملک کے ہر شہری کو اگرچہ انفرادی حیثیت میں سرکاری خزانہ سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے، لیکن دستور ہند کی رو سے ہر شہری متعینہ شرائط و معیارات اور مقررہ ضابطے کا پابند ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا، اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانا حرام ہے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ہر حالت میں سچائی کا پابند رہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

"یا أیها الذین آمنوا اتقوا الله و کونوا مع الصادقین" (۹/ التوبہ: ۱۱۹) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو، اور راست بازوں کے ساتھ رہو)۔

اور اللہ عز وجل کا فرمان ہے:

"فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور" (۲۲/ الحج: ۳۰) (سو بتوں کی گندگی سے دور رہو اور جھوٹ بات سے بچو)۔

اس آیت سے جھوٹ کی شناعت عیاں ہے کہ اسے شرک کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں: ''والمراد من الزور مطلق الکذب'' (آلوسی، روح المعانی ۹/ ۱۴۲، بیروت، العلمیہ، ۱۴۱۵ھ، تحقیق: علی عطیہ، ح-أ-: ۱۶) (اور زور سے مراد مطلق جھوٹ بولنا ہے)۔

۲۔ جس طرح افراد کے مال کی حرمت ہے، اسی طرح مال عام کی بھی حرمت ہے کیونکہ ملک کا کوئی بھی شہری اپنی انفرادی حیثیت میں سرکاری خزانہ کا مالک نہیں ہے، لہٰذا غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانا باطل طریقہ سے مال کھانے میں داخل ہے جس کی قرآن کریم نے شدید طریقہ پر ممانعت کی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم" (۴/ النساء: ۲۹) (اے ایمان والو! اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ کوئی مال باہمی رضامندانہ تجارت کی راہ سے حاصل ہو جائے)۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے مال عام کی چوری پر سخت وعید فرمائی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: "ومن یغلل یأت بما غل یوم القیامة ثم توفی کل نفس ما کسبت وهم لا یظلمون" (۳/ آل عمران: ۱۶۱) (اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہوگا، پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کچھ ظلم نہ ہوگا)۔

علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "وھذا تھدید شدید ووعید أکید" (ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۱/ ۵۱۸، بیروت، دار الفکر، ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴ء) (اس آیت میں مال عام کے اندر خیانت کے سلسلہ میں سخت دھمکی اور زبردست وعید ہے)۔

۴- اللہ کے رسول ﷺ نے بھی مال عام پر دست درازی سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

"قام فینا النبی ﷺ فذکر الغلول فعظمه وعظم أمره، قال: لا ألفین أحدکم یوم القیامة علی رقبته شاة لها ثغاء، علی رقبته فرس له حمحمة، یقول: یا رسول الله! أغثنی، فأقول: لا أملك لك شیئا، قد ابلغتك وعلی رقبته بعیر له رغاء، یقول: یا رسول الله! أغثنی، فأقول: لا أملك لك شیئًا، قد أبلغتك وعلی رقبته صامت، فیقول: یا رسول الله! أغثنی، فأقول: لا أملك لك شیئا قد أبلغتك أو علی رقبته رقاع تخفق، فیقول: یا رسول الله! أغثنی، فأقول: لا أملك لك شیئًا، قد أبلغتك" (بخاری حدیث نمبر: ۳۰۷۳، مسلم حدیث نمبر: ۱۸۳۱، مسند احمد حدیث نمبر: ۹۵۰۳)

(نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان نصیحت کے لئے اٹھے اور مال عام میں خیانت اور چوری کا ذکر فرمایا، تو اسے اور اس کے معاملہ کو سنگین قرار دیا، اور ارشاد فرمایا: میں قیامت کے دن تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر بکری ہو جو ممیار ہی ہو، (یا) اس کی گردن پر گھوڑا ہو جو ہنہنا رہا ہو (اور) وہ کہہ رہا ہو، اے اللہ کے رسول! میری مدد فرمایئے، سو میں جواب میں کہوں: میرے بس میں تیرے لئے کچھ نہیں، میں نے تو تجھے آگاہ کردیا تھا، اور (یا) اس کی گردن پر اونٹ ہو جو بلبلا رہا ہو، اور وہ مجھ سے کہے، اے اللہ کے رسول، میری مدد فرمایئے، اور میں اس کے جواب میں کہوں، تیرے لئے میرے اختیار میں کچھ نہیں، میں نے تو تجھے خبردار کردیا تھا، اور (یا) اس کی گردن پر سونا اور چاندی ہو، اور وہ کہہ رہا ہو کہ اللہ کے رسول میری مدد فرمایئے، اور میں اس کے جواب میں بول پڑوں، میں تیرے کچھ کام نہیں آسکتا، میں نے تو تجھے آگاہ کردیا تھا، یا اس کی گردن پر چیتھڑے ہوں جو پھڑ پھڑا رہے ہوں، اور میں اس کے جواب میں بول پڑوں، میرے بس میں تیرے لئے کچھ نہیں، میں نے تو تجھے خبردار کردیا تھا)۔

۵- حکمراں طبقہ کو بھی آپ ﷺ نے سخت تاکید کے ساتھ مال عام پر دست درازی سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ مستورد بن شدادؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "من کان لنا عاملًا فلیکتسب زوجة، فإن لم یکن له خادم، فلیکتسب خادمًا، فإن لم یکن له مسکن، فلیکتسب مسکنا، من اتخذ غیر ذلك فهو غال أو سارق" (سنن ابی داود حدیث نمبر: ۲۹۴۵، صحیح ابن خزیمہ حدیث نمبر: ۲۳۷۰، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)

(جو ہمارا کارندہ ہے، وہ بیوی حاصل کرلے، سو اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو خادم حاصل کرلے، اور اگر اس کے پاس رہائش گاہ نہ ہو تو رہائش گاہ حاصل کرلے، (اور) جو اس کے علاوہ (غیر ضروری چیز) حاصل کرلے، وہ خائن یا چور ہے)۔

۶- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من غشنا فلیس منا" (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۰۱) (جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں)۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانا مسلمانوں کی شان نہیں ہے۔

۷- حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "المکر والخدیعة والخیانة فی النار" (حاکم، المستدرك حدیث نمبر: ۸۷۹۵، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (فریب، دھوکہ اور خیانت کا انجام جہنم ہے)۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام لینا درست نہیں ہے۔

۸- علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں: "والغلول: السرقة من الغنیمة، وهو حرام" (سرخسی، المبسوط ۱۰/ ۷، بیروت، دار الفکر، ط: ۱، ۱۴۲۱ھ-۲۰۰۰ء، تحقیق: خلیل میں) (اور "غلول" مال غنیمت (جو کہ مال عام ہے) سے چرانے کا نام ہے، اور وہ حرام ہے)۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بلا استحقاق مال عام سے لینا ناجائز ہے۔

۹- محمد رازی حنفیؒ لکھتے ہیں: "ویحرم الغلول" (رازی حنفی، تحفة الملوک، ص: ۱۸۰، بیروت، دار البشائر) (اور مال غنیمت (جو کہ مال عام ہے اور حصہ

ملنے سے پہلے اس میں سے لینا جائز نہیں ہے) میں خیانت حرام ہے)۔اس سے بھی معلوم ہوا کہ مال عام میں سے بلا استحقاق لینا حرام ہے۔

سوال نمبر (۱۱) کا جواب:

سود اسلام کی نگاہ میں سخت ترین گناہ ہے، اس پر اللہ تعالی نے سود خوار کو اعلان جنگ دیا ہے، اور سود سے باز نہ رہنے پر کافروں کی طرح دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "واتقوا النار التي أعدت للكافرين" (۳/آل عمران: ۱۳۱) (اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے)۔اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کو زنا سے زیادہ سخت جرم قرار دیا ہے کہ حرام لقمہ ہی انسان کو معاصی کی طرف بڑھاتا ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "الربا سبعون حوبا، أيسرها أن ينكح الرجل أمه" (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۲۷۴، بیہقی، شعب الایمان حدیث نمبر: ۵۵۲۲، مسند بزار حدیث نمبر: ۸۵۳۸، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (سود ستر قسم کے گناہ پر مشتمل ہے، اور ان سنگین گناہوں میں سے خفیف تر یہ ہے کہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے)۔

اور حضرت عمر بن الخطابؓ نے سود کی شناعت کو دیکھتے ہوئے فرمایا:

"فدعوا الربا والريبة" (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر: ۲۲۷۶، اور اس کی سند صحیح ہے) (سود اور شبہ سود دونوں کو چھوڑ دو)۔

لہٰذا اصولی طور پر اسلام کے اندر سود لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، خواہ اسکیم سے فائدہ اٹھانے والا خود سود ادا کرے، یا کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے سود دے۔

البتہ چونکہ تعلیم انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے، اور خاص طور سے موجودہ دور میں چونکہ اعلی تعلیم کے بغیر باعزت زندگی گزارنے کے راستے مسدود ہیں، اور نہ صرف فرد کی ترقی اس سے وابستہ ہے، بلکہ امت اسلامیہ ہندیہ کی اجتماعی ترقی بھی اس سے وابستہ ہے، لہٰذا فرد وسماج کی اس حاجت کو ضرورت کا درجہ دیتے ہوئے کہ "الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة" (ابن نجیم، الاشباہ، ص: ۹۱) (حاجت خصوصی) اعلی تعلیم کی غرض سے سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، اس گنجائش کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ حکومتی اسکیم سے فائدہ اٹھانے کا حق مسلمانوں کو بھی ہے، لہٰذا وہ اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے بدرجۂ مجبوری سود دے کر اپنا حق حاصل کر سکتے ہیں۔اگر چہ حاجت عام طور سے حرام کو مباح نہیں ٹھہراتی ہے، اور نہ ہی اعلی عصری تعلیم فرض عین ہے، لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ موجودہ دور میں اعلی عصری تعلیم کے بغیر ایک ہونہار اور اہل طالب علم کی زندگی بڑی دشواری سے دوچار ہو سکتی ہے، لہٰذا اہل محتاج طالب علم کے لئے اس کی حاجت شدیدہ کی بنیاد پر سودی اسکیم سے استفادہ کی گنجائش ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: "يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (ابن نجیم (و: ۹۷۰ھ)، البحر الرائق ۶/ ۱۳۷، بیروت، دار المعرفة) (ضرورت مند کے لئے سود کے ساتھ قرض حاصل کرنا جائز ہے)۔

اور دیگر مقصد پر مبنی سودی اسکیم بھی اگر حاجت شدیدہ کے درجہ میں ہو تو اس سے استفادہ کی گنجائش ہے۔

سوال نمبر (۱۲) کا جواب:

(الف): ضروری ہے کہ تعلیمی اور رفاہی اداروں کو پاک مال سے چلایا جائے تاکہ پڑھنے والے طلبہ، تعلیم دینے والے اساتذہ اور کام کرنے والے عملہ کے اندر نیکی کی روح بیدار ہو، اور خیر کا جذبہ پروان چڑھے، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالی نے اہل ایمان کو حلال اور پاکیزہ مال کھانے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

"يا أيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم. واشكروا الله إن كنتم إياه تعبدون" (۲/ البقرہ: ۱۷۲)

(اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ، اور اللہ ہی کے شکر گزار بنو، اگر تم اس کی بندگی کرتے ہو)۔

اور اس کی تفسیر میں علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"يقول الله تعالى: آمرًا عباده المؤمنين بالأكل من طيبات ما رزقهم تعالى. وأن يشكروه على ذلك، إن

كانوا عبيده، والأكل من الحلال سبب لتقبل الدعاء والعبادة، كما أن الأكل من الحرام يمنع قبول الدعاء والعبادة''
(ابن كثير، تفسير القرآن العظيم ۱/ ۲۵۵)

(اللہ تعالیٰ اپنے اہل ایمان بندوں کو اپنی عطا کردہ پاکیزہ چیزوں میں سے کھانے اور اس پر شکر ادا کرنے کا حکم دیتا ہے، اگر وہ واقعی اس کے بندے ہیں، اور حلال مال سے کھانا دعا اور عبادت کے قبول ہونے کا سبب ہے، جس طرح حرام مال سے کھانا دعا اور عبادت کے مقبول ہونے سے مانع ہے)۔

۲۔ حلال مال سے عمل صالح کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، جبکہ مال حرام سے معصیت کی روح بیدار ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو حلال وپاکیزہ اشیاء استعمال کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ انسانی معاشرہ میں خیر و بھلائی کی فضا قائم ہو، اور معصیت کی سرد بازاری ہو، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

"يأيها الناس كلوا مما في الأرض حلالا طيبًا ولا تتبعوا خطوات الشيطان إنه لكم عدو مبين" (۲/ البقرہ: ۱۶۸)

(اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال پاکیزہ ہیں ان کو کھاؤ، اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے)۔

۳۔ مسلمانوں کی شان یہ ہونی چاہئے کہ وہ تعلیم ودعوت کے مراکز پاکیزہ مال سے چلائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ وحلال اشیاء کے خرچ کرنے پر ہی اجر وثواب سے نوازتا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''أيها الناس، إن الله طيب، لا يقبل إلا طيبا، وإن الله أمر المؤمنين بما أمر به المرسلين، فقال: "يأيها الرسل كلوا من الطيبات واعملوا صالحا إني بما تعملون عليم" (۲۳/ المومنون: ۵۱)، وقال: "يأيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم" (۲/ البقرہ: ۱۷۲)، ثم ذكر الرجل يطيل السفر، أشعث أغبر، يمد يديه إلى السماء: يا رب يا رب، ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذي بالحرام، فأنى يستجاب لذلك؟'' (صحيح مسلم حديث نمبر: ۱۰۱۵، سنن ترمذی حديث نمبر: ۲۹۸۹، سنن دارمی حديث نمبر: ۲۷۱۷، مسند احمد حديث نمبر: ۸۳۴۸)

(اے لوگو! بے شک اللہ پاک ہے اور پاکیزہ چیز ہی کو قبول کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو وہی حکم دیا ہے جو رسولوں کو دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: (اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، جو کچھ تم کرو گے میں اسے سے اچھی طرح واقف ہوں) اور فرمایا: (اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو پاکیزہ چیزیں دی ہیں ان کو کھاؤ) پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبے سفر کرتا ہے، پراگندہ بال اور گرد آلود ہوتا ہے، آسمان کی طرف اپنے ہاتھ کو دراز کر کے اے پروردگار، اے پروردگار کی آواز لگاتا ہے، حالانکہ اس کا کھانا حرام اس کا پینا حرام اور اس کی پوشاک حرام ہے، اور اس کی پرورش حرام سے ہوئی ہے، پھر اس شخص کی دعا کیوں کر قبول ہوگی؟)۔

۴۔ جنابہ خولہ انصاریہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إن رجالا يتخوضون في مال الله بغير حق، فلهم النار يوم القيامة'' (صحیح البخاری حدیث نمبر: ۳۱۱۸، ترمذی حدیث نمبر: ۲۳۷۴، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۰۵۴، ۲۷۳۱۸) (کچھ لوگ اللہ کے مال کو ناحق ہڑپ کرتے ہیں سو قیامت کے دن ان کے لئے آگ ہے)۔

یہ وعید مال عام کو ہڑپنے پر ہے، تو پھر سودی مال کی طرف لپکنے پر کتنی سخت وعید ہوگی؟

۵۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''يأتي على الناس زمان لا يبالي المرء ما أخذ منه: أمن الحلال، أم من الحرام؟''

(صحيح البخاری حديث نمبر: ۲۰۵۹، سنن نسائی حديث نمبر: ۴۴۵۴، سنن دارمی حديث نمبر: ۲۵۳۹)

(لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو اس کی پروا نہ ہوگی کہ اس نے حلال مال سے لیا یا حرام مال سے)۔

ان نصوص سے واضح ہے کہ تعلیمی ورفاہی ادارے اور محتاج افراد واشخاص کے تعاون کے لئے سودی فنڈ قائم کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر غیر مسلم حکومت ایسا کرتی ہے تو ایسی حالت میں اگر تعلیمی ورفاہی ادارے ضرورت مند ہیں تو بیت الخلاء (Toilet)، راستے کی تعمیر اور دیگر عمومی مصالح کے کاموں کے لئے سودی مال لے سکتے ہیں۔

(ب): یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ سودی اسکیم کا تعلق افراد واشخاص سے ہو کہ اگر وہ فقراء اور مساکین میں سے ہوں تو ان کے لئے سودی امداد سے استفادہ کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ جس مال کو اس کے مالک کو نہیں لوٹا یا جا سکتا ہو، اسے بھلائی کی مدات میں صرف کیا جائے گا، اور ان مدات میں فقراء اور مساکین بھی داخل ہیں، اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک انصاری صحابی کہتے ہیں کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازہ میں نکلے، سو میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر کے پاس کھودنے والے کو وصیت کرتے ہوئے پایا: ''اس کے دونوں پیر کی طرف کشادہ کھودو، اس کے سر کی طرف کشادہ کھودو'' پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ سے لوٹے، تو ایک خاتون کی طرف سے دعوت دینے والا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا:

''فجاء وجئى بالطعام، فوضع يده، ثم وضع القوم فأكلوا، فنظر آباؤنا رسول الله ﷺ يلوك لقمة في فمه، ثم قال: أجد لحم شاة أخذت بغير إذن أهلها، فأرسلت المرأة، قالت: يا رسول الله، إني أرسلت إلى البقيع يشترى لى شاة، فلم أجد، فأرسلت إلى جارك قد اشترى شاة أن أرسل إلي بها بثمنها، فلم يوجد، فأرسلت إلى امرأته، فأرسلت إليَّ بها، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ''أطعميه الأسارى'' (سنن ابی داود حدیث نمبر: ۳۳۳۲، طحاوی، شرح مشکل الآثار حدیث نمبر: ۳۰۰۵، ۳۰۰۶، دار قطنی، حدیث نمبر: ۴۸۲۶، مسند احمد حدیث نمبر: ۲۲۵۰۹، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)

(تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس خاتون کے گھر تشریف لائے، اور کھانا لایا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ رکھا، پھر لوگوں نے اپنے ہاتھ رکھے، اور کھانے لگے، سو ہمارے آباء واجداد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دہن مبارک میں لقمہ کو ہلکے ہلکے چباتے ہوئے دیکھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس بکری کا گوشت پا رہا ہوں جسے مالک کی اجازت کے بغیر حاصل کیا گیا''، اس پر عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قاصد بھیجا اور معاملہ کو واضح کرتے ہوئے کہا، اے اللہ کے رسول، میں نے بقیع کی طرف قاصد کو بھیجا کہ وہ میرے لئے کوئی بکری خرید لائے، سو میں نے بکری کو نہیں پایا، تب میں نے اپنے اس ہمسایہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا جس نے بکری خریدی تھی کہ اس کی خرید کردہ قیمت کے بدلہ اسے میرے پاس بھیج دو، لیکن پڑوسی مل نہ سکا، سو میں نے اس کی بیوی کو پیغام بھیجا، اور اس نے میرے پاس بکری بھیج دی، تب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے قیدیوں کو کھلا دو'')۔

اس حدیث سے استدلال اس طرح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پکی ہوئی بکری کو صدقہ کرنے کا حکم دیا؛ اس لئے کہ وہ مالک کی اجازت کے بغیر لی گئی تھی، اور اس کی خریداری درست نہیں تھی، جیسا کہ ملا علی قاری رقمطراز ہیں:

''فظهر أن شراءها غير صحيح؛ لأن إذن جارها ورضاه غير صحيح.... وذلك أنه لما لم يوجد صاحب الشاة ليستحلوا منه، وكان الطعام في صدد الفساد، ولم يكن بد من إطعام هؤلاء، فأمر بإطعامهم....وقد لزمها قيمة الشاة بإتلافها، ووقع هذا تصدقا عنها'' (علی القاری، مرقاۃ المفاتیح ۱۰/۲۹۷)

(سو اس سے عیاں ہے کہ اس کی خریداری درست نہیں تھی، اور قیدیوں کو (جو عام طور سے محتاج ہوتے ہیں) کھلانے کا حکم اس وجہ سے دیا کہ بکری کا مالک جب نہیں ملا تاکہ اس سے حلال ٹھہرا لیں، حالانکہ کھانا خراب ہونے کے درپے تھا، اور قیدیوں کے کھلانے کے علاوہ چارہ نہیں تھا، لہٰذا ان کو کھلانے کا حکم دیا.... اور بکری کو ضائع کرنے کی وجہ سے اس پر قیمت لازم ہوئی، اور کھانا اس کی طرف سے صدقہ ہوا)۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے اگر اصل مالک تک مال نہ پہنچ سکے تو محتاج افراد پر صدقہ کیا جائے گا۔

۲۔ امام قرطبی (و: ۶۷۱ھ) لکھتے ہیں:

''قال علماؤنا: إن سبيل التوبة مما بيده من الأموال الحرام، إن كانت من ربا فليردها على من أربى عليه، ويطلبه إن لم يكن حاضرًا، فإن أيس من وجوده، فليتصدق بذلك عنه، وإن أخذه بظلم، فليفعله كذلك في أمر من ظلمه، فإن التبس عليه الأمر، ولم يدر كم الحرام من الحلال مما بيده، فإنه يتحرى قدر ما بيده مما يجب عليه رده، حتى لا يشك أن ما يبقى قد خلص له، فيرده من ذلك الذي أزال عن يده إلى من عرف ممن ظلمه أو أربى عليه، فإن أيس من وجوده تصدق به عنه، فإن أحاطت المظالم بذمته، وعلم أنه وجب عليه من ذلك ما لا يطيق

أداءه أبدًا لكثرته، فتوبته أن يزيل ما بيده أجمع إما إلى المساكين، وإما إلى ما فيه صلاح المسلمين، حتى لا يبقى في يده إلا أقل ما يجزئه في الصلاة من اللباس، وهو ما يستر العورة، وهو من سرته إلى ركبته، وقوت يومه؛ لأنه الذي يجب له أن يأخذه من مال غيره إذا اضطر إليه، وإن كره ذلك من يأخذه منه'' (قرطبي، الجامع لأحكام القرآن ۳/۳۶۶)

(ہمارے مالکی علماء فرماتے ہیں کہ مال حرام سے توبہ کی راہ یہ ہے کہ اگر سود سے حاصل ہو، تو جس سے سود لیا ہے اسے واپس کردے، اور اگر وہ موجود نہ ہو تو اسے تلاش کرے، سو اگر اس کو پانے سے ناامید ہو جائے، تو اس کی طرف سے اسے صدقہ کردے۔ اور اگر بہ طور ظلم اسے لیا ہو، تو جس پر ظلم کیا ہو اس کے معاملہ میں ایسا ہی کرے، سو اگر اس پر معاملہ مشتبہ ہو جائے، اور اسے معلوم نہ ہو کہ اس کے قبضہ میں جو مال ہے، اس میں کتنا حرام ہے اور کتنا حلال ہے، تو اپنے قبضہ کے مال میں سے جس مقدار کی واپسی اس پر واجب ہے اس کے سلسلہ میں تحری یعنی بہتر مقدار کو اختیار کرے، یہاں تک کہ اسے کوئی شک نہ رہ جائے کہ باقی ماندہ اس کا خالص مال ہے، سو اس نے مال کی جس مقدار کو اپنے قبضہ سے نکالا ہے اسے اس شخص پر ظلم کرکے لیا تھا یا اسے واپس کردے جس سے سود لیا تھا، سو اگر اس کو پانے سے ناامید ہو، تو اسے اس کی طرف سے صدقہ کردے، سو اگر مظالم اس کے ذمہ کا احاطہ کرلے، اور اسے یقین ہو جائے کہ اس پر اتنی مقدار واجب ہے جس کی ادائیگی کی طاقت اس کی کثرت کی وجہ سے اسے کبھی نہ ہوگی، تو اس کی توبہ یہ ہے کہ اس کے قبضہ میں جو سارا مال ہے اسے یا تو مساکین کو دے دے، یا ایسے مصارف میں خرچ کرے جن میں مسلمانوں کے معاملات کی درستگی ہو، یہاں تک کہ اس کے قبضہ میں وہ لباس رہ جائے جو کم سے کم نماز میں کافی ہے، اور یہ وہ لباس ہے جو اس کے ستر کو چھپائے، اور وہ بدن کا ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ہے، اور اس کے آج کے دن کی خوراک رہ جائے، اس لئے کہ یہی وہ مقدار ہے جو دوسرے کے مال سے وہ لے سکتا ہے، اگر اسے لینے پر وہ مجبور ہو جائے، اگر چہ وہ شخص اسے ناپسند کرے جس کے مال سے وہ لے) اس سے بھی معلوم ہوا کہ مال حرام کے مصارف میں فقراء اور مساکین داخل ہیں۔

۳۔ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''المال إذا تعذر معرفة مالكه صرف في مصالح المسلمين عند جماهير العلماء كمالك وأحمد وغيرهما. فإذا كان بيد الإنسان غصوب أو عوار أو ودائع أو رهون، قد يئس من معرفة أصحابها فإنه يتصدق بها عنهم. أو يصرفها في مصالح المسلمين، أو يسلمها إلى قاسم عادل يصرفها في مصالح المسلمين المصالح الشرعية'' (ابن تيميه، مجموع الفتاوى ۲۹/ ۳۲۱، ط: ۳، دار الوفاء، ۱۴۲۶ھ۔۲۰۰۵ء)

(مال کے مالک کو پانا اگر دشوار ہو جائے تو جمہور اہل علم جیسے مالک واحمد وغیرہما کے نزدیک اسے مسلمانوں کے مصالح میں صرف کیا جائے گا، سو اگر آدمی کے قبضہ میں غصب کردہ مال یا عاریتاً اور عارضی طور پر لی ہوئی چیز ہو یا امانت کے مال ہوں یا رہن ہوں، اور مالک کو پانے سے ناامید ہو جائے، تو وہ اسے ان کی طرف سے صدقہ کردے، یا مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کرے، یا منصف تقسیم کرنے والے کے حوالہ کردے جو اسے مسلمانوں کے شرعی مصالح میں صرف کرے)۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ فقراء اور مساکین مال حرام کی مدات میں سے ایک مد ہیں۔

۴۔ ابن قیم الجوزیہ (و: ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں:

''أن من قبض ما ليس له قبضه شرعًا، ثم أراد التخلص منه؛ فإن كان المقبوض قد أخذ بغير رضى صاحبه، ولا استوفى عوضه، رده عليه، فإن تعذر رده عليه، قضى به دينا يعلمه عليه، فإن تعذر ذلك، تصدق به عنه. فإن اختار صاحب الحق ثوابه يوم القيامة، كان له، وإن أبي إلا أن يأخذ من حسنات القابض، استوفى منه نظير ماله. وكان ثواب الصدقة للمتصدق بها، كما ثبتت عن الصحابة وإن كان المقبوض برضى الرافع، وقد استوفى عوضه المحرم، كمن عاوض على خمر أو خنزير أو على زنى اور فاحشة، فهذا لا يجب رد العوض على الدافع... فطريق التخلص منه، وتمام التوبة بالصدقة به، فإن كان محتاجًا إليه، فله أن يأخذ قدر حاجته، ويتصدق بالباقي، فهذا حكم كل كسب خبيث لخبث عوضه عينا كان أو منفعة'' (ابن القيم، زاد المعاد ۵/ ۷۷۸، ط: ۲۷، بيروت، مؤسسة

الرسالہ ۱۴۱۵ھ - ۱۹۹۴ء)

(جو شخص ایسی چیز پر قبضہ کرلے جس پر شرعی اعتبار سے اس کا قبضہ کرنا درست نہیں ہے، پھر اس سے نجات حاصل کرنا چاہے، سو اگر قبضہ کردہ مال مالک کی رضامندی کے بغیر لیا گیا ہو، اور مالک نے اس کا عوض حاصل نہ کیا ہو، تو وہ اس کو مالک کو واپس کردے، سو اگر مالک کو واپس کرنا دشوار ہو، تو اس کے اس دین کو ادا کردے جسے وہ جانتا ہو، سو اگر یہ بھی دشوار ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کردے، اب اگر مالک بروز قیامت اس کے ثواب کو اختیار کرے، تو اسے ایسا کرنے کا حق ہوگا، اور اگر انکار کردے اور قبضہ کرنے والے کی نیکی سے لینا چاہے، تو مال کے مثل اس سے نیکی وصول کرے، اور صدقہ کا ثواب صدقہ کرنے والے کو مل جائے گا، جیسا کہ صحابہؓ سے ثابت ہے، اور اگر قبضہ کردہ مال دینے والے کی رضامندی سے حاصل کیا گیا ہو، اور وہ اس کے حرام بدلہ کو وصول کرچکا ہو، جیسے کسی نے شراب یا خنزیر کا تبادلہ کیا ہو یا زنا یا بدکاری کا معاملہ کیا ہو، تو اس صورت میں دینے والے پر بدلہ کو واپس کرنا واجب نہ ہوگا... لہٰذا اس سے نجات کی راہ اور کامل توبہ یہ ہے کہ اسے صدقہ کردیا جائے، سو اگر قبضہ کرنے والا اس مال کا محتاج ہو تو وہ اپنی ضرورت کے بقدر لے سکتا ہے، اور باقی کو صدقہ کردے، سو یہی ہر اس کمائی کا حکم ہے جو اپنے بدل کے گندہ و حرام ہونے کی وجہ سے گندہ و حرام ہو، خواہ متعین چیز ہو یا منفعت ہو)۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ فقراء و مساکین مال حرام کے مصرف ہیں۔

۵۔ مصطفی رحیبانی حنبلی (و: ۱۲۴۳ھ) لکھتے ہیں:

"وله أي من بيده الغصوب ونحوها إن لم يدفعها للحاكم، الصدقة بها منهم، أي عن أربابها بلا إذن حاكم؛ لأن المال يراد لمصلحة المعاش أو المعاد، ومصلحة المعاد أولى المصلحتين، وقد تعينت ههُنا لتعذر الأخرى. ونقل المروزي: يعجبني الصدقة بها، قال الشيخ تقي الدين: إذا كان بيد الإنسان غصوب أو عوار، أو ودائع، أو رهون، قد يئس من معرفة أصحابها، فالصواب أنه يتصدق بها عنهم، فإن حبس المال دائمًا لا يرجى، لا فائدة فيه، بل هو تعريض لهلاك المال واستيلاء الظلمة عليه" (مصطفى رحيباني حنبلي، مطالب اولى النهى ۴/ ۶۵، دمشق، المكتب الاسلامي، ۱۹۶۱ء)

(اور اس شخص کو اختیار ہے جس کے قبضہ میں غصب کردہ اور دیگر مال حرام ہو، اگر وہ اہل اور امانتدار حاکم کو نہ دے، تو حاکم کی اجازت کے بغیر مالکین کی طرف سے صدقہ کردے؛ اس لئے کہ مال سے یا تو دنیا یا تو آخرت کی منفعت مقصود ہوتی ہے، اور آخرت کی منفعت زیادہ راجح ہے، اور وہی اس جگہ متعین ہے اس لئے کہ دوسری منفعت دشوار ہے، اور فقیہ مروزی نے نقل کیا ہے کہ اس کا صدقہ کردینا زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور شیخ تقی الدین ابن تیمیہ فرماتے ہیں: "جس کے ہاتھ میں غصب کردہ مال یا عاریت پر لیا ہوا، یا امانت یا رہن کا مال ہو، اور ان کے مالکین کو پانے سے ناامید ہو، تو صحیح قول یہی ہے کہ ان کی طرف سے صدقہ کردے، اس لئے کہ ایسے شخص کے لئے جسے پانے کی امید نہ ہو، مال کو ہمیشہ کے لئے روکے رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ اس میں مال کو اس چیز کی زد میں لانا ہے کہ وہ ضائع ہوجائے اور اس پر ظالم لوگ قبضہ کرلیں)۔

۶۔ امام نووی شافعیؒ امام غزالیؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"إذا كان معه مال حرام، وأراد التوبة والبراءة منه، فإن كان له مالك معين، وجب صرفه إليه، أو إلى وكيله، فإن كان ميتًا وجب دفعه إلى وارثه، وإن كان لمالك لا يعرفه، ويئس من معرفته، فينبغي أن يصرفه في مصالح المسلمين العامة كالقناطر والربط والمساجد ومصالح طريق مكة، ونحو ذلك مما يشترك المسلمون فيه، وإلا فيتصدق به على فقير أو فقراء، وينبغي أن يتولى ذلك القاضي إن كان عفيفًا، فإن لم يكن عفيفًا، لم يجز التسليم إليه، فإن سلمه إليه صار المسلم ضامنا، بل ينبغي أن يحكم رجلًا من أهل البلد دينا عالما؛ فإن التحكيم أولى من الانفراد، فإن عجز عن ذلك تولاه بنفسه؛ فإن المقصود هو الصرف إلى هذه الجهة، وإذا دفعه إلى الفقير لا يكون حراما على الفقير، بل يكون طيبا..... وله أن يأخذ منه قدر حاجته؛ لأنه أيضا فقير" (نووی شافعی، المجموع شرح المهذب ۹/ ۳۳۲، بيروت، دار الفكر، ۱۹۹۷ء)

(اگر کسی کے پاس مال حرام ہو، اور وہ اس سے توبہ اور نجات کا قصد کرے، سو اگر اس کا متعین مالک ہو تو اسے اس کو یا اس کے وکیل کو دینا واجب ہے، اور اگر وہ مر چکا ہو تو اس کے وارث کو دینا واجب ہے، اور اگر ایسے مالک کا ہو جو معلوم نہ ہو، اور اس کو پانے سے ناامید ہو چکا ہو، تو مناسب یہ ہے کہ اسے مسلمانوں کے مجموعی مصالح میں خرچ کرے، جیسے پل کی تعمیر، فقراء وغیرہ کی سرائے اور مسجد اور مکہ کے راستے کی مصلحتیں، اور ان ہی جیسے دیگر امور میں جن کی منفعت میں مسلمان شریک ہوتے ہیں، ورنہ ایک یا چند فقراء پر صدقہ کر دے، اور مناسب یہ ہے کہ یہ کام قاضی انجام دے اگر وہ پاکدامن ہو، سو اگر وہ پارسا نہ ہو، تو اس کے حوالہ کرنا جائز نہیں ہے، سو اگر اس کے حوالہ کر دے تو حوالہ کرنے والا ضامن ہوگا، بلکہ مناسب یہ ہے کہ اپنے شہر کے باشندگان میں سے کسی دیندار عالم دین کو حکم (ثالث) بنا دے، کیونکہ ثالث بنانا اکیلے تصرف کرنے سے بہتر ہے، سو اگر اس سے عاجز ہو، تو خود اسے انجام دے، کیونکہ مقصد اس مد میں خرچ کرنا ہے، اور اگر فقیر کو دے دے تو اس کے حق میں حرام نہ ہوگا، بلکہ حلال و پاکیزہ رہے گا...... اور وہ اس سے اپنی حاجت کے بقدر لے سکتا ہے، اس لئے کہ وہ بھی فقیر ہے)۔

۷۔ دسوقی مالکیؒ لکھتے ہیں: ''وسبيل ماله إذا لم يمكن رده لأربابه سبيل الصدقة على الفقراء ليس إلا. وقيل: يصرف في جميع منافع المسلمين كبناء القناطر وسد الثغور'' (دسوقی مالکی، حاشية الدسوقي على الشرح الكبير ۳/ ۲۷۷، بيروت. دار الفكر)

(اور اگر حرام مال کو مالکین کو واپس کرنا ممکن نہ ہو، تو اس کی راہ یہ ہے کہ اس کو فقراء پر صرف صدقہ کیا جائے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تمام منافع جیسے پل کی تعمیر اور سرحدوں کی حفاظت میں خرچ کیا جائے)۔

۸۔ علامہ شامی حنفیؒ لکھتے ہیں: ''المغصوب إن علمت أصحابه أو ورثتهم، وجب رده عليهم. وإلا وجب التصدق به'' (ابن عابدين. رد المحتار ۲/ ۲۹۱) (اگر غصب کردہ مال کے مالکین یا ان کے ورثہ معلوم ہوں، تو واجب ہے کہ اسے ان کو واپس دے دیا جائے، ورنہ اس کا صدقہ کرنا واجب ہے)۔

۹۔ علامہ حصکفی حنفیؒ لکھتے ہیں: ''إنما يكفر إذا تصدق بالحرام القطعي'' (حصكفي، الدر المختار ۲/ ۲۹۲)

(کافر تو بس اس وقت قرار دیا جائے گا، جبکہ حرام قطعی کا ثواب کی نیت سے صدقہ کرے)۔

۱۰۔ علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں: ''ويكفر بتصدقه على فقير بشئي حرام يرجو الثواب'' (ابن نجيم. البحر الرائق ۵/ ۱۳۲)

(اور حرام چیز ثواب کی نیت سے فقیر پر صدقہ کرنے سے کافر ہو جائے گا)۔

۱۱۔ علامہ شامی حنفیؒ ''ظہیریہ'' کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''رجل دفع إلى فقير من المال الحرام شيئا، يرجو به الثواب يكفر. ولو علم الفقير بذلك فدعا له. وأمن المعطي كفرا جميعًا..... (و) ينبغي أن يكون كذلك لو كان المؤمن أجنبيًا غير المعطي والقابض. وكثير من الناس عنه غافلون، ومن الجهال فيه واقعون'' (ابن عابدين، رد المحتار ۲/ ۲۹۲)

(کوئی شخص حرام مال سے فقیر کو کچھ دے، اور اس کے ذریعہ ثواب کی امید رکھے، تو وہ کافر ہو جائے گا، اور اگر فقیر کو حرام مال کا علم ہو، پھر بھی وہ دینے والے کو دعا دے، اور دینے والا آمین کہے، تو دونوں کافر ہو جائیں گے، اور یہی حکم اس صورت میں ہونا چاہئے، جبکہ آمین کہنے والا دینے اور لینے والے کے علاوہ کوئی اجنبی شخص ہو، حالانکہ بہت سے لوگ اس سے غافل ہیں اور بہت سے جاہل افراد اس میں مبتلا ہیں)۔

ان فقہی نقول و اقتباسات سے پوری طرح واضح ہے کہ فقراء اور مساکین مال حرام کے مصارف میں سے ایک مصرف ہیں، اور یہ کہ مال حرام غصب کرنے یا رشوت لینے یا سود حاصل کرنے والے کے حق میں خبیث اور گندہ ہے، جبکہ فقیر کے حق میں وہ حلال اور پاکیزہ مال کے درجہ میں ہے۔

خلاصہ یہ کہ مال حرام کو فقراء اور مساکین پر صرف کیا جائے گا، لیکن مال حرام دینے والے کو چاہئے کہ وہ اس سے نجات حاصل کرنے کی نیت کرے، نہ کہ ثواب حاصل کرنے کی نیت سے دے۔

خلاصہ بحث:

۱۔ وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا لینا جائز ہے۔

۲۔ معافی والے قرضے جن میں سود کی شرط نہ ہو درست ہیں۔

۳۔ جو قرض سودی شرط پر مشتمل ہو وہ درست نہیں۔

۴۔ کم شرح سود کو سروس چارج نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

۵۔ جو قرض بھی سود پر مشتمل ہو درست نہیں ہے۔

۶۔ اپنے جائز حق کو حاصل کرنے کے لئے سود دینا پڑے تو بدرجہ مجبوری رشوت کی طرح سود دے سکتے ہیں۔

۷۔ حکومت کی طرف سے ملنے والی امدادی رقم قبول کرنا جائز ہے۔

۸۔ واسطہ بننے والے مطلوبہ محنتانہ کے نام سے جو رقم لیتے ہیں وہ رشوت میں داخل ہے، اور رشوت لینا ہر حال میں حرام ہے۔

۹۔ واسطہ بننے والے افراد کا حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لینا رشوت مین داخل ہے جو کہ حرام ہے، البتہ اپنے جائز حق کے حصول کے لئے رشوت دے سکتے ہیں۔

۱۰۔ امدادی رقوم اور قرضوں کے حصوں کے لئے بدرجہ مجبوری رشوت دے سکتے ہیں۔

۱۱۔ نااہل شخص کا امدادی رقوم لینا یا قرض حاصل کرنا اور اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا ناجائز ہے۔

۱۲۔ اصولی طور سے سود لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، البتہ تعلیم وغیرہ کی حاجت شدیدہ کی بنیاد پر رشوت کی طرح سود دینے کی گنجائش ہے۔

۱۳۔ سودی فنڈ قائم کرنا تاکہ فقراء کی مدد کی جائے درست نہیں ہے، جس طرح اس نیت سے بھی چوری حرام ہے کہ فقراء کی مدد کی جائے گی۔

۱۴۔ تعلیمی و رفاہی اداروں کو پاک اور حلال مال سے چلانا چاہئے۔

۱۵۔ اگر غیر مسلم حکومت سودی فنڈ قائم کرکے تعلیمی و رفاہی اداروں کا تعاون کرتی ہے، تو محتاج تعلیمی و رفاہی ادارے بیت الخلاء اور دیگر مصالح عامہ کے لیے ایسی حکومتی امداد قبول کرسکتے ہیں۔

۱۶۔ فقراء اور مساکین مال حرام کے مصرف ہیں، لہٰذا وہ سودی رقم پر مبنی حکومتی تعاون قبول کرسکتے ہیں۔

۱۷۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ تعلیمی و رفاہی اداروں اور محتاج افراد و اشخاص کے تعاون کے لئے غیر سودی فنڈ قائم کریں۔



سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور شرعی نقطۂ نظر

مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی[1]

۱۔ بینک سے سودی قرض کا حصول:

موجودہ سودی نظام نے ایسی صورت حال پیدا کردی ہے کہ اکثر افراد کا بینک سے واسطہ پڑتا ہی ہے، بینکوں سے ایسے واسطے پڑنے اور معاملات کرنے کے نتیجے میں سود کے بارے میں قسم قسم کے سوالات وجود میں آتے ہیں۔

اسی طرح حکومت اقتصادی اسکیموں، ترقیاتی منصوبوں اور لوگوں کی ضرورتوں کے پیش نظر سودی قرضے کم، زیادہ شرح سود کے ساتھ دیتی ہے، ایسے ہی امدادی یا معافی وغیر معافی والے قرضے بینکوں کے واسطے سے حکومتیں دیتی رہتی ہیں، ان میں سے بعضوں میں کم سود، بعض میں زیادہ سود لیا جاتا ہے، ان کے ماتحت جو سوالات وجود میں آتے ہیں وہ اصلا سود در بوا ہی سے تعلق رکھتے ہیں، اس نوعیت کے بہت سے مسائل کے بارے میں جواب سے پہلے سود در بوا کی وضاحت ضروری ہوتی ہے، لیکن ربوا کی تعریف، اس کی شرعی حقیقت، دائرۂ کار اور اس کے مصارف وغیرہ بھی لوگوں میں عام ہونے کے سبب اس پر اس وقت گفتگو ترک کی جاتی ہے۔

(۱) اولاتو ایک مؤمن بلا شدید ضرورت وحاجت کے قرض نہ لے، اگر واقعی ناگزیر ضرورت کی بناء پر لینا ہی ہے تو بینک کے بجائے کسی اور سے لے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے، لیکن اس وقت قرض دینے کے فضائل وثواب، اس میں مہلت دینے پر اجر وغیرہ سے ناواقفیت کی بناء پر اہل ثروت قرض دینے سے کتراتے ہیں، اور بعض قرض خواہ بھی ادائیگی میں ٹال مٹول کے عادی ہوتے ہیں، یا بعض لوگ بلا ضرورت وحاجت کے ہی قرض لیتے ہیں، دونوں طرف سے افراط وتفریط ہونے کے سبب خمیازہ ان لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے جنہیں حقیقت میں قرض لینا ضروری ہے، اور اہل ثروت سے قرض ملتا نہیں ہے؛ اس لئے بینک سے ہی رابطہ آخری درجہ ہوتا ہے، اور بینک بھی بعض اسکیموں میں قرضوں کا کچھ حصہ معاف کردیتی ہے اور لئے ہوئے حصے سے کم دینا پڑتا ہے، تو اب ایسے آدمی کے لئے اس طرح قرض لینا درست ہوگا یا نہیں؟

یہ بھی حقیقت ہے کہ قومی خزانے میں ہر ہندوستانی شہری کا حق ہے اور اسی حکومتی وسرکاری بینک سے قرض لیا جارہا ہے، فرق اتنا ہے کہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے ان قرضوں پر سود عائد کرنے کی پالیسی آڑے آتی ہے، اور اگر اس سے استفادہ نہ کریں تو بہت سے شعبوں میں مسلمان کی زندگی مفلوج ہوکر رہ جاتی ہے، انہیں پیچیدگیوں کے پس منظر میں جوابات درج ذیل ہے:

مذکور سوال میں لئے ہوئے قرض سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، اس میں سود دینا نہیں پڑتا، لہٰذا اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ سود کا تحقق اس وقت ہوگا جب ایک طرف سے ایسا فضل اور زیادتی ہو کہ دوسری طرف سے اس کا کوئی عوض نہ ہو، جیسا کہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی صاحب فرماتے ہیں:

"عرفه فى الكنز عن الحنفية بأنه فضل مال بلا عوض فى معاوضة مال بمال" (الفقه الاسلامى وادلته: كتاب أنواع البيوع، فصل فى الربا، ج: ۴، ص: ۳۳۵، ط: الهدىٰ إنٹر نیشنل، دیوبند)۔

اسی طرح کی تعریف علامہ شامیؒ (کتاب البیوع، باب الربا، ج: ۷، ص: ۳۹۸، ط: زکریا، دیوبند) نے ذکر فرمائی ہے، لہٰذا یہ صورت سود میں داخل نہیں ہوگی؛ بلکہ چھوٹ کے بعد باقی ماندہ قرض پر سود بڑھائیں تو وہ قرض کی مجموعی رقم سے کم ہوتو اس میں بھی جواز کی گنجائش ہوگی۔

---

[1] شیخ الحدیث ومہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے ہیں: چھوٹ کی جتنی رقم بینک نے دی ہے اس رقم کے اندر اندر تک جو رقم سود کے نام سے دی جائے گی اس میں تاویل کی گنجائش رہے گی، مگر اس رقم سے جب زائد رقم دینی ہوگی تو اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی (منتخب نظام الفتاوی: کتاب البیوع، باب الربوا،ص: ۱۸۳، ج: ۳، ط: ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی)۔

جواب: (۲) اس صورت میں زائد رقم اجل اور مدت کے عوض میں ہے؛ لیکن قرض کے باقی ماندہ حصے کے ساتھ ملانے کی صورت میں قرض کی مجموعی رقم سے زائد نہیں دینا پڑتا، اس لئے اس میں بھی تاویل کی گنجائش رہے گی، جیسا کہ اوپر ''نظام الفتاوی'' کی عبارت سے وضاحت ہو رہی ہے۔

اسی طرح حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

''اگر نیشنلائز بینک سے لون حاصل کیا جائے، جس میں بینک کو سود دینا پڑے، دوسری طرف گورنمنٹ سبسیڈی دے اور وہ سود میں ادا کی گئی رقم کے برابر یا اس سے کم ہو تو یہ صورت جائز ہے؛ کیونکہ جب گورنمنٹ ایک طرف بینک کے واسطہ سے زیادہ رقم حاصل کر رہی ہے اور دوسری طرف اپنے قرض کا کچھ حصہ معاف کر رہی ہے اور بحیثیت مجموعی جتنی رقم آپ نے لی تھی، اس سے زیادہ رقم ادا نہیں کرنی پڑتی ہے، تو چاہے اس کو سود کا نام دیا جائے، شرعاً یہ صورت سود کی نہیں ہوگی؛ کیونکہ سود اس وقت ہوتا ہے جب لین دین کے معاملہ میں بہ حیثیت مجموعی ایک طرف سے زیادہ رقم ہو جائے اور دوسری طرف سے کم؛ لہٰذا ایسے موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں؛ البتہ اگر سبسیڈی کی سہولت نہ ہو تو صرف اس بنیاد پر سودی قرض لینا جائز نہیں ہوگا کہ مسلمان بھی گورنمنٹ کو ٹیکس ادا کرتے ہیں؛ کیونکہ ٹیکس گورنمنٹ کی جانب سے ملنے والی شہری سہولتوں اور امن وامان کے انتظام وغیرہ کا عوض ہے، اس کا آپ کے قرض لینے اور دینے سے کوئی تعلق نہیں'' (کتاب الفتاوی: معاشی وتجارتی مسائل، سود ۱۰ / ۶۱، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی فرماتے ہیں:

''بظاہر تو یہ صورت جائز ہے کہ اس پر کم از کم اس وقت تک سود کی تعریف صادق نہیں آتی جب تک کہ مقروض کی طرف سے واپس کی جانے والی رقم اصل سے زائد نہ ہو، البتہ ایک اشکال یہ ہے کہ ابتداء معاملہ میں یہ بات بھی بہرحال سامنے آئی ہے کہ اگر مقررہ وقت پر مطلوبہ باقی ماندہ رقم ادا نہ کر سکے تو پھر اس حساب سے مزید دینا ہوگا جو کہ بڑھتے بڑھتے اصل سے زائد ہو سکتی ہے'' (الربا: ص: ۲۹۴، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی)۔

جواب: (۳) اس صورت میں مقررہ مدت کے بعد قرض کی اصل رقم کی ادائیگی کے ساتھ مزید رقم کی ادائیگی بلاعوض ہو رہی ہے، اگرچہ معاملہ میں یہ بات طے رہتی ہے کہ مقررہ مدت میں تاخیر کی صورت میں زائد رقم دینی ہوگی، اور متعینہ مدت میں ادائیگی کی صورت میں یہ زائد رقم کی ادائیگی لازم نہیں ہوتی، لیکن یہ شرط بھی فاسد معلوم ہوتی ہے، اور زیادتی سود۔

کیونکہ یہ اجل اور مدت کے عوض میں رقم لی جا رہی ہے اور اجل کوئی ایسی چیز معلوم نہیں ہوتی جس کا عوض لیا جا سکے۔

''لأن الأجل في نفسه ليس بمال، فلا يقابله شئ حقيقة۔'' (رد المحتار: كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، ص: ۱۴۲، ج: ۵، ط: دار الفکر)۔

ہاں اگر یہ بیوعات میں ہو اور وہاں ایک چیز ادھار بیچی جا رہی ہو، تو اس وقت مدت واجل کے عوض میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، اس کو نفع کہا جا سکتا ہے، جبکہ دوران عقد اس عوض کی تعیین ہو جائے۔

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''ووجهه أن الربح في مقابلة الأجل؛ لأن الأجل، وإن لم يكن مالا ولا يقابله شئ من الثمن لكن اعتبروه مالا في المرابحة إذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن۔'' (فقه البيوع: المبحث السادس، باب المرابحة والتولية/۲، ۶۳۶، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)، لیکن یہاں عقد مرابحہ نہیں ہے، بلکہ قرض ہے۔

ہاں ہمارے معاشرہ میں اسکول، کالج اور دیگر کچھ اداروں میں لیٹ فیس وصول کی جاتی ہے، تاکہ مقررہ فیس کی ادائیگی میں تاخیر نہ ہو، ایسے ہی

طلبہ وطالبات بھی وقت مقررہ پر حاضر ہو جائیں اور یہ ایک عام عرف بن چکا ہے، اس لیٹ فیس کا عوام پر اثر بھی پڑتا ہے اور وقت مقررہ میں لازم فیس ادا کردیتے ہیں، اور بینک بھی یہی چاہتی ہے کہ لوگ اس زیادہ رقم کی ادائیگی سے بچنے کے لئے جلدی قرضوں کی ادائیگی کی فکر کریں۔

لیکن اس پر قیاس کی صورت میں بھی ربا کا باب کھل جائے گا، اس لئے مقررہ مدت کے بعد ادائیگی کی صورت میں دی جانے والی زائد رقم کو سود ماننا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ قرض کی مقدار پر اس کے تناسب سے اجرت کا حصول اور مدت ادائیگی میں اضافہ کے ساتھ اس پر اضافہ اپنی ظاہری شکل کے لحاظ سے بعینہ سود ہے اور بظاہر اس کی کوئی مناسب تأویل نظر نہیں آتی۔

(۴) غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل رقم سے زائد کا مطالبہ- جس کی شرح بہت کم ہو- کو سروس چارج کہنا درست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ اس میں تاخیر کی صورت میں اضافہ ہوتا رہے گا، اور جتنی تاخیر اس قرض کی ادائیگی میں ہوتی رہے گی اتنا ہی اضافہ ہوگا؛ حالانکہ اس میں سروس تو یکساں ہی ہوتی ہے، چاہے قرض کی رقم زیادہ ہو یا کم، لیکن اضافہ لی ہوئی رقم کے مطابق ہوتا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ سود ہی ہو، کیونکہ اس پر سود کی تعریف صادق آرہی ہے، شامی میں ہے:

''وشرعا فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال''۔ (۴/ ۱۹۶) اور ایک جگہ لکھتے ہیں: ''كل قرض جر نفعا حرام إذا كان مشروطا'' (۴/ ۱۹۴)۔ اس قرض میں بھی کچھ ماہ کے بعد یا ایک سال کے بعد منافع مشروط ہے، چاہے مقدار کم ہو۔

یہ سروس چارج اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ حساب کرکے صرف حقیقی اور واقعی مصارف وصول کئے جاتے ہوں، دفتری مصارف کا جائزہ لیکر ٹھیک حساب کرکے اس کو عقد قرض کے درمیان ہی مقرر کردیا جائے؛ چاہے اس کی ادائیگی یک مشت ہو یا قسط وار متعین ہو، اس کو سروس چارج کہا جاسکتا ہے، اور یہ رقم واقعی اخراجات سے تجاوز نہ کرے۔

جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''قرض جاری کرنے اور اس کا حساب وکتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں، بینک کے لئے اپنے قرضداروں سے بطور ''سروس چارج'' کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے، جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آئے ہیں۔ البتہ اگر پوری احتیاط کے ساتھ ان اخراجات کی تحدید ممکن ہو تو یہ صورت احکام شریعت کے زیادہ موافق اور مناسب ہوگی، اور اس کے جواز میں کوئی کلام نہ ہوگا۔

اور اگر ہر منصوبہ کے علیحدہ علیحدہ اخراجات کی تحدید ممکن نہ ہو تو اس صورت میں بینک کے لئے ان سے واقعی اخراجات طلب کرنے کے بجائے قرض جاری کرنے سے پہلے اور بعد میں کی جانے والی دفتری کاروائی کی اجرت وصول کرنا جائز ہے؛ بشرطیکہ یہ اجرت اس قسم کے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو، اس لئے کہ قرض دینے کا عمل بذات خود ایک ایسا عمل ہے جس پر نفع کا مطالبہ کرنا یا اجرت کا مطالبہ کرنا شرعا جائز نہیں، لہذا قرض جاری کرنے پر آنے والے مصارف کو اندازے سے لَم سَم وصول کرنا جائز نہیں، لیکن اس قرض کے اجراء پر پیش آنے والے حقیقی دفتری اخراجات کا بلا معاوضہ ہونا شرعا کوئی ضروری نہیں۔

البتہ بینک کے لئے قرض لینے والوں سے قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے اجرت وصول کرنے کی گنجائش ہے جو قرض جاری کرنے پر آنے والے دفتری اخراجات کو پورا کرسکے، بشرطیکہ اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جائے، ایک یہ کہ یہ اجرت اس جیسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل کے برابر ہو، دوسرے یہ کہ اس اجرت کی وصولی کو قرض پر حصول نفع کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنالیا جائے''۔

اس مسئلہ کی نظیر وہ مسئلہ ہے جو فقہاء نے بیان فرمایا ہے کہ قاضی اور مفتی کے لئے فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر مدعی اور مستفتی سے اجرت طلب کرنا جائز نہیں، لیکن مفتی کے لئے فتوی تحریر میں لانے اور قاضی کے لئے دستاویزات لکھنے اور رجسٹر میں اندراجات کرنے کی اجرت لینا جائز ہے:

''يستحق القاضي الأجر على كتب الوثائق والمحاضر والسجلات قدر ما يجوز كالمفتي فإنه يستحق اجر المثل على كتاب الفتوى؛ لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبيان۔ وفي صيرفية: حكم: وطلب

أجرة ليكتب شهادته جاز . وكذا المفتي لو في البلدة غيره '' (رد المحتار مع الدر المختار: كتاب الاجارة، باب فسخ الإجارة . مطلب في اجرة صك القاضي والمفتي . ص: ۱۲۷، ج: ۸، ط: دار الكتب العلمية ، بيروت)۔

بشرطیکہ یہ اجرت ایسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو، اور بشرطیکہ اس کو نفس فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر اجرت لینے کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنایا جائے۔

البتہ قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے ''سروس چارج'' وصول کرنے پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ قرض کی مقدار کی کمی اور زیادتی پر دفتری امور میں یا اس قرض کے اندراجات میں کوئی کمی یا زیادتی واقع نہیں ہوتی۔ (چنانچہ ایک ہزار کے اندراج کے مقابلے میں دو ہزار کے اندراج میں کوئی زیادتی واقع نہیں ہوتی) اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہ ''سروس چارج'' کی رقم ہر قرض لینے والے سے برابر وصول کی جانی چاہئے، قرض کی مقدار کی کمی اور زیادتی سے اس پر کوئی فرق واقع نہ ہونا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اجرت مثل ہمیشہ کام کرنے کی اس مشقت کے بقدر ہونا ضروری نہیں ہے، جو عامل نے برداشت کی ہے؛ بلکہ بعض اوقات اس میں کام کی نوعیت اور اس کی معنوی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا ہے اور بعض اوقات مستاجر کو حاصل ہونے والے نفع کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، اسی لئے بعض اوقات معمولی مشقت کے کام پر زیادہ اجرت دی جاتی ہے اور بعض اوقات زیادہ مشقت کے کام پر تھوڑی اجرت دی جاتی ہے (فقہی مقالات: اسلامی بینکنگ کے چند مسائل ۱/ ۲۷۰، ۲۷۱، ط: زمزم بکڈپو، دیوبند)۔

جدہ فقہ اکیڈمی کا فیصلہ اس مسئلہ میں درج ذیل ہے:

''وہ قرض جس کی مدت پوری ہوگئی ہو اور مقروض ادائیگی سے معذور ہو اس پر تاخیر کے عوض میں لیا جانے والا کوئی بھی اضافہ یا انٹرسٹ، اسی طرح قرض پر ابتداء معاملہ ہی سے لیا جانے والا اضافہ یا انٹرسٹ دونوں شرح سود اور حرام ہیں'' (فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے: دوسرا سیمینار، قرارداد نمبر: ۱۰ (۱۰/ ۲) ص: ۸۹، ط: ایفا پبلیکیشنز)۔

اور تیسرے سیمینار کے فیصلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''(اول) اسلامی ترقیاتی بینک کے لون (قرض) پر سروس چارج لینا درست ہے بشرطیکہ وہ حقیقی اخراجات کے دائرہ میں ہو۔

(دوم) حقیقی اخراجات سے زائد کوئی بھی رقم شرعاً سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے''

(فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے: تیسرا سیمینار، قرارداد نمبر: ۱۳: (۱/ ۳) ص: ۹۷، ط: ایفا پبلیکیشنز)۔

اسی طرح اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے گیارہویں اجلاس (منعقدہ: مکہ مکرمہ بتاریخ ۱۳--۲۰/ رجب ۱۴۰۹ مطابق ۱۹-۲۶/ فروری ۱۹۸۹) میں درج ذیل تجویز منظور کی گئی: ''اگر قرض دینے والے نے مقروض پر شرط لگائی یا اس پر لازم کیا کہ اگر مقروض دونوں کے مابین طے شدہ مدت کے اندر ادائیگی میں تاخیر کرتا ہے تو ایک مقررہ مقدار میں یا کسی مقررہ شرح سے مالی جرمانہ دینا ہوگا، تو ایسی شرط کا لزوم باطل ہے، اس پر عمل ضروری نہیں، بلکہ جائز بھی نہیں ہے، خواہ شرط لگانے والا کوئی بینک ہو یا کوئی اور شخص، اس لئے کہ یہ تو بعینہ دور جاہلیت کا سود ہے جس کو حرام قرار دینے ہی کے لئے آیت ربا نازل ہوئی تھی'' (اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے: گیارہواں اجلاس، آٹھواں فیصلہ، ص: ۲۲۷، ط: ایفا پبلیکیشنز)۔

(۵) اوپر چار نمبر میں معمولی اور کم شرح پر کیا جانے والا اضافہ اگر سود کے دائرہ میں آسکتا ہے تو اگر قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو اس صورت میں اس کو بدرجۂ اولی سود کہنا چاہئے، جیسا کہ سوال نمبر چار کے تحت ذکر کردہ جواب سے مصرح ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ بعض مرتبہ یہ قرضے واقعی ضرورتوں کے پیش نظر بدرجۂ مجبوری لئے جاتے ہیں، اور اس وقت شرح سود زیادہ ہوتی ہے، تو کیا ان قرضوں کے پیش نظر ایسے قرضوں کی گنجائش ہوسکتی ہے؟

حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

نقہ حنفی میں اس سلسلہ میں ''الاشباہ والنظائر'' کا جزئیہ بہت معروف ہے جسے عموماً ارباب افتاء ذکر کیا کرتے ہیں: ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (القاعدۃ الخمسۃ، الضرر یزال، ص: ۲۲۶، ط: مکتبہ فقیہ الأمت دیوبند)۔

''حاجت مند کے لیے کچھ نفع کے عوض قرض کا لینا جائز ہے'' لیکن یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: پہلا سوال یہ ہے کہ وہ حاجت کیا ہے؟ اور وہ محتاج کون ہے، جس کے لیے یہ جواز ہے؟ دوسرا یہ کہ جواز جہاں اور جس کے لیے ہوگا کس حد تک؟ فقہ کی اصطلاح میں حاجت اور ضرورت کیا ہے؟ اور اس کے احکام وتفصیلات تو ''الاشباہ والنظائر'' اور اس کی شروح وغیرہ میں مذکور ہیں، اور ارباب افتاء ذکر کرتے ہیں اور کریں گے، میں تو اس موقع پر زیر بحث مسئلہ کی نسبت سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سود کے جواز کا محتاج بقول مفتی محمود حسن صاحب:

(۱) ایسا شخص ہے جو کہ اس درجہ محتاج ہو کہ کما نہیں سکتا اور بغیر قرض کے گزارہ کی کوئی صورت نہیں اور قرض بغیر سود کے ملتا نہیں، یعنی یہ محتاج ایسا شخص ہے کہ جس کے پاس ضروریات زندگی کی صورت میں یا سامان کی صورت میں کوئی اثاثہ نہیں ہے اور نہ وہ کمانے پر قادر ہے۔

(۲) یہ محتاج ایسا شخص ہے جس کے پاس ضروریات زندگی، مکان، کپڑے، ضروری برتن کی صورت میں اثاثہ ہے، مگر ضروریات پورا کرنے کے لیے نقد اثاثہ نہیں ہے اور ضروریات کا جو سامان بیچ دے تو عزت کے ساتھ سر و بدن چھپانے کی صورت بھی جاتی رہے اور کمانے پر بھی قادر نہیں۔

(۳) یہ محتاج ایسا شخص ہے کہ جس کے پاس مکان وغیرہ ضروریات کے ساتھ اتنی کم زمین ہے جس سے کسی طرح اس کی ضرورت کی بقدر غلہ یافت ہوسکتی ہے، مگر اس کے حصول کے لیے معاون چیزیں نہ ہونے کی وجہ سے اسے زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثلاً کھاد، بیج وسینچائی کے حق میں اور اس کے مخصوص حالات کے پیش نظر مزدوری کے حق میں بھی زحمت ہوتی ہے کہ خود بدن سے محنت نہیں کرسکتا اور مزدوری کے پیسے نہیں پاتا اور اس قسم کی صورت میں ایسے شخص کو غیر سودی قرض یا کوئی امدادی رقم کہیں سے حاصل نہیں ہوسکتی تو وہ اس حد کے تحت آئے گا اور خیال رہے کہ کمانے پر قادر نہ ہونے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ صحت وقوی کمزور ہوں؛ بلکہ صحت وقوی کے ہوتے ہوئے آدمی خاندانی طور پر محنت ومشقت کا عادی نہیں ہے تو وہ بھی قادر نہیں شمار ہوگا، اور جیسے قدر کفاف روزی کے لیے آدمی کو محتاج قرار دے کر جواز ہوسکتا ہے، ایسے ہی اگر رہائش کے مسئلہ میں آدمی واقعی مجبور ہو کہ کرایہ گراں، پھر کرایہ داری مستقل زحمت تو ضرورت کے لیے کافی مکان بنانے کی حد تک بھی اسے محتاج قرار دیا جاسکتا ہے، ایسا شخص کہ جس کے پاس ایک معقول ذریعہ معاش ہے جو بقدر کفاف روزی دیتا ہے، وہ اسے اور اچھا کرنا چاہے، یا پھیلانا چاہے تو وہ محتاج نہیں ہے؛ جیسے کہ رہائش کے ایک مکان کے علاوہ اگر مزید ایک مکان ہے جس کے کرایہ کو استعمال کرتا ہے مگر نا کافی ہے تو وہ محتاج نہیں ہے، اسے مکان بیچ کر ذریعہ معاش اپنانا چاہئے، اسی طرح زائد از ضرورت گھر کا سامان ہوتے ہوئے انسان محتاج نہیں کہلائے گا، حضرت گنگوہیؒ نے ایک فتوی میں فرمایا کہ مکان اگرچہ نقصان کے ساتھ بیچنا پڑے، مکان بیچ دے مگر سود نہ دے، جیسے کہ احتیاج کے تحت اس کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس وسیع کاروبار ہے، کاروبار پھیلانے کے لیے وافر سرمایہ موجود ہے، لیکن اگر وہ اپنی ضروریات کے لیے اپنے سرمایہ کو سامنے لاتا ہے تو سرکاری قوانین کے سامنے اس کو جواب دہ ہونا پڑے گا؛ بلکہ مجرم کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا اور بڑی زحمتیں اور نقصان اٹھانے پڑیں گے، اب وہ مجبور ہو کر اپنی جائز کمائی کو بچانے اور چھپانے کے لیے اگر اقدام کرے تو اس کو بھی حد ضرورت میں شمار کیا جاسکتا ہے، جیسے کہ کاروبار وغیرہ کے انشورنس کے حق میں اہل افتاء کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ چونکہ یہ جواز مخصوص حال وحاجت کی بنا پر ہے اس لئے صرف اسی حد تک ہوگا کہ جس سے یہ حاجت آدمی کی پوری ہوجائے یعنی معقول صورت میں کہ جو گزارہ کے لیے واقعی کافی ہو اور اس کی ضرورت کی حالت ختم ہوجائے جیسا کہ جواز کے فتویٰ کے ساتھ اکابر نے تصریح کی ہے اور فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے (الربا: ص: ۲۹۰-۲۹۲)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب فرماتے ہیں:

''اگر کسی شخص کے پاس اپنی ضرورت کے بقدر رہائش کی سہولت نہ ہو اور اتنا پیسہ بھی نہ ہو کہ مکان بنا سکے، یا کوئی نوجوان بے روزگار ہو اور ضروری حد تک روزگار کے لئے اس کو وسائل مہیا نہ ہوں تو اس کے لیے حکومت کی ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانا درست ہے، اور اس پر جو سود ادا کرنا پڑے ان شاء اللہ وہ عند اللہ اس سلسلہ میں معذور سمجھا جائے گا، سود کا مجبوری کے بغیر دینا بھی گناہ ہے؛ لیکن دوسرے اشخاص یا بینکوں کے مقابلہ حکومت کو سود ادا کرنے کا معاملہ نسبتاً خفیف ہے؛ کیونکہ بے مکانوں کو مکان فراہم کرنا اور بے روزگاروں کے لئے روزگار کے مواقع مہیا کرنا حکومت

کی ذمہ داری ہے؛ لہٰذا ان مقاصد کے لئے حکومت جو قرض دے رہی ہے، اگر کوئی شخص قرض کی شرائط کو پورا کرتا ہو تو وہ واقعی اس کا حقدار ہے اور اس پر سود ادا کرنا اپنے جائز حق کو حاصل کرنے کے لئے مجبوراً رشوت ادا کرنے کے مماثل ہے، جس کی اجازت دی گئی ہے'' (کتاب الفتاوی: معاشی وتجارتی مسائل ۱۰/ ۶۴، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

(۶) یقیناً قانونی طور پر ترقیاتی منصوبوں یا بعض ضروریات کے لئے حکومت کی طرف سے مکمل امداد کی مد میں دی جانے والی رقم سے استفادہ کا حق عام ہندوستانیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے، اور مسلمان بھی اس جمہوری ملک میں عام شہری کی حیثیت سے شریک ہیں، اور جب تک ہمیں یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ مذکور حکومتی امداد حرام ذرائع کی آمدنی سے دی جاتی ہے تو اس کے استعمال میں گنجائش معلوم ہوتی ہے جیسا کہ فتاوی عالمگیری میں مذکور ہے:

''قال أبو الليث: اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان. قال بعضهم: يجوز ما لم يعلم أنه يعطيه من حرام۔ قال محمد: وبه نأخذ ما لم نعرف شيئا حراما بعينه، وهو قول أبي حنيفة وأصحابه. كما في الظهيرية'' (كتاب الكراهية. الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات ۵/ ۳۴۲. ط: مکتبہ زکریا دیوبند)۔

(۷، ۸) کچھ بنیادی ضرورتیں ہے جیسے بیت الخلاء کی تعمیر، کیونکہ وطن عزیز میں عصمت دری کے واقعات ہر روز اخبارات کی سرخیاں بٹورتے ہیں، اس لئے عصمت وناموس کی حفاظت اور سہولتوں کے پیش نظر بھی بیت الخلاء قریب میں ہو یہ ایک ضرورت معلوم ہوتی ہے، اسی طرح آدمی کا خود کا مکان ہو تو اپنی ضروریات کے مطابق اس میں رہن سہن اختیار کرتے ہوئے کام کاج کر سکتا ہے، ایسی اہم ضرورتوں کے لئے آدمی کی اقتصادی حالت درست نہ ہو تو حکومتی تعاون وامداد کا حصول اس کی مجبوری بن جاتا ہے، پھر بھی اس سے احتراز کرے اور دیگر ممکن ذرائع ووسائل کو کام میں لائے پھر بھی یہ ضروریات کی تکمیل نہ ہوتی ہو تو بدرجہ مجبوری حکومتی تعاون وامداد لے گا۔

لیکن وطن عزیز کی بدقسمتی ہے کہ حکومتی قرض اور تعاون کے حصول کے لئے یا حکومتی دفتروں میں جائز وضروری کام یا حق وصول کرنے کے لئے بھی مٹھی گرم کروانا ضروری ہوتا ہے، اور آج کل یہ کام دلالوں کے لئے ایک ذریعہ معاش بن چکا ہے، جس کو اب محنتانہ واجرت کا نام دیا جانے لگا ہے، اب براہ راست رشوت لینے میں عملہ کو پکڑے جانے کا ڈر ہے اس لئے اس میں دلالوں کو واسطہ بنادیا گیا۔

بہر حال اشد مجبوری کی صورت میں حکومتی امداد وتعاون کے حصول کے لئے واسطہ بننے والے افراد کو ان کی اجرت دینا ضروری ہو گیا ہے تا کہ ہمیں امداد جلدی مل جائے اور دوسری پریشانیوں سے دوچار نہ ہونا پڑے؛ اس لئے بوجہ مجبوری رشوت کی طرح اس طرح کی اجرت دینا جائز معلوم ہوتا ہے، چاہے وہ اجرت متعین ہو یا فیصد کے حساب سے۔

اور اگر واقعی وہ محنت ہی کر رہا ہے، اور دفتری افسران اس دلال کی اجرت یا ملنے والی امداد سے کوئی رقم بطور رشوت وصول نہیں کرتے ہیں، اور یہ دلال لوگوں کو آسانی فراہم کرنے کی غرض سے ہی جدوجہد کر رہا ہے تو پھر اس اجرت میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔

چاہے یہ اجرت متعین ہو یا فیصد کے حساب سے دی جاسکتی ہے؛ جیسا کہ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

سمسرۃ کے معنی:

سمسرۃ کے معنی ہیں دلالی اور دلال کو سمسار کہتے ہیں۔

''السمسار: من يعمل للغير بالأجر بيعًا او شراءً ويقال له في العرف الدلال، كذا في جمال الحسنیٰ'' (دستور العلماء وجامع العلوم في اصطلاح الفنون: باب السين مع الميم ۲/ ۱۳۲، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)۔

اس سے وہ شخص مراد ہے جو کسی کو کوئی چیز خریدنے میں مدد دے، بائع اور مشتری کے درمیان رابطہ قائم کرے اور کسی سے سودا کرائے۔ بعض اوقات سمسار، بائع کا اور کبھی مشتری کا وکیل ہوتا ہے اور بعض اوقات دونوں کا وکیل ہوتا ہے۔

دلال کی اجرت کے بارے میں اختلاف فقہاء:

دلال کی اجرت کے بارے میں فقہاء کرام کے درمیان کچھ اختلاف ہے، پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دلالی کی ایک صورت تو ایسی ہے جس کا جواز متفق علیہ ہے۔

دلالی کے جواز کی متفق علیہ صورت:

متفق علیہ صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے کہا: مثلاً میرا فلاں مکان ہے تم اس کے لئے مشتری تلاش کرو اور مدت مقرر کردی کہ ایک مہینہ کے اندر اندر تم میرے لئے مشتری تلاش کرو، اس ایک مہینہ میں تم میرے اجیر ہوں گے، اس کی میں تمہیں اتنی اجرت ادا کروں گا۔

اس معاہدہ کی رو سے اگر فرض کریں کہ اس نے پندرہ دن میں مشتری تلاش کرلیا اور بائع ومشتری کے درمیان سودا ہو گیا تو اس کو پندرہ دن کی اجرت مل جائے گی، اس کو ایک مہینہ کے لئے اجیر رکھا تھا، فرض کریں اس کی پانچ ہزار اجرت مہینہ کی مقرر کی گئی تھی، اس نے پندرہ دن میں تلاش کرلیا تو اس کی اجرت ڈھائی ہزار ہوگئی۔

یہ صورت درحقیقت سمسرۃ کی نہیں بلکہ حقیقت میں یہ اجارہ ہے اور اس کے جواز پر سب کا اتفاق ہے۔

''الإجارة شرعًا: هي بيع منفعةٍ معلومة بأجر معلومٍ'' (كنز الدقائق مع البحر: كتاب الاجارہ ۷/ ۵۰۶، ط: مکتبہ زکریا، دیوبند)۔

اور ''ہدایہ'' میں ہے: ''الإجارة عقد يرد على المنافع بعوض'' (كتاب الاجارات ۳/ ۲۹۳، ط: ادارة المعارف، دیوبند)۔

اور ''الموسوعۃ الفقہیہ'' میں ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے:

''عرفها الفقهاء بأنها عقد معاوضة على تمليك منفعة بعوض'' (۱/ ۲۵۲)۔

اور اگر فرض کریں کہ وہ پورا مہینہ کوشش کرتا رہا، مشتری تلاش کرتا رہا؛ لیکن اس کو کوئی مشتری نہ ملا تب بھی مہینہ ختم ہونے پر اس کے پانچ ہزار روپے واجب ہوجائیں گے، یہ اجارہ ہے اور اس کے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

سمسرۃ کی معروف صورت:

لیکن سمسرۃ کی عام طور پر جو صورت معروف ہے وہ یہ ہے کہ آپ میرے لئے مشتری تلاش کریں، اگر مشتری تلاش کر کے لائیں گے تو میں آپ کو پانچ ہزار روپے دوں گا، اس میں عام طور پر مدت نہیں ہوتی؛ بلکہ عمل کی تکمیل پر اجارہ ہوتا ہے کہ اگر تم مشتری تلاش کر کے لاؤ گے تو تمہیں پانچ ہزار روپے ملیں گے۔

اب اگر بالفرض وہ دوسرے دن تلاش کر کے لے آیا تو اس کو پانچ ہزار روپے مل گئے اور اگر دوسرے دن تلاش کر کے نہ لایا، دوسرا دن کیا پورا مہینہ گزر گیا، دو مہینہ گزر گئے وہ کوشش کرتا رہا لیکن کوئی مشتری نہیں ملا تو ایک پیسہ بھی اجرت نہیں ملے گی، اس کو عام طور پر سمسرۃ کہتے ہیں۔ اس کے جواز میں فقہاء کرام کا کلام ہوا ہے۔

امام شافعی، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا قول:

امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کو مطلقا جائز کہتے ہیں شرط صرف یہ ہے کہ اجرت معلوم ہو۔

حنفیہ کا مسلک:

امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں علامہ عینیؒ نے ''عمدۃ القاری'' میں یہ نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک یہ عقد جائز نہیں ہے اور انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی طرف غالبًا یہ قول اس وجہ سے منسوب کیا ہے کہ یہ اجارہ تو ہے نہیں، اس لئے کہ اجارہ میں معقود علیہ یا عمل ہوتا ہے یا مدت ہوتی ہے، اس میں عمل کی

تکمیل سے بحث نہیں ہوتی کہ عمل مکمل ہوا یا نہیں ہوا، اس نے اپنی محنت کی ہے؛ لہٰذا اس کو اس کی اجرت مل جائے گی، یہ اجارہ نہیں درحقیقت سمسرۃ ہے جو جعالہ کی ایک شکل ہے۔

جعالہ:

جعالہ یہ ایک مستقل عقد ہوتا ہے جو اجارہ سے مختلف ہے۔

''الفقہ الاسلامی وأدلتہ'' میں مذکور ہے: ''لغةً: هي ما يجعل للإنسان على فعل شيئ أو ما يعطاه الإنسان على أمر يفعله. وشرعًا: التزام عوض معلوم على عمل معين أو مجهول عسر علمه'' (الفصل الرابع فی الجعالة أو الوعد بالجائزة ۴/۵۸۷)۔

اور ''الموسوعة الفقهيه'' میں مذکور ہے: ''التزام عوض معلوم على عمل معين أو مجهول يعسر ضبطه'' (۱۵/۲۰۸)۔

خلاصہ یہ کہ جعالہ کے معنی یہ ہوتے ہیں: اس میں نہ تو کوئی مدت مقرر ہے نہ کوئی عمل مقرر ہے؛ بلکہ عمل کے نتیجے پر اجرت دی جاتی ہے، مثلاً کسی شخص کا غلام بھاگ گیا، پتہ نہیں وہ کہاں ہے؟ اس نے کسی شخص سے کہا کہ اگر تم میرے غلام کو میرے پاس لے آؤ تو تمہیں اتنی اجرت دوں گا۔

اب غلام کب آئے گا؟ کتنی دیر لگے گی؟ کتنی محنت کرنی پڑے گی؟ یہ سب کچھ مجہول ہے، ملے گا یا نہیں ملے گا، ہوسکتا ہے چھ مہینے تلاش کرتا رہے؛ لیکن وہ نہ ملے اور ہوسکتا ہے کہ کل مل جائے، ہوسکتا ہے کہ بہت محنت کے باوجود نہ ملے اور ہوسکتا ہے کہ گھر سے باہر نکلے اور مل جائے تو نہ عمل کی تعیین ہے، مدار اس پر ہے کہ جب عمل مکمل ہوجائے گا تو پیسے ملیں گے ورنہ نہیں ملیں گے، اس کو جعالہ کہتے ہیں۔

ائمہ ثلاثہؒ کا مسلک:

ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ یہ تینوں حضرات جعالہ کو جائز کہتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ منسوب ہے کہ وہ جعالہ کو جائز نہیں فرماتے، کیونکہ یہ اجارہ کی شرائط پر پورا نہیں اترتا۔

لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایسی کوئی صراحت موجود نہیں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے کہا ہو کہ جعالہ حرام ہے، البتہ جعالہ کے جواز پر بھی ان کی کوئی روایت موجود نہیں ہے، اس واسطے لوگوں نے یہ سمجھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جعالہ جائز نہیں۔

سمسار کو بھی جعالہ کے اصول پر قیاس کیا چونکہ سمسرہ میں بھی نہ عمل متعین ہے اور نہ مدت متعین ہے، بلکہ یہ کہا کہ جب تم مشتری تلاش کرکے لاؤ گے تو اجرت ملے گی، یہ بھی جعالہ کی ایک شکل ہے۔ اور جعالہ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ سے کوئی روایت نہیں ہے، اس واسطے کہا گیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ عقد جائز نہیں اور علامہ عینیؒ نے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسا کرنا درست نہیں۔

اس کے بارے میں میں نے عرض کیا کہ میرا غالب گمان یہ ہے کہ اس بارے میں امام ابوحنیفہؒ سے کوئی نفی کی بات ثابت نہیں ہے؛ لیکن اثبات کی بھی کوئی روایت نہیں ہے اس واسطے ان کی طرف عدم جواز کی نسبت کی جاتی ہے۔

ورنہ دلائل کے نقطہ نظر سے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ "ولمن جاء به حمل بعير" کی روشنی میں جعالہ کا جواز واضح ہے، اس واسطے متاخرین حنفیہ نے سمسرۃ کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔

دلالی (کمیشن ایجنٹ) میں فیصد کے حساب سے اجرت طے کرنا:

دوسرا مسئلہ اس میں یہ ہے کہ سمسرۃ کی اجرت کی ایک شکل یہ ہے کہ کوئی اجرت مقرر کرلی جائے، اجرت کی مقدار معین کردی جائے کہ تمہیں پانچ ہزار روپے دیں گے تو اس کو بھی جائز کہتے ہیں اور محقق قول کے مطابق حنفیہ کے ہاں بھی جائز ہے، لیکن عام طور سے سمسرہ میں جو صورت ہوتی ہے وہ اس طرح اجرت متعین نہیں ہوتی بلکہ فیصد کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے کہ جتنے تم بیچو گے اس کا دو فیصد تم کو ملے گا۔

آج کل کی اصطلاح میں اس کو کمیشن ایجنٹ (Commission Agent) بھی کہتے ہیں، یعنی تم جو سامان بیچو گے اس کی قیمت کا دو فیصد تمہیں ملے گا، ایک فیصد ملے گا، اجرت فیصد کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے۔

بعض وہ حضرات جو سمسرۃ کو جائز کہتے ہیں کہ اس قسم کی اجرت مقرر کرنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ سمسرۃ درحقیقت ایک عمل کی اجرت ہے اور سمسار کا عمل ثمن کی کمی بیشی سے کم اور زیادہ نہیں ہوتا۔ وہ تو مشتری کو تلاش کر رہا ہے، اب اگر ثمن ایک لاکھ ہے تب بھی اس کو اتنا عمل کرنا پڑتا ہے اور اگر ثمن ایک ہزار ہے تب بھی اتنا ہی عمل کرنا پڑتا ہے؛ لہٰذا اس کو ثمن کی مقدار کے ساتھ مربوط کر کے اس کا فیصد مقرر کرنا، بعض نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔

مفتی بہ قول:

لیکن اس میں بھی مفتی بہ قول یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے اور علامہ شامیؒ نے بعض متاخرین حنفیہ سے نقل کیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ اجرت کا عمل کی مقدار کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ عمل کی قدر و قیمت اور عمل کی حیثیت کے لحاظ سے بھی اجرت میں فرق ہو جاتا ہے، اس کی مثال علامہ شامیؒ نے یہ دی ہے کہ ایک شخص چمڑے میں سوراخ کرتا ہے اور ایک شخص موتی میں سوراخ کرتا ہے۔

اب چمڑے میں سوراخ کرنے والے اور موتی میں سوراخ کرنے والے کے عمل میں محنت کے اعتبار سے کوئی زیادہ فرق نہیں، لیکن موتی کے اندر سوراخ کرنے والے کے عمل کی قدر و قیمت زیادہ ہے، بنسبت چمڑے میں سوراخ کرنے والے کے، تو عمل کی قدر و قیمت کا بھی لحاظ ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص دلالی کر رہا ہے اور اس نے قیمت زیادہ مقرر کر لی ہے تو چونکہ اس کے عمل کی قدر و قیمت زیادہ ہے اس لئے اس میں فیصد کے تناسب سے اجرت مقرر کی جا سکتی ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل: خرید و فروخت کی جائز و ناجائز صورتیں ۳/۱۹۶-۲۰۱، ط: فیصل، نئی دہلی، انعام الباری: کتاب الاجارہ، باب اجر السمسرۃ ۶/۴۵۲-۴۰۷، ط: مکتبہ حقانیہ کھور سورت)۔

اور آج کل دلالی صرف بیع و شراء ہی میں منحصر نہیں رہی؛ بلکہ ہر کام میں اب دلالی آ چکی ہے، خاص طور پر حکومتی افسران اور دفاتر سے کام نکلوانے میں بھی ان سے رابطہ کرنا ضروری ولابدی ہو چکا ہے، ورنہ آدمی مشقتوں سے دو چار ہوتا جاتا ہے۔

(۹) ہمارے یہاں اسلامی بیت المال یا صدقات و زکوۃ کا کوئی منظم نظام نہیں ہے، ایسے ہی غیر سودی قرضوں کا مسلمانوں کے پاس کوئی نظام نہیں ہے اور اس جمہوری ملک میں اگر بدرجہ مجبوری امدادی رقم یا قرض لینے کی نوبت آ جائے تو یہاں کی صورت حال سے کون ناواقف ہے؟ چونکہ رشوت لینا اور دینا دونوں ہی جائز نہیں ہے اس لئے حتی الامکان اس سے بچنا چاہئے، لیکن بدقسمتی سے اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے بھی مٹھی گرم کروانا لازمی جزو بن چکا ہے، اس لئے مجبوری کی صورت میں لی جانے والی امداد یا قرض کے حصول کے لئے رشوت دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور لینے والا گنہ گار ہوگا۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

''ثم الرشوة اربعة اقسام: منها ما هو حرام على الآخذ والمعطي، وهو الرشوة على تقليد القضاء والإمارة۔ الثاني: ارتشاء القاضي ليحكم وهو كذلك ، ولو القضاء بحق؛ لأنه واجب عليه۔ الثالث: أخذ المال ليسوّي أمره عند السلطان دفعا للضرر أو جلبا للنفع، وهو حرام على الآخذ فقط۔ الرابع: ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه او ماله، حلال للدافع حرام على الآخذ، لأن دفع الضرر عن المسلم واجب۔'' (رد المحتار: كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية ۸/۳۵،۳۴، ط: زکریا بکڈپو دیوبند)۔

(۱۰) حکومت کی طرف سے اس کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق بعض ضروریات کے لئے رقوم دی جاتی ہے، اور مسلمان کی شان یہ نہیں ہے کہ دھوکہ دہی یا کذب بیانی سے کام لے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

''قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: آية المنافق ثلث، زاد مسلم: وإن صام وصلىٰ وزعم أنه مسلم ؛ ثم

اتفقا:إذا حدث كذب، وإذا وعد اخلف، وإذا اؤتمن خان'' (مشكوة المصابيح: كتاب الايمان، باب الكبائر وعلامات النفاق ۱/ ۱۷، ط: مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

اولاتو بغیر ضرورت شدیدہ کے اس رقم سے احتراز کی کوشش کرے اور اگر ضرورت شدیدہ کے تحت لینے کی نوبت آئے تو حکومت کی طرف سے جو کچھ شرائط و معیارات ہوں اس کا لحاظ رکھے اور اپنی صحیح و سچی حالت بیان کرنے کے بعد ایسی رقم لے کر استعمال کرنا درست ہے۔

(۱۱) سابق بحث کی روشنی میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر قرض پر عائد ہونے والا سود خود حکومت ادا کردے اور حاجت مند کو صرف قرض کی اصل رقم کی ہی ادائیگی کرنی پڑے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

اور اگر قرض پر عائد ہونے والا سود بھی خود قرض لینے والے کو ادا کرنا پڑتا ہے، چاہے اس کی شرح کم ہو، پھر بھی اس کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی جیسا کہ جواب نمبر: ۴ کے تحت گذر چکا۔

(۱۲) موجودہ دور میں بینک ڈپازٹ بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں، ہر شہر اور ہر ملک کا انسان اپنے کاروباری معاملات میں اس کی شدید ضرورت محسوس کرتا ہے، بلکہ اب حکومتیں بھی رقم ڈپازٹ کرتی ہے، تا کہ اس کے منافع سے تعلیمی شعبوں اور رفاہی اداروں میں تعاون کیا جاسکے، یہ مسائل موجودہ دور میں پیدا ہوئے ہیں، اور اب یہ غالبا ہر ملک کا مسئلہ بن گیا ہے۔

کوئی آدمی اپنے طور پر اپنی رقم بینک میں ڈپازٹ رکھے تو اس کے لئے اس پر حاصل ہونے والے سود سے استفادہ جائز نہیں ہے، لیکن اگر حکومتیں بینک میں رقم رکھے، تو سود کی مالک وہ حکومتیں ہوگی، اب وہ اس منافع اور سود کی رقم سے لوگوں کا تعاون و امداد کرے تو ''لک صدقة ولنا هدية'' (حدیث) کے پیش نظر اس اسکیم سے استفادہ کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی لکھتے ہیں: ''اگر گورمنٹ بینک میں کوئی رقم رکھتی ہے اس کا سود حاصل کرتی ہے، اور اس سے اپنے بعض ملازمین کو تنخواہ کے طور پر دیتی ہے، تو ان ملازمین کو اس تنخواہ سے استفادہ کرنے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ بینک میں رقم رکھنے اور اس پر سود حاصل کرنے کی ذمہ داری گورنمنٹ سے متعلق ہے، نہ کہ ملازمین سے یا ان لوگوں سے جن کا تعاون کیا جائے اور فقہ کا اصول یہ ہے کہ رقم متعین نہیں ہوتی ہے اور مالک کے بدلنے سے شئ کی حیثیت بدل جاتی ہے، یعنی اگر بینک نے گورنمنٹ کو رقم دی تو یہ بعینہ وہ رقم نہیں سمجھی جائے گی، جو ملازمین کو تنخواہ میں ملی ہے؛ البتہ اگر کوئی شخص بہ طور احتیاط کے اس رقم سے پرہیز کرے تو یہ یقینا اس کے لئے باعث اجر ہوگا'' (کتاب الفتاوی: سود، گورنمنٹ کا سود سے تنخواہ ادا کرنا ۱۰/ ۶۱، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

سرکاری اسکیموں سے متعلق چند جدید فقہی مسائل

مولانا محمد مصطفی عبدالقدوس ندوی[1]

ایک حصہ معاف کیا جانے والے قرضے کا حکم:

سوال (۱): وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب: وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے، جس کو سبسیڈی کا عنوان دیا جاتا ہے، معافی کے بعد باقی رقم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضے کو لینا شرعاً درست ہے؛ کیونکہ سبسیڈی حکومت کی طرف سے ایک رعایت واعانت ہے، جو مکمل تعاون نہ کرکے جزوی طور پر تعاون کرتی ہے اور جس طرح دوسری قومیں حکومت سے تعاون ورعایت کی حقدار ہیں اسی طرح مسلمان بھی برابر کے حقدار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مقروضوں کو کلی طور پر یا جزوی طور پر ان کے قرضوں کو معاف کردینے کی بڑی فضیلت بیان کی ہے، اور تنگدست مدیون کو دین کی ادائیگی کے لئے مہلت دینا جو کہ فرض ہے، کے مقابلہ میں معاف کردینا جو کہ نفل ومستحب ہے، افضل وبہتر قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ" (البقرۃ: ۲۸۰)۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ اور علامہ سبکیؒ نے لکھا ہے کہ تنگدست مدیون کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کے قرض کو معاف کردینا مستحب ہے؛ لیکن ثواب کے اعتبار سے معاف کردینا مہلت دینے کے مقابلہ میں بڑھا ہوا اور افضل ہے۔

(الاشباہ والنظائر لابن نجیم المصری: ۱/۴۵۱، وللسبکی: ۱/۱۸۱)۔

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرض دینے والوں کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنے تنگدست مقروضوں کو ان کے پورے قرضے یا بعض معاف کردیں، اور فرمایا: ایسا کرنا تمہارے حق میں خیر ہی خیر ہے (تفسیر ابی سعود: ۱/۸۶۲، تفسیر طبری: ۵/۴۶/۶۳۶)۔

اس اعتبار سے حکومت کا یہ عمل قرآن کے مطابق ہے اور پسندیدہ عمل ہے، اور مسلمانوں کے لئے اس طرح کے قرضے سے فائدہ اٹھانا صحیح ہے بشرطیکہ حکومت کا معاملہ اسی حد تک ہو، اس معاملہ کی کسی صورت میں حکومت کی طرف سے قرض سے زائد رقم کا مطالبہ نہ ہو، ورنہ درست نہیں ہوگا؛ کیونکہ یہ پھر سودی قرض میں شامل ہوجائے گا۔ جس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

قرض کی پوری رقم ادا کرنا اور زائد رقم نہ دینا:

سوال (۲): معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے اس صورت کا کیا حکم ہے جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

جواب: اصولی طور پر قرض لیا ہی اسی لئے جاتا ہے کہ اسے واپس کرنا ہے، اور پورا واپس کرنا ہے، عرف میں بھی قرض لینے کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے، قرض دینے والا معاف کردے تو اس کا احسان وفضل ہے۔ شریعت اسلامیہ نے بھی اپنے ماننے والوں کو یہی تعلیم دی کہ قرض میں اصل قرض دینے والے کو اس کا پورا سرمایہ واپس کردینا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ" (البقرۃ: ۲۸۰)۔

[1] استاذ کلیۃ القرآن والحدیث جامعہ اسلامیہ کیرالا۔

پس سوال میں ذکر کردہ صورت درست ہے؛ کیونکہ مقروض حکومت کو اصل سرمایہ ہی واپس کرتا ہے، کوئی زائد رقم واپس نہیں کرتا ہے؛ اس لئے اس میں سود کی صورت نہیں پائی گئی۔

کل سرمایہ کی واپسی کے ساتھ زائد رقم دینے کا حکم:

سوال (۳): اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: یہ صورت درست نہیں ہوگی؛ کیونکہ زائد رقم سود ہے؛ اس لئے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہیں ہے، اور معاملہ کرتے وقت حکومت کی طرف سے بعض صورتوں میں جن میں ایک صورت یہ بھی ہے شرط ہوتی ہے کہ اگر مقررہ مدت تک قرض واپس نہیں ہوا، تو اس کے بعد قرض ادا کرنے پر اتنی زائد رقم ادا کرنی ہوگی جو کہ سود ہے؛ اس لئے کہ اصول یہ ہے کہ جس معاملہ میں سود کی آمیزش ہو، خواہ وہ ابتداءِ عقد میں ہو، یا وسطِ عقد میں، یا انتہاء عقد میں، وہ معاملہ درست نہیں؛ کیونکہ وہ شرعی قباحت وحرمت سے خالی نہیں؛ اس لئے کہ قرض لینے والا قرض کے دباؤ میں اس شرط کو قبول کر رہا ہے کہ اگر وہ مقررہ مدت تک قرض ادا نہیں کر سکا تو مقررہ مدت گذرنے کے بعد قرض ادا کرنے پر زائد رقم جو کہ سود ہے، بھی ادا کرے گا، اس شرط کی وجہ سے یہ سودی معاملہ ہو گیا، جس میں قرض دینے والے کا فائدہ ہے، اور وہ قرض کے ذریعہ مالی فائدہ حاصل کر رہا ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ قرض کی وجہ سے جس طرح کا بھی نفع قرض دینے والا حاصل کرے وہ سود ہے: ''كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًا'' (مسند الحارث عن علی مرفوعا، باب فی القرض، حدیث: ۴۳۷)۔

نیز حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ جو شخص کسی کو قرض دے تو اسی کی واپسی کی شرط لگائے مزید کی نہیں

''مَنْ أَسْلَفَ سَلَفًا، فَلاَ يَشْتَرِطْ إِلاَّ قَضَائَهُ'' (موطا الامام مالك، التجارات، باب ما لا يجوز من السلف، حديث: ۲۸۴۱)۔

امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے نقل کیا کہ انہوں نے حضرت ابو بردہؓ سے فرمایا: جب تمہارا کسی پر قرض ہو پھر وہ تمہیں گھاس کا، یا جو کا، یا چارے کا گٹھا تحفہ کے طور پر بھیجے، تو وہ مت لو، اس لئے کہ وہ سود ہے (بخاری، مناقب عبداللہ بن سلام، حدیث: ۳۸۱۴)۔

یہی بات حضرت عمرؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے منقول ہے (السنن الصغیر للبیہقی: باب القرض، ۲/۳۷۲، حدیث: ۲۱۹۱، السنن الکبریٰ للبیہقی: ۵/۳۵۷، حدیث: ۱۰۹۳۳، المغنی لابن قدامہ: ۴/۲۴۰، الفتاوی الکبریٰ لابن تیمیہ: ۴/۲۱۶، بحوالہ سنن سعید بن منصور)۔

علامہ عینیؒ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے قول کی تشریح کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ قرض دینے والے کا مقروض سے ہدیہ قبول کرنا سود کے قائم مقام ہوگا؛ اس لئے کہ جتنا اس نے دیا ہے اس سے زائد لے رہا ہے

علامہ ابن قدامہؒ نے حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ ان حضرات نے ایسے قرض سے روکا ہے جس سے فائدہ اٹھایا جائے (المغنی لابن قدامہ: ۴/۲۴۰)۔ امام بغویؒ نے حدیث بالا کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: اگر قرض میں یہ شرط ہو کہ اس سے زیادہ مقدار یا اس سے افضل چیز کو واپس کرنا ہوگا تو وہ حرام ہوگا (شرح السنہ للبغوی: ۸/۱۹۳)۔

مذکورہ بالا نصوص وتصریحات سے معلوم ہوا کہ مدت کے عوض کسی طرح کا فائدہ اٹھانا سود ہے؛ اس لئے اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی دینی پڑے تو یہ قرض کا معاملہ درست نہیں ہوگا؛ کیونکہ زائد رقم سود ہے؛ اس لئے کہ یہ زائد رقم عوض سے خالی ہے اور شرط کے مطابق مدت کے بدلہ ہے۔ نیز سدّ اللذریعہ قاعدہ کے مطابق بھی مذکورہ قرض کی صورت کا معاملہ ناجائز ہونا معلوم ہوتا ہے؛ کیونکہ عملی طور پر دیکھا جاتا ہے کہ قرض کی ادائیگی مقررہ مدت کے اندر ادا کرنے والے سے عام طور پر تاخیر ہو جاتی ہے اور تاخیر کرنے کی بناء پر سود ادا کرتے ہیں۔

نیز غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا قرض کی صورت اگر مقررہ مدت کے اندر قرض ادا کر دیا تو زائد رقم نہیں دینی پڑے گی، اور اگر مدت گذرنے کے بعد قرض کی ادائیگی ہوتی ہے تو زائد رقم دینی پڑے گی کا معاہدہ اصلاً سود کی بنیاد ہی پر ہوتا ہے، اور اس کی ادائیگی کا وعدہ ہوتا ہے۔ دراصل حکومت یا سرکاری یا پرائیوٹ بینک اس طرح کے اسکیمی قرضے لوگوں کو پھانسنے کے لئے جاری کرتے ہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شکاری مچھلی

کو چارہ ڈالتا ہے شکار کرنے کے لئے نہ کہ مچھلی کے ساتھ خیر خواہی اور اس کا پیٹ بھرنے کے لئے؛ کیونکہ معلوم ہے کہ لوگ عام طور پر مقررہ مدت کے اندر قرض ادا نہیں کر پاتے ہیں۔

سروس چارج کے نام پر زائد رقم کا مطالبہ:

سوال (۴): غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو؛ لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرے میں آئے گا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت و گنجائش ہوگی؟

جواب: اس صورت میں بنیادی طور پر سوچنے کا مقام یہ ہے کہ آیا یہ زائد رقم اصل قرض کے ساتھ ملحق ہو کر ادا کی جاتی ہے، یا اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، اگر اصل قرض کے ساتھ ملحق کر کے زائد رقم ادا کی جاتی ہے تو یہ سود ہے، اس کو سروس چارج کا عنوان نہیں دیا جا سکتا؛ کیونکہ سود کا شبہ قوی ہے؛ اس لئے کہ سود اصل قرض کے ساتھ ہی لیا دیا جانا معروف و مروج چلا آ رہا ہے۔ نیز یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ قرض دینے والا ادارہ، شخص، حکومت یا بینک زائد رقم سروس چارج کے نام پر لیتے ہیں یا انٹرسٹ (سود) کے نام پر، اگر وہ انٹرسٹ کے نام پر لیتے ہیں تو اس کو سروس چارج کا نام دے کر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا ہے، فقہ اسلامی کا مشہور قاعدہ ہے: ''لا عبرة للدلالة فی مقابلة التصریح'' (مجلۃ الأحکام العدلیۃ، ص: ۱۷، مطبوعہ کراچی)

امام محمدؒ سے بھی یہ قاعدہ تھوڑے سے الفاظ کے فرق کے ساتھ منقول ہے:

''لاعبرة للدلالة مع التصریح بخلافه'' (الجامع الصغیر، باب فی الرجعة، ص: ۸۲۲)۔

صاحب درر نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: ''التصریح أقوی من الدلالة'' (دررالحکام شرح غررالأحکام، الاختلاف فی المھر: ۲۲/ ۱، مزید ملاحظہ ہو: المبسوط للسرخسی: ۱۵۱/ ۵، ۳۲/ ۱۱، البدائع للکاسانی، فصل فی أحکام العدة: ۲۰۶/ ۳، تبیین الحقائق للزیلعی، باب المھر الھبة: ۲۹/ ۵، الماذون: ۲۱۲/ ۵، العنایة شرح الھدایة، الماذون: ۴۹۲/ ۹، البحر الرائق، الأمة الماذون لھا: ۱۱۱/ ۸)۔

اگر یہ زائد رقم سروس چارج کے عنوان سے لیتے ہیں اور قرض کے ساتھ ملحق ادا نہیں کی جاتی ہے، اور نہ ہی شرح سود سے اس کا حساب ہوتا ہے، اور اس کی مقدار اتنی ہے کہ سروس چارج ہی کہے جانے کے لائق ہے۔ اگر یہ شرطیں پائی جائیں گی تو زائد رقم سود کے دائرہ میں نہیں آئے گی، بلکہ انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت و گنجائش ہوگی۔ واضح رہے کہ اگر زائد رقم کی مقدار سروس چارج کہلانے جانے کی مقدار سے بڑھ کر ہے تو وہ سود کے دائرہ میں آ جائے گی؛ اس لئے کہ اس وقت شبہ ربا پایا جائے گا؛ کیونکہ زائد رقم کا ہونا سود کے لئے قرینہ ہوگا نہ کہ سروس چارج کا۔

سوال (۵): اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جا سکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

واضح رہے کہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جا سکتا ہے؟

اصل قرض سے زائد رقم کو سروس چارج پر محمول کرنا مشکل ہو:

جواب: جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ یہ زائد رقم اتنی ہو کہ انتظامی خرچ پر محمول نہ کیا جا سکے تو وہ سود کے دائرہ میں آئے گی اور یہ قرض کا معاملہ ناجائز وحرام ہوگا؛ اس لئے کہ اس میں شبہ ربا پایا جا رہا ہے، اور وہ بھی قوی ہے، اور شبہ ربا اصل ربا کے حکم میں ہوتا ہے، علامہ سرخسیؒ کا بیان ہے:

''الفضل الذی ھو یتوھم الوجود کالمتحقق فی باب الربا احتیاطا'' (المبسوط للسرخسی، بیع السویق بالدقیق: ۱۷۱/ ۲۱، نیز دیکھئے: البدائع، فصل فی شرائط جریان الربا: ۱۹۸/ ۵، ہدایہ، باب الربا: ۲۶/ ۳)۔

وہ اضافہ جس کے وجود کا احتمال ہو وہ بربناء احتیاط سود کے باب میں موجود کی طرح ہے۔

علامہ زیلعیؒ رقم طراز ہیں:

''والاحتراز عن شبهة الربا واجب كالاحتراز عن حقيقة الربا؛ لأن الشبهة في باب المحرمات ملحقة بالحقيقة'' (تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق باب الربا: ۴/۸۷، نیز دیکھئے: العناية شرح الهداية، بيع الصرف: ۶/۵۱۴، درر الحكام شرح غرر الأحكام، أركان الدعوى: ۲/۳۳۲، قرة عين الأخبار لتكملة رد المحتار: ۸/۸۷)۔

شبہ ربا سے بچنا واجب ایسے ہی ہے جیسے حقیقت ربا سے بچنا واجب ہے؛ کیونکہ محرمات کے باب میں شبہ حکم میں حقیقت سے ملحق ہوتا ہے۔

شبہ ربا سے بچنے کے وجوب کی اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

حلال وحرام کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، جن کو بہت سارے لوگ نہیں جانتے ہیں، پس جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچا، اس نے اپنے دین وآبرو کو محفوظ رکھا، اور جو مشتبہ چیزوں میں پڑا وہ (ایک نہ ایک دن) حرام میں مبتلا ہو گیا (مسلم، باب اخذ الحلال وترک التبہات، حدیث: ۱۵۹۹)۔

حضرت حسن بن علیؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مشتبہ ومشکوک کو چھوڑ کر غیر مشتبہ ومشکوک کو اختیار کرو (ترمذی، حدیث: ۲۵۱۸، یہ حدیث صحیح ہے، صحیح ابن حبان، حدیث: ۷۲۲)۔

نیز اسی اساس پر فقہی قاعدہ ہے: ''إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام'' (الاشباه والنظائر لابن نجيم المصري: ۱/۱۰۹)۔

اور جب زائد رقم اتنی ہے کہ انتظامی خرچ جس کو سروس چارج سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، پر محمول کرنا مشکل ہو تو حدیث ''كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًا'' (مسند الحارث عن علي مرفوعا، باب في القرض، حديث: ۴۳۷) اور اوپر ذکر کردہ آثار صحابہؓ کی بناء پر ناجائز وحرام ہوگا۔

ضرورت کے وقت سودی قرض لینا:

اوپر سوالنامہ میں ذکر کیا گیا کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جا سکتا ہے؟

جیسا کہ اوپر تفصیل سے بات آچکی ہے، ان تفصیلات کو سامنے رکھتے ہوئے زیر بحث مسئلہ کا حکم یہ ہوگا کہ جن صورتوں میں سود کا تحقق نہیں ہوتا ہے ان میں قرض لینا درست ہوگا، اور جن صورتوں میں سود یا شبہ سود کا تحقق ہوتا ہے، ان میں ذکر کردہ ضروریات ومقاصد کے لئے قرض لینا درست نہیں ہوگا، اصل حکم یہی ہے۔ ہاں اگر کوئی محتاج وضرورتمند ہو، اس کی احتیاج اس حد تک ہو کہ اس کے لئے سودی قرض لئے بغیر چارہ کار نہ ہو، تو اس کے لئے سودی قرض لینا درست ہوگا، فقہاء کا بیان ہے: ''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الأشباه والنظائر لابن نجيم المصري: ۱/۳۹) یعنی ضرورتمند کے لئے سود پر قرض حاصل کرنا جائز ہے۔

بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے امدادی رقوم لینے کا حکم:

سوال (۶): ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب: ایسے رقوم کا حاصل کرنا اور استعمال کرنا درست ہے؛ کیونکہ یہ رقوم حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کے لئے بطور اعانت کی ہوتی ہے، اور ملک کے خزانہ پر جس طرح دوسرے لوگوں کا حق ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی حق ہے، اور وہ بھی براہ راست یا بالواسطہ حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں، اور ملک کی حفاظت وصیانت اور دفاع میں ان کا بڑا حصہ ہوتا ہے، اور ملک کے وفادار صحیح مانو میں مسلمان ہی ہیں جیسا کہ تاریخ ہند اس پر شاہد ہے۔

ایجنٹ کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا حکم:

سوال (۷): گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم جس قسم کی بھی ہوں ان کے حصول کے لئے کافی جدو جہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: انسان کے کمانے کے ذرائع جہاں زراعت، صنعت، تجارت، مضاربت، شرکت اور استصناع ہیں، وہیں محنت و مزدوری، دست کاری اور ہنر بھی ہیں۔ فقہی نقطۂ نظر سے اجیر (مزدور) دو طرح کے ہوتے ہیں: اجیر خاص اور اجیر مشترک، ایجنٹ لوگ اجیر مشترک کے زمرہ میں آتے ہیں، جن کی محنت روزمرہ مزدور اور ملازمین کی طرح ساتھ خاص نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ وقت کی قید سے آزاد، نفس کام مقصود ہوتا ہے، اور وہ کام وعدہ کے مطابق انجام پاتا ہے، اسی وجہ سے اجیر مشترک بیک وقت مختلف لوگوں کے کام کو انجام دیتا ہے گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کے حصول کے لئے واسطہ بننے والے لوگ اجیر مشترک کے حکم میں ہیں۔

وکیل بالاجرۃ پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ مقدمات کی پیروی کے لئے وکلاء اجرت لیتے ہیں، اسی طرح واسطہ بننے والے اپنی مطلوبہ محنتانہ ان سے لے سکتے ہیں، جن کو امدادی رقوم ملنے والی ہیں؛ البتہ اجرت مثل سے زیادہ لینا درست نہیں ہوگا، ورنہ استحصال لازم آئے گا جو کہ شرعاً درست نہیں ہے۔ جب لینا درست ہوا تو دینا بھی درست ہوگا؛ اس لئے کہ فقہی اسلامی کا قاعدہ ہے: احرم أخذه حرم إعطاؤه (الأشباه والنظائر لابن نجيم المصري: ۱/۵۵۱)۔ اور فقہاء کی عبارت میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے، اس لئے اس کا قاعدہ کا مفہوم مخالف یوں ہوگا: ماأبيح أخذه أبيح إعطاؤه، یعنی جس چیز کا لینا مباح تو اس کا دینا بھی مباح۔

واسطہ بننے والے لوگوں کا حاصل شدہ رقم سے ایک حصہ لینے کا حکم:

سوال (۸): بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اصیل امدادی رقم کو حاصل کر لیتا، اس کے بعد واسطہ بننے والے اس سے اپنی محنتانہ وصول کرتا؛ لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ویسا ہوتا ہے جیسا کہ سوال میں ہے تو ایسی صورت میں اصیل اس کو اپنا قبضہ کا وکیل بنا دے، تو اس کا حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ جو اس کا محنتانہ ہے لے لینا درست ہوگا؛ کیونکہ وکیل کا قبضہ موکل کا قبضہ ہوتا ہے۔

''تصرف الوكيل بمنزلة تصرف الموكل'' (المحيط البرهاني، الفصل الثامن في الوكالة بالنكاح: ۳/۸۳، نیز دیکھئے: البدائع، فصل ركن النكاح: ۲/۱۲۲)۔

اگر قبضہ کا وکیل نہیں بنایا تھا، تو اس کا حاصل شدہ رقم سے ایک حصہ کا لینا غصب کے حکم میں ہوگا، بعد میں اصیل اس کو اجازت دیتا ہے تو اس کے لے لی ہوئی رقم حلال ہو جائے گی ورنہ حلال نہیں ہوگی؛ کیونکہ بغیر اجازت کے کسی کی کوئی چیز لے لینا غصب ہے، اور مال مغصوب خبیث مال ہے، مالک کی اجازت یا اس کا ضمان ادا کرنے کے بعد ہی غاصب کے لئے حلال ہوتا ہے (دیکھئے: بدائع الصنائع: ۹۹۲/۲، ۹۸۱/۷، ۱۵۵، ۱۵۱، ۱۴۴، ۱۴۱، ۳۴۱)۔

جہاں تک دینے لینے کے معاملہ کی بات ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں؛ کیونکہ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ واسطہ بننے والے کی حیثیت اجیر مشترک یا وکیل بالاجرۃ کی ہے، شرعاً دونوں درست ہیں تو لینے دینے کا معاملہ کرنا بھی درست ہوگا؛ اس لئے کہ یہ کام مباح ہے تو اس پر اجرت لینا اور اجرت طے کرنا بھی درست ہوگا۔

امدادی رقوم اور جائز قرضوں کے حصول کے لئے رشوت دینا:

سوال (۹): اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

جواب: رشوت کا لینا دینا اور دونوں ناجائز و حرام ہیں؛ کیونکہ حدیث شریف میں صاف لفظوں میں رشوت لینے والے اور دینے والے اور دونوں کے درمیان تگ و دو کرنے والے پر اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہیں (ابوداؤد، حدیث: ۳۵۸۰، ترمذی، حدیث: ۱۳۳۷)، امام ترمذی کا بیان ہے: یہ

حدیث صحیح ہے، مستدرک حاکم، حدیث: ۷۰۶۶، حاکم کا بیان ہے: اس حدیث کی سند صحیح ہے، حافظ ذہبی نے تصحیح سند میں موافقت کی ہے، مسند احمد: ۵۸/ ۴۳، حدیث: ۲۲۳۹۹، مسند بزار: ۹/ ۷۰۱، حدیث: ۶۱۶۴)

ایک دوسری حدیث میں رشوت لینے اور دینے والے دونوں کے بارے جہنم کی سزا کا ذکر آیا ہے (المعجم الاوسط للطبرانی: ۲/ ۵۹۲، حدیث: ۲۰۲۶، مسند بزار: ۳/ ۲۴۷، حدیث: ۱۰۳۷)۔

اور فقہ اسلامی کا قاعدہ ہے "ما حرم أخذه حرم إعطاؤه" (الأشباه والنظائر لابن نجيم: ١/ ١٥٥)، یعنی جس چیز کا لینا حرام اس کا دینا بھی حرام، اسی طرح اس کا مطالبہ بھی حرام ہے "ما حرم فعله حرم طلبه" (حوالہ سابق)۔

معلوم ہوا عام حالات میں رشوت دینا بھی حرام ہے؛ لیکن جب امدادی رقم لینے کا مستحق ہے اور قرض جائز طریقہ پر اور جائز مقاصد کے لئے لینا ناگزیر ہو تو اس وقت رشوت دے کر امدادی رقم حاصل کرنا اور قرض لینا درست ہوگا ورنہ درست نہیں ہوگا، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصریؒ "ما حرم أخذه حرم إعطاؤه" (الأشباه والنظائر لابن نجيم: ١/ ١٥٥) سے چند مسائل کو مستثنی قرار دیا ہے، مستثنیات میں رشوت دینے کے جواز کی بعض صورتوں کو بھی شمار کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جان یا مال کا خطرہ ہو، یا سلطان یا امیر کے پاس اٹکے ہوئے کام کو بنانا ہو (حوالہ سابق)۔

نیز فقہ اسلامی کا قاعدہ ہے: ''الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة'' (الأشباه والنظائر لابن نجيم: ١/٣٩)
یعنی حاجت ضرورت کے درجہ میں اتاری جاتی ہے، خواہ وہ حاجت عام و اجتماعی ہو یا خاص شخصی و انفرادی ہو۔

غلط بیانی اور غلط طریقہ پر امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنا:

سوال (۱۰): امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط و معیارات متعین ہیں اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: ظاہر ہے کہ جو غلط ہے وہ غلط ہی رہے گا، اور جو صحیح ہے وہ صحیح ہی رہے گا، جس طرح کاغذ کی مصنوعی کشتی پانی کی سطح پر نہیں چل سکتی، اسی طرح جھوٹ کبھی سچ نہیں ہوسکتا اور غلط کبھی صحیح نہیں ہوسکتی۔ غلط بیانی جھوٹ ہے، اور جھوٹ گناہ کبیرہ ہے، اللہ تعالی نے جھوٹ بولنے والوں پر لعنت فرمائی ہے (آل عمران: ۶۱)، پس شرعاً ناجائز طریقہ پر امداد یا قرض حاصل کرنا نادرست و گناہ اور فقہ کی زبان میں مکروہ تحریمی عمل ہے؛ البتہ امدادی رقوم اور قرض کی رقم سے فائدہ اٹھانا کراہت کے ساتھ درست ہوگا؛ اس لئے کہ دینے والا لینے والے کو مالک بنا رہا ہے، تملیک عمل سے لینے والے کے حق میں ملکیت ثابت ہوگئی؛ لیکن خارج سے اس میں شرعی قباحت آرہی ہے اور وہ غیر استحقاق اور غلط طریقہ پر حاصل کرنا ہے، گویا یہ منہی عنہ لغیرہ ہوگیا، یہ ایسا ہی ہوا، جیسا کہ مغصوبہ زمین میں کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز درست ہوجاتی ہے؛ اس لئے کہ صحت نماز کی شرطیں پائی جارہی ہیں، اور عمل مکروہ ٹھہرتا ہے، تو کراہت خارج صلاۃ سے آرہی ہے، اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں تملیک کی شرطیں پائی جارہی ہیں، دینے والا اپنی مرضی سے، بغیر جبر و اکراہ کے اپنا مال متقوم دے رہا ہے، اور مال مفرز ہے اور مالک بنا رہا ہے۔

تعلیم اور دیگر مقاصد کے لئے سرکاری قرض اسکیم سے فائدہ اٹھانا:

سوال (۱۱): بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب: سوال کے دو اجزاء ہیں، پہلا جزء یہ ہے کہ انٹرسٹ کی رقم پوری کی پوری قرض لینے والے کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، قرض لینے والا صرف اصل رقم سرمایہ ادا کرنے کا مکلف رہتا ہے۔ اس اسکیم سے استفادہ کی گنجائش ہے: کیونکہ حکومت خود ہی طالب و مطلوب ہے، مقروض سے اس کا کوئی تعلق نہیں، مقروض کو زائد رقم دینا پڑتا تب جاکر سود کا تحقق ہوتا، جیسا کہ سود کی تعریف و تفصیل آتی ہے کہ ایک فریق کی طرف سے زائد رقم کی شرط و مطالبہ ہو، اور وہ زائد رقم عوض سے خالی ہو اور مدت کے عوض ہو، یہاں ایسا نہیں ہے، یعنی مذکورہ بالا صورت والی اسکیم پر سود کی تعریف

صادق نہیں آتی ہے۔

جہاں تک دوسری صورت کا مسئلہ ہے تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ صورت ناجائز ہے، اور اس صورت والی اسکیم سے فائدہ اٹھانا مسلمان کے لئے جائز نہیں؛ کیونکہ یہ سودی قرض ہو گیا، سود کی مقدار تھوڑی ہو یا زائد بہر حال حرام ہے، حرمتِ سود میں کثرت وقلت کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی محتاج ہو، اس کی احتیاج اس حد تک ہو کہ اس لئے سودی قرض لینا جائز ہے، تو اس کے لئے اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا۔

"یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الأشباہ والنظائر لابن نجیم المصری: ۱/۳۹) یعنی ضرورتمند کے لئے سود پر قرض حاصل کرنا جائز ہے۔

سرکار کے انٹرسٹ کی رقم سے تعاون حاصل کرنا:

سوال (۱۲): بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر دیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے تو کیا یہ صورت درست ہوگی؟

جواب: حکومت ہو یا حکومت کے ادارے سب ایک ہی ہیں، ایک ہی شی وحقیقت کے اجزاء ہیں، وہ جس نام سے دے اسی کا عمل ہے، لینے والے کو زائد رقم واپس کرنے کا مکلف نہیں بنایا جاتا ہے؛ بلکہ کچھ بھی لوٹانا نہیں پڑتا ہے، حکومت غیر اسلامی ہے، غیر اسلامی حکومت کے نظریہ کے مطابق انٹرسٹ کی رقم جائز ہے؛ اس لئے یہ صورت درست ہوگی، اس کی نظیر یہ ہے کہ غیر مسلم شراب وخنزیر کے کاروبار سے حاصل شدہ رقم سے کسی مسلمان کا قرض ادا کرتا ہے، تو اس مسلمان کے لئے وہ رقم حلال ہے۔

نیز اثمان متعین نہیں ہوتے ہیں، اور تمام کرنسیاں اثمان کے قبیل سے ہیں، پس حکومت جو کرنسیاں بطور تعاون افراد واشخاص اور اداروں کو فراہم کرتی ہیں، متعین طور پر اس کو سود نہیں کہا جا سکتا۔ نیز ملکیت کے بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے، اس حیثیت سے دیکھا جائے تو حکومت اس انٹرسٹ کی رقم پر اولاً خود قبضہ کرتی ہے اور اس کے نزدیک سود عام مالوں کی طرح ہے، جب حکومت اس رقم کی مالک ہوگئی، اور وہ رقم اس کے نظریہ کے مطابق اس کے لئے مباح ہے اور اسلام بھی اس کو اس کے حق میں مباح تسلیم کرتا ہے، جس طرح شراب وخنزیر کی قیمت کو اس کے حق میں حلال گردانتی ہے؛ علامہ ابوزید دبوسیؒ نے اپنی مشہور کتاب تاسیس النظر میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف نسبت کر کے ایک اصل ذکر کیا ہے: "أهل الذمة يتركون على مايدينون به"؛ لہٰذا وہ دوسروں کو جس حیثیت سے دے، تحفہ کے نام پر، یا قرض اسکیم کے طور پر، یا تعاون کے طور پر، درست ہوگا، لینے والے کے لئے بھی جائز ہوگا؛ کیونکہ ملکیت کے بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے خاص طور پر جبکہ وہ اثمان ہوں؛ چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گوشت آیا جو کہ حضرت بریرہؓ کے پاس صدقہ کے طور پر آیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اسے کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے (بخاری، زکاۃ، حدیث: ۱۴۹۵)۔

اسی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ حرام لغیرہ اشیاء اعیان کے قبیل سے ہوں تو اس کی حرمت مع العلم (حرام ہونا معلوم ہو) منتقل ہوتی ہے، اور اثمان کی حرمت منتقل نہیں ہوتی ہے، اگر اثمان کے ساتھ حرمت منتقل ہوتی تو آج کوئی مسلمان حرام کھانے پینے سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے ایک شخص چوری کی گھڑی فروخت کرتا ہے، زید کو معلوم ہے کہ یہ گھڑی چوری کی ہے، تو اس کے لئے اس گھڑی کا خریدنا جائز نہیں ہوگا، وہیں اگر یہ معلوم ہو کہ یہ روپے چوری کے ہیں، یا شراب یا خنزیر کی قیمت کے ہیں، تو اس کے لئے لینا جائز ہے؛ وجہ وہی ہے کہ اثمان متعین نہیں ہوتے ہیں۔

☆☆☆

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی شرعی حیثیت

مولانا خورشید احمد اعظمی مدنی[1]

انسانی معاشرہ میں حقوق کی ادائیگی، عدل وانصاف کے قیام، اور ظلم وحق تلفی کی روک تھام کے لئے امارت وحکومت کا قیام ناگزیر ہے، اور اتحاد واجتماعیت کے لئے معاشرہ میں ایک حاکم اور امیر کا ہونا ضروری ہے، جس کی اطاعت رعایا پر لازم ہوتی ہے، اسلامی شریعت میں سیادت وامارت سے متعلق مکمل اصول وضوابط موجود ہیں جن میں حاکم اور رعایا دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق کا ذکر بھی تفصیل سے مذکور ہے، حاکم کا حق یہ ہے کہ ان تمام امور میں اس کی اطاعت کی جائے جن میں خالق کی معصیت نہ ہو، اور رعایا کا حق یہ ہے کہ حاکم ان کا خیر خواہ ہو، ان کے حقوق کا ادا کرنے والا ہو، اوران میں انصاف قائم کرنے والا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

’’ألا كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته، فالأمير الذى على الناس راع، وهو مسئول عن رعيته والرجل راع على أهل بيته، وهو مسئول عنهم، والمرأة راعية على بيت بعلها وولده، وهى مسئولة عنهم، والعبد راع على مال سيده، وهو مسئول عنه، ألا فكلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته‘‘۔

سنو! تمھارا ہر شخص ذمہ دار ہے اور تمھارے ہر شخص سے اس کے ماتحتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا، لہٰذا وہ شخص جو لوگوں پر حکمراں ہے ذمہ دار ہے، اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اور مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، اس سے اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی ذمہ دار ہے اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا، لہٰذا متنبہ رہو، تمھارا ہر شخص ذمہ دار ہے، اور ہر شخص اپنے ماتحتوں کے بارے میں جواب دہ ہے (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ)

امام نووی علیہ الرحمۃ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

’’ففيه أن كل من كان تحت نظره شئ فهو مطالب بالعدل فيه والقيام بمصالحه فى دينه ودنياه ومتعلقاته‘‘

لہٰذا اس حدیث میں (بیان کیا گیا) ہے کہ ہر شخص جس کے ماتحت اور اس کی نگرانی میں کچھ ہے اس کے حقوق کی رعایت، اور اس کی دینی ودنیوی مصلحتوں اور اس کے متعلقات کا نظم ونسق اس سے مطلوب ہے (شرح صحیح مسلم: ۱۲/ ۲۱۳)، اور ایک حدیث میں ارشاد ہے:

’’ما من عبد يسترعيه الله رعية يموت يوم يموت وهو غاشّ لرعيته إلا حرم الله عليه الجنة‘‘

،کوئی بھی شخص جسے اللہ نے کسی رعیت کا حاکم ونگراں بنایا ہے، وہ اس حال میں مرتا ہے کہ اپنی رعایا کی خیانت کرنے والا ہے ان کے حقوق کی نگہداشت نہیں کی تو اللہ تعالی نے اس پر جنت حرام کردیا ہے (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامیر العادل)

حضرت داؤد علیہ السلام جنھیں اللہ تعالی نے نبوت کے ساتھ بادشاہت سے بھی سرفراز فرمایا تھا، ان سے اللہ تعالی نے فرمایا:

يا داؤد انا جعلناك خليفة فى الأرض فاحكم بين الناس بالحق، ولا تتبع الهوىٰ فيضلك عن سبيل الله ان الذين يضلون عن سبيل الله لهم عذاب شديد بما نسوا يوم الحساب (سورۃ ص: ۲۶)

[1] جامعہ عربیہ تعلیم الدین مئو۔

(اے داؤد ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا آپ لوگوں کے مابین حق کے ساتھ فیصلہ کیجئے، اور نفس کی اتباع مت کیجئے کہ وہ آپ کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے، بلا شبہ وہ لوگ جو اللہ کے راستہ سے ہٹتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے انکے یوم حساب کو بھولنے کی وجہ سے)، لہٰذا حاکم خواہ مسلم ہو یا کافر، اپنی رعایا کی حفاظت، ان کے حقوق کی رعایت، انصاف کا قیام، ظلم و بربریت سے اجتناب اس کا فریضہ ہے، اور رعایا کے لئے جائز ہے کہ حاکم وامیر کی طرف سے جو جائز سہولیات اور حقوق انھیں فراہم ہوں، اسے قبول کریں۔

ہماری ہندوستانی حکومت، عوام کی معاشی و معاشرتی ضرورتوں کی کفالت، تعلیمی ترقی، صنعتوں کے فروغ اور اقتصادی اعتبار سے محروم و پسماندہ شہریوں کو اونچا اٹھانے، نیز ملک کی معیشت کی مضبوطی و ترقی کے لئے مختلف شکلوں میں رقوم دیتی ہے، جن میں کچھ امداد و اعانت کے طور پر ہوتی ہیں، اور کچھ قرض کی نوعیت کی، مسلمانوں کے لیے بھی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، امداد و اعانت کے طور پر ملنے والے مال کو واپس کرنا نہیں ہوتا، اور قرض سے مراد وہ مال ہے جس کا مثل واپس کرنا ہوتا ہے۔

۱- وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے، اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ان کا لین دین جائز ہے، اس پر ربا اور سود کا اطلاق نہیں ہوگا، کیونکہ اس صورت میں مقرض اپنی رقم کا ایک حصہ خود ساقط کر رہا ہے، جب کہ اسے یہ حق بھی ہے کہ وہ اپنی پوری رقم معاف کر دے، اور شریعت میں اسے مستحسن قرار دیا گیا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَإِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورۃ البقرۃ، ۲۸۰)

(اور قرض خواہ اگر تنگدست ہو تو مہلت دینا ہے آسانی ہونے تک، اور تمھارا صدقہ کر دینا تمھارے لئے بہتر ہے، اگر تم سمجھو)، اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "ندب اللہ تعالی بہذہ الألفاظ إلی الصدقة علی المعسر وجعل ذلک خیرا من أنظارہ" اللہ تعالی نے ان الفاظ کے ذریعہ تنگدست پر صدقہ کرنے کی دعوت دی ہے اور اس کو اسے مہلت دینے سے بہتر بتایا ہے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ۳/ ۳۷۴)

اور مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یأمر تعالی بالصبر علی المعسر الذی لا یجد وفاء فقال: {وَإِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ} لا کما کان أهل الجاهلية يقول أحدهم لمدينه إذا حل عليه الدين إما أن تقضي. وإما أن تربي ،ثم يندب إلى الوضع عنه ويعد على ذلك الخير والثواب الجذيل فقال: {وَأَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ} أى وأن تتركوا رأس المال بالكلية وتضعوه عن المدين"

اللہ تعالی (قرض دینے والے کو) ایسے تنگدست مقروض پر صبر کرنے کا حکم دیتے ہیں جو ادائیگی کی صورت نہیں پاتا ہے، تو ارشاد فرمایا: اگر تنگی والا ہو تو مہلت دینا ہے آسانی ہونے تک، اہل جاہلیت کی طرح نہیں جو اپنے مقروض سے جب ادائیگی کا وقت آتا تھا تو کہتے تھے: یا تو ادا کرو یا اضافہ کرو، پھر اللہ دعوت دیتے ہیں اس سے ساقط کر دینے کی، اور اس پر بہت بہت خیر و ثواب کا وعدہ کرتے ہیں، تو ارشاد فرمایا: تمھارا صدقہ کر دینا تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم جان لو، یعنی اگر تم رأس المال کو بھی پورے طور پر چھوڑ دو، اور اپنے مقروض سے اس کو ساقط کر دو، اور اسے بری کر دو (تفسیر ابن کثیر، ۱/ ۳۳۱)، اس آیت سے قرض واپس نہ لینے کا جواز ثابت ہے، اور جب کل دین کا وضع کرنا جائز ہوگا، تو دین کے بعض حصہ کا وضع کرنا بھی جائز ہوگا۔

اس کا ثبوت احادیث نبویہ سے بھی ملتا ہے، حضرت جابر کے والد عبداللہ رضی اللہ عنہما غزوۂ احد میں شہید ہو گئے، ان کے ذمہ قرض تھا، قرض خواہوں کا تقاضا شدید ہو گیا، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کروائی "فسألهم أن يقبلوا تمر حائطي ويحللوا أبي۔ الحديث" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عرض کیا کہ وہ ان کے باغ کے کھجور کو قبول کر لیں اور ان کے والد کو بری کر دیں (صحیح بخاری، حدیث: ۲۳۹۵) اور یہ صراحت بھی منقول ہے کہ باغ کے کھجور ان کے ذمہ قرض سے کم تھے۔

ایک روایت حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

’’أنه تقاضیٰ ابن أبي حدرد دینا کان له علیه فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم فی المسجد فارتفعت أصواتهما حتی سمعها رسول الله صلی الله علیه وسلم وهو فی بیته فخرج إلیهما رسول الله صلی الله علیه وسلم حتی کشف سجف حجرته، ونادی کعب بن مالك فقال: یا کعب، فقال: لبیك یا رسول الله فأشار الیه بیده أن ضع الشطر من دینك، قال کعب قد فعلتُ یا رسول الله، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: قم فاقضه‘‘

کہ انہوں نے ابن ابی حدردؓ سے اپنے قرض کا جوان پر تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسجد میں مطالبہ کیا، اور ان دونوں کی آوازیں اونچی ہو گئیں یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا، جبکہ آپ گھر میں تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف چلے، اپنے کمرہ کا پردہ ہٹایا اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو پکارا: اے کعب! انھوں نے کہا، حاضر، اے اللہ کے رسول، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اپنا آدھا قرض معاف کردو، انھوں نے کہا: کر دیا، اللہ کے رسول، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن اب حدرد سے کہا، جاؤ اپنا قرض ادا کردو (صحیح مسلم ۱۰/۲۲۰)

اگر قرض خواہ کی رضا و خوشی سے ذمہ میں واجب قرض سے کم واپس کرنا جائز نہ ہوتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی سفارش نہ فرماتے۔

۲- معافی والے قرضے جن میں یہ صورت ہوتی ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، زائد رقم نہیں ادا کرنی پڑتی تو یہ صورت بھی جائز ہے۔

’’ومن له علی اٰخر ألف درهم فقال: أد إليّ غدا منها خمس مأة علی أنك بریٔ من الفضل، فهو بریٔ، فإن لم یدفع إلیه الخمس مأة غدا عاد علیه الألف، وهو قول أبي حنیفة و محمد رحمهما الله، وقال أبویوسف: لا یعود علیه‘‘

آگے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’إذا قال صالحتك من الألف علی خمس مأة تدفعها الیّ غدا وأنت بریٔ من الفضل علی أنك إن لم تدفعها إليّ غدا فالألف علیك علی حاله وجوابه أن الأمر علی ما قال؛ لأنه أتی بصریح التقیید فیعمل به‘‘

اور جس کا کسی دوسرے پر ہزار درہم ہے، اور اس نے اس سے کہا کہ اس میں سے پانچ سو کل دیدو اس طور پر کہ تم بقیہ سے بری ہو گے، تو وہ بری ہو جائے گا، پھر اگر کل ہو کر پانچ سو نہیں دیا تو ہزار اس پر لوٹ آئے گا، اور یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ کا قول ہے، اور امام ابویوسف رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اس پر ہزار عائد نہیں ہوگا۔ جب اس نے کہا کہ میں نے تم سے ہزار میں سے پانچ سو پر مصالحت کی جو مجھ تم کل دیدو اور بقیہ سے تم بری ہو اس طور پر کہ اگر تم نے کل نہیں دیا تو ہزار تم پر علی حالہ باقی رہے گا اور اس کا جواب یہ ہے کہ معاملہ اسی پر ہے جو اس نے کہا، اس لئے کہ اس نے قید کی صراحت کیا ہے، لہٰذا اس پر عمل کیا جائے گا (هدایة: کتاب الصلح، باب الصلح فی الدین، نیز دیکھئے فتاوی خانیة علی هامش عالمگیریة: ۹۰۳)

اور مذکورہ صورت یہی ہے کہ مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم واپس کرنی ہوتی ہے، اور اس معاملہ میں زائد لینے کی شرط بھی نہیں پائی جاتی اور نہ قرض پر زائد رقم لی جاتی ہے، قرض کے لین دین کا وہ معاملہ ناجائز ہے، جس میں اصل پونجی رأس المال پر زائد رقم کا مطالبہ ہو، فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

’’کل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا‘‘ (السنن الصغریٰ للبیهقی، باب القرض، حدیث: ۱۹۵۸)

قرض کے معاملہ میں یہ صورت بھی درست ہے کہ قرض دینے والا اپنی پوری رقم وصول کرے اور یہ بھی جائز ہے کہ بعض یا کل رقم کو معاف کردے، جیسا کہ تفصیل اوپر مذکور ہوئی۔

۳- اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو یہ معاملہ سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہوگا، ہر وہ قرض جس میں اصل رقم سے زیادہ واپس کرنے کی شرط ہو وہ سودی قرض ہے، زمانہ جاہلیت میں یہ معمول تھا کہ ایک مدت کے لئے ادھار بیع کرتے یا قرض دیتے تھے، اور جب مدت پوری ہو جاتی اور مدیون اسے ادا نہ کر پاتا تو مدت بڑھا دیتے تھے اور دین یا مقررہ سود پر مزید اضافہ کر دیتے تھے جس سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (سورۃ آل عمران : ۱۳۰)

(اے وہ لوگ جو ایمان لائے یہ بڑھتا اور چڑھتا سود مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم کامیاب ہو)

نیز ارشاد فرمایا: وأحل الله البيع وحرم الربا (سورۃ البقرۃ: ۲۷۵) (بیع جس میں نفع لینا درست ہوتا ہے، وہ ربا کے مثل نہیں ہے، بیع تو اللہ نے حلال اور جائز رکھا ہے اور سود و ربا کو حرام کیا ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "كل قرض جر منفعة فهو ربا" (تکملۃ فتح الملہم: ۱/ ۵۷۴، بحوالہ سیوطی فی الجامع الصغیر، رقم: ۶۳۳۶)، اور شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "الربا هو القرض على أن يؤدي اليه أكثر أو أفضل مما أخذ"

ربا اس شرط پر قرض دینا ہے کہ وہ لئے ہوئے سے زیادہ یا بہتر واپس کرے گا (حجۃ اللہ البالغۃ، ۲/ ۲۸۲)

علامہ کاسانی علیہ الرحمۃ شرائط قرض بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وأما الذي يرجع إلى نفس القرض فهو ألا يكون فيه جر منفعة..... ولأن الزيادة المشروطة تشبه الربا؛ لأنها فضل لا يقابله عوض"

، اور بہرحال وہ شرط جو نفس قرض کے لئے ہے یہ ہے کہ اس میں نفع لینا نہ ہو۔ اور اس لئے کہ مشروط اضافہ ربا کے مشابہ ہے، کیونکہ وہ ایسا اضافہ ہے جس کے مقابل میں کوئی عوض نہیں ہے (بدائع الصنائع ۶/ ۵۱۸)

ابن قدامہ حنبلی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: "وكل قرض شرط فيه أن يزيده فهو حرام بغير خلاف...... ولأنه عقد ارفاق وقربة، فإذا شرط فيه الزيادة أخرجه عن موضوعه"

اور ہر وہ قرض جس میں شرط ہو کہ وہ زیادہ دے گا تو وہ بالاتفاق حرام ہے،........ اور اس لئے کہ قرض ترحم اور ثواب کا معاملہ ہے، لہٰذا جب اس میں اضافہ کی شرط لگا دی جائے گی تو اس کے مقصد سے ہٹا دے گی (المغنی: ۶/ ۴۳۶)۔

لہٰذا قرض کی یہ صورت جسمیں مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی واپس کرنی پڑے جائز نہیں ہوگی۔

۴- ایسا قرض جس میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو، سود کے دائرہ میں داخل ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

"أن رسول الله ﷺ قال: الدينار بالدينار لا فضل بينهما، والدرهم بالدرهم لا فضل بينهما"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دینار، دینار کے بدلہ میں، ان کے مابین اضافہ نہ ہو، اور درہم، درہم کے بدلہ میں، ان کے درمیان اضافہ نہ ہو (صحیح مسلم)، اس حدیث میں قلیل و کثیر کی وضاحت کے بغیر علی الاطلاق فضل و اضافہ سے منع کیا گیا ہے، سودی معاملہ کے حرام ہونے کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ مشروط اضافی رقم کثیر ہو، مطلوبہ زائد رقم قلیل ہو یا کثیر اس پر سود کا اطلاق ہوگا، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

"من أسلف سلفا فلا يشترط الا قضاءه" جو شخص کچھ قرض کے طور پر دے، تو اس میں ادائیگی کے علاوہ کوئی شرط نہ لگائے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے: "من أسلف سلفا فلا يشترط أفضل منه، وان كانت قبضة من علف فهو ربا" جو شخص کوئی قرض دے تو اس سے عمدہ لینے کی شرط نہ لگائے، اگرچہ وہ ایک مٹھی چارہ ہی ہو، اس لئے کہ وہ سود ہے (موطأ امام مالک مع شرح تنویر الحوالک: ۳/ ۱۶۹)، چنانچہ فقہاء نے جودت اور عمدگی کی شرط کو بھی ناجائز کہا ہے "ولا يجوز قرض جر نفعا، بأن أقرضه دراهم مكسرة بشرط رد صحيحة" اور ایسا قرض جو نفع لائے جائز نہیں، اس طور پر کہ اسے ریزہ ریزہ ٹوٹے ہوئے دراہم اس شرط کے ساتھ دے وہ صحیح و سالم دراہم واپس کرے گا (البحر الرائق: ۶/ ۲۰۴)

ابن قدامہ علیہ الرحمۃ قرض پر اضافہ کے ناجائز ہونے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: "ولا فرق بين الزيادة في القدر أو في الصفة" اور اس میں کوئی فرق نہیں کہ اضافہ مقدار میں ہو یا صفت میں (المغنی: ۶/ ۴۳۶)، لہٰذا نفس قرض پر زائد رقم کا مطالبہ اگرچہ اس کی مقدار معمولی ہو جائز نہیں ہوگا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بنک یا کسی ادارہ سے قرض لینے کی صورت، کسی فرد سے قرض لینے کی صورت سے مختلف ہے، بنک یا ادارہ کو عمارت کا کرایہ

،عمال کے مشاہرے اور رجسٹر و فارم وغیرہ کے انتظامی اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں، اور معاملہ قرض کے لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے کی ہوتی ہے {وليملل الذي عليه الحق} (سورۃ البقرۃ)، لہٰذا اس کی اجرت بھی اسی کے ذمہ عائد ہوگی، اس لئے ذہن میں آتا ہے کہ قرض لینے والا، لی ہوئی رقم سے کچھ زائد ادا کرے، مگر سود و ربا کا معاملہ بہت ہی اہم اور نازک ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

''من آخر ما نزل آية الربا ، وأن رسول الله ﷺ قبض قبل أن يفسرها لنا. فدعوا الربا و الريبة''

،حرمت ربا کی نزول کے اعتبار سے اواخر آیات سے ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل اس کے کہ اس کی تفصیلات بیان کرتے، وفات پاگئے، لہٰذا ربا کو بھی ترک کرو اور شبہ ربا کو بھی چھوڑ دو (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۲۸)

ملک العلماء علامہ کاسانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: ''والتحرز عن حقيقة الربا وعن شبهة الربا واجب'' اور حقیقت ربا اور شبہ ربا دونوں سے بچنا واجب ہے (بدائع الصنائع: ۶/ ۵۱۹)، لہٰذا نفس قرض پر زائد رقم کی طلب اگرچہ قلیل ہو سروس چارج کے احتمال کے باوجود جائز نہیں ہوگی۔

ایسے قرضوں کے لین دین کے معاملہ میں ہی یہ صورت اختیار کی جائے کہ قرض کی تحریر و اندراج اور اس کے انتظامی امور پر آنے والے خرچ کے لیے بطور سروس چارج الگ سے ایک متعینہ رقم قرض لینے سے پہلے انتظامی امور کے حق خدمت اور اجرت نیز فارم اور پاس بک وغیرہ کی بیع کے طور پر وصول کی جائے جو لئے جانے والے قرض کے فیصد کے اعتبار سے نہ ہو، یہ انتظامی امور کے حق خدمت کے طور پر اجرت اور فارم وغیرہ کی بیع کا الگ معاملہ ہوگا، قرض پر نفع لینے میں شمار نہیں ہوگا، ''شراء الشئ اليسير بثمن غال لحاجة القرض يجوز و يكره''، قرض کی ضرورت کے مدنظر معمولی چیز کا مہنگی قیمت میں خریدنا جائز ہے اور مکروہ ہے، اس کے تحت شامی میں مذکور ہے ''أي يصح مع الكراهة، وهذا لو الشراء بعد القرض'' یعنی کراہت کے ساتھ صحیح ہوگا، یہ اس صورت میں جبکہ خریدنا قرض کے بعد ہو، آگے لکھتے ہیں:

''فإن تقدم البيع بأن باع المطلوب منه المعاملة من الطالب ثوبًا قيمته عشرون دينارًا بأربعين دينارًا ثم أقرضه ستين دينارًا أخرى حتى صار له على المقروض مأة دينار و حصل للمستقرض ثمانون دينارًا ذكر الخصاف أنه جائز''

اور اگر بیع پہلے ہو، بایں طور کہ جس سے معاملہ مطلوب ہے وہ طلب کرنے والے کو کوئی کپڑا جس کی قیمت بیس دینار ہے چالیس دینار میں بیچے، پھر اس کو ساٹھ دینار دوسرے بطور قرض دے، اس طرح قرض لینے والے پر اس کے سو دینار ہو جائیں گے، اور قرض لینے والے کو اسی دینار ہی حاصل ہونگے، خصاف نے ذکر کیا ہے کہ یہ جائز ہے، پھر اس میں بھی کچھ مشائخ بلخ کا اختلاف نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''و كان شمس الأئمة الحلواني يفتي بقول الخصاف، وابن سلمة يقول: هذا ليس بقرض جر منفعة، بل هذا بيع جر منفعة وهي القرض'' اور شمس الائمہ الحلوانی، خصاف کے قول کے مطابق فتوی دیتے تھے، اور ابن سلمہ کہتے ہیں کہ یہ نفع والا قرض نہیں ہے، بلکہ بیع ہے جس نے قرض کی صورت میں نفع دیا ہے (الدر المختار مع رد المحتار: ۷/ ۳۹۶-۳۹۷)، لہٰذا نفس قرض پر زائد رقم کا مطالبہ اگرچہ قلیل ہی ہو سود ہی قرار پائے گا، وہ سروس چارج کے نام پر جائز نہیں ہوگا۔

۵- ایسے تمام قرض جن پر زائد رقم کا مطالبہ کیا جائے سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ان کا لین دین حرام ہوگا، ''كل قرض جر نفعًا حرام''

خواہ یہ قرض جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی غرض سے ہوں یا دیگر کاروباری اغراض کے لئے، قرض کی واپسی میں لی جانے والی مشروط زائد رقم بلا عوض ہونے کے سبب سود اور ربا کی صورت قرار پاتی ہے، اور سود کو اللہ نے حرام کیا ہے ''أحل الله البيع و حرم الربوا''، لہٰذا سود اور واپسی میں زائد رقم لینا تو بہر کیف حرام ہے، البتہ حالت احتیاج و اضطرار جس میں زندگی کا گزارہ مشکل ہو جائے، جس حالت میں محرمات کے استعمال کی بقدر ضرورت رخصت ہوتی ہے، ایسی حالت در پیش ہو تو بلا سودی قرض نہ ملنے کی صورت میں سودی قرض بقدر ضرورت لینا جائز ہوگا، محرمات کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل به لغير الله .فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا اثم عليه.ان الله غفور رحيم (سورۃ البقرۃ: ۱۷۲)

(حرام کیا ہے تم پر مردار کو، اور خون کو اور سور کے گوشت کو، اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، پھر جو مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ اس کا خواہشمند نہ ہو اور نہ ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو، تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بیشک اللہ معاف کرنیوالا، رحم کرنے والا ہے)،

اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم فان الله غفور رحیم} (سورۃ المائدۃ: ۳)

(تو جو شخص بھوک کی وجہ سے مجبور ہو، گناہ کی طرف میلان کے بغیر، تو اللہ مغفرت کرنے والا، رحم کرنے والا ہے)

اسی بنا پر فقہاء نے صراحت کیا ہے کہ ضرورتمند محتاج کے لئے سودی قرض لینا جائز ہے، "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ والنظائر) محض کاروبار بڑھانے یا مکان کی تعمیر کے لئے سودی قرض لینا حرام ہے، بعض قانونی مشکلات کے پیش آنے کی صورت میں کسی معتبر عالم اور مفتی کے سامنے اپنی ضرورت کو واضح کرنے اور اس سے مشورہ کرنے کے بعد ہی سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی۔

۶- گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر ملنے والی رقم جس میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی، اور یہ حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کے لئے اعانت ہوتی ہے، ایسی رقم کے حاصل کرنے اور اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے، شہریوں اور عوام کی اعانت و امداد حکومت کے فرائض میں داخل ہے، اور مذکورہ صورت میں کسی حرام کا ارتکاب بھی لازم نہیں آتا، "والأصل فی الأشیاء الاباحة" اور اشیاء میں اصل مباح ہونا ہے (الهدایة: ۴۰۸، کتاب الطلاق، الاشباہ والنظائر مع شرحہ غمز عیون البصائر: ۹۷/۱، الفن الاول)۔

۷- ایسی رقوم کو حاصل کرنے میں اگر کسی کو واسطہ بنایا جائے، جو ان کے حصول کے لئے تگ و دو اور جد و جہد کرتا ہے، تو اس کو بطور محنتانہ مناسب رقم جو باہمی رضامندی سے طے ہو جائے دینا درست ہوگا، اور واسطہ بننے والے شخص کے لئے محنتانہ لینا جائز ہوگا، یہ معاملہ اجارہ کی قبیل سے ہوگا یعنی اس کی ذات سے نفع حاصل کرنے پر اجرت دینا۔

"الأجراء علی ضربین: مشترك و خاص، فالأول من یعمل لا لواحد کالخیاطة و نحوه أو یعمل له عملًا غیر موقت کأن استأجره للخیاطة فی بیته غیر مقیدة بمدة کان أجیرًا مشترکًا وان لم یعمل لغیره أو موقتًا بلا تخصیص ... ولایستحق المشترك الأجر حتی یعمل"

اجیر دو قسم کے ہیں، مشترک اور خاص، اول یعنی مشترک وہ ہے جو متعدد لوگوں کے لئے عمل کرتا ہے، جیسے سلائی وغیرہ، یا کسی کے لئے عمل کرے وقت کی قید کے بغیر، جیسے اس کو سلائی کے لئے مدت کی پابندی کے بغیر اپنے گھر میں اجرت پر لایا ہو، تو وہ اجیر مشترک ہوگا، اگر چہ اس کے علاوہ کا کام نہ کرے، یا وقت کا پابند کر کے لایا ہو کام کی تخصیص کے بغیر، .... اور اجیر مشترک کام کرنے کے بعد ہی اجرت کا مستحق ہوتا ہے (الدر المختار مع الرد: ۹/ ۸۷)، لہٰذا جو شخص واسطہ بنتا ہے اور اس کے لئے تگ و دو کر کے رقم فراہم کرتا ہے اس کی محنت پر اجرت دینا اور اس کا لینا جائز ہے۔

۸- واسطہ بننے والے کے لئے جو اس کی تگ و دو اور جد و جہد کا معروف طور پر محنتانہ بنتا ہے اسی کے بقدر لینا جائز ہوگا، اس پر نظر کرتے ہوئے کہ یہ رقم اس کو مفت میں مل رہی ہے اجر مثل سے زائد اس کے لئے لینا درست نہیں معلوم ہوتا، اس سے معاشرہ میں فساد اور خرابی رواج پائے گی رشوت عام ہوگی، نیز فیصد پر لین دین کا معاملہ بھی درست نہیں ہوگا

"و فی الدلال والسمسار یجب أجر المثل وما تواضعوا علیه أن فی کل عشرة دنانیر کذا فذاك حرام علیهم"

دلال اور ایجنٹ میں اجر مثل واجب ہوتا ہے، اور جو یہ معمول بنا لیا ہے کہ ہر دس دینار میں اتنا، تو یہ ان کے لئے حرام ہے (رد المحتار علی الدر المختار: ۹/ ۸۷)۔

۹- امدادی رقوم کا وہ مستحق ہے اور بغیر رشوت دیئے اپنا حق نہیں پا سکتا ہے تو رشوت دے سکتا ہے، ملا علی قاری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

"قیل الرشوة: ما یعطی لابطال حق أو لاحقاق باطل، أما اذا أعطی لیتوصل به الی حق أو لیدفع به عن نفسه ظلما فلا بأس به، وکذا الأخذ اذا أخذ لیسعی فی اصابة صاحب الحق فلا بأس به. لکن هذا ینبغی أن یکون فی غیر القضاة والولاة، لأن السعی فی اصابة الحق الی مستحقه ودفع الظالم عن المظلوم واجب علیهم فلا یجوز لهم الأخذ علیه"

رشوت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ شئے ہے جو حق کو باطل یا باطل کو حق قرار دینے کے لئے دی جائے، اور جب کوئی اس لئے دیتا ہے تا کہ حق تک پہونچ سکے یا اپنے اوپر سے ظلم کو دفع کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور ایسے ہی لینے والا جب اس لئے لے، تا کہ صاحب حق تک حق پہونچانے کی کوشش کرے، تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، لیکن یہ حکام اور قضاۃ کے علاوہ کے لئے ہی درست ہے، اس لئے کہ مستحق تک اس کا حق پہونچانا یا مظلوم سے ظالم کو دفع کرنا ان پر واجب ہے لہٰذا ان کے لئے اس پر کچھ لینا جائز نہیں ہوگا (مرقاۃ المفاتیح ۷ / ۲۴۸)

فتاوی ہندیہ میں بھی مذکورہ صورت میں جواز کا ہی قول مذکور ہے، بلکہ اس میں المحیط للسرخسی اور فتاوی قاضی خان کے حوالہ سے یہ بھی صراحت ہے:

''ھذا اذا أعطاہ قبل أن یسوی أمرہ أما اذا أعطاہ بعد أن سوّی أمرہ و نجاہ عن ظلمہ فیحل للمعطی الاعطاء ویحل للآخذ الأخذ، وھو الأصح''

حکام اور قضاۃ کے لئے عدم جواز کا قول اس صورت میں ہے جب کہ کام کرنے سے پہلے ان کو دے، اور جب اس کا کام کرنے کے بعد، یا ظلم سے نجات دلانے کے بعد ان کو دے تو دینے والے کے لئے دینا اور لینے والے کے لئے لینا حلال ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے (فتاوی ہندیہ: ۳/۳۳۱) یعنی اپنا حق مل جانے کے بعد، یا ظلم سے نجات پا جانے کے بعد اگر دیتا ہے تو دینے والے کے لئے دینا اور لینے والے کے لئے لینا بھی جائز ہے۔

۱۰- امدادی رقوم کے حصول کے لئے جو شرائط اور معیار متعین ہیں، ان کا لحاظ کرنا لازم ہے، تا کہ وہ رقم اس کے مستحقین تک پہنچ سکے، مستحق نہ ہوتے ہوئے، رشوت وغیرہ کے ذریعہ اس کا حاصل کرنا اپنی ذلت و سزا اور ان کے بعض مستحقین کی محرومی کا باعث ہوگا، اس لئے غلط بیانی کے ذریعہ اس کا حاصل کرنا جائز نہ ہوگا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل، اپنے مالوں کو اپنے درمیان غلط طریقہ سے مت کھاؤ (سورۃ البقرۃ: ۱۸۸)۔

علامہ قرطبیؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''من أخذ مال غیرہ لا علی وجہ اذن الشرع فقد أکلہ بالباطل، و من الأکل بالباطل أن یقضی القاضی لك وأنت تعلم أنك مبطل، فالحرام لا یصیر حلالاً بقضاء القاضی، لأنہ انما یقضی بالظاھر، وھذا إجماع فی الأموال''۔

جس نے اپنے غیر کے مال کو شریعت کی اجازت کے خلاف طریقہ پر لیا تو اس نے اسے باطل طور پر کھایا اور باطل طور پر کھانے کی صورتوں میں سے یہ ہے کہ قاضی تمہارے لئے فیصلہ کر دے اور تم جانتے ہو کہ تم غلط ہو، اس کے مستحق نہیں ہو، تو قاضی کے فیصلہ کر دینے سے حرام، حلال نہیں ہو جائے گا اس لئے کہ وہ ظاہر پر فیصلہ کرتا ہے، اور اموال کے بارے میں اس پر اتفاق ہے (الجامع لاحکام القرآن ۲ / ۳۳۸)۔

البتہ وہ شرائط اگر انصاف پر مبنی نہ ہوں، اور ان کی وجہ سے دوسرے ضرورتمند لوگ محروم ہو رہے ہوں تو ایسے ضرورتمند امداد کے مستحق شخص کے لئے اس کی گنجائش ہوگی کہ وہ کسی حیلہ سے امداد حاصل کر لے، کیونکہ محتاج اور ضرورتمندوں کی اعانت حکومت کے فرائض میں داخل ہے، لہٰذا اس سے اپنا حق حاصل کرنے کے لئے کوئی حیلہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۱۱- جن اسکیموں میں حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر عائد انٹرسٹ، حکومت خود ادا کرتی ہے، قرض لینے والے کو کچھ زائد رقم نہیں دینا ہوتا ہے، تو یہ صورت درست ہوگی اور قرض لینے والے کے لئے اس کا استعمال کرنا جائز ہوگا، اس لئے کہ اس قرض کی نوعیت یہ ہے کہ مقرض حقیقۃ حکومت ہے جس نے اپنے ایک ادارہ بنک کو وکیل بنا دیا ہے کہ وہ مستقرض کو ایک متعینہ رقم ادا کر دے، قرض دینا بھی اپنے مال میں ایک تصرف ہے، اور یہ بیع کے مشابہ ہے، جس میں وکیل بنانا جائز ہے۔

''فلھذا اختص جوازہ بما لہ مثل، فأشبہ البیع''، اسی لئے اس (قرض) کا جواز خاص ہے ایسی شئے کے ساتھ جس کا مثل ہو، تو یہ بیع کے مشابہ ہوا (بدائع الصنائع: ۶ / ۵۱۷)، ''إن القرض فی معناہ العام یشبہ البیع، لأنہ تملیک مال بمال''، قرض اپنے عمومی معنی میں بیع کے مشابہ ہے، اس لئے کہ یہ مال کے بدلہ میں مال کا مالک بنانا ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵ / ۳۷۹۶، القسم الثالث)، ''صح التوکیل و ھو إقامۃ الغیر مقام

نفسه في التصرف ممن يملكه" وکیل بنانا صحیح ہے، اور وہ غیر کو اپنا قائم مقام بنانا ہے تصرف میں اس شخص کی طرف سے جو تصرف کا مالک ہو (کنز الدقائق مع شرحہ البحر الرائق: ۷ / ۲۳۵)، "ويجوز التوكيل بالبياعات والأشربة والاجارات والنكاح والطلاق والعتاق والخلع والصلح والاعارة والاستعارة والهبة والصدقة۔" (فتاوی عالمگیریہ: ۳ / ۵۶۴)، اور حکومت خود قرض لینے والے سے کوئی زائد مطالبہ نہیں کرتی، لہٰذا اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے مستقرض کا حکومت کے ساتھ قرض لینے کا معاملہ سودی نہیں ہوا، اس لئے اس اسکیم سے اس کا استفادہ جائز ہوگا۔

البتہ جس صورت میں مقروض کو لئے ہوئے قرض پر کچھ بھی زائد ادا کرنا مشروط ہو تو سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس اسکیم سے استفادہ درست نہیں ہوگا، قرض کی وہی صورت جائز ہوگی جس میں لئے ہوئے قرض کے مثل یا اس سے کم رقم ادا کرنی ہوتی ہے۔

" و الخلاصة أن القرض جائز بشرطين: ا الا يجر نفعًا ، فان كانت المنفعة للدافع منع اتفاقًا للنهي عنه وخروجه عن باب المعروف وان كانت للقابض جاز"

خلاصہ یہ کہ قرض دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے: ا- یہ کہ وہ نفع پر مشتمل نہ ہو، اور اگر منفعت قرض دینے والے کے لئے ہے تو بالاتفاق منع ہے اس سے نہی منصوص ہونے کی وجہ سے، نیز اس لئے کہ (قرض دینا احسان اور بھلائی کا کام ہے، اس پر نفع لینے کی وجہ سے) وہ معروف اور احسان کی قبیل سے نہیں رہ جائے گا، اور اگر نفع قرض لین والے کے لئے ہو تو جائز ہوگا (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵ / ۳۷۹۶)۔

۱۲- یہ صورت جس میں حکومت انٹرسٹ اور سود کی رقم کو تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کے تعاون و امداد میں استعمال کرتی ہے، چونکہ حکومت اس کی مالک ہوتی ہے، لہٰذا اس اسکیم سے بھی فائدہ اٹھانا درست ہے، اس رقم کے حاصل کرنے والے مسلمان کا اس شکل میں سود لینا اور دینا نہیں پایا جاتا، اور ملکیت بدلنے سے شئے کا حکم بدل جاتا ہے

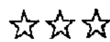
" تبدل الملك بمنزلة تبدل العين " (رد المحتار على الدر المختار : ۲ / ۲۸۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کچھ گوشت ہدیہ کیا۔

"فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم :لو صنعتم لنا من هذا اللحم ، قالت عائشة رضي الله عنها :تصدق به على بريرة ، فقال : هو لها صدقة و لنا هدية "

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمارے لئے بھی اس گوشت کو بناؤ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یہ گوشت حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو صدقہ میں ملا ہے (اور آپ کے لئے صدقہ کا استعمال جائز نہیں) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ ان کے لئے صدقہ ہے، اور ہمارے لئے (ان کی طرف سے) ہدیہ ہے (صحیح مسلم مع شرحہ للنووی: ۱۰ / ۱۴۷، کتاب العتق)۔

جیسے کوئی کافر شراب کی فروخت سے حاصل شدہ رقم قرض کی ادائیگی میں کسی مسلمان کو دے تو اس کا لینا جائز کہا گیا ہے، "وجاز أخذ دين على كافر من ثمن خمر لصحة بيعه" (الدر المختار مع رد المحتار: ۹ / ۵۵۳)، اس لئے کہ وہ کافر اس رقم کا مالک ہے۔



سرکاری اسکیموں سے متعلق اکیڈمی کے سوالات کا شرعی جائزہ

مولانا خورشید انور اعظمی [1]

حکومت کی قانونی واخلاقی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اپنے ملک میں بسنے والے تمام افراد کے بنیادی حقوق ومفادات کا بہرصورت لحاظ رکھے اور ان کی جملہ شہری ضروریات کی تکمیل کے لئے ہمہ وقت فکرمند رہے، تاکہ تمام باشندگان ملک، اطمینان وسکون کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کرسکیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماتحتوں کی دیکھ ریکھ اوران کی نگہداشت پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''الا کلکم راعٍ، وکلکم مسئول عن رعيته، فالأمير الذي على الناس راعٍ، وهو مسئول عن رعيته'' (صحیح مسلم ۳/ ۱۴۵۹)

[ہر شخص نگراں ہے اور ہر شخص سے اس کے ماتحت کے بارے میں باز پرس ہوگی، چنانچہ جو امیر، لوگوں کا نگراں ہے اس سے اس کے ماتحت کے بارے میں باز پرس ہوگی]

امام نووی نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''ففيه أن كل من كان تحت نظره شئ فهو مطالب بالعدل فيه، والقيام بمصالحه في دينه ودنياه ومتعلقاته'' (شرح النووی علی مسلم ۱/ ۲۱۳)۔

[اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ہر شخص سے اس کے ماتحت کے بارے میں مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ عدل کرے اور اس کی دینی ودنیاوی مصلحتوں اور اس سے متعلق امور کا خیال کرے]

علامہ ماوردی نے حاکم کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"أن يباشر بنفسه مشارفة الأمور، وتصفح الأحوال، لينهض بسياسة الأمة وحراسة الملة، ولا يعول على التفويض تشاغلا بلذة أو عبادة، فقد يخون الأمين، ويغش الناصح، وقد قال الله تعالى: يا داؤد إنا جعلناك خليفة في الأرض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله'' (الاحکام السلطانیۃ ۱/ ۴۰)۔

[حاکم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ بذات خود جملہ امور پر نگاہ رکھے اور حالات کا جائزہ لیتا رہے اور کسی لذت یا عبادت میں مشغول ہوکر کام کو کسی دوسرے کے حوالے نہ کرے، تاکہ امت کی قیادت اور ملت کی حفاظت پورے طور پر کرسکے اس وجہ سے کہ بسا اوقات امین سے خیانت اور خیر خواہ سے فریب دہی کا صدور ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا: اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے لہٰذا لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی]

اسی طرح حاکم کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنی رعایا کو جو کچھ دینا ہے مناسب وقت پر اس کی ادائیگی کرے، جیسا کہ علامہ ماوردی رقم طراز ہیں:

''تقدير العطايا وما يستحق في بيت المال من غير سرف ولا تقتير، ودفعه في وقت لا تقديم فيه ولا تأخير'' (الاحکام السلطانیۃ ۱/ ۴۰)۔

[حاکم، عطیات اور بیت المال کے مستحقات کو بغیر کسی کمی بیشی کے طے کرے اور اس کی بروقت ادائیگی کرے]

---

[1] صدر مدرس جامعہ مظہر العلوم، بنارس۔

یہی وجہ ہے کہ تمام حکومتیں اپنی رعایا کا مالی تعاون کرتی ہیں کبھی قرض کی صورت میں اور کبھی امداد کی شکل میں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرض کو کلی یا جزئی طور پر معاف کر دیا جاتا ہے، اور اسے حکومت کے فرائض میں شمار کیا جاتا ہے۔

شریعت میں کسی کا تعاون کرنا یا کسی کو قرض دینا مستحسن امر ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''ما مِن مسلِم يقرِض مسلِما قرضا مرتين إلا كان كصدقتِها مرة'' (ابن ماجه ۲/ ۸۱۲)۔

[کسی مسلمان کو دو بار قرض دینا ایک بار صدقہ کرنے کے مثل ہے]

علامہ قرطبی نے آیت کریمہ ''من ذا الذِي يقرِض الله قرضا حسنا فيضاعِفه له ا ضعافا كثِيرة والله يقبِض ويبسط وِ اليهِ ترجعون'' (البقرة: ۲۴۵) کی تفسیر کرتے ہوئے قرض کی فضیلت کو واضح کیا ہے:

''ثواب القرضِ عظِيم، لأن فيه توسعة على المسلم وتفريجا عنه'' (تفسير قرطبی: ۳/ ۲۴۰)۔

[قرض کا ثواب، بڑا ہے اس وجہ سے کہ اس سے مسلمان کے لئے کشادگی پیدا ہوتی ہے اور اس کی تنگی دور ہوتی ہے]

البتہ شریعت نے اس بات پر کافی زور دیا ہے کہ قرض کے لین دین میں اس بات کا لحاظ کرنا از حد ضروری ہے کہ اس میں حصول منفعت کا جذبہ کارفرما نہ ہو اس لئے کہ قرض ایک تبرع ہے اسے منفعت وآمدنی کا ذریعہ نہیں بننا چاہئے، اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس قرض سے منع فرمایا ہے جس سے نفع خوری مقصود ہو، ارشاد نبوی ہے:

''كل قرض جر منفعة فهو وجه مِن وجوهِ الربا'' (السنن الكبرى للبيهقي: ۲/ ۲۷۳)۔

[جو قرض حصول نفع کا سبب ہو، وہ ربوا کی ایک صورت ہے]

اس لئے اگر سرکاری اسکیموں میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو تو ان سے استفادہ کرنا درست ہوگا ورنہ نہیں۔

(۱) اگر حکومت نے کسی کو قرض دیا اور اس کے کچھ حصے کو معاف کر دیا کہ لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا ہے تو قرض کی یہ صورت درست ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالی نے قرض کے معاف کرنے کی ترغیب دی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

''وان كان ذو عسرة فنظرة الى ميسرة وان تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون'' (البقرة: ۲۸۰)۔

[اور اگر قرض لینے والا تنگدست ہو تو اسے کشائش کے حاصل ہونے تک مہلت دو اور اگر بخش ہی دو تو تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو]

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں صدقہ کرنے سے مراد قرضے کی معافی بتایا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

'' الظاهر أن المراد بالتصدق الإبراء وهو خير وأكثر ثوابا من الأنظار '' (التفسير المظهری: ۱/ ۴۱۲)۔

[ظاہر ہے کہ صدقہ کرنے سے مراد معاف کرنا ہے اور وہ مہلت دینے کی بنسبت زیادہ بہتر اور بہت ثواب والا ہے]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض معاف کرنے کی ترغیب دی ہے:

'' من سره أن ينجيه الله مِن كربِ يومِ القِيامة، فلينفِس عن معسِر أو يضع عنه'' (رواه مسلم)۔

[جس کو یہ بات بھلی معلوم ہو کہ اللہ تعالی اسے قیامت کے دن کی تکلیفوں سے نجات دے تو چاہئے کہ وہ کسی غریب تنگ دست کو مہلت دے یا معاف کر دے]

امام نووی نے اس طرح کی احادیث کی تشریح کرتے ہوئے قرض کو کلی یا جزئی طور پر معاف کرنے کی اہمیت وفضیلت پر روشنی ڈالی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''فِي هٰذه الأحادِيثِ فضل انظارِ المعسِرِ والوضع عنه إما كل الدين. وإما بعضه من كثير أو قليل '' (نووی شرح

مسلم :۱۰/ ۲۲۴)۔

[ان احادیث میں غریب تنگ دست کو مہلت دینے اور اس کو معاف کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے، یا تو پورے قرض کی معافی ہو یا کچھ کی، زیادہ قرض سے ہو یا کم سے]

مبسوط سرخسی میں ہے: ''وإذا أقرض الرجل الرجل الدراهم ثم صالحه منها على أقل من وزنها فهو جائز. لأنه قبض البعض وابرأه عن البعض وكل واحد منهماصحيح في الكل فكذلك في البعض'' (المبسوط للسرخسی:۱۴/۳۸)۔

[اگر کسی نے کسی کو دراہم قرض دیئے، پھر اس سے کم وزن کے دراہم پر مصالحت کرلی تو یہ جائز ہے، اس لئے کہ اس نے بعض پر قبضہ کیا اور بعض کو معاف کردیا، اور ان دونوں میں سے ہر ایک کل میں صحیح ہے تو بعض میں بھی صحیح ہوگا]

نیز زیر بحث مسئلے میں نفع، قرض دینے والے کا نہیں ہے، بلکہ قرض خواہ کا ہے جو درست، ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''فان كانت المنفعة للدافع منع اتفاقا للنهي عنه ، وخروجه عن باب المعروف. وإن كانت للقابض جاز'' (الفقه الاسلامی وادلته:۵/ ۴۴۸)۔

[اگر منفعت، قرض دہندہ کے لئے ہو تو بالاتفاق ممنوع ہے اس وجہ سے کہ وہ منہی عنہ اور حسن سلوک کے دائرے سے خارج ہے، اور اگر قرض خواہ کے لئے ہو تو جائز ہے]

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایسے قرضے جن کے کچھ حصے معاف کردئے جائیں اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑے، درست ہیں۔

(۲) اگر حکومت نے قرض دیا اور طے کیا کہ مقررہ مدت کے اندر رقم واپس کرنے پر قرض معاف ہوجائے گا ورنہ پوری رقم ادا کرنی ہوگی تو جائز ہے۔

ہدایہ میں ہے: ''إذا قال: صالحتك من الألف على خمس مائة تدفعها إلى غدا، وأنت برئ من الفضل على أنك إن لم تدفعها إلى غدا، فالألف عليك على حاله، وجوابه أن الأمر على ما قال؛ لأنه أتى بصريح التقييد. فيعمل به'' (ہدایہ:۳/ ۲۲۶)

[اگر کہا کہ میں نے تم سے ہزار میں پانچ سو پر صلح کی کہ تم مجھے کل دیدو گے تو بقیہ سے بری ہوجاؤ گے بایں طور کہ اگر تم نے مجھے کل نہیں دیا تو ایک ہزار تم پر علی حالہ باقی رہے گا، مسئلہ قائل کے قول کے مطابق ہوگا اس وجہ سے کہ اس نے بصراحت قید لگائی ہے، لہٰذا اس پر عمل کیا جائے گا]

(۳) اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ ربوا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"یایها الذین آمنوا لا تأکلوا الربا أضعافا مضاعفة واتقوا الله لعلکم تفلحون" (آل عمران:۱۳۰)۔

[اے ایمان والو! دوگنا چوگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ نجات حاصل کرو]۔

علامہ ابن کثیر اس آیت کریمہ کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

''يقول الله تعالى ناهيا عباده المومنين عن تعاطي الربا وأكله إضعافا مضاعفة. كما كانوا يقولون في الجاهلية إذا حل أجل الدين: إما أن يقضي وإما أن يربي. فإن قضاه وإلا زاده في المدة. وزاده الآخر في القدر. وهكذا كل عام فربما تضاعف القليل حتى يصير كثيرا مضاعفا'' (تفسیر ابن کثیر :۲/ ۱۱۷)۔

[اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو سودی لین دین اور اس کو کئی گنا کرکے کھانے سے منع کیا ہے، جیسا کہ جاہلیت میں جب قرض کی مدت پوری ہوجاتی تو لوگ کہتے تھے یا تو قرض ادا کرو یا سود دو، اگر دیدیا تو ٹھیک، ورنہ وہ مدت بڑھادیتے اور دوسرا اہادہ مقدار بڑھاتا، یہ ہر سال ہوتا اور بسا اوقات کم مال بڑھتے بڑھتے کئی گنا زیادہ ہوجاتا]

اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے قرض سے منع فرمایا ہے، جو حصول منفعت کا ذریعہ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا'' (السنن الكبرى للبيهقي: ۵/ ۳۵۰)۔

جو قرض حصول نفع کا سبب ہو، وہ ربوا کی ایک صورت ہے۔

ردالمحتار میں ہے: ''كل قرض جر نفعا حرام'' (ردالمحتار: ۷/ ۳۹۵)۔ ہر قرض جو نفع کا ذریعہ ہو حرام ہے۔

المغنی میں ہے: ''كل قرض شرط فيه أن يزيد فهو حرام بلا خلاف'' (المغنی ۴/ ۳۶۰)۔

جس قرض میں زیادتی کی شرط ہو وہ بلا کسی اختلاف کے حرام ہے۔

(۴) اگر معافی یا غیر معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح کم ہونے کے سبب اسے سروس چارج کہا جاسکتا ہو تب بھی یہ درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ قرض سے زائد مشروط رقم خواہ کتنی ہی قلیل ہو وہ سود ہے، جس کا لین دین شرعاً درست نہیں ہے، عمدۃ القاری میں ہے:

''قد أجمع المسلمون نقلا عن النبي ﷺ: أن اشتراط الزيادة في السلف ربا'' (عمدة القاری ۱۲/ ۱۳۵)

مسلمانوں کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے اس بات پر اجماع ہے کہ قرض میں زیادتی کی شرط لگانا ربوا ہے۔

علامہ عبدالبر نے تحریر فرمایا: ''قد أجمع المسلمون نقلا عن نبيهم ﷺ أن إشتراط الزيادة في السلف ربا، ولو كان قبضة من علف، أوحبة، كما قال ابن مسعود أوحبة واحدة'' (التمهيد: ۴/ ۶۸)۔

مسلمانوں کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے اس بات پر اجماع ہے کہ قرض میں زیادتی کی شرط لگانا ربوا ہے، وہ ایک مٹھی چارہ یا دانہ ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ عبداللہ ابن مسعود نے یا ایک دانہ کہا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض سے زائد رقم سود ہے، خواہ اس کی مقدار اتنی کم ہی کیوں نہ ہو کہ اسے سروس چارج کہا جاسکتا ہو۔

البتہ اگر قرض کا معاملہ علیحدہ کیا جائے اور الگ سے سروس چارج کی بات طے کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ قاضی، دستاویز وغیرہ کی لکھا پڑھی کے لئے اجرت لے سکتا ہے، درمختار میں ہے:

''يستحق القاضي الأجر على كتب الوثائق أو المحاضر أو السجلات قدر ما يجوز لغيره كالمفتي'' (درمختار ۹/ ۱۲۷)

قاضی، دستاویز یا کارروائی یا رجسٹر کے لکھنے کی اجرت، مفتی وغیرہ کے لئے جتنی درست ہے، لے سکتا ہے

(۵) اگر صورت مسئلہ یہ ہو کہ حکومت کی جانب سے دیئے جانے والے قرض پر زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ اس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے، تو یہ بھی سود ہے جس کا لین دین از روئے شریعت ممنوع وحرام ہے، عمدۃ القاری میں ہے:

''قد أجمع المسلمون نقلا عن النبي صلى الله عليه وسلم: أن اشتراط الزيادة في السلف ربا'' (عمدة القاری ۱۲/ ۱۳۵)

مسلمانوں کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے اس بات پر اجماع ہے کہ قرض میں زیادتی کی شرط لگانا سود ہے۔

ردالمحتار میں ہے: ''كل قرض جر نفعا حرام'' (ردالمحتار ۷/ ۳۹۵)۔ ہر قرض جو نفع کا ذریعہ ہو حرام ہے۔

(۶) اگر حکومت مکان وغیرہ کی تعمیر اور تعلیم وتعلم یا کسی بنیادی ضرورت کے لئے اپنے شہریوں کی مکمل اعانت کرے اور ان رقوم کو واپس نہ لے تو ایسی رقوم کا استعمال درست ہوگا، اس لئے کہ حکومت کی اخلاقی وقانونی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اپنی رعایا کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایا کے تئیں حاکم کی ذمہ داری کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

''ألا كلكم راع، وكلكم مسئول عن رعيته، فالأمير الذي على الناس راع، وهو مسئول عن رعيته'' (صحیح مسلم ۳/ ۱۴۵۹)۔

ہر شخص نگراں ہے اور ہر شخص سے اس کے ماتحت کے بارے میں باز پرس ہوگی، چنانچہ جو امیر، لوگوں کا نگراں ہے اس سے اس کے ماتحت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

علامہ ماوردی نے حاکم کے فرائض بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''أن يباشر بنفسه مشارفة الأمور، وتصفح الأحوال، لينهض بسياسة الأمة وحراسة الملة، ولا يعول على التفويض تشاغلا بلذة أو عبادة، فقد يخون الأمين ويغش الناصح ، وقد قال الله تعالى : يا داؤد إنا جعلناك خليفة فى الأرض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله'' (الاحكام السلطانية ۱/ ۴۰)۔

حاکم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ بذات خود جملہ امور پر نگاہ رکھے اور حالات کا جائزہ لیتا رہے اور کسی لذت یا عبادت میں مشغول ہو کر کام کو کسی دوسرے کے حوالے نہ کرے تاکہ امت کی قیادت اور ملت کی حفاظت پورے طور پر کر سکے اس وجہ سے کہ بسا اوقات امین سے خیانت اور خیر خواہ سے فریب دہی کا صدور ہو جاتا ہے، اللہ تعالی نے کہا: اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کا فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی مت کرو کہ وہ تم کو اللہ کی راہ سے دور کردے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات پورے طور پر واضح ہے کہ سرکار کی جانب سے اپنے شہریوں کی اعانت و امداد مستحسن قدم ہے اور اس کا استعمال کرنا درست ہے۔

(۷) اگر حکومت کی جانب سے ملنے والی امدادی رقوم کے حصول کے لئے کچھ لوگ واسطہ بنتے ہوں اور بھاگ دوڑ کر کے ان رقوم کو حاصل کرتے ہوں تو ان لوگوں کے لئے محنتانہ لینا کثرۃ تعامل کے سبب درست ہے، ردالمحتار میں ہے:

''وفى الحاوى: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان فى الأصل فاسد الكثرة التعامل'' (ردالمحتار ۶/ ۶۳)۔

حاوی میں ہے: محمد ابن سلمہ سے دلال کی اجرت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا: امید کرتا ہوں کہ کثرت تعامل کے سبب اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ یہ اصلا فاسد ہے

(۸) حکومت کی جانب سے ملنے والی رقوم کے حصول کے سلسلے میں واسطہ بننے والے کے لئے معمول کے مطابق مناسب محنتانہ لینا درست ہے جو عام طور پر لیا دیا جاتا ہے، حاصل شدہ رقم سے ایک حصہ طے کرنا درست نہیں ہوگا، علامہ شامی نے تاتارخانیہ کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے:

''قال فى التتار خانية: وفى الدلال والسمسار يجب أجرالمثل، وماتواضعوا عليه أن فى كل عشرة دنانير كذا فذاك حرام عليهم'' (ردالمحتار ۶/ ۶۳)۔

تاتارخانیہ میں ہے کہ دلال کے لئے اجر مثل واجب ہے اور جو یہ طے کرتے ہیں کہ ہر دس دینار پر اتنا دینا ہوگا یہ ان کے لئے حرام ہے۔

(۹) اگر حکومت کی جانب سے حاصل ہونے والی امدادی رقوم یا قرض کے حصول کے لئے رشوت دینی پڑے تو دیکھا جائے گا کہ اگر صاحب معاملہ اس طرح کے تعاون اور قرض کا واقعتا حقدار ہے اور رشوت کے بغیر اس کے حق کے ملنے کی بظاہر کوئی شکل نہیں ہے تو بحالت مجبوری اس کا رشوت دینا درست ہوگا، مفتی محمود صاحب نے اس طرح کے مسئلے میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

''اپنا حق ''تجارت یا ملازمت وغیرہ'' حاصل کرنے کے لئے اگر مجبورا رشوت دی جائے تو امید ہے کہ رشوت دینے والا گناہ سے بچ جائے گا'' (فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۳۳۹)۔

اسلامی شریعت میں رشوت لینا دینا حرام ہے، لیکن اس سے ایسی رشوت مراد ہے جس سے کسی حق کو باطل کیا جائے یا باطل کو ثابت کیا جائے اور

اگر اس کے ذریعہ اپنا حق حاصل کیا جائے یا اپنے اوپر ہونے والے کسی ظلم کو دفع کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح میں لکھا ہے:

''قیل: الرشوۃ مایعطی لإبطال حق أو لإحقاق باطل، إما إذا أعطی لیتوصل به إلی حق، أو لیدفع به عن نفسه ظلما، فلابأس به'' (مرقاۃ المفاتیح ۶/ ۲۴۳۷)۔

کہا گیا ہے کہ رشوت سے مراد ایسا مال ہے جو کسی حق کو باطل کرنے یا کسی باطل کو ثابت کرنے کے لئے دیا جائے، رہا وہ مال جو کسی حق کے حصول یا اپنی ذات سے کسی ظلم کو دفع کرنے کی غرض سے دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

رد المحتار میں ہے: ''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوۃ یعنی فی حق الدافع'' (رد المحتار: ۶/ ۴۲۴)۔

اپنی جان ومال سے ظلم کو دفع کرنے اور کسی حق کے پالینے کی غرض سے ظالم بادشاہ کو مال دینا، دینے والے کے حق میں رشوت نہیں ہے۔

اور اگر کوئی شخص مذکورہ تعاون یا قرض کا حقدار نہ ہو یا اس طرح کے تعاون یا قرض کے حصول سے کسی دوسرے کا حق متاثر ہو رہا ہو تو اس صورت میں رشوت دینے کی قطعاً اجازت نہ ہوگی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے دینے والے پر لعنت فرمائی ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرو سے روایت ہے:

''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الراشی والمرتشی'' (سنن ابوداود: ۲/ ۲۰۰)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

(۱۰) حکومت کی جانب سے امدادی رقوم یا قرض کے حصول کے لئے متعین شرائط ومعیارات کا پورا کرنا شرعاً لازم اور ضروری ہوگا، اور اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لینا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ اسلامی شریعت میں غلط بیانی، کذب بیانی اور فریب دہی سے سختی سے منع کیا گیا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من غشنا فلیس منا'' (صحیح مسلم: ۴/ ۹۷)۔ جس نے ہم کو دھوکہ دیا وہ ہمارے طریقے پر نہیں ہے۔

اسی طرح اللہ تعالی نے کسی دوسرے کے مال کو غلط طریقے سے لینے کو منع فرمایا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

''ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بها إلی الحکام لتأکلوا فریقا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون'' (البقرۃ: ۱۸۸)۔

اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ اس کو حاکموں کے پاس پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھا جاؤ اور تم جانتے بھی ہو

علامہ زمخشری نے اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ولا یأکل بعضکم مال بعض بالباطل بالوجه الذی لم یبحه الله ولم یشرعه ولا تدلوا بها ولا تلقوا امرها والحکومة فیها الی الحکام لتاکلوا بالتحاکم فریقا طائفة من اموال الناس بالاثم بشهادۃ الزور او بالیمین الکاذبة'' (تفسیر کشاف: ۱/ ۳۴۳)۔

[تم میں سے کوئی، کسی کا مال باطل طریقے پر یعنی اس طور پر نہ کھائے کہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے اور نہ اس کو مشروع قرار دیا ہے اور نہ اس مسئلے کو حکام کے پاس لے جاؤ تاکہ ان کے یہاں مسئلہ لے جا کر جھوٹی گواہی یا جھوٹی قسم کے ذریعے لوگوں کے مال کے ایک حصے کو غلط طریقے سے کھاؤ]

البتہ اگر کوئی شخص کسی چیز کا واقعتاً حقدار ہے اور اس کا حصول غلط بیانی کے بغیر ممکن نہیں ہے تو اس کے لئے کسی بھی حیلے سے اپنا حق واجبی حاصل کرنا درست ہے، علامہ شامی نے کذب بیانی کے جواز وعدم جواز کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"إن كل مقصود محمود يمكن التوصل إليه بالصدق والكذب جميعا، فالكذب فيه حرام، وإن أمكن التوصل إليه بالكذب وحده، فمباح أن أبيح تحصيل ذلك المقصود، وواجب إن وجب تحصيله" (ردالمحتار ۶/ ۴۲۷)

جس محمود مقصد تک رسائی صدق وکذب دونوں کے ذریعہ ممکن ہو اس میں جھوٹ بولنا حرام ہے اور جس کا حصول صرف کذب بیانی سے ممکن ہو تو اگر اس مقصد کا حاصل کرنا مباح ہو تو کذب بیانی مباح اور اگر واجب ہو تو واجب ہے۔

(۱۱) اگر تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے کوئی ایسی اسکیم ہے کہ اس تعلق سے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر عائد انٹرسٹ بھی خود ہی ادا کرتی ہے، مقروض کو ادا نہیں کرنا پڑتا تو اس طرح کے قرض لینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر قرض کا اکثر انٹرسٹ حکومت خود ادا کرتی ہو اور اس کا کچھ حصہ قرض لینے والے کو ادا کرنا پڑتا ہو تو یہ درست نہیں ہوگا الا یہ کہ قرض خواہ محتاج ہو تو اس کے لئے اس طرح کا قرض لینا درست ہے ،علامہ ابن نجیم نے اس بات کی تصریح کی ہے:

"يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباه والنظائر ۱/ ۷۹) ۔ محتاج کے لئے سود پر قرض لینا جائز ہے۔

(۱۲) اگر حکومت یا حکومت کا کوئی ادارہ انٹرسٹ وصول کر کے اس کا مالک ہو جائے اور اس سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کرے تو ایسی اسکیم سے استفادہ کرنا درست ہوگا، اس لئے کہ اگر حکومت غیر اسلامی ہے تو اس کے نزدیک اس طرح کا سودی مال حلال ہے، وہ اس کا مالک ہے، لہٰذا اس کی جانب سے اس مال سے کسی دوسرے کی مدد کرنا اور دوسرے کا اس کو لینا درست ہوگا، علامہ ابن عابدین شامی نے شرح السیر الکبیر کے حوالے سے لکھا ہے:

"إذا دخل المسلم دار الحرب بأمان، فلا بأس بأن يأخذ منهم أموالهم بطيب أنفسهم، بأى وجه كان" (ردالمحتار ۵/ ۱۸۶)۔

اگر مسلمان دار الحرب میں امان کے ساتھ داخل ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ان سے ان کے مال کو ان کی رضامندی سے جس طرح چاہے لے

تبیین الحقائق میں ہے:

"فإذا أخذه برضاهم فقد أخذ مالا مباحا بلا غدر" (تبيين الحقائق ۴/ ۹۷)۔

اگر ان کی رضامندی سے مال لیا ہے تو اس نے بلا کسی عہد شکنی کے مال مباح لیا ہے۔

اور اگر حکومت اسلامی ہے تو اس طرح کی اسکیم سے مستحق صدقات کا استفادہ کرنا درست ہوگا اس وجہ سے کہ انٹرسٹ کا یہ مال اسلامی نقطہ نظر سے واجب التصدق ہے لہٰذا اگر حکومت اپنے ملک کے مستحق اداروں یا شہریوں کا تعاون کرتی ہے اور مستحقین اس طرح کی اسکیم سے استفادہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا، ردالمحتار میں ہے:

"ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (ردالمحتار ۹/ ۵۵۳)۔

ان اموال کو اگر ان کے مالک کا پتہ چل جائے تو ان کے حوالے کر دیا جائے ورنہ ان کا صدقہ کر دیا جائے، اس لئے کہ اگر کسب خبیث کا اس کے مالک کو واپس کرنا متعذر ہو تو اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ اس کا صدقہ کر دیا جائے۔

☆☆☆

سرکاری اسکیموں سے استفادہ، غور وخوض کے چند پہلو

مفتی محمد عثمان بستوی [1]

سرکاری اسکیموں سے متعلق فقہ اکیڈمی کا جاری کردہ سوالنامہ کل پانچ موضوعات پر مشتمل ہے (۱) تبرعات، (۲) رباء معلق ومحقق، (۳) اجرت، (۴) رشوت، (۵) حرام طریقے سے حاصل شدہ مال سے انتفاع، تمام سوالات کے جوابات ترتیب وار قلمبند کئے جاتے ہیں۔

سوال نمبر (۱) کا جواب:

حکومت سے قرض لینے کی وہ شکل جس میں قرض میں لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑے اس کے فی نفسہ جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، کیونکہ یہ شکل قرض اور تبرع پر مشتمل ہے جتنے حصے کی ادائیگی لازم ہوا اتنا حصہ تو قرض ہوگا بقیہ تبرع اور حکومت، خواہ مسلم کی ہو یا غیر مسلم کی قرض اور اس کے تبرعات کے لینے کی شرعاً اجازت ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر مسلم سے قرض لینا ثابت ہے، حتی کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس وقت بھی آپ کی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس تیس صاع جو کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی۔

۱۔ ''عن عائشة قالت: توفي رسول الله ﷺ ودرعه مرهونة عند يهودي بثلثين صاعًا من شعير''۔

۲۔ ''وعنها قالت: اشترى رسول الله ﷺ طعامًا من يهودي إلى أجل ورهنه درعًا له من حديد'' (مشکوۃ المصابیح/ ۲۵۰)۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر مسلم افراد اور حکومتوں کی طرف سے ہدیہ کا قبول کرنا بھی ثابت ہے۔

۱۔ ''إن النبي صلى الله عليه وسلم كان يقبل هدايا المشركين، وأنه أهدى مع عمرو بن أمية الضمري إلى أبي سفيان تمرة عجوة واستهداه أدمًا فقبل هدية رسول الله ﷺ وأهدى له الأدم، وأن نصرانيًا أهدى إلى رسول الله ﷺ حريرًا يتلألأ فقبل هديته'' (شرح السیر الکبیر ۲/ ۱۳۲۷)۔

مذکورہ بالا روایات سے حکومتی قرضے اور تبرعات کا جواز بالکل ظاہر ہے، لیکن اگر یہ قرضے اور تبرعات دینی یا سیاسی مصالح کے خلاف ہوں تو اس وقت ایسے قرضے اور تبرعات کی ممانعت ہوگی حضرات فقہاء نے غیر مسلم کے ہدایا قبول کرنے اور رد کرنے والی روایات کے درمیان اسی طرح تطبیق دی ہے۔

۱۔ کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر مسلم کے بارے میں احساس ہوا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی جدو جہد کا مقصد مال ودولت کا حصول سمجھ رہے ہیں تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم کا ہدیہ رد فرماتے ہوئے فرمایا:

''إني نهيت عن زبد المشركين'' (کتاب الاموال لابی عبید/ ۶۳۰) (مجھے مشرکین کے ہدیہ سے روکا گیا ہے)۔

اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم کے ہدیہ قبول کرنے میں دینی وملی صلابت اور غیرت وحمیت کی کمی کا احساس فرمایا اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم کا ہدیہ رد فرما دیا، نیز جس وقت غیر مسلم کا ہدیہ قبول کرنے کی صورت میں ان کی مسلمانوں سے قربت اور غلط فہمی دور ہونے کی امید ہو تو ہدیہ قبول کرنا جائز ہے،

''اختلفت عبارة المشائخ رحمهم الله في وجه التوفيق، فعبارة الفقيه أبي جعفر الهندواني: أن ما روى أنه لم

[1] ریاض العلوم گورینی، جونپور۔

يقبلها محمول على أنه إنما لم يقبلها من شخص غلب على ظن رسول اللهﷺ أنه وقع عند ذلك الشخص أن رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما يقاتلهم طمعًا فى المال لا لإعلاء كلمة الله ولا يجوز قبول الهدى من مثل هذا الشخص فى زماننا. وما روى أنه قبلها محمول على أنه قبل من شخص غلب على ظن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه وقع عند ذلك الشخص أن رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما يقاتلهم لإعزاز الدين ولإعلاء كلمة الله لا لطلب المال. وقبول الهدية من مثل هذا الشخص جائز فى زماننا أيضا. ومن المشائخ من وفق من وجه آخر. فقال: لم يقبل من شخص علم أنه لو قبل منه صلابته وعرنة فى حقه، ويلين له بسبب قبول الهدية وقبل من شخص علم أنه لا يقبل صلابته وعرنة فى حقه، ولا يلين بسبب قبول الهدية، كذا فى المحيط" (الهنديه ۵/ ۳۴۷-۳۴۸)۔

حاصل یہ کہ دین وایمان کی حفاظت بہر حال مقدم ہے، لہٰذا اگر حکومتی اسکیموں سے دین وایمان پر ضرب پڑتی ہو تو اس سے احتراز واجب ہے اور اگر اس طرح کی اسکیمیں دین وایمان کے لئے مضر نہ ہوں، بلکہ شہری وملکی تقاضوں کی بنا پر لوگوں کی سہولت کے لئے جاری کی جائیں تو اس سے نفع اٹھانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں خصوصاً جب وہ اسکیم سود وقمار سے خالی اور قرض حسن وتبرع پر مشتمل ہو تو اس کے فی نفسہ جواز میں کوئی شبہ بھی نہیں۔

چنانچہ حضرت اقدس تھانویؒ دینی مدارس میں سرکاری امداد حاصل کرنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ:

اگر سرکار وعدہ کرے کہ ہم اعانت کر کے دخل نہ دیں گے تب اعانت لینا درست ہے (امداد الفتاوی ۴/ ۷۹)۔

اس سے معلوم ہوا کہ سرکاری امداد حاصل کرنے میں مصالح کا خیال رکھنا لازم ہے، خصوصاً دینی مصالح کا، لہٰذا اگر سرکاری امداد دین وایمان کے لئے مضر ہو تو احتراز کرنا لازم ہے۔

سوال نمبر (۲) کا جواب:

قرض کی وہ شکل جس میں مقررہ مدت کے اندر ادا کرنے پر کچھ حصہ قرض کا معاف کر دیا جائے اور مقررہ مدت میں ادا نہ کرنے کی صورت میں پوری رقم ادا کرنا پڑے اس شکل کے بارے میں حضرات فقہاء کی عبارات بظاہر متعارض نظر آتی ہیں، بعض عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً یہ ابراء معلق کی صورت ہے جس کا حکم یہ ہے کہ شرط لغو اور دینِ کامل کی ادائیگی لازم ہے، خواہ وقت مقررہ پر ادا کرے یا وقت مقررہ کے بعد۔

"فى الدر: ما يبطل بالشرط الفاسد ولا يصح تعليقه به .... الإبراء عن الدين؛ لأنه تمليك من وجه. وفى رد المحتار: قال لمديونه: إذا أديت إلى كذا أو متى أديت أو إن أديت من خمس مائة فأنت برئ عن الباقى فهو باطل. ولا إبراء ...فيه معنى الإسقاط. فيكون معتبرًا بالتمليكات، فلا يجوز تعليقه بالشرط.... وليس من مبادلة المال بالمال. فينبغى أن لا يبطل بالشرط الفاسد" (شامی ملخصا ۷/ ۵۰۲-۵۰۳)۔

یعنی ابراء مبادلۃ المال بالمال میں داخل نہیں، اس لئے شرط فاسد سے فاسد تو نہ ہوگا، لیکن چونکہ تملیکات میں داخل ہے اس لئے تعلیق بالشرط صحیح نہیں، لہٰذا شرط کالعدم ہوگی اور دین علی حالہ باقی رہے گا۔

اس کے برعکس دوسری بعض عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وقت مقررہ میں ادا کی جائے تو شرط کے مطابق دین کا بقیہ حصہ ساقط ہو جائے گا اور جتنی رقم معاف کی گئی ہے وہ قرض دہندہ کی طرف سے احسان ہے، چنانچہ صاحب "درمختار" فرماتے ہیں:

"قال لغريمه: أدّ إلى خمس مائة غدًا من ألف لى عليك على أنك برئ من النصف الباقى. فقبل وأدى فيه برئ، وإن لم يؤد ذلك فى الغد عاد دينه" (الدر المختار ۸/ ۴۲۲)۔

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وقت مقررہ میں دین کی ادائیگی ہو تو شرط کے مطابق قرض کا بقیہ حصہ معاف ہو جائے گا اور اگر وقت مقررہ میں ادائیگی نہ کی گئی تو پورے دین کی ادائیگی لازم ہوگی۔

اس کے برعکس علامہ حصکفی وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے اپنے دین مؤجل کے کچھ حصہ کو وقت مقررہ سے پہلے ادا کرنے پر بقیہ کے معاف

کرنے کی شرط لگائی تو یہ شرعاً ناجائز ہے، اس سے قرض و دین کا بقیہ حصہ ساقط نہیں ہوگا، بلکہ کامل ادائیگی لازم ہوگی۔

''لا یصلح الصلح عن ألف مؤجل علی نصفه حالًا.... لأنه اعتیاض عن الأجل وهو حرام'' (شامی ۸/ ۴۲۱)۔

عبارات متعارضہ کے درمیان تطبیق:

عبارات مذکورہ میں بظاہر جو تعارض نظر آتا ہے وہ اس وقت ختم ہو جائے گا جب ان عبارات کا محمل متعین کردیا جائے چنانچہ پہلی عبارت ابراء معلق علی الشرط سے متعلق ہے اور ابراء چونکہ اسقاط متضمن بر تملیک کی قبیل سے ہے، اس لئے اس کی تعلیق صحیح اور درست نہ ہوگی اور شرط کی وجہ سے معاملہ فاسد بھی نہ ہوگا، کیونکہ ابراء از قبیل مبادلہ نہیں، لہٰذا شرط لغو ہو جائے گی اور دین علی حالہ باقی رہے گا۔

اور دوسری عبارت ابراء مقید پر محمول ہے کہ اگر ابراء کو مشروط بشرط متعارف کردیا جائے تو شرط معتبر ہوگی اور ابراء وجود شرط پر موقوف ہوگا اور مقید اور معلق کے درمیان فرق اس طرح ہوگا کہ تعلیق اداۃ شرط کے ساتھ ہوتی ہے اور تقیید مادہ ش ر ط (لفظ شرط) سے یا لفظ علی سے ہوتی ہے۔

(البحر، احسن الفتاوی ۵/ ۲۱۸ تا ۲۲۲)۔

اور تیسری عبارت اس دین سے متعلق جو عقد بیع کے ضمن میں پایا جائے، یعنی ثمن کی ادائیگی میں ایک مدت متعینہ تک موخر کرنے کی سہولت حاصل کی جائے اس صورت میں اگر صاحب دین مدیون سے ''ضع و تعجل'' کے اصول پر عمل کرے تو یہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اس لئے کہ اس صورت میں مدیون کو جو مہلت حاصل ہے وہ مدیون کا حق ہے اب اگر صاحبِ دین اپنے دین کا کچھ حصہ وقت مقررہ سے پہلے ادا کرنے پر بقیہ کے معافی کی شرط لگائے تو اس میں مدیون نے گویا کہ اپنے حق (اجل) کا عوض وصول کیا ہے اور اعتیاض عن الاجل شرعاً حرام و ناجائز ہے، عبارات مذکورہ کے محامل متعین ہو جانے کے بعد بظاہر جو تعارض نظر آرہا تھا وہ باقی نہیں رہا۔ ابراء عن الدین کی تعلیق و تقیید وغیرہ سے متعلق صاحبِ درمختار نے مختلف شکلیں ذکر فرمائی ہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''والأصل أن الإحسان إن وجد من الدائن فإسقاط، وإن منها فمعاوضة قال لغریمه: أدّ إلی خمس مائة غدًا من ألف لی علیك علی أنك بریئ من النصف الباقی، فقبل وأدی فیه بریئ، وإن لم یؤد ذلك فی الغد عاد دینه، کما کان لفوات التقیید بالشرط، ووجوها خمسة، أحدها: هذا، والثانی: إن لم یؤد بالغد لم یعد، لأنه إبراء مطلق. والثالث: کذا لو صالحه من دینه علی نصفه یدفعه غدًا وهو بریئ مما فضل علی أنه إن لم یدفعه غدًا، فالکل علیه کان الأمر کالوجه الأول، کما قال؛ لأن صرح بالتقیید، والرابع: فإن أبرأه عن نصفه علی أن یعطیه ما بقی غدًا، فهو بریئ أدی الباقی فی الغد أو لا، لبدائته بالإبراء لا بالأداء. والخامس: لو علق بصریح الشرط کإن أدیت إلی کذا أو إذا أو متی لا یصح الإبراء لما تقرر أن تعلیقه بالشرط صریحًا باطل؛ لأنه تملیك من وجه'' (شامی ۸/ ۴۲۱، ۴۲۲)۔

عبارت بالا کا حاصل یہ ہے کہ اگر معاملہ قرض کا ہو اور قرض دہندہ اپنے قرض کا کچھ حصہ وصول ہونے پر بقیہ کے معافی کی شرط لگاتا ہے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں خواہ قرض مؤجل ہو یا غیر مؤجل، کیونکہ قرض میں اجل کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا یہ قرض دہندہ کا احسان ہوگا، البتہ اگر یہ صورت ثمن مؤجل میں پیش آئے تو اعتیاض عن الاجل میں داخل ہو کر حرام ہوگا، اور اس کے علاوہ صاحب ''درمختار'' کی ذکر کردہ پانچ شکلوں میں سے آخری شکل تعلیق بالشرط سے متعلق ہے اور تعلیق بالشرط بہر کیف مبطل ابراء ہے اور بقیہ چار شکلوں میں سے پہلی اور تیسری اور چوتھی شکل بھی ابراء مقید سے متعلق ہے اور ابراء کو مقید بالشرط کرنا بہر صورت صحیح ہے اور ابراء بہر حال وجود شرط پر موقوف رہے گا اور دوسری شکل ابراء مطلق سے متعلق ہے، لہٰذا وہ کسی شرط پر موقوف نہ ہوگا۔

نوٹ: شرط کو مقدم و موخر کرنے کی صورت میں اختلاف روایات یہ فقط لفظ ''علی'' پر مبنی ہے، کیونکہ اس میں معاوضہ و شرط دونوں احتمال ہیں، لہٰذا اگر شرط صراحۃً استعمال کیا تو بالاتفاق بہر کیف ابراء مقید ہوگا، خواہ شرط مقدم ہو یا موخر (فلیراجع للتفصیل إلی احسن الفتاوی ۷/ ۱۸۰ - ۱۸۴)۔

سوال میں درج صورت کا حکم:

سوال میں درج صورت کہ قرض کو ایک مقررہ مدت کے اندر ادا کرنے پر اس کا بعض حصہ معاف ہوجائے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑے یہ شکل ابراء مقید میں داخل ہے اور وقت مقررہ کے اندر ادا کرنے پر قرض کا جو حصہ معاف ہوتا ہے وہ قرض دہندہ کا احسان ہے یہ اجل کا عوض نہیں، کیونکہ قرض میں اگر اجل ہو بھی تو وہ شرعاً غیر معتبر ہے اور یہ احسان وقت مقررہ پر ادائیگی کی شرط کے ساتھ مشروط ہے، لہٰذا اگر وقت مقررہ میں ادائیگی پائی جائے گی تو یہ احسان ہوگا، ورنہ نہیں اور اس شکل کو ابراء معلق پر محمول کرنا درست نہیں، کیونکہ اس صورت میں ابراء کالعدم ہوجائے گا جس کی وجہ سے معاملہ میں مذکور ایک حصہ لغو و مہمل قرار پائے گا اور کلام کو صحیح محمل پر محمول کرنا اس کے لغو و اہمال سے مقدم ہے۔

''القاعدة التاسعة: إعمال الكلام أولى من إهماله متى أمكن'' (الاشباه والنظائر ۱/ ۳۵۱) ''يعني إنه لا يجوز إهمال الكلام واعتباره بدون معنى ما أمكن حمله على معنى حقيقي له أو معني مجازي'' (شرح المجلة لعلي حيدر ۱/ ۵۳)۔

حاصل یہ ہے کہ سوال میں درج ۲ والی صورت قرض اور احسان و تبرع مشروط پر مشتمل ہے اور ان دونوں میں سے کسی کے بھی جواز میں کوئی شبہ نہیں جس طرح تبرع بغیر کسی شرط کے صحیح اور درست ہے، اسی طرح مناسب و موافق شرائط کے ساتھ بھی جائز و درست ہے، البتہ معلق بالشرط کرنا درست نہیں تعلیق کی صورت میں شرط لغو ہوگی اور تبرع صحیح نہیں ہوگا قرض علی حالہ باقی رہے گا۔

''أن الإبراء يصح تقييده لا تعليقه... لكن لا بد أن يكون الشرط متعارفًا... والمراد بالتعليق المذكور التقييد بالشرط، ولا يخفى أن هذا صريح أن الإبراء لا يبطل بالشرط، إنما يبطل بالتعليق'' (منحة الخالق على هامش البحر ۶/ ۱۸۳، شامی ملخصا ۷/ ۵۰۳)۔

اور مذکورہ شکل تعلیق نہیں، بلکہ تقیید میں داخل ہے، اس لئے اگر وقت مقررہ پر ادائیگی پائی جائے گی تو قرض کا بقیہ حصہ ساقط ہوجائے گا۔

تعلیق و تقیید کے درمیان فرق:

تقیید و تعلیق کے درمیان لفظی فرق یہ ہے کہ تعلیق میں حروف شرط صراحۃً مذکور ہوتے ہیں اور تقیید میں حروف شرط کا ذکر نہیں ہوتا اور معنوی فرق یہ ہے کہ تعلیق میں حکم فی الحال غیر ثابت اور معدوم کے درجہ میں ہوتا ہے اور شرط کے پائے جانے کے وقت ثبوت حکم کا تحقق ہوتا ہے اور تقیید میں حکم فی الحال ثابت ہوتا ہے، لیکن شرط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے حکم کے زوال کا امکان اور احتمال رہتا ہے، اور مفتی رشید احمد صاحبؒ نے ایک فرق یہ لکھا ہے کہ تعلیق اداۃ شرط کے ساتھ اور تقیید لفظ شرط یا لفظ ''علی'' کے ساتھ ہوتی ہے (احسن الفتاوی ۵ / ۲۱۹)۔

''(الفرق بينهما) لفظًا فهو أن التقييد بالشرط لا يستعمل فيه لفظ الشرط (أداة الشرط) صريحًا، والتعليق به يستعمل فيه ذلك، ومعنى التقييد به الحكم ثابت في الحال على عرضية أن يزول، إن لم يوجد الشرط. وفي التعليق به الحكم غير ثابت في الحال، وهو بعرضية أن يثبت عند وجود الشرط'' (عنایہ ۸/ ۴۲۹)۔

سوال نمبر (۳) کا جواب:

اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے کی صورت میں کل رقم کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو یہ شکل قرض مشروط بشرط الفاسد میں داخل ہوگی اور شرائط فاسدہ کے ساتھ قرض کا معاملہ کرنا جائز نہیں اگر معاملہ کیا گیا تو شرط لغو ہوگی اور صرف اصل قرض کے بقدر شرعاً ادائیگی لازم ہوگی اور اس سے زائد کا لین دین حرام ہوگا۔

''وفي الخلاصة: ''القرض بالشرط حرام والشرط لغو بأن يقرض على أن يكتب به إلى بلد كذا ليوفي دينه''

(شامی ۷/ ۳۹۴، خلاصة الفتاوی ۳/ ۵۳)۔

لیکن محقق عصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی کی کریڈٹ کارڈ والی بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ معاملہ مقررہ

وقت پر ادائیگی کی نیت سے کرے اور اس کا اہتمام بھی کرے کہ قرض مقررہ وقت پر ادا ہوجائے اور اضافی رقم لازم نہ ہونے پائے تو ایسی صورت میں اس طرح قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر وہ مقررہ وقت پر قرض کی ادائیگی میں کاہلی وسستی اور ادائیگی کا اہتمام نہ کرنے کی وجہ سے اضافی رقم لازم ہوجائے تو یہ شرط سود ہے جو ناجائز وحرام ہے، چنانچہ مولانا تحریر فرماتے ہیں: کہ کریڈٹ کارڈ میں اگر اس بات کا اہتمام واطمینان کرلیا جائے کہ بل کی ادائیگی تیس دن سے پہلے پہلے ہوجائے تا کہ اس پر سود نہ لگے تو اس میں کوئی خرابی نہیں یہ جائز ہے (انعام الباری ۶/ ۴۸۶)۔

اور ''فقہ البیوع'' میں رقمطراز ہیں:

''ولكن مثل هذه الشروط قد عمت بها البلوى في زماننا، فإن مثل هذه الشروط توجد في كثير من التعاملات مثل التعامل مع شركة الكهرباء، وشركات الهواتف وغيرها، فإن شرط غرامة التأخير موجود في جميع ذلك... واشتدت الحاجة إلى مثل هذه البطاقة فالمرجو أن حامله يعتبر معذورًا في الدخول في هذا العقد إن شاء الله تعالى بعد أخذ جميع الاحتياط اللازمة، لأن لا يلجأ إلى دفع الفائدة الربوية'' (فقه البيوع ملخصًا ۱/ ۴۶۲)۔

کریڈٹ کارڈ استعمال کرنے میں وقت مقرر پر ادائیگی نہ پائے جانے کی صورت میں اضافی رقم کی ادائیگی کی جو شرط ہوتی ہے اس شرط پر تفصیلی گفتگو حضرت نے فرمائی ہے حضرت فرماتے ہیں کہ اس شرط کے ساتھ معاملہ کرنا شرعاً ربا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہے، لیکن کارڈ استعمال کرنے والے کے لئے اس شرط سے بچنا ممکن ہے نیز اس طرح کی شروط کا عموم بلوی بھی ہے مثلاً بجلی، ٹیلی فون، پانی وغیرہ کی بل کی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ عائد ہوتا ہے اس کے باوجود بلا کسی رد ونکیر کے ان سہولیات سے نفع اٹھانے کا عمومی رواج ہے اسی طرح کی کارڈ بھی وقت کی ضرورت ہے، لہٰذا اگر سود سے بچنے کی تمام تر تدابیر کو اختیار کرتے ہوئے اس طرح کے کارڈ استعمال کئے جائیں تو ان شاء اللہ وہ معذور ہوگا اس کے برعکس بعض علماء عصر اس شرط کے ساتھ معاملہ کو مطلقاً حرام فرماتے ہیں اور بعض محققین اس شرط کے ساتھ اس کے استعمال کی اجازت دیتے ہیں کہ استعمال کرنے والے کو مقررہ وقت میں ادائیگی کا یقین ہو۔

''فيه خلاف للعلماء المعاصر، فقال بعضهم: إن مجرد التوقيع على هذا الشرط دخول في عقد محرم، فلا يجوز، ولو كان بنية عدم تطبيقه في الواقع، وقال آخرون: إن حامل البطاقة إن كان على يقين بأن هذا الشرط لا يطبّق فعلًا لعزم أدائه مبلغ الفاتورة خلال الفترة المحددة، فإنه يجوز الخ'' (فقه البيوع ۱/ ۴۶۲)۔

ایک فقہی نظیر:

سوال میں درج صورت (وقت مقررہ میں ادائیگی نہ ہونے پر زیادتی کے لزوم کی شرط) کو تین دن سے زائد خیار شرط، خیار نقد والے مسئلہ سے بہت حد تک مشابہت حاصل ہے، کیونکہ ان مسائل میں جس طرح وجہ فساد اور وجہ حرمت کا تحقق عقد کے ساتھ نہیں ہوتا ہے، بلکہ تین دن (وقت مقررہ) کے بعد وجہ فساد اور وجہ حرمت کا تحقق ہوتا ہے اسی طرح اس قرض والے مسئلہ میں بھی وجہ حرمت کا تحقق عقد کے وقت نہیں، بلکہ وقت مقررہ کے بعد ہوتا ہے، اس لئے یہ شکل بہت حد تک تین دن سے زائد خیار نقد وغیرہ والے مسائل کے مشابہ ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خیار نقد وغیرہ کے حکم سے متعلق مختصر سی گفتگو کی جائے۔

خیار نقد کا حکم:

جب وجہ فساد عقد کے ساتھ متحقق نہ ہو، بلکہ اس کا وجود وقت مقرر کے بعد ہونے کا امکان ہو تو ایسی صورت میں وجہ فساد پر مشتمل عقد کو انجام دینے کے جواز وعدم جواز میں اختلاف ہے، چنانچہ مشائخ عراق اس طرح کے عقد کو انجام دینے کی حرمت کے قائل ہیں اگر چہ وجہ فساد کا تحقق وقت مقرر کے بعد ہو۔ کیونکہ جب عقد شرط فاسد پر مشتمل ہے تو اس کا ظاہر اس شرط کو پورا کرنا اور انجام دینا ہے، لہٰذا یہ عقد فی الحال فاسد ہوگا اور اس کا انجام دینا شرعاً جائز نہ ہوگا اسی کو ظاہر الروایۃ بھی کہا گیا ہے اور اس کے برعکس مشائخ خراسان، اور مشائخ ماوراء النہر، امام سرخسی، علامہ ابن ہمام، فخر الاسلام، علامہ کرخی وغیرہ فرماتے ہیں کہ جب وجہ فساد عقد کے ساتھ متحقق وموجود نہیں، بلکہ وقت مقررہ کے بعد اس کا امکان ہے تو فی الحال عقد موقوف ہوگا اور

اس کو انجام دینا عقد فاسد کو انجام دینا نہیں ہوگا، اس لئے اس کی انجام دہی جائز ہوگی اور وقت مقررہ سے قبل اگر وجہ فساد ختم ہو جائے تو عقد صحیح اور نافذ ہو جائے گا اور اگر وقت مقررہ کے بعد وجہ فساد کا تحقق ہو جائے تو اس وقت عقد فاسد ہوگا۔

''ثم اختلفوا فی حکم هذا العقد فی الابتداء، فعند مشائخ العراق حکمه الفساد ظاهرًا، إذ الظاهر دوامهما علی الشرط، فإذا أسقطه تبین خلاف الظاهر، فینقلب صحیحًا، وقال مشائخ خراسان، والإمام السرخسی، وفخر الإسلام وغیرهما من مشائخ ما وراء النهر: هو موقوف وبالإسقاط قبل الرابع ینعقد صحیحًا، وإذا مضی جزء من الرابع فسد العقد الآن وهو الوجه، کذا فی الظهیریة والذخیرة، ولکن الأول ظاهر الروایة.... فائدة الخلاف تظهر فی حرمة المباشرة وعدمها، فتحرم علی الأول لا علی الثانی''، نهر (شامی ۷/ ۱۱۴)۔

اور علامہ ابن ہمام کی رائے تو یہ ہے کہ دونوں قولوں (مشائخ عراق، مشائخ خراسان) کے مطابق حقیقت میں فساد وقت مقررہ کے بعد ہی ظاہر ہوگا، وقت مقررہ سے پہلے حقیقی فاسد ظاہر ہی نہیں ہو سکتا، لہٰذا حقیقت میں یہ عقد موقوف ہی رہے گا، ابن ہمام کی تحقیق کے مطابق جب فساد عقد کے ساتھ نہ ہو، بلکہ وقت مقررہ کے بعد اس کا تحقق ہو تو اس کو انجام دینا جائز ہونا چاہئے۔

''ولا یخفی أنه لا معنی للفساد بحسب الظاهر دون الباطن، إلا عدم الفساد فی نفس الأمر إلی أن یدخل الرابع، فیثبت الفساد فی نفس الأمر، فحقیقة القولین لا فساد قبل الرابع، بل موقوف'' (فتح القدیر ۶/ ۲۸۱)۔

علامہ ابن ہمام کی تائید درج ذیل اصول سے:

(۱) جب کوئی چیز کسی شرط پر معلق ہو تو وجود شرط سے قبل وہ چیز کالعدم ہوتی ہے شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہوتا، لہٰذا جب فساد اور حرمت کسی زمانہ اور وقت پر معلق ہو تو اس وقت سے پہلے فساد اور حرمت کالعدم ہوگا۔

''المعلق بالشرط یجب ثبوته عند ثبوت الشرط، ویکون معدومًا قبل ثبوت شرطه، یعنی أن الشئی المعلق علی شرط یکون معدومًا قبل ثبوت الشرط الذی علق علیه'' (شرح المجله لعلی حیدر ۱/ ۷۲، الماده: ۸۲)۔

(۲) اگر کوئی شخص اپنے نفع کے لئے لگائے لیکن اس شرط کو پوری کرنے اور اس شرط کو ختم کرنے کا اختیار دوسرے کو ہو تو من له الشرط وہ شخص ہوگا جس کو پوری کرنے اور ختم کرنے کا اختیار ہے، مثلاً خیار نقد (إن لم ینقد الثمن إلی ثلاثة أیام أو إلی أربعة أیام فلا بیع) میں شرط بائع اپنے فائدہ کے لئے لگاتا ہے، لیکن اس میں وقت مقررہ سے پہلے ثمن ادا کر کے بیع کو نافذ کرنے اور وقت مقررہ پر ثمن ادا نہ کر کے بیع کو فاسد کرنے کا اختیار مشتری کو ہے، اس لئے اس صورت میں من له الخیار مشتری ہوگا بائع نہیں۔

''ومقتضی هذه المادة إنه إذا عقد البیع بخیار النقد، فللمشتری دفع الثمن وإمضاء البیع وفسخ البیع وعدم دفع الثمن، فیکون الخیار ثابتًا للمشتری مع أن الغریب فی ذلك أن الذی ینتفع من الخیار'' (شرح المجله لعلی حیدر ۱/ ۲۶۱، شامی ۷/ ۱۱۷)۔

اسی طرح قرض کی مذکورہ صورت میں شرط قرض دہندہ کی طرف سے لگائی جاتی ہے، لیکن قرض لینے والے کو وقت مقررہ سے پہلے قرض ادا کر کے اس شرط کو ختم کرنے اور وقت مقررہ پر ادائیگی نہ کر کے شرط کو باقی رکھنے کا اختیار ہوتا ہے، اس لئے اس میں من له الشرط قرض لینے والا قرار پائے گا۔

(۳) اگر من له الشرط شرط فاسد کے وجود اور تحقق سے قبل شرط فاسد کو ساقط کردے تو معاملہ صحیح ہو جاتا ہے۔

''صح شرطه إلی ثلاثة أیام أو أقل لا أکثر فیفسد غیر أنه یجوز أنه أجاز من له الخیار فی الثلاثة، فینقلب صحیحًا علی الظاهر'' (شامی ۷/ ۱۱۴)۔

مذکورہ بالا اصول میں سے نمبر (۱) سے معلوم ہوا کہ جب شرط معلق ہے تو وہ کالعدم ہونے کی وجہ سے معاملے کے لئے مفسد اور محرم نہ بنے گی، بلکہ فساد اور حرمت کا حکم شرط کے تحقق تک موقوف ہوگا اور جب من له الشرط کی جانب سے وقت مقررہ پر ادائیگی ہو جائے تو شرط محرم کا وجود سے قبل اسقاط

وابطال ہوجائے گا اور شرط کے باطل ہوجانے کی وجہ سے معاملہ صحیح ہوجائے گا نتیجہ سب کا یہ نکلا کہ شروط فاسدہ معلقہ کے ساتھ عقد کرنا فی نفسہ جائز ہے، لیکن اگر شروط فاسدہ معلقہ کو باطل نہ کیا گیا تو اس وقت اس معاملے پر حرمت کا حکم عائد ہوگا ابتداء عقد حرمت وفساد سے خالی ہوگا اور ابن ہمام کا بھی یہی مسلک معلوم ہوتا ہے، جس کی تائید مذکورہ بالا اصول سے بالکل ظاہر وباہر ہے۔

شکل (۳) کا حکم:

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ جب وقت مقرر پر قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں زائد رقم کے ادائیگی کی شرط ہو تو اس صورت میں مذکورہ شرط کے ساتھ اس نیت سے قرض حاصل کرنا کہ قرض وقت مقرر پر ادا کردیا جائے گا اور اس کے ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو تو اس طرح سے قرض کے جواز وعدم جواز میں علماء کا اختلاف ہے جو لوگ شرط معلق کو وقت مقرر سے پہلے معدوم مانیں گے ان کے نزدیک وقت مقررہ پر ادائیگی کی نیت اور اس کے اہتمام کے ساتھ قرض حاصل کرنا جائز ہوگا اور جو لوگ قرض میں مذکور شرط کو موجود مانتے ہیں ان کے نزدیک قرض کا حصول جائز نہ ہوگا۔

اور اختلاف رکھنے والے فقہاء خواہ وہ جواز کے قائلین ہوں یا عدم جواز کے ان کا شمار اجلۂ علماء میں ہے اس لئے کسی ایک کو بالکلیہ لغو کالعدم نہیں قرار دیا جاسکتا، البتہ عدم جواز والا قول ظاہر الروایہ کی طرف منسوب ہے، اس لئے عام حالات ترجیح عدم جواز کو ہوگی، لیکن جب کوئی ضرورت داعی ہو خصوصاً اس طرح کے معاملات کا رواج پذیر ہونا اور اس سے تحرز میں حرج وتنگی ہو تو اس وقت جواز والے قول کو ترجیح ہوگی، لہٰذا جواز والا قول اوسع اور عدم جواز والا قول احوط ہوگا ضرورت کے وقت جواز کو اور بلا ضرورت عدم جواز کو ترجیح ہوگی۔

حاصل:

قرض کی مذکورہ شکل میں اگر قرض لینے کی ضرورت ہو اور بغیر شرط کے قرض حاصل نہ ہو اور شرط کے ساتھ قرض نہ لینے کی صورت میں حرج وتنگی ہو یا کاروباری نقصان ومشکلات ہوں تو اس وقت زیادتی کی شرط کے ساتھ اس نیت سے قرض لینا جائز ہوگا کہ قرض کو وقت مقررہ پر ادا کردیا جائے گا اور اس نیت کے ساتھ ساتھ ادائیگی کا اہتمام بھی ہو، لہٰذا ادائیگی میں بلا کسی سخت مجبوری کے کوتاہی کرنا یا بلا ضرورت وحاجت کے صرف تن آسانیوں کے لئے اس طرح کا قرض حاصل کرنا شرعاً جائز نہ ہوگا۔

سوال نمبر (۴) کا جواب:

سودی قرض پر لیے جانے والی معمولی نفع جو رائج سود کے مقابل میں بہت ہی کم ہو اس کو سروس چارج میں داخل ہونے اور نہ ہونے کے سلسلہ میں فقیہ ہند حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں کہ سرکاری قرضہ جات میں جس کا اصل مقصد خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا، بلکہ ملک کا افلاس دور کرنا مقصود ہوتا ہے اور سود کے نام پر جس قدر نفع لیا جاتا ہو بہت معمولی ہوتا ہے بعض علماء کے نزدیک اس میں مزید سہولت ہے ان کے نزدیک عام حالات میں بھی ایسے قرض لینے کی گنجائش ہے گو کہ اس کو سود کا نام دے دیا گیا ہے، مگر اس کو اس شعبہ کے ملازمین اور عملہ کی اجرت پر بھی محمول کرسکتے ہیں، چنانچہ مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند لکھتے ہیں کہ:

"اس معاملہ کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کار کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت میں لی جاتی ہے جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے"۔

(جدید فقہی مسائل ۱/۲۱۷)۔

چونکہ حضرت مولانا نے اپنی اس رائے میں مدار مفتی دار العلوم حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ کے فتوے پر رکھا ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کو نقل کرکے پھر اپنی رائے ظاہر کی جائے، چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ سوال (۵۶) (ترقیاتی منصوبوں میں شرکت کا حکم) کے جواب (۲) کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ "حکومت سے کارخانہ قائم کرنے یا باغ لگانے یا کاشت وغیرہ کرنے یا درست رکھنے کے لئے حکومت سے جو اعانتیں لی جاتی ہیں یا جو قرض وغیرہ لیے جاتے ہیں ان کی کچھ نوعیت اس طرح ہوتی ہے کہ ان سب کا سود یا سودی لین دین ہونا لازم نہیں بلکہ بعض صورتیں غیر سودی اور بعض معاملے امدادی اور محض از قبیل اعانت بھی شمار ہوسکتے ہیں اس کے ہر لین دین

کوسودی یا سود کے شرط پر قرض لینا یا سودی معاملہ ہونا نہیں کہہ سکتے، بلکہ بعض صورتیں بالکل جائز ہوں گی اور بعض ناجائز اور سودی بھی ہوں گی توضیح کے لئے بعض صورتیں ذرا تفصیل سے بیان کردی جاتی ہیں، مثلاً:

(الف) اگر محض نقد روپیہ بطور قرض کے لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے یا سامان وغیرہ کے ساتھ ہی نقد بھی لیا جائے مگر نقد کی یہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے بہت زیادہ اور فاضل ہو اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے اور واپسی کی کل رقم کل رقم یا فقٹی سے زائد ہو جائے تو سود کی تعریف ”ھو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدین فی عقود المعاوضة“ صادق آجائے گی اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض معاوضہ کا ہوگا، اس لئے وہ نفع کم ہو یا زیادہ سود ہی کا ہوگا اور ”کل قرض جر نفعا فھو ربوا“ بھی صادق آجائے گا اور حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا۔

(ب) جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جاتی ہے اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لئے اعانت میں داخل کر کے اس معاملے کو غیر سودی معاملہ ہونے کا حکم لگائیں گے اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے بلکہ انتظامات کی درستگی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جاسکے گا اور اس صورت میں یہ معاملہ جائز رہے گا۔

اور جواب (۳، ۴) کے تحت لکھتے ہیں کہ سود کا ایک شرعی مفہوم ہے اور اسی مفہوم کے اعتبار سے سود کی حرمت منصوص ہے اور بغیر قید کسی ملک و مذہب اور بغیر قید کسی زمانہ یا افراد زمانہ کے مطلقاً منصوص ہے اور اس کے مرتکب تو درکنار اس میں کسی حیثیت سے شرکت کرنے والے اور معاونین پر بھی طرح طرح کی وعیدیں و لعنتیں وارد ہیں...... اور جس معاملہ پر سودی معاملہ ہونا صادق آجائے گا وہ چیز یا وہ معاملہ خواہ ہندوستان میں ہو یا کسی اور ملک میں ہو، مسلمانوں کے ساتھ ہو یا غیر مسلموں کے ساتھ ہو سب حرام و ناجائز رہے گا اور اس کا لینا دینا بھی کچھ بھی درست نہیں رہے گا۔

اور جواب (۵) کے تحت رقمطراز ہیں کہ ”بینک کا ابتدائی دور ایسا ضرور تھا کہ اس کا پورا کاروبار محض سود ہی پر ہوتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہے اس کے اصول و مقاصد میں اور طریقہ کار میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں، اب تو بہت سے بینکوں میں مختلف نوع کو مستقل کاروبار تجارتی اصول پر ہونے لگے ہیں، بہت سے بینک شرکت اور مضاربت کے اصول پر چلنے لگے ہیں جیسا کہ خود سوال کے بعض جملوں سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے پس جن کاروبار میں مطالبات کی ادائیگی بینک کے چیک کے ذریعہ ہوتی ہے یا جن ملازموں کی تنخواہیں بینک کے چیک کے ذریعہ برآمد ہوتی ہیں اس میں اگر بینک اپنے لئے بھی کوئی رقم وصول کرے تو اس کا سود ہونا ہی ضروری نہ ہوگا بلکہ وہ بینک کا محنتانہ بھی کہا جاسکتا ہے بینک کو ذریعہ یا درمیانی واسطہ قرار دے کر اس رقم کو بینک کی اجرت یا عوض کارکردگی بھی کہا جاسکتا ہے، اس لئے اب ہر بینک کا ایک ہی حکم باقی نہیں رہے گا، بلکہ ہر بینک کے اصول و ضوابط و طریقہ کار وہ معاملات کے اعتبار سے الگ الگ حکم رہے گا اور پھر جب بینک کے علاوہ دیگر ذرائع سے سرمایہ کی حفاظت دشوار یا پریشان کن ہو تو بوجہ احتیاج و مجبوری اس مسلمہ سودی بینک میں جو ابتدائی دور میں تھے رقوم کے محفوظ رکھنے کا جواز محققین علماء و فقہاء آج سے بہت پہلے بتلا چکے ہیں تو اب بینکوں میں جن میں محض سودی کاروبار ہونا متیقن نہیں ہے محفوظ رکھنے کی بدرجہ اولی اجازت ہوگی۔

اور سوال (۵۷) (محکمہ اقتصادیات سے مدد لینے کی بعض صورتوں کا حکم شرعی) کے جواب کے تحت بھی حضرت مفتی صاحبؒ نے تقریباً انہیں باتوں کو ذکر کیا ہے البتہ ”امداد الفتاوی“ کے حوالے سے اس کی نظیر میں آرڈر والے مسئلہ کو پیش کیا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں: ”اس کی توجیہ قریب قریب ایسی ہی ہوگی جو اس رقم میں کی جاتی ہے جس کو حکومت اپنے ملازمین کو ملازمت ختم کرنے کے وقت اگرچہ سود کے نام پر دیتی ہے، مگر ہمارے فقہاء محققین اس کو سود نہیں کہتے، بلکہ انعام کہتے ہیں اور اس کو جائز فرماتے ہیں کما فی امداد الفتاوی۔

اور نیز یہ توجیہ ایسی ہوگی جیسے منی آرڈر کے فیس میں کی جاتی ہے فیس اجرت کتابت اجرت روانگی فارم کہا جاتا ہے۔ کما قال بہ العلامۃ التھانوی فی حادث الفتاوی (ایک طویل سلسلہ کلام میں فرماتے ہیں) البتہ بہت عرق ریزی سے اس قدر تاویل کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ فیس (منی آرڈر) کو اجرت کتابت اور روانگی فارم کہا جاوے اس سے اس کی حرمت تفاضل تو رفع ہو جائے گی۔ مگر کراہت سفتجہ باقی رہے گی (امداد الفتاوی ۳/۱۰۶)۔

ایضاً ثم قال فی مقال آخر اور معاملہ پیش نظر میں جب اشکال حرمت تفاضل کا ختم ہوگیا تو اباحت اصلیہ لوٹ آئے گی، وھو المراد۔ پھر اسی ”امداد الفتاوی“ (۳/۱۰۸) میں فرماتے ہیں: البتہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت و روانگی فارم کی کہہ کر حرمت تفاضل کو رفع کیا جاسکتا ہے لیکن کراہت سفتجہ

کے رفع کی کوئی وجہ خیال میں نہیں آئی گو ابتلاء عام کی وجہ سے دل ضرور چاہتا ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ نکل آئے (الی قولہ) حتی کہ اگر یہ بھی نقل صحیح سے مل جائے کہ سفتجہ کے جواز کی طرف ائمہ اربعہ میں سے کوئی امام گئے ہیں تب بھی بضرورت اس پر عمل کرنے کو کہا جائے گا (ثم قال فیہ ۳/ ۱۰۸) منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے ایک قرض سے جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرے اجارہ سے جو فارم لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دی جاتی ہے اور دونوں معاملے جائز ہیں پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے اور چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے اس لئے یہ تاویل کر کے جواز کا فتوی مناسب ہے (انتہی بلفظہ) امداد الفتاوی کی ان مجموعی عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے معاملات میں جب ابتلاء عام ہو جائے یا ضرورت صحیحہ داعی ہو جائے تو حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے ''مہما یمکن توجیہ'' جواز تلاش کرنا امر مستحسن ہے، نیز ''عالمگیری کتاب الحیل'' کی عبارت سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے حل و توجیہات کا مدار ابتلاء عام اور ضرورت صحیحہ معتبرہ پر ہے اور سوالنامہ سے بھی ان دونوں چیزوں کا وجود مترشح ضرور ہوتا ہے اس لئے یہ توضیح مستحسن بھی ہو سکتی ہے خاص کر ایسے ملکوں میں جہاں اقتدار اعلی غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو وہاں یہ توجیہ اور بھی آسان ہوگی۔

''علی ما فصل المحققون من الفقہاء بالتفصیل التام'' (منتخب نظام الفتاوی ا/ ۲۶۴ تا ۲۶۶)۔

مذکورہ فتوی کی چند قابل غور باتیں:

(۱) حضرت مفتی صاحب نے ایک بات یہ تحریر فرمائی ہے کہ اگر بینک قرض میں صرف پیسہ دے اور اس پر کچھ اضافہ کر کے اصول کرے تو یہ سود میں داخل ہو کر حرام و ناجائز ہے۔

(۲) بینک اگر ساز و سامان دے اور پیسہ بالکل نہ دے یا پیسہ دے، لیکن وہ بہت معمولی ہو جو سامان کے تابع ہو جائے پھر بینک معمولی اضافہ کے ساتھ وصول کرے تو یہ اضافہ حق الخدمت سروس چارج میں داخل ہو سکتا ہے۔

(۳) تیسری بات سروس چارج کی نظر میں امداد الفتاوی سے منی آرڈر والا مسئلہ ذکر کیا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں باتوں کو سامنے رکھ کر اگر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بینک اگر رقم کی شکل میں قرض دے تو اس پر جا ہے جتنا معمولی نفع لے یہ سود میں داخل ہوگا اس کو سروس چارج اور حق الخدمت پر محمول کرنا ممکن نہیں جس کی تائید مفتی صاحب کے ایک دوسرے فتوی سے بھی ہوتی ہے، حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ''سوال: ادارہ کے انتظامی مصارف اور اخراجات کے لئے قرض لینے والوں سے اجرت الخدمت وصول کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ جواب: قرض دینے سے قبل تبل وہ دونوں فارموں کی قیمت جن کا ذکر معاملہ ۲، ۴، ۶ میں گزر چکا ہے احقر کی تحریر کردہ ضابطے کے مطابق لے سکتے ہیں ورنہ نہیں (الف تا د) کے مناسب قیمت و اخراجات کے ساتھ حسب قید مذکور جائز رہے گا اور اس کا نام اجرۃ الخدمت رکھا جائے یا کچھ بھی رکھا جائے درست رہے گا باقی قرض دیدینے کے بعد کوئی رقم مستقرض سے لینا درست نہ رہے گا، بلکہ ''کل قرض نفعًا'' میں داخل ہو کر شرعاً ممنوع رہے گا'' (منتخب نظام الفتاوی ۳/ ۱۶۰)۔

البتہ اگر بینک سامان فراہم کرے تو سروس چارج اور حق الخدمت والی تاویل اس طرح سے ہوگی کہ بینک کو قرض وصول کرنے والے کا سامان کی خریداری کا وکیل مان لیا جائے گا اور وکیل کے لئے اجرت لینا جائز ہے جس طرح کی منی آرڈر میں ڈاک خانہ کو فارم پری اور ترسیل وغیرہ کا وکیل مان کر کے اجرت کے جواز کی شکل نکالی گئی ہے، تفصیل مذکور سے یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ حضرت مفتی صاحب کے فتوی سے بینک کے معمولی اضافہ والی رقم کو سروس چارج پر محمول کر کے جواز کا حکم لگانے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی ہے، البتہ اگر بینک سامان فراہم کرے تو اس وقت کچھ تاویل وغیرہ کی گنجائش نظر آتی ہے و بس۔

سروس چارج کے سلسلہ میں دیگر علماء کی آراء:

(۱) محقق عصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کا سروس چارج کے سلسلہ میں ایک تفصیلی کلام فقہی مقالات (ا/ ۲۶۹ تا ۲۷۷) پر موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرض جاری کرنے اور اس کا حساب و کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں بینک کے لئے اپنے قرض داروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے، جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش

آئے ہیں، البتہ اگر پوری احتیاط کے ساتھ ان اخراجات کی تحدید ممکن ہو تو یہ صورت احکام شریعت کے زیادہ موافق اور مناسب ہوگی اور اس کے جواز میں کوئی کلام نہ ہوگا اور اگر ہر منصوبہ کے علاحدہ علاحدہ اخراجات کی تحدید ممکن نہ ہو تو اس صورت میں بینک کے لئے ان سے واقعی اخراجات طلب کرنے کے بجائے قرض جاری کرنے سے پہلے اور بعد میں کی جانے والی دفتری کارروائی کی اجرت وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اجرت اس قسم کے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو، اس لئے قرض دینے کا عمل بذات خود ایک ایسا عمل ہے جس پر نفع کا مطالبہ کرنا یا اجرت کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز نہیں، لہٰذا قرض جاری کرنے پر آنے والے مصارف کو اندازے سے لم سم وصول کرنا جائز نہیں، لیکن اس قرضے کے اجراء پر پیش آنے والے حقیقی دفتری اخراجات کا بلا معاوضہ ہونا شرعاً کوئی ضروری نہیں، البتہ بینک کے لئے قرض لینے والوں سے قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے اجرت وصول کرنے کی گنجائش ہے جو قرض جاری کرنے پر آنے والے دفتری اخراجات کو پورا کر سکے، بشرطیکہ اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جائے ایک یہ کہ یہ اجرت اس جیسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل کے برابر ہو، دوسرے یہ کہ اس اجرت کی وصولی کو قرض پر حصول نفع کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنالیا جائے، اس مسئلہ کی نظیر وہ مسئلہ ہے جو فقہاء نے بیان فرمایا ہے کہ قاضی اور مفتی کے لئے فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر مدعی اور مستفتی سے اجرت طلب کرنا جائز نہیں، لیکن مفتی کے لئے فتوی تحریر میں لانے اور قاضی کے لئے دستاویزات لکھنے اور رجسٹر میں اندراجات کرنے کی اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ یہ اجرت ایسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو اور بشرطیکہ اس کو نفس فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر اجرت لینے کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنایا جائے، اور اجرت مثل ہمیشہ کام کرنے کی اس مشقت کے بقدر ہونا ضروری نہیں ہے جو عامل نے برداشت کی ہے بلکہ بعض اوقات اس میں کام کی نوعیت اور اس کی معنوی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا ہے اور بعض اوقات مستاجر کو حاصل ہونے والے نفع کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے اسی لئے بعض اوقات معمولی مشقت کے کام پر زیادہ اجرت دی جاتی ہے اور بعض اوقات زیادہ مشقت کے کام پر تھوڑی اجرت دی جاتی ہے لہٰذا دلالی کے کمیشن پر قیاس کرتے ہوئے زیر بحث مسئلے میں قرض کے اجراء پر آنے والے دفتری اخراجات کو قرض کی مقدار پر فیصد کے لحاظ سے مقرر کرنے کو جائز قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ دونوں کے درمیان مابہ الفرق کوئی چیز نہیں ہے، البتہ فیصد کے اعتبار سے وصول کئے جانے والے اخراجات کی مقدار بہت معمولی ہونی چاہئے تا کہ واقعتاً اس کے سروس چارج ہونے میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اور یہ سروس چارج اجرت مثل سے زیادہ وصول کرنا کسی حال میں جائز نہیں ورنہ کل قرض جر نفعا کے تحت داخل ہو کر یقینی طور پر حرام ہو جائے گا فیصد کے اعتبار سے اتنا سروس چارج وصول کرنا جائز تو ہے جو اجرت مثل سے تجاوز نہ کرے، لیکن اجرت مثل سے زیادہ ہونے کا احتمال پھر بھی باقی رہتا ہے، اور اس کا بھی احتمال موجود ہے کہیں سروس چارج کو سود وصول کرنے کے لئے ایک آلہ کار نہ بنالیا جائے، اس لئے اسلامی بینک کو چاہئے کہ وہ یہ طریقہ اختیار کریں کہ پہلے ایک سال میں قرضوں کے اجراء پر جتنے دفتری اخراجات آئیں، ان کا مجموعہ نکال لیں اور اس کو ایک سال میں کئے گئے تمام قرضوں پر تقسیم کر دیں، اس طرح ان قرضوں کے اجراء پر آنے والے اخراجات کا فیصد کے حساب سے تعین ہو جائے گا، اور پھر وہ اخراجات تمام قرضہ داروں سے ان کے قرض کی مقدار کے لحاظ سے بطور سروس چارج کے وصول کرے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے ہر ہر قرض پر آنے والے اخراجات کا علاحدہ حساب نہیں کرنا پڑے گا۔ (فقہی مقالات ملخصا ۱/ ۲۶۹ تا ۲۷۷)۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ کی رائے:

قرض حسن پر سروس چارج وصول کرنے کے لئے اس بات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا کہ سروس چارج کی مقدار واقعی اجرت مثل کی نمائندگی کرتی ہو محض حیلہ نہ ہو۔

ضروری نوٹ:۔ اس نظام کی نگرانی کے لئے "رقابہ شرعیہ" کا شعبہ قائم کرنا ناگزیر ہے اس کے بغیر شرعی حدود کی رعایت نہیں ہو سکے گی (احسن الفتاوی ۷/ ۱۲۴)۔

سروس چارج سے متعلق شبہات اور ان کا ازالہ:

سروس چارج کا جواز شبہات سے خالی نہیں کیونکہ شریعت مطہرہ میں قرض کے دباؤ میں مقروض سے ہر قسم کے چھوٹے بڑے نفع کے حصول سے منع کیا گیا ہے۔

"لا یحل له أن ینتفع بشئی منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراہن؛ لأنه أذن له فی الربا؛ لأنه یستوفی

دينه كاملًا، فتبقى له المنفعة فضلًا، فيكون ربا (لو هٰذا أمر عظيم) (شامی بحوالہ امداد الفتاوی ۳/ ۴۵۴)۔

چنانچہ کتب فقہیہ میں سفتجہ کی کراہت مصرح ہے جس میں قرض دہندہ کو کوئی مالی نفع نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو صرف راستے کے خطرے سے حفاظت کا نفع حاصل ہوتا ہے اس کے باوجود اس کی کراہت مصرح ہے۔

''وكرهت السفتجة، وهي إقراض لسقوط خطر الطريق'' (شامی ۸/ ۱۷)۔

''ولا يجوز أن يقرضه دراهم على أن يعطيه بدلها في بلد آخر... الخ'' (شرح المهذب ۱۳/ ۱۷۲)۔

نیز اس باب میں امام صاحب کا احتیاط بے مثال ہے کہ وہ مقروض کے دیوار سے سایہ کا نفع بھی حاصل نہ کرتے تھے۔

''كان أبو حنيفة لا يجلس في ظل شجرة غريمه، ويقول: كل قرض جر منفعةً فهو ربا'' (عقود الجمان في مناقب النعمان / ۲۴۴)۔

شریعت کی تعلیمات مذکورہ اور امام صاحب کے اس احتیاط کی بنا پر سروس چارج کے جواز میں شبہ بہر حال پیدا ہوتا ہے ان شبہات کے ازالہ کے لئے اگر درج ذیل تاویلات پیش نظر رکھی جائیں تو کچھ حد تک اطمینان اور رفع خلجان ہو جائے گا۔

ازالہ شبہات:

بینک کے سروس چارج پر شبہ کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بینک جو کچھ لکھتا پڑھتا اور کارڈ رکھتا ہے اس کا یہ عمل خود اپنے لئے ہے، کیونکہ ریکارڈ رکھنے کا شرعاً وہ خود پابند ہے، لہٰذا اس کا چارج قرض لینے والے سے حاصل کرنا بلا عوض اور بلا عمل ہوگا، لہٰذا ربا اور شبہ ربا سے تو خالی نہیں اس شبہ کو درج ذیل تاویلات وتوجہات سے دفع کیا جا سکتا ہے:

(۱) قرض کے ریکارڈ کی شرعی ذمہ داری جس طرح قرض دہندہ پر ہے اسی طرح مقروض پر بھی ہے، لیکن موجودہ وقت میں مقروض بینک کے قرض کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھتا ہے، بلکہ بینک ہی کے ریکارڈ پر وہ بھی اکتفا کرتا ہے، لہٰذا بینک کو ریکارڈ رکھنے میں مقروض کا وکیل عرفاً مانا جا سکتا ہے تو جب بینک کا وکیل ہو گیا تو اس کے لئے اجرت وصول کرنے کا جواز حاصل ہو گیا۔

(۲) بینک قرض جاری کرتے وقت پاس بک وغیرہ بھی دیتا ہے اور اس میں ریکارڈ کا اندراج بھی کرتا ہے اور اس کا یہ عمل بہر حال مقروض کے لئے ہوتا ہے، لہٰذا اس تاویل سے اس کے لئے سروس چارج وصول کرنے کی اجازت کا راستہ نکل آتا ہے چنانچہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: کہ بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد بینک بہت سی خدمات انجام دیتا ہے جس میں چیک بک جاری کرنا، ڈراف بنانا، رقمیں ایک اکاؤنٹ سے دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کرنا وغیرہ ان تمام کاموں کی فیسیں اور اخراجات خالص انتظامی نوعیت کی ہیں اکاؤنٹ ہولڈر سے وصول کی جاتی ہیں۔

(۳) قرض والی اسکیم اگر سرکاری ہو اور وہ قرض بینک کے واسطے سے ملے تو اس صورت میں بینک قرض خواہ کی طرف سے قرض حاصل کرنے میں وکیل ہوگا اور بینک کا تمام عمل وکالت کی بنیاد پر ہوگا، لہٰذا اس کے لئے اپنے عمل کی اجرت لینا جائز ہوگا۔

خلاصہ:

بینک کے سروس چارج وصول کرنے پر جو شبہات وارد ہوتے ہیں وہ مذکورہ بالا تاویلات سے بآسانی دور کئے جا سکتے ہیں لہٰذا سروس چارج وصول کرنا فی نفسہ جائز ہے اور سروس چارج ایک اجرت ہے، لہٰذا اس کا متعین ہونا ضروری ہے، خواہ تعیین فیصد ہی کے اعتبار سے کیوں نہ ہو۔

صورت مسئولہ کا جواب:

سرکاری قرضے اگر بینک کے واسطے سے جاری کئے جائیں یا کسی اور محکمہ کے واسطے سے اور اس قرض پر جو اضافہ وصول کیا جائے اگر وہ رائج سود کی مقدار سے بہت کم ہو تو اس اضافہ کو سروس چارج کے زمرے میں رکھ کر قرض حاصل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور اس اضافہ کو سود کا نام

دیئے جانے سے سود نہیں ہوگا (شرح وقایہ ۱ / ۲۲۸، امداد الفتاوی ۳ / ۱۴۸) کیونکہ نام رکھنے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدلا کرتی ہے اور سود کی رائج مقدار سے بہت کم ہونے کی بنا پر عرفاً ودلالۃً سود سے خارج ہوکر اجرت میں داخل ہورہی ہے اور شریعت میں عرف ودلالت کا اعتبار ہے۔

''هذا بمنزلة الشرط؛ لأن المعروف كالمشروط'' (شامی بحوالہ امداد الفتاوی ۵/ ۳۱۰، ۳/ ۴۵۴)۔

حاصل یہ ہے کہ سرکاری قرضہ پر جو اضافہ وصول کیا جاتا ہے اگر وہ اتنا معمولی ہو کہ سود کی رائج مقدار سے بہت کم ہو اور سروس چارج کی مقدار کے مناسب ہو تو عرف ودلالت کی بنا پر اس کو سروس چارج پر محمول کرنے کی گنجائش ہے۔

سوال نمبر (۵) کا جواب:

قرض سے زائد وصول کی جانے والی رقم اگر معمولی نہ ہو، بلکہ اتنی زیادہ ہو کہ اس کو سروس چارج پر محمول کرنا ممکن نہ ہو تو یہ شرعاً سود ہے اور سودی قرض لینا عام حالات میں جائز نہیں، البتہ ضرورت وحاجت کے وقت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے (ضرورت وحاجت کی تفصیل اور اس کے اقسام سے متعلق تفصیلات کے لئے دیکھئے: کتاب المقاصد النوع الاول، الموافقات للشاطبی ۲ / ۸، شرح الاشباہ للحموی ۱ / ۲۵۲، رسائل ابن عابدینؒ / ۱۱۱۔ ۱۱۲)۔

رشوت کا حکم:

حضرات فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جس طرح رشوت کا لینا حرام ہے اسی طرح رشوت کا دینا بھی حرام ہے، لیکن بہت سے مواقع میں حضرات فقہاء رشوت دینے کو جائز اور لینے کو حرام کہتے ہیں، چنانچہ رشوت کی کل چار قسمیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) لینا دینا دونوں حرام مثلاً منصب قضاء کے حصول کے لئے رشوت دینا تو اس صورت میں رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام ہے۔

(۲) اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لئے رشوت دینا اس صورت میں بھی دونوں حرام ہے۔

(۳) جان ومال کی حفاظت کے لئے رشوت دینا اس صورت میں دینا جائز لینا حرام ہے۔

(۴) بادشاہ وغیرہ کے یہاں کسی کام کے کرنے مثلاً سفارش وغیرہ۔ کے لئے اس صورت میں دینا جائز ہے لینا حرام ہے۔

''في الفتح: ثم الرشوة أربعة أقسام، منها: ما هو حرام على الآخذ والمعطي، وهو الرشوة على تقليد القضاء والإمارة، الثاني: ارتشاء القاضي ليحكم، وهو كذلك، ولو القضاء بحق، لأنه واجب عليه . الثالث: أخذ المال ليسوى أمر عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع، وهو حرام على الآخذ فقط. والرابع: ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله حلال للدافع حرام للآخذ'' (شامی عن الفتح. رسائل ابن نجیم عن قاضی خاں ۸/ ۳۴)۔

(۱) حکومت سے قضا یا اس جیسا کوئی منصب حاصل کرنے کے لئے، (۲) حاکم سے کوئی فیصلہ کروانے کے لئے، (۳) اعانت علی الظلم کے لئے، ان تینوں صورتوں میں رشوت لینا بھی حرام اور دینا بھی، (۴) جس سے ضرر کا اندیشہ ہو اسے رشوت دینا جائز ہے اس کے لئے لینا حرام ہے، (۵) دفع مضرت یا جلب منفعت کے لئے درمیان میں واسطہ بننے والے، یعنی صرف سفارش کرنے والے کو رشوت دینا جائز ہے، آخذ کے لئے لینا جائز نہیں (احسن الفتاوی ملخصاً ۸ / ۹۷)۔

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے رشوت دینا جائز ہے اور رشوت کے مثل سود بھی ہے لہٰذا دفع مضرت کے لئے سود دینے میں کوئی حرج نہیں، البتہ جلب منفعت کے لئے سود دینا محل نظر ہوگا۔

جزئیات متعلقہ (۵) کے جوابات

(۱) مکان کے لئے سودی قرض لینے کا حکم:

مکان انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے اگر کوئی شخص خود مکان حاصل کرنے سے عاجز ہو تو اس ضرورت کو پوری کرنے کی ذمہ داری حکومت کے ذمہ ہے، چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: اسلامی حکومت کی ذمہ داری میں یہ داخل ہے کہ وہ عوام سے کسی نفع کا مطالبہ کئے بغیر ان کی بنیادی ضروریات پوری کرے اور وہ ضروریات ان کی فراہم کرے چونکہ مکان بھی ہر انسان کی بنیادی ضرورتوں میں داخل ہے، اس لئے ہر انسان کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے مالی وسائل کی حدود میں رہتے ہوئے اس بنیادی ضرورت کو حاصل کرے اور جس شخص کے مالی وسائل تنگ ہیں جس کی وجہ سے نہ تو وہ مکان خرید سکتا ہے اور نہ وہ اپنی جیب سے مکان تعمیر کر سکتا ہے تو اس صورت میں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے اس کی یہ ضرورت پوری کرے: نمبر ایک اگر وہ شخص مستحق زکوۃ ہے، پھر زکوۃ فنڈ سے اس کی مدد کرتے ہوئے اس کی ضرورت پوری کرے، دوسرے یہ کہ صرف واقعی اخراجات کی بنیاد پر اس کو مکان فراہم کرے اور اس پر کسی نفع کا مطالبہ نہ کرے تیسرے یہ کہ حکومت اس شخص کو قرض حسنہ فراہم کرے جس پر اس سے کسی نفع یا سود کا مطالبہ نہ کرے (فقہی مقالات ۲/۲۲۱)۔

اور جب ہندوستان جیسے ممالک میں حکومت اسلامیہ موجود نہیں ہے اور نہ ہی ان کی کوئی ایسی تنظیم ہے جو اس طرح کی ضروریات میں معاون ہو تو یہ مجبوری ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اس قدر مجبور ولاچار ہو کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت کے بقدر مکان حاصل کرنے سے عاجز ہو اور سودی قرض کے علاوہ مکان حاصل کرنے کے لئے کوئی متبادل (زکوۃ، غیر سودی قرض، تبرع واحسان، اور ضرورت سے زائد زمین اور نقد سرمایہ وغیرہ) نہ ہو تو اس کے لئے بدرجہ مجبوری دفع مضرت کے لئے بقدر ضرورت سودی قرض لے کر مکان حاصل کرنے کی اجازت ہے۔

(۲) کاشتکاری، باغبانی کے لئے سودی قرض لینا عام حالات میں جائز نہیں، البتہ اگر اسی پر معاش کا مدار ہو اور بغیر سودی قرض کے اس کے نظم وانتظام سے عاجز ہو تو اس صورت میں بھی دفع مضرت کے تحت بدرجہ مجبوری سودی قرض لے کر اس کے نظم وانتظام کو درست کرنا جائز ہے بشرطیکہ دوسرا کوئی متبادل موجود نہ ہو۔

(۳) کاروباری ضرورت کے لئے سودی قرض لینا ناگزیر ہو مثلاً کوئی دوسرا معاشی انتظام نہ ہو اور کسی ایسے کاروبار کا تجربہ بھی نہ ہو جو بغیر سودی قرض کے چل سکے یا خاندانی وجاہت وغیرہ کی بنا پر کوئی دوسرا کام باعث ذلت وعار ہو اور غیر سودی قرض حاصل نہ ہو سکے اور دیگر کوئی متبادل بھی موجود نہ ہو تو اس صورت میں کاروباری ضرورت کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، کیونکہ آبرو کی حفاظت بھی مقاصد میں سے ہے۔

''العاجز عن الكسب كمن يلحقه العار بالتكسب'' (الدر ج ۵/ ۳۴۱)، ''أولا يحسن الكسب لحرفة أو لكونه من ذوي البيتوتات أي من أهل الشرف... إن الخليفة، بل من دونه في زماننا لو فعل كذلك لسقط من أعين رعيته فضلًا عن أعدائه وقد أثبت الشارع لولي المرأة فسخ النكاح لدفع العار عنه فحيث كان الكسب عارًا له، كما لو كان ابنًا أو أخًا للأمر أو لقاضي القضاة مثلًا تجب له النفقة عليه بشروطها'' (شامی ملخصًا ۵/ ۳۶۲-۳۶۳)۔

سوال نمبر (۶) کا جواب:

گورنمنٹ کی طرف سے مکان، بیت الخلاء، تعلیم، نیز دیگر ضروریات کے لئے دی جانے والی امداد جس کی واپسی نہیں ہوتی ہے اس کے حاصل کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ مصالح دینیہ کے خلاف نہ ہو،

''عن علي رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم إن كسرى أهدى له فقبل وإن الملوك أهدوا إليه فقبل

منهم. وعن عیاض بن حماد أنه أهدى للنبی صلی اللہ علیه وسلم هدية له ناقة فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم :أسلمت؟ فقال: لا، قال: فإني نهيت عن زبد المشركين'' (ترمذی باب ما جاء في قبول هدايا المشركين)۔

یہ دو متعارض روایتیں ہیں پہلی روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسری اور دوسرے بادشاہوں کے ہدایا قبول فرمائے ہیں اور دوسری روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ مشرکین کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ان دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ جس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کا ہدیہ قبول نہیں فرمایا وہ ابتدا کا واقعہ ہے اور کسری اور دوسرے بادشاہوں کے ہدایا قبول کرنے کا جو واقعہ ہے وہ بعد کا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اس کے لئے ناسخ ہے، یا دونوں حدیثوں کے مختلف حالتوں پر محمول کیا جائے گا اور یہ کہا جائے گا کہ جہاں کسی مشرک سے ہدیہ قبول کرنے کے نتیجے میں مسلمانوں کی کوئی مصلحت فوت ہو رہی ہو مثلاً یہ خیال ہو کہ مشرک ہدیہ دینے کے بعد اپنا رعب جمائیں گے، اور ہم سے اپنی بات منوانے کی کوشش کریں گے تو اس صورت میں ان کا ہدیہ قبول نہیں کرنا چاہئے، اسی طرح اگر مشرکین کا ہدیہ قبول کرنے سے شرک کی یا مشرکین کی تائید کسی طریقے سے لازم آتی ہو تو بھی ان کا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں۔ اور جہاں اس قسم کا کوئی خدشہ نہ ہو وہاں ان کا ہدیہ قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (درس ترمذی ۵/۲۴۵ مکتبہ نعیمیہ دیوبند)۔

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ حکومت کی ان اسکیموں سے اگر دینی وملی صلابت وغیرت اور حمیت پر حرف نہ آتا ہو اور یہ اسکیمیں دینی غیرت واحساس کو ختم نہ کرتی ہوں تو پھر اس کے قبول کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، لیکن اگر اس طرح کی اسکیموں سے اسلامی غیرت وحمیت کو ختم کرنا مقصود ہو پھر اس کے حاصل کرنے کی اجازت نہیں، لیکن حکومت کی طرف سے عام شہریوں کے لئے ان کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر مذہب سے قطع نظر اس طرح کی اسکیمیں جاری کی جاتی ہیں لہٰذا عام حالات میں اس کو حاصل کرنا جائز ہے شرعاً کوئی حرج نہیں۔

سوال نمبر (۷) کا جواب:

امدادی رقم حاصل کرنے کے لئے اگر کوئی شخص درمیان میں واسطہ بنے اور اس کے لئے کوشش کرے تو اس کے لئے اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ اس کام کی ذمہ داری اس کے اوپر لازم نہ ہو، چنانچہ ''فتاوی رشیدیہ'' میں ہے:

سوال:...... ایسے کام میں سعی کرنے کا عوض لینا جو اس پر نہ لازم ہے نہ اس میں کسی مستحق کی حق تلفی ہے اور نہ ہی دروغ فریب ہے رشوت ہے یا نہیں ہے۔

جواب:...... اگر مباح میں سعی کی اور کچھ لیا بشرطیکہ کسی وجہ سے ساعی کے ذمہ پر واجب نہ ہو تو درست ہے رشوت نہیں۔

''سعى له عند السلطان، وأثم أمره لا بأس بقبول هديته بعده وقبله بطلبه سحت، وبدونه مختلف فيه، ومشائخنا على أنه لا بأس به'' (رد المحتار ۸/۳۵)

مگر دفع ظلم اور اعانت ملہوف ہر مسلمان پر واجب ہے، حاکم عاقل ہو یا عامی (تالیفات رشیدیہ/۴۲۹، ۴۳۰)۔

حضرت کی اخیر والی قید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مجبور ومظلوم ہو اور دفع ظلم سے عاجز ہو تو اس کی اعانت واجب ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اجرت کی ادائیگی کی قدرت نہ رکھتا ہو تو بغیر اجرت کے بھی تعاون کی قدرت رکھنے والوں کے لئے مجبور ومظلوم کا تعاون کرنا واجب ہے۔

''لأن دفع الضرر عن المسلم واجب، ولا يجوز أخذ المال ليفعل الواجب'' (شامی ۸/ ۳۵)، ''إذا دفع الرشوة ليسوى أمره عند السلطان حل له الدافع ولا يحل للآخذ أن يأخذ، فإن أراد أن يحل للآخذ يستأخذ الآخذ يومًا إلى الليل بما يريد أن يدفع إليه، فإنه تصح هذه الإجارة.... وإن طلب منه أن يسوى أمره ولم يذكر له الرشوة وأعطاه بعد ما سوى اختلفوا فيه، قال بعضهم: لا يحل له أن يأخذ، وقال بعضهم: يحل وهو الصحيح؛ لأنه يروى مجازات الإحسان فيجعل كما لو جعلوا للإمام والمؤذن شيئًا فأعطوه من غير شرط كان حسنًا.....والحيلة أن يستأجره ثلاثة أيام ونحوه ليعمل له ثم يستعمله إن كان فعلًا يجوز الاستئجار عليه

كتبليغ الرسالة ونحوه، وإن لم يبين المدة لا يجوز، وهٰذا إذا كان فيه شرط، أما إذا كان الإبداء من غير شرط، ولكن يعلم يقينًا أنه إنما يهدى له ليعينه عند السلطان '' (رسائل ابن نجيم ملخصًا / ۱۱۳تا۱۱۴)۔

سوال نمبر (۸) کا جواب:

جس شخص کے ذمہ حکومت کی امدادی اسکیموں کو نافذ کرنا اور پہنچانا ہو اگر وہ شخص اسکیم حاصل کرنے والوں سے کوئی رقم لیتا ہے تو وہ رشوت ہے جس کا لینا اس کے لئے جائز نہیں مثلاً گرام پردھان، ایم ایل اے، اور ایم پی، نیکپال وغیرہ کے توسط سے بہت سی امدادی اسکیمیں حاصل ہوتی ہیں اور یہ حضرات حکومت کی اسکیموں کو پہنچانے میں حکومت کے وکیل ہوتے ہیں ان کے لئے امدادی اسکیم دلانے پر کم یا زیادہ کوئی معاوضہ لینا رشوت میں داخل ہے جو شرعاً حرام ہے۔

''حد الرشوة: هو ما يؤخذ عما وجب على الشخص سواء كان واجب على العين أو على الكفاية وسواء كان واجبًا حقًا للشرع أو كان واجبًا عقدًا'' (اعلاء السنن ۵/ ۶۴)۔

البتہ اگر کسی شخص کے ذمہ حکومتی اسکیموں کے نفاذ وغیرہ کی کوئی ذمہ داری نہ ہو، لیکن وہ شخص اپنی ظاہری صلاحیت ولیاقت کی بنا پر امداد کی تحصیل کی قدرت رکھتا ہو اگر یہ شخص امداد حاصل کرنے والے سے ملنے والی رقم کی کچھ مقدار متعین پر معاملہ کرلے تو اس کے جواز کی گنجائش ہے اور یہ صورت جعالہ میں داخل ہوگی، کیونکہ جب واسطہ بننے والے کے ذمہ اس اسکیم کو پہنچانا نہیں ہے اور وہ شخص کام ہوجانے پر ایک مقدار معین کا معاملہ کرے تو اس پر جعالہ کی تعریف صادق آتی ہے۔

جعالہ کی تعریف:

''التزام عوض معلوم على عمل معين معلوم أو مجهول يعسر ضبطه'' (الموسوعة الفقهيه ۱۵/۲۰۸)

یعنی جعالہ میں اجرت کام کے ہوجانے پر موقوف ہوتی ہے جب کام ہوجائے تو متعینہ اجرت ملے گی اور کام نہیں ہوگا تو اجرت نہیں ملے گا، جعالہ میں مدت اور عمل کچھ متعین نہیں ہوتا ہے اس کی مزید وضاحت کے لئے محقق عصر حضرت مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں: جعالہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس میں نہ تو کوئی مدت مقرر ہے نہ کوئی عمل مقرر ہے، بلکہ عمل کے نتیجہ پر اجرت دی جاتی ہے، مثلاً کسی شخص کا غلام بھاگ گیا معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے اس نے کسی شخص سے کہا کہ اگر تم میرے غلام کو میرے پاس لاؤ گے تو تمہیں اتنی اجرت دوں گا اب وہ غلام کب آئے گا کب ملے گا کتنی دیر لگے گی کتنی محنت کرنی پڑے گی سب مجہول ہے اسی طرح وہ ملے گا یا نہیں ملے گا ممکن ہے کہ بہت محنت کے باوجود نہ ملے اور ہوسکتا ہے کہ گھر سے باہر نکلتے ہی مل جائے نہ تو عمل کی تعیین ہے نہ مدت کی مدار اس پر ہے کہ جب عمل مکمل ہوجائے گا تو پیسے ملیں گے، ورنہ نہیں اس کو جعالہ کہتے ہیں اس کے بعد جعالہ اور اجارہ کے درمیان فرق ظاہر کرنے کے لئے تعریف، حکم وغیرہ لکھے جاتے ہیں تاکہ زیر بحث مسئلہ بالکل منقح ہوجائے (انعام الباری ۶/ ۴۵۴)۔

جعالہ:

تعریف:...... کسی کام کے انجام پر عوض مقرر کرنے کا نام جعالہ ہے۔

''التزام عوض معلوم على عمل معين معلوم أو مجهول يعسر ضبطه'' (الموسوعة الفقهيه ۱۵/ ۲۰۸)۔

جعالہ کا حکم:

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جعالہ جائز ہے شرط صرف یہ ہے کہ اجرت معلوم ہو۔

''عقد الجعالة مباح شرعًا عند المالكية والشافعية والحنابلة'' (الموسوعة الفقهيه ۱۵/ ۲۰۸)۔

مسلک احناف:

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف جعالہ کے عدم جواز کی نسبت کی گئی ہے۔ ''وقال الحنفية: بعدم جوازها في غير جعل العبد الآبق، ودليل المنع عندهم ما في الجعالة من تعليق التمليك على الخطر'' (الموسوعة الفقهيه ۱۵/ ۲۰۹)۔

استدراک:

لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف جعالہ کے حرمت کی نسبت صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے، البتہ حضرت امام صاحب سے اس کے سلسلہ میں کوئی صراحت موجود نہیں، اس لئے غالباً شرائط اجارہ کے مفقود ہونے کی وجہ سے ان کی طرف عدم جواز کی نسبت کردی گئی۔ ورنہ دلائل کے لحاظ سے قرآن کریم کی اس آیت "ومن جاء به حمل بعير أنا به زعيم" سے جعالہ کا جواز واضح اور مصرح ہے۔ اور حضرت ابن قدامہ حنبلی نے امام صاحب سے جواز نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "الجعل في رد الضالة والآبق وغيرهما جائزة هذا قول أبي حنيفة ومالك والشافعي ولا نعلم مخالفًا" تو صحیح بات یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک بھی سمسرہ جائز ہے (ملخصاً انعام الباری ۶/ ۴۵۵۔۴۵۶)۔

اور متاخرین حنفیہ نے کثرت تعامل کی وجہ سے دلالی کو جائز کہا ہے، اور جعالہ کو بھی جائز کہا ہے۔

''أجرة السمسار إن كان في الأصل فاسدًا لكثرة التعامل بأس به، فجوزوه لحاجة الناس إليه'' (شامی ۹/ ۸۷)۔

جعالہ اور اجارہ کے درمیان فرق:

اجارہ میں عمل یا مدت کا معلوم ہونا لازم وضروری ہے، لیکن جعالہ میں لازم نہیں۔

''والفرق بينهما أن الجعالة قد تكون على مجهول بخلاف الإجارة'' (الموسوعة الفقهيه ۱۵/ ۲۰۸)۔

احکام کے اعتبار سے فرق:

احکام کے اعتبار سے کل آٹھ فرق کیا گیا ہے: (۱) عمل مجہول پر جعالہ صحیح ہے، لیکن اجارہ صحیح نہیں ہے، (۲) جعالہ میں راد (عامل) نہیں ہوتا ہے لیکن اجارہ میں اجیر متعین ہوتا ہے، (۳) جعالہ میں عامل عمل کی تکمیل سے پہلے اجرت کا مستحق نہیں ہوتا ہے لیکن اجارہ میں عقد اجارہ سے استحقاق ثابت ہوجاتا ہے، (۴) جعالہ میں عامل اور راد کی طرف سے قبول کا پایا جانا شرط نہیں، (۵) بعض صورتوں میں عوض جعالہ میں مجہول ہوسکتا ہے، لیکن اجارہ میں عوض مجہول نہیں ہوسکتا، (۶) جعالہ میں کام کے لئے مدت کی عدم تعیین شرط ہوتی ہے، لیکن اجارہ میں کام کے لئے مدت کی تعیین جائز ہے، (۷) عقد جعالہ لازم نہیں ہوتا ہے بخلاف اجارہ کے کہ اس کی پابندی متعاقدین کے اوپر لازم ہوتی ہے، (۸) عامل کے عمل کی تکمیل سے پہلے فسخ کا اختیار رہتا ہے، لہٰذا تکمیل سے پہلے اجرت کا استحقاق نہ ہوگا، لیکن اجارہ میں عقد لازم ہے فسخ کا اختیار نہیں۔

''والجعالة تختلف عن الإجارة، الأول صحة الجعالة على عمل مجهول، والثاني صحة الجعالة مع عامل غير معين، والثالث: كون العامل لا يستحق الجعل إلا بعد تمام العمل، الرابع: لا يشترط في الجعالة تلفظ العامل بالقبول، الخامس: جهالة العوض في الجعالة في بعض الأحوال، السادس: يشترط في الجعالة عدم التاقيت لمدة العمل، السابع: الجعالة عقد غير لازم، الثامن: سقوط كل العوض بفسخ العامل تمام العمل المجاعل عليه''

(الموسوعة الفقهيه ۱۵/ ۲۰۹۔۲۱۰)۔

حاصل یہ کہ حکومت کی امدادی اسکیموں سے جڑے افسران وذمہ داران کے لئے کچھ لینا رشوت میں داخل ہے جو شرعاً حرام ہے، البتہ اسکیم حاصل کرنے والوں کے لئے دینے کی گنجائش ہے، اس لئے کہ ان کی یہ مجبوری ہے اور اسکیم سے غیر متعلق افراد اگر اسکیم دلانے کے لئے کوشش کریں اور اسکیم حاصل ہونے پر رقم کے کچھ پرسنٹ لینے کا معاہدہ کریں تو یہ جعالہ میں داخل ہوکر جائز ہوگا اس کے لینے دینے میں حرج نہیں۔

سوال نمبر (۹) کا جواب:

امدادی رقوم یا قرضوں کے حصول کے لئے رشوت دینا جلب منفعت کے لئے رشوت دینا ہے اور جلب منافع کے لئے بھی رشوت دینے کی گنجائش ہے، چنانچہ "احسن الفتاوی" میں ہے: "دفع مضرت یا جلب منفعت کے لئے درمیان میں واسطہ بننے والے (سفارش کرنے والے) کو رشوت دینا جائز ہے (احسن الفتاوی ۸ / ۹۷)، البتہ سودی قرضوں کا بلاضرورت لینا شرعاً جائز نہیں لہٰذا اس کے لئے رشوت دینا جائز نہ ہوگا۔

"أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع وهو حرام على الآخذ فقط" (شامی ۸/ ۳۵)۔

سوال نمبر (۱۰) کا جواب:

جس ملک میں انسان آباد ہو اگر چہ وہ غیر مسلم ملک ہی کیوں نہ ہو اس کے جائز قوانین کی پابندی لازم ہے، اور قانونی خلاف ورزی شرعاً جائز نہیں، لہٰذا امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام لینا کذب وخداع وغیرہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً جائز نہیں۔

"وهذا خلاف ما إذا جاءهم قوم من المسلمين ليدخلوا دار الحرب فقال لهم: ادخلوا وأنتم آمنون، فدخلوا ولم يشترطوا لهم شيئًا؛ لأن هناك مجيئهم على سبيل الاستيمان بمنزلة التصريح بالاشتراط على أنفسهم أن لا يغادروا بهم ولا يوجد هذا المعنى فى حق الأمراء لأنهم كانوا مقهورين فى أيديهم لا مستامنين" (شرح السير الكبير ۳/ ۲۴۵)

البتہ اگر کوئی شخص حکومت کے شرائط ومعیارات کے مطابق امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کا مستحق ہو، لیکن وہ قانونی داؤ پیچ اور بعض تحفظاتی شرائط وغیرہ کے پوری کرنے سے قاصر ہو تو ایسی صورت میں جو شخص واقعتاً حکومت کی منشا کے مطابق امدادی رقوم وغیرہ کا مستحق ہو تو اس کے لئے اس اسکیم کو حاصل کرنا جائز ہے اگر چہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے کچھ غلط بیانی سے بھی کام لینا پڑے، کیونکہ ضرورت کے وقت اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے اس طرح سے غلط بیانی کرنا جائز ہے جو بظاہر خلاف واقع تو ہو مگر اس کا کوئی صحیح مطلب نہیں سکتا ہو، لیکن صریح جھوٹ اس وقت بھی جائز نہیں، کذب کے سلسلہ میں علامہ شامیؒ نے صراحت فرمائی ہے کہ جب مباح مقصود کو صدق وکذب دونوں کے ذریعہ سے حاصل کیا جا سکتا ہو تو کذب حرام ہے اور اگر صرف کذب کے ذریعہ حصول ممکن ہو تو مباح ہے لیکن اگر مقصود واجب کی قبیل سے ہو اور بغیر کذب کے اسکا حصول ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں کذب واجب ہے۔ حاصل یہ کہ جس وقت صدق کا فساد کذب سے بڑھا ہو اس وقت کذب کی اجازت ہے اور اگر اس میں شک ہو یا کذب کا فساد صدق کے نقصان سے بڑھا ہوا ہو تو ایسی صورت میں کذب حرام ہے۔

"الكذب مباح لإحياء حقه ودفع الظلم عن نفسه والمراد التعريض؛ لأن عين الكذب حرام (الدر المختار) وفى الرد: اعلم أن الكذب قد يباح وقد يجب، والضابطة فيه أن كل مقصود محمود يمكن التوصل إليه بالصدق والكذب جميعًا، فالكذب فيه حرام، وإن أمكن التوصل إليه بالكذب وحده، فمباح. إن أبيح تحصيل ذلك المقصود، وواجب إن وجب تحصيله، كما لو رأى معصومًا اختفى من ظالم يريد قتله أو إيذاءه. فالكذب هنا واجب، وكذا لو سأله عن وديعة يريد أخذها يجب إنكارها ومهما كان لا يتم مقصود حرب أو إصلاح ذات البين أو استمالة قلب المجنى عليه إلا بالكذب، فيباح. ولو سأله سلطان عن فاحشة وقعت منه سرًا كزنا أو شرب. فله أن يقول: ما فعلته، لأن إظهارها فاحشة أخرى، وله أيضًا أن ينكر سرًا أخيه، وينبغى أن يقابل مفسدة الكذب بالمفسدة المرتبة على الصدق، فإن كانت مفسدة الصدق أشد فله الكذب" (شامی ۹/ ۶۱۲)۔

کذب بیانی سے حاصل کی گئی امداد کا حکم:

کذب بیانی کے ذریعہ سے حاصل کی گئی امداد بحکم غصب ہے اور مال مغصوب سے انتفاع شرعاً جائز نہیں، بلکہ اس کے اصل مالک کو واپس لوٹانا واجب ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے مالک تک لوٹانا ممکن نہ ہو تو اس کا تصدق واجب ہے، کذب بیانی سے حاصل کی گئی امداد غصب کے حکم میں اس لئے

ہے کہ یہ مال مالک کی رضا کے بغیر حاصل کیا گیا ہے، کیونکہ اس کی رضا شرائط کے ساتھ مشروط تھی اور شرائط کے فوت ہونے کی وجہ سے رضا بھی فوت ہے، لہٰذا اس کا بحکم غصب ہونا ظاہر ہے۔

''القسم الأول ماكان محرما على المرأ لكونه ملكًا للغير، القسم الأول نعبر عن جميع العقود الباطلة فيما يأتي بالمغصوب، والذى يقبض هذا المال الحرام بالغصب، وذلك لسهولة التعبير ويشمل هذا التعبير كل مالٍ حرام لا يملكه المرأ فى الشرع، سواء كان غصبًا أو سرقة، أو رشوة، أو ربا فى القرض، أو مأخوذًا ببيع باطل، وإنه حرام للغاصب الانتفاع به أو التصرف فيه، فيجب عليه أن يرده إلى مالكه أو إلى وارثه بعد وفاته، وإن لم يمكن ذلك لعدم معرفة المالك أو وارثه أو لتعذر الرد عليه لسبب من الأسباب وجب عليه التخلص منه بتصدقه عنه من غير نية ثواب الصدقة لنفسه، وهذا الحكم عام سواء كان المغصوب عرضًا أم نقدًا؛ لأن النقود تتعين فى الغصوب، حتى عند الحنفية الذين يقولون بعدم تعين النقود، كما مر تحقيقه، ثم إن كان المغصوب قائمًا عند الغاصب بعينه تتعدى حرمته إلى من يأخذه من الغاصب شراء أو هبة أو إرثًا، وهو يعلم أنه مغصوب. وهذا القدر لا نعلم فيه خلافًا بين الفقهاء'' (فقه البيوع ۲/۱۰۰۶)۔

مذکورہ صورت کے منافع کا حکم:

دراہم مغصوبہ وغیرہ سے حاصل کے گئے منافع کے سلسلہ میں فقیہ عصر حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ نے بڑی مفصل گفتگو فرمائی ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں کہ خریداری کی کل پانچ صورتیں ہیں: (۱) دراہم مغصوبہ بائع کو پہلے حوالے کئے جائیں پھر اس کے عوض خریداری ہو (۲) دراہم مغصوبہ کی طرف اشارہ ہو اور اس کے ذریعہ خریداری ہو پھر وہی حوالے بھی کئے جائیں (۳) دراہم مغصوبہ کی طرف اشارہ ہو اور اسی پر عقد ہو اور حوالے دوسرے دراہم کئے جائیں (۴) عقد مطلق ہو (کسی درہم کی طرف اشارہ اور تعیین نہ کی گئی ہو) لیکن دراہم مغصوبہ حوالے کئے جائیں (۵) مغصوبہ دراہم کے علاوہ دوسرے دراہم کی طرف اشارہ اور اس کے ذریعہ خریداری کی جائے، لیکن حوالے دراہم مغصوبہ کئے جائیں۔

مذکورہ بالا صورتوں کا حکم:

ان صورتوں کے احکام میں مشائخ احناف کا اختلاف ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) القول الاول: مذکورہ بالا پانچوں صورتوں کا حکم یہ ہے کہ اداء ضمان سے قبل جو بھی نفع ہو وہ حلال نہیں ہے اس کو نفع کے ساتھ مالک کو لوٹا دینا واجب ہے اور نفع کو صدقہ کرنے کا بھی اختیار ہے (انعام الباری ۶/۴۴۹)۔ البتہ اداء ضمان کے بعد جو نفع حاصل ہوگا وہ طیب وحلال ہے یہی ظاہر الروایہ کا مقتضا ہے اور اس کو ترجیح دیا ہے، ہدایہ، بدائع اور ہندیہ وغیرہ میں اسی کو اختیار کیا ہے ابوبکر اسکاف نے (فقہ البیوع ۲/۱۰۱۱)۔

(۲) القول الثانی: مذکورہ بالا صورتوں میں سے پہلی صورت کے علاوہ بقیہ سب صورتوں میں نفع طیب وحلال ہے، کیونکہ مشتری کے ذمہ مطلق دراہم کی ادائیگی واجب ہوتی ہے اور دراہم مغصوبہ اس دراہم مطلقہ کا بدل ہیں، لہٰذا خریدی ہوئی چیز میں کوئی خبث ظاہر نہ ہوگا اور دراہم کی طرف کئے گئے اشارہ کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں اس کے قائل ابوالنصر اور ابواللیث ہیں (فقہ البیوع ۲/۱۰۱۱)۔

(۳) القول الثالث: تیسرا قول امام کرخیؒ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ پہلی دونوں صورتوں میں نفع طیب وحلال نہیں اور بقیہ تین صورتوں میں طیب وحلال ہے (فقہ البیوع ۲/۱۰۱۱)۔

امام کرخیؒ ابوالنصر وغیرہ کے قول کا مطلب: حضرت مفتی صاحب نے ان حضرات کے اقوال کی توجیہ یہ بیان فرمائی ہے کہ نفع حاصل ہونے کے بعد اگر ضمان ادا کردیا جائے تو امام کرخی کے مطابق تین صورتوں میں نفع اس وقت حلال اور طیب ہوجائے گرچہ اداء ضمان سے قبل ہی حاصل ہوئے ہوں ''ينقلب هذا الربح طيبا بأداء الضمان''، البتہ پہلی اور دوسری صورت میں اداء ضمان کے بعد بھی نفع حلال وطیب نہ ہوگا اور ابونصر، ابواللیث وغیرہ کے قول کا مطلب یہ ہے پہلی صورت کے علاوہ بقیہ چار صورتوں میں اداء ضمان کے بعد نفع حلال ہوگا اور پہلی صورت میں حلال نہیں ہوگا اور اداء ضمان

سے قبل کسی صورت میں بھی کسی کے نزدیک حلال نہ ہوگا (فقہ البیوع ۲ / ۱۰۱۳)۔

فتوی اور ترجیح:

حضرت مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں کہ امام کرخی کے قول کا جو مطلب ہم نے ذکر کیا ہے اگر وہ لیا جائے تو اس کا راجح ہونا مسلم ہے اور اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ دراہم مغصوبہ سے حاصل شدہ نفع حلال ہے تو اس صورت میں صاحب ہدایہ اور علامہ کاسانی کا قول (نفع کا حرام ہونا) راجح معلوم ہوتا ہے اور اسی میں احتیاط ہے اگر چہ بہت سے فقہاء نے عموم بلوی کی وجہ امام کرخی کے قول پر فتوی بھی دیا ہے اس لئے سخت ضرورت اور مجبوری کے وقت اس پر عمل کی گنجائش ہے، البتہ احتیاط بہتر ہے۔

''وذكر كثير من المتأخرين أن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعًا للحرج عن الناس قال ابن عابدين: ''وعلى هٰذامشى المصنف (يعني صاحب الدر المختار) في كتاب الغصب تبعًا للدرر وغيرها. وقد أفتى به جماعة من مشايخنا

فلو أخذ قول الكرخي على ما فسرناه فرجحانه مسلم. أما إذا أخذ مبيحا لما اشترى بالنقود المغصوبة وربحه فالذي يميل إليه القلب أن ما رجحه صاحب الهداية والكاساني بناء على قول الإمام أبي حنيفة ومحمد رحمهم الله. هو الأولى بالترجيح وهو الاحتياط، وإن كان كثير من الفقهاء المتاخرين أفتوا بذلك لعموم البلوى. ولذا فمن ابتلى بمثل هٰذا يرجى أن يسوغ له الأخذ بهٰذا القول عند حاجة شديدة. والتنزه أولى. ولم يذكر عن الكرخي حكم البائع الذي أخذ من المشتري النقود المغصوبة هل يسوغ له استعمال تلك النقود؟ وقد أفتى كثير من علمائنا أنه يجوز له ذلك أيضًا. والله سبحانه وتعالى أعلم'' (فقه البيوع ۲/۱۰۱۶)۔

کذب بیانی سے حاصل کئے گئے قرض سے انتفاع:

کذب بیانی کرنا قرض حاصل کرنے کے لئے شرعاً جائز نہیں، لیکن حاصل کئے گئے قرض کا مالک ہو جائے گا اور اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی حلال ہوگا، کیونکہ ملکیت اور عقد میں کوئی خبث نہیں ہے، البتہ خبث سبب ملک میں ہے اور جب خبث ملکیت اور عقد میں نہ ہو تو نفع حلال ہوتا ہے، لیکن خبث فی السبب کی وجہ سے معاملہ کو ختم کر کے از سر نو کرنا واجب ہوتا ہے بشرطیکہ جس چیز میں خبث ہو اس کو باقی رکھ کر کے نفع حاصل کیا جائے۔

''إن الخبث عند الحنفية على ثلاثة أنواع خبث الكسب، خبث السبب، خبث البدل....أن المسلم إذا باع الخمر والخنزير في دار الحرب وأخذ ثمنهما، فليس هناك خبث في السبب ولا في البدل. لكن يوجد هناك خبث في الكسب فاتعاطي الخمر والخزير حرام على المسلم. فكذلك في مسئلتنا (النكاح الثابت بشهادة الزور) لأن السبب الحل هو القضاء، أي هو سبب مشروع، لكن الخبث متمكن في الكسب، يعني الطريق الذي أدى إلى ذلك السبب ولا يرتفع ذلك الخبث إلا بعقد مستأنف على الطريق المشروع وأضف إلى ذلك أن الخبث إن كان مستمرًا، فلا يطيب للرجل الانتفاع، حتى يزيل ذلك الخبث بطريق مشروع، وهو العقد المستأنف'' (تكملة فتح الملهم منخصًا ۸/ ۵۰۲، ۵۰۳ م الاشرفيه ديوبند)۔

جب کذب بیانی کے ذریعہ سے قرض حاصل کیا گیا اور اس قرض سے نفع حاصل ہوا تو اس نفع کے حصول کا سبب قرض ہے اور نفع میں خبث نہیں، لیکن کذب بیانی کی وجہ سے قرض میں خبث ہے اور جب ربح میں خبث نہیں تو اسکا تصدق بھی واجب نہیں اور قرض کی رقم کے استہلاک کے ذریعہ سے نفع حاصل ہوتا ہے اس کو باقی رکھ کر کے نہیں، لہٰذا معاملے کا استیناف بھی واجب نہیں، اس مسئلہ سے بہت قریب جعلی سرٹیفکٹ کے ذریعہ سے ملازمت حاصل کرنے والا مسئلہ ہے، کیونکہ جس طرح کذب بیانی کے ذریعہ سے قرض حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس قرض سے نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح کذب بیانی کے ذریعہ سے ملازمت حاصل کی جاتی ہے اور اس ملازمت کے ذریعہ سے آمدنی حاصل کی جاتی ہے دونوں مسئلوں میں نفع کی جو اصل ہے اس کے حاصل کرنے کے طریقہ میں خبث ہے اور جعلی سرٹیفکٹ والے مسئلہ میں علماء نے اس کی صراحت کی ہے کہ آمدنی حلال ہے واجد۔

التصدق نہیں۔

چنانچہ صاحب ''احسن الفتاوی'' تحریر فرماتے ہیں: کہ یہ جھوٹ اور دھوکہ ہے لہٰذا جائز نہیں اس کی اعانت کرنے والے گناہ گار ہوں گے، البتہ جو کام اس کے ذمہ ہے اگر وہ اسے بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو تنخواہ حلال ہے (احسن الفتاوی ۸ / ۱۹۸)

اور یہی حکم جدید فقہی مسائل میں بھی مذکور ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ مگر اس کی کمائی ہوئی آمدنی حلال وجائز اور یہ اس کی محنت کی اجرت ہے ایسا ممکن ہے کہ ذریعہ ناجائز ہو کمائی جائز ہو اس سلسلہ میں فقہ کا یہ جزئیہ قابل لحاظ ہے۔

''ومهر البغي في الحديث هو أن يواجر أمته على الزنا، وما أخذه من المهر فهو حرام عندهما، وعند الإمام إن أخذه بغير عقد، بأن زنى بأمته ثم أعطاها شيئًا، فهو حرام؛ لأنه أخذه بغير حق، وإن استاجرها ليزني بها ثم أعطاها مهرها أو ما شرط لها، لا بأس بأخذه؛ لأنه إجارة فاسدة. فيطيب له، وإن كان السبب حرامًا'' (جدید فقہی مسائل ۱/ ۴۱۳)۔

حاصل یہ کہ کذب بیانی کے ذریعہ سے حاصل کئے گئے قرض سے نفع اٹھانا بھی جائز ہے اور اس کا نفع بھی حلال ہے، البتہ کذب بیانی کا جو گناہ ہے وہ بہر حال ہوگا، کذب بیانی کی وجہ قرض اور اس کے ربح میں خبث کا تحقق نہیں ہوگا، لیکن کذب بیانی کے ذریعہ حاصل کی گئی امداد کا حکم قرض سے مختلف ہے، کیونکہ یہ امداد بحکم غصب ہے چنانچہ ''فتاوی عثمانی'' کے ایک فتوی میں ہے کہ آپ کے لئے اپنی رہائش کا فاصلہ زیادہ لکھوا کر کرایہ سواری وصول کرنا جائز نہیں.... اور جب اس طرح حاصل کی ہوئی رقم ناجائز ہوئی تو اسے حکومت ہی کو واپس کرنا ضروری ہے اور اس کو صدقہ کرنا بھی درست نہیں الا یہ کہ حکومت کو واپس کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو اس صورت میں بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے (فتاوی عثمانی ملخصا ۳/ ۳۹۰، ۳۹۱)۔

جس طرح سے کذب بیانی کے ذریعہ حاصل کئے گئے کرایہ کو غصب کے حکم میں رکھا گیا ہے اسی طرح کذب بیانی کے ذریعہ حاصل کی گئی امداد بھی غصب کے حکم میں ہوگا اور غصب کے حکم میں یہ بات تفصیل سے ذکر کر دی گئی ہے کہ اس کا ضمان ادا کرنے سے پہلے نہ تو اس سے انتفاع جائز ہے اور نہ ہی اس کا نفع حلال وطیب ہے اور اگر ضمان ادا کرنے سے پہلے نفع حاصل کیا گیا تو اداء ضمان کے بعد اس کا خبث زائل ہوگا یا نہیں اس میں اختلاف ہے، امام کرخی کے نزدیک اداء ضمان سے پہلے حاصل ہونے والے نفع کا خبث اداء ضمان سے زائل ہو جائے گا اور حرام کی اس کثرت کے زمانے میں یہی راجح ہے۔

سوال نمبر (۱۱) کا جواب:

تعلیم وغیرہ سے متعلق قرض کی اسکیموں میں قرض پر عائد ہونے والے انٹرسٹ کی اگر مقروض کے ذمہ ادائیگی لازم نہ ہو اور مقروض کو صرف اپنے قرض کے بقدر رقم ادا کرنی پڑے تو اس سے انتفاع میں شرعاً کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس نے کسی محظور شرعی کا ارتکاب نہیں کیا ہے رہا حکومت کا اس کی طرف سے انٹرسٹ ادا کرنا تو قرض جاری کرنے والا ادارہ اور قرض ادا کرنے والا ادارہ تو دونوں حکومت ہی کے شعبے ہیں، لہٰذا ان میں حقیقتاً ربا کا تحقق نہیں ہوگا، بلکہ ایک انتظامی صورت ہے جیسے عبد و مالک کے درمیان اور شرکت مفاوضہ اور عنان کرنے والوں کے درمیان ربا کا تحقق نہیں ہوتا ہے۔

''ولا ربا بين سيد وعبدة؛ لأنه ما في يده لمولى فلا يتحقق الربا لعدم تحقق البيع ... ولا ربا بين متفاضين وشريكي عنان إتبايعا من مالها'' (الدر مع الرد ملخصًا ۷/ ۴۲۱، ۴۲۲)

اور اگر بالفرض اس کو انٹرسٹ پر محمول ہی کریں تو یہ حکومت کا اپنا معاملہ ہے قرض حاصل کرنے والے کا اس میں کوئی دخل نہیں، لہٰذا اس کے لئے کوئی حرج بھی نہیں کیونکہ حکومت غیر مسلمہ اپنے طریقے سے جو معاملات انجام دے گی اس کی وہ خود ذمہ دار ہے اس کی مسلم رعایا کا اس میں کوئی قصور نہیں۔

لیکن اگر اپنے قرض کی مقدار سے کچھ زائد ادا کرنا پڑے تو بہر حال وہ حقیقت کے اعتبار سے سود ہی بنے گا، اس لئے عام حالات میں اس کی اجازت نہیں اگر چہ اضافہ کی مقدار بہت معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

''كل قرض جر نفعًا حرام وكره للمرتهن سكنى المرهونة بإذن الراهن وكره السفتجة'' (الدر مع الرد ۷/ ۳۹۵)

البتہ اگر تعلیمی قرضے کی ضرورت ہو اور اس قرض پر عائد ہونے والے انٹرسٹ کا اکثر حصہ حکومت ادا کرے اور معمولی حصہ مقروض کو ادا کرنا پڑے تو ضرورت کے وقت اس طرح قرض حاصل کرنے کی گنجائش ہے اور قرض سے زائد ادا کی جانے والی رقم کو سروس چارج پر محمول کرتے ہوئے گنجائش نکل سکتی ہے، نیز زائد رقم کو جلب منفعت کے لئے رشوت دینے پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں (سروس چارج، اور جلب منفعت کے لئے رشوت) حد جواز میں داخل ہیں، لہذا ضرورۃً اس کی گنجائش ہے چنانچہ سروس چارج کے سلسلہ میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ نے فقہی مقالات ۱/۲۶۹ تا ۲۷۷ پر تفصیلی گفتگو فرمائی ہے، اور جلب منفعت کے لئے رشوت دینے کا جواز (شامی ۷/۳۵) پر موجود ہے، فقط۔

سوال نمبر (۱۲) کا جواب:

حکومت کی وہ اسکیمیں جس میں حکومت ایک محفوظ فنڈ قائم کرکے بینک میں ڈپازٹ کرتی ہے پھر اس سے حاصل ہونے والے انٹرسٹ کو تعلیمی، رفاہی اداروں اور افراد واشخاص کے تعاون میں خرچ کی جاتی ہے، اس اسکیم سے بھی استفادہ کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں:

(۱) کیوں کہ بینک سے حکومت کا سود حاصل کرنا یہ صرف اسماً سود ہے لیکن حقیقتاً سود نہیں، کیونکہ بینک بھی حکومت کا ایک ذیلی شعبہ ہے اور اپنے شعبے سے کم زیادہ لینا دینا خود اپنی ہی ملکیت میں کمی بیشی کرنا ہے اس میں مبادلہ اور معاوضہ کی حقیقت مفقود ہوتی ہے اس لئے ربا کی تعریف صادق نہیں آتی یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء نے غلام اور آقا کے درمیان پائی جانے والی کمی بیشی کو سود شمار نہیں کیا ہے، کیونکہ جب غلام اپنے آقا کا مملوک ہے تو مبادلہ کی حقیقت مفقود ہے۔

''لا ربا بین سید وعبده ولو مدبرًا لأنه ما فی یده لمولی، فلا یتحقق الربا لعدم تحقق البیع'' ، فتح (شامی ۷/۴۲۱)۔

(۲) نیز حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ غیر مسلمین جن معاملات کو جائز سمجھ کر وہ انجام دیتے ہوں ان معاملات میں وہ آزاد ہیں اس میں ان پر کوئی قید وبند نہیں اور اس کے ذریعہ سے جو آمدنی حاصل ہوگی اگر وہ اس کو کسی مسلمان کو دیں تو مسلمان کے لئے اس کو لینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں، چنانچہ علامہ شامی نے حضرت عمرؓ کا جو اثر نقل کیا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

''وقد أمرنا بترکهم وما یدینون. کذا فی الهدایة، وقال: دل علیه قول عمر: ولو هم بیعها وخذوا العشر من أثمانها ... إلخ وأشار به إلی أن أعراضنا عنهم لیس لکونها مباحة شرعًا فی حقهم، کما هو قول البعض، بل الحرمة ثابتة فی حقهم فی الصحیح، لأنهم مخاطبون بها؛ کما قلنا: لکنهم لا یمنعون من بیعها، لأنهم مخاطبون بها کما قلنا، لکنهم لا یمنعون من بیعها، لأنهم لا یعتقدون حرمتها ویتمولونها، وقد أمرنا بترکهم وما یدینون، کما فی البحر عن البدائع'' (شامی ۷/۴۸۱)۔

(۳) اور مزید حضرات فقہاء نے اس کی بھی صراحت فرمائی ہے کہ اگر دو غیر مسلم غیر مسلم ملک میں سودی معاملہ کریں تو یہ ان کا اپنا فعل ہے اس سے کوئی تعارض نہیں کیا جائے گا اور اس سے حاصل شدہ نفع اس کے حق میں مباح ہے، لہذا اگر وہ اس نفع کا مالک کسی مسلم کو بنائیں تو اس کو قبول کرنے کی گنجائش ہے

''لو أن حربیًا باع من حربي درهمًا بدرهمین ثم خرجا إلی دار الإسلام مسلمین أو ذمیین واختصما إلی القاضي، فإن کان ذلك بعد التقابض فالقاضي لا یتعرض لذلك ولا یبطله'' (الفتاوی التاتارخانیه ۱۰/۲۴)۔

اور سوال میں درج شکل پرائیوٹ فنڈ والی صورت کے مشابہ ہے کہ پرائیوٹ فنڈ میں بھی فنڈ کی رقم کو نفع بخش کاروبار میں لگایا جاتا ہے اور عام طور سے وہ نفع بخش کاروبار سود کا ہوتا ہے کہ بینک میں رکھوادیا اور اس پر سود لے لیا، ڈیفنس سرٹیفکٹ لے لیا اور اس پر سود لے لیا، عام ڈپازٹ سرٹیفکٹ مل گئی، اس پر سود لے لیا تو جب ملازم کو پرائیوٹ فنڈ ملتا ہے تو اس میں یہ رقم شامل ہوتی ہے اس لئے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ سودی کام میں لگائی ہوئی رقم سے جو نفع حاصل ہوا وہ چونکہ سودی معاملات ہیں لہذا وہ جائز نہیں، لیکن اس کے برعکس دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں کہ سود کا جو کچھ معاملہ کیا وہ محکمہ نے اپنے طور پر کیا وہ جانے اس کا اللہ جانے اس میں جو کچھ تصرف کررہا ہے اگر چہ سودی کاروبار میں لگارہا ہے وہ محکمہ کررہا ہے جو جانبین میں

مشروط نہیں تھی، لیکن جب ملازم کو دے گا تو اپنے خزانے سے دے گا تو ملازم کے حق میں سب تبرع ہی تبرع ہے چاہے اس تبرع کے حصول کے لئے محکمہ نے ناجائز طریقہ ہی اختیار کیا ہو (انعام الباری ملخصاً ۶ / ۴۵۰، ۴۵۱)۔

تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ حکومت جو تعاون اور امداد کرے وہ شرعاً جائز ہے گرچہ اس کے حاصل کرنے کے لئے حکومت نے غلط طریقہ اختیار کیا ہو، کیونکہ حکومت اپنے عمل کی ذمہ دار ہے اسکیم حاصل کرنے والے کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

ایک اشکال:

سود وغیرہ کے ذریعہ آمدنی حاصل کر کے دی جانے والی امداد کے سلسلہ میں جو تاویلات ذکر کی گئی ہیں اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جو چیزیں مسلمانوں کے لئے صحیح ہیں وہی غیر مسلموں کے لئے بھی صحیح ہیں اور جن کی اجازت اہل اسلام کے لئے نہیں ہے ان کی اجازت غیر مسلم کے لئے بھی نہیں ہے تو جب غیر مسلم اور غیر مسلم باب ربا وغیرہ میں مساوی ہیں تو ان کے سودی معاملات کو ان کے حق میں جائز وصحیح کیونکر مانا جاسکتا ہے اور جب ان کے حق میں بھی صحیح نہیں تو اس کی آمدنی سے امداد وغیرہ حاصل کرنا کیسے جائز ہوگا۔

''فكل ما جاز للمسلمين من البياعات كالصرف والسلم وغيرهما من أنواع التصرفات جاز لهم، وما لا يجوز من الربا وغيره لا يجوز لهم إلا في الخمر والخنزير'' (تبیین الحقائق ۴/ ۵۲۲)۔

جواب:

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ جب غیر مسلمین اسلامی مملکت میں قیام کرلیں تو اس وقت خمر وخنزیر کے علاوہ بقیہ احکام میں وہ مسلمانوں کی طرح سے ہوں گے اور جو چیزیں اہل اسلام کے لئے جائز ہوں گی وہی ان کے لئے بھی کیونکہ انہوں نے دار الاسلام میں قیام کر کے اس کے قوانین کی پابندی کا التزام کیا ہے، لہٰذا خمر وخنزیر جن کا استثناء نص ہے بقیہ احکام مساوی ہوگا۔

''يجوز لهم منها ما يجوز للمسلمين ويمتنع عليهم ما يمتنع عليهم؛ لأنهم مكلفون بموجب البياعات محتاجون إلى مباشرتها والتصرفات، وقد التزموا أحكامنا بالإقامة في دارنا، فلا يجوز منهم بيع درهم بدرهمين، فيما بينهم... الخ'' (فتح القدیر ۷/ ۱۲۲)۔

یعنی دونوں کا مساوی حکم دار الاسلام میں ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ''أعلمهم، فإن لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين''، یہ احکام اہل ذمہ کے ساتھ خاص ہیں، لہٰذا غیر مسلمین اپنے ممالک میں اپنے طریقے کے مطابق جو معاملات کریں گے اس میں وہ آزاد ہیں ان پر کوئی پابندی عائد نہیں جیسا کہ (تاتارخانیہ ۱۰/ ۶۴) سے نقل کیا جاچکا ہے، نیز اگر وہ دار الاسلام میں اپنے طور طریقے کے مطابق کوئی معاملہ کریں گرچہ سود وربا پر مشتمل ہو تو بھی ان سے تعارض نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ اپنے معاملے میں آزاد ہیں، البتہ اگر دار القضاء میں ان کا معاملہ جائے گا تو اس وقت وہ احکام اسلام کے پابند ہوں گے دار القضاء میں جانے سے پہلے وہ آزاد ہیں جیسا کہ ''أمرنا بتركهم وما يدينون'' کا یہی تقاضا ہے اور حضرات فقہاء نے بھی ان کے حق میں معاملات کے فساد کو مقید کیا ہے دار القضاء میں لے جانے کے ساتھ اور فقہاء کی قیودات معتبر ہوتے ہیں، لہٰذا اگر معاملہ دار القضاء تک نہ جائے تو اس وقت وہ آزاد ہیں۔

''لو اعتقد وحل ما مات حتف أنفه أن يضح بيعه (إذا) ارتفعوا إلينا نحكم ببطلانه، وأيضًا لو اعتقد أحل السلم أو الصرف أو نحوهما بدون شرطه المعتبرة عندنا نحكم بينهم بشرعنا'' (شامی ۷/ ۴۸۱)۔

☆☆☆

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی چند صورتیں سوالات کی روشنی میں

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی[1]

حکومت کا بنیادی مقصد عوام کی ضروریات کی کفالت کرنا ہوتا ہے اور مشکلات کا آسان حل پیش کرنا ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں خوش حالی، امن وامان اور سلامتی کا ماحول سازگار ہوتا ہے، باشندگان وطن کے لئے خوب سے خوب تر روزگار مہیا ہوتے ہیں، اگر حکومتیں اسلام کی بنیاد پر قائم ہوں تو ہر قدم پر اسلام اور اس کے قوانین وہدایات کو ملحوظ رکھتی ہے یا رکھنی چاہئے، لیکن حکومت اگر غیر اسلامی یا سیکولر ہو تو اس کے پیش نظر صرف ترقی کرنا اور آگے بڑھنا ہوتا ہے، راہ کی شرعی خرابیوں، اور جائز وناجائز صورتوں سے سروکار نہیں، آج دنیا کی اکثر آبادی کی حکمرانیاں دوسری نوعیت ہی کی علم بردار ہیں، ہمارا ملک بھی سیکولر ہے جہاں کثیر مذہبی انسانوں کی آبادی ہے ان میں مسلمانوں کی تعداد دوسروں کی بنسبت حقیقی معنوں میں بہت زیادہ ہے، حکومت معاشی ومعاشرتی ضرورتوں کے احساس کے نام پر سرکاری اسکیمیں بناتی ہے ان سے استفادہ کا حق ایک شہر ہونے کے ناطے مسلمانوں کو بھی اتنا ہی ہے جتنا دوسرے باشندگانِ وطن کو، ملک کا خزانہ کسی مخصوص طبقہ کے لئے خاص نہیں سب کو یکساں حق حاصل ہے، مگر مسلمانوں کو بعض اوقات ان اسکیموں سے استفادہ میں الجھنیں ہوتی ہیں، کیونکہ بعض اسکیموں کی بنیادیں سود وقمار جیسے لعنتی نظام پر قائم ہیں، نیز ان اسکیموں سے کبھی تو اعانت کے نام سے جس کو سبسڈی سے تعبیر کیا جاتا ہے، انسانو ں کو رقوم حاصل ہوتی ہیں جو قابل واپسی نہیں ہوتی، اور کبھی قرض کے نام پر رقوم فراہم کی جاتی ہیں جس کے بعض حصے کو حکومت معاف بھی کر دیتی ہے، اور بعض حصے کو وصول کرتی ہے، بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سارا ہی معاف ہو جاتا ہے، تو کبھی قرض کی ادائیگی شرح سود کے ساتھ کرنی پڑتی ہے۔

سود، اور سود پر مبنی نظام اسلامی معاشی قانون میں انتہائی قابل نفرت ومذمت ہے، خاص طور پر جب معاملہ قرض کا ہو تو اس کی قباحت وشناعت دو چند ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے وہ تمام انتفاع جو مقروض کی جانب سے بحق قرض ہو اور مشروط ہو حرام سمجھے جاتے ہیں کیونکہ یہی آہستہ آہستہ اصل قرض میں سود کا سبب بن جائے گا، فقہاء نے بطور قاعدہ بیان کیا ہے:

"كل قرض جر نفعًا حرام أي: إذا كان مشروطًا" (رد المحتار ۴/ ۱۹۴ فصل فی القرض ط: رشیدیہ پاکستان)

(ہر وہ قرض جس میں نفع کی شرط ہو حرام ہے)۔

پھر اسی قاعدے کی روشنی میں مختلف قسم کے قرضوں اور ان پر ہونے والے نفع کو منع کیا گیا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اوقات قرض لئے بغیر چارہ بھی نہیں ہوتا، اعانت کی کوئی شکل نہیں ہوتی تو ایسے موقع پر استثنا بھی کیا گیا ہے۔

"يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الأشباه والنظائر: ۲۶۷ الفن الاول، القاعدة الخامسة، الضرر يزال)۔

کس قرض کو ضرورت مند کی بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لئے جائز قرار دیا جائے، اور کون سی صورت "كل قرض جر نفعا" کے ساتھ لاحق کر کے حرام وناجائز ہو، مندرجہ ذیل سطور میں اس بابت کچھ لب کشائی کی جارہی ہے۔

(۱) معافی والے قرضے کا حکم:

حکومت بعض اوقات ایسے قرضے فراہم کرتی ہے جو بعد میں معاف کر دیئے جاتے ہیں یا اس کا کچھ حصہ معاف کر دیا جاتا ہے، اگر بوقت قرض نہ تو معافی مشروط ہو اور نہ معروف ہو تو بظاہر ایسے قرضے کی حصولیابی میں کوئی حرج نہیں ہے، ہر قرض دہندہ کو یہ حق ہوتا ہے کہ قرض کا کل حصہ یا بعض حصہ معاف

[1] خادم حدیث وفقہ مدرسہ حسنیہ کایم کلم، کیرالہ۔

کردے، حکومت تو بہر حال ہمارے نفع ونقصان کی ضامن ہی ہے، اگر معاف کرتی ہے تو اس میں حرج کیا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں حسن قضاء کی اہمیت پر زور دیا ہے، اپنے ارشادات میں دین وقرض کو کم کرنے اور معاف کرنے کی سفارش وترغیب بھی دی ہے، ان واقعات کا احاطہ کرنا مختصری تحریر میں مشکل ہے، تاہم ایک دو واقعہ کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول نے دین معاف کرنے یا دین وقرض کے کچھ حصہ کو کم کرنے کی ترغیب دی ہے۔

الف: حضرت کعب بن مالک وعبداللہ بن ابی حدودؓ کے مابین ایک معاملہ تھا، یا تو دَین کا تھا یا قرض کا، حضرت کعب نے اپنے مطالبہ میں سختی برتی حتی کہ آواز تھوڑی بلند ہوگئی اللہ کے رسول تک جب آواز پہنچی تو روایتوں میں آتا ہے:

''كشف سجف حجرته ونادى كعب بن مالك، فقال: يا كعب: فقال: لبيك يا رسول الله، فأشار بيده أن ضع الشطر من دينك، قال كعب: قد فعلت يا رسول الله... الخ'' (بخاری ۱/ ۶۸ کتاب الصلاة، باب رفع الصوت في المسجد)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرے کے پردے کو ہٹا کر کعب بن مالک کو آواز دی، کعب نے لبیک یا رسول اللہ کہتے ہوئے جواب دیا، اللہ کے رسول نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اپنے نصف دَین کو معاف کردو، حضرت کعب نے فرمایا: یارسول اللہ میں نے معاف کردیا)۔

ب: حضرت جابر بن عبداللہ کے والد بزرگوار کا معاملۂ قرض حدیث کی کتابوں میں بہت مشہور ہے، یہودیوں سے کھجور لے رکھا تھا، مگر غزوۂ احد میں جام شہادت پینے سے پہلے اپنے نوعمر اکلوتے صاحبزادے حضرت جابر سے ادائیگی کی وصیت کی، حضرت جابر چاہتے تھے کہ یہود ان کے قرض کو یا تو موخر کردیں یا کچھ معاف کردیں، مگر وہ تیار نہیں ہوئے بالآخر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شفاعت کی، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، الفاظ حدیث ہیں:

''عن جابر قال: أصيب عبد الله وترك عيالًا ودَينًا فطلبت إلى أصحاب الدين أن يضعوا بعضًا، فأبوا، فأتيت النبي صلى الله عليه وسلم فاستشفعت به عليهم فأبوا'' (بخاری ۱/ ۳۲۲ کتاب الاستقراض، باب الشفاعة في وضع الدين)

(حضرت جابر فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ شہید ہوئے، عیال ودین چھوڑ گئے تو میں نے قرض دہندہ حضرات سے درخواست کی کہ بعض حصے کو معاف کردیں مگر انہوں نے نہ مانا، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر سفارش کی درخواست کی، اس کو بھی ان حضرات نے تسلیم نہیں کیا۔

ج۔ غازی ومجاہد کے مال میں برکت بے انتہاء ہوتی ہے، اس کے تحت حضرت زبیر بن عوام کے قصہ کو بھی ادائیگی قرض کے باب میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اور بہت تفصیل سے اس کی اہمیت بیان بھی کی جاتی ہے، اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے:

''فأتاه عبد الله بن جعفر وكان له على الزبير أربع مائة ألف فقال لعبد الله: إن شئتم تركتها لكم، قال عبدالله: لا'' (بخاری ۱/ ۴۴۱ کتاب الجهاد، باب بركة الغازي في ماله حيًا وميتًا)

(حضرت ابن زبیر کے پاس حضرت عبداللہ بن جعفر آئے، ان کا حضرت زبیر کے ذمہ چار لاکھ درہم قرض تھے، تو ابن زبیر نے کہا: اگر چاہو تو میں اس کو چھوڑ دوں، یعنی معاف کردوں، حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا: نہیں)۔

ان سب واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب حق اگر بلا پیشگی شرط اپنا کل حق یا بعض حق معاف کردے تو تحسین کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔

(۲) مقررہ مدت میں معافی، بعدہ کل کی ادائیگی لازم:

قرض کی ادائیگی میں اصل تو یہی ہے کہ جتنا لیا گیا ہے اتنا بلا کم وکاست ادا کردیا جائے، اگر قرض دہندہ ادارہ کسی خاص مدت میں واپسی پر کچھ معافی کا اعلان کرتا ہے تو یہ بھی اپنے حق سے سبکدوش ہونا ہے، اس لئے ایسے اسکیم سے فائدہ اٹھانے میں حرج نہیں ہے، البتہ پہلے سے یہ بات معلوم ومعروف ہو تو پھر محل شبہ ہوگا، اس کا حل اس طرح ہوسکتا ہے کہ مقررہ مدت میں ادا ہی نہ کیا جائے، تاکہ سارا ہی قرض ادا کرنا ضروری ہوجائے، اس طرح شبہ ربا سے بھی حفاظت ہوجائے گی۔

(۳) مقررہ مدت کے بعد ادا کرنے کی صورت میں قرض سے زائد رقم کی ادائیگی:

اگر مقررہ مدت کے بعد ادا کرنے کی صورت میں لی ہوئی رقم سے زائد ادا کرنی پڑتی ہے تو عین ربا ہے، جس کی حرمت میں کسی قسم کا کلام نہیں ہے، اس کا لینا دینا دونوں حرام ہے، کافر و مسلم کی قید سے بھی بالاتر ہے، اس لئے شدید مجبوری کے بغیر اس طرح کے قرض لینے کا اقدام کرنا جائز نہیں ہے، یہ ربا الفضل ہے جس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

(۴) اگر زائد رقم کی مقدار کم ہو جس کو سروس چارج بنایا جاسکتا ہو:

قرض دینا تبرعات کی قبیل سے ہے، مگر اس کا لکھنا، حساب و کتاب کو محفوظ رکھنا معاملات اور اجارہ کے باب سے ہے اور معاملات و اجارہ میں اجرت مثل کے بقدر رقم فکس کی جاسکتی ہے جس کو سروس چارج کہہ لیا جائے یا انتظامی خرچ کے دائرے میں رکھا جائے، اس کی بعض نظیریں بھی ملتی ہیں۔

''یستحق القاضی الأجر علی کتب الوثائق والمحاضر والسجلات قدر ما یجوز بغیرہ کالمفتی. فإنه یستحق أجر المثل علی کتابة الفتوی؛ لأن الواجب علیه الجواب باللسان دون الکتابة بالبنان، ومع هذا الکف أولی احترازًا عن القیل والقال، وصیانة لماء الوجه عن الابتذال'' (درمختار علی الرد ۵/ ۶۲ کتاب الاجارہ، مسائل شتی، ط: رشیدیہ پاکستان)

(قاضی دستاویز درجسٹر لکھنے پر اتنی اجرت کا مستحق ہوتا ہے جتنا دوسروں کے لئے جائز ہے جیسے مفتی، کیونکہ فتوی نویسی پر اجرت مثل کا مستحق ہوتا ہے اس لئے کہ اس پر واجب زبان سے جواب دینا ہے نہ کہ ہاتھ سے لکھ کر، باوجود اس کے اس سے اپنے آپ کو بچانا اولی ہے، قیل و قال سے بچنے کی خاطر اور ذلت سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی غرض سے)۔

اسی طرح اگر اتنی زائد رقم لی جارہی ہے جو اجرت مثل بن سکتی ہے تو اس کو سروس چارج کے دائرے میں رکھ کر روا رکھا جائے گا، حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ کا رجحان بھی اسی کی جانب ہے (دیکھئے: منتخبات نظام الفتاوی ۲۰/ ۴۳۶ کتاب المعاملات، ط: ایفا)۔

(۵) اگر زائد رقم سروس چارج کے ضمن میں نہ آسکتی ہو:

لیکن زائد رقم جو لی جارہی ہے وہ معمول سے زیادہ ہے جس کو سروس چارج یا انتظامی خرچ کے دائرے میں نہیں لا سکتے، کیونکہ اس طرح کے معاملات میں اتنی زائد رقم کا استحقاق ثابت نہیں ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ سود وربا ہے جو کل قرض جر نفعًا کے باوصف حرام ہوگا۔

البتہ قرض لینے والا کسی مجبوری ولاچاری کی وجہ سے لے رہا ہے، مثلاً ضرورت کے بقدر مکان کی تعمیر مقصود ہے یا کاشتکاری و باغبانی جس پر اس کی زندگی و خورد و نوش کا انحصار ہے، اس کے لئے ضروری خرچہ تک مہیا نہیں ہے، یا کسی اور کاروبار کے لئے قرض لینا چاہ رہا ہے کہ بدون اس کے اس کی زندگی اجیرن ہوگی تو یہ ضرورت وحاجت کی صورت ہوتی ہے، ضرورت وحاجت کے وقت سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے، علامہ ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر: ۲۶۷ الفن الاول، القاعدۃ الخامسۃ)

(نفع کے ساتھ قرض لینا حاجت مند کے لئے جائز ہے)۔

لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اس قرض سے مقصود محض طرز رہائش کی بلندی اور کشائش و آسودگی کی افزونی نہ ہو، اگر بدون اس قسم قرض کے زندگی کی گاڑی پٹری پر رواں دواں رہ سکتی ہے تو سودی قرض پر اقدام کی گنجائش نہیں ہوگی، سود پر لعنت اللہ ورسول دونوں نے بھیجا ہے۔

(۶) مختلف ضروریات کی فراہمی کے لئے حکومت کی طرف سے امدادی رقوم:

لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھنا اور ان کو پورا کرنے کے لئے سامان فراہم کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری ہے، ملکی خزانہ جہاں دوسرے رفاہی کام ہوتے ہیں باشندگان وطن کی بنیادی ضروریات کی تکمیل بھی کی جاتی ہے، مثلاً مکان کی تعمیر، بیت الخلاء کا انتظام، تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل وغیرہ ان ضروریات کی تکمیل کی کفالت سے ہی ملک کی ترقی سمجھی جاسکتی ہے، گورنمنٹ بلاتفریق کچھ معیار بنا کر لوگوں کو امدادی رقوم دیتی ہے، یہ محض امداد و اعانت ہے، اگر

گورنمنٹ کے معیار کے مطابق کوئی ہے تو اس کو لینے میں اور استفادہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۸،۷) امدادی رقوم کی حصولیابی کے لئے واسطہ بننے والے کے لئے محنتانہ کا حکم:

امدادی رقوم کو حاصل کرنے میں کافی جدو جہد کرنی پڑتی ہے جو ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے اس کے لئے کچھ ایجنٹ ہوتے ہیں جو کام کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچاتے ہیں اور محنت کی مزدوری بھی وصول کرتے ہیں، حقیقت میں یہ دلالی ہے، مبسوط میں ہے:

''السمسار اسم لمن یعمل للغیر بالأجر بیعًا وشراءً'' (المبسوط سرخسی ۱۵/ ۱۱۵ باب السمسار)

یعنی جو واسطہ ہو، اصل نہ ہو اور تگ ودو کرتا ہے تو وہ دلال ہوتا ہے، دلال کی اجرت کا مدار عرف پر ہے حتی کہ اگر پرسنٹ کے حساب سے طے ہو جائے تو فقہاء نے اس کی گنجائش دی ہے، حضرت تھانویؒ کا رجحان بھی اس کے جواز، بلکہ فی صد کے حساب سے بھی جواز کا ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۲۹۳ سوال نمبر ۳۳۳)۔

ردالمحتار میں ہے: ''وإن سعی بینهما وباع المالك بنفسه یعتبر العرف. فتجب الدلالة علی البائع أو المشتری أو علیهما بحسب العرف'' (الدر مع الرد ۴/ ۴۶ کتاب البیوع، مطلب: فساد المتضمن یوجب... الخ)

(اگر دو شخصوں کے مابین سعی کرے، لیکن بیع خود مالک کرے تو عرف کا اعتبار ہوگا اور بائع یا مشتری یا دونوں کے لئے عرف کے اعتبار سے دلال کا حکم ثابت ہو جائے گا)۔

حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ ایک فتوی میں رقمطراز ہیں:

''دلال سو روپے میں خرید کر ایک سو پانچ روپیہ میں بیچ دے تو یہ جائز ہے، مگر اس صورت میں صرف پانچ روپے کا نفع ہوا اور یہ دلالی کی صورت نہیں ہے، دلالی یہ ہے کہ بائع ومشتری کے درمیان معاملہ کرایا جائے، اس میں بائع ومشتری دونوں کو ثمن کی حتمیت معلوم ہوتی ہے، اور دلال کو اس ثمن کے علاوہ اجرت ملتی ہے، خواہ وہ اجرت پانچ دس روپے کی صورت میں متعین ہو، خواہ اس طرح کہ فی صد دس روپے یا فی روپیہ ایک آنہ اجرت مقرر کی جائے وہ اجرت درست ہے جس قدر بھی ہو'' (فتاوی محمودیہ ۴/ ۰۷ دلالی کی اجرت، نسخہ قدیم)۔

لیکن اتنی بات ضروری ہے کہ وہ دلال وایجنٹ جو واسطہ بن کر محنت کر رہا ہے اس قسم کی محنت اس کے فرائض منصبی میں سے نہ ہو، اگر اس کے ذمہ یہ کام عائد ہی ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ محنت وکوشش کرتا ہے تو اس کے لئے محنتانہ رشوت کے درجہ میں ہوگا جسے لینے کی گنجائش تو قطعاً نہیں ہوگی، ہاں دینا بھی اس وقت جائز ہوگا، جبکہ حق کا حصول بدون اس کے ممکن نہ ہو۔

(۹) رشوت دینے کا حکم:

اللہ کے رسول نے عام حالات میں رشوت کے لینے ودینے دونوں سے منع فرمایا ہے، حدیث میں ہے:

''لعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم الراشی والمرتشی فی حکم'' (ترمذی ۱/ ۲۴۸ ابواب الاحکام، باب ما جاء فی الراشی والمرتشی، قال حدیث حسن) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی فیصلہ کی بابت رشوت دینے ولینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے)۔

البتہ بعض ناگزیر حالات ایسے بھی ہیں جن میں رشوت دیئے بغیر کام نہیں چلتا، بالخصوص آج کے سرکاری دفاتر وآفیسز کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، وہاں کا ہر چھوٹا وبڑا منہ کھولے بیٹھا ہے، جب تک اس کے حلق کے نیچے لقمۂ حرام نہیں جاتا کسی کام کو انجام دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا، مسلمانوں کے ساتھ تو ویسے بھی دوغلی پالیسی برتی جاتی ہے، گندی سیاست کے تحت ہر قسم کے منافع کا ارتکاز کر لیا گیا ہے، حالات دن بدن بد سے بدتر بلکہ بدترین ہوتے جارہے ہیں، آئندہ ہمارے حکمراں اور ان کے نوکر شاہ کیا کیا ناچ نچوائیں گے کہنا مشکل ہے، آج کے حالات میں کسی بھی امدادی فنڈ سے فائدہ اٹھانا جوئے شیر لانے کے مرادف ہے، ہاں اگر رشوت وگھوس کے لئے جیب ڈھیلی کر لی جائے تو ہر طرح سے کام بنتا نظر آتا ہے، لہٰذا حاجت مند حضرات کے لئے رشوت دے کر اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے، جو بھی وبال ہے وہ لینے والے پر ہوگا، علامہ شامی نے رشوت لینے ودینے کی چار قسمیں کی ہیں، تیسری قسم کو یوں بیان کرتے ہیں:

"الثالث: أخذ المال ليسوي أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع، وهو حرام على الآخذ فقط" (رد المحتار ۴/ ۳۲۸ کتاب القضاء، مطلب: في الكلام على الرشوة والهدية) (تیسری قسم ہے، مال لینا تا کہ دینے والے کے معاملہ کو سلطان کے پاس ٹھیک کردے ضرر کو دفع کرنے یا نفع حاصل کرنے کے لئے تو یہ صرف لینے والے پر حرام ہے)۔

"ومنها: إذا دفع الرشوة خوفًا على نفسه أو ماله، فهو حرام على الآخذ، غير حرام على الدافع، وكذا إذا طمع في ماله، فرشاه ببعض المال" (البحر الرائق ۶/ ۲۵۲ کتاب القضاء، ط: مکتبہ رشیدیہ پاکستان)

(رشوت کی ایک قسم یہ ہے کہ رشوت جان یا مال کے خوف کی وجہ سے دیا ہے تو یہ لینے والے پر حرام ہے نہ کہ دینے والے پر، اسی طرح جب مال کی خواہش کی ہے تو اس نے اس کو کچھ رشوت میں دیا ہے)۔

نیز لینے والے کے لئے یہ حرمت اس وقت ہے، جبکہ لینے والا اس کام کے لئے مقرر ہو، اگر لینے والے کے فرائض منصبی میں سے وہ کام کرنا نہ ہو محض وہ اعانت کرنا چاہ رہا ہے تو اس کو مال دینا رشوت نہیں، بلکہ اجرت ہوگا، اور جائز ہو جائے گا۔

موسوعہ فقہیہ میں البحر الرائق کے حوالہ سے مذکور ہے: "إعطاء إنسان غير مؤظف عند القاضي أو الحاكم مالًا ليقوم بتحصيل حقه له؛ فإنه يحل دفع ذلك وأخذه" (موسوعہ فقہیہ ۲۲/ ۲۲۳)

(کسی ایسے انسان کو مال دینا جو قاضی یا حاکم کے پاس ملازم نہیں ہے؟ تا کہ حق کو حاصل کر سکے تو اس کو دینا اور لینا حلال ہے)۔

(۱۰) غلط طریقے سے امدادی رقوم کو حاصل کرنا:

کسی شئی کے حلال ہونے کے لئے دو باتیں لابدی ہیں، ایک تو فی نفسہ وہ شئی حلال ہو، دوسرے حصول کے طریقے میں کوئی خرابی نہ ہو۔

امدادی رقوم کو حاصل کرنے کے لئے جو معیارات متعین ہیں ان کی پاسداری ازبس ضروری ہے، اس کی خلاف ورزی، نیز کذب بیانی و دروغ گوئی، دھوکہ و فریب کے ذریعہ حاصل کرنا شریعت کی نگاہ میں حرام ہوگا، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من غش فليس منا" (ترمذی ۱/ ۲۴۵ ابواب البیوع، باب ما جاء في كراهية الغش في البيوع) (جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔

کذب و دروغ گوئی کی شناعت میں متعدد حدیثیں وارد ہیں، ایک حدیث میں تو رسول اللہ ﷺ نے اتنی بار "ألا وقول الزور" کہا کہ صحابہ پریشان ہو گئے اور تمنا کرنے لگے: "ليته سكت" جب انسان جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے سخت بدبو پھیلتی ہے فرشتے بھی نفرت کرنے لگتے ہیں، حدیث کے الفاظ ہیں: "إذا كذب العبد تباعد عنه الملك ميلًا من نتن ما جاء به، وقال حسن" (ترمذی ۲/ ۱۸، ابواب البر والصلة، باب ما جاء في الصدق والكذب)

(جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ ایک میل اس کی بدبو سے دور ہو جاتا ہے)، علامہ نووی نے اس پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"أما المخادعة في منع ما عليه أو عليها أو أخذ ما ليس له أو لها فهو حرام بإجماع المسلمين" (شرح النووي على مسلم ۱۶/ ۱۵۸) (بہر حال اپنے اوپر جو واجب ہے اس کو روکنا اور ناحق کو طلب کرنے میں دھوکہ دہی تو مسلمانوں کا اجماع ہے کہ حرام ہے)۔

"موسوعہ فقہیہ" میں ہے: "اتفق الفقهاء على أن الغش حرام سواء أكان بالقول أم بالفعل، سواء أكان بكتمان العيب في المعقود عليه أو الثمن، أم بالكذب والخديعه، وسواء أكان في المعاملات أم في غيرها من المشورة والنصيحة" (الموسوعة الفقهية الكويتيه ۳۱/ ۲۱۹) (فقہاء کا اتفاق ہے کہ دھوکہ دینا حرام ہے خواہ قول سے ہو یا فعل سے، یا سامان کے عیب یا قیمت کو چھپا کر ہو یا جھوٹ و دھوکہ دہی سے، خواہ معاملات میں ہو یا مشورہ و نصیحت میں)۔

اس تفصیل کا تقاضا ہے کہ متعین معیار پر نہ اترنے والے حضرات محض تکثیر مال کے لئے جھوٹ و فریب جیسے گناہ کا ارتکاب نہ کرے، یہ اس کے حق میں خسارہ کا سامان ہے، نیز بے برکتی کا خمیازہ کسی نہ کسی وقت ضرور بھگتنا پڑ سکتا ہے، اگر کسی نہ کسی مصلحت الہی سے یہاں ڈھیل ہو بھی گئی تو آخرت

کا معاملہ بہت سخت اور نازک ہے۔

(۱۱) حکومت جو قرض بینک کے توسط سے دلاتی ہے:

انٹرسٹ وسود خود دے یا کسی کے توسط سے دلائے اس میں کچھ فرق نہیں پڑتا، مگر صورت حال یہ کہ حکومت کسی کو قرض دلا رہی ہے اور وہ قرض واپس بھی ہو رہا ہے، اور انٹرسٹ حکومت ادا کر رہی ہے، قرض لینے والا تو اسی رقم کو واپس کرتا جو لیا ہے، یہاں پر دو معاملہ ہے اصل قرض دہندہ تو حکومت ہے، بینک محض ثالث کی حیثیت سے ہے، ایک معاملہ بینک کا گورنمنٹ کے ساتھ ہے، دوسرا معاملہ حکومت کا قرض گرندہ کے ساتھ ہے۔ چونکہ قرض گرندہ کو اس پر سود دینا نہیں پڑ رہا ہے، لہٰذا یہ معاملہ جائز ہوگیا۔ دوسرا معاملہ حکومت وبینک کے مابین ہے جس میں سود کا معاملہ ہو رہا ہے، لہٰذا قرض گرندہ کا حکومت سے بینک کے توسط سے قرضہ لینا جائز ہوگا۔ جیسا حوالہ میں ہوتا ہے، تین نفری معاملہ ہوتا ہے، ہر نفر کا معاملہ اپنے فریق سے جداگانہ سمجھا جاتا ہے اور ایک معاملہ کی حرمت دوسرے کے اوپر اثر انداز نہیں ہوتی ہے، ایسا ہی قرض کے معاملہ کو سمجھنا چاہئے۔

لیکن قرض دہندہ بینک کو ہی قرض سے زائد رقم واپس کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل قرض دہندہ بینک ہے حکومت محض سفارشی اور واسطہ ہے، اب معاملہ بینک اور قرض گیرندہ کے مابین ہے، ان دونوں کے مابین معاملہ سود پر مبنی ہے، اس لئے ناجائز ہے، واللہ اعلم۔

(۱۲) محفوظ فنڈ سے تعاون:

بعض اسکیمیں ایسی بھی ہیں جن میں حکومت نے محفوظ فنڈ قائم کیا ہے، اس کا انٹرسٹ وصول کرتی ہے، اور اس رقم سے مختلف افراد واشخاص، نیز رفاہی اداروں کی مدد کرتی ہے، یہ حکومت کی طرف تعاون کی ایک شکل ہے، انٹرسٹ جمع کرنے کا معاملہ حکومت سے متعلق ہے، کافر سود خوروں سے ہدیہ وتحفہ لینے میں، دعوت قبول کرنے میں کبھی بھی حجاب محسوس نہیں کیا گیا ہے، مختلف واقعات ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود بے بہبود سے جن کی امتیازی شان "أكالون للسحت" (سورہ مائدہ: ۴۲) بیان کی گئی ہے، جب ان کی طرف سے بھی ہدیہ وتحفہ آیا تو قبول کرلیا گیا، اور استعمال بھی کیا گیا، امام بخاری نے ایک باب قائم کیا ہے اور چار قصے بیان کر کے کافروں سے تعاون یا بالفاظ دیگر ہدیہ قبول کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

(۱) ملک ایلہ کی طرف سے دلدل نامی خچر ہدیہ میں آیا جس کو اللہ کے رسول آخر زندگی تک اپنے استعمال میں رکھے رہے۔

(۲) دومۃ الجندل کے اکیدر نامی نصرانی بادشاہ نے ایک رومال ہدیہ کیا جو بہت ہی نفیس تھا۔

(۳) یہود خیبر کی ایک خاتون کی دعوت میں شریک ہوئے جس نے بکری میں زہر ملا کر آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا، اس کا ایک لقمہ بھی آپ نے منہ میں رکھ لیا تھا، مگر وحی کے ذریعہ جب علم ہوا تو اگل دیا، اس زہر کا اثر ہر سال ظاہر ہوا کرتا تھا حتی کہ وفات کے سال اس کا کافی اثر رہا۔

(۴) ایک غزوہ میں ۱۳۰ مجاہدین کا قافلہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا، کیا کسی کے پاس کھانے کے لئے کچھ ہے؟ ایک صحابی کے پاس ایک صاع طعام تھا، اس کو گوندھا گیا ادھر ایک لمبا تڑنگا مشرک اپنی بکریوں کو ہنکاتا ہوا آیا، اللہ کے رسول نے دریافت کیا:

"بيعًا أم عطية، أو قال: أم هدية" (بیع ہے یا تحفہ) اس مشرک نے جواب دیا کہ بیع ہے، آپ نے ایک بکری خرید لی۔

(بخاری ۳۵۶/۱ کتاب الهبة وفضلها، باب قبول الهدية من المشركين)۔

معلوم ہوتا ہے کہ کافروں بلکہ سود خوروں کے مال کو بشرطیکہ وہ کافر ہو لینے میں حرج نہیں ہے، ظاہر ہے ہندوستان کی حکومت کافروں کی حکومت ہے، شریعت کا پاس ولحاظ کیونکر کرے گی، ہر چند کہ کفار بھی معاملات میں شرعی حدود کے پابند ہیں، مگر اس کا تعلق آخرت سے ہے، اس لئے ان کے مال سے انتفاع کی گنجائش ہے، فتاوی دار العلوم کے ایک فتوی سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

"کفار کے حق میں سود حرام نہیں ہے؛ کیونکہ وہ مکلف فروعات کے نہیں ہیں، لہٰذا ان سے چندہ لے کر مسجد وعیدگاہ بنوانا درست ہے اور نماز اس میں درست ہے، اور "إنما يعمر مساجد الله" (سورہ برأت: ۱۷، ۱۸) کے منافی نہیں ہے، کیونکہ تعمیر کرانے والے مسلمان ہی سمجھے جائیں گے، کفار سے چندہ لے کر مسلمان تعمیر کراتے ہیں" (فتاوی دار العلوم بترتیب جدید ۴۸۱/۱۴)۔

☆☆☆

سرکاری اسکیموں اور حکومت کے سودی قرضوں سے استفادہ

مولانا ومفتی شاہد علی قاسمی [1]

ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں، اور یہ ملک جمہوری ہے، جو انسان کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق چلتا ہے، ایسے ملک میں یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ اس کا قانون اور اس کی فلاحی ورفاہی اسکیمات اسلامی شریعت کے مطابق ہوں، نیز مسلمانوں کے ساتھ حکومت کا دوہرا معیار ایک واضح حقیقت ہے، مسلمانوں کو حاشیہ پر رکھنے اور نظر انداز کرنے کی پالیسی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جبکہ اس ملک کے گیسو کو سنوارنے میں مسلمانوں کا اہم رول رہا ہے، اور ملک کو آزاد کرنے میں مسلمانوں کی قربانیاں دوسری مذہبی اکائیوں کے مقابلہ زیادہ ہیں، اس لئے حکومت کے خزانہ پر دوسری مذہبی اکائیوں کی طرح مسلمانوں کا بھی برابر کا حق ہے، سرکاری ملازمت ہو یا کوئی عہدہ، سرکاری مراعات ہوں یا کوئی اسکیم، سب میں مسلمانوں کو آگے بڑھنے اور انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ مسلمان ایسے معاملہ اور لین دین کو قبول نہیں کرسکتا جہاں شریعت اجازت نہ دیتی ہو، جیسے بینک کی ملازمت وغیرہ، اس تمہید کے بعد سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی بابت سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں:

جواب: سوال نمبر: ۱، ۲، ۳

اسکیم والا قرض حاصل کرنا:

حکومت کی ایسی اسکیم جس میں حکومت عوام کو قرض دے اور قرض کا ایک حصہ معاف کرے، ایسی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة وأن تصدقوا خير لكم" (البقرہ: ۲۸۰)۔

(اگر مقروض تنگ دست ہو تو تونگری آنے تک مہلت دی جائے اور یہ کہ تم معاف کردو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے)۔

قرض کے کل یا بعض حصہ کو معاف کرنا شرعاً ہبہ ہے، اور ہبہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔

ایسی سرکاری اسکیموں میں کچھ قیود بھی ہوتی ہیں، ان میں ایک یہ کہ حکومت ادائیگی کی مدت متعین کردیتی ہے، اس مدت کے اندر ادائیگی سے مقروض معافی والے حصہ سے مکمل استفادہ کرسکتا ہے، لیکن اگر مقروض اس مدت میں ادا نہیں کرپاتا ہے تو پہلے سے مقرر معاہدہ کے مطابق ماہانہ انٹرسٹ کی خاص مقدار کے ساتھ قرض کی واپسی کرنی پڑتی ہے، مقروض جتنی تاخیر کرتا جائے گا، انٹرسٹ کی رقم بڑھتی جائے گی، اور بڑھتے ہوئے وہ مرحلہ بھی آتا ہے جب واجب الاداء اصل رقم اور انٹرسٹ کی رقم دونوں کا مجموعہ اس رقم کے برابر ہوجاتا ہے جتنی رقم اولاً حکومت نے دی تھی۔

مثال کے طور پر حکومت نے ایک ہزار روپے قرض دیا، اور کہا کہ چار سو روپے معاف ہے، باقی چھ سو روپے پانچ مہینہ میں ادا کرو، اگر مقروض نے پانچ مہینہ میں قرض (چھ سو روپے) واپس نہیں کیا تو آنے والے مہینوں میں انٹرسٹ کے ساتھ واپس کرنا پڑے گا، اگر ماہانہ پچاس روپے انٹرسٹ لگ رہا ہے تو آٹھ ماہ کی تاخیر پر اسے مجموعی طور پر چار سو روپے انٹرسٹ کے اور چھ سو روپے اصل رقم یعنی کل ایک ہزار روپے واپس کرنے پڑ رہے ہیں، مزید تاخیر کی صورت میں یہ رقم مزید بڑھتی چلی جائے گی۔

ان تفصیلات کی روشنی میں غور کیا جائے تو چار صورتیں بنتی ہیں، ایک یہ کہ مقروض وقت پر قرض واپس کردے، جس میں انٹرسٹ کا سامنا نہیں

---

[1] استاذ و ناظم تعلیمات: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

کرنا پڑتا ہے، دوسری یہ کہ کچھ تاخیر ہوئی، یعنی اتنی تاخیر کہ واجب الاداء اصل رقم کے علاوہ مزید کچھ رقم دینی پڑ رہی ہے، لیکن اتنی رقم بھی نہیں کہ اس کا مجموعہ واجب الاداء اصل رقم اور معافی والی رقم کے مجموعہ کو پہنچ جائے، تیسری صورت یہ ہے کہ اتنی تاخیر ہوجائے کہ واجب الاداء اصل رقم اور انٹرسٹ کی رقم کا مجموعہ واجب الاداء اصل رقم اور معافی والی رقم کے مجموعہ کے برابر ہوجائے، چوتھی صورت یہ ہے کہ واجب الاداء اصل رقم اور انٹرسٹ کی رقم کا مجموعہ واجب الاداء اصل رقم اور معافی والی رقم کے مجموعہ سے بڑھ جائے۔

اگر پہلی صورت ہو جس میں انٹرسٹ کا سامنا ہی کرنا نہیں پڑتا ہے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، دوسری اور تیسری صورت جس میں انٹرسٹ دینا پڑتا ہے، وہ بھی حقیقت میں انٹرسٹ نہیں ہے، کیونکہ مقروض نے حکومت سے جتنا روپیہ لیا تھا، اسے واپس کرتے ہوئے یا تو اتنا ہی واپس کرنا پڑ رہا ہے یا اس سے بھی کم اور جب مقروض بڑھ کر واپس نہیں کر رہا ہے تو اس پر سود کا اطلاق نہیں ہوگا، کیونکہ سود نام ہے اس زیادتی کا جو عوض سے خالی ہو۔

''هو (الربوا) الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه'' (ہدایہ ۳/ ۷۸، ط: دیوبند)

اور زیر بحث صورت میں زیادتی کی بات ہی نہیں ہے؛ بلکہ واپسی برابری کے ساتھ ہو رہی ہے، یا حاصل کردہ رقم سے کچھ کم ہی، متعدد اکابر علماء نے بھی اس کے جواز کی صراحت کی ہے، سابق مفتی دار العلوم دیوبند مفتی نظام الدین صاحبؒ اپنا موقف پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

کسی نے پروجیکٹ سے مثلاً چار ہزار روپے کنواں کھدوانے یا مکان بنانے یا کسی اور صنعت وحرفت کے لئے نقد لئے اور محکمۂ پروجیکٹ نے اس میں سے اپنے قاعدہ کے تحت، مثلاً ایک ہزار بالکل معاف کردیئے اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقع دیا، اور پھر دو سال بعد سے چھوٹی چھوٹی اور لمبی قسطوں میں ادائیگی کے لئے متعین کیا، اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کرکے وصول کیا، مگر کل رقم وصول کی چار ہزار، کل رقم قرضہ سے زائد نہ ہوئی تو ان قسطوں میں اصل پر جو زیادتی محکمہ نے وصول کی، وہ سود نہ ہوگی اور یہ معاملہ بھی جائز رہے گا؛ چونکہ مجموعہ قرض چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا۔

(نظام الفتاوی ۳/ ۱۶۴، ط: نئی دہلی)۔

چوتھی صورت جس میں مقروض کو حاصل شدہ رقم سے زائد رقم دینی پڑ رہی ہے، یہ یقیناً سود میں داخل ہے؛ کیونکہ سود کی تعریف اس پر صادق آرہی ہے، اس لئے کہ زائد رقم ایسی زیادتی ہے، جو عوض سے خالی ہے اور یہی سود کی تعریف ہے، اور سود سے حتی الامکان بچنا ضروری ہے، سود لینا تو بہر حال جائز نہیں ہے، حرام ہے، سود دینا بھی اصلاً ناجائز اور حرام ہے:

''لعن الله آكل الربا وموكله'' (ابوداؤد ۲/ ۴۷۳، باب فی اکل الربوا وموکلہ)۔

تاہم مجبوری کی صورت میں سود دینا جائز ہوجاتا ہے، علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر: ۱۴۹، القاعدة الخامسة، الضرر يزال)۔

اس لئے اگر مقروض نے محض سستی، کاہلی اور لاپرواہی یا کسی غیر معقول مجبوری کے بغیر اتنی تاخیر کی کہ حاصل شدہ رقم سے بھی زائد رقم دینی پڑ رہی ہے، تو وہ شرعاً گنہ گار ہوگا، اور موکل الربوا (سود کھانے والا) کے دائرہ میں آئے گا؛ لیکن اگر کسی نے معقول مجبوری کی وجہ سے ایسا کیا، جیسے وہ مختلف امراض وغیرہ میں مبتلا ہوگیا، اخراجات بڑھتے چلے گئے اور وقت پر مکمل قرض واپسی کی سبیل نہیں نکل سکی تو شرعاً وہ معذور سمجھا جائے گا، اللہ کی ذات رحیم وکریم ہے، امید ہے کہ اللہ معاف فرمائیں گے۔

ایک پہلو قابل توجہ یہ ہے کہ مذکورہ تمام صورتوں میں شرعاً ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ اس طرح کے قرضے اور اسکیمات سے استفادہ کنندہ کے لئے حکومت نے جو اصول وضوابط رکھے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر قرض کی ادائیگی میں تاخیر ہوتی چلی گئی تو انٹرسٹ کی رقم بھی بڑھتی چلے گی جائے گی اور زیادہ تاخیر کی صورت میں یہ رقم حاصل کردہ رقم سے بھی بڑھ سکتی ہے، جو شرعاً سود ہے، اس طرح سے یہ ایک شرط فاسد ہے، جو صلب عقد میں ہے، اور جب صلب عقد میں فساد ہو تو اس میں کراہت ضرور ہی آئے گی؛ تاہم محض اس کی وجہ سے مسلمانوں کو ایسی اسکیمات سے دور رکھنا مجموعی طور پر نقصان اور ضرر کا باعث ہے، اس لئے ضرر عام سے بچانے کے لئے ضرر خاص کو برداشت کیا جائے گا، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے:

''لو كان أحدهما أعظم ضررًا من الآخر، فإن الأشد يزال الأخف'' (الاشباہ والنظائر: ۱۴۳)۔

اس پس منظر میں اسکیمات سے استفادہ کنندگان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ وقت پر قرض کی واپسی کی کوشش کریں، تاکہ عملاً سود دینے سے بچا جاسکے، شدید مجبوری کے بغیر اتنی تاخیر ناجائز ہوگی کہ اسے حاصل کردہ رقم سے بھی زیادہ رقم واپس کرنی پڑے۔

جواب سوال نمبر: ۴، ۵

بینک کے جس قرضے پر شرح سود کم ہو یا زیادہ

غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ اصلاً سود ہے، خواہ شرح سود کم ہو یا زیادہ، دونوں صورتیں حرام ہیں، دکتور وہبہ زحیلی فرماتے ہیں: "وإن قلیل الربا و کثیرہ حرام" (التفسیر المنیر ۸۴/۴)۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: سود قلیل ہو یا کثیر، سب حرام ہے (بیان القرآن ۱/ ۵۷)۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بینک کو اپنی سرگرمیاں انجام دینے میں بہت سارے خرچے ہوتے ہیں، ملازمین کی مناسب تعداد ہوتی ہے، کمپیوٹر کا استعمال ہوتا ہے، کرایہ کے مکان میں بینک چلتا ہو تو اس کا مناسب کرایہ لگتا ہے، اس لئے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس پس منظر میں یہ بات قرین قیاس ہے کہ اگر ادا کی جانے والی زائد رقم اتنی کم ہو، جو معمولی ہو، یعنی اگر قرض لینے والے کی فائل بنانے، کمپیوٹر میں اندراج کرنے اور اس کے لئے استعمال ہونے والے وقت کی اجرتِ مثل نکالی جائے تو وہ زائد رقم کے مماثل ہو تو اسے سروس چارج کہنے میں مضائقہ نہیں ہے، اس سلسلہ میں معروف فقیہ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم رقمطراز ہیں:

قرض جاری کرنے اور اس کا حساب وکتاب رکھنے پر واقعی جو اخراجات آئیں، بینک کے لئے، اپنے قرض داروں سے بہ طور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے، جو اس منصوبہ کے قرض کے اجراء کے لئے پیش آتے ہیں؛ البتہ اگر پوری احتیاط سے ان اخراجات کی تحدید ممکن ہو تو یہ صورت احکام شرعیہ کے زیادہ موافق اور مناسب ہوگی، اور اس کے جواز میں کوئی کلام نہ ہوگا (فقہی مقالات ۱/ ۳۰۷ط: دیوبند)۔

اگر سود کی شرح کم ہو؛ لیکن اتنی بھی کم نہیں کہ اسے سروس چارج کہا جاسکے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ جو عام شرح سود کسی بھی عام قرضے میں مروج ہے، اس سے کم ہے تو محض کم شرح سود کی بنیاد پر اس کو سروس چارج کا عنوان دے کر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس معاملہ میں احتیاط کی ضرورت ہے، خصوصاً اس پس منظر میں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: سود سے بھی بچو اور شبہ سود سے بھی؛ چنانچہ سنن ابن ماجہ میں ہے:

"عن ابن عمر قال: إن آخر ما نزلت آیة الربا، وإن رسول اللہ ﷺ قبض ولم یفسرها لنا فدعوا الربا والریبة"

جہاں تک یہ بات کہ اس طرح کے قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار جیسے اہم کاموں کے لئے ہوتے ہیں تو اس کے باوجود ایک ناجائز صورت کو جائز قرار نہیں دیا جاسکتا؛ البتہ شریعت نے خاص مجبوری کی حالت میں ایک ناجائز صورت کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، اور وہ بھی بقدر ضرورت، جیسا کہ اضطرار کی حالت میں خنزیر کھانے کی اجازت دی، اور "غیر باغ ولا عاد" (سورہ بقرہ: ۱۷۳) کی قید بھی لگادی، اسی طرح مذکورہ بالا مصلحتوں کی خاطر سودی قرضے کی عمومی اجازت نہیں دی جاسکتی، جب تک کہ خاص مجبوری کی حالت نہ پیدا ہوجائے۔

جواب سوال نمبر: ۶، ۷، ۸:

حکومت کی رفاہی امداد قبول کرنا اور واسطہ بننے والے کو اجرت دینا:

حکومت مختلف رفاہی کام کرتی ہے، جیسے غریبوں کے لئے مکان کی فراہمی، یا اس کے لئے مناسب رقم کا عطیہ، بیت الخلاء بنانے کے لئے رقم مختص کرنا، تعلیمی ضروریات کے لئے مناسب تعاون وغیرہ، یہ سب صورتیں نہ صرف یہ کہ جائز ہیں؛ بلکہ ایسی رقم کو ضرور حاصل کرنا چاہئے، کیونکہ ملکی خزانہ میں تمام باشندوں کا حق ہے، اور اپنا حق وصول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں؛ بلکہ ایسی رقم کو حاصل کرکے اور ان کا صحیح استعمال کرکے لوگوں کو سہولت پہنچانا ایک مستحسن

عمل ہے، اس کی نظیریں عہد رسالت اور عہد فاروقی میں خصوصیت کے ساتھ اور بعد کے ادوار میں ملتی ہیں، جیسے مسافر خانے بنوانا، حضرت عمرؓ کا وظائف مقرر کرنا، بیواؤں اور مساکین کی مدد وغیرہ۔

البتہ ایسی امدادی رقوم حاصل کرنے میں کافی محنت اور تگ و دو کرنی پڑتی ہے اور بعض مرتبہ تو کئی چپلیں گھس جاتی ہیں، اگر یہی کام واسطہ بننے والے شخص سے کرایا جائے تو آسانی سے کام ہوجاتا ہے؛ لیکن واسطہ بننے والا مفت میں کام نہیں کرتا؛ بلکہ اسے محنتانہ دینا پڑتا ہے، اب محنتانہ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مطلوبہ محنت اور حاصل کی جانے والی رقم کو ملحوظ رکھتے ہوئے رقم کی مقدار مختص کردی جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ تناسب سے رقم مقرر کردی جائے، جیسے پانچ فیصد، دس فیصد وغیرہ۔

محنتانہ کی یہ دونوں صورتیں جائز ہوں گی یا نہیں؟ اس کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ واسطہ بننے والا کس طرح کا آدمی ہے، اگر واسطہ بننے والا ایسا ہے، جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ پوری رقم فراہم کرے، گویا وہ اسی شعبہ کا ملازم وخادم ہے، تو پھر اس کا محنتانہ لینا جائز نہیں ہے؛ بلکہ یہ رشوت ہے، اس لئے اگر وہ ملازم مسلمان ہو تو اسے رشوت لینے سے کلی اجتناب کرنا چاہئے، اس کی نظیر قاضی سے متعلق یہ مسئلہ ہے کہ اگر وہ فیصلہ کرنے کے لئے کسی فریق سے رقم لے تو یہ رشوت ہے؛ کیونکہ فیصلہ بلاعوض کرنا اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے، اگر رشوت لے ہی لے تو اس کی وجہ سے وہ فاسق ہوجائے گا، چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

''ولو کان (القاضی) عدلًا ففسق بأخذہا (الرشوۃ) أو بغیرہ وخصہا، لأنہا المعظم'' (الدر المختار مع رد المحتار ۵/ ۳۶۲ کتاب القضاء)۔

اگر واسطہ بننے والا اس شعبہ کا ملازم نہیں ہے اور وہ اس طرح کی رقم نکلوانے میں واقعی محنت کررہا ہے تو اس کے لئے محنتانہ لینا جائز ہے؛ کیونکہ اس کی حیثیت ایجنٹ کی ہے، جسے ''سمسار'' اور ''دلال'' کہا جاتا ہے، فی زمانہ دلالی کا معاملہ انتہائی مروج ہے، گوکہ حنفیہ کے اصول کے مطابق دلالی پر اجرت لینا جائز نہیں ہے؛ لیکن خود متاخرین احناف نے تعامل کو دیکھتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے، علامہ حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ نے بھی اس کا جواز نقل کیا ہے (دیکھئے: الدر المختار و رد المحتار باب البیع الفاسد)۔

واسطہ بننے والے کے لئے اجرت کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک رقم مختص کردینا، دوسرے: تناسب کے اعتبار سے دینا، رقم مختص کرنے کا جواز تو ظاہر ہے کہ اس میں جہالت نہیں ہے، اور اجرت میں اصل یہی ہے کہ وہ متعین ہو، جہالت نہ پائی جاتی ہو، اگر تناسب سے دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے، اس لئے کہ یہ بات دیکھی گئی ہے کہ اس متعین کام کے لئے حکومت جو بھی تعاون کرتی ہے، اس کی رقم مقرر ہوتی ہے اور جب حکومت سے آنے والی رقم متعین ہوتی ہے تو اگر واسطہ بننے والے کو تناسب سے دیا جائے تو اس میں بھی جہالت باقی نہیں رہتی ہے، جیسے ایک مکان کی تعمیر کے لئے حکومت نے ایک سو روپے متعین کردیا، اب اگر تعاون لینے والا واسطہ بننے والے کے لئے پانچ فیصد محنتانہ مقرر کردے تو اسے پانچ روپے ملیں گے؛ کیونکہ سو روپے کا پانچ فیصد پانچ روپے ہوتا ہے، گویا تناسب سے محنتانہ مقرر کرنے میں بھی حرج نہیں ہے۔

جواب سوال نمبر: ۹

امدادی رقوم حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا:

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ واسطہ بننے والا خود اس شعبہ کا ملازم ہو اور اس کی ذمہ داریوں میں وہ کام کرنا ہو، پھر بھی محنتانہ مانگے تو یہ رشوت ہے، یا اس کا مصرف دستخط کرنا ہو اور وہ اس پر رقم کا مطالبہ کرے، یا اس ڈپارٹمنٹ کے عہدیداران آپس میں رقم متعین کرلیں، جیسا کہ یہ کثیر الوقوع ہے، اور یہ جملہ بکثرت سنا جاتا ہے کہ ہر ٹیبل پر کھلانا پڑتا ہے، بہر حال یہ سب صورتیں رشوت کی ہیں اور رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی'' (ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۵۸)۔

تاہم رشوت دینا مجبوری کے وقت جائز ہوجاتا ہے، جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ ظالم بادشاہ کے ظلم سے بچنے کے لئے کچھ دینا پڑے تو اس کی اجازت ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له. ليس برشوة. يعني في حق الدافع'' (شامی ۶/ ۴۲۳ ط: بیروت)۔

رہی یہ بات کہ کیا اس طرح کی امدادی رقوم کے حصول کے لئے رشوت دینا جائز ہے؟ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے کہ اس طرح کی امدادی رقوم حاصل کرنا ہی ضروری نہیں ہے اور جب یہ ضروری نہیں تو گویا مجبوری بھی نہیں ہے، اور جب مجبوری نہیں ہے تو رشوت دینا بھی جائز نہیں ہے؛ لیکن اس میں ایک اور پہلو زیادہ اہم ہے اور وہ اپنا جائز حق وصول کرنا، ہندوستان جیسے ملک میں اگر مسلمان اس طرح کے جائز حقوق وصول نہ کریں تو مجموعی طور پر خسارہ کی بات ہے، مسلمان یہاں ویسے ہی کافی پیچھے ہیں، مزید پیچھے ہوتے چلے جائیں گے، جیسے عام طور پر سرکاری نوکری حاصل کرنے میں رشوت دینا پڑتی ہے، اب اگر رشوت دینے کے مفسدہ کی وجہ سے سرکاری نوکری کے حصول کو ناجائز قرار دیا جائے تو یہ بڑے خسارہ کی بات ہوگی، اسی طرح امدادی رقوم میں مسلمانوں کا حق ہے، اس سے پہلوتہی اختیار کرنا خسارہ کا باعث ہے، اس لئے اپنے جائز حق کو وصول کرنا درست ہے، خواہ رشوت دینی پڑے، حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

اپنا حق وصول کرنے کے لئے اگر مجبوراً رشوت دی جائے تو امید ہے کہ رشوت دینے والا گناہ سے بچ جائے گا (فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۵۶ ط: ڈابھیل)۔

اسی طرح سبل السلام میں ہے:

''فعلى هذا بذل المال للتوصل إلى الحق لا يكون رشوة'' (سبل السلام ۲/ ۵۹)۔

غلط بیانی اور غلط طریقہ سے امداد یا قرض حاصل کرنا:

اگر کسی امدادی رقم یا قرض حاصل کرنے کے لئے حکومت نے کچھ ضابطے اور اصول مقرر کر رکھے ہوں، تو ان اصولوں کا لحاظ ضروری ہے، مثلاً امدادی رقم کے حاصل کرنے کے لئے حکومت نے مالی معیار مقرر کر دیا ہو کہ جس کے پاس زیادہ سے زیادہ اتنا مال ہو، وہی اس امداد کا مستحق ہے، اب وہ امداد ایسا شخص حاصل کرنا چاہتا ہے، جس کے پاس اس سے زیادہ مال ہے تو اس کے لئے امداد حاصل کرنا جائز نہیں ہوگا؛ کیونکہ اس میں جھوٹ اور دھوکہ ہے، اور حق والوں کا حق مارنا بھی، جھوٹ اور دھوکہ ہونا تو واضح ہے، اور حق والوں کا حق مارنا اس اعتبار سے ہے کہ اگر غیر مستحق لوگ سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھائیں گے تو جتنے مستحقین کو اسکیم سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا، اتنے لوگ نہیں اٹھا سکیں گے، علامہ ابن نجیم مصریؒ نے بیت المال سے ملنے والی مدد کی بابت غیر مستحق کے استفادہ کرنے والے کو دو ظلم کا مرتکب قرار دیا ہے، ایک ظلم تو غیر مستحق کا فائدہ اٹھانا، دوسرا ظلم مستحق کو محروم کرنا؛ چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

''رجل له عطاء في الديوان مات عن ابنين، فاصطلحا على أن يكتب في الديوان اسم أحدهما ويأخذ العطاء، والآخر لا شئي له من العطاء ويبذل له من كان له العطاء له مالًا معلومًا فالصلح باطل ويرد بدل الصلح والعطاء للذى جعل الإمام العطاء له، ...... غير أن السلطان إن منع المستحق فقد ظلم مرتين في قضية حرمان المستحق وإثبات غير المستحق مقامه'' (الاشباه والنظائر، قاعده:۱۹، تصرف الامام على الرعية منوط بالمصلحة)۔

بہر حال! امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے جو شرائط ومعیارات متعین ہوں، ان میں غلط بیانی اور غلط طریقہ اختیار کر کے انہیں حاصل کرنا درست نہیں ہے۔

جواب سوال نمبر: ۱۱

اگر حکومت بینک سے قرض دلائے اور اس کا بڑا حصہ خود ادا کرے:

بعض اسکیموں میں اگر حکومت ضرورت مندوں کو بینک سے قرض دلاتی ہو اور اس پر عائد ہونے والے انٹرسٹ کو حکومت خود ادا کرتی ہو تو ایسی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اور یہ سودی معاملہ کے دائرہ میں نہیں آئے گا؛ کیونکہ بینک بھی حکومت ہی کا ادارہ ہے، اور حکومت کا اپنے ہی ادارہ کو انٹرسٹ ادا کرنا انٹرسٹ نہیں؛ بلکہ اس کا تعاون ہے، جیسے ایک آدمی کی دو دکانیں ہو، اور وہ ایک دکان کی رقم کا تبادلہ دوسری دکان کی رقم سے کمی بیشی کے

ساتھ کرے، تو یہ سود نہیں ہے، اور جیسے آقا اپنے ماذون بالتجارۃ غلام سے ربوی معاملہ کرے تو یہ شرعاً سود نہیں ہے، جیسا کہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

''لا ربوا بین سید وعبده ولو مدبرًا، لا مکاتبًا، إذا لم یکن دینه مستغرقًا لرقبته وکسبه، ..... التحقیق الإطلاق، وإنما یرد الزائد لا للربا، بل لتعلق حق الغرماء'' (الدر المختار مع رد المحتار ۵/ ۱۸۵، باب الربوا)۔

گویا مقروض نے جتنا قرض لیا تھا، وہ واپس اتنی ہی رقم کر رہا ہے، نہ کہ بڑھ کر، اور جب قرض کا معاملہ تساوی کے ساتھ ہو تو اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے۔

اگر حکومت مکمل انٹرسٹ ادا نہ کرتی ہو، البتہ انٹرسٹ کا ایک بڑا حصہ ادا کرتی ہو، اور کچھ حصہ مقروض ادا کرتا ہو، تو اگر مشکل ہو، یعنی مقروض کی طرف سے ادا کئے جانے والا حصہ مجموعی طور پر اتنا ہو کہ جو مناسب رقم بن جاتی ہو، سروس چارج کے دائرہ سے باہر ہو، جس کی تفصیل سوال نمبر ۴، اور ۵ کے جواب میں آچکی ہے۔ تو گو مقروض معمولی تناسب ہی سے انٹرسٹ ادا کر رہا ہے، پھر بھی وہ سود ہے، اور جب سود ہے تو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا عام حالات میں جائز نہ ہوگا، ہاں! اگر شدید مجبوری ہو، یعنی ایسی مجبوری جس کی وجہ سے ناجائز چیز جائز ہوجاتی ہے، تب ہی اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوگی۔

جواب سوال نمبر: ۱۲-

محفوظ فنڈ سے استفادہ:

بینک کا بنیادی کاروبار سود پر مبنی ہے، دوسروں کو قرض دے کر انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اسی طرح دوسروں کی رقم لے کر سود ادا کرتا ہے، اور سود مال حرام ہے، ایک مسلمان کا اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، حکومت محفوظ فنڈ قائم کر کے بینک میں اسے ڈپازٹ کر دیتی ہے اور اس کے انٹرسٹ سے بعض تعلیمی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کرتی ہے، تو بہ ظاہر یہ رقم مال حرام ہے، گویا مال حرام سے حکومت تعاون کرتی ہے؛ لیکن اس میں غور وفکر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس محفوظ فنڈ کی مالک بھی حکومت ہے اور اس کے انٹرسٹ پر بھی اولاً حکومت کی ہی ملکیت قائم ہوتی ہے، گویا وہ سب رقم سرکاری خزانہ کا ایک حصہ ہے، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ سرکاری خزانہ میں مخلوط رقم رہتی ہے، یعنی کچھ حلال اور کچھ حرام، بعض آمدنی کے ذرائع حلال ہوتے ہیں اور بعض کے ناجائز، اس اختلاط کے باوجود حکومت کی رقوم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اس پہلو سے محفوظ فنڈ کے انٹرسٹ سے فائدہ اٹھانا جائز ہے کہ اس کا مال حرام ہونا متعین نہیں ہے۔

اگر اس کو مال حرام مان بھی لیا جائے تو بھی اس سے استفادہ جائز ہوگا؛ کیونکہ کافر سود کا مالک ہوجاتا ہے اور مسلمان کا اس سے لین دین جائز ہے، چنانچہ علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

''وکره لرب الدین أخذ ثمن خمر باعها مسلم لا کافر'' (تبیین الحقائق ۶/ ۲۷)۔

اسی طرح ''درد الحکام'' میں ہے:

''وجاز أخذ دین علی کافر من ثمن خمر، بخلاف المسلم'' (درر الحکام ۱/ ۳۱۸)۔

''فتاوی دار العلوم زکریا'' میں ہے:

اگر کافر کے پاس سود کا مال آیا تو کافر اس کا مالک بن جائے گا اور اس سے ہدیہ قبول کرنا جائز و درست ہوگا (فتاوی دار العلوم زکریا ۵/ ۶۱۴)۔

ہندوستان کی حکومت، حکومت کافرہ ہے، اس لئے زیر بحث مسئلہ میں اسی اعتبار سے حکم جاری ہوگا، اور سودی مال پر حکومت کی ملکیت کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اس سے استفادہ جائز ہوگا، جیسا کہ مذکورہ بالا فقہی عبارت سے واضح ہے۔

☆☆☆

سرکاری اسکیمیں اور ان سے متعلق دینی احکام

مفتی تنظیم عالم قاسمی [1]

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ رعایا کو ہر ممکن سہولت فراہم کرے۔ ان کی معاشی، معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی ضروریات کی تکمیل اور ترقیات کے لئے منصوبے بنائے اور کوشش کرے کہ ملک کا کوئی شہری بھوکا نہ رہے۔ دیگر ممالک کے شہریوں سے زیادہ یہاں کے شہری خوش حال رہیں اور کسی طرح کی دشواری ان کو پیش نہ آئے بالخصوص وہ لوگ جو شہر میں پسماندہ اور دبے کچلے ہیں جن کو بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لئے بھی اسباب مہیا نہیں ہیں ان کے تئیں حکومت کو فکرمند ہونے اور ان کو اوپر اٹھانے کے لئے مختلف اسکیموں کی تشکیل کی ضرورت ہے، تاکہ ضرورت مند افراد ان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو روشن بناسکیں۔

ان ہی فرائض کی وجہ سے حکومتیں مختلف اسکیم تیار کرتی ہیں اور اس کے ذریعے عوام کو سہولیات فراہم کرتی ہیں۔ ان اسکیمات کا اہم مقصد عوام کا تعاون اور ان کی امداد ہے، تاہم بعض سرکاری ایسی بھی اسکیمیں ہوتی ہیں جن میں سود اور دیگر شرعی قباحتوں کا وہم ہوتا ہے، اس لئے حکومت کی جانب سے فراہم کردہ ان اسکیموں کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ نہایت ضروری تھا، تاکہ مسلمان ناجائز اسکیموں سے احتیاط کریں اور اسکیم کی جائز صورتوں سے استفادہ کرسکیں، کیونکہ ایک غیر مسلم شہری کو سرکاری اسکیموں سے استفادہ کا جس طرح حق ہے ویسے ہی مسلمان شہریوں کو بھی حق ہے۔ اس پس منظر میں درج ذیل سوالات قابل توجہ ہیں:

(۱) ان قرضوں کا حکم جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے:

حکومت کی جانب سے عوام کو دیئے گئے ایسے قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے یہ دراصل شہریوں کا ایک قسم کا تعاون ہے۔ حکومت کا مقصد عوام میں بیداری لانا، ان کو متحرک کرنا اور ان کو کام سے لگانا ہوتا ہے، تاکہ کوئی شہری بیکار نہ بیٹھے، بلکہ کسی نہ کسی پیشہ اور عمل سے وابستہ رہے۔ اس طرح خود عوام کے گھروں میں خوش حالی آئے گی اور اس سے ملک بھی خوش حال ہوگا' گویا حکومت اس کے ذریعے اپنے فرائض کی تکمیل کررہی ہے۔ اگر کسی کے پاس زراعت یا تجارت کے لئے پونجی نہیں ہے تو حکومت عوام کو اس طرح کے قرضہ کے ذریعے ابھارتی ہے کہ یہاں سے قرضہ لو اور کام کرو اور پھر بعد میں مقررہ اصول کے مطابق حکومت کو رقم واپس کردو، مکمل قرضے نہیں، بلکہ اس میں اس قدر چھوٹ ہے۔ یہ اس لئے کیا جاتا ہے، تاکہ اس میں عوام کی دلچسپی برقرار رہے جو لوگ نہیں بھی لینا چاہتے ہیں ان کے اندر بھی ایک طرح کی حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ لوگ بھی کچھ نہ کچھ کام شروع کردیتے ہیں' اگر مکمل قرض کی واپسی کی بات کی جاتی تو کوئی نئی بات محسوس نہ ہونے کے سبب اس میں دلچسپی پیدا نہ ہوتی۔

ایک غزوہ سے واپسی کے موقع پر سفر کے دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے ایک اونٹ خریدا اور جب مدینہ واپس ہوکر دربار رسالت میں اونٹ لے کر حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین قیمت ادا کی مگر اونٹ واپس فرمادیا، اس لئے کہ آپ کا مقصد اونٹ خریدنا نہیں تھا، بلکہ ان کا تعاون کرنا مقصد تھا، اس لئے کہ ان کے والد غزوۂ احد میں شہید ہوگئے تھے اور بہت سی لڑکیاں چھوڑ کر گئے تھے جن کی کفالت حضرت جابرؓ کرتے تھے' آپؐ نے ان کے تعاون کی یہ راہ نکالی اسی طرح حکومت کی جانب سے پسماندہ لوگوں کے تعاون کی یہ شکل ہے' مقصد پر نظر رکھتے ہوئے اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ یہ مستقرض کا اپنے قرض خواہ کو بعض قرضوں سے بری کرنا ہے۔ جس طرح ایک مستقرض اپنے قرض خواہ کے حال پر رحم کرتے ہوئے

[1]

کل یا بعض حصہ معاف کرسکتا ہے اسی طرح یہاں بھی حکومت مقرض ہے اور عوام قرض خواہ، حکومت چاہے تو کل قرضے معاف کرسکتی ہے، جیسا کہ بسا اوقات بہت سے قرضوں کی مکمل طور پر معاف کرنے کا اعلان کرتی ہے اور چاہے تو بعض حصے معاف کرسکتی ہے اور یہ شکل بعض حصہ معاف کرنے کی ہے۔ علامہ زیلعی قرضوں کے بعض حصے کی معافی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''(قوله ففعل صح) أي أخر رب الدين أو حط بعض الدين بأن ابرأ المديون عن بعض الدين'' (تبيين الحقائق ۵/۴۴)۔

(۲) مدت میں قرض ادا نہ کرنے پر پوری رقم کی واپسی:

یہ درحقیقت حکومت کی جانب سے قرضوں کی وصولیابی کے لئے ایک حکمت اور مفید طریقۂ کار ہے۔ عام طور پر عوام قرضے لینے کے بعد غفلت کے شکار ہوجاتے ہیں، ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ حکومت اگر ان قرضوں کی واپسی کے لئے یہ طریقۂ کار اختیار نہ کرے تو اس طرح حکومت کا خزانہ ہی خالی ہوجائے گا اور پھر دوسرے مستحقین کو قرضوں کی فراہمی ناممکن ہوگی۔ اس لئے حکومت کی جانب سے بعض قرضوں کی معافی کی مدت متعین کردی جاتی ہے کہ اتنے وقت میں قرض لینے والے محنت اور جدوجہد کے ذریعے اپنی حالت کو مستحکم کرلیں اور باقی قرضے حکومت کو واپس کردیں۔ اس حکمت عملی کا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگ سستی سے کام نہیں لیں گے، مکمل قرض کی واپسی کے خوف سے محنت سے کام کریں گے اور جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجائیں گے اور یہی حکومت کا مقصد بھی ہے۔ اسی طرح اس حکمت عملی سے عوام کا تعاون بھی ہوجائے گا اور حکومت کو وقت پر قرضے وصول ہوجائیں گے اور پھر وہ دوسروں کا تعاون بھی کرسکے گی۔

اس میں وقت پر قرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے متعین رقم سے زائد رقم ادا کرنی ہوتی ہے، اس لئے ربا کا وہم ہوتا ہے حالانکہ یہ حقیقت میں ربا نہیں ہے، اس لئے کہ لی ہوئی رقم سے زیادہ واپس نہیں کرنی ہوتی ہے، جتنی رقم قرض خواہ نے لی ہے اتنی ہی دینی پڑتی ہے اور ربا کہا جاتا ہے ایسی مشروط زیادتی کو جو بلاعوض ہو۔ علامہ سرخسی کہتے ہیں:

''الربا هو الفضل الخالي عن العوض المشروط في البيع'' (مبسوط ۱۲/ ۱۰۹)۔

صاحب ''ہدایہ'' لکھتے ہیں:

''هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه'' (ہدایہ ۳/ ۷۸)۔

اس سے معلوم ہوا کہ متعین رقم سے زائد رقم اصلی رقم کے مساوی ہونے کے سبب سود نہیں ہے، البتہ اسے یہ کہا جائے گا کہ مقرض نے قرض کی معافی کے لئے کچھ کنڈیشن اور اصول متعین کردیئے ہیں جن کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے قرض خواہ اس تبرع کا مستحق نہیں ہوسکا۔

(۳) زائد رقم ادا کرنے کی صورت کا حکم:

اگر مقررہ مدت کے بعد قرض واپسی کی صورت میں اصل رقم سے زائد رقم دینی پڑے تو بھی دو وجہ سے ان کے جواز کی طرف ذہن جاتا ہے ایک تو یہ کہ اسے ربا کے بجائے حکومت کی جانب سے مالی تعزیر مان لی جائے، چونکہ حکومت نے اسے وقت متعین پر ادا کرنے کا پابند بنایا تھا اور اسے محنت ومشقت کے ذریعے وقت پر استحکام حاصل کرنے کی ترغیب دی تھی، لیکن جب قرض خواہ نے سستی سے کام لیا اور حکومت کی اسکیم کے مقصد کو پورا نہیں کرسکا تو حکومت نے اسے مالی تاوان کا حکم دیا، تاکہ اس کے خوف سے وہ وقت پر قرض واپس کرسکے اور دوسروں کو بھی جدوجہد کا پیغام مل سکے۔ حکومت اپنے عوام پر مالی تعزیر کا حق رکھتی ہے۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''والتعزير يكون إما بالضرب أو بالحبس أو الجلد أو النفي أو التوبيخ أو التعزير المالي، ونحو ذلك مما يراه الحاكم رادعا للشخص بحسب اختلاف حالات الناس، حتى القتل سياسة ما قرر فقهاء الحنفية والمالكية'' (الفقه الاسلامي و ادلته ۴/ ۳۱۴۵)۔

اور اگر اسے ربا مان بھی لیا جائے تو بھی اس لئے جائز ہے کہ ضرورت مندوں کے لئے سود کا دینا جائز ہے اور یہ شخص ضرورت مند لاچار اور مجبور ہے اس

لئے اس کے لئے سود کے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اس شکل میں حقیقی لاچار اور ضرورت مند ہونا ضروری ہے، یعنی ان ہی صورتوں میں اس اسکیم سے استفادہ درست ہوگا جن میں سود دینا کسی کے لئے جائز ہوتا ہے۔ زائد رقم کو ربا ماننے کی شکل میں اپنی تجارت کو بڑھانے یا خوبصورت مکان کی تعمیر وغیرہ کے لئے اس سے استفادہ درست نہیں ہوگا۔

(۴) قرضوں پر سروس چارج کا حکم:

حکومت کی جانب سے دیئے گئے قرضوں پر اگر معمولی اضافہ لیا جائے تو اسے سروس چارج کا نام دے کر جائز کہا جاسکتا ہے بشرطیکہ زائد لی ہوئی رقم واقعتاً معمولی اور اتنی ہی رقم ہو جتنی انتظامی امور پر خرچ ہوتی ہے، جیسے کاغذات تیار کرنا، اس کے اندراج کے لئے رجسٹر بنانا، ادارے میں کام کرنے والوں کی تنخواہ کی ادائیگی وغیرہ۔ اس وقت یہ کہا جائے گا کہ حکومت یا کسی بھی ادارے کا اصل مقصد تو ضرورت مندوں کو مفت قرض فراہم کرنا ہے، مگر سروس چارج کے طور پر قرض خواہ سے کچھ زائد رقم لے رہا ہے، تاکہ سروس چارج کا بوجھ ادارہ پر نہ ہو، یہ شکل درست ہے۔ ذخیرۂ فقہ میں اس کی نظیر وہ مسئلہ ہے، جو فقہاء نے بیان فرمایا ہے کہ قاضی اور مفتی کے لئے فتوی اور فیصلہ کرنے پر مدعی اور مستفتی سے اجرت طلب کرنا جائز نہیں ہے؛ لیکن مفتی کے لئے فتوی تحریر میں لانے اور قاضی کے لئے دستاویزات لکھنے اور رجسٹر میں اندراجات کرنے کی اجرت لینا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اجرت ایسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو، چنانچہ درمختار میں علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

" يستحق القاضي الأجر على كتب الوثائق والمحاضر والسجلات قدر ما يجوز لغيره كالمفتي ؛ فإنه يستحق أجر المثل على كتابة الفتوى ؛ لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان. ومع هذا الكف أولى احترازا عن القيل والقال، وصيانة لماء الوجه عن الابتذال " (در مختار مع الشامی : ۹/ ۱۲۷، ط : زکریا، دیوبند)۔

(۵) زائد رقم غیر معمولی ہو تو کیا حکم ہے:

لیکن اگر معمول سے زیادہ رقم لے رہا ہو، یعنی اتنی رقم جتنی عام طور پر معاشرہ میں ربا کے طور پر وصول کی جاتی ہے تو پھر درست نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس وقت اسے سروس چارج کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے، اگرچہ ادارہ سروس چارج کا ہی نام کیوں نہ دے، نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی ہے۔

"على ما قال عمر رضي الله عنه: هذه جزية، فسموها ما شئتم. ولهذا تصرف مصارف الجزية. ولا جزية على النسوان" (ہدایہ ۲/ ۴۰۵)۔

البتہ اگر قرض خواہ ضرورت مند ہو اور جن صورتوں میں سود پر رقم لینے کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے ان میں سے کوئی صورت پائی جائے تو زائد رقم کی غیر معمولی ہونے کی صورت میں بھی جائز ہے۔ جیسے اس کے پاس اپنے علاج کے لئے پیسے نہ ہوں۔ خورد ونوش کے لئے پیسے نہ ہوں۔ بے روزگار ہو اور بنیادی روزگار کے لئے قرض کی ضرورت ہو۔ ذاتی مکان نہ ہو اور طویل مدت تک کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو اور صرف بقدر ضرورت مکان حاصل کرنا چاہتا ہو۔ اس کے پیشہ کے حساب سے گاڑی ضروری ہو اور ذاتی گاڑی نہ ہو۔ کاروبار ایسے مرحلہ میں ہو کہ اگر قرض فراہم نہ ہوا تو بہت بڑا سرمایہ ڈوب جائے گا۔ شادی کے لئے پیسے نہ ہو وغیرہ۔

لیکن خیال رہے کہ ان لوگوں کے لئے سود پر قرض لینا اس وقت درست ہوگا، جبکہ تبرع کے طور پر کہیں سے قرض حاصل ہونے کا امکان نہ ہو اگر کوئی شکل ہو جس سے اس کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے جیسے کوئی اسلامی بینک ہو جو بلاسودی قرضے فراہم کرتا ہے یا کوئی رفاہی ادارہ ہو جہاں سے ضرورت کے مطابق بلاسودی قرضے مل سکتے ہوں تو ان کے لئے حکومت سے یا سرکاری بینکوں سے سودی قرضے لینا درست نہیں۔

(۶) سرکاری امدادی رقم:

سرکار کی جانب سے دی گئی امدادی رقم درست ہے جیسے حکومت مکان یا بیت الخلاء کی تعمیر، تعلیمی، اقتصادی یا جسمانی ضروریات کی تکمیل کے لئے کچھ رقم عوام کو فراہم کرے اور اپنی زندگی بہتر کرنے کی ہدایت دے۔ اس کو حکومت کی جانب سے شہریوں کی اعانت کا نام دیا جائے گا، بلکہ یہ ایک طرح سے خود حکومت کے لئے اپنے فرائض کی تکمیل ہے، کیونکہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ حسب گنجائش عوام کا تعاون کرے اور ان کی ضروریات کی تکمیل میں ہاتھ

بتائے۔ اسی ذمہ داری کا احساس تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے شہریوں کے لئے وظائف جاری کئے تھے اور آج تک مختلف ممالک میں اس کا سلسلہ جاری ہے خود ہندوستان میں بعض شرائط کے ساتھ مکان وغیرہ کے لئے حکومت مفت رقم فراہم کرتی ہے یا عمر کی ایک حد پار کرنے کے بعد ان کو پنشن دیتی ہے۔ مشہور محقق ڈاکٹر یوسف قرضاوی حکومت کی ذمہ داریوں پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تتسع دائرتها لكل التصرفات و الإجراء ات التي من شأنها أن ترفع الظلم، و تقيم العدل بين الناس، و تزيل عنهم الضرر و الضرار، و أسباب النزاع و الصراع، ليحل محله التعاون والأخاء'' (فتاویٰ معاصره: ۱/ ۵۸۱)۔

اس کے دلائل اور وجوہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں: '' ومن ههنا نقول إن من واجبات الحكومة المسلمة أن تنظم علاقات الناس على أسس سليمة، فتضع من الأنظمة والقوانين ما يحقق العدل، و يرفع الظلم، و يشيع الطمانينة و الاستقرار بين الناس، و يزيل اسباب النزاع والخصام من بينهم'' (فتاویٰ معاصره:۱/ ۵۹۳)۔

ایک جگہ لکھتے ہیں: '' فكل مايرى ولي الأمر فعله أقرب إلى الصلاح للرعية وأبعد عن الفساد، فله أن يفعله بل قد يجب عليه، وإن لم يجئ بذلك نص خاص'' (فتاویٰ معاصره :۱/ ۵۸۳)۔

(۷) واسطہ بننے والوں کی اجرت:

ہر شخص کو ہر کام نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو بعض وجہ سے خود انجام دینا نہیں چاہتا اسی لئے شریعت نے دلالی اور اس کے پیشہ کو درست قرار دیا ہے۔ اس اجرت کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک شکل تو یہ ہے کہ مکمل کام پر متعین رقم طے کر لی جاتی ہے جیسے کسی کام کے کرنے پر ہزار یا دو ہزار روپے آپس میں طے کر لئے جائیں، لہٰذا جب کام مکمل ہوگا تو بیچ والا آدمی اس متعین رقم کا مستحق ہو جائے گا اور ایک صورت یہ ہے کہ متعین رقم کے بجائے فیصد متعین کیا جائے جیسے زمین فروخت کرنے پر کل رقم کا دو فیصد متعین کر لیا جائے، محقق قول کے مطابق یہ دونوں صورتیں جائز ہیں اور اسی پر آج کل فتویٰ بھی دیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں امام بخاریؒ نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت دلالی کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔

''ولم ير ابن سيرين، وعطا، وا براهيم، والحسن باجر السمسار باسا وقال ابن عباس: ''لا بأس أن يقول: بع هذا الثوب، فما زاد على كذا وكذا، فهو لك'' وقال ابن سيرين: ''إذا قال: بعه بكذا، فما كان من ربح فهو لك، وبيني وبينك، فلا باس به'' وقال النبي ﷺ: المسلمون عند شروطهم'' (صحیح بخاری باب اجر السمسرة)

گورنمنٹ کی جانب سے ملنے والی امدادی رقم کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہر ایک کو طریقہ کار سے واقفیت بھی نہیں ہوتی اور ہر شخص اس قدر جدوجہد کا متحمل بھی نہیں ہوتا، اس لئے اس میں جانکار افراد سے مدد لی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ مستقل طور پر کوئی شخص مفت یہ جدوجہد نہیں کر سکتا، اس لئے ان کے لئے جو عوض متعین کیا جائے ان کا لینا اور دینا درست ہے اور اس کو دلالی کی اجرت پر قیاس کیا جائے گا کیوں کہ یہ شخص حکومت اور مستحق شخص کے درمیان واسطہ بن رہا ہے اور اسے امداد دلانے کے لئے محنت کر رہا ہے گویا یہ اس کا محنتانہ ہے جس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

اسی طرح اس کو وکالت پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ چوں کہ ایک آدمی جو خود کوئی کام انجام دے سکتا ہے دوسرے کو بھی اس کا وکیل بنا سکتا ہے:

''كل عقد جاز أن يعقده الإنسان بنفسه جاز أن يوكله به غيره، لأن الإنسان قد يعجز عن المباشرة بنفسه على اعتبار بعض الأحوال فيحتاج إلى أن يؤكل به غيره، فيكون بسبيل منه دفعا للحاجة'' (ہدایہ ۳/ ۱۷۷)۔

(۸) واسطہ بننے والے کا رقم کا ایک حصہ لے لینا:

دلالی کی اجرت جائز ہے بشرطیکہ وہ اجرت عام کے بقدر ہو، اگر دلالی کے لئے اس قدر پیسے مانگے جائیں جو عموماً نہیں ہوتے تو اسے ظلم کہا جائے گا۔ آج کل بہت سے علاقوں میں سرکاری امداد کے لئے واسطہ بننے والے عام لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور من مانی پیسے لیتے ہیں جو ان کی محنت کی مقدار سے کئی گنا زائد ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ایک لاکھ پر پچاس ہزار یا چالیس ہزار وہ خود رکھ لیتے ہیں اور باقی رقم اصل مستحق کو دی جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات اصل مستحق تک رقم پہنچتے پہنچتے آدھی سے بھی کم رہ جاتی ہے، یہ سراسر ظلم، ناانصافی اور انسانیت و ہمدردی کے خلاف ہے۔ ایک شخص سرکاری دفاتر کے

آداب واصول سے ناواقف ہوتا ہے اس لئے وہ کسی جانکار شخص کا سہارا ڈھونڈ تا ہے اور مجبوراً بیچ والے شخص کو منہ مانگی رقم دینی ہوتی ہے، دل سے اس پر آمادہ نہیں ہوتا، گویا اکراہ کے ساتھ حامی بھر لیتا ہے، اس لئے اگر آپس میں اتنا حصہ لینے پر بات پہلے سے طے بھی ہوجائے تو یہ معاملہ کراہت سے خالی نہیں جیسے ایک مجبور شخص کے ہاتھ کوئی سامان عام بھاؤ سے زیادہ میں بیچا جائے اور یہ یقین ہو کہ اس شخص کو اس کی ضرورت ہے اور یہ کہیں اور دستیاب نہیں، اس لئے اسے یہاں لینا ہی ہوگا، فقہاء نے اسے طیب خاطر نہ ہونے کی وجہ سے مکروہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی فریقین کی رضامندی کی وجہ سے جائز کہا جائے گا، مگر کراہت میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اگر پہلے سے کچھ طے نہ ہوا اور پیسہ ملنے کے بعد من مانی رقم لے لی جائے تو یہ جائز نہیں ہے کیوں کہ یہاں اجرت متعین نہیں ہے اور اجرت متعین نہ ہو تو جائز نہیں ہے۔

''ولا تصح حتی تکون المنافع معلومة، والأجرة معلومة'' لما روینا، ولأن الجهالة فی المعقود علیه وبدله تفضی إلی المنازعة کجهالة الثمن والمثمن فی البیع'' (ہدایہ ۳/ ۲۳۰)۔

(۹) امدادی رقم کے لئے رشوت دینا:

آج کل جائز حق کی وصولیابی بھی مہنگی ہوتی جارہی ہے۔ انسانیت اور ہمدردی کے فقدان اور مادیت کا غلبہ ہونے کی وجہ سے ہر شعبے میں رشوت کا رواج بڑھتا جارہا ہے، اس کے بغیر امدادی رقم یا قرضوں کا حصول دشوار ہوگیا ہے۔ نیچے کے لوگ خاص طور پر اس میں بڑی ہیرا پھیری سے کام لیتے ہیں اور وہ رشوت لئے بغیر فائل آگے بڑھاتے ہی نہیں، ان حالات میں اپنا حق لینے کے لئے رشوت دینا درست ہے۔ فقہاء نے اپنا جائز حق وصول کرنے اور ظلم سے بچنے کے لئے رشوت دینے کو جائز قرار دیا ہے:

''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة یعنی فی حق الدافع'' (شامی ۶/ ۴۲۴)۔

البتہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اپنے نظام کو رشوت سے پاک بنائے، کوشش کرے کہ مستحقین کا حق ان تک مکمل طور پر پہنچ جائے اور بیچ میں کسی طرح کی ہیرا پھیری نہ ہو۔

(۱۰) غلط بیانی سے کام لے کر امدادی رقم لینا:

سرکاری امداد اور قرضے کے لئے کچھ شرطیں متعین ہوتی ہیں، اگر وہ شرطیں نہ پائی جائیں تو سرکاری امداد کے مستحق نہیں ہوتے، بعض لوگ اپنے حقائق صحیح طور پر پیش نہیں کرتے، بلکہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو ان شرائط اور معیارات پر اتارنا چاہتے ہیں جن سے ان کو سرکاری مراعات حاصل ہوں۔ یہ سراسر دھوکہ، جھوٹ اور تلبیس ہے۔ کذب بیانی، تلبیس اور غرر کسی بھی حال میں جائز نہیں، احادیث میں ان کی سخت مذمت آئی ہے اور خود حکومت کو اگر اس کی غلط بیانی کا علم ہوجائے تو اس کے لئے سخت سزا متعین ہے گویا حکومت کی نظر میں بھی یہ مجرم ہے۔ اس لئے سرکاری رقوم حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام لینا ہرگز جائز نہیں، یہ صرف ان ہی لوگوں کے لئے جائز ہے جو اس کے مقرر کردہ اصول ومعیارات پر اترتے ہوں۔

(۱۱) حکومت کی جانب سے انٹرسٹ ادا کئے جانے کی صورت میں قرض لینے کا حکم۔

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے عوام کی فلاح وبہبود کے لئے ہر ممکن کوشش کرے اور اس کے لئے ان کی اعانت کی مختلف صورتیں پیدا کرے۔ لہٰذا تعلیم یا کسی اور مقصد سے حکومت عوام کو بینک سے جو قرض دلاتی ہے یہ دراصل ان کے اپنے فرائض کی تکمیل ہے۔ حکومت کا انٹرسٹ ادا کرنا یہ اس کے تعاون کی واضح تصویر ہے، اس کے جواز میں کوئی شبہ معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ بینک بھی گورنمنٹ کا ہی ادارہ ہوتا ہے، محض ترتیب اور نظم ونسق کو بہتر رکھنے کے لئے اپنی جانب سے انٹرسٹ ادا کرتی ہے حقیقت میں یہ انٹرسٹ نہیں، بلکہ عوام کا تعاون ہوتا ہے۔

اگر اس کو انٹرسٹ مان بھی لیا جائے تو یہ اس لئے جائز ہے کہ یہ خود ادا نہیں کررہا ہے بلکہ اس کی جانب سے حکومت ادا کررہی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایک شخص جو کام خود انجام نہیں دے سکتا دوسروں کے واسطہ سے اس کا انجام دینا درست ہے، جیسے ایک مسلمان کسی ذمی کو شراب خریدنے کا وکیل بنائے تو جائز ہے اور مسلمان اس کا مالک ہوجائے گا حالاں کہ خود ان کے لئے راست طور پر شراب کی خرید وفروخت درست نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ فقہی

قاعدہ ہے:

''الأصل عند أبي حنيفة أن الإنسان يجوز أن لا يملك الشيء بنفسه قصدا و يملكه بتفويضه إلى غيره ويجوز أن لا يملك الشيء قصدا و يملكه حكما'' (تاسيس النظر للدبوسی-۵۵)-

(۱۲) انٹرسٹ سے مالی امداد:

اگر یہ بات یقینی ہوجائے کہ بینک کا نظام حکومت کا ایک شعبہ ہے اور درحقیقت یہ اسی سے مربوط ہے جیسا کہ موجودہ نظام سے ظاہر ہے تو اس کا انٹرسٹ، انٹرسٹ نہیں کہلائے گا۔ حکومت اپنی آسانی اور کامیاب نظم ونسق کے لئے بینک میں پیسے رکھتی ہے اور اس سے بوقت ضرورت پیسہ حاصل کرتی ہے جیسے ریزرو بینک حکومت کے کنٹرول میں ہوتا ہے اور ریزرو بینک کے تحت سارے بینک کا نظام ہوتا ہے۔ اس سے حاصل ہونے والا انٹرسٹ بظاہر انٹرسٹ ہے، مگر حقیقت میں وہ انٹرسٹ اور سود کے دائرہ میں نہیں آتا کیونکہ اپنی ہی ملکیت کی چیز میں جب کسی شی کا اضافہ ہوتو وہ اسی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ حکومت کی جانب سے یہ حکمت عملی ہے کہ ایک متعین رقم لوگوں کی امداد کے لئے مختص کرلیتی ہے اور اس کے منافع ہی امداد میں خرچ کئے جاتے ہیں یا کہ حکومت پر الگ سے بوجھ نہ پڑے۔

اگر اس کو حکومت کا ادارہ نہ مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ دراصل یہ سب پرائیوٹ ہیں مگر بوقت ضرورت حکومت سے تعاون حاصل کرنے کے لئے حکومت سے اس کا نظام مربوط کیا جاتا ہے تو بھی اس اسکیم سے استفادہ درست ہوگا بالخصوص جب کہ حکمراں غیر اسلامی ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہے اس لئے کہ صحیح قول کے مطابق غیر مسلم جزئیات کے مخاطب نہیں ہیں۔ حکومت کے خزانہ میں بہت سے ایسے پیسے جمع ہوتے رہتے ہیں جو شرعی طور پر حلال نہیں ہیں مثلاً انکم ٹیکس یا سیل ٹیکس ایک طرح کا ظلم ہے جو کسی شہری سے جبراً وصول کیا جاتا ہے اور حکومت کی ایک بڑی آمدنی اسی سے مربوط ہے اب اگر اس کے حلال اور شرعاً ناجائز ہونے کی وجہ سے مسلمان احتراز کریں تو بڑی دقتیں پیش آئیں گی، کیونکہ حکومت کی ہر آمدنی میں اس کا قوی احتمال ہے، پھر تو مسلمانوں کو سرکاری تمام اسکیموں سے ہی احتراز کرنا ہوگا بلکہ حکومت سے ملازمین کا تنخواہ بھی لینا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ احتمال ہے کہ پانی بل، لائٹ بل، ٹیکس اور دوسری چیزیں جس نے بھی ادا کی ہے ممکن ہے کہ حرام مال سے ادا کیا ہو یعنی کسی سے مال غصب کر کے لایا ہو اور اسی کو حکومت کے خزانہ میں جمع کردیا ہو، حکومت اس کی تحقیق بھی نہیں کرتی اور ظاہر ہے کہ حرام مال تبدل ملک سے حلال نہیں ہوتا ہے تو وہ مال حکومت کا نہیں ہوا اور اسی سے ملازمین کو تنخواہ دی جاتی ہے تو اس طرح صرف انٹرسٹ کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ بہت سے مسائل کھڑے ہوجائیں گے اور غیر متناہی الجھنیں پیش آئیں گی۔ اس لئے یہ کہا جائے کہ غیر اسلامی حکومت فروعیات کا مخاطب نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اسکیم سے فائدہ اٹھانے والا راست انٹرسٹ نہیں لے رہا ہے، طریقہ کار کے بدلنے سے بہت سے احکام بدل جاتے ہیں جیسا کہ اوپر یہ قاعدہ بیان کیا گیا:

''الأصل عند أبي حنيفة أن الإنسان يجوز أن لا يملك الشيء بنفسه قصدا و يملكه بتفويضه إلى غيره، ويجوز أن لا يملك الشيء قصدا و يملكه حكما'' (تاسيس النظر للدبوسی-۵۵)-

اس اصل سے متفرع ہونے والے بہت سے مسائل پر احناف کے یہاں فتوی ہے۔ تاہم بلا ضرورت شدیدہ اس اسکیم سے فائدہ نہ اٹھانا بہتر ہے، ایک مسلمان کو اس سے احتراز کرنا چاہئے، کیونکہ قرآن واحادیث میں ربا کی شدید مذمت آئی ہے۔ اس لئے حضرات فقہاء نے شبہ ربا سے بھی بچنے کی ہدایت دی ہے۔

''عن عمر رضي الله عنه قال: إن آخر ما نزلت آية الربا، وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض ولم يفسرها لنا، فدعوا الربا والريبة'' (ابن ماجه-۲۲۷۶)-

اسی لئے ابن ہمام فرماتے ہیں: و شبهة الربا مانعة كحقيقة الربا (فتح القدير ۷/ ۱۲)-

☆☆☆

سرکاری اسکیم سے استفادہ کا حکم

مفتی محمد عارف باللہ قاسمی [1]

حکومت کی جانب سے عوام کو جو رقمی تعاون دی جاتی ہے وہ عموماً دو عنوان سے ہوتی ہے: (۱) امداد و اعانت (۲) قرض۔

امداد و اعانت کے نام سے جو رقوم دی جاتی ہیں، وہ مکمل معاف ہوتی ہیں ان کے کسی بھی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی، البتہ قرض کے عنوان سے ملنے والی رقوم میں سے بعض وہ رقمیں ہوتی ہیں جن کا اکثر حصہ معاف ہوتا ہے اور کچھ کی واپسی ضروری ہوتی ہے، جبکہ بعض قرض ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں اصل سے زائد رقم واپس کرنی پڑتی ہے۔

۱۔ وہ قرضے جن کا اکثر حصہ معاف ہوتا ہے:

حکومت کی جانب سے ایسا قرض جس میں سے اکثر حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور کچھ رقم واپس کرنا پڑتا ہے، اس قرض کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، گویا یہ اسکیم قرض و امداد پر مشتمل ہے، اور جتنی رقم کی واپسی معاف ہے وہ رقم حکومت کی جانب سے امداد و اعانت ہے اور قرض دہندہ کے فوائد و منفعت کی شرط یا رقم کی زیادتی سود ہے، مقروض سے قرض کو معاف کرنا یا اس پر قرض کا بوجھ کم کرنا اعانت و امداد ہے، اور جس طرح قرض دہندہ کا پورا قرض معاف کرنا درست ہے تو اسی طرح جزء کو معاف کرنا بھی درست ہوگا:

''للدائن أن يعفو المدين وتبرأ بذلك ذمته من الدين'' (الموسوعة الفقهية: ۲۰/۱۷۳)۔

(قرض دہندہ کو یہ حق ہے کہ وہ مقروض کو معاف کر دے اور اس کو بری الذمہ کر دے)۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے قرض دہندہ کو جنت کی خوشخبری بھی دی ہے جو مقروض کو قرض کے بوجھ سے آزاد کر دے یا اس میں تخفیف کر دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من أنظر معسرا، أو وضع له، أظله الله يوم القيامة تحت ظل عرشه يوم لا ظل إلا ظله'' (ترمذی: ۱۳۰۶)۔

(جس نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا قرض (کل یا جزء) معاف کر دیا تو اللہ اس کو قیامت کے دن اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دیں گے، اس دن جس دن اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا)۔

اس لئے جزوی رقم کی معافی والا قرض لینا دینا جائز ہے اور اس طرح کی اسکیم سے فائدہ اٹھانے میں شرعی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں ہے اور مسلمان اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۲۔ متعین مدت میں ادا نہ کرنے پر کامل رقم کی وصولیابی:

بعض مرتبہ امدادی قرضوں میں سے اکثر رقم کی معافی میں یہ شرط ملحوظ ہوتی ہے کہ واجب الاداء رقم کو متعین مدت میں ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے، بصورت دیگر قرض خواہ پر پوری کامل رقم کی ادائیگی لازم ہوتی ہے، معافی کی منفعت سے قرض خواہ محروم ہو جاتا ہے، البتہ اس میں بھی اصل سے زائد کے دینے کی کوئی شرط نہیں ہوتی ہے، اس شرط کی صورت میں بھی اس طرح کے قرض کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اور اس کے جواز میں

[1] ناظم مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم الربانیہ، حیدرآباد۔

شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، کیونکہ جس طرح فقہاء نے تعجیل کی صورت میں قرض میں کمی کی اجازت دی ہے اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ عدم تعجیل کی صورت میں یا متعین مدت کی رعایت نہ کرنے کی صورت میں پوری رقم کا مطالبہ کرنا بھی جائز ہوگا، اور اس شرط کو سودی شرط نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ اس میں رقم کی زیادتی نہیں ہو رہی ہے، اور اس طرح ''ربا'' کی حقیقت صادق نہیں آرہی ہے۔ کیونکہ ربا کی حقیقت یہ ہے کہ اجل کی زیادتی کی وجہ سے دَین میں زیادتی ہو اور صورت مسئولہ میں دَین میں زیادتی نہیں ہو رہی ہے صرف معافی کی رعایت ختم ہو رہی ہے، جو کہ ربا نہیں ہے۔

۳۔ متعین مدت میں ادا نہ کرنے کی صورت میں زائد کی ادائیگی کی شرط:

اگر امدادی قرضوں میں یہ بات ہو کہ اگر مدت کے دوران واجب الاداء رقم کی ادائیگی عمل میں نہیں آئی تو بعد میں معافی سے محرومی ہونے کے ساتھ مزید زائد رقم کی ادائیگی بھی لازم ہوگی، اور اصل قرض کی رقم سے زائد کچھ رقم دینی پڑے گی، تو یہ شرط صریح سودی شرط ہوگی، اور اس شرط کے ساتھ یہ عقد ''عقد ربا'' ہوگا، اور ناجائز ہوگا، کیونکہ ربا کی حقیقت یہی ہے کہ مدت میں زیادتی کے عوض قرض کی رقم میں زیادتی کی جائے، جیسا کہ یہی طریقہ عہد جاہلیت میں مروج تھا کہ قرض دہندہ قرض کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتا: ''إما أن تقضي وإما أن تربي'' یا تو ادا کرو یا قرض کی رقم میں اضافہ کرو، اسلام نے اس کو سود قرار دیا اور حرام کہا، علامہ فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں:

'' إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل. فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به'' (التفسير الكبير للرازي: ۷/ ۷۲)۔

(جب دین کی ادائیگی کا وقت آجاتا تو قرض دینے والے اصل رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتے، اب اگر اس کے لئے ادائیگی دشوار ہوتی تو وہ حق میں اور مدت میں اضافہ کر دیتے، یہی وہ سود ہے جس کا معاملہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کیا کرتے تھے)۔

اس لئے اس طرح کی شرط جس قرض میں ملحوظ ہو اس سے شدید مجبوری اور اضطراری حالت کے سوا عام حالات میں استفادہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سودی عقد ہے جو کہ حرام ہے۔ مفتی اعظم حضرت مفتی نظام الدین علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

''ڈھائی ہزار قرض لیا اور ساڑھے بارہ سو معاف ہو جانے کے بعد پھر سود لگا کر جو رقم واپس دی ہے، اگر یہ کل واپسی کی رقم ڈھائی ہزار کے اندر ہی ہے، جب شرعاً سود دینا لازم نہ آئے گا، ہاں جتنی رقم ڈھائی ہزار سے زیادہ واپس دینی ہوگی اتنی مقدار سود میں دینے کی خرابی لازم آئے گی، اور بغیر شدید مجبوری ایسا کرنے کا گناہ بھی ہوگا جس پر توبہ کرنا بھی اس پر ضروری ہوگا'' (نظام الفتاوی: ۳/ ۲۷۴)۔

۴۔ زائد رقم انتہائی معمولی ہو اور انتظامی خرچ کے نام سے ہو یا اس کے مثل ہو؟

غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت معمولی اور انتہائی کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو یا اپنی مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کو ایسے اسکیموں کے مقاصد اور رقم کے تناسب کی کمی کے پیش نظر سروس چارج کے حکم میں رکھتے ہوئے بحالت ضرورت و مجبوری ایسی اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوگی، معروف فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اسی قسم کے ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

''سود لینا اور دینا دونوں ہی گناہ ہے، البتہ سرکار اور سرکاری ادارہ اور اشخاص اور پرائیویٹ ادارہ کے حکم میں ایک گونہ فرق ہے، جب ہم اس ملک کے شہری ہیں تو جیسے حکومت دوسرے شہریوں کو روزگار کے لئے قرض فراہم کرتی ہے ویسے ہی مسلمانوں کو بھی اس طرح کی سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور ہمارا بحیثیت شہری اس پر حق ہے، لہٰذا جو مسلمان واقعی بے روزگار ہوں اور معاشی اعتبار سے اس سطح پر ہوں کہ خود اپنے پیسوں سے کوئی روزگار شروع نہیں کر سکتے، ان کے لئے ایسے قرض حاصل کرنا جائز ہے، جو زائد رقم سود کے نام سے لی جاتی ہے اسے انتظامی اخراجات بھی قرار دیا جاسکتا ہے، حضرت مولانا نظام الدین اعظمی سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند کا رجحان اسی طرف ہے، ورنہ اس کی حیثیت سود یا قرض پر رشوت دینے کی ہوگی، اور مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہے، اصل یہ ہے کہ گورنمنٹ کا مقصد اس طرح کی اسکیم سے سود حاصل کرنا نہیں ہوتا، بلکہ بے روزگاری دور کرنا مقصود ہوتا ہے اسی لئے بعض اوقات قرض کا کچھ حصہ معاف بھی کر دیا جاتا ہے'' (کتاب الفتاوی: ۵/ ۳۸۰)۔

لیکن وسعت وقدرت کی صورت میں اور عام حالات میں احتیاط اسی میں ہے کہ اس کو سود شمار کرتے ہوئے اس سے بچنے کا اہتمام کیا جائے؛ کیونکہ قرض پر زائد رقم چاہے کم ہی کیوں نہ ہوں شرعی اصطلاح کے مطابق اس پر سود کا اطلاق ہی ہوتا ہے اور اس پر سود کی تعریف ہی صادق آتی ہے، جو اسلام میں سخت ترین حرام ہے اور جس سے بچنے کی خاطر احتیاط کی راہ اختیار کرنے تعلیم ہے، یہی وجہ ہے کہ کئی چیزوں پر حرمت کا حکم شبہ ربا کی وجہ سے ہے۔

۵۔ سرکاری قرض پر لی جانے والی رقم کا اوسط غیر معمولی ہو؟

سرکار کی جانب سے دی جانے والی رقم پر لی جاتے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ اسے انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو اس کو سروس چارج نہیں مانا جائے گا اور اسے سود ہی تصور کیا جائے گا، چاہے وہ قرض کسی بھی ضرورت کے نام پر جاری کیا گیا ہو؛ کیونکہ سروس چارج عموماً معمولی ہوتے ہیں، غیر معمولی زائد رقم کا مطالبہ اس بات کی غمازی کررہا ہے کہ یہاں حکومت امداد دے کر اس امداد سے حاصل ہونے والی منفعت میں خود کو شریک بنانا چاہتی ہے، اور سودی کاروبار کررہی ہے۔ اس لئے عام حالات میں اس طرح کا قرض لینا جائز نہیں ہوگا۔

۶۔ مکان، بیت الخلاء، یا دیگر ضروریات کے لئے حکومتی امداد حاصل کرنا:

حکومت کی جانب سے مخصوص ضروریات مثلاً مکان کی تعمیر بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ کی خاطر یا مخصوص حالات میں امداد کے طور پر جو رقم ملتی ہے اسے حاصل کرنے اور اس کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ عوام کا حکومت پر حق ہے، اور جس سے حق وابستہ ہو اس سے حق ملے تو اسے لینا درست ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اگر حکومت مخصوص شرطوں کی ساتھ امداد فراہم کررہی ہے تو اس امداد کو اسی وقت لینے کی تدبیر کرنی چاہئے، جبکہ اس میں وہ شرطیں پائی جائیں، ورنہ مالِ غیر کو لینے کے حکم میں ہوگا اور ناجائز ہوگا۔

۷۔ امدادی رقوم کے حصول کی کوشش کرنے والوں کے محنتانہ کا حکم:

حکومت کی جانب سے عوام کی ضروریات کی تکمیل کی خاطر دی جانے والی امدادی رقم کو حاصل کرنا بہت سے ممالک میں عام لوگوں کے لئے انتہائی دشوار عمل ہوتا ہے، بالخصوص دفتری امور سے نابلد اور ناخواندہ افراد تو بسا اوقات چکر کاٹتے رہ جاتے ہیں اور استفادہ نہیں کرپاتے، بلکہ اکثر و بیشتر حالات ایسے ہوتے ہیں کہ اگر مخصوص افراد کو واسطہ نہ بنایا جائے تو کام کا بننا اور اس امداد کا حاصل ہوجانا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے، اور جو واسطہ بنتا ہے اسے بھی مختلف قسم کے امور انجام دینے ہوتے ہیں، مثلاً مخصوص فائلیں تیار کرنا، اس سے متعلقہ دستاویزات کو مطلوبہ طریقہ پر فراہم کرنا اور فائلوں میں منسلک کرنا، فائلوں کو مختلف متعلقہ حکومتی افراد کے پاس پہونچانا اور ان کے سامنے استحقاق ظاہر کرکے منظوری حاصل کرنا وغیرہ کئی اہم امور اسے انجام دینے پڑتے ہیں، اس لئے اس پس منظر میں واسطہ بننے والے کے لئے اپنی اجرت کے طور پر مخصوص محنتانہ وصول کرنا جائز ہے اور دینے والے کے لئے دینا بھی جائز ہے؛ کیونکہ واسطہ بننے والا اس کی نمائندگی اور وکالت کرتا ہے جس کی اجرت کو فقہاء نے تسلیم کیا ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''أهل بلدة ثقلت عليهم مؤنات العمل فاستأجروا رجلا بأجرة معلومة ليذهب ويرفع أمرهم إلى السلطان الأعظم ليخفف عنهم بعض الحيف وأخذ الأجرة من عامتهم غنيهم وفقيرهم، ذكر ههنا أنه إن كان بحال لو ذهب إلى بلد السلطان تهيأ له إصلاح الأمر يوما أو يومين جازت الإجارة، وإن كان بحال لا يحصل ذلك إلا بمدة، فإن وقتوا للإجارة وقتا معلوما فالإجارة جائزة والأجر كله له، وإن لم يوقتوا فهي فاسدة وله أجر مثله'' (الهندية: ۴/۵۲۶)۔

(کسی شہر والوں پر کام کی ذمہ داریاں دشوار ہوگئیں تو انہوں نے مخصوص اجرت کے عوض ایک شخص کو اجرت پر رکھا تاکہ وہ حاکران کے مسائل سلطان اعظم کے سامنے پیش کرے، اس طرح ان کی بعض دشواریوں کا بوجھ کم ہو، اور اس اجیر نے غنی وفقیر ہر ایک سے اجرت لیا، ایسی صورت میں اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کے سلطان کے پاس جانے سے ایک دودن میں مسئلہ حل ہوجائے، تو یہ اجارہ جائز ہے، اور اگر صورت حال یہ ہو کہ اس کام کے ہونے کے لئے ایک مدت درکار ہو، تو اگر ان لوگوں نے اس کام کے لئے وقت کو متعین کیا ہو تو اجارہ جائز ہے اور وہ پوری اجرت کا حقدار ہوگا، اور اگر

وقت کی تعیین ان لوگوں نے نہیں کی تو یہ اجارہ فاسد ہے اور کام ہو جانے کی صورت میں اس کے لئے اجرت مثل ہوگی)۔

شیخ ابوزہرہ لکھتے ہیں:

''إن ما يأخذه المحامي رزق حلال إن كان لرفع الحق. لأن ما يأخذه على عمل وهو ثمن لمنفعة استوفاها المؤكل'' (مجلة لواء الاسلام: رمضان: ۱۳۶۸، صفحه: ۴۴)۔

(وکیل جو اجرت لیتے ہیں وہ رزق حلال ہے بشرطیکہ حق کی حفاظت کے لئے ہو، اس لئے کہ وہ جو کچھ لیتا ہے عمل کے عوض لیتا ہے، اور وہ اس منفعت کی قیمت ہے جو اس نے مؤکل کو دیا ہے)۔

۸۔ واسطہ بننے والے کا حاصل شدہ رقم میں سے لینا:

بعض مرتبہ واسطہ بننے والے اور صاحب حق کے مابین یہ طے ہوتا ہے کہ حکومتی امداد میں حاصل ہونے والی رقم میں ایک محدود و مخصوص رقم واسطہ بننے والا لے گا، عام طور پر صاحب حق اس کو تسلیم اس لئے کرتے ہیں کہ اس طریقہ میں وہ دھوکہ سے محفوظ رہتے ہیں؛ کیونکہ اپنی جیب سے اجرت دینے کی صورت میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ ان کی رقم خرچ ہو جاتی اور کام بھی نہیں ہو پاتا، اس لئے اگر فریقین اس بات پر متفق ہو جائیں کہ حاصل ہونے والی امدادی رقم میں سے ایک محدود و مخصوص رقم واسطہ بننے والے کو ملے گی، تو یہ جائز ہے؛ کیونکہ یہ اجرت کا مستحق ہے اور متعین اجرت کا یہ حقدار ہے، اور جو کچھ یہ لے رہا ہے متعین و محدود اجرت کے طور پر لے رہا ہے، لیکن اگر تعیین کے بجائے اجرت کو مجہول رکھا گیا ہو جیسے بعض لوگ اس طرح کہتے ہیں کہ جو بھی ہوگا دیکھ لیں گے وغیرہ تو اس طرح اجرت کی تعیین درست نہیں ہے، اور ایسی صورت میں صرف وہ اجرت مثل کا حقدار ہوگا۔

البتہ بعض لوگ ایسے موقعوں پر صاحب حق کی لاعلمی وغیرہ کا فائدہ اٹھا کر بڑی رقم دبانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ عمل درست نہیں ہے اور اس میں خیانت کرنا یا اس کی کم علمی وغیرہ کا فائدہ اٹھا کر زائد رقم کا مطالبہ ناجائز ہے؛ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''من غشنا فليس منا'' (حدیث)

بعض مرتبہ حاصل ہونے والی امدادی رقم کتنی حاصل ہوگی اس کا حتمی علم نہیں ہوتا، تناسب میں کمی زیادتی بھی ہوتی ہے، ایسے موقعوں پر اس طرح اجرت کی تعیین ہوتی ہے کہ جتنی رقم حاصل کروائیں گے اسی کے تناسب سے اجرت دی جائے گی، گویا اس صورت میں اجرت کو کمیشن کے طور پر متعین کیا جاتا ہے، اس میں ایک گونہ صاحب حق کو تحفظ بھی حاصل ہوتا ہے، اسی لئے عام طور پر اسی طریقہ کو اختیار کیا جاتا ہے، کمیشن پر اجرت فقہاء احناف کے نزدیک مختلف فیہ ہے، لیکن حضرت مفتی تقی عثمانی مدظلہ کے بقول: مفتی بہ قول کے مطابق کمیشن پر اجرت کی تعیین درست ہے، اس لئے اس طرح اجرت طے کر کے امداد حاصل کرنا بھی جائز ہوگا (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۲/ ۲۰۲)۔

بعض مرتبہ اس طرح بھی لوگ طے کرتے ہیں کہ جو بھی رقم حاصل ہوگی اس میں سے اتنی رقم محنت کرنے والے کی ہوگی، اس طرح اجرت کی تعیین درست نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں اجرت اسی کے عمل سے ہے، جس کی وجہ سے اس پر مکمل قفیز طحان کی صورت صادق آرہی ہے، جس کی ممانعت احادیث میں وارد ہوئی ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نهي عن عسب الفحل، وعن قفيز الطحان'' (معرفة السنن والآثار: ۱۱۴۴۴)۔

(جفتی کی کمائی اور قفیز طحان سے منع کیا گیا ہے)۔

علامہ سرخسی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''ولو استأجره لينقي تراب المعدن بنصف ما يخرج منه، كان فاسدا؛ لأن الأجر مجهول، ووجوده على خطر، وهو استئجار ببعض ما يخرج من عمله، فيكون بمعنى قفيز الطحان، فله أجر مثله؛ لأنه أوفى المنفعة بعقد فاسد'' (مبسوط سرخسی: ۱۴/ ۴۹)۔

(معدن کی مٹی صاف کرنے کے لئے کسی کو اس طور پر اجرت پر رکھا کہ جو کچھ بھی ملے گا اس میں سے نصف اس کے لئے ہوگا، تو یہ اجارہ فاسد ہوگا، اس لئے کہ اجرت مجہول ہے اور اس کا حاصل ہونا غیر یقینی ہے، اور یہ عمل کرنے والے کے عمل سے حاصل ہونے والی چیز سے اجرت دینا ہے)۔

اس لئے یہ قفیز طحان کے معنی میں ہو جائے گا، ایسی صورت میں اس کو اجرت مثل ملے گا؛ کیونکہ اس نے عقد فاسد کے ذریعہ فائدہ پہونچایا ہے)۔

کمیشن والی شکل میں بھی گرچہ کہ بظاہر ایسی ہی کیفیت نظر آرہی ہے، لیکن اس میں اُسی حاصل ہونے والی رقم سے دینے کی بات یا اسی میں سے مخصوص مقدار لے لینے کی بات مذکور ومشروط نہیں ہے، بلکہ اجرت تناسب میں متعین ہے، جو کہ حتمی طور پر تو متعین نہیں کہ ایک ہزار ہے یا دو ہزار، لیکن تناسب کی تعیین بھی جہالت کو ختم کر رہی ہے، اور اسی میں سے مخصوص رقم لے لینے کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے قفیز طحان سے اس کو جدا کرنے اور عوامی ضرورت کی رعایت میں اس کو جائز ماننے کی گنجائش ہے، اسی لئے اس شکل کو جائز مانا گیا ہے۔

۹۔ امدادی رقوم یا قرضوں کے حصول کے لئے رشوت؟

اسلام میں رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہے؛ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں پر لعنت فرمائی ہے:

''لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي في الحكم'' (سنن ترمذی: باب ما جاء في الراشي والمرتشي في الحكم ابوداؤد: باب في كراهية الرشوة)۔

(فیصلہ میں رشوت لینے اور دینے والے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے)۔

اس حدیث کی روشنی میں رشوت لینا تو حرام ہے ہی، عام حالات میں دینا بھی حرام ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سی مرتبہ ایسے حالات ہوتے ہیں کہ رشوت نہ دیا جائے تو حق کا حصول اور دفع ظلم ممکن نہیں ہوتا، اور آج کل مادیت کے خوگر لوگوں نے تو ایسا نظام بنا دیا ہے کہ رشوت دینا حقوق کے حصول کی راہ میں بنیادی ضرورت کے جیسا بن گیا ہے کہ اس کے بغیر کام ہی نہیں ہوتا، تو کیا حق کو حاصل کرنے کے لئے اور اپنے حق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے یا جس امداد کا وہ مستحق ہے اور جسے رشوت کے بغیر حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اس کی خاطر رشوت دینا جائز ہوگا یا نہیں؟ فقہاء کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مجبوری کی حالت میں اپنی ذات سے ظلم کو دور کرنے کے لئے یا اپنے ضائع ہونے والے حق کو بچانے کے لئے رشوت دینا جائز ہے، علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

''إذا دفع الرشوة خوفا على نفسه أو ماله، فهو حرام على الآخذ، غير حرام على الدافع ... ومنها: إذا دفع الرشوة ليسوي أمره عند السلطان حل له الدفع، ولا يحل للآخذ أن يأخذ'' (البحر الرائق: باب اخذ القضاء بالرشوة)

(جب اپنے نفس یا مال پر خوف کی صورت میں رشوت دیا تو یہ لینے والے پر حرام ہے دینے والے کے لئے حرام نہیں ہے۔ رشوت دینا جائز ہونے کی شکلوں میں سے یہ بھی ہے کہ رشوت اس لئے دیا تا کہ وہ شخص سلطان کے پاس اس کے کام کو بنا دے، تو اس کے لئے رشوت دینا حلال ہوگا، لینے والے کے لئے لینا حلال نہیں ہوگا)

علامہ ملا علی قاری لکھتے ہیں:

''الرشوة ما يعطى لإبطال حق أو لإحقاق باطل، أما إذا أعطي ليتوصل به إلى حق أو ليدفع به عن نفسه فلا بأس به ۔ وروي أن ابن مسعود أخذ في شيء بأرض الحبشة، فأعطى دينارين حتى خلي سبيله'' (مرقاة المفاتيح: ۶/ ۲۲۴)۔

(''رشوت'' وہ ہے جو کسی حق کو باطل کرنے کے لئے یا کسی باطل پر حق جتانے کے لئے دیا جائے، رہا وہ مال جو اس غرض سے دیا جاتا ہے تا کہ کسی حق کو حاصل کیا جائے، یا اپنی ذات سے کسی ظلم کو دور کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مروی ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے حبشہ کی زمین کو حاصل کرنے کے لئے دو دینار دئے، تو ان کا راستہ خالی کر دیا گیا)۔

فقیہ الامت حضرت اقدس مفتی محمود الحسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رشوت کا دینا لینا حرام ہے، البتہ دفع ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لیے بحالت مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے، اس صورت میں فقط رشوت لینے والا گنہ گار ہوگا'' (فتاوی محمودیہ مرتب: ۱۸/ ۴۵۶)۔

اس لئے اگر امدادی رقوم یا سرکاری اسکیموں اور قرضوں کو بغیر رشوت دئے حاصل کرنا ممکن نہ ہو اور دینے والا اس اسکیم کا حقدار و محتاج ہو تو مجبوراً اس کے لئے اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ رشوت دے کر امدادی رقوم حاصل کرے اور سرکاری اسکیموں سے استفادہ کرے۔

۱۰۔ غلط بیانی کے ذریعہ امداد حاصل کرنا:

سرکاری امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے حکومت کی جانب سے جو شرائط و معیارات متعین ہوتے ہیں، وہ درحقیقت ان مخصوص افراد کے تعاون کے لئے ہوتے ہیں جن میں وہ شرائط پائے جاتے ہیں، اور وہ اعانت و امداد صرف ان ہی لوگوں کے لئے خاص ہوتی ہے، اور ان شرطوں پر پورے اترنے والے ہی اس کے حقدار ہوتے ہیں، ان میں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے خود کو مستحق ثابت کرنا اور غلط طریقہ سے امداد یا قرض حاصل کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں جھوٹ، دھوکہ اور مستحق کی حق تلفی ہے، اور سب اسلام میں حرام ہیں، اسی طرح ناحق کسی چیز پر حق جتانا بھی اسلام میں حرام ہے، اور ایسا کرنے والا جہنم کا ٹکڑا لینے والا ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا:

''إنما أنا بشر، وإنه يأتيني الخصم، فلعل بعضهم أن يكون أبلغ من بعض، فأحسب أنه صادق، فأقضي له، فمن قضيت له بحق مسلم، فإنما هي قطعة من النار، فليحملها أو يذرها'' (مسلم: ۱۷۱۳)۔

بے شک میں بشر ہوں اور بیشک میرے پاس ایک مقدمہ والا آتا ہے اور ہوسکتا ہے ان میں سے ایک دوسرے سے اپنی بات اچھے انداز سے پہنچانے والا ہو۔ تو میں یہ گمان کروں کہ وہ سچا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ کردوں پس میں جس کے حق میں کسی مسلمان کے حق کا فیصلہ کروں تو وہ جہنم کا ایک ٹکڑا ہے پس وہ اسے اٹھالے یا چھوڑ دے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی دوسرے مستحق کے حق کا فیصلہ غلط بیانی کے ذریعہ اپنے حق میں کرا لینے سے وہ چیز اس کی نہیں ہوجاتی اور اس کے لئے اس سے استفادہ درست نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس کے لئے نار جہنم ہی ہوتا ہے۔

۱۱۔ بینک کے وہ امدادی قرضے جس کا سود حکومت ادا کرتی ہے:

بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور غرض سے حکومت عوام کو بینک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر عائد ہونے والے سود کو حکومت بینک کو ادا کرتی ہے، قرض گیرندہ کو ادا کرنا نہیں پڑتا، ایسی اسکیموں سے مسلمانوں سے کے لئے استفادہ میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیونکہ یہ بھی حکومت کی جانب سے امداد و تعاون ہی ہے، اور اس سلسلہ میں حقیقی قرض اور اس پر مرتب سود کا تعلق حکومت سے ہی ہوگا، گویا کہ قرض کا معاملہ بینک اور حکومت کے مابین ہوا اور بینک نے حکومت کی جانب سے عوام کو رقم دیا، اور عوام اور عام افراد کے پاس وہ رقم سودی قرض کے طور پر نہیں، بلکہ حکومتی امداد کے طور پر پہونچی، جو اس کے لئے جائز ہے۔

البتہ اگر اس رقم پر عائد ہونے والے سود میں سے کچھ حصہ کی ادائیگی رقم لینے والے پر لازم ہوتی ہو اور بقیہ پوری رقم حکومت ادا کرتی ہو تو ایسی صورت میں اگر وہ رقم اتنی کم ہو کہ سروس چارج کے مماثل و مشابہ ہو تو اسے سروس چارج تصور کیا جائے گا اور استفادہ درست ہوگا، لیکن اگر غیر معمولی ہو تو پھر اسے سروس چارج نہیں تصور کیا جائے گا، بلکہ وہ سودی قرض ہوگا، اور اس سے بلا ضرورت شدیدہ استفادہ کی اجازت نہ ہوگی۔

۱۲۔ محفوظ فنڈ کے سود سے حکومتی امداد:

بعض ایسی اسکیمیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا گیا ہے، اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی اور رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے، اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے۔ ایسی اسکیموں کے تحت ملنے والی امداد سے مسلمانوں کے لئے استفادہ درست ہے؛ کیونکہ اس کے لئے یہ رقم حکومت کی جانب سے امداد و تبرع ہے، مفتی اعظم از ہر ہند دار العلوم دیوبند حضرت مفتی نظام الدین صاحب

رحمۃ اللہ علیہ ایک فتوی میں تحریر فرماتے ہیں:

"وہ محکمہ جس کے اصحاب حل وعقد خالص غیر مسلم ہوں یا مشترک ہوتے ہوں، مگر اقتدار اعلی غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو اور وہ اپنے طور پر سودی کاروبار نفع حاصل کرکے کوئی رقم جمع کرے، اور بطور تبرع کسی مسلمان ملازم کو دے تو اس کا لینا جائز رہے گا اور بعد انعام داخل ہو کر طیب وحلال شمار ہوگا۔۔غیر مسلم آپس میں سودی کاروبار اور سودی لین دین بھی کرتے ہیں، بہت سی بیع باطل وفاسد بھی کرتے ہیں، شراب بھی بناتے اور بیچتے ہیں اور اس کی قیمت لیتے ہیں، خنزیر بھی بیچ کر اس کی قیمت لیتے ہیں، پھر مسلمانوں کو یہ پیسے مزدوری میں انعام وغیرہ میں دیتے ہیں، اور ان سب پیسوں کا حرام ہونا معلوم ہونے کے باوجود ان پیسوں کا لینا اس وقت تک شرعا جائز وغیر مکروہ شمار ہوتا ہے جب تک کہ یہ یقین نہیں ہوتا، کہ یہ چیز جس کو فروخت کررہا ہے یہ بعینہ وہی چیز ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لایا ہے، جو قیمت دے رہا ہے یہ بعینہ وہی روپیہ ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لایا ہے، غرض ان سب کا لے لینا اور استعمال کرنا سب درست رہتا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکم جواز کیوں ہے تو اس کی وجوہ متعدد ہیں، متعدد شرعی ضوابط اس کی بنیاد ہیں، مثلاً: (الف) تبدیل ملک سے حکما تبدل عین ہو جاتا ہے۔ یا (ب) الخلط استہلاک کا ضابطہ جو مسلم ہے۔ یا (ج) مثلاً یہ کفار ابتداء صرف ایمان کے حدود وعقوبت مشروعہ کے مخاطب ہوتے ہیں، باقی معاملات وجزئی احکامات کے مخاطب بعد میں ہوتے ہیں، اس لیے ان کے آپس کے معاملات برقرار اور نافذ رکھے جاتے ہیں، جب تک کہ وہ حرام لعینہ، فتیح خداع، چوری، ڈاکہ وغیرہ کا ارتکاب نہ کریں (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/ ۲۰۹)۔

اس لئے اگر چہ کہ حکومت نے اس رقم کو سودی ذریعہ سے حاصل کیا ہے، لیکن مستحق عوام تک وہ رقم حکومتی امداد کے طور پر پہنچتی ہے، اس لئے مسلمانوں کا اس اسکیم سے استفادہ کرنا درست ہے۔

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی شرعی حیثیت اور اس کے مسائل

قاضی محمد حسن ندوی[1]

سوال نمبر ۱ کا جواب:

اب یہاں تحقیق طلب بات یہ ہے کہ مستقرض مقرض کے قرض سے کب بری الذمہ ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث محدثین اور فقہاء کی توجیہات اس بات پر دال ہیں کہ اس کی دو شکلیں ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ مستقرض خود پوری رقم اور دین ادا کردے اور دوسری شکل یہ ہے کہ مقرض (صاحب دین) مدیون کو معاف کردے، مذکورہ دونوں صورتوں میں اور اسی طرح کفیل اور محیل کے ادا کرنے سے مستقرض دین کی ادائیگی سے بری الذمہ ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقرض کو نہ صرف قرض کی ادائیگی میں مہلت دینے کی ترغیب دی ہے بلکہ پورے دیون سے بری اور معاف کرنے کو افضل قرار دیا ہے۔

"وإن كان ذو عسرة فنظرة إلىٰ ميسرة وأن تصدقوا خير لكم" (سورۂ بقرہ: ۲۸۰) (اگر تمہارا مدیون تنگدست ہو تمہارا قرض دینے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک مہلت دی جائے اور اگر تم اس کا قرض معاف ہی کردو تو تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے)۔

حدیث شریف میں ہے: ''وعن حذيفة: قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: مات رجل فقيل له: قال: كنت أبايع الناس فاتجاوز عن الموسر وأخفف عن المعسر فغفر له'' (بخاری شریف: رقم ۲۳۹۱)۔

(حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم سے پہلے ایک شخص تھا جس کے پاس فرشتے روح نکالنے کے لئے آئے اور دریافت کیا گیا آپ کے پاس کوئی عمل صالح ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے یاد نہیں ہے البتہ مجھے یاد ہے کہ لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا تو مالدار کو مہلت دیتا اور تنگدست کو دین سے بری کردیتا تھا، اس وجہ سے اس کی مغفرت کی گئی)۔

علامہ کاسانی نے بھی ہبہ اور صدقہ کو معافی اور چھوٹ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

''لأن الهبة والصدقة في معنى الإبراء'' (بدائع الصنائع ۵ / ۱۳)۔

نیز اس سلسلہ میں ''ھدایہ'' کی ایک عبارت بھی ملاحظہ فرمائیں: ''وإذا أبرأ الطالب المكفول عنه أو استوفى منه برئى الكفيل؛ لأن براءة الأصيل توجب براءة الكفيل؛ لأن الدين عليه'' (ھدایہ ۳ / ۱۰۲)

اور جب صاحب مال نے مدیون کو بری کردیا یا اس سے دین وصول کرلیا تو کفیل بھی اس سے بری الذمہ ہوجائے گا، کیوں کہ اصیل کی برائت کفیل کی برائت کے موجب ہے چوں کہ دین اسی پر ہے۔ اس کی نظیر یہ قاعدہ بھی ہے "يسقط الفرع إذا سقط الاصيل" (الاشباہ مطبع دیوبند / ۴۰۴)۔

شبہ ربا اور اس کا ازالہ:

قرآن کریم کی آیت، حدیث شریف اور صاحب ھدایہ کی اس عبارت سے اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا کہ مقرض (صاحب مال) مدیون (مستقرض) کو دین سے بری کردے تو وہ اس سے بری الذمہ ہوجاتا ہے، لیکن یہاں زیر بحث مسئلہ میں جو معافی اور چھوٹ ہوتی ہے وہ دراصل حکومت اور سرکاری اسکیم کی طرف ہوتی ہے تو کیا ربا (سود) کا اطلاق اس پر نہیں ہوگا؟ جو مسلمان کے لئے حرام ہے۔

---

[1] استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ماٹلی والا بھروچ گجرات۔

اس سلسلہ میں سوال نامہ کے شروع میں جو تمہیدی بات ہے وہ بہت ہی اہم ہے اسی سے اس شبہ کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ حکومت عوام کی معاشی و معاشرتی ضرورت کی تکمیل اور پسماندہ شہریوں کو اونچا اٹھانے کے لئے دیتی ہے جس کی ہندوستان کے تمام مفتیان کرام نے گنجائش دی ہیں۔

یہاں حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ (سابق مفتی دار العلوم دیو بند) کی رائے ذکر کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا، لکھتے ہیں کبھی بے روزگاروں کو باروزگار بنانے کے لئے حکومت کچھ رقم قرض کے طور پر دیتی ہے اور اس میں کچھ چھوٹ بھی دیتی ہے...... کچھ سود کے نام سے زیادہ کر کے باقساط وصول کرتی ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک یہ کل ادائیگی رقم باقی رقم کے اندر رہے گی وہ شرعاً سود شمار نہ ہوگی اور کسی غیر مسلم خواہ حکومت ہی کیوں نہ ہو اس کے سود کہنے سے اس کا سود ہونا لازم نہ ہوگا (نظام الفتاوی ۷ / ۵۰)۔

الغرض اگر کسی مسلمان نے بدرجہ مجبوری ضرورت کی وجہ سے سرکاری اسکیم سے قرض لیا اور اس اسکیم کی طرف سے پورا یا آدھا معاف کر دیا گیا ہے نیز لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑ رہا ہے تو اس صورت میں مستقرض کل دین سے بری الذمہ ہو جائے گا اور حکومت یا سرکاری اسکیم سے جو چھوٹ مل رہی ہے وہ شرعاً سود میں شمار نہیں ہوگی۔ جیسا کہ در مختار میں ہے "و کان علیه مثل ماقبض" (۲۱۸/۳)۔

سوال نمبر ۲ کا جواب:

چونکہ قرض کا معاملہ ایک اعتبار سے تبرع ہے تو دوسرے اعتبار سے بیع صرف (درھم کی بیع درھم کے عوض) ہے، اس لئے "ربا النسیئۃ" سے بچنے کے لئے جمہور فقہاء کے یہاں تاجیل کی شرط لگانا درست نہیں، چنانچہ احناف کے یہاں اگر کوئی تاجیل کی شرط پر مقرض سے قرض لیتا ہے پھر بھی مقرض کو فی الفور قرض کی واپسی کے مطالبہ کا حق ہوگا، یعنی قرض دہندہ اس مدت کا پابند نہیں۔

صاحب ھدایہ لکھتے ہیں: "و لا یثبت الأجل فی القروض عندنا" (ھدایہ ۵ / ۳۶۸) قرض میں ہمارے یہاں تاجیل ثابت نہیں ہے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اس بات کو مزید واضح کر کے لکھا ہے:

"ولایجوز عند جمهور الفقهاء اشتراط الأجل في القرض، فإن أجل القرض إلى أجل مسمیٰ معلوم لم یتأجل. وكان حالا؛ لأنه فی معنی بیع الدرهم بالدرهم" (الفقه الاسلامی وادلته ۴/ ۵۱۱)

(قرض میں جمہور فقہاء کے نقطہ نظر سے تاجیل کی شرط درست نہیں ہے اگر کسی نے اس میں تاجیل کی شرط لگائی ہے لیکن وہ عقد معجّل ہوگا اس لئے کہ وہ بیع صرف کے معنی میں ہے)۔

البتہ امام مالک اس مسئلہ میں جمہور فقہاء کی رائے سے صرف نظر کر کے قول رسول ﷺ "المسلمون عند شروطهم" پر عمل کرنے کے لئے تاجیل کی شرط کے وجوب کے قائل ہیں، یعنی مالکیہ کے یہاں فریقین اس مدت کے پابند ہوں گے اس سے پہلے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا (حوالہ سابق ج ۴ ص ۵۱۲)، اسی طرح وصیت، جحود، قضاء کے باب میں اور حوالہ کی صورت میں احناف نے بھی تاجیل کی شرط کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس سے پہلے قرض کا مطالبہ مقرض اور اس کے وارثان کی طرف سے درست نہیں ہے (حوالہ سابق ج ۴/ ۵۱۶)۔

الغرض قرض میں مدت کی شرط کا لحاظ کس حد تک ہے؟ اوپر مسالک ائمہ ذکر کئے گئے مگر راقم کی ناقص رائے یہ ہے کہ مالکیہ کا نقطہ نظر تاجیل کے مسئلہ میں زیادہ راجح ہے، وجہ ترجیح درجہ ذیل ہیں۔

۱- قرآن مجید میں اللہ تعالی نے قرض دہندہ کو ترغیب اور تحریض کی ہے کہ معسر تنگدست مستقرض کو ادائیگی قرض میں مہلت دے، "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة" (بقرہ: ۲۸۰) (اگر مدیون تنگدست ہو تو اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک مہلت دو)۔

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کئی روایات میں ایسے مقرض کے حق میں مغفرت کی بشارت دی ہے جو دیون کی وصولیابی میں مستقرض کو مہلت دیتے ہیں، جیسا کہ اوپر حضرت حذیفہ کی روایت ذکر کی جا چکی ہے یہاں صرف ایک حدیث قلمبند کرتا ہوں۔

"وعن أبي اليسر قال: قال رسول الله ﷺ: من أنظر معسرا أو وضع عنه أظله الله في ظله" (اخرجه مسلم رقم: ۳۰۰۶)

(حضرت ابی الیسرؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص تنگدست کو مہلت دے گا یا اس کا کچھ حصہ معاف کردے گا تو اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے دن) اپنے سایہ میں پناہ دیں گے)۔

۳- تیسری وجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک دیانۃً ایفائے عہد واجب ہے، نیز علامہ ابن تیمیہؒ کا رجحان بھی یہی ہے کہ قرض میں تاجیل کی شرط درست ہے۔ (الاختیارات الفقہیہ / ۱۳۲ بحوالہ قاموس الفقہ ۴ / ۴۹۳)۔

۴- فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے بھی مالکیہ کے قول کو راجح قرار دیا ہے، مولانا اپنی کتاب ''قاموس الفقہ'' میں رقم طراز ہیں، واقعہ ہے کہ مالکیہ کا قول اس مسئلہ میں زیادہ قرین صواب نظر آتا ہے۔ (قاموس الفقہ ۴ / ۴۹۲ مکتبہ نعیمیہ دیوبند)۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات منقح ہوگئی کہ قرض میں مقرض (قرض دہندہ) کی طرف سے ادائیگی قرض میں مہلت کا ملنا جائز ہی نہیں ہے بلکہ مستحسن اور باعث رحمت ہے۔

تاہم یہاں تحقیق طلب بات یہ ہے کہ مقررہ مدت کے اندر قرض کی واپسی پر پورے دیون کی معافی کی جو شرط ہے شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

اس سلسلہ میں فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم: ''المسلمون عند شروطهم'' سے بڑی رہنمائی ملتی ہے کہ مقرض اور مستقرض دونوں وہ قید و شرط لگا سکتے ہیں جس میں دونوں کی مصلحت پوری ہونے کی امید ہو، چونکہ مستقرض کی غرض ادائیگی دین میں مہلت مل جائے یا دین کا پورا حصہ یا آدھا معاف ہو جائے اور مقرض کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ادائیگی دین جلد ہو، الغرض دونوں کی غرض پوری ہو رہی ہے، اس لئے اس صورت کے جواز میں کوئی قباحت نہیں،

صاحب ''موسوعۃ الفقہ الاسلامی'' لکھتے ہیں: ''يجوز الحط من الدين المؤجل من أجل تعجيله سواء كان بطلب من طلب صاحب الدين أو المدين لما فيه من مصلحة الطرفين'' (مطبع الافکار الدولیہ ۲ / ۵۰۲)

دین مؤجل میں فی الفور ادا کرنے کی صورت میں دین کا کچھ چھوڑ دینا (معاف کردینا) درست ہے چاہے اس کی طلب مقرض کی طرف سے ہو یا مدیون کی طرف سے وجہ یہ ہے کہ اس میں دونوں کی ضرورت پوری ہو رہی ہے۔

صورت مسئلہ کی شکلیں:

بہرحال سوال نمبر ۲ کی یہاں دو شکلیں ہوتی ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ قرض دہندہ مستقرض کو پورے دیون یا آدھے دیون سے بری کردے اور اس سے معافی اور چھوٹ کو کسی عمل پر معلق نہ کرے تو یہ بالاتفاق درست ہے۔ چونکہ فی الفور ایک ہی مجلس میں دین مؤجل کو نقد وکیش کی شکل میں دے دیا اور اس پر دائن نے دین کا کچھ حصہ معاف کیا ہے۔ جیسا کہ فرمان ربانی ہے:

"وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة وأن تصدقوا خير لكم" (بقرۃ: ۲۸۰)

(اگر مدیون تنگدست ہو تو اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک مہلت دو، اور یہ کہ معافی ہی کردو اور زیادہ بہتر ہے)۔

۲:- دوسری شق یہ ہے کہ کل دیون یا نصف کی معافی کو مقرض مستقرض کے ادائیگی دین پر معلق کرے، جیسا کہ مذکورہ صورت میں ذکر ہے دین کے نصف حصہ کی معافی ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر ہوتی ہے۔

اس شق کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت ہے وہ ملاحظہ کریں، فقال النبي صلی اللہ علیہ وسلم: ''ضعوا و تعجلوا'' (رواہ الحاکم: ۲۳۲۵)

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کو دین فی الحال وصول کرنے کے لئے اس کا کچھ حصہ وضع اور معاف کرنے کی اجازت دی۔

سوال نمبر ۳ کا جواب:

قرض کی صحت کے لئے فقہاء نے کچھ شرطیں مقرر کی ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ ہے کہ قرض کا تعلق اس مال سے ہو جس کو قرض میں لیا جاتا ہو، مثلاً وہ مال مثلی ہو، موزونات ہو، مکیلات ہو، مذروعات ہو اور عددیات متقاربہ ہو یہ سب مثلی ہیں ان میں قرض کے طور پر لین دین درست ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ان کا بدل تفاوت کے بغیر ادا کیا جاسکتا ہے،

”فقال الحنفية: يصح القرض في المثلي ... كالمكيل والموزون والمعدود المتقارب“ (الفقه الاسلامی وادلته ۴/ ۵۱۲ مکتبہ دیوبند) علماء احناف کا نظریہ ہے کہ قرض کا معاملہ مثلی چیزوں میں درست ہے چاہے وہ کیلی ہو، وزنی ہو، یا عددی ہو۔

لیکن ائمہ ثلاثہ کے یہاں ہر اس چیز میں درست ہے جس میں بیع سلم درست ہے (حوالہ سابق ۴/ ۵۱۲)۔

قرض کے باب میں ایک اہم شرط یہ ہے کہ قرض کے بدلہ میں نہ زیادتی کی شرط ہو اور نہ مقرض کی طرف سے قرض کے علاوہ ھدیہ کی پیشکش ہو، کیوں؟ اس لئے کہ زیادتی اور ہدیہ وہ مال ہے جو بدل سے خالی ہے اور شریعت کی اصطلاح میں ایک مال کا تبادلہ اسی مال کے جنس سے اسی وقت درست ہے، جبکہ برابری میں ہو اور نقد اہو، ورنہ وہ سود میں شامل ہوگا۔

علامہ شامی سود کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں،

”(هو) شرعا (فضل) ولو حكما خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين ... قال: ويدخل فيه إذ شرط الانتفاع بالرهن كالاستخدام والركوب والزراعة ... فإن الكل ربوا حرام“ (شامی ۴/ ۲۲۵)۔

(ربا شرعا لین دین کے سلسلہ میں فریقین میں سے کسی ایک کے لئے ایسے اضافہ کا نام ہے جو عوض سے خالی ہو، چاہے یہ اضافہ متعاقدین کی طرف سے حکما ہو، مثلا مرتہن مال مرہون سے فائدہ اٹھانے کی شرط لگادے، جیسے خدمت لینا، سوار ہونا، کاشتکاری وغیرہ بلا شبہ یہ سب سود اور حرام ہیں)۔

علامہ شامیؒ کی اس جامع عبارت سے اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا کہ قرض کے معاملہ میں دائن (مقرض) کی طرف سے قرض کی رقم کے علاوہ زیادتی کی شرط اور مستقرض سے منفعت اٹھانے کی شرط رکھنا ربا (سود) ہوگا اور حرام ہے۔

ارشاد ربانی ہے: ”أحل الله البيع وحرم الربوا“ (بقرہ: ۲۷۵) (اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے)۔

حدیث شریف میں سات چیزوں کو موبقات میں شمار کیا ہے ان میں ایک ”اکل الربا“ (سود کھانا) کو بھی شمار کیا ہے (متفق علیہ بخاری شریف رقم ۲۷۶۶)

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرض کی طرف سے منفعت کی شرط (جو عوض سے خالی ہو) کو سود میں شامل کیا ہے،

”كل قرض جر منفعة فهو حرام إذا كان مشروطا (رواہ البیہقی بحوالہ الفقہ الاسلامی ج۔ ۴ ص ۷۲۶)

جو قرض نفع کے لئے بنایا جائے وہ ربا ہے۔

اسی طرح ”عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری“ میں تھوڑے فرق کے ساتھ ذکر ہے۔

”كل قرض جر منفعة فهو ربا“ (كتاب عمدة القاری الاجارة)۔

اور ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی قرض میں مذکورہ زیادتی کی نفی کی ہے۔

”أن لا يجر نفعا، فإن كانت المنفعة للدافع منع اتفاقا“ (الفقه الاسلامی وادلته ۴/ ۵۱۸)

(قرض کو نفع کا ذریعہ نہ بنائے اگر یہ منفعت دائن (مقرض) کے لئے ہے تو بالاتفاق ممنوع ہے)۔

مذکورہ بالا بحث کے تحت سوال نمبر ۳ میں (دائن) کی طرف سے مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنے کی شرط درج ذیل وجوہ سے شرعا درست نہیں۔

۱- ایک وجہ یہ ہے کہ قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قول صحابہ ”كل قرض جر منفعة فهو ربا“ کے تحت سود ہے۔

۲- یہ شکل دور جاہلیت میں اور ابھی بھی ”ربا النسيئة“ میں داخل ہے اور یہ حرام ہے چونکہ ربا کے حکم میں ہے اور ربا (سود) کی حرمت پر علماء کا اتفاق ہے۔ چاہے ”ربا النسیئہ“ ہو یا ”ربا الفضل“۔ چنانچہ مفتی عبید اللہ اسعدی لکھتے ہیں، علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص ”ربا النسیئہ“ (یعنی ربا الدیون کی حرمت کا انکار کرے تو اس کی تکفیر کی جائے گی (الربا/ ۸۴ فقہ اکیڈمی دہلی)۔

حالت اختیاری اور حالت اضطراری کا اثر اور دونوں کے حکم میں فرق:

اسلام کے دین کامل اور عالمی دین ہونے میں ایک نمایاں وجہ یہ ہے کہ اس کے احکام میں راہ اعتدال کا جتنا لحاظ ہے وہ اسی دین متین کا طرہ امتیاز ہے، اسی وجہ سے دین کے ہر شعبہ میں حالت اختیاری اور حالت اضطراری دونوں کا اعتبار ہے دونوں کے حکم میں واضح فرق ہے، یعنی حالت اختیاری میں ایک چیز کا حکم عدم جواز کا ہوتا ہے تو اسی امر کا حکم حالت اضطراری میں جواز کا۔

اسی بنا پر سوال نمبر ۳ کے تحت اوپر یہ حکم لکھا گیا کہ اگر مقررمدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم دینا سود ہے اور ایک مسلمان کے لئے جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح سود دینا بھی، لہذا سود پر قرض لینا ایک مسلمان کے لئے شرعاً درست نہیں۔

یہ حکم اختیاری حالت میں ہے، لیکن اگر کوئی بہت زیادہ مالی تنگدستی میں ہے، غربت وبدحالی سے دوچار ہے، بلاسودی قرض ملنے کی کوئی راہ نہیں ہے تو یہ اضطراری حالت ہے، اس صورت میں "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت ممنوع اعمال بھی مباح ہوجاتے ہیں،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، "فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه" (بقرہ/ ۱۷۳)۔

پھر جو شخص بیتاب ہوجائے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا،

علامہ ابن نجیم نے بھی حاجت کو ضرورت کے قائم مقام قرار دے کر سود پر قرض لینے کی رخصت دی ہے۔ "وفي القنية والبغية، يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ/ ۱۴۵) قنیہ اور بغیہ میں ہے کہ حاجت مند کے لئے نفع کی شرط پر قرض لینا درست ہے۔

دوسری جگہ پر قاعدہ "ماحرم أخذه حرم اعطاءه" کے ضمن میں "الرشوة لخوف على ماله" کا استثنا کرتے ہیں "إلا في مسائل الرشوة لخوف على ماله او نفسه (قوله الرشوة لخوف على ماله) على في جانب الدافع ... وينبغي أن يستثنى الأخذ بالربا للمحتاج، فإنه لا يحرم" (اشباہ مع حموی/ ۱۷۶)۔

مگر مال یا جان کے خوف سے رشوت دینے کے مسائل ہیں، لیکن یہ جواز دینے والے کے حق میں ہے اس شخص کے حق میں جس کو دیا گیا ہے حرام ہے، اسی طرح مناسب ہے کہ اس سے یہ صورت بھی مستثنی ہو کہ کوئی محتاج سود پر قرض حاصل کرے یہ بھی حرام نہیں ہے۔

بحث بالا سے جب یہ مسئلہ واضح ہوا کہ نجی اور ذاتی مال (ذاتی حق) کی تحصیل اور وصولیابی میں رشوت دے سکتا ہے تو اسی طرح اگر کوئی شخص اس طرح تنگدست اور لاچار ہے، جس کی تلافی کے لئے مذکورہ صورت کے علاوہ کوئی جائز متبادل راہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں مذکورہ مضطر مسلمان کے لئے سرکاری اسکیم سے سود کی شرط پر قرض لینے کی گنجائش ہوگی۔

سوال نمبر ۴ کا جواب:

اس صورت کا حکم لکھنے سے پہلے یہاں اس اعتبار سے غور کرنا ضروری ہے کہ غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل رقم کے علاوہ جو زائد رقم کی واپسی کا مطالبہ ہوتا ہے اور اس کی شرح بہت کم ہوتی ہے کیا اس کو سروس چارج میں شمار کرکے اس کی رخصت دے سکتے ہیں یا اس پر سود کا حکم عائد ہوگا؟ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں فقہاء نے سود کی جو تعریف کی ہے۔

"هو شرعًا فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لاحد المتعاقدين" (شامی ۴/ ۲۴۵)

(وہ مال جو عوض سے خالی ہو اور متعاقدین میں سے کسی ایک کے لئے ہو) وہ اس صورت پر پورے طور پر صادق آرہی ہے، یعنی زائد رقم بھی ہے، جو عوض سے خالی ہے، جن کی واپسی کا مطالبہ شرط کے طور پر ہے چنانچہ اس کے بارے میں یہاں چند فقہاء کی رائے پیش کرنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"عن أنس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا قرض أحدكم قرضا فأهدى إليه طبقا فلا يقبله أو حمله على دابة فلا يركبها" (البيهقي السنن/ ۳۵) اگر تم میں سے کسی شخص نے کسی کو قرض دیا اور مقترض اس کو ایک طبق پیش کرے تو اسے نہیں قبول کرے

یا مقرض کو مستقرض جانور سواری کے لئے دے تو اس پر سواری نہیں کرنی چاہیے۔

دوسری روایت میں اس سے زیادہ سخت حکم آیا ہے کہ مقرض کا مستقرض کو قرض دے کر کسی طرح کا اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز اور حرام ہے۔ گرچہ اس حدیث کے بارے میں سنداً کلام کیا گیا ہے، مگر اس کا معنی اقوال صحابہ سے ثابت ہے۔

''كل قرض جر منفعة فهو ربا'' (مطالب: ۱۳۷۳- در منثور ۵/ ۳۵۰ کنز العمال/ ۱۵۵۱۶)۔

چنانچہ اس حدیث کے حکم کے بارے میں علامہ ابن باز رقمطراز ہیں:

''الحديث المذكور ضعيف عن أهل العلم ليس بصحيح، ولكن معناه صحيح عن العلماء معناه أن القروض التي تجز نفعا بممنوعة بالإجماع'' (تطبيقات الشيخ ابن باز وفتاوى ابن باز)۔

گرچہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے لیکن اس کے معنی کی علماء نے تصویب کی ہے یعنی قرض پر نفع کمانا بالاجماع ناجائز ہے،

''وقد نقل ابن المنذر إجماع العلماء على ذلك فقال: أجمعوا على أن المسلف إذا اشترط على المستسلف زيادة أو هدية فأسلف على ذلك إن أخذ الزيادة على ذلك ربا'' (احكام القرض)۔

علامہ منذر نے اس پر علماء کا اجماع لکھا ہے کہ مقرض کا زیادتی اور ھدیہ کی شرط پر مقترض کو قرض دینا اور زیادتی کا لینا ربا (سود) ہے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی اس سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں:

''فإن كانت الزيادة بشرط أو وعد أو عادة منعت مطلقا'' (الفقه الاسلامی وادلته ۴/ ۵۱۶)

اگر قرض کے علاوہ زیادتی کی شرط ہو یا وعدہ یا عادت کے طور پر ہو وہ مطلقا ناجائز ہے۔

حدیث بالا اور محدثین وفقہاء کے اقوال کے نتیجے میں راقم کی ناقص رائے یہ ہے کہ جس قرض میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ شرط اور وعدہ اور عادت کے طور پر ہو وہ ربا (سود) کے حکم میں ہے، لہٰذا اسے سروس چارج کے قائم مقام قرار دے کر نہ مقرض کا لینا درست ہوگا اور نہ مستقرض کا دینا۔

البتہ اگر مستقرض مضطر ہے تو بقدر ضرورت ہے علامہ حموی کے قول ''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' کے مطابق وہ زائد رقم دے کر قرض لے سکتا ہے، بشرطیکہ جان یا عزت پر آفت آنے کا امکان ہو اور سود پر قرض لئے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔

اصل سے زائد رقم کو سروس چارج میں شمار کی ایک صورت:

دین اسلام ہی کا امتیاز ہے کہ جہاں ایک صورت میں ایک معاملہ میں عدم جواز کا حکم دیا ہے تو وہیں دوسری طرف دوسری صورت میں جواز کا بہر حال پہلے یہاں چند صورتیں ملاحظہ کریں۔

ایک صورت:

اگر اس کی نوعیت وشکل میں تبدیل کر دی جائے مثلاً زائد رقم کو علی الاطلاق کرنے کے بجائے بینک اور دفتری تمام مصارف کا جائزہ لے کر ابتداء وقت میں ایک متعین رقم تمام مستقرضین پر لازم کی جائے جس کی ادائیگی قسط وار ہو تو اس کو سروس چارج کہہ سکتے ہیں، شرعاً یہ جواز کے حکم میں ہوگا۔

مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں، قرض جاری کرنے اور اس کا حساب وکتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں بینک کے لئے اپنے قرض داروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آتے ہیں (فقہی مقالات ۱/ ۲۷۰)۔

جواز کی دوسری صورت:

اس کے جواز کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص سرکاری اسکیم کے تحت قرض لے اس میں سے بعض رقم کو دوسرے بینک میں جمع کرے جس میں جمع

کی ہوئی رقم کا سالانہ سود اصل قرض لی ہوئی رقم سے بڑھ جاتی ہو پھر اسے نکال کر سرکاری اسکیم میں بطور سروس چارج جمع کردے، اس کے سلسلہ میں مفتی نظام الدین صاحب لکھتے ہیں:

مجبور و غریب کا حکومت سے قرض لینا کہ اس میں سے کچھ رقم بینک کے کسی ایسے کھاتے میں جمع کردی جائے جس سے ملنے پر سود پورے قرضہ کے سود کی ادائیگی کے لئے کافی ہو اور بقیہ رقم اپنے کاروبار میں لگادی جائے جس کو الگ سے ادا نہ کرنا پڑتا ہو تو شرعاً یہ حیلہ درست ہے۔

''من أراد بالحیلة الھرب من الحرام فلا بأس'' (سراج علی الخانیہ ۴/ ۴۷۵ بحوالہ تعلیم کے لئے قرض کا حصول/ ۱۳۰)۔

بینک میں اور اداروں کے مصارف کی بجا آوری کی متبادل راہ:

رہا یہ مسئلہ سرکاری اسکیم اور اداروں سے متعلق جو مصارف ہیں وہ کس طرح پورے ہوں گے؟ تو اس سلسلہ میں تیسرے فقہی سیمنار میں درج ذیل صورت میں راہ نکالی گئی ہے۔

ایک شکل:

(الف) کچھ اصحاب خیر ایک ملی قومی ضرورت سمجھ کر رضاء الٰہی کے لئے اپنے خرچوں سے چلائیں

(ب) سیمنار کی رائے میں ایسے تمام امدادی اداروں کو ہر طریقہ پر کوشش کرنی چاہئے کہ سرمایہ کا کچھ حصہ پیداوار میں لگا کر جائز آمدنی حاصل کی جائے ...... جس سے سوسائٹی کے انتظامی اخراجات پورے کئے جاسکیں (نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے/ ۱۳۵-۱۳۴)۔

دوسری شکل:

اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ ہر قرض دار بذات خود "ھل جزاء الإحسان إلا الإحسان" کی بنیاد پر قرض کی واپسی بہتر صورت میں کرے یا اپنی طرف سے کچھ زائد رقم دے بشرطیکہ ادارہ کی طرف سے نہ شرط ہو اور نہ اس سے وعدہ ہو تو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی، جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''إن خیارکم أحسنکم قضاءاً'' (بخاری شریف رقم ۲۳۰۵) (تم میں سے سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کی ادائیگی میں اچھا معاملہ کرنے والے ہوں)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی تفصیل سے اس شق پر روشنی ڈالی ہے: ''فإن أقرض شخص غیرہ مطلقا من غیر شرط فقضاء خیرًا منه فی الصفة أو زادہ في القدر جاز ولا یکرہ للمقرأخذہ'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۵۱۷)۔

اگر کسی شخص نے بغیر کسی شرط کے دوسرے کو قرض دیا اور قرض دار نے اس کی ادائیگی بہتر صورت میں کی یا مقدار میں زیادتی کردی تو یہ درست ہے اور مقرض کے لینے میں کوئی حرج نہیں۔

اسی طرح ''فتاوی عالمگیری'' میں بھی اس کی رخصت دی گئی ہے۔

''فإن لم تکن المنفعة مشروطة في العقد فاعطاہ المستقرض أجود مما علیه فلا بأس به'' (۳/ ۲۰۲)

(اگر مقرض نے قرض دیتے وقت منفعت کی کوئی شرط نہیں رکھی اور قرض دار نے بہتر صورت میں ادا کیا تو اس میں کوئی قباحت نہیں)۔

الغرض قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال فقہاء اس بات پر دال ہیں کہ ادارے کے مطالبہ اور شرط کے بغیر قرض دار اپنی صوابدید سے اصل رقم سے کچھ زائد رقم مقرض یا ادارے کو ادا کرے تو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی، لیکن شرط کی صورت میں زائد رقم دینا سود میں شامل ہوگا۔

سوال نمبر ۵ کا جواب:

چونکہ یہ صورت سوال نمبر ۴ کے بعینہ مشابہ ہے، اور اس کے جواب کے تحت دو اعتبار سے حدیث شریف اور فقہاء کے اقوال کے آئینہ میں سیر حاصل کلام کیا گیا ہے اس لئے بحث بالا پر قیاس کرتے ہوئے صرف یہاں مذکورہ دونوں شقوں اور دونوں کے حکم کو لکھنے پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ پہلی شق: یہ ہے کہ معافی یا غیر معافی والے والے قرضوں میں اگر مقترض (دائن) یا سرکاری ادارے کی طرف سے زائد رقم کی ادائیگی کا مطالبہ ہے یا اس ادارے میں اس کا رواج ہے تو وہ زائد رقم سود میں شمار ہوگی چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر، چاہے اس زائد رقم کو سروس چارج یا انتظامی خرچ میں شمار کریں یا کوئی اور نام سے اسے تعبیر کریں، "فإن كان مشرو طا فهو ربا محرم" (موسوعۃ الفقہ الاسلامی ۳/۴۹۹)۔

۲۔ دوسری شق: اگر ہر قرض دار "هل جزاء الإحسان إلا الإحسان" کے تحت اپنی خوشی سے دائن (یا سرکاری اسکیم) کو اصل رقم کے علاوہ کچھ زائد رقم ادا کرے بشرطیکہ دائن کی طرف سے کوئی شرط نہ ہو تو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی، کیونکہ یہ مکارم اخلاق میں داخل ہے۔

صاحب موسوعہ رقمطراز ہیں: الإحسان في أداء القرض مستحب إن لم يكن شرطا؛ لأن هذا من حسن القضاء ومكارم الأخلاق (موسوعة الفقة الاسلامية ج۳/ ۴۹۹)۔

البتہ قرضے کی وہ شکلیں جن میں جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضرورت کے لئے سرکاری اسکیم کے تحت ہوتی ہیں تو اس کی بھی دو شکلیں ہوں گی:

۱۔ پہلی شق: اگر قرض لینے والا مجبور اور مضطر نہیں ہے تو سود پر قرض لینا درست نہیں ہوگا، بلکہ بلا سودی قرض سے بچنا ضروری ہوگا۔

۲۔ دوسری شق: لیکن اگر وہ مجبور ہے مضطر ہے تو ان ضروریات کی بجا آوری کے لئے کوئی متبادل حلال سبیل نہیں ہے تو علامہ حموی کے قول "ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (اشباہ مع حموی/ ۱۴۵) کے مطابق بقدر ضرورت سرکاری اسکیم سے قرض لینے کی گنجائش ہوگی۔

"فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه" (بقرہ: ۱۷۳)

پھر جو شخص بیتاب ہو جائے بشرطیکہ نہ طالب لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوگا۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اضطراری حالت میں سرکاری اسکیم سے سود پر فائدہ اٹھانے کی گنجائش دی ہے لکھتے ہیں: لیکن دوسرے اشخاص یا بینکوں کے مقابلہ میں حکومت کو سود ادا کرنے کا معاملہ نسبتاً خفیف ہے (کتاب الفتاوی ۲/ ۶۴)۔

سوال نمبر ۶ کا جواب:

اس شق کا تعلق گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی اس رقوم سے ہے جو ضرورت مند اور محتاج لوگوں کو مکان بنانے اور بیت الخلاء اور دوسری ضروریات کی تکمیل کے لئے بطور اعانت کے دیجاتی ہیں، لیکن ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی ہے اس لئے یہاں دو جہتوں سے بحث ضروری ہے۔

۱۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو رقم بطور اعانت کے ملتی ہے شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟

۲۔ اس معاونت کے حقدار کون لوگ ہیں۔

پہلی شق کے تحت یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، لفظ جمہوری سے یہ معنی واشگاف ہوتا ہے کہ اس ملک کے خزانے کو مستحکم کرنے میں جس طرح عام شہری کے مال سے مختلف ٹیکس کے طور پر ایک حصہ لیا جاتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی جائداد اور املاک کا بڑا حصہ اس میں جمع ہوتا ہے، بلکہ مسلمانوں کی موقوفہ جائدادیں سے بڑی پروپٹی حکومت کے قبضہ میں ہے اس سے بڑی منفعت حاصل ہوتی ہے وہ اسی ملک کے خزانے میں جمع ہوتی ہے۔ اس لئے عام شہریوں کے مقابلہ میں اس ملک کے خزانے سے مسلمانوں کا حق زیادہ ہے۔

استاذ محترم قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

ہندوستان جمہوری طرز حکومت ہے جو دراصل (Reperesentative system of Gonernment) نیابتی نظام حکومت ہے۔

(الف) اختیارات کا سرچشمہ عوام کو تسلیم کیا گیا ہے۔ (ب) پورے ملک کی بالغ آبادی کو رائے دہندگی کا حق ہے۔

آگے لکھتے ہیں کہ یہ حکومت جو دستور ہند کی رہنمائی کی پابند ہوتی ہے، عوامی مفادات کو سامنے رکھ کر وسائل آمدنی پر کنٹرول اور خرچ کی مدات کی تعین اور ہر دو کی پالیساں وضع کرنے اور نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے (مباحث فقہیہ / ۷ ۶۴)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ملک کے مالیاتی نظام اور سرمایہ اندوزی کی بنیاد سود اور قمار پر ہے جو عام حالات میں ایک مسلمان کے لئے درست نہیں ہے، لیکن یہ بھی نا قابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمان یہاں کے نظام اور طریقہ تجارت میں (جو ملک کے تحت ہے) تبدیلی اور سدھار کرنے پر قادر نہیں ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ اپنے طور پر ایسے سرمایہ داروں سے اور سرکاری اسکیموں سے اپنے دامن کو داغدار ہونے سے بچائے، یہی تقوی کا تقاضہ ہے۔

ارشاد ربانی ہے: "ومن يتق الله يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لا يحتسب" (طلاق: ۳)

جو شخص اللہ سے ڈریگا تو وہ مشکل سے نجات کا راستہ نکال دیں گے اور اس کو بے گمان رزق عطا کریں گے۔

دوسری شق:- لیکن اگر کسی مسلمان کے پاس ضرورت کے بقدر مکان نہیں ہے۔ اور نہ اس کے پاس اتنی رقم ہے کہ مکان اور بیت الخلاء بنا سکے تو ایسی اضطراری حالت میں حکومت کی اسکیم اور گورنمینٹ کی طرف سے ملنے والی رقم کا لینا اور مکان بنانا شرعاً درست ہوگا، اور وہی حقیقت میں سرکاری اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے حقدار ہیں، جیسا کہ علامہ حموی نے لکھا ہے

''الضرورة بلوغه حدا أن يتناول الممنوع هلك وهدم يبيح تناول الحرام'' (حاشيه الاشباه /۱۰۸)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

"اگر کسی کے پاس ضرورت کے بقدر رہائش کی سہولت نہ ہو اور نہ اتنا پیسہ ہو کہ مکان بنا سکے...... تو اس کے لئے حکومت کی ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانا درست ہے، کیونکہ ضرورت مندوں کو مکان فراہم کرنا اور بے روزگاروں کو روزگار کے مواقع مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے" (کتاب الفتاوی ۱۰/ ۶۴)۔

حضرت مولانا قاضی مجاھد الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ قلمبند کرتے ہیں: "اگر چہ یہ درست ہے کہ ہندوستان کا کوئی شہری اپنی انفرادی حیثیت میں پبلیک اکاؤنٹ (سرکاری خزانہ) کا مالک نہیں ہے، لیکن دستور ہند کی رو سے ہر شہری کو مقررہ ضوابط کے تحت انتفاع سرکاری خزانہ سے حاصل ہے"۔

الغرض تفصیل بالا اس بات پر دال ہے کہ یہاں کے ہر شہری کو سرکاری خزانہ سے حق انتفاع حاصل ہے تو ضرورت مند محتاج مسلمان کا گورنمنٹ کی امدادی رقم سے مکان بنانا شرعاً جائز ہوگا۔

سوال نمبر ۷ کا جواب:

یہ ایک مسلّہ حقیقت ہے کہ اس قت ہندوستان میں اپنی نجی کمائی ہوئی رقوم بینک سے حاصل کرنا مشکل ہی نہیں، بلکہ ۸ نومبر ۲۰۱۶ء سے ۵۰۰ سو اور ہزار کی نوٹ بندی کی وجہ سے کتنے لوگوں کو اپنی قیمتی جان کی بھینٹ چڑھانی پڑی ہے، یعنی روپئے کے لیے قطاروں میں رہتے ہوئے جان بحق ہوگئی، لیکن وہ رقم نہیں ملی جس کو حاصل کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گورمینٹ کی امدادی رقوم کو حاصل کرنے میں کتنی دقتیں ہوتی ہیں، لہٰذا درمیان میں واسطے والوں کی مدد ہی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ ان کے بغیر روپیہ وصول کرنا اور کوئی کام کرانا محال ہے۔

بہر حال سوال یہ ہے کہ واسطہ والے جو اپنا قیمتی وقت صرف کرتے ہیں، دفاتر کے عملاء سے بار بار ملاقات کرتے ہیں، قانونی اور کاغذاتی دشواریوں کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں کیا ان کو محنتانہ دینا اور لینا شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلہ میں ہمیں قرآن مجید کی اس آیت سے بڑی رہنمائی ملتی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کنویں سے پانی نکال کر دینے پر اجرت دی۔

"قالت إنّ أبي يدعوك ليجزيك أجر ما سقيت لنا" (قصص/ ۲۵)

کہنے لگی کہ میرے والد تم کو بلاتے ہیں تاکہ تم کو اس کا صلہ دیں گے جو تم نے ہماری خاطر پانی پلا دیا تھا۔

دوسری جگہ پر ارشاد ربانی ہے: "فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن (طلاق/ ۶) پھر اگر وہ عورتیں تمہارے لئے دودھ پلادیں تو تم انکو اجرت دو۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کیوں اجرت دینے کا وعدہ کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیب علیہ السلام نے اس عمل پر اجرت اور معاوضہ دینے کے لئے طلب کیا کہ انہوں نے اپنا وقت لگایا تھا اور کنویں سے پانی نکال کر دیا تھا یہ ایک منفعت ہے جس

پر معاوضہ دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح شیر خوار بچے کو دودھ پلانا ایک منفعت ہے، اس لئے دوسری آیت میں اللہ تعالی نے مرضعہ کو معاوضہ دینے کی تاکید کی ہے۔

جس طرح پانی کنویں سے نکال کر دینا اور بچے کو دودھ پلانا اجارہ کے قبیل سے ہے اور دونوں منفعت بھی ہے اور دونوں کا معاوضہ لینا درست ہے اسی طرح سرکاری امدادی رقوم حاصل کرنے کے لئے واسطہ بننا، محنت کرنا اور تگ و دو اور محنت کر کے روپیہ وصول کرنا اور مستحق لوگوں کے حوالہ کرنا بھی ایک منفعت ہے جس کی اجرت لینا اور دینا درست ہے، نیز وکالت، دلالی کے قبیل سے بھی ہے اس لئے درست ہے۔

سوال نمبر ۸ کا جواب:

یہ سوال عقد اجارہ کے قبیل سے ہے، اس کی صحت کی شرطوں میں ایک اہم شرط یہ ہے کہ اجیر کے عمل کے ایک حصہ کو اجرت نہ بنایا جائے، بلکہ اس کے علاوہ کسی مال متقوم کو اجرت بنائیں ورنہ اجارہ فاسد ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجیر کے جزو عمل کو اجرت بنانے سے منع فرمایا ہے،

''عن أبي سعيد الخدري قال: نهى عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان'' (ابوداؤد رقم ۳۴۲۹)

حضرت ابوسعید الخدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی جفتی کی اجرت اور قفیز طحان سے منع فرمایا ہے۔

امام طحاوی کی توجیہ:

اس حدیث کے دوسرے جزء ''عن قفيز الطحان'' کے بابت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ممانعت کی وجہ وہ آٹا ہے جو موجود نہیں ہے اس کو اجرت میں طے کیا ہے، اور معدوم شئی کو اجرت میں پیش کرنا درست نہیں ہے (مشکل الآثار ۱ / ۳۰۷)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس طرح کے عقد اجارہ کو موجب فساد قرار دیا ہے۔

''تعين الأجر بما يعمل فيه الأجير مفسد للعقد'' (موسوعة الفقه الاسلامی ۴/ ۵۴۰)

(جیر کے عمل کے ایک حصہ کو اجرت میں متعین کرنا فساد عقد کا سبب ہے)۔

مگر چونکہ ہمارے ہندوستان میں معاملات میں بڑی تبدیلی آگئی ہے بالخصوص اجارہ کے باب میں معقود علیہ کے جزو خاص کو اجرت بنانے کا عرف ہو گیا ہے بلکہ عموم بلوی کے درجہ میں ہے، اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو امت ضیق اور تنگی میں مبتلا ہو جائے گی، اس لئے ''الأمر إذا ضاق اتسع'' اور قاعدہ ''لو كان أحدهما أعظم ضررا من الآخر، فإن الأشد يزال بالأخف'' (اشباہ/ ۳۱۵) کے تحت اور مذکورہ بالا فقہائے احناف، مالکیہ اور حنابلہ کی رائے کی روشنی میں راقم کی یہی رائے ہے کہ اجارہ کے باب میں عرف کی وجہ سے قیاس کا ترک کرنا درست ہے، لہذا اگر مستحق واسطہ والے کو حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ دیتے ہیں تو اس کا لینا اور دینا عرف کی وجہ سے درست ہے، بشرطیکہ اجرت کا حصہ پہلے سے متعین ہو۔

سوال نمبر ۹ کا جواب:

شرع میں جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح دینا بھی، لیکن اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے مسلمانوں کو رخصت حاصل ہے کہ بدرجہ مجبوری سود دے کر اپنا حق حاصل کر سکتے ہیں، اس کی نظیر موجود ہے چنانچہ علامہ ابن نجیم ''قاعدہ'' ''ماحرم أخذه حرم اعطاءه'' کے ضمن میں ''الرشوة لخوف على ماله أو نفسه'' کا استثناء کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''إلا في مسائل الرشوة لخوف على ماله أو نفسه ... هذا في جانب الدافع''

مگر مال یا جان کے خوف سے رشوت دینے کے مسائل ہیں، لیکن یہ جواز دینے والے کے حق میں ہے۔

بہر حال یہاں سوال یہ ہے کہ حکومت سے مستحقین اور غریب لوگوں کو جو امدادی رقم ملتی ہے۔

اس بارے میں اصولی بات یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے (سرکاری اسکیم) سے ملنے والی امدادی رقم اور قرضوں کی تحصیل کوئی اپنا جائز حق نہیں ہے

جس کی تحصیل کے لئے رشوت دینے کی رخصت دیجائے اور جس کی اجازت علامہ ابن نجیم نے اپنے اس قول کے ذریعہ "إلا في مسائل الرشوة لخوف علی ماله أو نفسه" دی ہے، لہذا سرکاری اسکیم سے امدادی رقم اور قرضوں کی تحصیل کوئی اپنا حق نہیں ہے، اس لئے اس کے لئے رشوت دینا عام حالت میں جائز نہیں، اور نہ رشوت دے کر امدادی رقم اور قرض حاصل کرنا درست ہے۔

تاہم کوئی مسلمان بہت ہی نادار اور مضطر ہے اس کے علاوہ معاش کی ضرورت پوری کرنے کی کوئی سبیل نہیں ہے تو "فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه" (البقرة: ۱۷۳) اور "الضرورات تبيح المحظورات" کی بنیاد پر اور بقول علامہ حمویؒ "ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" رشوت کے ذریعہ بقدر ضرورت امدادی رقم اور قرض لینے کی شرعاً گنجائش ہوگی۔

سوال نمبر ۱۰:

یہ دنیا جہاں ایک طرف انسان کے لئے عبادت گاہ، اور امتحان گاہ ہے وہیں دوسری طرف اپنی معیشت درست اور بہتر بنانے کے لئے دار الاسباب بھی ہے گرچہ اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، لیکن اس کا مدار انسان کی محنت ومجاہدہ اور ذرائع واسباب کے اختیار کرنے پر رکھا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اپنی ضرورت اور اپنے ماتحتوں کی ضرورت کی کفالت کے لئے محنت کرنا، ملازمت کرنا واجب ہے اور یہ توکل کے خلاف نہیں، بلکہ فریضہ کی ادائیگی کی نیت سے پرے ہے مال جائز طریقہ پر مال حاصل کرنا صدقہ ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے حصول کی ترغیب دی ہے:

"فإذا قضيت الصلوٰة فانتشروا في الأرض وابتغوا من فضل الله" (الجمعه/۱۰)

(جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو)۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کئی روایات میں صحت مند اور بغیر ضرورت کے سوال کرنے والے کو سوال سے منع ہی نہیں کیا ہے بلکہ یہ فرمایا ایسے لوگ قیامت کے دن نہایت ذلت و بے آبروئی کی حالت میں پیش ہوں گے، اس لئے آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو دست سوال دراز کرنے کے بجائے ملازمت کرنے کی ترغیب دی اور سائل کو وعید سے متنبہ کیا۔

"عن عبد الله بن عمر قال: قال: مايزال الرجل يسأل الناس حتى يأتي يوم القيامة ليس في وجهه مزعة لحم" (متفق عليه)

(حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی ہمیشہ لوگوں سے مانگتا رہتا ہے (سوال سے باز نہیں آتا (یہاں تک کہ قیامت کے دن آئے گا تو اس کے منہ پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہیں ہوگی)۔

اسی وجہ سے علماء نے بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں مصارف زکوٰۃ متعین کئے ہیں اور اس کی وضاحت کی ہے کس حال میں سوال کرنا درست ہے اور کس حال میں درست نہیں۔

ظاہر ہے کہ قرآن میں اللہ نے جہاں آٹھ مصارف زکوٰۃ کو متعین کیا ہے وہیں سائل کی حاجت کی بنیاد پر اس کی مدد اور نصرت کی ترغیب بھی دی ہے جیسا کہ قرآن میں ہے "وأما السائل فلا تنهر" (ضحیٰ: ۱۰) "وفي أموالهم حق للسائل والمحروم" (سورہ الذاریات: ۱۹)۔

"تو خذ من أغنيائهم و ترد على فقرائهم" (مستفاد از قاموس الفقہ ۴/۷۹) (مالداروں سے لو اور محتاج پر خرچ کرو)۔

بحث بالا سے میں یہی سمجھتا ہوں کہ علماء نے استحقاق زکوٰۃ میں جو معیار متعین کیا ہے اسی کو (معیار کو) حکومت کی امدادی رقوم اور قرض کی تحصیل میں ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا، چنانچہ علامہ ابن نجیم نے ضرورت مندی اور فقر ومحتاجگی کو معیار بنا کر سود پر قرض لینے کی گنجائش دی ہے۔

"ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (اشباہ مع حموی)۔

اس لئے جس طرح غیر مستحق کا زکوٰۃ لینا اور سوال کرنا درست نہیں اسی طرح غیر مستحق کا سرکاری اسکیم سے امدادی رقوم اور قرض سود پر لینا جائز نہیں ہوگا اس سلسلہ میں اس اسکیم کے قوانین اور اصول وضوابط کے خلاف ورزی کرنا اور غلط بیانی کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا۔ اور عند اللہ دوسرے مستحقین کے حقوق کی حق تلفی کی وجہ سے مستحق عقاب ہوں گے۔

سوال نمبر ۱۱ کا جواب:

تعلیم انسان کی بنیادی ضرورت ہے، اسلام نے ہر علم نافع کی حوصلہ افزائی ہی نہیں کی ہے، بلکہ بقدر ضرورت اس کی تحصیل کو ضروری قرار دیا ہے، اب رہا یہ مسئلہ کہ تعلیم لے لئے حکومت سے قرض لینا کیسا ہے؟ اس موضوع پر اکیڈمی کا اٹھارواں سمینار جامعۃ الریحان تملناڈو میں ۲۰۰۹ء میں منعقد ہوا، اور اس وقت جو تجاویز پاس ہوئے وہ یہاں نقل کرتا ہوں، اسی میں اس شق کا جواب ہے۔

ہمارے ملک میں تعلیم مہنگی ہو چکی ہے کہ ملک کے غریب شہریوں خاص کر مسلمان کی اکثریت کے لئے معاشی پسماندگی کی وجہ سے اعلی تعلیم کا حصول مشکل ترین امر بن گیا ہے۔ یہ ملک مختلف مذہبوں، زبانوں، اور تہذیبوں کا گلدستہ ہے اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں اپنا موثر رول ادا کرے، اعلی تعلیم کے حصول کے لئے مسلمانوں کو بلاسودی قرض فراہم کرے نیز تعلیم حاصل کرنے کے لئے مسلمان بچوں کو معقول اسکالرشپ فراہم کرے اور اس کے حصول کی شرائط کو آسان کرے (تعلیم کے لئے قرض کا حصول اسلامی نقطۂ نظر) ایفا پبلیکیشنز/)۔

رہا یہ مسئلہ کہ حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ خود حکومت ادا کرتی ہے تو ایسی اسکیم سے استفادہ کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلہ میں ایک بات صاف ہو گئی حکومت پر جو ذمہ داری تھی (اعلی تعلیم کے حصول کے لئے مسلمانوں کو بلاسودی قرض فراہم کرنا جیسا کہ اکیڈمی کے فیصلہ بالا سے واضح ہے) اس میں یہ حکومت ناکام ہے، جہاں تک مسلمانوں کا کیا کردار ہونا چاہیے؟ اس سلسلہ میں سوال نمبر ۵ اور ۹ کے تحت اوپر بحث آچکی ہے کہ جس طرح حکومت سے سود پر قرض لینا ایک مسلمان کے لئے معتدل حالت میں ناجائز ہے اسی طرح حکومت کے اس روپیہ کو امداد اور قرض کے طور پر لینا یا بلاسودی قرض لینا جائز نہیں جو بینک سے انٹرسٹ دے کر حاصل کی جاتی ہے گرچہ حکومت کی نظر میں وہ درست ہے لیکن اسلام کی نظر میں اسی کو سود کہتے ہیں اور یہ کسی مسلمان کے لئے درست نہیں، ارشاد ربانی ہے، احل اللہ البیع وحرم الربوا (سورہ بقرہ: ۲۷۵)

دوسری جگہ ہے "وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس ولا یربوا عند اللہ" (روم: ۳۹)

(اور جو چیز تم طرض سے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جاوے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا)۔

اختیاری اور اضطراری حالات اور دونوں کے حکم میں فرق:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے احکام میں حالت اعتدال اور حالت اضطرار کا بڑا لحاظ کیا گیا ہے بلکہ یہ اسلام ہی کا طرہ امتیاز ہے کہ اس نے انسان کی وسعت واستطاعت کا لحاظ کیا ہے اور حالت اختیار حالت اضطرار کے اعتبار سے اعمال پر حکم عائد کیا ہے، اس لئے اوپر جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ حالت اعتدال کے اعتبار سے ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان مالی اعتبار سے اتنا کمزور ہے کہ سودی قرض لئے بغیر اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلا سکتا، بلکہ مطلوبہ تعلیم سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہے تو ایسے مسلمان والد اور طلبہ کو چاہیے کہ کسی معتبر مفتی کے سامنے اپنے حالات رکھ کر ان کے مشورہ پر عمل کرے، اور اگر اجازت دے تو سرکاری اسکیم سے تعلیم کے لئے قرض لے سکتا ہے۔

"ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (اشباہ مع حموی) (مستفاد ایضا از تعلیم کے لئے قرض کا حصول ص ۱۵)۔

سوال نمبر ۱۲ کا جوب:

یہاں ڈپازٹ کی صورت اور اس کا حکم لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے اس کے بعد صورت مسئلہ کا حکم۔ جہاں تک کہ ڈپازٹ کا تعلق ہے تو یہ لفظ بڑے شہروں میں زیادہ مستعمل ہے، عرف میں اسے پگڑی بھی کہتے ہیں، جن کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی کسی سے مکان تجارت اور کاروبار کے لئے کرایہ پر لیتا ہے، تو کرایہ کے علاوہ عرف کے اعتبار سے مستاجر صاحب مکان کو موٹی رقم دیتا ہے، جو کبھی کرایہ میں وضع ہوتی ہے تو کبھی مکان خالی کرنے کے وقت واپس کرنی پڑتی ہے، جس کو فقہاء نے کچھ شرطوں کے ساتھ گنجائش دی ہے، یعنی مکان کا کرایہ علاحدہ ہو اور ڈپازٹ دینے کی وجہ سے کم نہ ہو تو زرضمانت کے طور پر ڈپازٹ دینا اور لینا درست ہے، ورنہ قرض پر نفع کمانے کی وجہ سے ناجائز ہے "کل قرض جر منفعة فهو من وجه الربا" (السنن الکبیر ج ۵/ ص ۳۵۰) لیکن سوال میں ڈپازٹ کی ایک دوسری صورت ہے وہ یہ ہے کہ بعض اسکیمیں ہیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ

قائم کردیا ہے جس کو بینک میں جمع کیا جاتا ہے، پھر اس سے انٹرسٹ کے طور پر رقم حاصل ہوتی ہے اسے حکومت حاصل کر کے استفادہ کرنے والے کو دیتی ہے بہر حال یہ صورت دو اعتبار سے محل تحقیق ہے۔

۱- پہلی صورت میں بینک میں روپیہ جمع کرنے کی نیت انٹرسٹ (سود) حاصل کرنا ہے جو شریعت کی نظر میں سود ہے، اس لئے کہ وہ رقم عوض سے خالی ہے، جو رقم عوض سے خالی ہوتی ہے اسی کو شرعاً سود کہتے ہیں، علامہ شامی سود کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''هو شرعًا (فضل) ولو كان حكما خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة'' (۲/ ۲۴۵)

وہ زائد رقم شرعاً سود ہے جو متعاقدین کی شرط کے مطابق ہو اور عوض سے خالی ہو۔

سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے اور اس کی حرمت پر کئی آیات ہیں، بلکہ جمہور فقہا اور محدثین اور ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے کہ سود حرام ہے، جیسا کہ اوپر قرآن وحدیث سے دلائل پیش کئے گئے۔

۲- دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب حکومت ایک محفوظ فنڈ کو بینک میں ڈپازٹ کرتی ہے، اس پر بینک والا انٹرسٹ کو طور پر رقم دیتی ہے (جو شرعاً سود ہے) اسے حکومت کا ادارہ وصول کرتا ہے اور اس پر قبضہ کرتا ہے اور حکومت کی ملکیت ہوجاتی ہے تو اس کے حکم میں فرق آجائے گا کیونکہ فقہاء کا اصول ہے جب ملکیت بدلتی تو حکم بدل جاتا ہے، گرچہ یہاں کی حکومت کا پورا معاشی نظام سود پر ہے، لیکن جب وہ انٹرسٹ رقم حکومت کے قبضہ میں آگئی تو وہ عام مال کے درجہ میں ہوگئی، جس طرح مال زکوٰۃ مستحق کے قبضہ اور ملکیت میں آنے کے بعد مال طیب کے درجہ میں ہوجاتا ہے اور وہ خود بھی کھا سکتا ہے اور دوسرے غنی کو بھی کھلا سکتا ہے۔ اس کی نظیر حضرت بریرہؓ والی روایت ہے:

''وعن عائشة قالت ... ودخل رسول الله و البرمة تفور بلحم فقرب إليه خبز وأدم من أدم البيت فقال: الم أربرمة فيها لحم! قالوا: بلى، ولكن ذلك لحم تصدق به على بريرة وأنت لاتأكل، قال: هو عليها صدقة، ولنا هدية'' متفق عليه (مشکوٰۃ شریف ۲ / ۱۶۱ كتاب الزكوٰة)۔

(حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے حالاں کہ ہانڈی میں گوشت پک رہا تھا آپ کے پاس روٹی اور سالن پیش کئے گئے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہانڈی کے گوشت کا تذکرہ کیا، گھر کے لوگوں نے جواب دیا کہ وہ صدقہ کا گوشت ہے جو آپ نہیں کھاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا وہ اس کے لئے (بریرہ) صدقہ ہے اور ہمارے لئے ھدیہ ہے۔ اس حدیث کے ضمن میں علامہ طیبیؒ نے بھی صراحت کی ہے)۔

''قال الطيبي: إذا تصدق على المحتاج بشي ملكه فله أن يهدى به إلى غيره'' (مرقاة المفاتيح ۴/ ۲۹۲)

فرماتے ہیں جب کسی محتاج کو صدقہ کیا پھر انہوں نے اس پر قبضہ کرلیا تو وہ دوسرے کو ہدیہ کرسکتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

چونکہ اقتدار علی غیر مسلم کا ہے، اس لئے اس کے احوال واحکام وہی ہوں گے جو عام غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے احوال واحکام ہوتے ہیں، غیر مسلم آپس میں سودی کاروبار کرتے ہیں...... جب تک کہ یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ چیز جس کو فروخت کر رہا ہے یہ بعینہ وہی چیز ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لایا ہے، ......غرض ان سب کا لے لینا اور استعمال کر لینا درست ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکم جواز کیوں ہے؟ اس کی وجوہ متعدد شرعی ضوابط ہیں مثلاً الف: ......تبدیل ملک سے حکماً تبدیل عین ہوجاتا ہے۔ ب: ......الخلط استہلاک کا ضابطہ جو مسلم ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۱۲۱)۔

حدیث بالا اور علامہ طیبیؒ اور مفتی نظام الدین صاحبؒ کی توجیہ کی وجہ سے مذکورہ صورت میں انٹرسٹ والی رقم پر جب حکومت کا قبضہ ہوگیا تو وہ رقم عام مال اور خزانہ کے مشابہ ہوگئی جو حالت اختیار میں مسلمان کے لئے درست نہیں، لیکن حالت اضطرار میں، جبکہ اس کے علاوہ کوئی متبادل حلال مال نہ ہو تو ضرورۃً بقدر ضرورت اس اسکیم سے مسلمان کا فائدہ اٹھانا شرعاً درست ہوگا۔

☆☆☆

سرکاری جانب سے جاری کردہ اسکیمیں اوران سے استفادہ

مولانا ابوالمکارم معروفی[1]

ہندوستانی حکومت معاشرتی ومعاشی اور تعلیمی ترقی کے لئے مختلف اسکیمیں جاری کرتی ہے، ان اسکیموں میں اس کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا کہ وہ شریعت کے مزاج ومنشا کے مطابق ہوں، اس لئے ضرورت تھی کہ شریعت کی روشنی میں ان کے احکام کا علم ہوجائے۔ اس پس منظر میں ''اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا'' نے اپنے ۲۶ ویں سمینار میں اجتماعی غوروخوض کے لئے ایک سوالنامہ جاری کیا۔ اکیڈمی کی طرف سے یہ ''سوالنامہ'' راقم کے پاس بھی بھیجا گیا۔ ذیل میں بالترتیب جوابات پیش کئے جاتے ہیں: ''اللّٰھم الطف بی فی تیسیر کل عسیر فإن تیسیر کل عسیر علیک یسیر''۔

۱۔ ایسے سرکاری قرض کا حکم جس کا ایک حصہ معاف کردیا جائے:

حکومت کی طرف سے دیا جانے والا ایسا قرض جس کا کچھ حصہ معاف کردیا جائے اور قرض میں لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑے اس پر کچھ حرج نہیں ہے، معافی کے بقدر حصہ حکومت کا تبرع ہوگا، اور تبرع، خواہ مسلمان کی طرف سے ہو، یا غیر مسلم کی طرف سے اس کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر دینی اور سیاسی مصلحت کے خلاف ہو تو اس طرح کے قرضوں اور تبرعات سے احتراز لازم ہے۔

دلیل یہ ہے کہ مشرکین کا ہدیہ قبول کرنے کے بارے میں آپ ﷺ سے متعارض روایتیں وارد ہیں، کہ آپ ﷺ نے کسی کا ہدیہ قبول کیا ہے اور کسی کا نہیں، ان روایات کے مابین کئی طریقوں سے تطبیق دی گئی ہے جن میں سے ایک تطبیق کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے جہاں ضرورت ومصلحت کا خیال کیا وہاں ہدیہ قبول فرمایا، اور جہاں خلاف ضرورت ومصلحت سمجھا وہاں قبول کرنے سے احتراز کیا۔

''روی محمد فی السیر الکبیر أخبارًا متعارضة فی بعضها أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قبل هدایا المشرکین، وفی بعضها أنه ﷺ لم یقبل، فلا بد من التوفیق، واختلف عبارة المشائخ فی وجه التوفیق..... ومن المشائخ من وفق بوجه آخر، فقال: لم یقبل من شخص علم أنه لو قبل منه یقلّ صلابته وعزته فی حقه ویلین له بسبب قبول الهدیة، وقبل من شخص علم أنه لا یقل صلابته وعزته فی حقه ولا یلین بسبب قبول الهدیة، کذا فی المحیط'' (الفتاوی العالمگیریه ۵/ ۳۴۷-۳۴۸ دار الکتاب دیوبند)۔

معلوم ہوا کہ کفار ومشرکین کے ہدایا وتبرعات کو قبول کرنا ضرورت ومصلحت کے ساتھ وابستہ ہے، چنانچہ افقہ الفقہاء حکیم الامت تھانویؒ مدارس دینیہ میں سرکاری اور حکومتی امداد حاصل کرنے کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر سرکار وعدہ کرے کہ ہم اعانت کرکے دخل نہ دیں گے تب اعانت لینا درست ہے'' (امداد الفتاوی ۴/ ۷۹، ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند)۔

تعجیل کی صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا:

دین کے کچھ حصہ کو اس شرط پر چھوڑ دینا کہ مدیون باقی دین کو فی الحال ادا کردے، فقہ کی اصطلاح میں اس کو ''ضع وتعجل'' کہا جاتا ہے (یعنی کچھ ساقط کردو اور جلدی حاصل کرلو)۔

---

[1] ریاض العلوم گورینی، جونپور، یوپی۔

جمہور علماء کے نزدیک ''ضع وتعجل'' کا معاملہ حرام ہے چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں:

''والأمر المکروہ الذی لا اختلاف فیہ عندنا أن یکون للرجل علی الرجل الدین إلی أجل، فیضع عنہ الطالب ویعجلہ المطلوب، قال مالك: وذلك عندنا بمنزلۃ الذی یؤخر دینہ بعد محلہ عن غریمہ، ویزید الغریم فی حقہ قال: فھذا الربوا بعینہ لاشك فیہ'' (مؤطا امام مالك ۱/ ۲۷۹ مکتبہ تھانوی دیوبند)۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں:

''من وجب لہ دین علی إنسان إلی أجل، فسئل أن یضع عنہ ویعجل لہ ما بقی لم ینبغ ذلك؛ لأنہ یعجل قلیلًا بکثیر دینا، فکأنہ یبیع قلیلًا نقدًا بکثیر دینا، وھو قول عمر بن خطاب وزید بن ثابت وعبد اللہ بن عمر، وھو قول أبی حنیفۃ'' (موطا امام محمد ا/ ۳۲۴، اشرفی بکڈپو)۔

''ضع وتعجل'' کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دین کا جو حصہ ساقط ہوتا ہے وہ اجل کے مقابلہ میں ہے اس لئے دیون مؤجلہ میں ''ضع وتعجل'' حرام ہے، لیکن دیون معجلہ جس میں مدت منتفی ہوتی ہے اس میں یہ معاملہ جائز ہے بشرطیکہ دیون باقی دین فوراً ادا کردے، علماء مالکیہ کے نزدیک دیون معجلہ میں اس کے جواز کی تصریح ہے، چنانچہ المدونۃ الکبری (۱۱/ ۳۸۵) میں ہے:

''قلت: أرأیت لو أن لی علی رجل مائۃ دینار ومائۃ درھم حالۃ فصالحتہ من ذلك علی مائۃ دینار ودرھم نقدًا قال: لا بأس بذلك''۔

علماء مالکیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے یہاں جواز کی تصریح نہیں ملتی ہے، لیکن دوسرے فقہاء نے جہاں کہیں ''ضع وتعجل'' کے حرام ہونے کا ذکر کیا ہے وہاں ''دیون'' کے ساتھ ''موجلہ'' کی قید ذکر کی ہے، جیسا کہ امام محمدؒ کی مذکورہ بالا عبارت میں ''إلی أجل'' کی قید مذکور ہے، اور کتب فقہ میں مفہوم مخالف حجت ہے جس سے معلوم ہوا کہ ''دیون معجلہ'' اور ''دیون حالہ'' میں ''ضع وتعجل'' کا معاملہ جائز ہے۔

معلوم ہوا کہ ''ضع وتعجل'' کا معاملہ دیون مؤجلہ میں اس لئے ناجائز ہے کہ دین کا جو حصہ معاف کیا جارہا ہے وہ ''اجل'' کے عوض میں معاف کیا جارہا ہے، اور ''اجل'' کے عوض میں دین کے کچھ حصہ کو ساقط کرنا حرام ہے (فقہی مقالات ۱/ ۱۰۰۔ ۱۱۴ ملخصا)۔

۲۔ مقررہ مدت کے اندر قرض کی ادائیگی پر کچھ حصہ کی معافی:

یہ ساری بحث ''دین'' سے متعلق ہے جس میں ''اجل'' معتبر ہے، اور ''قرض'' کو وقت مقررہ کے اندر ادا کرنے پر اس کا کچھ حصہ ساقط کرنا درست ہے کیونکہ ''اعتیاض عن الاجل'' نہیں پایا جارہا ہے اس لئے کہ قرض میں ''اجل'' کی قید شرعاً غیر معتبر ہے:

''ولزم تأجیل کل دین إن قبل المدیون إلا القرض، فلایلزم تأجیلہ، التأجیل فی القرض باطل'' (درمختار وشامی ۷/ ۲۸۸۔ ۲۹۰ دار الکتاب)۔

لہٰذا ایسے سرکاری قرضے جس میں ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر قرض کا کچھ حصہ معاف ہوتا ہے، ورنہ پوری رقم بغیر کسی زیادتی کے ادا کرنی پڑتی ہے اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، اور جو حصہ معاف کردیا گیا وہ حکومت کا تبرع اور احسان ہے۔

۳۔ اصل رقم کے ساتھ زائد رقم ادا کرنے کا حکم:

مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم کی ادائیگی کا سود ہونا بدیہی ہے اور اس شرط کے ساتھ قرض لینا کہ اگر مدت مقررہ میں عدم ادائیگی پر زائد رقم ادا کرنی پڑے گی شرط فاسد کی وجہ سے ناجائز ہے، علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

''وفی البزازیۃ: وتعلیق القرض حرام والشرط لا یلزم. والذی فی الخلاصۃ عن کفالۃ الأصل: والقرض بالشرط حرام اھ ''نھر'' أی فالمراد بالتعلیق الشرط. وفی صرف البزازیۃ: أقرضہ علی أن یوفیہ بالعراق فسد اھ أی

فسد الشرط وإلا خالف ماهنا تأمل'' (شامی ۷/ ۲۹۴ دار الکتاب دیوبند، والشرط لغو در مختار ۷/ ۲۹۸)۔

اس لئے حتی الامکان اس طرح کا قرض لینے سے احتراز ضروری ہے البتہ اگر شدید ضرورت ہے اور قرض نہ لینے کی وجہ سے حرج، تنگی اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا متبادل نہ ہو تو ایسی شدید مجبوری میں اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی گنجائش ہے کہ قرض لینے والا اس بات کی نیت اور پورا اہتمام کرے کہ وہ معین مدت سے پہلے پہلے ادائیگی کردے گا، اور کسی بھی وقت سود عائد ہونے کا امکان باقی نہ رکھے گا۔

نیز اس طرح کی شروط میں ابتلاء عام ہے کہ بجلی، ٹیلی فون اور حکومتی ٹیکس وغیرہ کی بل کی ادائیگی متعینہ مدت سے موخر کرنے پر کچھ اضافی رقم عائد کردی جاتی ہے، اس لئے عموم بلوی کی وجہ سے گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن بہت سے علماء نے اس طرح کے معاملہ کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے، اس لئے حتی الامکان اس طرح کا قرض لینے سے احتراز کیا جائے۔ برصغیر کے مشہور فقیہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی ''کریڈٹ کارڈ'' استعمال کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں:

''فيجوز استخدام بطاقة الائتمان إن كان حاملها على يقين أنه سيسدد الفاتورة قبل أن توضع عليها فائدة. أما كون العقد مشتملًا على شرط لزوم التعاقدات مثل عقود استخدام الكهرباء والتليفون والجوال والضرائب الحكومية وما إلى ذلك، فلا يمكن اليوم استخدام الكهرباء إلا بالتوقيع على العقد الذى يشترط فوائد التاخير. وتكن بما أن هذه شروط غير معتبرة فى الشرع. فما دام الإنسان مطمئنًا بأنها لا تطبق. عمليًا. وذلك بالتزام السداد فى جينه. فإنه يمكن أن يتسامح فيها العموم البلوى'' (فتاوی عثمانی ۳/ ۳۵۷)۔

''فيه خلاف للعلماء المعاصرين. فقال بعضهم: إن مجرد التوقيع على هذا الشرط دخول فى عقد محرم فلا يجوز. ولو كان بنية عدم تطبيقه فى الواقع. وقال آخرون: إن حامل البطاقة إن كان على يقين بأن هذا الشرط لا يطبق فعلًا لعزم أداءه مبلغ الفاتورة خلال الفترة المحددة. فإنه يجوز - وفى صفحه أخرى- تمكن يشكل القول بأنه لايجوز للإنسان أن يتعاقد مع هذه الشركات للحصول على الكهرباء والهاتف وغير ذلك. بل جرى التعامل على أن الإنسان يتعاقد معها من غير نكير بشرط أن يكون فى عزمه أن يؤدى واجباته فى حينها. وإنما أجيز ذلك لحاجه عامة. فإن لم يتيسر الحصول على بطاقة الحسم الفورى ولا التعاقد مع مصدر البطاقة. بأن يسحب مبلغ الفاتورة من حساب الحامل، واشتدت الحاجة إلى مثل هذه البطاقة فالمرجوع أن حامله يعتبر معذورًا فى الدخول فى هذا العقد إن شاء الله تعالى بعد أخذ جميع الاحتياطات اللازمة؛ لأن لا يلجأ إلى دفع الفائدة الربوية، والله سبحانه وتعالى اعلم'' (فقه البيوع ۱/ ۴۶۲-۴۶۳ دار المعارف ديوبند)۔

۴۔ سروس چارج یا سود:

سرکاری قرض جس پر مختصر سی زائد رقم وصول کی جائے جو سود کی مروجہ مقدار سے کم ہو اور سروس چارج کی مقدار کے قریب قریب ہو تو اس اضافہ کو سروس چارج میں داخل کرنے کی اور اس کے ساتھ قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ خواہ حکومت اس کو سروس چارج کا نام دے یا سود کہے، سود کا نام رکھ دینے سے اس کو سود نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ حقیقت اور معنی کا اعتبار ہوتا ہے الفاظ کا نہیں، جیسا کہ حضرت عمرؓ بنی تغلب کے جزئیہ کے بارے میں فرمایا تھا:

''هذه جزيتكم فسموها جزية أو صدقة'' (تکملة عمدة الرعایه حاشیه شرح الوقایه ۱/ ۲۲۸)، ''العبرة للمعانى'' (شامی ۹/)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب ''سروس چارج'' کے بارے میں فرماتے ہیں:

''قرض حسن پر ''سروس چارج'' وصول کرنے کے لئے اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ سروس چارج کی مقدار واقعی اجرت مثل کی نمائندگی کرتی ہو محض حیلہ نہ ہو (احسن الفتاوی ۷/ ۱۲۴)۔

مشہور و معروف فقیہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم رقمطراز ہیں:

''قرض جاری کرنے اور اس کا حساب و کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں بینک کے لئے اپنے قرضداروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آتے ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فقہی مقالات ۱/ ۲۷۰۔ ۲۷۷)۔

اس مسئلہ کی نظیر یہ ہے کہ قاضی اور مفتی کے لئے فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر مدعی اور مستفتی سے اجرت لینا جائز نہیں ہے لیکن مفتی کے لئے فتوی لکھنے اور قاضی کے لئے دستاویز لکھنے اور رجسٹر میں اندراج کرنے کی اجرت لینا جائز ہے شرط یہ ہے کہ یہ اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو۔

''في العلائية: يستحق القاضي الأجر على كتب الوثاق والمحاضر والسجلات قدر ما يجوز لغيره كالمفتي فإنه يستحق أجر المثل على كتابة الفتوى؛ لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان الخ''
(درمختار ۹/ ۱۰۸)۔

۵۔ قرض پر لی جانے والی زائد رقم کی مقدار غیر معمولی ہو تو کیا حکم ہے؟

اگر سرکاری قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط اس قدر زیادہ ہو کہ اس کو سروس چارج پر محمول نہ کیا جاسکے، بلکہ سود کی مروجہ مقدار تک پہنچ جائے تو وہ ''سود'' ہے۔

''فمن الربوا ما هو بيع ومنه ما ليس ببيع، وهو ربوا جاهلية وهو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على زيادة مال على المستقرض'' (احکام القرآن للجصاص/ ۵۶۹)۔

''وكل قرض شرط فيه الزيادة، فهو حرام بلا خلاف.... قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كل قرض جرّ منفعة فهو ربوا'' (اعلاء السنن ۱۴/ ۵۱۳ مکتبہ اشرفیہ دیوبند)۔

سودی قرض لینا بہت بڑا گناہ ہے اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے، لیکن اگر کوئی ایسا محتاج ہے کہ اس کے پاس گذر بسر اور ضروریات زندگی پوری ہونے کی کوئی شکل نہ ہو، اور غیر سودی قرض کہیں سے نہ مل رہا ہو تو اس کے لئے ضرورۃً سودی قرض بقدر ضرورت لینا جائز ہے۔

''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر/ ۱۳۹ مکتبہ دار العلوم دیوبند)۔

حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور حاجت کے وقت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز استعمال نہ کرے تو ہلاک یا قریب الموت ہو جائے، اور حاجت کا مطلب یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز استعمال نہ کرے تو ہلاک نہ ہوگا، لیکن مشقت شدید لاحق ہوگی۔

''فالضرورة بلوغه حدًا إن لم يتناول الممنوع هلك أو قارب، وهذا يبيح تناول الحرام، والحاجة كالجائع لو لم يجد ما يأكله لم يهلك غير أنه يكون جهد ومشقة'' (حاشية الحموي على الاشباه والنظائر، القاعدة الخامسة/ ۱۴۰)۔

اور قول اصح کے مطابق حاجت کے وقت بھی حلال حرام ہو جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کو آپ ﷺ نے سونے کی ناک لگانے کی اجازت دی تھی (ابوداود/ ۵۸۱، ترمذی/ ۳۰۶، نسائی/ ۲۴۲)۔ حالانکہ مرد کے لئے سونا حرام ہے اور یہ حاجت کی حالت تھی اضطرار (ضرورت) کی کیفیت نہ تھی، نیز ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے: ''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (ص/ ۱۳۹، القاعدة الخامسة)۔

معلوم ہوا کہ اگر مجبوری ایسی ہو کہ حاجت یا ضرورت کے دائرے میں آتی ہے تب تو سودی قرض بقدر ضرورت لینے کی گنجائش ہے ورنہ نہیں، خواہ اس مجبوری کا تعلق مکان اور باغبانی سے ہو یا کسی اور چیز سے (مثلاً کاروبار اور جانور پالنے کے لئے)۔

۶۔ سرکاری امدادی رقم حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا حکم:

مکان، بیت الخلاء وغیرہ کی تعمیر نیز دیگر ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے بطور امداد ملنے والی رقم کو حاصل کرنا اور استعمال کرنا درست

ہے (مطلوبہ شرائط ومعیارات کی رعایت کے ساتھ) کیونکہ اس طرح کی اسکیمیں عام طور سے شہریوں کی ضروریات مدنظر رکھتے ہوئے جاری کی جاتی ہیں، مذہب سے اس کا کوئی سروکا نہیں ہوتا ہے، البتہ اگر سیاسی، دینی مصلحت کے خلاف ہو تو اس طرح کی اسکیموں سے احتراز لازم ہے (دلیل کے لئے ملاحظہ ہو: سوال (۱) کا جواب)۔

۷، ۸۔ درمیان میں واسطہ بننے والوں کے محنتانہ کا حکم:

سرکاری امدادی رقم جس کا لینا جائز ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے جو لوگ درمیان میں واسطہ بنتے ہیں، اور جدوجہد کرتے ہیں ان کو محنتانہ کے نام پر اجرت دینا اور ان کے لئے لینا درست ہے، اگرچہ وہ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ ہو، بشرطیکہ وہ کام ان کے ذمہ واجب نہ ہو، کیونکہ اپنے اوپر واجب کام کی اجرت لینا جائز نہیں ہے، بلکہ رشوت ہے۔

''أما إعانته على عمل معين (إلى قوله) أو مباحًا فيه تعب بحيث يجوز الاستيجار عليه حل أخذه وهو جعل'' (شرح الطريقة المحمديه بحواله امداد الفتاوی ۳/ ۳۶۳)۔

''ولا يجوز أخذ المال ليفعل الواجب'' (شامی ۸/ ۳۳ دار الکتاب دیوبند)۔

''من أتى بعمل يستحق عليه لا يستحق الأجرة'' (بدائع الصنائع ۶/ ۷ مکتبہ نعیمیہ دیوبند)۔

''بذل المال فيما هو مستحق عليه حد الرشوة'' (البحر الرائق ۶/ ۴۴۱ زکریا بک ڈپو دیوبند)۔

''الحاصل أن حد الرشوة هو ما يؤخذ عما وجب على الشخص سواء كان واجبًا على العين أو على الكفاية وسواء كان واجبًا حقًا للشرع أو كان عقدًا'' (اعلاء السنن ۱۵/ ۶۱ کراچی)۔

دراصل سرکاری اسکیموں کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے والوں کا کچھ رقم کی مقدار پر معاملہ ''جعالہ'' کی قبیل سے ہے اور ''جعالہ'' ذیل میں آنے والی تحقیق وتفصیل کے مطابق درست معلوم ہوتا ہے۔

جعالہ کی تعریف:

متعین معلوم عمل یا ایسے مجہول عمل پر جس کا انضباط مشکل ہو متعین عوض کے التزام کا نام ''جعالہ'' ہے، اس میں نہ کوئی مدت مقرر ہوتی ہے اور نہ عمل، بلکہ عمل کے نتیجہ پر اجرت دی جاتی ہے:

''التزام عوض معلوم على عمل معين معلوم أو مجهول يعسر ضبطه'' (الموسوعة الفقهيه ۱۵/ ۲۰۸)۔

بہرحال جس طرح سمسرہ میں حاجۃ الناس اور تعامل ہے جس کی وجہ سے اس کو متاخرین احناف نے جائز کہا ہے اسی طرح ''جعالہ'' میں حاجۃ الناس اور تعامل ہے، لہٰذا سمسرہ کی طرح ''جعالہ'' بھی جائز ہونا چاہئے، جعالہ کی ضرورت کو مولانا ظفر احمد تھانویؒ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''لأن الجعالة تدعو إلى ذلك، فإن العمل قد يكون مجهولًا كرد الضالة والآبق وشفاء المريض والوكالة بالخصومة، ونحو ذلك، ولا تنعقد الإجارة فيه.... والحاجة داعية إلى ردهما وقد لا يجد من يتبرع به، فدعت الحاجة إلى إباحة بذل الجعل فيه مع جهالة العمل؛ لأنها غير لازمة'' (اعلاء السنن ۱۳/ ۳۸، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)۔

۹۔ امدادی رقم اور قرض کے حصول کے لئے رشوت دینے کا حکم:

سرکاری امدادی رقوم یا غیر سودی قرض کے حصول کے لئے رشوت دینا چونکہ جلب منفعت کے لئے ہے اور جلب منفعت کے لئے رشوت دینا جائز ہے اس لئے ایسی رقم کے حصول کے لئے رشوت دینا درست ہے اگرچہ رشوت لینا ناجائز ہے۔

''ثم الرشوة على أربعة أقسام ... الثالث أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع،

وهو حرام على الآخذ فقط'' (شامی ۸/ ۳۳ دار الکتاب دیوبند)۔

''فإذا أعطى ليتوصل به إلى حق أو يدفع عن نفسه ظلمًا، فلا بأس به'' (مرقاۃ المفاتیح ۷/ ۲۹۵ فیصل بکڈپو دیوبند)۔

۱۰۔ امدادی رقم اور قرض کے حصول کے لئے غلط بیانی سے کام لینا:

قرض اور امدادی رقم کے لئے حکومت کی طرف سے جو شرائط ومعیارات متعین ہیں ان کی پابندی ضروری ہے اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور جھوٹ جیسے اکبر الکبائر کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر کوئی شخص مطلوبہ شرائط ومعیارات کے مطابق امدادی رقم یا قرض کا واقعی مستحق ہے لیکن کچھ ایسی دشواریاں یا الجھنیں ہیں جو رقم کے حصول میں رکاوٹ بن رہی ہیں تو ایسی صورت میں اسکیم کو حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی اور تعریض (یعنی ایسی بات جو بظاہر خلاف واقعہ ہو، لیکن اس کا کوئی صحیح مطلب نکلتا ہو) کی گنجائش ہے، مگر صریح جھوٹ بالکل جائز نہیں ہے، چنانچہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ ''اگر جائز اور پسندیدہ مقصد ہو اور اس کا حصول غلط بیانی کے بغیر ممکن نہ ہو تو اس کے حصول کے لئے غلط بیانی مباح ہے'':

''إن كل مقصود محمود يمكن التوصل إليه بالصدق والكذب جميعًا فالكذب حرام، وإن أمكن التوصل إليه بالكذب وحده فمباح أن أبيح تحصيل ذلك المقصود، المراد التعريض؛ لأن عين الكذب حرام، قال: وهو الحق'' (درمختار وشامی ۹/ ۵۲۵ دار الکتاب)۔

غلط بیانی کے ذریعہ حاصل کردہ رقم سے فائدہ اٹھانے کا حکم:

غلط بیانی اور کذب کے ذریعہ رقم حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے اور حاصل کرنے والا گنہ گار ہوگا، تاہم اگر کوئی شخص غلط بیانی اور کذب کے ذریعہ رقم حاصل کرلے تو وہ اس کا مالک ہوگا، اور اس سے حاصل شدہ منافع اس کے لئے حلال ہوں گے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے رقم میں کچھ خبث پیدا نہیں ہوا ہے، اس کی نظیر میں جعلی سرٹیفکٹ اور اس کی آمدنی کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص جعلی سرٹیفکٹ کی بنیاد پر ملازمت حاصل کرلے تو گو اس کی یہ جعل سازی گناہ کبیرہ ہے، مگر اس کی آمدنی حلال وجائز ہے یہ اس کی محنت کی اجرت ہے، ایسا ممکن ہے کہ ذریعہ جائز نہ ہو اور کمائی جائز ہو۔

(جدید فقہی مسائل ۱/ ۴۱۳ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

۱۱۔ حکومت کا انٹرسٹ کی رقم ادا کرنا سود نہیں:

ایسی اسکیمیں جن میں تعلیم یا اور کسی مقصد کے لئے حکومت بینک سے قرض دلائے اور اس پر عائد ہونے والے انٹرسٹ کو خود حکومت ادا کرے، مقروض کو اس کی ادائیگی سے کوئی واسطہ نہ ہو تو ایسی اسکیموں سے استفادہ درست ہے، رہا بینک کا قرض دینا اور اس پر حکومت کا انٹرسٹ ادا کرنا یہ شہریوں کے امداد کی صورت ہے، وہ ''ربوا'' کی ماہیت سے خارج ہے، کیونکہ بینک حکومت کا ہی ایک شعبہ ہے جس کی وجہ سے عقد معاوضہ کا تحقق نہیں ہوگا، ربوا عقد معاوضۃ میں ایسی زیادتی کا نام ہے جو خالی عن العوض ہو، اس کی نظیر یہ ہے کہ آقا ومملوک اور شرکت مفاوضہ اور شرکت عنان کے شرکاء مال شرکت میں تفاضل کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں تو فقہاء اس پر ''ربوا'' کا اطلاق نہیں کرتے ہیں، اس لئے کہ ''ربوا'' کی ماہیت اور حقیقت نہیں پائی جاتی ہے۔

''ولا ربوا بين سيد وعبده... ولا ربوا بين متفاوضين وشريكي العنان، (قوله لا ربوا بين السيد وعبده) لأنه وما في يده لمولاه، فلا يتحقق الربوا لعدم تحقق البيع'' (درمختار شامی ۷/ ۳۲۱)۔

اور اگر انٹرسٹ کا وہ حصہ جو مقروض ادا کرتا ہے اس کی مقدار اتنی مختصر ہے کہ وہ رائج سود کی مقدار کو نہیں پہنچتا ہے تب تو اس کو سروس چارج پر محمول کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اگر انٹرسٹ کا وہ حصہ جس کو مقروض ادا کرتا ہے اتنا ہے کہ سود کی رائج مقدار کو پہنچ جاتا ہے تب تو سود پر قرض لینے کے حکم میں ہے اور حرام

ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: سوال (۵،۴) کا جواب)۔

۱۲۔ایسی اسکیموں سے استفادہ کا حکم جن کا انٹرسٹ حکومت بینک سے وصول کرتی ہے:

ایسی اسکیمیں جن کے لئے حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر کے بینک میں ڈپازٹ کردیا ہے اور اس کا حاصل ہونے والی انٹرسٹ کی رقم سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے ان کا حکم یہ ہے کہ اس طرح کی اسکیموں سے استفادہ درست ہے کیونکہ حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ کے نام پر جو رقم وصول کرتا ہے اس پر ربوا کی تعریف صادق نہیں آتی ہے اس لئے کہ بینک بھی حکومت کا ایک شعبہ ہے اور اپنے شعبہ میں تفاضل کے ساتھ تصرف کرنا ایسا ہے جیسے کہ آقا اپنے مملوک کے ساتھ کمی بیشی کا معاملہ کرتا ہے، اور یہ کمی بیشی فقہاء کرام کی تصریح کے مطابق ربوا نہیں ہے۔

''ولا ربوا بين سيد وعبده'' (درمختار ۷/ ۳۲۱)۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حکومت کفار کی ہے اور کفار کے وہ معاملات جو ان کے مذہب کے مطابق درست ہیں اس میں وہ آزاد ہیں اور ان معاملات سے حاصل شدہ مال کے وہ مالک ہوتے ہیں، افقہ الفقہاء حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ کفار جس کو اپنے دین کے موافق سمجھتے ہیں اس سے جو اموال حاصل ہوں وہ ان کے مملوک ہوتے ہیں (امداد الفتاوی ۴ / ۱۴۳، ادارہ تالیفات دیوبند)۔

محیط البرہان میں ہے: ''ولو أن حربيًا باع من حربي درهما بدرهمين ثم خرجا إلى دار الإسلام مسلمين أو ذميين واختصما إلى القاضي، فإن كان ذلك بعد التقابض، فالقاضي لا يتعرض لذلك ولا يبطله''

(المحيط البرهاني كتاب الصرف ۸/ ۳۷۷ دار احياء التراث العربي)۔

''(وقد أمرنا بتركهم وما يدينون) كذا في ''الهداية'' وقال: دل عليه قول عمر: ولوهم بيعها وخذوا العشر من أثمانها اه وأشار به إلى أن إعراضنا عنهم ليس لكونها مباحة شرعًا في حقهم، كما هو قول البعض، بل الحرمة ثابتة في حقهم في الصحيح، لأنهم مخاطبون بها كما قلنا، لكنهم لا يمنعون من بيعها، لأنهم لا يعتقدون حرمتها ويتمولونها، وقد أمرنا بتركهم وما يدينون، كما في البحر عن البدائع'' (شامی ۷/ ۳۷۱)۔

معلوم ہوا کہ کفار اپنے معاملات میں آزاد ہیں ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور ان معاملات سے حاصل ہونے والے اموال ان کی ملک ہیں، لہٰذا اگر کوئی کافر وہ مال مسلمان کو عطا کرتا ہے وہ اپنے پاس سے عطا کرتا ہے جو لینے والے کے حق میں تبرع ہے چاہے اس تبرع کے حصول کے لئے اس نے ناجائز طریقہ اختیار کیا ہے۔



سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور حکم شریعت

مولانا محمد قمر الزماں ندوی[1]

یہ حقیقت ہے کہ بینک جب کسی شخص کو قرض دیتا ہے تو اس کو اس شخص کے کاروبار کے مفاد اور اس کے نفع اور نقصان سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، اس کا سالانہ سود مقرر ہوتا ہے۔ کاروبار نفع بخش ہو یا نقصان دہ، اس کا راس المال محفوظ رہے اور اسے سود ملتا رہے۔ ایک مسلمان کے لئے بینک سے بلا عذر شرعی قرض لینا اور بینک کو سود کی رقم ادا کرتے رہنا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر حکومت بینک کے ذریعہ طلباء اور معذور افراد کو امدادی رقوم اور اسکالرشپ بطور اعانت ہے اور کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی تو اس رقم کو ایسے افراد کے لئے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم سرکاری اسکیموں سے استفادہ کے متعلق سوالات کے جوابات علی الترتیب پیش کر رہے ہیں:

۱۔ وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جائے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑے:

بینک سے حاصل کردہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، یہ صورت جائز ہے۔ بینک سے ایسے قرضوں کے لینے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، یہ گویا حکومت کی طرف سے امداد واعانت ہے، کیونکہ یہ شکل ''کل قرض جر نفعًا'' کے ضمن میں نہیں آتی۔ سرکاری بینک پر چونکہ تمام جمہور کا حق ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے ان سرکاری بینکوں سے قرض حاصل کرنے کا حق ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے امام کو بیت المال سے قرض دینے کا حق دیا ہے۔

دلائل:

(۱) سود کا تحقق اس وقت ہوتا ہے، جبکہ ایک طرف سے ایسا ''فضل'' ہو کہ دوسری طرف سے اس کا کوئی عوض نہ ہو، لہٰذا مذکورہ صورت سود میں داخل نہ ہوگی۔

(۲) یہ شکل ''کل قرض جر نفعًا''، ''فضل خال عن العوض'' وغیرہ کے ضمن میں داخل نہیں ہے کہ ربوا اور سود کی تعریف صادق آسکے۔

(۳) صاحب ''فتاوی رحیمیہ'' لکھتے ہیں جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا اور غریب رعایا کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرنا ہے، اسی لئے حکومت کچھ رقم کی چھوٹ بھی دیتی ہے (جسے سبسڈی کہا جاتا ہے)، اس قسم کے پلان (اسکیم) سے حکومت کا مقصد سود خوری نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی شخص حکمت سے اس اسکیم کے تحت قرض لے اور حکومت کی طرف سے اس پر کچھ رقم چھوٹ ملے اور بقیہ رقم حکومت مع سود وصول کرے اگر وہ سود چھوٹ میں ملی ہوئی رقم (یعنی سبسڈی) سے ادا ہو جاتی ہو، اپنے پاس سے زائد رقم نہ دینا پڑتی ہو تو اس تاویل سے کہ ''حکومت نے بطور تعاون جو رقم دی تھی اس شخص نے اسی تعاون والی رقم میں سے کچھ رقم واپس کردی''، مذکورہ اسکیم کے تحت قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اگر سود کی رقم چھوٹ میں ملی ہوئی رقم (یعنی سبسڈی) سے زیادہ دینی پڑی تو پھر یہ معاملہ سودی کہلائے گا اور جائز نہ ہوگا۔

(۴) اسلامک فقہ اکیڈمی نے سود سے متعلق مسائل کے سلسلہ میں جو تجاویز پیش کیا تھا اس میں سے ایک تجویز یہ بھی ہے:

ہندوستان میں بعض سرکاری قرضے ایسے ہیں جن میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (Subsidy) دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم چھوٹ (سبسڈی) کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں ہے (ماہنامہ

---

[1] استاذ مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپ گڑھ، یوپی۔

"الرشاد" جنوری ۱۹۹۰ء)۔

۲۔ معافی والے قرضہ کی ایک صورت جس میں زائد رقم نہ واپس کرنا پڑے:

معافی والے قرضوں کی وہ شکل جس میں مقررہ مدت کے اندر قرض واپس نہ کرنے کی صورت میں پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ لیکن صرف اصل رقم ہی واپس کرنی پڑتی ہے تو یہ صورت جائز ہے، لیکن اگر اس صورت میں لی ہوئی رقم سے زائد رقم واپس کرنا پڑے تو پھر یہ سود میں داخل ہوگا، اور اگر اس شخص نے مقررہ مدت کے اندر رقم جمع کر دیا اور حکومت نے اس رقم میں سے کچھ حصہ معاف کر دیا تو یہ صورت بھی جائز ہے اور یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حکومت کی طرف سے مدد تعاون اور سبسڈی ہے۔ جمہوری ملکوں میں مسلمان اس طرح کی اسکیموں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مفتی احمد خانپوری ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں جس سے اس مسئلہ کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"سوال میں مذکورہ صورت شرعی طور پر سود کی تعریف میں نہیں آتی، مثلاً پروجیکٹ سے کسی نے چار ہزار روپے کنواں بنوانے یا مکان بنوانے کے لئے نقد لیے، محکمۂ پروجیکٹ نے اپنے قاعدے کے ماتحت ایک ہزار روپے بالکل صاف معاف کر دیا اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقع دیا، پھر دو سال کے بعد چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لئے متعین کی اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا، مگر کل وصولی چار ہزار سے زائد نہ ہوئی، تو اب قسطوں کے ساتھ جو زیادتی تھی وہ سود نہ ہوگی، اور معاملہ بھی جائز رہے گا، کیونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا، چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ "فضل خال عن العوض الخ" یا "کل قرض جر نفعا" وغیرہ ربا کی تعریف صادق آسکے" (نظام الفتاوی ۱/ ۲۶۹ بحوالہ محمود الفتاوی ۴/ ۵۰۲) فقط واللہ اعلم۔

اسلامک فقہ اکیڈمی نے سود سے متعلق مسائل کے سلسلہ میں جو تجاویز اعظم گڈھ کے سمینار میں پیش کیا تھا ان تجاویز میں ایک تجویز یہ تھی کہ:" ہندوستان میں بعض سرکاری قرضے ایسے ہوتے ہیں جن میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (سبسڈی) دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقوم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم (Subsidy) چھوٹ کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں ہے"

(ماہنامہ "الرشاد" جنوری ۱۹۹۰ء)۔

۳۔ اگر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنی پڑے تو کیا حکم ہے:

اگر مقررہ وقت کے بعد قرض ادا کرنے پر قرض لینے والے کو اصل رقم کی (کل قرم) واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنی پڑے تو یہ صورت ناجائز ہے، کیونکہ کل رقم کے ساتھ جو زائد رقم ادا کرنی پڑی ہے وہ زائد رقم سود اور ربا ہے اور یہ صورت "کل قرض جر نفعا" میں داخل ہے۔

مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"لون کی واپس کی جانے والی کل مقدار اس کے ملنے والی مقدار کے برابر یا اس سے کم ہے، تو اس کا لینا درست ہے، ورنہ سود ہے جو جائز نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب" (محمود الفتاوی ۴/ ۴۹۸)۔

البتہ بے روزگار اور مفلس و محتاج مسلمان جن کے پاس روزگار کے لئے روپے پیسے نہ ہوں اور اس سطح پر ہوں کہ خود اپنے پیسوں سے کوئی روزگار شروع نہیں کر سکتے ان کے لئے ایسے قرض حاصل کرنا جائز ہے۔ سود لینا اور دینا یقیناً دونوں ہی گناہ ہے، البتہ سرکار و سرکاری ادارہ اور اشخاص اور پرائیوٹ ادارہ کے حکم میں ایک گونہ فرق ہے، جب ہم اس ملک کے شہری ہیں، تو جیسے حکومت دوسرے شہریوں کو روزگار کے لئے قرض فراہم کرتی ہے، ویسے ہی مسلمانوں کو بھی اس طرح کی سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے اور ہمارا بحیثیت شہری اس پر حق ہے۔ لہٰذا جو مسلمان واقعی ان قرضوں اور اسکیموں کے محتاج ہیں ان کو اس طرح کے قرضوں اور اسکیموں سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔ البتہ خوش حال مسلمانوں کے لئے بلا ضرورت اس طرح کے اسکیموں سے فائدہ اٹھانا اور ایسے قرض لینا جائز نہیں ہوگا۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ عام حالات میں محض معیار زندگی کی بلندی خوب سے خوب تر کی تلاش کے پیش نظر سودی قرض لینا جائز نہیں۔ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے لکھا ہے کہ حاجت مندوں کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش ہے۔

"ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ والنظائر ۱/ ۲۹۴)۔

۴۔ سروس چارج کے نام پر یا انتظامی خرچ کے نام پر زائد رقم کا لینا کیسا ہے؟

اگر بینک یا غیر سرکاری ادارے غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد کا مطالبہ کرے، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو جس کو بینک (یا اس طرح کے ادارے جو سودی قرض دیتے ہوں) سروس چارج کا نام دیتے ہوں یا اپنی مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم سود کے دائرے میں نہیں آئے گا اس کو انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت و گنجائش دی جاسکتی ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''جیسا کہ معلوم ہوا کہ ایسے ترقیاتی قرضوں میں اصل مقصود نفع کمانا نہیں ہوتا، بلکہ عوام کے لئے بنیادی ضروریات اور روزگار کی فراہمی مقصود ہوتی ہے، اس لئے اگر اس پر لیے جانے قرضے کو دفتری اخراجات اور ضروریات پر محمول کیا جائے تو مناسب محسوس ہوتا ہے، جیسا کہ مولانا مفتی نظام الدین صاحب ''کا رجحان ہے''۔ آگے مزید لکھتے ہیں:'' تاہم اس پر پورا اطمینان نہیں ہوتا کہ سودی قرضوں پر وصول کی جانے والی شرح قرض کی مقدار کے لحاظ سے اور اسی تناسب سے کم وبیش ہوتی ہے۔ اگر یہ دفتری اجرت ہوتی تو ضروری تھا کہ یہ فرق' پایا جاتا، کیونکہ رقم پچاس ہزار ہو یا پانچ ہزار دفتری کاروائی میں وقت اور محنت یکساں لگتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کو رشوت والے مسئلہ پر ایک درجہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ رشوت دینے والا بھی اپنے حق جائز کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دیتا ہے اور سودی قرض لینے والا بھی سرکاری خزانوں پر اپنے حق قرض کی وصولی کے لیے سود دینے پر مجبور ہے، تاہم چونکہ ان دونوں حقوق میں بہت تفاوت ہے، اس لئے کہ حکومت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مرفہ الحال لوگوں کو مزید معاشی خوش حالی کے لئے قرض دیتی چلی جائے، اس لیے اس قرض کو بھی ایسی صورت کے ساتھ مشروط رکھا جانا چاہئے کہ کاروبار کا بقا اور تحفظ اس کے بغیر دشوار ہو جائے'' (جدید فقہی مسائل ۴ / ۸۹)۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ قرض دینے والے مالیاتی ادارے جو سروس چارج کے نام پر اور انتظامی اخراجات کے نام پر کچھ زائد روپے قرض خواہوں سے وصول کرتے ہیں) کہ بارے میں اس حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''البتہ اگر سروس چارج سے مراد وہ واقعی عادلانہ اخراجات ہیں جو اس نظام کو چلانے پر خرچ ہوتے ہیں جیسے انتظامی اخراجات (Management Enpenses of Outlays) کہا جاسکتا ہے تو اس پر غور کیا جانا چاہئے کہ قرض خواہ جو اس نظام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں کیوں نہ وہی اس پر آنے والے خرچ کے ذمہ دار قرار دیئے جائیں، ٹھیک جس طرح ایک قرض خواہ جو اپنے دوست سے کوئی قرض حاصل کرتا ہے تو درمیانی قاصد کے آنے جانے کے اخراجات یا بذریعہ منی آرڈر قرض کی واپسی کے اخراجات اس کو ادا کرنا پڑتے ہیں، اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا، اور ظاہر ہے کہ جب حقیقی اخراجات ہی قرض خواہوں سے وصول کئے جائیں گے تو یہاں کوئی ایسی اضافی آمدنی حاصل نہ ہوگی جس سے اصحاب سرمایہ سوسائٹیز کے لئے آمدنی ذریعہ تمول بنے۔ البتہ صرف ایک خطرہ رہ جاتا ہے کہ سوسائٹیز قائم کرنے والے افراد اگر خوف خدا سے خالی دل رکھتے ہوں تو ضروری اخراجات کی مد کو پھیلا کر وہ اپنے تعیش اور تمول کا راستہ نکال لیں گے، لیکن اس طرح کے مالیاتی اداروں کا کوئی ایسا وفاقی بورڈ موجود ہو جو عادلانہ اخراجات کا تعین وقتاً فوقتاً کرتا رہے تو اس شرعی گنجائش سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا سد باب کیا جاسکتا ہے'' (مباحث فقہیہ / ۴۲۲، قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ)۔

۵۔ سروس چارج کے نام اوسط سے زیادہ رقم اگر بینک لے تو کیا حکم ہوگا؟

اگر حکومت اور سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی رقم جو حکومت سروس چارج کے نام پر لیتی ہے وہ اوسط سے زیادہ ہو اور اس کو انتظامی خرچ پر محمول نہ کیا جاسکے تو یقیناً یہ فقہی ضابطہ ''کل قرض جر نفعا'' کے تحت سود ہوگا اور سوائے محتاج، ضرورت مند اور پریشان حال مسلمانوں کے اور کسی دوسرے شخص کے لئے اس کی اجازت نہیں ہوگی جو مالی اعتبار سے خوش حال اور فارغ البال ہو محض معیار زندگی کو بڑھانے اور عیش وعشرت، نیز دوسرے کی ایس اور مقابلہ میں اس کے لئے اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

چونکہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کے پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں اس لئے ایسے اشخاص جو محتاج اور ضرورت مند ہیں اور بغیر اسکیم لیے اور اس سے فائدہ اٹھائے ان کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی اور سود پر قرض لیے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے تو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوگی، لیکن اجازت بھی بقدر ضرورت کی ہی ہوگی ضرورت پوری ہو جانے پر یا خود کفیل ہو جانے کے بعد ایک

مسلمان کو ایسے اسکیم سے بری الذمہ ہوجانا چاہئے یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ضرورت وحاجت کی شدت کا معیار ہر شخص کی قوت برداشت وغیرہ کے اعتبار سے مختلف ہوگا اور فیصلہ کن عنصر ''رائے مبتلی بہ'' ہوگی۔

مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''پس میرے نزدیک سرکاری خزانہ ایک ایسی دولت ہے جس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے، اس لئے ترقیاتی اسکیموں مکانات کی تعمیر، تجارت کی ترقی اور صنعت وحرفت کی ہمت افزائی، نیز بیکاروں کو باکار بنانے کے لئے جس قدر رقم بھی حکومت اپنے بجٹ میں رکھتی ہے ان میں ایک مسلمان شہری کا بھی اسی طرح حق ہے جس طرح دوسروں کا، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان اپنے اس حق کی تحصیل کے لئے جب آگے آنا چاہتا ہے تو حکومت جس نے اپنے مالیاتی نظام کی بنیاد سود پر رکھی ہے (اور فی الحال اکثریت کے فقدان کی وجہ سے ہم اس کی تبدیلی پر قادر بھی نہیں اگرچہ اس نظام کی تبدیلی کی خواہش اور اس کے لئے ممکن حد تک عملی جدوجہد ہر مسلمان کا بہرحال فرق ہے کہ

''من رأى منكم منكرًا فليغيره بيده، وإن لم يستطع فبلسانه، وإن لم يستطع فبقلبه'' (متفق عليه)

اس کا یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے آڑے آتا ہے پس ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے بدرجہ مجبوری سود دینا اور سود دے کر اپنے حق کا حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ میرے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے اور یہ کہنا درست ہے کہ اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے مسلمانوں کو رخصت حاصل ہے کہ وہ بدرجہ مجبوری سود دے کر اپنا حق حاصل کریں'' (مباحث فقہیہ/ ۴۶۸)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں میرے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے وہ یہ کہ مجبور اور محتاج مسلمان تجارت اور بزنس میں اپنے جائز حق کی تحصیل کے سروس چارج دے کر اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور بدرجہ مجبوری سود دے کر اپنا حق حاصل کرسکتا ہے۔

اور شریعت میں اس کی نظیر موجود ہے، اس لئے کہ شریعت کا عام قاعدہ اور اصول تو یہ ہے کہ ''ماحرم أخذه حرم إعطاءه'' اس اصول کے تحت علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہے، لیکن ایسی صورت میں جب کہ جائز حق کا حصول رشوت دیئے بغیر ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں رشوت دینا جائز ہے۔

صاحب ''الاشباہ'' علامہ ابن نجیم چودہویں قاعدہ ''ماحرم أخذه حرم إعطاؤه'' کے ذیل میں ''الرشوة لخوف علی ماله أو نفسه'' کا استثناء کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''إلا في مسائل الرشوة لخوف على ماله أو نفسه (قوله الرشوة لخوف على ماله) هذا في جانب الدافع. أما في جانب المرفوع له، فحرام، ولم ينسبه عليه، وينبغي أن يستثنى الأخذ بالربا للمحتاج. فإنه لا يحرم كما صرح به المصنف في البحر، ويحرم على الدافع الإعطاء بالربا'' (حموی/ ۱۷۶ بحواله مباحث فقهيه/ ۴۶۸)۔

''مگر مال یا جان کے خوف سے رشوت دینے کے مسائل ہیں، لیکن یہ جواز دینے والے کے حق میں ہے، اس شخص کے حق میں جس کو دیا گیا ہے حرام ہے، اور اس پر تنبیہ ہوسکا ہے، اسی طرح مناسب ہے کہ اس سے یہ صورت بھی مستثنی ہو کہ کوئی محتاج شخص سودی قرض حاصل کرے کہ یہ بھی حرام نہیں ہے، جیسا کہ اس کی ''البحر الرائق'' میں تصریح کردی گئی ہے، لیکن قرض دینے والے کے لئے سود کی شرط پر قرض دینا حرام ہوگا''۔

۶۔ حکومت کا عوام الناس کی اعانت کا شرعی حکم:

اگر حکومتِ وقت بعض ضروریات کے لئے عوام الناس اور رعایا کی مکمل امداد واعانت کرے، مثلاً مکان، بیت الخلاء وغیرہ کی تعمیر کرائے یا تعلیمی ضروریات کے لئے رقم دے اور اس کے لئے مخصوص شرائط وحدود ہو کہ کس معیار کے لوگ اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی بھی نہ ہوتی ہو اور یہ حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہو تو ایسے اسکیم سے مسلمان بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن ان شرائط اور معیارات کا خیال رکھنا ضروری ہوگا جو حکومت نے بنائے ہیں۔ ایک مسلمان کے لئے اس کی خلاف ورزی درست نہیں ہے۔

مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''صورت مسئولہ میں سرکار کی طرف سے جو رقم ملتی ہے وہ سرکاری امداد ہے وہ لی جا سکتی ہے، جس کو ضرورت نہ ہو وہ حاجت مند کو دے دے، اسی طرح مسجد و مدرسہ کی تعمیر میں لینا درست ہے، بہتر تو یہ ہے کہ بطور قرض رقم لے کر مسجد و مدرسہ میں خرچ کریں اور سرکاری امدادی رقم سے قرض ادا کر دیا جائے'' (فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۲۳۴ مطبوعہ جدید)۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

''پس میرے نزدیک سرکاری خزانہ ایک ایسی دولت ہے، جس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے، اس لئے ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، تجارت کی ترقی اور صنعت وحرفت کی ہمت افزائی، نیز بیکاروں کو باکار بنانے کے لئے جس قدر رقم بھی حکومت اپنے بجٹ میں رکھتی ہے ان میں ایک مسلمان شہری کا بھی اسی طرح حق ہے جس طرح دوسروں کا، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا'' (مباحث فقہیہ/ ۴۶۷)۔

مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''جب کہ حکومت بلا طلب بطور امداد اور غم خواری کے رقم دیتی ہے تو لینے میں مضائقہ نہیں، خود استعمال کرے یا حاجت مندوں کو دے دے'' (فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۲۲۵ جدید ایڈیشن)۔

۷۔ واسطہ بننے والوں کے لئے محنتانہ کا حکم:

گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کے حصول میں چونکہ کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے اس رقم کو حاصل کرنے کے لئے کچھ لوگوں کو واسطہ بننا پڑتا ہے، واسطہ بننے والے اپنی مطلوبہ محنتانہ لیتے ہیں اور اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے چونکہ ان کے محتاج ہوتے ہیں، اس لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دیتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ واسطہ بننے والے اپنے اوقات کو صرف کرتے ہیں اور کاغذی کاروائی کرتے ہیں اس لئے میری نظر میں چونکہ واسطہ بننے والوں کی حیثیت دلال کی ہے اور دلالی کی اجرت جائز ہے، لہٰذا صورت مسئلہ میں واسطہ بننے والوں کا اپنی مطلوبہ محنتانہ لینا جائز ہے۔

جن صورتوں میں حکومت عوام الناس کی مدد کرتی ہے اور ان رقوم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے ان صورتوں میں تو واسطہ بننے والوں کا مطلوبہ محنتانہ لینا جائز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جن صورتوں میں حکومت عوام الناس کو سودی قرض دیتی ہے اور پورا معاملہ سودی ہوتا ہے ان صورتوں میں واسطہ بننے والوں کا مطلوبہ محنتانہ لینا درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ حدیث شریف میں ہے:

''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ، وقال: ھم سواء'' (مسلم شریف)۔

البتہ فی نفسہ واسطہ بن کر محنتانہ لینا غیر سودی شکل میں درست ہے، بشرطیکہ وہ اپنی محنت اور کام کے موافق لے البتہ اجرت اور محنتانہ پہلے طے کرے تاکہ بعد میں نزاع نہ ہو، معاملہ مبہم نہ رہنا چاہئے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''قال فی التاتارخانیة: وفی الدلال والسمسار یجب أجر المثل وما تواضعوا علیه إن فی کل عشرة دنانیر کذا فذلك حرام علیهم، وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن کان فی الأصل فاسدًا لکثرة التعامل، وکثیر من هذا غیر جائز، فجوزوا لحاجة الناس إلیه... الخ'' (شامی ۵/ ۵۳ کتاب الاجارہ قبل فصل فی ضمان الاجیر)۔

جیسے سود پر قرض لینا حرام ہے اسی طرح سودی قرض کے لین دین میں واسطہ اور معاون بننا بھی جائز نہیں، ظاہر ہے کہ قرض دلانے کے لئے جو شخص واسطہ بن رہا ہے، وہ ایک سودی کاروبار میں معاون بن رہا ہے، اور گو اس کو کمیشن یا اجرت اصل رقم میں سے ملے، لیکن بہر حال یہ اس تعاون ہی کا اجر وصلہ ہے، لہٰذا اس معاملہ میں معاون بننا اور اس کی اجرت لینا درست نہیں، واللہ اعلم بالصواب (کتاب الفتاوی ۵/ ۳۷۰)۔

الغرض واسطہ بننے والا چونکہ سودی لین دین میں معاون بن رہا ہے اور قرآن مجید اس طرح کے تعاون سے منع کرتا ہے، "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲) اس لئے واسطہ بن کر محنتانہ لینا درست اور جائز نہیں ہوگا۔

۸۔واسطہ بننے والوں کا حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کر کے لینے کا حکم:

واسطہ بننے والوں حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کرنا اور اس کا لینا از روئے شرع جائز اور درست نہیں ہے، کیونکہ جس طرح سود پر قرض لینا دینا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح سودی قرض کے لین دین میں ذریعہ واسطہ اور معاون بننا بھی جائز نہیں، ظاہر ہے کہ قرض دلانے کے لئے جو شخص واسطہ اور ذریعہ بن رہا ہے، وہ سودی کاروبار میں اور ناجائز کام میں معاون بن رہا ہے، اور گو اس کو کمیشن یا اجرت اصل رقم میں سے ملے، لیکن بہر حال یہ اس تعاون ہی کا اجر وصلہ ہے، لہٰذا اس معاملہ میں معاون بننا اور اس کی اجرت لینا حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کر کے اس کا لینا یہ تمام صورت بھی ناجائز اور نادرست ہیں۔قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (المائدہ:۲) دوسری جگہ اللہ تبارک وتعالی نے فرمایا: "ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل" (سورہ البقرہ: ۱۸۸) اور حدیث شریف میں سودی کاروبار میں ذریعہ واسطہ اور معاون بننے والوں کو ملعون قرار دیا گیا ہے خواہ گواہ کی شکل میں ہو یا کتابت کرنے والا ہو سود دینے والا ہو یا لینے والا ہو، بلکہ حدیث کے مفہوم کے مطابق اس میں کسی طرح کا ذریعہ بننے والا ہو۔

البتہ غیر سودی کاروبار اور تجارت کے بارے میں فقہاء نے دلالی کی اجرت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ یہ فی نفسہ مباح ہے اور اپنی محنت اور کام کے موافق پہلے سے مناسب اجرت طے کر لے تو طے کردہ اجرت لے سکتا ہے، فتاوی دار العلوم میں ہے:

''دلال کی اجرت کام اور محنت کے موافق لینا اور دینا جائز ہے بشرطیکہ ظاہر کر کے رضا سے لیا جائے، اور جو خفیہ طرفین سے لیا جاتا ہے وہ جائز نہیں''

(فتاوی دار العلوم قدیم ۷، ۸/ ۱۱۹ بحوالہ فتاوی رحیمیہ)۔

لہٰذا جن صورتوں میں حکومت عوام الناس کی مدد کرتی ہے اور ان رقوم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے ان صورتوں میں واسطہ بننے والوں کا مطلوبہ محنتانہ لینا جائز معلوم ہوتا ہے، لیکن جن صورتوں میں حکومت عوام الناس کو سودی قرض دیتی ہے اور پورا معاملہ سودی ہوتا ہے ان صورتوں میں واسطہ بننے والوں مطلوبہ محنتانہ لینا درست معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کر کے لینا درست اور جائز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے:

''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ، وقال: ھم سواء'' (مسلم شریف)

اور شریعت کا حکم ہے کہ گناہ اور ظلم کے کاموں میں تعاون اور معاونت نہ کرو، "ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ:۲)۔

اور جن صورتوں میں واسطہ بن کر محنتانہ لینا درست ہے وہاں بھی شرط یہ ہے کہ وہ اپنی محنت اور کام کے مطابق پہلے سے اجرت طے کر دی جائے تا کہ بعد میں کوئی نزاع کی صورت پیدا نہ ہو۔

۹۔اگر امدادی رقوم اور قرضوں کے لئے اگر رشوت دینا پڑے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

امدادی رقوم اور سرکاری قرضوں کے حصول میں اگر رشوت دینی پڑے اور رشوت کے بغیر ان قرضوں کے حصول بالکل ممکن نہ ہو تو مجبوری کی صورت میں رشوت دے سکتے ہیں۔رشوت دینا تو اصلاً گناہ اور ناجائز ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس سے بچنے کی کوشش کی جائے لیکن اگر اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو اس مقصد کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ رشوت لینا تو ''حرام لعینہ'' ہے اور رشوت دینا ''حرام لغیرہ'' ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے دفع ظلم یا اپنے جائز حق کی وصولی کے لئے رشوت دینے کی اجازت دی ہے، مولانا ظفر احمد عثمانی نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، فرماتے ہیں:

''الرشوۃ ما یعطی لإبطال حق أو لإحقاق باطل أما إذا أعطی لیتوصل بہ إلی حق أو لیدفع بہ عن نفسہ ظلمًا فلا بأس بہ'' (اعلاء السنن ۱۵/ ۶۰)۔

رشوت کی تعریف کرتے ہوئے فقہاء نے لکھا ہے: رشوت وہ مال ہے جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے یا حق شرعی کے بغیر کوئی چیز حاصل کرنے کی غرض سے دی جائے، ''مایعطی لإبطال حق أو لإحقاق باطل'' (کتاب التعریفات للجرجانی/ ۱۴۸)۔

اس تعریف کی روشنی میں حکومت کے ملازمین اور کارکنان سے ناروا فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو رشوت دینا قطعی حرام ہے لیکن اگر اپنے جائز حقوق بھی آپ ان کو رشوت دیئے بغیر نہ حاصل کرسکیں اور ان کا نقصان بھی آپ کے لئے قابل برداشت نہ ہو، نیز اس قسم کے رشوت خور ملازموں کی شکایت ان کے افسروں سے کرنے کا بھی موقع نہ ہو یا اس سے کوئی نتیجہ نکلنے کی توقع نہ ہو تو مجبوراً ان کو رشوت دے سکتے ہیں، لیکن ہمیشہ ان کو نصیحت کرتے رہنا چاہئے کہ یہ حرام خوری ہے یہ انسانی شرافت اور مروت کے خلاف چیز ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اپنی کتاب حلال وحرام میں تحریر فرماتے ہیں:

''شریعت میں کمائی کے جن طریقوں کی سخت مذمت کی گئی ہے ان میں ایک رشوت بھی ہے، رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام ہے، ایک حدیث میں تو آپ ﷺ نے ان دونوں پر اپنی زبان مبارک سے لعنت بھیجی ہے۔ رشوت ظلم نہ کرنے کے لئے حاصل کی جانے والی رقم بھی ہے اور جائز حق دینے پر لی جانے والی رقم بھی، لینا تو بہر حال حرام ہے، البتہ اپنی جان ومال، عزت وآبرو کے تحفظ اور انصاف اور جائز حق کے حصول کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے۔ اسی طرح کسی دشمن اسلام کے شر سے حفاظت کے لئے اس کو رشوت دی جائے یہ بھی جائز ہے، جیسا کہ خود حضور ﷺ مفسد شعراء کی زبان بندی کے لئے دیا کرتے تھے'' (حلال وحرام/ ۳۷۵)۔

خلاصہ یہ کہ رشوت تو فی نفسہ قطعی حرام ہے خدا اور رسول نے راشی اور مرتشی دونوں پر لعنت کی ہے اور اس پر دوزخ کی وعید سنائی ہے۔ لیکن اضطرار کی حالت میں مردار کی بھی اجازت دی گئی ہے کچھ یہی نوعیت رشوت دینے کی ہے فقہاء نے لکھا ہے کہ دفع مضرت کے لئے رشوت دی جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالی مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔

من مانا محنتانہ لینا یا مجبور کرکے حاصل شدہ رقم میں فیصد یا حصہ طے کرکے اپنی محنتانہ لینا از روئے شرع بہتر اور پسندیدہ نہیں ہے، بلکہ یہ صورت کراہت کی ہوگی۔ اس مسئلہ کو نفع کے تناسب والے مسئلہ پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے مال میں کتنا فیصد نفع لے سکتا ہے؟

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

''شریعت میں نفع کے لئے کوئی تناسب متعین نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ تاجرین کے عرف ورواج اور فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، البتہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اتنا نفع لینا جو غبن فاحش کے دائرہ میں آجائے مکروہ ہے، غبن فاحش سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کی بازار میں زیادہ سے زیادہ جو قیمت لگائی جاتی ہو اس سے بھی زیادہ قیمت لی جائے، جیسے ایک چیز پچاس سے پچھتر روپیہ میں فروخت کی جاتی ہو، اب کوئی شخص اسے اسی اور پیسہ فروخت کرتا ہے، تو یہ غبن فاحش ہے، خرید وفروخت درست ہوجائے گی، نفع بھی تاجر کے لئے حلال ہوگا، لیکن اس کا یہ عمل مکروہ ہوگا اور اگر خریدار یقین دہانی کرائی ہو کہ میں نے مناسب قیمت لگائی ہے تو ایسی صورت میں اس کو معاملے کے ختم کردینے کا حق بھی حاصل ہوگا'' (کتاب الفتاوی ۵/ ۲۱۱)۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے خوب لکھا ہے کہ ''تاجرانہ نفع کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ محتاج کی ضرورت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے خوب گراں بیچا جائے، دوسرے یہ کہ معمولی نفع لیا جائے اور جلد جلد اس کو استعمال میں لایا جائے، نفع کی یہ دوسری شکل تمدنی تقاضوں کے مطابق بھی ہے اور برکت کا باعث بھی'' (حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۲۷۱)۔

ایک قابل غور پہلو:

ایک مسلمان کے لئے سودی معاملات، سودی لین دین اور سودی کاروبار میں واسطہ بن کر اپنی محنتانہ لینا اور اسی کو اپنا ذریعہ معاش بنانا از روئے شرع جائز نہیں ہے، وقتی طور پر جب تک کہ دوسرا ذریعہ معاش نہ مل جائے اس سے اپنی ضروریات پوری کرسکتا ہے، لیکن دوسرا ذریعہ معاش تلاش کرنا جو جائز وحلال ہو اس کی ذمہ داری ہے۔ اس مسئلہ کو بینک کی ملازمت پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

''بینک کے کاروبار سود پر مبنی ہیں اور سودی کاروبار حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے دینے والے، لکھنے والے، اس کے گواہان اور اس کا واسطہ بننے والے سب پر لعنت فرمائی ہے، اس لئے یہ تمام لوگ سودی کاروبار میں تعاون کررہے ہیں، بینک وہ ملازمین جو حساب وکتاب، نوشت وخواند لین

دین کا کام کرتے ہیں اس گروہ میں داخل ہیں اور معصیت میں براہ راست معاون ہیں، اس لئے یہ ملازمت ان کے لئے جائز نہیں ہے۔ البتہ نیچے درجہ کی ملازمت (مثلاً جاروب کش، چوکیدار، وغیرہ جن کا کاروبار اور معاملات سے تعلق نہیں نفس عمارت کی حفاظت وغیرہ پر مامور ہیں) جائز ہے''۔

۱۰۔ امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام لینے کا شرعی حکم:

امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے اگر حکومت وقت نے کچھ شرائط ومعیارات متعین کئے ہوں تو کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ دجل وفریب اور غلط بیانی سے کام لے اور دھوکہ دے کر غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھائے قرآن وحدیث میں اس کی صریح ممانعت آئی ہے کہ آدمی جھوٹ بول کر یا دھوکہ دے کر کسی چیز کو حاصل کرے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من غش فلیس منا'' (حدیث) جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں ہے، اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اس سلسلہ میں محتاط رہیں اور برادران وطن کے لئے ایک نمونہ بنیں۔

خاص کر ہم مسلمانوں کو تو قطعا یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم کسب معاش کی حرص میں ایسی نازیبا حرکتیں کریں، اس سے آخرت میں جو گناہ ہوگا وہ تو ہوگا ہی، دنیا میں بھی بے برکتی پیدا ہوتی، اور انسان آفتوں اور بلاؤں سے دو چار ہوتا ہے۔

مفتی احمد خانپوری مدظلہ العالی ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ ایک طرح کی دھوکہ بازی ہے کہ اپنی آمدنی کم بتلا کر ناحق طریقہ سے اپنے آپ کو مستحق امداد ثابت کیا جائے، یہ حرام ہے، مزید برآں اپنے اس فریب اور دھوکہ بازی کو درست ظاہر کرنے کے لئے رشوت کا بھی ارتکاب کیا جارہا ہے، وہ بھی حرام ہے'' (محمود الفتاوی ۴/ ۸۰۳۔ ۸۰۴)۔

حکومت وقت نے جو شرائط ومعیارات امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے متعین کئے ہیں اس میں فراڈ اور دجل وفریب سے کام لے کر یا جعلی سرٹیفکٹ بنوا کر حکومت سے رقم لینا یہ ایک طرح سے میری نظر میں لوٹ کھسوٹ کے درجہ میں ہے اور کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ لوٹ کھسوٹ کر مال حاصل کرے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''من انتهب نهبة فليس منا'' (ترمذی شریف ۱/ ۲۸۹)۔

الغرض جھوٹ اور غلط بیانی کر کے امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنا از روئے شرع ناجائز اور حرام ہے اور جھوٹ دغابازی اور فریب دہی پر جتنی وعیدیں آئی ہیں ایسا شخص ان کا مستحق ہے، مثلاً جھوٹوں پر اللہ کی لعنت، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ دھوکہ کرنے والا ہم میں سے نہیں ہے، اس لئے جعل سازی اور غلط بیانی کر کے امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنا از روئے شرع جائز نہیں ہوگا۔

۱۱۔ اگر مقروض کی طرف سے سود حکومت ادا کرے تو کیا حکم ہوگا؟

حکومت وقت بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے بنک سے پبلک کو قرض دلاتی ہے اور اس پر بینک کا جو سودی انٹرسٹ ہوتا ہے وہ حکومت مقروض کی طرف سے خود ادا کرتی ہے خود مقروض کو ادا نہیں کرنا پڑتا یا بعض صورتوں میں اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور معمولی سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے یہ اسکیم اور اس سے استفادہ از روئے شرع جائز نہیں ہے کیونکہ یہ معاملہ بھی خالص سودی معاملہ ہے، کیونکہ جس طرح عام حالت میں سودی قرض لینا جائز نہیں ہے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ کوئی فرد یا ادارہ یا حکومت کسی مقروض کا کفیل اور وکیل بن جائے اور قرض خواہ کی طرف سے وہ سود ادا کرے جس طرح سودی قرض لینا جائز نہیں ہے، اسی طرح کسی کو اپنی کفالت اور ضمانت سے سودی قرض دلانا بھی جائز نہیں ہے۔ دوسری بات یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ جس طرح زیادہ رقم کا سودی کاروبار اور لین دین جائز نہیں، اسی طرح معمولی سودی لین دین بھی جائز نہیں سود چاہے کم دینا پڑے یا زیادہ حرام دونوں ہیں۔

شریعت کی نظر میں جس طرح چوری ناجائز ہے اور چوری کا مال حرام ہے اسی طرح اگر کوئی دوسرا شخص یا ادارہ چوری کر کے کسی کو دے تو اس صورت میں بھی وہ مال حرام ہی ہوگا اور اس کا لینا جائز نہیں ہوگا، صورت مسئلہ میں بھی چاہے مقروض خود سود ادا کرے یا اس کی طرف سے حکومت ادا کرے دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔

البتہ محتاج اور ضرورت مند مسلمان جو واقعی ان سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانے میں محتاج ہیں اور ان کے پاس بینک کا انٹرسٹ بھرنے کا روپیہ

نہیں ہے ان کے لئے سہولت اور گنجائش ہے کہ وہ ان اسکیموں سے فائدہ اٹھائے جن میں مقروض کی طرف سے سود حکومت ادا کرتی ہے، البتہ خوش مسلمانوں کے لئے محض عیش وعشرت کی زیادہ اور تجارت کے فروغ کے اس طرح کا سودی قرض لینا جائز نہ ہوگا۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی ایک چشم کشا تحریر پیش خدمت ہے، جس سے اس مسئلہ کو سمجھنا آسان ہوگا۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان جیسے ملک میں جہاں زمام اقتدار ہمارے ہاتھوں میں نہیں اور خصوصیت سے معاشی نظام کی تشکیل اور قانون سازی میں اقلیت یا اکثریت کے مذہبی اصول کی رعایت کئے جانے کی کوئی ضمانت دستور میں نہیں دی گئی ہے، ضروری ہوگا کہ احکام پر غور کرتے ہوئے ہم شارع کی ان ہدایات اور فقہاء کے ان اصول واجتہاد کو سامنے رکھیں اور معاملہ کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرلیں، اس پہلو کو بھی کہ حرج اور مشقت سے بچانا شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے اور اس بات کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ شارع کی صریح محرمات کے دروازہ پر دستک دینے سے بچا جائے'' (کتاب الفتاوی ۵ / ۲۳۳)۔

۱۲۔ حکومت کا اپنے محفوظ سودی فنڈ سے افراد واشخاص کے تعاون کا شرعی حکم:

حکومت وقت کے یہاں بعض اسکیمیں ایسی بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، حکومت نے اس قسم کو بینک میں ڈپازٹ کردیا ہے اور حکومت کو اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اسی سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے گویا حکومت براہ راست یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے صورت مسئلہ میں ظاہری بات ہے کہ حکومت خالص سود کے پیسے اور روپے سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کی مدد کرتی ہے، اس لئے اس اسکیم سے صاحب حیثیت مسلمانوں کا استفادہ کرنا از روئے شرع درست اور جائز نہیں ہوگا، البتہ جو مسلمان محتاج ونادار ہیں نان شبینہ کے بھی محتاج ہیں اس اسکیم سے فائدہ نہ اٹھانے سے ان کو مالی اور معاشی دشواری کا سامنا کرنا یقینی ہو تو ایسے مسلمانوں کو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوگی، کیونکہ وہ محتاج اور ضرورت مند ہیں، البتہ غریب اور محتاج مسلمانوں کے لئے بھی سعادت مندی کی بات یہی ہے کہ اگر وہ صحت مند ہیں اور ان کے قوی مضبوط ہیں جسم میں طاقت وقوت ہے تو ایسے سودی رقم اور سودی اسکیم کے حصول سے پرہیز کرکے رزق حلال کی طلب میں رہے حلال اور پاکیزہ روزی پیٹ میں جاتی ہے تو اس سے قلب منور ہوتا ہے، اعمال صالحہ کی توفیق ہوتی ہے عبادات میں دل لگتا ہے اور جب حرام ومشتبہ روزی پیٹ میں جاتی ہے تو قلب میں ظلمت ووحشت پیدا ہوتی ہے، عبادات میں دل نہیں لگتا نیک کاموں کی توفیق نہیں ہوتی، نیز حلال رزق میں برکت ہوتی ہے، اس لئے ایک مسلمان کو مشتبہ مال سے بہرحال اجتناب کرنا چاہئے اقبال مرحوم نے امت کو یہی پیغام دیا تھا:

''اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی'' ..... ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی''

حکومت کے محفوظ سودی فنڈ سے مسلمانوں کی مدد واعانت کا شرعی حکم کے سلسلہ میں احقر کا موقف وہی ہے جس کا اظہار اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے موجودہ حالات، حکومت کے ساتھ ان کا رویہ برادران وطن کا سلوک اور معاشی اعتبار سے مسلمانوں کو قلاش بنانے کی نت نئی سازشیں ان تمام چیزوں کو اور پہلوؤں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں جہاں ہندو مسلم فسادات کی کثرت ہے اور ان فسادات کا اتفاقاً پیش نہ آنا، بلکہ بعض جماعتوں اور تحریکوں کی طرف سے مسلمانوں کی جان واملاک کی ہلاکت وبربادی کی منظم پلاننگ ہے بہ حالت موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایسے فنڈ سے اعانت اور مدد لینا جائز ہونا چاہئے، جیسا کہ ہمارے اکابرین نے ہندوستان کے مخصوص فرقہ وارانہ فسادات کی بنا پر انشورنس کی اجازت دی ہے باوجود اس کے کہ انشورنس کی تمام شکلوں میں ربوا اور جوا موجود ہے۔

ایک کلمہ گو کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر حال میں ان تمام اسکیموں سے فائدہ اٹھانے میں احتیاط کرے جو سودی اور ربوی ہو اور بغیر شرعی ضرورت اور حاجت کے اس کو اپنے اوپر حرام سمجھے، لیکن جہاں مسلمانوں کے جان ومال کو نقصان ہو اس نقصان کی بھرپائی اگر حکومت ان اسکیموں سے کرتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح محتاج اور انتہائی مجبور مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

☆☆☆

سرکاری اسکیموں کے قرضوں سے متعلق سوالات کے جوابات

مولانا محمد ممتاز خان ندوی[1]

سوال (۱) قرض کے کچھ حصہ کی معافی:

سرکار اپنی ترقیاتی اسکیموں کے تحت لوگوں کو جو قرض دیتی ہے، اگر بغیر شرط کے اس کا کچھ حصہ معاف کر دیتی ہے، تو راقم کے نزدیک ایسا قرض لینا دینا دونوں جائز ہے، اس کی تائید درج ذیل حدیثوں سے بھی ہوتی ہے۔

(۱) ''سنن ابن ماجہ'' کی روایت ہے:

''قال رسول اللهﷺ من أحب أن يظله الله في ظله فلينظر معسرًا أو ليضع '' (رواه ابن ماجه، كتاب الصدقات باب انظار المعسر، حديث نمبر: ۲۴۱۹) (اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو شخص چاہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سائے میں رہے تو وہ تنگ دست کو مہلت دے یا اس کے قرض کو معاف کر دے)۔

(۲) مسلم شریف کی روایت ہے:

''قال: من سره أن ينجيه من كرب يوم القيامة فلينفس عن معسر أو يضع عنه'' (رواه مسلم، باب فضل انظار المعسر، حديث: ۴۰۸۳) (اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جس کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے ان مصیبتوں میں سے کسی مصیبت سے اسے نجات دے، تو چاہئے کہ وہ مفلس کو مہلت دے یا اسے معاف کر دے)۔

(۳) مسلم شریف ہی کو روایت ہے:

''من أنظر معسرًا أو وضع عنه أظله الله في ظله'' (رواه مسلم، كتاب الزهد والرقائق باب حديث جابر الطويل وقصة أبي اليسر، حديث: ۳۰۰۶) (اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جس نے محتاج و تنگ دست کو مہلت دی، یا اس سے اپنا حق معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سائے میں رکھے گا)۔

اس کی تائید درج ذیل فقہی عبارت سے بھی ہوتی ہے:

''كذلك يجوز للبائع أن يزيد في المبيع، ويجوز أن يحط الثمن ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك''

(الفقه الميسر دوم/ ص: ۱۱۰، ط: مجمع الامام احمد بن عرفان الشهيد)

(اسی طرح بائع کے لئے جائز ہے کہ وہ مبیع میں اضافہ کر دے، اور جائز ہے کہ ثمن میں کمی کر دے، اور ان تمام چیزوں میں استحقاق متعلق ہے)

سوال (۲) مقررہ مدت سے پہلے قرض کی ادائیگی:

اگر مقروض مقررہ مدت سے پہلے قرض کی ادائیگی کر دیتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں سرکاری اسکیم قرض کا کچھ حصہ معاف کر دیتی ہے، تو راقم کے نزدیک اگر یہ معافی تبرعاً ہے، یعنی مقروض اور سرکاری اسکیم میں وقت سے پہلے قرض کی ادائیگی میں قرض کا کچھ حصہ معاف کرنے میں آپس میں مصالحت نہ ہو، تو یہ جائز ہے۔

---

[1] مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور، تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

اس کی تائید در مختار کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

''قال: أد إلی خمس مائة غدا من ألف لی علیك علیانك بری من الباقی فقبل بری، وإن لم یؤد ذلك فی الغد عاد دینه''

(قرض دینے والے نے مقروض سے کہا: تم میرے ایک ہزار میں سے جو تمہارے ذمہ ہیں، آئندہ کل پانچ سو ادا کردو، توتم بقیہ سے بری ہوجاؤ گے، تو اس نے قبول کرلیا تو وہ بقیہ سے بری ہوجائے گا، اور اگر اس نے آئندہ کل ادا نہیں کیا، تو اس کے ذمہ پورے قرض کی ادائیگی لازم ہوگی)۔

البتہ اگر جانبین یعنی قرض دینے والی اسکیم اور مقروض میں وقت سے پہلے قرض کی ادائیگی کرنے میں قرض کو کچھ حصہ کی معافی میں مصالحت ہوجائے، تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ربا ہے۔

''تنویر الابصار'' میں ہے: ''ولا یصح الصلح عن ألف درهم مؤجل علی نصفه حالًا'' (رد المحتار علی الدر ۴/ ۵۴۴)

(ایک ہزار ادھار درہم میں فوراً نصف ادائیگی پر صلح صحیح نہیں ہے)۔

ردالمحتار میں ہے: والأصل إن الإحسان إن وجد من الدائن فإسقاط وإن منهما فمعاوضة (رد المحتار علی الدر ۴/ ۵۴۴)

(اور اصل یہ ہے کہ بے شک احسان اگر دائن کی طرف سے ہو، تو یہ اسقاط ہے، اور اگر جانبین، یعنی دائن اور مدیون کی طرف سے ہو تو یہ معاوضہ ہے)

اسی طرح کی بات فقہاء شوافع نے بھی لکھی ہے:

''صالح عن عشرة مؤجلة علی خمسة حاله، لغی الصلح؛ لأنه إنما ترك الخمسة فی مقابلة حلول الباقی وهو لا یحل''

(حواشی تحفة المحتاج ۵/ ۱۵۲)

(دس ادھار کی پانچ نقد پر صلح کر لی، تو صلح غیر معتبر ہے، اس لئے کہ اس میں پانچ باقی کے نقد ہونے کے عوض چھوڑا ہے، اور یہ جائز نہیں ہے)۔

امام مالکؒ نے خود مؤطا میں اس پر قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اور اس میں ضع وتعجیل کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے، امام مالکؒ کا خیال ہے کہ اگر فریقین بطور خود تبرعاً ایسا کریں تو حرج نہیں، لیکن مشروط طور پر ایسا معاملہ کرنا جائز نہیں، فرماتے ہیں:

''من وجب علیه دین إلی رجل فسئل أن یضع عنه ویعجل له ما بقی لم یتبع له ذلك. لأنه یعجل قلیلًا بکثیر دینًا'' (مؤطا للإمام مالك)

(جس شخص پر ایک مدت کے بعد قابل ادائیگی دین واجب ہو اس سے کہا جائے کہ وہ کچھ معاف کردے اور باقی نقد لے لے، تو یہ مناسب نہیں، اس لئے کہ وہ دین کثیر کے بدلہ نقد کی وجہ سے قلیل کو قبول کر رہا ہے)۔

ابن قدامہ حنبلیؒ کا بیان ہے: ''إذا صالحه علی المؤجل ببعضه حالا لم یجز'' (المغنی ۴/ ۳۱۶)

(اگر دیر سے ادا طلب قرض میں کچھ کم کر کے نقد ادائیگی پر صلح کرلے، تو جائز نہیں)۔

اس کی تائید صاحب احسن الفتاوی مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے ایک فتوی سے بھی ہوتی ہے استفادہ کی غرض سے استفتاء وفتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

''سوال: ایک شخص کا دوسرے پر دین مؤجل تھا، مدیون نے دائن سے کچھ حصہ دین معاف کرنے کی درخواست کی، دائن نے اس شرط پر قبول کرلیا کہ باقی دین بروقت ادا کرے، چنانچہ مدیون نے باقی دین اسی وقت ادا کردیا شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب ومنه الصدق والصواب: ...... یہ معاملہ جائز نہیں، اس میں اصل یہ ہے کہ اگر جانبین سے احسان ہے، جیسا کہ صورت مسئولہ میں دائن کی طرف سے ترک حصہ دین اور مدیون کی طرف سے اسقاط اجل، تو یہ معاوضہ ہے، اور موجب ربا ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اور اگر احسان

صرف جانب واحد سے ہے تو یہ ایراد ہے، معاوضہ نہیں، اس لئے جائز ہے'' (احسن الفتاوی ۷/ ۱۸۰)۔

سوال نمبر (۳) مقررہ مدت کے بعد زائد رقم کی ادائیگی:

سرکاری اسکیم اور مقروض کے درمیان اس طرح کا معاملہ ہو، تاکہ مقررہ مدت میں قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں زائد رقم ادا کرنی ہوگی، مثال کے طور پر سرکاری اسکیم نے کسی کو ایک لاکھ روپے قرض دیئے، اور یہ شرط لگائی کہ مقررہ مدت میں قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں پانچ ہزار روپے زیادہ ادا کرنے ہوں گے، تو یہ پانچ ہزار روپے کھلا ہوا سود ہے، اور یہ شکل جائز نہیں ہے، اور اس کی حرمت پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں سود کی جو صورت رائج تھی، وہ یہی صورت ہے، حضرت امام مالک تحریر فرماتے ہیں:

''وكان ربا الجاهلية في الديون أن يكون للرجل على الرجل الدين، فإذا حل قال له: أتقضي أم تربي فإن قضاه أخذه، وإلا زاده في الحق، وزاده في الأجل'' (المدونة الكبرى ۵/ ۱۸)

(دیون میں زمانہ جاہلیت کا جو سود مروج تھا، وہ اس طرح کا تھا کہ ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہوتا، جب دین کی ادائیگی کا وقت آتا، تو صاحب دین دریافت کرتا کہ قرض ادا کروگے یا مہلت لوگے؟ اگر دین ادا کردیتا تو لے لیتا، ورنہ مقروض)۔

اس کی تائید حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کے ایک فتوی سے بھی ہوتی ہے، استفادہ کی غرض سے استفتاء وفتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

''سوال: ایک مسلمان گاہک نے ایک مسلمان تاجر سے ماہ جنوری میں مبلغ دو ہزار روپے کا سامان ادھار خریدا، اور مارچ میں اس کی قیمت ادا کی، جب مارچ میں قیمت ادا کرنے گیا، تو دوکاندار نے ماہ مارچ کے نرخ سے قیمت وصول کی، جو دو ہزار روپے سے زیادہ ہے، دوکاندار کا استدلال ہے کہ دو ماہ تک میرے دو ہزار روپے رکے رہے، اگر یہی رقم بینک میں جمع رہتی، تو مجھے اتنا اور اتنا سود ملتا، دوکاندار کا اس طریقہ پر تجارت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جب جنوری میں دو ہزار روپے قیمت طے ہوچکی ہے، تو اب تاخیر کی وجہ سے مارچ میں، زیادہ قیمت وصول کرنا جائز نہیں، یہ سود ہے، اگرچہ دو ہزار روپے دوکاندار کے گھر میں رہتے تو کیا خود بخود ان روپیوں میں اضافہ ہوجاتا؟ ظاہر ہے کہ روپیوں میں خود بخود پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، اور اگر وہ اس رقم کو تجارت میں استعمال کرتا، جب بھی کیا اس پر زیادہ حاصل ہونا یقینی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ دوکاندار کا زیادہ پیسوں کا مطالبہ کرنا شرعاً نہ درست ہے اور نہ عقلاً صحیح ہے، یہ کھلا ہوا سود ہے، اس لئے اس سے بچنا چاہئے، ہاں اگر کوئی شخص شروع میں ہی طے کردے کہ میں دو مہینے کے بعد قیمت لوں گا اور قیمت ہزار ہوگی، تو یہ صورت جائز ہے، کیونکہ ہر شخص کو اپنے سامان کے بارے میں اختیار ہے کہ وہ جو قیمت اس کی مناسب سمجھے متعین کردے، اور یہ بھی درست ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق رکھا جائے، اس لئے اگر ادھار معاملہ میں زیادہ لیتے ہیں تو اس کی جائز صورت یہ ہے کہ شروع ہی میں اس کا لحاظ کرتے ہوئے قیمت طے کردے'' (کتاب الفتاوی ۵/ ۲۲۱)۔

مقررہ مدت کے بعد قرض کی ادائیگی میں جو زائد رقم دی جائے، تو اگر اس کو مالی جرمانہ پر قیاس کیا جائے، تب بھی مالی جرمانہ کے طور پر یہ زائد رقم امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے، اس لئے یہ کسی سبب شرعی کے بغیر ایک شخص کا مال لینا ہے:

''إذ لا يجوز أخذ مال مسلم'' (حاشیہ شیخ احمد بن محمد صاوی مالکی علی)۔

البتہ امام ابو یوسفؒ نے مالی تعزیر کی اجازت دی ہے۔

''وعن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال'' (فتح القدیر ۴/ ۱۱۲)

تاہم امام ابو یوسفؒ کے مسلک کی بعض حنفی مصنف نے توضیح کی ہے کہ یہ جرمانہ محض وقتی طور پر از راہ دھمکی لیا جائے گا، نہ خود سلطان لے گا اور نہ بیت المال میں داخل کردے گا، بلکہ ایک مدت کے بعد واپس کردے گا۔

البحر الرائق میں ہے: ''إمساك شئی من ماله عنه مدة لينزجر ثم يعيده الحاكم إليه لا أن يأخذه الحاكم لنفسه أو لبيت المال'' (البحر الرائق ۵/۴۱)۔
(اس کے مال میں سے اس کی طرف سے کچھ مال کا ایک مدت تک روکنا ہے، تاکہ حاکم اس کی تنبیہ کرے، پھر حاکم اس کو مال واپس کردے گا، نہ تو حاکم خود اپنے لے گا اور نہ بیت المال کے لئے لے گا)۔

بعض حضرات نے نقل کیا ہے کہ امام مالک کا خیال ہے کہ مالی جرمانہ لینا جائز ہے۔

''وبه قال مالك'' (فقه السنه ۳/ ۵۹۲ بامش الشرح الصغير ۴/ ۵۰۴-۵۰۵)۔

اور قضا کے موضوع پر معین الحکام کے فاضل مصنف قاضی علاء الدین طرابلسیؒ بھی تعزیر مالی کے قائل ہیں، علامہ ابن قیمؒ بھی تعزیر مالی کے قائل ہیں۔

اگر ان حضرات کی بات جو کہ مالی جرمانہ کے قائل ہیں، صحیح مان بھی لی جائے، تب بھی تاخیر سے قرض کی ادائیگی میں زیادہ وصول کرنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اس میں سود بھی ہے، اور فقہی قاعدہ ہے، جب حلال وحرام ایک ساتھ جمع ہوجائیں تو حرمت والے پہلو کو ترجیح دی جائے گی، قاعدہ ہے:

''إذا اجتمع الحلال والحرام رجح الحرام'' (رد المحتار على الدر ۱/ ۲۱۹ كتاب الطهارة، ط: بيروت، لبنان)

(جب حلال وحرام ایک ساتھ جمع ہوجائیں، تو حرمت والے پہلو کو ترجیح دی جائے گی)۔

سوال (۴) قرض سے زیادہ لینے کو سروس چارج پر محمول کرنا:

قرض سے زائد رقم کا مطالبہ اگر چہ کہ یہ معمولی ہی کیوں نہ ہو، اس کو سروس چارج پر محمول کرنے اور نہ کرنے میں راقم کے نزدیک کچھ تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ اگر یہ زائد رقم متعین نہ ہو، بلکہ اس میں سالانہ اضافہ ہوتا رہے، خواہ اضافہ معمولی ہی کیوں نہ ہو، اس کو سروس چارج پر محمول کرنا درست نہیں ہے، بلکہ یہ سود ہے، اس لئے کہ اس میں سود کی تعریف صادق آرہی ہے، سود کی تعریف علامہ شامی نے بایں الفاظ کی ہے۔

''وشرعًا فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال'' (رد المحتار على الدر ۴/ ۱۹۶)

(مال کے مال سے معاوضہ کے وقت بلا عوض زائد مال)۔

البتہ اگر بینک دفتری مصارف اور دیگر مصارف کا جائزہ لے کر ٹھیک ٹھاک حساب کر کے ان کو ایک لخت مقرر کردے، وصولی خواہ قسط وار ہی کی جائے، تو اس کو سروس چارج پر محمول کیا جاسکتا ہے، اور شرعاً جواز کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

قرض جاری کرنے والے اور اس کا حساب وکتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں، بینک کے لئے اپنے قرض داروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے زیادہ نہ ہو (فقہی مقالات ۱/ ۷۰)۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند کا رجحان بھی اس طرف ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

جو رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے، اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لئے اعانت میں داخل کر کے اس معاملہ پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے، اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے، بلکہ انتظام کی درستگی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جاسکے گا اور اس پر معاملہ جائز رہے گا (منتخبات نظام الفتاوی ۲/ ۴۴۴)۔

سوال (۵) الف: سروس چارج سے زیادہ لینا:

اگر سرکاری اسکیم کی طرف سے دیئے جانے والے قرض میں قرض کی واپسی کے وقت اتنی زائد رقم لی جائے کہ وہ سروس چارج سے زیادہ

ہو جائے، جس کو سروس چارج پر محمول نہ کیا جا سکے، تو اس بابت راقم کی رائے یہ ہے کہ جتنی رقم انتظامی خرچ سے زائد ہوگی، وہ سود میں داخل ہوگی، کیونکہ اس پر سود کی تعریف صادق آرہی ہے، شامی میں ہے: "ہو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدین" (رد المحتار علی الدر ۴/۱۹۶)۔

حدیث شریف میں ہے:

"کل قرض جر نفعًا فهو ربا" (مصنف ابن ابی شیبہ ۱۰/ ۶۳۸ کتاب البیوع والاقضیہ، حدیث: ۲۱۰۷۸)

(ہر وہ قرض جو نفع کا سبب ہو، تو وہ ربا ہے)۔

مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی عبارت ابھی گذری ہے، جس میں تحریر فرماتے ہیں:

"بینک کے لئے قرض داروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے زیادہ نہ ہو"۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند بھی سروس چارج سے زائد رقم لینے کو سود قرار دیتے ہیں۔

"اگر محض نقد روپیہ قرض کے لیا جائے، اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے یا سامان وغیرہ کے ساتھ نقد بھی لیا جائے، مگر نقد کی وہ مقدار سامانوں سے کام چلانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہو، اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے، اور واپسی کی کل رقم یا پچاس فیصد رقم سے زیادہ ہو جائے، تو سود کی تعریف "ہو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدین" صادق آئے گی" (منتخبات نظام الفتاوی ۲/ ۴۴۴)۔

(ب) مکان کی تعمیر، کاشتکاری اور دیگر کاروبار کے لئے سودی قرض کا حکم:

سرکاری قرض اسی وقت لیا جا سکتا ہے کہ جب کہ اضطرار، حد درجہ کی احتیاج، اور شدید مجبوری ہو، اضطرار کا مطلب یہ ہے کہ جس کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے، اور احتیاج شدید کا مطلب یہ ہے کہ زندگی گزر تو جائے لیکن شدید دشواری ہونے کا یقین ہو جائے۔

اس تناظر میں اگر جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی اور دیگر کاروبار کے لئے سودی قرض لینے میں احتیاج شدید ہو جائے، جس کے بغیر زندگی گذارنا دشوار ہو جائے، تو ایسے وقت میں ان تمام چیزوں میں سودی قرض لینے کا حکم یکساں رہے گا۔

"الاشباہ والنظائر" میں ہے: "ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ والنظائر/ ۱۴۹)

(ضرورت مند کے لئے نفع کے ساتھ قرض حاصل کرنا درست ہے)۔

البتہ اگر محض مکان کی وسعت، کاروبار کو بڑھانے کے لئے سودی قرض لیا جائے، تو ایسا قرض لینا جائز نہیں ہوگا۔

(فتاوی رحیمیہ ۹/ ۲۰۷، کتاب الفتاوی ۵/ ۳۶۶)۔

سوال (۶) سرکاری امداد:

گورنمنٹ لوگوں کی جو امداد کرتی ہے، خواہ وہ کسی چیز کے لئے ہی ہو، اگر یہ امداد حکومت کی طرف سے ہر ایک کے لئے ہو، تو اس امداد کو کوئی بھی خواہ امیر ہو یا غریب، ہر ایک حاصل کر سکتا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ مالدار ایسی رقم لے کر کسی غریب کو دے دے، تا کہ اس کا بھلا ہو جائے، اور اگر حکومت کی طرف سے اعلان ہو کہ ایسی امداد غریب ہی شخص حاصل کر سکتا ہے، اور اس کے لئے حکومت کی طرف سے علامتیں متعین ہوں، تو پھر ایسی امداد کو غریب ہی شخص حاصل کر سکتا ہے، مالدار کے لئے ایسی امداد حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

(۱) "ترمذی شریف" کی روایت ہے:

"عن سماك قال: سمعت علقمة بن وائل يحدث عن أبيه أن النبي ﷺ أقطع أرضا بحضرموت. قال محمد: حدثنا النضر بن شعبة وزاد فيه: وبعث معه معاوية ليقطعها إياه" (رواه الترمذي، كتاب الاحكام باب ما جاء في القطائع، ح: ۱۳۸۰)

سماک سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے علقمہ بن وائل سے سنا، وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے

حضرموت میں زمین الاٹ کی، محمد نے کہا: ہم سے نضر نے شعبہ کے حوالہ سے بیان کیا، جس میں انہوں نے اس ٹکڑے کا اضافہ کیا، اور ان کے ساتھ معاویہ کو بھیجا، تاکہ وہ ان کے لئے زمین کو الاٹ کریں۔

اس کی تائید حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ کے دوفتوں سے بھی ہوتی ہے، استفادہ کی غرض سے استفتاء وفتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

سوال (۱۰۴۹) ضلع بھروچ میں زلزلہ آنے سے مکان اور مسجد و مدرسہ کو ناقابل برداشت نقصان ہوا ہے، گورنمنٹ کی طرف سے امداد مل رہی ہے، تو کیا مالدار اس کو لے سکتا ہے؟

الجواب، صورت مسئولہ میں سرکار کی طرف سے جو رقم ملتی ہے، وہ سرکاری امداد ہے، وہ لی جاسکتی ہے جس کو ضرورت نہ ہو، وہ حاجت مند کو دے دے۔

(فتاوی رحیمیہ ۳/ ۳۰۵)۔

سوال (۱۸۵۱) ایک شخص انگلینڈ میں مقیم ہے، ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے، کچھ روز بعد لڑکی کا انتقال ہوگیا ہے، وہاں کی حکومت ایسے موقع پر بطور امداد اپنی خوشی سے بچہ کے ماں باپ کو کچھ رقم دیتی ہے، تو وہ رقم لینا کیسا ہے، خود استعمال کرسکتا ہے یا لے کر کسی غریب کو دے دے۔

الجواب، جبکہ بلا طلب بطور امداد اور غم خواری کے لئے رقم دیتی ہے، تو لینے میں کوئی حرج نہیں، خود استعمال کرے، یا حاجت مند کو دے۔

(فتاوی رحیمیہ ۶/ ۳۱۶۔ ۳۱۷)۔

خلاصہ بحث:

حکومت لوگوں کی جو امداد کرتی ہے وہ کسی قسم کے لئے بھی ہو، وہ ایک انعام اور ہدیہ کے طور پر ہے، مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اس کو لیا جاسکتا ہے، اس کے لینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال (۷) محنتانہ دینا اور لینا:

سرکاری امداد حاصل کرنے یا سرکاری قرض کے حصول کے لئے جو لوگ واسطہ بنتے ہیں، اگر یہ سرکاری ملازم ہیں اور ان کو اسی کام کے لئے رکھا گیا ہے، تو ان کے لئے محنتانہ لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ ان کو محنتانہ خود سرکار دے رہی ہے، ایسی صورت میں محنتانہ لینا دینا رشوت لینے اور دینے کے حکم میں ہوگا، رشوت کے متعلق اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "الراشی والمرتشی کلاھما فی النار" (مسند ۶/ ۲۱۶) رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں ہی گناہ گار ہیں، اور اگر واسطہ بننے والا شخص سرکاری ملازم نہیں ہے، تو اگر اس کا محنتانہ پہلے طے کرلیا جائے، مثال کے طور پر پچاس ہزار روپے سرکاری امداد یا قرض کے ملنے ہیں اور اس پر پانچ ہزار روپے محنتانہ طے ہوجائیں، تو اس کا لینا دینا دونوں جائز ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، اس کی تائید درمختار کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

"قال فی التاتارخانية: وفی الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه إن فی كل عشرة دنانير كذا فذلك حرام عليهم. وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان فی الأصل فاسداً بكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز، فجوزوا لحاجة الناس" (رد المحتار على الدر، كتاب الاجارة فصل فی ضمان الاجير ۵/ ۵۳)۔

(تاتارخانیہ میں فرمایا: اور دلال کی اسی کے مثل اجرت واجب ہوگی، جو اجرت ان کے درمیان طے ہوتی ہے، بے شک دس درہم میں اتنی اجرت، تو یہ معاملہ ان پر حرام ہوگا، اور حاوی میں محمد بن سلمہ سے دلال کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کثرت تعامل کی وجہ سے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ کہ اصل میں یہ فاسد ہے، اور ان میں سے بہت سی چیزیں نہیں ہیں، پس فقہاء کرام نے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے)۔

اس کی تائید مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کے اس فتوی سے بھی ہوتی ہے، استفادہ کی غرض سے استفتاء وفتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ

فرمائیں:

''سوال: میری ایک سہیلی جو کہ لوگوں کو کڑھائی کروا کر دیتی ہے، کڑھائی سستی بنواتی ہے، اور پیسے زیادہ لیتی ہے، جن سے کڑھائی کرواتی ہے، اس کے پورے پیسے دیتی ہے، اور باقی خود کو لیتی ہے، دوکاندار بھی یوں کرتے ہیں، یہ پیسے اس کے لئے جائز ہیں یا ناجائز؟

جواب: اگر دونوں طرف کے پیسے طے کر لیے جائیں، تو جائز ہے'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶ / ۲۸۵)۔

سوال (۸) امداد یا قرض میں سے محنتانہ لینا:

جو لوگ سرکاری قرض یا سرکاری امداد لانے میں واسطہ بنتے ہیں، اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ حاصل شدہ رقم میں وہ متعین حصہ لیں گے، تو اس صورت میں بھی راقم کے نزدیک وہی حکم ہوگا، جو اوپر والی صورت کا حکم گزرا ہے، یعنی اگر یہ لوگ حکومت کی طرف سے ملازم ہیں، اور ان کو اسی کام کے لئے رکھا گیا ہے، اور حکومت اس کی تنخواہ دیتی ہے، تو حاصل شدہ رقم میں سے متعین حصہ نہ ان کے لئے لینا جائز ہوگا اور نہ ہی دینا جائز ہوگا، کیونکہ یہ رشوت کے حکم میں ہے، اور اگر واسطہ بننے والے لوگ سرکاری ملازم نہ ہوں، تو اور یہ لوگ سرکاری امداد یا سرکاری قرض دلانے میں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں اور اپنا وقت صرف کر رہے ہیں تو اگر پہلے سے محنتانہ طے ہو جائے، تو اس کی اجازت ہوگی۔

''رد المحتار'' میں ہے: ''قال في التاتارخانية: وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه إن في كل عشرة دنانير كذا فذلك حرام عليهم. وفي الحاوي سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدًا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز تجوزوا لحاجة الناس إليه'' (رد المحتار على الدر، كتاب الاجارة في ضمان الاجير ۲/ ۵۲)۔

(تاتارخانیہ میں فرمایا: اور دلال کی اسی کے مثل اجرت ہوگی، جو اجرت ان کے درمیان طے ہوئی ہے، بے شک دس درہم میں اتنی اجرت، تو یہ معاملہ پر حرام ہوگا، اور حاوی میں محمد بن سلمہ سے دلالی کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا کثرت تعامل کی وجہ سے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ کہ اصل میں یہ فاسد ہے اور ان میں سے بہت ساری چیزیں جائز نہیں ہیں، پس فقہاء کرام نے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے)۔

اس کی تائید مفتی رشید احمد لدھیانوی کے اس فتوی سے بھی ہوتی ہے، استفادہ کی غرض استفتاء و فتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

''سوال: بڑی بڑی کمپنیوں والے حضرات ان کی کس چیز کی فروختگی کے بعد کمیشن ادا کرنے میں مجھے کبھی دو، ایک مرتبہ واسطہ ہوا ہے، کہ میں نے ایک کمپنی کی چیز فروخت کرائی تھی، جس کے صلہ میں مالکان بھی کمیشن عنایت کیا تھا، آپ اس سوال کا جواب مطابق شرعی قوانین دیجئے کہ یہ کمیشن جائز ہے یا ناجائز ہے؟۔ جواب: ...... جائز ہے'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶ / ۲۸۱)۔

''کفایت المفتی'' میں ہے: ''دلال کے یہاں کھانا کیسا ہے، شریعت کی رو سے یہ پیشہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب، دلال کی دعوت کھانا مباح ہے، اور دلال کا پیشہ کرنا مباح ہے'' (کفایت المفتی ۷ / ۷۷ ۳)۔

سوال (۹) رشوت دینا:

حکومت لوگوں کی جو امداد کرتی ہے اگر یہ مطلق ہے، یعنی امیر و غریب ہر ایک کے لئے ہو تو یہ لوگوں کا ایک حق ہے، اس کے حصول کے لئے خواہ امیر ہو یا غریب اگر رشوت دینی پڑ جائے تو راقم کے نزدیک اس کی گنجائش ہے، اور اگر حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہو کہ یہ امداد صرف غریبوں کے لئے ہے، مالداروں کے لئے نہیں ہے، جو یہ صرف غریبوں کا حق ہے، اگر رشوت کے بغیر ان کو حق نہ ملے، تو رشوت دینے کی گنجائش ہے، چونکہ یہ مالداروں کا حق نہیں ہے، لہٰذا ایسی امداد نہ مالداروں کو لینا جائز ہے، اور نہ اس کے لئے رشوت دینی جائز ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور و معتمد علیہ کتاب ''درمختار'' میں ہے:

''دفع المال للسطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة في حق الدافع'' (رد المحتار على الدر ۹/ ۶۰۷)۔

ظالم بادشاہ کو اپنی ذات سے ظلم کے دفاع کے لئے اور اپنے مال کی حفاظت کے لئے اور اپنے حق کو وصول کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہے، اور یہ رشوت دینے والے کے حق میں رشوت نہیں ہے۔

سنن ابی داؤد کی مشہور شرح بذل المجہود میں ہے:

''فإذا أعطى ليتوصل به إلى حق أو يدفع عن نفسه ظلمًا، فإنه غير داخل في هذا الوعيد'' (بذل المجهود شرح ابی داؤد ۴/ ۲۱۱)

تو جب کسی نے رشوت دی، تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے حق تک پہنچے، یا اپنے سے ظلم کو دور کرے، تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے۔

رہا مسئلہ قرض کے حصول میں رشوت دینا، تو اس بابت راقم کی رائے یہ ہے کہ اگر قرض لینا ناگزیر ہو جائے تو ایسی صورت میں رشوت دینے کی گنجائش ہوگی۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ورنہ اس کی حیثیت سود یا قرض پر رشوت دینے کی ہوگی، اور مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت ہے'' (کتاب الفتاوی ۵/ ۳۷۸)۔

اس کی تائید حضرت مولانا رشید احمد لدھیانویؒ کے ان فتوی سے بھی ہوتی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''کوئی کام تو غیر قانونی تو حتی الوسع نہ کیا جائے اس کے باوجود اگر رشوت دینی پڑ جائے، تو رشوت لینے والے اپنے جہنم کا سامان کرتے ہیں دینے والا بہرحال مجبور ہے، امید ہے کہ اس سے مواخذہ نہ ہوگا، اور اگر غیر قانونی کام کے لئے رشوت دی جائے، تو دونوں فریق لعنت کے مستحق ہوں گے'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۱۸۷)۔

سوال (۱۰) جھوٹ اور غلط بیانی کر کے سرکاری امداد اور سرکاری قرضے حاصل کرنا:

سرکاری اسکیم کی طرف سے سرکاری امداد اور سرکاری قرضوں کے لئے جو اصول و معیارات متعین ہیں، انہیں حدود میں رہ کر سرکاری امداد یا سرکاری قرضے حاصل کئے جاسکتے ہیں، جھوٹ اور غلط بیانی کر کے سرکاری امداد یا سرکاری قرضے حاصل کرنا ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے، کیونکہ جھوٹ اور غلط بیانی کی قرآن وحدیث میں بڑی مذمت آئی ہے، اور بڑی سختی سے منع کیا گیا ہے۔

سورہ حج کی آیت ہے:

"فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور حنفاء لله غير مشركين" (سورہ حج: ۳۰)۔

(تو بتوں کی پلیدی سے بچو، اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو، صرف ایک خدا کے ہو کر رہ جاؤ، اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ)۔

(۲) ''بخاری شریف'' کی روایت ہے:

''وإن الكذب ليهدي إلى الفجور وإن الفجور يهدي إلى النار'' (بخاری، كتاب الادب، باب قول الله تعالى، يا أيها الذين آمنوا وكونوا مع الصادقين، ح: ۶۰۹۴)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جھوٹ انسان کو برائی کی طرف لے جاتا ہے، اور برائی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔

(۳) مسلم شریف ہی کی روایت ہے:

''آية المنافق ثلاث إذا حدث كذب وإذا اؤتمن خان وإذا وعد أخلف'' (رواه مسلم، كتاب الايمان باب بيان الكبائر، ح: ۱۴۲)۔ (منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب امانت رکھائی جائے، تو خیانت کرے اور جب وعدہ

کرے، تو اس کی خلاف ورزی کرے)۔

(۴) بخاری و مسلم کی روایت میں غلط بیانی کی کتنی مذمت کی گئی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''عن أم سلمة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: أيما أنا بشر وإنكم تختصمون إلي ولعل بعضكم أن يكون الحق بحجته من بعض فاقضي له ما فهو ما أسمع منه فمن قضيت له شئي من حق أخيه، فلا يأخذنه، فإنما أقطع له قطعة من النار'' (رواه بخاري، كتاب الاحكام باب موعظة الإمام للخصومة، ٣: ١٦٩)۔

(حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ میں انسان ہوں، اور تم لوگ میرے پاس اپنے نزاعات اور مقدمات لاتے ہو، اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے ایک زیادہ اچھا بولنے والا ہو اور بہتر انداز میں تقریر کر کے اپنی دلیل پیش کرنے والا ہو دوسرے سے، اور پھر میں اس کی بات سن کر اسی کے مطابق فیصلہ کر دوں، تو اس طرح میں جس کے لئے اس کے بھائی کی چیز کا فیصلہ کروں، تو وہ اس کو ہرگز نہ لے، (اس کے جھوٹے دعوی یا جھوٹی قسم کے نتیجہ میں) اس کو جو دیتا ہوں وہ (انجام کے لحاظ سے) اس کے واسطے دوزخ کا ایک حصہ ہے)۔

حضرت مولانا رشید احمد لدھیانویؒ جھوٹ اور جعل کے ذریعہ کسی چیز کے حاصل کرنے کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''جھوٹ اور جعل سازی کے ذریعہ کوئی عہدہ ومنصب حاصل کرنا یہ تو ظاہر ہے کہ حرام ہے، اور جھوٹ دغابازی اور فریب دہی پر جتنی وعیدیں آئی ہیں، یہ شخص ان کا مستحق ہے، مثلاً جھوٹ پر اللہ تعالی کی لعنت، ارشاد نبوی ہے کہ دھوکہ کرنے والا ہم میں سے نہیں ہے، اس جعل سازی خواہ چھوٹی یا بڑی ایسے شخص کے بدکار گناہ گار ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اللہ تعالی سے توبہ کرنی چاہئے'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶ / ۲۸۹)۔

سوال (۱۱) قرض لینا اور معمولی سود دینا:

حکومت تعلیم یا بے روزگار کے لئے روزگار فراہم کرنے کے لئے بینک سے قرض دلاتی ہے، اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، اگر انٹرسٹ کی ادائیگی خود حکومت کر دیتی ہے، تو راقم کے نزدیک ایسا قرض لینا ایک مسلمان کے لئے جائز ہے اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، اور اگر سود کا بڑا حصہ خود حکومت ادا کرتی ہے، اور بہت تھوڑی مند اور مقروض کو ادا کرنی پڑتی ہے، تو راقم کے نزدیک اس تھوڑے سود کو سروس چارج پر محمول کر کے ایسے قرض لینے کی گنجائش رہے گی۔

اس کی تائید حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کے اس فتوی سے بھی ہوتی ہے، استفادہ کی غرض سے استفتاء وفتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

''سوال: بینکوں کی جانب سے بے روزگار مسلم نوجوانوں کو کم میں قرض دیا جاتا ہے، لیکن میری پنچایت میں بہت ہی کم شرح سود پر بے روزگار اور معاشی اعتبار سے پسماندہ مسلمانوں اور نوجوانوں کو گورنمنٹ کے ذریعہ یہ سہولت فراہم کی جارہی ہے، اور ان قرضوں کے سبب نوجوان اپنے کاروبار شروع کر رہے ہیں، تو کیا بے روز مفلس اور پس ماندہ مسلمانوں کو انتہائی معمولی شرح پر قرض دلانا یا خود قرض لینا درست ہوگا؟

جواب، سود لینا اور دینا دونوں ہی گناہ ہے، البتہ سرکار اور سرکاری ادارہ اور اشخاص اور پرائیوٹ ادارہ کے حکم میں ایک گونہ فرق ہے، جب ہم اس ملک کے شہری ہیں، تو جیسے حکومت دوسرے شہریوں کو روزگار فراہم کرتی ہے، ویسے ہی مسلمانوں کو بھی اس طرح کی سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور ہمارا بحیثیت ہندی اس پر حق ہے، لہٰذا جو مسلمان واقعی بے روزگار ہوں اور معاشی اعتبار سے اس سطح پر ہوں کہ اپنے پیسوں سے کوئی روزگار شروع نہیں کر سکتے، ان کے لئے ایسے قرض حاصل کرنا جائز ہے، اور جو زائد رقم سود کے نام لی جاتی ہے، اسے انتظامی اخراجات قرار دیا جا سکتا ہے، ورنہ اس کی حیثیت سود یا قرض پر رشوت دینے کی ہوگی، اور مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہے'' (کتاب الفتاوی ۵ / ۳۷۸)۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ سابق صدر مفتی دار العلوم کا رجحان بھی اسی طرف ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے، اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لئے اعانت میں۔

داخل کر کے اس معاملات پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے، اور اس زائد رقم ... نہ کہیں گے، بلکہ انتظامی درستگی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جا سکے گا، اور ہر معاملہ جائز رہے گا'' (منتخبات نظام الفتاوی ۲ / ۴۴۴)۔

سوال (۱۲) حکومت کا بینک میں فنڈ ڈپوزٹ کرنا اور اس کے انٹرسٹ کے ذریعہ امداد کرنا:

حکومت کا بینک میں فنڈ ڈپازٹ کر کے اس کے انٹرسٹ کے ذریعہ تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص میں تعاون کرنا، اس سلسلہ میں راقم کی رائے یہ ہے کہ اگر حکومت کافرہ ہے، اور وہ انٹرسٹ کے ذریعہ تعلیمی اداروں، رفاہی کاموں اور افراد و اشخاص میں تعاون کرتی ہے، تو یہ جائز ہے کیونکہ کافر حکومت شرعی احکام کی مکلف نہیں ہے۔

البتہ اگر مسلم حکومت یا مسلم کمیٹی یہ طریقہ اختیار کرے، تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ مسلمانوں کے لئے سودی معاملہ حرام اور ناجائز ہے، بلکہ دیت میں سود کے شبہ سے بھی بچنے کی تاکید کی گئی ہے، سنن ابی داؤد کی روایت ہے: ''دعوا الربا و الريبة'' (رواہ ابو داؤد، کتاب التجارات، باب التغلیظ، ح: ۲۲۷۶) (تم لوگ سود اور سود کے شبہ کو بھی چھوڑ دو)۔

اس بابت دو فتوی نقل کئے جاتے ہیں، جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس طرح کی صورت شرعی لحاظ سے جائز نہیں ہوگی، استفادہ کی غرض سے استفتاء و فتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

سوال (۲۴۹۸): ایک شخص مقروض ہے، اور قرض بھی بہت بڑا ہے، اس کو قرض ادا کرنے کی بالکل گنجائش نہیں ہے، ایسے مقروض کو مدد کرنے کی نیت سے کسی شخص کا بینک میں فکس ڈپوزٹ میں رقم جمع کرنا کیسا ہے؟

الجواب، صورت مسئولہ میں مقروض کی مدد کرنے کی نیت سے فکس ڈپوزٹ میں رقم رکھنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر کسی شخص نے جہل اور ناواقفیت کی وجہ سے ڈپوزٹ میں رقم جمع کر دی ہو، اور اس کا سود ملا ہو، تو ایسے ضرورت مند مقروض کو ثواب کی نیت کئے بغیر دیا جا سکتا ہے (فتاوی رحیمیہ ۹ / ۲۸۰)۔

سوال: (۲۵۰۰) ایک کمیٹی جو عام مسلمانوں کی خدمت کرتی ہے، اس نے کچھ رقم بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کی ہے، جس میں سود نہیں ملتا، مگر کمیٹی کے ممبران چاہتے ہیں کہ یہ رقم سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کی جائے، تاکہ اس کا سود ملے، اور اسے مصیبت زدہ مسلمانوں پر خرچ کریں، کیا کمیٹی کا یہ اقدام از روئے شرع درست ہوگا؟ اور سود میں ملی ہوئی رقم مسلمانوں پر خرچ کرنا درست ہوگا؟

الجواب: بینک میں حفاظت یا قانونی دشواری کی وجہ سے رقم رکھی جا سکتی ہے، سود حاصل کرنے کی نیت سے رقم رکھنا درست نہیں ہوگا، اگرچہ یہ نیت ہو کہ سود کی رقم محتاجوں کو دیدی جائے (فتاوی رحیمیہ ۹ / ۲۸۰)۔

☆☆☆

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کرنے کے احکام

مفتی حیدر علی قاسمی[1]

ا۔ اللہ رب العزت کے یہاں معتبر اور مستند دین، دینِ اسلام ہے، یہ دین قیامت تک باقی رہنے والا ہے، اس دین میں ہر چھوٹی اور بڑی چیز کا حکم موجود ہے، یہاں تک کہ قرضے کا حکم بھی موجود ہے، قرضے کا ثبوت قرآن سے: ارشاد باری تعالی ہے:

"یاأیہا الذین آمنوا إذا تداینتم بدین إلی أجل مسمی فا کتبوہ" (سورہ بقرہ: ۲۸۲)۔

قرضے کا ثبوت حدیث سے: "عن ابن مسعود أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما من مسلم یقرض مسلمًا قرضًا مرتین إلا کان لہ کصدقتہا" (ابن ماجہ ۲/ ۱۷۵)۔

قرضے کا ثبوت اجماع ہے: امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرضہ جائز ہے۔

"وأجمع المسلمون علی جواز القرض" (مغنی ۴/ ۲۴۷)۔

شریعت اسلامیہ میں آسانی اور سہولت ہے، "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (سورہ بقرہ: ۱۸۵)

انسان مختلف حالات سے گذرتے ہیں، کسی کے پاس ایک ہی وقت میں تمام اسباب و وسائل کا موجود ہونا ضروری نہیں ہے، اس لئے ایک دوسرے کا محتاج ہونا اور امر بدیہی ہے، ایسی صورت میں ضرورت کی تکمیل کے لئے قرضے کا ثبوت ضروری ہے۔

البتہ قرضے کے لئے ضروری ہے کہ شرعی طور پر قباحتوں سے پاک ہوں، سودی لین دین اور دیگر خلاف شرع کوئی بات نہ ہو۔

اس دنیا میں ہر آدمی اپنی اپنی ملکیت میں اپنی اپنی مرضی سے تصرف کرسکتا ہے، کسی کو روکنے کی اجازت نہیں ہے، اگر کسی کو قرضہ دے کر معاف کردے تو اس کا بھی اختیار ہے۔

پاکیزہ شریعت میں تعاون کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے: "تعاونوا علی البر والتقوی" (سورہ مائدہ: ۲)

اور حدیث میں ہے: "واللہ فی عون العبد ما دام العبد فی عون أخیہ"۔

قرضے کی معافی کا تذکرہ حدیث میں بھی ہے: "إن جابر بن عبد اللہ أخبرہ أن أباہ قتل یوم أحد شہیدًا. وعلیہ دین فاشتد الغرماء فی حقوقہم فأتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسألہم أن یقبلوا تمر حائطی ویحللوا أبی فأبوا فلم یعطہم النبی صلی اللہ علیہ وسلم حائطی، وقال: سنغد، وعلیك فغدًا علینا حین أصبح فطاف بالنخل ودعا فی تمرہا بالبرکۃ فجددتہا فقضیتہم، وبقی لنا من تمرہا" (بخاری شریف ۱/ ۳۲۲)۔

(حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ ان کے ابا جنگ احد میں شہید ہوگئے تھے اور ان پر قرضہ تھا، پس قرض خواہوں نے اپنے حقوق کا شدت سے مطالبہ کیا، حضرت جابرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہوں سے درخواست کی کہ وہ جابر کے باغ کے پھل لے لیں اور باقی قرضہ معاف کردیں، مگر انہوں نے نہیں مانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے باغ کے پھل ان کو نہیں دیئے، اور فرمایا صبح میں تمہارے باغ میں آؤں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور کھجور کے باغ میں چکر لگایا اور پھلوں میں برکت کی دعا فرمائی، پس حضرت جابرؓ پھل توڑے اور

[1] خادم حدیث وفقہ جامعہ اسلامیہ جلالیہ، ہوجائی، آسام۔

ان کا پورا حق ادا کردیا، پھر بھی کچھ بچ گیا (حضور ﷺ نے باقی قرضہ چھوڑنے کی درخواست کی ہے)۔

اس سلسلہ میں علامہ انورشاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: ''أي إذا قضى المديون أقل من حق الدائن ورضي به الدائن أو لم يود إليه شيئا، ولكنه حلله عن الدائن، فأحل له فهو جائز'' (فيض الباري ۳/ ۳۱۱)۔

(یعنی جب مدیون دائن کے حق سے کم ادا کرے اور دائن اس پر راضی ہوجائے یا تو کچھ ادا نہ کرے، اور دائن سے معافی کی درخواست کرے اور دائن معاف کردے تو یہ جائز ہے)۔

حضرت مفتی سعید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''ہزار روپے قرض لیے یا مبیع کا ثمن ہزار روپے باقی تھا پھر ساڑھے نوسو روپے دیئے اور کہا: پچاس روپے معاف کردیں، میرے پاس نہیں ہے، قرض خواہ نے معاف کردیئے یا سارا ہی قرضہ معاف کرالیا تو یہ جائز ہے'' (تحفۃ القاری ۵/ ۴۲۱)۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ''وكذا لو أبرأه صح الإبراء'' (حاشیہ ابن عابدین ۸/ ۴۲۵)۔

دار العلوم دیوبند کا فتوی ہے: ''دائن نے جن مدیون کا دین معاف کردیا اور بخش دیا وہ معاف ہوگیا، اور وہ مدیون بری الذمہ ہوگئے''۔ (فتاوی دار العلوم ۱۵/ ۷۰)۔

صاحب فتاوی رحیمیہ فرماتے ہیں:

''اگر کوئی شخص حکومت سے اس قسم کی اسکیم کے تحت قرض لے اور حکومت کی طرف سے اس پر کچھ چھوٹ ملے، اور بقیہ رقم مع سود وصول کرے، اگر وہ سود یا چھوٹ میں ملی ہوئی رقم یعنی سبسڈی سے ادا ہوجاتی ہے، اپنے پاس سے زائد رقم نہ دینا پڑتی ہو، تو اس تاویل سے کہ حکومت نے بطور تعاون جو رقم دی تھی، اس شخص نے اسی تعاون والی رقم سے کچھ رقم واپس کردی، مذکورہ اسکیم کے تحت قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے'' (فتاوی رحیمیہ ۹/ ۲۶۵)۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری حکومت عوام کی معاشی ومعاشرتی ضرورتوں کی کفالت، تعلیمی ترقی، صنعتوں کے فروغ اور اقتصادی اعتبار سے محروم وپسماندہ شہریوں کو اونچا اٹھانے اور ملک کی معیشت کو مضبوط کرنے کے لئے مختلف شکلوں میں رقوم دیتی ہے، جس سے چھوٹے بڑے پیمانے پر بہت سارے کام انجام دیئے جاتے ہیں اور معاشی وتعلیمی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں، عوام کو ان سے فائدہ پہنچتا ہے، نیز ملک کے خزانہ پر جس طرح دوسرے لوگوں کا حق ہے، اسی طرح مسلمانوں کا بھی حق ہے، وہ بھی براہ راست یا بالواسطہ ٹیکس ادا کرتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کو ایسی فلاحی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

قرضہ دینے کے بعد ایک حصہ یا پورا معاف کرنے میں سود کا شائبہ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ تعاون ہے جس کی ترغیب دی گئی ہے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔

مذکورہ امور اور دلائل کی بنا پر ایسے قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، جائز ہیں۔

۲۔ قرضے میں مدت لازم ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ اختلافی مسئلہ ہے، امام مالکؒ کے نزدیک مدت لازم ہے، اگر قرضے کے وقت مدت متعین ہو، تو یہ لازم ہوجائے گی، اس سے پہلے قرض دینے والے قرضہ کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

''وقال مالك والليث: يتأجل الجميع بالتأجيل لقول النبي ﷺ: المؤمنون عند شروطهم'' (مغنی ۴/ ۳۴۹)

امام احمد بن حنبل، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک مدت لازم نہیں ہوتی ہے، اور اگر مدت متعین ہو تو بھی قرض دینے والا جب چاہے قرض کا مطالبہ کرسکتا ہے، ''وإن أجل القرض لم يتأجل وكان حالا، وبهذا قال الحارث العكلي والأوزاعي وابن المنذر والشافعي.... وقال أبوحنيفة في القرض..... كقولنا'' (مغنی ۴/ ۳۴۹)۔

''فتاوی عالمگیری'' میں ہے: ''لو أقرض مؤجلا أو شرط التأجيل بعد القرض فالأجل باطل والمال حال'' (عالمگیری ۳/ ۲۰۲)

واضح رہے اگرچہ مذکورہ مسئلہ میں فقہاء اسلام کے اقوال مختلف ہیں، تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ مدت متعین ہونے کی صورت میں دیانۃً تمام ہی

فقہاء کے نزدیک ایفاء عہد واجب ہے اور کتاب وسنت کی پیروی بھی ہے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

"إن الأجل لازم في القرض قضاءً أيضًا وعندنا ديانة فقط" (فیض الباری ۳/۲۱۵)۔

ایسی صورت میں مقررہ مدت کے اندر قرض ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی آدمی کسی وجہ سے مقررہ مدت کے اندر قرضہ ادا نہیں کر پا رہا ہے اور مقررہ مدت ختم ہونے پر پوری رقم ادا کرنی پڑے، تو اس صورت میں لی ہوئی رقم سے زائد ادا کرنا نہیں پڑ رہا ہے بلکہ اصل اور لی ہوئی رقم ہی ادا کرنی ہے، اس میں سود نہیں پایا جا رہا ہے اور نہ ہی شرعاً کوئی قباحت پائی جا رہی ہے۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

"ولو كان له عليه ألف فقال: أو إلى من الألف خمس مئة غدا على أنك بريئ من الباق . فإن أدى إليه خمس مئة غدا يبرأ من الباقي إجماعًا، وإن لم يؤد إليه فعليه الألف عند أبي حنيفة ومحمد، وعند أبي يوسف ليس عليه إلا خمس مئة" (بدائع الصنائع ۵/ ۵۵)۔

(اور اگر کسی کا دوسرے پر ایک ہزار ہو اور وہ کہے کہ آئندہ کل مجھے ہزار میں سے پانچ سو دیدو، اور بقیہ سے بری ہو جاؤ گے، پس اگر اس کو پانچ سو آئندہ کل دیدیتا ہے تو بقیہ سے بالاتفاق بری ہو جائے گا، اور اگر ادا نہیں کرتا ہے، تو اس پر ایک ہزار ادا کرنا ضروری ہے امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک، اور امام ابو یوسف کے نزدیک اس پر صرف پانچ سو ادا کرنا ضروری ہے)۔

صاحب "درمختار" تحریر فرماتے ہیں: "قال لغريمه: أد إلى خمس مئة غدًا من ألف لي عليك على أنك بريئ من النصف الباقي فقبل وأدى منه بريئ ... وإن لم يؤد ذلك في الغد عاد دينه" (درمختار مع رد المحتار ۸/ ۳۶۵)۔

(قرض خواہ نے قرض دار سے کہا کہ تمہارے ذمہ جو ایک ہزار ہے اس میں سے کل مجھے پانچ سو دیدو تم باقی نصف سے بری ہو جاؤ گے، اس نے قبول کرلیا اور پانچ سو ادا کردیا تو وہ بری ہو گیا.... اور اگر کل ادا نہ کرے تو اس کا دین لوٹ آئے گا)۔

اس سلسلہ میں دار العلوم کا فتوی ہے "اب وہ فیصلہ باقی نہ رہا، قرض خواہ کو اختیار ہے کہ کچھ چھوڑے یا نہ چھوڑے، پانچ سو روپیہ لے، لیکن کچھ چھوڑ دینا اور حسب سابق تین سو روپیہ لینا اور باقی معاف کر دینا بہتر ہے، مگر لازم نہیں ہے (فتاوی دار العلوم ۱۵ /۸۰)۔

اگر معافی والے قرضوں میں ایسی صورت ہو کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہو ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑے تو یہ صورت مذکورہ عبارات وفقہاء کرام کے اقوال کی بنا پر جائز ہے۔

۳، ۴، ۵۔ شریعت اسلامیہ خیر خواہی وہمدردی، ایثار وقربانی اور ہر قسم کی بھلائیوں کی ترغیب دیتی ہے، آپس میں خونریزی، ظلم وستم اور لڑائی وجھگڑے سے روکتی ہے، اور ایسی چیزوں سے بھی روکتی ہے جو چیزیں معاشرہ میں فتنہ وفساد اور جدل وجدال کے ذرائع ہوں۔

سود بھی ایسی چیز ہے جس سے فتنہ وفساد، لڑائی وجھگڑا اور اختلاف پیدا ہوتا رہتا ہے، اس لئے شریعت اسلامیہ میں اس سے بڑی تاکید کے ساتھ منع کیا گیا، نیز شبہ سود سے بھی بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ربا وسود کی تعریف: "فضل مال لا يقابله عوض في معاوضة مال بمال" (ہندیہ ۳/ ۱۱۷)۔

مالی لین دین کے معاملہ میں ایسا مالی اضافہ جس کا دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو ربا کہلاتا ہے۔

ربا کی حرمت قرآن سے ثابت ہے، ارشاد باری ہے: "الذين يأكلون الربا لا يقومون إلا كما يقوم الذي يتخبطه الشيطان من المس ذلك بأنهم قالوا إنما البيع مثل الربوا وأحل الله البيع وحرم الربوا" (بقرہ: ۲۷۵)۔

(جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قبروں سے اس طرح کھڑے ہوں گے، جیسے شیطان نے کسی کو چھو کر بدحواس کر دیا ہو، یہ اس لئے ہوگا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ خرید وفروخت سود کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے خرید وفروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے: "يأيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربوا إن كنتم مؤمنين. فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله وإن تبتم فلكم رؤوس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون" (بقرة: ۲۷۸-۲۷۹)۔

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، پھر اگر ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ)۔

تیسری جگہ ارشاد الٰہی ہے: "يأيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربو أضعافًا مضاعفة واتقوا الله لعلكم تفلحون" (آل عمران: ۱۳۰)۔

(اے ایمان والو دوگنا چوگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ فلاح پاؤ)۔

احادیث نبویہ سے بھی ربا کی حرمت ثابت ہے، ارشاد نبوی ہے:

''لعن الله آكل الربا وموكله وشاهده وكاتبه'' (ابوداؤد ۲/ ۴۷۳)۔

اللہ تعالیٰ نے سود کھانے والے، کھلانے اس کی گواہی دینے والے اور لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أربع حق على الله أن لا يدخلهم الجنة ولا يذيقهم نعيمها مدمن الخمر وأكل الربوا وأكل مال اليتيم بغير حق والعاق لوالديه'' (مستدرك حاكم حديث نمبر: ۲۲۶۰)۔

(اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ چار شخص کو جنت میں داخل نہ کریں اور جنت کی نعمت بھی نہ چکھائیں ہمیشہ شراب پینے والا، سود کھانے والا، ناحق یتیم کا مال کھانے والا اور والدین کا نافرمان)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں: ''لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء'' (مشكوة شريف ۱/ ۲۴۴)۔

(حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے پر، اس کے کھلانے والے پر، اس کے لکھنے والے پر اس کی گواہی دینے والوں پر لعنت فرمائی ہے، اور فرمایا: یہ سب برابر ہیں)۔

ایک اور روایت میں ہے:

''ليأتين على الناس زمان لا يبقى منهم أحد إلا آكل الربوا فمن لم يأكله أصابه من غبارة'' (ابوداؤد ۲/ ۴۷۲)۔

(لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی سود کھانے سے بچ نہ سکے گا، اگر سود نہیں کھائے تب بھی اس کا غبار لگ کر رہے گا)۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے: ''كل قرض جر نفعًا فهو ربوا''۔

اسلام میں سود اور شبہ سود سے بھی بچنے کا حکم ہے، چنانچہ سیدنا عمر فاروقؓ نے فرمایا:

''إن آخر ما نزلت آية الربوا، وإن رسول الله ﷺ قبض ولم يفسرها لنا فعوا الربوا والريبة'' (ابن ماجه ۲/ ۱۶۴)۔

آخر آخر میں نازل ہونے والی سود والی آیت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تفسیر نہیں فرما سکے، لہٰذا سود اور شبہ سود سے بچو۔

صحابہ کرامؓ اس باب میں بہت احتیاط کرتے تھے حتی کہ مقروض کا ہدیہ قبول کرنے اور اس کی سواری سے وقتی استفادہ کرنے سے بھی اجتناب کرتے تھے

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: ''إذا أقرض أحدكم أخاه قرضًا فأهدى إليه طبقًا فلا يقبله أو حمله على دابة فلا يركبها إلا أن يكون جرى بينه وبينه مثل ذلك'' (ابن ماجه ۲/ ۱۶۱)۔

جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو قرض دے اور مقروض اسے کوئی طشت بھیجے یا اپنی سواری پر سوار کرے تو اسے قبول نہ کرے اور سوار نہ ہو، سوائے اس کے کہ پہلے بھی ان میں ایسا لین دین رہا ہو۔

نیز سود کی حرمت پر امت کا اجماع بھی ہے (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۶۷۰)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سود حرام ہے اور یہ چاہے کم ہو یا زیادہ حکم برابر ہے جس طرح زیادہ مقدار میں سودی لین دین جائز نہیں ہے، حرام ہے، اسی طرح کم مقدار میں بھی سودی لین دین جائز نہیں ہے، بلکہ حرام ہے۔

''إن الربوا حرام مطلقًا ولا فرق بين قليله وكثيره'' (تکملۃ فتح الملہم ۱/ ۶۷-۵۶۸)۔

اور اگر سروس چارج شمار کر کے معمولی و کم مقدار سودی لین دین جائز قرار دیا جائے تو آئندہ فتنہ کا دروازہ کھل سکتا ہے، اور غیر معمولی و زیادہ سودی لین دین کا ذریعہ بن سکتا ہے، جبکہ شریعت اسلامیہ میں ''سد الذرائع'' بہت ساری چیزوں کی ممانعت موجود ہے،

''ما كان سببا لحرام فهو حرام''، نیز ''الشبهة كالحقيقة في باب الربوا''۔

مذکورہ امور اور وجوہ کی بنا پر بندہ کہتا ہے: اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو یہ سود ہے، ایسا قرض جائز نہیں ہے، بلکہ حرام ہے۔

اگر غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد کا مطالبہ ہو لیکن اس کی شرح بہت کم ہو جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے بھی ناجائز ہیں اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا شمار سود میں ہوگا، کیوں کہ اس کے اور سروس چارج کے درمیان مختلف اعتبار سے فرق ہے۔

اسی طرح اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جا سکے تو یہ بدرجہ اولی جائز نہیں ہے، بلکہ سود کے دائرہ میں آ کر حرام ہوگا۔

اگر یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے ہوں تو بھی حکم ایک ہی ہوگا، سود کے دائرہ میں آ کر حرام ہوگا۔

البتہ اگر کوئی آدمی مجبور ہو اور اس جیسے قرض کے علاوہ ضرورت کی تکمیل کے لئے کوئی صورت نہ ہو تو بدرجہ مجبوری ایسے قرض لے سکتا ہے۔

''ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر بحوالہ کتاب الفتاوی ۵/ ۲۱۱)۔

۷۔ اسلامی تعلیمات میں دلالی، وکالت اور متعاقدین کے درمیان ثالثی کرنے کی اجرت کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

''ترمذی شریف'' میں ایک حدیث ہے کہ مسلمان اپنی شرطوں پر ہیں، مگر وہ شرط جو حلال کو حرام کرے یا حرام کو حلال کرے، وہ جائز نہیں۔

مذکورہ حدیث شریف کی تشریح کے سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: پس جب بائع اور مشتری کے درمیان ایک بات طے ہوگئی اور وہ شریعت کے خلاف بھی نہیں اور اجرت طے شدہ ہے تو اس حدیث کی روح سے کمیشن ایجنٹ بننا جائز ہے۔

(تحفۃ القاری ۵/ ۳۱۷)۔

امام بخاریؒ نے ایک باب دلالی کی اجرت کے بارے میں قائم فرمایا، اس میں محمد بن سیرین، عطاء بن ابی رباح، ابراہیم نخعی اور حسن بصریؒ کی رائیں نقل فرمایا کہ ان حضرات کے نزدیک دلالی کی اجرت کی گنجائش ہے۔

''ولم ير ابن سيرين وعطاء وابراهيم والحسن بأجر السمسار بأسًا'' (تحفۃ القاری ۵/ ۳۱۷)۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: ''وأجرته حلال عندنا سواء كان من جهة البائع أو المشتري'' (فیض الباری ۳/ ۲۷۵)

ترجمہ: دلال کی اجرت ہمارے نزدیک جائز ہے خواہ بائع کی جانب سے ہو یا مشتری کی جانب سے۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: ''وسئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدا لكثرة التعامل'' (شامی ۹/ ۷۵)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: ایجنٹ کی حیثیت اصل میں وکیل اور دلال کی ہوتی ہے اور وکالت کی اجرت لی جاسکتی ہے، تو اگر وہ بیچنے والے کا کام کررہا تھا تو صرف اس سے اجرت لے سکتا ہے، خریدار سے نہیں، ہاں اگر کوئی ایجنسی اس بات کے لئے قائم ہو کر وہ تاجر اور گاہک دونوں کے لئے کام کرتی ہو، تو دونوں ہی سے اجرت لے سکتی ہے، شامی فرماتے ہیں:

''فتجب الدلالة على البائع أو المشتري أو عليهما بحسب العرف'' (شامی ۴/ ۴۲ بحوالہ کتاب الفتاوی ۵/ ۲۰۸، ۲۰۷)

مذکورہ عبارات وروایات کی بنا پر گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم- جس قسم کی بھی ہو- کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنے اور خرچ ہونے کی صورت میں جو لوگ واسطہ بنتے ہیں ان کی حیثیت وکیل، دلال اور ثالثی کرنے والی کی ہے، ان کو مطلوبہ محنتانہ دینا اور لینا جائز ہے بشرطیکہ مطلوبہ محنتانہ معلوم جیسا ہو اور اگر معلوم یا معلوم جیسا نہ ہو تو مفضی إلی النزاع کی وجہ سے ناجائز ہے۔

۶۔ شریعت اسلامیہ معاشرہ میں منکر اور برائی کو مٹانے کا حکم کرتی ہے، اور معروف وبھلائی کی اشاعت ونیک کام میں تعاون کی ترغیب دیتی ہے۔

"تعاونوا على البر والتقوى" (مائدہ: ۲)۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے ایک معاہدہ میں حصہ لیا جس کا نام حلف الفضول تھا، اس کا مقصد ظلم وستم کو روکنا تھا، نبوت کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ کی تحسین فرماتے رہے، ایک روایت میں ہے:

''عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من نفس عن مسلم كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة ومن يسر على معسر في الدنيا يسر الله عليه في الدنيا والآخرة ومن ستر على مسلم في الدنيا ستر الله عليه في الدنيا والآخرة والله في عون العبد ما كان العبد في عون أخيه'' (تحفۃ الالمعی ۵/ ۲۷۱)۔

(حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی مسلمان کی دنیا کے بے چینیوں میں سے کوئی بے چینی دور کی، تو اللہ تعالی اس سے قیامت کے دن کی بے چینیوں میں سے کوئی بڑی بے چینی دور فرمائیں گے، اور جو شخص دنیا میں کسی تنگ دست پر آسانی کرے گا، اللہ تعالی اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی فرمائیں گے (تنگ دست پر آسانی کرنا یہ ہے کہ اس کا قرضہ معاف کردے یا مہلت دے) اور جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالی دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے، اور اللہ تعالی بندے کی مدد میں ہوتے ہیں جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہوتا ہے)۔

ہر ایک کو بخوبی معلوم ہے کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اپنی رعایا کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کریں، تمام لوگوں کی ضروریات اور حاجات کی تکمیل کریں، ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کریں، ہر ایک کی راحت وسکون اور آرام کا خیال کریں، پریشان حال اور مصیبت زدہ کی اعانت کریں۔

حکومت کے خزانہ پر ہر ایک کا حق ہے، خواہ مسلم ہو یا کافر، حکومت کی چیزوں سے استفادہ کرنا ہر ایک کے لئے جائز ہے، بشرطیکہ شرعاً کوئی قباحت نہ ہو۔

ایسی صورت میں اگر بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرے، مثلاً مکان کی تعمیر، بیت الخلاء بنانے اور تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنا اور استعمال کرنا جائز ہے۔

۸۔ بندہ کی رائے کے مطابق اس سوال کا تعلق جز وعمل کو اجرت بنانے سے ہے، جز وعمل کو اجرت بنانے کے جواز اور عدم جواز کے سلسلہ میں فقہاء اسلام اور علماء امت کے اقوال مختلف ہیں، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، اور بعض اور فقہاء اس کی ممانعت کے قائل ہیں، امام احمد، اوزاعی، اور بعض اور فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں، امام مالکؒ سے دونوں طرح کے اقوال نقل کئے گئے ہیں (قاموس الفقہ ۱/ ۴۹۹)۔

جو حضرات عدم جواز کے قائل ہیں، ان حضرات کی دلیل قفیز طحان والی روایت ہے، اور ایک دلیل وہ روایت ہے جو بیہقی نے حضرت عوف بن مالکؓ سے نقل کیا ہے، کہ ہم نے سفر جہاد کیا، عمرو بن العاص ہمارے امیر تھے اور حضرت عمر اور ابو عبیدہ شریک سفر تھے، ہم سخت فاقہ کشی سے دو چار ہو گئے اور سامان زندگی کی تلاش میں لگ گئے، ہم نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے اونٹ ذبح کر رہے ہیں، ہم نے ان سے کہا کہ تم لوگ چاہو تو جانور کو ذبح کرنے اور گوشت وغیرہ کاٹنے کا کام ہم کئے دیتے ہیں اور تم گوشت میں کچھ دیدینا، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، ان لوگوں نے جو کچھ دیا، میں نے پکایا، پھر حضرت عمر کے پاس لایا، انہوں نے دریافت کیا کہ کہاں سے لائے؟ میں نے بتایا تو فرمایا: تم نے اجرت لینے میں جلدی کی ہے، اور کھانے سے انکار کیا، پھر ابو عبیدہ کے پاس آئے تو ان کو بھی اطلاع دی، انہوں نے بھی اس طرح کا جواب دیا اور کھانے سے انکار کر دیا، یہ دیکھ کر میں نے بھی چھوڑ دیا، تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اونٹ والے، اور کچھ نہ کہا۔

مذکورہ حدیث میں ہے حضرت عوف نے ذبح اور گوشت بنوائی کی اجرت خود اپنے جزو عمل کو بنایا تو اکابر صحابہ نے اس پر نکیر کی اور گوشت چھوڑ دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خاموشی اختیار فرمائی، تو معلوم ہوا کہ جزو عمل کو اجرت بنانا جائز نہیں ہے۔

جو حضرات جزو عمل کو اجرت بنانا جائز قرار دیتے ہیں، وہ حضرات مذکورہ دلائل کے جواب یہ دیتے ہیں کہ قفیز طحان والی روایت معلول اور متکلم فیہ ہے۔

ابن حجر نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، "وفی إسنادہ ضعف" (بحوالہ اسلام اور جدید معاشی مسائل)۔

علامہ ابن قدامہ مقدسی نے ابن عقیل سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی ہے۔

"وھٰذا الحدیث لا نعرفہ ولا یثبت عندنا حجتہ" (مغنی ۸/۵)۔

اور عوف بن مالک کی روایت کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مذکورہ روایت میں اجرت کی تعیین کا یہ طریقہ بالکل ہی غیر معتبر ہے، اس لئے صحابہ کرام نے اس سے اختلاف کیا۔

مجوزین حضرات درج ذیل باتوں سے استدلال کرتے ہیں، حدیث نبوی سے مزارعت کا جواز معلوم ہوتا ہے جو عامل کے جزو عمل کو اجرت بنانے کی نظیر ہے۔

فقہاء نے کھیتی ہی کی طرح پھلوں میں بھی بٹائی داری کی اجازت دی ہے جس کو فقہ کی زبان میں مساقاۃ کہا جاتا ہے، یہاں بھی جزو عمل کو اجرت بنایا جارہا ہے۔

مضاربت میں بھی جزو عمل اجرت بنتا ہے، (ملخص از اسلام اور جدید معاشی مسائل/ ۳۰-۳۲۹)۔

نیز اسلام میں حرج اور تنگی نہیں ہے، "وما جعل علیکم فی الدین من حرج" (سورہ حج: ۷۸) یہ دین یسر و سہولت کا سبق سکھاتا ہے، "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (سورہ بقرہ: ۱۸۵)۔

نیز ضرورت کی بنا پر بہت ساری ممنوع چیزیں حلال اور مباح ہو جاتی ہیں۔

"الضرورات تبیح المحظورات"، "المشقۃ تجلب التیسیر" اور "الضرر یزال"۔

عرف و رواج کی بنا پر بہت ساری چیزوں کے احکام میں تبدیلی ہو جاتی ہیں، "ما رآہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن"۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ قفیز طحان وغیرہ کی روایات میں جزو عمل کو اجرت بنانے سے منع کرنے کی وجہ اجرت مجہول ہونا اور مفضی الی النزاع ہونا ہے۔ لیکن ہمارے زمانہ میں ان جیسی صورتوں میں اس قسم کی جہالت عموماً مفضی الی النزاع نہیں ہے، اور اس سلسلہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

"والذی أراہ أن النھی عنہ لکونہ مفضیًا إلی النزاع، وکل أمر یکون النھی عنہ کذلک لا یشدد فیہ الشارع بنفسہ، بل ربما یغمض عنہ أیضا، فلا ینبغی التشدد فیہ، ویدل علیہ ما أخرجہ البخاری عن زید بن ثابت.... أن

الفساد کان بمعنی النزاع، وقد ارتفع بالتسلیم، ومقتضیاہ أن لا یکون الشیوع فی الھبۃ مفسدۃ'' (فیض الباری ۳/ ۷۲۔۳۷۱)۔

(اور میرا خیال یہ ہے کہ منھی عنہ مفضی الی النزاع کی وجہ سے ہے، اور ہر وہ امر جس میں منھی عنہ اس طرح ہو تو شارع اس میں خود تشدد اختیار نہیں کرتا ہے، بلکہ نرمی کا برتاؤ کرتا ہے، لہٰذا اس میں شدت اختیار نہیں کرنا چاہئے، اور اس پر بخاری شریف کی وہ روایت دال ہے، جو حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے... فساد نزاع کی وجہ سے تھا اور وہ حوالہ کردینے سے ختم ہوگیا، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہبہ میں شیوع مفسد ہبہ نہ ہو)۔

اور سوال نمبر (۷) کے جواب میں یہ بات آچکی ہے کہ دلالی، ثالثی اور واسطہ بننے والے کی اجرت جائز ہے۔

مذکورہ شواہد و دلائل کی وجہ سے واسطہ بننے والے لوگوں کا حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لینا یا دینے اور لینے کا معاملہ کرنا جائز ہونا چاہئے۔

۹۔ رشوت کی تعریف یہ کی جاتی ہے:

''ما یعطی لإبطال حق أو لإحقاق باطل'' (کتاب التعریفات/ ۱۲۵، قاموس الفقہ ۳/ ۴۸۱)

جو کسی کے حق کو باطل کرنے کے لئے یا کسی باطل کو حاصل کرنے کے لئے دیا جائے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے کی بھی ممانعت فرمائی ہے، اور رشوت دینے کی بھی۔

''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الراشی والمرتشی والراش'' (مجمع الزوائد)

''الراشی والمرتشی فی النار'' (مجمع الزوائد) (ترمذی شریف ۱/ ۲۴۸ معمولی ترمیم کے ساتھ)

لہٰذا رشوت لینا تو کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

لیکن اگر کسی کا مقصد اپنے آپ کو ظلم وستم اور ہلاکت وبربادی سے بچانا ہو یا انصاف حاصل کرنا اور اپنا حق وصول کرنا ہو تو ایسی صورت میں رشوت دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

''الرابع ما یدفع لدفع الخوف من المدفوع إلیہ علی نفسہ أو مالہ حلال للدافع حرام علی الآخذ'' (شامی ۸/ ۳۳)۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ جان ومال کے خطرہ کی وجہ سے کسی کو دیا جائے، تو دینے والے کے لئے حلال ہے اور لینے والے کے لئے حرام ہے۔

صاحب ''البحر الرائق'' تحریر فرماتے ہیں:

''ومنھا إذا دفع الرشوۃ خوفًا علی نفسہ أو مالہ، فھو حرام علی الآخذ غیر حرام علی الدافع'' (البحر الرائق ۶/ ۲۸۵)۔

ان میں سے ایک یہ ہے جب اپنے نفس اور مال کے خوف سے رشوت دے، تو یہ لینے والے پر حرام ہے، دینے والے پر حرام نہیں ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''الرشوۃ ما یعطی لإبطال حق أو لإحقاق باطل، أما إذا أعطی لیتوصل بہ إلی حق أو لیدفع بہ عن نفسہ ظلمًا، فلا بأس بہ'' (اعلاء السنن ۱۵/ ۶۰ بحوالہ کتاب الفتاوی ۵/ ۲۲۴)۔

رشوت وہ ہے جو حق کو باطل کرنے یا باطل کو حاصل کرنے کے لئے دیا جائے، بہرحال جو حق کو حاصل کرنے یا اپنے سے ظلم کو دور کرنے کے لئے دیا جائے تو اس میں حرج نہیں ہے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: لیکن رشوت دینا اس وقت جائز ہے، جب اس کا مقصد اپنے آپ کو ظلم سے بچانا یا صرف انصاف کا حاصل کرنا ہو (قاموس الفقہ ۳/ ۴۸۲)۔

یہ بھی واضح ہے کہ ملک کے خزانہ پر سب کا حق ہے، مسلم ہو یا کافر، حکومت کی ذمہ داری بھی ہے کہ فلاحی اسکیموں سے مسلمانوں کو فائدہ اٹھانے

کا موقع دیں۔

مذکورہ وجوہات کی بناء پر اپنے حق کے حصول اور انصاف حاصل کرنے کے لئے امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے۔

۱۰- اسلام پاک صاف اور کامل و مکمل مذہب ہے، انسانوں کو کامیابی اور کامرانی کی راہ دکھاتا ہے، ہر قسم کی گندگی و آلودگی اور ظاہری و باطنی ناپاکیوں اور برائیوں سے دور رہنے کی تعلیم دیتا ہے، جھوٹ بولنے، دھوکہ دینے، کسی پر ظلم کرنے اور کسی کا مال ناحق طریقہ سے حاصل کرنے سے مکمل طور پر اجتناب کا حکم دیتا ہے۔

لہٰذا امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے جو شرائط و معیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں اگر غلط بیانی سے کام لیا جائے یا غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھایا جائے تو بہت سی خرابیاں لازم آئیں گی۔

نمبر (۱) کسی دوسرے کا مال بغیر حق کے کھانا اور حاصل کرنا، جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (بقرہ: ۱۸۸)۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: اس ارشاد خداوندی کے الفاظ عام ہیں کہ باطل اور ناجائز طریقہ سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس میں کسی کا مال غصب کر لینا بھی داخل ہے، چوری اور ڈاکہ بھی جن میں دوسرے پر ظلم کر کے جبراً مال چھین لیا جاتا ہے، اور سود و قمار بھی، رشوت اور تمام بیوع فاسدہ اور معاملات فاسدہ بھی جو از روئے شرع جائز نہیں، اگرچہ فریقین کی رضامندی بھی متحقق ہو، جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر کوئی مال حاصل کر لینا یا ایسی کمائی جس کو شریعت اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، اگرچہ اپنی جان کی محنت ہی سے حاصل کی گئی ہو، وہ سب حرام اور باطل ہیں (معارف القرآن ۱/ ۴۶۰)۔

نمبر (۲) جھوٹ بولنا (لازم آرہا ہے) جو شریعت کی نگاہ میں سنگین جرم اور تمام فتنوں کی جڑ ہے، اسی لئے رب کائنات نے جھوٹ بولنے سے منع فرمایا "واجتنبوا قول الزور" (القرآن)، ارشاد نبوی ہے: "المسلم أخو المسلم.... ولا يكذبه" (ترمذی ۲/ ۱۴)۔

نمبر (۳) خیانت کرنا (لازم آئے گا) جبکہ اسلام اس سے زوردار انداز سے منع کرتا ہے، فرمان نبوی ہے:

"المسلم أخو المسلم لا يخونه" (ترمذی ۲/ ۱۴)۔

نمبر (۴) دھوکہ دینا (لازم آئے گا) حالانکہ یہ اسلام میں جائز نہیں ہے، "من غشا فليس منا"۔

نمبر (۵) دوسرے کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر ظلماً تصرف کرنا، یہ پاکیزہ شریعت میں جائز نہیں ہے، حدیث نبوی ہے: "ألا لا تظلموا ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه" (مشکوۃ ۱/ ۲۵۵) جان لو کسی پر ظلم نہ کرو، جان لو کسی کا مال اس کی مرضی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

صاحب "الاشباہ والنظائر" تحریر فرماتے ہیں: "لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك غيره بلا إذنه أو وكالة منه" (الاشباہ والنظائر/ ۲۷۶) کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ دوسرے کی ملکیت میں اس کی اجازت یا اس کی طرف سے وکالت کے بغیر تصرف کرے۔

مذکورہ چیزوں کی بنا پر امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے متعینہ شرائط و معیارات کے سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا یا غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

۱۱- سود لینا اور دینا دونوں ہی گناہ ہے، "الذين يأكلون الربوا لا يقومون إلا كما يقوم الذى يتخبطه الشيطان من المس ذلك بأنهم قالوا إنما البيع مثل الربو وأحل الله البيع وحرم الربو" (بقرہ: ۲۷۵)۔

ارشاد نبوی ہے: "لعن الله آكل الربو وموكله وشاهده وكاتبه" (ابوداؤد ۲/ ۴۷۳) اور قاعدہ ہے: "ما كان سببا لحرام حرام"

البتہ سرکار اور سرکاری ادارہ اور اشخاص و پرائیوٹ ادارہ کے حکم میں ایک گونہ فرق ہے، ہم اس ملک کے شہری ہیں، جس طرح حکومت دوسرے

شہریوں کو روزگار کے لئے قرض فراہم کرتی ہے، ویسے ہی مسلمانوں کے لئے بھی اس طرح کی سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے اور ہمارا بحیثیت شہری اس پر حق ہے۔

اسلام میں آسانی اور یسر و سہولت ہے۔

"یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (سورہ بقرہ: ۱۸۵) اور "وما جعل علیکم فی الدین من حرج" (سورہ حج: ۷۸)۔

حدیث میں ہے: "الدین یسر" (بخاری شریف)۔

شریعت اسلامیہ میں ضروریات کا لحاظ کیا گیا ہے، ضرورت کے وقت حرام چیز بھی حلال ہو جاتی ہے۔

"الضرورات تبیح المحظورات" (قواعد الفقہ)، "المشقة تجلب التیسیر"۔

اور اس قسم کی اسکیم سے حکومت کا مقصد سود خوری نہیں ہے بلکہ تعاون ہے، "إنما الأعمال بالنیات"، "الأمور بمقاصدہا"۔

موجودہ دور میں مسلمانوں پر ظلم وستم کیا جا رہا ہے، ان کو حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے، مختلف قسم کے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں، ان کو ہر قسم کی سہولیات سے محروم کرنے کی مذموم سازیش کی جا رہی ہیں، ایسی صورت میں اگر حکومت سے قرض لینے یا حکومت کے واسطہ سے قرض لینے کی اجازت نہ دی جائے، تو اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اگر حکومت قرض دلانے کے بعد قرض پر عائد انٹرسٹ حکومت ادا کرے تو مقروض کا براہ راست سودی لین دین سے کوئی تعلق نہیں رہتا ہے۔

نیز ہمارا ملک سیکولر ملک ہے، اسلامی ملک نہیں ہے، اس لئے مکمل اسلامی اور شرعی احکام جاری نہیں کئے جا سکتے، اور حکومت میں جو لوگ ہیں وہ عموماً غیر مسلم ہونے کی وجہ سے فروعات واحکام شرع کے مکلف نہیں ہیں۔

ایسی صورت میں اگر حکومت بعض اسکیم میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے بینک سے قرض دلائے اور قرض پر عائد انٹرسٹ مقروض کو بالکل ادا کرنا نہ پڑے، بلکہ حکومت اس کی طرف سے ادا کرے تو راقم السطور کی رائے کے مطابق ایسی اسکیم سے استفادہ جائز ہونا چاہئے۔

البتہ اگر حکومت مکمل انٹرسٹ وسود ادا نہ کرے، بلکہ بڑا حصہ ادا کرے تو بلا ضرورت شدیدہ یہ صورت جائز نہیں ہے، اور ایسی اسکیم سے استفادہ کرنا درست نہیں ہے، درج ذیل وجوہات اور دلائل کی بنیاد پر۔

ارشاد ربانی ہے: "یا أیہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربو إن کنتم مؤمنین فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ ورسولہ وإن تبتم فلکم رؤوس أموالکم لا تظلمون ولا تظلمون" (بقرہ: ۲۷۹-۲۷۸)۔

حدیث میں ہے: "لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربو وموکلہ وکاتبہ وشاہدیہ، وقال: ہم سواء" (مشکوۃ / ۲۴۴)

ایک اور روایت میں ہے:

"لیأتین علی الناس زمان لا یبقی منہم أحداً إلا آکل الربو فمن لم یأکلہ أصابہ من غبارہ" (ابوداؤد ۲/ ۴۷۲)۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے: "کل قرض جر نفعاً فہو ربوا"۔

شریعت اسلامیہ میں سود اور شبہ سود سے بھی بچنے کا حکم دیا گیا:

"إن آخر ما نزلت آیة الربو، وإن رسول اللہ ﷺ قبض ولم یفسرہا لنا فدعوا الربو والریبة" (ابن ماجہ ۲/ ۱۶۴)

جو چیز زیادہ مقدار میں حرام ہے وہ کم مقدار میں بھی حرام ہے، "ما أسکر کثیرہ فقلیلہ حرام" (نسائی)۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

"فإنہ یدل علی أن الربو حرام مطلقاً ولا فرق بین قلیلہ وکثیرہ" (تکملة فتح الملہم ۱/ ۵۶۸-۶۷۰)۔

قاعدہ بھی ہے: ''ما حرم کثیرہ حرم قلیلہ''۔

اور ایک قاعدہ ہے: ''ما کان سببا لحرام حرام''۔ نیز ''الشبهة کالحقیقة في باب الربو''۔

۱۲۔ عصر حاضر میں مسلمان بہت سارے حالات اور مشکلات سے دوچار ہیں، کبھی مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں، کبھی ان پر الزامات عائد کئے جاتے ہیں کبھی ان کو اپنے حقوق اور ہر قسم کی سہولیات سے محروم کرنے کی مذموم سازشیں کی جاتی ہیں، اور ان کو ہر میدان میں کمزور اور پیچھے رکھنے کی منصوبہ بند کوششیں کی جاتی ہیں، ان صورتوں میں سرکاری سہولیات سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دینا مزید نقصان کا باعث ہوگا۔

مذہب اسلام میں سختی اور تنگی نہیں ہے، ہر زمانہ اور ہر ماحول کے اعتبار سے ضروریات کا لحاظ کیا گیا ہے، بوقت ضرورت ممنوع چیز مباح ہوجاتی ہے، ''الضرورات تبیح المحظورات''۔

حکومت غیر مسلم ہے، وہ سود کی قباحت کا اعتقاد بھی نہیں رکھتی ہے، نہ ہی احکام وفروعات کی مخاطب۔

اسلام نے تعاون کو صرف جائز ہی قرار نہیں دیا ہے، بلکہ تعاون کی ترغیب بھی دیا، قرآن میں ہے: "تعاونوا علی البر والتقوی" (مائدہ: ۲)۔

حدیث میں ہے: "واللہ في عون العبد ما کان العبد في عون أخیه" (ترمذی)۔

اس قسم کی اسکیم سے حکومت کا مقصد تعاون ہوتا ہے، اور کسی بھی چیز کا حکم مقصد اور معنی کی بنا پر ہوتا ہے ''إنما الأعمال بالنیات'' (بخاری)۔

اور فقہی قاعدہ ہے: ''الأمور بمقاصدها''۔

جس طرح حکومت دوسرے شہریوں کا تعاون کرتی ہے، ویسے ہی مسلمانوں کا تعاون کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، مسلمانوں کا بھی بحیثیت شہری حکومت پر حق ہے۔

ظاہری اعتبار سے ایسی اسکیم سے استفادہ کرنے والا سودی لین دین میں تعاون کرتا ہے۔

نیز اگر مسلمان ایسی اسکیم سے استفادہ نہیں کریں گے تو حکومت اس سے باز نہیں آئے گی، تو مسلمانوں کے لئے محرومی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا، اور غیر مسلم کے لئے زیادہ استفادہ کا موقع ملے گا۔

جو اسکیمیں ایسی ہوں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا گیا ہے، اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہو، ایسی اسکیموں سے استفادہ کی گنجائش ہونی چاہئے مذکورہ دلائل اور شواہد کی بناء پر۔

☆☆☆

سرکاری فلاحی اور قرضہ جاتی اسکیموں سے استفادہ

مولانا محمد صابر حسین ندوی [1]

سوال نمبر ا۔ قرض کا بعض حصہ معاف کردینا:

جواب نمبر ا۔ دین اسلام ہمدردی ورواداری اور نہ صرف مسلمانوں، بلکہ پوری انسانیت کے ساتھ حسن سلوک کا مذہب ہے، خوشی وغمی، حالات کی نازکی وفراہی، غربت ومسکینیت اور مالداری، نیز بلا کسی انسانی امتیاز وطبقات کے امداد ونصرت اس کا لازمی حصہ وجز ولا ینفک ہے۔ معاشی واقتصادی اعتبار سے اپنی حد تک دولت جمع کرنے، بخل وشح کا مظاہرہ کرنے، فقرا کا خیال نہ کرنے اور ان کی حاجت روائی نہ کرنے کا سخت مخالف، بلکہ ایسوں کو ما فوق البشر گردانتا ہے (صحیح مسلم: ۲۵۷۵) اور ساتھ ہی ساتھ ان بزرگوں کو مژدہ بھی سناتا ہے جو دوسروں کی نصرت واعانت کرتے ہیں (صحیح مسلم: ۲۶۹۹)۔

حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں باہمی اعانت، قرض لینا دینا ایک ناگزیر ضرورت ہے، بالخصوص آج کی ترقی یافتہ دور میں بسا اوقات قرض ہی آخری سہارا ہوتا ہے، لیکن چونکہ اسلام معتدل ومتوسطانہ اور معتدلانہ تعلیمات کا حامی (بقرۃ: ۱۴۳) ہی نہیں، بلکہ اس کا مجموعہ ہے "خیر الامور أوسطہا" (بدائع الصنائع ۱/ ۲۳۳) لہٰذا اس نے روز اول سے ہی قرض لینے، دینے کی اجازت اور واجبی تعلیمات کا پابند بنایا جیسا کہ اسوۂ آخر الزماں کی حیات طیبہ سے معلوم ہوتا ہے۔

دراصل "قرض" کے لغوی معنی کاٹنے کے ہیں، قینچی کو اسلئے مقراض کہا جاتا ہے کہ؛ وہ کاٹنے کا ذریعہ ہے (الصحاح، القاموس المحیط، مادہ قرض)

اصطلاح میں بدل کی ادائیگی کی شرط پر نفع اٹھانے کے لیے مال دینا قرض کہلاتا ہے۔ "دفع المال ارفاقا لمن ینتفع بہ ویرد بدلہ" (درمختار وحاشیہ ابن عابدین ۴/ ۱۷۱، کفایۃ الطالب الربانی ۲/ ۱۵۰)، چونکہ قرض دینے والا اپنے مال کا کچھ حصہ علاحدہ کرکے یا دوسرے لفظوں میں کاٹ کر مقروض کو دیتا ہے اسی لئے اسے قرض کہتے ہیں، اس کی فضیلت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ: خود قرآن نے اللہ کے راستہ میں انفاق کو قرض حسن قرار دیا ہے: "من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا فیضعفہ" (بقرۃ: ۲۴۵، نیز: مائدۃ: ۱۲، حدید: ۱۱، ۱۸، تغابن: ۱۷، مزمل: ۲۰)۔

نیز متعدد روایتیں ہیں جن سے قرض کے جائز ہونے، بلکہ مستحب ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے؛ عبداللہ بن مسعود ارشاد نبوی ﷺ نقل کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دوبار قرض دینا ایک بار صدقہ کرنے کے برابر ہے (سنن بیہقی ۵/ ۳۵۳، ابن ماجہ ۲/ ۶۰)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے کسی چیز کو قرض دینا صدقہ دینے سے بہتر بتلایا "قرض الشئی خیر من صدقتہ" (سنن بیہقی ۵/ ۳۵۴) ابوالدرداء کہتے ہیں کہ یہ بات کہ میں دو دینار قرض دوں پھر وہ واپس آجائیں اور میں انکو کسی اور کو قرض دے دوں اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں انکو صدقہ دے دوں (سنن ابن ماجہ ۲/ ۱۷۵) اسی کے پیش نظر لوگوں کی تنگی اور دشواری دور کرنا اور فرمان الٰہی "ما یرید اللہ لیجعل علیکم حرج" (مائدۃ: ۶) کے تحت قرض کے جائز ہونے پر امت کا اجماع ہے (نہایۃ المحتاج مع حاشیہ ۴/ ۲۱۵، تحفۃ المحتاج مع حاشیۃ الشروانی ۵/ ۳۶)۔

قرض دینا گو مستحب ہے، کیونکہ یہ نیکی اور بھلائی میں تعاون ہے (الشرح الصغیر ۳/ ۲۹۲) لیکن قرض لینا بھی مباح ہے (المغنی ۴/ ۲۰۷، فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۶۶) خود آپ سے قرض لینا ثابت ہے (صحیح مسلم ۲/ ۳۰، سنن ترمذی ۱/ ۲۴۵)۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ جائز مقصد کے لئے قرض لیا جائے، ابن ماجہ نے سند صحیح سے نقل کیا ہے کہ: اللہ تعالیٰ قرض لینے والے کے ساتھ ہوتا ہے جب تک وہ ادا نہ کردے سوائے اس کے کہ وہ کسی ایسے مقصد کے لیے قرض حاصل کرے جو اللہ کو ناپسند ہے (سنن ابن ماجہ ۲/ ۵۶ (۲۴۳۳)) یا اس ارادے سے قرض لیتا ہے کہ واپس نہیں کرنا ہے آپؐ نے فرمایا ایسا شخص اللہ کے یہاں چور شمار کیا جائے گا (حوالہ سابق) ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص

[1] استاذ جامعہ ضیاء العلوم، کنڈلور، کرناٹک۔

دوسروں کا پیسہ ڈوبانے کے لئے قرض لے اللہ تعالی اسے ہلاک کر دینگے (حوالہ سابق) حضرت میمونہؓ راوی ہیں کہ جو شخص اس ارادے سے دین لے کہ اسے ادا کرے گا اللہ اسے ادا کر دینگے (حوالہ سابق) اسی طرح مقروض کو یہ بھی تلقین فرمائی کہ قرض دینے کے ساتھ زیادتی نہ کرے اور بہتر معاملہ رکھے ، باوجود استطاعت کے قرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور ٹال مٹول کو آپؐ نے بہت ناپسند فرمایا اور فرمایا کہ یہ چیز اس کی بے عزتی اور سزا کا جواز پیدا کر دیتی ہے "لی الواجد یحل عرضه وعقوبته" (سنن ابن ماجہ ۲/ ۶۰، ۲۴۵۲) یہاں تک کہ آپؐ نے متوفی کے مال میں سے پہلے اس کا دین ادا کرنے کا حکم دیا (حوالہ سابق) اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم میں بہترین شخص وہ ہے جو دین کی ادائیگی میں بہتر ہو (حوالہ سابق) ایک حدیث میں وارد ہے کہ مومن کی روح اس کے دین کے ساتھ معلق رہتی ہے ، تا آنکہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے (حوالہ سابق) ، مقروض کے ساتھ ساتھ قرض دہندہ ، یعنی دینے والے کو بھی آپؐ نے یہ ہدایت فرمائی کہ قرض کی ادائیگی کا مطالبہ مناسب طریقہ پر کرنا چاہئے (ابن ماجہ ۲/ ۵۶، ۲۴۳۲) اسی طرح اگر مقروض تنگدستی میں مبتلا ہو تو اس کو مزید مہلت دینی چاہئے اور ممکن ہو تو کچھ معاف بھی کر دینا چاہئے آپؐ نے فرمایا : جو اللہ کے سایہ میں رہنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ تنگدست شخص کو مہلت دے یا اسکا کچھ حصہ معاف کر دے (ابن ماجہ ۳/ ۶۰، ۲۴۴۴) ۔

مذکورہ تصریحات وتوضیحات کی روشنی میں بالخصوص آخر الذکر ابن ماجہ کی روایت کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ : وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہو ؛ لینا اور اس سے استفادہ کرنا جائز ہے ، بلکہ یہ شرعی اعتبار سے بھائی چارگی وانسان دوستی کے زمرے میں آئے گا خواہ یہ کام سرکاری سطح پر ہی کیوں نہ کیا جائے ۔

سوال نمبر ۲ ۔ مدت کے اندر زائد رقم ادا کرنے کا حکم :

جواب نمبر ۲ ۔ اسلام کسی قسم کے تفرقہ وانتشار کو نہ تو پسند کرتا ہے اور نہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے ، بلکہ آپسی معاملات میں ہر قسم کی نزاعتوں کی بیخ کنی کے ساتھ اس تک جانے والی ہر شاہراہ کا سد باب کرتا ہے ، چنانچہ فقہاء اسلام کا مسلم اصول ہے کہ ہر مفضی الی النزاع شئی معاملات میں قابل قبول نہیں (فتاوی ہندیہ ۳/ ۳) بلکہ "تابع تبع" (الاشباہ للسیوطی/ ۱۵۳) کے تحت حرام قرار پائی ہے ، ایسے میں اگر کوئی معاملہ اس صورت کا ہو کہ : مقررہ وقت پر (قرض ودین وغیرہ) ادائیگی سے قبل کی صورت میں نصف یا کم اور وقت پر ادائیگی کی صورت میں پورا پورا ادا کرنا پڑے ایسے میں معاملہ مجہول کہلائے گا اور یہی وہ صورت ہے جسے قرآن نے "قمار (جوا)" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے حرام قرار دیا ہے (مائدہ : ۹۰) ۔

چنانچہ قمار ایسے مقابلہ کو کہتے ہیں جس میں دونوں فریق کی جانب سے بازی لگائی جاتی ہو کہ ہارنے والا جیتنے والے کو حسب معاہدہ مقررہ چیز ادا کریگا

"هو أن يأخذ من صاحبه شيئا فشيئا في لعب، القمار فلعب زماننا : كل لعب يشترط فيه غالبا من المتغالبين شئي من المغلوب" (التعريفات/ ۱۸۱)

اسی طرح علامہ شامی لکھتے ہیں قمار (قمر) چاند سے مشتق ہے جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے ، چونکہ قمار کے حصہ بھی گھٹتے بڑھتے ہیں اس لیے اسکو قمار کہا جاتا ہے

"القمار : من القمر يزداد تارة وينقص أخرى وسمي القمار قمار، لأن كل واحد من المقامير يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجوز أن يستفيد مال صاحبه" (رد المحتار ۹/ ۵۷۸)

اس کی حرمت نہ صرف قرآن سے ہے (مائدہ : ۹۰) بلکہ احادیث میں بھی بڑی مذمت آئی ہے ، حضورؐ نے فرمایا :

من قال لصاحبه : تعال أقامرك فليتصدق (صحيح بخاری ۲/ ۸۶۰، ۲۰۱۷، ۲۳۰۱، ۶۶۵)

یعنی جو اپنے ساتھی سے کہے کہ آؤ ! تمہارے ساتھ جوا کھیلوں تو اسے صدقہ کرنا چاہئے ، عبد اللہ بن عمر حضورؐ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ :

نهى (النبي) عن الخمر والميسر (مسند احمد ۲/ ۲۱۲، ۲۴۷۵) یعنی آپؐ نے جوا اور شراب سے منع فرمایا ۔

انھی آیات واحادیث کی بنا پر صحابہ کرام اور فقہاء محدثین اس پر متفق ہیں کہ قمار (جوا) کی تمام صورتیں حرام ہیں

"لا خلاف بين أهل العلم في تحريم القمار، وإن المخاطرة من القمار"

یعنی جوئے کے حرام ہونے اور مخاطرہ کے جوئے ہونے کے درمیان اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں ہے (احکام القرآن ۱/۶، ۳۹۹)

علامہ ابوالحیان اندلسی اور علامہ قرطبی لکھتے ہیں: الإجماع منعقد علی تحریمہ (تفسیر المحیط ۲/ ۱۵۷)

''إجماع العلماء أن القمار کلہ حرام'' قمار کے حرام ہونے پر امت کا اجماع ہو چکا ہے (احکام القرآن للقرطبی ۲/ ۳/ ۳۵)۔

حقیقت یہ ہے کہ قمار ایک مفضی الی النزاع اور غرر کا معاملہ ہے جو کہ حرام ہے لیکن فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہیکہ غرر یعنی ''ما یکون مجھولۃ العاقبۃ لا یدری أیکون أم لا'' کہ جس میں وجود اور عدم وجود کا پہلو مشکوک ہو (تبیین الحقائق ۱۰/ ۴۳۶)

مگر اس میں اس بات کا بھی اعتبار کیا گیا ہیکہ اگر غرر قلیل ہو نہ کہ کثیر تو وہ معاملات کہ درستگی میں رکاوٹ نہیں (زاد المعاد ۵/ ۲۱۔ ۸۰۲)

لیکن غرر کثیر اور قلیل کے مابین فرق کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔

''فأما إن کان أحدھما مجھولا جھالۃ مفضیۃ المنازعۃ فسد البیع، وإن کان مجھولا جھالۃ لا تفضی إلی المنازعۃ لا یفسد... الخ'' (بدائع الصنائع ۶/ ۵، ۳۶۶)

یعنی (حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی زبانی) ''۔ جو غرر نزاع کا باعث بن سکتا ہو یا دوسرے فریق کے لیے ناقابل تحمل ہو اسکو غرر کثیر شمار کیا جائے گا اور جو غرر عام طور پر باعث نزاع نہ ہو؛ سمجھنا چاہئے کہ وہ غرر قلیل ہے جو صحت عقد کے لیے مانع نہیں ہے'' (جدید فقہی مسائل ۴/ ۲۱۱)

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب ''غرر یسیر'' کے متعلق لکھتے ہیں: ''جس قدر غرر مفضی الی النزاع نہ ہو اور عام حالات میں اس سے بچنا دشوار ہو تو ایسا غرر صحت عقد کے لیے مانع نہیں'' (تکملۃ فتح القدیر ۱/ ۳۳۰)، غالباً انھی تفصیلات وتشریحات کی بنا پر اور فقہی تناظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے دوسرے سیمینار منعقدہ ۶ تا ۱۱/ ۱۹۸۹ء بموضوع 'بینک انٹرسٹ کا مسئلہ ہندوستان کی شرعی حیثیت سے'، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اس سلسلہ میں ایک مفصل تحریر لکھنے کے بعد منظور شدہ تجاویز کے تحت یہ نقل کیا ہے کہ ''ہندوستان میں سرکاری قرضے ایسے ہیں جن میں سرکار کی طرف سے چھوٹ subsidy دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم چھوٹ subsidy کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں'' (جدید فقہی مسائل ۴/ ۹۲)۔

بالخصوص ہمارے ملک ہندوستان اور مسلمون کی اقلیتی حیثیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صورت سے استفادہ کی گنجائش ہو، کیونکہ یہ معاملہ بھی غرر یسیر میں شمار ہوگا، اس لئے کہ یہ فریقین کو معلوم ہے کہ ان پر ادائیگی کی رقم اور حصول کی رقم کیا ہوگی جو مفضی الی النزاع نہیں، نیز اصل رقم سے زائد بھی نہیں کہ سود کا حکم لگایا جاسکے۔

سوال نمبر ۳۔ مقررہ مدت کے بعد زائد رقم ادا کرنا:

جواب نمبر ۳۔ تاریخ انسانی گواہ ہیکہ انسانیت چھٹی صدی عیسویں میں گمراہی وضلالت، قرض وٹیکس اور سود کی بڑھتی شرح سے پراگندگی کا شکار تھی، گردنیں جھکی ہوئیں اور طوق وسلاسل سے دبی ہوئی تھی، سانسیں آقاؤں کی محتاج اور عزتیں سرداروں کی جاگیر ہوگئی تھیں، ایسے میں بعثت نبوی نے انسانیت پر جام حیات کی بوچھار کی، اور اپنی شفقتوں اور محبتوں کے سائے میں ڈھانپ لیا، زنجیروں اور بیڑیوں سے نجات ملی، جاگیروں کی جاگیری کو کچلا گیا اور انسان سوز وانسانیت سوز مروجہ سودی معمار کو مسمار کیا گیا، قرآن نے صاف اعلان کیا "أحل اللہ البیع وحرم الربا" (بقرۃ: ۲۵۷)۔

چونکہ جاہلیت کھار کھائے بیٹھی تھی، لہٰذا آپ کی وفات، مسلمانوں کی آپسی غلط پالیسیاں، تفرقہ وانتشار نے پھر سے اسے موقع دیا، اور اس نے ایڑیوں کے بل قلع اسلام پر حملہ کیا اور اسمیں رخنہ ڈالنے وتاراج کرنے کی کوشش کی، دولتمندوں، سرمایہ داروں اور جاگیروں نے پھر سے اپنی دکان آب وتاب کے ساتھ شروع کی، حرص وطمع کا شکار کیا اور امداد ونصرت کے نام پر تو کہیں رفاہی کاموں کے نام پر سودی نظام کا جال پورے عالم میں پھیلا دیا، آج حال یہ ہیکہ ہر بندہ خواہی نہ خواہی اس غلاظت سے متاثر ہے، ایسے میں ایمان کی بقا، حرمت سے حفاظت ایک چیلنج بن گیا اور یہ سوال اٹھا کہ قرضوں میں زائد رقم کی واپسی کا کیا حکم ہوگا؟۔

حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر میں نظامہائے حکومت کے متنوع ہونے اور مسلموں کی اقلیت ہونے کی وجہ سے بہت سے احکام میں سہولت پیدا ہوگئی

ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم کی تصریح سے پتہ چلتا ہے کہ "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ مع الغمز ۱/ ۱۴)

مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ "حاجت" سے کیا مراد ہے، اصولیین کی اصطلاح میں حاجت اسی چیز کو کہتے ہیں جس پر شریعت کے مقاصد خمسہ (حفظ دین، حفظ نفس، حفظ نسل، حفظ عقل، حفظ مال) میں سے کسی مقصد کا وجود موقوف تو نہ ہو لیکن اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو مشقت اور حرج پیدا ہو جائے۔

"وأما الحاجيات معناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسع ورفع الضيق المودي في الغالب إلى الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب" (الموافقات للشاطبي ۳/ ۵)

یہ حاجات بعض اوقات "ضرورت" کے حق میں تسلیم کی جاتی ہیں۔ علامہ سیوطی کا بیان ہے

"الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أوخاصة" (الاشباه للسيوطي / ۱۸۰)

اور جیسے ضرورت کی بنا پر ناجائز بقدر ضرورت جائز ہوتا ہے۔

"وما أبيح للضرورة يقدر بقدرها" (ابن عابدين ۵/ ۲۲۷، روضة الطالبين ۹/ ۱۰۴، المغني ۹/ ۱۴۵)

اسی طرح حاجت کی بنا پر فقہاء احکام میں آسانی پیدا کرتے ہیں، قاعدہ مشہور ہے: "المشقة تجلب التيسير" (موسوعۃ الفقہ الاسلامی قاعدہ نمبر: ۴)

اسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ افراد و اشخاص کے لئے بھی حاجت اور مشقت کا کوئی ایسا بے لچک پیمانہ نہیں رکھا جا سکتا جو سب کے لئے مساوی ہو، بلکہ لوگوں کے حالات، عادات اور مختلف علاقوں کے عرف اور رواجات و ضروریات کو سامنے رکھ کر ہی حاجت اور مشقت کا تعین کرنا ہوگا، فقہاء کے یہاں اس کی نظیر موجود ہے مثلاً: حجاج کے لیے زاد و راحلہ کا مسئلہ ہے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے:

"يعتبر في حق كل إنسان ما يصح معه بدنه" (فتح القدير، كتاب الحج)

اسی طرح کی بات نفقہ وغیرہ کے متعلق فقہاء نے لکھی ہے، پس اس سے اصولی طور پر یہ بات منقح ہوتی ہے:۔

الف: عام حالات میں محض معیار زندگی کی بلندی اور خوب سے خوب تر کی تلاش کے پیش نظر سودی قرض لینا جائز نہیں۔

ب: ضرورت؛ یعنی ایسے حالات جن میں کھانے، کپڑے، علاج وغیرہ کی بنیادی ضروریات کی فراہی کے لیے سودی قرض کے سوا چارہ نہ رہے اور فاقہ مستی کی نوبت ہو تو سودی قرض لینا جائز ہے۔

ج۔ حاجت کے تحت بھی یعنی جب سودی قرض نہ لینے کی شکل میں شدید مشقت یا ضرر کا اندیشہ ہو تو بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی جیسے غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کے لیے اس پر مجبور ہو یا انکم ٹیکس وغیرہ کے ناواجبی قانون سے بچنے کے لیے ایک قانونی ضرورت بن گئی ہو۔

د۔ مشقتوں کے معاملہ میں ایسی صورتوں میں جو اجتماعی بن گئی ہو؛ نسبتاً زیادہ تخفیف برتی جاسکتی ہے۔

ہ۔ افراد و اشخاص کے لیے سودی قرض کب حاجت بن جاتا ہے اور کب نہیں؟ اس کا اندازہ ان کے شخصی حالات اور ان کے علاقے اور خاندان کے معیار زندگی سے کیا جائے گا (جدید فقہی مسائل ۴/ ۸۷۔ ۸۸)۔

مذکورہ تمام تنقیحات و توضیحات کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرض کی ادائیگی میں کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم "كل قرض جر نفعا فهو الربا" کے تحت سود ہے۔ کیونکہ زائد رقم بلاعوض ہے، البتہ اگر کوئی حاجت و ضرورت کے زمرے میں شامل ہو؛ تو ہی ایسے سودی قرضوں سے استفادے کی گنجائش ہوگی، بدیگر صورت عام حالات یا مرفہ الحالی میں استفادہ مناسب نہیں۔

سوال نمبر ۴۔ کم شرح سود کو سروس چارج قرار دینا:

جواب نمبر ۴۔ عصر حاضر میں جن شعبوں نے ترقی کے جھنڈے گاڑے ان میں بینک کا نظام سر فہرست ہے۔ اس کے بہت سارے ناگزیر فوائد سے قطع نظر اسلامی روح و تعلیمات سے بیگانگی کی وجہ سے بہیترے مفاسد بھی پائے جاتے ہیں بالخصوص تجارت اور اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے سُودی کے دو

کنارے نظر آتے ہیں، لیکن چونکہ فقہاء کا قاعدہ کلیہ ہے کہ "إذا ضاق الأمر اتسع" یعنی جب کسی معاملہ کی ناگزیری کے باوجود سخت دشواری پیش آجائے تو قدر ضرورت تخفیف کردی جاتی ہے (الاشباہ لابن نجیم/ ۱۸۴، السیوطی/ ۸۳، الوجیز/ ۱۷۱)۔

اس تخفیف میں اس وقت اور آسانی ہوسکتی ہے، جبکہ معاملہ کی صورت وکیفیت کا کوئی دوسرا ناحیہ بھی پیدا ہوجائے، مثلاً: قرض لینا ناگزیر ہو، لیکن بطور سروس چارج ادائیگی کی رقم میں مطلوب ہو؟ معاملہ گو بظاہر "کل قرض جر نفعا فھو الربا" کے تحت سودی نظر آتا ہو، مگر ایک پہلو اس کا یہ بھی ہے کہ مطلوبہ رقم دفتری اخراجات کے لیے ہو؛ کیوں کہ فریق آخر (بینک) کا نظام اس کا سسٹم اور عملہ کی مزدوری وتنخواہ وغیرہ کی ذمہ داری جو کہ بینک پر لازم ہے ایسے میں وہ قرض بھی دے اور اخراجات کو اپنے سر مول لے یہ مناسب نہیں، کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر ہے کہ

"لا ضرر ولا ضرار" (الاشباہ للسیوطی/ ۷۵، ۷۶) "الضرر یزال" (الاشباہ لابن نجیم/ ۸۳) "الضرر یدفع بقدر الإمکان" (الوجیز/ ۱۹۸)

یعنی اسلامی قانون میں سے ہے کہ نہ تو نقصان برداشت کرنے اور نہ ہی نقصان میں مبتلا کرنے کی اجازت ہے اور اگر ایسا ہو بھی تو حتی المقدور اسے دفع کرنے کی کوشش کی جائے گی، یہی وجہ ہے کہ علامہ مودودیؒ اپنی معرکۃ الآراء کتاب "معاشیات اسلام" میں بینکوں کے لئے سروس چارج کی اجازت دی ہے، وہ لکھتے ہیں "۔۔ تو اس میں (حساب کتاب ودفتر داری) کوئی مضائقہ نہیں کہ بینک اپنی اس طرح کی خدمات کے لئے ایک ماہوار یا ششماہی فیس اپنے تمام تجارت پیشہ کھاتہ داری پر عائد کردے جو اس مد کے مصارف پورے کرنے کے لئے کافی ہوں۔۔" (معاشیات اسلام/ ۲۸۶، سود مولانا مودودی)۔

اس صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتی وسرکاری اسکیموں کے تحت قرض کی ادائیگی پر سروس چارج کو جسے سروس چارج کہا جاسکتا ہو؛ انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے وسعت کی گنجائش ہو اور یہ سود کے دائرے میں نہ آئے۔

سوال نمبر ۵۔ اگر سرکار کی طرف سے دئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لیے بھی ہوتے ہیں، تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

جواب نمبر ۵۔ حدیث اور اصول فقہ کے تناظر میں "الغنم بالغرم" (نہایۃ المحتاج ۵/ ۱۲۴، کشاف القناع ۴/ ۴۷) کا قاعدہ مسلم ہے، یعنی یہ کہ نقصان کے بقدر ہی تاوان لازم آئے گا، یہی وجہ ہے کہ بینکوں کے دفتری اخراجات کو سود نہ شمار کرتے ہوئے سروس چارج کے طور پر جائز سمجھا گیا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خواہ رقم بیس ہزار کی ہو یا بیس لاکھ کی اندراج میں تقریباً یکساں وقت ومحنت درکار ہوتے ہیں، اب ایسے میں اگر قرض پر لی جانے والی رقم اوسط یا معمولی نہ ہو کر غیر معمولی ہوں تو وہ اخراجات میں کیسے شمار ہونگے؟ بلکہ اس صورت میں سروس چارج کے نام پر استہزاء شریعت کا گمان ہوتا ہے! بالخصوص، جبکہ یہ قرضے مرفہ الحالی اور بزنیس کی وسعت کے نام پر لئے جائیں؛ شریعت حرام ذرائع سے مفرفہ الحالی کی قطعاً اجازت نہیں دیتی، کیونکہ جنت ہر ایسے جسم کے لیے حرام ہے جو حرام کے ذریعہ پرورش پائے (مسند بزار/ ۷/ ۱۰۳، مجمع الزوائد ۴/ ۱۱۹، طبرانی اوسط ۲/ ۲۹۶، ۲۰۲۶)۔

البتہ یہ کہ قرضے بنیادی ضرورت کی تکمیل اور ذرائع معاش جیسے:۔ جانوروں کو پالنے، مکان وکاشتکاری یا باغبانی اور دیگر بنیادی کاروبار کے لیے لئے جائیں؛ معاملہ کی اس صورت کو اپنے حق کے حصول کی خاطر رشوت دینے کے جواز پر محمول کرتے ہوئے اور لوگوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے فرق کیا جاسکتا ہے؛ جیسا کہ استاذ گرامی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی رقم طراز ہیں "ہاں یہ ضرور ہے کہ اسکو (بنیادی ضروریات) رشوت والے مسئلہ پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ رشوت والا بھی اپنے ایک حق جائز کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دیتا ہے اور سودی قرض لینے والا بھی سرکاری خزانوں پر اپنے حق فرض کی وصولی کے لیے سود دینے پر مجبور ہے، تاہم چونکہ ان دونوں حقوق میں بہت تفاوت ہے (ترقیاتی قرضے اور بنیادی ضروریات کے قرضے) اس لئے حکومت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ مرفہ الحال کو کوئی مزید خوشحالی کے لئے قرض دیتی چلی جائے، اس لئے اس (ترقیاتی) قرض کو ایسی صورت کے ساتھ مشروط رکھا جانا چاہئے کہ کاروبار کا بقا اور تحفظ اس کے بغیر دشوار ہو" (جدید فقہی مسائل ۲/ ۸۹)۔

چنانچہ صورت مسئلہ میں ظاہر ہے کہ انتظامی خرچ پر لی جانے والی رقم معمول سے زائد ہے ایسے میں اسے انتظامی خرچ پر محمول کرنا درست نہ ہوگا، اب اگر یہ قرضے مرفہ الحالی، یا کاروبار کی توسیع کے لئے نہ ہوں، بلکہ بنیادی ضرورتوں جیسے: بچیوں کی شادی، مکان کی تعمیر، یا دیگر روزی روٹی کے ذرائع حاصل کر

نے کے لیے لئے جائیں تو اجازت دی جاسکتی ہے، نیز بہتر یہ ہے کہ مبتلی بہ کسی معتمد بہ مفتی کے فتوے (صلاح ومشورہ) کے بعد ہی بینکوں سے اس طرح کے قرضے لیں، تاکہ ترقیاتی اور ضروریاتی قرضوں کی تفریق ہوسکے، کیونکہ ضروریات وحاجات کا کوئی متعین پیمانہ نہیں۔

سوال نمبر ۶۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً: مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب نمبر ۶۔ انسانی ضروریات بروئے کار لانے اور تکالیف ومشقت سے حفاظت کے طور پر قرض لینا دینا ایک مستحسن عمل ہے، لیکن حدیث کے ایک قاعدہ کلیہ کے اعتبار سے دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے زیادہ بہتر تصور کیا گیا ہے "الید العلیا خیر من الید السفلی" (صحیح بخاری/ ۷ ۱۴۲۷، مسلم/ ۱۰۳۳) یعنی یہ کہ امت مسلمہ ہر ممکن کوشش کرے کہ وہ ید العلیا (دینے والا) کی تصویر پیش کرے اور ید السفلی (لینے والے) وگداگری سے ہر ممکن پرہیز کرے۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ قرض کی فراہمی کرانا اور عوام الناس کی حاجت روائی کی فکر کرنا بھی من عزالامور ہے، جسے بسا اوقات ذاتی ایجنسیاں اور انتظامی کمیٹیاں طے کرتی ہیں تو کبھی حکومتی سطح پر بھی یہ کام انجام دیا جاتا ہے؛ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے دی جانے والی رقم قرض نہیں، بلکہ بطور اعانت ہوتی ہے تاکہ عام شہری اپنی ضروریات پوری کرسکے۔

فقہی نقطہ نظر سے اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی رقوم کا (جبکہ اس کے حقدار ہوں) حاصل کرنے اور استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، چونکہ حکومتی سطح پر کئے جانے کام میں ہر عام شہری کا کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی حصہ ضرور ہوتا ہے جو سامان وتجارت اور دوسرے طرق سے ازراہ ٹیکس پہونچتا ہے، ایسے میں ان حکومتی اسکیموں سے مستحق کو مستفید ہونے کا پورا پورا حق ہوگا، اسی طرح حکومتی سطح پر جمع شدہ مال کی حیثیت "بیت المال" کی ہوتی ہے اور فقہاء نے نقل کیا ہے کہ "امام کو بیت المال سے قرض دینے کا حق ہے" (تبیین الحقائق ۳/ ۲۰۷) اور حضور اکرمؐ نے ایسے صاحب ثروت اور قرض دہندہ کی تعریف وتحسین فرمائی ہے جو مقروض کے قرض میں واپسی کے وقت رقم میں تخفیف کردے (سنن ابن ماجہ ۲/ ۵۶، نمبر ۲۴۳۴) ایسے میں گنجائش ہوگی کہ امدادی واعانتی رقوم سے استفادہ کیا جائے اور تعلیمی وتعمیری کاموں کے ذریعہ پیش رفتگی اختیار کی جائے، تاکہ نہ صرف اعلی بلکہ ادنی، حاکم ومحکوم ہر ایک عمدہ معیار زندگی پائے اور ملک گیر ترقی کا حصہ دار ہو۔

سوال نمبر ۷۔ گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم (جس قسم کی بھی ہوں) ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب نمبر ۷۔ شرعی نقطہ نظر سے کسی بھی خیر کے کام میں تعاون مطلوب وممدوح ہے، قرآن اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں گویا ہے "تعاونوا علی البر والتقوی۔" (بقرۃ: ۲)، بسا اوقات عام شہریوں کو خاص شہریوں یا خود حکومت سے خواہ ان کی اسکیموں سے استفادہ ہی کیوں نہ ہو کسی بھی لئے، درمیانی اشخاص کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ وہ مطلوبہ شئی آسانی وسہولت کے ساتھ حاصل کرسکے جس کا تذکرہ حدیث کے ایک لفظ "الرائش" میں بھی موجود ہے، چنانچہ راوی نے اس کی خود وضاحت یوں کی ہے "الذی یسعی بینهما" یعنی جو فریقین کے درمیان کا کردار ادا کرے اور جو لوگ صاحب جاہ واقتدار ہوں ان کے اور ضرورتمندوں کے درمیان سفارش کے لئے دوڑ دھوپ کرے اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل اور حاجت روائی کے لئے سفارشی بن جائے (المستدرک ۴/ ۱۹۵، ۷۰۶۸) واسطہ یا سفارشی بننے کی دو صورتیں ہیں:۔

ا۔ ممدوح ثالث:۔ یہ وہ ثالث ہے جس کی تعریف قرآن وحدیث نے بھی کی ہے "من یشفع شفاعة حسنة یکن له نصیب منها" (نساء: ۸۵)

حضور اکرمؐ نے بھی فرمایا: "اشفعوا فلتؤجروا، ولیقض الله علی لسان نبیه ماشاء" (سنن ابی داؤد/ ۱۵۱۳) یعنی سفارش کرو اور عنداللہ ماجور رہو۔

۲۔ مذموم ثالث :۔ یہ وہ ثالث یا سفارشی ہے جس کی تذمیم خود قرآن کریم نے کی ہے: "من یشفع شفاعة سیئة یکن له کفل منها" (نساء: ۸۵)۔
ثالث یا بچولیا اور واسطہ بننے والوں کی اول الذکر قسم کی محنتانہ دینے یا لینے میں اس شرط کے ساتھ کہ ایک دوسرے کا ناجائز استحصال نہ ہو اور مقصود جائز حق کی حصول یابی ہو تو اجازت دی جاسکتی ہے، بدیگر صورت محنتانہ لینا دینا "ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (بقرۃ: ۲) کے تحت اجازت نہ ہو گی۔ بلکہ کسی مزدور کی مزدوری اور محنتی کا محنتانہ دینا عین شرعی ہے حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ مزدوروں کو ان کی مزدوری پسینہ سوکھنے سے پہلے دے دو۔

''اعطوا الأجیر أجره قبل أن یجف عرقه'' (ابن ماجه فی الرهون من سننه) ''من استاجر أجیرًا فلیعلمه أجره'' (رواه البیهقی)
اور اس کا لینا بھی عین جائز و درست ہے کیونکہ حضورؐ نے ایسے مزدوروں کی جانب سے خصامت (جھگڑے) کا اعلان کیا ہے جنکی مزدوری نہ دی جائے

''ثلاثة أنا أخصمهم یوم القیامة وعد منهم رجلًا استاجر اجیرًا فاستوفی منه ولمیعطه أجره'' (صحیح بخاری کتاب البیوع، الاجاره)۔

سوال نمبر ۸۔ بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب نمبر ۸۔ مزدور کو مزدوری دینا اور محنتی کا محنتانہ لینا ان دونوں میں کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ باہم راست بازی وصداقت وایمانداری کے ساتھ ایک دوسرے کا خیال رکھنا باعث اجر عظیم ہے (صحیح بخاری ۴ / ۲۶۹۰۷) لیکن جہاں تک سوال اس بات کا ہے کہ واسطہ بننے والے حاصل شدہ رقم میں سے دینے یا لینے کا معاملہ کریں تو کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں بعض جہتوں کا واضح ہونا ضروری ہے۔ اولا: قبضہ:۔ حضور اکرمؐ سے متعدد صحابہ کرام نے روایت کیا ہے کہ قبضہ سے پہلے کسی چیز کی بیع کرنا جائز نہیں عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں۔

''أن رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی أن یبیع الرجل طعاما حتی یستوفیه، قلت لابن عباس :کیف ذلك؟ ذلك دراهم بدراهم والطعام مرجاء''
رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی کھانے کی چیزیں اصول کرنے سے پہلے فروخت کردے میں نے عبداللہ بن عباس سے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ درہم کا درہم سے فروخت ہے اور کھانا تو میعاد پر دیا جائے گا (صحیح بخاری ۱ / ۲۱۹)
اسی طرح عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''من اشتری طعاما بکیل أو وزن فلا یبعه حتی یقبضه'' یعنی جو کیل یا وزن سے کھانا خریدے وہ قبضہ میں لئے بغیر اسکو فروخت نہ کرے (مسند احمد ۲ / ۱۱۱) اسی طرح ابو ہریرہؓ (مسلم ۲ / ۵) وجابر بن عبداللہ (مسلم ۲ / ۶) اور حکیم بن حزام (مسند احمد ۳ / ۴۰۲) کی روایتیں بھی قابل نظر ہیں۔ لیکن یہ کہ قبضہ سے قبل بیع کی کیا حقیقت ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔

شوافع : کہتے ہیں کوئی شیٔ جو خریدی گئی ہو خواہ وہ مال منقول ہو یا غیر منقول، خوردنی ہو یا کچھ اور، بیچنے والے کی اجازت سے تصرف کرے یا بلا اجازت، قیمت ادا کی ہو یا نہ کی ہو بہر صورت قبضہ سے پہلے اسے بیچنا جائز نہیں۔

''لا یجوز البیع المبیع قبل قبضه عقارا کان أو منقولا ،لا بإذن البائع ولا بغیر إذنه، ولا قبل أداء الثمن ولا بعده'' (شرح مهذب ۹ / ۲۹۴)

حنابلہ: کے نزدیک غیر خوردنی اشیاء میں قبضہ سے پہلے فروختگی جائز ہے اور زیادہ صحیح قول کے مطابق خوردنی شیٔ کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں۔ (المغنی ۴ / ۸۸)

مالکیہ: کے یہاں اس مسئلہ میں تفصیل ہے جیسے کہ؛ غیر خوردنی اشیاء قبضہ سے قبل بھی فروخت کی جاسکتی ہیں، جبکہ خوردنی اشیاء اگر پیمانے سے خریدنہ کی گئی ہوں؛ بلا تعیین مقدار مجموعہ (جزافا) تو قبضہ سے پہلے فروخت کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر اموال ربویہ نہ ہوں کہ اس کا ذخیرہ کیا جاسکے تو قول مشہور ہے کہ ان کو بھی قبضہ سے پہلے فروخت کیا جاسکتا ہے۔ وغیرہ، (بدایۃ المجتہد ۲ / ۱۴۴، الثمر الدانی / ۳۱۹)

حنفیہ: کے نزدیک غیر منقول اشیا جیسے: زمین ومکان وغیرہ قبضہ سے پہلے فروخت کی جاسکتی ہیں، منقول اشیا قبضہ سے پہلے فروخت نہیں کی جاسکتی۔

(البحر الرائق ۲/ ۱۱۶)۔

دراصل فقہاء کے مختلف آراء کی وجہ روایات کے پیش نظر علت کی تعیین ہے، یوں تو اہل علم نے متعدد علتیں بیان کی ہیں، لیکن حقیقتاً دو چیزوں کو عموماً علت قرار دیا گیا ہے: اولاً: غرر (دھوکہ)، دوم: ربا (سود)، چونکہ سود کے علاوہ غرر کی تعیین عرف وعادت کے اعتبار سے کی جاتی ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ کتب فتاوی میں منقول ہے اگر معاملہ میں نزاع جو عموماً غرر سے پیدا ہوتا ہے نہ پایا جائے تو اس عرف کے قبضہ کو قبضہ مانا جائے گا اور اس کی بیع درست ہوگی، فتاوی ہندیہ میں ہے "کسی چیز کا عرف ورواج بھی انسان کے لئے اسکو قابل قبول بنا دیتا ہے، اور یہ باہم تنازع کو روکنے کا باعث بن جاتی ہے، چنانچہ فقہاء نے ایسی شرط فاسد کو معاملہ خرید وفروخت کے درست ہونے میں مانع نہیں سمجھا جو سماج میں رواج کا درجہ حاصل کر لے" (فتاوی ہندیہ ۳/ ۱۳۳)

ان تصریحات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اسکیم کے ذریعہ ملنے والی رقم کا صاحب حق (مستحق) نکالنے سے پہلے ہی قابض ہو جاتا ہے کیونکہ عرف میں ایسوں کو قابض مانا جاتا ہے، بس دیر اس بات کی ہوتی ہے کہ ان صیغوں سے اپنی مطلوبہ رقم حاصل کرلے (جدید فقہی مسائل ۴/ ۲۱۱)۔

دوم: صورت مسئلہ میں قابل غور امر یہ بھی ہے کہ کیا یہ مال کے بدلے مال کی بیع نہ ہوگی جسمیں قبضہ بالفور ضروری ہے؟ چونکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملی ہوئی رقم میں سے رقم متعین کرنا بیع المثل ہے! جبکہ ایسا نہیں؛ کیونکہ اس صورت میں مالک اپنے مقبوضہ (عرفاً) مال سے ازراہ مزدوری صرف ایک جانب سے مال دے رہا ہے اسے؛ جو اس کی جانب سے ثالث یا سفارشی کا کام انجام دے رہا ہے، ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ فقہاء نے ہر شخص کو اپنی ملکیت میں؛ کمی وزیادتی کے ساتھ معاملہ کرنے کی اجازت دی ہے جبکہ مشتری بھی راضی ہو۔

"إذا كان الثمن موجلا وزاد البائع من أجل التاجيل جاز؛ لأن للأجل حصة من الثمن والى هذا ذهب الأحناف والشافعية وزيدبن علي والمويد بالله وجمهور الفقهاء لعموم الأدلة القاضية لجوازه" (فقه السنه ۳/ ۴۷)

"لاجل شبهة المبيع ألاترى أن الثمن قد يزاد لمكان الأجل" (بدائع الصنائع۵/ ۱۸۷)۔

مذکورہ مباحث کے مدنظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے اور رقم پانے والے اشخاص کے لئے اختیار ہو کہ وہ آئندہ ہونے والے محصول رقم میں سے واسطہ بننے والوں کا حصہ متعین کردے، لیکن اس صورت پر عمل کرنے سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ بیع وشراء کے چند اصول کا خیال رکھا جائے، مثلاً:

۱۔ معاملہ بالتراضی ہو۔ "يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (نساء:۲۹)۔

۲۔ عوضین معلوم اور متعین ہوں؛ ایسی جہالت نہ ہو جو باہم جھگڑے کا سبب بنے (حوالہ سابق ۵/ ۱۵۸، فتاوی ہندیہ ۳/ ۳)۔

۳۔ ثمن کی ادائیگی کے لئے مدت متعین ہو؛ مفضی الی النزاع کوئی چیز نہ ہو؛ معمولی جہالت نقصان دہ نہیں (حوالہ سابق ۳/ ۳)۔

۴۔ ثمن اموال ربویہ (نمک، گیہوں، سونا، چاندی، کھجور، جو) میں سے نہ ہو جن پر قبضہ مجلس عقد میں ہی ضروری ہوتا ہے (صحیح مسلم/ ۸۲، حدیث: ۱۵۸۴)

۵۔ بدلین مال متقوم ہو؛ یعنی ایسا مال ہو کہ اسے خرید وفروخت کیا جاسکے (فتاوی ہندیہ ۴/ ۲)۔

۶۔ اس میں غرر یا دھوکہ نہ ہو جیسے کہ کوئی ناجائز شرط لگادی (ہدایہ ۳/ ۴۰ھ)۔

سوال نمبر ۹۔ اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں۔

جواب نمبر ۹۔ رشوت کی عربی "رشا، ارشية" آتی ہے یعنی ڈول کی رسی؛ ابن سیدہ کہتے ہیں: رشا کو رسی اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ جس طرح اس کے ذریعہ کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے اسی طرح رشوت کے ذریعہ انسان اپنے مطلوب کو حاصل کرتا ہے (تاج العروس ۱۰/ ۱۵۰، لسان العرب ۵/ ۲۳)۔

اصطلاح میں رشوت "مايعطى لإبطال حق أو لإحقاق باطل" (التعريفات/ ۱۱۳)

یعنی وہ مال جو حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کرنے کے لیے دیا جائے، یہ ملکی اور معاشرتی اعتبار سے ایک ناسور مرض ہے جس کی حرمت کا اعلان شریعت اسلامیہ نے پرزور طریقے سے کی ہے، حضور اکرمؐ سے متعدد روایتیں اس ضمن میں وارد ہیں جن میں آپؐ نے رشوت لینے، دینے والوں پر اللہ کی لعنت اور ملعون قرار دیا ہے "لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الراشي والمرتشي" (سنن ترمذی ۲/ ۲۱۴، مسند احمد ۵/ ۲۷۹)، "لعنة اللّٰہ علی الراشي والمرتشي" (سنن ابن ماجہ/ ۲۳۲۳، مجمع الزوائد/ ۱۳۵۵)۔ لیکن گندی سیاست وحکمرانی، مادیت پرستی اور حرص وطمع کے عام ہونے کی وجہ سے اس سے بھی انکار نہیں کہ بسا اوقات انسان حق پر ہونے اور حق کا مستحق ہونے کے باوجود اس سے محروم کردیا جاتا ہے یا اس کے ساتھ ظلم وجور کا معاملہ کیا جاتا ہے، ایسے میں میں قاعدہ فقہیہ "إذا ضاق الأمر اتسع" (الاشباہ للسیوطی) کے تحت فقہاء نے جان ومال کی حفاظت یا ظالم وجابر بادشاہ کے پاس معاملہ درست کرنے کے لئے رشوت دینے کہ اجازت دی ہے اور اس کا گناہ لینے والے کے سر رکھا ہے۔

"إذا دفع الرشوة خوفا علی نفسه أو ماله، فهو حرام علی الآخذ غير حرام علی الدافع" (رد علی الدر ۸/ ۵، ۴۳)

"إذا دفع الرشوة ليسوی أمره عند السلطان حل له الدفع ولا يحل للآخذ أن يأخذ" (حوالہ سابق)۔

علامہ شامیؒ کی اس وضاحت سے کہا جاسکتا ہے کہ جب کوئی امدادی رقوم اور قرضوں کا محتاج ہو اور حکومت کسی اسکیم کے تحت مدد بھی کرنا چاہتی ہو، لیکن بعض عناصر اس سلسلہ میں رکاٹ بنتے ہوں، تو رشوت دے کر اپنا کام نکالا جاسکتا ہے اور ایسے میں گنہگار لینے والا ہی سمجھا جائے گا۔

"إنما الإثم علی القابض دون الدافع" (الجامع لاحکام القرآن ۳/ ۱۲۰)۔

البتہ اس میں قابل غور امر یہ ہے کہ کیا قرض لینے والا اور امدادی رقوم حاصل کرنے والا واقعی اتنا ضرورتمند ہے کہ حرام طریقے سے بھی اپنی حاجت پوری کرنے کی اجازت دی جائے؟ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر امدادی رقوم اور قرض رشوت کے ذریعہ لینی پڑے تو ایمانی تقاضہ ہے کہ حتی الامکان اس سے بچا جائے اور کوئی مناسب راہ تلاش کی جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کراہیت (دل میں ناپسندیدگی کے جذبہ) کے ساتھ اپنا حق رشوت کے ذریعہ حاصل کرلے؛ صورت مسئلہ میں ایک اہم اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس سے یہ بخوبی اندازہ ہوگا کہ کب رشوت دینے کی اجازت ہوگی، "میری نظر میں حق کو حاصل کرنے اور ظلم وضرر کو دفع کرنے کے لئے رشوت دینا اسی وقت جائز ہوگا، جبکہ انسان اپنا حق اصول کرنے یا ظلم وضرر کو دفع کرنے سے قطعی عاجز ہو، یہاں تک کہ اسے حق حاصل کرنے کے لئے حکومتی یا غیر حکومتی سطح پر کسی قسم کی تائید وحمایت حاصل نہ ہو، نہ ہی ایسا کوئی سہارا اسے مہیا ہو جو اس پر ہونے والے مظالم کے خلاف انصاف دلا سکے یا اگر کوئی سہارا بھی ہو تو اسے ڈر ہے کہ اگر اس نے اس سے تعاون چاہا تو پہلے سے زیادہ خطرہ اور مشکلات اسے لاحق ہوں گی، ایسے وقت میں رشوت دے کر کام نکالنے کی اسے اجازت ہوگی" (رشوت ایک سماجی ناسور/ ۷۳)۔

اس اقتباس کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ؛ آج معمولی معمولی کاموں کے لئے شارٹ کٹ کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے، اور اولین مرحلہ ہی میں رشوت سے بات کی جاتی ہے، یہ بھی ایک طرح سے "تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲) ہی ہے، اور فقہی نقطہ نظر کا غلط استعمال، اور ملکی نظام میں کرپشن کا ایک ذریعہ ہے، اسی لئے حتی المقدور راست بازی سے کام لینا چاہئے، واللّٰہ المستعان۔

سوال نمبر ۱۰۔ امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لیے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقے پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب نمبر ۱۰۔ شریعت مطہرہ نے ہر اچھی اور بری چیز کی نشاندہی فرمائی، ساتھ ہی وہ اصول مرتب فرمائے؛ جس کے ذریعہ خیر وشر کی تفریق اور ان میں شمولیت کا امتیاز پاسکے قرآن کہتا ہے: "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (بقرۃ: ۲) غالباً یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے فقہ الاقلیہ کے تحت وہ مسلمان جو غیر مسلم ممالک یا جمہوری یا دار العہد وامن میں اقلیتی حیثیت سے پناہ گزیں ہیں؛ پابند کیا کہ وہاں کے قوانین وضوابط کی پابندی کریں اور ملک کی ترقی وبہبودی میں حصہ دار بنیں، لیکن اس بات کا بھی اشد خیال رکھیں کہ وہ قوانین؛ اسلامی اصول وضوابط سے متصادم نہ ہوں، چنانچہ ڈاکٹر صلاح الدین سلطان لکھتے ہیں: "ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کے واجب ہونے میں تو کوئی اشکال نہیں بشرطیکہ وہاں کے باشندوں کا ہم سے تعلق مصالحانہ ہو، اسی طرح قوانین کی پابندی اور نظم ونسق کی تعمیل بھی ہر قسم کے اشکال سے پاک ہے شرط یہ ہے کہ وہ ہماری شریعت کے

خلاف نہ ہوں" (فقہ الاقلیات، تعارف، اصول/ ۳۷)۔

ایسے میں حکومتی سطح پر جاری ہونے والے اسکیم اور اس سے استفادے کے لیے جو کچھ شرائط و معیارات متعین کئے جائیں ان میں غلط بیانی سے کام لینا دو جہتوں سے درست نہ ہوگا۔

اولاً: اس لئے کہ ہمارا ملک دار العہد و امن ہے، یہاں کے مصالحانہ قوانین کی پابندی ہم پر لازم ہے، اور ملک کی ترقی میں حصہ لینا بھی ہمارا اخلاقی فریضہ ہے چنانچہ کسی قانون کی خلاف ورزی اور معیارات وشرائط کا نقض: نقض عہد مانا جائے گا جو اسلامی تعلیمات کی رو سے جائز نہیں۔

"لا إيمان لمن لا أمانة له ولا دين لمن لا عهد له" (المعجم الكبير ۱۰/ ۲۲۷، ۱۰۵۵۳)۔

دوم: اس لئے کہ حضور اکرمؐ نے بلا کسی تمیز و تفریق کے جھوٹی گواہی دینے یا جھوٹ بولنے کو گناہ کبیرہ میں سے شمار کیا ہے۔

"قال صلى الله عليه وسلم: أكبر الكبائر: الإشراك بالله وعقوق الوالدين وشهادة الزور ثلاثًا أو قول الزور" (صحیح بخاری ۱/ ۱۳۔ ۶۹۱۹، صحیح مسلم ۱/ ۹۱۔ ۱۴۳) بلکہ ایسوں کو اسلامی مزاج سے منحرف سمجھا گیا "من غش فليس مني" (صحیح مسلم ۱/ ۹۹۔ ۱۰۲، ابن ماجہ/ ۲۲۲۴، ابو داؤد/ ۳۴۵۲، طبرانی/ ۵۲۱)۔ ظاہر ہے حکومتی سطح پر بھی غلط بیانی جھوٹ اور دھوکہ ہی میں شامل ہوگا۔

نوٹ:

لیکن حالات حاضرہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ: حکومت نے امدادی رقوم یا قرض کی فراہمی کے لئے جو معیارات یا طبقات اور شرائط متعین کئے ہیں ان میں بڑی حد تک ناانصافی سے کام لیا گیا ہے نتیجتاً ضرورتمند محروم اور غیر ضرورتمند یا غیر مستحق ناجائز مستفید ہو رہے ہیں ایسے میں Rich are richest poor are poorst یعنی امیر، امیر تر اور غریب؛ غریب تر ہوتا جا رہا ہے، چنانچہ معمولی معیارات وطبقات نیز ضرورتمند لوگوں کو اپنی حاجت روائی کے لئے نہ کہ ترقیاتی طور پر غلط بیانی سے کام لینے اور فائدہ اٹھانے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

"الضرورات تبيح المحظورات" (الاشباہ للسیوطی/ ۷۷، الاشباہ للمصری/ ۹۵)

ساتھ ہی مسلمانوں کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ مرکزی حکومت سے متحدہ طور پر رجوع کریں اور یہ مطالبہ کریں کہ امدادی رقوم یا قرض کی تقسیم معیارات کی بنیاد پر نہیں، بلکہ حاجت مندوں اور ضرورت مندوں کی ضرورت کے اعتبار سے ہو؛ تاکہ ہر ایک کو اس کا حق مل سکے نیز ملک و معاشرے سے معیاراتی تصور و تفریق کا خاتمہ ہو سکے، "الناس كلهم بنى آدم وخلق الله آدم من تراب" (شعب الایمان ۷/ ۱۳۷، ۴۷۶۷)۔

سوال نمبر ۱۱۔ بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لیے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

جواب نمبر ۱۱۔ سودی قرض خواہ تجارتی ہو یا تعلیمی یا کسی اور مقصد کے لئے؛ اس کی شرح ادائیگی تھوڑی ہو یا زیادہ بہر صورت سود ہی ہے، قرآن وحدیث نے سود کی حرمت بیان کرتے ہوئے مطلق فرمایا ہے "احل الله البيع وحرم الربا" (بقرۃ: ۲۷۵)، نیز تعلیمی مقصد کا سنہرا پن یہ ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے کہ حرمت اس کے لئے حلت میں تبدیل ہو جائے گی، اگرچہ فقہاء نے رشوت پر قیاس کرتے ہوئے سود دینے کی اجازت دی ہے، مگر جب جبکہ حالت ناگزیر اور بقا اسی پر محمول ہو؛ اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام اتنی تعلیم کو کافی سمجھتا ہے کہ جس سے معرفت الٰہی حاصل ہو سکے اور آخرت و دنیا کی کچھ سمجھ ہو سکے، چنانچہ قرآن جیسی اعلیٰ وافضل کتاب۔ کلام اللہ، خلاصہ اسلام کے سیکھنے سکھانے کو اتنا کافی سمجھا گیا کہ اس سے نماز درست ہو جائے (البحر الرائق کتاب القرآن) جو دراصل قرآن ہی کے ایک حکم کا چربہ ہے "فاقرؤوا ما تيسر منه" (مزمل: ۲۰)۔

نیز اسلامک فقہ اکیڈمی ہی کی جانب سے منعقدہ دوسرا سیمینار (۱۹۸۹ء) میں یہ بات طے پائی تھی کہ "سود کی حرمت کا پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ مناسب حد تک کم ہے یا مناسب حد تک زیادہ شریعت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ شرح سود اگر

مناب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہے اور اگر نامناسب حد تک زیادہ ہے تو ناجائز؛ دلائل شرعیہ اس طرح کے کسی تفریق کی اجات نہیں دیتی" (نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے)۔

سوال نمبر ۱۲۔ بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک فنڈ قائم کر دیا ہے، جس کو بینک میں ڈپوزٹ کر دیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اس سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ اصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے تو کیا صورت درست ہوگی؟

جواب نمبر ۱۲۔ شب و روز کی ترقی یافتہ دنیا نے ہر میدان میں نئے نئے شگوفے کھلائے اور بیل بوٹے پھیلائے ہیں بالخصوص تجارتی دنیا نے رنگہا رنگ کے طور طرق اور قسمہا قسم کی منفعتی تصورات وتعبیرات ایجاد کئے ہیں، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پوری دنیا ایک تجارت گاہ اور منڈی بن چکی ہے، لیکن شومئی نصیب یہ کہ؛ ان میں وہ پہلوز یادہ رائج ومروج ہیں جو شرعی تضاد کے شکار ہیں، سود، غرر، کالی، ضرر وغیرہ اس کا خاصہ بن چکے ہیں، تجارتی کمپنیاں اور بینک سنہرے نام واشتہارات کے ساتھ تعلیمی، ترقیاتی، تعمیری اور رفاہی کاموں کی چمک میں سود کی گرم بازاری ہے؛ انھی صورتوں میں ایک صورت یہ بھی ہے کہ حکومتی پیمانے پر ایک محفوظ فنڈ قائم کر کے بینکوں میں ڈپازٹ کر دیتے ہیں اور اس سے ملنے والے سود کو اپنی ملکیت میں لے کر تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی اسکیموں سے بحیثیت مسلمان استفادہ درست نہیں، جبکہ مستفید کو صراحتا معلوم ہے کہ رقم سود کے فنڈ سے حاصل ہوئی ہے، اس لئے کہ سود مطلقا حرام ہے (بقرۃ: ۲۵۷)۔ اسی طرح فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ جس شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کی کمائی حرام کی ہے ؛ ایسوں کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں (کتاب الفتاوی ۴/ ۲۰۰)، کیونکہ کسی مسلمان کے لیے روا نہیں کہ اپنے جسم میں ایک لقمہ بھی حرام کا جانے دے ورنہ وہ جہنم کا حصہ ہوگا (مجمع الزوائد ۴/ ۱۹۹، مسند بزار/ ۷ ۱۰۳، طبرانی اوسط/ ۲۰۲۶)، نیز علماء اصول فقہ نے بھی یہ قواعد نقل کئے ہیں:

"التابع تبع" (الاشباہ للسیوطی/ ۱۵۳، الاشباہ للمصری/ ۱۲۰، ۲۲۶، المنثور فی القواعد۲/ ۱۶-۲۱۵) "الأصل بقاء ما کان علی ماکان" "الربا لا تصح إباحته فی الشرع تبعا" (الموسوعة الفقهیه، القواعد)۔

یعنی یہ کہ جو حکم اصل کا ہوگا وہی اس کے تابع کا ہوگا اگر چہ کہ وہ اپنا نام ہی کیوں نہ بدل لیں۔ سود ایک حرام مال ہے اب حکومت فنڈ کے نام سے دے یا نفع وتجارت کے نام سے تعلیمی ورفاہی ضرورتوں ہی کے لئے کیوں نہ ہو اگر اس کی بقا وتحفظ اسی پر منحصر نہ ہو تو بہر صورت حرام ہی سمجھا جائے گا۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ کوئی اپنے آپ کو ضرورت وحاجت کے دائرے میں شمار کرتا ہو تو پھر ایسوں کے لئے بدرجہا مجبوری ایسے فنڈ سے استفادے کی اجازت دی جاسکتی ہے "فمن اضطر غیر باغ فلا اثم علیه" (بقرۃ: ۱۷۳، مائدۃ: ۳، انعام: ۱۴۵، نحل: ۱۱۵)۔

نوٹ:

صوت مسئلہ میں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ کیا مالک کے بدلنے سے ملکیت کی حیثیت بدل سکتی ہے؟ کیونکہ حیات طیبہؐ کے صفحات پر ہمیں ایک واقعہ کچھ اس طرح بھی ملتا ہے: حضرت عائشہؓ کی ایک لونڈی تھی جس کا نام بریرۃؓ تھا انہیں کسی نے بکری کا گوشت یا بکری صدقہ کی آپ نے اس کا گوشت حضرت عائشہؓ کی خدمت میں پیش کیا، چونکہ اہل ہاشم پر صدقہ حرام ہے لہٰذا حضرت عائشہ نے تذبذب کا اظہار کیا اور اپنی کیفیت حضور ﷺ سے بیان کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ: عائشہ! بریرۃ کے لئے وہ صدقہ تھا اور ہمارے لئے ہدیہ ہے (صحیح بخاری/ ۱۴۹۵، هو صدقة لبریة وهدیة لنا)۔

اب محل نظر یہ ہے کہ جس طرح اہل ہاشم کے لیے حرام مال ملکیت کے بدلنے کی وجہ سے حلت یا ہدیہ میں تبدیل ہو گیا؛ کیا اسی طرح محفوظ فنڈ سے جو حکومت یا ادارہ انٹرسٹ اصول کرتا ہے اور مالک بننے کے بعد حرام مال دوسروں کے تعاون یا رفاہی کاموں کے لئے اگر دے تو کیا اسے لینے والے کے حق میں ہدیہ سمجھا جائے؟

☆☆☆

سرکاری اسکیم اور معمولی شرح سود پر فراہم کردہ قرض سے استفادہ

مولانا محمد عرفان [1]

شریعت اسلامیہ نے باطل اور ناجائز طریقوں سے ایک دوسرے کے مالوں کو کھانے کی ممانعت فرمائی ہے اور حلال و جائز طریقوں سے کھانے کی اجازت دی ہے۔

اللہ رب العزت کا پاک ارشاد ہے:

"ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" (سورۃ البقرۃ: ۱۸۸)

اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو (تو مضائقہ نہیں) (بیان القرآن)۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بالباطل کی تفسیر کی ہے:

"بالحرام في الشرع كالربوا والغصب" (تفسیر جلالین ۱/ ۷۵) (یعنی جو طریقہ شریعت میں حرام ہے جیسے ربوا، اور غصب)۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"أحل الله البيع وحرم الربوا" (سورہ بقرہ: ۲۷۵) (یعنی اللہ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے) (بیان القرآن)۔

ربوا کی دو قسمیں ہیں: ربوالفضل اور ربوالنسیئۃ۔

ربا کی پہلی قسم کی حرمت تو احادیث رسول ﷺ سے ثابت ہے جس میں فقہاء مجتہدین کا زبردست اختلاف ہے کہ کن اشیاء میں اس ربوا کا تحقق ہوگا اور کن میں نہیں۔

لیکن ربا کی دوسری قسم کی حرمت امت مسلمہ کا اجماعی مسئلہ ہے اور قرآن کریم نے جس ربا کی حرمت واضح طور پر بیان کیا ہے وہ یہی ربا ہے جس کو ربا القرآن اور ربا القرض بھی کہا جاتا ہے یعنی قرض ادھار پر بحساب میعاد نفع لینا اس کی حرمت کے سلسلہ میں پوری امت محمدیہ کا اتفاق شروع سے آج تک رہا ہے۔

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں ربا کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں:

"هو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على المستقرض" (احکام القرآن ۱/ ۴۶۹)

(یعنی وہ قرض جس کو ایک وقت مقررہ کے لئے اس شرط پر دیا جائے کہ مقروض مال قرض پر کچھ رقم زائد ادا کرے گا)۔

اور حدیث شریف میں رسول اکرم ﷺ نے ربا کی تعریف یہ فرمائی ہے:

"کل قرض جر نفعا فهو ربوا" (یعنی جو قرض نفع حاصل کرلے وہ ربا ہے)۔

یہ حدیث جامع صغیر میں ہے اور عزیزی نے اسے حسن کہا ہے (معارف القرآن ۱/ ۶۶۴)۔

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ مفتی اعظم پاکستان نے اپنی معروف تفسیر "معارف القرآن" میں تفسیر کی مختلف کتابوں کے حوالہ سے اس ربا کی

---

[1] خادم التدریس جامعہ اسلامیہ جلالیہ ہوجائی، آسام۔

وضاحت فرمائی ہے جسے قرآن کریم میں حرام قرار دیا گیا ہے، فرماتے ہیں:

''اب سنئے عرب کا مروجہ ربا کیا تھا امام تفسیر ابن جریرؒ نے حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ جو ربا جاہلیت میں جاری تھا اور قرآن نے اسے منع کیا تھا اور یہ تھا کہ کسی کو ایک میعاد معین کے لئے قرض دے کر اس پر اصل رأس المال سے زائد مقررہ زیادتی لیتے تھے اور اگر میعاد مقررہ پر وہ قرض ادا نہ کر سکتا تو مزید میعاد اس شرط پر بڑھا دیتے تھے کہ سود میں اضافہ کیا جائے، یہی مضمون حضرت قتادہ اور دوسرے ائمہ تفسیر سے نقل کیا گیا ہے (تفسیر ابن جریر ۳/۶۲)۔

اندلس کے مشہور امام تفسیر ابوحیان غرناطی کی تفسیر ''بحر محیط'' میں بھی جاہلیت کے ربا کی یہی صورت لکھی ہے کہ ادھار دے کر اس پر نفع لیتے اور جتنی مدت ادھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود اس پر بڑھا دینے کا نام ربا تھا، اسی جاہلیت عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ جیسے بیع وشراء میں نفع لینا جائز ہے اسی طرح اپنا روپیہ ادھار دے کر نفع لینا بھی جائز ہونا چاہئے۔ قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا، اور بیع وربا کے احکام کا مختلف ہونا واضح فرمایا۔

یہی مضمون تمام مستند کتب تفسیر ابن کثیر، تفسیر کبیر اور روح المعانی وغیرہ میں معتبر روایات کے ساتھ منقول ہے (معارف القرآن ۱/۶۶۴)۔

امام طحاوی نے ''شرح معانی الآثار'' میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے کلام کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ قرآن میں جو ربا مذکور ہے اس سے جلی اور واضح طور پر وہ ربا مراد ہے جو قرض ادھار پر لیا جاتا ہے اور اسی کو زمانۂ جاہلیت میں ربا کہا جاتا تھا (معارف القرآن ۱/۶۶۷)۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں رباء کی تعریف یہ بیان فرمائی ہے:

''الربا هو القرض على أن يؤدى إليه أكثر أو أفضل مما أخذ'' (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۰۶)۔

یعنی ربا وہ قرض ہے جو اس شرط پر دیا جائے کہ مستقرض اس سے زیادہ یا اس سے بہتر ہے جو اس نے لیا ہے۔

پھر شاہ صاحبؒ نے ربا کی تقسیم فرمائی ہے اور ربا الجاہلیت کی قباحت کو اس میں واضح فرمایا ہے:

''واعلم أن الربا على وجهين حقيقي ومحمول عليه''۔

''أما الحقيقي فهو في الديون وقد ذكرنا: أن فيه قلبا لموضوع المعاملات، وأن الناس كانوا منهمكين فيه في الجاهلية أشد إنهماك، وكان حديث لأجله محاربات مستطيرة، وكان قليله يدعو إلى كثيره، فوجب أن يسد بابه بالكلية. ولذلك نزل في القرآن في شأنه ما نزل'' (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۰۶)

(اور جان لیں کہ سود کی دو قسمیں ہیں: حقیقی (اصلی) ربا اور حقیقی پر محمول، یعنی اسکے ساتھ ملحق کیا ہوا ربا حقیقی، تو وہ قرضوں میں ہے۔ اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس میں معاملات کے موضوع کو الٹ دینا ہے اور یہ کہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں اس میں بری طرح منہمک تھے اور اس کی وجہ سے پھیلنے والی لڑائیاں پیدا ہوئی تھیں اور اس کا تھوڑا اس کے زیادہ کی طرف بلاتا ہے، پس ضروری ہوا کہ اس کا دروازہ بالکلیہ بند کر دیا جائے، اور اس وجہ سے قرآن میں اس کے بارے میں نازل ہوا جو نازل ہوا) (رحمۃ اللہ الواسعہ ۴/۵۴۸)۔

ربا القرض یعنی سود کی حرمت سے متعلق مذکورہ تفصیلات کے بعد اب سوالنامہ کے جوابات بالترتیب ذکر کئے جاتے ہیں:

(۱) وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور مقدار قرض سے کم واپس کرنا پڑتا ہے ایسے قرضوں کا لین دین شرعاً جائز ہوگا بشرطیکہ مقرض نے خود اپنی رضامندی سے قرض کی وہ مقدار معاف کر دی ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون" (البقرہ: ۲۸۰) (یعنی اور یہ کہ معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو خبر ہو) (بیان القرآن)۔

علامہ سیوطیؒ نے اس آیت کی یہ تفسیر فرمائی ہے: "أي تتصدقوا على المعسر بالإبراء (من كل الدين أو بعضه) (تفسیر جلالین مع ہامش ۱/۴۴) (یعنی محتاج اور تنگدست سے پورا دین یا اس کا بعض حصہ معاف کر دو (یہ تمہارے لئے بہتر ہے)۔

''فیض الباری'' میں حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''إذا قضى المديون أقل من حق الدائن ورضي به الدائن أو لم يؤد المديون شيئًا. ولكنه حلله عن الدائن فأحل له فهو جائز'' (فیض الباری ۳/ ۳۱۱کتاب الاستقراض)

(یعنی جب مقروض قرض خواہ کی رضامندی سے مقدار قرض سے کم ادا کرے یا مقروض قرض خواہ سے سارا قرض معاف کرالے اور وہ خوشی سے معاف کردے تو یہ جائز ہے)۔

لیکن اگر قرض لیتے وقت مستقرض یہ شرط لگائے کہ میں مقدار قرض سے کم واپس کروں گا اور مال قرض اموال ربویہ میں سے ہو تو جائز نہ ہوگا۔

''وإن شرط في القرض أن يوفيه أنقص مما أقرضه، وكان ذلك مما يجري فيه الربوا لم يجز'' (المغنی ۴/ ۳۵۰)

(اور اگر قرض میں مستقرض یہ شرط لگائے کہ وہ مقدار قرض سے کم ادا کرے گا اور مال قرض اموال ربویہ میں سے ہو تو یہ جائز نہ ہوگا)۔

(۲) قرضوں کی اس صورت کو فقہاء کرام نے جائز قرار دی ہے۔

صاحب ''بدائع الصنائع'' علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''ولو كان له عليه ألف فقال: أد إليّ من الألف خمس مائة غدا على أنك بريئ من الباقي. فإن أدى إليه خمس مائة غدا يبرأ من الباقي إجماعًا، وإن لم يؤد فعليه الألف عند أبي حنيفة ومحمد، وعند أبي يوسف ليس عليه إلا خمسمائة'' (بدائع الصنائع ۶/ ۵۵)

یعنی اگر کسی شخص پر کسی کا (مثلاً) ایک ہزار روپیہ قرض ہو اور مقرض مستقرض سے یوں کہے کہ اگر ایک ہزار میں سے آئندہ کل تک پانچ سو ادا کردو تو بقیہ پانچ سو سے تم بری ہو جاؤ گے، تو اگر مستقرض آئندہ کل تک پانچ سو ادا کردے تو بقیہ قرض سے بالاتفاق بری ہو جائے گا اور اگر ادا نہ کرے تو حضرات طرفین فرماتے ہیں کہ اس کے ذمہ پورا ایک ہزار قرض باقی رہے گا اور حضرت امام ابویوسف کی رائے یہ ہے کہ پانچ سو ہی مستقرض کے ذمہ میں باقی رہے گا

علامہ ابن عابدین اور صاحب ''ہدایہ'' کی رائے بھی یہی ہے اور ''فتاوی عالمگیری'' میں بھی یہ جزئیہ عبارت کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ مذکور ہے۔

''قال لغريمه (أدّ إلي خمس مائةغدا من ألف لي عليك على أنك بريئ من) النصف (الباقي فقبل) وأدى فيه (بريئ، وإن لم يؤد ذلك في الغد عاد دينه) كما كان لفوات التقييد بالشرط'' (درمختار ۸/ ۳۶۵ فصل فی دعوی الدين)

یعنی کسی شخص نے اپنے قرضدار سے کہا کہ میرے ایک ہزار قرض میں سے آئندہ کل تک پانچ سو ادا کردو تو بقیہ پانچ سو سے بری ہو جاؤ گے اور مستقرض نے ادا بھی کردیا تو وہ بری ہو جائے گا اور اگر آئندہ کل تک ادا نہ کرسکے تو مکمل دین اس پر علی حالہ باقی رہے گا شرط مذکور کے مفقود ہو جانے کی وجہ سے۔

عالمگیری میں یہ جزئیہ (۴/ ۲۳۴) پر اور ہدایہ میں (۳/ ۲۵۲) پر مذکور ہے۔

فقہاء مجتہدین کی مذکورہ آراء کے پیش نظر بندہ کے نزدیک بھی اس صورت کے جائز ہونے میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔

(۳) اگر وقت مقررہ پر قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں مقدار قرض سے زائد رقم ادا کرنی پڑے تو ایسے قرض کا حاصل کرنا اور ایسا قرض دینا سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہوگا، اور سود کی یہی صورت زمانہ جاہلیت میں رائج تھی جس کو قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ''أحل الله البيع وحرم الربوا'' (البقرہ: ۲۷۵) (اللہ تعالی نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''كل قرض جر نفعًا فهو ربوا'' (یعنی جو قرض نفع حاصل کرے وہ ربا ہے)۔

امام فخر الدین محمد بن عمر الرازی نے تفسیر کبیر میں ربا کی وضاحت کرتے ہوئے آیت کریمہ مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا ہے:

''أما ربا النسيئة فهو الأمر الذى كان مشهورًا متعارفًا فى الجاهلية، وذلك أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذوا كل شهر قدرًا معينًا ويكون رأس المال باقيًا، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال. فإن تعذر عليه الأداء زادوا فى الحق والأجل، فهذا هو الربا الذى كانوا فى الجاهلية يتعاملون به'' (تفسیر کبیر ۷/ ۲۷۵)

یعنی ربا النسیئہ ہی زمانہ جاہلیت میں مشہور و متعارف تھا، اور اس کا طریق یہ تھا کہ وہ لوگ اس شرط پر کسی کو قرض دیا کرتے تھے کہ مقدار قرض کو چھوڑ کر مستقرض مقرض کو ایک متعین مقدار زائد ادا کرے گا، پھر جب دین کی ادائیگی کا وقت آجاتا اور مستقرض کے لئے دین کی ادائیگی مشکل ہوتی تو وہ مدت کو بڑھادیتے تھے اور مقدار قرض پر ایک مقررہ زیادتی وصول کرتے تھے پس یہی وہ ربا ہے جس کا زمانہ جاہلیت میں چلن اور رواج تھا۔

علامہ ابن جعفر بن جریر الطبری نے اپنی مشہور تفسیر ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' میں حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا ہے:

''عن مجاهد قال فى الربا الذى نهى الله عنه كانوا فى الجاهلية: يكون للرجل على الرجل الدين، فيقول لك كذا وكذا، وتؤخر عنى فيؤخر عنه'' (جامع البيان فى تفسير القرآن ۳/ ٦٧)

(یعنی وہ ربا جو زمانہ جاہلیت میں جاری تھا اور اللہ تعالی نے اسے منع کیا وہ یہ تھا ایک شخص کا دوسرے پر قرض ہوتا تھا پھر مستقرض قرض خواہ سے کہتا کہ میں تمہیں مقدار قرض سے اتنا اتنا بڑھا کر دوں گا تم مجھے ادائیگی قرض کے لئے مزید مہلت دو لہٰذا قرض خواہ اس شرط پر مدت کو بڑھادیتا تھا)۔

ان ائمہ تفسیر کی عبارتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرض کی یہ صورت قطعاً حرام ہے اور اس قسم کے قرض لینے کی گنجائش نہیں ہے، سوائے حالت اضطرار کے۔

(۴) مقروض سے اصل قرض پر کسی بھی قسم کی زیادتی وصول کرنا سود کہلائے گا جس کی حرمت قطعی الثبوت ہے، خواہ وہ زیادتی قلیل ہو یا کثیر۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:

''عن عبد الله بن حنظلة غسيل الملائكة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم درهم يأكله الرجل، وهو يعلم أشد من ستة وثلاثين زنية'' (الفتح الربانى لترتيب مسند الامام احمد بن حنبل الشيبانى ۱۵/ ٦٩)

(حضرت حنظلہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر سود کا ایک درہم بھی کھاتا ہے تو وہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک ارشاد میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ سود کی ادنی سے ادنی مقدار بھی حرام ہے، لہٰذا اس سے کلی طور پر اجتناب ضروری ہے اور مقدار قرض پر جو بھی زائد رقم لی جائے اس پر سود کی تعریف صادق آتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے جو ربا کی تعریف فرمائی ہے اس میں بھی یہ وضاحت کی گئی ہے کہ مقدار کی زیادتی تو ربا ہے ہی وصف کی زیادتی بھی اگر مطلوب ہو تو یہ بھی ربا ہے۔

فرماتے ہیں: ''الربا وهو القرض على أن يؤدى إليه أكثر أو أفضل مما أخذ''۔

آگے فرماتے ہیں: ''وكان قليله يدعو إلى كثيره فوجب أن يسد بابه بالكلية ولذلك نزل فى القرآن فى شأنه ما نزل'' (حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۱۰۶) (یعنی سود کا قلیل کثیر کی طرف لے جاتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کا دروازہ مکمل طور پر بند کردیا جائے، اسی وجہ سے سود کے بارے میں قرآن میں نازل ہوا جو نازل ہوا)۔

''المغنی'' میں ابن قدامہ حنبلیؒ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ: ''كل قرض شرط فيه أن يزيده، فهو حرام بغير خلاف'' (یعنی ہر وہ قرض جس میں مقروض پر زیادتی کی شرط لگائی گئی ہو وہ بلا اختلاف حرام ہے)۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے اور ابی بن کعب، ابن عباس اور ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے ہر ایسے قرض سے منع

فرمایا ہے جس سے نفع حاصل کیا جائے (المغنی لابن قدامہ ۴ / ۳۵۴)۔

الغرض نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی، لہٰذا سود کا نام سروس چارج رکھنے سے سود سود ہی رہے گا۔

حضرت عمرؓ نے بنی تغلب پر جب جزیہ مقرر کرنا چاہا تو بنی تغلب چونکہ عرب تھے، اس لئے جزیہ مقرر کیا جانا انہوں نے اپنی شان کے خلاف سمجھا، البتہ وہ اس بات پر تیار ہو گئے کہ مسلمانوں سے جو کچھ زکوۃ کے نام پر لیتے ہو ہم سے بھی اسی نام کے ساتھ لے لو چاہے مقدار دوگنی وصول کرلو، صحابہ کرامؓ نے اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دے کر ان سے مشورہ طلب کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے ان سے زکوۃ کے نام سے ہی وصول کرو۔ لیکن صحابہؓ سے فرمایا: "هذه جزية سموها ما شئتم" (البنايه شرح الهداية ۳ / ۳۶۰) (یعنی یہ تو جزیہ ہی ہے چاہے تو اس کا نام جو چاہو رکھ دو)۔

اسی طرح جس کو سروس چارج کے نام سے وصول کیا جاتا ہے چونکہ وہ مقدار قرض پر ایک خاص مقدار کی زیادتی ہے تو اگر ربا نہ بھی ہو، لیکن شبہ ربوا تو ہے اور حضرت عمرؓ کا فرمان ہے: "فدعوا الربا والريبة" (یعنی ربا اور شبہ ربا دونوں سے بچو)۔

صاحب "بدائع الصنائع" علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

"وأما الذی یرجع إلی نفس القرض فهو أن لا یكون فیه جرّ منفعة، فإن كان لم یجز نحو ما إذا أقرضه دراهم غلة علی أن یرد علیه صحاحًا، أو أقرضه وشرط شرطا له فیه منفعة، لما روی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم "أنه نهی عن قرض جر نفعا" ولأن الزیادة المشروطة تشبه الربا، لأنها فضل لا یقابله عوض، والتحرز عن حقیقة الربا، وعن شبهة الربا واجب" (بدائع الصنائع ۶ / ۵۱۹)۔

علامہ کاسانی کی عبارت کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ قرض میں مقدار قرض پر کسی بھی قسم کی زیادتی کی شرط جائز نہیں، خواہ وہ زیادتی وصف کی ہو یا کسی بھی منفعت کی اور جس طرح ربا سے اجتناب کلی ضروری ہے، اسی طرح شبہ ربا سے بھی اجتناب کلی ضروری ہے۔

نیز اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ قرب قیامت میں ربا، زنا، اور شراب عام ہو جائیں گے آج اس کا ظہور پورے طور پر ہو رہا ہے، باطل طاقتیں حرام چیزوں کے نام اور شکلیں بدل بدل کر امت مسلمہ کو فتنے میں مبتلا کرنا چاہتی ہیں۔

اس لئے مسلمانوں کو مشتبہ کمائیوں سے کلی طور پر اجتناب کرنا چاہئے۔

"عن ابن مسعود رضی الله عنهما عن النبی صلی الله علیه وسلم قال بین یدی الساعة یظهر الربوا والزنا والخمر ۔ رواه الطبرانی" (جواہر الفقہ ۳ / ۹۴)۔

اس مقام پر عام طور پر ایک سوال پیدا کیا جاتا ہے کہ اگر ہم اسی طرح امت مسلمہ کے سامنے ہر ایک چیز کو حرام بتاتے رہیں گے اور سرکاری بہت ساری اسکیموں سے استفادہ حاصل کرنے سے منع کرتے رہیں گے تو یہ امت غربت و افلاس کا شکار ہو کر بڑی مشقت میں پڑ جائے گی، جبکہ ضابطہ فقہیہ ہے:

"الحرج مدفوع، الضرورات تبیح المحظورات"۔

تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس وقت آیت کریمہ "أحل الله البیع وحرم الربوا" (سورہ بقرہ: ۲۷۵) نازل ہوئی اور جن حالات میں قرض ادھار پر سود کے لین دین کے معاملہ کو حرام قرار دیا گیا ہے اور سودی معاملات کو ترک نہ کرنے کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان کیا گیا ہے، اس وقت صحابہ کی غربت و افلاس آج کے مسلمانوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ تھی صحابہ کرام کو غربت کی وجہ سے کئی کئی وقت فاقہ کی نوبت آتی تھی اور بہت سارے صحابہؓ قرض لے کر ہی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورتوں کا انتظام فرمایا کرتے تھے، ایسے نازک حالات میں بھی قرآن کریم صاف طور پر اعلان کرتا ہے:

"یأیها الذین آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقی من الربوا إن كنتم مؤمنین، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله" (البقرة: ۲۷۹)

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو، پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا

اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے) (بیان القرآن)۔

(۵) سودی قرضہ سے متعلق مذکورہ دلائل کی بنیاد پر یہ صورت بھی ناجائز اور حرام ہوگی، خواہ وہ سودی قرض مستقرض کی کسی بھی ضرورت کے پیش نظر دیا گیا ہو۔

البتہ اگر کوئی مسلمان واقعی اتنا مفلس اور تنگدست ہے کہ اس کے لئے اپنا اور اپنے بال بچوں کے کھانے پینے کا خرچ بھی کسی حلال طریقے سے حاصل نہیں ہو پا رہا ہے جس کی بنا پر وہ کافی پریشانی میں ہے تو ایسے شخص کے لئے سودی قرضوں کی صرف اتنی مقدار لینے کی اجازت ہوگی جس سے وہ کوئی ایسا کاروبار کرلے جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے نان ونفقہ کا وسیلہ بن جائے۔

''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر)
(یعنی محتاج کے لئے مقدار قرض پر زیادتی کی شرط کے ساتھ قرض لینا جائز ہے)۔

(۶) گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی اس امداد کو حاصل کرنا جائز ہے بشرطیکہ حکومت نے اس کے لئے جو شرائط مقرر کی ہو امداد حاصل کرنے والوں میں موجود ہو اور دھوکہ دے کر غیر مستحق نے حاصل نہ کی ہو۔

(۷) جو شخص حکومت کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کو حاصل کر کے مستحقین تک پہنچانے میں محنت کرتے ہیں اور واسطہ بنتے ہیں اور اس محنت کے اوپر محنتانہ وصول کرتے ہیں تو ان کو مطلوبہ محنتانہ دینا اور اس شخص کا لینا جائز ہوگا، اس لئے کہ ان کی حیثیت اجیر کی ہے اور اجیر کے لئے کام کرنے کے بعد اپنے کام کی اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ اس نے اجرت متعین کردی ہو، ورنہ اجرت کے مجہول ہونے کی صورت میں اجارہ فاسد ہوجائے گا اور وہ شخص اجرت مثل کا مستحق ہوگا۔

''ولا یصح حتی تکون المنافع معلومة والأجرة معلومة'' (ہدایہ ۳/ ۲۹۳)
(یعنی اجارہ صحیح نہیں ہوتا یہاں تک کہ منافع معلوم ہوں اور اجرت معلوم ہو)۔

اسی واسطہ بننے والے شخص کو دلال بھی کہتے ہیں اور دلال کی اجرت کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے بشرطیکہ اجرت متعین ہو جیسا کہ صاحب ''ہدایہ'' کی تحریر سے معلوم ہوا۔

علامہ بدرالدین عینیؒ نے اپنی کتاب ''عمدۃ القاری فی شرح البخاری'' میں فرمایا ہے کہ محمد بن سیرینؒ، عطاء بن ابی رباحؒ، ابراہیم نخعیؒ، اور حضرت حسن بصریؒ کے نزدیک دلالی کی اجرت مباح ہے۔

''لم یر محمد بن سیرین وعطاء بن أبی رباح وإبراهیم النخعی والحسن البصری بأجر السمسار بأسا'' (عمدۃ القاری ۱۲/ ۹۳)۔

علامہ شامی کی عبارت سے بھی جواز کا علم ہوتا ہے:

''قال فی التاتارخانیة: وفی الدلال والسمسار یجب أجر المثل، وفی الحاوی سئل عن ابن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان فی الأصل فاسدًا لكثرة التعامل، وكثیر من هٰذا غیر جائز، فجوزوه لحاجة الناس إلیه'' (رد المحتار ۶/ ۶۳ کتاب الاجارہ)۔

ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

''إجارة السمسار والمنادی والحمامی والصكاك وما لا یقدر فی الوقت ولا العمل تجوز لما كان به حاجة'' (رد المحتار ۶/ ۴۷)۔

فقہاء کرام کی ان عبارتوں سے صورت مسئولہ کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

(۸) واسطہ بننے والے لوگوں کی حیثیت اجیر کی ہے اور اجیر کے عمل کے ذریعہ حاصل ہونے والی چیز کے بعض حصول کو ہی اجیر کی اجرت بنانا یہ ایسا مسئلہ

ہے جس میں فقہاء ومجتہدین کی دورائیں ہیں، حنفیہ، امام شافعی، امام مالک، اور لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ اجیر کے عمل کے نتیجہ میں جو چیز حاصل ہو اسی کے بعض حصے کو اس اجیر کی اجرت بنانا جائز نہیں ہے۔

ان کا مستدل دار قطنی کی ایک حدیث ہے:

''عن أبي سعيد الخدري ﷺ قال: نهى عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان۔'' (اعلاء السنن ۱۶/ ۱۷۵)۔

(حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نر کو مادہ پر چڑھانے کی اجرت سے اور قفیز طحان سے منع کیا گیا ہے)۔

صاحب ''اعلاء السنن'' مولانا ظفر صاحب تھانویؒ اس حدیث کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

''أقول: الحديث احتج به الحنفية والشافعي ومالك والليث على عدم جواز أن تكون الأجرة بعض المعمول بعد العمل'' (اعلاء السنن ۱۶/ ۱۷۵)

(یعنی حنفیہ، امام شافعی، امام مالک اور لیث بن سعد رحمہم اللہ نے اس حدیث سے اس بات کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے کہ اجیر کی اجرت عمل کے بعد اس کے معمول کے بعض حصے کو بنایا جائے۔

صاحب ''ہدایہ'' نے بھی یہ اجارۂ فاسدہ کے باب میں اس صورت کے عدم جواز کو بیان کیا ہے۔

''قال: ومن دفع إلى حائك غزلا لينسجه بالنصف فله أجر مثله، وكذا إذا استاجر حمارا يحمل عليه طعامًا بقفيز منه فالإجارة فاسدة؛ لأنه جعل الأجر بعض ما يخرج من عمله، فيصير في معنى قفيز الطحان وقد نهى النبي صلى الله عليه وسلم عنه، وهو أن يستاجر ثورا ليطحن له حنطة بقفيز من دقيقه'' (ہدایہ ۳/ ۲۰۵)

(اگر کسی نے ایک جولاہے کو سوت دیا تا کہ وہ اس کو آدھے پر بن دے (یعنی بنائی کی اجرت بنے ہوئے کپڑے کے نصف کو قرار دیا) تو جولاہے کو اس کا اجر مثل ملے گا، اور اسی طرح اگر ایک گدھا اس واسطے اجارہ پر لیا کہ اس پر غلہ لادے جس کی اجرت اس غلہ میں سے ایک قفیز ہوگی تو اجارہ فاسد ہے کیونکہ جو چیز اس کے کام سے حاصل ہو اسی کے ایک جزء کو اس نے اجرت بنایا تو یہ قفیز الطحان کے معنی میں ہو گیا، حالانکہ آنحضرت ﷺ نے قفیز الطحان سے منع فرمایا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ایک بیل اس واسطے اجارہ پر لیا کہ چکی میں جوت کر اس کے ذریعہ سے گیہوں پیسے بعوض اس کے کہ اس سے جو آٹا حاصل ہو اس میں سے ایک قفیز دے گا (عین الھدایۃ)۔

دوسری رائے جواز کی ہے جس کو امام احمد بن حنبلؒ اور حنفیہ میں سے بعض مشائخ بلخ نے اسی طرح قاضی امام ابوعلی نسفیؒ نے اختیار کی ہے۔

علامہ بدرالدین عینیؒ ''ہدایہ'' کی شرح ''البنایہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''وقالوا في شرح ''الجامع'' وكذا إذا استاجر حمارًا ورجلًا يحمل طعامًا بقفيز منه محمولا فالإجارة فاسدة ويجب أجر المثل، وقال الفقيه أبو الليث: هذا قول المتقدمين، ولأن مشائخ بلخ يجيزون ذلك مثل نصر بن يحيى ومحمد بن مسلمة'' (۱۰/ ۲۹۶)

(یعنی شرح الجامع میں ذکر کیا ہے کہ اگر کسی نے ایک گدھا یا آدمی غلہ کی بار برداری کے لئے اجارہ پر لیا اور اس کی اجرت اسی غلہ محمولہ میں سے ایک قفیز کو مقرر کیا تو اجارہ فاسد ہے اور بوجھ اٹھانے والے کو اس کی اجر مثل دی جائے گی)۔

فقیہ ابواللیث فرماتے ہیں کہ یہ متقدمین فقہاء کا قول ہے اس لئے کہ مشائخ بلخ میں نصر بن یحییٰ اور محمد بن مسلمہ وغیرہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

اور علامہ عینیؒ آگے تحریر فرماتے ہیں:

''وفي المبسوط: حكى الحلواني عن أستاذه أبي على النسفي أنه كان يفتي بجواز دفع الثوب إلى الحائك لينسجه بالنصف؛ لأن فيه عرفًا ظاهرًا، وكذا مشائخ بلخ يفتون بجواز هذه الإجارة من الثياب للتعامل، والقياس قد

یترک بالتعامل کما فی الاستصناع"

(یعنی مبسوط میں ہے کہ امام حلوانی نے اپنے استاذ ابو علی نسفی کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ اس بات کے جواز کا فتوی دیتے تھے کہ جولاہے کو سوت دیا جائے کپڑا بننے کے لئے اور اجرت اسی بنے ہوئے کپڑے کے نصف کو قرار دیا جائے اور دلیل عرف عام کو قرار دیا ہے اسی طرح مشائخ بلخ تعامل ناس کی بنیاد پر اس صورت کے جواز کا فتوی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تعامل ناس کی بنیاد پر قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ آرڈر کی بیع میں)۔

اسی طرح امام بخاریؒ نے اپنی کتاب "صحیح البخاری" میں بعض تابعین ابراہیم نخعیؒ، ابن سیرینؒ، عطاءؒ، حاکمؒ، امام زہریؒ اور حضرت قتادہؒ کی طرف اس اجارہ کے جواز کے قائل ہونے کی نسبت کی ہے۔

صاحب "بنایہ" علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

"وفی صحیح البخاری: قال إبراہیم، وابن سیرین، وعطاء والحاکم والزہری وقتادۃ رحمہم اللہ: لا بأس أن یعطی الثوب بالثلث والربع ونحوہ" (البنایہ شرح الہدایۃ ۱۰/ ۲۹۶)۔

اور صاحب "بنایہ" نے ابن قدامہ حنبلیؒ کا قول نقل فرمایا ہے کہ امام احمدؒ نے حضرت جابرؓ کی حدیث سے اس صورت اجارہ کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

"واحتج أحمد بحدیث جابر أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أعطی خیبر علی الشطر"۔

اور علامہ عینی کا رجحان بھی اس صورت اجارہ کے جواز کی طرف معلوم ہوتا ہے، فرماتے ہیں:

"والمصنف لم یقم دلیلاً علی ما ادعاہ من الفساد سوی أن المستاجر عاجز عن تسلیم الأجر. وہو بعض المنسوج أو المحمول، وحصول بفعل الأجیر فلا یعد ہو قادر بفعل غیرہ، وہذا لا یعول؛ فإن المزارع یأخذ جزءًا من الخارج. والمضارب جزءًا من الربح والمعنی المذکور موجود فی کل منہما، بل ہذا أولی بالجواز من المضاربۃ والمزارعۃ، فإن الذی یأخذ منہ الجزء ہنا محقق الوجود وہناک معدوم علی خطر الوجود لم یکن ہذا لمعنی مانعًا من جواز المزارعۃ والمضاربۃ، فہنا أحق وأولی أن لا یمنع" (البنایہ ۱۰/ ۲۹۷)۔

علامہ عینی کی اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے اس قسم کے اجارہ کے فساد کی جو علت ذکر کی ہے کہ مستاجر وقت عقد میں اجرت کے سپرد کرنے سے عاجز ہے بعینہ یہی علت عقد مضاربت اور مزارعت میں بھی پائی جاتی ہے، اس لئے کہ مضارب نفع کا ایک حصہ لیتا ہے اور مزارع پیداوار کا جب کہ عقد کے وقت نہ تو نفع موجود ہوتا ہے اور نہ ہی پیداوار، لہٰذا جب یہ دونوں عقد جائز ہیں تو عقد اجارہ کی مذکورہ صورت بھی جائز ہوگی۔

الغرض یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور آج عموم بلوی اس بات میں ہے کہ امت مسلمہ اجیر کے عمل کے نتیجے میں جو چیز حاصل ہوتی اسی کے بعض حصے کو اس اجیر کی اجرت قرار دیتی ہے۔

لہٰذا اس وقت اگر قول اول پر فتوی دے کر اس کو ناجائز قرار دیا جائے تو امت کے اکثر افراد گنہگار قرار پائیں گے۔

اور اگر دوسری رائے کو اختیار کیا جائے تو اس میں امت کے لئے سہولت اور آسانی کا سامان پیدا ہو جائے گا۔

مذہب احناف میں عموم بلوی کی بنیاد پر خفت والے قول کو اختیار کرنے کی نظیریں موجود ہیں۔

مثلاً خفین میں اگر ایسی نجاست لگ جائے جس میں جرم ہوتا ہے اور پھر وہ نجاست سوکھ جائے تو اس کو زمین سے رگڑ کر صاف کر دینے سے خفین پاک ہو جاتا ہے، لیکن حضرت امام محمدؒ ایک زمانہ تک اس بات کے قائل تھے کہ خفین پاک نہیں ہوگا جب تک کہ اس کو دھویا نہ جائے لیکن جب مقام "ری" میں تشریف لے گئے اور وہاں گوبر کی کثرت دیکھی تو قول اول سے رجوع فرمالیا، بلکہ اس مسئلہ میں اتنی وسعت فرمادی کہ اگر ربع ثوب سے زیادہ بھی گوبر لگ جائے تو بھی اس کے ساتھ نماز درست ہو جائے گی اور پھر بعد کے فقہاء نے امام محمدؒ کے اسی قول پر بخاری کی مٹیوں کو بھی قیاس کیا اور

اس کی مقدار کثیر کو بھی عفو قرار دیا۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''وإذا أصاب الخف نجاسة لها جرم کالروث والعذرة والدم والمنی فجفت فدلکه بالأرض جاز. وهذا استحسان، وقال محمد: لا يجوز، وهو القياس، إلا في المنی خاصة'' (ہدایہ ۱/ ۷۲)۔

پھر آگے (صفحہ ۷۶) پر تحریر فرماتے ہیں:

''وعن محمد أنه لما دخل الري، ورأى البلوى أفتى أن الكثير الفاحش لا يمنع أيضًا (أي لا يمنع جواز الصلوة، بنايه) وقاسوا عليها طين بخارا وعند ذلك رجوعه في الخف يروى''۔

لہٰذا واسطہ بننے والے لوگ اگر حاصل شدہ رقم کے ایک حصہ کو بطور اجرت کے لینے کا معاملہ کریں تو عموم بلوی کی بنیاد پر بندہ کے نزدیک بھی یہ معاملہ جائز ہوگا۔

لیکن اگر وہ پہلے سے اجرت طے نہ کریں اور حکومت کی طرف سے رقم مل جانے کے بعد اپنی مرضی سے اسکے ایک حصہ کو لے لیں تو یہ جائز نہ ہوگا، بلکہ وہ اس وقت اجرت مثل کے مستحق ہوں گے چونکہ یہ اجارہ فاسدہ ہے۔

(۹) رشوت لینا اور دینا دونوں گناہ کبیرہ ہے۔

''ابوداؤد شریف'' کی حدیث ہے:

''لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي'' (ابوداؤد ۲/ ۱۴۸ باب فی کراهية الرشوة)

(یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے)۔

اس لئے حکومت کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم یا قرضوں کی حصولیابی کے لئے رشوت دینے سے بچنا ضروری ہے۔

لیکن اگر رشوت دیئے بغیر ان کی حصولیابی انتہائی دشوار ہو تو ایسی صورت میں فقہاء رشوت دینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

علامہ ابن عابدین تحریر فرماتے ہیں:

''ولا بأس بالرشوة إذا خاف على دينه، قال الشامي: عبارة المجتبى لمن يخاف، وفيه أيضًا: دفع المال للسلطان لدفع الظلم عن نفسه وماله وللاستخراج حق له ليس برشوة، يعني في حق الدافع'' (رد المحتار ۶/ ۴۲۶ الحظر والاباحة)۔

صاحب بلوغ الامانی فرماتے ہیں:

''فأما ما يعطى توصلا إلى أخذ حق أو دفع ظلم فغير داخل فيه'' (بلوغ الامانی علی الفتح الربانی ۱۵/ ۷۰)

(یعنی جو کچھ اپنے حق کو حاصل کرنے یا ظلم کو دفع کرنے کے لئے دیا جاتا ہے وہ رشوت دینے میں داخل نہیں ہے)۔

صاحب ''البحر الرائق'' فرماتے ہیں:

''ومنها إذا دفع الرشوة خوفًا على نفسه أو ماله فهو حرام على الآخذ غير حرام على الدافع، وكذا إذا طمع في ماله فرشاه ببعض المال'' (البحر الرائق ۶/ ۲۸۵)۔

فقہاء کرام کی ان عبارتوں سے یہ بات واضح ہے کہ اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، بلکہ علامہ شامی اور صاحب بلوغ الامانی کی عبارتوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رشوت کے تحت آتا ہی نہیں ہے۔

(۱۰) حکومت کی طرف سے امدادی رقوم یا قرض کے حاصل کرنے کے لئے جو شرائط و معیارات متعین ہوں اس میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقے سے امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانا درست نہ ہوگا۔

امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے حضرت ام سلمہؓ سے روایت نقل کی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ

''إنما أنا بشر وأنتم تختصمون إليّ ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض فأقضي له على نحو ما أسمع منه فمن قضيت له بشئي من حق أخيه، فلا يأخذنّه، فإنما أقطع له قطعة من النار'' (رواه البخاري ومسلم)۔

اس حدیث کے ذیل میں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں فرمایا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں واضح فرمادیا کہ اگر امام یا قاضی یا امام المسلمین کسی مغالطہ کی وجہ سے کوئی فیصلہ کردے جس میں ایک کا حق دوسرے کو ناجائز طور پر مل رہا ہو تو عدالتی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوجاتا (معارف القرآن ۱/۴۶۱)۔

نیز ارشاد خداوندی ہے:

"فاجتنبوا الرجس من الأوثان واجتنبوا قول الزور" (سورۃ الحج: ۱۴) (یعنی بچو بت پرستی کی نجاست سے اور بچو جھوٹ بولنے سے)۔

لیکن اگر حکومت کی طرف سے جو شرائط اور معیارات لگائے گئے ہوں وہ مبنی بر تعصب اور خلاف شرع ہوں تو پھر اس کا ذکر کسی معتبر عالم دین سے کر کے ان کے بتائے ہوئے مسئلہ پر عمل کیا جائے۔

(۱۱) اگر تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے، اور اس پر عائد ہونے والے انٹرسٹ کو مستقرض پر نہیں لادتی، بلکہ مکمل انٹرسٹ کو حکومت خود اپنی طرف سے ادا کرتی ہے تو اس اسکیم کے تحت قرض حاصل کرنا جائز ہوگا اور اگر انٹرسٹ کا کچھ حصہ حکومت مستقرض سے بھی ادا کراتی ہے تو اس صورت کے سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس قسم کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہوگا، دوسری قرض کی حرمت کے دلائل تفصیل کے ساتھ گذر چکے ہیں۔

(۱۲) اس اسکیم سے فائدہ حاصل کرنا مستحقین کے لئے جائز ہوگا، اس لئے کہ غیر مسلم حکومت فروعات کی مکلف نہیں ہے۔

......☆......

سرکاری قرضوں پر لیا جانے والا معمولی سود اور سروس چارج

مفتی محمد فلاحی [1]

(۱-۲) معافی والے قرضے:

مفتی نظام الدین صاحب نے اپنے فتاوی میں اس کی صراحت کی ہے کہ حکومت کی ترقیاتی اسکیموں کے متعلق قرضوں کی حیثیت عام ضرورتوں کے تحت لئے جانے والے قرضوں سے مختلف ہے، جیسا کہ معلوم ہوا ہے کہ ایسے ترقیاتی قرضوں میں حکومت کا اصل مقصود کمانا نہیں ہوتا، بلکہ عوام کے لئے بنیادی ضرورتوں اور روزگار کی فراہمی اور معاشرہ کی فلاح وصلاح مقصود ہوتی ہے، اس لئے اگر حکومت کسی قرض پر چھوٹ دیتی ہے، اور اس پر سود بھی عائد کرتی ہے، اور اس چھوٹ کا تناسب سود میں ادا کی جانے والی رقم سے کم یا اس کے مساوی ہے تو قرض کی یہ شکل شرعاً جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں قرض میں لی ہوئی رقم سے زیادہ دینا نہیں پڑتا، گویا یہ حکومت کی طرف سے ایک قسم کی امداد ہے، نیز اس پر سود اور ربوا کی تعریف بھی صادق نہیں آتی، کیونکہ سود کا تحقق اس وقت ہوگا جب ایک طرف سے ایسی زیادتی ہو کہ دوسری طرف اس کا کوئی عوض نہ، اس لئے یہ صورت سود میں داخل نہ ہوگی۔

"لأن الربا هو الفضل الخالي عن العوض، وحقيقة الشروط الفاسدة هي زيادة مالا يقتضيه العقد ولايلائمه. فيكون فيه فضل خال عن العوض وهو الربا بعينه" (رد المحتار: ۳۹۹/ ۷، باب الربا، ط: دار المكتب العلمية بيروت)۔

"وهو في الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض في معاوضة مال بمال" (الفتاوى الهندية: ۱۱۷/ ۳، الفصل السادس في تفسير الربا ط: دار الكفر)۔

"الربا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضه الخالي عن عوض شرط فيه" (الهداية ۶۱/ ۳، باب الربا، ط: دار احياء التراث العربي)۔

"وفي الشرع فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال" (البناية: ۲۶۰/ ۸، باب الربا، ط: دار الكتب العلمية بيروت)

(۳) معافی والی قرضے جس میں زیادتی کا طالبہ ہو:

سودی معاملہ اور سودی لین دین پر قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں، اس لئے جیسے سود لینا گناہ ہے، اسی طرح سود دینا بھی یعنی سودی قرض حاصل کرنا بھی گناہ ہے، اصل اہمیت شرح سود کے کم اور زیادہ ہونے کی نہیں ہے، بلکہ فی نفسہ سود کے لین دین کی ہے، نیز شریعت نے مالی لین دین کے معاملہ میں ایسی زیادتی جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہ ہو، ربا قرار دیا ہے، اس لئے عام حالات میں سودی قرض کی صورت میں کل رقم کی واپسی کے ساتھ زیادہ رقم ادا کرنی پڑے، تو یہ زیادہ رقم سود میں شامل ہو کر حرام ہوگی، ارشادِ خداوندی ہے:

وأحل الله البيع وحرم الربا" (البقرة: ۲۷۵) اور اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے:

"عن جابر رضي الله عنه قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء"

---

[1] خادم دار الافتاء والارشاد جامع مسجد ممبئی۔

(صحیح مسلم ، باب لعن آکل الربا و موکله ، حدیث نمبر: ۱۵۹۸)۔

''فمن الربا ماہو بیع ، ومنه مالیس بیع وهو ربا أهل الجاهلية وهو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على المستقرض'' (احکام القرآن للجصاص: ۵۶۹/ ۱، تحت آیة ''وحرم الربا'' ط: دار الکتب العلمیة)۔

''کل قرض جر نفعا حرام أي إذا کان مشروطا'' (رد المحتار: ۳۹۵/ ۷، کتاب البیوع ، باب المرابحة و التولیة، ط: دار الکتب العلمیة)۔

''وكل قرض شرط فيه الزيادة فهو حرام بلا خلاف. قال ابن المنذر: أجمعوا على أن المسلف إذا شرط على المستلف زيادة أو هدية، فأسلف على ذلك أن أخذ الزيادة على ذلك ربا، قال رسول الله ﷺ: كل قرض جر منفعة فهو ربا'' (اعلاء السنن: ۴۹۶/ ۱۴، کتاب الحوالة ، باب کل قرض جر منفعة، ط: ادارة القرآن کراچی)۔

''کل قرض شرط فيه الزيادة فهو حرام بلا خلاف... الفضل المشروط في القرض ربا محرم لا يجوز للمسلم من أخيه المسلم أبدا، لإجماع المجتهدين على حرمته'' (اعلاء السنن: ۵۱۸/ ۱۴، رسالة کشف الدجی علی حرمة الربوا، ط: ادارة القرآن کراچی)

جیسا کہ معلوم ہوا کہ عام حالات میں تو سودی قرض لینا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جس طرح سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے، البتہ اگر حالات ایسے ہیں، جن کو شریعت حاجت وضرورت سے تعبیر کرتی ہے، جن حالات میں حرام اشیاء کے استعمال کی شرعاً اجازت ہوتی ہے یا جن میں احکام کے اندر تخفیف ہو جاتی ہے تو پھر ایسی اضطراری اور حد درجہ کی مجبوری کی صورت میں بقدرِ مجبوری اور بدرجۂ مجبوری سودی قرض لینے کی اجازت ہو سکتی ہے، اور ضرورت سے زیادہ لینا درست نہ ہوگا، ''الاشباہ والنظائر'' میں ہے:

وفي القنية والبغية: يجوز للمحتاج الأستقراض بالربح، وفي الحموي قوله: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح، وذلك نحو أن يقترض عشرة دنانير مثلا ويجعل لربها شيئا معلوما في كل يوم ربحا '' (الاشباہ والنظائر مع الحموی، ص: ۲۲۷، الفن الاول ... القاعدة الخامسة، الضرر یزال، ط: مکتب فقیه الامت دیوبند، نیز دیکھئے: فتاوی رحیمیه ۶/ ۱۳۶، ۱۳۵، ط: مکتبه اردو بازار لاہور، کتاب الفتاوی: ۵/ ۲۱۱، ط: کتب خانه نعیمیه دیوبند)۔

نیز دوسری جگہ علامہ ابن نجیم مصریؒ قاعدۂ فقہیہ ''ماحرم أخذه حرم اعطاءہ'' کے ذیل میں ''الرشوة لخوف على ماله أو نفسه'' کا استثناء کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن یہ جواز دینے والے کے حق میں ہے، رشوت لینے والے کے حق میں ہر حال میں حرام ہے، بعض لوگوں کو اس فرق پر تنبہ نہ ہو سکا، اسی طرح مناسب ہے کہ اس سے یہ صورت بھی مستثنیٰ ہو کہ کوئی محتاج شخص سود پر قرض حاصل کرے کہ یہ بھی حرام نہیں ہے، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں اس کی تشریح کردی گئی ہے، لیکن قرض دینے والے کے لئے سودی کی شرط پر قرض دینا حرام ہوگا'' (الاشباہ والنظائر مع الحموی، ص: ۴۸۶، ۴۸۷، الفن الاول... النوع الثانی من القواعد، القاعدة الرابعة عشرة، ''ماحرم اخذه حرم اعطاءہ''، ط: مکتب فقیه الامت دیوبند)۔

(۴) غیر معافی والے قرضے جس میں معمولی زیادتی ہو:

جیسا کہ معلوم ہوا کہ سود لینا اور دینا دونوں ہی گناہ اور حرام ہے، البتہ سرکار اور نیم سرکاری ادارہ اور اشخاص اور پرائیویٹ ادارہ کے حکم میں ایک گونہ فرق ہے، جب ہم اس ملک کے شہری ہیں تو جیسے حکومت دوسرے شہریوں کو روزگار کے لئے قرض فراہم کرتی ہے، ویسے ہی مسلمانوں کو بھی اس طرح کی سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور ہمارا بحیثیت شہری ہونے کا اس پر حق ہے، لہٰذا جو مسلمان واقعی ضرورت مند ہوں اور کوئی دوسرا شخص بغیر سودی قرض دینے کو تیار نہ ہو، یا اس کے پاس ایسی کوئی جائداد نہ ہو جسے فروخت کر کے اپنی ضرورت پوری کر سکے، تو ایسی مجبوری اور اضطرار کی کیفیت میں بقدر مجبوری سودی قرض حاصل کرنے کی گنجائش ہے، اور جو زائد رقم سود کے نام سے وصول کی جاتی ہے، اسے انتظامی اخراجات بھی قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ بینک یا اس جیسا کوئی ادارہ جو سودی قرض فراہم کرتا ہے، اسے اپنے نظام چلانے اور عوام کی ایسی ضرورتوں کے

پورا کرنے کے لئے وسیع عملہ اور دیگر اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے، اگر چہ اس کی حیثیت ضمناً ہی ہوتی ہے، اس لئے یہ زائد رقم انتظامی اخراجات کے لئے بطور اجرت وفیس کہی جاسکتی ہے، نیز سرکار کا مقصد اس طرح کی اسکیم اور مراعات سے سود حاصل کرنا نہیں ہوتا، بلکہ بے روزگاری دور کرنا مقصود ہوتا ہے، اسی لئے تو بعض اوقات قرض کا کچھ حصہ معاف کردیا جاتا ہے، حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین اعظمی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مولانا عبید اللہ الاسعدی وغیرہ حضرات کا رجحان اسی طرف ہے۔

نیز دوسری طرف موجودہ زمانہ میں اسلامی بیت المال، زکوۃ وصدقات اور غیر سودی قرضوں کا منظم نظام نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی شخص غیر سودی قرض دینے کو تیار ہوتا ہے، اور سرکاری اسکیموں اور مراعات سے استفادہ میں دیگر قوموں کی طرح مسلمان بھی برابر کے شریک ہیں، اور ظاہر ہے کہ سرکاری اسکیموں اور مراعات کے حصوں میں سود دینا ہی وسیلہ ہے، تو ایسی صورت حال اور مجبوری کے درجہ میں زائد رقم کو اس رشوت کی حیثیت دی جائے جو اپنا حق وصول کرنے کے لئے دی جاتی ہے (دیکھئے: منتخبات نظام الفتاوی: ۱/ ۲۱۸، بنک انشورنس اور سرکاری قرضے، ص: ۲۱۲، ط: دار الکتاب دیو بند، کتاب الفتاوی: ۵/ ۳۰۷، کتب خانہ نعیمیہ دیو بند، جدید فقہی تحقیقات: ۲/ ۵۰۰، ط: کتب خانہ نعیمیہ دیو بند)۔

(۵) غیر معافی والے قرضے جس میں زیادتی کا مطالبہ ہو:

اس کا جواب سوال نمبر ۳ میں گذر چکا ہے کہ سود کی حرمت منصوص اور قطعی ہے اور سودی لین دین پر نصوص میں سخت وعیدیں بھی وارد ہوئی ہے، نیز جیسے سود لینا گناہ ہے اسی طرح سود دینا بھی یعنی سودی قرض حاصل کرنا بھی گناہ ہے، اصل اہمیت سود کے کم اور زیادہ ہونے کی نہیں ہے، بلکہ فی نفسہ سود کے لین دین کی ہے، اس لئے سودی قرض کی صورت میں کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنی پڑے تو یہ زیادہ رقم بھی سود میں شامل ہو کر حرام ہوگی، البتہ مجبوری میں سودی قرض حاصل کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس لئے اگر کسی کے پاس ضروریات زندگی کی چیزیں نہ ہو اور بقدر ضرورت ان چیزوں کے حصول کے لئے رقم بھی موجود نہ اور نہ ہی غیر سودی قرض حاصل ہوسکتا ہو، تو اسی قدر سودی قرض حاصل کیا جاسکتا ہے، کہ ضروریات زندگی سے محروم بے روزگار شخص اپنی ضرورت کے بقدر ضرورت پوری کر سکے۔

البتہ اگر کسی شخص کے پاس اپنی ضرورت کے بقدر رہائش کی سہولت نہ ہو اور اتنا پیسہ بھی نہ ہو کہ مکان بنا سکے، یا کوئی نوجوان بے روزگار ہو اور ضروری حد تک روزگار کے لئے اس کو وسائل مہیا نہ ہو، یا کسی کو کاشتکاری و باغبانی کی ضرورت درپیش ہو، اور اس کے لئے آلات زراعت مثلاً ٹریکٹر، ٹیوب ویل یا دیگر ضرورت کی چیزوں کے لئے پیسہ میسر نہ ہو تو اس کے لئے حکومت کی ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوگی، اور اس پر جو سود ادا کرنا پڑ رہا ہے تو انشاء اللہ وہ عند اللہ اس سلسلہ میں معذور سمجھا جائے گا، اصلاً سود کا مجبوری کے بغیر دینا بھی گناہ ہے، لیکن دوسرے اشخاص یا بینکوں کے مقابلہ حکومت کو سود ادا کرنے کا معاملہ نسبتاً خفیف ہے، کیونکہ بے مکانوں کو مکان فراہم کرنا اور بے روزگاروں کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کرنا اور کاشتکاروں کو ضروری سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، لہٰذا ان مقاصد کے لئے حکومت جو قرض دے رہی ہے، اگر کوئی شخص قرض کی شرائط کو پورا کرتا ہو تو وہ واقعی اس کا حقدار ہے، اور اس پر سود ادا کرنا اپنے جائز حق کو وصول کرنے کے لئے مجبوراً رشوت ادا کرنے کے مماثل ہے جس کی اجازت دی گئی ہے۔

مذکورہ صورت میں یہ تاویل بھی کی جاسکتی ہے کہ ایسے قرضے جن میں حکومت بنیادی طور پر ضرورت مندوں کو نقد رقم فراہم کے بجائے ضرورت کے مطابق مکان کی تعمیر، بے روزگاروں کو روزگار بنانے، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات کی چیزیں فراہم کرتی ہے، اور اس کے ساتھ کام چلانے کے لئے کچھ رقم نقد بھی دیتی ہے، وہ عام سودی قرضوں کے تحت نہیں آئیں گے، اس لئے کہ واپسی میں جو زیادتی دی جائے گی اس میں دو باتیں ہیں:

ایک تو یہ ہے ہم نے حکومت سے پیسہ لے کر چیزیں نہیں خریدی، بلکہ حکومت نے خرید کر دی، اب اگر وہ اپنی دی ہوئی رقم پر زائد رقم لیتی ہے تو گویا وہ مشین کی قیمت لیتی ہے اور ہر شخص کو اپنی خریدی ہوئی چیزوں کو نفع کے ساتھ بیچنے کا حق ہے، جسے بیع مرابحہ کہتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جو زائد رقم دی جائے گی تو ظاہر ہے کہ حکومت کو اپنا نظام چلانے اور عوام کی ضروریات کو پوری کرنے کے لئے وسیع عملہ اور دیگر

اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے یہ زائد رقم انتظامی اخراجات کے لئے بطور اجرت وفیس لی جا سکتی ہے، یہی رائے حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا ابوالحسن علی (شیخ الحدیث دار العلوم ماٹلی والا)، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا عبید اللہ الاسعدی وغیرہ حضرات کی ہے (دیکھئے: نظام الفتاویٰ: ۱/ ۴۷۲، بینک انشورنس اور سرکاری قرضے، ص: ۱۲۱، ط: دار الکتاب دیوبند، کتاب الفتاویٰ: ۱/ ۴۶، ط: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، جدید فقہی تحقیقات: ۲/ ۲۳۳ و ۵۰۰، ط: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

(۶) سرکاری امداد:

ترقیاتی منصوبوں کے پیش نظر حکومت سے مکمل امداد کے طور پر جو رقم ملا کرتی ہے اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ حکومت اپنے خزانے میں جو رقم رکھتی ہے وہ بلاتفریق مذہب تمام شہریوں کے لئے ہوتی ہے، گویا اس کے ساتھ جس طرح غیر مسلموں کا حق متعلق ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی حق وابستہ ہے، نیز حضرت مفتی عبد الرحیم لاجپوری صاحب ''گورنمنٹ کی امداد لینا کیسا ہے'' اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

صورت مسئولہ میں سرکار کی طرف سے جو رقم ملتی ہے وہ سرکاری امداد ہے، وہ لی جا سکتی ہے (فتاویٰ رحیمیہ: ۳/ ۲۰۵، ط: مکتبہ رحیمیہ اردو بازار لاہور)

نیز حضرت مولانا سلمان منصور پوری صاحب ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ بچی کے پیدائش پر جو رقم حکومت کی طرف سے ملتی ہے، وہ سب حکومت کی جانب سے عطیہ ہوگا اور یہ پوری رقم اس کے لئے حلال ہے۔

(کتاب النوازل: ۱۱/ ۲۹۳، ط: المرکز العلمی للنشر والتحقیق لال باغ مراد آباد)

(۷، ۸) سرکاری امداد میں محنتانہ لینا دینا:

یہ ایک حقیقت ہے کہ گورنمنٹ کا جو بھی کام ہو چاہے سرکاری مراعات ہو، یا قانونی پیپر، ان کو حاصل کرنے یا بنانے کے لئے کافی جدوجہد اور دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے، جس کے لئے کافی وقت بھی درکار ہوتا ہے، اور ان کے حصول کے لئے ایک حد تک معلومات بھی ضروری ہوتی ہے، اور خرچ بھی ہوتا ہے، بعض افراد اس قسم کے امور انجام دیتے ہیں، وہ کبھی اپنی مطلوبہ محنتانہ کے لینے دینے کا معاملہ کرتے ہیں، یا پھر حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لینے دینے کا معاملہ کرتے ہیں، اس کی شرعاً گنجائش ہے، جیسا کہ کمیشن کی اجازت ہے، البتہ اگر معاملہ پہلے سے طے ہو جائے کہ میں آپ کا یہ کام کروں گا لیکن اتنا پیسہ یا اتنا فیصد لوں گا، تو یہ معاملہ اجرت کا بن جائے گا اور شرعاً بھی درست ہوگا، کیونکہ یہ متعین عمل پر اجرت ہے، نیز حضرت تھانوی ''کسی کا دین اس شرط کے ساتھ وصول کرنا کہ اس کا ثلث بطور محنتانہ دیا جائے'' کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ شخص اجیر ہے، لہٰذا تنخواہ متعین ہونا چاہیے، خواہ ماہانہ خواہ یکمشت'' (امداد الفتاویٰ: ۳/ ۳۹۲، ط: مکتبہ دار العلوم کراچی)۔

نیز حضرت مولانا مفتی رشید صاحب نے ''ڈرائیونگ لائسنس بنوانے کی اجرت'' کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ وہ بھاگ دوڑ اور محنت کی اجرت لیتا ہے'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۷/ ۳۳۳، ط: بنگلہ اسلامی اکیڈمی)۔

نیز حضرت مفتی سلمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم نے بھی گاڑی کا رجسٹریشن کرانے پر بطور محنتانہ لینے کو جائز قرار دیا ہے (کتاب النوازل: ۱۲/ ۳۶۹، ط: المرکز العلمی للنشر والتحقیق لال باغ مراد آباد)۔

لہٰذا مذکورہ دونوں صورتوں (سوال نمبر: ۷، ۸) میں محنتانہ لینا دینا، یا پھر حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ بطور محنت لینا دینا شرعاً درست ہے اور یہ معاملہ اجارہ کا ہے، اس لئے پہلے سے اجرت کا متعین اور معلوم ہونا ضروری ہے، تاکہ نزاع کا اندیشہ نہ ہو، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''عن أبي سعيد الخدري أن النبي ﷺ نهى عن استئجار الأجير حتى يبين له أجره'' (مسند احمد: ۱۱۶/۱۹)

اجارہ میں اجرت کا معلوم اور متعین ہونے کو شرط میں ذکر کرتے ہوئے درمختار میں منقول ہے:

''وشرطها: كون الأجرة والمنفعة معلومتين لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة'' (الدر مع الرد: ۹/ ۷، كتاب

الاجارة،ط:دارالکتب العلمية)۔

ہدایہ میں مذکور ہے:''الإجارة عقد يرد على المنافع بعوض...ولا تصح حتى تكون المنافع معلومة والأجرة معلومة...وتارة تصير المنفعة معلومة بالتعيين'' (الهداية مع البناية:۲۲۱،۲۲۶،۲۳۱/ ۱۰،کتاب الاجارات،ط:دار الکتب العلمية)

علامہ شامی بزازیہ میں نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''إجارة السمسار والمنادى والحمامى والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل'' (ردالمحتار:۹/ ۶۳،کتاب الاجارة،باب الاجرة الفاسدة،ط:دارالکتب العلمية)۔

نیز علامہ شامی تاتارخانیہ کے حوالہ سے دلال سے متعلق نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وفى الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه أن فى كل عشرة دنانير كذا فذاك حرام عليهم. وفى الحاوى،سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار ،فقال:أرجو أنه لابأس به. وإن كان فى الأصل فاسد الكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز فجوزه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام'' (ردالمحتار:۹/ ۸۷،کتاب الاجارة،باب ضمان الاجير،ط:دارالکتب العلمية)۔

(۸) رشوت:

آج کل رشوت کا چلن بڑی شدت سے رائج اور جاری وساری ہے،حالانکہ رشوت ایک خطرناک جرم ہے جو معاشرہ میں ہزار ہا برائیوں اور مشکلات کو جنم دیتی ہے،قوم کو کھوکھلا کر دیتی ہے،اخلاقی قدروں کو پامال کر دیتی ہے،اور زندگی سے برکت کو ختم کر دیتی ہے،اس لیے اسلام نے رشوت خوری کو بہت شدت سے منع کیا ہے،اسی لئے رشوت کا لینا دینا دونوں حرام ہے،نصوصِ صریحہ سے اس کی حرمت ثابت ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:سمعون للكذب أكلون السحت(المائدة:۴۲)۔

مذکورہ آیت میں ''السحت'' سے مراد رشوت ہے جیسا کہ حضرت حسن،مقاتل،قتادہ،ضحاک اور ابن مسعود کا قول ہے،تفسیر بغوی میں منقول ہے:

''فالسحت هو الرشوة فى الحكم على قول الحسن ومقاتل وقتادة والضحاك وقال ابن مسعود:هو الرشوة فى كل شىء'' (التفسير البغوى:۲/ ۳۱،المائدة:۴۳،ط:دارالکتب العلمية)۔

حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشى والمرتشى'' (ابوداؤد،کتاب القضاء،باب فی کراہیة الرشوة:۳۵۸۰)

نیز رشوت کا سب سے زیادہ چلن سرکاری ونیم سرکاری دفاتر محکموں اور صنعتی وتعلیمی ترقی وغیرہ جگہوں میں عام ہے،اور یہ جگہ ایسی ہے جہاں ایک نیک،دیندار اور صلاحیت کے حامل شخص کو بھی اپنا حق حاصل کرنے کے لئے رشوت کا سہارا لینا پڑتا ہے،کیونکہ اگر وہ رشوت نہیں دیتے ہیں تو وہ اپنے حق سے محروم رہ جائیں گے تو ایسے معاملات میں جہاں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے بہ جبرواکراہ رشوت دینی پڑتی ہے،اس لئے فقہاء نے دفع ظلم اور اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے بحالتِ مجبوری رشوت دینے کی اجازت دی ہے،لیکن رشوت لینا تو بہر حال حرام ہے کیونکہ رشوت کا لینا اور نہ لینا اپنے اختیار کی چیز ہے،چنانچہ ابوداؤد کی مذکورہ حدیث کے ذیل میں صاحبِ ''بذل المجهود'' فرماتے ہیں:

''فأما إذا أعطى ليتوصل به إلى حق أو يدفع عن نفسه ظلما، فإنه غير داخل فى هذا الوعيد'' (بذل المجهود:۱۴۵/ ۱۵،کتاب القضاء،باب فی کراہیة الرشوة،ط:دارالکتب العلمية)۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:''أنه يجوز أن يرشى من كان يتوصل بالرشوة إلى نيل حق أودفع باطل'' (نيل الاوطار:۱۴۲/ ۹،کتاب الاقضية والاحکام،باب نهى الحاكم عن الرشوة،ط:دارالحدیث مصر)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: ''ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله حلال للدافع، حرام على الآخذ''
(رد المحتار: ۳۵/۷، کتاب القضاء، مطلب فی الکلام علی الرشوۃ والهدیة، ط: دار الکتب العلمیة)۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں: ''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة، يعني في حق الدافع'' (ردالمحتار: ۶۰۷/۹، کتاب الحظر والاباحة، فصل فی البیع، ط: دار الکتب العلمیة)۔

علامہ ابن نجیم مصری ''البحر الرائق'' میں رقمطراز ہیں: ''... ومنها إذا دفع الرشوة خوفا على نفسه أو ماله، فهو حرام على الآخذ، غير حرام على الدافع'' (البحر الرائق: ۲۸۵/۶، کتاب القضاء، اخذ القضاء یا لرشوۃ، ط: دار الکتاب الاسلامی)۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

''دفع الرشوة لدفع الظلم أمر جائز'' (الهداية مع البناية: ۱۰/۵، کتاب الصلح، الصلح مع الاقرار، ط: دار الکتب العلمیة)۔

(۱۰) امدادی رقوم کے حصول میں غلط بیانی سے کام لینا:

امدادی رقوم یا قرض گورنمنٹ نے غربت کی ایک خاص سطح پر زندگی بسر کرنے والوں کے لئے جاری کیا ہے، لہٰذا گورنمنٹ جن شرائط کے ساتھ امدادی رقوم یا قرض دے رہی ہے اگر کسی شخص کے اندر وہ شرطیں مفقود ہوں تو اس کے لئے اس طرح امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، کیونکہ انہیں جو سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں، اس کا بوجھ عوامی خزانہ پر ڈالا جاتا ہے، تو گویا یہ نہ صرف گورنمنٹ سے جھوٹ اور دھوکہ کا معاملہ ہے، بلکہ عام لوگوں کی کمائی ہوئی گاڑھے پیسے کی رقم کو اپنے استعمال میں لینا ہے، اور اس کے لئے جھوٹ اور دھوکہ کا سہارا لیا جارہا ہے، اور جھوٹ بولنا اور دھوکہ دینا کبیرہ گناہوں میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جھوٹ انسان کو برائی کی طرف لے جاتا ہے، اور برائی جہنم کی طرف لے جاتی ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا چلا جاتا ہے، یہاں تک اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو ''کذاب'' (بہت جھوٹا) لکھ دیا جاتا ہے۔

(صحیح البخاری، باب قول اللہ تعالیٰ: یا أیہا الذین آمنوا اتقوا اللہ. وما ینہی، عن الکذب: ۶۰۹۴)۔

نیز جھوٹ میں معنوی بدبو بھی ہے، جس سے فرشتہ ایک میل کے فاصلہ تک دور ہوجاتے ہیں۔

(سنن الترمذی، باب ماجاء فی الصدق والکذب: ۱۹۷۲)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبیرہ گناہوں کو شمار کرتے ہوئے شرک، والدین کی نافرمانی اور قتل کے بعد جھوٹ کا ذکر فرمایا۔ (سنن الترمذی، باب ماجاء فی التغلیظ فی الکذب والزور ونحوہ: ۱۲۰۷)۔

نیز دھوکہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

(سنن الترمذی، باب ماجاء فی کراهیة الغش فی البیوع: ۱۳۱۵)۔

(۱۱) حکومت کا مقروض کا سود ادا کرنا:

تعلیم انفرادی ضرورت بھی ہے اور اجتماعی اور عوامی ضرورت بھی، خاص طور پر مسلمانوں کو موجودہ حالات میں تعلیم پر توجہ دینے کی بہت زیادہ ضرورت ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دن بدن تعلیم کا حصول گراں بہا اور مہنگا ہوتا جارہا ہے، جس کے سبب نہ صرف خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں، بلکہ درمیانی معاشی معیار کے حامل لوگوں کے لئے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا حصول دشوار ہوتا جارہا ہے، اس پس منظر میں اگر کوئی طالب علم کسی خاص نوعیت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اہل ہو اور خود اس کے پاس اتنی رقم نہ ہو تو ایسی مجبوری اور اضطراری صورت میں حکومت کی مذکورہ اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے، جیسا کہ جواب نمبر ۳/ میں گزر چکا۔

(۱۲) سود کی رقم سے امداد کرنا:

کسی بھی عمل کے درست ہونے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: ایک یہ کہ اس کی نیت درست ہو دوسرے اس کا طریقہ بھی درست ہو اور شریعت کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو، تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کے تعاون کی نیت بہت اچھی ہے، لیکن رقم ڈپازٹ کر کے اس کا انٹرسٹ حاصل کرنا اور اس کے ذریعہ تعاون کرنا اصلاً حرام وناجائز ہے، لیکن چونکہ ہماری (ہندوستانی) حکومت اسلامی احکامات کے پابند نہیں ہے اس لئے اسلامی احکام ان پر جاری نہیں ہو سکتے، لیکن حکومت کی مذکورہ اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے حضرات واقعی غریب، ضرورت مند اور مجبور ہے تو بدرجۂ مجبوری اور بقدرِ مجبوری حکومت کی مذکورہ اسکیم سے استفادہ کرنے کی گنجائش ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی ''کفار جو مال حرام طریقے سے حاصل کریں'' اس کے جواب کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ:

جواب کا حاصل یہ ہے کہ کفار مخاطب بالعقوبات ومعاملات اگرچہ ہے، لیکن حکم بالحرمۃ والفساد کے لئے خطابِ عام کافی نہیں بلکہ التزام بھی شرط ہے، اہلِ حرب نے تو احکامِ اسلام کا التزام بالکل نہیں کیا، نہ اپنے معتقد کے موافق میں اور نہ مخالف میں، لہٰذا وہ تو جس طرح بھی روپیہ کمائیں خواہ ربا سے، خواہ غصب سے، خواہ بیوعِ باطلہ وفاسدہ سے، خواہ اپنے مذہب کے موافق، خواہ مخالف طریق سے بہر صورت وہ روپیہ وغیرہ ان کی ملک میں داخل ہو جائے گا اور مسلمان کو تنخواہ میں لینا اس کا جائز ہے (امداد الاحکام ۴/ ۳۹۰، ط: دار العلوم کراچی)۔

نیز مولانا اشرف علی تھانویؒ ''تقسیم انعام از رقم سود در بعضے اسکول'' کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

اس آمدنی سے انعام وغیرہ جو دیا جاتا ہے لینا جائز ہے... (امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۶۴، ط: دار العلوم کراچی)۔



سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی چند شکلیں اور احکام

مولانا رحمت اللہ ندوی[1]

سرکاری خزانہ سے حق انتفاع:

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اصولاً جمہوری حکومتوں کی آمدنی سے اس ملک کے عوام ہی منتفع ہوتے ہیں اور جو ذمہ داریاں جمہوری حکومت پر (قرض کی ادائیگی سود وغیرہ) عائد ہوتی ہیں، بالواسطہ ان کی ادائیگی بھی عوام پر ہی آتی ہے۔

حکومت کا خزانہ ''عوام کا خزانہ'' ہے، اس لئے پبلک اکاؤنٹ میں ہی ساری رقم جمع ہوتی ہے، البتہ سرکاری خزانہ کا مالک وہ اکائی ہے جو ہندوستان کے شہریوں پر مشتمل ہے، یعنی بہ حیثیت مجموعی قوم (Nation) اس کی مالک ہے، لیکن انفرادی حیثیت میں کوئی فرد اس کا مالک نہیں، لہٰذا دستور کی رو سے انتظامیہ کو اس کے تصرف کا مجاز بنایا گیا ہے، البتہ ''انفرادی ملکیت'' کے حقوق ''اجتماعی ملکیت'' کے ساتھ اس ملک پر تسلیم شدہ ہیں، اسی طرح اجتماعی کاروبار (Public Sector) کے ساتھ انفرادی کاروبار کی اجازت موجود ہے، اور بعض اوقات اس کی ہمت افزائی بھی کی جاتی ہے۔

دستور ہند کی رو سے ہر شہری کو مقررہ ضوابط کے تحت حق انتفاع سرکاری خزانہ سے حاصل ہے، یہ صورت کہ آدمی کسی چیز کا مالک نہ ہو، لیکن حق متعلق ہو جائے اس کی نظیر مورث کے مرض الموت میں مبتلا ہونے پر اس کے دو تہائی مال میں وارثوں کا حق متعلق ہو جاتا ہے، دوسری نظیر ''وقف علی الاولاد'' ہے کہ کوئی خاص فرد انفرادی طور پر مالکانہ تصرف تو نہیں کرسکتا لیکن واقف کی تصریحات کے مطابق ہر فرد کو انتفاع کا حق حاصل ہے، اسی طرح مساجد، سڑکیں، نہریں، وغیرہ فلاح عامہ کی چیزیں، شرعی نقطہ نظر سے کسی کی ملک تو نہیں ہوتیں، لیکن حق انتفاع، عوام کا اس سے متعلق ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ سرکاری خزانہ میں عام شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حق انتفاع حاصل ہے، اس لئے ترقیاتی اسکیموں، مکانات کی تعمیر، تجارتی فروغ، صنعتی ترقی، حرفت کی ہمت افزائی، نیز بے کاروں کو باکار بنانے کے لئے جس قدر حکومت اپنے بجٹ میں رقم رکھتی ہے، ان میں ایک مسلمان شہری کا بھی حق دوسروں کی طرح ہے۔

لیکن حکومت نے اپنے مالیاتی نظام کی بنیاد سود پر رکھی ہے، اس لئے مسلمان اپنے حق کی تحصیل کے لئے پیچھے ہٹ جاتا ہے، فاسد نظام کی تبدیلی کی خواہش اور ممکن حد تک عملی جد و جہد ہر مسلمان کا فرض ہے، اگرچہ موجودہ نظام میں ابھی تک اس تبدیلی کا امکان نہیں، لہٰذا مسلمانوں کے لئے اپنے جائز حق کی تحصیل کے لئے بدرجہ مجبوری سود دینا اور اپنا حق حاصل کرنا، رخصت کے درجہ میں درست ہے، جس طرح علماء نے رشوت لینا اور دینا، دونوں حرام مانا ہے، لیکن ایسی صورت میں، جبکہ جائز حق کا حصول بغیر رشوت دیئے ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں رشوت دینا جائز ہے (مباحث فقہیہ ملخصا/ ۴۶۶ تا ۴۶۸)۔

''سرکاری بینک پر ایک لحاظ سے تمام جمہور کا حق ہے، اور ایک درجہ میں قرض حاصل کرنے کا بھی حق ہے، اس لئے اس سے سودی قرض حاصل کرنے کا معاملہ دوسرے بینکوں کے مقابلہ میں نسبتاً خفیف اور کمتر ہے'' (جدید فقہی مسائل ۴/ ۹۰-۹۱)۔

حکومت کی مالیاتی اسکیموں سے استفادہ:

''اگر کسی شخص کے پاس اپنی ضرورت کے بقدر رہائش کی سہولت نہ ہو، اور اتنا پیسہ بھی نہ ہو کہ مکان بنا سکے، یا کوئی نوجوان بے روزگار ہو اور

---

[1] استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

ضروری حد تک روزگار کے لئے اس کو وسائل مہیا نہ ہوں، تو اس کے لئے حکومت کی ان اسکیموں سے [illegible] پر جو سود ادا کرنا پڑے گا، انشاء اللہ وہ عند اللہ اس سلسلہ میں معذور سمجھا جائے گا، سود کی مجبوری کے بغیر دینا بھی [illegible] کے مقابلہ میں حکومت کو سود ادا کرنے کا معاملہ نسبتاً خفیف ہے، کیونکہ بے مکانوں کو مکان فراہم کرنا [illegible] حکومت کی ذمہ داری ہے"۔ (کتاب الفتاویٰ ۱۰ / ۶۴)۔

دلائل و نصوص شرعی سے مزید [illegible] قلب و ضمیر کے لئے باعث طمانیت [illegible] حرام میں بمقابلہ حرمت و رتبہ پہلے (سود لینے) میں لعینہ (بذات خود) ہے، جبکہ دوسرے (دینے میں) لغیرہ ہے، پہلی صورت [illegible] ناحق کھانا ہے: ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل (بقرہ: ۱۸۸)۔ تو دوسری صورت میں پوری سوسائٹی میں تفاوت، سنگ دلی اور معاشی [illegible] ثم قست قلوبکم من بعد ذلک فہی کالحجارۃ أو أشد قسوۃ" (سورہ بقرہ: ۷۴) کا مصداق بنانا ہے (مباحث فقہیہ / ۲۶۲، ۲۶۳ ملخصا)۔

ضرورت اور مشقت کا اعتبار کب؟

واضح رہے کہ "المشقۃ تجلب التیسیر" قاعدہ فقہیہ کے تحت مشقت و حرج انہیں مواقع پر معتبر ہے، جہاں کوئی حکم منصوص موجود نہ ہو، وضع نص میں عموم بلوی کا اعتبار شرعاً نہیں کیا گیا ہے (ایضاً / ۲۶۳)۔

"المشقۃ والحرج انما یعتبر فی موضع لا نص فیہ" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم، قاعدہ رابعہ، فائدہ ثالثہ، ص ۲۴۸)

اسی طرح فقہی قاعدہ "الضرر یزال" جس کی بنیاد حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام" ہے، اور اس قاعدہ کلیہ سے مختلف ضمنی قواعد متعلق ہیں، مثلاً: "الضرورات تبیح المحظورات" اور ضرورت کی تفصیل کرتے ہوئے حموی نے بیان کیا ہے کہ یہاں پانچ مدارج ہیں:

(۱) ضرورت، (۲) حاجت، (۳) منفعت، (۴) زینت، (۵) فضول (ایضاً / ۲۵۱-۲۵۲، قاعدہ خامسہ، ۲۶۸)۔

ضرورت سے مراد کسی شخص کی احتیاج کا اس حد تک بڑھ جانا ہے کہ اگر اس شئی حرام کا استعمال نہ کرے تو ہلاک یا قریب الہلاک ہو جائے گا، اگر احتیاج اس درجہ کو پہنچ جائے تو شئی حرام کا استعمال مباح ہو جائے گا (ایضاً / حاشیہ ۳ ص / ۲۵۲، مباحث فقہیہ ص / ۲۶۳)۔

حاجت علی العموم حرام کو مباح تو نہیں کرتی لیکن کبھی کبھی حاجت چاہے عام ہو یا خاص، ضرورت کے درجہ میں تسلیم کر لی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسے حاجت مند لوگ جن کے لئے اپنی ضرورت کی تکمیل کا کوئی اور راستہ نہ ہو [illegible] ضروریات بھی ایسی ہیں کہ نا گزیر ہو وانہیں پورا نہ کریں تو بڑی دشواری میں پڑ جائیں گے، ان کے لئے فقہاء نے سودی قرض لینا جائز قرار دیا ہے [illegible] ۲۶۴ بحوالہ الاشباہ و بحر الرائق [illegible]۔

ضرورت یعنی ایسے حالات [illegible] بنیادی ضرورت کی فراہمی کے لئے سودی قرض [illegible] رہے اور فاقہ مستی کی نوبت [illegible] لینا جائز ہے۔

حاجت کے تحت بھی یعنی جب سودی قرض نہ لینے کی شکل میں شدید مشقت یا ضرر کا اندیشہ ہو تو بھی سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، جیسے غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کے لئے اس پر مجبور ہو، مشقت کی ایسی صورتوں میں جو اجتماعی بن گئی ہوں، حکم نسبتاً زیادہ خفیف ہے، اشخاص و افراد کے لئے سودی قرض کب حاجت بن جاتا ہے اور کب نہیں؟ اس کا اندازہ ان کے شخصی حالات، ان کے علاقے اور خاندان کے معیار زندگی سے کیا جائے گا (حلال وحرام / ۱ / ۳۰۳-۲۷۳، ضرورت و حاجت کی رعایت اور حدود کے لئے دیکھئے: نئے مسائل اور اکیڈمی کے فیصلے ص / ۲۸ تا ۳۰)۔

ضرورت کے استثناء کا مقصد، دفع مضرت:

فقہاء کے یہاں عام قاعدہ تو یہ ہے کہ جن چیزوں کا لینا جائز نہیں، ان کا دینا بھی جائز نہیں، [illegible] سے کسی مضرت کے دفع کرنے یا اپنے کسی جائز حق کے حاصل کرنے [illegible]

مثلاً: جان ومال کی حفاظت اور سلطان وامیر کو عدل وبرابری پر آمادہ کرنے کے لئے رشوت دینے کی اجازت دی گئی ہے، چنانچہ فقہاء نے اس کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے: ''الرشوة لخوف على ماله أو نفسه أو ليسوى أمره عند سلطان أو أمير''۔

اور اسی اصل پر ابن نجیمؒ نے سود لینے اور دینے میں فرق کیا ہے کہ سود لینا کسی طرح جائز نہیں، لیکن حاجت مندوں کے لئے سود دینا جائز ہے، ''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' موجودہ حالات میں واقعی بعض دفعہ ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں کہ سودی قرض کا حصول ایک ضرورت بن جاتا ہے (جدید فقہی مسائل ۴/ ۸۵-۸۶، الاشباہ: ۹۱، ۳، قاعدہ: ۱۴، نیز قاعدہ خامسہ: الضرر یزال)۔

حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ نے یہ دریافت کرنے پر کہ وہ کونسی ضرورت ہے جس میں سودی قرض لینا جائز ہے؟ کے جواب میں لکھا ہے: ''ناقابل برداشت مجبوری کے وقت سود لینے سے گناہ نہ ہونے کی توقع ہے، هكذا حكم سائر المحرمات'' (فتاوی محمودیہ ۲۴/ ۴۴۸، فتاوی قاسمیہ ۲۱/ ۳۲)۔

سرکاری سودی قرض لینے کے متعلق ایک سوال کا جواب حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے کس قدر احتیاط کے ساتھ دیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''مجبوری کے بغیر قرض لینا حرام ہے، البتہ بہت زیادہ مجبوری ہو کہ اپنے پاس کوئی چیز ایسی نہیں کہ جس کو بیچ کر مکان بنا سکے، اور قرض بھی نہ ملتا ہو تو سرکاری سودی قرض لینے کی گنجائش ہے'' (کفایت المفتی ۸/ ۴۸، منقول از فتاوی عبد الغنی/ ۴۳۳)۔

ڈاکٹر احمد علی ندوی نے اپنی کتاب ''القواعد الفقہیہ'' میں قاعدہ: ''المشقة تجلب التيسير'' کے تحت ایک حدیث ذکر کی ہے، وہ یہ ہے:

جاء في حديث أسامة بن شريك التغلبي رضي الله عنه قال: ''أتيت النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه كأنما على رؤوسهم الطير، فجاءته الأعراب من جوانب تسأله عن أشياء، فقالوا: هل علينا حرج من كذا؟ فقال: عباد الله! وضع الله الحرج إلا امرءًا اقترض امرءًا ظلمًا، فذلك يحرج ويهلك'' (ابوداؤد الطيالسي؛ القواعد الفقهيه/ ۳۰۴)۔

(حضرت اسامہ بن شریک تغلبیؓ کی حدیث میں ہے: وہ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس حال میں کہ گویا خاموشی کی وجہ سے صحابہ کرامؓ کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، تو اعراب (بدو لوگ) مختلف اطراف سے کچھ چیزوں کے بارے میں دریافت کرنے آئے، انہوں نے پوچھا: کیا اس طرح کرنے میں کوئی حرج ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اصولی بات فرمائی) فرمایا: اللہ کے بندو! اللہ تعالی نے حرج ختم کر دیا ہے، مگر وہ شخص جو کسی آدمی سے ظالمانہ قرض لے، تو وہ حرج اور تباہی میں ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ ظالمانہ قرض میں مشقت اور حرج کی رعایت نہیں ہے، اور سودی قرض بھی ظالمانہ ہے۔

علامہ یوسف القرضاوی تیسیر وتخفیف کو تعسیر وتشدید پر ترجیح دینے کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''من التيسير المطلوب هنا: الاعتراف بالضرورات التي تطرأ في حياة الناس، سواء أكانت ضرورات فردية أم جماعية، فقد جعلت الشريعة لهذه الضرورات أحكامها الخاصة وأباحت بها ما كان محظورًا في حالة الاختيار من الأطعمة والأشربة والملبوسات والعقود والمعاملات، وأكثر من ذلك أنها نزّلت الحاجة في بعض الأحيان- خاصة أو عامة منزلتنا الضرورة أيضًا، تيسيرًا على الأمة ودفعًا للحرج عنها'' (في فقه الاولويات/ ۷۶)

(یہاں مطلوبہ سہولت میں یہ بھی ہے کہ ان ضروریات کا اعتراف کیا جائے جو انسانی زندگی کو پیش آتی ہیں، خواہ وہ ضرورتیں انفرادی ہوں یا اجتماعی، اس لئے کہ شریعت نے ان ضروریات کے مخصوص احکام رکھے ہیں، اور ماکولات، مشروبات، ملبوسات، عقود اور معاملات میں سے حالت اختیار میں جو چیزیں حرام ہیں، ان کو ضرورت واضطرار میں مباح قرار دیا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ حاجت کو بسا اوقات، خواہ خصوصی ہوں یا عمومی، ضرورت کا درجہ بھی دیا ہے، اور ایسا امت پر سہولت اور دفع حرج کے لئے کیا ہے)۔

دلالی کی اجرت:

دلالی کا عام رواج ہے، کثرت سے اس پر لوگوں کا عمل ہے، اس لئے کثرت تعامل کی بنیاد پر اس کی اجرت جائز قرار پائے گی، اگر چہ اصل کے اعتبار سے دلالی پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: ''تاتارخانیہ میں لکھا ہے کہ دلال کے لئے اجرت مثل یا وہ رقم جس پر اصحاب معاملہ کا اتفاق ہو جائے واجب ہوگی، مثلاً یہ کہ دس دینار میں اتنی رقم واجب ہوگی تو یہ حرام ہے اور حاوی میں ہے کہ محمد بن سلمہ سے دلال کی اجرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اگر چہ دلال کی اجرت اپنی اصل کے لحاظ سے فاسد ہے، مگر کثرت تعامل کی وجہ سے اس کی اجازت ہونی چاہئے، بہت سی چیزیں جو ناجائز ہیں، مگر بربنائے حاجت انہیں جائز قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حمام وغیرہ میں داخل ہونے کا مسئلہ ہے (فتاوی قاضی/ ۱۰۸ بحوالہ ردالمحتار ۹ / ۸۷ طبع بیروت)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم نے ایجنٹ کے کمیشن کے بارے میں کہا ہے کہ امام بخاری نے اس پر مستقل باب قائم کیا ہے اور نقل کیا ہے کہ ابن سیرین، عطاء، ابراہیم نخعی اور حسن بصری جیسے بلند پایہ علماء ایجنٹ کے کمیشن کو جائز قرار دیا ہے، حضرت ابن عباس سے بھی جواز منقول ہے، غالباً امام بخاری کا رجحان بھی یہی ہے، ''المؤمنون عند شروطھم'' سے استدلالی ایجنٹ اور مالک کے درمیان ہونے والے باتوں پر، دونوں کا قائم رہنے پر ہے۔

ائمہ اربعہ کا اس سلسلہ میں اختلاف ہے، امام مالک کے یہاں سامان کے فروخت کرنے پر اجرت متعین کرنا جائز ہے لیکن فروخت کی مدت متعین کرنا بھی شرط ہے، یہی رائے امام احمدؒ کی ہے۔

موصوف نے آگے لکھا ہے: ''راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ گو امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر کمیشن ایجنٹ کے کاروبار کی بعض صورتیں ایسی ہیں جو جواز کے دائرہ سے باہر ہیں، لیکن فی زمانہ اس کی کثرت اور ایک حد تک کاروباری دنیا میں اس کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہاء مالکیہ کی رائے کو قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں'' (حلال وحرام/ ۳۵۸-۳۵۹)۔

رشوت کا حکم:

رشوت ''رشأ'' سے ماخوذ ہے، رشأ کے معنی اس رسی کے ہیں جس کے ذریعہ پانی تک پہنچا جائے، چونکہ رشوت کے ذریعہ انسان ناحق کو حاصل کرتا ہے، اس لئے اس کو رشوت کہتے ہیں۔

فقہ کی اصطلاح میں رشوت وہ مال ہے جو کسی کے حق کو باطل کرنے یا کسی باطل کو حاصل کرنے کے لئے دیا جائے۔

''ما یعطی لإبطال حق أو لإحقاق باطل'' (قاموس الفقہ ۳/ ۲۸۱)۔

رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہے، اور حدیث میں لعنت بھیجی گئی ہے، یہی حال رشوت کے لئے واسطہ بننے والے کا ہے۔

''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی'' (ترمذی: ۱۳۸۷)

بعض روایات میں ''الرائش'' بھی ہے ''لینا تو بہر حال حرام ہے، البتہ اپنی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ اور انصاف :ر جائز حق کے حصول کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے'' (حلال وحرام/ ۳۷۵، مزید تفصیل قاموس الفقہ میں دیکھیں)۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ رشوت کا نام بدل جانے سے حکم نہیں بدلتا (تبصرۃ الحکام/ ۲۲ / ۲۳، آداب قضاء/ ۶۴، ایضاً فتاوی قاسمیہ ۲۰ / ۵۲۲)۔

حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ نے مسلمانان افریقہ کی طرف سے ترقیاتی اسکیموں سے استفادہ اور حکومت کے سودی قرضوں کے بارے میں کے ہونے والے سوال پر جو مفصل اور مدلل جواب تحریر فرمایا ہے اس کے چند اقتباس اختصار کے ساتھ پیش کرنا، مفید اور موزوں معلوم ہوتا ہے:

''مسلمانان افریقہ کے حالات کے مقابلہ میں ان مسلمانوں کے حالات زیادہ دردانگیز تھے، جن کو خطاب کر کے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے، اور سخت وعید سنائی گئی ہے، وہ حضرات کفار کے قرضہ میں دبے ہوئے تھے، کفار ان کا خون چوس رہے تھے، حتی کہ حضرت بلالؓ کو دوبارہ غلام بنانے کی دھمکی دی گئی تھی، جس سے انہوں نے پریشان ہو کر مخفی طور پر قرض کی ادائیگی کا انتظام ہونے تک کے لئے، مدینہ سے باہر چلے جانے کا ارادہ کر لیا تھا، وہ حضرات پیٹ پر پتھر باندھتے تھے، کئی کئی روز تک فاقہ کرتے تھے، بھوک کی وجہ سے غش کھا کر گر جاتے تھے، دو دو تین تین ماہ تک گھر میں آگ نہیں سلگتی تھی، پوری تن پوشی کے لئے کپڑا بھی موجود نہیں تھا، نکاح میں مہر دینے کو لوہے کی انگوٹھی تک میسر نہ تھی، بچوں کو بھوکا، روتا، بلکتا دیکھ کر تین چار دانے کھجور حاصل کرنے کے لئے یہودی کی مزدوری کرنا پڑی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواج مطہرات کے نفقہ کے لئے اپنی جہاد والی زرہ یہودی کے پاس رہن رکھنے کی نوبت آئی، اور اسی حال میں وصال ہوا، ان تمام حالات کے باوجود ان حضرات کو کفار کے مال و دولت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کو بھی منع فرمادیا۔

سودی کاروبار کے ذریعہ سے نہ مسلمان کا مال ترقی کر سکتا ہے، نہ ہی محفوظ رہ سکتا ہے، لہٰذا سودی کاروبار کو مال مسلم کی حفاظت یا ترقی کا ذریعہ تجویز کرنا نصوص قرآن وحدیث کا مقابلہ کرنا ہے، مسلمان کی کامیابی اور ترقی حرام وحلال کی تمیز کے بغیر مال جمع کرنے اور تجارت کو فروغ دینے میں ہرگز نہیں، بلکہ اس کی ترقی اور کامیابی احکام شریعت کی پابندی میں ہے، حرام اور لعنت کے کاموں سے پوری طرح پرہیز کرنے میں ہے۔

جب تمام معاشرہ بگڑ چکا ہو، غیر قومیں حرام مال سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوں تو علماء کا یہ کام نہیں کہ مسلمانوں کے لئے بھی جواز کی راہ نکال کر ان غیر قوموں کے اتباع کا فتوی دے دیں، بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ رضاء خداوندی اور ابدی انعامات کا پورا نقشہ قوم کے سامنے اخلاص وقوت کے ساتھ پیش کریں، متعین طور پر بلا کسی تذبذب کے حکم خداوندی سنادیں، بگڑے ہوئے معاشرے اور دیگر اقوام کی ترقیات سے متاثر ہو کر مسلمان کے لئے حرام کی راہیں کھولنا بہت خطرناک ہے، علماء بنی اسرائیل پر اسی وجہ سے پھٹکار لگائی گئی ہے، ورنہ تعمیرات وتجارت، عذاب الٰہی سے روکنے کی قوت نہیں رکھتیں۔

موسم کی خرابی سے اگر امرود سے ہیضہ پھیلنے کا اندیشہ ہو تو حفظان صحت کے ماہرین حدود میونسپلٹی میں بھی امرود داخل نہیں ہونے دیتے، یہ نہیں دیکھتے کہ بندر اور کدتے امرود کھا رہے ہیں اور ان کو ہیضہ کس وجہ سے نہیں ہوتا، کہ ان کی حرص میں انسانوں کو بھی اجازت دے دی جائے'' (تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں فتاوی محمودیہ ۲۴/۳۴۸ تا ۳۶۵)۔

خلاصہ بحث:

... تعاون کی ... اور باعث اجر ہے، قرض دینا بھی نیکی اور امداد ہے، یہ کام انفرادی اور اجتماعی دونوں طور پر کیا جاسکتا ہے، رفاہی ... ہیں، اور حکومت بھی عوام اور رعایا کی معاشی ومعاشرتی ضرورتوں کی کفالت کرتی ہے، تعلیمی ترقی اور صنعتی ... سے حکومت افراد کے لئے تعاون کی مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اور صحت وعلاج، رہائش وزراعت کے لئے متعدد اسکیموں ... بناتی اور متنوع طریقے اپناتی ہے، بنیادی طور پر سرکاری اسکیموں کی دو قسمیں ہیں: (۱) ... قرض۔

امداد کی واپسی نہیں ہوتی اور اس کے جواز میں کوئی کلام بھی نہیں، البتہ قرض کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک وہ قرض جس کی واپسی بلا ... اس قرض سے استفادہ میں بھی کوئی حرج نہیں، دوسری قسم اس قرض کی ہے جس کی واپسی سود کے ساتھ ہوتی ہے خواہ ... سود لینا اور دینا نص صریح قطعی سے حرام ہے، قلیل وکثیر مقدار کی صورت میں حکم نہیں ... تو وہ سود کم ہو یا زیادہ، یہ بھی ذہن میں رہے کہ حکومت کے سودی قرضوں اور عام قرضوں میں فرق ہے، اسی طرح حالت مجبوری ...

سرکاری اسکیموں سے استفادہ-شریعت اسلامی کی روشنی میں

مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی[1]

سوال (۱): وہ قرضے، جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب کے لئے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے:

۱- بینک کی حیثیت کیا ہے؟

۲- بینک میں جمع کی جانے والی رقوم کی حیثیت کیا ہے؟

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ بینک ایک ایسے ادارے کا نام ہے، جو افراد و تنظیم کی امانتیں ایک متعین یا غیر متعین مدت کے لئے قبول کرتا ہے، پھر دوسروں (ضرورت مندوں) کو قرض فراہم کرنے میں ان کا استعمال کرتا ہے، رضوان منیر ماردینی نے ڈاکٹر محمد اسماعیل ہاشم کی کتاب ''مذکرات فی النقود والبنوک'' سے اس کی تعریف یوں نقل کی ہے:

''أنه المنشأة التي تقبل الودائع من الأفراد والهيئات تحت الطلب أو لأجل، ثم تستخدم هذه الودائع في منح القروض والسلفيات'' (البنك الاسلامي ومجالات عمله لرضوان منير الماردينى، ص: ۳)۔

بینک کی اس تعریف سے معلوم ہوا کہ بینک بھی بنیادی طور پر ''جوائنٹ اسٹاک کمپنی'' ہے اور کمپنی کی حیثیت ایک ''قانونی شخص'' کی ہوتی ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بینک میں جمع کی جانے والی رقوم کی حیثیت ''امانت'' کی ہے، جو فقہی طور پر قرض ہوتا ہے (نظریۃ القرض فی الفقہ الاسلامی لأحمد أسعد، ص: ۳۳۲، اسلام اور جدید معیشت و تجارت از: مفتی تقی عثمانی صاحب، ص: ۱۱۵)، اور قرض کا حکم یہ ہے کہ مستقرض (قرض دار) کی ملکیت اس میں ثابت ہوجاتی ہے، لہٰذا وہ اس میں تصرف کا مالک ہوتا ہے، ملک العلماء علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

''وأما حكم القرض: فهو ثبوت الملك للمستقرض في المقرَض للحال'' (بدائع الصنائع: ۷/ ۳۹۶)۔

مذکورہ دونوں باتوں کی وضاحت سے ہمیں معلوم ہوا کہ بینک ایک ایسا ''قانونی شخص'' ہے، جو اپنی ملکیت میں تصرف کرسکتا [illegible] دوسرے کو قرض دے سکتا ہے، اور جب وہ قرض دے سکتا ہے تو اپنے دئے ہوئے قرض کا ایک حصہ معاف بھی کرسکتا ہے، اس [illegible] علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''والدائن إذا قبض دينه، ثم أبرأ المدين عنه صح'' (ردالمحتار، مطلب في التمليك: ۸/ ۵۰۲)۔

قرض خواہ قرض پر قبضہ کے بعد معاف کردے تو یہ درست ہے۔

جب کل قرض کو معاف کرنے کی اجازت ہے تو قرض کا ایک حصہ معاف کرنے کی بدرجۂ اولیٰ اجازت ہوگی؛ چنانچہ علی حیدر [illegible]

''الوجه الرابع: أن يقول الدائن: أعطني نصف ديني على أن تكون بريئًا من النصف [illegible] يذكر وقتًا لأداء النصف، أصبح الإبراء في النصف صحيحا، وكان هذا الإبراء ابراء مطلقًا'' (درر [illegible] إذا أبرأ أحد آخر من حق يسقط حقه...: ۴/ ۷۰)۔

---

[1] جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، ضلع اڈپی، کرناٹک۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ قرض خواہ کہے: مجھے میرے قرض کا نصف، نصف آخر کی معافی کے ساتھ دے دو، اور نصف آخر کی ادائے گی کا وقت غیر مذکور ہو تو نصف میں معافی صحیح ہے اور یہ معافی مطلق ہوگی۔

لہٰذا بینک کے وہ قرضے، جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ البتہ دو باتیں ملحوظ رہنی چاہئیں:

۱- قرض لینا ایک ضرورت ہے، جو پہاڑ کے بوجھ سے بڑھ کر ہوتا ہے؛ اس لئے اس ''ضرورت'' سے استفادہ بقدر ضرورت ہی ہونا چاہئے؛ کیوں کہ اصول ہے: ماأبیح للضرورة یقدر بقدرھا (الأشباہ والنظائر: ۱/۹۵)۔

۲- بینک کا اکثر کاروبار سود پر مشتمل ہوتا ہے، لہٰذا ''شدید قسم کی ضرورت'' پر ہی بینک سے قرض لینے کی کوشش کی جائے۔

سوال (۲): معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے، جب کہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ لوٹانا پڑے؟

جواب: پہلے سوال کے جواب (جس میں یہ بات بتلائی جا چکی ہے بینک قرض دینے کا اختیار رکھتا ہے، لہٰذا وہ اپنے دئے ہوئے قرض کو معاف بھی کرسکتا ہے) کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے قرضوں کے لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے؛ چنانچہ ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''ومن له علی آخر ألف درهم، فقال: ادفع إلي غدا منها خمس مأة علی أنك برئ من الفضل، ففعل، فهو برئ. فإن لم يدفع إليه خمس مأة غدا، عادت الألف عند أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله'' (الفتاوی الهندية، الباب الثانی فی الصلح في الدين... : ۴/ ۲۲۴، العناية مع شرح فتح القدير، باب الصلح فی الدين: ۸/ ۴۴۷)۔

جس شخص کا دوسرے پر ہزار روپے ہوں، وہ کہے: مجھے پانچ سو روپے کی معافی کے ساتھ کل صبح ہزار میں سے پانچ سو روپے دیدو، (اگر) وہ دیدے تو وہ (بقیہ کی ادائے گی) سے بری ہے؛ لیکن اگر صبح پانچ سو ادا نہ کرے تو امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ہزار کی ادائے گی لوٹ آئے گی۔

معلوم ہوا کہ وہ قرضہ، جس میں ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، بھی جائز ہے۔

سوال (۳): اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: زائد رقم ادا کرنے کی دو صورتیں ہیں:

۱- زائد رقم کی واپسی کے ساتھ قرض کی ادائے گی غیر مشروط ہو۔

۲- زائد رقم کی واپسی کے ساتھ قرض کی ادائے گی مشروط ہو۔

پہلی صورت میں زائد رقم کی واپسی کے ساتھ قرض کی ادائے گی جائز ہی نہیں؛ بل کہ مستحسن بھی ہے، خود آں حضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اس کی ترغیب دی ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

''كان لرجل على النبي صلى الله عليه وسلم سن من الإبل، فجاءه يتقاضاه، فقال صلى الله عليه وسلم: أعطوه، فطلبوا سنه، فلم يجدوا له إلا سنًا فوقها، فقال: أعطوه، فقال: أوفيتني، وفى الله بك، قال النبى صلى الله عليه وسلم: إن خياركم أحسنكم قضاءً'' (بخاری، باب حسن القضاء، حديث نمبر: ۲۳۹۳)۔

(رسول اللہ ﷺ کے ذمہ ایک شخص کا خاص عمر کا اونٹ تھا، وہ آپ کے پاس تقاضہ کرنے آیا تو آپ نے (صحابہ کرام کو مخاطب کرکے) فرمایا: اسے دیدو، لوگوں نے اس عمر کا اونٹ تلاش کیا تو اس سے زیادہ عمر کا اونٹ ملا، آپ ﷺ نے فرمایا: وہی اس کو دیدو، اس نے کہا: آپ نے مجھے پورا پورا دیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو پورا اجر دے، آں حضرت ﷺ نے فرمایا: تم میں بہتر وہ شخص ہے، جو قرض اچھی طرح ادا کرے)۔

اس حدیث میں آپ ﷺ نے ''تم میں بہتر وہ شخص ہے، جو قرض اچھی طرح ادا کرے'' کہہ کر صحابہ کو یہ ترغیب دی ہے کہ قرض کی واپسی میں کچھ

زائد دیا جائے، آپ ﷺ نے خود بھی دیا ہے، حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں:

''أتيت النبي صلى الله عليه وسلم، وہو في المسجد، قال مسعر: أراه قال: ضحى، فقال: صل ركعتين، وكان لي عليه دين، فقضاني وزادني'' (بخاری، باب حسن القضاء، حدیث نمبر: ۲۳۹۴)۔

(میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا، جب آپ مسجد میں تشریف فرما تھے، مسعر کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ یہ چاشت کا وقت تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: دو رکعت نماز پڑھو، اور میرا آپ ﷺ پر قرض تھا، آپ نے وہ ادا کیا اور بڑھا کر دیا)۔

اس حدیث میں صاف طور پر مذکور ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت قرض سے زائد رقم کی ادائے گی بہتر ہے، علامہ صنعانیؒ لکھتے ہیں:

''والحديث دليل على جوازه، وأنه يستحب لمن عليه دين من قرض أوغيره أن يرد أجود من الذي عليه، وأن ذلك من مكارم الأخلاق المحمودة عرفًا وشرعًا، ولايدخل في القرض الذي يجر نفعًا؛ لأنه لم يكن مشروطًا من المقرض، وإنما ذلك تبرع من المستقرض'' (سبل السلام، ابواب السلم والقرض والرہن: ۳/ ۱۲۶)۔

(حدیث اس کے جائز ہونے پر دلیل ہے، اور اس پر دلیل ہے کہ قرض دار وغیرہ کے لئے مستحب ہے کہ ذمہ میں واجب سے بہتر لوٹائے، اور یہ عرفاً وشرعاً اخلاق محمودہ کے مکارم میں سے ہے اور یہ اس قرض کے تحت داخل نہیں، جو نفع کو کھینچتا ہے؛ اس لئے کہ وہ قرض خواہ کی طرف سے مشروط نہیں؛ بل کہ قرض دار کی طرف سے تبرع ہے)۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے، یعنی قرض کی واپسی کے ساتھ زائد رقم کی شرط لگائی جائے تو اس سلسلہ میں دو امر قابل تنقیح ہیں:

۱- قرض خواہ کا زیادتی کے ساتھ واپسی کی شرط لگانا درست ہے یا نہیں؟

۲- ایسے قرض سے استفادہ درست ہے یا نہیں؟

امر اول کسی کے نزدیک درست نہیں، اس سلسلہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے آثار، نیز بعض ضعیف روایتیں دلیل ہیں؛ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایسی شرط لگانے سے منع فرمایا ہے، انھوں نے فرمایا:

''من أسلف سلفًا فلايشترط إلا قضاءه'' (مؤطا مالك، باب مالايجوز من سلف، حديث نمبر: ۲۵۱۲)۔

(جو قرض کا معاملہ کرے، وہ شرط نہ لگائے، مگر اسی (قرض) کی ادائیگی کا)۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا قول اور زیادہ واضح ہے، وہ فرماتے ہیں:

''من أسلف سلفًا، فلايشترط أفضل منه، وإن كانت قبضة من علف، فهو ربا'' (مؤطا مالك، باب مالايجوز من سلف، حديث نمبر: ۲۵۱۳)۔

(جس نے قرض کا معاملہ کیا، وہ اس سے بہتر کی شرط نہ لگائے، اگر چہ کہ ایک مٹھی چارہ ہو، تو سود ہے)۔

اس سلسلہ میں سندی اعتبار سے ایک ضعیف روایت بھی ہے، حضرت علیؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ فرمایا:

''كل قرض جر منفعة فهو ربًا'' (بلوغ المرام من أدلة الأحكام، ابواب السلم، والقرض والرہن، حديث نمبر: ۸۶۱)

(ہر وہ قرض، جو منفعت لائے، وہ سود ہے)۔

علامہ عینیؒ نے اس پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے، وہ رقم طراز ہیں:

''وقد أجمع المسلمون بالنقل عن النبي صلى الله عليه وسلم أن اشتراط الزيادة في السلف حرام'' (عمدة القاري، باب بيع العبيد والحيوان بالحيوان: ۱۲/ ۶۴)۔

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونے کی بنا پر قرض میں زیادتی کی شرط باجماع مسلمان حرام ہے)۔

علامہ ابن بطالؒ لکھتے ہیں:

"ولا خلاف بین العلماء أن اشتراط الزیادۃ فی ذلك ربًا لا یحل" (شرح صحیح البخاری، باب استقراض الابل ۶/۵۱۷)

(علماء کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ اس (قرض) میں زیادتی کی شرط سود ہے، جو جائز نہیں)۔

لہٰذا زیادتی کے ساتھ واپسی کی شرط پر قرض دینا درست نہیں کہ یہ سود ہے، جو حرام لذاتہ ہے۔

جہاں تک دوسرے امر کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ قرض ایک ضرورت ہے، جو ایسے وقت میں لینا جائز ہے، جس میں انسان محتاج ہو اور قرض نہ لینے کی صورت میں ضرر کا اندیشہ ہو؛ کیونکہ شریعت انسانی ضرر کو دور کرنے کا حکم دیتی ہے، آپ علیہ السلام کا ارشاد ہے:

لاضرر ولاضرار (مؤطا امام مالك، باب القضاء فی المرفق، حدیث نمبر: ۱۴۲۹) "نہ نقصان اٹھانا ہے نہ نقصان پہنچانا"،

اسی وجہ سے "الضرر یزال" اور "الضرورات تبیح المحظورات" کے اصول بنائے گئے ہیں۔

لہٰذا سودی قرض کے علاوہ کوئی اور شکل مسئلہ کے حل کی نہ نکلتی ہو تو سودی قرض لینا درست ہے۔

سوال (۴): غیر معافی قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو؛ لیکن اس کی شرح سود بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرہ میں آئے گا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت و گنجائش ہوگی؟

جواب: سروس چارج کو ہم دو صورتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱- وہ سروس چارج، جو پیسے رکھنے والوں سے وصول کیا جائے۔

۲- وہ سروس چارج، جو اپنے قرض داروں سے وصول کیا جائے۔

پہلی صورت کے جواز میں کوئی شک نہیں؛ کیونکہ بینک ایک ایسی کمپنی ہے، جس کے پاس لوگ روپے پیسے قرض کی شکل میں ودیعت رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان روپیوں کی حفاظت کے لئے افراد کی ضرورت پڑتی ہے، پھر اسی کے ساتھ ساتھ روپیوں کے حساب وکتاب کے لئے رجسٹر بھی تیار کرنا ہوتا ہے اور ان میں اخراجات ایک لازمی شئ ہے، کمپنی اپنی طرف سے روپیوں کی حفاظت پر مامور افراد اور حساب وکتاب کے لئے تیار رجسٹروں کے لئے خرچہ برداشت نہیں کر سکتی؛ اس لئے بینک ہر کھاتہ دار سے کچھ رقم سروس چارج کے نام سے لیتی ہے، جو دراصل روپیوں کی حفاظت کے لئے اور **"الأجرۃ إنما تکون فی مقابلۃ العمل"** (ردالمحتار، مطلب دعوی الأب أن الجہاز عاریۃ: ۳/۱۵۶) کے طور پر ہوتی ہے؛ چنانچہ "الجوہرۃ النیرۃ" میں ہے:

"... بخلاف الودیعۃ إذا شرط المودِع للمودَع أجرًا علی حفظها، فله الأجر" (الجوہرۃ النیرۃ، کتاب الرہن: ۲/۴۰۱)۔

(ودیعت کے برخلاف، جب صاحبِ ودیعت ودیعت کی حفاظت کے لئے ودیعت رکھنے والے کے لئے اجرت کی شرط لگائے تو اس کے لئے اجرت ہوگی)۔

ڈاکٹر احمد اسعد رقم طراز ہیں:

"والحکم الشرعی لهذه الصورۃ یتلخص فی أن المصرف یتقاضی أجرًا مقابل الخدمات التی یقدمها للمودع، وهذا جائز شرعًا، ولا مجال للشبهة فی اختلاط الأجر بالربا، أو المنفعة المحرمة" (نظریۃ القرض فی الفقه الاسلامی، ص: ۳۲۴، بحواله: تطویر الأعمال المصرفیة، ص: ۳۶۸، مشکلة الاستثمار فی البنوك الإسلامیة وکیف عالجها الاسلام، ص: ۵۵۵)۔

(اس صورت کے حکم شرعی کا خلاصہ یہ ہے کہ بینک اپنی ان خدمات کے لئے اجرت کا تقاضی کرتا ہے، جو وہ مودع کے لئے انجام دیتا ہے، یہ شرعاً جائز ہے اور اس میں سود اور منفعت محرمہ کے ساتھ اختلاط کا کوئی شبہ نہیں ہے)۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے تو اس کی بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱- قرض کسی شخص سے لیا جائے اور وہ سروس چارج کے نام سے کچھ رقم لے۔

۲- قرض کسی ادارہ سے لیا جائے اور وہ ادارہ سروس چارج کے نام سے کچھ رقم لے۔

پہلی صورت میں سروس چارج کے نام سے قرض کے علاوہ کچھ رقم لینا عام حالت میں درست نہیں؛ کیونکہ یہاں کسی عمل کے مقابلہ میں یہ "رقم" نہیں ہے، لہٰذا یہ "الأجرة إنماتكون في مقابلة العمل" کے دائرہ میں نہیں ہوگا؛ البتہ خاص حالت میں مثلاً: اس کے پیسے دوسرے شہر میں ہوا ور قرض لینے والے کو سخت ضرورت ہو، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پیسے لانے کے لئے دوسرے شہر جانے کا خرچ لینا درست ہوگا؛ کیوں کہ یہ "الأجرة إنماتكون في مقابلة العمل" کے تحت داخل ہے۔

دوسری صورت میں سروس چارج کے نام سے کچھ رقم لینا درست ہے کہ یہ "اجرۃ العمل" ہے؛ البتہ اس کے لئے اس بات کو لازم قرار دیا جائے کہ یہ زائد رقم قرض کا معاملہ کرتے وقت ہی لیا جائے، قرض کی واپسی کے وقت نہ لیا جائے، قرض کی واپسی کے وقت لینے میں سود کے شبہ کا امکان ہے، جس سے بچنا بھی ضروری ہے؛ کیوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"...فمن اتقى المشتبهات استبرأعرضه ودينه ، ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام" (ابوداود، باب في اجتناب الشبهات، حدیث نمبر: ۳۳۳۲)۔

(جوشبہات سے بچا، اس نے اپنے دین وآبرو کو (طعن وتشنیع سے) بچالیا اور جوشبہات میں پڑ گیا، وہ حرام میں جا پڑا)۔

یہ تو بات اس وقت کی ہے، جب سروس چارج کے نام سے کچھ زائد رقم لی جائے؛ لیکن زائد رقم کا نام سروس چارج نہ ہو، تاہم اس کی مقدار اتنی ہی ہو، جتنی سروس چارج کی ہوتی ہے، تو کیا اسے بھی سروس چارج سمجھا جائے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں دو باتیں ہیں:

۱- سروس چارج کی مقدار والی رقم اگر چہ سروس چارج نہ کہلاتا ہو؛ لیکن عرف میں اسے سروس چارج ہی سمجھا جاتا ہو تو اسے سروس چارج ہی سمجھا جائے (جس کے احکام گزر چکے ہیں)؛ کیوں کہ فقہی اصول ہے: "الثابت بالعرف كالثابت بدليل شرعي" (عرف سے ثابت ہونے والی چیز دلیل شرعی سے ثابت شدہ حکم کی طرح ہے)، ایسی صورت میں اسے سود نہیں سمجھا جائے گا۔

۲- اگر عرف میں سروس چارج نہ سمجھا جاتا ہو تو اسے سروس چارج نہ سمجھا جائے اگر چہ کہ مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کے برابر ہو؛ کیوں کہ عرفی اور وضعی دونوں اعتبار سے اسے سروس چارج نہیں سمجھا جاتا اور جب سروس چارج نہیں سمجھا جاتا تو پھر اس کا حکم بھی ثابت نہ ہوگا؛ کیوں کہ فقہ کا ایک اصول ہے: "اختصاص العقد باسم لاختصاصه بحكم يدل عليه معنى ذلك الاسم" (حکم کے ساتھ مختص ہونے کے لئے عقد کا کسی نام کے ساتھ مختص ہونا اسی نام پر دلالت کرتا ہے، جس پر وہ نام دلالت کرے)، جیسے کسی شخص نے قسم کھائی کہ وہ فلاں کے گھر نہیں جائے گا، اس شخص کے قسم کھانے کے بعد وہ فلاں اپنے گھر کو باغ یا مسجد میں تبدیل کردے، پھر قسم کھانے والا اس باغ یا مسجد میں داخل ہو تو وہ شخص حانث نہیں ہوگا؛ کیونکہ:

"عقد اليمين باسم الدار، والبستان والمسجد والحمام غيرالدار، فإذالم يبق ذلك الاسم لايبق اليمين" (الجامع الصغير، باب اليمين في الدخول والخروج والسكنى والركوب: ۱/ ۲۵۹، نیز دیکھئے: المبسوط للسرخسي، باب المهايأة: ۲۰/ ۱۴۷)۔

(قسم کا معاملہ گھر کے نام کے ساتھ پیش آیا، جب کہ باغ، مسجد اور حمام نام زد گھر نہیں، پس جب نام باقی نہیں رہا تو قسم بھی باقی نہیں رہی)۔

لہٰذا ایسی صورت میں اسے سود سمجھا جائے گا۔

سوال (۵): اگر سرکار کی طرف سے دئے جانے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو، جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جا سکے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: سوال نمبر (۴) کے جواب سے یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط اگر معمولی نہ ہو، جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جا سکے تو اس زائد رقم کا شمار سود میں ہوگا؛ کیونکہ شریعت میں "سود ایسے لین دین میں فریقین میں سے کسی ایک کے لئے اضافہ کو کہتے ہیں، جو عوض سے

خالی ہو"، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

"(هو) شرعًا (فضل) ولو حكما خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين" (الدرالمختار: ۴/ ۲۲۵)

لہٰذا یہ بھی سود ہوگا؛ البتہ اگر یہ قرضے جانوروں کے پالنے، مکان کی تعمیر اور کاشت کاری و باغبانی وغیرہ یا پھر کاروبار کے لئے دئے جارہے ہیں تو ایسی صورت میں مسئلہ کی دو صورتیں ہوں گی:

۱- ان قرضوں میں کسی قسم کی کوئی چھوٹ نہ دی جائے؛ بلکہ پوری رقم کی واپسی کے ساتھ ساتھ زائد رقم بھی لی جائے، ظاہر ہے کہ ایسا معاملہ سودی کہلائے گا، جس کے احکام پیچھے گزر چکے ہیں۔

۲- ان قرضوں میں کچھ چھوٹ بھی دی جائے (جسے عرف میں سب سی ڈی کہا جاتا ہے)، ایسی صورت میں دیکھا جائے گا کہ:

(الف) چھوٹ کی رقم زائد رقم سے زیادہ یا اس کے برابر ہے، ایسی صورت میں یہ سود نہیں کہلائے گا، اس سلسلہ میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی تجویز موجود ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ:

ہندوستان میں بعض سرکاری قرضے ایسے ہیں، جس میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (Subsidy) دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم چھوٹ (Subsidy) کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں ہے (نئے مسائل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۱۶۸)۔

(ب) چھوٹ کی رقم زائد رقم سے کم ہے، ایسی صورت میں یہ سود ہوگا، جس کے احکام پیچھے گزر چکے ہیں، مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ رقم طراز ہیں:

"......اور اگر سود کی رقم چھوٹ میں ملی ہوئی رقم (یعنی سب سیڈی) سے زیادہ دینی پڑیں تو پھر یہ معاملہ سودی کہلائے گا اور جائز نہ ہوگا" (فتاوی رحیمیہ: ۹/ ۳۳۲)

سوال نمبر (۶): ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً: مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جب کہ ان رقوم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب: ایسی رقوم کا حصول اور ان کا استعمال دونوں جائز ہیں کہ یہ حکومت کی طرف سے اپنی رعایا کی امداد و تعاون ہے، جو حکومت کی ذمہ داری ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته، الإمام راع ومسئول عن رعيته... (بخاری، باب الجمعة في القرى والمدن، حديث نمبر ۸۹۳)

(تم سب ذمہ دار ہو اور تم سب سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھ ہوگی، امام (حاکم) ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھ ہوگی)۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام نوویؒ لکھتے ہیں:

قال العلماء: الراعي هو الحافظ المؤتمن الملتزم صلاح ماقام عليه وماهو تحت نظره، ففيه أن كل من تحت نظره شئ فهو مطالب بالعدل فيه والقيام بمصالحه في دينه ودنياه ومتعلقاته" (شرح النووي على مسلم، باب فضيلة الأمير العادل وعقوبة الجائر: ۱۲/ ۲۱۳)۔

(علماء فرماتے ہیں کہ 'راعی' اس امانت دار نگراں کو کہتے ہیں، جو اپنی ذمہ داری اور اپنے ماتحت کی درستگی اور سلامتی کا التزام کرتا ہو؛ چنانچہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہر شخص اپنے ماتحت کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرے اور اس کے دینی و دنیوی مصلحتوں کو انجام دے)۔

علامہ عینیؒ لکھتے ہیں:

"قال بعض أهل العلم: يجب على الإمام أن يقضي من بيت المال دين الفقراء ... كما أن على الإمام أن

یسد رمقه، ویراعی مصلحته الدنیویة'' (عمدة القاری، باب إذا أحال دین المیت علی رجل جاز، حدیث نمبر: ۲۲۸۹)۔

(بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ امام (حاکم) پر لازم ہے کہ وہ فقراء کا قرض بیت المال سے ادا کریں...... جیسا کہ ان پر ان کی دنیاوی مصالح کی رعایت اور بقدر کفاف روزی مہیا کرنا ضروری ہے)۔

معلوم ہوا کہ اپنی رعایا کی اعانت حکومت کی ذمہ داری ہے اور یہ اسی قبیل سے ہے؛ اس لئے ایسی رقوم کا حصول اور ان کا استعمال دونوں جائز ہیں۔

سوال نمبر (۷): گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم- جس قسم کی بھی ہوں- ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہے؟

جواب: جو لوگ واسطہ بنتے ہیں، انھیں تجارتی اصطلاح میں ''دلال'' کہتے ہیں، دلالی کا پیشہ مباح ہے؛ اس لئے ان کو محنتانہ دینا اور خود ان کا اس کام کے لئے پیسے لینا دونوں جائز اور درست ہیں؛ البتہ اس کے لئے ایک شرط ہے، وہ یہ کہ اجرت متعین ہونی چاہئے، مجہول اجرت طے کرنا درست نہیں؛ چنانچہ فتاوی بزازیہ میں ہے:

''وفی الدلال والسمسار أجر المثل، وماتواضعوا أن من کل عشرة کذا حرام علیهم'' (الفتاوی البزازیة علی هامش الهندیة: ۵/ ۴۹)۔

(دلال اور سمسار میں اجرت مثل ہے، اور جو اس طرح طے کریں کہ ہر دس میں اتنا ہے تو یہ ان پر حرام ہے)۔

دلالی کی اجرت کے جواز کی وجہ کو بتلاتے ہوئے علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

''وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن کان فی الأصل فاسدًا لکثرة التعامل، وکثیر من هذا غیر جائز، فجوزوه لحاجة إلیه کدخول الحمام'' (حاشیة ابن عابدین، باب الاجارة، مطلب فی أجرة الدلال ۹/ ۸۷)۔

(''حاوی'' میں ہے کہ محمد بن سلمہ سے سمسار (دلال) کی اجرت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا: مجھے امید ہے کہ اس میں کثرتِ تعامل کی وجہ سے کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ کہ اصل میں یہ فاسد ہے، اس طرح کے بہت سارے امور ناجائز ہیں؛ لیکن لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے جیسے حمام میں جانا)۔

''فتاوی محمودیہ'' میں پوری وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ:

دلالی یہ ہے کہ بائع ومشتری کے درمیان معاملہ کرایا جائے، اس میں بائع ومشتری دونوں کو ثمن (قیمت) معلوم ہوتی ہے اور دلال کو اس ثمن کے علاوہ اجرت ملتی ہے، خواہ وہ اجرت پانچ دس روپے کی صورت میں متعین ہو، خواہ اس طرح کہ فی صد دس روپے یا فی روپیہ ایک آنہ اجرت مقرر کی جائے، وہ اجرت درست ہے، جس قدر بھی ہو، فقط، واللہ سبحانہ أعلم (فتاوی محمودیہ: ۴/ ۷۰)۔

ان تمام عبارتوں سے معلوم ہوا کہ واسطہ بننے والے لوگوں کو محنتانہ دینا اور ان کا روپے لینا دونوں جائز ہیں۔

سوال نمبر (۸): بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: اس سوال کے جواب کے لئے دو باتوں پر بحث ضروری معلوم ہوتی ہے:

۱- کسی چیز کے ملکیت میں آنے سے پہلے اس میں تصرف کا اختیار ہوتا ہے یا نہیں؟

۲- جزء عمل کو اجرت بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

پہلی بات کے سلسلہ میں یہ جان لیں کہ سرکاری اسکیموں کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، ان میں سے ایک شکل یہ ہے کہ:

۱- وہ اسکیم عام ہو، جسے ہر وہ شخص حاصل کرسکتا ہے، جو اس اسکیم کے سلسلہ میں مقررہ شرائط کے دائرہ میں آتا ہو، مثلاً: بی پی ایل کارڈ ہولڈرس تمام کے تمام فی روپیہ کلو چاول خرید سکتے ہیں اور اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۲- اس اسکیم سے فائدہ صرف وہی اٹھا سکتا ہے، جس کے نام کا اندراج اس اسکیم کے لئے ہو چکا ہو، جیسے: گھر اور بیت الخلاء وغیرہ کے لئے حکومتی اعانت کی اسکیم، ظاہر ہے کہ یہ بھی بی پی ایل کارڈ ہولڈرس کے لئے ہی ہے؛ لیکن اس اسکیم سے فائدہ صرف وہی اٹھا سکتا ہے، جس کے نام کا اندراج ہو چکا ہو، اس کے علاوہ دوسرے بی پی ایل کارڈ ہولڈرس فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

پہلی صورت میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی؛ اس لئے اس کے سلسلہ میں درمیانی شخص کی ضرورت بھی نہیں پڑتی؛ البتہ دوسری صورت میں دشواری پیش آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں درمیانی شخص کی ضرورت پیش آتی ہے؛ اس لئے یہاں اسی سے متعلق بات کی جائے گی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسکیم کے لئے کسی کے "نام کے اندراج" کی حیثیت کیا ہے؟ آیا نام کے اندراج کو یہ سمجھا جائے کہ وہ چیز اس کے لئے ہو چکی ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سرکاری اسکیموں میں نام کے اندراج سے عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ چیز اس کی ہو چکی ہے؛ چنانچہ علامہ شامیؒ کی ایک عبارت سے اس کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"(لوغير مسجل) أي محكوم به، فأطلق التسجيل، وهو الكتابة في السجل، وأراد ملزومه، وهو الحكم؛ لأنه في العرف إذا حكم بشئي كتب في السجل" (ردالمحتار، كتاب الوقف، مطلب في وقف المريض: ۶/ ۵۴۳)۔

((اگر غیر مسجل) یعنی غیر محکوم بہ ہو؛ چنانچہ تسجیل کو مطلق رکھا، جس کے معنی رجسٹر میں لکھنے کے آتے ہیں اور مراد لازم ہونے والی شئی یعنی حکم ہے؛ کیوں کہ عرف میں جب کسی چیز کا حکم دیا جاتا ہے تو رجسٹر میں لکھ دیا جاتا ہے)۔

یہ اور بات ہے کہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں نہیں آیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ہاتھ آئے بغیر کسی چیز میں تصرف جائز ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چیزوں کی قسمیں ہیں، جن میں سے بعض قسموں میں قبل القبض تصرف جائز نہیں، جیسے بیع قبل القبض تصرف جائز ہے، علامہ کشمیری "بیع قبل القبض" کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"واعلم أن الاختلاف المذكور إنما هو في البيع خاصة، لا في سائر التصرفات؛ لأنهم جوزوا الهبة والتصدق قبل القبض كما في النهاية والبحر عن محمد" (فيض الباري، باب بيع الطعام قبل أن يقبض وبيع ماليس عندك، حديث نمبر: ۲۱۳۵)۔

(جاننا چاہئے کہ مذکورہ اختلاف یہ خصوصیت کے ساتھ بیع میں ہے، تمام تصرفات میں نہیں؛ کیونکہ فقہائے کرام ہبہ اور صدقہ میں قبل القبض تصرف کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ بحر اور نہایہ میں امام محمدؒ سے منقول ہے)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ سرکاری اسکیموں کا تعلق چوں کہ بیع سے نہیں ہے، نیز نام کے اندراج کی وجہ سے یک گونہ ملکیت حاصل ہو جاتی ہے؛ اس لئے اس میں تصرف کرنے کا اختیار ہے۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے، یعنی جزء عمل کو اجرت بنانا، آیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے اور شریعت میں اس طرح کی کئی مثالیں ہمیں ملتی ہیں؛ چنانچہ اس کی سب سے بڑی مثال "مضاربت" ہے، جس میں جزء عمل کو ہی اجرت بنایا جاتا ہے، عقد مضاربت کے وقت مضارب سے کہا جاتا ہے:

"خذ هذا المال، واعمل به على أن لك من الربح نصفه أو ثلثه" (البحر الرائق، كتاب المضاربة: ۷/ ۴۴۸)۔

(اس مال کو لو اور نفع میں سے نصف یا ثلث پر عمل کرو)۔

اس سے معلوم ہوا کہ واسطہ بننے والے لوگوں کا حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لینا، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرنا درست ہے۔

سوال نمبر (۹): اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: رشوت اس شئی کو کہا جاتا ہے، جو ابطالِ حق یا احقاقِ باطل کے لئے دیا جائے، یہ باجماعِ امت حرام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''لعن رسول اللہ ﷺ الراشي والمرتشي'' (ابوداود، باب في كراهية الرشوة، حديث نمبر: ۳۵۸۲، ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۳۶)

لیکن اس حرمت سے اس شخص کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، جو اپنے حق کے حصول کے لئے رشوت دے، علامہ بغویؒ لکھتے ہیں:

''فأما إذا أعطى المعطي ليتوصل به إلى حق، أو يدفع عن نفسه ظلمًا، فلابأس'' (شرح السنة، باب الرشوة والهدية للقضاة والعمال، حدیث نمبر: ۲۴۹۳)۔

جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ معطی اپنے حق تک پہنچنے یا ظلم سے اپنے کو بچانے کے لئے رشوت دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

علامہ ابن ہمامؒ رشوت کی قسمیں تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الرابع: مايدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه وماله حلال للدافع حرام على الآخذ؛ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب، ولايجوز أخذالمال ليفعل الواجب'' (شرح فتح القدير، كتاب أدب القاضي: ۷/ ۲۳۶، ردالمحتار، کتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية: ۸/ ۳۴)۔

(چوتھی قسم: جو مدفوع الیہ سے جان و مال پر خوف کو دور کرنے کے لئے دے، یہ دینے والے کے لئے جائز ہے، لینے والے کے لئے؛ کیونکہ مسلمان سے ضرر کو دور کرنا واجب ہے، اور واجب کی ادائے گی کے لئے مال لینا جائز نہیں (اس لئے رشوت لینا درست نہیں)۔

''فتاوی ہندیہ'' میں ہے: ''إذادفع الرشوة لدفع الجور عن نفسه، أو أحد من أهل بيته، لم يأثم'' (الفتاوى الهندية، كتاب الهبة، الباب الحادي عشر في المتفرقات: ۴/ ۴۰۳)۔

(جب رشوت اپنے آپ یا اپنے گھر والوں سے ظلم کو دفع کرنے کے لئے دے تو وہ (دینے والا) گنہ گار نہیں ہوگا)۔

ان تمام عبارتوں سے معلوم ہوا کہ دفع ظلم اور حق کی وصولی کے لئے رشوت دینا جائز ہے، اب دیکھنا یہ ہوگا کہ جن امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے رشوت دی جارہی ہے، وہ حق کے حصول کے لئے ہے یا نہیں؟ اگر حق کے حصول کے لئے ہے تو درست، ورنہ نادرست ہوگا، مثلاً: ایک شخص حکومتی امداد کا مستحق یا ایسا ضرورت مند ہے، جس کے لئے قرض لینا جائز ہے؛ لیکن بغیر کچھ دئے نہ وہ امدادی رقم مل پارہی ہے اور نا ہی قرض ہی حاصل ہورہا ہے، ایسی صورت میں کچھ دے دلا کر امدادی رقم اور قرض حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

سوال نمبر (۱۰): امدادی رقم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط و معیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: امدادی رقم یا قرض حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانا نادرست ہے؛ کیوں کہ یہ دھوکہ دینا ہے، جس سے اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''من حمل علينا السلاح، فليس منا، ومن غشنا، فليس منا'' (صحيح مسلم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: من غشنا فليس منا، حدیث نمبر: ۱۰۱)۔

(جس نے ہم پر ہتھیار اٹھایا، وہ ہم میں سے نہیں اور جس نے ہمیں دھوکہ دیا، وہ ہم میں سے نہیں)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

''ليس منا من غش'' (جامع الأصول في أحاديث الرسول، فيما لايجوز فعله في الحداء، الفرع الأول: في مطلق الحداء حديث نمبر: ۳۲۸)۔

غلط بیانی کرنا ان اعمال میں سے ہے، جن پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے، ارشاد تعالیٰ ہے: "لعنت اللہ علی الکاذبین" (آل عمران: ٦١)۔

نیز یہ باطل طریقہ سے مال کھانا ہے، جس سے قرآن نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے، ارشاد باری ہے:

"وَلاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُواْ بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُواْ فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ" (البقرة: ۱۸۸)

(اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لئے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقہ سے کھانے کا موقع مل جائے)۔

دروغ گوئی مؤمن کی شان کے خلاف ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کل خلة یطبع علیها المؤمن؛ إلا الخیانة والکذب" (مسند ابی یعلی، حدیث نمبر: ۷۱۱، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۱۷۰، مصنف ابن ابی شیبة، حدیث نمبر: ۳۰۹۷۵)۔

خیانت اور دروغ گوئی کے علاوہ ہر عادت مؤمن کے اندر ہو سکتی ہے۔

ان تمام آیات واحادیث سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ غلط بیانی سے کام لینا درست نہیں، "الموسوعة الفقهية کویت" میں ہے:

"اتفق العلماء على أن الغش حرام، سواء أكان بالقول، أم بالفعل، وسواء أكان بكتمان العيب في المعقود عليه، أوالثمن، أم بالكذب والخديعة، وسواء أكان في المعاملات، أم في غيرها من المشورة والنصيحة" (الموسوعة الفقهية، لفظ: غش: ۳۱/ ۲۱۹)۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دھوکہ حرام ہے، خواہ قول کے ذریعہ سے ہو یا فعل کے ذریعہ سے، یا معقود علیہ یا ثمن میں عیب کو چھپا کر ہو، یا جھوٹ یا دھوکہ کے ذریعہ سے ہو اور خواہ یہ معاملات میں ہو یا اس کے علاوہ مشورہ یا نصیحت وغیرہ میں۔

البتہ بعض دفعہ حق کو حاصل کرنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لینا ایک مجبوری بن جاتا ہے، جیسے: کوئی شخص حکومت کے متعینہ معیارات پر مکمل اتر رہا ہو اور وہ محتاج بھی ہو؛ لیکن کرپٹیڈ عناصر کے ہاتھوں میں امدادی رقوم رہنے کی وجہ سے جھوٹ کا سہارا لئے بغیر حاصل کرنا ممکن نہ ہو ایسی صورت غلط بیانی سے کام لینے کی گنجائش ہونی چاہئے، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حق کو حاصل کرنے کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہے، نیز مجبوری میں سودی قرض لینا جائز ہے، یہاں بھی غلط بیانی ایک مجبوری ہے: اس لئے جائز ہونی چاہئے۔

سوال (۱۱): بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بل کہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اس سوال کو چار مختلف اجزاء میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱- تعلیم کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ خود حکومت ادا کرے۔

۲- تعلیم کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرے۔

۳- تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ خود حکومت ادا کرے۔

۴- تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرے۔

پہلی صورت (تعلیم کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ خود حکومت ادا کرے) کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا بالکل جائز ودرست ہے؛ کیوں کہ حکومت جو زائد رقم ہماری طرف سے ادا کر رہی ہے، وہ ہمارے لئے اعانت ہے، جس سے فائدہ اٹھانا ایک جائز عمل ہے، جیسا کہ سوال نمبر (٦) کے جواب میں گزر چکا ہے۔

دوسری صورت (تعلیم کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرے) کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ اس میں سود ادا کرنا پڑتا ہے، خواہ جس مقدار میں ہو؛ اس لئے ایسے قرض کے سلسلہ میں دو باتوں میں غور کرنے کی ضرورت ہے:

۱- جس تعلیم کے لئے قرض لیا جارہا ہے، وہ فرض کفایہ میں سے ہے اور قرض لینے والے شخص کے علاقہ میں فرض کفایہ کی ادائے گی کرنے والا کوئی نہیں۔

۲- وہ تعلیم، جس کے لئے قرض لیا جارہا ہے، ہو تو فرض کفایہ تو ہے، لیکن اس کی ادئے گی کرنے والے موجود ہوں۔

ان دونوں صورتوں کے احکام بیان کرنے سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ فرض کفایہ علوم کونسے ہیں؛ تاکہ حکم لگانے میں سہولت بہم ہوسکے، مشہور اسلامی فلاسفر امام غزالیؒ نے 'فرض کفایہ علوم' کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''أما فرض الكفاية، فهو علم لا يستغني عنه في قوام أمور الدنيا كالطب، إذ هو ضروري في حاجة بقاء الأبدان، وكالحساب، فإنه ضروري في المعاملات، وقسمة الوصايا، والمواريث وغيرهما، وهذه هي العلوم التي لو خلا البلد عمن يقوم بها حرج أهل البلد، وإذا قام بها واحد كفى وسقط الفرض عن الآخرين'' (إحياء علوم الدين، كتاب العلم، الباب الثاني: بيان العلم الذي هو فرض كفاية: ۱/۲۸)۔

(جہاں تک فرض کفایہ کا تعلق ہے تو وہ علم ہے، جس سے دنیاوی معاملات کی درستگی میں چھٹکارہ نہیں، جیسے: ڈاکٹری کہ جسمانی بقا کی حاجت کے لئے یہ ضروری ہے، اور جیسے: حساب کہ میراث و وصیت کی تقسیم اور معاملات کے لئے ضروری ہے، اور یہ وہ علوم ہیں کہ اگر شہر ان کے جاننے والے سے خالی ہو تو اہل شہر حرج و مشقت میں پڑ جائیں اور اگر ایک شخص بھی ان امور کو انجام دینے والا ہو تو کافی ہوگا اور دوسروں سے فرض ساقط ہوجائے گا)۔

امام غزالیؒ کی وضاحت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں قرض لینے کی گنجائش ہونی چاہئے، بالخصوص موجودہ زمانہ میں اور ہمارے ملک میں، جہاں فرقہ پرستی کا عفریت راج کرتا ہے، گنجائش کی یہ بات اس مسئلہ کی روشنی میں بھی کہی جاسکتی ہے، جس میں ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' کے ذریعہ محتاج کے لئے سودی قرض لینے کی بات کہی گئی ہے، فرض کفایہ کی تعلیم، جب کہ پورا علاقہ خالی ہو، ایک دینی اور قومی ضرورت ہے، جو ذاتی ضرورت سے کہیں بڑھا ہوا ہے؛ اس لئے اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے تو اس میں گنجائش نہیں ہونی چاہئے کہ یہاں نہ دینی ضرورت ہے اور نا ہی قومی ضرورت۔

تیسری صورت (تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ خود حکومت ادا کرے) کا جواب بھی اثبات میں ہے کہ یہ حکومت کی طرف سے ہماری اعانت ہے، جو حکومت پر ضروری ہے؛ اس لئے اس صورت میں حکومت کی اعانت سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

اب رہی چوتھی صورت (تعلیم کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لئے حکومت کا کسی کو بینک سے قرض دلا کر بینک انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرے) کی بات، تو اس سلسلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ:

۱- اگر وہ مقصد ایک ''ضرورت'' ہے تو ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' کی روشنی میں اس طرح کے قرض سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

۲- لیکن اگر وہ مقصد ''ضرورت'' نہیں تو اس کے لئے اس طرح کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

سوال نمبر (۱۲): بعض اسکیمیں ایسی بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا گیا ہے اور انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے تو کیا یہ صورت درست ہوگی؟

جواب: اس طرح کی اسکیموں سے استفادہ کرنا جائز ہے؛ کیونکہ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کے اندر دو چیزوں کی صلاحیت اور اس کی دو مختلف حیثیتیں ہوں، جیسے: ولایتِ نکاح کا ایک مسئلہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر کسی صغیرہ لڑکی کا ولی اس کا چچازاد بھائی ہو اور وہ چچازاد بھائی اپنی چچازاد بہن سے نکاح کرلے

تو جائز ہے، یہاں اس کی دو حیثیتیں بتلائی گئی ہیں:

"فیکون أصیلًا من جانب، ولیا من جانب أخر" (اللباب فی شرح الکتاب، کتاب النکاح: ۱/ ۲۵۹)۔

(وہ ایک جانب سے اصیل (بذاتِ خود) ہوتا ہے، جب کہ دوسرے جانب (لڑکی کی جانب) سے وکیل)۔

اس طرح کی واضح مثال حدیث شریف میں وارد ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

"أُتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلحم، فقیل: تصدق علی بریرۃ، قال: ہولہا صدقۃ، ولنا ہدیۃ (بخاری، باب قبول الہدیۃ، حدیث نمبر: ۲۵۷۷، نسائی، باب خیار الأمۃ، حدیث نمبر: ۳۴۴۷)۔

(آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گوشت لایا گیا اور بتلایا گیا کہ یہ بریرہ کو صدقہ کیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اس کے لئے صدقہ اور ہمارے لئے ہدیہ ہے)۔

اس حدیث کے ضمن میں علامہ نور الدین سندیؒ لکھتے ہیں:

"(ولنا ہدیۃ) فبین أن العین الواحدۃ یختلف حکمہا باختلاف جہات الملك" (حاشیۃ السندی علی النسائی: ۶/ ۱۶۲)۔

(اور ہمارے لئے ہدیہ ہے) اس میں واضح کیا کہ عینِ واحد کا حکم جہتِ ملک کے اختلاف سے مختلف ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صدقہ حرام تھا، اسی لئے آپ صدقہ قبول نہیں کرتے تھے، حضرت بریرہؓ پر حرام نہیں تھا، اس لئے ان کے پاس صدقہ بھیجا گیا تھا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گوشت کے اس صدقہ والے تحفہ کو پیش کیا گیا، جو اصل کے اعتبار سے آپ کے درست نہیں تھا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہتِ ملک کے بدلنے سے حکم کے بدلنے کی بات بتلائی اور فرمایا کہ یہ ہمارے حق میں (حضرت بریرہؓ کی طرف سے) ہدیہ ہے، علامہ عینیؒ لکھتے ہیں:

"المتصدق علیہ زال عنہا وصف الصدقۃ، وحلت لکل واحد ممن کانت الصدقۃ محرمۃ علیہ" (شرح أبی داود، باب فی فقیر یہدی إلی غنی من الصدقۃ، (حدیث نمبر: ۱۶۵۵): ۶/ ۴۰۸)۔

متصدق علیہ سے صدقہ کی صفت ختم ہوگئی اور ہر اس شخص کے لئے جائز ہوگیا جس پر صدقہ حرام تھا۔

مذکورہ مسئلہ کی مزید وضاحت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ایک فتوے سے ہورہی ہے:

"عن ابن مسعود أنہ سئل عمن لہ جار یأکل الربا علانیۃ، ولا یتحرج من مال خبیث یأخذہ یدعوہ إلی طعام، قال: أجیبوہ، فإنما المہنأ لکم، والوزر علیہ" (جامع العلوم والحکم لابن رجب الحنبلی، ص: ۷۱)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا کہ جس کا پڑوسی علانیہ سود کھاتا ہو اور مال خبیث لینے میں ہچکچاتا نہ ہو، وہ (اگر) کھانے کی دعوت کرے (تو کیا کرنا چاہئے) انھوں نے جواب میں فرمایا: اسے جواب دو کہ تمہارے لئے خوش گوار ہے اور گناہ اُس پر ہے۔

مذکورہ عبارات سے یہ بات آشکار ہوگئی کہ اس طرح کی حکومتی اسکیم سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہے۔

......☆......

سرکاری اسکیموں اور معمولی شرح سود کا حکم

مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی بہرائچی [1]

ترتیب وار سوالنامہ میں مذکور جزئیات کے جوابات ملاحظہ ہوں:

۱۔ وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے تو ایسے قرض سے مسلمانوں کو استفادہ جائز ہے، شرعاً یہ تبرع کے حکم میں ہے قرض لینے والا اس کا مالک ہو جاتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے خرچ کر سکتا ہے۔

''ویکون متبرعًا علی المدعی علیه، کما لو تبرع بقضاء الدین'' (الهدایة ۳/ ۲۵۰ باب التبرع بالصلح ویتوکل کتاب الصلح)، ''العفو إنما یسقط ماکان مستحقا للمعافی خاصة'' (قواعدالفقه/ ۹۳، رقم: ۱۹۱)، ''و هبة الدین ممن علیه إبراء'' (الهدایة ۳/ ۲۹۲ باب ما یصح رجوع وما لا یصح کتاب الهبة) ''هبة الدین ممن علیه الدین جائز قیاسًا واستحسانًا، کذا فی التاتارخانیة'' (الفتاوی الهندیه ۴/ ۳۸۴، الباب الرابع فی هبة الدین)۔

فتاوی قاسمیہ (۱۷/ ۲۲۱) میں ہے: اگر حکومت نصف معاف کر دیتی ہے تو اس کا حکم شرعاً تبرع کے ہے، شرعی طور پر خود مالک ہو جاتا ہے وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے خرچ کر سکتا ہے، اس کے صرف کرنے میں من جانب شرع کوئی پابند نہیں ہے (فتاوی قاسمیہ ۱۷/ ۲۲۱ کتاب الامارۃ والسیاسۃ)۔

۲۔ اس صورت میں جبکہ مقررہ مدت میں قرض کو واپس کرنے کی حالت قرض کا ایک حصہ حکومت معاف کرتی ہے تو یہ بھی پہلی صورت کی طرح شرعاً تبرع میں داخل ہو کر جائز ہے۔

''ویکون متبرعًا علی المدعی علیه کما لو تبرع بقضاء الدین'' (الهدایة ۳/ ۲۵۰ کتاب الصلح)

''العفو إنما یسقط إما کان مستحقًا للمعافی خاصة'' (قواعد الفقه/ ۹۳، رقم: ۱۹۱)

اور بصورت دیگر مقررہ مدت کے بعد اگر ادا کیا تو پورا قرض ادا کرنا ہوتا ہے یہ بھی شرعاً جائز و درست ہے، کیونکہ اس قرض میں سے زائد کوئی رقم دینی نہیں پڑتی ہے بلکہ جتنا قرض ہے اتنا ہی دینا ہوتا ہے، لہٰذا ''الدیون تقضی بأمثالها'' کے تحت شرعاً جائز و درست ہے، فتاوی شامی میں ہے:

''الدیون تقضی بأمثالها'' (شامی زکریا ۷/ ۶۷۵ کتاب الایمان مطلب الدیون تقضی بامثالها، کذا فی الاشباه والنظائر ۲/ ۲۴۹، الفن الثانی کتاب المداینات)

''هو عقد مخصوص یرد علی دفع مثلی لیرد مثله'' (تنویر الابصار ۷/ ۳۸۸ باب المرابحة والتولیة فصل فی القرض)

خلاصہ یہ کہ دونوں صورتیں شرعاً جائز و درست ہیں۔

۳۔ مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑتی ہے تو یہ زیادتی سود کے زمرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے اور سود کی حرمت کتاب وسنت اور کتب فقہ میں مصرح ہے، ارشاد خداوندی ہے:

''أحل الله البیع وحرم الربا'' (سورہ بقرہ: ۲۷۵) اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے سوداگری کو اور حرام کیا ہے سود کو۔ (ترجمہ شیخ الہند/ ۱۶۵ تفسیر عثمانی)،

ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''عن جابر قال لعن رسول الله ﷺ اکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه، وقال: وهم سواء''۔

[1] خادم التدریس والافتاء معراج العلوم، چیتا کیمپ، ممبئی۔

حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے سود لینے والے سود دینے والے سودی دستاویز لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر اور ارشاد فرمایا کہ لعنت میں سب برابر ہیں (صحیح مسلم ۲/ ۲۷، رقم: ۱۵۹۸، باب لعن آکل الربا، ترمذی ۱/ ۲۲۹، رقم: ۱۲۰۶، باب ما جاء فی اکل الربا، ابوداؤد ۲/ ۴۷۳، ابن ماجه ۲/ ۱۶۵، مسند احمد بن حنبل ۱/ ۸۳، رقم: ۶۳)۔

(۱) ''لأن الربا هو الفضل إلى عن العوض'' (شامی زکریا ۷/ ۳۹۹ باب الربا، البحر الرائق ۶/ ۱۲۴ باب الربا)،

ربا (سود) وہی وہ زیادتی ہے جو عوض سے خالی ہو (الهدایة ۳/ ۸۰)۔

(۲) ''أما فی اصطلاح الفقهاء فهو زیاده أحد البدلین المتجانسین من غیر أن یقابل هذه الزیادة عوض'' (کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة ۲/ ۲۲۷)،

فقہاء کرام کی اصطلاح میں ربا (سود) وہ ہم جنس بدلیں میں سے ایک کا زیادہ ہونا کہ اس زیادتی کا مقابل کوئی عوض نہ ہو۔

(۳) ''الربا لغة مطلق الزیادة وشرعًا فضل خال عن عوض بمیعاد شرعي مشروط لأحد المتعاقدین''۔

ربا کے لغوی معنی مطلق زیادتی کے ہیں اور شرعاً وہ زیادتی ہے جو عوض سے خالی ہو (اللباب فی شرح الکتاب ۱/ ۲۲۱ باب الربا)۔

''فی المعاوضة الربا فی اللغة هو الزیادة، وفی الشرع عقد فاسد بصفة سواء کان هناك زیادة أولی، والربا حرام بالکتاب والسنة، أما الکتاب فقوله تعالی وحرّم الربا، وأما السنة فقوله ﷺ أكل درهم واحد من ربا أشد من ثلث وثلثین زینة یزینها الرجل، ومن نبت لحمه من حرام فالنار أولی به، وقال ابن مسعود: آکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه إذا علموا به ملعونون علی لسان محمد ﷺ إلی یوم القیامة'' (کذا فی النهایة، الجوهر ۱/ ۲۵۸ باب الربا)۔

خلاصہ یہ کہ سود کے تحقق کی وجہ سے یہ صورت ناجائز و حرام ہے۔

۴۔ غیر معافی والے یا معافی والے قرضوں میں جو اصل رقم سے زائد کا مطالبہ مشروط ہوتا ہے تو یہ زائد رقم اس کی شرح خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو سود کے دائرہ میں داخل ہو کر حرام ہوگی چونکہ یہ زیادتی مشروط ہے اور خالی عن العوض ہے اور یہ زیادتی صلب عقد میں داخل ہے لہٰذا اس پر سود کا تحقق ہوگا۔

''الربا لغة مطلق الزیادة وشرعًا فضل خال عن عوض بمعیار شرعي مشروط لأحد المتعاقدین فی المعاوضة'' (اللباب فی شرح الکتاب ۱/ ۲۲۱ باب الربا) ''قال ابن عبد البر: وکل زیادة فی سلف أو منفعة ینتفع بها السلف فهی ربا، ولو کانت قبضة من علف وذلك حرام إن کان بشرط'' (الموسوعة الفقهیه ۳۳/ ۱۳۰، الکافی فی فقه اهل المدینة ۲/ ۲۵۹)

موسوعہ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ تھوڑی سی مشروط زیادتی سود کے دائرہ میں داخل ہو کر حرام ہوگی سروس چارج یا انتظامی خرچ میں شمار کرنا درست نہیں معلوم ہوتا ہے۔

۵۔ سرکاری کی طرف سے دیئے جانے والے قرض جن پر قرض سے زائد رقم وصول کی جاتی ہے یہ صاف اور واضح سود ہے جو کہ ناجائز و حرام ہے۔

''عن جابر قال: لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم آکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه، وقال: هم سواء'' (صحیح مسلم شریف ۲/ ۲۷ باب لعن آکل الربا، مسند احمد بن حنبل ۱/ ۸۳، ۶۳) ''عن فضالة بن عبید صاحب النبی صلی الله علیه وسلم إنه قال: کل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا'' (سنن کبری بیهقی ۸/ ۲۷۶، ۹۲-۱۱۰)۔

''کل قرض جر نفعًا إحرام'' (شامی زکریا ۷/ ۳۹۵ کتاب البیوع)۔

خلاصہ یہ کہ قرض پر زیادہ رقم کی واپسی جو کہ مشروط ہوتی ہے اس پر سود کا اطلاق کیا جانا بالکل واضح ہے ایسا قرض لینا شرعاً جائز و درست نہیں ہے۔

۵ ب۔ مذکورہ قرضے جو مختلف عنوانات سے دیئے جاتے ہیں ان کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا اگر یہ سود پر مشتمل ہوگا تو ممنوع ہوگا ورنہ جائز ہوگا، البتہ اگر کسی شخص کو واقعی ضرورت درپیش ہو تو اس کے لئے جواز کی گنجائش ہوگی بات ضرورت کی آئی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کی وضاحت

ہوجائے اور اس کے درجات کی نشاندہی ہوجائے، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب نے ''جواہر الفقہ'' میں ضرورت واحتیاج کے پانچ درجات ذکر فرمائے ہیں، (۱) ضرورت، (۲) حاجت، (۳) منفعت، (۴) زینت، (۵) فضول۔

(۱) ضرورت طبعی اضطرار، اس کی تعریف یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب المرگ ہوجائے گا یہی صورت اضطرار کی ہے اس صورت میں حرام وممنوع چیز کا استعمال (بہ چند شرائط) جائز ہوتا ہے۔

(۲) حاجت، کے معنی یہ ہے کہ اگر وہ ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو ہلاک تو نہیں ہوگا، مگر مشقت اور تکلیف شدید ہوگی یہ صورت اضطرار کی نہیں ہے، اس لئے اس کے واسطے روزے نماز طہارت وغیرہ کے بہت سے احکام میں رعایت اور سہولتیں تو دی گئی ہیں مگر ایسی حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوگی۔

(۳) منفعت، یہ ہے کہ کسی چیز کے استعمال کرنے سے اس کے بدن کو فائدہ پہنچے گا، لیکن نہ کرنے سے تکلیف یا ہلاکت کا خطرہ نہیں، جیسے عمدہ قسم کے کھانے اور مقوی غذائیں اس حالت کے لئے نہ کوئی حرام حلال ہوتا ہے نہ روزہ کا افطار جائز ہوتا ہے مباح اور جائز طریقوں سے یہ چیزیں حاصل ہوسکیں تو استعمال کرے اور نہ حاصل کرسکیں تو صبر کریں۔

(۴) زینت، جس سے بدن کی کوئی خاص تقویت بھی نہیں محض تفریح خواہش ہے ظاہر ہے اس کام کے لئے کسی ناجائز چیز کے جائز ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۵) فضول، وہ ہے جو زینت مباح کے دائرہ سے بھی آگے محض ہوس ہو اس کا حکم بھی ظاہر ہے کہ اس کے لئے احکام میں کوئی رعایت ہونے کے بجائے اس فضولی کی مخالفت احادیث صحیحہ میں وارد ہے (فتاوی رحیمیہ جدید ۵ / ۲۸۰ مکتبہ الاحسان دیوبند، بحوالہ جواہر الفقہ ۲۸ / ۲۹)۔

ضرورت کی ان پانچ قسموں ودرجات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) ضرورت طبعی اضطرار جس کی وجہ سے حرام چیزوں (شراب اور میتہ وغیرہ) کا استعمال جائز ہوتا ہے۔

(۲) ضرورت بمعنی حاجت جس کی وجہ سے حرام اشیاء کا استعمال جائز نہیں ہوتا، البتہ عبادات میں تخفیف آجاتی ہے، جیسا کہ حالت عذر وسفر وغیرہ میں روزہ افطار اور ترک جماعت وغیرہ۔

(۳) ضرورت بمعنی منفعت جیسا کہ قوت حاصل کرنے کے لئے عمدہ غذا وغیرہ تناول کرنا۔

(۴) ضرورت بمعنی زینت، جیسا کہ میلان طبیعت کی وجہ سے حلوہ ومٹھائی وغیرہ کھانا۔

(۵) ضرورت بمعنی فضول، جیسا کہ خواہش نفس کی وجہ سے حرام اور مشتبہ چیزوں کا کھانا (ایضاح النوادر ۲ / ۱۶۱-۱۶۲)۔

''وفي فتح القدير ههُنا خمس مراتب: ضرورة وحاجة ومنفعة وزينة وفضول، فالضرورة بلوغه حدًا إن لم يتناول الممنوع هلك أو قارب، وهذا يبيح تناول الحرام والحاجة كالجائع لو لم يجد ما يأكله لم يهلك غير أنه يكون في ومشقة، وهذا لا يبيح الحرام، ويبيح الفطر في الصوم والمنفعة كالذي يشتهي خبز البر ولحم الغنم والطعام الدسم والزينة المشتهي بحلوى والسكر والفضول التوسع بأكل الحرام والشبهة'' (حموی علی ہا الاشباہ والنظائر / ۱۴۰)

مندرجہ بالا ضرورت وحاجت وغیرہ کی تعریف سے یہ ثابت ہوا کہ حرام چیز ضرورت واضطرار ہی کی حالت میں بقدر ضرورت جائز الاستعمال ہوتی ہے، لہٰذا سود جو بہ نص قطعی سے حرام ہے اضطرار اور مجبوری کی حالت میں بقدر ضرورت جائز الاستعمال ہوگا (مستفاد فتاوی رحیمیہ ۵ / ۲۸۰)۔

اسی طرح فقہاء کرام نے اضطرار اور حد درجہ کی شدید احتیاج ومجبوری کی صورت میں، جبکہ بلاسودی قرض ملنے کی امید نہ ہو بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے ضرورت سے زیادہ لینا درست نہیں ہوگی، الاشباہ والنظائر میں ہے:

''وفي القنية والبغية: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر ۱ / ۲۶۷ الفن الاول فی القواعد الکلیۃ القاعدۃ

الخامسة الضرر يزال، البحر الرائق ٦/ ١٣٦ باب الربا، فتاوى رحيميه ٥/ ٢٨٠)۔

خلاصہ یہ کہ مختلف ضروریات کے لئے سودی قرضے صرف شدید احتیاج واضطرار کی صورت میں لئے جاسکتے ہیں اور کسی بھی عنوان سے قرض لیا جائے باہم کوئی فرق نہیں۔

۶۔ حکومت کی طرف سے جو رقومات مکمل طور پر اعانت کے مدنظر دی جاتی ہے خواہ وہ مکان بنانے اور بیت الخلاء بنانے کے لئے یا تعلیمی ضروریات کے لئے یا بچوں کی پیدائش پر یا کسی اور مقصد کے لئے اس کا حکم شرعاً تبرع کا ہے یہ حکومت کی طرف سے تبرع وہدیہ ہے اس کا استعمال سبھی کئے جائز و درست ہے اور بلا تردد جائز اور حلال ہے۔

''أخذ الجائزة من السلطان قال بعضهم: ما لم يعلم أنه يعطيه من حرام قال محمد، وبه نأخذ ما لم نعرف شيئًا حرام بعينه وهو قول أبي حنيفة وأصحابه إن الشيخ أبا القاسم كان يأخذ جائزة السلطان'' (الفتاوى العالمگیری زکریا قدیم ٥/ ٣٤٢، الباب الثانی عشر فی الهداية والضيافات كتاب الكراهية)۔

اور حکومت کا یہ تعاون امیر وغریب سب کے لئے حلال ہے۔

''ما كان على وجه التبرع يستوى فيه الغنى والفقير'' (قواعد الفقه/ ١١٦، رقم: ٢٩٧، مستفاد فتاوى قاسميه ١٧/ ٦٢٣)

خلاصہ یہ کہ حکومت کی طرف سے امداد کے طور پر دی جانے والی رقومات کا حکم شرعاً تبرع کا ہے جس کو امیر وغریب سب استعمال کر سکتے ہیں۔

دلالی کی اجرت:

۷۔ جو لوگ سرکاری امداد کے حصول کے لئے واسطہ بنتے ہیں اور اس کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اپنا وقت صرف کرتے ہیں ان کی حیثیت دلال کی ہے پھر جو لیتے ہیں اگر وہ طے شدہ لیتے ہیں تو یہ دلالی کی اجرت ہے جس کے لینے کی گنجائش ہے، کیونکہ دلال اجیر مشترک ہوتا ہے جو بہت سے لوگوں کے کام بیک وقت انجام دیتا ہے اور اگر دلالی میں باقاعدہ معاملہ طے نہ ہو، بلکہ مجہول ہو تو مذہب حنفیہ میں اس کو فاسد قرار دیا گیا ہے اور کام پورا ہونے پر اجر مثل کی بات کہی گئی ہے نہ کہ اجرت مقررہ کی۔

''وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل'' (شامی زکریا ٩/ ٨٠)،

مذکورہ عبارت کا محمل یہی صورت ہے لیکن اگر جہالت معمولی ہو یا کثرت تعامل کی وجہ سے موجب نزاع نہ رہی ہو تو اس کو متاخرین فقہاء نے ضرورۃً جائز قرار دیا ہے (مستفاد کتاب النوازل ١٢/ ٣١٧)

''والسمسار في الأصل هو القيم بالتمر والحافظ له ثم استعمل في قولي البيع والشراء لغيره'' (تكملة فتح الملهم ١/ ٢٣٦ باب تحريم الحاضر للبادي)، ''والسمسرة اصطلاحًا هي التوسط بين البائع والمشتري والسمسار هو الذي يدخل بين البائع والمشتري متوسطة لامضاء البيع وه والمسن الدلال؛ لأنه يدل المشتري على السلع، ويدل البائع على الأثمان'' (الموسوعة الفقهيه١٠/ ١٥١، ١٥١)، ''والسمسار اسم لمن يعمل للغير بالأجر بيعًا وشراء'' (المبسوط ١٥/ ١١٥، كتاب النوازل ١٢/ ٣٦٨)

متعاقدین کے درمیان جو واسطہ بنتا ہے اس کو دلال اور سمسار کہتے ہیں یہ تعریف سرکاری امداد سے حصول کے لئے جدوجہد کرنے والے پر صادر آتی ہے لہٰذا اس کے لئے اپنے مطلوبہ محنتانہ لینے اور دوسرے لوگوں کو اس کے دینے کا جواز شرعاً۔

''قال في الدر المختار نقلًا عن البزازية إجارة السمسار والمنادى والحمامي والصكاك ما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان الناس به حاجة ويطيب الأجر الماخوذ لو قدر أجر المثل'' (شامی زکریا ٩/ ٨٧ باب الاجارة الفاسده،

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاوى ہندیہ ٤/ ٤٥٠ الفصل الرابع في الاجارة الفاسدة، المبسوط للسرخسى ١٥/ ١١٥، خلاصة الفتاوى ٣/ ١١٦، الاشباه والنظائر قديم ١٣٨، امداد الفتاوى ٣/ ٣٦٦، كتاب النوازل ١٢/ ٣٣٦، فتاوى شامی زکریا ٩/ ٨٧ باب اجرة الفاسد مطلب في اجرة الدلال.
الكافي في فقه أهل المدينه ٢/ ٧٥٦، اعلاء السنن ٦/ ٢٣٦، كذا في فتح الباري ٤/ ٤٥١ باب اجرة السمسرة، عمدة القاري ١٢/ ٩٣ باب أجرة السمسرة)

ان عبارتوں سے دلالی کی اجرت کے جواز پر روشنی پڑتی ہے یہ دلالی اگر طے شدہ ہے تو بلا شبہ جائز ہے اور اگر قدرے جہالت ہے یا کثرت تعامل کی وجہ سے موجب نزاع نہیں ہے تو اس کو متاخرین فقہاء نے صرف جائز قرار دیا ہے۔

''عن حماد أنه كره أجر السمسار إلا بأجر معلوم'' (مصنف ابن شیبه ۴/ ۴۵۷، ۲۲۰۵۷)، ''قلت: والحاصل أن الجهالة اليسيرة عفو فيما جرى به التعامل لكونها لا تفضي إلى النزاع عادة'' (اعلاء السنن ۱۶/ ۲۲۵ باب اجر السمسرة)۔

خلاصہ یہ کہ سرکاری امداد کے حصول کے لئے جو لوگ جد و جہد کرتے ہیں ان کی حیثیت دلال کی ہے ان کا محنتانہ دلالی کے اجرت کے عدد پر ہے، لہٰذا اس کا لینا اور دینا دونوں شرعاً جائز ہے۔

۸۔ سرکاری امداد کے مستحق شخص کے امدادی رقوم کے حصول میں واسطہ بننے والے شخص کا از خود اس میں کا ایک حصہ رکھ لینا تو شرعاً درست نہیں ہوگا۔

حدیث شریف ہے: ''لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه'' (مسند احمد/ ۷۲، شعب الایمان للبیهقی ۲/ ۶۹ ۷، مشکوۃ شریف/ ۲۵۵، مرقاۃ ۳/ ۳۵۰)، البتہ اگر یہ شخص اس رقم کے حصول کے متعلق کاغذات کی تیاری اور دوڑ دھوپ پر اپنے محنتانہ کا اجرت مقرر کے معاملہ کرے تو یہ درست ہوگا اس وقت دلالی اور سمسرہ میں داخل ہو کر شرعاً جائز ہوگا، جیسا کہ ۷ میں متعدد عبارات مع حوالہ ذکر کی جا چکی ہیں،

''وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن كان في الأصل فاسدًا لكثرة التعامل'' (شامی زکریا ۹/ ۸۷ باب الاجارة الفاسدة، مستفاد کتاب النوازل ۱۱/ ۳۲۶)۔

اصل یہ ہے کہ واسطہ بننے والے شخص کا از خود رقم کا ایک حصہ رکھ لینا درست نہ ہوگا، البتہ معاملہ کر کے لینا...... دلالی سمسرہ کم میں داخل ہو کر جائز ہوگا۔

۹۔ رشوت کا لینا اور دینا دونوں از روئے حدیث حرام ہے موجب لعنت ہے۔

روایت ہے، ''عن عبد الله بن عمر رضي الله عنه قال لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي''۔

آپ نے دونوں پر لعنت فرمائی ہے (ترمذی ۱/ ۲۴۸، ۱۳۳۷، ابوداؤد ۲/ ۵۰۴ کتاب القضاء)۔

''عن عبد الرحمن بن عوف رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي في النار''

یعنی رشوت لینے دینے والے دونوں دوزخ میں ہوں گے (مجمع الزوائد ۴/ ۱۹۹)۔

''عن أبي سلمة بن عبد الله عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي في النار'' (مسند بزار ۳/ ۲۴۷، ۱۰۳۷، المعجم الاوسط ۱/ ۵۵۰، ۲۰۰۲۶)، البتہ دفع ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لئے بحالت مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے اس صورت میں صرف رشوت لینے والا گنہگار رہوگا، جیسا کہ حضرات فقہاء کرام کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے۔

(۱) ''الرابع ما يدفع لدفع الخوف عن المدفوع إليه على نفسه أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ'' (شامی ۸/ ۳۵ کتاب القضاء مطلب في الكلام على الرشوة والهدية)۔

(۲) ''ومنها إذا دفع الرشوة خوفًا على نفسه أو ماله، فهو حرام على آخذ غير حرام على الدافع'' (البحر الرائق ۶/ ۲۶۲، فتاوی ہندیہ ۴/ ۴۰۳ کتاب الهدیه)۔

(۳) ''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة. يعني في حق الدافع'' (شامی ۹/ ۱۶۰۷ الخطر والاباحه فصل في البيع)۔

(۴) ''أما إذا أعطى ليتوصل به إلى حق أو ليدفع عن نفسه ظلمًا فلا بأس به'' (مرقاة ۷/ ۲۴۷ کتاب الامارة والقضاء)۔

ان تمام عبارات فقہیہ سے واضح ہوا کہ اپنے حق کے وصولیابی کے لئے بدرجہ مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے، لہٰذا جو مستحق شخص سرکاری امداد بغیر رشوت دیئے حاصل نہ کر سکتا ہو اس کے لئے گنجائش ہے ان کو رشوت دینے کا گناہ نہ ہوگا، البتہ لینے والا ہر حال میں گنہگار رہوگا۔

خلاصہ یہ کہ سرکاری امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول میں مجبوراً رشوت دینے کی گنجائش ہے۔

۱۰۔ جو لوگ حکومت کے امدادی رقوم یا قرض کے استحقاق کے معیار و شرط پر پورے نہیں اترتے اور جھوٹ و کذب بیانی سے اس کو حاصل کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے ایسی سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانا حرام ہے یہ کذب وخیانت ہے جو کہ حرام ہے۔

''قال الله تعالى لعنة الله على الكاذبين'' (آل عمران: ٦١)، ''وقال الله تعالى: ''واجتنبوا قول الزور'' (سورة الحج: ٣٠)

حدیث شریف میں ہے: ''عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم آية المنافق ثلاث إذا حدث كذب'' (مشكوة/ ١٧)، ''قال الملا علی قاری: إذا حدث كذب وهو أقبح الثلثة'' (مرقاة شرح مشكوة ١/ ٢٢٦)۔

اس طریقہ سے حاصل کی جانے والی امدادی رقوم کو اپنے استعمال میں لانا باطل طریقہ سے استعمال میں لانا ہے جس سے قرآن کریم نے روکا و منع کیا ہے

قال الله تعالى: "يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (النساء: ٢٩)۔

قال الله تعالى: "ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (البقرة: ١٨٨)۔

''قال الإمام القرطبي: من أخذ مال غيره لا على وجه أذن الشرع فقد أكل بالباطل'' (الجامع لاحكام القرآن للقرطبي ٢/ ٣٢٨)، ''قال العلامة البغوي: بالباطل الحرام يعني بالربا والقمار والغصب والسرقة والخيانة ونحوها'' (معالم التنزيل ٢/ ٥٠)، ''لا يأكل بعضكم أموال بعض بالوجه الذي لم يبحه'' (تفسير ابي السعود ١/ ٢١٨، كذا في احكام القرآن للجصاص ١/ ٢٥٠)، ''أو بغير عقد كالسرقة والغصب والخيانة والغلول ففي جميع الأموال المال الحاصل حرام عليه'' (بذل المجهود ١/ ٣٧)۔

ان تمام آیات وعبارات کا خلاصہ یہی ہے کہ بغیر شرط و معیار پورا کئے ہوئے امدادی رقوم و قرض حاصل کرنا غیر شرعی طریقہ سے حاصل کیا جانے والا مال ہے جس سے اجتناب لازم ہے اس بارے میں غلط بیانی سے کام لینا جھوٹ ہے جو کہ حرام ہے۔

حکومت کی ایسی اسکیم کہ حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے اور اس کا انٹرسٹ خود ہی بینک کو ادا کرتی ہے تو یہ سودی قرض کے دائرہ میں داخل نہیں ہے، لہٰذا ایسے قرض سے استفادہ جائز ہے اور یہ قرض حسنہ کے درجہ میں ہوگا، البتہ جس صورت میں ایک بڑا حصہ انٹرسٹ کا حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ مقروض کو ادا کرنا پڑتا ہے تو ایسی اسکیم سے استفادہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی ہے، کیونکہ سود تو بہر حال سود ہے کم ہو یا زیادہ حرام ہے اور موجب لعنت ہے۔

''عن علی رضي الله عنه مرفوعًا كل قرض جر منفعة فهو ربا'' (اعلاء السنن ١٤/ ٤٩٨)۔

خلاصہ یہ کہ جس صورت میں حکومت از خود انٹرسٹ کی رقم ادا کرتی ہے اس صورت میں تو اس قرض سے استفادہ جائز و درست ہے، اور جس صورت میں مقروض کو بھی تھوڑا سا حصہ ادا کرنا پڑتا ہے تو ایسی صورت میں سود دینے کی وجہ سے استفادہ کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔

اگر واقعی حکومت یا اس کا ادارہ وصول کرتا ہے پھر اس کا مالک بن کر اس اسکیم سے استفادہ کرنے والے لوگوں کی امداد کرتا ہے تو ایسی اسکیم سے استفادہ شرعاً ناجائز ہوگا انٹرسٹ کے اس طرح مالک ہونے سے اس کی حرمت ختم نہیں ہوتی۔

''الحرام ينتقل أي تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدي وتبدلت الأملاك'' (شامی ٧/ ٣٠٠ كتاب البيوع باب البيع الفاسد مطلب في تعيين الدراهم في القصد الفاسد، مستفاد فتاوی قاسميه ٢٠/ ٢٨٠)۔

خلاصہ یہ کہ ایسی اسکیم سے استفادہ درست نہیں جو خاص انٹرسٹ سے اسکیم چلتی ہے۔

☆.......

سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور معمولی شرح سود پر قرض کا حصول

مولانا محمد زبیر ندوی[1]

۱۔ شریعت میں ایسے قرض کو ناجائز قرار دیا گیا ہے جس پر زائد رقم لی جاتی ہو، اسی کو ''ربا'' یعنی سود سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ یہ فقہی قاعدہ عام اور نہایت متداول ہے: ''کل قرض جر منفعة فهو ربا'' (فیض القدیر ۹/ ۴۴۸۷)۔

اور اسی مناسبت سے ''فتاوی عالمگیری'' میں ہے کہ ہر وہ مال جس کے عوض میں کوئی مال نہ ہو یعنی سود ہے۔

''وهو في الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض في معاوضة مال بمال'' (الفتاوی الهنديه ۳/ ۱۱۷)۔

لیکن زیر بحث مسئلہ میں حکومت جو قرضے اپنی رعایا کو دیتی ہے اس پر کوئی زائد رقم کا مطالبہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ حکومت اس کا ایک حصہ معاف بھی کر دیتی ہے، جو حکومتی قانون اور عرف عام میں حکومت کی رعایا کے لئے امداد ہوتی ہے، اور جیسا کہ ظاہر کہ رعایا کی دیکھ بھال کرنا اور معاشی و مادی اعتبار سے انہیں ترقی دینا اور اس کی فکر کرنا اور حسب ضرورت وبقدر قوت امداد و اعانت کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور اسی احساس وجہ داری کے تئیں سرکار قرضے کا ایک حصہ معاف کرتی ہے، لہٰذا ایسے قرض لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ بلاضرورت لینے میں احتیاط برتنا چاہئے کہ قرض خوری کی عادت بن جانے کا اندیشہ ہے، چنانچہ اسی قسم کے ایک سوال کا جواب حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب لاجپوری تحریر فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اگر یہ صحیح ہے کہ بطور امداد وہ رقم دی جاتی ہے اور اس پر کوئی سود نہیں لیا جاتا تو یہ سودی معاملہ نہیں ہے، اس لئے درست ہے''

(فتاوی رحیمیہ ۶/ ۱۳۵)۔

۲۔ جواب نمبر ۱ سے واضح ہو چکا ہے کہ سود اسے کہتے ہیں جو قرض پر زائد رقم ہو اور اس زائد رقم کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو، زیر بحث صورت میں چونکہ حکومت اپنے دیئے ہوئے قرض سے زائد رقم نہیں لیتی ہے؛ بلکہ مدت سے پہلے یا وقت پر ادا کرنے سے حکومت اپنی امداد دے گی، اور تاخیر کرنے پر حکومت اپنی امداد سے محروم کر دے گی، اور جتنی رقم حکومت نے دی تھی صرف اتنی ہی وصول کرے گی، لہٰذا ایسا سرکاری قرض لینا بھی درست ہے، کہ اس میں کوئی سودی معاملہ نہیں ہے۔

''قال محمد في كتاب الصرف: إن أبا حنيفة كان يكره كل قرض جر منفعة. قال الكرخي: هذا إذا كانت المنفعة مشروطة في العقد'' (الفتاوی الهنديه ۳/ ۲۰۲)۔

اسی طرح زیر بحث مسئلہ کی ایک نظیر بھی ہندیہ میں یوں منقول ہے:

''رجل له على رجل ألف درهم قرضًا فصالحه على مائة منها إلى الأجل صح الحط والمائة حالة'' (الفتاوی الهنديه ۳/ ۲۰۵)

۳۔ اگر مقررہ مدت کے بعد کچھ رقم زائد ادا کرنا پڑے اور وہ ادائیگی حکومت کی جانب سے بصورت تاخیر واجب نہ ہو اور عقد قرض کے وقت اس کی شرط بھی نہ لگائی گئی ہو، بلکہ مستقرض اپنی خوشی سے بغیر سرکار کے مطالبہ کے ادا کرے تو یہ درست ہے، کیونکہ اس میں ربا کی شرط نہیں پائی جا رہی ہے، بلکہ اسے حدیث میں حسن القضاء سے تعبیر کیا گیا ہے، اور فتاوی ہندیہ میں ہے:

''فإن لم تكن المنفعة مشروطة في العقد فأعطاه المستقرض أجود مما عليه فلا بأس به'' (الفتاوی الهنديه ۳/ ۲۰۲)۔

---

[1] دار العلوم اسلامیہ، گلشن نگر، اوشیوری، جوگیشوری، ممبئی۔

لیکن اگر تاخیر کی صورت میں زیادہ رقم کی ادائیگی حکومت کا مطالبہ ہو، اور مستقرض کے لئے دینا لازم ہو، تو یہ صریح ربا اور سود ہے، جو جائز نہیں ہے، کیونکہ قرض میں مستقرض کو اتنا ہی لوٹانا ہے جتنا اس نے لیا ہے، اگر زائد لوٹاتا ہے تو سود ہوگا۔

''لا يجوز أن يرد المقترض إلى المقرض إلا ما اقترضه منه أو مثله تبعًا للقاعدة الفقهية القائلة: كل قرض جر نفعًا فهو ربا'' (فقه السنه ۳/ ۱۴۸)۔

۴۔ شریعت اسلامیہ نے قرض پر نفع کے سلسلہ میں کم نفع یا زیادہ نفع کی کوئی قید نہیں لگائی ہے، نفع مقرض بہت کم لے یا بہت زیادہ یا متوسط بہر حال ناجائز اور حرام ہے، علامہ علاء الدین کاسانی لکھتے ہیں:

''أما الذي يرجع إلى نفس القرض فهو أن لا يكون فيه جر منفعة'' (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۶/ ۵۱۸)

''فتاوی محمودیہ'' میں بصراحت منقول ہے:

''سودی معاملہ کرنا جائز نہیں، سود قلیل ہو یا کثیر'' (فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۳۰۴ باب الربا)۔

لیکن چونکہ موجودہ دور میں حکومت کا قرضی معاملہ کافی وسیع اور بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے، اور اس کو عوام تک پہنچانے اور اسکیم سے بسہولت فائدہ اٹھانے کے لئے دفاتر یا دیگر ذرائع جیسے بینک وغیرہ اپنائے جاتے ہیں، جس میں خاصی رقم خرچ ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ حکومت ایک طرف اسکیم کے مطابق معافی یا غیر معافی والے قرضے دے رہی ہے، اور اس پر مستفاد یہ کہ اس پورے عمل میں لگنے والی لاگت بھی بھرے تو یہ ایک مشکل کام ہے، یہی وجہ ہے کہ سرکار کچھ رقم لیتی ہے، اب اگر یہ زائد رقم سود کے نام پر لیتی ہے یا فیصد کے اعتبار سے انٹرسٹ کی صراحت کر دیتی ہے تو بلا شبہ یہ سود ہوگا، اور اس ایسا سودی قرض لینا بلا وجہ شدید مجبوری کے درست نہ ہوگا، چنانچہ مشہور و متداول کتاب ہدایہ میں ہے:

''لأن الربا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين فى المعاوضة الخالى عن عوض وشرط فيه'' (الهداية ۳/ ۸۰ باب الربا)

لیکن یہی قلیل زیادتی اگر اس قدر کم ہو کہ واقعی اسے سروس چارج کہا جاسکتا ہو، اور عرفاً اسے سروس چارج ہی سمجھا جاتا ہو اور حکومت سود کے نام سے مطالبہ کرے، بلکہ اجرت الخدمت کے نام سے مطالبہ کرے اور قرضی دستاویزات یا فارم وغیرہ میں اسے سروس چارج ہی درج کیا جاتا ہو اور اس کا مقصد بھی اس عمل میں آنے والی لاگت کی بھرپائی ہو، تو اس بات کی گنجائش ہے کہ اسے سود نہ سمجھا جائے، کیونکہ ایسا ہونا کبھی ناگزیر ہو جاتا ہے، اور مقصد بھی چونکہ سود وصول کرنا نہیں ہے، تو اس زائد مطالبہ کا شمار سود میں نہ ہوگا، اس سلسلہ میں ان قواعد سے بھی روشنی پڑتی ہے جن میں اعمال کو نیت کے تابع قرار دیا گیا ہے اور مشقت کو دور کرنے اور ضرر کو ختم کرنے کی وضاحت ہے، جیسے:

''الأمور بمقاصدها، إنما الأعمال بالنيات، الحكم الذى يترتب على أمر يكون على مقتضى ما هو المقصود من ذلك الأمر، المشقة تجلب التيسير يتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام'' (انظر شرح المجلة ۱/ ۱۹-۳۹)۔

۵۔ سرکار کی جانب سے دیئے جانے والے قرض پر جو زائد رقم کا مطالبہ ہے اگر وہ اس قدر زیادہ ہو کہ سروس چارج یا انتظامی خرچ پر محمول نہ کیا جاسکتا ہو تو بلا شبہ یہ سود ہے اور شریعت اسلامی میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

''وهو فى الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض فى معاوضة مال بمال، وهو محرم فى كل مكيل وموزون بيع مع جنسه'' (الفتاوى العالمگيريه ۳/ ۱۱۷، الفصل السادس)۔

حکومتی سودی قرضے خواہ کسی بھی کام کے لئے دیئے جاتے ہوں عام حالات میں ان کا سود پر لینا درست نہیں ہے، البتہ اگر کوئی شخص محتاج ہو تو اس سودی قرض اس حد تک لینے کی گنجائش ہے جتنے میں اس کی ضرورت پوری ہو سکے۔

''ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (البحر الرائق ۶/ ۱۲۶ باب الربا)۔

''الضرورات تقدر بقدرها، ما جاز بعذر بطل بزواله'' (مجلة الاحكام ۱/ ۳۷، ۳۹)۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ محتاج ہوگا کیوں؟ اور کس قسم کے لوگ اس میں آئیں گے، تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اصولیین کی اصطلاح میں حاجت ایسی چیز کو کہتے ہیں جس پر شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے کسی مقصد کا وجود موقوف نہ ہو، لیکن اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو مشقت اور حرج پیدا ہو جائے۔

علامہ شاطبی لکھتے ہیں: ''وأما الحاجيات: معناها أنها مفتقرة إليها من حيث التوسع ورفع الضيق المؤدي في الغالب إلى الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب'' (الموافقات للشاطبی ۳/ ۵)۔

لہٰذا اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اس کے حالات سازگار نہ ہوں اور اس کی اس کے بغیر گزر اوقات مشکل ہو تو ایسے شخص کا سودی قرض لینا درست ہوگا، چنانچہ علامہ یوسف القرضاوی دامت فیوضہم نے ایسے شخص کو سودی قرض لینے کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے:

''وإذا كانت هناك ضرورة أو حاجة ملحة اقتضت معطي الفائدة أن يلجأ إلى هذا الأمر، فإن الإثم في هذا الحال يكون على آخذ الربا وحده، وهذا بشرط أن تكون هناك ضرورة أو حاجة حقه'' لا مجرد توسع في الكماليات أو أمور يستغني عنها'' (الحلال والحرام في الاسلام/ ۳۱۹)۔

اسی سلسلہ میں ''فتاوی محمودیہ'' میں ایک سوال کا جواب ان الفاظ میں تحریر کیا گیا ہے:

''سود لینا اور دینا حرام ہے، اگر گزارہ کی کوئی صورت نہ ہو تو محتاج کے لئے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے''

(فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۳۰۲ باب الربا)۔

ہندوستان کے معروف صاحب فتاوی حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ اپنے فتاوی میں رقمطراز ہیں:

''بینک سے سودی معاملہ کرنا درست نہیں، اگر اضطراری اور حد درجہ کی مجبوری ہو تو جتنی رقم سے ضرورت پوری ہو جائے اتنی ہی مقدار سودی قرض لینے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ لینا درست نہیں ہے'' (فتاوی رحیمیہ ۶/ ۱۳۶ کتاب الربا)۔

ان تمام علماء کے فتاوی اور فقہی عبارات سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ شدید ضرورت مند اور محتاج کے لئے بقدر ضرورت حکومتی سودی قرض لینا جائز ہے، اس بابت حضرت الاستاذ فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا ایک اقتباس مفید معلوم ہوتا ہے، حضرت الاستاذ اپنی مشہور، بے نظیر تصنیف میں تحریر فرماتے ہیں:

الف: عام حالات میں محض معیار زندگی کی بلندی اور خوب سے خوب تر کی تلاش کے پیش نظر سودی قرض لینا جائز نہیں۔

ب: ضرورت یعنی ایسے حالات میں، جبکہ کھانے پینے، کپڑے، علاج وغیرہ کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لئے سودی قرض کے سوا چارہ نہ رہے اور فاقہ مستی کی نوبت ہو تو سودی قرض لینا جائز ہے۔

د: مشقت کے معاملہ میں ایسی صورتوں میں جو اجتماعی بن گئی ہو نسبتاً زیادہ تخفیف برتی جاسکتی ہے۔

ہ: اشخاص وافراد کے لئے سودی قرض کب حاجت بن جاتا ہے اور کب نہیں؟ اس کا اندازہ ان کے شخصی حالات اور علاقے اور خاندان کے معیار زندگی سے کیا جائے گا (جدید فقہی مسائل ۴/ ۵۶)۔

۲۔ گورنمنٹ اپنے باشندوں کو مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر یا دیگر ضروریات کے لئے جو رقم دیتی ہے اور اس کو واپس نہیں لیتی اور نہ ہی اس پر کسی قسم کی شرط یا سود ہوتا ہے شرعی نقطہ نظر سے وہ امداد ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ حکومت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی غریب رعایا بھی خوشحال ہو اور اس کے لئے وہ کوشش بھی کرتی ہے، اور اس کا ایک طریقہ رعایا کو مالی امداد فراہم کرنا بھی ہے، اور جس طرح ایک شخص دوسرے شخص کا مالی تعاون کرسکتا ہے حکومت بھی کرسکتی ہے، بلکہ اسے کرنا چاہئے، لہٰذا ایسی امدادی رقم لینا اور استعمال کرنا درست ہے۔

شرعی نقطہ نظر سے ایسی امداد کو ہبہ بھی کہا جاسکتا ہے، کیونکہ ہبہ کہتے ہیں کسی شخص کو کسی چیز کا بغیر عوض کے مالک بنانا اور یہاں یہی صورت پائی جارہی ہے۔

''الهبة تمليك مال لآخر بلا عوض'' (شرح المجلة، رقم الماده: ۸۳۳)۔

''تمليك العين بلا عوض وهي الهبة'' (التعريفات الفقهيه/ ۲۲۷)۔

حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ نے اپنے ایک فتوی میں ایسی رقم لینے کی صراحت کی ہے۔

''صورت مسئولہ میں سرکار کی طرف سے جو رقم ملتی ہے وہ سرکاری امداد ہے وہ لی جاسکتی ہے'' (فتاوی رحیمیہ ۳/ ۲۰۵ کتاب المتفرقات)۔

نیز ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حکومت بلا طلب بطور امداد اور غمخواری کے جو رقم دیتی ہے تو لینے میں مضائقہ نہیں'' (فتاوی رحیمیہ ۶/ ۳۱۷، مسائل شتی)۔

۷۔ گورنمنٹ کی جانب سے ملنے والی رقوم کے حصول کے لئے یقیناً کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اور بسا اوقات خود دفتر یا بینک تک رسائی نہیں ہو پاتی، یا مستحق خود معذور اور اس قابل نہیں ہوتا کہ خود حاصل کرسکے، ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ انسان کسی آدمی سے مدد لے جو اس کے اس کام کو آسان کردے عرف میں عموماً یہ دلال ہوتے ہیں جو اس کام کو بسہولت کروادیتے ہیں، اور اس پر وہ اپنی محنتانہ یا اجرت الخدمت لیتے ہیں، شرعی نقطہ نظر سے یہ معاملہ درست ہے، اور انہیں مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کی اجازت ہے، شرعاً کوئی قباحت نہیں، چنانچہ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

''إجارة السمسار والمنادي والحمامي والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان به حاجة. ويطيب الأجر المأخوذ'' (رد المحتار ۵/ ۴۳ باب الاجاره)۔

اور ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے: ''وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل'' (الفتاوی الهنديه ۴/ ۴۵۰ الفصل الرابع)۔

۸۔ اس سوال کا تعلق دراصل قفیز طحان والی روایت سے ہے، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اجیر کے جزء عمل کو اجرت بنانا درست نہیں ہے، اور اس پر بہت سے مسائل فقہاء احناف نے متفرع کئے ہیں اور اس روایت کو ایک مستقل اصل کی حیثیت دی ہے، اسی لئے صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:

''هذا أصل كبير يعرف به فساد كثير من الإجابات، لا سيما في ديارنا''۔

لیکن تحقیق سے ثابت ہے کہ حدیث ''نهى عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان'' والی روایت متکلم فیہ اور موقوف ہے، اس حدیث کا پہلا جزء اگرچہ بہت ساری روایات میں موجود ہے، لیکن حدیث کا دوسرا جزء حافظ ابن حجرؒ کے بیان کے مطابق صرف دارقطنی، ابویعلی اور بیہقی میں نقل کیا گیا ہے۔

نیز امام طحاویؒ اور دیگر محدثین نے اس پر بحث کی ہے کہ اس ممانعت کی علت کیا ہے؟ ان کی بحث کا خلاصہ ہے کہ اس میں اجیر یعنی آٹا پیسنے والا آٹا کو اجرت بناتا ہے جو فی الحال یعنی عمل سے پہلے اس کے پاس موجود نہیں ہے، بلکہ اس کے پیسنے کے بعد ہی اس کا وجود ہوگا پس ایک معدوم اور غیر موجود شئی کو اس نے اجرت بنایا ہے اور اس طرح کی معدوم غیر موجود شئی کو اجرت بنانا درست نہیں ہے، اس لئے یہ معاملہ اور اس طرح کے دیگر معاملات درست نہیں ہوں گے (تفصیل کے لئے دیکھئے مشکل الآثار ۱/ ۲۹۷، جدید فقہی مسائل ۴/ ۱۸۸-۱۹۸)۔

اوپر کی توجیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں پر علت پائی جائے گی وہ معاملہ ناجائز ہوگا، اور فقہی اصطلاحات وشرعی اصولوں میں دیکھا جائے تو اسی کا نام قیاس ہے، کہ ایک علت کو دوسری جگہ پر جہاں وہ علت موجود ہو وہی حکم دیا جائے تو پہلی صورت کا ہے، اب دیکھئے کہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جو احکام قیاس کے ذریعہ ثابت ہوں اگر عرف وعادت اس کے خلاف ہو تو قیاس کو ترک کیا جائے گا اور عرف پر عمل کیا جائے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں رقم ہو ردوم اور غیر موجود نہیں ہے، بلکہ اس پر صرف قبضہ نہیں ہوا ہے، اور اسی قبضہ کے لئے ساری تگ

ودوہوری ہے، لہٰذا یہ مسئلہ قفیز طحان کی علت سے خارج ہے، اور پھر چونکہ عرف میں ایسے معاملات میں ایک حصہ دینے کا ہے لہٰذا عرف کی بنا پر بھی یہ معاملہ لین دین کا درست معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی ضروری ہے کہ کتنا دیا ہے وہ پہلے سے متعین ہو، وگرنہ عدم تعیین کی صورت میں اجرت مجہول اور مفضی الی النزاع ہونے کی وجہ سے معاملہ درست ہوگا۔

اس بابت ایک اور بات ذہن میں آتی ہے کہ رقوم جوکہ دراہم ودینار یا کرنسی نوٹ کی شکل میں ہوتی ہیں، اور فقہاء نے لکھا ہے کہ دراہم ودنانیر پر اور نوٹ وغیرہ متعین کرنے سے بھی متعین نہیں ہوتے ہیں۔

''الفلوس بمنزلة الدراهم إذا جعلت ثمنًا لا تتعين في العقد وإن عينت'' (الفتاوی الہندیہ ۳/ ۱۰۷)۔

اور اسی عدم تعیین کی بنا پر وصول کرنے والا چاہے تو ان نوٹوں کو بدل کر دوسرے نوٹ دیدے تو کسی کو اعتراض نہیں ہوتا، اور جب وہ متعین ہی نہیں ہوئے اور دلالی کی اجرت دینے والے کو بالآخر دلال کی رقم ہی کی شکل میں اجرت دینی ہے تو چاہے اسی میں سے لے لے یا الگ سے لے، بات ایک ہی ہے، لہٰذا یہ معاملہ ہر اعتبار سے درست معلوم ہوتا ہے اور دلال اسی سرکاری رقم سے اپنی دلالی کی اجرت لے سکتا ہے۔

۹۔ حکومت جو امدادی رقم یا امدادی قرض لوگوں کو دیتی ہے وہ اس کے مستحق لوگوں کے لئے لینا جائز ہے، بلکہ بسا اوقات ان رقوم کا حاصل کرنا واجب ہوجاتا ہے، اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ ناجائز استعمال ہوگی یا غیر مستحق لوگ اس پر قابض ہوجائیں گے اور اہل حاجت محروم رہ جائیں گے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت کہ ہندوستان جیسے ملک میں ان رقوم کا حصول بغیر رشوت نہایت مشکل ہے، عام طور سے اس قسم کی رقوم کے حصول کے لئے لوگ دو طرح کا...... معاملہ کرتے ہیں۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ رقم ملنا متعین ہوتا ہے، اور دیر سویر ضرور وہ رقم مستحق کو مل جائے گی، لیکن جلد حاصل کرنے کے لئے لوگ رشوت دیتے ہیں کہ پہلے انہیں مل جائے گا، ظاہر ہے کہ صرف تاخیر سے بچنے اور جلد حصول کے لئے، جبکہ رقم ملنا متیقن ہو رشوت دینا درست نہیں ہے، ہاں اگر بہت زیادہ تاخیر کا امکان ہو اور اس کے بغیر کام نہ چل سکتا ہو تو رشوت دے کر اپنی مجبوری دور کرنے کے لئے جلد حاصل کرنا درست ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر رشوت نہ دے تو سرے سے اپنے حق ہی سے محروم ہوجائے گا، اور جو واقعی اس کا حق تھا اسے نہیں مل سکے گا، تو ایسی صورت میں بھی چونکہ بغیر رشوت دینا جائز حق اور استحقاقی رقم نہیں مل سکتی تو فقہاء کے بیان کے مطابق اپنے حق کو حاصل کرنے یا ظلم کو دور کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہوگا، البتہ سامنے والے کا رشوت لینا کسی طرح درست نہ ہوگا، چنانچہ فتاوی رحیمیہ میں ایک جگہ یوں مرقوم ہے:

''دفع ظلم اور اپنے جائز حق کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینی پڑے تو گنجائش ہے'' (فتاوی رحیمیہ ۳/ ۱۱۸ کتاب الحج)۔

۱۰۔ وہ امدادی رقوم یا قرض جو سرکار کی طرف سے ہوں، اور ان کے لئے حکومت نے کچھ شرائط ومعیارات متعین کئے ہوں، صرف انہیں کے لئے ہیں، اور وہی شرعاً اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر وہ شرائط اور معیارات پائے جائیں، اور جو لوگ اس معیار یا شرط پر پورے نہ اتریں ان کے لئے ان رقوم کا حاصل کرنا اور غلط بیانی سے کام لینا یا غلط طریقے سے حاصل کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں غیر مستحق اور معیاری سے خالی شخص کئی قسم کے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔

(۱) غلط بیانی سے کام لینا یعنی جھوٹ بولنا یا جھوٹے اور جعلی دستاویزات اور پروف دکھانا اور ان کی بنا پر اپنے کو مستحق ثابت کرنا بجائے خود بڑا گناہ ہے، اور اس گناہ کے بارے میں بڑی وعیدیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔

(۲) اسی طرح اس میں دھوکہ بھی پایا جاتا ہے کہ انسان جان بوجھ کر حکومت کو دھوکہ دیتا ہے اور اپنی اہلیت کو چھپا کر اپنے کو اہل ثابت کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ دھوکہ دینا شریعت میں بڑا گناہ شمار کیا گیا ہے۔

(۳) اسی طرح اس میں حق تلفی بھی پائی جاتی ہے، کیونکہ جب حکومت امدادی رقم یا قرض کی اسکیم تیار کرتی ہے تو اس کے سامنے خاص تعداد ہوتی ہے اور یہ تعداد حکومت کی نظر میں ان لوگوں کی ہوتی ہے جو واقعی امداد یا قرض کے مستحق ہوتے ہیں، اور جب غیر مستحق اس رقم کو لے گا تو ظاہر ہے کہ

اس لسٹ میں سے ایک شخص جو مستحق تھا اسی کا حق لیا ہے، لہٰذا یہ اس کی حق تلفی ہوئی جو ناجائز ہے۔

(۴) پھر غور کیا جائے تو ایسا شخص اس صورت میں حکومت کے معاہدہ اور قانون شکنی کا مرتکب بھی ہوتا ہے، جبکہ جائز امور میں حکومت کے قانون واحکام کی اطاعت و پابندی لازم ہے۔

ان تمام وجوہات کے پیش نظر شراط سے عاری اور معیارات سے خالی شخص کے لئے ایسی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

۱۱۔ ربا یعنی سود کے بارے میں جو اصول ہے کہ ''کل قرض جر نفعاً فھو ربا'' کہ یہ وہ قرض جو نفع لائے وہ سود ہے، ظاہر ہے کہ اس میں عموم ہے اور عموم کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے ہر فرد کو شامل ہو، پس قرض لینے والا سود کی رقم خواہ خود ادا کرے یا کوئی شخص یا تنظیم یا ادارہ ادا کرے، یا خود مستقرض کچھ ادا کرے اور زیادہ حصہ کوئی اور بہر صورت یہ سود ہونے کی وجہ سے حرام ہوگا، اور بغیر کسی شدید ضرورت اور حاجت کے ایسی اسکیم سے سود پر قرض لینا اور فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فقہاء کے بیان کے مطابق سود پر لی گئی رقم کے اندر فی نفسہ کوئی خبث نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ معاملہ جو سود پر مبنی ہوتا ہے اور وہ نفع جو قرض دہندہ کو حاصل ہوتا ہے وہ درست نہیں ہوتا، اور شرع میں اصلاً وہی حرام ہے، اب ہم زیر بحث مسئلہ میں دیکھتے ہیں کہ سودی معاملہ بھی ہے اور قرض دہندہ کو سود دینا اور اس کا اس سے فائدہ اٹھانا بھی پایا جا رہا ہے، لہٰذا یہ صورت ناجائز ہوگی، فتاوی محمودیہ کے محشی نے ایک مقام پر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''سود پر لی ہوئی رقم قرض ہے اس میں فی نفسہ کوئی خبث نہیں ہے، بلکہ خبث ان کے درمیان سودی معاملہ اور اس کے بعد مقرض کو حاصل ہونے والا نفع ہے'' (حاشیہ بر فتاوی محمودیہ ۱۶/ ۳۰۵ باب الربا)۔

۱۲۔ اس سوال میں جو شکل لکھی گئی ہے وہ بالکل سود کی شکل ہے، اور حکومت جو سود حاصل کر رہی ہے ظاہراً کسی سامان کے لئے اس کا استعمال کرنا درست نہیں، کیونکہ سود کی رقم جو ناجائز ہے، البتہ وہ لوگ جو شرعی نصاب زکوۃ کے مالک نہ ہوں اور ان کو معیار زندگی اس قدر بلند ہو کہ اپنی صحیح معاشی زندگی گزار سکیں اور وہ اسکیم ان کے مناسب ہو تو وہ لے سکتے ہیں، اسی طرح وہ تنظیمیں یا ادارے جو غریب و نادار بچوں کی کفالت اور یتیموں کی تعلیم و تربیت کا نظم کرتے ہیں وہ بھی اسے لے سکتے ہیں، اور خود ان کی ذات پر یا ان کے لئے بیت الخلاء وغیرہ کی تعمیر میں صرف کر سکتے ہیں، البتہ مدارس و مساجد کی تنظیم و تعمیر اور تعلیم علم دین میں بھی اس قسم کی رقم لگانا مناسب نہیں ہے، کیونکہ مدارس دینیہ اور مساجد کے لئے طیب اور عمدہ مال ہی زیب دیتا ہے۔

......☆......

سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور اس کا شرعی حکم

مفتی لطیف الرحمن فلاحی [1]

حکومت ہند معاشی و معاشرتی ضرورتوں کی کفالت، نیز تعلیمی ترقی اور صنعتوں کے فروغ کے لئے مختلف شکلوں میں رقوم دیتی ہے (کبھی تو رقمیں بطور قرض دے کر سود کے ساتھ وصول کرتی ہے اور کبھی صرف بطور امداد واعانت کے دیا کرتی ہے) جس سے معاشی ومعاشرتی ضرورتیں پوری ہوتی ہے اور عوام اپنی صحت وعلاج، رہائش وزراعت میں اس رقم سے فائدہ اٹھاتی ہے۔

تو آیا ایک مسلمان اس طرح کی رقوم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اقتصادی اور معاشی ضرورت پورا کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور اس رقم کا لینا شرعی قباحتوں سے پاک ہے یا نہیں؟ اور اس طرح مسلمان سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہیں سودی قرض کے وبال میں تو شامل نہیں ہوتا، اور اس طرح کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے تعلق سے اسلام اپنے ماننے والوں کو کیا تعلیم دیتا ہے؟ اور اسلام کا اس بارے میں کیا نقطۂ نظر ہے؟ آئندہ کی سطروں میں ایسی اسکیموں سے استفادہ کا شرعی حکم تحریر کیا جاتا ہے:

(۱) وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے، اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرض کا کیا حکم ہے؟

(۱) حکومت اس طرح کے جو قرضے اپنی عوام کو دیتی ہے، اور پھر اس کا ایک حصہ معاف کردیتی ہے، اور قرضدار کو لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے تو اس طرح کے قرض لینے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، جائز اور درست ہے اس پر ربا کی تعریف شرعاً صادق نہیں آتی۔

شامی میں ہے: ''لأن الربو هو الفضل الخالي عن العوض، وحقيقة الشروط الفاسدہ هي زيادة ما لا يقتضيه العقد ولا يلائمه، فيكون فيه فضل خال عن العوض وهو الربا بعينه'' (۵/ ۱۶۹)۔

''کنز الدقائق'' میں ہے: ''هو فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال'' (۲۴۸) (بحوالہ کتاب النوازل ۱۱/ ۲۱۹)۔

''اعلاء السنن'' میں ہے:

''عن علي مرفوعًا: كل قرض جر منفعة فهو ربا، وكل قرض شرط فيه الزيادة فهو حرام بلا خلاف'' (۱۴/ ۴۹۹)۔

(۲۔۳) معافی والے قرض میں مقررہ مدت کے بعد اگر زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

اگر قرض میں لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے اور برابر کا معاملہ رہے تو یہ سود کے دائرہ میں داخل نہ ہونے کی وجہ سے جائز ہے، اور اگر لی ہوئی رقم زائد ہوگی تو سودی لین دین میں شامل ہو کرنا جائز ہے (مستفاد کتاب النوازل ۱۱/ ۲۲۷)۔

عالمگیری میں ہے: ''وهو في الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض في معاوضة مال بمال'' (۳/ ۱۱۷)۔

''عن جابر بن عبد الله ﷺ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء'' (صحيح مسلم ۲/ ۲۷)۔

(۴) کم شرح سود کو سروس چارج یا انتظامی خرچ شمار کیا جاسکتا ہے؟

---

[1] ہیلٹن ہاؤس، نیسٹر کمپاؤنڈ بلڈنگ نمبر ۷، روم نمبر ۵، اپوزٹ ایئر انڈیا کالونی، کلینا، سنتکروز، ممبئی۔

قرض دار نے جو رقم لی ہے اگر اس سے زائد رقم کا مطالبہ ہے اگر چہ اس کی شرح بہت کم ہے تو بھی یہ سودی لین دین ہو کر ناجائز رہے گا۔ اس بارے میں ''فقہ اکیڈمی'' کا ایک فیصلہ ملاحظہ ہو:

''سود کی حرمت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ، مناسب حد تک کم رہے یا مناسب حد تک زیادہ، شریعت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ شرح سود اگر مناسب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہے اور اگر نامناسب حد تک زیادہ ہے تو ناجائز، دلائل شرعیہ اس طرح کی کسی تفریق کی اجازت نہیں دیتے'' (نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے/ ۲۶)۔

لیکن اس بارے میں حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ (سابق مفتی دار العلوم دیوبند) کا نقطہ نظر دوسرا ہے اور اس معاملہ کی توجیہ دوسرے انداز سے فرماتے ہیں اور اس مختصر رقم کو جو سود کے نام سے وصول کی جاتی ہے، سروس چارج پر محمول کرتے ہوئے اور انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے سودی لین دین سے خارج قرار دیتے ہیں، اور اگر شرح سود کم ہے تو ان کے یہاں اس معاملہ کی گنجائش ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی تحریر ملاحظہ ہو:

''پس اس معاملہ کی توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت ہے اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت لی جاتی ہے جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے اور اعانت لینے والوں اور دینے والوں دونوں کا معاملہ صاف رہتا ہے اور یہ محض ایک قومی دمشترکہ نظام کی صورت ونوعیت ہے کوئی سودی کاروبار نہیں، بلکہ قوم کا سرمایہ ہے اور قوم ہی کے کام میں صرف کیا جاتا ہے اس کے منتظمین وکارکنان قوم کے اجیر ووکیل ہوسکتے ہیں اور غریبوں کی اعانت اور پسماندوں کو آگے بڑھانے اور ان کے لئے اسباب معیشت فراہم کرنے کی راہیں کھولنے کا ایک انتظام کیا جاسکتا ہے، نیز اس طریقہ کار ومحکمہ میں نفع وسہولت بھی دونوں جانب کو قریب قریب یکساں حاصل ہوتی ہے سود تو نام ہے اس نفع وزیادتی کا جو محض ایک جانب کو حاصل ہو اور عوض سے خالی ہو''۔

''کما صرح به الفقهاء الربا هو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدين في المعاوضة'' (مستفاد نظام الفتاوی ۲/ ۴۴۰)

حضرت مفتی صاحبؒ کی تحریر کی روشنی میں اس سروس چارج کو مطلق اجرت اور انتظامی فیس پر محمول نہیں کیا جاسکتا، بلکہ کچھ اس میں تبدیلی کرنی ہوگی، وہ اس طرح کہ سالانہ یا ماہانہ اضافہ کرنے کے بجائے دفتری مصارف کا جائزہ لے کر ٹھیک حساب کر کے ان کو ایک لخت مقرر کر دیا جائے، وصولی خواہ قسط وار میں کی جائے تو اس کو سروس چارج قرار دیا جاسکتا ہے، اور شرعاً جواز کا حکم لگایا جاسکتا ہے اس صورت میں یہ گنجائش بھی رہے گی کہ اس سروس چارج کو قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے مربوط کر دیا جائے، یا ہر قرض پر یکساں چارج لگایا جائے، یعنی سروس چارج وصول کرنا بھی جائز ہے اور اس کو فیصد سے مربوط کرنا بھی جائز ہے۔

حضرت فقیہ العصر مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''قرض جاری کرنے اور اس کا حساب وکتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں بینک کے لے اپنے قرضداروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آتے ہیں'' (فقہی مقالات ۱/ ۲۷۰)

حضرت موصوف نے اس سروس چارج کو فیصد سے مربوط کرنے کی بھی اجازت دی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قرض کی مقدار کی مناسبت سے سروس چارج میں بھی کمی بیشی ہو اور اس پر استدلال مختلف کتب فقہیہ کے حوالہ سے دلال کی اجرت سے کیا ہے کہ اس کو فیصد سے مربوط کرنے کی اجازت فقہاء نے دی ہے، اخیر میں لکھتے ہیں:

لہٰذا دلال کے کمیشن پر قیاس کرتے ہوئے زیر بحث مسئلہ میں قرض کے اجراء پر آنے والے دفتری اخراجات کو قرض کی مقدار پر فیصد کے لئے مقرر کرنے کو جائز قرار دیا جائے گا (فقہی مقالات ۱/ ۲۷۶)۔

(۵) اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی رقم جو زائد ہے اس کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں، تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

وہ قرضہ جو حکومت کی طرف سے اس شرط پر دیا جاتا ہے کہ قرض دار اس قرضہ کو سود کی ایک خاص مقدار کے ساتھ (اس کا وسط معمولی نہ ہو کہ سروس چارج پر محمول کیا جاسکے) ادا کرے گا تو شریعت مطہرہ میں یہ ایک خالص سودی معاملہ ہے، جو موبقات میں شمار ہوتا ہے، یہ معاملہ ناجائز اور حرام ہے اس سے اجتناب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم اور ضروری ہے، قرآن وحدیث میں سودی لین دین کرنے والوں پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، لہٰذا عام حالات میں اس طرح کے معاملات سے سخت پرہیز کرنا چاہئے۔

''عن جابر بن عبداللّٰہ لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه. وقال: هم سواء'' (مسلم ۲/ ۴۷)

لیکن اگر کوئی شخص یہ قرضے اپنی مختلف ضروریات (مثلاً باغبانی، کاشتکاری اور کسی کاروبار کو شروع کرنے کے لئے سخت مجبوری میں لیتا ہے اور اس کے پاس نہ تو کوئی جائیداد ہے اور نہ سونا، جس کو بیچ کر اپنی ضروریات پوری کرے اور نہ قرض حسن ملنے کی امید ہے، تو پھر اس طرح کے قرض لینے کی گنجائش ہوگی۔

''فتاوی محمودیہ'' میں ہے:

سود لینا اور دینا دونوں حرام ہے، اگر گذارہ کی کوئی صورت نہ ہو تو محتاج کے لئے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے (۱۶/ ۳۰۲)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

''سود دینا حرام ہے ایسے شخص پر حدیث شریف میں لعنت آئی ہے حرام کا ارتکاب اضطرار کی حالت میں معاف ہے، پس اگر جان کا قوی خطرہ ہے یا عزت کا قوی خطرہ ہے، نیز اور کوئی صورت اس سے بچنے کی نہیں، مثلاً نہ جائیداد فروخت ہوسکتی ہے، نہ روپیہ بغیر سد کے مل سکتا ہے تو ایسی صورت میں زید شرعاً معذور ہے اور اگر ایسی ضرورت نہیں، بلکہ کسی اور دنیوی کاروبار کے لئے ضرورت ہے یا روپیہ بغیر سود کے مل سکتا ہے یا جائیداد فروخت ہوسکتی ہے تو پھر سود پر قرض لینا جائز نہیں کبیرہ گناہ ہے'' (۱۶/ ۳۰۵)۔

''تعمیر مکان'' ضرورت میں داخل نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ ایک مسلمان اپنی زندگی کرایہ کے مکان میں گذارنے کی سکت وطاقت رکھتا ہے، اسے حاجت شدیدہ کا درجہ نہیں دیا جانا چاہئے۔

''جدید فقہی مسائل'' میں ہے:

''سود لینا اور دینا دونوں ہی معصیت ہے، اس لئے اصولی طور پر ظاہر ہے کہ سودی قرض لینا درست نہ ہوگا، مگر کبھی کبھی ایسے قرض لینا ضرورت بن جاتی ہے اور تجارت، کاشتکار کے لئے ایسے قرض لینا ناگزیر ہوجاتا ہے، ان حالات میں بدرجہ ضرورت ایسے قرض لینے کی اجازت ہوگی، البتہ یہ اجازت اسی وقت ہوگی کہ آدمی اس کے لینے پر اس طرح مجبور ہوجائے کہ نہ لے تو کوئی ذریعہ معاش فراہم نہ ہو، اور بنیادی ضرورتوں، کھانا، کپڑا، مکان، کی تکمیل بھی ممکن نہ رہ سکے، نہ کہ محض تعیش، آرام طلبی اور معاشی معیار بلند کرنے کے لئے ایسا کریں'' (۱/ ۲۴۸)۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں:

''وفي القنية والبغية: يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر ۱/ ۲۶۷)۔

علامہ حموی اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''وذلك نحوه أن يقترض عشرة دنانير مثلاً ويجعل مربها شيئاً معلوماً في كل يوم ربحاً'' (حاشية الحموي على الاشباه ۱/ ۲۶۷ القاعدة الخامسة الضرر يزال)۔

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سودی قرض کی گنجائش فقط ضرورت اور مجبوری کی حالت میں ہے جس وقت حرام بھی حلال ہو جاتا ہے عام حالات میں اس کی گنجائش نہیں (مستفاد فتاوی زکریا ۵/ ۳۷۰)۔

(۶) ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضرویات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے .... تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟

حکومت سے اس طرح کی رقوم کو حاصل کرنے پھر اسے اپنی ضروریات کے استعمال کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں بلا تکلف استعمال کی جاسکتی ہے، یہ رقوم خالص امداد واعانت کے طور پر دی گئی ہے، سودی معاملہ ہرگز نہیں ہے۔

(۷-۸) گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم - جس قسم کی بھی ہو - ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

یہ پورا معاملہ دلالی کا ہے اور دلال کی اجرت کو فقہاء کرام نے تعامل ناس کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ بوقت عقد اجرت کی تعیین کرلی جائے، ورنہ کام ہونے پر دلال اجرت مثل کا حقدار ہوگا۔

اب یہاں مذکورہ سوال میں اس امدادی رقوم کے حصول میں اگر درمیان میں واسطہ بننے والے کو واقعی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اور دوڑ دھوپ کے بغیر وہ رقم صاحب حق کے ہاتھ نہیں پہنچتی تو عاقدین کے مابین حاصل شدہ رقم کا ایک یا دو فیصدی حصہ پہلے سے اگر طے کرلیا جائے تو یہ معاملہ لوگوں کی حاجت اور ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے جائز ہوگا، اور اس طرح دلال کو اپنی اجرت لینے کا حق حاصل ہوگا۔

''کتاب النوازل'' میں ہے: عاقدین یا بائع اور مشتری کے درمیان معاملات طے کرانے میں جو شخص اپنا کردار ادا کرتا ہے اس کو ''سمسار''، یا دلال کہا جاتا ہے، اب اگر یہ دلال ایسے معاملات میں ہو جس میں کسی دوسرے فرد یا معاشرہ کا نقصان لازم نہ آتا ہو تو باتفاق ائمہ اس کی گنجائش ہے، البتہ اگر اس سے عوام کو نقصان ہو یا لوگوں کے لئے تنگی پیش آئے تو بتقاضائے حدیث: ''لا بیع حاضر لباد'' ایسی دلالی مکروہ ضرور ہوگی۔

بہر حال اگر دلالی میں باقاعدہ معاملہ طے ہو اور کسی قسم کی جہالت نہ ہو تو فی نفسہ اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں اور اگر معاملہ مجہول ہو تو مذہب حنفیہ میں اس کو فاسد قرار دیا گیا ہے اور کام پورا ہونے پر اجر مثل کی بات کہی گئی ہے، نہ کہ مقررہ اجرت کی۔

لیکن اگر جہالت معمولی ہو یا کثرت تعامل کی وجہ سے موجب نزاع نہ رہی ہو تو اس کو متاخرین فقہاء نے ضرورۃً جائز قرار دیا ہے (۱۲/ ۳۸۰)۔

''قال فی التاتارخانیة: وفی الدلال والسمسار یجب أجر المثل وماتوا منعوا علیه أن فی کل عشرة دنانیر کذا فذلك حرام علیهم، وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به، وإن کان فی الأصل فاسدًا لکثرة التعامل، وکثیر من هذا غیر جائز، فجوزوه لحاجة الناس إلیه کدخول الحمام'' (رد المحتار ۵/ ۴۲)

''أجرة السمسار والمناوی والحمامی والصکاك وما لا یقدر فی الوقت ولا العمل تجوز لی کان للناس به حاجة'' (رد المحتار ۵/ ۴۲، احسن الفتاوی ۷/ ۲۷۳)۔

(۹) اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں؟

اولاً رشوت کی تعریف ملاحظہ فرمائی جائے:

رشوت بکسر راء وہ مال جو اپنے موافق فیصلہ کروانے کے لئے دیا جائے۔

حضرت ابن عطیہ نے رشوت کی جامع تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

''أخذ المال علی فعل ما یجب علی الآخذ فعله، أو فعل ما یجب علیه ترکه'' (تفسیر بحر محیط ۴/ ۵۲۳)۔

یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے (مستفاد جدید معاملات کے شرعی احکام ۱/ ۱۷۸)۔

اب دو موقع ایسے ہیں جہاں پر فقہاء کرام ایک مسلمان کو رشوت دینے کی گنجائش دی ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ، اللہ پاک اس سے مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔

(۱) جس سے ضرر کا اندیشہ ہو اسے رشوت دینا جائز ہے، اس کے لئے لینا حرام ہے۔

(۲) دفع مضرت یا جلب منفعت کے لئے درمیان میں واسطہ بننے والے یعنی صرف سفارش کرنے والے کو رشوت دینا جائز ہے، آخذ کے لئے لینا جائز نہیں، البتہ اگر درمیانی واسطہ کے ذمہ کوئی کام لگایا جائے تو اس کے لئے اس کام کی اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ وہ یہ کام کرنے پر بنفس خود قادر ہو قادر بقدرت غیر کا اعتبار نہیں (حوالہ بالا/۱۷۸)۔

اب مذکورہ سوال میں اگر یہ شخص گورنمنٹ کی اس امداد کا واقعی مستحق ہے یا اس قرض کی اسکیم کا واقعی حاجت مند ہے، اور اس طرح کی رقم عموماً افسران کو رشوت دیئے بغیر ہاتھ نہیں آتی، لہٰذا اپنے حق کی وصولیابی اور دفع ظلم کی خاطر اگر اس نے رشوت دے دی تو امید ہے کہ انشاء اللہ آخرت میں مواخذہ سے بچ جائے گا۔ لیکن ان افسران کو لینا کسی صورت میں جائز نہیں ہوگا۔

صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں: ''ودفع الرشوة لدفع الظلم أمر جائز'' (۳/ ۲۳۵)۔

صاحب بحر الرائق تحریر فرماتے ہیں: ''ومنها: إذا دفع الرشوة خوفًا على نفسه أو ماله، فهو حرام على الآخذ غير حرام على الدافع، وكذا إذا طمع في ماله فرشاه ببعض المال، ومنها: إذا دفع الرشوة ليسوّى أمره عند السطان حلّ له الدفع ولا يحل للآخذان يأخذ'' (البحر الرائق ۶/ ۲۶۲)۔

''فتاوی محمودیہ'' میں ہے: رشوت کا لینا دینا حرام ہے، البتہ دفع ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لئے بحالت مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے، اس صورت میں فقط رشوت لینے والا گنہگار ہوگا (بحوالہ فتاوی زکریا ۵/ ۴۸۲)۔

(۱۰) امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط و معیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

اگر سرکار نے اس رقم کی وصولیابی کے لئے کچھ شرائط متعین کئے ہیں، تو اس سلسلہ میں کسی بھی طریقہ سے غلط بیانی سے کام لینا حرام اور سخت گناہ ہوگا، اور اس طرح رقم حاصل کرنا ''أكل بالباطل'' ہوگا، اور یہ شخص بیک وقت جھوٹ، دھوکہ اور حرام مال تینوں گناہ کا مرتکب ہے، اس لئے کہ امور مباحہ میں حکومت کے قانون کی خلاف ورزی سخت گناہ ہے اور امور مباح میں شرائط کی پاسداری لازم اور ضروری ہے۔

قرآن میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: "يأأيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (سورة النساء: ۲۹)۔

''عن أبي جرّة الرقاشي عن عمه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا لا تظلموا ألا لا يحل مال امرأ إلا بطيب نفس منه'' (مشكوة المصابيح/ ۲۵۵)۔

''عن أبي هريرة: "آية المنافق ثلاث'' زاد مسلم، وإن صام وصلى، وزعم أنه مسلم ثم اتفقا إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا ائتمن خان'' (متفق عليه)۔

شامی میں ہے: ''لا يجوز التصرف في مال غيره بلا إذنه ولا ولايته'' (در مختار كتاب الغضب ۹/ ۲۹۱)۔

(۱۱) بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

قرض کا انٹرسٹ مقروض کی جانب سے حکومت پورا پورا ادا کرے یا بڑا حصہ تو حکومت ادا کرے، لیکن مقروض کو بھی تھوڑا بہت حصہ ادا کرنا پڑے، بہر صورت اگر بینک سے لی ہوئی رقم سے ادائیگی کی رقم سے زائد نہ ہو تو یہ سودی لین کے دائرہ میں شامل نہیں ہوگا اور اس اسکیم سے استفادہ شرعاً جائز ہوگا، اور ادائیگی کی رقم اصل لی ہوئی رقم سے تجاوز کر جاتی ہے تو چاہے حکومت ادا کرے یا مقروض کو ادا کرنا پڑے، بہر صورت حرام ہوگا، اور اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں ہوگی، سود بہر حال سود ہے، کمی زیادتی سے حد جواز میں داخل نہیں ہوگا اور گنجائش نہیں ہوگی۔

"اعلاء السنن" میں ہے: "وكل قرض شرط فيه الزيادة فهو حرام بلا خلاف، قال ابن المنذر: أجمعوا على أن السلف إذا شرط على المستسلف زيادة أو هدية، فأسلف على ذلك أن آخذ الزيادة على ذلك ربا، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كل قرض جرّ منفعة فهو ربوا" (۱۴/ ۴۹۹، كتاب النوازل ۱۱/ ۲۳۳)۔

(۱۲) بعض اسکیمیں ایسی بھی ہیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر دیا ہے جس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے تو کیا صورت درست ہوگی؟

سود اور ربو ایک شرعی لفظ ہے اور شریعت مطہرہ میں اس کا شرعی مفہوم متعین ہے جب تک وہ مفہوم صادق نہ آئے اس وقت تک کسی کے سود کہہ دینے سے وہ سود نہ ہوگا۔ احکام القرآن میں ہے:

"الربوا في اللغة الزيادة، والمراد في الآية كل زيادة لا تقابلها عوض" (قواعد الفقه/ ۱۱۵، منتخبات نظام الفتاوی ۲/ ۱۴۰)

اب یہاں مذکورہ سوال میں حکومت کا مقصد ان افراد واشخاص کا تعاون کرنا جو بے روزگار اور معاشی الجھنوں میں گرفتار اور ان اداروں کا تعاون کرنا ہے جو کسمپرسی میں چل رہے ہیں، یہاں پر حکومت ان افراد کو بطور رقم قرض دے کر زیادتی وصول نہیں کر رہی ہے، بلکہ بلا کسی رقم کے اپنی اس رقم سے جو اس نے سود پر حاصل کی ہے ان افراد کا خالص تعاون کر رہی ہے، لہٰذا بلا کسی شرعی قباحت کے ان افراد کو تعاون لینا جائز رہے گا اور حکومت کی جانب سے یہ رقم خالص عطیہ کہلائے گی۔

علاوہ ازیں اگر یہ افراد واشخاص پریشان حال اور بے روزگار رہے تب تو اس اعانت سے یہ حضرات بلا تکلف استفادہ کر سکتے ہیں اور اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس لئے کہ یہی تو وہ لوگ ہیں جو سودی رقم کے مصرف ہے۔

(یہ ایک الگ اور جدا بحث ہے کہ حکومت یہ پورا تعاون خاص بینک کی انٹرسٹ کی رقم سے کرتی ہے اور بینک میں ڈپازٹ میں اس نے انٹرسٹ کی رقم پانے کے لئے کیا ہے اور پھر وہ مدد کر رہی ہے، تو حکومت کے لئے ربوی اور سودی معاملہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اور کفار فروع کے مخاطب ہے یا نہیں؟ او رمعاملات میں اسلامی احکام کے پابند ہیں یا نہیں؟ اصول فقہ میں یہ بحث اپنی جگہ مرقوم ہے، علامہ شامی نے جزیہ کی بحث میں اس بحث کو تفصیل سے ذکر فرمایا ہے، اور "المنار" سے عبارت نقل فرمائی ہے، اور معاملات میں بالکلیہ انہیں مخاطب نہیں تسلیم فرمایا ہے، مثلاً حدود وقصاص میں کافر ذمی سے مواخذہ ہوگا، لیکن حد شرب کا مکلف نہیں ہوگا، نیز اسی طرح ذمی کے مذہب میں بلا مہر اور بلا گواہوں کے نکاح ہوتا ہے، تو اس نکاح کو باقی رکھا جائے گا، لیکن معاملات میں سودی لین سے احتراز کا وہ بھی پابند ہوگا، یہ کفار و یہود کے مذہب میں بھی حرام ہے) (تفصیل ملاحظہ ہو: مستفاد رد المحتار علی در المختار ۶/ ۱۵۸ دار الکتاب) بعض علماء تفسیر نے فرمایا ہے کہ سود اور ربو ہر شریعت وملت میں حرام رہا ہے (جواہر الفقہ ۳/ ۸۳)۔

شامی میں ہے: "الربا هو فضل خال عن عوض مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة فليس الفضل في الهبة بربا" (۷/ ۳۹۸)۔

"ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تقدر الرد على صاحبه" (شامی ۶/ ۳۶۵، كتاب النوازل ۱۱/ ۲۷۷)۔

……☆……

سرکاری اسکیمیں......فقہ اسلامی کی روشنی میں

مفتی محمد رمضان سعادتی[1]

(۱) وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے، اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، اور اس میں کسی قسم کی کوئی شرط نہیں ہوتی ہے، قرض لینے والے کو کبھی پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنے فی صد سبسڈی ملے گی، اور کبھی بعد میں علم ہوتا ہے، معافی کا علم قبل القرض ہو یا بعد القرض، اس سے اصل صورت مسئلہ پر فرق نہیں پڑے گا اور یہ صورت جواز کے دائرے میں آئے گی، کیوں کہ یہ ''ابرا'' ہے، صاحب حق کو اپنا پورا یا بعض حق ساقط کرنے کا اختیار ہے۔

صاحب ہدایہ علامہ علی المرغینانیؒ فرماتے ہیں: ''ألا یری أنه یملك إبرائه مطلقا'' (ہدایہ ۳/ ۷۶)

امام ابوبکر جصاص رازی حنفیؒ آیت مداہنت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''کما لایوعظ الطالب فی نقصان ماله، إذ لو أبرأه من جمیعه لصحت برائته'' (احکام القرآن للجصاص الرازی ۱/ ۵۸۹)

(۲) معافی والے قرضوں میں بعض اوقات طے کردہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ نہیں، تاہم لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت کا حکم ''ضع وتعجل'' والے مسئلے سے معلوم ہوتا ہے، اس مسئلے کا حاصل یہ ہے کہ دائن مدیون سے کہے: ''قرضے میں کمی کر اور جلدی ادا کر یا مدیون دائن سے کہے کہ اپنے قرضے میں کمی کر اور جلدی وصول کر''۔ اس پر قدیم فقہاء نے تفصیلی گفتگو کی ہے، ائمہ اربعہ اور اکثر فقہاء کے نزدیک اگر قبل از وقت ادائیگی کے لئے اس کمی کو شرط قرار دیا تو جائز نہیں ہے، عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ جب دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی کرنا سود میں داخل ہے تو دین کی تعجیل کی صورت میں دین کے اندر کمی کرنا بھی سود میں داخل ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں:

''قال مالك: والأمر المکروہ الذی لا اختلاف فیه عندنا أن یکون للرجل علی الرجل الدین إلی أجل، فیضع عنه الطالب، ویعجله المطلوب .... قال مالك: وذلك عندنا بمنزلة الذی یؤخر دینه بعد محله عن غریمه، ویزید الغریم فی حقه قال: فهٰذا الربا بعینه لاشك فیه'' (موطا امام مالك ۱/ ۶۰۶ کتاب البیوع، باب ما جاء فی الربا فی الدین، بحواله بحوث فی قضایا فقهیه معاصرة للعلامة المفتی محمد تقی العثمانی ۱/ ۲۸)۔

امام محمدؒ موطا امام محمد میں فرماتے ہیں:

''قال محمد: وبهذا نأخذ، من وجب له دین علی إنسان إلی أجل، فسأل أن یضع عنه ویعجل له ما بقی، لم ینبغ ذلك، لأنه یعجل قلیلًا بکثیر دینا، فکأنه یبیع قلیلًا نقدًا بکثیر دینا، وهو قول عمر بن الخطاب، وزید بن ثابت، وعبد الله بن عمر، وهو قول أبی حنیفة'' (موطا امام محمد ۱/ ۳۲۲ باب الرجل یبتاع المتاع أو غیرہ نسیئة ثم یقول أنقدنی واضع عنك، بحوالۂ بحوث فی قضایا فقهیه معاصرة ۱/ ۲۸)۔

اسی بنا پر صاحب ''ہدایہ'' فرماتے ہیں:

''ولو کانت له ألف مؤجلة فصالحه علی خمس مائة حالة لم یجز، لأن المعجل خیر من المؤجل، وهو غیر مستحق بالعقد، فیکون بإزاء ما حطه عنه، وذلك اعتیاض عن الأجل وهو حرام'' (ہدایہ ۳/ ۲۵۱)۔

---

[1] جامعہ سعادت العلوم دیش والی کالونی مکرانہ، ناگور، راجستھان۔

مذکورہ بالا سطروں سے معلوم ہوا کہ "ضع وتعجل" والے مسئلے کی حرمت کی بنیاد اجل کا عوض ہے، اور اجل کے مقابلہ میں ثمن کی زیادتی یا کمی نہیں ہوتی ہے، اگر اجل کے مقابلے میں ثمن میں کمی کی جاتی ہے تو یہ ویسا ہی ربا ہوگا، جیسا ثمن میں زیادتی کی صورت میں ہوتا ہے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہ دیون مؤجلہ میں ضع وتعجل کا معاملہ حرام ہے۔ رہی بات دیون حالہ اور قرض کی، سو اس میں یہ معاملہ جائز ہے، کیونکہ احناف کے نزدیک قرض تاجیل کو قبول نہیں کرتا ہے، مؤخر کرنے سے مؤخر نہیں ہوتا ہے۔ "ہدایہ" میں ہے:

"وكل دين حال إذا أجّله صاحبه صار مؤجلا لما ذكرنا إلا القرض، فإن تأجيله لا يصح" (ہدایہ ۳/ ۷۶)۔

علامہ ابن عابدین شامی "ولزم تأجيل كل دين إلا القرض" کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"أى أنه يصح تأجيله مع كونه غير لازم، فللمقرض الرجوع عنه" (فتاوى شاميه، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية ۷/ ۳۸۴)

جب قرض میں اجل ہے ہی نہیں، تو اس کے مقابلے میں ثمن ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا، اس لئے اگر ثمن میں کمی کی جاتی ہے تو اس کمی کو اجل کے مقابل نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ لہٰذا اگر قرض خواہ بعجلت ادائیگی کی شرط پر اپنے قرض کا کچھ حصہ ساقط کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فقہاء کرام نے اس کی وضاحت فرمائی ہے، صاحب "ہدایہ" ذرا الگ پیرائے میں اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"وكل شئي وقع عليه الصلح، وهو مستحق بعقد المداينة لم يحمل على المعاوضة، وإنما يحمل على أنه استوفى بعض حقه وأسقط باقيه، كمن له على آخر ألف درهم فصالحه على خمس مائة ... جاز، فكأنه أبرأه عن بعض حقه"۔

کچھ سطروں کے بعد ایک اور مسئلہ لکھتے ہیں:

"ومن له على آخر الف درهم، فقال: أد إلي غدا منها خمس مائة على أنك برئ من الفضل فهو برئ، فإن لم يدفع إليه خمس مائة غدا عاد عليه الألف، وهو قول أبي حنيفة ومحمد، وقال أبويوسف: فلا يعود عليه" (ہدایہ ۳/ ۲۵۱، ۲۵۲)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے بھی اسی نوع کا ایک مسئلہ خانیہ کے حوالے سے نقل فرمایا ہے:

"رجل له على رجل ألف درهم قرض، فصالحه على مائة إلى أجل، صح الحط والمائة حالة" (رد المحتار ۷/ ۲۸۵ كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية)۔

"جامع صغیر میں امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے روایت کی کہ دائن مدیون کو بشرط ادائے نصف بری کردے تو مدیون نصف ادا کرنے سے بری ہوجاتا ہے" (غیر سودی بینکاری، شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی: ۱۵۴ مطبوعہ اریب پبلیکیشنز، دیوبند)۔

اس باب میں مالکیہ کا رجحان بھی احناف کے ساتھ ہے، دیون مؤجلہ میں امام مالکؒ کی تصریح اوپر گذر چکی ہے، دیون حالہ کے باب میں امام مالک فرماتے ہیں:

"قلت: أرأيت لو أن لى على رجل ألف درهم قد حلت، فقلت: اشهدوا إن أعطاني مائة درهم عند رأس الشهر، فالتسع مائة درهم له، وإن لم يعطني فالألف كلها عليه، قال: قال مالك: لا بأس بهذا، وإن أعطاه رأس الشهر فهو كما قال، وتوضع عنه التسع مائة، فإن لم يعطه رأس الهلال، فالمال كله عليه" (المدونة الكبرى ۱۱/ ۲۷ آخر كتاب الصلح، بحواله بحوث فى قضايا فقهيه معاصرة ۱/ ۳۰)۔

مندرجہ بالا معروضات سے معلوم ہوا کہ یہ صورت جائز ہے، کیونکہ یہ قرض ہے اور قرض میں کمی کرنا درست ہے، جیسا کہ اوپر گذرا۔ معاصر علماء میں مفتی سلمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم نائب مفتی دار الافتاء شاہی مرادآباد نے اس قسم کی صورت کے جواز کا فتوی دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

سوال: (۲۶۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین، ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گورنمنٹ کسی بھی آدمی کو قرض کے نام سے رقم دیتی ہے، اس میں یہ شرط مقرر ہوتی ہے کہ سات سال سے پہلے پہلے اگر مقروض بینک کا قرض ادا کردے تو اس کو یہ رعایت دی جاتی ہے کہ متعین رقم سے کچھ حصہ معاف

کردیا جاتا ہے، مثلاً ۱۵ ہزار روپے کسی نے لیے تو ۱۱ ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے، اور اگر سات سال سے مدت تجاوز کرگئی تو پھر ہر ماہ سود بڑھتا رہے گا، یعنی مقروض کو متعین رقم سے زیادہ دینا ہوگا؟

الجواب وباللہ التوفیق: صورت مسئولہ میں مذکورہ شرط پر نفس قرض کا معاملہ تو صحیح ہے، لیکن اس میں سات سال کے بعد سود دینے کی جو شرط لگی ہے وہ لغو ہے، لہٰذا اگر مقروض قرض لے کر سات سال کے اندر اندر قرض ادا کردے تو وہ گنہگار نہ ہوگا، اور حکومت کی طرف سے جو قرض میں کمی ہوگی وہ "ابرا" یعنی قرض کی معافی کی ایک شکل ہوگی، اور اگر سات سال میں قرض ادا نہ کرسکا اور اسے سود دینا پڑا تو اب سود دینے کا اسے گناہ ہوگا۔

"عن علی أمیر المؤمنین رضی اللہ عنہ مرفوعًا: کل قرض جر منفعة فهو ربا، وکل قرض شرط فیه الزیادة فهو حرام بلا خلاف" (اعلاء السنن ۱۴/ ۴۹۹ ادارۃ القرآن کراچی کتاب الحوالہ، باب کل قرض جر منفعة فهو ربا)۔

"قوله علیه السلام: کل قرض جر منفعة فهو ربا، أی فی حکم الربا، فیکون عقد القرض باطلًا، فإذا شرط فی عقده ما یجلب نفعًا إلی المقرض من نحو زیادة قدر أو صفة، بطل" (فیض القدیر ۹/ ۴۲۸۷ رقم: ۶۳۳۶ مصطفی الباز ریاض)

"وفی الخلاصة: القرض بالشرط حرام والشرط لغو" (الدر المختار مع الشامی، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة ۵/ ۱۶۶ کراچی ۷/ ۳۹۵ زکریا) فقط واللہ تعالی اعلم (کتاب النوازل ۱۱/ ۵۱۵-۵۱۶)۔

(۳) اس صورت کا حکم اوپر کے اقتباس سے واضح ہو چکا ہے، "فلا حاجة إلی إعادته"۔

(۴) معافی یا غیر معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن زیادتی کی شرح اتنی کم ہو کہ اس کو حق الخدمت (Service Charge) کے دائرے میں لایا جاسکے، تو ایسے قرضوں اور زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ اس پر غور کرنے سے قبل مناسب ہے کہ نفس حق الخدمت کو شریعت اسلامیہ کے آئینہ میں دیکھ لیا جائے، تاکہ اس کی حیثیت اور حکم کے تعین میں دشواری پیش نہ آئے۔

قرض ایک انسانی اور معاشرتی حاجت ہے، بوقت ضرورت خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا ہے۔ چونکہ اسلام دین رحمت ہے، اس کے احکام مبنی برانصاف اور اس کی تعلیمات مبنی بر رحمت ہیں، وہ لوگوں میں باہمی محبت ومودت، رحم دلی وہمدردی کے جذبات پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ دوسرے کی حاجت کو اپنی حاجت سمجھنے کا مزاج انسان میں پروان چڑھے، اس لئے قرض کے باب میں اسلام نے یہ واضح اور دوٹوک فیصلہ دیا ہے کہ قرض پر نفع نہیں لیا جاسکتا؛ قرض پر نفع لینا ربا ہے جو قطعاً حرام ہے، دی ہوئی رقم سے زائد ایک کوڑی بھی لینا قرض خواہ کے لئے جائز نہیں ہے۔

"عن علی أمیر المومنین مرفوعًا کل قرض جر منفعة فهو ربا" (اعلاء السنن، کتاب الحوالہ، باب کل قرض جر منفعةً فهو ربا"، دار الکتب العلمیه، بیروت ۱۴/ ۵۶۶)۔

شریعت مطہرہ نے قرض کے معاملے پر مختلف انسانی مصالح کے پیش نظر "لکھا پڑی" اور اقامت شہادت کا حکم دیا ہے۔

"یا أیها الذین آمنوا إذا تداینتم بدین إلی أجل مسمی فاکتبوه...... ولا تسئموا أن تکتبوه صغیرًا أو کبیرًا إلی أجله" (البقرة: ۲۸۲)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: یہ آیت سلم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یعنی اہل مدینہ پھلوں میں جو دو، تین سالوں کے لئے سلم کا معاملہ کرتے تھے، اس آیت کے نزول کا سبب یہ معاملہ بنا، لیکن یہ آیت، مداینت کے سارے معاملات کو شامل ہے، علامہ قرطبی ابن خویز منداد کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ تیس حکموں کو متضمن ہے، مالکیہ نے اس سے قرض میں تاجیل کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

"ثم هی تتناول جمیع المداینات إجماعًا، وقال بن خویز منداد: "إنها تضمنت ثلاثین حکمًا، وقد استدل بها بعض علمائنا علی جواز التاجیل فی القروض .... وحقیقة الدین: عبارة عن کل معاملة کان أحد العوضین فیها نقدًا والآخر فی الذمة نسیئة، فإن العین عند العرب ما کان حاضرا، والدین ما کان غائبًا" (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۳/ ۲۴۳)۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''ذهب بعض الناس إلى أن كتب الديون واجب عليه أربابها، فرض بهذه الآية، بيعاكان أو قرضًا، لئلا يقع فيه نسيان أو جحود'' (الجامع لاحكام القرآن ۲/ ۲۴۷)

امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں: ''ينتظم سائر عقود المداينات التى يصح فيها الآجال'' (احکام القرآن للجصاص الرازی ۱/ ۵۸۵)۔

قرض پر لکھا پڑھی کا یہ حکم جمہور کے نزدیک استحبابی ہے، جبکہ کچھ علماء کے نزدیک وجوبی ہے۔

''ولا خلاف بين فقهاء الأمصار أن الأمر بالكتابة والإشهاد والرهن المذكور جميعه فى هذه الآية ندب وإرشاد إلى ما لنا فيه الحظ والصلاح والاحتياط للدين والدنيا، وإن شيئًا منه غير واجب'' (احکام القرآن ۱/ ۵۸۴-۵۸۵)۔

کتابت کا حکم وجوبی ہو یا استحبابی، اگر انجام پاتا ہے تو اس کی کتابت اور املاء کی ذمہ داری مدیون پر ہے:

''وليملل الذى عليه الحق وليتق الله ربه ولا يبخس منه شيئًا، فإن كان الذى عليه الحق سفيهًا أو ضعيفًا أو لا يستطيع أن يمل هو فليملل وليه بالعدل'' (البقرہ: ۲۸۲)۔

اگر کتابتِ وثیقہ اور املاء پر اجرت اور معاوضہ دینے کی نوبت آتی ہے تو لکھنے والے کے لئے اس کی اجرت لینا جائز ہے، اور اجرت دینے کی ذمہ داری مدیون کے کاندھوں پر ہوگی۔ علامہ قرطبی مالکی فرماتے ہیں:

''ولم يختلف العلماء فى جواز أخذ الأجرة على كتب الوثيقة'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۲/ ۲۴۸)۔

احناف میں سے علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں:

''فلما لم يختلف الفقهاء فى جواز أخذ الأجرة على كتب كتاب الوثيقة دل ذلك على أن كتبه ليس بفرض، لا على الكفاية ولا على التعيين'' (احکام القرآن ۱/ ۵۸۸)۔

''وليملل الذى عليه الحق'' (البقرہ: ۲۸۲)۔

پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مقرض قرض پر نفع نہیں لے سکتا ہے، اگر لیتا ہے تو یہ صریح ربا ہوگا۔ اور قرض کے دستاویز کی تیاری پر آنے والا خرچ مستقرض اٹھائے گا، مقرض نہیں، یہ بات تو صاف ہے، لیکن اگر ایک آدمی بینک سے قرض لیتا ہے اور بینک اس سے اتنی معمولی شرح پر سود وصول کرتا ہے جو معاملۂ قرض کے دستاویز لکھوانے کے معاوضے کے برابر ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ اپنی مقدار کے لحاظ سے 'سروس چارج' یا 'حق الخدمۃ' کہلا سکتا ہے، گویا وثیقہ قرض کی کتابت واملاء کی اجرت کا دوسرا نام سروس چارج ہے۔ کتابت وثیقہ کی اجرت کی طرح سروس چارج بھی فی نفسہ جائز ہے۔

یہ بات تو نفس سروس چارج کے بارے میں ہوئی۔ رہی بات ہمارے ملک کے بینکوں کی جو بعض اوقات مخصوص طبقات یا سب کے لئے معمولی شرح سود پر قرض جاری کرتے ہیں، معمولی شرح پر ادا کیا جانے والا سود سروس چارج کے دائرے میں آکر جائز ٹھہرے گا یا نہیں؟ اس سود کو سروس چارج قرار دینے پر راقم السطور کو دو وجہوں سے اشکال ہے: ایک یہ کہ اس قسم کے قرضوں سے بینک کا مقصد سود حاصل کرنا ہوتا ہے، فقط دفتری اخراجات کی تکمیل نہیں؛ اور فقہ کا قاعدہ ہے: ''الأمور بمقاصدها'' (الاشباہ والنظائر ۱/ ۱۰۳)۔

دوسرے یہ کہ اس سود کی وصول یابی کا طریقہ عین ربا کا طریقہ ہے، ''إما أن تقضى وإما أن تربى'' (قرض ادا کرو یا قرض میں اضافہ کرو) جیسا کہ جاہلیت میں ربا کا رائج طریقہ تھا۔ اس لئے بندے کے نزدیک تفصیل کا طریقہ مناسب ہے، وہ یہ کہ بینک اگر قرض پر فیصد کے حساب سے یا کسی اور حساب سے ایک متعین رقم عائد کرتا ہے۔ مثلاً ۵۰۰۰۰ ہزار روپے پر ۲۰۰۰ ہزار روپے کی ادائیگی لازم ہوگی، وقت پر ادائیگی ہو یا نہ ہو، تاخیر کی صورت میں سود میں اضافہ نہیں ہوگا؛ یہ صورت جائز ہے۔ اور اگر مستقرض پر بینک متعین رقم عائد نہیں کرتا ہے، بلکہ اجرائے قرض سے سود کا کانٹا چلنا شروع ہوتا ہے اور ادائیگی پر ہی آکے رکتا ہے۔ تو یہ ''إما أن تقضى وإما أن تربى'' کی بنیاد پر ناجائز ہوگا۔

(۵) اگر قرض پر لی جانے والی رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ اس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے، تو پھر یہ ''کل قرض جر نفعًا حرام'' (در مختار مع رد

المحتار، کتاب البیوع، باب المرابحۃ والتولیۃ، زکریا ۷/ ۳۹۵) کے تحت داخل ہونے کی بنا پر حرام ہوگا۔ رہی بات کاروباری حاجات اور دیگر ضرورت کی، سوان کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں ہوگی، کیونکہ یہ ضروریات ایسی نہیں ہیں جن پر زندگی کی بقااور گذران کا انحصار ہو، اور جو حرام کو حلال قرار دے۔

(۶) بعض اوقات حکومت کچھ ضروریات کے لئے مکمل امداد کے طور پر رقم دیتی ہے، اس کے کسی بھی حصے کی واپسی نہیں ہوتی ہے، یہ حکومت کی جانب سے تبرع اور عطیہ ہوتا ہے، فقہی نقطہ نظر سے اس میں عدم جواز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہو رہی ہے۔

(۷) آج جب کہ بدعنوانیوں کا دور دورہ ہے، گورنمنٹ کی جانب سے دی جانے والی امدادی رقوم کے حصول کے لئے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے، پیسے بھی خرچ کرنے پڑتے ہیں، کچھ لوگ واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے مطلوبہ محنتانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

واسطہ بننے والے شخص کی دو حیثیتیں ہوسکتی ہیں: ایک حیثیت وکالت کی، دوسری اجارے کی، وکالت کا ہونا واضح ہے کہ واسطہ بننے والا رقم گیرندہ کی نمائندگی کے فرائض انجام دیتا ہے، وکالت ایک جائز عقد ہے، اور وکیل پر وکالت کرنا واجب نہیں ہے، اس لئے اگر اس پر معاوضہ لیا جاتا ہے تو درست ہے۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی تحریر فرماتے ہیں:

''تصح الوکالة بأجر وبغیر أجر؛ لأن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم کان یبعث عماله لقبض الصدقات، ویجعل لهم عمولة، ولهذا قاله أبناء عمه: لو بعثتنا علی هذه الصدقات فنؤدی ما یؤدی الناس ونصیب ما یصیبه الناس. أی: العمولة، ولأن الوکالة عقد جائز لا یجب علی الوکیل القیام بها، فیجوز أخذ الأجرة فیها بخلاف الشهادة'' (الفقه الاسلامی وادلته ۴/ ۷۴۵ بحواله فتاوی قاسمیه ۲۱/ ۶۸۹)۔

اس میں دوسرا پہلو اجارے کا ہے، واسطہ بننے والا رقم گیرندہ کا اجیر عام ہوتا ہے، اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ صحت اجارہ کے لئے تعیین اجرت ضروری ہے اور یہاں اجرت مجہول ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسی جہالت نہیں ہے، جو نزاع کا باعث ہو، لوگ ایجنٹ کو اس کی دوڑ دھوپ کے مطابق اجرت دیتے ہیں، اور ایجنٹ بخوشی قبول کرلیتا ہے، یا ایجنٹ اجرت طے کرتا ہے تو لوگ خوشی سے اتنی اجرت ادا کردیتے ہیں، لوگوں میں اس کا تعامل چل پڑا ہے، اور تعامل میں معمولی جہالت سے چشم پوشی کا معاملہ برتا جاتا ہے، اس لئے اس پہلو سے بھی یہ معاملہ جائز ہے۔

ملاحظہ فرمائیں درج ذیل تصریحات:

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطیبہ سے پچھنہ لگوایا پھر ایک صاع تمر اجرت دینے کا حکم فرمایا۔

''عن أنس قال: حجم رسول اللّٰه ﷺ أبو طیبة، فأمر له رسول اللّٰه بصاع من تمر'' (رواه البخاری وغیره)۔

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''فیه أنه ﷺ لم یشارط الحجام علی أجرته اعتمادًا علی العرف فی مثله.... ولا تفسد الإجارة لجهالة الأجر ظاهرًا، فإن المعروف کالمشروط'' (اعلاء السنن، کتاب الاجارة، باب الاجارة من غیر مشارطة اعتمادًا علی العرف ۱۶/ ۲۵۸-۲۵۹)

دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''والحاصل أن الجهالة الیسیرة عفو فی ما جری به التعامل، لکونها لا تفضی إلی النزاع عادة'' (اعلاء السنن، کتاب الاجارة، باب اجرة السمسرة، دار الکتب العلمیه بیروت ۱۶/ ۲۴۵)۔

''فتاوی بزازیہ'' میں ہے:

''السمسار والمنادی والحمامی والصکاک وما لا یقدر فیه الوقت ولا مقدار العمل لما کان للناس به حاجة جاز، ویطیب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل'' (فتاوی بزازیه علی هامش الفتاوی الهندیه، کتاب الاجارة، نوع فی المتفرقات ۵/ ۴۰)۔

(۸) بعض دفعہ واسطہ بننے والے اشخاص حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ رکھ لیتے ہیں، یا ذکر لینے کا معاملہ کرتے ہیں، بندے کے خیال میں بظاہر یہ صورت قفیز طحان کی خرابی کی وجہ سے محل استفسار ہے۔ قفیز طحان کی حقیقت یہ ہے کہ بعض معمول کو عمل کا معاوضہ قرار دیا جائے، امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور

امام شافعیؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قفیز طحان سے منع فرمایا ہے۔

''عن أبي سعيد الخدري قال: نهى عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان'' (رواه الدار قطني ٣/ ٤٧ بحواله اعلاء السنن ١٦/ ٢١٢)۔

مسئولہ صورت قفیز طحان سے قدرے مختلف ہے، قفیز طحان میں بطور اجرت معمول کا بعض حصہ ہونے کی شرط ہوتی ہے، مستاجر اجیر سے کہتا ہے: یہ گیہوں پیس دے، اجرت میں انھی پسے ہوئے گیہوں کا آٹا ایک قفیز دوں گا، یہ تو نا جائز ہے۔ اگر مستاجر انھی گیہوں کے آنے کی شرط نہ لگائے، بلکہ مطلق رکھے، پھر چاہے اجرت اسی میں سے ادا کردے تو یہ جائز ہے۔ ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''أو يستأجر إنسانًا ليطحن له الحنطة بنصف دقيقها أو ثلاثة أو ما أشبه ذلك، فذلك فاسد، والحيلة في ذلك لمن أراد الجواز أن يشترط صاحب الحنطة قفيزًا من الدقيق الجيد ولم يقل من هذه الحنطة، أو يشترط ربع هذه الحنطة من الدقيق الجيد، لأن الدقيق إذا لم يكن مضافًا إلى حنطة بيعينها يجب في الذمة، والأجر كما يجوز أن يكون مشارًا إليه يجوز أن يكون دينا في الذمة، ثم إذا جاز يجوز أن يعطيه ربع دقيق هذه الحنطة إن شاء، كذا في المحيط'' (فتاوی عالمگیری، کتاب الاجارة، الباب الخامس، الفصل الثالث ٤/ ٤٤٤)۔

جب کہ یہاں اجرت من العمل ہونے کی شرط عرفاً نہیں ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ایجنٹ بسا اوقات اسی رقم میں سے اپنا محنتانہ اور اجرت وصول کرلیتا ہے، اجرت من العمل کے شرط نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مستقرض اگر ایجنٹ کو اسی رقم میں سے نہ دینا چاہے، اپنی جیب سے ادا کرنا چاہے یا کچھ دنوں بعد دینے کا وعدہ کرے تو ایجنٹ اس پر راضی ہوجاتا ہے، اس لئے یہ شکل قفیز طحان میں شامل نہیں ہوگی۔ اگر کہیں ایسی صورت شرطاً یا عرفاً پائی جائے تو شرط فاسد ہوگی اور واسطہ بننے والا اجرت مثل کا مستحق ہوگا۔ فتاوی عالمگیری میں ہے:

''رجل له غريم في مصر آخر، فقال لآخر: اذهب إليه، وخذ المال منه، فإذا قبضت ذلك منه، فلك عشرة دراهم من تلك الدراهم، فذهب وأخذ يجب أجر المثل؛ واشتراط العشرة مما يقبض شرط فاسد؛ لأنه في معنى قفيز الطحان، كذا في جواهر الفتاوى'' (فتاوی ہندیہ، کتاب الاجارة، الباب الخامس، الفصل الثالث ٤/ ٤٤٦)۔

(۹) اس قسم کی امدادی رقموں اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو کیا اس کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ فقہاء کرام کی عبارات اور اکابر کے فتاوی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں رشوت دینے کی گنجائش ہے، اس ملک کے خزانے پر جس طرح برادران وطن کا حق ہے، اسی طرح مسلمانوں کا بھی حق ہے، فلاحی اور ترقیاتی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے میں ملک کے ہر شہری کا برابر کا حق ہے، اگر نچلے درجہ کے سرکاری افسران لوگوں کو حکومت کی جاری کردہ فلاحی اسکیموں سے محروم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، یا رکاوٹیں کھڑی کرکے اپنی جیبیں گرم کرنا چاہتے ہیں، تو وہ لوگوں کے ثابت شدہ حق پر ڈاکہ زنی کرتے ہیں، اور ظلم کرتے ہیں، اس لئے اس ظلم کو دفع کرنے کے لئے اگر رشوت دینے کی نوبت آجائے تو اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

''الرابع: ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله حلال للدافع، حرام على الآخذ، لأن دفع الضرر عن المسلم واجب'' (فتاوی شامی، کتاب القضاء ٨/ ٣٥)۔۔۔۔''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة، يعني في حق الدافع'' (رد المحتار، کتاب الحظر والاباحة، باب البیع ٩/ ٦٠٧)۔

(۱۰) امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے حکومت کی جانب سے کچھ طے کردہ شرائط و معیارات ہیں، اس سلسلہ میں کذب بیانی سے کام لے کر سرکار کی ان اسکیموں سے مستفید ہونا شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور حرام ہے، شریعت کی نظر میں جھوٹ اور دھوکہ انتہائی مبغوض ہیں، قرآن اور احادیث میں بے شمار وعیدیں ان پر آئی ہیں؛ انتہائی درجے کے حرام، قابل مذمت فعل کی اجازت حکومت کی امدادی رقم یا قرض حاصل کرنے کے لئے ہرگز نہیں دی جاسکتی ہے۔ امانت داری سے کام لیا جائے، چاہے ظاہری محرومی نصیب میں آئے۔

''عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مر على صبرة طعام، فأدخل يده فيها، فنالت أصابعه بللًا فقال: ماهذا يا صاحب الطعام؟! قال أصابته السماء يا رسول الله! قال: أفلا جعلته فوق الطعام كي يراه الناس،

من غش فلیس منی'' (صحیح مسلم، کتاب الایمان ۱/ ۷۰)۔

''عن أنس قال: قلما خطبنا رسول اللہ ﷺ إلا قال: لا إیمان لمن لا أمانة له، ولا دین لمن لا عهد له'' (رواہ البیہقی فی شعب الایمان (مشکوۃ المصابیح، کتاب الایمان ۱/ ۱۵)۔

علماء کرام نے جن حاجتوں کی بنا پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے ان میں اس قسم کی دھوکا دھڑی والی حاجت نہیں ہے۔ علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

''الکذب مباح لإحیاء حقه، ودفع الظلم عن نفسه، والمراد: التعریض، لأن عین الکذب حرام'' (در مختار مع الشامی ۹/ ۶۱۲)۔

(۱۱) بعض اسکیموں میں حکومت تعلیم وغیرہ کسی مقصد کے لئے بینک سے قرض دلاتی ہے، بینک قرض پر جو انٹرسٹ عائد کرتا ہے وہ سارا کا سارا حکومت ادا کرتی ہے یا بہت تھوڑا سا مقروض کو ادا کرنا پڑتا ہے، بقیہ حکومت ادا کر دیتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مقروض کو تھوڑا سا بھی سود ادا کرنا پڑتا ہے تو یہ ''کل قرض جر نفعا حرام'' کی فہرست میں شامل ہے، اس معمولی سود کو سروس چارج پر بھی محمول نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر مقروض کو کچھ بھی ادا کرنا نہیں پڑتا ہے، سارا انٹرسٹ حکومت ادا کرتی ہے، تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ بینک اگر سرکاری ہے تو یہ ربا نہیں کہلائے گا، یہ ایسا ہوگا، جیسے کوئی آدمی کسی کو سودی قرض دے اور کہے کہ آپ کے ذمہ اصل رقم کی ادائیگی ہے، سود میں ادا کردوں گا، ظاہر ہے کہ یہ صورت جائز ہے، اسی طرح مذکورہ بالا صورت بھی جائز ہے، کیونکہ بینک بھی حکومت کا ادارہ ہے، حکومت اور بینک شخص واحد کے حکم میں ہوں گے۔ حکومت یہ کہتی ہے کہ سود سرکار چکائے گی، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت نے نفع معاف کر دیا۔ عقود ومعاملات میں حقائق ومقاصد کا اعتبار ہوتا ہے، ظاہری الفاظ کا نہیں، ''الأمور بمقاصدها'' (الاشباہ والنظائر ۱/ ۱۱۳)۔

اگر بینک سرکاری نہیں ہے، تو یہ صورت جائز ہوگی یا نہیں؟

فقہاء عظام کی عبارات میں عاجز کو کوتاہ دستی کے سبب مقدور بھر تلاش کے باوجود ایسا کوئی جزئیہ نہیں مل سکا جس میں قرض پر نفع مقروض کے علاوہ کسی تیسرے فریق کی جانب سے ادا کرنے کا ذکر ہو۔ ربا کی شناعت اور سنگینی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ صورت ناجائز ہے۔ حضرت عبد اللہ بن جابرؓ کی روایت پیچھے گذر چکی ہے:

''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه، وقال: هم سواء'' (صحیح مسلم ۲/ ۴۲)

اس میں موکل عام ہے، بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ؛ مذکورہ صورت میں اگر چہ مستقرض خود ربا نہیں کھلا رہا ہے، لیکن کھلانے کا سبب قریب بن رہا ہے، اس لئے مآلاً یہ بھی موکل ٹھہرے گا۔ اس روایت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جو سراپا دین رحمت ہے، ہر اس پتلی گلی پر روک لگاتا ہے، جس سے سود کے درآنے کا امکان ہوتا ہے۔ اسی لئے کاتب ربا اور شاہدین کو آکل وموکل کی طرح ربا میں برابر کا شریک مانا، اور سب پر لعنت کی گئی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ثالث بھی اثر لعنت سے محفوظ نہیں رہے گا۔ اس لئے بندے کی ناقص رائے کے مطابق صورت ثانی ناجائز ہوگی۔

(۱۲) بعض اسکیمیں ایسی ہیں کہ جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، جس کو بینک میں جمع کر دیا گیا ہے، اور اس کے انٹرسٹ سے حاصل ہونے والی رقم سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور مختلف افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں جس رقم سے امداد کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ حرام طریقے سے کمائی گئی ہے، فی نفسہ اس کا لینا دینا مسلمان کے لئے مسلمان سے جائز نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن یہاں اولاً نقود متعین نہیں ہوتے ہیں، کہ خبث اس میں سرایت کرے۔ ثانیاً: یہ غیر مسلم حکومت کی رقم ہے، کفار فروعات کے مکلف نہیں ہیں، اس لئے کفار اگر بیع فاسد یا بیع باطل (سودی قرض) سے نفع حاصل کرتے ہیں تو ان کے لئے کوئی ممانعت نہیں، پھر اگر وہ اس نفع سے کسی مسلمان شخص یا مسلم ادارے کا ایسے طریقے سے تعاون کریں جس میں مسلمان کے لئے شرعی لحاظ سے کوئی خرابی نہ ہو تو یہ جائز ہوگا۔ مندرجہ ذیل جزئیہ سے اس کی تائید ہوتی ہے:

''وجاز أخذ دین علی کافر من ثمن خمر لصحة بیعه، بخلاف دین علی المسلم لبطلانه'' (درمختار مع رد المحتار ۹/ ۵۵۳ کتاب الکراهیه، فصل فی البیع)۔

......☆......

سرکاری اسکیم سے استفادہ کا حکم

مفتی محمد اسعد پالنپوری فلاحی[1]

سوال نمبر:-۱وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب نمبر:-۱صورت مسؤلہ میں اس طرح قرض لینا جائز ہے؛ کیونکہ اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا، غرباء اور ضرورت مندوں کو استفادے کا موقع فراہم کرنا ہے، اسی لئے حکومت اپنی جانب سے دی ہوئی رقم کے ایک حصے کو معاف بھی کردیتی ہے، جسے ''سب سیڈی'' کہا جاتا ہے؛ اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد سودخوری نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی شخص حکومت سے اس طرح کی اسکیم کے تحت قرض لے اور حکومت کی جانب سے اس پر اگر کچھ رقم کی معافی ملے اور مابقیہ رقم حکومت خواہ سود کے ساتھ ہی کیوں نہ وصول کرے، جبکہ اس کی کل مقدار اصل رقم سے زائد نہ ہو تو جائز ہے، یعنی وہ سود سب سیڈی میں ملی ہوئی رقم سے ادا ہو جاتا ہے، اپنی طرف سے کچھ زائد نہ دینا پڑتا ہو تو جائز ہے، اس تاویل کے سے ''کہ حکومت نے جو رقم بطور تعاون اسے دی تھی اس میں سے کچھ رقم اس نے حکومت کو واپس کردی'' مذکورہ اسکیم کے تحت قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور اگر سود کی رقم سب سیڈی کی رقم سے زیادہ ہو، تو یہ معاملہ سودی کہلائے گا اور جائز نہ ہوگا

(فتاوی رحیمیہ، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی ۹ / ۲۳۳؛ کذا فی محمود الفتاوی، مطبوعہ مکتبہ انور ڈابھیل ۴ / ۵۰۲؛ کتاب النوازل، مطبوعۃ المرکز العلمی للنشر والتحقیق، لال باغ مراد آباد ۱۱ / ۳۱۰)۔

''خلاصۃ الفتاوی'' میں ہے:''وفي الأصل إذا كان لرجل على آخر ألف درهم، فقال له: أبرأتك عن خمس مأة أو حططت عنك خمس مأة على أن تعطيني الباقي، ولم يوقت وقتًا، فأعطاه الباقي في هٰذا اليوم، أولم تعطه برئ عن خمس مأةٍ'' (خلاصة الفتاوى، مطبوعة المكتبة الأشرفية، ديوبند ۴/ ۱۷۷)۔

خلاصۃ الفتاوی کی مذکورہ بالا عبارت سے بھی ذکر کردہ مسئلے کی تائید ہوتی ہے۔

اور ''فتاوی شامی'' میں ہے:''الربا هو الفضل الخالي عن العوض'' (ردالمحتار المعروف بالشامية، كتاب البيوع، باب الربا، مطبوعة كراچي ۵/ ۱۶۹)۔

اور ''فتاوی ہندیہ'' میں ہے: ''هو في الشرع عبارة عن فضل مال لايقابله عوض في معاوضة مال بمال'' (الفتاوى الهندية، الباب التاسع، الفصل السادس، مطبوعة زكريا: ۳/ ۱۱۷)۔

اور ''مبسوط سرخسی'' میں ہے:''وفی الشريعة :الربا: هوالفضل الخالی عن العوض المشروط فی البيع''۔

مذکورہ بالا تمام عبارات سے بھی یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ سوال میں مذکور صورت ربا میں داخل نہیں ہے؛ کیونکہ ربا کی جو تعریف مذکورہ عبارات میں کی گئی ہے، وہ سوال میں مذکور صورت پر صادق نہیں آتی ہے۔

سوال نمبر:-۲معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

---

[1] خادم الحدیث والافتاء دارالعلوم مرکز اسلامی انکلیشور، گجرات۔

جواب نمبر:-۲ صورت مسؤلہ میں بھی اس طرح قرض طلب کرنا جائز ہے، کوئی حرج نہیں۔

جیسا کہ ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں ''جامع صغیر'' کی اس عبارت سے ثابت ہو رہا ہے:

''إن قال: أد إليّ غدًا خمس مأة على أنك بريئ من الباقي، على أنك لو لم تعطني غدًا خمس مأة، فالألف عليك على حاله، فالأمر كما قال'' (خلاصة الفتاوى، مطبوعة المكتبة الأشرفية، ديوبند: ۴/ ۱۷۷)۔

سوال نمبر:-۳ اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے، تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

جواب نمبر:-۳ مذکورہ صورت سود میں داخل ہے، اس لئے یہ صورت حرام اور ناجائز ہوگی، اس سے بچنا ضروری ہے؛ کیونکہ زائد رقم حکومت کی طرف سے جولی جارہی ہے، وہ خالی عن العوض ہے اور جس قرض کی زائد رقم خالی عن العوض ہو، اس کو سود کہا جاتا ہے؛ چنانچہ مبسوط سرخسی میں سود کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''الرِّبَا: هُوَ الْفَضْلُ الْخَالِي عَنِ الْعِوَضِ الْمَشْرُوطِ فِي الْبَيْعِ''۔

اور ''تبیین الحقائق'' میں سود کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ''هُوَ فَضْلُ مَالٍ بِلَا عِوَضٍ فِي مُعَاوَضَةِ مَالٍ بِمَالٍ، هٰذَا فِي الشَّرْعِ''۔

اور ایک حدیث میں حضرت علیؓ سے مرفوعاً منقول ہے: ''كل قرض جر منفعة فهو ربا''۔ ایک اور حدیث میں حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے منقول ہے: ''كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا'' (فتح الملہم شرح المسلم، مطبوعہ فیصل پبلیکیشنز ۷/ ۵۳۰)۔

(ہر وہ قرض جو کسی طرح کے بھی نفع کو کھینچ کر لے آئے، وہ ربا ہے)۔

اور ڈاکٹر عبدالحمید محمود طھماز اپنی کتاب ''الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''كل قرض جر نفعًا للمقرض إذا كان مشروطًا، فهو حرام للحديث الشريف ''كل قرض جر نفعًا فهو حرام'' [الفقه الحنفي في ثوبه الجديد، مطبوعة دار الايمان سهارن پور: ۴/ ۲۲۰]۔

لہٰذا مذکورہ صورت سود میں داخل ہوگی، جس سے خود بھی بچنا اور دوسروں کو بھی بچنے کی تلقین کرنا ضروری ہے۔

سوال نمبر:-۴ کیا کم شرح سود کو سروس چارج کا نام دیا جاسکتا ہے؟

جواب نمبر:-۴ مذکورہ صورت میں اس طرح قرض لینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اصل قرض پر ادا کی جانے والی زائد رقم سود کے دائرے میں نہیں آئے گی؛ بل کہ بندے کی ناقص رائے کے مطابق یہ سروس چارج اور انتظامی خرچ میں شمار ہوگی اور اس پر اجارے کے احکام جاری ہوں گے: گویا قرض لینے والے کی طرف سے قرض حاصل کرنے کے لئے حکومت کو یہ ایک طرح کی اجرت دی جارہی ہے؛ لہٰذا اجارے کی صحت کے لئے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، ان میں ایک شرط اجرت کی مقدار کا پہلے سے معلوم ہونا بھی ہے؛ جیسا کہ دیگر اجارتی معاملات میں اجرت کا پہلے سے معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے۔

چنانچہ ''بدائع الصنائع'' میں حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرۃؓ سے آں حضرت ﷺ کا ایک فرمان منقول ہے:

''عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، وَأَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: وَمَنْ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَلْيُعْلِمْهُ أَجْرَهُ۔ وَهٰذَا مِنْهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعْلِيمُ شَرْطِ جَوَازِ الْإِجَارَةِ وَهُوَ إِعْلَامُ الْأَجْرِ فَيَدُلُّ عَلَى الْجَوَازِ''۔

ایک اور جگہ اس طرح منقول ہے:

''وَالْأَصْلُ فِي شَرْطِ الْعِلْمِ بِالْأُجْرَةِ قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ »مَنْ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَلْيُعْلِمْهُ أَجْرَهُ« وَالْعِلْمُ بِالْأُجْرَةِ لَا يَحْصُلُ إِلَّا بِالْإِشَارَةِ وَالتَّعْيِينِ أَوْ بِالْبَيَانِ''۔

مذکورہ بالا دونوں عبارتوں سے معلوم ہوا کہ اجارے میں اجرت کی مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے؛ خواہ اس کا علم کسی طرح سے بھی ہو؛ لہٰذا

صورت مسؤلہ میں اصل قرض پر ادا کی جانے والی زائد رقم بندے کی ناقص رائے میں سروس چارج اور انتظامی خرچ میں شمار ہوگی، دینے میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن اس کی مقدار کا پہلے سے معلوم ہونا ضروری ہوگا۔

سوال نمبر:-۵ اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

جواب نمبر:-۵ مذکورہ صورت سود میں داخل ہے؛ کیونکہ ربا کی حرمت منصوص ہے، اس میں کم اور زیادہ کی کوئی قید نہیں ہے؛ لہٰذا اصل رقم پر لی جانے والی زائد رقم خواہ کم ہو یا زیادہ سود کے دائرے میں آئے گی؛ اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:

"أحل الله البيع وحرم الربوا" (سورہ بقرہ:۲۷۵) (اللہ تعالی نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربوا کو حرام)۔

مذکورہ آیت میں ربوا کی حرمت مطلق ہے؛ کم اور زیادہ کی کوئی قید نہیں ہے؛ لہٰذا یہ صورت ربا میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہوگی۔

اور ڈاکٹر عبدالحمید محمود طھماز اپنی کتاب "الفقه الحنفي في ثوبه الجديد" میں اللہ رب العزت کے فرمان: "لا تظلمون ولا تُظلمون" کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''أي: لا تظلمون بأخذ أيّ زيادة على أموالكم، ولا تُظلمون بأن تردوا إلى الدائن أقل مما أخذ منه''۔

یعنی تم اپنے اموال پر ایک کوڑی بھی زیادہ لے کر سامنے والے (مدیون) پر ظلم مت کرو اور تم پر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا بایں طور کہ تم دائن کو اس کے پاس سے لئے مال سے کم مال لوٹاؤ۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:

''فالربا حرام في كل صوره وأشكاله، سواء كانت الزيادة كثيرة أم قلية، وسواء كان الاستقراض للاستثمار أم للاستهلاك؛ فالآية ترد على الذين يستحلون قليل الربا، ويستحلون الربا الذي يكون في قرض للاستهلاك؛ فكل صور الربا حرام؛ لأن الله تعالى شرع لأصحاب الأموال أن يستردوا أموالهم فقط دون أي زيادة عليها؛ وقد نادى النبي صلى الله عليه وسلم بتحريمه على الإطلاق في خطبة حجة الوداع عندما قال فيها: ''ألا إن كل ربا من ربا الجاهلية موضوع، لكم رؤوس أموالكم، لا تَظلِمون ولا تُظلَمون'' [الفقه الحنفي في ثوبه الجديد، مطبوعة دار الايمان سهارن پور: ۲۲۸/۴، ۲۲۹]۔

مذکورہ بالا پوری عبارت سے بطور خلاصہ یہ بات ثابت ہوئی کہ ربا کی ساری صورتیں خواہ ربا کم ہو یا زیادہ، خواہ ربا استثمار کے لئے ہو یا استہلاک کے لئے، حرام ہے؛ کیونکہ حجۃ الوداع کے موقع پر آں حضرت ﷺ نے جو عام خطبہ دیا تھا، اس میں بھی آپ ﷺ نے ربا کو مطلقا حرام قرار دیا تھا، کم زیادہ کی کوئی تفصیل بیان نہیں فرمائی تھی۔

الغرض! حضرات فقہاء نے شدید ضرورت اور اضطرار کی حالت میں سود لینے کی اجازت دی ہے جس طرح اضطرار کی حالت میں جبکہ جان جانے کا خطرہ ہو اور کوئی ایسی حلال چیز نہ ملے جسے کھا کر وہ اپنی جان بچا سکے، تو بقدر ضرورت خنزیر کے گوشت اور شراب کے استعمال کی شریعت نے اجازت دی ہے؛ لیکن صورت مسؤلہ میں کوئی ایسا اضطرار نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے سود لینے کی اجازت دی جائے؛ اس لئے بندے کی رائے میں صورت مسؤلہ میں اس طرح سود لینا جائز نہیں ہوگا، یہ صورت بھی حرمت کے دائرے میں آئے گی۔

سوال نمبر:-۶ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل رقم امداد کے طور پر ملا کرتی ہے؛ مثلاً: مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ؛ نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی

واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب نمبر:-٦ صورت مسؤلہ میں حکومت کی جانب سے اپنے شہریوں اور باشندوں کو جو رقم اپنا ذاتی مکان بنانے یا ذاتی بیت الخلاء وغیرہ کی تعمیر کے لئے از راہ امداد دی جاتی ہے، اس کا لینا جائز ہے، کوئی حرج نہیں ہے؛ حکومت خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی؛ کیونکہ اس میں حکومت کی جانب سے اپنے شہریوں اور باشندگاں کے بلئے امداد کا پہلو ہوتا ہے؛ لیکن جہاں تک تعلیمی ضروریات اور اس کی ترقی کے لئے حکومت کی جانب سے پیش کی جانے والی رقم کے لینے کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگر حکومت اسلامی ہو اور اس کی جانب سے مساجد کی تعمیر اور دینی اداروں کی تعلیمی وتعمیری ترقی کے لئے اگر رقومات فراہم کی جاتی ہیں تو ان کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ آج کل سعودی حکومت کی جانب سے وہاں کے بعض اداروں میں رقومات وافر مقدار میں فراہم کی جاتی ہیں؛ لیکن اگر کسی غیر اسلامی حکومت کی جانب سے کوئی رقم دینی داروں میں بطور امداد پیش کی جائے، تو اس کا لینا جائز نہیں؛ کیوں کہ حکومت اس رقم کی آڑ میں رہ کر مسلمانوں کو اپنے احسان تلے دبا کر ان کے دینی اداروں میں مداخلت شروع کردے گی، اپنا نصاب تعلیم داخل کرے گی، اپنے خیالات کے ٹیچر اور اساتذہ کا تقرر کرے گی، مدرسے کے نظام الاوقات کو تبدیل کردے گی، نتیجۃً یہ خالص اسلامی اور دینی ادارہ ایک دنیوی اسکول اور کالج بن کر رہ جائے گا؛ جیسا کہ ہمارے اسی ملک کے بعض علاقوں کے مدارس کے متعلق یہ بات پختہ ذرائع سے سنی گئی ہے کہ انہوں نے حکومت کی جانب سے پیش کی جانے والی امداد کو قبول کیا، جس کا نتیجہ ان لوگوں کو بہت خطرناک انداز میں بھگتنا پڑا کہ ان کے یہ خالص دینی ادارے دنیوی تعلیم گاہوں میں بدل گئے، ان دینی اداروں میں حکومت نے اپنا نصاب تعلیم داخل کردیا، اپنے خیالات کے اساتذہ کا تقرر کردیا، جن کے مزاج اور طبیعتوں کا اثر ان کے طلبہ پر بھی پڑا، نتیجۃً وہی طلبہ جو مستقبل میں امت کے قائد اور دین متین کے مخلص خادم بننے والے تھے، وہ خالص دنیوی ملازم بن کر رہ گئے، جن کے پیش نظر ہمہ وقت دنیا طلبی ہی رہتی ہے اور دین کی خدمت صرف برائے نام ہوتی ہے؛ اس لئے حکومت کی جانب سے پیش کی جانے والی امداد دینی اداروں میں لینا جائز نہیں اور ان کا استعمال کرنا مفاسد سے خالی نہیں ہے، جس سے احتراز لازم ہے۔

جس کی تائید ''فتاوی محمودیہ'' کے ایک فتوی سے بھی ہوتی ہے، جس کے سوال وجواب دونوں کو بعینہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

دینی مدارس میں سرکاری امداد:

سوال: جس گاؤں میں مدرسۂ اسلامیہ قائم ہو، مگر گاؤں والے امداد نہیں کرتے؛ بل کہ لڑکے بھی بڑی مشکل سے اکھٹے ہوتے ہیں، تو اگر ڈسٹرکٹ بورڈ، سب ڈپٹی یا ڈپٹی انسپکٹر سے مدرسۂ اسلامیہ کی امداد کی درخواست کی جائے اور وہ درخواست امداد منظور بھی ہوجائے، تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداومصلیا:

گاؤں والوں کو مدرسۂ اسلامیہ کی ضرور امداد کرنی چاہئے، ڈسٹرکٹ بورڈ سے امداد لینے میں اگر یہ خیال ہو کہ مدرسے کو سرکار اپنے قبضے میں کرکے اپنی تعلیم اس میں جاری کرے گی اور دینی تعلیم یا بالکل بند کردے گی یا مختصر کرکے برائے نام جاری رکھے گی، تو سرکار سے امداد نہیں لینی چاہئے؛ اور اگر اطمینان ہو کہ دینی تعلیم بدستور جاری رہے گی اور بھی کسی قسم کا شرعی نقصان نہیں ہوگا، تو درست ہے اور اس کا کام میں لانا بھی درست ہے (فتاوی محمودیہ، مطبوعۃ اشرفی بک ڈپو دیوبند ۱۵ / ۶۰۴)۔

نوٹ: ......لیکن ہمارے اس زمانے میں تو دینی مدارس اور تعلیم گاہوں کے لئے سرکاری امداد لینا بالکل جائز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ امداد پیش کرنے میں حکومت کی نیت ہی خالص نہیں ہوتی ہے، اس کے پیچھے ان کے فاسد اغراض ومقاصد پنہا ہوتے ہیں، جو کبھی نہ کبھی ظاہر ہوکر رہتے ہیں۔

اسی وجہ سے جب دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی، اس وقت ہمارے ملک میں دین اسلام کو ختم کرنے کے لئے کئی منظم اور متحرک تحریکات چلائی جارہی تھیں، بظاہر بقائے اسلام کی کوئی ممکنہ شکل وصورت نظر نہیں آرہی تھی، اسی لئے قیام دار العلوم کا ایک انقلابی فیصلہ کیا گیا، دار العلوم کے سارے اخراجات کا دارومدار چونکہ عوام کے عطیات پر رکھا گیا تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ اس کے کچھ اصول وضوابط اور طریقۂ کار کا لائحۂ عمل مرتب کیا جائے، چناں چہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے سب سے پہلے اسی لائحۂ عمل کی جانب توجہ فرمائی اور آٹھ دفعات پر مشتمل ایک دستور العمل مرتب کردیا، دار العلوم دیوبند کی تاریخ میں جنہیں اصول ہشتگانہ کہا جاتا ہے؛ وہ آٹھوں اصول لکھے ہوئے موجود ہیں، یہاں

ان میں سے ہر ایک کولکھنا طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ عوامی چندے اور عطیات سے مدارس اسلامیہ کو چلانا اور اس کو مدارس کے لئے لازم قرار دینا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی فراست ایمانی تھی اور دفعہ نمبر سات میں شرکتِ سرکار سے روکا گیا ہے اور عوامی چندے اور عوامی عطیات پر ان مدارس کے مدار کی تلقین کی گئی ہے۔

سوال نمبر:-۷ گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم-جس قسم کی بھی ہوں-ان کے حصول کے لئے کافی جدو جہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب نمبر:-۷ صورت مسؤلہ میں رقم حاصل کرنے کے لئے درمیان میں واسطہ بننے والوں کو ان کی محنت کا اجر وصلہ اور محنتانہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، جائز ہے، بشرطیکہ اجرت کی تعیین پہلے سے کردی گئی ہو؛ کیونکہ اجارے کی صحت کے من جملہ شرائط میں سے ایک شرط اجرت کا پہلے سے متعین ہونا بھی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

سوال نمبر:-۸ بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب نمبر:-۸ صورت مسؤلہ میں جواز وعدم جواز کی بات تو ایک طرف رہی؛ لیکن واسطہ بننے والے کا اس رقم کے ایک بڑے حصے کو اپنے قبضے میں لے لینا مروت وانسانیت کے بھی خلاف ہے؛ کیونکہ اصل مالک نے مذکور رقم حکومت سے اپنے کام کے لئے منظور کروائی ہے؛ لہٰذا اس کے لئے اس رقم کے ایک معتدبہ حصے کو لے لینا کس طرح جائز اور درست ہوسکتا ہے؟؟ ہاں! اگر اس کو اپنی محنت کی اجرت دی جائے یا وہ اپنی محنت کی اجرت طلب کرے، بشرطیکہ اجرت پہلے سے متعین ہو، تو لینا دینا دونوں جائز ہے، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔

سوال نمبر:-۹ اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے، تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں۔

جواب نمبر:-۹ اس سلسلے میں صاحب منتخبات نظام الفتاوی حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

راشی اور مرتشی یعنی رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم میں جلیں گے اور ساتھ ساتھ جس کا حق اس سلسلے میں تلف ہوگا اس کا وبال بھی ان پر پڑے گا، دنیا میں بھی بے برکتی، ذلت ورسوائی اٹھانی پڑے گی، ایسے لوگ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہوجاتے ہیں؛ اب انسان خود دیکھ لے، ایک پلے میں آخرت کا نقصان رکھے اور دوسرے پلے میں دنیا کی چندروزہ پریشانیاں رکھ لے، پھر خود موازنہ کرے، دیکھ لے کہ کس کو اختیار کرنا چاہئے، دنیا کی پڑیشانی یا آخرت کی پریشانی؟؟ ظاہر ہے کہ آخرت کی تھوڑی پریشانی بھی دنیا کی ساری پریشانیوں سے بڑھ کر اور سخت ہے؛ باقی اگر اپنا جائز حق لینا بغیر رشوت دیئے ممکن نہ ہو، تو رشوت دے دے، دینے والا گنہ گار نہ ہوگا (البتہ لینے والا ضرور گنہ گار رہوگا) (منتخبات نظام الفتاوی، مطبوعہ ایفا پبلیکیشنز: ۳/ ۲۰۳، ۲۰۴)۔

اور فقیہ الامت حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ فتاوی محمودیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

رشوت کا لینا دینا حرام ہے؛ البتہ دفع ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لئے بحالت مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے، اس صورت میں فقط رشوت لینے والا گنہ گار ہوگا (فتاوی محمودیہ، مطبوعہ اشرفی بک ڈپو دیوبند: ۱۸/ ۴۵۵)۔

اور حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

اگر کام کرنے والے پر آپ کا حق ہو کہ وہ کام کردے اور وہ کام فی نفسہ جائز بھی ہو اور اس کا مقصد دوسروں کے ساتھ زیادتی بھی نہ ہو، تو اپنا جائز حق حاصل کرنے اور ظلم وناانصافی سے بچنے کے لئے کراہت خاطر کے ساتھ رشوت دینے کی گنجائش ہے؛ لیکن رشوت لینا بہر صورت حرام ہے (کتاب الفتاوی، مطبوعہ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند: ۶/ ۲۴۵)۔

شامی میں لکھا ہے: ''ثم الرشوة أربعة أقسام: ـ ''الثالث: أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعًا للضرر، أوجلبًا لنفع، وهو حرام على الأخذ. الرابع: مايدفع لدفع الخوف من المدفوع اليه على نفسه أو ماله حلال للدافع، حرام على الأخذ؛ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب'' (الشامية مطبوعة مكتبة زكريا ديوبندكتاب القضاء، مطلب فى الكلام على الرشوة: ۸/ ۳۵)۔

اور شارح ابوداؤد صاحب ''بذل المجہود'' تحریر فرماتے ہیں:

''فأما إذا أعطى ليتوصل به إلى حق، أو يدفع عن نفسه ظلما؛ فانه غيرداخل فى ہذا الوعيد'' [بذل المجهود مركزالشيخ أبي الحسن ۱۱/ ۲۰۶]۔

اور صاحب ''تکملہ ردالمحتار'' تحریر فرماتے ہیں:

''قال الرحمتي: والرشوة إذا كانت لدفع الضرر عن نفسه وعن رب المال، كانت جائزة للدافع، مأذونًا فيهاعادة للمالك، وإن حرمت على الأخذ'' (تكملة ردالمحتار، دارالفكر بيروت ۸/ ۴۶۰)۔

اور ''صاحب اعلاء السنن'' تحریر فرماتے ہیں:

وأما اذا دفع الرشوة ليسوى أمره عندالسلطان حل للدافع، ولايحل للأخذ [اعلاء السنن، مطبوعة كراچی: ۱۵/ ۶۲]

اور ''تلخیص الحبیر'' کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے آپ ﷺ کا فرمان منقول ہے:

(الراشي والمرتشي فى النار) (رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے)۔

مذکورہ بالا تمام فتاوی، فقہی عبارات اور حدیث کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ رشوت کا لینا دینا سخت گناہ کا باعث ہے، دونوں کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے؛ تاہم اپنے اوپر سے ظلم کو دور کرنے یا اپنا کوئی جائز حق وصول کرنے کے لئے جبکہ بغیر کچھ مال دیئے اپنا حق وصول نہ ہوتا ہو، تو بدرجۂ مجبوری کراہت خاطر کے ساتھ رشوت کا دینا تو جائز ہے؛ البتہ لینے والے کے لئے اس کا لینا جائز نہیں؛ لہٰذا صورت مسؤلہ میں سرکاری امدادی رقوم اور قرضوں کا وصول بغیر رشوت دیئے ممکن نہ ہو، تو مذکورہ بالا اکابرین کے فتاوی کی روشنی میں اس ناچیز کے نزدیک بھی رشوت دینے کی گنجائش ہے، کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال نمبر: -۱۰ امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لیے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقے پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب نمبر: -۱۰ مذکورہ بالا طریقے سے امدادی رقم یا قرض سے فائدہ اٹھانا حکومت یا متعلقہ محکمے کے ساتھ واضح طور پر دھوکہ دہی ہے، جس سے بچنا ہر مسلمان کے لئے لازم ہے؛ کیونکہ حکومت نے مذکورہ رقوم سے فائدہ اٹھانے کا حق صرف انھی لوگوں کو دیا جو اس کی مقرر کردہ شرائط اور معیارات پر پورے پورے اترتے ہوں؛ ظاہری بات ہے کہ غلط بیانی کر کے حق حاصل کرنے کی صورت میں مستحقین کا حق بھی ہڑپ کرنا لازم آئے گا اور حکومت یا متعلقہ محکمے کے ساتھ دھوکہ دہی بھی ہوگی اور ظلماً کسی کا حق ہڑپ کرنا اور کسی کو دھوکہ دینا دونوں گناہ کبیرہ ہے۔

چناں چہ اللہ رب العزت قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" (سورہ بقرہ: ۱۸۸) (تم لوگ اپنے اموال کو اپنے درمیان ناحق طریقے سے مت کھاؤ)۔

اور ایک حدیث میں آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من غشنا فليس منا'' (جس کسی نے ہمیں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں)۔

لہٰذا مذکور طریقے سے امدادی رقوم یا قرض سے فائدہ اٹھانا مذکورہ بالا دونوں وجوہات کی بنیاد پر حرام اور ناجائز ہوگا۔

قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا حکم:

سوال (۳): اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

سوال (۴): غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو؛ لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو، تو ایسے قرضے اور ان پر دی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟

سوال (۵): اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جا سکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں، تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جا سکتا ہے؟

جواب (۴)، (۵)، (۶):

کم شرح سود والے قرض کا حکم:

مذکورہ تینوں سوالوں کے جوابات اس طرح ہوں گے کہ اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنی پڑے تو اس زائد رقم کی شرح کم ہوگی یا زیادہ ہوگی، اگر زائد رقم کی شرح کم ہے تو اس کا حکم درج ذیل ہے:

دار العلوم دیوبند کے سابق صدر مفتی مفتی نظام الدین صاحبؒ مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جاتی ہے، اس میں تاویل چل سکے گی، اور اس کو کام چلانے کے لئے اعانت میں داخل کر کے اس معاملہ کو غیر سودی ہونے کا حکم لگائیں گے، اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے، بلکہ انتظامات کی درستی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جا سکے گا، اور اس صورت میں یہ معاملہ جائز رہے گا'' (منتخبات نظام الفتاوی: ۳/۱۶۴)۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''اور اس معاملہ میں دی ہوئی رقم پر کچھ زائد رقم سود کے نام سے وصول کرتی ہے، اس زائد رقم کو ان کام کرنے والوں کی اجرت قرار دینے کے حیلہ سے شرعی سود کے حکم سے بچانے کی ایک تاویل کی جاتی ہے'' (منتخبات نظام الفتاوی: ۳/۱۸۹)۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی مذکورہ عبارات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اگر سود کی شرح کم ہو تو اس کو انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت کی گنجائش ہوگی؛ تاہم حضرت مفتی صاحب کے کم شرح سود کو انتظامی خرچ قرار دیتے ہوئے اس میں وسعت کی گنجائش دینے پر بچند وجوہ پورا قلبی اطمینان نہیں ہوتا۔

(۱): قرضوں پر وصول کی جانے والی رقم قرض کی مقدار کے لحاظ سے کم و بیش ہوتی ہے، اگر یہ انتظامی خرچ ہوتا تو یہ بات ضروری تھی کہ اس طرح کا فرق نہ کیا جاتا؛ اس لئے کہ رقم چاہے ۵ لاکھ ہو یا ۵ ہزار دونوں میں محنت اور وقت یکساں لگتا ہی۔

(۲): کم شرح والی سودی رقم کو انتظامی خرچ قرار دینے میں گو کہ حقیقتِ ربا کا تحقق نہیں ہوتا؛ مگر شبہ ربا کے تحقق سے کون انکار کر سکتا ہے، حالانکہ روایات میں حقیقتِ ربا اور شبہ ربا دونوں سے احتراز کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ وہ روایات جن میں شبہ ربا سے بھی احتراز کا حکم دیا گیا ہے درج ذیل ہیں:

''سنن ابن ماجہ'' میں ہے: ''عن عمر رضي الله عنه قال: إن آخر ما نزلت آية الربا، وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض، ولم يفسرها لنا، فدعوا الربا والريبة'' (سنن ابن ماجه، باب التغليظ في الربا، حديث: ۲۲۷۶)۔

''مسند احمد'' میں ہے: ''قال عمر: انّ آخر ما نزل من القرآن آية الربا، وأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض، ولم يفسرها، فدعوا الربا والريبة'' (مسند احمد۱/ ۲۶۱، حدیث: ۲۴۵)۔

''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں ہے: ''عن الشعبي قال: خطب عمر...... إنّ آخر ما عهد إلينا النبي صلى الله عليه وسلم آية الربا، فقبض النبي صلى الله عليه وسلم و لم يبينهنّ لكم، إنّما هو الربا و الريبة، فدعوا الربا و الريبات'' (مصنف ابن ابي شيبه، باب اكل الربا وما جاء فيه، ۴/ ۴۴۸)۔

کنز العمال میں ہے: ''عن عمر رضي الله عنه قال: إنّ آخر ما نزل من القرآن آية الربا، وإنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض، ولم يفسرها لنا، فدعوا الربا و الريبة'' (كنز العمال، باب في الربا و احكامه، ۴/ ۱۸۶)۔

ان تمام دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سود کی شرح کم ہو یا زیادہ دونوں میں حرمت کا حکم لاگو ہونا چاہئے۔

ہاں اگر واقعۃً جو اخراجات آئیں اس کے مطابق سروس چارج لیا جائے تو اس کی گنجائش ہوگی، چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''قرض جاری کرنے اور اس کا حساب و کتاب رکھنے پر واقعی جو اخراجات آئیں، بینک کے لئے اپنے قرض داروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے جو اس منصوبہ کے قرض کے اجراء کے لئے پیش آئیں ہیں، البتہ اگر پوری احتیاط سے ان اخراجات کی تحدید ممکن ہو تو یہ صورت احکام شریعت کے زیادہ موافق اور مناسب ہوگی اور اس کے جواز میں کوئی کلام نہ ہوگا'' (فقہی مقالات: ۱/ ۳۰۷، ط: زمزم بکڈپو، دیوبند)۔

اگر قرض پر وصول کی جانے والی زائد رقم کی شرح زیادہ ہو تو اس میں تو بطریق اولیٰ حرمت کا حکم لاگو ہوگا۔

سرکاری امداد سے استفادہ:

سوال (۶): ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جب کہ ان رقوم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی، اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب (۶): سرکار کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ سرکار کی طرف سے ملنے والی امداد کے متعلق مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ رقم فرماتے ہیں:

''صورت مسئولہ میں سرکار کی طرف سے جو رقم ملتی ہے، وہ سرکاری امداد ہے، وہ لی جاسکتی ہے'' (فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۴۳۸)۔

واسطہ بننے والوں کی اجرت:

سوال (۷): گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم۔ جس قسم کی بھی ہو۔ ان کے حصول کے لئے کافی جد و جہد کرنی ہوتی ہے، اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

سوال (۸): بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا لینے اور دینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب (۷)، (۸): مذکورہ دونوں سوالوں میں یہ صورت بھی درست معلوم ہوتی ہے کہ درمیان میں واسطہ بننے والے شخص کو دلال کی حیثیت دی جائے، اور واسطہ بننے والے شخص اور استفادہ کرنے والے شخص کے درمیان باہمی رضامندی سے جو اجرت متعین ہو اس کو درست قرار دیا جائے جیسا کہ مفتی سلمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں اسی طرح تحریر فرماتے ہیں، چنانچہ ذیل میں وہ سوال اور اس کا جواب درج ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ: تھانہ، بلاک، تحصیل، کورٹ وغیرہ میں ضرورت مندوں کا کام کروانا اوراس کے لئے رشوت دلانا، دلالی کرنا اوراپنا حصہ بھی وصول کرنا بھی کیسا ہے؟

جواب: تھانہ، بلاک، کورٹ وغیرہ میں حق داروں کو جائز حق دلانے کے لئے دلالی کرنا اوراس پر متعینہ اجرت لینا جائز ہے''

(کتاب النوازل: ۱۲/ ۳۶۴)۔

یا پھر یہ صورت بھی درست ہے کہ درمیان میں واسطہ بننے والے شخص کو وکیل کی حیثیت دی جائے، اور وکیل کی حیثیت دینے کی وجہ صاحب ہدایہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے، چنانچہ وہ وکالت کے بیان کے شروع میں لکھتے ہیں:

''كل عقد جاز أن يعقده الإنسان بنفسه جاز أن يؤكله به غيره؛لأن الإنسان قد يعجز عن المباشرة بنفسه علىٰ اعتبار بعض الأحوال، فيحتاج إلىٰ أن يؤكل به غيره، فيكون بسبيل منه دفعًا للحاجة'' (ہدایہ: ۳/ ۱۷۷، ط: مكتبۂ حجاز ديوبند)۔

اور یہاں پر بھی جس شخص کو امداد مل رہی ہے، وہ اس امدادی رقم کو وصول کرنے پر اس طرح قدرت نہیں رکھتا ہے جس طرح کی قدرت درمیان میں واسطہ بننے والا شخص رکھتا ہے، لہٰذا اس کو وکیل کی حیثیت دینا درست ہوا، پس وکیل اور مؤکل کے درمیان باہمی معاہدہ کے مطابق جو اجرت طے ہو، وہ درست ہونی چاہئے، اس لئے کہ وکالت بالاجرت بھی صحیح ہے، چنانچہ علامہ وہبہ زحیلیؒ رقم فرماتے ہیں:

'' و تصح الوكالة بأجر و بغير أجر'' (الفقه الاسلامى و ادلة: ۴/ ۲۹۹۷)۔

نیز مفتی شبیر صاحب قاسمی دامت برکاتہم اسی طرح کی ایک صورت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''کسی ایجنٹ کے ذریعہ سرکاری یا غیر سرکاری کام کرانا جائز ہے، اوراس کام میں آپس کے تراضی سے جو بھی پیسہ طے ہو جائے، اس پیسہ کا لینا اور دینا بھی جائز ہے''۔

مفتی صاحب نے استدلال کے طور پر درج ذیل عبارت کو پیش کیا ہے:

''تصح الوكالة بأجر و بغير أجر'' (فتاوى قاسميه: ۲۱/ ۶۸۸)۔

البتہ اتنی بات ہے کہ واسطہ بننے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مناسب اجرت متعین کرے ایسا نہ ہو کہ سرکاری اسکیم سے استفادہ کرنے والے شخص کو امداد میں ملنے والی رقم میں ۴۰ فیصد یا ۵۰ فیصد (استفادہ کرنے والے شخص کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے) واسطہ بننے والا شخص ہی وصول کرلے۔

جائز حق کے لئے رشوت:

سوال (۹): اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

جواب (۹): فقہاءِ کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے اور اپنے آپ کو ظلم سے بچانے کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو اس مین کوئی حرج نہیں ہے، اور چونکہ حکومت کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم مین حکومت کی طرف سے مقرر کردہ معیار پر پورے اترنے والے تمام عوام کا حق ہوتا ہے، اس لئے اگر ان کو اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینی پڑے تو اس کی گنجائش ہوگی، چنانچہ اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینے کے جواز پر مندرجۂ ذیل عبارات دلالت کرتی ہیں:

خاتم الفقہاء علامہ ابن عابدین شامیؒ رقمطراز ہیں:

''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة. يعنى فى حق الدافع'' (شامی ۶/ ۴۲۴، ط: دار الفكر، بيروت)۔

''بذل المجہود'' میں ہے:

''فإذا أعطي ليتوصل به إلى حق أو يدفع عن نفسه ظلمًا فإنه غير داخل في هذا الوعيد'' (بذل المجهود ۱۱/ ۲۰۶، ط: دار البشائر الاسلامية، بيروت، لبنان)۔

''فیض القدیر'' میں ہے:

''أما ما وقع للتوصل لحق أو دفع ظلم فليس برشوة'' (فيض القدير: ۵/ ۲۶۸، ط: المكتبة التجارية الكبرى، مصر)۔

''التیسیر'' میں ہے:

''فلو أعطي للتوصل لحق أو دفع باطل فلا حرج'' (التيسير بشرح جامع الصغير: ۲/ ۲۷، ط: مكتبة الامام الشافعية، رياض)

''سبل السلام'' میں ہے:

''فعلى هذا بذل المال للتوصل إلى الحق لا يكون رشوة'' (سبل السلام: ۲/ ۵۹، ط: دار الحديث)۔

''منتخبات نظام الفتاویٰ'' میں ہے:

''اپنا جائز حق اگر بغیر رشوت دیئے حاصل نہ ہوتو رشوت دے کر اپنا جائز حق حاصل کرنے کی گنجائش رہتی ہے'' (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۳/ ۲۰۷)۔

''فتاویٰ محمودیہ'' میں ہے:

''اپنا حق وصول کرنے کے لئے اگر مجبوراً رشوت دی جائے تو امید ہے کہ رشوت دینے والا گناہ سے بچ جائے گا'' (فتاویٰ محمودیہ: ۱۸/ ۴۵۶، ط: ادارۂ صدیق، ڈابھیل)۔

''کتاب الفتاویٰ'' میں ہے:

''رشوت لینا تو بہر صورت حرام ہے، مجبوری کے بغیر رشوت دینا بھی حرام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے، لیکن رشوت لینا تو بہر حال حرام ہے؛ کیونکہ رشوت کا لینا اور نہ لینا دونوں اپنے اختیار کی چیز ہے، مگر رشوت دینے پر بعض دفعہ آدمی مجبور ہوجاتا ہے، اس لئے اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے اور اپنے آپ کو ظلم سے بچانے کے لئے فقہاء نے رشوت کی اجازت دی ہے''

(کتاب الفتاویٰ: ۱۰/ ۳۱۴)۔

''محمود الفتاویٰ'' میں ہے:

''رشوت کا لینا دینا حرام ہے، البتہ رفعِ ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لئے بحالتِ مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے'' (محمود الفتاویٰ: ۳/ ۳۱۳، ط: مکتبۂ انور، ڈابھیل)۔

سوال (۱۰): امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط و معیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

معیارات میں غلط بیانی:

جواب (۱۰): حکومت کی طرف سے کسی بھی طرح کی امداد کے حاصل کرنے کے لئے جو شرائط و معیارات مقرر ہیں، ان میں غلط بیانی سے کام لینا شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں دھوکہ بھی ہے اور جھوٹ بھی، چنانچہ حضرت اقدس مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

''اصولی طور پر یہ بات جان لیں کہ حکومت کی طرف سے بعض لوگوں کو بعض مخصوص شرائط کے ساتھ سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں، کسی ایسے آدمی کا جو ان مخصوص شرائط پورا نہ اترتا ہو فائدہ اٹھانا شرعاً ناجائز اور حرام ہے'' (محمود الفتاویٰ: ۶/ ۵۸۶، ط: مکتبۂ محمودیہ، ڈابھیل)۔

''فتاوی دینیہ'' میں ہے:

''حکومت سے جھوٹ بول کر ان کی طرف سے دی جانے والی امداد کو حاصل کرنا شرعاً بھی ناجائز اور اخلاقاً بھی گری ہوئی بات ہے''

(فتاوی دینیہ: ۴/ ۳۰۷، ط: جامعہ حسینیہ، راندیر، گجرات)۔

گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والے سفید کارڈ کے سلسلہ میں جو شرائط ہیں، ان میں غلط بیانی سے کام لے کر سفید کارڈ کو حاصل کرنے کے متعلق حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم کا فتوی ملاحظہ ہو، جس سے صورتِ مسئولہ کے متعلق حکم پر بھی روشنی پڑتی ہے، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''گورنمنٹ سفید کارڈ جن شرائط کے ساتھ دے رہی ہے، اگر کسی کے اندر وہ شرطیں مفقود ہوں تو اس کے لئے اس کا حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، کیوں کہ انہیں جو سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں، اس کا بوجھ عوامی خزانہ پر ڈالا جاتا ہے، تو گویا یہ نہ صرف گورنمنٹ کو دھوکہ دینا ہے، بلکہ عام لوگوں کی کمائی ہوئی گاڑھے پسینے کی رقم کو اپنے استعمال میں لانا ہے، اور اس کے لئے جھوٹ اور دھوکہ کا سہارا لیا جاتا ہے، اس لئے یہ صورت جائز نہیں ہوگی'' (کتاب الفتاوی: ۱۰/ ۳۱۶)۔

سوال (۱۱): بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے، اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے، اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب (۱۱): جواب نمبر ۵ کے تحت سودی قرض لینے کے جواز کے متعلق جو صورتیں ذکر کی گئی، اگر ان صورتوں میں سے کوئی صورت پائی گئی تو سوال میں ذکر کی گئی اسکیم سے استفادہ درست ہے، ورنہ نہیں۔

سودی رقم سے امداد:

سوال (۱۲): بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا گیا ہے، اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے، اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے، تو کیا یہ صورت درست ہوگی؟

جواب (۱۲): سوال میں ذکر کردہ صورت کے حکم کو جاننے سے قبل اس بات کو جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تبدلِ ملک کی وجہ سے مال حرام کی حیثیت وہی رہے گی کہ اس سے فائدہ اٹھانا درست نہ ہو یا پھر اس کی حیثیت بدل جائے گی کہ اس سے فائدہ اٹھانا درست ہو۔

کتبِ فقہ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مالِ حرام میں تبدل ملک واقع ہو، پھر بھی اس کی حیثیت وہی باقی رہے گی، چنانچہ علامہ شامی رقم فرماتے ہیں:

''(قوله الحرام ينتقل) أي تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدي وتبدلت الأملاك'' (شامی: ۵/ ۹۸، ط: دار الفکر، بیروت)۔

علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

''الحرمة تتعدى مع العلم بها'' (الاشباہ و النظائر: ۱/ ۲۴۷، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان)۔

علامہ شامی کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی یہی مفہوم متبادر ہوتا ہے:

''لو رأى المكاس مثلًا يأخذ من أحد شيئا من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذ من ذلك الآخر آخر فهو حرام'' (شامی: ۵/ ۹۸)

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ مال حرام میں اگرچہ ملکیت کی تبدیلی واقع ہو پھر بھی وہ مال حرام ہی رہے گا۔

صاحبِ ''البحر الرائق'' کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے:

''یعنی إذا کان لشخص مسلم دین علیٰ مسلم فباع الذی علیه خمرًا وأخذ ثمنها، و قضی الدین لایحل للمدین أن یأخذ ذلك بدینه'' (البحر الرائق: ۸/ ۲۲۹، ط: دار الکتاب الاسلامی)۔

نیز تبیین الحقائق میں ہے:

''معناه إذا کان لشخص مسلم دین علیٰ مسلم فباع الذی علیه الدین خمرًا وأخذ ثمنها وقضیٰ به الدین لا یحل للدائن أن یأخذ ثمن الخمر بدینه'' (تبیین الحقائق: ۶/ ۲۷، ط: المطبعة الکبریٰ، مصر)۔

مذکورہ دونوں عبارتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مالِ حرام میں اگرچہ ملکیت کی تبدیلی واقع ہو پھر بھی وہ حرام ہی رہے گا اس لئے کہ اگر ملکیت کی تبدیلی کی وجہ سے اس کی حیثیت بدل جاتی تو مسلمان کے لئے قرض میں اس مال کا لینا درست ہوتا۔

البتہ اگر کتبِ فقہ کی عبارات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم میں کافر اور مسلم کے درمیان میں فرق ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے اس بات کی اجازت دی ہے کے کافر سے قرض کی وصولی میں مال حرام کا لینا درست ہے، جب کہ مسلم سے قرض کی وصولی میں مالِ حرام کا لینا درست نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ رقم فرماتے ہیں:

'' یعنی إذا کان لشخص مسلم دین علیٰ مسلم فباع الذی علیه الدین خمرًا وأخذ ثمنها، وقضیٰ الدین لا یحل للمدین أن یأخذ ذلك بدینه، وإن کان البائع کافرًا جاز له أن یأخذ'' (البحر الرائق ۸/ ۲۲۹)۔

''تبیین الحقائق'' میں ہے:

''وکره لرب الدین أخذ ثمن خمر باعها مسلم لا کافر'' (تبیین الحقائق: ۶/ ۲۷)۔

''درر الحکام'' میں ہے:

''وجاز أخذ دین علیٰ کافر من ثمن خمر بخلاف المسلم'' (درر الحکام: ۱/ ۳۱۸)۔

''فتاوی ہندیہ'' میں ہے:

''لو کان لمسلم علیٰ نصرانی دین فباع النصرانی خمرًا وأخذ ثمنها و قضاه لمسلم جاز له أخذه ...ولوکان الدین لمسلم علیٰ مسلم فباع المسلم خمرًا وأخذ ثمنها وقضاه صاحب الدین کره له أن یقبض ذلك من دینه'' (فتاوی ہندیه: ۵/ ۳۶۷)

فتاویٰ دار العلوم زکریا میں کافر اور مسلم سے سودی مال قرض میں وصول کرنے کے متعلق حکم ملاحظہ ہو:

''مسلمان سودی رقم کا مالک نہیں ہوتا، سود کی رقم فی الفور واجب التصدق ہے، لہٰذا کسی مسلمان کا قرض ادا کرنا بھی جائز نہیں ہے اور قرض خواہ کے لئے اپنے قرض میں سودی رقم رقم کا لینا بھی ناجائز ہے''۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:

''فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی ملکیت اس مالِ حرام پر ثابت ہو جاتی ہے، اس لئے مسلمان اپنے قرض میں وصول کرسکتا ہے'' (فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۵۲۳، ط: مجلس البحوث والافتاء، بمبئی)۔

مذکورہ عبارات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مالِ حرام کے حکم میں کافر اور مسلمان کے درمیان فرق ہے، اس فرق کو مزید سمجھنے کے لئے حضرت مولانا ظفر عثمانیؒ کی چشمکشا عبارت ملاحظہ ہو:

''کفار مخاطب بالفروع فی العقوبات والمعاملات اگرچہ ہیں، لیکن حکم بالحرمۃ والفساد کے لئے خطابِ عام کافی نہیں، بلکہ التزام بھی شرط

ہے، اہلِ حرب نے تو احکام اسلام کا التزام بالکل نہیں کیا، نہ اپنے معتقد کے موافق میں اور نہ مخالف میں، لہٰذا وہ تو جس طرح روپیہ کمائیں، خواہ ربا سے، خواہ غصب سے، خواہ بیوع باطلہ وفاسدہ سے خواہ اپنے مذہب کے موافق خواہ مخالف طریق سے بہر صورت وہ روپیہ وغیرہ ان کی ملک میں داخل ہو جائے گا، اور مسلمانوں کو تنخواہ میں لینا اس کا جائز ہے" (امداد الاحکام: ۴/ ۳۹۰)۔

اسی طرح حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی بامت برکاتہم کی درج ذیل عبارت بھی لائقِ ملاحظہ ہے:

"اگر گورنمنٹ بینک میں کوئی رقم رکھتی ہے، اس کا سود حاصل کرتی ہے، اور اس سے اپنے بعض ملازمین کو تنخواہ کے طور پر دیتی ہے، تو ان ملازمین کو اس تنخواہ سے استفادہ کرنے کی گنجائش ہے، کیونکہ بینک میں رقم رکھنے اور اس پر سود حاصل کرنے کی ذمہ داری گرنمنٹ سے متعلق ہے، نہ کہ ملازمین سے یا ان لوگوں سے جن کا تعاون کیا جائے، اور فقہ کا یہ اصول ہے کہ رقم متعین نہیں ہوتی، اور مالک کے بدلنے سے شئی کی حیثیت بدل جاتی ہے، یعنی اگر بینک نے گورنمنٹ کو رقم دی تو یہ بعینہ وہ رقم نہیں سمجھی جائے گی، جو ملازمین کو تنخواہ میں ملی ہے؛ البتہ اگر کوئی شخص بطور احتیاط اس سے بھی پرہیز کرے تو یہ یقیناً اس کے لئے باعثِ اجر ہوگا" (کتاب الفتاوی: ۱۰/ ۶۲)۔

پس جس طرح مسلمان کے لئے کافر کے مالِ حرام کو تنخواہ میں لینا اور قرض میں وصول کرنا درست ہے، اسی طرح کافر وہ مال مسلمان کو بطور ہدیہ دے، تو مسلمان کے لئے اس ہدیہ کو قبول کرنا بھی درست ہے، چنانچہ فتاوی دار العلوم زکریا میں ہے:

"اگر کافر کے پاس سود کا مال آیا تو کافر اس کا مالک بن جائے گا اور اس سے ہدیہ قبول کرنا جائز درست ہوگا"

(فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/ ۶۱۴)۔

ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے سوال میں ذکر کردہ صورت کا حکم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی اسکیموں سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ جب حکومت کا ادارہ بینک سے ملنے والی سودی رقم کا مالک ہوتا ہے تو پھر جس طرح کوئی کافر مسلمان کو مالِ حرام ہدیہ میں دے تو اس کو قبول کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر وہ اس پیسہ سے کسی مسلمان کی مدد کرے تب بھی کوئی حرج نہ ہونا چاہئے؛ البتہ اگر کوئی احتیاطاً اس سے بھی پرہیز کرے تو یہ یقیناً اس کے لئے باعثِ اجر ہوگا جیسا کہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم نے سودی رقم سے تنخواہ وصول کرنے کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔

......☆......

معمولی شرح سود کو سروس چارج قرار دینے کا مسئلہ

مولانا محمد حذیفہ داحودی[1]

عوام کی معاشی ومعاشرتی ضرورتوں کی کفالت کرنا، تعلیمی وصنعتی اعتبار سے فروغ دینا، اقتصادی اعتبار سے پسماندہ شہریوں کو اونچا اٹھانا، صحت وعلاج وغیرہ کی سہولیات فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اس لئے حکومت وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی فلاحی اسکیمیں جاری کرتی اور عوام کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیتی ہے، لیکن چونکہ مسلمان اس بات کا پابند ہے کہ وہ ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانے میں بھی احکام شریعت کا پاس ولحاظ رکھے، اس لئے اس قسم کی اسکیموں کے تعلق سے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، جن میں سے چند سوالات وجوابات مختصر طور پر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، واضح رہے کہ سرکاری اسکیموں میں عوام کو جو رقوم فراہم کی جاتی ہیں وہ بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں ایک: امداد واعانت، دوسری: قرض، پھر قرضے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک: وہ قرض جس کا ایک حصہ سبسڈی کے عنوان سے معاف کردیا جاتا ہے، دوسرا: وہ قرض جو پورا واپس کرنا پڑتا ہے، بلکہ کبھی اس کے ساتھ مزید کچھ ادا کرنا ہوتا ہے، جو کم بھی ہوتا ہے اور زیادہ بھی، پس:

سوال (۱): وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب (۱): حکومت سے کسی شہری نے ایسا قرض لیا ہے جس کا ایک حصہ واپسی کے وقت سبسڈی کے عنوان سے معاف ہوجائیگا تو یہ معافی حکومت کی طرف سے قرضدار کا تعاون ہے اور ایسا قرض لینا شرعاً درست ہے، قرض دینے کے بعد اس کا کل یا بعض حصہ معاف کردینے کی ترغیب خود قرآن کریم اور احادیث میں موجود ہے، ارشاد باری ہے: "وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون" (البقرۃ: ۲۸۰)

روایت میں ہے: ''من أنظر معسرا أو وضع عنه أظله الله في ظله'' (اخرجه مسلم عن كعب بن عمرو، رقم: ۳۰۰۶)۔
''فتاوی رحیمیہ'' میں ہے:

''اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا اور غریب رعایا کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرنا ہے، اسی لئے حکومت کچھ رقم چھوٹ بھی دیتی ہے، جسے سبسڈی کہا جاتا ہے، اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد سودخوری نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی شخص حکومت سے اس قسم کی اسکیم کے تحت قرض لے اور حکومت کی طرف سے اس پر کچھ رقم چھوٹ ملے اور بقیہ رقم حکومت مع سود وصول کرے اگر وہ سود چھوٹ میں ملی ہوئی رقم، یعنی سبسڈی سے ادا ہوجاتی ہو، اپنے پاس سے زائد رقم نہ دینا پڑتی ہو، تو اس تاویل سے کہ حکومت نے بطور تعاون جو رقم دی تھی اس شخص نے اسی تعاون والی رقم میں سے کچھ رقم واپس کردی، مذکورہ اسکیم کے تحت قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اور اگر سود کی رقم چھوٹ میں ملی ہوئی رقم، یعنی سبسڈی سے زیادہ دینی پڑے تو پھر یہ معاملہ سودی کہلائے گا اور جائز نہ ہوگا'' (۹/ ۲۶۵)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فیصلوں میں ہے:

''ہندوستان میں محض سرکاری قرضے ایسے ہیں جن پر سرکار کی طرف سے چھوٹ دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی اضافی رقم چھوٹ کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں'' (۱۶۲)۔

سوال (۲): معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے، جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

---

[1] ندی روڈ، نزد جمعہ مسجد، گھانچی واڑہ داحود، گجرات۔

جواب (۲): اس صورت میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے، یہ حکومت کی طرف سے مشروط تعاون ہے، اس لئے درست ہے۔

سوال (۳): اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

جواب (۳): اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنے کی شرط ہو تو اس صورت میں بینک سے نفس قرض کا معاملہ تو صحیح ہے، مگر زیادتی کی شرط لغو ہے اور یہ زیادتی سود ہے جو شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے وقت مقررہ کے اندر قرض واپس کرنے کی نیت سے قرض لے گا اور پھر مقررہ مدت میں واپس کر دیگا تو گنہگار نہ ہوگا اور حکومت کی طرف سے قرض کی واپسی میں جو کمی ہوگی وہ ابراء یعنی قرض کی معافی اور تعاون ہوگا اور اگر وقت مقررہ کے اندر قرض ادا نہ کیا اور اسے سود دینا پڑا تو اب اسے سود دینے کا گناہ ہوگا۔

علامہ حصکفی نے لکھا ہے: "القرض بالشرط حرام، والشرط لغو" (الدر مع الرد: ۷/۳۹۴)۔

سوال (۴): غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرے میں آئیگا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت اور گنجائش ہوگی؟

جواب (۴): غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو تو چاہے اس زیادتی کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج یا اجرۃ الخدمۃ کہا جا سکتا ہو، تب بھی عام اصول شرع کے مطابق قرض پر ادا کی جانے والی یہ زائد رقم سود کے دائرے میں آتی ہے، کیوں کہ شریعت اسلامی میں سود بہر صورت سود ہے، اس کی شرح کم یا زیادہ ہونے سے اس کے سود اور پھر ممنوع ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

علامہ حصکفی نے لکھا ہے: "کل قرض جر نفعا حرام" (الدر مع الرد، کتاب البیوع، باب المرابحۃ والتولیۃ: ۷/۳۹۵)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فیصلوں میں ہے:

"سود خواہ ذاتی مصارف کے قرضوں پر دیا جائے یا تجارتی وکاروباری قرضوں پر، شریعت اسلامیہ کی نظر میں بہر حال حرام ہے،...... قرآن وسنت، اجماع وقیاس اور امت محمدیہ کا عمل متوارث سب یہی بتاتے ہیں کہ حرمت ربو کے بارے میں اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا کہ قرض لینے دینے کا مقصد اور محرک کیا ہے؟ سود کی حرمت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ، مناسب حد تک کم ہے یا نامناسب حد تک زیادہ، شریعت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ شرح سود اگر مناسب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہے اور نامناسب حد تک زیادہ ہے تو ناجائز، دلائل شرعیہ اس طرح کی کسی تفریق کی اجازت نہیں دیتے۔" (۱۵۴)

نیز لکھا ہے: "قرض خواہوں سے قرض میں دی گئی رقم سے زائد وصول کرنا چاہے اس کا کوئی سا بھی طریقہ اختیار کر لیا جائے ہرگز جائز نہیں اور قرض سے زائد حاصل کی گئی رقم شرعاً سود ہے، لہٰذا ذاتی مفاد یا ادارہ کے مفاد یا دیگر رفاہی اسکیموں پر خرچ کرنے کے لئے بھی قرض سے زائد کوئی رقم وصول کرنا جائز نہیں، نیز ان اداروں میں جمع شدہ رقوم کو فکس ڈپازٹ میں رکھنا اور ان پر سود حاصل کرنا بھی حرام ہے۔" (۱۶۹)

البتہ چونکہ بعض علماء نے مالیاتی ادارہ کے لئے اس بات کی گنجائش لکھی ہے کہ ادارہ قرض داروں سے اجراء قرض پر ہونے والے انتظامی اخراجات اور سروس چارج کے طور پر قرض جاری کرنے سے پہلے اور بعد میں کی جانے والی دفتری کاروائی کی اجرت وصول کر سکتا ہے، جبکہ دو شرطیں پائی جائیں: ایک: یہ کہ اجرت اس قسم کے کاموں پر آنے والی اجرتِ مثل سے زیادہ نہ ہو، دوسری: یہ کہ اس اجرت کی وصولی کو قرض پر حصول نفع کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنالیا جائے۔ چنانچہ:

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں:

"قرض جاری کرنے اور اس کا حساب کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں، بینک کے لئے اپنے قرضداروں سے بطور سروس چارج کے ان کو وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے جو اس منصوبہ پر قرض کے اجراء کے لئے پیش آئیں ہیں، البتہ پوری احتیاط کے ساتھ ان اخراجات کی تحدید ممکن ہو تو یہ صورت احکام شریعت کے زیادہ موافق اور مناسب ہوگی اور اس کے جواز میں کوئی کلام نہ ہوگا اور اگر ہر منصوبہ کے

علاحدہ علاحدہ اخراجات کی تحدید ممکن نہ ہو تو اس صورت میں بینک کے لئے ان سے واقعی اخراجات طلب کرنے کے بجائے قرض جاری کرنے سے پہلے اور بعد میں کی جانیوالی دفتری کارروائی کی اجرت وصول کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اجرت اس قسم کے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو، اس لئے کہ قرض دینے کا عمل بذات خود ایک ایسا عمل ہے جس پر نفع کا مطالبہ کرنا یا اجرت کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز نہیں، لہٰذا قرض کاری کرنے پر آنے والے مصارف کو اندازہ سے لم سم وصول کرنا جائز نہیں، لیکن اس قرض کے اجراء پر پیش آنے والے حقیقی دفتری اخراجات کا بالا معاوضہ ہونا شرعاً کوئی ضروری نہیں، البتہ بینک کے لئے قرض لینے والوں سے قرض کی مقدار پر فیصد کے حساب سے اجرت وصول کرنے کی گنجائش ہے جو قرض جاری کرنے پر آنے والے دفتری اخراجات کو پورا کر سکے بشرطیکہ اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جائے، ایک یہ کہ یہ اجرت اس جیسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل کے برابر ہو، دوسرے یہ کہ اس اجرت کی وصولی کو قرض پر حصول نفع کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنالیا جائے۔ اس مسئلہ کی نظیر وہ مسئلہ ہے جو فقہاء نے بیان فرمایا ہے کہ قاضی اور مفتی کے لئے فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر مدعی اور مستفتی سے اجرت طلب کرنا جائز نہیں، لیکن مفتی کے لئے فتوی تحریر میں لانے اور قاضی کے لئے دستاویز لکھنے اور رجسٹر میں اندراجات کرنے کی اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ یہ اجرت ایسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو اور بشرطیکہ اس کو نفس فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر اجرت لینے کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنایا جائے ؛...... البتہ فیصد کے اعتبار سے وصول کئے جانے والے اخراجات کی مقدار بہت معمولی ہونی چاہئے تاکہ واقعتہ اس کے سروس چارج ہونے میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اور یہ سروس چارج اجرت مثل سے زیادہ وصول کرنا کسی حال میں جائز نہیں، ورنہ "کل قرض جر نفعًا" کے تحت داخل ہو کر یقینی طور پر حرام ہو جائے گی" (فقہی مقالات: ۱/ ۲۷۰-۲۷۱)۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

"ترقیاتی قرضوں میں اصل مقصود نفع کمانا نہیں ہوتا، بلکہ عوام کے لئے بنیادی ضروریات اور روزگار کی فراہمی مقصود ہوتی ہے، اس لئے اگر اس پر لئے جانے والے قرضے کو دفتری اخراجات اور ضروریات پر محمول کیا جائے تو مناسب محسوس ہوتا ہے" (۴/ ۸۹)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فیصلوں میں ہے: "سیمینار کے شرکاء میں سے متعدد علماء کی رائے یہ ہے کہ اجرۃ الخدمت یا انتظامی اخراجات اگر چہ ضروری اور واقعی اخراجات تک محدود ہوں قرض خواہوں سے نہیں لئے جاسکتے، بعض علماء کی رائے میں اگر چہ یہ اصلاً جائز ہیں، لیکن سود کا دروازہ کھل جانے کا خطرہ ہے، اس لئے اسے قطعی طور پر ممنوع قرار دیا جانا چاہئے، دیگر علماء کی رائے میں اس طرح کے اداروں کا قیام مفید اور ضروری ہے اور اگر اصحاب خیر کی طرف سے تعاون یا پیداواری ذرائع میں سرمایہ لگا کر بقدر ضرورت جائز آمدنی حاصل کر کے بھی ادارہ چلانا ممکن نہیں ہو تو ادارہ کے ضروری اور حقیقی انتظامی اخراجات قرض خواہوں سے وصول کئے جاسکتے ہیں کہ اس ادائیگی کا کوئی نفع نہ سرمایہ جمع کرنے والوں کو پہنچتا ہے اور نہ ادارہ کے لئے ذریعۂ آمدنی ہے ......" (۱۷۰)

اس لئے غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح اتنی زیادہ کم ہو کہ وہ اخراجات کے بقدر یا دفتری کارروائی کی اجرت مثل کے برابر ہو، اس سے زیادہ نہیں تو ایسے قرضے لینا درست ہوگا اور ان پر ادا کی جانے والی معمولی زائد رقم کو سود کے دائرے میں نہ مان کر انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت اور گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

سوال (۵): اگر سرکار کی طرف سے دئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

جواب (۵): سرکار کی طرف سے دئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم جس کا اوسط غیر معمولی ہے ظاہر ہے کہ وہ قرض پر لیا جانے والا نفع ہے اور حدیث نبوی: "کل قرض جر نفعا فھو ربا۔" کے تحت سود کے دائرہ میں آتا ہے، اس لئے عام حالات میں نہ ایسا قرضہ لینا درست ہے اور نہ ہی زائد رقم یعنی سود دینا جائز ہے، ہاں البتہ اگر رہائشی یا معاشی واقعی حاجت وضرورت ہو، جس کے انتظام کی اور کوئی صورت نہ ہو تو ایسا قرض لینے کی گنجائش ہوگی، کیونکہ کبھی حالات ایسے پیش آتے ہیں جن میں انسان سودی قرض لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور سودی قرض لئے بغیر بنیادی خورد ونوش و رہائش کی تکمیل نہیں ہو پاتی اور نہ ہی اسے غیر سودی قرض ملتا ہے، جس سے وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کر سکے، ایسے ضرورت مند اور محتاجوں کے لئے بقدر حاجت سودی

قرض لینے کی فقہاء نے اجازت دی ہے، مشہور حنفی فقیہ ابن نجیم مصری نے لکھا ہے:

''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ، القاعدۃ الخامسۃ: الضرر یزال: ۹۲)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فیصلوں میں ہے:

''ربو (سود) قطعی حرام ہے اور جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے، سود ادا کرنے کی حرمت بذات خود نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سود خواری کا ذریعہ ہے، اس لئے بعض خاص حالات میں عذر کی بنا پر سود ادا کر کے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔'' (۱۶۲)

سوال (۶): ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقوم کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب (۶): مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر یا تعلیمی ضروریات وغیرہ لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر جو رقم ملا کرتی ہے، جس کی واپسی نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ذریعہ حکومت اپنے شہریوں کی اعانت کرتی ہے ایسی رقوم کو حاصل کرنا اور استعمال کرنا بلا تردد درست اور صحیح ہے۔

سوال (۷): گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم-جس قسم کی بھی ہو-ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے، اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کے مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہے؟

جواب (۷): گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہو اور خرچ بھی ہوتا ہو، تو جو لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، اور واقعی محنت کرتے ہیں ان کو مطلوبہ محنتانہ دینا اور ان کا لینا درست ہے، بشرطیکہ وہ اجرت اور محنتانہ ان کاموں کی اجرت مثل کے مطابق ہو۔

سوال (۸): بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب (۸): واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا جو حصہ لیتے ہیں اگر وہ واسطہ بننے والے کی محنت کے برابر ہے تو اس کا لینا درست ہے، اور اگر زائد ہے تو یہ ظلم اور حق تلفی ہے، جو درست نہیں ہے۔

سوال (۹): اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

جواب (۹): اگر قرض واقعی ضرورت کے لئے لیا جارہا ہے، نیز امدادی رقوم کا آدمی واقعی حقدار ہے جو حق اس کو رشوت دیئے بغیر نہیں مل رہا ہے تو اس صورت میں اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے رشوت دینا جائز ہے، ظلم سے بچنے یا اپنے کسی جائز حق کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔

شامی میں ہے: ''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع'' (شامی، کتاب الحظر والاباحۃ، باب الاستبراء، فصل فی البیع: ۹/ ۶۰۷)۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

رشوت دینے کی گنجائش کب ہوگی؟ اس سلسلہ میں فقہاء نے یہ اصول متعین کیا ہے کہ اگر رشوت نہ دے تو ناحق طریقہ پر اس کو جانی یا مالی نقصان کا اندیشہ ہو یا یہ اندیشہ ہو کہ جس ذمہ دار کے پاس اس کی درخواست زیر غور ہے وہ اس کے ساتھ انصاف سے کام نہ لے گا اور اس کے اور دوسرے امیدواروں کے درمیان مساویانہ سلوک روا نہیں رکھے گا۔ علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

''الرشوة لخوف على نفسه أو ماله أو ليسوي أمره عند السلطان أو أمير'' (الاشباہ: ۱۸۳، جدید فقہی مسائل ۱/ ۴۵۵)

اور اگر قرض کی کوئی واقعی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح امدادی رقوم کا آدمی واقعی حقدار نہیں ہے، اس کے باوجود رشوت دے کر بلا ضرورت اور ناحق طور وہ لینا چاہتا ہے تو اس صورت میں اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے رشوت دینا جائز نہیں ہے اور رشوت لینا تو کسی حال میں بھی درست نہیں ہے، رشوت لینے اور بلا وجہ رشوت دینے پر سخت وعیدیں وارد ہیں، حدیث میں ہے کہ رشوت لینے والے اور دینے والے پر خدا کی لعنت ہے:

''لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی'' (رواہ الترمذی: کتاب الاحکام، باب ما جاء فی الراشی والمرتشی فی الحکم، رقم: ۱۳۳۷)

سوال (۱۰): امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب (۱۰): امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے جو شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے۔

''محمود الفتاوی'' میں ہے: ''حکومت کی طرف سے بعض لوگوں کو بعض مخصوص شرائط کے ساتھ جو سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں، کسی ایسے آدمی کا جوان مخصوص شرائط پر پورا نہ اترتا ہو، فائدہ اٹھانا شرعاً ناجائز اور حرام ہے'' (۴۹/۳)۔

سوال (۱۱): بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب (۱۱): تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت عوام کو بنک سے قرض دلائے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہو وہ خود مقروض کو ادا نہ کرنا پڑے، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کردے تو اس طرح کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں قرض دار کو لئے ہوئے قرض پر کوئی سود نہیں دینا پڑتا۔ ہاں! جس اسکیم میں انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرے، مگر تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا پڑتا ہو ایسی اسکیم سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، کیونکہ اس صورت میں قرض دار کو لئے ہوئے قرض پر سود دینا پڑتا ہے، جو ممنوع ہے۔

سوال (۱۲): بعض اسکیمیں ایسی بھی ہیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، جس کو بینک میں ڈپوزٹ کردیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس اس کا مالک ہوجاتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے، تو کیا یہ صورت درست ہوگی؟

جواب (۱۲): جن اسکیموں میں حکومت نے محفوظ فنڈ قائم کرکے اس کو بینک میں ڈپوزٹ کردیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے حاصل شدہ رقم سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کرتی ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ سود کی رقم ہے جس کا مصرف وہ لوگ ہیں جو مستحق زکوۃ ہیں، جو لوگ مستحق زکوۃ نہیں ہیں وہ سود کی رقم کا مصرف نہیں ہیں، اس لئے اگر حکومت بعینہ سود کی رقم ہی سے عوام کا تعاون کرتی ہے تو اس رقم سے مستحق زکوۃ لوگوں کا استفادہ کرنا جائز ہے، غیر مستحق کے لئے ایسی سودی رقم سے استفادہ کرنا جائز نہیں ہے۔

ہاں! اگر حکومت اپنی دوسری رقوم جو اس کے علاوہ دیگر راستوں سے آئی ہیں اس سے اس رقم کو مخلوط کردیتی ہے اور پھر اس مجموعی اور مخلوط رقم سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کرتی ہے تو اس صورت میں مستحق زکوۃ اور غیر مستحق زکوۃ سبھی لوگوں کا اس سے استفادہ کرنا جائز ہے۔

فی الدر: ''ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه ... لأن الخلط استهلاك۔ وفي الرد: قوله: (لأن الخلط استهلاك) أي بمنزلته من حيث إن حق الغير يتعلق بالذمة لا الأعيان'' (الدر المختار ورد المحتار، باب زكوة الغنم ۲/ ۲۱۷)۔

……☆……

سرکاری قرضوں پر وصول کیا جانے والا سود اور سروس چارج

مفتی محمد شوکت ثنا قاسمی [1]

وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جائے؟

عوام کے فلاح و بہبود اور ان کی معاشی و معاشرتی کفالت وغیرہ مقاصد کے لیے حکومت کی طرف سے جو مختلف قرضے جاری کیے جاتے ہیں، ان میں سے وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے، اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، مسلمانوں کے لیے بوقت ضرورت قرض کی اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ رقم حکومت کی جانب سے مدد و تعاون کے طور پر دی جاتی ہے۔

مقررہ مدت کے اندر عدم واپسی پر پوری رقم کی ادائیگی؟

کچھ حصے کی معافی والے قرضوں کی وہ صورت جس میں یہ شرط رکھی گئی ہو کہ اگر مقررہ مدت کے اندر واپس کر دیا جائے تو اس معافی کا اطلاق ہوگا، ورنہ پوری رقم ادا کرنی ہوگی، البتہ اس پر کوئی سود نہیں لیا جائے گا، قرض کی اس صورت سے بھی مسلمانوں کے لیے استفادہ کی مکمل گنجائش ہوگی۔

بصورت تاخیر زائد رقم کی ادائیگی؟

اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم کی ادائے گی کو شرط قرار دیا گیا ہو تو یہ صورت سود میں داخل ہوگی، زمانہ جاہلیت میں ربا کا یہی طریقہ زیادہ مروج تھا جسے ''ربا نسیہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، اسے شریعت اسلامیہ نے ناجائز وحرام قرار دیا ہے۔

علامہ فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں:

''ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به'' (تفسیر رازی: ۷/ ۴۲)

پھر جب دین کی ادائے گی کا وقت آجاتا تو قرض دینے والے اصل رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتے، اب اگر اس کے لیے ادا کرنا مشکل ہوتا تو رقم میں بھی اضافہ کر دیتے، یعنی زائد رقم کا مطالبہ کرتے اور مہلت بھی دے دیتے، ربا کی یہی صورت ہے جو زمانہ جاہلیت میں مروج تھی۔

''فتاوی اللجنة الدائمة'' میں بصورت تاخیر زائد رقم کی ادائے گی کو سود قرار دیا گیا ہے۔

''س: كرت تسلمه بعض الشركات بقرض معلوم، يقدمه لأي بنك ويأخذ ما فيه والبنك يرجع به على الشركة التي قدمت الكرت، وتسلم له حقه، وهذا القرض مؤجل لأجل معلوم في الكرت. إذا سلم صاحبه ما عليه قبل الأجل فلا شيء عليه، وإن تأخر فعليه غرامة 1%، وبعض الشركات تعطي بعض النقود في مقابل هذه الخدمة في مقابل تسليم الكرت.

ج: إذا كان الواقع كما ذكر من الاتفاق على أن المقترض إن وفى بسداد القرض عند الأجل لا يغرم شيئا، وإن تأخر دفع زيادة عليه 1% من مقدار المبلغ فهو عقد ربوي، مدخول فيه على ربا الفضل، وهو تلك الزيادة، وربا النسأ وهو التأخير، وكذلك الحكم إذا دفعت الشركة النقود وأخذت زيادة عليها مقابل هذه الخدمة، بل

---

[1] مفتی واستاذ شعبہ تربیت افتاء، جامعہ عائشہ نسواں، داراب جنگ کالونی، مادنا پیٹ، حیدر آباد۔

الثاني أصرح من الأول في الربا" (فتاوى اللجنة الدائمة: ۱۳/ ۵۲۳)۔

اور یہ قرض دے کر نفع حاصل کرنا ہے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض پر نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا اور بعض روایتوں میں اسے سود قرار دیا گیا ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "کل قرض جر منفعة فهو ربا" (المطالب العالية: ۱۴۴۰، تلخيص الحبير: ۱۲۲۷) اس لیے قرض کی اس صورت سے بلا شدید مجبوری کے مسلمانوں کے لیے استفادہ درست نہیں ہوگا۔

اصل سے زائد رقم پر سروس چارج کا اطلاق؟

معافی یا غیر معافی والے قرضوں کی صورت میں اگر اصل رقم سے زائد مطالبہ کی رقم کی شرح بہت معمولی ہو تو کیا اس کو سروس چرج کہا جاسکتا ہے، یا اس کو انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس کو لینے اور دینے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟

اگر قرض دینے والا ادارہ خواہ بینک ہو یا کوئی کمپنی ہو یا سرکار ہو ان کی طرف سے یہ وضاحت ہو کہ اصل رقم سے زائد رقم بطور انٹرسٹ کے نہیں، بلکہ سروس چارج اور انتظامی اخراجات کے ہے، اور وہ اپنی مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کہلا سکتا ہو تو اس زائد رقم کو انتظامی خرچ میں شمار کرنے کی گنجائش ہوگی، اور اس ادارے، بینک یا سرکار کو اس زائد رقم لینے کی اور قرض لینے والے کو دینے کی اجازت ہوگی۔

عصر حاضر کے مشہور و معروف فقیہ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

بینک اپنی جن خدمات پر اجرت وصول کرتا ہے، مثلا: لاکرز، لیٹر آف کریڈٹ، بینک ڈرافٹ، بیع وشراء کی دلالی وغیرہ ان کی اجرت لینا جائز ہے، البتہ سود کا کاروبار ناجائز ہے (ہمارا معاشی نظام: ۱۱۵)۔

اور اگر بینک، یا کمپنی اور سرکار اصل رقم سے زائد رقم انٹرسٹ کے نام سے ہی وصول کرتا ہو تو اگر چہ کی اس کی مقدار کم ہو پھر بھی اس کو سروس چارج قرار نہیں دیا جاسکتا ہے،، بلکہ وہ زائد رقم سود ہی ہوگی۔ اور سود کی حرمت، قباحت اور شناعت میں قلیل وکثیر کا کوئی فرق نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جانتے ہوئے سود کا ایک درہم بھی استعمال کرنا اپنی ماں سے چھتیس بار بدکاری کرنے سے بھی زیادہ قبیح ہے۔

"درهم ربا يأكله الرجل وهو يعلم أشد من ستة وثلاثين زنية" (مسند احمد: ۲۱۹۵۷، مسند بزار: ۳۳۸۱، سنن دار قطنی: ۲۸۴۳)

یہی حکم اس صورت کا بھی ہے کہ سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زئد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے۔

ضرورت کے پیش نظر مختلف قرضوں کا حکم؟

سود لینا تو بہر حال حرام ہے اور کسی صورت اس کی اجازت نہیں مل سکتی ہے، اور عام حالات میں سودی قرض لینا بھی جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" (البقرة: ۲۷۵)۔

(جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو، یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے کہا تھا کہ: بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے)۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ" (البقرة: ۲۷۹)۔

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اگر تم واقعہ مومن ہو تو سود کا جو حصہ بھی (کسی کے ذمے) باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو۔ پھر بھی اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ

اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔ اور اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہارا اصل سرمایہ تمہارا حق ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، دینے والے اور اس میں تعاون کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے: "لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا، وموكله، وشاهديه" (ترمذی: ۱۲۰۶، مسلم: ۱۵۹۷، باب لعن آكل الربا ومؤكله، ابوداؤد: ۳۳۳۳)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سودی معاملہ کرنے والے کو ستر قسم کے گناہ لاحق ہوتے ہیں جن میں ادنیٰ درجہ کا گناہ یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔ "الربا سبعون حوبا، أيسرها أن ينكح الرجل أمه" (سنن ابن ماجة: باب التغليظ في الربا: ۲۲۷۴)

ان نصوص کے پیش نظر عام حالات میں کسی بھی مقصد کے لیے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں ہے، البتہ ضروریات کی تکمیل، روزگار کی فراہمی کے لیے سودی قرض لینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو تو ایسی صورت میں بدرجہ مجبوری فقہائے کرام سودی قرض لینے کا اجازت دی ہے:

چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

"يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (البحر الرائق: ۶/ ۱۳۷) ضرورت مند کے لیے سود پر قرض لینا جائز ہے۔

حالات اور صلاحیت کے لحاظ ہر شخص کی ضرورت مختلف ہوتی ہے، اس لیے اس سلسلہ میں مبتلیٰ بہ شخص خود اپنا جائزہ لیتے ہوئے اس پر غور کرے کہ کیا اس کے لیے بظاہر اس کے بغیر روزگار اور ضروریات کی تکمیل کی کوئی اور جائز صورت نکل سکتی ہے یا نہیں، نیز اپنے علاقہ کے علماء اور مفتیان کرام سے اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مشورہ کرے اور ان کے مشورہ پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عام حالات میں کسی بھی مقصد کے لیے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں ہے، البتہ ضروریات کی تکمیل، روزگار کی فراہمی کے لیے سودی قرض لینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو تو ایسی صورت میں بدرجہ مجبوری سودی قرض لینے کی اجازت ہے، ضرورت خواہ جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی یا دیگر کاروبار کا متقاضی ہو۔

عصر حاضر کے مشہور و معروف فقیہ مفتی اعظم ہندوستان حضرت اقدس مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

سود لینا تو کسی طرح جائز نہیں، البتہ مجبوری میں سودی قرض حاصل کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس لیے کسی کے پاس مکان نہ ہو اور بقدر ضرورت مکان کی تعمیر کے لیے بھی رقم موجود نہ ہو اور نہ غیر سودی قرض حاصل ہو سکتا ہو تو اس قدر سودی قرض حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ضرورت کے بقدر مکان تعمیر کرلے، یہی حکم ضروریات زندگی سے محروم بے روزگار شخص کے لیے دوکان کی غرض سے قرض حاصل کرنے کا بھی ہے، اسی طرح جس شخص کے لیے سواری ضروری ہو، اور اس کے پاس پیسے موجود نہ ہوں، وہ ایسے قرض کے ذریعہ سواری خرید سکتا ہے، غرض مجبوراً ایسی ضروریات کے لیے سودی قرض حاصل کیا جا سکتا ہے، جو زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے لوازم حیات کا درجہ رکھتے ہوں (کتاب الفتاوی: ۵/ ۳۵۳)۔

گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی مکمل امدادی رقم کا حکم؟

مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے جو رقم دی جاتی ہے، یہ رقم مدد و تعاون کے طور پر ہوتی ہے، نیز یہ رقم حکومت کے خزانہ سے ملتی ہے، جو تمام شہریوں کے ٹیکس وغیرہ سے جمع ہوتی ہے، اور موجودہ دور میں ہر آدمی کسی نہ کسی عنوان سے ٹیکس ادا کرتا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص دکان سے ایک پانی کا بوتل بھی خریدتا ہے تو اس میں بھی ٹیکس کی رقم شامل ہوتی ہے، اس لیے اس طرح کی رقم بطور امداد لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

امدادی رقم کے حصول میں واسطہ بننے والے کے لیے محنتانہ لینے کا حکم؟

عوام الناس کے لیے حکومت کے خزانہ سے رقم حاصل کرنا خواہ امدادی ہی کیوں نہ ہو آسان نہیں ہے، اس کے لیے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور خاص طور پر ناخواندہ افراد جو امداد کے حصول کے طریقے، شرائط و ضوابط، اور محکمہ سے ناواقف ہوتے ان کے لیے تو سرکاری امداد حاصل کرنا تو کافی مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے، این حالات میں ان تفصیلات سے واقف شخص سے رابطہ قائم کرنا لازم ہوتا ہے، اور اس واقف کار کے لیے بھی امداد کے حصول

کی کاروائی بہت آسان نہیں ہوتی ہے، مختلف کاغذات کی تیاری، متعدد آفیسر سے ملاقات اور کئی بار کئی آفیس کا چکر لگانے کے بعد ہی امدادی رقم کے حصول کے مراحل طے ہوتے ہیں، اور اس کے لیے کافی اوقات بھی درکار ہوتا ہے، اس لیے واسطہ بننے والوں کے لیے مناسب معاوضہ کا مطالبہ درست ہے، اور امداد حاصل کرنے والے کے لیے مناسب معاوضہ دینا بھی جائز ہے۔

''في الكبرى: أهل بلدة ثقلت عليهم مؤنات العمل فاستأجروا رجلا بأجرة معلومة ليذهب ويرفع أمرهم إلى السلطان الأعظم ليخفف عنهم بعض الحيف وأخذ الأجرة من عامتهم غنيهم وفقيرهم ذكر ههنا أنه إن كان بحال لو ذهب إلى بلد السلطان تهيأ له إصلاح الأمر يوما أو يومين جازت الإجارة. وإن كان بحال لا يحصل ذلك إلا بمدة فإن وقتوا للإجارة وقتا معلوما فالإجارة جائزة والأجر كله له وإن لم يوقتوا فهي فاسدة وله أجر مثله'' (الهندية: ۴/ ۵۲۶)۔

البتہ واسطہ بننے والوں کے لیے اپنی محنت سے زائد حاصل شدہ رقم کے بڑے حصہ کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے، وہ اس وجہ سے کہ عوام الناس کی ناواقفیت اور مجبوریوں کی وجہ سے ان کا استحصال کرنا ہے۔ اور ان کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کو شریعت اسلامیہ اجازت نہیں دے سکتی ہے۔

امدادی رقم یا قرضوں کے حصول کے لیے رشوت؟

رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام، اور گناہ کبیرہ ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل، وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون (البقرة: ۱۸۸)۔

(اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقوں سے نہ کھاؤ، اور نہ ان کا مقدمہ حاکموں کے اس سے غرض سے لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہڑپ کرنے کا گناہ کرو)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔

''لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي في الحكم'' (سنن ترمذی: باب ما جاء في الراشي والمرتشي في الحكم ابوداؤد: باب في كراهية الرشوة ۳۵۸۰، سنن ابن ماجه: ۲۳۱۳)۔

البتہ دفع ظلم وضرر اور اپنا حق وصول کرنے کے لیے بحالت مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے۔ چناں چہ علامہ ابن نجیم مصری حنفیؒ لکھتے ہیں:

''ومنها إذا دفع الرشوة خوفا على نفسه أو ماله فهو حرام على الآخذ غير حرام على الدافع، وكذا إذا طمع في ماله فرشاه ببعض المال، ومنها: إذا دفع الرشوة ليسوي أمره عند السلطان حل له الدفع، ولا يحل للآخذ أن يأخذ'' (البحر الرائق: باب اخذ القضاء بالرشوة)۔

مشہور معروف فقیہ علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

'' الرشوة أربعة أقسام: منها ما هو حرام على الآخذ والمعطي وهو الرشوة على تقليد القضاء والإمارة۔
الثاني: ارتشاء القاضي ليحكم وهو كذلك ولو القضاء بحق؛ لأنه واجب عليه۔
الثالث: أخذ المال ليسوي أمره عند السلطان دفعا للضرر أو جلبا للنفع وهو حرام على الآخذ فقط۔
الرابع: ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ؛ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب'' (حاشیه ابن عابدين: كتاب القضاء، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية)۔

امدادی رقوم یا قرضوں کے حصول میں اگر رشوت دیئے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو تو ایسی صورت میں بدرجہ مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہوگی، اور اس صورت میں صرف رشوت لینے والا گنہ گار ہوگا۔

''ومن كان له حق مضيع لم يجد طريقة للوصول اليه الا بالرشوة، او وقع عليه ظلم، فلم يستطع دفعه عنه الا

بالرشوة فالأفضل له أن يصبر حتى يسر الله له أفضل السبل لرفع الظلم ونيل الحق، فإن سلك سبيل الرشوة من أجل ذلك، فالإثم على الآخذ المرتشي، وليس عليه اثم الراشي في هذه الحالة مادام قد جرب كل الوسائل الأخرى، فلم تات بجدوئ، ومادام يرفع عن نفسه ظلما أو يأخذ حقا له دون عدوان على حقوق الآخرين'' (الحلال والحرام في الاسلام في العلاقات الاجتماعية، الرشوة لرفع الظلم: ۲۷۲)۔

فقیہ الامت حضرت اقدس مفتی محمود الحسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

رشوت کا دینا لینا حرام ہے، البتہ دفع ظلم اور اپنا حق وصول کرنے کے لیے بحالت مجبوری رشوت دینے کی گنجائش ہے، اس صورت میں فقط رشوت لینے والا گنہ گار ہوگا (فتاویٰ محمودیہ مرتب: ۱۸/ ۴۵۶)۔

امدادی رقم یا قرضوں کے حصول میں غلط بیانی سے کام لینا؟

امدادی رقوم یا قرضوں کو حاصل کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے جو شرائط و معیارات متعین ہوں، ان شرائط و معیارات کے حامل افراد کے لیے ہی ان اسکیمات سے استفادہ کرنا جائز ہوگا، جو لوگ ان شرائط و معیارات پر پورے نہ اترتے ہوں، ان کے لیے اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے، غلط طریقہ پر امداد یا قرض حاصل کرنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اس میں جھوٹ، دھوکہ اور مستحق کی حق تلفی ہے، جو کہ اسلام میں جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ" (آل عمران: ۶۱) جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ خاص طور پر جھوٹی بات سے کنارہ کش رہنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

"واجتنبوا قول الزور" [الحج: ۳۰] اور جھوٹی بات سے کنارہ کش رہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کو فسق و فجور اور جھنم میں لے جانے والا عمل قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ آدمی جھوٹ بولتے بولتے اللہ کے نزدیک جھوٹوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

''وإن الكذب يهدي إلى الفجور، وإن الفجور يهدي إلى النار، وإن الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذاب'' (بخاري: باب قول الله تعالى: يأيها الذين آمنوا اتقوا الله وكونوا مع الصادقين [التوبه: ۱۱۹] وما ينهى عن الكذب، مسلم: ۲۶۰۷)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریب اور دھوکہ دینے والے کے بارے میں واضح طور پر اعلان فرمایا کہ وہ ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔

''لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّ'' (سنن ابن ماجه: باب النهي عن الغش، مسند احمد: ۱۵۸۳۳)۔

مشہور و معروف فقیہ عبد الرحمن بن محمد بن سلیمان لکھتے ہیں:

جھوٹ بولنا حرام ہے، البتہ چند صورتوں میں جھوٹ بولنے کی اجازت ہے، میدان جنگ میں دشمن کو چکمہ دینے کے لیے، دو آدمیوں کے درمیان صلح کرانے، اپنے اہل و عیال کو راضی کرنے اور ظلم کو دفع کرنے کے لیے، اور ان مقامات پر بھی صریح جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ تعریض مراد ہے، اس لیے کہ صریح جھوٹ تو بہر حال حرام ہے۔

''والكذب حرام الا في الحرب للخدعة، وفي الصلح بين اثنين، وفي إرضاء الأهل، وفي دفع الظالم عن الظلم، والمراد التعريض؛ لأن عين الكذب حرام، قال في المجتبى: وهو الحق والمراد به التعريض؛ لأن عين الكذب حرام الا لحاجة الخ'' (مجمع الانهر مع سكب الانهر، فصل في المتفرقات، كتاب الكراهية، مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں، الدر المختار مع رد المحتار: فرع يكره إعطاء سائل المسجد إلا إذا لم يتخط رقاب الناس، ۶/ ۴۲۷)۔

جس قرض کا انٹرسٹ حکومت ادا کرے؟

اگر تعلیم یا کسی اور مقصد کے لیے ایسی اسکیم جس میں حکومت بنک سے قرض دلائے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہو وہ حکومت ادا کرے، خود مقروض

کو وہ انٹرسٹ ادا نہ کرنا پڑے تو ایسی اسکیموں سے مسلمانوں کے لیے استفادہ میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ بھی حکومت کی طرف سے ایک طرح کا امداد وتعاون ہے، البتہ اگر اس قرض پر عائد ہونے والی انٹرسٹ رقم کا کچھ حصہ مقروض کو بھی ادا کرنا لازم وضروری ہو تو ایسی صورت میں دیکھا جائے کہ کیا اس کی مقدار اتنی ہے کہ اس کو سروس چارج یا انتظامی خرچ قرار دیا جاسکے، اگر ہاں تو پھر اس کی اجازت ہوگی، ورنہ پھر عام حالات میں اس کی اجازت نہیں ہوگی، اور مجبوری وضرورت کی صورت میں گنجائش ہوگی۔

بینک میں ڈپازٹ کردہ محفوظ فنڈ کے انٹرسٹ کی رقم سے استفادہ کا حکم

بعض ایسی اسکیمیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا گیا ہے، اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی اور رفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے، اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے۔ گویا کہ اس اسکیم میں تعلیمی اور رفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون بینک سے حاصل شدہ انٹرسٹ کی رقم سے کی جاتی ہے، ایسی اسکیم سے بھی مسلمانوں کے لیے استفادہ کی گنجائش ہوگی۔ حضرت اقدس مفتی نظام الدین اعظمی نوراللہ مرقدہ مفتی دارالعلوم دیوبند ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’محکمہ جس کے اصحاب حل وعقد خالص غیر مسلم ہوں یا مشترک ہوتے ہوں، مگر اقتدار اعلی غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو اور وہ اپنے طور پر سودی کاروبار نفع حاصل کرکے کوئی رقم جمع کرے، اور بطور تبرع کسی مسلمان ملازم کو دے تو اس کا لینا جائز رہے گا اور بہ انعام داخل ہوکر طیب وحلال شمار ہوگا‘‘ (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/ ۲۰۹)۔

مزید ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’غیر مسلم آپس میں سودی کاروبار اور سودی لین دین بھی کرتے ہیں، بہت سی بیع باطل وفاسد بھی کرتے ہیں، شراب بھی بناتے اور بیچتے ہیں اور اس کی قیمت لیتے ہیں، خنزیر بھی بیچ کر اس کی قیمت لیتے ہیں، پھر مسلمانوں کو یہ پیسے مزدوری میں انعام وغیرہ میں دیتے ہیں، اور ان سب پیسوں کا حرام ہونا معلوم ہونے کے باوجود ان پیسوں کا لینا اس وقت تک شرعاً جائز وغیر مکروہ شمار ہوتا ہے جب تک کہ یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ چیز جس کو فروخت کر رہا ہے یہ بعینہ وہی چیز ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لایا ہے، جو قیمت دے رہا ہے یہ بعینہ وہی روپیہ ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لایا ہے، غرض ان سب کا لے لینا اور استعمال کرنا سب درست رہتا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکم جواز کیوں ہے تو اس کی وجوہ متعدد ہیں، متعدد شرعی ضوابط اس کی بنیاد ہیں، مثلاً:

(الف) تبدیل ملک سے حکماً تبدل عین ہوجاتا ہے۔ یا

(ب) الخلط استہلاک کا ضابطہ جو مسلم ہے۔ یا

(ج) مثلاً یہ کفار ابتداءً صرف ایمان کے حدود وعقوبت مشروعہ کے مخاطب ہوتے ہیں، باقی معاملات وجزئی احکامات کے مخاطب بعد میں ہوتے ہیں، اس لیے ان کے آپس کے معاملات برقرار اور نافذ رکھے جاتے ہیں، جب تک کہ وہ حرام لعینہ، فتیح خداع، چوری، ڈاکہ وغیرہ کا ارتکاب نہ کریں‘‘ (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/ ۲۰۸)۔

☆☆☆

باب دوم مختصر تحریریں

حکومت کی فلاحی اسکیموں سے استفادہ اور سروس چارج کا حکم

قاضی عبدالجلیل قاسمی[1]

۱- یہ جائز ہے۔

۲- یہ بھی جائز ہے، اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔

۳- اگر ضرورت و مجبوری کی وجہ سے قرض لیا گیا تو کوشش کی جائے کہ مقررہ مدت کے اندر قرض کی رقم واپس کردی جائے اگر کوشش کے باوجود مقررہ مدت میں واپس نہ ہوسکے، اضافی رقم دینے کی گنجائش ہے اگر مجبوری کے بغیر دولت بڑھانے کے لیے قرض لیا گیا ہو تو اضافی رقم سود ہے اور سود دینے کا گناہ ہوگا۔

۴- اگر اضافی رقم اتنی معمولی ہے کہ اس کو سروس چارج کہہ سکتے ہوں تو اس کو دینے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

۵- اضافی رقم سود ہے، اگر ضرورت و مجبوری کی حالت میں قرض لیا گیا ہو تو مجبوری میں سود دینے کی گنجائش ہوسکتی ہے اور اگر محض دولت میں اضافہ کے لیے قرض لیا گیا ہو تو سود دینے کا گناہ ہوگا۔

۶- اس طرح کی امدادی رقم حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

۷- واسطہ بننے والوں کو ان کی محنت کا معاوضہ دینا جائز ہے، البتہ اجرت متعین کرلینا ضروری ہوگا، تاکہ کوئی نزاع نہ پیدا ہو۔

۸- یہ بھی درست معلوم ہوتا ہے۔

۹- اگر اس قسم کی امدادی رقم اور قرض حاصل کرنا بحیثیت ایک شہری کے اس کا حق ہو اور رشوت دیئے بغیر حاصل نہ ہوسکے تو رشوت دینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

۱۰- امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لیے جو شرائط یا معیار حکومت کی طرف سے متعین ہیں ان میں غلط بیانی سے کام لینا اور اس طرح یہ رقم حاصل کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۱۱- اضافی رقم سود ہے، اگر حکومت ادا کرتی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر خود مقروض کو ادا کرنا پڑے تو اس میں تفصیل ہے اگر ضرورت و مجبوری کی وجہ سے قرض لیا گیا تو سود ادا کرنے کی گنجائش ہوگی اور اگر بلا مجبوری کے لیا گیا ہو تو سود دینے کا گناہ ہوگا۔

۱۲- اس طرح کی رقم سے استفادہ کرنا جائز معلوم ہوتا ہے۔

......☆......

[1] قاضی امارت شرعیہ، پٹنہ۔

سرکاری قرضوں پر معمولی شرح سود کی ادائیگی

مولانا قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی[1]

(۲،۱) پہلی دوسری صورت کے جواز میں کوئی کلام نہیں معلوم ہوتا، یہ حکومت کی طرف سے سبسڈی ہے اس سے انتفاع درست ہونا چاہئے۔

(۳) اگر معاملہ اس طرح ہو کہ مقررہ مدت پر قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں قرض کے ساتھ کچھ زائد رقم ادا کرنی پڑے گی تو یہ سود کی صورت ہوگی، "کل قرض جر نفعًا فھو ربا"۔ خواہ معاملہ کرتے وقت اسی طرح کی شرط لگائی گئی ہو یا یہ کہ بعد میں اس طرح کا مطالبہ کیا جائے۔

مشہور محقق اور فقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم بحوالہ المدونۃ الکبری (۱۸/۵)، بقول امام مالک:

"وكان ربا الجاهلية في الديون أن يكون للرجل على الرجل الدين، فإذا حل قال له: أتقضي أم تربي، فإن قضاه أخذه وإلا زاده في الحق وزاده في الأجل"

تحریر فرماتے ہیں: اس طرح معاملہ کرنا کہ وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں دس کے بارہ ادا کرنے ہوں گے کھلا ہوا ربا ہے (مجلہ بیع بالتقسیط/۳۱ نیز دیکھئے اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ کے فقہی فیصلے/۳۲۷)۔

(۴) زائد رقم کا مطالبہ سروس چارج کے نام سے درست ہے مولانا برہان الدین صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

"اخراجات کے بقدر رقم کی وصولیابی اور چیز ہے اس کا جواز بالعموم مسلم ہے، لیکن پھر اخراجات سے بچ جانے والی کل رقم ان لوگوں کی طرف لوٹانا ضروری ہے جن سے یہ رقم لی گئی ہے"۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ ایک استفتاء "قرض خواہوں سے ٹیکسوں کی قیمت وصول کرنے کی بابت" (جسے فارم پر چسپاں کر کے درخواست دینے پر بلاسودی تین ماہ کے لئے روپے دیئے جاتے ہیں) تحریر فرماتے ہیں: "اس ٹیکس کی اباحت کی گنجائش ہے، کیونکہ یہ رقم دفتری مصارف کے کام آئے گی کسی شخص کے ذاتی مفاد کے لئے قرض پر کوئی سود نہیں"۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ لکھتے ہیں: "پس اگر یہ بات صحیح ہے تو اس زائد رقم کو سود کا نام دینا شرعًا ضروری نہ ہوگا، بلکہ انتظامی اخراجات کی فیس بھی قرار دیا جاسکتا ہے" (منتخبات نظام الفتاوی ۱۳۹/۳)۔

(۵) مکان انسان کی بنیادی ضرورت ہے اگر اس کے لئے بطور قرض رقم میسر نہ ہو سکے تو لون لیا جاسکتا ہے حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: "ایسی حالت میں اگر بغیر سود قرضہ نہ ملے تو شریعت مطہرہ نے بوجہ ضرورت اور حسب ضرورت بینک سے سودی قرض بھی لے لینے کی اجازت دی ہے۔ "ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ والنظائر/ ۱۱۵)، البتہ جہاں تک جلد ہو سکے ایسے قرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور جب تک سبکدوشی حاصل نہ ہو جائے کچھ استغنا کرنے کا معمول بنالے (منتخبات نظام الفتاوی ۱۰۱/۳)۔

---

[1] سابق شیخ الحدیث و پرنسپل دار العلوم مئو۔

شریعت میں کاشتکاری وباغبانی کا حکم دیا گیا ہے: "من كانت له أرض فيزرعها أو يمنحها" (مشكوة باب المساقات والمزارعه) نیز اس سے فضائی آلودگی (جو اجتماعی ضرر کا سبب ہے) کم ہوتی ہے، اس لئے یہ بھی ایک اہم ضرورت ہے۔

کاشت کے لئے بینک سے سودی قرض ناقابل تحمل تنگی کی صورت میں لینے کی مفتی نظام الدین صاحبؒ نے اجازت دی ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۱۷۵-۱۷۶)۔

لون لے کر کاروبار کرنے کی بابت احقر کو تامل ہے۔

طلب كسب الحلال فريضه بعد الفريضة (مشكوة شريف: ۲۴۲) "إن أطيب ما أكلتم من كسبكم" (مشكوة باب الكسب)، اس لئے اگر اپنی محنت کی کمائی سے کاروبار کریں تو انشاء اللہ برکت ہوگی، بہرحال صورت مسئولہ میں زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو تو بھی جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

(۶) گورنمنٹ سے امداد لینے میں کوئی کلام نہیں، مولانا سید عبدالرحیم لاجپوریؒ تحریر فرماتے ہیں: "جبکہ حکومت بلا طلب بطور امداد اور غم خواری کے رقم دیتی ہے تو لینے میں کوئی مضائقہ نہیں خود استعمال کرے یا حاجت مندوں کو دیدے" (فتاوی رحیمیہ ۱۰/ ۲۲۵)۔

(۷، ۸، ۹) تینوں صورتیں رشوت کی ہیں اور رشوت کے سلسلہ میں یہ جزئیہ ہے کہ اگر اپنا جائز کام بدون رشوت نہ ہو سکے تو بدرجہ مجبوری دی جاسکتی ہے۔

"لو اضطر إلى دفع رشوة لإحياء حقه جاز له الدفع وحرم على القابض"

(الرد المحتار على الدر ۷/ ۲۶۵، نیز دیکھئے: آپ کے مسائل اور ان کا حل ۷/ ۶۷)۔

(۱۰) غلط بیانی سے کام لے کر قرض حاصل کرنا اور اس سے فائدہ حاصل کرنا ناجائز ہے۔

(۱۱) اس تھوڑے حصہ کو سروس چارج شمار کرتے ہوئے استفادہ کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

(۱۲) انتہائی لاچار اور مجبور حضرات اس اسکیم سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

"الضرورات تبيح المحظورات"۔

......☆......

سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور سودی قرضے

مولانا ابوسفیان مفتاحی[1]

۱۔ صورت مسئولہ میں سرکاری وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے، اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، تو ایسے قرضوں سے مسلمانوں کو استفادہ جائز ہے۔

۲۔ معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے اور مقررہ مدت کے بعد واپس کرنے پر پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ پس وہ صورت جس میں لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے تو مسلمانوں کو لینا جائز ہے۔

۳۔ اگر مقررہ کے بعد ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے، اور یہ زائد رقم قرضدار اپنی خوشی سے ادا کرنے اور عقد قرض اس کی شرط نہ لگائی جائے تو یہ جائز ہے۔

اس کے لئے احادیث سے استدلال کیا جائے حدیث (۱) جو صحیح مسلم مع التکملۃ (۱/ ۶۴۰ تا ۶۴۸)

''عن أبي رافع أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استسلف من رجل بكرًا فقدمت عليه إبل من إبل الصدقة. فأمر يا رافع أن يقضي الرجل بكره، فرجع إليه أبو رافع فقال: لم أجد فيها إلا خيارًا رباعيًا، فقال: أعطه إياه، إن خيار الناس أحسنهم قضاءً'' (رواه مسلم)۔

علامہ تقی عثمانی حفظہ اللہ تکملۃ فتح الملہم (۱/ ۶۴۴) میں لکھتے ہیں:

''قوله: إن خيار الناس أحسنهم قضاءً، وفيه دليل على أن رد الأجر في القرض أو الدين من السنة ومكارم الأخلاق، وليس هو من قرض جر منفعة؛ لأن الممنوع منه ما كان مشروطًا في عقد القرض. وأما إذا لم يكن مشروطًا في العقد وتبرع به المديون، فلا بأس بأخذه ولا بإعطاءه''۔

اس حدیث میں دلیل ہے اس پر بہت عمدہ واپس کرنا قرض میں یا دین میں سنت ہے اور اخلاق حسنہ میں ہے اور عمدہ واپس کرنا اس قرض میں نہیں ہے جو نفع لائے، کیونکہ ممنوع وہ ہے جو عقد قرض میں شرط ہو، اور جس کی شرط عقد میں نہیں لگائی گئی ہے اور قرضدار اس سے اچھا یا اس سے زیادہ تبرع واحسان کیا ہے تو اس کے لینے اور دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حدیث (۲) ''عن أبي رافع مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم قال استسلف رسول الله صلى الله عليه وسلم بكرًا بمثله غير أنه قال: فإن خير عباد الله أحسنهم قضاءً'' (رواه مسلم)۔

حدیث (۳) ''عن ابي سلمة عن أبي هريرة قال: كان لرجل على رسول الله صلى الله عليه وسلم حق فأغلظ له فهمّ به أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: إن لصاحب الحق مقالًا، فقال لهم: اشتروا

---

[1] جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

له سنًا فأعطوه إياه، فقالوا: إنا لا نجد إلا سنًا هو خير من سنه، قال: فاشتروه، فأعطوه إياه، فإن من خيركم أو خيركم أحسنكم قضاءًا'' (رواه مسلم)۔

حدیث (۴) ''عن أبي سلمة عن أبي هريرة قال: استقرض رسول الله صلى الله عليه وسلم سنًا فأعطى سنًا فوقه، وقال: خياركم محاسنكم قضاءًا'' (رواه مسلم)۔

حدیث (۵) ''عن أبي سلمة عن أبي هريرة قال: جاء رسول يتقاضى رسول الله صلى الله عليه وسلم بعيرًا، فقال: أعطوه سنًا فوق سنه، وقال: خيركم أحسنكم قضاءًا'' (رواه مسلم)۔

خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں جو عمدہ وزائد رقم ادا کرے تو یہ جائز ہے، اور سنت ومکارم اخلاق میں ہے اس شرط سے کہ عقد قرض میں وہ زائد دینا مشروط نہ ہو، واللہ اعلم، اور اگر عقد قرض میں زائد دینا مشروط ہو تو وہ ناجائز ہے اور سود ہوگا۔

۴۔ غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو، تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم سود کے دائرے میں آئے گی، اور انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش نہ ہوگی۔

۵۔ اگر سرکار کی طرف سے دیے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے، تو اس کا حکم سود کا ہوگا۔

واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری اور باغبانی کی ضروریات کو اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو ان ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے حکم سود میں کچھ فرق نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں سود کا حکم ہوگا، اور مذکورہ ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے حکم سود میں کچھ فرق نہیں کیا جاسکتا۔

۶۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا جواز کا حکم ہے، جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

۷۔ گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم جس قسم کی ہوں ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، تو واسطہ بننے والوں کو ان کو مطلوبہ محنتانہ دینا اور لینا دونوں جائز ہے۔

۸۔ بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں اپنے من سے لے لینا درست نہیں ہے، بلکہ واسطہ بننے والے لوگ امدادی رقوم پانے والوں سے دینے یا لینے کا معاملہ کرلیں تو درست ہے، ورنہ نہیں۔

۹۔ امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو ان رقوم کے حصول کے لئے رشوت دینا جائز ہے۔

۱۰۔ امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا حکم درست نہ ہونا ہے شرعاً۔

۱۱۔ بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے۔

تو ایسی اسکیموں سے استفادہ ناجائز ہے، دیکھئے استدلال کے لئے ''تکملۃ فتح الملہم'' (۱/ ۵۷۴-۵۷۵)

''فکذلك رفع الظلم حكمة لحرمة الربا، ولكن حكم الحرمة لا يدور معها، فلو سلمنا انتفاء الظلم في صور الربا، فلا يستلزم ذلك جوازه لبقاء علته وهي الزيادة المشروطة في القرض، وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كل قرض جر منفعة فهو ربا، أخرجه الحارث ابن أبي أسامة عن علي رضي الله عنه مرفوعًا كما ذكره السيوطي في الجامع الصغير (۱/ ۹۴ رقم ۶۳۳۶)، وضعفه المناوي في فيض القدير (۵/ ۲۸) وجعله العزيزي في السراج المنير (۳/ ۸۶) حسنًا لغيره لتعدد طرقه، وأخرج البيهقي في سننه الكبرى (۵/ ۳۵۰) من فضالة بن عبيد موقوفًا كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا، وإن هذه الأحاديث تبين علة حرمة الربا فالحكم يدار عليها، وتكون كل زيادة على القرض ربا سواء اتضح لنا وجه الظلم أو لم يتضح، ثم إن نظام البنوك الرائجة الذي يسير على أساس الربا له مفاسد لا تحصى، فإنه يفسد نظام توزيع الثروة على الناس۔

۱۲۔ بعض اسکیمیں ایسی بھی ہیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر دیا ہے جس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد اور اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات مذکر تا ہے تو یہ صورت تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد و اشخاص جو غرباء اور مساکین بغیر نیت ثواب کے تعاون کرنا درست ہے صرف۔

خلاصہ کلام یہ کہ صورت مسئولہ میں صرف تعلیمی ورفاہی اداروں اور غریب و مسکین افراد و اشخاص بغیر نیت ثواب کے تعاون کرنا درست ہے۔

......☆......

سرکاری ترقیاتی قرضوں سے فائدہ اٹھانا

مفتی محبوب علی وجیہی[1]

(۱) ضرورت کے لئے قرض لیا جا سکتا ہے اور قرض دینے والے کو اگر مال اس کی ملک ہے یا اسکو اختیار حاصل ہے تو کل یا جزء قرض معاف کر دینا درست ہے اور اگر حکومت کی طرف سے قرضدار کو قرض میں معافی مل رہی ہو تو اس کے حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۲) جو قرضدار کے لئے سہولت کا باعث ہو اس پر عمل کرے دونوں صورتیں درست ہیں۔

(۳) یقیناً اس کا حکم سود کا حکم ہوگا۔

(۴) مذکورہ صورت میں وہ رقم سروس چارج سمجھی جائے گی اور انتظامی امور میں شمار کی جائے گی۔

(۵) اگر کوئی شخص ضرورت مند ہے اور اسے بلا سودی قرض نہیں ملتا تو پھر سرکاری اسکیم سے اس کے لئے فائدہ حاصل کرنا درست ہے، خواہ وہ استفادہ کسی بھی ضرورت کے لئے ہو، چاہے مکان کی تعمیر کے لئے ہو چاہے جانوروں کے لئے یا کاشت وغیرہ کے لئے۔

(۶) وہ رقوم جو گورنمنٹ کی طرف سے امداد کے طور پر ملتی ہیں ان کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے یہ حکومت کی طرف سے اپنے شہروں کی امداد واعانت ہے۔

(۷) اگر درمیان کے لوگوں کا وقت خرچ ہو اور اس کا وہ معاوضہ لیں تو اس معاوضہ کا انکے لیے لینا جائز ہے اور اس کے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اگر معاوضہ لینے والے گورنمنٹ کے ملازم ہیں اور وہ سرکاری طرف سے اس کام کے کرنے کے لئے مکلف ہیں تو پھر ان کے لئے وہ معاوضہ لینا جائز نہیں ہوگا، بلکہ وہ رشوت ہوگی جو ان کے لئے حرام ہے، مگر دینے والے کے لئے ضرورتاً جائز ہے۔

(۸) جو صورت نمبر ۷ میں گزری اسی کے اعتبار سے معاوضہ لینے والے لوگ اگر حاصل شدہ رقم سے معاوضہ حاصل کریں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور باقی جواب نمبر ۷ میں گزر چکا ہے۔

(۹) ضرورتاً رشوت دینا جائز ہے لینا جائز نہیں ہے۔

(۱۰) امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے جو شرائط اور معیارات قائم کئے جائیں اس سلسلہ میں غلط بیانی اور دھوکہ دے کر قرض لینا جائز نہیں ہے، البتہ اگر شرائط و معیارات پورے کرنے کے بعد بھی امدادی رقم یا قرض حاصل نہ ہو اور سرکاری لوگ بلا وجہ رشوت لینے کے لئے پریشان کریں اور وہ شخص سخت ضرورت مند ہو تو پھر کسی حیلۂ شرعی کے ساتھ اس رقم کو حاصل کر لے اس میں وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ اگر حیلہ شرعی نہ ہو سکے تب بھی دفع مضرت کے لئے وہ رشوت دے سکتا ہے۔

(۱۱) اگر وہ شخص ضرورت مند ہے خود پورا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تو اسے مذکورہ اسکیم سے استفادہ کرنا جائز ہے۔

(۱۲) اس صورت میں حکومت اس سود کی مالک ہو جاتی ہے پھر اسے خرچ کرتی ہے، لہٰذا اس سے بھی استفادہ کرنا درست ہے۔

---

[1] مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ مستن گنج، رامپور یوپی۔

سرکاری اسکیم کے تعلق سے جو جوابات دیئے گئے ہیں وہ ضرورت دنیا کے پیش نظر دیئے گئے ہیں اور ان جوابات میں اکثر جگہ ضرورت مند کا لفظ آیا ہے اس سلسلہ میں فقہی دلائل مندرجہ ذیل عبارات میں انہیں ملاحظہ کیا جائے۔

الموسوعۃ الفقہیہ ۲۸/۲۰۷ پر ہے:

''والضرورات عند الاصوليين هي الأمور التي لا بد منها في قيام مصالح الدين والدنيا بحيث إذا فقدت لم تجر مصالح الدنيا على استقامة، بل على فساد وتهارج وفوت حياة، وفي الأخرى فوت النجاة والنعيم والرجوع بالخسران المبين'' (الفتاوی الشرعیہ ۱۹/۲۱۶)۔

''الشئون الاسلامیہ کویت'' میں ہے: ''ولا يجوز اللجوء إليه إلا عند الضرورة''

اور (صفحہ ۲۲۱) پر ہے: ''فلا حرج عليك أن تأخذ بالضرر الأخف۔ ونرجو أن لا تكون آثمًا في ذلك لحالة الضرورة أو الحاجة الماسة. ففي هذه الأحوال يجوز الاقتراض بمقدار ما تحتاجه العملية المشار إليها. دون زيادة للضرورة، ولا يجوز بغير ذلك۔ ولو وجد طريقًا آخر لتحويل هذا المبلغ. ولو كان بأجرة أكثر من البنك الربوي وهي في حدود المعتاد. فلا يجوز له تحويلها عن طريق البنك الربوي لما فيه من مساعدة له على أعمال الربا. أما إذا لم يوجد طريقًا لتحويل هذا الحال لجرى البنك الربوي، فلا مانع من ذلك بشرط أن يكون ذلك بدون فوائد ربوية، ولا مانع عند الحاجة من دفع أجرة محددة له على ذلك''۔

اور ''الفتاوی الشرعیہ'' (۱۳/۱۷۳) پر ہے: ''ولا يباح الربا إلا لضرورة. فإذا تقدر بقدرها''۔

اور صفحہ ۱۷۶ پر ہے: ''لا يجوز الاقتراض بالربا إلا للضرورة وهي خوف الهلاك''۔

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ سودی قرض لینا اس وقت جائز ہوگا جس وقت ہلاکت کا خوف ہو اور اگر اس قدر ضرورت نہیں ہے تو پھر سودی قرض لینا درست نہیں ہے۔ ''الموسوعۃ الفقہیہ'' (۲۲/۱۴۳) پر ہے:

''لا يجوز للمسلم أن يقترض بالربا للسكن أو غيره''۔ فقط

......☆......

سرکاری اسکیموں میں حکومت کا اپنی طرف سے سود ادا کرنا

دکتور عبداللہ جولم عمری مدنی[1]

۱- وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب۔ یہ قرض سود سے خالی ہے، اس لئے جائز ہے۔

۲- معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے، جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

جواب۔ سود سے خالی ہے، اس لئے جائز ہے۔

۴- غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو؛ لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرہ میں آئے گا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش ہوگی؟

جواب۔ انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے وسعت وگنجائش ہوگی۔

۶- ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب۔ مسلمانوں کا حکومت کی اعانتی اسکیم سے فائدہ اٹھانا درست ہے، کہ یہ بھی ملک کے رعایا ہیں، اور حکومت کو ٹیکس دیتے ہیں، تو اس سے فائدہ اٹھانا بھی درست ہے۔

۹- اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

جواب۔ اگر اس قسم کی امدادی رقم اور قرضے کا حقدار ہے تو اپنے حق کے حصول کے لئے رشوت دینا، جبکہ رشوت کے بغیر حق حاصل نہ ہوتا ہو جائز ہے

۱۰- امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب۔ ناجائز ہے۔

......☆......

[1] شیخ الحدیث جامعہ دار السلام، عمر آباد۔

سرکاری خزانے سے انتفاع کا حق

مولانا حفیظ الرحمن اعظمی مدنی خیر آبادی[1]

سوال (۱) وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

ایسے قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے، ایسا قرضہ لینا جائز ہے۔

دلیل (۱): یہ سرکار کی طرف سے رعایا کے لیے امدادی اسکیمیں ہوتی ہیں، اور یہ قرضے سرکاری فنڈ سے ہوتے ہیں، جن کا حکم بیت المال کا ہوتا ہے، اور اس سے فائدہ حاصل کرنا ہر شہری کا حق ہے اور مسلمان بھی اس ملک کے شہری ہیں؛ لہٰذا جائز ہے۔

(۲) یہ قرض واپس لینے والے کی طرف سے کم کرنا، قرض کو معاف کرنے کے درجہ میں ہے، جس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں سود کی ملاوٹ نہیں ہے، سود تو دی ہوئی رقم سے زیادہ لینے کا نام ہے شرط کے ساتھ۔ عالم گیری میں ہے:

''لا بأس بأن يستدين الرجل إذا كانت له حاجة لابد منها'' [فتاوی عالمگیری ۵/ ۳۶۶ کوئٹه پاکستان كتاب الكراهية] ''عن جابر بن عبد الله قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء'' [صحيح مسلم الرقم ۱۵۹۸]۔

''أما في اصطلاح الفقهاء فهو زيادة أحد البدلين المتجانسين من غير أن يقابل هذه الزيادة عوض'' [كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، مباحث الربا ۲/ ۲۲۱ دار الكتب العلمية بيروت]۔

سوال (۲) معافی والے قرضوں میں ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے، جب کہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

مقررہ مدت کے اندر قرض واپس کرنے پر کچھ حصہ معاف ہو جانا حکومت کی طرف سے ایک امداد ہے، اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیونکہ قرض خواہ اپنے قرض کا پورا حصہ یا کچھ حصہ معاف کر دے تو اسے اختیار ہے۔

اور اگر مقررہ مدت کے بعد پوری رقم ادا کرنی پڑے تو یہ بھی جائز ہے، اس شرط کے ساتھ کہ حکومت کی طرف سے دی گئی رقم سے ادا کی جانے والی رقم زائد نہ ہو، بلکہ برابر کا معاملہ ہو؛ کیونکہ یہ سود کے اندر داخل نہیں ہوتا، جیسا کہ ابتدا میں تعریف ربوا سے واضح ہے۔ ہدایہ میں ہے:

''الربا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه'' [الهداية باب الربا ج: ۲، زكريا كتب خانه جيسور]، کیونکہ ربوا کی تعریف میں ایسی زیادتی ملحوظ ہے جس کی شرط لگائی گئی ہو۔

درحقیقت یہ سوال بھی پہلے سوال کے مثل ہے، جس کے دلائل اس سے قبل مذکور ہیں۔

سوال (۳) اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے، تو اس صورت کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلے میں یہ بات واضح ہے کہ قرض دیئے جانے کے وقت ہی سے یہ بات طے ہے جو شرط کے درجہ میں ہے کہ مقررہ مدت کے بعد زائد رقم دینی پڑے گی، لہٰذا یہ سود ہوگا جو ناجائز اور حرام ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: أحل الله البيع وحرم الربوا [البقرة: ۲۷۵] ربوا کی تعریف درمختار میں

---

[1] استاذ مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیر آباد، مئو، یوپی۔

مذکور ہے:

''وشرعًا فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة''۔ [الدر المختار زکریا بکڈپو دیوبند وکذا في البحر ص: ۱۲۴، ج: ۶ کوئٹہ پاکستان]۔

سوال (۴) غیر معافی والے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کہلا سکتا ہو، تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ کیا یہ سود کے دائرہ میں آئے گا، یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت و گنجائش ہوگی۔

اگر قرض دینے والی جانب سے، یعنی بینک سے قرض سے زائد رقم کا مطالبہ ہو تو ایسی صورت میں زیادہ دینا جائز نہیں، بلکہ یہ سود میں داخل ہے؛ کیونکہ اہمیت سود کے کم یا زیادہ کی نہیں ہے، بلکہ نفس سود کے لین دین کی اہمیت ہے؛ کیوں کہ آیت میں آیا ہے:

یا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربا، إن كنتم مؤمنين، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله، فإن تبتم فلكم رؤوس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون﴾ [البقرة: ۲۷۹]

اور حدیث میں ہے کہ دیدہ دانستہ سود کا ایک درہم کھانا ۳۶ / مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ [مشکوۃ ۲۴۶، باب الربا الفصل الثالث]

لیکن ''الضرورات تبيح المحظورات'' [الأشباه والنظائر ۸۵] کے قاعدے سے ایسے مسلمان جن کے پاس کوئی معاشی ذریعہ نہ ہو تو ان کے لیے ایسے قرض حاصل کرنا جائز سمجھ میں آتا ہے اور معمولی شرح سود انتظامی خرچ شمار کی جائے گی، جیسا کہ مفتی نظام الدین صاحبؒ کا رجحان بھی یہی ہے۔

جیسے موبائل وغیرہ کے بیلنس میں سروس چارج کے طور پر معمولی رقم کم کر کے دیا جاتا ہے، لیکن یہ ضرورت ہے، ورنہ بیشتر صارفین کا کام اس کے بغیر نہیں چلے گا، جبکہ آج کل موبائل ایک ضرورت زندگی بن چکا ہے۔

قرض کی تعریف یہ ہے: ''القرض هو عقد مخصوص يرد على دفع مال مثلي لآخر ليرد مثله'' [تنوير الأبصار مع رد المحتار ج۵/ ۱۶۷ فصل في القرض] ''كل قرض جر نفعًا فهو حرام'' [رد المحتار ۵/ ۱۶۶]۔

سوال (۵) اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچہ پر محمول کیا جا سکے، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ جب کہ یہ قرضے جانور پالنے، تعمیر مکان، کاشت و باغبانی و دیگر کاروبار کے لیے ہوتے ہیں، تو ضرورتاً فرق ہو سکتا ہے؟

جس طرح سود لینا جائز نہیں، ایسے ہی سود دینا بھی جائز نہیں، سودی لین دین پر قرآن و حدیث میں سخت ترین وعیدیں وارد ہوئی ہیں اور یہ نص قطعی حرام ہے، چاہے مکان بنانے، تجارت کرنے، جانور پالنے یا دیگر معاشی ضروریات کے لیے ہوں۔

فقیہ الامت مفتی اعظم محمود حسن گنگوہی قدس سرہٗ نے ''فتاوی محمودیہ کتاب الربا'' میں لکھا ہے کہ سود کی حرمت فروعی اور استنباطی نہیں، بلکہ منصوص اور قطعی ہے۔ ﴿وحرم الربا: ۲۷۵﴾ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔

اور جن کو خطاب کر کے سود کو حرام قرار دیا گیا اور سخت وعیدیں سنائی گئیں، وہ حضرات کفار کے قرضہ میں دبے ہوئے تھے، کفار ان کا خون چوس رہے تھے، حتی کہ حضرت بلالؓ کو دوبارہ غلام بنانے کی دھمکی دی گئی تھی، جس سے پریشان ہو کر انھوں نے مدینہ پاک سے مخفی طور پر قرض کی ادائیگی کا انتظام ہونے تک کے لیے باہر چلے جانے کا ارادہ کر لیا تھا، وہ حضرات پیٹ پر پتھر باندھتے تھے، کئی کئی روز تک فاقہ کرتے تھے، بھوک کی وجہ سے غش کھا کر گر جاتے تھے، دو دو تین تین مہینہ تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، کپڑا بھی پوری تن پوشی کے لیے موجود نہیں تھا۔ وغیرہ وغیرہ [فتاوی محمودیہ ج: ۲۴/ ۳۵۴ مکتبہ محمودیہ میرٹھ]۔

أحل الله البيع وحرم الربا [سورة البقرة: ۲۷۵]۔

''عن جابر بن عبد الله قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء

'' [رواہ مسلم الرقم ۱۵۹۸، مشکوۃ باب الربا ۲۴۴ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند]۔

''عن ابن مسعود قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الربا وإن كثر، فإن عاقبته تصير إلى قل''۔ رواه ابن ماجة والبيهقي [مشکوۃ باب الربا ۲۴۶ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند]۔

البتہ اگر کوئی شخص ایسا محتاج اور مجبور ہو جائے کہ اس کے لیے کھانے پینے اور ضروریات زندگی اختیار کرنے کی کوئی صورت نہ رہے، تو اس کے لیے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش فقہاء نے دی ہے، جیسا کہ فقہاء کا اصول ہے:

الضرورات تبيح المحظورات [الأشباه والنظائر لابن نجيم ۸۵] يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح [الأشباه والنظائر لابن نجيم ۹۲ دار الكتب العلميه بيروت]۔

سوال (۶) ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان وبیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لیے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے، جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی، اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے؟

ایسی رقوم کو حاصل کرنا اور استعمال کرنا جائز اور حلال ہے، اس لیے کہ مسلمان اس ملک کے شہری ہیں تو جس طرح حکومت دوسرے شہریوں کی امداد کرتی ہے، ویسے ہی مسلمانوں کو بھی سہولت پہنچانا اور تعاون کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور مسلمانوں کا بحیثیت شہری اس پر حق ہے۔

اور گورنمنٹ کی آمدنی کا اکثر حصہ حلال ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ ملکی وسائل سے حاصل ہوتا ہے، اس میں قدرتی صنعتیں، عوامی ٹیکس، ریلوے اور پوسٹ اور دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی ہے، اور اگر حکومت ورلڈ بینک سے قرض لیتی ہے تو اس میں سود دیتی ہے، لیتی نہیں اور دونوں کا حکم الگ ہے۔

''أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه، إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس، إلا أن يعلم أنه حرام. فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية'' [فتاوى عالم گيرى كتاب الكراهية والاستحسان كوئته پاكستان ۵/ ۳۴۲، فتاوى تاتار خانيه زكريا ۱۸/ ۱۷۵]۔

سوال (۷) گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم جس قسم کی بھی ہوں ان کے حصول کے لیے کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

قرض پر نفع لینا جائز نہیں، جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے: ''كل قرض جر نفعًا فهو حرام'' [الأشباه والنظائر الفن الثاني ۲۶۵ مطبوعه بيروت] ''كل قرض جر نفعا حرام أي إذا كان مشروطًا'' [شامي زكريا بكڈپو ۷/ ۳۹۵]۔

لیکن یہ صورت خالص محنتانہ اور اجرت کی ہے، اس لیے اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، یہ قرض بھی نہیں اور سودی رقم بھی نہیں ہے، بلکہ امداد وصول کرنے والا خود نہ کر کے دوسرے سے کام لیتا ہے اور اس کی اجرت دیتا ہے، اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال (۸) بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں، تو اس کا کیا حکم ہے؟

ایک حصہ لینا یا لینے دینے کا معاملہ کرنا یہ اجرت کی قبیل سے ہے، لہٰذا یہ جائز ہے، البتہ اگر اجرت مجہول ہو تو جائز نہیں، کیونکہ جس بیع میں اگر ثمن مجہول ہو تو بیع جائز نہیں، اسی طرح اگر اجرت مجہول ہو تب بھی جواز نہیں ہوگا؛ کیونکہ یہ نزاع کا باعث ہے۔

سوال (۹) اگر امدادی رقوم یا قرضوں کے حصول کے لیے اگر رشوت دینی پڑے تو کیا حکم ہے؟

درحقیقت رشوت دینا لینا دونوں شریعت میں ناجائز ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقًا من أموال الناس بالإثم وأنتم تعلمون [سورہ بقرہ: ۱۸۸]۔

حدیث میں ہے: ''عن عبد الله بن عمرو قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي''۔ رواه أبوداؤد

وابن ماجة ورواه الترمذي عنه [مشکوۃ ص: ۳۲۶ باب رزق الولاة وہدایاہم الفصل الثاني] [موسوعہ فقہیہ کویت ۲۲/ ۲۲۱]۔
لیکن فقہاء نے صراحت کیا ہے کہ دفع ظلم کے لیے اور اپنا حق لینے کے لیے رشوت دینا جائز ہے، لینا جائز نہیں، لینے والا گناہ گار ہوگا۔

مشکوۃ ص: ۳۲۶ کے حاشیہ پر مرقاۃ کے حوالے سے لکھا ہے:

''أما إذا أعطى ليتوصل به إلى حق أو ليدفع به عن نفسه ظلمًا فلا بأس به''۔

شامی میں ہے: ''دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع'' [شامي كتاب الحظر والإباحة فصل في البيع کراچی ۶/ ۴۲۳، زکریا ۹/ ۶۰۷]۔

سوال (۱۰) امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لیے کچھ شرائط و معیارات متعین ہیں، اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

مذکورہ طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے میں دو خرابیاں ہیں: ایک کذب بیانی اور دوسری دغابازی (دھوکہ)۔

کذب گناہ کبیرہ ہے، حدیث پاک کی روشنی میں نفاق کی تین علامتوں میں سے ہے: ''إذا عهد غدر، إذا ائتمن خان، وإذا حدث كذب''۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: لعنت الله على الكاذبين (آل عمران: ۶۱)۔

دھوکہ کے بارے میں حدیث میں وارد ہے:

''قال النبي صلى الله عليه وسلم: من غش فليس منا'' [ترمذی ۱/ ۱۵۷ باب ما جاء في كراهية الغش في البيوع طبع قديم]

اور اس کا مطلب یہ بھی ہے، شرائط و معیارات کے اعتبار سے ایسا کرنے والے کا استحقاق ثابت نہیں ہے، اور کوئی بھی امداد یا قرض بغیر استحقاق کے لینا جائز نہیں ہوگا۔

سوال (۱۱) بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لیے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے، اور اس پر انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، اس کو مقروض کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا زیادہ حکومت اور تھوڑا انٹرسٹ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ ہوسکتا ہے؟

جس قرض پر انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ سودی قرض ہے اور قرض کے معاہدے کے اندر سود کی شرط پائی گئی، اب چاہے مقروض خود وہ انٹرسٹ کی رقم ادا کرے یا حکومت اس کی طرف سے ادا کرے، اور چاہے انٹرسٹ کا کچھ حصہ ادا کرے یا زیادہ ادا کرے؛ کیونکہ اس کی اہمیت نہیں ہے کہ کون ادا کرتا ہے، بلکہ اہمیت اس کی ہے کہ صلب عقد کے اندر شرط پائی گئی، لہٰذا ایسی امدادی اور قرض کی اسکیم سے استفادہ جائز نہیں ہوسکتا۔

(۱) ''كل قرض جر نفعا حرام أي إذا كان مشروطًا'' [شامی کراچی ۵/ ۱۶۶، زکریا ۷/ ۳۹۵]

(۲) ''كل قرض جر نفعًا حرام'' [الأشباه والنظائر الفن الثاني ۶۶۵ مطبوعہ بیروت]

(۳) ''فقد أجمعوا على فضل المجموع في القرض'' [اعلاء السنن ۱۴/ ۵۱۹ ادارۃ القرآن کراچی]

(۴) ''عن جابر بن عبد الله قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء''
[صحيح مسلم الرقم ۱۵۹۸، مشكوة كتاب البيوع باب الربا ۲۴۴ نعیمیہ دیوبند]۔

سوال (۱۲) بعض اسکیمیں بھی ہیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا گیا ہے، اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے، تو کیا یہ صورت درست ہوگی؟

حکومت کا محفوظ فنڈ قائم کرنا، ایک رفاہی فنڈ ہے، اور رفاہی ادارہ یا فنڈ اگر صرف حفاظت کے لیے مجبوراً بینک میں جمع کرے تو جائز ہے، البتہ اس کو ذاتی مصرف میں نہیں استعمال کیا جاسکتا۔

مگر فکس ڈپوزٹ کھاتے میں جمع کرنا بالکل جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کھاتے میں جمع کرنے کا مقصد سود حاصل کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

''عن جابر بن عبد الله قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء''۔ [صحيح مسلم الرقم ۱۵۹۸، مشكوة كتاب البيوع باب الربا ۲۴۴ نعيميه ديوبند]۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سود کے کھانے والے، کھلانے والے، اس معاملہ کو لکھنے والے اور اس کے گواہ بننے والوں پر لعنت ہے اور گناہ میں یہ سب برابر کے شریک ہیں۔

شریعت میں سودی معاملہ حرام ہے، خواہ بینک سے حاصل ہونے والا انٹرسٹ ہو یا کسی اور طریقہ سے ہو، سود کی حرمت کی صراحت قرآن وحدیث میں بکثرت وارد ہوئی ہے اور سود خور کی بڑی سخت سزا بیان کی گئی ہے۔

(۱) الذين يأكلون الربا لا يقومون إلا كما يقوم الذى يتخبطه الشيطن من المس ذلك بأنهم قالوا إنما البيع مثل الربا [البقرة: ۲۷۵]۔

(۲) وأحل الله البيع وحرم الربا [البقرة: ۲۷۵]۔

(۳) يمحق الله الربا ويربي الصدقات [البقرة: ۲۷۶]۔

(۴) يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربا إن كنتم مؤمنين [البقرة: ۲۷۸]۔

(۵) يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربا أضعافًا مضاعفة [آل عمران: ۱۳۰]۔

اور یہ زمانہ جاہلیت کے ربوا سے بالکل مشابہ ہے۔

''أما ربا النسيئة فهو الأمر الذي كان مشهورًا متعارفًا في الجاهلية وذلك أنهم كانوا يدفعون المال على أن يأخذ على شهر قدرًا معينًا، ويكون رأس المال باقيًا، ثم إذا حل الدين طالبوا المديون برأس المال، فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل فهذا هو الربوا الذي كانوا فى الجاهلية يتعاملون به'' [تفسير كبير للامام الرازي ۴/ ۷۵ مكتبه دار الباز]۔

فکس ڈپوزٹ کی سودی رقم کو کسی طرح بھی لینا مسلمان کے لیے قطعاً حرام ہے، اس لیے کہ یہ سودی رقم ہے اور حکومت کے امدادی فنڈ نے اس کو لوگوں کو دینے ہی کے لیے حاصل کیا، اور سود لینا قطعاً حرام ہے، لہٰذا اس سے اجتناب لازم ہے۔

دلیل:

فتاویٰ شامی میں ہے:

''ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه'' [شامي كتاب الحظر والاباحة باب الاستبراء زكريا ۹/ ۵۵۳]۔

......☆......

حکومت کی فلاحی اور رفاہی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کا حکم

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی[1]

سوال: ۱- وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے، اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب: ۱- شرعاً قرض کا حکم یہ ہے کہ جتنا قرض لیا جائے، اتنا ہی ادا بھی کیا جائے (۱)، لیکن اگر صاحب قرض اس میں سے کچھ حصہ مقروض سے ساقط ومعاف کر دے، تو یہ جائز ہے (۲)، چنانچہ اگر حکومت کی طرف سے دیئے گئے قرضوں میں سے بطورِ امداد واعانت کے کچھ حصہ معاف کر دیا جائے (۳)، تو اس طرح کے قرضوں کا لینا جائز ہے۔

سوال: ۲- معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے؟ جب کہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

جواب: ۲- یہ صورت بھی جائز ہے (۴)۔

سوال: ۳- اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے، تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: ۳- قرض جتنا لیا اُتنا ہی واپس کرنا چاہیے (۵)، یہاں چونکہ کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑ رہی ہے، جو ربوا کی صورت ہے، اس لیے جائز نہیں ہے (۶)۔

سوال: ۴- غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو، تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرے میں آئے گا؟ یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش ہوگی؟

جواب: ۴- انتظامی خرچ (سروس چارج) شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش ہوگی۔ یہ سود کے دائرے میں نہیں آئے گا (۷)۔

سوال: ۵- [الف] اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو، کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

[ب] واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لیے بھی ہوتے ہیں، تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

جواب: ۵- [الف] یہ سود کے دائرے میں آتا ہے، لہٰذا جائز نہیں ہے (۸)۔

[ب] اس میں کوئی فرق نہیں ہے، یعنی چاہے وہ قرض کسی بھی ضرورت سے لیا گیا ہو، اگر اس پر سود ادا کرنا پڑے، تو وہ ربوا میں شامل ہے جو کہ حرام ہے (۹)۔

سوال: ۶- ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلا کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لیے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جب کہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں

[1] دار الافتاء جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندر بار، مہاراشٹر۔

ہوتی، اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب:۶- گورنمنٹ کی طرف سے اس طرح کی رقوم (جن کو مع سود کے واپس کرنا نہیں پڑتا) لینا جائز ہے (۱۰)۔

سوال:۷- گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم- جس قوم کی بھی ہوں- ان کے حصول کے لیے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے، اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لیے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب:۷- شرعاً یہ دلالی اور سمسرہ ہے، اور حاجاتِ ناس کی بنا پر دلالی وسمسرہ کی اُجرت جائز ہے (۱۱)۔

سوال:۸- بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں، تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب:۸- یہ درست نہیں ہے (۱۲)۔

سوال:۹- اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لیے اگر رشوت دینی پڑے، تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

جواب:۹- مجبوری میں رشوت دی جاسکتی ہے (۱۳)۔

سوال:۱۰- امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لیے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقے پر امداد یا قرض سے فائدہ اُٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب:۱۰- کذب وخیانت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے (۱۴)۔

سوال:۱۱- بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لیے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے، اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے، اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب:۱۱- اگر پورا سود حکومت ادا کرتی ہے، تو جائز ہے، ورنہ جائز نہیں (۱۵)۔

سوال:۱۲- بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا گیا ہے، اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے، اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے، تو کیا یہ صورت درست ہوگی؟

جواب:۱۲- اگر استفادہ کرنے والے حضرات واقعی مستحق ومحتاج ہیں، تو ان کے لیے اس طرح کی رقم لینا جائز ہونا چاہیے (۱۶)۔

الحجة على ما قلنا:

(۱) ''ما في ''رد المحتار'': إن الديون تقضى بأمثالها على معنى أن المقبوض مضمون على القابض ؛ لأن قبضه بنفسه على وجه التملك ، ولرب الدين على المديون مثله '' (۶۷۵/۵)۔

''ما في '' بحوث في قضايا فقهية معاصرة '': القرض يجب في الشريعة الإسلامية أن تقضى بأمثالها ... والذي يتحقق من النظر في دلائل القرآن والسنة، ومشاهدة معاملات الناس أن المثلية المطلوبة في القرض هي المثلية في المقدار والكمية ، دون المثلية في القيمة والمالية '' (ص/ ۱۷۴)۔

''ما في ''الفتاوى الهندية'': والقرض هو أن يقرض الدراهم والدنانير أو شيئًا مثليًا يأخذ مثله في ثاني الحال '' (۳۶۶/۵)۔

(۲) ''ما في '' درر الحكام شرح مجلة الأحكام '' : يسقط حق المبرأ منه (۱) إذا كان قابلا للإسقاط ـ (۲) إذا وقع الإبراء مشروعًا ـ (۳) إذا لم يكن لفظ الإبراء مقيدًا بقيد يفيد الشك ـ (۴) إذا كان الإبراء غير معلق بشرط '' (۸۰/۴ ،

أحكام الإبراء)۔

(۲) ''ما في '' تنوير الأبصار وشرحه'' : الهبة : هي شرعًا تمليك العين مجانًا أي بلا عوض، وسببها إرادة الخير للواهب، وينوى كعوض ومحبة وحسن ثناء '' (۸/ ۴۲۳، كتاب الهبة، الدر المنتقى شرح الملتقى : ۳/ ۴۸۹، كتاب الهبة، البحر الرائق :۷/ ۴۸۳)۔

''ما في '' الاختيار لتعليل المختار'' :الهبة:وهي العطية الخالية عن تقدم الاستحقاق ، وهي أمر مندوب وصنع محمود محبوب وقبولها سنة فإنه قبل هدية العبد'' (۲/ ۵۲۳، كتاب الهبة)۔

''ما في '' فتح باب العناية '':هي تمليك عين بلا عوض ومعناها إيصال ما ينفع مالا كان أو غيره '' (۲/ ۴۰۹، كتاب الهبة)

(۴) ''ما في '' درر الحكام شرح مجلة الأحكام '':لو قال الدائن لمدينه :أعطني غدًا نصف الألف درهم المطلوبة منك على أن تكون بريئًا من النصف الآخر فأعطى المدين في الغد النصف للدائن يبرأ من النصف الآخر '' (۴/ ۶۹ . ۷۰، المسائل المتعلقة بأحكام الإبراء)۔

''وفيه أيضًا: إذا قال أحد : ـ أبرأت فلانا من حقي ، أو جعلت حقي من فلان حلالا له ، أو وهبت حقي من فلان له ، أو تركت دعواي مع فلان ـ أو تركت مطلوبي من فلان فيكون قد أبرأه ـ ويدخل في هذا الإبراء الأمانات والمضمونات التي هي من الحقوق المالية'' (۴/ ۶۷، الفصل الثاني في المسائل المتعلقة بأحكام الإبراء)۔

''فيه أيضًا :أما إذا لم يؤد المدين النصف غدًا فلا يبرأ المدين من النصف وللدائن مطالبته بالكل '' (۴/ ۷۰)۔

(۵) ''ما في '' رد المحتار '' : إن الديون تقضى بأمثالها على معنى أن المقبوض مضمون على القابض ؛ لأن قبضه بنفسه على وجه التملك ، ولرب الدين على المديون مثله'' (۵/ ۶۶۵)۔

''ما في '' بحوث فقهية قضايا معاصرة'':القرض يجب في الشريعة الإسلامية أن تقضى بأمثالها ـ والذي يتحقق من النظر في دلائل القرآن والسنة، ومشاهدة معاملات الناس أن المثلية المطلوبة في القرض هي المثلية في المقدار والكمية دون المثلية في القيمة والمالية ''(ص/ ۱۷۴)۔

(۶) ''ما في '' القرآن الكريم '' : {أحل الله البيع وحرم الربوا} '' (سورة البقرة :۲۷۵)۔

''ما في '' صحيح مسلم '' : عن جابر قال : '' لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه ، وقال : هم سواء'' (۲/ ۲۷، كتاب المساقات والمزارعة، باب لعن آكل الربا وموكله)۔

''ما في '' صحيح البخاري '' : عن عون بن أبي جحيفة قال : رأيتُ أبي اشترى عبدًا حجامًا فأمر بمحاجمه فكُسرتْ فسألته، فقال : '' نهي النبي ﷺ عن ثمن الكلب وثمن الدم ونهى عن الواشمة والموشومة ، وآكل الربا وموكله، ولعن المصور '' (۱/ ۲۸۰، كتاب البيوع ، باب موكل الربا ، رقم :۲۰۸۶ ، سنن ابن ماجه :ص/ ۱۶۵، باب التغليظ في الربوا ، ط : قديمي)۔

''ما في ''سنن ابن ماجة '' :عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله ﷺ: '' الربوا سبعون حوبًا. أيسرها أن ينكح الرجل أمه''(ص/ ۱۶۴ ، باب التغليظ في الربوا)۔

''ما في '' التنوير وشرحه مع الشامية '' : قال صاحب التنوير التمرتاشي : ''الربا شرعًا فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة'' (تنوير الأبصار) (۷/ ۳۹۸ ۴۰۱) (فتاوىٰ محموديه :۱۶/ ۳۰۷، ۳۰۳، ۳۰۲، بینك سے سودى قرض لينا،ط: كراچى)۔

(۷) ''ما في '' المبسوط للسرخسي'' : ''اعلم أن الإجارة عقد على المنفعة بعوض هو مال ـ اھ'' (۱۵/ ۸۶ ، كتاب

الاجارات ، ط : بیروت)۔

(۸) ''ما في '' التنوير وشرحه مع الشامية '':قال صاحب التنوير التمرتاشي : الربا شرعًا فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين في المعاوضة'' (تنوير الأبصار) - (۷/ ۳۹۸ ۴۰۱) (فتاویٰ محمودیه:۱۶/ ۳۰۲، ۳۰۸،۳۰۷،۳۰۴، بینک سے سودی قرض لینا،ط: کراچی)۔

(۹) (التنوير وشرحه مع الشامية :۷/ ۳۹۸ ۴۰۱) (فتاویٰ محمودیه:۱۶/ ۳۰۷،۳۰۴،۳۰۲، بینک سے سودی قرض لینا،ط: کراچی)۔

(۱۰) ''ما في '' الاختيار لتعليل المختار '' :الهبة: وبي العطية الخالية عن تقدم الاستحقاق ، وبي أمر مندوب وصنيع محمود محبوب وقبولها سنة فإنه قبل هدية العبد'' (۲/ ۵۳۳، كتاب الهبة)۔

''ما في '' فتح باب العناية '':بي تمليك عين بلا عوض ومعنابا إيصال ما ينفع مالا كان أو غيره'' (۲/ ۳۰۹، كتاب الهبة)۔

(۱۱) ''ما في '' صحيح البخاري '':باب أجرة السمسرة ولم ير ابن سيرين وعطاء وابرٰهيم والحسن بأجر السمسار بأسًا وقال ابن عباس :لا بأس أن يقول : بع هٰذا الثوب فما زاد على كذا وكذا فهو لك ، وقال ابن سيرين : إذا قال : بعه بكذا وكذا فما كان من ربح فهو لك أو بيني وبينك فلا بأس به'' (۱/ ۳۰۳، كتاب الإجارة ، باب أجر السمسار).

''ما فی '' عمدة القاری شرح صحيح البخاری '' : قال ابن عباس : لا بأس أن يقول : بع هٰذا الثوب فما زاد على كذا وكذا فهو لك ، علقه البخاري ، ووصله ابن أبي شيبة عن ہشيم عن عمرو بن دينار عن ابن عباس نحوه وهٰذا سند صحيح'' (۱۱/ ۳۰۳)

''ما فی '' اعلاء السنن'' : وشرط جوازہا عند الجمهور أن تكون الأجرة معلومة ، قلت: والحاصل أن أجرة السمسار ضربان: إجارة وجعالة، فالأول يكون مدة معلومة يجتهد فيها للبيع ، وهٰذا جائز بلا خلاف، فإن باع قبل ذلك أخذ بحسابه، وإن انقضى الأجل أخذ كامل الأجرة'' (۱۶/ ۲۴۴، ۲۴۵)۔

''ما في '' خلاصة الفتاوی '' : وفي الأصل : أجرة السمسار والمنادي والحمامي والصكاك ، وما لا تقدير فيه للوقت، ولا مقدار لما يستحق بالعقد ، لكن للناس فيه حاجة جاز ، وإن كان في الأصل فاسدًا'' (۳/ ۱۱۶ ، كتاب الإجارات ، جنس آخر في المتفرقات)۔

''ما في '' رد المحتار '' : قال في '' التاتر خانية '' : وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا فذاك حرام عليهم - وفي '' الحاوی '' : سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار ، فقال : أرجو أنه لا بأس به وإن كان في الأصل فاسدًا لكثرة التعامل ، وكثير من هٰذا غير جائز فيجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام'' (۹/ ۸۵، كتاب الإجارة ، مطلب في أجرة الدلال ، المبسوط للسرخسي : ۵/ ۱۳۸، باب السمسار)۔

''ما في '' الفتاوی البزازية على ہامش الهندية '' : إجارة السمسار والمنادي والحمامي والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا مقدار العمل لما كان للناس به حاجة جاز ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل'' (۵/ ۴۰ ، نوع في المتفرقات)۔

''ما فی ''رد المحتار على الدر المختار '':قال في البزازية:إجارة السمسار والمنادي والحمامي والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة ، ويطيب الأجر المأخوذ لو قدر أجر المثل'' (۹/ ۶۴، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة ، كذا في خلاصة الفتاوی : ۳/ ۱۱۶ ، وكذا في الفتاوی الهندية : ۴/ ۴۵۰) (فتاویٰ محمودیه:۱۶/ ۶۱۷، ۶۱۸، باب أجرة الدلال والسمسار، ط: کراچی)۔

(۱۲) ''ما في '' سنن الدار قطني '':عن أبي سعيدٍ الخدري قال : '' نهى عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان '' (۳/ ۴۲، رقم :۲۹۶۶ ، السنن الكبرىٰ للبيهقي :۵/ ۵۵۶ ، رقم :۱۰۸۵۴، نصب الراية للزيلعي : ۴/ ۳۳۴)

''ما في '' الدر المختار مع الشامية '' : ولو دفع غزلا لآخر لينسجه له بنصفه ، أي بنصف الغزل أو استأجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه ، أو ثورًا ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت في الكل ، لأنه استأجره بجزء من عمله ، والحاصل في ذلك نهيه ﷺ عن قفيز الطحان '' ۔ (درمختار) (۹/ ۷۸ ، ۷۹ ، كتاب الإجارة ، باب الإجارة الفاسدة ، مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر :۳/ ۵۳۹ ، كتاب الإجارة ، تبيين الحقائق:۶/ ۱۲۷ ، ۱۲۸ ، كتاب الإجارة ، باب الإجارة الفاسدة ، الفتاوىٰ الهندية :۴/ ۴۴۴ ، كتاب الإجارة ، الفصل الثالث في قفيز الطحان)

(۱۳) ''ما في '' بذل المجهود '' : فأما إذا أعطى ليتوصل به إلى الحق أو يدفع عن نفسه ظلمًا ، فإنه غير داخل في هذا الوعيد '' ۔ (۱۱/ ۳۰۶ ، كتاب القضاء ، باب في كراهية الرشوة ، رقم :۳۵۸۰)

''ما في '' رد المحتار '' : ثم الرشوة أربعة أقسام : ۔۔ الثالث : أخذ المال ليسوي أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع ، وهو حرام على الآخذ فقط ۔۔۔ الرابع : ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله ، حلال للدافع حرام على الآخذ '' (۸/ ۳۴ ، ۳۵ ، كتاب القضاء ، مطلب في الكلام على الرشوة والهدية ، ط : بيروت)

(۱۴) ''ما في '' صحيح مسلم '' : عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه ، أن رسول الله ﷺ قال : ''من حمل علينا السلاح فليس منا ، ومن غشنا فليس منا '' (۲/ ۱۷۷، كتاب الإيمان ، باب قول النبي ﷺ : من غشنا فليس منا)

''ما في '' جامع الترمذي '' : عن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه ، أن رسول الله ﷺ قال : ''من غشّ فليس منا '' قال أبو عيسى: والعمل على هذا عند أهل العلم كرهوا الغشّ، وقالوا : الغش حرام '' ۔ (۱/ ۲۴۵)

''ما في ''الموسوعة الفقهية'':اتفق العلماء على أن الغشّ حرام ، سواء أكان بكتمان العيب في المعقود عليه أو الثمن ، أم بالكذب والخديعة، وسواء أكان في المعاملات أم في غيرها من المشورة والنصيحة'' (۳۱/ ۲۱۹)

ما في ''رياض الصالحين'' : عن ابن مسعود رضي الله عنه ، عن النبي ﷺ قال : '' إن الصدق يهدي إلى البرّ ، وإن البرّ يهدي إلى الجنة ، وإن الرجل ليصدُق حتى يُكتب عند الله صدّيقًا ، وإن الكذب يهدي إلى الفجور ، وإن الفجور يهدي إلى النار ، وإن الرجل ليكذِب حتى يُكتب عند الله كذّابًا '' متفق عليه ۔ (ص/ ۴۶ ، رقم :۵۴ ، باب الصدق ، ط : مكتبة الإحسان ديوبند)(۱۵) (التنوير وشرحه مع الشامية :۷/ ۳۹۸ ۴۰۱)

(۱۶) ''ما في '' رد المحتار '': والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب ردّه عليهم ، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحلّ له ، ويتصدق به بينة صاحبه'' ۔ (۷/ ۳۰۱ ، كتاب البيوع ، مطلب فيمن ورث مالا حراما ، الموسوعة الفقهية : ۳۹/ ۴۰۷ ، الكسب الناشي عن الميسر ، الفتاوىٰ الهندية : ۵/ ۳۴۹ ، كتاب الكراهية ، الباب الخامس عشر في الكسب)

''ما في ''بذل المجهود '' : صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالًا بغير حق ، فأما إذا كان عند رجل مال خبيث ، فأما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمة عن نفسه ، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء'' ۔ (۱/ ۳۵۹ ، كتاب الطهارة)

......☆......

سرکاری اسکیموں کے حصول میں واسطہ بننے والے کی اجرت

مفتی عبدالتواب اناوی[1]

وہ قرضے جن کا کچھ حصہ واپسی کے وقت معاف کر دیا جائے:

(۱) حکومت یا کسی مالیاتی ادارہ سے حاصل شدہ وہ قرضے جن کی واپسی میں کچھ حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس ہوتی ہے تو اس کے حکم میں شبہ ربوا کی وجہ سے کچھ تفصیل ہوگی:

الف: یہ معافی اور چھوٹ عام ہے محکمہ اور اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے ہر فرد کے ساتھ یکساں اصول ہے کوئی فرق نہیں تو یہ صورت سب کے لئے جائز اور درست ہوگی اور یہ کل قرض جر نفعا فھو حرام کے تحت داخل نہ ہوگی۔

ب: یہ معافی خاص درجہ کے افراد کے لئے ہے باقی کے لئے نہیں، یعنی حکومت کے پاس پہنچنے والی کاغذی کارروائی نیز اس کی جانچ پڑتال کے بعد ایک خاص درجہ کے لوگوں کے لئے حکومت کی طرف سے یہ معافی کا اعلان ہو تو اس خاص درجہ کے تحت آنے والے لوگوں کے لئے جائز ہوگی بقیہ اس درجہ سے فائق لوگوں کے لے جائز نہ ہوگی، کیونکہ ان کے حق میں یہ قرض سے نفع اٹھانے کی صورت ہوگی جو جائز نہیں۔

ج: انسانی احوال کی بعض صورتوں میں حکومت کے یہاں قرض کو معاف کرنے یا کچھ کم وصولنے کا ضابطہ تو ہو، مگر اعلان نہ ہو، پھر سفارشات کے ذریعہ ان مخفی ضابطوں پر عمل کرا کر قرض کی واپسی میں معافی یا کمی کرانا دو حکم رکھتا ہے، پہلا کل کی ادائیگی کی واقعۃً وسعت نہیں ہے تو معافی یا کمی کرانا جائز ہوگا اور قرض سے نفع اٹھانے کا حکم عائد نہیں ہوگا، دوسرا اگر کل قرض کی ادائیگی کی وسعت ہے، لیکن غیر اعلان شدہ ضابطہ معلوم ہونے کی وجہ سے قرض کی واپسی میں معافی یا کمی چاہتا ہے تو پھر یہ "کل قرض جر نفعا ربوا" کے حکم میں داخل ہو کر ناجائز ہو جائے گا اور معافی اور کمی شرعاً معافی نہیں، بلکہ سود خوری کے زمرے میں داخل ہو کر ناجائز ہوگی، کیونکہ استقراض بالربح مقید ہے محتاج کے ساتھ اور یہاں فوت ہے۔

(۲) مقررہ تاریخ کے اندر قرض کی واپسی پر چھوٹ یہ معافی کا اعلان عام ہے اور جب کسی معافی یا چھوٹ کا اعلان عام ہوتا ہے تو اس اسکیم سے نفع اٹھانا ہر کسی کے لئے جائز اور درست ہوتا ہے، اس لئے اس صورت میں وقت مقررہ کے اندر جو لوگ لیے ہوئے قرض سے کم واپس کر رہے ہیں یہی وہ سود نہیں کہلائے گا، بلکہ اسے حکومتی اعانت سے تعبیر کیا جائے گا اور کل قرض جر نفعا فھو ربوا کے تحت داخل نہ ہوگا، رہی وہ صورت جس میں کل رقم واپس ہو رہی ہے، یعنی اعلان معافی کی مدت گذرنے کے بعد جو لوگ اپنے قرض کی رقم واپس کر رہے ہیں اور حکومت ان سے قرض سے زیادہ واپس نہیں لے رہی، تو اس میں کوئی نادرست ہونے کی وجہ سے نہیں، کیونکہ قرض مثل کا مثل واپس ہو رہا ہے، نہ یہ ربوا ہی ہو سکتا ہے اور نہ شبہ ربوا، البتہ اگر کوئی شخصی سفارشات کے ذریعہ وقت معین کے بعد کم واپس کرتا ہے یا حکومت دی ہوئی رقم سے زائد واپس لیتی ہے تو یہ زیادتی اور وہ کمی دونوں "کل قرض جر نفعا فھو ربوا" کے حکم میں داخل ہو کر ناجائز ہوں گی۔

(۳) وقت معین کے بعد قرض کی واپسی زائد رقم کے ساتھ ہو اس کی دو صورتیں ہیں:

ا۔ حکومت کے اعلان معافی میں یہ ضابطہ بھی شامل ہو کہ وقت معین نکلنے کے بعد قرض کی واپسی زائد رقم کے ساتھ ہوگی اور اس کی شرح بھی متعین ہو تو یہ صورت تعزیر بأخذ المال کے ضابطے سے ناجائز ہوگی، البتہ اگر واقعۃً کوئی شخص مجبوراً وقت پر ادا نہ کر سکا تو اسکے حق میں گنجائش ہوگی، کیونکہ قرض لینے کے وقت میں وقت معینہ گذار کر دینے کی نیت کسی کی نہیں ہوتی بر بناء حالات اور مجبوری ایسی صورتیں پیش آتی ہیں اس لئے

[1] جامعہ اسلامیہ بانگر، ضلع اناؤ۔

گنجائش کا پہلو ہوگا۔

۲۔ حکومت وقت معینہ پر قرض کی واپسی نہ ہونے پر اصل رقم پر زیادتی کے ساتھ واپسی کا اعلان تو کرتی ہے، مگر زیادتی کی شرح متعین نہیں کرتی عین واپسی کے وقت پتہ چلتا ہے کہ کتنا زیادہ واپس کرنا ہے، اگر یہ واپسی اصل رقم پر معمولی ہے تو اسے اخراجاتی فیس، یعنی سروس ٹیکس چارج پر محمول کر کے معاملے کو جائز قرار دیا جائے گا ورنہ تعزیر بأخذ المال کے ضابطہ سے ناجائز اور بڑھی ہوئی رقم کو سود کا حکم دے کر حرام قرار دیا جائے گا، الا یہ کہ دینے والا کسی آفت ناگہانی میں پھنس کر وقت معینہ پر ادا نہ کر سکا ہو تو اس کے حق میں الضرر یزال کے تحت گنجائش کا پہلو روا رکھا جائے گا۔

(۴) قرض، خواہ معافی والا ہو یا غیر معافی والا اگر دی ہوئی رقم سے زائد کا مطالبہ ہے تو وہ بظاہر تو سود ہی ہے، لیکن اگر یہ مطالبہ بہت زیادہ مقدار میں نہیں ہے، بلکہ برائے نام ہے، انتظامی امور کے اخراجات کے بقدر ہے یا اس سے بھی کم ہے یا اس سے کچھ زائد محسوس ہوتی ہے تو ان تینوں صورتوں میں قرض پر اس زیادتی کو اخراجات فیس پر محمول کیا جانا چاہئے، کیونکہ حکومت یا مالیاتی ادارہ جو لوگوں کو قرض فراہم کرتے ہیں ان کو افراد رکھ کر ان کی تنخواہوں کا انتظام کرنا ہوتا ہے، دفتری اخراجات بھی کم نہیں ہوتے تو ان اخراجات کو اگر قرض حاصل کرنے والوں کے سر ڈال کر قرض سے ہٹ کر وصول کیا جائے تو یہ قرض پر زیادتی شمار نہیں ہوگی، بلکہ اسے سروس چارج ٹیکس پر محمول کیا جائے گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''آج کل حکومت نے اقتصادی ترقیات کے لئے جو مختلف محکمے کھول رکھے ہیں ان میں عموماً حکومت کا مقصد سودی کاروبار کرنا یا زر اندوزی کرنا نہیں ہوتا، بلکہ محض عوام کا اقتصادی و معاشی سدھار اور عوامی بے روزگاری اور پریشان حالی دور کرنے میں سعی کے درجہ کی چیز ہے، جیسے پروجیکٹ وغیرہ کے محکمے، اور اسی وجہ سے جب کوئی شخص محکمہ سے قرض طلب کرتا ہے جب بسا اوقات محکمہ نقد قرض نہیں دیتا، بلکہ اس کے کاروبار اور روزگار کی تحقیق و تفتیش کے بعد اس کے مناسب حال مشینیں و دیگر سامان وغیرہ بہت سستے داموں پر چھوٹی قسطوں پر ادھار دیتا ہے اور نقد بہت تھوڑی مقدار کام چلانے کے لئے دیتا ہے پھر اس شخص کے کاروبار کی نگرانی بھی خود محکمہ کرتا ہے پھر اس کو رہنمائی اور مفید مشورے بھی کاروبار کے سلسلہ میں دیتا رہتا ہے پھر ان کاموں کے لئے اور اپنی دی ہوئی رقم ٹھکانے لگانے لگتی ہے کہ نہیں اس کا انتظام درست رکھنے کے لئے بہت سے ملازمین کلرک، انسپکٹر وغیرہ بھی رکھنے پڑتے ہیں، دفاتر بھی قائم کرنے پڑتے ہیں پھر ان اخراجات کو پورا کرنے اور درست رکھنے کے لئے دیئے ہوئے ادھار سامان کی قسطوں کے ساتھ کچھ رقم سود کے نام سے وصول کرتی ہے، پس اس زائد رقم کو سود کا نام دینا شرعاً ضروری نہ ہوگا، بلکہ انتظامی اخراجات کی فیس بھی قرار دیا جا سکتا ہے، چونکہ محکمہ مسلم نہیں ہے، اس لئے وہ شرعی اصطلاحی الفاظ بولنے کا نہ تو پابند ہے اور نہ وہ اس کا پابند کیا جا سکتا ہے''

(منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ایفا)۔

چونکہ سود کا لین دین شریعت اسلامیہ میں بہر صورت حرام اور ناجائز ہے اور صورت مسئولہ میں اگر چہ بظاہر قرض پر بڑھی ہوئی رقم کی واپسی سروس چارج پر محمول کرنے کی گنجائش ہے، لیکن پھر بھی شبہ ربوا ہونے کی شکل موجود ہونے کی وجہ سے اجازت عامہ نہ ہونی چاہئے، بلکہ روزگار اور پریشان حال مسلم افراد کے لئے ہی ایسے قرضوں سے استفادہ کی اجازت ہو اور دیگر متمول حضرات کے لئے ایسے قرضوں سے فائدہ اٹھانے کی ہرگز اجازت نہ ہونی چاہئے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

''جو مسلمان واقعی بے روزگار ہوں، اور معاشی اعتبار سے اس سطح پر ہوں کہ خود اپنے پیسوں سے کوئی روزگار شروع نہیں کر سکتے ان کے لئے ایسے قرض حاصل کرنا جائز ہے جو زائد رقم سود کے نام سے لی جاتی ہے اسے انتظامی اخراجات بھی قرار دیا جا سکتا ہے، اور نہ اس کی حیثیت سود یا قرض پر رشوت دینے کی ہوگی، اور مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہے'' (کتاب الفتاوی ۵ / ۸ ۷ ۳ دیوبند)۔

(۵) غیر معمولی شرح سود پر حکومت سے یا کسی بھی مالیاتی ادارے سے قرض حاصل کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ قرضے مکان کی تعمیر کے لئے

لیے جائیں یا کاروبار اور تجارت کے لئے، سود کا لینا اور دینا دونوں شریعت میں حرام ہیں الا یہ کہ کوئی مجبور محض ہو، کسی بھی طرح اس کی زندگی کی گاڑی نہ چل رہی ہو اور بہر صورت وہ مجبور ہو سودی قرض کے لینے پر تو اسے "الاستقراض بالربح یجوز للمحتاج" کے ضابطے سے اجازت ہو سکتی ہے ہر عام وخاص کے لئے نہیں، خواہ یہ سہولیات حکومت دے رہی ہو یا پرائیوٹ مالیاتی ادارے، سود کی شرط کے ساتھ کسی سے بھی قرض لینا جائز نہیں ہے۔

عام مسلمانوں کو چاہئے کہ چھوٹی آمدنی پر قناعت کریں اور محنت کریں اخراجات کو کم کر کے تجارتوں اور دیگر معاشیاتی نظام کو فروغ دیں اللہ رب العزت اس کم میں وہ برکت عطا فرمائیں گے کہ ہماری ضروریات کے لئے کافی ہو جائے گا، سود لینا تو بہت دور کی بات ہے سود دینے کی طرف بھی کسی حال میں نظر نہ کریں، ورنہ جتنی وسعت کی طرف نظر کی جائے گی حرام قریب ہوتا چلا جائے گا، اور پھر آہستہ آہستہ حرام کو حلال کرنے کی طرف بہت جلد نگاہیں اٹھنے لگیں گی، اور پھر امت کو حرام خوری سے کسی بھی طرح سے بچانا امر مشکل ہی نہیں امر محال نظر آئے گا، اس لئے ضروری ہے کہ ہم ان امور میں وسعت اور لچک کو تلاش نہ کریں، بلکہ جو "کل قرض جر نفعا فھو ربوا" کا حکم ہے اسے اپنے حال پر باقی رہنے دینا چاہئے۔

(۶) انسان دنیا کے جس ملک میں زندگی بسر کرتا ہے اسے اپنا وطن گردانتا ہے اس سے محبت کرتا ہے اس کے جائز اصولوں پر عمل کرتا ہے، اپنی حیثیت کے مطابق اخراجات ادا کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح ملک پر بھی اصولی طور پر یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ عوام کی صورت حال پر نظر رکھے ان کی ضروریات کا مالی امداد کرے ان کی ذاتی ضروریات پر بھی نظر رکھے، بے گھروں کو گھر دے بے سہاروں کا سہارا بنے، پورے ملک میں خوشحالی لانے کی پیہم کوشش کرے۔

جس طرح ملک میں دیگر اقوام کی رہائش ہے مسلمانوں کی بھی ہے، اور جس طرح دیگر قومیں سرکاری معاونت کی مستحق ہیں مسلمان بھی مستحق ہیں، اس لئے ہر ضرورت مند مسلمان کے لئے سرکاری تعاون سے استفادہ کرنا بہر صورت درست ہے، خواہ وہ تعمیر مکان کی شکل میں، تعمیر بیت الخلاء کی شکل میں ہو، اسکالرشپ کی شکل میں ہو، تعلیمی اخراجات کی ذمہ داری برداشت کرنے کی شکل میں ہو، اناج اور غلہ تقسیم کرنے کی شکل میں ہو، تعلیمی ضروریات کی اشیاء کی تقسیم کی شکل میں، بچیوں کی شادیوں میں امداد، حادثاتی اموات کے بعد کی امداد، ملازمت تمام ہونے کے بعد پنشن، فوت شدہ شوہر کی اہلیہ کو دنشرہ، دیگر عناوین کے تحت پنشن، تعلیمی اداروں کو برائے تعلیم دی جانے والی امداد، تعلیم میں اچھا نتیجہ حاصل کرنے والوں کو انعام وغیرہ کی شکل میں ہو سب درست اور جائز ہیں یہ حکومت کی طرف سے اپنی ضرورت مند رعایا کی اعانت ہے جس سے استفادہ ہر ضرورت مند مسلمانوں کے لئے بہر صورت درست اور جائز ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ ایسی صورتوں سے فائدہ اٹھائیں اور ان صورتوں اور اسکیموں سے ناواقف ضرورت مند مسلمانوں کو واقف کرا کر انہیں بھی مستفید کرانے کی جدوجہد کریں۔

(۷) حکومت سے ملنے والی امداد کو از خود حاصل کرنا چاہئے، تاکہ حکومت سے جو کچھ بھی حاصل ہو رہا ہے اس سے پورے طور پر فائدہ ہو اور حکومت جس مقصد کے لئے تعاون کر رہی ہے وہ مقصد بھی پورا ہو، لیکن اگر ہر کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہو، اور صورت حال یہی ہے کہ حکومت کی طرف جاری کردہ امدادی رقوم کا حصول ہر فرد مستحق کے لئے از خود ممکن نہیں ہے، بلکہ ایک بڑی تعداد افراد کے لئے دوسروں کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس سے سہارا لیا جاتا ہے اس کا وقت بھی خراب ہوتا ہے اور پیسہ بھی، تو اگر مذکورہ شخص مستحقین امداد سے امداد حاصل کرانے کے عوض کچھ اجرت متعین کرتے ہیں اور یہ اجرت دونوں کے درمیان طے بھی ہو جاتی ہے یا معروف بہ ہوتی ہے، جس کا لینا اور دینا دونوں درست ہونا چاہئے، جیسے اجرت سمسار جو بہر صورت درست اور جائز ہے یہاں بھی کوئی قباحت کا پہلو نظر نہیں آتا، اور اسے قفیز طحان کے حوالے سے بھی ناجائز نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ قفیز طحان میں اجرت عن العمل شرط ہے اور وہ یہاں موجود نہیں ہے، یہ اجرت مثل اجرت دلالہ ہے، اور اجرت دلالہ جائز ہے، لہٰذا اس محنتانہ کا لینا اور دینا دونوں جائز ہونا چاہئے۔

(۸) امدادی رقوم کے حصول میں وسطہ بننے والے حضرات مستحقین امداد سے جو معاملہ کرتے ہیں خواہ وہ فیصد کے درجہ میں ہو، یا کسی اور طرح، یہ اجرت عمل ہی ہوگی اور بحکم اجرت دلالہ موسوم ہوگی، لیکن اگر واسطہ بننے والے لوگ اکثر رقم پر غریب کو مجبور کرتے ہوئے کریں تو یہ غبن فاحش

کے حکم میں ہو کر لینے والے کے حق میں ناجائز ہوگی، البتہ دینے والا چونکہ مجبور محض ہے، اس لئے اس کے حق میں جواز کی گنجائش ہوگی اور اسے الضرورات تبیح المحظورات پر محمول کریں گے۔

''وفی الشامیة: قال: فتجب الدلالة علی البائع، أو المشتری أو علیهما بحسب العرف'' (فتاوی شامی ۴/ ۴۲)۔

مذکورہ عبارت سے مستفاد ہوتا ہے کہ اجرت دلالہ عرف پر مبنی ہوتی ہے، یعنی دلالی کی اجرت کے حصول کے لئے عرف ضابطہ ہوتا ہے اگر کوئی دلال عرف سے ہٹ کر اجرت دلالی متعین کرتا ہے تو اسے غبن فاحش کا درجہ دیا جائے گا اور عرف سے زیادہ رقم کو اس کے حق میں ناجائز قرار دیا جائے گا، اسی طرح اگر امدادی رقوم کو حاصل کرانے والے عرف سے بڑھ کر اپنی اجرت طے کرتے ہیں تو ان کو اس بڑھی ہوئی رقم کو لینا جائز نہ ہونا چاہئے۔

(۹) شریعت اسلامیہ میں رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، حدیث میں ہے: ''الراشی والمرتشی فی النار''، یعنی رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔

فقہاء کرام نے یہ بھی صراحت فرمائی ہے کہ اپنا حق بغیر رشوت دیئے حاصل نہ ہو رہا ہو، یا ظلم کا دفعیہ رشوت دیئے بغیر نہ ہو رہا ہو تو ایسی مجبوری کی صورت میں رشوت دینے کی گنجائش ہو جاتی ہے۔

''کما فی الشامیة، قال: دفع المال للسلطان الجائر، لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة، یعنی فی حق الدافع'' (رد المحتار علی الدر المختار ۱۰/ ۶۰۷)۔

مذکورہ عبارت سے مفہوم ہوا کہ اپنا حق وصول کرنا جب بغیر رشوت کے نہ ہو رہا ہو تو براہ مجبوری رشوت دے کر اپنا حق حاصل کرنا چاہئے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر قرض یا امدادی رقوم کے حصول میں مستحقین کو بغیر رشوت دیئے حق موصول ہونے کی کوئی راہ نہ ہو تو ان کو حصول حق کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند لکھتے ہیں:

''اپنا جائز حق اگر بغیر رشوت دیئے نہ حاصل ہو تو رشوت دے کر اپنا حق حاصل کر لینے کی گنجائش رہتی ہے، البتہ رشوت لینے والا ہر حال میں گنہگار رہے گا'' (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۲۰۷، ایفا)۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''فقہاء کرام تصریح کرتے ہیں کہ رشوت جس کا لینا دینا مثل سود کے دونوں حرام ہیں، مگر مجبوری کی صورت میں اپنا حق بغیر رشوت کے نہ ملتا ہو تو رشوت دینے میں صرف رشوت لینے والے کو گناہ ہوگا، دینے والا معذور قرار دے کر ان شاء اللہ تعالیٰ گناہ سے محفوظ رہے گا'' (منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۱۰۳، ۱۰۴)۔

(۱۰) حکومت غریب عوام کی خستہ حالی دور کرنے کے لئے اور ایک بہتر سماج تشکیل دینے کے لئے کبھی قرض کی شکل میں مدد کرتی ہے کبھی نقد روپیہ بہم پہنچاتی ہے اور کبھی دیگر ضروری اشیاء مہیا کرا کر غرباء کی مدد کرتی ہے، حکومت کی نظر میں اس طرح کی اسکیموں کا مقصد تو بہرحال غریب پروری ہی ہوتا ہے، لیکن بسا اوقات قانون سازی اور اصولوں کی تعیین میں ارباب حکومت سے چوک ہو جاتی ہے جس سے غیر مستحق لوگ بھی امداد کے حقداروں کی فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں اور ضابطہ کی کارروائی ہو جانے کے بعد حکومت ان غیر مستحق لوگوں کو بھی وہ رقوم دینے پر مجبور ہوتی ہے، چونکہ حکومت کی جانب سے ملنے والی رقم کوئی زکوۃ کی رقم تو ہے نہیں کہ کسی شخص کے ضابطے میں آنے کے بعد محض اس وجہ سے اس کو رقم لینے سے منع کیا جائے کہ تم صاحب نصاب اور اہل استطاعت ہو تم کو یہ رقم لینا جائز نہیں ہے، چونکہ یہ حکومت کا تبرع ہے اس لئے ضابطہ میں آنے والا ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص حکومت کے بناتے ہوئے ضابطے اور معیار پر صحیح نہیں اترتا مگر کسی دوسری راہ سے وہ ان امدادی رقوم سے فائدہ اٹھانا چاہتا

ہے تو اس کی دو صورتیں ہوں گی:

۱۔ ان اسکیموں کے پیچھے حکومت کی منشا اصلاً غریبوں کی مدد کرنا ہے اور کوئی غریب کسی عارضی وجہ مثلاً مطلوبہ کاغذات نہ ہونے یا تاخیر سے معلوم ہونے کی وجہ سے وقت معینہ تک کاغذات جمع نہ ہو پانے کی وجہ سے بے چارہ ایسی مدد سے محروم ہو جاتا ہے، پھر یہ شخص اپنا حق حاصل کرنے کے لئے کوئی دوسری راہ اختیار کرتا ہے جس سے وہ حق اسے مل جاتا ہے تو شرعاً اس کا یہ عمل غیر جائز نہ ہوگا اگر چہ ایسا کرنے کی عام اجازت بھی نہ ہوگی۔

۲۔ ایک شخص حکومت کے جاری کردہ ضابطہ سے بھی باہر ہے اور واقعتہً وہ غریب بھی نہیں مگر غلط بیانی اور غلط راہیں اختیار کر کے حکومت سے امدادی رقوم حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لئے یہ عمل بہر حال ناجائز ہوگا۔ اور حاصل شدہ رقم کا استعمال بھی اس کے لئے کسی طرح جائز نہ ہوگی، کیونکہ حکومت نے اسے اس شخص کے لئے جاری نہیں کی تھی اس نے دوسروں کا حق غلط بیانی اور غلط طریقے سے حاصل کیا ہے، اور دوسرے کا مال حق چھین کر استعمال کرنا کسی بھی طرح جائز نہیں ہے، اگر چہ اہل حقوق متعین نہیں ہیں۔

وفی الحدیث: ''لا یحل لامرء مال أخیہ إلا بطیب نفسہ'' (الحدیث)۔
اور قرآن کریم کا اعلان ہے: "یا أیھا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل" (سورہ نساء: ۲۹)۔
یعنی غلط راہوں سے کسی کا مال حاصل کرنا اور پھر اسے استعمال کرنا کسی بھی طرح حلال نہیں۔

(۱۱) کسی بھی مقصد کے لئے جب حکومت کسی بھی مالیاتی ادارہ سے قرض دلا کر دیگر اخراجات کی ذمہ دار خود ہو، اور قرض کی واپسی زیادتی کے ساتھ نہ ہو تو چونکہ یہ معاملہ ربویہ نہیں ہوگا اس لئے اس طرح کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے میں کچھ حرج نہیں ہے، نیز دوسری صورت کہ مالیاتی اداروں کے اخراجات کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور قرض کی واپسی کے ساتھ کچھ مزید قرض لینے والے کو بھی ادا کرنا پڑتا ہے، تو اگر قرض پر بڑھی ہوئی رقم کل اتنی مقدار میں ہو کہ اسے سروس چارج پر محمول کیا جا سکتا ہو تو کچھ حرج یہی نہیں ہے، لیکن اگر وہ تھوڑا سا حصہ بھی معمولاً سروس چارجیز سے کہیں زیادہ ہے تو یہ اسکیم بھی سودی قرض میں داخل ہو جائے گی اور پھر وہی ضابطہ سامنے ہوگا ''الاستقراض بالربح یجوز للمحتاج''، غیر ضرورت مند کے لئے ایسی اسکیموں سے استفادہ کرنا ممنوع ہوگا۔

(۱۲) حکومت کے پاس جو رقوم ہوتی ہیں وہ ہر طرح کی ہوتی ہیں جس میں تجارت بھی ہوتی ہے ٹیکس اور اخراجات بھی ہوتے ہیں، انٹرسٹ بھی ہوتا ہے اور یہ تمام طرح کی آمدنی سرکاری خزانے میں جمع ہوتی ہیں پھر اس خزانے سے سرکاری تمام تر اخراجات پورے کئے جاتے ہیں عوام کی ضرورتوں کے لحاظ سے الگ الگ فنڈ قائم کئے جاتے ہیں اور ان کے واسطے سے عوام کی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے، جن سے استفادہ ہر کسی کے لئے درست قرار دیا جاتا ہے، حکومت کی ہر غیر واپسی امداد کو جائز قرار دیا جاتا ہے، جبکہ وہ بھی ملک کی طرح کی آمدنی کا مشترک حصہ ہوتا ہے کچھ فرق نہیں ہوتا۔ پھر اگر حکومت کچھ رقم مالیاتی اداروں کو دیدے اور اس سے حاصل ہونے والے نفع سے ملکی ضرورت مند لوگوں اور رفاہی اداروں کی مدد کرے تو بظاہر اس صورت میں غیر جواز کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا کیونکہ مالیاتی اداروں سے حکومت کا جو بھی معاملہ ہو اس کی ذمہ دار حکومت ہے وہ معاملہ ہمارا نہیں ہے حکومت کا ہے، نیز حکومت چونکہ مسلم نہیں ہے وہ ہر نفع کو انٹرسٹ کا نام دیتی ہے بینک سے اس کا معاملہ مضاربت کا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ اسلامی اصطلاحات سے غیر واقف ہے اور پابند بھی نہیں، محض اس کے کہہ دینے کی وجہ سے کہ یہ امدادی سودی رقم سے ہی ہمیں تسلیم نہیں، ہم اسے حکومت کا محض تعاون سمجھتے ہیں جو تمام مسلمانوں کے لئے اور تمام رفاہی اداروں کے لئے درست اور حلال ہے اسی طرح تعلیمی اداروں کے لئے بھی۔

......☆......

سرکاری اسکیموں سے متعلق سوالات کے جوابات

مفتی جمیل احمد نذیری[1]

۱۔ لینا جائز ہے، لعدم المانع۔

۲۔ اس صورت میں قرض لینا جائز ہے۔ لعدم المانع۔

۳۔ ایسا قرض جس میں مقررہ مدت کے بعد زائد رقم دینی پڑے سود اور جائز نہیں۔

۴۔ اس کے انتظامی خرچ میں شمار کرنے کی تاویل کی گنجائش ہے (دیکھئے: نظام الفتاوی ۳/ ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۸۹)۔

۵۔ ضرورت شدیدہ کے تحقق پر لینا جائز ہے۔ ''الاشباہ'' میں ہے:

''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (ص: ۱۴۹)، ''الضرورات تبیح المحظورات'' (القواعد الفقهیه/ ۸۹)۔

۶۔ ایسی رقوم حاصل کرنا اور استعمال کرنا جائز ہے۔ لعدم المانع۔

۷۔ واسطہ بننے والوں کا محنتانہ، دینا جائز ہے۔

۸۔ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ جو بطور محنتانہ لیتے ہیں، اگر واقعی محنت کے اعتبار سے، ان کی وہ اجرت ہوتی ہو تو بلاشک وشبہ جائز ہے، اور اگر محنتانہ سے زائد مانگ رہے ہوں تو بھی لینا دینا جائز ہے۔ اس کی دلیل جواب نمبر ۹ کے تحت آرہی ہے، وکذا الأخذ الخ۔

۹۔ اس صورت میں رشوت دینا جائز ہے، یہ صورۃً رشوت ہے، شرعاً اور حقیقتاً رشوت نہیں ہے، کیونکہ اپنا حق لینے کے لئے رشوت دینی پڑ رہی ہے۔

''مرقاۃ المفاتیح'' میں ہے: ''قیل: الرشوة ما یعطی لإبطال حق أو لإحقاق باطل. أما إذا أعطی لیتوصل به إلی حق أو لیدفع به عن نفسه ظلمًا فلا بأس به، وکذا الأخذ إذا أخذ لیسعی فی إصابة صاحب الحق فلا بأس به. لکن هذا ینبغی أن یکون فی غیر القضاة والولاة؛ لأن السعی فی إصابة الحق ودفع الظلم عن المظلوم واجب بینهم، فلا یجوز الأخذ علیه (۷/ ۲۴۸) تحت حدیث الراشی والمرتشی کلاهما فی النار''۔

۱۰۔ غلط بیانی کرکے امداد یا قرض وصول کرنا اور اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ ارشاد نبوی ہے: ''ألا لا یحل مال امرء إلا بطیب نفسه الخ''۔

۱۱۔ مقروض جو خود ادا نہ کرے، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرے تب تو عدم جواز کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور خود دینا پڑے اور وہ بھی معمولی رقم ہو تو سروس چارج میں شمار کئے جانے کی تاویل کی جاسکتی ہے۔ سوال ۴ کے جواب کی طرح۔

۱۲۔ حکومت فرد حقیقی نہیں ہے، فرد اعتباری ہے، اس لئے اسے جو سود کی رقم حاصل ہوگی وہ واجب التصدق نہ ہوگی۔ اگر وہ افراد واشخاص متعین ہوں جن سے سود لیا ہے تو انہیں واپس کردینا چاہئے، ورنہ جہاں چاہے، خرچ کرے، لیکن سود، خواہ فرد حقیقی (افراد واشخاص) وصول کرے۔ یا فرد اعتباری (حکومت) عدم جواز دونوں کے لئے ہے۔

☆

[1] مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، نوادہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی۔

سرکاری اسکیم کے تحت فراہم کئے جانے والے سودی قرضے

مفتی عبدالرحیم بھوپالی[1]

حکومت عوام کی معاشی ومعاشرتی ضرورتوں کی کفالت، تعلیمی ترقی، صنعتوں کے فروغ اور اقتصادی اعتبار سے محروم وپسماندہ طبقات کی ترقی کے لئے مختلف اسکیموں کے ذریعہ جو رقوم فراہم کرتی ہے اگر وہ امداد واعانت کے طور پر ہے تو ان کو لینے میں کوئی حرج نہیں، البتہ قرضوں کی شکل میں ہوئی رقم کی مختلف صورتیں ہیں جنکے احکام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) جو رقمیں اس طرح فراہم کی جاتی ہیں کہ قرضہ کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتی ہے، اس کو لینا جائز ہے، یہ حکومت کی طرف سے یہ امداد یا عطیہ اعانت ہے۔

(۲) جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا اور غریب رعایہ کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرنا ہے، اسی لئے حکومت کچھ چھوٹ بھی دیتی ہے (جسے سبسڈی کہا جاتا ہے) اس قسم کے پلان اسکیم سے حکومت کا مقصد سودخوری نہیں، اس لیے اگر کوئی شخص حکومت سے اس قسم کی اسکیم کے تحت قرض لے اور حکومت کی طرف سے اس پر کچھ رقم چھوٹ ملے اور بقیہ رقم حکومت مع سود وصول کرے اگر وہ سود چھوٹ میں ملی ہوئی رقم (یعنی سبسڈی) سے ادا ہو جاتی ہو اپنے پاس سے زائد رقم نہ دینا پڑتی ہو تو اس تاویل سے کہ حکومت نے بطور تعاون جو رقم دی تھی اس شخص نے اسی تعاون والی رقم میں سے کچھ رقم واپس کر دی مذکورہ اسکیم کے تحت قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

(فتاویٰ رحیمیہ ۹ / ۲۶۵)۔

لون کی واپس کی جانے والی کل مقدار اسکے ملنے والی مقدار کے برابر یا اس سے کم ہے تو اسکا لینا درست ہے (محمود الفتاویٰ ۳ / ۵۹)۔

حکومت کی طرف سے بے روزگاری کو ختم کرنے کے لئے سبسڈی والی لون ملتی ہے یہ لون لینا اور اس سے فائدہ اٹھانا مسلمان کے لیے جائز ہے، البتہ ایک بات کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ سود میں دیجانے والی رقم معافی کی رقم سے بڑھ نہ جائے (فتاویٰ دینیہ ۴ / ۱۶۳)۔

(۳، ۴) جزوی معافی والے قرضے یا غیر معافی والے قبضوں میں اصل سے زائد معمولی رقم کا مطالبہ ہو جس کی شرح بہت کم ہو جو اپنی مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کہلا سکتا ہو تو یہ ادا کی جانے والی زائد رقم پر سود کی تعریف صادق نہیں آئیگی حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت میں لی جاتی ہے جن میں انتظام میں سہولت رہتی ہے اور اعانت لینے والوں اور دینے والوں دونوں کا معاملہ صاف رہتا ہے اور یہ محض ایک قومی ومشترکہ نظام کی صورت ونوعیت ہے کوئی سودی کاروبار نہیں، بلکہ قوم کا سرمایہ ہے اور قوم ہی کے کام میں صرف کیا جاتا ہے۔ اسکے منتظمین اور کارکنان قوم کے اجیر ووکیل ہو سکتے ہیں اور غریبوں کی اعانت وپسماندوں کو آگے بڑھانے اور انکے لئے اسباب معاشیت فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کھولنے کا انتظام کہا جا سکتا ہے، نیز اس طریقہ کار و محکمہ میں نفع وسہولت بھی دونوں جانب کو قریب قریب یکساں حاصل ہوتی ہے۔ سود تو نام ہے اس نفع وزیادتی کا جو محض ایک جانب کو حاصل ہو اور عوض سے خالی ہو، غرض یہ مفہوم سود کے مفہوم سے جدا کہا جا سکتا ہے اور یہ توجیہ قریب قریب ایسی ہی ہوگی جو اس رقم میں کی جاتی ہے جس کو حکومت اپنے ملازمین کو ختم ملازمت کے وقت اگر چہ سود کے نام پر دیتی ہے، مگر ہمارے فقہاء محققین اسکو سود نہیں کہتے، بلکہ اسکو انعام کہتے ہیں اور اسکو جائز فرماتے ہیں، نیز یہ توجیہ ایسی ہوگی جیسی منی آرڈر کی فیس میں کی جاتی ہے فیس کو اجرت کتابت اور اجرت روانگی فارم کہا جاتا ہے جیسا کہ علامہ تھانویؒ امداد الفتاویٰ میں ایک طویل سلسلہ کلام میں فرماتے ہیں (نظام الفتاویٰ ۲ / ۴۳۶)۔

---

[1] جامعہ خیر العلوم بھوپال۔

جو مسلمان واقعی بے روزگار ہوں اور معاشی اعتبار سے اس سطح پر ہوں کہ خود اپنے پیسوں سے کوئی روزگار شروع نہیں کرسکتے انکے لئے ایسے قرض حاصل کرنا جائز ہے جو زائد رقم سود کے نام سے لی جاتی ہے انہیں انتظامی اخراجات بھی قرار دیا جاسکتا ہے (کتاب الفتاویٰ ۳۷۸/۵)۔

اگر ابتلاء عام یا ضرورت صحیحہ معتبرہ واقع میں متحقق ہے جب تو اس توجیہہ میں کوئی کلام ہی نہیں اور اگر ایسا نہ ہو جب بھی اگر چہ اس قسم کے نفس معاملہ کو ناجائز کہا جائے اور نفس معاملہ کرنا تو گناہ ہو، مگر مجبوری اور حاجت شدیدہ کے وقت جب کوئی دوسرا ذریعہ معاش و معیشت سنبھالنے کا اور ضرورت رفع کرنے کا نہ رہے یا متعذر ہو جائے تو اس وقت اس قسم کا معاملہ کرنے کی گنجائش ہوگی (نظام الفتاویٰ ۴۳۹/۲)۔

۵۔ اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو یہ زائد رقم کی ادائیگی سود مانی جائے گی۔ ''فتاویٰ رحیمیہ'' میں ہے اگر سود کی رقم چھوٹ میں ملی ہوئی رقم (یعنی سبسڈی) سے زیادہ دینی پڑے تو پھر یہ معاملہ سود ہی کہلائے گا اور جائز نہ ہوگا (فتاویٰ رحیمیہ ۲۶۵/۹)۔

سود میں دی جانے والی رقم معافی کی رقم سے بڑھ نہ جائے اگر زیادہ ہوگا تو سود کہلائے گا (فتاویٰ دینیہ ۱۳۸/۴)۔

جیسے سود کا لینا حرام ہے اسی طرح شدید مجبوری کے بغیر سود دینا بھی حرام ہے، اس لئے محض کاروبار کو وسعت دینے اور کاروبار کو بڑھانے کے لئے کے لیے سودی قرض لینا جائز نہیں جو شخص بے روزگار ہو اور کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اسی طرح کسی اور ضرورت کے تحت بہت مجبور شخص کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش ہے۔ (کتاب الفتاوی ۲۶۶/۵)۔ ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ ص ۴۹)۔

یہ مختلف قرضے مکان کی تعمیر کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے ہو تو یہ دیکھا جائے گا کس درجہ کی ضرورت کے لئے قرض لیا جا رہا ہے مثلاً کرایہ کے مکان سے کام چل سکتا ہے تو مکان خریدنے یا بنانے کے لئے سودی قرضے کی اجازت نہیں ہوگی مکان بنانے کے لئے سرکار کی طرف سے لئے گئے لون کی، واپس کی جانے والی کل مقدار اسکے ملنے والی مقدار کے برابر یا اس سے کم ہے، تو اسکا لینا درست ہے، ورنہ سود ہے جو جائز نہیں (محمود الفتاویٰ ۵۹/۳)۔

محکمہ ترقیات کے شعبہ سے چار ہزار روپئے کنواں کھدوانے یا مکان بنوانے یا کسی اور صنعت وحرفت کے لئے نقد لئے اور محکمہ ترقیات نے اسمیں سے اپنے قاعدے کے تحت ایک ہزار بالکل معاف کردیئے اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقع دیا، پھر دو سال کی تاخیر کے بعد چھوٹی چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لئے متعین کیں اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا، مگر کل رقم وصولی کی چار ہزار سے زائد نہ ہوئی تو اب ان قسطوں کے ساتھ جو زیادتی محکمہ نے وصول کی وہ سود نہ ہوگی اور یہ معاملہ جائز رہیگا چونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا اور چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا (نظام الفتاویٰ ۴۴۴/۲)۔

اسی طرح حکومت کے کسی اعانتی محکمہ سے کھاد یا بیج وغیرہ ادھار لیا محکمہ نے چھ ماہ میں ہر ماہ دس روپئے کے حساب سے کل ساٹھ روپئے وصول کئے اور اپنے رجسٹر میں از خود اصل قیمت کے خانہ میں پچاس روپئے درج کئے تو اس دس روپئے کا سود ہونا ضروری نہیں، بلکہ جزو ثمن قرار پاسکتا ہے، اس لئے کہ سود نام ہے فضل خال عن العوض کا جو اموال ربویہ کہ اندر عقد معاوضہ کا معاملہ کرنے میں مشروط طریقہ پر طرفین متعین کریں اور یہاں ایسا نہیں ہوا ہے۔

خواہ مشتری خریدار کو اس اندراج کا علم ہو جائے یا نہ ہو بالخصوص ایسے ملک میں جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلمین کے ہاتھ میں ہو مسلمانوں کو قانوناً ایسا معاملہ کرنے سے روکنے کا یا اس کی اصلاح کا اکتیار نہ ہو اور خاص کر جب مجموعہ وصولی کی مقدار عام بازار کے نرخ کے اعتبار سے غبن فاحش کی مقدار سے زائد نہ ہو (منتخبات نظام الفتاوی ۴۴۵/۲)۔

جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے اس میں تادیل چل سکے گی اور اسکو کام چلانے کے لئے اعانت میں داخل کر کے اس معاملہ پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے، بلکہ انتظامات کی درستگی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کیا جاسکے گا اور اس پر معاملہ جائز رہے گا (منتخبات نظام الفتاوی ۴۴۴/۲)۔

اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط یا متعدد یا تمام اقساط کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو اسکو بھی قاعدے کے مطابق انتظامات کی درستگی باقی رکھنے کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کر کے جائز کہا جاسکے گا (منتخبات نظام الفتاوی ۴۴۵/۲)۔

۶۔ ضروریات کے لئے گورمینٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر جو رقم ملتی ہے مثلاً مکان بنانے یا بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے اگر یہ صحیح ہے کہ بطور امداد وہ رقم دیجاتی ہے اور اس پر کوئی سود نہیں لیا جاتا تو یہ سودی معاملہ نہیں اس لیے درست ہے (فتاوی رحیمیہ ۶ / ۱۳۵)۔

۷۔ گورمینٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کو اگر بغیر رشوت کے حاصل نہ کیا جاسکتا ہو تو مجبوراً اپنا حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دے سکتے ہیں (کتاب الفتاوی/ ۳۰۸)۔

۸۔ گورمینٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کے حصول میں واسطہ بننے والے اگر محنتانہ طلب کریں تو انسے اجرت طے کر کے دے سکتے ہیں۔

''أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعا للضرر أو جلبا للنفع، وهو حرام على الآخذ فقط، وحيلة حلها أن يستأجره يوما إلى الليل أو يومين فتصير منافعه مملوكة ثم يستعمله في الذهاب إلى السلطان. سمرقندى'' (رد محتار ۴/ ۳۰۳)۔

مال لینا تاکہ حاکم کے پاس اسکا معاملہ درست کردے دفع کرنے کے لئے یا نفع حاصل کرنے کے لئے یہ صرف لینے والے پر حرام ہے اس کی حلت کا حیلہ یہ ہے کہ مزدوری طے کر لے ایک دن یا دو دن کی تو وہ منافع کا مالک ہوجائے گا پھر فلاں کام کے لئے حاکم کے پاس آنے جانے میں اسکو استعمال کرلے (شامی ۴/ ۳۰۳)۔

۹۔ اپنا حق وصول کرنے کے لئے اگر رشوت کے علاوہ کوئی ذریعہ نہ ہو تو مجبوراً دے سکتے ہیں۔

''وحرام على الأخذ فقط، وهو أن يهدى ليكف عنه الظلم والحيلة أن يستأجره''

جب ہم اس ملک کے شہری ہیں تو جیسے حکومت دوسرے شہریوں کو روزگار کے لئے قرض فراہم کرتی ہے ویسے ہی مسلمانوں کو بھی اس پر اسی طرح کی سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے اور ہمارا بحیثیت شہری اس پر حق ہے، لہٰذا جو مسلمان واقعی بے روزگار ہوں اور معاشی اعتبار سے اس سطح پر ہوں کہ خود اپنے پیسوں سے کوئی روزگار شروع نہیں کرسکتے انکے لئے ایسے قرض حاصل کرنا جائز ہے جو زائد رقم سود کے نام سے لیجاتی ہے اسے انتظامی اخراجات بھی قرار دیا جاسکتا ہے، ورنہ اس کی حیثیت سود یا قرض پر رشوت دینے کی ہوگی اور مجبوری کی حالت میں اس کی گنجائش ہے (کتاب الفتاوی ۵ / ۳۷۸)۔

اپنا حق تجارت یا ملازمت وگیرہ حاصل کرنے کے لئے دیجائے تو امید ہے کہ رشوت دینے والا گناہ سے بچ جائیگا (جامع الفتاوی ۳/ ۲۱۷)۔

۱۰۔ امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے جو شرائط و معیارات ہوں انکو مطابق جو شخص ہوں وہی لے سکتا ہے دوسرے شخص کے لئے غلط بیانی کرنے امداد یا رقم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، کیونکہ یہ جھوٹ اور دھوکہ دہی ہے۔

۱۱۔ جن اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے اور اسپر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے مقروض کی طرف سے حکومت ہی ادا کرتی ہے تو یہ حکومت کی طرف سے اعانت و امداد ہے اس سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر حکومت کی طرف سے بینک کے ذریعہ دلائے ہوئے روپیوں کا کچھ انٹرسٹ مقروض کو دینا پڑے تو اسکو دینے کی گنجائش ہے۔ ''نظام الفتاوی'' میں ہے، اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے اعانتی محکموں سے ہو اسمیں غرض و مقصود سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کوئی صحیح تاویل ملتی رہے گی ربوٰ سود کہنے سے اجتناب کریں گے (منتخبات نظام الفتاوی ۲ / ۴۴۰)۔

پس اس معاملہ کی توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اسی پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت میں لیجاتی ہے جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے (منتخبات نظام الفتاوی ۲ / ۴۳۶)۔

۱۲۔ حکومت کی طرف سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کرنے کے لئے جو رقم دی جاتی ہے وہ لے سکتے ہیں اگر چہ حکومت یا اس کا ادارہ انٹرسٹ وصول کر کے اسکیم سے استفادہ کرنے والوں کو دے تب بھی ان کے لئے یہ مدد لینے کی گنجائش ہے۔

……☆……

سرکاری اسکیموں کے حصول کے لئے رشوت اور ایجنٹ کی اجرت

مفتی عبدالمنان صاحب[1]

۱۔ وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم کم واپس کرنا پڑتا ہے ایسے سرکاری قرضوں کا لینا درست ہے۔

۲۔ معافی والے قرضوں میں جن صورتوں میں مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ قرض بھی جائز ہے، جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے۔

۳۔ اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو یہ صورت سود کی وجہ سے ناجائز ہوگی۔ ایسی حالت میں قرض خواہ کو اس کوشش میں رہنا چاہئے کہ مدت کے اندر اندر قرض ادا کردے، تاکہ سود سے بھی بچ جائے اور قرضہ سے بھی مستفید ہو سکے۔

۴۔ غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو جس کو سروس چارج کہا جاتا ہے یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہا جاسکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم سود کے دائرہ میں آئے گا۔ انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت کی گنجائش نہیں ہوگی۔

لیکن معافی والے قرضے میں سروس چارج کی گنجائش ہوگی۔ غیر معافی والے قرضے میں برابر سے زائد رقم اگر چہ بہت کم ہو لیکن یہ ''کل قرض جر نفعًا فھو ربوا'' کے تحت میں آکر سود کے دائرہ میں آئے گا اور ناجائز وحرام ہوگا۔ پھر بھی اضطرار کی حالت میں اسے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ "من اضطر غیر باغ ولا عاد فلا إثم علیه" (سورہ بقرہ: ۱۷۳) کی دلیل کی بنیاد پر جائز کہا جاسکتا ہے۔

۵۔ اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے اس پر بھی سود کا لاگو ہوگا۔ حکم میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔

۶۔ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی بھی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے تو ایسی رقوم حاصل کرنا اور استعمال کرنا درست ہے۔ اصل مین یہ اعانت پبلک ورعایۃ کے لئے سرکار کی ذمہ داری بھی ہے جس کو وہ ادا کر رہی ہے۔ لہٰذا ان رقوم سے استفادہ میں کچھ حرج نہیں ہے۔

۷۔ گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم جس قسم کی بھی ہوں ان کے حصول کے لئے جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ اس میں واسطہ بھی بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ دینے کے بارے میں تو دو صورتیں ہو سکتی ہیں، پہلی صورت اینکہ قرض لینے والے کو فرصت نہیں کہ آفس میں دوڑ بھاگ کریں وہ ایک شخص کو متعین کیا کہ وہ ضروری انتظامات کے لئے اپنا وقت خرچ کرے، اس کے بدلہ میں اس کا کچھ محنتانہ بھی متعین کرے۔ تو خرچہ اس کو جس طرح دینا جائز ہے اس کو لینا بھی جائز ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جدوجہد میں وہ خود لگا ہوا ہے، لیکن متعلق افسر کو رشوت دینا پڑتا ہے اس کے بغیر کام نہیں ہوتا یا ہوگا، لیکن چکر لگاتے لگاتے رشوت سے زیادہ خرچ بھی ہوگا تاخیر بھی پریشانی بھی۔ ایسی صورت اپنا حق کی وصولیابی کے لئے رشوت دینے میں گناہ نہیں

[1] مفتی دارالحدیث، برمائی پٹی، نوگاؤں، آسام۔

ہوگا۔ جیسے ''البحر الرائق'' میں ہے:

''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (۶/ ۲۱۱)۔

الاشباہ والنظائر میں ہے کہ

''الضرورات تبیح المحظورات'' (القاعدة الخامسة/ ۸۷) لیکن لینے والے کے لئے جائز نہیں ہوگا، بلکہ حرام ہے۔

۸۔ بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں اس میں اگر اس کی محنتانہ کی شکل میں یا دلالی کی حیثیت سے ایک مناسب لیتے ہیں اور دینے والے بھی اپنی سہولیات کے پیش نظر خوش ہوکر اس کو دیتا ہے تو اجرت یا محنتانہ یا دلالی کی حیثیت سے دینا ولینا ناجائز نہیں ہونا چاہئے، لیکن غیر مناسب تعداد یا حصہ کا دعوی کرنا ولینا جائز نہ ہوگا۔

۹۔ اس قسم کی امدادی رقم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینے کی ضرورت ہو، جبکہ وہ حاجت مند ہو اپنا حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینا ناجائز نہیں ہوگا، جیسا کہ ضابطہ ہے: ''الضرورات تبیح المحظورات''، لیکن لینے والے کے لئے جائز نہیں ہوگا بلکہ حرام ہوگا۔

۱۰۔ امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہوگا۔

۱۱۔ بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یہ صورت جائز ہے۔

یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے یہ دوسری صورت ناجائز ہے، سود کی وجہ سے۔ اگر اضطرار کی حالت ہے تو جائز ہوگا۔ ''الضرورات تبیح المحظورات'' (الاشباہ والنظائر)۔

۱۲۔ بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کردیا ہے جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے، جبکہ ڈپازٹ حکومت کی طرف سے ہوتا ہے تو انٹرسٹ بھی حکومت کو ملے گی، حکومت اس کا مالک ہے۔ رعایا کا امداد وتعاون کرنا سرکار وحکومت کی ذمہ داری ہے وہ مالک بن کر پبلک کو دیتا ہے۔ حکومت کی طرف سے امداد وتعاون ہونے کی بنیاد پر لینا جائز ہے، لیکن اس سے پرہیز کرنا بہتر ہے، لیکن غرباء ومساکین سے استفادہ کرسکتا ہے، بلکہ وہ غرباء ومساکین ہی اس کے مستحق ہیں یہ اس بنیاد پر کہ وہ بعینہ سود کے روپے ہیں، لیکن پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اسمیں سودی روپے حکومت لے رہی ہے۔ اور روپے میں عینیت بھی نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے جواز کا حکم لگایا جاسکتا ہے غیر غرباء کے لئے بھی۔

......☆......

مختلف سرکاری اسکیموں سے استفادہ کا شرعی حکم

مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی[1]

۱۔ ایسے قرضوں کا لینا جائز ہے۔

۲۔ ایسے قرضوں کا لینا بھی جائز ہے۔

۳۔ اگر قرض لینے کو قرض لینے کی حاجت اور ضرورت ہو تو یہ سودی قرض لینا اس کے لئے جائز ہے۔

۴۔ ایسا قرض جس میں سروس چارج کے نام سے بہت تھوڑی مقدار میں کچھ زائد رقم لی جاتی ہو ایسا قرض لینا بھی جائز ہے۔

۵۔ اگر قرض لینے والا شخص حاجت مند اور ضرورت مند ہو تو اس کے لئے یہ سودی قرض لینا جائز ہے۔

۶۔ سرکاری امداد کی رقم حاصل کرنا اور استعمال میں لانا جائز ہے۔

۷۔ واسطہ بننے والے لوگوں کو ان کا محنتانہ دینا اور لینا دونوں جائز ہے۔

۸۔ ملنے والی رقم کا ایک خاص حصہ محنتانہ کے طور پر مقرر کرنا جائز ہے، لیکن بہتر ہے کہ متعین طریقہ پر ملنے والی رقم سے محنتانہ نہ مقرر کیا جائے، بلکہ صرف رقم کی ایک خاص مقدار متعین کی جائے، خواہ اس کی ادائیگی ایسی ملنے والی رقم سے کی جائے۔

۹۔ حکومت نے جب امداد کی پیشکش کی ہے تو امداد حاصل کرنا اس کا ایک حق ہو گیا، اب اس حق کی وصولی رشوت کے بغیر نہ ہو سکے تو رشوت دینا بھی جائز ہے۔

۱۰۔ امداد حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام لینا اور امداد حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

۱۱۔ سود ادا کرنے کی صورت میں ضرورت مند کو اور سود ادا نہ کرنے کی صورت میں ضرورت مند اور غیر ضرورت مند دونوں کو ایسی اسکیم سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

۱۲۔ اسکیم بھی حکومت ہی نے بنائی ہے اور بینک بھی حکومت ہی کے کنٹرول میں ہے اس لئے جس کو سود کہا گیا ہے وہ درحقیقت سود نہیں ہے، اس لئے ایسی اسکیم سے فائدہ اٹھانا ضرورت مند اور غیر ضرورت مند دونوں کے لئے جائز ہے۔

......☆......

[1] جامعہ اسلامیہ دار العلوم ملیا، کھگڑیا، بہار۔

عوام کی ترقی کے لئے جاری کردہ سرکاری اسکیمیں

مولانا محمد سلمان منصور پوری [1]

(۱) حکومت کے وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے، اور لی ہوئی رقم سے کم رقم ہی واپس کرنی ہوتی ہے، تو ایسے قرضوں کا لینا شرعاً درست ہے۔ اور یہ شرعی اصطلاح میں مقرض (حکومت) کی طرف سے ابراء اور تعاون کی ایک شکل ہے۔

''ومنها لو أبرأ الدائن مديونه من الدين الذي عليه سقطت الدين ولا تسمع الدعوىٰ به'' (شرح المجلة ۱/ ۴۰ رقم المادة: ۵۱ المكتبة الاتحاد ديوبند)۔

''إذا أبرأ واحدٌ آخر من حقٍّ، سقط ذٰلك الحق، ولا يبقىٰ له أن يدعي به إلىٰ قوله ہٰذا إذا كان الحق مما يسقط بالإسقاط كالدين'' (شرح المجلة ۲/ ۸۴۸ رقم المادة: ۱۵۶۲ المكتبة الاتحاد ديوبند)۔

(۲) اگر مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی کی شرط لگائی جائے، اور مقررہ مدت کے بعد صرف وصول کردہ رقم ہی واپس کرنی پڑے، زیادہ نہ دینا پڑے، تو یہ بھی جائز اور درست ہے، جس کی تائید اس فقہی جزئیہ سے ہوتی ہے:

''ومن له علىٰ آخر ألف درهمٍ، فقال: أدِّ إليَّ غدًا منها خمس مائة علىٰ أنك بريء من الفضل ففعل، فهو بريئٌ، فإن لم يدفع إليه خمس مائة غدًا عاد عليه الألف، وهو قوله أبي حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالىٰ'' (الهداية ۳/ ۲۵۲)۔

''إذا قال صالحتك من الألف علىٰ خمس مائةٍ تدفعها إلي غدًا، وأنت بريء من الفضل علىٰ أنك إن لم تدفع إلي غدًا فالألف عليك علىٰ حاله۔ وجوابه أن الأمر علىٰ ما قال؛ لأنه أتىٰ بصريح التقييد فيُعمل به'' (الهداية ۳/ ۲۵۲)۔

(۳) قرض کے معاملہ میں کل رقم کی واپسی کے شرط کے ساتھ مزید رقم ادا کرنے کی شرط لگانا باطل ہے: لہٰذا اس طرح قرض لے کر زائد رقم ادا کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

''وبالجملة فحرمة الزيادة المشروطة في القرض مجمعٌ عليها لا خلاف فيها من أحدٍ لكونها منفعةً قد جرها القرض'' (إعلاء السنن ۱۴/ ۵۰۰ كراچی)۔

''وأما القرض المشروط بالفضل والمنفعة إلىٰ قوله. قال الحنفية: يبطل الشرط لكونه منافيًا للعقد۔ ويبقى القرض صحيحًا۔ وقولهم: ببطلان الشرط لكونه منافيًا للعقد، فيه تصريحٌ بأن القرض إذا كان مشروطًا بالمنفعة يلزم منه انقلابه بيعًا۔ ولذا أبطلوا الشرط حفظًا للعقد عن الانقلاب إلىٰ قوله ومرادهم بكون القرض صحيحًا والشرط باطلًا أن المستقرض إذا قبض الدراهم التي استقرضها بالشرط يصير دينًا عليه، ولا تكون أمانةً غير مضمونة۔ وأما أن الإقراض والاستقراض بالشرط جائزٌ فكلَّا'' (إعلاء السنن ۱۴/ ۵۲۴ كراچی)۔

(۴-۵) قرض میں اصل رقم سے زیادہ رقم کا مطالبہ خواہ قلیل ہو یا کثیر؛ سود ہی میں داخل ہے، اُس کو سروس چارج یا اور کوئی نام دے کر سود کے حکم سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اور سوال میں جس طرح کی ضروریات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اگر اضطرار کے درجہ میں نہ ہوں، تو اُن سے اصل حکم میں کوئی تخفیف نہیں ہوسکتی۔

قال الله تعالىٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا [البقرة: ۲۷۵]۔

---

[1] خادم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد، یوپی۔

’’عن جابر بن عبد الله قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء‘‘ (صحيح مسلم ۲/ ۷۲ رقم: ۱۵۹۸، سنن الترمذي ۱/ ۲۲۹ رقم: ۱۲۰۶، مشكاة المصابيح، البيوع / باب الربا ۲۴۴، مرقاة المفاتيح ۶/ ۴۳ رقم: ۲۸۰۷ دار الكتب العلمية بيروت)۔

’’فالضرورة بلوغه حدًّا إن لم يتناول الممنوع هلك أو قارب، وهذا يبيح تناول الحرام‘‘ (الأشباه والنظائر ۲۵۲ زكريا جديد)۔

’’الضرورات تبيح المحظورات، ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة‘‘ (الأشباه والنظائر ۱۴۰ قديم)۔

’’ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح‘‘ (البحر الرائق ۶/ ۱۲۶ كوئٹه)۔

(۶) حکومت کی طرف سے شرائط کے مطابق ضرورت مند شہریوں کو جو نا قابل واپسی امداد جاری کی جاتی ہے، یہ حکومت کی جانب سے اپنے شہریوں کے تعاون کی ایک صورت ہے، اور مستحق لوگوں کے لئے اُن سے اِستفادہ کرنے میں شرعًا کوئی حرج نہیں ہے؛ البتہ جو لوگ امداد کے حکومتی معیار پر پورے نہ اترتے ہوں، اُن کے لئے اُس سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

’’عن سعيد بن زيد عن النبي ﷺ قال: من أحيىٰ أرضًا ميتة فهي له، وليس لعرق ظالم حقٌ‘‘ (سنن أبي داؤد ۲/ ۴۳۷)۔

’’المستفاد: من أحيىٰ بإذن الإمام ملكه، وإن أحياه بغير إذنه لم يملكه عند أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ‘‘ (الهداية ۴/ ۴۷۸ المكتبة الأشرفية ديوبند)۔

’’إذ لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي‘‘ (شامي، كتاب الحدود / باب التعزير، مطلب: في التعزير باخذ المال ۶/ ۱۰۶ زكريا، الفتاوىٰ الهندية، كتاب الغصب / الباب السابع، فصل في التعزير ۲/ ۱۶۷، البحر الرائق، كتاب الحدود / فصل في التعزير ۵/ ۶۸ زكريا، وهٰكذا في قواعد الفقه ۱۱۰)۔

’’عن ابن مسعود رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: من غشنا فليس منا، والمكر والخداع في النار‘‘ (المعجم الكبير للطبراني ۱۰/ ۱۳۸ رقم: ۱۰۲۳۴ مكتبة دار التراث العربي، الترغيب والترهيب مكمل ۴۰۰ رقم: ۲۷۴۲ بيت الأفكار الدولية)۔

(۷) جو غیر سرکاری شخص حسب شرائط امدادی رقوم حکومت سے دلوانے میں واسطہ بن کر محنت کرے، تو وہ مستحق سے بطورِ اُجرتِ وکالت متعینہ محنتانہ لینے کا مجاز ہے۔

’’قال في رد المحتار نقلًا عن البزازية: إجارة السمسار والمنادي والحمامي والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة، ويطيب الأجر الماخوذ لو قدر أجر المثل‘‘ (شامي / باب الإجارة الفاسدة ۶/ ۴۷ دار الفكر بيروت، ۹/ ۶۴، ۹/ ۸۷ زكريا)۔

(۸) اگر یہ شرط لگادی جائے کہ جو امدادی رقم ملے گی، اُسی میں سے اتنا حصہ بطورِ اُجرت دیا جائے گا، تو یہ معاملہ قفیز طحان کے حکم میں ہو کر ناجائز ہوگا؛ لیکن اگر صرف رقم طے کرلی جائے اور یہ شرط نہ ہو کہ ملنے والی رقم ہی سے اُس کی ادائیگی ہوگی تو یہ معاملہ جائز قرار دیا جائے گا۔

’’لو دفع غزلًا لآخر لينسجه له بنصفه أي بنصف الغزل أو استأجره بغلا ليحمل طعامه ببعضه أو ثورًا ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت في الكل؛ لأنه استأجره بجزء من عمله، والأصل في ذٰلك نهيه صلى الله عليه وسلم عن قفيز الطحان‘‘ (الدر المختار، كتاب الإجارة / باب الإجارة الفاسدة ۹/ ۷۹ زكريا، تبيين الحقائق / باب إجارة الفاسدة ۶/ ۱۲۷ زكريا)۔

(۹) مستحق شخص کو اگر امدادی رقوم اور جائز قرض کے وصول کے لئے سرکاری افسروں کو مجبوراً رشوت دینی پڑے تو اِس کی گنجائش ہے؛ لیکن افسران کے لئے رشوت لینا بہر حال حرام ہے۔

’’قال في الشامي: دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله أو لاستخراج حق له ليس برشوة،

یعني في حق الدافع'' (شامي، کتاب الحظر والإباحة / باب الاستبراء، فصل في البیع ۹/ ۶۴ زکریا)۔

''ومنها: إذا دفع الرشوة خوفًا علی نفسه أو ماله فهو حرام علی الآخذ غیر حرام علی الدافع، وکذا إذا طمع في ماله فرشاه ببعض المال، ومنها: إذا دفع الرشوة لیسوي أمره عند السلطان حل له الدفع ولا یحل للآخذ أن یأخذ'' (البحر الرائق / کتاب القضاء ۶/ ۲۶۲ کراچی، ۶/ ۴۴۱ زکریا)۔

''ارتشاء القاضي لیحکم وهو کذلك، ولو القضاء بحق؛ لأنه واجب علیه'' (شامي ۸/ ۲۴۳۵ زکریا)۔

(۱۰) امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام لینا اور غیر مستحق کو مستحق ثابت کرکے امداد یا قرض سے فائدہ اُٹھانا ہرگز جائز نہیں ہے، یہ سراسر خیانت اور دھوکہ میں شامل ہے۔

''عن أبي حمید الساعدي أن رسول الله قال: لا یحل لامرئ أن یأخذ مال أخیه بغیر حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم علی المسلم۔ وفي روایة: لا یحل للرجل أن یأخذ عصا أخیه بغیر طیب نفسه''۔ (المسند للامام أحمد ۵/ ۴۲، شعب الایمان للبیهقي ۴/ ۳۸۷ رقم: ۵۴۹۲، مجمع الزوائد ۴/ ۱۷۱۱۴۲ دار الکتب العلمیة بیروت)۔

''عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: لا یحل لمسلم أن یأخذ مال أخیه بغیر حق'' (مجمع الزوائد ۴/ ۱۷۱ دار الکتب العلمیة بیروت)۔...... ''عن ابن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ: من غشنا فلیس منا، والمکر والخداع في النار'' (المعجم الکبیر للطبراني ۱۰/ ۱۳۸ رقم: ۱۰۲۳۴ مکتبة دار التراث العربي، الترغیب والترهیب مکمل ۴۰۰ رقم: ۲۷۴۳ بیت الافکار الدولیة)۔

''عن أبي هریرة عن النبي ﷺ قال: آیة المنافق ثلاث: إذا حدث کذب، وإذا وعد أخلف، وإذا اؤتمن خان'' (صحیح البخاري، کتاب الایمان، باب علامة المنافق ۱/ ۱۰ رقم: ۳۳، مرقاة المفاتیح، باب الکبائر وعلامات النفاق ۱/ ۲۱۱ رقم: ۵۵ دار الکتب العلمیة بیروت)۔

(۱۱) مذکورہ اسکیموں میں اگر حکومت خود اپنی طرف سے سود ادا کرے اور مقروض کو اُس سے کچھ واسطہ نہ ہو، تو مقروض شرعاً اِس عمل کا ذمہ دار نہیں ہے؛ لیکن اگر مقروض کو تھوڑا یا زیادہ سود ادا کرنا پڑتا ہے تو اِس طرح کے سودی معاملہ سے استفادہ کرنا ناجائز اور گناہ ہوگا۔

''العبرةُ في العقود للمعاني لا للألفاظ والمباني'' (القواعد الفقهیة المحمودة/ ۲۳)۔... ''والمعنی هو المعتبر في هذه العقود؛ ولهذا ینعقد بالتعاطي في النفیس والخسیس، هو الصحیح'' (الهدایة ۳/ ۲ المکتبة الأشرفیة دیوبند)۔

''کل قرض شرط فیه الزیادة فهو حرام بلا خلاف'' (إعلاء السنن / رسالة کشف الدجی علی حرمة الربوا ۱۴/ ۵۱۸ إدارة القرآن کراچی)۔... ''کل قرض جر نفعًا حرام أي إذا کان مشروطًا'' (شامي ۵/ ۱۶۶ کراچی، ۷/ ۳۹۵ زکریا)۔

(۱۲) اگر یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ حکومت کی امدادی رقومات کا تعلق عوام سے حاصل کردہ انٹرسٹ اور سود ہی سے ہے، تو ایسی اسکیموں سے استفادہ کرنا کسی کے لئے حلال نہیں ہے۔ اور اگر یقینی طور پر معلوم نہ ہو؛ بلکہ صرف شبہ اور اندیشہ ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔

''أهدی إلی رجل شیئًا أو أضافه إن کان غالب ماله من الحلال فلا بأس، إلا أن یعلم بأنه حرام، فإن کان الغالب هو الحرام ینبغي أن لا یقبل الهدیة ولا یأکل الطعام... الخ'' (الفتاوی الهندیة، کتاب الکراهیة / الباب الثاني عشر ۵/ ۳۴۲)۔

......☆......

سرکاری اسکیموں سے استفادہ - سوالات اور ان کے جوابات

دار الافتاء جامعہ سلفیہ بنارس

(۱) قرض خواہ کا کچھ حصہ یا پورا کا پورا معاف کر دے دونوں ہی صورتیں جائز ہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

"وإن كان ذو عسرة فنظرة إلى ميسرة وأن تصدقوا خير لكم إن كنتم تعلمون" (سورہ بقرہ: ۲۸۰)

یعنی اگر کوئی تنگ دست ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہئے اور اگر صدقہ کر دو تو تمہارے لئے یہ بہت بہتر ہے اگر تمہیں علم ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''من أنظر معسرًا أو وضع عنه أظله الله في ظله'' (مسند احمد محقق: ۱۵۵۱۲)

یعنی جس نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا اس سے قرض معاف کر دیا تو اللہ تعالی اسے اپنے سایے میں سایہ عطا فرمائے گا۔

مذکورہ آیت کریمہ اور حدیث نبوی سے معلوم ہوا کہ پورے قرض کا معاف کر دینا بڑا کار ثواب ہے تو جب پورا قرض معاف کیا جا سکتا ہے تو اس سے کم تو بدرجۂ اولی معاف کیا جا سکتا ہے۔

(۲) یہ صورت بھی جائز ہے کیونکہ اس میں اصل رقم سے زائد نہیں لیا جاتا اور نہ ہی دیا جاتا ہے۔

(۳) اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) اگر قرض دار بلا کسی شرط و دباؤ کے زائد دے رہا ہو تو یہ صورت درست ہے جیسا کہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، ''وكان لي عليه دين فقضاني وزادني'' (بخاری: ۲۳۹۴) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر میرا کچھ قرض تھا، آپ نے مجھے وہ ادا کیا اور مجھے اس سے زائد بھی دیا۔ لیکن اگر یہ اضافہ باشرط ہو تو جائز نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ ایک حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

''وفيه جواز وفاء ما هو أفضل من المثل المقترض إذ لم تقع شرطية ذلك في العقد فيحرم ذلك اتفاقا، وبه قال الجمهور'' (فتح الباری ۵/ ۵۷) یعنی اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ قرض سے بہتر قرض کی ادائیگی ہو لیکن اضافہ کی شرط قرض میں پہلے سے نہ ہو ورنہ بالاتفاق حرام ہوگا، یہی جمہور کا موقف ہے۔

(۴) غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضے ہوں، مگر ان میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو یہ سود میں داخل ہے خواہ اس کا کچھ بھی نام دے دیا جائے جیسے سروس چارج وغیرہ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "كل قرض جر منفعة فهو ربا" یعنی ہر وہ قرض جو نفع لائے وہ سود ہے۔ یہ حدیث اگر چہ تمام طرق کے ساتھ ضعیف ہے جیسا کہ اس کی تمام سندوں پر علامہ البانی نے ارواء الغلیل میں (۱۳۹۸) میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، لیکن کچھ احادیث اس کی مؤید ہیں، ان میں سے ایک حدیث جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت ابو بردہ بن ابو موسیؓ سے روایت ہے کہ میں مدینہ منورہ آیا وہاں عبد اللہ بن سلام سے ملا، اس نے مجھ سے کہا تو ایسی جگہ سکونت پذیر ہے جہاں ادھار لینا عام ہے، پس جب کسی شخص پر حق ہو اور وہ تجھے بھوسا یا گھٹیا جو یا خشک گھاس رسی سے باندھ کر ہدیہ بھیجے تو تجھے چاہئے کہ اسے نہ لے یقیناً وہ سود ہے (بخاری: ۳۸۱۴) اس پر اجماع ہے جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے جواب میں حافظ ابن حجر کا کلام نقل کیا۔ اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے (مجموع الفتاوی ۲۹/ ۳۳۳)۔

(۵) اگر سرکار (قرض خواہ) کی طرف سے دیئے گئے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی ہو یا غیر معمولی ہو تو اس کا لینا دینا دونوں ہی سود میں داخل ہے اور یہ حرام ہے، کتاب و سنت میں اس کی بہت ہی مذمت ہے۔

(الف) ارشاد الٰہی ہے: "وأحل الله البيع وحرم الربوٰ" (البقرہ: ۲۷۵) یعنی اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔
یہاں مطلق سود کا ذکر ہے۔

(ب) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سود لینے والے، دینے والے، اس کے تحریر کرنے والے اور اس کے گواہوں پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ نیز فرمایا گناہ کے ارتکاب میں یہ سب مساوی اور برابر ہیں (بخاری: ۱۵۹۸)۔

(ج) سود کی حرمت پر اجماع ہے (موسوعۃ الاجماع ۱/۴۲۹)۔

(د) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سونے کے بدلے سونا، چاندی کے بدلے چاندی، گندم کے بدلے گندم، کھجور کے بدلے کھجور، نمک کے بدلے نمک برابر اور نقد بنقد فروخت کی جائے، پھر جو زیادہ لے اور زیادہ دے تو اس نے سودی کاروبار کیا۔ سود لینے اور دینے والے گناہ میں برابر ہیں (مسلم: ۱۵۸۴ بحوالہ فتاوی شیخ الحدیث ۲/۳۶۵)۔

(۶) ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے یہاں رہنے والے کے حقوق برابر ہیں اور حقوق کی برابری اس لئے ہے کہ یہاں کی ترقی وبام عروج تک پہنچانے کے لئے بھی کوشاں ہیں، ہم یہاں کی ترقی کے لئے ہر طرح کا تعاون کرتے ہیں، ہم یہاں سیل ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، سڑک ٹیکس، پانی ٹیکس وغیرہ سرکار کے خزانہ میں جمع کرتے ہیں، اس لئے اگر ہمیں سرکار مکان، بیت الخلاء اور تعلیمی ضروریات کے لئے بلا سود تعاون و مدد دیتی ہے تو اس کے لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ آخر ہم سرکار کی بنائی ہوئی سڑک، ٹیوب ویل اور کنوؤں وغیرہ سے فائدہ حاصل کرتے ہی ہیں، مکان، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے سرکاری تعاون لینا بہر حال جائز ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جب حکومت دی ہوئی رقوم واپس نہیں لیتی ہے، اگر یہ شبہ ظاہر کیا جائے کہ سرکاری خزانہ میں حلال وحرام مخلوط مال جمع ہوتے ہیں تو اس کا استعمال کیسے جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں جو سرکار کی طرف سے تعاون مل رہا ہے جو ہمارے حقوق ہیں اور اپنے حقوق کو حاصل کرنا جائز ہے خواہ سرکار جس مال سے دے۔

(۷) سرکاری امدادی رقوم حاصل کرنے کے لئے جن کو واسطہ بنایا گیا ہے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:
"من صنع إليكم معروفًا فكافئوه" (مسند احمد ۲/ ۶۸، ابوداؤد: ۶۷۲، نسائی، ابن حبان، حاکم وقال علی شرط الشیخین ووافقه الذهبی) یعنی جو تمہارے ساتھ بھلائی کرے اس کا بدلہ چکاؤ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب" (المائدہ: ۲) اور اسی طرح نبی ﷺ کا فرمان: "المسلمون على شروطهم فيما يحل" (الارواء: ۱۳۰۳)۔

(۸) جو واسطے بننے والے حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں یہ عمل شریعت کی نظر میں درست نہیں ہے، کیونکہ یہ رشوت خوری کے درجہ میں ہے اور رشوت دینا اور لینا دونوں ہی شریعت میں ممنوع ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "لعن الله الراشي والمرتشي في الحكم" (صحیح الجامع الصغیر: ۵۰۹۳) رشوت لینے والے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔ سرکار سے رقم حاصل کرنے کے لئے جو واسطہ بنا ہوا ہے وہ وکیل کے قائم مقام ہے اسے صرف اجرت مثل ملے گی اس سے زائد نہیں۔ علامہ محمد صالح العثیمین فرماتے ہیں:

"قال أهل العلم: يعطى الأقل من أجرته أو كفايته والصحيح أنه يعطى قدر الأجرة مطلقًا؛ لأنه يعطى للحاجة إليه، فيحسن قدر الأجرة مطلقًا، فإن كان قدر كفايته فقد كفته، وإن كان أقل من كفايته أخذ العمولة وأعطي لفقره" (الشرح الممتع ۶/۲۲۵) اسے ایک قسم کی دلالی بھی قرار دی جاسکتی ہے اور یہ دلالی اگر فریقین کی رضامندی سے ہو اور باہم دھوکہ اور کذب بیانی نہ ہو تو جائز ہے، ورنہ مکروہ (دیکھئے فتاوی علمیہ، زبیر علی زئی ۲/۲۲۲)۔

(۹) اسی طرح رقوم وقرض کے لئے رشوت لینا اور دینا دونوں ہی حرام ہے الا یہ کہ ضرورت ملجئہ ہو اور فقہاء نے جو اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے رشوت کو جائز قرار دیا ہے اس کا مفہوم مندرجہ ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

"إذا كان المدعي محقا يرى أن القاضي لا يحكم له بحقه ولا يدفع ظلم خصمه إلا بدفع الرشوة فلا بأس له في الدفع، وحرام على القاضي الأخذ، لأن الحكم بالحق ودفع الظلم وواجب عليه، لا يجوز له أن يأخذ عليه شيئًا"

(التفسير المظهري بحواله مجله فقه اسلامي. دوسرا فقهي سمينار ۱۹۸۹ء)۔
رشوت تو اس صورت میں لینا جائز ہے جب مال کسی مسلمان کی ملکیت میں آچکا ہو اور قبضہ بھی ہو چکا ہو اور اس کے متعلق ظلم کا خوف ہو یا اپنی آبرو یا جان کے متعلق ظلم کا خوف ہو جیسا کہ البحر الرائق میں مذکور ہے: ''إذا دفع الرشوة خوفًا على نفسه أو ماله فهو حرام على الآخذ غير حرام على الدافع. وكذا إذا طمع في ماله فرشاه ببعض المال'' (۷/ ۲۶۸)۔

(۱۰) امدادی رقوم یا قرض کے حصول کے لئے دروغ گوئی، کذب بیانی سے کام لینا اور اسی طرح سے قرض یا امداد سے فائدہ حاصل کرنا حرام ہے، اس لئے کہ اس میں دوسرے حق داروں کی حق تلفی ہے، ارشاد الٰہی ہے: ایک دوسرے کا مال نہ کھایا کرو، نہ حاکموں کو رشوت پہنچاؤ کہ کسی کا کچھ مال ظلم و ستم سے اپنا کرلیا کرو حالانکہ تم جانتے ہو (البقرہ:۱۸۸) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جس کسی کو اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ دوں تو وہ اسے نہ لے کیونکہ میں اس کے لئے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں (بخاری:۷/ ۶۹۶۷)۔

(۱۱) (الف) جن اسکیموں میں تعلیم یا کسی بھی مقصد کے لئے حکومت قرض دلاتی ہے اور جو سود اس پر عائد ہوتا ہے وہ پورا کا پورا مقروض کی طرف سے خود حکومت ادا کرتی ہے یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت ہی تھوڑا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا پڑتا ہے، ایسی اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنا شرعاً درست نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں سود دینا اور دلوانا لازم آتا ہے اور سود دینا جس طرح حرام ہے اسی طرح دلوانا بھی خواہ کم ہی کیوں نہ ہو۔

قال: ''يأتي على الناس زمان يأكلون فيه الربا، قيل: الناس كلهم يا رسول الله! فقال عليه الصلاة والسلام: من لم يأكله ناله غباره'' (الفتح الرباني لترتيب مسند احمد ۱۵/ ۶۹) اس حدیث میں کم سے کم ربا کی حرمت کی طرف اشارہ ہے۔

(ب) ''قال القرطبي أجمع المسلمون نقلًا عن نبيهم صلى الله عليه وسلم أن اشتراط الزيادة في السلف ربا ولو كان قبضة من علف كما قال ابن مسعود أو حبة واحدة'' (۳/ ۲۱۴)۔

(ج) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ألا إن كل ربا من ربا الجاهلية موضوع لكم رؤوس أموالكم لا تظلمون ولا تظلمون'' (سنن ابی داؤد)

(د) ''كل قرض جر نفعًا فهو ربا'' تقدم تخريجه۔

حکومت کی طرف سے جو سود ادا کیا جاتا ہے وہ درحقیقت مقروض کو تعاون دینا ہے اور اس مقروض کا تعاون لینا ہے اور یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: "وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ: ۲)۔

اسی لئے شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ مبارک پوریؒ لکھتے ہیں: حکومت وقت غریبوں کو قرض دے کر اوپر اٹھانے کی جو بھی اسکیم بناتی ہے وہ سودی لین دین سے خالی نہیں ہوتی اسی لئے ایسی اسکیم سے مسلمانوں کے لئے فائدہ اٹھانا ٹھیک نہیں ہے (فتاویٰ شیخ الحدیث ۲/ ۳۶۸)۔

(۱۲) حکومت وقت کا بعض اسکیموں کے تحت کوئی محفوظ فنڈ قائم کرنا پھر اس کو بینک میں ڈپازٹ کرنا اور اس کے انٹرسٹ سے رقمیں وصول کرنا اور اس سے مستفیدین کی مدد کرنا سراسر غلط ہے۔ اس لئے کہ اس طریقہ کار سے حرام مال (سود) کے ذریعہ تعلیمی ورفاہی اداروں اور اشخاص کی مدد کی جاتی ہے اور مدد لی جاتی ہے اور یہ تعاون علی الاثم والعدوان ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تعاون علی البر والتقویٰ کا تو حکم دیا ہے مگر تعاون علی الاثم والعدوان کا نہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ:۲)

اور ایک حدیث حضرت ابوسعید وابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر میں عامل بنا کر بھیجا، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عمدہ کھجور لایا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہیں؟ تو اس نے جواب دیا نہیں اے اللہ کے رسول مگر ہم نے اس میں سے ایک صاع کھجور دو صاع کے بدلے اور دو صاع تین صاع کے بدلے میں خریدا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس طرح نہ کرو، بلکہ ردی کھجور کو درہم سے بیچ لو پھر درہم کے ذریعہ عمدہ کھجور خرید لو (بخاری:۲۲۰۱) اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وکالہ کی صورت میں ظلم وعدوان پر تعاون دینا ولینا حرام ہے، غرضیکہ وکیل کو کسی کام کا انجام دینا درحقیقت موکل کا انجام دینا ہے، بہرحال اس صورت میں سود پر تعاون لینا اور دینا ہے اس لئے یہ صورت جائز نہیں ہے۔ نیز جو افراد واشخاص اسے استعمال کرتے ہیں وہ درحقیقت سود ہی استعمال کرتے ہیں اور یہ جائز نہیں۔ ......☆......

سرکاری فلاحی اسکیمیں اور ان سے انتفاع کی حیثیت

مولانا بدر احمد مجیبی [1]

(۱) وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جب حکومت اپنے دیے ہوئے قرض کا ایک حصہ خود معاف کر دیتی ہے اور مقروض کو قرضے کی رقم سے کم ہی واپس کرنا ہوتا ہے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ وہی صورت ہے جس کو فقہ میں ''ابراء عن الدین'' کہتے ہیں۔ یہ جائز ہے۔

''كذلك لو قال أحد: ليس لي قبل فلان دين أو أبرأت فلانًا من ديني أو تركت ديني الذي على فلان أوجعلت ديني على فلان حلالًا له يكون إبراءًا عامًا من المطلوب، فلا تسمع دعوى هذا الدين'' (درر الحكام شرح مجلة الاحكام ۴/ ۶۲)۔

جس طرح پورے دین سے ابراء درست ہے، اسی طرح دین کے بعض حصے سے بھی ابراء درست ہے، باقی کی ادائیگی لازم ہوتی ہے۔ اس لئے جب حکومت اس اسکیم میں قرض کا کچھ حصہ خود معاف کر رہی ہے اور اس میں سود کی صورت بھی نہیں ہے تو ایسے قرض لینا جائز اور درست ہے۔ حکومت کی معافی کے بعد بقیہ قرض کی ادائیگی لازم ہوگی۔

(۲) معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس صورت کا کیا حکم ہے جب کہ لی ہوئی رقم سے زیادہ واپس نہ کرنا پڑے؟

یہ ''ضع وتعجل'' والا مسئلہ ہے۔ یعنی دین مؤجل میں دائن مدیون سے کہے کہ اگر تم قرض جلدی ادا کر دو تو قرض میں سے اتنا حصہ کم کر دوں گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک لاکھ کا قرض ہے اور قرض کی مدت تین مہینے کی ہے۔ دائن مدیون سے کہتا ہے کہ اگر تم ایک مہینے میں قرض ادا کر دو تو ہم اس میں سے پچیس ہزار معاف کر دیں گے۔ ۷۵ ہزار ہی دینا ہوگا۔ اس کو فقہاء کرام ناجائز قرار دیتے ہیں۔ مبسوط میں ہے۔

'' قال: وإذا كان لرجل على رجل دين إلى أجل وهو من ثمن مبيع فحط عنه شيئًا على أن يعجل له مابقي فلاخير فيه، ولكن يرد ما أخذ، والمال كله إلى أجله، وهو مذهب عبد الله بن عمر رضي الله عنهما، وكان زيد بن ثابت رضي الله عنه يجوّز ذلك، ولسنا نأخذ بقوله، لأن هذا امقابلة الأجل بالدراهم، ومقابلة الأجل بالدراهم ربا۔ ألا ترى أن في الدين الحالّ لو زاده في المال ليؤجله لم يجز، فكذلك في المؤجل إذا حط عنه البعض ليعجل له ما بقي''۔ (المبسوط للسرخسي ۱۶/ ۷۵)۔

''ولا تجوز الوضيعة من الدين على تعجيله على المشهور، وتسمى هذه المسألة عند الفقهاء ''ضع وتعجل''۔ وصورتها أن يكون لرجل على آخر دين إلى أجل مثل أن يكون عليه مائة درهم إلى شهر، فيقول له: رب الدين عجل لي خمسين وأنا أضع عنك خمسين'' (الثمر الداني في الفقه المالكي ص۵۰۷)۔

لیکن چونکہ یہ معاملہ حکومت کی طرف سے عوام کو سہولت دینے کا ہے۔ اس میں سود لینے یا دینے کا مقصد نہیں ہے، اس لئے اس کا جواز ہو سکتا

---

[1] صدر مدرس المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء، پھلواری شریف، پٹنہ

ہے۔ خاص طور سے جب اس میں سود دینا اور لینا لازم نہیں ہوتا، اس لئے یہ جائز ہے۔

(۳) اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

یہ صورت جائز نہیں ہے کیونکہ اس میں سود دینا لازم ہوگا اور سود لینا دینا حرام ہے۔

''أحل الله البيع وحرم الربا'' (البقرة: ٢٧٥)۔ ''كل قرض جر نفعًا فهو ربا'' (حديث)۔

البتہ اگر لینے والے کو ظن غالب ہے کہ وقت مقررہ میں وہ قرض ادا کردے گا تو وہ لے سکتا ہے، وہ قرض لے کر مقررہ مدت میں ادائیگی کردے۔ لیکن اگر اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ وقت مقررہ پر قرض ادا نہیں کرسکا تو مجبوری میں زائد رقم دے سکتا ہے اور اس پر توبہ واستغفار کرے۔ اللہ تعالی سے اس کی معافی کی امید ہے۔

(۴) غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلاسکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرے میں آئے گا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت کی گنجائش ہوگی؟

اگر قرض کی واپسی میں اصل قرض سے زائد دینا پڑے، مگر وہ زائد رقم مقدار کے اعتبار سے بہت کم ہو جس کو سروس چارج پر محمول کیا جاتا ہو یا کیا جاسکتا ہو تو اس کو سود کے بجائے انتظامی اخراجات میں شمار کیا جاسکتا ہے اور اس کی اجازت ہوگی۔

(۵) اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ واضح رہے کہ یہ قرض مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

یہ واضح طور سے سود ہے۔ جس کی شناعت معلوم ہے، اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے شدید مجبوری کے بغیر ایسے قرض لینا جس میں سود دینا پڑتا ہو حرام ہے۔

اگر ضرورت شدیدہ ہے تو اس کی اباحت ہوسکتی ہے۔ وہ بھی بقدر ضرورت اباحت ہوگی۔

''فمن اضطر في مخمصة غير متجانف لإثم فإن الله غفور رحيم'' (المائدة: ٣)۔

''الضرورات تبيح المحذورات۔ المشقة تجلب التيسير۔ الضرر يزال۔ الضرورة يتقدر بقدرها'' وغیرہ قواعد۔

(۶) ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملتی ہے۔ مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصہ کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

ایسی امداد جو عوام کو مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر یا تعلیمی ضروریات کے لئے دی جاتی ہیں اور بطور اعانت ہوتی ہیں، ان کی واپسی بھی نہیں ہوتی، ان کو حاصل کرنا اور ان کو استعمال کرنا جائز اور درست ہے۔ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

'' القاعدة: تصرف الإمام على رعيته منوط بالمصلحة'' (الاشباه والنظائر للسيوطي وابن نجيم المصري)۔

'' قال الفقيه ابو الليث رحمه الله تعالى: اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان. قال بعضهم: يجوز مالم يعلم أنه يعطيه من الحرام۔ قال محمد رحمه الله تعالى: وبه نأخذ مالم نعرف شيئا حراما بعينه، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله وأصحابه'' (الهندية: ٥/ ٣٤٢)۔

(۷) گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم جس قسم کی بھی ہوں ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور دوڑ بھی ہوتی ہے کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کے مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

یہ اجارہ کی صورت ہے۔ اس میں واسطہ بننے والے کی حیثیت اجیر مشترک کی ہوتی ہے۔ کام کرنے پر اجیر مشترک اجرت کا مستحق ہوتا ہے۔ چونکہ واسطہ بننے والے نے اپنی محنت و کوشش سے اس کام کو مکمل کرایا ہے، اس لئے کام کرانے والے کے لئے محنتانہ یعنی اجرت لینا جائز ہوگا۔ اسی طرح اس کو اجرت دینا بھی جائز ہوگا۔ البتہ اس میں اجرت متعین ہونی چاہئے تاکہ بعد میں نزاع کی صورت نہ پیدا ہو۔

"قالت: إن أبي يدعوك ليجزيك أجر ما سقيت لنا" (قصص: ۲۵)۔

"أعطوا الأجير أجره قبل أن يجف عرقه" (حدیث نبوی: ابن ماجة، باب أجر الأجراء)۔

"عن أبي هريرة وأبي سعيد قالا: من استأجر أجيرا فليعلمه أجره" (مصنف ابن أبي شيبة ۲/ ۳۰۲)۔

"(الأجراء على ضربين: مشترك وخاص. فالأول من يعمل لا لواحد) كالخياط ونحوه (أو يعمل له عملا غير موقت) كأن استأجره للخياطة في بيته غير مقيد بمدة كان أجيرا مشتركا. وإن لم يعمل لغيره (أو موقتا بلاتخصيص) كأن استأجره ليرعى غنمه شهرا بدرهم كان مشتركا۔ ولايستحق المشترك الأجر حتى يعمل كالقصار ونحوه" (الدر المختار، باب ضمان الاجير)۔

(۸) بعض واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

یہ حکومت کی طرف سے غریب کو ملنے والی امدادی رقم ہے۔ اس میں واسطہ بن کر کام کرانے والے کو اجرت مثل سے زیادہ لینا جائز نہیں ہوگا۔ ورنہ سرکاری افسران کی ملی بھگت سے ساری رقم ایسے ہی افراد لے لیں گے اور غریب بے چارہ کو بہت معمولی حصہ ملے گا جس سے حکومت کا امداد وتعاون کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ البتہ اگر اس کا قوی اندیشہ ہو کہ اس رقم کا کچھ حصہ نہ دینے پر پوری امدادی رقم ہی نہیں ملے گی تو اس کے لئے کچھ حصہ چھوڑ کر باقی رقم لینے کی بات طے کرنا جائز ہوگا۔

(۹) اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

یہ رشوت ہے، اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہے۔ رشوت لینے اور دینے والوں پر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ البتہ رشوت نہ دینے سے کسی کا حق مارا جا رہا ہے، رشوت کے بغیر اس کا صحیح کام بھی نہیں ہو سکتا ہے تو اس کے لئے مجبوری کے تحت فقہاء کرام نے اپنا حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینے کی اجازت دی ہے، لیکن اس وقت بھی لینے والے کے لئے اس کی حرمت باقی رہے گی۔ اس لئے اس صورت میں رشوت دے کر اپنی امدادی رقم نکلوا سکتا ہے۔

"عن عبدالله بن عمرو قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي" (ابوداؤد، ترمذی)۔

"إذا دفع الرشوة خوفا على نفسه أو ماله فهو حرام على الآخذ. غير حرام على الدافع" (البحر الرائق، كتاب القضاء ۶/ ۲۸۵)۔

"كما إذا اضطر إلى دفع الرشوة لإحياء حقه جاز له الدفع وحرم على القابض" (رد المحتار ۵/ ۷۲)۔

(۱۰) امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط و معیارات متعین ہیں، اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقے پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

امدادی رقوم حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقے سے امداد یا قرض حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔ غلط بیانی کرنا ویسے بھی گناہ

کا کام ہے۔ دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر حاصل کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ اس لئے حکومت نے امدادی رقوم حاصل کرنے کے لئے جن شرائط و معیار کو لازم قرار دیا ہے ان کو پورا کئے بغیر غلط بیانی کر کے امداد حاصل کر لینا جائز نہیں ہوگا۔

''لایجوز التصرف فی مال غیره بلا إذنه ولا ولایته'' (الدرالمختار، کتاب الغصب)۔

(۱۱) بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے۔ اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے یا اس کا بڑا حکومت حصہ ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

وہ صورت جس میں پورا انٹرسٹ خود حکومت ادا کرتی ہے اور قرض لینے والے کو صرف قرض کی رقم واپس کرنی ہوتی ہے یہ جائز ہے۔ یہ حکومت کی طرف سے تعاون اور امداد ہے۔ اس میں قرض لینے والے کو سود بھی دینا نہیں پڑتا ہے۔ اس لئے یہ جائز اور درست ہے۔

وہ صورت جس میں قرض لینے والے کو سود کا کچھ حصہ دینا پڑتا ہے یہ عام حالت میں جائز نہیں ہے۔ البتہ مجبوری کی صورت میں اس کی اجازت ہوسکتی ہے۔

(۱۲) بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر دیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اس سے تعلیمی یا رفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے۔ گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے تو کیا ایسی صورت درست ہوگی؟

ایسی اسکیموں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ کیونکہ اس سے استفادہ کرنے والوں کو حکومت خود دے رہی ہے، وہ خواہ اپنے خزانے سے دے یا بینک کے ذریعہ دے، ایسے بینک بھی جس میں حکومت ڈپوزٹ کرتی ہے عام طور سے حکومت کے ہی ہوتے ہیں۔ ملکیت کی تبدیلی سے بھی حکم بدل جاتا ہے۔

''والأصل فی ذلک ماروی أن بریرة کانت تهدی إلی الرسول صلی الله علیه وسلم وهی مکاتبة ماکان یتصدق به علیها، وکان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقبل هدیتها، ویأکل وکان یقول: ''لها هی صدقة ولنا هدیة'' فقد جعل تبدل الملک بمنزلة تبدل العین'' (المحیط البرهانی ۴/ ۱۶۱)۔

......☆......

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی بابت اکیڈمی کا سوالنامہ اور جوابات

مدرسہ جامعہ عربیہ سلم العلوم کالٹیرہ، ضلع بناس کانٹھا

ربا ایک معاشرتی لعنت ہے جس کی اقتصادی تباہ کاریوں نے ہمیشہ ہی سے غربت کے لہو سے سرمایہ داری کی آبیاری کی ہے اور غربت کے سسکتے وجود سے سرمایہ دار کی ہوش کو غذا بخشی ہے، اسی وجہ سے خداوند قدوس نے بھی ایسوں کے دلوں کو ہلا دینے والا چیلنج کیا ہے، "فأذنوا بحرب من الله ورسوله" (سورہ بقرہ: ۲۷۹) اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کم وبیش چالیس حدیثیں اس کی مذمت پر مشتمل ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ربا کو وجود پذیر ہوئے اتنا طویل زمانہ گزر چکا کہ اس کی جڑوں کو کھود کر پھینکنا اور معاشرہ ومعیشت کو اپنے احاطہ میں اس طرح لے لیا ہے کہ اس سے نکلنا بہت ہی دشوار ہوگیا ہے، اس کے باوجود ایسے دیندار ہر زمانہ میں رہے جنہوں نے اختیاری درجہ تک اس لعنت سے بچنے اور دور رہنے کی مکمل کوشش کی اور نتیجہ کے طور پر اگر کچھ لوگ ناکام رہے تو کچھ کامیاب بھی ہے اگر چہ عصر حاضر میں ملکی اعتبار سے ایمان والے بعض ایسی مشکلوں کے شکار ہے جس نے اختیار کو اضطرار سے بدل دیا ہے، اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ اہل افتاء پیدا ہونے والی نئی شکلوں کے سلسلہ میں متفقہ طور پر کوئی ایک راہ عمل متعین کر کے امت کو اس سے باخبر کریں۔

چنانچہ حکومت کی طرف سے دی جانے والی اسکیموں اور قرضوں میں عامۃً سود شامل ہوتا ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ سود کی مذمت کے بارے میں قرآن وحدیث اور اقوال فقہاء کی روشنی میں کچھ باتیں سپرد قرطاس کی جائیں۔

سودی معاملہ اور سودی لین دین یہ نص قطعی حرام ہے، قرآن واحادیث میں بہت وعیدیں آئی ہیں، ارشاد خداوندی ہے: "أحل الله البيع وحرم الربو" (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔ نیز ارشاد فرمایا: "يمحق الله الربا ويربي الصدقات" (سورہ بقرہ: ۲۷۶)۔ تو جس چیز کو اللہ مٹاتے ہے اس کو اختیار کرنا کیا یہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت ومقابلہ نہیں ہے؟ اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فأذنوا بحرب من الله ورسوله" (سورہ بقرہ: ۲۷۹) جس کو اللہ اور اس کا رسول "جنگ کا اعلان" دیں اور باز نہ آئے تو اس کا خاتمہ بخیر ہوسکتا ہے؟

احادیث میں بھی سودی لین دین پر بہت سخت وعیدیں آئی ہیں اختصار کے پیش نظر صرف ایک حدیث پر اکتفا کرتا ہوں جو بہت ہی سخت ہے،

"عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الربوا سبعون جزءًا أيسرها أن ينكح الرجل أمه"

دوسری ایک حدیث موقع کے حساب سے ہے کہ جس بستی میں زنا اور سودی لین دین پھیل جاتا ہے اس بستی والوں نے اللہ کے عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیدی یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے بحوالہ معارف القرآن۔

مندرجہ بالا ارشادات خداوندی اور احادیث نبوی سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ سودی معاملہ قطعاً حرام ہے، اس کا مرتکب سخت گنہ گار فاسق باغی سرکش ہے اور سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے۔

ان نصوص کے پیش نظر شرعاً سودی معاملہ کی قطعاً اجازت نہیں ہے، دار الحرب میں بھی امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا مذہب عدم جواز کا ہے اور علماء محققین اور محتاط حضرات نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، البتہ اضطرار اور حد درجہ کی حالت میں، جبکہ ہلاکت نفس کا خوف ہے جس طرح بقدر

ضرورت مردار کھا کر اپنی جان بچانے کی اجازت ہے، اسی طرح فقہاء نے اضطرار اور حد درجہ کی احتیاج اور شدید مجبوری کی صورت میں، جبکہ قرض وغیرہ ملنے کی امید نہ ہو تو بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت ہے، ضرورت سے زیادہ لینا درست نہیں ہے۔

''وفی القنیة والبغیة: یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر، البحر الرائق)۔

اس موقع پر یہ بات مکمل پیش نظر رہنی چاہئے کہ سودی قرض لینے کی اجازت حد درجہ کی مجبوری اور شدید احتیاج کی صورت میں ہے، زیب وزینت محض کاروبار کی ترقی اور اپنی خواہش پوری کرنے کو ضرورت اور احتیاج کا عنوان دینا سخت دھوکہ دہی اور بے ہودہ تاویل ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت اور حاجت وغیرہ کی شرعی تعریف نقل کردی جائے۔

''جواہر الفقہ'' میں حضرت مفتی شفیع صاحبؒ ضرورت اور حاجت کی تعریف فرماتے ہیں:

(۱) ضرورت، (۲) حاجت۔

(۱) ضرورت کی تعریف یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کریں تو یہ شخص ہلاک ہوجائے یا قریب الموت ہوجائے، یہی صورت اضطراری کی ہے، اسی حالت میں حرام اور ممنوع چیز کا استعمال حلال ہوجاتا ہے۔

(۲) حاجت کے معنی ہیں اگر وہ ممنوع چیز کا استعمال نہ کریں تو وہ ہلاک تو نہ ہو، البتہ مشقت اور تکلیف شدید ہوگی یہ صورت اضطراری کی نہیں ہے، اسی لئے اس کے واسطے نماز روزے طہارت وغیرہ میں احکام میں رعایت اور سہولتیں ہوگئی ہیں، مگر اسی حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوگی۔

مندرجہ بالا ضرورت اور حاجت کی تعریف سے یہ ثابت ہوا کہ حرام چیز ضرورت اور اضطرار ہی کی حالت میں بقدر ضرورت جائز الاستعمال ہوتی ہے، لہٰذا سود جو بہ نص قطعی حرام ہے اضطرار اور مجبوری یہی حالت میں بقدر ضرورت جائز الاستعمال ہوگا، اس لئے جو شخص اضطرار اور ضرورت میں مبتلا ہو وہ اپنی حالت کسی مفتی یا ماہر عالم کے سامنے پیش کرے اور اجازت ملنے پر بقدر ضرورت استعمال کرے۔

سودی معاملہ سے بچنے میں ہی مسلمانوں کی ترقی ہے گو بظاہر تنزلی ہو جو قوم بے ہودہ تاویلوں سے حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز کرنے میں کوشاں ہوں وہ کسی صورت میں ترقی نہیں کرسکتی مسلمانوں کی عزت وبلندی عمدہ معیار زندگی میں ہیں، بلکہ تقوی اور پرہیزگاری میں ہے (فتاوی رحیمیہ)۔

مندرجہ بالا تمہید سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں اور واضح ہوگئی کہ جن سرکاری اسکیموں میں سود ہے وہ اسکیمیں اور جن امدادی قرضوں میں سود ہے وہ تمام شکلیں بغیر کسی شدید مجبوری اور اضطراری حالت کے درست نہیں ہے، اگرچہ ظاہر میں مسلمانوں کی پستی اور انحطاطی نظر آرہی ہے، البتہ مسلمانوں کی بہبودی اور کامیابی اس میں مضمر ہے کہ ان کو شریعت کے احکام کا پابند رکھا جائے۔

اب ہر شکل کا جواب الگ لگا جارہا ہے:

(۱) جائز ہیں اس میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہے۔

(۲) یہ شکل بھی جائز ہے۔

(۳) اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنی پڑے تو یہ شکل سود میں داخل ہونے کیوجہ سے ناجائز ہے ہاں البتہ اگر کسی شخص کو پورا اعتماد اور یقین ہے کہ وہ رقم کی بھرپائی مقررہ مدت میں کردے گا تو اس کو اجازت ہوسکتی ہے۔

(۴، ۵) سروس چارج، یعنی بینک کا عملہ جو حساب کتاب یا حفاظت وغیرہ کی ذمہ داری سنبھالتا ہے ان کی اجرت بینک ادا کرتا ہے اور پھر بینک میں رقم

جمع کرنے والوں (قرض خواہ) یا بینک سے قرض لینے والے (قرض دار) پر تناسب سے تقسیم کرتا ہے تاکہ ہر ایک اس میں شریک ہوجائے اور سب مل کر اس عملہ کی اجرت ادا کردیں تو اصل مسئلہ احتیاج کا ہے جو اس عمل کا محتاج ہے اس کے ذمہ اجرت آئے گی اور بنظر غائر دیکھا جائے تو احتیاج دونوں طرف سے ہے بینک اس معنی میں محتاج ہے کہ لوگوں کی رقوم سے تجارت کر کے نفع حاصل کرتا ہے اور جمع کرنے والا بھی محتاج ہے کہ ان کے رقوم کی حفاظت ہورہی ہے، نیز وہ اپنی ضرورت کی وجہ سے بینک کے دروازوں پر حاضر ہوئے بینک نے دعوت پیش نہیں کی تھی، لہٰذا بینک کا سروس چارج بجا ہے، فتاوی دار العلوم زکریا کے اس جواب سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ غیر معافی والے اور معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ جو سروس چارج کہلا سکتا ہو لینے کی گنجائش ہوسکتی ہے، ہاں البتہ سروس چارج جس کو انتظامی خرچ پر محمول نہ کی جاسکے تو پھر یہ سود کے دائرہ میں داخل ہو کر ناجائز ہوگا، چاہے یہ قرض مختلف جانوروں کے پالنے یا مکان کی تعمیر کاشتکاری یا باغبانی کی ضروریات کے لئے ہو اور اس میں سودی شکل ہو تو کسی شدید مجبوری اور اضطراری حالت کے درست نہیں ہے۔

(۶) گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی رقوم جس میں کسی طرح کا غرر، دھوکہ سود شامل نہ ہو صرف اعانت کے طور پر ہو تو اس کے لینے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

(۷، ۸) گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی رقوم میں جو لوگ واسطہ بنتے ہیں اور وہ محنت کرتے ہیں تو وہ لوگ مطلوبہ محنتانہ لے سکتے ہیں۔

(۹) اگر کوئی شخص واقعتاً مجبور ہو اور اس کو اس قسم کے امدادی قرضوں کے اصول کے لئے اگر رشوت دینے پڑے تو کراہت خاطر کے ساتھ اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے (مختلف کتب فقہ)۔

(۱۰) اس قسم کی امدادی رقوم کے حصول کے لئے اگر حکومت کی طرف سے کچھ شرائط اور معیارات متعین ہو تو اس میں غلط بیانی سے کام لینا درست نہیں ہے۔

(۱۱) اس صورت میں ظاہراً کوئی قباحت نظر نہیں آرہی ہے۔

(۱۲) اگر حکومت کسی بینک سے قرض دلاتی ہے اور اس میں بینک کی حیثیت توکل کی ہے اور قرض لینے والا وکیل ہے اور اس صورت میں پورا انٹرسٹ حکومت پر عائد ہوتا ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر حکومت کی حیثیت ضامن کی ہے تو یہ صورت درست نہیں ہے، اور اگر انٹرسٹ کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا حصہ خود کو ادا کرنا پڑتا ہے تو یہ دونوں صورتیں درست نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اوپر دی گئی تمام شکلوں میں سے جن شکلوں میں ربوا پایا جاتا ہے وہ صورتیں قطعاً درست نہیں ہے ہاں البتہ جن میں سود نہیں ہے وہ صورت بلا شبہ جائز ہے۔



سرکاری اسکیموں سے متعلق چند سوالات کے جوابات

مفتی اعجاز الحسن بانڈے القاسمی[1]

خالق ارض وسماء نے مخلوقات عالم میں اشرف المخلوقات حضرت انسان کو یہ امتیاز بخشا ہے کہ وہ دنیا کی اس مختصر زندگی میں نظام چلانے کے لئے عقل وخرد کا بھرپور استعمال کرے جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے ہر دور کا انسان زمانہ ماضی کے مقابلے میں ترقی یافتہ قرار پایا ہے، انسان نے تمام شعبہ ہائے حیات کے لئے نت نئے راستے تلاش کئے ہیں خاص طور پر معیشت کو مضبوط تر بنانے کے لئے بے شمار وسائل معاش ڈھونڈ نکالے گئے یہ کوشش انفرادی سطح پر یقینا ہوئی، اجتماعی اور حکومتی سطح پر اس جانب خاص توجہ دی گئی یہ بات تقریبا طے ہے کہ اگر حکومتی کارندے اہل اسلام سے تعلق رکھتے ہوں اور عوام کی اکثریت بھی قرآن وحدیث کو اپنا نمونہ مانتی ہو تو حکومت حلال وحرام کی رعایت رکھے گی، جائز وناجائز کا پیمانہ ضرور مدنظر ہوگا اور مسلمان ہونے کے ناطے ان کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے:

اور موجودہ حالات میں اکثر مسلم ملکوں کی یہی شبیہ سامنے آرہی ہے اب جبکہ اہل حکومت کافر ومشرک ہوں اور عوام کی اکثریت بھی غیر مسلم ہی ہو تو حلال وحرام کی تمیز کی جائے گی اس کی توقع رکھنا بھی عبث ہے۔

ملک ہندوستان جو اپنے دعوؤں کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ اس ملک میں رہنے والے کثیر المذاہب ہیں مذاہب کے تنوع میں حقیقت کے اعتبار سے دو قسمیں نکل کر آتی ہیں "مسلمان"، یعنی قرآن وسنت کو اصل سرمایہ حیات ماننے والے، "غیر مسلم"، یعنی منکرین قرآن وسنت۔

ہندوستان میں مسلمان دوسری بڑی اکثریت ہے جس کو ہم بڑی اقلیت کا نام بھی دے سکتے ہیں اور عوام کی اکثریت وہی غیر مسلم کہلاتی ہے، جہاں تک زمام اقتدار کا تعلق ہے تو وہ بھی غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہی ہے۔

اس بڑی جمہوریت کے غیر مسلم حکمراں ملک کی معیشت کو مضبوط تر بنانے کے لئے کسی بھی طبقے کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ وہ اپنا معاشی نظام اکثریتی طبقے کو نظر انداز کر کے صرف اقلیتی طبقۂ اہل ایمان کی ترقی کے لئے مرکوز کریں جب اکثریتی طبقہ غیر مسلم برادری کا ہے کہ جن کے نزدیک حلال وحرام کا کوئی قابل ذکر پیمانہ ہے ہی نہیں تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنا معاشی نظام قرآن وسنت کی روشنی میں مرتب کریں گے۔

غیر مسلم برادری کا یہ کردار تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ وہ ترقی کی راہوں میں حلال وجائز کو رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہتے ہیں زمانہ نبوت میں بھی سود بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مروج تھا جس شدت کے ساتھ سودی نظام رائج تھا اسی شدت کے ساتھ قرآن وسنت نے اس پر تنبیہ فرمائی:

"یا أیھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا إن کنتم مؤمنین، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ ورسولہ" (البقرۃ: ۲۷۹-۲۸۰)

(اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود باقی ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم مؤمن ہو، اگر تم اس پر عمل نہ کرو (یعنی سود چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو) تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے)۔

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کی سب سے خوفناک آیت وہ ہے جو سود خوروں کے متعلق نازل ہوئی ہے، جس میں اہل ایمان کو اس آگ سے ڈرایا گیا جو خصوصیت کے ساتھ اہل کفر کے لئے تیار کی گئی ہے (تفسیر روح المعانی)۔

مشہور تابعی محدث وقت حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں سب سے زیادہ ڈرانے والی آیت یہی ہے جس میں اللہ نے

---

[1]

سود خوروں کے خلاف اعلانِ جنگ فرمایا ہے، سیدنا حضرت سعید بن جبیرؓ، سیدنا حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالی سود خوروں سے فرمائیں گے، میرا تمہارے خلاف اعلان جنگ تھا تو آج اپنے ہتھیار لے آؤ تا کہ تم سے جنگ ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس معاشرے میں تاج نبوت سے سرفراز فرمائے گئے اس میں دیگر قسم قسم کی خرابیوں میں سے ایک بدترین خرابی سودی لین دین بھی تھا، چنانچہ عرب معاشرے کے تقریباً ہر قبیلے میں عام سودی قرضوں کے لین دین کے ساتھ تجارتی قرضوں میں بھی سودی لین دین کا سلسلہ قائم تھا انھی قبائل میں سے ایک قبیلہ بنوثقیف تھا۔ اسی قبیلۂ بنوثقیف کے ذمہ دار حضرت عباسؓ و حضرت خالدؓ کی کوئی سودی رقم باقی تھی۔ اسی طرح سے کچھ دوسرے قبائل وانسانوں کے ایسے سودی تقاضے سامنے آئے کہ اللہ تعالی نے ان معاملات کے پس منظر میں یہ حکم نازل فرمایا کہ اب تک جو کچھ ہو گیا، ہو گیا اب آئندہ اس کی اجازت نہیں ہے، لہٰذا یکسر یہ سودی معاملہ چھوڑ دو، ورنہ اعلان جنگ ہے اور بذات خود جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرمایا

''إن أمور الجاهلية موضوع تحت قدمي هذا وأول ربًا أضع ربا عباس فإنه موضوع كل'' (مسلم شریف)

(خوب سمجھ لو جاہلیت کی تمام رسمیں میرے پاؤں کے نیچے روندی گئیں اور زمانۂ جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا اور سب سے پہلا سود جو چھوڑ دیا گیا وہ ہمارے چچا عباس بن عبدالمطلب کا ہے وہ معاف کر دیا گیا)۔

قرآن مقدس کی سلسلہ وار نو آیات نے تو سود کی حرمت کا اعلان کر ہی دیا ہے، جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے چالیس احادیث وارد ہوئیں جن سے سود اور اس طرح کے معاملات کی حرمت وشناعت مزید مؤکد ہوئی جن کا فائدہ یہ نکلا کہ اس وقت کا پورا معاشرہ اور مکمل معاشی نظام سود سے پاک وصاف ہو گیا۔

سود جسے اسلام میں حرام قرار پایا ہے قوم یہود کے لئے بھی اس کی حرمت نازل ہوئی تھی قرآن فرماتا ہے:

"وأخذهم الربا وقد نهوا عنه" (النساء: ۱۶۱) (اور ان یہودیوں کا سود لینا بھی ایک جرم تھا، حالانکہ ان کو اس سے روک دیا گیا تھا)۔

بنی اسرائیل کو بھی اس سے منع کیا گیا تھا، چنانچہ بائبل میں متعدد آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سود یہود ونصاری کے دین میں بھی ممنوع تھا، ملاحظہ ہو سود کے متعلق ''ایک تاریخی فیصلہ'' (از مولانا محمد تقی عثمانی صاحب / ۵۲)۔

بلکہ سود تو درحقیقت ہندو مذہب میں بھی حرام رہا ہے، چنانچہ حضرت مولانا عبیداللہ اسعدی صاحب نے اپنی محققانہ کتاب ''الربا'' میں لکھا ہے۔ داراشکوہ نے ایک پنڈت سے پوچھا کیا اہل ہنود کے لئے سود حلال ہے؟ اس نے جواب میں کہا اہل ہنود کے لئے سود کا لینا حرام سے بھی زیادہ برا ہے، پھر سوال کیا کہ پھر وہ سود لیتے کیوں ہیں جواب میں اس نے کہا رواج پا گیا ہے اور یہ رواج بھی اس کے نقصان سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ہے۔

جن مذاہب کا اوپر ذکر کیا گیا یہ وہ مذاہب ہیں جو تقریباً سب سے زیادہ مشہور ومعروف ہیں، یعنی اسلام، ہندومت، یہودیت اور نصرانیت، اگر دیکھا جائے تو پوری دنیا کی غالب اکثریت انھی مذاہب کے ماننے والوں پر مشتمل ہے، لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس موجودہ دنیا کی غالب اکثریت اپنے نظریات اور مذہبی تعلیمات کی بنا پر سود کی حرمت کی ہی قائل ہے، مگر عملاً معاملہ اس کے برعکس ہے، اس وقت کا پورا معاشی نظام تقریباً بنک کاری کے ذریعہ رواں دواں ہے، یہودیت تو شروع سے ہی سودی نظام کی دلدادہ رہی ہے، بلکہ وہ پورے عالم کو اس کی لپیٹ میں لینا چاہتے ہیں نصاری کو انہوں نے اپنے قبضے میں لے ہی لیا ہے۔ اہل ہنود بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے میں عافیت محسوس کرنے لگے ہیں اور مسلمانوں کا وہ طبقہ جو سودی نظام کی مضرت سے قطعاً ناواقف اور دوسری طرف سے مغرب سے شدید حد تک متاثر، بلکہ مغرب سے آنے والی ہر صدا پر آمنّا وصدقنا کی صدائے نیاز بلند کرنے والے ہیں ان ہی کی پیروی میں خوش وشاداں دکھتے ہیں۔

فقہاء کی ذمہ داری:

اس صورتحال میں فقہاء کرام اور علماء کرام کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ باریک بینی سے تمام نکات پر نظر رکھیں اور حرام وحلال کے درمیان ایک واضح حد فاصل کھینچیں، ورنہ وہی زمانہ جاہلیت کی طرح "إنما البيع مثل الربا" (سورہ بقرہ: ۲۷۵) کا منظر دیکھنے کو ملے گا اور پوری امت مسلمہ جو پوری کائنات کے لئے سفینۂ نجات ہے سود کے دلدل میں غرقاب ہو جائے گی۔

محترم قارئین کرام! ملک ہندوستان کے ارباب اقتدار ہمیشہ سے اس کوشش میں رہے ہیں کہ پورا ملک معاشی اعتبار سے روز افزوں ترقی کی منزلوں کو طے کرتا جائے، اس سلسلہ میں ملک ہندوستان کا کمزور طبقہ کس طرح آگے بڑھ سکتا ہے کئی طرح کی اسکیمیں رائج کی گئی ہیں، مگر پریشانی وہی ہے کہ چونکہ ارباب اقتدار غیر مسلم ہیں وہ صرف ترقی چاہتے ہیں، حلال وحرام کے جھنجھٹ میں پھنسے بغیر بس اور بس ترقی ہونی چاہئے، ان اسکیموں میں سے کچھ تو اقلیتی طبقات خاص کر مسلمانوں کے لئے مختص ہوتی ہیں، یہ اسکیمیں نقدی رقم کی صورت میں بھی مروج ہیں جنسی شکل میں بھی، یعنی صنعت وحرفت کی قبیل سے، ان اسکیموں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ بعض اسکیمیں وہ ہیں جن کے ذریعہ سے امداد واعانت مقصود ہے، یعنی انسان کو نفع ملے گا بغیر کسی اجرت وعوض کے اور بعض اسکیمیں وہ ہیں جن میں رقم بطور قرض ملے گی اس میں بھی پھر یہ تقسیم ہے کہ بعض قرضہ کی رقوم مکمل مگر قسطوں میں واپس کرنی پڑتی ہیں اور بعض پر سبسڈی فراہم کی جاتی ہے جس میں قرض کا ایک حصہ یکسر معاف کردیا جاتا ہے اور بعض قرضے اس طرح کے ہوتے ہیں کہ کثیر المیعاد ہونے کی بنا پر ان رقوم پر سود کے نام سے زائد رقم لی جاتی ہے، کبھی یہ رقم عام بنک کاری سودی نظام کے مثل ہوتی ہے اور کبھی اس میں تھوڑی بہت رعایت برتی جاتی ہے اور بنک کی بہ نسبت کم رقم بطور سود ادا کرنی پڑتی ہے بہر کیف ان اسکیموں اور قرضہ کی رقوم سے استفادہ کی کون سی شکلیں جائز ہیں اور کون سی ناجائز، سوالوں کی ترتیب سے جواب پیش خدمت ہے:

سوال نمبر ۱: وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

حکومت اگر کوئی رقم بطور قرض دے اور واپسی کے لئے اس لی ہوئی رقم میں سے کچھ کم ہی واپس ادا کرنی پڑے تو یہ قرض ہونے کے ساتھ ساتھ تعاون کی ایک شکل ہے جس میں بغیر کسی کراہت کے انتفاع جائز اور درست ہے اور آیت کریمہ "یا أیها الذین آمنوا إذا تداینتم بدین إلی أجل مسمی فاکتبوه" (البقرہ: ۲۸۲) کے دائرہ میں داخل ہوکر ایسا معاملہ کرنا جائز اور درست ہے۔

سوال نمبر ۲: مقررہ مدت میں واپسی والے قرضے کا حکم جن میں زائد رقم نہ دینا پڑے؟

ظاہر سی بات ہے اگر قرضہ میں لی ہوئی رقم کے بقدر ہی ایک متعینہ مدت تک واپس کرنا پڑ رہی ہے کچھ بھی زائد رقم نہیں دینی پڑ رہی ہے تو یہ شکل بلا کراہت جائز ہے اور حقیقت میں یہ امداد وتعاون کی ہی ایک قسم ہے، ضرورت مند کو ایسا قرضہ دینے پر تو احادیث میں بشارتیں آئی ہیں، حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ ایک آدمی جنت میں داخل ہوا تو اس نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ صدقہ کا اجر وثواب دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا (معجم طبرانی کبیر بحوالہ معارف الحدیث ۷/۴۹۵)۔

اس حدیث کو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے اس کے آخر میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا کہ قرض میں کیا خاص بات ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے تو جبرئیل نے بتایا کہ جس کو صدقہ دیا جاتا ہے وہ اس حالت میں بھی سوال کرتا ہے اور صدقہ لے لیتا ہے، جبکہ اس کے پاس کچھ ہوتا ہے اور قرض مانگنے والا جب ہی قرض مانگتا ہے جب وہ محتاج اور ضرورت مند ہوتا ہے۔

''عن أبي أمامة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم دخل رجل الجنة. فرأی علی بابها مکتوبًا الصدقة بعشر أمثالها والقرض بثمانیة عشر (رواه الطبراني فی الکبیر) فقلت یا جبرئیل ما بال القرض أفضل من الصدقة؟ قال لأن السائل یسئل وعنده والمستقرض لا یستقرض إلا من حاجة'' (جمع الفوائد)۔

لہٰذا قرض کی یہ صورت بلا کسی کراہت کے درست اور جائز ہے۔

سوال نمبر ۳: مقررہ مدت کے بعد ادائیگی والے قرضے جن زائد دینا پڑے:

اس سوال کا جواب تو بالکل واضح ہے کہ ''کل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا'' (السنن الکبری للبیهقي کتاب البیوع، باب کل قرض جر نفعًا: دار الفکر: ۱۱۰۹۲)۔

حدیث مبارک کی روشنی میں یہ زائد رقم سود ہے لینا بھی ناجائز ہے اور دینا بھی گناہ ہے، لہٰذا ایسے قرض سے احتیاط واجب ہے۔

سوال نمبر ۴: قرض پر لی جانے والی زائد رقم کو سروس چارج ماننا:

حقیقت اور اصل کے اعتبار سے تو کسی بھی حالت میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ سود دیا جائے یا سود لیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعیدات کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی ہے حضرت جابرؓ سے روایت ہے:

''لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء'' (مسلم شریف: ۵۱۰۸، ابوداؤد: ۳۳۳۳)۔

اگر ایک انسان اس درجہ مجبور ہو کہ ذرائع معاش بالکل مخدوش ہوں اور بنیادی ضروریات کھانا، کپڑا یہاں تک کہ رہائشی ضروریات کا بھی فقدان ہو اور ان کی تکمیل ناممکن نظر آتی ہو تو پھر اس کی گنجائش ہے کہ اس طرح کی رقم قرض لے لی جائے جس میں بہت ہی کم زائد رقم ادا کرنی پڑے، صاحب ''الاشباہ والنظائر'' علامہ ابن نجیم مصری رقمطراز ہیں:

''ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباه والنظائر/ ۱۱۵)
(ضرورت مند کے لئے نفع کے ساتھ (یعنی سود دے کر) قرض حاصل کرنا جائز ہے)۔

یہ اجازت تو عام سودی قرضوں میں منقول ہے، لیکن مسئلہ ہٰذا میں جو صورت حال مذکور ہے وہ ہے تو مختصر سی زائد رقم سروس چارج کے نام سے وصول کی جاتی ہے یا سروس چارج کے نام کے بغیر سروس چارج کے ہی بقدر یہ زائد رقم ہے، اس صورت حال میں اس مختصر زائد رقم کے ہوتے ہوئے قرض لینا جائز ہونا چاہئے کہ یہ انتظامی خرچہ جات کی مد میں داخل ہو کر سود کے نام سے بچ سکتی ہیں'' دارالعلوم دیوبند'' کے سابق صدر مفتی حضرت مولانا نظام الدین صاحبؒ ''نظام الفتاویٰ'' میں رقمطراز ہیں:

اس معاملہ کی توجیہ کی جاسکتی ہے کہ جزوی رقم جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت میں لی جاتی ہیں جس سے انتظام میں سہولت ہوتی ہے (نظام الفتاویٰ/ ۲۶۴)۔

لہٰذا اس جزوی زائد رقم کی شرط پر بوقت ضرورت شدیدہ قرض لینے کی اجازت ہوگی۔

سوال نمبر ۵: قرض پر لی جانے والی زائد رقم جسے سروس نہ کہا جاسکے کا حکم:

ظاہری بات ہے کہ اس صورت میں یہ سیدھا سودی لین دین ہے جو کسی بھی حالت میں جائز اور درست نہیں ہے قرآن وحدیث کی رو سے یہ حرام ہے اگر آدمی شدید مجبور ہے معاشی لحاظ سے بے حد پریشان ہے کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں بھکمری کی حالت ہے بچے واہل عیال بلبلا رہے ہیں تو پھر علامہ ابن نجیم مصریؒ کی ذکر کردہ عبارت کی روشنی میں اس کی گنجائش ہے کہ سود دے کر رقم قرض پر لے لی جائے اور جائز ضروریات کی تکمیل کر لی جائے۔

''ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباه والنظائر/ ۱۱۵) (بلا ضرورت اس کا سودی قرض لینا حرام اور ناجائز ہے)۔

سوال نمبر ۶: حکومت کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم سے استفادہ:

سرکار کی طرف سے کی جانے والی معاونت کسی بھی ضرورت کے لئے ہو اس سے استفادہ شرعاً جائز اور درست ہے، البتہ دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جس مد میں مدد کی جارہی ہے وہ رقم اسی مد میں صرف کی جائے۔

سوال نمبر ۸: حکومتی قرض کے حصول میں واسطہ بننے والے کا کمیشن:

اگر انسان خود محنت وکوشش کرے تو قانوناً امداد کے حصول میں اپنی طرف سے رقم خرچ نہیں کرنی پڑتی ہے، لیکن اس وقت کا معاشرہ زہر آلود ہے گناہوں کی معصیت دلوں سے نکل چکی ہے اگر خود مشقت سے بچتے ہوئے کسی اور کے واسطہ سے کاروائی کرائی جارہی ہے تو پھر محنتانہ اس کا حق بنتا ہے جو اس کے لئے لینا جائز ہے اور دینا بھی جائز ہے۔

سوال نمبر ۹: قرض حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کا حکم:

اگر ان امدادی رقوم کی حصولیابی مستحق ہونے کے باوجود ناممکن الحصول ہو تو بدرجہ مجبوری کچھ خرچ کر کے اپنا حق حاصل کرنا جائز اور درست ہے، ظاہر

ہے کہ لینے والا قطعاً گنہ گار نہ ہوگا۔ اس کے لئے کسی بھی طور اس کی گنجائش نہیں ہوگی کہ وہ یہ رشوت کی رقم لے، لیکن دینے والا چونکہ مجبور ہے اور اپنی ضروریات کو پوری کرنا اور حکومت کی امداد سے فائدہ اٹھانا رشوت دیئے بغیر ممکن نہیں بن پا رہا ہے، لہٰذا یہ دینا بدرجۂ ضرورت جائز ہوگا۔ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ پکڑ اور عذاب سے محفوظ رہے گا۔

سوال نمبر ۱۰: امدادی رقوم یا قرض کے حصول کے لئے غلط بیانی کا حکم:

جس حاجت یا ضرورت کے لئے کوئی فرد درخواست کر رہا ہے اگر وہ اس کی شرائط و معیارات کو پورا نہیں کر رہا ہے جھوٹ پر مبنی درخواست دے کر ان امدادی رقوم یا قرض سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اس طرح سے امداد وصول کرنا یا قرض لینا درست نہیں ہوگا، رشوت تو دور تحفۃً کچھ دینا بھی حرام ہوگا، کہ اس طرز عمل سے ضرورت مندوں کے حقوق پامال ہوں گے۔ بعض اوقات کٹر مسلم مخالف کچھ افراد جان بوجھ کر ایسی شرائط رکھ دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے اس سے استفادہ ممکن نہ ہونے پائے، جبکہ جن مقاصد کے تحت یہ امداد یا قرضہ دیا جا رہا ہے چند مسلم طبقوں میں وہ چیزیں و حاجات پائی جا رہی ہیں تو ایسی صورت میں اگر حقیقتاً کسی مسلمان میں یہ کمزوریاں موجود ہیں جو ان قرضہ جات یا امداد کی بنیاد ہے تو پھر ان مسلمانوں کے لئے جائز حدود کا خیال کرتے ہوئے ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوگی کہ ظاہری شرائط کے مقابلے میں مقاصد و نتائج پر نظر رکھتے ہوئے یہ درست قرار پائے گا اور اس کے لئے کچھ رشوت بھی دینی پڑے تو گنجائش ہوگی، ورنہ مستقبل میں ایک وقت آئے گا کہ مسلمان سماج سے اس طرح پچھڑ جائے گا کہ وہ اس قابل نہیں ٹھہرے گا کہ اس کا نام بھی لیا جا سکے۔

''ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه أو ماله حلال للدافع حرام على الآخذ. لأن دفع الضرر عن المسلم واجب ولا يجوز أخذ المال'' (شامی ۸/۳۵)۔

سوال نمبر ۱۱: ایسی اسکیم سے استفادہ جس میں سود حکومت ادا کرے:

تعلیمی قرضہ جات کے نام سے اگر حکومت اس کے انٹرسٹ کو خود ادا کرتی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ رقم درحقیقت قابل اور ذہین بچوں کے لئے حکومتی امداد کے حکم میں ہے جس سے مستحقین کے لئے استفادہ یقیناً جائز ہے، لیکن اگر مقروض کو انٹرسٹ کے نام سے کچھ رقم خود بھی ادا کرنی پڑتی ہے تو شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہوگی۔ حرام وسائل کو حلال کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ حلال وسائل کو تلاش کیا جائے یا حلال ذرائع کو پیدا کیا جائے۔

سوال نمبر ۱۲: حکومت کی طرف سے محفوظ فنڈ پر لیے جانے والے سود سے استفادہ کا حکم:

حکومت کی طرف سے یہ امداد مستحقین کے لئے ہوتی ہے اگر مستحق کو یہ پتہ ہے کہ اس مد میں انٹرسٹ کی رقم سے مدد کی جا رہی ہے تو بربناء مستحق اس کے لئے اس رقم سے استفادہ درست ہوگا، اگر حکومت مسلمانوں کی ہوتی تو پھر یہ مسئلہ قابل اعتراض بن سکتا تھا، مگر جب حکومت ہی غیر مسلموں کی ہے اور ان کے لئے انٹرسٹ و غیر انٹرسٹ میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تو اس طرح کے فنڈس قائم کرنے کے بعد ان رقوم سے مستحقین کی مدد بھی جائز ہوگی اور مستحقین کے لئے استفادہ بھی درست ہوگا۔ ملک ہندوستان میں تو اس کی بھی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو ان اسکیموں سے متعارف کرایا جائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمان ان سے مستفید ہوں، تا کہ پسماندگی کا کچھ مداوا ہو سکے۔

......☆......

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی مختلف صورتوں کے احکام

مفتی محمد ابو بکر قاسمی[1]

مختلف قسم کی سرکاری اسکیموں کے ذریعہ عوام جو جو رقوم مہیا کرائی جاتی ہیں ان کا تعلق امداد و اعانت کے قبیل سے ہو یا قرض سے متعلق ہو اگر کوئی ضرورت مند ان سے مستفید ہوتا ہے تو شرعاً ان سے استفادہ ضرورت مندوں کے لئے مطلقاً جائز ہے، رہا غیر ضرورت مندوں کا ان سے مستفید ہونا تو اگر اس اسکیم میں کوئی غیر شرعی کام نہیں کرنا پڑتا تو جائز ہے ورنہ جائز نہ ہوگا۔

مذکورہ اصول کی روشنی میں فقہ اکیڈمی دہلی کے مرسلہ سوالوں کا جواب ذیل میں تفصیل سے لکھا جاتا ہے:

(۱) معافی والے قرض کا شرعی حکم:

قرض کی وہ صورت جس میں قرض کی رقم کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور قرض کی گئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرض کا لینا تمام لوگوں کے لئے جائز ہے، فقہاء نے قرض کی اس قسم کا ذکر ذیل میں لکھا ہے، چنانچہ "الفقہ الاسلامی وادلتہ" کی نویں جلد میں ہے:

"الابراء إسقاط الدائن ماله فی ذمة المدیون من دین کثمن مبیع أو دین قرض" (ص ۳۷۷)۔

مشروعیة الإبراء ثابتة بالآیة الکریمة: "وإن کان ذو عسرة فنظرة إلی میسرة وأن تصدقوا خیر لکم" والتصدق ھٰھنا بمعنی الإبراء، وجاء فی الحدیث: "ضع الشطر من دینك" (رواہ البخاری کتاب الصلوۃ باب رفع الصوت فی المساجد حدیث ۴۷۱ وباب التقاضی والملازمة فی المسجد حدیث ۴۵۷)۔

(۲) مقررہ مدت میں قرض کی واپسی پر کچھ معافی کا حکم:

معافی والے قرض میں اگر یہ مشروط ہو کہ مقررہ مدت میں قرض کی واپسی پر ہی معافی ملے گیا تب بھی اس قسم کا قرض لینا بلاشبہ جائز ہے جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے، جیسا کہ حدیث نبوی ہے: "ضع الشطر من دینک" (بخاری کتاب الصلوۃ حدیث ۴۵۷، ۴۷۱)۔

(۳) مقررہ مدت کے بعد قرض کی واپسی پر قرض سے زائد رقم دینا:

اگر قرض میں یہ مشروط ہو کہ مقررہ مدت کے بعد قرض کی واپسی کی صورت میں قرض میں لی ہوئی رقم سے زائد واپس کرنا ہوگا، تو زائد رقم شرعاً سود ہے اور حدیث نبوی "کل قرض جر نفعا فھو ربوا" میں داخل ہے تاہم اس صورت سود کھانے کا گناہ نہ ہوگا بلکہ سود دینے کا گناہ ہوگا، تاہم ضرورت مند کے لئے اس قسم کا قرض لینا شرعاً جائز ہوگا، جیسا کہ "الاشباہ والنظائر" میں ہے: "یجوز بالاستقراض بالربح للمحتاج" (الاشباہ للحموی / ۹۲)، یہ جواز کا فتوی "الضرورات تبیح المحظورات" کے قبیل سے ہے، اور ضرورت مند شخص کے لئے ہے، غیر ضرورت مند کے لئے نہیں۔

(۴) معافی یا غیر معافی والے قرض میں اصل سے زائد رقم کو سروس چارج قرار دے کر جائز کہنا:

قرض خواہ معافی والا ہو یا غیر معافی والا ہو، اگر اس میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو اور شرح سود کم رکھی گئی ہو اس کو سروس چارج قرار دیا جائے یا انتظامی خرچ قرار دیا جائے یا قرض کے فارم کی قیمت قرار دیا جائے تو اگر وہ فکس رقم ہو گھٹے بڑھے نہیں تب تو مذکورہ توجیہ درست ہو سکتی ہے،

[1] مہتمم جامعہ رحیمیہ اسلام آباد رحمت نگر برہم پور، دربھنگہ بہار۔

لیکن اگر قرض کی واپسی میں جلدی یا تاخیر کے سبب اس کی مقدار گھٹتی بڑھتی ہو تو پھر وہ زائد رقم شرعاً سود قرار دی جائے گی، ہاں اگر زائد رقم غرباء وفقراء پر خرچ کی شرط کے ساتھ وصول کی جائے اور مقروض نے قرض لیتے وقت اس شرط کو تسلیم کرلیا ہو تو مالکیہ کے مسلک کی رو سے ایسا کرنا شرعاً درست ہے، چنانچہ حضرت مولانا محمد تقی صاحب نے فقہی مقالات کی پہلی جلد میں اس صورت کو جائز لکھا ہے، اور اسلامی بینکنگ کے نظام کو چست و درست رکھنے کے لئے اس صورت کو اپنانے کا مشورہ دیا ہے، (ملاحظہ ہو بحث ''ادائے دین میں ٹال مٹول کے نقصان کا عوض مقرر کرنا'' فقہی مقالات جلد اول ص ۱۲۰ تا ۱۳۳ رسالہ قسطوں میں خرید وفروخت)۔

''وأما إذا التزم أنه إن لم يوفه حقه في وقت كذا فعليه كذا، وكذا لفلان أو صدقة لمساكين، فهذا هو محل الخلاف المعقود له هذا الباب. فالمشهور أنه لا يقضى به، كما تقدم. وقال: ابن دينار يقضى به'' (تحرير الكلام في مسائل الالتزام /۱۷۶ بحواله فقهي مقالات ۱/ ۱۳۱)۔

(۵) دیئے گئے قرض کی واپسی میں زیادہ شرح سود مقرر کرنا:

بینک سے قرض کی رقم جو دی گئی ہے اس کی واپسی میں سروس چارج سے زیادہ رقم حصول کرنا اور واپسی میں جلدی یا تاخیر کے سبب رقم میں کمی زیادتی کرنا شرعاً سود ہے، اور حدیث نبوی ''كل قرض جر نفعًا فهو ربا'' میں داخل ہے (معرفة السنن للبيهقي)۔

شیخ وہبہ زحیلی نے ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں لکھا ہے:

''القرض الذي جرّ منفعة، قال الحنفية في الراجح: عندهم كل قرض جر نفعًا حرام إذا كان مشروطًا. فإن لم يكن النفع مشروطًا أو متعارفًا عليه في القرض، فلا بأس به'' (۴/ ۵۱۵)۔

اور حاشیہ میں حدیث ''كل قرض جر نفعًا'' کے متعلق لکھا ہے: ''إسناده ساقط معناه صحيح تؤيده قواعد الشريعة'' (حوالہ بالا)۔

حکومت کی طرف سے جو مختلف قسم کے قرضے جانوروں کے پالنے، مکان تعمیر کرنے کاشتکاری وباغبانی کرنے یا دیگر کاروبار کرنے کے لئے دیئے جاتے ہیں، پریشان قسم کے لوگ اور قرض کے محتاج وضرورت مند لوگ اس قسم کے قرض سے مستفید ہوسکتے ہیں جیسا کہ حضرات فقہاء نے صراحت کی ہے

''يجوز الاستقراض بالربح للمحتاج''۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ فرماتے ہیں:

''وأجاز الحنفية أيضًا للمحتاج الاستقراض بالربح، وذلك مثل أن يقترض شخص عشرة دنانير مثلًا ويجعل لصاحبها من الربح شيئًا معلومًا في كل يوم ربحًا خاصًا به، ومن الواضح أن هذا التعامل يختلف عن الاقتراض بفائدة محددة مشروطة لا تتاثر بالخسارة والربح'' (الفقه الاسلامي وادلته ۹/ ۵۹۲)۔

(۶) سرکار کی طرف سے دی گئی امدادی رقم کا شرعی حکم:

مکان بنانے یا بیت الخلاء تعمیر کرنے یا تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لئے جو امدادی رقم سرکار اپنے شہریوں کو بطور امداد واعانت کے دیتی ہے اور پھر اسے واپس نہیں لیتی ہے تو اس قسم کا عطیہ قبول کرنا بھی عوام کے لئے جائز ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کا ہدیہ قبول کیا ہے، چنانچہ امام بخاریؒ نے ''کتاب الھبۃ باب قبول الھدیۃ'' کے تحت لکھا ہے:

''قال أبوحميد: أهدى ملك أيلة للنبي بغلة بيضاء'' (بخاري، حديث نمبر: ۲۶۱۶ كتاب الهبه باب ۲۸)۔

(۷) سرکار کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کے لئے واسطہ بننے والے کو محنتانہ دینے کا حکم:

گورنمنٹ کی طرف سے جو امدادی رقوم بیت الخلاء بنانے یا مکان تعمیر کرنے کے لئے ملتی ہے جس کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، آمدورفت میں بھی صرفہ ہوتا ہے، اس لئے جو شخص رقوم دلانے میں واسطہ بنے ان کو ان کا مطلوبہ محنتانہ دینا اور واسطہ بننے والے کا محنتانہ قبول کرنا

شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ وہ واسطہ خود اس سرکاری ادارہ کا باتنخواہ ملازم نہ ہو، کیونکہ سرکاری ملازم کا محنتانہ وصول کرنا رشوت میں داخل ہے، اور کسی دوسرے کا واسطہ بننا شرعاً دلالی اور سمسرہ ہے جسے فقہاء نے جائز لکھا ہے، چنانچہ "الفقہ الاسلامی وادلتہ" کی چوتھی جلد میں ہے:

"السمسرة هي الوساطة بين البائع والمشتري لإجراء البيع والسمسرة جائزه والأجر الذي يأخذه السمسار حلال؛ لأنه أجر على عمل وجهد معقول اه" (الفقه الاسلامي ۴/ ۱۳۹)۔

(۸) قرض یا سرکاری امداد دلانے والے کو حاصل شدہ رقم کا کچھ حصہ دینا:

سرکاری امداد یا قرض دلوانے والے کو حاصل شدہ قرض والی رقم یا امداد والی رقم سے اس کا ایک مخصوص حصہ یا طے شدہ حصہ دینے یا لینے کا معاملہ کرنا اس کی سعی وکوشش کردینے کے سبب بطور محنتانہ کے شرعاً جائز ہے، چنانچہ فقہاء نے کفالت وکالت اور وساطت کی اجرت کو جائز لکھا ہے، چنانچہ شیخ وہبہ زحیلی نے "الفقہ الاسلامی وادلتہ" کی پانچویں جلد میں "أخذ الأجر على الكفالة في الوقت الحاضر" کے زیر عنوان لکھا ہے:

"إن شرط الكفيل تقديم مقابل أو أجر على كفالته، وتعذر على المكفول عنه تحقيق مصلحته من طريق المحسنين المتبرعين جاز دفع الأجر للضرورة أو الحاجة العامة لما يترتب على عدم الدفع من تعطيل المصالح كالسفر للخارج للدراسة" (۵/ ۵۰)۔

اسی طرح وکالت کی اجرت کے متعلق لکھا ہے:

"ومن المعلوم أنه يجوز أخذ الأجر على الوكالة" (الفقه الاسلامي ۵/ ۵۲)۔

اور دلالت ووساطت کی اجرت کے متعلق اوپر حوالہ گذر چکا ہے۔

"نقل الإمام البخاري في صحيحه في كتاب الشفعة في باب أجر السمسرة، ولم ير ابن سيرين وعطاء وإبراهيم والحسن بأجر السمسار بأسًا" (بخاری کتاب ۳۶ وباب ۱۴)۔

(۹) امدادی رقوم یا قرضوں کے حصول کے لئے رشوت دینے کا حکم:

دفع ظلم یا حصول حق کے لئے فقہاء نے رشوت دینے کو جائز لکھا ہے، لیکن رشوت کا لینا کسی حال میں جائز نہیں ہے، رہا رشوت دینے کا عمل تو یہ بھی موجب لعنت ہے، لیکن اگر حصول حق کی بغیر رشوت دیئے کوئی صورت نہ ہو اور رشوت دینے والا رشوت دینے پر مجبور ہو جائے تو مالکیہ اور حنابلہ نے جواز رشوت کا فتوی دیا ہے، چنانچہ الفقہ الاسلامی کی نویں جلد میں ہے:

"وأجاز ذلك كثير من فقهاء المالكية محتجين بقصة الملحقين الذين كانوا يسألون النبي صلى الله عليه وسلم من الصدقة، فيعطيهم وهم لا يستحقون. وهذه الصدقة هي: أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن أحدكم ليخرج بصدقته من عندي متأبطها (يعني تكون تحت إبطه)، وإنما هي له نارًا، قال عمر: يا رسول الله كيف تعطيه وقد علمت أنها له نار! قال: فما اصنع يأبون إلا مسألتي، ويأبى الله عزوجل لي البخل" (رواه ابي يعلى في الكبير ورجاله ثقات من حديث عمر وروى البخاري وأحمد نحوه ورجال احمد رجال الصحيح مجمع الزوائد ۳/ ۹۴، ۹۵) هذا دليل على أنه يجوز بذل المال مع اعتقاد الباذل عدم استحقاق المعطى له ويؤيده ما ذكرت سابقًا إن الله سبحانه أباح أغلب المحرمات عند الضرورة" (الفقه الاسلامي ۹/ ۵۲۲)۔

(۱۰) قرض یا امدادی رقوم کی مقررہ شرائط کی خلاف ورزی کر کے استفادہ کا حکم:

امدادی رقم یا قرض دینے کے لئے حکومت کی طرف سے جو شرائط ومعیارات متعین ہیں ان کی خلاف ورزی کر کے اور غلط بیانی سے کام لے کر غلط طریقہ سے فائدہ اٹھانا شرعاً جائز نہیں ہے، حدیث نبوی ہے:

''المسلمون عند شروطهم'' (رواه الحاكم عن انس وعائشه وه وحديث صحيح ورواه الحاكم وابوداؤد عن أبي هريرة بلفظ المسلمون على شروطهم وأخرجه الترمذى وابن ماجة من حديث عمرو بن عوف باللفظ الأخير، نصب الرايه ۴/ ۱۱۲)۔

جھوٹ بولنے والے کو قرآن کریم نے مستحق لعنت قرار دیا ہے، ارشاد ربانی ہے: "لعنة الله على الكاذبين" (سورہ آل عمران: ۶۱)۔

نیز حدیث نبوی میں وارد ہے کہ جھوٹ بول کر کاروبار کرنے سے برکت اٹھالی جاتی ہے۔

''عن حكيم بن حزام عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: البيعان بالخيار ما لم يتفرقا، فإن صدقا وبينا بورك لهما فى بيعهما وإن كتما وكذبا محقت بركة بيعهما'' (بخارى كتاب البيوع باب ما يمحق الكذب والكتمان فى البيع حديث ۲۰۸۲)۔

نیز حدیث نبوی میں سچائی کو موجب نجات اور کذب بیانی سبب ہلاکت کہا گیا ہے، چنانچہ امام بخاری نے اپنی صحیح کے کتاب الادب میں سچوں کے ساتھ رہنے اور جھوٹ بولنے کی ممانعت کا تذکرہ کرتے ہوئے کئی روایات نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے:

''عن عبد الله عن النبى صلى الله عليه وسلم إن الصدق يهدى إلى البر وإن البر يهدى إلى الجنة، وإن الرجل ليصدق حتى يكون صديقًا، وإن الكذب يهدى إلى الفجور وإن الفجور يهدى إلى النار، وإن الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذابًا'' (بخارى حديث ۶۰۹۴)۔

''عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وكذا، وعد أخلف، وإذا ائتمن خان'' (بخارى حديث ۳۳، ۲۶۸۲، ۲۷۴۹، ۶۰۹۵)۔

''عن سمرة بن جندب قال: قال النبى ﷺ: رأيت الليلة رجلين أتيانى قالا الذى رأيته يُشدّ شدقه، فكذّاب يكذب بالكذبة تحمل عنه حتى تبلغ الآفاق، فيصنع به إلى يوم القيامة'' (بخارى ۱۳۸۶، ۶۰۹۶، ۷۰۴۷ كتاب التعبير)۔

''عن عبد الله بن عمرو أن النبى صلى الله عليه وسلم قال: أربع من كن فيه كان منافقًا خالصًا ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها إذا ائتمن خان، وإذا حدث كذب، وإذا عاهد غدر وإذا خاصم فجر'' (بخارى ۳۴، كتاب الايمان باب علامة المنافق، كتاب المظالم باب ۱۸ حديث ۲۴۵۹، كتاب الخيريه/ ۳۱۷۹)۔

مذکورہ احادیث کی روشنی میں جھوٹ بول کر تو کوئی سرکاری فنڈ سے مستفید ہونا شرعاً جائز نہیں ہے، البتہ اگر فنڈ حاصل کرنے والا غریب اور نادار ہے تو اس کے لئے ہر قسم کا مال استعمال کرنا شرعاً درست ہے۔

(۱۱) تعلیم یا کسی اور مقصد سے حکومت کا بینک سے قرض دلا کر خود سود ادا کرنا یا خود مقروض کا تھوڑا سا سود ادا کرنا:

اگر حکومت کی کوئی اسکیم ایسی ہو کہ تعلیم یا کسی اور مقصد سے حکومت ضرورت مند کو بینک کے ذریعہ قرض دلوادے اور پھر خود حکومت ہی اس کا انٹرسٹ ادا کردے یا انٹرسٹ کا تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو دینا پڑے تو اس قسم کا قرض ضرورت مند شخص کے لئے لینا تو شرعاً جائز ہے، جیسا کہ حضرات فقہاء نے لکھا ہے: "یجوز الاستقراض بالربح للمحتاج"، رہا غیر ضرورت مند شخص کا اس قسم کی اسکیم سے فائدہ اٹھانا تو شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ بلاضرورت مقروض بننا بھی شرعاً کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے، حدیث نبوی میں گناہ کی طرح حضور اکرم ﷺ سے قرض لینے سے بھی پناہ مانگنا مذکور ہے، چنانچہ حضرت امام بخاریؒ نے کتاب الاستقراض باب من استعاذ من الدین کے تحت حضرت عائشہؓ کی سند سے یہ روایت نقل کی ہے؛

''عن عروة أن عائشة رضى الله عنها أخبرته أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يدعو فى الصلوة، ويقول: اللّٰهم إنى أعوذ بك من المأثم والمغرم، فقال له قائل: ما أكثر ما تستعيذ يا رسول الله! من المغرم.

قال: إن الرجل إذا غرم حدث فکذب، ووعد فأخلف'' (بخاری شریف ۲۲۹۷، ۸۳۲، کتاب الاذان باب الدعاء قبل السلام)۔

اس حدیث نبوی سے معلوم ہوا کہ جب انسان مقروض ہوتا ہے تو ادائیگی قرض وغیرہ سے متعلق کبھی جھوٹ بھی بولتا ہے اور کبھی وعدہ کر کے اس کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے گویا قرض لینا جھوٹ بولنے اور وعدہ خلاف کا پیش خیمہ ہے، لہٰذا نہ قرض لینے کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے اور نہ ہی قرض لینے کے بعد ادائیگی کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے اور نہ ہی بلاضرورت قرض حاصل کرنا کوئی پسندیدہ عمل ہے،

اللّٰھم احفظنا وأعذنا منه، آمین۔

(۱۲) خود حکومت کا بینک میں رقم فکس کر کے سود حاصل کرنا اور ملک کے ضرورت مندوں کی اس رقم سے مدد کرنا:

حکومت ہو یا کوئی فرد بینک میں اس لئے رقم فکس رکھے کے اس سے انٹرسٹ (سود) حاصل کر کے اپنے ملک کے باشندوں کی مدد کرے، یا اپنے یہاں قائم تعلیمی ورفاہی اداروں کا تعاون کرے تو ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے اس کے کاتب اور گواہ سب پر لعنت فرمائی ہے، اس لئے کوئی حکومت یا فرد کوئی ایسا کام کرے کہ جو شرعاً ناجائز ہو اور اس سے حاصل شدہ آمدنی اور سود سے لوگوں کا تعاون کرے تو شرعاً ایسا کرنا کسی کے لئے بھی جائز نہیں ہے، رہا کسی غیر مسلم حکومت نے ایسا کام کرنا اور پھر ضرورت مند لوگوں کی اس سے مدد کی تو ضرورت مند لوگوں کا اس قسم کی رقم سے مستفید ہونا شرعاً جائز ہے یا نہیں ہے تو میرے نزدیک جواز کا پہلو راجح ہے، کیونکہ غیر مسلم فروع کا مکلف نہیں اصول کا مکلف ہے،

''عن جابر: قال لعن رسول اللّٰہ صلی الله علیه وسلم: آکل الربا، وموکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء'' (رواہ مسلم کتاب المساقات باب الربا ۲/ ۲۷، بخاری کتاب البیوع باب مؤکل الربا، حدیث نمبر: ۲۰۸۶)۔

......☆......

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی شرعی رخصتیں

ڈاکٹر محی الدین غازی[1]

تمہید:

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں مسلم آبادی کا ایک بڑا حصہ شدت کے ساتھ اس بات کا ضرورت مند ہے کہ اسے اپنے مسائل کے دلدل سے نکلنے کے لئے کہیں سے مدد ملے۔

ایسے لوگوں کو سرکاری اسکیموں سے استفادہ کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نظر نہیں آتا، اور بحیثیت شہری ان اسکیموں سے استفادہ ان کا حق بھی ہے۔

لیکن مسئلہ کی سنگینی اس میں مضمر ہے کہ ایسی سرکاری اسکیمیں زیادہ تر سودی قرضوں کی صورت میں ہوتی ہیں، یہ ممکن ہے کہ ان سودی قرضوں میں سود کی شرحیں کم اور ادائیگی کی شرطیں آسان ہوں، لیکن کم شرح اور آسان شرطوں کے باوجود ان کے سودی قرض ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ایسی صورت میں تین راستے سامنے آتے ہیں:

ایک راستہ یہ ہے کہ سودی قرضے کی حرمت کی بنا پر ایسی اسکیموں سے استفادے کو ہر مسلمان کے لئے یکسر حرام قرار دے دیا جائے۔ لیکن یہ فتوی ان لوگوں کا مسئلہ حل نہیں کرتا جو ضرورت مند ہیں، اور ان کی حالت زار شرعی رخصت کی خواست گار ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ ایسے سودی قرضوں کے سود کو سروس چارج وغیرہ جیسے نام دے کر حلال قرار دے دیا جائے، یہ راستہ اس وقت بہت سارے لوگوں کو بہت آسان اور قابل عمل نظر آتا ہے، لیکن یہ ایک خطرناک راستہ ہے، اس سے سود کے حلال کرنے کے دروازے کھلتے ہیں، اور چونکہ سروس چارج طے کرنے کا کوئی متعین ضابطہ نہیں بن سکا اور نہ ہی بن سکتا ہے، اس لئے وہ دروازہ دھیرے دھیرے اتنا بڑا ہوجاتا ہے کہ اس میں سے بڑے بڑے سودی دیو گزرنے لگتے ہیں۔ سود کو کوئی اور نام دینا بہت غلط راستے کا انتخاب ہے، جس پر سختی سے روک لگنی چاہئے، ہندوستان کی بہت ساری غیر سودی سوسائٹیاں اور انجمنیں اس راستے پر بے دھڑک چل رہی ہیں۔ اور بیرونی ملکوں میں بہت سے اسلامی مالیاتی اداروں کے سروس چارج کے تعامل نے سود کی قباحتوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

تیسرا راستہ یہ ہے کہ سودی قرضوں کو حرام کہتے ہوئے، ضرورت مندوں کے لئے بقدر ضرورت رخصت کا راستہ نکالا جائے، یہی درست راستہ ہے، اور یہی قرآنی طریقہ ہے، قرآن مجید میں جگہ جگہ حرام کو پوری شدت کے ساتھ حرام کہا گیا ہے، اور اہل اضطرار کے لئے رخصت بھی ساتھ ہی ذکر کی گئی ہے۔ اس اسلوب کا اثر یہ رہا ہے کہ حرام حرام ہی رہا، اور رخصت رخصت ہی رہی، رخصت کی موجودگی کی وجہ سے کبھی حرام کی حرمت مسلمانوں کے دل سے نہیں نکلی۔ ہمیں زیر بحث مسئلہ میں بھی اسی راستے کو اختیار کرنا چاہئے۔

تیسرے راستے کو یہ کہہ کر بند نہیں کیا جاسکتا کہ بحالت ضرورت ومجبوری سودی قرض لینے کے بجائے مسلمان اللہ کی رازقیت پر توکل کرے، اور ان دروازوں پر دستک دینے کے بجائے رازق سے حلال رزق مانگے۔ اور ایسا نہ کرنا توکل کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس رازق نے بندوں کو اس پر بھروسہ کرنے اور اسی سے مانگنے کی تلقین کی ہے، اسی نے بحالت اضطرار اور بقدر اضطرار حرام چیزوں سے کام چلا لینے کی رخصت بھی دی ہے۔

---

[1] ممبر مجمع فقہاء الشریعۃ (امریکہ)، عمید کلیۃ القرآن الجامعۃ الاسلامیہ شانتاپرم (کیرلا)۔

تیسرے راستے، یعنی رخصت بحالت ضرورت اور بقدر ضرورت کے سلسلے میں یہ بات بھی سامنے رہے کہ یہ سود لینے کے سلسلے میں نہیں ہے، کیونکہ سود لینے کی اضطراری حالت ہوتی ہی نہیں ہے، یہ صرف سود دینے کے لئے ہے، اور اس میں نرمی کی گنجائش یہاں سے بھی نکلتی ہے، کہ قرآن مجید نے سود کے سلسلے میں شدید وعیدوں کا مخاطب سود لینے والوں کو بنایا ہے، سود دینے والوں کے سلسلے میں قرآن مجید میں ایسی کوئی وعید نظر نہیں آتی ہے۔ البتہ احادیث میں دونوں کے لئے وعیدیں ہیں۔ قرآن مجید کے اس اسلوب کی روشنی میں سود دینے کے لئے بحالت ضرورت اور بقدر ضرورت اجازت کا راستہ اختیار کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالوں کے مختصر جواب لکھے جاتے ہیں:

۱- وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب: اگر کسی شرط کے بغیر قرض دینے والا اپنی طرف سے کچھ حصہ معاف کردے یا معاف کرنے کا معاہدہ کرلے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

۲- معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے، جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

جواب: قرض دینے والے سے اگر یہ طے ہو کہ قرض کی واپسی متعین وقت پر ہونے کی صورت میں کچھ رقم معاف کردی جائے گی، اور تاخیر ہونے کی صورت میں پوری رقم ادا کرنا ہوگی، تو ایسی صورت میں یہ معاہدہ قرض درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ صورت ضع وتعجل والے مسئلے کے تحت آئے گی، جس کے سلسلے میں جمہور فقہاء سے ممانعت منقول ہے۔ لیکن بہرحال اس کے جواز کی گنجائش بھی موجود ہے، کیونکہ جواز کا قول بھی سلف سے منقول ہے۔ اس لئے اس معاملے میں نرم رویہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۳- اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: یہ صریح طور پر سودی قرضے کی صورت ہے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ اس صورت میں ہمارے فتوے کے مخاطب، یعنی ایسا قرض لینے والے کو سود لینا نہیں، بلکہ دینا ہے، اس لئے بحالت ضرورت اس کی گنجائش موجود ہے۔

۴- غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو؛ لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلاسکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرہ میں آئے گا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش ہوگی؟

جواب: سروس چارج کے سلسلے میں ایک شرط تو یہ ہے کہ وہ خاص اس قرض پر ہونے والے انتظامی خرچ کے بقدر ہو، اور دوسری شرط یہ بھی ہے کہ وہ متعین رقم ہو، جس کا رقم اور زمانے سے تعلق نہ ہو، اور اگر قرض کی مقدار اور زمانے دونوں سے تعلق ہوجائے تب تو اس کا سود ہونا اور زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ اس میں یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سود کی شرح کم ہے یا زیادہ۔ بلکہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس میں سود والا وصف ہے یا نہیں۔

یہ بات اس لئے بھی اہم ہے کہ اگر ایسی کسی زائد رقم کو جو دراصل سود ہی ہے، اگر سروس چارج قرار دے دیا جائے، تو وہ ہمیشہ کے لئے حلال قرار پاتی ہے۔ پھر یہ طے کرنا بھی بہت مشکل اور ایک طرح سے اضافی ہوجاتا ہے، کہ کتنی رقم کو سروس چارج کہا جائے، اور لوگ بڑی بڑی زائد از قرض رقمیں دھڑلے کے ساتھ سروس چارج کے نام پر وصول کرتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں اگر سود کو سود ہی کہا جائے، اور قاعدہ ضرورت کے تحت مستحق افراد کے لئے رخصت رکھی جائے، تو اس کا سود ہونا بہرحال لوگوں کو محتاط رکھنے کے لئے معاون ہوتا ہے۔

سود کو سروس چارج کہہ کر مستقل طور پر حلال کر دینا منکرات جاریہ میں شمار ہو سکتا ہے، جس کا وبال قیامت تک ان لوگوں کے سر آئے جنہوں نے سود کو سروس چارج کا روپ دیا۔

البتہ یہاں بھی یہ بات قابل غور ہے کہ معاملہ کے دونوں فریقوں کو ایک ہی صف میں رکھا جائے، یا سود لینے کی حرمت پر سود دینے کی حرمت سے زیادہ زور رہے۔ قرآن مجید نے سود لینے کی حرمت پر اصل زور دیا ہے، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ بحالت ضرورت سود دینے کی گنجائش ہے، البتہ سود لینے کی گنجائش کبھی نہیں ہے۔

۵- اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جا سکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: ایسی صورت میں تو اس کا سود ہونا بالکل واضح ہے۔ اور میرا وسیع مشاہدہ ہے کہ انتظامی خرچ پر اضافی رقم کو محمول کرنے کا دائرہ بڑھتے بڑھتے اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس میں بہت سارے سود سما جاتے ہیں۔ تاہم یہاں بھی سود دینے کا مسئلہ ہے جس میں بحالت ضرورت نرمی کی جا سکتی ہے۔

واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جا سکتا ہے؟

جواب: سودی قرض خواہ کسی بھی مقصد کے لئے ہو، اس سے اس کے سودی قرض ہونے کے وصف پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ فرق اگر پڑ سکتا ہے تو وہ صرف قرض لینے والے اور سود دینے والے کی اضطراری حالت سے پڑ سکتا ہے۔

۶- ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب: جو رقوم حکومت کی طرف سے بطور قرض نہیں، بلکہ بطور امداد ملیں ان کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ حکومت کن افراد پر مشتمل ہے، کن نظریات کی حامل ہے، اور اس کے ذرائع آمدنی کیا ہیں۔

۷- گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم- جس قسم کی بھی ہوں- ان کے حصول کے لئے کافی جدو جہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: واسطہ بننے والوں کو ان کا مطلوبہ محنتانہ دینے اور ان کے لئے اسے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس کی حیثیت عقد اجارہ کی ہوگی، بشرطیکہ وہ کسی ناجائز طریقے کو اختیار کر کے واسطہ کے عمل کو انجام نہ دیں۔ ورنہ یہ عقد اجارہ باطل اور محنتانہ دینا اور لینا حرام قرار پائے گا۔

۸- بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: اصولی طور پر تو جائز کاموں کا محنتانہ جائز ہے، خواہ وہ متعین رقم کی صورت میں ہو یا متعین رقم کے متعین حصہ کی صورت میں ہو۔

تاہم ملحوظ رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے واسطہ بننے والوں کا ہجوم حق داروں کے حق میں مستقل طور پر ایک بڑی کٹوتی کا سبب بنتا ہے۔ واسطے کے بغیر حق نہیں ملتا، اور واسطے حق میں سے اچھا خاصا کاٹ کھاتے ہیں۔ قاعدہ ضرورت کے تحت بطور رخصت وقتی طور سے اجازت تو دی جا سکتی ہے، لیکن اسے مطلق شرعی جواز فراہم کرنا بہت سارے مفاسد کو جنم دیتا ہے۔

سوال نمبر سات اور آٹھ کے سلسلے میں یہ بھی دیکھنا مناسب ہوگا کہ ملک کا قانون اس طرح کے واسطے اور محنتانے کی کس قدر اجازت دیتا ہے۔

خاص طور سے فتوی جاری کرتے ہوئے اس باب میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

۹- اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

جواب: اگر دوسرے کو اس کے حق سے محروم کرنے کے بجائے صرف اپنے حق کے حصول کے لئے کوئی رقم دینا پڑے بشرطیکہ اس کے بغیر کوئی راستہ بھی نہیں ہو، تو یہ رقم شرعا رشوت کے دائرہ حرمت میں نہیں آئے گی۔ البتہ یہ واضح رہے کہ ہمارے ملک میں قانونا رشوت دینا بھی جرم قرار پاتا ہے، اس کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۰- امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط و معیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: غلط بیانی سے اور غلط طریقہ پر امداد یا غیر سودی قرض لینا درست نہیں ہے، غلط بیانی خود ایک گناہ ہے، اور اس باب میں غلط بیانی سے اصل مستحقین کے محروم رہ جانے کا امکان ہے جو ظلم ہے، اور غیر مستحق کا غیر حق پر قابض ہو جانا ہے جو سرقہ اور غصب میں شمار ہوتا ہے۔

۱۱- بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

جواب: قرض کی جن اسکیموں میں سارا سود حکومت ادا کرتی ہے، ان اسکیموں سے استفادہ کرنے میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا ہے، بشرطیکہ اس سود کی ادائیگی کی ساری قانونی ذمہ داری اول روز سے حکومت پر ہی عائد ہوتی ہو۔

۱۲- بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر دیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے تو کیا صورت درست ہوگی؟

جواب: ایسی اسکیم سے استفادے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ سود کی رقم سود لینے والے کے لئے حرام ہوتی ہے، دوسروں کے لئے حرام نہیں ہوتی ہے، اس میں یہ قاعدہ بھی معاون ہوتا ہے کہ "النقود لا تتعین بالتعیین"۔

......☆......

سرکاری اسکیموں کے حصول میں ایجنٹ کی اجرت

مفتی ظہیر احمد[1]

حکومت جو عوام کی فلاح و بہبود، تعلیمی ترقی، معاشی و معاشرتی ضرورتوں، صنعتوں کے فروغ اور اقتصادی طور پر پسماندہ و کمزور شہریوں کی امداد کے لئے رقم دیتی ہے وہ عموماً جائز ہیں الا ماشاء اللہ۔

بالترتیب سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں:

۱۔ ایسے قرضے بلاشبہ جائز ہیں، یہ حکومت کی طرف سے امداد ہے۔

۲۔ یہ شکل بھی بلاشبہ جائز ہے گویا مقررہ مدت پر ادا کرنے پر معاف کی ہوئی رقم انعام ہے، اور متعینہ مدت کے بعد ادا کرنے پر آپ انعام کے مستحق نہیں۔

۳۔ زائد رقم کا ادا کرنا سود ہے یہ عموماً جائز نہیں، مگر یہ کہ وہ شخص شدید ضرورت مند ومحتاج ہو تو ''الضرورة تبیح المحظورات، والضرورة تتقدر بقدرها، ویجوز الاستقراض بالربح وغیره'' (نظام الفتاوی ۷ / ۲۱۹) کی روشنی میں بقدر ضرورت عند الحاجة الشدیة اجازت دی جاسکتی ہے۔

۴۔ اس صورت میں زائد رقم جو سروس چارج کے درجہ میں قلیل ہو سود کے دائرہ میں نہیں آئے گی، یہ غیر اسلامی ملک ہے یہاں پر اگر چہ سروس چارج کے نام سے نہیں لیا جارہا، بلکہ (Interest) سود کے نام سے لیا جارہا ہو تب بھی جائز ہوگا ہم اس قلیل رقم کو سروس چارج، انتظامی خرچ وغیرہ پر محمول کر سکتے ہیں۔

۵۔ اگر زائد رقم سروس چارج سے زائد ہو، لیکن بہت غیر معمولی بھی نہ ہو، اس کا مقصد لوگوں کی فلاح ہو، امداد کرنا ہو، اس کا (زائد رقم) ادا کرنا دشوار نہ ہو تو اس کی بھی اجازت ہوگی۔ اس کو بھی ہم انتظامی امور اور سروس چارج وغیرہ پر محمول کر سکتے ہیں، چونکہ یہ ملک سیکولر ہے شرعی اصطلاحات سے لوگ واقف نہیں۔ ''الأمور بمقاصدها'' کے تحت داخل کر کے ہم ایسے قرضوں کے مقاصد کی تعیین کر سکتے ہیں اور اس پر شرعی حکم منطبق کر سکتے ہیں۔ (نیز دیکھئے: نظام الفتاوی ۷ / ۲۱۴)۔

۶۔ یہ شکل بھی مکمل حکومتی امداد و تعاون کی ہے یہ بھی بلاشبہ جائز ہے۔

۷۔ اگر یہ محنتانہ واقعی محنتانہ کے درجہ میں ہو گورنمنٹ کی طرف سے مدد لینے والے کا استحصال نہ ہو، تو یہ بھی شرعاً جائز ہوگا۔

(دیکھئے: فتاوی محمودیہ ۲ / ۳۱۲)۔

لیکن اگر مدد لینے والے کو برائے نام ہی رقم آئے خاص مقدار اس کو واسطہ در واسطہ ادا کرنی پڑے تو اس کی اجازت ہوگی، یعنی اتنا کثیر محنتانہ لینا

---

[1] مسجد حلوہ سوہن، رام نرائن بازار، کانپور۔

جائز نہ ہوگا، دینے والا تو مظلوم ہے۔

۸۔ ایک معقول اور مناسب حصہ لیتے ہیں تو اس کی گنجائش ہے۔

غیر معمولی اور غیر معمولی معاوضہ بطور محنتانہ کے لینے کی شرعاً اجازت نہ ہوگی۔

۹۔ اگر بغیر رشوت کے امدادی رقوم اور قرضے میسر نہ ہوں اپنا حق وصول کرنے کے لئے اس کی بھی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۱۰۔ ان شرائط اور معیارات کے حکم پر شرعی حکم موقوف ہوگا، یعنی شرائط وغیرہ بھی اگر شرعی ہیں تو اس کی اجازت ہوگی، ورنہ نہیں۔اس کے بعد پھر صحیح طریقوں پر ہی امدادی قرض حاصل کیا ہو غلط بیانی یا غلط طریقہ سے اس طرح کی رقم کا حصول شرعاً درست نہ ہوگا۔

۱۱۔ جب مستفید کو بہت کم سود ادا کرنا ہوتا زیادہ حصہ حکومت ہی ادا کرتی ہے تو بھی جائز ہے یہ حکومتی مدد کی ایک شکل ہے (نظام الفتاوی ۷/ ۲۱۷۔۲۱۴)۔

۱۲۔ یہ شکل بھی ہندوستان جیسے ملک میں جائز ہونی چاہئے، چونکہ اس کا مکمل انتظام وانصرام حکومت کرتی ہے اس میں مسلم عوام کا کوئی کردار نہیں ہے۔

......☆......

مختلف سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور جائز حق حاصل کرنے کا طریقہ

مولانا محمد نثار عالم ندوی [1]

سوال نمبر (۱-۲) کا جواب:

قرض کا ایک حصہ یا زائد حصے کے معافی کی صورت میں اسکیم سے استفادہ؟

وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے تو ایسے قرضے سے استفادہ کرنا جائز قرار دیا جائے گا اور حکومت کی طرف سے تعلیمی قرض کے لئے مختص پروجکٹ واسکیموں سے استفادہ سمجھا جائے گا، جبکہ بینک قوم کے سرمایہ کو ہی تعلیم وترقی کے لئے قرض کی فراہمی کے راستے کھولتے ہیں پس یہ حکومتی ادارہ یا نجی ادارہ کی طرف سے مدد سمجھی جائے گی اور تعلیم کی اہمیت اور مصارف تعلیم کی گرانی کے پیش نظر ایسے قرض کے اسکیموں سے قوم وملت کو متعارف کرایا جانا چاہئے اور سراہا جانا چاہئے، تاکہ تعلیمی زبوں حالی کسی قدر دور ہو اور قوم کے لئے خدمت گار میسر ہو۔

اسی طرح قرض چاہے قلیل المدت ہو، طویل المدت بہر صورت جائز ہوگا کہ اس میں سود کا پیسہ بھی بھرنا نہیں پڑتا ہے جتنا لیا ہے اتنا ہی واجب الاداء ہوتا ہے، لہٰذا بینک کے جائز اسکیموں سے استفادہ سمجھا جائے گا اور سودی بینک سے بغیر سود کے کاروبار کرنا ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں ضرورت کے دائرہ میں ہے، بچند وجوہ:

(الف): تعلیم وترقی کی زبوں حالی کو دور کر کے اعلی تعلیم حاصل کر کے کفار پر غلبہ حاصل کر کے قوم سے لاحق مصیبت کو دور کرنا یہ بھی ایک اہم ضرورت وحاجت کے دائرہ میں شمار ہوگا۔

(ب): نیز بغیر اعلی تعلیم وٹکنالوجی وہنر کے اس بے رحم معاشرہ میں کسی مرد یا قوم کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

(ج): دنیاوی عصری تعلیم وٹکنالوجی کے تمام شعبہ میں مسلم قوم کی بھی نمائندگی ضروری اور فرض کفایہ ہے اور غیر کے شانہ بشانہ ہی نہیں، بلکہ اس سے بہتر رہنا چاہئے، ورنہ قوم کی ذلت ودرگت لازمی ہے، پس مخالفین دین وایمان پر غلبہ حاصل کرنا بغیر اعلی تعلیم کے ناممکن ہے اور اعلی تعلیم حاصل کرنا گرانی کے ماحول میں بغیر تعلیمی قرض وحکومتی اسکیموں سے استفادہ کے ناممکن ہے۔

(د) اعلی تعلیم وٹکنالوجی کے ذریعہ ہی اسلام دشمن طاقتیں اسلامی ممالک کے معدنیات وذخائر پر قابض ہیں اور اپنے ذخائر اپنے کام آنے کے بجائے اپنوں کی بیخ کنی میں استعمال کیا جا رہا ہے، اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ اعلی تعلیم وٹکنالوجی کے علاوہ نظر نہیں آتا۔

(ہ) اسلام کا ماضی روشن اور تابناک ہے تمام علوم وفنون صناعت وٹکنالوجی کے ایجادات کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، لیکن موجودہ دور میں امت مسلمہ کہاں کھڑی ہے کسی سے مخفی نہیں ہے اس ناگفتہ بہ حال سے نکلنے کا واحد راستہ جدید تعلیم وٹکنالوجی کا حصول ہی ہے اور اس کے لئے ان اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنا ناگزیر ہے۔

سوال نمبر (۳-۴) کا جواب:

اصل سے زائد رقم کو سروس چارج میں شمار کرنا:

غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضے میں اصل سے زائد رقم کا اگر مطالبہ ہو اور اس کی شرح عام شرح سود کے مقابلہ میں کم ہو تو اس کو سروس

---

[1] الجامعۃ الکوثریہ، اوتلاالوای، کیرلا۔

چارج میں شمار کئے جانے کی گنجائش ہے، اور اس کو انتظامی مصارف شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش دی جانی چاہئے، بچند دلائل کے:

(الف) بعض ممالک میں سروس چارج کا مد اور سود کا مد دو الگ الگ شقیں ہوتی ہیں، ایسے ممالک میں سروس چارج کو سود اور سود کو سروس چارج قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن جن ممالک میں یا جن بینکوں میں سروس چارج اور سود کے الگ الگ خانے نہیں ہیں الگ الگ شرحیں نہیں ہیں دونوں ہی خلط ملط یا دونوں میں فرق ہی نہیں ہے تو وہاں پر سود کو سروس چارج مانا جاسکتا ہے۔

(ب) اسلامی شریعت نے سود لینے کو جس طرح حرام قرار دیا ہے سود دینے کو بھی حرام ٹھہرایا ہے اور بینک کے سود کو بھی سود ہی قرار دیا ہے، البتہ فقہاء نے بوقت ضرورت وحاجت سودی قرض کو جائز قرار دیا ہے اور اس سلسلہ میں علامہ ابن نجیم مصری کے قول سے استدلال کیا جاتا ہے:

''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباہ والنظائر / ۱۱۵)۔

فقہاء کرام نے ضرورت مند کے لئے سود پر قرض لینے کی اجازت دی ہے اور ضرورت میں کھانا کپڑا مکان کو شمار کیا ہے۔

پس جب شخصی ضرورت کے لئے سود پر قرض لینے کی گنجائش ہے تو تعلیم جو ایک اجتماعی ضرورت ملی حاجت ہے اور ایک دائمی دیرپا ضرورت ہے اس کے لئے تو بدرجہا گنجائش ہونی چاہئے۔

(ج) ملک کے تمام باشندوں کو تعلیم سے آراستہ اور اس کے لئے راہیں ہموار کرنا یہ حکومت کی اولین ذمہ داری ہے اور جیسا کہ بہت سارے ملکوں میں اس کا بندوبست ہے اور اسی نظم ونسق کے امور میں ہے کہ حکومتیں بینکوں کے واسطے یہ کام کرواتی ہے اور ہر حکومت اس کو بھی معاف بھی کردیتی ہے، جیسا کہ عام مشاہدہ ہے تو طالب علم اسے اپنا حق سمجھ کر لے سکتا ہے اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

موجودہ دور میں سودی نظام سے چھٹکارا مشکل ہے، جبکہ بغیر سودی تعلیمی قرض کا بندوبست سازونادر ہی ہے اور حصول بھی مشکل سے مشکل تر ہے، سود کو حرام قرار دینا مقاصد شریعت کا تقاضا ہے اور ضرورت کی بنا پر جواز کا فتوی دینا بھی تقاضہ شریعت ہے۔

''الضرورات تبیح المحظورات'' (الاشباہ والنظائر، القاعدۃ الخامسۃ)۔

(د) ہندوستان کی حکومتوں کا اسلام مخالف رویہ اور موجودہ صورتحال جس کی تبدیلی کا دور دور تک امکان نظر نہیں آتا ہے اور دار الحرب کی اصطلاح صادق نظر آتی ہے، پس فقہاء احناف میں سے طرفین کے قول پر ''لا ربوا بین الحربی والمسلم'' کی بنا پر اس کو سروس چارج شمار کر کے استفادہ کی گنجائش دی جانی چاہئے۔

(ہ) موجودہ ناگفتہ بہ حالت غارت گری گنڈہ گردی کے ماحول میں بغیر اعلی تعلیم وٹکنالوجی کے حصول کے اسلام کا غلبہ نہیں، بلکہ اسلام کی حفاظت بھی مشکل نظر آتا ہے پس اعلی تعلیم بھی ایک حاجت وضرورت بن گئی ہے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے آج مسلمان عالم کی حالت ہمارے سامنے ہے۔

(و) حکومت کا دعوی ہے کہ تعلیمی لون جاری کرنے کا مقصد اعانت ہے نہ کہ سود سے نفع حاصل کرنا، ورنہ کم شرح سود نہ رکھا جاتا پس اصل حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو سروس چارج شمار کر کے استفادہ کی گنجائش ہونی چاہئے۔

سوال نمبر (۵) کا جواب:

کثیر شرح پر زائد رقم کا حکم:

(الف) بینک ایک نجی ادارہ ہوتا ہے، لیکن اب وہ حکومت کے نمائندہ ادارہ کے طور پر یہ کام کرتے ہیں اور حکومتیں اپنی تمام اسکیمیں تعلیمی، صنعتی، فنی وثقافتی، زراعتی ترقی کے لئے اسی کا سہارا لیتی ہے، چنانچہ مختلف بنکوں کے ذمہ مختلف اسکیمیں جاری کئے جاتے ہیں اور وہ مختص ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اسکیم کے پیچھے حکومتی منشا وارادے ہیں اور حکومتیں یہ اسکیم عام انسانوں کی تعلیمی سماجی اقتصادی ترقی کے لئے بناتے ہیں اور چلاتے ہیں، لیکن وہ سود پر مبنی بھی ہوتے ہیں جس سے ایک گونہ بحیثیت مسلم ایک مسلم ہولڈر کو پریشانی لاحق ہوتی ہے۔

لیکن جس طرح فقہاء نے روٹی مکان کپڑا کو ایک حاجت مانا ہے تو اعلی تعلیم وعلوم وفنون کو بدرجہا حاجت میں شمار ہونا چاہئے اور اسکے عمومی وخصوصی ضرورتوں کے پیش نظر شرعی ضرورت کا درجہ دیا جانا چاہئے۔

(ب) نیز ان اسکیموں سے مطالبہ شرائط کے ساتھ فائدہ حاصل کرنا ایک مفسدہ ہے اور اس سے بچتے ہوئے اعلیٰ تعلیم وٹکنالوجی چھوڑنا بھی ایک مفسدہ ہے اور آخر الذکر کا مفسدہ ذاتی قومی وملی بھی ہے اس کی رعایت کرتے ہوئے ایک چھوٹے مفسدہ کا ارتکاب درست ہوگا۔

''إذا تعارض مفسدتان روعی أعظمها ضررًا بارتکاب أخفهما'' (الاشباہ والنظائر/ ۱۴۵)۔

(ج) نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بڑے بڑے سیکٹرس اور صناعتی اہل کار اور ان اسکیموں سے بڑے بڑے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے صنعت کار کو ہضم کرتے جارہے ہیں، ان کے لئے اپنا بچاؤ بھی مشکل ہوتا ہے، پھر وہ صنعت کار اس سے حاصل شدہ مال میں سے ایک حصہ سے باقی صنعت کاروں کو کچلنے میں یا اسلام کی بیخ کنی میں خرچ کرتے ہیں، پس موجودہ صورت حال میں ایسے اسکیموں سے استفادہ کی گنجائش ہونی چاہئے بایں شرط کے حاصل کنندہ اس سے جلد از جلد چھٹکارے کا راستہ حاصل کریں۔

واضح ہو کہ یہ حکم ہندوستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر حاجت کے دائرہ میں ہوگا عام حالات پر اس کا انطباق نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر (٦) کا جواب:

حکومت کے امدادی اسکیم کا حکم:

بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم دی جاتی ہے اور پھر حکومت اس کو واپس نہیں لیتی ہے جو بطور اعانت کے ہوا کرتی ہے، پس اس سے فائدہ حاصل کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے، بلکہ مستحق شخص تک پہنچانے میں مدد ہونی چاہئے مسئلہ ھٰذا کے دلائل بھی ماقبل مذکور دلائل سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر (۷، ۸، ۹) کا حکم:

درمیانی واسطہ ودلالی کا حکم؟

اعلان شدہ اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنے میں دلالی کا واسطہ بننا یا کسی کا سہارا حاصل کرنا اور سہارا بننے والے شخص کا اپنا مطلوبہ محنتانہ وصول کرنا یا حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ رکھ لینا اس میں دو پہلو نظر آتے ہیں:

ایک تو ہے واسطہ بنانا، ظاہری بات ہے حکومت کے اسکیم سے استفادہ کرنا اس قدر مشکل کام ہوتا ہے کہ بسا اوقات بغیر واسطہ در واسطہ کام بھی نہیں ہوتا ہے واسطہ بنانا یہ مستفید شخص کے لئے مجبوری ہوتی ہے اس لئے واسطہ بننے والے شخص کو کچھ محنتانہ کے طور پر دینا یا ان کا لینا جائز ہوگا، چنانچہ فقہاء کے اقوال میں دلالی کی اجرت جائز نہیں آتی ہے، چنانچہ مفتی مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں کہ ''دلالی کی اجرت میں مفتی بہ قول یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے، اور فیصد کے حساب سے بھی سمسرہ کی اجرت لینا جائز ہے (انعام الباری ٦/ ۴۵۷)۔

رشوت کا حکم:

لیکن رائج الوقت دلالی کا مسئلہ ماقبل کے دلالی کے احوال سے مختلف ہے، آج کل جو حکومت کی طرف سے اسکیمیں لائی جاتی ہیں وہ بینک یا حکومت کے منتخب افراد نمائندہ افراد کے واسطے سے لائے جاتے ہیں اور یہ حضرات حکومت کے نمائندہ ہوتے ہیں حکومتی اسکیموں کو تقسیم کرانے کے لئے یہ ان کی ذمہ داری ہوتی ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو نمائندہ ظاہر کرنے کے بجائے دلال ظاہر کرکے اپنا محنتانہ وصول کرتے ہیں جو دراصل رشوت کی تعریف میں داخل ہے، لہٰذا اس پر حکم بھی رشوت کا ہی لے گا، جو کہ حرام ہوگا رشوت کا طلب کرنا ناجائز ہے اس سے حاصل شدہ رقم حرام سمجھی جائے گی اور وہ حدیث کے بموجب جہنمی ہونے کا مصداق ہے۔

اب رہا رشوت دینے والے کا مسئلہ تو اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جلب منفعت یا دفع مضرت کے لئے یا اپنا حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دی جائے تو امید ہے کہ رشوت کے وعید سے وہ خارج ہو پس اس میں گنجائش دی جانی چاہئے، چنانچہ یہ بات فقہاء کے قول سے بھی تائید ہوتی ہے مرقات میں ہے: ''أما إذا أعطی لیتوصل به إلی حق أو لیدفع به عن نفسه ظلمًا، فلا بأس به'' (مرقاۃ ۲/ ۲۷۸)۔

اسی طرح فقہاء کرام نے اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے یا ظلم وضرر کو دور کرنے کے لئے رشوت دینے کو جائز قرار دیا ہے۔
(ملاحظہ ہو: ردالمحتار ۸/ ۳۵، نہایۃ المحتاج للرملی ۸/ ۲۳۸)۔

سوال نمبر (۱۰) کا جواب:

اس سوال کے جواب کو بھی دو جزء میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) امدادی رقوم یا لون واسکیم سے استفادہ کرنے کے لئے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہے اور حاصل کرنے والے شخص کے پاس وہ مطلوبہ شرائط ومعیارات کا غذات مکمل دستیاب نہیں ہے، لیکن وہ شخص فی نفسہ اس امداد واسکیم کا مستحق ہے تو ایسی صورت میں غلط بیانی سے ڈبلی کیٹ (Duplicate) کاغذات کا سہارا لیتا ہے تو اس کے اس عمل کی گنجائش ہونی چاہئے کہ وہ اسکیمیں مستحق اشخاص کے لئے ہی مختص ہوتے ہیں اور مستحق اشخاص کے پاس مطلوبہ شرائط وکاغذات نہیں ہے پس اصل کا اعتبار ہوگا نہ کہ کاغذات وشرائط کا۔

نیز کاغذات بنانے کی ذمہ داری اس شخص پر خود عائد ہوتی ہے، لیکن دوسری طرف بنانے کی ایک ذمہ داری حکومت کی بھی ہوتی ہے۔ مشاہدہ ہے کہ بہت سارے کاغذات حکومت کے عدم توجہی سے نہیں بن پاتے ہیں اور بہت سارے، بلکہ اکثر وبیشتر کاغذات حکومت کے اہل کار کی غفلت وکاہلی، عدم توجہی یا جہالت کے سبب غلط بن جاتے ہیں اس میں اس شخص سے زیادہ حکومت کی بے توجہی کو دخل ہے پھر غلط کاغذات کی وجہ سے خمیازہ اس شخص کو بھگتنا پڑتا ہے۔

نیز حکومت کی طرف سے بعض اسکیم علی الاعلان ہوتے ہیں، لیکن کچھ کاغذات کی وجہ سے، بہانہ بنا کر وہ رقم واپس چلی جاتی ہے حالانکہ حکومت کے پاس ان افراد کی لسٹ ہوتی ہے وہ اس کے مطابق تقسیم کر سکتے ہیں، لیکن بعض دفعہ بیجا شرائط لگا کر اس سے محروم کر دیا جاتا ہے، گاؤں دیہات میں عام مشاہدہ ہے، پس حکومت کے اس حیلے تراشے سے بچنے کے لئے نقلی دستاویزات سے حاصل شدہ رقم کے استعمال کی گنجائش ہونی چاہئے۔

پس اگر مطلوبہ دستاویزات وکاغذات امیدوار کے پاس نہیں ہے اور واقعۃً وہ اس اسکیم کا مستحق ہے وہ اپنے Duplicate کاغذات وغلط بیانی کے سہارے اس اسکیم سے فائدہ حاصل کرنے کا مجاز سمجھا جاسکتا ہے۔

(ب) اسکیم سے استفادہ کے کچھ شرائط ومعیارات ہیں اور امیدوار شخص اس کا مستحق بھی نہیں ہے اس کے باوجود وہ غلط بیانی سے یا Duplicate کاغذات کے سہارے حکومت کی مختلف امدادی اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہندوستان کی موجودہ صورتحال جس میں اسلام ومسلمان، بلکہ عامۃ الناس غریب کی بیخ کنی کی منظم سازشی پلاننگ پر درآمد جودن بدن کم تر ہونے کے بجائے فروتر ہوتا جارہا ہے جو کسی سے مخفی نہیں ہے ایسی صورتحال میں اس کی گنجائش ہونی چاہئے بچند وجوہ:

(الف): حکومت کی طرف سے مختلف پروجیکٹ کے لئے مختلف ترجیحات کے لئے ہی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں اور لوگوں کو عدم واقفیت کی وجہ سے بہت ساری اسکیمیں رکھی رہ جاتی ہے اور وہ واپس ہوجاتی ہے وہ یا تو نمائندہ افراد کے جیب میں چلی جاتی ہے یا پھر وہ کسی سرمایہ دار کے ہاتھ میں لگ جاتے ہیں جو بالکلیہ ہی غیر مستحق ہوتے ہیں۔

(ب) مستحق شخص یا عام افراد کے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے وہ رقم نمائندہ افراد یا سرمایہ دار شخص کے پاس جانے کی صورت میں وہ مال عیش وعشرت یا اسلام دشمنی میں خرچ ہونے کا قوی امکان ہے۔

ابھی حال ہی میں بات واضح ہوگی کہ کس طرح عوام کے پیسے کو جبراً بینک میں رکھوا جارہا ہے اور رکھے ہوئے مال سے سرمایہ دار سیکٹرس افراد کو مالا مال کرکے حکومت اپنی مرضی حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہے۔

پس ”أھون البلیتین“ کے تحت غلط بیانی سے حاصل شدہ رقم کے جواز کی راہ نکالی جاسکتی ہے۔

(ج) ہندوستان کی موجودہ صورتحال کی وجہ سے قدیم ومعاصر فقہاء کرام نے بر بنائے حاجت سود ورشوت جیسی حرام وقبیح چیز کو بعض صورتوں میں جائز قرار دیا ہے ملاحظہ ہو مسائل سود از مولانا حبیب الرحمن صاحب خیر آبادی صفحہ ۱۹۰ تا صفحہ ۲۰۰ تک۔

جب بر بنائے حاجت وضرورت سود ورشوت جیسی چیز کو بعض صورتوں میں جائز قرار دیا جاسکتا ہے تو صورت مسئلہ میں بدرجہ اولی گنجائش ہونی چاہئے، ''الضرورات تبیح المحظورات'' کی بنا پر۔

(د) ہندوستان کی موجودہ ناگفتہ بہ صورتحال میں جبکہ علی الاعلان حکومت کے نمائندوں کی طرف سے مسلمانوں کو دیش بدر کردینے کی سازش اور سیاسی وسماجی علمی واقتصادی ہر اعتبار سے تہ دست کردینے کی ایک منظم سازش وعمل ہورہا ہے ایسی صورت حال میں اقتصادی بدحالی وزبوں حالی کو دور کرنے کے لئے اس کی اجازت دی جانی چاہئے۔

(ہ) مذکورہ صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کو دار الحرب مان کر امام ابوحنیفہؒ وامام محمدؒ کے قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے اور غلط بیانی سے حاصل شدہ مال کے جواز کی گنجائش دی جانی چاہئے۔

''ولا ربوا بين المسلم والحربي في دار الحرب خلافًا لأبي يوسف ولأئمة الثلاثة'' (الدر المنتقى ۲/ ۹۹۲)۔

سوال نمبر (۱۱) کا حکم:

سبسڈی کا حکم:

بعض اسکیموں میں مثلاً تعلیم یا دیگر کسی شعبہ میں حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ یعنی سود عائد ہوتا ہے حکومت اپنی طرف سے ادا کرتی ہے اس کو اصطلاح میں سبسڈی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص مذکورہ بالا اسکیم کے تحت قرض لے اور سود کی رقم حکومت کی طرف سے ادا ہوتی ہے تو اس کو ایسے اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔ اور حکومت کی طرف سے ادا شدہ رقم اعانت سمجھی جائے گی ہولڈر کے حق میں اور بینک کے حق میں سروس چارج مانا جائے گا اور یہ عمل جائز ہوگا اور اس کے دلائل بھی وہی ہوں گے جو سروس چارج کے مسئلہ میں گزر چکے ہیں۔

سوال نمبر (۱۲) کا جواب:

فکس ڈپازٹ سے حاصل شدہ سودی رقم سے جاری کردہ اسکیموں سے استفادہ؟

حکومت کچھ رقم بینک میں فکس ڈپازٹ کرتی ہے اور اس سے حاصل شدہ سود سے رفاہی ادارہ یا افراد واشخاص کا تعاون کرتی ہے تو ایسے اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنا جائز ودرست ہوگا، کیونکہ حکومت کے حق میں وہ سود ہے اس کا وبال حکومت کے اہل کار پر ہے، لیکن استفادہ حاصل کرنے والے کے حق میں وہ حکومت کی طرف سے مدد سمجھا جائے گا اور جائز ہوگا۔

مسئلہ ہذا کو سودی رقم کے مصرف پر قیاس کیا جاسکتا ہے، چنانچہ فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ سود کی رقم کو بینک میں چھوڑنا مناسب نہیں ہے اسے نکال کر کسی غریب یا ضرورت مند کو بغیر ثواب کی نیت کے بطور امداد کسی محتاج کو دیدیں، چنانچہ فتاوی ''بزازیہ'' میں ہے:

''فيرد على أربابها إن علموا وإلا تصدق به على الفقراء'' (فتاوى بزازيه على هامش الهنديه ۶/ ۳۵۵)۔

پس معلوم ہو کہ سود کی رقم لینے والے کے حق میں تو سود ہے لیکن جس کی مدد کی گئی ہے اس کے حق میں وہ سود شمار نہ ہوگا، لہذا حکومت کا یہ عمل تو مناسب نہیں ہے، اس کا متبادل تلاش کریں، لیکن استفادہ کرنے والے شخص کے لئے وہ جائز ہوگا اور اقتصادی بدحالی ومعاشی زبوں حالی کو دور کرنے کے لئے موجودہ ہندوستانی صورتحال میں حاجت وضرورت کے دائرہ میں ہے جس کی گنجائش دی جاسکتی ہے۔



سرکاری قرضہ جاتی اسکیموں سے استفادہ کا شرعی حکم

مفتی ریاست علی قاسمی رامپوری[1]

اپنی رعایا اور پبلک کی معاشی ومعاشرتی ضرورتوں کی تکمیل اور کفالت نیز تعلیمی ترقی اور دیگر ضروریات کی تکمیل ہر حکومت کے فرائض اور ذمہ داری میں داخل ہے، ہماری حکومت بھی اپنی رعایا کی معاشی، معاشرتی، تعلیمی ترقی، صنعتوں کے فروغ اور اقتصادی طور سے محروم اور پسماندہ شہریوں کو خط افلاس سے اونچا اٹھانے کے لئے اور ملک کی معیشت کے استحکام اور ترقی کے لئے مختلف شکلوں میں رقوم اور فنڈ کا اعلان کرتی ہیں اور ان کو روبعمل لانے کے لئے مختلف اسکیمیں وجود پذیر ہوتی ہے اور ان کی نگرانی میں وہ امور مکمل ہوتے ہیں، صحت، علاج ومعالجہ، رہائش، زراعت وغیرہ عوام الناس کو ان اسکیموں سے فائدہ ہوتا ہے، اس قسم کی اسکیمیں ملک کے تمام طبقات اور بعض اسکیمیں صرف مسلمانوں اور خاص طبقات کے لئے ہوتی ہیں، چونکہ سرکاری خزانہ پر ملک کے دوسرے لوگوں کی طرح مسلمانوں کا بھی برابر کا حق ہے اور سبھی حکومت کو براہ راست یا بالواسطہ ٹیکس ادا کرتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کے لئے فلاحی اسکیموں کا اعلان کرنا اور ان کو اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور حکومت وقت مسلمانوں کے لئے فلاحی اسکیموں کا اعلان کرتی بھی ہے، اور مسلمان حسب گنجائش ان اسکیموں سے استفادہ کرتے بھی ہیں، سوال یہ ہے کہ اس قسم کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانا مسلمانوں کے لئے کس حد تک درست ہے؟ اسی قسم کے سوالات پر مشتمل فقہ اکیڈمی کی جانب سے آمدہ سوالنامہ کا جواب پیش نظر تحریر میں پیش کرنا مقصود ہے۔

ضرورت سے موقع پر قرض لے کر اپنی ضروریات پوری کرنا شرعاً درست ہے، خواہ قرض اپنے کسی عزیز، رشتہ دار، تعلق دار سے لیا جائے یا سرکار سے لیا جائے پھر حکومت سے قرض لینے کی صورت میں اگر حکومت کی جانب قرض کا کچھ حصہ معاف ہو جاتا ہو اور اس میں زائد بالکل نہ دینا پڑے تو یہ صورت بھی درست ہے اور سرکار کی جانب سے چھوٹ اور معافی کو سرکاری اور حکومت کی جانب سے اعانت اور امداد تصور کیا جائے گا اور حکومت کا اپنی پبلک اور رعایا کی مدد کرنا شرعاً درست ہے، معافی والے قرض میں بعض دفعہ مقررہ مدت کے اندر قرض کی واپسی ہوتی ہے اگر مقررہ مدت میں قرض کی واپسی نہ ہو تو پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے تو اس صورت میں اگر اصل رقم سے زائد ادا کرنی نہ پڑے تو یہ صورت بھی شرعاً درست ہے اور یہ صورت سود کے دائرہ میں داخل نہ ہوگی، اور اگر اصل رقم سے زائد رقم دینا پڑے تو زائد رقم سود کہلائے گی اور سود کی حرمت اور عدم جواز نص قطعی سے ثابت ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"أحل الله البيع وحرّم الربوا" (سورہ بقرہ: ۲۷۵)، "يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربوا أضعافًا مضاعفة" (سورہ آل عمران: ۱۳۰)

ارشاد نبوی ہے: ''لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء'' (مشکوۃ ۱/ ۲۴۴ باب الربوا)۔

وفی الدر المختار علی رد المحتار عن الاشباہ: كل قرض جر نفعًا حرام (۷/ ۳۹۵ زکریا)۔

وفی رد المحتار: أي إذا كان مشروطًا كما علم، وإن لم يكن النفع مشروطًا في القرض فعلى قول الكرخي لا بأس به'' (۷/ ۳۹۵ زکریا)۔

لہٰذا مسلمانوں کے لئے معاشی ترقی اور استحکام کے لئے سودی قرض سے اجتناب اور گریز کرنا شرعاً لازم اور ضروری ہے، البتہ سخت مجبوری اور اضطراری حالات میں سودی قرض لینے کی گنجائش ہے۔

---

[1] خادم التدریس والافتاء جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ۔

قرض کی واپسی میں اصل رقم سے زائد کا مطالبہ بہت کم ہونے کی صورت میں شرعی حکم:

اگر قرض کے اندر کے اصل رقم سے زائد رقم کا مطالبہ بہت معمولی اور برائے نام ہو کہ اس کو سروس چارج اور انتظامی اخراجات پر محمول کیا جاسکتا ہو تو اس طرح کے قرض کو حکومت سے لینے کی شرعاً اجازت ہوگی اور اضافی رقم کو سروس چارج کہا جائے گا، حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا مفتی نظام الدین صاحب نور اللہ مرقدہ سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند رقم طراز ہیں: "انتظامی ضروریات کے لئے قرض پر محکمہ سود کے نام سے جو رقم وصول کرتا ہے اس زائد رقم کو سود کا نام دینا ضروری نہ ہوگا، بلکہ انتظامی اخراجات کی فیس بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کو اس شعبہ کے ملازمین اور عملہ کی اجرت پر محمول کر سکتے ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ محکمہ چونکہ مسلم نہیں ہے، اس لئے وہ شرعی اصطلاحی الفاظ بولنے کا تو پابند ہے اور نہ اس کا پابند کیا جاسکتا ہے۔ (نظام الفتاوی)

قرض واپسی پر سود کی شرح بہت زیادہ ہو تو اس کا حکم:

اگر سرکار سے قرض لینے کی صورت میں سود کی شرح بہت زیادہ ہو تو معاشی ترقی اور استحکام اور کاروبار میں اضافہ کے لئے سودی قرض لینا شرعاً ناجائز اور حرام ہوگا اور ایسے قرض سے اجتناب اور پرہیز اختیار کرنا شرعاً لازم اور ضروری ہوگا۔

مگر سخت پریشانی، مجبوری اور اضطراری حالت میں مثلاً سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہ ہو اور مکان کی سخت ضرورت لاحق ہو یا کاروبار بالکل ٹھپ ہو گیا ہو اور غیر سودی قرض دستیاب نہ ہو رہا ہو تو ایسے اضطراری حالات میں سودی قرض لینے اور اس پر سود دینے کی گنجائش ہوگی اور اس سود دینے کا وہی حکم ہوگا جو اضطراری حالت رشوت دینے کا حکم ہے۔ "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ/ ۲۹۴)۔

حکومت کی جانب سے امداد و اعانت کا حکم:

اپنے عوام اور رعایا کی امداد اور اعانت کرنا اور ان کے لئے روزگار اور کاروبار مہیا کرنا حکومت کے فرائض میں داخل ہے لہٰذا بعض اوقات بعض خاص ضروریات مثلاً مکان، بیت الخلاء کی تعمیر اور تعلیمی ضروریات کے لئے جو امدادی رقوم دی جاتی ہیں مسلمان کے لئے اس رقم کو حاصل کرنا اور اس کو اپنے استعمال میں لانا شرعاً درست ہے، کیونکہ یہ رقم حکومت کو واپس نہیں دی جاتی ہے لہٰذا یہ صورت سود کے شائبہ سے بالکلیہ طریقہ سے پاک ہے، بعض دفعہ اس امدادی رقم کو حاصل کرنے کے لئے کافی جدوجہد اور محنت کرنی پڑتی ہے اور بعض لوگوں کو اس میں واسطہ اور ذریعہ بنا کر محنتانہ بھی دینا پڑتا ہے، اور بعض دفعہ محنتانہ اور حق الخدمت میں حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ بھی دینا بھی پڑ جاتا ہے تو اس امدادی رقوم کو حاصل کرنے کے لئے دلال اور کمیشن لینے والوں کو متعین کرنا اور ان کو مطلوبہ دلال اور کمیشن دینا شرعاً درست ہوگا۔

"وفی رد المحتار: قال فی التاتارخانیة: وفی الدلال والسمسار یجب أجر المثل وما تواضعوا علیه أن فی کل عشرة دنانیر کذا فذلك حرام علیهم، وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار: فقال: أرجوا أنه لا بأس به. وإن کان فی الأصل فاسدًا لکثرة التعامل وکثیر من هذا غیر جائز، فجوزوه لحاجة الناس إلیه کدخول الحمام" (۹/ ۸۷ زکریا)۔

امدادی رقم حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کا حکم:

اگر سرکار کی جانب سے امدادی رقوم اور قرضوں کا حصول محض معاشی ترقی کے لئے ہے تو اس کے حصول کے لئے رشوت دینا شرعاً درست نہیں ہے اور اگر سخت مجبوری اور اضطراری حالت میں امدادی رقم حاصل کرتا ہے تو بلا رشوت اس کا حاصل ہونا ناممکن اور دشوار ہے، تو اپنا حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینا جائز قرار دیا جائے گا، کیونکہ سرکاری خزانہ پر ہر فرد کا حق ہے اور اپنے حق کو وصول کرنے کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے۔

"دفع الرشوة لدفع الظلم أمر جائز" (هدایه ۳/ ۲۲۹)۔

وفی رد المحتار: "دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة،

یعنی فی حق الدافع" (۹/۶۰۷ زکریا)۔

امدادی رقوم اور قرض حاصل کرنے کے لئے غلط بیانی کا حکم:

حکومت کی جانب سے امدادی رقم حاصل کرنا تو مطلقاً درست ہے اور سخت مجبوری کی حالت میں سودی قرض لینے کی بھی فقہاء کرام نے اجازت دی ہے، مگر اس کے لئے حکومت کی جانب سے مقرر کردہ شرائط ومعیار پر پورا اترنا ضروری ہے، اس کے لئے غلط بیانی اور کذب بیانی کرنا اور غلط طریقہ سے امداد حاصل کرنا شرعاً درست نہ ہوگا، ہر مسلمان کو ہر حالت میں سچ بولنا چاہئے اور کذب بیانی سے پرہیز کرنا چاہئے، کذب بیانی کو حدیث میں نفاق کی علامت قرار دیا ہے: "إذا حدث کذب"۔

تعلیم کے لئے حکومت سے قرض لینا:

ہندوستان کا ایک شہری اور باشندہ ہونے کی حیثیت سے ترقیاتی اسکیموں اور حکومت کی جانب سے منظور شدہ فلاحی منصوبوں سے فائدہ اٹھانے کا ہر مسلمان کو برابر کا حق حاصل ہے اس لئے حکومت کی جانب سے تعلیم یا دوسرے کسی مقصد کے لئے بنک سے جو قرض ملتا ہے اور اس پر عائد ہونے والے انٹرسٹ اور سود کو حکومت خود ادا کرتی ہے، مقروض ادا نہیں کرتا یا بہت معمولی حصہ ادا کرتا ہے تو اس طرح کی اسکیموں سے مسلمان کے لئے استفادہ کرنے کی اجازت ہے اور برائے نام ادا ہونے والے سود کو سروس چارج قرار دیا جائے۔

"وفی الهندية: وفی شرح حیل الخصاف لشمس الدین أن الشیخ أبا القاسم الحکیم کان یأخذ جائزة السلطان وکان یستقرض لجمیع حوائجه وما یأخذ من الجائزة یقضی بها دیونه. والحیلة فی هذه المسائل أن یشتری نسیئة ثم ینقد ثمنه من أی مال شاء" (۵/۳۹۶ کتاب الکراهیه)۔

حکومت کے از خود حاصل کردہ سود سے استفادہ کا حکم:

اگر حکومت از خود ایک کثیر رقم فکس ڈپوزٹ کردے اور اس سے حاصل شدہ سودی رقم سے تعلیمی اداروں اور منتخب افراد اور اشخاص کا مالی تعاون کرے تو اس رقم سے مسلمانوں کے لئے استفادہ کرنا شرعاً درست ہوگا، اس صورت میں مسلمان بینک سے سود حاصل نہیں کررہا ہے اور نہ ہی اس کے نام سے سودی رقم حاصل ہوتی ہے، بلکہ سرکاری اداروں اور اس کے منتخب افراد نے از خود خطیر رقم ایف ڈی کرا کے سودی رقم حاصل کی ہے لہٰذا اس صورت میں مسلمان سودی رقم حاصل کرنے والا نہ ہوگا اور مسلمان کے لئے اس سے استفادہ کرنا درست ہوگا۔

"وفی الهداية: فإن عقدهم علی الخمر کعقد المسلم علی العصیر وعقدهم علی الخنزیر کعقد المسلم علی الشاة؛ لأنها أموال فی اعتقادهم، ونحن أمرنا بأن نترکهم وما یعتقدون دل علیه قول عمر رضی اللہ عنہ ولوهم بیعهما وخذوا العشر من أثمانها" (۳/۸۶)۔

.....☆.....

تعلیم، مکان اور روزگار سے متعلق اسکیموں سے فائدہ اٹھانا

مولانا عبدالحمید قاسمی دیناجپوری[1]

سرکاری اسکیموں سے استفادہ، اسکالرشپ:

اسکالرشپ کی صورت میں ملنے والی امداد میں کوئی قباحت نہیں، اسے بلا کھٹک استعمال کر سکتے ہیں اسی طرح سبسیڈی کے عنوان سے جو قرض معاف کر دیا جاتا ہے اس کے حصول میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے مسلمان اپنی معاشی، تعلیمی، اور دیگر ترقیاتی کاموں کے لئے ان سے استفادہ کر سکتے ہیں اسی طرح بوقت ضرورت اس قرض کے لینے میں بھی کوئی قباحت نہیں جو بلا اضافہ واپس کیا جاتا ہے حکومت کی طرف سے ملنے والے قرض مندرجہ ذیل صورتوں میں ہوتا ہے اور ہر ایک کا الگ الگ حکم لکھا جاتا ہے۔

قرض کے بعض حصے کی معافی:

سوال ا۔ وہ قرضے جن کا بعض حصہ معاف ہو جاتا ہے اس کے لینے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے افراد اور اداروں کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے مقروض کو مکمل قرضے سے بری کر دے یا اس کا کچھ حصہ معاف کر دے فقہ کی تمام کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔ احادیث و آثار سے اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

۲۔ قرض کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت کی طرف سے ایک مدت مقرر کی جاتی ہے اگر اسی مقررہ وقت پر مابقی رقم واپس کر دی جائے تو سبسیڈی یعنی معافی والی رقم کی مقدار باقی رہتی ہے، اور وقت مقررہ پر ادا نہ کرنے کی صورت میں سبسیڈی کی سہولت ختم ہو جاتی ہے مگر قرض کی مقدار سے زائد ادا نہیں کرنا پڑتا، ایسے قرض حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کیوں کہ اس میں سود کی کوئی مقدار نہیں۔

۳۔ وہ قرض جس میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ وقت پر قرض لی گئی رقم واپس نہ کرنے کی صورت میں اصل سے زائد ادا کرنا پڑے، جن لوگوں کو اپنے اوپر اعتماد و یقین ہو، کہ میں مقررہ وقت پر قرض ادا کر دوں گا اور مجھے بطور سود اصل سے زائد رقم ادا نہ کرنی پڑے گی تو ایسے لوگوں کے لئے اس طرح کا قرض حاصل کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے لیکن اگر ظن غالب یہ ہو کہ وہ وقت مقررہ پر اصل قرض ادا نہ کر سکے گا تو اس کے لیے اس طرح کا قرض لینا جائز نہ ہوگا، کیوں کہ سودی لین دین کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، جس کے دلائل یہاں فراہم کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

سروس چارج یا انتظامی خرچ کے عنوان سے اصل قرض سے زائد وصول کرنا:

سوال نمبر ۲: غیر معافی والے قرض میں اگر اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو اور اسے سروس چارج یا انتظامی خرچ کہ کر وصول کیا جاتا ہو تو اس سلسلے میں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا کہ وہ مقدار سروس چارج کہلانے کے لائق ہو اجارہ، اور حق الخدمت کے اصول کو ملحوظ رکھا جاتا ہو، ان تمام شرائط کے ساتھ اس طرح کا قرض لینا درست ہوگا اور وہ زائد رقم سودی رقم نہیں کہلائے گی، لیکن اس میں یہ شق بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا کہ ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں اس اضافی رقم میں مزید اضافہ نہ ہو، نہ ہی قرض کی کمی بیشی سے چارج میں کمی بیشی ہو ورنہ وہ سود ہی سمجھا جائے گا۔ جیسا کہ

---

[1] ادارہ فیض القرآن محمود چوک ٹھکری باڑی، ضلع اتر دیناجپور، مغربی بنگال۔

سودی معاملات میں ہوتا ہے ورنہ سے سروس چارج یا حق الخدمت کا نام دینا درست نہ ہوگا وہ سود کہلائے گا۔

گورنمنٹ سے سودی قرض لینے کا حکم:

سوال ۳: جن چیزوں کی حرمت منصوص ہے وہ صرف ضرورت شدیدہ کے وقت ہی جائز ہوتی ہیں اور وہ بھی بقدر ضرورت اس سلسلے میں کتاب وسنت کی نصوص کے ساتھ فقہ کے ان ضابطوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

''الضرورات تبیح المحظورات''۔ ''الضرورات تتقدر بقدر الضرورات''۔ ل

لہٰذا جب ضرورت شدیدہ نہ ہو اس وقت تک افراد یا اداروں سے سودی قرض لینے کی اجازت نہیں ہے رزق حلال سے جس پیمانے پر صنعت وحرفت یا زراعت ہو سکے اسی پر اکتفا کر کے مزید کی طمع نہیں کرنا چاہئے یہ مسلمانوں کا صدیوں کا تجربہ ہے کہ حرام سے بچنے کی صورت میں انہیں ابتداً اگرچہ بعض تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر اس سے بے پناہ فیوض وبرکات حاصل ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ کا صاف صاف ارشاد ہے:

"ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا" (سورہ طلاق: ۲) یعنی کہ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کی حرام کردہ امور سے بچیں گے ان کے لئے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ فراہم کرے گا۔

مکان، بیت الخلاء اور دیگر ضروریات کے لئے ملنے والی سرکاری امداد کا حکم:

سوال ۴: مکان یا بیت الخلاء کی تعمیر یا تعلیمی ضروریات کے لیے ملنے والی امدادی رقوم کا حاصل کرنا بلا کراہت درست ہے، یہ حکومت کی طرف سے تعاون ہے، جو بلا تفریق مذہب وملت ہر ایک کے لئے ہے اور سرکاری خزانے پر ملک کے تمام باشندوں کا یکساں حق ہے نیز یہ رقوم خود عوام ہی کی ہوتی ہے جو مختلف طریقوں سے حکومتی خزانے میں جمع ہوتی ہیں۔

گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امداد کے حصول کے لیے واسطہ بننے اور جدوجہد کرنے کی اجرت:

سوال ۵: ہر شخص کے لئے اپنی مصروفیتوں کو ترک کر کے ان امداد کے لئے جدوجہد کرنا یا متعلقہ حکام تک رسائی حاصل کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے اس لئے اگر کوئی تیسرا شخص واسطہ بن کر ان مشکل مراحل کو حل کر دے اور حبس وقت کی وجہ سے محنتانہ وصول کرے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، البتہ کسی کی ناخواندگی یا عدم معلومات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر زائد رقم اینٹھنا اخلاقاً درست نہ ہوگا یہ مروت کے خلاف ہے۔

امدادی رقوم کی ایک مخصوص مقدار واسطہ بننے کی اجرت میں لے لینا

سوال ۶: امدادی رقوم حاصل کرانے میں جدوجہد کرنا اور واسطہ بن کر معاوضہ لینا درست ہے نیز کم وبیش جس معاوضہ پر معاہدہ ہوا ہو ''المسلمون علی شروطھم'' کے تحت اس کا پورا کرنا ضروری ہوگا اور اس سے حاصل شدہ رقم بھی جائز ہوگی لیکن ایک مسلمان کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ دوسروں کی مجبوری سے اس طرح فائدہ اٹھائے دین وشریعت کا تقاضہ یہ ہے کہ معاوضہ بقدر عمل پر ہی اکتفا کرے۔

امدادی رقوم کے حصول کے لئے رشوت دینا:

سوال ۷: رشوت دینا اور لینا دونوں ہی ناجائز ہے البتہ اگر اپنا حق وصول کرنے میں رشوت دیے بغیر چارۂ کار نہ ہو تو اس کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن بہرحال رشوت کا لین دین چونکہ حرام ہے، اس لئے بلا ضرورت شدیدہ اس کا ارتکاب نہ کرے، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حیثیت دی ہے اور ان امدادی رقوم کے بغیر بھی ان کا کام چل سکتا ہے تو رشوت جیسی ملعون چیز سے وہ پرہیز کریں۔

امدادی رقوم کے حصول کے لئے غلط بیانی سے کام لینا:

سوال ۸: امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے حکومتوں نے جو شرائط اور معیارات متعین کئے ہیں ان پر پورا اترنے کے لیے غلط بیانی سے کام لینا یا جھوٹے دستاویزات اور ثبوت فراہم کرنا حکومت کی نظر میں تو جرم ہے ہی خود شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی یہ قطعاً ناجائز اور حرام ہے اس حقیر دنیا کے حصول کے لئے دین وشریعت کو بالائے طاق رکھ دینا ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

تعلیم یا دوسرے مقاصد کے لئے حکومت کے سودی قرض کی اسکیم:

سوال ۹: حکومت چاہے جونسے مقاصد کے لئے قرض دے یا بینکوں سے دلوائے اگر قرض لینے والے کو صرف اصل رقم واپس کرنا پڑتا ہے اور اس پر جو انٹرسٹ آتا ہے وہ حکومت ادا کرتی ہے تو بظاہر یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ تمام کے تمام حکومتی ادارے ہیں اصل یا نفع دونوں سرکاری خزانے ہی میں جمع ہوتا ہے، لہٰذا یہ امداد ہی کی شکل معلوم ہوتی ہے۔

دوسری شکل جس میں سود کا بعض حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بعض حصہ خود مقروض کو ادا کرنا پڑتا ہے شرعی رو سے ناجائز ہے کیوں کہ سود کی حرمت مطلقاً ہے کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

محفوظ فنڈ کی سودی رقم سے افراد واشخاص اور تعلیمی ورفاہی اداروں کا تعاون:

سوال ۱۰: محفوظ فنڈ جس کو ڈپازٹ کر دیا گیا ہے اس سے حاصل ہونے والے سود سے افراد واشخاص یا کسی طرح کے اداروں کی مدد کرنا شرعاً ناجائز ہے ایسے فنڈ سے مسلمانوں کو بچنا چاہئے کیونکہ یہ خالص سودی رقم ہے جس کا استعمال بلا ضرورت شدیدہ جائز نہیں ہے۔

......☆......

سرکاری ترقیاتی اسکیموں سے استفادہ

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی[1]

موضوع سے متعلق سوالات اور جوابات پیش خدمت ہیں:

۱- وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب۔ صورت مسؤلہ میں از روئے شرع ایسے قرضے درحقیقت حکومت کی طرف سے تعاون کے قبیل سے ہیں، اس تعاون کو قبول کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، ہم ہندوستان کے معزز شہری ہیں، حکومتوں کی طرف سے ملنے والی رعایتوں سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲- معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اس صورت کا کیا حکم ہے جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے؟

جواب۔ ہر وہ قرض جس میں لی ہوئی رقم سے زائد رقم کا مطالبہ نہ ہو تو اس کا حکم قرض حسنہ کا ہے، اس قرض اسکیم سے استفادہ میں شرعاً کوئی قباحت نظر نہیں آتی ، زائد رقم کا جہاں مطالبہ ہو وہ سود کے حکم میں شامل ہوگا۔

۳- اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

جواب۔ صورت مسؤلہ میں اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا حکم یقیناً سود ہی ہے جو شرعاً حرام ہے۔

۴- غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو؛ لیکن اس کی شرح بہت کم ہو، جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو، یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلا سکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرہ میں آئے گا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت و گنجائش ہوگی؟

جواب: قال اللہ تعالی "وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا" (سورۃ البقرۃ ۲۸۲)۔

(اور جو شخص قرض لے وہی (دستاویز کا) مضمون بول کر لکھوائے اور اللہ سے کہ جو اس کا مالک ہے خوف کرے اس میں کچھ کمی نہ کرے)۔

صورت مسؤلہ میں مذکورہ آیت کی روشنی میں مقروض سے سروس چارج لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ وہ سروس چارج درحقیقت اتنا ہی ہو جتنا کہ عرف میں لیا جاتا ہے، نیز یہ سروس کا عوض مقروض کے ذمہ واجب الاداء ہے۔ نیز اسلامی اصول یہ ہے کہ "کل قرض جر نفعا فهو ربا" یعنی ہر وہ قرض جس کے پیچھے نفع کمانا مقصود ہو تو ایسا قرض بھی سود ہے (السنن الکبری للبیہقی ۱۰۹۳۳، شرح السنۃ للبغوی ۸/ ۱۴۵) لہذا قرض پر زائد رقم کا ادا کرنا سود ہی ہوگا۔

۵- اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جا سکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے الی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جا سکے تو اس کا حکم سود ہی

---

[1] استاذ و مفتی جامعہ دار السلام، عمر آباد۔

ہوگا جو کہ جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کو پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری وباغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہوں، سب کا حکم سود ہوگا جو کہ شرعا حرام ہے، خواہ ہم جمہوری حکومتوں میں ایک باشندے ضرور ہیں، لیکن ہم اپنے مذہب کے ہر حال میں پابند ہیں، ہر معاملہ میں شریعت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے، شریعت کی بالادستی کو تسلیم کرنا ہر مسلمان کا ذمہ ہے۔

۶- ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلا مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب۔ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر جو رقم ملا کرتی ہے، مثلا مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے، تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنا درست ہے، جبکہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہو ایسے تمام اسکیموں سے استفادہ کرنا جائز ہے، ہم حکومت کے رعایا ہیں، باوقار ومعزز شہری ہیں، اور اس کے کل پرزے ہیں، اس ملک کو آزاد کرنے، ملک کے لئے خون پسینہ ایک کرنے میں، اس کی آزادی کے ہر دوڑ میں، تن من دھن کی قربانیاں پیش کرنے میں ہمارے مسلمان بھائیوں، علماء، فضلاء، مجاہدین آزادی کا پورا حق حاصل ہے، نیز حکومتیں ہمارے ووٹوں سے بنتی ہیں، لہٰذا حکومت کی جائز اعانت سے فائدہ اٹھانا ہمارا حق ہے، اس سلسلہ میں کسی بھی قسم کے تامل کی کوئی ضرورت نہیں۔

۷- گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم - جس قسم کی بھی ہوں - ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں، واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب۔ شریعت کے اصول میں سے ایک اصول یہ ہے کہ "الضرورات تبیح المحظورات"۔ یعنی ضروریات زندگی ممنوعات کو مباح کردیتی ہیں، یعنی مجبور انسانوں کے لئے ضرورۃ رشوت دے کر اپنا جائز حق حاصل کرنا جائز ہے، جہاں کوئی بھی کام بغیر کسی رشوت کے نہ ہوتا ہو، رشوت معمول بن چکا ہو۔ لیکن مجبور انسان کی مجبوری کا غلط فائدہ اٹھا کر رشوت لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں رشوت لینا ہر حال میں حرام ہے۔

۸- بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب۔ حکومت کی یا کسی بھی معاملہ میں رشوت لینا کسی بھی صورت میں درست نہیں ہے، یعنی حرام ہے، مجبوری میں رشوت دینا الگ ہے، لیکن رشوت لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں' 'الراشی والمرتشی کلاھما فی النار" (الطبرانی فی الاوسط بسند جید) یعنی رشوت لینے اور دینے والے دونوں جہنمی ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل فتوی میں بھی رشوت لینے پر حرمت کا بیان ہے۔

(مرکز الفتوی۔ ۲۴۸۷ ۔من اعطی رشوۃ لیتوصل بہا الی حق مشروع)۔

۹- اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے۔

جواب۔ ارباب علم ودانش کے فتاوے میں منقول ہے کہ اگر اپنا حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کی ضرورت پڑی، اور اس کے بغیر کوئی صورت نہ ہو تو اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہے، لیکن رشوت لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

''إذا لم يستطع صاحب الحق أخذ حقه، إلا بدفع رشوة فقد نص العلماء رحمهم الله على جواز دفعه للرشوة حينئذ، ويكون التحريم على الآخذ لها لا المعطى '' (فتاوى الاسلام سوال وجواب ۷۲۲۶۸۔، المشرف العام: محمدصالح المنجد)۔

۱۰- امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط ومعیارات متعین ہیں، اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب۔ ارشاد باری تعالی ہے۔ "یَآیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (سورۃ النساء ۲۹) مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ ہو جائے تو وہ جائز ہے) صورت مسؤلہ میں مذکورہ آیت کی روشنی میں امدادی رقم یا قرض حاصل کرنے کی غرض سے غلط بیانی سے کام لینا یا غلط طریقہ پر امداد یا قرض حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

۱۱- بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب۔ صورت مسؤلہ میں حکومت اپنی ذمہ داری پر بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بنک سے جو قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے، یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے تو بصورت صدق سوال ایسی صورت میں مقروض کے لئے حکومت کی طرف سے اعانت ہے، اس صورت سے فائدہ اٹھانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، مقروض کسی بھی صورت میں سود کا مسؤل نہیں ہوگا۔

۱۲- بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں، جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر دیا ہے، جس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، اس سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے، گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے، اس کا مالک ہوتا ہے اور پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے تو کیا صورت درست ہوگی؟

جواب۔ تقوی کا تقاضا یہ ہے کہ مذکورہ اسکیم سے اجتناب کیا جائے اور حلال کا راستہ اپنایا جائے، ارشاد باری تعالی ہے:

"وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا"

(سورۃ الطلاق: ۳)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لئے (رنج و محن سے) نجات (کی صورت) پیدا کر دے گا۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔ اللہ اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کر دیتا ہے اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ: ''إن الحلال بين وإن الحرام بين وبينهما مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس فمن اتقى الشبهات فقد استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام'' (متفق علیه)

یعنی یقیناً حلال اور حرام واضح ہے ان دونوں کے درمیان کچھ متشابہات ہیں، جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے، جو شخص مشتبہ چیزوں سے بچ جاتا ہے تو وہ اپنے دین اور عزت و آبرو کی حفاظت کر لیتا ہے اور جو مشتبہ چیزوں میں گھر جاتا ہے حرام میں پھنس جاتا ہے۔

......☆......

سرکاری جانب سے جاری کردہ ترقیاتی اسکیمیں اور سودی معاملات

مفتی محمد حسین قمر الدین ماہمکر فلاحی [۱]

ہمیں یہ اصول پیش نظر رکھنا چاہیے کہ عقود و معاملات میں حقائق و معانی کا اعتبار ہوتا ہے، انھیں کے اعتبار سے احکامات مرتب ہوتے ہیں، نہ کہ الفاظ کا، لہٰذا قرض بھی چونکہ ایک اہم شرعی عقد ہے، لہٰذا تمام امور میں حقائق کا اعتبار ہوگا، چاہے اس کی کچھ صورتوں و نوعیتوں میں ناموں کا الگ استعمال ہو۔ یہ بات صاف اس لیے کرنی پڑی، کیونکہ سرکاری اسکیموں اور قرضوں میں بسا اوقات سود یا دیگر شرعی ناجائز صورتوں کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، جبکہ ان کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے، لہٰذا وہاں حقائق و معانی کا اعتبار ہوگا، ظاہری الفاظ کا نہیں۔

(۱) قرض دینے والے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنا کل دین و قرض یا بعض قرض معاف کرسکتا ہے، جسے شرعاً ''ابراء'' کہا جاتا ہے، صرف معاملہ یہ کہ قرض دینے والا اہل تبرع و اختیار میں سے ہو، مجور علیہ نہ ہو، اور اگر قرض دینے والا ادارہ یا حکومت ہو تو دیگر منتظمین کی طرف سے ادارہ و حکومت کو ابراء دین کا حق حاصل ہو، اور کسی شرط پر معلق یا کسی مدت کے ساتھ مقید نہ ہو۔

صحیحین کی حدیث مبارک ہے کہ حضرت کعب بن مالک ؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ ﷺ کے دور مسعود میں حضرت عبداللہ بن ابی حدرد سے مسجد میں اپنے قرض کا مطالبہ کیا جس میں دونوں کی آواز بلند ہوگئی اور آپ ﷺ نے اپنے حجرہ مبارک میں اسے سنا، تو آپ ﷺ تشریف لائے، یہاں تک کہ اپنے حجرے کا پردہ ہٹایا پھر حضرت کعب بن مالک ؓ کو آواز دے کر اشارہ فرمایا: ''نصف قرض معاف کردو'' انہوں نے تسلیم کرلیا، تو آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ ؓ سے فرمایا: اب تم بقیہ ادا کرلو۔

لہٰذا حدیث پاک سے پتہ چلتا ہے کہ قرض دینے والا اپنے قرض کو معاف کرنے کا مکمل حق رکھتا ہے، البتہ ابراء دین وغیرہ کو کسی شرط پر معلق کرنا اور کسی مدت کے ساتھ مقید کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں کتب فقہ شوافع کی فقہی عبارات ملاحظہ فرمائیں:

''لأن الاعتبار في العبادات بمافي ظن المكلف وبما في نفس الأمر، وفي العقود بما في نفس الأمر فقط'' (فتح المعين مع حاشية اعانة الطالبين : ۱/ ۱۹۶)۔

''لأن العبرة في العقود بما في نفس الأمر'' (تحفة المحتاج ،كتاب السلم ،فصل في القرض : ۲/ ۲۰۹۔ ط : دارالكتب العلمية)۔

نیز قرضے میں سے بعض حصہ معاف کرنے سے متعلق حضرت امام نووی شافعیؒ رقمطراز ہیں:

''صلح الحطيطة وهو الجاري على بعض الدين المدعى ،فهو ابراء عن بعض الدين ،فإن أستعمل لفظ الإبراء أو مافي معناه بأن قال: أبرأتك من خمسة مأة من الألف الذي عليك أو صالحتك على الباقي ،برئ مما أبرأه، ولا يشترط القبول على الصحيح'' (روضة الطالبين : ۳/ ۴۳۰، ط : دارالكتب العلمية)۔

کتاب الأم میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''قال الشافعي: فأما السلف، فإن اسلفه شيئا ثم اقتضى منه أقل ،فلا بأس، لأنه متطوع له بهبة الفضل'' (الأم: ۳/ ۴۰۔ ط: دارالكتب العلمية)، اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: نهاية المحتاج مع الحاشيتين : ۴/ ۲۲۰۔۲۲۱۔ ط : دارالكتب العلمية. حاشية الجمل : ۵/ ۵۹۔ط : دار الكتب العلمية۔ نيز : تكملة المجموع : ۱۳/ ۲۹۲۔ حاشية اعانة الطالبين : ۳/ ۹۳ . نهاية المحتاج مع

---

[۱] قاضی شریعت مرکزی دار القضاء کوکن، جامعہ حسینیہ عربیہ شریوردھن۔

الحاشيتين: ۲/ ۲۲۱۔ ط: دار الكتب العلمية، الحاوي الكبير: ۱۸/ ۲۲۳۔ ط: دار الكتب العلمية)۔

(۳) اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کے ساتھ زائد رقم ادا کرنے کی شرط لگائی جائے تو یہ ایسی شرط ہے جس میں مقترض (قرض دینے والے) کا فائدہ ہے، ایسی صورت میں شرط کے ساتھ ساتھ عقد قرض بھی فاسد ہے۔

"لا يجوز القرض إن اقترض بشرط رد زيادة على القدر المقرض أو رد جيد عن ردی أو غير ذلك من كل شرط جر منفعة للمقرض" (تكملة المجموع: ۱۳/ ۲۹۱)۔

اور یہ صریح سود بھی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "ہر وہ قرض جو (دینے والے کے) نفع کا باعث ہو وہ سود ہے"۔ حدیث پاک کا حوالہ سابق میں گذرا۔

"مغنی المحتاج" میں تحریر ہے کہ یہ روایت گرچہ ضعیف ہے، لیکن اس مفہوم کو امام بیہقیؒ نے صحابہ کرامؓ سے نقل فرمایا ہے، صاحب مہذب نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے نفع کے باعث قرض سے منع فرمایا۔

"(ولا يجوز) قرض نقد أو غيره إن (بشرط رد صحيح عن مكسر أو) رد (زيادة) على القدر المقرض أو رد جيد عن ردی أو غير ذلك من شرط جر منفعة للمقرض كرده ببلد آخر أو رهنه بدين آخر، فإن فعل فسد العقد لخبر فضالة بن عبيد الله "كل قرض جر منفعة" أی شرط فيه ما يجر إلى المقرض منفعة "فهو ربا" وروى مرفوعا بسند ضعيف لكن الامام والغزالی رفعه، وروى البيهقی معناه عن جمع من الصحابة، والمعنى فيه أن موضوع القرض الارفاق" (نهاية المحتاج مع الحاشيتين: ۴/ ۲۳۰۔ ط: دار الكتب العلمية)۔

(۴، ۵) سوالنامہ میں مذکور چوتھی صورت میں غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن رقم کی شرح بہت کم ہو جس پر سروس چارج کا اطلاق ہوتا ہو تو عند الشوافع جو رقم بھی سروس چارج کے طور پر قرضوں پر زائد لی جائے وہ چاہے کم ہو یا زیادہ، سود شمار ہوگا، چاہے کسی فرد کی طرف سے ہو یا ادارہ وحکومت کی طرف سے، اسلئے کے اشیاء ربویہ میں تماثل ضروری ہے، یہاں تک کہ جو رقم بطور اجرت بھی زائد ہو وہ بھی تماثل کے لیے مانع ہے۔

مشہور فقیہ شافعی علامہ خطیب شربینیؒ فرماتے ہیں:

"ولا أثر لقيمة الصنعة فى ذلك، حتى لو اشترى بدنانير ذهبا مصوغا قيمته أضاف الدنانير، اعتبرت المماثلة ولا نظر إلى القيمة" (مغنی المحتاج: ۲/ ۳۱۔ ط: دار الكتب العلمية)۔

البتہ محتاج وغریب افراد کو غیر سودی قرض دستیاب نہ ہو اور گورنمنٹ کی سوالنامہ میں مذکور صورتوں کے لیے قرضے حاصل کریں، تو معمولی یا غیر معمولی زائد رقم جو انہیں ادا کرنی پڑے، تو اس میں ان کو اجازت رہے گی، یعنی ایسے قرضوں سے وہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

"مسألة: عمت البلوى أن أهل الثروة لا يقرضون أحدا إلا بزيادة، إما من نوع المستقرض أو غيره بصيغة النذر، أو يتأجر المقرض من المقترض أرضا بمال يسير يستغلها مرة بقاء الدين المذكور، أو يردها على المستقرض بأجرة تقابل تلك الزيادة، فالعقود المذكورة صحيحة إذا توفرت شروطها، ولا يدخل ذلك فى أبواب الربا۔

"مسألة: إعطاء الربا عند الإقتراض ولو للضرورة بحيث إنه إن لم يعطه لم يقرضه لا يدفع الإثم" (فتاوى ابن زياد مع بغية المسترشدين ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ط: دار الكتب العلمية)۔

صاحب "فتح المعین" رقمطراز ہیں:

"قال شيخنا ابن زياد: لا يندفع اثم اعطاء الربا عند الاقتراض للضرورة بحيث أنه إن لم يعط الربا لا يحصل له القرض إذ له طريق إلى إعطاء الزائد بطريق النذر أو التمليك، لاسيما إذا قلنا: النذر لا يحتاج إلى قبول لفظا على المعتمد، وقال شيخنا: يندفع الاثم للضرورة" (فتح المعين مع حاشية اعانة الطالبين: ۳/ ۲۵۔ ط: دار الكتب العلمية)۔

(۶، ۷، ۸) گورنمنٹ کی طرف سے کچھ ضروریات کے لیے جو رقم مکمل امداد کے طور پر ملا کرتی ہے تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور انکے مصارف میں استعمال کرنا جائز ہے اور اگر ان رقوم کے حصول کے لیے کوئی فرد محنت کرتا ہے تو اس کو متاجر کا درجہ حاصل ہوگا اور عقد اجرت کے شرائط کے مطابق اس کو پہلے سے طے شدہ اجرت یا اگر طے نہ ہو تو اجرت مثل کی ادائیگی لازم ہوگی۔ یا پھر حاصل ہونے والی رقم میں سے بھی اس کو اجرت دینا جائز ہے۔

(۹) اس قسم کی امدادی رقوم اور جائز قرضوں کے حصول کے لیے رشوت لازمی دینی پڑتی ہو تو اپنے حق کے حصول کے لیے رشوت دینا جائز ہے۔

جیسا کہ علامہ خطابی شافعیؒ حدیث مبارک ''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی'' کے تحت فرماتے ہیں:

''۔۔ فأما إذا أعطى ليتوصل به إلى حق أو يدفع عن نفسه ظلما، فإنه غير داخل فى هذا الوعيد۔ وروى أن ابن مسعود رضي الله عنه أخذ فى شيئى وهو بأرض الحبشة فأعطى دينارين حتى خلى سبيله'' (معالم السنن شرح سنن أبي داؤد ۴/ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ط: دار الكتب العلمية)۔

(۱۰) البتہ امدادی رقوم حاصل کرنے کے لیے حتی الامکان سچائی سے کام لینا چاہیے، جہاں سچ اور صدق بیانی سے معاملہ حل ہوتا ہو وہاں جھوٹ وغلط بیانی سے کام لینا حرام ہے، لیکن موجودہ حالات میں ہماری ملکی صورتحال کے مطابق ہم جانتے ہیں کہ حکومتی محکموں میں سارے دستاویزات وکاروائیاں مکمل ہونے کے باوجود بھی جھوٹ کا سہارا لینا ضروری ہوتا ہے، ایسے وقت میں مقاصد کے حصول کے لیے ضروری حد تک غلط بیانی سے کام لینے میں حرج نہیں ہے۔

''(الكذب حرام) سواء أثبت به منفيا ۔۔أو نفى به مثبتا۔۔ وهو مناقض للإيمان معرض صاحبه للعنة الرحمن لقوله تعالى: ''إنما يفترى الكذب الذين لا يؤمنون بآيات الله وأولئك هم الكاذبون'' (النحل: ۱۰۵) وقول النبي صلى الله عليه وسلم إن الصدق يهدى إلى البر والبر يهدى إلى الجنة والكذب يهدى إلى النار وقال سيدنا عمر رضي الله عنه: ''لأن يضعني الصدق وقلما يفعل أحب إلى من أن يرفعنى الكذب وقلما يفعل۔'' قال فى الإحياء: والضابط فى ذلك أن كل مقصود محمود يمكن التوصل إليه بالصدق والكذب جميعا فالكذب فيه حرام أو بالكذب وحده فمباح إن أبيح تحصيل ذلك المقصود (وجب إن وجب)'' (حاشية إعانة الطالبين ۴/ ۴۲۱۔ ط: دار الكتب العلمية)۔

(۱۱، ۱۲) جن اسکیموں میں تعلیم یا کوئی اور مقصد سے حکومت بنک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ حکومت مقروض کی طرف سے ادا کرتی ہے، زائد رقم مقروض کو ادا نہیں کرنا ہوتا ہے، لہٰذا ایسی اسکیموں سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے یا حکومت بینک میں اپنے محفوظ فنڈ کے سود کے ذریعے پر لوگوں کا تعاون کرتی ہے، تو اس سے استفادہ بھی جائز ہے۔

حضرت امام نووی شافعیؒ کی کتاب ''کتاب السبق والرمی'' کے ایک جزئیہ سے اس کے جواز کو مستنبط کیا جاسکتا ہے۔

''الحالة الاولى: أن يخرجه غيرهما فيجوز للإمام أن يخرج المال من خاص نفسه ومن بيت المال لما فيه من التحريض على تعلم الفروسية۔ الثانية: أن يخرجه المتسابقان فيقول كل واحد: إن سبقتك فلي عليك كذا، وإن سبقتني فلك على كذا، فهذا لا يجوز؛ لأنه صورة قمار، إلا أن يدخل بينهما محللا، وهو ثالث يشاركهما فى المسابقة على أنه إن سبق أخذ شرطاه'' (روضة الطالبين: ۷/ ۵۳۶۔ ط: دار الكتب العلمية)۔

......☆......

سرکاری اسکیموں سے متعلق جوابات کا خلاصہ

مولانا عبدالباسط قاسمی[1]

سرکاری اسکیم سے متعلق جوابات کا خلاصہ:

۱) ایسے قرضے جس میں اصل قرض سے معاف کردیا جائے تو واضح ہو کہ رعایت کرنے کا حق قرض دہندہ کو حاصل ہے، اور شرعاً اس میں بالکل کوئی قباحت نہیں ہے۔

۲) یہ صورت بھی جائز ہے، اس لیے کہ معافی پر جو زائد لیا جارہا ہے وہ اصل قرض کے برابر ہے، اصل سے زائد نہیں ہے اس لیے اس کے جواز میں بھی کوئی کلام نہیں ہے۔

اس لیے کہ یہ زیادتی گرچہ سبسڈی پر ضرور ہے، تاہم اصل قرض سے زائد نہیں ہے، جبکہ سود کی حقیقت شرعی وہ نفع وزیادتی جو کسی جانب کے لیے ہو اور عوض سے خالی ہو، جبکہ یہاں اصل قرض سے زائد نہ ہونے کی وجہ سے عوض سے خالی نہیں ہے، اس لیے بلا کراہت یہ قرضہ بھی لینا درست ہے۔

''الربا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه'' (الهداية، باب الربو ۳/ ۸۰)۔

''هو فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال'' (كنز الدقائق، باب الربا، ۲۴۸)۔

۳و۴) اگر اضافہ عام شرح سود سے کافی کم ہے اور بادی النظر میں یہ مترشح ہو کہ اس زیادتی کو انتظامی خرچ مانا جاسکتا ہو تو اس صورت میں توجیہ اور تاویل کی جائے گی محض سود کا نام دیدینے سے اس زیادتی کو سود قرار نہیں دیا جائیگا، جیسا کہ سابق میں تفصیلاً اس پر کلام گذرا، اور منی آرڈر کی فیس اور ڈیمانڈ ڈرافٹ کی فیس وغیرہ کے حکم میں مان کر اسے سروس چارج قرار دیا جانا چاہیے۔

۵) یہ سودی قرض ہوگا، عام حالت میں لینے کی کوئی گنجائش نہ ہوگی البتہ حاجت شدیدہ صحیحہ حارجہ کے متحقق ہونے کے بعد اور کوئی چارہ نہ ہو تو اس صورت میں لینے کی گنجائش ہوگی۔ ''دفعاً للحرج والمشقة''۔

واضح ہو کہ حاجت کی تعیین ہر شخص کے ذاتی احوال کی بناء پر کی جائے گی، جیسا کہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

''يعتبر في حق كل إنسان مايصح معه بدنه''۔

۶) ایسی رقوم کا استعمال درست ہے، درحقیقت یہ حکومتی ذمہ داری ہے کہ رعیت کی ضرورت کی تکمیل کے لیے وظائف، رعایتی رقوم اور غریب وپسماندگی اور بھکمری کا خاتمہ اور معاشی خوشحالی کا نظم کرے۔ جس کی مثالیں عہدِ فاروقی میں بکثرت ملتی ہیں۔ اس کے بعد مسلم بادشاہوں میں خصوصاً اور دیگر حکمرانوں کے یہاں بھی اس کی نظیریں کسی درجہ میں موجود ہیں، اس لیے اس طرح کی اعانت وامداد حکومت پر ضرور تمند شہریوں کا حق ہے، اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

۷) سب سے پہلی بات یہ ذہن میں رہے کہ اس طرح کی امداد کے لیے شرعاً جو معیار ہے وہ پایا جائے تو مطلوبہ امداد واعانت کے حصول کے لیے کسی سے تعاون لینا اور اس سے باضابطہ اجرت طے کرکے یہ رقم حاصل کرنا درست ہے۔

۸) یہ زیادتی ہے، مستحق اور امداد لینے والا پر ظلم ہے، بلکہ جو لوگ کی اس طرح اعانت کرسکتا ہو کہ ان کے جائز حقوق دلواسکے تو اسے یہ کرنا چاہیے اور

---

[1] جامعہ عبداللہ بن مسعودؓ، دارالمؤمنین جامع مسجد اتر شیو، تھانے ممبئی۔

معروف ومتداول اجرت سے زائد لینا بھی بہرحال اجرت کہلائیگی، لیکن اگر اجیر خود اس رقم بانٹنے والے محکمہ کا ملازم ہو تو یہ لینے دینے کا معاملہ رشوت میں داخل مانا جائیگا، جس کی بدرجۂ مجبوری دینے والے کے حق میں گنجائش ہوگی۔

۹) ضرورتمند اور مستحق افراد کے لیے جائز حقوق کی وصولیابی کے لیے رشوت دینے کی گنجائش ہوگی، جبکہ لینے والے کے لیے رشوت ہر حال میں حرام ہے، احناف کے علاوہ فقہاء ثلاثہ کے یہاں بھی جائز حقوق کی وصولیابی کے لیے رشوت دینے کی اجازت دی گئی ہے۔

لہٰذا جو شخص شرعی ضابطوں کے مطابق ضرورتمند و مستحق ہو تو اس شخص کے لیے رشوت دیکر یہ امداد حاصل کرنے کی اجازت ہوگی، لیکن جو مالی حیثیت رکھتا ہو، اور ضابطہ کے مطابق سارے کاغذات بھی ہوں تو چونکہ امداد اعانت کا مقصود حاجتمندوں اور پسماندہ افراد کی اعانت ہے تو، اس لیے ایسے شخص کو رشوت دینے کی اجازت میں تأمل ہے۔ فتاوی شامی کی عبارت میں "طلبا للنفع" موجود ہے، اس سے گنجائش کی بات کہی جاسکتی ہے۔

۱۰) شرعی قواعد کی بناء پر ایسی امداد و قرض کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت وحاجت کو معیار بنایا گیا ہے، اگر شرعی بنیادیں پائی جائیں اور ضرورت وحاجت کے پورا ہونے کی کوئی شکل نہ ہو اور سرکاری شرائط ومعیار موجود نہ ہوں تو عزت وآبرو کے تحفظ کے ساتھ کوئی حیلہ ممکن ہو تو اختیار کرنے کی گنجائش ہوگی۔ جیسا کہ بہت سے معاملات میں سرکاری شرائط ومعیارات کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ اور عزت وآبرو کے تحفظ کے ساتھ ان شرائط کے ترک کی گنجائش دی گئی ہے۔ حج وعمرہ میں نئی پابندیوں کے سلسلہ میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں۔ اور ان پابندی سے متعلق قوانین کے خلاف ورزی کو گناہ نہیں قرار دیا گیا ہے، بلکہ یہ صرف انتظامی مسائل ہیں، ان کی پاسداری اخلاقی فرض ہے، اس کے اور بھی نظائر تجارت و ملازمت کے نو پید مسائل سے متعلق کتب فتاوی میں موجود ہیں۔ لیکن جو شرعی ضابطوں کے مطابق ضرورتمند نہیں ہے، اس کے لیے گنجائش نہیں دی جاسکتی۔

۱۱) یہ سودی قرض ہے اس میں تاویل وتوجیہ کی کوئی گنجائش نہیں معلوم ہوتی ہے، اس لیے ایسی اسکیموں سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے۔

۱۲) اس طرح کی اسکیموں سے استفادہ درست ہے، اس لیے کہ غیر مسلموں کے یہاں سودی لین دین ان کے نظریہ کے مطابق درست ہیں۔ اور قانوناً حکومت بھی درست مانتی ہے۔ اگر سودی لین دین حکومت خود بھی اداروں اور بینکوں سے کرتی ہے، اور اس سے حاصل ہونے والے سود کی مالک بنتی ہے، پھر اس سے اشخاص یا اداروں کی اعانت کرتی ہے تو چونکہ امداد واعانت حاصل کرنے والوں کا سودی معاملات سے لینا دینا نہیں ہے، اس لیے غیر مسلم حکومت کی اس طرح کی امداد اعانت درست ہے۔

جیسا کہ پراویڈنٹ فنڈ میں جو رقم ملازم کی تنخواہ سے کٹتی ہے اور اتنی ہی ادارے کی جانب سے ملائی جاتی ہے اور پھر وہ ادارہ بینک یا کسی سرکاری ادارے کو بطور قرض دیتا ہے اور اس پر بینک یا حکومت سے سود حاصل کرتا ہے۔ اور بوقت سبکدوشی تینوں مال کو ایک ساتھ ملازم کے حوالہ کرتا ہے، ارباب فقہ وفتاوی نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اس لیے اس سود سے ملازم کا لینا دینا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ جو فنڈ جمع ہوتا ہے اس پر ملازم کی ملک نہیں ہے، بلکہ محکمہ کی ملک میں وہ فنڈ کی رقم ہوتی ہے اور وہ خود اس پر اضافہ حاصل کرتی ہے خواہ بینک سے ہو یا اور کہیں سے۔ چونکہ محکمہ کا یہ ذاتی فعل ہے اور ملازم کا اس سارے معاملات سے براہِ راست یا بالواسطہ عملاً کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ملازم اس طرح کے معاملات کا مطالبہ کرتا ہے اور نہ ہی اس میں کوئی دخل ہوتا ہے بلکہ محکمہ خود کرتا ہے۔ نیز شرعاً اس پر سودی لین دین کی تعریف صادق نہیں آتی۔ اس لیے کہ سودی معاملہ عقد معاوضہ (تبادلہ کا معاملہ) ہو اور کسی ایک جانب بلاعوض زیادتی ہو، حالانکہ یہاں ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے، اس لیے مجموعہ رقم کو انعامی رقم مانا جائے گا۔ اور ملازم کے لیے بلا کراہت درست ہوگی۔

اسی طرح اگر بینک یا حکومت غیر مسلم ہو، یا مشترک ہو، لیکن اقتدار اعلیٰ غیر مسلم کا ہو تو اس میں بھی وہی احکام جاری ہوں گے جو عام غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کے احوال واحکام ہوتے ہیں، غیر مسلم آپس میں سودی کاروبار بھی کرتے ہیں، غیر شرعی اور ناجائز کاروبار بھی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، پھر مسلمانوں کو یہی پیسے مزدوری میں اسی طرح انعام اور ہدیہ میں دیتے ہیں۔ حالانکہ شرعاً وہ تمام پیسے حرام معلوم ہونے کے باوجود ان سب کا

لے لینا اور استعمال کرنا بلا کراہت درست ہے، اس شرط کے ساتھ جب تک یہ تعین نہ ہو جائے کہ یہ وہی رقم ہے جو ڈاکہ ڈال کر لایا ہے یا چرا کر۔ اس کے جواز کی بنیاد یہ ہے کہ تبدل ملک سے تبدل عین ہو جاتی ہے، نیز "الخلط استہلاک" کا فقہی ضابطہ بھی اس میں جاری ہوگا۔

کفار ابتداء ایمان اور حدود وعقوبات کے مخاطب ہوتے ہیں باقی معاملات میں جزئی احکامات کے مخاطب نہیں ہوتے ہیں، اس لیے ان کے آپس کے معاملات برقرار اور نافذ رکھے جاتے ہیں، جیسا کہ غیر مسلم زوجین اگر ایک ساتھ مسلمان ہو جائیں تو باوجود یہ کہ زمانۂ کفر کا نکاح جو شرعی ضابطوں کے خلاف ہوتا ہے اس کو باقی رکھا جاتا ہے۔ الا یہ کہ بہن یا بیٹی یا دیگر محارم نکاح میں ہوں، تو اس صورت میں تفریق کرادی جاتی ہے ورنہ باقی رکھے جاتے ہیں۔ بس یہی حکم وحال یہاں بھی ہوگا کہ بینک اور سرکاری محکمہ کے ذمہ داران وافسران عام طور پر غیر مسلم ہوتے ہیں یا کم از کم اقتدار اعلی غیر مسلم کے ہاتھ میں ہوتا ہے، یہ لوگ اپنے طور پر سودی کاروبار سے نفع حاصل کر کے جمع کریں پھر کسی مسلمان ملازم کو بطور تبرع دیں تو اس کا لینا جائز ہوگا۔ اور بمد انعام یا اعانت وامداد داخل ہو کر طیب وحلال ہوگا (مستفاد، از: منتخبات نظام الفتاوی)۔

ان تمام تفصیلات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ اس طرح کے محکموں سے رفاہی، تعلیمی اعانت لینا افراد واشخاص اور اداروں کے لئے بلا کراہت درست ہے۔

......☆......

کچھ سرکاری اسکیموں سے فائدہ اُٹھانے کا شرعی حکم

مولانا محمد فاروق دربھنگوی[1]

قرض میں زیادتی کی شرط:

شریعت کی رو سے قرض دینا قربتوں میں سے ایک قرب اور بڑے اجر و ثواب کا ذریعہ ہے، مگر تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ عقد قرض میں کسی بھی طرح کی زیادتی کی شرط لگانا جائز نہیں ہے خواہ مقرض کے لئے مقدار میں زیادتی کی شرط ہو کہ مثلاً: ادائیگی قرض کے وقت اسی جنس سے اصل مقدار پر زائد دینا ہوگا، یا صفت میں عمدگی کی شرط لگائی جائے، یا یہ کہ قرض لینے والے کی جانب سے ہدیہ وغیرہ دینے کی شرط ہو، تو اس طرح کی تمام شرطیں ناجائز اور باعث گناہ ہیں، جس کی چند وجہیں ہیں:

۱۔ حدیث پاک میں ہر ایسے قرض سے نہی وارد ہوتی ہے جو مقرض کے لئے نفع کا ذریعہ ہو۔

۲۔ عقد قرض کی وضعیت ارفاق وقربت کے لئے ہے، اب اگر کوئی مقرض اپنے لئے زیادتی کی شرط لگا دے تو یہ عقد اپنی موضوعیت ارفاق وقربت سے خارج ہو جائے گا، کیونکہ اس وقت یہ قرض تحصیل زیادتی کے لئے ہوگا، نہ کہ قربت کے لئے۔

۳۔ یہ زیادتی کی شرط اس لئے بھی ممنوع ہے کہ زیادتی مشروطہ ربوا کے مشابہ ہے، اس لئے کہ یہ ایسی زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہیں ہے، اور شریعت غرا نے جس طرح حقیقت ربو کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح شبہ ربوا کو بھی حرام قرار دیا ہے، لہٰذا اگر عقد قرض میں اس طرح کی زیادتی مشروط ہو تو عقد قرض فاسد ہو جائے گا۔

لہٰذا حکومت ہو یا کوئی ادارہ اس کے لئے قرض کی سہولیات فراہم کرتے وقت اس طرح سے زیادتی کی شرط لگانا جائز نہیں ہے، اسی طرح آج کل بعض ادارے قرض جاری کرتے ہیں اور قرض کے تناسب سے مقروض سے ماہانہ فیس رکنیت کی وصول کرتے ہیں تو یہ صورت بھی جائز نہیں ہے، اور یہ بھی سود کے دائرہ میں آتی ہے ایسے قرض کو غیر سودی کہنا محض دھوکہ ہے (قاموس الفقہ ۴ / ۴۹۳)۔

بوقت ضرورت زیادتی کے ساتھ قرض لینا:

رہی بات ضرورت و مجبوری کے وقت زیادتی کے ساتھ قرض لینے کی، تو اس سلسلہ میں علامہ ابن نجیم مصری علیہ الرحمہ نے ''الاشباہ والنظائر'' اور ''البحر الرائق'' میں ذکر کیا ہے کہ حاجت وضرورت کے وقت اس طرح قرض لینے کی گنجائش ہے، جیسا کہ تحریر فرماتے ہیں:

''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح، وفی الحموی: وذلك نحو أن یقترض عشرة دنانیر مثلًا، ویجعل لربھا شیئًا معلومًا فی کل یوم ربحًا'' (الاشباہ ۱/ ۳۲۷، البحر الرائق ۶/ ۲۱۱ بیروت)۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مذکورہ جزئیہ میں ''محتاج'' سے کیا مراد ہے:

آیا اس سے مضطر، یعنی ایسا شخص مراد ہے کہ اگر وہ اس طرح قرض نہ لے تو ہلاک یا قریب الہلاک ہو جائے، جیسا کہ صاحب ضرورت کی یہی تعریف کی گئی ہے:

---

[1] جامعہ دار الاحسان باردولی، سورت، گجرات۔

سود دینا حرام ہے ایسے شخص پر حدیث شریف میں لعنت وارد ہوئی ہے، حرام کا ارتکاب اضطرار کی حالت میں معاف ہے، اگر جان کا قوی خطرہ یا عزت کا قوی خطرہ ہے، نیز اور کوئی صورت اس سے بچنے کی نہیں، مثلاً نہ جائیداد فروخت ہوسکتی ہے نہ روپے بغیر سود کے مل سکتا ہے، تو ایسی حالت میں زید شرعاً معذور ہے (فتاوی محمودیہ میرٹھی ۲۴ / ۴۳۸)۔

تائید (۴): اسی طرح حضرت علیہ الرحمہ نے "الاشباہ والنظائر" کے اسی جزئیہ سے متعلق سوال کا جواب حسب ذیل انداز سے ارقام فرمایا ہے:

سوال: "یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" کا مصداق کیا ہے؟

جواب: قاعدہ تو یہ بیان کیا ہے "الحاجة تنزل منزلة الضرورة" اس ذیل میں اس استقراض بالربح کے جواز کو لکھا ہے، حاجت کی کوئی تفصیل وتشریح شرح میں بیان نہیں کی، بظاہر مطلب یہ ہے کہ: جو شخص اس درجہ محتاج ہو کہ کما نہیں سکتا، اور بغیر قرض کے گزارہ کی کوئی صورت نہیں، اور قرض بغیر ربو کے نہیں ملتا، وہ اپنی مجبوری کی حد تک معذور ہے (محمودیہ میرٹھ ۲۴ / ۳۹۹)۔

اس تشریح سے بھی محتاج بمعنی مضطر ہی مفہوم ہوتا ہے، اس لئے کہ جو نہ خود کما سکتا ہو اور نہ گزارے کے لئے کوئی چیز میسر ہو اور قرض لیے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، اور قرض دینے کے لئے کوئی تیار نہ ہو تو ایسی حالت یقیناً اضطرار کی مصداق ہے۔

مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوگیا کہ ان حضرات اکابرینؒ کے نزدیک حالت اضطراری میں سودی قرض لینے کی اجازت ہے ورنہ نہیں۔

البتہ اضطراری صورت جس طرح ہلاکت جان میں متحقق ہوتی ہے اسی طرح عزت نفس میں بھی متحقق ہوتی ہے، جیسے کہ شادی کی ضرورت ہو اور اس کے حصول کے لئے دوسری کوئی صورت نہ ہو اور نہ صبر کی طاقت ہو، بلکہ معصیت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ اور ظن غالب ہو تو ایسی صورت میں بھی بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی، البتہ فضول اخراجات، مہمان نوازی، حتی کہ ولیمہ کی دعوت کے لئے بھی ایسی رقم لینے کی اجازت نہ ہوگی۔

(فتاوی رحیمیہ جدید ۵ / ۲۹۹)۔

حاصل یہ کہ غیر حالت اضطراری جیسے کسی کے پاس سر چھپانے کے لئے مکان موجود ہو، خواہ کرایہ کا کیوں نہ ہو اس کے لئے مکان خریدنے کے لئے سودی قرض لینا درست نہ ہوگا، اسی طرح فیکٹری لگانے، یا کاروبار بڑھانے کے لئے سودی قرض لینے کی اجازت نہ ہوگی، کیونکہ یہ سب غیر اضطراری حالتیں ہیں، جیسا کہ (کتاب الفتاوی ۵ / ۳۱۴، فتاوی عثمانی ۳ / ۳۱۱، فتاوی محمودیہ ۲۴ / ۴۳۹) وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

شرط زائد میں تردد:

اگر کسی سے اس طور سے قرض لیا جائے کہ ادائیگی کے لئے مدت متعین ہو، اور عقد قرض میں یہ معاہدہ ہو کہ اس مدت تک اگر ادائیگی ہوگئی تو اصل مقدار پر کسی طرح کی زیادتی نہ لی جائے گی، ورنہ مدت گذرنے کے بعد ادائیگی کی گئی تو اصل قرض پر زیادتی کے ساتھ ادائیگی کرنی ہوگی، تو آیا قرض لینے کی یہ صورت جائز ہوگی یا نہیں، تو اس صورت کے سلسلہ میں دو طریقے سے غور کیا جا سکتا ہے:

پہلا طریقہ:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ اگر قرض لینے والے کو اپنی ذات پر وثوق واطمینان ہو کہ وقت متعین پر وہ ادائیگی کر دے گا، اور ایسی صورت پیش آنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ مدت گذر جائے اور زیادتی لازم ہو تو یہ صورت جائز ہے، اس لئے کہ اس صورت میں کسی طرح کی بھی شرعی قباحت لازم نہیں آتی، جیسا کہ اس کی تائید عقد بیع میں خیار شرط کے ایک جزئیہ سے ہوتی ہے کہ اگر عقد بیع میں خیارت شرط کی مدت تین دنوں سے زائد لگائی گئی تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ شرط جائز نہ ہوگی، لیکن اگر تین دنوں کے اندر ہی بیع کی اجازت دیدی یا خیار ساقط کر دیا تو بلا کراہت بیع جائز ہو جائے گی، جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

"ولا يجوز أكثر منها عند أبي حنيفة، إلا أنه إذا أجاز في الثلث جاز عند أبي حنيفة . لأنه سقط المفسد قبل تقرره، فيعود جائزًا" (هدايه ٣/ ٢٩)۔

اس جزئیہ سے معلوم ہوگیا کہ اگرچہ ناجائز شرط کے ساتھ عقد بیع کا انعقاد ہوا ہو، مگر چونکہ فساد کا تقرر چوتھے دن سے حاصل ہوگا، اس لئے اگر اس

سے پہلے ہی بیع نافذ ہوگئی تو یہ بیع جائز ہوجائے گی، اسی طرح قرض میں زیادتی کی شرط اس وقت موثر ہوگی جبکہ مدت گذر جائے، اور اگر مدت سے قبل ہی قرض ادا کردیا گیا تو زیادتی کی شرط پر کسی طرح کا عمل نہیں پایا گیا، لہٰذا اس طرح قرض لینا جائز ہوگا، اور دونوں مسئلوں میں جامع علت مدت متعینہ کے گذرنے پر فساد کا لزوم ہے نہ کہ اس سے قبل۔

دوسرا طریقہ:

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس طرح سے قرض لینا جائز نہ ہو، کیونکہ اس میں اگرچہ قرض دہندہ متعین مدت فراہم کرتا ہے کہ جس میں اگر مقروض ادائیگی کردے تو اس کو سود ادا نہیں کرنا پڑتا، لیکن اصلاً معاہدہ سود کی بنیاد پر ہوتا ہے اور قرض لینے والا اس کی ادائیگی کا عہد و پیمان کرتا ہے، اس لئے اس طرح قرض لینا جائز نہ ہوگا، چنانچہ فقہ اکیڈمی کی جانب سے پندرہویں سمینار میں بینکنگ کے مختلف کارڈ کے استعمال کے سلسلہ میں جو فیصلے ہوئے ہیں، ان میں کریڈٹ کارڈ کے بارے میں یہی فیصلہ ہوا تھا کہ اس کا استعمال جائز نہیں ہے، اور یہی بات واضح ہے کہ کریڈٹ کے استعمال میں اسی طرح وقت متعین کے اندر کوئی سود لازم نہیں آتا، اور مدت گذر جانے کے بعد عدم ادائیگی کی صورت میں زیادتی لازم آتی ہے (دیکھئے: فقہ اکیڈمی کے فیصلے/۱۵۱)۔

بندہ کی رائے:

اس سلسلہ میں بندہ کی رائے یہ ہے کہ عصر حاضر میں جبکہ اس طرح کے معاملے کا ہر جگہ شیوع اور عام چلن ہو چکا ہے کہ اگر وقت متعین میں ادائیگی نہ کی گئی تو زیادتی کے ساتھ ادا کرنا پڑتی ہے، جیسے بجلی، ٹیلیفون، پائپ لائن گیس اور پوسٹ پیڈ موبائل کے بلوں میں تاخیر سے ادا کرنے پر زیادتی کی شرط ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر مسلموں سے ادھار تجارت کرنے، اسکول کالجوں کی فیس بھرنے اور بینک کے مختلف کارڈ استعمال کرنے میں بھی یہی شرط ہوتی ہے، اب اگر اس طرح کے معاملہ کو مطلقاً ناجائز قرار دیا جائے تو لوگوں کے بہت سے معاملے ناجائز ہوجائیں گے، اور یہ یقیناً تنگی وحرج ہے جو قابل موضوع ہے، اس لئے بندہ کی رائے یہ ہے کہ:

ان لوگوں کے لئے جو وقت متعین پر ادا کرنے پر قادر ہوں اور انہیں پورے طور سے اطمینان ہو کہ وہ اس کے خلاف نہ کریں گے ان کے لئے اس طرح قرض لینے اور فائدہ اٹھانے کی اجازت ہونی چاہئے، اس لئے کہ ایسے وقت میں زیادتی کا معاہدہ محض خانہ پری کے لئے ہوگا، اور اصل معاملہ جزم ویقین کے ساتھ غیر سودی ہوگا، البتہ ایسے لوگ جنہیں تردد ہو اور وقت پر ادائیگی ممکن نہ ہو تو ان کے لئے اس طرح سے قرض لینا درست نہ ہوگا، جیسا کہ حسب ذیل عبارت سے مسئلہ مذکورہ میں استفادہ کیا جاسکتا ہے:

''إن المفسد ليس هو شرط الخيار، بل وصله بالرابع، فإذا أسقطه تحقق زوال المعنى المفسد قبل مجيئه فيبقى العقد صحيحًا'' (شامی ۷/۱۱۴ خیار شرط)۔

(یعنی مفسد شرط خیار (کی مدت کا تین سے زائد ہونا) نہیں ہے، بلکہ اس کا چوتھے دن سے مل جانا ہے تو جب چوتھے دن سے قبل اس زائد مدت کو ساقط کردیا تو معنی مفسد آنے سے پہلے زائل ہوگیا، لہٰذا عقد صحیح وسالم باقی رہا۔

سروس چارج کے نام پر زیادتی:

قرض فراہم کرنے والے ادارہ خواہ سرکاری ہوں یا پرائیوٹ قرض جاری کرنے اور اس کے حساب وکتاب منضبط رکھنے پر جو اخراجات آئیں وہ قرضداروں سے سروس چارج کے نام سے لے سکتے ہیں، بشرطیکہ دو شرطیں بیک وقت موجود ہوں:

۱۔ یہ سروس چارج کے عنوان پر لی جانے والی زیادتی اس جیسے کاموں پر آنے والی اجرت مثل سے زائد نہ ہو۔

۲۔ اس اجرت کی وصولی کو قرض پر حصول نفع کے لئے ایک حیلہ اور بہانہ نہ بنالیا جائے اگر یہ دونوں شرطیں بیک وقت موجود ہوں تو سروس چارج کے نام سے کچھ زیادتی لینے کی اجازت ہوگی۔

اس لئے کہ قرض کا اجراء کرنا اور اس کے حساب و کتاب کا محفوظ رکھنا از خود نہ ہوگا، بلکہ ایک عاملہ کے ذریعہ ہی انجام پائے گا، اور اس عاملہ کا بلا معاوضہ ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ عموماً اس کی تنخواہ اور اجرت مثل متعین ہوتی ہے، اور ظاہری بات ہے کہ یہ عمل قرض لینے والوں کے لئے ہو رہا ہے تو اس کی اجرت بھی ان ہی پر ہوگی، جس کی نظیریں قاضی و مفتی کا لکھنے پر اجرت لینا ہے، یعنی قاضی و مفتی کے لئے زبانی فتوی دینے اور فیصلہ کرنے کی اجرت لینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ زبانی فتوی دینا اور فیصلہ کرنا ان کا امر وجوبی اور حق منصبی ہے، اور ایسے عمل پر کسی طرح کی بھی اجرت لینا درست نہیں، لیکن مفتی کے لئے فتوی تحریر میں لانے اور قاضی کے لئے دستاویز لکھنے اور رجسٹرڈ کرنے کا عمل وجوبی نہیں ہے، اس لئے ان کے لئے عمل مذکور پر اجرت لینا جائز ہے، بشرطیکہ یہ اجرت ایسے کاموں پر ملنے والی اجرت مثل سے زیادہ نہ ہو، اور نہ فتوی دینے اور فیصلہ کرنے پر اجرت کے لئے حیلہ ہو، جیسا کہ علامہ علاء الدین حصکفی فرماتے ہیں:

''ویستحق القاضي الأجر على كتب الوثائق والمحاضر والسجلات قدر ما يجوز لغيره. كالمفتي فإنه يستحق أجر المثل على كتابة الفتوى؛ لأن الواجب عليه الجواب باللسان دون الكتابة بالبنان. ومع هذا الكف أولى. احترازًا عن القيل والقال وصيانة لماء الوجه عن الابتذال'' (درمختار مع الشامی ۹/ ۱۲۷)۔

(اور قاضی وثیقہ، محاضرات اور سجلات کی تحریر کرنے پر اتنی مقدار اجرت کا حقدار ہوگا، جتنی مقدار اس جیسے عمل پر لی جاتی ہے، جیسے کہ مفتی فتوی تحریر کرنے پر اجرت مثل کا حقدار ہوتا ہے، اس لئے کہ ان پر زبان سے جواب دینا واجب ہے نہ کہ تحریری جواب دینا، لیکن اس کے باوجود لوگوں کے قیل وقال اور اپنے کو حقارت و ذلت سے دور رکھنے کے لئے اجرت نہ لینا ہی افضل ہے)۔

رہی بات یہ ہے کہ یہ سروس چارج قرض کی مقدار پر فیصد کے اعتبار سے لے سکتے ہیں یا نہیں؟ تو ظاہر یہی ہے کہ قرض کی مقدار پر فیصد کے اعتبار سے لینا جائز نہ ہو، اس لئے کہ مقدار قرض تھوڑی ہو یا زیادہ اس کے اندراج میں محنت و مشقت کی کمی یا زیادتی واقع نہیں ہوتی، بلکہ دونوں کے اندراج میں یکساں عمل کی ضرورت پڑتی ہے، لہٰذا ہر قرض دار سے یکساں چارج لینا چاہئے۔

لیکن اس ظاہر کے خلاف ہر قرضدار سے مقدار قرض پر فیصد کے اعتبار سے بھی سروس چارج لینا جائز ہے، اس لئے کہ اجرت مثل ہمیشہ مشقت کار کے مطابق نہیں ہوتی، بلکہ اجرت کی قلت و کثرت میں بعض اوقات کام کی معنوی حیثیت کا اعتبار ہوتا ہے، اور بعض دفعہ نفع اٹھانے والے کے نفع کا اعتبار ہوتا ہے، اور اس اعتبار سے معمولی مشقت کے کام پر زیادہ اجرت دی جاتی ہے، اور بعض دفعہ زیادہ مشقت کے کام پر تھوڑی اجرت دی جاتی ہے۔

جیسا کہ علامہ شامیؒ کے حسب ذیل جزئیہ سے اس کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے:

''قال في جامع الفصولين: للقاضي أن يأخذ ما يجوز لغيره، وما قيل: في كل ألف خمسة دراهم لا نقول به، ولا يليق ذلك بالفقه، وأي مشقة للكاتب في كثرة الثمن؟ وإنما أجر مثله بقدر مشقة أو بقدر عمله في صنعته أيضًا كحكاك وثقاب يستأجر بأجر كثير في مشقة قليلة. قال بعض الفضلاء: افهم ذلك جواز أخذ الأجرة الزائدة. وإن كان العمل مشقته قليلة، ونظرهم لمنفعة المكتوب له'' (شامی ۹/ ۱۲۷)۔

(قاضی کے لئے (دستاویز وغیرہ لکھنے پر) وہی اجرت لینا جائز ہے جو اجرت دوسرے کے لئے جائز ہے، اور جو کہا گیا کہ وہ ہر ہزار میں پانچ درہم لے گا، تو ہم اس کے قائل نہیں، اور نہ یہ ازروئے فقہ مناسب ہے، (کیونکہ) کاتب کے لئے زیادتی ثمن لکھنے میں کونسی زائد مشقت اٹھانی پڑتی ہے؟ اور یقیناً عمل کی اجرت مثل اس کی مشقت کے بقدر ہوتی ہے یا کام کی صنعت و نوعیت کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے، جیسے کہ سونے چاندی کو رگڑ کر پرکھنے والا اور (موتی) میں سوراخ کرنے والا تھوڑی مشقت والے عمل پر بڑی اجرت لیتا ہے، بعض فقہاء نے فرمایا: کہ اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اگر چہ عمل کی مشقت تھوڑی ہو مگر اس پر زائد اجرت لینا جائز ہے، اور ان فقہاء کی نظر مکتوب لہ کے نفع کی طرف متبادر ہوگی)۔

خلاصہ یہ کہ اجرت کی کمی و زیادتی کا مدار عمل کی قلت مشقت اور کثرت مشقت نہیں ہے، بلکہ اس کا مدار عمل کی معنویت اور نافعیت ہے، جس کی وجہ سے اجرت کی کمی و زیادتی واقع ہوتی ہے، لہٰذا قرض وغیرہ کے اجراء کرنے میں اس کی معنوی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے فیصد کے اعتبار سے اتنا سروس چارج وصول کرنا جائز ہے جو اجرت مثل سے زائد نہ ہو۔ ..... ☆ .....

ترقیاتی نقطہ نظر سے سرکاری اسکیم سے استفادہ

مفتی محمد ارشاد پالنپوری[1]

۱۔ سرکاری طرف سے ملنے والے وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم دینا پڑتا ہے حکومت کے نزدیک ایسے قرضوں کی فراہمی کا مقصد لوگوں کی امداد اور تعاون ہوتا ہے، لہٰذا قرض کی رقم کا وہ حصہ جو معاف کردیا جاتا ہے اس میں یہ تاویل کی جائے گی کہ حکومت نے بطور تعاون یہ رقم دی ہے، لہٰذا شرعاً ایسے قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے (فتاوی رحیمیہ ۹ / ۲۳۳)۔

۲۔ معافی والے قرضوں میں اگر مقررہ مدت میں آدمی رقم واپس نہ کرسکا جس کی بناء پر پوری رقم ادا کرنی پڑے، لیکن لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے تو اس میں یہ تاویل کی جائیگی کہ حکومت نے بطور تعاون جو رقم دی تھی اس شخص نے وہ تعاون والی رقم واپس کردی لہٰذا مذکورہ تاویل کی بناء پر مذکورہ اسکیم کے تحت قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ ''وکان علیہ مثل ماقبض'' (تنویر الابصار ۷ / ۲۹۸)۔

۳۔ اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا حکم یہ ہیکہ جس شخص کو اپنے پر یقین کے ساتھ پورا اعتماد ہو کہ میں مقررہ مدت میں قرض کی رقم واپس کردونگا اور مجھے ایک روپیہ بھی زائد ادا نہ کرنا پڑیگا تو وہ شخص تو اس اسکیم کے تحت قرض وصول کرسکتا ہے، لیکن جس شخص کو قرض کی واپسی کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ ہو کہ میں مقررہ مدت مدت میں قرض کی رقم کی واپسی کرسکونگا کہ نہیں تو ایسے شخص کے لئے مذکورہ اسکیم کے تحت بالکل قرض کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے کہ سود کا معاملہ اتنا بھیانک اور خطرناک ہے کہ سود لینے دینے سے تو بچنا ہی ہے، لیکن جہاں سود لینے دینے کا شبہ لازم آتا ہو اس سے بھی بچنا ضروری ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں کہ سود اور ربا کے معاملہ میں شبہ ربا بھی حقیقت کے ساتھ لاحق ہے:

''والأصل فیه أن شبهة الربا وشبهة الجنسیة ملتحقة بالحقیقة فی باب الربا احتیاطا للحرمة'' (فتاوی شامی ۷/ ۳۱۹)

۴۔ سرکار کی طرف سے جاری کردہ قرضوں میں اگر اصل رقم سے زائد کا مطالبہ ہو اور یہ زائد رقم اتنی معمولی ہو کہ اس کو اجرۃ الخدمت (سروس چارج) کہا جاسکتا ہو تو اس کا حکم یہ ہیکہ سرکار کو اس منصوبہ پر قرض جاری کرنے کے لئے اس کا حساب وکتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات ہوئے ہوا گر یہ زائد رقم ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے تو یہ صورت جواز کے دائرہ میں آسکتی ہے، لیکن یہ پتہ لگانا کہ اجرۃ الخدمت (سروس چارج) کے نام پر لی ہوئی رقم واقعی اخراجات کے برابر ہے یا زائد ہے یہ بہت مشکل ہے تو قرض حاصل کرنے کی یہ صورت بھی شبہ ربوا سے خالی نہیں ہے، لہٰذا بندہ کی ناقص رائے میں احتیاط کا تقاضا یہ ہیکہ قرض حاصل کرنے کی یہ صورت بھی ناجائز ہونی چاہئے۔

''عن عمر بن خطاب ان آخر مانزلت آیة الربوا، وأن رسول الله صلی الله علیه وسلم قبض ولم یفسرها لنا، فدعوا الربوا والریبة رواه ابن ماجه والدارمی'' (مشکوۃ المصابیح / ۲۴۶)۔

''قوله آخر ما نزلت ای آیة الربوا، یعنی هی ثابتة غیر منسوخة. لکن رسول الله قبض، ولم یفسرها، بحیث یحیط بجمیع جزئیاتها وموادها، فینبغی لکم أن تدعوا الربوا الصریح وما یشبه الأمر فیه تورعا واحتیاطا، هذا ما یفهم من ظاهر العبارة، وقال الطیبی: إن هذه الآیة تابعة غیر منسوخة غیر مشتبهة، ولذلك لم یفسرها النبی صلی الله علیه وسلم، فأجروها علی ما هی علیه، ولا ترتابوا فیها، واترکوا الحیلة فی حل الربوا المعات'' (هامش مشکوۃ

[1] استاذ مدرسہ جامع العلوم دساڑہ، سریندرنگر (کاٹھیاواڑ) گجرات۔

شریف : ۲۴۶)۔

مذکورہ بالا حاشیہ مشکوۃ شریف کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ سود کی حالت کے بارے میں کوئی ایسا حیلہ کرنا جو شبہ سے خالی نہ ہو اس سے بچنا اور احتیاط بالکل ضروری ہے۔

۵۔ سرکار کی طرف سے ملنے والے وہ قرضے جس پر سود ادا کرنا پڑتا ہو اور اس سود کا اوسط اتنا معمولی نہ ہو کہ اس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے اس کا حکم یہ ہے کہ اضطراری اور حد درجہ کی احتیاج کے بغیر ایسا قرض لیکر اس پر سود ادا کرنا بالکل ناجائز اور حرام ہوگا، ہاں البتہ اضطراری اور حد درجہ کی ایسی ضرورت پیش آجائے کہ قرض کے بغیر گزارہ کی کوئی صورت نہ ہو اور قرض بھی بغیر سود کے نہ ملتا ہو تو بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، ورنہ گنجائش نہیں اور نہ ضرورت سے زیادہ لینا درست ہے۔

''عن جابر رضی اللہ عنہ قال لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم : آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه. وقال: هم سواء'' رواه مسلم (مشكوة شريف / ۲۴۴)۔

''ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباه والنظائر)۔

''الضرورات تقدر بقدرها'' (قواعد الفقه)۔

نوٹ:...... جب عام معاشرہ بگڑ چکا ہو غیر قوموں میں حرام مال سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو تو علماء کا کام یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لئے بھی جواز کی راہ نکال کر غیر قوموں کی اتباع کا فتوی دیں، بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ رضا خداوندی اور ابدی انعامات کا پورا نقشہ قوم کے سامنے اخلاص وقوت کے ساتھ پیش کریں اور یہ بتائیں کہ مسلمان کی ترقی احکام شریعت کی پابندی میں ہے نہ کہ حلال وحرام کی تمیز کے بغیر مال جمع کرنے میں۔

(فتاوی محمودیہ ۲۴ / ۳۵۸)۔

۶۔ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی وہ رقم جسکے کسی حصہ کی واپسی نہیں کرنی پڑتی اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس رقم کے حاصل کرنے لئے کچھ شرائط ہیں تو وہ تمام شرائط رقم حاصل کرنے والے کے اندر پائے جاتے ہوں اور اس بارے میں عام طور پر غلط بیانی سے کام لیا جاتا ہے تو غلط بیانی سے کام نہ لیا جائے تو یہ رقم حاصل کی جاسکتی ہے اور اس کو گورنمنٹ کی طرف سے امداد اور تعاون سمجھا جائے گا۔

۷۔ گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کے حصول کے لئے جو لوگ واسطہ بنتے ہیں، وہ دو قسم پر ہیں۔

(۱) وہ لوگ جو سرکاری ملازمین میں سے ہیں اور اور سرکار کی طرف سے ان کو تنخواہ ملتی ہے اور ان کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ لوگوں کو گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم فراہم کرنا تو ایسے لوگوں کے لئے تو بالکل محنتانہ کے طور پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، یہ رشوت ہوگی اور رشوت کے بارے میں بڑی سخت وعیدیں احادیث میں آئی، ہیں جیسا کہ مفتی نظام الدین صاحبؒ نے علامہ سیوطی کی جامع صغیر کے حوالہ سے ایک حدیث ذکر کی ہے۔ ''الراشي والمرتيشي في النار'' (الجامع الصغير) (منتخبات نظام الفتاوی ۳ / ۲۰۶)۔

'' ولا يجوز أخذ المال ليفعل الواجب'' (فتاوی شامی ۸ ص ۳۳)۔

(۲) وہ لوگ جو سرکاری ملازمین میں سے نہیں ہیں اور اس بارے میں ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ اجرت لیکر جس طرح لوگ ایک دوسرے کے کام کیا کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی اجرت لیکر سرکار کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم لوگوں کو دلوایا کرتے ہیں تو اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ سرکار کی طرف سے ملنے والی امدادی رقم ایسی ہو جو جواز کی حد میں آتی ہو، یعنی اس میں ربوا اور شبہ ربوا لازم نہ آتا ہو، ایسی اسکیم کے ماتحت ملنے والی رقم کسی قسم کی غلط بیانی کے بغیر لوگوں کو دلوائیں اور اس پر اجرت وصول کریں تو شرعا اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اس صورت میں امدادی رقم حاصل کرنے والوں کے لئے محنتانہ کے طور پر یہ اجرت دینا بھی جائز ہوگا، لیکن اس اجرت کو پہلے سے طے کردیا جائے، تاکہ اجرت مجہول نہ رہے اور معاملہ جائز ہوجاوے۔

۸۔ گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقوم کے حصول کے لئے جو لوگ واسطہ بنتے ہیں ان کے لئے اجرت کے طور پر حاصل ہونے والی رقم

کا ایک حصہ طے کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اجرت کے طور پر جو چیز طے کی جاوے وہ ایسی ہونی چاہئے کہ عقد کے وقت متاجر اس کی ادائیگی پر قادر ہو اور یہاں حاصل ہونے والی رقم ہی کے ایک جز کو اجرت بنایا جارہا ہے جس کی ادائیگی پر فی الحال متاجر قادر نہیں ہے، لہٰذا اسکے لئے یہ شکل اختیار کی جائے کہ مثلاً ایک لاکھ روپیوں کی رقم ملنے والی ہے اور اجرت کے طور پر اسکا دسواں حصہ دس ہزار روپئے طے کرنی ہے تو دس ہزار روپئے اجرت طے کرلے چاہے بعد میں اسی حاصل شدہ رقم میں سے دے دیوے یہ تو اس وقت ہے، جبکہ حاصل ہونے والی رقم کی مقدار پہلے سے معلوم ہو اور اگر وہ مقدار پہلے سے معلوم نہ ہو تو اس میں تو بہر حال واسطہ بننے والے شخص کے لئے محنتانہ کے طور پر اجرت کی کوئی مقدار طے کرنی پڑے گی چاہے وہ اجرت حاصل شدہ رقم ہی سے دی جاوے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔

''صورة قفيز الطحان ان يستأجر الرجل من آخر ثورا ليطحن به الحنطة على أن يكون لصاحبها قفيز من دقيقها أو يستأجر إنسانا ليطحن له الحنطة بنصف دقيقها، أو ثلثه وما أشبه ذلك، فذلك فاسد، والحيلة فى ذلك لمن أراد الجواز أن يشترط صاحب الحنطة من الدقيق الجيد ولم يقل من هذه الحنطة أو يشترط ربع هذه الحنطة من الدقيق الجيد؛ لأن الدقيق إذا لم يكن مضافا إلى حنطة بعينها يجب فى الذمة والأجر، كما يجوز أن يكون مشارا إليه يكون أن يكون دينا فى الذمة، ثم إذا جاز يجوز أن يعطيه ربع دقيق هذه الحنطة إن شاء''

(فتاوی عالمگیری ۴/ ۴۸۰ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

۹۔ گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی امدادی رقم کے حصول کے لئے رشوت دینا جائز نہیں ہے اب رہی یہ بات کہ جمہوری حکومت کے خزانہ عامہ کی مالک اس ملک کے شہریوں کی مجموعی اکائی ہوتی ہے تو ملک کے خزانہ سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے تو اپنا یہ حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہونا چاہئے تو جواب یہ ہیکہ یہ بات ظاہر ہے کہ یہاں مالک ہونے سے شرعی ملک مراد نہیں، چنانچہ مالکانہ تصرفات (بیع، ہبہ اور وصیت وغیرہ) اس میں جاری نہیں ہوتے، لہٰذا یہ حق انتفاع دفع رشوت کے جواز کے لئے کافی نہیں، کیونکہ یہ حق انتفاع ایسا ہی ہے، جیسا کہ جنگل سے لکڑیاں چننے کا حق ہے اور حق احتطاب کے لئے رشوت دینا جائز نہیں چنانچہ بحر الرائق میں لکھا ہے۔

''الظلمة تمنع الناس من الاحتطاب من المروج، إلا بدفع شيئ إليهم، فالدفع والأخذ حرام؛ لأنه رشوة''

(البحر الرائق ۶/ ۴۴۱)۔

رشوت تو اس صورت میں دینا جائز ہے، جبکہ مال کسی مسلمان کی ملک میں آچکا ہو اور قبضہ بھی ہو اور اس کے متعلق ظلم کا خوف ہو یا اپنی آبرو یا جان کے متعلق ظلم کا خوف ہو، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں مذکور ہے۔

''إذا دفع الرشوة خوفا على نفسه أو ماله، فهو حرام على الأخذ، غير حرام على الدافع، وكذا إذا طمع فى ماله، فرشاه ببعض المال'' (بحر الرائق: ۶/ ۴۴۱)۔

نوٹ:...... سرکاری ضروری پروف اور کاغذات بنانے پڑتے ہیں بعض مرتبہ سرکاری آفسر رشوت کے بغیر ٹال مٹول کرتے ہیں اور بناتے نہیں ہیں اس موقع پر جو رشوت دی جاتی ہے وہ تو ضرورت کی بناء پر اور اس کے بغیر چارہ نہ ہونے کی وجہ سے دی جاتی ہے لہٰذا اس پر مذکورہ بالا صورت کو قیاس نہیں کیا جائے گا۔

۱۰۔ امدادی رقوم اور قرض حاصل کرنے کے لئے جو شرائط اور معیارات متعین ہیں اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لے کر اس امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانا بالکل ناجائز اور حرام ہوگا اس صورت میں جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا لازم آتا ہے اور دونوں چیزیں جائز نہیں ہے۔

''والكذب حرام، إلا فى الحرب للخدعة، وفى الصلح بين اثنين، وفى أرضاء الأهل، وفى دفع الظالم عن الظلم''

(ملتقی الابحر ۴/ ۲۲۱)۔

۱۱۔ حکومت کی طرف سے جاری کردہ وہ اسکیمیں جسمیں حکومت قرض خواہ کو بینک سے قرض دلاتی ہے اوراس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ حکومت خود ادا کرتی ہے یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی ہے اور اس کا بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے ایسی اسکیم سے استفادہ کرتے ہوئے قرض حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ سود کا معاملہ ایسا بھیانک اور خطرناک ہے کہ اس معاملہ میں واسطہ بننے والے پر بھی اللہ تعالی کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اور صورت بالا کی پہلی شق جس میں پورا پورا سود حکومت ادا کرتی ہے اور مقروض کو بالکل ادا کرنا نہیں ہوتا ہے اس میں یہ مقروض سود ادا کرنے میں واسطہ بنا اس طور پر کہ اس نے قرض حاصل کیا تو حکومت کو سود ادا کرنا پڑا اور دوسری شق جس میں تھوڑا سا حصہ سود کا خود مقروض کو بھی ادا کرنا ہوتا ہے اس صورت میں تو خود مقروض سود ادا کرتا ہے، لہذا یہ صورت بھی ناجائز ہوگی۔

''عن جابر رضی الله عنه قال :لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال:هم سواء'' رواه مسلم (مشکوۃ ص ۲۴۴)۔

۱۲۔ اگر حکومت کوئی محفوظ فنڈ قائم کرتی ہے جس کو بینک میں ڈپازٹ کردیتی ہے اور اسکے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اس سے اداروں اور افراد واشخاص کی امداد کرتی ہے تو ایسی رقم سے امداد حاصل کرنا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں امداد حاصل کرنے والوں کا سود کھانا لازم آتا ہے اور سود جس طرح خود حاصل کرے اور اس سے استفادہ کرے یہ ناجائز ہے، اسی طرح سود حاصل کرتا ہے ایک آدمی اور دوسرا آدمی اس سے استفادہ کرتا ہے تو اس دوسرے شخص کو بھی اس رقم سے استفادہ کرنا جائز نہیں ہے، نیز حکومت یا کسی فرد کے لئے اس لئے اپنی رقم بینک میں ڈپازٹ کرنا کہ اس کا جو سود آئیگا اس سے غریبوں کی مدد کی جائیگی یہ جائز نہیں ہے اب اگر کوئی آدمی حکومت کی مذکورہ بالا اسکیم سے استفادہ کرتے ہوئے رقم حاصل کرتا ہے تو اس کے اس عمل سے حکومت کی اسکیم کے جواز کی دلیل فراہم ہورہی ہے، اس لئے بھی یہ رقم حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

......☆......

سرکاری اسکیموں کے تحت ملنے والے سودی وغیر سودی قرضے

مولانا محمد فیاض عالم قاسمی[1]

حکومت کی سودی اسکیم سے مسلمانوں کا استفادہ:

موجودہ حالات میں جب کہ مسلمان تعلیمی، معاشی اور اقتصادی سطح پر نہایت ہی پسماندہ ہیں، حالانکہ مسلمانوں کا خزانہ حکومت کے پاس محفوظ ہے، اسی حق کو حاصل کرنے کے لیے حکومت نے کچھ شرطیں لگادیں ہیں، من جملہ شرائط میں سے یہ ہے کہ اس خزانہ کو قرض کی صورت میں دیا جائے گا، اور اس کی واپسی مع سود کے ہوگی۔ اگر دیکھا جائے تو درحقیقت یہ کھلا ہوا ظلم ہے، اس لیے صرف حکومت سے مجبوری کی حالت میں سودی قرض لینے، دوسرے الفاظ میں حکومت کے سودی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مجبوری کا مطلب یہ ہے کہ قرض لینے والا بنیادی ضرورتوں سے محروم ہے، اگر وہ قرض نہ لے تو سخت دشواری اور تنگی میں مبتلا ہو جائے، قرض خواہ تجارت کرنے کے لیے ہو یا زراعت یا تعمیر عمارت کے لیے ہو، یا علاج ومعالجہ کے لیے تو ایسے لوگوں کے لیے سودی قرض لینا جائز ہے۔ ورنہ یعنی اگر اس کو سخت ضرورت نہیں ہے، اور قرض نہ لینے کی صورت میں کوئی خاطر خواہ ضرر لاحق بھی نہیں ہوگا۔ تو ایسے لوگوں کے لیے سودی قرض لینا جائز نہیں۔ اسی طرح صرف اپنی تجارت کو بڑھانے کے لیے یا مزید عیش وعشرت کے لیے قرض لینا جائز نہیں، کیونکہ یہ ضرورت اور احتیاج کے دائرہ سے باہر ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے سودی قرض:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کی آزادی کے بعد سے مسلمان ذلت ورسوائی اور غربت وافلاس کا مسلسل شکار ہوتے آرہے ہیں، اس پسماندگی کی بڑی وجہ تعلیمی فقدان ہے، تعلیمی فقدان ہی کی وجہ سے اعلیٰ عہدوں تک جن عہدوں سے حکومت اور عدلیہ کی باگ ڈور منسلک ہے، مسلمانوں کی رسائی نہیں ہو پارہی ہے۔ جس سے شریعت کے مقاصد خمسہ میں سے دین، جان ومال کا تحفظ غیر یقینی ہوگیا ہے اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ سرمایہ کا نہ ہونا ہے۔ اس لئے تعلیم کے لئے سرمایہ کی فراہمی مسلمانوں کی عام حاجت بن گئی ہے۔ اور حاجت جب عام ہو جائے تو ضرورت کے دائرہ میں آجاتی ہے۔ وَالْحَاجَةُ إِذَا عَمَّتْ كَانَتْ كَالضَّرُورَةِ (الاشباہ للسیوطی ۱/ ۸۸) اور اوپر یہ تفصیل بھی گزری کہ حاجت عام ہو یا خاص ضرورت بن کر حرام چیز کو مباح کردیتی ہے۔ اس لئے اگر حکومت کی طرف سے امدادی رقوم نہ ملے، تو محض اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بھی سودی قرض لینا جائز ہے۔

کسی مسلمان سے سودی قرض لینا جائز نہیں:

البتہ کسی مسلمان سے سودی قرض لینا جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں دوسرے مسلمان کو حرام کھلانے پر تعاون کرنا لازم آئے گا، اور وہ آیت قرآنی: "وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (سورہ مائدہ: ۲) کے تحت ناجائز وحرام ہوگا۔

سودی رقم سودی قرض میں دینا:

بہت سارے لوگ بینک میں اپنی رقم جمع رکھتے ہیں، جس سے انھیں سود بھی حاصل ہوتا ہے، تو کیا سودی رقم کو سودی قرض میں دینا جائز ہے

---

[1] قاضی شریعت، دار القضاء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ناگپاڑہ، ممبئی۔

؟دراصل حرام آمدنی کا اصل مصرف یہ ہے کہ اس کے مالک تک اس کو بعینہ لوٹا دیا جائے، اگر لوٹانا ممکن نہ ہوتو غریب کو ثواب کی نیت کے بغیر دیدیا جائے، تو زیر بحث معاملہ میں اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی صورت میں بینک کی سودی رقم حکومت کو سود کی شکل میں واپس کرنا گویا اس کو اس کے اصل مالک تک لوٹا دینا ہے، اس لیے ایسا کرنا جائز ہے۔اس کی نظیر یہ ہے کہ علماء کرام نے بینک کی سودی رقم کو حکومت کو انکم ٹیکس کے طور پر دینا جائز کہا ہے۔لہٰذا قرض والی اسکیم میں بھی دینا جائز ہوگا (مستفاد از کفایت المفتی ۸ /۷)۔

دلالی کی مناسب اجرت جائز،لیکن اسکیم سے کٹوتی جائز نہیں:

حکومت کی اسکیموں سے لوگوں کو فائدہ پہونچانے کے لیے جولوگ دلالی کا کام کرتے ہیں اور اس تعلق سے لوگوں کا تعاون کرتے ہیں، تو یہ جائز ہے،اور ایسے لوگوں کا رائج اجرت حاصل کرنا بھی جائز ہے۔بشرطیکہ اس کی اجرت معلوم ہو،شامی میں ''بزازیہ'' کے حوالہ سے ھے:

''إِجَارَةُ السِّمْسَارِ وَالْمُنَادِي وَالْحَمَّامِ وَالصَّكَّاكِ وَمَا لَا يُقَدَّرُ فِيهِ الْوَقْتُ وَلَا الْعَمَلُ تَجُوزُ لِمَا كَانَ لِلنَّاسِ بِهِ حَاجَةٌ وَيَطِيبُ الْأَجْرُ الْمَأْخُوذُ لَوْ قُدِّرَ أَجْرُ الْمِثْلِ (ردالمحتار ۶/ ۴۷)۔

وَفِي الْحَاوِي: سُئِلَ مُحَمَّدُ بْنُ سَلَمَةَ عَنْ أُجْرَةِ السِّمْسَارِ، فَقَالَ: أَرْجُو أَنَّهُ لَا بَأْسَ بِهِ وَإِنْ كَانَ فِي الْأَصْلِ فَاسِدًا لِكَثْرَةِ التَّعَامُلِ وَكَثِيرٌ مِنْ هَذَا غَيْرُ جَائِزٍ، فَجَوَّزُوهُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ'' (ردالمحتار: ۶/۶۳)۔

لیکن دلال کا اسکیم کے بعض حصے کو لے لینا جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں اصل مقصد، یعنی اسکیم سے استفادہ فوت ہوجائے گا، نیز اس صورت میں محتاجوں تک اصل رقم نہیں پہنچ سکے گی۔علامہ شامیؒ نے ''تاتارخانیہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

''قَالَ فِي التتارخانية: وَفِي الدَّلَّالِ وَالسِّمْسَارِ يَجِبُ أَجْرُ الْمِثْلِ. وَمَا تَوَاضَعُوا عَلَيْهِ أَنَّ فِي كُلِّ عَشَرَةِ دَنَانِيرَ كَذَا فَذَاكَ حَرَامٌ عَلَيْهِمْ'' (ردالمحتار: ۶/۶۳)۔

اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے رشوت دینے کی گنجائش:

اس طرح کی اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے اگر رشوت دینے کی ضرورت پڑے تو بدرجہ مجبوری رشوت دینا جائز ہے، اس لیے کہ اپنے حق کی وصولیابی کے لیے رشوت دینا جائز ہے۔

''درمختار'' اور اس کی شرح ''ردالمحتار'' میں ہے:

''لَا بَأْسَ بِالرِّشْوَةِ إِذَا خَافَ عَلَى دِينِهِ وَالنَّبِيُّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ كَانَ يُعْطِي الشُّعَرَاءَ وَلِمَنْ يَخَافُ لِسَانَهُ وَكَفَى بِسَهْمِ الْمُؤَلَّفَةِ مِنَ الصَّدَقَاتِ دَلِيلًا عَلَى أَمْثَالِهِ. (قَوْلُهُ إِذَا خَافَ عَلَى دِينِهِ) عِبَارَةُ الْمُجْتَبَى لِمَنْ يَخَافُ. وَفِيهِ أَيْضًا دَفْعُ الْمَالِ لِلسُّلْطَانِ الْجَائِرِ لِدَفْعِ الظُّلْمِ عَنْ نَفْسِهِ وَمَالِهِ وَلِاسْتِخْرَاجِ حَقٍّ لَهُ لَيْسَ بِرِشْوَةٍ. يَعْنِي فِي حَقِّ الدَّافِعِ اء'' (درمختار مع ردالمحتار ۶/ ۴۲۳)۔

''الاشباہ والنظائر'' اور اس کی شرح ''غمز عیون البصائر للحموی'' میں ہے:

''الرشوة لخوف على ماله أو نفسه، قَوْلُهُ: الرِّشْوَةُ لِخَوْفٍ عَلَى مَالِهِ إلَخْ. هَذَا فِي جَانِبِ الدَّافِعِ أَمَّا فِي جَانِبِ الْمَدْفُوعِ لَهُ فَحَرَامٌ. وَلَمْ يُنَبِّهْ عَلَيْهِ، كَذَا قِيلَ. أَقُولُ: إِنَّمَا لَمْ يُنَبِّهْ عَلَيْهِ لِظُهُورِهِ إِذْ لَا ضَرُورَةَ فِي جَانِبِ الْمَدْفُوعِ لَهُ'' (الاشباہ والنظائر تحت القاعدة الرابعة عشرة ماحرم اخذه حرم اعطائه مع شرحه للحموی ۱/ ۲۸۷، ۱/ ۴۴۹ش)۔

یعنی جب اپنے دین وایمان اور مال ودولت ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اور رشوت دینے کی صورت میں ان کا تحفظ ہوسکتا ہے تو ظلم کو دفع کرنے کی خاطر رشوت دینا جائز ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شعراء کو جو مسلمانوں کی ہجو کرتے تھے، ان کی زبان کو بند کرنے کی خاطر کچھ دیا کرتے تھے۔واضح رہے کہ رخصت رشوت دینے میں ہے، لینے میں نہیں، کیونکہ لینا تو ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے بہرحال حرام ہے؛ لیکن اس کو انفرادی طور پر

رکھا جائے باضابطہ اس کے جواز کی تجویز متعین نہ کی جائے، تاکہ حکومت کے کارندوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔

اسکیم سے استفادہ کے لئے غلط بیانی سے کام لینا جائز نہیں، البتہ توریہ کرنے کی گنجائش ہے۔

حکومت کے کسی بھی اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ شرائط اور معیارات متعین ہیں، اگر وہ درخواست دینے والا ان شرائط اور معیارات پر کھرا اترتا ہے تو وہ اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ ایسی صورت حال میں غلط بیانی سے کام لینا جھوٹ اور سراسر دھوکہ ہے۔ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ تعریض وتوریہ سے کام نکالنے کی گنجائش ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لَا يَحِلُّ الْكَذِبُ إِلَّا فِي ثَلَاثٍ: يُحَدِّثُ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ لِيُرْضِيَهَا، وَالْكَذِبُ فِي الْحَرْبِ، وَالْكَذِبُ لِيُصْلِحَ بَيْنَ النَّاسِ'' (سنن ترمذی، حدیث نمبر ۱۹۳۹، عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيدَ)۔

توریہ کی تعریف:

توریہ اور تعریض یہ ہے کہ آدمی اپنے کلام کے ظاہری مفہوم کے خلاف مراد لے، مثلاً لڑائی کے وقت دشمنوں کی جماعت سے یوں کہے کہ تمہارا کمانڈر مر چکا ہے، تاکہ دشمن کی جماعت میں افراتفری مچ جائے اور وہ مایوس ہو جائیں، اور اس کی نیت یہ ہو کہ گزرے ہوئے کسی کمانڈر کی موت ہو چکی ہے۔

''التورية هِيَ أَن يُرِيد الْمُتَكَلّم بِكَلَامِهِ خلاف ظَاهره مثل أَن يَقُول فِي الْحَرْب مَاتَ إمامكم وَهُوَ يَنْوِي بِهِ أحدا من الْمُتَقَدّمين'' (قواعد الفقه ۱:۲۴۱)۔

علامہ نوویؒ صحیح مسلم کی شرح میں فرماتے ہیں:

''قَالُوا: وَمَا جَاءَ مِنَ الْإِبَاحَةِ فِي هَذَا الْمُرَادُ بِهِ التَّوْرِيَةُ وَاسْتِعْمَالُ الْمَعَارِيضِ لَا صَرِيحُ الْكَذِبِ مِثْلَ أَنْ يَعِدَ زَوْجَتَهُ أَنْ يُحْسِنَ إِلَيْهَا وَيَكْسُوَهَا كَذَا وَيَنْوِي إِنْ قَدَّرَ اللَّهُ ذَلِكَ. وَحَاصِلُهُ أَنْ يَأْتِيَ بِكَلِمَاتٍ مُحْتَمَلَةٍ يَفْهَمُ الْمُخَاطَبُ مِنْهَا مَا يُطَيِّبُ قَلْبَهُ'' (شرح مسلم للنووی ۱۶/ ۱۵۸، تحفة الاحوذی ۶/ ۵۸ش)۔

یعنی صریح جھوٹ بولنا تو جائز نہیں ہے، البتہ ایسے کلمات سے بات چیت کرنا جائز ہے کہ مخاطب کا ذہن اس طرف نہ جائے جس کی متکلم نے نیت کی ہے، بلکہ مخاطب اپنے اعتبار سے اس کا مفہوم سمجھے۔

''درمختار'' اور اس کی شرح ''ردالمحتار'' میں ہے:

''الْكَذِبُ مُبَاحٌ لِإِحْيَاءِ حَقِّهِ وَدَفْعِ الظُّلْمِ عَنْ نَفْسِهِ وَالْمُرَادُ التَّعْرِيضُ؛ لِأَنَّ عَيْنَ الْكَذِبِ حَرَامٌ قَالَ: وَهُوَ الْحَقُّ. قَالَ الطَّحَاوِيُّ وَغَيْرُهُ هُوَ مَحْمُولٌ عَلَى الْمَعَارِيضِ، لِأَنَّ عَيْنَ الْكَذِبِ حَرَامٌ. قُلْت: وَهُوَ الْحَقُّ قَالَ تَعَالَى { قُتِلَ الْخَرَّاصُونَ [الذاريات:۱۰] وَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: الْكَذِبُ مَعَ الْفُجُورِ وَهُمَا فِي النَّارِ وَلَمْ يَتَعَيَّنْ عَيْنُ الْكَذِبِ لِلنَّجَاةِ وَتَحْصِيلِ الْمَرَامِ اه'' (درمختار مع ردالمحتار: ۶/ ۴۲۷)۔

یعنی احیاء حق اور دفع ظلم کے لیے تعریض اور توریہ کے طور پر کلام کرنا جائز ہے، صریح جھوٹ بولنا جائز نہیں؛ لیکن چونکہ عوام کے لئے توریہ اور جھوٹ میں فرق کرنا ممکن نہیں ہوگا، اس لیے بہتر ہے کہ اس تعلق سے یہ تجویز مقرر کی جائے کہ بوقت ضرورت مستند دارالافتاء اور علمائے کرام سے رجوع کیا جائے۔

حکومت کی سودی رقم سے بھی استفادہ جائز ہے:

اگر حکومت کوئی فنڈ بینک میں محفوظ کر دے اور اس سے حاصل ہونے والا سود خود ہی وصول کرے اور پھر اسی سے مدد فراہم کرے تو ایسی رقموں

سے بھی استفادہ جائز ہے، اس لیے کہ اس صورت میں سود حکومت لیتی ہے نہ کہ استفادہ کرنے والا اور تبدیل ملکیت سے حرام چیز حلال میں سے ہوجاتی ہے، اس لئے اس کا گناہ اسکیم لینے والے کو نہیں ہوگا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت پیش کیا گیا، تو کسی نے کہا کہ یہ گوشت حضرت بریرۃ کو صدقہ کے طور پر دیا گیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ھُوَلَھَاصَدَقَۃٌوَلَنَاھَدِیَۃٌ" (بخاری، حدیث نمبر: ۲۵۷۷) یعنی یہ گوشت تو بریرۃ کے لئے صدقہ تھا، لیکن اب ہمارے لئے ہبہ ہوگیا۔

اس حدیث کے تحت علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

"قَوْلُهُ هُوَ لَهَا صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَّةٌ. فَيُؤْخَذُ مِنْهُ أَنَّ التَّحْرِيمَ إِنَّمَا هُوَ عَلَى الصِّفَةِ لَا عَلَى الْعَيْنِ" (فتح الباری: ۵/ ۲۰۴)
یعنی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل حرمت گوشت میں نہیں، بلکہ اس کی صفت میں تھی۔

علامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں:

"قَوْله: (ہُوَ عَلَيْهَا صَدَقَة)، قد لفظ: (عَلَيْهَا) لِيُفِيد الْحصْر أَي: عَلَيْهَا صَدَقَة لَا علينا. وَحَاصِله أَنَّهَا إِذا قبضهَا الْمُتَصَدّق زَالَ عَنْهَا وصف الصَّدَقَة وَحكمهَا، فَيجوز للغني شراها للْفَقِير وللهاشمي أَكله مِنْهَا" (عمدۃ القاری ۹۲/ ۹)۔
یعنی جب اس کو وصول کرنے والے نے قبضہ کرلیا تو اس کا وصف اور حکم (حرمت) ختم ہوگیا، پس مالدار کے لئے خرید کرنا اور غریب اور سادات کے لیے کھانا جائز ہوجائے گا۔

علامہ ابن الھمامؒ فرماتے ہیں:

"وَتَبَدُّلُ الْمِلْكِ بِمَنْزِلَةِ تَبَدُّلِ الْعَيْنِ فِي الشَّرِيعَةِ، كَذَا فِي الْكَافِي وَعَامَّةِ الشُّرُوحِ" (فتح القدیر ۹/ ۲۱۳)
یعنی ملکیت بدلنے سے گویا عین میں تبدیلی ہوتی ہے (نیز دیکھئے عنایہ شرح ہدایہ ۹/ ۲۱۳)۔

لہٰذا حکومت اگر بینک سے سود لیتی ہے تو اس رقم کی صفت (رباء) حکوت کے حق میں ہے، دوسرے کے حق میں نہیں۔ پس اگر حکومت کسی کو اس رقم سے قرض کے طور پر یا تعاون کے طور پر دیتی ہے۔ تو اس کی حرمت باقی نہیں رہے گی، اور تبدیل ملکیت کی وجہ سے اس کا استعمال کرنا بھی جائز ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سود کا حرام ہونا مسلمانوں کے نزدیک ہے، حکومت کے نزدیک حلال وحرام کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے ایسی رقم سے استفادہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

......☆......

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی شرعی بنیادیں

مولانا عباس بن یوسف[1]

سوال: (۱): -وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے ایسے قرضوں کا کیا حکم ہے؟

جواب: -اس میں تین باتیں ہیں: (۱) قرض لینا بوقت ضرورت کیسا ہے؟ (۲) حکومت کی امداد لی جاسکتی ہے؟ (۳) اگر واپس لوٹائی جانے والی رقم مجموعی رقم سے کم ہو تو کیا حکم ہے؟

(۱) ضرورت کے وقت قرض لینا جائز ہے روایت میں ہے:

"روى أبو رافع أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استسلف من رجل بكرا فقدمت عليه إبل من إبل الصدقة، فأمر أبا رافع أن يقضي الرجل بكره فرجع إليه أبو رافع فقال: لم أجد فيها إلا خيارا رباعيا، فقال: أعطه إياه إن خيار الناس أحسنهم قضاءً (مسلم ج: ۳/ رقم: ۱۲۲۴)

خلاصہ یہ کہ جائز ضرورت کے لئے قرض لینا مباح ہے۔ (المغنی ۴/ ۲۰۷- فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۶۶- الموسوعۃ ۳۳/ ۱۱۳۳)۔

(۲) قاضی مجاہد الاسلام فرماتے ہیں میرے نزدیک سرکاری خزانہ ایک ایسی دولت ہے جس سے انتفاع کا حق عام ہندوستانی شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حاصل ہے، لہٰذا جس قدر رقم بھی حکومت اپنے بجٹ میں رکھتی ہے ان میں ایک مسلمان شہری کا بھی اسی طرح حق ہے جس طرح دوسروں کا (المباحث الفقہیۃ ص: ۴۶۷)، اسی طرح "فتاوی رحیمیہ" میں حکومتی امداد لینے کے جواز کا قول کیا گیا ہے (ج: ۵/ ص: ۴۳۸)۔

(۳) مولانا برہان الدین سنبھلی لکھتے ہیں کہ ایک نئی اسکیم میں حکومت قرض کی تقریبا نصف رقم بطور امداد دیتی ہے اور بقیہ رقم کو وہ سود لگا کر وصول کرتی ہے، لیکن سود کی رقم ملا کر بھی حکومت کو واپس کی جانے والی کل رقم اس کی دی ہوئی مقدار سے کم ہی رہتی ہے، قرض کی یہ شکل شرعا جائز ہے کیونکہ اس میں سود کا تحقق نہیں ہوتا۔ (بینک انشورنس اور سرکاری سود ص: ۱۲۰)۔

خلاصہ یہ کہ یہ تینوں باتیں جائز ہیں۔

سوال: (۲) معافی والے قرضوں میں بعض صورتوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے، ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے اس صورت کا کیا حکم ہے، جبکہ لی ہوئی رقم سے زائد واپس نہ کرنا پڑے۔

جواب: سابق تفصیل کے مطابق جائز ہے۔

سوال (۳): -اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے تو اس صورت کا کیا حکم ہے؟

جواب: لزوم ربا کی وجہ سے ناجائز ہے، علامہ ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں:

"الربوا هو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على المستقرض" (۱/ ۵۵۷/ بحوالہ فقہ البیوع ۲/ ۶۶۱)

ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں "كل زيادة في سلف أو منفعة ينتفع بها المسلف فهي ربا" (الكافي في فقه اهل المدينة ۲/ ۳۵۹)

بلکہ موسوعہ میں بدائع وغیرہ کے حوالے سے مرقوم ہے:

---

[1] خادم جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، بھروچ، گجرات۔

''لاخلاف بین الفقهاء فی أن اشتراط الزیادة فی بدل القرض للمقرض مفسد لعقد القرض... وأن هذه الزیادة تعد من قبیل الربا'' (۳۳/۱۳۰)

اور خود حدیث پاک میں ہے: ''کل قرض جر نفعه فهو ربا'' (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۰۶۹۱)۔

سوال (۴): - غیر معافی والے قرضے یا معافی والے قرضوں میں اصل سے زائد رقم کا مطالبہ ہو، لیکن اس کی شرح بہت کم ہو جس کو سروس چارج کہا جاتا ہو یا اپنی مقدار کے اعتبار سے وہ سروس چارج کہلاسکتا ہو تو ایسے قرضے اور ان پر ادا کی جانے والی زائد رقم کا کیا حکم ہوگا؟ یہ سود کے دائرے میں آئیگا یا انتظامی خرچ شمار کرتے ہوئے اس میں وسعت وگنجائش ہوگی؟

جواب: - (الف) مولانا برہان الدین سنبھلی لکھتے ہیں کہ وہ زائد مقدار اس قرض کے سلسلے کے ہی انتظام اور حسابی عملہ اور ضروری اخراجات میں صرف ہونے والی مقدار کے برابر ہو تو اس زائد رقم کو سود قرار دے کر ناجائز ٹھہرانا ضروری نہ ہوگا، کیونکہ وہ زائد مقدار اس کے دینے والے ہی کی طرح گویا بالواسطہ واپس ہوگی کہ وہ اس کی منفعت (حسابات وانتظامات) میں خرچ ہوتی ہے اور قرض دینے والے، یعنی حکومت نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، اس لئے اس کا ناجائز ہونا متعین نہ ہوگا (بینک انشورنس اور سرکاری سود ص: ۱۲۱)۔

(ب) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: بدرجۂ ضرورت ایسے قرضے لینے کی اجازت ہے، البتہ یہ اجازت اس وقت ہوگی جب آدمی اس کے لینے پر اس طرح مجبور ہو جائے کہ نہ لے تو کوئی ذریعۂ معاش فراہم نہ ہو اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل بھی ممکن نہ رہ سکے، نہ کہ محض تعیش، آرام طلبی اور معاشی معیار بلند کرنے کے لئے ایسا کرے چنانچہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں: ''ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر ص: ۱۱۵)۔

یہ تو عام سودی قرضوں کا حکم ہے جس میں بینک بھی داخل ہے (اور) سرکاری قرضہ جات میں جس کا اصل مقصد خود معاشی فائدہ اٹھانا نہیں ہوتا، بلکہ ملک کا افلاس دور کرنا مقصود ہوتا ہے اور سود کے نام پر جس قدر نفع لیا جاتا ہے بہت معمولی ہوتا ہے اس میں مزید سہولت ہے عام حالات میں بھی ایسے قرضے لینے کی گنجائش ہے گوکہ سود کا نام دے دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کو اس شعبے کے ملازمین اور عملے کی اجرت پر بھی محمول کر سکتے ہیں، چنانچہ مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند لکھتے ہیں: ''اس معاملے کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے حقیقت میں وہ سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس پر خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں ان کی قیمت میں لی جاتی ہے، جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے'' (نظام الفتاوی ص: ۲۶۴ / بحوالہ جدید فقہی مسائل ۱/ ۲۵۲ تا ۳۵۲)۔

(ج) علامہ تھانوی فرماتے ہیں غرض یہ مفہوم سود کے مفہوم سے جدا کیا جاسکتا ہے اور یہ توجیہ قریب قریب ایسی ہی ہوگی جو اس رقم میں کی جاتی ہے جس کو حکومت اپنے ملازمین کو ختم ملازمت کے وقت (P.F) گرچہ سود کے نام پر دیتی ہے ہمارے فقہائے محققین اس کو سود نہیں کہتے، بلکہ انعام کہتے ہیں اور اس کو جائز فرماتے ہیں (امداد الفتاوی ص: ۱۲۳/ تا ۱۲۵/ بحوالہ تعلیم کے لئے قرض کا حصول ص: ۹۸)۔ اسی طرح امداد الفتاوی کے حاشیہ پر لکھتے ہیں'' البتہ بہت عرق ریزی سے اس قدر تاویل کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ فیس (منی آرڈر) کو اجرت کتابت وروانگی فارم کہا جائے اس سے اس کی حرمت تفاضل تو رفع ہو جائے گی، مگر کراہت سفتجہ باقی رہ جائے گی (امداد الفتاوی ۳/ ۱۰۶)۔

ان عبارات وفتاوی سے تاویل کی گنجائش مترشح ہوتی ہے اور ابتلاء عام بھی ہے، لیکن دوسری طرف فقہ اکیڈمی کا فیصلہ ہے کہ سود کی حرمت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ، مناسب حد تک کم ہے یا مناسب حد تک زیادہ، شریعت اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ شرح اگر مناسب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہے اور اگر نامناسب حد تک زیادہ ہے تو ناجائز، دلائل شرعیہ اس طرح کی کسی تفریق کی اجازت نہیں دیتے (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۸۶)۔

خلاصہ یہ کہ تاویل کی گنجائش کے باوجود شبہ ربا باقی ہے جس سے اجتناب واجب ہے۔

'' التحرز عن حقیقة الربا وعن شبهة الربا واجب '' (بدائع الصنائع ۷/ ۳۹۵/ بحواله الموسوعة ۲۲/ ۱۳۰)
اس لئے ضرورت شدیدہ معتبرہ کے وقت حرمت کے باوجود بقدر ضرورت رفع اثم میں رخصت وسہولت ہوسکتی ہے۔

سوال (۵):- اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ واضح رہے کہ یہ قرضے مختلف قسم کے جانوروں کے پالنے، مکان کی تعمیر، کاشتکاری و باغبانی کی ضروریات اور دیگر کاروبار کے لئے بھی ہوتے ہیں تو کیا ضرورت کو دیکھتے ہوئے حکم میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے؟

جواب:- سابق تفصیلات کے پیش نظر یہاں تو تاویل کی بھی بالکل گنجائش نہیں ہے، البتہ ضرورت مند کے لئے بقدر ضرورت استفادے کی گنجائش ہے

' الضرورات تبیح المحظورات '' (الاشباہ والنظائر ص: ۹۹)۔

سوال (۶):- ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مکمل امداد کے طور پر رقم ملا کرتی ہے، مثلاً مکان بنانے، بیت الخلاء کی تعمیر وغیرہ، نیز تعلیمی ضروریات کے لئے تو ایسی رقوم کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ جب کہ ان رقوم میں سے کسی حصے کی واپسی نہیں ہوتی اور حکومت کی طرف سے اپنے شہریوں کی اعانت ہوتی ہے۔

جواب:- سرکاری خزانے میں چونکہ ہر ملکی کا برابر حق ہے، لہٰذا اس سے استفادے کی اجازت ہے، بلکہ حق ہے جیسا کہ پہلے جواب میں قاضی صاحب کے حوالے سے گزر گیا۔

سوال (۷):- گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی رقوم، جس قسم کی بھی ہوں، ان کے حصول کے لئے کافی جدوجہد کرنے ہوتی ہے اور خرچ بھی ہوتا ہے، کچھ لوگ اس میں واسطہ بنتے ہیں واسطہ بننے والوں کے لئے ان کو مطلوبہ محنتانہ دینے اور لینے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب:- واسطہ بننے والے افراد دو طرح کے ہوسکتے ہیں (۱) سرکاری ملازمین (۲) عام افراد (دلال agent) دونوں کا حکم علاحدہ ہے۔
(الف) اگر حکومت یا ادارے کی طرف سے جن افراد کو ان رقومات کی تقسیم وغیرہ کے جملہ مراحل طے کرنے کے لئے مقرر کیا ہے اور ان اس کی تنخواہ دی جاتی ہے تو ایسے افراد (سرکاری ملازمین) کے لئے عوام سے محنتانہ لینے کی بالکل گنجائش نہیں، اس لئے کہ یہ رشوت ہے جو کہ حرام ہے، روایت کے الفاظ:

'' لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي '' (ترمذی ۳/ ۶۱۴ / بحواله الموسوعة ۲۲/ ۲۲۱)
نیز دوسری روایت میں ہے کہ رشوت تو کیا ہدیہ بھی نہیں لے سکتے: '' هدايا الأمراء غلول '' (احمد ۵ / ۴۲۴ / بحوالہ سابق)

اور ابن حبیب فرماتے ہیں: لم يختلف العلماء في كراهية الهدية إلى السلطان الأكبر وإلى القضاة والعمال وجباة الأموال ويقصد بالكراهة الحرمة '' (القرطبی ۲/ ۳۴۰ الحطاب ۶/ ۲۵)

البتہ دینے والے کے لئے اس شرط کے ساتھ گنجائش ہوسکتی ہے اپنا ایسا حق حاصل کرنا ہو یا ایسا ظلم وضرر کو دفع کرنا ہو جو اس کے بغیر ممکن نہ ہو

'' يجوز للإنسان عند الجمهور أن يدفع رشوة للحصول على حق أو لدفع ظلم أوضرر. ويكون الإثم على المرتشي دون الراشي '' (کشاف القناع ۶/ ۳۱۶ ابن عابدین ۴/ ۳۰۴ نهاية المحتاج ۸/ ۲۴۳/ بحوالہ سابق)۔

(ب) اور اگر واسطہ بننے والے غیر سرکاری عام آدمی (دلال، ایجنٹ) ہے، تو اگر باقاعدہ معاملہ ہوا ہو اور رقم وصول کرے تو مولانا تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ مفتی بہ قول کے مطابق ایسا کرنا جائز ہے، اور فیصد کے حساب سے بھی سمسرۃ کی اجرت لینا جائز ہے (حاشیہ ابن عابدین ۶/ ۶۳ - فتاوی السعدی ۲/ ۵۷۵/ بحوالہ انعام الباری ۶/ ۴۵۳ تا ۴۵۷)۔

سوال (۸):- بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں، یا دینے اور لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہوگا

؟

جواب:- سابق تفصیل ملحوظ رہے گی۔

سوال (۹):- اس قسم کی امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے اگر رشوت دینی پڑے تو رشوت دینے کا کیا حکم ہوگا؟ لینا تو ظاہر ہے کہ درست نہیں ہے

جواب:- رشوت دینا اس وقت جائز ہے جب اس کا مقصد اپنے آپ کو ظلم سے بچانا یا صرف انصاف حاصل کرنا ہو، اسی لئے فقہاء نے اس سلسلے میں تفصیل کی ہے، فتاوی عالم گیری میں ہے کسی شخص سے جان یا مال کا خوف ہو یا خود بادشاہ سے اس کی افتاد طبع یا عام مزاج کے پیش نظر ظلم کا اندیشہ ہو تو اس سے بچنے کے لئے مال دینا جائز ہے (ہندیہ ۳/۳۳۱/بحوالہ قاموس الفقہ ۳/۴۸۲)۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں بھی دو شرطوں کے ساتھ جواز ہوگا (۱) کسی کی حق تلفی مقصود نہ ہو، بلکہ اپنا حق واجبی ضرورت شدیدہ کے وقت وصول کرنا ہو (۲) اس سے پہلے بلا رشوت کام نکالنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر چکا ہو (ہم رشوت کیوں نہ لیں، ص:۱۱۱)۔

سوال (۱۰):- امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لئے کچھ شرائط و معیارات متعین ہیں، اس سلسلے میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقے پر امداد یا قرض سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب:- یہ دھوکا اور کذب بیانی ہے جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے، بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں:

''وإن كذبا وكتما مُحقت بركة بيعهما'' (كتاب البيوع رقم: ۱۵۳۲)

اسی طرح موسوعہ کی عبارت ہے، ''اتفق الفقهاء على أن الغش حرام سواء كان بالقول أو بالفعل، وسواء كان بكتمان العيب في المعقود عليه أو الثمن أم بالكذب والخديعة، وسواء كان في المعاملات أو في غيرها من المشورة والنصيحة'' (الزواجر عن اقتراف الكبائر بحواله الموسوعة ۳۱/۲۱۹)۔

سوال (۱۱):- بعض اسکیموں میں تعلیم یا کسی اور مقصد کے لئے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے اور اس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے وہ خود مقروض کو ادا کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اس کی طرف سے حکومت ادا کرتی ہے یا اس کا بڑا حصہ حکومت ادا کرتی اور بہت تھوڑا سا حصہ خود مقروض کو ادا کرنا ہوتا ہے، کیا ایسی اسکیم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

جواب:- فتاوی رحیمیہ میں ایک سوال و جواب اس جزئیہ کے قریب قریب منقول ہے جس سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

استفتاء:- مثلاً حکومت نے یہ قانون بنایا ہے کہ جس کے پاس ڈھائی ایکڑ زمین ہو اور وہ اس میں تالاب کھود کر مچھلی پالنا چاہتا ہے تو حکومت اس کو بیس ہزار کی رقم بطور قرض دے گی ابتداء کاغذات مچھلی پالن آفس میں جمع ہوں گے، پھر وہ آفس سے منظور کر کے کسی بینک کو بھیج دے گا، بینک بیس ہزار قرض دے گا اور اس پر پچیس فیصد چھوٹ، یعنی سبسیڈی ہوگی اور بقیہ رقم، یعنی پندرہ ہزار دس فیصد کے سود کے ساتھ وصول کیا جائے گا اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:- اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنا اور غریب رعایا کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرنا ہے، اس لئے حکومت کچھ رقم کی چھوٹ دیتی ہے جسے سبسیڈی کہا جاتا ہے اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد سود خوری نہیں ہے، اس لئے اگر کوئی شخص حکومت سے اس قسم کی اسکیم کے تحت قرض لے اور حکومت کی طرف سے کچھ رقم چھوٹ ملے اور بقیہ رقم حکومت مع سود وصول کرے اگر وہ سود چھوٹ میں ملی ہوئی رقم سے ادا ہو جاتی ہو اور اپنے پاس سے زائد رقم نہ دینا پڑتی ہو تو اس تاویل سے کہ حکومت نے بطور تعاون جو رقم دی تھی اس شخص نے اسی تعاون والی رقم میں کچھ واپس کر دی تو مذکورہ اسکیم کے تحت قرض لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور اگر سود کی رقم چھوٹ میں ملی ہوئی رقم سے زیادہ دینی پڑے تو پھر یہ معاملہ سودی کہلائے گا اور جائز نہ ہوگا (۹/۲۵۶/بحوالہ سود اور مروجہ سودی معاملات ص:۱۳۰)۔

نیز اکیڈمی کے فیصلوں میں بھی سبسیڈی کے متعلق متفقہ رائے یہ ہے کہ ہندوستان میں محض سرکاری قرضے ایسے ہیں جن پر سرکار کی طرف سے چھوٹ دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے اگر سود کے نام سے لی جانے والی رقم چھوٹ کے مساوی یا کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعا سود نہیں (اہم فقہی فیصلے ص:۱۹)۔

ان نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ سود پر لی جانے والی رقم چھوٹ کے مساوی یا کم ہے تو ضرورت صحیحہ معتبرہ شرعیہ داعی ہو یا ابتلاء عام ہو جائے تو تاویل مذکور سے ساتھ بقدر ضرورت ایسی اسکیم سے استفادے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

سوال (۱۲):- بعض ایسی اسکیمیں بھی ہیں جن میں حکومت نے ایک محفوظ فنڈ قائم کر دیا ہے جس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا گیا ہے اور اس کے انٹرسٹ سے جو رقم حاصل ہوتی ہے اس سے تعلیمی و رفاہی اداروں اور افراد و اشخاص کا تعاون کیا جاتا ہے گویا حکومت یا حکومت کا ادارہ انٹرسٹ وصول کرتا ہے اس کا مالک ہوتا ہے پھر وہ اسکیم سے استفادہ کرنے والے حضرات کی مدد کرتا ہے تو کیا یہ صورت درست ہوگی؟

جواب:- فقہائے احناف میں سے علامہ بزدوی کے حوالے سے ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

''من جملة صور البيع الفاسد جملة العقود الربوية يملك العوض فيها بالقبض'' (البحر الرائق ، باب الربا ۶/ ۲۰۹ رد المحتار ۱۵/ ۲۲۱)

اسی طرح علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی نقل کیا ہے:

'' القبض اللذى لايفيد الملك هو الظلم المحض، فأما المقبوض بعقد فاسد كالربا أو الميسر ونحوهما فهل يفيد الملك ؟ على ثلاثة أقوال للفقهاء أحدها أنه يفيد الملك وهو مذهب أبي حنيفة'' (مجموع فتاوى ابن تيمية قبيل باب الشروط فى البيع۲۹/ ۱۸۰)

یعنی احناف کے یہاں عقود ربویہ سے حاصل شدہ مال بیع فاسد سے حاصل شدہ مال کی طرح مفید ملک ہے، لیکن فقیہ عصر مولانا تقی عثمانی فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق یعنی عقود ربویہ کا مفید ملک ہونے کا، تو ''ربا الفضل'' و ''ربا النسیہ'' سے ہوسکتا ہے، رہی بات ربا القرض کی تو وہ حرام ہے اور وہ بیع فاسد نہیں، بلکہ شرعا بیع باطل ہے، اس کی تائید علامہ ابوبکر جصاصؒ کی گفتگو سے بھی ہوتی ہے۔

''فمن الربا ما هو بيع ومنه ماليس ببيع وهو ربا أهل الجاهلية وهو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على المستقرض (احكام القرآن للجصاص ۱/ ۴۶۹)،

یعنی ربا کی دو قسمیں ہیں (۱) وہ جو بیع ہے، (۲) وہ جو بیع نہیں ہے اور وہ اہل جاہلیت کا ربا ہے، وہ قرض جس میں مدت اور مستقرض پر مال کی زیادت کی شرط لگائی گئی ہو، خلاصہ یہ کہ یہ بیع فاسد میں شامل نہیں ہے، بلکہ غصب اور رشوت کی طرح حرام محض ہے، اسی لئے فقہاء نے اس کو مکاسب محرمہ کے ساتھ ذکر کیا ہے (دیکھئے الہندیہ الحضر والاباحۃ، باب: ۱۲ ج: ۵ /ص: ۳۴۳)، اور اسی پر علامہ تھانویؒ نے فتوی دیا ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۳۰۷/سوال: ۲۴۹)، اس کے بعد مولانا تقی صاحب لکھتے ہیں

'' فما أخذه المرابي زيادة على القرض فهو فى حكم الغصب والرشوة، ومن كان ماله متمحضا من الربا لايجوز قبول الهدية منه ولا إجابة دعوته ولاعقد الشراء أوالبيع معه'' (فقه البيوع ۲/ ۱۰۵۸/ تا ۱۰۶۰)،

ایک مقام پر لکھتے ہیں:''حكم البيع الباطل أنه لايترتب عليه أى أثر من آثار البيع حتى أن المشترى لا يملك المبيع وإن قبضه'' (ايضا ص: ۹۵۱)،

لہٰذا صورت مسئولہ درست نہ ہوگی، اس لئے مسلمانوں کو اس طرح کے اموال سے کلی احتراز کرنا ہوگا۔

......☆......

ترقیاتی قرضوں میں مدت کے بعد زائد رقم کا مطالبہ

مولانا محمد ابرار خان ندوی[1]

حالات وضرورت انسان کو قرض لینے پر مجبور کرتے ہیں، اسی لئے قرض دینے کو اصحاب حاجت کے ساتھ رفق ونرمی اور ہمدردی کہا گیا ہے، اور بعض روایات میں صدقہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

''ما من مسلم يقرض مسلمًا قرضًا مرتين إلا كان كصدقة مرة'' (كنز العمال ٦/ ٢١١، الفصل الاول في الاقراض، حديث: ١٥٣٨١، موسوعة الرساله بيروت)

(کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو دو مرتبہ قرض دیتا ہے یہ اس کے لئے صدقہ دینے کے درجہ میں ہے)۔

قرض دہندہ ضرورت کے وقت حاجت مند کی مالی امداد وتعاون کے ذریعہ اجر وثواب کا مستحق بنتا ہے، وہیں دوسری طرف قرض لینے والے کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ قرض بہتر طور پر ادا کرے۔

ارشاد نبوی ہے:

''خير الناس أحسنهم قضاءًا'' (كنز العمال ٦/ ٢٢٥، آداب أداء الدين وفضله من الاكمال، حديث: ١٥٣٥٣، الطبعة الخامسه)

(لوگوں میں بہتر وہ شخص ہے جو اپنا قرض بہتر طور پر ادا کرنے والا ہے)۔

اگر قرض دینے والا اپنا قرض معاف کردے تو یہ اس کا احسان اور مقروض کے ساتھ ہمدردی ومعاونت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

''من أنظر معسرًا أو وضع عنه أظله الله في ظله يوم لا ظل إلا ظله'' (كنز العمال ٦/ ٢٢٠، الفصل الثاني في الانظار والمسامحة، حديث: ١٥٣٩١، الطبعة الخامسه)۔

قرض معاف کرنے کا حکم:

حکومت عوام کی تعلیمی ومعاشی ترقی، اور صنعتوں کے فروغ کے لئے سودی وغیر سودی دونوں طرح کے قرضے دیتی ہے، بعض قرضے وہ ہوتے ہیں جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے، تو ایسے قرض جن کا کچھ حصہ معاف کردیا جاتا ہے، اور حاصل کردہ قرض سے کم واپس کرنا ہوتا ہے، اس سے مسلمانوں کا فائدہ اٹھانا کیسا ہے؟

ظاہر ہے کہ ملک کے عوام کی تعلیمی ومعاشی ترقی حکومت کی ذمہ داری ہے، اور ملک کے خزانہ میں سب کا حصہ ہے، کہ خزانہ کی دولت کی ایک کثیر مقدار عوام پر عائد ٹیکسوں سے وصول کردہ زر پر مشتمل ہے، لہٰذا حکومت دیگر باشندگان ملک کے ساتھ مسلمانوں کے لئے قرض کی جو اسکیم پیش کرتی ہے، اور اس کا کچھ حصہ معاف بھی کرتی ہے، تو ایسے قرضوں سے استفادہ جائز ہی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کو اپنی تعلیمی پسماندگی دور کرنے اور معاشی بدحالی کے خاتمہ کے لئے اس طرح کے قرضوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے، اور جہاں تک سوال ہے کہ حکومت قرض دے کر کچھ حصہ معاف کردیتی

[1] جامعۃ الہدایہ، جے پور، راجستھان۔

ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

"الموسوعۃ الفقہیہ" میں یہ صراحت موجود ہے کہ:

"يصح باتفاق إسقاط الدين الثابت في الذمة؛ لأنه حق، والحقوق تسقط بالإسقاط. . . . كما يجوز الإبراء عن كل الدين يجوز الإبراء عن بعضه" (الموسوعة الفقهيه ۲۲۱/۴، وزارة الاوقاف والشئون الاسلاميه كويت)

(ذمہ میں ثابت دین کو ساقط کرنا بالاتفاق درست ہے، اس لئے کہ یہ حق ہے، اور حقوق ساقط کرنے سے ساقط ہوجاتے ہیں، اور جس طرح کل دین سے بری کرنا درست ہے، اسی طرح بعض دین سے بھی بری کرنا جائز ہے)۔

نیز علماء کویت کا فتوی ہے کہ بری کردینے سے مقروض بریٔ الذمہ ہوجائے گا۔

"من المقرر شرعًا أن الديون الثابتة في الذمة لا تسقط إلا بالأداء، أو الإبراء" (مجموعة الفتاوى الشرعيه ۱۶۹/۶)

(شریعت کا ضابطہ یہ ہے کہ ذمہ میں ثابت شدہ قرض ادا کرنے یا بری قرار دینے سے ہی ساقط ہوتے ہیں)۔

نیز "فتاویٰ ہندیہ" میں ہے:

"لو كان له على آخر حق فأبرأه على أنه بالخيار، صح الإبراء وبطل الخيار، كذا في خزانة الفتاوى" (الفتاوى الهنديه ۳۶۷/۵، الباب في القرض والدين)

(اگر اس کا دوسرے پر کوئی حق ہو تو وہ اس کو بری کردے خیار کے ساتھ، براءت تو صحیح ہوگی، اختیار باطل ہوگا)۔

معینہ مدت کے اندر ادا کرنے پر قرض معاف ہوگا، ورنہ کل رقم واپس کرنا ہوگی، کا حکم:

قرض دراصل انسانی ہمدردی کا عمل ہے، اور قرض خواہ اگر کچھ حصہ بلا شرط معاف کردے تو رفق ونرمی کی اعلی مثال ہے، حکومت بعض قرض ایسے دیتی ہے جس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ اگر مقررہ مدت سے پہلے ادا کردیا گیا تو کل یا بعض حصہ معاف کردیا جائے گا، اور وقت مقررہ کے بعد ادا کیا گیا تو پوری رقم واپس کرنی ہوگی، زائد رقم نہیں لی جائے گی، معافی مشروط ہو تو اس سلسلہ میں فقہاء کی رائے مختلف ہے۔

فقہاء شوافع وحنابلہ کی ایک رائے یہ ہے کہ اس طرح کی شرط کے ساتھ عقد قرض فاسد ہوجائے گا، دوسری رائے فاسد نہ ہونے کی ہے، اور ان کا راجح واضح مذہب عدم فساد کا ہی ہے۔

"إذا اشترط في عقد القرض أن يرد المقترض على المقرض أنقص مما أخذ منه قدرًا أو صفة، فقد ذهب الشافعية والحنابلة إلى فساد هذا الشرط وعدم لزومه، وهل يفسد العقد بذلك؟ للشافعية وجهان: أصحهما في المذهب أنه لا يفسد العقد، وهو مذهب الحنابلة، لأن المنهي عنه جر المقرض النفع إلى نفسه، وههنا لا نفع له في الشرط، بل النفع للمقترض، فكان المقرض زاد في المسامحة والإرفاق ووعده وعدًا حسنًا، والوجه الثاني عند الشافعية الفساد لمنافاته مقتضى العقد كشرط الزيادة" (الموسوعة الفقهيه ۱۲۸/۳۳)۔

(عقد قرض میں یہ شرط لگادی جائے کہ مقروض قرض دہندہ کو مقدار یا صفت میں کم قرض واپس کرے گا، تو حنابلہ وشوافع کی رائے یہ ہے کہ یہ شرط فاسد وغیر لازم ہے، لیکن کیا اس شرط کی وجہ سے عقد بھی فاسد ہوگا، تو اس سلسلہ میں فقہاء شوافع کے دو نقطہ نظر ہیں، اصح فی المذہب یہ ہے کہ عقد فاسد نہیں ہوگا یہی حنابلہ کا بھی مسلک ہے، اس لئے کہ ممنوع قرض دہندہ کا اپنے قرض سے اپنے لئے نفع حاصل کرنا ہے، اور یہاں شرط میں اس کو نفع نہیں مل رہا ہے، بلکہ مقروض کو فائدہ ہے، تو یہ قرض دہندہ اور نرمی، مسامحت، رعایت اور حسن وعدہ ہے، شوافع کا دوسرا نقطہ نظر تقاضہ عقد کے ان شرط کے منافی ہونے کی وجہ سے فاسد ہونے کا ہے، جیسے زیادتی کی شرط (مفسد عقد) ہے)۔

البتہ ماضی قریب کے معروف فقیہ شیخ سید سابق سے معینہ مدت سے پہلے قرض ادا کرنے پر قرض کا کچھ حصہ معاف کرنے کی ممانعت پر تمام فقہاء کا اتفاق نقل کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

''ذهب جمهور الفقهاء إلى تحريم وضع قدر من الدين نظير التعجيل بالقضاء قبل الأجل المتفق عليه، فمن أقرض غيره قرضًا إلى أجل، ثم قال المقرض للمقترض: أضع عنك بعض الدين تظهر أن ترد الباقي قبل الأجل. فإنه يحرم'' (فقه السنه ۳/ ۱۶۷)

(جمہور فقہاء کی رائے ہے کہ مقررہ مدت سے پہلے جلدی ادا کرنے کی صورت میں قرض میں سے کچھ حصہ کم کرنا حرام ہے، مثلاً کسی شخص نے دوسرے کو معینہ مدت تک کے لئے قرض دیا، پھر قرض دہندہ مستقرض سے کہے کہ میں قرض کا کچھ حصہ تم سے چھوڑ دوں گا، اس شرط کے ساتھ کہ تم باقی حصہ مدت سے پہلے دے دو، تو یہ حرام ہے)۔

قرض میں معافی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو تو جائز ہے:

وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ بدولۃ الکویت سے شائع شدہ ''مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ'' میں ایک استفتاء کے جواب میں یہ فتوی دیا گیا ہے کہ اگر تعجیل کی شرط کے ساتھ دین میں کمی کی جائے تو ممنوع ہے، اگر بلا شرط ہو تو قرض دہندہ کی جانب سے قرض میں کمی کرنا ہے، اور یہ درست ہے۔

''إذا كان حط الدين المؤجل مشروطًا بتعجيله، فهو ممنوع، لأنه من قبل (ضع وتعجل) أما إذا كان كان من غير شرط ملفوظ ولا ملحوظ فهو جائز، فيكون حينئذ تبرعًا من الدائن للمدين. والله أعلم'' (الفتاوى الشرعيه ۶/ ۱۶۵)

(دین مؤجل میں کم کرنا جلدی ادا کرنے پر مشروط ہو تو یہ ممنوع ہے، اس لئے کہ یہ ضع وتعجل کی قبیل سے ہے، لیکن اگر یہ بلا شرط ہو یعنی نہ زبان سے کہا گیا ہو اور نہ ہی عرف ورواج ہو تو جائز ہے، اس صورت میں قرض دہندہ کی طرف مقروض کے لئے (کم کرنا یہ) بطور تبرع ہوگا)۔

راقم کی رائے:

گرچہ حکومت کی جانب سے قرض کی معافی معینہ مدت سے پہلے ادا کرنے پر مشروط ہے، مگر اس میں کسی طرح کا ربا نہیں پایا جا رہا ہے، اس لئے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے، یہی حنابلہ وشوافع کا بھی راجح مذہب ہے، کہ اس میں قرض دینے والا اپنے قرض سے نفع نہیں حاصل کر رہا ہے، بلکہ مقروض کو مزید سہولت دی جا رہی ہے، اور اس کے ساتھ ہمدردی وحسن سلوک کا برتاؤ کیا جا رہا ہے، خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنی نظیر کو جلا وطن کرنے کا حکم فرمایا تو انہوں نے آکر عرض کیا کہ ہمارا قرض ابھی لوگوں کے ذمہ باقی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کچھ کم کر کے پہلے لے لو، نیز حضرت عبد اللہ بن عباس اور احناف میں امام زفرؒ کی رائے بھی جواز کی ہے۔

شیخ سید سابق نقل فرماتے ہیں:

''ويرى ابن عباس وزفر جواز ذلك، لما رواه ابن عباس أن النبي صلى الله عليه وسلم لما أمر بإخراج بني النظير، جاءه ناس منهم، فقالوا يا نبي الله، إنك أمرت بإخراجنا، ولنا على الناس ديون لم تحل، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ضعوا وتعجلوا'' (فقه السنه ۳/ ۱۶۷)

(حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور امام زفرؒ اس کے جواز کے قائل ہیں، حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنی نظیر کی جلاوطنی کا حکم فرمایا، تو ان کے کچھ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اے اللہ کے نبی! آپ نے ہماری جلاوطنی کا حکم فرمایا ہے اور ہمارا لوگوں کے اوپر کچھ قرض ہے جس کا وقت ابھی باقی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ کم کر کے پہلے لے لو)۔

مقررہ مدت کے بعد زائد رقم کا مطالبہ:

مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر اصل رقم کے ساتھ زائد رقم کا مطالبہ سود ہے، یعنی قرض میں اضافہ کے ساتھ واپسی پہلے سے مشروط ہو تو ناجائز ہے۔

معروف حنبلی فقیہ شیخ ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں: ''فإن شرط أن يعطيه أكثر مما أقرضه أو أجود أو أعطاه مثل ما أخذ

وزاده كسرة، كان ذلك حرامًا'' (المغنی لابن قدامه ۴/ ۳۵۹)
(اگر یہ شرط لگائی جائے کہ وہ اس کو اس کے دیئے ہوئے قرض سے زائد، یا بہتر اور جو اس نے لیا ہے اس میں کچھ حصہ زیادہ کر کے دے گا تو یہ حرام ہے)۔

مزید لکھتے ہیں: ''كل قرض شرط فيه أن يزيده فهو حرام بغير خلاف'' (المغنی لابن قدامه ۴/ ۳۶۰)
(ہر وہ قرض جس میں یہ شرط لگائی گئی ہو کہ مقروض کچھ زیادہ رقم ادا کرے گا، وہ بلا اختلاف حرام ہے)۔

اپنی مرضی سے زیادہ واپس کرنا اگر زیادتی واضافہ کے ساتھ واپسی مشروط نہ ہو اور نہ ہی اضافہ کے ساتھ قرض لوٹانے کا عرف ورواج ہو، بلا شرط اپنی مرضی سے بڑھا کر یا بہتر مال واپس کرے تو یہ پسندیدہ ومستحسن عمل ہے۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

''فأما إذا كانت غير مشروطة فيه ولكن المستقرض أعطاه أجودهما فلا بأس بذلك... بل هذا من باب حسن القضاء وأنه أمر مندوب إليه قال النبي عليه السلام: خير الناس أحسنهم قضاءًا'' (بدائع الصنائع ۷/ ۳۹۵، كتاب القرض)
(لیکن اگر قرض میں سے (پہلے سے) شرط نہ ہو، بلکہ مستقرض اپنی طرف سے اس سے بہتر ادا کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ بہتر طور پر ادا کرنے کی قبیل سے ہے اور مستحسن امر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں میں بہتر وہ ہے جو ان میں اپنے قرض کو بہتر طریقہ سے ادا کرنے والا ہے)۔

امام کرخی کی رائے:

علامہ ابن عابدین شامی رقمطراز ہیں: ''كل قرض جر نفعًا حرام أى إذا كان مشروطًا...وفي الذخيرة: وإن لم يكن النفع مشروطًا في القرض فعلى قول الكرخي لا بأس به'' (رد المحتار ۵/ ۱۷۴، مطلب كل قرض جر نفعًا)
(ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے وہ حرام ہے، جبکہ یہ مشروط ہو......ذخیرہ میں ہے کہ اگر قرض میں نفع مشروط نہ ہو تو امام کرخی کے قول کے مطابق کوئی حرج نہیں ہے)۔

بلا شرط قرض میں اضافہ کے ساتھ واپس کرنا حسن اخلاق ومستحسن امر ہے۔

قرض میں زائد رقم کا مطالبہ کم ہو یا زیادہ سود ہے:

قرض میں زائد رقم کی واپسی معمولی ہو یا غیر معمولی ربا ہے، ''كل قرض جر منفعة فهو ربا'' (کنز العمال ۶/ ۲۳۱، حدیث: ۱۵۵۱۶)، اور یہ قرض کے مقصود کے خلاف بھی ہے، ربا کی شناعت بہت زیادہ ہے، اور اس پر وعیدیں بھی شدید ہیں، لہٰذا ربا اور شائبہ ربا، دونوں سے احتراز واجتناب لازم ہے، اس لئے معمولی زیادتی کو سروس چارج نہیں کہا جا سکتا ہے، احتیاط بھی اسی میں ہے، جہاں تک سوال ہے ضرورت وحاجت کا تو ''الضرورات تبيح المحظورات''، اور ''الحاجة تنزل منزلة الضرورة'' کے تحت اصحاب حاجت مسلمانوں کے لئے سودی قرض حاصل کرنے کی گنجائش ہے۔

لہٰذا ضرورت مند مسلمانوں کے لئے مکان کی تعمیر، اور کاروبار کے لئے سودی قرض حاصل کرنے کی اجازت ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری نقل فرماتے ہیں:

''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' (الاشباه والنظائر لابن نجيم ۱/ ۲۹۴)۔
خوشحال مسلمانوں کے لئے کاروبار میں اضافہ، ضرورت سے زائد مکان کی تعمیر وآرائش کے لئے سودی قرض حاصل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

حکومت کی جانب سے بطور امداد رقم کا حصول درست ہے:

حکومت کی طرف سے مکان کی تعمیر، تعلیمی ضروریات اور بیت الخلاء بنانے کے لئے بطور امداد رقم دی جاتی ہے، اور اس رقم میں کچھ بھی واپس کرنا نہیں ہوتا ہے، یہ حکومت کی جانب سے مکمل امداد ہوتی ہے، جن شرائط وضوابط ومعیارات کے ساتھ حکومت یہ رقم دیتی ہے، ان مالی شرائط ومعیارات کا لحاظ کرتے ہوئے اس طرح کی امداد سے فائدہ اٹھانا درست ہے۔

رقم دلانے میں واسطہ بننے والے کے لئے محنتانہ کا حکم:

حکومت کی جانب سے ملنے والی امدادی رقوم، اور قرض وغیرہ کا حصول بڑا مشکل ہوتا ہے، کرپشن، بدنظمی، نظام کی پیچیدگی، قانونی دشواری، انتظامی امور میں بدعنوانی کے باعث ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانا براہ راست بڑا دشوار گذار عمل ہے، لہذا اسکیموں اور ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقوں سے واقف کار افراد کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے، وہ ضروری کاغذی کارروائی مکمل کر کے ان اصحاب حاجت افراد کو رقم دلاتے ہیں، او راس کے عوض جس میں ان کا وقت بھی صرف ہوتا ہے، معاوضہ لیتے ہیں، تو ان کی حیثیت دلال کی ہے، لہذا اس کا محنتانہ لینا اور اس شخص کا دینا دونوں درست ہے۔

سودی قرضوں میں واسطہ بننے والے کا محنتانہ طلب کرنا:

لیکن دوسری قرضوں کے حاصل کرنے میں واسطہ بن کر معاوضہ لینا درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سودی معاملات میں تعاون ہے، اور سودی معاملہ میں سے کسی طور پر معاونت جائز نہیں ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم آکل الربا وموکله وکاتبه'' (صحیح مسلم)

(سود کھانے والے، اور کھلانے والے اور سودی معاملہ کو لکھنے والے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے)۔

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کے لئے رشوت دینا:

حکومت کی جائز امدادی رقوم کی اسکیموں اور ضرورت مند مسلمانوں کے لئے سودی قرضوں کا حصول اگر رشوت دیئے بغیر ممکن نہ ہو تو ان اسکیموں اور قرضوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے رشوت دینا جائز ہوگا، حدیث مبارک ''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الراشی والمرتشی'' (سنن ابی داؤد ۲ / ۵۰۴) کی تشریح میں صاحب ''بذل المجہود'' نے یہ استثناء نقل کیا ہے۔

''فإذا أعطی لیتوصل به إلی حق أو یدفع عن نفسه ظلمًا، فإنه غیر داخل فی هذا الوعید'' (بذل المجہود ۶/ ۳۰۷)

(کسی جائز حق کو حاصل کرنے یا اپنے نفس سے ظلم کو دفع کرنے کے لئے رشوت دے تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے)۔

جائز حق کا حصول رشوت دیئے بغیر دشوار ہو، تو اپنا حق لینے کے لئے رشوت دینا رشوت دینے کی وعید میں شامل نہیں ہے۔

......☆......

سرکاری اسکیموں میں قرض سے کم واپسی کا شرعی حکم

مفتی جنید بن محمد پالنپوری[1]

حامدًا ومصليًا ومسلمًا،

حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ عوام کی معاشی ومعاشرتی ضرورتوں کی کفالت، تعلیمی ترقی صنعتوں کے فروغ اور اقتصادی اعتبار سے محروم وپسماندہ شہریوں کو اونچا اٹھانے نیز ملک کی معیشت کی مضبوطی وترقی کے لئے رقوم اور روزگار فراہم کرکے مدد کریں اور عوام الناس کی معاشی وتعلیمی ضرورتیں پوری کرنے کے ساتھ ان صحت وعلاج کا بھی مکمل بندوبست کریں، اور یہ رقوم حکومت اپنے مالدار شہریوں سے بہ نام ٹیکس وصول کرتی ہے جس میں مسلمان بھی ٹیکس دہندگان میں شامل ہیں، لہٰذا ایک شہری ہونے کے ناطے جس طرح ایک غیر مسلم سرکاری اسکیموں سے مستفید ہوسکتا ہے اسی طرح مسلمان بھی ان اسکیموں سے بلا امتیاز مذہب فائدہ اٹھاسکتا ہے۔

مگر مسلمان چونکہ شریعت کا بھی پابند ہے، لہٰذا اسے یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی ہوگی کہ یہ سرکاری اسکیم کہیں شریعت کے خلاف نہ ہو۔

اس مختصر تمہید کے بعد تمام سوالات کے جوابات ترتیب وار درج ذیل تحریر کئے جاتے ہیں:

(۱) حکومت کی جانب سے دینے جانے والے وہ قرضے جن کا ایک حصہ معاف کردیا جاتا ہے، یعنی قرض لی ہوئی رقم سے کم واپس کرنا پڑتا ہے، یہ حکومت کی طرف سے تبرع اور احسان ہے جو بالکل جائز ہے، اس پر ربوٰ کی تعریف صادق نہیں آتی، حکومت کی طرف سے یہ سبسڈی کہلاتی ہے۔

''الربوٰ هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالى عن عوض شرط فيه (بدايه) أما في اصطلاح الفقهاء فهو زيادة أحد البدلين المتجانسين من غير أن يقابل هٰذه الزيادة عوض'' (كتاب الفقه على المذاهب الاربعة)۔

''التبرع: العطاء بغير مقابل'' (معجم لغة الفقهاء)۔

(۲) قرض حسن، حنفیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا (یعنی قرض کی مدت ذکر کرنے سے وہ مدت لازم نہیں ہوتی) قرض خواہ وقت سے پہلے بھی اس کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

علامہ عینی فرماتے ہیں:

''اختلف العلماء في تاخير الدين إلى أجل، فقال أبوحنيفة وأصحابه: سواء كان القرض إلى أجل أو غير أجل، له أن يأخذه متى أحب وكذلك العارية وغيرها، لأن عندهم من باب العدة والهبة غير مقبوضة، وهو قول الحارث العكلي وإبراهيم النخعي الخ'' (عمدة القاري للعيني ۶/ ۶۰)۔

کسی مدت تک دین کو موخر کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ قرض چاہے مؤجل ہو یا غیر مؤجل، دونوں صورتوں میں دائن اپنا قرض جب چاہے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے اور عاریت وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ یہ مدت ان کے نزدیک وعدہ اور ہبہ غیر مقبوض کی طرح ہے۔

بہرحال قرض حسن مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا۔ گویا یہ دیون حالہ میں سے ہے اور دیون حالہ میں ''ضع وتعجل'' کا اصول جائز ہے، یعنی وقت مقررہ سے پہلے قرض کے واپس کرنے پر کچھ قرض معاف کرنے کی شرط لگانا جائز ہے (مستفاد از اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/ ۱۱۶-۱۱۷)۔

---

[1] دار الافتاء والارشاد، المجلس البرکۃ، ممبئی۔

[illegible]

طرح ہو جو خرچ ... سے زائد اور حکومت کی نیت زرخیزی معلوم ہوتی ہو تو جائز نہ ہوگا۔

اسلامی ترقیاتی بینک سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی [illegible]

"قرض جاری کرنے اور اس کا حساب کتاب رکھنے پر جو واقعی اخراجات آئیں، بینک ... [illegible] وصولی کرنا جائز ہے، بشرطیکہ یہ رقم واقعی ان اخراجات سے تجاوز نہ کرے، ہر اس منصوبہ پر قرض [illegible] ساتھ ان اخراجات کی تحدید ممکن ہو تو یہ صورت احکام شریعت کے زیادہ موافق اور مناسب ہوگی اور اس [illegible]

(٦) یہ حکومت کی طرف سے امدادی شکل میں تبرع اور احسان ہے، جو بالکل جائز ہے۔

(۷-۸) خرید و فروخت و دیگر معاملات میں جن کو ناواقف ہونے کی بنا پر یا فرصت نہ ہونے کی بنا پر خود انجام نہیں دے پاتا اب جو شخص دلال (ایجنٹ) بن کر یہ کام انجام دے رہا ہے، شرعاً اس کے لئے اجرت لینا حلال ہے۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ رقمطراز ہیں: ''اجرت دلال کے بارے میں فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کی عبارات مختلف ہیں، مگر لوگوں کی ضرورت اور حاجت کو مدنظر رکھتے ہوئے جواز کا قول مختار اور مفتی بہ ہے، البتہ بوقت عقد تعیین اجرت ضروری ہے۔

''قال فی التاتارخانية: وفی الدلال والسمسار يجب أجر المثل وماتواضعوا عليه إن فی كل عشرة دنانير كذا فذلك حرام عليهم. وفی الحاوی سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به. وإن كان فی الأصل فاسدًا لكثرة التعامل، وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام'' (رد المحتار ۵/ ۴۲)۔

''أجرة السمسار والمناوی والحمامی والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز مما كان للناس به حاجة'' (ایضاً ۵/ ۳۲؛ احسن الفتاوی ۷/ ۲۷۳)۔

دلال کی اجرت کی ایک شکل یہ ہے کہ کوئی اجرت متعین کرلی جائے، اجرت کی مقدار معین کردی جائے کہ یہ کام کردو گے تو تمہیں پانچ ہزار روپے دیں گے، یہ بالکل درست ہے۔ لیکن عام طور پر سمسرہ میں جو صورت ہوتی ہے وہ اس طرح اجرت متعین نہیں ہوتی، بلکہ فی صد کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے، مفتی بہ قول کے مطابق یہ بھی جائز ہے۔

''وعنه قال: رأيت ابن شجاع يقاطع نساجًا ينسج له ثيابًا فی كل سنة'' (حاشیہ ابن عابدین ۶/ ۶۳؛ اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴/ ۱۲۳، ۱۲۴ ملخصاً)۔

حاصل یہ کہ امدادی رقوم کے حصول میں جدوجہد کرنی پڑتی ہے، لہٰذا واسطہ بننے والے کے لئے دلال ہی کا حکم لاگو ہوگا۔

''کتاب النوازل'' میں ہے: اب اگر یہ دلال ایسے معاملات میں ہو جس میں دوسرے کسی فرد یا معاشرے کا نقصان لازم نہ آتا ہو تو باتفاق ائمہ اس کی گنجائش ہے؛ البتہ اگر اس سے عوام کا نقصان ہو یا لوگوں کے لئے تنگی پیش آئے تو بہ تقاضۂ حدیث ''لا یبیع حاضر لباد'' ایسی دلالی مکروہ ہوگی (۱۲/ ۳۸۰)۔

صورت مسئولہ میں حکومت کی امدادی رقوم کے حصول میں دقت اور مشکل ان دلالوں ہی کی وجہ سے آئی ہے، حکومتی افسران اور ان دلالوں کی ملی بھگت ہی سے ان امدادی رقوم کا حصول عوام کے لئے مشکل ہوا ہے، ایسے معاملات کے دلال دو فی صد اور چار فی صد پر بس نہیں کرتے بلکہ ثلث (تہائی) اور کبھی کبھار اس سے بھی زیادہ وصول کرتے ہیں، اور صاف طور پر کہتے ہیں کہ ''ہمیں افسران کو بھی اس سے بھی دینا ہے'' اور یہ افسران بھی دلالوں کے واسطہ کے بغیر جلدی فائل آگے بڑھانے پر راضی نہیں ہوتے کہ عوام کو براہ راست امدادی رقم دینے میں انہیں کچھ نہ ملنے کا یقین ہوتا ہے، لہٰذا اس طرح کے معاملات میں دلالی سے فرد کے نقصان کے ساتھ معاشرہ کا خطرناک حد تک نقصان ہوتا ہے، رشوت کو بھی اس سے راہ ملتی ہے۔

بہر حال اس طرح کے معاملات میں دلالی کرنے والے کے لئے دلالی مکروہ ہوگی، بلکہ غرباء کا حق مارنا کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا، کیونکہ اگر یہ دلال درمیان سے بالکل ہٹ جائیں تو عوام کے لئے امدادی رقوم حاصل کرنا آسان ہو جائے اور مکمل رقم انہیں وصول ہو۔

(۹) اگر کام کرنے والے پر آپ کا حق ہو کہ وہ اس کام کو کرے اور اس کا مقصود دوسروں کے ساتھ زیادتی بھی نہ ہو تو اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے اور ظلم و ناانصافی سے بچنے کے لئے کراہیت خاطر کے ساتھ رشوت دینے کی گنجائش ہے، لیکن رشوت لینا بہرصورت حرام ہے۔

''ما يدفع لدفع الخوف من المدفوع إليه علی نفسه أو ماله حلال للدافع حرام علی الأخذ؛ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب ولا يجوز أخذ المال ليفعل'' (رد المحتار ۸/ ۳۵)۔

''فإذا أعطی ليتوسل به إلی حق أو يدفع عن نفسه ظلمًا، فإنه غير داخل فی هذا الوعيد'' (بذل المجهود ۶/ ۳۰۷؛ کتاب الفتاوی)

صورت مسئولہ میں امدادی رقوم اور قرضوں کی وصولیابی میں بناء رشوت دلالی مشکل آتی ہو تو یہاں رشوت دینے کی گنجائش ہے، رشوت دینے والے کا انشاء اللہ مواخذہ نہیں ہوگا، کیونکہ امدادی رقوم وغیرہ حکومت کی طرف سے دیئے جانے والے عوام کے حقوق ہیں، اور سرکاری افسران پر بھی یہ لازم ہوتا ہے

کہ شرائط پوری ہونے پر بنا کچھ لیے یہ رقوم جاری کریں۔ البتہ لینے والا سخت گنہ گار ہوگا:

''لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی'' (سنن ابی داؤد ۲/ ۵۰۴)۔

ایک مسلمان اور ملک کے خیر خواہ شہری کی حیثیت سے ہم سب کا فریضہ ہے کہ کرپشن کے آگے سرنگوں ہونے کے بجائے اس کی مزاحمت کریں اور سرکاری نظام میں ایمان داری اور شفافیت لانے کی کوشش کریں، کیونکہ کرپشن بہ حیثیت قوم پورے ملک کو نقصان پہنچانا اور اجتماعی املاک کو لوٹنے کے مترادف ہے (کتاب الفتاوی)۔

(۱۰) حکومت نے امدادی رقوم اور قرضوں کے حصول کے لئے جو شرائط اور معیارات متعین کئے ہیں اس کی پاسداری لازم ہے، جو شخص ان شرائط اور معیارات پر پورا اترتا ہوگا اسی کے لئے ان رقوم کا لینا جائز ہوگا۔

امدادی رقوم حاصل کرنے کے لئے جعلی دستاویز بنانا اور غلط بیانی سے کام لینا حرام ہے، یہ جھوٹ اور دھوکہ ہے، نیز اصل مستحقین کا حق مارنا بھی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں: "یاأیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل" (سورہ نساء:۲۹)۔

حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے: ''من غشنا فلیس منا'' (مسلم شریف)۔

(۱۱) صورت مسئولہ میں حکومت اپنی عوام کو بنک سے قرض دلوانے میں مدد کرتی ہے اگر ساتھ میں یہ بھی معاہدہ ہو کہ بنک کی طرف سے مقروض پر ڈالے جانے والا مکمل سود یا سود کا کچھ حصہ حکومت مقروض کی طرف سے ادا کرے گی تو اس صورت میں سود تھوڑا ہو یا زیادہ بہرصورت یہ جائز نہ ہوگا، کیونکہ یہاں مقروض کی رضامندی سے حکومت اس کا سود ادا کر رہی ہے تو گویا مقروض ہی نے اسے ادا کیا یہ معاملہ صریح سود میں شمار ہوگا۔

''عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوٰ وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ، وقال: ھم سواء'' (صحیح مسلم)

''الربوٰ ھو القرض علی أن یؤدی إلیہ أکثر أو أفضل مما أخذ'' (حجۃ اللہ البالغۃ۔ الربا سحت باطل ۲/ ۲۸۳)۔

اور اگر بنک مقروض سے کچھ بھی زائد وصول نہ کرے، بلکہ اس کو دی ہوئی رقم ہی لوٹانی ہو اور حکومت کا مقروض سے کوئی معاہدہ نہ ہو کہ مقروض کا سود حکومت ادا کرے گی، بلکہ حکومت براہ راست بنک سے معاہدہ کرتی ہو کہ بنک کسی غریب شہری کو تعلیمی یا دیگر ضروریات کے لئے قرض دے گی تو حکومت بنک کو اتنی رقم ادا کرے گی، تو یہ صورت جواز کی معلوم ہوتی ہے، یہاں گویا دو معاملے الگ الگ ہوئے اور عاقدین بھی الگ ہے، ایک معاملہ بنک کا شہری (مقروض) سے ہوا کہ یہاں صرف قرض دیا گیا بغیر سود کے جو بالکل جائز ہے اور دوسرا معاملہ بنک کا حکومت سے ہوا کہ حکومت اسے بلاعوض رقم دے رہی ہے جو ہبہ ہوا۔

اس تاویل سے تعلیمی و دیگر ضروریات کے لئے لون لینا جائز ہوگا، البتہ اگر اس صورت میں مقروض پر لی ہوئی رقم سے کچھ بھی زائد دینا ہوگا تو یہ سود ہی کے زمرے میں آئے گا کہ یہ بنک سے براہ راست سودی معاملہ ہو رہا ہے۔

(۱۲) سود ایسے اضافہ کو کہتے ہیں جو لین دین کے معاملہ میں شرط اور معاہدہ کے مطابق دیا گیا ہو۔

''الربا ھو الفضل المستحق لأحد المتعاقدین فی المعاوضۃ الخالی عن عوض شرط فیہ'' (الھدایۃ ۳/ ۸۰)

''أما فی اصطلاح الفقہاء فھو زیادۃ أحد البدلین المتجانسین من غیر أن یقابل ھذہ الزیادۃ عوض'' (کتاب الفقہ علی مذاھب الاربعۃ)۔

صورت مسئولہ میں تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا حکومت سے کوئی لین دین کا معاملہ نہیں ہوتا، لہٰذا یہ حکومت کی طرف سے تبرع اور احسان کہا جائے گا، جس کے استعمال کی گنجائش ہے، یہ اس اضافہ کی طرح ہے جو پراویڈنٹ فنڈ میں سود کے نام سے دیا جاتا ہے، مگر چونکہ اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی، اس لئے جائز ہے۔

☆☆☆

باب چہارم

مناقشہ
سرکاری اسکیموں سے استفادہ کا حکم

مولانا جنید بن محمد پالنپوری:

حکومت جو قرضے اپنے عوام کو دیتی اور جو اس میں شرط لگاتی ہے کہ اگر وقت سے پہلے دیدیا تو آپ کا اتنا قرضہ معاف کردیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اگر یہ دیون کے تعلق سے ہے تو جائز نہیں ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ میں ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ دین اور قرض میں فرق ہے، دین کہتے ہیں: جو معاملات بیوع وغیرہ کے ہوں اور جو اس پر بقایہ ہوا سے دین کہتے ہیں اور قرض قرض حسنہ کو کہتے ہیں جو بغیر کسی غرض اور فائدہ کے دیا جائے، احناف، بلکہ شوافع اور حنابلہ کے یہاں بھی قرض حسنہ مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا وہ جب چاہے مانگ سکتا ہے تو گویا دیون حالات سے متعلق ہیں۔ اسی طرح قرض حسنہ میں مدت متعین کردی جائے، اس کے بعد بھی وقت سے پہلے دینے پر اگر کچھ حصہ معاف کردیا جاتا ہے تو یہ بھی جائز ہوگا۔ اسے ناجائز نہیں کہہ سکتے تو اس لحاظ سے قرض حسنہ اور دین میں فرق ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دلالی کے تعلق سے یہ بات آئی کہ سرکاری اسکیموں کے اندر دلال بیچ میں ہوتے ہیں تو اس تعلق سے ہمیں ذرا غور کرنا چاہئے کہ معاملہ جو خراب ہوتا ہے ان دلالوں کی ہی وجہ سے خراب ہوتا ہے۔ حکومت کے افسران اور ان دلالوں کی ملی بھگت ہی سے ان امدادی رقوم کا حصول عوام کے لئے مشکل ہوتا ہے، ایسے معاملات کے دلال دو فیصد یا چار فیصد پر بس نہیں کرتے، بلکہ ثلث اور کبھی کبھار اس سے بھی زیادہ وصول کرتے ہیں۔ اور صاف طور پر کہتے ہیں کہ ہمیں افسران کو بھی اس میں سے دینا ہوتا ہے اور افسران بھی ان دلالوں کے واسطے کے بغیر فائل جلدی آگے نہیں بڑھاتے۔ بلکہ عوام کو براہ راست امدادی رقم دینے میں انہیں کچھ نہ ملنے کا یقین ہوتا ہے، اس لئے دلال کا واسطہ بیچ میں لازم سمجھتے ہیں۔ یعنی غیر قانونی طور پر۔ تو گویا کہ مطلقاً دلالی کو جائز نہیں کہنا چاہئے۔ جو شریعت کا اصول ہے "لا یبیع حاضر لباد" کی جس طرح بیع مکروہ ہے کہ اس میں عوام کا نقصان ہے، اسی طرح یہاں پر بھی عوام کا نقصان ہے، اس لئے دلالی کو مطلقاً جائز نہیں کہہ سکتے اسے مکروہ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔

مولانا ظہیر احمد کانپوری:

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جو حکومتی تعاون سے متعلق استفادہ کا مسئلہ ہے تو عام طور سے ہم کو یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ حکومت کے جو الفاظ ہیں اس پر ہم کو دھیان نہیں دینا چاہئے، بلکہ ان کے مقاصد کی طرف ہم کو دھیان دینا چاہئے، جب اس پر ہم کوئی شرعی حکم لگائیں تو ہمیں خاص طور سے اس نکتہ کو پیش نظر رکھنا چاہئے تب ہی ہم حکم شرعی صحیح لگا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت کی جتنی بھی استفادے کی اسکیمیں ہیں ان میں ظاہر ہے کہ انٹرسٹ کا لفظ رہتا ہے اور کہیں کہیں مدت کی تعیین بھی رہتی ہے، لیکن اس کا مقصد سود لینا نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہاں پر تو حکومت کا تعاون ہی کرنا اصل مقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومتی تعاون کے سلسلہ میں جو ہمارے مقالہ نگار حضرات ہیں انہوں نے اپنے مقالوں میں اس کو جائز قرار دیا ہے، لیکن دوسری جگہ پر پہلے جو سوالات کئے گئے ہیں اس کی تفصیل کے سلسلہ میں عرض ہے کہ وہاں پر بھی انہوں نے اس کے تفصیلی احکام میں اس کو جائز قرار دیا کہ اگر یہ قید نہ ہو، بلکہ یہ ہو، تو معلوم یہ ہوا کہ اصل ہم کو استفادہ کی نوعیت کو دیکھنا ہے کہ کونسی اسکیم حکومت کی ہمارے مفاد میں ہے، اور

[illegible]

مولانا مفتی عبد القدوس ندوی:

[illegible]

دوسری بات یہ ہے کہ ابھی بات سامنے آئی کہ حکومت کی اسکیم کے تعلق سے مقصد کو دیکھنا چاہئے وہ لفظ کیا استعمال کرتا ہے اس کو نہیں دیکھنا چاہئے، سوال یہ ہے کہ فقہی قاعدہ معروف ومشہور ہے، "الصراحة أولى من الدلالة"۔ دوسرا فقہی قاعدہ مشہور ومعروف ہے "الأمور بمقاصدھا" یہ اس وقت جاری ہوتا ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں صراحت موجود نہ ہو۔ جب اس کے مقابلے میں صراحت موجود ہو جائے تو تقریباً فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے: "الصراحة أولى من الدلالة"۔

اس بنیاد پر کہ جب حکومت صراحت کر رہی ہے انٹرسٹ کے لفظ کے ساتھ تو خواہ مخواہ اس کو مقصد یا دوسری چیز پر محمول کرنا میرے خیال میں درست معلوم نہیں ہوتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے جو سوال ۱۱ کے تحت جو بات آئی تھی اور جس کے دو اجزاء کے گئے تھے، تو بہر حال پہلے جزء کے تعلق سے تو بات آئی ہے، دوسرے جزء کے تعلق سے جو ایک رائے آئی کہ حکومت اگر تھوڑا حصہ ادا کرتی ہے، اور تھوڑا حصہ مقروض ادا کرتا ہے تو کیا حکومت کو جو تھوڑا حصہ مقروض ادا کرتا ہے کیا اس کو سروس چارج پر محمول کر کے اس کو جائز قرار دیا جائے؟ تو بعض نے اس کو سروس چارج پر محمول کر کے اس کو جائز قرار دیا ہے اس میں وہی بات ہے کہ حکومت خود اس کو سود سمجھ کر کے ادا کرتی ہے اور مقروض کے اوپر سے ایک طرح سے بار کو ہلکا کرنا چاہتی ہے تو جب صراحت آجائے تو اس کو سروس چارج پر محمول کرنا درست کیسے ہوگا؟ دوسری بات جب آپ مانتے ہیں کہ سود حرام ہے، خواہ وہ سود کی مقدار تھوڑی ہو یا زیادہ ہو۔ بہر حال حرام حرام ہے۔ اس میں تھوڑی اور زیادہ کی تقسیم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب حرام تسلیم کرتے ہیں تو وہ حرام ہے، خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ ہو۔ لہٰذا اس کو سود ہی کہا جائے گا اور یہ صورت ناجائز ہوگی۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

ایک تحریر آئی ہے مولانا عارف باللہ قاسمی صاحب کی ہے وہ سوال ا کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ عرض مسئلہ میں آراء کا احاطہ بہت محدود پیمانہ پر کیا گیا ہے، بہت سے مقالہ نگار کی آراء اور ان کے دلائل کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے کم از کم جو اضافی دلائل تھے ان کو ذکر کرنا چاہئے تھا۔

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی:

اس میں دو بات مجھے عرض کرنی ہے، ایک تو یہ ہے کہ تلخیص مقالات بھی آپ کے پاس ہے آپ دیکھ لیجئے اور عرض بھی مکمل چھپ گیا ہے، میں نے چونکہ عارضین سے یہ بات کہی تھی کہ جو سوالات متفق علیہ ہیں جن کے بارے میں اختلاف نہیں ہے ان میں زیادہ تفصیل میں مت جائیں۔ ایسا نہیں ہے کہ دلائل کا انہوں نے احاطہ نہیں کیا ہے اور چیزوں کا ذکر نہیں کیا ہے تمام چیزیں موجود ہیں، لیکن جن سوالات کے بارے میں مقالہ نگاروں کا اتفاق ہے، اختلاف نہیں ہے ان کے بارے میں زیادہ دلائل میں جانا، اس کی ضرورت نہیں، باقی آپ کے نام آئیں گے کہ فلاں نے یہ دلیل پیش کیا ہے فلاں نے یہ کہا ہے جب چیز چھپے گی تو گویا ایک دستاویز کی حیثیت سے اس میں ان چیزوں کا ذکر ہوگا۔ اور بعض مقالے بعد میں بھی آئے ہیں، جو وقت مقرر کیا جاتا ہے اکیڈمی کی طرف سے وہ اس وقت کے بعد بہت سے مقالات بھیجے گئے ہیں ان سے استفادہ نہیں ہو سکا ہے تو آئندہ بھی اس کا اہتمام کیا جائے کہ جو تاریخ طے کی جائے اس کے اندر ہی آپ مقالہ بھیج دیا کریں۔

مولانا شمس تبریز قاسمی:

میں شمس تبریز میں یہاں مفتی کی حیثیت سے مدعو نہیں ہوں، بلکہ ملت ٹائمس کو نمائندگی کا موقع دیا گیا ہے، لہٰذا میں ایک صحافی کی حیثیت میں یہاں آیا ہوں، لیکن میرا ایک سوال ہے سوال نمبر ۳ کے بارے میں مقالہ نگاروں سے، آپ نے کہا کہ قرض ادا کرنے پر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم ادا کرنے پر تو اس کی صورت کیا ہوگی تو آپ لوگوں نے لکھا کہ۔ سوال ۳ ہے کہ اگر مقررہ مدت کے بعد قرض ادا کرنے پر اگر کل رقم کی واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑی...... ربا میں شامل کیا گیا ہے، لیکن میرا یہ ماننا ہے کہ حکومت مختلف طرح کا لون دیتی ہے کسان لون، ایجوکیشن لون،

مطلب عوام کو کام کرنے کے لئے، کسان ہیں تو کھیتی کر سکیں، طلبہ ہیں تو پڑھ سکیں اور ایک وقت مقرر ہوتا ہے کہ اتنے وقت تک آپ کو رقم ادا کرنی ہے، مقررہ وقت کے بعد کچھ زیادہ رقم کا مطالبہ کرتی ہے حکومت، تو وہ زیادہ رقم کا مطالبہ بطور تاوان وسزا کے کیا جاتا ہے، کیونکہ لوگ اگر لون لیتے رہیں اور مقررہ وقت پر ادا نہ کریں تو حکومت کا نظام خراب ہوگا اور مزید زیادہ لوگوں کو استفادہ کا موقع نہیں مل سکے گا۔ تو زیادہ رقم کا مطالبہ بطور تاوان وسزا کے کیا جاتا ہے تو اس سلسلہ میں میری مقالہ نگاران حضرات سے گزارش ہے کہ آپ اس پر نظر ثانی کریں۔

مولانا نثار عالم ندوی:

سوال ۱۰ / میں جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں ''غلط بیانی'' یہ لفظ ہی غلط ہے۔ غلط بیانی کا مفہوم کچھ اور ہو جاتا ہے، اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ ہم قانون، حکومت کے قانون کے خلاف اور قانون کو توڑ کر اسکیم سے استفادہ کریں ہم، اس کا یہ مطلب نہیں ہے، اس لفظ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لئے حیلہ اور چالبازی اور ہوشیاری سے کام لینا، اس کا مصداق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکومت جو اسکیمیں ہمارے لئے فکس کرتی ہے وہ حکومت کے پیسے نہیں ہیں وہ عوام کے پیسے ہوتے ہیں جو ٹیکس کی صورت میں مختلف ترجیحات کے اصول پر حکومت کرتی اور ہماری ترقی کے لئے مختلف اسکیمیں چلاتی ہیں، لیکن ان اسکیموں کو تقسیم کرنے میں حکومت کے پاس عادلانہ اور منصفانہ کوئی رول نہیں ہے، بلکہ وہ انسان کی کوشش اور محنت کے اوپر انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں عملی طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے برادران ملت مکمل طور پر غلط بیانی کر کے کس طرح سے ان اسکیموں کو لوٹ کھسوٹ رہے ہیں اور اس کو کس طرح سے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ پورے ملک کے سامنے موجود ہے اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت جب بھی کوئی مسلم شخص ان اسکیموں سے استفادہ کی کوشش کرتا ہے تو ذرا ذرا سی بات پر مختلف بہانوں سے ان اسکیموں کو رد کیا جاتا ہے اور پھر اس کے اندر اور وہ ان اسکیموں کو رد کرنے کے لئے شاید اتنا حیلے استعمال کرتے ہیں جتنا ہم اسکو حاصل کرنے کے لئے بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا غلط بیانی سے اپنے کاغذات کو داخل کریں تو کیا اس کو غلط بیانی کہا جائے گا؟ اور یہ بھی صحیح ہے عملی طور پر بات ہے کہ بغیر غلط بیانی کے آج کے ماحول میں خاص کر اس ماحول میں اور اس ملک میں ان اسکیموں سے استفادہ کرنا ناممکن سا نظر آتا ہے عملی طور پر، اور بغیر رشوت کے بھی نہیں ہوتا ہے۔ میں عملی طور پر اپنا خود تجربہ بتا رہا ہوں کہ ایک اسکیم کے تحت جب ہم بات کر رہے تھے بینک منیجر صاحب سے تو وہ دینے کے لئے تیار نہیں تھے، لیکن جب ہم نے ان سے بات کی کہ بھائی کچھ لے لیجئے تو فوراً وہ ٹین پرسینٹ (10٪) پر راضی ہو گئے تو یہ عملی طور پر ہمارے سامنے ہے کہ ہمارے یہاں کا ایک گروپ جو ہے اس کو لوٹ کھسوٹ رہا ہے اور اگر ہمارے لئے یہ راستے مسدود ہیں، تو پھر ایک امت کے لئے اقتصادی طور پر پیچھے رہ جانا بڑے خسارہ کی بات ہوگی، اور اقتصادیات کی بھی شاید شریعت میں ایک اہمیت ہے۔

مولانا زید مظاہری صاحب (استاذ ندوۃ العلماء):

سوال ۲ کے تعلق سے۔ اس سوال کے جواب کے متعلق حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ معاملے کے دو پہلو ہیں ایک نفس تعدی، یعنی وقت مقررہ پر ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں قرض میں لی ہوئی رقم سے زائد سود دینا، زائد رقم، یعنی سود دینا یہ تو حرام ہے اور اس صورت میں حرام کا گناہ ہوگا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ وقت مقررہ پر رقم کی ادائیگی کر دی جائے اور زائد رقم نہ دینا پڑے تب بھی چونکہ نفس عقد اور صلب عقد میں ربا کا تذکرہ ہے اور یہ خود ناجائز اور معصیت ہے، اس صورت میں سود کے لین دین کا گناہ نہیں ہوگا، لیکن عقد ناجائز کا گناہ ہوگا، یہ بات حضرت تھانویؒ نے ارشاد فرمائی۔

مفتی جنید عالم ندوی صاحب (پٹنہ):

سوال ۳ میں یہ ہے کہ اضافی رقم جو دینی پڑتی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ میرا خیال یہ ہے کہ عام قرضوں میں اور حکومت سے جو قرض لئے جاتے ہیں

باب چہارم

مناقشہ
سرکاری اسکیموں سے استفادہ کا حکم

مولانا جنید بن محمد پالنپوری:

حکومت جو قرضے اپنے عوام کو دیتی اور جو اس میں شرط لگاتی ہے کہ اگر وقت سے پہلے دیدیا تو آپ کا اتنا قرضہ معاف کر دیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اگر یہ دیون کے تعلق سے ہے تو جائز نہیں ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ میں ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ دین اور قرض میں فرق ہے، دین کہتے ہیں: جو معاملات بیوع وغیرہ کے ہوں اور جو اس پر بقایہ ہوا سے دین کہتے ہیں اور قرض قرض حسنہ کو کہتے ہیں جو بغیر کسی غرض اور فائدہ کے دیا جائے، احناف، بلکہ شوافع اور حنابلہ کے یہاں بھی قرض حسنہ مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا وہ جب چاہے مانگ سکتا ہے تو گویا دیون حالات سے متعلق ہیں. اسی طرح قرض حسنہ میں مدت متعین کردی جائے، اس کے بعد بھی وقت سے پہلے دینے پر اگر کچھ حصہ معاف کر دیا جاتا ہے تو یہ بھی جائز ہوگا۔ اسے ناجائز نہیں کہہ سکتے تو اس لحاظ سے قرض حسنہ اور دین میں فرق ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دلالی کے تعلق سے یہ بات آئی کہ سرکاری اسکیموں کے اندر دلال بیچ میں ہوتے ہیں تو اس تعلق سے ہمیں ذرا غور کرنا چاہئے کہ معاملہ جو خراب ہوتا ہے ان دلالوں کی ہی وجہ سے خراب ہوتا ہے۔ حکومت کے افسران اور ان دلالوں کی ملی بھگت ہی سے ان امدادی رقوم کا حصول عوام کے لئے مشکل ہوتا ہے، ایسے معاملات کے دلال دو فیصد یا چار فیصد پر بس نہیں کرتے، بلکہ ثلث اور کبھی کبھار اس سے بھی زیادہ وصول کرتے ہیں۔ اور صاف طور پر کہتے ہیں کہ ہمیں افسران کو بھی اس میں سے دینا ہوتا ہے اور افسران بھی ان دلالوں کے واسطے کے بغیر فائل جلدی آگے نہیں بڑھاتے۔ بلکہ عوام کو براہ راست امدادی رقم دینے میں انہیں کچھ نہ ملنے کا یقین ہوتا ہے، اس لئے دلال کا واسطہ بیچ میں لازم سمجھتے ہیں۔ یعنی غیر قانونی طور پر۔ تو گویا کہ مطلقاً دلالی کو جائز نہیں کہنا چاہئے۔ جو شریعت کا اصول ہے ''لا یبیع حاضر لباد'' کی جس طرح بیع مکروہ ہے کہ اس میں عوام کا نقصان ہے، اسی طرح یہاں پر بھی عوام کا نقصان ہے، اس لئے دلالی کو مطلقاً جائز نہیں کہہ سکتے اسے مکروہ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔

مولانا ظہیر احمد کانپوری:

مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جو حکومتی تعاون سے متعلق استفادہ کا مسئلہ ہے تو عام طور سے ہم کو یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ حکومت کے جو الفاظ ہیں اس پر ہم کو دھیان نہیں دینا چاہئے، بلکہ ان کے مقاصد کی طرف ہم کو دھیان دینا چاہئے، جب اس پر ہم کوئی شرعی حکم لگائیں تو ہمیں خاص طور سے اس نکتہ کو پیش نظر رکھنا چاہئے تب ہی ہم حکم شرعی صحیح لگا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت کی جتنی بھی استفادے کی اسکیمیں ہیں ان میں ظاہر ہے کہ انٹرسٹ کا لفظ رہتا ہے اور کہیں کہیں مدت کی تعیین بھی رہتی ہے، لیکن اس کا مقصد سود لینا نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہاں پر تو حکومت کا تعاون ہی کرنا اصل مقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومتی تعاون کے سلسلہ میں جو ہمارے مقالہ نگار حضرات ہیں انہوں نے اپنے مقالوں میں اس کو جائز قرار دیا ہے، لیکن دوسری جگہ پر پہلے جو سوالات کئے گئے ہیں اس کی تفصیل کے سلسلہ میں عرض ہے کہ وہاں پر بھی انہوں نے اس کے تفصیلی احکام میں اس کو جائز قرار دیا کہ اگر یہ قید نہ ہو، بلکہ یہ ہو، تو معلوم یہ ہوا کہ اصل ہم کو استفادہ کی نوعیت کو دیکھنا ہے کہ کونسی اسکیم حکومت کی ہمارے مفاد میں ہے، اور

حکومت اس کے ذریعہ ہمارا تعاون کررہی ہے تو اس میں ہم کو جہاں تک ہو سکے گنجائش دینا چاہئے، مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے "وتعاونوا علی البر والتقوی" (سورہ مائدہ: ۲) کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور باقی جو چیزیں ہیں چونکہ حکومت کے جو نمائندے ہیں وہ سب کے سب غیر اسلامی اور ہمارا یہ ملک بھی غیر اسلامی ہے، اس لئے ان سب چیزوں سے ان کو کوئی واقفیت نہیں ہوتی ہے، تو ہم کو اپنے لحاظ سے چونکہ شرعی حکم ہم کو دینا ہے، لہٰذا ہم اس مقصد کو پہلے پیش نظر رکھیں گے تو انشاء اللہ عوام کے لئے اس میں سہولت بھی پیدا ہو جائے گی اور ہمارے جو حضرات ہیں وہ سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانے سے محروم بھی نہیں ہوں گے۔

دوسری بات جو واسطہ بننے سے متعلق ہے اس میں عرض مسئلہ کے بارے میں بھی اور تلخیص میں بھی جو رائے سامنے آرہی ہے واسطے کے مفہوم میں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سمجھنے میں دقت ہوئی ہے، اس وجہ سے بھی اس میں رایوں میں اختلاف پیدا ہوا ہے، لیکن واسطہ اگر حقیقی معنی میں ہم یہاں دیکھتے ہیں، ہمارا یہ جو ملک ہے، اس کے اندر جو اسکیمیں ہوتی ہیں وہ ہر شخص کے سامنے نہیں آتی ہیں، جب آپ بیچ میں کسی واسطے والے کو تلاش نہیں کریں گے اس وقت تک آپ سرکاری اسکیموں سے صحیح طور سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں، لہٰذا آپ کو ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے واسطہ لینا پڑے گا۔ ایک مفہوم وہ ہے کہ ایک سرکاری ملازم ہے وہ ہم سے بیچ میں واسطہ بن کر کچھ مانگتا ہے تو ظاہر ہے کہ ناجائز ہوگا، لیکن عمومی درجہ میں بہت ساری جو یہاں پر تنظیمیں ہیں وہ سرکاری فنڈ فراہم کرنے کی پوری ذمہ داری لیتی ہیں کہ ہم آپ کو پہنچائیں گے، اگر کوئی آدمی انفرادی کوشش کرتا ہے وہ اس کو اتنی جلدی حاصل نہیں کرسکتا، لہٰذا اس کے اندر بھی ہم کو اس کی اصل پیچیدگی کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور واسطہ بننے کے سلسلہ میں اگر ہم کو کوئی اجرت وغیرہ دینا ہے اور وہ ایک اجرت مثل کے درجہ میں ہے اور غیر معمولی نہیں ہے، اس میں قرض سے مستفید ہونے والے کا استحصال نہیں ہے تو اس کو جائز قرار دینا چاہئے ہم کو، وما علینا إلا البلاغ۔

مولانا نعمت اللہ صاحب قاسمی:

سوال نمبر ۸ کے سلسلہ میں جو عرض مسئلہ آیا اس میں جو اجرت کا مسئلہ ہے کہ اجرت متعین ہو یا اجرت فیصد کے حساب سے ہو، اجرت فیصد کے حساب سے درست ہے یا نہیں؟ یہ بات آئی تو میرا خیال یہ ہے کہ اجرت فیصد کے حساب سے بھی درست ہے اور یہ مسئلہ جو ہے گویا کہ فقہاء متاخرین کے درمیان مفتی بہ اور یہ فتوی طے ہو چکا ہے اور ہمارے اکابرین میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے بھی اس سلسلہ میں فتوی دیا ہے، اس لئے فیصد کے حساب سے اجرت اگر طے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ ایک بات ہوئی۔ دوسری بات سوال نمبر ۱۲ کے بارے میں ہے، اس میں یہ بات آئی ہے کہ حکومت عوام کی امداد کے لئے ایک فنڈ مختص کردیتی اور اس کے بعد جو ہے وہ بینک اس پر سود دیتا ہے اور پھر اس سود سے عوام کی امداد ہوتی ہے، تو اس سلسلہ میں عرض یہ کرنا ہے کہ اسکیم بھی حکومت ہی بناتی ہے اور بینک بھی حکومت ہی کے کنٹرول میں ہے، دونوں جیب تو ایک ہی جیب ہے، اس لئے وہاں اگر بینک جو ہے حکومت کو سود ادا کرتا ہے تو سود نہیں ہے وہ۔ وہ ایک اضافی رقم ہے، اس لئے اگر حکومت اس رقم سے لوگوں کا تعاون کرتی ہے تو اس کو سود کے دائرہ میں لانا میرے خیال سے مناسب نہیں ہے۔ اب یہ ہے کہ بینک کہاں سے وہ رقم حاصل کرتا ہے زائد رقم، کس سے یعنی کاروبار کرکے وہ رقم حاصل کرتا ہے یا کسی سے سود لے کر کے وہ رقم حاصل کرتا ہے اس طوالت میں ہم کو جانے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں حکومت اور بینک کے درمیان جو معاملہ ہے وہ سودی معاملہ نہیں ہے، اس لئے یہ ہم نہیں کہہ سکتے یقین کے ساتھ کہ سود کی رقم حکومت دے رہی ہے لوگوں کو۔ اس لئے ضرورت مند، غیر ضرورت مند دونوں کے لئے یہ رقم جائز ہے یہ میری رائے ہے۔

مولانا مصطفی عبد القدوس ندوی:

مجھے تین باتیں کہنی ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ جو عرض مسئلہ ہے اس میں نقاط نظر تو پیش کردیئے گئے، مگر عارض کو چاہئے تھا کہ کسی ایک رائے کو مدلل کرکے بیان کرتا، تاکہ معلوم ہوتا کہ کونسی رائے اس کے نزدیک ارجح ہے، اس سے بحث کرنے میں آسانی ہوتی۔

ان میں فرق ہونا چاہئے۔ عام قرضوں میں تو اضطراری حالت میں گنجائش دی جائے سودی قرض لینے کی، لیکن حکومت سے جو قرض لیتے ہیں چونکہ حکومت تمام شہریوں کی ترقی کے لئے، فلاح وبہبود کے لئے اپنے خزانے میں رقم رکھتی ہے، اس لئے حکومت سے جو قرض لیے جاتے ہیں وہ اضطراری حالت کے علاوہ جو درمیانی حالت میں ہے اس میں بھی گنجائش رکھنی چاہئے۔ جیسا کہ مفتی نظام الدین صاحب نے ''نظام الفتاوی'' میں اس کو یہ کہا ہے کہ ضروری اخراجات قرار دیئے جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو حالات ہیں ان حالات میں بیسہ رہتے ہوئے بھی مکان بنانا، تجارت کرنا بڑا مشکل ہے، مکان بنائیں گے فوراً سوال ہوگا کہ پیسے کہاں سے آئے ہیں، اس لئے لوگ مجبور ہو کر پیسے رہتے ہوئے بھی حکومت سے قرض لیتے ہیں سودی قرض لیتے ہیں جو مجبور ہیں، اس لئے میرے خیال سے حکومت سے قرض لینے میں کچھ گنجائش اور کچھ سہولت رکھنی چاہئے۔

سوال نمبر ۸، اس میں یہ ہے کہ جو درمیان میں واسطہ بنتے ہیں وہ لوگ ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں یا دینے اور لینے کا جو معاملہ طے ہوتا ہے اس کے مطابق معاملہ کرتے ہیں اس سلسلہ میں ایک تو یہ ہے کہ مدت مجہول ہوتی ہے اور دوسرے میں یہ ہے کہ عامل کی اجرت اس کے عمل سے قرار پاتی ہے۔ اس کی وجہ سے قفیز طحان والی روایت کو سامنے رکھ کر اس صورت کو ناجائز ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ اس میں عرف عام ہے اور عرف عام کی وجہ سے بہت سارے مسائل ہیں جن میں مدت بھی مجہول اجرت بھی مجہول اور عامل کی اجرت اس کے عمل سے قرار پاتی ہے پھر بھی اس کو جائز قرار دیا گیا ہے، وہ مدت جب مدت مجہول ہو تو وہ جہالت مفسد اجارہ ہے جو مفضی الی النزاع ہو، لیکن جو مفضی الی النزاع نہ ہو، وہ جہالت مفسد اجارہ نہیں ہے، جہاں تک یہ مسئلہ کہ عامل کی اجرت اس کے عمل سے قرار پاتی ہے، جیسا کہ قفیز طحان والی روایت ہے، تو اس سلسلہ میں علامہ شامی نے ''شرح عقود رسم المفتی '' میں بہت اچھی بحث کی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ عرف عام کی وجہ سے روایت کا ترک جائز نہیں، لیکن عرف عام کی وجہ سے روایت کی تخصیص جائز ہے، اگر قفیز طحان پر ہی عرف عام ہو جائے اور وہاں پر عرف پر عمل کیا جائے تو یہ روایت کا ترک لازم آئے گا، لیکن اگر قفیز طحان والی روایت کی علت کو سامنے رکھ کر اگر دوسری صورت ناجائز ہو اور وہاں پر عرف عام بن جائے۔ تو اگر اس صورت میں عرف عام پر عمل کرتے ہیں تو یہ عرف عام کی وجہ سے روایت کی تخصیص ہے، ترک نہیں ہے، اس لئے میرے خیال سے اس صورت میں اگر معاملہ طے پا جاتا ہے بشرطیکہ وہ واسطہ بننے والے وہ سرکاری آدمی نہ ہو جن پر وہ کام کرنا لازم ہے واجب ہے اور ان کی ذمہ داری ہے، دوسرے لوگ اگر درمیان میں واسطہ بن کر کام کرتے ہیں تو میرے خیال سے اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

مولانا ارشد فاروقی صاحب (دیوبند):

سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی شرائط کا مسئلہ زیر بحث ہے، بہت سے شرائط یقیناً ہندوستان کے ماحول میں مسلمانوں کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، اس لحاظ سے کہ مذہبی رکاوٹ ہے اور اس میں سود کا مسئلہ اور ممنوعات شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو جب ایسی اسکیمیں یا ایسے قوانین اس ملک کے لئے آئیں اور پاس ہوں تو مسلم اداروں کی طرف سے نمائندگی کے طور پر صحیح تصویر اگر واضح کی جائے اور حکومتوں کو بتایا جائے کہ ان شکلوں کو اگر اس طرح کر لیا جائے تو سب کے لئے قابل استفادہ ہے اور مذہبی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ تو ایک بڑا اقدام ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی اپنے تمام جو اہم چیزیں اس نے جاری کی ہے اس منصوبے میں اگر اسے بھی شامل کرے تو ایک اچھا قدم ہوگا۔ شکریہ۔

مولانا عثمان صاحب (گورینی):

سوال نمبر ۲ میں ہے کہ سرکاری اسکیموں سے استفادہ، جس میں وقت مقررہ پر قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں رقم زائد، یعنی اضافی رقم ادا کرنا پڑے۔ تو اس اسکیم سے استفادہ جائز ہے یا نہیں؟ تو اس میں دو پہلو ہیں ایک پہلو تو اس کا یہ ہے کہ وقت مقررہ پر رقم ادا کر دی جائے سود ادا نہ کرنا پڑے اس اعتبار سے یہ جائز ہے، لیکن چونکہ قرض میں سود کی شرط لگی ہے اس اعتبار سے یہ معاملہ کرنا ناجائز ہے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے اور فقہاء نے بھی صراحت فرمائی ہے: ''القرض بالشرط حرام والشرط لغو''۔ صاف صاف یہ مسئلہ بار بار ذکر کیا جاتا ہے تو جب یہ سوال نامہ پہنچا

اور اس مسئلہ پر میں نے غور کیا تو مختلف عبارتیں دیکھی مختلف مقامات دیکھے، پھر اس اشکال کا حل نکالا اور میں نے اس کے جواز کی طرف نشاندہی بھی کی، لیکن معلوم نہیں کیوں عارض نے اور اسی طرح سے تلخیص مقالات میں جو کہ ایک اہم جزء تھا کہ یہ جائز ہے، تو اس پر یہ اشکال ہوتا ہے اور اس اشکال کا جواب ہے اس کی طرف بہر حال توجہ دلانی چاہئے، اس کو عرض کرنا چاہئے۔

بہر حال اس کا جواب جو ہے میں نے اس کو اپنے مقالہ میں ذکر کیا ہے، مقالہ اس وقت موجود نہیں پاس میں کہ اس کو پڑھ کر سنا دوں، جس کا حاصل یہ ہے کہ شرط کی دو قسمیں ہیں ایک شرط معلق ہے اور ایک شرط مبرم ہے، شرط معلق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہوگا تو ایسا ہو جائے گا، نہیں ہوگا تو نہیں ہوگا، اور شرط مبرم میں یہ ہے کہ اس معاملہ کے ساتھ شرط لازم ہے، بہر حال اس کو پایا جانا ہے، جیسے قرض لیا جائے تو شرط لگے کہ قرض لیں گے تو سود دینا پڑے گا۔ اور ایک یہ ہے کہ اگر وقت مقررہ پر ادا نہیں کیا گیا پھر تو سود دینے کی نوبت آسکتی ہے، لیکن لازم نہیں ہے، تو اس مسئلہ میں علامہ شامیؒ نے خیار شرط کی بحث میں جہاں یہ مسئلہ آتا ہے کہ تین دن کی شرط لگانا جائز ہے اور تین دن سے زیادہ کی شاید شرط لگانا جائز نہیں۔ اس مسئلہ پر بحث کیا کہ یہ معاملہ کرنا جائز ہے کہ نہیں جائز ہے، فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ اگر چار دن کی یا پانچ دن سے زائد کی شرط لگائی، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر تین دن کے اندر ادا کر دیا تو جائز ہے تین دن کے بعد اگر تاخیر پائی گئی تو یہ فاسد ہے، جائز نہیں ہے اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابتداء عقد یا معاملہ یہ جائز ہے کہ نہیں، جائز ہے، اس میں علامہ شامیؒ نے لکھا کہ اس میں اختلاف ہے اور اہم فقہاء کا اختلاف لکھا ہے، ابن ہمامؒ بھی جواز کے قائل ہیں کہ معاملہ کرنا جائز ہے۔ اور اسی طرح سے بہت فقہاء نے اور اصول وضوابط سے بھی اس کا جواز مستفاد ہوتا ہے جو میرے مقالہ میں پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

مولانا عبدالباسط صاحب قاسمی (ممبئی):

بینک یا حکومت کو قرض پر دی جانے والی زائد رقم کو اپنی مقدار کے اعتبار سے سروس چارج کہلا سکتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ نے جو منی آرڈر کے سلسلہ میں ''امداد الفتاوی'' میں تحقیق لکھی ہے اور اس سے استفادہ کر کے منتخبات ''نظام الفتاوی'' میں حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ نے سرکاری اور اقتصادی اسکیموں کے فتووں میں ایسے چارج کو سروس چارج قرار دیا گیا ہے، گو کہ اس کا نام انٹرسٹ یا سود صراحت کے ساتھ موجود ہو، لیکن وہ انتظامی خرچ کے دائرہ میں آسکتا ہو تو اسے انتظامی خرچ مانا جائے گا، اس سلسلہ میں ''امداد الفتاوی'' کے وہ فتاوی اور مفتی نظام الدین صاحب کا وہ فتوی بھی سامنے رہنا چاہئے، عرض مسئلہ میں اس کا ذکر نہیں ہے، اس لئے میں نے تذکرہ کر دیا ہے۔

سوال نمبر ۱۰ جس میں غلط بیانی کے تعلق سے بات ہے کہ ساری اسکیموں میں انتظامی بنیادوں پر کچھ شرائط ومعیارات ہوتے ہیں، جیسے کاغذات وغیرہ، اور شرعی معیارات جو طے ہوتے ہیں وہ ضرورت واحتیاج کی بنیاد پر ہوتے ہیں، اگر کوئی مستحق ہو سرکاری اسکیموں کا اور قانونی طور پر شرعی معیارات پورے نہیں کر سکتا ہو تو جیسے بہت سے ایسے مسائل ہیں جہاں انتظامی مسائل الگ ہیں، لیکن شرعاً گنجائش دی گئی ہے۔ جیسے آج کل قانونی طور پر حج وعمرہ کے لئے شرط رکھ دی گئی ہے کہ چالیس سے کم عمر والوں کو عمرہ کا ویزہ نہیں دیا جائے گا۔ لیکن اس سلسلہ میں اگر کسی بھی عمر کا آدمی کسی حیلہ سے عمرہ کرنے چلا جائے تو اس کو کوئی گناہ اور ناجائز قرار نہیں دیا جاتا۔ ناجائز نہیں کہتا ایسے ہی سرکاری ملازمت کے تعلق سے بھی کتب فقہ میں فتاوی موجود ہیں کہ اگر سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے کسی طرح کا حیلہ یا کذب بیانی کی جائے اور وہاں پر حقدار ہو محض تعصب کی بنا پر اور معیار ہونے کے باوجود ترجیحات کی بناء پر اگر وہ ملازمت چھوٹ رہی ہو تو اسے حاصل کرنے کے لئے ایسے حیلہ کا اور معمولی درجہ کے غلط بیانی کا استعمال کیا جا سکتا ہے، اس لئے چند شرائط کے ساتھ میں عزت وآبرو کے تحفظ کے ساتھ میں اور شرعی معیار پورے ہونے کے ساتھ میں اگر کوئی اس طریقے کی کارروائی ہوتی ہے کہ قانوناً گرفت نہ ہو تو اس میں گنجائش ہونی چاہئے۔

اسی طریقہ سے سوال ۱۲ کے سرکاری اسکیموں سے متعلق ہے کہ ایسی اسکیمیں جس کے اندر محض سود کی رقم جمع کر کے اداروں کو، تعلیمی اداروں

کو، اشخاص کو اجازت دی جاتی ہے اس سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے اس کو بھی مطلقاً جائز ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں بھی منتخبات میں حضرت مفتی نظام الدین صاحب ؒ نے بہت طویل بحث کی ہے اور پراویڈنٹ فنڈ کے معاملہ کے اندر ان بحث کو بنیاد بنایا ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کے اندر جو صراحت انٹرسٹ کی ہوتی ہے وہ حقیقت میں انٹرسٹ ہوتی ہے، لیکن اس انٹرسٹ کا حصول اصل ملازم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے وہ سرکاری محکمہ یا کمپنیاں اپنے طور پر معاملات کر کے اس کو حاصل کرتی ہیں اور خود مالک بنتی ہیں اور مالک بننے کے بعد اپنے ملازم کو دیتی ہیں۔ تو اس طریقے سے حضرت مفتی نظام الدین صاحب ؒ نے اس کو طیب اور حلال قرار دیا ہے، اس لئے اس کو بھی مطلقاً جائز ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس میں جو نفع اٹھانے والے حضرات ہیں ان اسکیموں سے ان کا براہ راست سودی معاملات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، اس لئے اس کے جواز میں بھی کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔

مفتی نذیر احمد کشمیری:

زیر بحث مسئلہ میں چند امور ملحوظ رکھے جانے چاہئیں، ایک تو یہ کہ گورنمنٹیں جو ترقیاتی اسکیمیں بناتی ہیں ظاہر ہے اس کے یہاں شرعی اصول ملحوظ نہیں ہوں گے، کہ کونسی صورت ان کے لئے جائز ہوگی اور کونسی صورت ناجائز ہوگی، اس لئے اس بات کا امکان ہے کہ جہاں شرعی سود نہیں ہوگا وہاں وہ انٹرسٹ کا خانہ لکھ دیں گے کہ اس سے زائد رقم بطور انٹرسٹ کے لی جائے گی، اس لئے اس پر ہمیں غور کرنا ہوگا کہ جہاں گورنمنٹ کے قانون میں انٹرسٹ لکھا گیا، کیا وہ واقعی شرعی طور پر انٹرسٹ بنتا بھی ہے یا نہیں؟ اس بات کا امکان ہے کہ وہ جس چیز کو کہہ رہے ہیں انٹرسٹ اور شرعی طور پر وہ سود نہ ہو اس کی مثال پراویڈنٹ فنڈ کی اضافی رقم بھی ہے جس کو شبہ ربا تو کہا گیا حقیقت ربا نہیں ہے۔ تو ایک تو اس بات کو ملحوظ رکھا جانا چاہئے کہ گورنمنٹ اپنی اسکیمیں بنانے میں شرعی ضوابط نہ جانتی ہیں نہ ملحوظ رکھیں گی۔ اور دوسرا نکتہ یہ سامنے رہنا چاہئے کہ آج کے اس کرپشن کے دور میں اور خاص طور پر گورنمنٹ کے دفاتر میں جو رشوت ستانی ہے اور معمولی کاموں کے لئے جو مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں اس صورت حال کے اندر جائز اسکیموں سے بھی استفادہ کرنا آسان نہیں ہے اور اس کی مثالیں سب لوگوں کو پیش آتی رہتی ہیں کہ اسکیم بالکل درست ہے اس سے نفع اٹھانے والا اس کا حقدار ہے، مگر درمیان کے لوگ چاہے وہ گورنمنٹ کے افراد ہوں اور چاہے وہ درمیان کے ایجنٹ ہوں وہ اس معاملہ کو اتنا مشکل بنا دیتے ہیں کہ آدمی اسکیم لینے والا تھک ہار کر کے سوچتا ہے کہ وہ اس مصیبت میں پڑا ہی کیوں۔ اور اس بیچ میں اس سے مطالبے ہوتے ہیں کہ اگر تم اتنے فیصد ادا کردو گے تو تمہارے لئے آسانی ہوگی، اور دفتری طوالتوں سے تم بچو گے اور فائلیں بہت جلدی سے آگے چلیں گی اور جلدی سے آرڈر ہو جائے گا۔ تو اب یہ جو درمیان کے لوگ ہیں ان درمیان کے لوگوں کو دی ہوئی رقم کو ہم رشوت کہیں یا ان کے عمل کا معاوضہ کہیں یا اجرت کہیں اور اس کے نتیجے میں اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے کو ہم ناجائز کہیں۔ اس پر بھی غور کیا جانا چاہئے، کہ اتنی جلدی ناجائز ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے، جن صورتوں میں گورنمنٹ کی طرف سے معافی ملتی ہے رقم کچھ کم کردی جاتی ہے سبسڈی کے طور پر اور اضافی رقم مانگی جاتی ہے تو اضافی رقم اس سبسڈی کے مقابلے میں تسلیم کی گئی، جیسا کہ اس سے پہلے بار بار یہ فیصلے ہوئے ہیں۔ تو جب وہاں یہ شکل اختیار کی گئی تو جن صورتوں میں بہت معمولی اضافی رقم لی جارہی ہے اس کو سود کے دائرہ میں نہ لا کر سروس چارج کے دائرہ میں اگر لایا جائے تو اس سے مسلمانوں کو ان ترقیاتی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کی راہ کھل جائے گی، جن سے فائدہ نہیں اٹھا پارہے ہیں، ترقیاتی اسکیموں سے زیادہ تر تعلق مثلاً مکان بنانے سے، مثلاً جانور پالنے سے، مثلاً تعلیمی خرچوں سے ہے، تو اب اگر یہاں معمولی شبہ کی بنیاد پر ناجائز ہونے کے فیصلے کر دیئے گئے اور حقیقتاً سود نہیں تھا، لیکن ہم نے اس کو سود کے دائرہ میں لایا۔ تو اس کے نتیجے میں اور زیادہ مشکلات ان بھائیوں کے لئے پیدا ہوگی جو اپنے بچوں کو مثلاً تعلیم دلانا چاہتے ہیں یا اپنے گھر میں باغبانی کرنا چاہتے ہیں یا اس طرح کی کوئی دوسری ترقیاتی اسکیم۔ ان تمام امور کو پیش نظر ضرور رکھا جانا چاہئے۔ تا کہ فیصلے کرنے میں ایک طرف سے شریعت کے ضوابط ملحوظ رہیں اور دوسری طرف سے امت کے لئے یسر پیدا ہو اللہ کرے یہ بات ہم سب کے یہاں ملحوظ رہے اور ہم صدق وصواب تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں۔

مولانا فیاض عالم قاسمی (قاضی ناگپاڑہ ممبئی):

حکومت کی طرف سے جو قرضہ فراہم کیا جاتا ہے اس کی نوعیت عام قرضہ کی طرح نہیں، کیونکہ عام قرضہ میں مقروض کی حصہ داری نہیں ہوتی ہے، یعنی قرض دینے والا، قرض دینے والے کی خزانہ کی حیثیت کیا ہے اس پر بھی ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے، عارض نے بھی اس مسئلہ پر بحث نہیں کی ہے، کیونکہ حکومت کی طرف سے جو قرضہ فراہم کیا جاتا ہے اس میں خود مقروض کی حصہ داری ہوتی ہے، حکومت اپنے گھر سے قرضہ فراہم نہیں کرتی ہے، بلکہ خود ہمارے ہی پیسوں سے ہمارے ہی خزانے سے ہم کو قرضہ فراہم کرتی ہے، مثلاً ٹیکس، تاوان، جرمانہ، معدنیات اور جنگلات وغیرہ سے قرضہ فراہم کیا جاتا ہے، اس اعتبار سے حکومت کا خزانہ گویا خود ہمارا خزانہ ہے، اس لئے تجاویز مرتب کرتے وقت اس حیثیت کو بھی ذہن میں رکھا جائے، میرے خیال سے سود کے تعلق، ایک تو یہ ہے کہ سود لینا یہ حرام لعینہ ہے، لیکن سود دینا، اس میں یہ حرام لغیرہ ہے اور اس میں کچھ گنجائش ہے، لہٰذا جب ہم خود اپنے خزانے سے استفادہ کررہے ہیں اور حکومت اس کو قرضہ کہہ رہی ہے یا حکومت اس کو انٹرسٹ کے نام سے ہم کو دے رہی ہے، تو اس میں کچھ گنجائش ہونی چاہئے، تجاویز مرتب کرتے وقت اس حیثیت کو بھی ذہن میں رکھا جائے۔

مولانا ظفر اللہ صاحب ندوی:

سوال نمبر ۸، ۹ کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ واسطہ بننے والے کے محنتانہ لینے کو جائز اور ناجائز کی بات کہی گئی ہے، اس وقت مرکزی سرکار کی طرف سے غریبوں کے لئے مکان کی اسکیم چل رہی ہے اور یہ اسکیم ۲۰۲۲ تک نافذ ہوگی، اس میں پچاس فیصد تک محنتانہ وصول کرنے کی بات کہی گئی ہے اگر کوئی شخص پچاس فیصد، اسکیم کا اگر آدھا حصہ دے دیتا ہے تو اس کے لئے مکان ملنا یقینی ہوتا ہے اور اگر کوئی اس سے کم دے گا تو اس کے لئے یقینی نہیں ہوگا۔ مقالہ نگاروں نے اجرت مثل لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ بعض لوگوں نے ایک حصہ کو جائز قرار دیا ہے، لیکن اس کی حد طے نہیں کی گئی ہے کہ یہ کہاں تک جائز ہے، یعنی کس حد تک، کس مقدار تک اس کو جائز قرار دیا جائے، صورت حال یہ ہے کہ اگر پچاس فیصد تک ادا نہ کیا جائے تو اس اسکیم سے استفادہ ممکن نہیں ہے، اس پہلو پر بھی ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ اس اسکیم میں واسطہ بنتے ہیں وہ افسروں کی طرف سے بھی محنتانہ لیتے ہیں اور اسکیم حاصل کرنے والوں سے بھی محنتانہ لیتے ہیں، تو کیا یہ شکل جائز ہے یا ناجائز ہے یا اس کی کیا حیثیت ہے اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے...... (آواز غیر واضح تھی) پچاس فیصد تک اگر محنتانہ نہیں ملے گا تو اس اسکیم سے استفادہ کرنا غیر یقینی ہوگا اور اگر پچاس فیصد محنتانہ، یعنی اسکیم کا حصہ دیدیا جائے تو اس سے استفادہ کرنا یقینی ہوگا، اب صورت حال یہ ہے کہ اگر کسی کو مکان کی سخت ضرورت ہے تو اس کو جتنا ادا کرنا پڑے اس کے لئے اس کی جائش ہوسکتی ہے، یہ میرا خیال ہے۔ جزاکم اللہ۔

مفتی عقیل مظاہری:

سوال ۷، ۸، ۹ کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے، سوال ۷ کا تعلق درمیان میں واسطہ بننے والے کے محنتانہ لینے اور دینے سے متعلق ہے، سوال ۸ کا تعلق حاصل شدہ رقوم سے حصہ لینے اور اس کا معاملہ کرنے سے متعلق ہے اور سوال ۹ کا تعلق سرکاری قرضوں کے حصول کے لئے رشوت دینے سے متعلق ہے، اس سلسلہ میں مقالہ نگار حضرات کی جو آراء آئی ہیں وہ چار رائے ہیں پہلی یہ کہ مطلقاً جائز ہے، دوسری یہ ہے کہ عام شخص ہے تو اس کے لئے جائز ہے اور اگر حکومت ہی کے افراد میں سے ہو تو ناجائز ہے، تیسری یہ آئی ہے کہ اگر سودی قرضے ہیں تو ان میں ناجائز ہے اور اگر غیر سودی قرضے ہیں تو ان میں درست ہے، تو ان قسموں، ان تین رائیں جو آئی ہیں ان میں کسی شرط کے ساتھ یا مطلقاً لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن سوال ۸ یہ ہے کہ بعض مرتبہ واسطہ بننے والے لوگ حاصل شدہ رقم کا ایک حصہ لے لیا کرتے ہیں یا لینے اور دینے کا معاملہ کرتے ہیں تو اس میں اگر لینے کی گنجائش ہو تو اس شرط کے ساتھ ہونا چاہئے کہ پہلے سے معاملہ طے نہ ہوا ہو اگر لینے اور دینے کا معاملہ کیا گیا تو یہ قفیز طحان کی صورت میں ہو کر کے ناجائز ہونا چاہئے، جیسا کہ کتب فقہ میں موجود ہے

اور اگر بغیر معاملہ کے لین دین ہوا ہے تو پھر یہ جائز ہونا چاہئے، جیسا کہ ہمارے اکابرین کے فتاوی میں یہ بات ہے، لیکن ان چاروں رایوں میں سے سوال ۸ کے بارے میں اس کی وضاحت نہیں آئی ہے، تو یہ سوال ۷، ۸ اور ۹ میں مشترکہ طور پر اگر لینے کی کوئی گنجائش ہے تو آٹھویں سوال کو مدنظر رکھتے ہوئے معاملہ کو طے کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے اس میں فرق ہونا چاہئے، جزاکم اللہ۔

مولانا اسماعیل مظاہری:

سوال ۱۰ / (آواز غیر واضح تھی) حکومت کی طرف سے امدادی رقوم حاصل ہوتی ہے مستحقین حضرات کا جہاں تک تعلق ہے ان کے لئے تو گنجائش نکالی گئی، لیکن بعض مقالہ نگار کی طرف سے ان حضرات کے لئے بھی جو غیر مستحق ہیں اور ملک کی موجودہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے بھی اجازت دی گئی ہے کہ غلط بیانی سے کام لیا جاسکتا ہے، تو ارباب اکیڈمی سے ادبا درخواست ہے کہ اس مسئلہ پر غور فرمائیں، کیونکہ اکیڈمی کا مقصد سہولیات کو فراہم کرنا ہے، نہ یہ کہ غیر ضروری چیزوں کو بھی مباح کی طرف لے کر جانا، اگر غیر مستحقین افراد کے لئے بھی ادنی قسم کی گنجائش نکال لی جائے تو وہ تمام نصوص جن میں سچائی کی طرف رغبت دلائی گئی اور جھوٹ سے پرہیز کرنے کا حکم دیا گیا۔ ان سب کی مخالفت صراحتاً لازم آئے گی، اس لئے اس مسئلہ پر توجہ فرمائیں اور جو حضرات واقعتاً غیر مستحق ہیں ان کے لئے ایسی رقوم سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے، جزاک اللہ۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

مولانا روح الامین صاحب نے ایک پرچی بھیجی ہے، انہوں نے اپنی بات لکھ کر بھیج دی ہے کہ:

''مفتی زید صاحب نے حضرت تھانوی کی بات جو نقل فرمائی ہے اس میں اضافہ بھی مناسب ہے کہ جب شرط فاسد کی وجہ سے عقد فاسد ہو تو فقہاء اس کی دو علت ذکر فرماتے ہیں: نمبر ایک ربا کو مستلزم ہونا، نمبر دو مفضی الی النزاع ہونا، فقہ البیوع میں دوسری علت ہی کو راجح قرار دیا گیا ہے، کیونکہ فقہاء نے شرط فاسد کو تعامل کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، اس لئے کہ تعامل کے بعد نزاع نہیں ہوتا ہے، حالانکہ ربا تعامل کی وجہ سے بھی جائز نہیں ہوتا ہے''۔

مولانا عتیق احمد بستوی / مفتی ذکاء اللہ

ان کی بات آگئی، اور مفتی ذکاء اللہ صاحب نے ایک پرچی بھیجی ہے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار تو کیا ہے، لیکن بندوق کسی اور کے کندھے پر رکھ دی ہے، سرکاری اسکیموں سے استفادہ کو جائز کرنے کی رائے ان کی ہے، لکھا ہے کہ ''ہمارے ملک میں بریلوی کا ایک بڑا طبقہ اس ملک کے نظام کو دار الحرب تصور کرتا ہے اور حکومت سے قرض اور بینک سے لون نیز سود کو رضامندی سے دینے کی بنیاد پر اس کو جائز سمجھتا ہے، بلکہ ان کے دار الافتاؤں سے اس کا فتوی بھی دیا جاتا ہے، اس لئے سرکاری اسکیموں کو ضرورت مند کے حق میں جائز کیا جانا چاہئے''، ان کی رائے ہے جو انہوں نے بھیجی ہے۔

مولانا معین قاسمی:

اس وقت جو بحث چل رہی ہے، تو اس میں بہت سی اسکیمات ایسی ہیں کہ جس میں غلط بیانی سے استفادہ آسان ہوجاتا ہے، مثال کے طور پر یہ بتادیا جائے کہ ہمارے پاس فلاں کاسٹ کی سرٹیفکٹ ہے تو اس سے اسکیموں سے فائدہ اٹھانا آسان بھی ہوجاتا ہے، بلکہ ملنا یقینی ہوجاتا ہے، جیسے سروس ہے یا کسی ایجوکیشن میں یونیورسٹی وغیرہ میں داخلے ہیں یا اسی طریقے سے سروس وغیرہ، یا پھر اپنے مکانات کے لئے تجارت کے لئے زراعت کے لئے لون حاصل کرنا تو یہ اس قسم کا سرٹیفکٹ غلط بیانی کے زمرے میں آئے گا اور کیا یہ: ''الضرورات تبیح المحظورات'' کا مصداق بنے گا؟ تو میں یہ عرض کررہا تھا۔

مفتی محمد بن اسلم رشید فلاحی پالنپوری:

سوال ۵ میں اگر سرکار کی طرف سے دیئے جانے والے قرض پر لی جانے والی رقم کا اوسط معمولی نہ ہو تو اس کے جواب میں مقالہ نگاروں کی دو رائے ہیں، عدم گنجائش اور گنجائش تو اس سلسلہ میں عدم گنجائش اور عدم جواز کے قائلین کی رائے زیادہ پختہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ سود کی حرمت منصوص ہے اور منصوص کو بغیر کسی اضطراری و مجبوری کی بنیاد کے جواز فراہم کرنا یہ صحیح بات معلوم نہیں ہوتی ہے، اور میں نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر عبد الحمید محمود طہاس کی کتاب ''الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید'' کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ''فالربوا حرام فی کل صورہ وأشکالہ سواء کانت الزیادۃ کثیرۃ أو أمر قلیلۃ. وسواء کان الاستقراض للاستثمار أو للاستھلاك''، یہ پوری عبارت ہے اس عبارت سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ سود کی ہر صورتیں حرام ہونی چاہئیں، لہٰذا عدم جواز کے قائلین کی رائے زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ شریعت کا مزاج یہ ہے کہ اس نے جہاں گناہ سے روکا ہے، اس نے گناہ کی طرف لے جانے والے اسباب اور جو دواعی ہوتے ہیں ان سے بھی روکا ہے، اس لئے جیسے زنا سے روکا ہے تو زنا کی طرف لے جانے والے جو اسباب ہیں جو بدنگاہی وغیرہ ان سے بھی روکا ہے تو یہاں جو ہے سود کی طرف لے جانے والے اور سود کی عادت ڈالنے والی جو چیزیں ہیں ان سے بھی آدمی کو روکا جانا چاہئے۔ لہٰذا عدم جواز کے قائلین کی رائے بہتر ہے۔

مولانا اعجاز الحسن صاحب بانڈی پر کشمیر:

''حکومتی اسکیموں سے مسلمانوں کے استفادہ میں غلط بیانی کے الفاظ کے بجائے مناسب تعبیر اختیار کرنے کی گزارش ہے''۔

مولانا محمد جنید پٹیل صاحب (سورت):

حکومت کی مختلف اسکیم سے جو اقلیت کے لئے چل رہی ہے اس کے بارے میں عوام تو عوام یہاں موجود خواص امت بھی ناواقف ہیں تو فقہ اکیڈمی ماہرین کی کمیٹی بنا کر اس پر کام کر کے عوام و خواص کو ان اسکیموں سے واقف کرائیں۔ امت پر یہ بڑا احسان ہوگا۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

میں سمجھتا ہوں کہ سارے کام اکیڈمی کے ذمہ نہ کیجئے کچھ آپ حضرات بھی کام کریں جو اس طرح کے کام ہیں تو اب تک جو نام بھیجے گئے تھے سب میرے پاس آکر مکمل ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جتنے حضرات بھی خواہشمند تھے اظہار خیال کے ان کی آراء سامنے آگئیں، یہ جو ابھی مفتی جنید پٹیل کی طرف سے بات آئی، اس بارے میں یہ عرض ہے کہ ابھی اکیڈمی کی طرف سے ایک چیز تیار کرائی گئی ہے ''سرکاری اسکیموں سے استفادہ ایک مختصر نوٹ'' عبد الرشید اگوان صاحب نے اس کو تیار کیا ہے کہ کیا کیا اسکیمیں چل رہی ہیں تو جائز ناجائز کا فیصلہ تو آپ فرمائیں گے، لیکن جو اسکیمیں چل رہی ہیں اس وقت جن سے استفادے ممکن ہیں ان کی تفصیل اس کے اندر ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے شرکاء سمینار کو یہ تحریر پہنچ جانی چاہئے، تا کہ اس کی روشنی میں وہ واقف ہو جائیں اسکیموں سے، اب میں عرض کرتا ہوں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب سے چند منٹ وہ اس موضوع کے بارے میں اظہار خیال فرمائیں۔ پھر انشاء اللہ صدارتی کلمات اس کے بعد ہوں گے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

اسلامک فقہ اکیڈمی نے اس سوالنامے کے مرتب کرنے سے پہلے سرکاری اسکیموں سے واقف حضرات کی اور ماہرین کی ایک باضابطہ نشست اکیڈمی کے دفتر میں بلائی تھی۔ وہ اسکیمیں جو عام نوعیت کی ہیں۔ وہ اسکیمیں جو اقلیتوں کے لئے ہیں، وہ اسکیمیں جن کا تعلق معاشی فلاح و بہبود سے ہیں، وہ اسکیمیں جن کا تعلق تعلیم اور علاج سے ہے، کوشش کی گئی۔ ان تمام اسکیموں کو سامنے رکھ کر فقہی اور شرعی اعتبار سے جو نکات قابل بحث ہیں ان

کی جو شکلیں اور صورتیں بنتی ہیں ان کی جو شقیں ہوسکتی ہیں وہ سوالنامے کی شکل میں آپ حضرات کے سامنے پیش کی جائیں۔ ان صورتوں کو بھی شامل رکھا گیا جس میں بظاہر کلام کی بہت کم گنجائش تھی اور اسی لئے کئی اسکیموں کے بارے میں آپ محسوس کرتے ہیں کہ اس پر علماء کا اتفاق ہے، ان صورتوں کو ذکر کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حکومت کے خزانے میں ہر طرح کا پیسہ آتا ہے، اس میں سود بھی ہوتا ہے، اس میں شراب کی کمپنیوں اور دکانوں کے ٹیکس بھی ہوتے ہیں تو جن میں براہ راست حرمت کی کوئی شکل نہیں ہے کیا ہمیں ایسی اسکیموں سے بھی استفادہ کرنا چاہئے؟ تو اس لئے ان سوالوں کو بھی شامل رکھا گیا، اسی ضمن میں یہ بحث آتی ہے کہ جو غیر مسلم ہیں وہ مخاطب بالفروع ہیں یا نہیں ہیں اور کوئی شخص جو بہت سارے مال کا مالک ہو اس میں غلبہ کا کثرت کا اعتبار ہوگا یا کوئی عنصر قلیل مقدار میں شامل ہو تو وہ بھی اس کے حکم پر اثر انداز ہوگا؟ تو اس لئے ان شکلوں کو بھی اس میں شامل رکھا گیا، دوسری طرح کی وہ شکلیں تھیں کہ جس میں سود کا پہلو یا رشوت کا پہلو یا کم سے کم اس کا شبہ پیدا ہوتا ہے تو کوشش یہ کی گئی کہ ان تمام شکلوں کا احاطہ ہو جائے، اکیڈمی نے اس سلسلہ میں جناب عبدالرشید اگوان صاحب سے ایک تحریر بھی مرتب کرائی ہے انشاء اللہ آپ لوگوں کے درمیان تقسیم کی جائیں گی۔ جس میں مختلف اسکیموں کا ذکر ہے اور بعض مسلمان تنظیمیں اس پر باضابطہ کام کر رہی ہیں ان کی ویب سائٹس موجود ہیں اس میں انہوں نے ایسی تمام اسکیموں کو جمع کر دیا ہے، میرا خیال ہے کہ علماء کو ان اسکیموں سے واقعی واقف ہونا چاہئے، تاکہ ہم جب کوئی فتوی دیں تو وہ واقعی صورت مسئلہ کے مطابق ہو، واقعہ کے موافق ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ پر جو مناقشہ ہوا بہت عمدہ ہوا فقہ کی جزئیات سے بھی استدلال کیا گیا اور جو فقہی اصول ہیں ان کو بھی سامنے رکھا گیا۔

میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقلیتی اسکیمیں حکومتوں کے یہاں کم ہیں بمقابلہ ان اسکیموں کے جو دلتوں کے لئے ہیں اور دوسرے لوگوں کے لئے ہیں جو اقلیتی اسکیمیں ہیں ان کا بھی بجٹ بالخصوص ۲۰۱۴ سے کم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو بجٹ منظور ہوتا ہے اس کا اعلان کر دیا جاتا ہے، لیکن اس اسکیم تک پہنچنے کو اتنا مشکل بنا دیا جاتا ہے اور اتنی افسر شاہی سے گزرنا پڑتا ہے کہ بہت کم مسلمان وہاں تک پہنچ پاتا ہے، کچھ اس میں دخل ہماری ناواقفیت کا بھی ہے، ہماری ملی تنظیمیں اگر اپنے کام کے شعبہ میں ایک شعبہ یہ بھی رکھیں کہ جو مسلمانوں کے لئے مفید اسکیمیں ہوسکتی ہیں اور شریعت کے دائرہ میں آتی ہیں ان اسکیموں تک مسلمانوں کو پہنچائے تو یہ ایک بڑا کام ہوگا اور ہمارا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو تجویز میں اس کو بھی پیش کرنا چاہئے کہ مختلف ملی تنظیمیں اپنے یہاں مسلمانوں کو جائز شرعی اسکیموں تک رسائی کو آسان بنانے کے لئے کوئی شعبہ قائم کریں۔

جہاں تک نفس مسئلہ کی بات ہے، مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمیں دو باتیں ضرور پیش نظر رکھنی چاہئے، ایک یہ کہ ایک شکل یہ ہے کہ آپ خود نظام بنائیں سسٹم بنانا آپ کے ہاتھ میں ہو، وہاں یقیناً ہمیں ایک مکمل آئیڈیل معیاری شرعی نظام بنانا چاہئے اور پوری قوت کے ساتھ اس پر جمنا اور لوگوں کو جمانا چاہئے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ بنے بنائے نظام کا حصہ بننے پر مجبور ہیں، آپ خود کوئی سسٹم نہیں بنا سکتے، بلکہ جو سسٹم بنا ہوا ہے آپ اس سے وابستگی رکھنے پر مجبور ہیں۔ ہمیں ان دونوں حالتوں کا فرق پیش نظر رکھنا چاہئے۔ فقہاء نے جو ہمارے دار الاسلام اور دار الکفر کے احکام میں فرق کیا ہے شاید اس کی بنیاد یہی ہے کہ دار الاسلام میں مسلمان خود اپنے نظام حیات کا قالب بناتا ہے اور دار الکفر میں وہ ایک بنے بنائے نظام کا حصہ بننے پر مجبور ہوتا ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أطیعوا ما استطعتم" (جس قدر ہو سکے تم کو بہرحال اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر قائم رہنا چاہئے)۔ تو یہ دراصل جو دار الکفر میں بسنے والے مسلمان ہیں ان کے لئے یہ ایک ضرورت بن جاتی ہے اور اسی لئے ہمارے سلف صالحین نے اور بالخصوص ہمارے ماضی قریب کے اکابر علماء کے فتاوی میں اس کی جھلک ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ دوسری قابل ذکر بات وہ ہے جس کی طرف اشارہ کیا ہمارے ایک دوست نے، شریعت کے احکام میں دونوں باتوں کو اہمیت حاصل ہے، مقاصد کو بھی اور اشکال کو بھی، عقد کی شکل کیا ہوتی ہے، عقد کا مقصد کیا ہے، یہ تو ٹھیک ہے احکام کی بنیاد حکمت و مصلحت پر نہیں ہوتی ہے، بلکہ علتوں پر ہوتی ہے، لیکن بہت سی جگہ ایسا ہوتا ہے زیادہ تر شکل پر حکم کی بنیاد رکھی جاتی ہے لیکن کبھی شکل کے مقابلہ میں مقصد کو ترجیح دی جاتی ہے، یہ جو ہمارے یہاں اصول فقہ ہے، اس میں ایک اصل ہے استحسان، اور استحسان کی ایک قسم ہے استحسان بالمصلحت، استحسان بالضرورۃ۔ اگر آپ غور فرمائیں تو وہاں علت کو وقتی طور پر نظر انداز کر کے شریعت کے مقاصد و مصالح کو

ترجیح دی جاتی ہے تو یہ دونوں باتیں بنیادی ہیں۔ اب مثال کے طور پر یہ انٹرسٹ کی بات آتی ہے، اصل میں ہمارے یہاں جو بینکنگ قانون ہے بینکنگ نظام ہے اس کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ بینک کو انٹرسٹ لینا ہے اور بینک کو انٹرسٹ دینا ہے، اپنے مقروضوں سے انٹرسٹ لینا ہے اور اپنے کسٹمر کو انٹرسٹ دینا ہے اور ان کے یہاں حلال وحرام کا کوئی تصور نہیں ہے تو اس لئے کوئی رقم اگر سروس چارج کے طور پر بھی لیتے ہوں کتنی ہی کم رقم وہ لیتے ہوں جو عام طور پر کہیں حکومت یا بینک کے شرح سود میں اتنی کم رقم قبول نہیں کی جاتی ہو اور جس اسکیم کا مقصد مسلمان لوگوں کو روزگار سے لگانا ہو، بے مکان لوگوں کو مکان فراہم کرنا ہو، تعلیم کی سہولت پیدا کرنا ہو اس کو بھی وہ انٹرسٹ کا نام دیتے ہیں، اب آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں بہت سے عقود میں بھی ہبہ کا لفظ بولا جاتا ہے اور نکاح کا معنی مراد لیا جاتا ہے، وصیت کا لفظ کہا جاتا ہے، یا ہبہ کا لفظ، ایک دوسرے کی جگہ قرائن کی بنیاد پر معنی متعین کئے جاتے ہیں تو ہمیں جو حکومت کے مقاصد ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات متعین کرنی چاہئے کہ کیا حکومت نے ہماری اصطلاح کے اعتبار سے ایک شرعی مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے، جیسے ہمارے بعض دوستوں نے مثال دی۔ پراویڈنٹ فنڈ پر جو انٹرسٹ دیا جاتا ہے اس کے سلسلہ میں جیسے ہمارے اکابر کے فتاوی موجود ہیں کہ اگر حکومت آپ سے انٹرسٹ لے اور سبسڈی دے اور یہ دونوں برابر ہو جائیں تو چاہے وہ اس کو انٹرسٹ کا نام دیں، مگر اس پر انٹرسٹ کا اطلاق نہیں ہوگا، تو یہ ایک دونوں اصولی باتیں ہیں اور ان کو ہمیں پیش نظر رکھنی چاہئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ حکومت کا اور ہمارا تعلق کیا ہے، جب ہم حکومت سے کوئی چیز لیتے ہیں یا حکومت ہمیں کوئی چیز دیتی ہے تو ایسا نہیں ہے کہ ہم مکمل طور پر ایک فریق ہیں اور حکومت مکمل طور پر دوسری فریق ہے۔ ہم ایک فریق ہیں اور حکومت ایک ایسی فریق ہے جس میں ہماری شرکت ہے اگر آپ ایک بوتل پانی بھی لیتے ہیں تو آپ حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں، ہمارے برادران وطن جتنا ٹیکس ادا کرتے ہیں اتنا ہی ٹیکس آپ بھی ادا کرتے ہیں۔ آپ اعداد وشمار دیکھیں جو اقلیتی اسکیمیں ہیں افسوس کی بات ہے کہ سکھ اور عیسائی جن کی آبادی کا تناسب بہت کم ہے ان کے استفادہ کا تناسب بڑھ جاتا ہے اور مسلمانوں کے استفادہ کا تناسب کم ہوتا ہے تو ہمیں کچھ اصولی باتوں کو سامنے رکھنا چاہئے، بہر حال ان دو تین نکات کی طرف ہم نے آپ کو متوجہ کرنے کی کوشش کی کہ ہم اس بات کو بھی پیش نظر رکھیں کہ حکومت سے جو ہمارا معاملہ ہے وہ دو افراد کی طرح نہیں ہے، بلکہ ہم ایک فریق ہیں اور حکومت ایک ایسی فریق ہے جس کا جزء ہم بھی ہیں، ہمارا بھی اس کے خزانہ میں حصہ ہے، ہماری قوم کا بھی اس کے خزانہ میں حصہ ہے، ایسا نہ ہو کہ ہم ایسا راستہ اختیار کریں کہ جو کھلا ہوا سود ہو اس کی اجازت دیدیں اور ایسا بھی نہ ہو کہ جو حقیقت میں سود نہ ہو، لیکن اس کو انٹرسٹ کا نام دیا گیا ہو اور ان لوگوں نے نام دیا ہو کوئی حکم لگادیں۔ یہ دو تین بنیادی باتیں ذہن میں آئیں جسے ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

ابھی آپ کے سامنے بہت ہی بنیادی نکات مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے پیش فرمائے ہیں۔ دو تین تحریریں آئی ہیں جن میں اچھے نکات اٹھائے گئے ہیں۔ ایک تحریر مفتی شاہد علی قاسمی حیدرآبادی کی ہے، لکھتے ہیں: ''معمولی شرح سود والی اسکیم سے استفادہ کے جواز کی طرف اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے اور راقم کی بھی یہی رائے ہے، اب سوال یہ ہے کہ معمولی شرح سود سے کیا مراد ہے؟ یہ پہلو زیادہ واضح نہیں ہوسکا۔ راقم کی رائے ہے کہ رقمی لین دین میں جو اخراجات مروج ہیں جیسے ویسٹرن یونین اور اس طرح کی رقمی لین دین کرنے والے ادارے لیتے ہیں اسے معیار بنایا جائے۔ دوسری بات سوکنیا اسکیم سے متعلق عرض ہے کہ ارباب افتاء اس کے بارے میں دو آراء رکھتے ہیں، اگر اس کا حکم بھی سامنے آجائے او رتجویز میں بھی اس کو شامل کیا جائے تو بہتر ہو۔ اور ایک تحریر ہے مولانا عبد اللہ خالد صاحب کی کہ تجویز میں حکومت سے بھی درخواست کی جائے کہ اسکیمیں بناتے وقت مسلمانوں کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے ان کے مذہب کے مطابق بنائی جائے۔ خاص کر جو اسکیمیں اقلیتوں سے تعلق رکھتی ہیں، مسئلہ تو یہ ہے کہ جو اسکیمیں مسلمانوں کے بارے میں ہے اقلیتوں کے بارے میں ہے اس میں خاص طور سے اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ اس میں ایسا کچھ شامل کر دیا جائے کہ مسلمان خود اس سے گریز کریں۔ مولانا آزاد کے نام پر جو مولانا آزاد فنڈ ہے کیا ہے؟ مولانا آزاد فاؤنڈیشن کے نام

سے۔تو وہاں یہی ہے کہ حکومت نے ایک رقم گویا بینک میں ڈال دی، اب اس کے سود سے جو بھی امداد کرتی ہے اداروں کی، تعلیمی اداروں کی، وہ اس کے سود سے کرتی ہے، حالانکہ اور بے شمار اسکیمیں گورنمنٹ کی ایسی ہوتی ہیں کہ وہ رقم جو مختص ہوتی ہے بجٹ میں سے وہ براہ راست خرچ ہوتی ہے، یہ نہیں ہوتا کہ اس کو بینک میں محفوظ کر دیا جائے اور اس کے سود سے فائدہ اٹھایا جائے، تو افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی اس پوزیشن میں ہم نہیں ہیں، خدا کرے ہو جائیں کہ جب یہاں کی جو اسکیمیں ہیں جو پالیسیاں بنتی ہیں عوام کی فلاح کے لئے، اس میں ہم دخیل ہو سکیں کہ وہ اسکیمیں ایسی ہوں جو ہمارے لئے قابل قبول ہو۔ میں نے ابھی آپ کو مثال دی کہ بھائی ہمارے کتنے لوگ سود سے اور بینک سے بہت دور تھے، بچے ہوئے تھے، لیکن اب جب یہ حکم آ گیا نوٹ بندی کا تو سارے کے سارے لوگوں کو ملوث ہونا پڑا، اور وہاں سے معاملہ کرنا پڑا تو ابھی اس پوزیشن میں ہم نہیں ہیں، لیکن ہم مایوس نہیں ہیں یہ کوشش ہونی چاہئے کہ مسلمان طاقتور ہو سیاسی لحاظ سے اور ان کے جو جذبات ہیں ان کے جو خیالات ہیں یا ان کے جو مذہبی احکام ہیں ان کا لحاظ بھی ان اسکیموں میں کیا جائے۔ اور مولانا ثناء الہدیٰ صاحب نے ایک تحریر بھیجی ہے "سرکاری اسکیموں سے استفادہ کی عملاً کوئی شکل، سود و رشوت کے بغیر عصر حاضر میں نہیں ہے، سرکاری خزانے میں ٹیکس دینے کی وجہ سے ہماری حصہ داری ضرور ہے، لیکن اس حصہ داری کا حصول ہمارے بس میں نہیں ہے، سود و رشوت کے ساتھ ہمارے لئے ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے، لیکن یہ دونوں ممنوعات شرعیہ میں سے ہیں، رشوت کو دلالی کی اجرت قرار دینا شرعاً درست نہیں معلوم ہوتا۔ دلالی اور چیز ہے اور یہ جو اسکیم میں سرکاری افسروں کو رشوت دلانے کے لئے یہ جو بچولیے ہیں اسے ان کی اجرت قرار دینا یہ درست نہیں، یہ مولانا کی رائے ہے"۔ تو اب ایک نام صرف باقی بچا ہے اظہار رائے کے لئے اسی پر گویا مناقشہ مکمل ہوگا۔

مولانا محمد سعید اسعد قاسمی (امارت شرعیہ آسنسول):

میرا سوال واسطہ بننے والے کے محنتانہ لینے دینے کے بارے میں ہے کہ اگر یہ فیصلہ جواز کا ہوتا ہے جس طرح سے آراء آئی ہیں تو ایسی صورت میں اگر متعین کر لیں محنتانہ کہ دس فیصد یا بیس فیصد لیا جائے اور اس کے بعد وہ اپنی محنتانہ میں سے رشوت دے کر وہ حاصل کرتا ہے، سرکاری اسکیم سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور رقم حاصل کرتا ہے اور وہ اس شخص کو دیتا ہے جو صاحب معاملہ ہے تو ایسی صورت میں اس رشوت کے دینے میں کیا وہ خود مجرم ہوگا یا وہ شخص صاحب معاملہ بھی اس کے لئے مجرم ہوگا یا اس کی کیا شکل ہوگی؟ میرے خیال سے تجویز میں اس کو بھی واضح کرنا چاہئے۔

جزاك الله۔

صدارتی کلمات

مفتی اشرف علی باقوی (امیر شریعت کرناٹک):

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم. أما بعد۔

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار گوہر بار میں درود وسلام، اس اہم اور فقہی اور تحقیقی علمی اور فنی مجلس میں جہاں ملک کے اور بیرون ملک کے اکابر علماء اور اصحاب تحقیق فقہاء، تجربہ کار اور تازہ دم اور تازہ علم نوجوان علماء بھی تشریف رکھتے ہیں، مجھ طالب علم کو یہ اعزاز بخشا گیا، میں اس پر ذمہ داران فقہ اکیڈمی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، آج جس موضوع پر یہاں گفتگو ہوئی وہ سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں ہے، عرض مسئلہ سامنے رکھا گیا اور ساری تفصیلات جو مقالات کی شکل میں اکیڈمی کے پاس پہنچی تھی ان کو مختصر طریقے پر نکات کی شکل میں سامنے لایا گیا، سن کر اندازہ ہوا کہ ہر مسئلہ میں اصحاب علم وفضل کی رائیں الگ الگ ہیں، مکمل طریقے سے سب کا اتفاق کسی بھی مسئلہ میں نظر نہیں آیا، ہر مسئلہ میں کچھ نہ کچھ رائے بدلی ہوئی ہے اور دلائل یقینا سب کے ساتھ ہیں سب کے پاس ہیں، قرآنی دلائل بھی، احادیث شریفہ بھی، فقہی عبارتیں بھی، بڑا اہم یا بہت ہی نمایاں چیز جو تھی وہ غلط بیانی کے سلسلہ میں تھی کہ اس میں بھی گنجائش نکال لی گئیں۔ حضرت مولانا عتیق احمد صاحب بستوی نے اس کی نزاکت کی طرف اشارہ کیا کہ الفاظ کو اور ذرا صحیح کرلیا جائے گا اور غلط بیانی تو بہرحال غلط بیانی ہے اس کو کیسے صحیح قرار دیا جائے گا؟

بزرگان محترم! ہمارے کرناٹک میں ایک اسکیم چلی ہوئی ہے اور حکومت گھروں کی تعمیر کررہی ہے اور سستے داموں میں اس کے حساب سے لوگوں کو دے رہی ہے مکان اور بہترین اس کا انداز ہے چوڑی سڑکیں ہیں، باغات ہیں، پارک ہیں، ساری سہولتیں ہیں، اس میں ایک شرط یہ ہے کہ جو صاحب خریدنا چاہتے ہیں وہ اتنی رقم پہلے دیں گے اس کے بعد جو بھی کریں گے، لیکن پہلی شرط یہ ہے کہ ان کا کوئی ذاتی مکان نہ ہو، اور اگر آپ غلط بیانی کی مجھے اجازت دیں تو میں ذاتی مکان رکھتے ہوئے اس میں یہ لکھوں کہ میرا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے، اس لئے یہ سستا مکان مجھے ملنا چاہئے۔ تو یہ کیسے صحیح ہوگا؟ میری سمجھ میں تو نہیں آیا، اس لئے چاہے کوئی بھی صورت ہو غلط بیانی تو غلط بیانی ہے۔ بہرحال یہ حضرات اکابر بیٹھیں گے اور ساری تفصیلات کو سامنے رکھ کر اپنا ایک آخری قطعی فیصلہ دیں گے، لیکن یہ کوئی بہت اچھی یا حضرات علماء کے لئے یا فقہ اکیڈمی کے لئے کوئی خوبی کی بات نہیں ہوگی کہ اس میں یہ فیصلہ کردیا جائے کہ گنجائش ہے، اس طرح سے، اس طرح سے اور اس طرح سے، غلط بیانی کی شکلیں نکالی جاسکتی ہیں، میں طالب علم ہوں، لیکن بہرحال اس کی کوئی گنجائش نہیں پاتا ہوں، اور وہ جو بہت پہلے سے ایک بات آئی تھی کہ کیا فقہ اکیڈمی کی تاسیس کا

مقصد یہ ہے کہ ہر ناجائز چیز کو جائز کر دیا جائے یہ تو نہیں ہے ظاہر ہے یہ، بڑی تحقیقات ہیں اور بہت زیادہ گہرائی میں جا کر فیصلے کئے جاتے ہیں، اس لئے اس انداز کے الفاظ سے بھی احتیاط برتنی چاہئے، علماء تو علماء عام آدمی بھی سوچے گا، تو پھر وہی بات ہوگی جو پہلے سے چلی آرہی ہے کہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر اپنا بیان بدلتے ہیں اور جوان کے فائدے کے لئے ہوتا ہے اس طرح بیان دیتے ہیں اور پھر اس طرح وہ اپنا فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔

بزرگان محترم! فقہ اکیڈمی ماشاء اللہ ۲۸ / سال سے اس میدان میں کام کر رہی ہے اور یہ چھبیسواں فقہی سمینار ہے اور یہاں اجین میں اس کا جو نظام قائم کیا گیا بہت ہی خوشی اور مسرت ہوئی اور یہ بھی دیکھا گیا کہ علماء میں فقہاء میں اور مقالہ نگاروں میں بڑی سنجیدگی بھی ہے، متانت بھی ہے، تحمل بھی ہے، برداشت بھی ہے، وہ جو ابتداء ابتداء میں ذرا تیزم تازی بھی ہوتی تھی وہ بھی اس موقع سے کہیں کبھی کسی موقع سے نظر نہیں آرہی ہے۔ یہ حضرات علماء، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا عتیق احمد بستوی صاحب اور مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب اور ہمارے صدر محترم، ان حضرات کا فیض ہے، ان کی برکتیں ہیں کہ ہمارے اندر وہ تحمل بھی آیا ہے برداشت بھی آئی ہے، سنجیدگی اور متانت بھی آئی ہے، دوسروں کی بات کو لینے کا، سمجھنے کا جذبہ بھی پیدا ہوا ہے، میں مبارک باد دیتا ہوں، اور یہ جو نظم وضبط ہے او راجین کے مجلس استقبالیہ کے ذمہ داروں نے جو انتظامات کئے ہیں ان انتظامات کی خوبی، خوبصورتی اور اس کا حسن وجمال اور اس کے نظام کی پاکیزگی، نزاکت ولطافت ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد تو واقعی بڑی دل سے شکر گزاری کے جذبات نکلتے ہیں اور الفاظ نکلتے ہیں، اللہ تعالی ان حضرات کو جزاء خیر عطا فرمائے۔ میں کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوں، لیکن بہرحال ان حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ایسے بزرگوں کے درمیان میں اس طالب علم کو یہ اعزاز بخشا اور آپ حضرات کے سامنے کچھ عرض کرنے کا موقع دیا۔ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کا کرم ہے، عنایت ہے، مہربانی ہے، خوردنوازی ہے کہ انہوں نے مجھے یہ مقام دیا۔ میں پھر ایک بار شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ حضرات کا بھی ممنون ہوں کہ میری طالب علمانہ سمع خراشی کو آپ نے برداشت فرمایا۔ تجاویز کمیٹی کی جو مجلس ہوگی اس میں انشاء اللہ یہ ساری تھوڑی تھوڑی جو اختلافی صورتیں ہیں وہ سب باقاعدہ ختم ہوں گی۔ او رسب ایک متفقہ فیصلے پر ہم لوگ انشاء اللہ پہنچیں گے۔ میں ان ہی چند باتوں پر اللہ کی حمد وثنا کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار عالی میں ہدیہ درود وسلام پیش کرنے کی دوبارہ سعادت پاتے ہوئے اجازت چاہتا ہوں

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔